

لغات القرآن

باب اوّل

عربی لغت سے استفادہ کے لئے ضروری معلومات

یہ باب ان قارئین کے لئے لکھا گیا ہے جو عربی زبان اور اس کی گرامر سے واقف نہیں - اس میں صرف و نحو کی دقیق اصطلاحات اور فنی باریکیوں سے بحث نہیں کی گئی ' بلکہ مختصر اور سادہ الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ عربی الفاظ کی شکلیں کس طرح بدلتی ہیں اور اس تبدیلی سے معنوں میں کیا فرق پڑتا ہے ؟

عربی لغت سے استفادہ کے لئے ضروری معلومات

عربی زبان کی لغت کی خصوصیت

آپ اردو زبان کی ڈکشنری میں (مثلاً) ''مُستَعلَم'' یا ''تعلیم'' کے الفاظ دیکھنا چاہیں تو مُستعلَم آپ کو ''م'' کی تختی میں اور تعلیم "ت" کی تختی میں مل جائے گا- لیکن اگر آپ یہی الفاظ عربی زبان کی ڈکشنری میں دیکھیں گے تو نہ متعلم ''م'' کی تختی میں ملے گا اور نہ ہی تعلیم "ت" کی تختی میں - یہ دونوں ع - ل - م (علم) کے باب میں ملیں گے - اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ عربی زبان کی لغت (ڈکشنری) میں الفاظ کی ترتیب ان کے حروف کی ترتیب کے مطابق ہو - یہ پہلی دشواری ہے جو عربی نہ جاننے والوں کی راہ میں عربی زبان کی ڈکشنری سے الفاظ کے معانی معلوم کرنے کی راہ میں حائل ہوتی ہے - لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ایسا کیوں ہے تو یہی دشواری ایک طرف یہ بتا دیگی کہ عربی زبان کس قدر سائنٹیفک ہے اور دوسری طرف یہ کہ اس کے الفاظ کے معانی معلوم (بلکہ متعین) کرنے کس قدر آسان اور دلچسپ ہیں -

عربی زبان کا ہر لفظ الگ الگ مستقل حیثیت نہیں رکھتا بلکہ جس طرح درخت کی شاخیں ' پتے ' پھول ' پھل اس کے بیج یا جڑ سے نکلے ہوتے ہیں اسی طرح اس زبان کا ہر لفظ اپنی ایک جڑ اور اصل رکھتا ہے جس سے وہ وجود پذیر ہوتا ہے -

مادّہ

اس جڑ یا اصل کو مادّہ (Root) کہتے ہیں - عربی زبان میں ایک مادہ سے سینکڑوں الفاظ (اسماء - افعال- صیغے وغیرہ) بنتے ہیں- ان الفاظ کی شکلیں مختلف ہوں گی لیکن ان میں سے ہر ایک میں اس جڑ (مادہ) کی خصوصیت ضرور موجود ہوگی ' نیز یہ کہ یہ الفاظ اور ان کی مختلف شکلیں یونہی اندھا دھند نہیں بن جاتیں - یہ

خاص قاعدوں کے مطابق سائنٹیفک طریق سے بنتی ہیں اور ہر شکل اپنا خاص مفہوم رکھتی ہے - اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی لفظ کا مادہ معلوم ہو اور ان قاعدوں سے واقفیت ہو جن کے مطابق اس مادہ سے مختلف الفاظ خاص شکلیں لئے ہوئے ابھرتے ہیں تو مادہ کے معنی معلوم ہو جانے سے ان تمام الفاظ کے معانی خود بخود سامنے آ جائیں گے - یہ وجہ ہے کہ عربی زبان کی ڈکشنری میں مختلف الفاظ کو ان کے حروف کی ترتیب سے نہیں دیا جاتا بلکہ انہیں ان کے مادہ کے تحت دیا جاتا ہے -

اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی لفظ کا مادہ معلوم کرنا آ جائے تو اس سے نہ صرف اس خاص لفظ کے معانی معلوم ہوجائیں گے بلکہ اس "خاندان" (شجر، درخت) کے تمام افراد سے تعارف ہو جائیگا اور ہم ان کے خط و خال کو دیکھتے ہی بتا دینگے کہ یہ کس اصل کی شاخیں ہیں -

مادّہ معلوم کرنیکا طریقہ

اب ہم ایک مثال سے بتاتے ہیں کہ مادہ (بالعموم) کس طرح معلوم کیا جاتا ہے - مندرجۂ ذیل الفاظ ہماری روز مرہ کی بولی میں شامل ہیں :

(۱) معلوم (۲) معلومات (۳) عالم (۴) علماء (۵) علم (۶) مُعَلّم (۷) متعلم (۸) متعلمہ (۹) معلّمہ (۱۰) تعلیم (۱۱) علوم (۱۲) علیم (۱۳) علمی (۱۴) علامت (۱۵) علمیّت (۱۶) علاّمہ

یہ تمام الفاظ عربی زبان کے ہیں جنہیں ہم بے تکان، اپنی زبان میں لکھتے پڑھتے اور بولتے ہیں - آپ ان الفاظ کی ساخت پر غور کیجئے - ایک بات نمایاں طور پر نظر آ جائیگی - یعنی کچھ حروف ایسے ہیں جو ان تمام الفاظ میں مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں - یہ حروف ہیں "ع - ل - م -" ان کے علاوہ باقی حروف ایسے ہیں جو کسی ایک لفظ میں پائے جاتے ہیں لیکن دوسرے میں موجود نہیں ہیں - مثلاً عالم میں "الف" ہے جو تعلم میں نہیں - متعلّم میں "ت" ہے جو معلوم میں نہیں -

وہ حروف جو تمام الفاظ میں مشترک پائے جاتے ہیں ان الفاظ کا مادہ (اصلی حروف)

کہلاتے ہیں - اس اصول کے مطابق مندرجۂ بالا سواہ الفاظ کا مادہ "ع - ل - م" (علم) ہے -

ایک مادہ سے جو مختلف الفاظ بنائے جاتے ہیں وہ اس مادہ کے "مشتقات" ہیں -

[نوٹ بعض اوقات ایک لفظ جس انداز سے لکھا ہوا ہمارے سامنے آتا ہے اس کے ساتھ مادہ کے اصلی حروف اور زائد حروف کے علاوہ اور حروف بھی ملے ہوئے ہوتے ہیں - اصل لفظ جس کا مادہ معلوم کرنا ہو' ان حروف کو الگ کرنے سے سامنے آتا ہے - مثلاً فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللہُ میں اصلی لفظ یَکْفِی ہے - باقی حروف (ف - س - ک - ھُمُ) اس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں - ان حروف کو الگ کرکے یَکْفِی کا مادہّ معلوم کیا جائیگا- عربی زبان سے تھوڑی سی واقفیت ہو جانے سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی لفظ میں اس قسم کے حروف کون کون سے ہیں - یہ حروف خاص مقصد کے لئے آتے ہیں -]

الف اور ھمزہ کا فرق

عربی زبان کے حروف ھجا (Alphabet) حسب ذیل ہیں :

ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض
ط ظ ع غ ف ق ك ل م ن ه و ی -

زیر نظر لغت میں الفاظ انہی حروف کی ترتیب سے سامنے آئینگے - ان حروف میں صرف ایک چیز قابل غور ہے اور وہ ہے الف اور ھمزہ کا فرق - الف پر زبر' زیر' پیش کچھ نہیں ہوتا - جیسے قَالَ میں ق کے بعد الف ہے لیکن اس پر کوئی حرکت نہیں اس کے برعکس اَکَلَ میں الف پر زبر ہے' اس لئے اسے الف نہیں بلکہ ھمزہ کہینگے- اسی طرح یَأْتِی میں الف پر جزم ہے - یہ بھی ھمزہ ہے الف نہیں -

عربی زبان کے کسی لفظ کے مادہ میں الف کبھی نہیں آئیگا' ھمزہ آئیگا - اگر کسی مادہ میں الف نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ اس جگہ در حقیقت اصلی حرف واو یا ی تھا - الف اس واو یا ی سے بدل کر آیا ہے - مثلاً قَامَ میں مادہ ق - و - م ہے - گویا قَامَ اصل میں' قَوَمَ تھا - واو' الف سے بدل گیا ہے - اسی طرح بَاعَ کا مادہ ب - ی - ع ہے - ی' الف سے بدل گئی ہے -

حروفِ علّت

عربی حروف ہجا میں تین حروف (ا ـ و ـ ی) حروف علت (Vowel) کہلاتے ہیں اور باقی حروف صحیحہ یا حروف صحت (Consonant) ـ علت بیماری کو کہتے ہیں ـ جس لفظ میں ان حروف میں سے کوئی حرف آ جائے اس کے مادہ کے معلوم کرنے میں کچھ پریشانی ہو جاتی ہے (روگ لگ جاتا ہے) ـ اس لئے کہ یہ حروف اس لفظ کو اس کی صحیح حالت اور پورے وزن پر نہیں رہنے دیتے ـ ان امور کی تفصیل میں جانے کی آپ کو ضرورت نہیں ـ یہاں صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہوگا کہ جس مادہ میں واو ہو اسے واوی اور جس مادہ میں ی ہو اسے یائی کہتے ہیں ـ ان مادوں کا فرق ظاہر کرنے اور حروف علت کی پریشان کن تبدیلیوں کو سامنے لانے کے لئے ہم آگے چل کر کچھ مثالیں پیش کرینگے ' جنہیں سمجھ لینے سے حروف علت والے مادوں کا معلوم کر لینا بھی چنداں دشوار نہیں رہیگا ـ

مادّہ اور اسکے مُشتقّات

ہر مادہ سے معین اوزان پر ' افعال (Verbs) اور اسماء (Nouns) بنائے جاتے ہیں (انہیں اس مادہ کے "مشتقات" کہتے ہیں) حروف (Particles) مادہ سے نہیں بنتے ـ

[عربی زبان میں دیگر زبانوں کی طرح حروف بڑی اہمیت رکھتے ہیں ' ان کا تفصیلی بیان آگے چل کر آئیگا]

مختلف مادوں سے حسب ذیل افعال اور اسماء بنتے ہیں :

(نوٹ ـ اصطلاحات کی تشریح آگے چل کر آئیگی)

افعال اور ان کے مختلف ابواب :

(۱) فعل ماضی ـ معلوم و مجہول ـ مثبت و منفی وغیرہ (مع جملہ اقسام) ـ

(۲) فعل مضارع ـ معلوم و مجہول ـ مثبت و منفی ـ لام تاکید اور نون تاکید (ثقیلہ و خفیفہ) کے ساتھ ـ وغیرہ ـ

(۳) امر ـ حاضر و غائب وغیرہ ـ

(۴) نہی ـ حاضر و غائب ـ

افعال

فعل ماضی | گزرے ہوئے زمانے کو ماضی کہتے ہیں ۔ لہذا جو کام گذرے ہوئے زمانہ میں ہوا ہو یا کیا دیا ہو وہ ''فعل ماضی'' کہلاتا ہے ۔انگریزی گرامر میں اسے (Past Tense) کہتے ہیں ۔

فعل مضارع | موجودہ زمانہ کو حال (Present) اور آنے والے کو مستقبل (Future) کہتے ہیں ۔ عربی زبان میں ان دونوں زمانوں (یعنی حال و مستقبل) کے لئے ایک فعل استعمال ہوتا ہے جسے ''فعل مضارع'' کہتے ہیں ۔ انگریزی میں اسے (Aorist Tense) کہا جاتا ہے ۔

فعل مثبت اور منفی | جس فعل میں کسی کام کے کرنے کا ذکر ہو وہ فعل مثبت (Affirmative) کہلاتا ہے ۔ جس فعل میں نہ کرنے کا ذکر ہو وہ فعل منفی (Negative) ۔ فعل ماضی کو منفی بنانے کے لئے اس کے شروع میں مَا بڑھا دیتے ہیں اور فعل مضارع کے شروع میں لَا ۔

فعل کی ضمیریں | عربی زبان میں فعل کے ہر صیغے میں ایک ضمیر (Pronoun) ہوتی ہے ۔ مثلاً کَتَبَ کے معنی صرف " لکھا " نہیں بلکہ " اس (مذکر) نے لکھا "۔ اسی طرح ''اَکْتُبُ'' کے معنی ہیں " میں لکھتا ہوں " ۔

ضمائر (Pronoun) کی تین قسمیں ہیں ۔ غائب کی ضمیر (Third Person) ۔ مخاطب کی ضمیر (Second Person)۔ اور متکلم کی ضمیر (First Person) ۔ جس فعل میں غائب کی ضمیر ہوگی وہ ''غائب'' کہلائیگا ۔ جس میں مخاطب کی ضمیر ہوگی وہ ''مخاطب'' اور جس میں متکلم کی ضمیر ہوگی وہ ''متکلم'' ۔

مذکّر و مؤنّث | عربی زبان میں مذکر (Masculine) اور مؤنث (Faminine) کے افعال (Verb) کے لئے بھی الگ الگ شکلیں ہوتی ہیں ۔ مثلاً کَتَبَ ۔ اس (مذکر) نے لکھا ۔ کَتَبَتْ ۔ اس (مؤنث) نے لکھا ۔ یا ذَهَبَ وہ (مذکر) گیا ' اور ذَهَبَتْ وہ مؤنث گئی ۔

واحد ۔ تثنیہ ۔ جمع

اردو زبان میں ایک کو واحد (Singular) اور ایک سے زیادہ کو جمع (Plural) کہتے ہیں ۔ لیکن عربی زبان میں "دو" کے لئے الگ صیغہ استعمال ہوتا ہے ۔ اسے تَثْنِیَہ یا مُثَنّٰی (Dual) کہتے ہیں۔ مثلاً کَتَبَ : اس ایک (مذکر) نے لکھا ۔ کَتَبَا : ان دو (مذکروں) نے لکھا۔ اور کَتَبُوا : ان دو سے زیادہ یا سب (مذکروں) نے لکھا ۔

آپ نے دیکھا کہ عربی زبان میں محض صیغہ بدل دینے سے کیا کیا فرق پڑ جاتا ہے ۔ اس اعتبار سے یہ زبان بڑی جامع ہے ۔

فعل معلوم و مجہول

فعل (Verb) کی ابھی ایک اور قسم باقی ہے اور وہ ہے معلوم ومجہول ۔ فعل معلوم (Active) وہ ہے جس میں فاعل (یعنی کام کرنے والا) معلوم ہو۔ مثلاً قَتَلَ کے معنے ہیں "اس نے قتل کیا"۔ اس میں معلوم ہے کہ قتل کرنے والا کون ہے ۔ لیکن جب کہا جائے قُتِلَ (وہ قتل کیا گیا) تو اس میں یہ معلوم نہیں کہ قاتل کون ہے ۔ اول الذکر کو فعل معلوم یا فعل معروف کہتے ہیں اور ثانی الذکر کو فعل مجہول (Passive)۔ آگے چل کر ہم بتائینگے کہ فعل معروف سے فعل مجہول بنتا کس طرح ہے ۔

فعل کے متعلق یہ تفصیل معلوم ہوجانے کےبعد اب آپ فعل کےوزن اور صیغے دیکھئے۔

فعل ماضی کے صیغے (گردان یا شکلیں)

فعل ماضی معلوم (مثبت)

صیغہ	ترجمہ	عدد	جنس	شخص
ذَهَبَ	وہ گیا	واحد	مذکر	غائب
ذَهَبَا	وہ دو گئے	مثنّی		
ذَهَبُوا	وہ سب گئے	جمع		
ذَهَبَتْ	وہ گئی	واحد	مؤنث	
ذَهَبَتَا	وہ دو گئیں	مثنّی		
ذَهَبْنَ	وہ سب گئیں	جمع		
ذَهَبْتَ	تو گیا	واحد	مذکر	حاضر
ذَهَبْتُمَا	تم دو گئے	مثنّی		
ذَهَبْتُمْ	تم سب گئے	جمع		
ذَهَبْتِ	تو گئی	واحد	مؤنث	
ذَهَبْتُمَا	تم دو گئیں	مثنّی		
ذَهَبْتُنَّ	تم سب گئیں	جمع		
ذَهَبْتُ	میں گیا یا میں گئی	واحد	مذکر و مؤنث	متکلم
ذَهَبْنَا	ہم دو یا ہم سب گئے ہم دو یا ہم سب گئیں	مثنّی و جمع		

نوٹ - فعل ماضی منفی بنانے کے لئے شروع میں ''مَا'' پڑھا دیجئے - مثلاً

مَا ذَهَبَ : وہ نہیں گیا -

فعل ماضی مجہول (مثبت)

فعل ماضی مجہول بنانے کے لئے پہلے حرف پر پیش اور دوسرے حرف پر زیر ہوجاتا ہے۔

قُتِلَ	وہ قتل کیا گیا	واحد	مذکر	غائب
قُتِلَا	وہ دو قتل کئے گئے	مثنی		
قُتِلُوْا	وہ سب قتل کئے گئے	جمع		
قُتِلَتْ	وہ قتل کی گئی	واحد	مؤنث	
قُتِلَتَا	وہ دو قتل کی گئیں	مثنی		
قُتِلْنَ	وہ سب قتل کی گئیں	جمع		
قُتِلْتَ	تو قتل کیا گیا	واحد	مذکر	حاضر
قُتِلْتُمَا	تم دو قتل کئے گئے	مثنی		
قُتِلْتُمْ	تم سب قتل کئے گئے	جمع		
قُتِلْتِ	تو قتل کی گئی	واحد	مؤنث	
قُتِلْتُمَا	تم دو قتل کی گئیں	مثنی		
قُتِلْتُنَّ	تم سب قتل کی گئیں	جمع		
قُتِلْتُ	میں قتل کیا گیا، میں قتل کی گئی	واحد	مذکر و مؤنث	متکلم
قُتِلْنَا	ہم دو یا ہم سب قتل کئے گئے ہم دو یا ہم سب قتل کی گئیں	مثنی و جمع		

نوٹ۔ منفی ماضی مجہول بنانے کے لئے "مَا" بڑھا دیجئے۔ جیسے مَا قُتِلَ: وہ قتل نہیں کیا گیا۔

فعل مضارع (حال و استقبال) معلوم ۔ مثبت

صیغہ	ترجمہ	عدد	جنس	شخص
يَعْلَمُ	وہ جانتا ہے یا جانے گا	واحد	مذکر	غائب
يَعْلَمَانِ	وہ دو جانتے ہیں یا جانیں گے ۔	مثنی	مذکر	غائب
يَعْلَمُوْنَ	وہ سب جانتے ہیں یا جانیں گے ۔	جمع	مذکر	غائب
تَعْلَمُ	وہ جانتی ہے یا جانے گی	واحد	مؤنث	غائب
تَعْلَمَانِ	وہ دو جانتی ہیں یا جانیں گی	مثنی	مؤنث	غائب
يَعْلَمْنَ	وہ سب جانتی ہیں یا جانیں گی	جمع	مؤنث	غائب
تَعْلَمُ	تو جانتا ہے یا جانے گا	واحد	مذکر	حاضر
تَعْلَمَانِ	تم دو جانتے ہو یا جانوگے	مثنی	مذکر	حاضر
تَعْلَمُوْنَ	تم سب جانتے ہو یا جانوگے	جمع	مذکر	حاضر
تَعْلَمِيْنَ	تو جانتی ہے یا جانے گی	واحد	مؤنث	حاضر
تَعْلَمَانِ	تم دو جانتی ہو یا جانوگی	مثنی	مؤنث	حاضر
تَعْلَمْنَ	تم سب جانتی ہو یا جانوگی	جمع	مؤنث	حاضر
أَعْلَمُ	میں جانتا ہوں یا جانوں گا میں جانتی ہوں یا جانوں گی	واحد	مذکر و مؤنث	متکلم
نَعْلَمُ	ہم دو یا ہم سب جانتے ہیں یا جانیں گے ہم دو یا ہم سب جانتی ہیں یا جانیں گی	مثنی و جمع	مذکر و مؤنث	متکلم

نوٹ ۔ فعل مضارع منفی بنانے کے لئے شروع میں ”لَا“ بڑھا دیا جاتا ہے ۔
مثلاً ”لَا يَعْلَمُ : وہ نہیں جانتا ہے یا نہیں جانے گا“

فعل مضارع مجہول - مثبت

فعل مجہول بنانے کے لیے پہلے حرف پر پیش اور تیسرے پر زبر لگایا جاتا ہے

صیغہ	معنی	عدد	جنس	شخص
یُقْتَلُ	وہ قتل کیا جاتا ہے یا قتل کیا جائیگا	واحد	مذکر	غائب
یُقْتَلَانِ	وہ دو قتل کئے جاتے ہیں یا قتل کئے جائینگے	مثنی		
یُقْتَلُوْنَ	وہ سب قتل کئے جاتے ہیں یا قتل کئے جائینگے	جمع		
تُقْتَلُ	وہ قتل کی جاتی ہے یا قتل کی جائیگی	واحد	مؤنث	
تُقْتَلَانِ	وہ دونوں قتل کی جاتی ہیں یا قتل کی جائینگی	مثنی		
یُقْتَلْنَ	وہ سب قتل کی جاتی ہیں یا قتل کی جائینگی	جمع		
تُقْتَلُ	تو قتل کیا جاتا ہے یا قتل کیا جائے گا	واحد	مذکر	حاضر
تُقْتَلَانِ	تم دو قتل کئے جاتے ہو یا قتل کئے جاؤگے	مثنی		
تُقْتَلُوْنَ	تم سب قتل کئے جاتے ہو یا قتل کئے جاؤگے	جمع		
تُقْتَلِیْنَ	تو قتل کی جاتی ہے یا قتل کی جائے گی	واحد	مؤنث	
تُقْتَلَانِ	تم دو قتل کی جاتی ہو یا قتل کی جاؤگی	مثنی		
تُقْتَلْنَ	تم سب قتل کی جاتی ہو یا قتل کی جاؤگی	جمع		
اُقْتَلُ	میں قتل کیا جاتا ہوں یا قتل کیا جاؤنگا میں قتل کی جاتی ہوں یا قتل کی جاؤنگی	واحد	مذکر و مؤنث	متکلم
نُقْتَلُ	ہم دو یا ہم سب قتل کئے جاتے ہیں یا قتل کئے جائیں گے ہم دو یا ہم سب قتل کی جاتی ہیں یا قتل کی جائیں گی	مثنی و جمع		

نوٹ - منفی بنانے کے لئے شروع میں "لَا" بڑھا دیا جاتا ہے - جیسے

"لَا یُقْتَلُ : وہ قتل نہیں کیا جاتا ہے یا قتل نہیں کیا جائے گا"

بعض تغیرات

فعل ماضی اور فعل مضارع کے جو اوزان پیچھے دئے گئے ہیں (وہ ثلاثی مجرد کے ہیں) ان کے مطابق ہر فعل سے اتنی ہی شکلیں بنائی جا سکتی ہیں۔ فعل معلوم (معروف) میں ماضی کے درمیانی یعنی دوسرے حرف پر الگ الگ حرکت (زبر' زیر' پیش) ہوتی ہے۔ مثلاً فعل ماضی عَلِمَ میں ل پر زیر ہے لیکن ثَقُلَ میں ق پر پیش ہے اور ذَهَبَ میں ه پر زبر ہے۔ اسی طرح مضارع معروف میں بھی تیسرے حرف پر مختلف حرکات ہوتی ہیں' مثلاً یَعْلَمُ میں ل پر زبر ہے' یَنْصُرُ میں ص پر پیش ہے اور یَکْذِبُ میں ذ پر زیر ہے۔ ان درمیانی حروف کی حرکتوں کے اختلاف کے متعلق تفصیل سے اگلے باب میں لکھا جائے گا جہاں بتایا جائے گا کہ "ابواب اور ان کے خواص" کیا ہیں۔

یہ تو رہا درمیانی حرف کی حرکتوں کا بیان۔ فعل ماضی کے صیغوں کے آخر میں کوئی تغیر نہیں ہوتا لیکن فعل مضارع کے شروع میں بعض حروف کے آ جانے سے اس کے صیغوں کے آخر میں کچھ تغیر ہو جاتا ہے۔ مثلاً إِنْ ۔ لَمْ ۔ لَمَّا ۔ لام امر ۔ لا، نہی ، میں سے جب کوئی حرف مضارع سے پہلے آ جائے تو :

۱۔ مضارع کے جن صیغوں کے آخر میں ن نہیں ہوتا ان کے آخری حرف پر جزم آجاتا ہے۔ مثلاً یَعْلَمُ ۔ تَعْلَمُ ۔ اَعْلَمُ ۔ تَعْلَمُ سے لَمْ یَعْلَمْ ۔ لَمْ تَعْلَمْ ۔ لَمْ اَعْلَمْ ۔ لَمْ تَعْلَمْ ۔

۲۔ جمع مؤنث کے صیغوں کو چھوڑ کر (جو اپنی حالت پر رہتے ہیں) باقی جن صیغوں کے آخر میں ن ہے وہ اُڑ جاتا ہے۔ مثلاً :

یَعْلَمَانِ ۔ یَعْلَمُوْنَ ۔ تَعْلَمَانِ ۔ تَعْلَمُوْنَ ۔ تَعْلَمِیْنَ سے لَمَّا یَعْلَمَا ۔ لَمْ یَعْلَمُوْا ۔ إِنْ تَعْلَمَا ۔ لَمْ تَعْلَمُوْا اور لَمْ تَعْلَمِیْ ۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے جمع مؤنث کے دو صیغوں کے ن ہر حال میں باقی

رہتے ہیں۔ مثلاً لَمْ یَعْلَمْنَ ۔ لَمْ تَعْلَمْنَ ۔

۳۔ اسی طرح بعض حروف مضارع کے شروع میں آتے ہیں تو وہ مضارع کے ان صیغوں کے آخری حرف پر زبر لگا دیتے ہیں جن کے آخر میں ن نہیں ہوتا اور جن کے آخر میں ن ہوتا ہے ان میں وہی تغیر پیدا کرتے ہیں جو لَمْ اور لَمّا وغیرہ کرتے ہیں ۔ وہ حروف یہ ہیں :

اَنْ ۔ لَنْ ۔ کَیْ ۔ لِکَیْ ۔

مثلاً یَعْلَمُ ۔ تَعْلَمُ ۔ اَعْلَمُ ۔ نَعْلَمُ سے اَنْ یَّعْلَمَ ۔ لَنْ تَعْلَمَ لِکَیْ اَعْلَمَ ۔

اور یَعْلَمَانِ سے لَنْ یَعْلَمَا ۔ یَعْلَمُوْنَ سے اَنْ یَّعْلَمُوْا وغیرہ ۔ جمع مؤنث کے دو صیغوں کے آخری ن ہر حال میں باقی رہتے ہیں ۔ مثلاً لَنْ یَعْلَمْنَ ۔ لَنْ تَعْلَمْنَ ۔

۴۔ مضارع کے شروع میں لام تاکید اور آخر میں نون تاکید کے آنے سے بھی مضارع میں بعض تغیرات پیدا ہوتے ہیں ۔ مثلاً لَا یَحْطِمُ کے آخر میں نون تاکید بڑھایا جائے تو وہ لَا یَحْطِمَنَّ ہو جائے گا ۔ یعنی م کا پیش زبر سے بدل جائے گا ۔ اسی طرح اَحْتَنِكُ کے پہلے لام تاکید اور آخر میں نون تاکید بڑھانے سے لَاَحْتَنِکَنَّ ہوگیا ۔ یعنی كَ کا پیش زبر سے بدل گیا ۔ (بغرض اختصار انہی مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے) ۔

اب امر اور نہی کے صیغوں کو لیجئے ۔

امر کے صیغے
(IMPERATIVE)

اِذْهَبْ	تو جا	واحد	مذکر
اِذْهَبَا	تم دو جاؤ	مثنی	
اِذْهَبُوْا	تم سب جاؤ	جمع	
اِذْهَبِیْ	تو جا	واحد	مؤنث
اِذْهَبَا	تم دو جاؤ	مثنی	
اِذْهَبْنَ	تم سب جاؤ	جمع	

چونکہ امر (حکم) زیادہ تر سامنے والے شخص (مخاطب) کو دیا جاتا ہے اس لئے حاضر کے صیغوں سے امر کی شکلیں بنتی ہیں ۔ علاوہ ازیں غائب اور متکلم کے صیغوں سے بھی امر آتا ہے ۔ مثلاً لِیَفْعَلْ : اسے کرنا چاہئے یا وہ کرے ۔

نہی کے صیغے
(PROHIBITIVE IMPERATIVE)

لَا تَذْهَبْ	تو مت جا	واحد	مذکر
لَا تَذْهَبَا	تم دو مت جاؤ	مثنی	
لَا تَذْهَبُوْا	تم سب مت جاؤ	جمع	
لَا تَذْهَبِیْ	تو مت جا	واحد	مؤنث
لَا تَذْهَبَا	تم دونوں مت جاؤ	مثنی	
لَا تَذْهَبْنَ	تم سب مت جاؤ	جمع	

نہی کے صیغے بھی امر کی طرح حاضر کے لئے زیادہ استعمال ہوتے ہیں ۔ علاوہ ازیں

غائب اور متکلم سے بھی نہی کے صیغے مستعمل ہیں - مثلاً " لَا یَعْلَمْ : وہ نہ جانے ' اسے نہیں جاننا چاہئے " - " لَا یُشْرِكْ : وہ شرک نہ کرے ' اسے شرک نہیں کرنا چاہئے " - " لَا یَغْتَبْ : وہ غیبت نہ کرے ' اسے غیبت نہیں کرنا چاہئے " -

---

اسم (NOUN)

یوں تو عربی زبان میں نام کو اسم کہتے ہیں لیکن اس میں اسم کا مفہوم بہت وسیع ہے - جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں عربی زبان کے تمام الفاظ صرف تین شکلوں میں تقسیم ہوتے ہیں - (۱) اسم (۲) فعل (۳) حرف - لہذا عربی زبان میں جو لفظ بھی فعل یا حرف نہیں ہوگا وہ اسم ہوگا -

مختلف مادوں سے جو فعل بنتے ہیں وہ پہلے لکھے جا چکے ہیں -

اسم کی متفرق شکلیں

جس طرح (سابقہ صفحات میں) افعال (ماضی - مضارع - امر - نہی) کے اوزان اور ان کی مختلف شکلیں آپ کے سامنے آئی ہیں اسی طرح اسماء کے بھی متفرق اوزان اور مختلف شکلیں ہوتی ہیں - مثلاً مُشْرِكٌ کے معنی ہیں شرک کرنے والا- لیکن آپ کہیں مُشْرِكٌ دیکھیں گے کہیں مُشْرِكَةٌ - کہیں مُشْرِكُوْنَ اور کہیں مُشْرِكِيْنَ وغیرہ وغیرہ - لفظ مُشْرِكٌ میں یہ تبدیلیاں خاص مفہوم رکھتی ہیں - مُشْرِكٌ کے معنی ایک (مذکر) مشرک- مُشْرِكُوْنَ اور مُشْرِكِيْنَ کے معنے ہیں بہت سے مشرک مرد - مُشْرِكَةٌ : ایک مشرک عورت - مُشْرِكَاتٌ : بہت سی مشرک عورتیں -

نوٹ : ہم نے اوپر لکھا ہے کہ مُشْرِكٌ کی جمع مُشْرِكُوْنَ اور مُشْرِكِيْنَ (دونوں) آتی ہیں - اس کے یہ معنی نہیں کہ جہاں آپ کا جی چاہے مُشْرِكُوْنَ کہہ دیں اور جہاں جی چاہے مُشْرِكِيْنَ - اس کے لئے خاص قاعدے مقرر ہیں ' لیکن

چونکہ ان قواعد کا تعلق نحو سے ہے اور ان کا بیان بہت طول طویل ' اس لئے ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہئے ۔ مقصد پیش نظر کے لئے اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ بعض حالتوں میں مُشْرِکُوْنَ آتا ہے اور بعض میں مُشْرِکِیْنَ ۔

اس سے ظاہر ہے کہ اسم کی بھی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ ان شکلوں کی تفصیل درج ذیل ہے ۔

مُذَکَّر و مُؤَنَّث جیسا کہ آپ کو معلوم ہے' مذکر (نر) کو کہتے ہیں اور مؤنث (مادہ) کو۔ اکثر مذکر نام ایسے ہوتے ہیں جن کا مؤنث نہیں ہوتا ۔ مثلاً (ہماری زبان میں) دریا ۔ سمندر ۔ آسمان ۔ مذکر بولے جاتے ہیں لیکن ان کا مؤنث کوئی نہیں ہوتا ' ان کے برخلاف بہت سے مذکر نام ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے مقابلہ میں ان کا مؤنث بھی ہوتا ہے ۔ مثلاً دھوبی کے مقابلہ میں دھوبن۔ عربی زبان میں مذکر نام کو مؤنث بنانے کے لئے کچھ قاعدے مقرر ہیں ۔ مثلاً :

(۱) مذکر اسم کے آخر میں ۃ (گول ت) کا اضافہ کر دیا جاتا ہے ۔ مثلاً عَالِمٌ (جاننے والا) عَالِمَةٌ (جاننے والی) ۔

(یاد رکھئے ۔ گول ت (ۃ) زائد حروف میں ہوتی ہے ' مادہ کے اصلی حروف میں نہیں ہوتی) ۔

(۲) جو مذکر اسم اَفْعَلُ کے وزن پر ہو اس کا مؤنث کبھی فُعْلٰی کے وزن پر اور کبھی فَعْلَاءُ کے وزن پر آتا ہے۔ جیسے اَصْغَرُ (جو اَفْعَلُ کے وزن پر ہے) کا مؤنث صُغْرٰی آئیگا (جو فُعْلٰی کے وزن پر ہے) ۔ آخَرُ بروزن اَفْعَلُ کا مؤنث اُخْرٰی (بروزن فُعْلٰی) ہوگا[1] اور اَصْفَرُ (بروزن اَفْعَلُ) کا مؤنث صَفْرَاءُ (بروزن فَعْلَاءُ) آئیگا ۔

---

(۱) اَدْنٰی کا مؤنث دُنْیَا بھی اسی قاعدے کے مطابق ہے ۔

واحد ۔ تثنیہ ۔ جمع

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ عربی زبان میں ایک کے لئے واحد، دو کے لئے تثنیہ یا مثنٰی اور دو سے زیادہ کے لئے جمع آتی ہے ۔

واحد اسم کو تثنیہ بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ اس کے آخر میں "ان" یا "یْن" بڑھا دیا جائے ۔ ان اور یْن سے پہلے جو حرف ہو اس پر زبر رہیگا اور آخری نون پر ہمیشہ زیر، مثلاً :

عَیْنٌ ایک آنکھ ۔ سے تثنیہ ۔ عَیْنَانِ یا عَیْنَیْنِ (دو آنکھیں)۔ یَدٌ ۔ ایک ہاتھ سے تثنیہ ۔ یَدَانِ یا یَدَیْنِ (دو ہاتھ)۔ عَالِمَۃٌ : ایک جاننے والی عورت سے تثنیہ ۔ عَالِمَتَانِ یا عَالِمَتَیْنِ (دو جاننے والی عورتیں) ۔

مرکب اضافی (Possessive Construction) میں جب مضاف (Adjunct) تثنیہ ہو تو اس کا آخری نون اڑ جاتا ہے ۔ مثلاً تَبَّتْ یَدَا اَبِی لَہَبٍ میں یَدَا درحقیقت یَدَانِ (تثنیہ) تھا لیکن چونکہ یہ مضاف تھا اس لیے اس کا نون اڑ گیا اور یَدَانِ کی جگہ صرف یَدَا رہ گیا ۔ اسی طرح اِخْلَعْ نَعْلَیْکَ میں نَعْلَیْ مضاف ہے اس لئے اس کا نون اڑ گیا اور نَعْلَیْنِ کے بجائے صرف نَعْلَیْ رہ گیا ۔

جمع

عربی زبان میں جمع کی دو بڑی قسمیں ہیں ۔ جمع سالم (Sound Plural) اور جمع مُکَسَّر (Broken Plural) ۔ جمع سالم اسے کہتے ہیں جس میں واحد کی شکل اسی طرح صحیح و سالم باقی رہے اور مُکَسَّر میں واحد کی شکل بدل جاتی یا اس کے حروف کی ترتیب ٹوٹ جاتی ہے ۔ مثلاً عَالِمٌ (واحد) سے عَالِمُوْنَ جمع سالم ہے اور کِتَابٌ کی جمع کُتُبٌ جمع مُکَسَّر ہے۔ اس میں لفظ کِتَابٌ (واحد) اپنی اصلی شکل پر نہیں رہا ۔

جمع مذکر سالم بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ واحد کے آخر میں "وْنَ" یا "یْنَ" لگا

دیا جائے اور و سے پہلے حرف پر پیش اور ی سے پہلے حرف پر زیر دیدیا جائے۔ (آخری نون پر ہمیشہ زبر رہیگا) مثلاً -

عَالِمٌ سے جمع مذکر سالم - عَالِمُوْنَ یا عَالِمِیْنَ آئیگا -

جمع مؤنث سالم بنانے کے لئے واحد کے آخر میں اتٌ کا اضافہ کر دیا جائے، مثلاً۔

عَالِمٌ سے جمع مؤنث سالم عَالِمَاتٌ آئیگا -

(ۃٌ کہاں آئیگا اور ت کہاں .. اس کا تعلق نحو کے قاعدوں سے ہے) -

جمع مُکَسَّر | وہ جمع جس میں واحد جوں کا توں نہیں رہتا بلکہ اس میں کچھ تبدیلی آ جاتی ہے "جمع مکسر" کہلاتی ہے - مثلاً کِتَابٌ کی جمع کُتُبٌ ۔ رَسُوْلٌ کی جمع رُسُلٌ۔ قَلَمٌ کی جمع اَقْلَامٌ ۔ رَجُلٌ کی جمع رِجَالٌ -

اس جمع کے بہت سے اوزان ہیں اور مختلف وزنوں پر آنے والے اسموں کی مختلف وزنوں پر جمع بنائی جاتی ہے - یہاں چند کثیر الاستعمال جمعوں کے اوزان مع امثلہ درج کئے جاتے ہیں :

(۱) اَفْعَالٌ (کے وزن پر) - جیسے قَلَمٌ کی جمع اَقْلَامٌ اور رَبٌّ کی جمع اَرْبَابٌ -

(۲) اَفْعُلٌ (کے وزن پر)- جیسے رِجْلٌ کی جمع اَرْجُلٌ اور نَفْسٌ کی جمع اَنْفُسٌ -

(۳) اَفْعِلَةٌ (کے وزن پر) - جیسے لِسَانٌ کی جمع اَلْسِنَةٌ -

(۴) فِعْلَةٌ (کے وزن پر) - جیسے فَتیً کی جمع فِتْيَةٌ -

(۵) فُعَلٌ (کے وزن پر) - جیسے صُورَةٌ کی جمع صُوَرٌ -

(٦) فُعُولٌ (کے وزن پر) - جیسے بَیْتٌ کی جمع بُیُوتٌ -

(۷) فِعَلٌ (کے وزن پر) - جیسے قِطْعَةٌ کی جمع قِطَعٌ -

(۸) فِعَالٌ (کے وزن پر) - جیسے ثَوْبٌ کی جمع ثِیَابٌ -

(۹) فُعْلٌ (کے وزن پر) - جیسے اَحْوَرُ کی جمع حُوْرٌ -

(۱۰) فُعُلٌ (کے وزن پر) - جیسے کِتَابٌ کی جمع کُتُبٌ -

(۱۱) فَعْلَی (کے وزن پر) - جیسے مَرِیْضٌ کی جمع مَرْضَی -

(۱۲) فَعَلَةٌ (کے وزن پر) - جیسے کَافِرٌ کی جمع کَفَرَةٌ -

(۱۳) فُعَّلٌ (کے وزن پر) - جیسے رَاکِعٌ کی جمع رُکَّعٌ -

(۱۴) فُعَلَاءُ (کے وزن پر) - جیسے سَفِیْهٌ کی جمع سُفَهَاءُ -

(۱۵) اَفْعِلَاءُ (کے وزن پر) - جیسے غَنِیٌّ کی جمع اَغْنِیَاءُ -

(۱٦) فَعَالِلُ (کے وزن پر) - جیسے نُمْرُقٌ کی جمع نَمَارِقُ -

(۱۷) فَعَائِلُ (کے وزن پر) - جیسے اَرِیکَةٌ کی جمع اَرَائِكُ -

(۱۸) فَوَاعِلُ (کے وزن پر) - جیسے کَاعِبٌ کی جمع کَوَاعِبُ -

(۱۹) اَفَاعِلُ (کے وزن پر) - جیسے اِصْبِعٌ کی جمع اَصَابِعُ -

(۲۰) اَفَاعِیْلُ (کے وزن پر) - جیسے اُسْطُورَةٌ کی جمع اَسَاطِیْرُ -

(۲۱) فَعَالِیْلُ (کے وزن پر) - جیسے قِرْطَاسٌ کی جمع قَرَاطِیْسُ -

(۲۲) مَفَاعِلُ (کے وزن پر) - جیسے مَسْجِدٌ کی جمع مَسَاجِدُ -

(۲۳) مَفَاعِیلُ (کے وزن پر)- جیسے مِسْکِیْنٌ کی جمع مَسَاکِیْنُ -

نکرہ اور معرفہ

انگریزی زبان کے ان دو فقروں پر غور کیجئے :

1. On my way to Lahore I saw a house.

2. The house was an old one.

عربی : (۱) رَاَیْتُ فِی طَرِیْقِی اِلٰی لَاھُور بَیْتًا -

(۲) وَ کَانَ الْبَیْتُ قَدِیْمًا جِدًّا -

اردو ترجمہ : (۱) لاھور جاتے وقت میں نے ایک مکان دیکھا -

(۲) وہ مکان بہت پرانا تھا -

پہلے فقرہ میں لفظ لاھور ایک شہر کا نام ہے ' اسے (Proper Noun) یا اسم معرفہ کہتے ھیں - عربی زبان میں بھی ایسے اسماء کو معرفہ ھی کہتے ھیں - اس سے آگے (بَیْتًا = *A* house) ہے - یعنی ایک مکان ' اسے (Common Noun) یا اسم نکرہ کہتے ھیں - عربی میں بھی اسے اسم نکرہ ھی کہتے ھیں -

اگلے فقرہ میں اَلْبَیْتُ = *The* house) کے معنی " کوئی مکان " نہیں بلکہ اس سے مطلب وھی مکان ہے جس کا ذکر پہلے فقرہ میں آچکا ہے - یعنی اب یہ لفظ (house) نکرہ یا (Common Noun) نہیں رھا بلکہ معرفہ (Proper Noun) بن گیا -

گویا اسم معرفہ دو قسم کا ھوا - ایک تو وہ جو پہلے ھی معرفہ ھو- جیسے لاھور- زید وغیرہ اور ایک وہ جسے نکرہ سے معرفہ بنا لیا جائے -

عربی زبان میں اسم نکرہ پر تنوین آتی ہے - تنوین دو زبر- دو زیر- دو پیش کو کہتے ھیں - انہیں تنوین اس لئے کہا جاتا ہے کہ جس حرف پر تنوین ھو اس کے آخر میں نون کی آواز نکلتی ہے - جیسے نَسْلًا ' رَجُلٍ ' قَلَمٌ -

اسے سمجھ رکھئے کہ یہ ضروری نہیں کہ جس اسم پر تنوین ھو وہ ضرور نکرہ

ہی ہوتا ہے ۔ قرآن مجید میں آپ دیکھینگے کہ نُوحٌ ۔ لُوطٌ ۔ مُحَمَّدٌ (علیہم السلام) جیسے انبیاء کرام کے اسماء پر تنوین ہے ۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جو اسم نکرہ ہو اس پر تنوین ہو ۔

نکرہ سے معرفہ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ نکرہ سے پہلے اَلْ لگا دیا جائے ۔ مثلاً بَیْتٌ کے معنی ہیں کوئی گھر (*A* house) اور اَلْبَیْتُ کے معنی ہیں وہ خاص گھر (*The* house) ۔ گویا عربی زبان کا اَلْ وہی کام کرتا ہے جو انگریزی زبان کا (Definite Article, *The*) کرتا ہے ۔ جس اسم سے پہلے اَلْ آجائے اس پر تنوین نہیں آتی ۔

اسم کے متعلق مذکورہ تفصیلات کے بعد اب ان مختلف اسماء کو دیکھئے جو مادہ سے مشتق ہوتے ہیں ۔

۱۔ مصدر اردو میں مصدر (مثلاً مارنا) سے افعال بنتے ہیں (اس نے مارا ۔ وہ مارتا ہے ۔ وہ مارے گا ۔ تو مار' وغیرہ) لیکن عربی زبان میں افعال ' مصدر اور جملہ اسماء وغیرہ درحقیقت مادہ سے بنتے ہیں ۔ مثلاً ض-ر-ب (ضرب) مادہ ہے ۔ اس سے ضَرَبَ فعل ماضی بنا جس کے معنے ہیں " اس نے مارا " ۔ اور اَلضَّرْبُ مصدر ہے جس کے معنے ہیں "مارنا ۔ مار ۔ چوٹ" ۔ ثلاثی مجرد کے مصادر کے اوزان تو غیر معین ہیں ' لیکن ثلاثی مزید فیہ اور رباعی کے مصادر ' ان کے ابواب کے مطابق معینہ اوزان پر بنائے جاتے ہیں [1]

ثلاثی مجرد کے مصادر کے چند اہم اوزان درج ذیل کئے جاتے ہیں ۔

(۱) اگر فعل کسی فن یا پیشہ سے متعلق ہو تو اس کا مصدر " فِعَالَةٌ " کے وزن پر آتا ہے ۔ مثلاً کِتَابَةٌ (کتابت) ۔ تِجَارَةٌ (تجارت) ۔ قِرَاءَةٌ (پڑھنا) ۔

---

(۱) ثلاثی مجرد ۔ ثلاثی مزید فیہ ' رباعی وغیرہ اصطلاحات یہاں پہلی مرتبہ آئی ہیں ۔ ان کی تفصیل کے لیے آئندہ باب دیکھئے جس میں " ابواب اور ان کے خواص " کا ذکر ہے ۔

(۲) فَعِلَ وزن کی ماضی اگر لازم ہو تو اس کا مصدر فَعَلٌ کے وزن پر آئیگا - جیسے غَضِبَ سے مصدر غَضَبٌ - فَرِحَ سے مصدر فَرَحٌ -

(۳) فَعَلَ وزن کی ماضی اگر لازم ہو تو اس کا مصدر فُعُولٌ کے وزن پر آئیگا - جیسے قَعَدَ سے مصدر قُعُودٌ - خَرَجَ سے مصدر خُرُوجٌ -

(۴) فَعِلَ اور فَعَلَ کے وزنوں پر ماضی اگر متعدی ہو تو اس کا مصدر فَعْلٌ کے وزن پر آتا ہے - جیسے سَمِعَ سے مصدر سَمْعٌ اور نَصَرَ سے مصدر نَصْرٌ -

ہم نے یہ اوزان بطور مثال دیدئے ہیں ورنہ ثلاثی مجرد کے مصادر کے اور بھی بہت سے اوزان ہیں -

۲- مصدر میمی | مصدر کی ایک قسم مَفْعَلٌ کے وزن پر آتی ہے اور وہ مصدر میمی کہلاتی ہے - مثلاً شَرِبَ فعل سے مَشْرَبٌ مصدر میمی ہے اور یہی وزن اسم ظرف کا بھی ہے -

۳- اسم مرّۃ | کسی کام کو ایک بار کرنے کے لئے ہر فعل سے فَعْلَةٌ کے وزن پر " اسم مرّۃ " بنا لیا جاتا ہے - مثلاً سَكْرَةٌ (ایک بار مدھوش ہونا) - نَظْرَةٌ (ایک بار دیکھنا) -

٤- اسم نوع | کسی کام کی وضع ہیئت - ڈھنگ بتانے کے لئے اس فعل سے فِعْلَةٌ کے وزن پر اسم نوع بنا لیا جاتا ہے - جیسے سِيْرَةٌ (چلنے کا ڈھنگ وضع یا ہیئت)-

۵۔ اسم مکان و زمان (ظرف)

ہر فعل سے اس کام کے کرنے یا ہونے کی جگہ یا وقت بتانے کے لئے مَفْعَلٌ (ع پر زبر اور زیر حسب قاعدہ)[1] کے وزن پر اسم مکان یا زمان بنا لیا جاتا ہے۔

اسم زمان و مکان کی شکلیں

مَقْتَلٌ	قتل کرنے کی جگہ، قتل گاہ قتل کرنے کا وقت یا زمانہ	واحد	مذکر
مَقْتَلَانِ مَقْتَلَيْنِ	دو قتل کرنے کی جگہیں قتل کرنے کے دو وقت یا دو زمانے	مثنی	مذکر
مَقَاتِلُ	قتل کرنے کی جگہیں قتل کرنے کے اوقات یا زمانے	جمع	مذکر
مَقْتَلَةٌ	قتل کرنے کی جگہ قتل کرنے کا وقت یا زمانہ	واحد	مؤنث
مَقْتَلَتَانِ مَقْتَلَتَيْنِ	دو قتل کرنے کی جگہیں دو قتل کرنے کے وقت یا زمانے	مثنی	مؤنث
مَقَاتِلُ	قتل کرنے کی جگہیں قتل کرنے کے اوقات یا زمانے	جمع	مؤنث

اسی طرح مَغْرِبٌ (سورج غروب ہونے کی جگہ یا وقت)۔ مَسْجِدٌ (سجدہ کرنے

۱۔ اگر مضارع کے " ع " پر زبر یا پیش ہو تو اسم ظرف کے " ع " پر زبر ہوگا ورنہ زیر۔

کی جگہ یا وقت)۔ مَقْعَدٌ (بیٹھنے کی جگہ یا وقت) وغیرہ۔ یہ ثلاثی مجرد سے اسم زمان و مکان بنانے کا وزن ہے۔ ثلاثی مزید فیہ وغیرہ سے اسم مفعول کی شکل ان معنوں کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے، مثلاً مُغْتَسَلٌ (غسل کرنے کی جگہ یا غسل کرنے کا وقت) اور مُسْتَقَرٌّ (ٹھیرنے اور قرار پانے کی جگہ یا وقت)۔

٦۔ اسم آلہ ہر فعل سے اس آلہ کے لئے جس کے ذریعہ وہ کام کیا جائے مِفْعَلٌ۔ مِفْعَالٌ کے وزنوں پر اسم آلہ بنایا جاتا ہے۔

اسم آلہ کی شکلیں

مِضْرَبٌ ۔ مِضْرَابٌ	مارنے یا چوٹ لگانے کا آلہ	واحد	مذکر
مِضْرَبَانِ ۔ مِضْرَابَانِ مِضْرَبَيْنِ ۔ مِضْرَابَيْنِ	مارنے یا چوٹ لگانے کے دو آلے	مثنی	مذکر
مَضَارِبُ ۔ مَضَارِيْبُ	مارنے یا چوٹ لگانے کے آلے	جمع	مذکر
مِضْرَبَةٌ	مارنے یا چوٹ لگانے کا آلہ	واحد	مؤنث
مِضْرَبَتَانِ مِضْرَبَتَيْنِ	مارنے یا چوٹ لگانے کے دو آلے	مثنی	مؤنث
مَضَارِبُ ۔ مَضَارِيْبُ	مارنے یا چوٹ لگانے کے آلے	جمع	مؤنث

اسی طرح مِفْتَاحٌ (کھولنے کا آلہ ' کنجی) - مِیْزَانٌ (تولنے کا آلہ ' ترازو) وغیرہ -

۷- اسم فاعل | ہر فعل سے اس کام کو کرنے والے کے لئے ایک اسم ''فَاعِلٌ'' کے وزن پر بنا لیا جاتا ہے -

اسم فاعل کی شکلیں

(ACTIVE PARTICIPLE NOUN)

عَالِمٌ	جاننے والا	واحد	مذکر
عَالِمَانِ عَالِمَيْنِ	دو جاننے والے	مثنی	
عَالِمُوْنَ عَالِمِيْنَ	جاننے والے (بہت سے)	جمع	
عَالِمَةٌ	جاننے والی	واحد	مؤنث
عَالِمَتَانِ عَالِمَتَيْنِ	دو جاننے والیاں	مثنی	
عَالِمَاتٌ	جاننے والیاں (بہت سی)	جمع	

اسی طرح ظَالِمٌ ' قَاتِلٌ ' جَاهِلٌ وغیرہ سے بھی شکلیں بنائی جا سکتی ہیں -

یہ ثلاثی مجرد کے اسم فاعل کی شکلیں ہیں۔ ثلاثی مزید فیہ اور رباعی سے اسم فاعل کی شکلیں "ابواب اور ان کے خواص" میں دیکھئے۔

۸۔ اسم مفعول | ہر متعدی فعل سے اس چیز کے لئے جس پر کام کیا جائے ایک اسم "مَفْعُوْلٌ" کے وزن پر بنا لیا جاتا ہے۔

اسم مفعول کی شکلیں
(PASSIVE PARTICIPLE NOUN)

مَقْتُوْلٌ	قتل کیا ہؤا	واحد	مذکر
مَقْتُوْلَانِ مَقْتُوْلَيْنِ	دو قتل کئے ہوئے	مثنی	
مَقْتُوْلُوْنَ مَقْتُوْلِيْنَ	بہت سے قتل کئے ہوئے	جمع	
مَقْتُوْلَةٌ	قتل کی ہوئی	واحد	مؤنث
مَقْتُوْلَتَانِ مَقْتُوْلَتَيْنِ	دو قتل کی ہوئیں	مثنی	
مَقْتُوْلَاتٌ	بہت سی قتل کی ہوئیں	جمع	

اسی طرح مَسْعُوْدٌ۔ مَعْرُوْفٌ۔ مَنْصُوْرٌ وغیرہ سے تمام شکلیں بنائی جا سکتی ہیں۔ یہ ثلاثی مجرد کے افعال سے اسم مفعول کی شکلیں ہیں۔ ثلاثی مزید فیہ اور رباعی سے مفعول کا وزن "ابواب اور ان کے خواص" میں دیکھئے۔

۹ اسم صفت

عربی زبان میں اسم صفت (Adjective) کے بہت سے اوزان ہیں۔ ان میں زیادہ استعمال ہونے والے اوزان حسب ذیل ہیں۔

(۱) فَعِیْلٌ ۔ جیسے کَرِیْمٌ ۔ لَطِیْفٌ ۔

(۲) فَعَلٌ ۔ جیسے حَسَنٌ ۔

(۳) فَعْلٌ ۔ جیسے سَهْلٌ ۔ صَعْبٌ ۔

(۴) اَفْعَلُ ۔ جیسے اَسْوَدُ ۔ اَبْيَضُ ۔ اَعْرَجُ ۔

۱۰۔ افعل التَّفْضِيْل

جب دو آدمیوں میں ' ایک دوسرے سے مقابلہ ہو اور ہم بتانا چاہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے سے بڑھا ہوا (یا سب سے بڑھا ہوا) ہے تو اس کے لیے أَفْعَلُ کے وزن پر اَفْعَلُ التَّفْضِيْل بنائی جاتی ہے۔ جیسے اَعْلَمُ (بہت زیادہ جاننے والا) وغیرہ۔ دو کے درمیان مقابلہ ہو تو (Comparative Degree) کہیں گے اور سب کے ساتھ مقابلہ ہو تو (Superlative Degree)۔

اَفْعَلُ التَّفْضِيْل کی شکلیں

اَصْغَرُ	زیادہ چھوٹا ۔ بہت چھوٹا	واحد	مذکر
اَصْغَرَانِ ۔ اَصْغَرَيْنِ	دو زیادہ چھوٹے	مثنی	
اَصْغَرُوْنَ ۔ اَصْغَرِيْنَ اَصَاغِرُ	بہت سے زیادہ چھوٹے	جمع	
صُغْرَى	زیادہ چھوٹی	واحد	مؤنث
صُغْرَيَانِ صُغْرَيَيْنِ	دو زیادہ چھوٹی	مثنی	
صُغْرَيَاتٌ ۔ صُغَرٌ	بہت سی زیادہ چھوٹی	جمع	

۱۱۔ اوزان مبالغہ

جب کسی صفت میں زور و شدت اور زیادتی کا اظہار کرنا ہو، تو مختلف فعلوں سے مبالغہ کے اوزان (Exaggerative Adjective) استعمال کئے جاتے ہیں، ان میں زیادہ استعمال ہونے والے یہ ہیں۔

(۱) فَعَّالٌ۔ جیسے تَوَّابٌ۔ عَلَّامٌ۔ غَفَّارٌ۔

(۲) فِعِّیْلٌ۔ جیسے صِدِّیْقٌ۔

(۳) مِفْعِیْلٌ۔ جیسے مِسْکِیْنٌ۔

(۴) فُعَلَۃٌ۔ جیسے ھُمَزَۃٌ۔ لُمَزَۃٌ۔

(۵) فَعِلٌ۔ جیسے أَسِفٌ۔ فَرِحٌ۔

(۶) فَعِیْلٌ۔ جیسے رَحِیْمٌ۔ عَظِیْمٌ۔

(۷) فَعُوْلٌ۔ جیسے غَفُوْرٌ۔ وَدُوْدٌ۔ ظَلُوْمٌ۔

(۸) فُعَّالٌ۔ جیسے کُبَّارٌ۔

(۹) فَیْعُوْلٌ۔ جیسے قَیُّوْمٌ۔

(۱۰) فَعْلَانُ۔ جیسے رَحْمٰنُ۔ غَضْبَانُ۔

ضمائر

جب ہم کہتے ہیں " حامد آیا " تو آپ کے ذہن میں فوراً ایک آدمی آجاتا ہے جس کا نام حامد ہے۔ اسے اسم ظاہر کہتے ہیں۔ یعنی بالکل کھلا ہوا نام۔ لیکن جب ہم کہیں " وہ آیا " تو اگرچہ اس وقت بھی ہم کسی آدمی کے آنے کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس سے متعین نہیں ہوتا کہ کون آیا۔

مگر جب ہم کہیں " حامد آیا۔ وہ بیمار تھا "۔ تو اب اس لفظ " وہ " سے مطلب سمجھ میں آگیا۔ یعنی " حامد "

لہذا لفظ "وہ" کے اندر حامد کا نام چھپا ہوا ہے ۔ پوشیدہ اسموں کی کئی قسمیں ہیں ۔ مثلاً :

(۱) اسم ضمیر (PRO-NOUN)

جب اسمائے ضمیر شروع میں آئیں تو ان کی شکل اس طرح ہوتی ہے ۔

	غائب			مخاطب (حاضر)			متکلم		
	واحد	مثنی	جمع	واحد	مثنی	جمع	واحد	مثنی	جمع
مذکر	هُوَ	هُمَا	هُمْ	اَنْتَ	اَنْتُمَا	اَنْتُمْ	اَنَا	نَحْنُ	نَحْنُ
مؤنث	هِيَ	هُمَا	هُنَّ	اَنْتِ	اَنْتُمَا	اَنْتُنَّ	اَنَا	نَحْنُ	نَحْنُ

لیکن جب ان ضمائر سے پہلے کوئی اسم یا فعل یا حرف مل کر آئے تو ان کی حسب ذیل شکلیں ہو جاتی ہیں :

	غائب			مخاطب (حاضر)			متکلم		
	واحد	مثنی	جمع	واحد	مثنی	جمع	واحد	مثنی	جمع
مذکر	هُ	هُمَا	هُمْ	كَ	كُمَا	كُمْ	ى	نَا	نَا
مؤنث	هَا	هُمَا	هُنَّ	كِ	كُمَا	كُنَّ	ى	نَا	نَا

(۲) اسم اشارہ پوشیدہ اسماء کی دوسری قسم اسم اشارہ (Demonstrative Pronoun) ہے ۔ جیسے :

(ا) اشارہ قریب :

مذکر			مؤنث		
واحد	مثنی	جمع	واحد	مثنی	جمع
هٰذَا	هٰذَانِ هٰذَيْنِ	هٰؤُلَاءِ	هٰذِهٖ	هَاتَانِ هَاتَيْنِ	هٰؤُلَاءِ

(ب) اشارہ بعید :

مذکر			مؤنث		
واحد	مثنی	جمع	واحد	مثنی	جمع
ذٰلِكَ	ذَانِكَ ذَيْنِكَ	اُولٰٓئِكَ	تِلْكَ	تَانِكَ تَيْنِكَ	اُولٰٓئِكَ

نوٹ : ذٰلِكَ اشارہ قریب اور بعید دونوں کے لئے آتا ہے۔

(۳) اسم موصول

پوشیدہ اسماء کی تیسری قسم اسم موصول (Relative Pronoun) ہے۔ جیسے :

مذکر			مؤنث		
واحد	مثنی	جمع	واحد	مثنی	جمع
اَلَّذِیْ	اَلَّذَانِ اَلَّذَيْنِ	اَلَّذِيْنَ	اَلَّتِیْ	اَللَّتَانِ اَللَّتَيْنِ	اَللَّاتِیْ اَللَّائِیْ

(٤) اسمائے استفهام

پوشیدہ اسماء کی چوتھی قسم اسمائے استفهام (Interogative Pronoun) ہے۔ جیسے : مَنْ (کون شخص) اور مَا (کونسی چیز)۔

مادّہ اور اس کے حروف

گذشتہ صفحات میں آپ ثلاثی مجرد - ثلاثی مزید فیہ - رباعی وغیرہ اصطلاحی الفاظ پڑھ چکے ہیں - ان کا تفصیلی بیان تو آئندہ باب میں آئے گا ' جہاں یہ بتایا جائیگا کہ " ابواب اور ان کے خواص " کیا ہوتے ہیں - اس مقام پر مختصر الفاظ میں دیکھئے کہ ان کا مطلب کیا ہے -

عربی زبان میں استعمال ہونے والے اکثر و بیشتر الفاظ کے مادے تین حروف پر مشتمل ہوتے ہیں - ان الفاظ کو ثُلَاثِی (تین حرفوں والا) کہتے ہیں - لیکن بعض مادے تین سے زیادہ حروف بھی رکھتے ہیں - جس مادہ میں چار حرف ہوں اسے رُبَاعِی اور جس میں پانچ ہوں اسے خُمَاسِی کہتے ہیں - ذیل میں رباعی مادہ "زل زل" سے افعال اور اسماء کی ایک ایک شکل بطور مثال درج کی جاتی ہے -

ماضی معروف	مضارع معروف	ماضی مجہول	مضارع مجہول	امر
زَلْزَلَ	يُزَلْزِلُ	زُلْزِلَ	يُزَلْزَلُ	زَلْزِلْ
نہی	اسم فاعل	اسم مفعول	مصدر	
لَا تُزَلْزِلْ	مُزَلْزِلٌ	مُزَلْزَلٌ	زَلْزَلَةٌ - زِلْزَالٌ	

نوٹ : قاعدے کی رو سے رباعی مادوں کو ثلاثی سے الگ لکھنا چاہئے لیکن بہت سے ارباب لغت انہیں ثلاثی کے تحت ہی لکھتے ہیں - اس لئے ہم نے بھی لغت میں انہیں (بجز مستثنیات) عام طور پر ثلاثی کے تحت لکھا ہے - لیکن اسکی تصریح کر دی ہے کہ یہ رباعی ہے -

مادّہ میں حرف علت

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ' عربی کے ان الفاظ کا مادہ تو نسبتاً آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے جن میں حروف صحت ہوں ' لیکن جن مادوں میں حروف علت ہوں ان کا دریافت کرنا قدرے دشوار ہوتا ہے ' بالخصوص واوی اور یائی میں یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہوتا ہے

کہ اس مادہ میں واو ہے یا ی ۔ بعض شکلوں میں اگر واوی کو یائی یا یائی کو واوی سمجھ لیا جائے تو معنوں میں بہت فرق پڑ جاتا ہے ۔ مثلاً صَلّٰی ایک لفظ ہے ۔ اگر اسے صلو (مادہ) سے لیا جائے تو اس کے معنے ہونگے "صلوٰۃ ادا کرنا" اور اگر صلی (مادہ) سے لیا جائے تو اس کے معنے ہونگے "آگ میں جھونکنا"۔ چونکہ عربی نہ جاننے والوں کے لئے یہ متعین کرنا از بس دشوار (بلکہ ناممکن) ہے کہ کسی لفظ کا صحیح مادہ کیا ہے اس لئے ہم نے زیر نظر لغات کے شروع میں قرآن کریم کے تمام الفاظ کو انہی شکلوں میں لکھ کر جن میں وہ قرآن مجید میں آئے ہیں ان کے سامنے ان کا مادہ لکھ دیا ہے ۔ آپ جس لفظ کے معنی معلوم کرنا چاہیں اسے پہلے اس فہرست میں دیکھ کر متعین کر لیں کہ اس کا مادہ کیا ہے ' پھر اس مادہ کے معنی لغات میں دیکھ لیں ۔

ذیل میں ہم چند مثالیں درج کرتے ہیں جن سے آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ جن مادوں میں حروف علت آتے ہیں ان میں مختلف اوزان اورابواب میں جا کر کیا کیا (تعجب انگیز اور پریشان کن) تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں ۔

نوٹ : اس مقام پر آپ ابواب کے صرف نام دیکھ جائیے ان کا تفصیلی تعارف اور خواص آئندہ باب میں سامنے آئینگے ۔

حروفِ علت والے مادوں میں تبدیلیوں کی مثالیں

پہلی مثال مادہ ۔ و ع د

مادہ	فعل کی قسم	فعل ماضی	فعل مضارع	امر	نہی
و ع د	معلوم	وَعَدَ	يَعِدُ	عِدْ	لَا تَعِدْ
	مجہول	وُعِدَ	يُوْعَدُ	لِتُوْعَدْ	لَا تُوْعَدْ

دیگر اسماء میں جا کر تبدیلیاں

مادہ	اسم فاعل	اسم مفعول	افعل التفضیل	اسم آلہ	اسم زمان ومکان
و ع د	وَاعِدٌ	مَوْعُوْدٌ	اَوْعَدُ	مِيْعَادٌ	مَوْعِدٌ

دوسری مثال مادہ د ع و

مادہ	قسم	ماضی	مضارع	امر	نہی
د ع و	معلوم	دَعَا	یَدْعُو	اُدْعُ	لَا تَدْعُ
	مجہول	دُعِیَ	یُدْعَی	لِتُدْعَ	لَا تُدْعَ

دیگر اسماء میں جا کر تبدیلیاں

مادہ	اسم فاعل	اسم مفعول	افعل التفضیل	اسم آلہ	اسم زمان و مکان
د ع و	دَاعٍ، اَلدَّاعِی	مَدْعُوٌّ	اَدْعَی	مِدْعًی	مَدْعًی

تیسری مثال مادہ و ق ی

مادہ	قسم	ماضی	مضارع	امر	نہی
و ق ی	معلوم	وَقَی	یَقِی	قِ	لَا تَقِ
	مجہول	وُقِیَ	یُوْقَی	لِیُوْقَ	لَا یُوْقَ

دیگر اسماء میں جا کر تبدیلیاں

مادہ	اسم فاعل	اسم مفول	افعل التفضیل	اسم آلہ	اسم زمان و مکان
و ق ی	وَاقٍ، الوَاقِی	مَوْقِیٌّ	اَوْقَی	مِیْقًی	مَوْقًی

چوتھی مثال مادہ ق و ل

ماده	قسم	ماضی	مضارع	امر	نہی
ق و ل	معلوم	قَالَ	يَقُوْلُ	قُلْ	لَا تَقُلْ
	مجہول	قِيْلَ	يُقَالُ	لِيُقَلْ	لَا يُقَلْ

دیگر اسماء میں جا کر تبدیلیاں

ماده	اسم فاعل	اسم مفعول	افعل التفضیل	اسم آله	اسم زمان و مکان
ق و ل	قَائِلٌ	مَقُوْلٌ	اَقْوَلُ	مِقْوَلٌ	مَقَالٌ

پانچویں مثال مادہ ب ی ع

ماده	قسم	ماضی	مضارع	امر	نہی
ب ی ع	معلوم	بَاعَ	يَبِيْعُ	بِعْ	لَا تَبِعْ
	مجہول	بِيْعَ	يُبَاعُ	لِيُبَعْ	لَا يُبَعْ

دیگر اسماء میں جا کر تبدیلیاں

ماده	اسم فاعل	اسم مفعول	افعل التفضیل	اسم آله	اسم زمان و مکان
ب ی ع	بَائِعٌ	مَبِيْعٌ	اَبْيَعُ	مِبْيَعٌ	مَبَاعٌ

مختلف ابواب میں منتقل ہونے کے بعد

مادہ	قسم	فعل	تفعیل	افعال	افتعال	تفاعل	مفاعلہ	تفعّل	استفعال
و ع د	معلوم	ماضی	وعّد	اوعد	اتّعد	تواعد	واعد	توعّد	استوعد
		مضارع	یوعّد	یوعد	یتّعد	یتواعد	یواعد	یتوعّد	یستوعد
	مجہول	ماضی	وعّد	اوعد	اتّعد	تووعد	ووعد	توعّد	استوعد
		مضارع	یوعّد	یوعد	یتّعد	یتواعد	یواعد	یتوعّد	یستوعد
		امر	وعّد	اوعد	اتّعد	تواعد	واعد	توعّد	استوعد
و ع د		نہی	لا توعّد	لا توعد	لا تتّعد	لاتتواعد	لاتواعد	لاتتوعّد	لاتستوعد
و ع د		اسم فاعل	موعّد	موعد	متّعد	متواعد	مواعد	متوعّد	مستوعد
		اسم مفعول	موعّد	موعد	متّعد	متواعد	مواعد	متوعّد	مستوعد

مختلف ابواب میں منتقل ہونے کے بعد

مادہ	قسم	فعل	تَفْعِیل	اِفْعَال	اِفْتِعَال	تَفَاعُل	مُفَاعَلَہ	تَفَعُّل	اِسْتِفْعَال
د ع و	معلوم	ماضی	دَعَّی	اَدْعَی	اِدَّعَی	تَدَاعَی	دَاعَی	تَدَعَّی	اِسْتَدْعَی
		مضارع	یُدَعِّی	یُدْعِی	یَدَّعِی	یَتَدَاعَی	یُدَاعِی	یَتَدَعَّی	یَسْتَدْعِی
د ع و	مجہول	ماضی	دُعِّیَ	اُدْعِیَ	اُدُّعِیَ	تُدُوعِیَ	دُوعِیَ	تُدُعِّیَ	اُسْتُدْعِیَ
		مضارع	یُدَعَّی	یُدْعَی	یُدَّعَی	یُتَدَاعَی	یُدَاعَی	یُتَدَعَّی	یُسْتَدْعَی
د ع و		امر	دَعِّ	اَدْعِ	اِدَّعِ	تَدَاعَ	دَاعِ	تَدَعَّ	اِسْتَدْعِ
		نہی	لَا تُدَعِّ	لَا تُدْعِ	لَا تَدَّعِ	لَا تَتَدَاعَ	لَا تُدَاعِ	لَاتَتَدَعَّ	لَا تَسْتَدْعِ
		اسم فاعل	مُدَعٍّ، اَلْمُدَعِّی	مُدْعٍ، اَلْمُدْعِی	مُدَّعٍ، اَلْمُدَّعِی	مُتَدَاعٍ، اَلْمُتَدَاعِی	مُدَاعٍ، اَلْمُدَاعِی	مُتَدَعٍّ، اَلْمُتَدَعِّی	مُسْتَدْعٍ، اَلْمُسْتَدْعِی
		اسم مفعول	مُدَعًّی	مُدْعًی	مُدَّعًی	مُتَدَاعًی	مُدَاعًی	مُتَدَعًّی	مُسْتَدْعًی

مختلف ابواب میں منتقل ہونے کے بعد

ماده	قسم	فعل	تفعیل	افعال	افتعال	تفاعل	مفاعله	تفعل	استفعال
و ق ی	معلوم	ماضی	وَقَّى	اَوْقَى	اِتَّقَى	تَوَاقَى	وَاقَى	تَوَقَّى	اِسْتَوْقَى
		مضارع	يُوَقِّي	يُوْقِي	يَتَّقِي	يَتَوَاقَى	يُوَاقِي	يَتَوَقَّى	يَسْتَوْقِي
	مجہول	ماضی	وُقِّيَ	اُوْقِيَ	اُتُّقِيَ	تُوُوْقِيَ	وُوْقِيَ	تُوُقِّيَ	اُسْتُوْقِيَ
		مضارع	يُوَقَّى	يُوْقَى	يُتَّقَى	يُتَوَاقَى	يُوَاقَى	يُتَوَقَّى	يُسْتَوْقَى
و ق ی		امر	وَقِّ	اَوْقِ	اِتَّقِ	تَوَاقَ	وَاقِ	تَوَقَّ	اِسْتَوْقِ
		نہی	لَا تُوَقِّ	لَا تُوْقِ	لَا تَتَّقِ	لَا تَتَوَاقَ	لَا تُوَاقِ	لَا تَتَوَقَّ	لَا تَسْتَوْقِ
و ق ی		اسم فاعل	مُوَقٍّ ۔ اَلْمُوَقِّي	مُوْقٍ ۔ اَلْمُوْقِي	مُتَّقٍ ۔ اَلْمُتَّقِي	مُتَوَاقٍ ۔ اَلْمُتَوَاقِي	مُوَاقٍ ۔ اَلْمُوَاقِي	مُتَوَقٍّ ۔ اَلْمُتَوَقِّي	مُسْتَوْقٍ ۔ اَلْمُسْتَوْقِي
		اسم مفعول	مُوَقًّى	مُوْقًى	مُتَّقًى	مُتَوَاقًى	مُوَاقًى	مُتَوَقًّى	مُسْتَوْقًى

مختلف ابواب میں منتقل ہونے کے بعد

مادہ	قسم	فعل	تفعیل	افعال	افتعال	تفاعل	مفاعلہ	تفعّل	استفعال
ق و ل	معلوم	ماضی	قوّل	أقال	اقتال	تقاول	قاول	تقوّل	استقال
		مضارع	يقوّل	يقيل	يقتال	يتقاول	يقاول	يتقوّل	يستقيل
ق و ل	مجہول	ماضی	قوّل	أقيل	اقتيل	تقوول	قوول	تقوّل	استقيل
		مضارع	يقوّل	يقال	يقتال	يتقاول	يقاول	يتقوّل	يستقال
		امر	قوّل	أقل	اقتل	تقاول	قاول	تقوّل	استقل
		نہی	لا تقوّل	لا تقل	لا تقتل	لا تتقاول	لا تقاول	لا تتقوّل	لا تستقل
ق و ل		اسم فاعل	مقوّل	مقيل	مقتال	متقاول	مقاول	متقوّل	مستقيل
		اسم مفعول	مقوّل	مقال	مقتال	متقاول	مقاول	متقوّل	مستقال

مختلف ابواب میں منتقل ہونے کے بعد

مادہ	قسم	فعل	تَفْعِیْل	اِفْعَال	اِفْتِعَال	تَفَاعُل	مُفَاعَلَہ	تَفَعُّل	اِسْتِفْعَال
ب ی ع	معروف	ماضی	بَیَّعَ	اَبَاعَ	اِبْتَاعَ	تَبَایَعَ	بَایَعَ	تَبَیَّعَ	اِسْتَبَاعَ
		مضارع	یُبَیِّعُ	یُبِیْعُ	یَبْتَاعُ	یَتَبَایَعُ	یُبَایِعُ	یَتَبَیَّعُ	یَسْتَبِیْعُ
ب ی ع	مجہول	ماضی	بُیِّعَ	اُبِیْعَ	اُبْتِیْعَ	تُبُوْیِعَ	بُوْیِعَ	تُبُیِّعَ	اُسْتُبِیْعَ
		مضارع	یُبَیَّعُ	یُبَاعُ	یُبْتَاعُ	یُتَبَایَعُ	یُبَایَعُ	یُتَبَیَّعُ	یُسْتَبَاعُ
ب ی ع		امر	بَیِّعْ	اَبِعْ	اِبْتَعْ	تَبَایَعْ	بَایِعْ	تَبَیَّعْ	اِسْتَبِعْ
		نہی	لَاتُبَیِّعْ	لَا تُبِعْ	لَا تَبْتَعْ	لَا تَتَبَایَعْ	لَا تُبَایِعْ	لَا تَتَبَیَّعْ	لَا تَسْتَبِعْ
		اسم فاعل	مُبَیِّعٌ	مُبِیْعٌ	مُبْتَاعٌ	مُتَبَایِعٌ	مُبَایِعٌ	مُتَبَیِّعٌ	مُسْتَبِیْعٌ
		اسم مفعول	مُبَیَّعٌ	مُبَاعٌ	مُبْتَاعٌ	مُتَبَایَعٌ	مُبَایَعٌ	مُتَبَیَّعٌ	مُسْتَبَاعٌ

نگہ باز گشت

مادہ اور اس کے مشتقات کا مختصر سا بیان آپ کے سامنے آ چکا ہے - آگے بڑھنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مثال کے ذریعے آپ کے سامنے وہ تمام مختلف شکلیں آ جائیں جو گذشتہ صفحات میں آپ کی نگاہوں سے گذری ہیں - اس سے آپ کو اس کا بھی اندازہ ہو جائیگا کہ زیر نظر لغت میں آپ کو ایک عنوان کے تحت کس کس قسم کے الفاظ بالعموم ملیں گے - مثلاً مادہ ہے -

فتح یعنی ف - ت - ح

اس مادہ کے تحت آپ کو فَتَحَ (فعل ماضی معروف) - فُتِحَ (فعل ماضی مجہول) - يَفْتَحُ (فعل مضارع معروف) - يُفْتَحُ (فعل مضارع مجہول) - اِفْتَحْ (امر) - لَا تَفْتَحْ (نہی) - فَاتِحٌ (اسم فاعل) - مَفْتُوحٌ (اسم مفعول) - مَفْتَحٌ (اسم ظرف) - مِفْتَحٌ و مِفْتَاحٌ (اسم آلہ) - فَتَّاحٌ (اسم مبالغہ) وغیرہ ملیں گے - ان کے علاوہ فَتَحَ کے مختلف ابواب سامنے آئیں گے - مثلاً اَفْتَحَ (باب اِفْعَال) - فَتَّحَ (باب تَفْعِیل) - فَاتَحَ (باب مُفَاعَلَہ) - تَفَاتَحَ (باب تَفَاعُل) - تَفَتَّحَ (باب تَفَعُّل) - اِفْتَتَحَ (باب اِفْتِعَال) - اِنْفَتَحَ (باب اِنْفِعَال) - اِسْتَفْتَحَ (باب اِسْتِفْعَال) وغیرہ بھی لکھے ہوئے ملیں گے -

نوٹ : زیر نظر لغت میں ہر مادہ کے تحت یہ تمام مشتقات نہیں دئیے گئے - جس طرح لغت میں صرف وہی مادے دئیے گئے ہیں جن سے متعلق کوئی لفظ قرآن کریم میں آیا ہے اسی طرح ہر مادہ کے تحت الفاظ کی صرف وہی شکلیں دی گئی ہیں جو قرآن مجید میں آئی ہیں (بعض مقامات میں ان تمام شکلوں کو بالتفصیل بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی) اس لئے کہ ہمارا یہ لغت قرآن کریم کا لغت ہے ' عربی زبان کا مکمل لغت نہیں -

حروف

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، عربی زبان کے تمام الفاظ تین قسموں کے ہوتے ہیں - (۱) یا تو وہ لفظ نام ہوگا - اسے اسم کہا جاتا ہے - جیسے :

اَللّٰہُ - مُحَمَّدٌ - قَلَمٌ - عَالِمٌ - قَتْلٌ - تَعْلِیْمٌ - وغیرہ -

(۲) یا وہ لفظ کسی کام کے کرنے یا ہونے کے لئے بولا جائے گا - اسے فعل کہا جاتا ہے - مثلاً ذَهَبَ : وہ گیا (فعل ماضی) - يَأْكُلُ : وہ کھاتا ہے یا کھائے گا (فعل مضارع) قُلْ : تو کہہ دے (فعل امر) وغیرہ

(۳) اور یا وہ حرف ہوگا - بالفاظ دیگر اگر کوئی لفظ نہ اسم ہے نہ فعل، تو وہ لازماً حرف ہوگا - مثلاً اس فقرہ میں

اَنَا - اَذْهَبُ - اِلَى - الْبَيْتِ -

اَنَا اسم ضمیر ہے (معنی - میں) - اَذْهَبُ - فعل ہے (میں جاتا ہوں) - الْبَيْتِ اسم ہے (معنی - گھر) - اب رہ گیا اِلَى - سو یہ حرف ہے (معنی - کی طرف) - فقرے کے معنے ہوئے - میں گھر کی طرف جاتا ہوں -

حرف کی اہمیت | ہر چند حرف نہ اسم ہے نہ فعل اور دیکھنے میں بھی زبان کا سب سے چھوٹا جزو ہے (مندرجہ بالا مثال میں اِلَى پھر بھی وزن دار دکھائی دیتا ہے ورنہ خالی ب - ل بھی حروف ہیں) لیکن زبان میں ان کی بڑی اہمیت ہے - یہ زبان میں ربط پیدا کرتے ہیں - اسماء اور افعال کو ایک دوسرے سے جوڑتے ہیں - گفتگو میں زور و قوت اور معنوں میں ہمواری اور استواری پیدا کرتے ہیں - انہی سے اقرار اور انکار کا علم ہوتا ہے اور انہی کے ذریعہ کلام میں استفہام - ترغیب - تاکید - تنبیہ کے معانی پیدا ہوتے ہیں - ان کی تبدیلی سے فعل کا پورے کا پورا مفہوم بدل جاتا ہے - مثلاً "رغبت"

عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنے آپ بخوبی سمجھتے ہیں۔ اگر ہم (عربی زبان میں) کہیں رَغِبْتُ اِلَیْہِ تو اس کے معنے ہوں گے "میں اس کی طرف مائل ہوا"۔ لیکن اگر اِلٰی (حرف) کی جگہ عَنْ آ جائے اور ہم کہیں رَغِبْتُ عَنْہُ تو اس کے معنی ہوں گے "میں نے اس سے اعراض برتا۔ اس سے منہ موڑا۔ اسے چھوڑ دیا"۔ آپ نے دیکھا کہ حرف (جو بظاہر نہ نام کا ہے نہ کام کا) کس طرح افعال کی ناک میں نکیل ڈالے انہیں ادھر سے اُدھر لئے لئے پھرتا ہے۔ یہ حروف وہی ہیں جنہیں انگریزی زبان میں (Prepositions) کہتے ہیں اور جن کی اہمیت کا غالباً آپ کو اندازہ ہے۔

محذوفات کی جگہ

اتنا ہی نہیں کہ یہ افعال کے معانی میں تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایک حرف کتنے ایسے الفاظ کے معنے دے جاتا ہے جو اس فقرے میں کہیں نہیں ہوتے۔ یعنی وہ محذوف (Understood) ہوتے ہیں۔ مثلاً۔

وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ اللہ مفسد کو مصلح سے جانتا ہے۔ لیکن اس سے بات واضح نہیں ہوتی۔ در حقیقت اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ مفسد کو مصلح سے الگ کر کے۔ تمیز کر کے۔ فرق کر کے جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون۔ دیکھئے اس عبارت میں ایک حرف مِنْ نے اس محذوف عبارت کا کام دے دیا۔ یا مثلاً قرآن میں ہے

اِلَّا (اِنْ لَا) تَنْصُرُوْہُ فَقَدْ نَصَرَہُ اللّٰہُ ۔ اس کا ویسے ترجمہ یہ ہوگا کہ "اگر تم اس کی مدد نہیں کرتے تو یقیناً اللہ اس کی مدد کر چکا ہے"۔ لیکن اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اگر تم اس کی مدد نہیں کرتے تو نہ کرو۔ اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ کوئی حرج نہیں' کوئی پرواہ نہیں۔ کیونکہ (جس طرح) اللہ اس کی مدد (فلاں موقع پر) کر چکا ہے (اب بھی کرے گا)۔ چنانچہ عربی

زبان میں یہ قاعدہ بن گیا ہے کہ اگر اِنْ (حرف شرط) کے جو اب شرط سے پہلے فَقَدْ آ جائے تو اس کا مفہوم وہ ہوتا ہے جیسے اوپر بیان کیا گیا ہے ۔

حرف کی قسمیں

حرف کے اس تمہیدی تعارف کے بعد اب یہ دیکھئے کہ اس کی قسمیں کتنی ہیں ۔ یہ قسمیں حروف کے انداز استعمال کی رو سے کی جا سکتی ہیں ۔ مثلاً

(۱) وہ حروف جو صرف افعال (Verbs) سے پہلے آتے ہیں ۔ ان سے فعلوں کے معنوں میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے ۔ مثلاً ۔ لَمْ ۔ لَنْ ۔ قَدْ ۔ سَ ۔ سَوْفَ وغیرہ ۔

لَمْ اور لَنْ دونوں مضارع پر آتے ہیں اور دونوں " تاکید کے ساتھ نفی" (نہ) کے معنے پیدا کرتے ہیں ۔ لَمْ فعل مضارع کو فعل ماضی منفی کے معنوں میں تبدیل کر دیتا ہے ۔ جیسے یَأْکُلُ (وہ کھاتا ہے یا کھائیگا) سے پہلے لَمْ آ جائے تو لَمْ یَأْکُلْ کے معنے ہو جائینگے " اس نے قطعاً نہیں کھایا " ۔ اسی طرح جب ارع سے پہلے حرف لَنْ آ جاتے تو اس کے معنے منفی مستقبل کے ہو جاتے ہیں ۔ مثلاً لَنْ یَأْکُلَ : " وہ قطعاً نہیں۔ کھائیگا "

(۲) دوسری قسم کے حروف وہ ہیں جو تنہا لفظوں پر نہیں بلکہ جملوں پر آتے ہیں ۔ مثلاً اِنَّ ۔ اَنَّ ۔ کَاَنَّ ۔ لَیْتَ ۔ لٰکِنَّ ۔ لَعَلَّ وغیرہ ' جملوں کے پہلے آتے ہیں اور جملہ میں خاص معنے پیدا کر دیتے ہیں ۔ جیسے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ یقیناً ' بے شک ' یہ حقیقت ہے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے ۔

(۳) تیسری قسم کے وہ حروف ہیں جو اسم سے پہلے آتے ہیں ۔ ب ۔ فِی ۔ ل ۔ عَلٰی ۔ مِنْ ۔ اِلٰی ۔ عَنْ وغیرہ ۔ جیسے بِالْقَلَمِ (قلم سے ' قلم کے ساتھ) فِی الْبَیْت

(گھر میں)- الیٰ اللہ (اللہ کیطرف) ۔ عربی زبان میں ان حروف کو خاص اھمیت حاصل ہے ۔ اس اھمیت میں اس وقت اور اضافہ ہوجاتا ہے جب ان سے پہلے فعل آئے۔ جیسا کہ ہم رَغِبْتُ اِلَیْہِ اور رَغِبْتُ عَنْہُ کی مثال میں بتا چکے ہیں ۔

حروف کا ترجمہ

نمبر ۱ اور نمبر ۲ کے حروف تو اپنے معانی معین رکھتے ہیں لیکن نمبر ۳ کے حروف کچھ اس انداز سے آتے ہیں کہ اردو زبان میں ان کا لفظی ترجمہ نہیں کیا جا سکتا ' بلکہ مفہوم کے اعتبار سے ہی کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً

(۱) عَلیٰ کے معنی " پر' اوپر " ہیں۔ عربی زبان میں کہینگے عَلیٰ سَفَرٍ لیکن اردو میں اس کا ترجمہ " سفر پر " غیر فصیح ہوگا ۔ " سفر میں " ٹھیک ہوگا ۔ ہم یہ نہیں کہینگے کہ " اگر تم سفر پر ہو " ۔ ہم کہینگے " اگر تم سفر میں ہو " ۔

(۲) یا مثلاً ل کے معنے " لئے یا واسطے " ہیں۔ جیسے لِزَیْدٍ : زید کے لئے یا زید کے واسطے ۔ لیکن جب ہم اس سے پہلے فعل لا کر قُلْتُ لِزَیْدٍ کہینگے تو اس کا ترجمہ " میں نے زید کے لئے کہا " نہیں ہوگا ' اس کا صحیح ترجمہ ہوگا " میں نے زید سے کہا " ۔

اسی طرح ب کے معنی عموماً " ساتھ " یا " سے " کئے جاتے ہیں ' لیکن مختلف فعلوں (VERBS) کے ساتھ آتے ہی اس کا ترجمہ مختلف ہو جائیگا ' جیسے

(۱) ذَهَبَ بِالْكِتَابِ : لفظی ترجمہ ۔ وہ کتاب کے ساتھ گیا ۔ با محاورہ ترجمہ ۔ وہ کتاب لے گیا ۔

(۲) حَكَمَ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ : لفظی ترجمہ ۔ اس نے ما انزل اللہ کے ساتھ فیصلہ کیا ۔ با محاورہ ترجمہ ۔ اس نے ما انزل اللہ (قانون خداوندی) کے مطابق فیصلہ کیا ۔

آپ نے دیکھا' ان مثالوں میں کہیں بھی ب کے معنے " سے" یا " ساتھ " نہیں -
زیر نظر لغت میں حروف کا عام ترجمہ دیا گیا ہے - لیکن اردو زبان میں ان کا ترجمہ
(عبارت کے لحاظ سے) الگ الگ ہوگا - اس کے لئے کوئی خاص قاعدہ مقرر نہیں - زبان
سے واقفیت اور تھوڑی سی مشق کے بعد سمجھ میں آ جاتا ہے کہ فلاں فقرہ میں
حرف کا صحیح ترجمہ کیا ہونا چاہئے -

تفصیلی بیان

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے' عربی زبان میں حروف کو بڑی اہمیت
حاصل ہے جس کے پیش نظر آپ گرامر (اور بعض لغت) کی کتابوں
میں حروف کے متعلق بڑی طویل بحثیں دیکھینگے - لیکن ہم نے اس مقام پر بھی' اور
لغت کے اندر بھی بڑے اختصار سے کام لیا ہے اور فنی بحثوں' لفظی باریکیوں اور
علمی اصطلاحوں سے قطع نظر کر کے حروف کے صرف وہ معانی بیان کر دئے ہیں جن کا
استعمال عام ہوتا ہے - مثلاً گرامر کی کتابوں میں واو عطف کی بہت سی قسمیں دی گئی ہیں
لیکن ان سب کا ترجمہ " اور" (and) ہی ہوتا ہے - ہم نے ان اقسام سے بحث
نہیں کی - نیز ہم اس بحث میں بھی نہیں الجھے کہ ایک حرف کے آنے سے اسم میں کیا
کیا اعرابی' رفع (پیش) نصب (زبر) جر (زیر کی) تبدیلیاں ہو جاتی ہیں - مثلاً اِنَّ مبتدا
کو نصب اور خبر کو رفع دیتا ہے وغیرہ وغیرہ - ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ آپ
کو عربی زبان کے الفاظ اور ان کی مختلف شکلوں کی اس قدر پہچان ہو جائے کہ مادہ کے
معنے سمجھ لینے کے بعد ان مختلف شکلوں کا مفہوم بھی آپ کے سامنے آ سکے اور اس
طرح آپ قرآن کریم کو براہ راست سمجھنے کے قابل ہو سکیں - فنی نکات آفرینیوں اور
اصطلاحی موشگافیوں سے بحث کرنا ہمارے پیش نظر نہیں -

ابواب اور ان کے خواص

یہ بتایا جا چکا ہے کہ عربی زبان میں ہر فعل مادّہ سے بنتا ہے - مادّہ ان اصلی حروف کو کہتے ہیں جن کے بغیر فعل کی پہلی شکل وجود میں نہ آ سکے - فعل کا مادّہ کبھی تین حروف کا ہوتا ہے اور کبھی چار کا - (اسماء کے مادہ میں پانچ اور چھ حروف بھی ہوتے ہیں) تین حرفی مادہ کو ثُلَاثِي کہتے ہیں - یہ ثَلَاثَةٌ سے بنا ہے جس کے معنی "تین" ہیں - عربی زبان میں زیادہ تر ثلاثی افعال ہیں - چار حرفی مادہ کو رُبَاعِي کہتے ہیں - یہ اَرْبَعَةٌ سے بنا ہے جس کے معنی "چار" ہیں - عربی زبان میں رباعی افعال کم استعمال ہوتے ہیں -

ثلاثی مجُرّد اور ثلاثی مزید فیہ

اگر کسی فعل کا مادہ تین حروف کا ہو اور اس کی ماضی کی پہلی شکل میں بھی تین حروف ہی ہوں تو وہ ثلاثی مجرّد کہلاتا ہے - لیکن جب مادہ تین حروف کا ہو مگر ماضی کی پہلی شکل میں تین حروف سے زیادہ ہوں تو ایسے فعل کو ثلاثی مزیدفیہ کہا جائیگا - آپ کو شاید اس پر تعجب ہوگا کہ جب مادہ تین ہی حروف کا ہے تو پھر فعل ماضی میں تین سے زیادہ حروف کیسے آسکتے ہیں ؟ یہ اس طرح کہ ثلاثی مجرد میں کچھ حروف کا اضافہ کر دیتے ہیں اور اس اضافہ سے وہ ایک نیا باب بن جاتا ہے اور بسا اوقات اس کے معنے بدل جاتے ہیں - یہی وہ تبدیلیاں ہیں (یعنی ابواب اور ان کے خواص) جن کی وضاحت کے لئے موجودہ عنوان آپکے سامنے لایا گیا ہے - "ابواب اور ان کی خاصیتیں" عربی زبان کی منفرد خصوصیت ہے جس سے یہ زبان لامحدود وسعتوں کی حامل ہوگئی ہے ' لہذا آپ اس عنوان کو بڑے غور سے دیکھئے -

ثلاثی مجرد کے ابواب

ابواب ثلاثی مجرد کے بھی ہوتے ہیں اور ثلاثی مزیدفیہ کے بھی - پہلے ثلاثی مجرد کے ابواب کو لیجئے - یہ وہ ابواب ہیں جن کا مادہ سہ حرفی ہے اور ماضی کی پہلی شکل بھی سہ حرفی ہے -

اور اس میں کسی حرف کا مزید اضافہ نہیں ہوتا ہے' صرف حرکت بدل جانے سے باب بدل جاتا ہے' اور حرکت بھی تینوں حروف کی نہیں بلکہ صرف دوسرے (یعنی درمیانی) حرف کی حرکت بدلنے سے ایک نیا باب ظہور میں آجاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے' فعل ثلاثی مجرد میں ماضی کی پہلی شکل تین حرف رکھتی ہے۔ ان میں سے پہلا اور تیسرا (آخری) حرف ایک حالت میں رہتے ہیں لیکن دوسرا (درمیانی) حرف ایک حالت پر نہیں رہتا' اس پر کبھی زبر کبھی زیر اور کبھی پیش آتا ہے۔ یہی درمیانی حرف فعل مضارع میں بھی بدلتا رہتا ہے۔ ہر نئی شکل جو فعل [illegible] اور اس کے فعل مضارع کے درمیانی حروف کی حرکتوں (زبر۔ زیر۔ پیش) سے مل کر بنتی [illegible] "باب" کہلاتی ہے۔

ماضی اور مضارع کے درمیانی حروف کی حرکتوں کے اعتبار سے ثلاثی مجرد کے چھ ابواب مستعمل ہیں۔

نمبر	فعل ماضی	فعل مضارع	کیفیت
۱	فَتَحَ	يَفْتَحُ	درمیانی حرف "ت" ہے۔ فعل ماضی میں اس پر زبر ہے اور فعل مضارع میں بھی اس پر زبر ہے۔
۲	ضَرَبَ	يَضْرِبُ	درمیانی حرف "ر" ہے۔ فعل ماضی میں اس پر زبر ہے اور فعل مضارع میں اس پر زیر ہے۔
۳	كَتَبَ	يَكْتُبُ	درمیانی حرف "ت" ہے۔ فعل ماضی میں اس پر زبر ہے اور فعل مضارع میں اس پر پیش ہے۔
۴	عَلِمَ	يَعْلَمُ	درمیانی حرف "ل" ہے۔ فعل ماضی میں اس پر زیر ہے اور فعل مضارع میں اس پر زبر ہے۔
۵	ثَقُلَ	يَثْقُلُ	درمیانی حرف "ق" ہے۔ فعل ماضی میں اس پر پیش ہے اور فعل مضارع میں بھی اس پر پیش ہے۔
۶	وَرِثَ	يَرِثُ	درمیانی حرف "ر" ہے۔ فعل ماضی میں اس پر زیر ہے اور فعل مضارع میں بھی اس پر زیر ہے۔

(نوٹ۔ ثلاثی مجرد کے اول الذکر پانچ ابواب عام طور پر آتے ہیں۔ آخری چھٹا باب قرآن میں شاذ آیا ہے۔)

مندرجہ بالا چھ متفرق شکلیں ہیں جو فعل ماضی اور فعل مضارع کے درمیانی حروف کی حرکتوں کے اختلاف سے پیدا ہوتی ہیں' اور یہی ثلاثی مجرد کے ابواب ہیں۔ ان میں سے ہر شکل ایک باب کہلاتی ہے۔ ان ابواب کا معنوں سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ فقط اتنا بتاتے ہیں کہ عربی زبان میں جسقدر ثلاثی مجرد کے افعال (ماضی۔ مضارع) آئینگے وہ انہی شکلوں کے اندر آئینگے۔ لیکن اگر ایک ہی باب میں درمیانی حرکتوں کو بدل دیا جائے تو اس طرح بعض اوقات معنوں میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً :—

	فعل ماضی	فعل مضارع	کیفیت
۱	بَعُدَ	یَبْعُدُ	ماضی اور مضارع میں درمیانی حرف پر پیش ہے' اس کے معنی ہیں "دور ہوا"
	بَعِدَ	یَبْعَدُ	فعل ماضی میں درمیانی حرف پر زیر اور فعل مضارع میں درمیانی حرف پر زبر ہے۔ اب اس کے معنے ہیں "ہلاک ہوا' مر گیا"
۲	حَزِنَ	یَحْزَنُ	فعل ماضی میں درمیانی حرف پر زیر اور فعل مضارع میں درمیانی حرف پر زبر ہے۔ اس کے معنی ہیں "غمگین ہوا' رنجیدہ ہوا" (فعل لازم)۔
	حَزَنَ	یَحْزُنُ	فعل ماضی کے درمیانی حرف پر زبر اور فعل مضارع کے درمیانی حرف پر پیش ہے۔ معنی "غمگین کیا رنجیدہ کیا" (فعل متعدی)

ثلاثی مزید فیہ کے ابواب

ثلاثی مجرد کے علاوہ ایسے افعال جن میں اصلی حروف تو تین ہی ہوں' لیکن ماضی کی پہلی شکل میں تین سے زیادہ حروف ہوں ثلاثی مزید فیہ کہلاتے ہیں۔ ان کے مختلف ابواب مختلف وزان پر آتے ہیں' جن میں بیشتر استعمال ہونے والے ابواب قرآن مجید میں بارہ ہیں' اور یہ حسب ذیل ہیں :-

نمبر شمار	باب (مصدری وزن)	ثلاثی مجرد (نیز مادہ کے حروف)	ثلاثی مزید فیہ: فعل ماضی	ثلاثی مزید فیہ: فعل مضارع	کیفیت
۱	تَفْعِیْل	کَرُمَ	کَرَّمَ	یُکَرِّمُ	اس باب میں ثلاثی مجرد کے درمیانی حرف کو مشدد کر دیا جاتا ہے۔
		عَلِمَ	عَلَّمَ	یُعَلِّمُ	

نمبر شمار	باب (مصدری وزن)	ثلاثی مجرد (نیز مادہ کے حروف)	ثلاثی مزید فیہ: فعل ماضی	ثلاثی مزید فیہ: فعل مضارع	کیفیت
۲	اِفْعَالٌ	حَسُنَ	اَحْسَنَ	يُحْسِنُ	اس باب میں ثلاثی مجرد کے ماضی پر ایک "ھمزہ" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔
		نَعِمَ	اَنْعَمَ	يُنْعِمُ	
۳	مُفَاعَلَةٌ	جَهَدَ	جَاهَدَ	يُجَاهِدُ	اس باب میں ثلاثی مجرد کے پہلے حرف کے بعد الف کا اضافہ کیا جاتا ہے۔
		قَتَلَ	قَاتَلَ	يُقَاتِلُ	
۴	تَفَاعُلٌ	كَثُرَ	تَكَاثَرَ	يَتَكَاثَرُ	اس باب میں ثلاثی مجرد کی ماضی سے قبل "ت" اور پہلے حرف کے بعد "الف" بڑھایا جاتا ہے۔
		غَمَزَ	تَغَامَزَ	يَتَغَامَزُ	
۵	تَفَعُّلٌ	قَطَعَ	تَقَطَّعَ	يَتَقَطَّعُ	اس باب میں ثلاثی مجرد سے قبل "ت" بڑھا کر درمیانی حرف مُشَدَّد کر دیا جاتا ہے۔
		عَلِمَ	تَعَلَّمَ	يَتَعَلَّمُ	
٦	اِنْفِعَالٌ	قَلَبَ	اِنْقَلَبَ	يَنْقَلِبُ	اس باب میں ثلاثی مجرد سے قبل "اِن" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔
		فَجَرَ	اِنْفَجَرَ	يَنْفَجِرُ	
۷	اِفْتِعَالٌ	قَرُبَ	اِقْتَرَبَ	يَقْتَرِبُ	اس باب میں شروع میں "ھمزہ" اور ثلاثی مجرد کے پہلے حرف کے بعد "ت" بڑھائی جاتی ہے۔
		كَسَبَ	اِكْتَسَبَ	يَكْتَسِبُ	
۸	اِسْتِفْعَالٌ	كَبُرَ	اِسْتَكْبَرَ	يَسْتَكْبِرُ	اس باب میں ثلاثی مجرد پر "اِسْت" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔
		غَفَرَ	اِسْتَغْفَرَ	يَسْتَغْفِرُ	

نمبر شمار	باب (مصدری وزن)	ثلاثی مجرد (نیز مادہ کے حروف)	ثلاثی مزید فیہ: فعل ماضی	ثلاثی مزید فیہ: فعل مضارع	کیفیت
۹	اِفْعِلَالٌ	سَوِدَ	اِسْوَدَّ	يَسْوَدُّ	اس باب میں ثلاثی مجرد کے شروع میں ہمزہ کا اضافہ اور آخری حرف کو مشدد کیا جاتا ہے ۔
		بَيِضَ	اِبْيَضَّ	يَبْيَضُّ	
۱۰	اِفْعِيْلَالٌ	دَهِمَ	اِدْهَامَّ	يَدْهَامُّ	اس باب میں باب نمبر ۹ پر آخری مشدد حرف سے قبل الف کا اضافہ کیا جاتا ہے ۔
۱۱	اِفَّعُّلٌ	زَمَلَ	اِزَّمَّلَ	يَزَّمَّلُ	اس باب میں شروع میں ہمزہ کے علاوہ پہلے اور دوسرے حرف کو مشدد کیا جاتا ہے (بعض اسے باب تفعّل کی ایک متغیر شکل قرار دیتے ہیں) ۔
		دَثَرَ	اِدَّثَّرَ	يَدَّثَّرُ	
۱۲	اِفَّاعُلٌ	ثَقُلَ	اِثَّاقَلَ	يَثَّاقَلُ	اس باب میں شروع میں ہمزہ اور پہلے حرف کے بعد الف لایا جاتا ہے نیز پہلے حرف کو مشدد کیا جاتا ہے (بعض اسے باب تفاعل کی متغیر شکل قرار دیتے ہیں) ۔

نوٹ ۔ ان ابواب کا مصدر اسی وزن پر آئے گا جو باب کے خانے میں درج ہیں ۔ مثالیں ذرا آگے چل کر آئیں گی ۔

یہاں آپ کے دل میں لازماً یہ سوال پیدا ہوگا کہ ان تبدیلیوں سے بالآخر مقصود کیا ہوتا ہے ؟ ان تبدیلیوں سے مقصود معانی میں وسعت اور ان کے درمیان معنوی فرق و اختلاف پیدا کرنا ہے ۔ یعنی ایک ہی فعل جب باب تفعیل میں ہو تو اس کے معنے اور ہوتے ہیں اور باب افعال میں ہو تو اور ۔ ان ابواب کی یہ خصوصیات (یعنی خاص معنی) مستقل حیثیت رکھتے ہیں ۔ لہذا (اگرچہ ان خصوصیات میں بعض اوقات استثناء بھی ہو جاتی ہے) کسی فعل کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے دیکھنا یہ چاہئے کہ :

۱۔ اس مادہ کے معنی کیا ہیں اور

۲۔ وہ کس باب میں ہے ۔

یہ عربی زبان کی وہ خصوصیت ہے جو کہیں اور نہیں ملتی - ذیل میں ہم ان ابواب کی خصوصیتیں (مختصراً) درج کرتے ہیں - آپ انہیں غور سے دیکھیں -

ابوابِ ثلاثی مزید فیہ کے خواص

اب ثلاثی مزید فیہ کے مختلف ابواب کے خواص دیکھئے - واضح رہے کہ ہم نے مختلف ابواب کے تمام خواص درج نہیں کئے - صرف اسی قدر خواص دئے ہیں جو قرآن کریم میں استعمال شدہ الفاظ کے سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں -

۱- باب تَفْعِیْل :-

(اس باب سے مصدر تَفْعِیْلٌ کے وزن پر آئیگا - مثلاً تَکْرِیْم - تَنْزِیْل)[۱]

ثلاثی مجرد کو باب تَفْعِیْلٌ میں لے جائیں تو مندرجہ ذیل فوائد و خواص مطلوب ہوتے ہیں :

(۱) لازم فعل متعدی بن جاتا ہے - مثالیں :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب تفعیل	معنی
ثَبَتَ	مضبوطی سے جما ' ثبت ہوا -	ثَبَّتَ	مضبوطی سے جمایا ' ثبت کیا -
کَرُمَ	شریف و باعزت ہوا	کَرَّمَ	شریف و باعزت بنایا

---

(۱) کبھی کبھی تَفْعِیْلٌ کے علاوہ تَفْعِلَةٌ اور فِعَّالٌ کے وزن پر بھی اس کا مصدر آ جاتا ہے - جیسے جَرَّبَ سے مصدر تَجْرِیْبٌ اور تَجْرِبَةٌ - اور کَذَّبَ سے مصدر تَکْذِیْبٌ و کِذَّابٌ - بالخصوص جب مادہ میں آخری حرف صحیح نہ ہو بلکہ حرف علت ہو تو مصدر ہمیشہ تَفْعِلَةٌ کے وزن پر آئیگا - جیسے صَلَّی سے تَصْلِیَةٌ اور سَمّٰی سے تَسْمِیَةٌ -

(۲) ثلاثی مجرد کا فعل متعدی جو ایک مفعول چاہتا ہے اس باب میں آنے کے بعد دو مفعول چاہنے لگتا ہے ۔ جیسے :

ثلاثی مجرد	معنی و مثال	ثلاثی مزید فیہ باب تفعیل	معنی و مثال
سَمِعَ	اس نے سنا ۔ سَمِعَ زَیدٌ الخَبَرَ : زید نے خبر سنی ۔ یہاں ''الخَبَرَ'' مفعول ہے ۔	سَمَّعَ	سنایا ۔ سَمَّعَ زَیدٌ حَامِدًا الخَبَرَ : زید نے حامد کو خبر سُنائی ۔ یہاں ''حامداً اور الخَبَرَ'' دو مفعول ہیں ۔
فَهِمَ	اس نے سمجھا ۔ فَهِمَ حَامِدٌ الکَلَامَ'' حامد نے بات سمجھی ۔ یہاں '' الکَلَامَ'' مفعول ہے ۔	فَهَّمَ	سمجھایا ۔ فَهَّمَ حَامِدٌ ذَاکِرًا الکَلَامَ حامد نے ذاکر کو بات سمجھائی' یہاں 'ذَاکراً اور الکَلَامَ' دو مفعول ہیں ۔

(۳) کسی کام میں زور و شدت' زیادتی و کثرت اور مبالغہ کے معنے پیدا ہو جاتے ہیں ۔ جیسے :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب تفعیل	معنی
قَطَعَ	اس نے کاٹا	قَطَّعَ	بہت زیادہ کاٹا ' خوب اچھی طرح کاٹا ۔ کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا ۔
قَتَلَ	مار ڈالا ' قتل کیا ۔	قَتَّلَ	بکثرت قتل کیا ۔ بری طرح قتل کیا ۔

(۴) کسی کام کو بتدریج تھوڑا تھوڑا اور بار بار کرنے کے لئے :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب تفعیل	معنی
نَزَلَ	اترا ، نازل ہوا	نَزَّلَ	اتارا ، نازل کیا ، بار بار تھوڑا تھوڑا بتدریج اتارا ۔
ذَکَرَ	یاد کیا	ذَکَّرَ	یاد دلایا بار بار یاد دلایا ۔

(۵) کسی کام کو کسی کی طرف منسوب کرنے کے لئے بھی یہ باب استعمال کیا جاتا ہے ۔ مثلاً :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب تفعیل	معنی
کَذَبَ	جھوٹ بولا	کَذَّبَ	اسےجھٹلایا ، جھوٹا بتایا ۔ اسکی طرف جھوٹ کو منسوب کیا ۔
صَدَقَ	سچ بولا	صَدَّقَ	اسے سچا بتایا ۔ اس کی تصدیق کی ۔ سچ اسکی طرف منسوب کیا ، سچ کرکے دکھایا ۔

(۶) کسی کیفیت کو دور کرنے اور سلب کرنے کے لئے بھی یہ باب استعمال ہوتا ہے - مثلاً :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب تفعیل	معنی
مَرِضَ	وہ بیمار ہوا -	مَرَّضَ	اس کی بیماری دور کی -
ذُکَاءٌ	حرارت غریزی -	ذَکّٰی	جانورکی حرارت غریزی نکالی 'اسے ذبح کیا'

(۷) باب افعال کے مخالف معنوں کے لئے بھی آتا ہے - مثلاً :

اَفْرَطَ (باب افعال) حد سے تجاوز کیا - افراط -

فَرَّطَ (باب تفعیل) حد سے کمی کی - تفریط -

(۹) بعض اوقات یہ ثلاثی مجرد کے معنوں میں آتا ہے - مثلاً بَشَرَ اور بَشَّرَ کے معنی ایک ہیں -

باب تفعیل سے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی معلوم	فعل ماضی مجہول	فعل مضارع معلوم	فعل مضارع مجہول	امر	نہی	اسم فاعل	اسم مفعول	مصدر
عَلَّمَ	عُلِّمَ	يُعَلِّمُ	يُعَلَّمُ	عَلِّمْ	لَا تُعَلِّمْ	مُعَلِّمٌ	مُعَلَّمٌ	تَعْلِيْمٌ

(۲) باب اِفْعَالٌ کے خواص

(اس باب سے (حروف صحت والے مادوں کا) مصدر اِفْعَالٌ کے وزن پر آئے گا - مثلاً اِسْلَامٌ - اِکْرَامٌ)

ثلاثی مجرد کو اِفْعَال میں منتقل کرنے سے مندرجہ ذیل فوائد مطلوب ہوتے ہیں -

(۱) ثلاثی مجرد کے فعل لازم کو فعل متعدی بنانے کے لئے - جیسے :-

ثلاثی مجرد	معنے	ثلاثی مزید فیہ باب افعال	معنے
فَرِحَ	وہ خوش ہوا	أَفْرَحَ	اسنے خوش کیا
عَزَّ	وہ با عزت و سر بلند ہوا	أَعَزَّ	اسنے با عزت و سر بلند کیا

(۲) ثلاثی مجرد اگر متعدی ہے اور ایک مفعول چاہتا ہے تو اسے دو مفعول والا متعدی فعل بنانے کے لئے - جیسے :-

ثلاثی مجرد	مثال	ثلاثی مزید فیہ باب افعال	مثال
قَرَأَ اس نے پڑھا	قَرَأَ زَيْدٌ كِتَابًا : زید نے کتاب پڑھی یہاں " كِتَابًا " مفعول ہے -	أَقْرَأَ پڑھایا	أَقْرَأَ زَيْدٌ حَامِدًا كِتَابًا : زید نے حامد کو کتاب پڑھائی - یہاں " حَامِدًا اور كِتَابًا " دو مفعول ہیں -

(۳) کسی " وقت یا جگہ میں داخل ہونا " بتانے کے لئے - مثلاً :-

أَصْبَحَ (باب افعال) وہ صبح کے وقت میں داخل ہوا -

أَمْسَى (باب افعال) وہ شام کے وقت میں داخل ہوا -

أَعْرَقَ (باب افعال) وہ عراق میں داخل ہوا -

(۴) کسی " حالت یا صفت کا پایا جانا " بتانے کے لیے :- جیسے

أَكْبَرَ (باب افعال) اسے بڑا پایا -

(۵) کبھی یہ باب ثلاثی مجرد کے ہم معنی ہوتا ہے ۔ مثلاً

اَلْحَقَ (باب افعال) بمعنی لَحِقَ (ثلاثی مجرد) : پیچھے سے آکر ملا ۔

(٦) کسی صفت کے زائل ہونے اور سلب کرنے کے لئے ۔ مثلاً

اَعْتَبَ (باب افعال) عتاب زائل کیا ۔

(۷) بعض دفعہ یہ باب ثلاثی مجرد متعدی کا لازم بنتا ہے ۔ جیسے کَبَّہٗ (ثلاثی مجرد متعدی) عَلٰی وَجْهِہٖ :- اسے منہ کے بل گرایا ، فَاَکَبَّ (باب افعال لازم) تو وہ منہ کے بل گر گیا

اس باب سے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

مصدر	اسم مفعول	اسم فاعل	نہی	امر	فعل مضارع		فعل ماضی	
					مجہول	معلوم	مجہول	معلوم
اِسْلَامٌ	مُسْلَمٌ	مُسْلِمٌ	لَا تُسْلِمْ	اَسْلِمْ	يُسْلَمُ	يُسْلِمُ	اُسْلِمَ	اَسْلَمَ

(۳) باب مُفَاعَلَۃ کے خواص

(اس باب سے مصدر مُفَاعَلَۃٌ اور فِعَالٌ کے وزن پر آتا ہے ۔ مثلاً مُجَاهَدَةٌ و جِهَادٌ ، مُسَابَقَةٌ و سِبَاقٌ) ۔

ثلاثی مجرد کو باب "مُفَاعَلَۃ" میں لے جانے سے مندرجہ ذیل فوائد مطلوب ہوتے ہیں :

(۱) دو آدمیوں کا ایک ہی کام میں ایک دوسرے کے ساتھ مصروف ہونا' مثلاً جب دو آدمی آپس میں جنگ کر رہے ہوں تو قَتَلَ کی جگہ قَاتَلَ کہا جائیگا ۔ یعنی دونوں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں ۔ مثالیں دیکھئے :

ثلاثی مجرد	معنے	ثلاثی مزید فیہ باب مفاعلہ	معنے
حَرْبٌ	جنگ، لڑائی	حَارَبَ	ایک دوسرے کے خلاف لڑے
جَهَدَ	اس نے پوری کوشش کی	جَاهَدَ	ایک نے دوسرے کو زیر کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کی
ضَرَّ	نقصان پہنچایا	ضَارَّ	ایک نے دوسرے کو نقصان پہنچایا

(۲) کسی کام میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور مقابلہ کرنے کے لئے - جیسے:

ثلاثی مجرد	معنے	ثلاثی مزید فیہ باب مفاعلہ	معنے
سَبَقَ	وہ آگے بڑھا	سَابَقَ	ایک نے دوسرے سے آگے بڑھنے اور سبقت لیجانے کی کوشش کی، آگے بڑھنے میں مقابلہ کیا -
سَرُعَ	وہ تیز رفتار ہوا	سَارَعَ	ایک نے دوسرے سے جلدی کرنے میں مقابلہ کیا

(۳) باب تفعیل کی طرح کسی کام میں کثرت و زیادتی بتانے کے لئے - مثلاً:

ضَاعَفَ (باب مفاعلہ): کئی گنا بڑھایا، دو چند سہ چند کیا -

(۴) باب اِفْعَال کی طرح لازم کو متعدی بنانے کے لئے بھی کبھی کبھی یہ باب

مستعمل ہوتا ہے - مثلاً :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب مفاعلہ	معنی
بَعُدَ	دور ہوا	بَاعَدَ	دور کیا
		وَارَی	چھپایا

(۵) کبھی اس کے معنے - ثلاثی مجرد کے ہوتے ہیں - مثلاً :

نَافَقَ (باب مفاعلہ) اس نے منافقت کی -

قَاتَلَ (باب مفاعلہ) اس نے مار ڈالا' قتل کیا ' بمعنی قَتَلَ (ثلاثی مجرد) -

بَارَكَ (باب مفاعلہ) اس نے خیر کا اضافہ کیا' برکت دی -

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی (معلوم)	فعل ماضی (مجہول)	فعل مضارع (معلوم)	فعل مضارع (مجہول)	امر	نہی	اسم فاعل	اسم مفعول	مصدر
قَاتَلَ	قُوتِلَ	يُقَاتِلُ	يُقَاتَلُ	قَاتِلْ	لَا تُقَاتِلْ	مُقَاتِلٌ	مُقَاتَلٌ	مُقَاتَلَةٌ قِتَالٌ

(٤) باب تَفَاعُلٌ کے خواص

(اس باب سے مصدر تَفَاعُلٌ کے وزن پر آئیگا۔ مثلاً تَقَابُلٌ)

ثلاثی مجرد کو باب تَفَاعُل میں منتقل کرنے سے مندرجہ ذیل فائدے مطلوب ہوتے ہیں :

(۱) دو یا دو سے زیادہ افراد کا ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کوئی کام کرنا ' ایک شخص کا دوسرے کے ساتھ (مفاعلہ کے باب کی طرح) یا ایک جماعت کا دوسری جماعت

کے ساتھ کسی کام کو کرنا (باب مفاعلہ میں بالعموم ایک فرد دوسرے فرد کے مقابل میں ہوتا ہے اور باب تفاعل میں عام طور پر ایک جماعت دوسری جماعت کے مقابل ہوتی ہے)۔

مثلاً :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب تفاعل	معنی
قَبِلَ	سامنے ہوا۔	تَقَابَلَ	آپس میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے
رَأَى	دیکھا	تَرَاءَى	آپس میں ایک نے دوسرے کو دیکھا۔

(۲) باب ”مُفَاعَلَةٌ“ کا اثر قبول کرنے کے لئے آتا ہے - اگر ”مفاعلۃ“ میں فاعل و مفعول درکار ہوں تو اس باب (تَفَاعُل) میں صرف فاعل درکار ہوگا :

باب مفاعلہ	معنی	باب تفاعل	معنی
بَاعَدَهُ	اسے دور کیا	تَبَاعَدَ	وہ دور ہوگیا

نوٹ ۔ غور کیجئے ۔ دور ہونے میں دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں لیکن جب ایک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دور ہو گیا تو اس سے بات واضح ہو جاتی ہے' یعنی دونوں کا ذکر ضروری نہیں ہوتا ۔

(۳) کبھی یہ باب ثلاثی مجرد کا ہم معنی ہوتا ہے ۔ جیسے :-

ثلاثی مجرد	معنے	ثلاثی مزید فیہ باب تفاعُل	معنے
عَلَا	بلند ہوا	تَعَالیٰ	بلند ہوا

اس باب سے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع	امر	نہی	اسم فاعل	اسم مفعول اور یہی اسم مکان و زمان بھی ہے	مصدر
تَنَافَسَ	يَتَنَافَسُ	تَنَافَسْ	لَا تَتَنَافَسْ	مُتَنَافِسٌ	مُتَنَافَسٌ	تَنَافُسٌ

(۵) باب تَفَعُّل کے خواص

(اس باب سے مصدر تَفَعُّلٌ کے وزن پر آئے گا۔ جیسے تَقَدُّمٌ)

ثلاثی مجرد کو باب " تَفَعُّل " میں لے جانے سے مندرجہ ذیل فوائد مطلوب ہوتے ہیں :-

(۱) باب تَفْعِيْل میں جس کام کو کیا جائے اس کا اثر قبول کر لینے اور اس کام کے ہو جانے کے لئے یہ باب استعمال ہوتا ہے - جیسے :-

باب تَفْعِيْلٌ	معنے	باب تَفَعُّلٌ	معنے
قَطَّعَ	کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا	تَقَطَّعَ	کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوا -
قَدَّمَ	آگے بھیجا ، پیش کیا	تَقَدَّمَ	آگے آیا ، پیش ہوا -

(۲) کسی کام کا یکے بعد دیگرے تھوڑا تھوڑا ہونا یا کرنا - جیسے :-

تَجَرَّعَ (باب تَفَعُّل) گھونٹ گھونٹ پیا -

(۳) کسی کام کو کرنے اور اس کے فوائد سے متمتع ہونے کے لئے زور لگانا اور

جد و جہد کرنا ۔ جیسے :-

تَعَلَّمَ (باب تَفَعُّل) اس نے (کوشش اور کاوش سے) علم حاصل کیا ۔

تَدَبَّرَ (باب تَفَعُّل) اس نے (سعی و محنت سے) غور کیا ' پیچھا کیا ۔

(۴) کسی کام کو چھوڑنا اور اس سے دور ہونا ۔ مثلاً :-

" هُجُوْدٌ " کے معنی نیند اور سونا ہیں ۔

تَهَجَّدَ (باب تَفَعُّلٌ میں اس کے معنی ہوں گے) : اس نے سونا چھوڑا ۔ یعنی جاگا ۔

(۵) باب تفعیل کے ہم معنی ہوتا ہے ۔ جیسے :-

باب تَفْعِيْلٌ	معنے	باب تَفَعُّل	معنے
فَكَّرَ	اس نے غور و فکر کیا ۔	تَفَكَّرَ	اس نے غور و فکر کیا ۔

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی معروف	فعل ماضی مجہول	فعل مضارع معروف	فعل مضارع مجہول	امر	نہی	اسم فاعل	اسم مفعول (و اسم ظرف)	مصدر
تَدَبَّرَ	تُدُبِّرَ	يَتَدَبَّرُ	يُتَدَبَّرُ	تَدَبَّرْ	لَا تَتَدَبَّرْ	مُتَدَبِّرٌ	مُتَدَبَّرٌ	تَدَبُّرٌ

(٦) باب اِنْفِعَالٌ کے خواص

(اس باب سے مصدر اِنْفِعَالٌ کے وزن پر آئے گا ۔ جیسے اِنْقِلَابٌ)

ثلاثی مجرد کو باب انفعال میں لے جانے سے مندرجہ ذیل فوائد پیدا ہوتے ہیں :-

(۱) ثلاثی مجرد کے جن افعال میں اثر اندازی اور زور لگا کر کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے ' یہ باب ان افعال کا اثر قبول کرنے اور ویسا ہوجانے کے لئے استعمال ہوتا ہے

نیز متعدی فعل کو لازم کر دیتا ہے - مثلاً :-

ثلاثی مجرد	معنے	ثلاثی مزید فیہ باب اِنْفِعَالٌ	معنی
قَلَبَ	پلٹا ، پھیرا، الٹا	اِنْقَلَبَ	پلٹ گیا ، پھر گیا ، الٹ گیا -
فَلَقَ	پھاڑا	اِنْفَلَقَ	پھٹ گیا -

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع	امر	نہی	اسم فاعل	ظرف زمان و مکان	مصدر
اِنْقَلَبَ	يَنْقَلِبُ	اِنْقَلِبْ	لَاتَنْقَلِبْ	مُنْقَلِبٌ	مُنْقَلَبٌ	اِنْقِلَابٌ

نوٹ - یہ باب لازم ہی آتا ہے اور کسی لازم فعل سے نہ مجہول بنایا جاتا ہے نہ اسم مفعول -

۷ - باب اِفْتِعَالٌ کے خواص

(اس باب سے مصدر اِفْتِعَالٌ کے وزن پر آئے گا - مثلاً اِكْتِسَابٌ)

ثلاثی مجرد کو باب اِفْتِعَال میں لے جانے سے مندرجہ ذیل فوائد متحرک ہوتے ہیں -

(۱) ثلاثی مجرد فعل کا اثر قبول کرنا اور جو کام کیا جائے اس کا ہو جانا ، جیسے :

ثلاثی مجرد	معنے	ثلاثی مزید فیہ باب افتعال	معنے
جَمَعَ	جمع کیا ، اکٹھا کیا -	اِجْتَمَعَ	جمع ہو گیا ، اکٹھا ہوا -
هَدَى	راستہ بتایا، رهنمائی کی -	اِهْتَدَى	راستہ پر لگا ، رهنمائی ہوئی، راستہ معلوم ہوا -

(۲) کسی کام میں محنت کرنا اور انتہائی زور لگانا ، مثلاً :

ثلاثی مجرد	معنے	ثلاثی مزید فیہ باب افتعال	معنے
كَسَبَ	اس نے کمایا	اِكْتَسَبَ	اس نے محنت اور انتہائی زور لگا کر کمایا ۔
جَهَدَ	کوشش کی	اِجْتَهَدَ	پوری کوشش اور انتہائی زور لگایا ۔

(۳) اپنے جی سے کسی کام کو بنا لینا اور گھڑ لینا :۔ جیسے

ثلاثی مجرد	معنے	ثلاثی مزید فیہ باب افتعال	معنے
كَتَبَ	لکھا	اِكْتَتَبَ	اپنی طرف سے لکھ لیا ۔
خَلَقَ	بنایا	اِخْتَلَقَ	اپنے جی سے بنا لیا، گھڑ لیا ، تراش لیا ۔

(۴) کسی کام کو چاھنا اور اسے طلب کرنا ۔ نیز کسی چیز کو پیش کرنا اور اظہار کرنا ۔ مثلاً :۔

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب افتعال	معنی
عَذَرَ	اس نے معاف کیا ۔ عذر قبول کیا	اِعْتَذَرَ	اس نے معافی چاھی ۔ عذر پیش کیا ۔

(۵) باب تَفَاعُل کی طرح اس باب میں بھی باہمی اشتراک کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ مثلاً :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب افتعال	معنی
قَتَلَ	قتل کیا	اِقْتَتَلَ	باہم قتل کیا
سَبَقَ	آگے بڑھا	اِسْتَبَقَ	آپس میں ایک دوسرے سے سبقت کی ۔

اس باب کے مشتق اسماء و افعال کے مثالی اوزان

فعل ماضی معلوم	فعل ماضی مجہول	فعل مضارع معلوم	فعل مضارع مجہول	امر	نہی	اسم فاعل	اسم مفعول	مصدر
اِشْتَمَلَ	اُشْتُمِلَ	يَشْتَمِلُ	يُشْتَمَلُ	اِشْتَمِلْ	لَا تَشْتَمِلْ	مُشْتَمِلٌ	مُشْتَمَلٌ	اِشْتِمَالٌ

(۸) باب اِسْتِفْعَالٌ کے خواص

ثلاثی مجرد کو باب "استفعال" میں منتقل کرنے سے مندرجہ ذیل فوائد مطلوب ہوتے ہیں :

(۱) کسی کام کو چاہنا، اسے طلب کرنا اور مانگنا ۔ مثلاً :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب استفعال	معنی
نَصَرَ	اس نے مدد کی	اِسْتَنْصَرَ	اس نے مدد چاہی، مدد مانگی
غَفَرَ	اسے بچایا، محفوظ رکھا	اِسْتَغْفَرَ	اس نے حفاظت چاہی۔ بچاؤ کا طالب ہوا ۔

(۲) مفعول میں فعل کی صفت کو پانا یا سمجھنا ۔ جیسے :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب استفعال	معنی
ضعف	کمزور ہوا	استضعفہ	اسے کمزور پایا ، یا کمزور سمجھا ۔

(۳) کسی کام کا اثر قبول کرنے اور اس کے ساتھ جیسا کیا جائے ویسا ہو جانے کے لئے بھی اس باب کو استعمال کیا جاتا ہے ۔ جیسے :

استجاب (باب استفعال) پکار کا جواب دیا، آواز کو قبول کیا ۔

(۴) کبھی یہ باب ثلاثی مجرد کے ہم معنی ہوتا ہے ۔ جیسے :

ثلاثی مجرد	معنی	ثلاثی مزید فیہ باب استفعال	معنی
قرّ	وہ ٹھہرا	استقرّ	وہ ٹھہرا

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی		فعل مضارع		امر	نہی	اسم فاعل	اسم مفعول	مصدر
معلوم	مجہول	معلوم	مجہول					
استنصر	استنصر	یستنصر	یستنصر	استنصر	لا تستنصر	مستنصر	مستنصر	استنصار

(۹) باب اِفْعِلَال کے خواص

(ابواب نمبر ۹ تا ۱۲ بہت کم استعمال ہوتے ہیں)

(۱) یہ باب کسی رنگ یا عیب کو بتانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:

اسم	معنے	ثلاثی مزید فیہ باب افعلال	معنے
أَبْيَضُ	سفید	اِبْيَضَّ	سفید ہوا۔
أَسْوَدُ	کالا	اِسْوَدَّ	سیاہ ہوا۔

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع	امر	نہی	اسم فاعل	مصدر
اِبْيَضَّ	يَبْيَضُّ	اِبْيَضَّ	لَا تَبْيَضَّ	مُبْيَضٌّ	اِبْيِضَاضٌ

(۱۰) باب اِفْعِيلَال کے خواص

باب اِفْعِيلَال در اصل باب افعلال (نمبر ۹) کی ایک قسم ہے اس لئے اسی کے

خواص رکھتا ہے۔ نیز حرف "ی" کے اضافہ کی وجہ سے معنی میں زور ومبالغہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً:

اِدْهَامَّ (باب افعیلال) سخت سیاہ ہوا۔

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع	امر	نہی	اسم فاعل	مصدر
اِدْهَامَّ	يَدْهَامُّ	اِدْهَامَّ	لَا تَدْهَامَّ	مُدْهَامٌّ	اِدْهِيمَامٌ

۱۱، ۱۲۔ باب اِفَّعُّلٌ اور باب اِفَّاعُلٌ کے خواص

یہ ابواب در اصل باب تَفَعُّلٌ اور باب تَفَاعُلٌ کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں، اور انہی ابواب کے خواص اپنے اندر رکھتے ہیں ۔ مثالیں :

باب اِفَّعُّلٌ	معنے	باب اِفَّاعُلٌ	معنے
اِزَّمَّلَ	(۱) اس نے چادر اوڑھی ۔ (۲) اس نے ساتھی بنایا ۔	اِثَّاقَلَ	وہ بوجھل اور بھاری ہوا ۔
اِطَّهَّرَ	اس نے پاکی اختیار کی، پاک ہوا ۔	اِدَّارَكَ	ایک دوسرے کو ملا ۔ ایک نے دوسرے کو پایا ۔

رُباعی مجرّد اور مزید فیہ کے ابواب

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، ثلاثی وہ فعل ہے جس میں مادّہ یعنی اصلی حروف کی تعداد تین ہو۔ اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں ۔ (۱) مجرّد (۲) مزید فیہ ۔ ''مجرد'' وہ جس کی ماضی کی پہلی شکل میں صرف تین حروف ہوتے ہیں ۔ ''مزید فیہ'' وہ جس کی ماضی کی پہلی شکل میں تین سے زیادہ حروف ہوں لیکن بہر حال اصلی حروف تین ہی ہوں ۔ مثال کے طور پر ''نَصَرَ'' فعل ماضی کی پہلی شکل ہے۔ اس میں تین حروف ہیں ۔ یہ ثلاثی مجرّد ہے۔ لیکن ''اِسْتَنْصَرَ'' جو اگرچہ نَصَرَ میں ہی کچھ حرفوں کے اضافہ سے بنا ہے، ثلاثی مجرد نہیں بلکہ ثلاثی مزید فیہ ہے ۔

رُباعی
مجرّد۔ مزید فیه

وہ فعل جس کی ماضی کی پہلی شکل میں چار حروف ہوں اور وہ چاروں اصلی ہوں اور ان میں کوئی بھی زائد نہ ہو فعل رباعی کہلاتا ہے۔ اگر ماضی کی پہلی شکل میں صرف چار حرف ہوں تو وہ فعل رباعی مجرّد کہلائے گا' لیکن جب اصلی حروف تو چار ہی ہوں لیکن ماضی کی پہلی شکل میں چار سے زیادہ حروف ہوں تو اسے رباعی مزید فیه کہینگے۔

عربی میں عموماً ثلاثی افعال زیادہ استعمال ہوتے ہیں' رباعی کم استعمال ہوتے ہیں' اور اسی لئے رباعی کے ابواب بھی کم ہیں۔ رباعی مجرد کا تو صرف ایک باب ہے۔

(۱) باب فَعْلَلَةٌ

رباعی مجرد

وہ فعل جس کا مادہ (اصلی حروف) چار حرفوں پر مشتمل ہو اور ماضی کی پہلی شکل میں بھی صرف چار حرف ہوں' رباعی مجرد کہلاتا ہے۔ اور اس کا ایک باب ہے۔ یہ باب عموماً متعدی ہوتا ہے۔ مثالیں :

وَسْوَسَ : اس نے خیال یا وسوسہ ڈالا۔

زَلْزَلَ : اس نے ہلایا۔

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی معلوم	فعل ماضی مجہول	فعل مضارع معلوم	فعل مضارع مجہول	امر	نہی	اسم فاعل	اسم مفعول	مصدر
زَلْزَلَ	زُلْزِلَ	يُزَلْزِلُ	يُزَلْزَلُ	زَلْزِلْ	لَا تُزَلْزِلْ	مُزَلْزِلٌ	مُزَلْزَلٌ	(۱) زَلْزَلَةٌ (۲) زِلْزَالٌ

نوٹ۔ مصدر میں دوسرا وزن کم مستعمل ہے۔

رباعی مزید فیه اور اس کے ابواب

جب فعل ماضی کی پہلی شکل میں اصلی چار حروف کے ساتھ ساتھ کچھ زائد حروف بھی ہوں تو وہ فعل "رُبَاعِی مَزِید فِیہ" کہلاتا ہے۔ اس کے ابواب یہ ہیں۔

(۱) باب اِفْعِلَّالٌ

اس باب میں ماضی کی پہلی شکل اِطْمَأَنَّ ہے' یہ طَمْأَنَ سے بنی ہے۔ اِطْمَأَنَّ میں شروع کا الف اور آخر میں ن پر تشدید زیادہ ہے۔ اسی طرح اِقْشَعَرَّ اور اِشْمَأَزَّ۔

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع	امر	نہی	اسم فاعل	مصدر
اِطْمَأَنَّ	يَطْمَئِنُّ	اِطْمَئِنَّ	لَا تَطْمَئِنَّ	مُطْمَئِنٌّ	اِطْمِئْنَانٌ

(۲) باب تَفَعْلُلٌ

رباعی مزید کا ایک باب جو رباعی مجرد کے باب کا اثر قبول کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے' اس کی ماضی کی پہلی شکل تَفَعْلَلَ کے وزن پر آتی ہے۔ جیسے : تَزَحْزَحَ ، تَزَلْزَلَ۔

اس باب کے مشتق افعال و اسماء کے مثالی اوزان

فعل ماضی	فعل مضارع	امر	نہی	اسم فاعل	مصدر
تَدَحْرَجَ	يَتَدَحْرَجُ	تَدَحْرَجْ	لَا تَتَدَحْرَجْ	مُتَدَحْرِجٌ	تَدَحْرُجٌ

امید ہے کہ عربی گرامر کے ان مختصر سے نکات سے (عربی نہ جاننے والے) قارئین اتنا سمجھ گئے ہونگے کہ عربی الفاظ کے مادے کیا ہوتے ہیں ۔ ان مادوں سے الفاظ کی مختلف شکلیں کیسے بنتی ہیں اور ان شکلوں سے الفاظ کے معنوں میں کیا فرق پڑتا ہے - یہ معلومات نہ صرف زیر نظر لغت سے استفادہ میں بڑی مدد دینگی بلکہ عربی زبان کے سمجھنے میں بھی ممد و معاون ثابت ہونگی ۔

آئندہ باب میں قارئین کے سامنے ایک فہرست آئیگی جس میں قرآن کریم کے تمام الفاظ ان کی اصلی شکل میں (یعنی جس شکل میں وہ قرآن میں آئے ہیں) دئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے سامنے اس کا مادہ دیا گیا ہے تاکہ لغت سے الفاظ کے معنی معلوم کرنے میں دقت نہ ہو ۔

إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ

لغات القرآن

قرآنی مطالب کا انسائیکلوپیڈیا

جس میں قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی و مطالب
مستند کتب لغت کی بنیاد پر اس انداز سے متعین کئے گئے ہیں
کہ قرآن جو تصورات پیش کرتا ہے، ان کا مکمل نقشہ
سامنے آجائے اور اس کا صحیح مفہوم سمجھنے میں کوئی الجھاؤ پیدا نہ ہو

پرویز

جلد اول

طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور

نام کتاب لغات القرآن (اول)

مصنف غلام احمد پرویز

ایڈیشن چہارم اکتوبر 1998

ناشر طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

25بی گلبرگ II لاہور پاکستان

فون :5753666,5764484

مطبع زاہد بشیر پرنٹرز

طلوع اسلام ٹرسٹ کی کتب سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

فہرست مشتمولات

لغات

جلد اول کل صفحات ۵۰۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ (پہلا ایڈیشن)

خاک ما خیزد کہ سازد آسمانِ دیگرے
ذرہ ناچیز و تعمیر بیابانِ نگر

قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور نوع انسان کے لئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ ایسے ابدی حقائق پر مشتمل ہے جن پر زمانہ کے تغیرات اثر انداز نہیں ہو سکتے، اور جو اسقدر عالمتاب اور ہمہ گیر ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے اور تاریخ کے ہر دور میں انسانی فکر کی امامت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس کتاب کی کیفیت یہ ہو اسکی زبان کو کسقدر جامع، ہمہ گیر، وسیع، بلند اور عمیق، اور اسکے ساتھ، کسقدر صاف، واضح اور متعین ہونا چاہئے۔ ایک مغربی مفکر نے—جو عیسائیت سے برگشتہ ہو کر ایک ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جو انسانی عقل و بصیرت کی تسکین کر سکے۔ کہا ہے کہ وہ جس مذہب کی تلاش میں ہے اسکی کتاب کی زبان ایسی ہونی چاہئے:

> جو ایک طرف ایسی سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے مستفید ہو سکیں اور دوسری طرف اسقدر عمیق اور پر معنی کہ ایک بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو جائے*۔

قرآن کریم کی زبان اس معیار پر بھی صحیح طور پر پوری اترتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب مشیت ایزدی نے قرآن کے انقلابی پروگرام کو عملاً متشکل کرنے کے لئے عربوں جیسی قوم کا انتخاب کیا تو، نزول قرآن سے صدیوں پہلے، اس قوم کے ذمے یہ فریضہ عائد کر دیا کہ وہ اپنی زبان کو بتدریج ارتقائی منازل طے کرائے اس مقام تک لے جائے کہ وہ قرآن کے عظیم حقائق کی متحمل ہو سکے۔ جب حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کو دو شاخوں میں تقسیم کیا گیا، تو ایک شاخ (بنی اسرائیل) کے حصے میں نبوت اور حکومت آئی اور دوسری شاخ (بنی اسمٰعیل) کو حجاز کی وادی غیرذی زرع میں بسایا گیا، جہاں ان کے ہاں (حضرت اسمٰعیلؑ کے

* Julian Huxley-N.Y. Times 22.8.52.

بعد) نہ کوئی نبی مبعوث ہوا ، نہ انہیں بادشاہت ملی ۔ لیکن یہ شاخ ، رفتہ رفتہ ایک ایسی قوم بن گئی جو دایہ٭ فطرت کے آغوش میں پل کر جوان ہوئی اور نبی آخرالزمان ؐ کے پیغام کی اولین مخاطب بننے کی اہل قرار پائی ۔ اسکے ساتھ ہی اس نے اپنی زبان کو اسقدر جلا دی کہ وہ اپنے آپ کو بجا طور پر ، عرب (یعنی فصیح البیان) اور دوسروں کو عجم (یعنی گونگے) کہا کرتے تھے۔ لفظ ''عربی'' کے معنے ہی صاف ، واضح اور بیّن کے ہیں ۔ اسوقت عربی زبان کی اصل (Origin) اور اسکے ارتقائی مراحل کے متعلق کوئی تحقیقاتی بحث میرے پیش نظر نہیں ۔ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ جہاں بنی اسرائیل صدیوں تک تمدن و حضارت کے بلند اور پر شکوہ محلات تعمیر کرنے میں مصروف رہے ٭ اور سطوت داؤدی٭ اور شوکت سلیمانی ٭ کے حامل بنے ، ان کے بھائی ۔ بنی اسمٰعیل ۔ اس تمام عرصہ میں ، شعوری یا غیرشعوری طور پر ، ایک ایسی زبان کی ترتیب و تہذیب میں کوشاں رہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی زبان نہیں کرتی تھی ۔ ماہرین علم الالسنہ کے پیش کردہ نظریات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر تاریخ کے کسی خاص دور میں ، کسی قوم کی ذہنی سطح کا اندازہ لگانا ہو تو دیکھنا یہ چاہئے کہ اس دور میں اس قوم کی زبان میں کتنے الفاظ ایسے تھے جو تصورات (Concepts) کے مظہر تھے ۔ اس ضمن میں انکی تحقیق یہ ہے کہ ہندی ۔ یوروپی (Indo - European) زبانوں میں جسقدر الفاظ مروّج ہیں ان کے تصوراتی مشتقات (Root - Concepts) کی تعداد زیادہ سے زیادہ ایک سو اکیس تک پہنچتی ہے۔ اور تو اور، جس زمانے میں سنسکرت ایک زندہ زبان تھی ، اور سورج اور آگ کو دیوتا مانا جاتا تھا ، اس زمانے میں اس زبان میں سورج کے لئے کل سینتیس (۳۷) الفاظ تھے اور آگ کیلئے پینتیس (۳۵) ۔ اسکے برعکس عربوں کو دیکھئے تو ان کے ہاں شہد کیلئے اسّی الفاظ ۔ سانپ کیلئے دو سو ۔ شیر کیلئے پانچسو ۔ تلوار کیلئے ایک ہزار ۔ اور اونٹ کیلئے پانچہزار سات سو چوالیس الفاظ موجود تھے* ۔ اس سے عربوں کے تخیل کی وسعت اور ان کی زبان کی جامعیت کے متعلق اندازہ ہو سکتا ہے

یہ تھی وہ زبان جسمیں قرآن کریم نازل ہوا ۔

وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (۲۶ / ۱۹۵-۱۹۲)

* Cosmic Consciousness-Richard Maurice Bucke pp 30-31

اور یہ (قرآن) کائنات کے نشوونما دینے والے کی طرف سے
اتارا گیا ہے - روح الامین اسے لیکر تیرے قلب پر نازل
ہوا ہے تاکہ تو زمرۂ انبیاء میں شامل ہوجائے جو
لوگوں کو ان کی غلط روش کے عواقب سے متنبہ کرتے تھے -
(یہ قرآن) عربی مبین (بات کو کھول کر بیان کرنے والی
عربی زبان) میں (نازل ہوا ہے) -

یہ تو اس زبان کے متعلق تھا جس میں قرآن نازل ہوا۔ خود قرآن کے متعلق ہے -

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (۱۲/۲)
ہم نے اس (قرآن) کو صاف اور واضح کتاب بنا کر نازل
کیا ہے تاکہ (تم بات کو اچھی طرح) سمجھ سکو۔

دوسری جگہ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (۴۳/۳) کہا ہے - قُرْآنًا عَرَبِيًّا کے معنی '' قرآن بزبان عربی ،، بھی ہوسکتے ہیں ، اور یہ بھی کہ واضح اور کھول کر بات کرنے والا قرآن - اس حقیقت کو قرآن نے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے - مثلاً سورۃ الرعد میں ہے کہ وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا (۱۳/۳۷) '' اور اس طرح ہم نے اسے کھلے اور واضح فیصلے کے طور پر نازل کیا ہے،، - سورۃ طٰہٰ میں ہے وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (۲۰/۱۱۳) '' اور اس طرح ہم نے اسے واضح کتاب (کی شکل میں) نازل کیا ہے ''- (نیز (۴۲/۷ ; ۴۶/۱۲) - سورۃ زمر میں قُرْآنًا عَرَبِيًّا کے ساتھ غَيْرَ ذِي عِوَجٍ (۳۹/۲۸) کہکر یہ بتا دیا کہ یہ قرآن اسقدر صاف اور واضح ہے کہ اس کے مطالب میں کوئی پیچ و خم نہیں - سورۃ کہف میں ہے وَلَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجًا (۱۸/۱) '' اور اس میں کوئی پیچ و خم نہیں رہنے دیا ''- دوسرے مقام پر کہا گیا ہے كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۴۱/۳) '' یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیات الگ الگ کر کے ، نکھار کر ، بیان کی گئی ہیں- (اسطرح) یہ قرآن صاف اور واضح (ہوگیا ہے) ان لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں ،، -

قرآن کے حقائق نہایت بلند اور اس کے مطالب غایت درجہ عمیق ہیں ' لیکن اس کے ساتھ اس کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ اس کا انداز بیان بڑا آسان ہے - سورۃ دخان میں ہے فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (۴۴/۵۸) '' اے رسول! ہم نے اسے تیری زبان میں آسان کر دیا ہے تا کہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں ،،- سورۃ قمر میں اس حقیقت

کو ان الفاظ میں بار بار دھرایا گیا ہے کہ "وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (۵۴/۱۷) " یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنادیا ہے۔ تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟"

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا تھا اور اپنے مطالب میں بڑا صاف، واضح اور آسان ہے۔ اس سے انسان (عام طور پر) اس نتیجہ پر پہنچیگا کہ جس شخص کو عربی زبان آتی ہو وہ قرآنی حقائق کو بآسانی سمجھ لیگا۔ یعنی قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے صرف عربی زبان کا جاننا کافی ہوگا۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے عربی زبان کا جاننا ضروری ہے ـــــ دنیا میں کوئی کتاب بھی سمجھی نہیں جا سکتی جب تک انسان اس زبان سے واقف نہ ہو جس میں وہ کتاب لکھی گئی ہے ـــ لیکن اگر صرف عربی زبان جاننے سے قرآنی حقائق سمجھ میں آسکتے تو عرب (جن کی مادری زبان عربی ہے) قرآنی حقائق کے ماہر ہوتے۔ لیکن عرب کس حد تک قرآن کریم کی تعلیم کو سمجھتے ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ عربوں سے مراد صرف ان کے عوام نہیں۔ اس میں ان کا پڑھا لکھا (علماء کا) طبقہ بھی شامل ہے۔ جب اس باب میں خود عربوں کی یہ حالت ہے تو غیر عربوں کے متعلق اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ اس سے ایک اہم سوال ہمارے سامنے آتا ہے، اور وہ یہ کہ ایک طرف قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ عربی زبان کی آسان کتاب ہے اور دوسری طرف کیفیت یہ ہے کہ نہ صرف عربی جاننے والوں میں سے، بلکہ خود ان میں سے جن کی مادری زبان عربی ہے، بہت کم ہیں جو قرآنی تعلیم کو کما حقہ سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ سوال بڑا بنیادی اور اہم ہے اور اس کا اچھی طرح سمجھ لینا ضروری۔

عربی زبان کی وسعت و جامعیت کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ زمانہ نزولِ قرآن سے پہلے ہی یہ زبان بہت منجھ چکی تھی۔ لیکن یہ معلوم کر کے غالباً آپ کو حیرت ہوگی کہ قرآن کریم نثر کی سب سے پہلی کتاب ہے جو اس زبان میں لکھی گئی*۔

* بعض لوگوں نے قرآن کریم سے پہلے، عربی زبان میں نثر کی ایک آدھ غیر معروف سی کتاب کی نشاندھی کی ہے۔ لیکن اس کے متعلق حتمی اور یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں۔ عام تحقیق کا رخ اسی طرف ہے کہ قرآن کریم اس زبان میں نثر کی اولین کتاب ہے۔

عربوں کے ہاں شعر و شاعری کا زیادہ رواج تھا اس لئے ان کی زبان کا تمام تر ذخیرہ اشعار کی شکل میں تھا جو نسلاً بعد نسلٍ (زبانی) آگے منتقل ہوتا چلا آ رہا تھا۔ جسے آج عربی لٹریچر کہا جاتا ہے وہ بیشتر عباسیوں کے زمانے میں مرتب ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں کتب احادیث و سیر اور تاریخ و آثار مرتب ہوئیں۔ قرآن کریم کی تفاسیر لکھی گئیں۔ عربی ادب کی کتابیں تالیف ہوئیں۔ اس زبان کی صرف و نحو کے قواعد مدون ہوئے۔ لغت کی کتابیں مرتب ہوئیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی عجیب ماجرا ہے کہ جن حضرات نے یہ کتابیں مرتب کیں وہ (باستثنائے معدودے چند) سب غیر عرب (یعنی عجمی) تھے۔ یہی کتابیں عربی زبان کا اولین سرمایہ ہیں۔

تاریخ کا طالب العلم اس حقیقت سے واقف ہے کہ عباسیوں کے زمانے میں، عجمی تصوراتِ حیات ساری فضا میں پھیل چکے تھے۔ انہوں نے سلطنت انہی کی مدد سے حاصل کی تھی اس لئے اس دور کی سیاست پر بھی انہی کا اثر غالب تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس گروہ کا سیاست پر اثر ہو، اس کا زندگی کے ہر شعبے پر اثر چھا جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ان لوگوں کے قلم سے جو کچھ نکلا اس کے الفاظ تو عربی تھے لیکن ان الفاظ کے پیکروں میں تصورات عجمی تھے۔ یوں عربی زبان، تصنیف و تالیف کے پہلے دور میں ہی، غیر عربی تصورات کی حامل بن گئی۔ یہ تبدیلی کس کس انداز سے ہوئی، اس کی تفصیل علامہ احمد امین مصری (مرحوم) نے اپنی مایہ ناز تصنیف فجر الاسلام میں شرح و بسط سے دی ہے۔ اس بحث کے آخر میں وہ لکھتے ہیں۔

> یقیناً آپ اس بارے میں مجھ سے متفق ہونگے کہ ایرانی لٹریچر نے عربی لٹریچر کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا۔

ظاہر ہے کہ جب عربی زبان پر خارجی (غیر عربی) اثرات اس طرح مرتب ہوئے اور اس کے الفاظ کے حقیقی مفہوم میں تبدیلی پیدا ہو گئی تو اس زبان کے جو الفاظ قرآن کریم میں آئے تھے ان کے مفہوم میں بھی فرق آ گیا۔ چونکہ ہماری کتب تفاسیر بھی اسی فضا میں مرتب ہوئی تھیں اس لئے وہ بھی عجمی تصورات سے متاثر ہوئیں۔ یوں قرآنی الفاظ کے اس مفہوم میں فرق آ گیا جو ان سے زمانۂ نزولِ قرآن میں لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اس فرق کی ایک اور وجہ بھی ہوئی جو آئندہ سطور میں آپ کے سامنے آئیگی۔

ہمارے ہاں جب تفاسیر لکھنے کی ابتدا ہوئی (یعنی تیسری چوتھی صدی ہجری میں) تو ان کا انداز یہ رکھا گیا کہ قریب قریب ہر اہم آیت کے متعلق یہ کہا گیا کہ اس کی '' شانِ نزول '' یہ ہے - یعنی فلاں واقعہ یوں ہوا اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی - اس طرح قرآن کریم کی آیات کا مفہوم ان کے الفاظ کی رو سے نہیں ، بلکہ ان واقعات کی رُو سے متعین کیا گیا جن کے متعلق سمجھا گیا کہ وہ ان کے نزول کا سبب تھے - پھر اسی مفہوم کے مطابق قرآنی الفاظ کے معانی متعین کئے گئے - جو تفاسیر ان کے بعد لکھی گئیں ان میں متقدمین کا اتباع ہوتا چلا گیا - اس طرح متعلقہ آیات کا وہ مفہوم مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر گیا - اور چونکہ شان نزول کی روایات کا انتساب خود نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی طرف کیا گیا تھا اسلئے آیات کی وہ تفسیر خود نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی تفسیر سمجھ لی گئی - اسطرح قرآن کریم کے اس مفہوم کو مقدس ترین سند بھی حاصل ہوگئی ، حالانکہ تفسیری روایات کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں بیشتر ضعیف اور وضعی ہیں - حتی کہ بعض اکابر ائمہ نے سرے سے ان کا انکار ہی کر دیا ہے مثلاً امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جنکی کوئی اصلیت نہیں - مغازی - ملاحم اور تفسیر* - لیکن اس کے باوجود ہماری کتب تفاسیر کا مدار بیشتر انہی روایات پر ہے - اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی ضعیف یا وضعی روایات کی بنا پر قرآنی آیت کی تفسیر کی جائیگی اور اس تفسیر کی روشنی میں قرآنی الفاظ کا مفہوم متعین کیا جائیگا تو وہ مفہوم قرآن کریم کا صحیح صحیح مطلب بیان نہیں کریگا - یہ بات ایک مثال سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھ میں آسکیگی - سورۃ النساء کی چونتیسویں آیت ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ .... عَلِيًّا كَبِيْرًا (۴/۳۴) اسمیں ابتدائی چار الفاظ کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے

مرد حاکم ہیں اوپر عورتوں کے (ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ)

یہاں ''قوامون'' کا ترجمہ ''حاکم'' کیا گیا ہے حالانکہ لغت کی رُو سے اس کے معنی ہیں ''روزی مہیا کرنے والے'' جس کا مطلب یہ ہے کہ تقسیم عمل کی رُو سے مردوں کا فریضہ کسب معاش ہے - اب یہ دیکھئے کہ اس لفظ (قَوّٰامٌ) کا ترجمہ ''حاکم'' کسطرح ہوگیا - اس آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے -

* تذکرۃ الموضوعات الشیخ محمد طاہر - بحوالہ مقدمہ معارف القرآن صفحہ ۲۸ از علامہ اسلم جیراجپوری مرحوم -

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (اسکا) مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑیگی - حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہؐ کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے مجھے تھپڑ مارا ہے - اس پر آپ نے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا جو یہ آیت اتری اور بدنہ نہ دلوایا گیا - ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاری اپنی بیوی صاحبہ کو لئے ہوئے حاضر خدمت ہوئے - اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہؐ میرے خاوند نے مجھے تھپڑ مارا ہے جسکا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے - آپ نے فرمایا کہ اسے (اسکا) حق نہ تھا - وہیں یہ آیت اتری کہ ادب سکھانے کے لئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں- آپ نے فرمایا کہ میں نے اور چاہا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اور چاہا- . . . . ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا - اللہ کی لونڈیوں کو مارو نہیں - اسکے بعد حضرت عمرؓ آئے اور عرض کرنے لگے- یا رسول اللہؐ ! عورتیں آپکے اس حکم کو سنکر مردوں پر دلیر ہوگئیں- اس پر حضورؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی-اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار پیٹ شروع ہوئی اور بہت سی عورتیں شکایتیں لیکر آنحضرتؐ کے پاس آئیں تو آپ نے لوگوں سے فرمایا - سنو! میرے پاس عورتوں کی فریاد پہنچی ہے - یاد رکھو جو تم میں سے اپنی عورتوں کو زد و کوب کرتے ہیں وہ اچھے آدمی نہیں ہیں -

حضرت اشعثؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت فاروق اعظمؓ کا مہمان ہوا - اتفاقاً میاں بیوی میں اس روز ناچاقی ہوگئی اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی صاحبہ کو مارا - پھر مجھ سے فرمانے لگے - اشعث ! تین باتیں یاد رکھو جو میں نے رسول اللہؐ سے سن کر یاد رکھی ہیں - ایک تو یہ کہ مرد سے پوچھا نہ جائے کہ اس نے اپنی عورت کو کس بنا پر مارا - دوسری یہ کہ وتر پڑھے بغیر سونا مت - اور تیسری بات راوی کے ذہ .

سے نکل گئی (نسائی)۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ۔ اگر میں کسی کو حکم کرسکتا کہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے*۔

ان تفسیری روایات کی رو سے مرد کی پوزیشن حاکم ، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ کشاف میں ''قَوَّامُوْنَ'' کا مطلب ''نسیطرین'' قرار دیا گیا ہے۔ یعنی ''داروغے''۔ اور تفسیر جلالین میں '' متسلطین''۔ یعنی عورتوں پر غلبہ و تسلط رکھنے والے ۔ اس لفظ کا یہی مفہوم کتب لغت میں بھی آگیا اور اسی سے ہمارے ہاں اسکا ترجمہ ''حاکم'' اور ''داروغہ'' ہوگیا ۔ یہی تفاسیر تمام ممالک اسلامیہ کے مذہبی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں اور انہی کی تعلیم عوام کو دی جاتی ہے ۔ یہ وجہ ہے کہ عربی جاننے والے، حتکہ خود عرب (اہل زبان) بھی قرآن کریم کے حقیقی مفہوم تک بہت کم پہنچ پاتے ہیں ۔

اس سے ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے ۔ اور وہ یہ کہ

(۱) جب عربی زبان عباسیوں کے دور میں عجمی اثرات سے ملوّث ہوگئی تھی ۔ اور

(۲) ہمارے ہاں عربی زبان کا جسقدر اولین تحریری سرمایہ ہے وہ بیشتر اسی دور کا پیدا شدہ ہے — خواہ یہ کتب تفاسیر ہوں یا لغت کی کتابیں ، کتب تاریخ ہوں یا ادبی تصانیف — اور کتب تفاسیر میں بھی ، ضعیف یا وضعی روایات کی وجہ سے قرآنی آیات (و الفاظ) کا مفہوم اپنی اصل سے ہٹ چکا ہے ۔ تو

(۳) آج اسکی کونسی صورت باقی ہے کہ قرآنی الفاظ کا وہ مفہوم متعین کیا جاسکے جو ان سے نزول قرآن کے زمانہ میں سمجھا جاتا تھا ۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہ بات کسی اور زبان (اور کسی اور کتاب) سے متعلق ہوتی تو یہ دشواری ایسی تھی جسکا غالباً کوئی حل نہ مل سکتا۔ لیکن عربی زبان (اور قرآن کریم) کے سلسلے میں بعض عناصر ایسے ہیں جنکی موجودگی میں یہ مسئلہ ایسا نہیں رہتا جسکا حل ناممکن ہو ۔ سب سے پہلے یہ کہ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) نزول قرآن سے پہلے عربی زبان کا تمام تر ذخیرہ ان کے شعراء کے کلام میں محفوظ تھا۔ عربوں کے معاشرہ میں شعراء کو خاص

*تفسیر ابن کثیر ۔ المترجم مولانا محمد جونا گڑھی (مرحوم) پارہ پنجم صفحہ ۱۶-۲۰

مقام حاصل تھا۔ نیز انکی شاعری بھی زیادہ تر مختلف قبائل کے محاسن و خصائص اور ان کے مدمقابل قبائل کے معائب و ذمائم سے متعلق ہوتی تھی، اسلئے یہ اشعار بچے بچے کی زبان پر چڑھ جاتے تھے۔ نثر کو اگر ضبط تحریر میں نہ لایا جائے تو اسکا علیٰ حالہٖ آگے منتقل ہونا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن شعر کی کیفیت یہ نہیں۔ اسے جب بھی زبانی یاد کیا جائیگا اور دھرایا جائے گا تو اسکے الفاظ، اور الفاظ کی ترتیب اسی حالت میں رھیگی۔ یعنی شعر بالفاظہٖ آگے منتقل ہوتا ہے، اسکا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاتا۔ یہ وجہ تھی کہ زمانہ قبل از اسلام کے شعراء کا کلام بلفظہٖ اور بجنسہٖ آگے منتقل ہوتا رہا تآنکہ وہ (عباسیوں کے عہد میں) ضبط تحریر میں آگیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں بہت سے وضعی اشعار بھی شعرائے جاہلیہ کی طرف منسوب کرکے ان کے کلام میں شامل کردئے گئے، لیکن اس سے اس مقصد پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا جس کے لئے ہم نے اس مقام پر اس حقیقت کو پیش کیا ہے۔ وضعی اشعار کی زبان لامحالہ وھی رکھنی پڑتی تھی جو اصل اشعار کی زبان تھی۔ ایسا نہ کیاجاتا تو اصل اور نقل میں فوراً تمیز ہو جاتی۔ بہرحال، شعرائے جاہلیہ کے کلام کا بیشتر حصہ اپنے اصلی الفاظ میں عربی ادب کی کتابوں میں مدون اور محفوظ ہو گیا۔ یعنی عربی زبان کے وہ الفاظ جو زمانہ نزول قرآن میں مروج تھے، عربی ادب کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اور چونکہ وہ اشعار بھی موجود ہیں جن میں وہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس لئے (ان اشعار کی مدد سے) ان الفاظ کا وہ مفہوم بھی متعین کیا جا سکتا ہے جو ان سے زمانہ نزول قرآن میں لیا جاتا تھا۔ یہ الفاظ قرآن کریم میں بیشتر انہی معانی میں استعمال ہوئے ہیں جن معانی میں وہ ان اشعار میں استعمال ہوئے تھے اور جن سے زمانہ نزول قرآن کے عرب اچھی طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں قرآن کریم کے سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ اشعار (ادب کی کتابوں کے علاوہ) عربی زبان کی مستند لغت کی کتابوں میں بھی آچکے ہیں اور ان میں، ان کے الفاظ کے معانی سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ معانی، بعد میں مرتب ہونے والی کتب لغت نے، اول الذکر کتابوں کی سند سے اپنے ہاں درج کرلئے ہیں۔ ان الفاظ کے ان معانی سے، قرآن کریم کے الفاظ کے وہ معانی سامنے آسکتے ہیں جو زمانہ نزول قرآن میں مروج تھے۔

(۴) یہ تو رھا وہ خارجی عنصر جس کے ذریعے یہ متعین کیا جا سکتا ہے کہ فلاں لفظ سے، زمانہ نزول قرآن میں، کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ عربی زبان کی ایک داخلی خصوصیت ایسی ہے جو خاص اسباب

سے اثر پزیر نہیں ہو سکتی اور جس پر غور و فکر سے اسکے الفاظ کے صحیح مفہوم تک پہنچنا مشکل نہیں رہتا ۔ عربی زبان کے ہر لفظ کا ایک مادہ (Root) ہوتا ہے جو اپنے بنیادی معنی رکھتا ہے ۔ گرامر کے قواعد کی رو سے اس مادہ کی شکلیں خواہ کیسے ہی بدلتی رہیں ، اسکے بنیادی معنی کی جھلک ہر شکل میں موجود رہیگی* ۔ مادہ کے بنیادی معنی تو ایک طرف ، اس سلسلہ میں یہانتک بھی متعین ہے کہ اگر مادہ میں فلاں حروف (مثلاً ح اور ب) اکٹھے آئیں تو فلاں مفہوم پایا جائیگا اور فلاں حروف (مثلاً ص اور ر) اکٹھے آئیں تو فلاں مفہوم ۔ لہٰذا ، اگر مرور زمانہ سے کسی لفظ کے مفہوم میں فرق بھی آجائے تو بھی اس کے مادہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابتداءً وہ لفظ کس مفہوم کے لئے استعمال ہوتا تھا ۔ اس طریق سے بھی یہ متعین کیا جا سکتا ہے کہ جو الفاظ قرآن کریم میں آئے ہیں زمانہ نزولِ قرآن میں ان سے بالعموم کیا مفہوم لیا جاتا تھا ۔

(٥) اس باب میں تیسرا عنصر یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے کے عرب نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ سر پر کھلا ہوا آسمان جس میں چمکتے تارے اور جگمگاتے چاند سورج ، سامنے وسیع و عریض صحرا جس میں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے اور کہیں کہیں پہاڑیاں ، پانی کے چشمے زندگی کے مراکز ان کے ارد گرد ہری ہری گھاس ، سروقامت کھجوروں کے جھنڈ ، کہیں کہیں انگوروں کی بیلیں اور اناروں کے پیڑ ۔ ان کے آس پاس ان صحرانشینوں کے خیمے ۔ خیموں کے اندر نہایت مختصر سامان زیست ۔ ان میں سب سے زیادہ قیمتی متاع ان کے ہتھیار ۔ تلوار ۔ تیر ۔ کمان ۔ نیزہ ۔ ڈھال ۔ خنجر ۔ سامنے چراگاہ میں انکے مویشی ۔ اونٹ ، گھوڑے ، بھیڑیں ، بکریاں ۔ بس یہ تھی ان کی کل کائینات جس کے گرد ان کی زبان کے تمام مشتقات و مصادر گھومتے تھے ۔ چونکہ یہ تمام اشیاء محسوس و مرئی تھیں اسلئے ان کے متعلق جسقدر الفاظ استعمال میں آتے تھے ان کا مفہوم نہایت آسانی سے ذہن میں (بلکہ آنکھوں کے سامنے) آجاتا تھا ۔ الفاظ کے صحیح مفہوم کے تعین میں دقت وہاں پیش آتی ہے جہاں وہ الفاظ فلسفہ اور مابعدالطبیعیاتی مسائل سے گفتگو میں استعمال ہوئے ہوں ۔ یعنی جہاں بات تجریدی (Abstract) امور کے متعلق ہو ۔ خانہ بدوشوں اور

* اس زبان کی یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اس سے ہر زمانے کی نئی نئی ضرورتوں کے ماتحت نئے نئے الفاظ بنتے چلے جاتے ہیں ۔ اس کے لئے مادہ کے بنیادی معنی اور مختلف ابواب کے خواص سامنے ہونے چاہئیں ۔ پھر کوئی نیا تصور ایسا نہیں رہتا جس کے لئے موزوں لفظ نہ بن سکے ۔

صحرانشینوں کے ہاں تجریدی مسائل کا کیا کام؟ انہی لوگوں کی صاف ستھری ، اُجلی ، نکھری زبان تھی جسے عربوں کے ہاں سند مانا جاتا تھا ۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب (بہت دور جا کر نہیں) حضرت عمرؓ کے زمانے میں عربوں کا غیر عربوں سے خلا ملا بڑھنے لگا تو آپ اہل مدینہ سے کہا کرتے تھے کہ قرآن سمجھنا چاہتے ہو تو صحرا کے بدؤوں میں جا کر کچھ دن گذارو ، کیونکہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے وہ زبان ان کے ہاں اپنی اصلی شکل میں موجود ہے ۔

(۶) مادہ کے بنیادی مفہوم اور ان صحرانشینوں کے ہاں انْ الفاظ کے عملی استعمال سے الفاظ کا صحیح مفہوم کسطرح سامنے آ جاتا ہے ، اسکا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (۲/۱۵۳) ''یہ حقیقت ہے کہ خدا صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے'' ۔ لفظ صبر کے جو معنی ہمارے ہاں مروّج ہیں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ۔ جب کسی پر ایسی مصیبت آ پڑے جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو ۔ جہاں انسان یکسر بے چارہ اور بے کس و بے بس ہو کر رہ جائے ۔ جہاں کوئی تدبیر کارگر نہ ہو ، وہاں ہم کہتے ہیں کہ میاں صبر کرو ۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ۔ حتّٰی کہ جب کوئی کمزور و ناتوان مظلوم کسی کے ظلم و زیادتی کے خلاف کچھ نہ کرسکے تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیتا ہے کہ ''اچھا ! میرا صبر'' ۔ لیکن عربی مبین میں اس مادہ (ص ۔ ب ۔ ر) کے بنیادی معنی ہیں ، کسی شخص کا مطلوبہ شے کے حصول کے لئے مسلسل جد و جہد کرنا ، جم کر کھڑے ہو جانا ، ثابت قدم رہنا ۔ اب دیکھئیے کہ صحرانشین عرب اس مادہ کو کن معنوں میں استعمال کرتے تھے ۔ بادل کا وہ ٹکڑا جو چوبیس گھنٹے ایک ہی جگہ کھڑا رہے اور ادھر اُدھر نہ ہو ، اَلصَّبِیْرُ کہلاتا تھا ۔ اَلاَصْبِرَۃُ ان اونٹوں یا بکریوں کو کہتے تھے ، جو صبح جنگل میں چرنے کیلئے چلے جائیں اور شام کو ٹھیک انہی قدموں پر واپس آ جائیں ۔ نہ کوئی ادھر اُدھر ہو ، نہ پیچھے رہے* ۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان (عربوں) کے ہاں صَبْرٌ کے معنی تھے استقامت ، استقلال ، استواری ، ثابت قدمی ، ایک اصول اور روش پر جم کر کھڑے رہنا ، عمل میں دوام و استمرار ۔ یہ ہے صبر کی وہ کیفیت جو انسان کے اپنے اندر پیدا ہوتی ہے ۔ اب اس سے آگے بڑھئیے ۔ اگر کبھی بوجھ یا سواریوں کی کمی بیشی سے کشتی کا توازن بگڑ جائے اور وہ ڈگمگانے لگے تو ملاح ایک بڑا سا پتھر کشتی میں رکھدیتے تھے جس سے اسکا وزن ہموار ہوجاتا

* تاج العروس ۔

تھا - (ہمارے ہاں تانگے والے اکثر ایسا کرتے ہیں) - اس پتھر کو اَلصَّبُوْرَۃُ کہتے ہیں**- لہٰذا صبر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب کسی کے پاؤں ڈگمگانے لگیں تو "صبر" سے اس کا توازن برقرار ہو جاتا ہے اور اسکے پاؤں میں لغزش نہیں آتی - چونکہ اس قسم کے عملِ پیہم اور ثبات و قرار کا نتیجہ کامرانیاں اور کامیابیاں ہوتا ہے اس لئے اَلصُّبْرَۃُ غلے کے اس ڈھیر کو کہتے ہیں جس کی ناپ اور تول نہ کی گئی ہو*-

اس لفظ (صبر) کے طریق استعمال کی ان محسوس مثالوں سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ زمانہ نزول قرآن میں عربوں کے ہاں اس کا مفہوم کیا تھا - اس مفہوم کی رو سے قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم بھی آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ " اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے "-

(ے) مذکورہ بالا عرسہ عناصر عربی زبان کی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اسکے الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں زیادہ دشواری نہیں رہتی - لیکن، بایں ہمہ ، صرف اتنی خصوصیات سے قرآن کریم جیسی کتاب کے الفاظ کے صحیح صحیح معانی متعین نہیں کئے جاسکتے - اسلئے کہ یہ کتاب زندگی کے ان اصولوں کا ضابطہ ہے جن میں تغیروتبدل نہیں ہو سکتا اور جن کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے - اسکے لئے ضروری ہے کہ اسکا صحیح مفہوم یقینی طور پر ہمارے سامنے آجائے - تنہا لغت سے یہ نہیں ہو سکتا - لغت انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے جس سے سہو و خطا اور خارجی اثرات کا امکان بہر حال باقی رہتا ہے - علاوہ بریں، قرآن کریم نے بعض الفاظ کو اصطلاحات کے طور پر استعمال کیا ہے - یہ اصطلاحات اسقدر جامع ہیں کہ تنہا لغت سے وہ عظیم تصورات سامنے نہیں آسکتے جنہیں قرآن نے ان الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے - مثلاً صلٰوۃ - زکٰوۃ - تقویٰ - ایمان - اسلام - کفر - فسق - فجور - دنیا - آخرت وغیرہ - ان اصطلاحات میں قرآنی تعلیم کے بنیادی تصورات بڑی جامعیت سے سمو دئے گئے ہیں - ان کی اس جامعیت کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ جوں جوں انسانی علم کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے ان کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے - ان اصطلاحات کا مفہوم خود قرآن کریم ہی سے سمجھا جا سکتا ہے-

قرآن کا انداز یہ ہے کہ اسمیں اگر ایک مقام پر ایک بات کہی گئی ہے تو دوسرے مقام پر اسکی وضاحت اس انداز سے کر دی گئی ہے کہ اس سے مقام

* تاج العروس - **محیط المحیط -

اول کی بات خود بخود واضح ہوجاتی ہے۔ اس انداز کو قرآن نے "تصریف آیات" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی آیات کو مختلف مقامات پر لوٹا کر لانا اور اسطرح مطالب کی وضاحت کر دینا۔ سورۃ انعام میں ہے وَكَذَالِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيَاتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ (۶/۱۰۶) "اور اسطرح ہم آیات کو لوٹا کر لاتے ہیں تاکہ یہ لوگ کہیں کہ تو نے بات ذہن نشین کرادی ہے اور تاکہ ہم اسے ان لوگوں کے لئے واضح کر دیں جو علم و بصیرت سے کام لیں"۔ قرآن کریم کا یہ وہ خصوصی انداز ہے جس سے اس کے مطالب واضح طور پر سامنے آ جاتے ہیں اور اسکے الفاظ کا مفہوم متعین کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ مثلاً لفظ (صبر) کے جو لغوی معنی اوپر دئیے گئے ہیں انہیں پیش نظر رکھئیے اور پھر قرآن کریم کی طرف آئیے۔ قرآن کریم میں ایک جگہ ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ (۲/۱۵۳)۔ "یقیناً اللہ صابرین کے ساتھ ہے"۔ یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ الصابرین کن لوگوں کو کہتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ (۳/۱۴۵) "کتنے ہی انبیاء (ایسے گذرے) ہیں جن کی معیّت میں بہت سے ربّانی لوگوں نے (مخالفین کے مقابلے میں) جنگ کی۔ پھر ان تکالیف کی وجہ سے جو انہیں اس طرح اللہ کی راہ میں پیش آئیں نہ وہ سست گام ہوئے۔ نہ ان میں کمزوری آئی۔ اور نہ ہی وہ مخالفین سے مغلوب ہوئے۔ (یہی وہ) الصابرین ہیں جنہیں اللہ دوست رکھتا ہے"۔ اگلی آیت میں ان کی اس کیفیت کو ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (۳/۱۴۶) دعاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ دعا کہ "ہمارے قدموں کو مضبوط رکھ"۔ عین میدان جنگ کی حالت میں کہا ہے فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ.... (۸/۶۶) "اگر تم میں ایک سو صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آجائینگے"۔ ان آیات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح اور متعین طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ قرآن کریم میں صبر سے مفہوم کیا ہے اور صابر کسے کہتے ہیں۔

یہی کیفیت قرآنی اصطلاحات کی بھی ہے۔ قرآن کریم ان کے مفہوم کی وضاحت بھی تصریف آیات کی رو سے کر دیتا ہے۔ لہذا کوئی عام لفظ ہو یا قرآنی اصطلاح، اگر وہ تمام آیات بیک وقت سامنے رکھ لی جائیں جن میں قرآن کریم نے انہیں استعمال کیا ہے، یا ان کے مفہوم کو بیان کیا

ھے، تو ان الفاظ و اصطلاحات کے معانی متعین کرنے میں دشواری نہیں رہتی۔ ان مقامات پر غور و فکر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ھے کہ "قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ھے"۔

۸ ۔ جو کچھ اوپر کہا گیا ھے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ھے کہ قرآن کریم کے معانی متعین کرنے کا طریق یہ ھے کہ

(ا) ۔ سب سے پہلے متعلقہ لفظ کے مادہ کو دیکھا جائے کہ اس کا بنیادی مفہوم کیا ھے اور خصوصیت کیا ۔ اس مادہ کی شکلیں کتنی ھی کیوں نہ بدلیں، اس کی خصوصیت کی روح بالعموم ھر پیکر میں جھلکتی رھیگی ۔

(ب)۔ اس کے بعد دیکھا جائے کہ صحرا نشین عربوں کے ھاں اس لفظ کا استعمال کس کس انداز سے ہوتا تھا ۔ ان کے استعمال کی محسوس مثالوں سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ ان کے ھاں اس مادہ کا تصور (Concept) کیا تھا ۔ واضح رھے کہ جب تک تصورات (Concepts) کا تعین نہ کیا جائے، الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا ۔ یہ وہ بنیادی اصول ھے جس پر دور حاضرہ میں (Semantics) نے بڑی عمدہ روشنی ڈالی ھے ۔ علم اللسان کے اس شعبہ کا مطالعہ، الفاظ کی روح تک پہنچنے میں بڑا ممد و معاون ثابت ہوتا ھے ۔

(ج) ۔ اس کے بعد یہ دیکھنا چاھئیے کہ قرآن کریم میں وہ لفظ کس کس مقام پر آیا ھے اور اس نے اسے کس کس رنگ میں استعمال کیا ھے ۔ ان مقامات سے اس لفظ کا قرآنی تصور (Quranic Concept) سامنے آ جائیگا ۔

(د) ۔ سب سے بڑی چیز یہ کہ قرآن کریم کی پوری تعلیم کا مجموعی تصور سامنے ہونا چاھئیے ۔ اور اس بنیادی اصول کو ھمیشہ پیش نظر رکھنا چاھئیے کہ اس کے مفردات اور اصطلاحات کا مفہوم اسکی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جائے ۔ اس لئے کہ قرآن کا دعویٰ ھے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ھے کہ ذھن کو خارجی اثرات سے الگ رکھکر قرآن کا مطالعہ خود قرآن کی روشنی میں کیا جائے ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نور (روشنی) کہا ھے اور روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لئے خارجی مدد کی محتاج نہیں ہوتی ۔

یہ ہے وہ طریق جس سے قرآن کے الفاظ اور آیات کا صحیح مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس ضمن میں، علامہ جمال الدین افغانیؒ کے شاگرد رشید—اور سید رشید رضاؒ کے استاد—امام شیخ محمد عبدہ، (علیہ الرحمۃ) نے تفسیرالمنار کے مقدمہ میں قرآن فہمی کے اعلیٰ مراتب کے سلسلہ میں بعض اہم امور بیان کئے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے۔

> اس سلسلہ میں پہلی چیز یہ ہے کہ قرآن میں استعمال ہونے والے مفرد الفاظ کے حقیقی معنی سمجھے۔ یعنی یہ معلوم کرے کہ ان الفاظ کو اہل عرب کیونکر استعمال کرتے تھے، اور اس سلسلہ میں کسی دوسرے کے قول و فہم پر بھروسہ نہ کرے۔ نہ اس پر اکتفا کرے۔ اسلئے کہ بہت سے الفاظ زمانۂ نزول قرآن میں کسی خاص مطلب و معنی کو ادا کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ بعد میں، تھوڑا یا زیادہ عرصہ گذرنے پر، ان کے دوسرے معنی کئے جانے لگے۔ مثلاً لفظ ''تاویل،، ہے جو ''تفسیر،، کے معنوں میں مشہور ہوگیا ہے۔ لیکن قرآن میں یہ لفظ دوسرے معنوں میں آیا ہے۔ یعنی ''انجام کار،،۔ ''عاقبت،،۔ ''قرآن کے وعدہ وعید کا نتیجہ ظاہر ہونا''*۔
>
> اس ضمن میں قرآن کریم میں غور و فکر کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ملت میں بعد میں پیدا ہونے والی اصطلاحات کی تحقیق کرے۔ اور پھر ان میں اور قرآن میں آنے والے الفاظ میں فرق کرے۔ اکثر مفسرین قرآن کریم کے الفاظ کا ترجمہ ان اصطلاحات کی رُو سے کرتے ہیں جو پہلی تین صدیوں میں ملت میں رائج ہوچکی تھیں۔ قرآن پر غور کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کے الفاظ کے وہی معنی لیں جو زمانۂ نزول

---

* سید رشید رضاؒ نے اس سلسلہ میں لفظ ''الولی'' کی مثال دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قرآن میں اس لفظ کے معنی ناصرو مددگار، حمایتی اور دوست کے ہیں۔ ''اولیاء اللہ'' کے معنی ہیں وہ اہل ایمان و تقویٰ جو اللہ کے دین کے حامی و مددگار ہیں۔ لیکن بعد میں یہ اصطلاح چل پڑی کہ وہ لوگ جو کرامات و خوارق کا مظاہرہ کریں اور ظاہری اسباب سے ماوراء قوانین فطرت میں تصرف کریں انہیں اولیاء اللہ کہا جاتا ہے، حالانکہ صحابہ کبارؓ ''اولیاء اللہ'' کے یہ معنی جانتے ہی نہیں تھے (المنار)۔

قرآن میں لئے جاتے تھے - اس سلسلہ میں بہتر طریق یہ ھے کہ الفاظ کے معانی کے تعین میں خود قرآن سے مدد لے اور مکرر آنے والے الفاظ کا قرآن مین مطالعہ کرے۔ بعض اوقات وہ دیکھیگا کہ ایک ھی لفظ متعدد معانی کے لئے استعمال ھوا ھے - مثلاً ”ھدایت،، وغیرہ - ان مقامات پر غور و فکر سے معلوم ھوجائیگا کہ فلاں مقام پر اس لفظ کے صحیح معنی کیا ھیں - اسلئے کہا گیا ھے کہ اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بعضاً - قرآن کا ایک مقام دوسرے کی تفسیر کرتا ھے - اسیطرح کسی لفظ کے خاص معنی کو ترجیح دینے کیلئے قانون یہ ھوگا کہ وہ معنی سابقہ عبارت سے مطابقت اور موافقت رکھتے ھوں - پورے موضوع و مطالب سے اتفاق رہتے ھوں اور قرآن کے مجموعی مقصد سے ھم آھنگ ھوں - (مقدمہ تفسیر المنار)

(۹) میں قرآن کریم کا طالب علم ھوں - میری زندگی، بچپن سے لیکر اسوقت تک، اس کتاب عظیم کے ساتھ متمسک رھی ھے - ابتداءً میں نے بھی (جیسا کہ ھمارے ھاں کا معمول ھے) اسکا مطالعہ تقلیدی اور رواجی انداز سے کیا - لیکن اس سے کچھ بات نہ بنی - بعد میں جب میرے شعور میں انقلاب آیا اور میں نے ان راستوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ

منزل و مقصود قرآن دیگر است - رسم و آئین مسلماں دیگر است

یہ میرے بخت کی یاوری تھی کہ عین اسوقت جب میں اس ذھنی کشمکش میں مبتلا تھا علامہ اقبالؒ کی بصیرت قرآنی سے (من جملہ دیگر امور) یہ اھم نکتہ میری سمجھ مین آیا کہ قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریف آیات کی رو سے سمجھنا چاھئے، اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ھونے دینا چاھئے - ”تصریف آیات،، کی رو سے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے تبویب القرآن کی ضرورت تھی - یعنی ایک موضوع سے متعلق، قرآن کریم کی تمام آیات کو یکجا کرکے انھیں مربوط مضمون کی شکل میں مرتب کرنا - اگرچہ تبویب القرآن کے متعلق اس سے پہلے بھی کوششیں ھوئی تھیں لیکن جو خاکہ علامہ اقبالؒ کے پیش نظر تھا، اور جسکی تفصیل انہوں نے مجھے بتائی تھی، اس کے مطابق کوئی کتاب مجھے نہ مل سکی - اس کے لئے ایک نئی کتاب کی تدوین کی ضرورت تھی - میں نے بڑی کوشش کی

کہ کوئی جماعت ، یا مجھ سے زیادہ موزوں فرد، اس اہم کام کے لئے تیار ہوجائے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اور بالآخر یہ اہم کام مجھے خود ہی کرنا پڑا۔ اس کے لئے میں نے سینکڑوں عنوانات کے ماتحت قرآنی آیات کی تبویب (Classification) کی۔ اس میں کئی برس لگ گئے۔ پھر ہر موضوع کو، انسائیکلو پیڈیا کے انداز پر، مربوط مقالہ کی شکل میں مرتب کیا۔ اسکے بعد ان مقالات کو مختلف مجلدات میں تقسیم کیا۔ اسطرح ''معارف القرآن'' کا طویل سلسلہ وجود میں آیا۔ اس میں سے، من و یزدان۔ ابلیس و آدم۔ جوئے نور۔ برق طور۔ شعلہ مستور۔ معراج انسانیت، شائع ہوچکی ہیں۔ باقی جلدیں اپنے وقت پر شائع ہوتی جائینگی۔ و بیدہ التوفیق۔

(۱۰) ''معارف القرآن،، اور میری دیگر تصانیف و مقالات کی اشاعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے نوجوان، تعلیم یافتہ (بالخصوص '' مذھب گزیدہ،،) طبقہ کے دل میں قرآن کریم کی قدر و منزلت اور عظمت و عقیدت کے جذبات بیدار ہوگئے۔ میری (سالہا سال کی) محنت اور کوشش کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہمارا نوجوان طبقہ (جو انسانوں کے خود ساختہ مذھب سے گھبرا کر، خدا کے عطا فرمودہ دین ہی سے دور بھاگ رہا تھا) کسی طرح قرآن کریم کے قریب آجائے اور اس پر براہ راست غور و فکر کرنا شروع کردے۔ میری ان حقیر سی کوششوں سے (بتوفیق خداوندی) جو نتیجہ برآمد ہوا وہ میری توقعات سے کہیں بڑھکر تھا۔ ان نوجوانوں کی کثیر تعداد قرآن کریم کے قریب آگئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

یہ طبقہ قرآن کے قریب تو آگیا لیکن جب ان سے کہا گیا کہ وہ اس کتاب عظیم کی تعلیم کو براہ راست سمجھنے کی کوشش کریں تو ان کا جواب یہ تھا کہ قرآن کریم نہ موجودہ تراجم سے ان کی سمجھ میں آتا ہے، نہ تفاسیر سے۔ (وہ ایسا کہنے میں حق بجانب تھے) اسلئے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ طریق بتایا جائے جس سے وہ قرآن کریم کو براہ راست سمجھنے لگ جائیں۔ اس مطالبہ میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو عربی زبان سے ناواقف تھے اور وہ بھی جو اسے جانتے تھے۔ اس کی وجہ وہی تھی جسے تفصیل سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ ایک مدت کے غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس دشواری کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآن کریم کا ایسا لغت ہو جس میں قرآنی الفاظ اور تصورات کا مفہوم اس انداز سے متعین کیا گیا ہو جسکی تصریح پہلے کی جا چکی ہے۔ میں نے بہت تلاش کیا لیکن اس قسم کا کوئی لغت مجھے نہ مل سکا۔ اس قسم کا لغت تو ایک طرف، مفردات امام راغبؒ

کے علاوہ، نظر سے کوئی ایسی کتاب نہیں گذری جسے خالص قرآنی الفاظ کا لغت کہا جا سکے۔ (حال ہی میں لغات القرآن کے عنوان سے بعض کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن وہ ہمارے پیش نظر مقصد کو پورا نہیں کرتیں۔ علامہ حمیدالدین فراہیؒ نے اس طرز پر قرآن کریم کے افہام و تفہیم کی طرح ڈالی تھی۔ اور کچھ الفاظ کے معنی بھی اس انداز سے متعین کئے تھے۔ اگر وہ قرآن کریم کا پورا لغت اس نہج پر مرتب فرما جاتے تو وہ بڑے کام کی چیز ہوتا۔ میں نے اپنے ظرف کے مطابق ان کی قرآنی بصیرت سے بھی استفادہ کیا ہے)۔ اندریں حالات، چارہ کار اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس قسم کا لغت مرتب کیا جائے۔ قرآن کریم کا لغت مرتب کرنا، اور وہ بھی اس انداز کا جسکا ذکر اوپر آچکا ہے، جسقدر مشکل کام ہے اس کا اندازہ اہل علم حضرات بخوبی لگا سکتے ہیں۔ میں نے (جسطرح اس سے پہلے تبویب القرآن کے سلسلہ میں کیا تھا) بڑی کوشش کی کہ اس عظیم اور مشکل کام کے لئے کوئی جماعت تیار ہو جائے، لیکن (جسطرح پہلے ناکامی ہوئی تھی) اس میں (بھی) ناکامی ہوئی۔ ادھر یہ دشواری تھی اور ادھر ان ارباب ذوق کا (جنہیں میں قرآن سے قریب لے آیا تھا) یہ تقاضا کہ انہیں بتایا جائے کہ وہ قرآن کو براہ راست کسطرح سمجھیں، شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں جب اپنی طرف نگاہ ڈالتا تھا تو ایسے مشکل اور اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کی نہ اپنے اندر کماحقہ اہلیت پاتا تھا، نہ ہمت۔ ایک مدت تک یہ کشمکش جاری رہی۔ اور آخرالامر، اسکے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ، بھلی بری جیسی بھی ہو، اس کام کی بنیاد رکھ دینی چاہئیے۔ جب ایک دفعہ اسکی طرح پڑ گئی اور اس نے مفید نتائج مرتب کئے تو پھر دوسرے (اور مجھ سے زیادہ اہلیت رکھنے والے) حضرات اس پر بہتر عمارت استوار کردینگے۔ یہ تھے وہ حالات جن سے مجبور ہو کر میں نے اس لغت کی ترتیب کا فیصلہ کیا۔ سالہا سال کی مسلسل محنت کے بعد، جیسا کچھ یہ مرتب ہو سکا ہے، آپ کے سامنے ہے۔ اس دشوار گزار سفر میں مجھے بعض اچھے رفقاء کی معیت بھی نصیب ہوگئی۔ نیز کٹھن منازل پر میں نے ان حضرات سے مشورے بھی کئے جو ان مشوروں کے اہل تھے۔ اور آمادہ بہ تعاون۔ جی نہیں چاہتا کہ میں اس مقام پر، حبیب مکرم، (سابق سفیر مصر) ڈاکٹر عبدالوہاب عزام (نوراللہ مرقدہ) کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھ جاؤں۔ انہیں عربی زبان پر جسقدر عبور اور قرآن سے جسقدر عشق تھا اس کا ان احباب کو بخوبی علم ہے جنہیں ان کو قریب سے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ کلام اقبال کی شرح اور ترجمہ کے سلسلہ میں میرے ان کے ساتھ برسوں تک

گہرے تعلقات رہے۔ عربی ادب کے سلسلہ میں میں نے ان کے تبحر علمی سے جسقدر استفادہ کیا اس کی قدروقیمت کا اندازہ میں ہی لگا سکتا ہوں۔لغات کے مرتب ہو جانے کے بعد میں نے اسکا مسودہ ایسے ذی علم احباب کو بھی دکھا لیا جن کی عربی زبان کی استعداد اور قرآنی ذوق کا مجھے اندازہ تھا۔میں ان تمام احباب کا بصمیم قلب شکر گزار ہوں۔لیکن اس کے ساتھ، اس حقیقت کا اعلان میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس لغت میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسکی ذمہ داری میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ وہ تنہا مجھپر عائد ہوتی ہے۔افسوس ہے کہ علامہ اسلم جیراجپوری لغت کی تکمیل سے پہلے انتقال فرما گئے۔اگر وہ اسے ایک نظر دیکھ لیتے تو میرا پورا اطمینان ہو جاتا۔اس انداز سے قرآن کو سمجھنے والا (جس کا اوپر ذکر آچکا ہے) مجھے آج کہیں نظر نہیں آتا۔ میرا فہم قرآن ان کی بصیرت فرقانی کا جسقدر رہین کرم ہے اسکے لئے میرا ایک ایک سانس انکا سپاس گذار ہے۔

(۱۱) زیر نظر لغت کی ترتیب و تدوین میں سب سے پہلا فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ عربی زبان کے کون سے لغت کو بطور اساس و بنیاد سامنے رکھا جائے۔مروّجہ کتب لغت میں تین کتابوں کو بڑی شہرت حاصل ہے — یعنی لسان العرب۔ تاج العروس۔ اور قاموس۔ (ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتب لغت بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اور خاص خاص شعبوں میں وہ ان سے بھی زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں بہ ہیئت مجموعی ان تین کتابوں کو خاصی شہرت حاصل ہے)۔ ان تینوں کے محاسن و خصوصیات کے تقابلی مطالعہ کے بعد یہی طے پایا کہ تاج العروس کو بنیاد قرار دیا جائے۔

تاج العروس، قاموس کی شرح ہے۔ اور چونکہ لسان العرب کے بعد مرتب ہوئی ہے اسلئے اس میں لسان کی ضروری تفصیلات بھی آگئی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تاج العروس آخری (Latest) مفصل اور مستند لغت ہے جس میں اس سے پہلے کی شائع شدہ قریب قریب تمام مستند کتب لغت کا خلاصہ آگیا ہے۔لسان العرب ابن مکرّم* کی تالیف ہے جن کی وفات ۷۱۱ ھ میں ہوئی۔ قاموس کے مولف علامہ فیروز آبادی ہیں جن کی وفات ۸۱۶ ھ میں ہوئی۔ تاج العروس کے مولف کا پورا نام محب الدین، ابن الفیض، السیدمحمد مرتضٰی الحسینی الواسطی الزبیدی الحنفی ہے۔ ان کی وفات ۱۲۰۵ ھ (مطابق ۱۷۹۱ء) میں ہوئی۔ انہوں نے اپنی معرکہ آرا لغت کو مصر میں مدوّن کیا۔ یہ دس ضخیم جلدوں میں چھپی ہے۔ ہمارے پیش نظر نسخہ مصر کے مطبع الخیریہ کا طبع شدہ ہے جس پر سن

* انہیں ابن منظور بھی کہا جاتا ہے۔

طباعت ۱۳۰۲ھ (بار اول) درج ہے۔ لین کے قول کے مطابق، تاج العروس میں لسان العرب کے علاوہ، ایک سو مستند کتب لغت سے استفادہ کیا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں عربی کا مشہور لغت (Lane's Lexicon) تاج العروس ھی پر مبنی ہے۔ ترتیب کے اعتبار سے یہ لغت بڑا سائنٹیفک ہے۔

(۲) تاج العروس کے ساتھ جس کتاب کو ہم نے بنیادی طور پر سامنے رکھا ہے وہ امام راغب اصفہانی (متوفی قریب ۵۰۲ھ) کی مشہور تصنیف "المفردات فی غریب القرآن" ہے۔ یہ قرآنی الفاظ کا لغت ہے اور اسدرجہ مقبول اور مشہور کہ اسکے تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ کتاب بڑی مختصر ہے۔ ہمارے سامنے جونسخہ ہے وہ مطبع میمنیه (مصر) میں ۱۳۲۴ھ میں چھپا تھا۔

(۳) تیسری اھم کتاب، ابن فارس (المتوفی ۳۹۵ھ) کی مقاییس اللغۃ ہے جس میں ھر لفظ کا مادہ اور مادہ کے بنیادی معنی دئے گئے ھیں۔ چونکہ ھمارے لغت کا مرکزی نقطہ، مادہ کے بنیادی معنی ھیں اسلئے اس میں ابن فارس سے نمایاں استفادہ کیا گیا ہے۔ ھمارے پیش نظر نسخہ چھ جلدوں میں مصر میں (۱۹۵۲ء میں) چھپا تھا۔

(۴) اس کے بعد جس کتاب سے زیادہ استفادہ کیا گیا وہ پطرس بستانی کی محیط المحیط ہے۔ یوں تو یہ کتاب مختصر ہے۔ (دو جلدوں میں مکمل ہوئی ہے)۔ لیکن اس کی افادی حیثیت بہت زیادہ ہے۔ ھمارے پیش نظر نسخہ بیروت میں، (۱۸۷۰ء میں) چھپا تھا۔

یہ وہ کتب لغت ھیں جنکے حوالے آپ کو زیر نظر لغت میں بالعموم ملینگے۔ ان کے علاوہ اکثر مقامات پر حسب ذیل کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

(الف) فقه اللغۃ۔ ابو منصور الثعالبی کی مشہور کتاب ہے جو مختصر ہونے کے باوجود بڑی مستند خیال کی جاتی ہے۔ ھمارے پیش نظر نسخہ ۱۹۳۸ میں مصر میں چھپا تھا۔

(ب) اقرب الموارد۔ لغت کی مشہور کتاب ہے جسے سعید الخوری الشرتونی اللبنانی نے مرتب کیا تھا۔ ھمارے پیش نظر نسخہ بیروت میں (۱۸۸۹ء میں) چھپا تھا۔

(ج) منتھی الارب۔ عربی۔ فارسی کا مشہور لغت ہے۔ ھمارے سامنے وہ نسخہ ہے جو مطبع اسلامیه لاھور میں (۱۹۲۵ءمیں) چھپا تھا۔

(د) کتاب الاشتقاق - یہ ابن درید کی تصنیف ہے (جنکی وفات ۳۲۱ھ میں ہوئی تھی) لغت میں ابن درید کا مقام بہت بلند ہے اور انکی یہ کتاب مادہ کے بنیادی معنی معلوم کرنے کے لئے بڑی مفید ہے، اگرچہ مقاییس اللغۃ جیسی مفصل نہیں ۔ اسکے علاوہ، ابن درید کی لغت کی مشہور اور مستند کتاب جمہرۃ اللغۃ سے بھی بعض مقامات میں استفادہ کیا گیا ہے ۔

(ر) العلم الخفاق فی علم الاشتقاق ۔ یہ نواب صدیق حسن خان کا مختصر سا رسالہ ہے لیکن اسمیں مادوں کے حروف کی بنیادی خصوصیات عمدگی سے بیان کی گئی ہیں ۔

(س) الالفاظ المترادفۃ - یہ علی ابن عیسیٰ الرمانی (متوفی ۳۸۴ ء) کا رسالہ ہے جس میں مترادفات کے لطیف اور دقیق فرق کو عمدگی سے بیان کیا گیا ہے ۔

(ش) لطائف اللغۃ ۔ یہ احمد بن مصطفیٰ اللبابیدی (دمشقی) کی کتاب ہے جسمیں الفاظ کی لغوی باریکیوں سے بحث کی گئی ہے ۔

(ص) کتاب القرطین ۔ یہ امام ابن قتیبہ الدینوری (المتوفی ۲۷۶ھ) کی مشہور کتابوں—مشکل القرآن و غریبہ—پر مشتمل ہے اور مصر میں ۱۳۵۵ء میں چھپی ہے ۔ ابن قتیبہ کا مقام علمی دنیا میں بہت بلند ہے ۔

(ط) البستانی ۔ شیخ عبداللہ البستانی اللبنانی (المتوفی ۱۹۳۰ء) کا یہ لغت ۱۹۲۷ء میں چھپا تھا ۔ اسکا مقدمہ خاص طور پر قابل مطالعہ ہے ۔

ان کتب لغت کے علاوہ زمخشری کی تفسیر (کشاف) تفسیر جلالین اور علامہ محمد عبدہؒ کی شہرہ آفاق تفسیر المنار، سے بھی استفادہ کیا گیا ہے ۔ زیر نظر لغت میں ان کتابوں کے حوالے میں یا تو کتاب کا (پورا یا مخفف) نام دیا گیا ہے یا مصنف کا ۔ مثلاً تاج ۔ راغب ۔ محیط ۔ ابن فارس ۔ لین ۔ العلم الخفاق وغیرہ ۔ علاوہ ازیں بعض مقامات پر دیگر کتب سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے ۔ ان کا حوالہ متعلقہ مقام پر دے دیا گیا ہے ۔

(۱۲) اس لغت میں ترتیب (بالعموم) یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے مادہ کے بنیادی معنی دئے گئے ہیں ۔ پھر عربی زبان میں اسکے استعمال کی مثالیں ۔ ان مثالوں میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ یہ حتی الامکان محسوس اشیاء کی مثالیں ہوں تا کہ ان سے زیر بحث لفظ کا مفہوم محسوس طور پر سامنے آ جائے ۔ اسطرح متعلقہ لفظ کا لغوی مفہوم متعین کرنے کے بعد، قرآن کریم

کی ان آیات کو درج کیا گیا ہے جن میں وہ لفظ (اپنی مختلف شکلوں) میں آیا ہے۔ ان آیات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم میں وہ لفظ کن کن معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے بعد اہم الفاظ اور اصطلاحات کے ضمن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس لفظ کے استعمال سے قرآن کس قسم کا تصور (Concept) پیش کرتا ہے، اور وہ تصور قرآن کریم کی مجموعی تعلیم میں کیا مقام رکھتا ہے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ کتاب محض قرآنی الفاظ کا لغت نہیں بلکہ اس میں قرآنی تصورات پیش کئے گئے ہیں۔ چنانچہ جن دوستوں نے اس لغت کا مسودہ (پورا یا اسکا بعض حصہ) دیکھا، ان کی رائے یہ ہے کہ اسکا بغور مطالعہ کرلینے کے بعد قرآن کا طالب علم کسی تفسیر کا محتاج نہیں رہ سکتا۔ اس خصوصیت کے پیش نظر ہم چاہتے تھے کہ اس لغت کا نام کچھ اور رکھا جائے جس سے اسکی یہ خصوصیت نمایاں طور پر سامنے آ جائے، لیکن اس سے اسکی بنیادی خصوصیت (یعنی قرآنی الفاظ کے معانی) کے نظر سے اوجھل ہو جانے کا امکان تھا، اسلئے اسکا نام لغات القرآن ہی تجویز کیا گیا ہے۔

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ، قرآن کریم کے الفاظ (مفردات) کا لغت ہے، پوری عربی زبان کا لغت نہیں۔ اسلئے نہ تو اس میں عربی زبان کے تمام الفاظ آئے ہیں اور نہ ہی الفاظ کی تشریح میں ادبی بحثوں کو چھیڑا گیا ہے۔ اس میں ہر لفظ کے متعلق صرف اس حد تک بحث کی گئی ہے جس حد تک اسے قرآن نے لیا ہے۔ نیز قرآن کریم کی آیات بھی تمام کی تمام نہیں دی گئیں۔ مثلاً اگر ایک لفظ قرآن کی بیس آیات میں (ایک ہی مفہوم میں) آیا ہے تو ان میں سے ایک آیت دی گئی ہے۔ البتہ جہاں مختلف آیات میں اس لفظ کو جداگانہ مفہوم کے لئے استعمال کیا گیا ہے وہاں وہ تمام آیات درج کر دی گئی ہیں۔ جہاں کسی آیت کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی وہاں اس کے حوالہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ان تمام آیات کو قرآن کریم سے نکال کر خود دیکھ لینا چاہئے۔ اس سے بات واضح ہو جائیگی۔

(۱۳) اس ضمن میں ایک اور اہم نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ ہر زبان میں قاعدہ ہے، الفاظ کے ایک معنی "حقیقی" ہوتے ہیں اور ایک "مجازی"۔ مثلاً جب ہم کہیں کہ "وہ تو شیر ہے" تو اس سے مراد وہ (شیر) جانور نہیں جو جنگل میں رہتا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ شیر جیسا بہادر ہے۔ لفظ "شیر" کے حقیقی معنی "جنگل کا ایک طاقتور جانور" ہیں اور (مندرجہ بالا فقرہ میں) مجازی معنی "بڑا بہادر"۔

"حقیقی اور مجازی معانی"، کی یہ صرف ایک مثال ہے ۔ بلند پایہ تصانیف میں اور بھی بہت سے طرق و اسالیب بیان ایسے ہوتے ہیں جن میں الفاظ کے مجازی معنی مقصود ہوتے ہیں ۔ عام طور پر یہ انداز بیان، تشبیہات اور استعارات پر مشتمل (Symbolical) ہوتا ہے* ۔ لیکن یہ بھی کوئی ضروری شرط نہیں ۔ اس ضمن میں ابن قتیبہ نے لکھا ہے ۔

> عرب کے لوگ کلام میں مجازی معنی بھی لیتے ہیں ۔ یعنی ان کے ہاں بات کہنے کے کئی طریقے اور کئی اسلوب ہوتے ہیں ۔ چنانچہ استعارہ، تمثیل، قلب، تقدیم، تاخیر، حذف، تکرار، اخفاء، اظہار، تعریض، افصاح، کنایہ، ایضاح، واحد کو جمع کے صیغے سے خطاب کرنا اور جمع کو واحد کے صیغے سے ۔ خاص لفظ سے عام معنی مراد لینا اور عام لفظ سے خاص ۔ غرضیکہ بہت سے اسلوب ہوتے ہیں جو آپکو مجاز کے ابواب میں مل سکتے ہیں . . . قرآن کا نزول ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہؤا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ترجمہ کرنے والا، قرآن کریم کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں نہیں کرسکتا . . . کیونکہ عجمی زبانوں میں مجاز کی وہ وسعت نہیں جو عربی زبان میں ہے ۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کی ایک آیت ہے فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا (۱۸/۱۱)** ۔ اگر آپ چاہیں کہ اس مضمون کو کسی دوسری زبان کے الفاظ میں منتقل کرلیں تو اس سے وہ مفہوم نہیں سمجھا جاسکیگا جو ان الفاظ سے سمجھا جاسکتا ہے ۔ اگر آپ یوں کہیں کہ اسکا ترجمہ یہ ہے کہ ہم نے انہیں چند سال تک سلائے رکھا، تو اب بھی آپ نے مفہوم کا ترجمہ تو کردیا، الفاظ کا ترجمہ نہیں کرسکے ۔
> (قرطبین جلد ۲ ۔ صفحہ ۱٦۳)

---

* اس قسم کے اسلوب بیان کے متعلق مشہور انگریز ادیب (Chesterton) کہتا ہے۔
Not literally true, but only really true. (Quoted by W. H. Urban—in Humanity and Deity—P. 117)

** یہ آیت اصحاب کہف کے متعلق ہے ۔ شاہ رفیع الدین ؒ اس کا لفظی ترجمہ یوں کرتے ہیں "پس پردہ مارا ہم نے اوپر کانوں ان کے بیچ غار کے برس کئی ایک" ۔

یہ انداز بیان عام کتابوں میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن جس کتاب عظیم کی یہ کیفیت ہو کہ اس کے حقائق کو تمام نوع انسان کے لئے، ہر زمانے میں مشعل ہدایت بننا ہو، اسکا وہ حصہ اسی انداز کا ہونا چاہئے جس کا تعلق حقائق سے ہو۔ اس سے ہر دور کے ارباب علم و بصیرت اور اصحاب فکر و تدبر، اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق، الفاظ کے مجازی معانی سے، قرآنی حقائق کو سمجھتے چلے جائینگے۔ اور یوں، جوں جوں انسانی عقل کی سطح بلند ہوتی جائیگی، قرآنی حقائق بے نقاب ہوکر سامنے آتے جائینگے۔

لہذا قرآنی الفاظ کا مفہوم سمجھنے کے لئے ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ متعلقہ آیت میں فلاں لفظ کے معنی حقیقی لئے جانے چاہئیں یا مجازی۔ زیر نظر لغت میں اسکا بھی التزام کیا گیا ہے۔ لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ جن مقامات پر ہم نے کسی لفظ کے مجازی معنی لئے ہیں وہاں (بالضرور) اسکے مجازی معنی لئے جائیں۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ ان الفاظ کے حقیقی معنی کیا ہیں۔ اسکے بعد متعلقہ آیت میں جو معنی (حقیقی یا مجازی) زیادہ موزوں نظر آئیں انہیں اختیار کر لینا چاہئے۔ یہی کیفیت ان مقامات کی بھی ہے جہاں ہم نے قرآنی آیات سے کوئی خاص مفہوم مستنبط کیا ہے۔ قارئین میں سے جنہیں ہمارے مفہوم سے اختلاف ہو وہ اپنے لئے خود مفہوم متعین کرسکتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ زیر نظر لغت میں جو حصہ الفاظ کے لغوی معانی سے متعلق ہے وہ مستند کتب لغت سے ماخوذ ہے، اس لئے مستند ہے۔ لیکن جوکچھ ہم نے اپنی طرف سے کہا ہے اگر کسی کو اس سے اتفاق نہ ہو تو وہ اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق اس کا مفہوم خود متعین کرسکتے ہیں۔

بعض الفاظ کے سلسلہ میں یہ بھی ممکن ہے کہ جو معانی اس لغت میں دیئے گئے ہیں وہ قرآن کریم کے ان تراجم سے مختلف ہوں جو ہمارے ہاں عام طور پر مروّج ہیں (اسکی وجہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں)۔ ایسی صورت میں آپ اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ ہم نے ہر لفظ کے لغوی معانی کی سند میں اس کتاب کا حوالہ دےدیا ہے جہاں سے وہ معانی لئے گئے ہیں۔ اور جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے، ارباب علم کے نزدیک ان کی حیثیت مستند ہے۔ ان کتابوں میں البتہ بعض‌اوقات ان کے مؤلفین نے (لغوی معانی کےعلاوہ) قرآنی تعلیم کے بارے میں خوذ اپنی رائے بھی دی ہے۔ ہم نے بعض مقامات پر ان آراء سے اختلاف کیا ہے۔ اسلئے کہ اشخاص کی آراء ان کی ذاتی استعداد، رجحانات و میلانات، نیز خود اس زمانے کی علمی سطح اور

عام فضا کا نتیجہ ہوتی ہیں جس میں وہ تربیت پاتے ہیں ، اسلئے دوسروں پر ان آراء کی پابندی لازم نہیں ہوتی ۔ ایسے مقامات پر ہم نے اپنے فہم وبصیرت (اور اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق) جو بہتر سمجھا ہے لکھ دیا ہے ۔ لیکن ہم نے ہر مقام پر اس کا التزام کیا ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ (ہماری بصیرت کے مطابق) قرآن کریم کی بہ ہیئت مجموعی تعلیم کے خلاف نہ ہو۔ یہی اصول ہمارے اس لغت کی اصل و بنیاد ہے ۔

اردو زبان میں عربی کے بہت سے الفاظ داخل ہیں لیکن یہ الفاظ اردو میں ان معانی سے مختلف معانی میں استعمال ہوتے ہیں جن معانی میں وہ بنیادی اور اصولی طور پر عربی میں استعمال ہوتے ہیں ۔ زیر نظر لغت میں جب اس قسم کے الفاظ (ہماری) اردو زبان کی عبارت میں آئیں تو ان کے وہی معانی سمجھے جائیں جن معانی میں وہ اردو میں استعمال ہوتے ہیں ۔

اس سلسلہ میں ایک لفظ کا ذکر خصوصیت سے کرنا ضروری ہے جو آپ کو زیر نظر لغت میں بکثرت ملیگا ۔ وہ لفظ ہے '' قانون ''۔ ہمارے ہاں قانون سے عام طور پر مفہوم وہ (Laws) لئے جاتے ہیں جن کے مطابق عدالتوں میں فیصلے ہوتے ہیں ۔ لیکن لفظ قانون کا مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے ۔ قانون سے مراد ایسے محکم اصول ہیں جن میں تغیر وتبدل نہیں ہوتا ۔ مثلاً '' قانون فطرت '' سے مراد ہیں وہ لگے بندھے اصول وضوابط جن کے مطابق خارجی کائنات کا محیر العقول سلسلہ اس نظم و ضبط سے چل رہا ہے ۔ ''قوانین خداوندی'' سے مراد ہیں انسانی زندگی سے متعلق وہ اصول وضوابط جو قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں ۔ وقس علیٰ ذالک ۔ لہٰذا اس لغت میں جہاں یہ لفظ (قانون) آئے سیاق وسباق کے مطابق اسکا مفہوم سمجھ لینا چاہئے ۔

بعض اوقات آپ دیکھینگے کہ لغت کی رو سے ایک ہی لفظ کے متعدد معنی دئے گئے ہیں ۔ ہم اسوقت اس امر کے متعلق بحث نہیں کرنا چاہتے کہ ایک ہی لفظ کے متعدد (اور بعض وقت متضاد) معانی کیوں ہو جاتے ہیں ۔ (یہ علم الالسنہ کا ایک اہم مسئلہ ہے اور ہمارے موضوع سے خارج) ۔ بالعموم یہ اختلاف معانی ان الفاظ کے طریق استعمال کی بنا پر ہوتا ہے ۔ قرآن کریم میں اس قسم کا لفظ جس مقام پر آئیگا ، یا تو سیاق وسباق بتا دیگا کہ اسکا صحیح مفہوم کیا ہے ، یا تصریف آیات سے یہ مقصد حاصل ہو جائیگا ۔ یعنی قرآن کریم کی ان متعدد آیات کو سامنے لانے سے جہاں وہ لفظ آیا ہے ۔ ہم نے اپنے لغت میں یہی طریق اختیار کیا ہے ۔

(۱۴) ان اہم امور کے علاوہ ذیل کے مختصر نقاط بھی پیش نظر رہنے ضروری ہیں۔

(ا) لغت میں حروف مقطعات کے معانی نہیں دئے گئے۔ یہ قرآنی مفردات نہیں بلکہ مخففات ہیں۔ انکے متعلق ہم اپنا نقطہ نظر، مفہوم القرآن میں بیان کرینگے اور وہیں انکا مفہوم بھی دینگے۔ (مفہوم القرآن کا تعارف ذرا آگے چل کر آتا ہے)۔

(ب) عربی زبان میں حروف کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن ان کی تفصیلی بحث ایک مستقل موضوع ہے جو اس قسم کی لغت کی کتاب میں جو آپ کے پیش نظر ہے ضمنی طور پر نہیں کی جا سکتی۔ بنا بریں اس لغت میں حروف کی بحث کو صرف اس حد تک محدود رکھا گیا ہے جہانتک یہ بحث قرآنی آیات کے سمجھنے میں مفید تصور کی گئی ہے۔

(ج) بعض حروف کے متعلق لکھا گیا ہے کہ فلاں آیت میں یہ "زائد" ہے۔ زائد کے یہ معنی نہیں کہ وہ بلا ضرورت استعمال کیا گیا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ اس حرف کے (اس مقام میں) الگ معنی کچھ نہیں لیکن اہل زبان اسے ایسے مواقع پر استعمال کرتے ہیں اور اس سے کلام میں خاص وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اس موقع پر قرآن اسے استعمال نہ کرتا تو قرآن کا انداز غیر فصیح ہو جاتا۔

(د) عربی الفاظ کے مادے بالعموم سہ حرفی (ثلاثی) ہوتے ہیں لیکن بعض مادے چار حرفی (رباعی) بھی ہوتے ہیں۔ عام کتب لغت میں رباعی کو ثلاثی کے تابع دے دیا جاتا ہے۔ ہم نے بھی اس باب میں اسی طریق کا اتباع کیا ہے بجز ان مقامات کے جہاں رباعی مادہ کا الگ دیا جانا ضروری سمجھا گیا ہے۔

(ر) حضرات انبیائے کرام ؑ اور اقوام سابقہ کا تعارف الگ عنوانات کے تحت کرایا گیا ہے۔ لیکن یہ تعارف (لغت کی مناسبت سے) اجمالی ہے۔ تفصیلی تعارف میری دوسری تصانیف (مثلاً جوئے نور، برق طور، شعلۂ مستور، معراج انسانیت) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(س) قرآنی آیات کا حوالہ اسطرح دیا گیا ہے کہ اوپر سورۃ کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا۔ مثلاً ($\frac{7}{92}$) سے مراد ہے ساتویں سورۃ (سورۂ اعراف) کی آیت ۹۲۔ چونکہ قرآن کریم کے مختلف نسخوں میں آیات کے نمبروں میں دو ایک کا فرق ہوتا ہے،* اسلئے اگر زیر نظر لغت میں کوئی آیت حوالہ کے مطابق نہ

* آیات کے نمبروں کے لحاظ سے، ساری دنیا کے لئے قرآن کریم کے ایک اسٹینڈرڈ (Standard) نسخہ کی بڑی ضرورت ہے جو کتابت کی غلطیوں سے بھی بالکل پاک ہو

ملے تو ایک دو آیات آگے پیچھے دیکھ لیں ۔ لغات میں درج شدہ آیات کو اگر آپ قرآن کریم کے نسخہ سے ملا لیں تو بہتر ہوگا تاکہ اگر ان میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اسکی تصحیح ہو جائے ۔ قرآنی آیات میں صحت کا بالخصوص خیال رکھنا چاہئے ۔

(ص) لغت میں عندالضرورت حوالہ کے ساتھ قرآنی آیات بھی درج کر دی گئی ہیں ۔ لیکن جہاں آیت درج نہ کی گئی ہو اور صرف حوالہ دیا گیا ہو وہاں آپ متعلقہ آیت قرآن کریم سے خود نکال کر دیکھ لیں ۔ اس سے بات واضح ہو جائیگی ۔

(ط) بعض اوقات "قرآن کریم" یا "قرآن مجید" کے بجائے صرف "قرآن" لکھا ہوا ملیگا ۔ اسے عدم احترام پر محمول نہ کیا جائے ۔ قرآن کریم بہرحال و بہر نوع واجب الاحترام ہے خواہ اسکے ساتھ احترام کا لفظ آئے یا نہ آئے ۔ جہاں ایسا لفظ موجود نہ ہو وہاں آپ اسکا اضافہ خود کر لیں ۔

(۱۰) یہ لغت اوّلاً واساساً ان حضرات کے لئے مرتب کیا گیا ہے جو عربی زبان سے واقف نہیں ۔ اسلئے

(۱) اس میں علمی اصطلاحات سے اجتناب کیا گیا ہے اور بات عام فہم الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے ۔ نیز کوشش کی گئی ہے کہ اسکا انداز سلیس اور سادہ ہو تاکہ عام پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں ۔ البتہ جہاں گفتگو ہی کسی علمی یا فنی مسئلہ کے متعلق ہو وہاں اسلوب بیان کا فنی یا نسبتاً مشکل ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے ۔

(۲) لغت سے پہلے، قریب ستر صفحات میں 'عربی زبان کے گرامر کے قواعد، آسان اور غیر فنّی زبان میں دیئے گئے ہیں ۔ یہ عربی زبان کی پوری گرامر (صرف و نحو) نہیں ' صرف مبادیات ہیں جن سے مقصود یہ ہے کہ جو حضرات عربی زبان سے ناواقف ہوں انہیں عربی الفاظ کی مختلف شکلوں اور عربی فقروں کی مختلف ترکیبوں سے شناسائی ہو جائے اور وہ اسطرح لغت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں ۔ اگر آپ نے ان مبادیات کا غور سے مطالعہ کیا تو آپ دیکھینگے کہ ان کی مدد سے آپ عربی زبان سے کافی حد تک شناسا ہو جائینگے ۔

(۳) عربی زبان کے اصول کے مطابق لغت کی ترتیب الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ مادوں کے اعتبار سے رکھی گئی ہے ۔ مثلاً لفظ "متقین" آپ کو (م ۔ ت ۔ ق) کے تحت نہیں ملیگا ۔ اس لفظ کے مادہ (و ۔ ق ۔ ی) کے ماتحت

ملیگا۔ لیکن عربی زبان نہ جاننے والوں کے لئے یہ مشکل (بلکہ بعض اوقات نا ممکن) ہوگا کہ وہ معلوم کر سکیں کہ فلاں لفظ کا مادہ کیا ہے، اور جب وہ مادہ ہی معلوم نہیں کر سکینگے تو وہ اس لفظ کو لغت میں تلاش کیسے کرینگے؟ اس دقت کے پیش نظر ہم نے تمام قرآنی الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی ہے ۔ اس فہرست کو حروف تہجی (ا ۔ ب ۔ ت ۔ ث) کے مطابق ترتیب دیا ہے ، اور ہر لفظ کے سامنے وہ مادہ دےدیا ہے جس کے ماتحت وہ لفظ ملیگا ۔ مثلاً فہرست میں لفظ '' متقین — م — کے ماتحت (بہ ترتیب ۔ م ۔ ت ۔ ق) دیا گیا ہے ، اور اس کے سامنے لکھا گیا ہے — و ۔ ق ۔ ی — اس کے معنی یہ ہیں کہ لفظ '' متقین '' لغت میں '' و ۔ ق ۔ ی '' کے عنوان کے تحت ملیگا ۔ یہ فہرست تریبب سو صفحات سے زیادہ پر پھیلی ہوئی ہے ۔ کوشش کی گئی ہے کہ یہ مکمل ہو ، لیکن اس میں پھر بھی سہو و خطا کا امکان ہے ۔ اگر آپ کو اس میں کوئی سہو یا غلطی نظر آئے تو اس سے مطلع فرمائیں تا کہ آئندہ اڈیشن میں مناسب اصلاح کر لی جائے ۔

مبادیات اور فہرست میں ، کوششِ بسیار کے باوجود ، چند ایک طباعت کی غلطیاں رہ گئی ہیں ۔ انہیں فہرست کے آخر میں '' اغلاط نامہ '' میں درج کر دیا گیا ہے ۔ آپ متعلقہ الفاظ کی تصحیح کر لیں ۔

۱۶ ۔ جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے ، اس لغت کی تدوین کا محرک جذبہ یہ تھا کہ جن حضرات کے دل میں قرآن کریم کا ذوق پیدا ہو چکا ہے وہ براہ راست اسے سمجھنے کے قابل ہو سکیں ۔ یہ مقصد بڑی حد تک زیر نظر لغت سے پورا ہو جانے کی امید کی جا سکتی ہے ۔ لیکن اکثر احباب کا خیال تھا (جس سے غور و فکر کے بعد مجھے بھی متفق ہونا پڑا) کہ اس کے باوجود (یا یوں کہئیے کہ اس کے ساتھ) قرآن کریم کے ایک رواں ترجمہ کی ضرورت باقی رہتی ہے ۔ جیسا کہ ابن قتیبہ نے کہا ہے (اور ابن قتیبہ ہی نے نہیں ، اب یورپ کے اکثر فاضل مستشرقین بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ) قرآن کریم کا ترجمہ کسی زبان میں بھی نہیں ہو سکتا ۔ (اس کی تفصیل '' مفہوم القرآن '' میں ملیگی) ۔ یہ بالکل درست ہے ۔ میرے مدت العمر کے مطالعہ اور تدبر فی القرآن نے خود مجھے بھی اسی نتیجہ پر پہنچایا ہے ۔ چنانچہ میں نے اس مشکل مسئلہ پر ایک عرصہ تک غور کیا اور ایک ایسا اسلوب وضع کیا جو ترجمہ اور تفسیر کے بین بین ہے ۔ یہ کچھ اس سے ملتا جلتا ہے جسے انگریزی زبان میں (Paraphrasing) کہتے ہیں ۔

اردو زبان میں اسے "مفہوم" کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی قرآن کا مفہوم اپنے الفاظ میں۔ میں نے قرآن کریم کے بعض مقامات کا "مفہوم" اس انداز سے متعین کیا اور اسے تجربۃً مختلف احباب کے سامنے پیش کیا۔ یہ تجربہ بڑا مفید رہا۔ ان کی رائے تھی کہ اس سے قرآن کریم کا مفہوم سمجھنے میں دقت نہیں رہتی۔ اس تجربہ کے بعد میں نے، قرآنی الفاظ کے ان معانی کے رو سے جو زیر نظر لغت میں دئے گئے ہیں، قرآن کریم کا مفہوم مرتب کیا ہے۔ اسی کا نام "مفہوم القرآن" ہے جو ابتدائی مسودہ کی شکل میں اس وقت موجود ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ زیر نظر لغت اور مفہوم القرآن کی اشاعت سے وہ دشواریاں رفع ہو جائینگی جو قرآن مجید کے سمجھنے میں عام طور پر پیش آتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ (لغت نہیں تو کم از کم) مفہوم القرآن انگریزی زبان میں بھی شائع ہو جائے تا کہ بیرونی دنیا (بالخصوص یورپ اور امریکہ) خدا کی اس عظیم کتاب کو جو تمام نوع انسانی کی رهنمائی کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے، براہ راست سمجھ لے اور اس طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ اس کا یہ دعویٰ کسقدر مبنی بر صداقت ہے کہ جو نظام اس نے عطا کیا ہے وہ نوع انسان کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ میں علیٰ وجہ البصیرت محسوس کرتا ہوں کہ مغربی ممالک اس نظام کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں لیکن یہ نظام ان کے سامنے نہیں آ رہا۔ یہ اسی صورت میں سامنے آ سکیگا جب قرآن کریم کو، اس کی اصلی شکل میں، دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

۱۷۔ لغت (اور اس کے ساتھ مفہوم القرآن) سالہا سال کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے مرتب تو ہو گئے لیکن اتنی ضخیم کتابوں کے چھپوانے کی مجھ میں کہاں استطاعت تھی؟ یہ وہ مقام تھا جہاں میں بے بس تھا۔ میری تصانیف سے جو کچھ (تھوڑا بہت) منافع حاصل ہوتا ہے وہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں صرف ہو جاتا ہے (بلکہ یوں کہئے کہ وہ اس کے لئے بھی کفایت نہیں کرتا۔ اس عظیم مشن کے متعدد گوشے ایسے ہیں جو سرمایہ کے نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے ہیں) اس بے بسی نے مجھے عرصہ تک وقف اضطراب رکھا تا آنکہ میرے ان قرآنی احباب نے جو میرے مشن سے متفق ہیں، از خود آگے بڑھ کر میرا یہ بوجھ ہلکا کر دیا، اور یوں میرے لئے اس دشوار گذار مرحلہ کو آسان بنا دیا۔ میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں اور میرا دل ان احباب کے لئے جذبات شکر و امتنان سے لبریز ہو رہا ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ وہ نہ شکریہ

کے خواہاں ہیں، نہ ستائش کے متمنی — قرآن کا رشتہ بھی دنیا میں عجیب رشتہ ہے ۔

اس کے بعد ، طباعت کی عملی دشواریاں سامنے آئیں ۔ آجکل لیتھو کی چھپائی جس بری طرح سے کتاب کو مسخ کر دیتی ہے اس کا مجھے تلخ تجربہ ہے ۔ میں اس تجربہ کو ، کم از کم لغت جیسی اہم کتاب کے سلسلہ میں ، دھرانے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھا ۔ اوفسٹ کی چھپائی کے متعلق معلوم کیا تو وہ ہماری بساط سے کہیں زیادہ تھی ۔ اب لے دے کے ٹائپ کی چھپائی رہ جاتی تھی ۔ اس میں دشواری یہ تھی کہ ہمارے ہاں ابھی ایسا ٹائپ رائج نہیں ہوا جس کے ساتھ اعراب ہوں ، اور اعراب الگ لگانے سے وہ اپنے صحیح مقام سے ادھر ادھر ہٹ جاتے ہیں ۔ اس کے لئے کئی ایک مطابع میں تجربے کئے گئے ۔ ایک پریس میں مبادیات اور فہرست کو چھپوا کر بھی دیکھ لیا ۔ اس تمام تگ و تاز کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ لغت کی طباعت کی اطمینان بخش صورت اسی نہج سے ہو سکتی ہے کہ پریس اپنے زیر اہتمام ہو ۔ اس کے لئے کافی عرصہ تک انتظار کرنا پڑا ۔ بہرحال اب خدا خدا کر کے اس کا انتظام ہوا ہے اور میں اس قابل ہوا ہوں کہ لغت کی پہلی جلد احباب کی خدمت میں پیش کر سکوں ۔ اس کی طباعت اب بھی میرے معیار کے مطابق نہیں (اس میں بھی بعض اوقات اعراب اپنے ٹھیک مقام پر نہیں لگ سکے ۔ لیکن میں نے اسے اس لئے گوارا کر لیا ہے کہ "معیار" کی تلاش میں، وقت کی اشد ضرورت کو بالآخر کب تک التوا میں ڈالا جا سکتا ہے ؟ احباب کے تقاضوں کا تو یہ عالم ہے کہ -- سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا — اس لئے اپنی طرف سے جسقدر بھی اچھے سے اچھا ہو سکا ، اسے چھاپ دیا گیا ہے ۔

اندازہ یہ ہے کہ لغات القرآن ، چار یا پانچ جلدوں میں تکمیل تک پہنچ جائیگی ۔ اس کے بعد "مفہوم القرآن" کی طباعت کی باری آئیگی ۔ "مفہوم القرآن" کے لئے بھی احباب کے تقاضے جسقدر شدید ہیں اس کا مجھے احساس ہے ۔ لیکن چونکہ اس مفہوم کی سند ، صرف لغت زیر نظر میں مل سکیگی ، اس لئے اسے لغت کی تکمیل سے پہلے شائع نہیں کیا جا سکتا ۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم ۔

واضح رہے کہ زیر نظر لغت میں قرآنی آیات کا اردو ترجمہ لغوی مفہوم کی رعایت سے دے دیا گیا ہے ۔ مفہوم القرآن کا انداز اس سے الگ ہے ۔ اس میں قرآن کریم کا ترجمہ نہیں بلکہ مفہوم پیش کیا گیا ہے ۔

(۱۸) عام کتب لغت اسوقت مکمل ہوتی ہیں جب ان کی تمام جلدیں چھپ کر سامنے آجائیں - جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے زیر نظر لغت بھی اسی طرح مکمل ہوگا- لیکن یہ صرف لغت کی کتاب نہیں - اس میں قرآنی تعلیم کے بنیادی تصورات بھی آ گئے ہیں - اس لحاظ سے اسکی ہر جلد اپنی جگہ مکمل اور خود مکتفی ہے - لہذا آپ اس کا انتظار نہ کیجئے کہ تمام جلدیں چھپ جائیں تو اس سے فائدہ اٹھایا جائے - آپ ہر جلد سے الگ الگ استفادہ کرسکتے ہیں - آپ اسے لغات کیطرح نہ دیکھئے ، کہ جب کسی خاص لفظ کے معانی معلوم کرنے ہوں توکتاب کھول کر وہ معانی دیکھ لئے اور پھر کتاب رکھ دی - آپ اسکا مسلسل مطالعہ کیجئے - اس طرح قرآنی تعلیم کے بنیادی تصورات ایک ایک کر کے آپ کے سامنے آتے جائینگے -

(۱۹) اگرچہ لغت کا پورا مسودہ طباعت کے لئے تیار رکھا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ طباعت کے دوران ، مزید غور و فکر سے بعض اہم چیزیں اسوقت سامنے آئیں جب متعلقہ جلد چھپ چکی ہو، یا قارئین کی طرف سے مفید مشورے، تجاویز یا وضاحت طلب امور سامنے آئیں - اگر ایسا ہوا تو آخری جلد کے ساتھ ایک تکملہ شائع کر دیا جائیگا جس میں یہ تمام امور آجائینگے۔

(۲۰) جیسا کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے، میں اپنی کسی تحریر کو نہ سہو وخطا سے منزہ سمجھتا ہوں ، نہ اس موضوع پر حرف آخر- میری دیگر تصانیف کی طرح یہ لغت بھی بہر حال انسانی کوشش ہے جس میں سہو وخطا کا امکان اور حک و اضافہ کی گنجائش ہے - جو احباب مجھے میری غلطیوں سے مطلع اور اپنے مشوروں سے مستفید فرمائینگے میں انکا شکر گذار ہونگا بشرطیکہ یہ بغرض تعاون ہو ، نہ کہ بحث و جدل کی خاطر- میں بحث میں الجھا نہیں کرتا -

اگر میری اس کوشش ناتمام سے کچھ احباب بھی قرآن کریم کو براہ راست سمجھنے کے قابل ہو گئے تو میں سمجھونگا کہ مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا - یہی میری زندگی کا مقصد اور یہی میری کاوشوں کا منتہی ہے - ربّنا تقبّل منّا انّک انت السّمیع العلیم -

۲۵ - بی - گلبرگ
لاہور (پاکستان)

غلام احمد پرویز
مارچ ۱۹۶۰

لغات القرآن

باب دوم

جیسا کہ سابقہ باب میں لکھا جا چکا ہے ' عربی زبان کے ہر لفظ کا (بجز حروف کے) ایک مادہ ہوتا ہے اور لغت میں وہ لفظ اپنے مادہ کے تحت لکھا جاتا ہے - عربی جاننے والوں کے لئے تو یہ معلوم کر لینا مشکل نہیں ہوتا کہ فلاں لفظ کا مادہ کیا ہے ' لکن جو لوگ عربی زبان سے واقف نہیں ان کے لئے الفاظ کے مادے معلوم کرنا مشکل (بلکہ بعض اوقات ناممکن) ہوتا ہے - اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی کو ایک لفظ کا مادہ ہی معلوم نہیں ہوگا تو وہ اسے لغت میں تلاش کیسے کریگا ؟ مثلاً ایک لفظ ہے ”مُتَّقِیْنَ“ - عربی نہ جاننے والا اسے " م ت " کے نیچے تلاش کرے گا ' اور اس کا ذہن کبھی اس طرف منتقل نہیں ہوگا کہ یہ لفظ " و ق ی " کے تحت ملے گا جو اس کا مادہ ہے - چونکہ ہماری کوشش یہ ہے کہ اس لغت کی مدد سے عربی نہ

جاننے والے حضرات قرآنی مطالب کو براہ راست سمجھ سکیں اس لئے ان کی سہولت کے لئے قرآنی الفاظ کی ایک فہرست مرتب کر دی گئی ہے - اس فہرست میں قرآن کا ہر لفظ اسی شکل میں دیا گیا ہے جس میں وہ قرآن کے اندر موجود ہے اور اس کے سامنے وہ مادہ دیا گیا ہے جس کے تحت وہ لفظ لغت میں ملے گا - آپ قرآن کے جس لفظ کے معانی معلوم کرنا چاہیں ' اسے فہرست میں ' عام ڈکشنریوں کے قاعدے کے مطابق ' تلاش کرلیں - پھر ' اس کے سامنے جو مادہ دیا گیا ہو اسے زیر نظر لغت میں (ڈکشنری کے قاعدے کے مطابق) اس کے مقام میں دیکھ لیں - مطلوبہ لفظ اس مادہ کے تحت مل جائیگا -

اس فہرست میں :

(۱) عام طور پر قرآنی الفاظ پر اعراب (زبر - زیر - پیش - جزم وغیرہ) نہیں دیئے گئے - ایسا کیا جاتا تو فہرست (بلا ضرورت) طویل ہو جاتی - مثلاً اِسْتَغْفَرَ - اَسْتَغْفِرُ - اِسْتَغْفِرْ کو الگ الگ لکھنے کی بجائے ' ایک ہی جگہ (استغفر کی شکل میں بلا اعراب) لکھ دیا گیا ہے اور اس کے سامنے اس کا مادہ (غ ف ر) دیدیا گیا ہے - البتہ جہاں اعراب کے بدل جانے سے مادہ بدل جاتا ہے وہاں الفاظ پر اعراب لگا دئے گئے ہیں - مثلاً صَفًّا کا مادہ (ص ف ف) ہے اور صَفَا کا مادہ (ص ف و) - ان پر اعراب دیدئے گئے ہیں -

اسی طرح عربی میں ' مختلف وجوہ کی بنا پر ' اسم کے آخری حرف پر زبر (ـَ یا ـً) زیر (ـِ یا ـٍ) پیش (ـُ یا ـٌ) آتے ہیں - فہرست میں ایسے الفاظ کی بھی صرف ایک شکل دی گئی ہے - مثلاً قرآن میں کہیں عِلْماً ہے - کہیں اَلْعِلْمَ' عِلْمٌ اَلْعِلْمُ ' عِلْمٍ اور اَلْعِلْمِ - فہرست میں آپ کو صرف (علم) ملے گا -

(۲) عربی زبان میں بعض اوقات اصل لفظ سے پہلے (ا ل) یا (ف) وغیرہ کے حروف آ جاتے ہیں - مثلاً اَلْبَيْتُ - یا فَذَكِّرْ - زیر نظر فہرست میں ایسے الفاظ اپنی اصل شکل میں ملینگے - یعنی (اَلْبَيْتُ) آپ کو (اَلْ) کے نیچے نہیں ملے گا بلکہ

بَیْت کے مقام پر ملے گا۔ لیکن جہاں (اَلْ) کسی لفظ کا جزو ہے تو وہ لفظ (اَلْ) ہی کے تحت ملے گا۔ مثلاً (اَلْوَاح)۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ عربی زبان نہ جاننے والوں کے لئے بعض اوقات یہ متعین کرنا بھی مشکل ہوگا کہ (اَلْ) اس لفظ کا اصلی جزو ہے یا نہیں۔ لیکن اس دشواری کا اس کے سوا کوئی حل نہیں کہ ایسے الفاظ کو آپ (اَلْ) کے تحت بھی دیکھ لیں اور (اَلْ) کے بغیر اصل لفظ کے تحت بھی۔

اسی طرح عربی میں متعدد حروف، اسم اور فعل سے پہلے، اور مختلف ضمیریں اسم اور فعل کے بعد، اس طرح ملا کر لکھدی جاتی ہیں کہ عربی نہ جاننے والوں کے لئے انہیں الگ الگ کر کے الفاظ کی اصلی شکلیں جاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اَفَتُمٰرُوْنَهٗ مجموعہ ہے اَ+فَ+تُمَارُوْنَ+هٗ کا۔ اور فَقُلْنَا مجموعہ ہے فَ+ق+نَا، کا۔ اور فَاَلْهَمَهَا مجموعہ ہے ف+اَلْهَمَ+هَا کا۔ اور اَلْهٰكُمْ مجموعہ ہے اَلْهٰی+كُمْ کا۔ لہٰذا ان میں سے جس لفظ (یا حرف) کے معنی دیکھنے مقصود ہوں اسے الگ کر کے لغت میں دیکھئے۔

(۳) بعض اوقات لفظ کے مادہ میں بھی تھوڑی سی دقت پیش آ جاتی ہے۔ ایسا ان مادوں میں ہوتا ہے جن میں (ی) یا (و) آئے۔ مثلاً (تَرَاقِی) کا مادہ (رق ی) بھی ہو سکتا ہے اور (ر ق و) بھی۔ ایسے الفاظ کی صورت میں فہرست میں دونوں مادے دیدئے گئے ہیں۔ لیکن اگر کسی جگہ ایسا نہ کیا جا سکا ہو تو ان مادوں کو (ی) میں بھی دیکھ لینا چاہئے اور (و) میں بھی۔ اس ضمن میں مزید دیکھئے تتمہ ص۱۸۰۳ جلد چہارم عنوان تمہید۔

(۴) فہرست میں حروف مقطعات مثلاً الٓرٰ ۔ کٓھٰیٰعٓصٓ ۔ وغیرہ نہیں دئے گئے۔ اس ضمن میں مزید دیکھئے تتمہ ص۱۸۰۵ جلد چہارم عنوان تمہید۔

آخر میں اتنا واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اگرچہ کوشش کی گئی ہے کہ یہ فہرست ہر لحاظ سے مکمل ہو لیکن اس کے باوجود ہو سکتا ہے کہ اس میں بعض قرآنی الفاظ نہ آ سکے ہوں یا کوئی اور غلطی رہ گئی ہو۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اگر انہیں کہیں اس قسم کا سہو یا غلطی نظر آئے تو اس سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اس کی تصحیح کر دی جائے۔

اب فہرست الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔ ہر صفحہ پر تین خانے ہیں۔ اور ہر خانے میں "لفظ" کے نیچے قرآنی الفاظ ہیں اور "مادہ" کے نیچے وہ مقام جہاں وہ الفاظ لغت میں ملیں گے۔



قرآنی الفاظ کی فہرست

لفظ	مادہ
اَ	أ
آباء	ا ب و
آت	ا ت ی
آتی	,,
آتوا	,,
آتِی	,,
آتیت	,,
آتیة	,,
آتیتم	,,
آتیتموا	,,
آتین	,,
آتینا	,,
آثار	ا ث ر
آثر	,,
آثم	ا ث م
آثمین	,,
آخذین	ا خ ذ
آخر	ا خ ر
آخران	,,
آخرة	,,
آخرون	,,
آخرین	,,
آدم	ا د م
آذان	ا ذ ن
آذن	,,
آذنا	,,
آذنت	,,
آذوا	ا ذ ی
آذیتمو	,,
آزر	ا ز ر
آزفة	ا ز ف
آسی	ا س و
آسفوا	ا س ف
آسن	ا س ن
آصال	ا ص ل
آفاق	ا ف ق
آفلین	ا ف ل
آکلون	ا ک ل
آل	ا و ل
آلاء	ا ل و (الی)
الآن	أ+ا و ن
آلاف	ا ل ف
آلهة	ا ل ہ
آمر	ا م ر
آمرون	,,
آمن	ا م ن
آمنا	,,
آمنت	,,

لفظ	مادہ	لفظ	مادہ	لفظ	مادہ
آمنة	ا م ن	ائتیا	ا ت ی	ابرئ	ب ر أ
آمنتم	,,	ائذن	ا ذ ن	ابرار	ب ر ر
آمنوا	,,	ائذنوا	,,	ابراهیم	ابراهیم
آمنون	,,	ائمة	ا م م	ابرح	ب ر ح
آمنین	,,	امر	ا م ر	ابرص	ب ر ص
آمین	ا م م	اَبٌ	ا ب و	ابرموا	ب ر م
آنٌ	ا و ن	اَبٌّ	ا ب ب	ابسلوا	ب س ل
آن	ا ن ی	ابی	ا ب ی	ابشروا	ب ش ر
آناء	,,	ابابیل	ا ب ل	ابصار	ب ص ر
آنس	ا ن س	اباریق	ب ر ق	ابصر	,,
آنستم	,,	ابت	ا ب و	ابصرنا	,,
آنف	ا ن ف	ابتدعوا	ب د ع	ابعث	ب ع ث
آنیة	ا ن ی	ابتر	ب ت ر	ابعثوا	,,
آوی	ا و ی	ابتغ	ب غ ی	ابغي	ب غ ی
آووا	,,	ابتغی	,,	ابق	ا ب ق
آوی	,,	ابتغاء	,,	ابقی	ب ق ی
آوینا	,,	ابتغوا	,,	ابکی	ب ک ی
آیات	ا ی ی	ابتغي	,,	ابکار	ب ک ر
آیة	,,	ابتغیت	,,	ابکم	ب ک م
آیتین	,,	ابتلی	ب ل و	ابل	ا ب ل
ائت	ا ت ی	ابتلوا	,,	ابلعي	ب ل ع
ائتمروا	ا م ر	ابحر	ب ح ر	ابلغ	ب ل غ
ائتمن	ا م ن	ابدا	ا ب د	ابلغت	,,
ائتوا	ا ت ی	ابدل	ب د ل	ابلغوا	,,

لفظ	ماده
اثقلت	ث ق ل
اثل	ا ث ل
اثم	ا ث م
اثمر	ث م ر
اثنان	ث ن ی
اثنتین	,,
اثیم	ا ث م
اجاء	ج ی ء
اجاج	ا ج ج
اجتبی	ج ب ی
اجبتم	ج و ب
اجتبیت	ج ب ی
اجتبینا	,,
اجتثت	ج ث ث
اجترحوا	ج ر ح
اجتمعت	ج م ع
اجتمعوا	,,
اجتنبوا	ج ن ب
اجد	و ج د
اجداث	ج د ث
اجدر	ج د ر
اَجر	ا ج ر
اَجر	ج و ر
اجرام	ج ر م

لفظ	ماده
اجرمنا	ج ر م
اجرموا	,,
اجسام	ج س م
اجعل	ج ع ل
اجعلوا	,,
اجل	ا ج ل
اجلب	ج ل ب
اجلت	ا ج ل
اجلدوا	ج ل د
اجلین	ا ج ل
اجمعوا	ج م ع
اجمعون	,,
اجمعین	,,
اجنب	ج ن ب
اجنة	ج ن ن
اجنح	ج ن ح
اجنحة	,,
اجور	ا ج ر
اجیب	ج و ب
اجیبت	,,
اجیبوا	,,
احادیث	ح د ث
احاط	ح و ط
احاطت	,,

لفظ	ماده
احب	ح ب ب
احباء	,,
احبار	ح ب ر
احببت	ح ب ب
احبط	ح ب ط
احترقت	ح ر ق
احتمل	ح م ل
احتملوا	,,
احتنکن	ح ن ک
احد	ا ح د
احدی	,,
احدث	ح د ث
احذر	ح ذ ر
احذروا	,,
احرص	ح ر ص
احزاب	ح ز ب
احس	ح س س
احسان	ح س ن
احسن	,,
احسنتم	,,
احسنوا	,,
احسوا	ح س س
احشروا	ح ش ر
احصی	ح ص ی

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
احصرتم	ح ص ر	احمی	ح م ی	اختین	ا خ و
احصرو	,,	احي	ح ی ی	اخدان	خ د ن
احصن	ح ص ن	احیاء	,,	اخدود	خ د د
احصنت	ح ص ن	احیط	ح و ط	اخذ	ا خ ذ
احصوا	ح ص ی	احوی	ح و و	اخذة	ا خ ذ
احصینا	,,	احیي	ح ی ی	اخذت	,,
احضرت	ح ض ر	احییت	,,	اخذتم	,,
احطت	ح و ط	احیینا	,,	اخذن	,,
احطنا	,,	اخ	ا خ و	اخذنا	,,
احفظوا	ح ف ظ	اخاف	خ و ف	اخذوا	,,
احق	ح ق ق	اخالف	خ ل ف	اخر	ا خ ر
احقاب	ح ق ب	اخبار	خ ب ر	اخری	,,
احقاف	ح ق ف	اخبتوا	خ ب ت	اخراج	خ ر ج
احکم	ح ک م	اخت	ا خ و	اخرت	ا خ ر
احکمت	,,	اختار	خ ی ر	اخرج	خ ر ج
احل	ح ل ل	اخترت	,,	اخرجت	,,
احلام	ح ل م	اخترنا	,,	اخرجتم	,,
احلت	ح ل ل	اختصموا	خ ص م	اخرجنا	,,
احلل	,,	اختلاف	خ ل ف	اخرجوا	,,
احللنا	,,	اختلاق	خ ل ق	اخرنا	ا خ ر
احلوا	,,	اختلط	خ ل ط	اخزی	خ ز ی
احال	ح م ل	اختلف	خ ل ف	اخزیت	,,
احمد	ح م د	اختلفتم	,,	اخسئوا	خ س أ
احمل	ح م ل	اختلفوا	,,	اخسرون	خ س ر

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
اخشوا	خ ش ی	اخوة	ا خ و	ادفعوا	د ف ع
اخضر	خ ض ر	اخیار	خ ی ر	ادکر	ذ ک ر
اخطأتم	خ ط أ	اخیه	ا خ و	ادل	د ل ل
اخطانا	خ ط أ	اد	ا د د	ادلٰی	د ل و
اخفی	خ ف ی	ادآء	ا د ی	ادنی	د ن و
اخفض	خ ف ض	ادارأتم	د ر أ	ادوا	ا د ی
اخفي	خ ف ی	ادارك	د ر ك	ادهی	د ه ی
اخفیتم	,,	اداركوا	د ر ك	اُذْ	ا ذ
اخلاء	خ ل ل	ادبار	د ب ر	اِذًا	ا ذ ن
اخلاص	خ ل ص	ادبر	,,	اِذَا	ا ذ ا
اخلد	خ ل د	ادخل	د خ ل	اذاعوا	ذ ی ع
اخلصنا	خ ل ص	ادخلا	,,	اذاق	ذ و ق
اخلصوا	,,	ادخلنا	,,	اذان	ا ذ ن
اخلع	خ ل ع	ادخلوا	,,	اذبح	ذ ب ح
اخلف	خ ل ف	ادخلي	,,	اذکر	ذ ک ر
اخلفت	,,	ادری	د ر ی	اذکروا	,,
اخلفتم	,,	ادرءوا	د ر أ	اذقان	ذ ق ن
اخلفنا	,,	ادرك	د ر ك	اذقنا	ذ و ق
اخلفوا	,,	ادری	د ر ی	اذل	ذ ل ل
اخلق	خ ل ق	ادریس	ادریس	اذلة	,,
اخن	خ و ن	ادع	د ع و	اذلین	,,
اخوات	ا خ و	ادعوا	,,	اذن	ا ذ ن
اخوال	خ و ل	ادعیاء	,,	اذنت	,,
اخوان	ا خ و	ادفع	د ف ع		

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
اذنين	ا ذ ن	ارتدوا	ر د د	ارسل	ر س ل
اذهب	ذ ه ب	ارتضى	ر ض ى	ارسلت	,,
اذهبا	,,	ارتقب	ر ق ب	ارسلتم	,,
اذهبتم	,,	ارتقبوا	,,	ارسلنا	ر س ل
اذهبوا	,,	ارجاء	ر ج و	ارسلوا	,,
اذى	ا ذ ى	ارجع	ر ج ع	ارصاد	ر ص د
ار	ر أ ى	ارجعوا	,,	ارض	ا ر ض
ارائک	ا ر ک	ارجعي	,,	ارضعت	ر ض ع
اراد	ر و د	ارجل	ر ج ل	ارضعن	,,
ارادا	,,	ارجم	ر ج م	ارضعي	,,
ارادوا	,,	ارجوا	ر ج و	ارعوا	ر ع ى
اراذل	ر ذ ل	ارجه	,,	ارغب	ر غ ب
اربى	ر ب و	ارحام	ر ح م	ارکب	ر ک ب
ارباب	ر ب ب	ارحم	,,	ارکبوا	,,
اربة	ا ر ب	اردى	ر د ى	ارکس	ر ک س
اربع	ر ب ع	اردت	ر و د	ارکسوا	,,
اربعه	,,	اردتم	,,	ارکض	ر ک ض
اربعين	,,	اردن	,,	ارکعوا	ر ک ع
ارتاب	ر ى ب	اردنا	,,	ارکعی	,,
ارتابت	,,	ارذل	ر ذ ل	ارم	ا ر م
ارتابوا	,,	ارذلون	,,	اروا	ر أ ى
ارتبتم	,,	ارزق	ر ز ق	ارهبوا	ر ه ب
ارتد	ر د د	ارزقوا	,,	ارهق	ر ه ق
ارتدا	,,	ارسى	ر س و	ارى	ر أ ى

لفظ	ماده
ارید	ر و د
ارینا	ر أ ی
از	ا ز ز
ازاغ	ز ی غ
ازدادو	ز ی د
ازدجر	ز ج ر
ازر	ا ز ر
ازفت	ا ز ف
ازکی	ز ک و
ازل	ز ل ل
ازلام	ز ل م
ازلفت	ز ل ف
ازلفنا	,,
ازواج	ز و ج
ازید	ز ی د
ازین	ز ی ن
ازینت	,,
اساء	س و ء
اسائم	,,
اساءوا	,,
اساری	ا س ر
اساطیر	س ط ر
اسال	س أ ل
اسالوا	,,

لفظ	ماده
اساور	س و ر
اسباب	س ب ب
اسباط	س ب ط
اسبغ	س ب غ
استاجر	ا ج ر
استاجرت	,,
استاذن	ا ذ ن
استاذنوا	,,
استبدال	ب د ل
استبرق	استبرق
استبشروا	ب ش ر
استبقا	س ب ق
استبقوا	,,
استجاب	ج و ب
استجابوا	,,
استجار	ج و ر
استجب	ج و ب
استجبتم	,,
استجیب	,,
استجیبوا	,,
استحبوا	ح ب ب
استحفظوا	ح ف ظ
استحق	ح ق ق
استحقا	,,

لفظ	ماده
استحوذ	ح و ذ
استحیاء	ح ی ی
استحیوا	,,
استحیی	ح ی ی
استخرج	خ ر ج
استخف	خ ف ف
استخلص	خ ل ص
استخلف	خ ل ف
استرق	س ر ق
استرهبوا	ر ه ب
استزل	ز ل ل
استسقی	س ق ی
استشهدوا	ش ه د
استضعفوا	ض ع ف
استطاع	ط و ع
استطاعوا	,,
استطعت	,,
استطعتم	,,
استطعما	ط ع م
استطعنا	ط و ع
استعجال	ع ج ل
استعجلتم	,,
استعذ	ع و ذ
استعصم	ع ص م

لفظ	ماده
استعلى	ع ل و
استعمر	ع م ر
استعينوا	ع و ن
استغاث	غ و ث
استغشوا	غ ش ى
استغفار	غ ف ر
استغفر	,,
استغفرت	,,
استغفروا	,,
استغفري	,,
استغلظ	غ ل ظ
استغنى	غ ن ى
استفت	ف ت ى
استفتحوا	ف ت ح
استفزز	ف ز ز
استقاموا	ق و م
استقر	ق ر ر
استقم	ق و م
استقيا	,,
استقيموا	,,
استكانوا	ک و ن
استكبار	ک ب ر
استكبر	,,
استكبرت	,,
استكبرتم	ک ب ر
استكبروا	,,
استكثرت	ک ث ر
استكثرتم	,,
استمتعتم	م ت ع
استمتعوا	,,
استمسك	م س ك
استمع	س م ع
استمعوا	,,
استنصر	ن ص ر
استمتع	م ت ع
استنصروا	ن ص ر
استنكفوا	ن ک ف
استوى	س و ى
استوت	,,
استوقد	و ق د
استويت	س و ى
استويتم	,,
استهزئ	ه ز أ
استهزء وا	,,
استهوت	ه و ى
استيأس	ى أ س
استيأسوا	,,
استيسر	ى س ر
استيقنت	ى ق ن
اسجد	س ج د
اسجدوا	,,
اسجدى	,,
اسحار	س ح ر
اسحق	اسحق
اسخط	س خ ط
أَسَرَ	ا س ر
أَسْرِ	س ر ى
أَسَرُّ	س ر ر
أَسْرى(فعل)	س ر ى
أَسْرى(اسم)	ا س ر
اسرائيل	اسرائيل
اسرار	س ر ر
اسراف	س ر ف
اسرح	س ر ح
اسررت	س ر ر
اسرع	س ر ع
اسرف	س ر ف
اسرفوا	,,
اسروا	س ر ر
اسس	ا س س
استطاعوا	ط و ع
اسعوا	س ع ى

لفظ	ماده
اسفا	ا س ف
اسفی	,,
اسفار	س ف ر
اسفر	,,
اسفل	س ف ل
اسفلین	,,
اسقط	س ق ط
اسقي	س ق ی
اسقینا	,,
اسکن	س ک ن
اسکنا	,,
اسکنت	,,
اسکنوا	,,
اسلام	س ل م
اسلحة	س ل ح
اسلفت	س ل ف
اسلفتم	,,
اسلك	س ل ك
اسلکوا	,,
اسلکي	,,
اسلم	س ل م
اسلما	,,
اسلمت	,,
اسلمتم	,,
اسلمنا	س ل م
اسلموا	,,
اسلنا	س ی ل
اسم	س م و
اسماء	,,
اسمع	س م ع
اسمعوا	,,
اسمعیل	اسمعیل
اسوأ	س و ء
اسواق	س و ق
اسوة	ا س و
اسود	س و د
اسودت	,,
اسورة	س و ر
اسیر	ا س ر
اشاء	ش ی ء
اشارت	ش و ر
اشتات	ش ت ت
اشتدت	ش د د
اشتری	ش ر ی
اشتروا	,,
اشتعل	ش ع ل
اشتملت	ش م ل
اشتهت	ش ه و
اشحة	ش ح ح
اشد	ش د د
اشداء	,,
اشدد	,,
اشر	ا ش ر
اشرار	ش ر ر
اشراط	ش ر ط
اشراق	ش ر ق
اشربوا	ش ر ب
اشربي	,,
اشرح	ش ر ح
اشرقت	ش ر ق
اشرك	ش ر ك
اشرکت	,,
اشرکتم	,,
اشرکتموا	,,
اشرکنا	,,
اشرکوا	,,
اشعار	ش ع ر
اشفقتم	ش ف ق
اشفقن	,,
اشق	ش ق ق
اشقی	ش ق ی
اشکر	ش ک ر

لفظ	مادہ	لفظ	مادہ	لفظ	مادہ
اشکروا	ش ک ر	اصحاب الیمین	ص ح ب ی م ن	اصلب	ص ل ب
اشکرا	ش ک ر	اصحاب الفیل	ص ح ب ف ی ل	اصلح	ص ل ح
اشمأزت	ش م ز	اصحاب الکهف	ص ح ب ک ه ف	اصلحا	,,
اشهاد	ش ه د	اصدع	ص د ع	اصلحنا	,,
اشهد	,,	اصدق	ص د ق	اصلوا	ص ل ی
اشهدت	,,	اصر	ا ص ر	اصلی	,,
اشهدوا	,,	اصرف	ص ر ف	اصم	ص م م
اشهر	ش ه ر	اصروا	ص ر ر	اصنام	ص ن م
اشیاء	ش ی ء	اصطادوا	ص ی د	اصنع	ص ن ع
اشیاع	ش ی ع	اصطبر	ص ب ر	اصوات	ص و ت
اصاب	ص و ب	اصطفی	ص ف و	اصواف	ص و ف
اصابت	,,	اصطفیت	,,	اصول	ا ص ل
اصابع	ص ب ع	اصطفینا	,,	اصیب	ص و ب
اصب	ص ب و	اصطنعت	ص ن ع	اصیل	ا ص ل
اصباح	ص ب ح	اصغر	ص غ ر	اضاء	ض و ء
اصبتم	ص و ب	اصفی	ص ف و	اضاءت	,,
أصبح	ص ب ح	اصفاد	ص ف د	اضاعوا	ض ی ع
اصبحت	,,	اصفح	ص ف ح	اضحك	ض ح ك
اصبحتم	,,	اصفحوا	,,	اضرب	ض ر ب
اصبحوا	,,	اصل	ا ص ل	اضربوا	,,
اصبر	ص ب ر	اصلاب	ص ل ب	اضطر	ض ر ر
اصبروا	,,	اصلاح	ص ل ح	اضطررتم	,,
اصبنا	ص و ب			اضعاف	ض ع ف
اصحاب	ص ح ب			اضعف	,,

لفظ	ماده
اضغاث	ض غ ث
اضغاث }	ض غ ث
احلام }	ح ل م
اضغان	ض غ ن
اضل	ض ل ل
اضلا	,,
اضللتم	,,
اضللن	,,
اضلوا	,,
اضمم	ض م م
اضيع	ض ی ع
اطاع	ط و ع
اطاعوا	,,
اطراف	ط ر ف
اطرحوا	ط ر ح
اطعام	ط ع م
اطعتم	ط و ع
اطعتموا	,,
اطعم	ط ع م
اطعموا	,,
اطعن	ط و ع
اطعنا	,,
اطغى	ط غ ی
اطغيت	,,

لفظ	ماده
اطفا	ط ف أ
اطفال	ط ف ل
اطلع	ط ل ع
اطلعت	,,
اطمان	ط م ن (طمأن)
اطمانتم	,,
اطمانوا	,,
اطمس	ط م س
اطمع	ط م ع
اطوار	ط و ر
اطهر	ط ه ر
اطهروا	,,
اطيرنا	ط ی ر
اطيروا	,,
اطيعوا	ط و ع
اظفر	ظ ف ر
اظلم	ظ ل م
اظن	ظ ن ن
اظهر	ظ ه ر
اعادة	ع و د
اعان	ع و ن
اعبد	ع ب د
اعبدوا	,,
اعتبروا	ع ب ر

لفظ	ماده
اعتدى	ع د و
اعتدت	,,
اعتدنا	,,
اعتدوا	,,
اعتدينا	,,
اعترى	ع ر ی
اعترفنا	ع ر ف
اعترفوا	,,
اعتزل	ع ز ل
اعتزلتموا	,,
اعتزلوا	,,
اعتصموا	ع ص م
اعتلوا	ع ت ل
اعتمر	ع م ر
اعثرنا	ع ث ر
اعجاز	ع ج ز
اعجب	ع ج ب
اعجبت	,,
اعجل	ع ج ل
اعجمی	ع ج م
اعجمين	,,
اعد	ع د د
اعداء	ع د و
اعدت	ع د د

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
اعدل	ع د ل	اعقاب	ع ق ب	اغترف	غ ر ف
اعدلوا	,,	اعقب	,,	اغدوا	غ د و
اعدوا	ع د د	اعلى	ع ل و	اغرقنا	غ ر ق
اعذب	ع ذ ب	اعلام	ع ل م	اغرقوا	,,
اعراب	ع ر ب	اعلم	,,	اغرينا	غ ر و
اعراض	ع ر ض	اعلموا	,,	اغسلوا	غ س ل
اعراف	ع ر ف	اعلنت	ع ل ن	اغشيت	غ ش ى
اعرج	ع ر ج	اعلنتم	,,	اغشينا	,,
اعرض	ع ر ض	اعلون	ع ل و	اغضض	غ ض ض
اعرضتم	,,	اعمى	ع م ى	اغطش	غ ط ش
اعرضوا	,,	اعمال	ع م ل	اغفر	غ ف ر
اعز	ع ز ز	اعمام	ع م م	اغفلنا	غ ف ل
اعزة	,,	اعمل	ع م ل	اغلال	غ ل ل
اعصار	ع ص ر	اعملوا	,,	اغلب	غ ل ب
اعصر	ع ص ر	اعناب	ع ن ب	اغلظ	غ ل ظ
اعصي	ع ص ى	اعناق	ع ن ق	اغنى	غ ن ى
اعط	ع ط و	اعنت	ع ن ت	اغنت	,,
اعطى	,,	اعوذ	ع و ذ	اغنياء	,,
اعطوا	,,	اعهد	ع ه د	اغوى	غ و ى
اعطينا	,,	اعيب	ع ى ب	اغويت	,,
اعظ	و ع ظ	اعيدوا	ع و د	اغوينا	,,
اعظم	ع ظ م	اعيذ	ع و ذ	اف	ا ف ف
اعف	ع ف و	اعين	ع ى ن	افاء	ف ى أ
اعفوا	,,	اعينوا	ع و ن	افاض	ف ى ض

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
افاق	ف و ق	افل	ا ف ل	اقترفتموا	ق ر ف
افاك	أ ف ك	افلت	,,	اقتل	ق ت ل
افئدة	ف أ د	افلح	ف ل ح	اقتلوا	,,
افت	ف ت ی	افنان	ف ن ن	اقدام	ق د م
افتح	ف ت ح	افواج	ف و ج	اقدمون	,,
افتدی	ف د ی	افواه	ف و ه	اقذفي	ق ذ ف
افتدت	,,	افوز	ف و ز	اقرأ	ق ر أ
افتدوا	,,	افوض	ف و ض	اقرءوا	,,
افتراء	ف ر ی	افیضوا	ف ی ض	اقرب	ق ر ب
افتری	,,	اقام	ق و م	اقربون	,,
افتریت	,,	اقاموا	,,	اقررتم	ق ر ر
افترینا	,,	اقاویل	ق و ل	اقررنا	,,
افتوا	ف ت ی	اقبر	ق ب ر	اقرضتم	ق ر ض
افرغ	ف ر غ	اقبل	ق ب ل	اقرضوا	,,
افرق	ف ر ق	اقبلت	,,	اقسط	ق س ط
افسحوا	ف س ح	اقبلنا	,,	اقسطوا	,,
افسدوا	ف س د	اقبلوا	,,	اقسم	ق س م
افصح	ف ص ح	اقتت	و ق ت	اقسمتم	,,
افضی	ف ض و	اقتتل	ق ت ل	اقسموا	,,
افضتم	ف ی ض	اقتتلوا	,,	اقصی	ق ص و
افعل	ف ع ل	اقتحم	ق ح م	اقصد	ق ص د
افعلوا	,,	اقتد	ق د و	اقصص	ق ص ص
افق	ا ف ق	اقترب	ق ر ب	اقض	ق ض ی
افك	ا ف ك	اقتربت	,,	اقضوا	,,

لفظ	مادہ	لفظ	مادہ	لفظ	مادہ
اقطار	ق ط ر	اکالون	ا ک ل	اکفر	ک ف ر
اقطع	ق ط ع	اکبر	ک ب ر	اکفرن	,,
اقطعوا	,,	اکبرن	,,	اکفروا	,,
اقعد	ق ع د	اکتالوا	ک ی ل	اکفل	ک ف ل
اقعدوا	,,	اکتب	ک ت ب	اکل	ا ک ل
اقفال	ق ف ل	اکتبوا	,,	اکلا	,,
أَقُلْ	ق و ل	اکتتب	,,	اکام	ک ل م
أَقَلَّ	ق ل ل	اکتسب	ک س ب	اکلوا	ا ک ل
اقلام	ق ل م	اکتسبت	,,	اکمام	ک م م
اقلت	ق ل ل	اکتسبن	,,	اکملت	ک م ل
اقلعي	ق ل ع	اکتسبوا	,,	اکمه	ک م ه
اقم	ق و م	اکثر	ک ث ر	اکن	ک و ن
اقمت	,,	اکثرت	,,	اکنان	ک ن ن
اقمتم	,,	اکثروا	,,	اکنة	,,
أقمن	,,	اکدی	ک د ی	اکننتم	,,
اقنی	ق ن ی	اکرام	ک ر م	اکواب	ک و ب
اقنتي	ق ن ت	اکراه	ک ر ه	اکون	ک و ن
اقوات	ق و ت	اکرم	ک ر م	اکید	ک ی د
اقول	ق و ل	اکرمن	,,	أَلْ	ا ل
اقوم	ق و م	اکرمي	,,	أَلّ	ا ل ل
اقیموا	,,	اکره	ک ر ه	أَلَّا	الّا
الك	ک و ن	اکرهت	,,	أَلَّا	أَلَّا
اکابر	ک ب ر	اکسوا	ک س و	أَلَا	أَلَا–أَ+لا
اکاد	ک و د	اکشف	ک ش ف		

لفظ	مادہ	لفظ	مادہ	لفظ	مادہ
الی	ا ل ی	الذی	الذی	اللاتی	الذی
الآن	ا و ن	الذین	,,	اللہ	ا ل ہ
الہ	ا ل ہ	الزم	ل ز م	اللّٰھُمَّ	,,
اللہ	,,	الزمنا	,,	الواح	ل و ح
الٰھین	,,	السنۃ	ل س ن	الوان	ل و ن
الباب	ل ب ب	العن	ل ع ن	الوف	ا ل ف
التفت	ل ف ت	الغوا	ل غ و	الھی	ل ہ و
التقی	ل ق ی	الف	ا ل ف	الھم	ل ہ م
التقتا	,,	الفاف	ل ف ف	اِلیَّ	الی+ی
التقط	ل ق ط	الفت	ا ل ف	اِلیاس	الیاس
التقم	ل ق م	الفوا	ل ف ی	اِلیاسین	الیاس
التقیتم	ل ق ی	الفیا	,,	الیسع	الیسع
التمسوا	ل م س	الفین	ا ل ف	الیم	ا ل م
التنا	و ل ت	الفینا	ل ف ی	اَمْ	اَمْ
التی	الذی	الق	ل ق ی	اُمّ	ا م م
الحاد	ل ح د	القی	,,	اِمّا	اِمّا
الحاف	ل ح ف	القاب	ل ق ب	اَمّا	اَمّا
الحق	ل ح ق	القت	ل ق ی	اماء	ا م و
الحقتم	,,	القوا	,,	امات	م و ت
الحقنا	,,	القی	,,	امارۃ	ا م ر
اَلَدُّ	ل د د	القیا	,,	امام	ا م م
اَلِدُ	و ل د	القیت	,,	امانۃ	ا م ن
اللذان	الذی	اللائی	الذی	امانات	,,

لفظ	ماده
امانی	م ن ی
اَمْتٌ	ا م ت
أَمَتٌ	م و ت
اَمَةٌ	ا م و
اُمَّةٌ	ا م م
امتازوا	م ی ز
امتحن	م ح ن
امتحنوا	,,
امتع	م ت ع
امتعة	,,
امتلئت	م ل أ
امثال	م ث ل
امثل	,,
اَمَدٌ	ا م د
اَمَدَّ	م د د
امددنا	,,
اَمْرٌ	ا م ر
اَمَرَّ	م ر ر
اِمْرٌ	ا م ر
اَمرؤ	م ر أ
امراة	,,
امرءتان	,,
امرت	ا م ر
امرنا	,,
امروا	ا م ر
امس	ا م س
امساك	م س ك
امسحوا	م س ح
امسك	م س ك
امسكتم	,,
امسكن	,,
امسكوا	,,
امشاج	مشج
امشوا	م ش ی
امضوا	م ض ی
امطر	م ط ر
امطرت	,,
امطرنا	,,
امعاء	م ع ی
امكثوا	م ک ث
امكن	م ک ن
امل	ا م لْ
املأ	م ل أ
املی	م ل و
املاق	م ل ق
املك	م ل ك
املي	م ل و
امليت	,,
امم	ا م م
امن	ا م ن
امنت	,,
امنة	,,
امنتم	,,
امنن	م ن ن
امني	م ن ی
امنية	,,
اموات	م و ت
اموال	م و ل
اموت	م و ت
امور	ا م ر
امهات	ا م م
امهل	م ه ل
امي	ا م م
اميت	م و ت
امين	ا م ن
اميون	ا م م
اميين	,,
انَّ	انَّ
اَنَّ	اَنَّ
اَنْ	اَنْ
اِنْ	اِنْ

لفظ	ماده
أَنَّى	أَنَّى
أَنَا	أَنَا
أَنَّا	ا ن ى
أَنَّا	انّ+ نَا
اناب	ن و ب
انابوا	,,
اناث	ا ن ث
اناس	ا ن س
اناسي	,,
انام	ا ن م
انامل	ن م ل
انباء	ن ب أ
انبأ	,,
انبئ	,,
انبئوا	,,
انبت	ن ب ت
انبتت	,,
انبتنا	,,
انبجست	ب ج س
انبذ	ن ب ذ
انبعاث	ب ع ث
انبعث	,,
انبنا	ن و ب

لفظ	ماده
انبياء	ن ب أ - ن ب و
أَنْتَ	أَنْتَ
أَنْتِ	أَنْتِ
انتبذت	ن ب ذ
انتشرت	ن ش ر
انتشروا	,,
انتصر	ن ص ر
انتصروا	ن ص ر
انتظر	ن ظ ر
انتظروا	,,
انتقام	ن ق م
انتقمنا	,,
أَنْتُمْ	أَنْتُمْ
أَنْتُمَا	أَنْتُمَا
انتهى	ن ه ى
انتهوا	,,
انثى	ا ن ث
انثيين	,,
انجى	ن ج و
انجيت	,,
انجيل	انجيل
انجينا	ن ج و
انحر	ن ح ر

لفظ	ماده
انداد	ن د د
انذر	ن ذ ر
انذرت	,,
انذرنا	,,
انذروا	,,
انزل	ن ز ل
انزلت	,,
انزلتموا	,,
انزلنا	,,
انس	ا ن س
انسى	ن س ى
انساب	ن س ب
انسان	ا ن س
انسلخ	س ل خ
انسوا	ن س ى
انسى	ا ن س
انشأ	ن ش أ
انشاء	,,
انشأتم	,,
انشأنا	,,
انشر	ن ش ر
انشرنا	,,
انشزوا	ن ش ز
انشق	ش ق ق

لفظ	ماده
انشقت	ش ق ق
انصاب	ن ص ب
انصار	ن ص ر
انصب	ن ص ب
انصتو	ن ص ت
انصح	ن ص ح
انصر	ن ص ر
انصرفوا	ص ر ف
انصروا	ن ص ر
انطق	ن ط ق
انطلق	ط ل ق
انطلقا	,,
انطلقتم	,,
انطلقوا	,,
انظر	ن ظ ر
انظروا	,,
انظری	,,
انعام	ن ع م
انعم	,,
انعمت	,,
انعمنا	,,
انف	ا ن ف
انفاق	ن ف ق
انفال	ن ف ل
انفجرت	ف ج ر
انفخ	ن ف خ
انفخوا	,,
انفذوا	ن ف ذ
انفروا	ن ف ر
انفس	ن ف س
انفصام	ف ص م
انفضو	ف ض ض
انفطرت	ف ط ر
انفق	ن ف ق
انفقت	,,
انفقتم	,,
انفقوا	,,
انفلق	ف ل ق
انقذ	ن ق ذ
انقص	ن ق ص
انقض	ن ق ض
انقلب	ق ل ب
انقلبتم	,,
انقلبوا	,,
انکاث	ن ک ث
انکال	ن ک ل
انکحوا	ن ک ح
انکدرت	ک د ر
انکر	ن ک ر
اَنَّمَا	ان+ما
انّه	ن ه ی
انهی	,,
اَنْہَارٌ	ن ه ر
اَنْہَارَ	هُ و ر
اَنّٰی	اَنّٰی
انیب	ن و ب
انیبوا	,,
اَوْ	اَوْ
اواب	ا و ب
اوابین	,,
اواری	و ر ی
اواه	ا و ه
اوبار	و ب ر
اوبي	ا و ب
اوتی	ا ت ی
اوتین	,,
اوتاد	و ت د
اوتوا	ا ت ی
اوتي	,,
اوتیت	,,

لفظ	ماده
اوتیتم	,,
اوتینا	,,
اوثان	و ث ن
اوجس	و ج س
اوجفتم	و ج ف
اوحی	و ح ی
اوحي	,,
اوحیت	,,
اوحینا	,,
اودية	و د ی
اوذوا	ا ذ ی
اوذي	,,
اوذینا	,,
اورث	و ر ث
اورثتمو	,,
اورثنا	,,
اورثوا	,,
اورد	و ر د
اوزار	و ز ر
اوزع	و ز ع
اوسط	و س ط
اوصی	و ص ی
اوضعوا	و ض ع
اوعی	و ع ی

لفظ	ماده
اوعية	و ع ی
اوف	و ف ی
اوفِ	,,
اوفوا	,,
اوقد	و ق د
اوقدوا	,,
اول	ا و ل
اُولیٰ	,,
اَولیٰ	و ل ی
اُولاءِ	اُولاءِ
اُولٰئِكَ	اُولٰئِكَ
اولات	اُولُو
اولات الاحمال	اُولُو + ح م ل
اولاد	و ل د
اولی لك	و ل ی
اولو	اُولُو
اولی النعمة	اُولُو + ن ع م
اولون	ا و ل
اولیاء	و ل ی
اولیان	,,
اولین	ا و ل
اوهن	و ه ن
اهان	ه و ن

لفظ	ماده
اهانن	ه و ن
اهب	و ه ب
اهبط	ه ب ط
اهبطا	,,
اهبطوا	,,
اهتدی	ه د ی
اهتدوا	,,
اهتدیت	,,
اهتدیتم	,,
اهتزت	ه ز ز
اهجر	ه ج ر
اهجروا	,,
اهد	ه د ی
اهدی	,,
اهدوا	,,
اهدي	,,
اهش	ه ش ش
اُهِلَّ	ه ل ل
اَهْل	ا ه ل
اهلة	ه ل ل
اهلك	ه ل ك
اهلكت	,,
اهلكنا	,,
اهلكوا	,,

لفظ	ماده
اهلون	ا ه ل
اهمت	ه م م
اهواء	ه و ی
اهوی	,,
اهون	ه و ن
أيِ	أيِ
أيّ	أيّ
اياب	ا و ب
اياك	ايّا+كَ
اياكما	ايّا+كُمَا
اياكم	ايّا+كُمْ
ايام	ی و م
ايامی	ا ی م
ايان	أيّانَ
ايانا	ايّا+نَا
اياه	,, +هُ
اياها	,, +هَا
اياهم	,, +هُمْ
اياي	,, +ی
اية	ا ی ی
ايتاء	ا ت ی
ايد	ا ی د
ايدت	,,
ايدنا	ا ی د
ايدی	ی د ی
ايقاظ	ی ق ظ
ايكة	ا ی ك
ايلاف	ا ل ف
أيمانٌ	ی م ن
أيمان	ا م ن
أيمن	ی م ن
أينَ	أينَ
أينما	أينَ+مَا
ايوب	أيّوب
ايها	ای+ها

ب

لفظ	ماده
ب	ب
باد	ب د و
باء	ب و ء
بائس	ب أ س
بئر	ب أ ر
بئس	ب أ س
بائع	ب ی ع
باءوا	ب و ء
بئيس	ب أ س
باب	ب و ب
بابل	بابل
باخع	ب خ ع
بادون	ب د و
بادي	,,
بارد	ب ر د
بارزة	ب ر ز
بارزون	,,
بارك	ب ر ك
باركنا	,,
بارئ	ب ر أ
بازغ	ب ز غ
بازغة	ب ز غ
بأس	ب أ س
بأساء	,,
باسرة	ب س ر
باسط	ب س ط
باسطون	,,
باسقات	ب س ق
باشروا	ب ش ر
باطل	ب ط ل
باطن	ب ط ن

لفظ	ماده
باطنة	ب ط ن
باعد	ب ع د
باغ	ب غ ی
باق	ب ق ی
باقون	,,
باقيات	,,
باقية	,,
بال	ب و ل
بالغ	ب ل غ
بالغة	,,
بالغون	,,
بايع	ب ی ع
بايعتم	,,
بث	ب ث ث
بحار	ب ح ر
بحر	,,
بحران	,,
بحرين	,,
بحيرة	,,
بخس	ب خ س
بخل	ب خ ل
بخلوا	,,
بدا	ب د و
بدأ	ب د أ
بدار	ب د ر

لفظ	ماده
بدءوا	ب د أ
بدأنا	,,
بدت	ب د و
بدر	ب د ر
بدع	ب د ع
بدعة	,,
بدل	ب د ل
بدلنا	,,
بدلوا	,,
بدن	ب د ن
بدو	ب د و
بديع	ب د ع
بر	ب ر ر
برا	ب ر أ
برءاء	,,
براءة	,,
برد	ب ر د
بررة	ب ر ر
برز	ب ر ز
برزت	,,
برزخ	ب ر ز خ
برزوا	ب ر ز
برق	ب ر ق
بركات	ب ر ك

لفظ	ماده
بروج	ب ر ج
برهان	ب ر ه
برهانان	,,
بريء	ب ر ا
بريئون	,,
برية	,, - برى
بس	ب س س
بساط	ب س ط
بست	ب س س
بسر	ب س ر
بسط	ب س ط
بسطة	,,
بسطت	,,
بشر	ب ش ر
بشرى	,,
بشرتموا	,,
بشرنا	,,
بشروا	,,
بشرين	,,
بشير	,,
بصائر	ب ص ر
بصر	,,
بصرت	,,

لفظ	ماده
بصل	ب ص ل
بصير	ب ص ر
بصيرة	,,
بضاعة	ب ض ع
بضع	,,
بطائن	ب ط ن
بطانة	,,
بطر	ب ط ر
بطرت	,,
بطش	ب ط ش
بطشة	,,
بطشتم	,,
بطل	ب ط ل
بطن	ب ط ن
بطون	,,
بعث	ب ع ث
بعثر	ب ع ث ر
بعثرت	,,
بعثنا	ب ع ث
بعد	ب ع د
بعدت	,,
بعض	ب ع ض
بعل	ب ع ل
بعوضة	ب ع ض

لفظ	ماده
بعولة	ب ع ل
بعيد	ب ع د
بعير	ب ع ر
بغى	ب غ ى
بغاء	,,
بغال	ب غ ل
بغت	ب غ ى
بغتة	,,
بغضاء	ب غ ض
بغوا	ب غ ى
بغى	,,
بقر	ب ق ر
بقرات	,,
بقرة	,,
بقعة	ب ق ع
بقل	ب ق ل
بقى	ب ق ى
بقية	,,
بكة	ب ك ك
بكت	ب ك ى
بكر	ب ک ر
بكرة	,,
بكم	ب ک م
بكى	ب ک ى

لفظ	ماده
بَلْ	بَلْ
بَلٰى	بَلٰى
بلاء	ب ل و
بلاد	ب ل د
بلاغ	بلغ
بلد	ب ل د
بلدة	,,
بلغ	ب ل غ
بلغا	,,
بلغت	,,
بلغن	,,
بلغنا	,,
بلغوا	,,
بلونا	ب ل و
بَلِّغْ	ب ل غ
بنى	ب ن ى
بناء	,,
بنات	ب ن و- ى
بنان	ب ن ن
بنوا	ب ن ى
بنون	ب ن و
بنى	ب ن و
بنى اسرائيل	بنى اسرائيل

لفظ	ماده
بنیان	ب ن ی
بنی	,,
بنینا	,,
بوأ	ب و أ
بوانا	,,
بوار	ب و ر
بور	,,
بورك	ب ر ك
بهت	ب ه ت
بهتان	ب ه ت
بهجة	ب ه ج
بهیج	,,
بهیمة	ب ه م
بیات	ب ی ت
بیان	ب ی ن
بیت	ب ی ت
بیض	ب ی ض
بیضاء	,,
بیع	ب ی ع
بین	ب ی ن
بین ایدی	,, + ی د ی
بینا	,,
بینات	,,
بینة	ب ی ن
بینوا	,,
بیوت	ب ی ت

ت

لفظ	ماده
ت	ت
تائب	ت و ب
تائبات	,,
تائبون	,,
تاب	,,
تابا	,,
تأبی	أ ب ی
تابع	ت ب ع
تابعین	,,
تابوا	ت و ب
تابوت	تابوت
تاتنی	ا ت ی
تاتوا	,,
تاتون	ا ت ی
تاتي	,,
توثرون	ا ث ر
تاثیم	ا ث م
تاجر	ا ج ر
تاجیل	أ ج ل
تاخذ	ا خ ذ
تاخذوا	,,
تاخذون	,,
تاخر	ا خ ر
تودوا	ا د ی
تاذن	ا ذ ن
تارة	ت و ر
تارك	ت ر ك
تاركوا	ت ر ك
تؤز	أ ز ز
تاس	ا س و
تاسرون	ا س ر
تاسوا	ا س و
تافك	ا ف ك
تاكل	ا ك ل
تاكلوا	,,
تاكلون	,,
تالمون	ا ل م
تالیات	ت ل و
تامر	ا م ر
تامرون	,,

لفظ	ماده
تامرين	ا م ر
تامن	ا م ن
تاويل	ا و ل
تُبْ	ت و ب
تَبَّ	ت ب ب
تباب	,,
تبار	ت ب ر
تبارك	ب ر ك
تباشروا	ب ش ر
تبايعتم	ب ی ع
تُبْتُ	ت و ب
تَبَّتْ	ت ب ب
تبتئس	ب أ س
تبتم	ت و ب
تبتغون	ب غ ی
تبتغي	,,
تبتل	ب ت ل
تبتيل	ب ت ل
تبخسوا	ب خ س
تبخلوا	ب خ ل
تبد	ب د و
تبدل	ب د ل
تبدوا	ب د و
تبدون	ب د و
تبدى	,,
تبديل	ب د ل

لفظ	ماده
تبذر	ب ذ ر
تبذير	,,
تبرأ	ب ر أ
تبرئ	,,
تبرأنا	,,
تبرءوا	,,
تبرج	ب ر ج
تبرجن	,,
تبرنا	ت ب ر
تبروا	ب ر ر
تبسط	ب س ط
تبسل	ب س ل
تبسم	ب س م
تبشر	ب ش ر
تبشرون	,,
تبصر	ب ص ر
تبصرة	,,
تبصرون	,,
تبطلوا	ب ط ل
تبع	ت ب ع
تبعثون	ب ع ث
تبعوا	ت ب ع
تبغ	ب غ ی
تبغوا	,,
تبغون	,,

لفظ	ماده
تبغي	ب غ ی
تبقي	ب ق ی
تبكون	ب ك ی
تبلى	ب ل و
تبلغ	ب ل غ
تبلغوا	,,
تبلوا	ب ل و
تبلون	,,
تبنون	ب ن ی
تبوء	ب و ء
تبوءا	,,
تبوءوا	,,
تبور	ب و ر
تبهت	ب ه ت
تبيان	ب ی ن
تبيد	ب ی د
تبيض	ب ی ض
تبيع	ت ب ع
تبين	ب ی ن
تبينت	,,
تبينوا	,,
تتبدلوا	ب د ل
تتبع	ت ب ع
تتبعان	ت ب ع

لفظ	مادہ	لفظ	مادہ	لفظ	مادہ
تحزنی	ح ز ن	تحید	ح ی د	تخسروا	خ س ر
تحس	ح س س	تحیطوا	ح و ط	تخسیر	خ س ر
تحسب	ح س ب	تحیون	ح ی ی	تخشی	خ ش ی
تحسبون	,,	تحیی	ح ی ی	تخشع	خ ش ع
تحسدون	ح س د	تخاصم	خ ص م	تخشوا	خ ش ی
تحسسوا	ح س س	تخاطب	خ ط ب	تخضعن	خ ض ع
تحسنوا	ح س ن	تخاف	خ و ف	تخط	خ ط ط
تحسون	ح س س	تخافا	,,	تخطف	خ ط ف
تحشرون	ح ش ر	تخافت	خ ف ت	تخفی	خ ف ی
تحصن	ح ص ن	تخافون	خ و ف	تخفوا	,,
تحصنون	,,	تخافی	,,	تخفون	,,
تحصوا	ح ص ی	تخالطوا	خ ل ط	تخفی	,,
تحط	ح و ط	تخبت	خ ب ت	تخفیف	خ ف ف
تحکم	ح ك م	تختانون	خ و ن	تخلت	خ ل و
تحکمون	,,	تختصموا	خ ص م	تخلدون	خ ل د
تحل	ح ل ل	تختصمون	,,	تخلف	خ ل ف
تحلوا	,,	تختلفون	خ ل ف	تخلق	خ ل ق
تحلة	,,	تخر	خ ر ر	تخلقون	,,
تحلقوا	ح ل ق	تخرج	خ ر ج	تخوف	خ و ف
تحمل	ح م ل	تخرجون	,,	تخونون	خ و ن
تحملون	,,	تخرصون	خ ر ص	تخویف	خ و ف
تحنث	ح ن ث	تخرق	خ ر ق	تخیرون	خ ی ر
تحویل	ح و ل	تخزون	خ ز ی	تدارك	د ر ك
تحیة	ح ی ی	تخز	,,	تداینتم	د ی ن

لفظ	ماده
تدخرون	ذ خ ر
تدخل	د خ ل
تدخلوا	،،
تدرسون	د ر س
تدرك	د ر ك
تدرون	د ر ی
تدري	،،
تدع	د ع و
تدعی	،،
تدعوا	،،
تدعون	،،
تدلی	د ل و
تدلوا	،،
تدمر	د م ر
تدمیر	،،
تدور	د و ر
تدهن	د ه ن
تديرون	د و ر
تذبحوا	ذ ب ح
تذر	و ذ ر
تذرن	،،
تذروا	ذ ر و
تذرون	و ذ ر
تذکر	ذ ک ر
تذکرة	ذ ک ر
تذکرون	،،
تذکروا	،،
تذکیر	،،
تذل	ذ ل ل
تذلیل	،،
تذودان	ذ و د
تذوقوا	ذ و ق
تذهب	ذ ه ب
تذهبوا	،،
تذهبون	،،
تذهل	ذ ه ل
تر	ر أ ی
تری	،،
ترآء	،،
ترآئب	ت ر ب
ترآءت	ر أ ی
تراب	ت ر ب
تراث	و ر ث
تراض	ر ض ی
تراضوا	،،
تراضیتم	،،
تراقي	رق ی-رق و
تراود	ر و د
تربص	ر ب ص
تربصتم	ر ب ص
تربصوا	،،
تربصون	،،
ترتابوا	ر ی ب
ترتدوا	ر د د
ترتیل	ر ت ل
ترثوا	و ر ث
ترجع	ر ج ع
ترجعون	،،
ترجف	ر ج ف
ترجمون	ر ج م
ترجو	ر ج و
ترجون	،،
ترجی	،،
ترحم	ر ح م
ترحمون	،،
ترد	ر د د
تردی	ر د ی
تردن	ر و د
تردون	ر د د
تردین	ر د ی
ترزق	ر ز ق
ترزقان	،،
ترضی	ر ض ی

لفظ	ماده
ترضع	ر ض ع
ترضون	ر ض ی
ترغبون	ر غ ب
ترفع	ر ف ع
ترفعوا	,,
ترق	ر ق ی
ترقب	ر ق ب
ترک	ت ر ک
ترکب	ر ک ب
ترکبون	,,
ترکبوا	,,
ترکت	ت ر ک
ترکتم	,,
ترکتموا	,,
ترکضوا	ر ک ض
تَرَکْنَ	ت ر ک
تَرْکَنُ	ر ک ن
ترکنا	ت ر ک
ترکنوا	ر ک ن
ترکوا	ت ر ک
ترمی	ر م ی
ترون	ر أ ی
ترهبون	ر ه ب
ترهق	ر ه ق
تری	ر أ ی
تریحون	ر و ح
ترید	ر و د
تریدون	,,
ترین	ر أ ی
تزال	ز و ل
تزاور	ز و ر
تزد	ز ی د
تزداد	,,
تزدری	ز ر ی
تزر	و ز ر
تزرعون	ز ر ع
تزعمون	ز ع م
تزغ	ز ی غ
تزکی	ز ک و
تزکو	,,
تزل	ز ل ل
تزودوا	ز و د
تزول	ز و ل
تزولا	,,
تزهق	ز ه ق
تزیدون	ز ی د
تزیلوا	ز ی ل
تساءلون	س أ ل
تساقط	س ق ط
تسأل	س أ ل
تسالون	,,
تسأموا	س أ م
تسبح	س ب ح
تسبحون	,,
تسبق	س ب ق
تسبوا	س ب ب
تسبیح	س ب ح
تستأخرون	ا خ ر
تستأنسوا	ا ن س
تستبدلون	ب د ل
تستبین	ب ی ن
تسترون	س ت ر
تستجیبون	ج و ب
تستخرجون	خ ر ج
تستخفون	خ ف ف
تسترضعوا	ر ض ع
تستطع	ط و ع
تستطیع	,,
تستطیعون	,,
تستعجل	ع ج ل
تستعجلون	,,

لفظ	ماده
تستعجلوا	ع ج ل
تستغفر	غ ف ر
تستغفرون	,,
تستغیثون	غ و ث
تستفت	ف ت ی
تستفتحوا	ف ت ح
تستفتیان	ف ت ی
تستقدمون	ق د م
تستقسموا	ق س م
تستکبرون	ک ب ر
تستکثر	کثر
تستمعون	س م ع
تستووا	س و ی
تستوی	,,
تستهزءون	ه ز أ
تسجد	س ج د
تسجدوا	,,
تسحر	س ح ر
تسحرون	,,
تسخرون	س خ ر
تسر	س ر ر
تسرحون	س ر ح
تسرقوا	س ر ق
تسرون	س ر ر
تسریح	س ر ح
تسع	ت س ع
تسعة	,,
تسعة عشر	,,+ع ش ر
تسعون	,,
تسعی	س ع ی
تسفکون	س ف ک
تسقط	س ق ط
تسقی	س ق ی
تسکن	س ک ن
تسکنون	,,
تسلکوا	س ل ک
تسلموا	س ل م
تسلیم	,,
تسمع	س م ع
تسمعون	,,
تسمی	س م و
تسمیة	,,
تسنیم	س ن م
تسوء	س و ء
تسوی	س و ی
تسود	س و د
تسوروا	س و ر
تسیر	س ی ر
تسیمون	س و م
تشاء	ش ی أ
تشاؤن	,,
تشابه	ش ب ه
تشابهت	,,
تشاقون	ش ق ق
تشاور	ش و ر
تشتروا	ش ر ی
تشتکی	ش ک و
تشتهی	ش ه و
تشخص	ش خ ص
تشربون	ش ر ب
تشرک	ش ر ک
تشرکون	,,
تشطط	ش ط ط
تشعرون	ش ع ر
تشقی	ش ق ی
تشقق	ش ق ق
تشکرون	ش ک ر
تشمت	ش م ت
تشهد	ش ه د
تشهدون	,,
تشیع	ش ی ع
تصاحب	ص ح ب

لفظ	مادہ
تصبح	ص ب ح
تصبحون	,,
تصبر	ص ب ر
تصبرون	ص ب ر
تصدی	ص د ی
تصدق	ص د ق
تصدقوا	,,
تصدقون	,,
تصدون	ص د د
تصدیة	ص د ی
تصدیق	ص د ق
تصرف	ص ر ف
تصرفون	,,
تصریف	,,
تصطلون	ص ل ی
تصعدون	ص ع د
تصعر	ص ع ر
تصغی	ص غ و
تصف	و ص ف
تصفحوا	ص ف ح
تصفون	و ص ف
تصلی	ص ل ی
تصلحون	ص ل ح
تصلِ	ص ل و
تصِلُ	و ص ل
تصلیة	ص ل ی
تصنع	ص ن ع
تصنعون	,,
تصوموا	ص و م
تصیب	ص و ب
تصیبوا	,,
تصیر	ص ی ر
تضار	ض ر ر
تضاروا	,,
تضحی	ض ح و
تضحکون	ض ح ک
تضربوا	ض ر ب
تضرع	ض ر ع
تضرعوا	,,
تضرون	ض ر ر
تضع	و ض ع
تضعون	,,
تضل	ض ل ل
تضلوا	,,
تضلیل	,,
تضیقوا	ض ی ق
تطئوا	و ط أ
تطاول	ط و ل
تطرد	ط ر د
تطع	ط و ع
تطعمون	ط ع م
تطغوا	ط غ ی
تطلع	ط ل ع
تطمئن	ط م ن
تطمعون	ط م ع
تطوع	ط و ع
تطهر	ط ه ر
تطهرن	,,
تطهیر	,,
تطیرنا	ط ی ر
تطیعوا	ط و ع
تظاهرا	ظ ه ر
تظاهرون	,,
تظلم	ظ ل م
تظلمون	,,
تظما	ظ م ا
تظن	ظ ن ن
تظنون	,,
تظهرون	ظ ه ر
تعارفو	ع ر ف
تعاسرتم	ع س ر
تعاطی	ع ط و
تعالیٰ	ع ل و

لفظ	مادہ	لفظ	مادہ	لفظ	مادہ
تعالوا	ع ل و	تعری	ع ر ی	تعملون	ع م ل
تعالین	,,	تعرج	ع ر ج	تعودوا	ع و د
تعاونوا	ع و ن	تعرض	ع ر ض	تعولوا	ع و ل
تعبثون	ع ب ث	تعرضوا	,,	تعی	و ع ی
تعبد تعبدوا	ع ب د ,,	تعرضون	,,	تغابن	غ ب ن
تعبدون	,,	تعرف	ع ر ف	تغتسلوا	غ س ل
تعبد	,,	تعرفون	,,	تغر	غ ر ر
تعبرون	ع ب ر	تعریف	,,	تغرب	غ ر ب
تعتدوا	ع د و	تعز	ع ز ز	تغرق	غ ر ق
تعتدون	ع د د	تعزروا	عز ر	تغشی	غ ش ی
تعتذرو	ع ذ ر	تعزموا	ع ز م	تغفر	غ ف ر
تعثو	ع ث ی	تعس	ت ع س	تغفروا	,,
تعجب	ع ج ب	تعضلوا	ع ض ل	تغفلون	غ ف ل
تعجبون	,,	تعظون	و ع ظ	تغلبون	غ ل ب
تعجبین	,,	تعفف	ع ف ف	تغلوا	غ ل و
تعجل	ع ج ل	تعفوا	ع ف و	تغمضوا	غ م ض
تَعْدُ	ع د و	تعقلون	ع ق ل	تغن	غ ن ی
تَعِدُ	و ع د	تعلم تعلموا	ع ل م	تغنی	,,
تعدان	,,	تعلمون تعلن	,, ع ل ن	تغیض	غ ی ض
تعدل	ع د ل	تعلنون	ع ل ن	تغیظ	غ ی ظ
تعدلوا	,,	تعلوا	ع ل و	تفاخر	ف خ ر
تعدوا	ع د و	تعمی	ع م ی	تفادون	ف د ی
تعدون	ع د د	تعمدت	ع م د	تفاوت	ف و ت
تعذب	ع ذ ب	تعمل	ع م ل	تفتئو	ف ت أ

لفظ	ماده
تفتح	ف ت ح
تفترون	ف ر ی
تفتری	,,
تفتن	ف ت ن
تفتنون	,,
تفث	ت ف ث
تفجر	ف ج ر
تفجیر	,,
تفرح	ف ر ح
تفرحوا	,,
تفرضوا	ف ر ض
تفرق	ف ر ق
تفرقوا	,,
تفرون	ف ر ر
تفریق	ف ر ق
تفسحوا	ف س ح
تفسدون	ف س د
تفسقون	ف س ق
تفسیر	ف س ر
تفشلا	ف ش ل
تفشلوا	,,
تفصیل	ف ص ل
تفضحوا	ف ض ح
تفضیل	ف ض ل

لفظ	ماده
تفعل	ف ع ل
تفعلون	,,
تفقد	ف ق د
تفقدون	,,
تفقهون	ف ق ه
تفکهون	ف ک ه
تفلحون	ف ل ح
تفندوا	ف ن د
تفور	ف و ر
تفيء	ف ی أ
تفیض	ف ی ض
تفیضون	,,
تقاة	و ق ی
تقاتل	ق ت ل
تقاتلون	,,
تقاسموا	ق س م
تقبل	ق ب ل
تقبلوا	,,
تقتل	ق ت ل
تقتلون	,,
تقتیل	,,
تقدروا	ق د ر
تقدیر	,,
تقدم	ق د م

لفظ	ماده
تقدموا	ق د م
تقر	ق ر ر
تقرأ	ق ر أ
تقرب	ق ر ب
تقربا	,,
تقربوا	,,
تقربون	,,
تقرض	ق ر ض
تقرضوا	,,
تقسطوا	ق س ط
تقسموا	ق س م
تقشعر	ق ش ع ر
تقصروا	ق ص ر
تقصص	ق ص ص
تقضي	ق ض ی
تقطع	ق ط ع
تقطعت	,,
تقطعوا	,,
تقطعون	,,
تقع	و ق ع
تقعد	ق ع د
تقعدوا	,,
تقف	ق ف و
تقلب	ق ل ب

لفظ	مادہ	لفظ	مادہ	لفظ	مادہ
تقلبون	ق ل ب	تکرمون	ک ر م	تلذ	ل ذ ذ
تقم	ق و م	تکرہ	ک ر ہ	تلظی	ل ظ ی
تقنطوا	ق ن ط	تکرھون	,,	تلفت	ل ف ت
تقوی	و ق ی	تکسب	ک س ب	تلفح	ل ف ح
تقول	ق و ل	تکسبون	,,	تلقاء	ل ق ی
تقولون	,,	تکفر	ک ف ر	تلقی	,,
تقوم	ق و م	تکفرون	,,	تلقف	ل ق ف
تقوموا	,,	تکلف	ک ل ف	تلقوا	ل ق ی
تقویم	,,	تکلم	ک ل م	تلقون	,,
تقھر	ق ہ ر	تکلمون	,,	تلک	ذلك
تقي	و ق ی	تکلیم	,,	تلکما	,,
تقیموا	ق و م	تکملوا	ک م ل	تلکم	,,
تَكُ	ک و ن	تکن	ک ن ن۔ك و ن	تلمزو	ل م ز
تکاثر	ک ث ر	تکنزون	ک ن ز	تلوت	ت ل و
تکاد	ک و د	تکوی	ک و ی	تلومون	ل و م
تکبروا	ک ب ر	تکون	ک و ن	تلوون	ل و ی
تکبیر	,,	تکونا	,,	تلھی	ل ہ و
تکتب	ک ت ب	تکونون	,,	تلیت	ت ل و
تکتبوا	,,	تل	ت ل ل	تلین	ل ی ن
تکتموا	ک ت م	تلی	ت ل و	تم	ت م م
تکتمون	,,	تلاق	ل ق ی	تماثیل	م ث ل
تکذبان	ک ذ ب	تلاوۃ	ت ل و	تمار	م ر ی
تکذبون	,,	تلبثوا	ل ب ث	تماروا	,,
تکذیب	,,	تلبسون	ل ب س	تمارون	,,

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
تنظرون	ن ظ ر	تنهی	ن ه ی	توصية	و ص ی
تنفخ	ن ف خ	تنیا	و ن ی	توعدون	و ع د
تنفد	ن ف د	تواب	ت و ب	توعظون	و ع ظ
تنفذون	ن ف ذ	توابین	,,	توف	و ف ی
تنفروا	ن ف ر	تؤاخذ	أ خ ذ	توف	,,
تنفس	ن ف س	توارت	و ر ی	توفت	,,
تنفع	ن ف ع	تواصوا	و ص ی	تؤفکون	ا ف ك
تنفقون	ن ف ق	تواعدتم	و ع د	توفون	و ف ی
تنقذ	ن ق ذ	تواعدون	,,	توفیت	,,
تنقص	ن ق ص	توب	ت و ب	توفیق	و ف ق
تنقصوا	,,	توبة	,,	توقدون	و ق د
تنقضوا	ن ق ض	توبوا	,,	توقروا	و ق ر
تنقلبوا	ق ل ب	تونؤن	ا ت ی	توقنون	ی ق ن
تنقم	ن ق م	تونی	,,	توکل	و ک ل
تنقمون	,,	تؤثرون	ا ث ر	توکلت	,,
تنکح	ن ک ح	توجل	و ج ل	توکلنا	,,
تنکحوا	,,	توجه	و ج ه	توکلوا	,,
تنکرون	ن ک ر	تود	و د د	توکید	و ک د
تنکصون	ن ک ص	تودون	,,	تول	و ل ی
تنکیل	ن ک ل	تؤذون	ا ذ ی	تولی	,,
تنوء	ن و ء	تورون	و ر ی	تولوا	,,
تنور	ت ن و ر	تورته	تورات	تولون	,,
تنهر	ن ه ر	توسوس	و س و س	تولیتم	,,
تنهون	ن ه ی	توصون	و ص ی	تومر	ا م ر

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
تومرون	ا م ر	تهتز	ه ز ز	تهنوا	و ه ن
تومن	ا م ن	تهجد	ه ج د	تهوی	ه و ی
تومنون	,,	تهجرون	ه ج ر	تیئسوا	ی أ س
تووی	ا و ی	تهدوا	ه د ی	تیسر	ی س ر
تهاجروا	ه ج ر	تهدی	,,	تیمموا	ی م م
تهتدون	ه د ی	تهلک	ه ل ک	تین	ت ی ن
تهتدی	,,	تهلکة	,,		

ث

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ثابت	ث ب ت	ثجاج	ث ج ج	ثلثی	ث ل ث
ثاقب	ث ق ب	ثری	ث ر ی	ثُمّ	ثُمّ
ثالث	ث ل ث	ثعبان	ث ع ب	ثَمّ	ثَمّ
ثالثة	,,	ثقل	ث ق ل	ثمانی	ث م ن
ثامن	ث م ن	ثقفتموا	ث ق ف	ثمانیة	,,
ثانی	ث ن ی	ثقفوا	,,	ثمانین	,,
ثاوی	ث و ی	ثقلان	ث ق ل	ثمر	ث م ر
ثبات	ث ب ی	ثقلت	,,	ثمرة	,,
ثبت	ث ب ت	ثقیل	,,	ثمن	ث م ن
ثبتنا	,,	ثلاث	ث ل ث	ثمود	ث م د
ثبتوا	,,	ثلثون	,,	ثواب	ث و ب
ثبط	ث ب ط	ثلة	ث ل ل	ثوب	,,
ثبوت	ث ب ت	ثلث	ث ل ث	تثریب	ث ر ب
ثبور	ث ب ر	ثلثان	,,	ثیاب	ث و ب
				ثیبات	ث ی ب

ج

لفظ	ماده
جرم	ج ر م
جروح	ج ر ح
جرین	ج ر ی
جزء	ج ز أ
جزاء	ج ز ی
جزعنا	ج ز ع
جزوع	,,
جزیت	ج ز ی
جزیة	,,
جسد	ج س د
جسم	ج س م
جعل	ج ع ل
جعلا	,,
جعلت	,,
جعلتم	,,
جعلنا	,,
جعلوا	,,
جفاء	ج ف و
جفان	ج ف ن
جلاء	ج ل و
جلی	,,
جلابیب	ج ل ب
جلال	ج ل ل
جلدة	ج ل د

لفظ	ماده
جم	ج م م
جمال	ج م ل
جمالة	,,
جمع	ج م ع
جمعان	,,
جمعة	,,
جمعنا	,,
جمعوا	,,
جمل	ج م ل
جملة	,,
جمیع	ج م ع
جمیل	ج م ل
جن	ج ن ن
جنا	ج ن ی
جنات	ج ن ن
جناح	ج ن ح
جناحی	,,
جنبه	ج ن ب
جنة	ج ن ن
جنتان	,,
جنحوا	ج ن ح
جند	ج ن د
جنف	ج ن ف
جنوب	ج ن ب

لفظ	ماده
جنود	ج ن د
جنی	ج ن ی
جو	ج و و
جواب	ج و ب-ج ب ی
جوار	ج ر ی
جوارح	ج ر ح
جودی	ج و د
جوع	ج و ع
جوف	ج و ف
جهاد	ج ه د
جهار	ج ه ر
جهاز	ج ه ز
جهالة	ج ه ل
جهد	ج ه د
جهر	ج ه ر
جهرة	,,
جهز	ج ه ز
جهنم	جهنم
جهول	ج ه ل
جیاد	ج و د
جیب	ج ی ب
جید	ج ی د
جیوب	ج ی ب
جیء	ج ی أ

ح

لفظ	ماده
حاج	ح ج ج
حاجة	ح و ج
حاججتم	ح ج ج
حاجز	ح ج ز
حاجزین	,,
حاجوا	ح ج ج
حاد	ح د د
حاذرون	ح ذ ر
حارب	ح ر ب
حاسبنا	ح س ب
حاسبین	,,
حاسد	ح س د
حاش	ح ا ش
حاشرین	ح ش ر
حاصب	ح ص ب
حاضرة	ح ض ر
حاضری	,,
حافرة	ح ف ر
حافظ	ح ف ظ
حافظات	,,
حافظوا	,,
حافظون	,,

لفظ	ماده
حافین	ح ف ف
حاق	ح ی ق
حاقة	ح ق ق
حاکمین	ح ک م
حال	ح و ل
حام	ح م ی
حامدون	ح م د
حاملات	ح م ل
حاملین	,,
حامیة	ح م ی
حب	ح ب ب
حبال	ح ب ل
حبیب	ح ب ب
حبة	,,
حبط	ح ب ط
حبطت	,,
حبك	ح ب ك
حبل	ح ب ل
حتی	حتّی
حتم	ح ت م
حثیثا	ح ث ث
حج	ح ج ج

لفظ	ماده
حجاب	ح ج ب
حجارة	ح ج ر
حجة	ح ج ج
حجج	,,
حجر	ح ج ر
حجرات	,,
حجور	,,
حدائق	ح د ق
حداد	ح د د
حدب	ح د ب
حدث	ح د ث
حدود	ح د د
حدیث	ح د ث
حدید	ح د د
حذر	ح ذ ر
حر	ح ر ر
حرام	ح ر م
حرب	ح ر ب
حرث	ح ر ث
حرج	ح ر ج
حرد	ح ر د
حرس	ح ر س

لفظ	ماده
حرصت	ح ر ص
حرصتم	,,
حرض	ح ر ض
حرف	ح ر ف
حرقوا	ح ر ق
حرم	ح ر م
حرمات	,,
حرمت	,,
حرمنا	,,
حرموا	,,
حرور	ح ر ر
حرير	,,
حريص	ح ر ص
حريق	ح ر ق
حزب	ح ز ب
حزين	,,
حزن	ح ز ن
حساب	ح س ب
حسابيه	,,
حسان	ح س ن
حسب	ح س ب
حسبان	,,
حسبت	,,
حسبتم	,,
حسبوا	ح س ب
حسد	ح س د
حسرات	ح س ر
حسرة	,,
حسرتی	,,
حسن	ح س ن
حسنی	,,
حسنات	,,
حسنة	,,
حسنت	,,
حسنيين	,,
حسوم	ح س م
حسيب	ح س ب
حسير	ح س ر
حسيس	ح س س
حشر	ح ش ر
حشرت	,,
حشرنا	,,
حصاد	ح ص د
حصب	ح ص ب
حصحص	ح ص ص (حصحص)
حصدتم	ح ص د
حصرت	ح ص ر
حصل	ح ص ل
حصور	ح ص ر
حصون	ح ص ن
حصيد	ح ص د
حصير	ح ص ر
حضر	ح ض ر
حضروا	,,
حطام	ح ط م
حطب	ح ط ب
حطة	ح ط ط
حطمة	ح ط م
حظ	ح ظ ظ
حفدة	ح ف د
حفرة	ح ف ر
حفظ	ح ف ظ
حفظة	,,
حفظنا	,,
حففنا	ح ف ف
حفي	ح ف ی
حفيظ	ح ف ظ
حق	ح ق ق
حق اليقين	ح ق ق + ی ق ن
حقب	ح ق ب
حقت	ح ق ق
حقيق	,,

لفظ	ماده
حکام	ح ک م
حکم	,,
حکمة	,,
حکمت	,,
حکمتم	,,
حکیم	,,
حل	ح ل ل
حلائل	,,
حلاف	ح ل ف
حلال	ح ل ل
حلفتم	ح ل ف
حلقوم	ح ل ق
حللتم	ح ل ل
حلم	ح ل م
حلوا	ح ل ی
حلي	,,
حلیة	,,
حلیم	ح ل م
حمأ	ح م أ
حمار	ح م ر
حمالة	ح م ل
حمئة	ح م أ
حمد	ح م د
حمر	ح م ر
حمل	ح م ل
حملت	,,
حملتم	,,
حملنا	,,
حملوا	,,
حمولة	,,
حمیة	ح م ی
حمید	ح م د
حمیر	ح م ر
حمیم	ح م م
حناجر	ح ن ج ر
حنان	ح ن ن
حنث	ح ن ث
حنفاء	ح ن ف
حنیذ	ح ن ذ
حنیف	ح ن ف
حنین	ح ن ن
حواري	ح و ر
حوایا	ح و ی
حوب	ح و ب
حوت	ح و ت
حور	ح و ر
حول	ح و ل
حولین	,,
حي	ح ی ی
حیوة	,,
حیة	,,
حیتان	ح و ت
حیث	حَيْثُ
حیثما	,,
حیران	ح ی ر
حیل	ح و ل
حیلة	,,
حین	ح ی ن
حینئذ	حین+اذ
حیوا	ح ی ی
حیوان	,,
حیوك	,,
حییتم	,,

خ

لفظ	ماده
خائبین	خ ی ب
خائضین	خ و ض
خائف	خ و ف
خائفین	,,
خائنة	خ و ن
خائنین	,,

لفظ	ماده
خاب	خ ی ب
خاتم	خ ت م
خادع	خ د ع
خارج	خ ر ج
خارجین	,,
خازنین	خ ز ن
خاسیٔ	خ س أ
خاسئین	,,
خاسرة	خ س ر
خاسرون	,,
خاشع	خ ش ع
خاشعات	,,
خاشعة	,,
خاشعون	,,
خاصة	خ ص ص
خاضعین	خ ض ع
خاضوا	خ و ض
خاطئة	خ ط أ
خاطئون	,,
خاطبه	خ ط ب
خاف	خ و ف
خافت	,,
خافضة	خ ف ض
خافوا	خ و ف

لفظ	ماده
خافیة	خ ف ی
خال	خ و ل
خالات	,,
خالد	خ ل د
خالدین	,,
خالص	خ ل ص
خالصة	,,
خالفین	خ ل ف
خالق	خ ل ق
خالقون	,,
خالقین	,,
خالیة	خ ل و
خامدون	خ م د
خامسة	خ م س
خائنا	خ و ن
خانوا	,,
خاویة	خ و ی
خبأ	خ ب أ
خبائث	خ ب ث
خبال	خ ب ل
خبت	خ ب و
خبث	خ ب ث
خبر	خ ب ر
خبز	خ ب ز

لفظ	ماده
خبیث	خ ب ث
خبیثة	,,
خبیثون	,,
خبیر	خ ب ر
ختار	خ ت ر
ختام	خ ت م
ختم	,,
خد	خ د د
خذ	ا خ ذ
خذوا	,,
خذول	خ ذ ل
خر	خ ر ر
خراب	خ ر ب
خراج	خ ر ج
خراصون	خ ر ص
خرج	خ ر ج
خرجت	,,
خرجتم	,,
خرجن	,,
خرجنا	,,
خرجوا	,,
خردل	خ ر د ل
خرطوم	خ ر ط م
خرق	خ ر ق

لفظ	مادہ
خمسة	خ م س
خمسين	,,
خمط	خ م ط
خنازير	خنزير
خناس	خ ن س
خنزير	خنزير
خنس	خ ن س
خوار	خ و ر
خوالف	خ ل ف

لفظ	مادہ
خوان	خ و ن
خوض	خ و ض
خوف	خ و ف
خول	خ و ل
خولنا	,,
خياط	خ ی ط
خيام	خ ی م
خيانة	خ و ن

لفظ	مادہ
خير	خ ی ر
خيرات	,,
خيرة	,,
خيط	خ ی ط
خيط الابيض	خ ی ط + ب ی ض
خيط الاسود	خ ی ط + س و د
خيفة	خ و ف
خيل	خ ی ل

د

لفظ	مادہ
دآئبين	د أ ب
دآئرة	د و ر
دآئم	د و م
دآئمون	,,
داود	داود
دأب	د أ ب
دأبا	,,
دابة	د ب ب
دابر	د ب ر
داحضة	د ح ض
داخرون	د خ ر
داخرين	,,
داخلون	د خ ل

لفظ	مادہ
دار	د و ر
داع	د ع و
داعی	,,
دافع	د ف ع
دافق	د ف ق
ماء دافق	م و ه + د ف ق
دامت	د و م
دامو	,,
دان	د ن و
دانية	,,
دبر	د ب ر
دحی	د ح و - ی
دحورا	د ح ر

لفظ	مادہ
دخان	د خ ن
دخل	د خ ل
دخلت	,,
دخلتم	,,
دخلتموا	,,
دخلوا	,,
دخول	,,
دراسة	د ر س
دراهم	د ر ه م
درجات	د ر ج
درجة	,,
درست	د ر س
درسوا	,,

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
درك	د ر ك	دفء	د ف أ	دمدم	د م د م
دری	د ر ر	دفع	د ف ع	دمر	د م ر
دسی	دس‌س(دس‌و)	دفعتم	,,	دمع	د م ع
دسر	د س ر	دك	د ك ك	دنی	د ن و
دُعَ	و د ع	دكاء	,,	دنيا	,,
دُعّ	د ع ع	دكت	,,	دوآئر	د و ر
دعا	د ع و	دكة	,,	دواب	د ب ب
دعاء	,,	دكتا	,,	دولة	د و ل
دعائی	,,	دل	د ل ل	دون	د و ن
دعوا	,,	دلی	د ل و	دهاق	د ه ق
دعوی	,,	دلو	,,	دهان	د ه ن
دعوة	,,	دلوك	د ل ك	دهر	د ه ر
دعوت	,,	دليل	د ل ل	دهن	د ه ن
دعوتم	,,	دم	د م و	ديار	د و ر
دعوتموا	,,	دماء	,,	دية	و د ی
دعي	,,	دمت	د و م	دين	د ی ن
دعيتم	,,	دمتم	,,	دينار	د ن ر

ذ

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ذا	ذ ا	ذئب	ذ أ ب	ذاقوا	ذ و ق
ذا	ذ و	ذات	ذ و	ذاك	ذ ا
ذا النون	ذا النون	ذاريات	ذ ر و	ذاكرات	ذ كر
ذائقة	ذ و ق	ذاقا	ذ و ق	ذاكرين	,,
ذآئقون	,,	ذاقت	,,	ذالک	ذا

لفظ	ماده
ذلکم	ذ ا
ذلکما	,,
ذلکن	,,
ذان	,,
ذانک	,,
ذاهب	ذ ه ب
ذهاب	ذ ه ب
ذبح	ذ ب ح
ذبحوا	,,
ذر	و ذ ر
ذرنی	,,
ذرأ	ذ ر أ
ذرأنا	,,
ذراع	ذ ر ع
ذراعی	,,
ذرة	ذ ر ر
ذرع	ذ ر ع
ذَرُوا	ذ ر و
ذَرُوا	و ذ ر

لفظ	ماده
ذریة	ذ ر ر (ذری)
ذریات	,,
ذق	ذ و ق
ذکر	ذ ک ر
ذکری	,,
ذکران	,,
ذکرت	,,
ذکرتم	,,
ذکروا	,,
ذکرین	,,
ذکور	,,
ذکیتم	ذ ک و
ذل	ذ ل ل
ذلة	,,
ذلل	,,
ذللت	,,
ذللنا	,,
ذلول	,,

لفظ	ماده
ذمة	ذ م م
ذنب	ذ ن ب
ذنوب	,,
ذو	ذ و
ذوالکفل	ذوالکفل
ذوالقرنین	ذوالقرنین
ذوا	ذ و
ذواتا	,,
ذواتی	,,
ذوقوا	ذ و ق
ذوی	ذ و
ذه	ذ ا
ذهاب	ذهب
ذهب	,,
ذهبت	,,
ذهبنا	,,
ذهبوا	,,
ذي	ذ و

ر

لفظ	ماده
رابطوا	ر ب ط
رابع	ر ب ع
رابیا	ر ب و
رابیة	ر ب و
رأت	ر أ ی
راجعون	ر ج ع
راجفة	ر ج ف
راحمین	ر ح م
راد	ر د د

لفظ	ماده
رادفة	ر د ف
رادو	ر د د
رادي	,,
رازقين	ر ز ق
رأس	ر أ س
رءوس	,,
راسخون	ر س خ
راسيات	ر س و
راشدون	ر ش د
راضية	ر ض ی
راعنا	رعن(رعی)
راعون	ر ع ی
راغ	ر و غ
راغب	ر غ ب
راغبون	,,
رافة	ر أ ف
رافع	ر ف ع
رافعة	,,
راق	ر ق ی
راكع	ر ك ع
راكعون	,,
ران	ر ی ن
رأوا	ر أ ی
راودت	ر و د

لفظ	ماده
راودتن	ر و د
راودوا	,,
رؤس	ر أ س
رءوف	ر أ ف
راي	ر أ ی
رئى	,,
رويا	,,
رايت	,,
رايتم	,,
رايتموا	,,
راين	,,
رب	ر ب ب
ربو	ر ب و
ربائب	ر ب ب
رباط	ر ب ط
رباع	ر ب ع
ربانيون	ر ب ب
ربانيين	,,
ربت	ر ب و
ربحت	ر ب ح
ربطنا	ر ب ط
ربع	ر ب ع
ربما	رب
ربوة	ر ب و

لفظ	ماده
ربيا	ر ب و
ربيون	ر ب ب
رتق	ر ت ق
رتل	ر ت ل
رتلنا	,,
رج	ر ج ج
رجال	ر ج ل
رجت	ر ج ج
رجز	ر ج ز
رجس	ر ج س
رجع	ر ج ع
رجعى	,,
رجعت	,,
رجعتم	,,
رجعنا	,,
رجعوا	,,
رجفة	ر ج ف
رجل	ر ج ل
رجلان	,,
رجلين	,,
رجم	ر ج م
رجمنا	,,
رجوع	ر ج ع
رجوم	ر ج م

لفظ	ماده
رجيم	ر ج م
رحال	ر ح ل
رحبت	ر ح ب
رحل	ر ح ل
رحلة	,,
رحما	ر ح م
رحم	,,
رحماء	,,
رحمة	ر ح م
رحمن	,,
رحمنا	,,
رحيق	ر ح ق
رحيم	ر ح م
رخاء	ر خ و
رد	ر د د
رداً	ر د أ
ردت	ر د د
رددت	,,
رددنا	,,
ردف	ر د ف
ردم	ر د م
ردوا	ر د د
ردوا	,,
رزاق	ر ز ق

لفظ	ماده
رزق	ر ز ق
رزقنا	,,
رزقوا	,,
رس	ر س س
رسالة	ر س ل
رسل	,,
رسول	,,
رشاد	ر ش د
رشد	,,
رشيد	,,
رصد	ر ص د
رضاعة	ر ض ع
رضوا	ر ض ی
رضوان	,,
رضي	,,
رضيت	,,
رضيتم	,,
رطب	ر ط ب
رعاء	ر ع ی
رعاية	,,
رعب	ر ع ب
رعد	ر ع د
رعوا	ر ع ی
رغب	ر غ ب

لفظ	ماده
رغبت	ر غ ب
رغد	ر غ د
رفات	ر ف ت
رفث	ر ف ث
رفد	ر ف د
رفرف	ر ف ف
رفع	ر ف ع
رفعت	,,
رفعنا	,,
رفيق	ر ف ق
رفيع	ر ف ع
رق	ر ق ق
رقاب	ر ق ب
رقبة	,,
رقود	ر ق د
رقى	ر ق ی
رقيب	ر ق ب
رقيم	ر ق م
ركاب	ر ک ب
ركام	ر ک م
ركب	ر ک ب
ركبا	,,
ركبان	,,
ركبوا	,,

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ركز	ر ك ز	رواسی	ر س و	رهط	ر ه ط
ركع	ر ك ع	رواكد	ر ك د	رهق	ر ه ق
ركن	ر ك ن	روح	ر و ح	رهوا	ر ه و
ركوب	ر ك ب	روضات	ر و ض	رهين	ر ه ن
رمى	ر م ى	روضة	,,	رهينة	,,
رماح	ر م ح	روع	ر و ع	رئاء	ر أ ى
رماد	ر م د	روم	ر و م	رياح	ر و ح
رمان	ر م ن	رويدا	ر و د	ريب	ر ى ب
رمز	ر م ز	رهان	ر ه ن	ريبة	,,
				ريح	روح
رمضان	ر م ض	رهب	ر ه ب	ريحان	ر و ح
رميت	ر م ى	رهبان	,,	ريش	ر ى ش
رميم	ر م م	رهبانية	,,	ريع	ر ى ع
رواح	ر و ح	رهبة	,,		

ز

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
زاجرات	ز ج ر	زالتا	ز و ل	زجاجة	ز ج ج
زاد	ز ى د	زانى	ز ن ى	زجر	ز ج ر
زادت	,,	زانية	,,	زجرة	,,
زادوا	,,	زاهدين	ز ه د	زحزح	ز ح ز ح
زارعون	ز ر ع	زاهق	ز ه ق	زحف	ز ح ف
زاغ	ز ى غ	زبانية	ز ب ن	زخرف	ز خ ر ف
زاغت	,,	زبد	ز ب د	زد	ز ى د
زاغوا	,,	زبر	ز ب ر	زدنا	,,
زالت	ز و ل	زبور	,,	زرابى	ز ر ب

س

لفظ	ماده
سابقون	س ب ق
ساجد	س ج د
ساجدون	,,
ساحة	س ی ح
ساحر	س ح ر
ساحران	,,
ساحرون	,,
ساحل	س ح ل
ساخرین	س خ ر
سادة	س و د
سادس	س د س
سار	س ی ر
سارب	س ر ب
سارعوا	س ر ع
سارق	س ر ق
سارقة	,,
سارقون	,,
ساعة	س و ع، س ی ع
سافل	س ف ل
سافلین	,,
ساق	س و ق
ساقط	س ق ط
ساقی	س و ق
ساکن	س ک ن

لفظ	ماده
سال	س أ ل
سئل	,,
سألتَ	,,
سالَتْ	س ی ل
سئلت	س أ ل
سألتم	,,
سألتموا	,,
سالمون	س ل م
سألوا	س أ ل
سئلوا	,,
سامدون	س م د
سامر	س م ر
سامری	,,
سؤل	س أ ل
ساوی	س و ی
ساهرة	س ه ر
ساهم	س ه م
ساهون	س ه و
سبا	سبأ
سبات	س ب ت
سبب	س ب ب
سبت	س ب ت
سبح	س ب ح
سبحان	,,

لفظ	ماده
سبحوا	س ب ح
سبع	س ب ع
سبعة	,,
سبق	س ب ق
سبقت	س ب ق
سبقوا	,,
سبل	س ب ل
سبیل	,,
ستة	س ت ت
ستر	س ت ر
ستین	س ت ت
سجی	س ج و
سجد	س ج د
سجدا	,,
سجدوا	,,
سجرت	س ج ر
سجل	س ج ل
سجن	س ج ن
سجود	س ج د
سجیل	س ج ل
سجین	س ج ن
سحاب	س ح ب
سحابة	,,
سحار	س ح ر

لفظ	ماده
سحت	س ح ت
سحر	س ح ر
سحران	،،
سحرة	،،
سحروا	،،
سحق	س ح ق
سحيق	،،
سخر	س خ ر
سخرنا	،،
سخروا	،،
سخري	،،
سخط	س خ ط
سد	س د د
سدی	س د ی
سدر	س د ر
سدرة	،،
سدس	س د س
سديد	س د د
سدين	،،
سر	س ر ر
سراء	،،
سرائر	،،
سراب	س ر ب
سرابيل	س ر ب ل

لفظ	ماده
سراج	س ر ج
سراح	س ر ح
سرادق	س ر د ق
سراع	س ر ع
سرب	س ر ب
سرحوا	س ر ح
سرد	س ر د
سرر	س ر ر
سرق	س ر ق
سرمد	س ر م د
سرور	س ر ر
سری	س ر ی - و
سرير	س ر ر
سريع	س ر ع
سطحت	س ط ح
سعی	س ع ی
سعة	و س ع
سعدوا	س ع د
سعر	س ع ر
سعرت	،،
سعوا	س ع ی
سعي	،،
سعيد	س ع د
سعير	س ع ر

لفظ	ماده
سفاهة	س ف ه
سفر	س ف ر
سفرة	،،
سفلی	س ف ل
سفه	س ف ه
سفهاء	،،
سفينة	س ف ن
سفيه	س ف ه
سقی	س ق ی
سقاية	،،
سقر	س ق ر
سقط	س ق ط
سقطوا	،،
سقف	س ق ف
سقنا	س و ق
سقوا	س ق ی
سقيا	،،
سقيت	،،
سقيم	س ق م
سكاری	س ک ر
سكت	س ک ت
سكر	س ک ر
سكرة	،،
سكرت	،،

لفظ	مادہ	لفظ	مادہ	لفظ	مادہ
سهول	س ه ل	سيحوا	س ی ح	سيق	س و ق
سيءُ	س و ء	سيد	س و د	سيل	س ی ل
سيئات	,,	سير	س ی ر	سيما	س و م
سيئة	,,	سيرة	,,	سيناء	سيناء
سيئت	,,	سيرت	,,	سينين	سينين
سيارة	س ی ر	سيروا	,,		

ش

لفظ	مادہ	لفظ	مادہ	لفظ	مادہ
شاء	ش ی ء	شان	ش أ ن	شر	ش ر ر
شئت	,,	شانئُ	ش ن أ	شراب	ش ر ب
شئتما	,,	شاور	ش و ر	شرب	,,
شئتم	,,	شاهد	ش ه د	شربوا	,,
شئنا	,,	شاهدون	,,	شرح	ش ر ح
شاخصة	ش خ ص	شبه	ش ب ه	شرد	ش ر د
شاربون	ش ر ب	شتاء	ش ت و	شرذمة	ش ر ذ م
شارك	ش ر ك	شتى	ش ت ت	شرر	ش ر ر
شاطئ	ش ط أ	شجر	ش ج ر	شرع	ش ر ع
شاعر	ش ع ر	شجرة	,,	شرعة	,,
شافعين	ش ف ع	شح	ش ح ح	شرعوا	,,
شاقوا	ش ق ق	شحوم	ش ح م	شرقي	ش ر ق
شاكر	ش ک ر	شداد	ش د د	شرقية	,,
شاكرون	,,	شددنا	,,	شرك	ش ر ك
شاكلة	ش ک ل	شدوا	,,	شركاء	,,
شامخات	ش م خ	شديد	,,	شروا	ش ر ی

لفظ	ماده
شریعة	ش ر ع
شریك	ش ر ك
شطأ	ش ط أ
شطر	ش ط ر
شطط	ش ط ط
شعائر	ش ع ر
شعب	ش ع ب
شعر	ش ع ر
شعراء	ش ع ر
شعری	,,
شعوب	ش ع ب
شعیب	شُعَیْبٌ
شغف	ش غ ف
شغل	ش غ ل
شغلت	,,
شَفَا	ش ف و
شفَاءٌ	ش ف ی
شَفاعة	ش ف ع
شفة	ش ف ه (شفو)
شفتین	,,
شفع	ش ف ع
شفعاء	,,
شفق	ش ف ق
شفیع	ش ف ع
شق	ش ق ق
شقاق	,,
شقة	,,
شققنا	,,
شقوا	ش ق ی
شقوة	,,
شقي	,,
شك	ش ك ك
شكر	ش ک ر
شكرتم	,,
شكل	ش ک ل
شكور	ش ک ر
شمال	ش م ل
شمائل	,,
شمس	ش م س
شنآن	ش ن أ
شوی	ش و ی
شواظ	ش و ظ
شوب	ش و ب
شوری	ش و ر
شوكة	ش و ك
شهاب	ش ه ب
شهب	,,
شهادة	ش ه د
شهادات	ش ه د
شهد	,,
شهداء	,,
شهدتم	,,
شهدنا	,,
شهدوا	,,
شهر	ش ه ر
شهرین	,,
شهوة	ش ه و
شهوات	,,
شهود	ش ه د
شهور	ش ه ر
شهید	ش ه د
شهیدین	,,
شهیق	ش ه ق
شيء	ش ی أ
شیاطین	ش ط ن
شیب	ش ی ب
شیبة	,,
شیخ	ش ی خ
شیطان	ش ط ن
شیع	ش ی ع
شیعة	,,
شیوخ	ش ی خ
شیة	و ش ی

ص

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
صدیقون	ص د ق	صفًّا	ص ف ف	صنع	ص ن ع
صرٌّ	ص و ر	صفا	ص ف و	صنعة	,,
صر	ص ر ر	صفح	ص ف ح	صنعوا	,,
صراط	ص ر ط	صفر	ص ف ر	صنوان	ص ن و
صرة	ص ر ر	صفراء	,,	صواب	ص و ب
صرح	ص ر ح	صفصف	ص ف ف	صواع	ص و ع
صرصر	ص ر ر	صفوان	ص ف و	صواعق	ص ع ق
صرعی	ص ر ع	صكت	ص ك ك	صواف	ص ف ف
صرف	ص ر ف	صل	ص ل و	صوامع	ص م ع
صرفت	,,	صلّی	,,	صوت	ص و ت
صرفنا	,,	صلوٰة	,,	صور	ص و ر
صریخ	ص ر خ	صلب	ص ل ب	صورة	,,
صریم	ص ر م	صلبوا	,,	صورنا	,,
صعد	ص ع د	صلح	ص ل ح	صوم	ص و م
صعق	ص ع ق	صلد	ص ل د	صهر	ص ه ر
صعقا	,,	صلصال	ص ل ص ل	صیاصي	ص ی ص
صعود	ص ع د	صلوا	ص ل و	صیام	ص و م
صعید	,,	صلوات	,,	صیب	ص و ب
صغار	ص غ ر	صلي	ص ل ی	صیحة	ص ی ح
صغت	ص غ و	صم	ص م م	صید	ص ی د
صغیر	ص غ ر	صمد	ص م د	صیف	ص ی ف
صغیرة	,,	صموا	ص م م		
صف	ص ف ف				

ض

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ضائق	ض ى ق	ضراء	ض ر ر	ضغث	ض غ ث
ضاحك	ض ح ك	ضرار	,,	ضفادع	ض ف د ع
ضاحكة	,,	ضرب	ض ر ب	ضل	ض ل ل
ضار	ض ر ر	ضربت	,,	ضلال	,,
ضاق	ض ى ق	ضربتم	,,	ضلالة	,,
ضاقت	,,	ضربنا	,,	ضللت	,,
ضال	ض ل ل	ضربوا	,,	ضللنا	,,
ضالين	,,	ضرر	ض ر ر	ضلوا	,,
ضامر	ض م ر	ضريع	ض ر ع	ضنك	ض ن ك
ضأن	ض أ ن	ضعاف	ض ع ف	ضنين	ض ن ن
ضبح	ض ب ح	ضعف	,,	ضياء	ض و ء
ضحى	ض ح و	ضعفاء	,,	ضير	ض ى ر
ضحكت	ض ح ك	ضعفوا	,,	ضيزى	ض و ز
ضد	ض د د	ضعفين	,,	ضيف	ض ى ف
ضر	ض ر ر	ضعيف	,,	ضيق	ض ى ق

ط

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
طائر	ط ى ر	طائفتين	ط و ف	طاعة	ط و ع
طائعين	ط و ع	طائفين	,,	طاعم	ط ع م
طائف	ط و ف	طاب	ط ى ب	طاغوت	ط غ ى
طائفة	,,	طارد	ط ر د	طاغون	,,
طائفتان	,,	طارق	ط ر ق	طاغية	,,

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
طاغين	ط غ ی	طعموا	ط ع م	طمع	ط م ع
طاف	ط و ف	طعن	ط ع ن	طوی	ط و ی
طاقة	ط و ق	طعنوا	,,	طوافون	ط و ف
طال	ط و ل	طغى	ط غ ی	طوبی	ط ی ب
طالب	ط ل ب	طغوا	,,	طود	ط و د
طالوت	طالوت	طغوی	,,	طور	طور
طامة	ط م م	طغيان	,,	طوع	ط و ع
طباق	ط ب ق	طفق	ط ف ق	طوعت	,,
طبتم	ط ی ب	طفقا	,,	طوفان	ط و ف
طبع	ط ب ع	طفل	ط ف ل	طول	ط و ل
طبق	ط ب ق	طل	ط ل ل	طويل	,,
طبن	ط ی ب	طلاق	ط ل ق	طهر	ط ه ر
طحی	ط ح ی	طلب	ط ل ب	طهرا	,,
طرائق	ط ر ق	طلح	ط ل ح	طهور	,,
طردت	ط ر د	طلع	ط ل ع	طي	ط و ی
طرف	ط ر ف	طلعت	,,	طيب	ط ی ب
طرفي	,,	طلق	ط ل ق	طيبات	,,
طري	ط ر ی	طلقتم	,,	طيبة	,,
طريق	ط ر ق	طلقتمو	,,	طيبون	,,
طريقة	,,	طلقوا	,,	طير	ط ی ر
طعام	ط ع م	طلوع	ط ل ع	طين	ط ی ن
طعم	,,	طمست	ط م س		
طعمتم	,,	طمسنا	,,		

ظ

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ظالم	ظ ل م	ظلتم	ظ ل ل	ظمآن	ظ م أ
ظالمة	,,	ظلل	,,	ظن	ظ ن ن
ظالمون	,,	ظللنا	,,	ظنا	,,
ظانين	ظ ن ن	ظلم	ظ ل م	ظننا	,,
ظاهر	ظ ه ر	ظلمات	,,	ظننت	,,
ظاهرة	,,	ظلمة	,,	ظننتم	,,
ظاهروا	,,	ظلمت	,,	ظنوا	,,
ظاهرين	,,	ظلمتم	,,	ظنون	,,
ظعن	ظ ع ن	ظلمنا	,,	ظهر	ظ ه ر
ظفر	ظ ف ر	ظلموا	,,	ظهور	,,
ظل	ظ ل ل	ظلوا	ظ ل ل	ظهري	,,
ظلال	,,	ظلوم	ظ ل م	ظهير	,,
ظلام	ظ ل م	ظليل	ظ ل ل	ظهيرة	,,
ظلة	ظ ل ل	ظماء	ظ م أ		
ظلت	,,				

ع

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
عائدون	ع و د	عابري	ع ب ر	عَادٌ	عَادٌ
عائل	عیل (عول)	عابر	,,	عَادَ	ع و د
عابد	ع ب د	عاتية	ع ت و	عادوا	,,
عابدات	,,	عاجلة	ع ج ل	عادون	ع د و
عابدون	,,	عَادٍ	ع د و	عاديات	,,
عابدين	,,				

لفظ	ماده
عادیتم	ع د و
عادین	ع د د
عارض	ع ر ض
عاشروا	ع ش ر
عاصف	ع ص ف
عاصفات	,,
عاصفة	,,
عاصم	ع ص م
عافین	ع ف و
عاقب	ع ق ب
عاقبة	,,
عاقبتم	,,
عاقبوا	,,
عاقر	ع ق ر
عاكف	ع ك ف
عال	ع ل و
عالم	ع ل م
عالمون	,,
عالمین	,,
عالی	ع ل و
عالية	,,
عالیهم	,,
عالین	,,
عام	ع و م

لفظ	ماده
عامل	ع م ل
عاملة	,,
عاملون	,,
عامین	ع و م
عاهد	ع ه د
عاهدا	,,
عاهدت	,,
عاهدتم	,,
عاهدوا	,,
عباد	ع ب د
عبادة	,,
عبث	ع ب ث
عبد	ع ب د
عبدت	,,
عبدتم	,,
عبدنا	,,
عبدین	,,
عبرة	ع ب ر
عبس	ع ب س
عبقری	ع ب ق ر
عبوس	ع ب س
عبید	ع ب د
عتت	ع ت و
عتل	ع ت ل

لفظ	ماده
عتو	ع ت و
عتوا	,,
عتی	,,
عتید	ع ت د
عتیق	ع ت ق
عثر	ع ث ر
عجاب	ع ج ب
عجاف	ع ج ف
عجب	ع ج ب
عجبت	,,
عجبتم	,,
عجبوا	,,
عجزت	ع ج ز
عجل	ع ج ل
عجلت	,,
عجلتم	,,
عجلنا	,,
عجوز	ع ج ز
عجول	ع ج ل
عجیب	ع ج ب
عد	ع د د
عداوة	ع د و
عدة	ع د د
عدتم	ع و د

لفظ	ماده
عصيت	ع ص ی
عصيتم	,,
عصينا	,,
عضد	ع ض د
عضوا	ع ض ض
عضين	ع ض و
عطاء	ع ط و
عطف	ع ط ف
عطلت	ع ط ل
عظ	و ع ظ
عظام	ع ظ م
عظم	,,
عظوا	و ع ظ
عظيم	ع ظ م
عفا	ع ف و
عفريت	عفريت
عفو	ع ف و
عفونا	,,
عفي	,,
عقاب	ع ق ب
عقبى	,,
عقبى	,,
عقبة	,,
عقبي	,,
عقد	ع ق د
عقدة	,,
عقدت	,,
عقدتم	,,
عقر	ع ق ر
عقروا	,,
عقلوا	ع ق ل
عقود	ع ق د
عقيم	ع ق م
علا	ع ل و
على	على
علام	ع ل م
علامات	,,
علانية	ع ل ن
علق	ع ل ق
علقة	,,
علم	ع ل م
علماء	,,
علمت	,,
علمتم	,,
علمتموا	,,
علمنا	,,
علموا	,,
عُلُوًّا	ع ل و
عَلَوْا	ع ل و
علي	,,
عليا	,,
عليم	ع ل م
عليون	ع ل و
عليهم	على + هم
عَمَّ	عن + ما
عَمٌّ	ع م م
عمات	,,
عماد	ع م د
عمارة	ع م ر
عمد	ع م د
عمر	ع م ر
عمران	,,
عمرة	,,
عمروا	,,
عمل	ع م ل
عملت	,,
عملتم	,,
عملوا	,,
عموا	ع م ی
عمون	,,
عمي	,,
عميان	,,

غ

لفظ	ماده
غرف	غ ر ف
غرفات	,,
غرفة	,,
غرق	غ ر ق
غروب	غ ر ب
غرور	غ ر ر
غزی	غ ز و
غزل	غ ز ل
غساق	غ س ق
غسق	,,
غسلین	غ س ل
غشی	غ ش ی
غشاوة	,,
غصب	غ ص ب
غصة	غ ص ص
غضب	غ ض ب
غضبان	,,
غضبوا	,,
غطاء	غ ط و
غفار	غ ف ر
غفر	,,
غفران	غ ف ر
غفرنا	,,
غفلة	غ ف ل
غفور	غ ف ر
غل	غ ل ل
غلاظ	غ ل ظ
غلام	غ ل م
غلامین	,,
غلب	غ ل ب
غلبت	,,
غلبوا	,,
غلت	غ ل ل
غلظة	غ ل ظ
غلف	غ ل ف
غلقت	غ ل ق
غلمان	غ ل م
غلوا	غ ل ل
غلي	غ ل و - ی
غلیظ	غ ل ظ
غم	غ م م
غمرة	غ م ر
غمرات	غ م ر
غمة	غ م م
غمام	,,
غنم	غ ن م
غنمتم	,,
غني	غ ن ی
غوی	غ و ی
غواش	غ ش ی
غواص	غ و ص
غور	غ و ر
غول	غ و ل
غوي	غ و ی
غوینا	,,
غي	,,
غیابت	غ ی ب
غیب	,,
غیث	غ ی ث
غیر	غ ی ر
غیض	غ ی ض
غیظ	غ ی ظ
غیوب	غ ی ب

ف

لفظ	ماده
ف	ف
فئت	ف ی أ
فائزون	ف و ز

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
فآءوا	ف ی أ	فالق	ف ل ق	فجرة	ف ج ر
فات	ف و ت	فان	ف ن ی	فجرت	,,
فئة	ف أ و	فاه	ف و ه	فجرنا	,,
فئتان	,,	فتی	ف ت ی	فجوة	ف ج و
فئتین	,,	فتاح	ف ت ح	فجور	ف ج ر
فاتحین	ف ت ح	فتح	,,	فحشا	ف ح ش
فاتنین	ف ت ن	فتحت	,,	فخار	ف خ ر
فاجر	ف ج ر	فتحنا	,,	فخور	,,
فاحشة	ف ح ش	فتحوا	,,	فدآء	ف د ی
فار	ف و ر	فترة	ف ت ر	فدیة	,,
فارض	ف ر ض	فتقنا	ف ت ق	فدینا	,,
فارغ	ف ر غ	فتنا	ف ت ن	فرات	ف ر ت
فارقات	ف ر ق	فتنة	,,	فرادی	ف ر د
فارقوا	,,	فتنتم	,,	فرار	ف ر ر
فارهین	ف ر ه	فتنوا	,,	فراش	ف ر ش
فاز	ف و ز	فتون	,,	فراق	ف ر ق
فاسق	ف س ق	فتیات	ف ت ی	فرت	ف ر ر
فاصلین	ف ص ل	فتیان	,,	فرث	ف ر ث
فاطر	ف ط ر	فتیة	,,	فرج	ف ر ج
فاعل	ف ع ل	فتیل	ف ت ل	فرجت	,,
فاقرة	ف ق ر	فج	ف ج ج	فرح	ف ر ح
فاقع	ف ق ع	فجاج	,,	فرحوا	,,
فاکهة	ف ک ه	فجار	ف ج ر	فرحون	,,
فاکهون	,,	فجر	,,	فرد	ف ر د

لفظ	ماده
فواکه	ف ک ه
فوت	ف و ت
فوج	ف و ج
فور	ف و ر
فوز	ف و ز
فوق	ف و ق
فوم	ف و م
فهمنا	ف ه م
في	في
فيل	ف ی ل

ق

لفظ	ماده
ق	و ق ی
قَآئِلٌ	ق و ل
قَآئِلُوْنَ	ق ی ل؟
قائم	ق و م
قائمة	,,
قائمون	,,
قاب	ق و ب
قاب قوسين	ق و ب + ق و س
قابل	ق ب ل
قاتل	ق ت ل
قاتلا	,,
قاتلوا	,,
قادر	ق د ر
قارعة	ق ر ع
قارون	قَارُوْنُ
قاسطون	ق س ط
قاسم	ق س م

لفظ	ماده
قاسية	ق س و
قاصد	ق ص د
قاصرات	ق ص ر
قاصرات الطرف	ق ص ر + ط ر ف
قاصف	ق ص ف
قاض	ق ض ی
قاضية	,,
قاطعة	ق ط ع
قاع	ق ی ع
قاعد	ق ع د
قاعدون	,,
قال	ق و ل
قالا	,,
قالت	,,
قالتا	,,
قالوا	,,
قالين	ق ل ی - و

لفظ	ماده
قام	ق و م
قاموا	,,
قانت	ق ن ت
قانتات	,,
قانتون	,,
قانطين	ق ن ط
قانع	ق ن ع
قاهر	ق ه ر
قبائل	ق ب ل
قبر	ق ب ر
قبس	ق ب س
قبض	ق ب ض
قبضة	,,
قبضت	,,
قبضنا	,,
قبل	ق ب ل
قبلة	,,
قبور	ق ب ر

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
قبول	ق ب ل	قدمت	ق د م	قربان	ق ر ب
قبيل	،،	قدمتم	،،	قربنا	،،
قتال	ق ت ل	قدمتموا	،،	قرة	ق ر ر
قتر	ق ت ر	قدمنا	،،	قرح	ق ر ح
قترة	،،	قدموا	،،	قردة	ق ر د
قتل	ق ت ل	قدور	ق د ر	قرض	ق ر ض
قتلى	،،	قدوس	ق د س	قرطاس	ق ر ط س
قتلت	،،	قدير	ق د ر	قَرْنَ	و ق ر
قتلتم	،،	قديم	ق د م	قَرْنٌ	ق ر ن
قتلتموا	،،	قذف	ق ذ ف	قرناء	،،
قتلنا	،،	قذفنا	،،	قرنين	،،
قتلوا	،،	قرى	ق ر ى	قروء	ق ر أ
قتور	ق ت ر	قرأ	ق ر أ	قرون	ق ر ن
قثاء	ق ث أ	قرئ	،،	قري	ق ر ر
قَدْ	قَدْ	قرأت	،،	قريب	ق ر ب
قُدَّ	ق د د	قرار	ق ر ر	قرية	ق ر ى
قدت	،،	قراطيس	ق ر ط س	قريتين	،،
قدح	ق د ح	قرآن	ق ر أ	قريش	قريش
قدد	ق د د	قرآنا	،،	قرين	ق ر ن
قدر	ق د ر	قرب	ق ر ب	قست	ق س و
قدرنا	،،	قربا	،،	قسط	ق س ط
قدروا	،،	قربى	،،	قسطاس	،،
قدس	ق د س	قربات	،،	قسم	ق س م
قدم	ق د م	قربة	،،	قسمة	،،

لفظ	ماده
قسمنا	ق س م
قسوة	ق س و
قسورة	ق س ر
قسيسين	ق س س
قص	ق ص ص
قصاص	,,
قصد	ق ص د
قصر	ق ص ر
قصص	ق ص ص
قصصنا	,,
قصمنا	ق ص م
قصوى	ق ص و
قصور	ق ص ر
قُصِّي	ق ص ص
قَصِيًّا	ق ص و
قضى	ق ض ى
قضب	ق ض ب
قضوا	ق ض ى
قضي	,,
قضيت	ق ض ى
قضيتم	,,
قضينا	,,
قط	ق ط ط
قطر	ق ط ر

لفظ	ماده
قطران	ق ط ر
قطع	ق ط ع
قطعت	,,
قطعتم	,,
قطعن	,,
قطعنا	,,
قطمير	ق ط م ر
قطوف	ق ط ف
قعد	ق ع د
قعدوا	,,
قعوا	و ق ع
قعود	ق ع د
قعيد	,,
قفوا	و ق ف
قفينا	ق ف و
قُلْ	ق و ل
قَلَّ	ق ل ل
قلى	ق ل ى
قلائد	ق ل د
قلب	ق ل ب
قلبوا	,,
قلبين	,,
قلت	ق و ل
قلتم	,,

لفظ	ماده
قلم	ق ل م
قلن	ق و ل
قلنا	,,
قلوب	ق ل ب
قليل	ق ل ل
قليلة	,,
قم	ق و م
قمتم	,,
قمر	ق م ر
قمطرير	ق م ط ر
قمل	ق م ل
قميص	ق م ص
قناطير	ق ن ط ر
قنطار	,,
قنطوا	ق ن ط
قنوان	ق ن و
قنوط	ق ن ط
قوا	و ق ى
قوى	ق و ى
قوارير	ق ر ر
قواعد	ق ع د
قوام	ق و م
قوامون	,,
قوة	ق و ى

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
قوتلتم	ق ت ل	قولی	ق و ل	قیضنا	ق ی ض
قوتلوا	,,	قوم	ق و م	قیعة	ق ی ع
قوس	ق و س	قوموا	,,	قیل	ق و ل
وسین	,,	قوي	ق و ی	قیله	,,
قول	ق و ل	قهار	ق ه ر	قیم	ق و م
قولا	,,	قیام	ق و م	قیمة	,,
قولوا	,,	قیامة	,,	قیوم	,,

ك

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ک	ک	کارهون	ک ر ه	کالوا	ک ی ل
کَ	کَ	کارهین	,,	کامله	ک م ل
کِ	کَ	کاس	ک أ س	کاملین	,,
کاتب	ک ت ب	کاشف	ک ش ف	کَأَنَّ	کَأَنَّ
کاتبوا	,,	کاشفة	,,	کأنما	,,
کاتبون	,,	کاشفوا	,,	کَانَ	ك و ن
کاتبین	,,	کاظمین	ک ظ م	کانا	,,
کاد	ک و د	کاف	ک ف ی	کانت	,,
کادت	,,	کافة	ک ف ف	کانتا	,,
کادح	ک د ح	کافر	ک ف ر	کانوا	,,
کادوا	ک و د	کافرة	,,	کاهن	ک ه ن
کاذب	ک ذ ب	کافرون	,,	کاین	کأیِّن ۸
کاذبة	,,	کافرین	,,	کبآئر	ک ب ر
کاذبون	,,	کافور	,,	کبار	,,
کاذبین	,,	کالحون	ک ل ح	کُبِتَ ۸	ك ب ب

لفظ	مادہ	لفظ	مادہ	لفظ	مادہ
کُبِتَ	ک ب ت	کدنا	ک ی د	کسبا	ک س ب
کبتوا	،،	کذاب	ک ذ ب	کسبت	،،
کبد	ک ب د	کذالک	ک + ذ ا	کسبتم	،،
کبر	ک ب ر	کذالکم	،،	کسبوا	،،
کبریٰ	،،	کذب	ک ذ ب	کسف	ک س ف
کبراء	،،	کذبت	ک ذ ب	کسوۃ	ک س و
کبرت	،،	کذبتم	،،	کسونا	،،
کبکبوا	ک ب ب	کذبنا	،،	کشطت	ک ش ط
کبریاء	ک ب ر	کذبوا	،،	کشف	ک ش ف
کبیرۃ	،،	کرام	ک ر م	کشفت	،،
کتاب	ک ت ب	کراما کاتبین	ک ر م / ک ت ب	کشفنا	،،
کتابیہ	،،	کرب	ک ر ب	کظیم	ک ظ م
کتب	،،	کرۃ	ک ر ر	کعبۃ	ک ع ب
کتبت	،،	کرتین	،،	کعبین	،،
کتبنا	،،	کرسي	ک ر س	کف	ک ف ف
کتم	ک ت م	کرمت	ک ر م	کفا	،،
کثر	ک ث ر	کرمنا	،،	کفیٰ	ک ف ی
کثرۃ	،،	کرہ	ک ر ہ	کفات	ک ف ت
کثرت	،،	کرھتموا	،،	کفار	ک ف ر
کثیب	ک ث ب	کرھوا	،،	کفارۃ	،،
کثیر	ک ث ر	کریم	ک ر م	کفر	،،
کثیرۃ	،،	کساد	ک س د	کفران	،،
کدت	ک و د	کسالیٰ	ک س ل	کفرۃ	،،
کدح	ک د ح	کسب	ک س ب	کفرت	،،

لفظ	مادہ
كَفرتم	كَ ف ر
كَفرنا	,,
كَفروا	,,
كَففت	كَ ف ف
كَفل	كَ ف ل
كَفلين	,,
كَفؤ	كَ ف أ ـ و
كَفوا	كَ ف ف
كَفور	كَ ف ر
كَفي	كَ ف ف
كَفيل	كَ ف ل
كَفينا	كَ ف ى
كُلّ	كَ ل ل
كُلّ	كُلّ (حرف)
كَلا	كَلاَ (حرف)
كَلّا	كَلّا ,,
كُلَا	أ كَ ل
كَلالة	كَ ل ل

لفظ	مادہ
كَلام	كَ ل م
كَلب	كَ ل ب
كَلتا	كَلا
كَلتم	كَ ى ل
كَلم	كَ ل م
كَلما	كَ ل ل
كَلمات	كَ ل م
كَلمة	,,
كُلوا	ا كَ ل
كُلي	,,
كَمْ	كَمْ (حرف)
كُمْ	كُم (ضمير)
كُمَا	كُمَا ,,
كُمُوا	كُمْ ,,
كُنْ	كَ و ن
كُنّ	كَ ن ن
كُنَّ	ك و ن+ كُنَّ(ضمير)

لفظ	مادہ
كُنّا	ك و ن
كُنْتُ	,,
كُنْتُمْ	,,
كُنْتُنَّ	,,
كَنز	كَ ن ز
كَنزتم	,,
كَنس	كَ ن س
كَنود	كَ ن د
كوكب/كواكب	كَ و كَ ب
كونوا	كَ و ن
كوني	,,
كَهف	كَ ه ف
كَهل	كَ ه ل
كَيف	كَيْفَ (حرف)
كَي	كَيْ ,,
كَيد	كَ ى د
كَيدوا	,,
كَيل	كَ ى ل

ل

لفظ	مادہ
ل	لَ (حرف جر)
ل	لَ (حرف تاكيد)
لا	لَا (حرف)
لائم	ل و م

لفظ	مادہ
لابثين	ل ب ث
لَاتَ	لَاتَ
لَاتُّ	لَاتُّ
لازب	ل ز ب

لفظ	مادہ
لاعبين	ل ع ب
لاعنون	ل ع ن
لاغية	ل غ و
لاقي	ل ق ى

لفظ	ماده
لٰكِنْ	لٰكِنْ
لٰكِنَّ	لٰكِنَّ
لٰكِنَّا	لٰكِن
لامستم	ل م س
لؤلؤ	ل أ ل أ
لاهية	ل ه و
لباس	ل ب س
لبث	ل ب ث
لبثت	,,
لبثتم	,,
لبثنا	,,
لبثوا	,,
لبد	ل ب د
لبس	ل ب س
لبسنا	,,
لبن	ل ب ن
لبوس	ل ب س
لجة	ل ج ج
لجوا	,,
لجي	,,
لحم	ل ح م
لحن	ل ح ن
لحوم	ل ح م
لحية	ل ح ی
لد	ل د د
لدی	لَدَیْ
لَدُنْ	لَدُنْ
لَدَیَّ	لَدَیْ+یَ
لَدَیْنَا	لَدَیْ+نَا
لذة	ل ذ ذ
لزام	ل ز م
لسان	ل س ن
لست	لَيْسَ
لستم	,,
لستن	,,
لطيف	ل ط ف
لظی	ل ظ ی
لعب	ل ع ب
لعل	لَعَلَّ
لعن	ل ع ن
لعنا	,,
لعنة	,,
لعنت	,,
لعنوا	,,
لغو	ل غ و
لغوب	ل غ ب
لفيف	ل ف ف
لقاء	ل ق ی
لقی	,,
لقمان	لقمان
لقوا	ل ق ی
لقيا	,,
لقيتم	,,
لقينا	,,
لِكَیْلَا	لِ+كَیْ+لَا
لِمَ	ل+ما
لَمْ	لَمْ
لَمَّا	لَمَّا
لَمًّا	ل م م
لَمْ تَرَ	لَمْ+ر أ ی
لمتن	ل و م
لمح	ل م ح
لمزة	ل م ز
لمسنا	ل م س
لمسوا	,,
لمم	ل م م
لَنْ	لَنْ
لنت	ل ی ن

لفظ	ماده
متلقیان	ل ق ی
مُتِمّ	ت م م
مِتُّم	م و ت
مِتنا	,,
متنافسون	ن ف س
متوسمین	و س م
متوفی	و ف ی
متوکل	و ک ل
متوکلون	,,
متوکلین	,,
متین	م ت ن
مثابة	ث و ب
مثانی	ث ن ی
مثبور	ث ب ر
مثقال	ث ق ل
مثقلة	,,
مثقلون	,,
مثل	م ث ل
مثلی	,,
مثلات	,,
مثلی	,,
مثنی	ث ن ی
مثوی	ث و ی
مثوبة	ث و ب

لفظ	ماده
مجالس	ج ل س
مجاهد	ج ه د
مجتمعون	ج م ع
مجذوذ	ج ذ ذ
مجری	ج ر ی
مجرم	ج ر م
مجرمون	,,
مجمع	ج م ع
مجموع	,,
مجموعون	,,
مجنون	ج ن ن
مجوس	مجوس
مجیب	ج و ب
مجید	م ج د
محاریب	ح ر ب
محاسبة	ح س ب
محال	م ح ل
محبة	ح ب ب
محتضر	ح ض ر
محتظر	ح ظ ر
محجوبون	ح ج ب
محجور	ح ج ر
محدث	ح د ث
محذور	ح ذ ر

لفظ	ماده
محراب	ح ر ب
محرر	ح ر ر
محرم	ح ر م
محرمة	,,
محروم	,,
محرومون	,,
محسن	ح س ن
محسنات	,,
محسنون	,,
محسنین	,,
محسور	ح س ر
محشورة	ح ش ر
محصنات	ح ص ن
محصنة	,,
محصنین	,,
محضر	ح ض ر
محضرون	,,
محظور	ح ظ ر
محفوظ	ح ف ظ
محکمات	ح ک م
محکمة	,,
محل	ح ل ل
محلقین	ح ل ق
محلی	ح ل ل

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
محله	ح ل ل	مخلصون	خ ل ص	مدهنون	د ه ن
محمد	ح م د	مخلصين	,,	مدين	مدين
محمود	,,	مخلف	خ ل ف	مدينة	م د ن
محونا	م ح و	مخلفون	,,	مدينون	د ى ن
محي	ح ى ى	مخلقة	خ ل ق	مدينين	,,
محيا	,,	مخمصة	خ م ص	مذءوم	ذ ا م
محيص	ح ى ص	مد	م د د	مذبذبين	ذ ب ب
محيض	ح ى ض	مدآئن	م د ن	مذعنين	ذ ع ن
محيط	ح و ط	مداد	م د د	مذكر	ذ ك ر
محيطة	,,	مدبر	د ب ر	مذكور	,,
مخاض	م خ ض	مدبرات	,,	مذموم	ذ م م
مخبتين	خ ب ت	مدبرين	د ب ر	مر	م ر ر
مختال	خ ى ل	مدة	م د د	مرء	م ر أ
مختلف	خ ل ف	مدت	,,	مرآء	م ر ى
مختوم	خ ت م	مدثر	د ث ر	مرات	م ر ر
مخذول	خ ذ ل	مدحضين	د ح ض	مراضع	ر ض ع
مخرج	خ ر ج	مدحور	د ح ر	مراغم	ر غ م
مخرجون	,,	مدخل	د خ ل	مرافق	ر ف ق
مخرجين	,,	مدد	م د د	مرة	م ر ر
مخسرين	خ س ر	مددنا	,,	مرت	,,
مخضرة	خ ض ر	مدرار	د ر ر	مرتاب	ر ى ب
مخضود	خ ض د	مدركون	د ر ك	مرتان	م ر ر
مخلدون	خ ل د	مدكر	ذ ك ر	مرتفق	ف ق
مخلص	خ ل ص	مدهامتان	د ه م	مرتقبون	

لفظ	مادہ
مرج	م ر ج
مرجان	,,
مرجع	ر ج ع
مرجفون	ر ج ف
مرجوا	ر ج و
مرجومین	ر ج م
مرجون	ر ج و
مرح	م ر ح
مرحب	ر ح ب
مرحمة	ر ح م
مرد	ر د د
مردفین	ر د ف
مردوا	م ر د
مردود	ر د د
مردودون	,,
مرسی	ر س و
مرسل	ر س ل
مرسلات	,,
مرسلة	,,
مرسلوا	,,
مرسلون	,,
مرشد	ر ش د
مرصاد	ر ص د
مرصد	,,

لفظ	مادہ
مرصوص	ر ص ص
مرض	م ر ض
مرضی	,,
مرضات	ر ض ی
مرضت	م ر ض
مرضعة	ر ض ع
مرضیة	ر ض ی
مرعی	ر ع ی
مرفق	ر ف ق
مرفود	ر ف د
مرفوع	ر ف ع
مرفوعة	,,
مرقد	ر ق د
مرقوم	ر ق م
مرکوم	ر ک م
مروا	م ر ر
مروة	م ر و
مریٔ	م ر أ
مریب	ر ی ب
مریة	م ر ی
مریج	م ر ج
مرید	م ر د
مریض	م ر ض
مریم	مریم

لفظ	مادہ
مزاج	م ز ج
مزجاة	ز ج و
مزحزح	ز ح ز ح
مزدجر	ز ج ر
مزقتم	م ز ق
مزقنا	,,
مزمل	ز م ل
مزن	م ز ن
مزید	ز ی د
مس	م س س
مساجد	س ج د
مساس	م س س
مسافحات	س ف ح
مسافحین	,,
مساق	س و ق
مساکن	س ک ن
مساکین	,,
مسئول	س أ ل
مسئولون	,,
مسبحون	س ب ح
مسبوقین	س ب ق
مست	م س س
مستاخرین	أ خ ر
مستانسین	أ ن س

لفظ	ماده
مستبشرة	ب ش ر
مستبصرين	ب ص ر
مستبين	ب ی ن
مستخف	خ ف ی
مستخلفين	خ ل ف
مستسلمون	س ل م
مستضعفون	ض ع ف
مستطر	س ط ر
مستطير	ط ی ر
مستعان	ع و ن
مستغفرين	غ ف ر
مستقبل	ق ب ل
مستقدمين	ق د م
مستقر	ق ر ر
مستقيم	ق و م
مستكبر	ک ب ر
مستكبرون	,,
مستمر	م ر ر
مستمسكون	م س ك
مستمع	س م ع
مستمعون	,,
مستنفرة	ن ف ر
مستودع	و د ع
مستور	س ت ر

لفظ	ماده
مستهزؤن	ه ز أ
مستيقنين	ی ق ن
مسجد	س ج د
مسجور	س ج ر
مسجونين	س ج ن
مسح	م س ح
مسحرين	س ح ر
مسحور	,,
مسحورون	,,
مسخر	س خ ر
مسخرات	,,
مسخنا	مسخ
مسد	م س د
مسرف	س ر ف
مسرفون	,,
مسرفين	,,
مسرور	س ر ر
مسطور	س ط ر
مسغبة	س غ ب
مسفرة	س ف ر
مسفوح	س ف ح
مسک	م س ک
مسکن	س ک ن
مسکنة	,,

لفظ	ماده
مسکوب	س ک ب
مسکونة	س ک ن
مسکين	,,
مسلم	س ل م
مسلمات	,,
مسلمة	,,
مسلمون	,,
مسلمين	,,
مسمى	س م ی
مسمع	س م ع
مسنا	م س س
مسندة	س ن د
مسنون	س ن ن
مسود	س و د
مسودة	,,
مسومة	س و م
مسومين	,,
مسیء	س و ء
مسيح	م س ح
مسيطر	س ط ر
مسيطرون	,,
مشاء	م ش ی
مشارب	ش ر ب
مشارق	ش ر ق

لفظ	مادہ	لفظ	مادہ	لفظ	مادہ
مشئمة	ش أ م	مصباح	ص ب ح	مضاعفة	ض ع ف
مشتبه	ش ب ه	مصبحين	ص ب ح	مضت	م ض ی
مشترکون	ش ر ک	مصدق	ص د ق	مضطر	ض ر ر
مشحون	ش ح ن	مصدقات	ص د ق	مضعفون	ض ع ف
مشرب	ش ر ب	مصدقين	,,	مضغة	م ض غ
مشرق	ش ر ق	مصر	م ص ر	مضل	ض ل ل
مشرقين	,,	مصرخ	ص ر خ	مضلين	,,
مشرك	ش ر ك	مصروف	ص ر ف	مطاع	ط و ع
مشركات	,,	مصطفين	ص ف و	مطر	م ط ر
مشركة	,,	مصفى	,,	مطففين	ط ف ف
مشركون	,,	مصفر	ص ف ر	مطلع	ط ل ع
مشركين	,,	مصفوفة	ص ف ف	مطلعون	,,
مشعر	ش ع ر	مصلى	ص ل و	مطلقات	ط ل ق
مشفقون	ش ف ق	مصلح	ص ل ح	مطلوب	ط ل ب
مشكوة	ش ک و	مصلحون	,,	مطمئن	ط م ن
مشكور	ش ک ر	مصلين	ص ل و	مطمئنة	,,
مشوا	م ش ی	مصور	ص و ر	مطمئنين	,,
مشهد	ش ه د	مصيب	ص و ب	مطوعين	ط و ع
مشهود	,,	مصيبة	,,	مطويات	ط و ی
مشي	م ش ی	مصير	ص ی ر	مطهر	ط ه ر
مشيد	ش ی د	مصيطر	س ط ر	مطهرة	,,
مشيدة	,,	مضى	م ض ی	مطهرون	,,
مصابيح	ص ب ح	مضاجع	ض ج ع	مظالم	ظ ل م
مصانع	ص ن ع	مضار	ض ر ر	مظلمون	,,

لفظ	ماده
مظلوم	ظ ل م
مَعَ	مع
معاجزين	ع ج ز
معاد	ع و د
معاذ	ع و ذ
معاذير	ع ذ ر
معارج	ع ر ج
معاش	ع ی ش
معایش	,,
معتبین	ع ت ب
معتد	ع د و
معتدون	,,
معتر	ع ر ر
معجز	ع ج ز
معجزین	,,
معدود	ع د د
معدودات	,,
معدودة	,,
معذب	ع ذ ب
معذبون	,,
معذبین	,,
معذرة	ع ذ ر
معذرون	,,
معرة	ع ر ر
معرضون	ع ر ض
معرضین	,,
معروشات	ع ر ش
معروف	ع ر ف
معروفة	,,
معز	م ع ز
معزل	ع ز ل
معزولون	,,
معشار	ع ش ر
معشر	,,
معصرات	ع ص ر
معصیة	ع ص ی
معطلة	ع ط ل
معقب	ع ق ب
معقبات	,,
معکوف	ع ک ف
معلقة	ع ل ق
معلم	ع ل م
معلوم	,,
معلومات	,,
معمر	ع م ر
معمور	,,
معوقین	ع و ق
معیشة	ع ی ش
معین	ع ی ن-م ع ن
مغارات	غ و ر
مغارب	غ ر ب
مغاضب	غ ض ب
مغانم	غ ن م
مغتسل	غ س ل
مغرب	غ ر ب
مغربین	,,
مغرقون	غ ر ق
مغرم	غ ر م
مغرمون	,,
مغشي	غ ش ی
مغضوب	غ ض ب
مغفرة	غ ف ر
مغلوب	غ ل ب
مغلولة	غ ل ل
مغنم	غ ن م
مغنون	غ ن ی
مغیر	غ ی ر
مغیرات	غ و ر
مفاتح	ف ت ح
مفاتیح	,,
مفاز	ف و ز
مفازة	,,

لفظ	ماده
مفتحة	ف ت ح
مفتر	ف ر ی
مفتری	,,
مفترون	,,
مفتریات	,,
مفتون	ف ت ن
مفر	ف ر ر
مفرطون	ف ر ط
مفروض	ف ر ض
مفسد	ف س د
مفسدون	,,
مفصل	ف ص ل
مفصلات	,,
مفعول	ف ع ل
مفلحون	ف ل ح
مقابر	ق ب ر
مقاعد	ق ع د
مقالید	ق ل د
مقام	ق و م
مقامة	,,
مقامع	ق م ع
مقبوحین	ق ب ح
مقبوضة	ق ب ض
مقت	م ق ت

لفظ	ماده
مقتحم	ق ح م
مقتدر	ق د ر
مقتدرون	,,
مقتدون	ق د و
مقتر	ق ت ر
مقترفون	ق ر ف
مقترنین	ق ر ن
مقتسمین	ق س م
مقتصد	ق ص د
مقتصدة	ق ص د
مقدار	ق د ر
مقدس	ق د س
مقدسة	,,
مقدور	ق د ر
مقربة	ق ر ب
مقربون	,,
مقرنین	ق ر ن
مقسطین	ق س ط
مقسمات	ق س م
مقسوم	,,
مقصرین	ق ص ر
مقصورات	,,
مقضی	ق ض ی
مقطوع	ق ط ع

لفظ	ماده
مقطوعة	ق ط ع
مقعد	ق ع د
مقمحون	ق م ح
مقنطرة	ق ن ط ر
مقنعی	ق ن ع
مقوین	ق و ی
مقیت	ق و ت
مقیل	ق ی ل
مقیم	ق و م
مقیمین	,,
مکاء	م ک و
مکان	ک و ن
مکانة	م ك ن
مکب	ک ب ب
مکة	م ک ك
مکتوب	ک ت ب
مکث	م ک ث
مکذبون	ک ذ ب
مکذوب	,,
مکر	م ک ر
مکرتموا	,,
مکرم	ک ر م
مکرمة	,,
مکرمون	,,

لفظ	ماده
مکرنا	م ک ر
مکروا	,,
مکروه	ک ر ه
مکظوم	ک ظ م
مکلبین	ک ل ب
مکن	م ک ن
مکنا	,,
مکنون	ک ن ن
مکیال	ک ی ل
مکیدون	ک ی د
مکین	م ک ن
ملأ	م ل أ
ملء	,,
ملئه	,,
ملائکة	ال ك - م ل ك
ملئت	م ل أ
ملاقی	ل ق ی
ملاقوا	,,
ملة	م ل ل
ملتحد	ل ح د
ملتجأ	ل ج أ
ملح	م ل ح
ملعونة	ل ع ن
ملعونین	,,
ملقون	ل ق ی
ملقیات	ل ق ی
مَلَك	ال ك + م ل ك
مُلْك	م ل ك
ملکت	,,
ملکتم	,,
ملکوت	ال ك + م ل ك
ملکین	,,
ملوك	م ل ك
ملوم	ل و م
ملومین	,,
ملی	م ل و
ملیک	م ل ك
ملیم	ل و م
مم	من + ما
مما	,,
مات	م و ت
ممترین	م ر ی
ممد	م د د
ممدود	,,
ممدودة	,,
ممرد	م ر د
ممزق	م ز ق
ممسک	م س ك
ممسکات	م س ك
ممطر	م ط ر
مملوك	م ل ك
ممن	مَن + مِن
ممنوعة	م ن ع
ممنون	م ن ن
مَن	مَن
مِن	مِن
مَنّ	م ن ن
منوة	منوة
مناد	ن د و - ی
منادی	,,
منازل	ن ز ل
مناسک	ن س ك
مناص	ن و ص
مناع	م ن ع
منافع	ن ف ع
منافقات	ن ف ق
منافقون	,,
منافقین	,,
مناکب	ن ك ب
منام	ن و م
منبث	ب ث ث

لفظ	ماده
منتشر	ن ش ر
منتصر	ن ص ر
منتظرون	ن ظ ر
منتقمون	ن ق م
منتهى	ن ه ی
منتهون	,,
منثور	ن ث ر
منجوا	ن ج و
منخنقة	خ ن ق
من ذا	من+ذا
منذر	ن ذ ر
منذرون	,,
منذرين	,,
منزل	ن ز ل
منزلون	,,
منزلين	,,
منسأة *	ن س أ
منسک	ن س ك
منسى	ن س ی
منشآت	ن ش أ
منشئون	,,
منشرة	ن ش ر
منشرين	,,
منشور	,,

لفظ	ماده
منصور	ن ص ر
منضود	ن ض د
منطق	ن ط ق
منظرون	ن ظ ر
منع	م ن ع
منفطر	ف ط ر
منفقون	ن ف ق
منفكين	ف ك ك
منفوش	ن ف ش
منقعر	ق ع ر
منقلب	ق ل ب
منقلبون	,,
منقوص	ن ق ص
منكر	ن ك ر
منكرة	,,
منكرون	,,
مننا	م ن ن
منوع	م ن ع
منون	م ن ن
منهاج	ن ه ج
منهمر	ه م ر
مني	م ن ی
منيب	ن و ب
منيبين	,,

لفظ	ماده
منير	ن و ر
مواخر	م خ ر
موازين	و ز ن
مواضع	و ض ع
مواطن	و ط ن
مواقع	و ق ع
مواقعوا	,,
مواقيت	و ق ت
موئل	و أ ل
موالى	و ل ی
موؤدة	و أ د
موبق	و ب ق
موت	م و ت
موتى	,,
مؤتفكات	أ ف ك
مؤتفكة	,,
موتوا	م و ت
مؤتون	أ ت ی
موثق	و ث ق
موج	م و ج
موجل	أ ج ل
مودة	و د د
مؤذن	أ ذ ن
مور	م و ر

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
مورود	و ر د	مولود	و ل د	مهلکی	ه ل ک
موریات	و ر ی	مولي	و ل ی	مهلکین	,,
موزون	و ز ن	مومن	ا م ن	مها	مها
موسیٰ	موسیٰ	مؤمنة	,,	مهیل	ه ی ل
موسعون	و س ع	مؤمنون	,,	مهیمن	ه ی م ن
موص	و ص ی	مومنین	,,	مُهِين	ه و ن
مؤصدة	أ ص د	موهن	و ه ن	مَهِين	م ه ن
موضوعة	و ض ع	مهاجر	ه ج ر	میت	م و ت
موضولة	و ض ن	مهاجرات	,,	میتة	,,
موطا	و ط أ	مهاجرین	,,	میتون	,,
موعد	و ع د	مهاد	م ه د	میثاق	و ث ق
موعدة	,,	مهان	ه و ن	میراث	و ر ث
موعظة	و ع ظ	مهتد	ه د ی	میزان	و ز ن
موعود	و ع د	مهتدون	,,	میسر	ی س ر
موفوا	و ف ی	مهتدین	,,	میسرة	,,
موفور	و ف ر	مهجور	ه ج ر	میسور	,,
موفون	و ف ی	مهد	م ه د	میعاد	و ع د
موقدة	و ق د	مهدت	,,	میقات	و ق ت
موقنون	ی ق ن	مهزوم	ه ز م	میکال	میکال
موقوت	و ق ت	مهطعین	ه ط ع	میل	م ی ل
موقوذة	و ق ذ	مهل	م ه ل	میلة	,,
موقوفون	و ق ف	مهلک	ه ل ک	میمنة	ی م ن
مولی	و ل ی	مهلکون	,,		
مؤلفة	أ ل ف	مهلکوا	,,		

ن

لفظ	ماده
ن (ثقيله يا خفيفه)	ن
ن (وقايه)	ن
نا	نا (ضمير)
نأ	ن أ ى
نائم	ن و م
نأتى	أ ت ى
نؤتى	,,
ناج	ن ج و
ناجيتم	,,
نأخذ	أ خ ذ
نادى	ن د و ـ ى
نادت	,,
نادمين	ن د م
نادوا	ن د و ـ ى
نادى	,,
ناديتم	,,
نادينا	,,
نار	ن و ر
نازعات	ن ز ع
ناس	ا ن س
ناسكو	ن س ك
ناشئة	ن ش أ
ناشرات	ن ش ر
ناشطات	ن ش ط
ناصبة	ن ص ب
ناصح	ن ص ح
ناصحون	,,
ناصر	ن ص ر
ناصرين	,,
ناصية	ن ص و
ناضرة	ن ض ر
ناظرة	ن ظ ر
ناظرين	,,
ناعمة	ن ع م
نافقوا	ن ف ق
نافلة	ن ف ل
ناقة	ن و ق
ناقور	ن ق ر
ناكبون	ن ك ب
ناكسوا	ن ك س
نأكل	أ ك ل
ناهون	ن ه ى
نبأ	ن ب أ
نبؤ	,,
نُبِّئُ	ن ب أ
نَبَّأْتُ	,,
نَبَاتٌ	ن ب ت
نبئوا	ن ب أ
نبتغي	ب غ ى
نبتلي	ب ل و
نبتهل	ب ه ل
نبدل	ب د ل
نبذ	ن ب ذ
نبذت	,,
نبذنا	,,
نبذوا	,,
نبرأ	ب ر أ
نبرح	ب ر ح
نبشر	ب ش ر
نبطش	ب ط ش
نبعث	ب ع ث
نبغي	ب غ ى
نبلوا	ب ل و
نبوئ	ب و أ
نبوة	ن ب أ
نبي	,,

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ندي	ن د و	نزداد	ز ی د	نسف	ن س ف
نذر	ن ذ ر	نزع	ن ز ع	نسفت	,,
نَنَذَرُ	و ذ ر	نزعنا	,,	نسفع	س ف ع
نذرت	ن ذ ر	نزغ	ن ز غ	نسقط	س ق ط
نذرتم	,,	نزل	ن ز ل	نسقي	س ق ی
نذق	ذ و ق	نزلة	,,	نسک	ن س ك
نذکر	ذ ك ر	نزلت	,,	نسكن	س ك ن
نذل	ذ ل ل	نزلنا	,,	نسل	ن س ل
نذور	ن ذر	نزيد	ز ی د	نسلخ	س ل خ
نذهب	ذ ه ب	نساء	ن س و	نسلك	س ل ك
نذير	ن ذ ر	نسارع	س ر ع	نسلم	س ل م
نذيق	ذ و ق	نسئل	س أ ل	نسم	و س م
نری	ر أ ی	نسب	ن س ب	نسمع	س م ع
نراود	ر و د	نسبح	س ب ح	نسوا	ن س ی
نرب	ر ب و	نستبق	س ب ق	نسوة	ن س و
نرث	و ر ث	نستحوذ	ح و ذ	نسوق	س و ق
نرد	ر د د	نستحيي	ح ی ی	نسوی	س و ی
نرزق	ر ز ق	نستدرج	د ر ج	نسی	ن س ی
نرسل	ر س ل	نستعين	ع و ن	نسيْ	ن س أ
نرفع	ر ف ع	نستنسخ	ن س خ	نسيا	ن س ی
نري	ر أ ی	نسجد	س ج د	نسيت	,,
نريد	ر و د	نسخة	ن س خ	نسيتم	,,
نزاعة	ن ز ع	نسخر	س خ ر	نسير	س ی ر
نزد	ز ی د	نسر	نسر	نسينا	ن س ی

لفظ	ماده
نعمر	ع م ر
نعمل	ع م ل
نعود	ع و د
نعيد	،،
نعيم	ن ع م
نغادر	غ د ر
نغرق	غ ر ق
نغرين	غ ر و
نغفر	غ ف ر
نفاثات	ن ف ث
نفاد	ن ف د
نفاق	ن ف ق
نفتن	ف ت ن
نفحة	ن ف ح
نفخ	ن ف خ
نفخة	،،
نفخت	،،
نفخنا	،،
نفد	ن ف د
نفدت	،،
نفر	ن ف ر
نفرغ	ف ر غ
نفرق	ف ر ق
نفس	ن ف س

لفظ	ماده
نفسد	ف س د
نفشت	ن ف ش
نفصل	ف ص ل
نفضل	ف ض ل
نفع	ن ف ع
نفعت	،،
نفعل	ف ع ل
نفق	ن ف ق
نفقات	،،
نفقة	،،
نفقد	ف ق د
نفقه	ف ق ه
نفور	ن ف ر
نفوس	ن ف س
نفير	ن ف ر
نقاتل	ق ت ل
نقب	ن ق ب
نقبوا	،،
نقتبس	ق ب س
نقتل	ق ت ل
نقدر	ق د ر
نقدس	ق د س
نقذف	ق ذ ف
نُقَر	ن ق ر

لفظ	ماده
نُقِرُّ	ق ر ر
نقرء	ق ر أ
نقرب	ق ر ب
نَنقُصُ	ن ق ص
نَقُصُّ	ق ص ص
نقصص	،،
نقض	ن ق ض
نقضت	،،
نقع	ن ق ع
نقعد	ق ع د
نقلب	ق ل ب
نقموا	ن ق م
نقول	ق و ل
نقيب	ن ق ب
نقير	ن ق ر
نقيض	ق ى ض
نقيم	ق و م
نَكُ	ك و ن
نكاح	ن ك ح
نكال	ن ك ل
نكتب	ك ت ب
نكتل	ك ى ل
نكتم	ك ت م
نكث	ن ك ث

لفظ	ماده
نكثوا	ن ك ث
نكح	ن ك ح
نكحتم	,,
نكد	ن ك د
نكذب	ك ذ ب
نكر	ن ك ر
نكروا	,,
نَكَسُوا	ك س و
نُكِسُوا	ن ك س
نكص	ن ك ص
نكفر	ك ف ر
نكلف	ك ل ف
نكلم	ك ل م
نكن	ك و ن
نكون	,,
نكير	ن ك ر
نلزم	ل ز م
نلعب	ل ع ب
نلعن	ل ع ن
نلقي	ل ق ى
نمارق	ن م ر ق
نمتع	م ت ع
نمد	م د د
نمكن	م ك ن
نمل	ن م ل
نملة	,,
نملي	م ل و
نمن	م ن ن
نمنع	م ن ع
نموت	م و ت
نميت	,,
نمير	م ى ر
نميم	ن م م
ننبئ	ن ب أ
ننجي	ن ج و
ننزع	ن ز ع
ننزل	ن ز ل
ننس	ن س ى
ننسىٰ	,,
ننسخ	ن س خ
ننسف	ن س ف
ننشئ	ن ش أ
ننشز	ن ش ز
ننصر	ن ص ر
ننظر	ن ظ ر
ننقص	ن ق ص
ننكس	ن ك س
ننهىٰ	ن ه ى
نوى	ن و ى
نواصي	ن ص و
نؤت	ا ت ى
نؤثر	ا ث ر
لوح	لوح
نوحي	و ح ى
نؤخر	ا خ ر
نودوا	ن د و - ى
نودي	,,
نور	ن و ر
نورث	و ر ث
نوف	و ف ى
نولي	و ل ى
نوم	ن و م
نومن	ا م ن
نون	ن و ن
نهىٰ	ن ه ى
نهار	ن ه ر
نهتدي	ه د ى
نهدي	,,
نهر	ن ه ر
نهلك	ه ل ك
نهوا	ن ه ى
نهيت	,,
نيسر	ى س ر
نيل	ن و ل

و

لفظ	ماده
و	و
وابل	و ب ل
واثق	و ث ق
واجفة	و ج ف
واحد	و ح د
واحدة	,,
واد	و د ی
وادی‌المقدس	,,+ق‌دس
وارث	و ر ث
وارثون	و ر ث
وارد	و ر د
واردون	,,
وازرة	و ز ر
واسع	و س ع
واسعة	,,
واصب	و ص ب
واعدنا	و ع د
واعظ	و ع ظ
واعظين	,,
واعية	و ع ی
واق	و ق ی
واقع	و ق ع
واقعة	و ق ع
وال	و ل ی
والد	و ل د
والدات	,,
والدة	,,
والدين	,,
واهية	و ه ی
وبال	و ب ل
وبيل	,,
وتر	و ت ر
وتين	و ت ن
وثاق	و ث ق
وثقی	,,
وجبت	و ج ب
وجد	و ج د
وجدا	,,
وجدت	,,
وجدتم	,,
وجدنا	,,
وجدوا	,,
وجلة	و ج ل
وجلت	,,
وجلون	و ج ل
وجوه	و ج ه
وجه	,,
وجهة	,,
وجهت	,,
وجيه	,,
وحد	و ح د
وحده	,,
وحوش	و ح ش
وحي	و ح ی
وحيد	و ح د
وَدٌّ	وَدّ
وُدٌّ	و د د
وَدّ	,,
ودت	,,
ودع	و د ع
ودق	و د ق
ودوا	و د د
ودود	,,
وراء	و ر ی
ورث	و ر ث

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ورثوا	و ر ث	وصيد	و ص د	وقع	و ق ع
ورد	و ر د	وصيلة	و ص ل	وقعة	,,
وردة	,,	وصينا	و ص ی	وقعت	,,
وردوا	,,	وضع	و ض ع	وقفوا	و ق ف
ورق	ورق	وضعت	,,	وقود	و ق د
ورقة	,,	وضعنا	,,	وكز	و ك ز
وريد	و ر د	وطأ	و ط أ	وكل	و ك ل
وزر	و ز ر	وطر	و ط ر	وكلنا	,,
وزن	و ز ن	وعاء	و ع ی	وكيل	,,
وزنوا	,,	وعد	و ع د	ول	و ل ی
وزير	و ز ر	وعدت	,,	ولى	,,
وسط	و س ط	وعدنا	,,	ولاية	,,
وسطى	,,	وعدوا	,,	ولد	و ل د
وسطن	,,	وعظت	و ع ظ	ولدان	,,
وسع	و س ع	وعيد	و ع د	ولدت	,,
وسعت	,,	وفى	و ف ی	ولدن	,,
وسق	و س ق	وفاق	و ف ق	ولوا	و ل ی
وسواس	و س و س	وفد	و ف د	ولي	,,
وسوس	,,	وفيت	و ف ی	وليت	,,
وسوسة	,,	وق	و ق ی	وليتم	,,
وسيلة	و س ل	وقار	و ق ر	وليجة	و ل ج
وصى	و ص ی	وقب	و ق ب	وليد	و ل د
وصف	و ص ف	وقت	و ق ت	ووری	و ر ی
وصلنا	و ص ل	وقر	و ق ر	وهاب	و ه ب
وصية	و ص ی				

لفظ	مادہ
وهاج	و ه ج
وهب	و ه ب
وهبت	,,
وهبنا	و ه ب
وهن	و ه ن
وهنوا	,,
وَيْكَأَنَّ	وى + كأن
ويل	و ى ل
ويلتى	,,

ه

لفظ	مادہ
ه	ه (ضمیر)
ه	ه (سکتہ)
ه	ه (وقف)
ها	ها (ضمیر)
ها	ها (حرف تنبیہ)
هَآؤُلَآءِ	هؤلاء
هاؤم	هاؤم (اسم فعل)
هاتوا	ه ى ت
هاتين	هذا
هاجر	ه ج ر
هاجرن	,,
هاجروا	,,
هادوا	ه و د
هادي	ه د ى
هٰذا	هٰذا
هٰذان	,,
هٰذه	,,
هار	ه و ر
هاروت	هاروت

لفظ	مادہ
هارون	هارون
هكذا	ها + ك + ذا
هالك	ه ل ك
هالكين	,,
هامان	هامان
هامدة	ه م د
هاوية	ه و ى
هٰهنا	هنا
هب	و ه ب
هباء	ه ب و
هجر	ه ج ر
هد	ه د د
هدى	ه د ى
هداية	,,
هدمت	ه د م
هدنا	ه و د
هدوا	ه د ى
هد هد	هد هد
هدي	ه د ى

لفظ	مادہ
هديت	ه د ى
هدية	,,
هدينا	,,
هرب	ه ر ب
هزل	ه ز ل
هزموا	ه ز م
هزؤ	ه ز أ
هزى	ه ز ز
هشيم	ه ش م
هضم	ه ض م
هضيم	,,
هل	هل
هلك	ه ل ك
هلم	هَلُمَّ
هلوع	ه ل ع
هُمْ	هُمْ
هَمَّ	ه م م
هما	هما
هماز	ه م ز

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
همت	ه م م	هنيئا	ه ن أ	هيْ	ه ى أ
همزات	ه م ز	هو	هُوَ	هيئة	,,
همزة	,,	هوى	ه و ى	هيت	هيت
همس	ه م س	هواء	,,	هيم	ه ى م
هموا	ه م م	هود	ه و د	هين	ه و ن
هُنَّ	هُنَّ	هون	ه و ن	هَيِّئْه	هى + ه
هنالك	هُنَا	هِيَ	هِيَ	هيهات	هيهات

ى

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ي	ي (ضمير)	ياخذون	أ خ ذ	يالمون	أ ل م
يا	يا (حرف ندا)	يوخر	أ خ ر	يالون	أ ل و
ياايها	,,	يودي	أ د ى	يَا لَيْتَهَا	يا+ليت+ها
ياب	أ ب ى	ياذن	أ ذ ن	يامر	أ م ر
يابس	ى ب س	يبعث	ب ع ث	يامرون	,,
يابسات	,,	يئس	ى أ س	يامن	أ م ن
ياتل	أ ل و	يئسن	,,	يامنوا	,,
ياتمرون	أ م ر	يئسوا	,,	يان	أ ن ى
ياتون	أ ت ى	يافكون	أ ف ك	يَئُودُ	أ و د
ياتي	,,	ياقوت	ياقوت	يُؤَدِّ	أ د ى
ياتيان	,,	ياكل	أ ك ل	يؤس	ى أ س
ياتين	,,	ياكلان	,,	يؤيد	أ ى د
ياجوج	ياجوج (اج ج)	ياكان	,,	يبايعن	ب ى ع
ياخذ	أ خ ذ	ياكلون	,,	يبايعون	,,

لفظ	ماده
يبتغ	ب غ ی
يبتغون	,,
يبتكن	ب ت ك
يبتلي	ب ل و
يبث	ب ث ث
يبحث	ب ح ث
يبخس	ب خ س
يبخسون	,,
يبخل	ب خ ل
يبخلون	,,
يبدء	ب د أ
يبدل	ب د ل
يبدلون	,,
يبدون	ب د و
يبدئ	ب د أ
يبدين	ب د و
يبس	ی ب س
يبسط	ب س ط
يبسطوا	,,
يبشر	ب ش ر
يبصر	ب ص ر
يبصرون	,,
يبطئ	ب ط أ
يبطئن	,,
يبطش	ب ط ش
يبطشون	,,
يبطل	ب ط ل
يبعث	ب ع ث
يبعثون	,,
يبغون	ب غ ی
يبغي	,,
يبغيان	,,
يبقى	ب ق ی
يبكون	ب ك ی
يبلى	ب ل ی
يبلس	ب ل س
يبلغ	ب ل غ
يبلغا	,,
يبلغوا	,,
يبلغون	,,
يبلو	ب ل و
يبلون	,,
يبلي	,,
يبور	ب و ر
يبيتون	ب ی ت
يبين	ب ی ن
يتاخر	أ خ ر
يتامى	ی ت م
يتبدل	ب د ل
يتبروا	ت ب ر
يتبع	ت ب ع
يتبعون	,,
يتبوء	ب و أ
يتبين	ب ی ن
يتجرع	ج ر ع
يتجنب	ج ن ب
يتحاجون	ح ج ج
يتحاكموا	ح ك م
يتخافتون	خ ف ت
يتخبط	خ ب ط
يتخذ	أ خ ذ
يتخذون	,,
يتخطف	خ ط ف
يتخلفون	خ ل ف
يتخيرون	خ ی ر
يتدبرون	د ب ر
يتذكر	ذ ك ر
يتذكرون	,,
يتر	و ت ر
يتراجعا	ر ج ع
يتربص	ر ب ص
يتربصن	,,

لفظ	ماده
يتربصون	ر ب ص
يتردّدون	ر د د
يترقب	ر ق ب
يترقبون	,,
يترك	ت ر ك
يتركوا	,,
يتزكّى	ز ك و
يتساءلون	س أ ل
يتسللون	س ل ل
يتسنه	س ن ه
يتضرعون	ض ر ع
يتطهر	ط ه ر
يتطهرون	,,
يتعارفون	ع ر ف
يتعد	ع د و
يتعلمون	ع ل م
يتغامزون	غ م ز
يتغير	غ ي ر
يتفجر	ف ج ر
يتفرقا	ف ر ق
يتفرقون	,,
يتفضل	ف ض ل
يتفطرن	ف ط ر
يتفقهوا	ف ق ه

لفظ	ماده
يتفكرون	ف ك ر
يتفيؤا	ف ي أ
يتقبل	ق ب ل
يتقدم	ق د م
يتقون	و ق ي
يتقي	,,
يتكئون	و ك أ
يتكبرون	ك ب ر
يتكلم	ك ل م
يتكلمون	,,
يتلى	ت ل و
يتلاومون	ل و م
يتلطف	ل ط ف
يتلقى	ل ق ي
يتلو	ت ل و
يتلون	,,
يتم	ت م م
يتماسا	م س س
يتمتعون	م ت ع
يتمطى	م ط ي
يتمنوا	م ن ي
يتمنون	,,
يتناجون	ن ج و
يتنازعون	ن ز ع

لفظ	ماده
يتنافس	ن ف س
يتناهون	ن ه ي
يتنزل	ن ز ل
يتوارى	و ر ي
يتوب	ت و ب
يتوبون	,,
يتوفى	و ف ي
يتوفون	,,
يتوكل	و ك ل
يتوكلون	,,
يتولى	و ل ي
يتولون	,,
يتيم	ي ت م
يتيمين	,,
يتيهون	ت ي ه
يثبت	ث ب ت
يثبتوا	,,
يثخن	ث خ ن
يثرب	ث ر ب
يثقفوا	ث ق ف
يثنون	ث ن ي
يجادل	ج د ل
يجادلون	,,
يجار	ج و ر

لفظ	مادہ	لفظ	مادہ	لفظ	مادہ
يجارون	ج أ ر	يجيب	ج و ب	يحرمون	ح ر م
يجاورون	ج و ر	يجير	ج و ر	يحزن	ح ز ن
يجاهد	ج ه د	يحاجون	ح ج ج	يحزنون	,,
يجاهدون	,,	يحادون	ح د د	يحسب	ح س ب
يجبٰى	ج ب ى-و	يحاربون	ح ر ب	يحسبون	,,
يجتبى	,,	يحاسب	ح س ب	يحسدون	ح س د
يجتنبون	ج ن ب	يحاط	ح و ط	يحسنون	ح س ن
يجحد	ج ح د	يحافظون	ح ف ظ	يحشر	ح ش ر
يجحدون	,,	يحاور	ح و ر	يحشرون	,,
يجد	و ج د	يحب	ح ب ب	يحض	ح ض ض
يجدون	,,	يحبب	,,	يحضرون	ح ض ر
يجر	ج ر ر	يحبرون	ح ب ر	يحضن	ح ى ض
يجرم	ج ر م	يحبس	ح ب س	يحطم	ح ط م
يجري	ج ر ى	يحبط	ح ب ط	يحف	ح ف ى-و
يجزى	ج ز ى	يحبطن	,,	يحفظن	ح ف ظ
يجزون	,,	يحبون	ح ب ب	يحفظون	,,
يجعل	ج ع ل	يحتسب	ح س ب	يحق	ح ق ق
يجعلون	,,	يحتسبون	,,	يحكم	ح ك م
يجلي	ج ل و	يحتسبوا	,,	يحكمان	,,
يجمحون	ج م ح	يحدث	ح د ث	يحكمون	,,
يجمع	ج م ع	يحذر	ح ذ ر	يحل	ح ل ل
يجمعون	,,	يحذرون	,,	يحلفون	ح ل ف
يجنب	ج ن ب	يحرفون	ح ر ف	يحلل	ح ل ل
يجهلون	ج ه ل	يحرم	ح ر م	يحلون	,,

لفظ	ماده
يدعون	د ع و
يُدَعُّونَ	د ع ع
يدمغ	د م غ
يدنين	د ن و
يدهنون	د ه ن
يدى	ى د ى
يدينون	د ى ن
يذبح	ذ ب ح
يذبحون	,,
يذر	و ذ ر
يذرون	,,
يذكر	ذ ک ر
يذكرون	,,
يذوق	ذ و ق
يذوقون	,,
يذهب	ذ ه ب
يذهبا	,,
يذهبن	,,
يذهبوا	,,
يذيق	ذ و ق
يرى	ر أ ى
يراءون	,,
يراد	ر و د
يربط	ر ب ط
يربوا	ر ب و
يربي	,,
يرتاب	ر ى ب
يرتابوا	,,
يرتد	ر د د
يرتدد	,,
يرتع	ر ت ع
يرتقوا	ر ق ى
يرث	و ر ث
يرثون	,,
يرجع	ر ج ع
يرجعون	,,
يرجموا	ر ج م
يرجوا	ر ج و
يرجون	,,
يرحم	ر ح م
يُرَدُّ	ر د د
يَرِدُ	ر و د
يَرُدُّوا	ر د د
يردون	,,
يردن	ر و د
يُرْدُوا	ر د ى
يرزق	ر ز ق
يرزقون	ر ز ق
يرسل	ر س ل
يرشدون	ر ش د
يرضيا	ر ض ى
يرضعن	ر ض ع
يرضون	ر ض ى
يرضين	,,
يرغب	ر غ ب
يرغبون	,,
يرغبوا	,,
يرفع	ر ف ع
يرقبون	ر ق ب
يركبون	ر ک ب
يركضون	ر ک ض
يركعون	ر ک ع
يركم	ر ک م
يرمون	ر م ى
يرمي	,,
يروا	ر أ ى
يرون	,,
يرهبون	ر ه ب
يرهق	ر ه ق
يري	ر أ ى
يريد	ر و د

لفظ	ماده
یریدان	ر و د
یریدون	,,
یریکموا	ر أ ی+کم
یزال	ز و ل
یزالون	,,
یزجي	ز ج و
یزداد	ز ی د
یزدادوا	,,
یزرون	و ز ر
یزعمون	ز ع م
یزفون	ز ف ف
یزکی	ز ک و
یزکون	,,
یزلقون	ز ل ق
یزنون	ز ن ی
یزنین	,,
یزوج	ز و ج
یزید	ز ی د
یزیدون	,,
یزیغ	ز ی غ
یسارعون	س ر ع
یساقون	س و ق
یسئل	س أ ل
یسئلون	,,

لفظ	ماده
یسام	س أ م
یسامون	,,
یسبتون	س ب ت
یسبح	س ب ح
یسبحن	,,
یسبحون	,,
یسبق	س ب ق
یسبقون	,,
یسبوا	س ب ب
یستاخرون	أ خ ر
یستاذن	أ ذ ن
یستاذنون	,,
یستبدل	ب د ل
یستبدلون	,,
یستبشرون	ب ش ر
یستثنون	ث ن ی
یستجیب	ج و ب
یستجیبون	,,
یستحبون	ح ب ب
یستحسرون	ح س ر
یستحیون	ح ی ی
یستحیي	,,
یستخرجا	خ ر ج
یستخف	خ ف ف

لفظ	ماده
یستخفون	خ ف ی
یستخلف	خ ل ف
یستسخرو	س خ ر
یستصرخ	ص ر خ
یستضعف	ض ع ف
یستضعفون	,,
یستطع	ط و ع
یستطیع	,,
یستطیعون	,,
یستعتبوا	ع ت ب
یستعتبون	,,
یستعجل	ع ج ل
یستعجلون	,,
یستعفف	ع ف ف
یستعففن	,,
یستغشون	غ ش ی
یستغفر	غ ف ر
یستغفرون	,,
یستغیثان	غ و ث
یستغیثوا	,,
یستفتحون	ف ت ح
یستفتون	ف ت ی
یستفز	ف ز ز
یستفزون	,,

لفظ	مادہ
يشاقق	ش ق ق
يشترون	ش ر ى
يشتري	,,
يشتهون	ش ه و
يشرب	ش ر ب
يشربون	,,
يشرح	ش ر ح
يشرك	ش ر ك
يشركن	,,
يشركون	,,
يشرون	ش ر ى
يشري	,,
يشعر	ش ع ر
يشعرون	,,
يشفع	ش ف ع
يشفعون	,,
يشفي	ش ف ى
يشقى	ش ق ى-و
يشقق	ش ق ق
يشقي	ش ق ى-و
يشكر	ش ک ر
يشكرون	,,
يشوي	ش و ى
يشهد	ش ه د

لفظ	مادہ
يشهدون	ش ه د
يصب	ص ب ب
يصبح	ص ب ح
يصبحوا	,,
يصبر	ص ب ر
يصبروا	,,
يصحبون	ص ح ب
يصد	ص د د
يصدر	ص د ر
يصدعون	ص د ع
يصدفون	ص د ف
يصدق	ص د ق
يصدقوا	,,
يصدقون	,,
يصد	ص د د
يصدوا	,,
يصدون	,,
يصدن	,,
يصر	ص ر ر
يصرف	ص ر ف
يصرفون	,,
يصرمون	ص ر م
يصرمن	,,
يصروا	ص ر ر

لفظ	مادہ
يصرون	ص ر ر
يصطرخون	ص ر خ
يصطفي	ص ف و
يصعد	ص ع د
يصعقون	ص ع ق
يصفحوا	ص ف ح
يصفون	و ص ف
يصلى	ص ل ى
يصلب	ص ل ب
يصلبوا	,,
يصلح	ص ل ح
يصلحا	,,
يصلحون	,,
يَصْلَوْنَ	ص ل ى
يَصِلُوْنَ	و ص ل
يُصَلُّوْنَ	ص ل و
يصلي	,,
يصم	ص و م
يصنع	ص ن ع
يصنعون	,,
يصور	ص و ر
يصهر	ص ه ر
يصيب	ص و ب
يضار	ض ر ر

لفظ	ماده
يعرضون	ع ر ض
يعرف	ع ر ف
يعرفن	,,
يعرفون	,,
يعزب	ع ز ب
يعش	ع ش و
يعص	ع ص ى
يعصرون	ع ص ر
يعصم	ع ص م
يعصون	ع ص ى
يعصين	,,
يعض	ع ض ض
يعطوا	ع ط و
يعطي	,,
يعظ	و ع ظ
يعظم	ع ظ م
يعفوا	ع ف و
يعفون	,,
يعقب	ع ق ب
يعقل	ع ق ل
يعقلون	,,
يَعْقُوب	يَعْقُوب
يعكفون	ع ك ف
يعلم	ع ل م

لفظ	ماده
يعلمان	ع ل م
يعلمون	,,
يعلنون	ع ل ن
يعمر	ع م ر
يعمروا	,,
يعمل	ع م ل
يعملون	,,
يعمهون	ع م ه
يعودون	ع و د
يعوذون	ع و ذ
يعوق	يَعُوق
يعيد	ع و د
يعيدوا	,,
يعي	ع ى ى
يغاث	غ و ث
يغاثوا	,,
يغادر	غ د ر
يغتب	غ ى ب
يغر	غ ر ر
يغرر	,,
يغرق	غ ر ق
يغرن	غ ر ر
يغشى	غ ش ى
يغشي	,,

لفظ	ماده
يغضضن	غ ض ض
يغضون	,,
يغفر	غ ف ر
يغفرون	,,
يغل	غ ل ل
يغلب	غ ل ب
يغلبوا	,,
يغلبون	,,
يغلل	غ ل ل
يغلي	غ ل و-ى
يغنوا	غ ن ى
يغني	,,
يغنيا	,,
يَغُوث	يَغُوث
يغوصون	غ و ص
يغوي	غ و ى
يغير	غ ى ر
يغيروا	,,
يغيظ	غ ى ظ
يفتح	ف ت ح
يفتدوا	ف د ى
يفتدي	,,
يفتر	ف ت ر
يفترى	ف ر ى

لفظ	ماده
یقیمون	ق و م
یقین	ی ق ن
یَكُ	ک و ن
یکاد	ک و د
یکادون	,,
یکبت	ک ب ت
یکبر	ک ب ر
یکبروا	,,
یکتب	ک ت ب
یکتبون	,,
یکتم	ک ت م
یکتمن	,,
یکتمون	,,
یکد	ک و د
یکذب	ک ذ ب
یکذبون	,,
یکره	ک ر ه
یکرهون	,,
یکسب	ک س ب
یکسبون	,,
یکشف	ک ش ف
یکف	ک ف ف
یکفِ	ک ف ی
یکفر	ک ف ر
یکفروا	,,

لفظ	ماده
یکفرون	ک ف ر
یکفل	ک ف ل
یکفلون	,,
یکفون	ک ف ف
یکفي	ک ف ی
یکلؤ	ک ل أ
یکلف	ک ل ف
یکلم	ک ل م
یَكُنْ	ک و ن
یکنزون	ک ن ز
یکور	ک و ر
یکون	ک و ن
یکونا	,,
یکونون	,,
یکیدون	ک ی د
یلاقوا	ل ق ی
یلبثون	ل ب ث
یلبس	ل ب س
یلبسوا	,,
یلبسون	,,
یلت	و ل ت
یلتفت	ل ف ت
یلتقط	ل ق ط
یلتقیان	ل ق ی

لفظ	ماده
یلج	و ل ج
یلحدون	ل ح د
یلحقوا	ل ح ق
یلد	و ل د
یلدوا	,,
یلعب	ل ع ب
یلعبون	,,
یلعن	ل ع ن
یلفظ	ل ف ظ
یلق	ل ق ی
یلقی	,,
یلقوا	,,
یلقون	,,
یلمز	ل م ز
یلمزون	,,
یلون	و ل ی
یلوون	ل و ی
یله	ل ه و
یلهث	ل ه ث
یم	ی م م
یمارون	م ر ی
یمت	م و ت
یمترون	م ر ی
یمتع	م ت ع

لفظ	ماده	لفظ	ماده	لفظ	ماده
ينشؤا	ن ش أ	ينقص	ن ق ص	يوثر	أ ث ر
ينشئ	,,	ينقصوا	,,	يوثرون	,,
ينشر	ن ش ر	ينقض	ق ض ض	يوثق	و ث ق
ينشرون	,,	ينقضون	ن ق ض	يوجه	و ج ه
ينصر	ن ص ر	ينقلب	ق ل ب	يوح	و ح ى
ينصرون	,,	ينقلبون	,,	يوحوا	,,
ينطق	ن ط ق	ينكث	ن ك ث	يوحون	,,
ينطقون	,,	ينكثون	,,	يوحي	,,
ينطلق	ط ل ق	ينكح	ن ك ح	يوخذ	أ خ ذ
ينظر	ن ظ ر	ينكحن	,,	يؤخر	أ خ ر
ينظرون	,,	ينكر	ن ك ر	يُؤَدِّ	أ د ى
ينع	ى ن ع	ينكرون	,,	يَوَدُّ	و د د
ينعق	ن ع ق	ينكسون	ن ك س	يودون	,,
ينغضون	ن غ ض	ينهى	ن ه ى	يوذن	أ ذ ن
ينفخ	ن ف خ	ينهون	,,	يؤذون	أ ذ ى
ينفد	ن ف د	ينيب	ن و ب	يؤذي	أ ذ ى
ينفروا	ن ف ر	يواخذ	أ خ ذ	يؤذين	,,
ينفضوا	ف ض ض	يوادون	و د د	يورث	و ر ث
ينفع	ن ف ع	يواري	و ر ى	يوزعون	و ز ع
ينفعون	,,	يواطئوا	و ط أ	يُوسُفُ	يوسف
ينفق	ن ف ق	يوبق	و ب ق	يوسوس	و س و س
ينفقون	,,	يؤت	أ ت ى	يوصى	و ص ى
ينفوا	ن ف ى	يوتى	,,	يوصل	و ص ل
ينقذون	ن ق ذ	يوتون	,,		

اغـــلاط نـامه مبادیات و فهرست

کوشش کے باوجود طباعت میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ بہتر ہو کہ آپ ان غلطیوں کی تصحیح ابھی کر لیں۔ ان میں بعض مقامات پر تو صرف حروف اڑ گئے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۷ سطر ۱۰- کم کرنے والا۔ صفحہ ۱۴- نہی کے صیغے۔ صفحہ ۲۷- مر بجائے امر۔ صفحہ ۳۴ سطر ۱۲- مضارع۔ صفحہ ۴۸- وزان بجائے اوزان۔ لیکن ذیل کی غلطیاں ایسی ہیں جن کا اثر معانی پر پڑتا ہے اس لئے ان کی تصحیح بہت ضروری ہے۔

صفحہ	سطر	تصحیح
۲۲	۵	فَعلَ کی جگہ فَعلَ
۳۵	۱	اِفتعال کی جگہ اِفتعال
۳۵	۵	یَواعَد کی جگہ یُواعَدُ
۳۹	۶	استَتبِع کی جگہ اِستَتبِع
۷۵		آنَسَ کے سامنے ا ن س
۷۶		ہوا کی جگہ اہوا
۸۸		اقطار کے سامنے ق ط ر
۸۹		الهم کے سامنے ل ه م
۱۰۳		تصبر کے سامنے ص ب ر
۱۱۳		حصل کے سامنے ح ص ل
۱۲۳		زالتا کے سامنے ز و ل
۱۲۵		ساهرة کے سامنے س ه ر
۱۳۱		صلی کی جگہ صلیٰ
۱۵۱		مُتِمّ کے سامنے ت م م
		متوکل کے سامنے و ك ل
۱۶۱		نا کے سامنے نا
۱۶۲		تتبراء کی جگہ تتبرأ
۱۶۳		تذهب کے سامنے ذ ه ب
۱۷۳		یحکم کے سامنے ح ک م
۱۷۷		یسقی کے بجائے یسقی
۱۷۸		پہلا کالم آخری سطر کے بجائے یشهد - ش ه د
۱۸۳		یؤذون کے سامنے ا ذ ی


تَتِمَّةٌ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تتمه

ہم نے لغات القرآن، جلد اول (صفحہ ۴۳) پر لکھا تھا کہ اگر لغات کی طباعت کے دوران، مزید غور و فکر سے بعض اہم نکات سامنے آئے، یا قارئین کی طرف سے مفید مشورے، تجاویز یا وضاحت طلب امور موصول ہوئے، تو آخری جلد کے ساتھ ایک تتمہ شائع کر دیا جائیگا۔ یہ تتمہ اسی مقصد کے پیش نظر شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں بیشتر اضافے یا ترمیمات جلد اول سے متعلق ہیں۔

جہانتک طباعت کی غلطیوں کا تعلق ہے، ان میں سے صرف انہی اغلاط کی تصحیح کی گئی ہے جن سے مفہوم پر اثر پڑتا تھا۔ دیگر معمولی غلطیوں، یا آیات میں بعض مقامات پر اعراب کی غلطیوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ جب اردو کے ٹائپ میں عربی عبارت چھاپی جائے تو اس میں اعراب کی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ آیات کا قرآن کریم کے نسخے سے مقابلہ کر لینا چاہئے۔ یہ ضروری ہے۔

ان اضافوں یا تبدیلیوں کے بعد بھی یہ دعوےٰ نہیں کیا جاسکتا کہ جو کچھ اس لغات میں لکھا گیا ہے وہ حرف آخر ہے۔ یہ بہرحال ایک انسانی کوشش ہے جس میں اصلاح کی گنجائش ہر وقت رہتی ہے۔

مبادیات

صفحہ ۱۵۔ سطر ۹۔ "جو اسم بنتے ہیں" میں "اسم" کی جگہ "فعل" ہونا چاہئے۔

تمہید

ہم نے صفحہ ۳۷۔ نمبر (۳) کے تحت لکھا ہے کہ مادوں میں جہاں "و" یا "ی" آئے وہاں مادہ کا تعین کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ جب مادہ کا آخری حرف "و" یا "ی" ہو تو اس

مادہ میں بیشتر "و" یا "ی" دونوں ھی شکلیں جائز ھوتی ھیں - ایسے مادوں کو جن کے آخر میں ھم نے "و" دیا ھے، "ی" میں بھی دیکھ لینا چاھئے - بعض جگہ ھم نے فہرست میں مادہ بتاتے ھوئے آخری حرف "و" لکھ دیا ھے لیکن لغت میں آخر میں "و" کی بجائے "ی" ھے - مثلاً آسی، تَاَسَّ - تاسوا - اسوۃ - میں ھم نے مادہ بتاتے وقت "ا س و" لکھا ھے اور لغت میں ان کی تشریح "ا - س - ی" کے عنوان کے تحت دی گئی ھے - لہذا جہاں مادہ کے آخر میں "و" ھو اور وہ "و" میں نہ ملے تو اس کے ساتھ "ی" میں بھی دیکھ لیجئے - اسی طرح جہاں مادہ کا آخری حرف "ی" ھو اور وہ "ی" میں نہ ملے تو اسے "و" میں بھی دیکھ لیجئے -

---

بعض الفاظ جو قرآن کریم میں نہیں ملتے اور فہرست میں آگئے ہیں :—

لفظ	مادہ
بائیع	ب ی ع
بدعة	ب د ع
ذہ	ذ ا
کفا	ک ف ف
محاسبة	ح س ب

(۴) ایک اهم بات حروف تہجی کی ترتیب کے ضمن میں ھے - عربی زبان میں (ن - و - ھ) بھی ترتیب وار لکھتے ھیں اور (ن - ھ - و) بھی - ھم نے ''فہرست الفاظ قرآنی'' میں (ن - و - ھ) کی ترتیب کو ملحوظ رکھا لیکن اصل لغات میں سہواً یہ ترتیب (ن - ھ - و) کی ھو گئی - یہی ترتیب شروع سے اخیر تک چلی جاتی ھے - اس لئے آپ کو لغات میں (ن) کے بعد (ھ) ملیگی اور اس کے بعد (و) - مادے تلاش کرنے وقت اس ترتیب کو ذھن میں رکھئیے - واضح رہے کہ مادوں میں تو "ھ" کے بعد "و" کی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے لیکن خود حرف "و" لغت میں "ھ" سے پہلے ملے گا - ملاحظہ ہو صفحہ (۱۶۸۰) اور (۱۷۹۷) -

---

اب اصل لغات کی طرف آئیے -

أ

صفحہ ۱۹۰

نمبر (۵) میں اَلَمْ تَرَ برائے تعجب بتایا گیا ھے ، لیکن اس قسم کا مرکب عموماً دعوت غور و فکر دینے کے لئے استعمال ھوتا ھے - اسی طرح ''اَفَلاَ'' اور ''اَوَلاَ''، اَفَلَمْ اور اَوَلَمْ وغیرہ بھی-

ا ب د

صفحہ ۱۹۲

دوسرے پیریگراف کے آخری حصہ سے یہ نہیں سمجھ لینا چاھئیے کہ جہنم کی بالآخر کوئی حد زمانی ھے ، اس کے بعد جہنم ختم ھو جائیگا اور جہنمی اس سے نکل کر کہیں اور چلے جائینگے - قرآن کریم کے متعدد مقامات میں یہ تصریح موجود ھے کہ جہنم سے نکل جانے کا سوال ھی پیدا نہیں ھوتا - جو کچھ ھم نے کہا ھے وہ صرف یہ ھے کہ یہ ابدیت اس قسم کی ابدیت نہیں جس قسم کی ابدیت خدا کے لئے مخصوص ھے - اسکی تشریح اگلا پیرا کر رھا ھے -

ابراھیم

صفحہ ۱۹۳

اُمَّةً قَانِتاً -

''ا م م''- (صفحہ ۲۶۱) میں اُمَّةٌ کے معنے امام بھی دئے ھوئے ھیں - نیز اسکے معنے وہ شخص بھی ھیں جو ھر قسم کے خیر کا منبع و سر چشمہ ھو-

"امام"، کی تائید قرآن کریم میں دوسری جگہ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (۲/۱۲۴) سے کر دی ہے۔ اس لئے، جیسا کہ عنوان (ا - م - م) میں لکھا گیا ہے، آیت (۱۶/۱۲۰) میں اُمَّۃً کے معنی امام اور مقتدا بھی کئے جا سکتے ہیں۔

ا ب ی

صفحہ ۱۹۶

(۱) اس مادہ میں چوتھی سطر کے آخر میں جہاں الاِبَاءُ والاَبَاءُ لکھا گیا ہے وہاں سے الاَبَاءُ حذف کر دیا جائے۔

(۲) نیچے سے چوتھی سطر میں یَاٰبِیْ کی جگہ یَاْبَی ہونا چاہئے۔

ا ج ج

صفحہ ۲۰۲

سَمِعْتُ اَجَّۃَ الْقَوْمِ میں نے لوگوں کی مخلوط حرکتوں اور آوازوں کا شور سا سنا۔

صفحہ ۲۰۴

شعر سے اوپر کے پیریگراف میں کہا گیا ہے کہ جب کسی مردہ قوم پر دوسری مہذب اور ترقی یافتہ قوم استیلاء کر لیتی ہے تو اس سے کچھ عرصہ کے بعد اس مردہ قوم کو زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ خدا خود یہ چاہتا ہے کہ طاقتور قومیں، کمزور قوموں کو اپنا غلام بنائیں تاکہ کمزور قوموں کو ازسرنو زندگی مل جائے۔ قرآن کریم کی تعلیم تو یہ ہے کہ طاقتور قوموں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ کمزور قوموں کی کمزوریوں کو رفع کرکے انہیں انسانیت کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل بنا دیں۔ اس نے کہا یہ ہے کہ اگر طاقتور قومیں ایسا نہ کریں تو کمزور قومیں خود ایک دن اٹھ کر ان کی غلامی کے جوئے کو گلے سے اتار پھینکینگی۔

ا ج ر

صفحہ ۲۰۵

دوسرا پیرا۔ یہ مفہوم لین نے قاموس کے حوالے سے دیا ہے۔

ا ج ل

صفحہ ۲۰۶

اَجَلٌ مدتِ معینہ کو بھی کہتے ہیں اور اس آخری حد کو بھی جہاں وہ مدت ختم ہو جاتی ہے۔

صفحہ ۲۰۷

ا ح د

پانچویں سطر میں آحَدٌ الاَ حَدِیْن لکھا ہے۔ صحیح " آحَدٌ اْلاَحَدِیْنَ ،، ہے۔

صفحہ ۲۰۸

ا خ ذ

دوسری سطر۔ مَاْخُذٌ کی بجائے مَاْخَذٌ ہونا چاہئے۔

صفحہ ۲۱۴

ا د م

اخیر میں لکھئے۔ ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے جس تمدنی دور سے قرآن کریم نے اس تمثیلی داستان کا آغاز کیا ہے، اس میں کوئی عظیم شخصیت " آدم ،، کے نام کی ہو اور اس دور کو اسی کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو۔ یا اس دور کی نسبت سے اس شخصیت کو اس نام سے پکارا گیا ہو۔ ہم نے انہیں بالیقین " نبی ،، اس لئے نہیں لکھا کہ قرآن کریم نے زمرہ انبیاء میں ان کا ذکر بصراحت نہیں کیا۔

۲ ۔ قرآن کریم میں " قصہ آدم بیان کرنے سے ایک مقصد تو یہ تھا کہ انسان کو بتایا جائے کہ اگر اس نے وحی کا دامن چھوڑا تو اس کی حالت کیا ہوگی اور اس حالت سے نکل کر پھر سے جنتی زندگی حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے وحی سے تمسک۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اس قصہ سے ان باطل عقائد کی بھی تردید کر دی جسے (بالخصوص) عیسائیت نے پھیلا رکھا تھا۔ یعنی یہ کہ ہر بچہ پیدائشی طور پر گنہگار ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے اولین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہ کا بوجھ ساتھ لاتا ہے، اور یہ گناہ حضرت عیسیٰؑ کے کفارہ پر ایمان لائے بغیر دھل ہی نہیں سکتے۔ یا یہ کہ مرد کو پھسلانے کا باعث عورت ہوتی ہے اس لئے عورت تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ یا یہ کہ (جیسا کہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے) فطرت کی قوتیں دیوی دیوتا ہیں، انسان کو انہیں معبود بنانا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم نے اس داستان سے ان تمام باطل عقائد و تصورات کی تردید کر دی۔

صفحہ ۲۲۱

ا ر ب

چوتھی سطر۔ اَلتَّابِعِیْنَ غَیْرَ اُولِی الْاِرْبَۃِ مِنَ الرِّجَالِ کے معنے لکھے گئے ہیں "جنہیں نکاح کی ضرورت نہ ہو"۔ ان میں ایسے ملازم

(یا دیگر پست درجه کے کام کاج کرنے والے) بھی شامل ہو سکتے ہیں جو زیادہ عقل و فکر کے مالک نہ ہوں اور کھانے پینے سے زیادہ کسی اور طرف ان کا دھیان ہی نہ جاسکے ۔ یا وہ کسی طرح وجہ' کشش ہی نہ بن سکیں ۔ قرآن کریم کی یہ اصطلاح بڑی جامع ہے ۔

ا ر ض

صفحہ ۲۲۱

تیسرا پیرہ ۔ پہلی سطر ۔ اس میں اِرَاضَۃٌ کی جگہ اَرَاضَۃٌ ہونا چاہئیے ۔

ا ر ک

صفحہ ۲۲۴

الاَرَاک ۔ یہ چارہ ترش نہیں بلکہ نمکین اور تلخ سا ہوتا ہے ۔ اونٹ اسے پیٹ بھر جانے پر کھاتے ہیں تا کہ اس سے کھانا ھضم ہو جائے ۔

اَرِیْکَۃٌ کے ضمن میں راغب نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ اَرَکَ بِالمَکَانِ سے بھی ہوسکتا ہے جس کے معنے کسی جگہ اقامت کرنا ہیں ۔ اس لحاظ سے اَرِیْکَۃٌ مسہری کو اس لئے کہا جائے گا کہ اس پر ٹھہرا اور رہا جاتا ہے ۔ گویا وہ قیام گاہ ہوگی ۔

ا ز ر

صفحہ ۲۲۴

پہلی سطر ۔ الاَزْرُ کے پہلے معنے ''کمر،، کاٹ دئے جائیں ۔

تیسری سطر ۔ الاِزَارُ کے معنے لکھے ہیں ہر وہ چیز جو ستر کا کام دے ۔ اس کی بجائے یہ کہئے کہ ہر وہ چیز جو تمہارے بدن کے لئے ستر کا کام دے ۔

ا ز ف

صفحہ ۲۲۵

دوسری سطر میں بجائے اِلتقا اَزِفَ کے التقا اَزِفَ ہے ۔ اس کے معنی قریب کے ہیں ۔

ا س ف

صفحہ ۲۲۸

چھٹی سطر ۔ ''حزن دل'' کی بجائے ''خونِ دل،،۔

ا س ن

صفحہ ۲۲۹

پہلی سطر میں آلاَسِینُ کے بجائے آلاَسِینُ ہونا چاہئے ۔

صفحہ ۲۲۹

ا س ی

اس میں مادہ (ا ۔ س ۔ و) بھی شامل ہے ۔

صفحہ ۲۳۳

ا ص ر

یہ اضافہ کر لیجئے ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْاِصْرُ سے مراد وہ امور ہیں جو بھلائیوں اور نیکیوں کی راہ میں مانع اور حائل ہوتے ہیں اور ان تک پہنچنے نہیں دیتے ۔

صفحہ ۲۳۶

ا ف ک

(۱) المؤْتَفِکَاتُ ۔ اَفَکَ کے معنے جھوٹ بولنے کے ہیں ۔ نیز کسی کو اس کی صحیح راہ سے پھیر دینا بھی ۔ اس لحاظ سے اِئْتَفَکَ میں صحیح راہ سے ہٹ جانے اور جھوٹ گھڑ لینے کا مفہوم آسکتا ہے ۔ اَلْمُؤْتَفِکَاتُ ان ہواؤں کو بھی کہتے ہیں جو اپنے صحیح رُخ سے ہٹی ہوئی چلتی ہیں ۔ لہذا المؤْتَفِکَاتُ کے معنے ہوسکتے ہیں وہ بستیاں جو اپنی صحیح روش پر قائم نہ رہیں اور غلط اعمال کرتی رہیں ۔ یا جھوٹ گھڑتی رہیں ۔ اگرچہ قرآن مجید کا طرز بیان یہی بتا رہا ہے کہ وہ خاص بستیاں تھیں جنہیں الٹ دیا گیا تھا ۔

(۲) جھوٹ گھڑنے کے معنوں میں سورۃ احقاف میں ہے فَسَیَقُوْلُوْنَ ھٰذَا اِفْکٌ قَدِیْمٌ (۴۶/۱۱) ۔ یہ کہینگے کہ یہ تو وہی جھوٹ ہے جو ابتدائی ایام (قدیم) سے گھڑا جاتا رہا ہے ۔ اسی کو دوسری جگہ قرآن کریم نے سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (۵۴/۲) سے تعبیر کیا ہے ۔ یعنی وہ جھوٹ جو شروع سے چلا آرہا ہے ۔

(۳) سورۃ نور میں قرآن کریم نے مومنین کو نصیحت اور تاکید کی ہے کہ وہ جھوٹے الزامات نہ وضع کیا کریں اور معاشرہ میں اس قسم کی باتوں کو نہ پھیلایا کریں (دیکھئے ۲۴/۴ و ۲۴/۱۸) ۔ اس ضمن میں اس نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جس میں ایک گروہ نے کسی پر جھوٹا الزام لگایا تھا ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْکِ عُصْبَۃٌ مِّنْکُمْ (۲۴/۱۱)۔ ”جو لوگ اس جھوٹ کو افترا کرکے لائے ہیں وہ تمہیں میں سے ایک گروہ ہے“ ۔ اس سارے واقعہ میں قرآن کریم نے کہیں نہیں بتایا کہ وہ کون تھا جس کے خلاف یہ الزام لگایا گیا تھا ۔ اس نے کہا صرف یہ ہے کہ جب یہ خبر جماعت مومنین تک

پہنچی ہے تو ان کا پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہئیے تھا کہ وہ حسن ظن سے کام لیتے اور کہہ دیتے کہ هٰـذَا اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (۲۴/۱۲) ۔ اور هٰـذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۲۴/۱۶) ۔ یہ وہی بات ہے جس کی دوسری جگہ یہ کہکر وضاحت کی گئی ہے کہ جب کوئی فاسق کوئی بات تم تک پہنچائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو (۴۹/۶) ۔ قرآن کریم نے صرف اتنا کہا ہے لیکن ہماری تاریخ (روایات) میں اس واقعہ کو (معاذ اللہ) حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب کرکے اس پر افسانہ طرازی کی ایک عمارت قائم کر دی گئی ہے ۔ حتکہ اس میں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ خود نبی اکرمؐ بھی اس باب میں سخت متردد تھے اور انہوں نے حضرت عائشہؓ کو ان کے میکے بھیج دیا تھا جہاں ان کی حالت غیر ہو گئی ۔ حتکہ خدا نے بذریعہ وحی ان کی براءت کی ۔ تب حضور اکرمؐ انہیں گھر لائے ۔

صاف نظر آتا ہے کہ یہ ایک گھڑا ہؤا قصہ ہے جسے خاص مقصد کے ماتحت وضع کیا گیا ہے ۔ لیکن ہم ہیں کہ اسے مستند واقعہ کی حیثیت سے لئے چلے آ رہے ہیں ، اور جب مخالفین اسلام اس پر اعتراض کرتے ہیں تو ہم طیش میں آ جاتے ہیں ۔ حالانکہ ہمیں اس کے جواب میں وہی کہہ دینا چاہئیے جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ هٰـذَا اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (۲۴/۱۲) ۔ یعنی یہ واقعہ جسے حضرت عائشہؓ اور نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ، افک مبین اور بہتان عظیم (۲۴/۱۶) ہے ۔

ا ک ل

صفحہ ۲۳۸

دوسرا پیرا ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اکل مال سے مراد انفاق مال ہے ، اس لئے کہ مال کا بیشتر مصرف کھانے پینے اور معاشی ضروریات سے متعلق ہوتا ہے ۔

آخری پیرا ۔ یوں چاہئیے ۔ '' ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی . . . .

ا ل ک

صفحہ ۲۴۲

پہلی سطر ۔ اَلْمَآلَكَ کی بجائے اَلْمَآلَكَ ہے ۔

دوسرے پیرے میں تاج کا ** حوالہ دیا گیا ہے ۔ تاج میں یہ مادہ (م ل ک) کے تحت آیا ہے ۔

اَلَّا (حرف)

صفحہ ۲۴۶

پہلی سطر ۔ '' اَلَّا تَعْلُوْا '' یوں ہونا چاہئیے ۔

صفحہ ۲۵۲

ا ل و (ا ل ی)

دوسرے پیرے کے آخر میں بڑھائیے ۔

آلاءٌ پر بحث کرتے ہوئے علامہ حمید الدین فراہیؒ اپنی تالیف مفردات القرآن صفحہ ۱۱ پر لکھتے ہیں :—

اگرچہ آلاءٌ کے معنے بالاتفاق نعمتیں ہی بتائے جاتے ہیں لیکن قرآن مجید اور اشعار عرب میں اس لفظ کا استعمال بتا رہا ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں ۔ بظاہر اس کے معنے ”عجیب کاریگریاں“، معلوم ہوتے ہیں جن کے لئے فارسی کا لفظ ”کرشمہ“، استعمال ہو سکتا ہے . . . “ ۔

انہوں نے جوہری کے حوالہ سے آلاء کے معنے خصال جمیلہ ، اچھی صفات ، خوبیاں بھی لکھے ہیں ، اس ضمن میں انہوں نے متعدد عربی اشعار بھی پیش کئے ہیں ۔

صفحہ ۲۵۳

اِلٰی (حرف)

نمبر (۴) میں وَ اُلاءِ مُرُّ اَلَیْکَ کی بجائے اِلَیْکَ ہے (۳/۳۳)

صفحہ ۲۵۵

ا م ت

سطر چھٹی ۔ ”بمقابلہ قاعاً صَفْصَفاً“، کے معنی یہ ہیں کہ اَمْتًا اس کی ضد ہے ۔

صفحہ ۲۵۹

ا م ر

دوسرے پیرے کے آخر میں لکھئے ۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ قوموں کی ہلاکت کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ آرام پرست ، کثرت کی طالب ، تعیش پسند اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی مالک ہو جاتی ہیں ۔ ان میں آسودہ حالوں کی کثرت ہوتی جاتی ہے جو معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کر دیتے ہیں اور اس سے قوم تباہ ہو جاتی ہے ۔

صفحہ ۲۶۰

ا م س

چوتھی سطر میں اَمْسٌ کی جگہ اُلاَءِ مْسِ چاہئے ۔

صفحہ ۲۶۰

ا م ل

چھٹی سطر شروع میں " ھے "، کے بعد دو نشان ** رہ گئے ھیں ، یعنی یہ عبارت تاج میں ھے ۔

صفحہ ۲۶۱

ا م م

اُمّۃٌ ۔ فُعْلَۃٌ یا فُعَلَۃٌ دونوں وزنوں پر مبالغہ کا صیغہ بھی ھو سکتا ھے ۔ فُعْلَۃٌ کے وزن پر اس کے معنے ھونگے جسکا بہت قصد کیا جائے ۔ اس مفہوم سے اس کا مطلب امام ھو سکتا ھے ۔ اور فُعَلَۃٌ کے لحاظ سے اسکے معنے ھونگے جو بکثرت کسی کا قصد کرے ۔ اس اعتبار سے آیت (۱۶/۱۲۰) میں اُمّۃٌ سے مراد ھوگا خدا کی طرف بار بار قصد کرنے والا ۔

اُمّۃٌ (۱۶/۱۲۰) کے لئے ابراھیم کے عنوان کے تحت بھی لکھا جا چکا ھے ۔

صفحہ ۲۶۵

ا م ن

شروع پیرا ۔ " جب اَمِنَ کا صلہ لام ھو"، میں بجائے اَمِنَ کے آمَنَ چاھئے ۔

صفحہ ۲۶۸

اِمّا

دوسری سطر ۔ " خواہ وہ انہیں عذاب دے " ھونا چاھئے ۔

صفحہ ۲۶۹

ا م و

دوسری سطر ۔ عَبَدٌ کی بجائے عَبْدٌ چاھئے ۔

اِنْ

صفحہ ۲۷۰ شق (۳) ۔ حوالہ آیت (۹/۷۹) کی جگہ (۹/۸۳) ھونا چاھئے ۔

صفحہ ۲۷۵

ا ن س

تیسرا پیرا ۔ انسان اور بشر کے فرق کے لئے دیکھئے عنوان " ب ش ر "۔

صفحہ ۲۸۰

ا ھ ل

پہلی سطر ۔ صاحب محیط نے اس لفظ کے متعدد معنے درج کئے ھیں ۔ پھر ابوحنیفہ کے حوالہ سے لکھا ھے کہ ان کے نزدیک اس سے بالخصوص بیوی مراد ھوتی ھے ۔

ا و ب

صفحہ ۲۸۲

اس میں (**) دو نشان سے راغب کا حوالہ مراد ہے، محیط زائد ہے۔ راغب نے اختیار کا لفظ نہیں لکھا۔ صرف ارادہ لکھا ہے۔ لہذا "اختیار" کاٹ دیا جائے۔

صفحہ ۲۸۳ اس عنوان کے اخیر پر لکھئے۔

اگر اس آیت میں "جبال" کے حقیقی معنی (پہاڑ) لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت داؤد پہاڑوں سے وہ کام لیتے تھے جن کے لئے فطرت نے انہیں بنایا ہے۔ حفاظت کا کام، جنگلات اگانے اور لکڑی حاصل کرنے کا کام، معدنیات نکالنے اور پتھروں کو مختلف مصارف میں لانے کا کام۔ وغیرہ وغیرہ، یہ تھی پہاڑوں کی طرف سے قانون خداوندی کے مطابق اطاعت۔

ب (حرف)

صفحہ ۲۹۲

نمبر (۴) آیت اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ بِاتِّخَاذِكُمْ میں ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمْ چاہئے۔

ب أ س

صفحہ ۲۹۴

پہلی سطر شروع بِئْسَ (بڑا) کی بجائے "برا" ہونا چاہئے۔

ب خ ل

صفحہ ۳۰۰

دوسری سطر راغب کی عبارت کا پورا ترجمہ یوں ہے "بخل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان اپنی جمع جوڑ کے ساتھ بخل کرے۔ یعنی انہیں خرچ کی ضرورت پر روکے رکھے۔ اور دوسری قسم یہ کہ انسان دوسرے کی جمع جوڑ کو ضرورت پر خرچ ہوتے دیکھ نہ سکے۔ اور یہ زیادہ قابل مذمت ہے"۔ پھر اس نے موخر الذکر بخل کے لئے آیت (۴/۳۷) کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔

ب د ل

صفحہ ۳۰۴

آخری پیرے کی آخری سے اوپر کی سطر میں آیت (۴/۲۰) میں اسْتِبْدَالَ زَوْاجٍ میں الف زائد ہے۔ یہ اِسْتِبْدَالَ زَوْجٍ ہے۔

صفحہ ۳۰۵

ب د و

دوسرا پیرا ۔ بَادِیَ الرَّأیِ (۱۱/۲۷) کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں نے تیرا اتباع کیا ہے وہ کسی غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر نہیں پہنچے بلکہ یونہی ایک بات سنی اور اسکے پیچھے لگ گئے ۔

صفحہ ۳۱۰

ب ر د

دوسرے پیرا کی دوسری سطر۔ آیت کا حوالہ (۲۱/۹۹) کی بجائے (۲۱/۶۹) ہے۔

صفحہ ۳۱۶

ب ر ک

صفحہ کے آخر کی چار سطروں کی جگہ (آیت کے بعد) یہ لکھئے ۔

تَبَارَکَ ۔ با برکت اور ہر قسم کے خیر و برکت کا سرچشمہ ہونا ۔ تَبَارَکَ الَّذِیْ . . . سے مراد ہے وہ ذات جس میں خیرو برکت اپنی پوری کثرت کے ساتھ انتہا تک پہنچ چکی ہو ۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اصل سرچشمہ خیر و برکت جہاں تمام خوبیاں اپنی کامل شکل میں موجود ہیں اور ان میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی ، ذاتِ خداوندی ہے ۔ اور ربوبیت عالمینی اسی سرچشمہٗ خیر و برکت سے ہوتی ہے ۔ جو قوم اللہ کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرے ، اسے بھی (علیٰ حد بشریت) سرچشمہ خیر و برکت اور عالمگیر انسانیت کے لئے سامان نشو و نما مہیا کرنے کا ذمہ دار ہونا چاہئے ۔

صفحہ ۳۲۱

ب س ل

چوتھی سطر کے آخر میں بڑھائیے ۔

راغب کی عبارت کا ترجمہ یہ ہے ۔ " روکنے کے مفہوم کے پیش نظر البَسْلُ اس کو کہینگے جسے محروم کر دیا گیا ہو ۔ نیز اس چیز کو جسے کسی کے پاس گرو رکھ دیا ہو" ۔

راغب نے اس مادہ میں بَسْلٌ اور حرام کا فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ حرام عام ہے اور بَسْلٌ اس روکنے اور منع کرنے کو کہینگے جس میں قہر پایا جائے ۔

صفحہ ۳۲۳

ب ش ر

پہلا پیرا شروع ۔ " بِشَارَۃٌ " سے لیکر " خبر دینا " تک کی عبارت کا حوالہ اقرب الموارد ہے ۔

سطر ۱۱ - بَشَارَۃ کی بجائے بِشَارَۃ چاھئے -

عنوان کے آخر پر لکھئے -

قرآن کریم میں بَشِیْرٌ و نَذِیْرٌ حضرات انبیاء کرامؑ کے لئے آیا ھے (۵/۱۹)۔ بَشِیْرٌ کے معنی ھیں وہ جو لوگوں کو ایمان اور اعمال صالح کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دے - اور نَذِیْرٌ وہ جو انہیں غلط روش زندگی کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرے۔ دوسری جگہ نَذِیْراً کے ساتھ مُبَشِّراً بھی آیا ھے (۱۷/۱۰۵) - اس کے معنی بھی خوش خبری دینے والا ھیں -

ب ص ر

صفحہ ۳۲۳ -

سطر ۳ - بَصِیْرَۃ۔ خون کا نشان یا ٹیکا جس کے ذریعے شکار کی نشاندھی ھوتی ھو -

سطر ۴ - بَصْرَۃ - سخت زمین نیز خستہ سفید پتھر کو کہتے ھیں (تاج) راغب نے چمکدار کا اضافہ کیا ھے -

صفحہ ۳۲۴ - سطر ۱۱ - پہلا لفظ ''میں'' کاٹ دیجئے -

(۲) عنوان کے آخر میں حسب ذیل اضافہ کیجئے -

اِسْتَبْصَرَ الشَّیْءَ - کسی چیز کو بغور دیکھا (تاج و محیط) راغب نے لکھا ھے کہ اِسْتَبْصَرَ کے معنے ھیں بصیرت طلب کرنا - نیز یہ بمعنی اَبْصَرَ بھی ھوتا ھے - یعنی دیکھنا - قرآن کریم میں ھے وَ کَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ (۲۹/۳۸) یعنی وہ دانا و بینا اور معاملہ فہمی کی صلاحیت رکھتے تھے -

قرآن کریم نے کہا یہ ھے کہ عاد و ثمود کی قومیں باوجود عقل و بصیرت رکھنے کے ، تباہ و برباد ھوگئیں - دوسری جگہ اس کی تشریح یہ کہکر کر دی گئی کہ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَۃً - ھم نے انہیں سننے ، دیکھنے اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیت دے رکھی تھی - فَمَا اَغْنٰی عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَا اَبْصَارُهُمْ وَ لَا اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ کَانُوْا یَجْحَدُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ (۴۶/۲۶) - لیکن چونکہ انہوں نے قوانین خداوندی سے انکار و سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی ، اس لئے ان کی سماعت و بصارت اور عقل و بصیرت ان کے کسی کام نہ آ سکی اور وہ تباہ و برباد ھوگئے - قرآن کریم نے کہا یہ ھے کہ اگر عقل و بصیرت سے وحی کی روشنی میں کام نہ لیا جائے ، تو وہ

افراد یا اقوام کو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ ذرا دیکھئے کہ عقل کرتی کیا ہے۔ انسان، اپنے ساتھ حیوانی جذبات (Animal Instincts) لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہی جذبات اس کے دل میں طرح طرح کی خواہشات (Desires) پیدا کرتے ہیں۔ اگر اس کی عقل خام، اور جذبات غالب ہیں، تو عقل اس خواہش کے جواز کے لئے دلائل (Justificatory Reasons) تراشیگی اور اس کے حصول کے لئے طرح طرح کی تدابیر سوچیگی۔ اس طرح وہ خواہش (Desire)۔ تمنا (Wish) بن جائے گی۔ اور جب انسان آخری فیصلہ کے بعد اس کے حصول پر تل جائیگا تو وہ ارادہ (Will) ہو جائے گی۔ اس صورت میں انسانی عقل، اس کی خواہشات یا جذبات کے بروئے کار لانے کا ذریعہ ہوگی۔

اگر عقل ذرا پختہ ہے، تو وہ اس انسان کو سمجھائے گی کہ اس خواہش (جذبہ) کے پورا کرنے میں تمہارا کتنا بڑا نقصان ہے۔ یعنی عقل زیادہ سے زیادہ اس فرد کے مفاد کا تحفظ کرسکتی ہے۔ اس سے آگے بڑھنا عقل کے بس کی بات نہیں۔ عقل، خیر و شر میں تمیز کر ہی نہیں سکتی۔ یہ تمیز صرف وحی کے ذریعے ہوتی ہے جو نوع انسانی کے عالمگیر نفع نقصان، اور انسانی ذات کے ضعف و قوت کے لئے حرف آخر کا حکم رکھتی ہے۔ اس لئے، انسان تباہی سے اسی صورت میں بچ سکتا ہے جب وہ عقل و بصیرت سے وحی کی روشنی میں کام لے۔

آج دنیا کی بڑی بڑی ترقی یافتہ قومیں جو تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل و علم کو وحی کے تابع نہیں رکھتیں۔

اور ہم اس لئے ذلیل و خوار ہو رہے ہیں کہ ہم نہ وحی سے مستفید ہوتے ہیں، نہ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں۔

ب ط ل

صفحہ ۳۲٦۔

باطل کے معنوں میں لکھا گیا ہے کہ یہ ایسی کوشش کا نام ہے جس کا نتیجہ کچھ نہ نکلے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دنیا میں ایسے کام بھی ہیں جو بلا نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ خدا کے قانون مکافات کی رو سے نتیجہ تو ہر کام کا مرتب ہوتا ہے۔ باطل ان کوششوں کا نام ہے جن کا نتیجہ وہ نہ نکلے جو

ان سے مقصود ہو۔ کوشش بیہودہ ۔ سعیٔ ناکام ۔ اور اس سے انسان میں ضعف پیدا ہو جائے ۔ یہ ہے باطل کا وہ تخریبی اثر جس کا مداوا تمسک بالحق کے سوا ہو نہیں سکتا ۔

ب ط ن

صفحہ ۳۲۸ ۔

پہلی سطر ۔ بَطْنٌ کے معنے پیٹ ۔ اندرونی حصہ ۔ اسکی جمع بُطُوْنٌ ہے ۔

تیسرا پیرہ ۔ پہلی سطر میں حوالہ (۵۵/۵۴) سے پہلے لکھئے ''اس کی جمع بَطَائِن ہے'' ۔

(آخر میں اضافہ) ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ (۶/۱۲۱) سے مراد ہے گناہ کی محسوس و غیر محسوس شکلیں ۔ اس میں نگاہ کی خیانت اور دل میں گزرنے والے خیالات تک آجاتے ہیں ۔

ب ع د

صفحہ ۳۳۱ ۔

دوسری سطر میں بَعَدًا و بَعْدًا ہے ۔ اس میں بَعْدًا کی بجائے بُعْدًا صحیح ہے ۔

ب غ ل

صفحہ ۳۳۴ ۔

آخر میں لکھئیے ۔ چونکہ خچر ، گھوڑی اور گدھے کے اختلاط سے وجود میں آتا ہے اس لئے ہر اس جانور کو بھی بَغْلٌ کہتے ہیں جو دو مختلف جنسوں کے ملاپ سے پیدا ہو ۔

ب غ ی

صفحہ ۳۳۶ ۔

حضرت مریمؑ کے واقعہ کے سلسلہ میں حسب ذیل اضافہ کرلیجئے ۔

لیکن اگر بَغِیًّا کے معنے ''بدکار'' ہی لئے جائیں ، تو آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت مریمؑ نے کہا کہ میں ہیکل میں تجرد کی زندگی بسر کر رہی ہوں اس لئے میرے متعلق خاوند سے اختلاط کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ دوسری صورت بدکاری کی ہوسکتی ہے ۔ سو میں بدکار بھی نہیں ۔ اس لئے میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہوسکتا ہے ۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت مریمؑ ہیکل میں (Nun) کی زندگی گذار رہی تھیں ۔ بعد میں ، جب ان تک تعلیم خداوندی پہنچی تو انہوں نے ہیکل کی تجرد کی زندگی چھوڑ کر متاہل زندگی اختیار کر لی ۔ چونکہ یہودیوں کے ہاں کسی (Nun) کے لئے متاہل زندگی

بسر کرنا جائز ھی نہیں تھا ، اس لئے وہ حضرت مریم[ع] کی اس زندگی کو (معاذ اللہ) بدکاری کی زندگی قرار دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰ[ع] نے ان کی اسی خود ساختہ شریعت کی تردید کرکے اپنی والدہ کی مدافعت کی تھی -

واضح رہے کہ بَغِیٌّ باوجود صیغہ مذکر ہونے کے ، صرف عورت کے لئے استعمال ہوتا ہے - ایسی عورت کو بَغِیَّۃٌ نہیں کہتے -

ب ق ع

صفحہ ۳۳۷ -

ساتویں سطر - "نیز" کے بجائے اَلْبُقْعَۃُ ہونا چاہئے -

ب ق ی

صفحہ ۳۳۹ -

دوسرا پیرہ - وَجْہِ رَبّ کے دوسرے مفہوم کے لئے عنوان (و - ج - ہ) دیکھئے -

ب ک ر

صفحہ ۳۴۰ -

پہلی سطر - اَلْبِکْرُ کی جمع اَبْکَارٌ ہے -

ب ل د

صفحہ ۳۴۳ -

نیا پیرہ - بَلَدَ الْفَرَسُ کی جگہ بَلَّدَ الْفَرَسُ ہونا چاہئے -

ب ل س

صفحہ ۳۴۴ -

پہلے پیرے کے آخر میں لکھئے -

لیکن اگر بَعْثٌ کے مفہوم کی گہرائی پر نگاہ ڈالئے تو یومِ یُبْعَثُوْنَ کے معنے اور ہونگے - بَعْثٌ کے معنی ہیں ان موانع کو دور کر دینا جو کسی کی آزادی کے راستے میں حائل ہوں - کھلا چھوڑ دینا - ابلیس سے کہا یہ گیا کہ تمہارا کام انسانوں کی اخلاق بندھنوں کو توڑ کر انہیں "مادر پدر آزاد" کر دینا ہے - تمہاری ضرورت اس وقت تک رہے گی جب تک انسان ان اخلاقی حدود کو توڑ کر یکسر آزاد نہ ہو جائیں - جب وہ اس طرح آزاد ہو جائیں گے تو پھر ان کے لئے تمہاری ضرورت نہیں رہے گی - اس لئے تمہیں اس وقت تک کی مہلت کی ضرورت ہے سو وہ مہلت تمہیں دی جاتی ہے - حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی بندھنوں کو ابتداءً توڑنے میں کچھ دقت محسوس ہوتی ہے لیکن جب یہ ایک مرتبہ ٹوٹ جائیں تو پھر انسان غیر شعوری طور پر خود بخود ، اس سیلاب میں بہے چلا جاتا ہے -

عنوان کے اخیر پھر لکھئے - نیز دیکھئے عنوانات (ق - ن - ط اور ی - أ - س) -

(۳) صفحہ ۳۴۵ کے اوپر بائیں ہاتھ کی طرف عنوان (ب - خ - ع) کی جگہ (ب - ل - س) لکھئے -

صفحہ ۳۵۸ - **ب ھ ل**

سطر ۱۲ میں انثی. کے بجائے انثیٰ -

صفحہ ۳۷۰ - **ب ی ن**

عنوان کے آخر میں لکھئے -

اِسْتَبَانَ الاَمْرُ - معاملہ کھل گیا ، ظاہر اور واضح ہوا - قرآن کریم میں ہے وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (۶/۵۵) - تاکہ مجرموں کی راہ کھل کر واضح ہو جائے - فَتَبَيَّنَ الشَّيْءُ - چیز واضح اور ظاہر ہوئی - تَبَيَّنْتُهٗ - میں نے اسے کھولا ، واضح کیا اور اسے سمجھا (لازم و متعدی) - (۴۹/۶)

صفحہ ۳۸۰ - **ت ف ث**

سطر چھٹی - التَّفَثُ کے معنے بالوں کی پراگندگی و پریشانی ہیں ، نہ محض پراگندگی و پریشانی -

اسی لائن کے آخر میں جو ابن عباس رض کا قول ہے ، وہ یہ ہے کہ تفث سر کے بال مونڈنے یا تراشنے ، ڈاڑھی موچھیں بنانے اور بغل کے بال لینے اور ذبح ورمی کو کہتے ہیں -

صفحہ ۳۸۲ - **ت ل و**

پہلی سطر کا پہلا لفظ - تَلَوْتُہٗ کے بجائے تَلَوْتُہٗ -

دوسرا پیرا پہلی سطر - تِلاَوَۃٌ کے بجائے تِلْوٌ وتُلُوٌّ صحیح ہے - راغب کی عبارت کا پورا ترجمہ یوں ہے -

تَلاَ کے معنے ہیں کسی کے پیچھے اس طرح چلنا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی غیر حائل نہ ہو - یہ شکل کبھی تو جسمانی طور پر ہوتی ہے اور کبھی حکم کا اقتداء کرنے میں - اور ان معانی میں اس کا مصدر تُلُوٌّ وتِلْوٌ آتا ہے - کبھی اسکے معنے پڑھنے اور غور و تدبر کرنے کے ہوتے ہیں تو اس کا مصدر تِلاَوَۃٌ آتا ہے -

ت م م

صفحه ۳۸۵ -

دوسرے پیرے میں جہاں کہا گیا ہے کہ " اب ہم نے تمہارا غلبہ و اقتدار انتہا تک پہنچا دیا "، تو اس سے مراد ان مخالفین کا سرنگوں ہوجانا ہے جو نبی اکرمؐ سے مدت العمر برسر پیکار رہے تھے۔ ورنہ دین (نظامِ خداوندی) کا غلبہ و اقتدار حضورؐ کے بعد بھی آگے بڑھتا گیا تھا۔

اور اگر " دین "، کے معنی دین اسلام ہی لیں تو اس سے مراد تکمیل دین ہوگی جو قرآن کریم کے اندر آکر اپنی انتہا تک پہنچ گئی تھی۔

ث م د

صفحہ ۴۰۱ -

چوتھی سطر۔ الثَّاسِدُ کے معنے ہیں چوپایہ یا انسان کا بچہ جو تھوڑا تھوڑا کھانا شروع کر دے۔ یہ اسکی ابتدائی عمر ہوتی ہے۔

ثَمَّ

صفحہ ۴۰۳ -

آیت ($\frac{۲}{۱۱۵}$) میں وجہ اللہ کے معنی ذات خداوندی بھی ہو سکتے ہیں لیکن ذات خداوندی ہمارے سامنے اس کی آیات کی رو سے ہی آتی ہے۔ آیات اللہ میں قانون خداوندی کی حیثیت بنیادی ہے۔

ثُمَّ

صفحہ ۴۰۴ -

ثُمَّ کے ایک معنی "اس پر بھی، اس کے باوجود بھی" ہوتے ہیں، مثلاً يَعْرِفُوْنَ نِعْمَةَ اللهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا ($\frac{۱۶}{۸۳}$)۔

ث ن ی

صفحہ ۴۰۶ -

پانچویں سطر۔ ثَنْيٌ الْحَيْقَةِ کے بجائے ثِنْيٌ الْحَيْقَةِ ہونا چاہئے۔

صفحہ ۴۰۷ - اوپر سے تیسری سطر کے بعد لکھئے۔ " یعنی سب کا سب اپنے لئے رکھ لینگے۔ اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں چھوڑینگے "۔

صفحہ ۴۰۷ - نیچے سے تیسری سطر (اوپر کو)۔ انگریزی کا لفظ کاٹ دیجئے۔ اس پیرے کے اخیر پر لکھئے۔ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِيَ کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم پہلی کتابوں کے متشابہ ہے اور اصولاً ان کی تکرار۔

صفحہ ۴۱۲ - ج ب ب

الجُبّ کے معنے بتاتے ہوئے محیط نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ایسے گہرے گڑھے اور کھائی کو بھی کہتے ہیں جسکی تہ اور آخری حد معلوم نہ ہو۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ ایسے کنویں کو کہتے ہیں جو سخت زمین میں کھودا جاتا ہے۔

صفحہ ۴۱۳ - ج ب ر

اس کا حوالہ رہ گیا ہے۔ "الجَابِرُ۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے والا" کا حوالہ تاج و محیط و راغب ہے۔

صفحہ ۴۱۴ - نیچے سے پانچویں سطر۔ "اس کی نوعیت" یہ الفاظ کاٹ دیں۔

صفحہ ۴۱۵ - ج ب ل

حضرت داؤدؑ کے پہاڑوں کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں، اسی تتمہ میں عنوان (ا۔ و۔ ب) بھی دیکھئے۔

صفحہ ۴۱۶ - ساتویں سطر میں سرداران قوم کی بجائے سردار قوم ہونا چاہئے۔

صفحہ ۴۱۷ - ج ب و (ی)

(اضافہ) جَبَی الْمَاءَ فِی الْحَوْضِ، جس کے معنی ہیں حوض میں پانی جمع کیا، سے الجَابِیَۃُ کے معنے ہوتے ہیں پانی جمع کر لینے والا حوض۔ اسکی جمع جَوَابِ (الجَوَابِی) ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَ جِفَانٍ کَالْجَوَابِ (۳۴/۱۳)۔

(تاج و محیط و راغب)

صفحہ ۴۱۹ - ج ح م

دوسری سطر۔ جَحَمَ الْبَعِیْرُ کے بجائے الْبَعِیْرَ چاہئے۔

صفحہ ۴۲۲ - ج د ر

دوسری سطر۔ التَّجِیدُرُ کے بجائے الجَدْرُ چاہئے۔

صفحہ ٤٢٥ - ## ج ر ز

آخر میں یہ لکھئے -

اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم جو کچھ زمین پر ہے اسے مثلا کر خاک اور خشک وبے گیاہ کرتے رہتے ہیں - (بہار اور خزاں کے دور جاری رہتے ہیں)

صفحہ ٤٢٦ - ## ج ر ف

آخری پیرا - دوسری سطری - بجائے انڈیل دینے کے " نکال لینے ، چلو سے لے لینے ، نیز کاٹ دینے " چاہئے -

صفحہ ٤٢٧ - ## ج ر ی

الجَارِيَةُ مؤنث ہے جَارٍ اور الجَارِیْ کا جسکے معنے ہیں چلنے والا ، بہنے والا ، تیزی سے دوڑنے والا - جَارِيَةٌ کی جمع جَارِيَاتٌ اور جَوَارٍ آتی ہے - قرآن مجید میں ہے الجَارِيَاتِ يُسْرًا (٥١/٣) - بہنے اور پانی میں تیرتی چلی جانے کی وجہ سے کشتی کو بھی جَارِيَةٌ کہدیتے ہیں - اسکی جمع جَوَارٍ اور جَارِيَاتٌ ہے -

صفحہ ٤٣٤ - ## ج ع ل

جعل کے لغت میں بہت سے معنی ہیں - صاحب محیط نے اسکے معنے بدل دینے کے بتائے ہیں - مثلاً جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (١٥/٧٤)- یعنی ہم نے اس کے بالائی حصے کو نچلے حصے سے بدل دیا -

اور نام رکھنے کے - مثلاً - جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا (٢/١٤٣)-

اور اعتقاد رکھنے کے - مثلاً يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ (١٥/٩٦)- گو یہ سب " کر دیتے اور بنا دینے " کے مفہوم ہی سے ہیں لیکن ان مثالوں سے اس مادہ کا مزید استعمال واضح ہو جاتا ہے -

صفحہ ٤٣٧ - ## ج ل ل

دوسری سطر - معمر یا جلیل القدر میں معمر زائد ہے - اسکی بجائے بڑا عظیم المرتبت - ہونا چاہئے -

راغب نے لکھا ہے کہ جلال میں جلالت سے زیادہ کمال پایا جاتا ہے -

صفحہ ۴۴۱ - **ج م م**

چھٹی سطر میں " سیرابی " کاٹ دیجئے -

صفحہ ۴۴۳ - **ج ن ح**

آخری پیرا ، پہلی سطر - " گناہ کے معنوں میں یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے" - اس عبارت میں " یہ لفظ " کی جگہ " جُنَاح* " لکھئے -

صفحہ ۴۴۴ - **ج ن ن**

دوسری سطر - راغب نے کہا ہے کہ جَنّ کے معنے کسی چیز کو حاسہ (نگاہ) سے پوشیدہ کر دینا ہیں -

صفحہ ۴۴۴ - آٹھویں سطر - جَنِیْن کے معنے کے بعد لکھئے ، اسکی جمع آجِنَّة* ہے ($\frac{53}{32}$) -

صفحہ ۴۵۰ - **جہنّم**

پہلا پیرا - حوالہ (*) سے مراد فٹ نوٹ میں تاج ہے -

صفحہ ۴۵۶ - **ج و ب**

پہلی سطر - قوسین کے اندر کی عبارت کی بجائے حسب ذیل عبارت لکھئے (اس لئے کہ جواب دینے والا جب کسی کی بات کا جواب دیتا ہے تو وہ اس کے منہ سے نکل کر سائل کے کانوں تک کا فاصلہ قطع کرتی ہے - ویسے سوال بھی یہ فاصلہ طے کرتا ہے - لیکن یہ لفظ جواب کے لئے خاص ہو گیا ہے - راغب)

(۲) اضافہ - سوال دو قسم کا ہوتا ہے - ایک تو کسی بات یا مسئلہ کا دریافت کرنا - اور دوسرے امداد و اعانت طلب کرنا - لہذا اس اعتبار سے جواب کی بھی دو قسمیں ہونگی اور اجابت و استجابت ، ان دونوں قسموں کے جواب کے لئے بولا جائیگا - یعنی کسی سوال کا جواب دینا ، یا کسی مانگ اور مطالبہ کو پورا کر دینا -

صفحہ ۴۵۹ - **ج و و**

پانچویں سطر کا آخر - "آسمان کو الجَوّ" میں ، " آسمان " کی بجائے " بالائی فضا" لکھئے -

صفحہ ۳۶۰۔ پہلی سطر۔ راغب نے "اتیان" اور "مجیء" کا فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اتیان کسی کام کے کرنے کے ارادہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے (خواہ وہ کام نہ ہوسکے)۔



لغات القرآن جلد دوم، سوم اور چہارم سے متعلق تتمہ کے مندرجات ان جلدوں میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔


لغات القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لغات القرآن کی تدوین ، ترتیب اور طریق استفادہ کے متعلق ''پیش لفظ'' میں تفصیل سے لکھا جاچکا ہے ۔ لیکن چونکہ ''پیش لفظ'' بہت پیچھے رہ گیا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس ضمن میں ضروری نکات آپ کے ذہن میں مستحضر نہ ہوں ۔ بنابریں مناسب سمجھا گیا ہے کہ ان میں سے اہم نکات کو دوبارہ پیش کر دیا جائے ۔ مثلاً :

۱ ۔ قرآن کریم کے جس لفظ کے معانی معلوم کرنے ہوں ، اُس لفظ کو ''فہرست الفاظ قرآنی'' میں دیکھئے جو صفحہ ۴۷ تا ۱۸۵ پر چھپی ہے ۔ فہرست میں اُس لفظ کے سامنے جو ''مادہ'' دیا گیا ہے ، لغات میں وہ لفظ اُس ''مادہ'' کے تحت ملیگا ۔

۲ ۔ عربی زبان میں الفاظ مختلف شکلیں بدلتے رہتے ہیں ۔ یہ ضروری نہیں کہ لغات میں ہر لفظ کی تمام شکلیں دی گئی ہوں ۔ اگر کسی لفظ کی کوئی خاص شکل لغات میں نہ ملے تو ، باب اول ''مبادیات'' میں دیکھئے کہ اس شکل میں پہنچکر لفظ کے معنی کیا ہو جاتے ہیں ۔ اس کے مطابق معنی متعین کر لیجئے ۔

۳ ۔ قرآنی حوالوں کی صورت یہ ہے کہ اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا ۔ مثلاً $(\frac{۳}{۷۸})$ سے مراد ہے سورہ آلِ عمران (تیسری سورت) کی آیت ۷۸ ۔

۴ ۔ قرآن کریم کے مختلف نسخوں میں آیات کے نمبروں میں تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے ۔ اگر آپ کے نسخے میں کوئی آیت اُس نمبر کے سامنے نہ ملے جو لغات میں دیا گیا ہے ، تو ایک دو نمبر اوپر یا نیچے دیکھ لیجئے ۔ وہاں آیت مل جائیگی ۔

۵ ۔ لغات میں جہاں آیت درج نہیں کی گئی بلکہ اسکا صرف حوالہ دیا گیا ہے ، اُس آیت کو قرآن سے نکال کر دیکھ لیجئے ۔ یہ ضروری ہے ۔ اس سے بات صاف ہو جائیگی ۔

۶ ۔ لغات میں جن کتابوں کے حوالے دئے گئے ہیں ان کا تعارف ''پیش لفظ'' میں کرایا جاچکا ہے ۔ اگر آپ ان میں سے کسی کتاب کو خود دیکھنا چاہیں تو ''پیش لفظ'' سے اس کی تفصیل معلوم کر لیں ۔

۷ ۔ اپنی طرف سے انتہائی کوشش کی گئی ہے کہ لغات میں طباعت کی غلطی نہ رہے ۔ لیکن اسکے باوجود غلطیاں رہ جانے کا امکان ہے ۔ اگر آپ کو کوئی غلطی نظر آئے تو اُس سے مطلع فرمائیں ۔

خدا کرے یہ لغات ، قرآن کریم کو براہ راست سمجھنے میں آپ کی ممدو معاون ثابت ہو ۔ اس سے یہی مقصود ہے ۔ والسلام ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ء
ا

أ (حرف)

أ - یہ حرف استفہام بھی ہے اور حرف ندا بھی ۔ یعنی کسی بات کے دریافت کرنے کے لئے بھی آتا ہے اور کسی کے پکارنے کے لئے بھی ۔ ذیل کی مثالوں سے اس کے استعمال کے مختلف انداز واضح ہو جائیں گے ۔

۱ - کسی سے کوئی بات دریافت کرنے کے لئے ۔ جیسے أَ زَيْدٌ قَائِمٌ؟ (کیا زید کھڑا ہے) ۔ اسکا جواب ھاں (نَعَمْ) یا نہ (لَا) میں آئیگا ۔ یا أَ زَيْدٌ قَائِمٌ أَمْ عَمْرٌو (کیا زید کھڑا ہے یا عمرو) ۔ قرآن میں حضرت ابراھیم (علیہ السلام) کے قصہ میں ہے ۔ أَ أَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِآلِهَتِنَا (۲۱/۶۲) ۔ کیا ھمارے معبودوں کے ساتھ یہ کچھ تو نے کیا ہے ؟ دوسری قسم کی مثال أَ أَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ (۷۹/۲۷) ۔ کیا تخلیق میں تم زیادہ سخت ہو یا آسمان ؟

۲ - ایسا استفہام جس کے بعد نفی آئے اور اس نفی سے اقرار میں تاکید اور زور مقصود ہو ۔ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ (۹۵/۸) ۔ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ؟ یعنی وہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم ہے ۔ یہاں أَ ۔ استفہام کے بعد لَيْسَ (نفی) ہے ، لیکن اس نفی سے مراد اُس بات کا انکار نہیں جو آگے کہی جا رہی ہے بلکہ اس کا اقرار مقصود ہے ۔ اور اقرار بھی تاکید اور شدت کے ساتھ ۔

۳ - ایسا استفہام جس میں توبیخ (ڈانٹنے) کا مفہوم پایا جائے ۔ جیسے ۔ أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ (۳/۸۲) ! کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور دین چاھتے ھیں ؟ یعنی ۔ ھیں ! کیا یہ ایسا چاھتے ھیں ۔

۴ ۔ ایسا استفہام جس میں استحقار آمیز تعجب اور طنز کا پہلو ہو۔ مثلاً قوم شعیب کا حضرت شعیب (علیہ السلام) سے کہنا کہ : أَصَلَوٰتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا (۱۱/۸۷) ۔ کیا تیری صلٰوۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ اپنے آباء و اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ اس میں حقارت، طنز اور تعجب کی تمام کیفیات موجود ہیں ۔

۵ ۔ تعجب کے لئے ۔ مثلاً ۔ أَلَمْ تَرَ إِلَى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ (۲۵/۴۵)۔ کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ تیرا رب کسطرح سایہ کو لمبا کرتا ہے ؟ مزید براں دیکھئے صفحہ ۱۸۰۵ جلد چہارم عنوان أ ۔

۶ ۔ کسی بات میں تاخیر ہو جانے پر تنبیہ کرنے کے لئے ۔ مثلاً ۔ أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا ۔ ۔ ۔ ۔ (۵۷/۱۶) ۔ کیا ایمان والوں کے لئے ابھی تک وہ وقت نہیں آیا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی وہ وقت آ چکا ہے ۔

۷ ۔ ایسا استفہام جس میں در حقیقت حکم دیا جانا مقصود ہو ۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ بتاؤ ! تم ایسا کرتے ہو یا نہیں؟ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ تمہیں ایسا کرنا ہوگا ۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو ۔ ۔ ۔ ۔ حضرت ابراہیم(ؑ) کے والد نے ان سے کہا أَرَاغِبٌ أَنْتَ عَنْ آلِهَتِي (۱۹/۴۶)۔ کیا تو میرے معبودوں سے کنارہ کشی کرتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ایسا مت کرو ۔ اگر تم نے ایسا کیا تو لَأَرْجُمَنَّكَ ۔ میں تجھے ذلت آمیز سزا دونگا ۔

۸ ۔ دو باتوں کو برابر قرار دینا ۔ لیکن یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب یہ سَوَاءٌ کے بعد آئے ۔ مثلاً ۔ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (۲/۶) ۔ تم انہیں (ان کی روش کے تباہ کن نتائج سے) متنبہ کرو یا نہ کرو ۔ اُن کے لئے یکساں ہے ۔

۹ ۔ ندا (پکارنے) کے لئے کہتے ہیں أَزَيْدُ أَقْبِلْ (اے زید آگے بڑھو) قرآن کریم میں اس کا استعمال نہیں آیا ۔

۱۰ ۔ أَ ہمیشہ جملہ کے شروع میں آتا ہے ۔ حتی کہ واؤ عطف سے بھی پہلے ۔ أَوَلَمْ يَنْظُرُوا ۔ أَفَلَمْ يَسِيرُوا ۔ بعض اوقات اسے حذف بھی کر دیا جاتا ہے ۔ خواہ اس سے پہلے ۔ أَمْ ۔ آ رہا ہو یا نہ آ رہا ہو* ۔ جیسے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے قصہ میں ہے کہ جب رات کے وقت ستارہ نمودار ہوا تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے پوچھا ۔

*محیط ۔

قَالَ هٰذَا رَبِّیْ (۶/۷۸)۔ کیا یہ میرا رب ہے؟ یعنی تم کہتے ہو کہ میں اس کی پرستش کروں؟ یہاں حرف استفہام (أَ) محذوف ہے ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ (هٰذَا رَبِّیْ) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نہیں بلکہ ان کے باپ (آزر) کا قول ہے اور اس کے بعد کا ٹکڑا (فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (۶/۷۶) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا جواب ہے ۔ (یعنی یہ سب باہمی مکالمہ ہے) اس صورت میں قَالَ هٰذَا رَبِّیْ میں (أَ) کو محذوف ماننے کی ضرورت نہیں رہتی ۔

نوٹ :۔ جب اس همزہ کے بعد کوئی ایسا لفظ آئے جس کے شروع میں بھی همزہ ہو تو یہ دونوں همزہ مل کر "آ" بن جاتے ہیں جیسے آلْاٰنَ (۱۰/۹۱) جو دراصل أَ أَلْاٰنَ (کیا اب؟) ہے ۔

ا ب ب

اَلْاَبُّ ۔ گھاس خواہ خشک ہو یا تر ۔ چراگاہ ۔ یہ لفظ ہر اس گھاس کے لئے استعمال ہوتا ہے جسے جانور کھاتے ہیں* ۔ قرآن میں ہے ۔ فَاكِهَةً وَّ أَبًّا (۸۰/۳۱) مجاہد نے کہا ہے کہ فَوَاكِهُ وہ میوے اور پھل ہیں جنہیں آدمی کھاتے ہیں اور أَبٌّ ۔ جانوروں کے کھانے کی چیزیں ہیں ۔ اس میں سبز گھاس ۔ چارہ ۔ بھوسہ سب شامل ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی (۱) چراگاہ اور (۲) قصد و ارادہ کے ہیں ۔ غالباً اس لئے کہ جانور چراگاہ کی طرف قصد و ارادہ سے جاتا ہے ۔

صاحب مفردات نے کہا ہے کہ مویشیوں کے لئے أَبٌّ کی وہی حیثیت ہے جو انسانوں کے لئے فَاكِهَةٌ کی ہے ۔ فَاكِهَةٌ اس کھانے کی چیز کو کہتے ہیں جسے لذت کے لئے کھایا جائے ۔ اس لئے أَبٌّ ان کھانے کی چیزوں کو کہینگے جنہیں مویشی خوشی سے کھائیں ۔

ا ب د

اَلْاَبَدُ ۔ غیر محدود زمانہ ۔ ہمیشہ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے طول مدت اور توحش کے ہوتے ہیں ۔ راغب نے لکھا ہے کہ أَبَدٌ سے مراد وہ طویل زمانہ ہے جسکا تجزیہ نہ کیا جاسکے ۔ یعنی جسے حصوں میں تقسیم نہ کیا جاسکے ۔ اس کے برعکس زَمَانٌ اس مدت کو کہتے ہیں جس کا تجزیہ کیا جاسکے ۔ اس اعتبار سے أَبَدٌ کا تثنیہ یا جمع نہیں آنی چاہئے تھی

*تاج

لیکن اس کے باوجود اس کی جمع آبَادٌ آتی ہے ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ لفظ (آبَادٌ) عرب عرباء کے کلام میں کہیں نہیں آیا* ۔

اَلْاَوَابِدُ ۔ وحشی جانوروں کو کہتے ہیں ۔ (کیونکہ عربوں کا خیال تھا کہ) وہ اپنی موت نہیں مرتے ، ہمیشہ کسی آفت سے مرتے ہیں ۔ غیرمانوس قوافی کو بھی اَوَابِدُ کہتے ہیں اور مصائب کو بھی* ۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور ہمزہ ساتھ آئیں ان میں توحش ، نفرت ، بُعد اور جدائی کا مفہوم ہوتا ہے ۔ اَبَدَا لْوَحْشُ کے معنی ہیں جنگلی جانور بدک کر بھاگ اُٹھے ۔

قرآن میں اَبَدٌ کا لفظ یا تو اس معنی میں آیا ہے جس معنی میں ہم کہتے ہیں کہ وہ کبھی ایسا نہ کریگا ۔ مثلاً وَ لَنْ یَتَمَنَّوْهُ اَبَدًا (۲/۹۵) وہ کبھی اس کی آرزو نہیں کرینگے ۔ اور یا جنت وغیرہ کے لئے خَالِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا (۵/۱۱۹) میں ۔ ''وہ اس میں ابدی طور پر رہینگے'' ۔ ابدی اور ازلی اصطلاحات قرآنی نہیں ۔ (اَزَلٌ کا تو لفظ ہی قرآن میں نہیں آیا) لہذا اَبَدٌ کے معنے زمانہ دراز کے ہونگے ۔ چنانچہ اہل جہنم کے متعلق جہاں یہ آیا ہے کہ خَالِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا (۴/۱۶۹) ۔ وہاں ان کے متعلق لَا بِثِیْنَ فِیْهَا اَحْقَابًا (۷۸/۲۳) بھی آیا ہے جس کے معنے زمانہ دراز کے ہیں (دیکھئے عنوان ح ۔ ق ۔ ب) اس کی تشریح مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ (۱۱/۱۰۹) سے بھی کر دی گئی ہے ۔ یعنی جب تک آسمان اور زمین ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اَبَدٌ سے مراد غیر مختتم (نہ ختم ہونے والا) زمانہ نہیں ۔ مزید دیکھئے صفحہ ۱۸۰۵ جلد چہارم عنوان اب د

زمان (TIME) کی فلسفیانہ بحث بڑی عمیق اور فنّی ہے اس لئے ہم اس میں نہیں الجھنا چاہتے ۔ اس مقام پر ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ جن معنوں میں ہم خدا کے لئے ازلی اور ابدی بولتے ہیں وہ مفہوم صرف خدا کیلئے مخصوص ہے ۔ کسی اور کے لئے نہیں ۔

ابراھیم (علیہ السلام)

حضرت ابراھیم (علیہ السلام) ، ترتیب زمانی کے اعتبار سے حضرت نوح (علیہ السلام) ۔ حضرت ھود (علیہ السلام) اور حضرت صالح (علیہ السلام) کے بعد آتے ہیں (ان حضرات کے تذکار جلیلہ کے لئے متعلقہ عنوانات دیکھئے) لیکن ملت ابراھیمی کے مؤسس اور معمار کعبہ کی حیثیت سے قرآن میں آپ کا ذکر بڑی شرح و بسط سے آیا ہے ۔ تورات کا بیان ہے کہ حضرت نوح (علیہ

*العلم الخفاق ۔

السلام) کی آٹھویں پشت میں نحور پیدا ہوئے۔ ان کے بیٹے تارح (آزر) اور آزر کے بیٹے حضرت ابراہیم (علیہ السلام)۔ آزر کا خاندان کلدانیوں کے شہر اُور میں آباد تھا۔ اس زمانے میں کلدانیوں (بابل) کا تمدن اپنے اوجِ کمال پر تھا۔ اس تاریخی قیاس کے مطابق آپ کا زمانہ قریب ۲۲۰۰ ق۔م قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ کی قوم بت پرستی اور ستارہ پرستی میں مشہور تھی۔ خود آپ کے والد ایک بہت بڑے پجاری (آدار) تھے۔ آپ نے اپنی دعوت توحید کا آغاز خود اپنے گھر (والد) سے شروع کیا (۶/۷۵)۔ باپ نے اس کی سخت مخالفت کی (۱۹/۴۶)۔ پھر آپ نے قوم کو مخاطب کیا اور واضح الفاظ میں انہیں بتایا کہ وہ کس ضلالت میں مبتلا ہیں (۲۱/۵۲) یہ کشمکش اس حد تک بڑھی کہ آپ نے ایک دن اُن کے مندر میں جا کر بتوں کو توڑ دیا (۲۱/۵۸) اس دوران میں خود بادشاہ کے ساتھ بھی آپ مکالمہ ہوا جس میں آپ نے اُسے دلائل و براہین سے لا جواب کر دیا (۲/۲۵۸)۔

ان پے درپے شکستوں سے قوم کے دل میں آتش انتقام بھڑک اُٹھی اور وہ آپ کی جان کے لاگو ہو گئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام تدابیر کو ناکام کر دیا اور آپ (اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کے ساتھ) اس مقام سے شام کی طرف ہجرت کر گئے (۲۱/۶۸-۷۰) اور فلسطین میں اقامت پذیر ہو گئے۔

آپ نے اپنے بیٹے (حضرت) اسحٰق (علیہ السلام) کو فلسطین میں بسایا اور دوسرے بیٹے (حضرت اسمٰعیل علیہ السلام) کو ساتھ لیکر خدا کے حکم سے وادی غیرذی زرع (حجاز) میں خانہ کعبہ کو تعمیر کیا (۲/۱۲۵) اور حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کے سپرد اس کی تولیت کی۔

حضرت اسحاق (علیہ السلام) کی شاخ میں تمام انبیائے بنی اسرائیل مبعوث ہوئے اور شاخ اسماعیل (علیہ السلام) کے گلِ سرسبد نبی اکرمؐ وجہ شادابی عالم ہوئے۔

یہ تھے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۔ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۶/۱۲۰) "بلاشبہ۔ ابراہیم (اپنی شخصیت میں ایک فرد نہیں بلکہ) پوری امت تھا۔ اللہ کے حضور جھکا ہوا۔ اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھا"، نیز دیکھئے صفحہ ۱۸۰۵/۱۸۰۶ جلد چہارم عنوان ابراہیمؑ۔

ا ب ق

اَبَقَ الْعَبْدُ اَبْقًا وَ اِبَاقًا ۔ غلام کا (اپنے فرائض کو چھوڑ کر) بھاگ جانا ۔ یعنی نہ اس سے کوئی سخت کام لیا جا رہا ہو اور نہ ہی اسے کسی قسم

تاج ۔ راغب ۔ محیط ۔

کا خوف ہو۔ اس کے باوجود اس کا چپکے سے بھاگ جانا*۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں بؔا اور ہمزہ ساتھ آئیں ان میں توحش۔ نفرت۔ بُعد اور جدائی کا مفہوم ہوتا ہے۔ اَبَقَ میں بھی کیفیت ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی غلام کا بھاگ جانا نیز کسی معاملہ میں تشدد برتنا ہیں۔

اَلْاٰبِقُ۔ اپنے فرائض منصبی سے احتراز کر کے بھاگ جانے والا یا چھپ جانے والا۔ تَاَبَّقَ الشَّیْیَ۔ وہ کسی شے کو ناگوار سمجھتے ہوئے اس سے کنارہ کش ہوگیا۔ عَبْدٌ اٰبِقٌ۔ بھاگ جانے والا غلام*۔

قرآن نے حضرت یونس کے متعلق اَبَقَ کالفظ استعمال کیا ہے (اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْکِ الْمَشْحُوْنِ۔ جب وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگا (۳۷/۱۴۰)) رسول کو خاص مشن دیکر اس کی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ اُسے اس مشن کی تکمیل میں ہزار مشقتیں اٹھانی پڑتیں، وہ کسی حالت میں بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑتا تھا۔ لیکن جب مشیت خود دیکھتی کہ اس کا اس جگہ زیادہ عرصہ کیلئے رہنا اس مشن کیلئے مفید نہیں تو اسے اس مقام کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جانے کا حکم مل جاتا۔ اسے هجرت کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس (علیہ السلام) نے جب دیکھا کہ ان کی قوم سرکشی سے باز نہیں آتی تو انہوں نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ یہ ماحول پیغام خداوندی کے لئے سازگار نہیں رہا۔ اسلئے وہ قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ چونکہ ان کا یہ فیصلہ مشیت کے پروگرام سے قبل از وقت تھا (اور انہوں نے خدا کے حکم کا انتظار کئے بغیر اپنی جگہ چھوڑ دی تھی) اسلئے ان کے اس عمل کیلئے اَبَقَ کہا گیا۔ یعنی اپنے فریضہ منصبی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ واضح رہے کہ یہ خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں تھی۔ اپنا اجتہادی فیصلہ تھا۔ لیکن چونکہ یہ فیصلہ مشیت کے پروگرام کی رُو سے ذرا قبل از وقت تھا اس لئے خدا نے اسے پسند نہیں کیا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ ایک رسول کی زندگی کسقدر احکام خداوندی کے تابع ہوتی تھی اور جن معاملات میں فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہوتا تھا ان میں رسول اپنی طرف سے ایک قدم بھی نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ دوسرے معاملات میں البتہ اسے آزادی ہوتی تھی کہ وہ وحی کے دئے ہوئے اصولوں کی روشنی میں اپنا پروگرام آپ مرتب کرتا جائے۔

---

*تاج۔ راغب۔ محیط۔

ا ب ل

اَلْاِبِلُ و اَلْاِبْلُ۔ اونٹ ۔ یہ کثیر تعداد میں اونٹوں کیلئے آتا ہے اور اس کا واحد اس لفظ سے نہیں آتا (۶/۱۴۵)۔ بادل کو بھی اونٹ سے تشبیہ دیتے ہیں ۔ چنانچہ قرآن میں جو ہے اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ (۸۸/۱۷) ''کیا یہ لوگ ابل کی طرف نہیں دیکھتے کہ انہیں کسطرح پیدا کیا گیا ؟ ،، اس میں اَلْاِبِلِ کے معنے بادل بھی ہو سکتے ہیں* ۔

اِبِل اَبَابِیْلُ۔ گلہ در گلہ اونٹ ۔ طَیْرًا اَبَابِیْلَ (۱۰۵/۳) جھنڈ در جھنڈ پرندے**۔ اَلْاِبَالَۃُ ۔ اَلْاِبِیْلُ ۔ اَلْاَبُوْلُ ۔ اَلْاِبَّالُ ۔ پرندوں، گھوڑوں اور اونٹوں کی ٹکڑی جو پے در پے یکے بعد دیگرے آتی ہے* ۔

اَبَلَ ۔ وہ متوحش ہو گیا ۔ جن الفاظ میں با اور ہمزہ ساتھ آئیں ان میں توحش، نفرت، بُعد اور جدائی کا مفہوم مضمر ہوتا ہے''* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تین ہیں ۔ اونٹ ۔ کافی ہو جانا ۔ اور بوجھ اور غلبہ ۔

ا ب و

اَبَاءٌ ۔ اَبٌ کی جمع ہے ۔ اَبٌ اصل میں اَبَوٌ تھا ۔ اَلْاَبُ ۔ باپ ۔ وہ شخص جس سے اس کی نوع کا کوئی دوسرا شخص پیدا ہو یا وہ شخص جو کسی شے کی ایجاد، اصلاح یا ظہور کا موجب ہو۔ مربی ۔ وصی ۔ چچا وغیرہ کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ نیز عمر اور مرتبہ کے لحاظ سے ہر بڑے آدمی کو بھی اَبٌ کہدیتے ہیں ۔ اَبَوْتُہٗ اَبْوًا ۔ میں نے اس کی تربیت کی۔ تَاَبَّاہٗ اس کو باپ بنا لیا ***

قرآن میں اَبَاءٌ کا لفظ آبا و اجداد (اسلاف) کے لئے آیا ہے ۔ مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَاءَنَا (۲/۱۷۰) ''جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا،، ۔ اور باپ چچا اور دادا کیلئے بھی ۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبودیت اختیار کروگے ، تو انہوں نے کہا کہ نَعْبُدُ اِلٰھَکَ وَ اِلٰہَ اٰبَائِکَ اِبْرَاھِیْمَ وَ اِسْمَاعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ (۲/۱۳۳) '' ہم تیرے الہ ۔ اور تیرے آباء ابراھیم ۔ اسماعیل اور اسحٰق کے الہ کی عبودیت اختیار کرینگے'' ۔ حضرت اسحاقؑ حضرت یعقوبؑ کے والد تھے ۔ حضرت اسماعیلؑ ان کے چچا اور حضرت ابراھیمؑ ان

* تاج ۔ راغب ** اس کے قرآنی مفہوم کیلئے دیکھئے عنوان ف ی ل ۔
''* العلم الخفاق *** محیط ۔

کے دادا تھے۔ ان سب کے لئے آباء کا لفظ آیا ہے۔ سورہ یوسف میں اَبَوَیْهِ آیا ہے جس کے معنی ماں باپ (والدین) ہیں (۱۲/۹۹)۔ باپ کو پکارتے وقت یَا اَبِیْ کی بجائے یَا اَبَتِ بھی کہتے ہیں* (مثلاً ۱۲/۴ میں)۔اَلْاَبَا۔ اَلْاَبُ کی ایک لغت ہے۔ اس کے معنی ہیں باپ۔

ا ب ی

اَبَی الشَّیْءَ یَأْبَاہُ۔ کسی چیز کو ناپسند کرنا۔ کسی چیز سے رکنا۔ باز رہنا۔ شدت سے انکار کرنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔اَخَذَہٗ اُبَاءٌ مِّنَ الطَّعَامِ۔ اسے کھانے سے کراہت ہوگئی۔ رَجُلٌ اَبَیَانٌ۔ وہ شخص جو کھانا کھانے سے باز رہے۔اَلْاِبَاءُ۔
کراہت۔ نفرت۔ امتناع۔ تکبر۔ نخوت کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی بات کو اپنے شایانِ شان نہ سمجھتے ہوئے اسے پائے استحقار سے ٹھکرا دینا اور پھر اپنی اس روش پر بضد قائم رہنا۔اَلْاَبِیُّ شیر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی مرضی کرتا ہے اور کسی کے کہنے پر نہیں چلتا**۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور ہمزہ ساتھ آئیں ان میں توحش۔ نفرت۔ بُعد اور جدائی کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ اَبٰی میں یہی کیفیت ہے۔ قرآن میں سجدہ (اطاعت) کے مقابلہ میں اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ (۲/۳۴) آیا ہے۔ یعنی ابلیس حکم خداوندی کی اطاعت سے رکا اور اس نے اس سے سرکشی برتی۔ دوسرے مقام پر ہے وَلَا یَأْبَ الشُّھَدَاءُ اِذَا مَا دُعُوْا (۲/۲۸۲)۔ ''جب گواہ بلائے جائیں تو وہ گواہی دینے سے انکار نہ کریں۔ رکیں نہیں'' قرآن میں اس کا استعمال ایک اور انداز سے بھی ہوا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ ہم نے قرآنی حقائق کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے لیکن فَاَبٰٓی اَکْثَرُ النَّاسِ اِلَّا کُفُوْرًا (۱۷/۸۹ نیز ۲۵/۵۰) ''اکثر لوگ ایسے ہیں جو کفر و انکار کے سوا ہر چیز سے اباء کرتے ہیں۔ یعنی وہ اس پر غور و فکر کرنے اور اس طرح اس سے راہ نمائی حاصل کرنے سے رکے رہتے ہیں اور اس کے حقائق سے انکار کئے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح سورۃ توبہ میں ہے وَیَاْبَی اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ (۹/۳۲) ''اللہ کسی بات کو قبول نہیں کرتا بجز اس کے کہ وہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے''۔ ان مثالوں سے واضح ہے کہ اِلَّا کے ساتھ اس لفظ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کے سوا اور کچھ مقصود و مطلوب نہیں۔ سورۃ کہف میں حضرت

---

* محیط ** تاج۔

موسیٰ اور ان کے رفیق سفر کے قصہ میں ہے فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْ هُمَا (۱۸/۷۷) " بستی والوں نے (انہیں حقیر سمجھتے ہوئے) ان کی مہمانداری کرنے سے انکار کر دیا"۔

ا ت ی

آتیٰ - یَاْتِیْ - کے معنے ہیں آنا* - راغب کے نزدیک اِتْیَانٌ - سہولت کے ساتھ آنے کو کہتے ہیں* - صاحب محیط نے آتَی الْمَاءَ کی مثال دی ہے جس کے معنے ہیں پانی کا راستہ آسان کر دیا **۔ مَاْتِیًّا - ضرور آنے والا (گویا آچکا ہے) (۱۹/۶۱)۔ مَاْتِیًّا اصل میں مفعول کا صیغہ ہے جس کے معنی اس چیز کے ہیں جس کے پاس آیا جاتا ہے یا وہ چیز جو آئی ہوئی ہو۔ اس اعتبار سے اس کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے جو قانون مقرر کر دیا ہے ہر شے اس تک پہنچ کر رہتی ہے۔

آتیٰ اِلَیْهِ الشَّیْءَ کے معنی ہیں اس کی طرف کوئی چیز بھیج دی۔ آتیٰ فُلَانًا شَیْئًا - اس نے اسے وہ چیز دیدی*۔ زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ اِیْتَاءٌ - اِعْطَاءٌ کے معنوں میں بکثرت آتا ہے مگر اِیْتَاءٌ کے معنے در حقیقت حاضر کرنے کے ہیں - راغب نے اسی لئے کہا ہے کہ قرآن میں صدقات وغیرہ کے لئے اِیْتَاءٌ ہی کا لفظ آیا ہے - اِعْطَاءٌ کا لفظ نہیں آیا - اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ صدقات سہولت سے دیے جا سکیں اور اس کی ضرورت نہ پڑے کہ اس کی تفتیش کی جائے کہ فلاں آدمی نے کیا دیا ہے*۔ (اس کی وضاحت کے لئے دیکھئے صَدَقَاتٌ - عنوان ص - د - ق) - صاحب تاج العروس نے مختلف اقوال سے بتایا ہے کہ اِعْطَاءٌ اور اِیْتَاءٌ میں فرق یہ ہے کہ اِعْطَاءٌ میں دینے والے کی پوزیشن اس سے ذرا بلند ہوتی ہے جسے دیا جائے لیکن اِیْتَاءٌ میں یہ بات نہیں ہوتی - بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جسے دیا جائے اس کی پوزیشن دینے والے سے ذرا بلند ہی ہو - یا کم از کم برابر ہو* (لیکن اسے ہم قاعدہ کلیہ نہیں کہ سکتے کیونکہ قرآن میں بعض جگہ اِیْتَاءٌ اور اِعْطَاءٌ کے الفاظ مرادف معنوں میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۃ توبہ میں ہے فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا .... وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَا آتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ .... (۹/۵۸-۵۹) - " سو اگر انہیں ان (صدقات) میں سے دیا جائے تو راضی ہو جاتے ہیں - .... اور (کیا اچھا ہوتا) اگر وہ اس پر راضی ہو جاتے جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے انہیں دیا تھا"۔

---

* تاج - ** محیط -

قرآن میں مالِ فیء کی تقسیم کے ضمن میں ہے کہ وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۵۹/۷) ،، - جو کچھ تمہیں رسول دے اسے لے لو اور جس کے لینے سے روک دے اس سے رک جاؤ۔ اس کی تشریح (۵۹/۹) میں ہے جہاں فرمایا - وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ - اس کا مطلب یہ ہے کہ مال فیئی اور مال غنیمت کے متعلق اصول یہ نہیں کہ جس نے جو لوٹ لیا وہ اس کی ملکیت ہو گیا - یہ سارا مال نظام خداوندی کی ملکیت ہوتا ہے اور اس کی تقسیم مرکز نظام کی طرف سے ہوتی ہے -

سورۃ اٰلِ عمران میں یہ لفظ نزع کے مقابلے میں آیا ہے جس کے معنی لے لینے کے ہیں - تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ (۳/۲۵) - ،، تو جسے چاہتا ہے ملک دے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے ،، (اس کی تفصیل ،، مشیت ،، کے ماتحت عنوان ش - ی - أ میں دیکھئیے)۔ اَتَی الرَّجُلُ - اس نے کوئی کام کیا - عمل کیا*- قرآن میں ہے لَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰی (۲۰/۶۹) - اس کے معنی یہ ہیں کہ ساحر خواہ کچھ ہی کیوں نہ کرے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا- یا مثلاً سورۃ الشعراء میں ہے اَتَاْتُوْنَ الذُّکْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ- (۲۶/۱۶۵) ** ،، تم دنیا جہاں سے الگ مردوں کے ساتھ بد فعلی کرتے ہو،، -

صاحب تاج العروس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اِیْتَآءٌ اور اِعْطَآءٌ میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ اِیْتَآءٌ کے معنی یہ ہیں کہ جسے کچھ دیا جائے وہ اس تک پہنچ جائے اور وہ اسے قبول بھی کر لے - بر عکس اس کے اِعْطَآءٌ کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ کسی کو دیا جائے ضروری نہیں کہ وہ اس تک پہنچ بھی جائے یا وہ اسے حاصل بھی کرے - اس اعتبار سے قرآن میں جو کہا گیا ہے کہ کُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَهٰۤؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّکَ- وَمَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحْظُوْرًا (۱۷/۲۰) - تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے جو کچھ عطا ہوا ہے وہ عام ہے - لیکن خدا اسے ہر ایک تک براہ راست نہیں پہنچاتا - اسے حاصل کر لینے کے لئے خود جد و جہد کرنی پڑتی ہے - نیز یہ کہ کسی کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان بخشائشوں کو عام انسانوں تک نہ پہنچنے دے اور راستے میں روک بن کر کھڑا ہو جائے -

تاج العروس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اِتْیَانٌ کے معنی ہلاک کر دینے کے بھی ہیں - مثلاً قرآن میں ہے فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا

* تاج -

(۵۹/۴) - ” اللہ نے انہیں ایسے انداز سے ھلاک کر دیا جس کا انہیں وھم و گمان بھی نہ تھا ،، -

ا ث ث

اَلْاَثَاثُ - ہر چیز کا بڑا حصہ - مال کثیر - گھر کا سامان - ھر قسم کا مال مثلاً - اونٹ - بکریاں - غلام وغیرہ - اَثَاثَۃٌ اس کا واحد ھے - اَثَاثٌ گھر کے نئے سامان کو کہتے ھیں - بعض نے کہا ھے کہ یہ لفظ ھر اس سامان کیلئے استعمال ھوتا ھے جو گھر کی ضروریات کیلئے بنایا جائے - نہ کہ تجارت کی غرض سے* - ابن درید نے لکھا ھے کہ اَثَاثُ الْبَیْتِ سے مراد ھوتی ھے اَلْمَتَاعُ الْجَیِّدُ - گراں قدر سامان* - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی اجتماع اور نرمی کے ھوتے ھیں اور آثَّ النَّبْتُ آثًا کے معنی ھوتے ھیں، پودے بہت کثیر ھو گئے -

قرآن میں اَثَاثًاوَّ مَتَاعًا آیا ھے (۱۶/۸۰) - یعنی ساز و سامان -

ا ث ر

اَلْاَثَرُ - کسی کھنڈر وغیرہ کا باقی رہ جانے والا حصہ - اَلْاَثَرُ - زخم کا نشان جو اس کے اچھا ھو جانے کے بعد باقی رہ جاتا ھے - اَلْاَثِیْرَۃُ - وہ جانور جس کے چلنے سے زمین پر بڑا سا نشان بن جائے - اَلثُّؤْثُوْرُ وَالْمِئْثَرُ - لوھے کا ایک آلہ جس سے اونٹ کے تلوے میں خاص نشان بنا دیتے ھیں کہ اگر وہ کہیں گم ھو جائے تو اس نشان قدم سے اسے تلاش کر لیا جائے -***

صاحب محیط نے لکھا ھے کہ اَثَرٌ کے چار معنی ھوتے ھیں - (۱) نتیجہ جو کسی چیز سے حاصل ھو - (۲) علامت - (۳) خبر - (۴) حکم جو کسی چیز پر مرتب ھو ″* -

قرآن میں ھے فَانْظُرْ اِلٰی اٰثَارِ رَحْمَتِ اللّٰہِ (۳۰/۵۰) - یہاں آثار کے معنی نشانیاں یا علامات ھیں - سورۃ فتح میں اَثَرِ السُّجُوْدِ (۴۸/۲۹) آیا ھے - یعنی اطاعتِ خداوندی سے جو قلبی سکون اور اطمینان نصیب ھوتا ھے اس کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ھیں - سورۃ مومن میں ھے اَشَدَّ مِنْھُمْ قُوَّۃً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ (۴۰/۲۱) - دوسری جگہ سورۃ یٰسین میں قَدَّمُوْا کے مقابلہ میں اٰثَارَھُمْ آیا ھے (۳۶/۱۲) یعنی جو وہ آگے بھیجتے ھیں اور جو پیچھے چھوڑتے ھیں - سورۃ کہف میں ھے عَلٰٓی اٰثَارِھِمْ (۱۸/۶) - ان کے

* تاج و محیط - ** کتاب الاشتقاق - *** تاج ″* محیط -

پیچھے ۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے ۔ فَارْتَدَّا عَلٰی آثَارِ ھِمَا قَصَصًا (۱۸/۶۴) ۔ اپنے نقوش قدم پر پیچھے کی طرف لوٹے ۔ سورۃ حدید میں ہے۔ ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰی آثَارِ ھِمْ بِرُسُلِنَا (۵۷/۲۷) ۔ پھر ہم نے ان کے نقش قدم پر ان کے پیچھے اور رسول بھیجے ۔ اس سے اُس کے معنے مسلک و مشرب کے آتے ہیں (یعنے کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے) ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْاَثَرُ کے معنے پیچھے چلنے اور پیروی کرنے کے ہوتے ہیں۔ اس میں آثَرٌ اور اِثْرٌ دونوں آتے ہیں۔ سورۃ طہ میں سامری کا قول ہے کہ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ (۲۰/۹۶) میں نے رسول (حضرت موسیٰؑ) کے مسلک و مشرب سے تھوڑا سا حاصل کیا تھا ۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کا قول ہے ۔ ھُمْ اُولَاءِ عَلٰی اَثَرِیْ (۲۰/۸۴) ۔ وہ میرے نقش قدم (مسلک) پر ہیں ۔ سورۃ احقاف میں ہے اَثَارَةٍ مِنْ عِلْمٍ (۴۶/۴) ۔ اس کے معنی علمی دلیل کے ہیں ۔ (یعنی جو کچھ علم میں سے باقی رہ جائے)

آثَرَ ۔ نشان زدہ کرکے اپنے لئے مخصوص کر لینا یا کسی دوسرے کے لئے مختص کر دینا ۔ اسی سے اِیْثَارٌ ہے جس کے معنی ہیں کسی کو اپنے اوپر ترجیح یا فوقیت دینا۔ابن فارس نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے ۔ پہلے معنوں میں سورۃ اَعْلٰی میں ہے بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (۸۷/۱۶) ۔ یہ قریبی مفاد ۔صرف طبعی زندگی کے انفرادی مفاد ۔ کو اپنے لئے ترجیح دیتے ہیں ۔ نیز (۷۹/۳۸)۔ اور دوسرے معنوں میں سورۃ حشر میں ہے یُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ (۵۹/۹) ۔ وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں ۔ سورۃ یوسف میں ہے لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَیْنَا (۱۲/۹۱) ۔ خدا نے تمہیں ہم پر فضیلت دی ہے ۔ سورۃ طہ میں ہے لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰی مَا جَاءَنَا (۲۰/۷۲) ۔ جو ہمارے پاس آ چکا ہے تجھے ہم اس پر ترجیح نہیں دینگے ۔

حَدِیْثٌ مَا ثُوْرٌ ۔ ایسی بات جس کی لوگ ایک دوسرے کو خبر دیتے چلے آرہے ہوں * ابن فارس نے لکھا ہے کہ اَلْمَاْثُوْرَةُ اس کنویں کو کہتے ہیں جو پہلے بنا ہوا ہو پھر زمین کے نیچے دب گیا ہو لیکن جب کوئی وہاں پہنچے تو ڈول اور رسی کے نشانات پائے ۔

ا ث ل

اَلْاَثْلُ ۔ جھاؤ کا درخت ۔ * وہ درخت جسکی جڑ خوب مضبوط ہو ** ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کی اصل اور اس کے

* تاج ۔ ** راغب

مجتمع ہونے کے ہیں - یعنی پختہ بنیاد ہونا - قرآن میں آثلِِ (۳۴:۱۶) جھاؤ کے معنوں میں آیا ہے -

ا ث م

آلاَثِمَةُ - اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تکان کی وجہ سے مضمحل ہو چکی ہو اور اسلئے بہت آہستہ آہستہ چلے - آلنَّمُؤَاثِمُ - وہ اونٹ جو اضمحلال کی وجہ سے چلنے سے جواب دے جائے *- لہذا اِثْمٌ کے بنیادی معنوں میں اضمحلال- افسردگی - توانائی کا کم ہو جانا- سست روی اور شکستگی کا پہلو ہوتا ہے- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دیر ہونا اور پیچھے رہ جانا ہیں - قرآن میں جرم کیلئے اِثْمٌ اور عُدْوَانٌ کے الفاظ آئے ہیں- ان کے صحیح مفہوم کیلئے (ع-د-و) کا عنوان دیکھئے جہاں عُدْوَانٌ کے مقابلہ میں اِثْمٌ کے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے- مقصد اس سے وہ تمام اعمال ہیں جن سے انسانی ذات میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو جائے - جن سے اسکی قوت عمل میں کمزوری واقع ہو جائے - جن سے وہ سفر حیات طے کرنے میں سست گام ہو جائے - جن سے وہ دوسروں کے مقابلہ میں پیچھے رہ جائے- اس کے لئے قرآن نے خَمْرٌ اور مَیْسِرٌ کی مثال دی ہے جہاں کہا ہے کہ ان میں فائدہ تو ضرور ہے لیکن ان سے انسان کے قوائے عملیہ میں جو اضمحلال پیدا ہوتا ہے اسکے نقصانات اس فائدہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں- وَ اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا(۲:۲۱۹)- خَمْرٌ (نشہ آور اشیاء) کے ان اثرات سے کون نا واقف ہے جن سے انسان کی قوتیں آہستہ آہستہ مضمحل ہو جاتی ہیں - اسی لئے ''جنت کی شراب'' کے متعلق کہا ہے کہ اس میں تَاْثِیمٌ نہیں ہوگی (لَا لَغْوٌ فِیْهَا وَلَا تَاْثِیمٌ ۵۲:۲۳)- یعنی اس سے قویٰ مضمحل نہیں ہونگے بلکہ ان کی کمی پوری ہو جائیگی- لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّ لَا تَاْثِیْمًا -اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (۲۶-۵۶:۲۵) باقی رہا مَیْسِرٌ- سو یہ لفظ یُسْرٌ سے ہے (دیکھئے عنوان ی-س-ر) یسر کے معنی ہیں آسانی (بائیں ہاتھ کا کھیل) لہذا مَیْسِرٌ ہر اس آمدنی اور دولت کو کہینگے جو بغیر محنت کئے حاصل ہو جائے - اس قسم کی دولت سے جسطرح انسان کے قوائے عملیہ میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے اور انسان محنت کر کے کمانے کے قابل نہیں رہتا وہ بھی کسی سے مخفی نہیں - اس لئے سود خوار کو بھی اَثِیْمٌ کہا گیا ہے - (۲:۲۷۶) -

(ع-د-و) کے عنوان میں عُدْوَانٌ کے معنے یہ بھی بتائے گئے ہیں کہ ان سے مراد ایسے جرائم ہیں جن کے اثرات متعدی ہوں - یعنی ان سے معاشرہ کے دوسرے افراد بھی اثر پذیر ہوتے ہوں - اس بنا پر اِثْمٌ کے معنی ہونگے ایسے جرائم جن کا اثر انسان کی اپنی ذات تک ہی محدود رہتا ہو - مثلاً ایک

* تاج -

شخص افیون کھا کر چپکے سے لیٹے رہتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اسکے اس عمل کا اثر اسکی اپنی ذات تک محدود ہے ۔ لیکن قرآن کی رو سے یہ بھی جرم ہے ۔ اسلئے کہ اسکے نزدیک زندگی کا مقصود انسانی ذات کا نشو و نما ہے لہذا ہر وہ کام جس سے انسانی ذات میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو جرم ہوگا خواہ وہ انسان کے اپنے ہاتھوں سے ہی پیدا کیوں نہ ہو ۔ قرآن کی رو سے انسان کا خود اپنے آپکو نقصان پہنچانا بھی جرم ہے ۔ خود کشی بھی قتل نفس میں شامل ہے اور اسلئے اِثْمٌ میں داخل ۔ اور زنا کے وجہ اثم ہونے کے لئے تو کسی ثبوت اور شہادت کی بھی ضرورت نہیں ۔ اسلئے قتل نفس اور زنا کے لئے کہا گیا ہے کہ مَنْ یَفْعَلْ ذَالِکَ یَلْقَ اَثَامًا ۔ (۲۵/۶۸) ۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو بغیر محنت کئے مفت میں دولت حاصل ہو جائے (خواہ وہ کسی طریق سے ملے) اور وہ کسی کو نقصان بھی نہ پہنچائے ۔ تو وہ بھی اِثْمٌ ہے ۔ اسلئے کہ محنت نہ کرنے سے اسکے قوائے عملیہ مضمحل ہو جائیں گے اور یہ چیز قرآن کی رو سے جرم ہے ۔

یہ ہیں اِثْمٌ کے بنیادی معنی ۔ اسکے بعد یہ لفظ عمومی حیثیت سے عام جرائم (گناہوں) کے لئے بھی استعمال ہونے لگا ۔ قرآن کے متعدد مقامات میں یہ لفظ ان معنی میں آیا ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے بالخصوص ایسے افعال مراد ہوتے ہیں جو اپنے نتائج مرتب کرنے میں دیر لگائیں * (یہ چیز بھی اسکے بنیادی معنوں میں داخل ہے ۔ یعنی سست روی ۔ نتائج پیدا کرنے میں تاخیر ۔ آہستہ آہستہ نتائج مرتب کرنے والے ۔ جیسے خمر یعنی نشہ آور چیزوں کا استعمال) ۔ راغب کے نزدیک اثمٌ اور ذَنْبٌ میں فرق یہ ہے کہ ذَنْبٌ عَمْدًا اور سہواً دونوں طریق پر ہو سکتا ہے لیکن اِثْمٌ صرف ارادۃً ہوتا ہے ۔ لیکن اس لفظ کے مفہوم میں بُطْؤٌ (دیر لگانے) کے معنے ضرور شامل ہوتے ہیں **

اِثْمٌ کیلئے (ب-ر-ر) کا عنوان بھی دیکھئے کیونکہ قرآن میں یہ لفظ بِرٌّ کے مقابلہ میں بھی آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵/۲) بر اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور اثم و عدوان میں تعاون مت کرو ۔

ا ج ج

اَلْاَجَّةُ ۔ اَلْاَجِیْجُ ۔ آگ کا بھڑکنا ۔ مشتعل ہونا ۔ آگ کی آواز کو بھی کہتے ہیں ۔ اَجَّ ۔ یَؤُجُّ ۔ اَجًّا ۔ وہ تیز چلا ۔ سَمِعْتُ اَجَّتَهُمْ ۔ میں نے انکے چلنے کی آواز یا مخلوط سا شور سنا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی

* تاج ۔ ** راغب ۔

معنی آہٹ اور شدت کے ہیں۔ اَلْاَجَّۃُ۔ اختلاط و اضطراب۔ گرمی کی شدت۔ مَآءٌ اُجَاجٌ۔ سخت کڑوا پانی؛ وَھٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ اور یہ سخت کھاری پانی ہے۔ (۳۵/۱۲ و ۲۵/۵۳)۔ اَجَّجَ فُلَانٌ۔ اس نے دشمن پر حملہ کیا *۔ *نیز دیکھئے صفحہ ۱۸۰۶ جلد چہارم عنوان ل۔ج۔ج۔

قرآن میں یَاْجُوْجُ۔ مَاْجُوْجُ کے الفاظ دو مقام پر آئے ہیں۔(۱۸/۹۴) اور (۲۱/۹۶) میں۔ اول الذکر ذوالقرنین کے قصہ کے ضمن میں ہے جہاں ایک قوم نے اس سے فریاد کی کہ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ آکر تباہ کاریاں مچا دیتے ہیں اسلئے آپ ہمارے لئے ایک ایسی دیوار بنا دیں جو انکے حملوں کے لئے روک ثابت ہو۔چنانچہ ذوالقرنین نے وہ دیوار تعمیر کردی جسکا ذکر سورۃ کہف میں (۱۸/۹۴) آتا ہے۔ دوسرا حوالہ سورۃ انبیاء کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَا اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ۔ حَتّٰی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ (۲۱/۹۵-۹۶)۔

یاجوج وماجوج کا نام تورات میں ملتا ہے۔ چنانچہ حزقیل نبی کی پیشگوئی میں ہے (واضح رہے کہ حزقیل نبی کو بخت نصر بیت المقدس کی تباہی کے بعد گرفتار کرکے بابل لے گیا تھا جہاں وہ ایران کے بادشاہ سائرس۔ جسے قرآن میں ذوالقرنین کہا گیا ہے۔کے زمانہ تک زندہ تھے)''اور خداوند کا کلام مجھ تک پہنچا۔ اس نے کہا اے آدم زاد تو جوج کی طرف منہہ کرکے اسکے خلاف نبوت کر۔ جوج کی طرف جوماجوج کی سرزمین کا ہے اور ارس۔ مسک۔ اور توبال۔کا سردار ہے''۔ اسکے بعد یہ الفاظ عہد نامہ جدید (یوحنا کے مکاشفات) میں ملتے ہیں جہاں لکھا ہے ''جب ہزار سال پورے ہو چکینگے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائیگا اور وہ ان قوموں کو جو زمین کے چاروں طرف ہونگی یعنے یاجوج وماجوج کو گمراہ کرنے اور لڑانے کیلئے جمع کرکے نکلیگا۔ انکا شمار سمندر کی ریت کے برابر ہوگا اور وہ تمام زمین کی وسعتوں پر چڑھ جائینگی''۔ یاجوج وماجوج یورپ کی زبانوں میں گاگ (Gog) میگاگ (Magag) کے نام سے متعارف ہیں۔کہا جاتا ہے کہ یہ یونانی زبان کے نام ہیں اور وہیں سے یورپ کی دیگر زبانوں میں آئے۔ یاجوج وماجوج کونسی قومیں تھیں،اس کے متعلق محققین کی آراء مختلف ہیں۔ لیکن اکثریت کا رخ جس سمت کو گیا ہے وہ یہی ہے کہ یہ منگولیا کے علاقہ کے وحشی اور صحرا نورد قبائل تھے جن کا کام لوٹ مار تھا۔ یہ آندھی کے طوفان کی طرح اٹھتے اور اس سیلاب بلا کے سامنے جو کچھ آتا اسے خس و خاشاک کی طرح بہا کرلے جاتے۔ چنگیز خاں

تاج۔ محیط و راغب

اور ھلاکو خاں کے ہلاخیز جھگڑوں سے کون واقف نہیں ۔ منگولیا کا قدیم نام ''موگ''، تھا جو یونان میں میگاگ اور عبرانی میں ماجوج ھوگیا ۔ اس علاقہ میں دوسرا قبیلہ ''یواچی''، کے نام سے مشہور تھا جس نے عبرانی میں یاجوج کی شکل اختیار کرلی*- انہی کے حملوں سے بچنے کیلئے قومیں اپنے ملکوں کے گرد دیواریں تعمیر کیا کرتی تھیں ۔ یہی وہ سطح مرتفع تھی جہاں سے یہ وحشی قبائل بپھرے ہوئے دریاؤں کی پر شور طغیانیوں اور تلاطم انگیزیوں کی طرح ملحقہ اقوام کو تباہ و برباد کر دیتے (مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ) ۔ اگر ان الفاظ کو اَجَّ سے مشتق مانا جائے تو انکی خصوصیات میں آگ کی شعلہ انگیزیاں، طوفانی دریاؤں کی تلاطم خیزیاں اور تند و تیز ھواؤں کی تباہ کاریاں سب آ جاتی ھیں ۔ اشتقاق کی رو سے دیکھا جائے تو ذھن اس طرف منتقل ھو جاتا ھے کہ سورۃ انبیاء میں اگرچہ نام یاجوج و ماجوج ھی کا لیا گیا ھے لیکن اس سے مفہوم ''یاجوجیت و ماجوجیت'' ھے خواہ وہ کسی قوم میں پائی جائے۔ قرآن نے کہا یہ ھے کہ جو اقوام قعر مذلت میں گر جائینگی ان کے دوبارہ ابھرنے کی کوئی صورت نہیں ھوگی - بجز ایک صورت کے - اور وہ یہ ھے کہ جب دنیا کی ایسی قومیں جن میں اپنے ملک سے نکل کر دوسرے ممالک پر چھا جانے کی صلاحیت ھوگی ان پسماندہ اقوام کے ملکوں میں پہنچینگی تاکہ وھاں اپنی استعماریت قائم کریں تو ان کے اس تصادم سے ان کمزور قوموں کی قوتیں بیدار ھو جائینگی اور انہیں دوبارہ زندگی حاصل ھو جائیگی ۔ ھمارا دور اس پر شاھد ھے کہ یورپ کی اقوام کس طرح کمزور اقوام (بالخصوص مسلمانوں کے ممالک) میں پہنچیں تاکہ ان کا خون پیا جائے ۔ لیکن آھستہ آھستہ یہ کمزور اقوام انہی سے سبق سیکھکر ان کے مقابلہ میں اٹھ کھڑی ہوئیں اور اس طرح دوبارہ زندگی سے متمتع ھو گئیں**۔ اس حقیقت کو اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ھے کہ ۔

** نیز دیکھئے صفحہ ۱۸۰۶ جلد چہارم عنوان ر ج ج

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطمہائے دریا ھی سے ھے گوھر کی سیرابی

اسی طرح ان ''یاجوج و ماجوج''، اقوام کی تلاطم انگیزیاں ان مردہ اقوام کیلئے حیات نو کا باعث بن گئیں اور یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ حَتّٰى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ (۲۱: ۹۵-۹۶)

لیکن اگر ھم یاجوج و ماجوج کو ان کے علاقہ کے ساتھ مخصوص سمجھیں تو اس سے یہ بھی اشارہ نکل سکتا ھے کہ روس کا موجودہ سیلاب

* بحوالہ ترجمان القرآن ۔ ابوالکلام آزاد ۔ جلد دوم ۔ ۲۹

جس کی رو سے وہ ساری دنیا پر چھا جانا چاھتا ھے ۔ مسلمانوں کے ممالک کی بیداری کا باعث بن سکتا ھے ۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ھوگا جب مسلمانوں کے ممالک قرآن کا معاشی نظام اپنے ھاں رائج کر لیں ۔

نوٹ :۔ سورۃ انبیاء کی مندرجہ بالا آیات (۲۱/۹۵-۹۶) میں حتی کا ترجمہ '' یہاں تک ،، کیا گیا ھے ۔ لیکن بعض اوقات یہ حرف محض ابتدائے کلام کے لئے بھی آتا ھے اور اس کے کچھ معنی نہیں ھوتے ۔ دیکھئے حرف حتی ۔

ا ج ر

اَلْاَجْرُ ۔ کام کا بدلا ۔ اَلْاُجْرَۃُ ۔ جو کچھ کام کا معاوضہ دیا جائے ۔ کرایہ * ۔ اِسْتِئْجَارٌ ۔ کسی کو اجرت پر ملازم رکھنا ۔ جیسے سورۃ قصص میں ھے ۔ یٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ (۲۸/۲۶) '' اے میرے باپ ۔ اسے اجرت پر ملازم رکھ لے ،، ۔

اَجْرٌ ۔ کنایۃً اس تحفے کو بھی کہتے ھیں جو بیوی کو شادی کے وقت دیا جاتا ھے (جسے عرف عام میں مہر کہتے ھیں) قرآن میں ھے اٰتَیْتَ اُجُوْرَھُنَّ (۳۳/۵۰) ۔ یہ مفہوم لین نے قاموس کے حوالے سے دیا ہے (دیکھیں صفحہ ۱۸۰۹ جلد چہارم)

قرآن کریم نے اس قانون محکم کو بیان کیا ھے کہ انسان کو جو کچھ ملتا ھے (اس دنیا میں یا اس کے بعد کی زندگی میں) وہ اس کے اعمال (کاموں) کا بدلہ ھوتا ھے ۔ جو کام نہیں کرتا اسے معاوضہ بھی کچھ نہیں ملتا ۔ یہ جہان سعی و عمل ھے جس میں مفت خوروں کا کوئی مقام نہیں ۔ جس معاشرہ میں کسی شخص کو بغیر کام کئے کچھ مل جاتا ھے (بجز اس کے کہ وہ کام کرنے کے قابل ھی نہ رھا ھو) وہ معاشرہ خدائی قوانین کے مطابق متشکل نہیں ھوتا ۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی اُجرت (مزدوری) اور ٹوٹی ھوئی ھڈی کے جوڑنے کے ھیں ۔ مزدور کی اجرت کو بھی اس لئے اَجْرٌ کہتے ھیں کہ اس سے اس کی مشقت کے زخم مندمل ھو جاتے ھیں ۔ اس کی چٹخ جانے والی ھڈیاں جڑ جاتی ھیں ۔

[آیت لَاۤ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی (۴۲/۲۳) کے سلسلہ میں دیکھئے عنوان (ا ۔ ل ۔ ل) اور (ق ۔ ر ۔ ب) بالخصوص (ق ۔ ر ۔ ب)] ۔

---

* تاج ۔

ا ج ل

اَلْاَجَلُ ۔ کسی بات کی مدت مقررہ ۔ اَلتَّاْجِیْلُ ۔ مدت کا تعین کرنا ۔ مدت مقرر کرنا ۔ مُؤَجَّلٌ ۔ وہ جس کے لئے مدت مقرر کی گئی ہو ۔ تَاَجَّلَ اس نے تاخیر کی ۔ اَجِلَ اَجْلًا ۔ وہ پیچھے ہوا ، موخر ہوا ۔ اَلْاٰجِلُ ۔ عاجل کی ضد ہے* ۔ اَجْلٌ ۔ باعث ۔ وجہ ۔ مِنْ اَجْلِ ذَالِکَ (۳۲/۵) اسی وجہ سے .... اَجَلٌ مدتِ معینہ کو بھی کہتے ہیں اور اس آخری حد کو بھی جہاں وہ مدت ختم ہوجاتی ہے۔ (دیکھیں مَثَلًا اجلد چہارم)

قرآن میں ہے لِکُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (۳۴/۷) ۔ ہر ایک قوم کیلئے (عروج و ترقی کی) ایک مدت ہوتی ہے ۔ لیکن یہ اَجَلٌ (مدت) ایک قانون کے مطابق مقرر ہوتی ہے ۔ لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ (۱۳/۳۸) "ہر مدت کے لئے ایک قانون ہے" اور وہ قانون یہ ہے کہ مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) یعنی جوقوم جسقدر نوع انسانی کے لئے منفعت بخش کام کریگی اسی قدر اسے بقا نصیب ہوگی ۔

قرآن نے اقوام عالم کے استخلاف و استبدال کے متعلق تفصیلی پروگرام دیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں قوموں کا عروج و زوال محض اتفاقیہ نہیں ہو جاتا بلکہ ایک محکم قانون کے مطابق ہوتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ ہر ایک عمل کا نتیجہ تو اسی وقت مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن وہ محسوس شکل میں ایک مدتِ معینہ کے بعد سامنے آتا ہے ۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے اسطرح محسوس شکل میں سامنے آنے کے درمیانی وقفہ کو بھی اجل سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ اسے مہلت کا وقفہ بھی کہاجائیگا ۔ یہ وقفہ بھی قانونِ خداوندی کے مطابق متعین ہوتا ہے جیسے بیج کے درخت بننے تک کی مدت ۔

موت کے متعلق سورۃ آل عمران میں ہے کہ یہ خدا کے قانون کے مطابق وارد ہوتی ہے اور یہی قانون اس کے لئے مدت مقرر کرتا ہے وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ کِتَابًا مُّؤَجَّلًا (۳/۱۴۴) کوئی ذی حیات خدا کے قانون کے بغیر نہیں مرتا (موت اس کے قانون طبعی کے مطابق واقع ہوتی ہے) ۔ اور یہی قانون انسان کی عمر کی مدت کا تعین کرتا ہے ۔ یہ قانون، قانون طبعی ہے جس کے مطابق (مثلاً صحت خراب کر لینے سے) عمر کم ہو جاتی ہے اور (صحت کا خیال رکھنے اور ہلاکتوں سے بچنے سے) عمر بڑھ جاتی ہے ۔ وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِہٖ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ (۳۵/۱۱) "کسی بڑی عمر والے کو عمر نہیں دی جاتی اور نہ

* تاج ۔

ھی کسی کی عمر میں سے کمی کی جاتی ھے مگر (یہ سب کچھ) ایک قانون کے مطابق ھوتا ھے،، ۔ یعنی عمر کا بڑھنا اور گھٹنا سب خدا کے قانون طبعی کے مطابق ھوتا ھے ۔

عورت کی عدت کی میعاد کو بھی آجَلٌ کہا گیا ھے (۲۳۲/۲)۔ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ . . (۲۳۱/۲) جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مدت (عدت) کے قریب پہنچنے لگیں . . . .

ا ح د

اَلْاَحَدُ۔ ایک۔ پہلا عدد۔ آحَدٌ کوئی ایک۔ اس کا مؤنث اِحْدٰی ھوتا ھے۔ اَلْاَحَدُ اللہ کی صفت ھے اور اس معنی میں کسی اور کیلئے یہ لفظ نہیں بولا جاتا *۔(آحَدٌ اور وَاحِدٌ میں فرق کیلئے دیکھئے عنوان و ح د)۔ آحَدٌ میں دراصل یگانہ ھونے (Uniqueness) کا پہلو نمایاں ھوتا ھے ۔ چنانچہ کہتے ھیں فُلَانٌ آحَدُ الْاَحَدَيْنِ ۔ اُسکی کوئی مثل و نظیر نہیں۔ یہ کسی کی بلیغ ترین تعریف ھو سکتی ھے *۔ اِتَّحَدَ۔ مجتمع ھوا۔ متفق ھوا۔ اِتِّحَادٌ اسی کا مصدر ھے۔ اِسْتَاْحَدَ ۔ منفرد اور تنہا ھوا ۔ **

قرآن میں ھے ۔ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ (۱۰۲/۲) اس کے معنی ھیں ،،کسی کو بھی،،۔ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱/۱۱۲) میں، اَحَدٌ کے معنی یگانہ۔ بے مثل و بے نظیر (Unique) ھیں ۔ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت اسکی انفرادیت (Uniqueness) ھوتی ھے اور چونکہ خدا کی ذات ، مکمل ترین ھے اس لئے اس میں یہ صفت بھی اپنے انتہائی کمال تک پہنچی ھوئی ھے (نیز دیکھئے عنوان و-ح-د)

ا خ ذ

اَلْاَخْذُ ۔یہ عطا (دینا) کی ضد ھے ۔ یعنی لینا ۔ کسی شے کا احاطہ کر لینا ۔ بعض علمائے لغت نے کہا کہ آخْذٌ کے معنوں میں دراصل قہر اور غلبہ کا مفہوم ھوتا ھے اور ھلاک کر دینے اور استئصال (بیخکنی کر دینے) کے معنوں میں یہ لفظ استعمال ھوتا ھے۔ نیز سزا دینے (مُؤَاخَذَةٌ) کے معنوں میں بھی ۔ * ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو احاطہ میں لے لینا ۔ وصول کرنا اور جمع کرنا ھیں *۔ ابو عُبَیْدہ نے کہا ھے (بحوالہ ابن فارس) کہ اَلْاِخَاذُ حوض جیسی جگہ کو کہتے ھیں جہاں پانی جمع ھو

* تاج ۔ ** محیط ۔

جائے - اَلْاَخِیْذُ - قیدی کو کہتے ہیں - اَلْاَخِیْذَۃُ - غصب کی ہوئی چیز کو۔* مَأْخَذٌ - مسلک و منہاج کو۔**

قرآن میں یہ لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے - مثلاً سورۃ آل عمران میں ہے اَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ (۳/۸۱)۔ یہاں اسکے معنی "قبول کرنا" ہیں - سورۃ یوسف میں یہ لفظ روک لینے یا گرفتار کرلینے کے معنوں میں آیا ہے - فَخُذْ اَحَدَنَا مَکَانَہٗ (۱۲/۷۸)۔ "تو ہم میں سے ایک کو اسکی جگہ روک لے"، سورۃ ھود میں یہ لفظ اس گرفت کے معنوں میں آیا ہے جو اعمال کے نتیجہ میں خدا کے قانون مکافات کی رو سے ہوتی ہے - وَکَذٰلِکَ اَخْذُ رَبِّکَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰی وَھِیَ ظَالِمَۃٌ اِنَّ اَخْذَہٗٓ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ (۱۱/۱۰۲)"اور اسی طرح تیرے رب کی پکڑ ہؤا کرتی ہے جب وہ ان بستیوں کو پکڑتا ہے جو ظالم ہوں - یقیناً اسکی گرفت الم انگیز اور شدید ہوتی ہے"۔ سورۃ المؤمن میں ہے وَھَمَّتْ کُلُّ اُمَّۃٍ بِرَسُوْلِھِمْ لِیَاْخُذُوْہُ (۴۰/۵)۔ یہاں اَخَذَ کے معنی ہر قسم کی مخالفت کے ہیں جس سے اس رسول کا مشن آگے نہ بڑھنے پائے۔ سورۃ انفال میں ہے فِیْمَآ اَخَذْتُمْ (۸/۶۸)۔ اس کے معنی ہیں جو کچھ تم نے کیا تھا یا جو کچھ لیا تھا - *** سورۃ کہف میں تَتَّخِذَ فِیْھِمْ حُسْنًا (۱۸/۸۶) میں اسکے معنی اچھے سلوک کرنے کے ہیں - یعنی حسن کا رانہ روش اختیار کرنا -

ا خ ر

آخِرٌ (اس کا مونث آخِرَۃٌ ہے) - آخِرٌ - اَوَّلٌ کا مقابل ہے - ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (۵۷/۳) - صاحب محیط کے الفاظ میں یہ ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی پہلے آنے والی چیز کے بعد آ رہی ہو لیکن اس کے بعد پھر اس جیسی کوئی اور چیز نہ آ رہی ہو - اس سے معلوم ہؤا کہ آخِرٌ ایک سلسلہ کی آخری کڑی ہوتا ہے - یعنی اس کے بعد پھر اس جیسی اور کڑیاں نہیں آتیں - یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس زندگی کے بعد دوسری زندگی (آخِرَۃٌ) کو خَلْقٌ جَدِیْدٌ سے تعبیر کیا ہے - (۱۷/۴۹،۹۸ ؛ ۳۲/۱۰) یعنی وہ زندگی، اس موجودہ زندگی کے تسلسل میں (اس سے ملے ہوئے) آئیگی، اس لئے اس لحاظ سے وہ اس کی آخری کڑی ہوگی - لیکن اس سے موجودہ طبعی زندگی کی کڑیوں کا خاتمہ ہو جائیگا اور ایک نئے انداز کی زندگی کا آغاز ہوگا - اس اعتبار سے وہ ایک نئی زندگی کی پہلی کڑی ہوگی -

---

* تاج - ** محیط - *** لسان العرب -

اسی طرح قرآنی انقلاب کے بعد انسانوں کی جو تمدنی زندگی شروع ہوتی ہے وہ بھی اگرچہ سابقہ تمدن سے متصل ہی ہوتی ہے لیکن وہ اس تمدن کی آخری کڑی ہوتی ہے۔اس سے ایک نئے انداز کا انسانی تمدن شروع ہوتا ہے۔

لہذا آخِرَۃٌ کسی سلسلہ کی آخری کڑی کو کہتے ہیں جس کے بعد نئے سلسلہ کا آغاز ہو۔ آخِرَۃُ الرَّحْلِ کجاوہ کے پچھلے حصے کو کہتے ہیں جو قَادِمَۃُ الرَّحْلِ کی ضد ہے۔ آخِرَۃُ الْعَیْنِ آنکھ کے اس کونے کو کہتے ہیں جو رخسار سے متصل ہوتا ہے اور قَادِمَۃُ الْعَیْنِ اس حصے کو جو ناک سے متصل ہوتا ہے۔

اُخُرٌ قُدُمٌ کی ضد ہے**۔ قُدُمٌ کے معنے ہیں آگے ہونا - لہذا اُخُرٌ کے معنے ہیں پیچھے ہونا۔ تَاَخَّرَ، تَقَدَّمَ کی ضد ہوتا ہے۔ مُتَقَدِّمٌ اور مُتَاَخِّرٌ کے معنے اس سے واضح ہیں۔ قرآن میں مَا تَسْبِقُ کے مقابلہ میں مَا یَسْتَاْخِرُوْنَ (۱۵/۵) بھی آیا ہے۔ مُسْتَقْدِمِیْنَ کے مقابلہ میں مُسْتَاْخِرِیْنَ بھی (۱۵/۲۴)۔

آخَرٌ (خا کی زبر کے ساتھ) غیر کے معنے میں مستعمل ہوتا ہے۔ یعنے جو دوسرے سے مختلف ہو۔ جیسے رَجُلٌ آخَرٌ۔دوسرا آدمی۔ [دوسرے کے معنے (Second) نہیں بلکہ (Another) یا (Other Than) ہیں] اسی طرح اگر ایک لائن میں کچھ آدمی کھڑے ہوں تو پہلے کے بعد دوسرا آدمی آخَرٌ ہوگا۔ اور دوسرے کے بعد تیسرا آخَرٌ ہوگا۔ اسی طرح یہ سلسلۂ اخیر تک چلا جائیگا۔*

اس کے بعد یہ لفظ آخَرٌ مغایرت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ***مغایرت کے معنے ہیں جو اپنی پہلی کڑیوں سے مختلف ہو۔ سورۃ المؤمنون میں اس لفظ کے یہ معانی بڑی عمدگی سے سامنے آتے ہیں۔اس میں انسانی پیدائش کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ اس کی ابتدامٹی کے خلاصے سے ہوئی۔ پھر نطفہ بنا اس سے حمل قرار پایا۔ پھر نطفہ سے لوتھڑا بنا۔ لوتھڑا گوشت کے ٹکڑے میں تبدیل ہوا۔ پھر اس میں ہڈیاں بنیں۔ ہڈیوں پر گوشت چڑھا۔ یہاں تک پیدائش کے وہ مراحل ہیں جو قانون طبعی کے مطابق سلسلہ وار چلے آتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی کڑی نہیں آتی جو اس قانون کی رو سے سابقہ کڑی سے الگ ہو۔

---

* آخَرُ کی تانیث اُخْرٰی ہے جس کی جمع اُخَرُ ہے (تاج)۔

** ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں۔

*** تاج

(حتیٰ کہ اس منزل تک حیوان کے بچے اور انسانی جنین میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا) ۔اس کے بعد ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ (۲۳/۱۴) " پھر ہم نے انسان کو ایک بالکل نئی تخلیق میں اٹھا کھڑا کیا "۔ یہاں خَلْقًا اٰخَرَ کے معنی یہ ہیں کہ سلسلہ تخلیق کی یہ کڑی سابقہ کڑیوں سے یکسر مختلف ہے - اس میں انسانی ذات کی طرف اشارہ ہے جو طبعی قوانین کی پیداوار نہیں ہوتی - اسے دور حاضر کی اصطلاح میں فجائی ارتقاء (Emergent Evolution) کہتے ہیں - یعنے جس میں اچانک ، غیر متوقع طور پر ایک ایسی تخلیق سامنے آ جاتی ہے جو اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے ۔

لہذا آخَرُ اور آخِرٌ کے معانی کے اعتبار سے انسانی زندگی کا یہ تصور سامنے آیا کہ انسانی پیکر میں آکر زندگی نے اپنی سابقہ کڑیوں سے ایک بالکل مختلف شکل اختیار کر لی ۔ اب یہ سلسلہ اس کی طبعی موت تک جاری رہیگا ۔ اس کے بعد ایک دوسری زندگی ہوگی جو اگرچہ اس زندگی سے با لکل متصل ہوگی لیکن اس سے موجودہ کڑیوں کا خاتمہ ہو جائیگا اور اس کے بعد زندگی ایک نیا اسلوب اختیار کریگی ۔ جو لوگ اس زندگی کے متعلق موجودہ زندگی کے قوانین (Physical Laws) کے مطابق سوچتے ہیں انہیں اس پر یقین پیدا نہیں ہو سکتا ۔ لیکن جو دل و دماغ ، قدرت کے اچانک انقلابات کی تخلیقی کارفرمائیوں پر نگاہ رکھتے ہیں وہ آخرت پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ آخرت ، اس مستقبل کا نام ہے جو انقلاب آفرینی کے ذریعے ظہور میں آتا ہے ، نہ کہ گردش دولابی (کولہو کے بیل کی حرکت) کے ذریعے ۔ یہ انقلاب اس زندگی میں (قرآن کے ذریعے) پیدا ہوتا ہے اور موت کے بعد کی زندگی بھی ایک نئے انقلاب سے ظہور میں آتی ہے ۔

قرآن ، اَلْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا کے مقابل قِیَامَۃٌ اور اٰخِرَۃٌ کے الفاظ لاتا ہے ۔ مثلاً خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ .... (۲/۸۵) ۔ اور اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ (۲/۸۶) ۔ دنیا کے معنی ہیں قریبی (دیکھئے عنوان د ۔ ن ۔ و) اسی طرح وہ عَاجِلَۃٌ کے مقابلہ میں آخِرَۃٌ بھی لاتا ہے ۔ مثلاً (۱۷/۱۸،۱۹)؛ (۷۵/۲۰،۲۱) میں ۔ یعنے پیش پا افتادہ بمقابلہ مستقبل ۔ آخِرا لا مر ۔ اسی طرح تَعَجَّلَ اور تَاَخَّرَ بھی ایک دوسرے کے مقابلہ میں استعمال ہوئے ہیں (۲/۲۰۳) ۔ نیز آخِرَۃٌ بمقابلہ اُوْلیٰ (۹۳/۴) بھی ۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے ، سورۃ حجر میں مُسْتَقْدِمِیْنَ کے مقابل مُسْتَاْخِرِیْنَ کا لفظ آیا ہے (۱۵/۲۴) ۔ یعنی پہلے چلے جانے والے اور بعد میں آنے والے ۔ اسی

کی تشریح دوسری جگہ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّۃٍ اَجَلَہَا وَمَا یَسْتَاْخِرُوْنَ (۱۵/۵) نے کر دی ہے۔ سورۃ شعراء میں فِی الْاٰخِرِیْنَ (۲۶/۸۴) کے معنے آنے والی نسلیں ہیں۔

لہٰذا ''آخرت،، کے مفہوم میں، پیش پا افتادہ مفاد کے بجائے مستقبل کی خوشگواریاں، موجودہ نسل کے بجائے آنے والی نسلیں (انسانیت عامہ)، انقلاب آفرینی کے ذریعہ ایک نئی زندگی کی نمود، اور اس طبعی زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی کے تصورات، سب شامل ہیں۔

آخَّرَ۔ یُؤَخِّرُ۔ کسی کام کو بعد میں کرنا۔ ملتوی کرنا۔ موقوف کرنا (عن)۔ مہلت دینا (الٰہی)۔ تَاَخَّرَ پیچھے رہ جانا۔ دوسرے کے بعد آنا۔ وَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ .... وَمَنْ تَاَخَّرَ ...... (۲/۲۰۳)۔ '' اور جو جلدی کر کے دو دن میں (چلا جائے) .... اور جو پیچھے رہ جائے ،،

قرآن کریم نے جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ آخرت (مستقبل) پر یقین رکھتے ہیں۔ یعنے وہ مفاد عاجلہ (پیش پا افتادہ مفاد) پر گر نہیں پڑتے بلکہ ہمیشہ اپنے سامنے مستقبل کا مفاد رکھتے ہیں۔ جو کسان بیج کے لئے رکھے ہوئے گیہوں کو چکی میں پسوا کر اس کی نرم نرم روٹیاں کھا لیتا ہے اس کی آج کی بھوک تو مٹ جاتی ہے۔ لیکن مستقبل (آخرت) میں اس کے لئے مستقل بھوک ہوتی ہے۔ لیکن جو کسان اس بیج کو زمین میں ڈال کر چھ مات ماہ تک برابر محنت کرتا ہے اور نہایت ثبات و تحمل سے فصل پکنے کا انتظار کرتا ہے اس کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے اور جب یہ سلسلہ ایک چکر باندھ لیتا ہے تو اس کا حال بھی خوشگوار ہو جاتا ہے اور مستقبل بھی۔ یہ اس لئے کہ اسے مستقبل (آخرت) پر یقین تھا اس لئے وہ مفاد عاجلہ پر لپک نہیں پڑا۔ غور کیجئے۔ دنیا میں وہی قوم زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے جس کے سامنے مستقبل کی بہبودی ہو۔ مومن کو مستقبل پر یقین رکھنے والا کہا گیا تھا۔ لیکن آج اس آسمان کے نیچے جماعت مومنین (مسلمان) سب سے زیادہ عاقبت فراموش (مستقبل سے بے نیاز) ہے اور اس لئے سب سے پیچھے۔ حالانکہ اس کا مستقبل اس قدر حدود فراموش تھا کہ اس کا احاطہ اس دنیا کی چار دیواریوں تک محدود نہیں تھا۔ وہ موت کے بعد بھی برابر آگے چلتا تھا۔

واضح رہے کہ ایک فرد کی زندگی میں ہر آنے والا سانس مستقبل ہے۔ ایک قوم کی زندگی میں آنے والی نسل اس کا مستقبل ہے۔ نوعِ انسانی کے

لئے آنے والے زمانے کی انسانیت (Humanity) اس کا مستقبل ہے، اور ان سب کے لئے اس دنیا کی طبعی زندگی کے بعد، اگلی زندگی (حیات آخرت) مستقبل ہے۔ اس کے بعد سوچئے کہ جب قرآن کریم نے مفاد عاجلہ کے مقابلے میں آخرت پر یقین رکھنے کی تاکید کی تھی تو اس کا مفہوم کیا تھا؟ یہی کہ فرد ہو یا قوم۔ وہ

(۱) صرف اپنے حال ہی کو نہ دیکھے۔ مستقبل پر بھی نگاہ رکھے۔
(۲) موجودہ نسل کی بہبود ہی پر قناعت نہ کرے۔ آنے والی نسلوں کی خوش حالی کو بھی پیش نظر رکھے۔ اور
(۳) زندگی اس دنیا کی طبیعی زندگی کو نہ سمجھ لے۔ موت کے بعد کی زندگی پر بھی یقین رکھے۔
(اس کے ساتھ (د۔ ن۔ و) کا عنوان بھی دیکھئے)۔

ا خ و

اَلْاَخُ۔ یہ لفظ آخِیَّۃٌ سے مشتق ہے۔ رسّی یا آھنی تار کے دونوں سرے زمین میں دبا کر باقی حصے کا جو حلقہ بن جاتا تھا اسے آخِیَّۃٌ کہتے تھے۔ اس کے ساتھ جانوروں کو باندھہ دیا جاتا تھا۔ لہذا آخ کے معنے ہوئے ایک حلقہ میں بندھے ہوئے یا ایک کھونٹے کے ساتھ بندھے ہوئے۔ یہ لفظ بھائی اور ہر اس شخص کیلئے بولا جاتا ہے جو کسی دوسرے شخص سے قبیلہ یا دین یا صفت یا معاملہ یا محبت میں مشترک ہو*۔ بعض کے نزدیک اس کا مادہ وَخیٌ ہے جس کے معنے قصد کے ہیں۔ لہذا آخٌ کے معنے ہونگے ہم مقصد**۔ اس کا مؤنث اُخْتٌ ہے۔

قرآن کریم میں اِخْوَانٌ بمقابلہ آعْدَاءٌ آیا ہے۔ اِذْ كُنْتُمْ آعْدَاءً .... فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔ "تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اس نے اپنی نعمت سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا"، ($\frac{3}{103}$)۔ آعْدَاءٌ انہیں کہتے ہیں جن کے درمیان پچر (Wedge) لگ رہی ہو۔ لہذا اِخْوَانٌ وہ ہونگے جن کے مابین کوئی چیز حائل نہ ہو۔ قرآن کے الفاظ میں فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ ($\frac{3}{103}$)۔ "اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی"۔ اس اعتبار سے مومن وہ ہیں جن کے قلوب ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مل چکے ہوں جس طرح بادل کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کے ساتھ گھل مل جاتا ہے***۔ قرآن نے تمام مومنین کو اِخْوَۃٌ

* محیط ** تاج *** (دیکھئے عنوان ا۔ ل۔ ف)

قرار دیا ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ ۔ ''یقیناً سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں،، (۴۹/۱۰) جو قرآن کی رسی کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللہِ جَمِیْعًا (۳/۱۰۲) '' تم سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو،،۔ یہ ہے جماعت مومنین کے افراد کا باہمدگر صحیح رشتہ۔

قرآن میں ہم قبیلہ افراد کیلئے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صَالِحًا (۲۷/۴۵)۔ '' ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا ،، اور ہم مشرب لوگوں کے لئے بھی۔ جیسے مُبَذِّرِیْنَ کو اِخْوَانَ الشَّیَاطِیْنِ کہا گیا ہے (۱۷/۲۷)۔ اسی طرح اُخْتٌ ہم قبیلہ عورت کو کہا گیا ہے۔ جیسے حضرت مریم کو یَا اُخْتَ ھَارُوْنَ کہا گیا ہے (۱۹/۲۸)۔ اور مثیل اور ہم مشرب کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے، جیسے (۷/۳۸) میں ہم مشرب اقوام کو ایک دوسرے کی اُخْتٌ کہکر پکارا گیا ہے۔

ا د د

اَلْاِدُّ۔ تعجب۔ گھبرا دینے والا معاملہ۔ اچنبھا *۔ اَلْاَدِیْدُ چیخنے چلانے اور ہانک لگانے کی آواز کو کہتے ہیں**۔ ہر ناخوشگوار بات جس میں شور و غوغا ہو ***۔ یعنی ایسی بات جو لوگوں کو اسقدر ناگوار گذرے کہ اس سے اختلاف خلفشار پیدا ہو جائے اور لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگ جائیں۔ اَدَّ الْبَعِیْرُ۔ اونٹ بڑ بڑایا۔ اَدَّتِ النَّاقَۃُ۔ اونٹنی کا آہیں بھرنا اور رونے کی آواز بلند کرنا۔ اَدَّتْہُ الدَّاھِیَۃُ۔ مصیبت نے اسے پریشانی میں ڈال دیا *۔ تَاَدَّدَ الْاَمْرُ۔ معاملہ سنگین ہو گیا ** قرآن کریم نے عیسائیوں سے کہا ہے کہ تم نے یہ عقیدہ وضع کرکے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں۔ جِئْتُمْ شَیْئًا اِدًّا (۱۹/۸۹)۔ ایک نہایت افسوس ناک اور کرب انگیز بات کردی۔ تم نے ایک بڑا ہی خطرناک اور حقیقت سوز عقیدہ ایجاد کر لیا۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا بڑا ہونا (امر عظیم) شدید ہونا اور بار بار ہونا۔ نیز بدک کر بھاگ جانا ہیں۔

اِدْرِیْس علیہ السلام

قرآن کریم نے حضرت ادریسؑ کا ذکر انبیاء کرامؑ کے زمرہ میں کیا ہے۔ وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِدْرِیْسَ۔ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا (۱۹/۵۶)۔ '' اور تو کتاب میں ادریس کا ذکر کر۔ یقیناً وہ سچا نبی تھا ،،۔ نیز (۲۱/۸۵)

* تاج۔ ** محیط۔ *** راغب۔

لیکن آپ کا تفصیلی تذکرہ کہیں نہیں آیا ۔ قیاس یہ ہے کہ آپ کا زمانہ حضرت نوحؑ سے بھی پہلے کا ہے ۔ اور آپ کا نام تورات میں حنوک یا اخنوخ ہے ۔ اگر آپ حنوک ہی ہیں تو آپ حضرت نوحؑ کے اجداد میں چوتھی پشت پر آتے ہیں ۔ کیونکہ تورات نے حضرت نوحؑ کا نسب نامہ یوں لکھا ہے ۔ نوح ۔ بن لمک ۔ بن متوسلح ۔ بن حنوک ۔ (پیدائش - ۵ : ۲۱-۲۹) ۔

ا د م

اَلْاُدْمَةُ کے معنے ہیں قرابت ۔ موافقت ۔ مل جل کر رہنے کی صلاحیت ۔ یا خود میل جول ۔ اَلْاَدَمَةُ اور اَلْاُدْمَةُ کے معنے ہیں مخلوط ہونا ۔ موافق ہونا ۔ ایک دوسرے میں میل محبت ہونا ۔ اَدَمَ اللّٰهُ بَيْنَهُمْ یَاْدِمُ کے معنی ہیں خدا نے ان کے درمیان موافقت سازگاری اور ہم آہنگی پیدا کر دی ۔ اَلْاِدَامُ ہر موافق چیز کو کہتے ہیں* ۔ یعنے جو مل جل کر رہ سکے ۔ اصل میں یہ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے روٹی لگا کر کھائی جائے (مثلاً سالن ۔ ترکاری وغیرہ) ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں ۔ یعنی موافقت ۔ محبت ۔ مودت ۔

اَلْاُدْمَةُ گندم گون رنگ کو کہتے ہیں** ۔ اَدَمَةٌ ۔ اندرونِ جلد کو بھی کہتے ہیں (ابن فارس) ۔ اِدَامٌ ۔ کسی خاندان کا ایسا مثالی فرد جس سے اس کے قبیلہ کو پہچانا جائے* ۔ آدَمِیٌّ ۔ جس کی نسبت آدَمُ کی طرف ہو ۔ انسان* ۔

***

ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ " آدم " جن کے جنت سے نکلنے کا قصہ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں آیا ہے (مثلاً ۲/۳۵) نبی تھے ۔ قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی ۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر قصہ آدم کی جو تفاصیل بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت سے نکلنے والا آدم کوئی خاص فرد نہیں تھا بلکہ انسانیت کا تمثیلی نمائندہ تھا ۔ بالفاظِ دیگر، قصہ آدم کسی خاص فرد (یا جوڑے) کا قصہ نہیں بلکہ خود " آدمی " کی داستان ہے جسے قرآن نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے ۔ اس داستان کا آغاز انسان کی اس حالت سے ہوتا ہے جب اس نے قدیم (Primitive) انفرادی زندگی کی جگہ پہلے پہل تمدنی زندگی شروع کی ۔ اُدْمَةٌ کا لفظ خود اس تمدنی زندگی (Social Life) کی طرف اشارہ کر رہا ہے ۔ لہذا " آدمیت " انسانی زندگی کی اس حالت کا نام ہے جس میں اس نے مل جل کر رہنا شروع کیا ۔ اس طرح مل جل کر رہنے سے باہمی مفادات

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** مزید بر آں دیکھئے تفسیر صفحہ ۱۸۰ جلد چہارم عنوان آدم

کا تصادم ہؤا۔ اس تصادم کا حل تنہا عقل انسانی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کا حل وحی کے ذریعے دیا گیا۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں ملیگی)۔

قرآن کریم میں البتہ ایک مقام ایسا ہے جس میں آدم کا لفظ اس انداز سے آیا ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ کسی فرد کا نام ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰیٓ اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ...... (۳/۳۳) ''یقیناً اللہ نے آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو (ان کی ہم عصر اقوام پر) فضیلت دی تھی ......''۔ یہاں آدم کا ذکر حضرت نوح کے ساتھ آیا ہے جس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس سے مفہوم کوئی خاص فرد ہے اور وہ (حضرت نوح کی طرح) نبی تھے (اگرچہ اصْطَفٰی کا لفظ قرآن میں غیر نبی کے لئے بھی آیا ہے۔ مثلاً حضرت مریم کے متعلق۔ دیکھئے (۳/۴۱)۔ اور خود اُمت محمدیہ کے متعلق۔ دیکھئے (۳۵/۳۲)۔ بہر حال جس آدم کا ذکر سورۃ آلِ عمران کی مندرجہ بالا آیت (۳/۳۳) میں آیا ہے وہ ''جنت سے نکلنے والے آدم'' سے مختلف تھے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ نبی ہوں (اور ان کا نام آدم ہو) قرآن نے ان کا مزید تعارف نہیں کرایا۔ اس نے سلسلہ نبوت کا آغاز عام طور پر حضرت نوح کے ذکر ہی سے کیا ہے۔ مثلاً سورۃ نساء میں ہے اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِہٖ (۴/۱۶۳) بے شک ہم نے تیری طرف وحی کی ہے جس طرح ہم نے نوح اور اس کے بعد کے انبیاء پر وحی کی ....''۔ اگرچہ قرآن کریم سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ قوم نوح میں حضرت نوح سے پہلے اور انبیاء بھی آ چکے تھے (دیکھئے ۲۶/۱۰۵۔ و عنوان نوح)۔

ا د ی (ا د و)

اَدَوْتَ تَفْعَلُ کَذَا۔ تو ایسا کرنے کی تدبیر کرتا رہا *
اسکی اصل اَدَاۃٌ ہے جس کے معنی ایسی تدبیر یا ذریعہ کے ہیں جس سے کسی تک پہنچا جاسکے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو کسی چیز تک پہنچانے یا کسی چیز کے دوسری چیز تک خود بخود پہنچ جانے کے ہیں۔

اَدَّاہُ۔ تَاْدِیَۃً۔ اسکو پہنچا دیا۔ اَدَّی دَیْنَہٗ اس نے اپنا قرض ادا کر دیا۔ اَلْاَدَاءُ اسم ہے**۔ قرآن میں ہے وَاَدَاءٌ اِلَیْہِ بِاِحْسَانٍ (۲/۱۷۸)۔ ''اور احسان کے ساتھ اسکی ادائیگی کی جائے''۔

* راغب ** تاج

نیز اس کے معنی ہیں کسی کے سپرد کر دینا ۔ (جیسے امانت واپس کر دی جاتی ہے ۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے کہا تھا اَدُّوْا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ (۴۴/۱۸) ”اللہ کے بندوں کو میرے سپرد کر دے“، ادائے امانت کے لئے یہ لفظ (۲/۲۸۳) میں آیا ہے جہاں کہا گیا ہے فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَہٗ ۔ ”جس کا اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہئیے کہ اپنی امانت ادا کر دے“ ۔

اِذْ

اِذْ ۔ جب ۔ جسوقت ۔ جس جگہ ۔ کے معنوں میں آتا ہے ۔ یہ عموماً زمانہ ماضی (گذرے ہوئے زمانے) کے لئے آتا ہے ۔ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ (۲/۳۰)۔ ”جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا“ ۔ یا اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ (۲/۱۲۷) ۔ ” جب ابراھیمؑ (اس گھر کی) بنیادیں اٹھا رہا تھا“ ۔ بعض اوقات یہ ”کیونکہ“، یا ”اس لئے کہ“، کے معنوں میں بھی آتا ہے ۔ مثلاً لَنْ یَّنْفَعَکُمُ الْیَوْمَ اِذْ ظَلَمْتُمْ (۴۳/۳۹) ” آج یہ تمہیں کچھ فائدہ نہیں دیگا کیونکہ تم زیادتیاں کیا کرتے تھے“۔

لین نے صحاح کے حوالے سے لکھا ہے کہ بعض اوقات (اِذْ) زائد بھی ہوتا ہے ۔ مثلاً وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً (۲/۵۱) ۔ اس کے معنی ہیں، یہ واقعہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کو چالیس راتوں کا حکم دیا ۔ ایسے مقامات پر اِذْ سابقہ واقعہ میں فصل پیدا کر دیتا ہے ۔ یعنی اس سے ایک نئی بات شروع ہو جاتی ہے ۔

یَوْمَئِذٍ ۔ اس دن ۔ یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَھَا (۹۹/۴) ۔ ”اس دن وہ اپنی تمام خبریں بیان کردیگی“۔

حِیْنَئِذٍ ۔ اس وقت ۔ وَ اَنْتُمْ حِیْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۔(۵۶/۸۴) اورتم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو۔

اِذَا

اِذَا ۔ یہ کئی معنوں میں آتا ہے ۔ مثلاً :

(۱) کبھی یہ ”اچانک“، کے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے ۔ یعنی اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی واقعہ دفعتاً ظہور میں آ جائے ۔ خَرَجْتُ فَاِذَا الْاَسَدُ بِالْبَابِ ۔ میں باھر نکلا تو اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے کےسامنے شیر کھڑا ہے ۔ قرآن میں ہے فَاِذَا ھِیَ حَیَّۃٌ تَسْعٰی (۲۰/۲۰)۔ ”تو اس نے یکایک کیا دیکھا کہ وہ سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے“ ۔

(۲) کبھی اِذَا کے معنی ''پس'' کے بھی آتے ہیں۔ یعنی کسی بات کے نتیجہ میں کچھ واقعہ ہونا۔ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ (۳۰/۳۶) اور جب ان پر خود انکے اپنے ہاتوں کی لائی ہوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔

(۳) کبھی یہ شرط کے مفہوم کے ساتھ 'جب' کے معنوں میں زمانہ ماضی اور زمانہ مستقبل دونوں کے لئے آتا ہے۔ مثلاً اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱۱۰/۱)۔ جب خدا کی مدد اور فتح آگئی (یعنی زمانہ ماضی)۔ اور زمانہ مستقبل کی مثال فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۳/۱۵۸) جب تو پختہ ارادہ کرلے تو اللہ (کے قانون) پر پورا پورا بھروسہ رکھ

اِذًا۔ یہ ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن معنوں میں ہم اپنے ہاں کہتے ہیں کہ اگر یوں ہؤا تو اس صورت میں بات یوں ہوگی۔ سورہ مومنون میں ہے وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (۲۳/۳۴) اگر تم اپنے ہی جیسے ایک انسان کی اطاعت کروگے تو (یاد رکھو) اس صورت میں تم یقیناً سخت نقصان اٹھاؤ گے۔

اِذَا مَا۔ جب۔ جس وقت۔ سورہ شوریٰ میں ہے۔ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (۴۲/۳۷) وہ جب کبھی غصہ میں آئیں تو دوسروں کو اپنے غصہ کے نقصان رساں اثرات سے محفوظ رکھتے ہیں۔

اذ ن

اُذْنٌ۔ اُذُنٌ۔ کے معنے ہیں کان (جسکی جمع اٰذَانٌ ہے)۔ اَذَنٌ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جسکے کان بڑے بڑے ہوں اور اُذُنٌ اسے کہتے ہیں جو ہر شخص کی بات سن لے اور اسے قبول کرلے *۔ قرآن کریم میں ہے وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ۔ (۹/۶۱) مخالفین، رسول کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو کانوں کا کچا ہے۔ اَذَانٌ کے معنے اعلان کے ہیں۔ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلَى النَّاسِ (۹/۳) میں اس کے معنے اعلان ہی کے ہیں۔ اَذِنَ اِلَيْهِ وَ لَهٗ کے معنے ہیں کان لگا کر سننا۔ پسندیدگی کے ساتھ۔ لیکن بعض کے نزدیک اسمیں پسندیدگی اور غیر پسندیدگی کی کوئی شرط نہیں۔ خالی سننے کے لئے بھی ایسا کہا جاتا ہے۔* لیکن بعض علمائے لغت کے نزدیک اس میں سننے کے ساتھ اطاعت کرنے کا مفہوم بھی

* تاج۔

پایا جاتا ہے ۔ چنانچہ ان کے نزدیک وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا (۸۴/۲) ۔ میں صرف سننا ہی مراد نہیں بلکہ اطاعت کرنا بھی ہے*۔ تَاَذَّنَ کے معنی اعلان کرنے (یا کسی کو خبر دینے) کے ہوتے ہیں ۔ لیکن بعض کے نزدیک اسکے معنے قسم کھانے کے بھی ہوتے ہیں ۔** در اصل اس میں قسم اور یقین کا پہلو نمایاں ہوتا ہے ۔ یعنی کہنے والا کہتا ہے کہ میں یقیناً ایسا کرونگا ۔ چنانچہ سورهٔ اعراف میں جہاں ہے وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ (۷/۱۶۷) ۔ تو اسکے معنی یا تو یہ ہیں کہ جب تیرے رب نے اعلان کیا، یا یہ کہ جب تیرے رب نے کہا کہ میں یقیناً ایسا کرونگا ۔ (خدا کے اعلان کرنے یا یقینی طور پر کہنے سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا نے اس بات کے لئے ایسا قاعدہ یا قانون بنا رکھا ہے ۔) اَذِنَ بِالشَّیْءِ کے معنے ہیں کسی بات کا علم حاصل کرلینا۔ اس سے آگاہ ہو جانا ۔ چنانچہ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ (۲/۲۷۹) کے معنے ہیں تم آگاہ اور خبردار ہو جاؤ کہ تمہارے خلاف خدا نے جنگ کا اعلان کر دیا ہے ۔**

اَذِنَ لَهٗ فِی الشَّیْءِ ۔ کے معنی ہیں اجازت دیدینا اور اِسْتِئْذَانٌ کے معنے ہیں اجازت طلب کرنا ۔**

اِذْنٌ کے معنے ہیں اجازت ۔ اعلان اور علم (اجازت و اعلان کا ذکر اوپر آگیا ہے ۔ علم کے ضمن میں) فَعَلَهٗ بِاِذْنِیْ کے معنے ہیں اس نے اس کام کو میرے علم سے کیا ہے ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے کان اور علم دونوں ہیں ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اِذْنٌ اور عِلْمٌ میں فرق یہ ہے کہ اذْنٌ وہیں بولا جاتا ہے جہاں صاحب علم کا ارادہ اور مشیت بھی اسکے ساتھ شامل ہو لیکن عِلْمٌ میں اسکی شرط نہیں ۔ لہذا اِذْنُ اللّٰهِ کے معنی ہوئے اللہ کا علم اور مشیت ***۔ اس چیز کو عام اصطلاح میں ''خدا کا قانون'' کہتے ہیں ۔ (اسکی تفصیل ''مشیت'' عنوان ش ی أ کے تحت ملیگی) ۔ لہذا قرآن کریم میں جہاں اِذْنُ اللّٰهِ آئیگا اسکے معنے سیاق و سباق کے اعتبار سے خدا کے قانون کے ہونگے جسمیں اسکا علم اور مشیت دونوں آجاتے ہیں ۔ مثلاً سورهٔ اعراف میں ہے وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (۷/۵۸) ۔ ''اور اچھی زمین سے اسکی پیداوار خدا کے اذن (قانون) کے مطابق نکلتی ہے''۔ ظاہر ہے کہ زراعت کے متعلق خدا نے ایک قانون مقرر کر دیا ہے اور فصلیں اس قانون کے مطابق پیدا ہوتی ہیں ۔ اسی طرح سورہ الحج میں ہے ۔ یُمْسِکُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (۲۲/۶۵)

* لین ** تاج *** راغب

''وہ بادلوں (بارش) کو تھامے رکھتا ہے کہ اس کے اذن کے بغیر زمین پر نہ گرے''۔ یہاں بھی اذن سے مراد قانون خداوندی ہے جس کے مطابق مینہ برستا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے وَمَاکَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللہِ ($\frac{3}{144}$) اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ ہر ذی حیات کی موت خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت وَمَا ھُمْ بِضَآرِّیْنَ بِہٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللہِ ($\frac{2}{102}$) پر بحث کرتے ہوئے صاحب مفردات نے لکھا ہے کہ اللہ نے انسان کے اندر یہ خصوصیت رکھدی ہے کہ وہ کسی دوسرے کی طرف سے وارد کردہ نقصان سے اثر پذیر ہوسکے۔ پتھر میں یہ خصوصیت نہیں ہے۔ یہی خدا کا إذْنٌ ہے*۔ اسی کو قانون خداوندی کہا جاتا ہے۔ یعنی مختلف اشیاء میں مختلف قسم کی خصوصیات جن کی رو سے ان کی روش زندگی متعین ہوتی ہے۔ خارجی کائنات میں اللہ کا یہ إذْنٌ قانون کائنات کی شکل میں کارفرما ہے۔ اور جہانتک انسانوں کی تمدنی دنیا کا تعلق ہے، یہ إذْنٌ کتاب اللہ (قرآن) کے اندر ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں فَھَدَی اللہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِہٖ ($\frac{2}{213}$) کے معنی ہیں اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں ان امور کے بارے میں جن میں انسان اختلاف کرتے ہیں اپنی کتاب (ضابطہ قانون) کے مطابق حق کے ساتھ صحیح راستہ کی طرف راہ نمائی کردیتا ہے۔ یہاں بِاِذْنِہٖ کے معنی ہیں کتاب اللہ (قرآن) کے مطابق یا قرآن کے ذریعے۔ اور اگر اسکے معنی عام قانون لیا جائے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ اپنے قانون ہدایت کے مطابق لوگوں کی راہ نمائی کر رہا ہے اور قانون ہدایت یہ ہے کہ ہدایت اسکو ملتی ہے جو ہدایت حاصل کرنا چاہے۔ جو ہدایت حاصل کرنا نہ چاہے وہ گمراہ رہتا ہے (تفصیل اسکی ش-ی-أ کے عنوان میں ''مشیت'' کے تحت ملیگی) بہرکیف ''إذْنُ اللہِ'' کے معنی ہیں خدا کا قانون خواہ وہ قانون کائنات ہو یا قانون ہدایت جو قرآن کے اندر ہے۔

أ ذ ی

اَلْاَذِیَّۃُ۔ کسی چیز کا طبیعت پر ناگوار گزرنا۔ ناخوشگوار سی بات۔ خفیف سی تکلیف۔ یہ جب ذرا آگے بڑھ جائے تو ضَرَرٌ کہلاتی ہے۔ جس کے معنے سخت تکلیف، نقصان یا مصیبت کے ہیں**۔

اَذٰی۔ یُؤْذِیْ۔ ایذا پہنچانا۔ یعنی ایسی باتیں کرنا جو دوسرے کو ناگوار گزریں**۔ صاحب تاج نے لکھا ہے کہ اگرچہ قیاسی طور پر اس کا مصدر اِیْذَاءٌ آسکتا ہے لیکن کلام عرب میں یہ لفظ دیکھا نہیں گیا۔

---

* راغب **تاج

نَاقَةٌ آذِيَةٌ - اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو طبعاً ایسی ہو کہ کسی ایک مقام پر چین سے نہ بیٹھے*-

قرآن کریم نے عورت کے حیض آنے کے متعلق کہا ہے کہ قُلْ هُوَ اَذًى (۲۲۲/۲) - اس میں گھناؤنا پن - نا گواری - نا خوشگواری اور ذرا سی بےچینی کا پہلو پایا جاتا ہے - اسی لئیے اس حالت میں عورتوں سے الگ رہنے کے لئیے کہا گیا ہے - اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (۲۶۴/۲) - دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کیلئے جو کچھ تم دو اس کے بعد ایسی صورت نہ پیدا کردو کہ تم ان کے سر پر سنگِ گراں بنکر بیٹھ جاؤ یا کوئی ایسی بات کرو جو انہیں ناگوار گزرے - ایسا کروگے تو تمہاری یہ امداد تعمیری نتائج پیدا کرنے کے بجائے تخریبی نتائج پیدا کریگی - یہ عمل، باطل ہوجائیگا -

سزا دینے کے معنوں میں یہ لفظ (۱۶/۴) میں آیا ہے - جہاں کہا گیا ہے وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا - ”اور تم میں سے جو دو اس کا ارتکاب کریں تو انہیں سزا دو،، -

بیماری کی تکلیف کے لئیے سورۃ بقرہ میں ہے - فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ (۱۹۶/۲) - ” پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو،، -

ا ر ب

اَلْاِرْبُ - اَلْاِرْبَةُ - اَلْاُرْبَةُ - چالاکی - معاملات کی بصیرت - تیز ذہانت - پورا مکمل عضو جس میں سے کچھ کم نہ ہو - عقل - کشادگی - اَرِبَ بِالشَّيْءِ - کسی چیز کا ماہر ہونا - اَرِبَ اِلَيْهِ - اس نے شدت سے کسی چیز کی ضرورت محسوس کی یا اس کا محتاج ہؤا - اَلْاَرْبُ - وہ فاصلہ (یا کشادگی) جو انسان کی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی کے مابین ہوتا ہے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چار ہیں (۱) ضرورت - (۲) عقل - (۳) حصہ اور - (۴) گرہ باندھنا اور سخت کرنا -

اَرَّبَ الشَّيْءَ - چیز کو مضبوط کردیا - مکمل کردیا ** - اَلْاَرَبُ - شدتِ احتیاج، ضرورت - اَلْاِرْبَةُ - اَلْمَاْرَبَةُ - حاجت، ضرورت - غرض - آرَابٌ - وہ اعضاء جن کی شدید ضرورت ہوتی ہے***-

سورۃ طٰہٰ میں ہے وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى (۱۸/۲۰) - اس سے میری دیگر بہت سی ضرورتیں پوری ہونگی - یا میں اس سے دیگر بہت سے معاملات کو

---

*تاج - نیز ابن فارس - ** محیط *** راغب

سلجھاؤنگا۔ میں اس سے ایسی بصیرت حاصل کرونگا جس سے مشکل معاملات میں میری عقدہ کشائی ہوتی جائیگی۔ میں مختلف اہم اور ضروری امور میں اس سے مدد لونگا۔

سورۂ نور میں ہے غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَۃِ مِنَ الرِّجَالِ (۲۴/۳۱)۔ مردوں میں سے ایسے (نوکر) جنہیں نکاح کی ضرورت نہ ہو۔ نیز دیکھئے تتمہ صفحہ ۱۸۰۴، ۱۸۰۵ جلد چہارم۔

ا ر ض

اَرْضٌ۔ زمین۔ ہر وہ چیز جو نیچے ہو، اَرْضٌ کہلاتی ہے۔ (برعکس سَمَاءٌ کے)۔ چنانچہ اَرْضُ النَّعْلِ جوتے کے تلے کو کہتے ہیں۔ نیز ٹانگوں کا وہ حصہ جو گھٹنے سے نیچے ہو اَرْضٌ کہلاتا ہے۔ زمین کو بھی اَرْضٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ پاؤں کے نیچے رہتی ہے*۔

چونکہ انسانی معاش کا بنیادی ذریعہ اَرْضٌ (زمین) ہے اس لئے اَلْاَرَاضَۃُ خوش حالی اور شادابی کو کہتے ہیں*۔ اَرُضَتِ الْاَرْضُ کے معنے ہیں زمین عمدہ ہوگئی۔ اس میں بہت پیداوار ہونے لگی اور اس لئے آنکھوں کو بھلی معلوم ہونے لگی*۔ جَدْیٌ اَرِیْضٌ کے معنے ہیں بکری کا موٹا اور فربہ بچہ۔ اَلْاَرَضُ دیمک کو کہتے ہیں*۔

چونکہ اَرْضٌ نیچلی چیز کو کہتے ہیں اس لئے اَرَاضَۃٌ کے معنے ہیں کسی کا منکسرالمزاج یا مطیع و فرمانبردار ہو جانا**۔ اَرِیْضٌ کے معنی ہیں خلیق آدمی۔ یا نرم اور عمدہ زمین۔ اس میں خیر کا پہلو غالب ہوتا ہے (ابن فارس)۔ قرآن میں جِبَالٌ کے ساتھ اَرْضٌ کا لفظ آیا ہے۔ (مثلاً یَوْمَ نُسَیِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَی الْاَرْضَ بَارِزَۃً (۱۸/۴۷) "جس دور میں ہم جبال کو (اپنے غلبہ اور قوت سے) ان کی جگہ سے ہلا کر الگ کر دینگے اور ارض ابھر کر سامنے آ جائیگی"۔ ان مقامات میں جِبَالٌ کے مجازی معنے ہونگے بڑے بڑے لوگ (قوم کے اکابر) اور اَرْضٌ کے مجازی معنے چھوٹے طبقے کے لوگ۔

اَرْضٌ وَسَمٰوٰتٌ کے معنی کائنات کی پستیاں اور بلندیاں ہونگے۔ اور جہاں ان الفاظ کا تعلق زندگی کے کسی پہلو سے ہوگا تو سَمَاءٌ کے معنی خدا کا کائناتی قانون اور اَرْضٌ کے معنے انسان کی معاشی زندگی ہونگے۔ قرآن نے اَرْضٌ کے متعلق کہا ہے کہ وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ (۷/۱۰)

---

* تاج۔ ** لین۔ *** راغب۔

"ہم نے تمہارے لئے زمین میں سامانِ معیشت رکھے ہیں"۔ اگر آپ غور کرینگے تو یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ سامانِ زیست کا اصلی سر چشمہ ارض ہی ہے ۔ اس لئے یہ لفظ وسائل و ذرائع رزق کے لئے استعمال ہوا ہے (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان س - م - و) ۔ اگر معاشی زندگی کو خدا کے کائناتی قانون (یا قرآن کے ضابطہ حیات) سے الگ کر لیا جائے تو وہ نہایت پست سطح کی (حیوانی) زندگی ہو جاتی ہے جس میں طبعی زندگی سے متعلق مفاد عاجلہ تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن انسانی زندگی کا بلند نصب العین حاصل نہیں ہوتا ۔ اس قسم کی معاش کو قرآن نے عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى (۷/۱۶۹) ۔ "اس قریبی زندگی کی متاع"، کہکر پکارا ہے ۔ اور اسے رفعت (بلندی) کے مقابلہ میں پستی قرار دیا ہے ۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (۷/۱۷۶) "ہم چاہتے تھے کہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اسے (انسان کو) بلندی عطا کر دیں لیکن وہ پستی کے ساتھ چمٹ گیا"، ۔ اسی کو جذبات پرستی ۔ خود غرضی یا نفسانیت اور مفاد پرستی کہا گیا ہے ۔ یعنی صرف طبعی زندگی کے مفاد کو مقصدِ حیات قرار دے لینا ۔ قرآن کے الفاظ میں وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (۷/۱۷۶) "اس نے اپنی خواہشات کا اتباع کر لیا"، ۔ توحید یہ ہے کہ خدا کا جو قانون خارجی کائناتی زندگی میں کارفرما ہے اسی قانون کو انسان کی معاشی زندگی کا مدار بنایا جائے ۔ (یہ قانون وحی کے ذریعے ملتا ہے اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے) ۔ اس توحید کے معنے یہ ہیں کہ اَرْضٌ اور سَمَآءٌ میں ایک ہی قانون کو تسلیم کیا جائے۔ هُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (۴۳/۸۴) "ارض و سماء میں وہی صاحب اقتدار ہے"، ۔ اگر انسان اپنی معاشی زندگی کو (قانونِ خداوندی کے بجائے) اپنے خود ساختہ قوانین کے تابع رکھے تو معاشرہ میں ناہمواریوں کا جہنم پیدا ہو جاتا ہے ۔ اَمِ اتَّخَذُوْۤا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۲۱/۲۱-۲۲) "کیا انہوں نے اپنی معاشی زندگی کے لئے اور قوتوں کو صاحب اقتدار تسلیم کر رکھا ہے جن کے متعلق انکا خیال یہ ہے کہ وہ ان کی معاشی زندگی کو حیات نو عطا کردینگے ۔ اگر ارض و سماء میں اللہ کے سوا اور صاحب اقتدار ہستیاں ہوں تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے ۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اَرْضٌ (زمین) نوع انسانی کے لئے رزق کا سر چشمہ ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ کسی فرد کی ملکیت میں نہیں جا سکتی۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰) کے یہی معنی ھیں (یعنی ارض کو مخلوق کے فائدے کے لئے بنایا ہے) ۔ دوسری جگہ ہے مَتَاعاً لَّکُمْ وَلِاَنْعَامِکُمْ (۷۹/۳۳) ''تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لئے سامان زیست ۔ متاع حیات،، ۔ نہ صرف زمین بلکہ دیگر عناصر طبعی جن کے امتزاج و تعاون سے زمین سے رزق پیدا ھوتا ہے، ان سب کے متعلق فرمایا کہ یہ متاعاً لِلْمُقْوِیْنَ ھیں (۵۶/۷۳) یعنی بھوکوں کے لئے سامان زیست ۔ لہذا کوئی نظام جس میں ارض تمام نوع انسانی کے مشترکہ فائدہ کی بجائے کسی خاص گروہ یا افراد کے فائدے کا موجب بن کر رہ جائے، قرآنی تعلیم (یعنی منشائے خداوندی) کے خلاف ہے ۔ اس لئے قرآن نے کہا ہے کہ اس رزق کے سر چشمے (یعنی زمین کی پیداوار) کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاھیئے ۔ سَوَاءً لِّلسَّائِلِیْنَ (۴۱/۱۰) ۔ وسائل پیداوار اور سامان زیست (مثلاً روشنی ۔ ھوا ۔ پانی ۔ زمین، قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہنے چاھئیں تاکہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام افراد کی ضروریات پوری ھوتی رھیں ۔ یہ وہ انقلاب ہے جسے قرآن چھٹی صدی عیسوی میں اس وقت لایا جب دینا جاگیر داری اور زمینداری کو ھین ''مطابق فطرت،، سمجھے ھوئے تھی ۔ دنیا نے اسوقت اس انقلاب کی اھمیت کو نہ سمجھا (اور بعد میں خود مسلمانوں نے بھی اسے پس پشت ڈال دیا) لیکن اب وھی دنیا، زمانے کے تقاضوں سے مجبور ھو کر اس کی طرف کشاں کشاں چلی آ رھی ہے ۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہکر اشارہ کیا ہے کہ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا .... (۱۳/۴۱) ۔ ''کیا یہ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ھم کسطرح زمین کو بڑے بڑے سرداروں کے ھاتھ سے چھین کر کم کرتے چلے جا رھے ھیں،، ۔ اس طرح بتدریج وہ وقت آ جائیگا جب زمین کسی فرد کے ھاتھ میں نہیں رھیگی بلکہ تمام افراد انسانیہ کی پرورش کا ذریعہ بن جائیگی ۔ یہ وہ دور ھوگا جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹) ۔ '' زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھیگی،، ۔

ا ر ک

اَلْاَرَآئِکَۃُ ۔ (جمع اَرَآئِکُ) ۔ تخت یا مسہری جس پر پردے پڑے ھوئے ھوں ۔ یا ھو وہ چیز جس پر ٹیک لگائی جائے ۔ راغبؔ نے کہا ہے کہ چھپر کھٹ کو اَرِیْکَۃٌ کہتے ھیں ۔ اس لئے کہ وہ بالعموم اَرَاک

(پیلو) کی لکڑی سے بنایا جاتا تھا ۔ اَلْاَرَاکُ ایک قسم کے ترش چارہ کو بھی کہتے ہیں* ۔ قرآن میں ہے مُتَّکِئِیْنَ فِیْھَا عَلَی الْاَرَائِکِ (۷۶/۱۳) ''وہ گدے دار تختوں یا مسہریوں پر تکیہ لگائے ہونگے''۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قیام کرنے کے ہیں ۔ نیز اَرَاکٌ (درخت) کے ۔ علاوہ ازیں، جب زخم مندمل ہو کر باقی جسم کی سطح کے برابر ہو جائے تو اسے بھی اَرِکَ ۔ یا اَرِکٌ کہتے ہیں ۔ اس لئے کہ وہ اپنی اصلی حالت پر قائم ہو جاتا ہے ۔ *مزید براں دیکھئے تتمہ صفحہ ۱۸۰۸ جلد چہارم۔*

ا ر م

اَلْاَرَامُ ۔ (واحد اِرَمٌ) نشانات راہ ۔ یا کسی چیز پر کوئی نشان بنا دینا تاکہ وہ پہچانی جا سکے* ۔ پتھروں کو اُرَّمٌ کہتے ہیں** ۔

قرآن میں قوم عاد کے متعلق ہے اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (۸۹/۷) ۔ اِرَمٌ اس مقام کا نام ہے جہاں وہ رہتے تھے۔ (ذَاتِ الْعِمَادِ کے لئے دیکھئے عنوان (ع ۔ م ۔ د) ۔ راغب نے کہا ہے کہ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ سے وہ بلند ستون مراد ہیں جن پر نقش و نگار ہوتے تھے** ۔ بعض محققین کا یہ خیال بھی ہے کہ قوم عاد کے مورث اعلیٰ کا نام اِرَم تھا جو سام کا بیٹا تھا ۔ اس اعتبار سے عاد اور اِرَم ایک ہی قوم کا نام ہے ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عاد) ۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَلْاَرُوْمَةُ درخت کی جڑ یا انسان کے حسب نسب کو کہتے ہیں*** ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں چیزوں کا اوپر تلے رکھتے چلے جانا ۔ اس میں ترتیب اور بلندی (دونوں) کا مفہوم آ جاتا ہے ۔

ا ز ر

اَلْاَزْرُ ۔ پشت ۔ قوت* ۔ قرآن میں ہے ۔ اُشْدُدْ بِهٖ اَزْرِیْ (۲۰/۳۱) ۔ اس سے میری پشت کو مضبوط کر دے۔ میری قوت کو مستحکم کردے ۔ اَلْاِزْرُ ۔ اصل و بنیاد ۔ اَلْاِزَارُ ۔ *ہر وہ چیز جو تمہارے بدن کیلئے ستر کا کام دے۔* اَلْمُؤَازَرَةُ ۔ آمنے سامنے ہونا ۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا ۔ کھیتی کا ایک دوسرے کے ساتھ گتھ جانا اور اس طرح بڑے پودوں کا چھوٹے پودوں کو تقویت دینا* ۔ آزَرَ کے معنی ہیں جڑ اور بنیاد کو مضبوط کرنا ۔ سورۃ فتح

---

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔

میں (شجر اسلام کے متعلق) ہے فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ (۴۸/۲۹)۔ (اس کھیتی کی طرح جو پہلے اپنی سوئی نکالتی ہے) پھر اپنی جڑ کو مضبوط کرتی ہے۔ اسطرح وہ موٹی ہوتی چلی جاتی ہے۔

آزَرُ۔ ایک بت کا نام تھا جس کے محافظ حضرت ابراہیمؑ کے باپ تارخ تھے۔ اس بت کی نسبت سے انکا لقب آزَرُ تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ آزر حضرت ابراہیمؑ کے چچا کا نام تھا، یا کسی اور بزرگ کا۔ لیکن قرآن میں لِاَبِيْهِ آزَرَ (۶/۷۵) آیا ہے۔ چونکہ اس مقام پر کوئی اور معنی لینے کا قرینہ نہیں اس لئے یہ حضرت ابراہیمؑ کے باپ ہی تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ تارخ ہی کو معرب کرکے آزر بنا لیا گیا*۔ لیکن یہ بڑی ضعیف سی بات ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ آزَرُ کے معنے ضَالٌّ (گمراہ) کے ہوتے ہیں**۔ لیکن قرآن نے اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ (نیز دیکھئے عنوان ابراہیم)۔

ا ز ز

اَلْاَزِيْزُ۔ تیزی اور حدت۔ گرج۔ اَزَّ النَّارَ يَؤُزُّهَا۔ اس نے آگ کو روشن کر دیا اور بھڑکا دیا۔ اَزَّتِ الْقِدْرُ۔ ہانڈی میں سخت ابال آ گیا۔ اَزَّتِ السَّحَابَةُ۔ بادل زور سے گرجا۔ اَلْاَزُّ۔ رگ کا پھڑکنا۔ برانگیختہ کرنا۔ بھڑکانا*۔ سورۃ مریم میں ہے تَؤُزُّهُمْ اَزًّا (۱۹/۸۳)۔ وہ (شیاطین) کفار کو اکساتے اور بھڑکاتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تحرک۔ تحریک۔ اور کسی چیز کو اس کی جگہ سے اکھاڑ دینا ہیں۔ نیز اس کے معنی کسی کو کسی دوسرے کے خلاف اسطرح اکسانا ہیں کہ جسے اکسایا جائے اسے محسوس تک نہ ہو کہ اس سے کیا کام لیا جا رہا ہے۔

ا ز ف

اَزِفَ التَّرَحُّلُ۔ روانگی کا وقت قریب آگیا۔ اَزِفَ الرَّجُلُ۔ آدمی نے جلدی کی۔ اَلتَّاَزُّفُ۔ قریب قریب اور یکساں قدم رکھنا۔ اَلْاَزِفُ۔ جلد ہونے والی چیز*۔

قرآن میں ہے اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ (۵۳/۵۷) آنے والی ساعت قریب آ پہنچی۔ یعنے اعمال کے ظہور نتائج کا وقت۔ اسی کو دوسری جگہ۔ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ

* تاج۔ ** راغب

(۵۴/۱۸) کہا گیا ہے - یعنی وہ ''آنے والی ساعت''۔ انقلاب کی گھڑی -
نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں زا کے ساتھ ہمزہ آئے
ان میں سختی اور تنگی کا مفہوم مضمرہوتا ہے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی
معنی قریب اور نزدیک ہونے کے لکھے ہیں -

استبرق

اِسْتَبْرَقٌ - موٹے ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں - بعض نے کہا ہے
کہ یہ ایسا دبیز ریشمی کپڑا ہوتا ہے جس پر سونے کا کام کیا گیا ہو*۔
قرآن میں سُنْدُسٌ اور اِسْتَبْرَقٌ (۱۸/۳۱) - اہل جنت کے عمدہ لباس کے لئے
آئے ہیں -

صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ جوہری نے اس لفظ کا مادہ برق بتایا
ہے۔ اگر یہ برق سے ہے تو ممکن ہے اس میں بجلی کی چمک کا استعارہ ہو۔

اسحٰق علیہ السلام

حضرت ابراہیم ؑ کے دو بیٹوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے - فرزند اکبر
حضرت اسمعیل ؑ حضرت ہاجر کے بطن سے تھے - اور چھوٹے بیٹے (حضرت
اسحٰق ؑ) حضرت سارہ کے بطن سے - حضرت اسمعیل ؑ حجاز کی وادی غیر ذی
زرع میں بسے اور حضرت اسحٰق ؑ کے حصہ میں فلسطین کی سرداری آئی -
اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام ؑ کے زمرہ میں آپ کا ذکر کیا ہے .... مَآ اُنْزِلَ
اِلٰی اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ ..... (۲/۱۳۶) - ''اور جو کچھ
نازل کیا گیا ابراہیم - اسماعیل اور اسحٰق کیطرف''۔ انبیائے بنی اسرائیل
آپ ہی کی اولاد میں سے تھے - (نیز دیکھئے عنوان ابراہیم)

ا س ر

اَلْاِسَارُ - وہ تسمہ یا رسّی وغیرہ جس سے کسی چیز کو باندھ لیا
جائیے - اَلْاَسْرُ کسی چیز کو رسی وغیرہ سے باندہ لینا - نیز بندش - ساخت
اور خلقت - اَلْاَسِیْرُ - قیدی - باندھا ہوا (آدمی) - اسکی جمع اَسَارٰی اور
اَسْرٰی آتی ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی روک دینے
اور قید کر دینے کے ہیں -

* تاج و محیط -

باندھنے کے مفہوم سے اس کے معنے مضبوط اور مستحکم ہونے کے بھی آتے ہیں* ۔ قرآن میں اَسَارٰی کا لفظ قیدیوں کے لئے آیا ہے ۔ وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی "اور اگر وہ قید ہو کر تمہارے پاس آئیں" ۔ (۲/۸۵)۔ سورۃ الدہر میں ہے نَحْنُ خَلَقْنٰھُمْ وَ شَدَدْنَآ اَسْرَھُمْ (۷۶/۲۸)۔ "ہم نے انہیں (انسانوں کو) پیدا کیا اور ان کے اَسْرٌ کو مضبوطی سے جکڑ دیا" ۔ اَسْرٌ کے معنے انسانی جسم یا ہیئت (Form) کے ہیں ۔ دور حاضرہ کی علمی تحقیقات کی روشنی میں نظر آتا ہے کہ یہ لفظ حقیقت کے ایک بہت بڑے گوشے کو بے نقاب کرتا ہے ۔ ہم کسی چیز کو محسوس نہیں کر سکتے جب تک اسکی کوئی (Form) نہ ہو ۔ سائنس کی تحقیق نے بتایا ہے کہ مادہ (Matter) در حقیقت کسی ٹھوس چیز کا نام نہیں ۔ یہ (Atoms) کا مجموعہ ہے جو ایک خاص نظام کے ماتحت ایک دوسرے کے ساتھ جکڑے ہوتے ہیں ۔ اگر ان میں یہ باہمی جکڑ بندی نہ رہے تو کسی شے کی (Form) باقی نہیں رہ سکتی ۔ لہذا یہ اَسْرٌ (باہمی جکڑ بندی) ہی ہے جس سے اشیاء کا وجود قائم ہے ۔ سرجیمز جینس نے اسے "مقیّد لہروں" (Bottled-up Waves) سے تعبیر کیا ہے ۔ اسی کو قرآن نے شَدَدْنَا اَسْرَھُمْ کے جامع الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں سین کے ساتھ ہمزہ آئے ان میں قوت اور شدت کا مفہوم مضمر ہوتا ہے ۔ اس اعتبار سے اس مادہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔

اسرائیل علیہ السلام

حضرت یعقوبؑ کا لقب تھا ۔ (۳/۹۲)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "یعقوب" ۔ بنی اسرائیل کیلئے عنوان "بنی اسرائیل" دیکھئے ۔

ا س س

اَلْاُسُّ ۔ اَلْاَسَاسُ ۔ عمارت کی بنیاد جہاں سے تعمیر شروع ہوتی ہے ۔ جمع آسَاسٌ ۔ اَلْاَسِیْسُ ۔ ہر چیز کی اصل ۔ اَلتَّاْسِیْسُ ۔ عمارت کی بنیادیں ڈال دینا ۔ ** نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں سین اور ہمزہ ساتھ آئیں ان میں قوت اور شدت کا مفہوم مضمر ہوتا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا اپنی جگہ پر ثابت اور قائم ہونا ۔ سورۃ توبہ میں ہے اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی (۹/۱۰۸) (وہ مسجد) جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی ۔

---

* تاج ۔ ** تاج و محیط

اَلْاُسُّ ۔ انسان کے دل کو بھی کہتے ہیں ۔* اور اس راکھ کو بھی جو کاروان کے منزل سے کوچ کر جانے کے بعد پیچھے رہ جاتی ہے ۔ اس سے اسکے معنے کسی چیز کے اثر یا نشان کے لئے جاتے ہیں ۔ خُذْ اُسَّ الطَّرِیْقِ کسی سے اس وقت کہتے ہیں جب اس سے صحیح راستہ تک پہنچنے کے لئے دیگر نشانات و قرائن سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے کہا جائے ۔

ا س ف

اَلْاَسَفُ ۔ کسی چیز کے کھو جانے پر شدید ترین حزن کو کہتے ہیں*۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں سین اور ہمزہ ساتھ آئیں ان میں شدت اور قوت کا مفہوم مضمر ہوتا ہے ۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف آئے غَضْبَانَ اَسِفًا (۷/۱۵۰) ۔ '' غصہ میں بھرے ہوئے ۔ افسوس کرتے ہوئے '' ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَسَفٌ سے مطلب انتقام کے جذبہ کے ماتحت خون دل کا جوش کھانا ہے ۔ اگر یہ کیفیت اپنے سے کمتر کے لئے پیش آئے تو غَضَبٌ کہلاتی ہے اور اگر اپنے سے برتر کے لئے پیش آئے تو حُزْنٌ کہلاتی ہے*۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے متعلق فرمایا ہے فَلَمَّا اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (۴۳/۵۵) ۔ جب انہوں نے ہمیں '' ناراض کیا ، تو ہم نے انہیں ان کے جرموں کی سزا دی ۔ (اللہ کے '' ناراض ہونے'' کے لئے عنوان (غ-ض-ب) دیکھئے)۔

سورۃ یوسف میں حضرت یعقوبؑ کا قول ہے یٰاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ (۱۲/۸۴) ۔ وائے افسوس! یوسف!! ۔ لہذا عام حالات میں اس کے معنے حزن و تاسف کے ہونگے۔ اَرْضٌ اَسِیْفَةٌ اس زمین کو کہتے ہیں جس میں کچھ پیدا نہ ہو ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی فوت (یعنی ہاتھ سے نکل جانا) اور حسرت و تاسف بتائے ہیں ۔ اَلْجَمَلُ الْاَسِیْفُ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو فربہ نہ ہوتا ہو (ابن فارس)۔ اَسِیْفٌ غلام کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی کھوئی ہوئی آزادی پر ہمیشہ محزون رہتا ہے ۔ نیز جلد غمگین ہو جانے والے رقیق القلب آدمی کو بھی*۔

اسمٰعیل علیہ السلام

حضرت ابراھیمؑ کے دو بیٹوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے ۔ حضرت ھاجر کے بطن سے حضرت اسماعیلؑ ۔ اور حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحٰقؑ ۔ حضرت اسمٰعیلؑ بڑے بیٹے تھے ۔ انہی کو حضرت ابراھیمؑ ، اپنے خواب کو

* تاج ۔

حکم خداوندی سمجھ کرخدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے لے گئے تھے (۳۷/۱۰۲)
لیکن خدا نے انہیں وقتی قربانی کے بجائے، عمر بھر کی قربانی کے لئے زندہ رکھا
(۳۷/۱۰۷) ۔یہ بڑی قربانی (ذبح عظیم)تھی ، بیت اللہ کی تولیت۔خانہ خدا کی پاسبانی۔
چنانچہ ان دونوں باپ بیٹوں (حضرت ابراھیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ) نے ملکر
کعبہ کوتعمیر کیا (۲/۱۲۷) اور اس کے بعد حضرت اسمٰعیلؑ اسکی پاسبانی کے لئے
وھیں بس گئے ۔ خدا نے انہیں نبوت سے سرفراز فرمایا (۴/۱۶۳)۔ اور صَادِقَ
الْوَعْدِ (۱۹/۵۴) کہکر پکارا ۔ ''اسمٰعیل'' عبرانی لفظ شماع (سماع سننا) اور
ایل (خدا) سے مرکب ھے۔چونکہ آپ کی پیدائش حضرت ابراھیمؑ کی دعاؤں کا
نتیجہ تھی اس لئے آپ کا نام اسمٰعیل (اللہ کا سننا) رکھا گیا ۔ آپ کی اولاد
میں حضور خاتم النبیینؐ پیدا ھوئے۔

ا س ن

آسَنَ الْمَآءُ یَأْسُنُ ۔ پانی کی بو،رنگ یا مزے کا بگڑ جانا ۔اَلْاٰسِنُ
وہ پانی جو دیر تک ٹھہرا رہنے کی وجہ سے متغیر ھوگیا ھو*۔قرآن میں جنت کی
انہار کے متعلق ھے مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ (۴۷/۱۵) ''ایسے پانی کی نہریں جو
بگڑتا نہیں'' ۔ اسلئے کہ جنتی معاشرہ میں کسی چیز کو روک کر نہیں رکھا
جاتا ۔ استعمال کی ھر شے گھومتی پھرتی اور رواں دواں جاری رہتی ھے۔ یہ تو
جہنمی معاشرہ ھے جس میں یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۷) کی کیفیت پیدا
ھوتی ھے۔ یعنی رزق کےجن چشموں کو بہتے رھنا چاھئیے انہیں ارباب قوت و اقتدار
اپنے ذاتی مفاد کے لئے روک رکھتے ھیں اور اسطرح رکنے سے ان میں تغیر
واقع ھوجاتا ھے ۔

[آخرت کی جنت کی کیفیات کو ھم اس دنیا میں نہیں سمجھ سکتے۔
لیکن قرآن صرف آخرت کی جنت و جہنم ھی کے متعلق گفتگو نہیں کرتا ۔ وہ
اس دنیا کی جنت اور جہنم کا بھی ذکر کرتا ھے۔ تفصیل جنت (ج۔ن۔ن) اور
جہنم کے عنوانوں میں ملیگی]۔ اس دنیا کے جنتی اور جہنمی معاشرہ کو ھم اپنی
آنکھوں سے دیکھ سکتے ھیں ۔ آخرت کی جنت اور جہنم پر ھمارا ایمان ھے ۔
قرآن کریم میں ان کا بیان تمثیلی ھے۔ (۱۳/۳۵ ؛ ۴۷/۱۵)

ا س ی**

آسِیْتُ عَلَیْہِ ۔ میں اس پر غمگین ھوا ۔ رَجُلٌ اٰسٍ وَآسْیَانٌ
وَآسْوَانٌ ۔ غم کرنے والا آدمی ۔ اٰسٍ (الاٰسِیُّ) طبیب و معالج کو کہتے

* تاج و راغب و محیط ** اس میں مادہ (ا۔س۔و) بھی شامل ہے۔

ھیں)۔ اِمْرَاَۃٌ اٰسِیَۃٌ۔ غم کرنے والی عورت*۔ قرآن میں ہے فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (۵/۲۶) ۔ ”تو قوم فٰسقین (کی تباھی) پر غمگین نہ ھو“ ۔

آسَاہُ بِمُصِیْبَتِہٖ تَاْسِیَۃً ۔ اس کی مصیبت میں اس کو تسلی دی۔ فَتَاَسّٰی ۔ پس اسے تسلی ھو گئی*۔ لہذا آسَی کے معنے (راغب کے الفاظ میں) غم کے ھونے اور تَاْسِیَۃٌ کے معنی غم کو دور کرنے کے ۔ چنانچہ اَلْاَسْوُ زخم کی دوا کرنے کو کہتے ھیں ۔ اَلْاَسِیَۃُ ۔ دوائیں۔ یہ الاَسُوَّۃُ کی جمع ہے ۔

اَلْاَسِیُّ ۔ جس کی دوا کی جائے **۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اسو کے بنیادی معنی دوا دارو کرنا ھیں اور اسی کے معنی رنج و غم ھیں ۔

راغب نے کہا ہے کہ اِسْوَۃٌ و اُسْوَۃٌ کے معنے وہ حالت ھیں جس پر کوئی شخص کسی کا اتباع کرتے وقت ھوتا ہے، خواہ وہ اچھی ھو یا بری، مسرت بخش ھو یا تکلیف دہ۔ نیز وہ چیز جس سے غمگین آدمی تسلی حاصل کرے۔ جس سے اس کا غم زائل ھو جائے ۔ جس سے اس کے دکھوں کا مداوا ھو جائے**۔ آسَوْتُہٗ بِہٖ ۔ میں نے اسے اس کے لئے قابل تقلید نمونہ قرار دیا ۔ جنگ احزاب میں جن لوگوں نے دون ھمتی اور عدم استقلال کا ثبوت دیا تھا ان سے کہا گیا کہ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (۳۳/۲۱) تمہیں وھی کچھ کرنا چاھئے تھا جو رسول اللہؐ نے کیا ۔ جس طرح وہ ھمت و استقلال سے قانون خداوندی سے کامل ھم آھنگی کے ساتھ تمام مصائب کا مقابلہ کرتے رھے تمہیں بھی اسی طرح کرنا چاھئے تھا ۔ ان کی مثال تمہارے لئے نہایت عمدہ نمونہ تھی ۔ اس سے تمہیں اپنی مشکلات میں تسلی حاصل کرنا چاھئے تھی ۔ اسی طرح دوسری جگہ حضرت ابراھیمؑ کا ذکر ہے کہ انہوں نے کس طرح نظام خداوندی کے مخالفین سے علانیہ کہدیا کہ ھمارا اور تمہارا کوئی رشتہ نہیں ۔ اس ضمن میں کہا گیا کہ قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ (۶۰/۴) ۔ ابراھیم اور ان کے ساتھیوں کی یہ روش تمہارے لئے قابل تقلید نمونہ ہے ۔ اس سے تمہارے دکھوں کا مداوا ھوگا ۔ چنانچہ قرآن میں کئی مقامات پر مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم اس نظام کے مخالفین سے کبھی دوستی کا رشتہ نہ رکھو۔ انہیں راز دار نہ بناؤ ۔ مثلاً (لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنْ دُوْنِکُمْ (۳/۱۱۷) ۔ ”تم اپنوں کے سوا کسی کو راز دار نہ بناؤ“

---

* تاج ۔ ** تاج و راغب *** محیط ۔

اَلْمُوَاسَاۃُ۔ کا مفہوم یہ ہے کہ تم دوسرے کو اپنی جگہ پرسمجھو اور جس قدر اپنے لئے نفع حاصل کرنے اور مضرات کو دفع کرنے کی کوشش کرواتنی ہی اس کے لئے کرو۔ اور اِیْثَارٌ یہ ہے کہ تم اسے اپنے آپ پر بھی ترجیح دو***۔ قرآن کریم اِیْثَارٌ کی تعلیم دیتا ہے یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ۔ ''وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں۔'' (۵۹/۹) ۔ اسی اصول پر قرآن کریم کے نظام ربوبیت کی بنیاد ہے *۔

ا ش ر

اَشِرَ۔ یَاْشَرُ۔ اَشَرًا۔ بہت زیادہ اترانا اور اکڑنا ۔ خود پسندی کے ساتھ خوش ہونا ۔ در اصل اُشَرُالْمِنْجَلِ۔ درانتی کے دندانوں کو کہتے ہیں ۔ اور اَلْمِئْشَارُ۔ آرے کو۔ اس لئے اَشَرٌ ایسی خود پسندی اور اکڑفوں ہے جو دوسروں کو کاٹتی چلی جائے۔ یعنے شدت کی خود پسندی اور تکبر جس میں انسان عقل کی حدود سے نکل جائے **۔

قرآن کریم میں ہے بَلْ ھُوَ کَذَّابٌ اَشِرٌ (۵۴/۲۵) ۔ یہ اَشِرَ۔ یَاْشَرُ سے ہے اور اس کے معنے انتہائی متکبر اور خود پسند کے ہیں ۔ '' وہ سخت جھوٹا اور بڑا خود پسند ہے'' ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی حدت اور تیزی کے لکھے ہیں ۔

اَصْحَابُ الْاُخْدُوْد

قوم تُبّع کے حاکم ذونواس کا وہ لشکر جس نے بڑی بڑی خندقوں میں آگ جلا کر عیسائیوں کو اس میں جھونک دیا تھا ۔ (۸۵/۴-۹) ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان (ت ۔ ب ۔ ع) اور (خ ۔ د ۔ د) ۔

اصحابُ الْاَیْکہ

وہ قوم جس کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے اَصْحٰبُ الْاَیْکَۃِ کے نام سے پکاری گئی ہے ۔ (۱۵/۷۸) ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ''شعیبؑ''۔

---

* تفصیل کے لئے دیکھئے میری ''کتاب نظام ربوبیت'' ** تاج و راغب *** محیط

اَصْحَابُ الْحِجْرِ

حضرت اسمٰعیلؑ کے بڑے بیٹے کا نام نبایط تھا ۔ ان کے خاندان کو نبط (جمع انباط) کہا جاتا ہے ۔ شام و عرب کی حدود پر ان کی حکومت کے آثار ملتے ھیں ۔ تورات میں (حزقیل نبی کے صحیفہ میں) نبط کا ذکر آیا ہے ۔ پہلے ان کا دارالسلطنت رقیم تھا ۔ لیکن جب اس پر رومیوں نے قبضہ کر لیا تو یہ وادی قریٰ میں شہر حجر کیطرف منتقل ھو کر آ گئے ۔ اسی نسبت سے انہیں اَصْحَابُ الْحِجْرِ کہا گیا ہے ۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہوں نے خدا کے رسولوں کی تکذیب کی اور عذاب میں ماخوذ ھو گئے (۱۵/۸۰-۸۴) ۔

چونکہ ان سے پہلے قوم ثمود کا مرکز بھی حجر کا شہر رہ چکا تھا اس لئے بعض مورخین کا خیال اسطرف بھی گیا ہے کہ قرآن کریم کی محولہ بالا آیات میں اصحاب الحجر سے مراد قوم ثمود ھی ہے ۔ لیکن قیاس غالب یہی ہے کہ ان سے مراد قوم نبط ہے جس کے عروج و زوال کی داستانیں آج بھی حجر کے کھنڈرات کی اینٹوں پر منقوش ملتی ھیں ۔

اَصْحَابُ الرَّسِّ

حضرت اسمٰعیلؑ حجاز میں سکونت پذیر ھوئے تھے ۔ آپ کے بارہ بیٹے تھے جو اپنے اپنے خاندانوں کے رئیس تھے ۔ ان میں سے ایک کا نام قیدماہ تھا ۔ اصحاب الرسّ انہی کی اولاد میں سے قیاس کئے جاتے ھیں ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ قوم ثمود کا ایک قبیلہ تھا ۔ قرآن کریم نے تکذیب رسل کے سلسلہ میں دو مقامات پر ان کا نام لیا ہے ۔ یعنی (۲۵/۳۸) اور (۵۰/۱۲) میں ۔

اَصْحَابُ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ

وہ نوجوان جنھوں نے آسمانی انقلاب کے سلسلہ میں ایک غار میں جا کر پناہ لی اور وھاں اس انقلاب کی تیاریاں کرتے رہے ۔ قرآن کریم میں ان کا ذکر سورۂ کہف میں آیا ہے (۱۸/۹-۲۶) ۔ تفصیل ان امور کی میری کتاب ''شعلہ مستور'' میں ملیگی ۔

زمانۂ قدیم میں نبطی حکومت کا دارالسلطنت رقیم کا شہر تھا ۔ جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا علاقہ فتح کیا تو اس شہر کو شہرت حاصل

ھوئی ۔ لیکن رقیم کے نام سے نہیں بلکہ پیٹرا کے نام سے ، جسے عربوں نے اپنے ہاں بطرا کہکر پکارا ۔ دور حاضر کی اثری تحقیقات نے اس شہر کے کھنڈرات کا سراغ لگا لیا ھے جہاں سے پرانے غاروں کے اندر خانقاھوں کے آثار ملے ھیں ۔ یہ شہر اس شاھراہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کیطرف جاتا تھا ۔ اسلئے نزول قرآن کے وقت عرب، اصحاب کہف (غاروالوں) یا اصحاب الرقیم (بطرہ والوں) کےقصہ سے آشنا تھے، لیکن انہی تفاصیل کےساتھ جو لوگوں میں عام طور پر پھیلی ھوئی تھیں ۔ قرآن کریم نے (جزئیات میں گئے بغیر) اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا اور بتایا کہ ان نوجوانوں کے پیش نظر مقصد کیا تھا اور بعد میں لوگوں نے کیا سمجھ لیا اورانہیں کیا سے کیا بتا دیا ۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ر ۔ ق ۔ م)

ا ص د

اَصَدَ ۔ اس نے بند کیا (دروازہ وغیرہ)۔ ابن فارس نے لکھا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے اندر شامل ھو جانا ھیں ۔ اس سے اَلْاَصِیْدُ باڑے کو کہتے ھیں جس میں جانور بند کئے جاتے ھیں ۔ قرآن کریم میں مُؤْصَدَۃٌ آیا ھے ($\frac{۱۰۳}{۸}$) ۔ جس کے معنی ھیں بند کی ھوئی یا مشتمل ۔

اھل لغت کا کہنا ھے کہ یہ وصد کا ایک لغت ھے * ۔ اس لئے ھم نے احتیاطاً اسے وھاں (و ۔ ص ۔ د میں) بھی لکھ دیا ھے ۔ اگرچہ ھمارے نزدیک یہ بھی ایک مستقل مادہ ھے ۔

ا ص ر

اَلْاَصْرُ ۔ کسی چیز کو باندہ دینا ۔ زبردستی روک دینا ** ۔

اَلْاِصَرَۃُ ۔ چھوٹی سی رسی جس سے خیمے کا نچلا حصہ باندہ دیا جائے *** ۔

اَلْاِصْرُ ۔ محکم عھد جس سے انسان بندھا ھوا ھو ۔ نیز اس کے معنے بوجھ کے ھیں *** ۔ سورۃ اعراف میں نبی اکرم ؐ کے متعلق ھے وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ ($\frac{۷}{۱۵۷}$) ۔ وہ اس بوجھ کو اتار دیگا جس کے نیچے نوع

*تاج و اقرب الموارد ۔ ** راغب *** محیط ۔

انسانی دبی چلی آ رہی ہے - اور ان گراں بار پابندیوں کو اٹھا دیگا جو انسانوں کے لئے نا قابل برداشت ہوں - اور اس طرح انسانیت کو صحیح حریت فکر و عمل عطا کر دیگا - یہی وہ اِصْرٌ ہے جس سے آزاد رہنے کی آرزو ہمیں سکھائی گئی ہے وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا (۲/۲۸۶)- ''اورہم پر وہ بوجھنہ ڈال،، یہی وہ حقیقی آزادی ہے جسے قرآن عطا کرتا ہے - یعنے اطاعت صرف خدا کے قانون کی ہوگی ، اس کے علاوہ دنیا میں کسی اور کے حکم کی اطاعت نہیں ہوگی، خواہ وہ مذہبی پیشوا ہوں یا دنیاوی ارباب اقتدار (۳/۴۸) - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی روکنے اور جھکانے کے لکھے ہیں - یعنی کسی کو محکوم بنا لینا - راغب نے کہا ہے کہ اَلْاِصْرُ سے مراد وہ امور ہیں جو بھلائیوں اور نیکیوں کی راہ میں مانع اور حائل ہوتے ہیں اور ان تک پہنچنے نہیں دیتے۔

ا ص ل

اَلْاَصْلُ - کسی چیز کا سب سے نچلا حصہ - اَصْلٌ - کسی چیز کی بنیاد یا جڑ * - قرآن کریم میں یہ لفظ فَرْعٌ کے مقابلہ میں آیا ہے - اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (۱۴/۲۴) - جس کے معنی شاخ کے ہیں۔

اِسْتَأْصَلَهُ - اس کو جڑ سے اکھیڑ دیا* - یا کاٹ دیا** -

اَلْاَصِيْلُ (جمع اَصَالٌ) عصر سے مغرب تک کا وقت* - قرآن کریم میں ہے بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (۷/۲۰۵) - صبح اور شام - ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے معنی شام کے بعد کا وقت ہیں - غالباً رات کے نچلے حصے کی جہت سے اسے ایسا کہتے ہیں - راغب نے کہا ہے کہ اَصْلٌ کسی چیز کے اس بنیادی حصے کو کہتے ہیں کہ اگر اسے مٹا دیا جائے تو وہ ساری چیز ختم ہو جائے - اس اعتبار سے عصر اور مغرب کے درمیانی وقت کو اَلْاَصِيْلُ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے چلے جانے سے دن ہی ختم ہو جاتا ہے -

ا ف ف

اَلْاُفُّ - ہر گندی مکروہ اور حقیر چیز کو کہتے ہیں - میل کچیل - ناخن کی کترن - ناخن یا کان کا میل - نیز کپڑے پر پڑی ہوئی مٹی یا راکھ وغیرہ کو پھونک مار کر صاف کرنے کے لئے اُفّ بولا جاتا ہے - غالباً پھونک مارنے کی آواز کی جہت سے ، اَلْاُفَّةُ بزدل کو کہتے ہیں - یا اسے جس کے پاس کچھ نہ ہو - جس کے پاس کم مال ہو - گندا آدمی - اَلْاَفَفُ - اکتا جانا - اَلْاُفُّ - بد بو - آفت - یَتَأَفَّفُ - بے چینی ، اکتاہٹ یا تکلیف

---

* تاج - ** محیط -

کی وجہ سے "اُفّ" کہنا۔ کسی سے نفرت و بیزاری یا اکتاہٹ کے اظہار کے لئے، نیز تحقیر کے موقع پر "اُفٍّ لَهٗ" کہا کرتے ہیں*۔

قرآن کریم میں والدین کے متعلق ہے فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۱۷/۲۳) "ان کی تحقیر نہ کرو۔ انہیں جھڑکو نہیں بلکہ نرمی سے بات کرو"۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ناپسندیدہ ہونے کے ہیں۔ (نیز موجودہ وقت کو بھی کہتے ہیں۔ لیکن قرآن میں اس معنی میں یہ لفظ نہیں آیا)۔

ا ف ق

اَلْاُفُقُ۔ اَلْاُفْقُ۔ کنارہ۔ جمع اٰفَاقٌ۔ یعنی جو کچھ زمین اور آسمان کے اطراف سے نظر آتا ہے۔ اُفُقُ الْبَيْتِ خیمے کا اگلا چھجا یا سائبان۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے اطراف و جوانب کے درمیان وسعت اور انتہائی بُعد کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (۴۱/۵۳)۔ "ہم انہیں اپنی نشانیاں دنیا کے اطراف و جوانب میں اور خود ان کے اپنے اندر دکھائینگے"۔ یعنی قومی اور بین الاقوامی حوادث۔ نیز اس کے معنی خارجی کائنات اور انسانی دنیا کے ہو سکتے ہیں۔

فَرَسٌ اُفُقٌ۔ خوشنما اور حیرت انگیز رفتار والا گھوڑا۔ اَفِقَ الرَّجُلُ۔ وہ علم وفضل اور کرم و شرافت اور دیگر فضائل میں انتہا تک پہنچ گیا۔ فَهُوَ اَفِقٌ و آفِيْقٌ*۔

انتہائی وسعت اور بلندی کے اعتبار سے نبی اکرم کے متعلق ہے۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ (۸۱/۲۳)۔ "اور اس (رسول) نے اپنے آپ کو نہایت بلند مرتبہ پر دیکھا"۔ (یا خدا نے رسول کو سیرت و کردار کے بلند مقام پر دیکھا)۔ سورۃ نجم میں ہے وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (۵۳/۷)۔ "وہ رسول (شرف انسانیت اور علم و حقائق کے) بلند ترین مقام پر ہے"۔

ا ف ک

اَفَكَ۔ يَاْفِكُ۔ جھوٹ بولنا۔ جھوٹی بات بنانا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو الٹ دینا اور اسکی جہت سے

* تاج۔ محیط۔ راغب۔ ** تاج

پھیر دینا ہوتے ہیں ۔ قرآن کریم میں عصائے کلیمی کے متعلق ہے فَاِذَا ھِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ (۷/۱۱۷)۔ '' اس نے ان سب چیزوں کو نیست و نابود کر دیا (نگل لیا) جنہیں وہ جھوٹ موٹ بنائے تھے،، ۔ سورۃ صٰفّٰت میں جھوٹے کفار کے متعلق ہے اَئِفْکًا (۳۷/۸۶) ۔ '' کیا تم صحیح راستہ سے ہٹ کر،، سورۃ شعراء میں ہے اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ (۲۶/۲۲۲) ۔ قرآن کریم نے اس کی تشریح سورۃ جاثیہ میں ان الفاظ سے بھی کی ہے یَسْمَعُ اٰیٰتِ اللّٰہِ تُتْلٰی عَلَیْہِ ثُمَّ یُصِرُّ مُسْتَکْبِرًا کَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْھَا (۴۵/۸) ۔ '' وہ قوانین خداوندی کو جو اس کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں سنتا ہے ۔ پھر تکبر کرتے ہوئے (اپنی ہی بات پر) اڑے رہتا ہے، گویا اس نے قوانین خداوندی کو سنا ہی نہیں ،، ۔

اِفْکٌ ۔ کسی چیز کو پلٹ دینا ۔ الٹ دینا ۔ جس طریق پر کسی چیز کو ہونا چاہئیے اسے اس سے پھیر دینا ۔ راغب کے نزدیک بھی اِفْکٌ کا یہی مطلب ہے** ۔

پھیر دینے کے معنوں میں سورۃ ذاریٰت میں ہے ۔ یُؤْفَکُ عَنْہُ مَنْ اُفِکَ (۵۱/۹) ۔ '' اس سے اس کو پھیرا جاتا ہے جو خود اس سے پھر جاتا ہے ،، ۔ یہ آیت ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف دلالت کرتی ہے ۔ یعنی خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا ۔ انسان خود ہی گمراہ ہوتا ہے ۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو گمراہ ہونا چاہے اسے صحیح راستے پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا ۔ یہاں ابتداء کار (Initiative) انسان کے ہاتھ میں ہے ۔ جو کچھ یہ کرتا ہے اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے ۔ اگر یہ اپنے اندر پتھر جیسی سختی پیدا کر لے تو ہر شیشہ اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیگا اور اگر یہ شیشے جیسا نازک بن جائے تو پتھر کی چھوٹی سی کنکری بھی اسے پاش پاش کر دیگی ۔ غرضیکہ وہ جدھر اپنا رخ کر لے اسی سمت کی منزل اس کے سامنے آجائیگی ۔ خدا زبردستی کسی انسان کا رخ نہیں پھیرتا ۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ (۶۱/۵) '' جب وہ ٹیڑھے چلے تو خدا (کے قانون مکافات) نے ان کے دل ٹیڑھے کر دئے ۔ ۔ ۔،،

اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ (۶۳/۴) '' کس طرح یا کدھر الٹے پھیرے جاتے ہیں ،، ۔ اَلْمُؤْتَفِکٰتُ (۹/۷۰) ۔ وہ بستیاں جنہیں الٹ دیا گیا تھا [1]

اَلْاَفِیْکَۃُ ۔ قحط والے سال کو کہتے ہیں*** ۔ اَلْمَاْفُوْکُ ۔ جہاں بارش نہ ہوتی ہو اور اس لئے وہاں گھاس وغیرہ کچھ نہ ہو*** ۔

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** تاج و محیط ۔ [1] مزید براں دیکھئے تتمہ صفحہ ۱۸۰۹/۱۸۱۰ جلد چہارم

ا ف ل

اَفَلَ الْقَمَرُ اُفُوْلاً ۔ چاند (نیز اجرام فلکی) کا غائب ہو جانا اور غروب ہو جانا ۔ اَلْمَأْفُوْلُ ۔ ناقص ۔ ضعیف ۔ رَجُلٌ مَأْفُوْلُ الرَّأْیِ ۔ ضعیف العقل آدمی۔* راغب نے کہا ہے کہ اُلاُفُوْلُ روشن ستاروں کے غروب ہو جانے کو کہتے ہیں ۔** ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی غروب ہو جانا بھی ہیں اور چھوٹا اور دھندلا ہو جانا بھی۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے کائناتی نظام پر بڑی دقت نظر سے غور و فکر کیا۔ اسکی قوتوں کا اچھی طرح سے مشاہدہ کیا۔ وَكَذٰلِكَ نُرِىٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ ''اور اسطرح ہم نے ابراہیم کو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اپنی قدرت دکھائی،، ۔ ($\frac{6}{79}$) اور ان سے ذات باری تعالیٰ پر ایمان کے دلائل کو علی وجہ البصیرت محکم کیا۔ چنانچہ انہوں نے ستاروں کو دیکھا ۔ چاند پر غور کیا۔سورج کا اچھی طرح مشاہدہ کیا ۔ ان کی قوم ان اجرام سماوی کی پرستش کیا کرتی تھی ۔ لیکن انہوں نے ان پر غور و فکر کے بعد کہا کہ ان کی حالت یہ ہے کہ ایک وقت میں نہایت آب و تاب سے نمودار ہوتے ہیں اور دوسرے وقت میں تاریکی کے پردے میں جا چھپتے ہیں ۔لہذا اس قسم کی تغیر پذیر چیزیں کبھی معبود نہیں بن سکتیں ۔ صاحب اقتدار خدا وہی ہو سکتا ہے جو تغیرات سے ماوراء ہو۔ اسلئے لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ($\frac{6}{76}$) ''میں تغیر آشنا چیزوں کو معبود ماننے کیلئے تیار نہیں ہوں،،*** ۔ میں اس ہستی کو خدا مانتا ہوں جو ان سب کی خالق ہے۔ (الَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ $\frac{6}{80}$) ۔

یہ اعلان کہ ایک تغیر پذیر شے معبود نہیں ہوسکتی ، بہت بڑی حقیقت کی طرف راہ نمائی کرتا ہے ۔ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خارجی حوادث سے تغیر پذیر نہیں ہوتی ۔ اس کی تعریف ، برگسان کے مفہوم کے مطابق ، یہ ہے کہ (Changelessness in Change) ''تغیرات کی دنیا میں عدم تغیر''۔ اسلئے خدا جو مکمل ترین ذات (The most complete and Perfect Personality) ہے تغیرات سے یکسر ماوراء ہوگا۔ لہذا ، جو اٰفِلْ

---

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آیات ($\frac{6}{77-79}$) میں حضرت ابراھیمؑ کے والد (آزر) اور حضرت ابراھیمؑ کا مکالمہ ہے ۔ یعنی قال ھذا ربی ۔ آزر کا قول ہے اور قال لا أحب الا فلین ۔ حضرت ابراھیمؑ کا قول ۔ اسی طرح دوسری آیات میں بھی ۔

ہے وہ خدا نہیں ہوسکتا ۔ ''آفلیت'' ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت کے منافی ہے ۔ جس انسان کی ذات کی نشو و نما ہو جائے اس میں بھی یہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ وہ اپنے اصولوں کا پکا ہوتا ہے اور خارجی احوال وظروف کے ساتھ (مرغ باد نما کی طرح) ہر آن بدلتا نہیں رہتا ۔ اسی کو ایمان کی پختگی اور عمل کی استقامت کہتے ہیں ۔ ایسے ہی انسان ہیں جن کی بات پر اعتماد کیا جاسکتا ہے ۔ جن کا خدا ''آفل'' نہیں وہ خود بھی ''آفل'' نہیں ہوتے ۔ جیسا کسی انسان یا قوم کا ''خدا'' ویسا ہی وہ انسان یا قوم ۔ خدا کے تصور کا انسان کی ذات یا قومی خصوصیات پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے ۔ قرآن کریم نے خدائے حقیقی کا جو تصور پیش کیا ہے، اس پر ایمان رکھنے والی قوم کا دنیا میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا — نہ قوت و ثبات میں ۔ نہ شرف و سعادت میں ۔

ا ک ل

اَکَلَ ۔ کے معنے ہیں کسی چبانے کی چیز کو چبا کر کھا لینا ۔ پینے والی چیز یا جس چیز کو چبائے بغیر نگل لیا جائے اسے مَاْکُوْل* نہیں کہا جاتا ۔ اَلْمَاْکُوْلُ ۔ وہ جانور جسے کوئی درندہ کھا جائے (سورۃ فیل میں عَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ ($\frac{105}{5}$) کے معنے ہیں کھایا ہوا بھس یا وہ چارہ اور پتے وغیرہ جنہیں کیڑوں نے کھا لیا ہو ۔ کرم خوردہ) اس اعتبار سے اَلْاٰکِلُ بادشاہ کو کہتے ہیں ۔ اور اَلْمَاْکُوْلُ رعیت کو ۔ اَلْاُکُلُ ۔ کا استعمال عام طور پر پھلوں کے لئے ہوتا ہے لیکن درحقیقت درختوں اور پودوں سے جو کچھ بھی کھایا جائے اَلْاُکُلُ کہلاتا ہے ۔ قرآن کریم میں جنت کے متعلق ہے ۔ اُکُلُهَا دَائِمٌ ($\frac{13}{35}$) ۔ ''اس کے پھل ہمیشہ رہینگے'' ۔ نیز وسیع رزق ۔ عقل اور رائے اور وزنی عقل کو بھی اَلْاُکُلُ کہتے ہیں* ۔

اَکَلَ کے حقیقی معنی تو کھانے کے ہیں لیکن اسکے مجازی معنے کسی چیز کے لینے کے بھی آتے ہیں ۔ لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوا ($\frac{3}{129}$) کے معنے ہیں ۔ سود مت لو ۔ اگرچہ ہمارے ہاں بھی ''سود کھانا'' ہی کہتے ہیں اور سود لینے والے کو سود خوار ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اکل مال سے مراد اتفاق مال ہے اس لئے کہ مال کا بیشتر مصرف کھانے پینے اور معاشی ضروریات سے متعلق ہوتا ہے ۔

سورۃ مائدہ میں حرام چیزوں کی فہرست میں وَمَا اَکَلَ السَّبُعُ ($\frac{5}{3}$) آیا ہے ۔ اس کے معنی ہیں وہ جانور جسے درندوں نے پکڑ کر تھوڑا بہت

* تاج ۔

کھا لیا ہو اور اس میں جان باقی ہو۔ کیونکہ اس کے بعد ہے اِلاَّ مَا ذَكَّيْتُمْ۔ ہاں اگر تم اسے ذبح کر لو تو پھر ٹھیک ہے۔ اگر درندوں نے سارے کا سارا کھا لیا ہو تو پھر اس کی حلت و حرمت کے متعلق کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ اور اگر وہ مر چکا ہو تو پھر "مردار" ہو جائیگا جو حرام ہے۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی "بتدریج کم ہونا" ہیں۔ جس چیز کو کھایا جائے وہ کم ہوتی جاتی ہے۔

اَلْ (حرف)

اَلْ۔ یہ اسم کو معرفہ بنانے یعنی متعین کرنے کے لئے آتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انگریزی زبان میں (The) آتا ہے۔ رَجُلٌ۔ کوئی آدمی۔ اور اَلرَّجُلُ۔ وہ خاص آدمی۔ (The Man)۔ ذیل کی مثالوں سے اس کے استعمال کے اسالیب واضح ہو جائینگے۔

(۱) پہلے کسی کا عمومی ذکر کرنا۔ اور اس کے بعد جب پھر اس کا ذکر آئے تو اَلْ بڑھا دینا۔ مثلاً كَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلاً۔ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ (۱۵-۱۶/۷۳)۔ "جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا۔ سو فرعون نے اس رسول کی نا فرمانی کی"۔ یہاں اَلرَّسُوْلَ کے معنی ہیں وہ رسول جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

(۲) کسی ایسی چیز کا ذکر کرنا جس سے سننے والا پہلے ہی متعارف ہو۔ یعنی وہ جانتا ہو کہ یہ کس چیز کا ذکر ہو رہا ہے۔ مثلاً اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ (۹/۴۰)۔ "جب وہ دونوں غار میں تھے"۔ یہاں پہلے کسی غار کا ذکر نہیں آیا۔ پہلی مرتبہ ہی اسے الغار کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سننے والوں کو معلوم تھا کہ اس سے کونسا غار مراد ہے۔

(۳) جب وقت یا زمانہ متعین کیا جائے۔ مثلاً اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (۵/۳) "آج کے دن۔ یا اس دور میں۔ ہم نے تمہارا غلبہ (یا دین) مکمل کر دیا ہے"۔

(۴) استغراق۔ جب کسی پوری کی پوری نوع کا ذکر ہو۔ یعنی كُلٌّ کے معنوں میں۔ مثلاً خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفاً (۴/۲۸)۔ انسان کی خلقت اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ یہ جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ خصوصیت تمام نوع انسانی کی بتائی گئی ہے۔

(۵) جب کسی چیز میں اس نوع کی تمام خوبیاں جمع ہو جائیں تو اسے بھی آلْ سے مخصوص کر دیتے ہیں۔ (محیط المحیط)۔ جیسے ذَالِکَ الْکِتَابُ (۲/۲)۔ یہاں اَلْکِتَابُ سے مراد یہ ہے کہ اس کتاب میں تمام آسمانی کتابوں کی خصوصیات یک جا جمع ہو گئی ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں الکتابُ مشارٌ الیہ ہونے کی وجہ سے معرفہ ہے۔ البتہ هُوَ الْحَقُّ کے آلْ میں یہ خصوصیت ہے کہ اس نوع کی تمام خوبیاں اس میں جمع ہو گئی ہیں۔

(۶) مضاف الیہ کی بجائے جب کسی چیز کی نسبت کسی معین شخص کی طرف کرنی ہو تو آلْ لگا دیتے ہیں۔ مثلاً اَلْمَدِیْنَةُ سے مراد ہے مَدِیْنَةُ الرَّسُوْلِ۔ رسول اللہؐ کا شہر۔ (اس نسبت سے اس شہر کی عظمت کو چار چاند لگ گئے)۔

(۷) بعض وقت یہ اَلَّذِیْ کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً اَلضَّارِبُ کے معنی ہیں اَلَّذِیْ یَضْرِبُ۔ وہ شخص جو مارتا ہے۔

اَلَا۔ (حرف)

اَلَا۔ یہ دو حرفوں (یعنی ہمزہ استفہام اور لام نفی) کا مجموعہ ہے (ء+لَا)۔ اس کا ترجمہ ہوگا۔ "کیا نہیں؟"۔ ان معنوں میں قرآن کریم میں ہے اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ (۲۴/۲۲) "کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہاری حفاظت کا سامان کر دے؟"۔ یا مثلاً اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَیْمَانَهُمْ (۹/۱۳)۔ "کیا تم ان لوگوں کے خلاف جنگ نہ کرو گے جنہوں نے اپنے عہد کو توڑ دیا ہے؟"۔

(۲) یہ حرف تنبیہ بھی ہے۔ یعنی اس کا استعمال کسی کو متنبہ (آگاہ) کرنے یا کسی بات کے متعلق یقین دلانے کے لئے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ (۲/۱۲)۔ "تم آگاہ رہو کہ یہی لوگ مفسد ہیں" (یا) "یہ واقعہ ہے کہ یہی لوگ مفسد ہیں"۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی اِعْلَمُوْا ...... یاد رکھو کہ ......

ا ل ف

اَلْفٌ۔ ایک ہزار (جمع آلَافٌ وَ اُلُوْفٌ)۔

چونکہ چار ہندسوں کے اکٹھا ہونے سے ایک ہزار کا عدد بنتا ہے اس لئے اَلْاِلْفُ کے معنی ہیں ہم آہنگی اور پیوستگی۔ یا گھل مل جانے

والا ساتھی ۔ (یا اَلْفٌ کا لفظ اِلْفٌ سے ہے)۔ اَلَّفَ بَیْنَھُمْ ۔ ان میں ہم آہنگی پیدا کر دی ۔ ایسی ہم آہنگی جیسے بادل کے ٹکڑے آپس میں مل کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں (...... سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَهٗ ۲۴/۴۳)۔ اَلْمُؤَلَّفُ ۔ وہ چیز جسکے اجزاء کو مرتب کرکے ایک دوسرے کے ساتھ جمع کردیا گیا ہو ۔ اَلْاُلْفَةُ ۔ باہمدگر پیوست ہو جانا۔ اَلْمُؤَلَّفَةُ قُلُوْبُهُمْ ۔ جن کے دلوں میں محبت اورالفت پیدا کرنا مقصود ہو۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ مل جانا اور منضم ہو جانا ہیں ۔ اَلْاِیْلَافُ ۔ مانوس کرنا اور الفت دلانا۔ (لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۱/۱۰۶) عہد و پیمان ۔ وہ اقرار نامہ جس سے دو فریق ایک دوسرے سے پیوست رہیں ۔ یہ وہ عہد نامے تھے جو قریش نے ہمسایہ ممالک کی حکومتوں سے لے رکھے تھے کہ ان کے قافلوں کو کوئی نہ لوٹے کیونکہ وہ کعبہ کے متولی تھے*۔

قرآن کریم میں جماعت مومنین کے متعلق ہے اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (۳/۱۰۲) ۔ ”تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ خدا نے تمہارے دلوں میں ہم آہنگی پیدا کر دی اور اس طرح تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے“۔ یہاں سے اِئْتِلَافٌ کے معنے واضح ہو جاتے ہیں ۔ اِئْتِلَافٌ درحقیقت تعاون اور اجتماع سے اگلا درجہ ہے ۔ اس میں جماعت کے افراد بالکل ایک دوسرے سے گھل مل جاتے ہیں اور دلوں میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کسی معاشرہ میں افراد کے باہمی تعلقات ایسے نہیں تو وہ مومنین کا معاشرہ نہیں ۔ ایمان کا فطری تقاضا یا لازمی نتیجہ ہم آہنگی، فکر و عمل ہے ۔ جب مختلف افراد کے سامنے نصب العین حیات ایک ہو۔ منزل ایک ہو۔ راستہ ایک ہو۔ ضابطہ، زندگی ایک ہو تو پھر ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے پیوستگی کیوں نہیں ہوگی ؟

أ ل ک

مَلٰٓئِکَةٌ ۔ بعض کا خیال ہے کہ اس لفظ کا مادہ اَلَکٌ ہے جسکے معنے پیغام رسانی کے ہیں۔ اَلِکْنِیْ اِلٰی فُلَانٍ (اصل میں اَلْئِکْنِیْ تھا) اسکو میری طرف سے پیغام پہنچا دو۔ اَلْمَلْاَکَةُ ۔ پیغام رسان ۔

* تاج ۔

فرشتہ ۔ جو اَلْمَأْلَکُ سے مقلوب ہے ۔ اَلْاَلُوْکَۃُ وَاَلْمَأْلَکَۃُ وَاَلْاَلُوْکُ وَالْمَأْلُکُ ۔ پیغام ۔ (اَلَکَ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو منہ میں چبانا ۔ پیغام کو اسلئے اَلْاَلُوْکَۃُ کہتے ہیں کہ اسے منہ میں چبا کر باہر نکالا جاتا ہے)۔* ابن فارس نے اسکے یہی بنیادی معنے لکھے ہیں۔ یعنی پیغام رسانی ۔

لیکن دوسرے محققین کا قول ہے کہ اسکا (مَلٰئِکَۃٌ کا مادہ مَلَکَ ہے جس کے معنی قوت کے ہیں (دیکھئے عنوان م-ل-ك) راغب نے کہا ہے کہ مَلَائِکَۃٌ در اصل مَأْلَکَ ہے۔ فرشتوں میں سے جن کے سپرد انتظامات کئے جاتے ہیں ان کو مَلَکَ کہتے ہیں اور انسانوں میں سے جو تدبیر امور کرتے ہیں انہیں مَلِکَ کہا جاتا ہے ۔**

مفتی محمد عبدہ نے اپنی تفسیر المنار میں لکھا ہے کہ ''یہ امر ثابت ہے کہ کائنات کی ہر شے کے اندر ایک قوت ایسی ہے جس پر اس چیز کا دار و مدار ہے اور جس کے ساتھ اس شے کا قوام و نظام قائم ہے ۔ جو لوگ وحی پر ایمان نہیں رکھتے وہ ان قوتوں کو طبیعی قوتیں (Physical Forces) کہتے ہیں، اور شریعت کی زبان میں انہیں مَلَائِکَۃٌ کہا جاتا ہے ۔ لیکن انہیں مَلَائِکَۃٌ کہئے یا کائناتی قوتیں ۔ حقیقت ایک ہی ہے اور عقلمند آدمی وہ ہے جسکے لئے ''رکھے ہوئے نام،، اصل مسمیات سے حجاب نہ بن جائیں،،۔

قرآن کریم میں مَلَائِکَۃٌ کو پیغام رساں کہا گیا ہے ۔ اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلَائِکَۃِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ ..... ($\frac{22}{75}$)''اللہ ملائکہ میں سے پیغام رساں چن لیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی،،۔ لیکن یہ چیز (پیغام رسانی) ملائکہ کے فرائض میں سے صرف ایک فریضہ ہے ۔ جامع طور پر انہیں مُدَبِّرَاتِ اَمْرًا ($\frac{79}{5}$) اور مُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ($\frac{51}{4}$) کہا گیا ہے ۔ یعنی ''تدبیر امور اور تقسیم امور کرنے والی قوتیں یا جماعتیں،، ۔ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی متعین کردہ مختلف اسکیمیں کارفرما ہیں ۔ جو ملکوتی قوتیں خدا کے قانون کے مطابق ان تدبیرات کو بروئے کار لاتی ہیں انہیں مَلَائِکَۃٌ کہکر پکارا گیا ہے ۔ اس اعتبار سے مَلَائِکَۃٌ کا مادہ اَلَکَ کی بہ نسبت مَلَکَ زیادہ صحیح ہوگا ۔ یعنے قوتیں ۔ ان قوتوں کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں (اختیار و ارادہ خدا کے بعد صرف انسان کو حاصل ہے) اسلئے یہ قوتیں بلا چون وچرا قانونِ خداوندی کے مطابق سرگرم عمل رہتی ہیں ۔ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ($\frac{16}{50}$)۔ ''جو کچھ ان سے کہا

* تاج و محیط ۔ ** تاج ۔ تاج میں یہ مادہ (م ل ک) کے تحت آیا ہے۔

جاتا ہے وہ وہی کچھ کرتی ہیں"۔ جس قانون کے مطابق یہ قوتیں مادی کائنات میں کارفرما رہتی ہیں اسکا علم انسان کو دیدیا گیا ہے۔* (یعنی انسان میں اس امر کی امکانی صلاحیت موجود ہے کہ وہ کائناتی قوتوں کی کارفرمائی کے قانون کا علم حاصل کرلے) اسلئے یہ قوتیں انسان کے تابع تسخیر آسکتی ہیں۔ (ملائکہ کے سجدہ آدم سے یہی مفہوم ہے۔** اسی کو تسخیر فطرت کہتے ہیں۔

لیکن مَلَائِكَةٌ صرف انہیں قوتوں کو نہیں کہا گیا جو خارجی کائنات میں تدبیر امور کرتی ہیں بلکہ ان قوتوں کو بھی کہا گیا ہے جو انسان کی داخلی دنیا (نفسیاتی زندگی) پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا .... (۴۱/۳۰) "یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ اللہ کی ربوبیت پر یقین رکھتے ہیں اور پھر اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم کسی قسم کا غم اور اندیشہ مت کرو"۔ اس میں "نزول ملائکہ" سے مراد وہ نفسیاتی تغیر ہے جو خدا کی ربوبیت پر یقین محکم سے انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ (اسکے برعکس جو قوتیں انسان کے دل میں خوف و ہراس اور یاس و نا امیدی پیدا کرتی ہیں (خواہ وہ خارجی قوتیں ہوں یا خود انسان کی داخلی قوتیں) انہیں ابلیس اور شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (دیکھئے عنوان ب۔ل۔س اور ش۔ط۔ن) یہی وہ "ملائکہ" تھے جو بدر و حنین کے میدان میں مجاہدین کیلئے تسکین خاطر اور تثبیت قلب کا موجب بنے تھے (۸/۱۲ ; ۹/۲۶) اسی قسم کی قوتیں ان تغیرات کا بھی موجب بنتی ہیں جو انسان کے طبعی جسم میں رونما ہوتے رہتے ہیں اور آخرالامر موت تک منتج ہوتے ہیں۔ (۳۲/۱۱ ; ۱۶/۲۸) نیز ملائکہ اعمال انسانی کے "رجسٹرار" (لکھنے والے۔ محفوظ رکھنے والے) ہوتے ہیں یعنی قانون مکافات کو بروئے کار لانے کا موجب بنتے ہیں۔ (۱۰/۲۱) ذ ۴۳/۸۰۔ ان آیات "کتابت اعمال" کو ملائکہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن دوسری جگہ ہے کہ ان امور کو اللہ تعالیٰ خود لکھ لیتا ہے (۱۹/۷۹) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اعمال نامہ خود انسان کے اپنے گلے میں لٹکا رہتا ہے (۱۷/۱۳-۱۴)۔ ان مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ملائکہ وہ ملکوتی قوتیں ہیں جو خدا کے قانون مکافات کے مطابق ہر عمل کا نتیجہ مرتب کرتی رہتی ہیں اور وہ نتیجہ انسان کی ذات پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔

---

* وعلم آدم الاسماء کلہا (۲/۳۱)۔ ** (۲/۳۴)

چونکہ ملائکہ کائنات کی غیر مرئی قوتیں ہیں اس لئیے ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ تم ان کے لشکروں کو دیکھ نہیں سکتے (۹/۲۶ ، ۹/۴۰)۔ باقی رہا وہ نظام جس کے مطابق ملائکہ ، انبیاء کرام کیطرف وحی لاتے تھے تو اسکے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے کیونکہ وحی کی حقیقت و ماہیت ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر کی چیز ہے - ہم اس پر ایمان لانے کے لئیے مکلف ہیں اور اسکے مطابق عمل کرنے پر مامور۔ البتہ وحی کی رو سے دئے ہوئے حقائق کی صداقت اور عظمت کو علم کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے (مزید تفصیل وحی کے عنوان میں ملیگی۔ نیز میری کتاب "ابلیس و آدم" میں جہاں ملائکہ اور وحی کے متعلق شرح و بسط سے گفتگو کی گئی ہے)۔ وحی ہی نہیں، بلکہ پورے کے پورے عالم امر میں یہ قوتیں کسطرح کام کرتی ہیں ہم اسے نہیں سمجھ سکتے - ہماری عقل کا دائرہ محسوسات تک محدود ہے۔ یعنی جو قوتیں محسوس کائنات میں کام کرتی ہیں ہم صرف ان کے متعلق تحقیق کرسکتے ہیں -

قرآن کریم نے ملائکہ پر ایمان کو "اجزائے ایمان" میں سے قرار دیا ہے (مثلاً ۲/۲۸۵)۔ یعنی ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لئیے ضروری ہے کہ وہ اللہ - کتب - رسل - آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ ملائکہ پر بھی ایمان لائے۔ سوال یہ ہے کہ ملائکہ پر ایمان کے معنی کیا ہیں ؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملائکہ کے متعلق وہ تصور رکھا جائے جو قرآن نے پیش کیا ہے اور انہیں وہی پوزیشن دی جائے جو قرآن نے ان کے لئیے متعین کی ہے - ملائکہ کے متعلق قرآن میں ہے کہ انہوں نے آدم کو سجدہ کیا - (۲/۳۴) یعنی وہ آدم کے سامنے جھک گئے - جیسا کہ آدم کے عنوان میں بتایا جا چکا ہے آدم سے مراد خود آدمی (یا نوع انسان) ہے - لہذا ملائکہ کے آدم کے سامنے جھکنے سے مراد یہ ہے کہ یہ قوتیں وہ ہیں جنہیں انسان مسخر کر سکتا ہے - انہیں انسان کے سامنے جھکا ہوا رہنا چاہئیے - کائنات کی جو قوتیں ابھی تک ہمارے علم میں نہیں آئیں ، انہیں چھوڑئیے - جو قوتیں ہمارے علم میں آچکی ہیں ان کے متعلق صحیح ایمان یہ ہوگا کہ ان سب کو انسان کے سامنے جھکنا چاہئیے - اب ظاہر ہے کہ جس قوم کے سامنے کائناتی قوتیں نہیں جھکتیں وہ قوم (قرآن کی رو سے) صف آدمیت میں شمار ہونے کے بھی قابل نہیں ، چہ جائیکہ اسے جماعت مومنین کہا جائے۔ (کیونکہ مومن کا مقام ، عام آدمیوں کے مقام سے کہیں اونچا ہے)۔

اب آپ سوچئیے کہ جس قوم کے ایمان میں یہ چیز داخل تھی کہ کائناتی قوتوں کو آدمی کے سامنے جھکنا چاہئیے ، وہ قوم اگر ان قوتوں کے سامنے جھک

ہوئی ہو (ان قوتوں کے سامنے ہی نہیں بلکہ ان قوموں کے سامنے جنہوں نے ان قوتوں کو اپنے سامنے جھکایا ہوا ہے) تو اس قوم کی پستی کی کوئی انتہا ہو سکتی ہے ؟ یاد رکھئیے ۔ ''مقام آدم ،، یہ ہے کہ کائنات کی تمام قوتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں ۔ اور مقام مومن یہ ہے کہ ان تمام قوتوں کو مسخر کرکے ان کے ماحصل کو قوانین خداوندی کے مطابق نوع انسان کی فلاح وبہبود کے لئے صرف کیا جائے ۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت ابھر کر سامنے آسکتی ہے کہ ہمیں مقام مومن تو کجا ، مقام آدم بھی نصیب نہیں ۔

ا ل ل

اَلْاِلُّ ۔ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کا کچھ احترام ہو اور اسکا کچھ حق ہوتا ہو ۔ یعنی وہ چیز واجب الاحترام ہو اور اس کا حق ادا کیا جانا ضروری ہو ۔ جیسے قرابت داری ۔ رحم ۔ پڑوس ۔ عہد ۔* ہر وہ کھلی ہوئی بات جسکا انکار نہ کیا جا سکتا ہو ۔** اس لفظ کے اصلی معنے چمکنے کے ہیں ۔* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حرکت کے ساتھ چمک کے ہیں ۔ اور آواز کے ۔ نیز اس ذریعہ یا سبب کے جس کی حفاظت کی جائے ۔ اَلْاِلُّ معاشرہ کی ایسی باتوں کو کہا جائے گا جو بالکل واضح ۔ صاف ۔ نکھری اور کھلی ہوئی ہوں ۔ جن کے ثابت کرنے کیلئے کسی دلیل یا سند کی ضرورت نہ ہو ۔ جو سب کے نزدیک مسلم اور قابل احترام ہوں ۔ پڑوسی یا قرابت دار کے ساتھ حسن سلوک ، یہہ ہر معاشرہ کی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے جسکے ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ قرآن کریم میں مخالفین (قریش) کے متعلق ہے لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً (۹/۸) ''یہ اپنی مخالفت میں اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ معاشرہ کے وہ مسلم اصول جن کا ہر شخص خیال رکھتا ہے ، تمہارے معاملہ میں یہ ان تک کا بھی خیال نہیں کرتے ۔ نہ ہی کسی حق اور حرمت کا پاس کرتے ہیں ،، ۔ ان لوگوں کی یہی روش تھی جس کیطرف اشارہ کرتے ہوئے نبی اکرم ؐ نے ان سے کہا تھا کہ لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (۴۲/۲۳) ۔ میں تم سے اپنے پیغام رسانی کا کوئی اجر نہیں مانگتا لیکن تم میری مخالفت میں اس حد تک تو نہ بڑھ جاؤ کہ جو عام رشتہ داروں کے حقوق ہوتے ہیں انہیں بھی نظر انداز کر دو! واضح رہے کہ نبی اکرم ؐ اس چیز کو بھی بطور اجر رسالت نہیں مانگتے ۔ (اجر مانگنے سے تو تمام انبیاء انکار کرتے رہے ہیں) بلکہ ان کی توجہ عام معاشرتی حقوق و واجبات کیطرف دلاتے ہیں ۔

* تاج ** راغب

اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر تم باہم (ایک دوسرے سے) صلہ رحمی اور رشتہ داری کے حقوق کا لحاظ رکھو گے تو یہی چیز میری رسالت کا اجر ہوجائے گی۔ اس لئے کہ دوسری جگہ ہے۔ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (۳۴/۴۷)۔ "میں جو اجر تم سے مانگتا ہوں وہ خود تمہاری ہی بھلائی کے لئے ہے"۔

(مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ق۔ ر۔ ب اور حرف اِلَّا)

اَلَّا ۔ [حرف]

اَلَّا ۔ (اَنْ ۔ لَا)۔ قرآن کریم میں ہے۔ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ (۲۷/۳۱) (بات یہ ہے) کہ تم میرے خلاف سرکشی نہ کرو۔ کبھی اسکے پہلے ۔ ل ۔ آجاتا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں تاکہ۔ مثلاً۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ (۲/۱۵۰)۔ تاکہ لوگوں کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل و حجت نہ رہے۔

اِلَّا [حرف]

اِلَّا ۔ اس کے معنی عام طور پر بجز ۔ علاوہ ۔ سوا ۔ مگر ۔ لیکن ۔ کے آتے ہیں۔ ذیل کی مثالوں سے مفہوم واضح ہوجائیگا۔

(۱) قَامَ الْقَوْمُ اِلَّا زَيْدًا ۔ زید کے علاوہ اور سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زید بھی قوم (لوگوں) کے اندر شامل تھا لیکن وہ کھڑا نہیں ہوا۔ قرآن کریم میں ہے۔ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (۲/۲۴۹) ان میں سے چند لوگوں کے سوا باقی سب نے پانی پی لیا۔ ایسے استثناء کو اصطلاح میں استثناء متصل کہتے ہیں۔

(۲) قَامَ الْقَوْمُ اِلَّا حِمَارًا ۔ تمام لوگ کھڑے ہوگئے لیکن گدھا نہیں کھڑا ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گدھا لوگوں میں شامل نہیں ہے۔ یعنی قَوْمٌ ۔ ایک الگ شے ہے۔ اور حِمَارٌ ۔ ایک الگ۔ یہ پہلی مثال (نمبر۱) کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن کریم میں ہے اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ (۲/۳۴) - جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کردیا لیکن ابلیس نے سجدہ نہ کیا۔ یعنی ابلیس ملائکہ

سے الگ جنس تھا ۔ وہ ملائکہ میں شامل نہیں تھا ۔ اس آیت کے یہ معنی نہیں کہ باقی ملائکہ نے تو سجدہ کر دیا مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا ۔ (ابلیس کو سجدہ کا حکم دینا قرآن کے دوسرے مقام سے ثابت ہے ۔ دیکھئے ۷/۱۲) ۔ اس قسم کے استثناء کو اصطلاح میں استثنائے منقطع کہتے ہیں ۔

اسی طرح قرآن کریم میں ہے ۔ قُلْ لَّآ أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (۴۲/۲۳)۔ ان سے کہو کہ میں اس تبلیغ کے بدلے تم سے قطعاً کوئی اجر نہیں مانگتا ۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ (یا باہمدگر، ایک دوسرے کے ساتھ) رشتہ داری کے تعلقات کا لحاظ کرو ۔ یعنی یہ چیز بھی بطور اجر کے نہیں مانگتا ۔ (اردو میں اس کا ترجمہ .... ہاں البتہ .... کیا جائے تو مفہوم واضح ہو جائیگا ۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان (ا ۔ ل ۔ ل) اور (ق ۔ ر ۔ ب)۔

اسی طرح سورۃ یونس میں ہے ۔ فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيْمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ (۱۰/۹۸) ۔ ”تو کیوں کوئی بستی ایسی نہ ہوئی (یعنی کوئی بستی ایسی نہ تھی) کہ وہ (عذاب دیکھنے کے بعد) ایمان لاتی تو اس کا ایمان اسے نفع دیتا ۔ ہاں البتہ یونس کی قوم ایسی تھی“ ۔

(۳) کبھی یہ واؤ (عاطفہ) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۔ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْءٍ ۔ (۲۷/۱۱) ہمارے حضور ہمارے رسول ڈرا نہیں کرتے ۔ اور نہ ہی (وَلَا) وہ لوگ ڈرا کرتے ہیں جو کبھی زیادتی کر بیٹھیں لیکن بعد میں اس برائی کو نیکی سے بدل لیں ۔

(۴) قرآن کریم میں ہے اِنْ كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ (۳۸/۱۴) ان تمام نے رسولوں کی تکذیب کی ۔ ان میں سے کوئی قوم بھی ایسی نہ تھی جس نے تکذیب نہ کی ہو ۔ سب کے سب نے ایسا کیا ۔ یعنی اِنْ كُلٌّ إِلَّا کے معنے ہیں ”سب کے سب“ ۔

(۵) کبھی یہ ”اگر نہیں“ (اِنْ ۔ لَا) کے معنوں میں آتا ہے ۔ مثلاً إِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ .... (۹/۴۰) اگر تم نے اس کی مدد نہ بھی کی (تو بھی کیا ہے) یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے اس کی مدد کی ۔

(۶) مفتی عبدہ، (اور ان کے شاگرد سید رشید رضا مرحوم) نے تفسیرالمنار (جلد نمبر ۱ ص ۹ ۱ ۳ - ۴ ۱ ۴) میں لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جب اِلاَّ مشیتِ خداوندی کے ساتھ آئے تو اس کے معنی ہمیشہ بالکل نفی کے ہوتے ہیں - سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى - اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (۸۷/۶) ہم تجھے (قرآن) پڑھائینگے تو تو اس میں سے کچھ نہیں بھولیگا - الا ما شاء اللہ - یعنی بالکل کچھ نہیں - یعنی خدا نے ایسا چاہا ہی نہیں - اس کی تائید (۱۷/۸۶) سے بھی ہوتی ہے جہاں کہا گیا کہ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ......

"اگر ہم چاہتے تو جو کچھ ہم نے تیری طرف وحی کیا ہے اسے لے جاتے،، اس سے ظاہر ہے کہ یہ مشیتِ خداوندی میں تھا ہی نہیں کہ قرآن میں سے کچھ غیر محفوظ رہ جاتا -

المنار میں اس قسم کی اور مثالیں بھی دی گئی ہیں - مثلاً خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ - عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (۱۱/۱۰۸) - اہل جہنم اس میں رہینگے جب تک آسمان اور زمین ہیں - اور اہل جنت اسی میں رہینگے - ان میں سے کوئی نکل کر دوسری طرف نہیں جا سکیگا - (مزید تشریح کے لئے دیکھئے عنوان (ن - س - ی) -

اَلَّذِی (اَلَّتِی) (اسم موصول)

اَلَّذِیْ - جو، جس - هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (۵۹/۲۲) اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں - اَللَّذَانِ - (مذکر - تثنیہ) یعنی دو (مذکر) کے لئے - اَلَّذِیْنَ (جمع - مذکر) اَلَّتِیْ - (واحد مونث) اَللَّاتِیْ و اَللَّائِیْ - (جمع مونث) -

یعنی :—

اَلَّذِیْ - وہ ایک (مذکر) جو

اَللَّذَانِ - وہ دو (مذکر) جو

اَلَّذِیْنَ - وہ (دو سے زیادہ مذکر) جو

اَلَّتِیْ - وہ ایک (مونث) جو

اَللَّتَانِ - وہ دو (مونث) جو

اَللَّاتِیْ - اَللَّائِیْ وہ (دو سے زیادہ مونث) جو

ا ل م

اَلَمٌ اور اَیْلَمَۃٌ۔ درد کو کہتے ہیں۔ اَلِیمٌ کے معنے درد پہنچانے والا۔ یا درد ناک۔ اَلِیْمُ الْعَذَابِ اس تکیف کو کہتے ہیں جو اپنی درد انگیزی میں انتہا تک پہنچی ہوئی ہو* صاحب محیط کے نزدیک زندگی کی ناخوشگواریوں کو اَلَمٌ کہتے ہیں۔ اس کے مقابل لَذَّۃٌ ہے**۔

اَلْوُمَۃٌ کے معنے خبثت اور کمینگی کے بھی آتے ہیں*۔

قرآن کریم میں عَذَابٌ اَلِیْمٌ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اس کے معنے غلط اعمال انسانی کے درد انگیز عواقب ہیں۔ اس دنیا میں ذلت آمیز زندگی اور تباہی۔ اور آخرت میں رسوا کن عذاب۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اگر تم نے قوانین خداوندی سے سرکشی برتی تو اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ (۱۱/۲) "تو میں تم پر ایک درد انگیز دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔ ان پر یہ عذاب سیلاب عظیم کی شکل میں آیا تھا جس سے وہ تباہ ہو گئے تھے۔ سورۃ بقرۃ میں منافقین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۲/۱۰) "ان کے لئے دردناک عذاب ہے"۔

ا ل ہ

اَلِہَ اِلَیْہِ یَاْلَہُ کے معنے ہیں گھبرا کر اس کی پناہ ڈھونڈنا۔ نیز اَلِہَ کے معنے ہیں متحیر ہونا۔ اور اَلَہَ۔ یَاْلَہُ۔ کے معنی ہیں کسی کو پناہ دینا۔ امان میں لینا۔ چنانچہ اَلِہَ بِالْمَکَانِ کے معنے ہیں امن و سکون سے کسی مکان میں سکونت اختیار کر لینا*۔ ان معانی کے اعتبار سے اِلٰہٌ کے معنے ہونگے ایسی ہستی جس سے خطرات میں پناہ حاصل کی جائے۔ جس سے مشکلات دور کرنے کی استدعا کی جائے اور جس کی عظمت و بلندی کے تصور سے انسان متحیر ہو جائے۔

بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ لفظ لَاہَ یَلِیْہُ سے مشتق ہے جسکے معنے بلند مرتبہ ہونا اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا ہیں*۔

بعض کہتے ہیں کہ اَلَہَ کے معنے ہیں وہ شخص غلام بن گیا اور اَلَّہَہٗ کے معنی ہیں اس نے اسے غلام بنا لیا۔ اس سے تَاْلِیْہٌ کے معنے تَعْبِیْدٌ (غلام بنانا) آتے ہیں۔ اور اِلٰہٌ اسی سے ہے جو در اصل بمعنی مفعول

* تاج۔ ** محیط۔

مَأْلُوْہٌ ہے** ۔ (جیسے کِتَابٌ بمعنی مَکْتُوْبٌ ہے) ۔ اس اعتبار سے اِلٰہٌ کے معنے ایسی ہستی ہونگے جس کا غلبہ و اقتدار قبول کیا جائے ۔ جس کے قانون کی اطاعت کی جائے ۔ جس کے حکم کا اتباع کیا جائے ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی تَعَبُّدٌ کے لکھے ہیں ۔ یعنی کسی کی محکومیت اختیار کرنا ۔ چنانچہ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا کہ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (۲۶/۲۹) (اگر تو نے میرے سوا کسی کو الٰہ تسلیم کیا تو میں تجھے قید کر دونگا) تو وہاں اِلٰہٌ کے معنے صاحب اقتدار ہی کے ہیں ۔ اسی طرح جہاں کہا گیا ہے اَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (۲۵/۴۳) ''کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا'' ۔ تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ وہ اپنے جذبات ہی کے پیچھے پیچھے چلتا ہے ۔ انہی کا اقتدار تسلیم کرتا ہے ۔ وہ اپنے جذبات کا بندہ بن چکا ہے ۔ اسی طرح جہاں اللہ تعالیٰ کیلئے ہے ۔ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَاءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (۴۳/۸۴) ۔ ''وہی ہے جو کائنات کی بلندیوں میں بھی اِلٰہ ہے اور پستیوں میں بھی'' ۔ (یا جو کائناتی اور معاشی دنیا میں اِلٰہ ہے) ۔ تو اس کے معنے بھی صاحب اقتدار کے ہیں ۔ یعنی کائنات میں بھی اقتدار و اختیار اسی کا ہے اور انسان کی معاشی اور معاشرتی دنیا میں بھی اسی کا ۔

چونکہ تو ہم پرستی کے زمانہ میں لوگ چاند سورج وغیرہ کو بھی بڑی بڑی قوتوں کا مالک مان کر ان کی پرستش کرتے تھے اس لئے اَلْاِلَاهَةُ کے معنی چاند ہیں اور اَلْاِلٰهَةُ کے معنی سورج ۔ اسی نہج سے ہر معبود کو اِلٰہٌ کہتے ہیں ۔ حتیٰ کہ بتوں کو بھی جن کی پرستش کی جاتی ہے (۷/۱۳۸) ۔

ایک خیال یہ ہے کہ اَللّٰہُ جامد لفظ ہے (کسی دوسرے لفظ سے نکلا نہیں) لیکن دوسرا خیال یہ ہے کہ اصل میں یہ لفظ اَلْاِلٰہُ تھا (اَلْ + اِلٰہٌ) ۔ کثرت استعمال سے اِلٰہٌ کا ہمزہ گر گیا اور پہلا لام دوسرے لام میں مدغم ہو گیا ۔ اس طرح یہ لفظ ''اَللّٰہُ'' بن گیا * ۔

قرآن کریم میں ''اَللّٰہُ'' خدا کی ذات کیلئے استعمال ہوا ہے ۔ باقی تمام اسماء (نام) اسکی صفات ہیں ۔

---

* تاج ۔ ** لین ۔

لہذا، اَللّٰہُ، (قرآنی اِنَّہٗ) وہ بلند و بالا ھستی ھے جو انسانی نگاھوں سے پوشیدہ ھے۔ جسکی عظمتوں کے سامنے انسانی عقل و ادراک متحیر رہ جاتے ھیں۔ جسکا اقتدار تمام کائنات پر چھایا ھوا ھے ۔ جسکی اطاعت نہایت ضروری ھے ۔ لیکن ھم اسکی اطاعت اسکے اس قانون کی رو سے کر سکتے ھیں جو اسنے اپنی طرف سے (بذریعہ وحی) ھمیں دیا ھے (اور جو اب قرآن کریم میں محفوظ ھے) ۔ لہذا اَطِیْعُوا اللّٰہَ کے معنے ھونگے خدا کے قانون کی اطاعت کرو۔ اسی طرح کائنات میں بھی جو کچھ ھوتا ھے سب اسی کے قانون کے ماتحت ھوتا ھے ۔ لہذا قرآن کریم میں جہاں یہ آئیگا کہ'' اللہ یوں کرتا ھے،، تو اسکا مفہوم یہ ھوگا کہ اللہ کے قانون کے مطابق اسطرح ھوتا ھے ۔عالم امر میں بھی اسی کا قانون کارفرما ھے اور عالم خلق میں بھی یہ قوانین اسنے اپنی مشیت سے بنائے ھیں اور اسی کی قدرت (کنٹرول۔ قبضہ۔اختیار) سے یہ قوانین نافذ العمل اور کارفرما ھیں ۔ یہی وہ سُنَّۃُ اللہ ھے جس میں تبدیلی نہیں ھوتی ۔ (اسکی تفصیل ش۔ی۔ء کے عنوان میں دیکھئے)

تمام قرآن، اللہ تعالیٰ کی صفات ، اس کے قوانین ، احکام، حکمت بالغہ ، ھدایات کا مجموعہ ھے ۔ اسکی ساری تعلیم کا نقطۂ ماسکہ اللہ کی وحدانیت ھے۔ یعنی اس حقیقت کا اعلان و ایمان کہ کائنات میں اقتدار و اختیار صرف اسی کا ھے۔ اس کے سوا کسی کا نہیں ۔

جہانتک اللہ تعالیٰ کی ذات کا تعلق ھے ، ھم اس کی ماھیت اور کیفیت کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے ۔ محدود (Finite) کسی لا محدود (Infinite) کا ادراک نہیں کر سکتا ۔ البتہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی جن صفات (الاسماء الحسنٰی) کا ذکر کیا ھے ھم ان سے خدا کے متعلق (اپنی محدود ذھنی کے اندر رھتے ھوئے) اندازہ کر سکتے ھیں ۔ اللہ پر وھی ایمان قرآن کریم کی رو سے صحیح ایمان ھے جو قرآن میں بیان کردہ صفات کے مطابق ھو ۔اس لئے دنیا میں جو لوگ اپنے اپنے طور پر خدا کو مانتے ھیں انہیں قرآن کی رو سے ''اللہ پر ایمان رکھنے والے،، نہیں کہا جا سکتا ۔ یہ بڑی اھم حقیقت ھے جسے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے ۔ ''خدا پرستی اور نیک عملی،، وھی درست ھے جو قرآنی تعلیم کے مطابق ھو ۔ نہ وہ جو مختلف افراد ۔ قوم یا مذھب کے اپنے اپنے تصور کے مطابق ھو۔

ا ل و (ا ل ی)

اَ لَا ۔ یَاْ لُوْ ۔ اُلُوًّا و اُلِیًّا ۔ کوتاھی کرنا ۔ تاخیر کرنا ۔ سستی کرنا ۔ باز رھنا ۔ لَا یَاْ لُوْنَکُمْ خَبَالًا (۱۱۷/۳) ۔ ''یہ لوگ تمہاری تخریب میں بالکل کوتاھی نہیں کرینگے،، ۔ اَ لَا اَلِیَّۃٌ ۔ قسم ۔ اِیْلَاءٌ ۔ باز رھنے کی

قسم ۔ عورت کے پاس نہ جانے کی قسم * ۔ لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِسَآءِ هِمْ (۲/۲۲۶) ۔ '' جو لوگ اپنی بیویوں سے باز رهنے کی قسم کھا لیتے هیں ''۔ سورۃ نور میں هے وَلَا یَاْتَلِ ...... (۲۴/۲۲) ۔ دوسروں کی مدد کرنے سے باز رهنے کی قسم نہ کھائیں ۔ اِن مقامات سے ظاهر هے کہ یہ قسم اس قسم کی هے جس سے دوسرے کو نقصان پہنچے ۔ راغب نے اسکی یہی خصوصیت بتائی هے ۔

ما اَلَوْتُهٗ ۔ میں اس کی وسعت اور طاقت نہیں رکھتا ۔ ابن الاعرابی نے کہا هے کہ اَلْوٌ اضداد میں سے هے ۔ یعنے اس کے معنے کوتاهی کرنے کے بھی هیں اور قدرت اور طاقت رکھنے کے بھی ۔ روکنے کے بھی اور عطا کرنے کے بھی ** ۔ اس لئے آلَاءٌ (جو اَلْوٌ کی جمع هے) کے معنی قدرت اور طاقت کے بھی هیں * اور عطیہ اور نعمت کے بھی ۔ قرآن کریم میں جہاں آتا هے فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۵/۱۳) تو وهاں اس کے معنے یہ بھی هیں کہ تم اپنے نشو نما دینے والے کی کس کس قدرت اور طاقت کو جھٹلاؤگے ۔ اور یہ بھی کہ تم اس کی کس کس نعمت اور عطیہ کو جھٹلاؤگے ۔ هر مقام پر معنی سیاق و سباق کی رو سے کئے جائینگے ۔ مزید برآں دیکھئے تتمہ صلا۱۸ جلد چہارم ۔

نوٹ ۔ آلَاءٌ کا واحد اَلْوٌ تاج العروس کے علاوہ اور کہیں نہیں ملا ۔ دیگر کتب لغت و تفاسیر میں اس کا واحد اِلًی ۔ اَلًی اور اِلْیٌ آیا هے ۔ البتہ اس کے معنی نعمت اور قدرت دونوں آتے هیں ۔

الٰی (حرف)

اِلیٰ ۔ تک ۔ کی طرف ۔ یہ زمان (وقت) کے لئے بھی آتا هے ۔ اور مکان (جگہ) کے لئے بھی ۔ جیسے ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ (۲/۱۸۷) پھر تم رات تک روزہ پورا کرو ۔ اور مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا (۱۷/۱) مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک ۔

اس مقام پر ایک بات قابل غور هے ۔ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ میں اِلَی الَّیْلِ کے معنی هیں آغاز شب تک ۔ یعنی جب دن ختم هوکر رات شروع هو جائے ۔ اس میں لَیْل (رات) شامل نہیں ۔ یعنی یہ مراد نہیں کہ ختم شب تک روزہ رکھو ۔ لیکن وضو کے احکام میں هے فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ (۵/۶) ۔ اپنے چہروں اور کہنیوں تک هاتھ دھو لیا کرو ۔ اس میں (اِلَی الْمَرَافِقِ) سے مراد هے کہنیوں سمیت ۔ یعنی اَلْمَرَافِق اس کے اندر داخل هیں ۔ لہذا اِلیٰ (بمعنی تک) کے استعمال کا یہ فرق ملحوظ رکھنا چاهئے ۔

---

* تاج و محیط ۔ ** محیط ۔

(۲) مَعَ - (ساتھ) کے معنوں میں بھی آتا ہے - جیسے وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ (۲/۴) - اور ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ -

(۳) ان معنوں میں بھی جن میں ہم اپنے ہاں کہتے ہیں - "میرے نزدیک"، یا "میرے لئے"، - جیسے رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ (۳۳/۱۲) - اے میرے پروردگار! میرے نزدیک قید خانہ اس سے کہیں بہتر ہے (جس کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں) -

(۴) ان معنوں میں جن میں ہم کہتے ہیں "اس کے لئے"، جیسے وَالْاَمْرُ اِلَیْكِ (۳۳/۲۷) اور معاملہ کا آخری فیصلہ تیرے لئے ہے - یعنی تجھے ہی آخری فیصلہ کرنا ہے -

(۵) بعض اوقات یہ عَلٰی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے (جس کا مطلب ہوتا ہے کسی کے خلاف کوئی بات کرنا - جیسے وَقَضَیْنَا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (۴/۱۷) - اور ہم نے بنی اسرائیل کے خلاف یہ فیصلہ کر دیا تھا - لیکن اس آیت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے بنی اسرائیل کو اس کی خبر دے دی تھی - اس صورت میں اس جگہ اِلٰی بمعنی عَلٰی نہیں ہوگا - بلکہ اس کے معنی "کی طرف"، ہونگے - ان معنوں میں یہ حرف عام طور پر استعمال ہوتا ہے -

(۶) بعض اوقات یہ - فی (میں) کے معنوں میں بھی آتا ہے - جیسے لَیَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ (۸۷/۴ ; ۱۲/۶) وہ تمہیں یوم القیامۃ میں اکٹھا کریگا -

(۷) بعض اوقات یہ مِنْ (سے) کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے - (لیکن قرآن کریم سے اس کی کوئی مثال ہمارے سامنے نہیں) -

الیاس علیہ السلام

قرآن کریم نے آپ کا تذکرہ بہ سلسلہ انبیائے کرام کیا ہے (۸۵/۶) - اور خصوصیت سے کہا ہے کہ اِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۱۲۳/۳۷) "یقیناً الیاسؑ رسولوں میں سے تھا" - اسی سورت میں آپ کو اِلْ یَاسِیْنَ بھی کہا گیا ہے (۱۳۰/۳۷) - اور یہ بتایا گیا ہے کہ جس قوم کیطرف آپ مبعوث ہوئے تھے وہ بَعْل کی پرستش کرتی تھی (۱۲۵/۳۷) - قیاس یہ ہے کہ آپ وہی پیغمبر ہیں جن کا نام تورات میں ایلیا نبی آیا ہے - بعض کا خیال ہے کہ حضرت ادریسؑ کا

دوسرا نام الیاس ہے۔ لیکن (جیسا کہ عنوان ادریس میں کہا گیا ہے) اگر حضرت ادریس ، حضرت نوح کے اجداد میں سے تھے تو آپ حضرت الیاس نہیں ہوسکتے۔ اسلئے کہ آیت (٦/٨٥) میں حضرت الیاس کو حضرت نوح (یا حضرت ابراهیم) کی ذریت میں سے بتایا گیا ہے۔ آپ غالباً انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے۔

اِلْ یَاسِیْن

حضرت الیاس کا دوسرا نام ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ''الیاس''۔ قرآن کریم میں آپ کا یہ نام (٣٧/١٣٠) میں آیا ہے۔

اَلْیَسَعْ

یہ وهی نبی هیں جنہیں تورات میں (Elisha) کہا گیا ہے۔ قرآن کریم نے زمرہ انبیائے کرام میں ان کا ذکر کرنے کے بعد (٦/٨٧) کہا ہے کہ ان سب کو کتاب دی گئی تھی (٦/٩٠)۔ نیز ان کا نام (٣٨/٤٩) میں آیا ہے۔ تفصیلی تعارف قرآن کریم نے نہیں کرایا۔

اَمْ۔ (حرف)۔

اَمْ۔ یا۔ حسب ذیل مثالوں سے اس کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔

(١) ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ (٧٩/٢٧) کیا پیدائش میں تم زیادہ سخت ہو یا آسمانی کُرے؟

(٢) سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (٢/٦) ان کے لئے برابر ہے خواہ تم انہیں آگاہ کرو یا نہ کرو۔

(٣) قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ (١٣/١٦) ان سے پوچھو کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوسکتے ہیں یا (بلکہ یہ کہ) کیا اندھیرا اور روشنی برابر ہوسکتے ہیں؟

(٤) بعض اوقات یہ زائد بھی ہوتا ہے۔ مثلاً اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ .... (٤٣/٥٢) میں اس سے بہتر ہوں۔ لیکن اسکے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں۔ ''یا (کیا) میں اس سے بہتر نہیں ہوں''۔ اس صورت میں اَمْ زائد نہیں ہوگا۔

علم محسوسات کی دنیا تک محدود ہے اور یہ امور' عالم محسوسات سے آگے کی باتیں ہیں - مشہور مفکر (Pringle Pattison) کہتا ہے کہ یہ انگریزی زبان کی کوتاہ دامنی ہے جس میں تخلیق کے لئے صرف ایک لفظ (Creation) ہے - حالانکہ محسوس کائنات کی تخلیق اور غیر مرئی وغیر محسوس کی تخلیق میں جو اہم فرق ہے اس کے اظہار کے لئے ضروری تھا کہ دو الگ الگ الفاظ ہوتے* قرآن نے اس کے لئے خلق اور امر الگ الگ الفاظ استعمال کئے ہیں -

امر کا دوسرا حصہ ' جس سے مفہوم وہ قانون خداوندی ہے جو کائنات کے رگ و پے میں کارفرما ہے ' ہمارے سامنے ہے اور اسکے متعلق ہم علم حاصل کر سکتے ہیں - لیکن وہ بھی صرف اس حد تک کہ فلاں چیز کس قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے - وہ قانون ایسا کیوں ہے ؟ اسکے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے - مثلاً ہم جانتے ہیں کہ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے - یہ اسکا قانون ہے - لیکن پانی کو کیوں ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے ؟ اسکے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے - اَمْر (یعنی قانون کائنات) کی شہادتوں سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے - وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرَاتٍ بِاَمْرِهٖ (۷/۵۴) سورج - چاند - ستارے - خدا کے امر (قانون) کی زنجیر سے جکڑے ہوئے ہیں - وَالْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ (۲۲/۶۵) کشتی سمندر میں اس کے امر (قانون) کے مطابق چلتی ہے - آیت (۳۲/۱۲) میں اِذْن اور اَمْر مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں - (اذن کے معنے بھی قانون خداوندی ہیں - دیکھئے عنوان اذن)

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جسطرح طبیعی کائنات (Physical World) میں تمام اشیاء ایک خاص قانون کے تحت سرگرم عمل رہتی ہیں اور ہر نتیجہ اس قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے ' اسی طرح انسانوں کی تمدنی دنیا میں بھی (اقوام کا) عروج و زوال اور زندگی اور ہلاکت ایک خاص قانون کے مطابق واقع ہوتے ہیں - یہ مکافاتِ عمل کا قانون ہے اور اسے بھی اَمْر ہی کہا گیا ہے - لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) - "(یہ سب اسلئے ہے کہ) خدا کا امر پورا ہو کر رہے - یعنی جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل و برھان کی رو سے ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے" وہ بھی دلیل و برھان کے مطابق زندہ رہے" یہ اَمْر (قانون مکافات عمل) وہ ہے جس کی نتیجہ خیزی میں کسی انسان کو

* خطبات اقبال . Reconstruction of Religious Thoughts in Islam. p. 97.

ا م ر

آلاَمَرَةُ والتَّامُوْرُ - چھوٹے پتھروں سے بنایا ہوا نشان جو صحراء میں بنا دیا جاتا ہے تاکہ اس سے علاقہ کے حدود یا راستہ کا پتہ لگ سکے؛ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معانی میں '' نشان ،، کو شامل کیا ہے ۔ لہذا اس کے بنیادی معنے ہیں علامت - نشان - راہ نمائی - یہیں سے اس کے معنے مشورہ کرنے کے آتے ہیں - آلاِئْتِمَارُ کے معنے ہیں مشورہ کرنا* - چنانچہ سورۃ اعراف میں ہے کہ فرعون نے اپنے سرداروں سے حضرت موسیٰؑ کے معاملہ کے متعلق گفتگو کی اور ان سے کہا کہ فَمَاذَا تَأْمُرُوْنَ (۷/۱۱۰ ; ۲۶/۳۵) '' سو تم کیا مشورہ دیتے ہو (نیز دیکھئے ۴۰/۲۹) - اسی طرح سورۃ قصص میں ہے کہ شہر کے دوسری طرف سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ اِنَّ الْمَلَاَ يَأْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ (۲۸/۲۰) '' سرداران قوم تیرے بارے میں باہمی مشورے کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیا جائے ،، لیکن تاج العروس میں ہے کہ یہاں اس کے معنی عزم اور ارادہ کر لینے کے ہیں - مُؤْتَمَرٌ اسی سے اسم ظرف بصیغہ اسم مفعول ہے - مشورہ گاہ - آجکل یہ لفظ کانفرنس کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے - آمِيْرٌ - اس شخص کو کہتے ہیں جس سے مشورہ لیا جائے - نیز اندھے کی راہ نمائی کرنے والے کو بھی کہتے ہیں* -

اَمِرَ کے معنی ہیں کسی چیز کا بہت زیادہ ہو جانا* - اَمِرَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں اس شخص کے جانور بکثرت ہو گئے - آلاَمِرُ - برکتہ والا آدمی - ان معانی کے اعتبار سے ، فراء نے کہا ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں جہاں آیا ہے آمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا (۱۷/۱٦) تو اس کے معنے ہیں '' ہم مترفین کو کثرت سے مال و دولت دے دیتے ہیں* ،، - مزید برآں دیکھئے ص۱۸۱۱ جلد چہارم۔

اَمْرٌ کے معنی حکم کے بھی ہیں اور حالت - معاملہ - کام یا بات کے بھی - (ابن فارس) - جب اس کے معنے حکم کے ہوں تو اس کی جمع اَوَامِرُ آتی ہے (اوامر و نواهی - جہاں امر ، نہی کی ضد ہے) اور جب اس کے معنے معاملہ - حادثہ - یا واقعہ یا حالت کے ہوں تو اس کی جمع اُمُوْرٌ آتی ہے - لیکن قرآن کریم میں اَوَامِر کا لفظ نہیں آیا -

* تاج -

ان معنوں کی رو سے اَلْاَمِیْرُ حاکم کو کہتے ہیں ۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ (۵۸/۴) کے معنی ہیں اللہ تمہیں حکم دیتا ہے ۔ عَلٰی اَمْرٍ جَامِعٍ (۶۲/۲۴) کے معنی ہیں اجتماعی معاملہ ۔ اَلْاِمْرَۃُ کے معنے ہیں حکومت* ۔ اِمَارَۃٌ کے بھی یہی معنی ہیں* ۔ اَمْرٌ عَظِیْمٌ کے معنے ہیں حادثۂ عظیم* ۔ اَوْ یَاْتِیَ اَمْرُ رَبِّکَ (۱۶/۳۳) کے معنے ہیں فیصلہ کن مرحلہ ۔ اِمْرًا ۔ سخت نا پسندیدہ بات (۱۸/۷۱) ۔ اَلْاَمَّارَۃُ کے معنی ہیں بہت حکم دینے والا ۔ برانگیختہ کرنیوالا (۱۲/۵۳) ۔ رائے ، مرضی اور خواہش کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے ۔ وَمَا فَعَلْتُہٗ عَنْ اَمْرِیْ (۱۸/۸۲) ۔ " میں نے اسے اپنی مرضی سے نہیں کیا " ۔

قرآن کریم میں خَلْقٌ کے مقابلہ میں اَمْرٌ کا لفظ آیا ہے (۷/۵۴) ۔ اور اس کا ایک خاص مفہوم ہے جس کے سمجھنے کے لئے اس لفظ کے بنیادی معانی کو سامنے رکھنا ضروری ہے ۔ یعنی علامت ۔ اشارہ ۔ راہ نمائی ۔ نیز ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نشو و نما کے بھی ہیں ۔ اور (جیسا کہ عنوان ۔ خ ۔ ل ۔ ق ۔ میں لکھا گیا ہے) خَلْقٌ کے معنی ہیں مختلف عناصر میں نئی نئی تراکیب سے نئی نئی چیزوں کو پیدا کرنا ۔ خَلْقٌ پیدائش کا یہ وہ مرحلہ ہے جب اشیاء بالعموم اپنی محسوس شکل میں ہمارے سامنے آ جاتی ہیں ۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان اشیاء کے اس طرح وجود میں آنے سے پہلے بھی ایک مرحلہ ہوتا ہے جب یہ ہنوز تدبیری حالت (In the Process of Becoming) میں ہوتی ہیں ۔ " یہ تدبیری مرحلہ " عَالَمِ امر سے متعلق ہے ۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی قابل غور ہے ۔ کائنات میں ایک تو اشیائے کائنات ہیں (مثلاً سورج ۔ چاند ۔ ستارے ۔ زمین ۔ درخت وغیرہ) اور دوسرے وہ قانون ہے جس کے مطابق یہ تمام اشیائے کائنات ایک نظم و ضبط کے ساتھ سرگرم عمل ہیں ۔ اس قانون کو بھی اَمْرٌ کہتے ہیں (اس کا تفصیلی تعارف مشیت کے ضمن میں عنوان ۔ ش ۔ ی ۔ ء ۔ کے ماتحت ملیگا) ۔

اشیا کی " تدبیری حالت " کے متعلق قرآن کریم میں ہے اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (۲/۱۱۷) " جب وہ ایک تدبیر (امر) کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس امر سے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے " ۔ یہ امر کیا ہوتا ہے اور وہ کسطرح متشکل ہوتا ہے اسکے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے ۔ ہمارا

* تاج و محیط ۔ ** محیط ۔

علم محسوسات کی دنیا تک محدود ہے اور یہ امور' عالم محسوسات سے آگے کی باتیں ہیں۔ مشہور مفکر (Pringle Pattison) کہتا ہے کہ یہ انگریزی زبان کی کوتاہ دامنی ہے جس میں تخلیق کے لئے صرف ایک لفظ (Creation) ہے۔ حالانکہ محسوس کائنات کی تخلیق اور غیر مرئی وغیر محسوس کی تخلیق میں جو اہم فرق ہے اس کے اظہار کے لئے ضروری تھا کہ دو الگ الگ الفاظ ہوتے* قرآن نے اس کے لئے خلق اور امر الگ الگ الفاظ استعمال کئے ہیں۔

امر کا دوسرا حصہ' جس سے مفہوم وہ قانون خداوندی ہے جو کائنات کے رگ و پے میں کارفرما ہے' ہمارے سامنے ہے اور اسکے متعلق ہم علم حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ بھی صرف اس حد تک کہ فلاں چیز کس قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ وہ قانون ایسا کیوں ہے؟ اسکے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے۔ یہ اسکا قانون ہے۔ لیکن پانی کو کیوں ایسا بنایا گیا ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے؟ اسکے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اَمْرٌ (یعنی قانون کائنات) کی شہادتوں سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِہٖ (۷/۵۴) سورج۔ چاند۔ ستارے۔ خدا کے امر (قانون) کی زنجیر سے جکڑے ہوئے ہیں۔ وَالْفُلْکَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِہٖ (۲۲/۶۵) کشتی سمندر میں اس کے امر (قانون) کے مطابق چلتی ہے۔ آیت (۴۳/۱۲) میں اِذْنٌ اور اَمْرٌ مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ (اذن کے معنے بھی قانون خداوندی ہیں۔ دیکھئے عنوان اذن)

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جسطرح طبیعی کائنات (Physical World) میں تمام اشیاء ایک خاص قانون کے تحت سرگرم عمل رہتی ہیں اور ہر نتیجہ اس قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے' اسی طرح انسانوں کی تمدنی دنیا میں بھی (اقوام کا) عروج و زوال اور زندگی اور ہلاکت ایک خاص قانون کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔ یہ مکافات عمل کا قانون ہے اور اسے بھی اَمْرٌ ہی کہا گیا ہے۔ لِیَقْضِیَ اللّٰہُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا ۔ لِیَھْلِکَ مَنْ ھَلَکَ عَنْ بَیِّنَۃٍ وَیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْ بَیِّنَۃٍ (۸/۴۲)۔ "(یہ سب اسلئے ہے کہ) خدا کا امر پورا ہو کر رہے۔ یعنی جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل و برھان کی رو سے ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے' وہ بھی دلیل و برھان کے مطابق زندہ رہے" یہ اَمْرٌ (قانون مکافات عمل) وہ ہے جس کی نتیجہ خیزی میں کسی انسان کو

* خطبات اقبال . Reconstruction of Religious Thoughts in Islam. p. 97.

کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کوئی انسان اس میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کر سکتا۔ حتی کہ رسول بھی نہیں۔ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ* (۳/۱۲۷) '' اے رسول تجھے اس قانون میں کوئی دخل نہیں ''۔ یہ امر (قانون) جس کا تعلق انسانی اعمال سے ہے وحی کے ذریعے (رسولوں) کو ملتا ہے اور انکی وساطت سے دوسرے انسانوں کو۔ وَآتَيْنَاهُمْ بَيِّنَاتٍ مِنَ الْأَمْرِ (۴۵/۱۷) اور ''ہم نے انہیں امر کی واضح باتیں دیں''۔ یا، ذَالِكَ أَمْرُ اللَّهِ أَنْزَلَهُ إِلَيْكُمْ (۶۵/۵)۔ ''یہ خدا کا امر (قانون) ہے جسے اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے''۔

لہذا خدا کے امر کے تین گوشے ہیں۔ ایک وہ جہاں ہر قانون متعین ہوتا ہے اور ہر تدبیر بنائی جاتی ہے۔ اس گوشے کی حقیقت و کیفیت کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔ دوسرا گوشہ وہ ہے جہاں خدا کا امر، قانونِ کائنات کی شکل میں کارفرما ہے۔ یہ قانون ہر شے کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔ اس کا علم تجربہ، عقل، بصیرت اور مشاہدات کی رو سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور تیسرا گوشہ وہ ہے جہاں خدا کا قانون انسانوں کی دنیا سے متعلق ہے۔ یہ قانون وحی کی رو سے رسولوں کو ملتا ہے اور رسولوں کی وساطت سے دوسرے انسانوں کو۔ یہ قانون قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جس کے مطابق قوموں کی موت اور زندگی کے فیصلے ہوتے ہیں اور ہر انسان' زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ گوشہء اول میں خدا اپنے ارادے اور مشیت کے مطابق جسطرح کا قانون چاہتا ہے مرتب کرتا ہے۔ گوشہء دوم میں خدا اپنی اسکیم کو اپنے مرتب فرمودہ قوانین کے مطابق چلاتا ہے اور اشیائے کائنات اس قانون کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ گوشہء سوم میں خدا کا قانون وحی کے ذریعے ملتا ہے لیکن انسانوں کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو اس کی اطاعت کریں اور جی چاہے تو اس سے سرکشی اختیار کرلیں۔ جس قسم کی روش انسان اختیار کرے گا اسی کے مطابق نتائج اس کے سامنے آ جائیں گے۔ خدا کا امر (قانون) خارجی کائنات سے متعلق ہو یا انسانی زندگی سے، اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ یہ بھی خدا کا فیصلہ ہے۔

ا م س

اَمْسِ۔ اور اَلْأَمْسِ (عام طور پر سین کی زیر سے آتا ہے لیکن کبھی پیش سے بھی آ جاتا ہے)۔ گذشتہ کل کا دن *۔ سورہء قصص کی آیات فَإِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهُ بِالْأَمْسِ (۲۸/۱۸) میں یہ لفظ انہیں معنوں میں آیا ہے۔ ''یعنی

* تاج۔

جس شخص نے کل اس سے مدد مانگی تھی،، ۔ لیکن جسطرح ہم کہتے ہیں کہ ''جو لوگ کل تک یہ دعائیں مانگتے تھے کہ ....'' تو اس سے مراد گذشتہ کل کا دن نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ کچھ دن پہلے تک ۔ یا کچھ دنوں پہلے سے اَلْاَمْسِ کا لفظ اس مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ چنانچہ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے وَ اَصْبَحَ الَّذِیْنَ تَمَنَّوْا مَکَانَہٗ بِالْاَمْسِ (۲۸/۸۲) جو لوگ ابھی کل تک اسکی آرزو کرتے تھے کہ ہمیں وہ پوزیشن حاصل ہو جائے جو (قارون) کو حاصل ہے ۔

ا م ل

اَلْاَمَلُ ۔ امید یا توقع ۔ عام طور پر اس لفظ کا استعمال ایسی چیزوں کی توقع کے لئے آتا ہے جن کا حاصل کرنا مستبعد ہو ۔ چنانچہ جو شخص دور دراز سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو وہ اَمَلْتُ کہتا ہے ۔ لیکن اگر وہ شہر قریب ہو اور وہاں جانا آسان ہو تو وہ طَمِعْتُ کہیگا ۔ اس سے اَمَلٌ اور طَمَعٌ کا فرق ظاہر ہے ۔ رَجَاءٌ کا لفظ ان دونوں کے بین بین بولا جاتا ہے* ۔ اَلْاَمِیْلُ ۔ ریت کا پہاڑ جو ایک دن کی مسافت کا ہو ۔ یا لمبائی میں کئی دن کی مسافت کا ہو ۔ تَاَمَّلَ الرَّجُلُ ۔ کسی معاملہ میں ٹھہرنا ۔ سوچنا اور انتظار کرنا ۔* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی انتظار کے ہوتے ہیں ۔ نیز جم کر غور کرنا ۔ اور ٹھہرنا ۔ امید رکھنا لیکن اس میں دیر تک کا پہلو ضرور شامل ہوتا ہے ۔ سورۃ حجر میں ہے کہ وَیُلْهِهِمُ الْاَمَلُ (۱۵/۳) ۔ ان کی لمبی چوڑی آرزو انہیں زندگی کے حقیقی مقصد سے غافل کئے رکھتی ہے ۔

ا م م

اُمٌّ ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ یہ لفظ جامد ہے اور بچہ کی اس آواز سے ماخوذ ہے جب وہ بولنا سیکھنے سے پہلے اُم ۔ اُم ۔ وغیرہ شروع کرتا ہے* ۔ اس سے اس کے اولین معنی والدہ (ماں) کے ہو گئے ۔ بعض لوگ اُمٌّ کو اُمَّةٌ بھی کہدیتے ہیں اور بعض اس لفظ کو اُمْهَةٌ بھی کہدیتے ہیں جس کی جمع اُمَّهَاتٌ آتی ہے ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اُمَّهَاتٌ ذوی العقول کے لئے آتا ہے اور اُمَّاتٌ غیر ذوی العقول کیلئے ۔

ماں کی آغوش کے اعتبار سے انسان کے مسکن کو اُمٌّ کہتے ہیں ۔ قوم اور جماعت کو بھی اُمَّةٌ کہتے ہیں ۔ بالخصوص ہم مسلک اور ہم

---

* محیط ۔ ** تاج

مشرب گروہ کو۔ چنانچہ سورۃ بقرہ میں مختلف انبیائے کرام* کے تذکرہ کے بعد ہے تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ (۲/۱۳۴)۔ '' یہ ایک اُمت تھی جو گذر چکی '' دوسری جگہ انہی کے متعلق ہے اِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲۱/۹۲) '' یقیناً یہ تمہاری اُمت، امتِ واحدہ ہے ''۔ نیز اس کے معنے ہر شے کی اصل اور بنیاد کے ہیں۔ اُمُّ الْقَوْمِ۔ قوم کا رئیس۔ اُمُّ النُّجُوْمِ۔ کہکشاں۔ اُمُّ الرَّاْسِ۔ دماغ۔ نیز ہر وہ مرکز جہاں بہت سی چیزیں آ کر مل جاتی ہوں اُمّ کہلاتا ہے۔ جیسے اُمُّ الْقُرٰی مکہ معظمہ کو کہتے ہیں۔ اُمُّ الْكِتَابِ۔ قانون کی اصل و بنیاد**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چار ہیں۔ (۱) بنیاد اور اصل (۲) مرجع (۳) جماعت (۴) دین۔

اَلْاُمَّةُ۔ حالت۔ نعمت۔ شان۔ طریقہ۔ سنت۔ وقت۔ زمانہ۔ مدت۔ شریعت اور دین (مدت کے معنوں میں یہ لفظ ۱۲/۴۵ میں آیا ہے)۔ نیز اس کے معنے اِمَام اور ہادی کے بھی ہیں۔ جیسے (ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ) اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا (۱۶/۱۲۰) میں اس کے معنے امام کے ہیں۔ اگرچہ اس کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ حضرت ابراہیم* گو ایک فرد تھے لیکن اپنی شخصیت کی جامعیت کے اعتبار سے ایسے تھے کہ ایک پوری کی پوری امت ان کے اندر سموئی ہوئی تھی۔ ابن قتیبہ نے بھی اُمَّةٌ کے معنی دین۔ امام اور جماعت کے لکھے ہیں***۔ لطائف اللغۃ میں اس کے معنی دئے گئے ہیں۔ '' ایسا آدمی جس میں تمام خوبیاں جمع ہوں۔ نیز امام ''۔ مزید برآں دیکھئے تتمہ صفحہ ۱۸۱۲ جلد چہارم۔

(۴) اَلْاِمَامَةُ۔ آگے ہونا۔ اِمَامٌ وہ شخص جو آگے ہو۔ یہ دراصل اس دھاگے کو کہتے ہیں جس سے معمار دیکھتے ہیں کہ دیوار کی تمام اینٹیں ایک سیدہ میں آ رہی ہیں یا نہیں۔ (عربی میں اس آلے کو فَادِن اور ہمارے ہاں ساھل کہتے ہیں۔ اس سے اِمَام کا صحیح تصور سامنے آ سکتا ہے) نیز وسیع راستہ کو بھی اِمَام کہتے ہیں (۱۵/۷۹)۔

(۵) اَمَامٌ۔ آگے۔ سامنے۔ مستقبل۔ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ (۷۵/۵)۔

اَمَّهٗ۔ يَؤُمُّهٗ۔ اَمًّا۔ قصد و ارادہ کرنا۔ آمِّيْنَ (۵/۲) قصد و ارادہ کرنے والے۔ قرآن کریم میں ا م م (اور اسکے مشتقات) ان تمام معانی میں آئے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ انکی مثالوں کی ضرورت نہیں۔

* محیط۔ ** تاج۔ *** القرطین۔ ج ۲ صفحہ ۳۳۔

اَلْاُمِّیُّ ایک ایسا لفظ ہے جس کا صحیح مفہوم سمجھ لینے کی ضرورت ہے ۔ اسکے بنیادی معنے ہیں ایسا شخص جو اپنی پیدائشی حالت پر ہو (جیسا ماں نے جنا تھا ویسا ہی رہے ۔ اسے مادرزاد بھی کہتے ہیں ۔) اور لکھنا پڑھنا نہ سیکھے** ۔ نبی اکرمؐ کو اسی اعتبار سے اُمّیؐ کہا جاتا ہے کہ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے ۔ لیکن یہ چیز زمانہ قبل از نبوت کی بات ہے ۔ نبوت کے بعد آپ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا ۔ اسکی واضح شہادت خود قرآن کریم میں موجود ہے ۔ سورۃ عنکبوت میں ہے وَ مَاكُنْتَ تَتْلُوْ مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (۲۹/۴۸) ”تو اس (قرآن کے نزول) سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتا تھا“۔ اس سے ظاہر ہے کہ نزول قرآن سے پہلے آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے لیکن نزول قرآن کے بعد یہ کیفیت نہیں رہی تھی ۔ اسی لئے قرآن نے مِنْ قَبْلِهٖ کی تخصیص کر دی ۔

لیکن قرآن کریم میں خود عربوں کو بھی اُمّیّٖن کہا گیا ہے ۔ اسکا مطلب ہے وہ لوگ جنہیں قرآن سے پہلے کوئی کتاب نہیں دی گئی تھی ۔ اس لئے کہ یہ لفظ اَهْلُ كِتَابٍ کے مقابلہ میں آیا ہے (دیکھئے ۳/۱۹ و ۳/۷۴) ۔ عرب میں یہود و نصاریٰ اہل کتاب کہلاتے تھے، اور وہ لوگ جو کوئی آسمانی کتاب رکھنے کے مدعی نہیں تھے ان کے مقابلہ میں ”غیر اہل کتاب“ یعنی اُمّیّٖن کہلاتے تھے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل ان پڑھ تھے ۔ یہ وہاں کی اصطلاح تھی جس سے ”اہل کتاب“ ان لوگوں کو اپنے سے الگ کرکے پکارتے تھے ۔* لہذا قرآن میں بعض مقامات پر اُمّیّٖن کے معنے ان پڑھ ہیں اور بعض مقامات پر اس سے مراد وہ اہل عرب ہیں جو کوئی آسمانی کتاب رکھنے کے مدعی نہیں تھے ۔

نیز اُمّی کے معنی اُمُّ الْقُرٰی (مکہ) کا باشندہ بھی ہیں جیسے حضرمی ۔ حضرموت کے رہنے والے کو کہتے ہیں ۔

(نوٹ ۔ اَمَّا حرف ہے جسے الگ لکھا گیا ہے ۔)

---

* واضح رہے کہ قرآن نے خود مسلمانوں کو (جنہیں قرآن کی کتاب دی گئی ہے) الذین اوتوا الکتاب کہکر پکارا ہے (۲/۱۲۱) لیکن صرف انہی کو جو اس کتاب کا صحیح علم رکھتے ہیں ۔

** (لطائف اللغۃ)

أَمَّا (حرف) -

اَمّا - یہ عام طور پر ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن معنوں میں ہم کہتے ہیں ''باقی رہا یہ کہ ....'' - یا ''جہانتک اس بات کا تعلق ہے'' - مثلاً -

(۱) فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ .... (۲/۲۶) - جہانتک ان لوگوں کا تعلق ہے جو ایمان لائے سو وہ جانتے ہیں کہ .... (یا) اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی (۸۰/۵) باقی رہا وہ جو اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے تو .... (یا) جہانتک اسکا تعلق ہے .... (یا) اَمَّا السَّفِیْنَةُ .... (۱۸/۷۹) جہانتک کشتی کا تعلق ہے .... وَاَمَّا الْغُلٰمُ .... (۱۸/۸۰) باقی رہا وہ لڑکا ....

(۲) بعض اوقات اَمّا مرکب ہوتا ہے اَمْ + مَا، کا - اوراس کے معنی ہوتے ہیں ''یا وہ چیز جو'' - یہ وہی اَمْ ہے جو استفہامی ہمزہ (ءَ) کے بعد آتا ہے - مثلاً سورۃ انعام میں ہے - قُلْ ءٰٓالذَّکَرَیْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَیْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِ (۶/۱۴۴) ان سے کہو کہ کیا دونوں نر حرام کئے ہیں یا دونوں مادہ - یا وہ جو دونوں کے رحم میں ہے -

ا م ن

اَمْنٌ - بے خوفی - اطمینان - خوف سے محفوظ ہونے کی حالت -* سورۂ بقرہ میں ہے فَاِذَآ اَمِنْتُمْ (۲/۲۳۹) ''جب تم امن میں ہو جاؤ'' - سورۃ انعام میں ہے - فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ (۶/۸۲) - ''سو دونوں گروہوں میں سے کونسا گروہ امن کا زیادہ حقدار ہے -'' ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) خیانت کی ضد - (۲) اطمینانِ قلب اور (۳) تصدیق کرنے کے ہیں -

اَمَنَ - کسی کو بےفکر اور مطمئن کردینا - دوسرے کو امن دیدینا - اسکی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر پر لے لینا -*

---

* تاج -

اِئْتِمَانٌ - کسی پر بھروسہ اور اعتماد کرنا - کسی کو امانت دار اور محافظ سمجھنا - *

نَاقَۃٌ اَمُوْنٌ - اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو قُویٰ اور عادات کے اعتبار سے قابلِ اعتماد ہو - جس کے متعلق یہ اطمینان ہو کہ وہ پیہم سفر سے کمزور نہیں ہو جائیگی اور راستے میں ٹھوکر کھا کر گر نہیں پڑیگی - *

مُؤْمِنٌ - امن کی ضمانت دینے والا - جس پر بھروسہ کرکے انسان بے فکر اور محفوظ ہو جائے - امنِ عالم کا ضامن - *

اَمَانَۃٌ - وہ چیز جو کسی کے بھروسہ پر دے دی جائے - ** (حمل امانت کے معنی امانت میں خیانت کرنا ہیں - اس کے لئے عنوان ح-م-ل دیکھئے) -

اَمِیْنٌ - بے خوف - مطمئن - جسے قابل اعتماد سمجھا جائے - جو کسی کو قابل اعتماد سمجھے - جس پر بھروسہ کیا جا سکے - * بَلَدٌ اَمِیْنٌ ($\frac{95}{3}$) - جس شہر میں امن و حفاظت ہو - مُقَامٌ اَمِیْنٌ - ($\frac{44}{51}$) جس مقام میں پورا پورا اطمینان اور سامانِ حفاظت ہو - *** اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ($\frac{26}{162}$) "میں تمہارے لئے رسول امین ہوں -"

سورۃ نحل میں امن و اطمینان کے معنی حفاظت اور سامانِ زندگی کی فراوانی کے آئے ہیں - ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا قَرْیَۃً کَانَتْ اٰمِنَۃً مُّطْمَئِنَّۃً یَّاْتِیْھَا رِزْقُھَا رَغَدًا .... فَاَذَاقَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ ($\frac{16}{112}$) "اللہ ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے - وہ امن و اطمینان کی حالت میں تھی - اس میں سامانِ زیست ہر جگہ سے بافراغت آتا تھا - پھر اس نے اللہ کی نعمتوں کی نا قدری کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا" - سورۃ حجر میں ہے - وَکَانُوْا یَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا اٰمِنِیْنَ ($\frac{15}{82}$) - "وہ حفاظت کی غرض سے پہاڑوں کو تراش کر مکان بنایا کرتے تھے" - سورۃ آلِ عمران میں امن بمقابلہ غم آیا ہے - ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَۃً ($\frac{3}{153}$) - "پھر اس نے تم پر غم کے بعد امن نازل کیا" -

قرآن میں یہ سادہ اعتماد اور بھروسہ کے معنوں میں متعدد مقامات میں استعمال ہوا ہے - مثلاً سورۃ بقرہ میں لین دین کے معاملات کے ضمن میں ہے فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُکُمْ بَعْضًا ($\frac{2}{283}$) - "اگر تم میں سے ایک دوسرے پر اعتماد کرے" - سورۃ یوسف میں ہے - لَا تَاْمَنَّا ($\frac{12}{11}$) -

* تاج - ** محیط - *** لین -

'' تو ہمارا اعتبار نہیں کرتا '' ۔ وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا (۱۲/۱۷) ۔ '' اور تو ہماری بات کا اعتبار نہیں کریگا ''۔ هَلْ آمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَا اَمِنْتُكُمْ (۱۲/۶۴) ۔ '' میں اس کے متعلق تمہارا اعتبار نہیں کرتا بجز اس کے جس طرح میں نے (پہلے) تمہارا اعتبار کیا تھا '' ۔ ان تمام مقامات میں اٰمَنَ کا لفظ اعتبار ۔ بھروسہ اور یقین آنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔

جب اٰمَنَ کا صلہ لام ہو تو اس کے معنی بات ماننے کے ہوتے ہیں ۔ سورۃ بقرہ میں قصہ بنی اسرائیل کے ضمن میں ہے ۔ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ (۲/۵۵) ۔ '' ہم تیری بات نہیں مانینگے '' ۔ اس میں اعتبار ۔ اعتماد ۔ یقین اور اطاعت، سب کا مفہوم آ جاتا ہے ۔ جب اس کا صلہ ب ہو تو اس کے معنی ایمان لانے کے ہوتے ہیں ۔ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (۲/۲۸۵) '' سب ایمان لائے ہیں اللہ پر '' ۔ اٰمَنَ کے جو معانی اوپر دئے گئے ہیں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ '' ایمان لانے '' میں ان سب کا مفہوم آ جاتا ہے ۔ یعنی ۔

(۱) یقین کرنا ۔ ماننا ۔ تسلیم کرنا ۔ یعنی انکار نہ کرنا ۔
(۲) تصدیق کرنا ۔ اس کے سچے ہونے کا اقرار کرنا ۔ یعنی تکذیب نہ کرنا ۔
(۳) اعتماد اور بھروسہ کرنا ۔
(۴) بات ماننا ۔ اطاعت کرنا ۔ سر تسلیم خم کرنا ۔

قرآن کی رو سے پانچ بنیادی حقیقتیں ہیں جن پر ایمان لانے سے انسان مؤمن ہو جاتا ہے ۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (۲/۱۷۷) ۔ '' کشاد کی راہ اس کی ہے جو اللہ پر ۔ یوم آخرت پر ۔ ملائکہ پر ۔ کتب پر اور انبیاء پر ایمان لائے '' ۔ ان کا (یا ان میں سے کسی ایک کا) انکار کفر ہے ۔ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (۴/۱۳۶) ۔ '' جو اللہ سے ۔ اور اس کے ملائکہ کتب ۔ رسل اور یوم آخرت سے انکار کرتا ہے تو وہ گمراہی میں بہت دور نکل جاتا ہے '' ۔ اللہ پر ایمان کے معنی ہیں اسکی ہستی پر یقین ۔ اسکی ہر بات پر اعتماد ۔ اسکے قوانین پر پورا پورا اعتماد ۔ اور ان کی اطاعت کا اقرار ۔ یوم آخرت پر ایمان کے معنی ہیں خدا کے قانون مکافات عمل کی محکمیت پر یقین اور اعتماد ۔ اور موت کے بعد تسلسل حیات پر یقین ۔ ملائکہ پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ ملکوتی قوتیں نظام کائنات میں اللہ تعالیٰ

کے پروگرام کو بروئے کار لانے میں سرگرم عمل ہیں اور خدا نے انہیں انسان کے سامنے جھکا دیا ہے ۔ مسخر کر دیا ہے ۔ اس لئے ان میں سے کوئی قوت ایسی نہیں جس کے سامنے انسان جھکے ۔ انبیاء پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان ، تنہا عقل کی رو سے شاہراہِ زندگی پر چلنے کی راہ نمائی حاصل نہیں کر سکتا ۔ یہ راہ نمائی وحی کی رو سے ملتی ہے ۔ اوروحی ہر فرد کو براہ راست نہیں ملتی بلکہ خدا کے منتخب کردہ افراد کی وساطت سے ملتی ہے جنہیں انبیاء کہا جاتا ہے ۔ وحی کا یہ سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذات پر ختم ہو گیا ۔ کتابوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ یہ ضابطۂ حیات، وحی کی رو سے ملا ہے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ منزل تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ نہیں ۔ نبوت پر ایمان لانے کی عملی شہادت اس نبی کی کتاب کو ضابطہ زندگی بنانا ہے ۔ لیکن نزولِ قرآن کے بعد کوئی اور کتاب ضابطۂ حیات نہیں بن سکتی ۔

لہذا مومن (ایمان لانے والا) وہ ہے جسے خدا کے اس قانون کی محکمیت پر بھی پورا پورا بھروسہ ہو جو کائنات میں کار فرما ہے اور اس قانون پر بھی جو حضرات انبیائے کرامؑ کی وساطت سے وحی کے ذریعے انسانی راہ نمائی کے لئے ملا (اور جواب قرآن کے اندر ہے) ۔ اور انسانی اعمال کی نتیجہ خیزی پر بھی پورا پورا یقین ہو (اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی) ۔ ایسے افراد پر مشتمل جماعت کو قرآن '' یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا '' کہہ کر پکارتا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہہ کر تنبیہ بھی کر دیتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جماعت کا یہ نام تو باقی رہ جائے اور وہ خصوصیات باقی نہ رہیں جن کی بناء پر انہیں اس خطاب کا حامل قرار دیا گیا تھا ۔ اس لئے اس جماعت سے بھی کہہ دیا گیا کہ جس طرح دیگر افراد انسانیہ (یہود ۔ نصاریٰ وغیرہ) کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوانین خداوندی اور مکافاتِ عمل پر پورا پورا یقین رکھیں اسی طرح ان کے لئے بھی ضروری ہے ۔ انہیں اطمینان اور بےخوفی کی زندگی اسی طرح مل سکیگی، نہ کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو جانے سے ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ ۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۶۲) ۔ '' یقیناً جو لوگ اپنے آپ کو مومن کہہ کر پکارتے ہیں اور جو یہود اور نصاریٰ اور صابئین ہیں ۔ کسے باشد ۔ جو بھی اللہ اور آ[illegible]ت

پر ایمان لائیگا اور اس کے اعمال صالح ہونگے ۔ تو ایسے لوگوں کا اجر ان کے رب کے ہاں ہوگا۔ اور انہیں نہ کوئی خوف ہوگا نہ حزن ۔ (نیز دیکھئے ۱۳۶/۳) ۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ یہود و نصاریٰ وغیرہ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ تو پہلے ہی خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے انہیں ''مومن،، ہونے کے لئے نئے سرے سے ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ ان سے واضح طور پر کہہ دیا کہ جب تک ان تمام امور پر اسطرح ایمان نہ لایا جائے جسطرح قرآن نے بتایا ہے (یعنی ان کی جو تشریحات قرآن نے بیان کی ہیں انہیں اسی طرح نہ مانا جائے) کسی کے (بزعم خویش) ایمان کو ایمان نہیں کہا جائیگا ۔ فَاِنْ آمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ آمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۱۳۷/۲) ۔ ''اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں جس طرح (اے جماعت مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائیگا کہ یہ لوگ صحیح راستے پر ہیں،، ۔ ایمان وہی ایمان ہے جو قرآن کے مطابق ہے اور عمل وہی صالح ہے جسے قرآن صالح قرار دے۔

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ تو مانتے ہیں کہ کائنات کو خدا نے بنایا ہے اور اس کا قانون اس میں کارفرما ہے ، لیکن اپنی زندگی (یا انسانی معاملات) میں خدا کی راہ نمائی (وحی) کو ضروری نہیں سمجھتے ۔ ایسے لوگوں کو وہ مومن قرار نہیں دیتا اس لئے کہ مومن کے معنی صرف یہی نہیں کہ وہ خدا کی ہستی پر ایمان رکھتا ہو۔ مومن وہ ہے جو وحی پر بھی ایمان رکھے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے (۲۳/۸۴-۹۰) ۔

یہ بھی یاد رہے کہ کسی مصلحت کی بنا پر ، یا جماعت مومنین کے غلبہ و اقتدار کے پیش نظر، ایمان لے آنا بھی ایمان نہیں کہلاتا ۔ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں قانون خداوندی کی صداقتوں کا یقین اور اس کی محکمیت پر بھروسہ رکھے ۔ سورۃ الحجرات میں ہے قَالَتِ الْاَعْرَابُ آمَنَّا ۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹/۱۴) ۔ ''اعراب (دیہاتی بدو) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں ۔ ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ یہ کہو کہ ہم نے تمہاری فرماں برداری اختیار کر لی ہے ۔ اس لئے کہ (ابھی تک) تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہؤا،، ۔

دوسری طرف اسے بھی سمجھ لینا چاھئے کہ ایمان صرف ان حقائق کو مان لینے کا نام نہیں ۔ ان کے سامنے عملاً سر تسلیم خم کر دینا بھی ضروری ھے ۔ سورۃ روم میں ھے اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۳۰/۵۳) ۔ '' تو صرف انھی کو سنا سکتا ھے جو ھمارے احکام پر ایمان لاتے ھیں اور وہ ان کے سامنے جھکنے والے ھیں ''۔ یہی وجہ ھے کہ جہاں ایمان کو کفر کے مقابل رکھا گیا ھے (مثلاً ۲/۲۵۳ میں) وھاں اسے '' گریز کی راھیں نکالنے اور پھر جانے'' کے مقابل بھی لایا گیا ھے ۔ (دیکھئے ۲/۱۰۳) حتی کہ مومن اور فاسق کو بھی ایک دوسرے کی ضد بتایا گیا ھے (مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۳/۱۰۹)۔ اور منافقین کی ضد بھی۔ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ـ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا (۳/۱٦٦-۱٦۵) '' تاکہ وہ مومنوں کو بھی جان لے اور ان لوگوں کو بھی جو منافقت برتتے ھیں ''۔

قرآن نے خدا کو اَلْمُؤْمِنُ (۵۹/۲۳) کہا ھے ۔ اس لئے کہ وہ تمام کائنات کی حفاظت کا ذمہ دار ھے اور جو اس کے قانون پر بھروسہ کرتا ھے وہ اسے تخریبی قوتوں کی تباھیوں سے محفوظ رکھتا ھے ۔ اس اعتبار سے بندۂ مومن وہ ھوگا جس پر تمام انسان اعتماد اور بھروسہ کر سکیں اور جو تمام دنیا میں امن قائم رکھنے کا ذمہ دار ھو۔

تصریحات بالا سے اس حقیقت کو سمجھ لیجئے کہ مومن کسے کہتے ھیں ۔ اس کا مقام کیا ھے اور فرائض اور ذمہ داریاں کیا ؟

اِمَّا (حرف)

اِمَّا (یا تو ۔ یا خواہ) حسب ذیل مثالوں سے مفہوم واضح ھوجائیگا :۔

(۱) اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ (۹/۱۰٦) ۔ خواہ وہ انہیں عذاب دے اور خواہ ان کی طرف متوجہ ھو۔

(۲) قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى (۲۰/٦۵) انہوں نے کہا ۔ اے موسیٰ یا تو تو پہلے ڈال یا ھم پہلے ڈالیں ۔

(۳) بعض اوقات یہ حرف شرط (اِنْ) کے معنی دیتا ھے ۔ اس صورت میں (مَا) اس میں زائد ھوتا ھے ۔ جیسے فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا (۱۹/۲٦) ۔ پھر اگر تو کسی انسان کو دیکھے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس میں صرف اِنْ کے معنی (اگر) آئے ھیں ۔ (مَا) زائد ھے ۔

ا م و (ا م ۃ)

اَمَۃٌ - باندی (حُرَّۃٌ کی ضد ہے) یہ لفظ دراصل اَمَوَۃٌ یا اَمْوَۃٌ تھا *- قرآن کریم میں مذکر کے لئے عَبْدٌ اور مونث کے لئے اَمَۃٌ آیا ہے (۲/۲۲۱) - اَمَۃٌ کی جمع اِمَاءٌ ہے (۲۴/۳۲) -

اَنْ - (حرف) -

اَنْ - عام طور پر (کہ) کے معنوں میں آتا ہے - یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـؤُا نُوْرَ اللّٰہِ (۹/۳۲) - وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نورکو بجھا دیں -

(۲) وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌلَّکُمْ .... (۲/۱۸۴) اور یہ کہ تم روزہ رکھو تو تمہارے لئے بہتر ہوگا- یعنی صِیَامُکُمْ - تمہارا روزہ رکھنا تمہارےلئے بہتر ہے -

(۳) بعض اوقات یہ زائد ہوتا ہے - مثلاً - وَلَمَّا اَنْ جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوْطاً (۲۹/۳۳) - جب ہمارے بھیجے ہوئے لوط کی طرف آئے - یہاں اَنْ زائد ہے - چنانچہ (۱۱/۷۷) میں ہے وَ لَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوْطاً - یعنی اس میں اَنْ نہیں ہے - نیز دیکھئے (۱۲/۹۶) جہاں اَنْ زائد ہے -

(۴) بعض اوقات اَنْ سبب کو ظاہر کرنے کے لئے بھی آتا ہے - مثلاً وَ عَجِبُوْا اَنْ جَاءَ ھُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْھُمْ (۳۸/۴) - اور انہیں اس بات پر تعجب آ رہا ہے کہ ان کی طرف انہی میں سے ایک آگاہ کرنے والا آ گیا! یعنی اسکیے تعجب کا سبب یہ ہے کہ ان کی طرف انہی میں سے رسول آ گیا - وہ اسپر متعجب ہیں کہ ایسا کس طرح ہوگیا - (لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ دراصل لِاَنْ ہے - یعنی اس میں لام سبب ، مقدر ہے - یعنی وہ لام جس کے معنی ''تا کہ،، یا ''اس وجہ سے،، ہوتے ہیں لکھا نہیں گیا - محذوف ہے -)

(۵) ''تا کہ،، کے معنوں میں - وَ اَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ (۱۶/۱۵) - ''اور اس نے زمین پر پہاڑ بنا رکھے ہیں تاکہ تمہیں سامان رزق عطا کرے،، - ''یا تم اسی پر آرام سے بیٹھے رہو اور یہ تمہیں لیکر گھومتی رہے -،، (بعض کے نزدیک یہاں بھی لام سبب مقدر ہے) -

---

* تاج -

(۶) بعض اوقات اس کا مطلب ہوتا ہے "یہ کہہ کر کہ"۔ وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِی كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ (۱۶/۳۶)۔ اور ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا۔ یہ پیغام دیکر کہ لوگ صرف اللہ کی محکومی اختیار کریں۔

(۷) "ایسا نہ ہو کہ"۔ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (۴/۱۷۶)۔ اللہ یہ باتیں تمہیں کھول کر بتاتا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ تم غلطی میں پڑ جاؤ۔

(۸) "تاکہ اگر ایسا ہو تو......" کے معنوں میں۔ مثلاً اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا (۲/۲۸۲)۔ تاکہ اگر ایسا ہو کہ ان میں سے کوئی ایک غلطی کر جائے تو.........

اِنْ (حرف)

اِنْ۔ حرف شرط ہے۔ "اگر" کے معنوں میں آتا ہے۔ اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ (۸/۳۸)۔ اگر وہ رک جائیں تو اللہ ان کی حفاظت کا سامان کر دے۔

(۲) کبھی یہ "ما" (نہیں) کے معنوں میں آتا ہے۔ وَ قَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۳۴/۴۳) اور وہ کہتے ہیں کہ یہ کچھ نہیں بجز اس کے کہ کھلا ہوا جھوٹ* ہے۔ یا وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا...... (۳۵/۴۱)۔ اگر وہ ہٹ جائیں تو کوئی انہیں روک نہیں سکتا۔

(۳) کبھی یہ اِنَّ کا مخفف ہوتا ہے اور اس کے معنی ہوتے ہیں۔ یقیناً۔ بالتحقیق۔ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰی (۸۷/۹)۔ سو تو انہیں قانونِ خداوندی کی یاد دلاتا جا۔ یقیناً یہ یاد دہانی نفع دیتی ہے۔ (بعض کا خیال ہے کہ اس آیت میں اِنْ شرطیہ ہی ہے اور مطلب یہ ہے کہ تذکیر صرف اسوقت کرو جب تک یہ نفع بخش ہو۔ ورنہ صحیح موقع کا انتظار کرو۔)**

(۴) کبھی یہ زائد ہوتا ہے۔ یعنی کوئی معنی نہیں دیتا۔ چنانچہ بعض کا خیال ہے کہ آیت وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِیْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِیْهِ (۴۶/۲۶) میں اِنْ زائد ہے۔ اس اعتبار سے اسکے معنی ہونگے "اور یقیناً ہم

---

* دیکھئے عنوان (س-ح-ر)۔ ** جب اِنْ مخفف ہو اِنَّ کا تو اسکی خبر پر اکثر لام تاکید آیا کرتا ہے۔ جیسے وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۶۲/۲) "اور یقیناً وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے"۔

نے انہیں ایسا تمکن عطا کیا تھا جیسا تمہیں کیا ہے،،۔ لیکن اگر یہاں ' اِنْ ' کے معنی مَا (نہیں) کے لئے جائیں تو معنی ہونگے ''ہم نے انہیں ایسا تمکن دیا تھا جیسا تمکن تمہیں بھی نہیں دیا،،۔

(ہ) بعض اوقات اس کے معنی اِذْ کے آتے ہیں۔ اور مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ''چونکہ تم ایسے ہو اسلئے ....۔ مثلاً اِتَّقُوْا اللهَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ (۵/۱۱۲)۔ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اس لئے کہ تم مومن ہو۔ (نیز ۸/۱) ۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ وَ اشْكُرُوْا اللهَ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۔ (۲/۱۷۲) ۔ اور نعمائے خداوندی کی قدردانی کرو در آنحالیکہ (جب کہ) تم اسکی محکومی اختیار کئے ہوئے ہو۔

(۲) اِلَّا ۔ (اِنْ + لَا) ۔ دیکھئے ۔ اِلَّا

اَنَا (ضمیر)

اَنَا ۔ واحد متکلم کی مرفوع ضمیر ہے اور مذکر و مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتی ہے ۔ اَنَا رَجُلٌ ۔ میں ایک مرد ہوں ۔ اَنَا اِمْرَاَةٌ ۔ میں ایک عورت ہوں ۔ قرآن کریم میں ہے قَالَ اَنَا اُحْيِىْ وَ اُمِيْتُ (۲/۲۵۸) '' اس نے کہا کہ میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں''۔ اَنَا کا تثنیہ اور جمع نَحْنُ آتا ہے ۔

اَنْتَ (ضمیر)

اَنْتَ ۔ واحد مذکر حاضر کی مرفوع ضمیر ہے ۔ اَنْتَ رَجُلٌ ۔ تو ایک مرد ہے ۔ سورۂ بقرہ میں ہے ۔ اُسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ (۲/۳۵) '' تو اور تیری بیوی باغ میں رہو'' ۔

اس کا تثنیہ اَنْتُمَا اور جمع اَنْتُمْ آتی ہے ۔

اَنْتِ (ضمیر)

اَنْتِ ۔ واحد مؤنث حاضر کی مرفوع ضمیر ہے ۔ اَنْتِ اِمْرَاَةٌ ۔ تو ایک عورت ہے ۔ اس کا تثنیہ اَنْتُمَا اور جمع اَنْتُنَّ آتی ہے ۔

اَنْتُمْ (ضمیر)

اَنْتُمْ ۔ جمع مذکر حاضر کی مرفوع ضمیر ہے ۔ اَنْتُمْ رِجَالٌ ۔ تم سب مرد ہو ۔ قرآن کریم میں ہے وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۲/۲) "تم مسلم ہو" ۔ اس کا واحد اَنْتَ ہے ۔

اَنْتُمَا (ضمیر)

اَنْتُمَا ۔ تثنیہ حاضر کی مرفوع ضمیر ہے ۔ اور مذکر و مؤنث دونوں کیلئے آتی ہے ۔ اَنْتُمَا رَجُلَانِ ۔ تم دونوں مرد ہو ۔ اَنْتُمَا امْرَاَتَانِ ۔ تم دونوں عورتیں ہو ۔ سورۃ قصص میں ہے اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَکُمَا الْغَالِبُوْنَ (۳۵/۲۸) ۔ "تم دونوں اور جو تمہارا اتباع کرے ' غالب رہوگے" ۔

اس کا واحد اَنْتَ (مذکر کے لئے) اور اَنْتِ (مؤنث کے لئے) ہیں ۔

اَنْتُنَّ (ضمیر)

اَنْتُنَّ ۔ جمع مؤنث حاضر کی مرفوع ضمیر ہے ۔ اَنْتُنَّ نِسْوَۃٌ ۔ تم سب عورتیں ہو ۔ اس کا واحد اَنْتِ ہے ۔

ا ن ث

اَنْثٌ ۔ اس کے بنیادی معنے نرم کے ہیں ۔ حَدِیْدٌ اَنِیْثٌ ۔ نرم لوہا ۔ اَرْضٌ اَنِیْثَۃٌ ۔ نرم زمین ۔ سَیْفٌ اَنِیْثٌ ۔ نرم تلوار جو قاطع نہ ہو ۔ اَنِثَ لَہٗ ۔ وہ اس کے لئے نرم ہو گیا * ۔

راغب نے لکھا ہے کہ چونکہ تمام حیوانات میں مؤنث بمقابلہ مذکر نرم اور ضعیف ہوتی ہے اس لئے اسے اُنْثٰی کہتے ہیں ۔ لہذا ہر وہ چیز جس میں فاعلیت کی بجائے انفعال کا پہلو غالب ہو اَنِیْثٌ کہلائیگی ۔ چنانچہ اسی اعتبار سے جمادات کو بھی اَلْاِنَاثُ کہتے ہیں ۔ اور خدا کے مقابلہ میں جن چیزوں کو بھی معبود بنا لیا جاتا ہے وہ (خدا کی قوت اور فاعلیت کے اعتبار سے) اِنَاثٌ کہلاتی ہیں ۔ سورۃ النساء میں جو کہا گیا ہے کہ اِنْ یَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا (۱۱۷/۴) تو اس میں اِنَاثٌ سے مراد ضعیف و کمزور ہی ہیں خواہ وہ پتھر کی مورتیاں ہوں یا دیگر معبود ** ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔

قرآن کریم میں ذَکَرٌ (نر ۔ مذکر) کے مقابلہ میں اُنثیٰ (مادہ۔ مؤنث) آیا ہے (۱۱/۳) اور بَنِیْنَ (بیٹے) کے مقابلہ میں بھی اِنَاثٌ (بیٹیاں) آیا ہے (۴/۵۰) ۔

انجیل

اَلنَّجْلُ کے بہت سے معنی ہیں ۔ منجملہ ان کے ' بہنے والے پانی کو بھی کہتے ہیں ۔ اور نَجَلَتِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں زمین سر سبز ہو گئی ۔ نَجَلَ الشَّیْئَ ۔ اس نے اس چیز کو ظاہر کر دیا ۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْاِنْجِیْلُ اسی سے مشتق ہے*۔ لیکن صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ لفظ ، یونانی لفظ اَونْجِیلْیُوْنُ کا معرب ہے جس کے معنی مسرت انگیز خبر یا بشارت ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْاِنْجِیْلُ ۔ نَجَلْتُ الشَّیْءَ سے ہے جس کے معنی ہیں ، میں نے اسے نکال لیا ۔ اس کا مفہوم ہے ' واضح کر دیا ۔ کھول کر بیان کر دیا ۔ اس لئے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں وسعت کے ہیں ۔ قرآن نے یہ لفظ اس کتاب کے لئے استعمال کیا ہے جو حضرت عیسیٰ کو دی گئی تھی (۵/۴۶) ۔

جو انجیل اسوقت عیسائیوں کے پاس ہے اسکی تاریخ کے لئے میری کتاب ''معراج انسانیت ،، کا پہلا باب '' ظہرالفساد ،، دیکھئے ۔ اس سے واضح ہوگا کہ یہ کتاب اپنی اصلی شکل میں بالکل نہیں ۔ حضرت عیسیٰ ؑ جو صحیفہ ربانی (انجیل) اپنے حواریوں کو دیکر گئے تھے ، اس کا کوئی پتہ نشان نہیں ملتا ۔ بعد میں جب عیسائی کلیسا ، یہودی اور غیر یہودی عناصر کی کشمکش کی رزمگاہ بن گیا تو مختلف الخیال فرقوں نے اپنی اپنی انجیلیں مرتب کرنا شروع کر دیں۔ چنانچہ انسائکلو پیڈیا برٹانیکا کی تحقیق کی رو سے اس زمانے میں قریب چونتیس اناجیل کا پتہ چلتا ہے ۔ یہ اناجیل درحقیقت حضرت عیسیٰ ؑ کے سوانح حیات تھے جنہیں عام روایات سے اخذ کرکے ترتیب دیا گیا تھا ۔ حضرت عیسیٰ ؑ اور آپ کے حواریوں کی زبان ارامی تھی لیکن حیرت ہے کہ ان چونتیس اناجیل میں سے (سوائے ایک کےجواب مفقود ہے) کوئی انجیل بھی ارامی زبان میں نہیں تھی ۔ سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں ۔ نیقیہ کی مشہور کونسل (منعقدہ ۳۲۵ ء) میں یہ تمام لٹریچر سامنے رکھا گیا اور ان میں سے چار اناجیل (متی ۔

---
* تاج ۔ ** محیط ۔

مرقس - لوقا - یوحنا) کو منتخب کرکے بقایا کو جعلی قرار دے دیا گیا - ان منتخب کردہ اناجیل (اور ان خطوط کو جنہیں سینٹ پال اور حواریوں کیطرف منسوب کیا جاتا ہے) عہد نامہ جدید کہا جاتا ہے - لیکن ان میں سے بھی کوئی کتاب اپنی اصلی شکل میں صفحہ ارض پر موجود نہیں - اسوقت دنیا میں اناجیل کے صرف تین قدیمی نسخے ہیں - ایک ویٹکن میں - دوسرا برٹش میوزیم میں اور تیسرا وہ جسے روس نے انگلستان کے پاس فروخت کیا ہے - پہلے دونوں نسخے پانچویں صدی کے اور تیسرا نسخہ چوتھی صدی کا ہے - چوتھی صدی میں جیروم نے یونانی زبان سے ان کا ترجمہ لاطینی میں کیا - یہی ترجمہ اس ترجمہ کا ماخذ ہے جو شاہ جیمس کے عہد میں (۱۶۱۱ ء میں) شائع کیا گیا اور جو مستند ترجمہ کہلاتا ہے - ۱۸۷۰ ء میں کنٹربری میں ستائیس علمائے عیسائیت کی ایک مجلس بدیں غرض منعقد ہوئی کہ چونکہ ۱۶۱۱ ء والا ترجمہ ناقص ہے اس لئے ایک اور مستند ترجمہ شائع کیا جائے - اس ترجمہ کو (Revised Edition) کہا جاتا ہے - لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اناجیل کے جو تراجم اب مروج ہیں وہ ان دو تراجم کے عین مطابق ہیں - بالکل نہیں - بائیبل سوسائٹیز کیطرف سے شائع ہونے والا ہر نسخہ ، پہلے نسخوں سے مختلف ہوتا ہے - ایسا مختلف کہ جب جرمن ڈاکٹر میل نے عہد نامہ جدید کے چند نسخے جمع کرکے موازنہ کیا تو تیس ہزار اختلافات شمار کئے - اور جان جیمس نے جب ذرا زیادہ تحقیق سے کام لیا تو دس لاکھ اختلافات سامنے آ گئے - (تفصیل کے لئے دیکھئے انسائکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون (Gospel) اور انسائکلوپیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ اتھکس کا مضمون (Bible) -

یہ ہے مختصراً انجیل کی کیفیت جسے عیسائی دنیا آسمانی کتاب مانتی ہے - واضح رہے کہ اناجیل میں یہ تحریفات سہواً نہیں کی گئیں - دانستہ اور "کارثواب" ، سمجھ کر کی گئی ہیں - چنانچہ (اور تو اور خود)-سینٹ پال کا بیان ہے کہ

> اگر میرے جھوٹ کے سبب سے ، خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے ظاہر ہوئی تو پھر مجھ پر ایک گنہگار کیطرح کیوں حکم دیا جاتا ہے ؟

(رومیوں کے نام خط - ۷/۳)-

اس "جھوٹ" ، سے " خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے" کسطرح ظاہر ہوئی ، اس کے متعلق (زیادہ نہیں) صرف ایک شہادت کافی ہوگی - ڈاکٹر جوڈ اپنی کتاب (God And Evil) میں لکھتا ہے کہ

جو چیز سب سے زیادہ افسوسناک ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کا وہ کیریکٹر ہے جسے اناجیل پیش کرتی ہیں۔ (صفحہ ۳۱۹)۔

اس سے یہ حقیقت سمجھ میں آجائیگی کہ جب قرآن نے یہ کہکر کہ انجیل محرف ہے، حضرت مریم اور حضرت عیسیٰؑ کے صحیح سوانح حیات پیش کئے تو یہ خود دنیائے عیسائیت پر کتنا بڑا احسان تھا۔

ا ن س

اُنْسٌ۔ مانوس ہونا۔ (وحشت کی ضد ہے)۔ چنانچہ اَلْحُمُرُ الْاِنْسِیَّۃُ پالتو گدھوں کو کہتے ہیں۔ اور حِمَارٌ وَحْشِیٌّ جنگلی گدھے (گورخر) کو۔ اِسْتَانَسَ الْوَحْشِیُّ کے معنی ہیں جانور مانوس ہو گیا*۔

اِنْسُ فُلَانٍ۔ فلاں شخص کا خاص دوست یا اس کا خالص رفیق۔

اِنْسٌ۔ بشر۔ اس کا واحد اِنْسِیٌّ ہے۔ الْاَنَسُ: وہ قبیلہ جو کسی جگہ مقیم ہو*۔ اِنْسٌ کے برعکس، وہ خانہ بدوش قبائل جو جگہ جگہ پھرتے رہتے تھے اور اس طرح عام نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے، جِنٌّ کہلاتے تھے۔ (دیکھئے عنوان۔ ج۔ ن۔ ن)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اِنْسٌ کے بنیادی معنی ظاہر ہونے کے ہیں۔ برعکس اَلْجِنٌّ کے، جس کے معنی پوشیدہ ہونے کے ہیں۔ اس کی جمع اُنَاسٌ اور اَنَاسِیٌّ آتی ہے۔ بعض کے نزدیک اَلنَّاسُ بھی اس کی جمع ہے۔ قبیلے کے معنوں میں اُنَاسٌ سورۃ بقرہ میں آیا ہے۔ قَدْ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ۔ (۲/۶۰)۔ "سب قبیلوں نے اپنا اپنا گھاٹ جان لیا"۔ نوع انسانی کے معنوں میں اَنَاسِیُّ اور اَلنَّاسُ سورۃ فرقان میں آئے ہیں۔ (دیکھئے ۲۵/۴۹؛ ۲۵/۵۰)۔

لفظ اِنْسَانٌ کے متعلق بہت سی توجیہات پیش کی جاتی ہیں لیکن اکثر لوگوں کا خیال یہی ہے کہ یہ بھی اِنْسٌ سے ہی ہے۔ قرآن میں اِنْسَانٌ اور بَشَرٌ مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں (دیکھئے ۱۵/۲۸؛ ۱۵/۳۳)۔ نیز اِنْسِیًّا بھی بَشَرٌ کے ساتھ آیا ہے (۱۹/۲۶)۔ انسان اور بشر کے فرق کیلئے دیکھئے عنوان ب ش ر

اَلنَّاسُ۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے بعض کے نزدیک یہ اِنْسٌ کی جمع ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ قَوْمٌ کی طرح اسم جمع ہے۔ بعض کے نزدیک اَلنَّاسُ دراصل اُنَاسٌ تھا جو اِنْسٌ کی جمع ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دراصل اَلْاَنَاسِیُّ تھا۔ کثرت استعمال سے آخر کی یاء گر گئی۔ اس کے بعد اَلْاُنَاسُ کا درمیانی ہمزہ بھی تخفیفاً حذف کر دیا اور اس طرح اَلنَّاسُ باقی رہ گیا**۔

---

* تاج و لین و اقرب الموارد۔ ** تاج

آنَسَ کے معنی دیکھنے اور محسوس کرنے کے ہیں ۔ تذکرہ حضرت موسیٰؑ میں جہاں انہوں نے کہا ہے اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا (۲۷/۷ ; ۲۰/۹) تو اس میں آنَسَ کے معنی دیکھنے کے ہیں ۔ اِیْنَاسٌ ۔ کسی شے کی معرفت اور ادراک حاصل کر لینے اور یقین کو کہتے ہیں**۔ مُسْتَانِسٌ ۔ جو مانوس اور بے تکلف ہو ۔ سورۃ احزاب میں ہے مُسْتَانِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ (۳۳/۵۳) ۔ اس کے معنی ہیں بے تکلف باتوں میں لگ جانا ۔

اِسْتَانَسَ ۔ اجازت طلب کرنا ۔ سورۃ نور میں ہے حَتّٰی تَسْتَانِسُوْا (۲۴/۲۷) اس کے معنی اگلی آیت (۲۴/۲۸) سے واضح ہو جاتے ہیں ۔ اِسْتَانَسَ کے معنی در اصل معلومات حاصل کرنے کے ہوتے ہیں ۔ جو شخص کسی مکان کے باہر کھڑا ہو کر دستک یا آواز دیتا ہے وہ دریافت کرتا ہے کہ گھر میں کوئی ہے ۔ اور اگر ہے تو وہ اندر آسکتا ہے؟ اس بنا پر یہ لفظ اِسْتِیْذَانٌ (اجازت طلبی) کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ۔ اس قسم کی اجازت طلبی سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ آنے والا گھر کے اندر داخل ہونے سے پہلے ایسا انداز اختیار کرے جس سے وہ اہل خانہ کے نزدیک اجنبی نہ رہے ۔ مانوس ہو جائے ۔

قرآن کا خدا رَبِّ النَّاسِ ۔ مَلِکِ النَّاسِ ۔ اِلٰہِ النَّاسِ (۱۱۴/۱-۳) ہے اور خود قرآن بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ (۴۵/۲۰) ۔ اس لئے یہ دعوت بلا حدودِ زمان و مکان ، تمام نوع انسانی کے لئے ہے اور خدا کی ربوبیت، ربوبیت عالمینی ہے ۔

نوٹ :۔ قرآن میں جِنٌّ و اِنْسٌ کے الفاظ اکٹھے بھی آئے ہیں اور انسان سے پہلے جَانٌّ کی تخلیق کا بھی ذکر آیا ہے (۱۵/۲۷) ۔ اس کے لئے (ج ۔ ن ۔ ن) کا عنوان دیکھئے) ۔

ا ن ف

اَلْاَنْفُ ۔ ناک *۔ ہر چیز کی ابتدا اور اس کا مضبوط اور سخت ترین حصہ* ۔ اَلْاَنْفُ بِالْاَنْفِ (۵/۴۵) ۔ " ناک کے بدلے ناک "۔ اَلْاِسْتِیْنَافُ کسی کام کو از سر نو شروع کرنا * ۔ عرب ' عزت اور ذلت دونوں کی نسبت اَنْفٌ کی طرف کرتے ہیں ۔ مثلاً حَمِیَ اَنْفُہٗ ۔ وہ معزز ہو گیا ، اور رَغِمَ اَنْفُہٗ ۔ وہ ذلیل ہو گیا ** ۔ ہماری زبان میں بھی " اونچی ناک والا " اور " ناک کٹ گئی " عزت اور ذلت کے معنوں میں بولتے ہیں ۔

* تاج و راغب ۔ **محیط ۔

اٰنِفاً - ابھی ابھی - قرآن کریم میں ہے مَاذَا قَالَ اٰنِفاً (۴۷/۱۶) اس نے ابھی ابھی کیا کہا تھا ؟ -

ا ن م

اَلْاَنَامُ مخلوق کو کہتے ہیں - یا صرف جن و انس کو کہتے ہیں - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ان تمام چیزوں کو اَنَام کہتے ہیں جو روئے زمین پر ہیں - غالباً یہ نَوْم سے ماخوذ ہے اور ہر اس چیز کو اَنَام کہہ سکتے ہیں جس پر نیند طاری ہوتی ہو*- بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اَلْاَنَام ہر جاندار چیز کو کہتے ہیں - **

قرآن کریم میں ہے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰) "زمین کو مخلوق کے فائدے کے لئے بنایا" - اس سے ظاہر ہے کہ کوئی ایسا نظام جس میں زمین (سرچشمہ رزق) تمام مخلوق کے فائدے کے بجائے چند افراد کے مفاد کا ذریعہ بن جائے (یا بے فائدہ پڑی رہے) منشائے خداوندی کے خلاف ہوگا- اس کی تشریح میں قرآن نے دوسرے مقام پر کہدیا ہے کہ ارض کو سَوَاءً لِلسَّائِلِيْنَ (۴۱/۱۰) رہنا چاہئیے - یعنی ایسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے - (مزید تفصیل ا - ر - ض کے عنوان میں ملیگی) -

اِنَّ (حرف)

اِنَّ - تاکید اور تحقیق کے لئے آتا ہے - اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۲/۶) یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ (اس نظام حیات سے) انکار کرتے ہیں -

اِنَّمَا (اِنَّ + مَا) - صرف (Only) کے معنوں میں بھی آتا ہے - (اسے حصر کہتے ہیں) اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ (۹/۶۰) صدقات صرف فقراء کے لئے ہیں - اور محض تاکید کے لئے بھی (نیز دیکھئے عنوان - مَا) -

اِنِّيْ در اصل اِنَّ اور یِ (متکلم کی ضمیر) سے مل کر بنا ہے - اسے اِنِّيْ اور اِنَّنِيْ دونوں طرح بولا جاتا ہے -

اِنَّا - در اصل اِنَّ اور نَا (جمع متکلم کی ضمیر) کا مرکب ہے - اسے اِنَّا - اور اِنَّنَا دونوں طرح بولا جاتا ہے -

---

* تاج - ** محیط -

اَنَّ - (حرف)

اَنَّ درحقیقت اِنَّ کی طرح ہے - تاکید کے لئے آتا ہے - جب اس پر کاف تشبیہ کا آجائے تو کَاَنَّ ہو جاتا ہے - (دیکھئے "کَاَنَّ" کے ماتحت)

اَنَّمَا کے معنی بھی اَنَّ ہی کے ہوتے ہیں - مطلب تحقیق اور تاکید ہوتا ہے - اَنَّمَا اِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ (۱۸/۱۱۰) - یقیناً تمہارا اِلٰہ اِلٰہِ واحد ہے - اس پر کاف تشبیہ آجائے تو کَاَنَّمَا ہو جاتا ہے -

اِنَّ اور اَنَّ کے استعمال میں فرق یہ ہے کہ ابتدائے کلام میں اِنَّ استعمال کرتے ہیں اور درمیان کلام میں اَنَّ استعمال کرتے ہیں - البتہ قَالَ اور اس کے مشتقات کے بعد اِنَّ استعمال کیا جاتا ہے - اَنَّ استعمال نہیں کیا جاتا -

اَنّٰی (حرف)

(۱) اَنّٰى - كَيْفَ (کسطرح - کیونکر) کے معنوں میں - وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى (۸۹/۲۳) - اور (آسدن) اسکےلئے قانون کی یاد دھانی کسطرح ہو سکے گی؟

(۲) مَتٰى (کب اور جب) کے معنوں میں - قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ (۱۹/۸) - زکریا نے کہا - اے میرے نشوونما دینے والے! میرے ہاں کب بیٹا پیدا ہوگا - (لیکن یہاں اس کے معنی "کسطرح"، یا "کیونکر"، بھی ہو سکتے ہیں) -

(۳) مِنْ اَيْنَ (کہاں سے) کے معنوں میں - اَنّٰى لَكِ هٰذَا (۳/۳۶) - تجھے یہ (رزق) کہاں سے ملا؟ (یہاں اسکے معنی "کسطرح - کیسے یا کیونکر"، بھی ہوسکتے ہیں) -

(۴) "کدھر"، کے معنوں میں - فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۶/۹۵) - تم کدھر الٹے پھر رہے ہو -

(۵) سورۂ بقرہ میں ہے - نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ - فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ (۲/۲۲۳) - تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں - تم اپنی کھیتیوں میں (ممنوع اوقاتِ حیض کے علاوہ) جب جی چاہے آؤ - یہاں اَنّٰى کے معنی حِيْنَ ہیں (ضحاک) - ابن عباس کا قول ہے کہ اسکے معنی ہیں - اَنّٰى شِئْتُمْ مِنَ اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ -

رات اور دن میں جب تم چاهو۔ صاحب تاج العروس نے بھی اسکے معانی میں ''جب،، شامل کیا ہے۔ مرزا ابوالفضل نے (غریب القرآن میں) ابو حیان کے حوالے سے لکھا ہے کہ اسکے معنی ''اگر،، کے هیں۔ یعنی اگر تم چاهو۔

ا ن ی

آنَی الشَّیْءُ آنْیاً ۔ کسی بات کا وقت هو جانا ۔ اسکا اپنی غایت اور تکمیل تک پہنچ جانا ۔ پخته هو جانا ۔ بَلَغَ هٰذَا آنَاهُ وَ اِنَاهُ ۔ یه چیز اپنی پختگی اور تکمیل کو پہنچ گئی * سورة احزاب میں ہے۔ نٰظِرِیْنَ اِنٰهُ (۳۳/۵۳) ۔ کھانے کے وقت کا انتظار کرنے والے ۔ یعنی جب تمہیں کھانے پر بلایا جائے اس وقت آؤ۔ یه نه کرو که یونہی آجاؤ اور پھر باتیں کرتے رهو تاآنکه کھانے کا وقت آجائے اور تم اس میں (خواہ مخواہ) شامل هو جاؤ۔ سورة الحدید میں ہے آلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۵۷/۱۶) راغب نے لکھا ہے که اسکے معنی یه هیں که کیا مومنین کے لئے اسبات کی تکمیل اور پختگی کا وقت نہیں آیا؟ سورة غاشیه میں عَیْنٍ اٰنِیَةٍ آیا ہے (۸۸/۵)۔ اسکے معنی هیں چشمے کا وہ پانی جو اپنی حرارت میں شدت تک پہنچ گیا هو ۔ کھولتا هوا ۔

آلْاِنَاءُ ۔ برتن * ۔ جمع آنِیَةٌ ۔ (۷۶/۱۵)

آلْاٰنَاءُ جمع ہے آنًی ۔ اِنًی کی، جس کے معنی وقت کا کچھ حصه ۔ ساعت هیں ۔ آنَاءُ الَّیْلِ ۔ رات کی گھڑیاں * (۳/۱۱۲ ۔ ۲۰/۱۳۰) ابن فارس نے کہا ہے که اِنًی رات کے کسی وقت کے لئے هی بولا جاتا ہے ۔ آنَیْتُ الشَّیْءَ ۔ میں نے اس چیز کو اسکے وقت سے مؤخر کر دیا **

ا ه ل

آَهْلٌ ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے که اس مادہ کے معنے عبرانی زبان میں خیمه کے هوتے هیں ۔ اس اعتبار سے اسکا مفہوم هؤا وہ لوگ جو ایک خیمه میں رهتے هوں*** اسکے بعد (راغب کے الفاظ میں) یه لفظ ان لوگوں کیلئے بولا جانے لگا جو آپس میں نسب ۔ دین یا پیشه ۔ مکان اور شہر میں مشترک هوں۔** عام طور پر آهْلُ الرَّجُلِ آدمی کے خاندان اور قریبی رشته داروں کو کہتے هیں آهْلُ الْبَیْتِ ۔ گھر میں رهنے والے ۔ آهْلُ الرَّجُلِ ۔ بیوی اور

* تاج ۔ ** راغب *** محیط ۔

اولاد کے لئے بھی آتا ہے۔* صاحب محیط نے اس لفظ کے متعدد معنے درج کئے ہیں۔ پھر ابو حنیفہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک اس سے بالخصوص بیوی مراد ہوتی ہے۔* آھْلِیٌّ اس چوپایہ کو کہتے ہیں جو مکانات سے مانوس ہو جائے* یعنی پالتو۔

بیشک قرآن کریم قرابت اور رشتہ داری کو اہمیت دیتا ہے لیکن اس کے نزدیک انسانوں کی بنیادی تقسیم کا ایک ہی معیار ہے۔ یعنی کفر اور ایمان (Ideology)۔ جو لوگ ایک دین کے رشتہ میں پروئے جائیں، وہ ایک گروہ، جماعت اور قوم کے افراد۔ لہذا اپنے۔ جو اس رشتہ سے باہر ہوں، وہ دوسری جماعت اور قوم سے متعلق۔ لہذا بیگانے۔ ان اپنوں میں سے جو قرابت دار ہوں وہ اس قرابت داری کی بنا پر قریبی ہو جاتے ہیں لیکن اگر قرابت دار دین میں مشترک نہوں تو وہ اپنوں میں سے نہیں رہتے۔ یہ وہ حقیقت تھی جسے حضرت نوح پر یہ کہکر منکشف کیا گیا کہ تمہارا بیٹا اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ (11/46) وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے*** اس لئے کہ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (11/46) اسکے اعمال غیر صالح ہیں۔ اس سے پہلے بتا دیا گیا کہ وہ بیٹا جماعت مومنین میں شریک نہیں ہوا تھا۔ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ (11/42) لہذا حضرت ابراہیم کا باپ ہو یا حضرت نوح کا بیٹا۔ حضرت لوط کی بیوی ہو یا نبی اکرم کے قریب ترین رشتہ دار (مثلاً چچا) اگر وہ دین کے رشتہ میں منسلک نہیں ہوتے تو وہ اَھل میں سے نہیں ہوسکتے۔ اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جو لوگ اسطرح اپنے اہل میں سے نہ ہوں ان سے نفرت اور عداوت کا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ عدل و انصاف اور انسانیت کا سلوک کیاجائیگا۔ اہل کی امتیازی خصوصیت یہ ہوگی کہ یہ اس جماعت کے افرد ہونگے جو قرآن کے نظام ربوبیت کی حامل ہوگی، یعنے جن کے ذمہ نوع انسانی کی پرورش کا اہم فریضہ ہوگا۔

هُوَ اَهْلٌ لِكَذَا۔ وہ اسکا مستحق ہے*۔ سورۃ نساء میں ہے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (4/58) ''اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کی طرف لوٹا دو''۔ یہاں امانات سے اگر وہ چیزیں مراد ہیں جو کوئی شخص کسی دوسرے کے پاس بطور امانت رکھ دے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی کی امانت میں خیانت نہ کرو۔ اسے اس کے مالک کو واپس دیدو۔ اور اگر امانات سے مراد امت کی وہ چیزیں ہیں

* محیط۔ ** تاج و راغب۔ *** (بعض نے کہا ہے کہ یہاں اہل کے معنے سزاوار۔ شایان شان ہیں۔ غریب القرآن از مرزا ابوالفضل)

جو ارباب بست و کشاد کے پاس بطور (Trust) ہوتی ہیں۔ مثلاً اختیارات وغیرہ، تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ چیزیں ان لوگوں کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں۔ نا اہلوں کے سپرد مت کرو۔

قرآن کریم میں اَهْلُ الْكِتَابِ کا ذکر بڑی کثرت سے آیا ہے۔ اس زمانے کے عربوں میں دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو کسی نہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے۔ یہ اَهْلُ الْكِتَابِ کہلاتے تھے۔ اور دوسرے وہ جو کسی آسمانی کتاب کو نہیں مانتے تھے۔ انہیں بالعموم مُشْرِكِيْنَ کہکر پکارا گیا ہے۔ (اگرچہ جہانتک شرک کا تعلق ہے ان اہل کتاب میں بھی شرک کے عقائد پائے جاتے تھے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ش۔ ر۔ ک۔) عرب کے غیر اہل کتاب کو اُمِّيِّيْنَ بھی کہا گیا ہے۔ (دیکھئے عنوان ا م م) ان تمام گروہوں میں سے جو لوگ رسول اللہ پر ایمان لے آتے مومنین کہلاتے تھے، اور جو اس جماعت سے باہر رہ جاتے تھے کافرین کہلاتے تھے۔

لہذا رسول کا اہل وہ ہے جو اسکی پیروی کرے ($\frac{۲۷}{۸۴}$)۔ نیز (جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے) اسکے معنے حقدار، مالک اور ان کے بھی ہیں جو کسی کام کی اہلیت رکھیں ($\frac{۳}{۵۸}$)۔

او (حرف)

اَوْ۔ "یا" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) شک کے لئے۔ مثلاً لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ($\frac{۱۸}{۱۹}$)۔ ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں۔ یعنی کہنے والے کو یقینی طور پر علم نہیں کہ ان دونوں میں سے کونسی ایک بات ہوئی ہے۔

(۲) جب دو چیزوں میں اختیار دیا جائے کہ چاہے یہ کر لو اور چاہے وہ کر لو۔ تَزَوَّجْ هِنْدًا اَوْ اُخْتَهَا۔ چاہے ہندہ سے شادی کر لو اور چاہے اس کی بہن سے۔ قرآن کریم میں اس کی متعدد مثالیں ہیں۔

(۳) جب اس کے پہلے نفی آ جائے تو اَوْ سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ دونوں چیزوں میں سے ایک بھی نہیں۔ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ($\frac{۲۴}{۷۶}$)۔ تم نہ کسی آثم کی اطاعت کرو اور نہ کفور کی۔

(۴) "بلکہ"، کے معنوں میں۔ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ($\frac{۳۷}{۱۴۷}$) اور ہم نے اسے ایک لاکھ کی طرف بھیجا۔ بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ تھے۔

(۵) حتّٰی (یہاں تک کہ) کے معنوں میں۔ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ (۴۸/۱۶) تم ان کے ساتھ جنگ کرو یہاں تک کہ وہ تمہارے تابع فرمان ہو جائیں۔

(۶) ''کبھی یوں ہوا اور کبھی یوں ہوا'' کے معنوں میں۔ فَجَآءَ هَا بَاْسُنَا بَيَاتاً اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ۔ (۷/۴) ۔ سو ہمارا عذاب کبھی ان پر رات کے وقت آیا اور کبھی اس وقت جب وہ دوپہر کو آرام کر رہے تھے۔ یعنی کسی قوم پر رات کے وقت اور کسی قوم پر دوپہر کے وقت۔

ا و ب

اَلْاَوْبُ ۔ تیز دوڑتے وقت ٹانگوں کو لوٹا کر پیچھے لانا اور تیزی سے گھمانا ۔ اَلْاَوْبَاتُ ۔ ٹانگوں کو کہتے ہیں ۔ اَلتَّاوِيْبُ کے معنی ہیں دن بھر سفر کر کے رات میں ٹھہرنا ۔ رِيْحٌ مُؤَوِّبَةٌ ۔ اس ہوا کو کہتے ہیں جو دن بھر چلتی رہے* ۔ اَوْبٌ کے معنے لوٹنے اور رجوع کرنے کے بھی ہیں ۔ رُجُوْعٌ اور اَوْبٌ کے معنوں میں فرق یہ ہے کہ رُجُوْعٌ ارادہ و اختیار کے ساتھ یا بلا ارادہ لوٹنے کے لئے بولا جاتا ہے لیکن اَوْبٌ صرف صاحب ارادہ کیلئے ہوتا ہے ۔ یعنی کسی کی طرف بالا رادہ رجوع کرنا** ۔ اَلْمَاٰبُ ۔ پلٹنا اور رجوع کرنا ۔ نیز مستقر ۔ جہاں ٹھہرا جائے، جہاں کوئی چیز چھپ جائے ۔ یا وہ جگہ جہاں کوئی چیز پلٹ کر جائے ۔ چنانچہ کہتے ہیں بَيْنَهُمَا ثَلَاثُ مَآوِبَ ۔ ان دونوں (مقامات) کے درمیان تین ٹھہرنے کے مقامات (منازل یا پڑاؤ) ہیں* ۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ (۸۸/۲۵) ۔ ''ان کا لوٹنا ہماری ہی طرف ہے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ غلط راستے پر چل رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ یہ راستہ ہمیں زندگی کی خوشگواریوں کی طرف لے جائیگا ۔ یہ ان کی بھول ہے ۔ ان کا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھ رہا ہے جو ہم نے ان کے اعمال کے نتائج کے لئے مقرر کر رکھی ہے ۔ ان کا کوئی قدم ہمارے قانون مکافات کے احاطہ سے باہر نہیں جا سکتا ۔ یہ کشاں کشاں اسی کی طرف جا رہے ہیں ۔ اس لئے کہ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (۸۸/۲۶) ۔ ان کے ہر عمل کا حساب ہمارے قانون مکافات کے ذمے ہے ۔

* تاج ۔ ** راغب ۔

اس اعتبار سے حُسْنِ عمل کے نتائج کو حُسْنُ الْمَآبِ (۱۳/۳) کہا گیا ہے۔ یعنی خوشگواریوں کی توازن بدوش منزل۔ لیکن آخری مقام نہیں بلکہ راستہ میں ٹھہرنے کی منزل۔ اس لئے کہ قرآن کی رو سے جنت انسانی زندگی کے ارتقائی منازل میں سے ایک منزل ہے (تفصیل جنت کے عنوان میں ملیگی۔ دیکھئے۔ ج۔ ن۔ ن)۔

حضرت ایوب کے متعلق ہے، اِنَّهٗ اَوَّابٌ (۳۸/۴۴)۔ یعنی بڑی تیزی سے قانونِ خداوندی کی طرف دوڑنے والا۔ اطاعت گزار۔ انہی معانی میں حضرت داؤد کی قوم کے سرداروں سے کہا گیا کہ یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ (۳۴/۱۰)۔ '' داؤد کے ساتھ تم بھی نہایت سرگرمی سے قانونِ خداوندی کی اطاعت کرو ''۔ (لفظی اعتبار سے یٰجِبَالُ کے معنی ہیں '' اے پہاڑو ''۔ لیکن اس کے مجازی معنی سردارانِ قوم ہیں۔ دیکھئے عنوان۔ ج۔ ب۔ ل) ۔مزید براں دیکھئے تتمہ صفحہ ۱۸۱۳ جلد چہارم۔

ا و د

اَلْاَوْدُ۔ ٹیڑھا ہو جانا۔ الاَوْدُ: جھکانا اور ٹیڑھا کر دینا، گراں گذرنا۔ شاق گذرنا۔ بوجھل اور گرانبار کرنا۔ چنانچہ اَلْاَوْدَةُ بوجھ کو کہتے ہیں۔ کسی چیز کا بار بن جانا۔ اٰدَهٗ الْاَمْرُ۔ کسی معاملہ کی گراں باری نے اسکی کمر ٹیڑھی کردی۔ تَاَوَّدَهٗ الْاَمْرُ۔ اس معاملہ نے اسے جھکا دیا اور گرانبار کردیا۔*

لَا يَـؤُدُهٗ حِفْظُـهُمَا (۲/۲۵۵)۔ کائنات کا کنٹرول خدا پر قطعاً گراں نہیں گذرتا۔ اسپر بوجھ نہیں بن رہا۔ اصل میں اسکے بنیادی معنی کسی چیز کا مڑ کر جھک جانا یا ٹیڑھا ہو جانا ہیں (ابن فارس)۔ یعنی بوجھ سے جھک جانا اور ٹیڑھا ہو جانا۔

ا و ل

آلَ اِلَيْهِ اَوْلاً۔ اس کی طرف رجوع کیا۔ لوٹنا۔ آلَ عَنْهُ۔ اسکی طرف سے پھر گیا۔ اسکے بنیادی معنے لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں اَوَّلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ ضَالَّتَكَ۔ خدا تیری کھوئی ہوئی چیز کو تیری طرف لوٹا دے۔ مَآل کہتے ہیں اس نقطہ یا مقام کو جس کی طرف کوئی بات آخر الامر لوٹ کر آئے۔ انجام کار۔ کسی بات کا آخری نتیجہ۔ تَاَوِيْلٌ

* تاج و محیط۔

کسی بات کو اسکے صحیح رخ کیطرف پھیرنے کو کہتے ہیں ۔ اَوَّلَ الْکَلَامَ تَاْوِیْلًا ۔ اسنے بات کا نتیجہ اور اندازہ واضح کیا ۔ اسنے کلام (بات) کی ترجمانی کی ۔ *

آلَ عَلَی الْقَوْمِ کے معنے ہیں وہ قوم کا والی اور حاکم بن گیا ۔ آلَ الْمَالَ وَ اِئْتَالَہٗ ۔ اس نے مال کی خبر گیری کی ۔ اسکا انتظام کیا ۔ اسے درست کیا ۔ اَلْاِیَالَۃُ ۔ سیاست ۔ حدود مملکت ۔**

آلَ کے معنی کم ہو جانا اور نجات پانا بھی ہوتے ہیں ۔ *

اَوَّلٌ ۔ آخِرٌ کی ضد ہے (۵۷/۳)۔ سب سے پہلا ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ کے معنی یہ ہیں کہ میں سب سے پہلے قوانین خداوندی کے سامنے جھک کر دوسروں کے لئے نمونہ یا مقتدا بنتا ہوں ۔

قرآن میں خدا کے لئے اَلْاَوَّلُ آیا ہے ۔(۵۷/۳) اس سے اسکی وہ لامحدودیت (Infinity) مراد ہے جس کا احاطہ انسانی ذہن نہیں کرسکتا ۔

اَوِلَ الرَّجُلُ یَاْوَلُ اَوَلًا ۔ وہ سابق ہو گیا ۔ سب سے پہلے نمبر پر ہو گیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ابتدائے امر اور انتہائے امر دونوں کے آتے ہیں ۔ اُوْلٰی اس کی تانیث ہے ۔ * اَلْاٰخِرَۃُ وَالْاُوْلٰی (۵۳/۲۵)۔ آلٌ ۔ آدمی کے اہل و عیال نیز رفقا ۔ متبعین ۔ آلٌ کا استعمال شرفاء ھی میں ہوتا ہے ، اراذل میں نہیں ہوتا ۔ * قرآن میں آلِ یَعْقُوْبَ (۱۹/۶ میں) اولاد کے معنوں میں آیا ہے ۔ اور رفقا اور متبعین کے معنے میں آلَ فِرْعَوْنَ (۲/۴۹ میں) ۔ اَلْاٰلَۃُ ۔ حالت ۔ اوزار ۔ اسکی جمع آلَاتٌ ہے ۔*

قرآن میں تَاْوِیْلٌ کا لفظ بات کے آخری نتیجہ کیلئے استعمال ہوا ہے ۔ انجام کار ۔ مآل کار ۔ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (۴/۵۹) ۔ ’’یہ روش سب سے بہتر ہے اور اسکا نتیجہ نہایت عمدہ نکلیگا،، ۔ ھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِیْلَہٗ (۷/۵۳) ’’اب انہیں صرف اسکا انتظار ہے کہ اس کتاب کے دعاوی کی صداقت ان کے سامنے آجائے ،، ۔ یعنی اس کتاب نے ان کے اعمال کے جو نتائج بتائے تھے وہ انکے سامنے آجائیں ۔ حضرت موسیٰؑ اور ان کے ہم سفر بزرگ کے قصے کے آخر میں ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ سَاُنَبِّئُکَ بِتَاْوِیْلِ مَالَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَیْہِ صَبْرًا (۱۸/۷۸) ۔ ’’میں اب تجھے ان باتوں کی حقیقت کی خبر دیتا ہوں جسے معلوم کرنے کیلئے تو

* تاج ۔ ** تاج و محیط ۔

اسقدر مضطرب و بیقرار تھا،،۔ حضرت یوسف؏ کے متعلق حضرت یعقوب؏ نے کہا تھا کہ وَ یُعَلِّمُکَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ (۱۲/۶)۔ خدا تجھے ایسی بصیرت و فراست عطا کریگا کہ تو بات سنکر فوراً اسکی تہ تک پہنچ جایا کریگا۔ معاملات کے آغاز پر نگاہ ڈالکر ان کے انجام تک پہنچ جایا کریگا۔ تمہاری فراست کی یہ کیفیت ہوگی۔ کہ خارے دید و احوالِ چمن گفت۔ خواب کی تعبیر کو بھی اسی لئے تَاْوِیْل کہتے ہیں (۱۲/۴۴) کہ اس سے انسان خواب کے مبہم اشارات سے اس کی حقیقت کا اندازہ لگا لیتا ہے۔

قرآن کریم میں اٰیاتِ متشابہات کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗ اِلَّا اللّٰہُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (۳/۶)۔ یعنی یہ بات کہ فلاں تشبیہ اور مثال سے اصلی مقصود کیا ہے اس کا علم خدا کو ہوتا ہے یا ان لوگوں کو جو علم میں پختگی حاصل کرتے رہتے ہیں۔(مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ش۔ب۔ہ اور ح۔ک۔م)۔

اُولَاءِ (اسم)

اُولَاءِ۔ یہ سب (جمع)۔ اس کا واحد ذَا آتا ہے (دیکھئے ذا۔)

اُولٰٓئِکَ۔ وہ سب (جمع)۔ اس کا واحد ذَاکَ اور ذَالِکَ آتا ہے۔ (دیکھئے ذا۔)

اُولٰٓئِکُمْ۔ وہ سب۔ مثلاً (۴/۹۱) میں۔ یہ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے آتا ہے۔ اس پر ہائے تنبیہ بھی آتی ہے، جیسے ھٰٓؤُلَاءِ بَنَاتِیْ (۱۱/۷۸)۔ یہ میری بیٹیاں ہیں۔

اُولُوْا (اسم)

اُولُوْا۔ بمعنی ،، والے،،۔ (جمع مذکر)۔ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳۹/۱۸)۔ عقل و بصیرت والے (نصب اور جرمیں) اُولِی الْاَلْبَابِ (۳۸/۴۳)۔ ان کا واحد ذُوْ آتا ہے (دیکھئے۔ ذُوْ)

اُولَاتُ۔ جمع مؤنث۔ (واحد ذَاتُ)۔ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ (۶۵/۴) حمل والیاں۔

ا۔و۔ن

اٰلْاٰنَ۔ وہ وقت جسمیں تم موجود ہو*۔ اب۔ اسوقت۔ اَلْاٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ (۲/۷۱) ،،اب تم سچی بات لائے،،۔

---

* تاج۔

ا و ہ

آہِ ۔ آوّہٌ ۔ آوِہِ ۔ یہ تمام کلمات شکایت اور درد کے وقت بولے جاتے ہیں ۔ آلاَوّاہٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ تاَوّہٌ کرتا ہو۔ تاَوّہٌ کے معنی ہیں آوّہ کہنا ۔ یعنے حزن اور غم کا اظہار کرنا ۔ آہیں بھرنا ۔ لہذا اس سے مراد ہوتا ہے ایسا شخص جو بہت رقیق القلب ہو اور لوگوں کی حالت پر بہت زیادہ متأسف اور ان کا غمخوار ہو* ۔ ویسے سمجھدار اور فقیہ کو بھی کہتے ہیں اور بہت دعائیں کرنے والے کو بھی* ۔ حضرت ابراہیم کے متعلق ہے کہ وہ آوّاہٌ حَلِیْمٌ (۹/۱۱۴) تھے۔ رحمدل ۔ غمخوار ۔ دوسروں کی مصیبت پر متأسف ہونے والے ۔

ا و ی

آوَیْتُ مَنْزِلِیْ ۔ میں اپنے گھر میں اترا ۔ یا اس کی طرف لوٹا ۔ یا اس میں رہا ۔ یہ سب معنے آتے ہیں ۔ یہیں سے آوَیٰ اِلَیْہِ کے معنی ہیں اس کی طرف جھکا اور مائل ہو گیا* ۔ آوَیْتُ لَہٗ ۔ مجھے اس پر رحم آ گیا ۔ یعنے رَجَعْتُ اِلَیْہِ بِقَلْبِیْ ۔ میں اس کی طرف اپنے دل سے مائل ہوا** ۔ اَلْمَاْوٰی ۔ وہ جگہ جہاں کوئی چیز رات کو یا دن کو لوٹے ۔ وہ جگہ جہاں اونٹ رات کو آرام کرنے کے لئے ہوتیں* ۔ الاُوِیُّ ۔ ایک جھنڈ میں اکٹھے رہنے والے پرندوں کو کہا جاتا ہے ۔ اَلْمَاْوٰی ۔ اس باغیچہ کو بھی کہا جاتا ہے جہاں رات گذاری جائے ۔ آوَیْتُہٗ ۔ میں نے اسے گھر میں اتارا* ۔ (نیز دیکھئے عنوان ث ۔ و ۔ ی) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) اکٹھا ہو جانا ۔ اور (۲) رحم اور ڈر کے ہیں ۔ سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت نوح کے بیٹے نے کہا سَاٰوِیْ اِلٰی جَبَلٍ (۱۱/۴۳) ۔ '' میں پہاڑ کی طرف پناہ لینے کے لئے مراجعت کرونگا'' ۔ سورۃ مومنون میں ہے آوَیْنٰھُمَا (۲۳/۵۰) ۔ '' ہم نے (عیسی اور مریم کو) پناہ دی ،، ۔ سورۃ احزاب میں تُئْوِیْ بمقابلہ تُرْجِیْ آیا ہے (۳۳/۵۱) ۔ یعنی اپنے پاس جگہ دینا ۔ سورۃ انفال میں ہے ۔ فَاٰوٰکُمْ (۸/۲۶) ۔ '' اللہ نے تمہیں پناہ دی ،، ۔ قرآن نے جنت کو اَلْمَاْوٰی کہا ہے (۵۳/۱۵) ۔ یعنی وہ مقام جہاں اس اطمینان سے رہا جائے کہ یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ۔ جہاں یہ خوف نہ ہو کہ کوئی اچک

---

* تاج ۔ ** راغب ۔

کرلے جائیگا (۸/۴) ۔ لیکن جہنم کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے ۔ وَمَاْوٰهُمُ النَّارُ (۳/۱۵۰) ۔ جہاں اس کے معنی مطلق رہنے کی جگہ کے ہیں ۔ اس لئے نہ مادہ کے اعتبار سے مَاْوٰی، ہر منزل ، مرجع یا مسکن کو کہینگے ۔

اِیْ (حرف)

اِیْ ۔ ہاں ۔ قُلْ اِیْ وَرَبِّیْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ (۱۰/۵۳) ۔ ان سے کہو کہ ہاں ۔ بیشک یہی بات ہے ۔ میرا رب اس پر شاہد ہے کہ یہ یقیناً حق ہے ۔ اِیْ کے بعد قسم کا آنا ضروری ہے ۔

ا ی د

اٰدَ ۔ یَئِیْدُ ۔ اَیْدًا ۔ مضبوط اور قوی ہونا ۔ سخت ہونا ۔ اَلْاٰدُ سختی اور قوت ۔ یہی معنے اَلْاَیْدُ کے ہیں ۔ ذَا الْاَیْدِ ۔ صاحبِ قوت ۔ اَیَّدْتُہٗ، تَاْیِیْدًا ۔ کسی چیز کو بہت زیادہ تقویت دینا ۔ اَلْاِیَادُ ۔ جس چیز سے کسی کو تقویت دی جائے ۔ مٹی جو خیمہ کے کنارے لگائی جائے تا کہ بارش کا پانی اس کے اندر نہ جائے ۔ بلند ٹیلہ ۔ محکم پہاڑ * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قوت اور حفاظت کے ہوتے ہیں ۔

وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (۲/۸۷) ۔ " اور ہم نے عیسیٰؑ کو روح القدس کے ذریعہ تقویت دی " ۔ وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْىدٍ (۵۱/۴۸) ۔ " ہم نے اجرام فلکی کو بڑی قوت کے ساتھ بنایا ہے " ۔

(اَیْدٍ ۔ یَدٌ (ہاتھ) کی جمع ہے ۔ دیکھئے عنوان ی ۔ د ۔ ی)

ا ی ک

اَلْاَیْکُ ۔ بہت سے گھنے درخت ۔ درختوں کا جھنڈ ۔ وہ بن جس میں بیری وغیرہ کے درخت اُگتے ہوں ۔ درختوں کی کثرت، خواہ وہ کسی قسم کے درخت ہوں ۔ اَیْکَۃٌ واحد ہے * ۔ قرآن کریم میں اَصْحٰبُ الْاَیْکَۃِ (۱۵/۷۸) اہل مدین کیلئے آیا ہے جو گھنے جنگلوں میں رہتے تھے ۔ (نیز دیکھئے عنوان اصحاب الایکۃ)

ا ی م

اَلْاِیَامُ ۔ دھوئیں کو کہتے ہیں اور اٰمَ یَئِیْمُ ۔ وَیَؤُوْمُ اِیَامًا کے معنے ہوتے ہیں اس نے شہد کا چھتہ اتارنے کے لئے شہد کی مکھیوں کو

---

* تاج ۔ محیط و راغب

دھونی دی تاکہ مکھیاں اڑ جائیں اور چھتہ خالی رہ جائے۔ اس سے اَلْاَیِّمُ اس عورت کو کہتے ہیں جس کا شوہر نہو۔ اسکی جمع الاَیَامٰی ہے۔ عربوں میں محاورہ تھا کہ اَلْحَرْبُ مَاْیَمَۃٌ لِلنِّسَاءِ ۔ جنگ عورتوں کو بیوہ کر دیتی ہے*۔ قرآن کریم میں ہے وَ اَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ (۲۴/۳۲) جو تم میں مجرد ہوں (خواہ عورتیں خواہ مرد ۔ غیر شادی شدہ ہوں یا رنڈوے مرد اور بیوہ عورتیں ، اس میں سب داخل ہیں **) انکی شادی کر دیا کرو ۔ اس سے واضح ہے کہ اسلامی معاشرہ کے فرائض میں سے یہ بھی ہے کہ وہ ایسے حالات اور سہولتیں پیدا کرے جن میں افراد معاشرہ ازدواجی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں ۔

اَیْنَ

اَیْنَ ۔ کہاں ، کدھر ، کس طرف ، کس جگہ ۔ اَیْنَمَا کے معنی ہیں ، جدھر ، جہاں کہیں ۔ اَیْنَ الْمَفَرُّ ؟ مفر کہاں ہے (۷۵/۱۰) اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یَاْتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیْعاً ...... (۲/۱۴۸) ۔ جہاں کہیں بھی تم ہو گے اللہ تمہیں اکٹھا کریگا ۔

اَیّ

اَیٌّ ۔ بمعنی کون ۔ کیا ۔ کونسا (استفہام کے لئے) ۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ (۷۷/۵۰) ۔ اس کے بعد یہ لوگ اور کس بات پر ایمان لائینگے ۔ اَیًّامَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی (۱۷/۱۱۰) ۔ تم اسے جس نام سے بھی پکارو ۔ اسماء حسنیٰ سب اس کے لئے ہیں ۔

(۲) ندا (پکارنے) کے لئے ۔ اَیُّھَا النَّاسُ ۔ اے لوگو !

اِیّا ۔ (حرف)

اِیَّا ۔ اسمیں تخصیص کا مفہوم پایا جاتا ہے ۔ یہ تنہا نہیں آتا بلکہ ضمیر کے ساتھ آتا ہے ۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ (۱/۴) ۔ ''ہم تیری ہی محکومی اختیار کرتے ہیں ۔'' فَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ (۱۶/۵۱) ۔ ''سو مجھ ہی سے ڈرتے رہو''۔ نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَاِیَّاھُمْ (۶/۱۵۲) ۔ ''ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی''۔

* تاج و محیط و راغب ۔ ** ابن فارس۔

اَیَّانَ

آیَّانَ (اَیٌّ + آنٌ) کب۔ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ اَیَّانَ مُرْسٰـھَا (۷/۱۸۷)۔ یہ تجھ سے پوچھتے ھیں کہ انقلاب کی گھڑی کب آئیگی؟

ایوب علیہ السلام

حضرت اسحٰقؑ کے دو بیٹے تھے۔ حضرت یعقوبؑ اور عیسو۔ عیسو اپنے چچا حضرت اسمٰعیلؑ کے ھاں چلے گئے اور ان کی صاحبزادی سے شادی کر لی۔ ان کی متعدد اولادیں ھوئیں جن میں سے عمالق اور عوض مشہور ھیں۔ عیسو کا عرف، ادوم (سرخ گوں) تھا اس لئے یہ خاندان ادوسی کہلایا۔ بحرمیت اور خلیج عقبہ کا درمیانی علاقہ ان کا مسکن تھا۔ تورات میں اس کا نام کوہ سعیر آیا ھے۔ اس کا دارالحکومت رقیم (پٹرا) تھا۔ حضرت ایوبؑ، عوض کے قبیلہ سے متعلق تھے۔ تورات میں سفر ایوب ان کی طرف منسوب ھے۔ یوباب، اوب اور ایوب ایک ھی نام ھے۔ ان کا زمانہ ۱۰۰۰ اور ۷۰۰ ق۔م کے درمیان سمجھئے (اگرچہ بعض ارباب تحقیق کا خیال ھے کہ آپ کا زمانہ حضرت موسٰیؑ سے پہلے کا ھے)۔ سفر ایوب میں ان کا تفصیلی قصہ مذکور ھے اور (تورات کے عام انداز کے مطابق) اس میں زیب داستان کے لئے بھی بہت کچھ بڑھایا چڑھایا گیا ھے۔ قرآن کریم نے آپ کی زندگی کا صرف ایک واقعہ بیان کیا ھے جس میں بتایا گیا ھے کہ آپ پر ایک زمانہ سخت مصیبت اور پریشانی کا گزرا۔ لیکن آپ نے ان مصائب کو بڑی ھمت اور استقامت سے برداشت کیا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے (۲۱/۸۳-۸۴ ، ۳۸/۴۱-۴۴)۔

قرآن کریم نے (دیگر مقامات میں) آپ کا نام زمرۂ انبیاءِ کرامؑ میں شمار کیا ھے۔ مثلاً (۶/۸۵) میں جہاں یہ بھی بتایا گیا ھے کہ آپ حضرت ابراھیمؑ کی نسل میں سے تھے۔

ا ی ی

آیَۃٌ۔ ظاھری علامت یا نشانی کو کہتے ھیں۔ چنانچہ راستہ کے نشانات کو آیَاتٌ کہتے ھیں۔ درحقیقت آیَۃٌ ھر اس ظاھر شے کو کہتے ھیں جو کسی چھپی ھوئی شے کا لازمی خاصہ ھو اور جب کوئی شخص اس ظاھری شے کا ادراک کر لے تو وہ جان لے کہ اس نے اس پوشیدہ شے کا ادراک یا اندازہ کر

لیا ہے*۔ خدا کی ذات، انسانی ادراک کے احاطہ کے اندر نہیں آسکتی۔ لہذا اسکے متعلق ان ظاہری علامات ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو کائنات میں بکھری پڑی ہیں۔ اسلئے یہ کائنات اور اسکی تمام اشیاء آیَاتُ اللہِ ہیں۔ یہ وہ نشانات راہ ہیں جس سے ہم آس '' منزل ،، کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ انسانوں کی دنیا میں وحی، خدا کی سب سے بڑی نشانی ہوتی ہے اسلئے یہ بھی آیَاتُ اللہِ ہے۔ قرآن کریم کے ہر ٹکڑے کو آیَۃٌ کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے پیغام (رِسَالَۃٌ) کو بھی آیَۃٌ کہتے ہیں**۔ حتٰی کہ جب حضرت صالحؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ یہ دیکھنے کیلئے کہ تم قانون خداوندی کا احترام کرتے ہو یا نہیں میں نے یہ طے کیا ہے کہ اس اونٹنی کو کھلا چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے اسکی باری پر اسے پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائیگا کہ تم قانون خداوندی کا پاس رکھتے ہو اور اگر تم نے اسے روکا تو یہ اسکی علامت ہوگی کہ تم اس قانون کا کوئی پاس نہیں کرتے۔ اس اعتبار سے اس اونٹنی کو آیَۃ کہا گیا۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللہِ لَکُمْ آیَةً ($\frac{۷}{۷۳}$) '' یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے نشانی ہے ،،۔ اسی طرح حضرت نوحؑ کی کشتی کو بھی آیَةً لِّلْعَالَمِیْنَ ($\frac{۲۹}{۱۵}$) کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اس غیر مرئی حقیقت کی نشانی تھی کہ جو قوم قانون خداوندی کا اتباع کریگی وہ خطرات سے محفوظ رہیگی۔ مختصراً یہ کہ ہر وہ محسوس شے جو انسان کی توجہ کو خدا اور اس کے قانون کی طرف منعطف کر دے آیَۃُ اللہِ ہے۔ نیز فکری دلائل بھی آیَۃُ اللہ ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ صاحب محیط کے نزدیک معقولات پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ وَجَعَلْنَا اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ آیَتَیْنِ ($\frac{۱۷}{۱۲}$) میں انہی فکری دلائل کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ان سے انسان فکری طور پر اس حقیقت تک پہنچتا ہے کہ کائنات جامد (Static) نہیں بلکہ متحرک (Dynamic) ہے۔ سورۃ شعراء میں آیَۃٌ کا لفظ اس عمارت وغیرہ کیلئے استعمال ہوا ہے جسے کسی کی یادگار (Memorial) کے طور پر بنایا جاتا ہے۔ ($\frac{۲۶}{۱۲۸}$)۔

اِیَا النَّبَاتِ۔ پودوں کے پھول اور خوبصورتی کو کہتے ہیں**۔ اِیَا الشَّمْسِ۔ سورج کی کرنوں کو کہتے ہیں***۔

تَاَیَّا کے معنی ہیں کسی جگہ ٹھہرنا۔ تَاَیَّا بِالْمَكَانِ وہ اس جگہ ٹھہرا اور دیر لگا دی ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) ٹھہر کر غور و فکر کرنا۔ اور (۲) قصدو ارادہ کرنا ہیں۔

* راغب و تاج و محیط۔ ** لین۔ *** تاج و محیط۔

''ٹھہر کر غور و فکر کرنے'' کی خصوصیت سے آیۃ کے مفہوم پر بڑی بلیغ روشنی پڑتی ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں ہر ایک آیۃ اللہ ہے لیکن یہ اسی کے لئے آیت ثابت ہو سکتی ہیں جو ان پر ٹھہر کر، رک کر، غور و فکر کریگا ۔ اس غور و فکر سے اس کی توجہ ان اشیاء کے خالق کی طرف منعطف ہو جائیگی ۔ اسی طرح قرآن کریم کی آیات پر بھی رک کر، غور و فکر سے انسان اصل مقصود کو پا سکتا ہے ۔ اگر کسی آیت پر رک کر، غور و فکر نہ کیا جائے تو وہ انسان کو اصل و غایت کا پتہ نشان نہیں دے سکتی ۔ یعنی وہ حقیقی معنوں میں '' آیت '' نہیں بنتی ۔

———:o:———

ب

ب (حرف)

ب - حرف جر ہے - ذیل کی مثالوں سے اس کا استعمال اور مفہوم واضح ہو جائیگا -

(۱) اردو میں کہتے ہیں "میں نے زید کو پکڑا" - عربی میں کہینگے - اَمْسَكْتُ بِزَيْدٍ - قرآن کریم میں ہے - فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ (۴/۴۳) "اپنے چہروں کو (پر) مسح کر لو" -

(۲) اردو میں کہتے ہیں "میں زید کے پاس سے گذرا" - عربی میں کہینگے - مَرَرْتُ بِزَيْدٍ - قرآن کریم میں ہے اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ (۲۵/۷۲) "جب وہ لغو کے پاس سے گزرتے ہیں" -

(۳) فعل لازم کو متعدی بنانے کے لئے - مثلاً - ذَهَبَ زَيْدٌ کے معنی ہیں زید گیا - یہ فعل لازم ہے - ذَهَبْتُ بِزَيْدٍ کے معنی ہونگے - میں زید کے ساتھ گیا یعنی زید کو لے گیا - اس طرح یہ فعل لازم سے متعدی بن گیا - قرآن کریم میں ہے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ (۲/۱۷) "اللہ ان کی روشنی کو لے گیا" -

(۴) سبب کو ظاہر کرتا ہے - مثلاً اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ (۲/۵۴) - "تم نے بچھڑے کی پرستش کی وجہ سے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے" -

(۵) "کے ساتھ" کے معنوں میں- يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا (۱۱/۴۸) "اے نوح! ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اتر جا" - یا عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶/۴) - "اس نے قلم کے ذریعے سکھایا" -

(۶) وقت یا جگہ بتانے کے لئے بمعنی فِیْ (میں)۔ مثلاً نَجَّیْنٰهُمْ بِسَحَرٍ (۵۴/۳۴) ۔ "ہم نے انہیں صبح کے وقت بچا لیا"۔ اور وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ - (۳/۱۲۲) "یقیناً اللہ نے بدر کے میدان میں تمہاری مدد کی ہے"۔

(۷) "کسی چیز کے عوض"۔ اِشْتَرَیْتُهٗ بِاَلْفِ دِرْهَمٍ۔ میں نے اسے ایک ہزار درہم کے عوض خریدا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ (۱۲/۲۰)۔ "اور انہوں نے اسے (حضرت یوسف کو) تھوڑی سی قیمت کے عوض بیچ ڈالا"۔

(۸) عَلٰی (اوپر) کے معنوں میں۔ لَوْ تُسَوّٰی بِهِمُ الْاَرْضُ (۴/۴۲)۔ "اگر (یا اے کاش) ان پر (ان کے اوپر) زمین ہموار کر دی جاتی"*۔

(۹) عَنْ (سے) کے معنوں میں۔ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا۔ (۲۵/۵۹) "اس کے متعلق اس سے پوچھو جو خبر رکھتا ہے"۔

(۱۰) مِنْ (سے) کے معنوں میں۔ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ (۷۶/۶)۔ "چشمہ جس سے اللہ کے بندے پیتے ہیں"۔

بعض کا خیال ہے کہ جس طرح مِنْ تبعیض کے لئے آتا ہے۔ اسی طرح ب بھی تبعیض کے لئے آتا ہے۔ تبعیض کے معنی ہیں، کسی چیز کا بعض۔ یعنی کچھ حصہ۔ پورا نہیں، بلکہ اس کا بعض حصہ۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ قرآن کریم میں جو آیا ہے وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ (۵/۶) تو اسکے معنی ہیں "سر کے کچھ حصہ کا مسح کر لیا کرو"۔ لیکن یہ صرف بعض کا خیال ہے (مغنی اللبیب)۔

(۱۱) بعض مقامات پر یہ حرف زائد ہوتا ہے۔ یعنی اسکے معنی کچھ نہیں ہوتے۔ جیسے كَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا (۴۸/۲۸)۔ "اللہ کافی شاہد ہے"۔ اگر كَفٰی اللّٰهُ شَهِیْدًا کہیں تو بھی وہی معنی ہونگے۔

(۱۲) میرزا ابوالفضل نے (غریب القرآن میں) لکھا ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ میں بِ کے معنی استعانت کے ہیں۔ یعنی مدد طلب کرنے کے۔

(۱۳) بِاللّٰهِ کے معنی ہیں اللہ کی قسم۔ یعنی بِ قسم کے معنوں میں بھی آتی ہے۔

ب أ ر

اَلْبِئْرُ۔ کنواں۔ اَلْمِئْبَرُ در اصل اس گڑھے کو کہتے ہیں جسکا منہہ اسطرح ڈھانپ دیا جائے کہ جو شخص اسکے اوپر سے گذرے اسمیں گر

* اس کا مجازی مفہوم کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ دیکھئے عنوان (س۔ و۔ ی)

جائے* ۔ قرآن کریم میں بِئْرٍ مُعَطَّلَةٍ آیا ہے (۲۲/۴۵) ۔ "اندھے (بیکار) کنویں" ۔

ب أ س

بِئْسَ ۔ (بُرا) ویسے تو فعل ماضی ہے لیکن اسکی گردان مستعمل نہیں ۔ یہ بَئِسَ سے اسی طرح بنا لیا گیا ہے جسطرح نَعِمَ سے نِعْمَ ۔ یہ دونوں فعل (بِئْسَ اور نِعْمَ) ذم اور مدح کیطرف منتقل کر لئے گئے ہیں اسلئے حروف کے مشابہ ہوگئے ہیں ۔ بِئْسَ کے ساتھ بعض اوقات مَا بھی آتا ہے ۔ بِئْسَمَا (۲/۹۰) ۔*

اَلْبَأْسُ کے معنے ہیں سخت مصیبت ۔ جنگ میں شدت ۔ سختی ۔ قوت ۔

لَا بَأْسَ عَلَیْکَ ۔ یعنی لَاخَوْفَ ۔ بَؤُسَ الرَّجُلُ ۔ آدمی بہادر ہوگیا ۔ بَئِسَ الرَّجُلُ بُؤْسًا ۔ آدمی سخت ضرورت مند ہو گیا ۔ اَلْبَأْسَاءُ شدت ۔ عَذَابٌ بَئِیْسٌ ۔ سخت عذاب ۔ وہ عذاب جس میں معیشت کی تنگی شامل ہو ۔ اَلْبَأْسَاءُ کے معنے بھوک کے بھی ہوتے ہیں ۔* صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْبَأْسَاءُ مال و دولت کے نقصان کو کہتے ہیں اور اَلضَّرَّاءُ جسمانی نقصان کو ۔ مثلاً بیماری ۔**

اَلْمُبْتَئِسُ ۔ غمگین و حزین کو کہتے ہیں *

قرآن کریم میں بَأْسًا شَدِیْدًا بمقابلہ أَجْرًا حَسَنًا آیا ہے (۱۸/۲) ۔ یہاں اسکے معنی غلط اعمال کے نا خوشگوار نتائج ہیں ۔ سورۃ اعراف میں ہے فَجَآءَھَا بَأْسُنَا (۷/۴) ۔ "جب اس بستی پر ہمارا عذاب آیا" ۔ یعنے قانون مکافات کی رو سے سخت مصیبت آ گئی جو ان کی بد اعمالیوں کا نتیجہ تھی ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ان طاقتور جنگجو قسم کے لوگوں کے لئے اُولِیْ بَأْسٍ (۱۷/۵) آیا ہے جو سخت مصیبتیں لاتے تھے ۔ سورۃ حدید میں فولاد کے متعلق ہے فِیْهِ بَأْسٌ شَدِیْدٌ (۵۷/۲۵) ۔ "اسمیں بڑی سختی ہے" ۔

اِبْتِئَاسٌ کے معنی ہیں برا ماننا ۔ غمگین ہونا ۔ سورۃ ھود میں حضرت نوحؑ سے کہا گیا ہے کہ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ (۱۱/۳۶) ۔ "یہ مخالفین جو کچھ کرتے ہیں اسکی وجہ سے تو غمناک نہ ہو" ۔ یا ان کے متعلق دل گرفتہ نہ ہو (کہ یہ ھلاک ہو جائینگے ۔ ان کے اعمال ہی ایسے ہیں) ۔

---

* تاج ۔ ** محیط ۔

بَابِلْ

قدیم کلدانی تہذیب کا مرکز؛ شہر بابل۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر سحر و کہانت کے اُن افسانوں کے ضمن میں کیا ہے جنہیں یہودی لٹریچر میں حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور جن کی تردید قرآن نے کی ہے۔ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ (۲/۱۰۲)۔ ''اور بابل میں ہاروت و ماروت (مزعومہ) فرشتوں پر بھی کوئی ایسی بات نازل نہیں کی گئی تھی''۔ یہ سب ان شیاطین (شریر لوگوں) کے خود ساختہ افسانے تھے۔

ب ت ر

اَلْبَتْرُ۔ کسی چیز کو اسکی تکمیل سے پہلے ہی کاٹ ڈالنا۔ (ابن فارس) دم کو جڑ سے کاٹ دینا۔ سَيْفٌ بَاتِرٌ۔ کاٹ ڈالنے والی تلوار۔ اَلْاَبْتَرُ۔ نامراد۔ فقیر جسکے پاس کچھ نہ ہو۔ بے اولاد۔ جسکی نسل کی جڑ کٹ جائے۔ وہ جس کی موت کے بعد اس کا نام و نشان اور ذکر خیر تک باقی نہ رہے*۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (۱۰۸/۳)۔ '' تیرے مخالف کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ اس کا کہیں ذکر خیر نہیں ہوگا''۔ ''نام و نشان باقی نہ رہنے'' سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ان کی وہ قوت و شوکت جس کی بنا پر وہ اسقدر مخالفت کرتے ہیں سب ختم ہو جائیگی اور انہیں زندگی کے خیر و برکت سے کوئی حصہ نہیں ملیگا۔

ب ت ک

بَتْكٌ کے بنیادی معنے کاٹنے کے ہیں، نیز کسی کے بال یا پر وغیرہ پکڑ کر اپنی طرف اس طرح کھینچنا کہ وہ جڑ سے اکھڑ جائیں۔ چنانچہ اَلْبِتْكَةُ ان اکھڑے ہوئے پروں یا بالوں کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے بَتَكَ کے معنے ہونگے جڑ سے اکھیڑ دینا، لیکن اسکے عرفی معنے ہیں جانوروں کے کان کاٹ کر یا چیر کر (انہیں بتوں کے نام پر) چھوڑ دینا۔ یہ جاہلیت عرب کا رواج تھا*۔ سورہ نساء میں ہے فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْاَنْعَامِ (۴/۱۱۹) '' سو وہ جانوروں کے کان چیریں گے''۔

اَلسَّيْفُ الْبَاتِكُ۔ کاٹنے والی تلوار کو کہتے ہیں* ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کاٹنے کے لکھے ہیں۔

---

* تاج۔ محیط۔ راغب

ب ت ل

بَتَلَہٗ ۔ یَبْتُلُہٗ ۔ اس نے اسے قطع کر دیا ۔ فَانْبَتَلَ ۔ چنانچہ وہ جدا ہوگیا ۔ تَبَتَّلَ ۔ کے بھی یہی معنے ہیں ۔ اَلْبَتُوْلُ ۔ مردوں سے، یا از دواجی زندگی سے دور رہنے والی عورت ۔ اَلْمُبَتَّلَۃُ ۔ حسین عورت ۔ وہ عورت جس کے تمام اعضاء سڈول ہوں ۔ تَبَتَّلَتِ الْمَرْاَۃُ ۔ عورت نے اپنا بناؤ سنگھار کر لیا ۔ اَلْمُبْتَیِلُ ۔ منفرد ۔ اَلْبَتْلُ ۔ حق* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو اس کے ماسوا سے الگ کر لینے کے ہوتے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَ تَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا (۷۳/۸) ۔ ''سب سے کٹ کر ایک خدا کی طرف متوجہ ہوجا'' ۔ صرف اس کے نظام کے قیام کی کوششوں میں لگ جا ۔ کیونکہ اِنْبَتَلَ فِیْ سَیْرِہٖ '' کے معنے ہیں وہ کوشش کر کے تیز چلا* ۔

رسول اللہ ؐ کو جب نظام خداوندی کے اصول عطا کر دیئے گئے تو آپ کو حکم ہوا کہ اب اپنے مخلص رفقاء کو ایک جماعت کی شکل دے کر (دیکھئے عنوان ۔ ز ۔ م ۔ ل) اس نظام کی تشکیل میں مصروفِ عمل ہو جائیں ۔ ایسا کرنے میں ان مخالفین کی باتوں پر قطعاً دھیان نہ دھریں ۔ قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ (۶/۹۲) ۔ ''کہو ۔ اللہ ۔ اور ان مخالفین کو چھوڑ کر (..... اپنے پروگرام کی تکمیل میں لگ جاؤ)'' ۔

جب انسان اپنا نصب العین متعین کر لے تو اس کے بعد این و آن کے خیال کو چھوڑ کر اس نصب العین کو سامنے رکھکر، ہر قدم اس کی طرف اٹھانا چاہئے ۔ اور یہ سب کچھ حسن کارانہ انداز سے کرنا چاہئے کیونکہ تَبَتُّلٌ میں زیبائش و آرائش کا مفہوم بھی ہے* ۔

ب ث ث

بَثٌّ کے معنے ہیں کسی چیز کو منتشر اور پراگندہ کر دینا ۔ اس سے پھیلا دینے کے بھی معنے آ گئے ۔ اور بڑھا دینے (بکثرت پیدا کر دینے) کے بھی* ۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنے ایجاد کرنا اور پیدا کرنا ہیں ۔ راغب نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے

---

* تاج ۔

اور لکھا ھے کہ بَثٌّ کے معنے کسی چھپی ہوئی چیز کے ظاہر کر دینے کے بھی ہوتے ہیں ۔ اس لئے اس سے مراد ایسی چیزوں کو نمودار کر دینا ھے جو پہلے موجود نہ تھیں** ۔ ابن فارس نے بھی کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی ظاہر کر دینا اور منتشر کر دینا ہیں ۔

بَثَّ الْغُبَارَ ۔ غبار اڑانا ۔ بَثَثْتُكَ السِّرَّ ۔ میں نے تجھ پر راز ظاہر کر دیا ۔ اَبْثَثْتُكَ ۔ میں نے تجھ پر اپنا غم ظاہر کر دیا* ۔ اسی سے اَلْبَثُّ سخت ترین غم کو کہتے ہیں جو چھپا نہ رہ سکے* ۔ سورۃ بقرۃ میں ھے ۔ وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ (۲/۱۶۴) ۔ ''خدا نے زمین میں ہر قسم کے حرکت کرنے والے جان داروں کو پھیلا دیا ۔ بکثرت پیدا کر دیا'' سورۃ القارعۃ میں ھے كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ (۱۰۱/۴) ۔ '' بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح '' ۔ سورۃ واقعہ میں هَبَآءً مُّنْبَثًّا (۵۶/۶) آیا ھے ۔ یعنی فضا میں منتشر ذرات ۔ سورۃ یوسف میں بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ اکٹھا آیا ھے (۱۲/۸۶) ۔ اس سے ظاہر ھے کہ بَثٌّ، حزن سے الگ اور شدید غم کا نام ھے ۔ ایسا غم جو چھپائے چھپ نہ سکے ۔

ب ج س

بَجَسَ الْمَآءُ ۔ پانی کا کسی چیز کو شق کر دینا اور اس میں سے پھوٹ کر بہہ نکلنا ۔ مَآءٌ بَجْسٌ ۔ اس طرح پھوٹ کر بہہ نکلنے والا پانی* ۔ قرآن کریم میں ھے فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ ..... (۷/۱۶۰) '' اس میں سے پانی کے چشمے پھوٹ بہے '' ۔ سورۃ بقرۃ میں اسے فَانْفَجَرَتْ کہا گیا ھے (۲/۶۰) ۔ راغب نے کہا ھے کہ اِنْبِجَاسٌ وہاں بولا جاتا ھے جہاں پانی کسی تنگ چیز میں سے نکل رہا ہو اور اِنْفِجَارٌ عام ھے*** ۔ لیکن ، جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے ، قرآن کریم نے دونوں الفاظ ہم معنے استعمال کئے ہیں ۔

ب ح ث

اَلْبَحْثُ ۔ مٹی میں کسی چیز کو تلاش کرنا ۔ یا مٹی کریدنا ۔ ابن فارس کے نزدیک یہی اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ اَلْبُحَاثَةُ ۔ کرید کر نکالی ہوئی مٹی ۔ اَلْبَحُوْثُ ۔ وہ اونٹ جو دوڑتا ہوا اپنے پاؤں سے مٹی پیچھے کی طرف

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔

اڑاتا جائے* ۔ اَلْبَحْثُ ۔ کان جس میں سونا چاندی تلاش کیا جائے** ۔ سورۃ مائدۃ میں ہے غُرَاباً یَبْحَثُ فِی الْاَرْضِ (۵/۳۱) ۔ "ایک کوّا زمین کو کرید رہا تھا" ۔ اَلْبَحِیْثُ راز کو کہتے ہیں* ۔

نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور حاء ساتھ آئیں ان میں تفتیش کا مفہوم مضمر ہوتا ہے ۔ یعنی ایک چیز سے دوسری چیز نکالنا ۔

ب ح ر

اَلْبَحْرُ ۔ وسیع پیمانے پرشق کرنے ۔ پھاڑنے یا چیرنے کو کہتے ہیں ۔ چنانچہ دریا یا سمندر کو بھی اسی لئے بَحْرٌ کہتے ہیں کہ وہ زمین میں کھدا ہوا ہوتا ہے ۔ کان کے چیرنے کو بھی بَحْرٌ کہتے ہیں ۔ چنانچہ وہ اونٹنی یا بکری جو دس بچے جن چکتی تھی اسکا کان چیر کر بتوں کے نام پر چھوڑ دیا کرتے تھے ۔ اسے بَحِیْرَۃٌ کہتے تھے* ۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور حاء ایک ساتھ ہوں ان میں تفتیش کا مفہوم مضمر ہوتا ہے ۔ یعنی ایک چیز سے دوسری چیز نکالنا ۔ ابن فارس نے (خلیل کے حوالے سے) کہا ہے کہ بَحْرٌ کو بحر اس کی وسعت کی بناء پر کہتے ہیں ۔ دریا ، جسکا پانی مسلسل بہتا رہے ، بَحْرٌ کہلاتا ہے ۔ (جیسے دجلہ یا نیل) ۔ اور سمندر کو بَحْرٌ کَبِیْرٌ کہتے ہیں ۔ کتاب الاشتقاق میں ہے کہ کثیر پانی (خواہ میٹھا ہو خواہ کڑوا) بَحْرٌ کہلاتا ہے ۔ بَحْرٌ دراصل اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں بہت سا پانی جمع ہو ۔ نیز بَحْرٌ اس زمین کو کہتے ہیں جہاں کھیتی باڑی ہوتی ہو ۔ نیز شہروں کو ، بالخصوص ان شہروں کو جو پانی کے کنارے آباد ہوں*** ۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۳۰/۴۱) کے یہ معنے بھی ہیں کہ شہری آبادیوں اور بادیہ نشینوں ، سب کے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہوچکی تھیں ۔ اور یہ بھی کہ دنیا کے خشک و تر میں خرابیاں پیدا ہوچکی تھیں ۔ خشکی اور تری (سمندر اور خشک زمین) کے معنوں میں یہ الفاظ (۶/۵۹) میں آئے ہیں ۔ (نیز دیکھئے عنوان ی ـ م ـ م) ، کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے دریا پار کرنے اور فرعون کے غرق ہونے کے لئے بَحْرٌ اور یَمٌّ دونوں الفاظ آئے ہیں (۲/۵۰ ، ۲۸/۴۰ ، ۲۰/۷۷)

قرآن کریم نے صَیْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ (۵/۹۶) "سمندر کے شکار" کو حلال قرار دیا ہے ۔ یعنی ایسے بھی جسے تم خود پکڑو ۔ اور وہ بھی جسے پانی

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** تاج و لین

خود بخود باعر اچھال دے۔ یا جو پانی کے پیچھے ہٹ جانے سے خشکی پر رہ جائے (دیکھئے عنوان ط ۔ ع ۔ م)۔

ب خ س

اَلْبَخْسُ ۔ کم کرنا ۔ ظلم کرنا * ۔ (حقوق میں کمی کرنے کا نام ظُلْمٌ ہے) اسی لئے ابن السکیت نے کہا ہے کہ بَخْسٌ کے معنے حق سے کم دینا یا حق میں کمی کرنا ہیں * ۔ اَلْبَاخِسُ ۔ تھوڑی سی ناقص چیز ** ۔ اَلْبَخْسُ ۔ چونگی یا محصول جو والی ملک وصول کرتا ہے * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نقص اور کمی کے ہوتے ہیں ۔

سورۃ بقرہ میں ہے وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا (۲/۲۸۲) ۔ '' اور اس میں ذرا بھی کمی نہ کرے '' ۔ سورۃ جن میں ہے فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا (۷۲/۱۳) ۔ '' اسے نہ اس کا خوف ہوگا کہ اس کے حقوق میں کمی ہوگی اور نہ ظلم و زیادتی کا ڈر '' ۔ سورۃ یوسف میں حضرت یوسف ؑ کے متعلق ہے شَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ (۱۲/۲) ۔ اس کے لفظی معنی تو ہیں '' اسے تھوڑی سی قیمت کے عوض بیچ دیا '' ۔ لیکن زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں ظلم و زیادتی سے اسے فروخت کر دیا ، کیونکہ انسان کا بیچنا ممنوع ہے ۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں بَاء اور خَاء اکٹھے آئیں ان کا مفہوم آنکھ کو پھوڑ دینا یا اسی قسم کی کوئی اور بات کرنا ہوتا ہے ۔ اس سے ظلم اور زیادتی کا تصور سامنے آ جاتا ہے ۔

ب خ ع

اَلْبِخَاعُ ۔ گردن کی ایک رگ کا نام ہے جو گدی کے اندر ہوتی ہے ۔ بَخَعَ بِالشَّاةِ کے معنے ہیں اس نے بکری کو اس زور سے ذبح کیا کہ اس کی بِخَاعُ تک کاٹ ڈالی ۔ یہ اس کے اصلی معنے ہیں ۔ اس کے بعد یہ لفظ عر مبالغہ کیلئے استعمال ہونے لگا ۔

بَخَعَ نَفْسَهُ يَبْخَعُ ۔ خود کو غم یا غصہ سے مار ڈالنا ۔ بَخَعَ الْاَرْضَ بِالزِّرَاعَةِ ۔ وہ زمین میں مسلسل کھیتی کرتا رہا جس سے زمین کی ساری قوت ختم ہو گئی * ۔

قرآن کریم میں نبی اکرم ؐ کے متعلق ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ (۱۸/۶) ۔ '' تو اس غم میں (کہ یہ لوگ ایمان

---

* تاج ۔ ** راغب ۔

کیوں نہیں لاتے) اپنے آپ کو ہلاک کر لیگا'' - غور کیجئے کہ ایک داعی الی الحق' طبیبِ مشفق کی طرح کسقدر غمگسار اور بہی خواہ ہوتا ہے -

ب خ ل

اَلْبُخْلُ - اپنی حاصل کردہ چیزوں کو ان مواقع سے روکنا جہاں سے انہیں روکنا نہیں چاہیئے* راغب نے لکھا ہے کہ بُخل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان اپنی جمع جوڑ کے ساتھ بُخل کرے۔ یعنی انہیں خرچ کی ضرورت پر روکے رکھے۔ اور دوسری قسم یہ کہ انسان دوسر کی جمع جوڑ کو ضرورت پر خرچ ہونے نہ دیکھ سکے۔ اور یہ زیادہ قابلِ مذمّت ہے۔ موخرالذکر کیلئے دیکھیں آیت ۴:۳۷ ** صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بُخل اشیاء کے روک لینے کو کہتے ہیں اور شُحّ اس جذبہ کو کہتے ہیں جس کے ماتحت انسان ایسا کرتا ہے***۔ (یعنی شُحّ میں حرص اور بخل دونوں جذبے ہوتے ہیں) -

قرآن کریم میں ہے اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَیَکْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ .... (۴/۳۷) - '' وہ لوگ جو (رزق کو) روک رکھتے ہیں - اور لوگوں کو بھی اس کا حکم دیتے ہیں کہ وہ (سامانِ زیست کو) روک کر رکھ لیں اور جو کچھ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دے رکھا ہوتا ہے اسے چھپاتے ہیں '' - قرآن کی تعلیم کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انسان پوری محنت سے کمائی کرے- پھر اس میں سے صرف اپنی ضروریات کیلئے لے اور باقی سب کچھ نوعِ انسانی کی ربوبیت کیلئے کھلا رکھدے- (دیکھئے عنوان - ن - ف - ق) بُخْل اس تعلیم کی عین ضد ہے جس میں انسان سب کچھ اپنے لئے روک رکھتا ہے اور دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا نہیں - اس طرح وہ معاشرہ کی ہمواریوں اور خوشگواریوں کی عملاً تکذیب کرتا ہے (۹۲/۹-۸) - قرآن کریم اِنْفَاق کی تاکید اور بُخْل کی مذمت کو مختلف انداز میں پیش کرتا ہے - اپنی محنت کی کمائی کو، خدا کے قانون کے مطابق، نوعِ انسانی کی ربوبیت عامہ کیلئے کھلا رکھنا اسلام کی بنیادی تعلیم ہے - یہی تَقْوٰی ہے (۹۲/۱۸) - اسی سے دنیا کی مشکلات حل ہوتی ہیں اور اسی سے انسان کی مستقبل کی زندگی (آخرت) سنورتی ہے - قرآن کریم واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو قوم بُخْل کی روش اختیار کر لیتی ہے اسے بساطِ زندگی سے الگ کر دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم آجاتی ہے جو اس قوم جیسی نہیں ہوتی (۴۷/۳۸) -

* تاج - ** راغب - *** محیط -

اس لئے کہ خدا کا غیر متبدل قانون یہ ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷) - ”دنیا میں بقاء اسی کے لئے ہے جو نوع انسانی کے لئے منفعت بخش ہے“ جو (نظام یا طریق زندگی) محض ایک فرد، ایک گروہ، یا ایک قوم کے مفاد کے لئے ہے (پوری انسانیت کے مفاد کے لئے نہیں) اسے بقاء اور دوام نصیب نہیں ہو سکتی - جب کسی شے کی منفعت بخشی کو عالمگیر انسانیت کے لئے عام ہونے کی بجائے اس طرح روک دیا جائے تو یہ بُخْلٌ ہو جائیگا جس کا نتیجہ تباہی ہے، افراد کی صورت میں بھی اور اقوام کے لئے بھی -

ب د أ

بَدَأَ بِهٖ - بَدْءًا وَابْتَدَأَ - کسی چیز کے ساتھ شروع کرنا - بَدَأَ الشَّيْئَ - اس چیز کو شروع کر دیا - اس نے پہل کی، فُلَانٌ مَا يُبْدِئُ وَمَا يُعِيْدُ - فلاں آدمی نہ از خود کوئی بات کرتا ہے - (Initiate) کرتا ہے) اور نہ ہی کسی بات کا جواب دیتا ہے - اَلْبَدِیْءُ* - سردار اول - بَدَأَ مِنْ اَرْضِهٖ اِلٰی اُخْرٰی - اپنی زمین سے دوسری زمین کی طرف نکل کھڑا ہوا - اپنا ملک چھوڑ گیا * - اَلْبَدْءُ - اَلْاِبْدَاءُ - کسی چیز کو اس کے غیر (ماسوا) پر مقدم کرنا * - بَادِئُ الرَّاْیِ وہ رائے جو ابتداءً قائم کر لی جائے - یا بَادِیَ الرَّاْیِ - وہ رائے جو بالکل ظاہر ہو ** - (نیز دیکھئے عنوان - ب - د - و)

قرآن کریم میں ہے وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۹/۱۳) - ”انہوں نے ہی پہلی مرتبہ تمہارے ساتھ ابتداء کی ہے“ - پہل ان کی طرف سے ہوئی ہے - تخلیق کائنات کے سلسلہ میں قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ اِنَّهٗ يَبْدَءُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (۱۰/۴) - ”وہی مخلوق کی ابتداء کرتا ہے اور پھر اسے گردش دیتا ہے“ - یہ ظاہر ہے کہ ہر شے کی تخلیقی ابتداء اس کے نقطہ آغاز سے ہوتی ہے - پھر وہ مختلف مراحل طے کرتی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے - اس کا نقطہ آغاز بھی خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے اور پھر اس کی مختلف گردشیں اور گردشوں کے بعد تکمیل بھی اسی کی رو سے ہوتی ہے (نیز دیکھئے عنوانات (ف - ط - ر) ; (ب - د - ع) اور (ع - و - د)) -

* تاج - ** راغب -

سورۃ سبا میں ہے قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (۴۹/۳۴) ۔ "ان سے کہدو کہ خدا کا اٹل تعمیری قانون آ گیا ہے ۔ اس کے مقابلہ میں تخریبی پروگرام ٹھہر نہیں سکے گا۔ اس لئے کہ تخریبی قانون میں یہ قوت ھی نہیں کہ کسی اسکیم کی ابتدا کر سکے اور پھر اسے پلٹ کر اور لوٹا کر تکمیل تک لے جائے"۔ باطل کوئی نتیجہ خیز بات کر ھی نہیں سکتا ۔

سورۃ ھود میں بَادِیَ الرَّأْیِ آیا ہے ۔ (۲۷/۱۱) اس کے لئے دیکھئے عنوان (ب ۔ د ۔ و) ۔

ب د ر

بَادَرَهُ ۔ مُبَادَرَةً ۔ بِدَارًا ۔ اس کام کے لئے جلدی کرنا جو خود کو اچھا لگے ۔* سورۃ نساء میں ہے اِسْرَافًا وَّبِدَارًا (۶/۴) ۔ "فضول خرچی اور عجلت کرتے ہوئے ۔ جلدی جلدی" ۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس مادہ کے اصلی معنے بھر جانے اور بھرپور ہو جانے کے ھیں ۔ عجلت میں بھی چونکہ انسان اپنی پوری پوری قوت صرف کر دیتا ہے اسلئے اسے مُبَادَرَةً کہتے ھیں ۔* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ھیں ۔ (۱) کسی چیز کا کامل اور بھرا ہوا ہونا ۔ اور (۲) کسی چیز کی طرف جلدی سے جانا ۔

اَلْبَدْرُ ۔ بھرا ہوا (پوراچاند) بھر پور جوان ۔ نیز بَدْرٌ ۔ مکہ اورمدینہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے ۔* اس مقام پر مخالفین سے جنگ ہوئی تھی (۱۲۳/۳)

راغب کے نزدیک اس مادہ کی اصل ھی اَلْبَدْرُ (پورا چاند ہے) ۔**
نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور دال ساتھ آئیں ان میں کسی کام کی ابتداء یا ظہور (ظاہر ہونے) کا مفہوم مضمر ہوتا ہے ۔ بَدَرَ اِلَيْهِ بِكَذَا کے معنی ھیں اس نے اس کے لئے فلاں بات کو ظاہر کر دیا ۔*** اس سے اَلْبَدْرُ کے معانی واضح ہو جاتے ھیں ۔ یعنی ظہور کامل ۔

ب د ع

اَلْبِدْعُ ۔ وہ کام جو پہلے پہل ہوا ہو اور اس سے پہلے اسکی مثال موجود نہ ہو (ابن فارس) ۔ اَلْبَدِيعُ وہ نئی رسی جسے پہلی بار نئے ریشہ سے بٹا گیا ہو ۔ رَكِيَّةٌ بَدِيعَةٌ نیا کھودا ہوا کنواں ۔* نواب صدیق

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** العلم الخفاق ۔

حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء کے ساتھ دال آئے ان میں ابتداء اور ظہور کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلْاِبْدَاعُ کے معنی ہیں کسی چیز کو بغیر کسی کی تقلید کے از خود پیدا کرنا۔ اور جب یہ لفظ خدا کیلئے بولا جائے تو اسکے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو بغیر آلہ بغیر مادہ اور بغیر زمان و مکان کے ایجاد کرنا۔ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲/۱۱۷) کا یہی مفہوم ہے۔** اسکے معنے (Originator) کے ہیں۔

کائنات کو عدم سے وجود میں لانا تو صرف خدا کیلئے ہے، لیکن اس کائنات میں نئی نئی چیزیں دریافت کرنا اور ایجاد کرنا انسان میں صفت خداوندی کا منعکس ہونا ہے اور وجہ شرفِ انسانیت۔ اس شرط کے ساتھ کہ ان ایجادات کو قانون خداوندی کے مطابق نوع انسانی کی تعمیر میں صرف کیا جائے، نہ کہ تخریب کے لئے۔ لیکن یہ ایجادات طبیعی دنیا کے اندر ہونگی۔ خدا کے قوانین جو نوع انسانی کی راہنمائی کیلئے (قرآن کے اندر) ہیں ان میں کسی نئے قانون کو شامل نہیں کیا جائیگا۔ اس لئے کہ یہ قوانین عقل کی رو سے وضع نہیں کئے جاسکتے، صرف وحی کی رو سے مل سکتے ہیں۔ اور وحی، قرآن کریم کے اندر پہنچکر مکمل ہوچکی ہے۔ دین میں اپنی طرف سے کسی قسم کا اضافہ جائز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے رہبانیت کو بدعت کہکر اسکی مذمت کی ہے (۵۷/۲۷)۔ البتہ دین کے غیر متبدل اصولوں کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، جزئی قوانین مرتب کئے جا سکتے ہیں۔

رسول اللہ ؐ کے متعلق ہے قُلْ مَا کُنْتُ بِدْعاً مِنَ الرُّسُلِ (۴۶/۹) "آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں"۔ میں کوئی پہلا رسول نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی رسول آتے رہے ہیں۔

ب د ل

بَدَلٌ۔ بِدْلٌ۔ بَدِیْلٌ۔ جو چیز کسی دوسری چیز کی قائمقام بن جائے۔ جو کسی کا عوض یا بدل بن جائے۔ ثعلب نے کہا ہے کہ اَبْدَلْتُ الْخَاتَمَ بِالْحَلْقَةِ کے معنے ہیں میں نے انگھوٹھی کو اتار کر اسکی جگہ چھلا پہن لیا۔ اور بَدَّلْتُ الْخَاتَمَ بِالْحَلْقَةِ کے معنے ہیں میں نے انگھوٹھی کو پگھلا کر اسکا چھلا بنوالیا۔ یعنی تَبْدِیْلٌ تو یہ ہے

* تاج۔ ** محیط۔

کہ ایک صورت سے دوسری صورت بدل دی جائے۔ جوہر (Substance) وہی باقی رہے - اور اِبْدَال* کے معنے ہیں ایک جوہر کو چھوڑ کر دوسرا جوہر اختیار کر لینا۔ مُبَادَلَۃ* کے معنے ہیں جیسی چیز اس سے لی اسکی مثل اسے دی - تَبَدَّلَ کے معنے ہیں متغیر ہو گیا - بدل گیا - نیز تَبَدَّلَہٗ و تَبَدَّلَ بہ کے معنے ہیں اسے کسی چیز کی جگہ لے لیا، بدل لیا ، تَبْدِیْل* تحریف کو بھی کہتے ہیں*۔

قرآن کریم میں بَدَلاً (۱۸/۵۰) بدل (معاوضہ) کے معنے میں آیا ہے۔ اور بَدَّلَ (۴/۲۱) ایک چیز کی جگہ دوسری چیز تبدیل کرلینے کے لئے۔ سورۃ روم میں ہے لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ (۳۰/۳۰) - "خدا کا عمل تخلیق کبھی نہیں بدلتا" - لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (۶/۳۴) "قوانین خداوندی کو تبدیل کرنے والا کوئی نہیں"۔ یعنی نہ تو ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ہو سکتا ہے اور نہ ہی ان کی جگہ کوئی اور قوانین لے سکتے ہیں۔

سورۂ تحریم میں ہے اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُّبْدِلَہٗ اَزْوَاجاً خَیْراً مِّنْکُنَّ (۶۶/۵) "......اگر وہ تمہیں طلاق دیدے تو خدا اسے تم سے بہتر بیویاں بدل کر دیدے"۔ سورۂ احزاب میں ہے وَلَا اَنْ تَبَدَّلَ بِھِنَّ (۳۳/۵۲)۔ "نہ یہ کہ تو ان کی جگہ دوسری بیویاں لے لے" - سورۃ نساء میں ہے اِسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّکَانَ زَوْجٍ (۴/۲۰) - "ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کی تبدیلی چاہنا"۔ استبدالِ قومی کے لئے دیکھئے (۴۷/۳۸)۔

ب د ن

اَلْبَدَنُ - جسم - سوائے سر اور ہاتھ پاؤں کے - لیکن ازہری نے کہا ہے کہ یہ لفظ تمام جسم کیلئے بولا جاتا ہے*۔ راغب نے کہا ہے کہ بَدَنٌ* جسم کو جثہ کے اعتبار سے کہتے ہیں اور جَسَدٌ* رنگ کے اعتبار سے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی خود کسی چیز کے ہیں۔ اسکی اطراف کے نہیں۔ قرآن کریم میں فرعون کے متعلق ہے کہ فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ (۱۰/۹۲) - "آج ہم تیرے بدن (لاش) کو محفوظ کر دینگے"۔ مصر میں رواج تھا کہ وہ بڑے بڑے لوگوں کی لاشوں کو ممی بنا کر محفوظ کر لیتے تھے چنانچہ فراعنہ مصر کے قدیم مقبروں سے اس قسم کی ممی شدہ لاشیں بہت سی برآمد ہوئی ہیں - جس فرعون نے حضرت موسٰیؑ کا پیچھا کیا تھا وہ پانی میں غرق ہو گیا تھا - اسلئے اسطرف خیال جاتا تھا کہ

---

* تاج - ** راغب -

اسکی لاش ضائع ہو گئی ہوگی - لیکن قرآن نے آج سے قریب چودہ سو برس پہلے بتا دیا کہ اسکی لاش بھی (پانی سے نکال کر) محفوظ کرکے رکھدی گئی تھی - چنانچہ جو ممی شدہ لاشیں برآمد ہوئی ہیں انمیں اسکی لاش بھی موجود ہے - (دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا - نیز میری کتاب برق طور) ویسے بَدَنٌ زرہ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ جسم پر رہتی ہے** -

اَلْبَادِنُ - اَلْمُبَدَّنُ - فربہ اور جسیم شخص - بَدُنَ و بَدَنَ - وہ فربہ اور جسیم ہوا - اَلْبَدَنَۃُ وہ گائے یا اونٹ جو ذبح کرنے کیلئے لے جایا جائے - یہ اسلئے تھا کہ جن جانوروں کو ذبح کرنے کیلئے مکہ لے جاتے تھے انہیں خوب موٹا کیا جاتا تھا - اسکی جمع بُدْنٌ ہے - سورۃ حج میں اَلْبُدْنَ (۲۲/۳۶) - انہی اونٹوں کے لئے آیا ہے** -

ب د و

بَدْوٌ - وَ - بُدُوٌّ کے معنے ہیں ظاہر ہونا - اَبْدَیْتُہٗ - میں نے اسے ظاہر کر دیا - بَدَاوَۃُ الشَّیْءِ - کس شے کا وہ حصہ جو سب سے پہلے ظاہر ہو* - قرآن کریم میں تُبْدُوْنَ (تم ظاہر کرتے ہو) کے مقابلہ میں تَکْتُمُوْنَ (تم چھپاتے ہو) بھی آیا ہے (۲/۳۳) اور تُبْدُوْا بمقابلہ تُخْفُوْ بھی (۴/۱۴۹) - سورۃ النور میں ہے وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ (۲۴/۳۱) ''وہ اپنی آرائش کو نمایاں نہ کریں'' -

اَلْبَدْوُ - اَلْبَادِیَۃُ - اَلْبَدَاوَۃُ - صحراء، دیہات، البَدَاوَۃُ - شہری زندگی کے مقابلہ میں دیہاتی یا صحرائی زندگی - صحراء کو اسلئے بادِیَۃٌ کہتے ہیں کہ وہ ظاہر اور کھلا ہوا ہوتا ہے* (۱۲/۱۰۰) - قرآن کریم میں اَلْبَادِ بمقابلہ الْعَاکِفُ آیا ہے (۲۲/۲۵) جسکے معنی ہیں باہر سے آنے والا - سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت نوح‌ؑ کے مخالفین نے آپ سے کہا کہ مَانَرَاکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیْنَ ھُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ (۱۱/۲۷) - اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ تیرا اتباع کرتے ہیں ان کی شکل و صورت دیکھکر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ہمارے معاشرہ کے پست درجے کے (رذیل) لوگ ہیں - یعنی ان کے متعلق اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے کسی دقتِ نظر کی ضرورت نہیں پڑتی - ان کی صورت سے ان کی حالت عیاں ہو جاتی ہے - (ہمارے ہاں اسے بادی النظر کہتے ہیں) - بَادِیَ الرَّاْیِ (۱۱/۲۷) کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جن لوگوں نے تیرا اتباع کیا ہے وہ کسی غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر نہیں پہنچے بلکہ کوئی ایک بات سنی اور اسکے پیچھے لگ گئے -

*تاج - نیز ابن فارس - ** راغب

ب ذ ر

بَذَرْتُہٗ بَذْراً : میں نے اسے بکھیرا، متفرق کیا، خراب کیا ۔ اَلبَذْرُ ۔ اس غلہ کو کہتے ہیں جو بیج ڈالنے کیلئے الگ رکھ لیا گیا ہو۔ اس سے اسکے معنے کھیتی کرنے کے آتے ہیں۔ نیز کھیتی یا سبزی کا وہ پودا جو شروع شروع میں زمین سے نکلتا ہے۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور ذال اکھٹے آئیں ان کا مفہوم کسی چیز کو نکال دینا ہوتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بکھیرنے اور متفرق کر دینے کے ہیں۔

اپنی اصل کے اعتبار سے تَبْذِیْرٌ کے معنی ہونگے اس غلہ کو بھی خرچ کر لینا جو بیج کے لئے رکھا ہو۔ مجازاً مال ضائع کر دینے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسلئے کہ تَبْذِیْرٌ متفرق کر دینے یا بکھیر دینے کو بھی کہتے ہیں *

قرآن کریم میں ہے لَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْراً اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ (۱۷/۲۶-۲۷) "تم مال کو بے جا صرف مت کرو۔ اسطرح مال کو ضائع کرنے والے لوگ شیاطین کے بھائی ہیں"۔

ب ر أ

بَرْءٌ ۔ اسکے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کا ان چیزوں سے الگ ہو جانا جو اسکی غیر ہوں۔ بَارَاَہٗ ۔ وہ اس سے الگ اور جدا ہو گیا۔ تَبَرَّءْنَا ۔ ہم سب جدا ہو گئے۔ بَرِیَٔ الْمَرِیْضُ مِنْ مَرَضِہٖ ۔ مریض شفایاب ہو گیا۔ یعنے اسکا مرض اس سے الگ ہو گیا۔ اَنَا بَرَاءٌ مِنْہُ ۔ میں اس سے بری ہوں۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کریم میں ہے اِذْ تَبَرَّاَالَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا (۲/۱۶۶)۔ "جب لیڈر اپنے پیچھے چلنے والوں سے بیزار اور الگ ہو جائیں گے"۔

سورۃ توبہ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ بَرَاءَۃٌ مِنَ اللہِ وَرَسُوْلِہٖ (۹/۱) ۔ "یہ اللہ اور اسکے رسول (قرآنی نظام کے مرکز) کی طرف سے اس امر کا اعلان ہے کہ ہم ان مشرکین مکہ سے بالکل الگ ہیں جن کے ساتھ معاہدہ کیا گیا تھا"۔ ان کے ساتھ اب ہمارا کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ یہی معنی (۹/۳) میں ہیں۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔

خدا کو اَلْبَارِیُ کہا گیا ہے (۵۹/۲۴)۔ اس میں درحقیقت تخلیق اشیاء کے تین مراحل میں سے ایک مرحلہ کا ذکر ہے۔ یعنی اَلْخَالِقُ اَلْبَارِیُ اَلْمُصَوِّرُ (۵۹/۲۴)۔ کائنات میں تمام عناصر باهمی ملے جلے رہتے هیں۔ اللہ کے سامنے جب کسی نئی چیز کی پیدائش کی تدبیر (اسکیم) هوتی ہے تو وہ مختلف عناصر کو ایک نئی ترتیب دیتا ہے۔ یہ خَلْقٌ ہے (دیکھئے عنوان خ ـ ل ـ ق)۔ پھر انہیں باقی عناصر سے الگ کرتا ہے۔ یہ بَرْاَۃٌ ہے۔ اور اسکے بعد انہیں ایک متعین شکل (Form) عطا کر دیتا ہے۔ یہ مُصَوِّرِیَّت ہے۔ (دیکھئے عنوان ص ـ و ـ ر)۔ اس اعتبار سے وہ خالق اور باری اور مصور کہلاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اسی نہج سے مخلوق کو اَلْبَرِیَّۃُ کہتے هیں۔ قرآن میں ہے اُولٰٓئِکَ هُمْ شَرُّ الْبَرِیَّۃِ (۹۸/۶)۔ (بَرِیَّۃٌ کی اصل بَرْیٌ ہے۔ اور یہ اَلْبَرَی سے ہے جس کے معنے مٹی کے هیں)۔

نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور راء اکٹھے آئیں ان کا مفہوم ''ظاهر هونا،، هوتا ہے۔ اس اعتبار سے کسی حادثہ کے واقع کرنے (رونما کرنے) کیلئے بھی بَرْءٌ آتا ہے (۵۷/۲۲)۔ مُبَرَّءٌ کے معنے هیں بَرِیٌ اَلذِّمَّۃِ (پاک) (۲۴/۲۶)۔ اَبْرَاَ کے معنے هیں کسی سے مرض دور کر دینا (۳/۴۸)۔

ب ر ج

بُرْجٌ۔ جمع بُرُوْجٌ۔ کسی محل کے چاروں طرف جو محفوظ کوٹھڑیاں بنا دی جاتی هیں انهیں بُرُوْجٌ کہا جاتا ہے۔ جو کوٹھڑیاں شہر پناہ یا قلعہ کی دیوار پر بنائی جاتی هیں انهیں بھی بُرُوْجٌ کہتے هیں۔ نیز اسکے معنے قلعہ کے بھی هوتے هیں *۔ چنانچہ (۴/۷۸) میں اسکے یہی معنے هیں۔ دراصل، ج ـ ب ـ ر اپنی تمام تراکیب میں شدت اور قوت پر دلالت کرتے هیں **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے ظاهر هونا اور جائے پناہ کے هیں۔

سورۃ احزاب میں ہے وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی (۳۳/۳۳)۔ ''اپنے گھروں میں سنجیدگی سے رهو اور سابقہ جاهلیت کے طریق پر اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو''۔ اور سورۃ نور میں ہے غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِیْنَۃٍ (۲۴/۶۰) ''اپنی زینت کو نمایاں نہ کرنے والیاں''

*تاج۔ ** العلم الخفاق۔

صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ تَبَرَّج کے معنے ہیں عورت نے اپنی زینت اور محاسن کو مردوں کے سامنے ظاہر کیا، اسطرح کہ اسکی آنکھوں میں شوخی جھلک رہی تھی۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور راء ساتھ آئیں ان میں اظہار کا مفہوم مضمر ہوتا ہے، جیسے بَرَج ظاہر ہو گیا۔ اسی سے تَبَرَّج ہے۔** ابواسحق نے کہا کہ * تَبَرُّج اس اظہار زینت کو کہتے ہیں جو مردانہ شہوت کی انگیخت کا ذریعہ بن جائے۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلتَّبَرُّجُ مٹک مٹک کر چلنے کو کہتے ہیں اور اَلْبَرَجُ خوبصورت اور حسین چہرے والے کو کہتے ہیں۔ اور اَلْاَبْرَجُ حسین آنکھوں والے کو ****۔ اَلْبَرَجُ آنکھ کا کشادہ اور حسین ہونا ***۔ لسان میں دونوں ابرؤوں کے درمیان کشادگی اور فاصلہ کو بَرَج بتایا ہے۔

راغب نے کہا ہے کہ عورت کے تَبَرُّج کے معنے یہ ہیں کہ وہ اپنے محل سے باہر نکل آئی۔ چنانچہ اس سے پہلے جو آیا ہے وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ اس نے بھی ان معانی کی تائید کر دی ہے***۔

لیکن ہمارے نزدیک صحیح معنے وہی ہیں جو ابواسحق نے کہے ہیں یعنی اس انداز کی نمائش جو مردوں کے جذبات کے مشتعل ہونے کا سبب بن جائے۔ دراصل اِبْرِیْج بلونی یا اس مشک کو کہتے ہیں جس میں دودھ بلو کر اس سے مکھن نکالا جاتا ہے****۔ لہذا تَبَرُّج کے معنے ہیں حسن اور زینت کی اس انداز کی نمائش کہ عورت کی آنکھوں میں شوخی جھلک رہی ہو اور اس سے مردوں کے جذبات متحرک اور مشتعل ہو جائیں۔ ایسی نمود و نمائش جو مردوں کے سینوں میں (بلونی کی طرح) تلاطم برپا کر دے۔ اسکی ممانعت ہے۔ جنسی جذبات ازخود بیدار نہیں ہوتے۔ انسانی خیالات انہیں بیدار اور مشتعل کرتے ہیں۔ لہذا، قرآن کریم ان تمام محرکات کو روکتا ہے جن سے ان جذبات میں انگیخت پیدا ہو۔ اس نے مردوں اور عورتوں کے باہمی اختلاط (میل جول) کے لئے جو حدود مقرر کئے ہیں ان سے بھی مقصود ہے۔

قدیم علم الافلاک کی رو سے، آسمان میں بارہ برج تسلیم کئے جاتے تھے۔ ابن درید نے (جمہرۃ اللغۃ میں) لکھا ہے کہ عرب، اِن بروج السماء (آسمانی برجوں) کو نہیں جانتے تھے۔ ان کے کلام میں ''منازلِ قمر'' کا تو ذکر ملتا ہے لیکن ''بروج السَّمَاء'' کا ذکر نہیں ملتا۔ لہذا، قرآن کریم میں جہاں ''بروج السَّمَاء'' کا ذکر آیا ہے تو اس سے وہاں مراد ستارے یا بڑے بڑے ستارے ہیں۔ مثلاً سورۃ

*تاج۔ **العلم الخفاق۔ ***راغب۔ ****محیط۔

حجرمیں ہے وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَیَّنّٰھَا لِلنّٰظِرِیْنَ (۱۵/۱۶)، "اور یقیناً ہم نے آسمان میں بروج بنائے ہیں اور انہیں دیکھنے والوں کے لئے خوشنما بنایا ہے" ۔ یہاں "بروج" سے مراد بڑے بڑے ستارے ہیں جو ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِ نِ الْکَوَاکِبِ (۳۷/۶) "اور ہم نے قریبی آسمان کو (عجیب) زینت یعنی ستاروں سے آراستہ کیا ہے" ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے "بُرُوْج" کو ستاروں کے معنی میں استعمال کیا ہے ۔

ب ر ح

اَلْبَرَاحُ ۔ کھلی وسیع زمین جہاں درخت، کھیتی، عمارت وغیرہ کچھ نہ ہو۔اس سے یہ لفظ اس معاملہ کے لئے بولتے ہیں جو بالکل واضح، ظاہراور کھلا ہوا ہو۔ لَا بَرَاحَ ۔اس میں کوئی شک وشبہ یا ابہام نہیں۔بَرِحَ الْخَفَآءُ ۔ راز فاش ہو گیا*۔نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء کے ساتھ راء آئے ان کے مفہوم میں "ظاہر ہونا" پایا جاتا ہے ۔ جیسے بَرِحَ الْخَفَآءُ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) ظاہر ہو جانا ۔ زائل ہو جانا اور کھل جانا ۔ اور (۲) سخت ہونا اور بڑا ہونا ہیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ لَا اَبْرَحُ اثبات یعنی مستقل جم کر رہنے یا کام کرنے کے لئے مخصوص ہوتا ہے** ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ بَرْحیٰ ایک کلمہ ہے جو نشانہ خطا ہو جانے پر بولتے ہیں ۔ چنانچہ اَلْبَارِحُ مِنَ الظِّبَآءِ وَالطَّیْرِ اس ہرن یا پرندے کو کہتے ہیں جو شکاری کے سامنے ایسے رخ سے آئے کہ اس کا نشانہ کرنا دقت طلب ہو*** ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ اثبات اور تاکید کے لئے آیا ہے ۔ جیسے سورۃ یوسف میں ہے فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ (۱۲/۸۰) "میں اس سر زمین کو کبھی نہیں چھوڑونگا" ۔ سورۃ کہف میں ہے لَا اَبْرَحُ حَتّٰۤی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ (۱۸/۶۰) ۔ "میں چلنا نہیں چھوڑونگا (یعنی مسلسل چلتا رہونگا) حتی کہ دو دریاؤں کے سنگھم پر پہنچ جاؤں" ۔

ب ر د

اَلْبَرْدُ ۔ ٹھنڈا ہونا ، یہ حَرٌّ (گرم ہونے) کی ضد ہے ۔ مَآءٌ بَرْدٌ وبَارِدٌ ۔ ٹھنڈا پانی ۔ اَلْبَرْدُ ۔ نیند ۔ اَلْبَرَدُ ۔ اولے ۔ عَیْشٌ بَارِدٌ ۔ خوشگوار زندگی ۔ بَرَدَ السَّیْفُ ۔ تلوار اچٹ گئی* ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔

راغب نے لکھا ہے کہ جس طرح حَرٌّ کے ساتھ حرکت مختص ہوتی ہے اسی طرح بَرْدٌ کے ساتھ کسی چیز کا جمود و ثبات مختص ہوتا ہے ۔ مثلاً بَرَدَ عَلَيْهِ دَيْنٌ کے معنی ہیں اس پر قرضہ ٹھہر گیا، یعنی ادا نہ ہو سکا** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معانی میں سکون اور ثبات کو بھی شامل کیا ہے ۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیم کے قصہ میں ہے یٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (۲۱/۶۹) ۔ "اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈ اور سلامتی ہوجا" ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ مخالفین نے ابراہیم کے خلاف تدبیریں اور سازشیں شروع کیں اور آمادہ بہ فسادِ ہوگئے لیکن ہم نے اسے ان کی شعلہ سامانیوں سے محفوظ رکھا اور خیریت سے نکال کر دوسرے ملک میں لے گئے ۔ (فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۲۹/۲۴)۔ "انہوں نے اسے زندہ جلا دینے تک کی بھی ٹھان لی لیکن ہم نے ان کی تدبیروں کو ناکام بنا دیا اور ابراہیم کو صحیح و سلامت بچا کر لے گئے" (۳۷/۹۷-۹۹) ۔ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ (۲۱/۷۰) ۔ "انہوں نے اس کے خلاف سازش کا ارادہ کیا لیکن ہم نے انہیں ناکام بنا دیا" ۔ یعنی ان کا ارادہ کامیاب نہ ہو سکا ۔ حضرت ابراہیم بحفاظت وہاں سے نکل کر دوسرے ملک میں چلے گئے (۳۷/۹۹) ; (۲۱/۷۱) ; (۲۹/۲۶) ۔ ان مقامات سے ظاہر ہے کہ یہاں آگ سے مراد ان لوگوں کی آتشِ انتقام تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ٹھنڈا کر دیا تھا ۔ اور وہ اپنی سازش میں ناکام رہ گئے تھے ۔

اولوں (ژالہ باری) کے معنوں میں یہ لفظ (۲۴/۴۳) میں آیا ہے ۔ سورۃ واقعہ میں عذاب جہنم کے ضمن میں ہے لَا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ (۵۶/۴۴) ۔ "نہ ٹھنڈ پہنچانے والا ۔ نہ خوشگوار اور نفع بخش" ۔

سورۃ النبا میں اہل جہنم کے متعلق ہے لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا (۷۸/۲۴) "وہ اس میں ٹھنڈ اور پینے کی چیز نہیں پائینگے" ۔

صاحب تاج العروس نے یہاں بَرْدٌ کے معنے نیند کے کئے ہیں ۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی اس کی تائید کی ہے ۔ ویسے اس سے مفہوم راحت و آرام بھی ہو سکتا ہے ۔ اور یہی معنی زیادہ موزوں ہیں ۔ عذاب میں راحت کہاں ؟ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں اضطراب اور حرکت کو بھی شامل کیا ہے ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔

ب ر ر

بـ ر ر ۔ اس مـادہ کے اصلی معنے وسعت ۔ فراخی اور کشادگی کے ہیں کیونکہ بَحْرٌ کے مقابلہ میں بَرٌّ کا لفظ خشکی کیلئے استعمال ہوتا ہے (۲۲/۹)۔ اَلْبَرُّ بے آب و گیاہ چٹیل میدان کو کہتے ہیں اور بَحْرٌ ان مقامات اور شہروں کو جہاں پانی بھی ہو۔ بَرٌّ بکریوں کو (جنگل کی طرف) ہانک دینے کو کہتے ہیں ۔ وسعت کے اعتبار سے اسکے معنے کثرت کے بھی ہو گئے ۔ چنانچہ اَبَرَّ الرَّجُلُ کے معنے ہیں وہ آدمی کثیرالاولاد ہو گیا ۔ اَبَرَّ الْقَوْمُ ۔ قوم بہت زیادہ ہو گئی ہے ۔ اس سے غلبہ و تسلط کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ اَبَرَّ عَلَیْہِمْ ۔ وہ ان پر فوقیت لے گیا اور غالب آیا ۔ اَلْمُبِرُّ ۔ غالب آنے والے کو کہتے ہیں* ۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور راء اکٹھے آئیں ان کا مفہوم ”ظاہر ہونا ،، ہوتا ہے ۔ چنانچہ بَرَّ کے معنی ہیں وہ ظاہر ہو گیا ۔ اس سے کشادگی اور غلبہ دونوں مفہوم واضح ہو جاتے ہیں ۔

نگاہ کی کشادگی اور دل کی وسعت کے اعتبار سے بِرٌّ کے معنی وسیع پیمانہ پر نیک سلوک ، صلہ رحمی اور احسان کے آتے ہیں ۔ نیز صداقت (بات پر پورا اترنا) اور اطاعت کے بھی ۔ بَرَّ اور بِرَّ ۔ قسم میں سچا ہونے کو کہتے ہیں ۔ اَلْبَرُّ ۔ خدا کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے (۵۲/۲۸)۔ نیز سچے اور احسان کرنے والے آدمی کو بھی کہتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں بِرٌّ بمقابلہ اِثْمٌ آیا ہے (۵/۲)۔ اِثْمٌ کے معنے ہیں کمزوری۔ اضمحلال۔ تکان۔ لہذا بِرٌّ کے معنے ہونگے قوت۔ وسعت۔ کثرت۔ کشادگی۔ فراخی۔ چونکہ اِثْمٌ جرم (گناہ) ہے اس لئے بِرٌّ نیکی (Virtue) ہے ۔ لہذا قرآن کی رو سے ”نیک کام ،، (بِرٌّ) وہ ہونگے جن سے کشاد کی راہیں کھل جائیں۔ جن سے انفرادی طور پر نگاہ میں فراخی، قلب میں کشادگی اور انسانی ذات میں وسعت پیدا ہو جائے اور اجتماعی طور پر سامان زیست میں کثرت اور وسعت آ جائے ۔ اور معاملات میں فراخ حوصلگی کا ثبوت دیا جائے ۔ بِرٌّ اور تَقْوٰی کے الفاظ اسی لئے اکٹھے آتے ہیں (مثلاً ۲/۲۲۴ ; ۵/۲) کیونکہ تَقْوٰی (قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنے) سے انسان سے تنگ نظری دور ہو جاتی ہے اور کشادہ ظرفی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس کا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ

---

* تاج ۔

انسان اپنی عزیز ترین متاع (مال و دولت حتی کہ جان تک کو) قوانین خداوندی کے مطابق، نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھے ۔ چنانچہ ارشاد ہے لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (۳/۹۱)۔ ’’جب تک تم ان چیزوں کو جو تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہیں (نوع انسان کی ربوبیت کے لئے) کھلا نہیں رکھوگے تمہیں کشادگی اور وسعت نصیب نہیں ہوسکیگی‘‘ ۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ’’مذہبی شعائر‘‘ کو رسمی طور پر ادا کر لینے کا نام بِرّ (نیکی) ہے وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں ۔ قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ ..... (۲/۱۷۷)۔ کشاد کی راہ یہ نہیں (تم معیار خداوندی پر اس طرح پورے نہیں اتر سکتے) کہ تم اپنا منہہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف ۔ کشاد کی راہ یہ ہے کہ تم ایمان کے بعد اپنے مال کو اس کی کشش و جاذبیت کے باوجود ضرورت مندوں کے لئے دیدو ۔ ایسا کرنے والوں کو اَبْرَارٌ بمقابلہ فُجَّارٌ کہا گیا ہے (۸۲/۱۳-۱۴)۔ اور بَرَرَةٌ بھی (۸۰/۱۶)۔

حضرت یَحْیٰی کے متعلق ہے ۔ بَرًّا بِوَالِدَيْهِ (۱۹/۱۴)۔ ’’وہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک (کشادہ نگھی) سے پیش آتا تھا‘‘ ۔ خدا کو اَلْبَرُّ الرَّحِيْمُ کہا گیا ہے (۵۲/۲۸)۔ ’’وسعتیں عطا کرنے والا ۔ سامان نشو و نما دینے والا‘‘ ۔ جس خدا نے تمام نوع انسانی کیلئے سامان ربوبیت اس وسعت و کثرت سے عطا کر رکھا ہے اس کی کشادگی اور فراخی میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟ ۔ لہذا جو معاشرہ اپنے اندر خدا کی صفات کو منعکس کریگا وہ بھی علٰی حد بشریت بَرٌّ ورَحِيْمٌ ہوگا ۔ یعنی نوع انسانی کی ربوبیت کیلئے وسعت ظرف اور کشادگی نگاہ کا مالک ۔ اسی کا نام بِرٌّ ہے جس کا ترجمہ عام طور پر نیکی کیا جاتا ہے ۔ لیکن یہ ظاہر ہے لفظ ’’نیکی‘‘ کا عمومی تصور بِرٌّ (وسعت و کشادگی) کا مفہوم نہیں پیدا کر سکتا ۔ نیک آدمی عام طور پر ایسے کہا جاتا ہے جو برائیوں سے بچے ۔ لیکن برائیوں سے بچنا سلبی پہلو (Negative Aspect) ہے ۔ قرآن کریم اس کے ساتھ مثبت جوہروں (Positive Virtues) کا بھی مطالبہ کرتا ہے ۔ بنا بریں جس فرد میں کشادہ نگھی اور فراخ حوصلگی نہیں اور جس قوم کو ربوبیت کا سامان وسعت و کثرت کے ساتھ نصیب نہیں اور وہ اسے اسی وسعت و کشادگی کے ساتھ نوع انسانی کی نشو و نما کے لئے صرف نہیں کرتی ۔ وہ قرآن کی رو سے حامل بِرٌّ (نیک) نہیں ہو سکتی ۔

ب ر ز

اَلْبَرَازُ - اَلْبِرَازُ - وسیع اور کھلی جگہ جہاں درخت وغیرہ کچھ نہ ہوں (چونکہ لوگ قضائے حاجت کے لئے باہر کھلی جگہ کی طرف جایا کرتے تھے اسلئے اَلْبِرَازُ والبَرَازُ کے معنی پاخانہ کے ہو گئے)۔

بَرَزَ - نمایاں ہو جانا - ظاہر ہو جانا - نکھر کر سامنے آ جانا - اَلْبَارِزُ وہ چیز جو پوری طرح ظاہر ہو جائے - نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء اور راء اکٹھے ہوں ان میں ظاہر ہوجانے کا مفہوم مضمر ہوتا ہے - ابن فارس نے بھی لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معانی ظاہر ہو جانا - اور کسی چیز کا اپنے جیسی اور چیزوں سے الگ ہو جانا ہیں - بَارَزَ مُبَارَزَةً - میدان جنگ میں جوانوں کا صفوں سے باہر نکل کر ایک دوسرے کے سامنے آنا - بَرَزَ - دوسروں پر فضیلت و شجاعت میں سبقت لیجانا - اور آگے بڑھ جانا*۔

سورۃ بقرہ میں ہے وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ (۲/۲۵۰) - "جب وہ جالوت کے مقابلہ میں جنگ کیلئے سامنے آئے" - سورۃ کہف میں ہے وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً (۱۸/۴۷) - "تو زمین کو دیکھیگا کہ وہ بالکل کھلی ہوئی ہے" (یا وہ لوگ جنہیں استبداد زمانہ نے دبائے رکھا ہے تو دیکھیگا کہ وہ ابھر کر اوپر آجائینگے) سورۃ ابراھیم میں ہے وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا (۱۴/۲۱) "چھوٹے بڑے سب خدا (کے قانون مکافات کے) سامنے آجائینگے - ان کے اعمال کے نتائج ابھر کر سامنے آ جائینگے - یعنے لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ (۴۰/۱۶) - "ان کی کوئی شے اللہ سے مخفی نہیں ہوتی" - اسی کو دوسری جگہ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ (۷۹/۳۶) سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی ظہور نتائج کے وقت جہنم ابھر کر سامنے آجائیگی - لیکن اسی کے لئے جو آنکھیں رکھتا ہے - لِمَنْ يَّرٰى (۷۹/۳۶) - یوں تو مجرم اور جہنم اب بھی ایک دوسرے سے اوجھل نہیں - (۸۲/۱۶) - جہنم ہر مجرم کو گھیرے ہوئے ہے - (۲۹/۵۴) - لیکن اسے دیکھ وہی سکتا ہے جو آنکھیں رکھتا ہے - وہ اسی کے سامنے ابھر کر آتی ہے جسے اسکا احساس ہو - (تفصیل جہنم کے عنوان میں ملیگی)۔

برزخ

بَرْزَخٌ - دو چیزوں کے درمیان روک یا حد کو کہتے ہیں - راغب نے کہا ہے کہ یہ دراصل بَرْزَةٌ (پردہ) ہے جسے معرب بنا لیا گیا ہے** - لیکن ابن فارس کا کہنا ہے کہ یہ لفظ عربی الاصل ہے جس کا مادہ برز ہے اور

* تاج - ** محیط -

خاء اس میں مبالغہ کے لئے بڑھائی گئی ہے۔ معنی اسکے ہیں اتنی بڑی وسعت جو اسکے باہر کی چیزوں کے لئے اوٹ بن جائے۔ مطلب اس سے بھی روک یا حائل ہونے کا ہوگا۔ سورۃ رحمٰن میں ہے۔ بَیْنَھُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ (۵۵/۲۰) ''ان دونوں دریاؤں کے درمیان ایک روک ہے جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتے''۔ (نیز ۲۵/۵۳)۔

سورۂ مومنون میں ہے کہ جب ان میں سے کسی کو موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے دنیا کی طرف لوٹا دے تو میں ضرور اعمالِ صالحہ کروں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ان کے کہنے کی باتیں ہیں۔ مرنے کے بعد کوئی اس دنیا میں واپس نہیں آسکتا۔ وَ مِنْ وَّرَآئِھِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (۲۳/۹۹-۱۰۰) ''ان کے پیچھے ایک روک ہے یوم بعث تک''۔ (نیز دیکھئے و راء۔ عنوان ''و۔ر۔ی'' میں اور عنوان ''ب۔ع۔ث'')

ب ر ص

اَلْبَرَصُ۔ سفید داغ جو بیماری کی وجہ سے بدن میں ظاہر ہوجاتے ہیں۔ پھلبھری۔ اَلْبِرَاصُ۔ ریگستانی خطے جہاں کچھ پیدا نہ ہو۔ بنجر زمین**۔ تَبَرَّصَ الْبَعِیْرُ الْاَرْضَ۔ اونٹ نے تمام گھاس چرلی۔ زمین پر کچھ بھی نہ چھوڑا*۔

سورۃ آل عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ وَ اُبْرِیُٔ الْاَکْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ (۳/۴۸)۔ ''میں پیدائشی اندھے کو نگاہ عطا کرونگا اور اَبْرَص کو اسکی بیماری سے نجات دلا دونگا''۔ بنی اسرائیل کی اسوقت کی حالت کو اَبْرَص سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یا تو اسکے یہ معنے ہیں کہ انکی ارضِ حیات کے کسی حصہ میں بھی سرسبزی اور تروتازگی باقی نہیں رہی تھی۔ اور یا یہ کہ وہ دنیا میں مارے مارے پھرتے تھے اور کوئی انہیں اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّةُ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْٓا (۳/۱۱۱) ''وہ جہاں کہیں بھی جائیں ذلت و رسوائیاں انکے ساتھ لگی ہوئی ہیں''۔ دونوں معانی میں مفہوم ایک ہی ہے۔ رسول آتا ہی اسلئے ہے کہ قوم کو ذلت و رسوائیوں سے نجات دلائے اور اسکی بنجر زمینوں میں سرسبزی و شادابی کے سامان پیدا کرے۔

---

* تاج ** ابن فارس۔

قرآن کریم نے اخلاق ذمائم کو بیماریوں سے تشبیہ دی ہے ۔ کہیں ایسے لوگوں کو بہرے ۔ گونگے ۔ اندھے ۔ (صُمٌّ ۔ بُکْمٌ ۔ عُمْیٌ) ۔ کہکر پکارا ہے ۔ کہیں کہا ہے کہ "ان کے دلوں میں روگ ہے" (فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۔) ۔ حتی کہ انہیں مردہ (مَوْتیٰ ۔) بھی کہا گیا ہے ۔ اسی اعتبار سے آسمانی تعلیم کو ھُدًی وَّ شِفَآءٌ ( ) "ھدایت اور شفاء" ۔ اور شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ( ) "جو کچھ سینوں میں ہے اس کے لئے شفاء" کہا گیا ہے ۔ حضرات انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد اور زندگی کا مشن جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں ہوتا ۔ ان کا مقصد "انسانیت کی بیماریوں" کا علاج ہوتا ہے ۔ حضرت عیسیٰ کے اَکْمَہ (اندھے) کو بینائی عطا کرنے اور اَبْرَص (کوڑھی) کو اچھا کرنے سے بھی یہی مراد ہے ۔ یہ الفاظ بطور استعارہ استعمال ہوئے ہیں ۔ (تفصیل میری کتاب "شعلۂ مستور" میں ملیگی)

ب ر ق

بَرْقٌ ۔ بجلی جو بادلوں میں چمکتی ہے ۔ اس کے بنیادی معنے چمک کے ہیں ۔ بَرِقَ بَصَرُہٗ کے معنی ہیں اسکی آنکھوں میں خیرگی پیدا ہوگئی ۔ اور وہ حیرت و دہشت کی وجہ سے کچھ دیکھنے کے قابل نہ رہا ۔ (فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ( ) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی متحیر رہ جانے کے ہیں ۔ سورۃ بقرہ میں ہے یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ ( ) قریب ہے کہ بجلی ان کی نگاہوں کو اچک کر لے جائے" ۔

اِسْتَبْرَقٌ ۔ دبیز ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں (؛)* ۔ اور اِبْرِیْقٌ ( ) لوٹے یا صراحی کو کہتے ہیں ۔ یہ لفظ فارسی لفظ "آب ریز" کا معرب سمجھا جاتا ہے ** ۔ لیکن ابن فارس کا قول ہے کہ یہ برق ھی سے ہے اور ہر چمک دار اور خوبصورت چیز کے لئے بولا جاتا ہے ۔

ب ر ک

بَرَکَۃٌ ۔ کے اصلی معنی اس ثبات کے ہیں جس کے ساتھ نمو بھی شامل ہو ۔ یعنے ایک چیز اپنے مقام پر مستحکم بھی ہو اور اسکے ساتھ ساتھ بڑھ بھی رہی ہو ۔ لہذا اس میں استحکام اور کثرت ۔ ثبات اور نشو نما دونوں شامل ہوتے ہیں ۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں

* تاج و محیط ۔ ** لین ۔

باء اور راء اکٹھے آئیں ان میں ''ظاہر ہونے،، کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ نشو و نما کے معنی ہی یہ ہیں، کہ مضمر صلاحیتیں نمودار ہو کر سامنے آ جائیں ۔ لہذا بَرَکَۃٌ میں ثبات ۔ استحکام ۔ کثرت ۔ نشو و نما اور ظہور و نمود کے تمام پہلو آ جاتے ہیں ۔ ابن فارس نے بھی اس کے معنی ثبات اور نشو و نما لکھے ہیں ۔ مُبَارَکٌ یا فِیْہِ بَرَکَۃٌ ۔ اسوقت کہتے ہیں جب کسی شے میں کثرت اور زیادتی محسوس ہو اور اسمیں ثبات و استحکام بھی ہو۔ یہ لفظ بَرَکَ اَلْبَعِیْرُ سے ماخوذ ہے جسکے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اونٹ جم کر بیٹھ گیا اور وہاں سے اٹھا نہیں ۔ اَلْبِرْکَۃُ ۔ اونٹ کے سینے کو کہتے ہیں جس پر ٹیک لگا کر وہ جم کر بیٹھتا ہے ۔ اور بہت دودھ دینے والی بکری کو بھی ۔ نیز حوض وغیرہ جس میں پانی ٹھہرا رہے * ۔

بَرَکَۃٌ کی جمع بَرَکَاتٌ ہے ۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، بَرَکَۃٌ کے معنی ثبات ۔ استحکام ۔ نشو و نما ۔ ہر قسم کا خیر اور فلاح ہیں ۔لیکن یہ چیزیں متعلقہ اسباب کے ذریعے ملتی ہیں اس لئے مجازاً خود ان اسبابِ خیر کو بھی بَرَکَاتٌ کہا جائیگا ۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ ایمان و تقوی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم کو بَرَکٰتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ ملتی ہیں (۷/۹۶) ۔ یعنے تمام استحکام بخش اسبابِ حیات کی کثرت و فراوانی ۔ آسمانی راہ نمائی بھی اور معاشی سہولتیں بھی ۔ زمین کے متعلق فرمایا وَبَارَکَ فِیْھَا (۴۱/۱۰) ۔ (خدا نے) اس میں اس سامان کی فراوانی رکھدی ہے جس سے نوعِ انسانی کو استحکام اور نشو و نما حاصل ہوتا ہے ۔ سورۃ قٓ میں کہا کہ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبٰرَکًا (۵۰/۹) ۔ ''ہم نے آسمان سے بارش برسائی جو نوع انسانی کی نشو و نما اور استحکام کا ذریعہ بنتی ہے،، ۔ اور قرآن کریم کو بھی کِتَابٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ کہا ہے (۳۸/۲۹) ۔ یعنے وہ ضابطہ حیات جس میں ایسے اصول و قوانین ہیں جو دائمی خیر و فلاح کا موجب ہیں ۔ جن سے انسان کا ثبات و استحکام اور نشو و نما وابستہ ہے ۔ اور اس لیل کو بھی مُبَارَکٌ کہا جسمیں یہ نازل ہوا (۴۴/۳) ۔ مکہ کو (جو قرآن کے نظام ربوبیت کا مرکز ہے) مُبَارَکٌ کہا (۳/۹۵) ۔ خود خدا بھی اپنی ربوبیت عالمینی کی وجہ سے مُبَارَکٌ ہے ۔ تَبَارَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۷/۵۴) ۔ تَبَارَکَ ۔ بابرکت اور ہر قسم کے خیر و برکت کا سرچشمہ ہونا ۔
تَبَارَکَ الَّذِیْ... سے مراد ہے وہ ذات جس میں خیر و برکت اپنی پوری کثرت کے ساتھ انتہا تک پہنچ چکی ہو ۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اصل سرچشمۂ خیر و برکت جہاں تمام خوبیاں اپنی کامل شکل میں موجود ہیں اور ان میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوتی ذات خداوندی ہے ۔ اور ربوبیت عالمینی اسی سرچشمۂ خیر و برکت سے ہوتی ہے ۔ جو قوم اللہ کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرے اسے بھی (علیٰ حدِ بشریت خیر و برکت اور عالمگیر انسانیت کے لئے سامانِ نشو و نما مہیا کرنے کا ذمہ دار ہونا چاہیئے ۔

*تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔

ب ر م

اَبْرَمَ الْحَبْلَ - اسنے رسی کو مضبوطی سے بٹ لیا (دو رنگوں میں یا دو بٹوں میں) -اَلْمِبْرَمُ- چرخیاں وغیرہ جن سے رسیاں مضبوط بٹی جائیں - اَلْبَرِيْمُ - دو مختلف بٹوں والا (مثلاً سرخ و سفید) دھاگا جسے عورتیں اپنے بازو یا کمر پر بھی باندھ لیتی ھیں - ھر وہ چیز جس میں دو مختلف رنگ ھوں- رسی یا ڈورا جس میں دو رنگ ھوں - اَبْرَمَ الْاَمْرَ- اسنے معاملہ کو محکم اور مضبوط کر دیا* - اسی سے قَضَاءٌ مُبْرَمٌ - محکم اور اٹل فیصلے کو کہتے ھیں - قرآن کریم میں ھے اَمْ اَبْرَمُوْا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ (۴۳/۷۹) - ''کیا انہوں نے (حق کی مخالفت کیلئے اپنے) معاملہ کو مضبوط کر لیا ھے ؟ اگر ایسا ھے تو ھم بھی معاملہ کو محکم کر لینے والے ھیں'' -

چونکہ رسی کو مضبوط بٹنے میں بار بار بل دینا اور کئی بار بٹنا پڑتا ھے اس لئے اصرار کرنے اور بضد رھنے کے لئے بھی اِبْرَامٌ بولا جاتا ھے** - ممکن ھے اسی جہت سے چیچڑی کو البُرَامُ کہا جاتا ھو-

ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں (۱) کسی چیز کا محکم ھو جانا - (۲) دو مختلف رنگ - اور (۳) تھک جانا اور دل برداشتہ ھو جانا لکھے ھیں -

آخری معانی کے لئے یہ لفظ قرآن میں نہیں آیا -

ب ر ھ

اَلْبَرَهْرَهَةُ- گورے پن کے ساتھ گدازی بدن - اَلْبَرَهْرَهَةُ - سفید نوجوان حسینہ ، جو حسن و نزاکت کی وجہ سے لچکتی ھو، رنگ کی صفائی کے باعث جسکی جلد چمک رھی ھو ، تنعم و آسودگی کی وجہ سے جو تروتازہ ھو**** - اَلْبَرْهَةُ والبُرْهَةُ - زمانہ طویل* -

اَلْبُرْهَانُ - خلیل نے کہا ھے کہ یہ لفظ بَرهْرَهَةٌ سے ماخوذ ھے (جسکے معنے اوپر لکھے گئے ھیں) یعنے روشن اور لطیف دلیل - یا بُرْهَةٌ سے ماخوذ ھے ، اپنے ثابت اور قائم ھونے کی وجہ سے - ایک اور قول ھے کہ یہ لفظ فعلان کے وزن پر ھے اور بَرْءٌ سے ماخوذ ھے جسکے معنے قطع کرنے کے ھوتے ھیں - یعنے دلیل قاطع*** - بعض نے نون کو اصلی مانکر اسے رباعی تسلیم کر لیا ھے - لیکن ایسا کثرت استعمال کی وجہ سے مانا گیا ھے ورنہ ھے یہ برہ ھی سے -

---

*تاج و راغب - **راغب - ***محیط - ****تاج -

راغب نے کہا ہے کہ یہ فَعْلَانٌ* کے وزن پر ہے اور بَرِہَ - یَبْرَہُ سے ماخوذ ہے جسکے معنے سفید ہونے کے آتے ہیں*** - نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ حسن الفاظ میں باء اور راء اکٹھے آئیں ان میں ''ظاہر ہونے،، کا مفہوم پایا جاتا ہے - بہرحال اس بات پر سب متفق ہیں کہ اس کے معنے ایسی دلیل کے ہیں جو ہر حال میں، ہمیشہ، سچی ہو - روشن واضح اور سچی دلیل - ایسی دلیل جو بالکل ظاہر ہو -

قرآن کریم نے اپنے آپکو بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ (۴/۱۷۵) کہا ہے - ''تمہارے رب کیطرف سے واضح دلیل،، - اسلئے کہ اسکا ہر دعوی دلیل و برہان پر مبنی ہے - یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین سے بھی دلیل و برہان ہی کا مطالبہ کرتا ہے اور علانیہ کہتا ہے کہ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ (۲/۱۱۱) - ''اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اسکی تائید میں دلیل پیش کرو،، - اسے اپنے دعوے کی صداقت پر اسقدر یقین ہے کہ اس مطالبہ کے ساتھ ہی ان سے کہدیتا ہے کہ تمہارے پاس کوئی دلیل قاطع نہیں ہو سکتی - لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ (۲۳/۱۱۷) - ''کسی کے پاس (شرک کی تائید میں) دلیل نہیں ہو سکتی،، -

مذہب**** کو (جسے ہمیشہ عقل کا حریف اور دلیل کا دشمن سمجھا جاتا تھا) علم و عقل اور دلیل و برہان کی رو سے پیش کرنا اور منوانا، قرآن کریم ہی کی خصوصیت ہے - وہ اپنے ہر دعوے کو علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی رو سے منواتا ہے -

ب ز غ

بَزَغَ نَابُ الْبَعِيْرِ کے معنے ہیں اونٹ کی ڈاڑھ گوشت کو شق کرکے نمودار ہوئی - اس سے چاند اور سورج کے طلوع ہو جانے کو جب انکی روشنی پھیل رہی ہو بُزُوْغٌ کہتے ہیں - * ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے نکلنے اور ظاہر ہو جانے کے ہیں -

اِبْتَزَغَ الرَّبِيْعُ - بہار کا آغاز ہو گیا - شگوفے پھوٹنے شروع ہو گئے - *

*تاج - **محیط - ***راغب - ****قرآن نے دین عطا کیا ہے - مذہب کا لفظ قرآن میں نہیں ہے - ہم نے یہ لفظ عام استعمال کے پیش نظر لکھ دیا ہے - ورنہ اسلام کو الدین کہنا چاہئے - یعنی خدا کا مقرر کردہ ضابطہء حیات - طریق زندگی - نظام معاشرہ -

قرآن کریم میں ہے اَلْقَمَرَ بَازِغاً اور اَلشَّمْسَ بَازِغَۃً (۶/۷۸-۷۹)
"طلوع ہوتے ہوئے یا چمکتے ہوئے چاند اور سورج"۔

نواب صدیق حسن خان نے کہا ہے کہ جب کسی لفظ میں بَا اور زَا اکٹھے آئیں تو اس میں "کسی چیز کے نکلنے اور ظاہر ہونے" کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ بَزْغ میں بھی کیفیت ہوتی ہے۔

ب س ر

اَلْبَسْرُ۔ کسی چیز کا وقت سے پہلے، نا مکمل حالت میں جلدی ہو جانا۔ یہ اسکے بنیادی معنے ہیں۔ بَسَرَ الدُّمَّلَ۔ اسنے پھوڑے کو پکنے سے پہلے ہی پھوڑ دیا۔ اَلْبُسْرُ ہر تروتازہ چیز نیز کھجور جو ابھی پکی نہ ہو*۔ ان معانی کے اعتبار سے ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ (۷۴/۲۲) کے معنے ہیں اس نے منہ بگاڑ لیا۔ لیکن بَسَرَ کے معنے شدت کراہت سے کسی کی طرف دیکھنے کے بھی آتے ہیں*۔ اس اعتبار سے اسکے معنے تیوری چڑھانے اور منہ بگاڑنے کے ہونگے۔ خیال اسطرف جاتا ہے کہ چونکہ کچا پھل کھانے سے منہ بد مزہ ہو جاتا ہے اس لئے بَسَرَ کے معنی "بد مزہ ہو گیا" ہیں۔ بد مزگی سے منہ ضرور بگڑتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وُجُوْہٌ یَوْمَئِذٍ بَاسِرَۃٌ (۷۵/۲۴)۔ "اس دن بعض چہرے برے بنے ہوئے ہونگے"۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی (۱) کسی چیز کی پکنے سے پہلے کی حالت۔ اور (۲) کسی چیز کی حرکت کم ہو جانا یا اس کا ٹھہر جانا ہیں۔ نیز بَسَرَ الرَّجُلُ الْحَاجَۃَ کے معنی ہیں اس شخص نے اپنی ضرورت کو وہاں تلاش کیا جہاں اس کے ملنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

ب س س

ستو یا خشک روٹیوں کا سفوف جو ستو کیطرح پانی میں گھول کر کھا لیا جائے۔ گھولنے، خلط ملط کرنے اور چورا چورا کرنے کے لئے بَسَّ یَبُسُّ بَسًّا بولا جاتا ہے۔ اسی طرح اسکے معنے کسی چیز کے ریزہ ریزہ کر دینے کے بھی ہیں۔

لیکن بَسَّ الْاِبِلَ بَسًّا کے معنی ہیں اس نے اونٹوں کو نرمی سے ہانکا۔ اَلْبَسُّ۔ اونٹوں کو مختلف شہروں میں بھیجدینا اور متفرق کر دینا۔ اس اعتبار سے اسکے معنے اپنی جگہ سے چلانے کے ہونگے*۔ چنانچہ اِنْبَسَّتِ الْحَيَّاتُ کے معنے ہیں سانپ تیزی سے رینگ گئے*۔ قرآن کریم میں ہے

*تاج و راغب۔

وَ بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (۵۶/۵)۔ اسکے ایک معنے تو یہ ھیں کہ جبال (بڑے بڑے سرداران قوم ۔ جابر و متکبر لوگ) ریزہ ریزہ ھو جائینگے ۔ اور یا یہ کہ وہ اپنے مقام سے ھانک کر ھٹا دئیے جائینگے یا وہ خود ھی رینگ کر الگ ھو جائینگے۔ انہیں معانی کیلئے دوسری جگہ ھے وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (۷۸/۲۰) یا وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (۸۱/۳)۔ یا، وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (۷۷/۱۰) ۔ نیز يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا (۲۰/۱۰۵)۔ ان تمام مقامات میں مفہوم ایک ھی ھے ۔ انکی قوت و استحکام کا ٹوٹ جانا ۔ انکے مقام کا ان سے چھن جانا ۔ انقلاب سے زیر و زبر ھوجانا۔ (عنوان ن-س-ف بھی دیکھئے اور ج ۔ ب۔ ل(بھی۔ واضح رھے کہ جَبَلٌ کے لغوی معنی پہاڑ ھیں ۔ اس لئے ان آیات میں اگر لغوی معنی لئے جائیں تو مطلب پہاڑوں کا اڑ جانا یا ریزہ ریزہ ھو جانا ھوگا ۔ لیکن آیات کے سیاق و سباق کے پیش نظر مجازی معنی زیادہ موزوں معلوم ھوتے ھیں ۔ اس لئے ھم نے مجازی معانی لکھے ھیں ۔

ب س ط

بَسَطَهُ ۔ بَسْطَةً ۔ پھیلانا ۔ نشر کرنا ۔ توسیع کرنا ۔ وسعت دینا**۔ بمقابلہ قَبْضٌ (۲/۲۴۵) ۔ نیز بمقابلہ قَدَرٌ (۴۲/۲۷) ۔ قَدَرٌ کے معنے ھیں پیمانوں سے ناپ تول کر دینا، بمقابلہ مَغْلُوْلَةٌ بمعنی بندھا ھوا ۔ (۱۷/۲۹ و ۵/۶۴) ۔ نیز اسکے معنے حملہ کرنے ۔ ھاتھ بڑھانے ۔ دست درازی کرنے کے بھی آتے ھیں (۵/۱۱) جس کے مقابلہ میں فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ آیا ھے ۔ (۵/۱۱) ۔ یعنی ''اس نے تم سے ان کے ھاتھوں کو روکا،، ۔ اور مسلط ھونے کے معنے بھی ۔ وَالْمَلٰئِكَةُ بَاسِطُوْا اَيْدِيْهِمْ (۶/۹۳) ۔ ''اور فرشتے اپنے ھاتھ پھیلا رھے ھونگے،، ۔ یعنی مسلط ھو جائینگے۔ مَبْسُوْطٌ ۔ کشادہ**۔ (۵/۶۴) ۔ بِسَاطٌ ۔ بچھی ھوئی یا وسیع اور پھیلی ھوئی (۷۱/۱۹)*۔

قرآن کریم میں حضرت طالوت کے متعلق ھے کہ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲/۲۴۷) ۔ اسکے عام معنے یہ ھیں کہ اسے علم اور جسمانی قوت بہت زیادہ دی ھے ۔ لیکن راغب نے کہا ھے کہ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ۔ یہ ھے کہ انسان اپنے علم سے خود بھی نفع اٹھائے اور دوسروں کو بھی نفع پہنچائے*** ۔ لہذا بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ تم اپنی قوتوں کو اپنی ذاتی منفعت کیلئے صرف کرتے ھو لیکن طالوت اپنے علم اور توانائی سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ھے ۔ یہ وجہ ھے کہ اسے ھم نے تمہارے

---

*تاج و راغب ۔ نیز ابن فارس ۔ ** تاج ***راغب

اوپر کمان کے لئے منتخب کیا ہے ۔ کمانڈر ہونے کے لئے جسمانی اور دماغی دونوں قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اور اس خصوصیت کی بھی کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے ۔

ب س ق

اَلْبُسَاقُ ۔ لعاب دھن ۔ بَسَقَ ۔ اسنے تھوکا ۔ (بجائے ''س'' کے ''ص'' سے بصق بھی کہتے ہیں) ۔

بَسَقَ النَّخْلُ بُسُوْقاً ۔ کھجور کے درخت لمبے اور بلند ہوئے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں ۔

بَسَقَ عَلَيْهِمْ ۔ وہ ان پر فضیلت میں بازی لے گیا ۔ بڑھ چڑھ گیا ۔

اَلْبَسُوْقُ وہ بکری جسکے تھن لمبے ہوں ۔

بَسَقَ الشَّيْءُ بُسُوْقاً ۔ چیز کی لمبائی مکمل ہو گئی* ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ (۵۰/۱۰) ۔ ''لمبے لمبے کھجوروں کے درخت'' ۔

صاحب محیط نے اسکے معنے باردار کھجوروں کے بھی کئے ہیں** ۔

ب س ل

بَسْلٌ کے اصلی معنی روک دینے کے ہیں یَوْمٌ بَاسِلٌ سخت دن کو کہتے ہیں ۔ اَلْبَاسِلُ شیر کو کہتے ہیں ۔ یہیں سے بَسَالَةٌ کے معنے بہادری کے ہیں کیونکہ بہادر اپنی مدافعت کرتا ہے** ۔ اور روکنے کے مفہوم کے پیش نظر اسکے معنے ہیں کسی کو اچھی چیزوں سے محروم کر دینا**** ۔ بَسَّلَهُ ۔ اسے تباہی آ جائے *** ۔ اَلْبَسْلُ ۔ چھلنی میں چھاننا ۔ کسی چیز کو تھوڑا تھوڑا لینا ۔ کسی کو قید کر دینا ۔ اَبْسَلَهُ ۔ اسے ہلاکت اور تباہی کے حوالہ کر دیا ۔ اَبْسَلَهُ لِعَمَلِهِ اسے اسکے عمل کے حوالہ کر دیا کہ جو کچھ اسنے کیا ہے اسکی سزا بھگتے*** ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ (۶/۷۰) ۔ ''ایسا نہ ہو کہ کوئی فرد اپنے (غلط) اعمال کی وجہ سے، (قرآن کی بخشائشوں سے) محروم رہ جائے'' ۔ اور اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا (۶/۷۰) ۔ ''یہ وہ ہیں جو اپنے اعمال کی وجہ سے محروم کئے گئے ہیں'' ۔ اس سے مفہوم ہے قانون مکافات کی رو سے اپنے اعمال کے نتائج بھگتنا ۔ غلط اعمال کے نتیجہ میں زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جانا اور اسطرح انسانی نشو و نما کا رک جانا ۔

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔ ****راغب ۔ راغب کی عبارت کے ترجمہ کے لئے دیکھیں ترجمہ صفحہ ۱۵ اجلد چہارم ۔

ب س م

بَسَمَ - يَبْسِمُ - بَسْماً - انسان کا خوشی اور مسرت میں هلکی سی هنسی هنسنا ، مسکرانا - (قدرے هونٹ کھول کر اور تھوڑے تھوڑے دانت نکال کر)- اِبْتَسَمَ وَ تَبَسَّمَ - وہ کم از کم اور حسین ترین هنسی هنسا - مسکرایا - مَابَسَمْتُ فِی الشَّیْءِ - میں نے اس چیز کو چکھا تک نہیں* -

قرآن کریم میں هے فَتَبَسَّمَ ضَاحِكاً (۲۷/۱۹) - ''وہ خوشی سے مسکرایا'' -

ب ش ر

بَشَرَةٌ کے معنے انسان کی جلد کی اوپر کی سطح کے هیں - چنانچه اَلْبَشْرُ کے معنے هیں کھال کو چھیل دینا* - (یعنی اسکے بال صاف کر دینا)- پھر البَشَرُ کے معنے خود انسان کے هو گئے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ بَشَرٌ سے صرف انسان کی طبعی ساخت اور جسمانی بناوٹ مراد هوتی هے- اس اعتبار سے هر انسانی بچه (یا انسان) بشر هوتا هے- لیکن انسانیت کے جوهر اور خصوصیات هر بشر میں مختلف هونگے- چنانچه قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرامؑ جہاں یہ کہتے هیں کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (میں بھی تمہارے جیسا بَشَرهوں) تو اس سے بشریت کے طبعی تقاضوں کا اشتراک مقصود هوتا هے - جیسا کہ سورۃ مومنون میں هے مَاهٰذَا اِلاَّ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ (۲۳/۳۳)- (انھوں نے کہا کہ) ''یہ رسول تمہارے جیسا ایک بشر هی هے - جو کچھ تم کھاتے هو وهی یه کھاتا هے - جو تم پیتے هو وهی یه پیتا هے'' - یعنی اگر اس وحی کو الگ کر لیا جائے جو اسے خدا کیطرف سے ملتی هے تو نبی کی طبیعی خلقت عام انسانوں کی سی هوتی هے - لیکن نبوت (خدا کیطرف سے وحی پانا) ایسی خصوصیت نہیں تھی جسے هر انسان اپنے کسب و هنر سے حاصل کر سکتا - یه خدا کی طرف سے وهبی طور پر ملتی تھی- نبی کی بشری حیثیت موت سے ختم هو جاتی هے - لیکن اسکی نبوت (وحی) آگے چلتی هے -

عمومی حیثیت سے اِنْسَانٌ اور بَشَرٌ مرادف طور پر بھی استعمال هوتے هیں - مثلاً - (۱۵/۲۹) اور (۱۵/۲۸) میں ایک جگہ اِنْسَانٌ اور دوسری جگہ بَشَرٌ

---

*تاج و محیط -

کہا گیا ھے ۔ بَاشَرَھا کے معنے عورت سے مجامعت کرنے کے ھیں (۲/۱۸۷) ۔ اس نہج سے کہ اس میں عورت اور مرد کی جلد سے جلد مل جاتی ھے ۔ کبھی اسکے معنے محض لپٹانے اور بوس و کنار کے بھی آتے ھیں* ۔ لیکن قرآن میں بَاشِرُوْھُنَّ (۲/۱۸۷) کے معنی مجامعت کے ھیں ۔

بِشَارَۃٌ (بالکسر) کے بنیادی معنے ایسی خبر کے ھیں جس سے انسان کے چہرے (کی رنگت) میں تغیر پیدا ھو جائے خواہ وہ خبر خوشی کی ھو یا غم کی ۔ بَشَّرَ کے معنے ھیں اس قسم کی خبر دینا** ۔ چنانچہ قرآن کریم میں عَذَابٌ اَلِیْمٌ کی خبر کیلئے بھی یہ لفظ آیا ھے (۳/۲۰) اسی طرح سورۃ نحل میں ھے کہ جب ان لوگوں کو لڑکی پیدا ھونے کی خبر دیجاتی ھے تو انکے چہرے کی رنگت سیاہ ھو جاتی ھے ۔ اسکے لئے بھی بُشِّرَ کا لفظ آیا ھے (۱۶/۵۸)۔ لیکن عام حالات میں بِشَارَۃٌ اچھی خبر کو کہتے ھیں ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا حسن و جمال کے ساتھ ظاھر ھو جانا ھیں ۔

اَبْشَرَ اور اِسْتَبْشَرَ کے معنے بھی خوش ھونے کے آتے ھیں ۔ چنانچہ سورۃ زمر (۳۹/۴۵) میں اِشْمِئْزَازٌ کے مقابلہ میں اِسْتِبْشَارٌ آیا ھے۔ اِشْمِئْزَازٌ کے معنے منقبض ھونے کے ھیں ۔

اَلْبَشَارَۃُ (بالفتح) کے معنے حسن و خوبصورتی کے بھی آتے ھیں۔ اَلْبَشِیْرُ ۔ خوشخبری دینے والے کو کہتے ھیں ۔ اَلْبِشْرُ ۔ خندہ پیشانی اور کشادہ روئی کو کہتے ھیں ۔ اَلتَّبَاشِیْرُ کے معنے خوشخبری کے ھیں، نیز ھر چیز کے ابتدائی حصے کے ۔ صبح کے وقت روشنی کی پہلے پہل رونما ھونے والی کرنوں کو بھی کہتے ھیں ۔

اَلْمُبَشِّرَاتُ ان ھواؤں کو کہتے ھیں جو سحاب بردوش آتی ھیں اور بارش کی خوشخبری دیتی ھیں ۔ مزید برآں دیکھئے تتمہ ص۱۸۱۵ جلد چہارم عنوان ب ش ر۔

ب ص ر

بَصَرٌ ۔ قوتِ بینائی۔ (اس میں روشنی اور چمک کا پہلو بھی ھوتا ھے) چنانچہ تیر کے پھل پر جو تھوڑا سا خون لگ جاتا ھے ، جس سے معلوم ھوتا ہے کہ وہ کسی شکار کے لگا ہے ، اسے بَصِیْرَۃٌ کہتے ہیں۔ خون کا نشان یا ٹکا جس کے ذریعے شکار کی نشاندہی ہوتی ہو۔ نیز چمکدار ڈھال اور زرہ بکتر کو بھی۔ اس زمین کو جس میں چمکدار اور نرم پتھر ہوں بَصْرَۃٌ کہتے ہیں۔ سخت زمین نیز سفید پتھر کو بھی (تاج)۔ راغب نے چمکدار کا اضافہ کیا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو جان لینا اور کسی چیز کا موٹا ہونا ہیں۔

---

*تاج ۔ ** اقرب الموارد۔

صاحب مصباح نے کہا ہے کہ بَصَرٌ اس روشنی کو کہتے ہیں جس سے آنکھ مُبْصَرَات (نظر آنے والی چیزوں) کا ادراک کر لیتی ہے۔ اسکے بعد آنکھ پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔ نیز بَصَرٌ کے معنے کسی چیز کا دل میں اتر جانا ہیں۔ اسی وجہ سے اسکے معنے علم کے آتے ہیں۔ بَصِیْرٌ دیکھنے والے کو نیز عالم کو کہتے ہیں۔ اور بَصِیْرَۃٌ قوتِ ادراک یا ذہانت و فطانت کو کہتے ہیں۔ نیز حجت اور دلیل کو۔ اور یقین و ارادہ کو۔ اور عبرت و موعظت کو۔ بَصِیْرَۃٌ کے معنے گواہ اور شاھد کے بھی آتے ہیں*۔

قرآن کریم نے اس مادہ کو عام دیکھنے کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۃ اعراف میں ہے اَمْ لَہُمْ اَعْیُنٌ یُّبْصِرُوْنَ بِہَا (۷/۱۹۵) "کیا انکی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں"۔ اور بَصِیْرٌ کے مقابل اَعْمٰی (اندھا) کا لفظ لاکر (۲۰/۱۲۵) ان معانی کو واضح کر دیا ہے۔ لیکن اس نے نَظَر اور بَصَر کے باریک فرق کو نہایت عمدگی سے واضح کر کے بتا دیا ہے کہ بصیرت کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے وَ تَرَاھُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَ ھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۷/۱۹۸)۔ "تو دیکھتا ہے کہ انکی آنکھیں تیری طرف ہیں (نظر) لیکن وہ درحقیقت دیکھ نہیں رہے ہوتے" (لَایُبْصِرُوْنَ)۔ یہاں سے نَظَر اور بَصَر کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ انہی لوگوں کو (سورۃ یونس) میں عُمْیٌ (اندھے) کہا ہے۔ یعنی جو بصیرت سے کام نہیں لیتے (۱۰/۴۳)۔ نیز (۴۷/۱۶) میں انہی جیسوں کے متعلق کہا ہے کہ بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے کہ وہ تیری بات سن رہے ہیں حالانکہ وہ اسوقت کسی اور خیال میں مستغرق ہوتے ہیں۔ اور (جیسا کہ ش۔ م۔ ع کے عنوان میں بتایا جائیگا)** بَصِیْرَۃٌ اسکی ہوتی ہے جو اپنے علم سے وحی کی راہ نمائی میں کام لے۔ (۶/۵۰) میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے*۔ مومن، صاحب بصیرت ہوتے ہیں، یعنی وحی کی روشنی میں عقل و فکر سے کام لینے والے۔

قرآن کریم میں بَصِیْرَۃٌ گواہ اور شاھد کے معنوں میں بھی آیا ہے (۷۵/۱۴)۔ مُبْصِرَۃً (۱۷/۵۹) کے معنے روشن اور واضح دلیل کے ہیں۔

بصیرت سے سمجھ لینے کے معنوں میں یہ لفظ (بَصِیْرًا) سورۃ یوسف میں (۱۲/۹۶) میں آیا ہے۔ قرآن نے اپنے آپکو بَصَائِرُ کہا ہے (۶/۱۰۵)۔ یعنی واضح دلائل۔ کھلی ہوئی حقیقتیں۔ روشن علم۔ مزید براں دیکھئے تتمہ صفحہ ۱۸۱۵/ صفحہ ۱۸۴۶ جلد چہارم عنوان ب ص ر

*تاج۔ ** (اس مفہوم کی وضاحت کیلئے س۔م۔ع۔ ق۔ل۔ب اور خ۔ت۔م کے عنوانات دیکھئے)۔

ب ص ل

بَصَلٌ ۔ پیاز کو کہتے ہیں*۔
قرآن کریم میں یہ لفظ (۲/۶۱) میں آیا ہے۔

ب ض ع

اَلْبَضْعُ ۔ کاٹنا ۔ بَضَعْتُ اللَّحْمَ ۔ میں نے گوشت کاٹا ۔ گوشت کوٹکڑے ٹکڑے کر دیا ۔ اَلْبِضْعُ ۔ ایک حصہ ۔ کچھ حصہ**۔ قرآن کریم میں ہے بِضْعَ سِنِیْنَ (۱۲/۴۲) ۔ "کچھ سال ۔ چند برس"۔ لیکن یہ تین سے اوپر اور دس سے کم کے لئے آتا ہے*۔ اَلْبِضَاعَۃُ ۔ مال کا وہ حصہ جس سے تجارت کی جائے** ۔ سامان تجارت ۔ پونجی ۔ سورۃ یوسف میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے ۔ وَاَسَرُّوْہُ بِضَاعَۃً (۱۲/۱۹) "انہوں نے اسے مال تجارت سمجھ کر چھپائے رکھا"۔ بِضَاعَتَھُمْ "پونجی"۔ (۱۲/۶۲) و (۱۲/۶۵)۔

ب ط أ

بَطُؤَ ۔ یَبْطُؤُ ۔ بِطَاءً ۔ تاخیر کرنا ۔ اَبْطَؤُا ۔ ان کے جانور سست رفتار ہو گئے*۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلْبُطْؤُ کے معنے ہیں چلنے یا اٹھنے میں دیر لگانا۔ اس اعتبار سے اس نے سورۃ نساء کی اس آیت (وَاِنَّ مِنْکُمْ لَمَنْ لَّیُبَطِّئَنَّ ۴/۷۲) کے معنے کئے ہیں، "وہ لوگ جو خود بھی دیر لگائینگے اور دوسروں سے بھی دیر لگوائینگے"۔

ب ط ر

اَلْبَطَرُ ۔ کسی نا اہل کو اگر بہت سی دولت اور قوت مل جائے تو اس سے اس میں جو تکبر، اکڑ فوں، اوچھا پن اور اترانے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اسے بَطَرٌ کہتے ہیں ۔ اصل میں بَطَرَ ۔ یَبْطُرُ کے معنے ہوتے ہیں پھاڑ دینا ۔ شق کر دینا ۔ (اَلْبَیْطَارُ وٹرنری ڈاکٹر کو کہتے ہیں جو حیوانات کی چیر پھاڑ کرتا ہے) ۔ چونکہ کثرت مال و دولت سے تنگ ظرف انسان کا دیدہ پھٹ جاتا ہے اسلئے اس نفسیاتی کیفیت کو بَطَرٌ کہتے ہیں۔ اَبْطَرَہُ الْمَالُ ۔ مال و دولت نے اس میں اوچھا پن پیدا کر دیا*۔

قرآن کریم میں ہے اَلَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بَطَرًا (۸/۴۷)۔ "جو اپنے گھروں سے اکڑتے اور اتراتے ہوئے نکلے"۔ سورۃ قصص میں ہے ۔ بَطِرَتْ مَعِیْشَتَھَا (۲۸/۵۸) ۔ جو قومیں اسباب زیست کی فراوانیوں پر اتراتی تھیں ۔

---

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔

ب ط ش

بَطَشَ ۔ یَبْطِشُ ۔ کسی چیز کو زبردستی اور طاقت کے ساتھ لے لینا ۔ اَلْبَطْشُ ۔ سخت گرفت ۔ جنگ ۔ بَطَشَ عَلَیْہِ ۔ اس پر تیزی سے حملہ کیا ۔ *

قرآن کریم میں ہے اَمْ لَھُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِھَا (۷/۱۹۵) "کیا ان کے ھاتھ ھیں جن سے وہ کسی چیز کو گرفت میں لے سکتے ھیں" ۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ (۸۵/۱۲) ۔ "تیرے رب (کے قانون مکافات) کی گرفت بڑی سخت ہے" ۔ یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَۃَ الْکُبْرٰی (۴۴/۱۶) ۔ "جس دن ہم سب سے بڑی شدید گرفت سے پکڑینگے" ۔ (جب ظہور نتائج کا وقت آئیگا) ۔ یہ تو قانون عدل و انصاف کی گرفت ہے ۔ دوسری طرف ظلم و استبداد کی گرفت ہے جسے ھلاک ھونے والی قوموں کا شیوہ بتایا گیا ہے ۔ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ (۲۶/۱۳۰) "جب تم کسی کو پکڑتے ھو تو جابرانہ انداز سے پکڑتے ھو" ۔ کمزور انسانوں کو اس گرفت سے چھڑانے کے لئے خدا کا نظام آتا ہے جو ظالموں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے ۔

ب ط ل

بَاطِلٌ ۔ قرآن میں حَقّ کے مقابلہ میں بَاطِل آیا ہے (مثلاً ۲/۴۲) ۔ لہذا بَاطِل کا صحیح مفہوم سمجھنے کیلئے حَقّ کا عنوان دیکھئے جہاں اسکے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے ۔ یعنی ھر وہ چیز یا تصور یا نظریہ جو حق نہیں ، وہ بَاطِل ہے ۔ مثلاً حَقّ کے معنے ٹھوس تعمیری نتائج کے ھیں اسلئے بَاطِل کے معنے تخریبی کوششوں کے یا ایسی کوششوں کے ھونگے جن کا نتیجہ کچھ نہ نکلے ۔ یعنی بَاطِلٌ صرف تخریبی کوششیں ھی نہیں بلکہ ھر وہ کام باطل ہے جسکا کچھ نتیجہ نہ نکلے ۔ چنانچہ بَطَلَ الشَّیْءُ کے معنے ھیں کسی چیز کا یونہی ضائع چلا جانا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا جاتے رھنا اور کم ٹھہرنا ھوتے ھیں ۔ صاحب تاج العروس نے کہا ہے کہ جب کسی چیز کو کسوٹی پر پرکھا جائے اور وہ اس پر پوری نہ اترے تو اسے بَاطِلٌ کہتے ھیں ۔ یعنی حَقٌّ وہ جو کسوٹی پر پورا اترے اور بَاطِلٌ وہ جو معیار پر پورا نہ اترے ۔

---

* تاج و محیط و راغب ۔ ** تاج

اِبْطَال* کےمعنے ھیں کسی چیز کو خراب کر دینا اور زائل کر دینا خواہ وہ چیز حَق* ھی کیوں نہ ھو۔ بَطَلَ الاَجِیْرُ کےمعنی ھیں مزدور بیکار ھو گیا۔ *صاحب محیط کے نزدیک بَاطِل* ان چیزوں کو کہتے ھیں کہ جن مفادات و مقاصد کیلئے وہ بنائی گئی تھیں ان میں وہ مفادات مِنْ کُلِّ وَجْہٍ (پوری طرح) باقی نہ رھیں اور انکی صرف صورت باقی رہ جائے**۔ (چنانچہ وہ کہتا ھے کہ کوئی بعید نہیں کہ اس مادہ کے اصلی معنے خالی ھونا ھوں)**۔ اس مفہوم کو سامنے رکھنے سے مذھب کے وہ تمام اعمال باطل قرار پا جائے ھیں جنہیں محض رسماً ادا کیا جائے اور ان سے وہ فائدے حاصل نہ ھو رہے ھوں جن کے لئے انہیں تجویز کیا گیا تھا۔ (ح۔ک۔م کا عنوان دیکھئے جہاں یہ بتایا گیا ھے کہ خدا نے قرآن میں قوانین کے ساتھ یہ بھی خود ھی متعین کر دیا ھے کہ ان قوانین سے کیا کیا نتائج مرتب ھونگے)۔ اسی لئے قرآن میں نِعْمَۃ* کے بالمقابل بَاطِل* آیا ھے (۲۹/۶۷ ; ۱۶/۷۲) اس لئے کہ حق پر عمل پیرا ھونے کا لازمی نتیجہ نعمائے حیات کا ملنا ھے۔ اور جہاں نعماء نہ ھوں ظاھر ھے وھاں حق نہیں باطل کار فرما ھے، خواہ ھم اپنے ذھن میں اسے کیسا ھی حق کیوں نہ سمجھ لیں۔ یا حَق* کے معنے ھیں وہ شے جو اپنی جگہ پر اٹل ھو، محکم ھو۔ اسلئے بَاطِل* اس چیز کو کہتے ھیں جسمیں ثبات نہ ھو*۔ یعنے وہ بظاھر نظر آئے لیکن جب تحقیق کی جائے تو اسمیں ثبات دکھائی نہ دے*۔ چنانچہ قرآن میں ھے جَآءَالْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا (۱۷/۸۱)۔ ''حق آگیا اور باطل تباہ ھو گیا۔ باطل ھوتا ھی تباہ ھونے والا ھے''۔ باطل کہتے ھی اسے ھیں جو باقی رھنے والا نہ ھو۔ وہ اسوقت تک باقی رھتا ھے جب تک حق نہیں آتا۔ چراغ آیا، اور اندھیرا گیا۔ لہذا باطل کو مٹانے کا طریقہ یہ ھے کہ ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرنے والے پروگرام (حق) کو عمل میں لایا جائے۔ تعمیری کوششیں کی جائیں۔ انکے محکم نتائج سے تخریبی اور بیکار کوششیں خود بخود مٹ جائینگی۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴)۔ ھمواریوں اور خوشگواریوں سے ناھمواریاں اور ناخشگواریاں خود بخود مٹ جاتی ھیں۔ ناھموار جگہ کو ھموار کر دیجئے، اسکی ناھمواری خود بخود مٹ جائیگی۔

اسی طرح حق کے مختلف معانی کو دیکھئے اور جو چیز اسکی نقیض ھو اسے باطل سمجھئے۔ نیز دیکھئے تتمہ صـ۱۸۱۶ جلد چہارم عنوان ب ط ل تحت صـ۳۲۶۔

*تاج۔ ** محیط

بِطَالٌ وبَطَلٌ ۔ بہت بہادر آدمی جو دوسرے کے خون کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا اور اسے یونہی ضائع کر دیتا ھے * ۔

ب ط ن

بَطْنٌ کے معنی پیٹ ۔ اندرونی حصّہ ۔ اس کی جمع بُطُوْنٌ ہے ۔

اَلْبَطْنُ ۔ ظَهْرٌ کی ضد ھے * ۔ محیط میں ھے کہ اصلی معنے اس مادہ میں خالی ھونا ۔ فارغ ھونا ھیں ** ۔ راغب نے کہا ھے کہ ھر چیز کی نیچے کی جہت (Side) کو بَطْنٌ کہتے ھیں اور اوپر کی طرف کو ظَهْرٌ *** ۔

اَلْبَطْنُ ۔ پیٹ کو کہتے ھیں ۔ جمع بُطُوْنٌ ۔ ھر چیز کا اندرونی حصہ ۔ بَطْنُ الْاَمْرِ ۔ معاملہ کی اندرونی حالت * ۔

اَلْبِطَانَةُ مِنَ الثَّوْبِ ۔ کپڑے کا استر ۔ اندرونی حصّہ ۔ اس کی جمع بَطَائِنُ ہے (۵۵/۵۴) ۔ یہیں سے اس کے معنے رازداں کے آتے ھیں ۔ یعنی وہ شخص جو اندر آ جا سکے اور اندرونی معاملات پر واقفیت رکھ سکے * ۔ قرآن میں ھے لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (۳/۱۱۷) ۔ ''اپنی جماعت کے افراد کے علاوہ کسی اور کو ایسی پوزیشن نہ دو کہ وہ تمہارے اندرونی رازوں سے واقف ھو جائے'' ۔ زجاج نے کہا ھے کہ اَلْبِطَانَةُ وہ دخیل لوگ کہلاتے ھیں جن کے ساتھ کھل کر بات کی جاتی ھو اور انہیں رازوں میں شریک کر لیا جاتا ھو ۔ نیز اس کے معنی راز کے بھی آتے ھیں ۔

قرآن کریم میں اللہ کیلئے هُوَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ آیا ھے (۵۷/۳) ۔ اس کے پورے پورے مفہوم کیلئے (ظ ۔ ہ ۔ ر) کا عنوان دیکھئے ۔ جب نگہ بصیرت کائنات کے تخلیقی مظاھر پر غور کرے تو وہ خالق کائنات کے متعلق اندازہ کر سکتی ہے ۔ یعنی اس سے انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ھے کہ اس مخلوق کا کوئی خالق بھی ہے اور اس محیرالعقول مشنری کے پیچھے کوئی بڑی علیم و حکیم قوت کام کر رھی ھے ۔ اس اعتبار سے خدا اَلظَّاهِرُ ھے ۔ لیکن وہ اپنی کنہ و حقیقت کے اعتبار سے نگاھوں سے پوشیدہ ھے ۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (۶/۱۰۴) ۔ ''وہ نگاھوں کے ذریعے ھمارے ادراک میں نہیں آ سکتا'' ۔ اس لحاظ سے وہ اَلْبَاطِنُ ھے ۔ (ظہور اور بطون کے دوسرے گوشے (ظ ۔ ہ ۔ ر) کے عنوان میں سامنے آئینگے ۔ اسے بھی ساتھ ھی دیکھ لیجئے) ۔ یاد رکھئے ، هُوَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ سے یہ مراد لینا کہ جو کچھ کائنات میں ظاھر ھے وہ بھی خدا ھے اور جو اس کے باطن میں

---

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔

ہے وہ بھی خدا ھی ہے ۔ یعنی ان محسوسات کے پردوں میں خود خدا ہے، باطل عقیدہ اور قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے ۔ اس عقیدہ کو تصوف کی اصطلاح میں '' وحدت وجود ،، یا '' ہمہ اوست ،، کہا جاتا ہے جو ہندؤں کے فلسفہ ویدانت کا چربہ ہے ۔ ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ (۶/۱۲۱) سے مراد ہے گناہ کی محسوس وغیر محسوس شکلیں۔ اس میں نگاہ کی خیانت اور دل میں گزرنے والے خیالات تک آجاتے ہیں۔

ب ع ث

بَعْثٌ کے بنیادی معنے ہیں وہ چیز جو کسی کی آزادانہ نقل و حرکت کی راہ میں حائل ہو اسے راستہ سے ہٹا دینا ، اس قسم کے موانع کو دور کر دینا ، اور یوں اس کی حرکت کو جاری کر دینا ۔ بَعَثَ النَّاقَةَ ۔ اس نے اونٹنی کی رسیاں وغیرہ کھول کر اسے آزاد چھوڑ دیا * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو ابھارنے اور اٹھانے کے ہوتے ہیں ۔ سورۃ تطفیف میں ہے کہ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّهُمْ مَبْعُوْثُوْنَ ۔ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ (۸۳/۴-۵) اس سورۃ میں قرآن کریم نظام معیشت کے ایک بنیادی اور عظیم اصول کو سامنے لایا ہے ۔ اس نے پہلے یہ کہا ہے کہ نظام سرمایہ داری میں '' تاجرانہ ذہنیت '' یہ ہوتی ہے کہ سرمایہ دار جب دوسرے سے لیتا ہے تو پورا پورا لیتا ہے اور جب (مزدور کو) دیتا ہے تو جس قدر وہ پیدا کرکے دیتا ہے ، اسے اس سے کم دیتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری کے نظام کی بنیاد ھی اس ذہنیت اور منہاج پر ہے ۔ لیکن خدا کا قانون یہ نہیں چاہتا ۔ وہ کسی کو اس سے کم نہیں دینا چاہتا جو وہ پیدا کرتا ہے ۔ اس سے پورے کا پورا معاشی نظام بدل جاتا ہے ۔

اس وقت صورت یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کے حامل یہ سمجھتے ہیں کہ جو نظام انہوں نے قائم کر رکھا ہے اسے کوئی بدل نہیں سکتا ۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ غلط ہے ۔ یہ نظام ضرور الٹ کر رہیگا ۔ اس لئے ان لوگوں کو جو یوں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے (اَنَّهُمْ مَبْعُوْثُوْنَ) تو یہ اس انقلاب عظیم تک کے لئے (لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ) ہے جس میں تمام نوع انسانی، اس غلط نظام سے تنگ آ کر، خدا کے نظام ربوبیت عالمینی کے لئے اٹھ کھڑی ہو گی (یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۸۳/۶)) ۔ نظام سرمایہ داری جو اس طرح بے روک ٹوک (ناقہ بے زمام کی طرح) بڑھے جا رہا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ تنگ آ کر، بہ ہیئت مجموعی، نظام ربوبیت کے لئے اٹھ کھڑے ہونگے، جس میں لینے اور دینے میں کم اور بیش کا سوال ھی نہیں ہوگا ۔

---

* تاج و لین ۔

اَلْبَعْثُ کے معنے کسی کو بھیجنے کے بھی ہیں۔ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِ هِمْ مُوْسٰى (۷/۱۰۳) "پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ کو بھیجا"۔ نیز کسی بیٹھی ہوئی چیز کو اٹھا دینا نیز یہ لفظ نیند سے جگا دینے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے*۔(دیکھئے ۶/۶۰)۔ اَلْبَعِيْثُ۔ راتوں کو بار بار جاگنے والا۔ اِنْبَعَثَ فُلَانٌ لِشَانِهٖ۔ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص جذبہ میں بھر کر اٹھ کھڑا ہو اور اپنا کام کرنے کو چل دے۔

بَاعِثٌ کے معنی سبب یا جذبہ محرکہ کے بھی ہیں (Cause or Motive) کیونکہ وہ عمل کے راستہ کے موانع کو ہٹا کر انسان کو کام کے لئے اٹھا دیتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ (۲/۵۶)۔ "پھر ہم نے تمہیں غش کی حالت کے بعد اٹھا کر کھڑا کیا"۔ یعنی تمہارے ہوش کی راہ میں جو موانع تھے انہیں دور کر کے پھر سے ہوش میں لے آئے۔ اسی سورۃ میں آگے ہے فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ (۲/۲۵۹)۔ "پھر اللہ نے اسے سو سال تک موت کی حالت میں رکھا اور پھر اسے اٹھا کھڑا کیا"۔ یہ قوموں کی اجتماعی موت اور زندگی کا تمثیلی بیان ہے۔ یہاں بَعَثَ کے معنی ان موانع کو دور کرنے کے ہیں جو کسی قوم کی نشاۃ ثانیہ کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ بیت المقدس کی پہلی تباہی کے بعد، بنی اسرائیل کی یہی حالت رہی تھی۔ (تفصیل میری کتاب "برق طور" میں ملیگی)۔

رسول بھیجنے کے معنوں میں دیکھئے (۲/۱۲۹) اور کسی کو کسی کام کیلئے مقرر کر دینے کے معنوں میں (۴/۳۵) میں، جہاں کہا ہے فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِنْ اَهْلِهٖ۔ "اس کے خاندان میں سے کسی کو ثالث مقرر کر دو"۔

بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ (۱۷/۵) کے معنے ہیں، تم پر انہیں غالب کر دیا۔

يَوْمُ الْبَعْثِ یا يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔ يَوْمِ الدِّيْنِ کی طرح قرآن کی اہم اصطلاحات ہیں جن کا صحیح مفہوم ہر مقام پر سیاق و سباق کے مطابق متعین کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی معنی ان کے حیاتِ نو یا ظہور نتائج کے وقت کے ہیں۔ خواہ یہ حیاتِ نو اسی دنیا میں (قوموں کی اجتماعی موت کے بعد) ملے۔ یا مرنے کے بعد دوسری زندگی (حیاتِ آخرت کی شکل میں)۔

---

* تاج و لین۔

ب ع ث ر

بَعْثَرَهٗ ۔ اسے دیکھا اور تلاش کیا ۔ بَعْثَرَ الشَّیْئَ ۔ اس نے اس چیز کو نکال کر اسے کھول دیا ۔ بَعْثَرَ الْحَوْضَ ۔ اس نے حوض کو منہدم کر کے اس کے نچلے حصے کو اوپر کر دیا ۔ بَعْثَرَ مَتَاعَہٗ، اس نے اپنے سامان کو الٹ پلٹ کر دیا ۔ اَلْبَعْثَرَۃُ ۔ جی متلانے کو کہتے ہیں* ۔ اس میں بھی الٹ پلٹ کرنے کا تصور موجود ہے ۔

قرآن میں ہے وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (۸۲/۴) ۔ ''جب قبور کو الٹ پلٹ کیا جائیگا،، ۔ (قُبُوْرٌ کیلئے دیکھئے عنوان (ق ۔ ب ۔ ر) ۔ جب تلاش و تفتیش کے بعد دبی ہوئی چیزیں نکالی جائینگی ۔ یعنی اذا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ (۱۰۰/۹) ۔ جو کچھ قبور''میں ہے جب اسے باہر نکالا جائیگا،، ۔

ب ع د

بُعْدٌ دوری، دور ہونا، یہ قُرْبٌ کی ضد ہے قَرِیْبٌ بمقابلہ بَعِیْدٌ (۱۰۹/۲۱) ۔ بَعِدَ ۔ یَبْعَدُ ۔ بَعَدًا وَ بُعْدًا ۔ ہلاک ہونا ۔ تباہ و برباد ہو جانا* ۔ (زندگی کی خوشگواریوں سے دور ہو جانا) ۔ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (۲۳/۴۱ و ۱۱/۶۸) ''ظالم قوم کے لئے تباہی ہے،، ۔ ان کے لئے زندگی کی خوشگواریوں سے محرومی ہے ۔ بَعِیْدٌ و بَاعِدٌ و بُعَادٌ ۔ دور ہونے والا ۔ تباہ ہونے والا* ۔ بَعْدُ ۔ قَبْلُ کی ضد ہے ۔ یعنی گزرے ہوئے زمانہ کے بعد آنے والا زمانہ* ۔

اَلْاَبْعَدُ ۔ اَقْرَبُ کی ضد ہے ۔ نیز خائن کو بھی کہتے ہیں ۔ اور اَلْبُعَدَاءُ ۔ اجنبی لوگوں کو کہتے ہیں* ۔

بَعْدُ کے معنے غَیْرُ کے بھی آتے ہیں ۔ فَمَنْ یَّھْدِیْہِ مِنْ بَعْدِ اللّٰہِ (۲۳/۴۵) ۔ اسکے معنے ہیں ''خدا کے سوا ''مِنْ غَیْرِاللّٰہِ،، اسے کون راہ نمائی دے سکتا ہے،، ۔ صحیح راہ نمائی صرف خدا کے قانون سے مل سکتی ہے ۔

نیز اسکے معنے ''باوجود،، کے بھی ہیں ۔ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَلَہٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۲/۱۷۸) ۔ ''جو اسکے باوجود سرکشی اختیار کرتا ہے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے،،۔

*تاج و محیط ۔

ب ع ر

اَلْبَعِیْرُ ۔ اونٹ ۔ جوان اونٹ ۔ نیز اَلْبَعِیْرُ گدھے کو بھی کہتے ھیں۔ اصل میں یہ اس جانور کیلئے بولا جاتا ھے جس پر بوجھ لادا جائے۔ بار برداری کا جانور ۔ اَلْبَعْرُ ۔ مینگنی کو کہتے ھیں* ۔ سورۃ یوسف میں حِمْلُ بَعِیْرٍ (۱۲/۷۲) آیا ھے ۔ یعنے ایک اونٹ (یا گدھے) کا بوجھ ۔

ب ع ض

بَعْضٌ ۔ ھر چیز کا کچھ حصہ خواہ وہ کم ھو یا زیادہ (۲/۸۵) ۔ مثلاً آٹھ ، دس کا بعض ھے اور دو بھی دس کا بعض ھے۔ آٹھ اور دو دونوں ملکر دس ھو جاتے ھیں۔ بَعَّضَ الشَّیْءَ کے معنے ھیں چیز کو تقسیم کردیا۔ تَبْعِیْضٌ کے معنے ھیں الگ الگ کر دینا ۔ تقسیم کر دینا* ۔

سورۃ بقرہ میں ھے اِذَا خَلَا بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ (۲/۷۶) ۔ ''جب انمیں سے کچھ لوگ اپنے دوسرے لوگوں سے خلوت میں ملتے ھیں یا انکی طرف چلے جاتے ھیں،،۔ بَعْضُنَا ۔ ''ھم میں سے کوئی یا کسی نے،،۔ بعض ائمہ لغت نے کہا ھے کہ بَعْضٌ کے معنے کُلٌّ کے بھی آتے ھیں اور اسکی تائید میں قرآن کی یہ آیت پیش کی ھے ۔ یُصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِی یَعِدُکُمْ (۴۰/۲۸) ''جن باتوں کی تمہیں دھمکی دی جاتی ھے وہ سب تم پر واقع ھو کر رھینگی،،** ۔ لیکن اس کے معنی ''بعض،، بھی ٹھیک ھیں ۔ نیز (۴۳/۶۳) ۔

بَعُوْضَۃٌ (جسکی جمع بَعُوْضٌ آتی ھے) مچھر کو کہتے ھیں (۲/۲۶) ۔ چونکہ باقی حیوانات کے مقابلہ میں اسکا جسم بہت چھوٹا ھوتا ھے اسلئے یہ بَعْضٌ سے ماخوذ ھے*** ۔

ب ع ل

بَعْلٌ ۔ بلند زمین جس تک سیلاب کا پانی نہ پہنچ سکتا ھو ۔ ھر درخت، بوٹا یا کھیتی جو بغیر آب پاشی کے اپنی جڑوں سے آپ پانی کھینچ لے۔ بلندی اور غیر محتاجی کے اعتبار سے بَعْلٌ کے معنے مالک اور آقا کے ھو گئے ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) صاحب (۲) حیرت اور دھشت اور (۳) اونچائی لکھے ھیں۔ ''صاحب،، میں رفیق اور ساتھی بھی آجاتے ھیں۔ راغب نے کہا ھے کہ اھل عرب اپنے بتوں کا نام بَعْلٌ رکھتے تھے کیونکہ وہ

---

*تاج و محیط و راغب ۔ ** لین ۔ ***تاج

انہیں بلند اور برتر خیال کرتے تھے۔ اسی طرح چونکہ ان کے مُعاشرہ میں تصور یہ تھا کہ مرد، عورت پر غالب ہوتا ہے اسلئے وہ خاوند کو بھی بَعْلٌ کہنے لگے۔ اسکی جمع بُعُوْلَۃٌ ہے۔ نیز ہر اس چیز کو جو دوسری چیزوں پر غلبہ و استیلاء رکھتی ہو۔ لیکن چونکہ انہیں اسکا بھی احساس تھا کہ ہر مستبد اور متغلب دوسروں پر بوجھ بن جاتا ہے اسلئے وہ بوجھ کو بھی بَعْلٌ کہتے تھے۔ چنانچہ اَصْبَحَ فُلَانٌ بَعْلًا عَلٰی اَهْلِهٖ کے معنے ہیں فلاں شخص اپنے گھر والوں پر بوجھ بن گیا ہے*۔

چونکہ عربوں میں خاوند کیلئے بَعْلٌ کا لفظ رائج تھا اسلئے قرآن کریم میں بھی یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے (۲/۲۲۸ و ۲۴/۳۱)۔ یعنے غلبہ‌واستیلاء کے معنوں میں نہیں بلکہ خاوند کے معنوں میں۔ بلکہ لین نے (مختلف اسناد سے) لکھا ہے کہ زَوْجٌ کیطرح بَعْلٌ بھی خاوند اور بیوی دونوں کے لئے آتا ہے۔ نیز جسطرح زَوْجٌ سے زَوْجَۃٌ آتا ہے اسی طرح بَعْلٌ سے بَعْلَۃٌ آتا ہے۔ اس لئے اس میں غلبہ و استیلاء کا مفہوم نہیں۔ صرف میاں بیوی ہونے کا مفہوم ہے۔ قرآن کریم نے جب نکاح کو بہ طیب خاطر معاہدہ قرار دیا ہے تو اس میں کسی فریق کے غلبہ و استیلاء کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

صاحب محیط کے نزدیک بَعْلٌ اور زَوْجٌ میں فرق یہ ہے کہ زَوْجٌ تو ہر خاوند کو کہتے ہیں لیکن بَعْلٌ اسوقت کہتے ہیں جب وہ بیوی سے جنسی اختلاط کر چکا ہو***۔

حضرت الیاسؑ کی قوم اپنے بت کو بَعْلٌ کہتی تھی (۳۷/۱۲۵)۔ یہ سامی قبائل میں سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا۔ شام میں خصوصیت سے اسکی پرستش ہوتی تھی۔ تورات میں اس کا ذکر اکثر آتا ہے (مثلاً تواریخ ۲۔ ۳۳/۳)۔

ب غ ت

اَلْبَغْتُ وَالْبَغْتَۃُ۔ یکبارگی۔ اچانک۔ اَلْمُبَاغَتَۃُ۔ ایک دوسرے کے پاس اچانک پہنچ جانا*۔ راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنے ہیں کسی چیز کا یکبارگی ایسی جگہ سے نمودار ہو جانا جہاں سے گمان بھی نہو**۔ قرآن میں ہے اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَۃُ بَغْتَۃً (۶/۳۱) ”جب ان پر الساعۃ اچانک آجائیگی،،۔ (اَلسَّاعَۃُ کسطرح اچانک اور یکبارگی آتی ہے، اسکے لئے

*تاج **راغب ۔ ***محیط ۔

س ۔ و ۔ ع کا عنوان دیکھئے) ۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے ۔۔ اِنْ اَتٰـکُمْ عَذَابُ اللّٰہِ بَغْتَۃً اَوْ جَھْرَۃً (۶/۴۷) ۔ ''تم پر خدا کا عذاب اچانک آ جائے یا اسطرح کہ پہلے اس کی علامات ظاہر طور پر تمہارے سامنے آئیں اور اس کے بعد عذاب آئے''۔ اس سے واضح ہے کہ بَغْتَۃً اُس انداز کو کہینگے جس میں کوئی واقعہ تدریجی یا ارتقائی طور پر (Bv Evolution) نمودار نہ ہو بلکہ انقلابی طور پر (By Revolution) یا دور حاضر کی تحقیق کے مطابق، فجائی ارتقاء کے طریق سے (by Emergent Evolution) واقع ہو ۔ اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ ہر عمل کا نتیجہ تو اُسی وقت مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن وہ محسوس شکل میں ہمارے سامنے کچھ وقت کے بعد آتا ہے ۔ چنانچہ سورۃ انبیاء میں ہے فَلَمَّا اَحَسُّوْا بَاْسَنَا ... (۲۱/۱۲) ۔ ''جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس کیا''۔ ... یعنی وہ عذاب غیر محسوس شکل میں تو پہلے سے مرتب ہو رہا تھا لیکن ان کے سامنے محسوس شکل میں بعد میں آیا تھا ۔ بعض صورتوں میں اس آنے والے عذاب (یعنی نتائج) کی علامات ظہور سے پہلے سامنے آنا شروع ہو جاتی ہیں ۔ (اسے جَھْرَۃً کہینگے) ۔ اور بعض اوقات اس کا علم اُس وقت ہوتا ہے جب وہ سامنے آ کھڑا ہوتا ہے (یہ بَغْتَۃً ہے) ۔ یعنی فَاَتٰـھُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ (۳۹/۲۵) ۔ ''ان پر ایسی جگہ سے عذاب آیا جس کی انہیں خبر تک نہ ملی''۔ جو ان کی عقل و شعور میں نہیں آ سکتی۔ سطح بین قومیں اپنی تباہی کے اسباب کا اندازہ ان واقعات اور عناصر سے لگانے کی کوشش کرتی ہیں جو تباہی واقع ہونے کے وقت محسوس طور پر ان کے سامنے آتے ہیں ۔ لیکن ان اسباب کا سراغ در حقیقت بہت پیچھے جا کر لگانا چاہئے۔

ب غ ض

اَلْبُغْضُ ۔ یہ لفظ اَلْحُبُّ (محبت) کی ضد ہے ۔ یعنی کسی چیز سے دل کا متنفر اور بیزار ہونا ، اَلْبَغْضَاءُ ۔ شدت بغض کو کہتے ہیں *۔ (۳/۱۱۷) ۔

ب غ ل

اَلْبَغْلُ ۔ خچر* ۔ جمع بِغَالٌ (۱۶/۸) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جسمانی قوت کے ہیں ۔ خچر کو اَلْبَغْلُ اسکی مضبوطی کی وجہ سے کہتے ہیں ۔ اَلتَّبْغِیْلُ جسم کا موٹا اور سخت ہونا* ۔ چونکہ خچر گھوڑی اور گدھے کے اختلاط سے وجود میں آتا ہے اس لئے ہر اس جانور کو بھی بَغْلٌ کہتے ہیں جو دو مختلف جنسوں کے ملاپ سے پیدا ہو۔

*تاج ۔ راغب ۔ محیط ۔

ب غ ی

اَلْبَغْیُ - درمیانہ روی کی حد سے بڑھ جانے کی خواہش (خواہ حد سے تجاوز کرسکے یا نہ کر سکے) - اَلْبَغْیُ بہت زیادہ بارش کو کہتے ہیں جو حد سے بڑھ جائے - بَغَتِ السَّمَاءُ بادل اپنی حد سے بڑھ گیا - بہت زیادہ برسا - یہ اس لفظ کے بنیادی معنے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے معنی (۱) کسی چیز کو طلب کرنا - اور (۲) بگڑ جانا ہیں -

فِئَۃٌ بَاغِیَۃٌ اس جماعت کو کہتے ہیں جو حدود شکنی کرے اور نظام کے خلاف اٹھ کھڑی ہو - اور اَلْبَغَایَا ان ہر اول دستوں کو کہتے ہیں جو لشکر کے پہنچنے سے پہلے انتظامات کرنے کے لئے چلتے ہیں -

بَغٰی یَبْغِیْ - اسنے تکبر کیا اور اپنی حد سے بڑھ گیا - تَبَاغَوْا - ایک دوسرے پر زیادتی کرنا -

بَغَتِ الْمَرْأَۃُ بِغَاءً - عورت اپنی حدود عفت سے بڑھ گئی اور زنا کی مرتکب ہو گئی - بَغِیٌّ اور بَغُوٌّ زنا کار عورت کو کہتے ہیں -

بَغٰی عَلَیْہِ کسی پر زیادتی کرنا - ظلم کرنا - دست درازی کرنا - نیز حسد کرنا (کہ وہ مجھ سے آگے کیوں بڑھ گیا ہے)* -

اِبْتِغَاءٌ - کسی چیز کے حاصل کرنے میں بہت زیادہ کوشش کرنا - اگر اچھی چیز کی طلب ہو تو یہ کوشش بھی محمود ہو جاتی ہے - ورنہ مذموم* -

اَلْبِغْیَۃُ اور اَلْبُغْیَۃُ - اس مطلوب چیز کو کہتے ہیں جسکے حصول کی اسطرح کوشش کی جائے - اس گم گشتہ چیز کو بھی کہتے ہیں جسکی بہت زیادہ تلاش کی جائے - اَلْبَاغِیْ - تلاش کرنے والے کو بھی کہتے ہیں* -

اِنْبَغٰی الشَّیْءُ کے معنے ہیں کسی چیز کا آسان ہو جانا، مہیا ہو جانا، یا مناسب ہونا - چنانچہ مَا یَنْبَغِیْ کے معنے ہیں، یہ درست نہیں - یہ مناسب نہیں - یہ ممکن نہیں - جائز نہیں* - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یَنْبَغِیْ میں دو چیزوں میں سے ایک کی طرف رجحان اور دوسری کے جواز کا پہلو مضمر ہوتا ہے** - سورۃ یٰسٓ میں ہے وَمَا عَلَّمْنٰہُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَہٗ (۳۶/۶۹) - ہم نے رسول کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی

*تاج - ** محیط -

ایک داعی انقلاب کی نفسیاتی کیفیت ایسی ہو سکتی ہے کہ اس پر حقائق کے مقابلہ میں جذبات غالب ہوں۔ (یہی شاعر کی نفسیات ہے) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ (۳۶/۶۹)۔ اسے جو کچھ دیا گیا ہے وہ تاریخ کے محکم نوشتے ہیں اور زندگی کے واضح قوانین۔ ان میں جذباتی تلون انگیزیوں کا کیا دخل؟ (مزید تفصیل ش۔ ع۔ ر کے عنوان میں ملیگی)۔

سورۃ حج میں ہے بُغِيَ عَلَيْهِ (۲۲/۶۰) جس پر زیادتی ہوئی ہو۔ قارون کے متعلق ہے کہ فَبَغٰى عَلَيْهِمْ (۲۸/۷۶) "وہ ان پر زیادتی کرتا تھا"۔ یا ان سے آگے بڑھا ہوا رہنا چاہتا تھا۔ نیز اسکے معنے حکومت اور سلطنت طلب کرنے کے بھی ہیں*۔

سورۃ النساء میں ہے وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ (۴/۱۰۴) "دشمن کا پیچھا کرنے میں سستی نہ کرو"۔ اسکی تلاش میں پیچھے جانے کی پوری پوری کوشش کرو۔ سورۃ آل عمران میں اِبْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ (۳/۷) آیا ہے۔ یعنے فتنہ پیدا کرنے کی انتہائی خواہش۔

سورۃ نور میں البِغَاءُ کا لفظ زناکاری کے لئے آیا ہے (۲۴/۳۳)۔ لیکن سورۃ مریم میں بَغِيًّا کا لفظ حدود شکن کیلئے (۱۹/۲۰) آیا ہے۔ خاص طور پر زناکار کے لئے نہیں۔ یعنی حضرت مریم نے کہا کہ میں ھیکل میں (Nun) کی زندگی بسر کر رہی ہوں اور (Nuns) کے متعلق "قانون شریعت" یہ ہے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ میںنے اس قانون کو نہیں توڑا۔ واضح رہے کہ ھیکل کے احبار و رہبان حضرت مریم[ع] کے خلاف یہ الزام عائد کرتے تھے کہ اس نے ھیکل سے نکل کر متاہل زندگی اختیار کر لی ہے اور یہ چیز شریعت خانقاھیت کے خلاف ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا تھا کہ تیری ماں تو ان حدود شریعت کو نہیں توڑتی تھی۔ (۱۹/۲۸) تونے حدود شکنی کیسے اختیار کر لی؟ حضرت عیسیٰ[ع] نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ یہ حدود، تمہاری خود ساختہ شریعت کی ہیں۔ مجھے اللہ نے نبی بنایا ہے۔ اور کتاب دی ہے۔ اس کتاب میں ایسا کوئی قانون نہیں۔ اس لئے میری والدہ نے قانون خداوندی کے خلاف کچھ نہیں کیا۔ مزید برآں اس ضمن میں دیکھئے تبویب صفحہ ۱۸۱ جلد چہارم عنوان ب ع ی۔

سورۃ بقرہ میں ہے کہ یہودی قرآن کریم کی مخالفت محض اسلئے کرتے ہیں کہ انہیں حسد ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل میں سے ایک شخص کی طرف کیوں نازل ہو گیا ہے۔ اس کے لئے بَغْيًا آیا ہے (۲/۹۰)۔

---

* غریب القرآن (میرزا ابوالفضل)

قرآن کریم میں کھانے پینے کی حرام اشیاء کے تذکرہ کے بعد ہے فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ (۲/۱۷۳)- بھوک سے جس شخص کی جان پر آبنے تو اس پر کوئی جرم نہیں (کہ وہ ان حرام چیزوں کو استعمال کرلے) بشرطیکہ وہ اتنا ہی لےجتنی اسے ضرورت ہے - اور حد سے نہ بڑھے اور نہ ہی اسکی نیت قانون شکنی کی ہو- یعنی نہ تووہ محض اس لئے کھائے کہ اس کا جی چاہتا ہے اور نہ ہی زائد ازضرورت لے۔

ب ق ر

بَقْرٌ کے معنے ہیں کسی چیز کو چیرنا پھاڑنا - جیسے کسی جانور کا پیٹ چاک کرنا - اسائے بَقَرَ الْعِلْمَ کے معنے ہیں علم کی گہری تحقیق و تجسس کرنا - بَاقِرٌ کے معنےشیر کے بھی ہوئے ہیں اور علمی محقق کے بھی*-

بَقَرٌ - گائے اور بیل (دونوں) کو کہتے ہیں * - یہ جمع ہے - اس کا واحد بَقَرَةٌ ہے - قصہ بنی اسرائیل میں یہ لفظ (۲/۶۷) میں آیا ہے - مابعد آیات میں جو کچھ مذکور ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے مطلب سانڈ تھا جس سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ دیوتاؤں کے نام پر ویسے ہی چھوڑ دیا جاتا ہے - مصر میں سانڈ کی پرستش ہوتی تھی اور یہی جذبہ تھا جو بنی اسرائیل کے دلوں کی گہرائی میں (شعوری یا غیرشعوری طور پر) جا گزیں ہو چکا تھا - اسی جذبہ عقیدت کو دور کرنے کے لئے ذبح بقر کا حکم دیا گیا تھا -

ب ق ع

اَلْبَاقِعُ - چتکبرا کوا یا کتا - اس کے بنیادی معنی رنگوں کا مختلف ہونا ہیں (ابن فارس) - اَلْبَاقِعَةُ - ایک پرندہ جو بہت ہوشیار اور چوکنا ہوتا ہے اور ہر وقت ادھر ادھر دیکھتا رہتا ہے کہ کوئی شکاری اس کی گھات میں تو نہیں ، وہ پانی پینے کے لئے بھی دوسرے پرندوں کی روش سے ہٹ کر کسی نامانوس جگہ پر آتا ہے*- پہلے معنوں کے لحاظ سے اَرْضٌ بَقِعَةٌ اس زمین کو کہتے ہیں جس میں کہیں گھاس اور سبزہ ہو اور کہیں خشکی - یعنی چتکبری زمین-اَلْبُقْعَةُ زمین کا ایسا قطعہ جو اپنے آس پاس کی زمینوں سے الگ ہو**-

قرآن کریم میں ہے فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ (۲۸/۳۰) - ''درخت والے مبارک قطعہ زمین میں (جو باقی زمینوں سے الگ

*تاج و لین **تاج و محیط - -

تھا)'' ۔ ویسے اَلْبَقْعَۃُ ایسی جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں پانی جمع ہو گیا ہو* ۔

ب ق ل

بَقَلَ الشَّیْءُ ۔ چیز ظاہر ہو گئی ۔ بَقَلَتِ الْاَرْضُ ۔ زمین پر سبزیاں نمودار ہو گئیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ بَقْلٌ ان سبزیوں کو کہتے ہیں جن کی جڑیں اور شاخیں سردیوں میں باقی نہیں رہتیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی روئیدگی کے ہیں ۔ ابو زیاد نے کہا ہے کہ جو کچھ زمین سے پہلے پھل نکلے اسے بَقْلٌ کہتے ہیں ۔ اقرب الموارد میں ہے کہ بَقْلٌ ایسی سبزی کو کہتے ہیں جو (آلو ۔ گاجر ۔ شلجم کی طرح) زمین کے اندر پیدا نہ ہوتی ہو بلکہ (میتھی، پالک، گوبھی، ٹماٹر وغیرہ کیطرح) زمین کے اوپر پیدا ہوتی ہو ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ سبزی ترکاری کے معنوں میں (۲/۶۱) میں آیا ہے ۔

ب ق ی

بَقِیَ ۔ یَبْقیٰ ۔ بَقَاءً ۔ کسی چیز کا اپنی حالت پر قائم رہنا ۔ تغیر پذیر نہ ہونا ۔ یہ فَنَاءٌ کی ضد ہے جس کے معنے تغیر پذیر ہو جانا ہیں ۔ اِبْقَاءٌ ۔ اِسْتِبْقَاءٌ ۔ باقی رکھنا* ۔ نیز اس کے معنے حفاظت اور نگہبانی کے بھی آتے ہیں* ۔

کائنات میں ہر شے تغیر پذیر ہے ۔ لیکن ذاتِ خداوندی تغیرات سے بلند ہے ۔ اسی طرح اس کا قانون بھی تغیر پذیر نہیں ہوتا ۔ یہی مستقل اقدار ہیں ۔ جو اعمال اس کے قانون کے مطابق سر زد ہوں ان کے نتائج بھی غیر متبدل ثمرات کے حاصل ہوتے ہیں ۔ اس سے انسانی ذات میں بھی ایسا استحکام پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ تغیرات سے بلند ہو جاتی ہے ۔ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تغیرات کی دنیا میں غیر متغیر رہتی ہے (Changelessness in Change) ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب '' نظام ربوبیت '' نیز من و یزداں ۔ اور معارف القرآن کی پانچویں جلد جس کا عنوان ہے '' انسان نے کیا سوچا '') ۔

---

*تاج و محیط ۔

ان معانی کی روشنی میں ان الفاظ کو دیکھئے جو قرآن کریم میں اس مادہ (بَقِيَ) سے آئے ہیں، بات واضح ہو جائیگی۔ سورۃ النحل میں ہے مَاعِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَاعِنْدَاللهِ بَاقٍ (۱۶/۹۶)۔ ''جو کچھ تمہارے پاس تمہارے اپنے تصورات کے مطابق ہوتا ہے وہ جاتا رہتا ہے۔ لیکن جو کچھ قانون خداوندی کے مطابق حاصل ہوتا ہے (خواہ وہ زیست کی خوشگواریاں ہوں اور خواہ انسانی ذات کی نشو و نما) وہ تغیر نا آشنا ہوتا ہے''۔ سورۃ کہف میں ہے۔ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ ''دولت۔ اولاد، یہ انسان کی قریبی (طبعی) زندگی کی زینت کی چیزیں ہیں،،۔ یہ بھی بُری نہیں کہ ان سے اجتناب کیا جائے۔ لیکن وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا (۱۸/۴۶)۔ ''خدا کے قانون ربوبیت کی رو سے بہترین اعمال وہ ہیں جن کے صلاحیت بخش نتائج تغیر پذیر نہیں ہوتے،،۔ انہی کی امید رکھنا بہترین نصب العین حیات ہے۔ اسی طرح سورۃ ہود میں بَقِيَّةُ اللهِ (۱۱/۸۶) اُس دولت اور سامان کو کہا گیا ہے جو خدا کے قانون کی رو سے حاصل کیا جائے۔ اس سے ذرا آگے اُولُوْا بَقِيَّةٍ (۱۱/۱۱۶) اُن لوگوں کو کہا گیا ہے جو قانون خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں۔ اور كَلِمَةً بَاقِيَةً (۴۳/۲۸) توحید کی تعلیم (ضابطہ قوانین خداوندی کی اصل و بنیاد) جسے حضرات انبیاء کرام اپنے متبعین کو دیکر جاتے تھے۔ اور جو کبھی تغیر پذیرنہیں ہوتی۔ ساحرین دربار فرعون نے اسی کو خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى (۲۰/۷۳) کہا ہے۔ یعنی سب سے زیادہ تغیر نا آشنا۔

سورۃ الرحمٰن میں ہے كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (۵۵/۲۶) اس کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ بدل رہی ہے۔ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (۵۵/۲۷)۔ لیکن خدا کی ذات تغیرات سے ماوراء ہے۔ اور اسکی صفت ربوبیت اور اسکا قانون ربوبیت اور اسکے نتائج و اثرات بھی تغیر نا آشنا ہیں۔ ''فَنَا'' کا جو مفہوم ہمارے ہاں رائج ہے اور جسکا مطلب معدوم ہو جانا ہے وہ درست نہیں۔ (اسکے لئے دیکھئے عنوان ف۔ ن۔ ی)۔ وَجْهِ رَبّ کے دوسرے مفہوم کے لئے عنوان (و۔ ج۔ ہ) دیکھئے۔

بَقِيَّةُ الشَّيْءِ۔ کسی چیز کا باقی ماندہ حصہ۔ لیکن اسے اس چیز کی جنس میں سے ہونا چاہئے۔ لہذا بھائی کو بَقِيَّةُ الْاَبِ نہیں کہہ سکتے*۔

بنی اسرائیل کے تابوت سکینت کے متعلق کہا ہے کہ اس میں بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ (۲/۲۴۸) تھا۔ یعنی جو کچھ آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون نے چھوڑا تھا اس کا باقیماندہ حصہ۔

* محیط۔

ب ک ر

اَلْبِکْرُ جمع اَبْکَارٌ کنواری عورت، نیز وہ مرد جو ابتک کسی عورت کے پاس نہ گیا ہو۔ پہلا بچہ دینے والی عورت یا اونٹنی۔ پہلا بچہ، ہر پہلی چیز۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ گائے جو ابھی حاملہ نہ ہوئی ہو یا نوجوان ہو۔ لَا فَارِضٌ وَّلَا بِکْرٌ (۲/۶۸) ''نہ بوڑھی ہے نہ نوجوان''۔

اَلْبُکْرَۃُ۔ صبح۔ دن کا پہلا اور ابتدائی حصہ*۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَلْاِبْکَارُ۔ طلوع فجر سے چاشت کے وقت تک کی مدت کو کہتے ہیں۔ (۱۹/۱۲ و ۳/۴۰) نیز اسکے نزدیک بَکْرٌ کے مادّہ کے اصلی معنے شق کرنے یا قطع کرنے کے ہیں**۔

ایسی چیزوں کو بھی جن کی پہلے نظیر نہ ہو، اَبْکَارٌ کہتے ہیں***۔ (۵۶/۳۵-۳۶) میں یہ لفظ انہی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی صحیح تعلیم و تربیت اور اعمال صالحہ سے ان میں ایسی تبدیلی ہوئی کہ وہ ایسی مخلوق بن گئیں جس کی پہلے نظیر نہ تھی۔ وہ عہد جاہلیہ کی عورتوں سے یکسر مختلف ہو گئیں۔

ب ک ک

بَکَّہٗ۔ یَبُکُّہٗ۔ بَکًّا۔ کسی چیز کو پھاڑ دینا۔ متفرق کر دینا۔ کسی پر ہجوم کرنا۔ مزاحمت کرنا۔ بَکَّ عُنُقَہٗ۔ اسنے اسکی گردن توڑ دی*۔

مکہ مکرمہ کا نام بَکَّۃُ بھی ہے۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا (۳/۹۵)۔ ''یقیناً پہلا گھر جو نوع انسان کے لئے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے، بابرکت''۔ اس نام کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ چونکہ لوگ اسکی طرف ہجوم کر کے آتے ہیں اور طواف میں بڑا ازدحام ہوتا ہے اسلئے اسے بَکَّۃُ کہا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ یہاں سرکشوں اور ظالموں کی گردن ٹوٹ جاتی ہے اسلئے اس کا یہ نام ہے۔ لیکن راغب کا خیال ہے کہ یہ مَکَّۃُ ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ عربی میں میم کے باء کے

*تاج۔ **محیط۔ ***قاموس۔

ساتھ بدل جانے کی کئی مثالیں ملتی ھیں** - مثلاً سَبَدَ اور سَمَدَ - ایسے ھی لاَزِبٌ اور لاَزِمٌ - ** ھر دو لفظ خواہ ''ب'' سے ھوں یا ''میم'' سے ایک ھی معنی رکھتے ھیں -

ب ک م

بَکَمٌ کے معنے ھیں گونگا ھونا - ازھری نے کہا ھے کہ اَبْکَمُ اور اَخْرَسُ میں یہ فرق ھے کہ اَخْرَسُ اسے کہتے ھیں جو پیدائشی طور پر بول ھی نہ سکتا ھو اور اَبْکَمُ اسے کہتے ھیں جو بولتا تو ھو لیکن حاضر جواب نہ ھو اور طریقہ سے بات نہ کرنے کی وجہ سے اسکی بات سمجھ میں نہ آتی ھو - لیکن اَبْکَمُ اس شخص کو بھی کہتے ھیں جو پیدائشی طور پر گونگا بہرا اور اندھا ھو* - ابن فارس نے کہا ھے کہ اَبْکَمُ (جسکی جمع بُکْمٌ ھے) اسے کہتے ھیں جو جہالت کی وجہ سے یا دانستہ بولنے چالنے سے گریز کرے - نیز جو بات کو واضح طور پر بیان نہ کر سکے -

قرآن کریم میں صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ آیا ھے (۲/۱۸) - جہاں بُکْمٌ کے معنے صرف گونگا ھیں (کیونکہ بہرے اور اندھے کیلئے اسکے ساتھ صُمٌّ اور عُمْیٌ کے الفاظ موجود ھیں) - سورۃ انفال میں اَلصُّمُّ الْبُکْمُ کے ساتھ اَلَّذِیْنَ لاَ یَعْقِلُوْنَ (۸/۲۲) کے الفاظ لا کربات واضح کردی کہ اس سے مراد طبعی طور پر بہرے اور گونگے نہیں ، بلکہ وہ لوگ مراد ھیں جو عقل سے کام نہیں لیتے - سورۃ نحل میں اَبْکَمُ (۱۶/۷۶) کے بعد ھے ، جو کسی شے کی مقدرت نہیں رکھتا - جو اپنے مالک پر بوجھ ھے - وہ اسے جدھر بھیجتا ھے کوئی اچھا کام کرکے نہیں آتا - اس کے مقابلہ میں وہ ھے جو صاحب اختیار ھے - عدل و انصاف کا حکم دیتا ھے - اور صراط مستقیم پر چلتا ھے - ان تصریحات سے واضح ھو جاتا ھے کہ قرآن کے نزدیک صُمٌّ بُکْمٌ سے مفہوم کیا ھے - یعنی وہ لوگ جو عقل و فکر سے کام نہ لیں بلکہ اندھا دھند اپنی غلط روش پر چلے جائیں -

ب ک ی

بُکَاءٌ - غم کے ساتھ آنسو بہانا - کبھی محض غم یا آنسو بہانے کو بھی کہہ دیتے ھیں** - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی رونا اور (۲) چیز کا کم ھو جانا ھیں - قرآن کریم میں ضَحِکَ کے مقابلہ میں بَکٰی

* تاج - **تاج و راغب -

آیا ہے (۹/۸۲) - لہذا اسکے معنے غم کرنے کے ہیں - سورۃ دخان میں ہے فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ (۴۴/۲۹)۔ ان کی تباہی پر نہ آسمان رویا نہ زمین۔ اس لئے کہ ان کی تباہی خدا کے قانون مکافات کے مطابق واقع ہوئی تھی - بُكِيًّا - (۱۹/۵۸) - قوانین خداوندی کے سامنے دل کے پورے گداز کے ساتھ جھکنے والے - لیکن اندھے اور بہرے بنکر نہیں (۲۵/۷۳) - عقل و بصیرت کی رو سے قوانین خداوندی کو اختیار کرکے، دل کی گہرائیوں سے ان کی متابعت کرنے والے -

بَلْ - (حرف)

بَلْ - بلکہ - ذیل کی مثالوں سے استعمال اور مفہوم واضح ہو جائیگا -

(۱) جب یہ فقرے کے درمیان آئے تو پہلی بات کی تردید اور دوسری بات کی تائید مقصود ہوتی ہے۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ، بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ - (۲۱/۲۶) - ''اور یہ کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن نے بیٹا بنایا ہے - ایسا نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جنہیں یہ اسکے بیٹے قرار دیتے ہیں وہ اس کے معزز بندے ہیں'' -

(۲) پہلی بات کی تردید کے بغیر دوسری بات کی تائید۔ وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ - بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا - (۲۳/۶۲-۶۳) ''ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو حق بات کہتی ہے اور ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوتی - لیکن (یا اور) ان کے دل تذبذب اور جہالت میں ہیں'' - یعنی دوسری بات پہلی بات سے الگ ہے (نیز ۸۴/۱۹-۲۰) - ان مقامات میں بَلْ - وَ - (اور) کے معنوں میں آیا ہے - (نیز دیکھئے ۸۵/۲۰-۲۱) - اسی طرح (۲۱/۶۳) میں بھی بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ سے نیا فقرہ شروع ہو سکتا ہے۔ (تفصیل اس کی متعلقہ عنوان میں ملیگی) -

ب ل د

اَلْبَلَدُ - زمین کا ہر وہ حصہ جسکی حد بندی کی گئی ہو۔ خواہ وہ آباد ہو یا غیر آباد - مٹی - زمین - اسکی جمع بِلَادٌ اور بُلْدَانٌ آتی ہے - اسکا استعمال قَرْيَةٌ (بستی) کے معنوں میں بعد میں ہوا ہے۔ سورۃ بقرہ میں هٰذَا بَلَدًا (۲/۱۲۶) سے قطعہ زمین اور بستی دونوں مراد ہو سکتے ہیں*- سورۃ البلد

* تاج و محیط۔

میں یہذَ البَلَدِ (۹۰/۱-۲) سے مراد مکہ ہے۔ اسی کو دوسری جگہ البَلَدِ الاَمِیْنِ (۹۵/۳) "امن والا شہر"، کہا گیا ہے ۔ حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی تھی (۲/۱۲۶) کہ یہ بستی دنیا میں جورو استبداد کے ستائے ہوئے ہر انسان کیلئے امن کا مقام بن جائے ۔ نوع انسانی کے امن کی ضامن اُمت (جماعت مؤمنین) اور خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت کے مرکز کو یقیناً عالم انسانیت کے لئے امن کا مقام ہونا چاہئے ۔ مزید تفصیل کے لئے حج اور کعبہ سے متعلق عنوانات دیکھئے ۔

زمین سے متمسک (زمین گیر) ہونے کی جہت سے کہتے ہیں بَلَّدَ الْفَرَسُ ۔ گھوڑا دوڑ میں پیچھے رہ گیا ۔ آگے نہ نکل سکا**۔ اسی لئے بَلِیْدٌ کے معنے کند ذہن کے ہوتے ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سینے (چھاتی) کے ہوتے ہیں۔ اور بَلَّدَ الرَّجُلُ بِالْاَرْضِ کے معنی ہیں اس شخص نے اپنا سینہ زمین پر ٹیک دیا ۔ یعنی وہ زمین کے ساتھ چپک گیا ۔

ب ل س

اَبْلَسَ ۔ کے معنے ہیں وہ ناامید ہوگیا ۔ مایوس ہوگیا ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنے یہی لکھے ہیں ۔ (اِذَاهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ "وہ ناگہاں اس میں مایوس ہو جائینگے" ۔ ۶/۴۴) ۔ نیز دہشت زدہ اور متحیر ہو جانا*۔ (پرانی سامی لغت میں اسکے معنے تھے "کچل کر مار ڈالنا ۔ روند ڈالنا" **۔

اِبْلِیْسُ ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اَبْلَسَ ہی سے مشتق ہے اور اسکے معنے ہیں رحمت خداوندی سے ابدی طور پر مایوس اور ناامید ۔ لیکن دوسرے ائمہ لغت نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ عربی لفظ نہیں بلکہ معرب ہے*۔

قرآن کریم میں ابلیس کو سرکشی اور بغاوت کے پیکر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے ۔ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ (۲/۳۴) ۔ "اس نے حکم خداوندی کی اطاعت سے انکار کیا ۔ خدا سے بغاوت و سرکشی اختیار کی اور کہنا نہ ماننے والوں میں سے ہوگیا" ۔ اسکے برعکس مَلَائِکَۃٌ ہیں جن کی فطرت میں اطاعت و انقیاد رکھ دیا گیا ہے (فَسَجَدَ الْمَلَائِکَۃُ کُلُّھُمْ اَجْمَعُوْنَ "تمام کے تمام ملائکہ نے سجدہ کر دیا" (۱۵/۳۰)۔ کائنات میں صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جسے اسکا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو قوانین خداوندی کی اطاعت کرے اور چاہے ان سے سرکشی برت لے ۔ کائنات کی

*تاج و محیط ۔ ** غریب القرآن میرزا ابوالفضل ۔ *** محیط

کسی اور شے کو معصیت (قانون خداوندی کی خلاف ورزی) کا اختیار نہیں دیا گیا۔ انسان، قانون خداوندی کی اطاعت سے سرکشی اسوقت اختیار کرتا ہے جب وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہ جذبات اسے (عالمگیر مفاد کلی کے مقابلہ میں) ذاتی مفاد پرستی پر ابھارتے ہیں اور وہ قوانین خداوندی کو پس پشت ڈالکر ان مفادات کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ پھر اسکی عقل اسے وہ طریقے بتاتی ہے جن سے وہ ان مفادات کو حاصل کر سکے۔ قرآن کریم نے ایسے جذبات اور انکے بروئے کار لانے والے سامان و ذرائع (عقل حیلہ جو کے بتائے ہوئے طرق و حِیَل) کو اِبْلِیْس کہکر پکارا ہے، اور اس کی سرکشی کی بنا پر اسکے متعلق کہا ہے کہ اسکی تخلیق آتش (نَار) سے ہوئی ہے (۷/۱۲)۔ اور چونکہ انسانی جذبات آنکھوں سے پنہاں ہوتے ہیں اور غیر محسوس طور پر مصروف عمل رہتے ہیں اسلئے کَانَ مِنَ الْجِنِّ (۱۸/۵۰) کہا ہے (جِنّ کے معنی ہیں چھپا ہوا)۔ نیز چونکہ انسان کے یہ جذبات اور اسکے یہ اختیارات جسکی رو سے یہ قوانین خداوندی سے سرکشی برت سکتا ہے، انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں اور جبتک انسان زندہ رہتا ہے اسوقت تک یہ ساتھ رہتے ہیں، اسلئے قرآن نے آدم کی جو سرگزشت بیان کی ہے (دیکھئے عنوان ادم) اسمیں ابلیس بھی آدم کے ساتھ ہی نمودار ہو جاتا ہے اور اسے انسانوں کے ساتھ ہی اسوقت تک مہلت دی گئی ہے جبتک انسان اس دنیا سے اٹھ نہیں جاتے۔ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (۱۵/۳۶)۔ مزید برآں دیکھئے تتمہ صفحہ ۱۸۱۸ جلد چہارم عنوان ب ل س۔

جو انسان قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کرلیتا ہے وہ ان تمام سعادتوں اور خوشگواریوں سے محروم رہ جاتا ہے جو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اسلئے ابلیس کو محروم و ناامید کہا گیا ہے۔ اسکے برعکس جو لوگ اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں ان کے متعلق کہا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)۔ ''ان پر کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا''۔ انہی کے متعلق کہا گیا ہے کہ ابلیس کا ان پر کسی قسم کا غلبہ و تسلط نہیں ہوگا (۱۵/۴۲)۔

قرآن کریم میں ابلیس اور شیطان کو ایک ہی سکے کے دو رخ، اور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو بتایا گیا ہے۔ مثلاً قصہ آدم میں دیکھئے۔ سجدے سے انکار۔ سرکشی و تکبر۔ ذریت آدم کو بہکانے کا چیلنج۔ سب ابلیس کی طرف سے ہے۔ لیکن اس کے بعد جب آدم کی لغزش کا ذکر ہے تو اسے شیطان

کیطرف منسوب کیا گیا ہے (فَاَزَلَّھُمَا الشَّیْطَانُ عَنْھَا - ۲/۳۶ - نیز دیکھئے ۷/۱۱-۲۰ ؛ ۲۰/۱۱۶-۱۲۰)۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابلیس ایک خاص ذہنیت کا نام ہے اور جس انداز سے وہ ذہنیت کام کرتی ہے اُسے شیطان کہکر پکارا گیا ہے۔ (شیطان کیلئے دیکھئے عنوان ش - ط - ن - نیز ان تمام امور کی تفصیل کیلئے دیکھئے میری کتاب ''ابلیس و آدم'' جو سلسلۂ معارف القرآن کی ایک کڑی ہے) ابلیس اور شیطان (ناامیدی و سرکشی) درحقیقت وہ موانع ہیں جو انسانی خودی کی نشوونما کی راہ میں حائل ہوتے ہیں ۔ اگر انسانی خودی ان موانع پر غالب آکر اپنے استحکام کا ثبوت دیتی ہے تو سلسلہ ارتقاء میں اسکا قدم آگے بڑھ جاتا ہے ۔ لیکن اگر یہ موانع اس پر غالب آجاتے ہیں تو وہ زندگی کی نچلی (حیوانی) سطح میں دب کر رہ جاتی ہے ۔ زندگی درحقیقت ''ابلیس و آدم'' کی اسی کشمکش کا نام ہے ۔ اسلئے آدم کے ساتھ ابلیس کا وجود ناگزیر ہے ۔ مخالفت (Opposition) اور تصادمات (Clashes) کے بغیر انسانی ذات میں استحکام پیدا نہیں ہوسکتا ۔ یا یوں کہئے کہ اسکی قوت و استحکام کا امتحان (Test) نہیں ہوسکتا ۔ نہر کی مسلسل روانی کے لئے ٹھوکر (Fall) کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کیا ٹھوکر کے پتھر، نہر کے پانی کے لئے بند بنکر اُسے جوہڑ بنا دیتے ہیں ۔ یا نہر کا پانی اپنے زور دروں سے ان پتھروں کو پھاند کر آگے نکل جاتا ہے؟ ایسے راستے تلاش اور اختیار کرنا جن میں پتھر نہ ہوں (یعنی مسلک رہبانیت و خانقاہیت) اپنی روانی کو اپنے ہاتھوں ختم کرلینا ہے ۔ زندگی مسلسل جد و جہد (جہاد) کا نام ہے ۔ یعنی ابلیس و آدم کی پیہم کشمکش کا ۔

اوپر کہا گیا ہے کہ ابلیس (ناامیدی) اور شیطان (سرکشی) ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ علم النفس (سائیکالوجی) کی تحقیقات حاضرہ اس نظریہ کی تائید کرتی ہیں کہ ناامیدی (Frustration) سے سرکشی کے جذبات (Aggressiveness) پیدا ہوتے ہیں۔ جب انسان دیکھتا ہے کہ وہ کچھ نہیں ہو رہا جو کچھ وہ چاہتا ہے تو اس میں غصہ ابھرنا شروع ہو جاتا ہے ۔ اس غصے کو اگر وہ خود اپنے آپ کے خلاف نکالتا ہے تو یہ پریشانی (Worry) یا افسردگی و غمگینی (Gloominess) ہوتی ہے جس کی آخری شکل خودکشی (Suicide) ہے ۔ جب اس غصہ کا مظاہرہ اس شخص یا شے کے خلاف ہو جو اس کی مایوسی کا باعث تھی تو اسے انتقام کہتے ہیں ۔ لیکن اگر وہ اس سے انتقام نہ لے سکے تو غیر متعلقہ چیزوں کے خلاف اپنا غصہ نکالتا ہے ۔ یہ پاگل پن کی ابتدا ہوتی ہے ۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ مایوسی اور سرکشی میں کسقدر گہرا تعلق

ہے' یہی تعلق ابلیس اور شیطان میں ہے ۔ یہ انسان کی نفسیاتی کیفیات ہیں ۔ قرآن ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں افراد کیلئے مایوسی کے مواقع پیدا نہیں ہوتے ۔ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ (۳۹/۵۳)۔ "اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو" وہاں کا معمول ہوتا ہے ۔ اور یہ رحمت (سامانِ نشو و نما) زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہوتا ہے (وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (۷/۱۵۶)۔ لہذا اس قرآنی معاشرہ میں ابلیسیت کسی پر غالب نہیں آ سکتی۔ اسی لئے ابلیس سے کہا گیا ہے کہ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲)۔ "یقیناً میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہوسکیگا" ۔ نیز دیکھئے عنوانات (ق۔ن۔ط) اور (ی۔أ۔س)

ب ل ع

بَلِعَ ۔ يَبْلَعُ ۔ کسی چیز کو حلق سے نیچے اتار لینا ۔ اَلْمَبْلَعُ وہ جگہ جہاں سے کھانا حلق سے اتر کر سری میں جاتا ہے ۔ اَلْبَلُّوْعُ پینے کی چیز ۔ اَلْبُلَعَةُ ۔ گھونٹ*۔ نیز چکی کا دھانہ جس میں اناج ڈالا جاتا ہے**۔

قرآن کریم میں طوفان حضرت نوحؑ کے متعلق ہے کہ اسکے بعد زمین کو حکم دیا گیا کہ اِبْلَعِيْ مَآءَكِ (۱۱/۴۴) ۔ "اپنا پانی نگل جا" ۔ یعنی اسے جذب کرلے ۔

ب ل غ

بَلَغَ الْمَكَانَ بُلُوْغاً ۔ وہ اس مقام تک پہنچ گیا ۔ مفردات میں ہے کہ بُلُوْغٌ اور بَلَاغٌ کے معنے مقصد کے آخری سرے تک پہنچ جانا ہیں خواہ یہ آخری حد مکانی ہو یا زمانی ، یا کسی اندازہ کئے ہوئے معاملہ کی ۔ لیکن کبھی محض قریب تک پہنچ جانے کیلئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ جیسے قرآن کریم میں ہے فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ (۲/۲۳۱)۔ یعنے جب وہ عدت ختم ہونے کے قریب تک پہنچ جائیں ۔ انکی عدت کی مدت قریب الاختتام ہو* ۔ یعنی جب وہ مقررہ مدت کی آخری حد پر پہنچیں ۔ اَلْبَلَاغُ ۔ کسی چیز کا اتنا کافی ہونا کہ اس کے ذریعہ انسان اپنے آخری مقصد تک پہنچ جائے اور اسے کسی اور سامان یا ذریعہ کی ضرورت نہ پڑے* ۔

اَلْبُلْغَةُ ۔ ہر وہ شے جس سے کسی مقصد تک پہنچا جائے ۔ ہر وہ شے جو کسی مقصد تک پہنچانے کیلئے کافی ہو جائے* ۔

---

* تاج ۔ **محیط ۔

عرب کے بادیہ نشین صحراؤں میں پھرتے رہتے تھے - پانی پر ان کی زندگی کا دار و مدار تھا - صحراء میں کہیں کہیں کنویں ہوتے تھے جن پر ڈول اور رسی رکھی رہتی تھی - لیکن گرم مقامات کے کنووں کا پانی ہمیشہ ایک سطح پر نہیں رہتا - اکثر نیچے اتر جاتا ہے جسکی وجہ سے ڈول کی رسی پانی کی سطح تک نہیں پہنچ سکتی - اس مقصد کیلئے یہ لوگ ہمیشہ اپنے ساتھ رسی کا ٹکڑا رکھتے تھے جسے ڈول کی رسی (اَلرِّشَاءُ) کے ساتھ باندھ دیتے تاکہ ڈول پانی تک پہنچ جائے - اس رسی کے ٹکڑے کو اَلتَّبْلِغَةُ کہتے تھے - یہاں سے تَبْلِیْغٌ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - یعنے اگر ایک انسان اپنی ذاتی استعداد کی کمی کی وجہ سے کسی مفہوم تک نہیں پہنچ سکتا تو اسکی اس کمی کو اسطرح پورا کر دیا جائے کہ وہ اصل مقصد تک پہنچ جائے - لیکن اگر وہ اپنی رسی (اَلرِّشَاءُ) کو استعمال ہی نہیں کرنا چاہتا تو خالی تَبْلِغَةٌ اسے پانی تک نہیں پہنچا سکتی - تبلیغ اسی کو فائدہ دے سکتی ہے جو اپنی عقل و بصیرت کو بھی کام میں لائے - مَبْلَغٌ آخری مقام جس تک کوئی پہنچ سکے (۵۳/۳۰) -

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو بَلٰغٌ لِلنَّاسِ (۱۴/۵۲) کہا ہے - یعنے وہ ذریعہ جس سے انسانیت اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتی ہے اور اسکے ہوتے ہوئے اسے کسی اور ذریعہ یا سامان کی ضرورت باقی نہیں رہتی - لہذا قرآن کیا ہے؟ انسانیت کو اسکی منزل مقصود تک پہنچانے کا کافی ذریعہ - لیکن یہ انہی کو منزل تک پہنچا سکتا ہے جو اسکی اطاعت اختیار کریں - جو اس کے مطابق زندگی بسر کریں - اسلئے کہ اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ (۲۱/۱۰۶) - "یہ اسی قوم کیلئے بلاغ ہے جو قوانین خداوندی کی اطاعت اختیار کرے" - یہ چیز انسان کے اپنے اختیار پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ قرآن کی بتائی ہوئی صحیح روش پر چلے یا کسی دوسری (غلط) روش پر - کسی کو کسی خاص روش پر چلنے کیلئے مجبور نہیں کیا جا سکتا - اگر مجبور کرنا ہوتا تو خدا انسانوں کو پیدا ہی اس انداز سے کر دیتا کہ وہ اس روش کے سوا کوئی دوسری روش اختیار نہ کر سکتے، جسطرح کائنات کی دوسری چیزیں قوانین فطرت پر چلنے کیلئے مجبور ہیں - اسلئے رسولوں کا کام پیغامات خداوندی انسانوں تک پہنچا دینا ہے - انہیں زبردستی ان پیغامات پر چلانا نہیں - فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (۱۶/۳۵) - "رسولوں کے ذمہ اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ قانون خداوندی کو نکھار کر پہنچا دیں" -

بَالِغَةٌ - پہنچنے والی (۶/۱۴۹) -

ب ل و

بَلاء ۔ اِبتِلاء* ۔ راغبؒ نے کہا ہے کہ اس لفظ کے دو معنے ہیں۔ (۱) کسی کا حال معلوم کرنا یعنے اسکے متعلق جو باتیں معلوم نہ ہوں انہیں معلوم کرنا اور (۲) کسی چیز کی اصلی حالت کا ظاہر ہونا ۔ خواہ وہ اچھی ہو یا بری ۔ جب یہ لفظ خدا کیلئے استعمال ہوگا تو وہاں صرف دوسرے معنی مراد ہونگے ۔ کیونکہ خدا علام الغیوب ہے اسلئے اسکے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی کی حالت سے بے خبر ہے* ۔

لہذا اس لفظ کے بنیادی معنے حالات کا معلوم کرنا یا اصل حقیقت کا ظاہر کرنا ہیں ۔

بَلِیَ ۔ یَبْلیٰ ۔ کے معنے کپڑے کا بوسیدہ ہو جانا یا پرانا ہو کر گھس جانا بھی ہیں**** ۔ اس لئے کہ اسطرح گھس کر اسکی اندرونی حالت نمایاں طور پر سامنے آ جاتی ہے ۔ لہذا بَلَاءٌ کے معنے ہیں مشکلات و مصائب کے وقت انسان کی حقیقی سیرت اور مضمر کیفیتوں کا ظاہر ہو جانا ۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر چیز کی اصلی حالت خراب ہی ہو ۔ وہ حالت اچھی بھی ہو سکتی ہے ۔ اسلئے مذکورہ صدر معنی کے برعکس بَلَاءٌ کے معنے ہونگے خوشحالی اور آسائش کے وقت انسان کی حقیقی سیرت کی نمود ۔ انسان کی حقیقی سیرت اور اصلی ذہنیت کی نمود کے دونوں مواقع ہوتے ہیں —— ناساعدحالات اور کامیابیوں اورکامرانیوں کا دور —— یہی مواقع پر اس کی ذات کی نمود ہوتی ہے۔

اَلْمُبَالَاۃُ کے معنی منافست و مفاخرت کے ہیں ۔ یعنے ایک دوسرے کے مقابلہ میں زندگی کے جوہر دکھا کر فخر کرنا** ۔ نیز اِبْتِلَاءٌ کے معنے انتخاب کرنا ۔ پسند کرنا بھی ہیں*** ۔

سورۂ بقرۃ میں بنی اسرائیل سے کہا گیا ہے کہ قوم فرعون تمہیں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا رکھا کرتی تھی ۔ ہم نے تمہیں انکے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی ۔ وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ (۲/۴۹) ان کے مظالم سے نجات نے تمہارے لئے یہ ظاہر کرنے کا موقع بہم پہنچا دیا کہ آزادی ملنے پر تم کیسے کام کرتے ہو ۔ سورۂ انفال میں ہے کہ خدا نے بدر کے میدان میں جماعت مومنین کو کامیابی عطا کی ۔ لِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْہُ بَلَاءً حَسَنًا (۸/۱۷) ۔ تا کہ وہ زندگی کی کامرانیوں سے

---

* تاج و راغب **محیط ۔ ***تاج ۔ ****بعض ارباب لغت نے بلو (ب-ل-و) اور بلی (ب-ل-ی) کو ایک ہی جگہ لکھ دیا ہے ۔ لیکن ہم نے بلی کو الگ بھی لکھا ہے ۔ اگرچہ ان دونوں میں بہت لطیف فرق ہے اور بعض اوقات ان میں تمیز بھی بمشکل ہوتی ہے ۔

انہیں یہ مواقع بہم پہنچادے کہ وہ دنیا کو بتا دیں کہ حکومت ملنے پر وہ کس قسم کے کام کرتے ہیں ۔ سورۃ دخان میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ ہم نے انہیں اقوام عالم پر برگزیدگی عطا کی اور انہیں وہ کچھ دیا مَافِیۡہِ بَلٰٓؤٌا مُّبِیۡنٌ (۴۴/۳۳) جس میں ان کی نمود ذات کے مواقع تھے۔

ظاہر کر دینے کے معنوں میں یہ لفظ سورۃ الطارق میں آیا ہے جہاں کہا ہے یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآئِرُ (۸۶/۹) ''جس دن تمام چھپی ہوئی باتیں ظاہر ہو جائینگی،، ۔سورۃ آل عمران میں ہے لِیَبۡتَلِیَ اللّٰہُ مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ (۳/۱۵۳) ''تا کہ اللہ ان باتوں کو ظاہر کر دے جو تمہارے سینوں میں تھیں،، ۔ سورۃ یونس میں ھُنَالِکَ تَبۡلُوۡا کُلُّ نَفۡسٍ مَّاۤ اَسۡلَفَتۡ (۱۰/۳۰) ۔ ''وہاں ہر شخص اپنے ان اعمال کو سامنے موجود دیکھیگا جو اسنے اس سے پہلے کئے تھے،، ۔ سورۃ المومنون میں قوم نوح کے احوال و کوائف بیان کرنے کے بعد کہا ہے اِنۡ کُنَّا لَمُبۡتَلِیۡنَ (۲۳/۳۰) ''ہم (اقوام سابقہ کی ان سر گزشتوں کو اس طرح) ظاہر کرتے رہتے ہیں،، ۔

دنیا میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے ۔ کشمکش میں زندگی کے مختلف پہلو بدل بدل کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ کبھی مشقتوں کے ہمت آزما پہلو اور کبھی خوشگواریوں کے سکون افزا پہلو ۔ اس طریق کو بھی قرآن نے اِبۡتَلٰی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے ۔ یعنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا سامنے آتے رہنا ۔ سورۃ الفجر میں یہ مفہوم نمایاں طور پر سامنے آ جاتا ہے (دیکھئے ۸۹/۱۵،۱۶) ۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان خود دیکھ لے، پرکھ لے کہ اسکی صلاحیتیں کس حد تک نشو و نما پا چکی ہیں ۔ کیونکہ وہ مزاحمتوں کا مقابلہ اسی حد تک کر سکیگا جس حد تک اسکی مضمر قوتیں بیدار ہو چکی ہونگی یہ حوادث جن سے اس کا مقابلہ ہوتا ہے در حقیقت اسکی نمود ذات کے مواقع ہوتے ہیں ۔ یہ ہے مفہوم اِبۡتِلَاءٌ کا ۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ وَاِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ (۲/۱۲۴) '' جب اسکے نشو نما دینے والے (رب) نے ابراہیمؑ کیلئے مختلف قوانین کے ذریعے اسکی نمود ذات کے مواقع بہم پہنچائے '' ۔ جب قوانین خدا وندی کے مطابق زندگی کے مختلف حوادث اسکے سامنے آئے تا کہ وہ دیکھ سکے کہ اس کی صلاحیتیں کس حد تک نشو و نما پاچکی ہیں۔ جسطرح ابراہیمؑ نے ان حوادث کا مقابلہ کیا (اسنے Re-act کیا) اس سے واضح ہو گیا کہ اسکی صلاحیتیں تکمیل تک پہنچ چکی تھیں ۔ انکی پوری پوری نشو و نما ہوچکی تھی ۔ فَاَتَمَّھُنَّ (۲/۱۲۴) ۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ جس چیز کو ہم اِبْتِلَاءٌ یعنی خدا کیطرف سے آزمائش کہتے ہیں وہ قرآنی تصور نہیں ۔ خدا کسی کو آزماتا نہیں ۔ وہ ایسے مواقع بہم پہنچاتا ہے جس سے انسان خود اپنی صلاحیتوں کو آزمائے اور دیکھے کہ وہ کس حد تک نشو و نما پا چکی ہیں ۔ اور اسطرح اپنے آپ کا اندازہ کرتا ہوا اپنی صلاحیتوں کی مزید نشو ونما وبالیدگی کیلئے کوشش کرتا جائے ۔

سورۃ الدّھر میں اِبْتَلٰی کے لفظ کو قرآن نے ایسے موقع پر استعمال کیا ہے جس سے مضمر جوہروں کے محسوس شکل میں سامنے آ جانے کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی پیدائش، مرد اور عورت کے نطفہ کے امتزاج سے ہوتی ہے ۔ نطفہ ایسے باریک جرثوموں پر مشتمل ہوتا ہے جو خوردبین کے بغیر نظر بھی نہیں آ سکتے لیکن انہیں جرثوموں میں پورے کا پورا انسانی بچہ چھپا ہوتا ہے ۔ اس حقیقت کی وضاحت کیلئے قرآن کہتا ہے اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعاً بَصِيْراً (۷۶/۲)۔ ”ہم نے انسان کی پیدائش (کی ابتداء) ایک ملے جلے نطفہ سے کی اور ایسا انتظام کیا کہ رحم مادر میں اس کے مضمر جوہروں کی نمود ہوتی جائے تاآنکہ وہ ایک سننے اور دیکھنے والا انسانی بچہ بن جائے“۔

یہ ہے اِبْتِلَاءٌ کا صحیح نقشہ ۔ مضمر جوہروں کا محسوس شکل میں سامنے آ جانا ۔ ان کی نمود ہو جانا ۔

بَلٰی ۔ (حرف)

بَلٰی ۔ سوال نفی میں ہو اور اس سوال کی تردید مقصود ہو تو اسوقت بَلٰی آتا ہے ۔ مثلاً اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۔ ”کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں“؟ یہ سوال نفی میں ہے ۔ اسکا جواب ہے قَالُوْا بَلٰی (۷/۱۷۲) ۔ ”انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں! تو ہمارا رب ہے“۔ یا مثلاً۔ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰهُمْ ۔ ”کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی پوشیدہ باتوں اور مخفی مشوروں کو سنتے نہیں“ ۔ بَلٰی ۔ کیوں نہیں ۔ ہم ضرور سنتے ہیں ۔ (۴۳/۸۰)

(۲) یا سوال نہ بھی ہو، ویسے ہی نفی کی تردید مقصود ہو ۔ جیسے وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ۔ یہ

اللہ کی قسمیں اور سخت قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ اُسے زندہ نہیں کرتا ۔ بَلٰی ۔ یہ بالکل غلط کہتے ہیں ۔ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا (۱۶/۳۸) ۔ یہ اس کا وعدہ (قانون) ہے (کہ مرنے کے بعد زندگی ہوگی) جسکا پورا ہونا ضروری ہے ۔ یہاں بَلٰی نے پہلے ٹکڑے کی تردید کر دی (نیز ۔ ۱۶/۲۸) ۔ اسی طرح سورۃ بقرۃ میں ہے کہ یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص ان کی گروہ بندیوں میں داخل نہ ہو وہ جنت میں نہیں جا سکتا۔ اس کے بعد ہے ۔ بَلٰی ، مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ ... (۲/۱۱۲) ۔ نہیں ۔ یہ غلط ہے ۔ حقیقت یہ ہے ۔ کہ جو شخص بھی اپنے آپ کو قانون خداوندی (قرآن) کے سامنے جھکادے .... وہ جنت میں جا سکتا ہے ۔

ب ل ی

بَلِيَ يَبْلٰى بِلًى اَلثَّوْبُ ۔ کپڑا پرانا اور خستہ ہوگیا۔ اسطرح پرانا ہوکر کمزور اور جھڑا ہو جانے والے کپڑے کو بالٍ کہا جائیگا*۔ قرآن کریم میں ہے مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (۲۰/۱۲۰) ۔ ایسی حکومت جس میں زوال و انحطاط رونما نہ ہو۔ ایسی مملکت جو ہمیشہ تازہ بتازہ رہے اور اس میں کُہنگی اور خستگی کے آثار پیدا نہ ہوں ۔

زندہ رہنے اور حیاتِ دوام حاصل کرنے کی آرزو ہر انسان میں ہے ۔ قرآن نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے کہ ابلیس نے انسان کے اس جذبہ کو (Exploit) کیا اور اس سے کہا هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (۲۰/۱۲۰) ۔ ''کیا میں تجھے ہمیشگی کے درخت کا اور ایک ایسی حکومت کا جو کبھی پرانی نہ ہو ، پتہ نشان دوں؟'' ۔ اس کے بعد قرآن نے نہایت لطیف اشارے سے بتایا ہے کہ ابلیس نے کہا کہ حیات جاوداں اولاد کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہے ۔ اس سے انسان کا نام روشن رہتا ہے ۔ لیکن یہ ابلیسی فریب ہے ۔ حیاتِ جاوید انسانی ذات کی نشوونما سے حاصل ہوتی ہے جس کیلئے قرآن نے خاص پروگرام دیا ہے (اس کو ایمان اور عمل صالح کہتے ہیں) ۔ اولاد سے افزائش نسل ہوتی ہے ۔ فرد کی ذات کی نشوونما نہیں ہوتی ۔ لیکن جو لوگ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں وہ اسی کو بقائے دوام سمجھ لیتے ہیں ۔

---

* تاج و راغب و اقرب الموارد ۔

ب ن ن

بَنَّ بِالْمَكَانِ - يَبِنُّ - بَنًّا - کسی جگہ اقامت کرنا - ٹھہر جانا - أَبَنَّتِ السَّحَابَةُ - بادل چند دن تک جما رہا - تَبَنَّنَ - وہ جما رہا - اَلْبَنَانُ - انگلیاں یا انگلیوں کے اطراف* (پورین اور بالائی سرے) اسلئے کہ انگلیوں ہی سے انسان کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑتا ہے - (حقیقت یہ ہے کہ انگلیاں ، بالخصوص انگوٹھا پختہ گرفت کرنے کے لئے ایک اہم اور قوی عضو ہے جو انسان کو دیا گیا ہے) - لہذا انسانی قوت ، قبضہ کرنے کی طاقت اور محکم گرفت کیلئے اس لفظ کو بولا جاتا ہے - چنانچہ سورۃ انفال میں ہے وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۸/۱۲) - ''ان کے ہر بنان پر مارو'' - اسمیں اگرچہ بَنَانٌ کے معنے انگلیاں ہیں لیکن مراد اس سے ہر وہ شے ہے جس سے دشمنوں کی طاقت اور گرفت کی قدرت وابستہ ہو - سورۃ قیامۃ میں ہے بَلٰى قَادِرِيْنَ عَلٰى اَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهٗ (۷۵/۴) - ''ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ انسان کے تمام اعضاء یا قوتوں کو مکمل کردیں - ہر اس چیز کو مکمل کردیں جس سے وہ دوسری چیزوں کی گرفت کرتا ہے - یعنے وہ تمام قوتیں جن سے انسانی اعمال سرزد ہوتے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ بَنَانٌ کے معنی ہاتھ پیر کے ہیں -

ب ن ی (ب - ن - و)

بِنَاءٌ کے معنی ہیں عمارت - جو چیز بھی تعمیر کی جائے - حتّٰی کہ ان خیموں کو بھی کہتے ہیں جن میں بدّو صحراؤں میں رہتے ہیں - نیز اسکے معنے چھت کے بھی ہوتے ہیں - ابو حنیفہ کا قول ہے کہ بِنَاءٌ در حقیقت اُن چیزوں کو کہتے ہیں جن میں قوتِ نمو نہ ہو - یعنے (Inorganic) مثلاً پتھر مٹی وغیرہ - بَنَّاءٌ معمار کو کہتے ہیں - نیز (Architect) کو بھی - بَانٍ بھی عمارت بنانے والے کو کہتے ہیں جسکی جمع بُنَاةٌ ہے - بَانِيَةٌ پسلی کی خمیدہ ہڈی کو بھی کہتے ہیں - بُنْيَانٌ دیوار کو کہتے ہیں (بعض کا خیال ہے کہ یہ جمع ہے) - اور بِنْيَةٌ طرز تعمیر کو - أَرْضٌ مُتَبَنِّيَةٌ اس زمین کو کہتے ہیں جس پر عمارت بنائی جائے** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کے کچھ حصے کو دوسرے حصہ کے ساتھ ملا کر بنانا -

* تاج - ** تاج و لین -

اِبْنٌ* - بیٹے کو کہتے ھیں - کیونکہ وہ بھی اپنے باپ کی عمارت ھوتا ھے* - یا اس لئے کہ اس میں کچھ حصہ باپ کا بھی شامل ھوتا ھے - اسکی جمع اَبْنَاءٌ وَ بَنُوْنَ ، بَنِیْنَ ھے - بِنْتٌ بیٹی - (جمع بَنَاتٌ*) - تَبَنَّاہُ کے معنے ھیں کسی کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالینا - نیز کسی چیز سے زیادہ ربط ضبط اور لگاؤ رکھنے والے، اور اس میں دلچسپی لینے والے کو بھی اِبْنٌ* کہتے ھیں - مثلاً اِبْنُ حَرْبٍ (جنگجو) - یا اِبْنُ السَّبِیْلِ (مسافر)* -

قرآن کریم میں ھے اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشاً وَّ السَّمَاءَ بِنَاءً (۲/۲۲) - " جس نے تمہارے لئے زمین کو نیچے بچھی ھوئی بنایا اور سماء کو اوپر چھایا ھوا " - یہاں بِنَاءٌ* بمقابلہ فراش آیا ھے - فراش نیچے بچھی ھوئی چیز کو کہتے ھیں اسلئے بِنَاءٌ* کے معنے اوپر چھائی ھوئی چیز کے ھونگے - جیسے خیمہ - سورۃ نحل میں ھے فَاَتَی اللّٰہُ بُنْیَانَھُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَیْھِمُ السَّقْفُ (۱۶/۲۶) "اللہ نے ان کی عمارتوں کو بنیادوں سے گرا دیا سو ان کی چھتیں انکے اوپر آگریں" - یہاں بُنْیَانٌ* کے معنے عمارت ھیں جن کے نیچے بنیادیں ھوں اور اوپر چھتیں -

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے قصہ میں اَبْنَاء بمقابلہ نِسَاء آیا ھے - مثلاً (۱۴/۶) میں ھے وَ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَکُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَاءَکُمْ "وہ تمہارے ابناء کو ذبح کر دیتے تھے اور تمہاری نساء کو زندہ رکھتے تھے" - یہاں یا تو نِسَاءٌ* کے معنے بیٹیاں ھونگے - لہذا اَبْنَاءٌ* کے معنی بیٹے - اور اگر نِسَاءٌ* کے معنے عورتیں لئے جائیں تو اَبْنَاءٌ* کے معنے مرد ھونگے - ان معانی کی تائید (۳۷/۱۵۳) سے بھی ھوتی ھے جہاں بَنِیْنَ (Males) کے مقابلہ میں اناث (Females) آیا ھے - مجازی معنوں کے اعتبار سے اَبْنَاءٌ* کے معنی قوم کے معزز افراد ھونگے (ابنائے قوم) -

(نیز دیکھئے عنوان ن - س - و)

سورۃ لقمان میں یٰبُنَیَّ* آیا ھے (۳۱/۱۶) جس کے معنی ھیں "اے میرے ننھے بیٹے" - یہاں بُنَیَّ* - اِبْنٌ* کی تصغیر ھے -

بنی اسرائیل

حضرت یعقوبؑ (حضرت ابراھیمؑ کے پوتے) کا لقب اسرائیل (یعنی مردِ خدا) تھا - آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی اسے بنی اسرائیل کہتے

* راغب -

ہیں۔آپ کے چوتھے بیٹے کا نام یہودہ (Juda)تھا ۔یہودہ اور بن یامین کی نسل کا قبیلہ، فلسطین کے علاقہ (Juda) میں حکمران تھا ۔ اس قبیلہ کو اسی نسبت سے یہودی کہتے تھے اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل ۔لیکن بعد میں عام طور پر یہ تفریق باقی نہ رہی اور بنی اسرائیل اور یہودی سے ایک ہی مفہوم لیاجانے لگا۔

حضرت یعقوبؑ کا وطن کنعان (فلسطین) تھا لیکن جب حضرت یوسفؑ مصر میں صاحبِ اقتدار ہو گئے تو انہوں نے اپنے والد اور تمام خاندان کو مصر بلا لیا ۔حضرت یوسفؑ کی وجہ سے مصر میں اس قبیلہ کی بڑی تعظیم و تکریم ہوئی ۔ چار سو برس تک یہ مصر میں رہے اور جو قبیلہ چند نفوس پر مشتمل تھا اس عرصہ میں ایک کثیرالتعداد قوم بن گیا ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ انقلاب بھی آیا کہ فراعنۂ مصر نے انہیں اپنا محکوم بنا لیا اور جو برتاؤ محکوموں کے ساتھ ہوتا ہے وہی ان کے ساتھ ہونے لگا ۔ جب ان کی ذلت و پستی انتہا تک پہنچ گئی تو ان کی طرف حضرت موسیٰؑ مبعوث ہوئے جو انہیں فرعون کی غلامی سے نجات دلا کر پھر فلسطین کے میدانوں کی طرف لے گئے ۔یہ واقعہ قریب ۱۶۰۰ ق۔م کا ہے ۔ یہاں انہوں نے بڑا عروج حاصل کیا۔ان میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ جیسے صاحب سطوت وشوکت نبی پیدا ہوئے ۔ لیکن اس کے بعد اس قوم نے قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کرلی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تشتت و انتشار کے عذاب میں مبتلا ہو کر دن بدن کمزور ہوتی چلی گئی ۔ ۵۹۹ ق۔م میں بابل کے شاھنشاہ بنوکد نصر (بخت نصر) نے یروشلم (بیت المقدس) پر حملہ کیا اور یہودیوں کے اس ملی مرکز کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ۔ انہیں قید کرکے بابل لے گیا اور وہاں ذلیل ترین زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا ۔ (قرآن کریم نے یہودیوں کی اس پہلی تباہی کی طرف (۱۷/۵) میں اشارہ کیا ہے) ۔قریب اسی سال تک یہ اس عذاب میں مبتلا رہے تاآنکہ فارس کے تین بڑے بڑے شاھنشاہ خورس (ذوالقرنین) دارا اور ارتخششتا یکے بعد دیگرے ان کی امداد کے لئے آمادہ ہو گئے ۔ انہوں نے انہیں بابل کی قید سے رہائی دلا کر یوروشلم کی دوبارہ آبادی اور ہیکل کی تعمیر کی اجازت دے دی ۔ چنانچہ ۵۱۵ ق۔م میں ہیکل دوبارہ تعمیر ہو گیا اور آوارۂ وطن یہودی پھر اپنے ملی مرکز میں آباد ہو گئے ۔ [قرآن نے اسکی طرف (۱۷/۶) میں اشارہ کیا ہے اور (۲/۲۵۹) میں اس سو سال کی ''مدت'' کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے ۔

کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر وہی حالت ہو گئی۔چنانچہ ۳۳۲ ق۔م میں پہلے اسکندر نے ان پر حملہ کرکے ان کا شیرازہ بکھیر دیا اور پھر ۳۲۰ ق۔م

میں بطلیموس (Ptolemy) نے یروشلم پر قبضہ کرکے ان کی رہی سہی قوت کو بھی ختم کردیا ۔ انٹی گونس کے عہد میں یہ تمام علاقہ یونانیوں کے قبضہ میں چلا گیا ۔ اسکے بعد ٦٦ ق ۔ م میں پاپئی (رومی) نے یروشلم کو تباہ کیا ۔ ۱۰ ق ۔ م میں ایک اور یورش نے ان کے وقار کو یکسر ختم کردیا [قرآن کریم نے (۷؍۱۷) میں اس دوسری تباہی کیطرف اشارہ کیا ہے] ۔

اس مقام پر فطرت نے انہیں باز آفرینی کا ایک اور موقعہ دیا اور ان میں حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے۔ لیکن ہیکل کے مشائخ وعلماء نے حکومت کے ساتھ مل کر آپ کے خلاف سازش کی اور اسطرح اپنی تباہی پر خود اپنے ہاتھوں مہر ثبت کر دی۔ ۷۰ء میں رومیوں کے گورنر ٹائٹس نے ان پر آخری وار کیا جس سے (مرکزی حیثیت سے) ان کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ انسائکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں ۔

> ۷۰ء مہینے کی دسویں تاریخ کو ایسے خوف و ہراس کے عالم میں جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی ، سقوط یروشلم عمل میں آیا ۔ ہیکل کو جلادیا گیا اور اسطرح یہودی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا ۔

یہودیوں کے علماء و مشائخ نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کیوں کی تھی اس کے متعلق انجیل برنباس کا یہ بیان قابل غور ہے ۔ اس کتاب کی فصل ۱۴۲ میں لکھا ہے کہ

''تب ان لوگوں نے کاھنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا ، اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے ۔ ہم پر یہ بڑی مصیبت ہوگی۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے ۔ اسوقت تو یہ ہماری تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قوت نہیں رکھتا ۔ لیکن (اگر اسے حکومت حاصل ہوگئی تو) اس کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائینگے ۔ اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دئے جائینگے تو ہم مجبور ہونگے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں ۔ حالانکہ اسوقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور ہمارا حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ کرنے والے نہیں ہیں جیسا کہ ہم ان کی شریعت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ اور اسی سبب سے ہم اسکی قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہے وہ کرلینگے ۔ (اسوقت) اگر ہم غلطی کرتے ہیں تو ہمارا خدا رحیم ہے ۔ قربانی اور روزہ

کے ساتھ اسے راضی کر لینا ممکن ہے ۔ مگر جبکہ یہ آدمی ہمارا بادشاہ ہو گیا تو ہر گز راضی نہ کیا جاسکیگا مگر جب کہ اللہ کی عبادت ویسے ہی ہوتے نہ دیکھے جیسے موسیٰؑ نے لکھی ہے''۔

جس قوم کی یہ حالت ہو چکی ہو وہ اگر تباہی اور بربادی کے رسوا کن عذاب میں مبتلا نہ ہو تو اور کیا ہو؟ نبی اکرمؐ کے دور رحمت مآب میں ان کے لئے پھر ایک موقعہ آیا تھا کہ نظام خداوندی کے اتباع سے شرفِ انسانیت کی سعادت حاصل کر لیں لیکن انہوں نے اپنی ضد اور قساوت قلبی کی بناء پر اس دعوت کی بھی انتہائی مخالفت کی اور بالآخر جزیرۃ العرب سے نکال دئے گئے (قرآن کریم نے اس کا ذکر (۵۹/۲) میں کیا ہے) اس کے بعد یہ قوم ''آوارہ گرد یہودی'' (Wandering Jews) کے نام سے دنیا میں مشہور ہوئی تاآنکہ اب بعض طاقتور سلطنتوں کے سیاسی مصالح نے ان کے لئے فلسطین میں ''گھر'' بنا دیا ہے۔ (چونکہ یہ حصہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم اس مقام پر اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے)۔

اس مقام پر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ یہودیوں کے ہاں مذہب نسلی (قومی) تھا۔ یعنی یہودی وہی ہو سکتا تھا جو یہودیوں کے گھر پیدا ہو۔ کوئی غیر بنی اسرائیلی یہودی مذہب اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ صرف یہ ایک بات ہی اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ مذہب قطعاً وہ نہیں تھا جو ان کے انبیائے کرام کو خدا کیطرف سے ملا تھا۔ خدا کا دیا ہوا دین تمام نوع انسانی کے لئے ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ساحرین دربار فرعون حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے ہیں تو آپ نے انہیں یہ کہکر رد نہیں کر دیا کہ خدا پر ایمان صرف بنی اسرائیل کے لئے ہے۔ تم اس دین میں داخل نہیں ہو سکتے۔ لیکن بعد میں یہودیوں نے اسے قومی دین بنا لیا۔

(بنی اسرائیل کے متعلق مزید تفصیل میری کتاب ''برق طور'' میں ملیگی)

ب ھ ت

بَہِتَ ۔ حیرت زدہ ہو جانا۔ متحیر ہو کر خاموش ہو جانا ۔ اَلْبَہْتُ ۔ کسی کو اچانک پکڑ لینا* ۔ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ (۲/۲۵۸)۔ جس نے خدا کا انکار کیا تھا وہ اس دلیل قاطع کی گرفت میں اسطرح آ گیا کہ ششدر و حیران ہو کر خاموش رہ گیا۔ فَتَبْهَتُهُمْ (۲۱/۴۰) وہ انقلاب اسطرح اچانک آئیگا کہ

---

*تاج۔

انہیں مبہوت کر دیگا۔ بُهْتَانٌ کسی پر ایسا الزام لگا دینا جسے سنکر وہ ششدر و حیران رہ جائے۔ (۲۳/۱۶)۔ یعنی اِفْکٌ مُّبِیْنٌ۔ جھوٹی بات (۲۴/۱۲)۔

سورۃ ممتحنہ میں یہ لفظ (بُهْتَانٌ) ہر عمل شنیع اور ناروا حرکت کے لئے آیا ہے جہاں کہا ہے وَلَا يَأْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ (۶۰/۱۲) "اور نہ کوئی بہتان باندھ لائینگی"۔ یعنی کسی عمل شنیع کی مرتکب نہیں ہونگی۔

ب ھ ج

اَلْبَهْجَةُ۔ حسن و جمال۔ نباتات میں ترو تازگی اور انسانوں میں خندہ روئی اور بشاشت کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اَلْاِبْتِهَاجُ۔ خوشی اور سرور۔ تَبَاهَجَ الرَّوْضُ۔ باغ میں پھول بہت کھل گئے۔ سورۃ حج میں ہے۔ وَاَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ (۲۲/۵) "اور زمین ہر قسم کے ترو تازہ اور حسین و خوشنما پودے اگاتی ہے"۔ سورۃ نمل میں ہے۔ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ (۲۷/۶۰)۔ "حسین و خوشنما باغات"۔

ب ھ ل

اَبْهَلَهٗ۔ اسے اسکی رائے اور ارادہ میں آزاد چھوڑ دیا۔ اَبْهَلَ النَّاقَةَ۔ اونٹنی کو تھن باندھے بغیر چھوڑ دیا کہ جسکے جی میں آئے اسکا دودھ دوہ کرے جائے۔ یا بغیر مہار کے چھوڑ دیا کہ وہ جہاں سے چاہے چرتی رہے۔ اِسْتَبْهَلَ الْوَالِيْ الرَّعِيَّةَ۔ حاکم نے رعایا کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جو جی میں آئے کرے*۔ چنانچہ راغب نے کہا ہے کہ بَهْلٌ کے اصلی معنے کسی چیز کا اس حال میں ہونا ہے کہ اسکی دیکھ بھال نہ کی جائے۔ اسے اسکے حال پر چھوڑ دیا جائے ۔ راغب نے اَلْاِبْتِهَالُ فِي الدُّعَاءِ کے معنے کھل کر عاجزی سے دعا کرتے رہنا بھی لکھے ہیں**۔ اَلْبَهْلُ مِنَ الْمَالِ۔ کے معنے تھوڑا سا مال ہیں۔ اَلْبَهْلُ تھوڑی سی حقیر چیز*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں پانی کی کمی کو بھی شامل کیا ہے۔

قرآن کریم میں یہ لفظ (۳/۶۰) میں آیا ہے جہاں رسول اللہ ؐ سے کہا گیا ہے کہ اگر یہ اہل کتاب ان دلائل و براہین کے بعد بھی نہ مانیں تو ان سے کہو کہ ہم اور ہمارے اہل وعیال ایک طرف ہو جاتے ہیں اور تم اور

---

*تاج۔ ** راغب

تمہارے اہل و عیال ایک طرف ہو جائیں - (ثُمَّ نَبْتَہِلْ) - اور اسطرح فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ (۳/۶۰) - اسکے معنے یہ ہو سکتے ہیں کہ اس کے بعد تمہارے اور ہمارے درمیان یہ معاملہ ہونا چاہئے کہ تم ہمارے معاشرہ میں دخیل نہ ہو اور ہم تم لوگوں سے کچھ واسطہ نہ رکھیں (یعنی ایک دوسرے کو اس کی فکر ورائے میں آزاد چھوڑ دیا جائے) اور طرفین اپنی اپنی جگہ اپنا پروگرام مکمل کرتے جائیں - اس کے بعد یہ پتہ چل جائیگا کہ کونسی جماعت خدا کی نوازشوں سے محروم (یعنی ملعون) ہو جاتی ہے، (لعنت کے یہی معنی ہیں) بس وہی اپنے دعوےٰ میں جھوٹی ہوگی- یہ وہی بات ہے جسے دوسرے مقامات پر ان الفاظ میں کہا گیا ہے کہ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلًا (۷۳/۱۰) - (نیز فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ (۱۵/۸۵)، ''نہایت عمدگی سےان سے کنارہ کش ہوتے ہوئے انہیں چھوڑ دے،،- اور اسکے بعد ان سے کہدے کہ اِعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَکُوْنُ لَہٗ عَاقِبَۃُ الدَّارِ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶) -''تم اپنی جگہ کام کرتے جاؤ اور میں اپنی جگہ کام کرتا ہوں - نتائج خود بتا دینگے کہ آخرالامر کامرانی کس کے حصہ میں آتی ہے- اس سے خدا کے اس قانون کی صداقت واضح ہو جائیگی کہ ظالمین کی کھیتیاں کبھی ثمر بار نہیں ہوا کرتیں،،- یہی لعنة اللہ علی الکاذبین ہے -

رسول کے انقلاب آفرینی کے پروگرام میں پہلا مرحلہ تبلیغ کا ہوتا ہے- دوسرا مرحلہ ان لوگوں سے حسن کارانہ انداز سے کنارہ کشی کا ہوتا ہے جو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر اس پیغام کی مخالفت کرتے ہیں - اس مرحلہ میں ان سے صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ تم میرے پروگرام میں دخل نہ دو، میں تمہارے معاملات میں دخل نہیں دیتا - اسی کو سورۃ آل عمران میں نَبْتَہِلْ سے تعبیر کیا گیا ہے - اور تیسرا مرحلہ تصادم (ٹکراؤ) کا ہوتا ہے جب نتائج نکل کر سامنے آ جاتے ہیں - یعنی فلاح اور لعنت کے بیّن طور پر سامنے آ جانے کا مرحلہ -

ب ہ م

اَلْبُہْمَۃُ - ٹھوس چٹان - اس سے اَلْاَبْہَمُ ٹھوس اور بند چیز - گونگا - نیز غیر واضح - غیر فصیح کو کہتے ہیں - اور بُہْمَۃٌ مشکل معاملہ کو جو سمجھ میں نہ آ سکے - اَبْہَمَ الْاَمْرُ اِبْہَامًا - معاملہ غیر واضح ہو

*تاج - **راغب -

گیا اور سمجھ میں نہ آ سکا کہ اسے کسطرح حل کیا جائے۔ حَائِطٌ مُبْهَمٌ۔ اس دیوار کو کہتے ہیں جسمیں کوئی دروازہ نہ ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا اسطرح ہو جانا کہ اسکی طرف جانے کا راستہ نہ ملے۔ یعنی غیر واضح اور مبہم ہو جانا۔

گونگے ہونے اور وضاحت سے کلام نہ کرسکنے کے اعتبار سے بَهَائِمُ (واحد اَلْبَهِيْمَةُ) تمام بے عقل اور بے زبان جانوروں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بول نہیں سکتے یا انکی آواز میں ابہام ہوتا ہے اور اس سے بات سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ اس میں تمام جانورشامل ہوتے ہیں خواہ وہ دریا ہی میں کیوں نہ ہوں۔ لیکن صاحب محیط اور راغب دونوں نے لکھا ہے کہ درندے اور پرندے اسمیں شامل نہیں ہوتے*۔ قرآن کریم نے کہا ہے اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ (۱/۵)۔ تمہارے لئے بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ حلال قرار دیئے گئے ہیں، بجز ان کے جنہیں خود وحی (قرآن) کی رو سے حرام قرار دیا گیا ہے۔(۳/۵)۔ اسکے مفہوم کیلئے (ن۔ع۔م کے عنوان میں اَنْعَامٌ دیکھئے)

ب و أ

بَاءَ۔ يَبُوْءُ۔ بَوْءًا۔ کے بنیادی معنے ہیں کسی کی طرف لوٹنا۔ رجوع کرنا۔ موافق و مطابق ہو جانا۔ اقرار واعتراف کرنا۔ بوجھ اٹھانا۔ برابر سرا بر ہو جانا**۔ قرآن کریم میں ہے وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۲/۶۱) "وہ اللہ کے غضب کےمستحق ہوگئے اوراسے لادے ہوئے پائے"۔ وہ اپنے اعمال کی وجہ سے سزا کے مستوجب ہوگئے۔ انکے اعمال، اورذلت ورسوائی کی عقوبت، ایک دوسرے کے ساتھ بالکل فِٹ (موافق) ہو گئے۔

سورۃ المائدہ میں فرزندانِ آدم کے قصے میں کہا گیا ہے کہ مظلوم نے ظالم سے کہا اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ (۲۹/۵)۔ "میں چاہتا ہوں کہ تو میرے قتل کے جرم اور اپنے دیگر جرائم کا بوجھ اٹھا لے"۔ انکی سزا کا مستحق بن جائے۔

اَلْمَبَاءَةُ۔ چھتہ کو کہتے ہیں۔ نیز اس کے معنے ہیں مکان۔ قیام گاہ**۔ بَوَّأَ الْمَكَانَ: وہ کسی جگہ ٹھیرا، اترا۔ بَوَّاَهُ الْمَنْزِلَ اسے کسی جگہ اتارا، ٹھیرایا۔ (لازم ومتعدی)۔ نیز بَوَّاَهُ مَنْزِلًا کے معنی ہیں اس کے لئے کسی

* تاج۔ راغب۔ محیط۔ ** تاج

جگہ کو موافق و سازگار بنایا ، ہموار اور درست کیا ***۔ راغب نے بھی اس مادہ کے معنوں میں کسی جگہ کے اجزاء کا ہموار ہونا،سازگار و مناسب ہونا بتایا ہے ۔ بَوَّأْتُ لَہٗ مَکَانًا ۔ میں نے اسکے لئے کسی جگہ کو ہموار و درست کیا** ۔ سورۃ حج میں ہے ۔ وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ (۲۲/۲۶) ۔ اسکے معنے یہ بھی ہیں کہ ابراہیم کیلئے خانہ کعبہ کی جگہ کو متعین کیا،اسے ان کے لئے سازگار و ہموار کیا۔اور یہ بھی کہ اس مقام کو انکے لئے مرجع بنا دیا ۔ تَبَوَّأَ الْمَكَانَ : کسی جگہ اترا اور وہاں اقامت کی***۔ سورۃ حشر میں ہے وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۵۹/۹) ۔ ''جن لوگوں نے ان سے پہلے مدینہ کو قیام گاہ بنا لیا اور ایمان کو اپنے دل میں محکم جگہ دے لی،، ۔

ب و ب

بَابٌ ۔ داخل ہونے کی جگہ* دروازہ، اسکی جمع أَبْوَابٌ ہے۔ مزارعت (کھیتی باڑی) میں ان جگہوں کو بھی أَبْوَابٌ کہتے ہیں جہاں سے پانی کھولا جائے*** ۔

هٰذَا بَابَتُہٗ ۔ یہ اسکے مناسب ہے ۔ اس کے لائق ہے ۔ یا اسکی شرط ہے* ۔

أَبْوَابُ السَّمَاءِ (۵۴/۱۱) ۔ خیر و برکت کی راہیں ۔

أَبْوَابَ جَهَنَّمَ (۳۹/۷۱) ۔ جہنم کے طبقات۔ درجات (نیز ۱۵/۴۴) ۔ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (۶/۴۴) ۔ ہر طرح کی راحت کے اسباب و سامان۔

سورۃ بقرہ میں مکان کے دروازوں (أَبْوَابٌ) کے مقابلہ میں ظُهُورٌ ''پچھواڑے،، (۲/۱۸۹) آیا ہے ۔

ب و ر

اَلْبَوْرُ ۔ غیر آباد زمین جس میں کھیتی نہ کی گئی ہو۔ ناقابل کاشت زمین ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی ہلاکت اور تعطل لکھے ہیں ۔

بَارَ عَمَلُہٗ ۔ اسکا عمل بیکار گیا*** ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يَبُورُ (۳۵/۱۰) ۔ ''انکی تدبیر بیکار جائیگی،،۔ بےنتیجہ رہ جائیگی۔ بَارَتِ السُّوقُ بازار مندا پڑگیا*** ۔ قرآن میں ہے تِجَارَةً لَنْ تَبُورَ (۳۵/۲۹) ۔ ''ایسی تجارت جو مندی نہ پڑے،، ۔ جس میں خسارہ نہو ۔ اَلْبُوْرُ

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔ محیط ۔ راغب

نکمے ، بے فیض ، نقصان اٹھانے والے، تباہ و برباد ہو جانے والے* ۔ وَکَانُوْا قَوْمًا بُوْرًا (۲۵/۱۸) ۔ ''وہ ہلاک ہونے والی قوم تھی،، ۔ اَلْبَوَارُ ۔ تباہی ، بربادی ، مندا پن ۔ بَوَارُ الْاَیِّمِ ۔ کنواری یا بیوہ لڑکی کا اس لئے گھر میں بیٹھا رہنا کہ اس کے لئے کوئی پیغام نہ آئے ۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۱۴/۲۸) ۔ وہ اپنی قوم کو ایسی جگہ لے آئے جہاں اس جنس کاسد کا کوئی گاہک نہو ۔ جہاں کوئی اس کی بات تک نہ پوچھے ۔ جہاں اسے کوئی ''پیغام،، نہ دے ۔ جہاں یہ سخت خسارہ میں ہو ۔ جہاں اسکے لئے تباہی اور ہلاکت سامانی ہو ۔ راهنماؤں کی غلط اندیشیوں اور مفاد پرستیوں سے قومیں ایسے ہی مقام میں پہنچ جاتی ہیں ۔ اسے قرآن نے جَهَنَّمُ کہکر پکارا ہے (۱۴/۲۹) ۔ پوری آیات کا ترجمہ یہ ہے ۔ ''کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنہوں نے نعمت خداوندی کی جگہ کفر اختیار کر لیا اور اپنے کاروانِ ملت کو اس منڈی میں جا اتارا جہاں اس جنس کا کوئی خریدار نہ ہو ۔ یعنی جہنم میں ۔ اور اس میں وہ داخل ہو گئے ۔ اور وہ بہت بری جگہ ٹھہرنے کی ہے،، ۔ جو لیڈر ، نعمائے خداوندی کی قدر نہیں کرتے وہ اپنی قوم کو تباہی اور بربادی کے جہنم میں لے آتے ہیں جہاں لیڈر اور ان کے متبعین ، سب تباہ و برباد ہو جاتے ہیں ۔ قرآن کریم نے ''جہنم،، میں لیڈروں اور ان کے متبعین کے باہمی مکالمات بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں ۔ یہ مقامات بڑے عبرت انگیز ہیں ۔ (دیکھئے (۱۴/۲۱) و (۳۳/۶۷) و (۳۴/۳۲) و (۳۷/۲۹) و (۴۰/۴۷) و (۳۸/۶۰)) ۔

ب و ل

اَلْبَالُ ۔ وہ حالت جسکے متعلق کچھ فکر یا پرواہ کی جائے ۔ گرانقدر اور مہتم بالشان معاملہ جس میں جی اٹکا رہے ۔ انسان کا دل ۔ دل میں گزرنے والا خیال ۔ نیز آرزو اور تمنا * ۔ سورۃ یوسف میں ہے مَا بَالُ النِّسْوَةِ (۱۲/۵۰) ۔ ''ان عورتوں کی حالت کیا ہے،، ۔ ان کا معاملہ کیا ہے ۔ بَالٌ کہنے سے مطلب یہ ہے کہ اس معاملہ کو خاص اہمیت حاصل تھی ۔ حضرت یوسفؑ کو اسکی فکر تھی ۔ سورۃ محمد میں ہے وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷/۲) ۔ ''خدا ان کے حالات اور معاملات کو سنوار دیگا،، ۔

ب ی ت

بَیْتٌ ۔ راغب نے کہا ہے کہ بَیْتٌ اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں انسان رات میں پناہ لے ۔ لیکن اسکے بعد یہ لفظ گھر اور مکان کے معنوں میں استعمال ہونے لگا** ۔

*تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔ **راغب ۔

بَیْتُ الرَّجُلِ آدمی کی بیوی نیز اس کے بال بچوں کو کہتے ہیں ۔ اور اَلْبَیْتُ شرف کو* ۔ اَلْبَیْتُ کے معنے شادی کرنا بھی ہیں* ۔
بَاتَ ۔ یَبِیْتُ ۔رات بھر کوئی کام کرنا ۔ اسکے معنے سونا اور آرام کرنا نہیں ہیں ۔ لیکن زجاج نے کہا ہے کہ ہر وہ شخص جو کہیں رات گزارے اسکے لئے بَاتَ کہنا صحیح ہے خواہ وہ رات کو سوئے یا کام کرے۔ بَیَّتَ الْاَمْرَ کے معنے ہیں کام کی تدبیر رات کے وقت کرنا ۔ یا کام کو رات کے وقت کرنا ۔ بَیَّتَ الْقَوْمَ ۔ قوم پر رات کے وقت حملہ کرنا* ۔ اَلْبِیْتُ غذا ۔ اَلْبَائِتُ ۔ باسی (جو تازہ نہ ہو)** ۔

سورۃ بقرہ میں اَلْبَیْتُ خانہ کعبہ کیلئے آیا ہے (۲/۱۲۵) ۔سورۃ الفرقان میں یُبَیِّتُوْنَ (۴/۸۱) راتوں کو مشورہ کرنے کے معنوں میں آیا ہے یا رات گزارنے کے معنوں میں ۔ اور (۲۷/۴۹) میں یہ لفظ رات کے وقت حملہ کرنے کے معنوں میں آیا ہے ۔

بَیَاتًا (۷/۴) راتوں رات ۔

ب ی د

بَادَ ۔ یَبِیْدُ ۔ کسی چیز کا جاتے رہنا ۔ختم ہو جانا ۔ ہلاک ہو جانا ۔ بَادَتِ الشَّمْسُ بُیُوْدًا ۔ آفتاب غروب ہوگیا۔ اصل میں اَلْبَیْدَاءُ لق و دق جنگل یا صحرا کو کہتے ہیں جس میں سفر کرنا موجب ہلاکت ہو۔ بَادَ الشَّیْءُ کے معنے ہیں وہ چیز متفرق اور منتشر ہو گئی ۔ اسی سے اسکے معنے جاتے رہنے اور برباد ہو جانے کے آتے ہیں ۔ اَبَادَہُ اللّٰہُ ۔ خدا نے اسے ہلاک کر دیا*** ۔ سورۃ کہف میں ہے مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِیْدَ ھٰذِہٖۤ اَبَدًا (۱۸/۳۵) ۔ ''میں گمان تک نہیں کرتا تھا کہ یہ کبھی برباد ہوگا،، ۔ اَلْبَائِدُ ہلاک ہونے والا** ۔

ب ی ض

اَلْاَبْیَضُ ۔سفید۔(جمع بِیْضٌ اورمؤنث بَیْضَاءُ)۔اَلْبَیَاضُ ۔ سفیدی۔ یہ اَسْوَدُ اورسَوَادٌ کی ضد ہے* ۔ چونکہ عربوں کے ہاں بَیَاضٌ افضل ترین رنگ تھا اسلئے وہ فضل و کرم اور عمدہ خصائل کو بیاض سے تعبیر کرتے تھے ۔ چنانچہ جو شخص کسی عیب کے ساتھ آلودہ نہو وہ اَبْیَضُ الْوَجْہِ

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج و راغب ۔

کہلاتا تھا** - نیز اس سے مراد زندگی کی بشاشت اور شگفتگی ہوتی ہے - چنانچہ قرآن کریم میں ہے یَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ (۳/۱۰۵) ''جس دن کچھ چہرے سفید ہونگے اور کچھ چہرے سیاہ،، - اس میں تَبْيَضُّ سے مراد زندگی کی مسرتیں حاصل ہونا ہیں ، جسطرح تَسْوَدُّ سے مراد حزن و غم ہے** - اَلْبَيْضَةُ - انڈا - نیز ہر چیز کی اصل اور مقامِ اجتماع - اجتماعی قوت - بنیاد - مقامِ حکومت و تسلط - جماعت - قبیلہ* - اَلْيَدُ الْبَيْضَاءُ - وہ حجت جس پر دلیل و برہان قائم ہو - یعنی روشن اور واضح دلیل - نیز وہ ہاتھ جو کسی کو کچھ دیکر احسان نہ جتائے - جو بلا سوال دے* - صاحب محیط نے اسکے معنے لکھے ہیں نعمت - قدرت - فخر - جودت - شہرت**- قرآن کریم میں ، حضرت موسیٰؑ کے قصے میں ''ید بیضاء،، کا ذکر متعدد مقامات میں آیا ہے (مثلاً ۷/۱۰۸ و ۲۰/۲۲ و ۲۶/۳۳ و ۲۸/۳۲) اس کے مجازی معنی روشن اور واضح دلائل کے ہیں - صاحب لطائف اللغۃ نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے -

قرآن کریم نے جنتی عورتوں کے متعلق کہا ہے کَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ (۳۷/۴۹) یوں سمجھو جیسے وہ محفوظ رکھے ہوئے ''انڈے،، ہیں - سفید - شفاف - بے داغ - گوہر آبدار - کَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ (۵۵/۵۸) - ''گو یا وہ یا قوت اور مرجان ہیں،، - وہ عفت مآب جنہیں (شادی سے قبل) کسی نے چھؤا تک نہ ہو (۵۵/۵۶)- عفت و عصمت اور شرف و مجد کی مالک خواتین -

اِبْيَضَّتْ یا بَيْضَتْ کے معنے ہیں بھر جانا - آنکھوں میں آنسو بھر جانا - اِبْيَضَّتْ عَيْنَاهُ - اسکی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں*** - سورۃ یوسف میں حضرت یعقوبؑ کے متعلق ہے وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ (۱۲/۸۴) - اسکے یہی معنے ہیں - یعنی غم کی وجہ سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہتی تھیں -

ب ی ع

بَاعَ - يَبِيْعُ - بَيْعاً - کسی چیز کو فروخت کردینا یا خرید لینا - دونوں معنوں میں آتا ہے -

---

*تاج - **محیط - ***رازی -

سورۃ بقرۃ میں ہے یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْہِ (۲/۲۵۴) "جس دن خرید و فروخت نہیں ہوگی" اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے۔ وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵) "خدا نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربوٰ کو حرام ٹھہرایا ہے"۔ آگے چل کر (جہاں لین دین کے معاملات کے متعلق احکام دئیے گئے ہیں) کہا گیا ہے کہ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً حَاضِرَۃً (۲/۲۸۲) "نقد تجارت کی صورت میں لکھنے کی ضرورت نہیں" وَ اَشْھِدُوْا اِذَا تَبَایَعْتُمْ (۲/۲۸۲) "جب باہمی بیع کا معاملہ ہو تو اس پر گواہ ٹھہراؤ"۔ (اور لکھو بھی۔ سیاق سے مترشح ہوتا ہے کہ یہاں اس خرید و فروخت کیطرف اشارہ ہے جو نقد نہ ہو) اس سے معلوم ہوا کہ تجارت اور بیع میں فرق ہے۔ اس کی تائید سورۃ نور سے بھی ہوتی ہے جہاں کہا گیا ہے رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّ لَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ (۲۴/۳۷)۔ ایسے لوگ جنہیں تجارت اور بیع اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی" - آجکل کی اصطلاح میں ان دونوں میں فرق یہ سمجھئے کہ بَیْعٌ تو عام خرید و فروخت کو کہینگے "تجارۃ" اسے جسے انگریزی میں (Trade or Commerce) کہتے ہیں*۔ یا تجارت، پیشہ ورانہ سوداگری کو کہینگے اور بَیْعٌ میں عام تبادلۂ اشیاء آجائیگا۔

اس آیت کو پھر سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ "خدا نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربوٰ کو حرام"۔ (۲/۲۷۵) "ربوٰ" کے متعلق گفتگو متعلقہ عنوان میں کی جائیگی۔ یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کی رو سے "بیع" کسے کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں عام تصور یہ ہے (اور اسی کے مطابق عمل بھی ہوتا ہے) کہ بیع، یعنی خرید و فروخت میں جسقدر منافع لے لیا جائے وہ جائز ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ سورۂ تطفیف میں ہے۔ وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ ۔ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَ اِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ (۸۳/۱-۳)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے۔ "تباہی ہے ان کے لئے جو کمی کرتے ہیں۔ یعنی ان کے لئے کہ وہ جب دوسروں سے لیتے ہیں تو پورا ماپ لیتے ہیں۔ اور جب دوسروں کو ماپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں"۔ ان آیات کا یہی مفہوم نہیں کہ "ماپ تول پورا رکھنا چاہئے"۔ یہ آیات، قرآنی نظام معیشت کے ایک بہت بڑے اصول کو بیان کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں ہوتا یہ ہے کہ (مثلاً) ایک

*لین۔

کاریگر جوتا بنا کر دوکاندار کے پاس لاتا ہے۔ دوکاندار کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسے کم سے کم دام دیکر جوتا خریدے۔ پھر جب اسی جوتے کا گاھک آتا ہے تو دوکاندار اس سے زیادہ سے زیادہ دام وصول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یہ وہ تاجرانہ ذہنیت ہے جسے قرآن کریم نے تباھی کا موجب بتایا ہے اور اس کمائی کو ''تطفیف'' کہکر پکارا ہے۔ یہ دوکاندار، کاریگر کو کم از کم دام کیوں دیتا ہے؟ یا یوں کہئے کہ کاریگر، کم از کم داموں پر اپنی چیز بیچنے پر کیوں مجبور ہوجاتا ہے؟ اس لئے کہ اس کے پاس ''سرمایہ'' نہیں۔ لہذا یہ ''منافع'' (جو اسطرح گاھک سے وصول کیا جاتا ہے) سرمایہ پر بڑھوتی ہے جو جائز نہیں ہوسکتی۔

اب سوال یہ ہے کہ دوکاندار کو کسقدر منافع لینا جائز ہے۔ اس کا جواب آسان ہے۔ دوکاندار ایک تو سرمایہ لگاتا ہے۔ اور دوسرے دن بھر دوکان پر بیٹھکر محنت کرتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے اصول یہ ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹) ''انسان کے لئے وھی ہے جس کے لئے وہ محنت کرے''۔ لہذا یہ دوکاندار اپنی محنت (Labour) کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ سرمایہ پر زیادہ لینے کا حقدار نہیں۔ اس کے لئے یہ مقرر ہونا چاھئیے کہ اس دوکاندار کی دن بھر کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاھئے۔ وہ اس کاروبار میں سے اس سے زیادہ نہیں لے سکتا۔ یعنی وہ گاھک سے ''رأس المال + اپنی محنت'' لے سکتا ہے۔ معاشیات میں قرآن کریم کا اصول یہ ہے کہ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۹) ''نہ تم کسی کو نقصان پہنچاؤ۔ نہ تمہیں نقصان پہنچایا جائے''۔ نہ تم کسی پر زیادتی کرو۔ نہ تم پر زیادتی کی جائے۔ ربوٰ میں چونکہ محنت کچھ نہیں ہوتی۔ صرف سرمایہ پر بڑھوتی لی جاتی ہے، اسلئے اس میں صرف رأس المال کا واپس لینا جائز ہے (۲/۲۷۹)۔ اور بیع میں چونکہ ساتھ محنت بھی ہوتی ہے اسلئے اسمیں رأس المال اور محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ یہ صورت بھی اسوقت تک ہوگی جب تک قرآن کا معاشی نظام اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوتا۔ اسوقت تمام افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ (مملکت) پر ہوگی اور اشیاء کے تبادلہ میں منافع لینے کا سوال ھی پیدا نہیں ہوگا۔

لہذا جس کاروبار میں صرف سرمایہ سے آمدنی ہو جائے اسلامی معاشرہ میں وہ جائز نہیں ہوگا۔ بیع اور ربوٰ میں فرق یہ ہے کہ بیع میں سرمایہ کے ساتھ محنت بھی ہوتی ہے اور ربوٰ میں فقط سرمایا ہوتا ہے۔ بیع میں محنت کا معاوضہ لیا جا سکتا ہے۔

بَیْعٌ کے معنی باہمی معاہدہ کے بھی ہوتے ہیں* ۔ قرآن کریم کی ُرو سے مؤمن اور اس کے خدا کے درمیان خرید و فروخت کا معاملہ ہوتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ($\frac{9}{111}$) " بے شک اللہ نے مومنوں سے انکی جانوں اور مالوں کا سودا جنت کے عوض کر لیا ہے " ۔ ظاہر ہے کہ اس معاہدہ کی ُرو سے نہ مال افراد کی ذاتی ملکیت میں رہتا ہے ، نہ وہ اپنی جان کے آپ مالک ہوتے ہیں ۔ یہ دونوں ان کے پاس بطور امانت رهتے ہیں ۔ ان کے معاوضہ میں انہیں اس دنیا میں بھی جنتی زندگی دیدی جاتی ہے اور آخرت میں بھی (تفصیل میری کتاب " نظامِ ربوبیت " میں ملیگی)۔ عملاً یہ معاہدہ اُس نظام کے مرکز کے ساتھ ہوتا ہے جو دنیا میں خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے ُمتشکل ہوتا ہے (سب سے پہلے رسول اللہؐ کے ساتھ اور حضورؐ کے بعد خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کے ساتھ جو ہمیشہ قائم کی جاسکتی ہے) یہی وہ معاہدہ ہے جو شروع میں اسلام لاتے وقت کیا جاتا ہے، جیسا کہ سورۃ ممتحنہ میں آیا ہے یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَکَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَکَ .... ($\frac{60}{12}$) "اے نبی جب مومن عورتیں تیرے پاس اس معاہدہ کے لئے آئیں "۔اور جس کی تجدید اسوقت ہوتی ہے جب اس نظام کو سخت مشکلات کا سامنا ہو اور جماعتِ مؤمنین کو سربکف میدان میں نکل آنا پڑے ۔ یہ وہ بیعت تھی جو جماعت مؤمنین نے حدیبیہ کے مقام پر کی تھی اور جس کا ذکر سورہ فتح میں ان الفاظ میں آیا ہے ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ($\frac{48}{10}$) - " جو لوگ تجھ سے بیعت (معاہدہ) کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے معاہدہ کرتے ہیں ۔ ان کے ہاتھ پر (بظاہر تمہارا ہاتھ لیکن درحقیقت) اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے " - آپ نے دیکھا کہ جو معاہدہ خدا کے ساتھ کیا جانا ہو اسکی عملی شکل کیا ہوتی ہے ؟ یعنی وہ معاہدہ اس نظام کے مرکز کے ساتھ کیا جاتا ہے جو قوانین خداوندی کی بنیادوں پر قائم ہو ۔ یہ تھی وہ بیعت جو جان اور مال ، یعنی سب کچھ دیکر جنت لینے کے لئے کی جاتی تھی ۔ لیکن جب دین ، مذہبِ خانقاہیت میں بدل گیا تو بیعت سے مفہوم رہ گیا " پیری مریدی کی بیعت " !

یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلا و نباتات و جمادات (اقبال)

* تاج

البِيْعَةُ - یہود کا کنیسہ یا نصاریٰ کی عبادت گاہ* (۲۲) - صاحب لطائف اللغہ نے کہا ہے کہ کنیسہ یہودیوں کی عبادتگاہ کو کہتے ہیں اور اَلْبِيْعَةُ نصاریٰ کی -

ب ی ن

اَلْبَيْنُ - جدائی، الگ الگ کرنا یا ہونا (لازم و متعدی) بعض لغویین کا خیال ہے کہ اس میں جدا ہونے اور ملنے کے متضاد معنی پائے جاتے ہیں، لیکن یہ خیال کمزور سا ہے - اس کا صحیح استعمال فَصْلٌ (الگ الگ کرنے) کیلئے ہوتا ہے - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں- اَلْبِيْنُ دو زمینوں کے درمیانی فاصلہ یا حد کو کہتے ہیں - بَانُوْا بَيْناً - وہ جدا ہوگئے - بَانَ الشَّيْءُ - وہ چیز منقطع ہو گئی - ضَرَبَهُ فَأَبَانَ رَأْسَهُ - اسے مارا اور اسکا سر اس کے جسم سے الگ کردیا - طَلاَقٌ بَائِنٌ اس طلاق کو کہتے ہیں جس کے بعد میاں بیوی کے تعلقات منقطع ہو جائیں* - (واضح رہے کہ یہ ایک فقہی اصطلاح ہے - قرآن کی رو سے طلاق رشتہ مناکحت کو منقطع کر دینے کے فیصلہ کا نام ہے دیکھئے عنوان ط - ل - ق) بَيْنَ - دو چیزوں کے وسط اور درمیان کو کہتے ہیں *

اَلْبَيَانُ کے معنے ہیں کسی چیز کا کھل کر سامنے آجانا، واضح ہو جانا، نمودار ہوجانا - (اس میں لازم اورمتعدی دونوں معنے پائے جاتے ہیں)- بَيَّنَ الشَّجَرُ - درخت کے پتے نکل آئے - یا جو چیزیں سب سے پہلے نمودار ہوتی ہیں (شگوفے وغیرہ) وہ نمودار ہوگئیں - بَيَّنَ الْقَرْنُ - سینگ نکل آیا - صاحب محیط کے نزدیک وہ دلیل وغیرہ جس سے کوئی چیز آشکارا اور واضح ہوجائے بَيَانٌ کہلاتی ہے** - قرآن کریم میں تَبْيِيْنٌ بمقابلہ كِتْمٌ آیا ہے (۱۸۷؛ ۱۵۹؛ ۲) كَتَمَ کے معنے ہیں کسی چیز کو چھپا دینا - لہذا تَبْيِيْنٌ کے معنے ہوئے کسی چیز کا ظاہر کر دینا - نمایاں کر دینا - دوسری جگہ یہی لفظ اِخْفَاءٌ (چھپانا) کے مقابلہ میں آیا ہے (۵/۱۵) - اسی جگہ قرآن کو كِتَابٌ مُبِيْنٌ (۵/۱۵) کہا گیا ہے - حقائقِ مستورہ کو ظاہر کرنے والا ضابطۂ حیات - یا وہ ضابطۂ حیات جو کھلے کھلے حقائق اپنے اندر رکھتا ہے - جن حقائق کا تعلق دنیائے محسوسات سے ماوراء ہے انکا معلوم کرلینا انسان کے بس کی بات نہیں - وہ انسانی عقل کے دائرہ سے باہر ہوتے ہیں - انہیں خود خدا وحی کے ذریعے رسول پر

*تاج - ** محیط

منکشف کرتا ہے ۔ اسطرح حقیقت کو منکشف کردینے کا نام تبیان ہے ۔ اسی لئے قرآنی حقائق کو بینات کہا گیا ہے ۔ یعنے وہ حقیقتیں جنہیں خدا نے خود ظاہر کیا ہے ۔ اگر وہ انہیں بیان (ظاہر) نہ کرتا تو وہ مستور ہی رہتیں ۔

یہانتک اس مرحلہ کا ذکر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان مستورہ حقائق کو بذریعہ وحی نبی اکرم پر منکشف کیا ۔ اب اگلا مرحلہ دیکھئے ۔ اور وہ بھی بہت اہم ہے ۔

قرآن کریم کی رو سے خدا کیطرف سے انسانوں پر انکشاف حقیقت کا ایک ہی طریق ہے جسے وحی کہتے ہیں ۔ اور وحی ، حضرات انبیاء کرام کے لئے مخصوص تھی ۔ لیکن انسانی ذہن نے غیر از انبیاء پر بھی انکشاف حقیقت کا تصور پیدا کر لیا اور اسے کشف والہام کا نام دیدیا (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ل ہ م) ۔ اور کشف و الہام کے متعلق یہ عقیدہ پیدا کر لیا کہ اس سے صرف وہی شخص کیف اندوز ہو سکتا ہے جس پر حقائق منکشف ہوں ۔ انہیں دوسروں تک منتقل نہیں کیا جا سکتا ۔ ''ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تانہ چشی ،، اور ''کانرا کہ خبر شد خبرش باز نیاید ،، وغیرہ قسم کے اقوال اسی عقیدہ کے مظہر ہیں ۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ عقیدہ غلط ہے ۔ خدا کیطرف سے کشف حقیقت سے مقصود ہی یہ ہے کہ اسے دوسرے لوگوں پر بھی ظاہر کیا جائے ۔ یہ انکشاف حقائق ایک فرد (رسول) کے ذریعے تمام انسانوں کے لئے کیا جاتا ہے لہذا اس فرد (رسول) کا فریضہ ہے کہ اسے دوسروں پر ظاہر کرے ۔ اور جن پر اسے ظاہر کیا جائے ان کا فریضہ یہ ہے کہ غوروفکر سے اسے سمجھیں اور پھر دوسروں پر اس کا اظہار کریں ۔ یہی وہ عظیم حقیقت ہے جسے سورۃ نحل میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ''وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۱٦/٤٤) ''اور ہم نے اس ضابطہ قوانین کو تیری طرف نازل کیا ہے تاکہ جو کچھ لوگوں کیطرف نازل کیا گیا ہے تو اسے لوگوں پر ظاہر کردے اور تا کہ وہ اس میں غوروفکر کریں ،، (نیز ۱٦/٦٤)۔ یعنی قرآن نے یہ کہا ہے کہ ۔

(۱) خدا نے رسول کیطرف کتاب نازل کی ۔ (اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ)

(۲) لیکن یہ کتاب درحقیقت تمام انسانوں کیطرف نازل کی گئی ہے (مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ) ۔ اس لئے

(۳) رسول کا فریضہ ہے کہ اسے (اپنے تک ہی محدود نہ رکھے ، جیسا کہ

کشف و الہام کے غلط تصور کی بناء پر سمجھا جاتا تھا) بلکہ اسے لوگوں پر ظاہر کر دے۔ (لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ)۔ اسے ان تک پہنچا دے۔ (بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ... ۵/۶۷)۔

(۴) جو لوگ اسے چھپاتے ہیں ان پر خدا کی لعنت ہے۔ چنانچہ سورۃ بقرۃ میں کہا گیا ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ (۲/۱۵۹)۔ ”جو لوگ اسے چھپاتے ہیں جو ہم نے کھلی کھلی باتوں یعنی ھدایت سے نازل کیا ہے۔ بعد اس کے کہ ہم نے اسے قرآن میں تمام لوگوں کے لئے ظاہر کر دیا ہے۔ تو ان لوگوں پر خدا کی لعنت اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے“ (لعنت کے لئے دیکھئے عنوان (ل۔ ع۔ ن)۔ اس کے بعد ہے۔ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ..... (۲/۱۶۰) ”مگر وہ لوگ جو اس روش سے باز آ گئے۔ اور انہوں نے اصلاح کر لی۔ اور ظاہر کر دیا (جو کچھ اللہ نے نازل کیا تھا)۔ تو یہ لوگ ہیں جن کی طرف میں لوٹ کر آ جاتا ہوں“۔

جو کتاب رسول اللہؐ کی طرف نازل کی گئی (یعنی قرآن کریم) اس کے متعلق بتا دیا کہ۔

(۱) وہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہے (۱۶/۸۹)۔ یعنی جن باتوں کو بذریعہ وحی دیا جانا مقصود تھا اس نے ان سب باتوں کو ظاہر کر دیا ہے۔ کوئی بات چھپی نہیں رہی۔ دوسری جگہ ہے كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (۲/۱۸۷) ”اس طرح اللہ اپنے احکام کو لوگوں کے لئے ظاہر کر دیتا ہے تا کہ وہ ان کی نگہداشت کریں“۔

(۲) لہذا یہ کتاب تمام نوع انسانی کے لئے اظہار حقیقت ہے۔ هَٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ (۳/۱۳۷)۔

(۳) اس میں صحیح اور غلط راستے بالکل ظاہر ہو گئے ہیں۔ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲/۲۵۶)۔

(۴) یہ كِتَابٌ مُّبِينٌ (۵/۱۵) ہے۔ یعنی بالکل واضح اور ظاہر۔ کھلے اور واضح راستے کو إِمَامٍ مُّبِينٍ (۱۵/۷۹) کہتے ہیں۔

(۵) یہ روشنی ہے۔ قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ (۵/۱۵) "یقیناً تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور (روشنی) یعنی واضح کتاب آ گئی"۔ روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لئے کسی چیز کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ خود روشن ہوتی ہے اور ہر اس شخص پر جو آنکھوں سے کام لے دوسری چیزوں کو روشن کر دیتی ہے۔ اس سے ہر شے نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس لئے اسے تَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ (۱۲/۱۱۱) بھی کہا گیا ہے۔ "تفصیل" کے معنی ہیں الگ الگ کر کے دکھا دینا (دیکھئے عنوان ف۔ ص۔ ل)۔

یہ ہیں اس کتاب (قرآن) کی خصوصیات جسے اللہ تعالیٰ نے بوساطت نبی اکرمؐ تمام نوع انسانی کو دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتا دیا کہ قرآن کا انداز تَبْیِیْن کیا ہے۔ سورۃ انعام میں ہے وَکَذٰلِکَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَیِّنَہٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (۶/۱۰۶)۔ "اس طرح ہم اس کی آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تا کہ یہ کہیں کہ تو نے بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا۔ اور تا کہ ہم اسے ان لوگوں پر ظاہر کر دیں جو علم سے کام لیتے ہیں"۔ یعنی قرآن تصریف آیات سے تبیانِ حقیقت کرتا ہے اور اسے علم و فکر کی رو سے سمجھا جاتا ہے۔

اَلْبَیِّنَۃُ کے معنی ہیں ایسی دلیل جو عقلی طور پر یا محسوس طور پر واضح ہو*۔ جمع بَیِّنَاتٌ ہے۔

قرآن کریم نے انسان کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے عَلَّمَہُ الْبَیَانَ (۵۵/۴)۔ اللہ نے اسے اظہارِ خیالات کی صلاحیت دی ہے۔ یعنی یہ صلاحیت کہ وہ زبان اور قلم کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچا سکے۔ یہ خصوصیت انسان کو باقی حیوانات سے متمیز کرتی ہے اور انسانی تہذیب و تمدن اور عروج و ارتقاء کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

بَیْنَ کے معنی ہیں درمیان۔ فَاللّٰہُ یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ (۲/۱۱۳)۔ "اللہ ان کے درمیان فیصلہ کرتا ہے"۔ (بَیْنَ یَدَیْہِ کے لئے دیکھئے عنوان ی۔ د۔ ی)۔

اِسْتَبَانَ الْاَمْرُ۔ معاملہ کھل گیا، ظاہر اور واضح ہوا۔ قرآن کریم میں ہے وَلِتَسْتَبِیْنَ سَبِیْلُ الْمُجْرِمِیْنَ (۶/۵۵)، تاکہ مجرموں کی راہ کھل کر واضح ہو جائے۔ تَبَیَّنَ الشَّیْءُ۔ چیز واضح اور ظاہر ہوئی۔ تَبَیَّنْتُہٗ میں نے اسے کھولا، واضح کیا اور اسے سمجھا (لازم و متعدی)۔ (تاج)۔

*تاج و راغب۔

ت

ت ۔ (حرف)

ت ۔ یہ حرف جر ہے جو قسم کھانے کے معنوں میں آتا ہے ۔ جیسے تَاللّٰہِ (۵۷/۲۱) " اللہ کی قسم " ۔ الثعالبی نے (فقہ اللغہ میں) لکھا ہے کہ یہ "تاء" اللہ تعالیٰ کے اسماء کے علاوہ اورکہیں استعمال نہیں ہوتی ۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات میں یَآ اَبَتِ آیا ہے جس کے معنی ہیں " اے میرے باپ " (مثلاً ۱۲/۴) ۔ یہاں تِ دراصل یِ کی جگہ آئی ہے ۔ یہ صرف اَب* کے ساتھ خصوصیت ہے ۔

تَابُوْت

تَابُوْت* ۔ صندوق* ۔ (۲/۲۴۸) ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنے قلب اور سینے کے بھی ہیں** ۔ لسان العرب سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے ۔ اس اعتبار سے (۲/۲۴۸) میں اسکے معنی ایسے قلب کے ہونگے جو سکون و اطمینان سے لبریز ہو اور اسمیں حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کی تعلیم ہو اور اسے کائناتی قوتوں (ملائکہ) کی تائید حاصل ہوتا کہ اسمیں ثبات اور استقامت رہے ۔ مراد یہ ہے کہ حضرت طالوت کو اس قسم کا قلب عطا ہوا تھا ۔ اور اگر اس کے مجازی معنی نہ لئے جائیں تو اس سے مراد وہ تابوت ہے جس کا ذکر بائیبل میں آیا ہے ۔

(بعض کے نزدیک یہ تَابَ سے ہے ۔ دیکھئے عنوان ت ۔ و ۔ ب)

ت ب ب

اَلتَّبُّ* ۔ خسارہ ۔ اَلتَّبَابُ ۔ اَلتَّبِیْبُ ۔ اَلتَّتْبِیْبُ ۔ نقصان اور خسارہ ۔ ہلاکت اور تباہی ۔ بربادی * ۔ سورۃ ہود میں ہے وَ مَا زَادُوْھُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ (۱۱/۱۰۱) ۔ "اس سے انکا نقصان یا ہلاکت ہی زیادہ ہوئی" ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔

سورۃ المومن میں ہے وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلَّا فِي تَبَابٍ (۳۷/۴۰) - ''فرعون کی تدبیر ہلاکت کے سوا اور کچھ نہ تھی''۔ تَبَّ فُلَانًا - اس نے فلاں آدمی کو ہلاک کر دیا - اِسْتَتَبَّ الرَّجُلُ - آدمی ضعیف اور کمزور ہوگیا - عاجز ہوگیا **۔ اَلتَّابُّ - کمزور اور بوڑھا آدمی - اونٹ یا گدھا جسکی کمر زخمی ہوگئی ہو اور اسطرح وہ کام کے قابل نہ رہے *۔

قرآن کریم میں ہے تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ (۱/۱۱۱) - ''ابولہب کے دونوں ہاتھ تباہ ہوگئے اور وہ خود بھی ہلاک ہوگیا'' - وہ خود بھی تباہ ہوگیا اور جس قوت کے بل پر وہ نظام خداوندی کی مخالفت کرتا تھا وہ بھی ختم ہوگئی - وہ مقابلہ کرنے سے عاجز آگیا - تباہ و برباد ہوگیا - سخت نقصان میں رہا - (راغب کے الفاظ میں) مسلسل خسارہ میں رہا***۔

ت ب ر

اَلتِّبْرُ - سونا - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ چاندی اور دیگر معدنیات کو بھی کہتے ہیں - بالخصوص اس حالت میں جبکہ انہیں کان سے نکالا جائے اور صاف کر کے ڈھالا نہ جائے - اَلتَّبْرُ - توڑ دینا - ہلاک کر دینا * - ابن فارس نے اس کے یہ دونوں معانی بنیادی لکھے ہیں - وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيرًا (۳۹/۲۵) - '' ان سب کو ہم نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ''- ہلاک کر دیا - تباہ و برباد کر دیا - تَبَارًا (۲۸/۷۱) - ہلاکت - مُتَبَّرٌ (۱۳۹/۷) - ہلاک شدہ - برباد شدہ - ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا -

ت ب ع

تَبِعَ کے معنی ہیں پیچھے پیچھے چلنا - بَقَرَةٌ مُتْبِعٌ اس گائے کو کہتے ہیں جس کا بچہ اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہو - اور اس کے پیچھے چلنے والے بچھڑے کو تَبِيعٌ کہتے ہیں - اَلتَّبَعُ - پیچھے چلنے والا (یہ تَابِعٌ کی جمع بھی ہے یعنی پیچھے چلنے والے) - اَتْبَعْتُهُمْ - میں ان کے پیچھے پیچھے چلا - وہ مجھ سے آگے نکل گئے تھے لیکن میں نے انہیں جا لیا *۔

قرآن کریم میں تَبِعَ کا لفظ عَصَى (سرکشی) کے مقابلے میں آیا ہے (۳۹/۱۴) - لہذا اِتِّبَاعٌ کے معنے ہیں قوانین خداوندی کی اطاعت - ان قوانین کو (Follow) کرنا - اس کے برعکس وہ شخص ہے مَنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ (۱۴۳/۳) - '' جو پچھلے پاؤں واپس ہو جاتا ہے ''۔

---

*تاج - **محیط - ***راغب -

دین چونکہ ایک اجتماعی نظام کا نام ہے اس لئے قوانین خداوندی کا اتباع انفرادی طور پر نہیں ہوگا بلکہ نظام کے تابع ہوگا ۔ یہ نظام سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا تھا ۔ اس لئے اتباع قوانین خداوندی آپؐ کے اتباع سے ہوتا تھا (۳/۱۵۷) ۔ آپؐ کے بعد یہ نظام آگے چلا اس لئے اس نظام میں خلیفۃ الرسول کے اتباع نے وہی مقام لے لیا ۔ یہی وجہ ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد تم پھر اپنی قدیم روش پر نہ چلے جانا بلکہ اس سلسلہ اتباع کو جاری رکھنا ۔ دیکھئے (۳/۱۴۳) ۔ واضح رہے کہ اتباع اور اطاعت میں ذرا سا فرق ہوتا ہے ۔ جیسے پیروی اور فرمانبرداری میں ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اطاعت بھی اس فرمانبرداری کو کہتے ہیں جو بطیب خاطر کی جائے لیکن اس میں حکم کا شائبہ یا کسی قدر قانونی تقاضا ضرور ہوتا ہے ۔ لیکن اتباع میں انسان ، تَبِیْعٌ کی طرح ، بلاحکم و فرمان ، محبانہ جذبہ اور کشش سے کسی کے پیچھے پیچھے چلتا ہے ۔

اَلتَّابِعُ اور اَلتَّبِیْعُ ۔ خادم کو کہتے ہیں*۔ تَابِعٌ کی جمع اَلتَّابِعِیْنَ (۲۴/۳۱) ۔ لیکن (۱۷/۶۹) میں تَبِیْعاً کے معنے ہیں کسی کے خلاف مقدمہ کی پیروی کرنے والا ۔ یا باز پرس کرنے والا ۔ نیز مطالبہ یا تقاضا کرتے ہوئے پیچھے لگ جانے والا ۔ سورۃ الشعراء میں اِتِّبَاعٌ کا لفظ جلوس نکالنے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے ۔ یعنی فاتح ساحرین کو آگے رکھکر ان کا جلوس نکالا جائے (۲۶/۴۰) ۔

تَتَبَّعَ کے معنے ہیں ایک بات کے ساتھ ہی دوسری بات لے آنا ۔ یکے بعد دیگرے (مسلسل) واقع ہونا ۔ پے در پے واقع ہونا * ۔ اَلتُّبَّعُ یمن کے بادشاہوں کا لقب تھا ۔ کیونکہ وہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوتے رہتے تھے * ۔ قرآن کریم میں قوم تُبَّعٍ کا ذکر آیا ہے ۔ (۵۰/۱۴) ۔ اسے الگ عنوان میں بیان کیا گیا ہے ۔ (دیکھئے عنوان تُبَّعٌ) ۔

کتاب الاشتقاق میں اَلتُّبَّعُ کے معنی اَلظِّلُّ (سایہ) دئے ہیں ۔ شاید اس لئے کہ سایہ ، روشنی کے سر چشمہ کے پیچھے پیچھے چلتا ہے ۔

تبع

سورۃ قٓ میں ہے وَاَصْحٰبُ الْاَیْکَۃِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۔ کُلٌّ کَذَّبَ الرُّسُلَ (۵۰/۱۴)۔ "اصحاب الایکۃ اور قوم تُبَّعٍ، ان سب نے ہمارے رسولوں

* تاج ۔

کو جھٹلایا،، ۔ دوسری جگہ قریش کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ (۴۴/۳۷) ''کیا (یہ قریش) بہتر ہیں یا قومِ تُبّع،، ۔

تذکرۂ حضرت سلیمانؑ میں بتایا گیا ہے کہ یمن کے مشرقی علاقہ میں سبا کی حکومت تھی۔ اسی قوم کی ایک شاخ مغربی علاقہ پر حکمران تھی جسے حِمْیَر کہتے ہیں۔ جب رومیوں نے اہل سبا کی تجارت کو تباہ کیا تو حمیر کا ستارۂ اقبال چمک اٹھا اور وہ بڑی زبردست قوت اور دولت کے مالک بن گئے ۔ اس خاندان کے ایک بادشاہ نے اپنا لقب تُبّع اختیار کیا جس کے معنی (حبشی زبان میں) سلطان کے ہیں۔ یعنی غلبہ و استیلاء اور قوت و جبروت کا مالک ۔ یہ خاندان بھی (اھل سبا کیطرح) شروع میں کواکب پرست تھا لیکن بعد میں انہوں نے یہود کا مذہب اختیار کر لیا۔ جب ذونواس کے زمانہ میں عیسائیوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی تو وہ سخت مشتعل ہو گیا ۔ اس نے عیسائیت کے مرکز نجران پر حملہ کر دیا ۔ پہلے تو اہل شہر قلعہ گزیں ہو گئے لیکن بالآخر شکست کھائی ۔ ذونواس کا تعصب بڑھ کر بربریت کی حد تک پہنچ گیا ۔ اس نے بڑے بڑے گڑھوں میں آگ جلائی اور عیسائیوں کو مجبور کیا کہ وہ یہودیت اختیار کریں ۔ جو اس سے انکار کرتا آگ کے گڑھے میں جھونک دیا جاتا ۔ قرآن کریم نے ذونواس کے اس سرکش لشکر کو أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ کہا ہے اور ان کے اس ظلم کی سخت مذمت کی ہے (۸۵/۴)۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا مقصد دنیا میں ظلم کو روکنا ہے خواہ وہ کسی کے ہاتھوں سے ہو اور کسی کے خلاف ہو۔

ت ج ر

تِجَارَةٌ ۔ (پیشہ ورانہ) خرید و فروخت۔ سوداگری۔ کاروبار کو کہتے ہیں۔ راغب نے تجارۃٌ کے معنے نفع کمانے کے لئے راس المال کو کاروبار میں لگانا بتائے ہیں ۔ محیط نے تجارۃ کے معنے وہ سامان بھی بتائے ہیں جس سے تجارت کی جائے ۔ تَاجِرٌ پیشہ ور خرید و فروخت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ عرب شراب بیچنے والے کو بھی تاجِرٌ کہتے تھے* ۔ مجازاً کسی معاملہ میں مہارت اور ہوشیاری کو بھی تِجَارَةٌ کہتے ہیں اور حاذق و ماہر کو تَاجِرٌ*۔

قرآن کریم میں ہے فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ (۲/۱۶) ۔ ''انکی خرید و فروخت (ھدایت کے بدلے گمراھی اختیار کر لینے) نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا،، ۔

---

*تاج و محیط ۔

قرآن کریم نے ایمان (اسلام) کو بھی ایک قسم کی تجارت قرار دیا ہے جس میں بیع و شریٰ (خرید و فروخت) کا معاملہ ہوتا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ... (۹/۱۱۱) - ''یقیناً اللہ نے مومنین سے ان کی جان اور مال خرید لئے ہیں۔ اور ان کے بدلے میں انہیں جنت عطا کر دی ہے،،۔ اس تجارت میں جماعتِ مومنین اپنی وہبی اور اکتسابی صلاحیتوں کے نتائج (جان اور مال) کو اس معاشرہ کے سپرد کر دیتے ہیں جو قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوتا ہے اور یہ معاشرہ ان کے لئے دنیا میں جنتی زندگی کے سامان مہیا کر دیتا ہے (اور آخرت میں بھی انہیں جنت ملتی ہے) - یہی وہ تجارت ہے جس کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ - تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ - ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (۶۱/۱۰-۱۱) - ''اے جماعتِ مومنین! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کا پتہ نشان دوں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلادے؟ - (وہ تجارت یہ ہے کہ) تم اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ - اور اپنی جان اور مال سے اللہ کی راہ میں جدو جہد کرو - اگر تم علم و بصیرت سے کام لو گے تو یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائیگی کہ یہ تجارت تمہارے لئے کسقدر اچھی ہے،،۔ اس تجارت کا ماحصل عام کاروبار سے کہیں زیادہ نفع رساں ہے (۶۲/۱۱)** -

تبادلہ اشیاء (خرید و فروخت) کے معاملہ میں کسقدر منافع لیا جاسکتا ہے، اسکے متعلق عنوان (ب-ی-ع) میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اصول یہ ہے کہ منافع صرف محنت کے معاوضہ کے برابر لیا جا سکتا ہے۔ سرمایہ پر کچھ نہیں لیا جا سکتا - یہی اصول تجارت پر بھی صادق آئیگا - اس اصول کی روشنی میں قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم سمجھ میں آ جائیگا جس میں کہا گیا ہے کہ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ (۴/۲۹)۔''تم ایک دوسرے کا مال باطل طریق سے مت کھاؤ - سوائے اسکے کہ باہمی رضامندی سے تجارت ہو،،۔ آجکل ''باہمی رضامندی سے تجارت،، سے مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ تم جسقدر جی چاہے منافع گاہک سے طلب کرو اور کہدو کہ جی چاہے تو خریدو

*تاج و محیط - ** تجارت اور بیع میں فرق کے لئے دیکھئے عنوان (ب-ی-ع)

نہ جی چاہے نہ خریدو۔ اس کے بعد اگر وہ خرید لیتا ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ اتنا منافع دینے پر رضامند ہوگیا ہے۔ ایسا سمجھنا خود فریبی ہے۔ گاہک اپنی ضرورت سے مجبور ہوکر منہ مانگی قیمت دیتا ہے۔ یہ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ نہیں کہلا سکتی۔ جب منافع صرف محنت کا معاوضہ ہو جسے معاشرہ متعین کردے، تو اسے ہر شخص بہ طیب خاطر ادا کردیگا۔ اسے تراضی مابین کہا جائیگا۔ پہلی شکل تو وہ ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے (مندرجہ بالا آیت کے ساتھ) کہا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (۴/۲۹) "ایک دوسرے کو قتل مت کرو"۔ یا "اپنے لوگوں کو قتل مت کرو"۔ دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر منہ مانگے دام لینا، اپنے لوگوں کو قتل کرنا ہے۔ محنت کا معاوضہ لینا ایسا اصول ہے جس میں لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۹) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی نہ تم کسی پر زیادتی کرو۔ نہ کوئی تم پر زیادتی کرے۔ تبادلہ اشیاء کا طریق کار، معاشرہ میں ایک دوسرے کی زندگی بڑھانے کے لئے ہونا چاہئے۔ نہ کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لئے۔ اگر تجارت، قرآن کی مستقل اقدار کے راستے میں حائل ہوتی ہے تو اسکا انجام تباہی ہے۔ (۹/۲۴)۔

ت ح ت

تَحْتٌ۔ فَوْقٌ (اوپر) کی ضد ہے۔ یعنی نیچے۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۳/۱۵)۔ "جن کے نیچے نہریں جاری ہیں"۔

اَلتُّحُوْتُ تَحْتٌ کی جمع ہے جسکے معنے ہیں رذیل اور پست درجے کے لوگ*۔

راغب نے کہا ہے کہ تَحْتَ کسی شے کے نچلے حصے کو نہیں کہتے بلکہ اس سے الگ اس کے نیچے کی چیز کے لئے بولتے ہیں۔ اس کے بر عکس، اَسْفَلُ اسی چیز کے نیچے کے حصے کو کہتے ہیں۔ یعنی جب ایک چیز کے نیچے کوئی دوسری چیز ہوگی تو اسوقت تَحْتٌ کہینگے۔ لیکن جب اسی چیز کا نچلا حصہ کہنا ہو تو اَسْفَلُ کہینگے۔

ت ر ب

اَلتَّرْبُ۔ اَلتُّرَابُ۔ مٹی (عَلَيْهِ تُرَابٌ ۲/۲۶۴)۔ اسکی جمع

*تاج۔

اَتْرِبَۃٌ اور تِرْبَانٌ آتی ہے ۔ مَتْرَبَۃٌ ۔ مسکنت ۔ افلاس ۔ فاقہ ۔
ذَامَتْرَبَۃٍ (۹۰/۱۶) ۔ خاک آلود ۔ حاجتمند ۔ مصیبت زدہ *

جَمَلٌ تَرَبُوْتٌ ۔ فرمانبردار اور سدھا ہوا اونٹ *

اَلتَّرَائِبُ ۔ سینہ کی ہڈیاں (۸۶/۷) ۔

اَلتِّرْبُ ۔ ہم عمر ۔ جمع اَتْرَابٌ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ہمسر اور برابر کے لوگوں کو کہتے ہیں اور یہ اس کے بنیادی معنوں میں سے ہے ۔ نیز اس کے معنی رفیق ۔ حبیب ۔ دوست اور سہیلی کے ہیں ۔

قرآن کریم میں جنت کے سلسلہ میں عُرُبًا اَتْرَابًا (۵۶/۳۷) ۔ یا کَوَاعِبَ اَتْرَابًا (۷۸/۳۳) کا ذکر آیا ہے ۔ اسکے معنے عام طور پر ہم عمر بیویاں کئے جاتے ہیں لیکن دراصل اس کے معنے ایسے ساتھیوں کے ہیں جو عادات و اطوار میں ایک دوسرے سے مماثل (ملتے) ہوں * ۔ ہم رِگل ۔ ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے ۔ کَوَاعِبَ اَتْرَابًا اور عُرُبًا اَتْرَابًا میں اَتْرَابًا صفت ہے کَوَاعِبَ اور عُرُبًا کی ۔ اس اعتبار سے اس کے معنی ایسی عورتیں ہونگے جو ہم مزاج اور مماثل ہوں ۔ یہ ہم مزاجی اور مماثلت عورتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے ۔ یعنی ان میں ایک دوسرے کے خلاف جذبات عداوت و رقابت اور بیگانگی و مغایرت نہیں ہونگے بلکہ ان میں موافقت خیالات و تصورات ہوگی ۔ اور میاں بیوی میں باہمی موافقت اور مماثلت بھی مراد ہو سکتی ہے ۔ یعنی ایسی عورتیں جو اپنے خاوندوں کے ہم مزاج و ہم خیال ہونگی ۔ اخروی جنت میں ان تعلقات کی کیا کیفیت ہوگی ، اس کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے ۔ لیکن اس دنیا میں ، میاں اور بیوی کا ہم مزاج و ہم خیال ہونا جسطرح گھر کو جنت بنا سکتا ہے وہ ظاہر ہے (۳۰/۲۱) ۔ نیز چونکہ اَتْرَابٌ ، ہمسر اور برابر کے لوگوں کو بھی کہتے ہیں ، اس لئے اس میں برابری اور مساوات کا پہلو بھی نمایاں ہے ۔ (اس کے لئے عنوان ز ۔ و ۔ ج بھی دیکھئے) ۔

ت ر ف

اَلتُّرْفَۃُ ۔ آسودگی اور فراخئی عیش ۔ عمدہ چیز ۔ خوشگوار کھانا ۔ تَرِفَ ۔ وہ آسودہ و خوش حال ہوا ، اُسے عیش و آرام کے سامان مل گئے ۔

* تاج

اَتْرَفَ - اسے خوش حال و آسودہ کیا - اَلْمُتْرَفُ - وہ شخص جو عیش و آرام کی زندگی گذار رہا ہو اور لذات و شہوات میں بڑھتا چلا جائے جسے فراخی عیش اور آسودگی نے بدمست کردیا ہو - بعض لوگوں نے اسکے معنے ایسے خوشحال کے کئے ہیں جس کے پاس کثرت سے دولت ہو اور وہ اسکی بنا پر لیڈر بن جائے ، اور جو کچھ کرے اس پر اسے ٹوکا نہ جائے - نیز وہ شخص کہ جو کچھ اس کے جی میں آئے کرتا رہے اور اسے کوئی روکنے والا نہ ہو* - جو کثرت دولت کی بنا پر سرکشی اختیار کرے - اسکی جمع مُتْرَفُوْنَ اور مُتْرَفِیْنَ ہے* - اَتْرَفَ فُلاَنٌ* - اسنے سرکشی اختیار کرلی اور نافرمانی میں بڑھتا چلا گیا -

مُتْرَفِیْنَ - قرآن کریم کی اہم اصطلاح ہے - اسنے کہا ہے کہ شروع ہی سے یہہ سلسلہ چلا آرہا ہے کہ خدا کی طرف سے جب بھی کوئی صحیح نظام کی طرف دعوت دینے والا آیا تو قوم کے مُتْرَفِیْن نے اس دعوت کی سخت مخالفت کی - یہہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی کمائی پر عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے اور پھر ان لوگوں پر حکومت بھی کرتے ہیں - ظاہر ہے کہ صحیح نظام ربوبیت میں ایسے لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی - اسلئے یہ ہمیشہ اس دعوت کی مخالفت کرتے ہیں - دیکھئے قرآن کس حصر کے ساتھ کہتا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلاَّ قَالَ مُتْرَفُوْھَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ ($\frac{34}{34}$) '' ہم نے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا جس کے مترفین نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تمہیں دیکر بھیجا گیا ہے ہم اس کے منکر اور مخالف ہیں،، - اس سے اگلی آیت نے مترفین کی وضاحت کردی - قَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالاً وَّ اَوْلاَدًا ($\frac{35}{34}$) ''وہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس مال و دولت اور افراد خاندان بڑی کثرت سے ہیں،، - اس لئے ہمیں کون ھاتھ لگا سکتا ہے - یہ وہی طبقہ ہے جو عصر حاضر میں سرمایہ داروں کا طبقہ کہلاتا ہے اور جو محض اپنی دولت کے زور پر قوت و اقتدار حاصل کرلیتا ہے - انہی میں وہ مذہبی پیشوا بھی شامل ہیں جو خود کوئی کام نہیں کرتے اور دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور پھر انہی لوگوں پر حکومت بھی کرتے ہیں جو انہیں لا لا کر کھلاتے ہیں - قرآن نے کہا ہے کہ یہ طبقہ بھی ہمارے قوانین و نظام کی مخالفت میں پیش پیش رہتا ہے اور لوگوں کو یہہ کہکر بھڑکاتا رہتا ہے کہ دیکھو یہہ داعیٔ انقلاب اس مذہب کی مخالفت کرتا ہے جو تمہارے آبا و اجداد سے چلا آتا ہے - (دیکھئے $\frac{34}{43}$ ، $\frac{34}{43}$) - یہہ سب مُتْرَفِیْن ہیں جنہیں قرآن نے

---

* (تاج و محیط و راغب)

انسانیت کے بدترین دشمن قرار دیا ہے ۔ اور یہی اہل جہنم ہیں ۔ (اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذَالِكَ مُتْرَفِيْنَ (۵۶/۴۵)۔ سورۃ مومنون میں ہے وَ اَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۲۳/۳۳) "یہ لوگ ہمارے قوانین کی مخالفت اسلئے کرتے ہیں کہ انہیں سامان زندگی بڑی فراوانی سے حاصل ہے اور اسنے انہیں سرکش و متکبر بنا دیا ہے"۔ قرآنی نظام میں نہ سرمایہ داری باقی رہتی ہے نہ مذہبی پیشوائیت ۔ اس میں ہر شخص کام کرتا ہے اور کوئی دوسرے کی محنت پر عیش نہیں اڑا سکتا ۔ (نیز دیکھئے عنوان م ۔ ل ۔ أ)

ت ر ک

تَرْكٌ ۔ کے معنے ہیں چھوڑ دینا ۔ پھینک دینا ۔ ڈال دینا ۔ خالی کر دینا ۔ تِرْكَةُ الرَّجُلِ ۔ آدمی کی میراث کو کہتے ہیں جسے وہ چھوڑ کر مرے ۔ تَرِيْكَةٌ اس عورت کو کہتے ہیں جس سے کوئی شادی نہ کرے۔ نیز انڈے کا خول جس میں سے چوزہ نکل گیا ہو*۔

اَلتَّرِيْكُ ۔ اس خوشے کو کہتے ہیں جس کے تمام پھل کھا لئے گئے ہوں یا جھاڑ لئے گئے ہوں* ۔

بعض کا خیال ہے کہ کسی کام کو چھوڑ دینا ۔ خواہ ارادةً ہو خواہ مجبوراً ۔ تَرَكَ کہلاتا ہے ۔ اس میں دونوں باتیں شامل ہوتی ہیں ۔ یعنی جس کام کو انسان کر رہا ہے اسے چھوڑ دینا ، یا کسی کام سے محتاط رہنا (اسے ہاتھ ہی نہ لگانا) یہ بھی تَرْكٌ ہے ۔ چنانچہ اَلتَّرِيْكُ اس باغیچہ کو کہتے ہیں جس کے مالک اس سے غفلت برتیں اور اس کی دیکھ بھال نہ کریں (ابن فارس) ۔ لیکن جس کام کے کرنے کی انسان میں قدرت ہی نہ ہو اسے نہ کرنا تَرْكٌ نہیں کہلا سکتا ** ۔

تَرَكَ ۔ جَعَلَ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ***۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کو ایسا کر دینا ۔ نیز اس کے معنی کسی سلسلہ کو باقی رکھنے (دوام عطا کر دینے) کے بھی ہوتے ہیں*** ۔ مثلاً وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ (۳۷/۷۸) کے معنی ہیں ہم نے اس کا تذکرہ آنے والی نسلوں میں باقی رکھا ۔ اسے دوام عطا کر دیا ۔ تَارَكَهُ کے معنی ہیں وہ جس حالت میں تھا اسے اسی حالت میں رہنے دیا *** ۔

---

* تاج ** محیط ۔ *** تاج و لین ۔

ت س ع

تِسْعَةُ رِجَالٍ ۔ نو آدمی ۔ تِسْعُ نِسْوَةٍ نو عورتیں۔ تِسْعُ آيَاتٍ (١٧/١٠١) نو نشانیاں ۔ تِسْعَةَ عَشَرَ (٧٤/٣٠) انیس (دارو غے) تِسْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ نَعْجَةً (٣٨/٢٣) ننانوے بھیڑیں ۔

ت ع س

اَلتَّعْسُ۔ منہ کے بل گر پڑنا ۔ ایسا گرنا کہ پھر اٹھا ھی نہ جائے ۔ لغزش ۔ هلاکت ۔ پست ھو جانا ۔ انحطاط ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی الٹ دینا لکھے ھیں ۔ تَعَسَهُ اللّٰهُ ۔ خدا نے اسے تباہ کر دیا ۔ فَهُوَ مَتْعُوْسٌ ۔ سو وہ تباہ ھوگیا ۔ بد دعا کے طور پر کہتے ھیں تَعْسًا لَّهٗ**۔ قرآن کریم میں ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ (٤٧/٨) "جنھوں نے انکار و سرکشی کی راہ اختیار کی تو ان کے لئے ھلاکت اور بربادی، ذلت اور نگوں ساری ہے" ۔

ت ف ث

اَلتَّفَثُ ۔ صاحب تاج العروس نے مختلف ائمہ لغت کے حوالوں سے لکھا ہے کہ اشعار جاھلیہ میں یہ لفظ کہیں نہیں ملتا اسلئے اسکے لغوی معنے متعین نہیں کئے جا سکتے ۔ البتہ تفسیر میں ہے کہ تَفَثٌ حج کے مناسک میں سے سر منڈانے ۔ ناخن کتروانے ۔ بغل اور زیر ناف کے بال صاف کرنے ۔ قربانی اور رمی (کنکریاں مارنے) کیلئے آتا ہے* ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَلتَّفَثُ ۔ بالوں کی پراگندگی و پریشانی کو کہتے ھیں ۔ نیز ابن عباس سے منقول[له] ہے کہ تَفَثٌ تمام مناسک حج کے لئے جامع لفظ ہے ۔ اس اعتبار سے ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ (٢٢/٢٩) کے معنے ھونگے وہ اپنے جملہ ارکان حج ادا کریں ۔ تَفِثَ الرَّجُلُ يَتْفَثُ ۔ اسوقت کہتے ھیں جب کوئی شخص اپنے بالوں کو صاف کرنا اور ان میں کنگھی وغیرہ کرنا چھوڑ دے اور اسطرح ژولیدہ و پراگندہ بال ھو جائے*** ۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ، قرآن کریم میں حج کے اجتماع کے ضمن میں ہے ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ (٢٢/٢٩) "پھر چاھئے کہ وہ اپنے "تفث" کو پورا کریں" ۔ اسے اگر مناسک حج تک محدود رکھیں تو اسکا مفہوم بالوں وغیرہ کی صفائی ھوگا ۔ لیکن اگر مجازاً اسکا مفہوم وسیع کر لیا جائے تو اسکے معنے ملت کی کثافتیں دور کرنے کی تدابیر سوچنا ھوگا ۔ حج ، ملی مسائل کا حل سوچنے کے لئے عالمگیر اجتماع ھوتا ہے ۔ (حج میں بال مونڈنے کے متعلق دیکھئے عنوان ح ۔ ل ۔ ق)

---

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔ [له] ابن عباس کا قول یہ ہے کہ "تفث" سر کے بال مونڈنے یا ترشنے، داڑھی مونچھیں بنانے اور بغل کے بال لینے اور ذبح و رمی کو کہتے ہیں۔

ت ق ن

اَلتَّقِنُ۔ ماہر آدمی *۔ ہر وہ چیز جس سے انسانی معاش قائم ہوتی ہے اور معاملات کی درستگی ہو جاتی ہے۔ جیسے معدنیات وغیرہ۔ نیز، ہر وہ چیز جس سے کسی دوسری چیز کی درستگی ہو جائے **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی کو مضبوط اور محکم بنانا اور (۲) گارا اور چکنی کالی مٹی۔ اَتْقَنَ اْلاَمْرَ اِتْقَاناً۔ کسی معاملہ کو محکم کر دینا *۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ (۲۷/۸۸) "اسنے ہر شے کو نہایت درست اور محکم بنایا ہے"۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفات حسنیٰ (الاسماءُالحسنیٰ) بیان کرنے سے جہاں صفاتِ خداوندی کا صحیح صحیح تصور سامنے لانا مقصود ہے وہاں یہ بتانا بھی مطلوب ہے کہ جو افراد، قوم، معاشرہ یا نظام قوانین خداوندی کا اتباع کریگا اس میں (تابہ حد بشریت) یہی صفات اجاگر ہوتی چلی جائینگی۔ مثلاً جب خدا کے متعلق کہا گیا ہے کہ صُنْعَ اللہِ الَّذِیْ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ (۲۷/۸۸) "یہ اس خدا کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو نہایت درست اور محکم بنایا ہے"، تو اس سے مقصود یہ بھی ہے کہ جماعت مومنین کی بنیادی صفت یہ بھی ہوگی کہ وہ جو چیز بنائیگی محکم اور درست بنائیگی۔ اس میں نہ کسی قسم کا جھول ہوگا نہ سلوٹ، نہ نقص ہوگا نہ عدمِ تناسب، نہ ہی وہ ناپختہ اور ناتمام ہوگی۔ جسطرح کارگہ کائنات کے متعلق پورے حتم و یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (۶۷/۳) "تو رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کا عدم تناسب نہیں دیکھے گا"، اسی طرح اس قوم کی مصنوعات کے متعلق بھی پورے پورے یقین اور اطمینان سے کہا جا سکیگا کہ تم ان میں کہیں تناسب و توازن کی کمی نہیں دیکھو گے۔ دنیا میں ایسی قوم، نہ صرف اپنے لئے بلکہ تمام نوع انسانی کے لئے جسقدر سکون و اطمینان کا موجب ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اور یہ تو صرف ایک صفتِ خداوندی کے انعکاس کا ذکر ہے۔ جس قوم میں تمام صفاتِ خداوندی اسی انداز سے جھلک رہی ہوں، اس کی نفع رسانیوں اور سکون بخشیوں کا کیا ٹھکانہ ہے؟

---

*تاج و محیط۔ **تاج

تلک

تِلْکَ - اشارہ بعید کے لئے مؤنث کا صیغہ ہے۔ یعنی "وہ"۔ (مؤنث)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ذا۔

ت ل ل

تَلٌّ کے اصلی معنے ایسی جگہ کے ہیں جو اپنے آس پاس کی زمین سے قدرے بلند ہو۔ اَلتَّلُّ مِنَ التُّرَابِ۔ مٹی کا ٹیلہ۔ نیز اَلتَّلُّ کے معنے تکیہ، گدا، ہیں۔ پھر اس سے اسکے معنے ٹیلہ پر پچھاڑ دینے یا لٹا دینے کے آئے ہیں۔ یا پھر یہ تَلِیْلٌ سے ہے جس کے معنے گردن اور رخسار کے ہیں۔ اس سے تَلَّهٗ کے معنے ہونگے اسے گردن اور رخسار کے بل گرایا۔ تَلَّهٗ۔ یَتُلُّهٗ۔ تَلاًّ۔ اسنے اس کو پچھاڑ دیا۔ قَوْمٌ تَلْقٰی۔ پچھڑے ہوئے لوگ۔ تَلَّ۔ یَتِلُّ۔ پچھڑ جانا، گر پڑنا۔ گرا دینا۔ اَلتَّلَّةُ۔ گرا دینا۔ لٹا دینا (ایک مرتبہ) اَلْمِتَلُّ۔ وہ جگہ جہاں کسی کو پچھاڑا جائے۔ یا وہ نیزہ وغیرہ جس سے کسی کو گرایا جائے۔ اَلتَّلِّیْ۔ ذبح کی ہوئی بکری*۔

قرآن کریم میں قصۂ حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ میں ہے وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ (۳۷/۱۰۳)۔ "اس نے اسے پٹ پڑی (کن پٹی) کے بل لٹا دیا"۔

ت ل و

تَلَوْتُهٗ۔ تَلَیْتُهٗ۔ میں اسکے پیچھے پیچھے چلا۔ اَتْلَیْتُهٗ اِیَّاہُ میں نے اس سے اسکی پیروی کرائی۔ اسے اس کے پیچھے لگایا۔ تَلُوٌّ۔ وہ شخص جو ہمیشہ پیچھے پیچھے چلے۔ اَلتِّلْوُ۔ جو چیز کسی کے پیچھے آئے۔ اونٹ، خچر یا بکری کا بچہ جو اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلے۔ اَتْلَتِ النَّاقَةُ۔ اونٹنی کے پیچھے پیچھے اسکا بچہ چلا۔ اَلتَّوَالِیْ و التَّالِیَاتُ پچھلے حصے۔ اَلتَّلِیْقَةُ اور التَّلَاوَةُ۔ قرض وغیرہ کے باقی ماندہ حصہ کو کہتے ہیں جو پیچھے (باقی) رہ جاتا ہے۔

راغبؒ** نے کہا ہے کہ تِلْوٌ و تُلُوٌّ کے معنے متابعت (پیچھے چلنے۔ اتباع کرنے) کے ہوتے ہیں جو کہیں جسمانی طور پر ہوتی ہے اور کہیں احکام کا اتباع ہوتا ہے

*تاج۔ محیط۔ راغب۔ ** راغب کی عبارت کے پورے ترجمہ کے لئے دیکھئے تتمہ صفحہ ۱۹۱۸ جلد چہارم۔

ہے۔ جسمانی طور پر پیچھے جانے کی مثال چاند کی ہے۔ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (۹۱/۲) جس کے معنی ہیں، چاند سورج کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور اس سے روشنی کا اقتباس کرتا ہے۔ تَتَلَّاهُ تَتَلِّيًا۔ اس نے اس کا پیچھا کیا۔ تَتَلَّيْتُ حَقِّي: میں نے اسکا پیچھا لیکر اس سے اپنا پورا پورا حق وصول کر لیا*۔ اتباعِ احکام کیلئے تلاوت قرآن کا حکم موجود ہے۔ راغب کے نزدیک تِلَاوَةٌ بالخصوص خدا کی طرف سے نازل شدہ کتابوں کے اتباع کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس اتباع کیلئے ضروری ہے کہ پہلے ان احکام کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے اسلئے انہیں اسطرح پڑھنے کو بھی تلاوۃ کہتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ قِرَاءَةٌ (پڑھنے) سے خاص ہے۔ یعنی قِرَاءَةٌ (پڑھنا) بہر حال تلاوۃ کے اندر آجاتا ہے لیکن تلاوۃ (اتباع کرنا) قراءۃ کے اندر نہیں آتا**۔ لہذا تلاوت قرآن کریم کے معنی ہیں قرآن پر عمل کرنے کے لئے اسے پڑھنا۔ (نہ صرف پڑھتے رہنا)۔

فُلَانٌ يَتْلُوْ عَلٰى فُلَانٍ وَ يَقُوْلُ عَلَيْهِ۔ عربی محاورہ ہے جس کے معنی ہیں فلاں آدمی فلاں کے خلاف جھوٹ بولتا اور غلط بیانی کرتا ہے*۔

تَلَاهُ کے معنی ''اسے چھوڑ دینا'' بھی آئے ہیں۔ یعنی اسطرح چھوڑ دینا کہ وہ پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہو (ابن فارس)

قرآن کریم میں ہے اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ، اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ، (۲/۱۲۱)۔ ''جن لوگوں کو ہم نے یہ کتاب دی ہے وہ اسکی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے، یہی لوگ ہیں جو اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں''۔ ظاہر ہے کہ اسمیں تلاوت کے معنے اتباع کرنے کے ہی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہی لوگ درحقیقت اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ورنہ اگر اسکے معنی فقط پڑھنے کے ہوں تو قرآن کو تو غیر مسلم بھی پڑھتے ہیں جو اسپر ایمان نہیں رکھتے۔ لہذا قرآن کی تلاوت سے مراد اسکے احکام کا اتباع ہے۔ اسے پڑھا اسلئے جاتا ہے کہ اسے سمجھا جائے اور سمجھا اسلئے جاتا ہے کہ اس پر عمل کیا جا سکے۔ قرآن کا اسطرح پڑھنا کہ وہ سمجھ میں نہ آئے یا اسے فقط سمجھ لینا اور اسپر عمل نہ کرنا، کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ مومن درحقیقت وہی ہیں جو اسکی پوری پوری پیروی کرتے ہیں۔

---

* تاج و محیط۔ **راغب

قرآن مجید میں نبی اکرمؐ کے متعلق جو فرمایا ہے کہ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ آیَاتِهِ (۳/۱۶۳) "وہ جماعت مومنین کے سامنے خدا کے احکام پیش کرتا ہے"۔ تو اسکے ساتھ ہی کہہ دیا کہ وَیُزَکِّیْهِمْ (۳/۱۶۳)۔ وہ ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہے (دیکھئے عنوان ز۔ک۔و) اس سے ظاہر ہے کہ تلاوتِ قرآن سے مقصود یہ ہے کہ خدا کا نظام عملاً متشکل ہو جائے جسکے تعمیری نتائج (یعنے افرادِ معاشرہ کی نشوو نما) محسوس صورت میں سامنے آ جائیں۔ صرف قرآن پڑھ لینے کو تلاوت کہنا اور سمجھ لینا کہ اس سے مقصد حاصل ہوگیا ہے خود فریبی ہے۔ قرآن کو سمجھنا اور اسپر عمل کرنا ضروری ہے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ قرآن کا پڑھنا اسلئے ضروری ہے کہ اسے سمجھ لیا جائے اور سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اگر قرآن کو سمجھا نہ جائے تو اسکا پڑھنا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اور اگر اسپر عمل نہ کیا جائے تو اس کا سمجھنا بھی بیکار ہے۔

سورۃ صٰفّٰت میں فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا (۳۷/۳) آیا ہے۔ یعنے قرآن کا اتباع کرنے والی جماعتیں۔ سورۃ بقرۃ میں یہودیوں کے خلاف ایک الزام یہ بھی ہے کہ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ (۲/۱۰۲)۔ "یہ ان باتوں کی پیروی کرتے ہیں جو شیاطین (دین خداوندی کے دشمنوں) نے مملکتِ سلیمان کے متعلق عام کر رکھی تھیں"۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ دین خداوندی کے دشمنوں نے انبیائے بنی اسرائیل کے خلاف کیا کیا افسانے وضع کئے تھے، اور یہودی کسطرح ان افسانوں کو آسمانی تعلیم مانتے ہیں، تو اسکے لئے تورات (بائبل کا عہد نامہ عتیق) پڑھئے۔ اس میں ایسی ایسی باتیں ان انبیائے کرامؑ کے خلاف موجود ہیں جنہیں کوئی شریف آدمی سن نہیں سکتا۔

ت م م

تَمَامُ الشَّیْءِ۔ وہ چیز جس سے کسی شے کی کمی پوری ہو جائے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی پورا ہونے کے لکھے ہیں۔ بعض لوگوں نے تَمَامٌ اور کَمَالٌ کو مرادف قرار دیا ہے لیکن بعض نے ان میں یہ فرق کیا ہے کہ تَمَامٌ کسی چیز کی کمی کو پورا کر دینے کو کہتے ہیں اور کَمَالٌ اس انتہائی حد کو کہتے ہیں جس تک وہ اپنی پوری پوری نشو و نما (Devloepment) کے بعد پہنچ سکے۔ یا وہ اس مقصد کو پورا کردے

جس کے لئے وہ بنائی گئی ہے - چنانچہ رَجُلٌ تَامُّ الْخَلْقِ کے معنے ہوتے ہیں ایسا آدمی جس کے اعضاء میں کوئی نقص (Constitutional Defect) نہ رہ گیا ہو - اور کَامِلُ الْخَلْقِ اسے کہتے ہیں جس میں حسن و خوبی اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہو - یعنی یہ تَمَامٌ سے آگے ہوتا ہے * -

تَمَّ الشَّیْئُ - چیز پوری ہو گئی - تَمَّ عَلَیْہِ - وہ اس پر مداومت سے قائم رہا - اس کا ہمیشہ پابند رہا - أَتَمَّ الشَّیْئَ : چیز کو پورا کر دیا * -

قرآن کریم میں ہے وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرٰھٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ (۲/۱۲۴) "جب اس کے نشو و نما دینے والے نے ابراہیم کے لئے نمود ذات کے مختلف مواقع بہم پہنچائے تو وہ دوام و ثبات سے ان میں پورا اترا اور اس طرح اس نے بتا دیا کہ اس میں کوئی کمی باقی نہیں رہی - " سورۃ المائدہ میں ہے - اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (۵/۳) "اب ہم نے تمہارا غلبہ و اقتدار انتہا تک پہنچا دیا -(کوئی سرکش قوت باقی نہیں رہی) تمہارے نظام زندگی کی تکمیل ہو گئی - اور ہماری نعمتوں میں سے جس جس کی کمی تھی ہم نے وہ سب پوری کر دی" - سورۃ انعام میں ہے - وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ (۶/۱۱۶) "قوانین خداوندی میں سے جو کچھ باقی رہتا تھا وہ بھی سب کا سب صدق و عدل سے پورا ہو گیا ، اور اب اس میں تبدیلی کرنے والا کوئی نہیں" - اس طرح دین کی تکمیل ہو گئی اور نبوت ختم ہو گئی - اس لئے کہ جب قوانین خداوندی میں نہ کسی اضافے کی ضرورت باقی رہے نہ رد و بدل کی گنجائش، تو پھر اور نبی آئیگا کس کام کیلئے ؟ آیت ۵/۳ کے مزید مفہوم کے لئے دیکھیں تتمہ صفحہ ۱۸۲۰ جلد چہارم عنوان ت م م -

مُتِمٌّ - پورا کرنے والا (۶۱/۸) -

ت ن و ر

اَلتَّنُّوْرُ - بعض نے کہا ہے کہ اس کا مادہ نَارٌ - نُوْرٌ ہے (دیکھئے عنوان ن - و - ر) لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ عجمی ہے - عربوں نے معرب بنا لیا ہے - اس کے ایک معنے تو وہی ہیں جو ہماری زبان میں رائج ہیں - یعنی روٹی پکانے کا تنور - لیکن اَلتَّنُّوْرُ وادی کے نشیبی مقام کو بھی کہتے ہیں

* تاج -

جہاں پانی جمع ہو جائے ۔ نیز ہر اس جگہ کو جہاں سے پانی کا چشمہ ابلتا ہو ۔ نیز بلند اور اونچی زمین کو کہتے ہیں * ۔

قرآن کریم میں حضرت نوحؑ کے طوفان کے ضمن میں ہے فَارَ التَّنُّوْرُ (۱۱/۴۰) ۔ یہاں تنور سے مراد وادی کی وہ جگہ ہے جہاں بارش کا پانی جمع ہو رہا تھا ۔ یعنی بارش اس زور کی ہوئی (۱۱/۴۴) کہ وادی میں جہاں پانی جمع ہوتا تھا وہاں پانی میں سخت جوش پیدا ہو گیا اور اس نے طوفان کی شکل اختیار کر لی ۔

ت و ب

تَابَ ۔ تَوْبًا ۔ تَوْبَةً ۔ مَتَابًا ۔ کے معنے ہیں واپس آ جانا**۔ آپ شاہراہ حیات پر چلے جا رہے ہیں ۔ راستہ میں ایک چوراہا آیا جہاں سے آپ ایک طرف کو مڑ گئے ۔ چند قدم آگے جا کر آپکو محسوس ہوا کہ آپکا قدم غلط سمت کو اٹھ گیا ہے ۔ صحیح راستہ یہ نہیں ۔ اب آپکو صحیح راستہ کی طرف جانے کیلئے اس مقام تک لوٹ کر آنا ہوگا جہاں سے آپکا قدم غلط سمت کو اٹھا تھا ۔ اس واپسی کو تَوْبَةً کہتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اسکے لئے آپکو چلکر واپس آنا ہوتا ہے ۔ وہیں کھڑے کھڑے اگر آپ عمر بھر بھی افسوس کرتے رہینگے کہ میں نے غلط سمت کیطرف کیوں قدم اٹھا لیا تو یہ تَوْبَةً نہیں ہوگی ۔ تَوْبَةً ایک عملی اقدام ہے جس سے غلط کام کو (Un-Do) کیا جاتا ہے۔ اس کے مضر اثرات کی تلافی کی جاتی ہے ۔ تَابَ عَنْهُ اور مِنْهُ کے معنے ہیں اسنے اپنی غلطی کا احساس کر کے غلط روش کو چھوڑ دیا اور صحیح راستہ کی طرف لوٹ آیا ۔ غلطی کا احساس، احساس کے بعد غلط روش سے اجتناب اور پھر صحیح روش کا اختیار کرنا، یہ تینوں مراحل تَوْبَةً کے اندر شامل ہیں ۔ ایسا کرنے والے کو تَائِبٌ کہتے ہیں**۔ اسی لئے قرآن کریم میں آیا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴) ۔ ''اعمالِ حسنہ میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ غلط اعمال کے نقصان رساں نتائج کا ازالہ کر دیں،، ۔ اسی کو تَوْبَةً کہتے ہیں ۔ یعنی غلط کام کے نقصان رساں نتائج کی تلافی کے لئے صحیح کام کرنے ۔ اس مقام پر ایک نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے ۔ آپ نے کسی شخص کا کوئی حق دبا لیا ۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کو اپنی اس غلط حرکت کا احساس ہوا۔ آپ کے دل میں ندامت کے جذبات بیدار ہوئے۔ آپ کی توبہ یہ ہے کہ آپ اس شخص کا حق واپس دیدیں اور

---

* تاج و محیط و لطائف اللغۃ ۔ **تاج

آئندہ کے لئے عہد کریں کہ آپ کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کرینگے ۔ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے شراب پی لی ۔ کچھ وقت کے بعد آپ کو اپنی غلط کاری کا احساس ہوا ۔ اس میں توبہ کی شکل یہی ہے کہ آپ اپنے عمل پر نادم ہوں اور آئندہ کے لئے کبھی اس کے مرتکب نہ ہوں ۔

شروع میں بیان کردہ مثال میں، جب آپ نے اس چوراہے سے غلط راستہ اختیار کیا تھا تو صحیح راستہ نے آپکا ساتھ چھوڑ دیا تھا ۔ جب آپنے اپنی غلطی کے احساس کے بعد غلط راستہ کو چھوڑ دیا اور صحیح راستہ کی طرف رخ کیا تو صحیح راستہ نے بھی (جو اسوقت تک آپ سے منہ موڑے ہوئے تھا) آپکی طرف رخ کر لیا ۔ رخ ہی نہیں کر لیا بلکہ آپ نے اسکی طرف ایک قدم اٹھایا تو وہ دو قدم اٹھا کر آپکی طرف بڑھ آیا ۔ دو قدم اسطرح کہ ایک قدم وہ کم ہوا جو آپ پہلے مخالف سمت میں جاتے وقت اٹھا رہے تھے اور دوسرا قدم وہ جو آپنے اسکی طرف اٹھایا ۔ اسے تَابَ عَلَيْهِ کہتے ہیں ۔ اور ایسا کرنے والے کو تَوَّابٌ ۔ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (۱۱۰/۳) خدا کے متعلق ہے ۔ اور اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (۲۲۲/۲) بندوں کے متعلق ۔ یعنے جب انسان غیر خدائی قانون کو چھوڑ کر قانون خدا وندی کی طرف رخ کرتا ہے تو یہ قانون اپنے تمام خوشگوار نتائج کو لئے ہوئے اس انسان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے ۔ اسی لئے (۳/۱۲۷) میں یہ لفظ عَذَابٌ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ نیز (۹/۱۰۶) میں ۔ بالفاظ دیگر انسان کسی جرم کے ارتکاب سے ابدی طور پر زندگی کی خوشگواریوں سے محروم نہیں ہو جاتا ۔ وہ جب بھی قانونِ خدا وندی کو اختیار کریگا اس قانون کے خوشگوار نتائج اسکی طرف لپک کر آ جائینگے ۔ یعنے ہر شخص کیلئے باز آفرینی کا امکان موجود ہوتا ہے ۔ اور اسی طرح ہر قوم کیلئے نَشْأَةٌ ثَانِيَةٌ کا امکان ۔ (قوموں کی زندگی میں وہ مرحلہ کب آتا ہے جب انکی حیاتِ نو ناممکن ہو جاتی ہے اس کے متعلق ہ ۔ ل ۔ ک کے عنوان میں بتایا جائیگا) لیکن یہ باز آفرینی اسی وقت تک ممکن ہے جب انسان کے لئے عملِ صالح کرنے کا امکان ہو ۔ جب عمل کا موقع ختم ہو جائے تو پھر باز آفرینی ناممکن ہو جاتی ہے ۔ جہنم میں عمل کا موقع باقی نہیں رہتا اس لئے باز آفرینی ناممکن ہو جاتی ہے ۔

توبہ اور استغفار میں کیا فرق ہے اسکے لئے (غ ۔ ف ۔ ر) کا عنوان دیکھئے ۔ لطائف اللغۃ میں ہے کہ توبہ سابقہ گناہوں پر ندامت کو کہتے ہیں ۔ اور انابت، مستقبل میں ترک معاصی کو ۔

---

*تاج ۔

اَلتَّابُوْتُ - صندوق کو کہتے ھیں کیونکہ جو چیزیں اس سے نکالی جاتی ھیں وہ اس میں واپس ھوتی رھتی ھیں* - (اس ضمن میں عنوان تَابُوْتٌ بھی دیکھئے)-

ت و ر

اَلتَّوْرُ - بہنا، جاری ھونا- ایلچی، سفیر - اَلتَّوْرَۃُ - باندی جنو اپنے چاھنے والوں میں آتی جاتی رہے -

اَلتَّارَۃُ - وقت - مرتبہ - جیسے جِئْتُہٗ تَارَۃً اُخْرٰی - میں اس کے پاس دوسری مرتبہ گیا - اَتَارَہٗ - اسنے اسے یکے بعد دیگرے دھرایا -

اَلتَّائِرُ - تھکنے کے بعد بھی برابر کام میں لگا رھنے والا* -

سورۃ طٰہٰ میں ہے نُخْرِجُکُمْ تَارَۃً اُخْرٰی (۲۰/۵۵) - ''ھم تم کو دوسری مرتبہ نکالینگے،، - راغب نے کہا ہے کہ یہ تَارَ الْجُرْحُ سے ماخوذ ہے جسکے معنے زخم کا بھر جانا اور مندمل ھو جانا ہے** - بہنا - جاری رھنا- اور تھکنے کے بعد بھی کام میں لگے رھنا کے اعتبار سے دیکھا جائے تو زندگی کی جوئے رواں کے لئے تَارَۃً کا لفظ کسقدر معنی خیز ہے- حیات کا سلسلہ غیر منقطع ہے - اس میں صرف احوال و ظروف کی تبدیلیاں ھوتی ھیں - اس کا نام تَارَۃً اُخْرٰی ہے -

اَلتَّوْرَاۃُ - (دیکھئے عنوان تورات) -

تَوْرَات

بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ وَرْیٌ سے ماخوذ ہے جسکے معنے روشن کرنے کے ھیں* - (اس کے لئے دیکھئے عنوان و- ر- ی)

لیکن اصل وھی ہے جو صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ تُوْرَہْ کا معرب ہے جو عبرانی لفظ ہے اور جسکے معنے شریعت اور حکم کے ھیں - اسکی جمع تُورَاتٌ ہے - یعنے احکام و شرائع*** -

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ تورات اس کتاب کا نام ہے جو حضرت موسیٰؑ پرنازل ھوئی تھی-لیکن قرآن کریم نےحضرت موسیٰؑ کی کتاب کا نام خصوصیت سے تورات نہیں بتایا - تورات کے متعلق اس نے کہا ہے کہ وہ حضرت ابراھیمؑ کے بعد (۳/۶۴) بلکہ حضرت یعقوبؑ کے بعد (۳/۹۲) اور حضرت

*تاج - **راغب - ***محیط

عیسیٰؑ سے پہلے (۵/۴۶) نازل ہوئی تھی- یہ یہودیوں کے لئے آسمانی راہنمائی تھی اور اس میں احکام خداوندی مندرج تھے۔ (۵/۴۴) ۔ اس میں ہدایت اور روشنی تھی ۔ اس کے مطابق انبیائے بنی اسرائیل اور ان کے علماء و مشائخ معاملات کا فیصلہ کرتے تھے (۵/۴۴) ۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے تورات آن مجموعہ، کتب کا نام ہے جو انبیائے بنی اسرائیل پر حضرت عیسیٰؑ سے پہلے نازل ہوئیں ۔ اسی مجموعہ کو عہد نامہ عتیق (Old Testament) کہا جاتا ہے۔اس میں انتالیس صحیفے ہیں اور ہر صحیفہ اپنے نبی کے نام سے موسوم ہے ۔ اس میں "اسفار موسیٰ"، بھی شامل ہیں جنہیں قرآن "صحف موسیٰ" سے تعبیر کرتا ہے (۸۷/۱۹) نیز "کتاب موسیٰ" سے بھی (۴۶/۱۲) ۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ، یہ کتاب چند تختیوں پر لکھی ہوئی تھی (۷/۱۴۵) ۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ، موجودہ عہد نامہ عتیق کے مجموعہ میں انتالیس کتابیں ہیں لیکن ان میں بعض ایسی کتابوں کا حوالہ آتا ہے جو اس مجموعہ میں موجود نہیں ہیں ۔ اس قسم کی کم از کم گیارہ کتابیں گنائی جا سکتی ہیں ۔ اس سے واضح ہے کہ یہ مجموعہ نامکمل ہے ۔

اس سے آگے بڑھئے۔ "اسفار موسیٰ"، کو حضرت موسیٰؑ کیطرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن ان میں حضرت موسیٰؑ کی وفات اور وفات کے بعد کے حالات بھی موجود ہیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کتابوں کا کم از کم کچھ حصہ حضرت موسیٰؑ کے بعد کا اضافہ ہے ۔

عہد نامہ عتیق کی کتابوں کے متعلق اسوقت تک بالتحقیق ثابت نہیں ہو سکا کہ ابتداءً یہ کس عہد میں مدون ہوئیں اور ان کے مؤلف کون تھے ۔ البتہ اتنا ضرور متحقق ہے کہ ایک زمانہ ایسا آیا تھا جس میں ان کا وجود ناپید ہو چکا تھا ۔ یعنی جب چھٹی صدی قبل مسیح میں بابل کے شہنشاہ بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ و برباد کیا ہے (دیکھئے عنوان بنی اسرائیل) ۔ تو اس نے تورات کی الواح کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا ۔جب یہودی ، بابل کی قید سے رہائی کے بعد دوبارہ بیت المقدس میں آئے تو انہیں اپنے گم گشتہ صحف مقدسہ کی ترتیب نو کی فکر ہوئی ۔ چنانچہ عزرا نبی نے سلسلہ اول کی پانچ کتابوں کو ازسر نو مرتب کرکے واقعات کو مؤرخانہ حیثیت سے قلمبند کیا ۔ لیکن خود عزرا نبی کے متعلق بھی یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ کب یروشلم آئے تھے ۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ۴۴۴ ق-م میں ان کتابوں کو

مرتب کیا تھا۔ یہ ترتیب و تدوین کسطرح عمل میں آئی تھی اس کے متعلق خود عزرا کی زبان سے سنئے۔ وہ کہتے ہیں۔

"دوسرے روز ایک آواز نے مجھے بلایا اور کہا کہ عزرا! اپنا منہ کھولو اور وہ کچھ پیو جسے میں تمہیں پینے کے لئے دیتا ہوں۔ سو میں نے اپنا منہ کھول دیا۔ تب دیکھو اس نے مجھ تک ایک پیالہ بھیجا۔ وہ پانی سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا لیکن اس کا رنگ آتشیں تھا۔ میں نے اسے لیا اور پی گیا۔ جب میں نے اسے پی لیا تو میرے دل میں فہم و فراست اور سینے میں بصیرت پیدا ہو گئی اور میری روح نے میرے حافظہ کو قوی بنا دیا۔ اور پھر جو میری زبان کھلی ہے تو بند نہیں ہوئی اور لکھنے والے چالیس دن تک بیٹھے لکھتے رہے۔ وہ دن بھر لکھتے تھے اور صرف رات کے وقت کچھ کھاتے اور میں دن بھر لکھاتا رہتا تھا اور رات کو بھی میری زبان بند نہ ہوتی تھی۔ چالیس دنوں میں انہوں نے ۲۰۴ کتابیں لکھ ڈالیں"۔ (کتاب عزرا ۲ - $\frac{۱۳}{۳۸-۴۴}$)۔

یہ بیان کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ اس پر صرف اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ یروشلم کی تباہی ۵۸۷ ق م میں ہوئی اور عزرا نے ان کتابوں کو ۴۴۴ ق م میں لکھوایا۔ یعنی قریب ڈیڑھ سو سال بعد۔ ظاہر ہے کہ عزرا نے ان کتابوں کو خود کہیں نہیں دیکھا تھا جو انہیں حفظ یاد کرلیا ہوتا۔ اس لئے انہوں نے حفظ کردہ کتابوں کو دوبارہ نہیں لکھوایا بلکہ ان کتابوں کو انہوں نے خود تصنیف کیا۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ خود عزرا کے بیان کے مطابق انہوں نے ۲۰۴ کتابیں لکھوائی تھیں لیکن اب کہا جاتا ہے کہ انہوں نے صرف پانچ کتابیں (اسفار موسیٰ) مرتب کرائی تھیں۔

عزرا کے بعد نحمیاہ نبی نے کچھ اور کتابوں کو مرتب کیا۔ لیکن ۱۶۸ ق م میں انطاکیہ کے یونانی بادشاہ، انٹونس نے پھر بیت المقدس کو برباد کیا اور مقدس صحیفوں کو جلا دیا۔ اس کے بعد یہودا مقابی کی ہمت سے ان صحیفوں کو ازسرنو مرتب کیا گیا۔ لیکن ۷۰ ء میں رومیوں کا طوفان اٹھا اور ٹائٹس نے بیت المقدس کو اسطرح برباد کیا کہ یہودی اسمیں پھر نہ بس سکے۔ وہ ان صحیفوں کو ہیکل سے نکال کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے بعد یہودی علماء نے ان صحیفوں کو اپنے حافظہ کی مدد سے پھر مرتب کیا۔

پھر یہی نہیں کہ ان کتابوں کو حوادث ارضی و سماوی تباہ کر دیتے تھے۔ ان میں دانستہ تحریف و الحاق کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ چنانچہ مشہور مسیحی مؤرخ رینان (Life of Jesus) میں لکھتا ہے کہ

> زمانہ قرب مسیحؑ میں تورات میں بہت سی اہم تبدیلیاں کی گئیں ۔ بالکل نئی کتابیں (مثل کتاب استثناء) مرتب کی گئیں ۔ یہ کتابیں حضرت موسٰیؑ کی اصل شریعت کی حامل کہی جاتی ہیں حالانکہ ان کی روح پرانی کتابوں سے بلکل مختلف تھی ۔ (ص ۔ ۴۰)

اس کے علاوہ یہودیوں نے ایک اور عقیدہ بھی وضع کیا ۔ وہ یہ کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک تورہ شبکتب (یعنی وحی مکتوب یا متلو) اور دوسری تورہ شبعلفہ، وحی غیر مکتوب (وحی غیر متلو) ۔ یہودی علماء نے وحی غیر متلو کی روایات کو جمع کرکے اسے بھی تورات کا درجہ دیدیا ۔ اس مجموعہ کو مشنا کہا جاتا ہے ۔ پھر اس مجموعہ کی تشریحات و تفسیرات جمع کی گئیں ۔ اس کا نام جمارا ہے ۔ ان دونوں کے مجموعہ کو تالمود کہتے ہیں ۔ تالمود دو ہیں ۔ ایک شامی دوسرا بابلی ۔ دونوں پانچویں صدی عیسوی کے مرتب شدہ ہیں اور آسمانی سمجھے جاتے ہیں ۔

ان روایات کے علاوہ، یہودیوں کے ہاں " باطنی علم "، کا عقیدہ بھی موجود ہے ۔ اس علم کی کتابوں کو " سفریم جنوزیم " (مخفی خزانہ کی کتابیں) کہا جاتا ہے ۔

اب کچھ تورات کی زبان کے متعلق بھی دیکھئے ۔ یہودیوں کی قدیم زبان عبرانی تھی ۔ بابل سے واپسی کے بعد ان کی زبان ارامی ہوگئی ۔ لیکن یہودیوں کی کوئی کتاب نہ عبرانی زبان میں تھی نہ ارامی میں ۔ ان کی سب کتابیں جن سے دنیا روشناس ہوئی یونانی زبان میں تھیں ۔ اسفار موسٰیؑ کا یونانی زبان سے عبرانی میں ترجمہ ہوا ۔ یہ یونانی نسخہ اسکندریہ کی لائبریری میں تھا جسے عیسائیوں نے جلا دیا تھا ۔ ۳۹۴ء میں سینٹ جیروم نے ان کتابوں کا مشہور رومی ترجمہ شائع کیا جو (Vulgate) کے نام سے مشہور ہے ۔ یہ بھی بالتحقیق معلوم نہیں کہ سینٹ جیروم کے پاس کونسا نسخہ تھا جس کا اس نے رومی زبان میں ترجمہ کیا تھا ۔

تورات کے جو نسخے دنیا میں آج مروج ہیں ان کے اختلافات کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کا پہلا نسخہ ۱۴۸۸ء میں چھپا ۔ جب اس کے دوسرے ایڈیشن کا ۱۷۰۵ء میں انتظام کیا گیا تو اس میں اور پہلے ایڈیشن میں قریب بارہ ہزار جگہ اختلاف کرنا پڑا ۔ اس طبع دوم کا نسخہ اب عام طور پر تورات (عہد نامہ عتیق) کہلاتا ہے ۔

مروجہ عہدنامہ عتیق کے متعلق خود یہودیوں اور عیسائی محققین کی تنقیدات کیا ہیں اس کے متعلق میری کتاب ''معراج انسانیت'' کے باب اول (ظہرالفساد) میں تورات کا عنوان ملاحظہ کیجیئے۔

یہ ہے اس تورات کی مختصر سی سرگزشت جسے یہودی اپنی آسمانی کتاب کہکر پیش کرتے ہیں اور جس کے متعلق قرآن نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا کہ انہوں نے خدا کی کتاب کو بری طرح سے مسخ کر ڈالا ہے۔ جب قرآن کریم ہم سے کہتا ہے کہ تم پہلی آسمانی کتابوں پر بھی ایمان لاؤ تو اس کا مطالبہ فقط اتنا ہوتا ہے کہ تم مانو کہ انبیائے سابقہ پر بھی خدا کی طرف سے وحی نازل ہوئی تھی۔ یہ نہیں کہ جن کتابوں کو اہل کتاب آسمانی کتابیں کہتے ہیں انہیں حرفاً حرفاً خدا کی وحی سمجھو۔ قرآن ان کی کسطرح ''تصدیق'' کرتا ہے اس کے لئے عنوان (ص۔ د۔ ق) دیکھئے۔

ت ی ن

اَلتِّیْنُ۔ انجیر یا انجیر کے درخت کو کہتے ہیں۔ نیز ایک پہاڑی کا نام ہے، جسطرح زَیْتُوْنٌ بھی ایک پہاڑی کا نام ہے*۔ اَلتِّیْنُ سے مراد وہ مقام ہے جہاں سے حضرت نوح ؑ نے اپنی دعوت کی آواز بلند کی تھی۔ جسطرح زَیْتُوْنٌ وہ مقام ہے جہاں سے دعوتِ حضرتِ عیسیٰ ؑ کا آغاز ہوا تھا۔ قرآن کریم نے ان مقامات (تین۔ زیتون۔ طور سینا اور مکہ) کو اس حقیقت پر شاہد ٹھہرایا ہے (۹۵/۱) کہ حق و باطل کی یہ کشمکش شروع سے اسی طرح چلی آ رہی ہے۔ یعنی آسمانی پیغام جہاں جہاں بھی آیا، مترفین نے اس کی مخالفت کی۔ وہ دعوت حضرت نوح ؑ کی تھی (التین) یا حضرت عیسٰے ؑ کی (الزیتون)۔ حضرت موسٰے ؑ کی تھی (طور سینا) یا نبی اکرم ؐ کی (البلد الامین)۔ ہر دعوت الی اللہ کی یکساں مخالفت ہوئی۔

ت ی ہ

اَرْضٌ تِیْہٌ۔ اس سرزمین کو کہتے ہیں جسمیں نہ پہاڑ ہوں نہ ٹیلے۔ نہ کوئی دوسری چیزیں ہوں جنہیں نشانِ راہ بنایا جا سکے اور اسطرح مسافر اس میں راستہ کھو کر حیران و سرگردان پھرے۔ تَاہَ یَتِیْہُ فِی الْاَرْضِ۔ راستہ گم کرکے زمین میں حیران و پریشان بھٹکتے پھرنا۔

*تاج و راغب۔

رَجُلٌ تَائِہٌ ۔ بھٹکتا ھوا راھی * ۔ اس سے تَاہَ ۔ یَتِیْہُ کے معنے متحیر ھونے کے آتے ھیں ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ھیں ۔ نیز تَاہَ یَتِیْہُ کے معنے خودرائی اور تکبر کرنا ھیں * ۔ التِّیْہُ ۔ اَلتِّیْہُ مقامات حیرت ** ۔ بنی اسرائیل کے متعلق ھے ۔ یَتِیْہُوْنَ فِی الْاَرْضِ (۵:۲۶) ''وہ (چالیس سال تک) حیران و سرگردان پھرتے رھینگے'' ۔ یہہ حالت ھوتی ھے اُس قوم کی جو قوانین خداوندی سے گریز کی راھیں تلاش کرنے اور ان میں حجتیں نکالے ۔ وہ سفر زندگی میں حیران و پریشان ماری ماری پھرتی ھے اور اسے کہیں نشانِ راہ اور سراغِ منزل نہیں ملتا ۔ (جیسا کہ خود ھمارے ساتھ صدیوں سے ھورھا ھے) ۔

———:o:———

*تاج ۔ **راغب ۔

ث

ث ب ت

ثَبَتَ ۔ ثابت رهنا۔ ایک حالت پر جمے رهنا ۔ اَلثَّبْتُ مِنَ الْخَیْلِ ۔ اس گھوڑے کو کہتے ھیں جو ایک رفتار پر دوڑتا چلا جائے ۔ اَلثِّبَاتُ ۔ وہ تسمہ جس سے کجاوہ کو باندھ کر جمایا جائے ۔ اور ایسے کجاوہ کو (جسے اس تسمہ سے باندھا جائے) اَلْمُثَبَّتُ کہتے ھیں* ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی دوامِ شے کے ھوتے ھیں۔ سورۃ رعد میں اثْبَاتٌ بمقابلہ مَحْوٌ (مٹا دینا) آیا ھے (۱۳/۳۹) اور سورۃ ابراھیم میں یُثَبِّتُ بمقابلہ یُضِلُّ (۱۴/۲۷) ۔ لہذا اس کے معنی ھوئے، جو رائگاں نہ جائے بلکہ نتیجہ خیز اور بارآور ھو ۔ جو مٹے نہیں، اپنی جگہ نہ چھوڑے بلکہ قائم و دائم رھے ۔ اَلْقَوْلُ الثَّابِتُ (۱۴/۲۷) محکم نظریہ حیات ۔ اَصْلُهَا ثَابِتٌ (۱۴/۲۴) ۔ جسکی جڑیں مضبوط جمی ھوں ۔ اس کے مقابلہ میں ھے، ایسا درخت اُجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ (۱۴/۲۶) جسے زمین کے اوپر ھی سے اکھاڑ لیا جائے اور اسے کچھ بھی قرار نہ ھو ۔ سورۃ نحل میں ثُبُوْتٌ بمقابلہ تَزِلَّ آیا ھے ۔ یعنی لغزش نہ کرنا اور جمے رهنا (۱۶/۹۴) ۔ اور سورۃ بنی اسرائیل میں بمقابلہ تَرْکَنُ (۱۷/۷۴) ۔ یعنی ذرا نہ جھکنا ۔ قطعاً مائل نہ ھونا ۔ یعنی وَیُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۸/۱۱) ۔ سورۃ نساء میں ھے وَ اَشَدَّ تَثْبِیْتًا (۴/۶۶) استحکام دینے میں زیادہ مضبوط ۔ دَاءٌ ثُبَاتٌ ۔ وہ بیماری جو انسان کو حرکت کرنے کے قابل نہ چھوڑے* ۔ اس اعتبار سے اَثْبَتَ کے معنے ھوتے ھیں کسی کو قید کر دینا یا ایسا کر دینا کہ وہ نقل و حرکت کے قابل نہ رھے ۔ سورۃ انفال میں لِیُثْبِتُوْکَ (۸/۳۰) کے یہی معنے ھیں ۔

جماعت مومنین کی خصوصیت یہ ھے کہ خدا کے عطا کردہ محکم نظریہ حیات (قرآن) پر جم کر کھڑی رھے اور اس پر عمل پیرا ھو کر اتنی قوت پیدا کرے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کے مقام سے ھلا نہ سکے ۔

---

* تاج و محیط ۔ راغب ۔

ث ب ر

اَلثَّبْرُ ۔ روکنا ۔ کسی بات سے منع کرنا ۔ مَاثَبَرَکَ عَنْ ھٰذَا ۔ تمہیں کس چیز نے اس بات سے روک دیا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلثَّبْرَۃُ اس مٹی کو کہتے ہیں جو چونے سے مشابہ ہوتی ہے اور جب کھجور کی جڑ اس مٹی تک پہنچ جاتی ہے تو اسکی نشوونما رک جاتی ہے ۔ اس سے اس کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ اَلثَّبْرُ ۔ نامراد و ناکام کرنا ۔ خوشگواریوں سے محروم کر دینا ۔ چنانچہ اَلْمُثَبَّرُ اس شخص کو کہتے ہیں جس پر جرم کی وجہ سے حد (سزا) لگ چکی ہو اور وہ اسطرح آزادی سے محروم کر دیا گیا ہو**۔ اَلْمَثْبِرُ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں اونٹ ذبح کیا جائے۔ اس اعتبار سے اَلثُّبُوْرُ ۔ ہلاکت اور مسلسل تباہی کو کہتے ہیں*۔ دَعَوْا ھُنَالِکَ ثُبُوْرًا (۲۵/۱۳)۔ "وہ وہاں ہلاکت کو پکارینگے" ۔ مَثْبُوْرٌ ۔ نامراد و ناکام ۔ ہلاک شدہ ۔ ناقص العقل ۔ محروم* ۔ اِنِّیْ لَاَظُنُّکَ یَا فِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (۱۷/۱۰۲) "اے فرعون! میں دیکھتا ہوں کہ تجھ میں عقل کی کمی ہے" ۔ ثَبَرَ فُلَانٌ ۔ فلاں آدمی ہلاک ہو گیا یا اسکی نشو و نما رک گئی ۔ قرآن کی رو سے مطلب دونوں کا ایک ہی ہے ۔ (دیکھئے عنوان ج ۔ ح ۔ م)

ث ب ط

ثَبَّطَہٗ عَنِ الْاَمْرِ ۔ اسکو کسی بات سے روک دیا اور دوسرے کام میں لگا دیا ۔ دیر کرا دی ۔ قرآن کریم میں ہے فَثَبَّطَھُمْ (۹/۴۶) ۔ "سو انہیں روک دیا"۔ تَثْبِیْطٌ کے معنی ہیں کسی آدمی کو اس کام سے روک دینا جو وہ کر رہا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنے ہیں آدمی اور اسکے ارادوں کے درمیان حائل ہو جانا ۔ اَلثَّبِیْطُ اسے کہتے ہیں جو اپنے کام میں سست اناڑی اور کمزور ہو۔ جو دیر سے حرکت کرے*** ۔

ث ب ی

اَلتَّثْبِیَۃُ ۔ ڈھیر ڈھیر جمع کرنا ۔ کسی معاملہ پر جم جانا اور مستقل مزاجی سے لگے رہنا ۔ بار بار اپنے قبیلہ کی تعریف کرنا ۔ متفرق خوبیوں کو بیان کرنا ۔ چیز کی اصلاح کرنا اور اس میں اضافہ کر دینا ۔ مکمل کر دینا ۔

* تاج و محیط و راغب ۔ ** تاج ۔ *** تاج و محیط

پورا کر دینا - تعظیم کرنا - آدمی کا اپنے باپ کی سیرت پر چلنا - خیر اور شر کو جمع کر لینا - بہت زیادہ ملامت اور نکتہ چینی کرنا - ثَبَّيْتُ الْمَالَ - میں نے مال کو جمع کر دیا - مَالٌ مُثَبًّى - جمع کیا ہوا مال - اَلثَّبِيُّ - لوگوں کی بہت تعریفیں کرنے والا - اَلثُّبَةُ - حوض کا درمیانی حصہ - لوگوں کی جماعت - سواروں کا دستہ - جَاءَتِ الْخَيْلُ ثُبَاتٍ - گھوڑے ٹکڑی ٹکڑی آئے - ابن جنّی نے کہا ہے کہ ثُبَةٌ کے آخر سے واؤ گرا ہوا ہے - (جیسا کہ اَبٌ - اَخٌ اور سَنَةٌ اور عِضَةٌ وغیرہ میں ہے) ابن بری نے کہا ہے کہ محققین نے اسی قول کو اختیار کیا ہے کہ اسکی اصل ثُبْوَةٌ تھی - ابو اسحٰق نے کہا ہے کہ یہ ثَابَ الْمَاءُ يَثُوْبُ سے مشتق ہے - جوہری نے کہا ہے کہ ثُبَةٌ وسط حوض کو کہتے ہیں جہاں پانی جمع ہو جاتا ہے - اور آخر کی ھاء (یا تاء مربوطہ) درمیانی واؤ کے عوض میں ہے - (اس صورت میں اس کا مادہ ث - و - ب ہوگا - لیکن) راغب نے کہا ہے کہ اس کے آخر میں سے ایک یاء محذوف ہے اور اس کا مادہ ثَبْیٌ ہے* -

ثَبَّى الشَّيْءَ يُثَبِّيْهِ تَثْبِيًا - چیز کو جمع کرنا - بڑا کرنا - درست کرنا - اس میں اضافہ کرنا - مکمل کرنا - قرآن کریم میں ہے فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا (۴/۷۱) - اس میں ثُبَاتٍ جمع ہے ثُبَةٌ کی جس کے معنے ایک الگ جماعت کے ہوتے ہیں - اس کے مقابلہ میں جَمِيْعًا آیا ہے - یعنی تم الگ، گروہ گروہ ہو کر نکلو یا سب کے سب اکٹھے - اس کی جمع ثُبَاتٍ اور ثُبُوْنَ ثِبِيْنَ آتی ہے - اس میں آخری یاء محذوف ہے** - (نیز دیکھئے عنوان ث - و - ب) -

ث ج ج

ثَجَّ الْمَاءُ - يَثُجُّ - ثُجُوْجًا - پانی کا بہنا - زور سے گرنا - اِنْثَجَّ - پانی گر گیا - اَلثَّجَّاجُ مِنَ الْمَطَرِ - زور سے برسنے والی موسلا دھار بارش*** - قرآن کریم میں ہے وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا (۷۸/۱۴) - "ہم نے بادلوں سے زور سے برسنے والا پانی اتارا" -

ث خ ن

ثَخُنَ - يَثْخُنُ - کسی چیز کا موٹا کثیف اور گاڑھا ہو جانا، اسطرح کہ وہ بہ نہ سکے - اَثْخَنَ فِي الْعَدُوِّ - اسنے دشمنوں کو بہت زیادہ قتل

* تاج - ** راغب - *** تاج و محیط و ابن فارس -

اور زخمی کیا ۔ اِسْتَثْخَنَ مِنْہُ النَّوْمُ ۔ نیند اس پر غالب آگئی ۔اَثْخَنَ ۔ وہ غالب آ گیا ۔ اس نے تسلط پا لیا* ۔

سورۃ انفال میں ہے حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ (۸/۶۷) ۔ "جب تک وہ تمام دشمنوں پر غالب نہ آ جائے" ۔ اور انہیں انکی مخالفانہ کارروائیاں جاری رکھنے سے نہ روک دے۔ سورۃ محمد میں ہے حَتّٰی اِذَا اَثْخَنْتُمُوْھُمْ (۴۷/۴) "جب تم انہیں مغلوب کر لو" ۔

دراصل ثَخَنَ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا اسقدر بھاری (یا بوجھل) ہو جانا کہ وہ اسکی وجہ سے حرکت نہ کرسکے ۔ (ابن فارس) ۔ چونکہ مغلوب یا مقتول اپنے مقام سے حرکت نہیں کرسکتا اس لئے اس کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے ۔ اس کے معنی ہونگے اس قسم کا غلبہ جو دشمن کو بے حس وحرکت اور بے دست و پا کردے اور اس طرح وہ مخالفت کے قابل نہ رہے۔ چنانچہ ثَخِیْن اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے پاس کوئی ھتھیار نہ ہو** ۔ محیط میں لکھا ہے کہ ثَخِیْن کے معنے ھتھیار بند ہیں۔ ممکن ہے کہ اپنی اصل کے لحاظ سے اس لفظ میں یہ دونوں معنی پیدا ہو گئے ہوں ۔ اس لئے کہ جس طرح ھتھیار بند اسلحہ کے بوجھ اور بندش کی وجہ سے آزاد نہیں رھتا اور پوری طرح تیزی سے حرکت نہیں کرسکتا ، اسی طرح نہتا بھی خوف کے باعث آزاد نہیں رھتا اور اسکی حرکت میں کمی آ جاتی ہے ۔

ث ر ب

ثَرْبٌ پتلی باریک چربی جو انتڑیوں کے ساتھ ہوتی ہے ۔ تَثْرِیْبٌ ۔ اس چربی کا ازالہ کر دینا ۔ اسے وھاں سے ھٹا دینا ۔ ثَرَّبَ الثَّوْبَ اسنے کپڑے کو لپیٹ دیا۔ ثَرَّبَہٗ وعَلَیْہِ یُثَرِّبُ تَثْرِیْبًا ۔ اسے اسکی غلطی پر عار دلانا یا ملامت کرنا ۔ زجروتوبیخ کرنا ۔ سرزنش کرنا*** ۔ سورۃ یوسف میں ہے ۔ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ (۱۲/۹۲) ۔ "تم پر آج کوئی ملامت نہیں" ۔ میں تمہیں زجروتوبیخ اور سرزنش نہیں کرتا ۔ تمہیں معافی ہے پچھلی لغزشوں پر، اور آئندہ تمہیں عار نہیں دلائی جائیگی ۔

یَثْرِبُ ۔ مدینہ منورہ کا قدیمی نام ہے*** ۔ قرآن کریم میں ہے یَا اَھْلَ یَثْرِبَ ۔ "اے یثرب کے رھنے والو" ۔ (۳۳/۱۳) ۔

* تاج ۔ ** ابن فارس ۔ ***تاج و راغب و محیط ۔

ث ر ی (ث ر و)

اَلثَّرىٰ - نمی - نم آلود مٹی - یعنے وہ مٹی جو گیلی ہو گئی ہو لیکن گارا نہ بنی ہو- زمین کی اوپر کی سطح خشک ہوتی ہے اور اس کے نیچے نم آلود - اس سطح کو ثریٰ کہتے ہیں - مَاتَحْتَ الثَّرىٰ (۲۰/۶) - "جو کچھ ثریٰ کے نیچے ہے"۔ ثَرِيَتِ الْاَرْضُ - زمین نم آلود ہو گئی - چونکہ زمین کی نمی کھیتی کیلئے نہایت ضروری ہے اسلئے فُلَانٌ قَرِيْبُ الثَّرىٰ کے معنے ہیں ایسا آدمی جو آسانی سے خیر و برکت عطا کر دے- حقیقی ثروت زمین کی نمی کے ساتھ وابستہ ہے جو رزق کا سر چشمہ ہے - اَنَا ثَرِیٌّ بِہٖ - میں اس سے خوش ہوں*۔

ث ع ب

ثَعَبَ الْمَاءَ - پانی بہایا - فَانْثَعَبَ - چنانچہ پانی بہہ نکلا - مَاءٌ اُثْعُبَانٌ - بہنے والا پانی - مَثَاعِبُ الْمَدِيْنَةِ - شہر کی پانی بہنے کی جگہیں - الثُّعْبَانُ - سانپ (موٹا لمبا اور نر سانپ) - چونکہ سانپ زمین پر اسطرح چلتا ہے جیسے پانی کی نالی بہہ رہی ہو اسلئے اسے ثُعْبَانٌ کہتے ہیں* - اَلْاُثْعُبَانُ- بھاری بھر کم سفید اور حسین چہرہ* -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی درازی اور پھیلنے کے ہوتے ہیں - (پانی وغیرہ میں)-

قرآن کریم میں قصہ حضرت موسےٰؑ کے سلسلہ میں کہا گیا ہے فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ... (۷/۱۰۷) - اس کے لغوی معنی ہیں "تب اس نے اپنا عصا ڈالا تو وہ صریح سانپ (اژدھا) تھا"۔ - اس کے مجازی مفہوم کے لئے عنوان (ع - ص - و) میں لفظ عصا دیکھئے -

ث ق ب

الثَّقْبُ - سوراخ - آر پار شگاف - ثَقَبَہٗ - يَثْقُبُہٗ - اسنے اسمیں سوراخ کر دیا - فَانْثَقَبَ - اسمیں سوراخ ہو گیا - اَلْمِثْقَبُ - سوراخ کرنے کا آلہ - ثَقَبَتِ النَّارُ - آگ بھڑک اٹھی- ثَقَبَ الْكَوْكَبُ ستارہ چمکا - شِهَابٌ ثَاقِبٌ - روشن ستارہ - گویا وہ تاریکی کی چادر میں سوراخ کر کے باہر نکل آتا ہے،یا اسکی کرنیں فضا کی تاریکی میں چھید کرتی جاتی ہیں -

*تاج - **محیط -

اَلثَّقِيْبُ ۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو بہت دودھیاری ہو ۔ جسکے دودھ کی دھاریں چھید کرتی جائیں* ۔ قرآن کریم میں شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۳۷/۱۰)۔ اور اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ (۸۶/۳) آیا ہے ۔

ث ق ف

اَلثَّقْفُ ۔ کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کے بھانپ لینے اور پا لینے میں مہارت اور کسی کام کے کرنے میں حذاقت۔ ثَقِفْتُ کَذَا ۔ میں نے کسی چیز کو مہارت نظر کے ذریعہ تاڑ لیا۔ اسکے بعد یہ لفظ محض پا لینے کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا خواہ اسکے ساتھ نگاہ کی مہارت شامل ہو یا نہو** ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس کے معنی غلبہ پا لینے کے بھی ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَاءً (۶۰/۲)۔ ''اگر وہ تم پر غلبہ پالینگے تو تمہارے دشمن ہوجائیں گے'' ۔ یا وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ (۲/۱۹۱) ''جہاں تم انہیں بھانپ لو اور غلبہ پا لو انہیں قتل کر دو'' ۔

الثِّقَافُ کے معنے باہم جھگڑنے اور تلواریں چلانے کے ہیں ۔ نیز وہ آلہ جس سے نیزوں کو سیدھا کیا جاتا ہے*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی ٹیڑھی چیز کو سیدھا کرنے کے ہوتے ہیں ۔ چنانچہ ثَقَّفْتُ الْقَنَاةَ کے معنی ہیں میں نے نیزہ کے خم کو سیدھا کر دیا۔ اس اعتبار سے اَلثَّقَافَةُ میں جہاں نگاہ کی تیزی ۔ ذہانت ۔ اور حذاقت کا مفہوم ہے وہاں اس میں تلوار چلانے اور نیزہ کے خم کو سیدھا کر دینے کا مفہوم بھی ہے* ۔ قوموں کی اولین ثَقَافَت شمشیر وسنان ہوتی ہے اور آخرالامر اس سے مفہوم شعر گوئی اور افسانہ طرازی رہ جاتا ہے۔ ایک زندہ قوم کی ثقافت، نگاہ کی تیزی اور شمشیر کی خارہ شگافی (دونوں) کا مجموعہ ہوتی ہے ۔

ث ق ل

اَلثِّقَلُ ۔ خِفَّةٌ کی ضد ہے ۔ بھاری اور بوجھل ہونا ۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ دونوں مقابل کے الفاظ ہیں ۔ جب تم کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ وزن یا اندازہ کر رہے ہو تو جو چیز بھاری ہو اسے ثَقِيْلٌ کہتے ہیں اور جو ہلکی ہو اسے خَفِيْفٌ۔ ثَقِيْلٌ کی جمع ثِقَالٌ آتی ہے***۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **راغب ۔ ***تاج ۔

عظیم الشان وزنی بات ۔ قَوْلاً ثَقِیْلاً (۵/۷۳) ۔ ثَقَلَیْنِ ۔ دو عظیم القدر چیزیں ۔ یا جماعتیں ۔ اَیُّهَ الثَّقَلٰنِ (۵۵/۳۱) ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس سے مراد عرب و عجم ہیں کیونکہ دونوں صفحہ ارض پر ثَقَل ہیں** ۔

اَثْقَال (ثِقْل کی جمع ہے) وزن ۔ بوجھ ۔ اعمال کے نتائج ۔ (۲۹/۱۳) ۔ سورۃ زِلزال میں ہے وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (۹۹/۲) ۔ "زمین اپنے اَثْقَال کو ابھرے آئیگی۔ باہر نکال دیگی"۔ اس سے مراد زمین کے چھپے ہوئے خزائن و دفائن (معدنیات وغیرہ) بھی ہیں اور بڑے بڑے لوگ بھی۔

مِثْقَال ۔ ہر وہ چیز جس سے کسی چیز کا وزن کیا جائے ۔ چنانچہ ہر باٹ کو مِثْقَال کہہ سکتے ہیں* (۴/۴۰) ۔

ثَقُلَ ۔ بھاری ہونا* ۔ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۷/۱۸۷) ۔ "وہ ارض و سماء میں بھاری ہے"۔ اَثْقَلَتِ الْمَرْاَةُ وَثَقُلَتْ ۔ عورت کا حمل ظاہر ہو گیا* ۔ (۷/۱۸۹)۔ اِثَّاقَلَ ۔ بوجھل ہو کر (زمین کی طرف) جھک جانا ۔ سست ہو جانا ۔ دیر لگا دینا** ۔ (۹/۳۸) ۔

مُثْقَل ۔ بوجھ سے دبا ہوا* (۵۲/۴۰) ۔ مُثْقَلَةٌ (۳۵/۱۸) ۔

سورۃ توبہ میں ہے ۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالاً (۹/۴۱) ۔ جب تمہیں جہاد کیلئے بلایا جائے تو تم چاہے فراخی کی حالت میں ہو یا تنگی کی حالت میں ہر حال میں جہاد کیلئے چل کھڑے ہو ۔ تاج العروس نے جوان اور بوڑھے بھی کہا ہے* ۔ نیز اس کے معنے چست اور سست بھی ہو سکتے ہیں اور سامانِ حرب سے ادھوری یا پوری طرح لیس ہونے والے بھی ۔

ثَقُلَتْ مَتَوا زِیْنُه ، کے لئے دیکھئے عنوان (خ ۔ف ۔ف) ۔

ث ل ث

اَلثُّلُثُ ۔ الثُّلْثُ ۔ ایک تہائی حصہ (⅓ حصہ) فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ (۴/۱۱) ۔ "تو اسکی ماں کے لئے ایک تہائی حصہ ہے"۔ اَلثُّلُثَانِ ۔ دو تہائی ۔

ثَلَّثَ ۔ گھوڑے کا دوڑ میں مُصَلِّی کے بعد تیسرے نمبر پر آنا۔ (مُصَلِّی وہ ہوتا ہے جو پہلے نمبر سے متصل دوسرے نمبر پر آئے) ۔ اَلثَّلاَثَةُ ۔ تین کا عدد ، مذکر (ثَلاَث مؤنث) ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ (۲/۱۹۶) ۔ "تین دن کے روزے (بطور فدیہ)"۔

ثُلاَثَ ۔ تین تین ۔ مَثْنٰی وَثُلاَثَ وَرُبٰعَ ۔ (۴/۳) "دو دو ۔ تین تین ۔ چار چار"۔ اَلثَّلاَثِیْنَ وَالثَّلاَثُوْنَ ۔ تیس (۳۰) ۔

*تاج ۔ **محیط ۔

ث ل ل

اَلثَّلَّۃُ - بہت سی بھیڑیں یا بکریاں۔ اصل میں اون کے ڈھیر کو کہتے ہیں ۔ چونکہ بھیڑ بکریوں پر اون ہوتی ہے اسلئے ان کے ریوڑ کیلئے بھی یہی لفظ بولا جاتا ہے ۔ حَبْلٌ ثَلَّۃٍ ۔ اون کی رسّی ۔ اَلثُّلَّۃُ ۔ آدمیوں کی جماعت* ۔ قرآن کریم میں ہے ثُلَّۃٌ مِنَ الْاَوَّلِیْنَ (۵۶/۱۳) ۔ "پہلوں میں سے ایک بہت بڑی جماعت" ۔

ثَلَّ الدَّارَ ۔ گھر کی دیوار کی بنیاد میں سے مٹی نکال لینا اور پھر اسے دھکا دیکر گرا دینا ۔ بَیْتٌ مَثْلُوْلٌ ۔ منہدم مکان کو کہتے ہیں ۔ اَلثَّلَّۃُ ۔ ہلاکت* ۔ یعنی ڈھیر ہو کر رہ جانا ۔

ث م د

اَلثَّمْدُ ۔ اَلثَّمَدُ ۔ اَلثِّمَادُ ۔ تھوڑا سا پانی جو کہیں جمع ہو جائے اور جسکا کوئی چشمہ نہو ۔ مثلاً بارش کا پانی ۔ اَثْمَدَ الماءَ : بارش کے پانی کو گڑھوں وغیرہ میں محفوظ کیا ۔**

اَلثَّامِدُ کے معنے ہیں چوپایہ یا انسان کا بچہ جو تھوڑا تھوڑا کھانا شروع کردے ۔ یہ اس کی ابتدائی عمر ہوتی ہے ۔

ثَمُوْدُ ۔ محققین علم الاقوام نے دنیا کی قوموں کو تین بڑی بڑی شاخوں میں تقسیم کیا ہے (۱) آریائی (۲) منگولی (۳) سامی ۔ سامی اقوام میں عرب ، آرامی ، عبرانی ، سریانی ، کلدانی وغیرہ شامل ہیں ۔ قرآن نے جن اقوام اور انبیائے کرام کا ذکر کیا ہے وہ سامی اقوام سے متعلق ہیں ۔ تورات کے بیان کے مطابق سام ، حضرت نوح کے ایک بیٹے کا نام تھا ۔ ان کی اولاد سامی کہلاتی ہے ۔ دور حاضرہ کی تحقیق کے مطابق امم سامیہ کا اولین وطن عرب تھا جہاں سے نکل کر وہ بابل ، شام ، مصر وغیرہ تک پھیل گئیں ۔ ان میں سے جنہوں نے اندرون عرب میں حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے مشہور قبیلہ ثمود کا تھا ۔ ثَمْدٌ کے لغوی معنی کے پیش نظر ، بعض کا خیال ہے کہ ان کا نام ثَمُوْد اس لئے تھا کہ ان کے علاقہ میں پانی کی قلت تھی اور یہ بارش کے پانی پر گزارہ کیا کرتے تھے** ۔ یہ قوم عرب کے شمال مغربی علاقہ پر حکمران تھی جسے وادیٔ قریٰ کہتے تھے ۔ حجر ان کا دارالحکومت تھا جو اس قدیم

*تاج ۔ راغب ۔ محیط ۔ **تاج ۔ ***راغب و محیط ۔

راستے پر واقع تھا جو حجاز سے شام کیطرف جاتا ہے ۔ وادیٔ قریٰ کے گرد و پیش کا علاقہ بڑا سرسبز ہے لیکن آتش فشاں مادہ سے لبریز ۔ یہ قوم میدانوں میں وسیع و رفیع محلات تعمیر کرتی اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتی تھی جو فن سنگ تراشی کے نمونے تھے (۷/۷۴ ؛ ۱۵/۸۲) ۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی اس کے لئے سامان رزق زمین کے دستر خوان پر بافراط بچھا دیا تاکہ ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے مطابق لے لے ۔ لیکن مستبد قوتیں رزق کے سر چشموں کو اپنی ملکیت بنا لیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمزور انسان بھوکے مر جاتے ہیں ۔ حضرات انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ رزق کے چشموں کو مستبد قوتوں کے ہاتھوں سے چھڑا کر نوع انسانی کے لئے عام کر دیں ۔

قدیم زمانہ (اور آج بھی صحرا نورد اور بادیہ پیما اقوام) میں پانی کے چشمے اور چراگاہیں رزق کے اولیں ذرائع ہوتے ہیں ۔ قوم ثمود کے ہاں بھی یہی حالت تھی ۔ سرداران قوم نے پانی کے چشموں کو اپنے قبضے میں لے رکھا تھا اور کمزور انسان انکے دست نگر تھے ۔ معاشرہ کے اس فساد کو مٹانے کے لئے ان میں حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے (۷/۷۳) جنہوں نے ان سے کہا کہ وہ ملک میں اس قسم کی ناہمواریاں (فساد) پیدا نہ کریں (۷/۷۴) ۔ کمزور طبقے نے حضرت صالحؑ کا ساتھ دیا لیکن دولت مند طبقہ نے ان کی سخت مخالفت کی (۷/۷۵) ۔ اور آپ کی دعوت کے جواب میں کہا کہ ہمارے ہاں جو مسلک ہمارے اسلاف سے چلا آرہا ہے ہم اس میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہونے دیں گے ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالحؑ کی پوزیشن مستحکم تھی اس لئے انہوں (سرداروں) نے آپ سے معاہدہ کر لیا کہ پانی کے چشموں پر جانوروں کی باریاں مقرر کر دی جائیں اور امیروں اور غریبوں (سب) کے جانور اپنی اپنی باری پر پانی پی لیا کریں ۔ حضرت صالحؑ نے کہا کہ اس بات کے ثبوت کے لئے کہ تم اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہو یا نہیں میں اپنی اونٹنی چھوڑتا ہوں ۔ اگر تم نے اسے اسکی باری پر پانی پی لینے دیا تو سمجھا جائیگا کہ تم اپنی بات کے پکے ہو (۷/۷۳) ۔ لیکن ان مفسدین نے اس اونٹنی کو مار ڈالا اور اسطرح اپنی بات سے پھر گئے (۷/۷۷) ۔ یہ اونٹنی گویا خدا کے قانون کی محسوس علامت تھی ۔ اس لئے اسے نَاقَةُ اللهِ اور آیَةٌ (۷/۷۳) کہا گیا ہے ۔ وہ لوگ عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک رات آتش فشاں پہاڑوں میں دھماکا ہوا ۔ ایک چیخ ۔

ایک گرج - ایک کڑک کی آواز فضا میں گونجی اور قوم ثمود کی بستیاں راکھ کا ڈھیر ہوگئیں (۷/۷۸)-

[اس قوم کی فساد انگیز روش زندگی اور اس حادثہ میں باھمی تعلق کیا تھا - اس کے متعلق میری کتاب " جوئے نور " میں (حضرت نوح کے تذکرہ کے ضمن میں) تفصیل ملیگی]

ث م ر

ثَمَرٌ - درخت کے پھل - ھر قسم کا مال - سونا چاندی - سب کو ثَمَرٌ کہتے ھیں - اَلثَّمْرَۃُ خود درخت کو بھی کہتے ھیں - اور اولاد کو بھی - مَالٌ ثَمَرٌ - کثیر مال ، (جو بہت جلد بڑھ جائے) - ثَمَّرَ النَّبَاتُ کے معنے ھیں پودے نے پھول جھاڑا اور اسکی جگہ پھل نمودار ھوا - ابن فارس نے اس مادہ کی اصل وہ چیز بتائی ھے جو مجتمع شکل میں کسی دوسری چیز سے پیدا ھو ، پھر استعارۃً دوسری چیزوں کو بھی کہدیا جاتا ھے -

قرآن کریم میں یہ لفظ مال و دولت کیلئے بھی آیا ھے - (كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۱۸/۳۴) - شہد کی مکھی کیلئے کہا گیا ھے کہ وہ تمام ثَمَرَاتٌ سے رس چوستی ھے (۱۶/۶۹) - راغب نے لکھا ھے کہ ثَمَرٌ درخت کے تمام ان اجزاء پر حاوی ھے جنکو کھایا اور چکھا جاسکے - اس لئے ثَمَرَات میں پھلوں کے علاوہ پھولوں وغیرہ کے بھی وہ اجزاء شامل ہیں جنہیں کھایا یا چکھا جاسکے -

ثَمَّ

ثَمَّ - یہ ظرف مکان ھے - اوران معنوں میں استعمال ھوتا ھے جن معنوں میں انگریزی میں (There) استعمال ھوتا ھے - یعنے وھاں** - سورۃ بقرۃ میں ھے - فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ[1] (۲/۱۱۵) " تم جسطرف بھی اپنا رخ کروگے وھاں اس راستہ کو اپنے سامنے پاؤگے جو تمہیں خدا کی مقرر کردہ منزل کی طرف لیجائے " - قانون خداوندی زندگی کے ہر گوشے میں مل جائیگا (دیکھئے عنوان و - ج - ہ) - سورۃ شعراء میں ھے وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ (۲۶/۶۴) - " ھم دوسروں کو بھی وھیں قریب لے آئے " - سورۃ الدھر میں ھے اِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا (۷۶/۲۰)" جب تو وھاں دیکھیگا (یا ادھر دیکھیگا) تو نعمتیں نظر آئینگی " - سورۃ تکویر میں ھے مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ (۸۱/۲۱)" وہ مطاع بھی ھے اور اس کے ساتھ ھی امین بھی - "

* (تاج) - ** تاج و لین - [1] - اس آیت میں وجہُ اللہ کے معنی ذاتِ خداوندی بھی ہوسکتے ہیں - لیکن ذاتِ خداوندی ہمارے سامنے اس کی آیات کی رُو سے ہی آتی ہے - آیات اللہ میں قانونِ خداوندی کی حیثیت بنیادی ہے -

(ثَمَّ - فعل بھی ھوتا ھے جسکے مختلف معانی ھیں - مثلاً درست کردینا - پاؤں سے روندنا - جمع کرنا وغیرہ -)

ثُمَّ (حرف)

ثُمَّ - عام طور پر یہ اس مقام پر آتا ھے جہاں کوئی ترتیب بیان کرنا مقصود ھو- جیسے ھم کہتے ھیں کہ پہلے اس نے کھانا کھایا پھر پانی پیا - سورۃ مومنون میں ھے - ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ - (۲۳/۴۲) ''پھر ھم نے ان کے بعد ایک اور نسل پیدا کی،، -

(۲) لیکن ضروری نہیں کہ ثُمَّ ھر جگہ ترتیب کے معنی ھی میں استعمال ھو- یہ وَ (اور) کے معنوں میں بھی استعمال ھوتا ھے - مثلاً سورۃ یونس میں ھے - ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ (۱۰/۴۶)- ''اور اللہ اس پر گواہ ھے جو یہ کرتے ھیں،، - اسکی ایک اور بیّن مثال یہ ھے کہ سورۃ بقرہ میں ھے هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (۲/۲۹)- ''اللہ وہ ھے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ھے - (ثُمَّ) اور وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ھوا - اور انہیں متعدد کُرّوں میں درست کیا،، - اگر یہاں ثُمَّ کے معنی ''پھر،، کئے جائیں تو مطلب یہ ھوگا کہ ترتیب کے لحاظ سے پہلے زمین کو بنایا اور پھر آسمانی کرون کو - لیکن سورۃ نازعات میں پہلے آسمانی کُرّوں کے متعلق ھے - رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا - ''اس نے آسمان کی بلندی کو اونچا کیا اور اسے ٹھیک بنایا،، - اس کے بعد ھے- وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا (۷۹/۳۰) ''اور زمین کو اس کے بعد پھینکا،، - اس سے معلوم ھوا کہ پہلے آسمانی کرون کو مرتب کیا - پھر زمین کو دور پھینکا - (اسکی تائید کہ ان کُرّوں کو چھینٹوں کی طرح اڑایا (۲۱/۳۰) سے بھی ھوتی ھے) - اس سے ظاھر ھے کہ (۲/۲۹) میں ثُمَّ ، ترتیب کے لئے نہیں آیا - لہذا اس کے معنی ھر مقام پر ترتیب کے نہیں لئے جائینگے - کہیں وَ (اور) کے بھی لئے جائینگے -

نیز کہیں یہ زائد ھوتا ھے - مثلاً سورۃ توبہ میں ھے حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ ..... ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ (۹/۱۱۸) - ''یہاں تک کہ جب ان پر زمین باوجود اپنی وسعت کے تنگ ھو گئی - اور وہ خود اپنے آپ سے تنگ آ گئے - اور انہیں یقین ھو گیا کہ اللہ کی سزا سے اللہ کے سوا کوئی بچانے والا نہیں - تو اللہ انکی طرف متوجہ ھوا،، - یہاں ثُمَّ کچھ معنی نہیں دیتا - اسے زائد کہتے ھیں - (''زائد،، کے متعلق کتاب کا پیش لفظ دیکھئے) -

ثُمَّ کے ایک معنیٰ "اس پر بھی، اس کے باوجود بھی" ہوتے ہیں مثلاً يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا (۱۶/۸۳)۔

ث م ن

ثَمَنٌ الشَّیْءِ - وہ کچھ جسے ادا کرنے کے بعد چیز کی ملکیت حاصل ہوجائے - عام طور پر ثَمَنٌ کسی چیز کی اس قیمت کو کہتے ہیں جسپر خریدار اور فروخت کرنے والا باہم راضی ہوجائیں - اور ''قیمت،، اس معاوضہ کو کہتے ہیں جو اس چیز کے فی‌الواقعہ برابر ہو - مَتَاعٌ ثَمِیْنٌ - قیمتی سامان* -

قرآن کریم میں ہے - وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیَاتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (۲/۴۱) ''میری آیات کو تھوڑی سی قیمت کے عوض مت بیچو،، - اس کے یہ معنی نہیں کہ انہیں زیادہ قیمت پر بیچو - کم قیمت پر مت بیچو - مطلب یہ ہے کہ ان کی حقیقی قیمت وهی ہے جو ان پر عمل پیرا ہونے سے ان کے نتائج کی صورت میں ملتی ہے - اس کے علاوہ جو قیمت بهی ہوگی وہ ثمنِ قلیل ہوگی - دین کو ذاتی اغراض و مصالح کے حصول کا ذریعہ بنانا بدترین جرم ہے - مذهبی پیشوائیت کا مدار هی اس پر ہے - چنانچہ قرآن، شیطان کی زبان سے کہلواتا ہے کہ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِکَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا (۴/۱۱۸) ''میں ضرور تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ لونگا،، - اسی کو وہ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا کہہکر پکارتا ہے (۱۰/۹) - یعنی انسان کی طبعی زندگی کے مفاد و متاع جس میں اس کی مستقبل کی زندگی کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا - یہ متاع بہر حال قلیل ہوتی ہے (۴/۷۷) خواہ اسکی مقدار کتنی هی زیادہ کیوں نہ ہو - اس لئے کہ جس متاع سے انسانی ذات کی نشو و نما نہ ہو وہ میزانِ انسانیت میں کچھ وزن نہیں رکھتی - مذهبی پیشوائیت کا باهمی گٹھ جوڑ اسی متاع کے لئے ہوتا ہے - (۲۹/۲۵) - اسی لئے پیشوائیت اور اسلام متضاد تصور هیں -

ثَمَانِیَةٌ - آٹھ (مذکر کے لئے) - ثَمَانِیَةَ اَیَّامٍ (۶۹/۷) - ''آٹھ دن،، -

ثَمَانٍ یا ثَمَانِیْ - آٹھ (مؤنث کے لئے) - ثَمَانِیَ حِجَجٍ (۲۸/۲۷) - ''آٹھ سال،، -

ثَمَانُوْنَ - ثَمَانِیْنَ - اسی - ثَمَانِیْنَ جَلْدَۃً (۲۴/۴) - ''اسی کوڑے،، -

اَلثُّمْنُ - اَلثُّمُنُ - اَلثَّمِیْنُ - کسی چیز کا آٹھواں حصہ -

فَلَهُنَّ الثُّمُنُ (۴/۱۲) - ''ان کے لئے آٹھواں حصہ ہے،، -

---

*تاج و محیط -

مرزا ابوالفضل نے (غریب القرآن میں) سر سید احمد خان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ لفظ کبھی محض فصاحت کلام کیلئے بھی بولا جاتا ہے جسمیں اسکے معنے غیر متناہی کے ہوتے ہیں - یعنی بہت سے)۔

ثمود

دیکھئے عنوان (ث - م - د) -

ث ن ی

ثَنَاہُ - ثَنْیاً - کسی چیز کو دُھرا کرنا یا تہہ کرنا (جیسے کپڑا)۔ یا کسی چیز کو موڑ کر دھرا کرنا (جیسے درخت کی شاخ کو موڑ کر دھرا کر دیا جائے) -

ثَنَی الشَّیْءَ - چیز کو موڑ دیا یا لپیٹ دیا - تَثَنّٰی - چیز مڑ گئی - ثِنْیُ الْحَیَّةِ - سانپ کا بل کھانا - اَلثِّنْیُ مِنَ الْوَادِیْ - وادی کا موڑ۔ اس کی جمع اَلْمَثَانِیْ مِنَ الْوَادِیْ ہے - اَلْمَثَانِیْ مِنَ الدَّابَّةِ - چوپایہ کے گھٹنے اور کہنیاں جو مڑ کر دھری ہو جاتی ہیں* - ثِنَاءٌ - اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کا گھٹنا موڑ کر اس کی ران سے باندھا جاتا ہے** - ثِنْیٌ - وہ چیز جسے دھرایا جائے ، یکے بعد دیگرے بار بار کیا جائے* - اَلْاِثْنَانِ - دو - ایک کا دگنا * - مؤنث اِثْنَتَانِ ، اِثْنَتَیْنِ فَوْقَ اثْنَتَیْنِ (۴/۱۱) - '' دو سے زیادہ '' (عورتیں) -

اَثْنَاءُ الْکَلَامِ - وسط کلام ، - فِیْ اَثْنَاءِ ذَالِکَ - اس درمیان میں -

اِسْتِثْنَاءٌ - کسی کو مستثنیٰ کرنا * - الگ نکال کر رکھ دینا - چنانچہ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) ایک کام کو دوبارہ (مکرر) کرنا اور (۲) ایک چیز کی دو الگ الگ چیزیں بنا دینا ہیں -

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق ہے اَلَآ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ (۱۱/۵) - '' وہ اپنے سینے کو دھرا کئے ہوتے ہیں '' - ایسے تہہ کر لیتے ہیں کہ اوپر کچھ اور دکھائی دے اور نیچے کچھ اور ہو- (Dual Personality) - سورۃ حج میں کتاب اللہ سے اعراض برتنے والے اور گریز کی راہیں نکالنے والے کے متعلق کہا گیا ہے ثَانِیَ عِطْفِهٖ (۲۲/۹) - '' وہ

*تاج - **لین - ***محیط -

اپنی گردن موڑ کر چل دیتا ہے۔ اعراض برتتا ہے" سورۃ القلم میں ہے کہ تباہ ہونے والے سرمایہ پرست لَا یَسْتَثْنُوْنَ (۱۸/۶۸) ۔ " دوسروں کا حق نکال کر الگ نہیں رکھتے تھے" یعنی سب کا سب اپنے لئے رکھ لیں گے۔ اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں چھوڑیں گے۔

سورۃ الحجر میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (۱۵/۸۷)۔ "ہم نے تجھے سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِیْ اور اَلْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ عطا کیا"۔ اَلْقُرْاٰنُ الْعَظِیْمُ خدا کے مقرر کردہ بنیادی اصول ہیں جن کے مطابق اعمال اپنا اپنا نتیجہ مرتب کرتے ہیں (دیکھئیے عنوان ع۔ظ۔م)۔ اور اَلْمَثَانِیْ وہ تاریخی حقائق ہیں جو اپنے آپ کو دھراتے رہتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ ایک تو ان بنیادی اصولوں کو بیان کر دیا جن کی رو سے قوموں کو عروج و زوال حاصل ہوتا ہے (یعنی قرآن کریم) اور اس کی تائید میں وہ متعدد تاریخی شواہد بیان کر دئے جو ہر زمانہ میں بار بار سامنے آتے ہیں۔ قرآن کی ابدی صداقتوں کے پرکھنے کا ایک اہم طریق یہ بھی ہے کہ تاریخ میں دیکھا جائے کہ فلاں قوم نے جب وہ روش اختیار کی جسے قرآن حق کی روش قرار دیتا ہے تو اس کے نتائج کیا بر آمد ہوئے اور جس قوم نے باطل کی روش اختیار کی تو اس کے ہواقب کیا ہوئے۔ (مزید تفصیل کیلئے مُحْکَمَاتٌ اور مُتَشَابِهَاتٌ کی بحث دیکھئیے۔ عنوان (ح۔ک۔م) کے تحت)۔

سورۃ زمر میں قرآن کریم کے متعلق ہے کِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِیَ (۳۹/۲۳)۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، مَثَانِیَ کے معنے ہیں وہ چیزیں جو ایک دوسرے کے سامنے آ جائیں۔ (جیسے چوپاؤں کے گھٹنے اور کہنیاں جو مڑ کر ایک دوسرے کے سامنے آ جاتی ہیں)۔ اور مُتَشَابِهًا کے معنے ہیں آپس میں ملتی جلتی۔ قرآن کی ساری تعلیم، یہاں سے وہاں تک، ایک دوسرے سے ملتی جلتی چلی جاتی ہے۔ اس میں کہیں تضاد نہیں۔ تخالف نہیں۔ لیکن اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ متضاد چیزوں کو آمنے سامنے لا کر بات صاف کر دیتا ہے۔ مثلاً ظُلُمَٰت کے مقابلہ میں نُوْر۔ حَیَات کے مقابلہ میں مَوْت۔ اِیْمَان کے مقابلہ میں کُفْر۔

یعنی متضاد چیزوں کو آمنے سامنے لا کر مطلب کی وضاحت کر دینا) لہذا قرآن مُتَشَابِهٌ بھی ہے اور مَثَانِیْ بھی۔ ایسی کتاب جس کی ایک کڑی

دوسری کڑی سے ملتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے لیکن جس کے مطالب کو متضاد چیزوں کو آمنے سامنے لا کر واضح کیا گیا ہے ۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان (ش ۔ ب ۔ ہ) اور (ح ۔ ک ۔ م) ۔

مَثْنیٰ ۔ دو، دو (۴/۳) ۔ (نیز ۲/۳) اِثْنَا عَشَرَ (مذکر) اِثْنَتَا عَشْرَةَ (مؤنث) (۳/۵) بارہ ۔ کِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم پہلی کتابوں کے متشابہ ہے اور اصولاً ان کی تکرار ۔

ث و ب

ثَابَ ۔ یَثُوْبُ ۔ ثَوْبًا ۔ چلے جانے کے بعد پھر واپس آ جانا ۔ ثَابَ جِسْمُهٗ ثَوَبَانًا وَاَثَابَ ۔ اسکا جسم بیماری کے بعد پھر اپنی اصلی حالت پر آنے لگا، اور اسطرح ضائع شدہ توانائی اور صحت پھر عود کر آئی* ۔ ثَابَ الْمَاءُ ۔ پانی نکالے جانے کے بعد پھر اتنا ہی آ گیا ۔ بحال ہو گیا** ۔ اَلثَّائِبُ مِنَ الْبَحْرِ ۔ جزر کے بعد سمندر کا بچ رہنے والا پانی ۔ بِئْرٌ ثَیِّبٌ ۔ وہ کنواں جسمیں دوبارہ پانی پلٹ آئے اور جمع ہو جائے* ۔ کتاب الاشتقاق میں ہے کہ ثَابَ یَثُوْبُ کے معنی رَجَعَ (واپس آ جانے) کے ہیں ۔ کُلُّ رَاجِعٍ ثَائِبٌ ۔ ہر واپس آنے والے کو ثائب کہا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں ۔

مَثَابَةُ الْبِئْرِ ۔ جہاں تک کنویں کا پانی پہنچ رہا ہو۔ اَلْمَثَابَةُ وہ مقام جہاں بار بار رجوع ہوا جائے ۔ مرجع ۔ مکان ۔ منزل ۔ ثَابَ النَّاسُ لوگ جمع ہو گئے* ۔

اَلثَّوْبُ ۔ کپڑے کو کہتے ہیں (غالباً اسلئے کہ اسکے بننے میں نال بار بار آتی اور جاتی ہے) اسکی جمع ثِیَابٌ ہے ۔ ثَوَّابٌ ۔ کپڑا بیچنے والا* ۔ عرب عام طور پر ثِیَابٌ کے لفظ سے انسان کی شخصیت مراد لیتے ہیں ۔ یعنے خود کپڑے پہننے والا ۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں فُلَانٌ دَنِسُ الثِّیَابِ ۔ یعنے وہ شخص بڑی خبیث فطرت کا ہے ۔ اسکی شخصیت بڑی خراب ہے* ۔

اس اعتبار سے کہ خود ثَابَ کے معنے جمع ہونے کے ہیں ۔ اور اسلئے بھی کہ عربوں میں جب لوگوں کو جمع کرنا مقصود ہوتا تو ایک آدمی کسی اونچی جگہ کھڑا ہو کر کپڑا ہلاتا ، تَثْوِیْبٌ کے معنے ہیں لوگوں کو آواز دیکر بلانا ، اکٹھا کرنا ۔ چنانچہ صبح کی نماز میں اَلصَّلٰوةُ خَیْرٌ مِنَ النَّوْمِ پکارنے کو تَثْوِیْبٌ کہتے ہیں** ،

---

* تاج و محیط ۔ نیز ابن قتیبہ (القرطین ج/۲ صفحہ ۱۹۰) ۔ **تاج ۔

ثَابَ یَثُوبُ۔ کے ان بنیادی معنوں کو سامنے لائیے (جن کا شروع میں ذکر آیا ہے) ۔ اس سے ثَوَابٌ کا صحیح مفہوم سمجھ میں آ جائیگا۔ ثَابَ کے معنے ہیں جو چیز چلی جائے اسکا پھر سے واپس آ جانا ۔ آپ جو کام بھی کرتے ہیں اسمیں آپکا کچھ نہ کچھ صرف ہوتا ہے ۔ اگر اور کچھ صرف نہ ہو تو بھی آپکے جسم کی توانائی ۔ وقت اور ذہن کی صلاحیتیں صرف ہوتی ہیں۔ اگر آپکا وہ کام بیکار ہے تو آپکی یہ سب توانائیاں (جو آپنے صرف کی ہیں) ضائع چلی جاتی ہیں ۔ لیکن اگر وہ کام نتیجہ خیز اور صلاحیت بخش ہے تو آپنے جو کچھ صرف کیا ہے وہ سب آپکو واپس مل جاتا ہے ۔ اس (Restoration) کا نام ثَوَابٌ ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز محض ذہنی یا خیالی نہیں ہو سکتی کہ ثواب ہو اور آپ کو محسوس ہی نہ ہو کہ کچھ ہؤا ہے یا نہیں ۔ آپ جو کچھ صرف کرتے ہیں اسکا آپکو پورا پورا احساس ہوتا ہے (خواہ وہ وقت یا جسم یا ذہن کی توانائی ہی کیوں نہو) اسلئے جو کچھ آپکو واپس ملے (Restore ہو) اسکا بھی آپکو احساس ہونا چاہئے ۔ ورنہ آپکو معلوم کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ واپس مل گیا ہے یا نہیں ۔ اسی لئے قرآن کریم نے جہاں ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ (۳/۱۴۴) کہا ہے ۔ یعنے وہ بازیابی (واپسی) جو انجام کار (یا بعد کی زندگی میں) ملے ، اسکے ساتھ ہی ثَوَابَ الدُّنْیَا (۳/۱۴۷) بھی کہا ہے ۔ یعنے اسی دنیا کی زندگی میں بازیابی ۔ نتیجہ خیزی ۔ اور اس خیال سے کہ کسی کو غلط فہمی نہ رہے کہ یہ ثَوَابٌ کس شکل میں ملیگا اسکی تفصیل میں بتا دیا کہ یہ ثواب، سرداری و سر بلندی کے نشانات، دبیز اور لطیف ریشمی ملبوسات اور سر فرازیوں کی نشست گاہیں ہیں ۔ (۱۸/۳۱) ۔ قرآن نے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا حتمی اور یقینی نتیجہ اِس دنیا کی حکومت اور سطوت بھی بتایا ہے ۔ (۲۴/۵۵) ۔ اس لئے ثَوَابٌ (نتائجِ اعمال) سب سے پہلے اسی دنیا میں سامنے آ جانے چاہئیں ۔ اس کے بعد اُخروی زندگی میں بھی ۔ چونکہ زندگی کی یہ تمام آسائشیں اور خوشگواریاں اور انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما اور ارتقاء ، اعمال صالحہ کا نتیجہ ہوتے ہیں، اس لئے ثَوَابٌ کے معنے اعمال کا نتیجہ بھی ہیں ۔ یعنے قانون مکافات کی رو سے اعمالِ انسانی کا نتیجہ مرتب ہونا ۔ عام طور پر اچھے نتائج کیلئے ہی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات غلط کاموں کے خراب نتائج کیلئے بھی اسکا استعمال ہوتا ہے، (مثلاً ۳/۱۵۲ اور ۸۳/۳۶ میں) ۔ یعنے انسان نے جو کچھ کیا ہے اسکا اسکی طرف لوٹ کر آ جانا ۔ اس کی (Return) ۔ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۸۳/۳۶) ۔ ''کفار کے اعمال ہی نتیجہ بنکر انکی طرف لوٹ کر آ جاتے

ھیں،،۔ قرآن کریم نے مکافات عمل کے ضمن میں یہ بڑا باریک نکتہ بیان کیا ہے کہ اعمال خود اپنی جزا آپ ہوتے ہیں۔ خود عمل کے اندر اسکا نتیجہ مضمر ہوتا ہے ۔ آپ صبح کے وقت سیر کیلئے جاتے ہیں ۔ دو تین میل کا چکر لگاتے ہیں ۔ اس سے آپکی طاقت خرچ ہوتی ہے ۔ وقت بھی صرف ہوتا ہے ۔ لیکن اس سے آپکو صحت و توانائی، شگفتگی اور بشاشت حاصل ہوتی ہے ۔ یہ صحت اور بشاشت کیا ہے ۔ آپکی سیر کا نتیجہ ہے ۔ یعنے آپکی سیر کا عمل خود اپنا آپ نتیجہ بن گیا ہے ۔ اسے ثَوَابٌ کہتے ہیں ۔ ثَوَابٌ کے اس مفہوم کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جس چیز کو اِیْصَالِ ثَوَاب کہتے ہیں وہ کسقدر غیر قرآنی تصور ہے ۔ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ سیر تو آپ کریں اور اس سیر کا نتیجہ آپ میری طرف منتقل کر دیں ؟ یہ ناممکن ہے ۔ اگر آپ سیر کرتے ہیں تو آپ ہی کی صحت ٹھیک ہوگی ۔ اگر میں سیر نہیں کرتا تو آپکا سیر کرنا میرے کسی کام نہیں آ سکتا۔ آپ ہزار چاہیں لیکن اس سیر کا نتیجہ (ثَوَابٌ) آپ کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتے ۔ اس لئے آپکا کسی دوسرے کو ثواب پہنچانا ایک موہوم عقیدہ ہے جسکا حقیقت (قرآن) کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ۔ ہر شخص کو اس کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ملتا ہے ۔ ہر عمل کا اثر انسان کی اپنی ذات پر ہوتا ہے اس لئے اس کے (کسی دوسرے کی طرف) منتقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

مَثُوْبَةٌ (۵/۶۰) بدلہ یا مکافات عمل کیلئے آیا ہے ۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ (۷۴/۴) ۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ثِیَابٌ کے معنے انسانی شخصیت اور سیرت و کردار کے ہیں ۔ (چنانچہ خود قرآن میں دوسرے مقامات پر یہ لفظ انسانی شخصیت یا قلب و دماغ کیلئے استعمال ہوا ہے ۔ مثلاً (۱۱/۵ و ۷۱/۷) ۔ اسلئے اسکے معنے یہ بھی ہیں کہ اپنی سیرت و شخصیت کو پاکیزہ رکھو ۔ اور اگر تَثْوِیْبٌ کے مفہوم کو سامنے رکھا جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اپنی دعوت کو ان لوگوں سے پاک اور صاف (یا دور دور) رکھو جو دل میں نفاق وغیرہ کی خباثتیں لئے ہوں ۔ لہذا اسمیں سیرت و شخصیت یا دعوت اور پکار کی پاکیزگی اور بلندی کا حکم ہے ۔ نہ کہ کپڑوں کو صاف رکھنے کا ۔

(ثَوَابٌ کے ایک اور مفہوم کیلئے لفظ سُدًی دیکھئے) ۔

ث و ر

اَلثَّوَرَانُ ۔ ہیجان کو کہتے ہیں۔ ثَارَ الشَّیْءُ ۔ اس چیز میں ہیجان پیدا ہوگیا ۔ ثَارَ الْغُبَارُ ۔ غبار اوپر کو اٹھا اور پھیل گیا۔ قَدْ ثَارَ ثَائِرُہٗ

وہ شخص غضبناک ہو گیا ۔ آثَارَۃٌ و ثَوَّرَۃٌ و اسْتِثَارَۃٌ ۔ اسنے اسے بھڑکا دیا ۔ برانگیختہ کر دیا ۔ آثَارَ الْاَرْضَ ۔ زمین میں ھل چلا کر اسکی مٹی کو الٹ پلٹ دیا* ۔ سورۃ عادیات میں ہے فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا (۱۰۰/۴) ۔ "وہ گھوڑے اپنے سموں کو زمین پر مار کر گرد اڑاتے ھیں" ۔

سورۃ بقرہ میں ہے لَا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ (۲/۷۱) ۔ "اس بیل کو ابھی ھل میں نہیں جوتا گیا" ۔ سورۃ روم میں ھواؤں کے متعلق ہے فَتُثِیْرُ سَحَابًا (۳۰/۴۸) ۔ "وہ بادلوں میں ھیجان پیدا کر کے انہیں اوپر اٹھاتی ھیں" ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے اوپر اٹھنے کے ہوتے ھیں ۔

ث و ی

ثَوَی الْمَکَانَ ۔ کسی جگہ دیر تک ٹھہرا ، وھاں مستقل اقامت کے لئے اترا ، ۔ اَلْمَثْوٰی ۔ اقامت گاہ ۔ قرار گاہ ۔ وہ جگہ جہاں مستقل طور پر رھا جائے ۔ منزل ۔ اَبُوْ مَثْوَی ۔ مہمان ، میزبان ، صاحب خانہ ۔ اَلثَّوِیُّ ۔ مہمان ۔ نیز وہ کمرہ جیسے مہمان کیلئے تیار کیا جائے ۔ اَثْوَاہُ ۔ اسکی مہمانی کی ، اَلثَّوِیَّۃُ ۔ گھر کے ارد گرد اونٹوں کے آرام کرنے کی جگہ (نیز دیکھئے عنوان ا ۔ و ۔ ی) ۔ اسے اَلثَّوِیَّۃُ بھی کہتے ھیں** ۔ سورۃ قصص میں ہے وَمَا کُنْتَ ثَاوِیًا فِیْ اَھْلِ مَدْیَنَ (۲۸/۴۵) ۔ "تو اھل مدین میں قیام پذیر نہیں تھا" ۔ سورۃ یوسف میں ہے ۔ اَکْرِمِیْ مَثْوٰیہُ (۱۲/۲۱) ۔ "اسے باعزت طریق سے رکھو" ۔ اسے اپنے ھاں عزت کی جگہ دو ۔ اس مادہ میں مستقل اقامت اور مہمانی کا مفہوم یہ بتارھا ہے کہ عزیز مصر نے پہلے ھی حضرت یوسفؑ کو باعزت مہمان کی حیثیت دیدی تھی اور انہیں عام غلاموں کی طرح نہیں رکھا گیا تھا ۔ سورۃ آل عمران میں ہے بِئْسَ مَثْوَی الظّٰلِمِیْنَ (۳/۱۵۰) "سرکشوں کی قرار گاہ (جہنم) کیا ھی بری ہے" ۔

ث ی ب

اَلثَّیِّبُ ۔ اس عورت کو کہتے ھیں جو کسی وجہ سے شوہر سے الگ ہوچکی ہو (خواہ بیوگی کی وجہ سے یا طلاق کی وجہ سے) * ۔ قرآن کریم میں ثَیِّبٰتٍ بمقابلہ اَبْکَارٌ آیا ہے ۔ اَبْکَارٌ کے معنے کنواری عورتوں کے ھیں ۔(۶۶/۵)۔

بِئْرٌ ثَیِّبٌ ۔ وہ کنواں جس کا پانی ختم ہوجانے کے بعد اس میں دوبارہ پانی آجائے ۔

ثَیَّبَتِ الْمَرْاَۃُ و تَثَیَّبَتْ ۔ عورت بیوہ ہو گئی* ۔

---

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔ نیز لطائف اللغۃ ۔

ج

ج أ ر

جُؤَارٌ - اس کے بنیادی معنی زور سے پکارنے اور آواز نکالنے کے ھیں (خواہ انسان کی طرف سے ھو یا حیوان کی طرف سے) مثلاً بلند آواز سے دعا کرنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ھوگا اور گائے وغیرہ کے بولنے کے لئے بھی۔ الجُؤَارُ بمعنی خُوَارٌ (بیل کا ڈکارنا) بھی ھے۔ اسی سے جَأَرَ الدَّاعِی یَجْأَرُ کے معنی ھیں دعا کے ساتھ آواز بلند کرنا۔ جَأَرَ الرَّجُلُ اِلَی اللہِ۔ وہ خدا کے سامنے دعا کے ساتھ گڑگڑایا* دعا اور تضرع و زاری میں افراط کے موقع پر بولتے ھیں**۔

قرآن کریم میں ھے کہ جب تمھیں مصیبت پڑتی ھے تو اِلَیْہِ تَجْئَرُوْنَ (۱۶/۵۳) "تم چیختے چلاتے۔ گڑگڑاتے ھوئے خدا سے ھی فریاد کرتے ھو،،۔

جَالُوْتُ

جَالُوْتُ۔ یہ عجمی لفظ ھے***۔ فلسطین میں ایک سرکش سردار تھا جسے حضرت داؤدؑ نے قتل کیا تھا (۲/۲۵۱)۔ اس کا عبرانی تلفظ جَلْیَات ھے****۔ بعض کا خیال ھے کہ یہ جَالَ سے ھے اور جَالَ فِی الْحَرْبِ کے معنی ھیں اس نے جنگ میں شدت سے حملہ کیا۔ انگریزی میں اسے (Goliath) کہتے ھیں۔

ج ب ب

اَلْجَبُّ۔ اَلْجِبَابُ اَلْاِجْتِبَابُ۔ کاٹ ڈالنا۔ قطع کر دینا۔ اَلْجُبُّ۔ کنواں۔ بہت گہرا کنواں۔ وہ کنواں جو پختہ یا لپا ہوا نہ ھو۔

* تاج۔ ** راغب۔ *** تاج و راغب۔ **** محیط۔

یہ اس وقت جُب* کہلاتا ہے جب وہ ایسی حالت میں پایا جائے کہ اسے لوگوں نے کھود کر خاص طور پر تیار نہ کیا ہو، بلکہ کھائی سی بنی ہوئی ہو یا گڑھا سا کھُدا ہوا ہو* (از خود بن جانے والا کنواں جسے خاص طور پر تیار نہ کیا گیا ہو)۔ ایسا ہی کنواں تھا جس میں برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف کو ڈالا تھا (۱۲/۱۰)۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ ایسے گڑھے اور کھائی کو بھی کہتے ہیں جس کی تہ اور آخری حد معلوم نہ ہو۔

راغب نے لکھا ہے کہ یہ ایسے کنوئیں کو کہتے ہیں جو سخت زمین میں کھودا جاتا ہے۔

ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے دوسرے بنیادی معنی چیزوں کا جمع کرنا ہیں - اس اعتبار سے اَلْجُبَّةُ لباس کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سارے جسم کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے - لیکن صاحب تاج العروس نے کہا ہے کہ اَلْجُبَّةُ اس لباس کو کہتے ہیں جو کپڑے کے کٹے ہوئے ٹکڑوں کو سی کر بنا لیا جائے -

ج ب ت

اَلْجِبْتُ - تاج العروس میں اسکے معنے، بُت - ساحر - کاہن کے لکھے ہیں - نیز شعبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اسکے معنے سحر کے ہیں - اسکی اصل اَلْجِبْسُ بتائی گئی ہے جسکے معنے ہر اس چیز کے ہیں جسمیں کوئی بھلائی نہو** - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ لفظ سریانی الاصل ہے جسکے معنے مُتَجَوِّف (یعنی کھوکھلی شے) کے آتے*** ہیں - اسکے بعد ہر خالی اور کھوکھلی چیز کیلئے استعمال ہونے لگا*** - صاحب المنار نے بھی اسکی تائید کی ہے**** -

قرآن میں اہل کتاب کے متعلق ہے - یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ (۴/۵۱) طاغوت انسانوں کے خود ساختہ قوانین اور ان قوانین کو نافذ کرنے والی قوتیں - اور جِبْت* ہر بے حقیقت اور بے معنے چیز - توہم پرستیاں - رسومات جن میں روح باقی نہ رہی ہو - جو اندر سے کھوکھلی (مُتَجَوِّف) ہو چکی ہوں - جو قوم بھی خدا کیطرف سے دئے ہوئے الدین کو چھوڑ دیتی ہے وہ جبت اور طاغوت کو اپنا ''معبود،، بنا لیتی ہے -

ج ب ر

اَلْجَبْرُ - اس کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کی اسطرح اصلاح کرنا کہ اس میں کچھ قوت صرف کرنی پڑے - چنانچہ ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے کے لئے جو لکڑیاں (Splints) اوپر اور نیچے رکھی جاتی ہیں انہیں اَلْجِبَارَۃُ،

*تاج و محیط - **تاج - ***محیط - ****تفسیر المنار جلد ۵ صفحہ ۱۵۶ -

اور اسطرح ھڈی جوڑنے کو جَبَرًا لعَظَمَ، کہتے ھیں۔ اَلْجَابِرُ۔ ٹوٹی ہوئی ھڈیوں کو جوڑنے والا*۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ھے کہ ج۔ب۔ر اپنی مختلف تراکیب میں قوت اور شدت کے مفہوم کو ظاھر کرتے ھیں۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ بنیادی طور پر اس کے اندر عظمت۔ بلندی اور استقامت کا مفہوم پایا جاتا ھے۔ اَلْجَبَّارُ۔ خدا کی صفت ھے۔ یعنے کائناتی نظام یا انسان کی ہر شکستگی کو قوانین کی (Splints) میں رکھکر جوڑنے والا۔ اس سے اسکے معنے ضرورتوں سے بے نیاز کر دینے کے بھی آتے ھیں۔ مثلاً کہتے ھیں جَبَرَ اَلْفَقِیْرَ مِنَ الْفَقْرِ۔ اسنے محتاج کو اسکی ضرورتوں سے بے نیاز کر دیا۔ تَجَبَّرَالشَّجَرُ۔ درخت سر سبز ہو گیا۔ تَجَبَّرَا لْمَرِیْضُ۔ مریض کی حالت سدھری۔ ان مثالوں سے خدا کی جَبَّارِیَّت (جَبَرُوْت) کا مفہوم واضح ھو جاتا ھے۔ یعنے یہ بھی اسکی ربوبیت اور رحمانیت ھی کا ایک پہلو ھے البتہ اسمیں انسان کو قانون کی حدود میں گھیر کر چلانا مقصود ہوتا ھے۔ لیکن جب انسانی قوتیں قوانین خداوندی کی حدیں توڑ کر سرکش ہو جاتی ھیں تو یہ جوئبار سیلاب بلاانگیز بن جاتی ھے۔ اسلئے اس حالت میں جَبْرٌ کے معنے استبداد اور جَبَّارٌ کے معنے مستبد۔ ظالم۔ سرکش اور حد سے بڑھ جانے والا ہونگے۔ چنانچہ قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کا قول ھے وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا (۱۹/۳۲)۔ ”خدا نے مجھے مستبد، سرکش اور بدبخت نہیں بنایا“۔ اور سورۃ ق میں نبی اکرمؐ کے متعلق ھے وَمَآ اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِجَبَّارٍ (۵۰/۴۵)۔ ”تو ان پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے والا نہیں ھے“۔ جبراً کوئی بات منوانے والا نہیں ھے۔ قوم عاد کے متعلق ھے اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِیْنَ (۲۶/۱۳۰)۔ ”جب تم کسی کو پکڑتے ھو تو نہایت مستبد انداز سے پکڑتے ہو۔“ ویسے عام قوی ھیکل لوگوں کے لئے بھی یہ لفظ آیا ھے (۵/۲۲)۔ اسلئے کہ اَلْجَبَّارُ مِنَ النَّخِیْلِ اس لمبی کھجور کو کہتے ھیں جس تک کسی کا ھاتھ نہ پہنچ سکے۔

آپ نے غور کیا کہ انسان کی کوئی قوت نہ بجائے خویش خیر ھے نہ شر۔ یہ اس کا مقصد استعمال، یعنی جس مقصد کے حصول کے لئے اس قوت کو استعمال کیا جائے اسے خیر یا شر بنا دیتی ھے۔ اگر قوت کو ٹوٹی ہوئی ھڈی کے جوڑنے کے لئے استعمال کیا جائے تو وہ خیر ھے اور اگر اسے کسی مظلوم کی ھڈی توڑنے کے لئے صرف کیا جائے تو وہ شر ھے۔ ظلم روکنے والا ”جبّار“ نوع انسان کے لئے آیۂ رحمت ھے، اور ظلم کرنے والا ”جبّار“ موجب عذاب۔

* تاج و محیط و راغب۔

جِبْرِیْلُ

جِبْرِیْلُ - عبرانی لفظ ہے - قرآن کریم میں اس سے مراد خدا کی وہ قوت ہے جو قلبِ نبویؐ پر وحیِ خداوندی کا القاء کرتی تھی - فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۲/۹۷) - ”اس نے اللہ کے قانون کے مطابق اسے تیرے قلب پر نازل کیا“ - اسے رُوْحُ الْقُدُسِ (۱۶/۱۰۲) - اور رُوْحُ الْاَمِیْنِ (۲۶/۱۹۳) بھی کہا گیا ہے - لفظ جبریل، دوبار سورۃ بقرہ میں (۲/۹۷،۹۸) اور ایک بار سورۃ تحریم میں آیا ہے (۶۶/۴)- چونکہ کوئی غیر نبی وحی کی ماہیت کو سمجھ نہیں سکتا (کیونکہ وحی اس علم کا نام ہے جسکا سرچشمہ انسانی ادراک سے ماوراء ہے) اسلئے ہم نہیں جان سکتے کہ جِبْرِیْلُ کی ماہیت کیا ہے - ہمارا واسطہ اس وحی سے ہے جو قرآن کے اندر ہے اور اسکا مفہوم ہم سمجھ سکتے ہیں - اس قوت (رُوْحٌ) کو قُدُسٌ اور اَمِیْنٌ کہنے سے مطلب یہ ہے کہ وحیِ خداوندی میں (جو قلبِ نبویؐ پر نازل کی جاتی ہے) نہ کسی قسم کی آمیزش ہوتی ہے ، نہ خیانت - نہ اس میں نبی کے اپنے جذبات کا کوئی شائبہ ہوتا ہے (مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی - ۵۳/۳) - نہ وہ اس میں کسی قسم کی خیانت کرتا ہے (۳/۱۶۰) - اور نہ ہی کوئی کائناتی قوت وحی میں کسی قسم کی دخل اندازی کر سکتی ہے - وحی میں آمیزش اور خیانت رسول کے بعد اس کے دین کے دشمن کرتے ہیں (خواہ وہ اپنے ہوں یا بیگانے) لیکن قرآن کریم کے الفاظ میں نہ کوئی آمیزش کر سکتا ہے نہ خیانت - اس لئے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خدا نے خود لے رکھی ہے -

ج ب ل

اَلْجَبَلُ - پہاڑ - قوم کا سردار یا عالم - (جمع جِبَالٌ) * - سورۃ انبیاء میں ہے وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ (۲۱/۷۹) ہم نے اس قوم کے بڑے بڑے لوگوں کو داؤد (کے مقصدِ زندگی کی تکمیل کیلئے) تابع فرمان کر دیا - یہی معنی (۳۴/۱۰) - میں ہیں - اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ حضرت داؤد** پہاڑوں کو مسخر کرکے اپنے مصرف میں لاتے تھے - سورۃ کہف میں اَلْجِبَالُ - بمقابلہ اَلْاَرْضُ آیا ہے - (۱۸/۴۷) - اسمیں بھی جِبَالٌ سے مراد سرداران قوم ہیں اور اَرْضٌ سے مراد قوم کا نچلا طبقہ - اَلْجِبِلُّ وَ الْجِبِلَّةُ -

* تاج - ** حضرت داؤدؑ کے پہاڑوں کو مسخر کرنے کے سلسلہ میں مزید دیکھیں عنوان (ا - د - ب) تتمہ میں صفحہ ۱۸۱۳ پر جلد چہارم۔

انسانوں کی بڑی جماعت *۔ (۳۶/۶۲) ۔ بڑی جماعت،*۔ (۲۶/۱۸۴) ۔ الجِبِلَّةِ ۔ کسی شے کی کثرت ۔ مستحکم عادت ۔ طبیعت ۔ خلقت **۔ ابنِ فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا بلند ہونا اور اس کے ساتھ ہی اس کے اجزا کا ایک دوسرے کے ساتھ مستحکم طور پر اکٹھے ہونا ہیں ۔ لہذا جِبَال ٌ میں بلندی و سرفرازی اور قوت و جمعیت دونوں شامل ہونگی ۔

واضح رہے کہ جَبَلٌ کے لغوی معنی پہاڑ کے ہیں اوراس کے مجازی معنی سردارِ قوم کے ہیں ۔ قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں (سیاق و سباق کو دیکھکر) متعین کیا جاسکتا ہے کہ اسے لغوی معنوں میں کہاں استعمال کیا گیا ہے اور مجازی معنوں میں کہاں ۔

ج ب ن

اَلْجُبْنُ ۔ بزدلی ۔ دل کا کمزور ہو جانا ۔ نیز اس کے معنی پنیر بھی ہیں۔ اَلْجَبِيْنَانِ ۔ پیشانی کے دونوں طرف کے کنارے جو بھووں کے بعد سے شروع ہوکر سر تک چلے جاتے ہیں اور جن کے اندر پسٹ پسڑیاں آجاتی ہیں ۔ اس کا واحد اَلْجَبِيْنُ ہے ۔ پیشانی (جَبْهَةٌ) ان دونوں جبینوں کے درمیان میں ہوتی ہے ***۔

قرآنِ کریم میں قصہ حضرت ابراهیمؑ و اسمٰعیلؑ کے ضمن میں ہے وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ (۳۷/۱۰۳) ۔ ابراهیمؑ نے اسمٰعیل کو پٹ پڑی کے بل لٹا دیا ۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ قصاب بکرے کو ذبح کرنے کیلئے ایک پہلو پر (یعنے کن پٹی کے بل لٹاتا ہے ۔ اس سے ذبح کرنے میں آسانی ہوتی ہے ۔ قرآن کے اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت ابراهیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو اسی طرح لٹایا تھا ۔

ج ب ہ

اَلْجَبْهَةُ ۔ پیشانی ۔ اسکی جمع جِبَاهٌ ہے ۔ جَبْهَاءُ ۔ کشادہ ، حسین اور بلند پیشانی والی عورت * ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس مادہ کے اصلی معنے بلند اور لمبا ہونا ہیں **۔

قرآن میں ہے جِبَاهُهُمْ (۹/۳۵) ان کی پیشانیاں ۔

---

* تاج ۔ **محیط ۔ *** تاج و محیط و راغب

ج ب و (ی)

جَبَی الْخَرَاجَ وَ الْمَالَ ۔ خراج اورمال جمع کیا ۔ جَبَی الماءَ فِی الحَوْضِ ۔ حوض میں پانی جمع کیا ۔ اصل معنے اس مادہ کے جمع کرنے یا جمع ہوجانے کے ہیں*۔ سورۃ قصص میں ہے یُجْبیٰ اِلَیْہِ ثَمَرَاتُ (۲۸/۵۷) ۔ حرم کعبہ کی طرف ہر قسم کے پھل کھنچکر چلے آتے ہیں اور جمع ہو جاتے ہیں۔

جَبًا ۔ تالیف کرنا یا جمع کرنا ۔ سورۃ اعراف میں ہے وَاِذَا لَمْ تَاْتِہِمْ بِاٰیَۃٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَیْتَہَا (۷/۲۰۳) ۔ ''جب تو انکے پاس کوئی آیت (قرآنی) نہیں لاتا تو یہ کہتے ہیں کہ تو خود ہی انہیں تالیف کیوں نہیں کرلیتا'' ۔ یعنی تو ادھر ادھر کی باتوں میں سے چن کر ایک آیت کیوں نہیں بنالیتا ۔ کفار، قرآن کے متعلق یہ تصور رکھتے تھے کہ اسے رسول اللہؐ نے (معاذاللہ) ادھر ادھر سے اکٹھا کرلیا ہے ۔ اب بھی مستشرقین حضورؐ کے متعلق کچھ اسی قسم کے خیالات پیش کرتے رہتے ہیں ۔ اسکی وجہ یا تو نبوت کے متعلق ان کی بے خبری ہے یا تعصب ۔ دونوں صورتوں میں ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ پر ان کی اس قسم کی تصانیف کا بڑا برا اثر پڑتا ہے ۔

اَلْاِجْتِبَاءُ ۔ جہاں سے مال مل سکتا ہو وہاں سے مال نکالنا اور جمع کرنا ۔ (یعنی خراج کے مال کو اسطرح وصول کرنا) ۔ اس سے اسکے معنے بطور انتخاب جمع کرنا ہیں ۔ یعنی چن کر اکٹھا کرنا* ۔ اَللّٰہُ یَجْتَبِیْ (۳/۱۷۸) ۔ ''اللہ چن لیتا ہے'' ۔ جبی الماء فی الحوض کے لئے مزید دیکھیں تتمہ صفحہ ۱۸۴ جلد چہارم

ج ث ث

اَلْجَثُّ ۔ درخت کو جڑ سے کاٹ دینا یا اکھاڑ لینا ۔ اَلْاِجْتِثَاثُ ۔ کے بھی یہی معنے ہیں، بلکہ زیادہ شدت اور مبالغہ کے ساتھ* ۔ قرآن میں اُجْتُثَّتْ (۱۴/۲۶) آیا ہے ۔ یعنی اسکی جڑ بنیاد تمام کی تمام اکھیڑ دی گئی ۔

اَلْجُثَّۃُ ۔ زمین کا بلند حصہ جو ایک چھوٹے سے ٹیلے کی طرح ہو جائے۔ اس سے جُثَّۃُ الْاِنْسَانِ آتا ہے ۔ انسانی جثہ* ۔ یہ اسوقت بولتے ہیں جب انسان بیٹھا ہؤا یا سویا ہؤا ہو کیونکہ اسوقت اس کا تمام جسم اکٹھا اور سمٹا ہوتا ہے** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے جمع ہونے کے ہیں ۔ درخت کو جڑ سے اکھیڑنے کیلئے یہ لفظ اسلئے استعمال ہوتا ہے کہ جس درخت کو اکھیڑا جاتا ہے اسکی جڑیں وغیرہ سب اکٹھی کی جاتی ہیں تا کہ ان میں سے کوئی چیز زمین میں باقی نہ رہ جائے ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **ابن فارس ۔

ج ث م

جَثَمَ - یَجْثِمُ - جَثْماً و جُثُوْماً - اپنی جگہ پر چمٹ جانا اور اسے نہ چھوڑنا - (پرند وغیرہ کا) سینہ کے بل بیٹھنا - اس طرح جم کر یا سینہ کے بل بیٹھ جانے والا جو اپنی جگہ سے نہ ہٹے اَلْجَاثِمُ کہلائیگا - اَلْجُثْمَۃُ - مٹی، گارے یا راکھ کا ڈھیر - اَلْجُثْوُمُ والجَثَمَۃ - ٹیلہ - اَلْمُجَثَّمَۃُ - اس جانور یا پرندے کو کہتے تھے جسے باندھ کر نشانہ بنا لیا جائے اور اسطرح مار دیا جائے* - لہذا اس لفظ کے معنے کسی ایک جگہ جم کر بےحس و حرکت پڑے رہنے کے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چیز کے مجتمع ہو جانے کے ہیں -

قرآن میں ہے فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ - (۷/۷۸) - ''وہ اپنے گھروں میں بےحس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے۔ ڈھیر ہو کر رہ گئے،، -

ج ث و

اَلْجَثْوَۃُ (جیم کی تینوں حرکتوں - زیر - زبر - پیش کے ساتھ) - پتھروں کا ڈھیر - ریت کا ڈھیر - جسم - جُثٰی الْحَرَمِ - رمی جمار کی وجہ سے حرم میں جمع ہو جانے والے پتھر یا وہ پتھر جو حرم کی حدود پر رکھ دئے جاتے تھے - تھان (انصاب) جن پر ایام جاھلیت میں جانور قربانی کے طور پر ذبح کئے جاتے تھے - پتھروں کے ڈھیر کے اعتبار سے اَلْجُثَا جماعتوں کو کہتے ہیں، اور جَثَوْتُ الاِبِلَ کے معنے ہیں میں نے اونٹوں کو جمع کیا -

جَثَا - یَجْثُوْ - جُثِیًّا - (جھگڑا کرنے کیلئے) گھٹنوں کے بل بیٹھ جانا - فَھُوَ جَاثٍ - گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا - اسکی جمع جُثِیٌّ اور جِثِیٌّ آتی ہے* -

سورۃ جاثیۃ میں ہے وَتَرٰی کُلَّ اُمَّۃٍ جَاثِیَۃً (۴۵/۲۸)- تو ہر جماعت کو (اس وقت) گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے دیکھیگا - یعنے ذلت و خواری اور عاجزی و درماندگی کی حالت میں -

سورۃ مریم میں ہے وَنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْھَا جِثِیًّا (۱۹/۷۲) ''ہم ظالمین کو اس میں گھٹنوں پر گرا ہؤا چھوڑینگے'' اور لَنُحْضِرَنَّھُمْ حَوْلَ جَھَنَّمَ جِثِیًّا (۱۹/۶۸) یعنی ''ہم انہیں جہنم کے گرد گھٹنوں کے بل گرے ہوئے حاضر کرینگے،، - اس سے مراد ذلت و خواری یا عاجزی و درماندگی ہے -

*تاج -

ج ح د

جَحَدَ حَقَّهُ ۔ جان بوجھکر کسی کے حق سے مکر جانا اور انکار کر دینا ۔ اَرْضٌ جَحِدَةٌ خشک زمین کو کہتے ہیں ۔ اور عَامٌ جَحِدٌ ۔ کم بارش والے سال کو ۔ اَجْحَدَ الرَّجُلُ اسوقت کہتے ہیں جب کسی کا سب کچھ جاتا رہے اور وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہو* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی قلتِ خیر (یعنی اچھی چیزوں کی کمی) کے ہیں ۔ راغب اور صاحب محیط نے کہا ہے اَلْجَحْدُ کے معنی ہوتے ہیں اس چیز سے انکار کر دینا جسکا اقرار دل کے اندر ہو اور اسکا اقرار کرنا جسکا انکار دل کر رہا ہو**۔ قرآن کریم نے حقائق کا انکار کرنے والوں کے متعلق متعدد مقامات پر کہا ہے بِاٰیَاتِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ ($\frac{6}{33}$) ۔ یہ جانتے بوجھتے (محض ضد اور سرکشی کی بنا پر) قوانین خدا وندی کا انکار کرتے ہیں ۔ (''جانتے بوجھتے'' کی تشریح قرآن کریم نے خود ہی دوسری جگہ کر دی ہے ۔ جہاں کہا وَجَحَدُوْا بِہَا وَاسْتَیْقَنَتْہَا اَنْفُسُہُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ($\frac{27}{14}$) ۔ ''یہ محض ظلم و تکبر کی بنا پر اسکا انکار کر رہے ہیں حالانکہ ان کا دل اندر سے اسے صحیح مانتا ہے'' ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ جَحَدَ النِّعْمَۃَ کے معنی ہیں اس نے نعمت کا یا تو شعور ہی نہیں کیا اور یا سمجھنے بوجھنے کے باوجود منعم کا شکر نہیں کیا ۔

ج ح م

اَجْحَمَ عَنْہُ ۔ وہ اس سے رک گیا ۔ اَلْجَحَّامُ ۔ بخیل کو کہتے ہیں جو مال و دولت کو روک کر رکھ لیتا ہے* ۔ جَحَمَ الْبَعِیْرَ ۔ اونٹ کے منہ پر ایسا چھینکا چڑھا دینا جس سے وہ کاٹنے سے رک جائے ۔ تَجَحَّمَ الْمَکَانُ وَالْقَلْبُ ۔ مکان یا دل تنگ ہو گیا*** ۔ امام الرمانی نے اَجْحَمَ کو اَمْسَکَ اور اِنْتَہٰی کا مرادف قرار دیا ہے****۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ان معنوں میں یہ لفظ اَحْجَمَ سے مقلوب ہے ۔

تَجَحَّمَ کے معنے ہیں بخل اور تنگ دلی کی وجہ سے جل بھن جانا ۔ اس سے جَحَمَ کے معنے ہوتے ہیں آگ بھڑکانا ۔ اَلْجَحْمَۃُ بڑی آگ کو کہتے ہیں جو کسی گہری جگہ میں ہو۔ نیز سخت گرم جگہ کو ۔ اَلْجَاحِمُ

---

*تاج ۔ **محیط و راغب ۔ ***محیط ۔ **** الالفاظ المترادفہ۔

مِنَ الْحَرْبِ - سخت گھمسان کی جنگ کو کہتے ہیں * - ابن فارس نے اس کے معنی حرارت اور گرمی کی شدت کے لکھے ہیں - قرآن کریم میں اَلْجَحِیْمُ جہنم کیلئے آیا ہے دیکھئے (۲۳/۳۷) اور (۶۸-۶۴:۳۷-۵۵) - قرآن کریم میں غلط اعمال کے نتائج کو عذاب نار سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ آگ سب کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے - لیکن اگر زندگی اور اسکے مقاصد کے متعلق قرآنی نقطہ نگاہ سے غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی اسکے سلسلہ ارتقاء کی ایک کڑی ہے جسے ابھی بہت آگے چلنا ہے - قوانین خداوندی کے مطابق عمل کرنے سے انسانی صلاحیتوں میں ایسی نشو و نما آجاتی ہے جس سے وہ (مرنے کے بعد) زندگی کی اگلی ارتقائی منزل تک پہنچنے کے قابل ہو جاتا ہے - لیکن اگر اسکی صلاحیتوں کی اسطرح نشوونما نہ ہو تو وہ آگے بڑھنے کے قابل نہیں رہتا، وہیں رک جاتا ہے - یہ قانونِ ارتقاء کا بنیادی اصول ہے - اس رک جانے کو قرآن نے اَلْجَحِیْم کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے جس کے بنیادی معنے رک جانے کے ہیں - لہذا جَحِیْمٌ انسانی زندگی کی وہ منزل ہے جسمیں وہ آگے بڑھنے سے رک جائے - اور چونکہ اس رک جانے کا احساس شدید ہوگا اسلئے اس سے انسان کے دل میں ایسی آگ بھڑک اٹھے گی (۱۰۴/۸-۷) جو اسکی کشتِ امل (امیدوں کی کھیتی) کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیگی - قرآن کریم کی رو سے فرد یا قوم، جس مقام پر رک جائے، وہ جحیم ہے - زندگی تو ایک جوئے رواں ہے جسے رواں دواں آگے بڑھتے چلے جانا چاہئے - جونہی اسکی روانی بند ہوئی، وہ جوئے رواں نہ رہی جوہڑ بن گئی اور اس میں سڑاہند پیدا ہونی شروع ہوگئی -

ج د ث

اَلْجَدَثُ - قبر - جمع اَجْدُثٌ و اَجْدَاثٌ - قرآن کریم میں ہے فَاِذَا هُمْ مِنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ (۳۶/۵۱) - "پس وہ ناگہاں قبروں سے (نکل کر) اپنے رب کی طرف دوڑ پڑینگے" - اس سے آگے ہے کہ وہ کف افسوس ملتے ہوئے کہینگے کہ مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا (۳۶/۵۲) "ہمیں ہماری خوابگاہ سے کس نے جگا دیا" - لہذا جَدَثٌ اور مَرْقَدٌ ہم معنی ہیں - واضح رہے کہ اس سے مقصود کوئی خاص مقام نہیں، کیفیت ہے - اَلْجَدَثَةُ - اونٹ کے پاؤں کی زمین پر پڑنے کی آواز** -

* تاج - ** تاج و محیط و راغب -

ج د د

اَلْجَدُّ - اس مادہ میں اصل معنے قطع کرنے اور کاٹنے کے آتے ہیں*۔ مثلاً ثَوْبٌ جَدِیْدٌ کے اصل معنے کاٹے ہوئے (قطع کردہ) کپڑے کے ہیں۔ پھر ہر اس چیز کو کہنے لگے جس کی پیدائش نئی نئی ہوئی ہو**۔

اَلْجَدِیْدُ - وہ چیز جس کے ساتھ تمہارا کبھی واسطہ نہ رہا ہو***۔ قرآن کریم میں ہے اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ (۱۴/۲۰)۔ "وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور تمہاری جگہ ایک نئی مخلوق لے آئے"، (ایسی مخلوق لے آئے جس سے تمہیں کبھی واسطہ نہ رہا ہو)۔

اَلْجُدَّۃُ - ہر چیز کا راستہ (جس سے اسے قطع کیا جاتا ہے یا جو اسے قطع کرتا ہوا چلا جاتا ہے)۔ اس کی جمع جُدَدٌ آتی ہے۔ قرآن کریم میں پہاڑوں کے متعلق ہے جُدَدٌ بِیْضٌ وَحُمْرٌ (۳۵/۲۷)۔ سفید اور سرخ رنگ کے راستے۔ راستہ سے یہاں مراد دھاریاں ہیں جو پہاڑوں کے مختلف قطعات اور تہوں کو متمیز کرتی ہیں۔ چنانچہ اَلْجُدَّۃُ اس دھاری کو بھی کہتے ہیں جو گدھے کی کمر پر ہوتی ہے***۔

اَلْجَدُّ - روئے زمین کو کہتے ہیں، اور بڑے نصیبہ والے آدمی کو بھی۔ دادا اور نانا کو بھی کہتے ہیں۔اسی سے اس کے معنی بڑائی، عظمت و جلال کے بھی آتے ہیں***۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَاَنَّهٗ تَعَالٰی جَدُّ رَبِّنَا (۷۲/۳)۔ "ہمارے رب کی عظمت بہت بڑی ہے"۔

اَلْجِدُّ - کسی کام میں کوشش کرنا۔ نیز جلدی اور عجلت کو بھی کہتے ہیں۔ نیز اس لفظ کو ہر بات میں مبالغہ کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں مثلاً عَالِمٌ جِدُّ عَالِمٍ۔ وہ عالم ہے اور بہت بڑا عالم***۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے تین بنیادی معانی ہیں (۱) عظمت۔ (۲) نصیبہ اور (۳) کاٹ دینا۔ تینوں کی مثالیں اوپر مذکور ہیں۔

ج د ر

اَلْجَدْرُ۔ اَلْجِدَارُ - دیوار کو کہتے ہیں۔ اَلْحَائِطُ - دیوار کو احاطہ کرنے کی وجہ سے کہتے ہیں اور اَلْجِدَارُ اسکے بلند ہونے کی وجہ سے۔ کیونکہ اس مادہ میں اصل معنے احاطہ کرنا۔ ابھرنا۔ بلند ہونا ہیں۔

* محیط۔ ** راغب۔ *** تاج۔

چنانچہ جَدَرْتُ الْجِدَارَ کے معنے ہیں میں نے دیوار کو اونچا کر دیا۔ اَلْجَدْرُ ایک قسم کا پودا جو ریتلی زمین میں اگتا ہے*۔

سورۃ کہف میں جِدَارٌ (۱۸/۷۷) دیوار کے معنے میں آیا ہے۔

اَلْجَدِیْرُ۔ مناسب اور لائق۔ قَدْ جَدُرَ جَدَارَۃً۔ وہ لائق ہوا۔ اِنَّهُ لَمَجْدُوْرٌ اَنْ یَفْعَلَ ذٰلِکَ۔ وہ ایسا کرنے کے قابل ہے*۔ قرآن کریم میں ہے وَ اَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا (۹/۹۷)۔ "ان کی حالت اس کے زیادہ قابل ہے کہ وہ اس بات کو نہ سمجھ سکیں"۔ اَلْجَدِیْرَۃُ طبیعت کو کہتے ہیں*۔

ج د ل

اَلْجَدْلُ۔ اصل معنے اس مادہ میں بٹنے کے ہیں۔ جَدَلَ الْحَبْلَ۔ رسی کو مضبوط بٹنا۔ اَلْجَدِیْلُ۔ چمڑے کی بٹی ہوئی لگام کو کہتے ہیں۔ یا چمڑے کی بٹی ہوئی رسی کو**۔ اَلْجَدَالُ ہر مضبوط چیز کو کہتے ہیں***۔ اَلْجَدَالَۃُ۔ سخت زمین**۔ جَدَلَ الشَّیْءُ جُدُوْلاً۔ کسی چیز کا سخت اور قوی ہو جانا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا لمبا اور مستحکم ہونا۔ جھگڑے کو جَدَلٌ گفتگو کی درازی کی وجہ سے کہتے ہیں۔

اَلْجِدَالُ۔ راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنے ایسی گفتگو کرنے کے ہیں جسمیں طرفین ایک دوسرے سے بازی لے جانے اور غلبہ حاصل کر لینے کی کوشش کریں اور اسطرح خواہ مخواہ بات کو بڑھاتے چلے جائیں۔ اسی سے بعض نے کہا ہے کہ اسکے اصل معنے صِرَاعٌ کے ہیں، یعنے ایک انسان کا دوسرے انسان کو زمین پر گرا دینا۔ پچھاڑ دینا**۔

قرآن کریم میں احکام حج کے ضمن میں لَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ (۲/۱۹۷) آیا ہے۔ اَلْجِدَالُ کے جو معنی اوپر دئیے گئے ہیں ان سے مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ حج مسلمانوں کا بین الملی اجتماع ہے جس سےمقصد یہ ہے کہ اُمت کے اجتماعی مسائل کا حل باہمی مشاورت سے تلاش کیا جائے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اس مقصد کے لئے باہمی گفتگو میں ایسی روش اختیار نہ کرو جس سے مقصد یہ ہو کہ تم فریق مقابل کو مناظرانہ شکست دیدو اور اس کے لئے خواہ مخواہ بات بڑھاتے اور اس پر اصرار کرتے چلے جاؤ۔ تم متانت اور سنجیدگی سے بات کرو اور مقصد یہ سامنے رکھو کہ کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مسائل کا تصفیہ ہو جائے۔

---

* تاج و راغب و محیط۔ ** تاج۔ *** محیط۔

سورۃ مجادلۃ میں جو آیا ہے اَلَّتِيْ تُجَادِلُكَ (۵۸/۱) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عورت رسول اللہ ؐ سے اپنے خاوند کے متعلق بار بار سوال کرتی تھی۔ خواہ مخواہ بات کو طول دئے جا رہی تھی۔ اپنی بات پر اصرار کرتی تھی اور یوں اس سے جھگڑے کا سا پہلو نکلتا تھا۔

سورۃ کہف میں ہے وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۱۸/۵۴)۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہر معاملہ کے متعلق بات واضح طور پر کہ دی گئی ہے لیکن اس سے راہ نمائی حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ انسان اس ذہنیت کو لیکر قرآن کیطرف نہ آئے کہ مجھے بہرحال اپنی بات پراڑے رہنا اور قرآن کو شکست دیدینا ہے۔ وہ خالی الذہن ہو کر قرآن پر غور و فکر کرے اور مقصد پیش نظر یہ رکھے کہ مجھے حق اور صداقت کو تلاش کرنا ہے۔ اسطرح قرآن سے صحیح راہ نمائی مل جائیگی۔

ج ذ ذ

اَلْجَذُّ۔ کسی چیز کو توڑ دینا۔ کَسَرْتُهٗ اَجُذُّهٗ جَذًّا۔ میں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے توڑ دیا*۔ اَلْجُذَّةُ۔ دراصل کسی شے کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جو اس سے کاٹ کر الگ کر لیا گیا ہو**۔

جُذَاذٌ۔ سونے کے ڈلے یا ٹکڑے یا ریزے***۔ سورۃ انبیاء میں ہے فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا (۲۱/۵۸)۔ ''ابراهیم ؑ نے ان بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا''۔

سورۃ ہود میں جنت کے متعلق ہے عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (۱۱/۱۰۸)۔ غیر منقطع عطاء۔ ایسی عطاء جو ان سے قطع نہیں کی جائیگی۔ جو ہمیشہ رہیگی۔ یعنی اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (۹۵/۶)۔

ج ذ ع

جِذْعٌ۔ درخت (خرما) کا تنہ۔ (جمع جُذُوْعٌ)۔ بعض نے کہا ہے کہ اس تنہ کو کہتے ہیں جو خشک ہو چکا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ اسے کہتے ہیں جو کاٹ لیا گیا ہو۔ لیکن دوسروں کا خیال ہے کہ اسمیں نہ خشک ہونے کی شرط ہے اور نہ کاٹ لینے کی*۔ سورۃ مریم میں جِذْعِ النَّخْلَةِ (۱۹/۲۳)۔ کھجور کے تنے کیلئے آیا ہے۔ اور (۱۹/۲۵) سے ظاہر ہے کہ

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب

وہ سر سبز اور ثمردار کھجور تھی۔ لیکن سورۃ طٰہٰ میں صلیب کی لکڑیوں کے لئے جُذُوْعِ النَّخْلِ (۲۰/۷۱) آیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خشک کاٹے ہوئے تنے ہوتے تھے جن پر صلیب دی جاتی تھی۔ ویسے جَذَعْتُہٗ کے معنے ہیں میں نے اسے کاٹ لیا****۔جَذَعَ الدَّابَّۃَ۔ اس نے جانور کو روک دیا۔ اَلْجُذُوْعَۃُ۔ جوانی اور نوعمری کو کہتے ہیں***۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) نو عمری اور تازگی۔ (۲) درخت کا تنہ اور (۳) کسی چیز کو مٹلنے کے لکھے ہیں۔

ج ذ و

جَذَا عَلَی الشَّیْءِ یَجْذُوْ جَذْوًا۔ وہ کسی چیز پر جم کر کھڑا ہوگیا۔ جَذَا الرَّجُلُ عَلٰی اَطْرَافِ اَصَابِعِہٖ۔ آدمی اپنے پنجوں کے بل کھڑا ہوگیا*۔ گویا اسمیں کسی چیز کے کسی ایک مقام پر جم کر ٹھہر جانے کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔ اسلئے جَذْوَۃٌ لکڑی کے اس انگارے کو کہتے ہیں جس سے شعلہ ختم ہوجائے اور صرف انگارہ باقی رہ جائے*۔ یعنی اس میں شعلے کا ابھرنا اور تڑپنا باقی نہ رہے اور وہ ایک مقام پر ٹھہر جائے۔ قرآن میں جَذْوَۃٍ مِّنَ النَّارِ (۲۸/۲۹) آیا ہے۔ یعنی آگ کا انگارہ۔

ج ر ح

جَرَحَ۔ کسی چیز کو حاصل کرنا۔ اکتساب کے معنوں میں آتا ہے** ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) کمانا اور (۲) کھال کو پھاڑنا (زخمی کرنا) بتائے ہیں۔ کمانے کے اعتبار سے قرآن کریم میں ہے اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ (۴۵/۲۹)۔ '' جو لوگ ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں ''۔ یعنی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یا سورۃ انعام میں ہے مَاجَرَحْتُمْ بِالنَّھَارِ (۶/۶۰)۔ '' جو کچھ تم دن میں کرتے ہو ''۔ اسی بنا پر اَلْجَوَارِحُ انسان کے ہاتھ پاؤں وغیرہ اعضاء کو کہتے ہیں جو اس کے لئے کام کرتے ہیں**۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْجَوَارِحُ ان مصائب کو کہتے ہیں جو دن کے وقت آئیں۔ جیسا کہ رات کے وقت آنے والی مصیبتوں کو طَوَارِقُ کہتے ہیں***۔ نیز اس کے معنے شکار کرنے والے جانور ہیں۔ اس لئے کہ جَرَحَ یَجْرَحُ کے معنے زخمی کر دینے کے

*تاج۔ راغب۔ ** تاج۔ *** محیط۔ ****راغب۔

ہیں ۔ اَلْجَرَاحَۃُ ۔ نیزہ یا تلوار کے زخم کو کہتے ہیں*۔ قرآن میں اَلْجَوَارِحِ مُکَلِّبِیْنَ آیا ہے (۵/۴)۔ یعنی شکار کے لئے سدھائے ہوئے کتے یا دیگر جانور۔ اَلْجُرُوْحُ زخموں کیلئے آیا ہے (۵/۴۵)۔

ج ر د

جَرَدَ ۔ یَجْرُدُ۔ چھیل دینا ۔ چھلکا اتار دینا ۔ جَرَدَ الْجِلْدَ ۔ اس نے کھال کے اوپر سے بال صاف کر لئے ۔ جَرَدَ زَیْدًا مِنْ ثَوْبِہٖ ۔ اس نے زید کو اس کے کپڑوں سے ننگا کر دیا ۔ فَتَجَرَّدَ ۔ پس وہ ننگا ہو گیا ۔ اَلتَّجَرُّدُ ۔ ننگا ہونا ۔ اَلْجَرَادُ (۷/۱۳۳) ۔ ٹڈی (کیونکہ وہ درختوں کو ننگا کر دیتی ہے) ۔ مَکَانٌ جَرِدٌ ۔ وہ جگہ جہاں گھاس نہ ہو ۔ سَنَۃٌ جَارُوْدٌ ۔ سخت قحط کا سال**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا اس طرح صاف ہو جانا کہ وہ کھل کر نظر آنے لگ جائے ۔

ج ر ز

جَرَزَ ۔ یَجْرُزُ ۔ جَرْزًا ۔ تیزی سے کھانا ۔ قتل کر دینا ۔ کاٹ ڈالنا۔ جڑ بنیاد سے اکھیڑ دینا ۔ اصل معنے اس مادہ میں قطع و استئصال کے آتے ہیں ۔ اَلْجَرُوْزُ ۔ بہت کھانے والا کہ جب وہ کھانے کیلئے بیٹھے تو دسترخوان پر کچھ نہ چھوڑے۔ اَرْضٌ جَرُزٌ ۔ وہ زمین جسمیں کچھ پیدا نہ ہوتا ہو یا وہ زمین جس سے تمام گھاس وغیرہ چر کر ختم کر دیا گیا ہو۔ اَلْجَرَزُ ۔ قحط کا سال ۔ اَلْجَارِزُ ۔ بانجھ عورت ۔ اَلْجُرَازُ۔ تیز تلوار*۔

قرآن کریم میں ہے لَجَاعِلُوْنَ مَا عَلَیْھَا صَعِیْدًا جُرُزًا (۱۸/۹) ''ہم اس زمین کو ایسی بنا دینے والے ہیں کہ اسپر سبزہ کا نام و نشان تک نہ رہے،،۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم، جو کچھ زمین پر ہے اسے مٹا کر خاک اور خشک و بے گیاہ کرتے رہتے ہیں (بہار اور خزاں کے دور جاری رہتے ہیں)۔

ج ر ع

اَلْجَرْعَۃُ ۔ (جیم کی تینوں حرکتوں — زیر۔ زبر۔ پیش — کے ساتھ) گھونٹ ۔ لسان العرب میں ہے کہ جَرْعَۃٌ ایک مرتبہ گھونٹ کے نگلنے کو کہتے ہیں اور جُرْعَۃٌ اس چیز کو جسے اسطرح نگلا جائے ۔ اَلتَّجَرُّعُ کسی چیز کو اسطرح گھونٹ گھونٹ کرکے نگلنا جس سے معلوم ہو کہ اسکا

* تاج ۔ ** تاج و راغب و محیط ۔

پینا پینے والے پر سخت نا گوار گذر رہا ہے* ۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہنمی کے متعلق ہے کہ اسے جو کچھ پینے کو ملیگا یَتَجَرَّعُہٗ وَلَا یَکَادُ یُسِیْغُہٗ (۱۴/۱۷) ۔ "وہ اسے سخت نا گواری سے گھونٹ گھونٹ کر کے پیئے گا اور گلے سے نیچے نہیں اتار سکیگا"۔ (الامان و الحفیظ! اس دنیا میں ذلت اور محکومی کی روٹی بھی کیسی تلخ ہوتی ہے ۔ کھائے بغیر گذارہ بھی نہیں اور حلق سے نیچے بھی نہیں اترتی)

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اصل معنے اس مادہ میں کسی چیز کو توڑ کر یا کاٹ کر الگ کر دینے (یا جمع کرلینے) کے ہیں** ۔ وَتَرٌ جَرِعٌ کمان کے ایسے تانت کو کہتے ہیں جسکا کوئی بٹ اسقدر ٹیڑھا ہو کہ دوسرے بٹوں میں نمایاں طور پر نظر آ رہا ہو ۔ اَلْاَجْرَعُ سخت اور سنگلاخ زمین کو بھی کہتے ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی پینے کی چیز کے کم ہونے کے ہیں ۔

ج ر ف

جَرَفَ ۔ یَجْرُفُ ۔ جَرْفًا ۔ بہت زیادہ لے لینا ۔ سب کچھ لے لینا یا بڑا حصہ لے لینا۔ جَرَفَ الطِّیْنَ ۔ اس نے زمین سے مٹی کو کھرچ لیا ۔ اس سے اَلْجَارِفُ اس تباہی کو کہتے ہیں جو قوم کے اموال کو بہا کر دے ۔ طاعون اور وبا کو بھی کہتے ہیں ۔ سَیْلٌ جُرَافٌ ۔ وہ سیلاب جو سب کچھ بہا کر لے جائے ۔ اَلْجُرْفُ والجُرُفُ زمین کا وہ حصہ جو کسی دریا کے کنارے واقع ہو اور وہ کٹ کٹ کر دریا میں گرتا رہے یا سیلاب کی زد میں آ کر بہ جائے*** ۔

سورۃ توبہ میں شَفَا جُرُفٍ (۹/۱۰۹) ۔ آیا ہے ۔ یعنی ایسا کنارہ جو کٹ کٹ کر گر رہا ہو۔ اصل معنے اس مادہ میں صاف کر دینے اور نکال لینے جگہ سے لے لینے نیز کاٹ دینے کے ہوتے ہیں ** ۔ یا کسی چیز پر پورا پورا قبضہ کر کے اسے ہڑپ کر جانے کے**** ۔

ج ر م

جَرْمٌ ۔ کے بنیادی معنے کسی چیز کو کاٹ دینے یا اس پر سے کسی چیز کو ہٹا کر اسے ننگا کر دینے کے ہیں**۔عام طور پر درخت سے پھل کاٹنے یا توڑنے کے لئے بولا جاتا ہے***** ۔ جَرَمَ النَّخْلَ ۔ کھجور کو کاٹ دیا یا اسکا پھل توڑلیا ۔

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** تاج و راغب ۔ ****ابن فارس ۔ ***** اغب ۔

اَلْجِرْمَۃُ ۔ وہ لوگ جو کھجوروں کا پھل توڑتے ھیں ۔ جَرَمَ لشَّاۃَ جَرْمًا ۔ اس نے بھیڑ کی اون کاٹ لی* ۔ جَرَمَ للّحْمَ عَنِ لْعَظْمِ ۔ ھڈی پر سے گوشت نوچ لیا اور اسطرح ھڈی کو ننگا کر دیا ** ۔ ان مثالوں سے لفظ جرم کا صحیح مفہوم سامنے آجاتا ھے ۔ یعنے لوٹ کھسوٹ ۔ سلب و نہب (Exploitation) ۔ دوسرے کا پھل توڑ کر اپنے ھاں لے جانا ۔ دوسروں کی محنت کا ماحصل چھین کر لے جانا اور انہیں ننگا کردینا ۔ ایسا کرنے والوں کو مُجْرِمُوْن کہا جاتا ھے ۔ اسی بنا پر ھر اکتسابِ مکروہ (ناپسندیدہ کمائی) کو جَرْمٌ کہاجاتا ھے ۔ آجْرَمَ ۔ وہ جرم والا ھوا ۔*** ۔ جرم کے اس مفہوم کو سامنے رکھئے اور سوچئے کہ جب قرآن کریم قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ (مجرم قوم) کو جہنم رسید کرتا ھے تو اس سے مقصود کیا ھے ۔ قرآن کی رو سے بدترین نظام اور معاشرہ وہ ھے جسمیں کچھ لوگ دوسرے لوگوں کو (Exploit) کریں اور انکی محنت کی کمائی پر عیش اڑائیں ۔ ایسا معاشرہ جہنمی معاشرہ ھےاور اسکا نتیجہ تباھی اور بربادی۔ سورۃ القلم میں ھے اَفَنَجْعَلُ لْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ (۶۸/۳۵) ''کیا ھم مسلمین کو مجرمین کے برابر کردینگے'' یہاں مسلمین کے مقابلہ میں مجرمین آیا ھے ۔ اس سےظاھر ھے کہ کوئی مسلم مجرم نہیں ھوسکتا۔(نیز دیکھئےعنوان ج ۔ ن ۔ ی)۔

لَا جَرَمَ ۔ لا محالہ ۔ ضرور* ۔ بےشک ۔ (جو بات واضح اور بے نقاب یعنی برھنہ ھو) ۔ سورۃ ھود میں ھے لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ (۱۱/۲۲)۔ ''بلا شک و شبہ یہی لوگ آخر الامر سب سے زیادہ نقصان میں رھینگے'' ۔ سورۃ مائدہ میں ھے لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ (۵/۲) ۔ اسکے معنے آمادہ کرنے کے ھیں ۔ یعنے اسکے اکتساب پر تمہیں آمادہ نہ کردے۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ جَرَمَ کے معنی کمانے کے بھی ھوتے ھیں ۔

ج ر ی

جَرْیٌ وَ جَرَيَانٌ ۔ کے معنے ھیں پانی وغیرہ کا چلنا ۔ بلا روک ٹوک بہنا۔راغب نے کہا ھے کہ اَلْجَرْیُ تیزی سے چلنے کو کہتے ھیں چنانچہ جَرَى الْفَرَسُ کے معنے ھیں گھوڑا تیزی سے دوڑا ۔ كُلٌّ يَّجْرِىْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى (۱۳/۲) ''ھرکرہ مدت معینہ کے لئے تیزی سے چل رھا ھے'' ۔ اس کے راستہ میں کوئی روک نہیں ۔ اَلْجَارِيَۃُ مونث ہےجَارٍ اور اَلْجَارِیْ کا جس کے معنی ہیں چلنے والا، بہنے والا، تیزی سے دوڑنے والا۔ جَارِيَۃٌ کی جمع جَارِيَاتٌ اور جَوَارٍ آتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے اَلْجَارِيَاتِ يُسْرًا (۵۱/۳)۔ بہنے اور پانی میں تیرتی چلے جانے کی وجہ سے کشتی

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

کو بھی جَارِیَۃٌ کہہ دیتے ہیں۔ جمع جَوَارٍ اور جَارِیَاتٌ ہے۔ اَلْجَارِیَۃُ آفتاب کو کہتے ہیں ۔ اور اَلْجَوَارِیْ ستاروں کو۔ جَارِیَۃٌ لڑکی کو کہتے ہیں ۔ جَرَی اللّٰہُ الشَّیْءَ کے معنے ہیں وہ شے اسکے لئے ہمیشہ قائم رہی ۔ یعنے اسمیں دوام کے معنے بھی پائے جاتے ہیں *۔ (دوام کے مفہوم کیلئے ج۔ن۔ن کا عنوان دیکھئے جہاں جَنّٰت کے ضمن میں تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہَارُ کی تشریح کی گئی ہے) ۔ قرآن کریم میں مُجْرٖھَا کے مقابلہ میں مُرْسٰھَا کا لفظ آیا ہے (۱۱/۴۱) ۔ یعنی کشتی کا چلنا اور اس کا لنگرانداز ہونا ۔ اَلْجَرِیُّ ۔ وکیل اور ضامن کو بھی کہتے ہیں ** ۔ سورۃ غاشیہ میں ہے فِیْہَا عَیْنٌ جَارِیَۃٌ (۸۸/۱۲) ۔ اس میں بہتا چشمہ ہے ۔ سورۃ شوریٰ میں ہے اَلْجَوَارِ فِی الْبَحْرِ (۴۲/۳۲) سمندر میں کشتیاں ۔

ج ز أ

اَلْجُزْءُ ۔ کسی چیز کا حصہ یا اس کا ٹکڑا۔ جمع اَجْزَاءٌ۔ یعنی وہ ٹکڑے جن سے کوئی چیز مل کر بنے، جیسے اجزاءُ الفَلسفِیْنَۃِ ۔ اجزاءُ الدَّواء وغیرہ ۔ بہت سی چیزوں کے مجموعہ میں سے اگر کچھ چیزیں الگ کرلی جائیں تو وہ بھی اس مجموعہ کا جُزْءٌ کہلائینگی * ۔ سورۃ زخرف میں عیسائیوں کے متعلق ہے وَجَعَلُوْا لَہٗ مِنْ عِبَادِہٖ جُزْءًا (۴۳/۱۵) ۔ ''وہ خدا کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزء قرار دیتے ہیں'' ۔ اس سے تثلیث کے عقیدہ کا ابطال مقصود ہے جسمیں ''تین میں ایک اور ایک میں تین'' کے گورکھ دھندے سے خدا کو تین حصوں میں بانٹ دیا جاتا ہے ۔ یا ہر اس عقیدہ کا ابطال جس کی رو سے کسی انسان یا کسی قوت کو خدائی کاروبار میں شریک سمجھا جائے ۔ ابنیتِ مسیح اور وحدت الوجود جیسے عقائد بھی اسی کے ذیل میں آجاتے ہیں ۔

جَزْءٌ کے معنے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ، الگ الگ کر دینا ہیں ۔ الجُزْءُ کسی چیز کے حصہ اور ٹکڑے کو کہتے ہیں خواہ وہ اپنے کل سے ملا ہوا ہو یا اس سے الگ کرلیا گیا ہو، یہ ضروری نہیں کہ جزء کے لئے کل کے ہر فرد کو بھی توڑا یا کاٹا جائے ۔ ہوسکتا ہے کہ بہت سے فرد مل کر ایک کل کے جزء بنیں ۔ مثلاً سورۃ الحجر میں ہے کہ لِکُلِّ بَابٍ مِّنْہُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ (۱۵/۴۴) ۔ یعنے ان (جہنم میں داخل ہونے والے انسانوں) میں سے، ہر دروازہ کیلئے، ایک حصہ الگ کر دیا گیا ہے ۔ اس سے یہ مطلب

---

*تاج ۔ **تاج و محیط ۔

نہیں کہ ان انسانوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ان کا ایک ایک حصہ الگ کر لیا گیا ہے ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کا ایک ایک گروہ الگ کر لیا گیا ہے ۔ اس سے سورۃ بقرہ کی اس آیت کا مطلب واضح ہو جاتا ہے جسمیں حضرت ابراھیمؑ سے کہا گیا ہے کہ چار پرندوں کو اچھی طرح سدھا کر اور اپنی طرف مائل کرکے ۔ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا (۲/۲۶۰) پھر انہیں الگ الگ کر لو اور ایک ایک پرندہ کو الگ الگ پہاڑیوں میں چھوڑ دو۔ پھر انہیں آواز دو تو وہ اڑتے ہوئے تمہاری طرف آجائینگے ۔ قرآن میں اعمال کے نتیجہ کیلئے جَزَآءٌ کا لفظ آیا ہے ۔ اس کے معنے (ج-ز-ی) کے عنوان میں دیکھئے ۔

ج ز ع

جَزْعٌ ۔ کے اصلی معنے رسی کو بیچ سے کاٹ دینا ہوتے ہیں* ۔ پھر اسکا استعمال ہر شے کو کاٹ دینے یا قطع کر دینے کے لئے ہونے لگا ۔ جَزَعَ الْاَرْضَ وَ الْوَادِیَ ۔ اسنے زمین اور وادی کو قطع کر دیا** ۔ اصل میں جِزْعُ الْوَادِیْ ۔ وادی کے اس حصہ کو کہتے ہیں جہاں پہنچکر وادی ختم ہو جاتی ہے یا مڑ جاتی ہے ۔ اَلْجَازِعُ اس شہتیر کو کہتے ہیں جو چھت کے وسط میں ڈالا جاتا ہے اور دونوں طرف سے شہتیریاں آ آ کر اس پر مل جاتی ہیں ۔ اسطرح وہ ان شہتیریوں (یا خود کمرے) کو دو حصوں میں قطع کر دیتا ہے* ۔

اَلْجَزَعُ ۔ صَبْرٌ کی ضد ہے ۔ صَبْرٌ کہتے ہیں کسی معاملہ کی مسلسل پیروی کرنا ۔ استقامت دکھانا (دیکھئے عنوان ص ۔ ب ۔ ر) ۔ اور جب کسی معاملہ کو درمیان ہی میں چھوڑ دیا جائے ۔ یعنے انسان اسکی پیروی سے اپنے آپکو منقطع کرلے ۔ تو وہ اَلْجَزَعُ ہوگا ۔ یعنی ہمت ہار دینا ۔ استقامت چھوڑ دینا* ۔ سورۃ ابراھیم میں ہے اَجَزِعْنَا اَمْ صَبَرْنَا (۱۴/۲۱) ۔ خواہ ہم ہمت ہار دیں یا استقامت سے برداشت کریں ۔

ج ز ی

جَزَآءٌ ۔ (نیز جَازِیَۃٌ) کسی چیز کا بدلہ ۔ جَزَاہُ کَذَا وَبِہٖ وَعَلَیْہِ ۔ اس نے اسے کسی بات پر ایسا بدلہ دیا** ۔ مُجَازَاۃٌ ۔ ایک دوسرے کو بدلہ دینا ۔ (عام طور پر مُجَازَاۃٌ شر میں استعمال ہوتا ہے اور

* راغب ۔ ** تاج ۔

مُكَافَاَةٌ* خیر میں)**. ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز کے قائم مقام ہونا ہیں ۔ یہ مفہوم ایک عظیم حقیقت کی طرف راہ نمائی کرتا ہے ۔ جس چیز کو عام طور پر "عمل کا بدلہ" کہا جاتا ہے وہ درحقیقت "اس عمل کا فطری نتیجہ ہوتا ہے ۔ یعنی نتیجہ، عمل کا قائم مقام ہوتا ہے ۔ آپ آگ میں ہاتھ ڈالتے ہیں یہ آپ کا عمل ہے ۔ آپ کا ہاتھ جل جاتا ہے اور اس میں سخت تکلیف ہوتی ہے ۔ یہ اس عمل کا نتیجہ ہے ۔ عمل تو فوراً ختم ہو گیا لیکن اس کے نتیجہ نے اس کی جگہ لے لی ۔ اس سے جزا اور سزا کا قرآنی تصور سامنے آ جاتا ہے ۔ اس تصور کی رو سے نہ سزا خارجی طور پر (باہر سے) ملتی ہے ۔ نہ جزا ہی کہیں باہر سے انعام ملنے کا نام ہے ۔ آپ نے کسی کو گالی دی ۔ اس نے آپ کو تھپڑ مارا ۔ گالی اور تھپڑ میں باہمی کوئی تعلق نہیں ۔ یہ سزا خارج سے ملی ہے ۔ لیکن آپ نے سنکھیا کھایا اور آپ کی موت واقع ہو گئی ۔ یہ چیز آپ کے عمل کا نتیجہ ہے ۔ یعنی عمل کی جانشین ۔ اس لئے قرآن نے کہا ہے کہ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۷/۱۴۷) ۔ اعمال خود اپنی جزا آپ ہوتے ہیں ۔ ہر عمل کا نتیجہ "اس عمل کی جگہ آ جاتا ہے ۔ اس کا قائمقام بن جاتا ہے ۔

جَزَىَ الشَّيْءُ** يَتَجَزَّى* کے معنے ہیں وہ چیز کافی ہو گئی ۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی لکھے ہیں ۔ مَا يُجْزِيْنِيْ هٰذَا الثَّوْبُ ۔ مجھے یہ کپڑا کافی نہیں ہوگا ۔ هٰذِهٖ اِبِلٌ مَجَازِئُ ۔ یہ اونٹ بار برداری کے لئے مجھے کافی ہیں* ۔ يَوْمًا لَا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا (۲/۴۸) ۔ " جس دن کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی کسی دوسرے کے کسی جرم کا بدلہ نہیں بن سکیگا " ۔ اس میں سے کچھ بھی اپنے سر نہیں لے سکیگا ۔ کوئی شخص کسی دوسرے کے لئے کافی نہیں ہو سکیگا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں کسی شخص کا کسی دوسرے کی طرف سے کچھ ادا کر دینا ۔

جِزْيَةٌ ۔ (۹/۲۹) وہ ٹیکس جو غیر مسلموں سے ان کی حفاظت کے بدلے میں لیا جائے ۔ یعنی جو "ان کی جان، مال، آبرو، معابد وغیرہ کی حفاظت کے لئے کافی سمجھا جائے اور جس کی وجہ سے ان پر (جنگ وغیرہ میں شریک ہونے کی) ذمہ داری نہ ڈالی جائے ۔ یہ تھوڑا سامالی معاوضہ

* تاج ۔ ** محیط ۔

ان تمام آسائشوں کے بدلے میں لیا جاتا ہے جو غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں حاصل ہوتی ہیں اور جن کے بہم پہنچانے کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہوتی ہے۔

اسام الرمانی نے اَلْجِزْیَةُ کو اَلْعَھْدُ۔ اَلذِّمَّةُ۔ اَلْاَمَانُ۔ اَلْخَرَاجُ کا مرادف قرار دیا ہے***۔ لہذا اس کے معنی وہ معاہدہ ہونگے جس میں کسی سے کچھ خراج لیکر اسے امان کی ذمہ داری دی جائے۔

ج س د

اَلْجَسَدُ۔ انسان کے جسم کو کہتے ہیں۔ دوسرے کھانے پینے والے اجسام کو جَسَدٌ نہیں کہتے۔ البتہ جو مخلوق کھاتی پیتی نہ ہو اور ذوی العقول میں سے ہو (عربوں کے عقیدہ کے مطابق۔ مثلاً جنات اور ملائکہ) تو انکے اجسام کو بھی جَسَدٌ کہدیتے تھے*۔ لیکن قرآن کریم نے بنی اسرئیل کے بچھڑے کو بھی جَسَداً (۷/۱۴۸) کہا ہے۔ صاحب محیط (نیز ابن فارس) نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے اصل معنے کسی چیز کا مجتمع اور سخت ہونا ہوتے ہیں۔ لہذا جَسَدٌ ٹھوس اور مرکب جسم کو کہینگے۔ گوسالۂ سامری کو جَسَدٌ کہنے کی یہ توجیہ زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ وہ ٹھوس بھی تھا اور مختلف زیورات کو ڈھال کر مرکب بنایا گیا تھا۔ کلیات میں ہے کہ جَسَدٌ دراصل رنگدار جسم کو کہتے ہیں**۔ سورۂ انبیاء میں انسانی اجسام کیلئے جَسَداً کا لفظ آیا ہے (۲۱/۸)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ وہ جَسَداً ایسے نہ تھے جو کھاتے پیتے نہ ہوں۔ اور حضرت سلیمانؑ کے بیٹے کو (جو جہانبانی کی اہلیت نہیں رکھتا تھا) جَسَداً کہا ہے (۳۸/۳۴)۔ یعنے محض گوشت کا لوتھڑا۔ بلکہ صرف دَابَّةٌ (۳۴/۱۴)۔ تورات میں (حضرت سلیمانؑ کے اس بیٹے اجعام کے متعلق) ہے:—

"اور اجعام کی سلطنت کے پانچویں برس ایسا ہوا کہ مصر کے بادشاہ سیسق نے یروشلم پر چڑھائی کی اور اس نے خداوند کا خزانہ اور بادشاہ کے گھر کا خزانہ لوٹ لیا۔ (نیز) . . . . حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں ایک شخص یربعام نامی نے حیا کاھن کے ساتھ مل کر آپ کی سلطنت کے خلاف سخت سازشیں کی تھیں۔ اسوقت تو وہ اپنی مساعی میں کامیاب نہ ہو سکا لیکن اجعام کے عہد میں اس نے بڑی قوت حاصل کر لی اور بنی اسرائیل کے دس اسباط کو اپنے ساتھ

*تاج۔ **محیط۔ ***الالفاظ المترادفة۔

ملا کر اجعام کو شکست دی۔ اس نے بیت المقدس کے هیکل کے مقابلے میں وہ بت خانے تعمیر کرائے جہاں سونے چاندی کے بتوں کی پرستش هوتی تھی''۔ (سلاطین ۱ ۔ باب ۱۴ ; ۱۲ ; ۱۰۱)

حضرت سلیمان کا یہی بیٹا (جانشین) ہے جسے قرآن کریم نے جیتے جاگتے انسان کے بجائے '' جَسَدٌ ''۔ محض گوشت پوست کا مرکب کہکر اسکی نااهلی کیطرف اشارہ کیا ہے۔ آیت (۳۸/۳۴) سے مترشح هوتا ہے کہ حضرت سلیمان کو اپنی زندگی هی میں اس کا احساس تھا اور انہوں نے خدا سے دعا کی تھی کہ مملکت تخریبی اثرات سے محفوظ رہے۔

ج س س

جَسّ کے اصلی معنے هیں رگ کو چھونا اور اسطرح نبض دیکھ کر تشخیص کرنا کہ وہ تندرست ہے یا بیمار۔ یہ لفظ حَسّ سے زیادہ خاص ہے کیونکہ حَسّ ان چیزوں کے معلوم کرنے کو کہتے هیں جن کا ادراک احساس کرسکے۔ اَلْجَسّ ۔ خبریں اور اندرونی حالات تلاش کرنا اور ان کی کرید کرنا ۔ بعض نے کہا ہے کہ تَجَسَّسٌ (جیم کے ساتھ) اور تَحَسَّسٌ (حاء کے ساتھ) ایک هی معنی میں آتے هیں ، اس فرق کے ساتھ کہ تَجَسَّسٌ کسی دوسرے کیلئے خبریں تلاش کرنا هوتا ہے (اسی سے جَاسُوْسٌ ہے) اور تَحَسَّسٌ خود اپنے لئے هوتا ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ تَجَسَّسٌ کے معنے چھپی هوئی باتوں کی کرید کرنا هوتا ہے اور تَحَسَّسٌ سے مفہوم چھپ کر باتیں سننا*۔ اَلْجَاسُوْسُ بُرے راز دان کو کہتے هیں اور اَلنَّامُوْس اور اَلْحَاسُوْسُ اچھے رازدان کو**۔

قرآن میں ہے لَا تَجَسَّسُوْا (۴۹/۱۲) پوشیدہ باتوں کی خواہ مخواہ کرید مت کرو۔ یعنی کسی کے ایسے اندرونی اور نجی حالات جنہیں وہ راز میں رکھنا چاهتا ہے اور اس سے اجتماعی فساد کا کوئی امکان نہیں ، اپنی ذاتی غرض سے انہیں معلوم کرنے میں دلچسپی نہ لو۔ خواہ مخواہ اپنے قیمتی وقت کو ایسے فضول، لا یعنی کاموں میں خرچ نہ کرو۔ مندرجہ بالا معانی کے اعتبار سے اس میں ارادے کی برائی بھی شامل ہے۔ یعنی بری نیت سے (شرانگیز مقصد کیلئے) ایسا کرنا معیوب ہے ۔ حکومت کے لئے ضروری هوتا ہے کہ باشندگان ملک اور بیرونی دشمنوں کے اندرونی حالات تک سے باخبر هو۔ یہ چیز اس تجسس میں نہیں آئیگی جس سے قرآن نے منع کیا ہے۔

*تاج و راغب ۔ **محیط۔

ج س م

اَلْجِسْمُ - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے جمع ہو جانے کے ہیں - بدن (کی مجموعی شکل) - اعضاءِ بدن* - تُعْجِبُکَ اَجْسَامُہُمْ (۶۳/۴) یعنی انکی جسمانی ہیئت اور ڈیل ڈول - سورۃ بقرۃ میں یہ لفظ جسمانی توانائی کیلئے بھی آیا ہے (۲/۲۴۷) جہاں کہا گیا ہے کہ فوج کی کمان اسے دی جاسکتی ہے جس کا علم بھی زیادہ ہو اور جسمانی توانائی بھی ، اور اس سے دوسرے بھی مستفید ہوتے ہوں - غور کیجئے ، قرآن نے علم کے ساتھ جسمانی توانائی کی اہمیت کو کس انداز سے اجاگر کیا ہے - جو فرد یا قوم جسمانی طور پر (Physically) کمزور ہو جائے اس کا علم زیادہ نفع رساں اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا - جسمانی قوت میں ہر قسم کی طبیعی قوت (Physical Force) آ جاتی ہے- اس میں شبہ نہیں کہ مقصودِ حیات ، انسانی ذات (Personality) کی نشو و نما ہے لیکن زندگی کی موجودہ سطح پر یہ نشو و نما جسم کے بغیر نہیں ہو سکتی - اس کے لئے جسم کی پرورش ایسے ہی ضروری ہے جسطرح انڈے میں بچہ بننے کے لئے انڈے کے خول کا صحیح و سالم ہونا ضروری ہے - قرآنی نظام میں جسم اور ذات دونوں کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچتا ہے -

ج ع ل

جَعْلٌ کے بہت سے معنے آتے ہیں اور راغب کے قول کے مطابق یہ لفظ ہر کام کرنے کے لئے بولا جاسکتا ہے - نیز فَعَلَ (اسنے کیا) اور صَنَعَ (اس نے بنایا) وغیرہ کی نسبت جَعَلَ بہت زیادہ وسیع المعنی ہے** - مثلاً قرآن کریم میں ہے وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا (۱۹/۳۰) ''اسنے مجھے نبی بنا دیا،، یہاں اسکے معنی خَلَقَ اور صَنَعَ سے بالکل الگ ہیں - لیکن جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ (۶/۱) ''اللہ نے تاریکی اور روشنی کو بنایا،، میں جَعَلَ کے معنے تَخْلِیْق و اِیْجَاد کے ہیں - اگرچہ یہاں بھی پہلے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کہا ہے اور پھر جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ-اسی طرح وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ - (۲۱/۳۰) ''اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا،، - اور جَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَۃَ (۱۶/۷۸) - ''خدا نے تمہارے لئے سمع و بصر اور قلب بنائے،، میں

*تاج - **تاج و راغب -

بھی جَعَلَ کے یہی معنے ہیں ۔ اسکے بعد فِی آنے سے اس کے معنے ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنا ہو جاتے ہیں ۔ مثلاً یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْ اٰذَانِهِمْ (۲/۱۹)۔''وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں''۔ نیز وَ جَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَ رَحْمَةً (۵۷/۲۷) ''ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے اس (حضرت عیسیٰؑ کی پیغمبری) کا اتباع کیا نرمی اور ہمدردی کے جذبات پیدا کر دئے''۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے، سیاق وسباق کے مطابق اسکے معنی کئے جائینگے ۔ ہر مقام پر ایک ہی معنے نہیں ہونگے ۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ لفظ (انگریزی کے (To Make) کی طرح) وسیع المعنی ہے ۔جعل کے دیگر معانی کے لئے دیکھئے تتمہ صفحہ ۱۸۳۳ جلد چہارم۔

ج ف ن

اَلْجَفْنُ ۔ غلافِ چشم ۔ پپوٹا (اوپر اور نیچے کا) ۔ تلوار کا نیام ۔ اَلْجَفْنَةُ ۔ چھوٹا کنواں ۔ بڑا پیالہ جسمیں کھانا کھایا جاتا ہو ۔ اسکی جمع جِفَانٌ آتی ہے* (۳۴/۱۳) ۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ پہاڑی علاقہ کے لوگ (جن) جنہیں حضرت سلیمانؑ نے کام میں لگایا تھا، ان کے لئے علاوہ دیگر اشیاء کے، بڑے بڑے لگن بناتے تھے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی ہر اس چیز کے ہیں جو کسی دوسری چیز کو محیط ہو ۔ یعنی اسے اپنے گھیرے میں لے لے ۔

ج ف و (ج ف أ)

جَفَا ۔ جَفَاءً ۔ تَجَافٰی ۔ وہ اپنی جگہ پر قائم نہیں رہا، جیسے زین جو گھوڑے کی پشت پر قائم نہ رہے ۔ اَجْفَیْتُهُ ۔ میں نے اسے اس کی جگہ سے ہٹا دیا ۔ جَفَا مَالَهٗ ۔ وہ اپنے اونٹوں سے جدا ہو گیا ۔ اَلْجُفَاءُ ۔ ہانڈی کا میل کچیل جو ابال آنے سے ادھر ادھر گر جائے ۔ کہتے ہیں اَجْفَتِ الْقِدْرُ زَبَدَهَا ۔ ہانڈی نے اپنا ابال پھینک دیا** ۔ اس معنی میں راغب نے اَجْفَأَتِ الْقِدْرُ بھی لکھا ہے*** ۔ اسی سے وادی کے دونوں کناروں پر رہ جانے والا کوڑا کرکٹ، نیز بیکار و بے فائدہ اور باطل شے کو جُفَاءٌ کہتے ہیں** ۔ سورۃ رعد میں ہے فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَاءً (۱۳/۱۷) ۔ ''سو جھاگ بالکل رائگاں جاتا ہے''۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے کہتے ہیں جَفَتِ الْاَرْضُ وَ اَجْفَتْ ۔ زمین بے خیر اور بے برکت ہو گئی ۔ بالکل بے کار ہو گئی** ۔

* تاج ۔ راغب ۔ محیط ۔ **تاج ۔ *** راغب

(راغب نے کہا ہے کہ یہ تمام الفاظ واوی ہیں ۔ مہموز نہیں*)

قرآن میں مومنین کے متعلق ہے تَتَجَافٰی جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ (۳۲/۱۶) ۔ ''ان کے پہلو بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں،، ۔ خداوندی پروگرام کی تکمیل میں ان پر راتوں کی نیند حرام ہوجاتی ہے ۔

ج ل ب

جَلَبَهٗ ۔ يَجْلِبُهٗ اس نے اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف ھانکا**۔ برائے تجارت مال وغیرہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گیا***۔ اَلْجَلَبُ ۔ وہ لوگ جو اونٹ بکریاں وغیرہ فروخت کرنے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں ۔ نیز خود ان اونٹ بکریوں کو بھی جَلَبٌ اور جَلَبَةٌ کہتے ہیں ۔ عَبْدٌ جَلِيْبٌ ۔ وہ غلام جو کسی دوسرے شہر سے لایا گیا ہو ۔ اَلْجُلْبَةُ ۔ زمانہ کی سختی ۔ بھوک کی شدت ۔ مشقت ۔ اسی سے اَلْجَلَبُ کے معنے ہیں کسی پر ظلم اور سختی کرنا ۔ جَلَبَ عَلَيْهِ ۔ اس نے اس پر ظلم کیا ۔ اَجْلَبَ الْقَوْمُ عَلَيْهِ ۔ قوم اس کے خلاف جمع ہو گئی ۔ اَجْلَبَ الْقَوْمُ ۔ لوگ ہر طرف سے جنگ کے لئے جمع ہو گئے** ۔ انہی معنوں میں قرآن کریم میں ہے وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ (۱۷/۶۴) ۔ ''تو ان کے خلاف اپنے تمام لشکر جمع کر لا ،، ۔ ان پر چڑھ دوڑ ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے دوسرے بنیادی معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جو دوسری چیز کو ڈھانپ لے ۔ اس اعتبار سے اَلْجِلْبَابُ ۔ اوڑھنی سے بڑا اور چادر سے چھوٹا کپڑا ہوتا ہے جس سے عورتیں اپنے سر اور سینے کو چھپاتی ہیں** ۔ قرآن میں ہے يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ (۳۳/۵۹) ۔ '' اپنی چادریں اپنے اوپر اوڑھ لیا کریں ،، ۔ انصار کی عورتیں سیاہ ملبوس (اور کوٹ کی طرح) اوپر سے پہنتی تھیں ۔ اسے بھی جِلْبَابٌ کہتے تھے ۔ لہذا اس سے مراد ایسا کپڑا یا لباس ہے جو اوپر سے اوڑھ یا پہن لیا جائے تا کہ اس سے زینت کی چیزیں نمایاں نہ ہوں ۔ ابن فارس نے یہ بھی کہا ہے کہ عربوں کے ہاں جِلْبَابٌ یا اسی قسم کے دیگر کشادہ لباسوں سے (بطور محاورہ) وقار اور سکون مراد لیا جاتا ہے ۔

ج ل د

اَلْجِلْدُ (وَالْجَلَدُ) ۔ ہر جاندار کی کھال (۴/۵۶) اس کی جمع جُلُوْدٌ اور اَجْلَادٌ ہے ۔ اَلْجِلْدُ سے کنایۃً عضو تناسل بھی مراد لیا جاتا ہے ۔

* تاج ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔ *** محیط ۔

اَجْلاَدُ الْاِنْسَانِ سے مراد آدمی کا پورا ڈھانچہ اور جسم ہے جس پر کھال ہوتی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قوت اور صلابت (سختی) کے ہوتے ہیں۔ فُلَانٌ عَظِيْمُ الْاَجْلَادِ۔ وہ قوی اعضا اور مضبوط جسم والا ہے۔ یا مَا اَشْبَهَ اَجْلَادَهٗ بِاَجْلَادِ اَبِيْهِ۔ اس کا جسم اور ناک نقشہ، چہرہ، بشرہ اور ڈیل ڈول اپنے باپ سے کسقدر مشابہ ہے*۔ اَلْجَلَدُ (بچہ کی) بھس بھری ہوئی کھال (جو اونٹنی وغیرہ کے سامنے دودھ اتارنے کے لئے رکھ دی جائے)۔ اَلْجَلَدُ۔ شدت اور قوت۔ استقامت اور سختی*۔ صاحب محیط نے اس کے معنے آسمان، کرۂ ہوائی، اور اس پانی کے کئے ہیں جو اوپر سے گر کر زمین پر جم جائے۔ راغب نے کہا ہے کہ جس طرح اَلْقُلُوبُ سے مراد نفوس ہوتے ہیں اسی طرح جُلُودٌ سے مراد اجسام ہوتے ہیں**۔

اَلْمِجْلَدُ۔ چمڑے کا ٹکڑہ جسے نوحہ کرنے والیاں اپنے چہرے پر مارا کرتی تھیں۔ جَلَدَ يَجْلِدُ۔ کوڑوں سے مارنا*۔ ($\frac{۲۴}{۲}$)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں (۱) چمڑے سے مارنا اور (۲) چمڑی پر مارنا۔ جَلَدَهٗ عَلَى الْاَمْرِ۔ اسے اس بات پر مجبور کر دیا*۔

سورۃ نساء میں ہے كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ($\frac{۴}{۵۶}$)۔ اس کے لفظی معنی ہیں "جب ان کی جلود (کھالیں) پک جائینگی تو ہم ان کی جگہ انہیں اور جلود (کھالیں) دیدینگے۔ مفہوم یہ ہے کہ ان مخالفین پر ذلت و رسوائیوں کا عذاب پیہم اور مسلسل آتا رہیگا۔ جب ایک دفعہ کی شکست سے ان کی قوت ٹوٹ جائیگی تو یہ پھر مقابلہ کے لئے اٹھینگے۔ اور پھر شکست اور ناکامی کی ذلت کا مزہ چکھینگے۔ اسطرح پیہم شکستوں اور متواتر ناکامیوں سے ان کی سختی اور صلابت ٹوٹیگی۔ بدر کی جنگ سے فتح مکہ تک پیہم شکستوں کا یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر آخرالامر ان مخالفین کی شدت و صلابت ختم ہوئی۔

سورۃ حم سجدہ میں سمع و بصر کے ساتھ جُلُوْدٌ کی شہادت کا ذکر آیا ہے ($\frac{۴۱}{۲۰-۲۲}$)۔ یعنی مجرمین کی سماعت، بصارت اور سارا جسم ان کے اعمال کی شہادت دینگے۔ وہ خود اپنے اعمال کی شہادت کے مجسمے ہونگے۔ ہر عمل کا اثر انسان کی ذات پر مرتب ہوتا ہے اس لئے انسانی اعمال کی بنیادی

* تاج و محیط۔ ** راغب۔

شاهد خود انسان کی ذات ہوتی ہے خواہ عقل حیلہ جو ان کے جواز میں کتنی دلیلیں کیوں نہ تراشے - بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ - وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِيْرَهٗ (۷۵ / ۱۴-۱۵) - '' انسان اپنی ذات کے خلاف خود دلیل ہے - خواہ (ویسے) وہ (اپنے اعمال کی مدافعت میں) کتنے ہی عذر کیوں نہ پیش کرے '' - یہی '' سمع و بصر و جلود '' کی شہادت ہے - ظہور نتائج کا وقت بھی کیسا عبرت انگیز اور دلدوز ہوتا ہے جب انسان کا کوئی خفیہ سے خفیہ عمل بھی چھپا ہوا نہیں رہ سکتا - حتیٰ کہ دل میں گذرنے والا خیال تک بھی نہیں -

ج ل س

جَلَسَ - يَجْلِسُ - جُلُوْسًا - مَجْلِسًا - بیٹھنا - جُلُوْسٌ - اس شخص کیلئے آتا ہے جو لیٹا ہو اور اس کے بعد اٹھ بیٹھے - اور قُعُوْدٌ - اس شخص کیلئے آتا ہے جو کھڑا ہو اور اس کے بعد بیٹھ جائے - اَلْجَلْسُ - دراصل سخت اور بلند زمین کو کہتے ہیں - یہی اس کے بنیادی معنیٰ ہیں - بیٹھنے کیلئے یہ لفظ اسلئے استعمال ہوتا ہے کہ اس میں انسان اپنی مقعد کو سخت زمین پر رکھتا ہے* لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلند ہونے کے ہیں اور چونکہ لیٹا ہوا آدمی جب اٹھتا ہے تو وہ بلند ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے - قرآن کریم میں مَجَالِسُ کا لفظ (۵۸ / ۱۱) میں آیا ہے - اس کے معنی ہیں وہ مقامات جہاں لوگ جمع ہو کر بیٹھیں -

ج ل ل

جَلَّ الرَّجُلُ يَجِلُّ جَلَالَةً وَ جَلَالًا - سن رسیدہ اور معمر ہو جانا - قدر و منزلت کے اعتبار سے بڑا عظیم المرتبت یا جلیل القدر ہونا جَلِيْلٌ کہلائیگا - جُلُّ الشَّيْءِ - چیز کا بڑا حصہ - اَلْجُلّٰی - امر عظیم - اَلْجُلُّ وہ کپڑا جو حفاظت کیلئے چوپایہ پر ڈال دیا جاتا ہے - اَلْجَلِيْلُ - بڑا آدمی - اونٹ کو بھی کہتے ہیں - اس کے مقابلہ میں دَقِيْقٌ بکری کو کہتے ہیں** - صاحب محیط کے نزدیک اصل معنے اس مادہ میں گول اور بلند ہونے کے ہیں*** - راغب نے لکھا ہے کہ جلال میں جلالت سے زیادہ کمال پایا جاتا ہے -

---

* تاج - محیط - راغب - ** تاج و راغب - *** محیط -

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کیلئے ذُو الْجَلَالِ وَ الْاِکْرَامِ (۵۵/۲۷) آیا ہے۔ یعنی عظمت و جلالت کا مالک۔ (اِکْرَام کے لئے مادہ ک۔ ر۔ م دیکھئے)۔

ج ل و

اَلْجَلَاءُ۔ منتشر کر دینا۔ علیحدہ اور الگ الگ کر دینا۔ جلا وطن کر دینا (۵۹/۳)۔ جَلَا فُلَانًا الْاَمْرَ۔ اس نے فلاں کیلئے معاملہ کو کھول دیا۔ واضح کر دیا۔ ظاہر کر دیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں۔ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا (۹۱/۳)۔ یعنی اِذَا جَلَا الظُّلْمَةَ۔ دن، جب وہ تاریکی کو دور کر کے ہر چیز کو واضح اور نمایاں کر دیتا ہے*۔

اَلْجَلِیُّ۔ واضح امر۔ خفی کی ضد ہے۔ اَلْجَلَاءُ۔ واضح امر۔

اَلْجِلْوَةُ۔ وہ چیز جو دولہا کی طرف سے دلہن (عروس) کو منہ دکھائی میں دی جائے*۔ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ (۷/۱۴۳) "جب اس کا رب پہاڑ پر جلوہ بار ہوا"۔ جَلْوٌ کے اصل معنے ظاہر طور پر کھول دینے کے آتے ہیں**۔

ج م ح

جَمَحَ الْفَرَسُ۔ گھوڑے کا تیزی کے ساتھ دوڑتے جانا اسطرح کہ وہ سوار کے قابو میں نہ رہے اور سر کو اونچا کئے اسطرح دوڑتا جائے کہ سوار اسکی گردن کو موڑ نہ سکے**۔ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ (۹/۵۷) وہ بے قابو ہو کر دوڑے جا رہے ہیں۔ قانون خداوندی سے سرکشی اختیار کر رہے ہیں۔ اَلْجَمَّاحُ۔ جنگ میں شکست کھا کر بھاگنے والے کہ جنھیں پھر میدان میں لانا ممکن نہو۔ جَمَحَتِ الْمَرْاَةُ مِنْ زَوْجِهَا۔ عورت اپنے خاوند سے ناراض ہو کر اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی، بغیر اسکے کہ شوہر نے اسے طلاق دی ہو۔ جُمَّيْحٌ۔ مرد کے عضو مخصوص کو کہتے ہیں۔ اور اَلْجَمُوْحُ۔ اس شخص کو جو بے قابو ہو کر اپنے جذبات کے تابع چلے اور اسے اس سے باز رکھنا ممکن نہ ہو***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا قوت اور غلبہ کے ساتھ آگے بڑھتے جانا۔ اس کے بعد اس کے معنی عام طور پر دوڑنے یا دوڑ جانے کے ہو گئے۔

---

*تاج۔ ** راغب۔ ***تاج و محیط۔ راغب۔

ج م د

جَمَدَ الْمَاءُ۔ پانی جم گیا۔ کھڑا ہو گیا۔ اَلْجَمَدُ۔ برف۔ جما ہوا پانی۔ اَلْجَمَادُ۔ سست رفتار اونٹنی جسکا دودھ نہ رہا ہو۔ جَمَادُ الْکَفِّ۔ بخیل آدمی۔ عَیْنٌ جَمُوْدٌ۔ وہ آنکھ جس سے آنسو نہ بہیں*۔ اَلْجَمَادُ۔ زمین۔ ہر وہ چیز جو نشو و نما نہ پاتی ہو۔ جو نامی نہو (Inorganic)۔ جمادیٰ۔ جُمَادَی الْاُوْلیٰ اور جُمَادَی الْاُخْرَۃ۔ ربیع الثانی کے بعد دونوں مہینوں کو کہتے ہیں۔ جس زمانے میں انکے یہ نام رکھے گئے تھے یہ مہینے سخت سردی میں آتے تھے (اب چونکہ حساب قمری ہے اسلئے یہ ضروری نہیں رہا کہ ہر مہینہ، ہر سال اسی موسم میں آئے)*۔

قرآن کریم میں پہاڑوں (یا قوم کے سرداروں) کے متعلق ہے۔ تَحْسَبُهَا جَامِدَۃً (۲۷/۸۸) "تو انہیں جما ہوا سمجھتا ہے"۔

ج م ع

اَلْجَمْعُ۔ متفرق چیزوں کو اکٹھا کر دینا۔ راغب نے کہا ہے، چیزوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ملا دینا۔ سرخ رنگ کے ایک گوند کو بھی کہتے ہیں۔ نیز لوگوں کے گروہ کو بھی۔ اَلْجَمِیْعُ۔ لشکر۔ مجتمع قبیلہ۔ اَلْجُمَّاعُ۔ ہر چیز جس کے اجزاء باہم ملے ہوئے اور مجتمع ہوں۔ مختلف قبائل کے لوگ جو ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ نیز کسی چیز کی جڑ کے جمع ہونے کی جگہ۔ جُمْعُ الْکَفِّ۔ بندھی ہوئی مٹھی*۔

اَجْمَعُ۔ (مذکر) جَمْعَاءُ (مؤنث)۔ اَجْمَعُوْنَ (جمع مذکر) جُمَعُ (جمع مؤنث) یہ الفاظ محض تاکید کے لئے آتے ہیں*۔ یعنی جب ہم کہینگے اَجْمَعُوْنَ۔ "سب لوگ"، تو اس سے لازماً یہ مراد نہیں ہوگی کہ کوئی ایک شخص بھی باقی نہیں رہا۔ مقصد اکثریت ہوگا۔ اَجْمَعْتُ الْاَمْرَ۔ میں نے اس امر کا پختہ ارادہ کر لیا (۱۰/۷۱)۔ (اس کے بعد عَلَیْہِ بھی آ جاتا ہے)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس میں کسی بات پر غور و فکر کے بعد ارادہ کرنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ اَمْرٌ جَامِعٌ۔ عظیم الشان کام جس کے لئے لوگ جمع ہو جائیں۔ یَوْمُ الْجُمُعَۃِ۔ اسلام سے پہلے قریش، ہفتہ میں ایک دن، جسے وہ یَوْمُ الْعَرُوْبَۃِ کہتے تھے، دار قُصَیّ کے پاس دارالندوہ (اپنے قومی دارالمشاورت) میں

* تاج۔ ** محیط۔

جمع ہوا کرتے تھے ۔ کعب بن لؤی نے اس دن کا نام یَوْمُ الجُمُعَةِ رکھ دیا۔ اسی حیثیت سے اَلْمُجَمِّعُ ، قُصَیّ بن کلاب کا لقب ہے جس نے دارالندوہ بنایا تھا* ۔ اس سے جمعہ کا مقصد واضح ہو جاتا ہے ۔ یعنی مشورہ کے لئے اکٹھا ہونا ۔ قرآن کریم میں ہے کہ جماعت مومنین کا شیوہ یہ ہے اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "وہ صلٰوۃ کے نظام کو قائم کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں"۔ صلوٰۃ کے اجتماعات میں خدا کے حضور جھکنا اور سجدہ ریز ہونا اس حقیقت کا محسوس مظاہرہ ہے کہ ہم اس کے قوانین و احکام کی اطاعت کے لئے جمع ہوئے ہیں ۔ اور اسی مقصد کے لئے ہماری مشاورت ہوگی ۔ محیط میں ہے کہ اَلْجُمُعَةُ ، اِجْتِمَاعٌ سے ماخوذ ہے جس طرح اَلْفُرْقَةُ ، اِفْتِرَاقٌ سے ماخوذ ہے**۔

قرآن کریم میں جَمِیْعاً بمقابلہ اَشْتَاتاً (۲۴/۶۱) آیا ہے جس سے اس کے معنے واضح ہو جاتے ہیں ۔ (اَشْتَاتاً کے معنی ہیں الگ الگ) سورۃ النساء میں جمیعاً بمقابلہ ثُبَاتٍ (۴/۷۱) ۔ آیا ہے جہاں اس کے معنی ہیں ایک پورا لشکر بنا کر۔ (ثُبَاتٍ کے لئے دیکھئے ۔ ث ۔ ب ۔ ی)۔

اَجْمَعِیْنَ کا لفظ قرآن کریم میں بکثرت آیا ہے (مثلاً ۲/۱۶۱) ۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس سے مفہوم محض تاکید ہوتی ہے نہ کہ یہ کہنا کہ اس سے کوئی ایک فرد بھی باہر نہیں رہا ۔

ج م ل

اَلْجَمَلُ ۔ اَلْجَمْلُ ۔ نر اونٹ ۔ اس کی جمع جِمَالَةٌ آتی ہے (۷۷/۳۳)۔ جَمَالٌ۔ خوبصورتی*۔ (۱۶/۶)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) اکٹھا ہونا اور خلقت میں بڑا ہونا اور (۲) خوبصورتی ہیں ۔ عربوں کے نزدیک جَمَلٌ (اونٹ) سے بڑھ کر عظمت اور بلندی اور حسن و خوبصورتی اور کس چیز میں ہو سکتی تھی؟ یا خود ان کا جمال و حسن بھی اونٹوں کی وجہ سے ہوا کرتا تھا ۔ جَمِیْلٌ۔ خوبصورت انداز۔ عمدہ چیز*۔ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ (۱۲/۱۸) حسن کا رانہ انداز سے صدمہ کو برداشت کرنا اور استقامت کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا ۔

---

* تاج ۔ ** محیط ۔

اَلْجُمَّلُ ـ اَلْجُمْلُ ـ اَلْجُمَلُ اَلْجُمُلُ ـ اَلْجَمَلُ ـ کشتی کا موٹا رسہ*۔ قرآن کریم میں ہے حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِی سَمِّ الْخِیَاطِ (۷/۴۰)۔ ''حتّٰی کہ جہاز کا رسہ سوئی کے ناکے میں سے گزر جائے''۔ اَلْجُمْلَۃُ ـ چیز کا مجموعہ*۔ یہیں سے اَلْمُجْمَلُ بھی بہت سی چیزوں کے مجموعہ کو کہتے ھیں۔ یعنی جس کی چیزیں الگ (منفصل) نہ کی گئی ہوں*۔ قرآن کریم میں جُمْلَۃً وَّاحِدَۃً (۲۵/۳۲) آیا ہے۔ یعنی سارے کا سارا ایک ھی بار۔ (مجمل اور مفصل کے لئے دیکھئے عنوان ف ۔ ص ۔ ل)۔

ج م م

اَلْجَمُّ ـ ہر چیز کی کثرت ۔ مَالٌ جَمٌّ ـ بہت زیادہ مال ۔ جُمَّۃُ الْمَاءِ ـ زیادہ مقدار میں پانی کے جمع ہونے کی جگہ**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کثرت اور اجتماع کے ھیں ۔ جَمَّتِ الْبِئْرُ ـ کنویں میں پانی (نکالے جانے کے بعد) لوٹ آیا اور کثیر اور مجتمع ہو گیا ۔ اَلْجَمَمُ ـ پیمانہ کو کناروں تک (لبالب) بھر دینے کے بعد جو کچھ اس کے اوپر ہو**۔ اَلْجَمَامَۃُ ـ راحت ۔ سیری ۔ ۔ جَمًّا غَفِیْرًا ـ سب کے سب، لوگوں کی بہت بڑی تعداد جس میں چھوٹے بڑے، ادنےٰ اور اعلےٰ سب شامل ہوں****۔

قرآن میں ہے وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹/۲۰) ۔ تم بڑی شدت سے دولت سے محبت رکھتے ہو ۔ تم چاہتے ہو کہ جسطرح گڑھے میں ارد گرد کا پانی جمع ہو جاتا ہے*** اسی طرح سب کی دولت، وہ تھوڑی ہو یا زیادہ، سمٹ سمٹا کر تمہاری طرف آجائے۔ نظام سرمایہ داری میں ہوتا ھی یہ ہے کہ دولت سمٹ سمٹا کر چند افراد کے پاس جمع ہو جاتی ہے ۔ قرآن اس نظام کو مٹانے کے لئے آیا تھا ۔

ج ن ب

اَلْجَنْبُ ـ پہلو** اسکی جمع جُنُوْبٌ ہے ۔ (۳/۱۹۰)۔ اَلصَّاحِبُ بِالْجَنْبِ (۴/۳۶) ۔ ساتھی، رفیق ۔ اَلْجَارِ الْجُنُبِ (۴/۳۶)۔ ایسا ہمسایہ جو رشتہ دار نہ ہو۔ کیونکہ اس سے پہلے اَلْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی آیا ہے ۔ کتاب الاشتقاق میں اس کے معنی اَلْغَرِیْبُ ـ یعنی اجنبی کے دئے ھیں ۔ سورۃ الزمر میں ہے مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْبِ اللّٰہِ (۳۹/۵۶) ۔ ''یعنی خدا کے (حقوق ادا کرنے کے) بارے میں جو کوتاھی کی''۔ زجاج نے کہا ہے کہ اسکے

* تاج و راغب ۔ ** تاج ۔ *** راغب ۔ ****محیط ۔

معنے اللہ کے اس راستہ کے ہیں جسکی طرف اسنے مجھے دعوت دی*۔ سورۃ مائدہ میں ہے وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا (۵/۶)۔ اسکے معنے حالت جنابت کے ہیں ۔ (ہم آغوشی کی رعایت سے)۔جَنَابَۃٌ ۔ دوسروں سے الگ رہنا ۔ جَنَابَۃٌ ۔ وہ چیز جس سے کوئی دور رہے***۔

جَنَبَہٗ ۔ جَانَبَہٗ ۔ اسے دور کر دیا ۔ جَنَّبَہٗ ۔ اَجْنَبَہٗ ۔ اسے ہٹا دیا ۔ رَجُلٌ جَنِبٌ ۔کنارہ کش ، اجنبی نیز وہ شخص جو بخل کی وجہ سے عام راستہ سے ہٹ کر رہتا ہو تاکہ مہمانی نہ کرنا پڑے*۔ سَيُجَنَّبُهَا (۹۲/۱۷)۔ يَتَجَنَّبُهَا (۸۷/۱۱) ۔ اجْتَنِبْ (۳۹/۱۷) ۔ یہ سب الفاظ انہی معانی میں آئے ہیں ۔ یعنی دور رکھنا ۔ یا دور رہنا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) کنارہ اور (۲) دوری کے ہیں ۔ جَانِبُ الْبَرِّ (۱۷/۶۸) ۔ خشکی کا قطعہ ۔ اَلْجَنَابُ ۔ گھر کے سامنے کھلے ہوئے میدان کو کہتے ہیں*۔ نیز کسی کے اترنے یا ٹھہرنے کی جگہ کو***۔

سورۃ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کی ماں نے بچہ کو (صندوق میں رکھ کر) دریا میں بہا دیا تو بیٹی سے کہا کہ وہ صندوق کے پیچھے پیچھے جائے فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۲۸/۱۱) ۔ اس مادہ کے جو معانی اوپر بیان کئے جا چکے ہیں ان کے پیش نظر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ

(۱) وہ اسے دور سے دیکھتی رہی اور (فرعون کے) لوگوں نے اسے محسوس نہ کیا کہ وہ اسکا پیچھا کر رہی ہے ۔ یا

(۲) وہ ایسے کچھ اجنبی سا بنکر دیکھتی رہی تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ وہ اسکی تاک میں ہے ۔

ج ن ح

اَلْجَنَاحُ ۔(جمع اَجْنِحَۃٌ) ہاتھ ۔ بازو ۔ پرندے کا بازو ۔ بغل ۔ پہلو ۔ نیز اسکا اطلاق خود نفس شے پر بھی ہوتا ہے****۔

اَنَا فِیْ جَنَاحِهٖ ۔ میں اس کے سایے اور حفاظت میں ہوں*۔ اس قسم کی حفاظت جیسے مرغی اپنے بچوں کو خطرہ کے وقت اپنے پروں کے نیچے لے لیتی ہے ۔ جَنَحَ اِلَيْهِ ۔ وہ اسکی طرف مائل ہوگیا ۔ جھک گیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جھکنے کے ہیں ۔ اس سے اَلْجُنَاحُ کے معنے ہیں گناہ کی طرف میلان*۔ لیکن محیط میں ہے کہ یہ لفظ گناہ کا معرب ہے**۔ یہ لفظ مضائقہ یا حرج کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے*۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***لین ۔ ****تاج و لطائف اللغہ ۔

جب نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ آپ مخالفین سے الگ ہٹ کر اپنی جماعت کی تنظیم کریں۔ (۱۵/۹۴)۔ تو اس کیلئے ان الفاظ میں تاکید کی گئی کہ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۱۵/۸۸) ''اپنی جماعت کے افراد کے لئے اپنا بازو جھکا دے،،۔ انہیں اپنے پروں کے نیچے ایسے سمیٹ لے جسطرح مرغی اپنے نوزائیدہ بچوں کو اپنے پروں کے نیچے لے لیتی ہے۔۔ سورۃ قصص میں حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ہے کہ فرعون کے ساتھ کشمکش میں گھبرانا نہیں۔ اپنے بال و پر سمیٹ کر رکھنا۔ وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ (۲۸/۳۲) خوف کے وقت پھڑپھڑانا نہیں بلکہ اپنے بال و پر سمیٹ کر رکھنا، حواس قائم رکھنا۔ یا اپنے افرادِ جماعت کی حفاظت کرنا، انکی تنظیم کرنا۔ یہ سب معانی اسمیں آجاتے ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ماں باپ کی پرورش و حفاظت کی تاکید کیلئے بھی کہا گیا ہے کہ۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (۱۷/۲۴)۔ نرمی اور رحمت سے اپنے بازو کو انکی طرف اور جھکا دو۔ انکی حفاظت اور خدمت نہایت نرم روی سے کرو کیونکہ وہ معذور ہو چکے ہیں۔

سورۃ فاطر میں ملائکہ کے متعلق کہا ہے اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ (۳۵/۱)۔ اس کے لفظی معنی ہیں بازوؤں (پروں) والے۔ چونکہ بازو یا پر وہ سہارا ہیں جن سے پرندے فضا میں اڑتے ہیں اس لئے مجازی طور پر اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ کے معنی ہونگے مختلف خواص کی مالک کائناتی قوتیں۔

گناہ، حرج یا مضائقہ کے معنوں میں جُنَاحٌ کئی جگہ آیا ہے۔ مثلاً لَاجُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (۲/۱۵۸)۔ ان پہاڑیوں (صفا اور مروہ) میں چلنے پھرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، یا زیادتی نہیں۔ کیونکہ ابن فارس نے اس کے دوسرے بنیادی معنی ''زیادتی،، لکھے ہیں۔

ج ن د

اَلْجَنَدُ۔ سخت زمین۔ پتھر جو مٹی سے مشابہ ہوں۔ جُنْدٌ۔ جمع ہو جانیوالے لوگ (یا اشیاء)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اکٹھا ہونے اور مدد کرنے کے ہیں۔ غلظت اور سختی کی وجہ سے لشکر کو اَلْجُنْدُ کہتے ہیں۔ (اسکی جمع جُنُوْدٌ آتی ہے) اور جمع ہو جانے کے اعتبار سے ہر جماعت اور انصار کو جُنْدٌ۔ سورۃ مریم میں ہے اَضْعَفُ جُنْدًا (۱۹/۷۵) اس کے معنی ہیں جس کے رفقاء اور ساتھی، اعیان و انصار، جماعت

---

* تاج و راغب۔

اور جتھہ کمزور ہے ۔ سورۃ فتح میں ہے لِلّٰہِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۴۸/۴) ۔ ''ارض و سماء کے لشکر اللہ کے لئے ہیں'' اس سے مراد کائنات کی تمام اشیاء اور قوتیں ہیں ۔ محیط میں ہے کہ اسکے معنی ایک نوع کی مخلوق کے بھی ہیں ۔ سورۃ بروج میں ہے ھَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ (۸۵/۱۷) ۔ ''کیا تجھے لشکروں کی خبر پہنچی ہے ۔'' یعنے بڑے بڑے لشکر اور قوت والوں کی داستان ۔ (اس سے اگلی آیت میں فرعون اور ثمود کا ذکر ہے) ۔

ج ن ف

اَلْجَنَفُ ۔ کسی ایک طرف جھک جانا ۔ جانبداری ۔ دل کا میلان ۔ (یہ عدل کا راستہ چھوڑ کر کسی دوسری طرف جھک جانے کے لئے آتا ہے) ۔ تَجَانَفَ عَنْ طَرِیْقِہٖ ۔ اپنے راستہ سے ایک طرف کو ہٹ گیا* ۔ قرآن کریم میں ہے فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا (۲/۱۸۲) ۔ ''جسے اسکا خدشہ ہو کہ وصیت کرنے والا کسی کی طرفداری کریگا'' ۔ یعنی وہ انصاف سے ہٹ کر کسی ایک کو زیادہ دیدیگا ۔ یاد رہے کہ مُتَجَنِّفٌ اس کو کہینگے جو حق و انصاف کو چھوڑ کر کس کی طرفداری کرے* ۔

سورۃ مائدہ میں ہے غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِاِثْمٍ (۵/۳) ۔ جو گناہ (اِثْمٌ) کی طرف جھکنے والا نہو ۔

ج ن ن

جَنَّ کے معنے ہیں چھپا لینا ۔ یہی اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں (ابن فارس) ۔ راغب نے کہا ہے کہ جَنَّ کے معنے کسی چیز کو حاسہ (نگاہ) سے پوشیدہ کر دینا ہیں ۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْہِ الَّیْلُ رَاٰ کَوْکَبًا (۶/۷۶) ''جب رات کی تاریکی نے اسے چھپا لیا تو اسنے ایک ستارہ دیکھا'' ۔ ویسے بھی ہر اس چیز کے لئے جو تم سے چھپ جائے قَدْ جَنَّ عَنْکَ کہتے ہیں ۔ جَنَنٌ قبر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ مردہ کو چھپا لیتی ہے ۔ اور خود میت اور اسکے کفن کو بھی ۔ جَنِیْنٌ جمع اَجِنَّۃٌ (۵۳/۳۲) اس بچہ کو کہتے ہیں جو ہنوز ماں کے پیٹ میں ہو ۔ جُنَّۃٌ ۔ اس ہتھیار کو کہتے ہیں جس سے آدمی اپنا بچاؤ کرے ۔ ہر پردہ اور آڑ ۔ جُنَّۃٌ اور مِجَنَّۃٌ ڈھال کو بھی کہتے ہیں* ۔ (۵۸/۱۶) ۔ لا جِنَّ بِھٰذَا الْاَمْرِ کے معنے ہیں اس بات میں کوئی راز (پوشیدہ) نہیں ۔ جِنَّۃٌ جنون

---

* تاج و محیط ۔

کو کہتے ہیں (۲۳/۲۵) - دراصل عربوں کے ہاں مَجْنُوْنٌ کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسے جِنٌّ چمٹ گیا ہے* -

دور توہم پرستی میں تمام وہ قوتیں جو انسانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتیں اور جن کے متعلق اُس زمانے کے انسان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا ، دیوی دیوتا بن جاتی تھیں - انہی کو عرب (اُن کے نگاہوں سے پوشیدہ ہونے کی بنا پر) جِنٌّ کہتے تھے - وہ فرشتوں کو بھی جِنٌّ کہا کرتے تھے ، حالانکہ انکی پرستش بھی کرتے تھے - راغب نے کہا ہے کہ اَلْجِنٌّ کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے - ایک تو ان تمام مخفی قوتوں (روحانیّین) کے لئے جو حواس سے پوشیدہ ہوتی ہیں - اس اعتبار سے جِنٌّ میں فرشتے بھی شامل ہوتے ہیں - دوسرا یہ کہ ان مخفی قوتوں (روحانیّین) میں سے بعض کو جِنٌّ کہتے ہیں ، اسطرح کہ جو روحانیئین نیک ہوتے ہیں وہ فرشتے کہلاتے ہیں ، جو بد اور سرکش ہوتے ہیں وہ شیاطین کہلاتے ہیں** - اور جن میں نیک و بد دونوں شامل ہوتے ہیں وہ جِنٌّ کہلاتے ہیں - چنانچہ قرآن کے کئی مقامات میں جہاں جاہلیت عرب میں جِنّوں کی پرستش کا ذکر ہے وہاں جِنَّةٌ سے مراد فرشتے ہی ہیں (مثلاً ۳۷/۱۵۸) وغیرہ ** -

ہماری زمین ابتدا میں ایک آتشیں گولہ تھی جسے ٹھنڈا ہوکر انسانی آبادی کے قابل بننے کے لئے لاکھوں اور کروڑوں برس لگ گئے - قرآن کریم میں ہے کہ جب کرۂ ارض پر ہنوز انسانوں کی آبادی نہیں ہوئی تھی تواسمیں جو مخلوق یہاں بستی تھی اسمیں حرارت برداشت کرنے کی قوت اور صلاحیت زیادہ تھی - اسکے بعد وہ مخلوق ختم (Extinct) ہوگئی اور اسکا جانشین (خلیفہ - دیکھئے عنوان خ-ل-ف) انسان ہوا - چونکہ اُس (پہلی) مخلوق میں حرارت برداشت کرنے کی صلاحیت زیادہ تھی اور چونکہ اب وہ انسانوں کے سامنے نہیں ہے ،ان کی نسل ختم (Extinct) ہو چکی ہے ، اسلئے قرآن نے کہا ہے کہ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۱۵/۲۷) - انسان سے پہلے ہم نے ایک مخلوق کو جلتی ہوئی ہوا کی حرارت سے پیدا کیا تھا - وہ مخلوق اب تمہاری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے - اس اعتبار سے اسے الجَآنّ کہا گیا ہے - اس سے یہ بھی مفہوم ہوسکتا ہے کہ اشیائے کائنات مادہ کی مرئی اور محسوس شکل میں آنے سے پہلے ، مخفی توانائی (Energy) کی حالت میں تھیں - یہی توانائی اب مادہ کے اندر (Latent) صورت میں ہے -

*تاج - **تاج و راغب -

نگاھوں سے پوشیدہ ھونے ، نیز اسکی خوئے سرکشی کی وجہ سے،ابلیس کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے کہ وہ جِنّوں میں سے تھا (دیکھئے عنوان ب ۔ ل ۔ س اور ش ۔ ط ۔ ن) ۔

قرآن کریم میں جِنٌّ اور اِنْسٌ کے الفاظ متعدد مقامات پر اکٹھے آئے ھیں ۔ ھم (ا۔ن۔س) کے عنوان میں بتاچکے ھیں کہ عربوں میں اَلْاِنْسُ ان قبیلوں کو کہتے تھے جو ایک مقام پر مستقل طور پر سکونت پذیر ھوجائیں ۔ لیکن جِنٌّ وہ قبائل تھے جو جنگلوں اورصحراؤں میں جگہ بہ جگہ پھرتے رھتے تھے اوراسطرح شہر والوں کی نگاھوں سے اوجھل رھتے تھے ۔ انہیں خانہ بدوش قبائل (Nomadic Tribes) کہا جاتا ہے۔اب بھی دنیا میں جہاں جہاں اس قسم کے قبائل پائے جاتے ھیں وہ شہروالوں سے دور دور، جنگلوں اور بیابانوں میں رھتے ھیں ۔ آجکل وسائل رسل و رسائل کے عام ھوجانے سے ، اِن قبائل اور شہر والوں کی زندگی میں بہت سے امور مشترک ھوچکے ھیں ، اس لئے اِن میں کوئی بنیادی بُعد محسوس نہیں ھوتا ۔ لیکن جس زمانے میں ملنے جلنے کے وسائل اور نشرو اشاعت کے طریق عام نہیں تھے ، شہر والوں اور اِن خانہ بدوش ، صحرانشینوں کے تمدن و معاشرت ، عادات واطوار ، خصائص و خصائل اور ذھنی اور نفسیاتی کیفیات وغیرہ میں اسقدر فرق تھا کہ یہ دونوں ایک نوع کے افراد نظر نہیں آتے تھے ۔ عربوں میں یہ صحرا نشین قبائل بہت زیادہ تھے (انہیں بدّو یا اَعْرَابٌ کہا جاتا تھا) چونکہ قرآن کا پیغام شہریوں اور صحرا نشینوں سب کی طرف تھا اس لئے اس نے جِنٌّ و اِنْسٌ دونوں گروھوں کو مخاطب کیا ہے ۔ ان مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ھوجاتی ہے کہ وھاں جِنٌّ سے مراد انسان ھی ھیں ۔ یعنی وہ وحشی قبائل (Gypsis) جو جنگلوں اور صحراؤں میں رھا کرتے تھے ۔ مثلاً سورۃ انعام میں ہے یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ (۶/۱۳۱) ۔ اے گروہ جن و انس، کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول نہیں آئے تھے ۔ قرآن نے کسی رسول کا ذکر نہیں کیا جو جن تھا ۔ اور سورۃ اعراف میں اس کی تصریح کردی کہ رسول، بنی آدم میں سے، انہی کی طرف بھیجے گئے تھے(۷/۳۵)۔ سورۃ جن اور سورۃ احقاف میں مذکور ہے کہ جنوں کی ایک جماعت رسول اللہؐ کے پاس قرآن سننے کے لئے آئی (دیکھئے ۷۲/۱ ؛ ۴۶/۲۹)۔ اس سے بھی واضح ھوتا ہے کہ ''جنوں'' کی طرف رسول انسانوں میں سے ھی ھوتے تھے ۔ انہی سورتوں (سورۃ جن اور سورۃ احقاف) سے یہ حقیقت بھی واضح ھوجاتی ہے کہ جو جن رسول اللہؐ کے پاس قرآن سننے کے لئے آئے تھے وہ انسان ھی تھے ۔

(وحشی قبائل میں سے عیسائی - یہودی اور مشرک) - سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ اگر ''جن و انس'' اکٹھے ہوجائیں تو بھی اس قرآن کی مثل نہ بنا سکیں - سورہ انعام میں ہے کہ ''انس و جن'' کے سرکش لوگ انبیاءؑ کی مخالفت کیا کرتے تھے (٦/١١٣)-سورۃ اعراف میں ہے کہ ''جن و انس'' میں اکثریت ان کی ہے جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اس لئے وہ اہل جہنم ہیں (٧/١٧٩)- سورۃ حم سجدہ میں ہے کہ اہل جہنم کہینگے کہ ہمیں ''جن و انس'' میں سے بعض نے گمراہ کیا تھا (٤١/٢٩)-سورۃ انعام میں ہے کہ اِنْسٌ کہینگے کہ ہم جِنوں سے فوائد حاصل کیا کرتے تھے اور جِنٌ کہینگے کہ ہم اِنْسٌ سے فائدےاٹھایا کرتے تھے (٦/١٢٩)- سورۃ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس جن و انس کے لشکر تھے - (٢٧/١٧) - ان جنوں کے متعلق سورۃ سباءؑ میں ہے کہ وہ ہیکل کی تعمیر کا کام کرتے تھے - مجسمے تراشتے تھے - لگن اور دیگیں بناتے تھے (٣٤/١٣) - سمندروں میں غوطہ خوری سے موتی نکالتے تھے (٢١/٨٢) - انہیں زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا تھا (٣٨/٣٧-٣٨) - تورات میں اسکی صراحت موجود ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے صور کے بادشاہ سے صیدونی قوم کے آدمی جنگل سے لکڑیاں کاٹنے کے لئے مانگے تھے - چنانچہ یہ قبائل اور ''جبلیم'' - پہاڑی قبائل - ان کے لئے لکڑیاں کاٹتے اور پتھر تراشتے تھے - ان کے علاوہ حضرت سلیمانؑ نے فلسطین کے پہاڑی اور جنگلی (غیر بنی اسرائیل) قبائل میں سے ستر ہزار آدمیوں کو بطور مزدور اور دس ہزار کو درخت کاٹنے اور پتھر تراشنے پر متعین کیا تھا (دیکھئے کتاب سلاطین و کتاب تاریخ الایام) -

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن میں ''جن و انس'' سے مراد وحشی اور متمدن انسان ہیں - اِنس جو مانوس تھے اور جن، جو وحشی اور غیر مہذب قبائل جنگلوں اور صحراؤں میں رہتے تھے - (مزید تفصیل میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں ملیگی) -

اَلْجَانُّ زرد رنگ کے سیاہ چشم سانپ کو بھی کہتے ہیں * (٢٧/١٠) ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ جَانٌّ سے تشبیہ کی بنا پر بولا جاتا ہے - اَلْجِنُّ مِنَ النَّبْتِ شگوفوں اور پھولوں کو کہتے ہیں * - جُنَّتِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں زمین پر سبز گھاس خوب پھیل گئی اور نگاہوں کو بھلی نظر آنے لگی * - جَنَّ النَّبَاتُ کے معنی ہیں پودے لمبے ہوگئے اور آپسمیں خوب گتھ گئے - نَخْلَةٌ مَجْنُوْنَةٌ نہایت لمبا کھجور کا درخت * -

جَنَّةٌ ۔ کھجوروں اور انگوروں کے باغ کو کہتے ہیں ۔ (اگر کسی باغ میں کھجوروں اور انگوروں کے درخت نہ ہوں دوسرے درخت ہوں تو اسے حَدِیْقَةٌ کہتے ہیں ۔ جَنَّةٌ نہیں کہتے)* ۔ لیکن راغب کا قول ہے کہ جَنَّةٌ ہر اس باغ کو کہتے ہیں جسکی زمین درختوں کی وجہ سے نظر نہ آئے** ۔

قرآن کریم میں جَنَّةٌ کا لفظ بڑی جامع اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے ۔ قرآنی نظام پر عمل پیرا ہونے سے اس دنیا میں جس قسم کا فردوس بدوش معاشرہ متشکل ہوتا ہے اسے بھی جنت سے تعبیر کیا گیا ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں حسن عمل کے جو خوشگوار نتائج سامنے آتے ہیں انہیں بھی جنت ہی کہہکر پکارا گیا ہے ۔ قرآن پر عمل کرنے والوں (مومنین) کو اس دنیا میں جس قسم کا جنتی معاشرہ نصیب ہوتا ہے اسکی تفاصیل قرآن کے مختلف مقامات میں مذکور ہیں ۔ لیکن اسے اگر دو لفظوں میں سمجھنا چاہیں تو اس آیت کو سامنے لے آنا چاہئے جو آدم کی سرگذشت سے متعلق ہے ۔ اس جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (۲/۳۵) ۔ "اس میں سے جہاں جی چاہے نہایت فراغت سے کھاؤ لیکن اس شجر کے قریب نہ جانا" (شجر کے لئے دیکھئے عنوان ش-ج-ر) ۔ یعنی جنت اس معاشرہ کا نام ہے جسمیں زندگی کی تمام آسائشیں بافراط موجود ہوں ۔ جہاں سامان زیست کی فراوانیاں ہوں ۔ (صرف غذا ہی نہیں بلکہ لباس ۔ مکان ۔ یعنی تمام بنیادی ضروریات زندگی ۲۰/۱۱۸-۱۱۹) لیکن ان کا استعمال حدود اللہ (قوانین خداوندی) کے مطابق کیا جائے ۔ اگر ایسا کیا جائیگا تو اس معاشرہ کی بہاروں پر کبھی خزاں نہیں آئیگی ۔ اسی لئے اسے تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ (۱۳/۳۵) کہا گیا ہے ۔ یعنی اس باغ کے نیچے آب رواں ہمیشہ جاری رہیگا ۔ قرآن نے اسکی تفسیر ان الفاظ سے کردی ہے اُكُلُهَا دَائِمٌ وَّظِلُّهَا (۱۳/۳۵) "اسکے پھل اور دیگر آسائشیں ہمیشہ رہینگی" ۔ باقی رہے اعمال حسنہ کے وہ نتائج جو مرنے کے بعد سامنے آئینگے، سو اگرچہ انہیں بھی جنت ہی سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی کہدیا گیا ہے کہ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (۳۲/۱۷) ۔ "خدا نے اعمال کے بدلے میں آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان چھپا کر رکھا ہے وہ کسی انسان کے

* تاج ۔ **راغب

حیطه ادراک میں نہیں آسکتا،، ۔ اس زندگی کی کیفیات کے متعلق ہم آج کچھ نہیں سمجھ سکتے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جنت کی اسقدر تفاصیل دینے کے باوجود یہ بھی کہدیا ہے کہ یہ سب تمثیلی بیان ہے (۱۳/۳۵) ۔

لیکن اس دنیا کی جنت ہمارے سامنے آسکتی ہے، اگر ہم اپنے معاشرہ کو قرآن کے متعین کردہ خطوط پر متشکل کرلیں ۔ اسمیں انسان کی خارجی اور داخلی زندگی کی تمام آسائشیں اور راحتیں موجود ہونگی ۔ لیکن اس سے بعد کی زندگی کی جنت کی کیفیت ہم سمجھ ہی نہیں سکتے اسلئے کہ ہمارا موجودہ شعور محسوسات کی حد سے آگے جا ہی نہیں سکتا ۔ اس کے متعلق اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اس دنیا میں جنتی زندگی بسر کرنے سے نہ صرف طبعی آسائشیں ہی ملتی ہیں بلکہ انسانی ذات (Personality) کی بھی نشوو نما ہوتی جاتی ہے ۔ اس سے انسانی ذات اس قابل ہوجاتی ہے کہ وہ اس زندگی کے بعد اگلے ارتقائی مراحل طے کرکے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکے ۔ اس قسم کی انسانی ذات مرنے کے بعد جس مرحلہ میں پہنچتی ہے اس کا نام جنت ہے ۔ وہ انسانی زندگی کی آخری منزل نہیں بلکہ آگے بڑھنے کا مقام ہے ۔ اس لئے کہ وہاں بھی ،،انسان کا نور اس کے آگے آگے چل رہا ہوگا،، (۶۶/۸) ۔ اس کے برعکس جن کی ذات کی نشو و نما (Development) رک چکی ہوگی ، جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی وہ اہلِ جہنم ہونگے (دیکھئے عنوان جَهَنَّم و ج ۔ہ ۔ م)۔ بہر حال ، مرنے کے بعد کی جنت اور جہنم ، مقامات نہیں ہیں انسانی ذات کی کیفیات ہیں جن کی حقیقت ہم آج سمجھ نہیں سکتے ۔ آج ہمیں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ کسی طرح اس دنیا کی جہنم (جس میں ہم سب مبتلا ہیں) جنت سے بدل جائے ۔ یہ قرآنی نظام کی رُو سے ہوسکیگا ۔

ج ن ی

جَنَى الثَّمَرَةَ يَجْنِيْهَا ۔ اسنے پھل کو درخت سے توڑ لیا ۔ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ (ابن فارس) فَهُوَ جَانٍ ۔ وہ پھل توڑنے والا ہے۔ اَلْجَنٰى پختہ اور تازہ کھجور ۔ چنے ہوئے پھل ۔ اَجْنَى الشَّجَرُ ۔ درخت کے پھل توڑنے کے قابل ہوگئے ۔ ثَمَرٌ جَنِيٌّ ۔ تازہ پھل جو ابھی ابھی توڑا گیا ہو* ۔ سورۃ مریم میں رُطَبًا جَنِيًّا (۱۹/۲۵) ۔ تر و تازہ کھجوروں کے لئے آیا ہے ۔ اور سورۃ رحمٰن میں جَنَا (۵۵/۵۴) پھلوں کیلئے ۔

*تاج و راغب ۔

کسی کا پھل توڑ کرلے جانا جرم ہے ۔ اس سے اَلْجِنَایَۃُ اس جرم کو کہتے ہیں جس سے سزا لازم آتی ہو۔ جَانٍ کے معنے ہیں مجرم ۔ جَانٰی عَلَیْہِ مُجَانَاۃً ۔ اسنے اسکے خلاف جرم کا دعوی کردیا* ۔ غور کیجئے ، جب ایک شخص کسی دوسرے کا پھل توڑ کرلے جانے سے مجرم بنتا ہے تو جو لوگ دوسروں کی محنت کے محاصل کو غضب کرلیں وہ مجرم کیوں نہیں؟ (اس ضمن میں عنوان ج-ر-م بھی دیکھئے) ۔

ج ھ د

اَلْجَھْدُ ۔ ابن اثیر نے کہا ہے کہ جَھْدٌ کے معنے تکلیف اور مشقت اور کسی کام کو اسکی انتہا تک پہنچا دینے کے ہیں ۔ اور جُھْدٌ کے معنے وسعت اور طاقت کے ہیں ۔ لیکن بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جَھْدٌ اور جُھْدٌ دونوں وسعت اور طاقت کے معنوں میں آتے ہیں ۔ لیکن مشقت کے معنوں میں صرف جَھْدٌ آتا ہے* ۔ لیکن قرآن میں جُھْدٌ بھی مشقت کے معنوں میں آیا ہے (۹/۷۹) ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اسکے بنیادی معنی ہیں ۔ جِھَادٌ کے معنے ہیں کسی مقصد کے حصول کیلئے اپنی طاقت اور وسعت کو پورا پورا صرف کردینا ۔ اسمیں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا ۔ اور جَھَادٌ کے معنے ہیں سخت زمین جسمیں گھاس وغیرہ کچھ نہ ہو* ۔ اَجْھَدَتْ لَکَ الْاَرْضُ ۔ زمین تیرے لئے ظاہر ہو گئی* ۔

اَلْاِجْتِھَادُ ۔ کسی ایسے مقصد کے حاصل کرنے میں اپنی پوری پوری کوشش صرف کر دینا جس میں کلفت اور مشقت لازمی ہو** ۔ یعنی اس کام کا مشکل اور کٹھن ہونا ضروری ہے ۔

اَلْجَاھِدُ ۔ جاگنے والا** ۔

قرآن کریم میں مُجَاھِدِیْنَ بمقابلہ قَاعِدِیْنَ آیا ہے (۴/۹۵) ۔ قَاعِدِیْنَ کے معنے ہیں بیٹھ رہنے والے ۔ سستی کرنے والے ۔ لہذا مُجَاھِدِیْنَ کے معنے ہوئے جد و جہد کرنے والے ۔ حصول مقاصد کیلئے پوری پوری کوشش کرنے والے ۔ خواہ اسمیں جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑ جائے ۔ قرآن کی رو سے زندگی کا راز جد و جہد اور سعی و عمل میں ہے ۔ لہذا مردِ مومن ، جو زندگی کا پیکر ہوتا ہے ، ساری عمر مجاھد رہتا ہے ۔ یعنی مصروفِ سعی و عمل ۔ (جنگ کے لئے دیکھئے عنوان ق-ت-ل) سورۃ النَّحْل میں جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ (۱۶/۳۸) سخت قسموں کیلئے آیا ہے ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔

ج ھ ر

جَہْرٌ ۔ راغب نے کہا ہے کہ اسکے اصلی معنے کسی چیز کا حد سے زیادہ زور کے ساتھ نمایاں اور ظاہر ہونا ہے، خواہ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہو یا سننے سے ۔ چنانچہ رَآہُ جَہْرَۃً کے معنے ہیں اسے کھلم کھلا اسطرح دیکھا کہ دونوں کے درمیان کوئی حجاب نہ تھا۔اورجَہَرَ الصَّلٰوۃَ کے معنے ہیں آواز کو بلند کیا ۔ جَہَرَ الْکَلَامَ اسنےاس بات کو کھول کر بآواز بلند کہا ۔ جَہْرَاءُ الْقَوْمِ ۔ قوم کے ممتاز اور برگزیدہ افراد*۔ جَہَرَ الْقَوْمُ الْقَوْمَ ۔ ایک قبیلے نے دوسرے قبیلہ پر صبح دم غفلت میں چڑھائی کر دی ۔ مُجَاھَرَۃٌ ۔ ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرنا*۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ وہ بے حجاب (جَہْرَۃً) نہیں دیکھا جا سکتا (۲/۵۵) ۔ سورۃ حدید میں اللہ کے لئے ھُوَالظَّاھِرُ آیا ہے ۔(۵۷/۳) اس کے مفہوم کےلئےدیکھئےعنوانات (ظ۔ ھ۔ ر) و(ب۔ط۔ن)۔سورۃ انعام میں جَہْر بمقابلہ سِرّ آیا ہے (۶/۳) ۔ اور (۲۱/۱۱۰) میں یہ لفظ کَتَمَ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں جَہْرٌ بمقابلہ خَفْتٌ آیا ہے ۔ (۱۷/۱۱۰ وَلَا تَجْہَرْ بِصَلَاتِکَ وَلَا تُخَافِتْ بِھَا **) ۔ سورۃ انعام میں ہے اِنْ اَتٰکُمْ عَذَابُ اللہِ بَغْتَۃً اَوْ جَہْرَۃً (۶/۴۷) ۔ بَغْتَۃً کے معنے ہیں جسکی علامات وغیرہ پہلے سے ظاہر نہ ہوں (اچانک) لہذا جَہْرَۃً کے معنے ہوئے جسکی علامات پہلے سے نمایاں ہو جائیں ۔

سورۃ الحجرات میں ہے لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْہَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَہْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ (۴۹/۲) ۔ اگرچہ اس کے ظاہری معنے یہی ہیں کہ تم نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کرو اور نہ ہی اس سے چلّا کر باتیں کرو جیسا کہ آپس میں کرتے ہو، لیکن اگر اسے آداب مجالس سے وسیع تر مفہوم میں لیا جائے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ تم اسکے فیصلہ پر اپنی رائے کو غالب رکھنے کی کوشش نہ کرو ۔ اسکے فیصلوں کو دل کے کامل جھکاؤ کے ساتھ تسلیم کرو ۔ قرآنی مملکت میں ، مرکز کی پوزیشن ایسی ہوتی ہے کہ وہاں کا فیصلہ حرفِ آخر قرار دیا جاتا ہے ۔ رسول اللہؐ کی حیات طیبہ میں یہ حیثیت حضور کو حاصل تھی ۔ آپؐ کے بعد ، یہ حیثیت حضورؐ کے جانشینان (یعنی خلافت علیٰ منہاج رسالت یا قرآنی نظام مملکت کے مرکز) کو حاصل ہوگی ۔

---

*تاج ۔ ** دیکھئے عنوان (ص ۔ ل ۔ و) ۔

ج ھ ز

اَلْجَھَازُ ۔ سامان سفر۔ جو سامان سواری پر لدا ہوتا ہے* ۔ ساز و سامان جو کسی کی ضرورت کا ہو** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی ایسی چیز کے ہوتے ہیں جسے خریدا اور حاصل کیا جاسکے ۔ اَلتَّجْھِیْزُ سامان سفر لادنا یا دینا * ۔ سورۃ یوسف میں ہے وَ لَمَّا جَھَّزَھُمْ بِجَھَازِھِمْ (۱۲/۵۹) ۔ ''جب انہیں ان کا سامان دیکر سفر کیلئے تیار کر دیا'' ۔

اَلْجَھْزَاءُ مِنَ الْاَرْضِ ۔بلند زمین کو کہتے ہیں** ۔

ج ھ ل

اَلْجَھْلُ کے معنی ہوتے ہیں جو امور واضح نہ ہوں ان کی واقفیت حاصل کئے بغیر ان میں پیش قدمی کرنا ۔ راغب نے کہا ہے کہ جَھْلٌ کی تین قسمیں ہوتی ہیں (۱) انسان کے ذہن کا علم سے خالی ہونا (یہ بنیادی معنی ہیں) ۔ (۲) کسی بات کے متعلق اس کی صحیح کیفیت کے خلاف اعتقاد رکھنا اور (۳) کسی بات کو جس طرح کرنا چاہئیے اس کے خلاف کرنا ۔ خواہ اس کی بابت اعتقاد صحیح ہو یا غلط* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) علم کی ضد اور (۲) ہلکا پن اور بے اطمینانی کے ہیں ۔

مَجْھَلٌ ۔ اس زمین کو کہتے ہیں جس میں نشانات راہ نہ ہونے کی وجہ سے صحیح راستہ نہ مل سکے* ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْجَھُوْلُ اس سادہ لوح اور نا تجربہ کار آدمی کو کہتے ہیں جو جلد دھوکے میں آجائے** ۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ جَاھِلٌ کا لفظ مذمت کے لئے آتا ہے لیکن کبھی اس کے معنے نا واقف کے بھی ہوتے ہیں ۔ اس صورت میں یہ لفظ مذمت کے لئے نہیں آتا ۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے یَحْسَبُھُمُ الْجَاھِلُ اَغْنِیَاءَ (۲/۲۷۳) '' ناواقف انہیں دولتمند سمجھتا ہے'' ۔

عربوں کے زمانہ قبل از اسلام کے لئے جَاھِلِیَّۃٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ قرآن میں بھی اس لفظ کا استعمال آیا ہے (مثلاً (۳۳/۳۳)) ۔ اس کے معنے یہ نہیں کہ وہ لوگ جاھل مطلق تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین سے ناواقف تھے ۔ جاھلیت سے مراد ان کی جہالت نہیں بلکہ اس دین سے ناواقفیت ہے

*تاج ۔ **محیط ۔

جو نبی اکرمؐ کے ذریعہ ان تک پہنچا ۔ لہذا رسوم جاہلیت سے مراد وہ رسوم ہی نہیں جو زمانہ قبل از اسلام میں عربوں کے ہاں رائج تھیں ۔ اس سے مراد وہ تمام غلط اعتقادات اور غیر قرآنی اعمال حیات ہیں جو دین سے ناواقفیت کی بنا پر مسلمانوں میں پھیل رہے ہیں ۔ نیز علم ہو جانے کے بعد بھی اسی روش پر جمے رہنا (محض اس لئے کہ وہ روش اسی طرح چلی آ رہی ہے) جاہلیت ہے ۔ یہ مسلک پتھروں کا ہے جو کسی حالت میں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتے ۔ اسی لئے بڑی چٹان کو صَفَاۃٌ جَیْہَلٌ کہتے ہیں**۔ یہ جہالت و جاہلیت کی بد ترین قسم ہے ۔ اسی لئے صاحب تاج العروس نے اسے جَہْلٌ مُرَکَّبٌ سے تعبیر کیا ہے *۔

احمد امین مصری (مرحوم) نے کہا ہے کہ "سَلاَمٌ" کے معنے مسالمت کے ہیں جو جنگ اور مخاصمت کی ضد ہے ۔ قرآن کریم کی اس آیت وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلاَمًا (۲۵/۶۳) میں جہالت کے مقابلہ میں سَلاَم کا لفظ لایا گیا ہے ۔ غالباً اس آیت کے ذریعہ ہم وہ وجہ معلوم کر سکتے ہیں جس کی بنا پر نبی اکرمؐ کی بعثت سے پچھلے زمانہ کو جاہلیت کا اور بعثت کے بعد کے زمانہ کو اسلام کا لقب دیا گیا ۔ یہ لفظ "جاہلیت" اس جَہْلٌ سے ماخوذ نہیں جس کے معنے نہ جاننے (عِلْمٌ کی ضد) کے ہوتے ہیں ۔ بلکہ یہ اس "جَہْلٌ" سے ماخوذ ہے جس کے معنے سفاہت، غضب، اور حمیت کے ہوتے ہیں ۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ انہوں نے کسی کو اس کی ماں کے نام سے عار دلائی تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا اِنَّکَ امْرُؤٌ فِیْکَ جَاھِلِیَّۃٌ ۔ "تمہارے اندر جاہلیت کی روح ابتک موجود ہے" ۔ اسی جہت سے عربوں کا محاورہ ہے "اِسْتَجْھَلَہٗ الشَّیْءُ" ۔ یعنی اس چیز نے اسے عقل و خرد سے بیگانہ بنا دیا۔ کسی شاعر کا مصرع ہے ۔ دَعَاکَ الْھَوٰی وَاسْتَجْھَلَتْکَ الْمَنَازِلُ ۔ محبت نے تجھے پکارا اور محبوب کے مکانوں نے تیرے حواس گم کر دئے ۔ عمرو بن کلثوم کے معلقہ میں ہے ۔

اَلَا لَا یَجْھَلَنْ اَحَدٌ عَلَیْنَا ۔
فَنَجْھَلَ فَوْقَ جَھْلِ الْجَاھِلِیْنَا ۔

خبردار کوئی ہمارے خلاف زیادتی نہ کرے ورنہ ہم زیادتی کرنے والوں سے بڑھ کر زیادتی کرینگے ۔ ان استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جَاھِلِیَّۃٌ کا لفظ ہلکے پن،

* تاج ۔ ** محیط ۔

عقل و ھوش سے بیگانگی، عصبیت، حمیّت اور مفاخرت وغیرہ کے لئے استعمال ھوتا تھا جو اسلام سے پہلے عربوں کی زندگی کا اھم ترین عنصر تھا۔ اسی لئے اس زمانہ کو جاھلیت کا زمانہ کہا جاتا ھے۔ ان معانی کے بالمقابل سکون نفس، تواضع، اعمال صالحہ کی اھمیت کا احساس، اور نسلی فخر و غرور کی بے اعتباری وغیرہ رجحانات، سلامتی اور مصالحت کے ھوتے ھیں''*۔ اس سے واضح ھو جاتا ھے کہ اسلامی نہجِ زندگی کیا ھے اور جاھلیت کی روش کیا؟

قرآن کریم کی رو سے علم حاصل نہ کرنا جرم ھے اور علم حاصل ھو جانے کے بعد اپنی غلط روش میں تبدیلی نہ کرنا اس سے زیادہ سنگین جرم (مزید تفصیل ع۔ل۔م اور ع۔ق۔ل کے عنوانات میں ملیگی)۔ سورۃ بقرہ میں یہ لفظ ھُزُوٌ کے ساتھ آیا ھے (۲/۶۷) لہذا اس کے معنے ھیں وہ لوگ جو زندگی کے مسائل اور احکام و قوانین کو سنجیدگی سے (Seriously) نہ لیں۔ انہیں مذاق ھی سمجھیں۔

جہنم

جَہَنَّمُ۔ بعض کا خیال ھے کہ یہ عربی لفظ ھے جسکے معنے ھیں گہرا۔ کہتے ھیں ''رَکِیَّۃٌ جَہَنَّمٌ'' گہری تہ والا کنواں۔ بعض نے اسے عبرانی لفظ گَہِنَّام سے معرب مانا ھے**۔

صاحب محیط نے لکھا ھے کہ یہ عبرانی الاصل ھے اور دو لفظوں سے مرکب۔ جِیْ، جسکے معنے وادی ھیں اور ھَنُّوم سے۔ ھنوم ایک آدمی کا نام تھا۔ وادی ھَنُّوم یروشلم کے جنوب میں ایک مشہور وادی تھی جسمیں زمانہ قدیم میں مولوک (عَمُّوْنِیِّیْن کے دیوتا) کے حضور آدمیوں کو جلا کر قربانی پیش کی جاتی تھی۔ لہذا جِیْ ھِنُّوْم سے مراد تھی وہ وادی جہاں انسان ذبح کئے جاتے تھے اور انھیں جلایا جاتا تھا۔***۔ اس اعتبار سے جَہَنَّم کا ترجمہ انسانیت کی قربانگاہ ھوگا۔ خدا کے قانون ربوبیت کا منشا یہ ھے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ھو۔ انسانیت برومند اور ثمر بار ھو۔ ایسا معاشرہ جسمیں انسانیت نشوونما پائے جنتی معاشرہ ھے۔ اسکے مقابلہ میں وہ معاشرہ جسمیں انسانیت ذبح ھوجائے اور جلکر راکھ کا ڈھیر بن جائے جَہَنَّمی معاشرہ ھے۔ اسکے لئے عربی لفظ جَحِیْمٌ ھے جس کے معنے روک دینا ھیں (دیکھئے عنوان ج ح م)۔ یعنے جس مقام پر انسانیت کی نشوونما رک جائے۔

* فجرالاسلام صفحہ ۶۹-۷۰۔ **تاج۔ ***محیط　نیز [illegible]

سورۃ بنی اسرائیل میں جَهَنَّم کے متعلق کہا ہے وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِيْنَ حَصِيْرًا (۸/۱۷)۔ جہنم ان لوگوں کے لئے روک کا مقام ہے جو قانونِ خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرتے ہیں -

چونکہ زندگی مسلسل آگے بڑھتی ہے اسلئے جسکی نشونما یہاں رک جاتی ہے وہ زندگی کی اگلی منزلیں طے کرنے کے قابل نہیں ہوتا - اسائے اس زندگی میں بھی وہ جَهَنَّم میں رهتا ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی - اس زندگی میں جَهَنَّم کی کیفیات کیسی ہونگی، اس کے متعلق ہم آج کچھ نہیں سمجھ سکتے - البتہ موجودہ زندگی میں جہنم کا عذاب ہم ہر وقت محسوس کر سکتے ہیں - انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی - اجتماعی طور پر جو قوم غلط راستے پر چلتی ہے اسکی سعی و عمل ثمر بار ہونے کی بجائے جلکر خاکستر ہو جاتی ہے - یہ جَهَنَّم ہے - اور اس کا نتیجہ ذلت و رسوائی - اسکی تفاصیل قرآن کے مختلف مقامات میں ملینگی - اسی طرح اس معاشرہ میں رہنے والے افراد کے جوہر انسانیت جلکر راکھ کا ڈھیر ہو جاتے ہیں -

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہنم ، انسان کے اپنے اعمال ہی سے بنتی ہے - اس لئے کہا گیا ہے کہ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكَافِرِيْنَ (۵۴/۲۹) '' یقیناً جہنم کفار کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے '' - وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِيْنَ (۱۶/۸۲) - یہ اسکی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں - وہ انہیں اب بھی دیکھ رہی ہے - ان کے سامنے ہی ہے، لیکن ان کا عدم احساس اُسے ان کی نظروں سے اوجھل کئے ہوئے ہے - جب ان کی آنکھیں کھل جائینگی تو وہ ابھر کر سامنے آجائیگی - وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (۳۶/۷۹) - وہ دیکھنے والے کے لئے ابھر کر سامنے آجائیگی - یہ وہ کیفیت ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ لوگ اس میں ''یوم الدین'' میں داخل ہونگے يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ (۱۵/۸۲) - يَوْمَ الدِّيْنِ ، ظہور نتائج کا زمانہ ہے ، اس دنیا میں یا مرنے کے بعد -

ج و ب

اَلْجَوْبُ - قطع کرنا - پھاڑنا - سوراخ کرنا - یہ اس مادہ کے اصلی معنے ہیں* - قرآن کریم میں ہے وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (۸/۸۹) اور ثمود جو وادی میں پہاڑوں کی چٹانوں کو تراش کر (اپنے مکان بناتے تھے) - اَلْجَوْبَةُ - مکانات کے پچھواڑے جو گڑھا سا بن جائے جسمیں بارش کا پانی جمع ہو جائے* - اَلْجَوْبُ ڈھال کو بھی کہتے ہیں* -

*تاج -

اَجَابَ۔ یُجِیْبُ۔ اِجَابًا و اِجَابَةً۔ جواب دینا۔* (اس لئے کہ جواب دینے والا جب کسی کی بات کا جواب دیتا ہے تو وہ اس کے منہ سے نکل کر سائل کے کانوں تک کا فاصلہ قطع کرتی ہے۔ ویسے سوال بھی یہ فاصلہ طے کرتا ہے لیکن یہ لفظ جواب کے لئے خاص ہو گیا ہے۔ راغب)۔ اس سے اسمِ فاعل مُجِیْبٌ ہے۔ جواب دینے والا۔ قرآن میں ہے اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ (۱۱/۶۱)

''یقیناً میرا رب قریب ہی ہے اور بات کا جواب بھی دیتا ہے سورۃ بقرۃ میں ہے اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲/۱۸۶)۔ ''میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے''۔ دعا اور خدا کی طرف سے اسکے جواب کے صحیح مفہوم کیلئے (د۔ع۔و) کا عنوان دیکھئے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ دُعَا سے مفہوم ہے خدا کے قوانین کا اتباع کرنا، اور اسکی طرف سے جواب کے معنی ہیں ان قوانین کا نتیجہ خیز ہونا۔ چنانچہ سورۃ المومن میں ہے وَ قَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (۴۰/۶۰)۔ ''تمہارا نشو و نما دینے والا کہتا ہے کہ تم مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دونگا'' اسکے بعد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ (۴۰/۶۰)۔ جو لوگ میری اطاعت گزاری سے سرکشی برتتے ہیں وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہونگے''۔ اس پوری آیت سے واضح ہے کہ دعا درحقیقت ''یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ'' کی ضد ہے۔ لہذا دعا سے مقصود خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ اسی لئے اس سے ذرا پہلے ہے وَمَا دُعَاءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ (۴۰/۵۰)۔ ''جو لوگ قوانین خداوندی سے انکار کرتے ہیں انکی دعا کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوتی''۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ بقرۃ میں جہاں یہ کہا ہے کہ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲/۱۸۶)۔ ''میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں'' تو اسکے ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ (۲/۱۸۶)۔ ''لہذا انہیں چاہئے کہ میرے قوانین پر ایمان رکھیں اور میری اطاعت کریں''، یہ لوگ یہ کچھ کریں اور میں انکی سعی و عمل کو نتیجہ خیز کرونگا۔ یہ ہے دعا اور اجابت دعا کا قرآنی مفہوم۔ یعنے جو کچھ خدا کے تقاضے ہیں انہیں تم پورا کرو۔ جو کچھ تمہارے تقاضے ہونگے خدا انہیں پورا کر دیگا۔ یہی خدا کا قانون ہے۔ جو شخص حسن کارانہ انداز سے اسکے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے وہ اسکی محنت کو رائگان نہیں جانے دیتا۔ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (۱۱/۱۱۵)۔ ''اور استقامت سے جما رہ۔ بیشک اللہ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا''۔ اور کوشش کے بغیر کچھ ملتا نہیں۔ وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹)۔ ''انسان کے لئے کچھ نہیں بجز اسکے جسکے لئے وہ کوشش اور محنت کرے''۔

* تاج - | سوال دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو کسی بات یا مسئلہ کا دریافت کرنا اور دوسرے امداد و اعانت طلب کرنا۔ لہٰذا اس اعتبار سے جواب کی بھی دو قسمیں ہوں گی اور اجابت و استجابت ان دونوں قسموں کے جواب کے لئے بولا جائے گا۔ یعنی کسی سوال کا جواب دینا، یا کسی مانگ اور مطالبہ کو پورا کر دینا۔

ج و د

اَلْجَیِّدٌ ۔ عمدہ چیز ۔ جَوْدَۃٌ ۔ عمدہ ہونا ۔ اَجَادَہٗ ۔ اسے عمدہ بنا دیا ۔ اَلْجَوَادُ ۔ سخی * ۔ اَلْجُوْدِیُّ ۔ اس پہاڑی یا ٹیلہ کا نام ہے جس پر حضرت نوحؑ کی کشتی ٹھہری تھی (۱۱/۴۴) ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس سلسلۂ کوہ میں واقع ہے جو آرمینیا کو میسوپوٹیمیا سے جدا کرتا ہے ۔

جَوَادٌ ۔ اعلیٰ درجے کا گھوڑا جو نہایت تیز رفتار ہو اور دوڑنے میں اپنی ساری طاقت صرف کردے** ۔ (جمع جِیَادٌ) ۔ سورہ ص میں ہے اَلصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ (۳۸/۳۱) ۔ ''اصیل ، تیز رو گھوڑے'' ۔

ج و ر

اَلْجَوْرُ ۔ درمیانی راہ چھوڑ کر ایک طرف کو ہٹ جانا ۔ اس سے اسکے معنے ظلم و ستم اور بےانصافی کے ہوگئے ۔ اسی سے جَارَ کے معنی ہیں عدل کی راہ چھوڑی * ۔ قرآن میں قَصْدُ السَّبِیْلِ کے مقابل جَائِرٌ آیا ہے (۱۶/۹) قَصْدُ السَّبِیْلِ ، درمیانی راہ اور جَائِرٌ ، ایکطرف کو ہٹی ہوئی راہ ۔ اَلْجَارُ ۔ پڑوسی ، ہمسایہ ، نیز وہ شخص جسے تم نے کسی کے جور و ستم سے پناہ دی ہو ۔ نیز ساتھی ، شریک ، مددگار کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے* قرآن میں اَلْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی اور اَلْجَارِ الْجُنُبِ آیا ہے (۴/۳۶) (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ج ۔ ن ۔ ب) ۔ سورۃ احزاب میں ہے لَا یُجَاوِرُوْنَکَ فِیْهَا (۳۳/۶۰) ۔ ''وہ اس شہر میں تیرے ہمسایہ بنکر نہیں رہنے پائینگے'' ۔ سورۃ انفال میں ہے اِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ (۸/۴۸) ۔ ''میں تمہارا پناہ دینے والا یا حامی و مددگار ہوں'' ۔ اَجَارَہٗ ۔ اسکو پناہ دیدی ۔ اسے حفاظت میں لے لیا (۲۳/۸۸) ۔ اِسْتَجَارَ ۔ پناہ طلب کرنا (۹/۶) ۔ سورۃ رعد میں ہے قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ (۱۳/۴) ۔ '' آپس میں ملے ہوئے قطعات زمین'' ۔

ج و ز

جَازَ الْمَوْضِعَ ۔ وہ اس مقام پر سے گزر گیا ۔ اسے پیچھے چھوڑ گیا ۔ اگر دریا ہو تو اسکے معنے ہونگے اسے عبور کر گیا ۔ نیز جَاوَزَ (۲/۲۴۹ ، ۱۸/۶۲) کسی مقام سے آگے بڑھ جانا * ۔ اصل معنے اس مادہ میں قطع کرنا ۔ کاٹنا ہیں *** ۔

* تاج ۔ ** راغب ۔ ***محیط ۔

تَجَوَّزَعَنْ ذَنْبِه ۔ اسکی خطا سے درگزر کردیا ۔ وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّئَاتِهِمْ (۴۶/۱۶) ۔ ''ہم ان کی برائیوں سے درگزر کرتے ہیں ''۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو قطع کرنا اور کسی شے کا وسط ہیں ۔ چنانچہ جَوْزُ کُلِّ شَیْءٍ ہر چیز کے وسط کو کہتے ہیں ۔ غالباً اسی وجہ سے اَلْجَائِزُ اسے کہتے ہیں جو کسی چیز کے وسط میں سے گزر جائے ۔ نیز اَلْجَائِزُ ۔ صحیح سمت کو گزرنے والا ** ۔ اَلْمَجَازُ ۔ راستہ جسے ایک طرف سے دوسری طرف کو قطع کیا جائے * ۔ یا وہ راستہ جس پر لوگ بہت زیادہ گزرتے ہوں * ۔ اَلْجَائِزَةُ ۔ عطیہ ۔ انعام ۔ وہ زاد سفر جو مسافر کو دیا جاتا ہے جس کے سہارے وہ ایک دن اور رات کی مسافت طے کرلے ۔(ممکن ہے اسی سے جائزہ انعام و عطیہ کے لئے بولا جانے لگا ہو) ۔

ج و س

اَلْجَوْسُ ۔ کسی چیز کی آخری حد تک اسے تلاش کرنا ۔ چھان مارنا ۔ گھومنا پھرنا *** ۔ اَلْاِجْتِیَاسُ ۔ رات میں گھومنا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے اندر گھس جانے کے ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ (۱۷/۵) ۔ ''وہ تمہارے شہروں کے اندر گھس گئے اور تمہاری کھوج میں انہوں نے گلی کوچوں کو چھان مارا'' اور اسطرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر تمہیں قتل یا گرفتار کیا ۔ محیط نے اس کے معنوں میں حملہ کرنے یا لوٹ مار کرنے میں ادھر ادھر آمد و رفت کرنا بھی بتائے ہیں ۔

ج و ع

اَلْجُوْعُ ۔ بھوک ۔ جَاعَ ۔ یَجُوْعُ ۔ جَوْعاً ۔ بھوکا ہونا ۔ عَامٌ مَجَاعَةٍ ۔ بھوک کا سال ۔ قحط سالی * ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ بھوک کیلئے آیا ہے (۲/۱۵۵) ۔ اور جنت کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اسمیں بھوک (رزق کی تنگی) نہیں ہوگی ۔ اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا (۲۰/۱۱۸) ۔ ''تیرے لئے یہ ہے کہ تو اس میں بھوکا نہیں رہیگا'' ۔ کفران نعمت (خدا کی طرف سے ملے ہوئے سامان زیست کو چھپا کر رکھنے یا غلط طور پر استعمال کرنے) کا نتیجہ لِبَاسُ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (۱۶/۱۱۲) بتایا ہے ۔ یعنی بھوک اور خوف کا عذاب ۔ لہذا کسی قوم میں سامان

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** تاج ۔ راغب ۔

رزق کی تنگی خدا کا عذاب ہے اور اسکی فراوانی جنتی معاشرہ کی خصوصیت۔ قرآن کی رو سے جو معاشرہ قائم ہوتا ہے اس میں کوئی فرد بھوکا نہیں رہ سکتا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جس نظام میں ہر فرد کو روٹی مل جائے اُسے نظام خداوندی اور اس معاشرہ کو جنتی معاشرہ کہا جائیگا۔ نظام خداوندی اور جنتی معاشرہ کی بہت سی خصوصیات ہیں اور جب تک وہ سب موجود نہ ہوں اسے جنتی نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جس نظام یا معاشرہ میں لوگوں کو پیٹ بھر کر روٹی نہ ملے اسے نہ نظام خداوندی کہہ سکتے ہیں نہ جنتی معاشرہ۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم ایسے ہنگامی حالات سے گزرے جس میں کچھ وقت کے لئے رزق کی تنگی آجائے (مثلاً جنگ کے زمانہ مین)۔ لیکن کسی قوم میں نہج زندگی ایسا قائم ہو جانا جس میں تمام افراد کو پیٹ بھر کر، با طمینان، کھانے کو نہ ملے، خدا کا عذاب ہے، اور جو قوم ایسی حالت سے نکلنا نہیں چاہتی وہ جہنم میں رہنا چاہتی ہے۔

ج و ف

اَلْجَوْفُ۔ وسیع نشیبی زمین۔ شکم (پیٹ) نیز کسی چیز کے اندرونی حصہ کو کہتے ہیں۔ جَوْفُ الْبَيْتِ۔ گھر کا اندرونی حصہ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے اندرون کے ہوتے ہیں۔ جَافَهٗ۔ يَجُوْفُهٗ۔ جَوْفاً۔ اس نے اسے گہرا کر دیا۔ اَلْمُجَوَّفُ۔ گہرائی والی چیز (مُحَدَّبٌ کے مقابلہ میں)۔ نیز وہ شخص جسکا دل نہو، (بزدل) یعنی جسکے سینے میں خلا ہو*۔

قرآن کریم میں ہے مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِىْ جَوْفِهٖ ($\frac{33}{4}$) یہاں جَوْفٌ سے مراد سینہ ہے۔ یعنی اللہ نے کسی شخص کے لئے اس کے سینے میں دو دل نہیں پیدا کئے۔

ج و و

اَلْجَوُّ۔ فضا۔ زمین اورآسمان کے درمیان خلا**۔ قرآن کریم میں ہے مُسَخَّرَاتٍ فِىْ جَوِّ السَّمَآءِ ($\frac{16}{9}$)۔ اسکے معنے فضائے آسمانی ہیں۔ یعنی (پرندے) آسمان کی فضا میں مسخر کئے ہوئے ہیں۔ ویسے اَلْجَوُّ اندرون مکان کو بھی کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں وہ چیز جو کسی دوسری چیز کے اطراف کو گھیرے ہوئے ہو۔ بالائی فضا کو اَلْجَوُّ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ زمین کے اطراف کو گھیرے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔

---

* تاج و محیط۔ ** تاج۔ راغب۔ محیط

ج ی أ

جَاءَ - یَجِیْ ءُ - آنا - اَجَآتُہٗ وَجِئْتُ بِہٖ - میں اسے لایا * - راغب نے اِتْیَانٌ اور مَجِیْیٌ کا فرق بتاتے ہوئے کہا ہے کہ اِتْیَانٌ کسی کام کے کرنے کے ارادہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے (خواہ وہ کام نہ ہوسکے)۔ لیکن المَجِیْءُ اسوقت بولا جائیگا جب کوئی کام رونما اور واقع ہوگیا ہو **۔ نیز اسکے معنی لیکر آنا یا مرتکب ہونا ہیں - حضرت مریمؑ سے لوگوں نے کہا لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا (۱۹/۲۷)۔ تو نے ایک انوکھا کام کیا ہے، تو ایک نرالی حرکت کی مرتکب ہوئی ہے - یہ تیری اپنی اختراع ہے - اسی طرح سورۃ کھف میں (قصۂ حضرت موسیٰؑ اور مرد بزرگ میں) ہے لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا اِمْرًا (۱۸/۷۱)۔ ” تو ایک خطرناک کام کا مرتکب ہوا ہے “۔

سورۃ مریم میں ہے فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَۃِ (۱۹/۲۳)۔ اس کے معنے ہیں درد زہ اسے کھجور کے درخت کی طرف لے آیا - یعنے اسمیں مجبوری کا پہلو پایا جاتا ہے -

ج ی ب

جَیْبٌ اَلْقَمِیْصِ - کرتے کا گریبان - الجَیْبُ سینہ کیلئے بھی مجازاً بولا جاتا ہے جس پر کرتہ ہوتا ہے نیز دل کو بھی کہتے ہیں - ھُوَنَاصِحُ الْجَیْبِ - وہ صاف دل اور صاف سینہ والا یعنی مخلص ہے * - سورۃ نور میں عورتوں سے کہا گیا ہے وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوبِهِنَّ (۲۴/۳۱)۔ ” انہیں چاہئے کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں “ - قصۂ حضرت موسیٰؑ میں ہے وَاَدْخِلْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ (۲۷/۱۲) اور اُسْلُکْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ (۲۸/۳۲)۔ ” اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کر یا ڈال “۔ (ان آیات کے مفہوم کیلئے ی - د - ی اور ب - ی - ض کے عنوان دیکھئے)۔

ج ی د

جِیْدٌ - گردن یا گردن کا اگلا حصہ یا گردن کی وہ جگہ جہاں ہار لٹکا رہتا ہے - ایک قول کے مطابق جِیْدٌ، مقام مدح میں بولا جاتا ہے اور عُنُقٌ، مذمت میں * - قرآن کریم میں ابولہب کی بیوی کے متعلق ہے فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۱۱۱/۵) ” اسکی گردن میں کھجور کے ریشوں کی رسی ہے “ - یعنے وہ گردن جو بڑی عزت و توقیر اور سرفرازی و سربلندی کی حامل سمجھی جاتی تھی، اسطرح ذلیل ہو رہی ہے - اس کا تکبر خاک میں مل رہا ہے -

جلد اول ختم شد

* تاج - ** تاج و راغب -

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ح

ح ا ش (ح ش و)

اَلْحَاشِیَةُ - کنارہ (کپڑے وغیرہ کا) - حَشْوَةُ النَّاسِ - رذیل لوگ* (یعنی وہ لوگ جنہیں کنارے پر دور دور رکھا جائے) - یہیں سے اسکے معنے دوری کے آتے ہیں - حَاشَ لِلّٰہِ - خدا اس سے بہت دور ہے وہ منزہ ہے - یا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں - (کیونکہ اَلْحَاشِیَةُ ان لوگوں کو بھی کہتے ہیں جو کسی کی حفاظت میں رہتے ہوں)*

قرآن کریم میں ہے وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰہِ (۱۲/۳۱) - ''انہوں نے کہا کہ خدا تمام عیوب سے پاک ہے - وہ نقائص سے مبرا ہے'' - یہ تنزیہ اور استثناء کیلئے آتا ہے** - یعنی عیوب اور نقائص سے منزہ ہونے کے معنوں میں[1]

ح ب ب

اَلْحَبُّ - اَلْمَحَبَّةُ - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے پانچ معانی ہیں - (۱) سفیدی اور صفائی - یہاں سے حَبَبُ الْاَسْنَانِ لیا گیا ہے یعنی دانتوں کی چمک (۲) بلند ہونا اور ظاہر و نمودار ہونا - یہاں سے حَبَابُ الْمَاءِ لیا گیا ہے - یعنی پانی کا بلبلہ (۳) کسی چیز کا اپنی جگہ ٹھہرے اور جمے رہنا - یہاں سے حَبَّ الْبَعِیْرُ وَ اَحَبَّ لیا گیا ہے - یعنی اونٹ اسطرح جم کر بیٹھ گیا کہ پھر نہ اٹھا - (۴) کسی چیز کا خالص ہونا یا اس کا لب لباب اور حقیقی جوہر - جیسے حَبَّةُ الْقَلْبِ سویدائے دل کو کہتے ہیں اور (۵) کسی کی حفاظت کرنا -

---

* تاج - ** راغب - [1] حاشٰی کے مادہ کے بارہ میں علماءِ لغت کا اختلاف ہے - بعض نے ح ش و بتایا ہے اور بعض نے ح ش ی - تاج نے حاش للّٰہ کے معنی معاذ اللّٰہ بھی لکھے ہیں یعنی میں اللّٰہ کی حفاظت اور پناہ

اسے تھامے رکھنا ۔ اسی سے حَبٌّ السَّمَاءِ مٹکا یا ٹھلیا یا مشک کو کہتے ہیں جسمیں پانی محفوظ رکھا جائے ۔ یا گھڑونچی جس پر مٹکے رکھے جاتے ہیں ***۔ حَبَّ الرَّجُلُ کے معنی ہیں آدمی ٹھہر گیا ۔ اَحَبَّ الزَّرْعُ ۔ کھیتی میں دانے پڑ گئے ۔ یعنی اسکی نشو و نما کے نتائج ابھر کر سامنے آ گئے * ۔

راغب نے لکھا ہے کہ محبت کے معنی اس چیز کو چاہنا ہیں جسے اچھا اور مفید پایا جائے ، اس کے تین پہلو ہیں ، ایک تو لذت کیلئے ۔ جیسے مرد عورت سے محبت کرتا ہے ، دوسری مفید اور نفع بخش (مادی) چیزوں کوچاہنا ، تیسرا پہلو یہ ہے کہ فضل و شرف (معنوی امور) سے محبت رکھنا ، جیسے اہل علم ، علم و فضل کی بناء پر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں ۔ کبھی محبت کے معنے ارادہ کے بھی کئے جاتے ہیں ۔ لیکن محبت میں ارادہ سے زیادہ زور و قوت ہے ** ۔ إِسْتَحَبَّهُ ۔ اسے چاہا ، پسند کیا ۔ إِسْتَحَبَّهُ عَلَيْهِ ۔ اسے اس پر ترجیح دی (١٦/١٠٧) ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْحَبُّ اور اَلْمَحَبَّةُ کے معنی کسی کو لازم پکڑنا ہیں ۔ اس مادہ کے بنیادی معنی لزوم اور ثبات کے ہیں ۔ یعنی کسی شے کو لازم پکڑنا اور اس کے ساتھ مستحکم طور پر رہنا ۔

قرآن کریم میں حُبٌّ کا لفظ کُرْهٌ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ وہاں اسکے معنے پسندیدگی کے ہیں (مثلاً ٢/٢١٦ ؛ ٤٩/٧) ۔ یہ معانی کسی تشریح و توضیح کے محتاج نہیں ۔ لیکن جہاں قرآن میں اللہ کی محبت کا ذکر آیا ہے وہ مقامات تشریح طلب ہیں ۔ مثلاً سورۃ بقرۃ میں ہے وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (٢/١٦٥) ۔ ”اور ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے علاوہ اور قوتوں کو اسکا ہمسر قرار دیتے ہیں اور ان قوتوں سے اسطرح محبت کرتے ہیں جسطرح اللہ سے محبت کی جاتی ہے ۔ حالانکہ جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ کی محبت بہت بڑھکر کرتے ہیں“ ۔ (یہ وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے) اسی طرح سورۃ آل عمران میں ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (٣/٣١-٣٢) ”ان سے کہدو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو ۔ اللہ تم سے محبت کریگا ۔ اور تمہارے قصوروں

* محیط ۔ ** راغب ۔ *** اگرچہ محیط نے یہ تشریح کی ہے کہ ان معنوں میں یہ فارسی سے معرب ہے ۔

کو معاف کر دیگا - اور اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے - ان سے کہدو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو - پھر اگر یہ لوگ اس سے پھر جائیں تو اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا'' - (یہ وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے) -

ان آیات سے اللہ سے محبت ، اور اللہ کی محبت ، کی سند لی جاتی ہے اور پھر اس پر تصوف کی پوری عمارت استوار کر لی جاتی ہے جس کا اصل الاصول خدا کی محبت ہے - اور محبت بھی ایسی شدت کی محبت کہ اس ذات میں اپنے آپ کو جذب کر دینا اسکا منتہی قرار دیا جاتا ہے - یہ سارا تصور لفظِ محبت کو اُن معنوں میں لے لینے سے پیدا ہوتا ہے جن معنوں میں ہم اپنے انسانوں سے محبت کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں -

خدا سے اس قسم کے تعلق کا تصور غیر قرآنی ہے - جہانتک خدا کی ذات کا تعلق ہے ہمارے حیطہ ادراک میں آ ھی نہیں سکتی - اسلئے اس سے اس قسم کی محبت کا سوال پیدا نہیں ہوتا جس قسم کی محبت انسانی محبوب سے کی جاتی ہے (خواہ وہ کسی کی اولاد ھی کیوں نہ ہو) - کسی اَن دیکھی چیز سے اس قسم کی محبت کا پیدا ہونا نفسیاتی طور پر ناممکن ہے - یہی وہ دشواری تھی جسکے پیش نظر لوگوں کو خدا کو بشکل انسان (اوتاروں کے روپ میں) ڈھالنا پڑا یا اسکی مورتیاں بنانی پڑیں -

لفظ محبت کے اُن معانی پر غور کیجئے جنہیں شروع میں درج کیا گیا ہے - ساری بات صاف ہو جائیگی - حَبٌّ کے معنے ہیں کسی چیز پر ثابت قدمی اور خلوص کے ساتھ جمے رہنا - لہذا خدا کے ساتھ انسان کی محبت کے معنے ہیں ، احکامِ خداوندی کی خلوص اور استقامت کے ساتھ اطاعت کرنا - ان پر نہایت ثابت قدمی سے جمے رہنا - ان سے ذرا اِدھر اُدھر نہ ہٹنا - ان معانی کی تائید خود وہ آیات کر رہی ہیں جنہیں اوپر درج کیا گیا ہے - سورۃ بقرہ کی آیت ($\frac{۲}{۱۶۵}$) میں دیکھئے - جو لوگ خدا کے علاوہ اوروں کو بھی صاحب اقتدار و اختیار مانتے ہیں (اَنْدَادًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ) وہ اُن کے قوانین اور فیصلوں کی اطاعت کرتے ہیں - ان کے مقابلہ میں مومنین کا شیوہ یہ ہے کہ وہ صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں اور نہایت شدت سے اطاعت کرتے ہیں - لہذا اس آیت میں اللہ کی محبت کے معنے ہیں قوانین خداوندی کی اطاعت - سورۃ آل عمران کی آیات ($\frac{۳}{۳۱-۳۰}$) میں اس مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے - ان میں اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ کی تفسیر اَطِيْعُوا اللّٰهَ نے کردی ہے - اور

اسکے مقابل میں تَوَلَّوْا (روگردانی کرنے) کے لفظ نے اسکی مزید وضاحت کر دی ھے ۔ لہذا ان آیات میں بھی خدا سے محبت سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ھے جو اُس نظام کے مرکز کی وساطت سے کی جاتی ھے جو اُسکے قوانین کو نافذ کرنے کیلئے متشکل ھوتا ھے۔ اس کی تائید سورۃ المائدۃ کی آیات (۵۶–۵۴/۵) سے بھی ھوتی ھے ۔ ان آیات میں مومنین سے کہا گیا ھے کہ تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھر جائے تو اسے سمجھ لینا چاھئے کہ خدا کا دین اس کی مدد کا محتاج نہیں ۔ وہ یہ نہ خیال کرے کہ اس نے اس دین کو چھوڑ دیا تو اس دین کو سنبھالنے والا کوئی نہیں رھیگا ۔ اللہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئیگا یُحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗ جن سے خدا محبت رکھیگا اور وہ خدا سے محبت رکھینگے ۔ یعنی وہ لوگ اپنوں کے سامنے نہایت نرم اور مخالفین کے مقابلہ میں غالب آنے والے ھونگے ۔ وہ اللہ کی راہ میں مسلسل جدوجہد کرینگے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرینگے ۔ اس سے اگلی آیت میں ھے اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا . . . (۵۵/۵) ۔ " تمہارے دوست اللہ اور اس کا رسول اور مومنین ھیں " ۔ اس سے واضح ھے کہ "محبت" سے مراد "ولی ھونا" ھیں ۔ اس سے آگے مومنین سے کہا گیا ھے کہ تم کفار کو اپنا ولی مت بناؤ (۵۷/۵) ۔ اس سے بھی "خدا سے محبت" کرنے کا مفہوم واضح ھو جاتا ھے ۔ یعنی اس کی اطاعت کرنا ۔

اب رھا خدا کا بندے سے محبت کرنا ، تو اس کے لئے اس لفظ کے دوسرے معانی کو سامنے لائیے یعنی حفاظت کرنا ۔ تھامے رکھنا ۔ مضمر صلاحیتوں کا نمودار کرنا ۔ اعمال کا نتیجہ خیز ھونا ۔ لہذا خدا کی طرف سے محبت کے معنے ھیں اُن تمام ثمرات و نتائج کا حاصل ھو جانا جو قوانین خداوندی کی اطاعت کا فطری ماحصل ھیں ۔

یہ ھے قرآنی مفہوم ، انسان کے خدا سے محبت اور خدا کے انسان سے محبت کرنے کا ۔ یہی مفہوم اللہ کا انسان کے ولی (دوست) ھونے یا انسان کا اللہ کا ولی ھونے سے ھے ۔ (دیکھئے عنوان و ۔ ل ۔ ی)

حَبٌّ ۔ دانہ ۔ اناج ۔ غلہ (۱۲/۵۵) ۔ حَبَّةٌ (واحد) دانہ (۲/۲۶۱) ۔

ح ب ر

اَلْحِبْرُ ۔ روشنائی (جس سے لکھا جاتا ھے) ۔ اَلْمِحْبَرَةُ ۔ دوات ۔ اَلْحِبْرِیُّ ۔ روشنائی فروش ۔ اَلْحِبْرُ* ۔ اھل کتاب کا عالم ۔ بالخصوص یہود کا عالم ۔ جمع اَحْبَارٌ (۵/۴۴) ۔ اَلْحِبْرُ ۔ حسن اور حسن کی رونق ۔

* مطلقاً عالم کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔ اس مادہ کے بنیادی معنوں کے لحاظ سے یہ ایسے عالم کو کہا جائیگا جو عبارت دکھائی سے شعف

اَلْحَبْرُ ۔ سرور ۔ خوشی ۔ مسرت ۔ حَبْرَةٌ ۔ کامل نعمت و آسائش ، فراوانی عیش ۔ اَلْحَبْرَةُ ۔ جنت میں سماع ۔ موسیقی ۔ عمدہ نغمہ ۔ چنانچہ قرآن میں جو ہے فَهُمْ فِیْ رَوْضَةٍ یُّحْبَرُوْنَ (۳۰/۱۵) ۔ یا اُدْخُلُوْا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ (۴۳/۷۰) تو زجاج نے اسکی تفسیر موسیقی کے ساتھ ھی کی ہے ۔ اس نے کہا ہے کہ لغت میں اَلْحَبْرَةُ عمدہ گانے کو کہتے ھیں* ۔ درحقیقت اس میں حسن و جمال اور زیبائی و رعنائی نیز خوشی اور مسرت کے تمام مظاہر آجاتے ھیں خواہ وہ جنتِ نگاہ ھوں یا فردوسِ گوش ۔ آرٹ کے شاہکار ھوں یا حیات افروز موسیقی ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایسے نشانات کے ھیں جن سے اس چیز کا حسن اور رونق نمایاں ھوں ۔

حَبَّرَ الْخَطَّ وَ الشِّعْرَ ۔ اسنے خط اور شعر کو عمدہ بنایا اور مزین کردیا ۔ تَحَبَّرَ الرَّجُلُ ۔ آدمی حسین اور مزین بن گیا** ۔ ثَوْبٌ حَبِیْرٌ ۔ عمدہ اور نیا کپڑا ۔ اَلْیَحْبُوْرُ ۔ نرم و نازک بدن والا آدمی* ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْحِبْرُ نہایت عمدہ اور حسین اثر (نشان) کو کہتے ھیں ۔ اَلْحَبْرُ عالم کو اسلئے کہتے ھیں کہ اس کے علم کا اثر لوگوں کے دلوں میں باقی رھتا ہے اور اس کے عمدہ آثارِ قدم کی پیروی کی جاتی ہے*** ۔

قرآن ، کائنات کی ھر حسین شے کی تحسین (Appreciation) کے جذبہ کو ابھارتا ہے اور اس سے لطف اندوز ھونے کی تاکید کرتا ہے ، اس شرط کے ساتھ کہ انسان حدود اللہ سے تجاوز نہ کرے ۔ ایک جنتی معاشرہ اس قسم کے حسن کا مظہر ھوتا ہے جس میں آرٹ ۔ نغمہ وغیرہ اپنے اپنے مقام پر وجہِ شادابئی قلب ونظر بنتے ھیں ۔ اور چونکہ اسمیں حدود اللہ کا ھر وقت خیال رکھا جاتا ہے اسلئے اس سے مضر اثرات مرتب نہیں ھونے پاتے ۔ حسن و زیبائی کا وہ کونسا گوشہ ہے جس کا ذکر ، قرآن نے ، جنتی زندگی کے ضمن میں نہیں کیا ؟ لیکن زندگی ، جنتی بنتی اسوقت ہے جب وہ قوانینِ خداوندی کے تابع رہے ۔

ح ب س

اَلْحَبْسُ ۔ روک لینا ۔ قید کر دینا ۔ اِحْتَبَسَهٗ ۔ اسے روک دیا ۔ فَاحْتَبَسَ ۔ پس وہ رک گیا ۔ اَلْمَحْبَسُ جانوروں کے چارہ رکھنے کی جگہ* ۔ چھلا جو انگلیوں میں پہنا جاتا ہے** ۔ حَبَسَهٗ عَنْهُ کے معنے اسے کسی چیز سے روکنے کے ھوتے ھیں ۔ اور حَبَسَهٗ عَلَیْهِ کے معنے وقف کر دینے کے** ۔

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ تَحْبِسُوْنَهُمَا (۵/۱۰۶) ''تم ان دونوں (گواہوں) کو روک لو''۔

ح ب ط

اَلْحَبَطُ ۔ زخم کا نشان جو زخم اچھا ہو جانے کے بعد رہ جائے ۔
اَلْحُبَاطُ ۔ مویشیوں کی ایک بیماری ہے جس میں ان کا پیٹ ابھر جاتا ہے اور وہ مر جاتے ہیں ۔ زمخشری اور ابن الاثیر نے کہا ہے کہ حَبِطَتِ الدَّابَّةُ حَبَطًا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جانور کسی نہایت اچھی چراگاہ میں پہنچکر بہت زیادہ کھا جائے جسے وہ ہضم نہ کرسکے ۔ اس سے اسکا پیٹ پھول جائے اور وہ مر جائے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی باطل ہو جانا اور درد و الم کے ہیں ۔

قرآن کریم نے حَبْطِ اَعْمَال (اعمال کے رائیگاں جانے) کی اصطلاح نہایت پر معنے طریق سے استعمال کی ہے ۔ (۲/۲۱۷)۔ جانور جو کچھ کھاتا ہے وہ اگر اچھی طرح ہضم ہوکر اسکا جزو بدن بن جائے تو اس سے اسکی صحت قائم رہتی ہے اور وہ فربہ و توانا ہو جاتا ہے ۔ لیکن اگر اسکا چارہ ہضم نہ ہو تو اسکا پیٹ پھول جاتا ہے ۔ اس سے ایسا نظر آتا ہے کہ وہ بہت فربہ ہے لیکن یہ در حقیقت فربہی نہیں ہوتی بلکہ اسکی ہلاکت کی علامت ہوتی ہے ۔ اسی طرح انسان بہت کام ایسے کرتا ہے جو اسے بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں اور وہ ان سے بڑے خوشگوار نتائج کی توقع وابستہ رکھتا ہے لیکن وہ در حقیقت اسکی ہلاکت کا موجب ہوتے ہیں ۔ اسے قرآن حَبْطِ اَعْمَال سے تعبیر کرتا ہے ۔ یعنے جن اچھے نتائج کی توقع ان سے وابستہ کی گئی ہو اُن نتائج کا مرتب نہ ہونا ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی اعمال خوشگوار نتائج مرتب کرسکتے ہیں جو قوانینِ خداوندی کے مطابق صحیح نظام کے اندر رہتے ہوئے سرزد ہوں ۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسان کی ساری محنت اکارت چلی جاتی ہے اور نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا ۔ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۲/۲۱۷) ۔ انہی کے لئے آیا ہے ۔ یعنی وہ جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں رائگاں جاتے ہیں ۔ ان کے اعمال کے صرف نشانات رہ جاتے ہیں ۔ نتائج کچھ نہیں نکلتے ۔ اور وقت اور توانائی، سب ضائع ہو جاتے ہیں ۔ لہذا اچھے اعمال وہ نہیں جنہیں ہم اپنے تصور یا عقیدہ کے مطابق اچھے سمجھ لیں ۔ اچھے اور برے اعمال کا معیار، اللہ کی کتاب

---

* تاج و محیط ۔

ہے - جو اعمال اس کی رُو سے اچھے نہیں وہ کبھی اچھا نتیجہ نہیں پیدا کرسکتے خواہ ہم انہیں کتنا ہی اچھا کیوں نہ سمجھیں اور کتنی ہی اچھی نیت سے انہیں کیوں نہ کریں - کائنات کی میزان میں فیصلے انسانوں کے اپنے عقیدوں اور تصوروں کے مطابق نہیں ہوتے - خدا کے اٹل معیاروں کے مطابق ہوتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نہ صرف اچھے اعمال کی نشاندہی کر دی ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان کا نتیجہ کیا نکلیگا تاکہ ہم قدم قدم پر اس کا محاسبہ کرتے جائیں کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں یا نہیں - اگر ہمارے اعمال کے وہ نتائج نہیں برآمد ہوتے جو قرآن کریم نے بتا رکھے ہیں تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اعمال قرآن کریم کے مطابق سرزد نہیں ہو رہے - اگر ہم ایسا نہ کریں اور اپنی خوش فہمی کے ماتحت ان اعمال کو ویسے ہی کرتے جائیں تو یہ سب رائگاں جائینگے - فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا - (۱۸/۱۰۵) "سو ان کے اعمال بے نتیجہ رہ گئے - لہذا ہم ان کے لئے ظہور نتائج کے وقت میزان تک کھڑی نہیں کرینگے" - ان کے تولنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی - غور کیجئے کہ ہمارے کسقدر اعمال ہیں جو یوں بے نتیجہ چلے جا رہے ہیں اور ہم کبھی رک کر نہیں سوچتے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے، حالانکہ خدا کی کتاب (اعمال کے نتائج کی زندہ کسوٹی) ہمارے پاس ہے

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ، ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نہ صرف باطل ہونے کے ہیں بلکہ اس کے ساتھ الم و تکلیف کے بھی ہیں - یعنی اعمال کا محض رائیگاں جانا ہی نہیں بلکہ ان کا الم و تکلیف کا موجب بن جانا بھی - خود یہی احساس کیا کم الم و تکلیف کا موجب ہے کہ جن کاموں کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ان کے نتائج ایسے خوشگوار مرتب ہونگے ، وہ آخرالامر بے نتیجہ ثابت ہوں ؟

ح ب ک

اَلْحَبْكُ - کس کر باندھنا اور مضبوط کرنا - اَلْحُبْكَةُ - ازار باندھنے کی جگہ - تَحَبَّكَ تَحَبُّكًا - اسنے کمر پر ازار باندھ لیا - اَلْحُبْكَةُ - وہ رسی جو کمر پر باندھی جائے - اَلْحُبُكُ مِنَ السَّمَاءِ - ستاروں کے راستے - حُبُكُ الرَّمْلِ - ریت کی لہریں - فراء نے کہا ہے کہ حَبْكٌ کسی چیز کے بل کھا کر مڑ جانے یا ٹوٹ جانے کو کہتے ہیں - چنانچہ اَلْحَبْكُ

مِنَ الشَّعْرِ ان گھونگھریالے بالوں کو کہتے ھیں جو بل کھا کر ٹوٹے پڑے ھوں ۔ اور اَلْحَبْكُ کے معنے کاٹ ڈالنے اور گردن اڑا دینے کے ھیں* ۔

قرآن کریم میں وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (۵۱/۷) آیا ھے ۔ یعنی راستوں والا آسمان ۔ وہ بلند فضا جس میں مختلف اجرام فلکی اپنے اپنے راستوں میں چلتے اور مڑتے رہتے ھیں ۔ اور اگر اسکے معنے مضبوطی کے لئے جائیں تو اس سے مفہوم ھوگا ایسی بلند فضا جسمیں تمام اجرام اپنے اپنے دوائر میں نہایت مضبوطی سے بندھے ھوئے ھیں اور وہ ادھر ادھر نہیں ھو سکتے ۔ چنانچہ اَلْحِبَاكُ لکڑیوں کے اس گٹھے کو کہتے ھیں جسے مضبوطی سے اسطرح باندھا جائے کہ کوئی لکڑی اپنی جگہ سے ھلے نہیں** ۔ اور اگر اسکے معنے ٹوٹنے کے لئے جائیں تو مفہوم ھوگا ان اجرام فلکی والی فضا جسمیں مختلف اجرام اپنے اولین ھیولے سے ٹوٹ کر چکر کاٹ رہے ھیں ۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز کا تسلسل، درازی اور مضبوطی شامل ھیں ۔ اس اعتبار سے وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُكِ کے معنی ھونگے ایسی بلندی (فضا) جس میں اجرام فلکی کے لئے لمبے لمبے راستے ھوں ۔

ح ب ل

اَلْحَبْلُ ۔ باندھنے کی چیز ۔ رسی ۔ اسکی جمع حِبَالٌ* ھے ۔ حَبَلَهٗ ۔ اسے رسی سے باندھ دیا* ۔ سورۃ طٰہٰ میں حِبَالُهُمْ آیا ھے (۲۰/۶۶) جسکے معنے "رسیاں" ھیں ۔ نیز اَلْحَبْلُ کے معنے عہد، ذمہ اور امان کے ھیں ۔ سورۃ آل عمران میں ھے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا (۳/۱۰۲) ۔ "تم سب کے سب حبل اللہ کو تھامے رکھو" ۔ اس کے ساتھ متمسک رھو ۔ اس میں، صاحب تاج العروس کے نزدیک، حَبْلٌ* کے معنے عہد کے ھیں ۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی اسکی تائید کی ھے ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی شے کی درازی پر دلالت کرتے ھیں ۔ راغب نے کہا ھے کہ ھر وہ چیز جس سے کسی دوسری چیز تک پہنچا جائے حَبْلٌ* کہلاتی ھے ۔ اس لئے اس آیت میں حَبْلُ اللّٰهِ کے معنے ھیں وہ چیز جو تمہیں خدا تک پہنچادے، یعنی قرآن کریم ۔ ابوعبیدہ نے کہا ھے کہ اَلْاِعْتِصَامُ بِحَبْلِ اللّٰهِ کے معنے اتباع قرآن کریم ھے ۔ ابن مسعود نے حَبْلُ اللّٰهِ کے معنے قرآن کریم

---

* تاج ۔ راغب ۔ محیط ۔ ** تاج ۔

هی لئے ہیں - ابن عرفہ نے کہا ہے کہ دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے اِلاَّ بِحَبْلٍ مِنَ اللّٰہِ وَ حَبْلٍ مِنَ النَّاسِ (۳/۱۱۱) جسکے معنے ہیں خدا کی ذمہ داری یا لوگوں کی دی ہوئی ذمہ داری - اسلئے (۳/۱۰۲) میں بھی حَبْلُ اللّٰہِ کے معنے خدا کی ذمہ داری کے ہیں* -

لیکن اسکے معنے رسّی لیں یا ذریعہ - ذمہ لیں یا عہد - بات ایک ہی ہے - خدا سے ہمارا تعلق قرآن کریم کی رو سے ہے - یہی وہ رسی ہے جو اسکی طرف سے ہم تک آئی ہے اور جس سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہ سکتے ہیں (کیونکہ آیت کا اگلا حصہ ہے وَلاَ تَفَرَّقُوْا اور اس سے آگے مومنین کو ایک امت بنکر رہنے کی تاکید کی گئی ہے دیکھئے ۳/۱۰۳ ؛ ۳/۱۰۹) لہذا حَبْلُ اللّٰہِ کے معنے ہیں وہ نظامِ اجتماعی جو قرآن کریم کی بنیادوں پر قائم ہو اور جسکا مقصد ، وحدتِ ملت اور اطاعتِ قوانین الٰہیہ ہو -

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (۵۰/۱۶) "ہم، انسان سے حَبْلُ الْوَرِیْدِ سے بھی زیادہ قریب ہیں" - فراء نے لکھا ہے کہ حَبْلٌ اور وَرِیْدٌ کے ایک ہی معنے ہیں - یعنے رگِ جان - شدتِ قرب کی بنا پر دونوں الفاظ آئے ہیں* - اس قربِ خداوندی کی تشریح آیت کے پہلے حصہ میں یہ کہکر کر دی گئی ہے - وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ (۵۰/۱۶) "ہم اسکے وساوسِ نفس تک سے بھی واقف ہیں" - یعنے اسمیں علم الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس پر قانونِ مکافات عمل کا مدار ہے - انسان کا کوئی عمل، حتّٰکہ اس کے دل میں گذرنے والا خیال تک بھی خدا کے قانونِ مکافات کے احاطہ سے باہر نہیں رہ سکتا - مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلاَّ لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ (۵۰/۱۸) نے اسکی مزید وضاحت کردی ہے - یعنی انسان کی ہر بات پر ایک نگہبان (چوکیدار - محاسب) موجود ہوتا ہے - یہ ہے خدا کے رگِ جان سے بھی قریب تر ہونے کا مفہوم - یعنی خدا کا قانونِ مکافات جو انسان کے دل میں گذرنے والے خیالات کو بھی محیط ہے -

ح ت م

حَتَمَہٗ وَ حَتَمَ بِکَذَا - یَحْتِمُ - حَتْمًا - اس نے کسی بات کا فیصلہ کر دیا - اسے طے کر دیا - حَتَمَ عَلَیْہِ الْاَمْرَ - اس پر کوئی بات واجب اور لازم کردی - اَلْحَاتِمُ - فیصلہ کرنے والا - فیصلہ کو کسی پر واجب اور لازم کرنے والا*** -

* تاج - ** محیط - *** تاج و محیط

قرآن کریم میں ہے کَانَ عَلٰی رَبِّکَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا (۱۹/۷۱) "یہ تیرے رب پر لازم ہے - اس کا فیصلہ ہو چکا ہے"۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ کوئی بنیادی لفظ نہیں بلکہ اس میں تاء' کاف سے بدلی ہوئی ہے - یعنی حَتَمَ اصل میں حَکَمَ تھا جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں -

حَتّٰی - (حرف)

حَتّٰی - حسب ذیل معنوں میں استعمال ہوتا ہے -

(۱) "یہاں تک کہ" - قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْہِ عٰکِفِیْنَ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰی (۲۰/۹۱) - "انہوں نے کہا کہ ہم اس کے ساتھ چمٹے رہینگے تا آنکہ موسیٰ ہماری طرف واپس نہ آجائے" - یعنی اسوقت تک ہم ایسا کئے جائینگے جب تک.......

(۲) بعض اوقات اس کے معنی "تا کہ" بھی ہوتے ہیں - جیسے بعض کے نزدیک اس آیت میں آیا ہے - وَ لَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (۲/۲۱۷) - "اور یہ لوگ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہینگے تا کہ اگر انہیں اسکی طاقت ہو تو تمہیں تمہارے دین سے پھرا دیں" - یعنی ان کے جنگ کرنے کا مقصد یہ ہے -

(۳) بعض اوقات اِلَّا کے معنوں میں بھی آتا ہے - تاج العروس اور محیط المحیط میں ابن مالک کے حوالہ سے اسکی مثال میں یہ شعر نقل کیا گیا ہے:-

لَیْسَ الْعَطَاءُ مِنَ الْفُضُوْلِ سَمَاحَۃً
حَتّٰی تَجُوْدَ وَ مَا لَدَیْکَ قَلِیْلُ

ضرورت سے زیادہ مال میں سے کچھ دیدینا سخاوت نہیں ہے - مگر یہ کہ تمہارے پاس جو کچھ مال ہو وہ تھوڑا ہو اور تم پھر بھی سخاوت کرو -

بعض اوقات یہ وَ (اور) کے معنوں میں بھی آتا ہے - مثلاً اس آیت میں - فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰی اِذَا اَثْخَنْتُمُوْھُمْ .... (۴۷/۴) - "سو جب تم کفار کے مقابل آؤ تو ان کی گردنیں مارو - اور جب تم ان پر غالب آ جاؤ تو......" (اس میں شبہ نہیں کہ یہاں حَتّٰی کے معنی تاآنکہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن "اور" سے بھی معنی واضح ہوجاتے ہیں) -

(۵) بعض اوقات یہ محض ابتدائے کلام (بات شروع کرنے) کے لئے آتا ہے - جیسے حَتّٰی اِذَا اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ .... (۲۷/۱۸)- "بہر حال - غرض ، جب وہ وادیٔ نمل میں آئے تو ......" یعنی حَتّٰی سے ایک بالکل نئی بات شروع ہوتی ہے - سابقہ بات سے اسکا تعلق نہیں -

ح ث ث

حَثَّهٗ یَحُثُّهٗ حَثًّا - جلدی کرانا - جلدی کا تقاضا کرنا (لگاتار) حَثَّهٗ عَلَیْهِ - اسے کسی کام پر ابھارا ، اکسایا ، برانگیختہ کیا - اَلْحَثِیْثُ - تیز رفتار - اپنے کام میں چست* - قرآن کریم میں لیل و نہار کے متعلق ہے یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا (۷/۵۴) - یعنے وہ (دن) اس (رات) کے پیچھے نہایت تیزی سے مسلسل چلا آ رہا ہے - حریری نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حَثٌّ اور حَضٌّ مرادف الفاظ ہیں - فرق یہ ہے کہ حَثٌّ چلنے میں جلدی کرانے اور برانگیختہ کرنے کو کہتے ہیں اور حَضٌّ دوسرے کاموں پر ابھارنے اور جلدی کرانے کو* -

ح ج ب

حَجَبَ - یَحْجُبُ - ڈھانپنا - چھپانا - اَلْحِجَابُ - وہ چیز جو بطور پردہ کے استعمال کی جائے** - وَ بَیْنَهُمَا حِجَابٌ (۷/۴۶) - "ان دونوں کے درمیان پردہ ہوگا" - لیکن راغب نے لکھا ہے کہ اسکے معنے ایسی روک کے ہیں جو ایک چیز کے دوسری چیز تک پہنچنے میں حائل ہو*** - یعنے اہل جہنم کا عذاب ، جنت والوں تک نہیں پہنچ سکے گا اور اہل جنت کی لذات سے اہل جہنم محروم ہونگے - "محروم" کے معنوں میں سورۃ تطفیف میں ہے اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (۸۳/۱۵) - "وہ اس دور میں خدا کے عطایا سے محروم ہونگے" ، اپنے اعمال کی وجہ سے - نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور جیم اکٹھے آئیں ان کا مفہوم منع کرنا اور روکنا ہوتا ہے - ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی روکنے کے لکھے ہیں -

اَلْحَاجِبُ مِنَ الشَّمْسِ وَ الْقَمَرِ - چاند اور سورج کا کنارہ جو پہلے پہل نمودار ہو** -

---

* تاج و محیط - ** تاج - *** راغب -

ح ج ج

اَلْحَجُّ ۔ ارادہ کرنا ۔ قصد کرنا ۔ حَجَجْتُ فُلَانًا ۔ میں نے اسکا قصد کیا ۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ اس کے معنے کسی باعظمت شے کا قصد کرنا یا بکثرت قصد کرنا ہیں* ۔ اسی لئے مکہ معظمہ کا سفر کرنے کے قصد کو حَجٌّ کہا جانے لگا ۔ اَلْحِجَّةُ ایک سال کو بھی کہتے ہیں* ۔ اسکی جمع حِجَجٌ ہے ۔سورۃ قصص میں ہے ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ($\frac{۲۸}{۲۷}$) یعنی آٹھ سال ۔

اَلْحَجُّ کے معنے روکنا بھی ہیں ۔ حَجَّهٗ عَنِ الشَّيْءِ ۔ اس کو اس چیز سے روک دیا ۔ منع کر دیا ۔ اسی سے اس کے معنے جھگڑا کرنے کے آتے ہیں ۔ اَلْمُحَاجَّةُ ۔ آپس میں ایک دوسرے سے جھگڑا کرنا* ۔ اسکی اصل یہ ہے کہ جھگڑا کرنے والوں میں سے ہر فریق دوسرے کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ فَاِنْ حَآجُّوْكَ ($\frac{۳}{۱۹}$) ''اگر یہ تجھے تیرے ارادے سے روکیں'' ۔ نیز ($\frac{۶}{۸۱}$) ۔ حُجَّةٌ ۔ دلیل ۔ محیط میں ہے کہ دلیل کو بَيِّنَةٌ اسلئے کہتے ہیں کہ اس سے بات واضح اور صاف ہو جاتی ہے اور حُجَّةٌ اسلئے کہتے ہیں کہ اس سے فریق مقابل پر فتح حاصل ہو جاتی ہے** ۔

سورۃ انعام میں قرآنی دلائل و احکام کو اَلْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ($\frac{۶}{۱۵۰}$) کہا گیا ہے ۔ حج کعبہ کیلئے لفظ حَجٌّ ($\frac{۲}{۱۹۶}$) میں آیا ہے ۔ اسی طرح ($\frac{۳}{۹۶}$) میں حِجُّ الْبَيْتِ کہا گیا ہے ۔ اَلْحَاجُّ ($\frac{۹}{۱۹}$) حج کرنے والا ۔

حج ، عالم اسلامی کا وہ عالمگیر اجتماع ہے جو اس اُمت کے مرکز محسوس (کعبہ) میں اس غرض کیلئے منعقد ہوتا ہے کہ ملت کے تمام اجتماعی امور کا حل قرآنی دلائل و حجت کی رو سے تلاش کیا جائے اور اسطرح یہ اُمت اپنے فائدے کی باتوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لے ۔ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ($\frac{۲۲}{۲۸}$) ''تاکہ یہ اپنے فائدے کی باتوں کو اپنے سامنے محسوس شکل میں دیکھ لیں'' ۔ نظام کے قیام کے لئے مرکزی اجتماعات نہایت ضروری ہوتے ہیں ۔ غور کیجئے ۔ قرآن نے اُس زمانے میں مشاورتی نظام ($\frac{۴۲}{۳۸}$) اور اس کے لئے اجتماعات کا تصور دیا جب ساری دنیا پر بادشاہی نظام مسلط تھا اور دنیا اسے خدا کی رحمت سمجھتی اور بادشاہ کو ''ایشور کا اوتار'' اور

---

* تاج ۔ ** محیط ۔

خدائی اختیارات (Divine Rights) کا حامل خیال کرتی تھی - صلوٰۃ کے مقامی اجتماعات سے لیکر حج کے عالمگیر اجتماع تک ہر اجتماع کی غرض یہ ہے کہ اُمت کے نمائندے باہمی مشاورت سے قرآنی نظام کے استحکام اور نوعِ انسان کی بہبود کے سامان و ذرائع پر غور کریں - (مزید تفصیل ''قبلہ'' کے عنوان میں ملیگی)

ح ج ر

حَجَرٌ - پتھر (جمع اَحْجَارٌ وحِجَارَۃٌ) اَلْحِجْرُ (حاء کی تینوں حرکات زبر زیر پیش کے ساتھ) منع کرنا - روکنا - حفاظت کرنا - حِجْرًا مَّحْجُوْرًا (۲۵/۲۲) کے معنے روک کے ہیں - حُجْرَۃٌ - اونٹوں کا باڑہ - کمرہ - جمع حُجُرَات (۴۹/۴) اَلْحِجْرُ - عقل جو انسان کو روکتی ہے (۸۹/۵)- نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور جیم اکٹھے آئیں ان کے معنوں میں روکنے اور منع کرنے کا مفہوم پایا جائے گا* -

حِجْرٌ - قوم ثمود کی بستیوں کو کہتے تھے کیونکہ وہ پہاڑوں میں پتھر تراش کر بنائی گئی تھیں - حَنْجَرَۃٌ - حلق - اسکی جمع حَنَاجِرُ ہے - (۳۳/۱۰ ; ۴۰/۱۸) - حَجَرٌ - سونے اور چاندی کو بھی کہتے ہیں - اور ایسے آدمی کو بھی جو بہت ہوشیار اور چالاک ہو* -

قرآن کریم میں النار کے متعلق ہے کہ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ (۲/۲۴)- ''جسکا ایندھن انسان اور پتھر ہیں''- راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سنگدل ہوں جیسے پتھر - انہی کے متعلق ذرا آگے چل کر کہا گیا ہے کہ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ فَھِیَ کَالْحِجَارَۃِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً (۲/۷۴) -''پھر اسکے بعد تمہارے دل سخت ہوگئے، سو وہ پتھر کی طرح ہیں بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھکر''- یعنے جن میں سمجھنے سونچنے اور اثر پذیری کی صلاحیت باقی نہیں رہی - یا جن کی صلاحیتوں کی نشو و نما رک چکی ہے - یا ، اَلنَّاسُ کے معنے ہونگے عام لوگ (جو بڑے بڑے لوگوں کے پیچھے چلتے ہیں) اور حِجَارَۃٌ کے معنے ہونگے وہ چالاک اور ہوشیار لوگ جو لیڈر بنکر عوام کو اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں - اس لحاظ سے آیت کے معنی یہ ہونگے کہ غلط راستے پر چلنے والے عوام اور خواص (لیڈر اور ان کے متبعین) سب جہنم میں ہونگے - اس کی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے ہو جاتی ہے (مثلاً ۱۴/۲۱ ; ۳۳/۶۷) اور اگر اسکے معنے سونے چاندی کے لئے جائیں تو اسکے معنے ہونگے سرمایہ

*تاج و محیط -

پرستی جو ایک جہنمی معاشرہ پیدا کردیتی ھے ، کیونکہ سورۃ توبہ میں ھے کہ جو لوگ سونا اور چاندی (دولت) جمع کرتے رھتے ھیں اور اسے نوع انسانی کی ربوبیت کیلئے کھلا نہیں رکھتے تو اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائیگا اور اس سے انکی پیشانیوں پر اور پشت پر داغ دیا جائیگا (۹/۳۴-۳۵) ۔ لہذا جہنم کا ایندھن سرمایہ پرست اور انکی وہ دولت ھے جسے وہ نوع انسانی کی منفعت کے لئے عام نہیں کرتے بلکہ انفرادی مفاد کی خاطر جمع رکھتے ھیں ۔ لیکن اگر (۲/۲۵) میں اَلنَّارُ کے معنے جنگ کے لئے جائیں (دیکھئے عنوان ن ۔ و ۔ ر) تو اَلْحِجَارَۃُ کے معنے ھونگے وہ پتھراؤ جو اُس زمانہ میں مخالفین پر کیا جاتا تھا (جیسا کہ سورۃ فیل میں ۱۰۵/۴ آیا ھے) ۔ اس صورت میں آیت کے معنے یہ ھونگے کہ تم لوگ جب علم و بصیرت کی رو سے بات کا فیصلہ نہیں کرنا چاھتے تو اسکا نتیجہ جنگ ھوگی جو انسانوں کے ھاتھوں سے اور ان پتھروں کے ذریعوں سے بھڑکائی جائیگی جو فریق مخالف کی تباھی کیلئے برسائے جاتے ھیں ۔ یہ جنگ ، نظامِ خداوندی کی حامل جماعت اور مخالفین کے درمیان بھی ھو سکتی ھے اور مخالفین کی باھمی جنگ بھی (جس کیلئے دیکھئے ۸/۶۵ ؛ ۶/۱۳۰ ؛ ۲۹/۸۲-۸۳) ۔ نظام خداوندی کی حامل جماعت کو جنگ اسلئے کرنی پڑتی ھے کہ دنیا سے خود جنگ کا خاتمہ ھو جائے (۴۷/۴) ۔

سورۃ انعام میں ھے حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا (۶/۱۳۹) ۔ یعنے ممنوع ۔ جسکے کھانے کی عام اجازت نہو ۔

حُجُوْرٌ کے معنے ھیں حفاظت ۔ (۴/۲۳) ۔ حِجْرٌ کے معنی گود بھی ھیں ۔*

ح ج ز

حَجَزَهٗ ۔ يَحْجُزُهٗ ۔ حِجَازَةً ۔ منع کرنا ۔ روک دینا ۔ اصل میں حَجَزَ الْبَعِيْرَ کے معنے ھوتے ھیں اونٹ کو بٹھا کر اس کی ٹانگوں کے نچلے جوڑوں کو رسی سے باندھ کر اس رسی سے اسکی کمر باندھ دینا تا کہ وہ ھل نہ سکے اور اسطرح اسکی پشت کے زخم کا علاج کیا جا سکے ۔ اَلْحِجَازُ اس رسی کو کہتے ھیں جس سے اونٹ کو اسطرح باندھا جائے ۔ کمر بند کو بھی کہتے ھیں ۔ حِجَازٌ کو اسلئے حِجَازٌ کہتے ھیں کہ یہ علاقہ نجد اور تہامہ کے درمیان روک ھے** ۔

* تاج و لین ۔ ** تاج و محیط و راغب

اَلْحَجْزُ ۔ دو چیزوں کے درمیان روک اور حد فاصل بنانے کو کہتے ہیں* ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی دو چیزوں کے درمیان حائل ہونا لکھے ہیں ۔

قرآن کریم میں حَاجِزاً (۲۷/۶۱) کا لفظ روک کیلئے آیا ہے ۔ دوسری جگہ حَاجِزِیْنَ (۶۹/۴۷) آیا ہے جسکے معنے روکنے والے یا منع کرنے والے، ہیں ۔

نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور جیم اکٹھے آئیں ان میں روکنے اور منع کرنے کا مفہوم پایا جائیگا ۔

ح د ب

اَلْحَدَبُ ۔ سینہ اور پیٹ کا اندر گھس جانا اور کمر کا کوب نکل آنا ۔ حَدِبَ یَحْدَبُ حَدَباً کبڑا ہوجانا ۔ اَلْحَدَبُ ۔ بلند (مرتفع) زمین** ۔ زمین کا سخت اور بلند حصہ*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے بلند ہونے کے ہیں ۔

قرآن کریم میں یا جوج و ماجوج کے متعلق ہے وَ ھُمْ مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ (۲۱/۹۶) ۔ ”وہ سطح مرتفع (بلند زمین) سے نہایت تیزی سے اچھل کر نکل پڑینگے“ ۔ اسکی تشریح کیلئے عنوان (ا ۔ ج ۔ ج) میں لفظ یَاْجُوْجُ دیکھئے ۔

ح د ث

اَلْحَدِیْثُ ۔ قدیم کی ضد ہے ۔ نئی بات ۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی عدم سے وجود میں آنے کے ہیں ۔ حَوَادِثُ ۔ نئے نئے واقعات جو سامنے آتے رہیں ۔ اَلْاَحْدَاثُ ۔ شروع سال میں ہونے والی بارشیں ۔ حَدِیْثُ السِّنِّ ۔ کم عمر نوجوان ۔ اَحْدَثَہٗ ۔ اس نے کسی کام کو (جو پہلے نہیں تھا) پہلی بار کیا ۔

اِحْدَاثٌ ۔ وجود میں لانا ۔ اَلْمُحَدَّثُ ۔ صادق اور سچا آدمی ۔ اَلْمُحَدِّثُ ۔ حدیث بیان کرنے والا**** ۔ مُحْدَثٌ ۔ جو قائم بذاتہ نہو*** ۔ نئی رونما ہونے والی بات ۔ جو بات پہلی بار وجود میں آئے ۔ جس کی پہلے نظیر نہ ہو ۔ نیز جس بات کو آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گذرا ہو ۔ قرآن میں مُحْدَثٌ کا لفظ انہی معنوں میں آیا ہے (۲۱/۲ ; ۲۶/۵) ۔

* تاج و محیط و راغب ۔ ** تاج و راغب ۔ *** محیط ۔ ****تاج ۔

سورۃ کہف میں ہے اُحْدِثَ لَکَ (۱۸/۷۰) - "میں خود ہی پہل کرکے تجھ سے بات کروں"۔ سورۃ طٰہٰ میں قرآن کریم کے متعلق ہے یُحْدِثُ لَهُمْ ذِکْراً (۲۰/۱۱۳) - اسکے یہ معنے بھی ہیں کہ یہ قرآن کریم لوگوں کو رفعت و بلندی عطا کردیگا - (دیکھئے عنوان ذ - ک - ر) اور یہ بھی کہ یہ ان کے سامنے نصیحت کی باتیں یا اقوام عالم کے تاریخی نوشتے لائیگا جس سے ان کی سمجھنے کی قوتیں بیدار ہو جائینگی - دونوں صورتوں میں اِحْدَاثٌ کے معنے وجود میں لانے کے ہیں - سورۃ الضّحٰی میں ہے وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ (۹۳/۱۱) - یہاں تَحْدِیْثٌ کے معنے ہیں عام چرچا کرنا - "تو اپنے رب کی نعمتوں کا عام چرچا کرتا رہ"۔ اَحَادِیْثُ - ** (واحد حَدِیْثٌ) قصّے - داستانیں - باتیں - (۱۲/۶) - افسانے (۲۳/۴۴) - جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ابن فارس نے کہا ہے حَدَثَ کے معنی ہیں کسی ایسی چیز کا وجود میں آنا جو پہلے موجود نہ تھی- اسی سے اَلْحَدِیْثُ ہے کیونکہ وہ ایسی بات ہوتی ہے جس سے ایک کے بعد دوسری بات پیدا ہوتی چلی جاتی ہے بات میں سے بات نکلتی جاتی ہے - افسانہ در افسانہ -

شرعی اصطلاح میں اَلْحَدِیْثُ اس قول یا عمل کو کہتے ہیں جسے رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہو - (واضح رہے کہ حدیث کی تفصیلی تعریف طویل ہے - ہم نے اسے یہاں مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے)- قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں نہیں آیا -

ح د د

اَلْحَدُّ - اس مادہ میں اصلی معنے روکنے اور منع کرنے کے ہیں* - حَدَّ الرَّجُلَ عَنِ الْاَمْرِ - آدمی کو اس معاملہ سے روکا - منع کیا - حَدَدْتُ فُلَاناً عَنِ الشَّرِّ - میں نے فلاں کو شر سے روکا - اَلْحَدَدُ روک - رکاوٹ - هٰذَا اَمْرٌ حَدَدٌ - یہ امر ممنوع ہے - اَلْحَدُّ - ایک چیز کو دوسری چیز سے ممیز کرنا - نیز وہ شے جو دو چیزوں کے درمیان فصل بن جائے تاکہ ایک چیز دوسری چیز سے مل نہ جائے - یا ایک چیز دوسری چیز تک پہنچ نہ جائے - اَلْحَدِیْدُ - لوہا - کیونکہ یہ اپنی سختی کی وجہ سے روک بن جاتا ہے (خصوصاً دشمن سے) - نیز تیز یا آرپار ہو جانے والی چیز کو بھی کہتے ہیں - حَدَّ - دھار تیز کرنا - اَلْمُحَادَّةُ - آپسمیں دشمنی کرنا، اور ایک دوسرے کی مخالفت

* محیط - **فراء کے نزدیک احادیث در اصل احدوثہ کی جمع ہے جو قیاس کے مطابق ہے لیکن بعد میں یہ حدیث کی جمع بن گئی-

کرنا۔* در اصل اس کے معنی ہیں ایک دوسرے کو روکنے اور باز رکھنے کی کوشش کرنا۔ سورۃ احزاب میں تیز زبانی (یا طعن و تشنیع) کیلئے بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ آیا ہے (۳۳/۱۹) اس میں حِدَاد، حَدِیْدٌ کی جمع ہے یعنی تیز زبانوں سے۔ سورۃ قٓ میں ہے فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (۵۰/۲۲)۔ جسکے معنے ایسی نگاہ کے ہیں جو حقیقت پر پڑے ہوئے پردوں سے آرپار گزر کر سب کچھ دیکھ لے۔ جسکے سامنے چھپی ہوئی چیزیں آجائیں۔ اس میں ظہورِ نتائج کے وقت کی کیفیت کا ذکر ہے جب نگاہیں اتنی تیز ہو جائینگی کہ وہ اعمال کے اندر چھپے ہوئے نتائج و عواقب کو بے نقاب دیکھ لینگی۔ سورۃ الحدید میں کتاب (ضابطۂ قوانین) کی عملی تنفیذ کیلئے حَدِیْدٌ (فولاد) کے نازل کرنے کا ذکر ہے جسکے معنے قوت (یا شمشیر) کے ہیں۔ (۵۷/۲۵)۔ سورۃ مجادلہ میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَادُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (۵۸/۵)۔ اسکے معنے مزاحمت کرنے کے ہیں۔ یعنی جو لوگ قانونِ مملکت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے رہتے ہیں۔ قرآن کریم میں قوانین خداوندی کیلئے متعدد مقامات پر آیا ہے تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا (۲/۱۸۷)۔ "یہ اللہ کی حدود ہیں جن کے قریب مت جاؤ"۔ قوانین الٰہیہ کو حُدُوْدُ اللّٰهِ سے تعبیر کرنے میں ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن کریم نے (عام طور پر) صرف اصولی احکام دیئے ہیں اور یہ چیز انسانوں پر چھوڑ دی ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی روشنی میں جزئی قوانین ایک نظام کے تابع خود مرتب کریں۔ قرآن کے اصول تو غیر متبدل رہینگے لیکن ان کے اندر رہتے ہوئے جو جزئی قوانین بنائے جائینگے وہ حالات کی تبدیلی کیساتھ بدلتے رہینگے۔ اسطرح انسان کو غیر متبدل حدود کے اندر سعی و عمل کی پوری آزادی رہتی ہے، جسطرح کھیل کے میدان میں چند لکیروں اور ضابطوں کے اندر ٹیم کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق کھیلے۔ لہذا قرآن ایک ایسا نظامِ زندگی پیش کرتا ہے جس میں انسان، مستقل اقدار اور تبدیل ہونے والے تقاضے، دونوں کا ساتھ دیتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے۔ وہ نہ تو انسان کی آزادی کو قاطبةً سلب کرتا ہے کہ اس کی ہر نقل و حرکت پر غیر متبدل پابندی عائد کر دے، اور نہ ہی ایسے ایسا بے زمام چھوڑتا ہے کہ وہ مستقل اقدار کی پابندی سے بھی بے نیاز ہو جائے۔ یہ ہے مقصد حُدُوْدُ اللّٰهِ کا۔ لیکن ہم نے اس حقیقت کو پس پشت ڈال کر اپنے لئے ایسے جامد احکام وضع کر رکھے ہیں جس سے اسلام ایک زندہ حرکت بننے کے

* تاج۔

بجائے منجمد اور متحجر نظریات و رسمیات کا مجموعہ بنکر رہ گیا ہے جو زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ ہی نہیں دے سکتا ۔

چند حدود (Limitations) کے اندر کھلی آزادی ۔ یہ ہے قرآن کا عطا کردہ دین ۔"حدوداللہ" قوانین کی وہ آخری حدیں یا سرے ہیں جن سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔

ح د ق

اَلْحَدَقَةُ ۔ آنکھ کی سیاہی جو پتلی کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایسی چیز کے ہیں جو کسی چیز کا احاطہ کرے، اُسے اپنے گھیرے میں لے لے ۔ حَدَقُوْابِہٖ, یَحْدِقُوْنَ ۔ انہوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا ۔ ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کو اپنی گولائی کے ساتھ گھیرے میں لے لے ، اسکے لئے اَحْدَقَ بِہٖ کہتے ہیں ۔آنکھ کی سیاہی کی نسبت سے حَدِیْقَةٌ وادی کے اس گڑھے کو کہتے ہیں جو پانی کو اپنے اندر جمع کرلے ۔ یا ہر نشیبی زمین کو جس میں پانی رک جائے ۔ اسی طرح حَدِیْقَةٌ اس باغ کو کہتے ہیں جسکے چاروں طرف دیوار ہو۔ جسکے گرد دیوار نہ ہو اسے حَدِیْقَةٌ نہیں کہتے۔ نیز اس میں گھاس کا ہونا بھی ضروری ہے ۔ اگر گھاس نہ ہو تو اسے رَوْضَةٌ کہینگے *۔ اسکی جمع حَدَائِقُ ہے ۔

قرآن کریم میں حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ (۲۷/۶۰) آیا ہے ۔ یعنی خوشنما باغات ۔ یہاں اس سے مراد عام باغات ہیں ۔

ح ذ ر

حِذْرٌ ۔ حَذَرٌ ۔ خوف زدہ کرنے والی چیز سے بچنا ۔ محتاط رہنا ۔ اجتناب کرنا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بچاؤ اور چوکنا رہنے کے ہیں ۔ چنانچہ رَجُلٌ حَذِرٌ ، اس شخص کو کہتے ہیں جو سخت احتیاط کی وجہ سے جاگتا رہے ۔اِبْنُ اَحْذَارٍ، اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت ہی محتاط ہو۔ حَذَارِ حَذَارِ کے معنے ہیں ۔ بچو ، بچو **۔اَلْحَاذِرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو ہتھیار لگا کر جنگ کیلئے بالکل مستعد ہو*۔اس کی جمع حَاذِرُوْنَ ہے ۔ وَاِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ (۲۶/۵۶) کے معنے اسلحہ بند لشکروں کے ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا (۱۷/۵۷) کے معنے ہیں خدا کا عذاب (یعنی انسان کی غلط روش کا تباہ کن نتیجہ) فی الواقعہ ایک ایسی چیز ہے جس سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے ۔ سورۃ

* تاج و راغب و محیط ** تاج و محیط

بقرہ میں فَاحْذَرُوْهُ (۲/۲۳۵) کے معنے ہیں قانون خداوندی کی نگہداشت اور پاسداری رکھو۔ سورۃ زمر میں بندہ مومن کے متعلق ہے یَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ (۳۹/۹) وہ آخرت (مستقبل) کی زندگی کی نگہداشت رکھتا ہے۔ سورہ مائدہ میں فَتَحْذَرُوْهُ کے مقابلہ میں فَاحْذَرُوْا آیا ہے (۵/۴۱) جس کے معنے کسی شے سے محترز رہنے کے ہونگے۔ سورۃ بقرہ میں حَذَرَ الْمَوْتِ (۲/۱۹؛ ۲/۲۴۳) کے معنے ہیں موت سے بچنے کی خاطر۔ سورۃ نساء میں خُذُوْا حِذْرَكُمْ (۴/۷۱) میں تمام حفاظتی تدابیر آ جاتی ہیں، بیدار مغزی کے ساتھ۔

حَذَّرَهُ تَحْذِيْرًا اسے چوکنا کیا، خبردار کیا۔ محتاط رہنے کے لئے کہا۔ حَذَّرَهُ مِنْ اَمْرٍ یا حَذَّرَهُ الْاَمْرَ۔ اس نے اُسے اُس بات سے محتاط رہنے کے لئے کہا (یا تاکید کی)۔ قرآن کریم میں ہے یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (۳/۲۸) "خدا تمہیں اپنے (قانونِ مکافات کے عواقب سے) محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو اوپر یوں کہی گئی ہے کہ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا (۱۷/۵۷) "یقیناً تیرے رب کا عذاب (غلط اعمال کے نتائج) ایسی چیز ہے جس سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے"۔

ح ر ب

اَلْحَرْبُ۔ صاحب محیط کے نزدیک اس مادہ میں اصل معنے ویرانی۔ تباہی و بربادی۔ تلف۔ سلب و نہب کے ہیں*۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور راء اکٹھے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا مفہوم ہوتا ہے۔ جیسے اَلْحَرْبُ۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چھیننے کے ہیں۔ یہ لفظ سِلْمٌ (امن و صلح) کی ضد ہے۔ یعنی لڑائی**۔ حَارَبَهٗ۔ اس سے لڑائی کی، نیز یہ لفظ سرکشی اختیار کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے**۔ چنانچہ لِمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۹/۱۰۷)۔ یا۔ اَلَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۵/۳۳) میں اسکے معنے سرکشی اختیار کرنے ہی کے ہیں**۔ حَرْبٌ۔ جنگ (۲/۲۷۹)۔ اَلْمِحْرَابُ۔ بالا خانہ۔ بلند جگہ۔ صدر مکان۔ نیز محلات (بحوالہ کتاب الاشتقاق) کیونکہ ایسی اونچی جگہیں در اصل حرب ہی کے لئے بنائی جاتی تھیں۔ جیسے قلعوں کی برجیاں وغیرہ۔ مَحَارِيْبُ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ۔ بنی اسرائیل کی مساجد جن میں وہ امور حرب کے متعلق مشورے*** کیا کرتے تھے**۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے

---

*محیط۔ **تاج۔ ***قرآن میں مسلمانوں کے متعلق بھی اقامت صلوٰۃ کے ساتھ و امرھم شوریٰ بینھم آیا ہے (۴۲/۳۸) یعنی وہ اپنے معاملات باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں۔ اس سے مساجد اور مشاورت کا تعلق ظاہر ہے۔

کہ مِحْرَاب ہیکل میں اس مقام کو کہتے تھے جہاں قربانیاں دی جاتی تھیں۔ یعنی قربانگاہ۔ حضرت زکریا کے متعلق ہے هُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ (۳/۳۸)۔ "وہ قربانگاہ میں کھڑا مصروف صلٰوۃ تھا"۔

سورۃ سبا میں ہے کہ حضرت سلیمان کیلئے مَحَارِيْبُ تیار ہوتے تھے (۳۴/۱۳) اسکے معنے مضبوط قلعے یا محلات بھی ہو سکتے ہیں اور ہیکل (مساجد) بھی۔

ح ر ث

اَلْحَرْثُ کے بنیادی معنے ہیں کچھ کمانا۔ کسب و ہنر کرنا۔ اسکے بعد یہ لفظ زمین ہر کام کرنے کیلئے عام ہوگیا۔ چنانچہ حَرْثٌ کے معنے ہیں کھیتی باڑی کرنا۔ چونکہ کام کرنے اور کمانے کیلئے تگ و تاز اور فکر و تجسس کی ضرورت ہوتی ہے اسلئے حَرَثَ الشَّيْئَ کے معنے ہیں اس نے اس بات میں تفقہ حاصل کرلیا۔ اَلْحَرْثُ کے معنے ہیں آگ کو حرکت دینا تاکہ وہ زیادہ روشن ہو جائے۔ اَلْمِحْرَاثُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے آگ کریدی جائے*۔ قرآن کریم نے عورتوں کو حَرْثٌ (کھیتی) سے تشبیہ دی ہے۔ (۲/۲۲۳) اس لئے کہ وہ افزائشِ نسلِ انسانی کا بنیادی ذریعہ ہیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے میاں بیوی کے جنسی اختلاط سے مقصود کیا ہے۔ یعنی افزائشِ نسل۔ (مزید تفصیل ح۔ ص۔ ن اور س۔ ف۔ ح کے عنوانات میں ملیگی)

سورۃ واقعہ میں تَحْرُثُوْنَ (۵۶/۶۳) کے معنے ہیں تخم ریزی (یعنی زمین میں بیج ڈالنا)۔ اور اسکے بعد تَزْرَعُوْنَ (۵۶/۶۴) کے معنے ہیں کھیتی کا زمین سے اُگانا۔ حَرْثٌ تو انسان کے اپنے اختیار میں ہے لیکن زَرْعٌ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان زمین میں بیج ڈال سکتا ہے۔ اُس بیج کو زمین سے اگانا اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے جو کچھ زمین سے پیدا ہوتا ہے وہ فرد متعلقہ کی محنت اور خدا کے وہبی عطیہ دونوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں سے فردِ متعلقہ صرف اپنی محنت کا حقدار ہو سکتا ہے۔ وہ موہبتِ خداوندی کا مالک نہیں بن سکتا۔ تفصیل کے لئے میری کتاب نظام ربوبیت دیکھئے۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ حَرَثَ نَاقَتَهٗ کے معنے ہیں اس نے اپنی اونٹنی کو لاغر کردیا۔ غالباً تگ و تاز اور محنت کی بنا پر یہ معنی لئے گئے ہیں۔

---

* تاج و محیط۔

ح ر ج

اَلْحَرَجُ - دراصل چیزوں کو اسطرح جمع کرنے کو کہتے ھیں جس سے تنگی نظر آنے لگے۔ یعنی جگہ کم ھو اور چیزیں زیادہ ھوں تو وہ جگہ تنگ نظر آنے لگ جاتی ھے۔ چنانچہ اس مقام کو بھی کہتے ھیں جہاں بہت ھی گھنے درخت ھوں*۔ راغب نے کہا ھے کہ اس سے یہ لفظ اضطراب، بے اطمینانی اور شک کے معنوں میں استعمال ھونے لگا*۔ جو کام دل کی کشاد سے نہ کیا جائے اسکے لئے یہ لفظ بولا جاتا ھے۔ چنانچہ حَرَجَ الرَّجُلُ اَثِيَابَهُ کے معنے ھیں اسنے اپنے دانت پیسے*۔ لَا حَرَجَ عَلَيْكَ۔ تم پر کوئی مضائقہ نہیں۔ کوئی اعتراض نہیں**۔ اسی سے یہ لفظ گناہ کے معنوں میں بھی استعمال ھوتا ھے***۔

اصل یہ ھے کہ جن الفاظ میں حآء اور رآء اکٹھے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا مفہوم مضمر ھوتا ھے۔ حَرَجٌ میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ھے****۔

سورۃ نساء میں ھے کہ مومنین کا شیوہ یہ ھے کہ وہ نظامِ خداوندی کی اطاعت اسطرح کریں کہ لَا يَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا (۴/۶۵)۔ "وہ اس اطاعت سے اپنے دل میں ذرا سی بھی کبیدگی محسوس نہ کریں"۔ سورۃ نور میں یہ لفظ قابلِ اعتراض بات کے معنوں میں آیا ھے (۲۴/۶۱)۔ سورۃ حج میں ھے وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِی الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (۲۲/۷۸)۔ "اس نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی"۔ اسکے یہ معنی بھی ھیں کہ دین زبردستی قبول نہیں کرایا جاسکتا۔ اسے بہ طیب خاطر اختیار کیا جائیگا۔ لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّيْنِ (۲/۲۵۶)۔ اور یہ معنے بھی کہ دین میں جن قوانین کی اطاعت کرائی جاتی ھے تو یہ اسلئے نہیں کہ تم سے کوئی بیگار لی جاتی ھے۔ بلکہ یہ اسلئے ھے کہ خود تمہاری ذات میں وسعت اور استحکام پیدا ھو۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶)۔ "اللہ کسی نفس کو کسی کام کے لئے مکلف نہیں ٹھہراتا بجز اس کے کہ اس سے مقصد خود اس ذات (نفس) میں وسعت پیدا کرنا ھوتا ھے"۔ یاد رکھئے۔ "دین میں تنگی نہیں" سے مراد یہ نہیں کہ آپ دین (نظام) کے اندر بھی رھیں اور اسکے بعد جن باتوں میں آسانی محسوس کریں انہیں مانیں اور جن میں کچھ گرانی نظر آئے انہیں یہ کہکر چھوڑ دیں کہ دین میں تنگی نہیں۔ جبتک آپ اس نظام کے اندر ھیں

---

* تاج۔ ** محیط۔ *** راغبؔ۔ **** العلم الخفاق۔

اسکے تمام قوانین و ضوابط کو بہ طیب خاطر ماننا ہوگا ۔ جسوقت آپ اسمیں تنگی محسوس کریں اس نظام کے دائرے سے باہر نکل جائیں ۔ نظام کے اندر رہتے ہوئے نظام کے ہر حکم اور ضابطہ کی پابندی لازمی ہوگی ۔ یہ جبر نہیں بلکہ ایسی پابندی ہے جسے انسان خوش دلانہ اور رضاکارانہ اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے ۔ یعنی اس کا بہ طیب خاطر دین قبول کر لینا اس امر کا اقرار ہے کہ وہ دین کی عائد کردہ پابندیوں کو اپنے اوپر لازم قرار دیگا ۔ دین میں تنگی نہ ہونے سے یہ مراد ہے ۔

ح ر د

حَرَدَہٗ ۔ یَحْرِدُہٗ ۔ حَرْداً اس نے اسکا قصد کیا ۔ اس نے اسے روکا اور منع کیا ۔ اَلْحَرُوْدُ کے معنے الگ تھلگ رہنے کے ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنے (۱) ارادہ کرنا (۲) غصہ ہونا اور (۳) ایک طرف کو ہو جانا ہیں ۔ رَجُلٌ حَارِدٌ ۔ الگ رہنے والا آدمی ۔ غضبناک آدمی کو بھی کہتے ہیں * ۔ قرآن میں باغ والوں کی مثال کے ضمن میں کہا ہے وَغَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قَادِرِیْنَ ($\frac{68}{25}$) ۔ اسکے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے مقصد کی تکمیل پر قادر تھے ۔ اور یہ بھی کہ وہ اسکی قوت رکھتے تھے کہ غریبوں اور مسکینوں کو اپنے باغ میں آنے سے روک دیں ۔ سیاق عبارت کی رو سے دوسرے معنے زیادہ مناسب نظر آتے ہیں ۔

نواب صدیق حسن خاں نے کہا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور راء اکٹھے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا پہلو ہوتا ہے ۔ مثلاً اَلْحَرْدُ ۔ غضب اور غصہ ۔

ح ر ر

اَلْحَرُّ ۔ اَلْحَرُوْرُ ۔ اَلْحَرَارَۃُ ۔ گرمی ۔ اَلْحَرُوْرُ ۔ (دھوپ کی) تپش (قرآن میں یہ لفظ ظِلٌّ کے مقابلہ میں آیا ہے $\frac{35}{21}$) ۔ اَلْحَرِیْرُ ** ۔ ریشمی کپڑا ($\frac{76}{12}$) ۔ راغب نے لکھا ہے کہ ہر باریک کپڑے کو حَرِیْرٌ کہتے ہیں ۔ اس مادہ کے معنی ہیں کسی چیز کا اس انداز سے خالص ہونا کہ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو ** ۔

اَلْحُرُّ ۔ عَبْدٌ کی ضد ہے ۔ مرد آزاد بمقابلہ غلام ۔ ہر چیز کا بہترین حصہ ۔ عمدہ گھوڑا ۔ عام زمین اور ریتلی زمین میں سے بہترین زمین ۔

---

* تاج و راغب ۔ ** تاج ۔

حُرُّ كُلِّ أَرْضٍ - ہر زمین کا بہترین حصہ - مَا هٰذَا مِنْكَ بِحُرٍّ - یہ بات تمہاری طرف سے اچھی نہیں ہے*

حَرَّ - يَحَرُّ - آزاد ہونا - اَلتَّحْرِيْرُ - (باندی اور غلام کو) آزاد کرنا - تَحْرِيْرُ الْكِتَابِ میں اگرچہ تحریر کے معنے اس اعتبار سے آزاد کرنا ہو سکتے ہیں کہ انسان اپنے خیالات کو ذہن کی قید سے آزاد کرکے صفحہ قرطاس پر لے آتا ہے لیکن صاحب تاج کے خیال میں اس سے مراد کتاب کے حروف کو خوبصورت بنانا اور اسکے اغلاط کو درست کرنا ہیں - یعنی بہتر بنانا -*

تَحْرِيْرُ الْوَلَدِ - کسی بچہ کو معبد یا خانقاہ کی خدمت کے لئے وقف کر دینا - سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت مریم کی والدہ نے کہا تھا اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا ($\frac{3}{34}$) - ''جو کچھ میرے پیٹ میں ہے اسے میں نے معبد کی خدمت کے لئے وقف کرنے کی منت مانی ہے ''- اس میں مُحَرَّرٌ کے یہی معنے ہیں - اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ بچہ اپنی ساری عمر اس خدمت کو چھوڑ نہیں سکتا تھا - یعنی وہ عمر بھر کے لئے کنیسہ کی خدمت کے لئے وقف ہو جاتا تھا* - چنانچہ اب بھی عیسائیوں کی (Nuns) کو عمر بھر غیر شادی شدہ رہ کر اپنے آپ کو کلیسا کی خدمت کے لئے وقف رکھنا پڑتا ہے - اس حقیقت کو سامنے رکھنے سے وہ تمام مقامات واضح ہو جاتے ہیں جن میں یہودیوں نے حضرت مریم کو مورد طعن و تشنیع بنایا تھا - حضرت مریم کو کنیسہ کی خدمت کے لئے بطور (Nun) وقف کر دیا گیا تھا - معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت مریم کی والدہ نے انہیں ہیکل کی نذر کیا تھا اس وقت ابھی ہیکل کے دستور میں یہ چیز داخل نہیں تھی کہ ہیکل کی خدمت گار لڑکی کو عمر بھر تجرد کی زندگی بسر کرنی ہوگی - یہودیوں نے بعد میں یہ قاعدہ وضع کر لیا (جو پھر عیسائیوں میں بھی جاری رہا - اور اب تک جاری ہے) حضرت مریم نے خدا کے حکم کے مطابق (انسانوں کے اس خود ساختہ مستبد) قاعدے کو ٹھکراتے ہوئے شادی کر لی اور خانقاہ کو چھوڑ کر تاہل کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی - یہودیوں کے خود ساختہ ضابطہ خانقاہیت کی رو سے ان کا یہ عمل بہت بڑا جرم تھا اور '' دین '' سے سرکشی کے مرادف - اس لئے یہودیوں کے احبار و رہبان ان کے پیچھے پڑ گئے - یہ تھا حضرت مریم کا جرم - (تفصیل ان امور کی میری کتاب '' شعلہ مستور '' میں ملے گی)

* تاج

ح ر س

حَرَسَہٗ - یَحْرِسُہٗ وَیَحْرُسُہٗ - اس نے اس کی حفاظت کی -
اَلْحَرَسِیُّ - سرکاری چوکیدار اور محافظ - حَرَسَ الرَّجُلُ - اس آدمی نے چوری کی - اَلْحَرِیْسَۃُ - مسروقہ شے * -

قرآن کریم میں ہے حَرَسًا شَدِیْدًا (۷۲/۸) یعنی سخت پہرے دار - حَرَسٌ اور حُرَّاسٌ - حَارِسٌ کی جمع ہے جس کے معنے کسی جگہ کے محافظ کے ہیں - حَرْزٌ ،، سامان کی حفاظت کو کہتے ہیں اور حَرْسٌ جگہ کی حفاظت کو - **

اس میں سختی اور مشقت کا پہلو مضمر ہوگا کیونکہ اس لفظ میں حاء اور راء اکٹھے آئے ہیں - اور یہ ان کا خاصہ ہے *** -

ح ر ص

اَلْحَرْصُ کے معنے ہیں کسی چیز میں چھید کر دینا - کسی چیز کو پھاڑ دینا یا چھیل دینا - جسطرح دھوبی کپڑے کو پتھر پر مار مار کر اس میں سوراخ کر دیتا ہے یا پھاڑ دیتا ہے - چنانچہ ثَوْبٌ حَرِیْصٌ اس طرح پھاڑے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں - اَلْحَارِصَۃُ - اس بادل کو کہتے ہیں جو اپنی بارش سے زمین میں سوراخ کر دے - یا اس کی بالائی سطح کو کھرچ دے - اَلْحَرْصَۃُ - تھنوں کا اسطرح پھٹ جانا کہ دودھ کی دھاریں منتشر ہو کر برتن میں گریں **** -

ان بنیادی معانی کے پیش نظر حِرْصٌ ایسی شدید آرزو کو کہتے ہیں (خواہ وہ اچھی چیز کی ہو اور خواہ بری چیز کی) جو دل کے آر پار ہو جائے - دل میں نہ ٹھہرے اور اس کا بار بار اظہار کیا جائے - یعنے نہایت شدید خواہش -* ابن فارس نے یہ دونوں اس کے بنیادی معنی لکھے ہیں -

قرآن کریم میں ہے وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوۃٍ (۲/۹۶) ,, تو دیکھیگا کہ ان لوگوں کے دلوں میں زندہ رہنے کی خواہش بہت زیادہ ہے'' - دوسری جگہ نبی اکرمؐ کے متعلق ہے - حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ (۹/۱۲۸) - ازہری نے کہا ہے کہ حَرِیْصٌ عَلَیْکَ کے معنے اہل عرب کے نزدیک حَرِیْصٌ عَلٰی نَفْعِکَ ہوتے ہیں* - یعنے اس کے دل میں

*تاج - **راغب - ***العلم الخفاق - ****تاج و محیط -

تمہاری منفعت کی آرزو نہایت شدید ہے ۔ یعنی عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ (۹/۱۲۸) ''جو تمہیں دکھ پہنچتا ہے وہ اس پر شاق گزرتا ہے'' منفیانہ پہلو ہے ، اور حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ ''وہ تمہاری منفعت کی شدید آرزو رکھتا ہے'' اس کا مثبت پہلو۔

ح ر ض

اَلْحَرَضُ ۔ بگاڑ ۔ خواہ جسم میں ہو خواہ عقل میں* ۔ تھکا ہوا کمزور آدمی جو بالکل تباہی کے قریب ہو نیز جسے غم و عشق نے گھلا ڈالا ہو (۱۲/۸۵)** ۔ناقابلِ اعتناء چیز جسمیں کوئی خوبی باقی نہ رہ گئی ہو*** ۔ اَلْحَرَضُ ۔ جو شخص بیماری کی وجہ سے بہت کمزور اور نڈھال ہو چکا ہو۔ اور ازکار رفتہ* ۔

راغب نے کہا ہے کہ تَحْرِیْضٌ کے معنے اِزَالَۃُ الْحَرَضِ کے ہیں ۔ یعنے کسی کی کمزوری ، لاغری یا خرابی کو دور کر دینا ۔ جیسے مَرَّضْتُہٗ کے معنے مرض دور کرنے کے ہوتے ہیں*** ۔ لہذا حَرَّضَ کے معنی ہیں کسی شخص کو ایسے کام کے لئے برانگیختہ کرنا جو اس کے لئے حیات بخش ہو اور اگر وہ ایسے نہ کرے تو اسکی ہلاکت کا خوف ہو۔ قرآن میں نبی اکرم ؐ سے کہا گیا ہے وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ (۸/۶۵) ۔ اسکے عام معنی ہیں ''تو انہیں جنگ کیلئے برانگیختہ کر'' ۔ لیکن اسکے اصلی معنے ہونگے تو ان مومنین (یعنی اپنے رفقا) کی تمام کمزوریوں اور کمیوں کو دور کردے تا کہ وہ جہادِ زندگی میں مردانہ وار شریک ہونے کے قابل ہو جائیں ۔ اسی کا نام تزکیہ ہے ۔ وَیُزَکِّیْھِمْ (۲/۱۲۹) یعنے نشو و نما دینا ۔ بالیدگی اور نمو پیدا کرنا ۔ کمزوری اور کمی کو رفع کرنا اس پروگرام کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے ۔

ح ر ف

حَرْفٌ ۔ کسی چیز کا سرا ، کنارہ یا حد ۔ حَرْفُ الْجَبَلِ ۔ پہاڑ کا اوپر کا حصہ جو ایک طرف کو نکلا ہوا ہو ۔ فُلَانٌ عَلٰی حَرْفٍ مِنْ اَمْرِہٖ ۔ وہ شخص اپنے معاملہ میں ایک کنارہ پر کھڑا انتظار کر رہا ہے کہ جس طرف جانے میں اسے فائدہ نظر آئے اسی طرف چلا جائے* ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرْفٍ (۲۲/۱۱)۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ وہ احکام خداوندی کی اطاعت کے معاملہ میں ایک

* تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

کنارہ پر کھڑے رہتے ہیں کہ اگر ان کی اطاعت میں فائدہ ہو تو یوں کر لیا جائے اور اگر انہیں چھوڑنے میں فائدہ نظر آئے تو چھوڑ دیا جائے۔ حَرَّفَ الشَّيْءَ عَنْ وَجْهِهٖ کے معنے ہیں کسی چیز کو اس کے صحیح رخ سے پھیر دیا۔ بدل دیا۔ اَلتَّحْرِيْفُ۔ تغیر و تبدل کر دینا۔ خواہ یہ لفظی ہو خواہ معنوی۔ قلم پر ٹیڑھا قط لگانا۔ اِنْحَرَفَ۔ ایک کنارہ کی طرف جھک جانا، ٹیڑھا ہو جانا*۔ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ (۲/۷۵)۔ ''کلام اللہ کو سمجھ لینے کے بعد اس میں تغیر و تبدل کر دیتے ہیں''۔

حَرَفَ لِعِيَالِهٖ۔ اس نے اپنے اہل و عیال کیلئے کمائی کی*۔ اَلْحِرْفَةُ۔ صنعت اور پیشہ جس سے انسان اپنی معاش پیدا کرے۔ حَرِيْفُكَ تمہارا ہم پیشہ**۔ (ہم پیشہ لوگوں میں باہمی چشمک کی وجہ سے یہ لفظ ہمارے ہاں مدمقابل یا دشمن کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے)۔ اَلْمُحَارَفُ۔ وہ شخص جو حصول معاش کیلئے بڑی محنت کرے لیکن اسکے باوجود اسکی آمدنی اسکے اہل و عیال کے گذارہ کیلئے کافی نہ ہو**۔ اَلْمُحَرَّفُ۔ وہ شخص جس کا مال جاتا رہا ہو**۔ لہٰذا تحریف کے معنی اسطرح کی توجیہ و تاویل کرنا ہونگے جس سے اس کی وہ روح جاتی رہے جو در اصل اس کا رأس المال ہے۔ خواہ یہ تحریف، الفاظ کے رد و بدل سے ہو یا مفہوم کی تبدیلی سے۔ اہل کتاب نے اپنی آسمانی کتابوں میں جو تحریف کی ہے اس کے متعلق سورۃ نساء میں ہے يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (۴/۴۶) ''وہ کلمات کو ان کے مقامات سے ہٹا دیتے ہیں''۔ نیز (۵/۱۳)۔ اس سے تحریف لفظی بھی مراد ہوسکتی ہے اور تحریف معنوی بھی۔ اور سورۃ بقرہ میں ہے يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ . . . . . . (۲/۷۹) ''یہ لوگ الکتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے'' اس سے تحریف لفظی مراد ہے۔ یہود و نصاریٰ دونوں نے اپنی آسمانی کتابوں میں جس بری طرح سے تحریف کی ہے اس کی تفصیل میری کتاب ''معراج انسانیت'' کے پہلے باب ''ظهرالفساد'' میں ملیگی۔ ان کی کوئی کتاب اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہیں۔

ح ر ق

حَرَقَ الْحَدِيْدَ بِالْمِبْرَدِ۔ لوہے کو ریتی سے گھسا۔ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں (ابن فارس)۔ چونکہ اس سے حرارت پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کے

---

* تاج۔ ** تاج و محیط۔

معنے آگ میں ڈال کر جلا دینے کے ھیں۔ اَلْحَرَقُ۔ آگ کا شعلہ یا آگ۔ اَلْحَرِقَۃُ۔ آگ۔ اَلْحَرِیقُ مِنَ السَّحَابِ۔ سخت بجلیوں والا بادل۔*
اَلْحَرِیْقُ۔ آگ***۔ نیز جلنا۔****

سورۃ آل عمران میں ہے ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ (۳/۱۸۰)۔ "سب کچھ جلا کر تباہ کر دینے والا عذاب چکھو"۔ سورۃ انبیاء میں حضرت ابراھیمؑ کے متعلق ہے قَالُوْا حَرِّقُوْہُ (۲۱/۶۸)۔ "انہوں نے کہا کہ اسے جلا ڈالو"۔ اِحْتَرَقَ۔ جل جانا (۲/۲۶۶)۔

چونکہ اس لفظ میں حاء اور راء اکٹھے آئے ھیں اس لئے اس کے مفہوم میں مشقت اور سختی کا پہلو ھوگا۔ یہی اس کا خاصہ ہے۔**

ح ر ک

حَرُکَ۔ یَحْرُکُ۔ حَرْکًا وَحَرَکَۃً۔ ھلا، حرکت کی (سکون کی ضد ہے)۔ حَرَّکْتُہٗ فَتَحَرَّکَ۔ میں نے اسے حرکت دی۔ پس وہ متحرک ھو گیا۔ یہ صرف مادی چیزوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ھونے کے لئے آتا ہے۔ بعض اوقات تَحَرَّکَ کَذَا اس موقعہ پر بھی بولتے ھیں جب کسی چیز میں کچھ تغیر ھو جائے۔ یعنی اس کے اجزاء میں کمی بیشی ھو جائے۔*

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے لَاتُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ (۷۵/۱۶)۔ "اس کے لفظی معنی ھیں تو اس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت مت دے، تاکہ اسے جلدی لے لے"۔ اس کا مفہوم عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ حکم قرآن کریم کے متعلق ہے اس لئے کہ دوسرے مقام پر ہے "وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ وَحْیُہٗ (۲۰/۱۱۴) یعنی جب تک (کسی ایک معاملہ کے متعلق) وحی کی پوری تعلیم سامنے نہ آ جائے اس کے عملی پروگرام میں عجلت مت کرو۔ عملی قدم اس وقت اٹھاؤ جب سارا پروگرام واضح طور پر سامنے آ جائے۔ لیکن (۷۵/۱۶) سے پہلے قرآن کا ذکر نہیں۔ انسان اور اس کے اعمال کا ذکر ہے۔ اس صورت میں، اس آیت سے نیا مضمون شروع ھوتا ہے۔ اگر ربط مضمون پیش نظر ھو تو یہ سمجھنا ھوگا کہ یہاں خطاب خود انسان سے ہے اور بات بھی اس کے اعمالنامہ سے متعلق ہے۔ (اس کی تشریح "مفہوم القرآن" میں کی جائیگی کیونکہ وھی اس کا صحیح مقام ہے۔)

---

* تاج۔ ** العلم الخفاق۔ *** راغب۔ **** محیط۔

ح ر م

حَرَمَهُ الشَّیْءَ حِرْمًا وَ حِرْمَانًا ۔ اس سے کسی شے کو روک لینا ۔ اس شے کو اس تک پہنچنے نہ دینا۔ لہذا اس کے بنیادی معنے شدت کے ساتھ روک دینے یا ممانعت کر دینے کے ھیں ۔ (ابن فارس) اَلْحَرَامُ ۔ تمام وہ چیزیں جن کی ممانعت کردی گئی ھو۔ جنکے کرنے سے روک دیا گیا ھو۔ یہ اَلْحَلَالُ کی ضد ہے جسکے معنے ھیں رسیاں کھول کر رکاوٹ اور بندش کا دور کردینا ۔ اَحْرَمَ الْحَاجُّ ۔ حاجی اس حالت میں پہنچ گیا جہاں اس پر کئی ایک ایسی چیزیں ممنوع ھو گئیں جنہیں وہ پہلے کر سکتا تھا ۔ اسی کو حالت اِحْرَام کہتے ھیں ۔ اَلْحَرِیْمُ ۔ ھر حرام کی ھوئی ممنوع چیز ۔ ھر جگہ جس کی حمایت و حفاظت لازمی ھو۔ نیز ایام جاھلیت میں ان کپڑوں کو کہتے تھے جنہیں وہ لوگ طواف کعبہ کے وقت اتار دیا کرتے تھے اور ننگے حج کیا کرتے تھے ۔ یعنے ان کپڑوں کا پہننا ممنوع تھا ۔ اسی طرح اَشْهُرُ الْحُرُمِ ۔ وہ (چار) مہینے (رجب ۔ ذوالقعدہ ۔ ذوالحجۃ اور محرم) تھے جن میں جنگ کی ممانعت تھی* ۔

روکنے کے اعتبار سے حَرِیْمُ الدَّارِ ، مکان کے اس اندرونی حصہ کو کہتے ھیں جو حدبندی کرکے مکان میں داخل کر لیا گیا ھو* ۔

اَلْمَحْرُوْمُ ۔ وہ ہے جسکی ضروریات رک جائیں ۔ جسکے پاس کچھ نہ رہے* ۔ اصل میں اس میں مشقت کا پہلو مضمر ہے ۔ اس لئے کہ حَرَمَ میں حاء اور راء اکٹھے آئے ھیں ۔ اور ان کا خاصہ ہے کہ جس لفظ میں یہ اکٹھے آئیں اس میں مشقت اور سختی پائی جائے** ۔ اسی لئے اس کے بنیادی معنی شدت کے ساتھ روکنے کے ھیں ۔ اَلْحُرْمَةُ کے معنے ھیں وہ کام جس کا کرنا جائز نہ ھو۔ وہ پابندی جسکے توڑنے کی ممانعت ھو۔ نیز وہ ذمہ داری جس کی حفاظت لازمی ھو۔ وہ کام جسکا کرنا ضروری ھو*۔ قرآن میں جہاں ہے تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ۔ ۔ ۔ ۔ (۶/۱۵۲) ۔ تو وھاں اسکے معنے یہی ھیں کہ یہ وہ باتیں ھیں جو اللہ نے تم پر واجب قرار دی ھیں ۔ جنکی خلاف ورزی سے تمہیں روکا گیا ہے ۔

سورۃ انبیاء میں ہے وَ حَرَامٌ عَلٰی قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۔ (۲۱/۹۵) ۔ جو قوم ھمارے قانون مکافات کے مطابق تباہ و برباد

*تاج و محیط ۔ ** العلم الخفاق ۔

ہو جاتی ہے اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ پھر زندہ نہ ہو سکے* - یعنے
اسکی باز آفرینی اسکے لئے ناممکن ہو جاتی ہے - یہ قوموں کی وہ آخری تباہی
ہے جو مہلت کے وقفہ کے بعد عمل میں آجاتی ہے اور جس سے وہ قومیں پھر ابھر
نہیں سکتیں - لیکن اگر اس آیت کو اس کے بعد کی آیت سے ملایا جائے جو
حتّٰی سے شروع ہوتی ہے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ انکی باز آفرینی اسوقت ممکن ہوتی
ہے جب وہ صورت پیدا ہو جائے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے - یا اس آیت کے
معنے یہ ہونگے کہ جب ہم نے بستیوں کو ہلاک کیا تھا تو ان پر یہ سزا اس
لئے واجب ہوئی تھی (حَرَامٌ عَلٰی) کہ وہ کسی طرح بھی خدا کے قانون کی
طرف رجوع نہیں کرتے تھے - یعنی کوئی قوم مستحق ہلاکت اسوقت ہوتی
ہے جب اس میں "رجعت الی اللہ" کی صلاحیت نہیں رہتی - (اس صورت میں اگلی
آیت میں حتّٰی زائد ہوگا)

حُرُمٌ - حالت احرام میں (۵/۱) - اَلْحُرُمٰتُ - جن چیزوں سے منع
کیا گیا ہے (۲/۱۹۴) -

مَحْرُوْمٌ - جو کسی چیز سے روک دیا گیا ہو - جسکہ اپنی محنت کے
ماحصل سے بھی - (۵۱/۱۹) - جسکی ضروریات زندگی پوری نہ ہوتی ہوں (۵۱/۱۹)
مُحَرَّمٌ - جو حرام یا ممنوع قرار دیا گیا ہو (۲/۸۵) - جیسے واجب التحریم یا
واجب الاحترام بنایا گیا ہو (۱۴/۳۷) -

حرام و حلال - چونکہ حرام اور حلال کے سوال کو مذہب (اور دین)
میں بڑی اہمیت حاصل ہے - ایسی اہمیت کہ بعض اوقات یہی شے ایک
مذہب اور دوسرے مذہب میں امتیازی نشان بن جاتی ہے - اس لئے اس کے
متعلق تفصیلی گفتگو ضروری ہے -

اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے - اس کے ارشاد کے مطابق
ہر ابن آدم - ہر انسان - محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم
ہے - (وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ - ہم نے بنی آدم کو تکریم عطا کی ہے
(۱۷/۷۰) اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ
وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے - اس پر اپنی مرضی چلائے -

* ابن قتیبہ نے بھی لکھا ہے کہ لا یرجعون میں لا زائد ہے - یا حرام کے معنی
واجب کے ہیں - (القرطین ج/۱ص ۳۳ ؛ ج/۲ص ۲۶) دوسرے معنی صحیح ہیں -
لا زائد نہیں مانا جا سکتا -

اسے اپنے احکام کے تابع رکھے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللّٰهِ . . . . (۳/۷۸) "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اللہ نے اسے ضابطۂ قوانین ۔ یا حکومت یا نبوت ہی کیوں نہ دی ہو ۔ کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ سے ورے میری محکومیت اختیار کرو" ۔ لہذا قرآن کریم کی رو سے کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی لگائے۔

لیکن زندگی میں بعض پابندیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔ ان پابندیوں کی مختلف قسمیں ہیں ۔ مثلاً

(الف) ڈاکٹر مریض سے کہہ دیتا ہے کہ تم اتنے دنوں تک گوشت نہیں کھانا ۔ ظاہر ہے ڈاکٹر کے اس فیصلہ کی پابندی، کسی کے حکم کی اطاعت نہیں ۔ یہ اس کا ایک فنی مشورہ اور مشفقانہ ہدایت ہے جسے ماننا یا نہ ماننا ہمارے اپنے بس کی بات ہے ۔ اسے ماننے سے ہمارا بھلا ہوگا ۔ نہ ماننے سے نقصان ہوگا ۔ ہم اسے بطیب خاطر مانتے ہیں ۔ اس سے ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی ۔

(ب) ہمارے ملک کی مجلس قانون ساز جو ہمارے نمائندوں پر مشتمل ہے، ایک قانون بناتی ہے اور حکومت اسے نافذ کرتی ہے (مثلاً یہ قانون کہ سڑک پر بائیں ہاتھ چلو) اس قانون کی پابندی بھی در حقیقت کسی دوسرے کے حکم کی پابندی نہیں ۔ ہمارے اپنے ہی فیصلہ کی پابندی ہے ۔ لہذا اس سے بھی ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی ۔

لیکن اس کے برعکس، ایک شخص کہتا ہے کہ اسلام کی رو سے فلاں چیز کا استعمال حرام ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نہ صرف اپنے زمانے کے کروڑہا مسلمانوں پر پابندی لگاتا ہے بلکہ قیامت تک آنے والی اُمّت مسلمہ کو اس حکم کی زنجیر میں اس طرح جکڑتا ہے کہ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں مجرم قرار پاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شدید پابندی کے لئے کوئی واضح اور متعین سند (Authority) ہونی چاہئے ۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے یہ اتھارٹی کیا ہے ؟

قرآن کریم نے اس قسم کی پابندی کے لئے "حرام" کا لفظ استعمال کیا ہے جو "حلال" کی ضد ہے ۔ حلال کے معنی ہیں، رسیاں کھول کر آزاد کر

دینا۔ اس لئے حرام کے بنیادی معنی ہوئے کسی کو کسی بات سے روک دینا۔ منع کر دینا۔ اس پر پابندی لگا دینا۔ قرآن کریم نے حرام اور حلال کے بارے میں واضح احکام دیئے ہیں۔

اس نے سب سے پہلے اصول یہ بیان کیا ہے کہ خوشگوار سامانِ رزق کی ہر شے حلال ہے بجز ان کے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہو۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ۔ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ...... (۲/۱۷۲-۱۷۳)

اے ایمان والو! جو کچھ اللہ نے بطور رزق دیا ہے اس میں سے طیّبات (خوشگوار چیزوں) کو کھاؤ۔ اور اللہ کا شکر کرو۔ اگر تم صرف اسی کی محکومی اختیار کرتے ہو۔ اس نے تم پر صرف مردار اور خون* اور سور کا گوشت اور جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے پکارا جائے، حرام کیا ہے۔

یہاں صرف کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ سورۃ اعراف میں ان کے ساتھ اشیائے مستعملہ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ...... (۷/۳۲)

(ان سے) کہو کہ وہ کون ہے جس نے زینت کی چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دیا ہے؟

اس سے آگے ہے۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ...... (۷/۳۳)

ان سے کہو کہ میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔

* سورہ انعام میں دماً مسفوحاً کہہ کر اس کی تصریح کردی کہ صرف بہتا ہوا خون حرام ہے۔ (۶/۱۴۶)

ان آیات سے ظاہر ہے کہ :

(i) کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔

(ii) خدا کے علاوہ اس کا حق کسی اور کو حاصل نہیں ۔

(iii) اس نے زینت کی کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا۔

(iv) اشیائے رزق میں سے جنہیں حرام قرار دیا ہے ان کی خود ہی تصریح کر دی ہے ۔

ہم نے دیکھ لیا کہ انسانوں پر کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے ۔ لیکن خدا ہر شخص سے براہ راست کلام نہیں کرتا اس لئے اس نے حرام و حلال کے متعلق اپنے فیصلے وحی کی رو سے دئیے جو رسول اللہؐ پر نازل ہوئی تھی ۔ سورۃ انعام میں ہے ۔

قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا.... (۶/۱۴۶)

(اے رسول ان سے) کہدو کہ جو کچھ میری طرف وحی کیا گیا ہے میں اسمیں کسی چیز کو جو کھانے والا کھائے حرام نہیں پاتا ۔ سوائے (مردار' بہتے خون' لحم خنزیر اور اسکے جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام سے پکارا گیا ہو)

اس سے ظاہر ہے کہ خدا نے حرام و حلال کا فیصلہ اس وحی کی رو سے کر دیا ہے جو نبی اکرمؐ کی طرف نازل ہوئی تھی ۔ یہ وہ وحی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے ۔ سورۃ حج میں ہے ۔

وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ.... (۲۲/۳۰)

اور تمہارے لئے چوپائے حلال ہیں بجز ان کے جن کے متعلق تمہیں اس وحی کی رو سے بتادیا گیا ہے جو تمہیں پڑھ کر (سنائی) جاتی ہے ۔

یہ ''مَا يُتْلَىٰ'' وہ وحی تھی جو 'الکتاب' میں تھی ۔ سورۃ عنکبوت میں ہے اُتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ (۲۹/۴۵) ''اسے پڑھ جو تیری طرف کتاب میں سے وحی کیا گیا ہے'' ۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق سورۃ آلِ عمران کی اس آیت میں جس کا پہلا حصہ سابقہ صفحات میں درج کیا گیا ہے

کہہ دیا کہ خدا کی محکومی اختیار کی جاتی ہے۔ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۸)۔ اس کتاب کے ذریعے جس کی تم تعلیم و تدریس کرتے ہو"۔ سورۃ نمل میں واضح الفاظ میں بتادیا کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ اِنَّمَا اُمِرْتُ ..... اَنْ اَتْلُوَ الْقُرْآنَ ... (۲۷/۹۲) "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کی تلاوت* کروں"۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے

(i) کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اور
(ii) اسے جو کچھ حرام قرار دینا تھا اسے قرآن میں بتا دیا ہے۔

یہ تو رہا اس موضوع کا مثبت پہلو۔ یعنی کسی شے کو حرام قرار دینے کی اتھارٹی کون ہے؟ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اس حقیقت کو کس طرح واضح کیا ہے کہ یہ اتھارٹی خدا کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔

ہم سورۃ اعراف کی وہ آیت پہلے درج کر چکے ہیں جس میں پوری تحدّی سے کہا گیا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲) "ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زینت کی اشیاء کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور خوشگوار سامانِ رزق کو حرام قرار دیتا ہے؟" اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے علاوہ اور کسی کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دیدے۔ اس بارے میں، اور تو اور، خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ..
.... (۶۶/۱)

اے نبی جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے،
تو اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے؟

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ وہ کیا چیز (یا بات) تھی جسے نبی اکرمؐ نے اپنے اوپر ممنوع قرار دے لیا تھا (اس لئے کہ یہ گوشہ ہمارے زیرِ نظر موضوع سے خارج ہے)۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حق نبی اکرمؐ کو بھی نہیں دیا کہ، دوسرے انسانوں پر کسی چیز کو حرام قرار دینا تو ایک طرف، خود اپنی ذات پر بھی کسی ایسی شے کو ممنوع قرار دے لیں جسے اللہ نے حلال قرار دیا تھا۔

*تلاوت کے معنی پیروی کرنے کے بھی ہیں۔

اس مقام پر ضمناً ایک نقطہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں حلال اشیاء کے ساتھ طَیِّبًا کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں ہے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ..... (۲/۱۶۸) ''اے نوع انسانی! زمین کی پیداوار جو تم پر حلال کی گئی ہے۔ اسے طیّب انداز سے کھاؤ'' طیب کے معنی ہیں خوشگوار۔ پاکیزہ۔ مفید۔ نفیس۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر حلال شے کا کھانا تم پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے تم اپنے ذوق اور پسند کے مطابق جسے اچھا سمجھو کھاؤ۔ جو ناپسند ہوں انہیں مت کھاؤ۔ اس میں انفرادی ذوق، میلانِ طبع، طبی ضرورت اور دیگر تضمنات کی رعایت رکھ دی گئی ہے۔

لیکن نبی اکرمؐ کے بارے میں اس رعایت میں بھی خاص احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یہ اس لئے کہ (مثلاً) زید کسی ایسی چیز کو چھوڑ دیتا ہے جو اسے ناپسند ہے، اس کے فیصلے کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے۔ لیکن اگر نبی کسی ناپسندیدہ چیز کو چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح چھوڑ دیتا ہے گویا اس نے اسے اپنے اوپر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے لیا ہے، تو اس کے نتائج بہت دور رس ہوسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ حقیقت سے ناواقف، یا عقیدت مندی میں افراط کی طرف چلے جانے والے، یہ سمجھ کر کہ اُس چیز میں کوئی دینی قباحت ہوگی، اسے اپنے اوپر مستقلاً حرام قرار دے لیں اور اس طرح، بالواسطہ (Indirectly) ہی سہی، خدا کی حلال کردہ شے، لوگوں پر حرام قرار پا جائے۔ پہلی قوموں میں ایسا ہوچکا تھا۔ اس لئے نبی اکرمؐ کی توجہ اس طرف خاص طور پر مبذول کرائی گئی۔ قرآن میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے کسی شے کو اپنے لئے ممنوع قرار دے لیا۔ ان کا یہ فیصلہ محض انفرادی تھا۔ لیکن بنی اسرائیل نے اسے خدائی حکم سمجھ کر اس شے کو اپنے اوپر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے لیا۔ حتّٰی کہ جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے ان میں اس شے کا ذکر نہیں تو انہوں نے اس پر اعتراض کیا کہ جس چیز کو پہلے (ان کے غلط خیال کے مطابق) ''خدا نے حرام قرار دیا تھا''، اسے اب قرآن میں کیوں حلال قرار دیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ۔ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰی نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ (۳/۹۲) ''یہ تمام کھانے (جواب مسلمانوں کے لئے حلال قرار دئے گئے ہیں) بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھے سوائے اس کے جسے، تورات نازل ہونے سے پہلے، اسرائیل (یعقوبؑ) نے

اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا''۔ وہ چیز خدا کی طرف سے حرام قرار نہیں دی گئی تھی۔ حضرت یعقوبؑ نے اسے، (کسی وجہ سے) از خود اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا۔ یہودی یہ سمجھ بیٹھے کہ خدا کے نبی نے جو اسے اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا تو وہ خدا کی طرف سے حرام کی گئی ہوگی۔ اس واقعہ کے پیش نظر، اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ سے خاص طور پر کہہ دیا کہ آپ نے اس چیز کو محض ذاتی بے رغبتی یا کسی اور وجہ سے چھوڑ دیا اور اسے ایک معمولی بات سمجھا (عام حالات میں یہ بات ہے بھی معمولی سی) لیکن ہوسکتا ہے کہ (یہودیوں کی طرح) آپ کی امت کے افراط پسند لوگ اسے حرام کی فہرست میں داخل کرلیں۔ اسلئے آپ کے لئے ان معاملات میں خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

اس سے یہی واضح ہے کہ اگر نبی، اپنے ذاتی میلان یا مصلحت کی بنا پر کسی حلال شے سے مجتنب رہے تو اس کے اتباع میں اس شے کو حرام سمجھ لینا، صحیح نہیں۔ حرام وہی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہو۔

یہ بحث نامکمل رہ جائے گی اگر ہم اس کے ساتھ سورۃ اعراف کی اس آیت کو بھی سامنے نہ لائیں جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے انسان ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اُس سورت میں نبی اکرمؐ کی خصوصیات کبریٰ کے ضمن میں فرمایا کہ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (۷/۱۵۷) ''وہ ان کے لئے طیبات کو حلال قرار دے گا اور خبائث کو حرام ٹھہرائے گا''۔ اس آیت سے یہ استنباط کیا جاتا ہے کہ حلال و حرام قرار دینے کا اختیار نبی اکرمؐ کو بھی حاصل تھا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جب

(i) اللہ تعالیٰ قرآن کے متعدد مقامات میں یہ کہتا ہے کہ حلت و حرمت کا حق صرف خدا کو ہے اور

(ii) خود نبی اکرمؐ سے بہ نص صریح کہتا ہے کہ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ (۶۶/۱) ''جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے تو اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے''۔

تو اس کے بعد یہ سمجھنا بنیادی طور پر غلط ہے کہ حلت و حرمت کا اختیار نبی اکرمؐ کو بھی تھا۔ اصل یہ ہے کہ جو امور وحی کی رو سے بیان ہوئے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ انہیں کبھی اللہ کی طرف منسوب کردیتا ہے اور

کبھی رسول کی طرف (کیونکہ لوگوں تک وہ احکام رسول ہی کی وساطت سے پہنچتے تھے) اور مراد دونوں جگہ خدا کی وحی (یعنی قرآن کریم) ہوتا ہے، سورۃ بقرہ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے جہاں ایک جگہ کہا ہے کہ وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ ..... (۲/۸۹) "جب ان کی طرف اللہ کے ہاں سے ایک کتاب آئی جو ان باتوں کو سچ کر دکھانے والی تھی جو ان کے پاس تھیں"۔ اور دوسری جگہ ہے وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ (۲/۱۰۱) دیکھئے۔ الفاظ دونوں آیتوں میں وہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک جگہ کتاب ہے اور دوسری جگہ رسول۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک احکام و ہدایات کا تعلق ہے، خدا، وحی، کتاب، رسول۔ ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشے ہیں۔

اس بنیادی اصول کے بعد، اب آیت زیر نظر کو دیکھئے یہاں رسول کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (۷/۱۵۷) یعنی رسول ان کے لئے طیّبات کو حلال کرتا ہے اور خبائث کو حرام قرار دیتا ہے۔ لیکن سورۃ مائدہ میں ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ (۵/۸۷) "اے ایمان والو! جن طیبات کو اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے انہیں حرام مت کرو۔" یہاں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ طیبات کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے۔ (اسی) سورۃ اعراف میں ہے قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ ... (۷/۳۳) "اے رسول! ان سے کہہ دے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے رب نے تو صرف فواحش حرام کئے ہیں"۔ یہاں خود رسول اللہ ؐ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا ہے کہ کسی شے کو حرام قرار دینا خدا کا کام ہے۔ اسی طرح سورۃ بقرہ میں ہے وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا (۲/۲۷۵) اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربٰو کو حرام"۔

لہذا، قرآن نے جہاں حلت و حرمت کو رسول اللہ ؐ کی طرف منسوب کیا ہے اس سے بھی مراد خدا کی وحی ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔

اس سلسلہ میں سورۃ توبہ کی اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھ لینا بھی ضروری ہے جس میں کہا گیا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ ... (۹/۲۹)

(اھل کتاب میں سے) جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور اللہ اور اس کے رسول نے جسے حرام ٹھہرایا ہے اسے حرام نہیں سمجھتے۔ ان سے جنگ کرو۔

اس آیت سے بھی یہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ حرام قرار دینے کا اختیار اللہ اور اس کے رسول دونوں کو ہے۔ اس آیت میں "یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ" سے مراد حرام قرار دینا نہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے حرام کا لفظ کسی بات کو واجب اور لازم قرار دینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جن باتوں کو اللہ اور اس کا رسول واجب قرار دیتے ہیں (ان کے کرنے کا حکم دیتے ہیں) یہ انہیں اپنے اوپر واجب نہیں قرار دیتے۔ یہ لوگ اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے اس کے قوانین سے انحراف کرتے ہیں۔ ان سے جنگ کی جائے گی تا آنکہ یہ اپنی اس روش کو چھوڑ کر، اسلامی حکومت کی رعایا کی حیثیت سے رہنے پر رضا مند ہو جائیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(۱) حرام و حلال کا اختیار صرف خدا کو ہے۔

(۲) جن چیزوں کو یا امور کو خدا نے حرام قرار دینا تھا ان کی تصریح قرآن میں کر دی گئی ہے۔

(۳) خدا کے علاوہ یہ اختیار کسی اور کو نہیں۔

قرآن کریم نے اس بات کو سنگین جرم قرار دیا ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے (یعنی حرام نہیں ٹھیرایا) انہیں حرام قرار دیدیا جائے۔ اس نے تاکیداً کہہ دیا کہ

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (۵/۸۷)

اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں جنہیں اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے انہیں حرام مت ٹھہراؤ۔ اور (اس طرح) حد سے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یعنی حلال کو حرام قرار دینا ، انسان کا اپنے اختیارات کی حد سے آگے بڑھ جانا ہے ۔ اس لئے کہ جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی کو سلب کرے۔ دوسری جگہ اس سے بڑی زیادہ تاکید کے ساتھ کہا کہ

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلَالٌ وَهٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ...... (۱۶/۱۱۶)

اور جو تمہاری زبانیں یونہی جھوٹ بیان کر دیتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام تاکہ اللہ پر محض بہتان باندھو ۔ ایسی بات مت کیا کرو۔

یہاں قرآن کریم نے بتایا کہ جو مذہبی پیشوا حرام و حلال کی فہرستیں تیار کر کے بیٹھ جاتے ہیں دل سے وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ۔(یا وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے ایسے حرام قرار دیا ہے تو لوگ ایسے مانیں گے نہیں) اس لئے وہ یہ نہیں کہتے کہ ان چیزوں کو ہم نے حرام یا حلال ٹھیرایا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سب "شریعت خداوندی" کے مطابق ہے ۔ اس طرح یہ لوگ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو اس نے کبھی نہیں کہیں۔ یہ افتراء ہے ۔ کذب ہے۔ بہتان عظیم ہے ۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا قُلْ آللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ (۱۰/۵۹)

ان سے کہو کیا تم اس پر غور کرتے ہو کہ اللہ نے جو کچھ تمہارے لئے بطور رزق نازل کیا ہے ، تم اس میں سے کسی کو حرام قرار دیتے ہو کسی کو حلال ۔ ان سے پوچھو کہ کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دے رکھی ہے (کہ جسے چاہو حرام قرار دے دو اور جسے چاہو حلال کر دو) یا تم اللہ پر افترا باندھتے ہو۔

قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ اللہ نے کسی انسان کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خدا پر افتراء باندھتا ہے ۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے، کہ بعض (حلال) چیزیں یہودیوں پر بطور سزا حرام قرار دیدی گئی تھیں۔ سورۃ انعام میں ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ . . .
ذَالِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ . . . . . ($\frac{6}{147}$)

اور ہم نے یہودیوں پر سب ناخن والے جانور (پرندے) حرام قرار دیدئے تھے۔ اور گائے اور بکریوں کی چربی بھی حرام کر دی تھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ کے ساتھ یا انتڑیوں کے ساتھ یا ھڈی کے ساتھ لگی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے انہیں ان کی بغاوت کی سزا دی تھی۔

سورۂ نسآء میں ہے

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ . . . . ($\frac{4}{160}$)

یہودیوں کی زیادتی کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ خوشگوار چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں، حرام قرار دیدیں۔

(اس کے بعد ان کی ان زیادتیوں کی تفصیل دی گئی ہے جن کی سزا کے طور پر ان پر حلال چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں۔ سورۂ نحل میں کہا گیا ہے کہ یہ حکم خدا کی طرف سے ظلم نہیں تھا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا تھا جو اس سزا کے مستوجب قرار پا گئے ($\frac{16}{118}$)۔ اس سے ظاھر ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا انہیں حرام قرار دیدینا، لوگوں کو سزا دینا ہے۔ یہودیوں کو اس سزا سے نجات دلانے کے لئے حضرت عیسٰیؑ تشریف لائے۔ چنانچہ آپؑ نے ان سے کہا کہ میری بعثت کا مقصد یہ ہے

وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ . . . .
($\frac{3}{49}$) . . .

تاکہ جو چیزیں تم پر حرام قرار دیدی گئی ہیں ان میں سے بعض کو حلال قرار دوں۔

یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کی اور اسطرح اپنی سزا کی زنجیروں کو خود اپنے ھاتھوں سے مضبوط کرلیا۔ آپ کے بعد نبی اکرمؐ تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی بعثت کا مقصد بھی یہ بتایا کہ

وَ یُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ . . . . . (۷/۱۵۷)

وہ ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کریگا اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دے گا۔

لیکن انہوں نے قرآن کی بھی مخالفت کی اور اسطرح اپنی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑے رہنا پسند کیا جن میں وہ اب تک ماخوذ ھیں۔

اھل کتاب نے اپنے علماء اور مشائخ (احبار و رھبان) کے فتاویٰ کے مطابق حرام و حلال کی فہرستیں مرتب کر رکھی تھیں جن کے لئے خدا کی کوئی سند ان کے پاس نہیں تھی۔ باقی رہے مشرکین عرب، سو ان کے ھاں حرام و حلال کے متعلق کچھ باتیں وراثتاً چلی آتی تھیں، جو محض توھم پرستی پر مبنی تھیں۔ قرآن نے ان کی بھی مخالفت کی۔ مویشیوں میں سے فلاں حرام ہے۔ کھیتی میں سے یہ منع ہے۔ سواری کے جانوروں میں سے فلاں فلاں پر چڑھنا ناجائز ہے (۶/۱۳۹)۔ فلاں چیز مردوں کے لئے حلال ہے اور عورتوں کے لئے حرام (۶/۱۴۰)۔ اونٹنی اس قسم کا بچہ دے تو وہ حرام ہے، گائے کے فلاں فلاں بچے حرام ھیں (۶/۱۴۴)۔ ان سے کہا گیا کہ یہ سب فہرستیں تمہاری یا تمہارے آباؤ اجداد کی مرتب کردہ ھیں (۶/۱۳۹)۔ تم اللہ کی طرف ان کی نسبت یونہی کرتے ھو۔ (۶/۱۴۱)۔ اس کے بعد انہیں چیلنج دیا گیا اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ھو کہ یہ خدا کی طرف سے حرام کردہ ھیں تو اس دعوے کے ثبوت میں گواہ لاؤ (۶/۱۵۱)۔

ان تصریحات سے بھی واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے حرام و حلال کے لئے سند صرف حکم خداوندی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور سند اور کوئی اتھارٹی نہیں۔

کھانے پینے کے علاوہ، قرآن نے رشتے ناطے کے متعلق بھی بالتصریح بتا دیا ہے کہ کونسا حلال ہے اور کونسا حرام۔ سورہ نساء کی آیات ۲۲-۲۴ میں ان کی فہرست دی ہوئی ہے۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے حلت و حرمت کی پوزیشن جس سے واضح ہے کہ کسی چیز کے متعلق یہ کہنے کے لئے کہ وہ حرام ہے قرآن کریم کی سند پیش کی جانی ضروری ہے۔

آخر میں اتنا اور کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ ھو سکتا ہے کہ اسلامی نظام، کسی ھنگامی مصلحت یا ضرورت کے ماتحت، کسی شے کا استعمال

عارضی طور پر ممنوع قرار دے دے - مثلاً برسات (یا ہیضہ) کے زمانہ میں ہیلتھ اوفیسر حکم دیدیتا ہے کہ شہر میں امرود یا کھیرے کا استعمال ممنوع ہے - یا جنگ کے زمانے میں حکومت فیصلہ کر دیتی ہے کہ سول آبادی کے لئے فلاں چیز کا استعمال ممنوع ہے کیونکہ فوجی ضرورت شدید ہے - وقس علی ذالک - ہوسکتا ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نظام نے (نبی اکرم اور خلافت راشدہ کے زمانے میں) بعض چیزوں کے استعمال کو اسی طرح ممنوع قرار دیا ہو - لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کسی شے کے استعمال کو ممنوع قرار دینے ، اور کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے میں بنیادی فرق ہے - کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے کا اختیار خدا کے سوا کسی کو نہیں - (نیز دیکھئے عنوان ح-ل-ل اور ن-ع-م)

ح ر ی

اَلتَّحَرِّیْ - قصد کرنا - کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنا - کسی کام کو کرنے کا خصوصیت کے ساتھ ارادہ کرنا - تَحَرَّاهُ - اس نے اس کا ارادہ کیا - بعض نے کہا ہے کہ بہتر اور حق چیز کی طلب میں کوشش کرنے کو کہتے ہیں* - قرآن کریم میں ہے فَاُولٰٓئِکَ تَحَرَّوْا رَشَدًا (۷۲/۱۴) - "یہ لوگ ہیں جنہوں نے رشد وسعادت کے حصول کے لئے عزیمت مندانہ قصد کر لیا" -

ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) قرب و ارادہ (۲) حرارت اور (۳) لوٹ جانا یا کم ہوجانا لکھے ہیں - حِرَاء مکہ میں ایک پہاڑ تھا جس کے غار میں (کہا جاتا ہے کہ) حضور قبل از نبوت (رشد و ہدایت کی طلب صادق میں) جایا کرتے تھے* یہ صرف تاریخ کا بیان ہے - قرآن کریم میں اس کی صراحت نہیں - قرآن کریم یہی بتاتا ہے کہ قبل از نبوت حضور تلاش حقیقت میں سرگرداں رہتے تھے - دیکھئے عنوان ض - ل - ل)

ح ز ب

نیز اس کے معنی ورد ہیں یعنی تلاوت قرآن کریم وغیرہ کا ایک مقررہ حصہ*

اَلْحِزْبُ - پانی پر اترنے کی باری ؛ لوگوں کی جماعت ، فریق ، گروہ (اسکی جمع اَحْزَابٌ ہے) اس کے لئے شرط یہ ہے کہ ان کے دل اور اعمال ایک دوسرے سے ملتے ہوں - خواہ ویسے وہ ایک دوسرے سے کبھی ملے ہوں یا نہ ملے ہوں** - راغب

* تاج و راغب - ** تاج -

نے کہا ہے کہ اسکی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ان میں سختی اور شدت پائی جائے*۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے حِزْبُ اللّٰہِ (۲۲/۵۸) اور حِزْبُ الشَّیْطَانِ (۱۹/۵۸) دو گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ حِزْبُ اللّٰہِ سے مراد وہ لوگ ہیں جو قانونِ خداوندی پر نہایت سختی سے کاربند ہوں خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں ، اور حِزْبُ الشَّیْطَانِ وہ ہیں جو غیر خدائی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوں ، خواہ وہ کسی قوم اور کسی ملک سے متعلق ہوں۔ قرآن کریم، قوموں کی تشکیل، نظریۂ زیست یا نصب العین حیات کی بنیادوں پر کرتا ہے نہ کہ وطن ، نسل یا زبان وغیرہ کے اشتراک پر۔ سورۃ مومن میں اَحْزَاب (۳۰/۴۰) ان پارٹیوں کو کہا گیا ہے جنہوں نے خدا کے رسولوں کی مخالفت کی تھی۔ سورۃ احزاب میں اَلْاَحْزَابُ (۲۲/۳۳) ان پارٹیوں کو کہا گیا ہے جنہوں نے مل کر رسول اللہؐ کے خلاف جنگ کی تھی۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں پھر حالت یہ ہو جاتی ہے کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۲/۳۰)۔ ہر فرقہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ وہ حق پر ہے (اور باقی سب فرقے باطل پر ہیں)۔ قرآن کریم نے "کُلُّ حِزْبٍ" (تمام فرقے) کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ جب دین میں فرقے پیدا ہو جائیں تو پھر یہ سمجھنا غلط ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک فرقہ حق پر ہے اور باقی باطل پر۔ فرقوں کا تو وجود ہی قرآن کریم کی رو سے شرک ہے۔ (۳۲/۳۰)۔ جب تک الدین کا نظام (یعنی اسلامی مملکت کا نظام) قائم رہے ، فرقے پیدا نہیں ہوسکتے۔ جب وہ نظام باقی نہیں رہتا تو دین ' انفرادی چیز بن جاتا ہے جس میں فرقے پیدا ہونے لازمی ہیں۔ جب فرقے پیدا ہو جائیں تو انہیں مٹانے کی ایک ہی شکل ہے۔ یعنی اسلامی نظام مملکت کا قیام۔ اس کے سوا اس "شرک" سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

ح ز ن

حَزْنٌ۔ یہ ایک جامع لفظ ہے جو ہر اس غم و فکر اور پریشانی کے لئے بولا جاتا ہے جو انسان کو کسی وجہ سے لاحق ہو۔ اس میں معاشی پریشانی خاص طور پر شامل ہے چنانچہ حَزَانَةُ الرَّجُلِ۔ انسان کے وہ متعلقین (اھل وعیال) ہیں جن کی تکلیف سے اسے پریشانی ہوتی ہو اور وہ ان کے سامانِ زیست کا

* راغب۔

اهتمام کرے* ۔ تاج العروس میں ہے کہ سورۃ فاطر کی آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵/۳۴) ۔ میں حَزَنٌ کے معنے ہیں صبح اور شام کے کھانے کی فکر ۔ راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں لَا تَحْزَنْ یا لَا تَحْزَنُوْا کہا گیا ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ تم فکر مت کرو ، اسلئے کہ فکر پر انسان کو اختیار نہیں ہوتا ۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ تم ان اسباب کو مت پیدا ہونے دو جن سے حُزْنٌ پیدا ہوتا ہے* ۔ یہ چیز معاشی فارغ البالی اور مرفہ الحالی سے پیدا ہوگی کیونکہ حُزْنٌ کے معنے فکر معاش سے پیدا ہونے والی پریشانی کے ہیں ۔ نیز اَلْحَزْنُ ۔ سخت پتھریلی زمین کو کہتے اس کی ضد ''سَھْلٌ'' ہے* ۔ (غالباً اسلئے کہ اس میں اناج وغیرہ پیدا نہیں ہو سکتا) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں سختی ۔ شدت اور کھردرے پن کا پہلو ہوتا ہے ۔

خَافَ کے عنوان میں آپ دیکھینگے کہ خَوْفٌ اس پریشانی کو کہتے ہیں جو کسی متوقع خطرہ سے پیدا ہو (یعنے اس کا تعلق مستقبل میں واقع ہونے والے حادثہ سے ہوتا ہے) ۔ جب ان معانی کے مقابل میں حُزْنٌ کا استعمال ہو تو اس سے مراد وہ غم ہوتا ہے جو اس حادثہ کی وجہ سے ہو جو گزر چکا ہے ۔ کسی نقصان سے پہلے جو کیفیت ہوتی ہے وہ خَوْفٌ ہے ۔ اس نقصان (یا حادثہ کے واقع ہو جانے) کے بعد خوف ختم ہو جاتا ہے اور غم یا حزن شروع ہو جاتا ہے ۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا تَھِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۳/۱۳۸)۔ یہاں وَھْنٌ اور حُزْنٌ ۔ عظمت اور بلندی ۔ عروج و اقبال اور غلبہ و تمکن (علو) کے مقابلہ میں آیا ہے ۔

قصہء آدم میں ہے کہ جب آدم سے جنت کی زندگی چھن گئی تو اسکی بازیابی کیلئے اس سے کہا گیا کہ اگر تم وحی کے تابع زندگی بسر کروگے تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)۔ اس سے خوف اور حزن نہیں رہیگا ۔ جب یہ جنتی معاشرہ اس دنیا میں قائم ہوگا تو اسمیں (منجملہ دیگر اسباب اطمینان و آسائش) سامان معاش کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی ۔ یہ حُزْنٌ کے بنیادی معنے ہیں ۔ نیز جس جنت سے آدم نکلا تھا اس کی خصوصیت بھی یہ بتائی گئی ہے کہ اُس میں بھوک ۔ پیاس ۔ لباس اور مکان کیلئے کسی کو جگر پاش مشقت نہیں اٹھانی پڑتی

* تاج ۔

تھی اور نہ ھی کوئی اس سے محروم رھتا تھا - (۲۰/۱۱۸-۱۹) - اس سے بھی حُزْنٌ کا مفہوم واضح ھو جاتا ہے - (ان امور کی تفصیل کیلئے ا-د-م ، ش-ج-ر ، ج-ن-ن ، کے عنوانات دیکھئے) - بہرحال یہ ظاہر ہے کہ جو قوم خوف - بھوک - حزن وغیرہ کی پریشانیوں میں مبتلا ھو اُسے سمجھ لینا چاھئیے کہ وہ خدا کی طرف سے ملی ھوئی راہ نمائی کا اتباع نہیں کر رھی - قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی اور حتمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی یہاں کی زندگی بھی مرفہ الحالی اور سرفرازی کی ھو اور آخرت کی زندگی بھی کامیابی اور کامرانی کی زندگی-

سورۃ یوسف میں حُزْنٌ کے معنے اس غم کے آئے ھیں جو کسی گزرے ھوئے واقعہ سے پیدا ھو (۱۲/۸۴) - اور لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ (۱۵/۸۸) - کے معنے ھیں ان پر غم نہ کھا - تَحَزَّنَ عَلَيْهِ کے معنے ھیں وہ اس پر درد مند ھوا *-

ح س ب

حَسَبَ يَحْسُبُ حُسْبَانًا و حِسَابًا - گننا - شمار کرنا - حَسِبَ يَحْسَبُ مَحْسَبَةً و حِسْبَانًا - خیال کرنا - گمان کرنا - حَسْبٌ - وہ جو کافی ھو - جو کفایت کرے - جسکے بعد کچھ اور ضرورت نہ رہے - حَاسِبٌ - حساب کرنے والا - حُسْبَانٌ - (حِسَابٌ کی جمع) - گنتی - شمار - حَسْبُكَ دِرْهَمٌ - تمہیں ایک درھم کافی ہے - حَسْبُنَا اللهُ (۹/۵۹)- ھمارے لئے اللہ (کا قانون) کافی ہے - اسکے ھوتے ھوئے ھمیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رھتی - وہ ھماری تمام ضروریات کو پورا کر دینے کیلئے کافی ہے - هٰذَا بِحَسَبِ ذَا - یہ اسکے مطابق یا اسکے بقدر ہے **-

حَسِيْبٌ - حساب کرنے والا - نگرانی کرنے والا - كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷/۱۴) - خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے مرتب شدہ نتائج کے ظہور کے وقت کسی خارجی شاھد اور محتسب کی ضرورت نہیں ھوتی - انسان کی اپنی ذات خود اپنے خلاف زندہ شاھد ھوتی ہے - بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ (۷۵/۱۴) اعمال کے جو اثرات اس پر مرتب ھوتے ھیں وہ اپنے منہ سے خود بول اٹھتے ھیں کہ اس نے کس قسم کے کام کئے تھے - ظہور نتائج کے وقت کو يَوْمُ الْحِسَابِ یا يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ (۱۴/۴۱) کہا ہے - یعنی ھر عمل کا نتیجہ تو اس کے ساتھ ھی مرتب ھونا

---

* محیط - ** تاج و محیط -

شروع ہوجاتا ہے ۔ لیکن اسکی نمود ایک خاص وقت پر جاکر ہوتی ہے ۔ جیسے درخت میں پھل تو اسوقت سے بننا شروع ہو جاتا ہے جب اس میں پہلا شگوفہ (بلکہ کونپل) پھوٹتی ہے لیکن وہ پھل کی شکل میں کچھ عرصہ بعد سامنے آتا ہے ۔ اسے ظہور نتائج کا وقت کہتے ہیں ۔

سورۃ انعام میں ہے وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا (۶/۹۶) ۔اسی کی تشریح دوسری جگہ ان الفاظ سے کر دی ۔ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ (۱۰/۵ ؛ ۱۷/۱۲) چاند اور سورج کو اسلئے بنایا تاکہ ان سے ماہ وسال وغیرہ کا حساب رکھا جا سکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کیلنڈر ، سورج کے حساب سے بھی رکھا جا سکتا ہے ۔ قمری اور شمسی میں سے جو زیادہ آسان اور ملی مفاد کے مطابق ہو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے ۔

سورۃ کہف میں ہے وَ يُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِنَ السَّمَاءِ (۱۸/۴۰) ۔ وہ کھیتی پر آسمان سے حُسْبَان بھیجدے ۔ یہاں حُسْبَان کے معنے عام طور پر بلا کے لئے جاتے ہیں ۔ یعنے کوئی آفت سماوی جس سے کھیتی تباہ و برباد ہو جائے ۔ مثلاً بارش کا طوفان ۔ آندھی ۔ جھکڑ ۔ یا ژالہ باری ۔ یا ٹڈی دل وغیرہ* ۔ لیکن (لغت حمیر میں) اسکے معنے سخت سردی کے آتے ہیں** ۔ ابن فارس نے اس کے معنی ٹڈی اور اولے دونوں لکھے ہیں ۔

اِحْتَسَبَ ۔ کے معنی گمان کرنا یا خیال کرنا ہیں*** ۔ سورۃ طلاق میں ہے ۔ وَ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (۶۵/۳) ۔ خدا کا قانون اسے ایسے مقامات سے رزق پہنچاتا ہے جو اسکے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں ۔

سورۃ بقرۃ میں ہے وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲/۲۱۲) ۔ ''جو ایسا چاہتا ہے اسے اللہ بغیر حساب رزق دیتا ہے'' ۔ راغب نے اسکے مختلف معانی لکھے ہیں ۔ ان میں ایک یہ بھی ہیں کہ وہ اُسے دیتا ہے لیکن اُس سے لیتا نہیں ۔ یا لوگوں کے عام اندازے اور شمار کے مطابق نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ دیتا ہے**** ۔ جب معاشرہ خدا کے قانون کے مطابق متشکل ہوجائے تو اس میں رزق کی فراوانیاں عام اندازوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں ۔

ح س د

حَسَدٌ ۔ کے اصلی معنے چھیلنے کے ہیں ۔ الحَسَدُ ۔ وہ ذہنیت جسکی رو سے تمنا کی جاتی ہے کہ دوسرے کے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے چھن کر

* تاج ۔ ** غریب القرآن ۔ مرزا ابوالفضل ۔ *** محیط ۔ **** راغب ۔

مجھے مل جائے ، اور اگر مجھے نہ بھی ملے تو کم از کم اس سے ضرور چھن جائے ۔ غِبْطَۃٌ یہ ہے کہ ایسی چیز اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی مل جائے (اسے رشک کہتے ہیں)* ۔ راغب نے اس پر اتنا اضافہ کیا ہے کہ اس میں اس مقصد کے لئے کوشش کرنا بھی شامل ہوتا ہے ۔

سورۃ بقرۃ میں ہے کہ یہ مخالفین حَسَد کی وجہ سے اسکی انتقامی آرزو کرتے ہیں کہ تم ایمان کو چھوڑ کر پھر سے کفر اختیار کر لو ۔ یعنے ایمان کے خوشگوار نتائج تم سے ضرور چھن جائیں خواہ اس سے ان کا اپنا کچھ بھلا ہو یا نہو ($\frac{۲}{۱۰۹}$) ۔

قرآن کریم نے حَسَد کو بڑی تخریبی ذہنیت قرار دیا ہے اور اس سے، اور ایسی ذہنیت رکھنے والوں کی تخریبی کوششوں سے بچنے کی تاکید کی ہے ($\frac{۱۱۳}{۵}$) یہ بچاؤ ، قانونِ خداوندی کے ساتھ گہرے تمسک (تَعَوُّذ) سے حاصل ہو سکتا ہے ۔

ح س ر

حَسَرَ ۔ یَحْسِرُ کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کو کھول دینا ۔ چھیل دینا ۔ کھال اتار دینا ۔ اَلتَّحْسِیْرُ کے معنے ہیں پرندے کے بال و پر گرجانا* ۔ یہاں سے اسکے معنے عاجز و درماندہ ہو جانے کے آتے ہیں ۔ حَسَرَ الْبَعِیْرَ ۔ اونٹ کو اتنا چلایا کہ وہ تھک کر عاجز و درماندہ ہو گیا ۔ اسی بنا پر اَلْحَسْرَۃُ اس کیفیت کو کہتے ہیں جس میں انسان کی حالت تھکے ماندے اونٹ کی سی ہو جائے ۔ اس میں عجز و ندامت دونوں پائے جاتے ہیں ۔ نیز غم و تاسف بھی* ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلْحَسْرَۃُ کے معنے ہیں کسی چیز کے فوت ہو جانے پر غم اور شرمندگی کی حالت ۔ گویا اس شخص سے اب وہ جہالت دور ہو گئی ہے جسکی وجہ سے اس نے یہ کام کیا تھا ، اب انکشاف حقیقت ہو گیا ہے** ۔ اسی لئے صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس مادہ کے اصلی معنے کَشْفٌ کے ہیں*** ۔ (یعنے کھول دینا) ۔ حَسَرَ الْبَحْرُ عَنِ السَّاحِلِ کے معنے ہیں دریا ساحل سے پیچھے ہٹ گیا اور پانی کے نیچے جو زمین تھی وہ کھل کر سامنے آگئی* ۔ اس میں عجز اور کشف کے دونوں پہلو ہیں ۔ سورۃ بقرۃ میں ہے یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَیْهِمْ ($\frac{۲}{۱۶۷}$) ۔ اللہ ان کے اعمال کو بے نقاب کر کے انہیں دکھا دیگا اور اس انکشاف حقیقت سے ان پر بری طرح عجز و درماندگی چھا جائیگی ۔ حَسَرَتِ الْبَیْتُ کے معنی ہیں

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔

میں نے گھر میں جھاڑو دی اور اَلْمِحْسَرَۃُ ۔ جھاڑو کو کہتے ھیں**۔ اس اعتبار سے مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ بھی ھو سکتا ھے کہ ان کے اعمال یکسر بے نتیجہ ھو کر رہ گئے ۔ ان کے کئے کرائے پر جھاڑو پھر گئی۔

سورۃ انبیاء میں لَا یَسْتَحْسِرُوْنَ (۲۱/۱۹) آیا ھے جسکے معنے تھک جانے کے ھیں ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (۱۷/۲۹) آیا ھے ۔ یعنے درماندہ ۔ ایسی حالت جس میں تمہارے پاس کچھ باقی نہ رھے ، سب کچھ صاف ھو جائے اور تم کو اپنے کئے پر پشیمانی ھو ۔ اور (۶۷/۴) میں حَسِیْرٌ آیا ھے ۔ یعنے تھکی ماندی ۔

اَلتَّحَاسِیْرُ ۔ بلاؤں اور مصیبتوں کو کہتے ھیں ۔ حَسْرَۃٌ کے معنے سخت افسوس و ندامت اور ھاتھ سے نکل جانے والی چیز پر غم کرنے کے ھیں**۔ یَا حَسْرَتٰی (۳۹/۵۶) ۔ وائے افسوس ۔

ح س س

اَلْحِسُّ ۔ حرکت ۔ خفی آواز (اس چیز کی جسے تم دیکھ نہ رھے ھو)۔ اَلْحَوَاسُّ اسی سے ھے ۔ اَحَسَّ ۔ محسوس کرنا ۔ آگاہ ھونا* ۔ راغب نے کہا ھے کہ جب کوئی چیز اسطرح نمایاں اور آشکارا ھو جائے کہ وہ با آسانی محسوس کی جا سکے تو اس وقت اَحَسَّ بولا جاتا ھے ۔ فَلَمَّآ اَحَسَّ (۳/۵۱) ۔ جب اس نے محسوس کیا ۔ تَحَسَّسَ ۔ کسی کا پتہ لگانا (۱۲/۸۷) ۔

حَسِیْسٌ ۔ ھلکی سی آواز ۔ آھٹ ۔ لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَھَا (۲۱/۱۰۲) ۔

اَلْحِسُّ ۔ سردی جو گھاس کو جلا دے ۔ حَوَاسُّ الْاَرْضِ ۔ سردی ۔ اولہ ۔ ھوا ۔ ٹڈی اور مویشی جو کھیتی پر تباھی لے آئیں ۔ اس سے اس کے معنے تباھی اور بربادی کے آتے ھیں ۔ چنانچہ اَلْحَاسُوْسُ قحط سالی کو کہتے ھیں* ۔ سورۃ آل عمران میں ھے اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ (۳/۱۵۱) ۔ "جب تم انہیں ھلاک اور برباد کر رھے تھے" ۔ ابن فارس نے اَلْحَسُّ کے معنے قتل کرنے کے بھی لکھے ھیں ۔

ح س م

حَسَمَہٗ ۔ یَحْسِمُہٗ ۔ اس نے اسے قطع کر دیا ۔ حَسَمَ الْعِرْقَ ۔ اس نے رگ کو کاٹ دیا ۔ اور اس پر لوھے سے داغ لگا دیا تاکہ اسکا خون نہ

---

* تاج ۔ ** محیط ۔

ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو اسکی جڑ سے کاٹ دینے کے ہیں ۔ اَلْحُسَامُ ۔ تیز کاٹنے والی تلوار ۔ اَلْحُسُوْمُ ۔ بدبختی ۔ ازہری نے کہا ہے کہ ہر اس چیز کو جو دوسری چیز کے بعد فوراً آ جاتی ہو حَاسِم* کہتے ہیں ، جسکی جمع حُسُوْمٌ* ہے ۔ لہذا اسکے معنے ہیں پے در پے اور مسلسل آنے والی چیزیں* ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْحَسْمُ کے معنے کسی چیز کے اثر کو مٹا دینے کے ہیں ۔ یعنی کسی چیز کو اس طرح تباہ کرنا کہ اس کا نشان تک مٹ جائے** ۔

قرآن کریم میں ہے کہ قوم عاد پر جو آندھی کا عذاب آیا تھا سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا (۶۹/۷) ۔ ''اس نے اس (آندھی) کو ان پر سات راتیں اور آٹھ دن چلائے رکھا'' (حُسُوْمًا کا ترجمہ نہیں کیا گیا) ۔ اس میں حُسُوْمًا کے معنے مسلسل کے بھی ہو سکتے ہیں ۔ لیکن عذاب کی شدت کے اعتبار سے یہ معنے زیادہ مناسب نظر آتے ہیں کہ وہ ایسی آندھی تھی جس نے اس قوم کے نام و نشان تک کو مٹا دیا ۔ یا ان کی جڑوں تک کو کاٹ کر رکھ دیا ۔

ح س ن

اَلْحُسْنُ ۔ صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ حسن سے مراد ہوتا ہے اعضاء کا صحیح صحیح تناسب اور توازن ۔ اور عرف عام میں حسین ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو نگاہ کو بھلی معلوم ہوں*** ۔ لہذا حُسْنٌ* کے بنیادی معنے ہیں تناسب و توازن کا قائم رہنا اور یہ سُوْءٌ* کی ضد ہے ۔ نیز اس کے مقابلہ میں فَسَادٌ* کا لفظ آیا ہے (۲۸/۷) جس کے معنی بگڑے ہوئے توازن کے ہیں ۔ لہذا اَلْاِحْسَانُ کے معنے ہوئے کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو ٹھیک کر دینا ۔ یعنے اگر کسی وجہ سے افراد معاشرہ میں سے کسی کی کسی قوت و صلاحیت میں کمی واقع ہو گئی ہے تو اس کمی کے پورا کر دینے کا نام اِحْسَانٌ* ہے ۔ (دیکھئے عنوان ع ۔ د ۔ ل جسمیں عَدْلٌ* و اِحْسَانٌ* کے متعلق تفصیلی گفتگو کی گئی ہے) ۔ راغب نے کہا ہے کہ احسان دو طرح ہوتا ہے ۔ ایک تو کسی دوسرے پر انعام کرنا (یعنے اسکی کمی کو پورا کرکے اسکا توازن درست کر دینا) ۔ اور دوسرے خود اپنے کاموں (سیرت و کردار) میں توازن پیدا کرنا ۔ اس میں حسن پیدا کرنا** ۔

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔

نیز راغب نے کہا ہے کہ عَدْل* تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے ذمہ ہو وہ دیدو اور جتنا تمہارا حق ہے وہ لے لو۔ اور اِحْسَان* یہ ہے کہ اس سے زیادہ دو جتنا تمہارے ذمہ ہے اور اس سے کم لو جتنا تمہارا حق ہے*۔ یعنی اِحْسَان* میں نگاہ واجب (Due) پر نہیں ہوتی بلکہ مقصد، توازن برقرار رکھنے سے ہوتا ہے۔ سورۃ قصص میں حضرت موسیٰ* کے متعلق ہے کہ جب وہ جوانی کو پہنچے وَاسْتَوٰی اور اسمیں ہر طرح کا اعتدال پیدا ہو گیا۔ تو ہم نے انہیں علم و حکم (قوت فیصلہ) عطا کیا۔ اسکے بعد ہے کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (۲۸/۱۴)۔ ہم اسطرح محسنین کو ان کے اعمال کا ثمرہ دیا کرتے ہیں۔ یہاں ظاہر ہے کہ مُحْسِنِیْنَ سے مراد اعتدال کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے ہیں۔

هُوَ یُحْسِنُ الشَّیْءَ اِحْسَاناً کے معنے ہیں وہ اس چیز کو اچھی طرح سے جانتا ہے*۔ سورۃ یوسف میں ہے کہ جب قید خانہ میں ان دو نوجوانوں نے حضرت یوسف* سے اپنا اپنا خواب بیان کیا اور آپ سے کہا کہ ان خوابوں کی تاویل بتائیے تو اسکے بعد ہے اِنَّا نَرٰکَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ (۱۲/۳۶)۔ یہاں مُحْسِنِیْنَ کے معنی ہیں وہ لوگ جو کسی بات کا اچھی طرح علم رکھتے ہوں*۔

قرآن کریم میں حَسَنَات* (بمقابلہ سَیِّئَات*) زندگی کی خوشگواریوں کیلئے آیا ہے (مثلاً ۳/۱۱۹ ؛ ۷/۱۳۱) سورۃ توبہ میں حَسَنَۃ* کے مقابلہ میں مُصِیْبَۃ* آیا ہے (۹/۵۰)۔ لہذا حَسَنَۃ* ہر وہ چیز ہے جس سے انسان کو آرام ملے۔ راحت و آسائش کا سامان۔ اور چونکہ سامان راحت و آسائش کی تکمیل مملکت و حکومت میں جا کر ہوتی ہے اسلئے بنی اسرائیل کی داستان کے سلسلہ میں کہا کہ ہم نے انہیں ارض فلسطین کے مشارق و مغارب کا وارث بنا دیا اور اسطرح تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی (۷/۱۳۷)۔ "تیرے نشو و نما دینے والے کے توازن بدوش قانون کی تکمیل (حسن کارانہ انداز سے) ہو گئی"۔ (حُسْنٰی مونث ہے اَحْسَنُ کا)۔ خدا کے اَسْمَاء کو الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی (۵۹/۲۴) کہا گیا ہے۔ اسلئے کہ خدا کی ذات وہ ہے جسمیں مختلف صفات اپنے پورے پورے تناسب و توازن کو لئے، انتہائی حسن کارانہ انداز سے یک جا جمع ہیں۔ جملہ صفات اور ان میں کامل تناسب۔ یہ ہے خدا کا تصور قرآن کریم کی رو سے۔ اور چونکہ انسانی زندگی کا مقصود یہ بتایا

* تاج۔

گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگ لے۔ (۲/۱۳۸) ۔ اسمائے خدا کا ''مقرب'' وہ ہے جسکی ذات (Personality) کی مختلف صلاحیتیں نشوونما حاصل کرتی جائیں، بایں نمط کہ ان میں پورا پورا توازن قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے کہ لِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا۔ (اسمائے خداوندی۔ صفاتِ الٰہیہ۔ پورا پورا توازن لئے ہوتی ہیں اسلئے خدا کو انہی کے مطابق پکارو۔ یعنی خدا کے متعلق وہی تصور درست ہے جو ان صفات کے مطابق قائم ہو۔ تو اسکے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ۔ (۷/۱۸۰) جو لوگ ان صفات میں سے کسی ایک میں بھی (توازن کی راہ چھوڑ کر) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں، تم ان سے الگ ہو جاؤ۔ لہذا خدا کی صفات کا اپنے اندر منعکس کرنا (یعنی انسانی ذات کے مضمر جوہروں کی نمود اور بالیدگی) ہی مقصود نہیں بلکہ ان میں حسن و توازن قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ جس زندگی میں حسن نہیں سمجھ لیجئے کہ وہ قرآنی قالب میں ڈھلی ہوئی نہیں ہے۔ زندگی کا مقصود یہ ہے کہ تم اپنے اندر کسقدر حسن پیدا کرتے ہو اور کائنات میں کسقدر حسن کا اضافہ کرتے ہو۔ خارجی دنیا میں اس اِحْسَانٌ (حسن پیدا کرنے) کی ابتدا اپنے رفقائے سفر (دوسرے افرادِ معاشرہ) کے ساتھ حسنِ معاملہ سے ہوتی ہے۔ اسکے لئے کہا ہے کہ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۲/۸۳) ۔ لوگوں سے ایسی باتیں کرو جن سے حسن پیدا ہو۔ اور اسکا عملی طریقہ یہ ہے کہ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اپنی محنت کے ماحصل کو ربوبیت عامہ کیلئے کھلا رکھو اور اسطرح اَحْسِنُوْا (۲/۱۹۵) معاشرہ میں حسن پیدا کرتے رہو۔ اسی کا دوسرا نام اِحْسَانٌ ہے (۲/۸۳) ۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم سے جو حسن پیدا کرنے (اِحْسَانٌ) کی تاکید کی گئی ہے تو اس کے متعلق یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ چیز کسی معاوضہ کی خاطر نہیں کی جائیگی۔ اس لئے کہ ھَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ* (۵۵/۶۰) ۔ حسن پیدا کرنے (احسان) کا بدلہ (یعنی نتیجہ) یہ ہے

* (ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہونا چاہئے یعنے کسی آدمی پر کوئی وقت آ پڑا۔ وہ دوسرے کے پاس مدد کے لئے گیا۔ اس نے اسکی مدد کی۔ یہ اسکا احسان ہوا۔ اب یہ دوسرا شخص اس انتظار میں رہے کہ کب اُس پہلے شخص پر کوئی مصیبت پڑے اور یہ اس کے احسان کا بدلہ اتارے۔ اور جب تک اُس کا بدلہ نہ اتارے اُس کا بے دام غلام بنا رہے۔ اگر اس نے اسکی کسی بات سے بھی اختلاف کیا تو اس نے جھٹ کہہ دیا کہ یہ کسقدر احسان فراموش ہے؟ یہ ہے احسان سے مراد ہمارے معاشرے میں۔ اور وہ ہے احسان کا مفہوم قرآن کی رو سے ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا!)

کہ اس سے حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی مقصود بالذات ہے۔ یعنی احسان کا بدلہ یہ ہے کہ تم احسان کرتے جاؤ اور اس کے معاوضہ کا دل میں خیال تک بھی نہ لاؤ۔ اس لئے کہ مومنین کا شعار یہ ہے کہ وہ جب کسی کے ساتھ احسان کرتے ہیں تو ان سے برملا کہہ دیتے ہیں کہ "لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا (۷۶/۹)"۔ "ہم تم سے نہ کوئی معاوضہ چاہتے ہیں نہ شکریہ کے متمنی ہیں۔ لہذا قرآنی تعلیم کا مقصود یہ ہے کہ انسان حسن پیدا کرے۔ خود اپنی ذات میں۔ دوسرے انسانوں میں اور خارجی کائنات میں۔ (Make it more Beautiful) ۔ یہ چیز اپنا بدلہ آپ ہوگی اسی بنا پر قرآن کریم نے کہا ہے کہ جہاں دیکھو کہ توازن بگڑ گیا ہے، اُسے درست کر دو۔ اسکے درست کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہاں حسن پیدا کر دو (توازن قائم کر دو) اس سے بگاڑ خود بخود دور ہو جائیگا۔ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ (۲۳/۹۶)۔ پہلے خود اپنا جائزہ لو۔ اگر تمہاری ذات متوازن (Balanced Personality) نہیں تو اس میں احسان (توازن پیدا کرنے) کی کوشش کرو۔ اسکے بعد جب کسی دوسرے شخص کو دیکھو کہ وہ اپنا توازن کھو رہا ہے تو اس سے احسان کرو۔ یعنی اسکا توازن قائم کرنے کی کوشش کرو۔ جب معاشرہ کا توازن بگڑ جائے تو معاشرے میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ اس طرح خارجی کائنات میں علم و تحقیق کی رو سے حسین اضافے کرتے جاؤ۔ تمہاری یہ کوششیں اپنا بدلہ آپ ہونگی۔ حسن پیدا کرنے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حسن پیدا ہو جائیگا۔ یعنی بگڑا ہوا توازن قائم ہو جائیگا۔ زندگی کا یہی مقصود ہے۔ یعنی تخلیقِ حسن۔ اور خدا کی ذات وہ ہے جس میں حسن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔ (اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی)۔ اس لئے انسانی ذات کی صحیح صحیح نشو و نما اور تکمیل کے لئے خارجی معیار (Objective Standard) خدا کی ذات ہے جس کا تعارف قرآن کریم نے کرایا ہے۔

ح ش ر

اَلْحَشْرُ۔ (لوگوں کو) جمع کرکے ہانک کر کسی طرف لیجانا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہانکنا، اٹھانا۔ اٹھ کھڑا ہونا اور چل پڑنا ہیں، اہل لغت اَلْحَشْرُ کے معنے اکٹھا کرنا اور ہانکنا کرتے ہیں۔ اَلْمَحْشَرُ (ش کو زیر اور زبر کے ساتھ) جمع ہونے کی جگہ*۔ محیط

* تاج۔

میں ہے کہ عوام اس لفظ کو ہجوم اور ایک دوسرے کے لئے تنگی پیدا کرنے کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں**۔ یعنے ایسا ہجوم (اجتماع) جو دوسروں کیلئے مشکل اور تنگی پیدا کرنے کیلئے کیا جائے ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ جنگ کے اجتماع کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے ۔ مثلاً وَ حُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ (۲۷/۱۷) ''سلیمان کے حکم کے مطابق اسکے لشکر جمع کرکے لیجائے گئے''۔ اور یہودیوں کے متعلق سورۃ حشر میں ہے هُوَ الَّذِیْ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۔ (۵۹/۲) ''اللہ وہ ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے سرکشی اختیار کی ، پہلے حشر، کے لئے ان کے گھروں سے نکالا''۔ اس سے بھی مراد جنگ کا اجتماع ہے ۔ یا جلاوطنی جو اسکا نتیجہ تھی ۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ ان مخالفین سے کہدو کہ سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ (۳/۱۱) ''تم بہت جلد مغلوب ہوگے اور تباہی کے میدان میں جمع کرکے جہنم کیطرف لے جائے جاؤگے ۔ اس سے اگلی آیت میں اس جنگ کی تفصیل درج ہے۔ سورۃ شعراء میں فرعون کے متعلق ہے کہ اس نے مختلف شہروں میں حَاشِرِيْنَ بھیجے (۲۶/۳۶)۔ یعنی ہرکارے جو لوگوں کو جمع کرکے لائیں ۔

اَلْحَشْرُ کے معنے دھار تیز کرنے نیز جمع کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے بھی آتے ہیں ۔ جیسے قحط سالی لوگوں کو دیہات سے نکال کر شہروں کی طرف لے آتی ہے*۔ اَلْحَشَرَةُ کے معنے ہیں شکار یا کھایا جانے والا شکار نیز کیڑا مکوڑا اس سے جمع حَشَرَاتٌ کیڑوں مکوڑوں اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کے لئے بولا جاتا ہے* ۔ لغت یمن میں اسکے معنے بھوسی کے بھی ہیں*۔

اَلْحَشْرُ ۔ موت کو کہتے ہیں ۔ نیز کان کا لطیف اور باریک حصہ*۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے وَ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴) ''اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائینگے''۔ اسکے معنے اعمال کا بدنہ دینے کے ہیں جو نہایت لطیف انداز سے واقع ہوتا ہے ۔ یعنے اعمال کے اثرات و نتائج نہایت لطیف انداز سے مرتب ہوتے رہتے ہیں ۔

مَحْشُوْرَةٌ ۔ اکٹھا کئے ہوئے ۔ (۳۸/۱۹) ۔ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ (۵۰/۴۴) ۔ ''یہ اکٹھا کرنا ہمارے لئے آسان ہے''۔ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ (۴۶/۶) ''جب لوگ اکٹھے کئے جائینگے'' ۔ ان مقامات میں جمع کرنے کے ساتھ ، آگے لے جانے کا مفہوم بھی پیش نظر رکھنا چاہئے ۔

---

* تاج ۔ ** محیط ۔

ہمارے ہاں حَشْرٌ سے مراد صرف مرنے کے بعد (قیامت کے دن) حساب کتاب کے لئے جمع ہونا لیا جاتا ہے۔ (جیسا کہ آخرت۔ قیامت۔ ساعت۔ بعث وغیرہ کے تحت لکھا گیا ہے)۔ یہ قرآن کریم کی جامع اصطلاحات ہیں جن سے مفہوم صرف مرنے کے بعد جی اُٹھنا نہیں بلکہ اس دنیا میں قوموں کی نشاۃِ ثانیہ بھی ہے۔ چنانچہ حَشْرٌ کے متعلق شاہ ولی اللہؒ (حجۃ اللہ البالغہ۔ کتاب الفتن میں) کہتے ہیں کہ ''زبانِ شریعت میں حشر کے دو معنی ہیں۔ ایک لوگوں کا ملک شام میں جمع ہونا، قیامت سے پیشتر یہ واقعہ اُس وقت ہوگا جب زمین پر لوگوں کی قلت ہو جائیگی تو بعض لوگ مختلف تقریبوں کی وجہ سے اور بعض لوگ آگ (غالباً جنگ سے مراد ہے) کی وجہ سے وہاں جمع ہونگے۔ دوسرے حشر کے معنی ہیں موت کے بعد زندہ ہونا''۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ الفاظ آئیں متن کے اعتبار سے دیکھ لینا چاہئے کہ وہاں مراد مرنے کے بعد کی زندگی ہے یا اس دنیا میں انقلاب آفرینی۔

ح ص ب

اَلْحَصَبَۃُ۔ کنکری۔ پتھر۔ اَلْحَصَبُ۔ ایندھن۔ جو کچھ آگ میں ڈالا جائے تاکہ وہ جلے اور اس سے آگ میں اضافہ ہو اور وہ تیز بھڑکے۔ لکڑی کو بھی حَصَبٌ اس وقت کہہ سکتے ہیں جب اس سے آگ کو بھڑکایا اور روشن کیا جائے۔ اَلْحَاصِبُ۔ وہ تیز ہوا (آندھی کا جھکڑ) جو مٹی۔ غبار اور کنکریاں اڑائے*۔ قرآن کریم میں ہے یُرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِباً (۱۷/۶۸)۔ تم پر کنکر برسانے والی آندھی بھیج دے۔ سورۃ انبیاء میں ہے اِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَہَنَّمَ (۲۱/۹۹) ''تم اور تمہارے وہ معبود جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں''۔ یہاں حَصَبٌ کے معنے ایندھن کے ہیں۔ قوم لوط پر آتش فشاں پہاڑ سے جو شعلہ آمیز آندھی چلی تھی اسے بھی حَاصِباً کہا گیا ہے (۵۴/۳۴)۔ اس میں پتھروں کی کنکریاں اور آگ کی حرارت دونوں کا امتزاج ہے۔

ح ص د

حَصَدَ۔ کھیتی یا پودوں کو درانتی سے کاٹنا**۔ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْہُ فِیْ سُنْۢبُلِہٖ (۱۲/۴۷)۔ ''جو کھیتی تم کاٹو اسے اسکے خوشوں ہی

* تاج و محیط۔ ** تاج

میں رهنے دو''۔ حَصَادٌ۔ کھیتی کاٹنا (٦/١٢٢) یا کھیتی کاٹنے کا وقت۔ اَلْحَصِیْدُ۔ کاٹی ہوئی کھیتی (١٠/٢٤) قرآن کریم نے ہلاک شدہ قوموں کے متعلق کہا ہے کہ جَعَلْنٰهُمْ حَصِیْدًا خَامِدِیْنَ (٢١/١٥) ''انہیں ہم نے کٹے ہوئے کھیت کی طرح بے حس وحرکت اور خاموش کر دیا۔ انہیں نشوونما کی صلاحیت کو ختم کر دیا'' بربادی اور زندگی کی حرارت سے محرومی کا کیسا عبرت انگیز نقشہ ہے!

ح ص ر

اَلْحَصْرُ۔ روک دینا۔ قید کرنا۔ تنگی پیدا کر دینا*۔ راغب نے لکھا ہے حَصْرٌ اور اِحْصَارٌ اُس وقت بولتے ہیں جب رکاوٹ کی وجہ کوئی ظاہری سبب ہو (جیسے دشمن نے روک دیا ہو) یا باطنی سبب ہو (جیسے بیماری رکاوٹ پیدا کردے) لیکن جب رکاوٹ صرف باطنی سبب سے ہو تو اس موقع پر حَصْرٌ ہی کہتے ہیں**۔ سورۃ نساء میں ہے اَوْجَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ (٤/٩٠)۔ ''یا وہ تمہارے پاس آئیں اس حالت میں کہ ان کے سینے بھنچے ہوئے اور دل تنگ ہوں''۔ حَصِیْرٌ (١٧/٨) قید خانہ کو بھی کہتے ہیں اور تنگدل شخص کو بھی۔ نیز وہ بخیل آدمی جو بخل کی وجہ سے شراب نہ پیے*۔

اَلْحَصُوْرُ (٣/٣٨) رکنے والا۔ بالخصوص وہ شخص جو عورتوں کے پاس جانے سے رکا رہے*۔ نیز حَصُوْر اس شخص کو بھی کہہ سکتے ہیں جو اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو اور اپنی نفسانی خواہشات کو لگام دے سکتا ہو۔ مُحَاصَرَةٌ۔ دشمن کو چاروں طرف سے گھیر کر روک لینا۔ حَصَرَ الْقَوْمُ بِفُلَانٍ۔ قوم نے فلاں کو گھیر لیا*۔

سورۃ بقرہ میں اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کی تفسیر لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ (٢/٢٧٣)۔ نے کردی۔ یعنی جو اسطرح روک لئے جائیں کہ نقل و حرکت کی استطاعت نہ رکھیں۔ ان کی نقل و حرکت پر پابندی لگا دی جائے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں جَهَنَّمَ کو حَصِیْرًا کہا گیا ہے۔ (١٧/٨)۔ یعنے وہ مقام جہاں کسی کی نشو و نما (Development) رک جائے۔ جہاں کسی کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔ (جہنم کے صحیح مفہوم کیلئے دیکھئے عنوان جَهَنَّم اور ج - ح - م)

* تاج۔ ** راغب۔

ح ص ص (ح ص ح ص)

اَلْحَصُّ ۔ بالوں کو مونڈ دینا ۔ (تا کہ سر صاف ہو جائے)۔ اَلْحَصَّاءُ مِنَ الرِّیَاحِ ۔ صاف ہوا جس میں گرد و غبار نہ ہو۔ حَصْحَصَ الشَّیْءُ حَصْحَصًا وَحَصْحَصَ*** ۔ چیز ظاہر ہو گئی ۔ واضح ہو گئی (جو چیز پہلے چھپی ہوئی ہو اور پھر واضح ہو جائے اس کے متعلق کہتے ہیں*۔

سورہ یوسف میں ہے اَلْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ (۱۲/۵۱)۔ "اب حقیقت واضح ہو گئی"۔ اب اصل بات بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی۔ لیکن صاحب محیط نے بیضاوی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ حَصْحَصَ الْبَعِیْرُ سے ہے جس کے معنے ہوتے ہیں اونٹ نے بیٹھنے کے لئے اپنے سینہ اور گھٹنوں کو اچھی طرح زمین پر جمایا۔ اس لئے حَصْحَصَ الْحَقُّ کے معنے ہونگے حق ثابت اور برقرار ہو گیا**۔ حِصَّةٌ ۔ (حصہ) جو چیز اصل میں سے کاٹ کر الگ کر لی جائے۔ مجموعہ کا ایک ٹکڑا*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں (۱) حصہ اور (۲) واضح اور متمکن ہو جانا لکھا ہے۔ نیز کسی چیز کا ختم یا کم ہو جانا۔

ح ص ل

اَلْحَاصِلُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ ۔ کسی چیز میں سے جو کچھ باقی رہ جائے۔ اَلتَّحْصِیْلُ ۔ جو کچھ حاصل ہو جائے اسے الگ الگ کر دینا۔ دراصل تَحْصِیْلٌ کے معنے چھلکے سے مغز نکالنا ہوتا ہے۔ مثلاً بھوسے سے گیہوں کے دانوں کو یا مٹی پتھر کو، الگ کرنا۔ تَحَصَّلَ الشَّیْءُ ۔ چیز جمع اور ثابت ہو گئی۔ اس سے اَلْحَوْصَلَةُ ۔ پرندے کے پوٹے کو کہتے ہیں*۔

قرآن کریم میں ہے وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ (۱۰۰/۱۰) جو کچھ سینوں میں (یا کہیں اور پوشیدہ) ہے اسے یوں الگ کر کے باہر نکال لیا جائے گا جیسے چھلکے سے مغز الگ کر لیتے ہیں۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ تَحْصِیْلٌ کے معنی سونے یا چاندی کو کان کی مٹی سے نکالنے کے ہیں۔

---

*تاج و راغب۔ ** محیط۔ *** حصحص رباعی ہے لیکن ہم نے اسے الگ لکھنے کی بجائے یہیں (ثلاثی میں) لکھدینا مناسب سمجھا ہے۔

ح ص ن

اَلْاِحْصَانُ کسی چیز کی حفاظت کرنا ۔ اسے محفوظ رکھنا ۔ یہ اس لفظ کے بنیادی معنے ھیں ۔ حَصُنَ اَلْمَکَانُ یَحْصُنُ ۔ جگہ کا محفوظ ہونا اس طرح کہ اس تک پہنچنے کی راہ نہ ہو ، ایسی محفوظ جگہ حَصِیْنٌ کہلائیگی ۔ حَصَّنَهٗ وَ اَحْصَنَهٗ اس نے اسے محفوظ کرد یا ۔ اَلْحِصْنُ ہر محفوظ مقام جسکے اندر تک رسائی نہ ہوسکے ۔ جمع حُصُوْنٌ ۔ (۵۹/۲) مُحَصَّنَةٍ ۔ محفوظ کی ہوئی (۵۹/۱۴) ۔ اَلْمِحْصَنُ ۔ قفل ۔ حفاظت کرنے کے معنوں میں سورۃ انبیاء میں ہے لِتُحْصِنَكُمْ (۲۱/۸۰) '' تاکہ وہ تمہیں محفوظ رکھے '' ۔

سورۃ یوسف میں بحفاظت ذخیرہ کی ہوئی گندم کیلئے ہے مِمَّا تُحْصِنُوْنَ (۱۲/۴۸) ۔ حفاظت کے اعتبار سے ، حَصَانٌ اس عورت کو کہتے ھیں جو پاکدامن ہو اور اپنی عفت کو محفوظ رکھتی ہو * ۔ (موتی کو بھی کہتے ہیں کہ وہ سیپ میں محفوظ ہوتا ہے) ۔ عورت کی پاکدامنی دو طریق پر ہوتی ہے ۔ ایک تو یہ کہ وہ غیر شادی شدہ ہو اور اپنی عفت کو محفوظ رکھے اور دوسرے یہ کہ وہ شادی کرکے (صرف ایک کی ہو جائے) اور اسطرح اسکی عصمت (غیروں کے ہاتھوں سے) محفوظ ہو جائے ۔ اس اعتبار سے پاکدامن عورت کو مُحْصِنٌ بھی کہتے ھیں اور مُحْصَنٌ بھی ۔ (یعنے بصیغہ فاعل اور بصیغہ مفعول دونوں طرح) ۔ راغب نے کہا ہے کہ مُحْصِنٌ (حفاظت کرنے والی) اسوقت کہتے ھیں جب وہ (غیر شادی شدہ حالت میں) اپنی عفت کی حفاظت آپ کرے ۔ اور مُحْصَنٌ ۔ (جس کی حفاظت کی جائے) جب اسکی عصمت کی حفاظت شادی کے ذریعہ سے ہو جائے ۔ چنانچہ اَلْمُحْصَنٰتُ ۔ شادی شدہ عورتوں کو کہتے ھیں ۔ اَحْصَنَ ۔ کے معنے ھیں شادی کرنا ۔ لیکن تاج العروس میں (جوھری اور ثعلب کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ پاکدامن عورت کے لئے مُحْصِنَةٌ اور مُحْصَنَةٌ ۔ دونوں الفاظ آتے ھیں ، لیکن شادی شدہ کیلئے صرف مُحْصَنَةٌ آتا ہے ۔ چنانچہ قرآن کریم میں پاکدامن عورتوں کیلئے اَلْمُحْصَنٰتُ آیا ہے (۴/۲۴) ۔ جسمیں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں شامل ھیں ۔ لہذا جہاں مُحْصَنَةٌ آئیگا ، وہاں سیاق و سباق کی رو سے دیکھنا ہوگا کہ اس سے مطلب غیر شادی شدہ پاکدامن عورت ہے یا شادی شدہ عورت ۔

---

* تاج و راغب و محیط

قرآن کریم میں یہ لفظ پاکدامن کے معنوں میں (۵/۵ ; ۲۴/۴ ; ۲۴/۲۳) میں آیا ہے ۔ سورۃ نساءؔ (۴/۲۵) میں یہ لفظ فَتَیٰت کے مقابلہ میں آیا ہے جہاں اسکے معنے آزاد عورتوں کے ھیں (بمقابلہ لونڈیوں کے) ۔ اسی سورۃ کی چوبیسویں آیت (۴/۲۴) میں جہاں یہ لفظ آیا ہے ، وھاں اسکے معنے ''پاکدامن'' بھی ھو سکتے ھیں اور ''شوھردار'' بھی ۔ پہلے معنوں کے اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ھوگا کہ تم پر تمام پاکدامن عورتیں حرام ھیں بجز ان کے جو تمہارے نکاح میں ھوں ۔ اور دوسرے معانی کے اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ھوگا کہ تم پر شوھر دار عورتیں حرام ھیں ، بجز ان لونڈیوں کے جو اس سے پہلے تمہاری ملک میں آ چکی ھوں (دیکھئے عنوان م۔ل۔ک) ۔ یا بجز شوھردار عورتوں کے جن کا استثناء (۶/۱۰) میں کیا گیا ہے ۔ ھمارے نزدیک یہاں شوھردار کا مفہوم زیادہ قرین قیاس ہے ۔

قرآن کریم نے مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کیلئے دو لفظ استعمال کئے ھیں ۔ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ (۴/۲۴) ۔ (سَفَحَ* کے تفصیلی معنے عنوان س۔ف۔ح کے تحت دیکھئے ۔ یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ اسکے معنے ھیں اپنے مادہ کو یوں ھی بہا دینا یا گرا دینا) یعنے اگر یہ اختلاط محض مادہ کو نکالنے کیلئے ہے (جسے شہوت رانی کہتے ھیں ۔ یعنے جنسی اشتعال کی تسکین ۔ زنا کا مقصد یہی ھوتا ہے) تو یہ ناجائز ہے ۔ اور اگر اس سے مقصد یہ ہے کہ اسطرح مادہ (استقرارِ حمل کی رو سے) محفوظ ھو جائے اور یونہی بہکر ضائع نہ چلا جائے ۔ تو یہ اختلاط جائز ہے ۔ اسے نکاح کہتے ھیں ۔ چنانچہ عربوں میں نِکَاح* کے مقابلہ میں لفظ سِفَاح* آتا تھا ۔ نیز ان کے ھاں تیروں سے جوؤا کھیلا کرتے تھے ۔ ھر تیر کسی خاص حصہ کیلئے ھوتا تھا ۔ لیکن ان میں ایک تیر خالی رکھا جاتا تھا جو محض خانہ پری کیلئے ھوتا تھا ۔ اسکا نہ کوئی حصہ ھوتا تھا نہ نتیجہ ۔ اس تیر کو اَلسَّفِيْحُ کہتے تھے * ۔ اس سے بھی واضح ھو جاتا ہے کہ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ کے معنے کیا ھیں ۔ اَلْمَسْفُوْحُ مِنَ الزَّرْعِ ۔ اس کھیتی کو کہتے تھے جسکے پتے شدت سردی سے زرد پڑجائیں ۔ دانے مرجھا کر پتلے ھوجائیں ۔ بالیں سیاہ پڑ جائیں ۔ اور انکے پرت گر پڑیں ** ۔ اسطرح ساری کھیتی ضائع ھو جائے ۔ اس سے بھی واضح ھو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے جنسی اختلاط کا منشا کیا ہے ۔ اسی لئے اس نے عورتوں کو حَرْث* (کھیتی) کہا ہے ۔ (۲/۲۲۳) ۔ یعنے مرد اور عورت کا جنسی اختلاط بطریق

* تاج ۔ **محیط ۔

مُحْصِنِيْنَ ہونا چاہئے ۔ یعنی ذمہ داریوں کی حفاظت کی غرض سے جو نکاح کے ذریعہ ایک دوسرے پر عائد ہوتی ہیں اور جسکا منشاء تحفظ اور بقائے نسل انسانی ہے ، نہ کہ محض جنسی تسکین کی خاطر۔ "خالی تیر چلانے" کیلئے۔ "وقتی نکاح" بھی سَفْحٌ ہی ہوتا ہے نہ کہ اِحْصَانٌ ۔ (نیز دیکھئے عنوان خ ۔ د ۔ ن)

(مردوں اور عورتوں کے جنسی اختلاط کے حدود و ضوابط کا قوموں کے تمدن اور کلچر سے کسقدر گہرا تعلق ہے ، اس کے لئے میری کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" ملاحظہ کیجئے) ۔

ح ص ی

اَلْحَصٰی ۔ چھوٹی چھوٹی کنکریاں ۔ سنگریزے ۔ چونکہ عرب ابتداءً چیزوں کی گنتی چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے کرتے تھے (جیسا کہ ہم انگلیوں سے گنتے ہیں) اس لئے اِحْصَاءٌ کے معنے گنتی کرنے (۱۴/۳۴) ۔ یا گنتی کر کے کسی چیز کو حاصل کر لینے اور احاطہ میں لے لینے کے ہوگئے * ۔

قرآن کریم میں ہے وَاَحْصٰی كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (۷۲/۲۸) ۔ "اس نے ہر چیز کو گن کر احاطہ میں لے رکھا ہے" ۔ یعنی اس میں گنتی اور اس کے بعد حفاظت سے حاصل کر لینے کے دونوں گوشے آجاتے ہیں ۔ جیسے سورۃ مزمل میں ہے عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ (۷۳/۲۰) ۔ "وہ جانتا ہے کہ تم پابندی کے ساتھ ایسا کرنے کی طاقت نہیں رکھ سکو گے" ۔ سورۃ کہف میں ہے اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْا اَمَدًا (۱۸/۱۲)" ان دونوں گروہوں میں سے کس نے اس عرصہ کا احاطہ کیا ہے" ، اور اس مدت کو شمار کر لیا ہے یا اسے اپنے ضبط اور کنٹرول میں رکھا ہے ۔ عموماً اس آیت میں اَحْصٰی افعل التفضیل سمجھا جاتا ہے لیکن ہمارے خیال میں بہتر یہ ہے کہ اسے فعل ماضی سمجھا جائے ۔ کشاف نے بھی یہی لکھا ہے ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنے روکنے کے لکھے ہیں ، نیز شمار کرنا اور بدقت کسی کام کی طاقت رکھنا ۔ اس سے بھی مطلب احاطہ کرنا اور ضبط کرنا ہیں ۔

ح ض ر

حَضَرَ ۔ يَحْضُرُ ۔ حُضُوْرًا ۔ حاضر ہونا ۔ موجود ہونا ۔ (غَابَ کی ضد ہے)۔ نیز حَاضِرٌ ۔ موجود ۔ اَحْضَرَ الشَّيْءَ ۔ چیز کو حاضر کر دیا** ۔

*تاج و راغب ۔ ** تاج

حَضَرَهٗ وَاحْضَرَہٗ واحْتَضَرَهٗ - اُسے حاضر و موجود کیا ، نیز اس کے پاس آیا اور پہنچا* ابن فارس نے اس مادہ کے معانی پہنچنا ، پہنچانا ، موجود ہونا بتائے ہیں - اس اعتبار سے الاِحْتِضَارُ دم مرگ کو کہتے ہیں جب موت حاضر ہو جاتی ہے - آیت (۲۳/۹۸) میں یَحْضُرُوْنِ کے معنے بتاتے ہوئے اس نے کہا ہے کہ بعض نے اس کے معنے ایذا پہنچانا اور برا کرنا بھی بتائے ہیں - اَلْحَضَارَۃُ - شہر میں اقامت کرنا - برخلاف بَدَاوَۃٌ کے، جس کے معنی دیہات میں سکونت اختیار کرنا ہیں - اَلْحَاضِرَۃُ - شہر ' بستیاں ' سرسبز آباد علاقے** -

قرآن کریم میں ہے اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ (۲/۱۳۳) ''جب یعقوبؑ کے سامنے موت آگئی'' - یعنی ان کے مرنے کا وقت آ گیا -

حَاضِرَۃَ الْبَحْرِ (۷/۱۶۳) دریا کے کنارے واقع ہونے والی - تِجَارَۃً حَاضِرَۃً (۲/۲۸۲) نقد تجارت - نقد سودا - مُحْضَرُوْنَ (۳۰/۱۶) حاضر کئے ہوئے، مبتلائے عذاب - مُحْتَضَرٌ (۵۴/۲۸) حاضر کیا ہوا - یعنی جس کی باری ہوگی اس کے لئے گھاٹ موجود ہوگا - کسی دوسرے نے اس پر قبضہ نہیں کیا ہوگا -

ح ض ض

اَلْحَضُّ - کسی کام پر برانگیختہ کرنا ، ابھارنا - خلیل کے نزدیک اَلْحَضُّ ہانکنے کے علاوہ دوسرے کاموں پر برانگیختہ کرنے کے لئے آتا ہے - (بحوالہ ابن فارس) حَضَّهٗ - یَحُضُّهٗ عَلٰی اَمْرٍ - کسی کو کسی کام پر ابھارنا - برانگیختہ کرنا - حَضِيْضٌ - نشیبی زمین کو کہتے ہیں*** - (کیونکہ اس طرف انسان تیزی سے چلا جاتا ہے) - اصل میں حَضٌّ کے معنے ہی جانور کو نشیب کی طرف ہانکنے کے ہوتے ہیں****- پھر اسکے معنے ابھارنے اور برانگیختہ کرنے کے آنے لگے -

قرآن کریم میں ہے وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (۶۹/۳۴) ''وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا'' - سورۃ فجر میں وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ (۸۹/۱۸) آیا ہے - ''وہ ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے'' - ایسا کرنے والے دین کی تکذیب کرتے ہیں - (۱۰۷/۱-۳) - آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رو سے دین اور معاشیات کا کتنا گہرا تعلق ہے !

* محیط - ** تاج - *** تاج و راغب - **** راغب -

ح ط ب

اَلْحَطَبُ ۔ وہ لکڑیاں جو آگ جلانے کے لئے درختوں سے کاٹی جاتی ہیں ۔ ایندھن (جب ان لکڑیوں میں آگ لگائی جائے تو پھر اس ایندھن کو وَقُوْدٌ کہا جائیگا)*** ۔ حَطَبَ یَحْطِبُ ۔ لکڑیاں جمع کرنا ۔ مَکَانٌ حَطِیْبٌ ۔ وہ جگہ جہاں بہت لکڑیاں ہوں ۔ ھُوَ حَاطِبُ لَیْلٍ ۔ وہ بری بھلی، کار آمد و بیکار، ہر قسم کی باتیں بیان کرتا ہے ۔ جیسے رات کے اندھیرے میں لکڑیاں چننے والا کبھی سانپ کو بھی لکڑی سمجھ کر اٹھا لیتا ہے* ۔ فُلَانٌ یَحْطِبُ عَلٰی فُلَانٍ ۔ فلاں آدمی فلاں کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتا ہے ۔ حَطِبَ فُلَانٌ بِصَاحِبِہٖ ۔ فلاں نے اپنے ساتھی کے خلاف چغلی کھائی** ۔

قرآن کریم میں حَطَبًا (۷۲/۱۵) ایندھن کے لئے آیا ہے ۔ اور ابو لہب کی بیوی کو حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ (۱۱۱/۴) کہا گیا ہے ۔ اس کے معنے چغلخور کے بھی ہوسکتے ہیں اور دشمنی کی آگ بھڑکانے کے بھی ۔ اس کا مفہوم ''لگائی بجھائی کرنے والی'' زیادہ موزوں نظر آتا ہے ۔ یا اسباب مخالفت میں اضافہ کرنے والی ۔

ح ط ط

اَلْحَطُّ ۔ اس مادہ کے اصلی معنے اوپر سے اتارنا اور نیچے رکھنا ہیں**** ۔ اَلْحَطُّ وَالْاِحْتِطَاطُ کے معنے ہیں سواری وغیرہ سے سامان اتار دینا ۔ حَطَّ فِیْ مَکَانٍ ۔ وہ کسی جگہ اتر گیا ۔ اَلْمَحَطُّ ۔ منزل، قیام گاہ ۔ حَطَّ الرَّجُلُ یَحُطُّ ۔ وہ آدمی اوپر سے نیچے کی طرف اترا ۔ اَلْحُطَائِطُ ۔ چھوٹے قد کا آدمی* ۔

سورۃ بقرہ میں جہاں بنی اسرائیل سے کہا گیا ہے کہ تم اب اس شہر میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہو جاؤ، وہاں ہے وَقُوْلُوْا حِطَّۃٌ (۲/۵۸) ۔ اسکے معنے یہ ہیں کہ تم اس شہر میں جا بسو، اور پھر یہ دعا کرو کہ اب ہماری دشت نوردی اور خانہ بدوشی کی زندگی ختم ہو جائے ۔ ہمارا رختِ سفر ہماری سواریوں سے اتر جائے اور ہم اس قیامگاہ میں آرام سے زندگی بسر کریں ۔

---

* تاج ۔ ** محیط و راغب ۔ *** لطائف اللغۃ ۔ **** محیط ۔

راغب نے کہا ہے کہ حِطَّۃٌ* کے معنے ہیں حُطَّ عَنَّا ذُنُوْبَنَا ۔ یعنی ہمارے گناہ ہم سے اُتار دے ۔ دور کردے* ۔ اسکا بھی مطلب یہی ہے کہ اب ہماری خطا معاف ہو اور صحرانوردی اور دشت پیمائی کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے ۔

ح ط م

اَلْحَطْمُ ۔ توڑ دینا ۔ خواہ کسی طریق سے بھی ہو ۔ خشک چیز جیسے ہڈی وغیرہ کو توڑ دینا ۔ اِنْحَطَمَ وہ چیز ٹوٹ گئی ۔ اَلْحِطْمَۃُ ۔ اَلْحُطَامَۃُ جو کچھ کسی چیز میں سے ٹوٹ جائے ۔ اَلْحَطِیْمُ ۔ وہ حصہ جو خانہ کعبہ کی عمارت سے الگ چھوڑا ہوا ہے ۔ اَلْحَطْمَۃُ ۔ سخت قحط کا سال ۔ اَلْحُطَمَۃُ ۔ کثیر تعداد میں اونٹ یا بکریاں جو زمین کے بالائی حصہ یا پودوں کو پامال کردیں ۔ سخت آگ جو ہر اس چیز کو جو اس میں ڈالی جائے بھسم کرکے رکھدے ۔ ایسا چرواہا جو اپنے جانوروں پر سخت ظلم کرے ۔

سورۃ نمل میں ہے لَا یَحْطِمَنَّکُمْ (۲۷/۱۸) "وہ کہیں تمہیں کچل نہ ڈالیں" ۔

سورۃ زمر میں ہے ثُمَّ یَجْعَلُہٗ حُطَامًا (۳۹/۲۱) پھر وہ اسے چورا چورا کر دیتا ہے ۔ کچلی ہوئی چیز کیطرح کر دیتا ہے ۔ سورۃ اَلْھُمَزَۃُ میں جہنم کیلئے اَلْحُطَمَۃُ آیا ہے (۱۰۴/۴) ۔ یعنی جس میں انسانیت کچلی جائے ۔

ح ظ ر

حَظَرَہُ الشَّیْءَ یَحْظُرُہٗ ۔ اس سے کسی چیز کو روک دینا ، بند کر دینا ، منع کر دینا ۔ جب کوئی شے تمہارے اور کسی دوسرے کے درمیان روک بن کر حائل ہوجائے تو کہتے ہیں حَظَرَہٗ عَلَیْکَ ۔ اَلْحَظِیْرَۃُ ۔ باڑ جو کھیت کے گرد لگادی جائے ۔ احاطہ ۔ کھجور کی شاخوں اور پتھروں سے ایک دائرہ سا بنا لیتے ہیں جس میں کجھوریں توڑ توڑ کر اکٹھی کرتے جاتے ہیں ۔ نیز اونٹوں وغیرہ کا باڑہ ۔ اَلْحِظَارُ ۔ دیوار کو بھی کہتے ہیں ۔

اَلْحَظِیْرُ ۔ بخیل کو بھی کہتےہیں کیونکہ وہ مال کو اپنے لئے روک رکھتا ہے اور نوع انسانی کیلئے کھلا نہیں رکھتا ۔ اَلْمَحْظُوْرُ ۔ روکا ہوا ۔ محروم ۔ جیسے کسی چیز کے لینے سے روک دیا ہو* ۔

---

* راغب ۔ * تاج و محیط و راغب ۔

قرآن کریم میں ہے کہ جہانتک خدا کے قانون طبعی کے ذریعہ دنیا کے مال و متاع سامنے کا تعلق ہے یہ ہر شخص کو اسکی کوشش کے مطابق مل سکتا ہے ۔ اس میں کافر و مومن ، کسی کی تمیز نہیں ۔ مَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷/۲۰) "خدا نے اپنی عطا کردہ نعمتوں پر کوئی احاطہ بندی نہیں کر رکھی"۔ اسے تمام نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کیلئے کھلا رکھا ہے ۔ لہذا انہیں اسی طرح کھلا رہنا چاہئے ۔ جو نظام ، خدا کے دیئے ہوئے رزق کے سرچشموں کو افراد کی ملکیتوں میں دیکر انہیں محظور کر دیتا ہے وہ خدا کے نظام رب العالمینی کی خلاف ورزی کرتا ہے ۔ اس لئے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا ۔ اسی کو يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۷) کہا گیا ہے ۔ یعنی جس رزق کو پانی کی طرح بہتا رہنا چاہئے تھا اسے بند لگا کر روک رکھنا ۔

سورۃ قمر میں قوم ثمود کی تباہی کے ضمن میں ہے فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ (۵۴/۳۱) ۔ وہ ایسے ہوگئے جیسے پرانی باڑ کا فرسودہ چورہ ہوتا ہے ۔ (ابن فارس) یا اس بھوسہ کی طرح ہوگئے جس کو رکھنے کیلئے باڑ بنانے والا باڑ بناتا ہے ۔

ح ظ ظ

اَلْحَظُّ ۔ نصیب ۔ مقررہ حصہ ۔ بخت ۔ اَحَظَّ فُلَانٌ ۔ فلاں شخص خوش بخت اور مالدار ہو گیا ۔ اَلْحَظِيْظُ ۔ خوش نصیب و آسودہ حال * ۔

قرآن کریم میں بہت بڑے نصیب والے (خوش بخت) کو ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ کہا گیا ہے (۴۱/۳۵) ۔ یہ وہ ہے جو برائی کو حسن کارانہ انداز سے دور کرتا اور جادۂ حق پر استقامت سے چلے جاتا ہے (۴۱/۳۴-۳۵) ۔

ح ف د

حَفَدَ ۔ يَحْفِدُ ۔ کام میں پھرتی اور جلدی کرنا ۔ خدمت کرنا ۔ اَلْحَفَدُ و الْحَفَدَةُ ۔ خدام و اعوان (حَافِدٌ کی جمع ہے) جو شخص کوئی کام کرے اور اس میں اطاعت اور تیزی دکھائے تو اسے حَافِدٌ کہتے ہیں * ۔ قرآن کریم میں ہے وَ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَ حَفَدَةً (۱۶/۷۲) "اس نے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے اولاد (بیٹے) پیدا کی ۔ اور خدمتگار بھی"۔ بعض نے کہا ہے کہ حِفَادُ الرَّجُلِ ۔ آدمی کی اولاد اور

---

* تاج ۔

اولاد در اولاد کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ نسبتی رشتہ داروں کو کہتے ہیں۔ بعض نے پوتے مراد لئے ہیں***۔ لیکن اکثریت اسی طرف گئی ہے کہ اس سے مراد خدمتگار ہی ہیں۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری بیویوں سے تمہاری اولاد پیدا کی۔ نیز تمہارے لئے خدمتگار بنائے۔ پوتے وغیرہ بھی اسلئے مراد لئے جاتے ہیں کہ ان کی خدمت زیادہ صداقت آمیز ہوتی ہے**۔ واضح رہے کہ "خدمتگار" سے مراد کام کاج میں معاون اور مددگار ہیں۔ ہمارے موجودہ تصور کے مطابق "نوکر" نہیں جنہیں انسانیت کا درجہ ہی نہیں دیا جاتا۔

ح ف ر

حَفَرَ الشَّیْءَ یَحْفِرُہٗ۔ کسی چیز کو کھودنا۔ جو جگہ کھودی جائے اسے حُفْرَۃٌ کہتے ہیں اور جس چیز سے کھودا جائے اسے مِحْفَارٌ*۔ اَلْحُفْرَۃُ۔ گڑھا* (۳/۱۰۲) اَلْحَافِرُ۔ جانور کے سم کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ چلنے میں مٹی کھودتا چلا جاتا ہے۔ اسی سے حَافِرَۃٌ اس راستہ کو کہتے ہیں جس پر کوئی نشان بناتا گیا ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں رَجَعْتُ عَلٰی حَافِرَتِیْ۔ میں اپنے اس راستہ پر لوٹ آیا جس پر میں گیا تھا۔ یعنے اپنی پہلی حالت پر واپس آجانا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھودنے کے علاوہ، اوّل امر کے بھی ہیں۔

سورۃ نَازِعٰت میں ہے کہ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ آنے والے انقلاب میں ان سے وہ سب قوت و دولت چھن جائیگی جو انہوں نے اسطرح سلب و نہب سے حاصل کر رکھی ہے اور اسطرح وہ اُسی حالت پر لوٹ جائینگے جس پر وہ اس دولت و قوت کے حصول سے پہلے تھے، تو یہ اسکا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ، ذرا ان کی سننا! یہ کہہ رہے ہیں کہ ہماری پھر وہی پہلی سی حالت ہو جائیگی۔ یَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَۃِ (۷۹/۱۰)۔ صاحب تاج نے لکھا ہے کہ حَافِرَۃٌ اسطرح لوٹنے کو کہتے ہیں کہ آخری حصہ بالکل پہلے حصہ پر پلٹ جائے****۔ (As you were) ہو جانا۔ یا مرنے کے بعد جب ہڈیاں تک کھوکھلی ہو جائیں، پھر زندگی کی حالت کیطرف لوٹ آنا۔ یعنی دوبارہ زندہ ہوجانا۔

* تاج و راغب۔ **راغب۔ ***لطائف اللغۃ۔ ****تاج

ح ف ظ

حَفِظَہٗ - حِفْظًا - نگہبانی کرنا - حفاظت کرنا - بچانا * - اَلْحِفْظُ کے بھی یہی معنے ہیں (۶/۴) - نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور فاء اکٹھے آئیں اُن میں جمع کرنے کا مفہوم مضمر ہوتا ہے - محفوظ کرنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اُس شے کو منتشر نہ ہونے دیا جائے۔ جمع رکھا جائے - حَافِظٌ - حَفِیْظٌ - وہ شخص جو کسی چیز کی نگہبانی کیلئے مقرر کیا گیا ہو - محافظ - نگہبان * - اِنْ کُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْہَا حَافِظٌ (۸۶/۴)- '' ہر شخص پر نگہبان مقرر ہے '' - اور اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ (۱۱/۵۷) - '' میرا رب ہر شے کا نگہبان ہے '' - سورۃ قٓ میں مومن کو بھی حَفِیْظٌ (۵۰/۳۲) کہا گیا ہے - اس کے معنے ہونگے قانون خداوندی کی نگہداشت کرنے والا - حَافِظٌ کی جمع حَفَظَۃٌ ہے -

قرآن کریم میں یہ لفظ اُن کائناتی قوتوں (ملائکہ) کیلئے بھی آیا ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق ہر شے پر کنٹرول رکھتی ہیں - (۶/۶۱) - اِسْتَحْفَظَ حفاظت کی خواہش کرنا - سورۃ مائدہ میں ہے بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ (۵/۴۴) یعنے جو کتاب اللہ انکی حفاظت میں دی گئی تھی - جس کی حفاظت کا ان سے مطالبہ کیا گیا تھا - مَحْفُوْظٌ - حفاظت میں رکھا ہوا - سورۃ انبیاء میں ہے وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (۲۱/۳۲) - ''ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا'' - فتح القدیر میں ہے کہ اسکے معنے مَرْفُوْعًا اونچا ہیں ** - لیکن ہمیں لغت سے اسکی تائید نہیں ملی شاید یہ معنی اس اعتبار سے لئے گئے ہوں کہ حفاظت کی غرض سے کسی شے کو اتنی بلندی پر رکھ دیا جائے جو لوگوں کی دسترس سے باہر ہو - لیکن یہ معنی قیاسی ہونگے - (آیت کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان س - م - و) -

نصر نے کہا ہے کہ اَلْحَافِظُ سیدھے اور واضح راستے کو بھی کہتے ہیں * -

ح ف ف

اَلْحِفَافُ - گنجے کے سر کے ارد گرد کے بال - اس سے اسکے معنے ہوتے ہیں ہر وہ چیز جو کسی چیز کے گردا گرد واقع ہو اور اسے اپنے گھیرے میں لئے ہو - حَفَّہٗ بِالشَّیْءِ - اس نے اسے کسی چیز کے ذریعہ گھیر لیا -

* تاج - ** بحوالہ غریب القرآن میرزا ابوالفضل -

حَفَّفَ حَوْلَہٗ ۔ اس نے اسکے گرد گھیرا ڈال دیا *۔ اصل میں ، جس لفظ میں حآء اور فآء اکٹھے ہوں اس میں جمع کرنے کا مفہوم مضمر ھوتا ھے ** ۔

سورۃ کہف میں دو باغوں کے متعلق ھے ۔ حَفَفْنٰھُمَا بِنَخْلٍ (۱۸/۳۲) " ھم نے انکے گردا گرد کھجوریں لگائیں "۔ سورۃ زمر میں ھے وَ تَرَی الْمَلٰٓئِکَۃَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (۳۹/۷۵) ۔ " تو ملائکہ کو دیکھیگا کہ وہ عرش کے اردگرد گھیرا ڈالے ھیں "۔ عرش ، کائنات کے کنٹرول کا مرکز ھے ۔ اور ملائکہ ، عالم امر و خلق کی وہ قوتیں جو مشیت کے پروگرام کو بروئے کار لاتی ھیں ۔ یہ سب قوتیں خدا کے کائناتی کنٹرول کے مطابق سرگرم عمل رھتی ھیں ۔

ح ف ی (ح ف و)

اَلْحَفَا ۔آدمی یا اونٹ کے پاؤں اور جانوروں کے سُم یا کھر کا زیادہ چلنے سے چھل جانا۔ ننگے پاؤں ، بغیر جوتے یا موزے کے چلنا۔اِحْتَفٰی ۔ وہ ننگے پاؤں چلا **** ۔ چونکہ انسان ننگے پاؤں اس کام کے لئے اٹھ کر چل دیتا ھے جسکے متعلق اسے بڑی کاوش اور اضطراب ھو ، اس لئے اس لفظ کا استعمال شدت اور مبالغہ کے لئے ھوتا ھے ۔ حَفِیَ بِہٖ : اسکے ساتھ مہربانی و لطف سے پیش آیا ، اس کا انتہائی اکرام و احترام کیا ، اسے دیکھ کر نہایت مسرت و شادمانی کا اظہار کیا *** ۔ حَفِیَ عَنْہُ یَحْفٰی ۔کسی کا حال بار بار، اکثرٗ با صرار پوچھتے رھنا ۔ اَحْفَی السُّؤَالَ ۔ اس نے بار بار سوال دھرایا ۔ با صرار مانگا ۔ اَلْحَفِیُّ ۔ اس عالم کو کہتے ھیں جو نہایت کاوش کے ساتھ علم حاصل کرے ۔ جو بات کی تہہ تک پہنچ جائے ۔اِسْتَحْفٰی الرَّجُلُ ۔ آدمی نے بڑی کوشش اور کاوش سے بات معلوم کی**** ۔ اَلْحَافِیْ ۔ قاضی کو کہتے ھیں جو مقدمہ کی تہ تک پہنچ کر فیصلہ دیتا ھے *** ۔ اَلْحَفِیُّ ۔ بات کو اچھی طرح جاننے والا **** ۔ وسیع معلومات اور ھمہ گیر علم رکھنے والا ۔ سورۃ اعراف میں ھے یَسْئَلُوْنَکَ کَاَنَّکَ حَفِیٌّ عَنْھَا (۷/۱۸۷) یہ تجھ سے (اَلسَّاعَۃُ) کے متعلق اسطرح پوچھتے ھیں گویا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسی مسئلہ کی تحقیق کے پیچھے لگا ھوا ھے ۔ سورۃ مریم میں خدا کے متعلق ھے اِنَّہٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا (۱۹/۴۷) ۔ وہ مجھ پر بہت مہربان ھے * میری حاجت روا کرنے والا ھے ۔ کیونکہ حَفِیَ بِہٖ کے معنے ھیں کسی کے

* تاج و محیط ۔ ** العلم الخفاق ۔ *** محیط ۔ **** تاج ۔

اکرام میں مبالغہ سے کام لینا ۔ اصمعی نے حَفِیٌ بِہٖ کے معنے کسی کی ضرورت پر اس کے کام آنا اور اسکو عزت سے ٹھیرانا کئے ہیں* ۔ سورۃ محمد میں ہے اِنْ یَّسْئَلْکُمُوْھَا فَیُحْفِکُمْ (۴۷/۳۷) اگر وہ تم سے (مال و دولت) مانگے اور اس مانگنے میں اصرار کرے تمہارا پیچھا لے اور چمٹ جائے ۔ ننگے پاؤں تمہارے پیچھے پھرے ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) روکنا ۔ (۲) سوال کرنے میں حد کر دینا ۔ اور (۳) ننگے پاؤں ہونا ہیں ۔ اس مادہ میں کسی چیز کو جڑ سے اکھیڑ دینے کے معنے بھی پائے جاتے ہیں ۔ اسی سے اِحْفَاءُ الشَّوَارِبِ ہے (یعنی مونچھوں کو جڑ سے کاٹ لینا ۔) ۔ صاحب محیط نے اس کی تائید میں ابوفراس بن حمدان عدوی کا یہ شعر نقل کیا ہے ۔

آغَایَۃُ الدِّیْنِ اَنْ تُحْفُوْا شَوَارِبَکُمْ

یَا اُمَّۃً ضَحِکَتْ مِنْ جَھْلِھَا الْاُمَمُ

کیا تمہارے نزدیک دین کی غایت یہی رہ گئی ہے کہ مونچھوں کو جڑ سے مونڈا جائے؟ اے وہ قوم کہ تیری جہالت پر دنیا کی قومیں ہنس رہی ہیں ۔

ح ق ب

اَلْحَقَبُ ۔ وہ بند جو اونٹ کے پیٹ کے نیچے سے کھینچکر کجاوہ یا کاٹھی کے ساتھ کس کر باندھا جائے ۔ (اسے ہمارے ہاں ''تنگ'' کہتے ہیں) اس کے بنیادی معنی روکنے اور قید کرنے کے ہوتے ہیں (ابن فارس) ۔ اَلْحَقِیْبَۃُ ۔ تھیلا ، بالخصوص وہ تھیلا جو پالان کے پچھلے حصہ میں لٹکا رہتا ہے ۔ اَلْمُحْتَقِبُ ۔ وہ شخص جو اپنے پیچھے کسی دوسرے آدمی کو سواری پر بٹھائے ۔ اِحْتَقَبَ فُلَانٌ ۔ فلاں آدمی نے اپنے کجاوہ یا کاٹھی کے پچھلے حصہ میں کچھ باندھ کر لٹکا لیا ۔ اِحْتَقَبَ فُلَانٌ الْاِثْمَ ۔ فلاں آدمی نے گناہوں کا پشتارہ اپنے پیچھے باندھ لیا ۔ اَلْحِقْبَۃُ مِنَ الدَّھْرِ ۔ زمانہ کی ایک مدت جسکی مقدار مقرر نہیں ۔ اَلْحُقْبُ وَالْحُقُبُ زمانہ ۔ اسّی (۸۰) سال کا زمانہ ۔ سال ۔ سالہاسال ، (جمع اَحْقَابٌ)* ۔ یہ لفظ غیر متعین مدت کے لئے بولا جاتا ہے** سورۃ کہف میں ہے اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا

* تاج ۔ ** راغب ، لطائف اللغۃ میں اس کے معنے اَلدَّھر لکھے ہیں ۔ یعنی زمانہ ۔

(۲۳/۷۸) ۔ ''سالہا سال تک چلتا رہوں''۔ اہل جہنم کے متعلق ہے لٰبِثِیْنَ فِیْھَا اَحْقَابًا (۲۳/۷۸) ۔ ''وہ اس میں زمانہ دراز تک رہینگے''۔ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ (۱۰۷/۱۱) تک۔ یعنی جب تک زمین و آسمان قائم ہیں ۔

ح ق ف

اَلْحِقْفُ ۔ لمبا بلند یا بڑا گول ریتیلا ٹیلہ ۔ جمع اَحْقَافٌ ہے ۔ نیز بل کھائی ہوئی ریتیلی زمین کو بھی کہتے ہیں ۔ اَحْقَافٌ (۲۱/۴۶) ۔ یمن میں ، عمان اور حضرموت کے درمیان ٹیلے اور پہاڑ ہیں جہاں قوم عاد رہتی تھی*۔

ح ق ق

حَقٌّ کے معنے ہیں کسی چیز کا اسطرح موجود ، واقع اور ثابت ہو جانا کہ اسکے واقع ہونے یا ثابت ہونے سے انکار نہ کیا جاسکے* ۔ یعنی کسی چیز کا ٹھوس شکل (Concrete Form) میں سامنے آ جانا۔ یا ثابت (Establish) ہو جانا۔ جن الفاظ میں حاء اور قاف اکٹھے آئیں ان میں اثبات (ثابت ہونے) کا مفہوم مضمر ہوتا ہے** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں صحت (صحیح ہونا)اور استحکام و ثبات دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں عِنْدَ حَقٌّ لِقَاحِھَا ۔ یعنی اونٹنی کا حمل ثابت ہونے پر۔ رَجُلٌ حَاقٌّ الرَّجُلِ کے معنے ہیں اس شخص کی مردانگی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے ۔ رَمٰی فَاَحَقَّ الرَّمِیَّةَ کے معنے ہیں اسنے تیر چلایا اور اس کے ساتھ ہی جانور مر گیا ۔ لہذا یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی کہ اسکا تیرنشانے پر لگا تھا ۔ یعنے یہ بات محض قیاسی اور نظری نہیں کہ تیر نشانہ پر لگا ہے یا نہیں ۔ مرے ہوئے شکار نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تیر نشانہ پر لگا تھا ۔ اِحْتَقَّتْ بِهِ الطَّعْنَةَ کے معنے ہیں نیزے کے وار نے اسے قتل کردیا ۔ جس سے ثابت ہو گیا کہ وار کاری تھا ۔ طَعْنَةٌ مُحْتَقَّةٌ ۔ یا مُحْتَقَّةٌ نیزے کی اس مار کو کہتے ہیں جو سیدھی آر پار ہو جائے اور اسطرح اسکے ٹھکانے پر لگنے میں کوئی شبہ نہ رہے* ۔ لہذا حَقٌّ کے معنے ہیں کسی چیز کا ٹھوس واقعہ یا حقیقت بنکر سامنے آ جانا ۔ چنانچہ سورۃ احقاف میں ہے کہ مجرمین کو عذاب کے سامنے کھڑا کرکے ان سے پوچھا جائیگا کہ اَلَیْسَ ھٰذَا بِالْحَقِّ (۳۴/۴۶) ۔ ''کہو اسکافات عمل ایک ٹھوس حقیقت ہے یا

---

* تاج و راغب ۔ ** العلم الخفاق ۔

نہیں؟'' اسی طرح جب حضرت یوسفؑ کو مصر میں تمکن حاصل ہوگیا تو انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُءْيَايَ مِن قَبْلُ ۔ ''یہ ہے مآل اس خواب کا جو میں نے بہت پہلے (بچپن میں) دیکھا تھا''۔ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا (۱۲/۱۰۰)۔ ''میرے نشو و نما دینے والے نے ایسے ایک ٹھوس واقعہ کی صورت میں سامنے لاکر دکھا دیا ہے'' ۔ اسی طرح سورۃ حجر میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کے مہمانوں نے انہیں انکی کبرسنی کے زمانہ میں بیٹے کی خوشخبری دی اور حضرت ابراہیمؑ کو اس پر تعجب سا ہوا تو انہوں نے کہا بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ (۱۵/۵۵) ''ہم جو تجھے خوشخبری دے رہے ہیں وہ ایک ٹھوس واقعہ بنکر سامنے آ جائیگی'' ۔

لہذا حَقٌّ کے اولین معنے ہیں کسی چیز کا ٹھوس واقعہ یا حقیقت بنکر سامنے آجانا ۔

(۲) چونکہ کوئی شے ٹھوس واقعہ میں اسی صورت میں تبدیل ہوسکتی ہے جب اسکی نشو و نما تعمیری (Constructive) ہو ۔ اس لئے حَقٌّ، اعمال کے محکم اور تعمیری نتائج کو کہتے ہیں ۔ چنانچہ تَحْقِيقٌ کے معنے ہیں کپڑے کو نہایت مضبوط کر کے بُننا* ثَوْبٌ مُحَقَّقٌ اُس کپڑے کو کہتے ہیں جو پختہ بُنا ہؤا ہو (محیط) ۔ اَلْحِقٌّ ۔ ان اونٹوں کو کہتے ہیں جو تین سال پورے کر کے چوتھے سال میں لگ گئے ہوں اور اس قابل ہوں کہ ان سے باربرداری کا کام لیا جا سکے ۔ نیز وہ اس قابل ہوں کہ وہ اونٹنیوں کو حاملہ کر کے ٹھوس نتائج مرتب کر سکیں**۔ اِحْتَقَّ الْفَرَسُ کے معنے ہیں گھوڑا لاغر ہوگیا، دبلا ہوگیا اور اِحْتَقَّ الْمَالُ کے معنی ہیں مویشی موٹے ہو گئے **۔ اِنْحَقَّتِ الْعُقْدَةُ ۔ کے معنے ہیں گرہ نہایت مضبوطی سے لگ گئی** ۔ لہذا حَقٌّ کے معنے ہوئے ٹھوس تعمیری واقعہ جو اپنی جگہ پر ثابت اور محکم ہو ۔ امٹ ہو ۔ اسلئے قرآن کریم میں يُحِقُّ ۔ بمقابلہ يَمْحُ (یمحو) آیا ہے ۔ وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ (۴۲/۲۴) ۔ خدا کا قانونِ کائنات، تخریبی قوتوں کے نتائج کو مٹا دیتا ہے اور تعمیری قوتوں کے نتائج کو برقرار رکھتا ہے، جو ٹھوس شکل میں موجود رہتے ہیں ۔

(۳) کوئی چیز اسی صورت مین باقی رہ سکتی ہے کہ وہ قانونِ حفظ و بقا کے عین مطابق ہو ۔ جو زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے ۔ جو اپنی جگہ

*لین ۔ ** تاج ۔

پر بھی فیٹ ھو اور بدلنے والے حالات سے بھی موافق رھے ۔ چنانچہ حَقٌّ کے تیسرے معنے ھیں علم و عقل ، عدل و انصاف اور واقعات ومصالح کے عین مطابق ھونا ۔ راغب نے اسے ایک مثال سے سمجھایا ھے ۔ آجکل تو دروازوں میں قبضے لگے ھوتے ھیں لیکن پرانے زمانہ میں دروازوں کے اوپر اور نیچے گلّی کی طرح لکڑی بڑھی ھوئی ھوتی تھی اور وہ لکڑی ساکٹ (Socket) میں اسطرح فیٹ آجاتی تھی کہ وہ اپنی جگہ پر قائم بھی رھتی تھی اور دروازے کے ساتھ گھومتی بھی تھی ۔ راغب کے نزدیک حَقٌّ کی یہی کیفیت ھوتی ھے** ۔ چنانچہ حَقٌّ اس موجد کو کہتے ھیں جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے ۔ اس لئے خدا کو اَلْحَقُّ کہا گیا ھے*** ۔ نیز ھر اس موجود چیز کو حَقٌّ کہتے ھیں جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق ھو** ۔ اَلْاَحَقُّ مِنَ الْفَرَسِ ۔ اس گھوڑے کو کہتے ھیں جو اپنا پچھلا پاؤں ٹھیک اس جگہ رکھے جہاں اسکا اگلا پاؤں پڑا تھا* ۔

ان معانی کی روشنی میں حَقٌّ اور بَاطِلٌ کی قرآنی اصطلاحات کا صحیح صحیح مفہوم سمجھ میں آ جائیگا ۔

حَقَّ الْاَمْرُ یَحُقُّ اور یَحِقُّ کے معنے ھیں وہ امر واجب ھو گیا ۔ یعنی کسی بات کا واجب ھونا ۔ حَقِیْقَةٌ ۔ اس چیز کو کہتے ھیں جسکی حفاظت تم پر واجب ھو جائے ۔ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ (۲/۱۸۰) کے یہی معنے ھیں ۔ یعنے متقین کے ذمہ اتنا ھی نہیں کہ وہ اس قانون (وصیت) پر خود ھی عمل پیرا ھوں بلکہ ان پر یہ بھی واجب ھے کہ وہ اسکی حفاظت کریں ۔ نیز کسی ملک کے جھنڈے کو بھی حَقِیْقَةٌ کہتے ھیں کیونکہ اس سے اس ملک کے وجود کا اثبات ھوتا ھے ۔ اور اسکی حفاظت ھر ایک پر واجب ھوتی ھے* ۔

حَقَّ الطَّرِیْقَ ۔ کے معنے ھیں وہ سوار ھوکر راستہ کے درمیان چلا ۔ اور اسطرح نمایاں ھوکر سامنے آ گیا* ۔

سورۃ یونس میں حَقٌّ کا لفظ ظَنٌّ کے مقابلہ میں آیا ھے (۱۰/۳۶) جہاں کہا گیا ھے کہ ظَنٌّ ، حق کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں دیتا ۔ اس لئے اتباع ، حق کی کرنی چاھئے نہ کہ ظن کی ۔ دین یکسر حق ھے ۔ اس میں ظن کے لئے کوئی گنجائش نہیں ۔ خدا خود حق ھے (۳۰/۱۰) ۔ اس کا رسول حق ھے (۳/۸۵) ۔ اسکی طرف سے بھیجا ھوا قرآن کریم حق ھے (۶/۳۴) ۔ اس کے وعدے (قوانین) حق

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** راغب و تاج ۔

ھیں (۱۰/۵۵) ۔ اس کا دین حق ہے (۹/۳۳) ۔ اور یہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے (۳۹/۵) ۔ چونکہ حَقّ ۔ ظن و شکوک سے بلند ھوتا ہے ۔ اور وہ ایک ٹھوس تعمیری واقعہ کی شکل میں سامنے موجود ھوتا ہے ، اس لئے ظہور نتائج کو بھی اَلْحَاقَّةُ کہا گیا ہے ۔ (۶۹/۱) ۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ حَقّ کوئی ذھنی ، نظری ، تصوراتی ، یا محض عقیدہ کی چیز نہیں ۔ یہ عقائد اور نظریات حیات کے تعمیری نتائج کا نام ہے جو ٹھوس شکل میں سامنے آ جائیں اور جو زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے چلے جائیں اور اپنی صداقتوں کیلئے خارجی دلائل کے محتاج نہ ھوں بلکہ سورج کی طرح اپنی دلیل آپ ھوں ۔ اس دنیا سے متعلق کوئی عقیدہ حق ثابت نہیں کہلا سکتا جب تک اسکے تعمیری نتائج ایک ٹھوس حقیقت بنکر سامنے نہ آجائیں ۔

قرآن کریم میں سَمَاءٌ کے متعلق ہے کہ وہ پھٹ جائیگا اور زمین کے متعلق ہے کہ وہ خالی ھو جائیگی (ان امور کی تشریح " مفہوم القرآن ،، میں ملیگی) اسکے بعد فرمایا کہ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ (۸۴/۲-۵) ۔ ''وہ اپنے نشو و نما دینے والے کے قانون پر عمل کریگی اور ایسے بنایا ھی اسکے مطابق گیا ہے ،، ۔ اسی طرح اعمال کے نتائج واجب ھوجانے کیلئے حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ (۷/۳۰) ۔ اور فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ (۱۷/۱۶) ۔ فَحَقَّ وَعِيْدِ (۵۰/۱۴) ۔ اور فَحَقَّ عِقَابِ (۳۸/۱۴) آیا ہے ۔ یا حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۱۰۳) ۔ ''مومنین کو مخالفین کی تدابیر سے محفوظ رکھنا ھم پر واجب ھوتا ہے ،، ۔

حَقِيْقٌ (۷/۱۰۵) ۔ مناسب ۔ ضروری ۔ واجب ۔ لازم ۔

اِسْتَحَقَّا اِثْمًا (۵/۱۰۷) ۔ انہوں نے ارتکاب جرم کیا ہے ۔ (دیکھئے ! یہاں بھی واقعہ کے سرزد ھونے ، یعنی اس کے اس واقعہ بن جانے کے لئے یہ لفظ آیا ہے ۔ یہ حَقّ کے بنیادی معنی ھیں) ۔

(حَقّ کے ساتھ بَاطِلٌ کا عنوان بھی دیکھئے تاکہ دونوں کے تقابل سے مفہوم اور نکھر جائے) ۔

ح ک م

اَلْحَكَمَةُ ۔ گھوڑے کی لگام کو کہتے ھیں** ۔ بلکہ منہ میں لگام دیکر جس چمڑے سے اسے باندھ دیا جائے کہ وہ اسکے دونوں جبڑوں کو کس لے اور

* تاج ۔ **راغب ۔

ادھر ادھر نہ ہونے دے ۔ ایسے حَکَمَۃٌ کہتے تھے ۔ اَحْکَمَ الْفَرَسَ کے معنے ہیں گھوڑے کو اسطرح کی لگام دینا * ۔ چونکہ اس لگام کا کام یہ ہے کہ گھوڑے کو سرکش اور بے راہرو ہونے سے روک دے اسلئے حَکَمْتُ الْفَرَسَ کے معنی ہیں میں نے گھوڑے کو روکا اور (لگام کے ذریعہ) قابو میں لیا ۔ اَحْکَمَہٗ عَنِ الْاَمْرِ کے معنے ہیں ، اسے اس بات سے روک دیا ۔ منع کردیا ۔ * ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ روکنے اور منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو بتا دیا جائے کہ اس کی آخری حد کونسی ہے جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا ۔ اسی کو اختلافی امور میں فیصلہ کرنا کہتے ہیں ۔ یعنی ہر ایک کے حقوق و واجبات کی حدیں متعین کر دینا اور کسی کو ان سے آگے نہ بڑھنے دینا ۔ اسی کو حُکْمٌ کہتے ہیں ۔ یعنی فیصلہ * ۔ حَاکِمٌ کے معنے ہیں فیصلہ کرنے والا ۔ اس قسم کا حکم دینے والا جسکا ذکر اوپر کیا گیا ہے ۔ حَکَمَ بَیْنَہُمْ کَذَالِکَ کے معنے ہیں اس نے ان کے درمیان اس طرح کا فیصلہ کیا * ۔ اَلْحُکُوْمَۃُ اسی سے اسم ہے * ۔ اَلْحَکَمُ ۔ صاحبِ اختیار ثالث یا پنچ ۔ ایسا فیصلہ کرنے والا جسے موافقت یا مخالفت میں فیصلے کا پورا پورا اختیار ہو ۔ قانون نافذ کرنے والا ۔ ($\frac{۳}{۳۵}$ و $\frac{۶}{۱۱۵}$)۔

اَلْحِکْمَۃُ کے معنے ہیں فیصلہ میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنا * ۔ یعنی ہر ایک کے حقوق کی حدیں مقرر کرکے کسی کو ان سے تجاوز نہ کرنے دینا ۔ اسی لئے حَکِیْمٌ اُس شخص کو بھی کہتے ہیں جو ہر چیز کو صحیح تناسب و توازن کے ساتھ ، ہر تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ، نہایت حسن و اتقان کے ساتھ بنائے ، یا معاملات کو اسطرح سر انجام دے ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ حِکْمَۃٌ کو حکمت اسلئے کہتے ہیں کہ وہ جہالت اور نادانی کی باتوں سے روکتی ہے ۔ اقبال کی اصطلاح میں حِکْمَۃٌ ، " رائے با قوت " کو کہینگے ۔ یعنی فیصلہ دینے کی صلاحیت اور پھر اس فیصلہ کو نافذ کرنے کی قدرت ۔ اسی کو آجکل کی زبان میں حکومت کہتے ہیں ۔

چونکہ حَکَمَ کے معنے کسی چیز کو (ایک مقام پر) روک دینے کے ہیں ۔ اور جو چیز ایک مقام پر جم کر کھڑی ہو جائے وہ مستحکم ہو جاتی ہے ۔ اسلئے اَحْکَمَہٗ کے معنے ہیں اسکو مستحکم کردیا ** ۔ اسے ایسا بنا دیا کہ وہ اپنے مقام سے نہ ہلے ۔

قرآن کریم کو حَکِیْمٌ کہا گیا ہے ($\frac{۳۶}{۲}$) کیونکہ وہ ہر شے کا صحیح مقام متعین کر کے کسی کو ان حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتا ۔ وہ

* تاج (نیز کتاب الاشتقاق) ۔ ** تاج و محیط ۔ *** راغب ۔

تمام اختلافی امور میں صحیح فیصلے کرتا ہے ۔ خدا کو بھی حَکِیْمٌ کہا گیا ہے (۳/۴۴) ۔ کیونکہ وہ کائنات کو ٹھیک ٹھیک راستہ پر چلاتا ہے ۔ ہر شے کو صحیح صحیح اندازے اور تناسب کے مطابق پیدا کرتا ہے اور اپنے قانون کی لگام سے ہر شے کو مسخر کئے ہوئے ہے یَحْکُمُ بَیْنَهُمْ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ (۲/۱۱۳) وہ انسانوں کے اختلافی امور میں فیصلے کرتا ہے ۔

قرآن نے کہا ہے کہ اسکی آیات مُحْکَمٰتٌ اور مُتَشَابِهَاتٌ ہیں ۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جسکا اچھی طرح سے سمجھ لینا ضروری ہے ۔ سورۃ آل عمران میں ہے ۔ هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْهُ اٰیَاتٌ مُحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَاءَ تَاْوِیْلِهٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّا اُوْلُوا الْاَلْبَابِ (۳/۶) ۔

عام الفاظ میں اس آیت کا ترجمہ یہ ہے ۔

اللہ وہ ہے جس نے تجھ پر یہ کتاب اتاری ہے ۔ اس میں ایک قسم تو ایسی آیتوں کی ہے جو ''محکم'' ہیں اور وہی کتاب کی اصل و بنیاد ہیں ۔ دوسری قسم ''متشابہات'' کی ہے ۔ سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ ان آیتوں کے پیچھے پڑتے ہیں جو ''متشابہ'' ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور انکی تاویل نکالیں ۔ حالانکہ اسکی تاویل اللہ جانتا ہے اور وہ لوگ (جانتے ہیں) جو علم میں پختہ ہوتے ہیں ۔ یہ کہتے ہوئے کہ ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں ۔ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے ۔ (حقیقت یہ ہے کہ) حقائق کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عقل و بصیرت والے ہیں ۔

ہم نے اس ترجمہ میں ''محکم'' ۔ ''متشابہ'' ۔ ''تاویل'' ۔ وغیرہ الفاظ کو اسی طرح لکھ دیا ہے ۔ اس لئے کہ انہی کے مفہوم کی وضاحت سے اس نکتے کی وضاحت ہوگی ۔

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں ، مُحْکَمٌ کے معنے ہیں اپنی جگہ پر قائم ۔ اٹل ۔ صاف صاف فیصلہ کرنے والا ۔ مستحکم ۔ لیکن یہاں اس کے مقابل میں مُتَشَابِهَاتٌ کا لفظ آیا ہے اس لئے مُحْکَمٌ کے معنے ہونگے وہ جو مُتَشَابِہ نہ ہو ۔ اور مُتَشَابِہٌ کے معنے ہونگے وہ جو محکم نہ ہو ۔ یعنے مُحْکَمٌ اور مُتَشَابِہٌ ۔ مختلف قسم کی آیات ہیں ۔ یا آیات کی دو قسمیں ہیں ۔

مُتَشَابِہ ؔ کے تفصیلی معنے ش ۔ ب ۔ ہ کے عنوان میں دیکھئے ۔ مختصر الفاظ میں اسکے معنے ہوتے ہیں ، ملتی جلتی ہوئی چیزیں جن میں باہمی مشابہت اور موافقت ہو ۔ تشبیہ کو اسی لئے تشبیہ کہتے ہیں کہ اس سے ایک چیز کو اس سے ملتی جلتی چیز کے ساتھ مثال دیکر سمجھایا جاتا ہے ۔

ان معانی کے اعتبار سے مُحْکَم ؔ کے اولین معنے ہونگے ایسی آیات جن کے الفاظ سے وہی مفہوم ہو جو ان الفاظ کے معنے ہیں ۔ مثلاً نکاح کے ضمن میں ارشاد ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ (۴/۲۳) ۔ تمہاری مائیں تم پر حرام ہیں ۔ اس میں اُمٌّ کے معنے ماں کے ہیں ۔ یعنے وہ عورت جسکے بطن سے کوئی پیدا ہو ۔ لیکن مُحْکَم وَ مُتَشَابِہَات کی جس آیت کو اوپر نقل کیا گیا ہے ۔ یعنے (۳/۶) ۔ اس میں هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ میں اُمٌّ کے معنے اس قسم کی ماں نہیں ۔ اس میں اُمٌّ کا لفظ استعارۃً استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مفہوم ہے ''اصل و بنیاد'' ۔ یہ اس لفظ کی تاویل ہے ۔ تَأْوِيل ؔ کے معنے ہیں آخری نتیجہ ۔ جو کچھ مآل کار ہو ۔ کسی شے کی آخری حقیقت (Ultimate Reality) ۔ قرآن میں انسانی راہنمائی کیلئے قوانین و ضوابط دئے گئے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان احکام و قوانین کے الفاظ ایسے ہونے چاہئیں جن کا مطلب ان الفاظ سے محکم طور پر متعین ہوجاتا ہو ۔ جیسا کہ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ کی مثال میں بتایا گیا ہے ۔ اس قسم کی آیات مُحْکَمَات ؔ ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن میں ایسے حقائق کا بھی ذکر ہے جن کا تعلق اُس عالم سے ہے جو ہماری سرحدِ ادراک سے باہر ہے ۔ مثلاً اللہ کی ذات اور اسکی صفات ۔ مرنے کے بعد کی زندگی اور اُس میں اعمال کے نتائج ۔ وہاں کی جنت اور جہنم ۔ یا انسانی زندگی کا منتہیٰ اور مآل ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے مجرد حقائق (Abstract Truths) کو جب بھی بیان کیا جائیگا تو تشبیہ و استعارہ اور تمثیلات کے رنگ میں بیان کیا جائیگا ۔ یعنی اُن کا بیان (Symbolically) ممکن ہوگا ۔ مثلاً اللہ کے متعلق کہا گیا ہے ۔ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (۷/۵۴) ۔ وہ عرش پر مستوی ہوگیا ۔ اور کَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ (۱۱/۷) اسکا عرش پانی پر ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان آیات میں عَرْش ؔ سے مراد لکڑی (یا کسی اور چیز کا) بنا ہوا تخت مراد نہیں ۔ نہ ہی مَاء ؔ سے مراد پانی ہے ۔ یہ بیان تمثیلی یا تشبیہی ہے ۔ یعنے ان حقائق کو تشبیہ اور مثال کے ذریعے بیان کیا گیا ہے ۔ لہذا یہ آیات مُتَشَابِہَات ؔ ہیں ۔ ایسی آیات جن میں حقائق کو تشبیہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے ۔

یہ بھی واضح ہے کہ جو حقائق ہمارے عالمِ محسوسات سے باہر کے ہیں اُن کی حقیقت ، کنہ ، ماہیت ، یعنی ان کی تَاْوِیْلٌ (What they Actually are) کا سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں ۔ البتہ جس قسم کی مثالوں سے انہیں سمجھایا گیا ہے ان پر غورو فکر کرنے سے ہم انکے متعلق کچھ ایسا اندازہ اپنے ذہن میں لگا سکتے ہیں جو اس حقیقت کا مفہوم سمجھا دے ۔ مثلاً لفظ عَرْشٌ سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اسکا مفہوم قوت و اقتدار (Authority or Control) ہے ۔ یا کَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ میں مَآءٌ سے مراد زندگی کا سرچشمہ ہے کیونکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (۲۱/۳۰) ۔ ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے بنایا ۔ لیکن خدا اپنے کنٹرول کو کسطرح عمل میں لاتا (Exercise کرتا) ہے یا اس نے خود حیات (Life) کو کسطرح پیدا کیا ۔ ان باتوں کی کنہ و حقیقت کو ہم نہیں پاسکتے ۔ ان حقائق کی اصل و حقیقت کے متعلق ہمیں علم کا بہت تھوڑا حصہ دیا گیا ہے ۔ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (۱۷/۸۵) ۔ ان کی اصل و حقیقت کا واقعی علم صرف خدا کو ہو سکتا ہے ۔ البتہ جہانتک ان کا تعلق ہماری ذات اور انسان کی تمدنی زندگی سے ہے، ہم عقل و فکر کے ذریعہ اس راہنمائی تک پہنچ سکتے ہیں جو ان سے مقصود ہے ۔ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳/۷) ۔

اس قسم کی آیات کے متعلق دو قسم کی ذہنیتوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جن کے پیش نظر فتنہ پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ یعنے لوگوں کو زندگی کے بنیادی حقائق اور عملی نتائج سے دور ہٹا کر محض نظری تصورات میں الجھا کر ان کی قوتوں کو تخریبی راستوں میں ضائع کرتے چلے جانا ۔ یہ لوگ ان ماوراء العقل حقائق کی کنہ و حقیقت اور کیفیت و ماہیت دریافت کرنے کیلئے نظری موشگافیاں اور تصوراتی نکتہ آفرینیاں کرتے رہتے ہیں ۔ اور ایسے بلند ترین سطح کا علم قرار دیتے ہیں ۔ یہ زمین کے ہنگاموں کو پست معاملات قرار دیکر ہمیشہ آسمان کی باتوں میں الجھے رہتے ہیں ۔ قرآن کریم ایسے فتنہ قرار دیتا ہے جو انسان کو عملی زندگی سے بیگانہ بنا دیتا ہے ۔ اس کے برعکس، دوسری ذہنیت کے لوگ وہ ہیں جنہیں قرآن کریم "رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" اور "اُولِی الْاَلْبَابِ" کہکر پکارتا ہے ۔ یعنے وہ جو عقل وفکر سے کام لیکر علم میں پختہ ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ اپنی فکر کی عمارت کو ایمان کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں ۔ یعنے وہ کہتے ہیں کہ یہ تمام حقائق اس خدا کی طرف سے بیان ہوئے ہیں جو ہر شے کا علم

رکھتا ہے اسلئے ان کے حقائق (Truths) ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں لیکن ہم انکی کنہ و حقیقت کو پا نہیں سکتے ۔ البتہ ان سے جو انسانی راھنمائی مقصود ہے (ذکر) ہم عقل و فکر سے اس تک ضرور پہنچ سکتے ہیں ۔ ان حقائق کے متعلق ہمارے علم کی یہی حد ہے ۔ یعنے ان حقائق کا علم خدا بھی رکھتا ہے اور یہ '' رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ '' بھی ۔ لیکن خدا انکی کنہ و حقیت تک کا علم رکھتا ہے اور یہ لوگ صرف اس حد تک ان کا علم رکھتے ہیں جس حد تک ان سے مقصود انسانی راھنمائی (ذکر) ہوتا ہے ۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر بتایا ہے کہ علم سے انسان صحیح نتیجہ تک اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے جب وہ اپنے علم سے وحی کی روشنی میں کام لے (مثلاً دیکھئے (۲۲/۲۶ یا ۳۴/۶)) ۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ '' ایمان والوں '' میں دو قسم کے لوگ ہونگے ۔ ایک وہ عوام جو وحی پر ویسے ہی ایمان رکھتے ہیں ۔ اور دوسرے صاحبان علم و بصیرت جو عقل و فکر کی رو سے وحی کے حقائق پر غور و خوض کرتے ہیں ۔ سورۃ مدثر میں اس دوسرے گروہ کو اَلَّذِیْنَ اُوْتُوْا الْکِتٰبَ '' کہکر پکارا گیا ہے اور ان کے برعکس عام لوگوں کو '' اَلْمُؤْمِنُوْنَ '' (۷۴/۳۱) ۔

جن دو ذھنیتوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلق سورۃ مدثر میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ۔ وہاں سَقَرْ (جہنم) کے متعلق کہا ہے کہ عَلَیْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (۷۴/۳۰) اس پر انیس (ملائکہ) مقرر ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک تمثیلی بیان ہے ۔ اس کے بعد فرمایا وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا (۷۴/۳۱) ۔ انکی یہ گنتی (یعنی اُنیس کی تعداد) ان لوگوں کے لئے وجہ '' فتنہ '' ہے جو قرآن کے حقائق کا انکار کرتے ہیں ۔ لیکن ان کے برعکس لِیَسْتَیْقِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَ یَزْدَادَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِیْمَانًا ۔ جن لوگوں کو اَلْکِتٰبُ (کا علم) دیا گیا ہے ان کے دل میں اس سے یقین پیدا ہو جاتا ہے اور (عام مومنین) کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے ۔ وَلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ بہر حال مومنین کی جماعت کے خواص ہوں یا عوام ان میں سے کسی کے لئے بھی اس قسم کا تمثیلی بیان وجہ اضطراب و شکوک نہیں ہوتا ۔ لیکن وَلِیَقُوْلَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ وَالْکٰفِرُوْنَ مَاذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا (۷۴/۳۱) جن لوگوں کے دل میں مرض ہوتا ہے ، نیز وہ لوگ جو قرآن پر سرے سے ایمان نہیں رکھتے ۔ یہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے خدا کا حقیقی منشاء کیا ہے ۔ اس کے بعد ہے کہ (قرآن میں یہ حقائق تمثیلی انداز میں بیان ہوئے ہیں) ۔ ان بیانات سے

جو چاهتا هے صحیح راهنمائی حاصل کر لیتا هے اور جو چاهتا هے ان سے گمراه هوجاتا هے - اسکے بعد هے وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلاَّ هُوَ (۳۱/۷۴) - یه خدا کے لشکر هیں جنکی کنه و حقیقت کا علم صرف اسی کو هے - وَ مَاهِيَ اِلاَّ ذِكْرىٰ لِلْبَشَرِ (۳۱/۷۴) - لیکن ان کے تمثیلی بیان سے انسانوں کی راهنمائی مقصود هے - لهذا جو "رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" هیں وه ان کی کنه و حقیقت کے پیچھے نهیں پڑتے بلکه غور و فکر سے اس راهنمائی (ذکر) تک پهنچ جاتے هیں جو ان سے مقصود هے -

یه هے آیات مُحْكَمٰتٌ وَ مُتَشَابِهَاتٌ کا پهلا مفهوم -

مُتَشَابِهَاتٌ میں ایسے حقائق بھی شامل هیں جنهیں اس قسم کے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کیا گیا هے جن کا مفهوم هر شخص اپنی اپنی علمی اور عقلی سطح کے مطابق یا هر زمانه کا انسان اپنے زمانه کی علمی سطح کے مطابق سمجھ سکتا هے - یه ظاهر هے که قرآن کریم هر سطح کے انسانوں کیلئے راهنمائی کا ضابطه هے اور هر زمانه کے انسانوں کیلئے بھی - هم دیکھتے هیں که ایک هی زمانه میں مختلف انسان مختلف علمی اور عقلی سطح رکھتے هیں - اگر قرآن کریم کسی ایک سطح کے انسانوں کو سامنے رکھکر هی اپنے حقائق بیان کرتا تو نه وه عالمگیر هو سکتا تھا نه ابدی - وه صرف کسی ایک زمانه کے انسانوں کیلئے یا ایک سطح کے انسانوں کیلئے هی مفید هو سکتا تھا - باقی انسانوں کیلئے بیکار هوتا - اس قسم کی کتاب کیلئے ضروری تھا که وه ان حقائق کو ایسے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کرے جن میں کافی وسعت اور لچک هو تاکه هر سطح کا انسان اس سے فائده اٹھا سکے - حقیقت یه هے که الفاظ کا اس قسم کا انتخاب بھی قرآن کریم کا وه خاصه هے جو اعجاز کا مرتبه رکھتا هے - ان الفاظ میں یه خصوصیت رکھی گئی هے که یه حقیقت کو اس کے صحیح مقام پر بھی رکھتے هیں اور اسکے ساتھ هی اپنے اندر ایسی لچک رکھتے هیں که اس سے هر انسان اپنی اپنی سطحِ علم و عقل کے مطابق مستفید هو سکتا هے - مثلاً قرآن کریم میں اجرام فلکی کے متعلق هے که كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۳۶/۴۰) - هر ایک اپنے اپنے دائرے میں تیزی سے تیر رها هے - اور سورج کے متعلق هے وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (۳۶/۳۸) - سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رها هے - اب ظاهر هے که جب تک فلکیات کے متعلق (قدیم) بطلیموسی تصور رائج تھا ، اجرامِ فلکی کی گردش سے متعلق صحیح تصور ذهن انسانی میں آ نهیں سکتا تھا - جب بعد میں کوپر نیکس کا

نظام سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اجرام سماوی کسطرح اپنے اپنے دائرے میں سرگرم گردش ہیں ۔ اسی طرح جبتک ہرشل کا نظریہ سامنے نہیں آیا تھا یہ کسی کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ سورج اپنے پورے نظام کے ساتھ کسی مستقر کی طرف بھی بڑھ رہا ہے ۔ جبتک انسانی علم اتنی بلندی تک نہیں پہنچا تھا قرآن کریم کی یہ آیات مُتَشَابِهَات کی فہرست میں شامل تھیں ۔ جب یہ انکشافات ہوئے تو یہ آیات مُحْكَمَات کے زمرے میں شامل ہوگئیں ۔ اب بھی یہ آیات ایک خاص علمی سطح کے انسانوں کیلئے مُحْكَمَات کا درجہ رکھتی ہیں ۔ ان سے نیچے کی سطح والوں کیلئے یہ مُتَشَابِهَات ہی میں داخل ہیں ۔ جب تک یہ آیات مُتَشَابِهَات کے زمرے میں تھیں انکی حقیقت (تَاوِيْل) کا علم خدا کو تھا ۔ جب یہ مُحْكَمَات کے ذیل میں آ گئیں تو انکی حقیقت " رَاسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ " پر بھی منکشف ہوگئی ۔ اسی بنا پر قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے اس خدا نے نازل کیا ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اسرار سے واقف ہے (۲۵/۶) ۔ اور اس سے کچھ آیات بعد ہے کہ اگر ان امور کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہو تو فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا (۲۵/۵۹) ۔ اس سے پوچھو جو ان اسرار سے واقف ہے ۔ جبتک انسانی علم ان حقائق کی بلندیوں تک نہیں پہنچتا ان کا واقف صرف خدا ہوتا ہے جسنے وحی کے ذریعہ ان حقائق کو بیان کردیا ہے ۔ جب انسانی علم ان کی بلندیوں تک پہنچ جائیگا تو ان حقائق کے ماہرین بھی (خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق) ان کے خبیر ہو جائینگے ۔

لہذا مُحْكَمَات و مُتَشَابِهَات کا ایک مفہوم یہ بھی ہے ۔

یہ ہیں قرآنی آیات کے مُحْكَمَات و مُتَشَابِهَات ہونے کے مختلف مفہوم ۔ لیکن مُحْكَمَات ہوں یا مُتَشَابِهَات تمام آیات اپنی اپنی جگہ پر یکسر مستحکم ہیں ۔ قرآن کا ایک ایک لفظ ہمالیہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر محکم ہے ۔ اسی لئے سورۃ ہود میں ہے كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (۱۱/۱) ۔ یہ وہ کتاب ہے جسکی تمام آیات کو محکم بنایا گیا ہے ۔ یہ کتاب مستقل اقدار (Permanent Values) کی حامل ہے ۔ اسکے حقائق غیر متبدل اور اسکے اصول تغیّر نا آشنا ہیں ۔ جن حقائق کو تمثیلی رنگ میں بیان کیا گیا ہے انکی بھی حقیقت غیر متبدل (مُحْكَم) ہے ۔ لہذا اس نقطہ نگاہ سے قرآن کریم کی تمام آیات مُحْكَمَات ہیں ۔

اسکے برعکس سورۃ زمر میں پوری کتاب کو مُتَشَابِهًا کہا گیا ہے ۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِىَ (۳۹/۲۳) ۔

لیکن یہاں مُتَشَابِهًا کا لفظ مُحْكَمًا کے مقابلہ میں استعمال نہیں ہوا بلکہ مَثَانِيَ کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے ۔ مَثَانِيَ کے مفہوم کیلئے ث ۔ ن ۔ ی کا عنوان دیکھئے ۔ یہاں مختصر طور پر یہ سمجھئے کہ مَثَانِيَ ان دو چیزوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی کر دی جائیں ۔ یعنے ایک دوسرے کی ضد ہوں ۔ قرآن کریم کا انداز بیان یہ ہے کہ وہ ایک چیز کی وضاحت اسکی ضد کو سامنے لا کر کرتا ہے ۔ مثلاً نور (روشنی) کے مقابلہ میں ظلمت (تاریکی) کا ذکر کرتا ہے ۔ یہ دونوں (نورو ظلمت) باھمدگر مَثَانِيَ ہیں ۔ اس طریق بیان سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے (چنانچہ بعض فلاسفرز کا تو خیال ہے کہ اشیاء پہچانی ہی اپنے اضداد سے جاتی ہیں) ۔ لیکن اس سے ذھن میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم میں متضاد باتوں کا بیان ہے ۔ اس کے متعلق اللہ نے کہدیا کہ نہیں ۔ قرآن کریم میں کہیں تضاد نہیں ($\frac{4}{83}$)۔ اس کی تمام آیات باھمدگر ملتی جلتی (مُتَشَابِهًا) ہیں ۔ مَثَانِيَ (متضاد اشیاء کو آمنے سامنے لانے) سے مقصود صرف یہ ہے کہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے ۔ لہذا قرآن کریم کی آیات مَثَانِيَ ہونے کے باوجود مُتَشَابِهٌ ہیں ۔ اسطرح قرآن کریم كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِيَ ہے ۔ یا یوں کہئے کہ متشابہ وہ اسلوب بیان ہے جس میں حقائق کو ملتے جلتے انداز میں بیان کیا گیا ہے (مثلاً نُوْرٌ و هُدًى) اور مثانی وہ اسلوب ہے جس میں ایک چیز کے سامنے اسکی ضد لا کر بات واضح کی گئی ہے۔

(سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي ($\frac{15}{87}$) کے لئے دیکھئے عنوان ث ۔ ن ۔ ی)

قرآن کریم میں كِتَابٌ کے ساتھ حِكْمَةٌ کا لفظ بھی آیا ہے ۔ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ($\frac{2}{151}$) ۔ ایک چیز ہوتی ہے قانون (Law) اور ایک ہوتی ہے اس قانون کی مصلحت یا غایت و علت (The why of it) قانون کو کہتے ہیں كِتَابٌ (دیکھئے عنوان ک ۔ ت ۔ ب) اور اسکی مصلحت یا علت اور غایت کو کہتے ہیں حکمت ۔ اس لئے کہ یہ حِكْمَةٌ ہی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ قانون کی غایت کیا ہے ۔ اس کا متعین راستہ کونسا ہے ۔ وہ کس روش پر انسانوں کو چلانا چاھتا ہے ۔ اگر قرآن کریم کا مقصود یہ ہوتا کہ اس کے قانون کو مستبدانہ انداز سے (ڈنڈے کے زور پر) اندھا دھند منوایا جائے تو پھر خالی قانون (کتاب) کی ضرورت تھی ۔ لیکن چونکہ اسکا مقصود یہ ہے کہ اس قانون کی اطاعت علی وجه البصیرت اور بطیب خاطر (دل کی پوری رضامندی کے ساتھ) ہو اسلئے ضروری تھا کہ ان قوانین کی حکمت

(مقصد ۔ غایت ۔ مصلحت) بھی ساتھ ھی واضح کر دی جائے ۔ لہذا کتاب
کے ساتھ حکمت بھی دی گئی ۔ یہ دونوں خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتے
ھیں اور قرآن کریم کے اندر محفوظ ھیں ۔ چنانچہ سورۃ نساء میں ھے وَ اَنْزَلَ
اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ (۴/۱۱۳) ۔ خدا نے تیری طرف
کتاب اور حکمت کو نازل کیا ۔ کہیں قرآن کریم کو صرف اَلْحِكْمَةُ
کہا گیا ھے (۱۷/۳۹) ۔ کہیں اسے اَلْكِتَابُ اور اَلْحِكْمَةُ کہکر ضمیر دونوں
کے لئے واحد کی استعمال کی گئی (۲/۲۳۱) تاکہ اس سے یہ حقیقت واضح ھو
جائے کہ اس سے مراد ایک ھی چیز (قرآن کریم) ھے ۔ سورۃ احزاب میں اس
حقیقت کو واضح کر دیا کہ اَلْحِكْمَةُ کی بھی تلاوت ھوتی ھے (۳۳/۳۴) ۔ اس
لئے حکمت وحی غیر متلو نہیں ۔ ان حقائق سے واضح ھے کہ حِکْمَت
قرآن کریم کے اندر ھے ۔ قرآن کریم سے باھر نہیں ۔

حِکْمَت کو وحی کے ذریعہ نازل کرنے میں ایک بہت بڑا مقصد
تھا ۔ قرآن کریم نے احکام و قوانین اسلئے دیے ھیں تاکہ ان کا نتیجہ مرتب
ھو ۔ یعنی اسکے قوانین مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک نتیجہ پیدا کرنے
(ایک مقصد حاصل کرنے) کا ذریعہ ھیں ۔ اگر اللہ کی طرف سے صرف قوانین مل
جاتے اور یہ نہ بتایا جاتا کہ ان قوانین پر عمل کرنے سے نتیجہ کیا نکلیگا
تو ھو سکتا تھا کہ ھم ان قوانین پر اپنے طور پر عمل کر کے مطمئن ھو کر
بیٹھ جاتے کہ خدا کا منشا پورا ھو گیا ھے ۔ خدا نے یہ نہیں کیا ۔ اسنے
قوانین دیے اور ساتھ ھی یہ بھی بتا دیا کہ ان قوانین پر عمل کرنے کا نتیجہ
کیا ھوگا ۔ لہذا ھمیں ھر وقت یہ دیکھنا ھوگا کہ ان قوانین سے وہ نتیجہ
برآمد ھو رھا ھے یا نہیں جو خدا نے متعین کیا ھے ۔ اگر ھو رھا ھے تو پھر
ان قوانین پر عمل بھی ٹھیک ھو رھا ھے ۔ لیکن اگر ان سے وہ نتیجہ نہیں
نکلتا تو پھر ھمیں رک کر اپنا جائزہ لینا ھوگا کہ ھم سے کہاں غلطی ھو رھی ھے
جسکی وجہ سے ان قوانین سے ان کا متعین کردہ نتیجہ بر آمد نہیں ھو رھا ۔
مثلاً قرآن کریم میں صَلٰوۃ کے متعلق ھے کہ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ
تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَ الْمُنْكَرِ (۲۹/۴۵) ۔ اسمیں اَقِمِ الصَّلٰوۃَ
(صَلٰوۃ قائم کرو) حکم (کِتَاب) ھے ۔ اور دوسرا حصہ (کہ صلٰوۃ سے
فحشاء اور منکر کی روک تھام ھو جائیگی) اس کی حِکْمَت ھے ۔ اگر صَلٰوۃ
سے یہ نتیجہ مرتب نہیں ھوتا تو ھمیں سوچنا ھوگا کہ ھم سے کہاں غلطی
ھو رھی ھے ۔ کیونکہ جب خود خدا نے کہا ھے کہ اقامت صلٰوۃ سے ایسا
ھوگا (تو اگر اقامت صلٰوۃ قرآن کریم کے منشاء کے مطابق ھو رھا ھے) تو اس

سے وہ نتیجہ لازمی طور پر نکلنا چاہئے ۔ اس لئے کہ یہ نتیجہ بھی خود خدا ہی کا بتایا ہوا ہے جو کبھی غلط نہیں ہوسکتا ۔ دین (قرآنی نظام) میں ہر حکم اپنا متعین نتیجہ مرتب کرتا چلا جاتا ہے ۔ یہ مقصد تھا کِتَاب کے ساتھ حکمت کے مُنَزَّلْ مِنَ اللّٰہِ ہونے کا (نیز دیکھئے عنوان ک ۔ ت ۔ ب)

حُکْمًا سے مراد وہ قوتِ فیصلہ (یا فہم) بھی ہے جو عام انسانوں کو حاصل ہوتی ہے، یعنی وحی کے بغیر۔ سورۃ قصص میں حضرت موسیٰ کے متعلق ہے کہ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَ اسْتَوٰی اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا وَّ عِلْمًا (۲۸/۱۴) جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا اور اس کے قویٰ میں اعتدال آگیا تو ہم نے اسے حکم (فہم ۔ قوت فیصلہ) اور علم عطا کیا ۔ سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ یہ بات حضرت موسیٰ کو نبوت ملنے سے پہلے کی ہے ۔ اس لئے اس سے مراد وہ حِکْمَۃ نہیں جو وحی کے ذریعے ملتی ہے۔ یہ وہ حکمت ہے جس کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے کہ خدا کے کسی حکم یا قانون کو، کب کسطرح اور کہاں ، زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق، منطبق کیا جائے اور اس کے اصولی حکم کو جزئیات پر چسپاں کرنے کے لئے کیا انداز تعبیر اختیار کیا جائے ۔ یا مختلف احکام میں سے کس کو مقدم اور کس کو موخر کیا جائے ، یہ ساری حکمتیں عقل ، فہم ، فراست سے تعلق رکھتی ہیں اور اس اَلْحِکْمَۃ سے الگ ہیں جو قرآن کریم کے اندر ہیں اور جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔ نبی اکرم کے متعلق قرآن کریم میں ہے یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیْھِمْ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ (۶۲/۲) ۔ اس میں تلاوتِ آیات ۔ تزکیہ ۔ تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت، چاروں الگ الگ چیزیں ہیں ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ رسول ایک تو ان قوانین اوران کی حکمت کی تعلیم دیتا ہے جو قرآن کریم کے اندر ہیں ۔ اور (اس نظام کی عملی تشکیل کے سلسلہ میں) بہت سی حکمتیں اس کے علاوہ بتاتا ہے اور اسطرح احکام خداوندی کے مناسب انطباق یا تقدیم و تاخیر وغیرہ کے فیصلے کرتا ہے ۔ اس تعلیم حکمت سے اُمت کو یہ سکھانا مطلوب ہوتا ہے کہ وہ بھی مختلف ادوار و حالات میں اسی طرح کی حکمتیں (سمجھ کی باتیں) کام میں لائے ۔ قرآن کریم کی بیان کردہ حکمت تو (اس کے قوانین کیطرح) غیر متبدل ہوگی لیکن یہ حکمت (عقل و فراست پر مبنی فیصلے) تغیرِ حالات سے بدلتی رہیگی ۔

حکومت ۔ قرآن کریم کا اصل الاصول یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے ، خواہ اسے ضابطہ

قوانین ، قوتِ فیصلہ اور نبوت تک بھی کیوں نہ دے دی گئی ہو (۳/۷۸) ۔ حکومت (لوگوں میں فیصلہ کرنے اور اپنے فیصلے منوانے) کا حق صرف خدا کو حاصل ہے (۱۲/۴۰) ۔ خدا کی یہ حکومت ، اس کی کتاب (قرآن کریم) کے ذریعے قائم ہوتی ہے (۶/۱۱۵) ۔ لیکن قرآن کریم کے فیصلوں کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت لاینفک ہے ۔ ایسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہینگے جسے سب سے پہلے رسول اللہؐ نے قائم کیا تھا ۔ اس نظام کے مرکز کی اطاعت ، خود خدا کی اطاعت تھی کیونکہ وہ مرکز خدا کے احکام کی اطاعت کراتا تھا اپنے فیصلوں کی نہیں (۳/۶۵ ; ۵/۴۸) ۔ رسول اللہؐ کے بعد یہ نظام علٰی حالہ آگے چلا ۔ ایسے خلافت علٰی منہاج رسالت کہتے ہیں ۔ (۳/۳۳ ,) الدین ، اپنی اصلی شکل میں صرف قرآنی مملکت کے اندر سامنے آسکتا ہے ۔ یہ انفرادی چیز نہیں ۔ ''خدا کی حکومت'' سے یہی مراد ہے ۔ یعنی قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرنا ۔ جو ایسا نہیں کرتے ، قرآن کریم انہیں کافر کہتا ہے (۵/۴۴) ۔ اس قسم کی حکومت ہر زمانے میں قائم ہو سکتی ہے ۔

ح ل ف

اَلْحَلْفُ والحَلِیفُ ۔ در اصل اس قسم کو کہتے ہیں جسکے ذریعہ ایک دوسرے کے ساتھ عہد و پیمان کیا جائے ۔ اس کے بعد اس کا استعمال عام قسم کے لئے بھی ہونے لگا* ۔ اَلْحِلْفُ ۔ معاہدہ جو لوگوں کے درمیان ہو ۔ دوستی نیز دوست ۔ اَلْحَلِیْفُ ۔ معاہد ۔ جس کے ساتھ عہد و پیمان کیا گیا ہو ۔ حَلَّافٌ ۔ بہت زیادہ قسمیں کھانے والا** (۶۸/۱۰) حَلَفَ ۔ یَحْلِفُ ۔ قسم کھانا** (۴/۶۲) ۔ در اصل اس کے بنیادی معنی لزوم کے ہیں ۔ یعنی ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ لگے رہنا*** ۔ اس سے اس کا مفہوم پابندی کرنا ہو گیا ۔

ح ل ق

حَلْقَۃٌ ۔ ہر گول گھیرے یا دائرہ کو کہتے ہیں ۔ خواہ وہ انسانوں کا ہو یا لوہے ، چاندی ، سونے وغیرہ کا ۔ اَلْحَلْقَۃُ ۔ زرہ ۔ ہتھیار ۔ رسی ۔ گول نشان جو اونٹ پر بنایا جاتا ہے** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں بال صاف کرنا ، سر کے بال مونڈنا بھی بتائے ہیں ۔ اس سے فعل حَلَقَ یَحْلِقُ کے معنے بال مونڈنے کے ہو گئے** ۔ راغب نے بھی حَلْقٌ کے اصلی

---

* محیط ۔ ** تاج ۔ *** ابن فارس ۔

معنے بال کاٹ دینے کے کئے ہیں**۔ اَلْحَلْقُ ۔ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے*۔ اس کے اندرونی حصہ کو حُلْقُوْم کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ (۴۸/۲۷) آیا ہے ۔ یعنی سر منڈانے والے ۔ اور حُلْقُوْم کا لفظ (۵۶/۸۳) میں بمعنے حلق آیا ہے ۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ ''سیدنا ابراہیمؑ کی اولاد میں پیشانی کے بال مقدس سمجھے جاتے تھے جیسے سکھوں میں کیس ، اور ہندؤں کے ہاں ''بودی،، (چوٹی) رکھنی۔ اہل عرب بال رکھتے اور نہایت عزت سے ان کی پرورش کرتے تھے اور پھر ان کو حج کے ایام میں مقام منٰی میں منڈواتے تھے ۔ اور یہ منڈوانا سر کٹانے کے برابر سمجھا جاتا تھا'' ***۔

ح ل ل

حَلَّ ۔ کے اصلی معنے گرہ کھولنے کے ہیں ۔ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِيْ (۲۰/۲۷) ۔ '' میری زبان کی گرہ کھولدے'' ۔ اسی طرح جب کسی جمی ہوئی چیز کو پگھلا دیا جائے تو اسے بھی حَلَّ کہتے ہیں ۔ یعنے اس کی گرہ کھل گئی ۔ اور وہ حل ہوگئی ۔ اسکے بعد حَلَّ الْمَكَانَ کے معنے ہو گئے کسی جگہ اترنا اور قیام کرنا ۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ دراصل حَلَّ الْاَحْمَالَ سے ماخوذ ہے جسکے معنے ہیں سامان کی رسیوں کی گرہ کھول کر اسے اونٹوں پر سے اتار لینا ۔ حَالَّهٗ کسی کے ساتھ اترنا ۔ قیام کرنا ۔ اس سے حَلِيْلٌ ہے جسکے معنے خاوند کے ہیں اور حَلِيْلَةٌ کے معنی بیوی ۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ (ایک ہی مکان میں) رہتے ہیں ۔ یا ایک دوسرے کے لئے حلال ہیں ۔ قرآن کریم میں حَلَائِلُ اَبْنَائِكُمْ آیا ہے (۴/۲۳) ۔ حَلَائِلُ جمع ہے حَلِيْلَةٌ کی ۔ یعنی تمہارے بیٹوں کی بیویاں ۔ اَلْحَالَّةُ ۔ محلہ ۔ قوم کی منزل ۔ اَلْحِلَّةُ ۔ اتری ہوئی قوم ۔ نیز محلہ ۔ اَلْحُلَّةُ جوڑا (کپڑوں کا) جس میں عموماً قمیص ، ازار ، چادر یا عمامہ ہوتا ہے (یہ لفظ کنایۃً بیوی کے لئے بھی بولا جاتا ہے) ۔ اَلْحِلُّ ۔ حرم کے حدود سے باہر کی جگہ ۔ اَلتَّحِلَّةُ ۔ وہ چیز جس سے قسموں کا کفارہ ادا کیا جائے (اور اسطرح قسموں کی گرہ کشائی کر لی جائے) حَلَّ اَمْرُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۔ اس پر خدا کا امر واجب ہوگیا ۔ عباب میں ہے کہ يَحِلُّ کے معنی واجب ہو جانے کے ہوتے ہیں اور يَحُلُّ کے معنے نازل ہونے (اترنے) کے * ۔

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** مولانا سندھی کی تفسیر المقام المحمود ۔ ص ۱۳۶

اَلْحَلَالُ (وَالْحِلَالُ) حرام کی ضد ہے۔ یعنی جس پر رکاوٹ کی گرہ نہ ہو۔ کھلی ہوئی چیزیں، جنکی حدود بندی نہ کی گئی ہو۔ اَلْحِلُّ وَالْحَلِيْلُ کے بھی یہی معنے ہیں*۔

سورۃ مائدہ میں ہے لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ (۵/۲)۔ یعنی شعائراللہ کے احترام اور تعظیم کی جو گرہیں باندھی گئی ہیں انہیں مت کھولو۔ انکا احترام کرو۔

واجب ہونے کے معنوں میں (۲۰/۸۱) میں ہے فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ "تم پر میرا غضب واجب ہو جائیگا" حج میں جانوروں کے ذبح ہونے کے مقام کے متعلق ہے ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (۲۲/۳۳) "ان کے ذبح ہونے کا مقام کعبہ ہے"۔ سورۃ البلد میں ہے وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ (۹۰/۲)۔ اسکے ایک معنے تو یہ ہیں کہ تو اس شہر میں مقیم ہے۔ لیکن اس میں حِلٌّ سے مراد حَلَالٌ بھی لی جا سکتی ہے (راغب) یعنی انہوں نے تیرے معاملہ میں اس بلد امین کی حرمت کا بھی لحاظ نہیں رکھا اور یہاں بھی تجھے تکالیف بہم پہنچائی ہیں اور تیری جان تک کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مولانا محمود الحسنؒ نے اس کے معنی لکھے ہیں "اور تجھ پر قید نہیں رہیگی اس شہر کی"۔

جہاں تک حرام و حلال کا تعلق ہے، قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ سوائے ان چیزوں کے جنہیں قرآن کریم میں حرام قرار دیدیا گیا ہے (دیکھئے عنوان ح۔ ر۔ م) کھانے پینے کی سب چیزیں حلال ہیں۔ ان پر ممانعت کی کوئی گرہ نہیں باندھی گئی۔ نہ ہی کسی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دیدے۔ (دیکھئے ۵/۸۷؛ ۶/۱۱۹-۱۴۰؛ ۶/۱۴۶؛ ۱۰/۵۹؛ ۱۶/۱۱۶؛ ۲۲/۳۰) حتیٰکہ رسول کو بھی اسکا اختیار نہیں دیا گیا (۶۶/۱)۔ سورۃ اعراف میں رسول اللہ ؐ کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (۷/۱۵۷)۔ وہ طیبات کو حلال اور خبائث کو لوگوں کے لئے حرام قرار دیگا: تو اس سے مراد وحی کے ذریعے ایسا کرتا ہے۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے (۶/۱۴۶؛ ۵/۱)۔

لیکن قرآن کریم نے حَلٰلًا کے ساتھ طَيِّبًا بھی کہا ہے (۲/۱۶۸)۔ یعنی جتنی حلال چیزیں ہیں ان میں سے جو تمہیں مرغوب ہوں وہ کھاؤ۔ ناخوشگوار چیزیں یا مضر چیزیں مت کھاؤ۔ (حلال) کھانے کی چیزیں دیدہ زیب بھی ہوں۔

* تاج و محیط۔

خوش ذائقہ بھی اور صحت کیلئے مفید بھی۔ یعنی ہر لحاظ سے خوشگوار۔ اس میں ہر فرد کے اپنے اپنے ذوق اور پسند کی رعایت رکھدی گئی ہے۔ نیز اجتماعی مصالح اور مفاد کی گنجائش بھی۔

اس مقام پر ایک نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی رو سے طیبات، حلال ہیں اور خبائث حرام۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے وہ سب فی ذاتہ طیب ہیں۔ یعنی پاکیزہ۔ مفید۔ منفعت بخش۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر حلال چیز کو بالضرور کھایا جائیگا۔ اگر کوئی چیز کسی کو نا پسند ہو، یا مضرت رساں، تو اسے اجازت ہے کہ وہ شے نہ کھائے۔ لیکن اسے حرام نہ سمجھے۔ اسی طرح اجتماعی مصالح کے پیش نظر، اسلامی معاشرہ، وقتی طور پر بعض چیزوں کے استعمال کو ممنوع قرار دے سکتا ہے۔

۔ ایسی پابندیاں عائد کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ لیکن کسی حلال چیز کو حرام سمجھ لینا یا اسے حرام قرار دیدینا قطعاً جائز نہیں۔ اسی طرح کسی حرام شے کو حلال قرار دیدینے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔

خدا کے نظامِ ربوبیت کے پیش نظر حلال و حرام کے معنے یہ بھی ہونگے کہ عام اشیائے فطرت جنہیں اللہ نے نوع انسانی کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے۔ یعنی رزق کے سرچشمے۔ انہیں کھلا (حلال) رہنے دو اور انہیں روک کر لوگوں کو اس کے استفادہ سے محروم نہ کرو۔ یہ بھی خدا کے حلال کو حرام کر دینا ہے۔ یہ قرآنی نظام معیشت کی اصل و بنیاد ہے۔ (Free Goods) کو (Economic Goods) میں تبدیل کرنا کبھی جائز نہیں قرار پاسکتا۔

(حرام و حلال کی مزید تفصیل کے لئے عنوان ح۔ ر۔ م بھی دیکھئے۔ اور عنوان ن۔ ع۔ م میں اَنْعَامٌ بھی۔ صَيْدُ الْبَحْرِ کے حلال ہونے کے لئے دیکھئے عنوان ب۔ ح۔ ر۔ آیت ۹۶/۵)۔

مُحِلٌّ۔ وہ جو حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھے۔ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ (۵/۱) شکار کو حلال نہ قرار دینے والے۔ حِلٌّ۔ بمعنی حَلَالٌ (۵/۵)۔ تَحِلَّةٌ۔ قسم کا کفارہ۔ جس سے قسم کی پابندی سے رہائی مل جائے (۶۶/۲)۔

ح ل م

اَلْحُلُمُ۔ اَلْحُلْمُ۔ خواب*۔ جمع اَحْلَامٌ (۴۴/۱۲)۔ خواب میں جماع۔ اور چونکہ یہ کیفیت بالغ ہونے کی دلیل ہے اس لئے سن تمیز و بلوغت کو بھی

* تاج

الحُلُمُ کہتے ہیں*۔ (۲۳/۵۹) ۔ چونکہ سن تمیز کے ساتھ عقل و تمیز بھی آ جاتی ہے اس لئے اَلْحِلْمُ متانت ، وقار و سکون ، عقل و تدبر اور ضبط نفس کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا ۔ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَا (۵۲/۳۲) کیا ان کا فہم و تدبر ، ان کی متانت و سنجیدگی ، ان کی فرزانگی اور وقار انہیں اسی کا حکم دیتے ہیں ۔ اَلْحِلْمُ کے معنے ہیں طبیعت پر ایسا ضبط رکھنا کہ غیظ و غضب کے موقع پر بھی انسان بھڑک نہ اٹھے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں جلدی نہ کرنا ۔ یعنی ذرا سی بات پر جھٹ سے بھڑک نہ اٹھنا ۔ چنانچہ تَحَلَّمَ الْمَالُ ۔ اس وقت کہتے ہیں جب مویشی فربہ ہو جائیں ۔ (اور ان میں قوت برداشت پیدا ہو جائے) ۔ اَلْحَلِيْمُ خدا کی صفت ہے جس سے مراد یہ ہے کہ نہ اسے نافرمانوں کی نافرمانیاں بھڑکاتی ہیں اور نہ اسے غصہ جلد بازی اور اوچھے پن پر اکساتا ہے ۔ بلکہ اس نے ہر چیز کے لئے ایک پیمانہ (قانون) مقرر کر رکھا ہے جس تک وہ چیز بہرحال پہنچ جاتی ہے*۔ (یعنی ہر عمل کا نتیجہ) ۔ لہذا حَلِيْمٌ کے معنے ہیں سمجھدار۔ ثقہ ۔ بھاری بھرکم ۔ پروقار ۔ ہمیشہ اصول اور قانون کے مطابق کام کرنے والا ۔ جو یونہی جذبات سے بھڑک نہ اٹھے ۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ (۱۱/۷۵) ۔ ''یقیناً ابراہیم بردبار ، غمگسار اور خدا کی طرف رجوع کرنے والا تھا'' ۔ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ (۳۷/۱۰۱) ۔ ''ہم نے ابراہیم کو ایک حلیم بیٹے کی خوشخبری دی ۔

ہمارے ہاں حِلْم (حلیم الطبع) سے مراد انکسار ۔ فروتنی ۔ نرم مزاجی لی جاتی ہے ۔ یہ ہمارے اپنے لغت کے معنے ہیں ۔ محض فروتنی تو ضعف اور کمزوری کی پیدا کردہ بھی ہوتی ہے لیکن حِلْمٌ قوت اور توانائی کا مظہر ہوتا ہے جس سے انسان کو اپنے اعصاب پر پورا کنٹرول ہوتا ہے اور وہ بڑے سے بڑے اشتعال انگیز حالات میں بھی ضابطہ اور قانون کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور کوئی بات بے سمجھی کی نہیں کرتا ۔ جس میں مقابلہ کی قوت نہ ہو اس کا جھکنا شکست اور ذلت ہے ۔ سرکشی کی قوت رکھتے ہوئے ، قانون و ضوابط کے سامنے جھکنا ، شرف انسانیت ہے ۔

ح ل ی

اَلْحَلْیُ ۔ زیور ، سامان آرائش ، جو معدنیات ڈھال کر یا قیمتی پتھر وغیرہ سے تیار کیا جاتا ہے* ۔ جمع حُلِیٌّ ۔ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا (۷/۱۴۸) ''ان کے

* تاج ۔ **راغب

زیورات سے بچھڑا (بنایا)"۔ اَلْحِلْیَۃُ۔ آرائش کی چیز۔ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْہُ حِلْیَۃً (۱۶/۱۴)۔ تم سمندر سے آرائش کی چیزیں (موتی وغیرہ) نکالتے ہو۔ حَلَّاھَا تَحْلِیَۃً۔ اس نے عورت کو زیور پہنایا*۔ یُحَلَّوْنَ فِیْھَا۔۔۔۔ (۱۸/۳۱) "انہیں وہاں آرائش و زیبائش کی چیزیں پہنائی جائینگی"۔ اس کے بنیادی معنے تحسین و آرائش کے ہیں (ابن فارس)۔

ح م أ

اَلْحَمْأَۃُ وَ الْحَمَأُ۔ سیاہ بدبودار کیچڑ۔ خراب بگڑی ہوئی مٹی۔ حَمِیَ الْمَاءُ۔ پانی سیاہ بدبودار کیچڑ کے ملنے کی وجہ سے گدلا اور بدبودار ہوا ایسا پانی یا ایسے پانی والی جگہ حَمِیٌ* کہلائیگی، مؤنث حَمِئَۃ**۔ قرآن کریم نے انسانی تخلیق کے ابتدائی مراحل کے متعلق کہا ہے کہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاٍ مَسْنُوْنٍ (۱۵/۲۶)۔ سیاہ متغیر شدہ مٹی کے اوپر جو پپڑی سی جم جائے، تخلیق انسانی کی ابتدا خدا نے اس سے کی۔ اسی کو طِیْنٍ لَّازِبٍ (۳۷/۱۱) کہا گیا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ زندگی کے اولین جرثومہ (Life Cell) کی نمود پانی اور مٹی کے امتزاج سے ہوئی۔ (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملیگی)۔

قرآن کریم نے بحر اسود کو عَیْنٍ حَمِئَۃٍ (۱۸/۸۶) کے الفاظ سے متعارف کرایا ہے۔

نوٹ: عنوان ح۔ م۔ ی کا آخری حصہ بھی دیکھئے۔

ح م د

حَمْدٌ۔ کسی نہایت حسین۔ متناسب۔ نادر شاہکار کو دیکھ کر انسان کے دل میں تحسین و ستائش (Appreciation) کے جو جذبات پیدا ہوں، ان کے اظہار کا نام حمد ہے جس سے مقصد اس شاہکار کے خالق کی عظمت و برتری کا اعتراف کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے چند شرائط ہیں جنہیں صاحب محیط نے یوں بیان کیا ہے۔

(۱) جس حسن و رعنائی اور شاہکاری کی ستائش کی جا رہی ہے وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس شے ہونی چاہئے (جیسے افعال محمودہ۔ مقام محمود۔ صفات محمودہ وغیرہ۔) غیر محسوس اور مشاہدہ میں نہ آنے

* تاج۔ ** تاج و محیط و راغب۔

والی چیزوں کے متعلق ہمارے دل میں جذبات تحسین وستائش پیدا نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہم کسی مصور کی تعریف اسکی ان تصاویر کے ذریعہ ہی کر سکتے ہیں جو مرئی طور پر ہمارے سامنے آ جائیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان نمود و نمائش کا ذوق رکھنے والوں پر طنز کیا ہے جو بغیر تعمیری اور نفع بخش کام کرنے کے اپنی ستائش چاہتے ہیں۔ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا* بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا (۳/۱۸۷)۔ "وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ کرتے نہیں"۔

(۲) کسی کی جس بات یا جس کام کی تعریف کی جا رہی ہے وہ اس سے اختیاری طور پر سرزد ہونی چاہئے (تا کہ اس کی انفرادی خودی کے زندہ و بیدار ہونے کا اندازہ کیا جا سکے)۔ اضطراری طور پر (خود بخود یونہی میکانکی انداز سے) کسی فعل کا سرزد ہو جانا ستائش کا حق پیدا نہیں کرتا۔ حتّٰی کہ وہ حسن جو کسی میں پیدائشی طور پر موجود ہو اسکے لئے بھی حمد کا لفظ نہیں بولا جاتا۔ مدح کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ (مَدَحَ الْجَمَالَ) اگر کوئی مشین نہایت عمدہ چیزیں بنا رہی ہے تو وہ مشین قابل حمد نہیں۔ بلکہ قابل مدح ہوگی اور اسکا بنانے والا مستحق حمد۔ یہی صورت رقص طاؤس کی ہے۔ طاؤس مستحق مدح ہے اور اس کا خالق (خدا) سزاوار حمد۔

(۳) حَمْدٌ کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس چیز کی حمد (ستائش) کی جا رہی ہے اسے ستائش کرنے والے کا دل بھی پسند کرتا ہو۔ کسی کے دباؤ سے اسکی تعریف کرنا حمد نہیں، مدح ہے۔ نہ ہی حمد میں ملمع کاری، نمائش، منافقت، یا کسی کو بنانے کے لئے تعریف کرنے کا کوئی دخل ہو سکتا ہے۔ حمد میں جذبات تحسین بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں۔

(۴) جس چیز کی حمد کی جا رہی ہے اسکا ٹھیک ٹھیک علم ہونا بھی ضروری ہے۔ محض گمان کی بنا پر حمد نہیں کی جا سکتی۔ مبہم تصورات، دھندلے نقوش، اور شکوک و تذبذب پیدا کرنے والے خیالات و معتقدات کبھی حمد کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔ حمد، فریب تخیل، توہم پرستی اور اندھی عقیدت سے نہیں ابھرتی۔ اسکا سرچشمہ یقین محکم اور ایمان مکمل ہوتا ہے۔ (مدح ظنی چیزوں کی بھی کی جا سکتی ہے مگر حمد نہیں)۔

(۵) جن نفع بخش، کشش انگیز باتوں اور حسن و تناسب کے شاہکاروں کی حمد کی جا رہی ہو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کمال کے درجہ تک پہنچ

* ہو سکتا ہے کہ یہاں حمد مجازاً بمعنی مدح استعمال ہؤا ہو۔

چکے ہوں اور انکی نفع بخشیاں محسوس* ہوں۔ جو آرٹ تکمیل تک نہ پہنچا ہو یا جو آرٹ انسانیت کے لئے نفع بخش نہ ہو وہ مستحق حمد و ستائش نہیں ہوتا۔ (جیب کترے کی ہاتھ کی صفائی وجہِ حمد نہیں ہو سکتی)

ان شرائط کے ساتھ جذباتِ تحسین و ستائش کے اظہار کا نام حَمْدٌ ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک شرط کی بھی کمی ہے تو اسکے لئے حَمْدٌ نہیں بلکہ مَدْحٌ کا لفظ بولا جائیگا۔ (قرآن کریم میں خدائی شاہکاروں کیلئے ہر جگہ حَمْدٌ کا لفظ آیا ہے۔ مَدْحٌ کا لفظ ایک جگہ بھی نہیں آیا)۔

(واضح رہے کہ ثناء کا لفظ مدح اور ذم دونوں کے لئے استعمال ہو سکتا ہے**)

لہذا جہاں قرآن کریم میں ہے کہ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ (۱۳/۱۳)۔ "گرج، اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے***"۔ یا وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳۰/۱۸) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں حمد اسی کے لئے ہے"۔ یا وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (۱۷/۴۴) "کوئی شے ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح نہ کرتی ہو"۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام کائناتی قوتیں، اس قسم کے تعمیری اور منفعت بخش نتائج پیدا کرنے میں مصروفِ عمل ہیں جو خدا کی حمد و تحسین کے زندہ پیکر ہیں۔ حتّٰی کہ اس مقصد کیلئے جب تخریبی قوتوں کو راستہ سے ہٹایا جاتا ہے تو یہ کام بجائے خویش وجہ ستائش ہوتا ہے۔ چنانچہ ظالم قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں کہا۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶/۴۵) "ظلم کرنے والی قوموں کی جڑ کٹ گئی۔ اور اللہ رب العالمین کے لئے حمد ہے"۔ اسی لئے خدا کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ عَزِيْزٌ بھی ہے اور حَمِيْدٌ بھی (۱۴/۱)۔ یعنی اپنے غلبہ واقتدار سے تخریبی قوتوں کو راستے سے ہٹا کر، تعمیری پروگرام کو اسطرح کامیاب بنانے والا کہ اس کے منفعت بخش نتائج خدا کی حمد و ستائش کی منہ بولتی تصویر بن جائیں۔ دوسری جگہ ہے لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (۶۴/۱)۔ ہر طرح کا اقتدار و ستائش اس کے لئے ہے۔ جلال و جمال کا سرچشمہ وہی ہے۔ مومنین کی صفات میں یہ بھی ہے کہ وہ حَامِدُوْنَ (۹/۱۱۲) حمد کرنے والے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انسان کو علم الاسماء، یعنی اشیائے کائنات کا علم۔ (علم الفطرت) دیا گیا ہے (۲/۳۱) کیونکہ

* (محیط) ** (المنار)۔ *** تسبیح کے معنی ہیں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں پوری قوت کے ساتھ سرگرم عمل رہنا۔ دیکھئے عنوان س۔ ب۔ ح۔

جب ملائکہ (کائناتی قوتوں) نے کہا کہ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (۲/۳۰)۔ "ہم تیری حمد وستائش کی نمود کیلئے ہمیشہ سر گرم عمل رہتے ہیں" تو اسکے جواب میں یہی کہا گیا کہ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا (۲/۳۱) آدم کو تمام اشیائے کائنات کا علم عطا کر دیا گیا" ۔ لیکن اسکا یہ علم اُسی صورت میں کائنات کو وجہ ستائش خداوندی بنا سکتا ہے جب وہ اپنے علم کے ماحصل کو وحی کے تابع رکھے ۔ اس لئے اس سے کہدیا گیا کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸) جو قوم خدا کی راهنمائی کے پیچھے چلے گی وهی خوف و حزن سے محفوظ رہے گی۔ یہ وہ مَقَامًا مَحْمُوْدًا ہے ۔ (۱۷/۷۹)۔ ایسی پوزیشن جو سراپا وجہ حمد و ستائش ہو) جس پر نبی اکرم فائز ہوئے ۔ وہ خود اَحْمَدُ (۶۱/۶) (بہت زیادہ حمد و ستائش کرنے والے) تھے** ۔ اسلئے (جیسا آپ کا دوسرا نام تھا ویسے ہی عملاً) مُحَمَّدٌ (۴۸/۲۹) ہو گئے ۔ یعنی وہ جو مسلسل و پیہم وجہ حمد وستائش ہو* (جسکی یکے بعد دیگرے ستائش کی جائے) رسول اللہ کا نام اَحْمَدُ بھی تھا اور مُحَمَّدٌ بھی ۔ اِسْمُهٗ اَحْمَدُ (۶۱/۶)۔ اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (۴۸/۲۹)۔ کتاب الاشتقاق میں ہے کہ مُحَمَّدٌ (مُفَعَّلٌ) کے معنی ہیں وہ جس کی یکے بعد دیگرے حمد کی جائے اور مَحْمُوْدٌ وہ ہے جس کی ایک بار حمد کی جائے ۔ اَقْرب الموارد میں مُحَمَّدٌ کے معنی ہیں الذی کثرت خصاله المحمودة۔ جو بکثرت قابل ستائش خصلتیں رکھتا ہو۔

حمد کے جو معانی اوپر دیئے گئے ہیں ان کی روشنی میں قرآن کریم کی سب سے پہلی آیت (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ - ۱/۱) پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان چار لفظوں سے قرآن کریم نے کسطرح اس عظیم حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ کائنات کا ہر حسین گوشہ اور منفعت بخش پہلو خدا کے اس عالمگیر قانون ربوبیت کے وجہ حمد وستائش ہونے کی زندہ شہادت ہے جو ہر شے کو اس کے نقطہ آغاز سے بتدریج اوج کمال تک لے جا رہا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ حمدیت محض ایک عقیدہ کا نام نہیں بلکہ وہ جذبہ تحسین ہے جس کا اظہار نظام کائنات پر غور و فکر سے بیساختہ ہو جاتا ہے ۔ جو قوم نظام کائنات پر غور نہیں کرتی وہ اس کے خالق کے کمال کو کسطرح (Appreciate) کر سکتی ہے؟ نیز جو اس کے نظام ربوبیت کو عملاً متشکل نہیں کرتی وہ کیسے سمجھ سکتی ہے کہ اس کے نتائج کس درجہ مستحق حمد و ستائش

*تاج ۔ **بعض کا خیال ہے کہ اس میں فاعلی معنی نہیں بلکہ مفعولی معنی ہی ہیں ۔ یعنی جو سب سے زیادہ مستحق ستائش ہو ۔

ہیں ۔ ''خدا کی حمد کرنا'' ایک عملی پروگرام ہے ۔یعنی نظام خداوندی کو عملاً متشکل کرکے ایسے محیرالعقول اور درخشندہ نتائج پیدا کرنا جنہیں دیکھکر دنیا کی ہر قوم پکار اٹھے کہ جس خدا نے ایسے قوانین عطا کئے ہیں وہ واقعی مستحق حمد وستائش ہے ۔

ح م ر

اَلْاَحْمَرُ ۔ سرخ ۔ اسکی جمع حُمْرٌ ہے* ۔

جُدَدٌ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ (۳۵/۲۷) ۔ سفید اور سرخ رنگ کی تہیں یا دھاریاں ۔

اَلْحِمَارُ ۔ گدھا ۔ (۲/۲۵۹) ۔ اس کی جمع حُمُرٌ ہے ۔ سورۃ مدثر میں ہے حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ (۷۴/۵۰) ۔ گھبرا کر بدکنے والے گدھے ۔

ح م ل

حَمَلَ ۔ يَحْمِلُ ۔ حَمْلاً ۔ بار اُٹھانا ۔ اپنے اوپر لادنا ۔ اِحْتَمَلَ ۔ اٹھانا ۔ اَلْحَمْلَةُ ۔ جنگ میں پلٹ کر حملہ بول دینا* ۔ حَمَّلَ ۔ کسی پر لادنا ' بار اٹھوانا ، کسی کے ذمہ کوئی کام لگا دینا ۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ (۶۲/۵) جن لوگوں پر احکام تورات کی بجاآوری کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی ۔ اِحْتَمَلَ ۔ اپنے اوپر بار لینا ۔ (۴/۱۱۲) ۔ حَمُوْلَةٌ ۔ باربرداری کا جانور* ۔ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا (۶/۱۴۳) ۔ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۱۱۱/۴) ۔ چغلخور* ۔ لگائی بجھائی کرنے والی ۔ مخالفت کے سامان جمع کرنے والی ۔ حَمَلَ ۔ کسی کو اپنی جگہ سے اٹھا دینا** ۔ یعنے تباہ و برباد کر دینا ۔ وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ (۶۹/۱۴) ۔ ''اور ارض و جبال تباہ کر دئے جائینگے'' ۔

حَمَلَ الْاَمَانَةَ ۔ امانت میں خیانت کرنا *** ۔ سورۃ احزاب میں ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلاً (۳۳/۷۲) ۔ ''ہم نے امانت کو آسمانوں زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا ۔ اور اس (خیانت) سے ڈر گئے ۔ لیکن انسان اس میں خیانت کرتا ہے ۔

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** تاج و محیط ۔

یہ بڑا ہی ظالم اور نادان ہے"۔ یعنی خدا نے اپنے قوانین کی اطاعت کی امانت کو خارجی کائنات کے سپرد کیا تو اس نے اس میں کسی قسم کی خیانت نہیں کی ۔تمام اشیائے کائنات اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں رہتی ہیں۔ لیکن یہی قانون جب انسان کو دیا تو یہ اس میں خیانت کرتا ہے ۔ اسکی اطاعت نہیں کرتا ۔ یہ بڑا نادان ہے اور اپنے آپ پر زیادتی کرتا ہے۔

سورۃ عنکبوت میں ہے وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا (۲۹/۶۰) ۔ صاحب تاجُ العروس نے لکھا ہے کہ یہاں حمل رزق کے معنی ذخیرہ اندوزی کرنے کے ہیں* ۔ قرآن کریم نے یہاں ایک اہم حقیقت کیطرف توجہ دلائی ہے ۔ رزق کو سمیٹ کر رکھنے کا جذبہ انسان ہی میں ہے ۔ حیوانات میں نہیں (یہ جو ہم چیونٹیوں ، چوہوں وغیرہ کو ذخیرہ اندوزی کرتے دیکھتے ہیں تو تحقیقات نے بتایا ہے کہ یہ محض عادۃً ایسا کرتے ہیں ۔ کسی مقصد کے ماتحت نہیں ۔) علاوہ ازیں ان کا جمع کردہ ذخیرہ ان کی قوم کے تمام افراد کے کام آتا ہے ۔ وہ گراں فروشی یا نفع اندوزی کے لئے ایسا نہیں کرتے ۔ جب ایک گائے اپنا پیٹ بھر لیتی ہے تو باقیماندہ چارےکو سنبھال کر شام کے لئے نہیں رکھ لیتی۔ یہ انسان ہی کرتا ہے ۔ اور مقصد اس سے گراں فروشی اور نفع اندوزی ہوتا ہے ۔ اس کی یہی ہوس ہے جو تقسیم رزق میں اس قدر فساد کا موجب بنی ہوئی ہے ۔ جس کے پاس قوت ہوتی ہے وہ سب کچھ سمیٹ کر ذخیرہ کر لیتا ہے اور کمزور اور غریب بھوکے مرتے ہیں ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اللّٰہُ یَرْزُقُهَا وَ اِیَّاکُمْ (۲۹/۶۰) ۔ اللہ ان حیوانات کو بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی ۔ حیوان صرف ضروریات پورا کرتے ہیں اور تم ذخیرہ اندوزی شروع کر دیتے ہو ۔ یہ روش فسادِ آدمیت کا موجب ہے ۔ (تفصیل میری کتاب نظام ربوبیت میں ملیگی ۔)

سورۃ اعراف کی ایک آیت میں کہا گیا ہے کہ اپنے جذبات کا اتباع کرنے والوں کی مثال كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ (۷/۱۷۶) ہے ۔ حَمَلَ عَلٰی کے معنی کسی کو چلا کر تھکا دینے کے ہیں* ۔ لہٰذا آیت کے معنی یہ ہوئے کہ کتے کی یہ حالت ہے کہ اگر تو اسے چلا چلا کر (دوڑا دوڑا کر) تھکا مارے تب بھی وہ ہانپتا رہے اور اگر اسے ویسے ہی چھوڑ دے تب بھی وہ ہانپتا رہے ۔ اسے کسی شکل میں بھی سکون اور اطمینان نہیں ملتا ۔ یا پھر یہ حَمَلَهٗ عَلَى الْاَمْرِ

* تاج و محیط ۔

سے ہوسکتا ہے جسکے معنے ہیں اسے کسی کام پر اکسایا* ۔ جیسے کتے کو شکار پر لپکایا جاتا ہے ، یعنی تم خواہ کتے کو شکار پر لپکا کر دوڑاؤ یا اسے بیٹھا رہنے دو ، وہ بہر حال ہانپتا ہی رہے گا ۔ بیشتر اہل تفاسیر نے یہاں حَمَلَ عَلَیْهِ کے معنے حملہ کرنے ، ٹوٹ پڑنے اور اس کو مار کر بھگانے اور دھتکارنے کے کئے ہیں ۔

ح م م

حَمَّ التَّنُّوْرَ حَمًّا ۔ اس نے تنور میں ایندھن ڈال کر اسے گرم کیا ۔ حَمَّ الشَّحْمَةَ ۔ اس نے چربی کو پگھلایا ۔ حَمَّ الْمَاءَ حَمًّا ۔ اس نے پانی گرم کیا ۔ اَلْحُمَامُ ۔ اونٹوں یا تمام جانوروں کا بخار ۔ حَمٌّ ۔ فکر ۔ غم ۔ اِحْتَمَّ لَهٗ ۔ وہ اس کے لئے فکر مند ہوا**۔ اِحْتَمَّ الرَّجُلُ ۔ آدمی فکر کی وجہ سے سو نہیں سکا ۔ اِحْتَمَّتِ الْعَيْنُ ۔ بغیر کسی درد کے آنکھ نہیں لگ سکی یعنی نیند نہ آئی*** ۔ اہل جہنم کے متعلق ہے لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۶/۷۰) ۔ وہ پینے کی چیز جو راحت جان ہونے کے بجائے سخت اذیت کا موجب بن جائے ۔ یعنی عذاب الیم ۔ لطائف اللغۃ میں ہے کہ اس کے معنی گرم پانی اور سرد پانی دونوں کے ہیں ۔ سورۃ واقعۃ میں ہے وَّ ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ (۵۶/۴۳) ۔ اس کے معنے ہیں گرم سیاہ دھوئیں کا سایہ ۔

اَلْحَمِيْمُ ۔ قریبی رشتہ دار جس کی خاطر فکر مند رہا جائے ، یا جس کے دل میں تمہاری محبت ہو اور تمہارے دل میں اسکی محبت ہو ، یا وہ جو اپنے متعلقین کی حمایت کا جوش دل میں رکھتا ہو ۔ اور ان کے لئے گرمجوشی اور تپاک کا اظہار کرتا ہو* ۔ قرآن کریم نے اسے دلسوز دوست اور غمخوار رفیق کے معنوں میں استعمال کیا ہے (۴۱/۳۴) ۔ نیز حُمَّ الْاَمْرُ کے معنے ہیں اس امر کا فیصلہ ہو گیا ۔ حَمَّ ۔ حَمَّهٗ ۔ اس نے اس کا ارادہ کیا ۔ حَمَّ اللّٰهُ كَذَا وَ اَحَمَّهٗ ۔ خدا نے اس کے لئے ایسا فیصلہ کر دیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں گرم ہونا اور ارادہ کرنا شامل ہیں۔

ح م ی

حَمَى الشَّيْءَ ۔ چیز کی حفاظت کی ۔ كَلَأٌ حِمًى ۔ حفاظت کی ہوئی گھاس ۔ اَلْحَمِيُّ ۔ وہ بیمار جسے نقصان دہ چیزوں سے روک دیا گیا ہو ۔ لہذا اَلْحَامِيَةُ ۔ وہ ہے جو کسی کی حفاظت کرے یا اسے نقصان دہ امور سے روکے* ۔ حمایت میں یہ دونوں چیزیں آجاتی ہیں ۔

---

* تاج و محیط ۔ ** حَمَّ دراصل هَمَّ سے اور اِحْتَمَّ لَهٗ اِهْتَمَّ لَهٗ سے بدل کر آئے ہیں ۔ *** تاج و محیط و راغب ۔

. حَامٍ۔ ایام جاھلیت میں یہ رسم تھی کہ وہ نر اونٹ جو مقررہ تعداد میں اونٹنیوں کو حاملہ کر چکا ھو اسے آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ (جیسے ھندؤں میں سانڈ چھوڑ دیتے ھیں) اس سے بار برداری کا کام نہیں لیتے تھے۔ اور وہ سانڈوں کی طرح آزاد پھرتا تھا جہاں جی چاھے جائے اور جہاں سے جی چاھے کھائے پیئے۔ اس میں ایک قسم کا توھم پرستانہ تقدس آجاتا تھا۔ قرآن کریم نے اس سے روکا ھے (۵/۱۰۳)۔

حَمِيَتِ الشَّمْسُ وَالنَّارُ تَحْمٰی۔ سورج اور آگ کی گرمی سخت ھوگئی۔ قرآن کریم میں ھے نَارٌ حَامِيَةٌ (۱۰۱/۱۱) سخت گرم آگ۔ ویسے حَمِيْتُ عَلٰی فُلَانٍ کے معنے ھوتے ھیں میں فلاں پر غصہ ھوا **۔ اَلْحُمَيَّا۔ جوش یا شدت غضب کو کہتے ھیں *۔ حَمِيَ الْمِسْمَارُ۔ میخ گرم ھوگئی *۔ قرآن کریم میں سرمایہ پرستوں کی دولت کے متعلق ھے يَوْمَ يُحْمٰی عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ (۹/۳۵)۔ "جس دن اسے جہنم کی آگ میں تپایا جائیگا"۔ اسی (گرمی) سے اَلْحَمِيَّةُ ھے جسکے معنے غیرت اور ضد کے ھیں *۔ اس سے مطلب یہ ھوتا ھے کہ انسان جس چیز کو عزیز رکھتا ھے اس کی حفاظت کے لئے وہ گرمجوشی دکھائے۔ اگر وہ شے فی الواقعہ اچھی ھے تو یہ جذبہ قابل ستائش قرار پائیگا۔ اور اگر وہ شے مذموم ھے تو یہ جذبہ بھی مذمت کے قابل ھو جائیگا۔ زمانہ قبل از اسلام میں عرب اپنے معاشرہ کے رسوم و رواج کے تحفظ میں بڑی گرمجوشی دکھاتے تھے۔ چونکہ ان رسوم و رواج میں بیشتر مذموم تھے اس لئے قرآن کریم نے اُس جذبہ کو حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ (۴۸/۲۶) کہکر پکارا ھے۔

اِحْمَوْمَی الشَّيْءُ۔ چیز سیاہ ھوگئی۔ جیسے رات اور بادل *۔

ح ن ث

اَلْحِنْثُ۔ گناہ، معصیت، نافرمانی **۔ (خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرنا)۔ سورۃ واقعہ میں ھے وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ (۵۶/۴۶) "یہ لوگ بڑے بڑے سخت جرائم پر مصر رھا کرتے تھے۔" اَلْحِنْثُ۔ عمداً جھوٹی قسم کھانے یا قسم کھا کر اسے پورا نہ کرنے کو بھی کہتے ھیں ***۔ نیز حق سے باطل کی طرف رجوع کرنے کو بھی ****حَنِثَ فُلَانٌ فِي كَذَا۔ اس نے کسی بارے میں گناہ اور کوتاھی کی، اسی سے جب بچہ جوان ھو جائے یعنی اس میں گناہ کرنے کی قوت آجائے تو کہتے بَلَغَ الْغُلَامُ الْحِنْثَ

* تاج۔ ** راغب۔ *** تاج و راغب۔ **** اقرب الموارد۔

یہ اس لئے کہ سن شعور کے بعد بچہ اپنے اچھے اور برے کاموں کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اگر اس سے کسی حکم کی خلاف ورزی ہو جائے تو وہ مجرم گردانا جاتا ہے۔ (ابن فارس)۔ اور تَحَنَّثَ کے معنے گناہوں سے باز رکھنے کے ہیں *۔

قرآن کریم میں قصۂ حضرت ایوبؑ میں ہے وَلَا تَحْنَثْ (۳۸/۴۴) (تو اپنی بیماری کا علاج جڑی بوٹیوں سے کر اور جھاڑ پھونک کی توہم پرستیوں میں مبتلا ہو کر) حق سے باطل کی طرف مائل نہ ہو۔ (اس کے لئے عنوان ض غ ث۔ بھی دیکھئے)

ح ن ج ر

اَلْحَنْجَرَۃُ۔ حلق۔*** سانس کی نالی** جمع حَنَاجِرُ (۳۳/۱۰)۔ حَنْجَرَہٗ اس نے اسے ذبح کر دیا ***۔

ح ن ذ

اَلْحَنْذُ۔ گرم پتھروں کے درمیان گوشت بھون کر کباب بنا لینا *۔ حَنِیْذٌ۔ اس گرم گرم گوشت کو کہتے ہیں جس سے، بُھننے کے بعد ابھی پانی ٹپک رہا ہو ***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو پکا دینا۔

سورۃ ھود میں ہے کہ حضرت ابراهیمؑ اپنے مہمانوں کے لئے عِجْلٌ حَنِیْذٌ (۱۱/۶۹) لیکر آگئے۔ یعنی بُھنا ہوا بچھڑا (مسلّم)۔

ح ن ف

اَلْحَنَفُ۔ پاؤں کا ٹیڑھا اور مڑا ہوا ہونا۔ رِجْلٌ حَنْفَاءُ۔ مڑا ہوا پاؤں۔ اسی سے حَنِیْفٌ اسے کہتے ہیں جو غلط راستے سے ہٹ کر (مڑ کر) سیدھی راہ پر آجائے۔ راغب نے کہا ہے کہ حَنَفٌ، گمراہی سے ہٹ کر استقامت (صراط مستقیم) کی طرف مائل ہونے کو کہتے ہیں ****۔ اس میں یکسو ہونے کا مفہوم غالب ہے۔ تفسیر المنار میں ہے کہ حَنِیْفٌ لغت میں مائل کو کہتے ہیں۔ حضرت ابراهیمؑ پر اس لفظ کا اطلاق اس لئے کیا گیا ہے کہ ان کے زمانے میں لوگ طریقۂ کفر کی پیروی کرتے تھے۔ انہوں نے ان سب کی مخالفت کی اور انکے طریقہ سے ہٹ کر دین مستقیم اختیار کر لیا *****۔

* تاج و راغب۔ ** محیط۔ *** تاج۔ **** تاج و محیط و راغب۔ ***** المنار جلد (۱) صفحہ ۴۸۰۔

قرآن کریم میں رِجْسٌ اور قَوْلُ الزُّوْرِ کے اجتناب کے بعد کہا ہے حُنَفَاءَ لِلّٰہِ (۲۲/۳۰-۳۱)۔ اس سے حَنِیْفٌ کا صحیح مفہوم سامنے آ جاتا ہے۔ یعنی ہر غیر خداوندی قانون و روش زندگی سے منہ موڑ کر خدا کے قوانین کی طرف آجانے والا۔ غَیْرَ مُشْرِکِیْنَ بِہٖ (۲۲/۳۱) اور ان قوانین کے ساتھ کسی اور کی اطاعت کو نہ شامل کرنے والا۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ یعنے پہلے ہر غیر خدائی طاقت سے منہ موڑا جائے (یَکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ) اور اسکے بعد اللہ کے قانون پر ایمان لایا جائے (یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ (۲/۲۵۶))۔

یہی مطلب لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ہے۔ "یعنی کوئی صاحب اقتدار ہستی نہیں بجز اللہ کے"۔ لہذا ہر مومن حَنِیْفٌ ہوتا ہے۔ یہی حضرت ابراہیم کی روش تھی جنہیں قرآن کریم نے حَنِیْفٌ کہکر پکارا ہے (۲/۱۳۵)۔ ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے والا۔

ح ن ک

اَلْحَنَکُ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ منہ کے اندرونی حصہ (تالو) کو کہتے ہیں۔ لیکن دوسروں نے کہا ہے کہ یہ منہ کے نچلے حصے، یعنی ٹھوڑی کے نچلے حصہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے کہتے ہیں تَحَنَّکَ فُلَانٌ۔ وہ اپنی پگڑی کا بل ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر اوپر لے گیا۔ اَلْحِنَاکُ۔ وہ بندھن جس سے قیدی کو اسطرح باندھا جاتا تھا کہ اگر وہ اسے ذرا بھی کھینچے تو اسکی ٹھوڑی کے نچلے حصہ میں تکلیف محسوس ہو**

جانور (گھوڑے گدھے وغیرہ) کے منہ میں ایک تو لگام دی جاتی ہے اور جب لگام نہ ملے تو ایک رسی لے کر اسے اسکے نچلے جبڑے میں دے کر ٹھوڑی کے نیچے بل دیدیا جاتا ہے اور اسطرح اسے پکڑ کر لے چلتے ہیں۔ اسے اِحْتِنَاکٌ کہتے ہیں۔ چنانچہ اہل عرب کہتے ہیں لَمْ اَجِدْ لِجَامًا فَاحْتَنَکْتُ دَابَّتِیْ۔ مجھے لگام نہیں ملی تو میں نے اپنی سواری کے منہ میں رسی ڈال دی اور اسطرح اسے لے چلا۔ اسی سے اسکے معنے کسی پر غالب آجانے کے آتے ہیں۔ اِحْتَنَکَ الْجَرَادُ الْاَرْضَ۔ ٹڈیاں زمین پر چھا گئیں اور جو کچھ پیداوار تھی اسے صفا چٹ کر دیا *۔ اِسْتَحْنَکَ النَّعِضَاہُ۔ جھاڑی جڑ سے اکھڑ گئی **۔

قرآن کریم میں ہے کہ ابلیس نے یہ چیلنج دیا کہ لَاَحْتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَہٗ (۱۷/۶۲) میں بالضرور ابن آدم کی ٹھوڑی میں رسی باندھونگا اور

*تاج- محیط- راغب۔ ** تاج نیز ابن فارس۔

اسطرح اسے جدھر جی چاہے لئے لئے پھرونگا - اس میں نہ صرف یہی ہے کہ ابلیس اسے جدھر جی چاہے لئے لئے پھرتا ہے بلکہ لاحْتَنِكَنَّ میں جو ذلت کا پہلو ہے وہ بھی نمایاں ہے - انفرادی مفاد پرستیاں جسطرح انسان کو اپنی گرفت میں لے کر ذلیل و خوار کرتی ہیں وہ سب کے سامنے ہے - جسطرح کتے کے پاؤں اُسکی ناک کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں ، اسی طرح انسان اپنے جذبات کے پیچھے لگا پھرتا ہے اور ذلیل و خوار ہوتا ہے - اگر اسکی بجائے وہ انہی جذبات کو وحی کی روشنی میں چلائے تو کونین کی سرفرازیاں اسکے حصہ میں آجائیں -

جو کچھ انفرادی جذبات پرستیاں ایک فرد کے ساتھ کرتی ہیں ، وہی کچھ طاقتور قومیں کمزور قوموں کے ساتھ کرتی ہیں - یعنی ان کے جبڑے میں رسی ڈال کر انہیں جدھر جی چاہے لئے لئے پھرتی ہیں - یہ بھی ابلیسی قوتیں ہیں - چنانچہ مذکورہ بالا آیت (۱۷/۶۲) کے بعد دیکھئے کہ قرآن کریم نے ان طاقتور قوموں کے اُن حربوں کا کسطرح ذکر کیا ہے جنہیں وہ کمزور قوموں کو پھانسنے کے لئے اختیار کرتی ہیں - (اسکی تشریح "مفہوم القرآن" میں ملیگی)

ح ن ن

اَلْحَنِيْنُ - کسی چیز کی طرف مشتاقانہ کھنچنا - شدت سے رونا یا خوش ہونا - بے تابانہ اشتیاق کی آواز خواہ غم سے ہو یا خوشی سے - صاحب مصباح نے لکھا ہے کہ حَنِيْنٌ کا لفظ صرف ماں کی مامتا کیلئے بولا جاتا ہے - اَلْحَانَّةُ - اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اپنے وطن سے دور اپنے بچے کیلئے بیحد مضطرب ومشتاق ہو رہی ہو - اَلْحَنَّانَةُ - وہ عورت جسے اسکے شوہر نے چھوڑ دیا ہو اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے غم میں بیحد اداس اور پریشان رہتی ہو * -

قرآن کریم میں حضرت یحییٰؑ کے متعلق ہے کہ آتَيْنٰهُ ...... حَنَانًا مِنْ لَدُنَّا (۱۹/۱۲-۱۳) - ہم نے اُسے اپنے ہاں سے رقت قلب - سوز و گداز - ماں کی سی محبت رکھنےوالا دل عطا کیا - اسی اعتبار سے ہمارے ہاں خدا کے اسماء میں ایک نام اَلْحَنَّانُ بھی شمار کیا جاتا ہے - لیکن یہ لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا - اس میں کچھ عیسائیت کے خدا کے تصور (رقت و سوز و گداز) کی جھلک پائی جاتی ہے -

---

* تاج و راغب

حُنَیْن (۹/۲۵) مکہ کے قریب ایک وادی ہے جہاں نبی اکرمؐ کی مخالفین سے جنگ ہوئی تھی۔

ح و ب

حُوْبَ۔ حَابِ۔ یہ لفظ اونٹوں کو ڈانٹنے کے لئے بولا جاتا ہے*۔
اَلْحَوْبَۃُ۔ حاجت اور ضرورت کو کہتے ہیں۔ ایسی حاجت جو محتاج کو ارتکاب جرم پر آمادہ کر دے**۔ اسکے بعد گناہ کیلئے بھی اسکا استعمال ہونے لگا۔ نیز اسکے معنے ہلاکت۔ غم و فکر۔ اور درد مند ہونا بھی ہیں*۔ جو گناہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی گناہ۔ حاجت یا مسکنت کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں یتیم کا مال کھا جانے کو حُوْباً کَبِیْراً کہا گیا ہے (۴/۲)۔ یعنی جرم عظیم۔ بڑی حق تلفی۔ حُوْبٌ کے معنے گناہ، وحشت، تباھی بربادی، آفت اور بیماری بھی ہیں***۔

ح و ت

اَلْحُوْتُ۔ مچھلی، لیکن بیشتر بڑی مچھلی کے لئے بولا جاتا ہے۔ جمع اَحْوَاتٌ وَ حِیْتَانٌ*۔ حَاوَتَہٗ۔ اس نے اسے ایسا دھوکا دیا جیسے مچھلی دھوکا دیتی ہے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تڑپنے اور چلتے وقت رخ بدلنے کے ہوتے ہیں۔ مچھلی کو اسی اعتبار سے حُوْتٌ کہتے ہیں۔ حَاتَ عَلَی الشَّیْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کے گرد چکر لگانا****۔ قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کے متعلق ہے فَالْتَقَمَہُ الْحُوْتُ (۳۷/۱۴۲)۔ لغوی اعتبار سے اس کے معنی ہیں "سو بڑی مچھلی نے اسے لقمہ بنایا"۔
سورۃ اعراف میں حِیْتَانُھُمْ (۷/۱۶۳) آیا ہے۔ یعنی ان کی مچھلیاں۔

ح و ج

اَلْحَاجَۃُ۔ اَلْحَائِجَۃُ۔ ضرورت۔ اصل میں اس کے معنے ہوتے ہیں اپنے مطلوب و مقصود تک عدم رسائی۔ جس چیز کو حاصل کرنے کی خواھش ہو اس تک نہ پہنچ سکنا۔ پھر اس کا استعمال عام احتیاج (ضرورتمندی) کے لئے ہونے لگا*۔ اَلْحَاجَۃُ در اصل کانٹے کو کہتے ہیں۔ لہذا اَلْحَاجَۃُ اس ضرورت کو کہتے ہیں جو انسان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ جائے اور

* تاج۔ ** راغب۔ *** محیط۔ **** لین بحوالہ قاموس۔

اٹک جائے**۔ ابن فارس نے کہا ہے اس کے معنیٰ ہیں کسی چیز کے (حصول) کے لئے مضطرب اور مجبور ہو جانا ۔

سورۃ یوسف میں ہے اِلَّا حَاجَۃً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ (۱۲/۶۸)۔ یہ محض یعقوب کے دل میں ایک خلش تھی (جو اس نے پوری کرلی) ۔ سورۃ مومن میں یہ لفظ مطلوب (جس چیز کی طلب ہو) کیلئے آیا ہے ۔ حَاجَۃً فِیْ صُدُوْرِکُمْ (۴۰/۸۰) تمہارا دلی مطلوب و مقصود ۔

ح و ذ

اَلْحَوْذُ ۔ کسی چیز کو گھیرے میں لے لینا* نیز اس کے معنے جانور کو سختی اور تیزی کے ساتھ ہانکنے کے بھی ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں ، پھرتی ۔ تیزی ۔ کسی معاملہ میں چستی کرنا ۔ اِسْتَحْوَذَ عَلٰی کَذَا ۔ کسی چیز پر تسلط جمالیا ، مستولی ہوگیا ۔ حَاذُ الْمَتْنِ اس لکیر کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پشت پر دُم سے گردن تک بنتی جاتی ہے ۔ (یعنی ریڑھ کی ھڈی کی لکیر) یا پشت پر نمدہ رکھنے کی جگہ یا ران کے پیچھے کا وہ حصہ جس پر دم لگتی ھو ۔ ایسے دونوں کنارے حَاذَانِ کہلائیںگے* ۔ اسی لئے اَلْحَوْذُ کے معنے ہیں ہانکنے والے کا جانور کے پیچھے اس طرح چلنا کہ وہ اسکی دونوں ٹانگوں کے عین بیچ میں رہے اور وہاں سے سختی سے اسے ہانکے جائے***۔ اس نقشہ کو سامنے رکھئیے اور پھر اس آیت کا مطلب سمجھئیے جس میں کہا گیا ہے کہ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ (۵۸/۱۹)۔ یعنے مفاد پرستیوں کے سرکش جذبات ان پر غالب آگئے اور انہیں نہایت سختی سے ہانکتے رہے اور وہ انہی کے ڈنڈے سے عمر بھر چلتے رہے ۔ یا کمزور قوم جو بالا دست اقوام کے ڈنڈے سے ہانکی جاتی ہے ۔ (نیز دیکھئے عنوان ح ۔ ن ۔ ک) ۔

سورۃ نساء میں ہے قَالُوْا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ . . . (۴/۱۴۱)۔ اس میں نَمْنَعْكُمْ کے معنی ہیں تمہارے دشمنوں سے تمہاری حفاظت کی ۔ اور نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ کے معنی ہیں ہم تم پر غالب تھے۔ یعنی جب تم حملہ کرنے کے لئے آئے تو ہم ہی نے تمہیں اسکی جرأت دلائی اور تمہیں اُن کے خلاف چڑھا لائے۔ یعنی ہم نے جماعت مومنین سے تمہاری حفاظت بھی کی اور یہ بھی ہماری جرأت افزائی کا نتیجہ تھا کہ تم ان کے خلاف آگے بڑھے ۔

---

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔

ح و ر

حَارَ - يَحُوْرُ - حَوْرًا - لوٹنا - واپس ہونا - ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہو جانا - نیز زیادتی کے بعد پھر سے کم ہو جانا (۸۴/۱۴) ابن فارسؒ نے اس کے بنیادی معنی (۱) ایک قسم کا رنگ - (۲) پلٹنا (۳) گھومنا لکھے ہیں - اَلْمُحَاوَرَةُ وَالتَّحَاوُرُ - ایک دوسرے کو لوٹا کر جواب دینا - تبادلۂ گفتگو (جس میں بات لوٹائی جاتی ہے) (۱۸/۳۴ و ۵۸/۱) - اَلْمِحْوَرُ - وہ لکڑی یا لوہا جسکے گرد کوئی چیز گردش کرتی ہے - اَلْحَوْرُ کے معنے تحیر اور حیرت کے بھی آتے ہیں - (دیکھئے عنوان ح - ی - ر) - اَلْحَوَرُ - ایک لکڑی ہوتی ہے جسے اس کی سفیدی کی وجہ سے بَيْضَاءُ بھی کہتے ہیں - صاغانی نے تصریح کی ہے کہ اس لفظ (حَوْرٌ) کی بنیاد سفید ہونے پر ہے - یعنے اس کے مادہ میں سفید ہونے کا مفہوم ہے - اس لئے اَلْحَوَارِيَّاتُ شہر کی عورتوں کو کہتے ہیں جن کا رنگ بھی سفید ہوتا ہے اور وہ ویسے بھی اجلی رہتی ہیں - اَلْحُوَّارَىٰ میدے کو کہتے ہیں جو آٹے کا لب لباب ہوتا ہے - نیز کھانے کی ہر اس چیز کو جسے صاف اور سفید کر لیا گیا ہو* - حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں کو اَلْحَوَارِيُّوْنَ (۶۱/۱۴) - کہتے تھے بعض کا خیال ہے کہ وہ چونکہ دھوبی تھے اس لئے انہیں ایسا کہا جاتا تھا - دوسروں کا خیال ہے کہ ان کی اپنی صفائی کی وجہ سے انہیں ایسا کہا جاتا تھا - اکثریت اسطرف گئی ہے کہ ان کی نیت کی صفائی اور عمل کے خلوص کی بنا پر انہیں ایسا کہا گیا ہے - شمر کا قول ہے کہ اَلْحَوَارِيُّ خیر خواہ کو کہتے ہیں** - بہر حال ، یہ لفظ ان کی پاکیزگیٔ خیال - خلوصِ عمل اور حسنِ رفاقت ، سب کا آئینہ دار ہے - صاحب المنار کا خیال ہے کہ حُوَّارَىٰ میدے کو کہتے ہیں جو آٹے کا خلاصہ ہوتا ہے - حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں کو اس لئے حَوَارِيُّوْنَ کہا جاتا تھا کہ وہ لوگ قوم کے منتخب اور مخصوص افراد تھے*** -

حُوْرٌ - یہ لفظ جمع ہے - اس کا واحد اَحْوَرُ بھی ہے ، جو مذکر ہے اور حَوْرَاءُ بھی ، جو مونث ہے - اَلْحَوَرُ کے معنے ہوتے ہیں آنکھ کی سفیدی کا بہت سفید اور سیاہی کا بہت سیاہ ہونا اور جلد کا رنگ صاف ہونا - یا آنکھ کی سیاہی کا اتنا زیادہ ہونا کہ آنکھ اس سے بھری ہوئی معلوم ہو - ایسے مرد اور عورتیں جن میں یہ خصوصیات پائی جائیں - حُوْرٌ کہلائینگے -

* تاج محیط و راغب - ** تاج ***المنار جلد ۳ - صفحہ ۳۱۳ -

قرآن کریم میں متقیوں کے متعلق ہے وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (۴۴/۵۴ و ۵۲/۲۰) - جس طرح حُوْرٌ مذکر اور مونث دونوں کے لئے آتا ہے اسی طرح عِيْنٌ بھی، اَعْيَنُ (مذکر) اور عَيْنَاءُ (مونث) دونوں کی جمع ہے - راغب نے لکھا ہے کہ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ کے معنے ہم نشین بنانا ہیں - (دیکھئے عنوان ز - و - ج) - اسلئے ان الفاظ کے معنے صرف میاں بیوی بننے کے نہیں بلکہ ہم نشین اور باہمدگر رفقاء بننے کے بھی ہیں* - میاں بیوی بھی باہمی رفاقت کی وجہ سے ایک دوسرے کے زَوْجٌ ہوتے ہیں - اس اعتبار سے قرآن کریم میں، جنتی معاشرہ کی پاکیزہ صفات عورتوں کو بھی حُوْرٌ کہا گیا ہے - (۵۵/۷۲ و ۵۶/۲۲) - نیز لین نے (متعدد اسناد کی تائید سے) لکھا ہے کہ اَحْوَرُ - جسکی جمع حُوْرٌ ہے . کے معنے پاکیزہ عقل (Pure or clean Intellect) کے ہیں - یعنے چالاک اور مکار عقل نہیں بلکہ پاک اور صاف عقل - چنانچہ مَا يَعِيْشُ بِاَحْوَرَ اس شخص کے متعلق کہتے ہیں جو معاملات کا صاف نہ ہو - جو پاکیزہ عقل کے مطابق زندگی بسر نہ کرے - لہذا جنت کی زندگی میں باہمی رفقاء (حُوْرٌ عِيْنٌ) خواہ وہ عام همنشین ہوں یا بیویاں - کی کیفیت یہ ہوگی کہ ان کی عقل و خرد ایک دوسرے کو دھوکا دینے کے کام میں نہیں لائی جائیگی - وہ عقل ادب خوردہ دل ہوگی - یعنے پاکیزہ اور شفاف عقل نہ کہ حیلہ جو اور فریب کار -

ح و ط

حِيْطَةٌ کے معنے ہیں حفاظت کرنا - محفوظ رکھنا - نگہبانی کرنا - مدافعت کرنا - کسی کی ضروریات کو پورا کرنا - لَا زِلْتَ فِیْ حِيَاطَةِ اللّٰهِ - کے معنے ہیں تو ہمیشہ خدا کی حفاظت میں رہے - رَجُلٌ يَتَحَوَّطُ اَخَاهُ - وہ ایسا آدمی ہے جو اپنے بھائی کی خبر گیری کرتا ہے - اَلْحَائِطُ - دیوار کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ اندر کی چیزوں کو اپنی حفاظت میں لے لیتی ہے - اَلْمُحْتَاطُ - اس مقام کو کہتے ہیں جہاں مال مویشی رکھے جائیں اور وہ چاروں طرف سے محفوظ ہو** - کتاب الاشتقاق میں ہے کہ حُطْتُ الشَّیْءَ کے معنی حفاظت کرنے کے ہیں . اور اَلْاِحَاطَةُ میں شدت حفاظت پائی جاتی ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لینا - اَلْحَيِّطَةُ - عفیف اور شریف عورت کو کہتے ہیں - یعنے جو بہت زیادہ محتاط ہو*** -

---

* راغب - ** تاج - *** محیط -

اُحِیْطَ بِالْقَوْمِ کے معنے ہیں ساری کی ساری قوم ہلاکت کے گھیرے میں آگئی * ۔ تباہیوں میں گھر گئی ۔

قرآن کریم میں وَاللّٰہُ مُحِیْطٌ بِالْکَافِرِیْنَ (۲/۱۹) اکثر مقامات پر آیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو سمجھ رہے ہیں کہ ہم ، جو کچھ ہمارے جی میں آئے کرتے رہیں ، ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ۔ تو یہ خیال غلط ہے ۔ ان کے اعمال کبھی بے نتیجہ نہیں رہ سکتے ۔ خدا کا قانونِ مکافات ان کے تمام اعمال کو اپنی حفاظت میں لئے ہوئے ہے اور ان کے نتائج ، تباہیوں اور بربادیوں کی شکل میں ، انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور یہ ضرور ہلاک ہو کر رہینگے ۔ اسطرح ، مُحِیْطٌ میں حفاظتِ اعمال اور انکے نتائج کی وجہ سے ہلاکت کے دونوں پہلو آجاتے ہیں ۔ اسی طرح جہنم کے متعلق ہے وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌ بِالْکَافِرِیْنَ (۹/۴۹) "یقیناً جہنم ان انکار کرنے والوں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے" ۔ دوسری جگہ ہے وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِیْنَ (۸۲/۱۶) " وہ اسکی نظروں سے اوجھل نہیں ہیں" ۔

سورۃ کہف میں ہے وَاُحِیْطَ بِثَمَرِهٖ (۱۸/۴۲) جسکے معنی ہیں اسکا مال و متاع ۔ باغ کے پھل وغیرہ سب تباہی کی لپیٹ میں آگئے ۔ سورۃ نمل میں ہے فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ (۲۷/۲۲) " اسنے کہا کہ میں نے ایسی بات معلوم کی ہے جسکی تجھے خبر نہیں " ۔ یہاں اَحَاطَ کے معنے ہیں کسی چیز کی معلومات فراہم کر لینا ۔ اسے حیطہ علم میں لے لینا ۔ سورۃ البروج میں ہے وَاللّٰہُ مِنْ وَّرَائِهِمْ مُحِیْطٌ (۸۵/۲۰) ۔ " اللہ انکے گرد اگرد غیر مرئی طور پر گھیرا ڈالے ہوئے ہے" ۔ اسکا مطلب وہی ہے جو مُحِیْطٌ بِالْکَافِرِیْنَ کے ضمن میں اوپر بیان ہو چکا ہے ۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ (۲/۲۵۵) " وہ اللہ کے علم میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتے " ۔ انکے حیطہ ادراک میں نہیں آسکتا ۔ وہ سمجھ نہیں سکتے ۔

ح و ل

حَوْلٌ کے بنیادی معنی کسی چیز کا تغیر پذیر ہونا ، ایک حالت سے دوسری میں جانا اور دوسری چیزوں سے الگ ہو جانا ہیں ۔ چنانچہ جو چیز

* محیط ۔

اپنی پہلی حالت پر نہ رہے بلکہ اس میں کوئی تغیر واقع ہو جائے اسے حَالَ الشَّیْیُٔ یا اِسْتَحَالَ الشَّیْیُٔ - کہتے ہیں کیونکہ اسکی حالت میں تغیر آجاتا ہے - مُسْتَحَالَۃٌ اور مُسْتَحِیْلَۃٌ - ٹیڑھی کمان کو کہتے ہیں - نیز اس زمین کو بھی کہتے ہیں جس میں کئی سال فصل نہ بوئی گئی ہو (اور وہ اسطرح اونچی نیچی ہو جائے - یعنے اپنی پہلی حالت پر نہ رہے -) راغب نے کہا ہے کہ حَوَّلْتُ الشَّیْیَٔ فَتَحَوَّلَ کے معنی ہیں غَیَّرْتُ الشَّیْیَٔ فَتَغَیَّرَ - اس سے حِوَلٌ کے معنے تغیر و تبدل کے آتے ہیں - چنانچہ قرآن کریم کی آیت لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلاً (۱۸/۱۰۸) میں ، حِوَلاً کے معنے تبدیلی اور تغیر کے ہیں - حَوَالُ الدَّھْرِ - زمانے کے تغیرات کو کہتے ہیں - راغب نے کہا ہے کہ انسان کے سال ، بدن یا خود اسکے نفس میں جو بدلنے والی کیفیات ہوتی ہیں وہ اسکا حَالٌ کہلاتی ہیں - نیز اَلْحَالُ - زمانہ حاضر کو بھی کہتے ہیں - حَوَلٌ - بھینگا ہونے کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں آنکھ اپنی اصلی حالت پر نہیں ہوتی - حِوَلٌ کے معنی زوال یا انتقال کے بھی ہیں * - (اس میں بھی حالت کے بدلنے کا پہلو موجود ہے) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دوری حرکت کے ہیں -

گردش کے اعتبار سے حَوْلٌ - سال کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین کی گردش سے واقع ہوتا ہے (۲/۲۴۰) - اَحَالَ الشَّیْءُ کے معنے ہیں اس چیز پر ایک سال گزر گیا - اَلْحَوْلِیُّ - اس چار پائے کو کہتے جو ایک سال کا ہو جائے -

حَوْلٌ کے معنے ارد گرد کے بھی آتے ہیں - حَوْلُ الشَّیْیِٔ کے معنے چیز کا کنارہ یا طرف ہیں - حَوَالَیْکَ اور حَوْلَیْکَ سے مراد وہ اطراف ہیں جو تجھے گھیرے ہوئے ہوں - احاطہ کئے ہوں - مَاحَوْلَ الشَّیْیِٔ کے معنے ہیں کسی چیز کا ارد گرد * -

جدا ہونے کے اعتبار سے ، جو چیز دو چیزوں کے درمیان حائل ہو جائے اسے حَالَ بَیْنَهُمَا کہتے ہیں (۵۴/۳۳) - اس چیز کو جو درمیان حائل ہو جاتی ہے حِوَالٌ یا حَوَلٌ یاحُوَلٌ کہتے ہیں - الگ کر دینے کی نسبت سے کسی چیز کا رخ تبدیل کر دینے نیز اسے دگرگوں کر دینے ، زائل کر دینے کو تَحْوِیْلٌ کہتے ہیں (۵۶/۱۷) * - یہ لازم بھی ہے - اور اس طرح اس کے معنے دگرگوں ہو جانا ، ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جانا بھی ہیں - ** اَلتَّحَوَالَۃُ

* تاج - ** محیط -

کے معنے ھیں ایک نہر کو دوسری نہر کی طرف موڑ دینا ۔ مُحَالٌ کے معنی ھیں دو متناقض چیزوں کا ایک جگہ جمع ھو جانا ۔ (جو نا ممکن ھے)* نیز باطل اور اپنے صحیح رخ سے ھٹا ھوا۔

حَوْلَۃٌ کے معنے قوت تصرف، غلبہ اور اقتدار کے بھی ھیں - نیز گھوڑے کی پشت پر جم کر بیٹھ جانے کو بھی کہتے ھیں - اپنی پیٹھ پر جو گٹھڑی وغیرہ اٹھائی جائے اسے حَالٌ کہتے ھیں - نیز اس گڈیلنے کو بھی جس کے سہارے بچہ بتدریج چلنا سیکھتا ھے*۔

حِیْلَۃٌ ۔ مہارتِ نگاہ اور نظر کی تیزی نیز معاملات میں تصرف پر قابو اور تدبیر امور پر قدرت حاصل ھونے کو کہتے ھیں - راغب نے کہا ھے کہ حِیْلَۃٌ وہ طریقہ ھے جس سے کسی بات تک پوشیدہ طور پر پہنچا جائے** ۔ ھمارے ھاں یہ لفظ عام طور پر برے معنوں میں استعمال ھوتا ھے لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ حالات میں تبدیلی کرنے پر قدرت اور معاملات میں تصرف کرنے کی طاقت ، کے لئے استعمال ھوا ھے ۔ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَۃً ۔ (۴/۹۸) ۔

حَوِیْلٌ ۔ گواہ اور شاھد کو بھی کہتے ھیں - نیز کفیل کو بھی ۔ حَاوَلْتُ لَہٗ بَصَرِیْ کے معنے ھیں ، میں نے اسکی طرف تیز نظر سے دیکھا** ۔

ح و و

اَلْحُوَّۃُ ۔ سبزی مائل سیاہی "گہری سبزی - لوھے کے رنگ جیسا رنگ ۔ یعنے سرخی جو مائل بہ سیاھی ۔ اِحْوَاوَتِ الْاَرْضُ ۔ زمین سرسبز ھو گئی* ۔

قرآن کریم میں ھے وَ الَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۔ فَجَعَلَہٗ غُثَآءً اَحْوٰی (۸۷/۴-۵) ۔ "خدا (کا قانون) زمین سے چارہ نکالتا ھے - پھر اسے خشک کرکے بالکل سیاہ رنگ کا کوڑا کرکٹ بنا دیتا ھے" - راغب نے بھی اس کی تائید کی ھے*** ۔ فرّاء نے کہا ھے کہ جب گھاس خشک ھو جائے تو اسے غُثَآءٌ کہتے ھیں اور جب وہ پرانی بوسیدہ ھو کر سیاہ پڑ جائے تو اسے اَحْوٰی کہتے ھیں* ۔ (اس کا مؤنث حَوَّاءُ ھے)

(غُثَآءٌ کوڑے کرکٹ کو کہتے ھیں - دیکھئے عنوان (غ ۔ ث ۔ و (ی)

*تاج - ** تاج و محیط - ***راغب -

ح و ی

اَلْحَوِیَّةُ - ہر چیز کی گولائی کو کہتے ہیں - (گول لپٹی ہوئی) آنت - جمع حَوَایَا یعنی انتڑیاں* - (۶/۱۴۷)

حَوَاہُ - یَحْوِیْہِ - کسی چیز کو جمع کرنا، اپنے اندر لے لینا ، مالک ہونا - اس کا احاطہ کر لینا - اسے نگاہ میں رکھنا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جمع کرنے کے ہوتے ہیں -

حَیْثُ

حَیْثُ - جسطرح حِیْنٌ زمانہ پر دلالت کرتا ہے (یعنی ”جب“) - اسی طرح حَیْثُ مکان پر دلالت کرتا ہے - (یعنی ”جہاں“) - لیکن اخفش کا قول ہے کہ حَیْثُ کا استعمال زمانہ کے لئے بھی ہو سکتا ہے** - یعنی حَیْثُ کے معنے ”جب“ بھی ہوسکتے ہیں -

سورۃ بقرہ میں ہے فَکُلُوْا مِنْہَا حَیْثُ شِئْتُمْ (۲/۵۸) - تم جب چاہو یا جہاں سے چاہو - کھاؤ - ”جنتِ آدم“ کے ضمن میں ہے وَ کُلَا مِنْہَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) - ”تم جہاں سے جی چاہے با فراغت کھاؤ“ - جنتی معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ اس میں ہر فرد کو سامانِ زیست ہر جگہ میسر ہوگا اور با فراغت میسر ہوگا -

ح ی د

حَادَ عَنِ الطَّرِیْقِ - یَحِیْدُ - وہ راستہ سے (ایک طرف کو) ہٹ گیا - اَلرَّجُلُ یَحِیْدُ عَنِ الشَّیْئِ - آدمی خوف اور نفرت کی وجہ سے کسی چیز سے رکتا اور باز رہتا ہے - حِمَارٌ حَیْدِیٌّ وہ گدھا جو اپنے سایہ سے بدکتا ہو - حَیْدُ الْجَبَلِ - پہاڑ کا اٹھا ہوا کنارہ جو بلند اور آگے کو نکلا ہوا ہو - سخت ٹیڑھی پسلی** - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی راستے سے ہٹ جانا لکھے ہیں -

قرآن کریم میں ہے ذٰلِکَ مَا کُنْتَ مِنْہُ تَحِیْدُ (۵۰/۱۹) - ”یہ وہ ہے جس سے تم بدکتے اور کنارہ کشی اختیار کرتے تھے“ -

---

* تاج ** تاج - صاحب محیط نے بھی اس کی تائید کی ہے -

ح ی ر

حَارَ بَصَرُہٗ - یَحَارُ - کسی چیز کی طرف دیکھنے سے نگاہ کا چندھیا جانا - حَارَ فِی اَمْرِہٖ : وہ اپنے معاملہ کا صحیح حل نہ پا سکا - حَیْرَۃٌ* کے اصلی معنے ھیں چمک سے آنکھوں کا چندھیا جانا (اور اس طرح نگاہ کو ادھر سے پھیر لینا) حَارَ وَاسْتَحَارَ-راستہ نہ پانا - فَھُوَ حَیْرَانٌ - سو وہ متحیر رہ گیا - یعنے صحیح راستہ دکھائی نہ دینے کی وجہ سے مضطرب اور پریشان ہو جانے والا - حَارَ الْمَاءُ فِی الْمَکَانِ - اس وقت بولتے ھیں جب پانی کو آگے جانے کا راستہ نہ ملے اور وہ ایک ھی جگہ رک کر گردش کرتا رھے*-

اَلْمُسْتَحِیْرُ - لق و دق بیابان کے عرض میں جانے والا راستہ جس کا پتہ ھی نہ چلے کہ کس طرف لے جائیگا* - اس کے معنے راستہ نہ پاسکنے کی وجہ سے پریشان اور مخبوط الحواس ہوجانے والا بھی ھیں- قرآن کریم میں ھے کَالَّذِی اسْتَھْوَتْہُ الشَّیٰطِیْنُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانَ (٦/۷١) "اس شخص کی مانند جسکے جذبات پر شیاطین قبضہ کرکے اسے زمین میں بھٹکاتے پھریں اور وہ حیران و پریشان ھو- یعنی جو اپنے جذبات کے پیچھے چلتا جائے اور اسطرح یوں راہ گم کردے کہ اسے پتہ ھی نہیں چلے کہ اب کدھر جانا ھے -

ح ی ز (ح و ز)

حَازَ الشَّیْءَ یَحُوْزُہٗ - کسی چیز کو جمع کرنا اور اپنی جانب یا اپنے اندر لے لینا - اِنْحَازَ عَنْہُ - وہ اس سے ھٹ گیا - اِنْحَازَ اِلَیْہِ - وہ اس کی طرف مائل ھو گیا - تَحَوَّزَ وَ تَحَیَّزَ - سانپ کی طرح بل کھانا - مڑ جانا - ایک طرف کو ھٹ جانا* - قرآن کریم میں ھے اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ (۸/١٦) - اپنی جماعت کی طرف پہنچنے کے لئے مڑ جانے والا- راغب نے کہا ھے کہ اس کے معنے ھیں حَیِّزٌ (خالی جگہ ، کنارہ ، گوشہ) کی طرف ھونے والا - اس کی اصل واو سے ھے جس کے معنے ھیں ھر وہ مجموعہ جس کے اجزا ایک دوسرے سے پیوست ھوں** - لہذا مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ کے معنی ھونگے اپنی (یا کسی) جماعت کے ساتھ مجتمع ھو جانے کی غرض سے -

ح ی ص

حَاصَ عَنْہُ-یَحِیْصُ-کسی چیز سے ھٹ جانا - الگ ھو جانا کسی سے بچنے کے لئے ایک طرف کو بھاگ جانا*- ابن فارس نے کہا ھے کہ اس میں ھٹنے کے

* تاج - **راغب -

ساتھ تحیر کا پہلو بھی ہوتا ہے ۔ اَلْمَحِیْصُ ۔ ہٹنے کی جگہ ۔ ایک طرف کو ہو جانے اور بھاگ جانے کی جگہ* ۔ وَلَا یَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِیْصًا ($\frac{4}{121}$) ۔ ''وہ اس سے بچکر جانے کی کوئی جگہ نہ پائینگے'' وہ فرار ہو کر پناہ گاہ نہیں پائینگے ۔

ایک طرف کو ہٹ جانے کے اعتبار سے اَلْاَحْیَصُ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کی ایک آنکھ دوسری سے چھوٹی ہو ۔ (حَیِّصَ بَیِّصَ کے معنے ہیں کسی بات کا نہایت شدت سے مبہم ہو جانا** ۔ سخت الجھاؤ*) ۔

ح ی ض

حَاضَ السَّیْلُ ۔ سیلاب خوب بڑھ گیا اور اس کا پانی چڑھا اور بہہ نکلا ، ۔ دراصل اس لفظ کے معنے بہنے اور جاری ہونے کے ہیں ۔ حَاضَتِ الْمَرْاَۃُ ۔ عورت کے ماہواری خون کا جاری ہونا *** ۔ اَلْمَحِیْضُ ($\frac{2}{222}$) ۔ حیض کا جاری ہونا ، حیض کا خون ، حیض کے ایام یا موضع حیض (جہاں سے حیض کا خون برآمد ہوتا ہے) لیکن یہ لفظ خود حیض کے لئے بھی آتا ہے ($\frac{65}{4}$) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ببول کے درخت سے جو سرخ رنگ کا پانی نکلتا ہے اس کے لئے حَاضَتِ السَّمُرَۃُ کہتے ہیں ۔ تاج نے بھی اس کی تائید کی ہے ۔

حَاضَتْ ، تَحِیْضُ ۔ حائضہ ہونا ۔ وَالّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ ($\frac{65}{4}$) ۔ وہ عورتیں جنہیں کسی وجہ سے حیض نہ آسکا ہو (یعنی عمر کے لحاظ سے انہیں حیض آنا چاہئیے تھا لیکن کسی بیماری کی وجہ سے حیض نہیں آ سکا) ۔

ح ی ف

اَلْحَائِفُ ۔ ٹیڑھی چیز ۔ نیز راستی سے ہٹنے والے کو کہتے ہیں ۔ اَلْحَائِفُ مِنَ الْجَبَلِ ۔ پہاڑ کا ایک طرف نکلا ہوا کنارہ ۔ اَلْحِیْفَۃُ ۔ کنارہ ۔ جانب ۔ پہلو ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے جھکاؤ اور میلان کے ہیں ۔ اَلْحَیْفُ ۔ فیصلہ کرنے میں ایک طرف کو جھک جانا ۔ انصاف نہ کرنا ، ظلم و زیادتی ۔ حَافَ عَلَیْهِ ۔ اس پر ظلم و زیادتی کی**** ۔ قرآن کریم میں ہے اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ($\frac{24}{50}$) ''کیا انہیں اس کا ڈر ہے کہ خدا اور اس کا رسول فیصلہ کرنے میں فریق مخالف کیطرف جھک جائیگا اور ان سے انصاف نہیں برتیگا'' ! (کس قدر غلط ہے ان کا یہ اندیشہ) ۔

---

* تاج ۔ **راغب ۔ *** تاج و محیط ۔ **** تاج و محیط و راغب

ح ی ق

حَاقَ بِهِ الشَّیْءُ یَحِیْقُ ۔ کسی چیز نے اسے گھیر لیا ۔ * وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ (۴۰/۴۵) ۔ ''بدترین عذاب نے قوم فرعون کو گھیر لیا ''۔ انسانی اعمال کے نتائج جس طرح اُسے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں اور وہ ان کے اثر سے بچ نہیں سکتا ، اسکے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے ۔ فَحَاقَ بِالَّذِیْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ (۶/۱۰) ۔ '' جو لوگ ان میں سے پیغامِ خداوندی کا تمسخر اڑاتے تھے ، انہیں اُس چیز نے گھیر لیا جس کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے ''۔ یعنی ان کے اعمال کے نتائج نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز پر چھا جانا ۔ اس کے اوپر آ کر بیٹھ جانا اور چپک جانا ۔

ح ی ن

اَلْحِیْنُ ۔ مطلقاً زمانہ اور وقت کو کہتے ہیں ۔ خواہ وہ وقت طویل ہو یا قصیر ۔ (کم ہو یا زیادہ) ۔ عربی زبان میں حِیْنٌ کا اطلاق ایک لمحہ سے لے کر لامتناہی حد تک ہوتا ہے ۔ راغب نے کہا ہے کہ حِیْنٌ اس وقت کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز پہنچے اور حاصل ہو جائے ۔ یہ وقت مبہم ہوتا ہے اور اُس وقت معین و مخصوص ہو جاتا ہے جب اس کے بعد مضاف الیہ آ جائے ۔ حَانَ الْقَوْمُ کے معنے ہیں قوم جو کچھ چاہتی تھی اس کے حاصل ہونے کا وقت آ گیا ۔ حِیْنٌ کے معنے مدت کے بھی آتے ہیں ۔ اور جب دو وقتوں کا بُعد بتانا ہو، یعنی یہ بتانا ہو کہ ایک کام کے بعد دوسرا ہوا، تو اس کے بعد اِذْ کا اضافہ کر دیتے ہیں ۔ جیسے حِیْنَئِذٍ ۔ مثلاً اَنْتُمْ حِیْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ (۵۶/۸۴) یعنی جس وقت جان نکلنے کے لئے حلق تک پہنچتی ہے اس وقت ، اس حالت کے بعد ، تم اسے دیکھ رہے ہوتے ہو* ۔

قرآن کریم میں ہے لَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ (۳۸/۳) ۔ یہاں لاتَ کے بعد مبتدا محذوف ہے ۔ آیت کے معنے ہیں یہ وقت بھاگ نکلنے کا وقت نہیں ہے ۔

حَیَّنَهٗ ۔ اس کے لئے وقت مقرر کیا * ۔

سورۂ بقرہ میں ہے وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ (۲/۳۶) اس کے یہ معنے ہونگے کہ تمہیں زمین پر ٹھہرنا ہے اور اس سے

* تاج ۔

فائدہ حاصل کرنا ہے ایک وقت تک کے لئے جس کی مدت معین نہیں - یہ مدت مختلف افراد اور مختلف اقوام کے لئے مختلف ہوگی - جس قسم کے اعمال کسی قوم سے سرزد ہونگے اس کے مطابق اسکی مدت حیات کا تعین ہو جائیگا - باقی رہا نوعِ انسان کا اس ارض پر قیام، سو اس کی مدت کے متعلق علمِ انسانی کچھ نہیں کہہ سکتا -

اَلْحَیْنُ - ہلاکت اور موت کو بھی کہتے ہیں - اَحَانَہُ اللہُ - خدا نے اسے ہلاک کر دیا - اَلْحَائِنُ - احمق کو کہتے ہیں اور اَلْحَانِیَۃُ شراب کو*-

ح ی ی

حَیِیَ (حَیَّ) - یَحْیٰی (یَحَیُّ) - وہ زندہ رہا - یا زندہ ہوا - حَیَاۃٌ (حَیٰوۃٌ) زندگی - اَحْیَاہُ - اس نے اسے زندہ کیا - اِحْیَاءٌ - زندگی بخشنا - تَحَیَّا مِنْہُ - وہ اس سے سمٹا سکڑا - (Shrank) - علم الحیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ زندگی کی ایک علامت سکڑنا ہے - آپ کسی جاندار چیز (مثلاً کیڑے وغیرہ) کو چھیڑئیے، اگر وہ زندہ ہے تو اس کا پہلا ردِ عمل یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو سکیڑ لیگا - سمٹ جائیگا - اگر وہ زندہ نہیں تو علیٰ حالہٖ رہیگا - اس کا یہ سمٹنا در حقیقت اس کے جذبہ تحفظ خویش (Preservation of Self) کا مظاہرہ ہوتا ہے - اسی سے عربوں نے اس سادہ سے سمٹنے اور سکڑنے کا مفہوم بھی لیا - یہیں سے حَیَاءٌ (شرم) ہے کیونکہ حیاء کا مظاہرہ بھی سمٹنے سے ہوتا ہے - سانپ کو بھی حَیَّۃٌ اس کے سکڑنے اور سمٹنے کی وجہ سے کہتے ہیں *-

راغب نے حَیٰوۃٌ کے معنے قوتِ حاسہ (Faculty of sensation) لئے ہیں - مَوْتٌ اس کی نقیض ہے - (دیکھئے عنوان م - و - ت) راغب کے نزدیک حَیَاۃٌ کا استعمال مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے - مثلاً (۱) بڑھنے کی قوت (قوت نامیہ) جو نباتات اور حیوانات میں ہوتی ہے - (۲) قوت احساس (۳) قوت عقل وعمل (۴) رنج وغم سے آزادی (۵) حیاتِ اخروی و ابدی جس تک انسان محض اُس حیات سے پہنچ سکتا ہے جو عقل و علم کی حیات ہوتی ہے - اور (۶) وہ حیات جس سے صرف خدا کی ذات متصف ہوتی ہے اور جس میں موت نہیں - (اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ)** -

اِحْیَاءٌ - زندہ کرنا - اِسْتِحْیَاءٌ - زندہ رکھنا نیز حیا کرنا - لیکن اِنَّ اللہَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا (۲/۲۶) میں لَا یَسْتَحْیٖ کے معنے

---

* تاج - ** راغب بحوالہ تاج

ہیں ، اللہ کو اس میں کسی قسم کا باک یا رکاوٹ نہیں کہ وہ اس قسم کی مثال دے**۔ لَا حَیَّ عَنْہُ کے معنے ہیں اس سے کوئی رکاوٹ نہیں**۔ اَلْحَیَاءُ کے معنے سر سبزی اور بارش کے بھی آتے ہیں کیونکہ ان سے زمین کی حیات وابستہ ہوتی ہے ۔ حَیَّ عَلٰی یا حَیَّ ھَلْ کے معنے ہیں اس کام کے لئے جلدی کرو''**۔

حَیَّاہُ تَحِیَّۃً کے معنے ہیں اس کے لئے خوشگوار زندگی ، درازی عمر کی آرزو کرنا یا دعا دینا**۔ سلام کرنا*** (۴/۸۶) تَحِیَّاتٌ کا لفظ در حقیقت حیاتِ جاوید کے لئے استعمال ہوتا ہے*** ۔ نیز ہر قسم کی سلامتی اور آفتوں سے محفوظ رہنے کے لئے**۔ اَلْمَحْیَا کے معنے زندگی ہیں ۔ جسطرح موت کے مقابلہ میں حیات کا لفظ آتا ہے (۶۷/۲) اسی طرح مَمَات کے مقابلہ میں مَحْیَا آتا ہے ۔ (۶/۱۶۳)۔ اَلْحَیَاۃُ بعض اوقات منفعت (نفع بخشی) کے معنوں میں بھی آتا ہے*۔ اَلْحَیَاۃُ الطَّیِّبَۃُ ۔ رزق حلال یا جنت کو کہتے ہیں****۔ حَیِیَ الطَّرِیْقُ کے معنے ہیں راستہ ظاہر یا واضح ہو گیا ۔ اور طَرِیْقٌ حَیٌّ کے معنے ہیں واضح راستہ****۔

قرآن کریم میں حیاتِ اخروی کے لئے ہے وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ (۲۹/۶۴)۔ اس آیت میں حَیَاۃٌ کے بجائے حَیَوَانٌ کا لفظ آیا ہے جسکا وزن فَعَلَانٌ ہے ۔ یہ فرق بڑا معنی خیز ہے ۔ عربی زبان میں فَعَلَانٌ کے وزن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شدت ، غلبہ ، ہنگامی طور پر کچھ نمودار ہونا اور حرکت و اضطراب کا پہلو غالب ہوتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حیات اخروی اسی سلسلہ کی ایک کڑی نہیں جو اِس دنیا میں طبعی قوانین کی رو سے قائم ہے ۔ اس میں زندگی اچانک ایک نئی صورت اختیار کریگی***** ۔ اور جمود و سکون کے بجائے حرکتِ پیہم اور سعیٔ مسلسل ہوگی****۔ (اس فرق کے لئے آخِرَۃٌ اور قِیَامَۃٌ کے الفاظ بھی دیکھئے جو ، ا۔ خ۔ ر اور ق ۔ و۔ م کے عنوانات میں ملینگے۔ نیز رَحْمٰنٌ کا لفظ جو ر۔ ح ۔ م کے تحت ملیگا)۔

حَیٰوۃٌ ۔ کے مختلف مفہوم جنکا ذکر اوپر آیا ہے قرآن کریم کی متعدد آیات میں مذکور ہیں ۔ لیکن اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ

---

* تاج ۔ **راغب بحوالہ تاج ***لین ۔ لین نے یہ بھی لکھا ہے کہ سانپ کو حیۃ اس کی درازیٔ عمر کی وجہ سے کہتے ہیں ۔ عربوں کا خیال تھا کہ سانپ صرف کسی حادثہ سے مرتا ہے ۔ طبیعی موت مرتا ہی نہیں ۔ ****محیط ۔ *****اس کا مطلب یہ ہے کہ حیات اخروی دنیا کی زندگی کے تسلسل میں تو ہوگی لیکن جن طبیعی قوانین کے ماتحت اس دنیا میں زندگی کی نمود اور بقا ہوتی ہے ، اخروی حیات ان قوانین کے تابع نہیں ہوگی ۔ وہاں اس کے لئے اور قوانین ہونگے ۔

جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے قرآن کریم ان کی محض طبیعی زندگی (Physi- cal life) کو حیات نہیں قرار دیتا۔ اس کے نزدیک حقیقی زندگی وہ ہے جو شرفِ انسانیت کو لئے ہو۔ جس میں انسان قوانین خداوندی کی روشنی میں علم و عقل سے کام لے کر اپنی ذات کی نشو و نما کرتا چلا جائے۔ الحَیَاۃُ الدُّنْیَا سے مراد ہے مفادِ عاجلہ۔ پیش پا افتادہ مفاد۔ فوری عیش و عشرت۔ محض قریبی فائدے۔ یعنی وہ زندگی جس میں مستقبل پر کوئی نگاہ نہ ہو۔ طبعی زندگی جس میں انسان حیوانی سطح (Animal Level) پر دن بسر کرتا ہے۔ نہ اس زندگی میں مستقبل کی درخشندگی پر نگاہ رکھتا ہے اور نہ ہی مرنے کے بعد تسلسلِ حیات پر یقین رکھتا ہے، الحَیَاۃُ الدُّنْیَا ہے۔ قرآن کریم میں الحیاۃ الدنیا اور حیاتِ آخرت کی اہم اصطلاحات کا مفہوم سمجھنے کے لئے ان معانی کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ نیز اس حقیقت کو بھی کہ جس طرح ہمارے ہاں (اردو میں۔ اور اسی طرح دنیا کی دیگر زبانوں میں) زندگی سے مراد صرف زندہ رہنا (سانس لینا) اور موت سے مراد محض مر جانا (نفس کی آمدوشد کا بند ہو جانا) نہیں بلکہ ان الفاظ کے معانی بہت وسیع ہیں۔ اسی طرح عربی زبان (اور قرآن کریم میں) بھی یہ الفاظ وسیع معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس لئے ہر مقام پر (نفسِ مضمون کے اعتبار سے) دیکھنا چاہئے کہ وہاں کونسے معانی زیادہ موزوں ہیں۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں قوم مردہ ہے تو اس سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے افراد قبروں میں دفن ہوچکے ہیں۔ اور جب کہتے ہیں کہ اس قوم کا شمار زندہ قوموں میں ہوتا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ اس کے افراد سانس لیتے ہیں۔ مردہ اقوام اور زندہ اقوام کا مفہوم واضح ہے۔ اسی طرح یہ الفاظ قرآن کریم میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۃ انعام میں ہے اَوَ مَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ وَ جَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ ۔۔۔۔۔۔ (٦/١٢٢)۔ "اور کیا وہ جو مردہ ہو۔ پھر اسے ہم زندہ کر دیں اور اسے ایسی روشنی عطا کر دیں جس سے وہ لوگوں میں چلے۔۔۔۔"۔ ظاہر ہے کہ یہاں موت اورحیات سے مراد طبعی موت اور زندگی نہیں بلکہ گمراہی اور ہدایت ہے۔ موت اور حیات کے معانی کے اس فرق کو ہر مقام پر ملحوظ رکھنا چاہئے۔ حضرات انبیاء کرام اقوام مردہ کو ایسی زندگی عطا کرنے کے لئے آتے تھے جو انہیں دنیا بھر کی سرفرازیاں عطا کردے۔ (٨/٢٤)۔ یہ زندگی اب قرآن کریم کی رو سے مل سکتی ہے لیکن صرف اُسے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو (٣٦/٧٠)۔ اور جو تباہیوں سے بچنا چاہے (٤٢/٨)۔

خ

خ ب أ

خَبَأَهٗ ۔ یَخْبَؤُہٗ ۔ خَبْأً ۔ چھپانا ۔ پردہ میں رکھنا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ اِمْرَأَۃٌ خُبَأَۃٌ ۔ خانہ نشین عورت جو گھر سے باہر نہ نکلتی ہو۔ اَلْخَبِیْئَۃُ ۔ بیج کے وہ دانے جنہیں کسان زمین کے اندر چھپا دیتا ہے ۔ قدرت کے خزانے جو اس نے زمین میں چھپا رکھے ہیں ۔ اَلْخَبْءُ ۔ ذخیرہ کی ہوئی اور چھپائی ہوئی چیز* ۔

قرآن کریم میں اَلْخَبْءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲۷/۲۵) آیا ہے۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اندر چھپے ہوئے خزانے ۔ ان کی مستور قوتیں اور مضمر صلاحیتیں ۔ ان کے اندر پوشیدہ رزق کے خزانے ۔

خ ب ت

اَلْخَبْتُ ۔ نشیبی زمین جو وسیع بھی ہو** ۔ وسیع میدان جس میں کچھ اگا ہؤا نہ ہو ۔ (ابن فارس) اَخْبَتَ ۔ وہ نشیبی زمین میں پہنچا ، اس کے بعد یہ لفظ نرمی خشوع ، تواضع اور جُھک جانے، اطاعت کرنے نیز مطمئن ہونے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا** ۔

قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے وَاَخْبَتُوْآ اِلٰی رَبِّہِمْ (۱۱/۲۳) ۔ " وہ خدا کے (قانون ربوبیت کے) سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں " ۔ یعنی فَتُخْبِتَ لَہٗ قُلُوْبُہُمْ (۲۲/۵۴) ۔ " اس کے سامنے ان کے دل جھک جائیں یا نرم ہو جائیں " ۔ انہی کو دوسری جگہ مُخْبِتِیْنَ (۲۲/۳۴) کہا گیا ہے ۔ دل کی نرمی اور جھکاؤ والے ۔ اس سے پہلے فَلَہٗ اَسْلِمُوْا (۲۲/۳۴) نے مفہوم واضح کردیا ہے ۔ قانونِ خداوندی کے سامنے جھک جانے والے ۔ اسے بطیبِ خاطر تسلیم کر لینے والے ۔

---

* تاج و راغب ۔ ** تاج ۔

خ ب ث

اَلْخَبِيْثُ - طَيِّبٌ کی ضد ہے اس لئے اسکے مفہوم کیلئے ط - ی - ب کا عنوان دیکھنا ضروری ہے - خُبْثٌ کے معنے گندے، گھناؤنے اور مکروہ کے ہیں خواہ وہ کھانے پینے کی چیزوں میں ہو یا کلام میں - یا افعال میں - یا عقائد و خیالات میں *- اَلْخَبِيْثُ - طَيِّبٌ کی ضد ہے ناپسندیدہ، ناگوار، خراب نیز دھوکا دینے والا - اَلْخَابِثُ - مکار آدمی - یا ردی شے *- خَبَثُ الْحَدِيْدِ وَالْفِضَّةِ - لوہے اور چاندی وغیرہ کا میل جو انہیں بوٹی میں پگھلانے سے الگ ہو جاتا ہے * - ملاوٹ - کھوٹ - اَلْخُبْثُ - زنا کو بھی کہتے ہیں *-

سورۃ اعراف میں خَبُثَ - اس زمین کے لئے آیا ہے جو شور ہو اور وہاں کچھ پیدا نہ ہو اور اگر پیدا ہو تو بہت تھوڑا (۷/۵۸)

اسی طرح سورۃ ابراہیم میں كَلِمَةٌ طَيِّبَةٌ کے مقابلہ میں كَلِمَةٌ خَبِيْثَةٌ آیا ہے جسے شَجَرَةٌ خَبِيْثَةٌ سے تشبیہہ دی گئی ہے (۱۴/۲۴ - ۲۶) - اس کے معنے ہیں ایسا درخت جو پھل نہ دے - غلط نظریہ حیات دیکھنے میں بالکل صحیح نظریہ کے مطابق نظر آتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا - ساری محنت اکارت جاتی ہے - حالانکہ غلط نظریہ حیات کی چمک دمک بھی بہت ہوتی ہے اور پھیلتا بھی بڑی کثرت سے ہے (۵/۱۰۰) - لیکن اسے ثبات و قرار کبھی نہیں ہو سکتا - اسکی جڑیں زمین کے اوپر اوپر ہوتی ہیں (۱۴/۲۶) -

خَبَائِثُ - خَبِيْثَةٌ کی جمع ہے چنانچہ (۷/۱۵۷) میں ہے کہ رسول طیبات کو حلال قرار دیتا ہے اور خبائث کو حرام - یعنی قرآن کریم نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ خبائث ہیں اور جو چیزیں حلال ہیں وہ طیبات ہیں - (تفصیل کے لئے عنوان ح - ر - م اور ح - ل - ل دیکھئے)

قرآن کریم میں فحش کاری یا فحش کار لوگوں کے لئے بھی خبیث کا لفظ آیا ہے - مثلاً سورۃ نور میں ہے اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ . . (۲۴/۲۶) - یہاں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ خبیث باتیں خبیث لوگوں کے شایان شان ہیں - اور یہ بھی کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں - ثانی الذکر مفہوم کی تائید اسی سورۃ کی دوسری آیت سے ہوتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اَلزَّانِیْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً . . . . . (۲۴/۳) زانی مرد صرف زانی عورت سے نکاح کر سکتا ہے . . . . . . (اسکی تشریح "مفہوم القرآن" میں ملیگی)

---

* تاج و محیط -

خ ب ر

اَلْخَبَرُ۔ جمع اَخْبَارٌ ہے (۹۹/۴) خَبَرٌ اور نَبَأٌ میں فرق یہ ہے کہ نَبَأٌ کسی بہت بڑے واقعہ کے متعلق ہوتی ہے اور خَبَرٌ عام واقعات کے متعلق۔ اہل لغت نے کہا ہے کہ خَبَرٌ عرف اور لغت میں اس بات کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے سے نقل کی جائے *۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ اس تخصیص کے ساتھ نہیں آیا۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنے اہل سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے سَآتِيْكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ (۲۷/۷) ''میں اس سے تمہارے پاس خبر لاونگا ''۔

اَلْخَبِيْرُ۔ خبر کو جاننے یا رکھنے والا۔ یا خبر دینے والا *۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲/۲۷۱)۔ '' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے ''۔

خُبْرٌ کے معنے بھی کسی چیز کے جاننے کے ہیں *۔(۱۸/۶۸)۔ محیط میں ہے کہ یہ اس واقفیت کو کہینگے جو تجربہ کی بنا پر ہو۔

ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی علم بتائے ہیں۔ اس اعتبار سے خَبَرٌ کے لئے علم اور واقفیت ضروری ہے۔

خ ب ز

اَلْخُبْزُ۔ روٹی *۔(۱۲/۳۶)۔ اصلی معنے اس مادہ میں مارنے اور دفع کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اَلْخَبْزُ کے معنے ہوتے ہیں اونٹ کا زمین پر ہاتھ مارنا۔ چونکہ روٹی بھی اس طرح ہاتھ مارنے سے بنتی ہے اسلئے اسے خُبْزٌ کہتے ہیں۔ یا اس لئے کہ روٹی سے بھوک مرتی اور دفع ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اس لفظ کا اطلاق ہر اس چیز پر کر دیا جاتا ہے جسے انسان کھانے یا معیشت کیلئے اختیار کرے **۔ جیسے ہمارے ہاں بھی جب کہا جائے کہ '' اصل سوال تو روٹی کا ہے '' تو اس کے معنی رزق یا معیشت ہی کے ہوتے ہیں۔

خ ب ط

خَبَطَ۔ کسی چیز کو زور سے مارنا۔ پاؤں کو زور سے مار کر کسی چیز کو روندنا۔ درخت کو لکڑی سے مار کر اسکے پتے جھاڑنا۔ خَبَطَ اللَّيْلَ۔ رات

* تاج۔ ** محیط نیز ابن فارس۔

کو سمت معلوم کئے بغیر یوں ہی منہ اٹھا کر چلدینا۔ تَخَبَّطَهُ الشَّيْطٰنُ ۔ اسے شیطان نے پاگل بنا دیا *۔ راغب نے لکھا ہے کہ بادشاہ کے تشدد اور ظلم کو بھی خَبْطٌ کہتے ہیں ۔ اور اِخْتِبَاطُ الْمَعْرُوْفِ کے معنے ہیں کسی سے زبردستی احسان کا مطالبہ کرنا ** ۔

سورۃ بقرہ میں سود خوار لوگوں کی حالت کا نقشہ یہ کہکر کھینچا گیا ہے کہ لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ (۲/۲۷۵) ۔ '' یہ لوگ یوں کھڑے ہوتے ہیں جیسے انہیں سانپ نے ڈس لیا ہو''۔ اسمیں ذہنی جنون اور قلبی اضطراب کی شدت سب کی سب آجاتی ہے جو اس شخص کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی جسکے دل میں ہوس زر نے آگ لگا رکھی ہو۔ اگر اس آیت میں اَلشَّيْطٰنُ سے مراد انسان کے سرکش جذبات لئے جائیں تو اس سے مفہوم ہوگا وہ شخص جو اپنے جذبات کے ہاتھوں پاگل ہو رہا ہو۔لیکن اس میں کمزور پہلو یہ ہوگا کہ اس شخص کی محسوس حرکات کی تشبیہ غیر محسوس شے سے ہوگی۔

خ ب ل

اَلْخَبْلُ ۔ اَلْخَبَلُ ۔ اس کے بنیادی معنے کسی خرابی کے پیدا ہو جانے کے ہیں ۔ مثلاً انسان کے اعضاء میں کوئی خرابی پیدا ہو جانا ۔ فالج گر جانا ۔ جنون ہو جانا۔ زجاج نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنے کسی چیز کا جاتے رہنا ہیں ۔ اسکے بعد اسکے عام معنے ہلاکت یا نقصان کے آتے ہیں ۔ * رَجُلٌ مُخَبَّلٌ ۔ اس شخص کو کہتے جس کے ہاتھ پیر (اعضاء) کٹ گئے ہوں *** قرآن کریم میں ہے لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا (۳/۱۱۷) ۔'' تمہارے دشمن ، تمہاری تخریب ، میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھینگے'' ۔ اس میں ہر قسم کے نقصانات، شر ، فساد آ جاتے ہیں ۔

خ ب و

خَبَتِ النَّارُ وَ الْحَرْبُ ۔ آگ اور جنگ کی تیزی و تندی ماند پڑ گئی ۔ پر سکون ہو گئی ۔ اس کا شعلہ افسردہ ہوگیا* ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے كُلَّمَا خَبَتْ . . . . (۱۷/۹۷) ''جب وہ آگ بجھنے لگے گی'' . . . . اس کے بعد زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (ہم ان کے لئے اسے اور زیادہ بھڑکا دینگے) نے مفہوم واضح کر دیا ہے ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط۔

خِبَاءٌ ۔ در اصل اس پردہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو ڈھانپا جائے۔نیز بالی میں دانہ کے اوپر کا خول** ۔ خاکستر کا پردہ جو شعلہ پر پڑ کر اسے دبا دیتا ہے ۔

(خَبْءٌ (۲۵/۲۷) کے لئے دیکھئے عنوان خ ۔ ب ۔ أ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ خَبْوٌ اور خَبْءٌ ۔ دونوں کے معنی چھپانے کے آتے ہیں) ۔

خ ت ر

اَلْخَتْرُ ۔ بدترین عہد شکنی ۔ عہد شکنی کرنا اور فریب دینا* ۔ در اصل یہ اس عہد شکنی اور غداری کو کہتے ہیں جسے اس قدر کوشش سے کیا جائے کہ انسان تھک کر چور چور ہو جائے ۔ وہ تکان سے کمزور ہو جائے اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں** ۔ اس لئے کہ اَلْخَتْرُ ، اَلْخَدَرُ کے ہم معنی ہے ۔ یعنی ایسی غنودگی و بے حسی جو کسی زہر یا دوا کے پینے سے پیدا ہو جائے اور اعضاء میں کمزوری و اضمحلال کا باعث بنے ۔ رَجُلٌ مُخَتَّرٌ ۔ وہ آدمی جس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں ۔ خَتَّرَهُ الشَّرَابُ ۔ شراب نے اس کے قوٰی کو مضمحل کر دیا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سستی اور فتور کے ہوتے ہیں ۔

قرآن کریم میں خَتَّارٍ كَفُوْرٍ (۳۱/۳۲) آیا ہے ۔ اس کے معنے دغاباز، فریب کار کے بھی ہو سکتے ہیں اور ایسے آدمی کے بھی جو محنت نہ کرنے کی وجہ سے سست ہو چکا ہو ۔ یا وہ آدمی جو احکام خداوندی کی بجا آوری میں سستی برتے ۔ (یعنی آثِیْمٌ ۔ دیکھئے عنوان ا ۔ ث ۔ م)۔

خ ت م

خَتْمٌ کے معنے ہیں کسی چیز کو چھپا دینا اور ڈھانک دینا ۔ اس طرح بند کر کے محفوظ کر دینا کہ اس کا کوئی حصہ باہر نہ نکل سکے ۔ چنانچہ زمین میں ہل چلا کر اور بیج ڈال کر جو پہلی مرتبہ پانی دیتے ہیں اسے اہل عرب خَتَمَ الزَّرْعَ کہتے ہیں ۔ اس لئے کہ پانی دینے کے بعد مٹی جم جاتی ہے اور بیج مٹی کے اندر بند ہو کر محفوظ ہوجاتا ہے ۔ اسی طرح شہد کی مکھیاں اپنے چھتہ کے خانوں میں شہد جمع کرکے موم کا نہایت باریک سا پردہ خانوں کے منہ پر بنا دیتی ہیں جس سے شہد اندر بند اور محفوظ ہو جاتا ہے ۔ اسے بھی عرب خَتْمٌ سے تعبیر کرتے ہیں (اس کے بعد خود شہد ، اور ان خانوں کے منہ کو بھی خَتْمٌ کہنے لگ گئے)*** ۔

---

* تاج و محیط ۔ ** راغب ۔ *** تاج ۔

خَتَمَ الشَّیْءَ خَتْمًا ۔ کے معنے کسی چیز کے آخری سرے تک پہنچ جانے کے بھی ھیں*۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ھیں ۔ خَتْمٌ اور طَبْعٌ کا لفظ دو طرح سے استعمال ھوتا ھے (۱) کسی چیز پر لاکھ وغیرہ لگا کر مہر سے اس پر نشان لگا دینا ۔ اور (۲) وہ نقش یا نشان جو اس طرح مہر لگانے سے بن جائے ۔ پھر قدرے مفہوم میں وسعت پیدا کرکے کسی چیز کو بند کرنے اور روک دینے کے لئے بولا جانے لگا ۔ اس لئے کہ مہر لگا کر خط یا دروازہ بند کر دیا جاتا ھے اور اس کے اندر کی چیز باھر نہیں نکالی جاتی** ۔ خِتَامٌ اس لاکھ یا موم وغیرہ کو کہتے ھیں جس سے کسی چیز کو بند کرکے اس پر مہر لگائی جاتی ھے ۔ اور خَاتَمٌ وہ چیز ھے (انگوٹھی وغیرہ) جس سے اس لاکھ پر مہر لگائی جاتی ھے ۔ ھر چیز کا انجام اور آخر خَاتَمٌ کہلاتا ھے ۔ چنانچہ خَاتَمُ الْقَوْمِ کے معنے ھیں قوم کا آخری فرد ۔ ایسے ھی ھر پینے کی چیز کا خِتَامٌ اس کا آخری حصہ ھوتا ھے۔ (ابن فارس)۔ فراء کا قول ھے کہ خَاتَمٌ اور خِتَامٌ دونوں قریب المعنی ھیں ۔ فُلَانٌ خَتَمَ عَلَیْکَ بَابَہٗ کے معنے ھیں ''وہ شخص تجھ سے اعراض برتتا ھے اور اپنا دروازہ تجھ پر بند کر لیتا ھے'' * ۔

قرآن کریم میں خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ (یا طَبَعَ اللّٰہُ ....) متعدد بار آیا ھے ($\frac{۲}{۷}$) ۔ دلوں پر مہر لگ جانے سے مطلب یہ ھے کہ ان میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت باقی نہیں رھتی ۔ چنانچہ سورۃ انعام میں اَخَذَ اللّٰہُ سَمْعَکُمْ وَاَبْصَارَکُمْ نے خَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِکُمْ ($\frac{۶}{۴۶}$) کی وضاحت کر دی ھے ۔ یعنی علم حاصل کرنے کے دروازے ھی اس پر مسدود ھو جاتے ھیں ۔ یہ حالت ان لوگوں کی ھو جاتی ھے جو اپنے دل کی مرضی سے (برضاورغبت) غلط روش اختیار کر لیتے ھیں ، کیونکہ وہ مستقبل کی خوشگواریوں پر مفاد عاجلہ کو ترجیح دیتے ھیں ($\frac{۱۶}{۱۰۶-۱۰۸}$)۔ اسی طرح وہ لوگ ھیں جو صحیح بات کے سننے سے انکار کر دیتے ھیں اور جب ان کے سامنے اسکا ذکر آئے تو منہ پھیر کر چل دیتے ھیں ($\frac{۱۸}{۵۷-۵۴}$) ۔ جن کی حالت یہ ھوتی ھے کہ تمہاری مجلس میں بیٹھتے ھیں ۔ بظاھر ایسا دکھائی دیتا ھے کہ تمہاری باتیں نہایت غور سے سن رھے ھیں لیکن وہ اس وقت سوچ کچھ اور ھی رھے ھوتے ھیں ۔ یہ صرف اپنے جذبات کے پیچھے چلنا چاھتے ھیں ۔ ($\frac{۴۷}{۱۶-۱۷}$) ۔ اور قرآن کریم میں غور و فکر نہیں کرتے ($\frac{۴۷}{۲۴}$)۔ ان لوگوں کے اپنے اعمال خود زنگ بن کر ان کے دلوں

---

* تاج ۔ ** راغب و تاج ۔ نیز ابن قتیبہ (القرطین ج/۱ صفحہ ۱۴)

پر مہر لگا دیتے ہیں (۸۳/۱۴) * - ان مقامات سے خَتَمَ اللہُ عَلٰی قُلُوبِہِم کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - یعنی اللہ مہر نہیں لگاتا - ان کے اپنے اعمال قوانین خداوندی کے مطابق مہر بن جاتے ہیں -

سورۃ تطفیف میں ”جنت میں پینے کی شے“، کو رَحِیقٍ مَّخْتُومٍ (۸۳/۲۵) کہا گیا ہے - اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ خِتَامُہٗ مِسْکٌ (۸۳/۲۶) اس کی مہر (یا وہ ذائقہ جو منہ میں باقی رہ جائے) مشک کا ہوگا - اس لئے کہ مِزَاجُہٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ (۸۳/۲۷) - اس میں وہ پانی ملا ہوگا جو بڑی بلندیوں سے آرہا ہے - جس سے زندگی کو بلند ترین منازل تک پہنچنے کی قوت حاصل ہو جائیگی -

سورۃ احزاب میں نبی اکرمؐ کو خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (۳۳/۴۰) کہا گیا ہے - خَاتَمٌ کے معنے اوپر لکھے جا چکے ہیں - ان کی رو سے اس کے معنے آخری نبی ہیں - لہذا رسول اللہؐ کے بعد نبوت کو جاری سمجھنا قرآن کریم کی صریح تعلیم کے خلاف ہے - جب قرآن کریم آخری کتاب ہے تو جس نبی پر قرآن کریم نازل ہؤا وہ آخری نبی ہے (نَبِیٌّ کے معنے - ن - ب - أ کے عنوان میں دیکھئے جہاں اس امر کی بھی تصریح کی گئی ہے کہ کوئی نبی بغیر کتاب کے آ نہیں سکتا) - لہذا نہ قرآن کریم کے بعد کوئی اور آسمانی کتاب اور نہ ہی نبی اکرمؐ کے بعد کوئی اور نبی - یہ تصور کہ نبی اکرمؐ کی مہر سے دوسرے لوگ نبی بن سکتے ہیں، نبوت کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے - نبوت خدا کی طرف سے ایک وہبی خصوصیت تھی جو بلا کسب و ہنر عطا ہوتی تھی - اسے نہ کوئی اپنی محنت سے حاصل کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی نبی، اسے دوسرے کو عطا کر سکتا تھا (تفصیل ن - ب - أ میں ملیگی) لہذا نبی اکرمؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ یکسر باطل ہے -

لیکن ”دعوائے نبوت“، کی ایک اور شکل بھی ہے جو بڑی دقیق فلہٰذا بڑی غور طلب ہے - ”نبوت“، سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے براہ راست علم حاصل کرے - یعنی اس علم میں اس کی اپنی عقل و خرد کا کوئی دخل نہ ہو - وہ علم اسے خدا سے براہ راست ملے - ہمارے ہاں (تصوف میں) یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ ”اولیاء اللہ“، یا صوفیائے کرام، خدا سے براہ راست حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں - اسے کشف یا الہام کہا جاتا ہے - بادنٰی تعمق یہ حقیقت سامنے آ جائیگی کہ یہ صرف الفاظ کا فرق ہے - ورنہ کشف و الہام اور وحی میں، حقیقت کے اعتبار سے، کوئی فرق نہیں - اس لئے یہ عقیدہ بجائے خویش باب نبوت کو کھول دیتا ہے - قرآن کریم کی رو سے

*(دیکھئے قلب - سمع - بصر -)

صحیح بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جو علم براہ راست دینا تھا وہ آخری نبیؐ کو دیدیا۔ یہ علم اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ کشف و الہام، انسان کی اپنی نفسیاتی کیفیت کے مظاہر ہوتے ہیں، خدا کی طرف سے کشف حقائق نہیں ہوتا۔

خ د د

اَلْخَدُّ۔ رخسار۔ (۳۱/۱۸) اَلْخَدُّ۔ زمین میں کھودا ہوا مستطیل گڑھا۔ اَلْاُخْدُوْدُ۔ کھائی یا خندق*۔

قرآن کریم میں ہے قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ (۸۵/۴)۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ ذونواس، شاہ یمن نے اہل نجران (عیسائیوں) کو مجبور کیا تھا کہ وہ عیسائیت چھوڑ دیں۔ وہ جب اس پر آمادہ نہ ہوئے تو اسنے خندق کھدوا کر اس میں آگ جلائی اور انہیں اس میں ڈلوا کر جلا دیا**۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ بخت نصر نے خدا پرست یہودیوں کو اسی طرح آگ میں جلایا تھا* لیکن قرآن کریم کے سیاق و سباق سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ تمام مخالفین اسلام ہیں جو رسول اللہؐ سے برسرپیکار تھے اور جنگ کی آگ بھڑکاتے رہتے تھے۔ قرآن کریم نے انہی کی تباہی کی خبر دی ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان اصحاب الاخدود اور تُبَّع)۔

خ د ع

خَدْعٌ* کے معنے ہیں جو کچھ دل میں ہو اسکے خلاف ظاہر کرنا۔ کسی کے ساتھ چھپ کر برائی کرنا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چھپانے اور مخفی رکھنے کے ہیں۔ اصل میں خَدُوْعٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو کبھی تو بہت سا دودھ دیدے اور کبھی بالکل چڑھا جائے۔ (کچھ نہ دے***)۔ عربوں کی شہرت اور شرافت کا مدار انکی مہمان نوازی پر تھا۔ وہ صحراؤں میں رہتے تھے۔ ان کے جانوروں کا دودھ (یا گوشت) ہی ہر وقت میسر آنے والی چیز ہو سکتا تھا۔ اب ذرا سونچئے کہ اگر ایسا ہو کہ مہمان آجائیں۔ وہ ان کے لئے اونٹنی کا دودھ دوہنے کیلئے جائیں اور اونٹنی دودھ چڑھا جائے۔ تو اس وقت میزبان کی حالت کیا ہوگی؟ اس قسم کی اونٹنی جسپر

---

* تاج **محیط۔ ***لین۔

بھروسہ ھی نہ کیا جا سکے خَدُوْعٌ کہلاتی ہے۔ اس سے خَدَعَ کا مفہوم اچھی طرح ذہن میں آسکتا ہے۔ چنانچہ خَیْدَعٌ سراب کو کہتے ھیں*۔ نیز غول بیابانی کو۔ اور اس راستے کو بھی جو بظاھر معلوم ھوکہ منزل کی طرف لئے جا رھا ہے لیکن درحقیقت اس کے خلاف ھو*۔ نیز کسی بڑے کمرہ کے بغل میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بنا لیتے تھے جس میں گھر کی قیمتی چیزیں بغرض حفاظت رکھتے تھے۔ اسے بھی خَادِعَةٌ کہتے تھے*۔ لطائف اللغۃ میں ہے کہ اَلْخَادِعُ اور اَلْخَدُوْعُ اُس راستے کو کہتے ھیں جو کبھی نکھر کر سامنے آجائے اور کبھی گم ھو جائے۔ لہذا خَدْعٌ زندگی کی وہ روش ہے جس میں بظاھر تو کچھ بتایا جائے اور بباطن کچھ اور۔ یا جس میں توقع کے مطابق امکان تو زیادہ کا ھو اور نکلے کم۔ یا جو ایک حالت پر نہ رہے۔ یعنی کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔ چنانچہ خَدَعَ الْکَرِیْمُ اسوقت کہتے ھیں جب کوئی سخی آدمی خلاف توقع بخل کا برتاؤ کرنے لگ جائے۔ خَدَعَ الْمَطَرُ اسوقت کہتے ھیں جب بارش خلاف توقع بہت کم ھو۔ سُوْقٌ خَادِعَةٌ اس بازار کو کہتے ھیں جو ایک حالت پر قائم نہ رہے۔ اور خَدَعَتِ الْاُمُوْرُ اسوقت کہتے ھیں جب حالات دگرگوں ھوتے چلے جائیں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ*۔ خَدَعَ کے معنی کم ھو جانے کے بھی آتے ھیں*۔ اَلسِّنُوْنُ الْخَوَادِعُ ان سالوں کو کہتے ھیں جن میں کبھی فراوانی ھو اور کبھی قحط۔ یا جن میں بارش تو بہت ھو لیکن پیداوار کم ھو* دِیْنَارٌ خَادِعٌ اُس دینار کو کہتے ھیں جو دیکھنے میں کھرا معلوم ھو لیکن پرکھنے پر کھوٹا ثابت ھو۔ (ابن فارس)۔ اسلئے خَادِعٌ سے مراد یا تو وہ جذباتی شخص ہے جو معاملات کا فیصلہ سوچ سمجھ کر نہیں محض جذبات کی رو سے کرتا ہے۔ ذرا جذبات ابھر آئے تو بڑے بڑے وعدے اور دعوے کر دئے۔ ذرا ان میں کمی اور افسردگی آگئی تو سمٹ اور سکڑ کر بیٹھ گئے۔ یا ایسا مفاد پرست جو اپنی مصلحت کی خاطر، اپنے آپ کو ایسا بنا کر دکھائے جیسا (یا جتنا) وہ درحقیت نہیں اور اسطرح معاشرہ کو دھوکے میں رکھے۔ معاشرہ کے استحکام کیلئے ایسے لوگوں پر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا وجود معاشرہ کے لئے سخت نقصان کا باعث ھوتا ہے۔ صاحب محیط کے الفاظ میں خَدَعَ کے بنیادی معنے اس اخفاء اور پوشیدگی کے ھیں جسکا قبل ازوقت اندازہ نہ لگایا جا سکے***۔ یہ مفاد پرستانہ ذھنیت کا شیوہ ھوتا ہے، یا سطحی جذبات پرستوں کا۔

---

*تاج ** لین۔ *** محیط۔

قرآن کریم نے اس قسم کی فریب دینے والی ذھنیت کو ’’ دل کا مرض ‘‘ (فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ (۲/۱۰)) قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ان کا یہ فریب درحقیقت غیر شعوری طور پر خود ان کی اپنی ذات سے فریب ہوتا ہے ۔ (وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَہُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ (۲/۹)) ۔ چونکہ خدا کے قانون مکافات کی رو سے ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے متعلق دھوکے میں رہتے ھیں اسلئے سورہ نساء میں اسے ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ (۴/۱۴۲) ۔ ’’ منافق اللہ کو دھوکا دینا چاھتے ھیں لیکن (اس کے قانون مکافات سے ھوتا یہ ہے کہ) وہ اپنے متعلق دھوکے میں رھتے ھیں ‘‘ ۔ یعنی وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَہُمْ (۲/۹) ۔ ’’ خدا فریبی ‘‘ خود فریبی (Self Deception) کا دوسرا نام ہے ، لیکن لوگ اسے سمجھتے نہیں ۔ مَا یَشْعُرُوْنَ (۲/۹) ۔ اس کا شعور نہیں رکھتے ۔ ویسے بھی جو شخص جذبات میں اندھا ھو جائے اس کا شعور بیکار ھو جاتا ہے ۔

خ د ن

اَلْخِدْنُ ۔ ساتھی ۔ بات چیت کرنے والا ۔ دوست* ۔ راغب نے لکھا ہے کہ بیشتر یہ ایسے ساتھی کے لئے بولا جاتا ہے جو شہوت نفسانیہ کی وجہ سے کسی کے ساتھ رہے ۔ * جن الفاظ میں خاء اور دال اکھٹے آئیں ان میں اثر اندازی کا مفہوم مضمر ھوتا ہے ۔ ** ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ساتھ رھنے کے ھیں ۔

قرآن کریم نے مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کیلئے کہا ہے ۔ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (۴/۲۵) ۔ مُحْصَنٰتٍ اور مُسَافِحَاتٍ کے معانی ح ۔ ص ۔ ن اور س ۔ ف ۔ ح کے عنوانوں کے تحت لکھے گئے ہیں ۔ بالخصوص ح ۔ ص ۔ ن کے ماتحت ۔ وھاں سے معلوم ھو جائیگا کہ سَفْحٌ کے معنے ھیں محض شہوت رانی کی غرض سے جنسی اختلاط ۔ یہاں اسکے ساتھ اِتِّخَاذِ اَخْدَانٍ کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ اس سے معلوم ھوتا ہے کہ مُسَافَحَۃٌ ’’ کھلی ھوئی بد کاری تھی ،، جسکے لئے عرب جاھلیۃ عورتوں کو پیغام بھیجا کرتے تھے ۔ یعنی وہ ان کے معاشرہ کا عام رواج تھا ۔ اور خِدْنٌ ۔ چوری چھپے کی آشنائی کو کہتے تھے ۔ منتہا دونوں کا ایک ھی ہے ۔ انہیں الگ الگ بیان کرنے سے مطلب یہ ہے کہ جاھلیت کے

---

* تاج ۔ ** العلم الخفاق ۔

زمانے میں (نکاح کے علاوہ) جنسی اختلاط کی جتنی صورتیں بھی مروج تھیں ان سب کی تردید ہو جائے، اور اس کی ایک ھی شکل باقی رہ جائے۔ یعنے مُحْصِنِيْنَ - قلعہ بند اور حصار عفت میں محفوظ۔ نیز مُسَافِحِيْنَ سے مطلب ھے محض شہوت رانی کی خاطر۔ اس میں زنا کاری بھی آجاتی ھے اور وقتی طور پر یا ویسے ھی نکاح کی رسم پوری کر لینے کے بعد، نکاح کی ذمہ داریوں کو (Avoid) کرتے ہوئے جنسی تعلقات بھی۔ اور مُتَّخِذَاتِ اَخْدَانٍ کے معنی صرف زناکاری ہونگے۔ اگرچہ قرآنِ کریم نے یہ الفاظ لونڈیوں کے ضمن میں کہے ھیں (جو اُس زمانے میں عربوں کے ھاں ھوتی تھیں - دیکھئے عنوان م - ل - ک میں مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) لیکن اس کا اطلاق عام ھے کیونکہ قرآن کریم کی رو سے زنا کی بہرحال ممانعت ھے خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔

بالفاظ دیگر، سَفْحٌ ، جنسی جذبات کی تسکین کی (قرآنی نکاح کے علاوہ) ایسی شکل ہوگی جو کسی معاشرہ میں معیوب نہ سمجھی جائے اور خِدْنٌ وہ شکل جسے وہ معاشرہ معیوب سمجھے۔ قرآن کریم کی رو سے جنسی جذبات کی تسکین کی ہر وہ شکل ناجائز ہوگی جو قرآن کریم کی رو سے نکاح اور اس کے مقصد کے خلاف ہو، خواہ کوئی معاشرہ اسے معیوب سمجھے یا نہ سمجھے۔ جنسی اختلاط سے مقصد جائز طریق سے افزائش نسل ھے۔

خ ذ ل

خَذَلَتِ الظَّبْيَةُ ۔ ھرنی اپنے گلہ سے پیچھے تنہا رہ گئی ایسی ھرنی کو خَاذِلٌ اور خَذُوْلٌ کہتے ھیں ۔ زیادہ تر ایسی ھرنی (یا گائے) اپنے بچے کی وجہ سے پیچھے رہ جاتی ھے* ۔ تَخَاذَلَتْ رِجْلَاهُ ۔ اس کے پاؤں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ اس طرح پیچھے رہ گیا ۔ ایسے شخص کو رَجُلٌ خَذُوْلُ الرِّجْلِ کہتے ھیں*۔ اَلْخِذْلَانُ ۔ ایسے شخص کا وقت پر ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جانا جسکے متعلق گمان ہو کہ وہ پوری پوری مدد کرے گا**۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی ساتھ چھوڑ دینے اور مدد نہ کرنے کے ھیں ۔

سورۃ آل عمران میں ھے اِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهٖ ($\frac{3}{159}$) ''اگر وہ تمہیں بے مدد چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ھے جو تمہاری مدد کرے گا''۔ جس قوم کا ساتھ خدا کا قانون چھوڑ دے (بمقابلہ

* تاج - **راغب -

یَنْصُرُ (۱۵۹/۳) اور وہ اس طرح باقی قوموں سے پیچھے رہ جائے تو اس کی مدد کوئی نہیں کرسکتا ۔ اس طرح پیچھے رہ جانے والا ، خواہ ایک فرد اپنی جماعت سے پیچھے رہ جائے اور خواہ ایک قوم دوسری قوم سے پیچھے رہ جائے ، زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتا ہے (۲۲/۱۷) ۔ اسلام کے معنے ہیں تمام رفقائے سفر کا کامل ہم آہنگی سے ملکر ساتھ ساتھ چلنا ۔ (دیکھئے عنوان س ۔ ل ۔ م میں تَسَالَمَ) ۔ اور آثِمَ کے معنے ہیں اپنی ذاتی کمزوری کی وجہ سے پیچھے رہ جانا (دیکھئے عنوان ا ۔ ث ۔ م) ۔ لیکن اگر کوئی شخص مختلف قسم کی کششوں سے ، جن میں اولاد کے مفاد کی کشش سب سے زیادہ ہوتی ہے*** ، جماعت سے پیچھے رہ جائے تو یہ خَذْلٌ ہوگا ۔ بہر حال اس کا نتیجہ وہی ہوگا۔ یعنی اپنے انفرادی مفاد اور ذاتی جذبات کی وجہ سے جماعتِ مومنین سے پیچھے رہ جانا ۔ یا قرآن کریم کے نظام کو چھوڑ دینے سے اقوامِ عالم کی صف میں پیچھے رہ جانا ۔ یہ دونوں خَذْلٌ ہونگے۔

سورۃ الفرقان میں ہے وَ کَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلاً (۲۹/۲۵) ۔ یعنی انسان کے سرکش جذبات کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ بظاہر نظر آتا ہے کہ وہ انسان کا آخری وقت تک ساتھ دینگے لیکن وہ عین وقت پر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں ۔ یعنی ایسے جذبات ہمیشہ ہنگامی ہوتے ہیں ۔

خ ر ب

اَلْخَرَابُ ۔ ویرانی ۔ آبادی یعنی عُمْرَانٌ کی ضد ہے ۔ غیر آباد ہونا ۔ خَرِبَ ۔ غیر آباد ہو جانا ۔ اَخْرَبَ ۔ غیر آباد کر دینا ۔ ویران کر دینا ۔ اَلْخَرِبَۃُ ۔ ویرانہ ، غیر آباد جگہ ۔ اَلْخَرْبَۃُ ۔ چھلنی ۔ عیب ۔ دینی خرابی ۔ شک و تہمت ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے اصل معنی کنارہ ٹوٹ کر خراب ہو جانا اور سوراخ ہو جانا بتائے ہیں ، جیسے چاقو وغیرہ کی دھار یا کسی چیز کا کنارہ خراب ہو جانے سے دندانے پڑ جاتے ہیں ۔ (ابن فارس) اَلخُرْبَۃُ ۔ سوراخ کو کہتے ہیں ۔ اَلْخُرَّابَۃُ ۔ سوئی کے ناکے کو کہتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں ہے یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَہُمْ بِاَیْدِیْھِمْ (۲/۵۹) ۔ ''وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو ویران کرتے ہیں'' ۔ سورۃ بقرہ میں مساجد کے متعلق ہے کہ جو شخص ان میں ذکراللہ کے لئے رکاوٹ کا موجب

*** یہ اس جہت سے کہا گیا ہے کہ خاذل اس ہرنی کو کہتے ہیں جو اپنے بچے کی وجہ سے پیچھے رہ جائے ۔ * تاج - نیز ابن فارس

بنتا ہے ، سَعٰی فِیْ خَرَابِھَا (۲/۱۱۴) ''وہ ان کی ویرانی کی کوشش کرتا ہے''۔ لہذا مساجد کی ویرانی یہی نہیں کہ ان میں لوگوں کا اجتماع نہ ہو۔ ان کی ویرانی یہ ہے کہ ان میں قوانین خداوندی کا ذکر اذکار اور صفات الٰہیہ کے متعلق بات چیت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (۴۲/۳۸) اکٹھا آیا ہے۔ یعنی اقامتِ صلٰوۃ اور باھمی مشورہ، لازم و ملزوم ہیں۔ دوسری جگہ ہے مشرکین مساجد کو آباد نہیں کر سکتے (۹/۱۷)۔ اس لئے کہ وہ خالص قوانین خداوندی کی اطاعت نہیں کرتے۔

خ ر ج

خُرُوْجٌ کے معنے ہیں ابھرنا، نکلنا۔ باہر آنا۔ اَلْخَرْجُ۔ خرج۔ (بمقابلہ آمدنی)۔ خَارِجُ کُلِّ شَیْئٍ۔ ہر چیز کے نکلے ہوئے بیرونی اور ظاہری حصہ کو کہتے ہیں۔ اَلْخَارِجِیُّ۔ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو اپنے ماں باپ سے عمدگی میں بازی لے جائے اور آگے نکل جائے۔ نیز ہر وہ چیز جو اپنی جنس کی چیزوں سے آگے نکل جائے*۔ خَرَجَ فُلَانٌ فِی الصِّنَاعَۃِ کے معنے ہیں فلاں شخص اپنی کاریگری میں بہت ماہر ہو گیا**۔ نَاقَۃٌ مُخْتَرِجَۃٌ۔ وہ اونٹنی جو اونٹنیوں کی صفات سے نکل کر اونٹ کی ہم صفت ہو*۔ یَوْمُ الْخُرُوْجِ۔ عید اور میلے کے دن کو کہتے ہیں جب لوگ زینت و زیبائش کے ساتھ باہر نکلیں*۔ خَرَجَتِ الرَّعِیَّۃُ عَلَی الْوَالِیْ۔ اس وقت کہتے ہیں جب رعیت اپنے امیر سے باغی ہو جائے اور اطاعت چھوڑ دے**۔

قرآن کریم نے یہ کہکر کہ بارش سے کسطرح زمینِ مردہ ازسرنو زندگی حاصل کر لیتی ہے، کہا کَذٰلِکَ الْخُرُوْجُ۔ (۵۰/۱۱)۔ اسی طرح ''خروج'' ہوگا۔ یہاں خُرُوْجٌ کے معنے حیاتِ نو کے ہیں۔ اسی کو ذرا آگے چل کر یَوْمُ الْخُرُوْجِ (۵۰/۴۲) کہا گیا ہے۔ قرآن کریم میں قیامت۔ ساعت۔ بعث۔ خروج وغیرہ الفاظ اپنا خاص مفہوم رکھتے ہیں۔ لیکن ان سب میں حیات نو کا پہلو مضمر ہوتا ہے۔ یہ حیات نو خواہ کسی قوم کے زوال کے بعد اس کا عروج ہو، یا پوری انسانیت کا اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جانا، یا انسان کی موت کے بعد حیاتِ اُخروی۔ یہ تمام تصورات ان اصطلاحات میں شامل ہیں اور سیاق و سباق سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ فلاں مقام پر کونسا مفہوم مراد لیا جائیگا۔

خَرْجٌ اور خَرَاجٌ کا لفظ بھی قرآن کریم میں آیا ہے (مثلاً ۱۸/۹۴ ؛ ۲۳/۷۲)۔ اس کے معنے ہیں وہ رقم جو اپنی دولت میں سے نکال کر دوسرے کو

* تاج۔ ** محیط۔

دیدی جائے۔ (ہم نے خَرَاجٌ کی فقہی اصطلاح سے بحث نہیں کی کیونکہ اس اصطلاحی مفہوم میں یہ لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا)۔ اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ عربوں کے ہاں خَرَاجٌ وہ معینہ مقدار ہوتی تھی جو آقا اپنے غلام پر روزانہ یا ماہوار مقرر کر دیتا تھا کہ وہ اس قدر اسے ادا کر دیا کرے۔ اس کے بعد خَرَاجٌ کا لفظ اس ٹیکس کے لئے بولا جانے لگا جو زمین پر لگایا جاتا تھا (جو ٹیکس ذمیوں پر لگایا جاتا تھا۔ یعنی جِزْیَۃٌ اسے خَرْجٌ کہتے تھے۔ اگرچہ بعض اوقات اسے خَرَاجٌ بھی کہدیتے تھے)۔ اب ہر اس ٹیکس کو کہتے ہیں جو گورنمنٹ لوگوں کے اموال سے وصول کرے۔ دراصل شروع میں خَرَاجٌ زمین کی پیداوار کے لئے استعمال ہوتا تھا لیکن اس کے بعد جائیدادوں سے جو کچھ حاصل ہوتا تھا اس کے لئے بھی یہی لفظ بولا جانے لگا*۔

خَارِجٌ ۔ وہ جو نکل پڑے۔ مَخْرَجٌ ۔ نکلنے کی جگہ۔ اَخْرَجَ ۔ نکالنا۔ پیدا کرنا۔ اِخْرَاجٌ ۔ نکال باہر کرنا۔ پیدا کرنا۔ مُخْرِجٌ ۔ وہ جو پیدا کرے۔ نکالے۔ مُخْرَجٌ ۔ وہ جو پیدا کیا گیا ہو۔ یا وہ جگہ یا وقت جہاں سے یا جس میں کوئی چیز نکالی گئی ہو ($\frac{۱۷}{۸۰}$)۔ اِسْتَخْرَجَ ۔ نکال لینا۔ سورۃ بقرہ میں اِخْرَاجٌ بمقابلہ کِتْمَانٌ آیا ہے ($\frac{۲}{۷۲}$)۔ یعنی ظاہر کرنا۔ اسی سورہ میں قصۂ آدم کے ضمن میں پہلے آیا ہے فَاَخْرَجَهُمَا ۔ اس نے ان دونوں کو وہاں سے نکال دیا۔ اور اس کے بعد ہے وَقُلْنَا اهْبِطُوْا ۔ ($\frac{۲}{۳۶}$)۔ اس سے ظاہر ہے کہ خُرُوْجٌ اور هُبُوْطٌ الگ الگ ہیں۔ خُرُوْجٌ محض نکلنا ہے اور هُبُوْطٌ میں گراوٹ بھی شامل ہے۔ یعنی اپنے مقام سے نیچے گر جانا۔ (تفصیل میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں ملیگی)۔

خ ر د ل

اَلْخَرْدَلُ ۔ رائی۔ خَرْدَلَ اللَّحْمَ ۔ اس نے گوشت کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیئے*۔ قرآن کریم میں ہے مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ ($\frac{۲۱}{۴۷}$)۔ ''رائی کے ایک دانے کے برابر''۔

خ ر ر

اَلْخَرِيْرُ ۔ پانی یا ہوا کے چلنے کی سرسراہٹ۔ اڑنے میں عقاب کے پروں کی آواز۔ سونے میں خراٹوں کی آواز۔ اَلْخَرُّ ۔ دراصل یہ بلندی سے اس طرح گرنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ ہی گرنے کی آواز بھی سنائی دے

* تاج ۔

پھر ہر گرنے کے لئے استعمال ہونے لگا * ۔ خَرَّمُوْسٰی صَعِقًا (۷/۱۴۳) "موسیٰ کڑک سے بیہوش ہو کر گر پڑے"۔ یا فَکَاَنَّمَا خَرَّمِنَ السَّمَاءِ (۲۲/۳۱) "گویا وہ آسمان (کی بلندیوں) سے گرا ہو"۔ (یہ مشرک کی حالت بیان کی گئی ہے)۔

سورۃ فرقان میں مومنین کی بہت سی صفات گنائی گئی ہیں ۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا (۲۵/۷۳) "جب ان کے سامنے آیات خداوندی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر گر نہیں پڑتے"، (بلکہ ان پر غور و فکر کرتے ہیں)۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ خَرَّعَلَی الشَّیْءِ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز پر قائم رہنا** ۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسمی طور پر تو ایک طرف رہا، جذباتی طور پر، بلا غور و فکر تمسک با لقرآن بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا ۔ مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا عمل بالقرآن غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ وہ علیٰ وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ تمسک بالکتاب سے مقصد کیا ہے ۔ ذرا سوچئے کہ جو خدا اپنی آیات کو بھی بہروں اور اندھوں کی طرح بلا سوچے سمجھے اور دیکھے بھالے ماننے اور ان پر قائم رہنے کی اجازت نہ دیتا ہو وہ غیر خداوندی باتوں کو بلا غور و فکر تسلیم کرلینے کی کب اجازت دے سکتا ہے؟ وہ مومن کی صفت ہی یہ بتاتا ہے کہ وہ بلا سوچے سمجھے کسی بات کے پیچھے نہیں لگ جاتا ۔ اُسے اس کا حکم ہے کہ لَاتَقْفُ مَالَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶) ۔ "جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو ۔ یقیناً سماعت ۔ بصارت اور قلب، ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کی بابت پوچھا جائیگا ۔ علم کے لئے سمع، بصر (یعنی حواس) اور قلب (Mind) کی شہادت ضروری ہے ۔ اور مومن وہ ہے جو احکام الٰہیہ اور قوانین خداوندی کو علیٰ وجہ البصیرت مانتا ہے ۔

خ ر ص

اَلْخَرْصُ ۔ اندازہ کرنا ۔ تخمینہ لگانا ۔ یعنے غیر یقینی چیزوں میں محض ظن و گمان سے کچھ کہنا ۔ خَرْصُ النَّخْلِ ۔ کھجور کے درخت پر اندازہ کرنا کہ اسمیں کسقدر پھل ہوگا ۔ کَمْ خَرْصُ اَرْضِکَ ۔ تمہاری زمین کی پیداوار اندازاً کتنی ہوگی؟ اس اعتبار سے ہر ظنی و تخمینی بات، بلکہ جھوٹی

* تاج ۔ ** محیط ۔

بات ، کو اَلْخَرْصُ کہتے ہیں * ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے اِنْ یَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ (۱۱۷/۶) " یہ لوگ صرف ظن کا اتباع کرتے ہیں اور محض اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں " ۔ سورۃ ذاریات میں ہے قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ (۱۰/۵۱) " محض ظن و قیاس کی اتباع کرنے والے تباہ و برباد ہو جائینگے " ۔ حقائق کی بنیاد یقین پر ہوتی ہے ۔ اسلئے دین کا سارا مدار یقین پر ہے ۔ کوئی ظنی اور قیاسی بات دین نہیں بن سکتی ۔ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے (خود قرآن کریم کی داخلی اور تاریخ کی خارجی شہادت اسپر دلالت کرتی ہے) اسلئے بہ یقینی طور پر دین ہے اور حق و باطل کے پرکھنے کا حقیقی معیار ۔ راغب نے کہا ہے کہ ظن و تخمین سے کوئی بات کہنا ، خواہ وہ حق کے مطابق ھی کیوں نہ ہو ، کذب (جھوٹ) ہے ۔ اس اعتبار سے خَرّاصٌ کے معنی کَذَّابٌ (جھوٹا) ہوتے ہیں ۔ ** خَرَصَ ۔ اس نے جھوٹ بولا *** ۔

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ ظن و تخمین کا اتباع کرنے والے تباہ ہونگے ۔ لہذا دین میں ظنیات کا اتباع کرنے والے (قرآن کریم کے دعوے کی رو سے) کبھی کامیاب و کامران نہیں ہو سکتے ۔ خود ہماری اپنی حالت اسکی زندہ شہادت ہے ۔

خ ر ط م

اَلْخُرْطُوْمُ ۔ ناک * یا ناک کا اگلا حصہ ۔ ہاتھی کی سونڈ کو بھی کہتے ہیں *** ۔ ثعلب نے کہا ہے کہ عام طور پر درندوں کی تھوتھنی کو مَخْطَمٌ اور خُرْطُوْمٌ کہتے ہیں ۔ خَرَاطِیْمُ الْقَوْمِ ۔ قوم کے سردار جو ہر معاملہ میں پیش پیش رہتے ہیں * ۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں " فلاں شخص قوم کی ناک ہے " ۔ یہ باشرف ہونے سے کنایہ ہے ۔ یا کہتے ہیں " ناک کٹ گئی " ۔ یعنی وہ بے عزت ہو گیا ۔

قرآن کریم میں ہے سَنَسِمُهٗ عَلَی الْخُرْطُوْمِ (۱۶/۶۸) " ہم اسکی ناک پر داغ لگائینگے " ۔ مطلب ذلیل کرنے سے ہے کیونکہ چہرہ یا ناک کا داغی کر دینا انتہائی ذلت کی بات ہوتی تھی ** ۔ اس میں توہین وذلت کا ایسا پہلو ہے جو چھپائے نہ چھپے ۔

خ ر ق

اَلْخَرْقُ ۔ کسی چیز کو بلا سوچے سمجھے بے قاعدہ پھاڑ ڈالنا ۔ یہ اَلْخَلْقُ کی ضد ہے جسکے معنے کسی چیز کو اندازہ کے مطابق خوش اسلوبی

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔

بنانے کے ہیں *۔ خَرَقَ الثَّوْبَ۔ اسنے بغیر اندازے کے کپڑے کو پھاڑ ڈالا **۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ (۱۷/۳۷)۔ اس کے معنے پھاڑ ڈالنے یا سوراخ کر دینے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنے ایک سرے سے دوسرے سرے تک (مسافت) قطع کرنے کے ہیں **۔ سورۃ کہف میں کشتی میں سوراخ کر دینے کے لئے خَرَقَهَا (۱۸/۷۱) آیا ہے۔

خَرَقَ۔ اس نے جھوٹ بولا۔ خَرَقَ الْكَذِبَ۔ اس نے جھوٹ تراشا۔ اَلتَّخَرُّقُ۔ جھوٹ بنانا۔ اَلتَّخْرِيْقُ۔ کثرت سے جھوٹ بولنا **۔ سورۃ انعام میں ہے وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ (۶/۱۰۱) وہ خدا کے لئے اولاد کا عقیدہ رکھتے ہیں جو یکسر جھوٹ ہے۔ ان کا یہ عقیدہ غورو فکر اور قاعدے اور قانون سب کے خلاف ہے۔ اس سے حقیقت کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں۔

خ ز ن

اَلْخَزْنُ کے بنیادی معنے کسی چیز کے ذخیرہ کرنے کے ہیں ***۔ اَلْخِزَانَةُ والخَزِيْنَةُ والمَخْزَنُ وہ جگہ جہاں کوئی چیز ذخیرہ کی جائے ***۔ اَلْخَزِيْنَةُ۔ وہ چیز جس کو حفاظت سے چھپا کر، بچا کر رکھا گیا ہو۔ اسکی جمع خَزَائِنُ ہے۔ قرآن کریم میں ہے لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ (۶/۵۰)۔ ”میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں“۔ خَازِنٌ۔ جمع کرنے والا۔ یا محافظ (اسکی جمع خَازِنُوْنَ اور خَزَنَةٌ ہے) قرآن کریم میں ہے وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا (۳۹/۷۳) ”جنت کے محافظ اُن سے کہینگے“۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ (خَزْنٌ) کے بنیادی معنی بچا کر حفاظت سے رکھنے کے ہیں۔ خَزَائِنُ اللّٰهِ کائنات کی وہ قوتیں اور ذخائر ہیں جو ہنوز انسان کے علم میں نہ آئے ہوں۔

خ ز ی

خِزْیٌ کے معنے ایسی ذلت ہے جس سے شرم آجائے۔ اسی وجہ سے یہ لفظ ذلت اورشرم دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لہذا اسکے معنے ہونگے ذلت آمیز رسوائی۔ یا ان عیوب کو بطور سزا ظاہر کرنا جن کا اظہار باعث شرم ہو **۔

قرآن کریم میں ضابطہ خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْيَا (۲/۸۵) بنایا گیا ہے۔ یعنے اس دنیا کی زندگی میں ذلت آمیز رسوائیاں۔ سورۃ طٰہٰ میں نَذِلَّ وَنَخْزٰی (۲۰/۱۳۴) ساتھ ساتھ آئے ہیں

* راغب ** تاج۔ *** تاج و راغب۔

جہاں اسکے معنے شرم و ندامت ہے - یعنے خفیف اورشرمسار ہونا - سورۃ الحجر میں یہ لفظ تَفْضَحُوْنِ (۱۵/۶۹) کے ساتھ آیا ہے - فضیحت و رسوائی - مُخْزِی الْکَافِرِیْنَ - کافروں کو ذلت آمیز رسوائیاں دینے والا (۹/۲) - دنیا میں عزت وشرف کی زندگی مومن کا شعار ہے - ذلت و رسوائی خدا کا عذاب ہے - لہذا جو قوم دنیا میں ذلیل و رسوا ہو وہ مومنین کی جماعت نہیں ہو سکتی - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی دور کرنے کے ہیں - یعنی ایسی قوم زندگی کی خوشگواریوں سے دور (محروم) کر دی جاتی ہے - اور یہ انتہائی ذلت ہے -

اگر کسی قوم کے متعلق یہ دیکھنا ہو کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے یا نہیں ، تو یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ دنیا میں سرفرازی و سربلندی ، غلبہ و تسلط اور عزت وشرف کی حامل ہے یا اقوام عالم کے مقابلہ میں ذلیل و خوار ہے - اگر وہ ذلیل و خوار ہے تو وہ قوانین خداوندی کے مطابق نہیں چل رہی - اس ضمن میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ

(۱) جو قوم ان قوانین کے مطابق تو زندگی بسر کرتی ہے جو خارجی کائنات میں کارفرما ہیں (یعنی تسخیر فطرت کرتی ہے) لیکن اپنی تمدنی زندگی کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کے تابع رکھتی ہے ، اسے مفاد عاجلہ حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے - اقوام مغرب کا شمار انہیں میں ہے -

(۲) جو قوم تسخیر فطرت بھی کرتی ہے اور اپنی تمدنی زندگی بھی قوانین خداوندی (قرآن کریم) کے مطابق بسر کرتی ہے اس کی دنیاوی زندگی بھی عزت وشرف کی زندگی ہوتی ہے اور آخرت بھی درخشندہ و تابناک - یہ جماعت مومنین کی خصوصیت ہے - لیکن

(۳) جو قوم نہ تسخیر فطرت کرتی ہے اور نہ اپنی تمدنی زندگی قرآن کریم کے مطابق رکھتی ہے ، اسکی دنیا بھی خراب ہوتی ہے اور آخرت بھی تباہ - ہم اسی زمرہ میں آتے ہیں - خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) " دنیاوی زندگی میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹنا " -

خ س أ

اَلْخَسِیْءُ* - ردی اُون کو کہتے ہیں جسے بیکار ہونے کی وجہ سے پھینک دیا جاتا ہے - اس جہت سے اس مادہ میں حقارت و نفرت کے معنے پیدا ہو گئے

* تاج -

ہو گئی۔ چنانچہ خَسَأَ الْکَلْبَ کے معنے ہیں اس نے کتے کو دھتکار دیا اور خَسَأَ الْکَلْبُ۔ کتا راندہ ہوا (یہ لازم و متعدی ہے)۔ اَلْخَاسِیءُ۔ ذلیل۔ کمینہ۔ دھتکارا ہوا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دور کر دینے کے ہیں۔

قرآن کریم میں قِرَدَةً خَاسِئِیْنَ آیا ہے (۲/۶۵)۔ ''ذلیل بندر''۔ اس کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان (ق۔ ر۔ د) خَسَأَ الْبَصَرُ۔ نگاہ حیران ہو کر تھک گئی*۔ سورۃ الملک میں ہے یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا (۶۷/۴) ''نگاہ درماندہ ہو کر کاشانہ چشم میں لوٹ آئیگی''۔ سورۃ المومنون میں اہل جہنم کے متعلق ہے اِخْسَئُوْا فِیْهَا (۲۳/۱۰۸) ''اس میں ذلت و خواری کے ساتھ رہو''۔ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم اور دور رہو۔

خ س ر

خَسِرَ فُلَانٌ کے معنے ہیں وہ شخص راستہ سے گم ہو گیا**۔ ہلاک ہو گیا***۔ اَلْخَسْرُ وَ الْخُسْرَانُ کے معنے ہیں کمی کرنا۔ نقص۔ خَسَرَ الْوَزْنَ وَ الْکَیْلَ وَ اَخْسَرَ۔ اس نے ماپ تول میں کمی کی۔ بعض ائمہ لغت نے کہا ہے کہ اَلْخَاسِرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو دیتے وقت ناپ تول میں کمی کرے، اور لیتے وقت زیادہ لے**۔ قرآن کریم میں ہے اَوْفُوا الْکَیْلَ وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِیْنَ (۲۶/۱۸۱) ''ماپ کو پورا کیا کرو اور نقصان پہنچانے والوں میں سے نہ ہو جاؤ، یعنی کسی کے حق میں کمی نہ کرو۔ سورۃ تطفیف میں ہے۔ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَ اِذَا کَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ (۸۳/۲-۳)۔ ''جب لوگوں سے لیتے ہیں تو ماپ تول پورا کرتے ہیں اور جب انہیں دیتے ہیں تو ماپ تول میں کمی کر دیتے ہیں''۔ (یہ آیت معاشیات کا بہت بڑا اصول بیان کرتی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان، ب۔ ی۔ ع) سورۃ الرحمٰن میں ہے وَ اَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ (۵۵/۹)۔ ''وزن کو عدل کے ساتھ پورا رکھو اور تول میں کمی نہ کرو''۔ نیز معاشرہ کے توازن کو مت بگاڑو۔

صَفْقَةٌ خَاسِرَةٌ کے معنے ہیں غیر نفع بخش سودا جس میں نقصان ہو**۔ اَلْخَیْسَرَی کے معنے ہیں دھوکہ۔ فریب۔ عہد شکنی۔ کمینگی، خسارہ۔ خَسَّرَهٗ تَخْسِیْرًا۔ اسکو ہلاک کر دیا**۔

---

* تاج و محیط۔ ** تاج۔ *** محیط۔

اَلْخَاسِرُ - راستے سے گم ہو جانے والا - ہلاک ہو جانے والا - جو شخص کامیاب نہ ہو سکے**- جو تجارت میں گھاٹے میں رہے - راغب نے کہا ہے کہ خُسْرٌ میں مادی اشیاء میں کمی اور معنوی اشیاء کا نقصان دونوں شامل ہیں - یعنی مال و دولت میں نقصان اور عقل و ایمان ، صحت و عزت میں کمی دونوں کے لئے خُسْرٌ بولا جاتا ہے***- ابن الاعرابی نے الخَاسِرُ کے معنی اس شخص کے کئے ہیں جو عقل و مال دونوں کھو چکا ہو* -

خُسْرٌ- نقصان - تباہی*- اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۱۰۳/۲) - اگر انسان (کو بلا وحی کے تنہا چھوڑ دیا جائے تو) یہ نقصان ہی نقصان میں رہے گا - "اس نقصان میں ہر قسم کا زیاں شامل ہے - خَسَارٌ - ہلاکت - نقصان - نقصان اٹھانے والا - اَخْسَرُ - سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والا - تَخْسِیْرٌ- نقصان دینا - گھاٹے میں رکھنا - خیر سے دور کر دینا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نقصان اور کمی کے ہیں -

خ س ف

خَسَفَ الْمَکَانُ - یَخْسِفُ - خُسُوْفًا - وہ جگہ زمین کے اندر دھنس گئی****- ابن فارس نے اس کے معنے اندر گہرائی میں جا کر چھپ جانا اور دھنس جانا بتائے ہیں - قرآن کریم میں ہے فَخَسَفْنَا بِہٖ وَ بِدَارِہِ الْاَرْضَ (۲۸/۸۱) ہم نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا" - نیست و نابود کر دیا - خَسْفٌ کے ایک بنیادی معنی جانور کو بلا چارہ اور گھاس کے باندھے رکھنا بھی ہیں - اسی سے اس کے معنے کسی پر جور و ظلم اور زیادتی کرنا ہونگے، پھر یہ لفظ، ذلت ، توہین اور جبر کرنے کے لئے بھی استعمال ہونے لگا - اَلْخَاسِفُ - لاغر - کمزور - بَاتَ الْقَوْمُ عَلَی الْخَسْفِ - لوگوں نے بھوکے رات گزار دی - سَامَہٗ خَسْفًا اس نے اسے ذلیل و خوار کیا - اَلْخَسِیْفُ - اندر کو دھنسا ہوا - اَخْسَفَتِ الْعَیْنُ - آنکھ اندھی ہو گئی**** -

قرآن کریم میں یَخْسِفُ اللّٰہُ بِہِمُ الْاَرْضَ (۱۶/۴۵) تباہی اور بربادی کے معنوں میں آیا ہے (یعنی اللہ انہیں زمین میں دھنسا دیگا - تباہ و برباد کر دیگا - خُسُوْفٌ - چاند گہن کو کہتے ہیں****- بِئْرٌ مَخْسُوْفَۃٌ - وہ کنواں جس کا پانی غائب ہو گیا ہو*** - قرآن کریم میں (نبی اکرمؐ کے ہاتھوں آنے والے انقلاب کے سلسلہ میں ہے) خَسَفَ الْقَمَرُ (۷۵/۸) -

* تاج - ** محیط - *** راغب - **** تاج و محیط -

جس کا مطلب یہ ہے کہ عرب جاہلیت (جن کا نشان قمر تھا) کا زور ٹوٹ جائیگا۔ وہ کمزور اور ماند پڑ جائینگے ۔ ان کی مخالفت اور سرکشی ختم ہو جائیگی ۔ یہ مجازی معنی ہیں ۔ لیکن اگر اس کے حقیقی معنی لئے جائیں تو ترجمہ ہوگا ''چاند کو گہن لگ گیا ۔ ماند پڑ گیا'' ۔

خ ش ب

خَشَبٌ ۔ موٹی لکڑی ۔ جمع خُشُبٌ * ۔ قرآن کریم نے منافقین کو خُشُبٌ مُسَنَّدَةٌ (۶۳/۴) سے تشبیہ دی ہے ۔ یعنی ایسی لکڑیاں جو دیوار کے آسرے کھڑی کر دی گئی ہوں ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ خَشَبَةٌ خَشْبَاءُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جسے اندر سے گھن نے کھا لیا ہو ** ۔ یعنی نہ ان میں عقل و فکر ہے' نہ زندگی کی کوئی تازگی ۔ نہ دماغ صحیح' نہ قلب زندہ ۔ نرے کندۂ نا تراش ہیں ۔ چنانچہ خَشَبَ الشِّعْرَ اُسوقت کہتے ہیں جب کوئی شخص یونہی روانی سے شعر کہہ دے اور اسے کاٹ چھانٹ کر خوبصورت نہ بنائے ۔ اور فَحْلٌ خَشِيبٌ ۔ اس نئے اونٹ کو کہتے ہیں جو سدھایا نہ جا سکا ہو ۔ جَبْهَةٌ خَشْبَاءُ ۔ کھُرّی پیشانی *** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سخت اور کھردرا ہونے کے ہیں ۔ اَلْاَخْشَبُ پتھریلے اور سخت پہاڑ کو کہتے ہیں ۔ نیز اس تلوار کو جو تازہ بننے کی وجہ سے ہموار اور چکنی نہ ہو ۔

ان معانی سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم نے منافقین کو خُشُبٌ کہکر کیوں پکارا ہے ۔

خ ش ع

خَشَعَ کے معنے ہیں نگاہ یا آواز کا پست ہو جانا * ۔ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ (۲۰/۱۰۸) '' آوازیں پست ہو جائیں گی'' ۔ اور خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ (۶۸/۴۳) '' ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی'' ۔ اس کے بعد ہے تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۔ (انہیں ذلت آلے گی) ۔ اس سے خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنی ذلت وخواری کی وجہ سے نگاہوں کا جھک جانا ۔ خَشَعَتِ الْاَرْضُ ۔ زمین خشک ہوئی اور اس پر پانی نہ برسا * خُشُوْعُ الْكَوْكَبِ کے معنی ہیں ستارہ کا غروب ہونے وقت جھک جانا ۔ خَشَعَتِ الشَّمْسُ ۔ سورج کو گہن لگ گیا ۔ اِخْتَشَعَ ۔ سر جھکا کر نگاہ

* تاج ** محیط *** راغب ۔

نیچی کرنا *۔ اَلْخُشْعَۃُ ۔ زمین کے سخت اور سنگلاخ قطعہ کو کہتے ہیں جس میں سبزہ نہ اُگے ۔ نیز اَلْخَاشِعُ ۔ گرد و غبار سے بھری ہوئی جگہ کو کہتے ہیں جہاں پڑاؤ نہ کیا جاسکے * ۔ قرآن کریم میں زمین مردہ کے لئے خَاشِعَۃً (۳۹/۴۱) آیا ہے ۔ سورۃ غاشیہ میں نَاعِمَۃٌ کے مقابلہ میں خَاشِعَۃٌ آیا ہے (۸۸/۲-۸) ۔ نَاعِمَۃٌ کے معنے شگفتہ و شاداب اور تر و تازہ ہیں اس لئے خَاشِعَۃٌ کے معنے افسردہ و پژمردہ ہونگے ۔ قرآن کریم نے اس کے بعد عَامِلَۃٌ نَاصِبَۃٌ (۸۸/۳) کہکر اس کی وضاحت کردی ۔ یعنی تھکے ماندے ۔ بے رونق ۔ خَاشِعِیْنَ ۔ ان لوگوں کے لئے بھی آیا ہے جو قوانین خداوندی کے سامنے جھک جائیں ۔ قرآن کریم نے اس کے معنے کئے ہیں اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَاَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (۲/۴۶) ۔ یعنی وہ لوگ جو اس کا گمان رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کا سامنا کرنا ہے ۔ یعنی وہ اپنے اعمال کے بارے میں خدا کے قانون مکافات کے سامنے جواب دہ ہیں اس لئے وہ ہر معاملہ میں اسی کے قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ یہ ہے خُشُوْعٌ سے مقصود ۔ قلب سلیم سے قوانین خداوندی کے سامنے جھک جانا ۔ سر تسلیم خم کردینا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ خَشَعَ کے معنے ہیں سر کو جھکا دیا ۔

خ ش ی

اَلْخِیْشِیُّ ۔ خشک پودے کو کہتے ہیں ۔ اَلْخَشَاءُ ۔ خشک پتھریلی زمین جہاں کچھ پیدا نہ ہو* ۔ عربوں کے نزدیک پانی کے نہ ملنے کی وجہ سے سبزی کا خشک ہو جانا سخت خطرہ کا موجب ہوتا تھا ۔ اس لئے خَشْیَۃٌ کا لفظ کسی نقصان کے احتمال سے خوف زدہ ہو جانے کے لئے استعمال ہونے لگا ۔ صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ خَشْیَۃٌ ۔ خَوْفٌ سے زیادہ شدید ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ وہ اہل عرب کے قول شَجَرَۃٌ خَاشِیَۃٌ سے ماخوذ ہے ، یعنی بالکل خشک درخت جس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہے ۔ اس کے برعکس خَوْفٌ کا لفظ صرف نقصان کے لئے آتا ہے کیونکہ وہ نَاقَۃٌ خَوْفَاءُ سے ماخوذ ہے یعنی بیمار اونٹنی جو مر نہیں گئی بلکہ اس کی زندگی کی آس باقی ہے** ۔ نیز خَشْیَۃٌ میں احتمال ، امید اورتوقع کے معنے بھی پائے جاتے ہیں جیسے خَشِیْتُ اَنْ یَکُوْنَ ذَالِکَ اَسْھَلَ لَکَ ۔ مجھے امید یا توقع تھی کہ یہ تمہارے لئے زیادہ آسان ہوگا ۔ اسی طرح اس میں عِلْمٌ (جاننے) کے معنے بھی بتائے گئے ہیں (۹۳/۲) (خَوْفٌ

*تاج ۔ **محیط ۔

کا لفظ بھی جاننے کے معنوں میں آتا ہے دیکھئے عنوان خ ۔ و۔ ف)۔ جب اس کے معنے خوف کے ہوں تو اس سے مراد ہوتا ہے اس قسم کا خوف جو کسی کی عظمت سے دل پر طاری ہو جائے* ۔ خَشْيَةٌ کے معنے ہوتے ہیں کسی کام کے انجام کا علم ہونے کی وجہ سے اس سے اندیشہ کرنا (۱۸/۸۰) ۔ یا اسے ناپسند کرنا* ۔ خشیت الٰہی سے عام طور پر مراد لی جاتی ہے خدا کا ڈر ۔ لیکن اس ڈر کا صحیح مفہوم خشیت کے بنیادی معنوں سے سمجھ میں آ سکتا ہے ۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ قوانین خداوندی کے اتباع کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی کوششوں کی کھیتی سرسبزوشاداب ہوتی ہے ۔ (هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲/۵) ۔ ان کی محنتوں کا بیج ایک شجر طیب بن جاتا ہے جسکی جڑیں زمین میں مستحکم ہوتی ہیں اور شاخیں آسمان کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی ۔ اور وہ ہر موسم میں مسلسل پھل دیتا رہتا ہے (۱۴/۲۴) ۔ یہ نتیجہ ہے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا ۔ اس کے برعکس اگر قوانین خداوندی کے خلاف زندگی بسر کی جائے تو انسان کی کوششوں کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں ۔ اور اس کی محنتوں کے پودے خشک ہو جاتے ہیں ۔ اس امر کا احساس کہ اگر ہم قانون خداوندی کے مطابق نہ چلے تو ہماری کھیتی جھلس کر رہ جائیگی ، خَشْيَةُ اللّٰهِ (خدا کا ڈر) کہلاتا ہے ۔ یعنی قوانین خداوندی سے سرکشی کے نتائج و عواقب کا احساس ۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں احتمال ، توقع ، اندیشہ ، اور علم کا پہلو مضمر ہوتا ہے ، اور ان قوانین کے غیر متبدل اور لازمی طور پر نتیجہ خیز ہونے کے یقین سے ان کی عظمت اور قوت کا پہلو بھی ۔ یہ ہے اصل مفہوم خَشْيَةُ اللّٰهِ (خدا کے ڈر) کا ۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے خ ۔ و۔ ف کا عنوان)۔

سورۃ توبہ میں ہے أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ (۹/۱۳) ۔ "تم اس سے تو ڈرتے ہو کہ ان لوگوں کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا حالانکہ تمہیں اس کا خیال کرنا چاہئے کہ اگر قانون خداوندی کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا ؟ " نتائج کا ڈر" ۔ یہ ہے خَشْيَت کا صحیح مفہوم ۔ اسی سورت میں ذرا آگے چل کر ہے ۔ وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا (۹/۲۴) " وہ تجارت جس کے نقصان سے تم ڈرتے ہو" ۔

خ ص ص

اَلْخَصَاصُ کے بنیادی معنی ہیں خلل یا شگاف جو دو چیزوں کے درمیان واقع ہو جائے ۔ نیز چھید اور سوراخ کو بھی کہتے ہیں ۔ چونکہ شگاف

* تاج بحوالہ راغب نیز ابن فارس۔

سے چیز کمزور ہوجاتی ہے اور اس میں نقص پیدا ہو جاتا ہے اس لئے خَصَاصَۃٌ کے معنے تنگی - بد حالی - فقر و فاقہ - ضرورت اور حاجت کے ہو گئے (۹/۵۹) - انگور کی بیل سے پھل توڑ لینے کے بعد کہیں کہیں جو اکادُکا چھوٹے چھوٹے خوشے باقی رہ جائیں انہیں اَلْخَصَاصَۃُ کہتے ہیں* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں شکستگی اور خلاء (کھلی جگہ) کا مفہوم ہوتا ہے - اس طرح اَلْخَصَاصَۃُ کے معنی ہوئے فقر اور حالت میں شکستگی -

یہ اس کے اولین معنے ہیں - چونکہ جن دو چیزوں کے درمیان شگاف آجائے وہ ایک دوسری سے الگ ہو جاتی ہیں ، اس لئے خُصُوْصٌ کے معنے ہیں کسی کو دوسروں سے الگ کرکے اس کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنا - لہذا خَاصٌّ - عَامٌّ کی ضد ہے - یعنے عمومی کے مقابلہ میں خصوصی آئے گا - خَصَّہٗ وَ اخْتَصَّہٗ - اس کو باقیوں سے الگ کرکے اس کے ساتھ امتیازی سلوک کیا - یعنے ایسا برتاؤ جس میں دوسرے لوگ شریک نہ تھے*- (۵/۲۵)- خَصَّ الشَّیْءُ - کوئی چیز عام نہ ہوئی - خَصَّ الرَّجُلُ خَصَاصَۃً وہ ضرورت مند اور محتاج ہوا** -

دوسروں سے الگ کرکے ، خصوصی برتاؤ کے سلسلہ میں سورۃ بقرہ کی یہ آیت دیکھئے جس میں کہا گیا ہے وَ اللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (۲/۱۰۵) - ''اللہ اپنی رحمت کے لئے جسے چاہتا ہے مختص کرلیتا ہے'' یہاں رحمت کے معنی وحیٔ خداوندی ہیں - مطلب یہ کہ اللہ عام انسانوں میں سے ایک فرد کو منتخب (الگ) کرکے اسے وحی عطا کردیتا ہے - وحی چونکہ وہبی عطیہ ہے جو اکتسابی طور پر نہیں مل سکتی ، اس لئے وحی کسی کے چاہنے یا نہ چاہنے سے نہیں ملتی - بہ مشیت کے پروگرام کے مطابق اُسے ملتی ہے (بلکہ یوں کہئے کہ اُسے ملتی تھی - کیونکہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے) جسے خدا اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق دینا چاہے -

خ ص ف

اَلْخَصْفُ - وہ جوتا جس میں اوپر تلے برابر کے چمڑے ہوں - اسکا ہر چمڑا خَصْفَۃٌ کہلاتا ہے - خَصَفَ النَّعْلَ یَخْصِفُھَا - جوتے پر دو برابر کے چمڑوں کو اوپر تلے رکھ کر سی دیا - خَصْفٌ کے معنے ملانے اور جمع کرنے نیز جوڑنے ، پیوند لگانے اور گانٹھنے کے بھی آتے ہیں - خَصَفَ الْعُرْیَانُ الْوَرَقَ عَلٰی بَدَنِہٖ - ننگے آدمی نے اپنے بدن پر پتوں کو چپکا لیا

* تاج - ** محیط -

لیا اور انہیں تو برتو رکھ لیا تاکہ ستر ڈھانپا جا سکے *۔ قرآن کریم میں قصۂ آدم کے ضمن میں ہے وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (۷/۲۲)۔ ،، وہ باغ کے پتوں کو اوپر تلے رکھ کر اپنے آپ کو ڈھانپنے لگے،،۔ جنسی شعور کی بیداری، یعنی حیا کے احساس سے مراد ہے۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ،، ابلیس و آدم ،، میں ملیگی)۔

اَلتَّخْصِيْفُ کے معنی ہوتے ہیں جو چیز اپنے پاس نہ ہو اسکے لئے بہ تکلف کوشش کرنا *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جانا۔

خ ص م

اَلْخُصُوْمَةُ۔ جھگڑا۔ اَلْخَصْمُ۔ جھگڑا کرنے والا۔ (یہ واحد۔ جمع۔ تثنیہ۔ سب کیلئے آتا ہے)۔ اَلْخَصِيْمُ۔ جھگڑا کرنے والا۔ اَلْخُصْمُ۔ ہر چیز کا کنارا، گوشہ۔ اَلْخُصُوْمُ۔ وادیوں کے دہانے *۔

قرآن کریم میں ہے اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲/۲۰۴) ،، سخت جھگڑالو،،۔ سورۃ حج میں ہے هٰذٰنِ خَصْمٰنِ (۲۲/۱۹)۔ ،، یہ دو فریق ہیں جو ایک دوسرے سے جھگڑا کرتے ہیں ،،۔

سورۃ نحل میں انسان کے متعلق ہے هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (۱۶/۴)۔ یعنے اگر اسے وحی کی روشنی کے بغیر علی حالہ رہنے دیا جائے تو یہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا نظر آئیگا۔ (نیز دیکھئے عنوان ج۔ د۔ ل)۔ سورۃ زخرف میں ہے مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۔ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (۴۳/۵۸-۵۹)۔ ،، یہ لوگ (ان باتوں کو) تجھ سے صرف جھگڑنے کی خاطر بیان کرتے ہیں۔ یہ ہیں ہی جھگڑالو ،،۔ سورۂ آلِ عمران میں (ہیکل کے پجاریوں کے ضمن میں) ہے وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ (۳/۴۴) ،، تو اُن کے پاس نہیں تھا جب وہ آپسمیں جھگڑتے تھے ،،۔

خ ض د

خَضْدٌ۔ کسی گیلی یا سوکھی چیز کو موڑنا یا اسطرح توڑنا کہ وہ ٹوٹ تو جائے لیکن الگ نہ ہو۔ کبھی یہ کاٹنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ خَضَدَ الشَّجَرَ۔ اسنے درخت کے کانٹے توڑ ڈالے (اور اس طرح

* تاج۔ محیط۔ راغب۔

اس میں جو ایذا رساں عنصر تھا اسے ختم کر دیا)۔ اِنْخَضَدَتِ الثِّمَارُ۔ پھل پچک گئے اور رس نکل جانے سے ان کی ترو تازگی ختم ہو گئی۔ رَجُلٌ مَخْضُوْدٌ۔ وہ آدمی جس کے پاس کوئی حجت نہ رہے یا جو چلنے پھرنے سے معذور ہو جائے۔*۔ اِخْتَضَدَ الْبَعِيْرَ۔ اس نے قابو پانے کے لئے اونٹ کے نکیل ڈالی اور اس پر سوار ہو گیا**۔

قرآن کریم میں اہل جنت کے متعلق ہے فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (۵۶/۲۸) ایسی بیریاں جن کی شاخیں پھل کے بوجھ سے ٹوٹی پڑتی ہوں۔ یا ایسی لذتیں جن سے ہر قسم کی خلش اور کانٹا نکال دیا گیا ہو۔ اور اگر اسے استعارۃً لیا جائے (دیکھئے عنوان س۔ د۔ ر) تو اسکا مطلب ہوگا، حیرت کی فراوانی لیکن اُس میں شکوک و اضطراب کی کوئی خلش نہ ہو (۵۳/۱۴)۔

خ ض ر

اَلْخُضْرَۃُ۔ سبز رنگ۔ جمع خُضَرٌ اور خُضْرٌ۔ قرآن کریم میں ثِیَابٌ سُنْدُسٍ خُضْرٍ (۷۶/۲۱) آیا ہے۔ یعنی سبز رنگ کے ریشمی کپڑے۔ یہاں خُضْرٌ، اَخْضَرُ کی جمع ہے۔ اَلْخَضِرُ۔ سبزہ (۶/۱۰۰)۔ سبز کھیتی۔ اَلْخَضَرُ۔ نرم و نازک اور سبز ہونا۔ اَلْخَضْرَاءُ۔ بھلائی۔ فراخی۔ نعمت۔ سرسبزی و شادابی*۔ چونکہ سبز رنگ زیادہ گہرا ہو کر مائل بہ سیاہی ہو جاتا ہے اسلئے عربوں کے ہاں اَسْوَدٌ کو اَخْضَرٌ اور اَخْضَرٌ کو اَسْوَدٌ بھی بولتے ہیں***۔ بلکہ ابن فارس نے تو کہا ہے کہ عربوں کے ہاں جو رنگ سفید رنگ سے مختلف ہو اس میں سیاہ رنگ کا شائبہ ہوتا ہے۔ مُخْضَرَّۃٌ (۲۲/۶۳) جو سبز ہو۔

اَلْخِضْرُ۔ اَلْخَضِرُ۔ "آبِ حیات والے خواجہ خضر"، جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ پانیوں کے پیغمبر ہیں اور قیامت تک زندہ رہینگے۔ لیکن یہ محض "شاعری" ہے۔ قرآن کریم میں اسکا کوئی ذکر نہیں۔

خ ض ع

اَلْخُضُوْعُ۔ جھکنے کے معنوں میں آتا ہے۔ خَضَعَ النَّجْمُ۔ ستارہ غروب ہونے کی طرف مائل ہو گیا۔ اَلْاَخْضَعُ۔ وہ شخص جس کی گردن میں پیدائشی طور پر پستی اور جھکاؤ ہو۔ جو بے دست و پا ہو چکا ہو۔

* تاج۔ ** محیط۔ *** راغب۔

خَضَعَهُ الْكِبَرُ ۔ بڑھاپے نے اسے جھکا دیا ۔ اَلْخَضِيْعَةُ ۔ سیلاب کی (نرم نرم) آواز ۔ اَخْضَعَ الرَّجُلُ ۔ آدمی نے گفتگو میں لوچ پیدا کی ۔ اَلْخُضَعَةُ ۔ وہ آدمی جو ہر ایک کے سامنے عاجزی اور انکساری کرتا ہو ۔ خَضِعَ ۔ وہ ساکن اور مطیع ہو گیا* ۔

قرآن کریم میں اُمہات المومنینؓ (نبی اکرمؐ کی ازواج مطہرات) سے کہا گیا ہے فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ (۳۳/۳۲) ''اپنی گفتگو میں نرمی اور لوچ نہ پیدا کرو'' ۔ تمکنت اور وقار سے باتیں کرو ۔

گردنیں جھک جانے ، یعنے مطیع و فرمانبردار ہوجانے کے لئے خَاضِعٌ کا لفظ (۲۶/۴) میں آیا ہے ۔ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ ۔ ''ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں'' ۔

خ ط أ

اَلْخَطْءُ ۔ اَلْخَطَا ۔ اَلْخَطَاءُ ۔ غلط ۔ نادرست** ۔ اس کے معنی نشانہ خطا (Miss) کر جانا ہیں*** ۔ کہتے ہیں کہ اَلْخَطَا اس قصور کو کہتے ہیں جو عمداً نہ کیا جائے اور اَلْخَطِيْئَةُ وہ قصور ہے جو عمداً سرزد ہو** ۔ لیکن صاحب محیط کے نزدیک اَلْخَطِيْئَةُ ۔ بلا ارادہ اور بلا عمد بھی ہو سکتا ہے ۔ لیکن اِثْمٌ ہمیشہ عمداً ہوتا ہے**** ۔ خَطِيْئَةٌ کی جمع خَطَايَا اور خَطِيْئَاتٌ ہے ۔ در اصل اس سے مراد ایسا کام ہے جو اپنا پورا پورا نتیجہ مرتب نہ کرے ۔ چنانچہ عَلَى النَّخْلِ خَطِيْئَةٌ مِنْ رُطَبٍ ۔ کے معنے ہیں کھجور کے درخت پر تھوڑی سی رطب (کھجوریں) ہیں** ۔ قرآن کریم میں ہے بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ (۲/۸۱) ۔ جو ناہمواریوں کے کام کرتا ہے اور (اس طرح) اسکی خطائیں اسے گھیر لیتی ہیں'' ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سَيِّاٰتٌ کا نتیجہ خطاؤں میں گھر جانا ہوتا ہے ۔ یعنے اس کے بعد انسان اپنے نشانے خطا کرتا جاتا ہے ۔ اسے کوئی بات صحیح طور پر سوجھتی نہیں ۔ اس کی کھجوریں پورا پھل نہیں لاتیں ۔ لیکن اگر اس آیت میں واو کو تفسیری مانا جائے تو كَسَبَ سَيِّئَةً کے معنے ہونگے اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ ۔ آیت (۲/۲۸۶) میں نسیان اور خطا کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے ۔ لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۔ ''اگر ہم سے بھول یا خطا ہو جائے تو ہماری گرفت نہ کرنا'' ۔ لیکن (۳۳/۵) میں ہے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۔ ''تم پر اس بارے میں گناہ نہیں جو تم سے

* تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***لین ۔ ****محیط ۔

خطا ہو جائے۔ گناہ وہ ہے جو تمہارے دل کے ارادے سے ہو" ۔ اس سے ظاہر ہے کہ خَطَأٌ اس غلطی کو کہتے ہیں جو سہواً ہو جائے اور اس میں دل کا ارادہ شامل نہ ہو۔ اسی قسم کی بلا عمد خطائیں (سہو) تھیں جن کے متعلق حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ خدا انہیں ان کے مضر اثرات سے محفوظ رکھیگا ۔ وَ الَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ (۲۶/۸۲) "وہ ذات جس سے مجھے توقع ہے کہ وہ ظہور نتائج کے وقت میری خطاؤں کے اثرات سے مجھے محفوظ رکھیگا ۔

سورۃ الحاقّۃ میں خَاطِئُوْنَ کا لفظ اہل جہنم کے لئے آیا ہے (۶۹/۳۷) اور خَاطِئَۃٌ کا لفظ ظلم و سرکشی کے لئے بھی (۶۹/۹) ۔ سورۃ علق میں ہے نَاصِیَۃٍ کَاذِبَۃٍ خَاطِئَۃٍ (۹۶/۱۶) ۔ "جھوٹی، خطا کار پیشانی" ۔ ان مقامات میں خَطَأٌ کے معنی جرم ہیں جس میں قصد و ارادہ شامل ہے ۔ اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں قتل اولاد کے سلسلہ میں ہے اِنَّ قَتْلَهُمْ کَانَ خِطْاً کَبِیْرًا (۱۷/۳۱) ۔ "ان کا قتل یقیناً ایک بہت بڑی غلطی ہے" ۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ خَطَأٌ اس غلطی کے لئے بھی آتا ہے جو سہواً ہو، اور اس کے لئے بھی جو بالارادہ ہو۔ جو بالارادہ ہو، وہ جرم ہوگی اور قابل مؤاخذہ۔ بعض اہل لغت نے خَطِیَ کے معنے عمداً غلطی کرنا اور اَخْطَأَ کے بغیر قصد غلطی کرنا بتائے ہیں ۔

خ ط ب

اَلْخَطْبُ ۔ بات، مسئلہ، حالت، معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ۔ جَلَّ الْخَطْبُ ۔ بات بڑی ہوگئی ۔ معاملہ بڑا ہوگیا* ۔ سورۃ یوسف میں ہے قَالَ مَا خَطْبُکُنَّ (۱۲/۵۱) "بادشاہ نے پوچھا کہ تمہارا معاملہ کیا تھا" ۔ سورۃ حجر میں ہے قَالَ مَا خَطْبُکُمْ اَیُّھَا الْمُرْسَلُوْنَ (۱۵/۵۷) "اس نے کہا کہ اے پیغامبرو! تمہارا معاملہ کیا ہے" ۔ اس میں معاملہ کے اہم ہونے کا تصور ضرور ہوتا ہے ۔ خَطَبَ الْمَرْاَۃَ خَطْبًا وَ خِطْبَۃً ۔ عورت کو نکاح کا پیغام دیا* ۔ خِطْبَۃٌ (۲/۲۳۵) نکاح کا پیغام ۔ خَطِیْبَۃٌ ۔ منگیتر عورت* ۔

اَلْخِطَابُ ۔ ایک دوسرے سے بات چیت کرنا نیز جن الفاظ سے کسی کو مخاطب کیا جائے وہ خطاب کہلاتے ہیں** ۔ فَصْلُ الْخِطَابِ ۔ دو ٹوک بات یا معاملہ کا دو ٹوک فیصلہ کر دینا (دیکھئے عنوان ف ۔ ص ۔ ل) ۔ خَاطَبَہٗ ۔

*تاج ۔ ** محیط ۔

اس سے بات کی* ۔ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۲۵/۶۳) ۔ جب ان سے ناواقف اور جاھل لوگ (بھی) ھمکلام ھوتے (یا معاملہ کرتے) ھیں تو وہ ''سلام'' کہتے ھیں یعنی ایسی بات کہتے ھیں جس سے وہ غلطی سے محفوظ اور سلامت رھیں ۔ خَاطَبَ میں بات کرنا یا معاملہ کرنا ۔ دونوں مفہوم ھوسکتے ھیں ۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی ھوتے ھیں (۱) دو آدمیوں کے درمیان باتیں ھونا ۔ اور (۲) دو مختلف رنگوں کا ھونا ۔

خ ط ط

اَلْخَطُّ ۔ کسی چیز میں لمبی دھاری یا لکیر ۔ نرم زمین میں خفیف اور پتلا سا راستہ ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنے اس نشان کے ھیں جو لمبا ھو ۔ نیز ھر راستہ ۔اَلْخِطُّ ۔ وہ زمین جس کے ارد گرد بارش ھوئی ھو لیکن اس میں نہ ھوئی ھو ۔ وہ زمین جہاں تمہارے اترنے سے پہلے کوئی نہ اترا ھو ۔ اَلْخِطَّةُ ۔ زمین کا وہ حصہ جسے آدمی نشان لگا کر اپنے لئے برائے تعمیر مخصوص کرلے ۔ خَطَّ ۔ یَخُطُّ ۔ خَطًّا ۔ لکھنا ، کتابت کرنا ۔ کِتَابٌ مَخْطُوْطٌ ۔ لکھی ھوئی کتاب* ۔

سورۃ عنکبوت میں نبی اکرمؐ کے متعلق ھے وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْ مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ . . . (۲۹/۴۸) ۔ ''تو اس سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ ھی اپنے دائیں ھاتھ سے کچھ لکھ سکتا تھا'' اس میں ''اس (قرآن کریم) سے پہلے'' کی تخصیص صاف بتا رھی ھے کہ نزول قرآن کریم سے پہلے تو حضورؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے لیکن اس کے بعد یہ صورت نہیں رھی تھی ۔ پھر آپؐ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا ۔ اس لئے یہ عقیدہ کہ حضورؐ ساری عمر اُمّی (اَن پڑھ) رھے قرآن کریم کی رو سے صحیح نہیں ۔

خ ط ف

خَطْفٌ کے معنے ھیں کسی چیز کو تیزی سے اچک لینا ۔ خَاطِفُ ظِلِّهٖ ۔ ایک پرندے کا نام ھے جو پانی میں اپنے سایہ کو دیکھ کر اُسے پکڑنے کے لئے جھپٹتا ھے** ۔ خُطَّافٌ ۔ ایک سیاہ پرند جو پرواز کرنے میں جھپٹتا ھے** ۔ اَلْخَاطِفُ ۔ اس تیر کو کہتے ھیں جو زمین پر لگ کر گھستے

---

* تاج و راغب ۔ ** تاج ۔

ہوئے نشانہ پر جالگے۔ گویا وہ کوئی چیز زمین سے اچک رہا ہو اسی سے آج کل اَلْخَطِیْفَةُ۔ اس لڑکی کو کہتے ہیں جسے کوئی شخص بھگا کر لے جائے***۔

قرآن کریم میں ہے یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ (۲/۲۰)۔ ''قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی نگاہوں کو اچک کرلے جائے''۔ سورۃ حج میں ہے فَتَخْطَفُهُ الطَّیْرُ (۲۲/۳۱)۔ ''اُسے پرندے اچک کرلے گئے''۔ دوسرے مقام پر ہے اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ (۳۷/۱۰)۔ ''بجز اس کے کہ کوئی (یونہی ذرا سی) بات اچک کر لے جائے''۔ سورۃ عنکبوت میں ہے جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (۲۹/۶۷)۔ ''ہم نے حرم کو امن کی جگہ بنا دیا اور (حالانکہ) ان کے گردو نواح سے لوگ اچک لئے جاتے ہیں''۔

خَطِفَ الْخَطْفَةَ (۳۷/۱۰)۔ اور اِسْتَرَقَ السَّمْعَ (۱۵/۱۸)۔ ''یونہی اچٹتی ہوئی بات لے اڑنا اور چوری چھپے کچھ سن لینا''۔ (دیکھئے عنوان س۔ ر۔ ق) یہ ان کاھنوں (نجومیوں) کے متعلق ہے جو علم غیب کی باتیں معلوم کرنے کے دعوے کرتے تھے۔ (اور اب بھی کئی جگہ کرتے ہیں جہاں ہنوز علم کی روشنی نہیں پہنچی)۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ محض اٹکلیں دوڑاتے رہتے ہیں۔ کوئی بات یونہی ٹھیک نکل آئی تو اسے اچھالتے پھرے۔ جو غلط ثابت ہو گئی، اس کی تاویل کرلی۔ ورنہ غیب کے علم پر ان کی قطعاً دسترس نہیں۔ لَا یَسَّمَّعُوْنَ (۳۷/۸)۔ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (۲۶/۲۱۲)۔ نزول قرآن کریم کے بعد علم و بصیرت کا دور آ گیا۔ اب توہم پرستیوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب ایسے عقائد کو علم کی بارگاہ سے آتشیں کوڑے پڑتے ہیں۔ (مزید تفصیل متعلقہ عنوانات میں ملیگی)

خ ط و

اَلْخُطْوَةُ (وَ الْخَطْوَةُ) جمع خُطًا و خُطُوَاتٌ۔ وہ فاصلہ جو دو قدموں کے درمیان ہو۔ پھر اس کا استعمال قدم کے لئے بھی ہونے لگا۔ یا راستے کے لئے۔ خُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ (۲/۱۶۸) ''سرکش قوتوں کے یا مفاد پرستی کے جذبات کے راستے*''۔ خَطَا الرَّجُلُ یَخْطُوْ اس آدمی نے چلنے کے لئے قدم بڑھایا۔ تَخَطَّیْتُهُ۔ میں اسے پھاند کر اس سے آگے بڑھ گیا*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ خَطْوٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز سے آگے بڑھ جانا۔ اور چلے جانا۔

* تاج۔ ** راغب۔ *** محیط۔

خ ف ت

خَفَتَ الصَّوْتُ ۔ بھوک کی شدت سے آواز میں پستی آ جانا یا آواز کا نہ نکلنا ، خَفَتَ فُلَانٌ ۔ فلاں آدمی مر گیا کیونکہ اس کی آواز منقطع ہو گئی اور وہ خاموش اور ساکت ہو گیا ۔ اَلْخَفْتُ ۔ چھپا کر بات کرنا ۔ پوشیدہ گفتگو کرنا ، * ۔ (جَہْرٌ کی ضد ہے) دیکھئے (۱۷/۱۱۰) ۔ سورہ طٰہٰ میں ہے یَتَخَافَتُوْنَ بَیْنَھُمْ (۲۰/۱۰۳) ۔ '' باہم چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں'' ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے پوشیدہ رکھنے اور چھپانے کے ہوتے ہیں۔

خ ف ض

اَلْخَفْضُ ۔ رَفْعٌ (بلند کرنا) کی ضد ہے ۔ یعنے نیچے کرنا ۔ خَفَضَ رَأْسَ الْبَعِیْرِ ۔ اس نے اونٹ کی گردن نیچے کی طرف جھکا دی تاکہ اس پر سوار ہو ۔ اَلْخَافِضَۃُ ۔ پست ٹیلہ کو کہتے ہیں ۔ اَلْخَفْضُ ۔ نرم رفتاری ۔ خَفَضَتِ الْاِبِلُ ۔ اونٹ نے اپنی رفتار نرم کر دی ۔ اسی سے اس کے معنے تواضع ۔ فروتنی ۔ اطمینان ۔ سکون کے آتے ہیں ۔

عَیْشٌ خَافِضٌ ۔ پرسکون و بافراغت زندگی ۔ خَفْضُ الْعَیْشِ ۔ وسعت اور فارغ البالی کی زندگی * ۔ بغیر کسی دقت اور مشقت ۔ پابندی اور رکاوٹ کے رزق فراواں ملنا ۔ اس مادہ میں بنیادی طور پر یہ مفہوم ہوتا ہے ۔

قرآن کریم میں ہے وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ (۱۵/۸۸) ۔ '' تو جماعتِ مومنین کے لئے اپنا بازو جھکا دے'' ۔ اسے نرم کر دے ۔ ان سب کو اپنے بازو کے نیچے لے لے ۔ اپنے پروں کے نیچے سمیٹ لے ۔ خَفَضَ الطَّائِرُ جَنَاحَہٗ ۔ اس وقت بھی کہتے ہیں جب پرندہ اپنی پرواز کو روکنے کے لئے بازو سمیٹ لے * ۔ ان معانی کی رو سے مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تو اپنی تیز رفتاری میں کمی کر دے تاکہ دیگر افراد کارواں جو اتنے تیز رو نہیں ہیں ، تمہارے ساتھ چل سکیں ۔ ایک قائد کو اپنے پروگرام کی ترتیب میں اپنے رفقاء کی استطاعت اور استعداد کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے ۔ سورۃ واقعہ میں ہے خَافِضَۃٌ رَّافِعَۃٌ (۵۶/۳) وہ انقلاب سرکشوں اور متمردوں کو پست کر دیگا اور صحیح نظام خداوندی پر چلنے والوں کو بلند کر دیگا ۔ یہاں خَفْضٌ ضد ہے رَفْعٌ کی ۔ یعنی جو اوپر ہیں انہیں نیچے کر دیگا ۔ جو نیچے ہیں انہیں اوپر کر دیگا ۔ تہ و بالا کر دیگا (۱۱/۸۲) ۔

---

* تاج و راغب ۔

خ ف ف

اَلْخِفُّ وَالْخَفِيْفُ ہلکا (ثقیل کے مقابلہ میں)۔ اَلْخُفَافُ ۔ ہلکا۔ بعض لوگوں نے خُفَافٌ اور خَفِيْفٌ میں یہ فرق کیا ہے کہ خُفَافٌ ' عقل و فکر میں ہلکا اور خَفِيْفٌ ' جسم میں ہلکا *۔ (خَفِيْفٌ کی جمع خِفَافٌ ہے۔ (۹/۴۱) راغب نے کہا ہے کہ خفیف کبھی تو قابل مدح صفت ہوتی ہے اور کبھی مذموم۔ مثلاً جس چیز کو ہلکا اور خوش آیند پایا جائے اسے خَفِيْفٌ کہتے ہیں اور جو گراں ہو اسے ثَقِيْلٌ ۔ یہ قابل مدح صفت ہے۔ اسکے بر خلاف اوچھا ' سطحیت پسند ' کم وزن خَفِيْفٌ کہلاتا ہے اور گرانبار و پروقار ثَقِيْلٌ ۔ یہاں خفیف مذموم صفت ہوگی۔ اِسْتَخَفَّ فُلَانٌ بِحَقِّيْ ۔ اسنے میرے حق کی کوئی عزت نہیں کی اور اسے بے وقعت سمجھا۔ تَخْفِيْفٌ ۔ کمی کر دینے کو کہتے ہیں۔ اَلْخُفُّ ۔ اونٹ یا شتر مرغ کا پاؤں۔ نیز چرمی موزہ جو پاؤں میں پہنا جاتا ہے۔ *

ہلکا ہونے کی جہت سے ' تیز خرامی (جلدی چلنے) کو بھی اس سے تعبیر کرتے ہیں۔ خَفَّ الْقَوْمُ عَنْ وَطَنِهِمْ ۔ لوگ اپنے وطن سے نکل کر تیزی سے سفر میں چلے گئے *۔

قرآن کریم میں بدوؤں کے خیموں کے متعلق ہے تَسْتَخِفُّوْنَهَا (۱۶/۸۰) "تم انہیں ہلکا پھلکا پاتے ہو"۔ سورۃ الروم میں ہے لَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ (۳۰/۶۰) "جو لوگ خدا کے قانون پر یقین نہیں رکھتے وہ تجھے خفیف نہ سمجھیں"۔ یعنی تم میں کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہئے جس سے مخالفین کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ تم اپنے دعوے میں ہلکے اور عزائم میں ڈھیلے ہو اس لئے تمہیں تمہارے مقام سے ہٹا کر اپنے ساتھ لے چلنا چنداں دشوار نہیں۔

سورۃ القارعۃ میں ثَقُلَتْ بمقابلہ خَفَّتْ آیا ہے۔ وَ اَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۔ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (۱۰۱/۶-۹) ۔ "سو جس کا پلڑا بھاری ہوگا وہ خوشگوار اور پسندیدہ زندگی بسر کریگا۔ اور جس کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ تباہی کے عمیق گڑھے میں ہوگا"۔ اس آیت میں ارتقاء کے ایک عظیم اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ طالب علموں کے لئے امتحان میں کامیابی کے لئے "فی صد نمبروں" کا قاعدہ مقرر ہوتا ہے (مثلاً ساٹھ فیصد)

* تاج و راغب۔

جو طالب علم سو میں سے ساٹھ نمبر حاصل کر لیتا ہے اس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے ۔ اس کی چالیس فیصد غلطیوں سے در گزر کر دیا جاتا ہے اور اسے اگلی جماعت میں ترقی دیدی جاتی ہے ۔ یعنی اس کی صلاحیتوں کا پلڑا جھکا ہوا ہوتا ہے اور غلطیوں کا پلڑا ہلکا ہوتا ہے ۔ اس کے بر عکس جو طالب علم چالیس فیصد نمبر حاصل کرتا ہے اسے فیل کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو ترقی کے لئے مقرر ہے ۔ کائنات میں قانونِ ارتقاء کا اصول بھی یہی ہے ۔ جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اس کی تھوڑی بہت کمزوریاں اس کے راستے میں حائل نہیں ہوتیں ۔ جس میں اتنی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی اس کی تھوڑی بہت صلاحیت اس کے کسی کام نہیں آتی ۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ یہی اصول انسانی ارتقاء کا بھی ہے ۔ جس کی صلاحیتوں کا پلڑا جھک جائیگا اسے زندگی کی اگلی منزل میں ترقی مل جائیگی ۔ جس کا پلڑا کمزور رہیگا ، وہ ترقی نہیں پا سکیگا ۔ '' ترقی پانے والوں ،، کو اهل جنت کہا گیا ہے اور آگے نہ بڑھنے والوں کو اهل جہنم ۔ اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۵) '' یقیناً حسنات (اچھے اعمال) سیاٰت (غلط اعمال) کو دور کردیتے ہیں ،، ۔ اگر حسنات (تقویت بخش) اعمالِ حیات کا پلڑا بھاری ہو تو کمزوریوں کے مضرت رساں اثرات زائل ہو جاتے ہیں ۔ اس مقصد کے لئے انسانی اعمال کا ایک ایک ذرہ سامنے لایا جاتا ہے (۹۹/۷-۸) ۔ لیکن فیصلہ اسی سے ہوتا ہے کہ حسنات کا پلڑا بھاری ہے یا سیاٰت کا ۔ انسانی ذات کی نشو و نما اور ضعف و اضمحلال کے لئے یہی اصول کار فرما ہے ۔ جو اعمال اس کی تقویت اور استحکام کا موجب بنتے ہیں ، اگر ان کا وزن زیادہ ہے تو وہ اعمال جو اس کی کمزوری کا باعث تھے ، نیچے دب جاتے ہیں ۔ یعنی ان کے اثرات اسکی نشو و نما کو روکتے نہیں ۔ لیکن اگر معاملہ اس کے بر عکس ہے ' تو تقویت بخش اعمال ، اس کے ارتقاء کا موجب نہیں بنتے ۔ (مزید تشریح کے لئے '' ن ۔ ج ۔ و ،، کا عنوان دیکھئے) ۔

خ ف ی

اَلْخَافِيَةُ ۔ عَلَانِيَةٌ کی ضد ہے ۔ یعنی چھپنا ۔ پوشیدگی ۔ نیز چھپی ہوئی چیز ۔ اَلْخَفَاءُ ۔ جو چیز تم پر مخفی رہ جائے ۔ اِخْتَفٰى ۔ اَخْفٰى ۔ اِسْتَخْفٰى چھپ گیا ۔ پوشیدہ ہو گیا ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (یعنی اِخْفَاءٌ) اِبْدَاءٌ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ (اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۔ وَاِنْ تُخْفُوْهَا .... ۲/۲۷۱) اِبْدَاءٌ کے معنے ظاہر کرنے کے ہیں ۔ سورۃ مائدہ میں اِخْفَاءٌ

تَبْيِيْن کے مقابلہ میں آیا ہے (۵/۱۵) اس کے معنے بھی ظاہر کر دینے کے ہیں۔ نِدَاءً خَفِيًّا (۳/۱۹) دھیمی آواز۔ چھپی ہوئی آواز۔ سورۃ طٰہٰ میں آخْفٰی اور سِرًّا ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ (۷/۲۰)۔ سورۃ الحاقّۃ میں ہے لَا تَخْفٰی مِنْكُمْ خَافِيَةٌ (۱۸/۶۹) ''کوئی چھپی ہوئی بات چھپی ہوئی نہ رہ سکے گی''۔ سورۃ النساء میں ہے۔ يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ (۱۰۸/۴) ''وہ لوگوں سے چھپنا چاہتے ہیں''۔ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ (۱۰/۱۳)۔ جو رات کو چھپ جائے یا چھپ جانا چاہے۔ الخَفِيُّ۔ پوشیدہ۔ جو ظاہر و آشکارا نہ ہو۔ قرآن کریم میں طَرْفٍ خَفِيٍّ (۴۵/۴۲) کنکھیوں سے دیکھنے کے لئے آیا ہے۔

اَخْفَاهُ۔ کسی بات کو ظاہر کر دینا۔ اس کے خفاء (پوشیدگی) کو دور کر دینا*۔ محیط میں ہے کہ خَفِيَ لَهُ کے معنے ظاہر ہونے کے آتے ہیں اور اس کا استعمال ان موقعوں پر ہوتا ہے جہاں کوئی چیز پہلے سے چھپی ہوئی ہو اور پھر ظاہر ہو جائے۔ یا کسی خفیہ طریقہ سے ظاہر ہو جائے**۔ لطائف اللغۃ میں ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے جس کے معنی كَتَمَ (چھپا دینا) اور اَظْهَرَ (ظاہر کرنا) دونوں آتے ہیں۔

ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے اَكَادُ اُخْفِيْهَا (۱۵/۲۰) اس میں اگر اَكَادُ کے معنی ارادہ کرنے کے لئے جائیں اور اُخْفِيْهَا کے معنی ظاہر کرنے کے تو مطلب یہ ہوگا کہ میں اسے ظاہر کر دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اور اگر اَكَادُ کے معنی نفی کے لئے جائیں اور اُخْفِيْهَا کے معنی پوشیدہ رکھنے کے تو بھی مطلب یہ ہوگا کہ میں اسے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا بلکہ ظاہر کردینا چاہتا ہوں۔ مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوگا۔ اس نکتہ کی وضاحت عنوان (ک۔ و۔ د) میں کی گئی ہے جسے ضرور دیکھ لینا چاہئے۔

خ ل د

خُلُوْدٌ دوام کو کہتے ہیں۔ لیکن صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب کسی چیز میں تغیر اور فساد بہت دیر میں پیدا ہو، یعنے وہ بہت دیر تک نہ بگڑے تو اس کی اس صفت کے لئے خلود کا لفظ استعمال کر دیتے ہیں۔ لہذا کسی چیز کے عرصۂ دراز تک علی حالہٖ قائم رہنے کو بھی خُلُوْدٌ کہتے ہیں خواہ وہ ہمیشہ رہے یا نہ رہے*۔ چنانچہ رَجُلٌ مُخْلَدٌ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جس میں بڑھاپا بہت دیر میں آئے۔ کتاب الاشتقاق میں اس کے معنی طُوْلُ الْعُمْرِ (لمبے عرصہ تک رہنا) اور

---

* تاج۔ ** محیط۔

اَلْبَقَاءُ (غیر متغیر رہنا) کے لکھے ہیں۔ اَلْخَوَالِدُ۔ پہاڑوں چٹانوں اور پتھروں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتے ہیں۔ خانہ بدوش، صحراء میں کھانا پکانے کیلئے پتھر کھڑے کرکے چولہا بنا لیا کرتے تھے جو انکے کوچ کے بعد وہیں رہ جاتے تھے (وہ انہیں ساتھ نہیں لے جاتے تھے)۔ انہیں بھی خَوَالِدُ کہتے تھے***۔ خَلَدَ وَاَخْلَدَ بِالْمَكَانِ وَالَی الْمَكَانِ کے معنے ہیں وہ کسی جگہ مقیم ہو گیا اور کافی عرصہ تک اس میں رہا۔ اَخْلَدَ الرَّجُلُ بِصَاحِبِهٖ کے معنے ہیں وہ شخص اپنے ساتھی کے ساتھ ساتھ رہا اور اسکا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اَخْلَدَ اِلَیْهِ کے معنے ہیں وہ اسکی طرف مائل ہوا اور اسکے ساتھ ہی چمٹ کر رہ گیا*۔ سورۃ اعراف میں ہے وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ (۷/۱۷۶)۔ ،،اگر ہم چاہتے تو اس کے ذریعے اسے بلندی عطا کر دیتے لیکن وہ زمین کے ساتھ چمٹ گیا،،۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنے ثبات اور مستقل ساتھ لگے رہنے کے ہیں۔ یعنی غیر متغیر ہونا اور کسی کے ساتھ چپکے رہنا۔

قرآن کریم میں جنت کے ساتھ خَالِدِیْنَ فِیْهَا یا هُمْ فِیْهَا خَالِدُوْنَ (۲/۲۵) عام طور پر آیا ہے۔ اسمیں جہاں اس دنیا کا جنتی معاشرہ مراد ہے (دیکھئے جَنّٰتٌ کا لفظ۔ ج۔ ن۔ ن کے عنوان کے نیچے) تو اس کے خُلُوْدٌ سے مقصود یہ ہے کہ جب تک وہ معاشرہ قوانین خداوندی کے مطابق رہیگا اس میں تغیر اور بگاڑ پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن جہاں اس سے مراد اس زندگی کے بعد کی زندگی کی کیفیات ہیں، تو اس سے وہ حیاتِ جاوید مقصود ہے جو اعمال صالحہ کا نتیجہ ہے۔ یاد رہے کہ قرآن کریم میں جنت اور جہنم دونوں کے لئے خُلُوْدٌ کا لفظ آیا ہے۔ جنت کا خلود حیات جاوید ہے۔ یعنے وہ زندگی جو اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی جائے۔ اور جہنم کے خلود سے مراد وہ حالت ہے جسمیں صلاحیتوں کی نشو و نما رک جاتی ہے اور زندگی، رتقائی منازل طے کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ اسلئے اس میں جمود آجاتا ہے۔ لہذا یہ خُلُوْدٌ پتھروں اور چٹانوں کا سا خلود ہے۔ (تفصیل ان نکات کی قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ملیگی)۔

مُخَلَّدُوْنَ۔ کلائیوں اور کانوں میں زیورات پہنے ہوئے۔ ان زیورات کو خَلَدٌ (واحد خَلَدَةٌ) کہتے ہیں۔ زیورات سے مزین****۔ وِلْدَانٌ مُخَلَّدُوْنَ (۵۶/۱۷)۔ کتاب الاشتقاق نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے۔

اَخْلَدَ۔ ایک زمانہ دراز تک مصیبتوں اور خرابیوں سے بچانا****۔ قرآن کریم میں ہے کہ وہ شخص جو مال کو جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا

---

* تاج و محیط۔ ** تاج و راغب۔*** تاج۔ ****۔ غریب القرآن میرزا ابو الفضل بحوالہ بحرالمحیط و لسان العرب۔

رهتا ھے یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗ اَخْلَدَہٗ (۱۰۴/۳) وہ خیال کرتا ھے کہ اس کا مال زمانہ دراز تک اسے تباھیوں سے محفوظ رکھیگا یا حیات دوام عطا کر دیگا۔ یہ اس کا خیال خام ھے۔ بقا اس کے لئے نہیں جو مال جمع کرکے دوسروں کو اس کے فائدے سے محروم رکھتا ھے۔ بقا اس کے لئے ھے جو نوع انسانی کے لئے نفع رساں ہو۔ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)۔

اخروی زندگی کی حیات الخلد (زندگیٔ جاوید) کے متعلق یہ نہیں سمجھ لینا چاھئے کہ اس کی ھمیشگی، خدا کی ابدیت کی طرح ھے۔ بالکل نہیں۔ خدا کی ابدیت کے مانند کوئی ابدیت نہیں۔ انسان کی حیات دوام، خدا کے قوانین کے مطابق ھوگی۔ اس کا انجام کیا ھوگا؟ ذھن انسانی کی موجودہ سطح اس کے متعلق نہ کچھ سمجھ سکتی ھے نہ بتا سکتی ھے۔ یہی وجہ ھے کہ قرآن کریم نے جنت اور جہنم کے خلود کے ساتھ مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (۱۱/۱۰۷-۱۰۸) کہکر، خدائی ابدیت (Infinity) کیطرف سے خیال کا رخ ھٹا دیا ھے۔ (ان آیات میں اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ن۔ س۔ ی)۔

خ ل ص

خَلَصَ کے معنے ھیں کھوٹ اور میل سے الگ ھو کر صاف اور خالص ھو جانا۔ خَلَصَ مِنَ الْقَوْمِ۔ وہ قوم سے الگ اور کنارہ کش ھوگیا*۔ اَخْلَصَ الشَّیْءَ: کسی چیز کو خالص کیا، چن لیا۔*** اس لئے اَلْمُخْلَصُ اُسے کہتے ھیں جسے دوسروں سے الگ کرکے کسی کام کیلئے خالص اور مختص کر لیا جائے*۔ اِنَّہٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ (۱۲/۲۴)۔ وہ (یوسف) عام لوگوں کی راہ پر چلنے والا نہیں تھا۔ اسے عام لوگوں سے الگ کر لیا گیا تھا۔ وہ ھماری روش خاص پر چلنے والا تھا۔ اسی طرح حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے متعلق ھے خَلَصُوْا نَجِیًّا (۱۲/۸۰) وہ باھمی مشورہ کرنے کے لئے لوگوں سے الگ ھٹ گئے۔ اسی اعتبار سے خَالِصَۃً مِنْ دُوْنِ النَّاسِ (۲/۹۴) کے معنے ھیں دوسرے لوگوں کو الگ ھٹا کر، خالص (Exclusively) ان کے لئے۔ اِسْتَخْلَصَہٗ۔ اُسے اپنے لئے خاص کر لیا (۱۲/۵۴)۔

خَالِصٌ۔ جس چیز سے آمیزش کو الگ کر دیا جائے۔ راغب نے لکھا ھے کہ اَلْخَالِصُ۔ اور اَلتَّصَافِیْ۔ دونوں مرادف المعنی ھیں۔ لیکن التصافی کبھی ایسی چیز کے لئے بھی بولدیا جاتا ھے جو پہلے ھی سے

---

* تاج۔ ** راغب۔ *** محیط۔

صاف ہو۔ اور خَالِصٌ وہ ہوتا ہے جس سے آمیزش دور کر کے اسے صاف کر لیا گیا ہو**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو صاف کرنا اور اس کے زائد اور فالتو حصوں کو چھانٹ دینا ہیں۔

اَلْخِلَاصُ۔ وہ مکھن یا سونا چاندی جسے تپا کر خالص کیا جائے۔ خَلَّصَ اللّٰہُ فُلَانًا۔ خدا نے فلاں کو اس مشکل اور الجھن سے نکال دیا جس میں وہ پڑ گیا تھا۔ جسطرح اُلجھا ہوا دھاگہ سلجھایا جاتا ہے*۔

سورۃ بقرہ میں ہے وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ (۲/۱۳۹)۔ ہم ہر طرف سے الگ ہٹ کر صرف قانون خداوندی کی راہ پر چلنے کیلئے مختص ہو چکے ہیں۔ اسکی وضاحت لَہٗ مُسْلِمُوْنَ اور لَہٗ عٰبِدُوْنَ نے کر دی ہے جو پہلی دو آیتوں میں آئے ہیں (۲/۱۳۶، ۱۳۸)۔ یعنی صرف اس کے قوانین کی اطاعت کرنے والے۔ اس سے مُخْلِصِیْنَ لَہٗ الدِّیْنَ (۷/۲۹) کے معنے بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی اور سب قوتوں سے منہ موڑ کر، اطاعت کو صرف خدا کے لئے مختص کر دینا۔ سورۃ ص میں حضرات انبیاء کرام کے تذکرہ کے بعد فرمایا اِنَّا اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَۃٍ ذِکْرَی الدَّارِ (۳۸/۴۶)۔ ہم نے انہیں عام لوگوں سے الگ ہٹا کر (ایک خاص گروہ بنا دیا) اس خصوصیت کی بنا پر کہ وہ ہمیشہ زندگی کے انجام ومآل کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ وہ حقیقی زندگی کے گھر کو پیش نظر رکھتے تھے (۲۶/۱۲) تاکہ جہاں اس کا تصادم طبعی زندگی سے ہو (ان دونوں میں (Tie) پڑے) حقیقی زندگی کو طبعی زندگی کے تقاضوں پر ترجیح دی جائے۔

خ ل ط

خَلَطَ اور خَلَّطَ۔ کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ خواہ وہ اسطرح ملیں کہ پھر جدا بھی کر لی جا سکیں (جیسے اونٹوں کو بھیڑوں کے ساتھ ملا دینا) اور خواہ اسطرح کہ وہ جدا نہ ہو سکیں*۔ صاحب محیط کے نزدیک اَلْمَزْجُ صرف سیّال چیزوں کے آپس میں ملانے کو کہا جاتا ہے اور اَلْخَلْطُ اس سے عام ہے۔*** جو شخص کاروبار میں شریک ہو اسے خَلِیْطٌ کہتے ہیں۔ لیکن جوہری نے کہا ہے کہ اس کے لئے کاروبار میں شرکت ضروری نہیں۔ جو لوگ ویسے ہی آپس میں میل جول رکھیں، مل جل کر رہیں اور اسطرح ان میں دلی تعلق پیدا ہو جائے وہ بھی خَلِیْطٌ کہلاتے ہیں*۔ اس کے معنی ساتھ رہنے والا یا پڑوسی بھی ہیں۔ اسکی جمع خُلَطَاءُ آتی ہے۔ (ابن فارس)۔

* تاج۔ ** راغب۔ *** محیط۔

اِخْتِلَاطٌ کے معنے مباشرت کے بھی ہوتے ہیں۔ رَجُلٌ خِلْطٌ مِلْطٌ۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو مختلط النسب ہو۔ اور الخِلْطُ ولدالزنا کو*۔

خالَطَہٗ۔ اس کے ساتھ مل کر رہا، گڈ مڈ ہوگیا۔ سورۃ بقرہ میں یتیموں کے متعلق ہے وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (۲/۲۲۰)۔ اگر تم ان سے میل جول رکھو یا ان کے کاروبار میں شریک ہو جاؤ تو ہر وقت اسکا خیال رکھو کہ وہ تمہارے اپنے بھائی ہیں۔ سورۃ ص میں خُلَطَاءٌ کا لفظ کاروباری شرکاء کیلئے آیا ہے (۳۸/۲۴)۔ سورۃ توبہ میں خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا ...... (۹/۱۰۲) کے معنے ہیں، جنہوں نے اچھے کام کو برے کام کے ساتھ ملا دیا۔ سورۃ انعام میں ہے مَااخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (۶/۱۴۷) جو (چربی) ھڈی کے ساتھ ملی (لگی) ہو۔ سورۃ کہف میں ہے فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ (۱۸/۴۵)۔ اس (بارش) کے ساتھ زمین کی روئیدگی مل جاتی ہے۔

خ ل ع

خَلْعٌ۔ کسی چیز کو اتار دینا۔ (نَزْعٌ کے معنے میں آتا ہے اس فرق کے ساتھ کہ خَلْعٌ میں مہلت اور آہستگی ہوتی ہے۔ یعنی یہ عمل فوراً نہیں ہوتا۔ اور نَزْعٌ میں جلدی اور تیزی پائی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے خَلْعٌ اور نَزْعٌ کو ہم معنے قرار دیا ہے۔ اَلْخَالِعُ۔ گرا ہوا، ٹوٹا ہوا درخت۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کا اُس چیز سے الگ ہو جانا جس کے ساتھ وہ پہلے شامل تھی۔ اَلْخُلْعُ۔ وہ طلاق جو عورت اپنے خاوند سے حاصل کرے**۔ (یہ فقہی اصطلاح ہے قرآنی نہیں۔)

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہا فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ (۲۰/۱۲)۔ اسکے لفظی معنے ہیں "تو اپنے جوتے اتار دے"۔ لیکن صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ تم اسی جگہ قیام کرو۔ یہیں ٹھہرو۔ جیسے تم اس شخص کو جسے تم چاہو کہ تمہارے پاس کچھ وقت ٹھہر جائے کہتے ہو کہ ذرا اپنے جوتے موزے اتار کر اطمینان سے بیٹھو**۔ لہذا آیت کے معنے یہ ہونگے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ تم جلدی نہ کرو۔ اطمینان سے بیٹھ کر بات سنو۔ اب تمہارا سفر (جو تم تلاش حقیقت میں کر رہے تھے) ختم ہو گیا ہے۔ اب تمہاری مسافتیں سمٹ گئی ہیں۔ (دیکھئے طُوًی)۔ اب تمہیں وحی کے ذریعے منزلِ مقصود

* تاج۔ ** تاج و راغب۔

کا پتہ بلاکاوش و تردد مل جائیگا۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہاں اِخْلَعْ نَعْلَیْکَ کے معنی یہ ہیں کہ تو اپنے اهل و عیال کے مشاغل سے فارغ ہو جا یعنی ذہن سے ان کے خیال کو نکال دے۔ اس نے کہا ہے کہ عربوں کے ہاں نَعْلٌ سے مراد اهل و عیال بھی لئے جاتے ہیں۔

خ ل ف

خَلْفٌ کے معنے ہیں پیچھے۔ نیز یہ بعد کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً خَلْفَکَ۔ تیرے بعد۔ آلْخَلْفُ۔ ایک قرن کے بعد دوسرا قرن (ایک نسل کے بعد دوسری نسل) نیز ان انسانوں کو کہتے ہیں جو پہلے لوگوں کے جانشین ہوں اور ان سے زیادہ ہوں۔ الخَلَفُ۔ باپ کے بعد اس کی جانشین ہونے والی نیک اولاد، اگر اولاد بداطوار ہو تو وہ خَلْفٌ کہلائیگی۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ بولدئے جاتے ہیں۔ ابن بری کا کہنا ہے کہ الخَلَفُ آدمی کے بعد اس کے پسماندہ جانشینوں کے لئے، نیز بدل و عوض کے معنوں میں آتا ہے اور الخَلْفُ اس کے لئے جو پہلے کے بعد آئے، جیسے قرن کے بعد قرن۔ یا لوگوں کے جانشین خواہ وہ لوگ مر چکے ہوں یا زندہ ہوں۔ ہلاک ہوجانے والوں کے بعد باقی رہ جانے والے۔ ابن اثیر نے کہا ہے کہ خَلْفٌ ہو یا خَلَفٌ، دونوں کے معنے ایک ہی ہیں۔ یعنی گزرے ہوؤں کے بعد آنے والے، البتہ فرق یہ ہے کہ خَلَفٌ خیر میں استعمال ہوتا ہے اور خَلْفٌ شر میں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے تین بنیادی معنی ہیں (۱) ایک چیز کا دوسری چیز کے بعد آنا اور اس کی جگہ لے لینا۔ (۲) آگے کی ضد۔ یعنی پیچھے۔ اور (۳) تغیر و تبدل۔ خِلْفَةٌ ان پتوں کو کہتے ہیں جو پت جھڑ کے بعد درخت پر نکلیں۔ ایک دوسرے کے بعد آنے اور اس کی جانشینی کرنے کے لئے بھی خِلْفَةٌ بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ هُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً (۲۵/۶۲)۔ ”اللہ وہ ہے جس نے رات اور دن کو اس طرح بنایا کہ ایک کے بعد دوسرا آتا ہے۔ آلْخَالِفُ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کی جگہ پر بیٹھے یا جو پیچھے رہ جائے۔ ساتھ شریک نہ ہو (۹/۸۳)۔ خَلَفَ آبَاهُ کے معنے ہیں وہ اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ آلْخَلِيْفَةُ دوسرے کا جانشین، نیز وہ فرمانروا جو اپنے سے پہلے فرمانروا کا جانشین ہو۔ اس کی جمع خُلَفَاء اور خَلَائِفُ ہے*۔ جب حضرت موسیٰؑ طور پر گئے ہیں تو انہوں نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا

* تاج۔

اُخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ (۷/۱۴۲) - تم (میری غیبت میں) قوم میں میرے جانشین بنو - یعنی حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں ان کی جانشینی کرنا - اس میں حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی کا تصور خاص طور سے ذہن نشین کرنے کے قابل ہے - اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی کسی کی موجودگی میں اس کا خلیفہ نہیں ہوسکتا - اُس کی عدم موجودگی ہی میں ہوسکتا ہے - خواہ وہ زندہ ہو لیکن اُس جگہ موجود نہ ہو - اور خواہ مر چکا ہو - چنانچہ سورۃ یونس میں ہے ثُمَّ جَعَلْنَاکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِھِمْ (۱۰/۱۴) - ''ہم نے تمہیں اُن کے بعد ملک میں ان کا جانشین بنایا'' - سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم نے قوانین خداوندی سے روگردانی کی تو یَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ (۱۱/۵۷) میرا رب تمہاری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئیگا'' - تم مٹ جاؤ گے اور تمہاری جانشین ایک اور قوم ہوجائیگی - قوم عاد کے متعلق ہے جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (۷/۶۹) - ''تمہیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا'' - اور ثمود کے متعلق ہے کہ انہیں قوم عاد کے بعد ان کا جانشین بنایا (۷/۷۴) -

قرآن کریم میں متعدد مقامات میں آدم (انسان) کے متعلق ہے - اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲/۳۰) - اس کے معنی عام طور پر کئے جاتے ہیں خَلِیْفَةُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ - یعنی زمین پر خدا کا نائب یا قائم مقام - یہ معنی بوجوہ غلط ہیں - سب سے پہلے تو اس لئے کہ قرآن کریم میں آدم کو کہیں بھی خَلِیْفَةُ اللّٰہِ (اللہ کا خلیفہ) نہیں کہا گیا - خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ کہا گیا ہے - دوسرے اس لئے کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خَلِیْفَةٌ کے معنی ہیں کسی کے بعد یا کسی کی عدم موجودگی میں اسکی جگہ لینےوالا - (انگریزی میں اسے Successor کہتے ہیں) - خدا ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اسلئے خدا کے بعد یا خدا کی عدم موجودگی میں اسکی جانشینی کا تصور ہی باطل ہے - جو خود موجود ہو اسکا جانشین (Successor) کیسا ؟ حضرت ابوبکرؓ خَلِیْفَةُ الرَّسُوْلِ تھے - یعنی رسول اللہؐ کی وفات کے بعد انکے جانشین - وہ خَلِیْفَةُ اللّٰہِ نہیں تھے - بیعتِ خلافت کے بعد ایک شخص نے آپ کو '' یا خلیفة اللہ '' کہکر پکارا - آپ نے اسے فوراً ٹوکا اور کہا کہ میں '' خلیفة الرسول '' ہوں - '' خلیفة اللہ '' نہیں ہوں** - انسان دنیا میں خدا کی جانشینی کرنے کیلئے نہیں آیا - خدا کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے

---

*تاج و محیط - **ابوبکر مصنفہ محمد حسین ہیکل (اردو ترجمہ صفحہ ۵۸۳)

اور اس کے قانون کو نافذ کرنے کیلئے آیا ہے۔ آدم (انسان) کو جو خَلِیْفَۃٌ فِی الْاَرْضِ کہا ہے تو اسکے معنے یہ ہیں کہ وہ دنیا میں اپنے سے پہلی مخلوق کا جانشین (Successor) ہے۔ (دیکھئے عنوان ا۔ د۔ م اور ج۔ ن۔ ن)۔ چونکہ جانشینی میں غلبہ و تسلط اور اختیار و اقتدار شامل ہوتا ہے اسلئے اِسْتِخْلَافٌ فِی الْاَرْضِ سے مراد ہے ملک کی حکومت۔ کسی دوسری حاکم قوم کی جانشینی۔ (تفصیل ان امور کی میری تصنیف "ابلیس و آدم" میں ملیگی جہاں آدم کے متعلق شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے)۔

یہ نظریہ بھی کہ انسان خدا کی نیابت کرتا ہے، قرآن کریم کی رو سے صحیح نہیں۔ نیابت کے معنی ہوتے ہیں کسی کو اپنے اختیارات تفویض کر دینا۔ (Powers Delegate) کر دینا۔ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتا۔ دنیا میں کسی کو خدائی اختیارات (Divine Rights) حاصل نہیں۔ نہ کسی بادشاہ کو۔ نہ مذہبی پیشوا کو۔ حتٰی کہ نبی کو بھی نہیں۔ خدا نے اپنے مطلق اختیارات سے قوانین مرتب کئے ہیں۔ خدا کے بندے ان قوانین کو پہلے اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں اور پھر باقی دنیا پر۔ انسان کا فریضہ، قوانین خداوندی کی تنفیذ ہے۔ قوانین سازی کے اختیارات اسے تفویض نہیں کئے گئے۔ خدا کا رسول بھی، خدا کا دین (قانون) دنیا تک پہنچاتا اور اسے نافذ کرتا ہے۔ دین بناتا نہیں۔ اس لئے ان معنوں میں انسان خدا کا نائب نہیں۔ البتہ اس سے اگر مفہوم " خدا کے قوانین کو نافذ کرنے والا "، لیا جائے تو اور بات ہے۔ لیکن اس کے لئے " نائب "، کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس سے تفویضِ اختیارات کا باطل مفہوم ذہن میں آجاتا ہے۔

اِخْلَافٌ کے معنے ہیں وعدہ خلافی کرنا۔ اَخْلَفَ وَعْدَہٗ کے معنے ہیں اس نے وعدہ کیا اور بعد میں اسے پورا نہ کیا*۔ فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ عَھْدَہٗ (۲/۸۰) ۔" اللہ وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔ وہ اپنے وعدے کو ضرور پورا کریگا"۔

اِخْتِلَافٌ۔ اتساق (موافق ہونے) کی ضد ہے۔ اسکے معنے یکے بعد دیگرے آنے کے بھی ہوتے ہیں*۔ (جیسے اِخْتِلَافُ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ (۲/۱۶۴) رات اور دن کا یکے بعد دیگرے ادل بدل کر آنا۔ اور اختلاف یا مخالفت کرنے کے بھی*۔ جیسے فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِھِمْ (۱۹/۳۷)۔ " پھر ان کے درمیان فرقوں نے اختلاف کیا "۔

*تاج و محیط۔

بعض کا خیال ہے کہ خَلَفٌ اولاد صالح کو کہتے ہیں اور خَلْفٌ غیر صالح کو۔ اور بعض نے اس فرق کو تسلیم نہیں کیا *۔ قرآن کریم میں فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ (۱۹/۵۹ ؛ ۷/۱۶۹) غیر صالح کے لئے آیا ہے۔ تَخَلَّفَ۔ پیچھے رہ جانا (۹/۱۲۰)۔ مُتَخَلِّفُوْنَ۔ پیچھے رہ جانے والے (۹/۸۱)۔ خَالَفَهٗ۔ اسکی مخالفت کی۔ مُخْلِفٌ۔ وہ جو وعدہ خلافی کرے (۱۴/۴۷)۔ مُخْتَلِفٌ۔ الگ الگ (۱۶/۶۹)۔ اِسْتَخْلَفَ۔ جانشین بنانا (۲۴/۵۵)۔ مُسْتَخْلَفٌ وارث (۵۷/۷)۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ استخلاف فی الارض بتایا ہے (۲۴/۵۵)۔ لہذا جس ایمان اور جن اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں غلبہ واقتدار اور حکومت و شوکت نہیں قرآن کریم کی رو سے نہ وہ ایمان ایمان ہے نہ وہ اعمال اعمال صالحہ۔ ایمان واعمال صالحہ کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ ان کا نتیجہ صرف آخرت میں (مرنے کے بعد) برآمد ہوگا، اس دنیا سے ان کا کچھ واسطہ نہیں۔ یا ان سے مقصود ایک فرد کی اپنی "روحانی ترقی" ہے جسے معاشرہ کی اجتماعی زندگی سے تعلق نہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔

سورہ ہود میں ہے کہ حضرت شعیب[۴] نے اپنی قوم کو غلط روش زندگی سے باز رہنے کی تلقین کی اور فرمایا وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ (۱۱/۸۸)۔ تاج نے لکھا ہے کہ خَالَفَهٗ اِلَى الشَّیْءِ کے معنی ہیں، کسی چیز سے منع کرنے کے بعد اس کا قصد کرنا۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں جس بات سے تمہیں روکتا ہوں میرا ارادہ قطعاً یہ نہیں کہ میں خود اس کا قصد کروں۔

قرآن کریم کی رو سے کسی قوم میں باہمی اختلاف خدا کا عذاب ہے (۶/۶۵) اور اختلافات کا مٹ جانا اللہ کی رحمت (۱۱/۱۱۸-۱۱۹)۔ قرآن کریم، لوگوں کے باہمی اختلافات مٹانے کے لئے آیا ہے (۱۶/۶۴)۔ اور اسی لئے یہ بھی خدا کی طرف سے رحمت ہے۔ جنتی زندگی کے مستحق وہ ہیں جن میں اختلافات نہ ہوں (۳/۱۰۵-۱۰۶)۔ باہم اختلافات اور دین میں تفرقہ شرک ہے (۳۰/۳۱-۳۲)۔ مسلمانوں کے باہمی اختلافات مٹانے کا طریق یہ ہے کہ ان کے ہر متنازع فیہ معاملہ کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق کیا جائے (۴۲/۱۰)۔ لیکن یہ فریضہ امت کا اجتماعی نظام (حکومت قرآنی) سر انجام دیگا۔ (۴/۶۵)۔ (ان امور کی مزید تفصیل ف-ر-ق کے عنوان میں ملیگی۔ نیز دیکھئے میری کتاب، سلیم کے نام خطوط۔ جلد دوم)۔

---

* تاج و محیط۔

خ ل ق

خَلْقٌ کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کو بنانے یا کاٹنے کے لئے اسے ماپنا۔ اس کا اندازہ لگانا (یہی مفہوم تقدیر کا بھی ہے دیکھئے ق۔د۔ر) اسکے تناسب و توازن کو دیکھنا۔ یا کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے مطابق بنانا۔ کسی چیز کو نرم و ہموار کرنا*۔ نیز ایک چیز کو دوسری چیز سے بنانا**۔ خَلَقَ الاَدِیْمَ کے معنے ہیں اسنے کوئی چیز بنانے کے لئے چمڑے کو ناپا اور پہلے اس کا اندازہ لگایا۔ رَجُلٌ تَامُّ الخَلْقِ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جسکی ساخت میں اعتدال ہو۔ جو بناوٹ اور تناسب کے اعتبار سے مکمل اور سڈول ہو۔ اس معنے میں خَلِیْقٌ بھی کہتے ہیں۔ اور خُلُقَۃٌ کے معنے ہیں چکنا پن، ہمواری، برابر ہونا۔ الخَلَقُ کے معنی ہیں کسی چیز کا شگاف وغیرہ سے خالی اور ہموار ہونا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا اندازہ کرنا۔ اور (۲) کسی چیز کا (استعمال کے بعد) ہموار اور صاف اور چکنا ہو جانا۔ (اسی جہت سے پرانی چیز کو خَلَقٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ گھس کر سپاٹ ہو جاتی ہے اور اس کا "رواں زائل ہو جاتا ہے)۔

لہٰذا خَلَقَ کے معنے ہونگے کسی چیز کا اندازہ کرنا۔ اسکے حشو و زوائد کو دور کرنا اور پھر اسے اندازے اور پیمانے کے مطابق بنانا، اسطرح کہ اسکا توازن و تناسب بالکل درست رہے۔ اور وہ صاف اور ہموار ہو جائے۔ بَدَعَ اور فَطَرَ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا۔ پہلی بار پیدا کرنا۔ ایجاد کرنا۔ اس اعتبار سے خَلَقَ کے معنے ہونگے مختلف عناصر کو نئی نئی ترکیبیں دینا اور اسطرح ان سے اور چیزیں پیدا کرتے چلے جانا۔ جیسے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ (۱۶/۴)۔ یا خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ (۵۵/۱۴)۔

سورۃ حج میں رحم مادر میں نطفہ اور جنین کے مختلف منازل کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ مُضْغَۃٍ میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ یعنی مُخَلَّقَۃٍ اور غَیْرِ مُخَلَّقَۃٍ (۲۲/۵)۔ مُخَلَّق کے معنی ہیں مکمل شدہ۔ یا ہموار کیا ہؤا یا نرم کیا ہؤا (محیط)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْمُخَلَّقُ اُس تیر کو کہتے ہیں جسے سدھار کر ٹھیک کر دیا جائے۔ اس لئے آیت سے یہ مفہوم لیا جا سکتا ہے کہ مُضْغَۃٍ یا تو پورا بچہ بن جاتا ہے اور یا نا تمام رہ کر گر جاتا ہے۔

---

* تاج و لین نیز ** راغب۔

سورۃ شعراء میں ہے اِنْ ھٰذَا اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ (۲۶/۱۳۷) یعنے یہ تو وہی پہلوں کا دستور ، پرانی عادت ، یا طریق کہن ہے ۔ بعض لوگوں نے اسکے معنے رسم و رواج کے بھی لئے ہیں*۔ اور اسی سے اسکے معنے عادات و اطوار کے بھی آتے ہیں ۔ چنانچہ خُلُقٌ کسی کی طبیعی عادت کو کہتے ہیں* ۔ اور چونکہ عادت عموماً پرانی ہوتی ہے اس لئے خَلَقٌ کے معنی کہنگی کے بھی ہیں ۔ خَلَقَ الثَّوْبُ ۔ کپڑا پرانا ہو گیا ۔ (۳۸/۷) میں ہے اِنْ ھٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۔ یہ گھڑی ہوئی بات ہے ۔ خِلْقَۃٌ کے معنے ہیں کسی کی طبیعی ترکیب (Natural Constitution)*۔ خَلَاقٌ کے معنے ہیں انداز کے مطابق مقرر کیا ہؤا حصہ ۔ اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَہُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ (۳/۷۶) میں خَلَاقٌ کے یہی معنے ہیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ خَلَاقٌ کے معنی ہیں وہ فضیلت جو حسن اخلاق کی بنا پر حاصل ہو ۔

(قرآن کریم میں خَلْقٌ کے مقابلہ میں اَمْرٌ بھی آیا ہے ۔ (۷/۵۴)۔ اسکے متعلق ا ۔ م ۔ ر کا عنوان دیکھئے)۔ خَلَقَ کے معنی ٹھیک اندازہ لگا کر اس کے مطابق عزم کرنے اور منصوبہ باندھنے کے بھی آتے ہیں ۔ نیز تربیت کرنے کے بھی** ۔

خَلَّاقٌ اور خَالِقٌ اللہ تعالیٰ کی دو عظیم صفات ہیں (۳۶/۸۱ و ۵۹/۲۴) ۔ لہٰذا جس فرد یا قوم میں صفات خداوندی کی نمود ہوگی اس کا مظاہرہ اس کی قوت تخلیق سے ہوگا ۔ اولاد پیدا کرنا تخلیق (Creation) نہیں، تولید (Procreation) ہے ۔ یہ وہ حیاتیاتی عمل (Biological Action) ہے جس میں حیوانات بھی انسان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں ۔ لہٰذا تولید ، حیوانی سطح زندگی کا عمل ہے، انسانی سطح پر تخلیق شروع ہوتی ہے جس میں حیوان شریک نہیں ہو سکتے جس قوم میں قوت تخلیق نہیں اس میں صفات خداوندی کی نمود نہیں ۔ اسی بنا پر اقبال نے کہا ہے کہ :

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست نزد ما جز کافر و زندیق نیست

یہ بھی یاد رہے کہ تخلیق محض (Duplication) نہیں ۔ یعنی ایک جیسی چیز کا بار بار بنائے چلے جانا تخلیق نہیں ۔ تخلیق نت نئے اضافے چاہتی ہے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ (۳۵/۱) ۔ "وہ اپنی مشیت کے مطابق خلق میں اضافے کرتا رہتا ہے"۔ اس لئے اس کے بندوں کی بھی یہ شان ہونی چاہئے کہ وہ اپنے تخلیقی کارناموں میں نئے نئے اضافے کرتے رہیں ۔ اس کو ایجاد کہتے ہیں ۔

*(تاج و لین **غریب القرآن ۔ میرزا ابوالفضل ، بحوالہ صحاح

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (۶۸/۴) "اور یقیناً تو خلق عظیم کا حامل ہے"۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے ، خلق کے معانی میں اعتدال، توازن و تناسب پایا جاتا ہے ۔ یہ چیز شرف انسانیت کی دلیل ہے ۔ نبی اکرمؐ کی ذات گرامی میں یہ شرف اپنی بلند ترین سطح پر تھا ۔ ہمارے ہاں جس چیز کو "اخلاقیات" سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ ہمارے دور ملوکیت کی تمدنی زندگی کا آئینہ ہیں ۔ قرآن کریم نے جو صفات مؤمن کی بیان کی ہیں، وہی صحیح اخلاق ہیں ۔ اور ان صفات کی بلند ترین مظہر نبی اکرمؐ کی ذات گرامی ہے جو نوع انسانی کے لئے حسین ترین نمونہ ہے ۔ حضورؐ کی سیرت کا یہ نمونہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے ۔

خ ل ل

اَلْخَلُّ ۔ وہ راستہ جو ریگزار کے اندر تک جاتا ہو ۔ یا جو دو ریگزاروں کے درمیان سے گذرتا ہو ۔ اَلْخَلَلُ ۔ دوچیزوں کے درمیان کشادگی ۔ خِلَالٌ ۔ درمیان کی جگہ ۔ خِلَالُ الدِّیَارِ ۔ گھروں کے درمیان کی جگہ ، گھروں کی حدود کے آس پاس کی جگہ ۔ تَخَلَّلَ الشَّیْءَ چیز کے اندر گھس جانا ۔ خَلَّ الشَّیْءَ ۔ چیز میں سوراخ کر دیا اور اس میں سے آر پار چلا گیا ۔ اَلْخِلَالُ ۔ وہ چیز جس سے آر پار سوراخ کیا جائے ۔ اَلْخَلَّۃُ ۔ احتیاج ۔ اضطراری حالت*۔ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ (۱۷/۵) وہ شہروں کے اندر گھس گئے ۔ خِلٰلَھَا (۱۷/۹۱) اس کے اندر ۔

خُلَّۃٌ ۔ دوستی* ۔ (۲/۲۵۴) غالباً اس اعتبار سے کہ دوست ایک دوسرے کے دلوں کے اندر گھسے ہوئے ہوتے ہیں ، یا انہیں ایک دوسرے کی احتیاج ہوتی ہے ۔ خَلِیْلٌ (جمع اَخِلَّاءُ)۔ دوست (۴/۱۲۶) و (۴۳/۶۷)۔ خِلَالٌ ۔ باہمی دوستی (۱۴/۳۱) ۔

اَلْخَلُّ ۔ سر کہ* ۔

خ ل و

خَلَا الْمَکَانُ کے معنے ہیں مکینوں کے چلے جانے سے کسی جگہ کا خالی ہو جانا ۔ خَلَا الشَّیْءُ ۔ کسی چیز کا گذر جانا اور چلا جانا ۔ خَلْوَۃٌ کے معنے تنہائی ہیں ۔ خَلِیَّۃٌ ۔ شہد کی مکھیوں کا چھتہ* ۔ راغب کا قول

*تاج ۔

ہے کہ خُلُوٌّ کا استعمال زمان اور مکان دونوں کیلئے آتا ہے۔ چونکہ زمانے میں مرور (گذرنا) پایا جاتا ہے اس لئے اہل لغت نے خَلَا الزَّمَانُ کے معنی زمانہ گذر گیا کر لئے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز سے الگ ہو جانا۔

قرآن کریم میں خَلَوْا بمقابلہ لَقُوْا کے آیا ہے (۲/۱۴ و ۲/۷۶) جہاں اسکے معنے علیحدگی اور تنہائی میں ملنے کے ہیں۔ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ (۲/۲۱۴) کے معنے ہیں وہ لوگ جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ (۲/۱۳۴) "یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی"۔ اَلْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ (۶۹/۲۴) کے معنے ایام گذشتہ ہیں۔ سورۃ یوسف میں یَخْلُ لَکُمْ وَجْهُ اَبِیْکُمْ (۱۲/۹) کے معنے ہیں تمہارے باپ کی ساری توجہ خالصتاً تمہارے لئے ہو جائیگی۔ کوئی دوسرا اسمیں شریک نہیں ہوگا۔ خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ (۳۵/۲۴) جسمیں کوئی آگاہ کرنے والا (نہ) گزرا ہو۔ تَخَلَّتْ (۸۴/۴) خالی اور صاف ہو جانا۔ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ (۹/۵) ان کا راستہ چھوڑ دو۔ ان سے تعرض مت کرو۔ خَلَّی سَبِیْلَ الْاَسِیْرِ کے معنی ہیں قیدی کو آزاد کر دیا***۔

خ م د

خَمَدَتِ النَّارُ۔ آگ کے شعلوں کا ساکن ہوجانا اگرچہ اس کے انگارے نہ بجھے ہوں۔ اگر انگارے بھی بجھ جائیں تو اسے هَمَدَتِ النَّارُ کہینگے*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنے حرکت کا ساکن ہوجانا نیز گر جانا بتائے ہیں۔ اَخْمَدْتُهَا۔ میں نے آگ کے شعلوں کو ساکن کر دیا۔ اَلْخَمُوْدُ۔ وہ جگہ جہاں آگ کو دبا دیا جاتا ہے۔ خَمَدَ الْمَرِیْضُ۔ مریض بیہوش ہوگیا یا مر گیا۔ قَوْمٌ خَامِدُوْنَ۔ وہ لوگ جن کی تم کوئی آہٹ تک نہ سنو****۔ بے حس و حرکت لوگ۔ اَخْمَدَ اللّٰهُ اَنْفَاسَهٗ۔ خدا نے اسے ذلیل کیا یا موت دیدی**۔ سورۃ انبیاء میں ہے جَعَلْنٰهُمْ حَصِیْدًا خَامِدِیْنَ (۲۱/۱۵) "ہم نے انہیں نشو و نما کی قوت سے عاری کرکے بے حس و حرکت کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیا"۔ دوسری جگہ ہے فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ (۳۶/۲۹)۔ "سو دیکھو! وہ بجھے ہوئے انگاروں کی طرح ہوگئے"۔ زجاج نے بھی اس آیت کے معنے بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں اس کے معنے خاموش اور مردہ ہیں****۔ تباہ ہو جانے والی قوموں کے خون سے حرارت سلب ہو جاتی ہے اور

*راغب۔ **تاج و راغب ***محیط۔ ****تاج۔

ان کے پیکر راکھ کا ڈھیر بنکر رہ جاتے ہیں ۔ یہی ان کا خمود ہے—بجھے ہوئے انگارے—نیز ان کی حیاتِ ملی کی سرسبز و شاداب کھیتیاں کٹ جاتی ہیں اور ان کے صرف نشانات باقی رہ جاتے ہیں ۔

خ م ر

خَمْرٌ ۔ کسی چیز کو ڈھانپ دینا یا چھپا دینا ۔ خَمَرَ الشَّیْیٔ یَخْمِرُهٗ ۔ اس کو چھپا دیا ۔ ڈھانپ دیا ۔ خَمَرَ فُلَانٌ الشَّهَادَةَ ۔ فلاں نے گواہی کو چھپا دیا ۔ اَلْخَمَرُ ۔ اوٹ ، آڑ ، پردہ ۔ خِمَارٌ ۔ اوڑھنی جس سے عورتیں اپنے سر کو ڈھانپتی ہیں* ۔ (جمع خُمُرٌ ۔ ۲۴/۳۱) ۔ لطائف اللغۃ میں ہے کہ عورتیں پہلے اپنے سر پر اَلْغِفَارَةُ اوڑھتی تھیں اور اس کے اوپر اَلْخِمَارُ ۔ (غِفَارَةٌ کے لئے دیکھئے عنوان غ ۔ ف ۔ ر) اَلْخَمْرُ ۔ ہر نشہ آور چیز ۔ کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ دیتی ہے ۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہے ۔ اَلْخَمْرُ مَا خَامَرَ الْعَقْلَ ۔ خمر اسے کہتے ہیں جو عقل میں گڈمڈ اور فتور پیدا کر دے ۔ بعض کا قول ہے "لاَ نَّهَا تَخْمِرُ الْعَقْلَ"۔ یعنی شراب کو خمر اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے* ۔ عرب عام طور پر شیرهٔ انگور سے شراب بناتے تھے اور اسے خَمْرٌ کہتے تھے ۔ ویسے ان کے ہاں انگور کو بھی خَمْرٌ کہتے ہیں* ۔ تَخْمِيْرٌ کے معنے ہیں خمیر اٹھانا* ۔ خَامَرَ الرَّجُلُ فِی الْبَيْعِ مُخَامَرَةً ۔ اس شخص نے خرید و فروخت میں فریب سے کام لیا اور آزاد کو غلام بنا کر بیچدیا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ڈھانپ لینے اور ڈھانپ لینے کے ساتھ گھل مل جانے کے ہیں ۔ اور اَلاِسْتِخْمَارُ کے معنے ہیں غلام بنا لینا ۔اس لئے کہ کسی کو غلام بنانے کے لئے اس کی عقل کو سلب کر لینا ضروری ہوتا ہے ۔

قرآن کریم میں خَمْرٌ اور مَيْسِرٌ*** کے متعلق ہے کہ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۔ "ان میں بڑا اثم ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی" ۔ وَ اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲/۲۱۹) ۔ "ان کا اثم ان کے فائدوں کی نسبت بہت زیادہ ہے" ۔ اِثْمٌ کے معنے ہیں اضمحلال ۔ افسردگی ۔ تکان ۔ سستی ۔ ایسی کمزوری جس سے انسان زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے ۔ (دیکھئے عنوان ا ۔ ث ۔ م) ۔ یعنے نشہ آور اشیاء (اور میسر یعنی آسانی سے ہاتھ آئی ہوئی دولت) سے بیشک دوران خون تیز ہو جاتا ہے ۔ انسان میں وقتی طور پر گرمجوشی پیدا ہو جاتی ہے ۔ لیکن اس کے بعد قویٰ اس قدر

* تاج و راغب ۔ ** محیط ۔ *** میسرة کے معنے ہیں وہ دولت جو آسانی سے ہاتھ آجائے ۔ جؤا بھی اس میں شامل ہے ۔ (دیکھئے عنوان ی ۔ س ۔ ر)

کمزور ہو جاتے ہیں کہ ان میں جد و جہد اور سعی و عمل کی ہمت باقی نہیں رہتی ۔ اسی لئے انہیں رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ قرار دیکر اس سے باز رہنے کی تاکید کر دی گئی (۵/۹۰) اور بتا دیا کہ ان سے تمہارے اندر باہمی عداوت پیدا ہو جائیگی اور تم نظام صلوٰة کو قائم کرنے کے قابل ہی نہیں رہوگے ۔ (۵/۹۱)۔ خَمْرٌ (شراب) کے طبعی اثرات کے متعلق ڈاکٹروں کی تحقیق یہی ہے کہ اس کا پہلا اثر دورانِ خون کو تیز کرتا ہے ۔ اور یہ چیز بعض حالتوں (بیماریوں) میں اچھے نتائج مرتب کرتی ہے ۔ لیکن اس کے بعد اس کا اثر دورانِ خون کو بہت سست کر دیتا ہے ۔ اور یہ اثر بہت گہرا ہوتا ہے ۔ لہذا اس کے ابتدائی فائدے کے مقابلہ میں اس کا ثانوی نقصان کہیں زیادہ ہوتا ہے ۔

خَمْرٌ (اور مَيْسِرٌ) سے صرف انسانی جسم ہی میں اضمحلال پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے انسانی ذات کی توانائیاں بھی افسردہ ہو جاتی ہیں، اور یہ بہت بڑا نقصان ہے ۔

خ م س

اَلْخَمْسَةُ ۔ پانچ ۔ ۵ ۔ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ (۱۸/۲۲) ۔ يَوْمُ الْخَمِيْسِ ۔ پانچواں دن (جمعرات) ۔ خَمْسُوْنَ ۔ پچاس ۔ ۵۰ ۔ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (۲۹/۱۴) ۔ خُمْسٌ اور خُمُسٌ ۔ پانچواں حصہ ۔ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ (۸/۴۱) ۔ خَامِسٌ ۔ پانچواں ۔ اس کا مونث اَلْخَامِسَةُ ہے (۲۴/۷)۔

مال غنیمت کا خُمُسٌ (پانچواں حصہ) اللہ اور رسول کے لئے ہے (۸/۴۱)۔ یعنے مرکز نظام خداوندی کے لئے ۔ امیر ملت اس مال کو امت کی اجتماعی ضروریات پر صرف کریگا ، اسی کو فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کہا جاتا ہے ۔

خ م ص

اَلْخَمْصَةُ ۔ بھوک ۔ خَمِصَ الْبَطْنُ ۔ پیٹ کھانے سے خالی ہو گیا اور اندر کو پچک گیا ۔ اَلْاَخْمَصُ ۔ پاؤں کے تلوے کو کہتے ہیں جسکا قعر (Curve) اندر کی طرف ہوتا ہے ۔ چونکہ سخت بھوک میں پیٹ بھی اسی طرح کمر کے ساتھ جا لگتا ہے اسلئے اسطرح کے بھوکے آدمی کو خَمِيْصٌ کہتے ہیں ۔ اور مجازاً زَمَنٌ خَمِيْصٌ قحط سالی کے زمانہ کو*۔

قرآن میں مَخْمَصَةٌ سخت بھوک کیلئے آیا ہے (۵/۳)۔

* تاج ۔

خ م ط

خَمَطَ اللَّحْمَ یَخْمِطُہٗ ۔ اسنے گوشت کو بھون لیا ۔ اگر اسے پانی میں ابال لیا جائے تو سَمْطٌ کہینگے ۔ اَلْخَمْطُ ۔ کھٹا ۔ ہر کڑوی چیز ۔ ہر پودا جس میں کسیلا پن اور کڑواہٹ ہو ۔ ایک قسم کا زہر قاتل یا زہریلا مہلک درخت ۔ ہر بے کانٹوں والا درخت، پیلو کے درخت کا پھل* ۔ راغب نے اس کے معنے پیلو کا درخت کئے ہیں ۔ قرآن کریم میں اہل سبا پر عذاب کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ ان کے عمدہ باغات کی جگہ ایسے باغات پیدا ہو گئے جو ذَوَاتَیْ اُکُلٍ خَمْطٍ تھے (۳۴/۱۶) ۔ یعنی کڑوے پھلوں والے ۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی زندگی کی خوشگواریوں کو بدمزگیوں سے بدل دیا ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) ننگا اور خالی اور سپاٹ ہونا ۔ اور (۲) تسلط و غلبہ ۔ اس اعتبار سے (معنوی انداز میں) اس کا مفہوم ہوگا کسی کو جور و اکراہ اور ظلم و استبداد کی پاداش میں متاع حیات سے محروم کر دینا ۔ یہی اہل سبا کے ساتھ ہؤا تھا ۔

خ ن ز ر

اَلْخَنْزَرَۃُ ۔ موٹا ہونا ۔ بڑا موٹا ہتھوڑا جس سے پتھر توڑے جاتے ہیں ۔ اَلْخِنْزِیْرُ ۔ سؤر ۔ (جمع خَنَازِیْرُ) ۔ خَنْزَرَ ۔ اس نے خنزیر کے سے کام کئے ۔ کسی کو کنکھیوں سے دیکھنے کیلئے بھی یہ لفظ آتا ہے** ۔

قرآن کریم میں لحم خنزیر کا شمار حرام اشیاء کی فہرست میں ہؤا ہے (۲/۱۷۳) ۔ نیز ان لوگوں کیلئے بھی یہ لفظ (خنزیر) آیا ہے جن کی سیرتیں مسخ ہو کر بد ترین حیوانوں جیسی ہو جائیں ۔ (۵/۶۰) ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کا استعمال مسخ صورت اور مسخ سیرت دونوں کیلئے ہو سکتا ہے*** ۔ (نیز دیکھئے عنوان ق ۔ ر ۔ د) صاحب غریب القرآن نے اسے خَنِیْزَ + نَزْرٌ سے مرکب لکھا ہے جسکے معنے ہیں سڑی گلی اور ناقص چیز**** ۔

خنزیر (سؤر) کے متعلق یہ عجیب چیز ہے کہ اسے دنیا میں ہر جگہ قابل نفرت سمجھا جاتا ہے ۔ حتٰی کہ یورپ کی جو قومیں اس کا گوشت کھاتی ہیں وہ بھی اس کے نام کو بطور گالی استعمال کرتی ہیں ۔ خود بائبل میں اس کا ذکر اسی انداز سے آیا ہے ۔

---

* تاج ۔ راغب ۔ محیط ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔ ****میرزا ابوالفضل ۔

خ ن س

خَنَسَ عَنْهُ۔ یَخْنِسُ۔ خَنْسًا۔ اس سے پیچھے ہٹ جانا۔ خَنَسَهُ۔ کسی کو پیچھے ہٹا دینا۔ اَلْخُنُسُ۔ ہرنوں کے چھپنے کی جگہ۔ (نیز دیکھئے کُنَّسٌ) ۔ خَنَسَ مِنْ بَیْنِ اَصْحَابِهٖ۔ وہ اپنے ساتھیوں کے درمیان میں سے چھپ گیا۔ اَلْخَنَسُ فِی الْقَدَمِ۔ پاؤں کے تلوے کا سپاٹ اور پر گوشت ہونا*۔ اَلْخِنِّیْسُ گھات لگانے والے مکار، نیز حیلہ ساز اور چالباز کو کہتے ہیں*۔

قرآن کریم میں ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ (۸۱/۱۵)۔ اس سے مراد وہ ستارے ہیں جو پیچھے ہٹتے ہیں۔ اور چونکہ ستاروں کی رفتار میں آواز نہیں ہوتی اسلئے دبے پاؤں پیچھے ہٹنے کا مفہوم بھی اسمیں آ جاتا ہے۔ یہ وہی شہادت ہے جو وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی (۵۳/۱) میں بیان ہوئی ہے (نیز ۵۶/۷۵ میں)۔ کیونکہ اس کے بعد بھی وحی و رسالت کا بیان ہے (۸۱/۲۰-۲۲)۔

سورۃ الناس میں اَلْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (۱۱۴/۴) آیا ہے۔ یعنے کانوں میں کچھ پھونک کر دبے پاؤں پیچھے ہٹ جانے والا۔ چپکے چپکے غلط خیالات پھیلا کر چھپ جانے والا۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ اَلْخَنَّاسُ، چھپنے والی طاقت کو کہتے ہیں۔ یا اسے کہ جب اس پر حملہ کیا جائے تو وہ چھپ جائے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسی کے بنیادی معنی چھپنے اور پوشیدہ ہونے کے ہیں۔

خ ن ق

خَنَقَ۔ یَخْنِقُ۔ گلا گھونٹ دینا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تنگی کے ہونے ہیں۔ چنانچہ اَلْخَانِقُ۔ تنگ گھاٹی کو کہتے ہیں۔ تنگی کی جہت سے اَلْخَنِقُ کے معنی گلا گھونٹنے کے آتے ہیں۔ اَلْخِنَاقُ۔ وہ رسی جس سے گلا گھونٹا جائے۔ اِنْخَنَقَ۔ اس کا گلا گھٹ گیا***۔ (خُنَاقٌ اسی سے ہے) اَلْمُنْخَنِقَةُ۔ جسکا گلا گھٹ جائے (اور وہ اسطرح مر جائے) قرآن کریم نے ایسے جانور کو حرام قرار دیا ہے (۵/۳)۔

خ و ر

خَوِرَ۔ یَخْوَرُ۔ خَوَرًا۔ کمزور ہو جانا۔ بز دل ہو جانا۔ ٹوٹ جانا۔ سست پڑ جانا۔ خَارَتْ قُوَّةُ الْمَرِیْضِ۔ مریض کی قوت کم ہو گئی

---

* تاج و راغب ** تفسیر المقام المحمود صفحہ ۲۲۱۔ *** تاج۔

یعنی وہ کمزور ہو گیا ۔ خَوِّرَتِ الْاَرْض ۔ بارش کی کثرت سے زمین کی مٹی بہ گئی* ۔

اَلْخُوَارُ ۔ گائے بیل بکری ۔ ہرن یا تیروں کی آواز ۔ دراصل یہ گائے بیل کی آواز کے لئے تھا ، پھر دوسری آوازوں کے لئے بھی بولا جانے لگا* ۔ راغب نے کہا ہے کہ خُوَارٌ خاص طور پر گائے بیل کی آواز کو کہتے ہیں پھر استعارۃً اونٹ کی آواز کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے* ۔ قرآن کریم نے عِجْلٌ (بچھڑے) کیلئے لَهٗ خُوَارٌ کہا ہے (۷/۱۴۸) ۔ یعنی جس سے آواز نکلتی تھی ۔

خ و ض

خَاضَ ۔ یَخُوْضُ ۔ کے بنیادی معنے ہوتے ہیں پانی میں اترنا اور اسمیں چلنا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے کسی چیز کے اندر چلے جانے کے ہیں ۔ اسکے بعد اسکا استعمال کسی معاملہ میں دیر تک مشغول رہنے کیلئے ہونے لگا۔ قرآن مجید میں اس کا بیشتر استعمال فضول باتوں میں اُلجھنے کیلئے ہوا ہے*** ۔ خَاضَ ۔ اسنے بیکار بات کی (اقرب الموارد) ۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں ہے وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا (۹/۶۹) اسکے معنے فضول باتوں میں الجھے رہنا ہیں ۔ سورۃ طور میں ہے اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَلْعَبُوْنَ (۵۲/۱۲) ۔ ”جو لوگ باطل میں منہمک اور حق سے غافل ہیں“ ۔ سورۃ مدثر میں مجرمین کی فہرستِ جرائم میں یہ بھی ہے کہ كُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ (۷۴/۴۵) ۔ یہ اس ٹائپ کے لیڈروں کا ذکر ہے جو فلاح عامہ کیلئے عملاً کچھ نہیں کرتے لیکن بیانات دھڑا دھڑ دیتے ، ریزولیشن پاس کرتے ، اسکیمیں بناتے اور ہمیشہ (Planning) میں وقت گزارتے رہتے ہیں ۔ یعنے باتیں ہی باتیں اور کام کچھ نہیں ۔ نیز ایسے علماء اور مفکرین جو نظری مسائل کی موشگافیوں اور نکات آفرینیوں میں لگے رہتے ہیں اور عملی نتائج مرتب کرنے والے امور کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ یہی لوگ قوموں کی تباہی کا موجب بنتے ہیں (۴/۱۰۴۲) ۔

خ و ف

خَوْفٌ ۔ قرائن اور شواہد سے کسی آنے والے خطرہ یا نقصان کا اندیشہ کرنا ۔ اسے (Apprehend) کرنا ۔ جسطرح طَمَعٌ کے معنی ہیں قرائن

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔ ***تاج و راغب ۔

و شواھد سے کسی فائدہ کی توقع کرنا ۔ اسی لئے قرآن کریم میں خَوْفًا وَ طَمَعًا اکٹھا آیا ہے (۷/۵۶) ۔ اسکے برعکس حُزْنٌ بالعموم اس غم کو کہتے ھیں جو حادثہ کے گزر جانے کے بعد اسکے نقصان کی وجہ سے ھو ۔ یعنے خَوْفٌ کا تعلق مستقبل (حادثہ واقع ھونے سے پہلے) کے اندیشہ سے ہے ۔ اور حُزْنٌ بالعموم گزرے ھوئے واقعہ کے غم کو کہتے ھیں* ۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے وَاِنِ امْرَاَۃٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا (۴/۱۲۸) جسکے معنے یہ ھیں کہ اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے زیادتی کا اندیشہ ھو ۔ لہٰذا خوف خدا وندی کے معنے یہ ھیں کہ اس احساس سے کہ قوانین خدا وندی کو چھوڑ دینے سے میرا کسقدر نقصان ھوگا ، ان قوانین کا اتباع کرنا ۔ غلط روش کے تباہ کن نتائج کے احساس اور اندیشہ سے اس روش سے مجتنب رھنا ۔ چنانچہ سورۃ نحل میں اشیائے کائنات، اور ملائکہ کے متعلق ہے يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰) ۔ ''یہ اپنے نشو و نما دینے والے کے غلبہ و اقتدار سے ڈرتے ھیں اور جنو کچھ حکم دیا جاتا ہے وھی کرتے ھیں،، ۔ یعنی وہ قوانین خدا وندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ھیں کیونکہ وہ جانتے ھیں کہ اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ فساد ھوگا ۔ لہٰذا خدا کا خوف کسی مستبد حاکم کے خوف کے مرادف نہیں ۔ اس خوف سے مفہوم ایسا ھی ہے جیسے ھم جلنے کے اندیشہ سے آگ میں ھاتھ نہیں ڈالتے ۔ چنانچہ اَلْخَافَةُ اس چرمی جبہ کو کہتے ھیں جسے چھتے سے شہد نکالنے والا اوڑھ لیتا ہے (تاکہ شہد تو مل جائے لیکن وہ مکھیوں کے ڈنک سے محفوظ رہے) ۔ نیز تھیلہ جس میں (تلف ھونے کے خوف سے) کسی چیز کو محفوظ کیا جاتا ہے** ۔

خَوَافٌ ۔ شور و غل کو کہتے ھیں** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی پریشانی اور گھبراھٹ کے ھیں ۔ خَوْفٌ کے معنے قتل اور جنگ کے بھی ھیں** ۔ چنانچہ (۳۳/۱۹) میں خَوْفٌ کے معنے قتل و قتال کے کئے گئے ھیں ۔ تَخَوَّفَ الشَّيْءَ کے معنے ھیں کسی چیز کو کم کر دینا** ۔ تَخَوَّفَهٗ حَقَّهٗ اسکے حق کو کم کر دیا ۔ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ (۱۶/۴۷) کے معنے ھیں انہیں بتدریج کم کرتا ھوا تباہ کر دے، دفعۃً نہیں ۔ نیز تَخَوُّفٌ کے معنے خوف کرنا ، ڈرتے رھنا ھیں ۔ اس طرح یہ معنی بھی ھو سکتے ھیں کہ باوجود ان کے خوف کرنے اور ھوشیار رھنے کے انکی گرفت کر لے ۔ لیکن اول الذکر معانی زیادہ موزوں نظر آتے ھیں ۔

اَلْخِيْفَةُ ۔ حالت خوف کو کہتے ھیں*** ۔

---

*راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

اتباع ھدایت کا لازمی نتیجہ یہ ھوتا ہے کہ اس قوم کو خوف اور حزن نہیں رھتا (۲/۳۸) ۔ لہٰذا اگر کسی قوم پر خوف چھایا رہے تو اسے سمجھ لینا چاھئیے کہ وہ ھدایت خداوندی کا اتباع نہیں کر رھی ۔ مومن اور خوفِ باطل دو متضاد باتیں ھیں ۔ لفظ مومن کا تو مادہ ھی امن ہے ۔ پھر اسے باطل سے خوف کیوں ؟

خ و ل

اَلْخَالُ ۔ ماں کا بھائی ، یعنی ماموں ۔ (جمع اَخْوَالٌ ۔ اَخْوِلَةٌ ۔ خُؤُوْلٌ) ۔ اَلْخَالَةُ ۔ ماں کی بہن یا خالہ (اس کی جمع خَالَاتٌ ہے) ۔ (۴/۲۳) ۔ اَخْوَالٌ (۲۴/۶۱) میں آیا ہے ۔ اَلْخَالُ ۔ بھلائی کا نشان جو کسی آدمی میں نظر آئے ۔ فوج کا جھنڈا ۔ سیاہ اونٹ ۔ ھُوَخَالُ مَالٍ ۔ وہ اونٹوں کا محافظ ہے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کی خبر گیری اور نگہداشت کرنے کے ھوتے ھیں ۔ خَوَّلَ (تَخْوِیْلٌ) کسی کو سامان حشم و خدم عطا کر دینا ۔ یا ایسی چیزیں دینا جن کی نگرانی اور دیکھ بھال کی ضرورت پڑے** ۔ اِذَا خَوَّلَہٗ نِعْمَةً (۳۹/۸) ۔ ''جب اللہ اسے سامان آسائش عطا کرتا ہے'' ۔

خ و ن

اَلْخَوْنُ کے بنیادی معنے ھیں کسی چیز کو کم کر دینا ۔ خَوَّنَہٗ ۔ اس کو کم کر دیا ۔ فِیْ ظَھْرِہٖ خَوْنٌ ۔ اس کی کمر میں کمزوری ہے ۔ نگاہ کی چندھیاھٹ کو بھی خَوْنٌ کہتے ھیں* ۔

خَانَ ۔ یَخُوْنُ ۔ خَوْنًا سے مراد یہ ھوتی ہے کہ جس شخص کو امانتدار سمجھا جائے وہ اپنی امانت اور عہد کا پاس نہ کرے ۔ اس کا نام خِیَانَةٌ ہے ۔ اس سے ظاھر ہے کہ خِیَانَةٌ دراصل اعتماد اور بھروسہ کو ضائع کر دینے کا نام ہے ۔ چنانچہ کہتے ھیں خَانَ الدَّلْوَالرِّشَاءُ ۔ رسی نے ڈول سے وفا نہ کی اور درمیان سے ٹوٹ گئی جس کے سبب سے ڈول کنوئیں میں گر گیا* ۔ ھم رسّی کی مضبوطی کے بھروسہ پر ڈول کو بھر کر کھینچتے ھیں ۔ اگر رسی درمیان میں پہنچ کر ٹوٹ جائے تو یہ اس کی خِیَانَةٌ کہلاتی ہے ۔ لہذا اَمَانَةٌ تو یہ ہے کہ انسان کسی کی طرف سے مطمئن (امن میں) ھو جائے اور اپنے اعتماد کو نہیں کھوئے ۔ لیکن خِیَانَةٌ میں یہ اعتماد اوربھروسہ

*تاج ۔ **راغب ۔

باقی نہیں رھتا ۔ یہی وجہ ھے کہ قرآن کریم نے قوانین خداوندی کے متعلق کہا ھے کہ وہ ایک ایسی مضبوط کڑی ھے کہ لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶) ۔ جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتی ۔ ان پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ھے ۔ یہ کبھی راستہ میں دغا نہیں دیتے ۔ یہ درمیان میں پہنچکر ٹوٹ نہیں جاتے ۔ صرف ٹوٹ کر نقصان پہنچانا ھی نہیں بلکہ ھر تغیر ، کمی اور تبدیلی کرنے کو تَخَوُّنٌ کہتے ھیں* ۔ خَانَہُ الدَّھْرُ ۔ زمانہ نے اس کے ساتھ وفا نہ کی ، یعنی اس کی حالت بگاڑ دی* ۔

قرآن میں ھے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ (۲۲/۳۸) ۔ خَوَّانٌ ھر ایسے شخص کو کہہ سکتے ھیں جس پر اعتماد اور بھروسہ نہ کیا جا سکے ، اور وہ دشمن بھی جو تمہاری حالت میں خرابی پیدا کر دینے کی کوشش کرے ۔ نیز بڑا خائن ۔ قرآن کریم نگاہ کی خیانت تک سے منع کرتا ھے (۴۰/۱۹) ۔

سورۃ بقرہ میں ھے اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ (۲/۱۸۷) راغب نے لکھا ھے کہ اِخْتِیَانٌ سے مراد خیانت کا ارادہ یا تیاری کرنا ھے** ۔ لہذا دوسروں سے تو ایک طرف ، خود اپنی ذات سے بھی خیانت نہیں کرنی چاھئے ۔ بلکہ خیانت کا خیال تک بھی دل میں نہیں لانا چاھئے ۔ سب سے بڑا جرم خود اپنے آپ سے خیانت کرنا ھے ۔ یعنی جن امور کو تم صحیح اور سچا مانتے ھو ان کے خلاف عمل کرنا (خواہ اس کا علم کسی دوسرے کو ھو یا نہ ھو) ۔ یہ انسانی خودی کی کمزوری کی دلیل ، بلکہ (Dual Personality) کی علامت ھے ۔ یعنی اُن باتوں کو ماننے والا کوئی اور ھوتا ھے اور ان کے خلاف کام کرنے والا کوئی اور ۔ قرآن کریم اس سے روکتا ھے ۔

سورۃ نساء میں ھے اَلَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ (۴/۱۰۷) جو لوگ آپس میں ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا ارادہ کرتے ھیں ۔ سورۃ انفال میں ھے کہ تم نہ تو نظام خداوندی کے خلاف سازش کرو ۔ (لَا تَخُوْنُوْا) ۔ اور نہ ھی ان امور میں کسی قسم کی خیانت کرو جو تمہارے سپرد کئے جائیں (۸/۲۸) ۔

خ و ی

خَوَتِ الدَّارُ ۔ گھر ویران ھو کر گر پڑا ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں خالی ھونا اور گرنا لکھے ھیں ۔ اَرْضٌ خَاوِیَۃٌ ۔ ویران زمین* ۔ اَلْخَوَاءُ کے معنے خالی ھونے کے ھیں** ۔ خَوِیَ الْمَکَانُ ۔ جگہ خالی ھوئی*** ۔

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔

سورۃ بقرہ میں ایک بستی کے متعلق ہے وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا (۲/۲۵۹)۔ برباد اور ویران' جسکے مکانات گر پڑے تھے۔ یا اس کے مکان؛ باوجود چھتوں کے قائم ہونے کے خالی تھے۔ سورۃ الحاقہ میں ہے أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (۶۹/۷) اندر سے کھوکھلے ہو کر گر پڑنے والے کھجور کے تنے۔ تباہ و برباد۔

خ ی ب

خَابَ۔ يَخِيْبُ۔ خَيْبَةً۔ محروم رہ جانا۔ نقصان اٹھانا۔ مایوس ہو جانا۔ نامراد رہ جانا*۔ توقعات کا منقطع ہو جانا۔ مطلوبہ کو حاصل نہ کر سکنا۔ محتاج و فقیر ہو جانا**۔ اَلْخَيَّابُ اس چقماق کو کہتے ہیں جس سے آگ نہ نکلے۔ (ابن فارس) قرآن میں ہے فَيَنْقَلِبُوْا خَائِبِيْنَ (۳/۱۲۶)۔ ''وہ خاسر و نامراد واپس ہو جائیں''۔ قرآن کریم میں خَابَ کا لفظ أَفْلَحَ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ أَفْلَحَ کے معنے ہیں کھیتیوں کا پروان چڑھنا ثمر بار ہونا۔ لہٰذا خَابَ کے معنے ہونگے، بے ثمر رہ جانا۔ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱/۹-۱۰) جسنے انسانی ذات (نفس۔ Self) کی نشو و نما کی، اسکی زندگی کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔ جسنے اسے دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا اسکی کشت حیات ویران ہو گئی۔ اس کا شعلۂ زندگی افسردہ ہو گیا۔ ایسے چقماق کی مانند ہو گیا جس سے چنگاری نہ نکلے۔ اسی لئے سورۃ ابراہیم میں خَابَ کی تفسیر هَلَكَ سے کر دی گئی ہے۔ تباہی اور بربادی (۱۴/۱۵،۱۳)۔ اسمیں اس زندگی کی بربادی بھی شامل ہے (بلکہ یہ تو سب سے پہلے سامنے آ جاتی ہے اسلئے انسانی ذات (Self) کی نشو و نما کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشگواریاں کا حاصل ہو جانا بھی ہے۔ ترک دنیا سے ''روحانی ترقی''، کا خیال غیر قرآنی ہے۔ انسانی ترقی تسخیر کائنات سے ہوتی ہے۔ وہ زندگی جس میں شعلہ نہ ہو، راکھ کا ڈھیر ہے۔

خ ی ر

الخَيْرُ۔ ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں جو سب کو مرغوب ہو۔ نیز مفید چیز۔ یہ الشَّرُّ کی ضد ہے۔ اَلْخَيْرُ، ہر قسم کے مال کو کہتے ہیں۔ عرب گھوڑوں کو بھی ان کی افادیت کے اعتبار سے خَيْرٌ کہتے تھے (۳۸/۳۲)۔ خَيْرَاتٌ۔ خوبصورت و خوش اخلاق عورتوں کو کہتے ہیں*۔ (یا جن میں بہت سی

---

*تاج۔ **محیط۔

خوبیاں ہوں ۔ خوبصورتی بھی ایک خوبی ہے) ۔ خَیَارٌ کے معنے اختیار کے ہیں ۔ یعنے اس امر کا اختیار کہ جس چیز کو چاہے لے لے اور جسے چاہے چھوڑ دے (Choice) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی میلان اور جھکاؤ کے ہیں ۔ اَنْتَ بِالْخِیَارِ ۔ تمہیں حسب مرضی کام کرنے کا اختیار ہے ۔ خَیَّرَہٗ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ ۔ اس نے اُسے اختیار دے دیا کہ وہ دو چیزوں میں سے جسے چاہے لے لے* ۔ اِسْتِخَارَۃٌ کے معنے ہیں دو باتوں میں سے بہتر کو طلب کرنا* ۔ چونکہ دو چیزوں میں سے جسے اختیار کیا جاتا ہے وہ بہرحال دوسری چیز سے بہتر ہوتی ہے (یا اُسے ایسا سمجھا جاتا ہے) اس لئے خَیْرٌ کا لفظ شرف و برتری ، فضیلت و کرم کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ ھُوَ خَیْرٌ مِنْکَ ۔ وہ تم سے بہتر ہے، یہ افعل التفضیل ہے ۔ خَارَ الرَّجُلَ عَلَی غَیْرِہٖ وَ خَیَّرَہٗ تَخْیِیْرًا ۔ اس نے آدمی کو دوسرے لوگوں پر فضیلت اور ترجیح دی ۔ اِخْتَرْتُہٗ عَلَیْھِمْ ۔ میں نے اسے ان سب پر فضیلت دے دی ۔ خَارَہٗ ۔ اُس کو چن لیا ، منتخب کرلیا ۔ اَلْخِیَارُ ۔ ککڑی کو کہتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں خَیْرٌ کا لفظ مال و دولت کے معنوں میں متعدد جگہ آیا ہے ۔ (مثلاً ۲/۱۸۰ و ۲/۲۷۲) ۔ اَدْنٰی کے مقابلہ میں خَیْرٌ (۲/۶۱) میں آیا ہے ۔ مِثْلٌ* ۔ کسی چیز کے مانند ۔ اور خَیْرٌ ۔ اس سے بہتر (۲/۱۰۶) ۔ سورۃ انعام میں یہ لفظ ضُرٌّ کے مقابلہ میں آیا ہے (۶/۱۷) ۔ سورۃ حج میں فِتْنَۃٌ کے مقابلہ میں (۲۲/۱۱) اور سورۃ بقرہ میں شَرٌّ کے مقابلہ میں (۲/۲۱۶) ۔ سورۃ نحل میں یہ لفظ ہر اچھی بات یا اچھے کام کے لئے آیا ہے (۱۶/۷۶) ۔ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے بِیَدِکَ الْخَیْرُ (۳/۲۶) ۔ اس میں اختیارات و اقتدارات اور ہر قسم کی بھلائیوں کا تصور موجود ہے ۔ سورۃ احزاب میں خِیَرَۃٌ کا لفظ اختیار و انتخاب کے معنوں میں آیا ہے (۳۳/۳۶) ۔ کائنات میں جو انتخاب طبعی (Natural Selection) کا عمل جاری ہے اس کے لئے یَخْتَارُ کا لفظ آیا ہے (۲۸/۶۸) ۔ سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق فرمایا وَاَنَا اخْتَرْتُکَ (۲۰/۱۳) ۔ میں نے تجھے (ایک مقصد عظیم کے لئے) چن لیا ہے ۔ منتخب کر لیا ہے ۔ سورۃ صٓ میں حضرات انبیاء کرامؑ کے لئے اَخْیَارٌ کا لفظ آیا ہے (۳۸/۴۷) ۔ یعنے منتخب افراد ۔ ابن فارس نے کہا ہے قَوْمٌ خِیَارٌ اور اَخْیَارٌ کے معنی ہیں بہت سی صلاحیتوں کی مالک قوم ۔

* تاج ۔

(۵۵/۷۰) میں خَیْرَاتٌ حِسَانٌ۔ متناسب الاعضاء اور معتدل سیرت و کردار رکھنے والی عورتوں کے لئے آیا ہے ، یا متوازن اور عمدہ خوشگوار اشیاء کے لئے۔

چونکہ زندگی کی تمام خوشگواریاں اور اختیارات و اقتدارات کی وسعتیں قوانین خداوندی کی رو سے حاصل ہوتی ہیں اس لئے وحی کے لئے بھی خَیْرٌ کی جامع اصطلاح آئی ہے (۲/۱۰۵) ۔ لہٰذا مومنین کی زندگی یہ ہے کہ انہیں وحی کے اتباع سے ساری دنیا کی مفید اور حسین چیزیں میسر ہوں اور ان کے اختیارات کی وسعتیں حدود فراموش ہوں ۔ یہ ہے خَیْرٌ جو قوانین خداوندی کی اطاعت کا لازمی نتیجہ ہے ۔ اسی لئے سورۃ نحل میں ہے کہ جب مومنین سے ان کے ، مخالفین سوال کرتے ہیں کہ ہمیں بتاؤ تو سہی کہ تمہارے رب نے تمہارے لئے کیا نازل کیا ہے تو وہ اس کے جواب میں ایک جامع لفظ کہہ دیتے ہیں ۔ قَالُوْا خَیْراً (۱۶/۳۰) ۔ یعنی تمام دنیا کی خوشگواریاں اور خوشحالیاں اور اختیارات کی وسعتیں ۔ اس کی تفسیر اگلے الفاظ نے یہ کہکر کر دی ہے کہ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ (۱۶/۳۰) اس دنیا میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں ، اور مستقبل کی زندگی میں بھی خوشگواریاں ۔ لہٰذا ہر وہ عمل جس کا نتیجہ حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) کی خوشگواریاں ہوں ، خیر ہے اور جس کا نتیجہ اس کے برعکس ہو وہ شر ہے ۔ خوشگواریوں میں انسانی ذات (Personality) کی نشو و نما (Development) سب سے مقدم ہے ۔ بلکہ یوں کہئیے کہ خوشگوار کہتے ہی اسے ہیں جس سے انسانی ذات کی نشو و نما ہو ۔ جس سے اس کی نشو و نما رک جائے وہ شر ہے ۔ قرآن کریم ایسا پروگرام دیتا ہے جس کا نتیجہ اس قسم کی خوشگواریاں ہوتا ہے ۔ اسے وہ اعمال صالحہ سے تعبیر کرتا ہے ۔ یعنی ایسے اعمال جن سے انسانی ذات کی صلاحیتیں بیدار ہوں اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہوں ۔ (دیکھئے عنوان ص ۔ ل ۔ ح)

سورۃ بقرہ میں حج کے سلسلہ میں کہا گیا ہے وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی (۲/۱۹۷) ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم حج کے لئے زاد راہ ضرور لیا کرو ۔ اس زادِ راہ کا فائدہ یہ ہوگا کہ تم وہاں بھیک مانگنے سے بچے رہو گے ۔ (یہاں خَیْرٌ کے معنی فائدے کے ہیں اور تقویٰ کے معنی محتاجی کی ذلّت سے محفوظ رہنے کے ۔)

خ ی ط

اَلْخَیْطُ ۔ دھاگہ ۔ لڑی*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے باریکی کے ساتھ دراز ہونے کے ہیں ۔ اَلْخِیَاطُ ۔ اَلْمِخْیَطُ

* تاج ۔

سوئی* - فِی سَمِّ الْخِيَاطِ : سوئی کے ناکہ میں (۷/۴۰) - خَاطَ الثَّوْبَ - کپڑے کے ایک حصے کو دوسرے حصے کے ساتھ سی دینا** - خَيَّاطٌ - درزی* -

قرآن کریم میں روزوں کے احکام کے سلسلہ میں اَلْخَيْطُ الْاَبْيَضُ وَ الْخَيْطُ الْاَسْوَدُ آیا ہے (۲/۱۸۷) یعنے سفید دھاگہ اور سیاہ دھاگہ - اس سے مراد ہے صبح کی پھٹنے والی روشنی اور رات کی تاریکی* - اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں ہر جگہ لفظی معنے نہیں لئے جاتے بلکہ مفہوم کے اعتبار سے مطلب لیا جاتا ہے - اسی بناپر لطائف اللغۃ میں اَلْخَيْطُ الْاَبْيَضُ کے معنی اَلنُّوْرُ (روشنی) کئے گئے ہیں -

اَلْخَيْطُ - رنگ کو بھی کہتے ہیں* - اور جماعت کو بھی* -

خ ی ل

خَالَ - يَخَالُ - گمان کرنا - خیال کرنا - خَيَّلَ - اندازہ سے معلوم کرنا اور تاڑنا - خُيِّلَ اِلَيْهِ اَنَّهٗ كَذَا - اس کے وہم میں کوئی چیز ایسی معلوم ہوئی - یعنی کوئی چیز جو در حقیقت ایسی نہ ہو لیکن یونہی متخیلہ میں ایسی دکھائی دے - چنانچہ اَلسَّحَابَةُ اَلْمُخَيِّلَةُ اس بادل کو کہتے ہیں جسے تم دیکھنے پر برستا ہوا خیال کرو - اَلْخَيَالُ (Scare - Crow) کو بھی کہتے ہیں - یعنے دو لکڑیوں کے اوپر سیاہ رنگ کا کپڑا ڈال کر اسے آدمی کی شکل دیتے ہیں اور کھیت میں کھڑا کر دیتے ہیں تاکہ جانور اسے آدمی سمجھ کر کھیت کے قریب نہ آئیں* - انہی معانی کے لحاظ سے سورہ طٰہٰ میں ساحرین دربار فرعون کے متعلق ہے کہ انہوں نے رسیوں کو پھینکا تو يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (۲۰/۶۶) "ان کی نگاہ بندی کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کے ذہن میں ایسا خیال پیدا ہوا گویا وہ دوڑ رہی ہیں" - یعنے وہ در حقیقت دوڑ نہیں رہی تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ متحرک ہیں - آپ غور کیجئے کہ قرآن نے سحر (Magic) کے متعلق کتنی بڑی حقیقت کا انکشاف کیا ہے - اس نے کہا یہ ہے کہ سحر کے زور سے اشیاء کی ماہیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی - صرف دیکھنے والے کے خیال میں تبدیلی واقع ہوتی ہے جس سے اسے وہ اشیاء ایسی نظر آنے لگ جاتی ہیں ، یعنی اس کا اثر محض نفسیاتی ہوتا ہے -

* تاج - ** محیط -

لیکن یہ مفہوم اسی صورت میں لیا جائیگا جب دربار فرعون کے منتریوں کی "رسیوں اور لاٹھیوں" کو حقیقی معنوں میں لیا جائے۔ اگر ان کے مجازی معنے لئے جائیں تو پھر مطلب اور ہوگا۔ تفصیل ان امور کی اپنے اپنے مقام پر ملیگی۔ (نیز دیکھئے عنوان س۔ح۔ر)

اسی سے خُیَلَاءُ کے معنے ہیں ایسا غرور جو انسان اپنے اندر یونہی کسی ذہنی بڑائی کی بناء پر پیدا کرلے۔ یعنے وہ بڑائی درحقیقت اس میں موجود نہ ہو لیکن وہ خود فریبی سے ایسا سمجھ لے کہ اس میں وہ بڑائی ہے اور پھر اس پر فخر کرنے لگ جائے۔ ایسا کرنے والے کو مُخْتَالٌ کہتے ہیں**۔ ($\frac{۳۱}{۱۸}$) یعنے خود فریبی میں مبتلا۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ایسی حرکت کے ہیں جس میں تلون بھی شامل ہو۔ خَیَالٌ اسی سے ہے۔ خَیَالٌ درحقیقت اس چیز کو کہتے ہیں جسے انسان خواب میں دیکھے۔ ایک تو خواب میں ہر شے متلون ہوتی ہے۔ ابھی کچھ ابھی کچھ۔ دوسرے انسان سمجھتا یہ ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے وہ فی الواقعہ ایسا ہے۔ حالانکہ اسکی حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ اس سے اس آیت کا مفہوم اور بھی واضح ہوجاتا ہے جس میں ساحرین کی سحرطرازی کا ذکر ہے (اور جو اوپر درج کی جا چکی ہے۔ یعنی ($\frac{۲۰}{۶۶}$)۔

راغب نے کہا ہے کہ اسی سے لفظ خَیْلٌ ($\frac{۳}{۱۳}$) ہے (یعنے گھوڑے یا گھڑ سواروں کا دستہ۔ ($\frac{۸}{۶۰}$) کیونکہ گھوڑا بھی اپنی رفتار میں اٹھلاتا ہوا چلتا ہے۔ اور گھڑ سوار کے دل میں بھی ایک عجیب قسم کا تکبر سا ہوتا ہے*۔

خ ی م

تَخْیِیْمٌ کے معنے ہوتے ہیں خیمے نصب کر کے قیام کرنا۔ عرب اپنے قیام کیلئے جو عارضی سا گھر بنا لیتے تھے اسے خَیْمَةٌ کہتے تھے۔ اسکی ساخت کے متعلق بہت سے اقوال ہیں لیکن عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ چار لکڑیاں کھڑی کر کے ان پر درختوں (جھاؤ وغیرہ) کے پتے ڈال دئے جاتے تھے۔ اسے خَیْمَةٌ کہتے تھے۔ جو خیمہ کپڑے سے بنایا جاتا تھا اسے مِظَلَّةٌ کہتے تھے۔ خَیَّمَ الشَّیْیءَ کے معنے ہیں اُسنے کسی چیز کو دوسری چیز سے ڈھانپ دیا***۔ خَیْمَةٌ کی جمع خِیَامٌ ہے۔ یہ لفظ ($\frac{۵۵}{۷۲}$) میں آیا ہے۔ حُوْرٌ مَقْصُوْرَاتٌ فِی الْخِیَامِ۔

*تاج۔ **لین۔ ***تاج و محیط۔

د

د أ ب

اَلدَّاْبُ ۔ اَلدَّاَبُ ۔ (کسی کام میں) مسلسل لگے رہنا ۔ لگا تار کوشش کرتے رہنا ۔ تسلسل اور مداومت کی وجہ سے اسکے معنے عادت مستمرہ یا حالت، دستور، طور طریق کے ہو گئے* ۔ دَاَبَ فُلَانٌ* ۔ اس شخص نے لگا تار کوشش کی، تھکا اور مصروف عمل رہا** ۔ کتاب الاشتقاق میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ دَاَبٌ اس کام کے لئے بولتے ہیں جو مسلسل، بلا انقطاع کیا جائے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مداومت کے ہیں ۔

سورۃ آل عمران میں ہے کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ (۳/۱۰) ۔ قوم فرعون کی روش کے مطابق ۔ سورۃ یوسف میں دَاَبًا (۱۲/۴۷) کے معنے ہیں، بہت زیادہ محنت اور کوشش کے ساتھ مسلسل ۔ سورۃ ابراھیم میں ہے وَالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَائِبَيْنِ (۱۴/۳۳) ۔ سورج اور چاند مسلسل اپنی رفتار کے مطابق چلتے رہتے ہیں ۔ وہ اپنے فریضہ کی سر انجام دہی میں مسلسل مصروف ہیں ۔

داوُد علیہ السلام

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ آپ حضرت ابراھیم[ع] کی ذریت (نسل) میں سے تھے ۔ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ (۶/۸۴) ۔ اللہ نے انہیں ایک کتاب (زَبُوْرًا ۔ ۴/۱۶۳) دی تھی ۔ (واضح رہے کہ زَبُوْرًا کے معنی "ایک کتاب" ہیں ۔ لیکن سورۃ انبیاء میں اَلزَّبُوْرُ بھی آیا ہے ۔ ۲۱/۱۰۵ ۔ جس کے معنے خاص کتاب کے ہیں ۔ ہوسکتا ہے کہ یہ حضرت داؤد[ع] پر نازل شدہ کتاب کا نام ہو) آپ کو علم کی فراوانی عطا کی گئی تھی (۲۷/۱۵) اور محکم سلطنت (۳۸/۲۰) ۔ تا کہ آپ لوگوں میں حق کے ساتھ حکومت کریں (۳۸/۲۶)۔ پہاڑی قبائل کے بڑے بڑے سردار آپ کے مطیع و فرمان پذیر تھے اور آپ کے پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہتے تھے (۳۸/۱۸) ۔ نیز قبیلہ طیر کے خانہ بدوش افراد بھی جن سے منہی

*راغب ۔ **تاج و محیط و اقرب الموارد ۔

وسالے(گھوڑوں کے لشکر) مرتب ہوئے تھے(۳۸/۱۹)۔ آپ نے اس سے قبل بنی اسرائیل کے لشکر کےساتھ جالوت کے لشکر کو شکست دی تھی اور جالوت کو قتل بھی کیا تھا (۲/۲۵۱)۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑائیوں میں پہننے کا لباس(زرہ بکتر) آپ کی ایجاد تھی یا آپ کو اس میں خصوصی ملکہ حاصل تھا (۲۱/۸۰)۔آپ کا زمانہ اندازاً ۔ ۔ ۔ ۱ ق ۔ م ۔ سمجھنا چاہئے۔ کہتے ہیں کہ حضرت داؤد[۴] بڑے خوش آواز تھے ۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عبرانی موسیقی مدون کی اور مصری اور بابلی مزامیر (سازوں)کو ترقی دے کر نئے نئے آلاتِ موسیقی ایجاد کئے۔ جب وہ پہاڑوں پر بیٹھ کر اپنا بربط بجاتے تھے تو شجرو حجر جھومنے لگ جاتے تھے ۔ تورات اور ہماری تفسیری روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے**۔

د ب ب

دَبَّ النَّمْلُ يَدِبُّ دَبًّا ۔ خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنا۔ اس سے دَبَّ الشَّرَابُ فِي الْجِسْمِ کہتے ہیں ۔ یعنے شراب کا جسم میں آہستہ آہستہ سرایت کر جانا ۔ اَلدَّابَّةُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو زمین پر چلے ۔ ہر رینگنے اور چلنے والا جاندار* ۔ الدِّبَّةُ۔ آہستہ رفتار۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس رفتار کو کہتے ہیں جو مَشْيٌ سے خفیف ہوتی ہے ۔

اَلدَّبَّابَةُ ۔ کھالوں اور لکڑیوں سے بنائی ہوئی ایک بہت بڑی سی محفوظ گاڑی جس میں بیٹھکر سپاہی قلعہ کی دیوار تک پہنچ جاتے تھے تا کہ اسے توڑ سکیں* ۔ (آجکل ٹینک کو دَبَّابَةٌ کہتے ہیں)۔ یہ آہستہ آہستہ چلتی تھی اور اس میں بیٹھنے والا دشمن کی زد سے محفوظ رہتا تھا۔ اَلدَّبْدَبَةُ۔ سخت زمین پر چلنے سے قدموں کی آواز ۔ نیز شور۔ ڈھول بجانا اور ڈھول کی آواز کو بھی کہتے ہیں* ۔

[قاعدہ کے مطابق اس لفظ کو دب دب کے عنوان کے تحت آنا چاہئے لیکن چونکہ اسے محض ضمنی طور پر لکھا گیا ہے اور قرآن میں یہ لفظ نہیں آیا اس لئے اسے الگ لکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کیگئی ۔]

قرآن کریم میں دَابَّةٌ کا لفظ ، رینگنے والے جانور ، دو پاؤں پر چلنے والے اور چار پاؤں پر چلنے والے جانور ، سب کے لئے آیا ہے ۔ (۲۴/۴۵) ۔ دَابَّةٌ کی جمع دَوَابُّ ہے۔ سورۃ حج میں یہ لفظ انسانوں کے علاوہ باقی ذی حیات کے لئے آیا ہے (۲۲/۱۸) ۔ سورۃ فاطر میں یہ لفظ انسانوں اور مویشیوں کے علاوہ دیگر ذی حیات کے لئے آیا ہے ۔ (۳۵/۲۸) ۔ سورۃ نحل میں ہے لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ (۱۶/۶۱) نیز

*تاج ۔ نیز لطائف اللغة ۔ **ترجمان القرآن (ابوالکلام آزاد ۔ جلد دوم صفحہ ۴۸۰)

(۳۵/۴۵) - ''اگر اللہ لوگوں کے ظلم کی وجہ سے ، ان کی (فوری) گرفت کرتا تو زمین پر کوئی دابۃ نہ چھوڑتا،، - اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہاں ''دابۃ،، کا لفظ خود انسانوں کے لئے آیا ہے کیونکہ انسانوں کے غلط اعمال کی وجہ سے انسانوں کو ہلاک ہونا چاہئے ، نہ کہ دیگر مخلوقات کو بھی - لیکن اگر اس کے مفہوم کی وسعت کو دیکھا جائے تو اس سے مراد ، انسان اور دیگر ذی حیات بھی ہو سکتے ہیں - سورۃ انفال میں ، عقل و خرد سےکام نہ لینے والے انسانوں کو شَرَّ الدَّوَآبِّ (۸/۲۲) کہا گیا ہے - یعنی چلنے والے جانوروں (یا ذی حیات) میں سب سے زیادہ بدتر - یعنی حیوانات سے بھی زیادہ راہ گم کردہ - (۷/۱۷۹) -

سورۃ النمل میں ہے وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ (۲۷/۸۲) - راغب نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ شریر لوگ ہیں جو جہالت میں جانوروں کی طرح ہیں - اس طرح یہ لفظ جمع ہو جائیگا* - لیکن جب قرآن نے دَآبَّةً کا لفظ انسانوں کیلئے بھی استعمال کیا ہے تو پھر ان شریر انسانوں کی جانوروں کے ساتھ مماثلت کی بھی ضرورت نہیں رہتی - اس سے مراد جنگجو قومیں ہونگی - اسکی وضاحت تُكَلِّمُهُمْ نے بھی کر دی ہے جسکے معنے زخمی کرنے کے ہیں - لیکن اگر تُكَلِّمُهُمْ کے معنی بات کرنے کے بھی لئے جائیں تو بھی دَآبَّةً کے مندرجہ بالا مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا - (دیکھئے عنوان ک - ل - م) - سورۃ سبا میں حضرت سلیمانؑ کے نالائق (جانشین بیٹے) کیلئے یہ لفظ آیا ہے (۳۴/۱۴) - یعنی وہ انسان نہیں تھا، محض حرکت کرنے والا پیکر تھا - (تفصیل سلیمانؑ کے عنوان میں ملیگی) سورۃ ھود میں ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) - ''اس زمین میں کوئی دَآبَّةً ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہو،، - دَآبَّةً سے مراد خواہ تمام حیوانات (انسان سمیت) ہوں یا صرف انسان، ان سب کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر ہے - یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے تو پھر دنیا میں لوگ بھوک سے کیوں مرتے ہیں ؟ ایک ایک قحط میں مرنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے - اورعام حالات میں بھی کروڑوں انسان ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا - اگر انکے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے تو وہ ذمہ داری پوری کیوں نہیں ہوتی؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور نہایت غورطلب - (جیسا کہ میں

*تاج -

نے اپنی کتاب ''نظام ربوبیت،، میں تفصیل سے لکھا ہے) ایسے مقامات میں اللہ کی ذمہ داری اس نظام کی وساطت سے پوری ہوتی ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوتا ہے - یعنی یہ نظام ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لے لیتا ہے جنکی نسبت (قرآن میں) اللہ کی طرف کی گئی ہے اوراسی طرح وہ حقوق و واجبات بھی، اسکی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جنہیں خدا کے حقوق کہا جاتا ہے - اس صورت میں خدا کی اطاعت اس نظام کی رو سے کی جاتی ہے جو خدا کے احکام کو نافذ کرتا ہے- اور عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا کے معنے یہ ہو جاتے ہیں کہ ان تمام انسانوں کے رزق کی ذمہ داری اس نظام کے سر پر عائد ہو جاتی ہے - لہذا نظام خداوندی میں تمام افراد کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا اس نظام کے ذمہ ہوتا ہے - رزق کے سر چشمے اصلاً اس نظام کی تحویل میں بطور امانت رہتے ہیں اور وہ نظام خدا کے دئیے ہوئے رزق کی تقسیم اسطرح کرتا ہے کہ کوئی متنفس اس سے محروم نہیں رہنے پاتا - اسطرح خدا کی ذمہ داریاں خود بخود پوری ہوتی رہتی ہیں - لیکن جب وہ نظام قائم نہ ہو تو مستبد قوتیں رزق کے سر چشموں پر قابض ہو جاتی ہیں اور کمزور انسان ان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتے ہیں - وہ جسے چاہتے ہیں رزق دیتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں دیتے ہیں - آسمانی انقلاب، رزق کے سر چشموں کو ان کے ہاتھ سے چھین کر، انسانیت کی پرورش کے لئے نظام خداوندی کی تحویل میں دیدیتا ہے -

سورۃ شوریٰ میں ہے وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ - وَهُوَ عَلٰی جَمْعِهِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ (۴۲/۲۹) - ''اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض وسمٰوٰت، زمین اور فضائی کروں، کو پیدا کیا اور (جو) ان کے اندر اس نے ذی حیات (دابۃ) پھیلا دئیے ہیں - اور وہ اپنے قانون مشیت کے مطابق انہیں جمع کرنے پر قادر ہے،، - اس آیت سے آسمانی کروں میں ذی حیات آبادی کا سراغ ملتا ہے- نیز، اب غالباً وہ زمانہ قریب آ رہا ہے جب زمین کی آبادی، آسمانی کروں کی آبادی کے ساتھ مل جائے (دونوں جمع ہو جائیں) - قرآن نے انسان کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ رکھا ہے کہ ارض وسمٰوات میں جو کچھ ہے وہ اس کے لئے تابع تسخیر کر دیا گیا ہے - اس لئے اسکی یہ کوشش کہ آسمانی کروں تک جا پہنچے، قرآنی تعلیم کے مطابق ہے - ان کروں میں سے جن میں آبادی ہوگی وہ اسطرح زمین کی آبادی کے ساتھ مل جائیگی - دیکھا آپ نے کہ انفس و آفاق کی نشانیاں کسطرح قرآنی حقائق کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتے چلی جا رہی ہیں ؟ (۴۱/۵۳)-

د ب ر

اَلدُّبُرُ - اَلدُّبْرُ - ہر شے کا پچھلا حصہ۔ بات کا انجام، نیز اس کے معنے پشت اور مقعد کے بھی کئے گئے ہیں۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنے کسی چیز کا آخری اور پچھلا حصہ بتائے ہیں۔ جمع اَدْبَارٌ - سورۂ قمر میں ہے یُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ (۵۴/۴۵)۔ وہ پیٹھ پھیر دینگے۔ سورۂ یوسف میں ہے مِنْ دُبُرٍ (۱۲/۲۵)۔ پیچھے سے۔ سورۂ نمل میں ہے وَلّٰی مُدْبِرًا (۲۷/۱۰)۔ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا۔

اِدْبَارٌ - پیچھے ہٹنا، آخری وقت۔ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ (۵۲/۴۹)۔ آخر شب میں ستاروں کے ڈوبنے کا وقت* - ستاروں کا پیچھے ہٹنا۔

اَلدَّابِرُ - ہر چیز کا آخر۔ اصل و بنیاد*۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ (۶/۴۵)۔ اس قوم کا آخری آدمی تک بھی ہلاک ہو گیا۔ اسکی جڑ کٹ گئی۔

اَلتَّدْبِیْرُ - اَلتَّدَبُّرُ - کسی معاملہ کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے اس میں غور و فکر کرنا - آخری منزل (مقام تکمیل) کو سامنے رکھکر نظم و نسق کرنا۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (۳۲/۵)۔ وہ تدبیر امور کرتا ہے۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (۴/۸۲) ''کیا یہ اس پر غور و فکر نہیں کرتے کہ قرآن کیا کہتا ہے،، اور کاروان انسانیت کو کس منزل کی طرف لیجاتا ہے۔ سورۂ ص میں ہے لِیَدَّبَّرُوْا اٰیٰتِہٖ (۳۸/۲۹)۔ تا کہ وہ اس کی آیات پر غور کریں۔

اَلْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (۷۹/۵)۔ معاملات کو تکمیل تک پہنچانے والے۔ تدبیر امور کرنے والے۔

سورۂ ق میں ہے فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ ـ وَ مِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْہُ وَ اَدْبَارَ السُّجُوْدِ (۵۰/۳۹-۴۰)۔ رسول اللہؐ سے کہا گیا ہے کہ تمہارے مخالفین جو کچھ کہتے ہیں اس سے مضطرب و بیچین نہ ہو۔ اور خدا کی ربوبیت کو مظہر حمدوستائش بنانے کے لئے سرگرم عمل رہو۔ طلوع شمس اور غروب شمس سے پہلے۔ اور رات میں بھی، اس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے جدو جہد کرو۔ اور اَدْبَارَ السُّجُوْدِ میں بھی۔ سورۂ طور کے اخیر میں بھی یہی مضمون قریب قریب انہی الفاظ میں آیا ہے۔ لیکن وہاں اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ہے۔ اس کے معنی ستاروں کے ڈوبنے یا پیچھے ہٹنے کے ہیں۔ لیکن سورۂ

*تاج و محیط۔

ق میں اَدْبَار آیا ہے جو دُبُرٌ کی جمع ہے۔ دوسرا لفظ سُجُوْد ہے جو مصدر ہے اور اس کے معنی جھکنے یا مائل ہونے کے ہیں۔ اس سُجُوْد کے اَدْبَار کیا ہیں، یہ چیز غور طلب ہے۔ عام تفاسیر اور کتب لغت میں اس کے معنی ''نماز کے بعد'' لکھے ہیں*۔ لیکن یہ معنی جچتے نہیں۔ بالخصوص اس لئے کہ یہاں لفظ اَدْبَار آیا ہے اِدْبَار نہیں۔ نیز دُبُر کسی شے کے آخری اور پچھلے حصہ کو کہتے ہیں جو اس میں شامل ہوتا ہے۔ اور ''بعد'' کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی واقعہ یا چیز ختم ہو جائے اور اس کے بعد کوئی اور واقعہ یا چیز شروع ہو۔ ہم اپنی اس وقت تک کی تحقیق کے مطابق متعین طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس سے مقصود کیا ہے۔

د ث ر

اَلدِّثْرُ۔ مال کثیر یا ہر کثیر شے کو کہتے ہیں۔ مَالٌ دَثْرٌ۔ بہت زیادہ مال۔ اَلدِّثَارُ۔ وہ کپڑا جس میں آدمی لپٹ جائے۔ تَدَثَّرَ بِالثَّوْبِ وہ کپڑے میں لپٹ گیا۔ دَثَرَ الشَّجَرُ دُثُوْرًا۔ درخت نے نئے پتے نکال لئے اور اسکی سبز شاخیں پھیلیں۔ هُوَ دِثْرُ مَالٍ۔ وہ اونٹوں کی اچھی خبر گیری کرنے والا ہے۔ تَدَثَّرَ الطَّائِرُ۔ پرند کا اپنے گھونسلے کو درست کرنا۔ نیز اَلدَّثُوْرُ۔ سست رفتار۔ بوجھل۔ اور زیادہ سونے والے آدمی کو بھی کہتے ہیں۔ (جو کپڑوں میں لپٹا رہے)۔ اور دَثَرَ الاَثَرُ نشان کے مٹ جانے کو کہتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں چیزوں کا اوپر تلے آ جانا۔ تہ بہ تہ جم جانا۔ یا اوپر چڑھ جانا۔ ان معانی کی رو سے راغب نیز ابن فارس نے اس مادہ کے مختلف استعمالات بیان کئے ہیں جن سے مفہوم کسی کے اوپر چھا جانا ہے۔ مَنْزِلٌ دَاثِرٌ۔ وہ منزل جس کے آثار (نشانات) مٹ گئے ہوں یا تہ بہ تہ مٹی چڑھ جانے سے چھپ گئے ہوں۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کو يٰاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (۷۴/۱) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اَلدِّثَارُ کے اعتبار سے اس کے عام طور پر معنے کئے جاتے ہیں۔ اے کپڑا اوڑھنے والے۔ لیکن تَدَثَّرَ الطَّائِرُ کے مفہوم کی رو سے اس کے معنے ہونگے، گھر کو ٹھیک کرنے والا۔ اور دِثْرُ مَالٍ کے مفہوم کے پیش

*لسان العرب۔ تفسیر فتح القدیر (شوکانی)۔ تفسیر روح المعانی (آلوسی) **تاج۔ محیط۔ راغب۔

نظر اسکے معنے ھونگے، اچھی خبرگیری کرنے والا ۔ لہذا اسکا یہی مفہوم زیادہ مناسب نظر آتا ھے کہ اے وہ جس کے ذمہ انسانیت کے سنوارنے کا فریضہ ھے۔ یا اے وہ جو نوع انسانی کے معاملات کو حسن تدبیر سے سلجھانے کیلئے آیا ھے ۔ اور دَثَرَ الشَّجَرُ کے اعتبار سے معنے ھونگے، اے وہ جسکی آمد سے ایک نئی دنیا وجود میں آنے والی ھے ۔ یا جسکی آمد سے چمن عالم پر بہار آنے والی ھے ۔ اس تخاطب کے بعد آپؐ سے کہا گیا قُمْ فَاَنْذِرْ (۷۴/۲) ''اٹھ اور دنیا کو غلط روش کے عواقب سے آگاہ کر دے،، ۔ اس کے بعد اس دعوت انقلاب کے مختلف اجزا کو سامنے لایا گیا ھے ۔ اس سے بھی واضح ھے کہ اَلْمُدَّثِّرُ میں انقلاب آفرینی اور نوع انسان کی خیر سگالی کا پہلو نمایاں ھے۔ یہی ایک آسمانی داعی انقلاب کی خصوصیت اور ذمہ داری ھوتی ھے ۔ راغب نے جو مفہوم بیان کیا ھے اسکی رو سے اس کے معنی باطل کے ھر تصور اور نظریہ پر چھا جانے والا ۔ (غالب آ جانے والا) بھی ھو سکتے ھیں ۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۴۸/۲۸) ''تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کرے،، ۔ اسی مفہوم کی وضاحت کرتا ھے۔ ابن فارس نے اس مادہ کے استعمال کی مثالیں دیتے ھوئے کہا ھے کہ تَدَثَّرَ الرَّجُلُ فَرَسَهٗ کے معنی ھیں آدمی اپنے گھوڑے پر اچھل کر سوار ھو گیا* ۔ اس میں ''اچھل کر یا اچک کر،، کی خصوصیت قابل غور ھے ۔ یہ چیز بتدریج نہیں ھوتی بلکہ یک لخت ھوتی ھے ۔ جو انقلاب نبی اکرمؐ کے ھاتھوں سے رونما ھوا تھا اس کا طریق (Revolutionary) تھا ۔ یعنی انقلاب کا دفعۃً رونما ھوجانا ۔ اس کے بعد اب قرآنی تصورات حیات کا غلبہ بتدریج ھو رھا ھے ۔ اسے (Evolutionary) طریق کہتے ھیں ۔ زمانہ ایک چیز کو لیتا ھے۔ اس کا تجربہ کرتا ھے اور اپنے ناکام تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ھے کہ صحیح نظریہ وھی ھے جسے قرآن نے پیش کیا تھا اور نبی اکرمؐ نے عملاً کر کے دکھا دیا تھا ۔ لہذا اب قرآنی تصورات کا باطل کے تصورات پر غلبہ تدریجًا ھو رھا ھے ۔ لیکن اگر انسانوں کی کوئی جماعت اس نظام کو لیکر اٹھے یا کوئی مملکت اسے اپنے ھاں نافذ کر کے اس کے انسانیت ساز تعمیری نتائج دنیا کے سامنے لے آئے تو یہ نظام پھر اچک کر، دوسرے نظامہائے حیات پر غالب آ سکتا ھے ۔ دیکھنا یہ ھے کہ سنت رسول اللہؐ کے اتباع میں تدثّر کا یہ عمل خیر کس قوم کے ھاتھوں سر انجام پاتا ھے؟ وھی قوم اس دور میں انسانیت کی سب سے بڑی محسن ھوگی، اسی کے ھاتھوں شجر ھستی کے پھول کھلینگے اور چمن کائنات پر پھر بہار آئیگی ۔

* نیز لسان العرب ۔

تفسیر روح المعانی میں ھے کہ اَلْمُدَّثِّرُ کے معنی ھیں انسانی کمالات اور شرف نبوت سے آراستہ و پیراستہ ھونے والا - نیز اس نے کہا ھے کہ اَلْمُدَّثِّرُ کے معنی کنایۃً ایسے شخص کے ھیں جس کے پاس کوئی پروگرام نہ ھو اور وہ فارغ بیٹھا ھو - اس مفہوم کے اعتبار سے مطلب یہ ھوگا کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے قُمْ فَاَنْذِرْ کہکر حضورؐ کو عظیم الشان انقلابی پروگرام عطا کردیا - تفسیر فتح القدیر (شوکانی) نے اس کے معنی لکھے ھیں، نبوت اور اسکی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے والا -

عام خیال یہ ھے کہ اَلْمُدَّثِّرُ دراصل اَلْمُتَدَثِّرُ تھا - (یعنی تَفَعُّلٌ کے خاندان سے)- تاء مد غم ھوگئی دال میں - اور اسطرح اَلْمُدَّثِّرُ بن گیا -

د ح ر

اَلدَّحْرُ - کسی کو نکال دینا - دور کر دینا - دھکا دینا - ذلت کے ساتھ جبراً نکال دینے کو کہتے ھیں* - سورۃ صٰفّٰت میں ھے وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ دُحُوْرًا (۳۷/۸-۹) "اور ہر طرف سے ملامت کئے جاتے ھیں، دھتکارے ھوئے" - دور اور دفع کرنے کے معنوں میں، سورۃ اعراف میں ابلیس کے متعلق ھے مَذْءُوْمًا مَدْحُوْرًا (۷/۱۸) - "ذلیل - دھتکارا ھؤا - دور کیا ھؤا" -

د ح ض

دَحْضٌ - اسکے اصلی معنے پھسلنے کے ھوتے ھیں - پھر اسکا استعمال کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہٹانے، مٹانے یا باطل کر دینے، کیلئے ھونے لگا - کیونکہ دَحَضَ بِرِجْلِهٖ - اسوقت بولتے ھیں جب کوئی ذبح کئے ھوئے جانور کی طرح اپنے پاؤں زمین پر مارتا اور رگڑتا ھے - مَكَانٌ دَحْضٌ - پھسلنی جگہ کو کہتے ھیں* - ابن فارس نے اس مادے کے بنیادی معنی ھٹ جانے اور پھسلنے کے لکھے ھیں -

سورۃ کہف میں ھے لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ (۱۸/۵۶) - تا کہ وہ (باطل کے ذریعہ) حق کو اپنے مقام سے پھسلا دیں اور بیکار کر دیں - سورۃ شوری میں ھے - حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ (۴۲/۱۶) انکی دلیل اور دعویٰ (خدا کے نزدیک) بالکل بودا اور بے ثبات ھے - سورۃ صٰفّٰت میں ھے فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ (۳۷/۱۴۱)- اسکا پاؤں پھسل گیا - یا اسمیں طاقت نہ رھی - وہ کمزور و ناتوان ھو گیا

*تاج و محیط و راغب -

د ح و (ی)

دَحٰی - پھیلا دینا - بچھا دینا - وسیع کر دینا*- دَحَا الْمَطَرُ الْحَصَا- بارش نے کنکریوں کو بہا دیا - دَحَی الْاِبِلَ - اس نے اونٹوں کو ھانکا**- مَرَّ الْفَرَسُ یَدْحُوْ دَحْوًا - گھوڑا اپنے سم زمین پر لگاتا مٹی اڑاتا ھوا دوڑا*** - ھُوَ یَدْحُوْ بِالْحَجَرِ - وہ پتھر پھینکتا ہے**** - تاج نے اس معنے میں یَدْحُوْ الْحَجَرَ بِیَدِہٖ لکھا ھے -

دَحَا کے ان معانی کو پیش نظر رکھئے اور پھر قرآن کی اس آیت پر غور کیجئے جس میں اجرام سماوی کی تخلیق کے سلسلہ میں کہا گیا ھے کہ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰھَا (۷۹/۳۰) - ''اور زمین کو اس کے بعد پھینکا - اور ھموار کیا،، - سورۃ انبیاء میں کہا ھے کہ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا (۲۱/۳۰) - اجرام فلکی (ارض و سما) کا ھیولی پہلے باھمدگر پیوست تھا - پھر انہیں الگ الگ کیا گیا- اسطرح زمین کے کرہ کا جداگانہ وجود عمل میں آیا - پھر اس میں مزید تغیرات سے ھمواری پیدا کی گئی - اس حقیقت کو دَحٰھَا سے تعبیر کیا گیا ھے - یعنے اَرْضٌ (زمین) کو اس ھیولی سے یوں الگ کیا جسطرح گوپئے سے پتھر پھینکا جاتا ھے- یا جیسے بارش کنکریوں کو بہا کر دور لیجاتی ھے - یا جیسے گھوڑا گرد و غبار اڑاتا چلا جاتا ھے - ذرا سوچئے کہ آج سے قریب ڈیڑھ ھزار سال پہلے، اجرام فلکی کی تخلیق سے متعلق یہ باتیں وحی کے علاوہ اور کون بتا سکتا تھا؟ نیز بَعْدَ ذٰلِکَ اس حقیقت کا انکشاف کرتا ھے کہ ارض (زمین) کی تخلیق اس ھیولی کے بعد ھوئی - یعنے یہ دوسری اسٹیج تھی - پہلے وہ ھیولی وجود میں آیا جو باھمدگر پیوست تھا - پھر اس میں سے مختلف کرے (منجملہ ارض) تیزی سے الگ ھوئے اور اپنے اپنے ''فلک،، میں تیرنے لگے (۳۶/۴۰) -

د خ ر

دَخَرَ - یَدْخَرُ و دَخِرَ - یَدْخَرُ - چھوٹا ھونا- مطیع ھو کر جھک جانا - اَلدَّاخِرُ - جھکنے والا - دُخُوْرٌ - ذلت اور کمتری کو کہتے ھیں - اَلدَّخَرُ - تحیر کو کہتے ھیں جو عقل کی بیچارگی اور عاجزی کی دلیل ھے - اَدْخَرَہٗ - اس نے اسے ذلیل کر دیا - عاجز بنا دیا***** -

قرآن کریم میں اشیائے کائنات کے متعلق ھے کہ وہ دَاخِرُوْنَ ھیں (۱۶/۴۸) - یعنی قوانین خدا وندی کے سامنے سجدہ ریز - یہ معانی اس سے ملحقہ

*تاج **محیط ***راغب ****لسان العرب - *****تاج - راغب و محیط-

آیت نے واضح کر دئے ھیں جس میں ھے کہ لِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۱۶/۴۹) - "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ھے اللہ (کے قانون) کے سامنے سجدہ ریز ھے"۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان س - ج - د) -

انسانوں کے خود ساختہ مذھب نے، مظاھر فطرت (اشیائے کائنات) کو معبود قرار دیکر، انسان کو ان کے سامنے جھکنا سکھایا ھے۔ قرآن کریم نے یہ اعلان کر کے کہ تمام اشیائے کائنات ان قوانین خدا وندی کے سامنے جھکی ھوئی ھیں جن کا علم انسان کو دیدیا گیا ھے، دنیائے انسانیت میں کتنا عظیم انقلاب برپا کر دیا ؟

د خ ل

دَخَلَ یَدْخُلُ - اندر داخل ھوا - خَرَجَ کی ضد ھے (۱۱۰/۲) - اَدْخَلَ - داخل کیا (۴۸/۲۵) - دَاخِلَۃُ الْاَرْضِ - وہ چیزیں جو زمین کے اندر چھپی ھوئی ھوں۔ اَلدَّخْلُ - جو کچھ اپنی جائداد سے آمدنی ھو- اَلدَّخَلُ - مکر و فریب، دھوکا، نیز عقلی یا جسمانی ابتری اور فساد کو بھی کہتے ھیں*- راغب نے اندرونی ابتری اور دشمنی کے لئے بھی دَخَلٌ کا استعمال کنایۃً بتایا ھے**- سورۃ نحل میں ھے تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَکُمْ دَخَلًا بَیْنَکُمْ (۱۶/۹۲) "تم اپنی قسموں کو باھمی فساد کا موجب بنا لیتے ھو"۔ یہاں دَخَلٌ کے معنے فساد اور ابتری کے ھیں-

دَخَلَ بِالْمَرْاَۃِ کے معنی ھیں، اس نے عورت سے مباشرت کی- سورۃ نساء میں ھے مِنْ نِسَائِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِھِنَّ (۴/۲۳)- اسمیں اسکے معنے مباشرت کے ھیں - یعنی ان عورتوں کے بطن سے جن سے تم زنا شوئی کے تعلقات قائم کر چکے ھو-

سورۃ توبہ میں منافقین کی ذھنیت کا ذکر کرتے ھوئے کہا گیا ھے کہ یہ لوگ طوعًا و کرھًا تمہارے ساتھ میدان جنگ میں آ تو گئے ھیں لیکن ان کی حالت یہ ھے کہ لَوْ یَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَیْہِ وَھُمْ یَجْمَحُوْنَ (۹/۵۷) اگر انہیں کوئی پناہ گاہ یا (چھپنے کے لئے) غار یا گھسنے کے لئے کوئی مقام مل جائے تو یہ بد حواسی سے اسکی طرف بھاگ نکلیں - یہاں قرآن کریم نے مُدَّخَلًا کا لفظ استعمال کیا ھے - یہ باب

*تاج - **راغب -

افتعال سے ہے جس کے خواص میں کسی کام کو پورا زور لگا کر بہ مشقت کرنا داخل ہے ۔ اس باب کے انتخاب سے قرآن کریم نے ان کی بدحواسی اور میدان سے بھاگ نکلنے کی شدت آرزو کا نقشہ کھینچکر رکھ دیا ہے ۔ یعنی اگر ان کے سامنے کوئی چھوٹی سی چھپنے کی جگہ بھی آ جائے تو یہ اس میں گھسنے کی کوشش کرینگے خواہ اس میں کتنا ہی زور کیوں نہ لگانا پڑے۔

د خ ن

اَلدُّخَانُ ۔ دھواں ۔ دَخَنَ الْغُبَارُ دُخُوْنًا ۔ غبار بلند ہو گیا *۔ دَخَنَ الْفِتْنَةَ ۔ فتنہ کو ظاہر کرنا اور بر انگیختہ کرنا **۔ خُلُقٌ دَاخِنٌ ۔ خراب اخلاق ۔ اَلدُّخَانُ ۔ قحط سالی، خشک سالی، اور بھوک کو بھی کہتے ہیں کیونکہ بھوکے آدمی کو بھوک کی شدت کی وجہ سے اپنے اور آسمان کے درمیان دھواں سا نظر آتا ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ بھوک کو دُخَانٌ اسلئے کہتے ہیں کہ خشک سالی میں زمین سے غبار اڑ کر آسمان میں دھواں سا بن جاتا ہے ۔ اَلدُّخَانُ ۔ شر، خرابی اور ابتری کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔ یَوْمٌ دَخْنَانٌ ۔ سخت گرمی اور مصیبت کا دن ** ۔

قرآن کریم میں ہے کہ اَرْضٌ کو دو مراحل میں پیدا کیا۔ ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (۴۱/۱۱) ۔ پھر وہ دیگر اجرام فلکی کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ بالکل دھوئیں (گیس) کی حالت میں تھے ۔ سائنس کے انکشافات اس حقیقت کی شہادت دے رہے ہیں جسے قرآن کریم نے اتنا عرصہ پہلے بیان کیا تھا ۔ اجرام سماوی کے اولین ہیولٰی (Nebulae) کو ایسا ہی بتایا جاتا ہے ۔

سورۃ دخان میں ہے ۔ یَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ (۴۴/۱۰)۔ جب ساری فضا میں گرد و غبار (یا دھواں) پھیل جائیگا۔ جب مصائب و آلام عام ہو جائینگے ۔ ہر طرف فتنہ و فساد پھیل جائیگا۔ یا بھوک اور قحط کی وجہ سے آسمان دھواں ہی دھواں نظر آئیگا۔ یہ عذاب الیم ہوگا ۔ (۴۴/۱۱)

د ر أ

دَرَاَهٗ ۔ یَدْرَؤُهٗ ۔ دَرْءًا ۔ دفع کرنا ۔ رد کرنا **۔ سختی سے ہٹانا ***۔ دَرَاَ عَلَيْهِمْ دُرُوْءًا ۔ یکایک کسی کے سامنے نمودار ہو جانا ۔ جَآءَ

*تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔ **تاج ***محیط ۔

السَّیْلُ دَرْأً ۔ سیلاب کہیں دور سے آگیا، نہ معلوم کہاں سے یکایک آگیا*۔

دَرَأْتُهُ عَنِّي ۔ میں نے اسے اپنے پاس سے ہٹایا (۳/۱۶۷)۔ مُدَارَاۃٌ ۔ کے معنے مخالفت اور مدافعت کے ہوتے ہیں*۔

قرآن کریم میں ہے وَ یَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ (۲۴/۸)۔ ''یہ بات عورت سے سزا کو دفع کرسکتی ہے''۔ اس سے اس کی سزا رک سکتی ہے۔ سورۃ قصص میں ہے وَ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ (۲۸/۵۴)۔ حسنات کے ذریعہ سیّئات کا ازالہ کرتے ہیں۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے متعدد مقامات پر، متنوع اسالیب سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ تخریب کی روک تھام دوسری قسم کی تخریب سے نہیں ہوتی۔ اس کی مدافعت اس سے قوی تر اور مؤثر تر تعمیر سے ہوتی ہے۔ آپ کمزور ہیں اس لئے ہر قسم کے تخریبی جراثیم آپ پر غالب آجاتے ہیں اور آپ بیمار ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنی قوتِ مدافعت بڑھائیں۔ اس طرح آپ کی تخریب رک جائیگی اور تعمیر کا سلسلہ آگے چلیگا۔ زندگی کے ہر گوشے میں، تخریب کی مدافعت کا یہی صحیح طریق ہے۔ اسی کو ''نیکیوں کا پلڑا جھکنا'' کہتے ہیں۔

تَدَارَءُوْا فِي الْخُصُوْمَةِ ۔ کے معنے ہوتے ہیں جھگڑے میں ایک دوسرے کو دھکا دینا یا بات کو ایک دوسرے پر ڈالنا اور اسطرح باہم اختلاف کرنا*۔ یعنے ایک کا کہنا کہ یہ اس نے کیا ہے اور دوسرے کا کہنا کہ نہیں اس نے کیا ہے۔ ان معنوں میں یہ لفظ (۲/۷۲) میں آیا ہے۔ یعنی فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ۔ اهل لغت کا کہنا ہے کہ یہ اصل میں تَدَارَأْتُمْ تھا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ ایک الگ باب ہے جسے قرآن کریم نے تو استعمال کیا ہے لیکن صرفیوں نے اسے الگ شمار نہیں کیا۔

د ر ج

دَرَجَ ۔ چلنا۔ بہت آہستہ آہستہ، کھسک کھسک کر چلنا* اوپر چڑھنے والے کی طرح چلنا**۔ مَدْرَجَةُ الطَّرِیْقِ ۔ راستے کا واضح اور کھلا حصہ۔ دَرَجَ الْقَوْمُ ۔ (آہستہ آہستہ) قوم ختم ہو گئی اور اس کی نسل باقی نہ رہی*، قرآن کریم میں ہے سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ (۷/۱۸۲)۔ اس کے معنے یہی ہیں کہ ہم انہیں یوں اسطرح آہستہ آہستہ پکڑ لینگے اور ختم کر دینگے کہ انہیں معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ تباہی کہاں سے آگئی۔

* تاج ۔ **راغب ۔

دَرَجَ الشَّیْءَ - اس نے چیز کو تہ کیا اور لپیٹ لیا - اَلْمُدْرَجُ - وہ چیز جس پر کچھ لکھا ہوا ہو - دَرْجُ الْکِتَابِ - کتاب کی تہ* -

اَلدَّرَجَۃُ - سیڑھی کا ایک ڈنڈا (Step) (دَرَجَاتٌ اوپر کی طرف لے جانے والے ڈنڈے (Steps) اور دَرَکَاتٌ نیچے کی طرف لانے والے**) - راغب نے کہا ہے کہ مَنْزِلَۃٌ اور دَرَجَۃٌ تقریباً ایک ہی چیز ہے - لیکن مَنْزِلَۃٌ (اترنے کی جگہ) کو دَرَجَۃٌ اس وقت کہتے ہیں جب اس پر چڑھا جا رہا ہو - نیز دَرَجَۃٌ سے بلند منزلت بھی مراد لی جاتی ہے - اسی اعتبار سے دَرَجَاتٌ کے معنی مراتب ہیں - ایک دوسرے کے اوپر طبقات - اَلْمَدَارِجُ - پہاڑی راستوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ عام طور پر ہر موڑ کے بعد راستہ اور بلند ہو جاتا ہے - ان موڑوں کو اَلْمَدَارِجُ کہتے ہیں* -

مجاہدین کے متعلق فرمایا کہ انہیں قَاعِدِیْنَ (بیٹھے رہنے والوں) پر دَرَجَۃٌ حاصل ہے ($\frac{4}{95}$) - سورۃ توبہ میں ہے کہ مجاہدین اور مہاجرین اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ ($\frac{9}{20}$) ''اللہ کے ہاں بہت بڑا درجہ'' رکھتے ہیں-

قرآن کریم میں مردوں اور عورتوں کے متعلق ہے کہ وَلَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ($\frac{2}{228}$) - عورتوں کے لئے، از روئے معروف، ان ذمہ داریوں کے مطابق حقوق ہیں جو ان پر عائد ہوتی ہیں - یعنی جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں - بلحاظ حقوق و فرائض ان میں کسی کو کسی پر افضلیت نہیں - دونوں مساوی ہیں - لیکن اس کے بعد ہے وَلِلرِّجَالِ عَلَیْھِنَّ دَرَجَۃٌ ($\frac{2}{228}$) - مردوں کو ایک بات میں ان پر فوقیت حاصل ہے - وہ ایک بات کیا ہے؟ اس کا ذکر خود اسی آیت میں موجود ہے - طلاق کے بعد عورت کے لئے عدت کی میعاد مقرر ہے جس میں وہ کسی سے نکاح نہیں کرسکتی لیکن مرد کے لئے عدت کی کوئی قید نہیں - نیز اگر طلاق مرد کی طرف سے ہو اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو وہ عدت کے دوران میں بھی مطلقہ بیوی کو پھر سے اپنی زوجیت میں لاسکتا ہے - وَبُعُوْلَتُھُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّھِنَّ فِیْ ذٰلِکَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ($\frac{2}{228}$) - یہ ہے وہ بات جس میں مرد کو عورت کے مقابلہ میں رعایت یا دَرَجَۃٌ (ایک فضیلت) حاصل ہے - یہ نہیں کہ مرد (Men) عورتوں (Women) کے مقابلہ میں افضل (Superior) ہیں - آپ تاریخ انسانیت پر غور فرمائیے - عورتوں اور مردوں کے تعلقات کے سلسلہ میں ہرجگہ

* تاج - ** لین - *** راغب -

"عَلَيْهِنَّ" نمایاں طور پر دکھائی دیگا۔ یعنی مردوں کے حقوق ہی حقوق ہونگے اور عورت کی ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ۔ عورت کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جائیگا۔ یعنی عورت کسی بات کو مرد سے بطور استحقاق (As of Right) طلب نہیں کرسکیگی ۔ یہ انقلاب آفریں آواز آپ کو قرآن کریم کی عدالت سے بلند ہوتی سنائی دےگی کہ عورت کے بھی اسی طرح حقوق ہیں جس طرح مرد کے ۔ اور اس باب میں دونوں برابر ہیں ۔ جس قسم کے مردوں کے حقوق عورتوں پر (عَلَيْهِنَّ) اسی قسم کے عورتوں کے حقوق مردوں پر (لَهُنَّ) ۔ انسان کی عمرانی اور معاشرتی زندگی میں کتنا بڑا انقلاب ہے جو ان چار لفظوں کی رو سے پیدا کر دیا گیا ہے ۔ اور کسقدر جامع ہیں یہ چار لفظ—وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ—اس کے بعد بِالْمَعْرُوفِ کہکر اس کی بھی صراحت کر دی کہ یہ بات کسی فرد یا معاشرہ کی مرضی پر نہیں چھوڑ دی گئی ۔ اس کی (Provision) قانونِ خداوندی میں کر دی گئی ہے ۔ اسی قانون (قرآن کریم) نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ ایک بات کیا ہے جس میں مرد کو عورت کے مقابلہ میں ایک فوقیت (دَرَجَةٌ) حاصل ہے ۔

حقوق اور ذمہ داریوں کی مساوات کا یہ مطلب نہیں کہ فطرت کی طرف سے جو فرائض مرد اور عورت پر عائد ہوتے ہیں وہ بھی یکساں ہیں ۔ تقسیم عمل کے لحاظ سے فطرت نے مرد اور عورت کی تخلیق میں فرق رکھا ہے ۔ اس لئے جو فرائض عورت کے ذمے عائد کئے گئے ہیں انہیں عورت کو سرانجام دینا ہوگا اور جو مرد کے ذمے ہیں انہیں مرد کو ۔ عورت کا مختص فریضہ جسے مرد ادا نہیں کرسکتا ، اولاد کی پیدائش اور تربیت ہے ۔ اور چونکہ اس میں عورت کا بہت سا وقت صرف ہو جاتا ہے اس لئے کسبِ معاش کا فریضہ مردوں کے ذمہ عائد کیا گیا ہے ۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ (٣٤/٤) ۔ کے یہی معنی ہیں ۔ (تفصیل ان امور کی اپنے مقام پر ملیگی)

د ر ر

اَلدَّرُّ ۔ دودھ (لیکن اس میں موٹی دھار کا تصور اور کثرت کا مفہوم پایا جاتا ہے) اَلدِّرَّةُ ۔ دودھ کی فراوانی ۔ اِسْتَدَرَّ اللَّبَنُ ۔ دودھ کثیر ہوگیا۔ دَرَّتِ السَّمَاءُ بِالْمَطَرِ ۔ آسمان سے بکثرت (موسلا دھار) بارش برسی۔ ایسے موسلادھار برسنے والے بادل مِدْرَارٌ کہلائینگے*۔(٦/٦)۔ دَرَّ السِّرَاجُ ۔ چراغ خوب روشن ہو گیا ۔ كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ ۔ چمکدار روشن ستارہ* ۔

*تاج و راغب **محیط ۔

جسمیں سے نور کی ندیاں رواں ہوں (۲۴/۳۵) - یہ لفظ دُرَّۃٌ (ایک موتی) میں یائے نسبتی لگا کر بنایا گیا ھے - یعنی موتی جیسا - صاحب محیط نے کہا ھے اَلدَّرُّ کے بنیادی معنے کسی چیز کے کسی دوسری چیز سے پیدا ہونے کے ہیں* - جیسے، جانور سے دودھ - چراغ سے روشنی - تارے سے چمک - ابن فارس نے بھی کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز سے پیدا ہونا ہیں - نیز حرکت و اضطراب - اس سے دودھ کی دھار اور ستارے کی جھلملاتی روشنی کا منظر سامنے آ جاتا ھے - اللہ نے اپنے نور ہدایت (قرآن کریم) کو: کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ (۲۴/۳۵) سے تشبیہ دی ھے - یعنی ایسا ستارہ جس سے علم و بصیرت کی کرنیں، اس ندی کی طرح رواں ہوں جس میں جمود نہ ہو بلکہ پیہم حرکت ہو - یہ نور علم خداوندی سے پیدا ہو اور دنیا میں روشنی پیدا کرتا چلا جائے -

د ر س

دَرَسَ الشَّیْئُ کے معنے ہیں کوئی چیز پرانی ہوئی اور اس کا نشان مٹ گیا۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی مخفی ہونا، پست ہونا اور مٹنا ہیں۔ دَرَسَهُ الْقَوْمُ - لوگوں نے اسکے نشان کو مٹا دیا۔ طَرِیْقٌ مَدْرُوْسٌ اس راستے کو کہتے ہیں جو لوگوں کی کثرت آمد و رفت کی وجہ سے پٹ کر دب گیا ہو - اسی طرح دَرَسَ الْحِنْطَةَ کے معنے ہیں گیہوں کو گاہ دینا - گیہوں (یا دوسرے اناج) کی بالوں کو زمین پر بچھا کر اس پر بیلوں کو مسلسل اور متواتر چلاتے رہتے ہیں جس سے بھوسہ اور اناج الگ الگ ہو جاتے ہیں - اسے گاھنا کہتے ہیں - لہذا دَرَسَ کے معنے ہیں کسی چیز کو اس کثرت سے گھسنا یا ملنا کہ اسکا نشان مٹ جائے - اسی سے دَرَسَ النَّاقَةَ ھے جسکے معنے یہ ہیں کہ اونٹنی کو اس کثرت سے چلایا جائے کہ وہ مطیع و منقاد ہو جائے - اَلْمُدَارَسَةُ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کیلئے پیہم مشقت کرنا یا اسکی خبر گیری کرنا** - اور دَرَسَ الْکِتَابَ یَدْرُسُهُ، کے معنے ہیں کتاب کو اس کثرت سے بار بار پڑھنا کہ وہ ازبر ہو جائے*** -

سورۃ آل عمران میں ھے بِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹) کتاب کو اسطرح گاھنا کہ اسکے معانی نکھر اور ابھر کر (الگ ہو کر) سامنے آجائیں - اس پر مسلسل غور و فکر کرنا تا کہ الفاظ کے پردوں میں جو حقائق مستور ہیں وہ نکھر کر سامنے آ جائیں - یا جو حقائق انسانی تخیلات کے پردوں میں چھپ گئے ہیں وہ بے نقاب ہو جائیں -

---

* محیط - **تاج - ***تاج و لسان -

سورۃ انعام میں دِرَاسَةٌ کا لفظ آیا ہے (٦/١٥٧)۔ یعنی نہایت غور کے ساتھ مطالعہ کرنا۔ وَاِنْ کُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ (٦/١٥٧): ہم ان کے مطالعہ کرنے سے یقیناً بے خبر تھے۔

د ر ک

اَلدَّرَکُ۔ کسی کا پیچھا کرکے اس سے جا ملنا۔ اس تک پہنچ جانا۔ اسے جا پکڑنا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے لَاتَخَافُ دَرَکًا (٢٠/٧٧)۔ ''تجھے اسکا ڈر نہیں ہوگا کہ فرعون تجھے پیچھے سے آکر پکڑ لیگا،،۔ سورۃ شعراء میں ہے کہ حضرت موسٰیؑ کے ساتھیوں نے کہا اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (٢٦/٦١)۔ ''بس ہم پکڑے گئے،،۔ فرعون کے لشکر نے ہمارا پیچھا کرکے ہمیں پکڑ لیا۔ تَدَارَکَ۔ کسی سے جا کر مل جانا۔ اسے پا لینا۔ اس تک پہنچ جانا۔ اس میں یکے بعد دیگرے پہنچتے رہنے کا تصور ہے۔ مثلاً۔ سورۃ قلم میں ہے لَوْلَا اَنْ تَدَارَكَهٗ نِعْمَةٌ (٦٨/٤٩)۔ اگر (اسکے رب کی) نعمت اس تک نہ پہنچ جاتی۔ یعنی اس (حضرت یونسؑ) پر مختلف واقعات گزرتے رہے لیکن خدا کی نعمت مسلسل اور متواتر اس کے شامل حال رہی۔ اَلدِّرَاکُ۔ ایک چیز کا دوسری چیز کے پیچھے مسلسل آنا۔ اَلتَّدَارُکُ مِنَ الْمَطَرِ۔ بارش کا یکے بعد دیگرے مسلسل گرنا*۔ اَلدَّرْکُ و اَلدَّرَکُ۔ کسی چیز کی گہرائی کا آخری حصہ تہ۔ اَلدَّرْکُ۔ دَرَجٌ کے مقابل میں آتا ہے۔ سیڑھی کے ڈنڈوں کو اوپر چڑھنے کے لحاظ سے دَرَجٰتٌ کہتے ہیں اور نیچے اترنے کے لحاظ سے دَرَکَاتٌ*۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جنت کے مراتب و منازل کو دَرَجٰتٌ کہا ہے۔ اس کے برخلاف جہنم کے منازل کو دَرَکَاتٌ۔ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (٤/١٤٥) جہنم کی سب سے نچلی تہ۔ غور کیجئے۔ سیڑھی وہی ہوتی ہے اور اس کے ڈنڈے بھی وہی۔ جو شخص اوپر چڑھنا چاہتا ہے سیڑھی اسے بلندی تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ جو نیچے اترنا چاہتا ہے، وہی سیڑھی اسے پستی کیطرف لے جانے کا موجب ہو جاتی ہے۔ زندگی ایک ہی ہے۔ جو اسے جس انداز سے بسر کرنا چاہے یہ اسے اسی انداز کی منزل تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اَدْرَكَهٗ: اسے جا لیا، پا لیا۔ اَدْرَكْتُهٗ بِبَصَرِیْ۔ میں نے اسے نگاہ سے پا لیا۔ دیکھ لیا*۔ اسی اعتبار سے اِدْرَاکٌ اس علم کو کہتے ہیں

*تاج۔

جو محسوسات (حواس) کے ذریعہ حاصل ہو۔ سورۃ یونس میں ہے حَتّٰی اِذَا اَدْرَکَہُ الْغَرَقُ (۱۰/۹۰) "جب اسے غرق ہونے نے آ لیا"۔ یعنے جب اسنے اپنے غرق ہونے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جب اسنے محسوس کر لیا کہ وہ غرق ہو چلا ہے۔

اَدْرَکَ الشَّیْءُ۔ چیز اپنے وقت کو پہنچ گئی اور مکمل ہو گئی۔ انتہا کو پہنچی*۔ قرآن کریم میں ہے بَلِ ادّٰرَکَ عِلْمُھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ (۲۷/۶۶)۔ اہل لغت نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ ان لوگوں کا آخرت کے متعلق علم ختم ہو گیا۔ یہ اسکی حقیقت کو نہ پا سکے۔ اس سے بے خبر رہے*۔ راغب نے ان معانی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے اس کے معنے یوں بھی کئے ہیں کہ انہیں آخرت میں جا کر اس بات کا علم ہو جائیگا**۔ لیکن ہمارے نزدیک ان معانی کی رو سے آیت کا مطلب واضح نہیں ہوتا۔ اس سے کچھ بات بنتی نہیں۔ اِدّٰرَاکَ کے معنی ہیں کسی چیز کا مسلسل اور پیہم اسطرح آگے چلتے آنا کہ اس کا آخری حصہ پہلے حصے سے ملا ہؤا ہو۔ قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ آخرت کے متعلق ان لوگوں کو مسلسل اور پیہم علم پہنچتا رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ان کے بارے میں شک و شبہ میں ہیں بلکہ اندھوں کی طرح تاریکی میں۔ بَلْ ھُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْھَا۔ بَلْ ھُمْ مِّنْھَا عَمُوْنَ (۲۷/۶۶)۔

د ر ھ م

اَلدِّرْھَمُ۔ ایک چاندی کے سکہ کا نام ہے۔ اسکی جمع دَرَاھِمُ ہے۔ یہ عربی لفظ نہیں۔ بعض نے اسکی اصل فارسی قرار دی ہے اور بعض نے یونانی*۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ رومی لفظ (Drawbrug) کا معرب ہے۔ اسیطرح دینار (Dinarins) کا، اور فلس (Fails) کا۔

سورۃ یوسف میں ہے دَرَاھِمَ مَعْدُوْدَۃٍ (۱۲/۲۰)۔ (انہوں نے حضرت یوسفؑ کو) چند درھموں کے عوض (بیچ دیا)۔

د ر ی

دَرَیْتُہُ۔ میں نے اسے جان لیا۔ (۲۱/۱۰۹)۔ اَدْرَاہُ بِہٖ۔ اس کو اس کے متعلق بتلایا*۔ دِرَایَۃٌ کے معنے ہیں کسی قسم کی کوشش یا تدبیر سے معلوم کرنا یا ایسی چیز کو معلوم کرنا جس میں پہلے شک ہو۔ یہی وجہ ہے

*تاج۔ **راغب۔

کہ اس لفظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر نہیں کیا جاتا تھا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز کا قصد کرنا اور اسے طلب کرنا ہیں ۔ نیز کسی چیز میں تیزی ۔ چنانچہ مِدْرًی کنگھی کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے دندانوں میں نکیلا پن اور تیزی ہوتی ہے ۔ (اس سے دِرَایَۃٌ میں طلب و قصد کے ساتھ ، تیزی فہم کا تصور بھی ہو سکتا ہے)

راغب نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں مَآ اَدْرٰکَ (تجھے کیا خبر ہے یا تجھے کس نے آگاہ کیا) آیا ہے اسکے بعد اس چیز کی بابت بیان کر دیا گیا ہے ۔ مثلاً ($\frac{۹۷}{۲}$) ۔ لیکن جہاں جہاں مَا یُدْرِیْکَ (تجھے کیا چیز بتاتی ہے) آیا ہے وہاں اس چیز کے بعد اس کے متعلق بیان نہیں کیا گیا** ۔ بلکہ اس کے بعد لَعَلَّ (شاید) کہہ کر ، پیش نظر بات کہی گئی ہے (دیکھئے $\frac{۴۲}{۱۷}$ و $\frac{۳۳}{۶۳}$ و $\frac{۸۰}{۳}$) ۔ یعنی مَآ اَدْرٰکَ کے بعد بات کا علم یقینی طور پر دے دیا گیا ہے لیکن مَا یُدْرِیْکَ کے بعد کہا ہے کہ شاید (یا ہوسکتا ہے) کہ یہ اس طرح ہوجائے ۔ مثال کے طور پر سورۃ القدر میں پہلے کہا گیا ہے کہ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا لَیْلَۃُ الْقَدْرِ ($\frac{۹۷}{۲}$) ۔ "تجھے کیا خبر کہ لیلۃ القدر کیا ہے" اس کے بعد باقی آیات میں لیلۃ القدر کے متعلق مزید صراحت ہے ۔ اس کے برعکس سورۃ شوریٰ میں ہے ۔ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ ($\frac{۴۲}{۱۷}$) "تجھے کیا خبر؟ ہو سکتا ہے کہ انقلاب کی گھڑی قریب ہی ہو"

ان مثالوں سے مَا اَدْرٰکَ اور مَا یُدْرِیْکَ کے استعمال کا فرق سامنے آجاتا ہے ۔

د س ر

دُسُرٌ ۔ دِسَارٌ کی جمع ہے ۔ دِسَارٌ کے معنے کیل یا میخ کے ہیں ۔ دَسْرٌ کے اصلی معنے سختی اور زور سے دھکا دینے کے ہیں** ۔ دَسَرَ الدِّسَارَ ۔ کیلوں کو زور سے ٹھونکا ۔ ویسے اَلدِّسَارُ کھجور کے ریشے کی رسی کو بھی کہتے ہیں جس سے کشتی کے تختوں کو آپس میں باندھا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلدِّسَارُ کے یہ معنی خلافِ قیاس ہیں ۔ دَسْرَاءُ خود کشتی کو بھی کہتے ہیں* اس لئے کہ وہ پانی کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے ۔ قرآن کریم میں کشتیٔ حضرت نوحؑ کو ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ($\frac{۵۴}{۱۳}$) کہا گیا ہے ۔ یعنے تختوں اور میخوں سے بنی ہوئی کشتی ۔ اگر دُسُرٌ

* تاج ۔ ** راغب ۔

سے مراد میخیں ہی ہیں (ریشوں کی رسی نہیں) تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کا زمانہ وہ تھا جس میں دھات کا استعمال ہونے لگ گیا تھا اور کشتیاں محض درختوں کے تنوں کو کھوکھلا کرلینے سے نہیں بنا لیتے تھے بلکہ تختوں اور میخوں سے بنائی جاتی تھیں - لیکن کشتی حضرت نوحؑ کے متعلق قرآن کریم میں یہ بھی ہے کہ اسے خدا کی زیر نگرانی ، اس کی وحی کے مطابق بنایا گیا تھا (۱۱/۳۷) - ممکن ہے اُس زمانہ میں اس قسم کی صنعتی نادرہ کاری کا علم بھی (پہلے پہل) وحی کے ذریعے دیا جاتا ہو اور پھر اسکا استعمال عام ہو جاتا ہو -

تاریخ انسانیت سے پردے اُٹھ جانے سے نہ معلوم کیا کیا حقائق سامنے آئینگے ، اور کتنی ایسی چیزیں ، جن کے متعلق آج یہی سمجھا جاتا ہے کہ ان کی ابتدا عقلِ انسانی نے کی تھی ، وحی کی رهینِ منت متحقق ہونگی؟

د س س (د س و)

الدَّسُّ - کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے نیچے چھپا دینا یا دبا دینا۔ دفن کر دینا* - راغب نے اس کے معنوں میں مجبور کرنے کا اضافہ کیا ہے - یعنی کسی چیز کو بزور کسی چیز کے اندر داخل کر دینا** - دَسَسْتُ الشَّيْیءَ فِی التُّرَابِ - میں نے اس چیز کو مٹی میں چھپا دیا* - سورۃ نحل میں ہے کہ جب (جاهلیت عرب میں) انہیں لڑکی پیدا ہونے کی اطلاع ملتی تو وہ سوچتے کہ اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ (۱۶/۵۹) - ''یا وہ اسے زمین میں دفن کر دے '' - سورۃ شمس میں نفس انسانی کے متعلق ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹۱/۹) - ''جس نے اس کی نشو و نما کرلی وہ کامیاب و کامران ہو گیا'' اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی - وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱/۱۰) - ''جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد و ناکام رہا'' - کھیتی (اَفْلَحَ) کی نسبت سے بیج کی مثال کو سامنے لائیے - اس کی برومندی کے لئے اسے مٹی میں ملانا پڑتا ہے - اگر پانی - مٹی - ہوا - حرارت - روشنی کا تناسب صحیح صحیح ہو تو بیج کی صلاحیتیں نشو و نما پالیتی ہیں - وہ شگوفہ بنکر پھوٹتا ہے - کونپل بنکر ابھرتا ہے اور تناور درخت کی شکل میں فضا میں جھومتا ہے - لیکن اگر اسی بیج پر مٹی زیادہ مقدار میں پڑ جائے تو اس کی تمام صلاحیتیں فنا ہو جاتی ہیں - انسانی ذات میں بڑھنے پھولنے اور پھلنے کی صلاحیتیں مضمر کردی گئی ہیں - لیکن ان صلاحیتوں کی نشو و نما (موجودہ سٹیج پر) مادی دنیا کے اندر ہوتی ہے-

* تاج - ** راغب -

اگر مادی قوتوں سے مناسب کام لیا جائے تو انسانی ذات کی مضمر صلاحیتیں برومند ہو جاتی ہیں - اگر یہ مفاد پرستیوں کے بوجھ کے نیچے دب جائے تو اس کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں -

دَسّٰی اصل میں دَسَّسَ تھا - چونکہ تین سین کا یکجا جمع ہونا گراں گزرتا ہے اس لئے اسے دسّٰی بنا دیا - فراء اور زجاج نے کہا ہے کہ اس سے مراد بخل ہے - کیونکہ بخیل آدمی اپنے آپ کو چھپاتا ہے اور سخی اپنے آپ کو نمایاں اور کھلا ہؤا رکھتا ہے - یہ معنے اس اعتبار سے (ایک گونہ) صحیح ہیں کہ قرآن کریم نے خود نفسِ انسانی کی نشو و نما کا راز اَعْطٰی (دوسروں کو دینے) میں بتایا ہے اور بُخل کو اس کی تباہی کا موجب قرار دیا ہے - فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی . . . . فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی - وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰی . . . . . . فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی (۹۲/۱۰-۵) - اسی کو ربوبیت کہتے ہیں - یعنی دوسروں کی پرورش سے اپنی ذات کی نشو و نما کرنا - اور یہی قرآنی تعلیم کا مقصود و منتہی ہے -

چھپانے کے اعتبار سے اَلدَّسِیْسَۃُ اس مکر و فریب کو کہتے ہیں جو چھپا ہوا ہو - مخفی طور پر داخل ہونے والی چیز** -

اہل لغت نے دَسّٰھَا میں دَسّٰی کا مادہ د - س - و یا د - س - ی بھی بتایا ہے - ان مادوں کے بنیادی معنوں میں یکسانیت کی وجہ سے ہم نے دَسَّہ اور دَسَاہُ کو ایک ہی عنوان کے تحت دیدیا ہے -

د ع ع

اَلدَّعُّ - سختی کے ساتھ دھکا دینا - دَاعِ دَاعِ - بکریوں کو ڈانٹنے کی آواز - اَلدَّعَاعُ - آدمی کے چھوٹے بال بچے* - (جن کی وجہ سے اسے دھکے کھانے پڑتے ہیں -)

قرآن کریم میں ہے فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ (۱۰۷/۲) - "یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے" - سورۃ طور میں ہے - یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَہَنَّمَ دَعًّا (۵۲/۱۳) - "جس دن یہ آتش جہنم کی طرف نہایت سختی سے دھکیلے جائینگے" - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دھکیلنے اور اضطراب کے ہیں -

* تاج - ** محیط - *** راغب -

سورة الماعون کی مذکورہ بالا آیت (۱۰۷/۴) پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے سورۃ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ (۱۰۷/۱) ''کیا تونے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے؟''۔ کون ہے جو یہ معلوم کرنا نہ چاہیگا کہ دین کی تکذیب کون کرتا ہے؟ اس کا جواب اگلی دو آیات میں یہ دیا گیا ہے کہ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (۱۰۷/۲-۳) - ''یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا''۔ آپ نے غور کیا کہ دین اور معاشیات میں کتنا گہرا تعلق ہے؟ بلکہ صلٰوۃ اور معاش میں بھی؟ اس لئے کہ اگلی آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ ان مصلین کے لئے تباہی ہے جو صلٰوۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں - وہ نماز کے محسوس و مرئی ارکان کی تو پابندی کرتے ہیں لیکن رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح، رواں، دواں ہر ایک ضرورت مند تک پہنچنا چاہئے، بندلگا کر روک لیتے ہیں۔ (مزید تشریح متعلقہ عنوانات میں ملیگی) -

د ع و

دَعَا کے معنے کسی کو پکارنے اور بلانے کے ہیں - چنانچہ اَلتَّدْعَاءَۃُ - اس انگلی (سبابہ) کو کہتے ہیں جس سے اشارہ کر کے کسی کو بلایا جائے - اَلدَّاعِیَۃُ - جنگ میں گھوڑوں کی چیخ پکار کو کہتے ہیں - ھُوَ مِنِّیْ دَعْوَۃَ الرَّجُلِ کے معنے ہیں وہ مجھ سے اتنی دور ہے کہ وہاں تک آدمی کی آواز پہنچ جاتی ہے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی کو اپنی آواز یا بات سے اپنی طرف مائل کرنا -

دَعَاہُ اِلَی الْاَمِیْرِ کے معنے ہیں وہ اسے امیر کیطرف لے گیا - اس اعتبار سے دَاعٍ صرف بلانے والے ہی کو نہیں کہتے بلکہ اسے بھی کہتے ہیں جو کسی کو کسی دوسرے کیطرف لے جائے* - اِدِّعَاءٌ - (یَدَّعُوْنَ) کے معنے تمنا کرنے کے ہیں* - یا کسی چیز کو پکار پکار کر بلانے کے (۳۶/۵۷) -

تَدَاعَوْا عَلَیْہِ کے معنے ہیں وہ اسکے خلاف جمع ہو گئے - اور تَدَاعٰی عَلَیْہِ الْعَدُوُّ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ کے معنے ہیں دشمن نے ہر طرف سے اس پر حملہ کر دیا - تَدَاعَتِ الْحِیْطَانُ کے معنے ہیں دیواریں یکے بعد دیگرے گر پڑیں* -

---

*تاج

دَعَوْتُهٗ زَيْدًا ۔ میں نے اسکا نام زید رکھ دیا ۔ اَلدَّعِیُّ ۔ وہ لڑکا جسے متبنی بنا لیا جائے* ۔ (اسکی جمع اَدْعِیَاءٌ ہے ۴/۳۳)۔

اَلدَّاعِیَۃُ ۔ اس دودھ کو کہتے ہیں جسے تھنوں میں اسلئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اسکے سہارے باقی ماندہ دودھ نکالا جا سکے* ۔ نیز سبب یا باعث۔ اَلدَّوَاعِیْ ۔ ان چیزوں کو کہتے ہیں جو انسان کے جذبات کو ابھار دیں اور اسکے اندر ہیجان پیدا کر دیں** ۔ (ان معانی کو اچھی طرح پیش نظر رکھنا چاہئے کیونکہ ان سے دُعَاءٌ کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے)۔

وَادْعُوْا شُہَدَاءَکُمْ (۲/۲۳) کے معنے ہیں تم اپنے مددگاروں کو بلاؤ ۔ سورۃ کہف میں نَادَیٰ اور دَعَا دونوں مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں (۱۸/۵۲)۔ سورۃ اعراف میں دَعَا کے مقابل میں صَمَتَ کا لفظ آیا ہے (۷/۱۹۳) جسکے معنے چپ رہنے کے ہیں۔ لہذا دَعَا کے معنی پکارنے یا بلانے کے ہوئے ۔

سورۃ بقرہ میں ہے فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ (۲/۶۱) ۔ جسکے معنے ہیں ہمارے لئے اپنے پروردگار کو پکار ۔ اَلدَّعْوٰی ۔ پکار ۔ مطالبہ ۔ تقاضا ۔ (۱۰/۱۰)۔

اب ہمارے سامنے دُعَا کا وہ گوشہ آتا ہے جو مذہب اور فلسفہ کی دنیا میں سب سے مشکل مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے سے طرح طرح کے شکوک اور خدشات لا حق ہو جاتے ہیں۔ یہ گوشہ ہے "خدا سے دعا مانگنے" کا۔ ان شکوک و خدشات کو سمجھنے کے لئے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ایک مثال پر غور کیجئے ۔ کسی مقدمہ میں زید مدعی ہے اور بکر مدعا علیہ ۔ زید خدا سے دعا کرتا ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے ۔ اس سے حسب ذیل سوالات سامنے آتے ہیں ۔

(الف) ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کے تمام معاملات کے فیصلے خدا کے ہاں پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں ۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیز بھی پہلے سے طے شدہ ہوگی کہ اس مقدمہ میں زید کو شکست ہوگی یا فتح ۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ پہلے سے طے شدہ تھا کہ زید کو شکست ہوگی تو کیا زید کے دعا کرنے سے خدا اپنے پہلے فیصلے کو بدل دیگا اور زید مقدمہ ہارنے کے بجائے جیت جائیگا ؟ اگر ایسا ہو تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ خدا اپنے فیصلوں کو انسانوں کی مرضی کے مطابق بدلتا

*تاج ۔ **محیط ۔

رہتا ہے - یعنی خدا، انسانوں کی مرضی کے تابع چلتا ہے - خدا کے متعلق یہ تصور کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا -

(ب) فرض کیجئے کہ زید اپنے دعویٰ میں جھوٹا تھا - اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کے دعا کرنے سے، خدا مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں کر دیگا؟ اگر ایسا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا نے جھوٹے کے حق میں فیصلہ کر دیا اور سچے کو اس کے حق سے محروم کر دیا - خدا کے متعلق یہ تصور بھی غلط ہے -

(ج) فرض کیجئے کہ زید اپنے دعویٰ میں سچا ہے - اگر زید خدا سے دعا نہ کرے تو کیا مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ہوگا یا نہیں؟ اگر دعا کے بغیر فیصلہ اس کے حق میں نہیں ہو سکتا تو اس کا مطلب یہ ہؤا کہ خدا از خود سچے کے حق میں فیصلہ نہیں دیتا - سچے کو اپنے حق میں فیصلہ لینے کے لئے خدا سے منت خوشامد کرنی پڑتی ہے - خدا کے متعلق یہ تصور بھی غلط ہے -

اور اگر خدا سچے کے حق ھی میں فیصلہ کرتا ہے خواہ وہ دعا کرے یا نہ کرے، تو زید کے دعا کرنے یا نہ کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑیگا - خدا کو بہرحال اس کے حق میں فیصلہ کرنا تھا - اس صورت میں دعا ایک بیکار عمل ہؤا -

(د) یہ ظاہر ہے کہ مقدمہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انسان کو کوشش کرنی پڑتی ہے - ناجائز نہ سہی، جائز ھی سہی - کوشش تو ضرور کرنی پڑتی ہے - اب سوال یہ ہے کہ اگر زید صرف دعا کرے لیکن کوشش نہ کرے تو کیا وہ مقدمہ جیت جائیگا؟ اگر وہ صرف دعا سے مقدمہ جیت جائے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے عمل (کوشش کرنے) پر جو اسقدر زور دیا ہے تو وہ سب بیکار ہوگا -

اور اگر کوشش کے بغیر مقدمہ نہیں جیتا جا سکتا تو پھر دعا کا فائدہ کیا ہؤا؟

(س) اگر زید اپنی جگہ خدا سے دعا کرے اور بکر اپنی جگہ - تو پھر مقدمہ کا فیصلہ کس کے حق میں ہوگا؟ خدا کس کی دعا قبول کریگا اور کس کی رد کریگا؟

یہ اور اس قسم کے اور بہت سے شکوک و خدشات ہیں جو دعا کے اس مفہوم سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے حل کرنے کے لئے مذہب* اور فلسفہ

---

*مذہب سے مراد انسانوں کا خود ساختہ مسلک ہے - دین خدا کی طرف سے ملتا ہے -

صدیوں سے (ناکام) کوششوں میں مصروف ہے۔ قرآن کریم نے بتایا کہ دعا کا یہ تصور غلط ہے اور اس دور کا پیدا کردہ جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا اور کائنات میں قانون اسباب (Law of Causality) کے تصور سے نا آشنا تھا۔ اس نے بتایا کہ۔

(۱) کائنات میں ہر شے خدا کے لگے بندھے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اور خدا اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲)۔ ''تو قانون خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں پائیگا''۔

(۲) انسانی دنیا میں بھی خدا ہی کا قانون کارفرما ہے۔ جو شخص اس قانون کے مطابق جسقدر کوشش کریگا اسی قدر وہ کامیاب ہوگا۔ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ (۵۳/۳۹-۴۰) ''انسان کے لئے اس کے سوا کچھ نہیں جس کی وہ کوشش کرے۔ اور اسکی کوشش کا نتیجہ بلاتاخیر سامنے آ جائیگا''۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہدیا کہ جو شخص خدا کے قانون کے مطابق کوشش نہیں کرتا اور محض دعا مانگنے سے سمجھتا ہے کہ مقصود حاصل ہو جائیگا، اس کا نہ تو خدا کے متعلق تصور صحیح ہے اور نہ ہی اسے کبھی کامیابی ہو سکتی ہے۔ سورۃ رعد میں ہے لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ۔ انسان کی جو دعوت تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ جو حق پر مبنی قرار پا سکتی ہے۔ وہ وہی دعوت ہے جو خدا کے لئے (یعنی اس کے قانون کے مطابق) ہو۔ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ۔ اور جو لوگ خدا کے علاوہ اوروں سے اپنی طلب وابستہ کرتے ہیں۔ یعنی چاہتے ہیں کہ خدا کے قانون کو چھوڑ کر، اپنی تو ہم پرستیوں کے زور پر کامیاب ہو جائیں، تو وہ غلطی پر ہیں۔ ان کی یہ خود ساختہ قوتیں ان کی کوئی مانگ پوری نہیں کر سکینگی۔ ایسے لوگوں کی مثال كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ۔ ہے، یعنی جیسے کوئی شخص (دریا کے کنارے) اپنے دونوں ہاتھ پانی کیطرف پھیلا کر بیٹھا رہے (اور دعا کرتا رہے کہ پانی اس کے منہ میں آ جائے تو) اسطرح پانی اس کے منہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ لہذا، وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ (۱۳/۱۴)۔ جو لوگ خدا کے قانون سے انکار کرتے ہیں ان کی دعا کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ

مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا ... (۱۳/۱۵) ۔ کائنات کی ہر شے، طوعاً و کرھاً، خدا کے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے ۔ سو جب ساری کائنات کا سلسلہ خدا کے قانون کے مطابق چل رہا ہے، تو انسان اس سے مستثنٰے کسطرح ہو سکتا ہے؟

لہذا، قرآن کریم کی رو سے ''خدا سے دعا،، کے معنی ہیں خدا کے قانون سے مدد چاہنا ۔ یعنی اس کی اطاعت سے اپنی کوششوں میں صحیح نتائج مرتب کرانا۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح کر دیا ہے۔ مثلاً سورۃ المؤمن میں ہے وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۔ تمہارا نشو و نما دینے والا کہتا ہے کہ تم مجھے پکارو ۔ میں تمہاری پکار کا جواب دونگا (اس کا مفہوم ذرا آگے چل کر بیان کیا جائیگا) ۔ اس کے بعد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ (۴۰/۶۰) ۔ یقیناً جو لوگ میری محکومیت اختیار کرنے سے سر کشی برتتے ہیں، وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوتے ہیں ۔ آیت کے دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ''خدا کو پکارنے،، سے مراد اس کے احکام و قوانین کی محکومیت اختیار کرنا ہے ۔ اور خدا کیطرف سے اس پکار کا جواب ملنے سے مراد انسان کی سعی و کاوش کا ثمر بار ہونا ۔ دوسرے مقام پر اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۳۲/۱۵)۔ ہمارے احکام پر ایمان لانے والے وہی لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے وہ احکام پیش کئے جاتے ہیں تو وہ سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اپنے نشو و نما دینے والے (کے پروگرام کو) در خور حمد و ستائش بنانے کے لئے سر گرم عمل رہتے ہیں ۔ اور وہ ان احکام سے سر تابی نہیں کرتے ۔ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳۲/۱۵-۱۶) ۔ وہ ان احکام کی تعمیل میں اسطرح سر گرم عمل رہتے ہیں کہ نیند تک کی بھی پرواہ نہیں کرتے ۔ راتوں کو بھی جا گتے ہیں۔ اور اسطرح اپنے رب کو دفع مضرت اور جلب منفعت کے لئے پکارتے ہیں ۔ کیونکہ انہیں علم ہوتا ہے کہ ان احکام کی تعمیل سے کیسے عمدہ نتائج مرتب ہونگے اور ان کی خلاف ورزی سے کسقدر تباہیاں آئیں گی ، جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہوتا ہے وہ اسے (نوع انسانی کی بہبود کے لئے) کھلا رکھتے ہیں۔ سورۃ اَلْمُؤمِن میں ہے فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ .... (۴۰/۶۵)

خدا کو پکارو تو اسطرح کہ فرمان پذیری کے ہر گوشے کو خالصۃً اُسی کے لئے وقف اور مختص کردو۔ سورۃ شوریٰ میں ہے وَ یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ...... (۴۲/۲۶)۔ ”وہ ان کی پکار کا جواب دیتا ہے جو اس کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے مطابق صلاحیت بخش کام کرتے ہیں“۔ یہاں سے بھی واضح ہے کہ ”پکار اور اس کے جواب“ سے مفہوم کیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَۃً اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (۷/۵۵)۔ ”تم اپنے نشو و نما دینے والے کو دل کے پورے جھکاؤ اور سکون سے پکارو۔ اس طرح کہ یہ پکار تمہارے دل کی گہرائیوں سے نکلے۔ یاد رکھو! جو لوگ اس کے قانون سے سرکشی برتتے ہیں اور حد سے تجاوز کر جاتے ہیں، وہ انہیں کبھی پسند نہیں کرتا“۔ اس سے بھی واضح ہے کہ ”خدا کو پکارنے“ سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اس سے اگلی آیت نے اسی مفہوم کی تشریح کردی ہے جہاں کہا ہے وَ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا۔ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ (۷/۵۶-۵۷)۔ یعنی تم معاشرہ میں ہمواری پیدا ہو جانے کے بعد نا ہمواریاں مت پیدا کرو۔ اور خدا کو دفع مضرت اور جلب منفعت کے لئے پکارو۔ یاد رکھو! جو لوگ حسن کارانہ انداز سے معاشرہ کا توازن قائم رکھتے ہیں، خدا کی رحمت ان سے بہت قریب ہوتی ہے“۔

یہاں ”خدا کی رحمت“ کو قریب کہا ہے۔ سورۃ بقرہ میں خود خدا کے متعلق کہا ہے کہ وہ قریب ہے۔ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ ”اور جب میرے بندے تجھ سے میری بابت پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں (کہیں دور نہیں ہوں۔ ان سے بہت) قریب ہوں۔ (ان کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب۔ ۵۰/۱۶)۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے“۔ اس کے بعد ہے۔ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ (۲/۱۸۶) ”پس انہیں چاہئیے کہ میری فرمانبرداری کریں اور میرے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں۔ تاکہ یہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کا راستہ پالیں“۔

اس سے واضح ہے کہ خدا کو پکارنے (دعا) سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اور دعا کا جواب دینے سے مفہوم اُس اطاعت پذیری کے نتائج مرتب ہونا۔

سورۃ نمل میں پہلے کائناتی نظام کے مختلف گوشوں کیطرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہاں کسطرح ہر بات خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے بعد، اس جماعت مؤمنین کو مخاطب کیا گیا ہے جو اپنے نظام کے ابتدائی مراحل میں سخت مصیبتوں اور پریشانیوں سے گذر رہی تھی اور قدم قدم پر پکار رہی تھی کہ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ (۲/۲۱۴) - خدا کی نصرت کب آئیگی ؟ ان سے کہا کہ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ . . . (۲۷/۶۲) (خدا کے علاوہ) وہ کون ہے جو (تمہارے) قلب مضطر کی پکار کا جواب دیتا ہے اور تمہاری پریشانیوں اور مشکلات کو دور کر کے تمہیں استخلاف فی الارض عطا کر سکتا ہے؟ لیکن یہ استخلاف فی الارض، تمہارے اعمال کے نتیجہ میں مل سکیگا (۲۴/۵۵) - اس لئے تم گھبراؤ نہیں - خدا کے قانون کے مطابق عمل کرتے جاؤ- وہ تمہاری بیکسی اور بے چارگی کو غلبہ و تسلط سے تبدیل کردیگا- اگر تم اس راستے پر چلتے رہے تو ہماری کائناتی قوتیں، ان مخالفین کی ضرر رسانیوں سے تمہاری حفاظت طلب کرتی رہینگی (۳/۱۲۴)- جماعت مومنین تو ایکطرف، خود حضرات انبیاء کرامؑ سے بھی یہی کہا گیا- مثلاً سورۃ یونس میں حضرت موسیٰؑ کے قصہ کو دیکھئے - حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ فرعون کا مقابلہ کرنے کے لئے دعائیں مانگتے ہیں - اسکے جواب میں ان سے کہا جاتا ہے - قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا، فَاسْتَقِیْمَا (۱۰/۸۹)- تم دونوں کی ''دعاء قبول ہوگئی ہے''۔ بس اب تم اپنے پروگرام پر پوری پوری استقامت سے کاربند رہو- ظاہر ہے کہ اگر دعاء قبول ہو جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ جو کچھ تم نے مانگا ہے وہ تمہیں دیدیا گیا ہے (یا وہ تمہیں مل جائیگا) تو اسکے بعد اسکے لئے کسی کوشش کی ضرورت نہ تھی - لیکن یہاں کہا یہ گیا ہے کہ تمہاری دعاء قبول ہو گئی ہے - لہٰذا اب تم نہایت استقامت سے اس پروگرام پر کاربند رہو- اس سے واضح ہے کہ جو کچھ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے کہا گیا تھا وہ فقط اتنا ہی تھا کہ تمہاری یہ آرزوئیں ہمارے قانون کے مطابق ہیں لہٰذا تم ان کے حصول میں نہایت مستقل مزاجی سے کوشش کرو- تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے -

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے خدا سے دعا کرنے کے معنی اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کرنا ہیں - اسی ''دعا'' کا حکم رسول اللہؐ کو دیا گیا تھا- قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِکُ بِہٖٓ اَحَدًا (۷۲/۲۰) - ان سے کہدو کہ میں صرف اپنے رب کو پکارتا

ہوں اور اس میں کسی اور کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرتا ۔ یعنی اس کی حاکمیت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا (۱۸/۲۶) ۔

''دعا،، کے اس قرآنی مفہوم کے بعد ان شکوک و خدشات کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ۔

اب ذرا آگے بڑھئے ۔ جن باتوں کو ہم اپنی اصطلاح میں ''دعا،، کہتے ہیں، قرآن کریم میں وہ بھی ہیں ۔ مثلاً رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا ۔ وَ انْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ (۳/۱۴۶) ۔ '' اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو ہماری کوتاہیوں ، اور معاملات میں حد سے بڑھ جانے کے مضر نتائج سے ہماری حفاظت کر ۔ ہمارے قدموں کو استقامت عطا فرما اور ہمیں قوم کفار پر کامیابی عطا کر دے،، ۔ یعنی وہ دعائیں جن میں انسان اپنی کسی آرزو کے بر آنے کی درخواست کرتا ہے ۔ یہ دعائیں در حقیقت انسان کی آرزو کی شدت کا مظاہرہ ہوتی ہیں ۔ اس شدت آرزو سے انسان کی اپنی ذات میں ایسا تغیر واقع ہوتا ہے جس سے اسکی خفیہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور مضمر صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں ۔ انکی وجہ سے اس کا عزم راسخ اور ہمت بلند ہو جاتی ہے اور وہ موانعات کا مقابلہ کرنے اور شدائد پر غلبہ پا لینے کے قابل ہو جاتا ہے ۔ (اَلدَّاعِیَۃُ اور اَلدَّوَاعِیْ کے جو معنی شروع میں دئے گئے ہیں ۔ ان پر غور کیجئے) یعنی سب سے پہلے تو یہ کہ انسان وہی کچھ چاہے جو قانون خدا وندی کے مطابق ہو ۔ اور پھر اس مقصد کے حصول کے لئے آرزو میں شدت پیدا کرے ۔ اس سے اس کے اندر ایسی انقلابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتائج حیرت انگیز ہوتے ہیں (واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ تمہاری ہر آرزو ، قانون خداوندی کے مطابق ہونی چاہئے ، ورنہ تم وہ کچھ طلب کرنے لگ جاؤ گے جو تمہارے لئے در حقیقت مضر ہو گا ۔ ۱۷/۱۱) ۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ۔

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

کہا جا سکتا ہے کہ اگر انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے اپنے اندر ویسے ہی شدت آرزو پیدا کر لے تو اس سے بھی اسکی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں ۔ پھر اس میں اور خدا سے دعاء کرنے میں کیا فرق ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ اسطرح بھی انسان کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں لیکن مقصد

صرف قوتوں کی بیداری نہیں ۔ سب سے پہلی چیز خود مقصد کا تعین ہے ۔ یعنے وہ مقصد ہے کیا جسکے حصول کیلئے آرزو کی جا رہی ہے ۔ اور وہ ہے کیسا ؟ ۔ پھر اسکے حصول کیلئے طریقے کیا کیا اختیار کئے جائینگے ۔ اور اس تمام سعی و کاوش کے ماحصل کو کس مصرف میں لایا جائیگا ۔ ایک مرد مومن (قرآنی انسان) ان تمام امور کا فیصلہ خدا کے احکام کی روشنی میں کرتا ہے اسلئے وہ، پہلے قدم سے آخری قدم تک، خدا کو اپنے سامنے رکھتا ہے ۔ اسکی طلب و آرزو کی شدت بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہوتی ہے ۔ اسلئے وہ اسکے لئے بھی خدا ہی کو پکارتا ہے ۔ خدا کی طرف سے سب کچھ اسکے قانون کے مطابق ہوتا ہے ۔ حتّٰیکہ دعاء کے نتیجہ میں انسان کی خفیہ قوتوں کی بیداری بھی اسکے قانون ہی کے مطابق ہوتی ہے ۔ علاوہ بریں، ایک اور بھی نقطہ ہے جس کا سمجھ لینا ضروری ہے ۔ خدا نے انسانی ذات میں ایسی صلاحیت دے رکھی ہے کہ وہ مناسب نشو و نما سے اپنے اندر (علٰی حید بشریت) ان صفات کو اجاگر کرتی جائے جنہیں (لا محدود طور پر) صفات خداوندی یا الاسماء الحسنٰی کہا جاتا ہے ۔ اس نقطہ نگاہ سے خدا کی ذات (یعنی ان صفات حسنٰی کی حامل ذات) انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے معیار (Standard) بن جاتی ہے ۔ انسان کا اپنی شدت آرزو میں خدا کو پکارنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر ان صفات خداوندی کو اجاگر کرنا چاہتا ہے جن سے مقصد پیش نظر میں کامیابی ہو جائے ۔ یہ ہے فرق ''خدا سے دعا مانگنے،، اور اپنے طور پر شدت آرزو پیدا کرنے میں ۔

(دعا کی اجابت کے لئے عنوان ج و ب بھی دیکھئے)

اب رہیں حضرات انبیاء کرامؑ کی وہ ذاتی دعائیں جن کا ذکر قرآن میں ہے ۔ سو نبوت کا معاملہ عام انسانی معاملات سے بالکل الگ ہے ۔ اسکے متعلق ہم نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں ۔ ہم ان کے لائے ہوئے پیغام کو سمجھتے ہیں اور اسی کی اطاعت ہمارا فریضہ ہے ۔ باقی رہا ان کی دعاؤں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جسطرح خدا ان کی دعا کے جواب میں ان سے ہم کلام ہوتا تھا، اسی طرح دیگر (غیر از انبیاء) انسانوں سے بھی ہم کلام ہو سکتا ہے ۔ تو یہ چیز وحی اور نبوت کے قرآنی تصور کے یکسر خلاف ہے ۔ خدا، حضرات انبیاء کرامؑ کے علاوہ کسی انسان سے ہمکلام نہیں ہوتا ۔ اور نبی اکرم ؐ کے بعد ایسا سمجھنا ختم نبوت کی مہر کو توڑنا ہے ۔

نہ ہی یہ عقیدہ صحیح ہے کہ خدا ہماری دعا کو نہیں سنتا اس لئے ''خدا کے کسی مقرب،، سے درخواست کی جائے کہ وہ ہمارے لئے خدا سے

دعا کرے۔ قرآن کی رو سے خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہو سکتی ۔ ایسا سمجھنا شرک ہے ۔ ''خدا تک پہنچنے،، یا اس تک اپنی آواز پہنچانے کے لئے کسی ذریعے اور واسطے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ ہر انسان، اس کے قوانین کے اتباع سے ''اس تک پہنچ سکتا ہے،، اور اپنی آواز اس تک پہنچا سکتا ہے ۔ (وسیلہ کے قرآنی مفہوم کے لئے متعلقہ عنوان دیکھئے) اور اس کے قوانین کا اتباع، قرآنی معاشرہ کے اندر رہ کر ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جو دعائیں مومنین کے لئے بتائی ہیں وہ عام طور پر اجتماعی ہیں ۔ مثلاً ۱/۵-۷ و ۲/۲۰۱ و ۲/۲۸۶ و ۳/۸ و ۳/۱۴۶ و ۳/۱۹۲)۔

سورۃ بقرہ کی جو آیت اوپر درج کی گئی ہے ۔ یعنی وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ۔ (۲/۱۸۶) ۔ ''جب تجھ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو (ان سے کہدو کہ) میں قریب ہوں،، ۔ یا نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۔ (۵۰/۱۶) ''میں انسان سے اسکی رگ جان سے بھی قریب ہوں،،۔ تو ان میں ضمناً خدا کے موجود فی الکائنات (Immanence) اور خارج از کائنات (Transcendence) کی طرف بھی اشارہ موجود ہے ۔ وہ ہر انسان سے، اسکی رگ جان سے بھی قریب ہے ۔ تو اس سے ظاہر ہے کہ خدا کائنات میں ہر جگہ موجود ہے ۔ لیکن اسطرح موجود نہیں جسطرح کوئی چیز کسی خاص مقام میں مقید ہوتی ہے ۔ چونکہ ہمارے حواس کسی ایسی شے کا تصور نہیں کر سکتے جو فضا (Space) کے اندر مقید نہ ہو اس لئے ہم اسے سمجھ ہی نہیں سکتے کہ خدا، اس کائنات میں، بغیر جگہ (Space) گھیرے کسطرح موجود ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہدیا ہے کہ لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ ۔ وَهُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ (۶/۱۰۴) ۔ انسانی نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں ۔ لیکن وہ انسانی نگاہوں کا ادراک و احاطہ کئے ہوئے ہے ۔ لیکن اس کے قانون کا ہم ادراک بھی کر سکتے ہیں اور نتائج سے اس کا مشاہدہ بھی ہو سکتا ہے ۔ اس لئے قرآن کریم نے ہمارا تعلق خدا کے قانون سے بتایا ہے ۔ خود خدا کی ذات سے نہیں ۔ دُعَا (پکارنے) کا تعلق بھی خدا کے قانون سے ہے۔ ہم اس کے قانون کو آواز دیتے ہیں اور جب ہم اس کے مطابق عمل کرتے ہیں تو وہ ان اعمال کے مشہود نتائج کو سامنے لا کر ہماری پکار کا جواب دیتا ہے ۔

باقی رہا خدا کا علم، سو جس چیز کو ہم ''ماضی ۔ حال ۔ مستقبل،، کہتے ہیں ، علم خداوندی کی رو سے اسکی کوئی حقیقت نہیں ۔ خدا کے سامنے ماضی، حال اور مستقبل سب بیک وقت (Eternal now کی شکل میں) موجود

ہوتے ہیں - یعنی ایسے ہونے والے واقعات کا اسطرح علم ہوتا ہے جیسے وہ سامنے اسوقت ہو رہے ہوں۔ لیکن اس چیز کا ہمارے اس اختیار و ارادے پر کچھ اثر نہیں پڑتا جو ہمیں خدا نے عطا کیا ہے - نہ ہی اس بات پر کوئی اثر پڑتا ہے کہ ہمارے لئے جو کچھ ہوتا ہے وہ ہمارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے - سب کچھ خدا کے سامنے ہو رہا ہوتا ہے (اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے) لیکن وہ ہمارے اختیار و ارادہ کو سلب نہیں کرتا - ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں - اور جو کچھ کرتے ہیں اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ اگر ہم خدا کے قانون کے مطابق کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ خوشگوار ہوتا ہے - اس کے خلاف کرتے ہیں تو نقصان اٹھاتے ہیں - کسی میں اس کی طاقت نہیں کہ خدا کے قانون کے خلاف کرے اور اس کا نتیجہ خوشگوار مرتب کرے۔ خدا کے قانون کے مطابق قدم اٹھانا، خدا کو پکارنا یا دعا کرنا ہے - اور اس کا خوشگوار نتیجہ مل جانا، دعا کا قبول ہو جانا ہے۔

د ف أ

اَلدِّفْءُ - حرارت اور گرمی۔ نیز وہ چیز جو گرمی پہنچائے - اَدْفَاَہٗ - اس نے اسے ایسا کپڑا پہنا دیا جو اسے گرم کردے۔ اَلدِّفَاءُ - ہر وہ چیز جو گرمی پہنچائے - مثلاً اون وغیرہ* - قرآن کریم میں مویشیوں کے متعلق ہے لَکُمْ فِیْھَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ (۱۶/۵) - یعنی ان میں تمہارے لئے (اون وغیرہ سے) گرمی یا گرمی بہم پہنچانے والا سامان اور دیگر فائدے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ دِفْءٌ - اونٹوں کے بچوں، ان کے دودھ اور ان کی دیگر منفعت بخش اشیاء کے لئے بولا جاتا ہے -

د ف ع

دَفْعٌ - کسی چیز کو قوت سے دور کردینا - ہٹا دینا** - (۲/۲۵۱) صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلدَّفْعُ کے معنے ہیں کسی بات کو وارد ہونے سے پہلے ہی دور کر دینا اور اَلرَّفْعُ کے معنے ہیں، اسے وارد ہو جانے کے بعد دور کرنا***۔ بصائر میں ہے کہ جب دَفْعٌ کے بعد اِلٰی آئے تو اس کے معنے سونپنے یا ادا کر دینے کے ہونگے۔ جیسے۔ فَادْفَعُوْٓا اِلَیْھِمْ اَمْوَالَھُمْ (۴/۶) میں یعنی۔ ''ان کے مال انہیں سونپ دو'' - اورجب اس کے بعد عَنْ آئے تو اس کے معنے حمایت کرنے یا حفاظت کرنے کے ہوتے ہیں**- جیسے

*تاج و راغب - **تاج - ***محیط -

اِنَّ اللّٰہَ یُدَافِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۲۲/۳۸)۔ ''یقیناً اللہ (کا قانون) ان کی حفاظت کرتا ہے جو اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں''۔ اَلْمُدَافَعَةُ ۔ ایک دوسرے کو ہٹانا اور دھکے دینا*۔ دَافِعٌ ۔ ہٹانے والا (۵۲/۸)۔

د ف ق

دَفَقَ الْمَاءَ یَدْفُقُ ۔ اس نے پانی گرا دیا بہا دیا۔ دَفَقَ الْکُوْزَ ۔ پیالہ کے پانی کو یکبارگی گرا کر منتشر کردیا۔ دَفَقَ الْمَاءُ ۔ پانی یکبارگی ابل پڑا۔ سَیْلٌ دُفَاقٌ ۔ وہ سیلاب جس کا پانی وادی سے اوپر اچھل جائے۔ اَلدِّفَقُّ ۔ تیز رفتار اونٹ۔ اَلدِّفِقّٰی ۔ ایک ایسی تیز رفتار جس میں جانور اچھل کر چلے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو آگے کی طرف دھکا دینا۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ہے خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ (۸۶/۶)۔ ''اسے پیدا کیا گیا ہے تیزی سے اچھل کر گرنے والے پانی (مادہ تولید) سے''۔ (یہ مَاءٌ مَدْفُوْقٌ کے معنوں میں آیا ہے)۔

د ک ک

اَلدَّکُّ ۔ کوٹنا۔ توڑنا (دیوار یا پہاڑ کو) منہدم کر دینا۔ دراصل یہ کسی چیز کو توڑ کوٹ کر زمین کے برابر کر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے***

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پست ہوجانے اور بچھ جانے کے ہیں۔ اَلدَّکَّةُ ۔ اَلدَّکُّ ۔ ہموار جگہ۔ زمین کے نشیب و فراز (اونچائی نیچائی) کو ہموار کر دینا***۔ اِذَا دُکَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّا (۸۹/۲۱)۔ ''جب زمین کے نشیب و فراز کو مٹا کر ہمواری پیدا کر دی جائے گی''۔ جب معاشی**** ہمواریاں پیدا کر دی جائینگی اور اونچ نیچ سب مٹا دی جائینگی۔ فَدُکَّتَا دَکَّةً وَّاحِدَةً (۶۹/۱۴)۔ ایک ہی مرتبہ ہموار کر دی جائیگی۔ جَعَلَهٗ دَکًّا (۷/۱۴۳)۔ اسے ہموار کر دیا۔ نشیب و فراز مٹادیا۔ جَعَلَهٗ دَکَّآءَ (۱۸/۹۸) اسے توڑ کر ہموار کردے گا۔ (یہاں اَرْضٌ محذوف ہے جس کے لئے دَکَّآءُ مؤنث آیا ہے)۔ تاج نے لکھا ہے کہ اَلدَّکَّاءُ مٹی کے ٹیلے کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے جَعَلَهٗ دَکَّآءَ کے معنی یہ ہونگے کہ وہ دیوار مسمار ہو کر ٹیلہ سا بن جائیگی۔ اَرْضٌ دَکَّاءُ ۔ ہموار زمین*****۔

اَلدُّکَّانُ ۔ ایسی جگہ جسکا اوپر کا حصہ بیٹھنے کے لئے ہموار کرلیا جائے***۔

---

*تاج۔ **تاج و راغب و محیط۔ ***تاج و محیط۔ ****دیکھئے عنوان ارض۔
*****راغب۔

د ل ک

دَلَکَہٗ یَدلُکُہٗ دَلکاً ۔ کسی چیز کو ہاتھ سے ملنا اور رگڑنا ۔ دَلَکَتِ الشَّمْسُ دُلُوْکاً ۔ آفتاب کا غروب ہونا، کیونکہ اسکی طرف دیکھنے والا اپنی آنکھوں کو ملنے لگتا ہے* ۔ (لیکن ہمارے نزدیک یہ توجیہ کمزور سی ہے) دَلَکَتْ دُلُوْکاً ۔ آفتاب کا زرد ہو جانا اور زوال یا غروب کی طرف مائل ہو جانا ۔ آفتاب کا ظہر کے وقت وسط آسمان سے نیچے کی طرف ڈھل جانا** ۔ ازہری نے کہا ہے کہ اسکے یہی معنے صحیح ہیں کیونکہ کلام عرب میں دُلُوک کے معنے زوال کے آتے ہیں ۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنے کسی چیز کا دوسری چیز سے ہٹ جانا (زوال) بتائے ہیں ۔ لیکن اس نے کہا ہے کہ دُلُوْک میں کسی چیز کا نرمی اور آسانی سے ہٹ جانا پایا جاتا ہے ۔ ملنے رگڑنے کے لئے بھی یہ لفظ اسی جہت سے استعمال ہوتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں ہاتھ ایک جگہ نہیں ٹھہرتا ۔

آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے ہیں ۔ اس لئے زوال بھی دلوک ہے اور غروب بھی دلوک ہے ۔ جب آفتاب نصف النہار میں زوال کر جاتا (ڈھل جاتا) ہے تو اسے دَالِکَۃٌ کہتے ہیں ۔ ایسے ہی جب وہ غروب ہو جائے تب بھی اسے دَالِکَۃٌ کہتے ہیں، **کیونکہ دونوں حالتوں میں اسے زوال ہوتا ہے ۔ لیکن نوادر الاعراب میں ہے کہ اسکے معنی آفتاب کے بلند اور اونچا ہونے کے آتے ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ دال (د) جہاں بھی لام (ل) کے ساتھ آئیگا تو وہ حرکت کرنے، آنے جانے، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ زوال پذیر ہونے، پر دلالت کریگا ۔ چنانچہ دَلَکَ الثَّوْبَ کے معنے ہیں کپڑے کو دھونے کیلئے ملا ۔ دَلَکَتِ الْمَرْاَۃُ الْعَجِیْنَ : عورت نے آٹا گوندھا ۔ تَدَلَّکَ الرَّجُلُ ۔ آدمی نے نہاتے ہوئے اپنے بدن کو ملا ۔ اَلدَّلُوْکُ ۔ خوشبو یا دوا وغیرہ جسے ملا جائے ۔ بَعِیْرٌ مُدَلَّکٌ ۔ اس اونٹ کو کہتے ہیں جسے سفروں میں برابر کام میں لایا گیا ہو ۔ اَلدَّالِیْکُ ۔ چلنے میں بلا پاؤں جمائے تیزی سے چلنا* ۔ ان تمام معانی سے واضح ہے کہ اصل معنے اس مادہ کے حرکت کرنے ہی کے ہیں ۔ لہذا جب آفتاب طلوعِ صبح سے دوپہر تک بلند ہوتا جاتا ہے تو اسے بھی دُلُوْک کہینگے (جیسا کہ نوادر الاعراب کے حوالہ سے اوپر لکھا گیا ہے) اور جب وہ نصف النہار

*تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔ **اسکی تائید ابن درید نے جمہرۃ اللغۃ میں کی ہے ۔

تک پہنچکر نیچے کی طرف حرکت کریگا (یعنے ڈھلنا شروع ہوگا) تو اسے بھی دُلُوْکٌ ہی کہینگے (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ نیز راغب نے بھی اسکے معنے سائل بہ غروب ہونے کے لکھے ہیں*) ابن درید نے جمہرة اللغة میں کہا ہے کہ دلوک کے معنی غروب اور غائب ہو جانا ہیں۔

قرآن کریم میں ہے أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَ قُرْآنَ الْفَجْرِ (١٧/٧٨)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہوگا ''صلٰوة قائم کرو دلوک شمس سے غسق لیل تک۔ اور فجر کا قرآن''۔ یہاں اگر دُلُوْکٌ کے معنے عام حرکت کے لئے جائیں تو اسمیں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کا سارا وقت آجاتا ہے۔ اور قُرْآنَ الْفَجْرِ۔ طلوع آفتاب سے پہلے، اور غَسَقِ اللَّيْلِ۔ غروب آفتاب کے بعد۔ یعنے اسطرح اس آیت میں سونے کا وقت نکال کر باقی دن رات کا سارا وقت آجاتا ہے۔ مفہوم ظاہر ہے کہ صلٰوة کیلئے یہ سارا وقت تمہارے لئے کھلا رکھا ہے۔ اور اگر دُلُوْکٌ کو زوال آفتاب سے غروب تک مقید کر دیا جائے تو پھر (اوپر کے مفہوم کی رو سے) طلوع آفتاب سے لیکر اسکے نصف النہار تک پہنچنے کا وقت خارج ہو جائیگا۔ دوسری جگہ صَلٰوةٌ کیلئے طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِنَ اللَّيْلِ (١١/١١٤) کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنے دن کے دونوں کناروں اور رات کے (ابتدائی) حصوں میں۔ دن کے دونوں کنارے فجر اور مغرب ہیں اور رات کے (ابتدائی) حصے غَسَقُ اللَّيْلِ۔ سورة نور میں صَلٰوةُ الْفَجْرِ اور صَلٰوةُ الْعِشَاءِ (٢٤/٥٨) کا خصوصیت سے نام لیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نزول قرآن کریم (رسول اللہ) کے زمانہ میں ان دونوں اوقات میں اجتماعات صلٰوة ہوتے تھے۔ یہ قُرْآنَ الْفَجْرِ اور غَسَقُ اللَّيْلِ کے اوقات تھے۔ باقی وقت دُلُوْكُ الشَّمْسِ سے غَسَقُ اللَّيْلِ تک کا ہے۔ اسے صبح سے شام کہہ لیجئے یا سورج ڈھلنے سے شام تک کا وقت۔ دُلُوْکٌ کے عام مفہوم کے اعتبار سے پہلے معانی (صبح سے شام تک کا وقت) لغوی اعتبار سے زیادہ موزوں ہونگے۔

(غَسَقٌ۔ ابتداءِ شب کی تاریکی کو کہتے ہیں۔ دیکھئے عنوان غ ۔ س ۔ ق)۔

صلٰوة سے متعلق عنوان (ص ۔ ل ۔ و) میں آپ دیکھینگے کہ صلٰوة سے مراد صرف وقتی اجتماعات نماز ہی نہیں۔ اس سے مراد قرآنی نظام یا قرآن کریم کے مطابق متعین کردہ فرائض زندگی بھی ہے۔ اس اعتبار سے اگر اس آیت (١٧/٧٨) میں بھی اقامت صلٰوة کے معنی فرائض زندگی کی سر انجامدھی

* تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔

یا قرآنی نظام کے قیام کے لئے جائیں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آغاز کار سے پہلے (ہر روز، صبحدم) یہ دیکھو کہ زیر نظر پروگرام کے لئے قرآن کریم کی طرف سے کیا راہ نمائی ملتی ہے (یہ قُرْآنَ الْفَجْرِ ہوگا) اور پھر صبح سے شام تک اس پروگرام کی تکمیل میں مصروف کار رہو۔ یہ اقامت صلٰوۃ دلوک شمس سے غسق لیل تک ہوگا۔

د ل ل

دَلَّ الْمَرْأَةِ وَدَلَالُهَا عَلٰی زَوْجِهَا۔ بیوی کا اپنے شوہر سے ناز و نخرے کرنا۔ اسکا فرط ناز میں ایسی حرکات کرنا جن سے بظاہر نظر آئے کہ وہ شوہر کی مخالفت کر رہی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہ ہو۔ دَلَّهٗ عَلٰی الشَّیْءِ۔ اسے کوئی چیز بتائی، اس تک رہنمائی کی۔ اَدَلَّ عَلَیْہِ۔ وہ اس سے بے تکلف ہوا، اس پر جری ہوا، اس کی محبت پر مکمل اعتماد کی وجہ سے اس پر زیادتی کی۔ اَلدَّالَّةُ۔ نازو ادا۔ اَلدَّلِّی۔ واضح راستے کو کہتے ہیں۔ اور اَلدَّلِیْلُ۔ رہنما جس سے کسی چیز کا پتہ نشان معلوم کیا جائے۔ وہ چیز جس سے بات واضح کی جائے۔ اَلدَّلَالَةُ۔ کسی کو راستہ دکھا دینے نیز علامتوں سے کسی چیز کا پتہ دینے کو کہتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس سے کسی دوسری چیز کی معرفت حاصل کی جائے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو کسی ایسی علامت کے ذریعے ظاہر کر دینا جسے تم غور و فکر کے بعد بتدریج جانو۔ یعنی معلوم علامت کے ذریعے اظہار حقیقت۔ نیز کسی چیز میں اضطراب اور حرکت کا موجود ہونا۔ قرآن مجید میں ہے کہ تم اپنے رب کے سایہ بڑھانے (کی حکمت) پر غور نہیں کرتے۔ اسکے بعد ہے ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْہِ دَلِیْلًا (۲۵/۴۵)۔ سایہ کے اس طرح گھٹنے اور بڑھنے کو معلوم کرنے کا ذریعہ (یا اسکا موجب) سورج کی روشنی ہے۔ اگر سورج کی روشنی نہ ہو تو سایہ بھی نہ ہو اور اسکا گھٹنا بڑھنا معلوم نہ ہو سکے۔ سورۃ السبأ میں ہے مَا دَلَّهُمْ عَلٰی مَوْتِہٖ اِلَّا.... (۳۴/۱۴)۔ کسی چیز نے انہیں (حضرت سلیمانؑ کی) موت کا پتہ نہیں دیا بجز .... یعنے وہ چیز بتدریج، غور و فکر کے بعد، ذریعہ بنی اس امر کا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ حضرت سلیمانؑ فی الواقعہ وفات پا چکے ہیں۔ (اسکی تفصیل عنوان حضرت سلیمانؑ میں ملیگی)۔ لہذا دلیل وہ ذریعہ ہے جس سے کسی بات کا علم غور و فکر کے بعد بتدریج ہو سکے۔

---

*تاج و محیط و راغب۔

د ل و (ی)

اَلدَّلْوُ۔ ڈول۔ (جب ڈول پانی سے بھرا ہوا ہو تو اسے ذَنُوْبٌ* کہتے ہیں*** لیکن یہ کلیہ نہیں ہے۔) دَلَوْتُ۔ اَدْلَیْتُ۔ میں نے ڈول کنویں میں ڈالا*۔ یا ڈول بھر کر کنویں سے نکالا**۔ اسی سے اَدْلٰی کے معنے ہیں کسی چیز تک پہنچنے کے لئے ذریعہ یا وسیلہ فراہم کرنا۔ جیسے پانی تک پہنچنے کے لئے ڈول ڈالنا پڑتا ہے۔ اَدْلٰی اِلَیْہِ بِمَالِہٖ: اسے اپنا مال دیا*۔ دَلّٰی حَاجَتَہٗ دَلْوًا۔ اس نے اپنی ضرورت کو طلب کیا۔ اَدْلٰی بِرَحِمِہٖ۔ اسنے اپنی رشتہ داری کو ذریعہ بنا کر چاہا کہ دوسرے تک پہنچ جائے اور اپنا کام نکال لے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں نرمی اور سہولت کے ساتھ کسی چیز کے قریب ہو جانا۔ قرآن کریم میں ہے تُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ (۲/۱۸۸) مال کے ذریعہ (رشوت دیکر) حکام تک پہنچ کر اپنے حق میں فیصلہ لے لینا۔

ڈول کو کنویں میں لٹکانے کی جہت سے تَدَلّٰی کے معنے ہوتے ہیں لٹکنا۔ قریب ہو جانا۔ سورۃ النجم میں ہے ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی (۵۳/۸) وہ قریب ہوا۔ (ہم رنگ ہو گیا)۔ ان حقائق کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ یہ مقام نبوت کی خصوصیات میں سے ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ (۷/۲۲) انہیں فریب دیکر پستیوں کی طرف گرا دیا۔ دَالَاۃٌ۔ مُدَالَاۃٌ۔ اس سے نرمی اور مدارات کی***۔ دَلِيَ۔ يَدْلٰی۔ متحیر ہونا*

د م د م

دَمْدَمَ الْقَوْمَ وَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ۔ قوم کو ہلاک و برباد کر دیا۔ دَمْدَمَ عَلَيْهِ۔ اس پر غصہ ہوا اور غصہ میں اس سے بات کی*۔ دَمْدَمَ عَلَيْهِمْ۔ انہیں ہلاک کیا اور پریشان و بے چین کیا****۔ اَلدَّمْدَمَةُ پریشان کن گفتگو۔ غضب*۔ تباہ و برباد کرنا***** اَلدَّمْدَمُ، سوکھی گھاس*۔ دَمْدَمَ الرَّعْدُ۔ گرج زور دار ہوئی**۔

قرآن کریم میں ہے فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ (۹۱/۱۴)۔ ان کے رب (کے قانون مکافات) نے انہیں اسطرح ہلاک کر دیا کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

---

* تاج۔ **لین۔ *** محیط۔ **** لطائف اللغة۔ ***** راغب۔ ******ابن فارس۔

د م ر

اَلدُّمُوْرُ ۔ اَلدَّمَارُ ۔ ہلاک ہو جانا ۔ ہلاک کر دینا ۔ اَلتَّدْمِیْرُ ہلاک کر دینا ۔ بیخکنی کر دینا ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں تباہی و بربادی کو کسی چیز میں داخل کر دینا ۔ دَمَرَ عَلَیْھِمْ ۔ وہ بغیر اجازت ، برائی کی نیت سے ان کے پاس آیا ۔ وہ اچانک ان پر حملہ آور ہوا* ۔ قرآن کریم میں ہے وَدَمَّرْنَا (۷/۱۳۷) ہم نے تباہ و برباد کر دیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی گھر وغیرہ میں داخل ہونے کے ہیں ۔ بعض اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ داخلہ بغیر اجازت کے ہوتا ہے ۔

د م ع

اَلدَّمْعُ ۔ آنسو خواہ وہ غم کے ہوں یا خوشی کے ۔ اَلدَّمْعَةُ ۔ آنسو کا ایک قطرہ ۔ دَمَعَتِ الْعَیْنُ ۔ آنکھ نمناک ہو گئی* ۔

دَمَعَتِ السَّحَابَةُ ۔ بادل سے پانی برسا** ۔ سورۃ مائدہ میں ہے ۔ تَرٰۤی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ (۵/۸۳) "تو دیکھیگا کہ ان کی آنکھوںسے آنسو جاری ہو جاتے ہیں" ۔

د م غ

اَلدِّمَاغُ ۔ بھیجا (سر کا گودا) دَمَغَ ۔ یَدْمَغُ ۔ اسنے اسے ایسا زخم لگایا کہ وہ دماغ تک پہنچ گیا ۔ اَلدَّامُوْغُ ۔ وہ چیز جو کسی چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھدے ۔ دَمَغَہٗ ۔ وہ اس پر غالب آ گیا* ۔ دَمَغَ الْحَقُّ الْبَاطِلَ ۔ حق نے باطل کو ختم کر دیا ۔ اسے مٹا دیا** ۔ حُجَّةٌ دَامِغَةٌ ۔ دماغ توڑ دلیل*** ۔

سورۃ انبیاء میں حق کے متعلق ہے فَیَدْمَغُہٗ (۲۱/۱۸) وہ باطل کا بھیجا نکال دیتا ہے ۔ اسے مٹا کر رکھدیتا ہے ۔ حق و باطل کی کشمکش میں (جو تعمیری اور تخریبی قوتوں کی شکل میں کائنات کے ذرے ذرے میں جاری ہے) حق (تعمیری پہلو) ہمیشہ باطل (تخریبی پہلو) پر غالب آتا ہے اور اسطرح یہ سلسلۂ کائنات ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے ۔ اگر تخریب غالب رہے تو ارتقاء تو ایکطرف کائنات کا وجود ہی باقی نہ رہے ۔ لہذا سنت اللہ یہ ہے کہ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُہٗ فَاِذَا ھُوَ زَاھِقٌ (۲۱/۱۸) ۔ " ہم حق کے ذریعہ باطل پر ضرب لگاتے ہیں ۔ سو حق ،

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

باطل کا مغز توڑ دیتا ہے ۔ سو دیکھو ! وہ (باطل کسطرح) نیست و نابود ہو رہا ہے !،، ۔ اس کشمکش میں خدا کے تعمیری پروگرام کا، تخریبی پروگراموں پر غالب آنا، قانون کائنات ہے ۔ اس کے خلاف ہو نہیں سکتا ۔ لیکن اس کے غلبہ اور تسلط کی رفتار (ہمارے پیمانوں کے مطابق) بہت سست ہے ۔ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا (بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا) ہوتا ہے ۔ (۳۲/۵ و ۷۰/۴) لیکن اگر انسان، خدا کے قانون کا رفیق بن جائے، تو پھر اس کے نتائج، خود انسان کے حساب و شمار کے مطابق مرتب ہونے شروع ہو جاتے ہیں ۔

د م و (ی)

دَمٌ کے معنے ہیں خون ۔ اَلدِّمَاءُ (۲/۸۴) اسکی جمع ہے* ۔ (دَمٌ ۔ در اصل دَمَوٌ ۔ یا دَمَیٌ تھا) ۔ قرآن کریم نے دَمًا مَسْفُوْحًا (۶/۱۴۶) ''بہتے ہوئے لہو'' کو حرام قرار دیا ہے ۔ (مزید تشریح س ۔ ف ۔ ح کے عنوان میں ملیگی) ۔

د ن ر

دِیْنَارٌ ۔ ایک طلائی سکے کا نام ہے ۔ اسکی جمع دَنَانِیْرُ آتی ہے ۔ غیر عربی لفظ کو عربی بنا لیا گیا ہے ۔ عرب ایسے قدیم زمانہ سے بولتے چلے آ رہے تھے اسلئے یہ عربی ہو گیا* ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (۳/۷۴) میں آیا ہے ۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ لفظ در اصل دِنَّارٌ تھا ۔ اسی لئے اسکی جمع دَنَانِیْرُ آتی ہے* ۔ اس کے معنی پونڈ یا گنی یا اشرفی کے ہیں جو طلائی ہوتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ، رومی لفظ (Dinarins) کا معرب ہے ۔ عربوں کے ہاں رومیوں کے سکوں کا زیادہ رواج تھا ۔ (نیز دیکھئے درہم) ۔

د ن و

دَنَا ۔ یَدْنُوْ ۔ دُنُوًّا ۔ دَنَاوَۃً ۔ قریب ہونا ۔ اَلدُّنْیَا ۔ نزدیک ترین چیز (یہ مؤنث ہے ۔ اس کا مذکر اَدْنٰی ہے) ۔ دَنِیَ ۔ یَدْنٰی کے معنے ہیں کمزور اور ضعیف ہونا ۔ اَدْنٰی الرَّجُلُ اِدْنَاءً ۔ اس شخص نے تنگی اور عسرت کی زندگی بسر کی ۔ اَدْنَی الشَّیْءَ کسی چیز کو قریب کیا ۔

---

*تاج ۔

اَدْنَتْ ثَوْبَهَا عَلَيْهَا ۔ اس نے اپنا کپڑا اپنے اوپر ڈال لیا*** ۔ اسی سے ہے يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ (۳۳/۵۹) "وہ اپنی چادریں (جلباب) اپنے اوپر ڈال لیا کریں"۔

اَلْاَدْنٰی کے معنے ہیں زیادہ قریب ، لیکن کبھی اس سے مراد اَصْغَرْ ہوتا ہے ۔ ایسی صورت میں اسکے مقابلہ میں اَكْبَرْ آتا ہے ۔ کبھی اس سے مراد اَرْذَلْ ہوتا ہے تو اسکے مقابلہ میں خَيْرٌ آتا ہے ۔ جب اس سے مراد اَوَّلْ ہوتا ہے تو اسکے مقابلہ میں آخِرٌ آتا ہے ۔ جب اس سے مراد اَقْرَبْ ہوتا ہے تو اسکے مقابلہ میں اَقْصٰی آتا ہے**۔

قرآن کریم میں ہے فِیْ اَدْنَى الْاَرْضِ (۳۰/۳) ۔ یعنے قریب کی سر زمین ۔ سورۃ النجم میں ہے ثُمَّ دَنَا . . . . اَوْ اَدْنٰی (۵۳/۸-۹) ۔ اسکے معنے ہیں پھر وہ قریب ہوا . . . . . یا قریب تر ۔ سورۃ الرحمٰن میں دَانٍ (۵۵/۵۴) بمعنے قریب آیا ہے ۔ سورۃ الحاقۃ میں ہے۔ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ (۶۹/۲۳) ۔ اسکے معنے بھی قریب ہیں ۔ اَلسَّمَاءُ الدُّنْيَا (۳۷/۶ و ۶۷/۵) کے معنے ہیں قریب ترین آسمان ۔ (دیکھئے عنوان س ۔ م ۔ و کے تحت سماء) ۔

اَلدُّنْيَا (قریب تر) بمقابلہ اَلْقُصْوٰى (بعید تر) (۸/۴۲) میں آیا ہے ۔ اَكْبَرْ کے مقابلہ میں یہ لفظ (۳۲/۲۱) میں آیا ہے ۔ اور اَكْثَرْ کے مقابلہ میں (۵۸/۷) میں۔ خَيْرٌ کے مقابلہ میں (۲/۶۱) میں ۔

قرآن کریم میں اَلْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۔ بمقابلہ آخِرَةٌ ۔ اکثر مقامات پر آیا ہے ۔ اور یہی وہ تقابل ہے جو زیادہ غور طلب ہے ۔ اسلئے کہ اس تقابل میں اَلْحَيٰوةُ الدُّنْيَا کو آخرت کے مقابلہ میں کم قیمت قرار دیا گیا ہے ۔

عام مذاہب عالم میں، جہاں روح اور مادہ کی ثنویت (Duality) کا عقیدہ رائج ہے، دنیا اور اسکی متاع کو بڑا ذلیل اور حقیر قرار دیا گیا ہے۔ ہندو دھرم کی رو سے دنیا ہے ہی مایا یعنے فریب ۔ اور اس فریب سے چھوٹ جانے کا نام نجات پا سکتی ہے ۔ بدھ مت میں دنیا کے متعلق ہر آرزو ایک تکلیف کا پیش خیمہ ہوتی ہے ۔ اسلئے اصلِ حیات ترکِ آرزو کا نام ہے۔ یہی عقیدہ عیسائیت میں ہے جہاں نیکو کاروں کی بادشاہت آسمان میں ہے۔ چنانچہ انکے ہاں ترک دنیا سب سے بڑی ولایت ہے ۔ یہی عقیدہ تصوف کی اصل ہے اور اس سے متاثر ہو کر خود ہمارے (مسلمانوں کے) ہاں بھی دنیا کو بڑا حقیر اور قابل نفرت سمجھا جاتا ہے ۔ چنانچہ "دنیا دار" اور گنہگار" قریب قریب

* تاج و محیط ۔ ** تاج و راغب ۔ *** لین بحوالہ مغنی اللبیب ۔

مرادف المعنی الفاظ ھو چکے ھیں - اس کے برعکس ، دین اور دنیا ایک دوسرے کے مقابلے میں بولے جاتے ھیں - لیکن یہ تصور قرآنی تعلیم کے خلاف ھے - وہ مومن کو (آخرت کے علاوہ) فِی هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً (۷/۱۵۶) کی دعا سکھاتا ھے اور واضح الفاظ میں کہتا ھے کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ (۱۶/۳۰) حسن عمل کا نتیجہ (آخرت کے علاوہ) اس دنیا کی خوشگواریاں ھیں - اسکے مقابلہ میں وہ ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۷/۱۵۲) - ''دنیا میں ذلت و خواری،، کو خدا کا غضب اور اسکی لعنت قرار دیتا ھے - اس قسم کی آیات متعدد مقامات پر آئی ھیں - لہذا قرآن کریم کی رو سے یہ تصور باطل ھے کہ دنیا قابل نفرت ھے اور اسکی آسائشیں اور آرائشیں گناہ کی آلودگیاں !

لیکن قرآن کریم میں ایسی آیت بھی ھیں جن میں متاع دنیا کو قلیل اور اسکی زندگی کو لہو و لعب قرار دیا گیا ھے - اس نکتہ کو سمجھنے کیلئے (ا - خ - ر) اور (ع - ج - ل) کے عنوانات دیکھئے جن میں بتایا گیا ھے کہ مَفَادِ عَاجِلَه اور مَتَاعِ آخِرَہ سے قرآن کریم کا مطلب کیا ھے - وھاں آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم ان لوگوں کی سخت مخالفت کرتا ھے جو اپنی نگاھوں کو مفاد عاجلہ (فوری حاصل ھو جانے والے مفاد) پر مرکوز رکھتے ھیں اور مستقبل کی خوشگواریوں کو نظر انداز کر دیتے ھیں - اسی مفاد عاجلہ کو وہ مَتَاعُ الدُّنْيَا قریبی مفاد، یا پیش پا افتادہ مفاد کہکر پکارتا ھے اور ان لوگوں کو سخت مطعون کرتا ھے جو ان پیش پا افتادہ مفادات کی خاطر مستقبل کی خوشگواریوں کو قربان کر دیتے ھیں - لہذا جو چیز قرآن کریم کی رو سے مذموم ھے وہ یہ ھے کہ انسان قریبی مفاد (Immediate Gain) کی خاطر مستقبل (Future) کی تابناکی کو نظر انداز کر دے - یعنی وہ زندگی اسی طبعی زندگی ھی کو سمجھ لے - اور یہ بھی مذموم ھے کہ انسان دنیا کو ترک کرکے صرف ''عاقبت سنوارنے،، کے خیال میں لگ جائے (اسے رھبانیت کہتے ھیں جسے قرآن کریم جائز قرار نہیں دیتا - دیکھئے عنوان ر - ھ - ب)- اسکی تعلیم یہ ھے کہ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (۲/۲۰۱)- اس دنیا میں، بھی خوشگواریاں اور اسکے بعد کی زندگی میں بھی خوشگواریاں - حال بھی درخشندہ اور مستقبل بھی تابناک - قریبی مفاد بھی اور مستقبل کے مفاد بھی -

اس نے یہ بھی کہدیا ھے کہ جسکا حال درخشندہ نہیں وہ سمجھ لے کہ اسکا مستقبل بھی تاریک ھی ھے- وَ مَنْ كَانَ فِي هٰذِهِ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۱۷/۷۲)- ''جو یہاں کا اندھا ھے وہ وھاں

بھی اندھا ھی ھوگا بلکہ اس سے بھی زیادہ گیا گزرا،، ۔ (اَعْمٰی کے مفہوم کیلئے دیکھئے عنوان ع ۔ م ۔ ی) ۔ لہذا ۔

(۱) یہ تصور بھی غلط ھے کہ دنیا کی خوشگواریاں قابل نفرت ھیں ۔

(۲) اور یہ بھی غلط ھے کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی ھے، لہذا مفاد صرف اسی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد ھیں ۔

(۳) صحیح تصور یہ ھے کہ اس دنیا کے مفاد بھی حاصل ھوں اور انسانی ذات اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما سے اس قابل ھو جائے کہ وہ اسکے بعد کی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل کرے ۔ نیز اس دنیا میں نگاہ صرف اپنے ذاتی مفاد پر نہ رھے بلکہ تمام نوع انسانی اور آنے والی نسلوں کی خوشحالی پر بھی نگاہ رھے ۔ یہ مستقبل اس دنیا میں ھوگا اور دوسرا مستقبل اسکے بعد کی زندگی میں (مزید تفصیل کیلئے دیکھئے عنوان ا ۔ خ ۔ ر) ۔

حقیقت یہ ھے کہ قرآن کریم کی تعلیم کا ماحصل یہ ھے کہ وہ انسان کو اقدار (Values) متعین کر کے دیتا ھے ۔ وہ ھر شے کے متعلق بتاتا ھے کہ انسانیت کی میزان میں اسکی قدر و قیمت کیا ھے ۔ اس کے بعد وہ کہتا ھے کہ عقل اور ایمان کی رو سے صحیح مسلک زندگی یہ ھے کہ انسان، بلند قدر و قیمت کی شے کے لئے کم قدر و قیمت کی شے کو قربان کر دے ۔ وہ بتاتا ھے کہ دنیاوی سامان زندگی اور اس کی خوشنمائیاں اپنی قدر رکھتی ھیں ۔ انہیں ضرور حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا چاھئے ۔ لیکن جب کبھی ایسا ھو کہ دنیاوی زندگی (یعنی انسان کی طبعی زندگی ۔ Physical Life) کے کسی تقاضے میں اور انسانی زندگی (انسانی ذات) کے کسی تقاضے میں تصادم واقع ھو جائے (ان میں (Tie) پڑ جائے) تو اسوقت، انسانی ذات کے بلند تقاضہ کی خاطر طبعی زندگی کے کمتر درجہ کے تقاضہ کو قربان کر دینا چاھئے ۔ یہ ھیں وہ مقامات جہاں قرآن کریم نے (طبعی زندگی اور انسانی ذات کا مقابلہ کرتے ھوئے) دنیاوی زندگی اور اس کے سازوسامان کو کم قیمت بتایا ھے ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دنیاوی زندگی قابل نفرت ھے ۔ اس کے معنی یہ ھیں کہ جب طبعی زندگی اور انسانی زندگی (جسے مرنے کے بعد بھی قائم رھنا ھے) کا مقابلہ ھو تو پھر طبعی زندگی کی قیمت، انسانی زندگی کے مقابلہ میں کمتر سمجھنی چاھئے ۔ یہ ھے قرآن کریم کی صحیح تعلیم ''دنیا اور آخرت،، کے متعلق ۔

د ھ ر

اَلدَّھْرُ ۔ دراصل مُدتِ عالَم کو کہتے ھیں جو اسکی ابتداء آفرینش سے لیکر اسکے اختتام تک ھوتی ھے ۔ پھر، طویل مدت کیلئے بھی اس کا استعمال ھونے لگا ۔ برخلاف زَمَانٌ کے جسکا اطلاق مُدتِ قلیلہ اور مُدتِ کثیرہ دونوں پر ھوتا ھے* ۔ قرآن کریم میں (تخلیق انسانی کے سلسلہ میں) حِیْنٌ مِنَ الدَّھْرِ (۱/۷۶) آیا ھے ۔ یعنی ایک زمانہ ۔ یا زمانے کی ایک مدت ۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی غلبہ اور زبردستی کے ھوتے ھیں ۔ زمانہ کو دَھْرٌ اس لئے کہتے ھیں کہ وہ ھر چیز پر سے گزرتا اور اس پر غالب آ جاتا ھے ۔ اَلدَّھَارِیْرُ ۔ زمانہ کے حوادث اور گردشیں ۔ دَھَرَھُمْ اَمْرٌ ۔ ان پر کوئی مصیبت نازل ھو گئی**۔

قرآن کریم میں ان لوگوں کا قول نقل کیا گیا ھے جو زندگی کو اس طبعی زندگی تک محدود سمجھتے ھیں ۔ کہ وَمَا یُھْلِکُنَا اِلَّا الدَّھْرُ (۲۴/۴۵)۔ یہ صرف مرور زمانہ (Time) ھے جو ھمیں ھلاک کر دیتا ھے ۔ وقت گزرنے سے انسان کے قویٰ مضمحل ھو جاتے ھیں اور اسطرح وہ (Deteriorate) ھوتا ھوا مر جاتا ھے اور زندگی کا سلسلہ ختم ھو جاتا ھے ۔ اسکے بعد کوئی اور زندگی نہیں ۔ یہ وھی تصور ھے جسے دور حاضر کی اصطلاح میں (Materialistic Concept of Life) مادی نظریۂ حیات کہتے ھیں ۔ قرآن کریم کہتا ھے کہ وَمَا لَھُمْ بِذَالِکَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ (۲۴/۴۵)۔ ان کا یہ عقیدہ علم پر مبنی نہیں ۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لیتے ھیں ۔ قرآن کریم نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی۔ اب ھمارے دور میں دھر (Time) کے متعلق جو جدید فلسفیانہ (اورسائنٹفک) تصورات قائم ھوئے ھیں ان کی رو سے زمان (Time) کی حقیقت ھی کچھ اور ھو گئی ھے ۔ اور ابھی تو اس نہایت مشکل اور نازک موضوع پر تحقیق و تفتیش اور بحث و نظر کی ابتداء ھوئی ھے ۔ آگے چلکر دیکھئے اس کے متعلق کیا کیا تصورات قائم ھوتے ھیں ۔ بہر حال یہ عقیدہ کہ زندگی محض طبعی زندگی (Physical Life) ھے اور مرور زمانہ سے اسکا خاتمہ ھو جاتا ھے، اب عہد کہن کا فرسودہ خیال سمجھا جاتا ھے ۔ اب تحقیقات کا رخ اسی طرف کو ھے کہ زندگی مسلسل آگے بڑھتی ھے ۔ (اسکے متعلق تفصیل سے معارف القرآن

*راغب ۔ **تاج ۔

کی آخری جلد میں لکھا جائیگا جو آخرت سے متعلق ھوگی - لیکن ضمنی طور پر، میری کتاب ''انسان نے کیا سوچا،، میں بھی لکھا جا چکا ھے) - مرور زمانہ سے انسان کا جسم مضمحل ھوتا ھے - اسکی ذات (Personality) پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا - وہ زمانے کے اثرات سے غیر متاثر رھتی ھے - قرآن کریم کی رو سے، انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں ، جسم کے علاوہ، اسکی ذات بھی ھے - اگر اس کی نشو و نما قرآن کریم کے طریق کے مطابق ھو جائے تو موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا - وہ زندگی کے مراحل طے کرنے کے لئے آگے بڑھ جاتی ھے - اسی لئے، دھر (زمانہ) کا اس پر کچھ اثر نہیں ھوتا -

قرآن کریم نے اَلدَّھْرُ اس زمانے کو بھی کہا ھے جب انسان ھنوز وجود میں بھی نہیں آیا تھا - ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا (۷۶/۱) - لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ خود زمانہ (دھر) کو خدا مان لیا جائے - بہر حال، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ھے ، زمانہ یا دھر (Time) کے متعلق بحث، بڑی فلسفیانہ ھے جو ھمارے پیش نظر موضوع سے خارج ھے - قرآن کریم میں یہ لفظ (دھر) انھی دو مقامات میں آیا ھے جن کا ذکر اوپر کر دیا گیا ھے - اُن مقامات میں اس لفظ کا مفہوم بالکل صاف اور سیدھا ھے جس کے سمجھنے کے لئے کسی فلسفیانہ بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں -

د ھ ق

دَھَقَ الْکَأْسَ - اسنے پیالہ بھر دیا - مَآءٌ دِھَاقٌ - کثیر پانی - کَاْسٌ دِھَاقٌ - صاف پیالہ - بھرا ھوا پیالہ - اَلدَّھْقُ کے معنے ھوتے ھیں زور سے دبانا - اَلدَّھَقُ - شکنجے کو کہتے ھیں - اَلْمُدَھَّقُ - زور سے دبایا ھوا* - (بھرے ھوئے کیلئے دِھَاقًا کا لفظ غالبًا اسلئے بولتے ھیں کہ اس میں چیز دبا دبا کر بھری جاتی ھے) -

قرآن کریم میں کَاْسًا دِھَاقًا - (۷۸/۳۴) آیا ھے - یعنے پاک اور صاف ، لبالب اور چھلکتا ھوا پیالہ - لبریز بھی اور مصفا بھی - یہی جنتی معاشرہ کی خصوصیت ھے - صحیح زندگی ایسی ھی ھونی چاھئے - بھر پور اور مصفا - جس میں زندگی، پاکیزگی اور حرکت بڑھانے والے عناصر کی فراوانی ھو، سب کچھ فراوانی اور پاکیزگی سے ملے - جس میں (طبعی ضروریات کے علاوہ) انسان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما ھو جائے اور تطہیر قلب و نگاہ

*تاج -

بھی میسر ہو۔ زندگی کے پیالے پاکیزہ اور قوت بخش خوشگواریوں سے بھرے ہوئے ہوں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں لبریز ہونے کے علاوہ چھلکنے (یعنی متحرک ہونے) کا پہلو بھی ہوتا ہے۔

د ھ م

اَلدُّھْمَۃُ۔ سیاھی۔ اِدْھَامَّ الشَّیْءُ۔ چیز سیاہ ہوگئی۔ اِدْھَامَّ الزَّرْعُ: سیرابی کی وجہ سے کھیتی سیاھی مائل ہوئی۔ حَدِیْقَۃٌ دَھْمَاءُ وَمُدْھَامَّۃٌ۔ سر سبز باغ جو اپنی سر سبزی کی شدت سے مائل بہ سیاھی ہو رہا ہو۔ عربوں کے ھاں گہرے رنگ کی سبزی کو دُھْمَۃٌ کہدیتے تھے کیونکہ گہری سبزی سیاھی مائل ہو جاتی ہے۔ اور ھلکے رنگ کی سیاھی کو خُضْرَۃٌ کہتے تھے کیونکہ وہ سبز رنگ کے قریب قریب آ جاتی ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تاریکی کے ساتھ کسی چیز پر چھا جانا ھیں۔ بعد میں کثرت استعمال سے اس میں تاریکی کی شرط بھی نہ رھی۔ قرآن کریم نے جنتی باغات کی شادابی و سر سبزی کی شدت کی بنا پر، اُنہیں مُدْھَامَّتٰنِ (۵۵/۶۴) کہا ہے۔ ایسی زندگی جس میں تازگی، شادابی، سر سبزی، شگفتگی، اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہو۔

د ھ ن

اَلدُّھْنَۃُ۔ چکناھٹ۔ اَلدُّھْنُ۔ تیل۔ اَلْمُدْھُنُ۔ تیل کی شیشی۔ اِدَّھَنَ۔ اس نے تیل مل لیا**۔ قرآن کریم میں زیتون کے متعلق ہے تَنْبُتُ بِالدُّھْنِ (۲۳/۲۰) وہ روغن (تیل) لیے ہوئے نکلتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نرمی اور سہولت اور قلت کے ہونے ھیں۔ اور اَدْھَنَ کے معنی خیانت کرنے کے۔ اَلْمُدَاھَنَۃُ۔ فریب۔ بناوٹ۔ تصنع، نمائش (چکنی چپڑی باتوں کے اعتبار سے)۔ اَلْاِدْھَانُ۔ فریب دینا۔ باطن کے خلاف ظاھر کرنا۔ نرمی برتنا۔ رعایت کرنا۔ سنجیدگی اور حقیقت کا دامن چھوڑ دینا**۔ سورۃ قلم میں ہے وَدُّوْا لَوْ تُدْھِنُ فَیُدْھِنُوْنَ (۶۸/۹)۔ یہ چاھتے ھیں کہ اگر تو تھوڑا سا اپنے مقام سے ھٹ جائے تو وہ بھی اپنے مقام سے ھٹ کر تجھ سے "مفاھمت" (Compromise) کر لیں۔ لیکن جو شخص حق پر ہو وہ اگر اپنے مقام سے ذرا سا بھی ھٹ جائے تو وہ باطل پر

*تاج و راغب۔ **تاج و محیط و راغب۔

پہنچ جاتا ہے ۔ اس کے بر عکس، باطل اگر اپنے مقام سے ہٹ جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا ۔ وہ باطل کا باطل ہی رہتا ہے ۔ مثلاً زید کہتا ہے کہ تین اور تین چھ ہوتے ہیں اور بکر کہتا ہے کہ نہیں ۔ تین اور تین چار ہوتے ہیں ۔ اب ان میں ''مفاھمت،، کرانے والا کہتا ہے کہ کچھ تم گھٹو اور کچھ تم بڑھو اور دونوں یہ مان لو کہ تین اور تین پانچ ہوتے ہیں ۔ بکر کا اس سے کچھ نہیں بگڑیگا کیونکہ وہ جیسا پہلے غلطی پر تھا ویسا ہی اب رھیگا ۔ لیکن اس سے زید فوراً اپنے مقامِ حق سے باطل پر آ جائیگا ۔ یہ وجہ ہے کہ حق کسی کی خاطر اپنے مقام سے ہٹ نہیں سکتا ۔ وہ اپنے مقام پر اٹل ہوتا ہے ۔ دین کے محکم اصول اپنے اندر کسی قسم کی کمی بیشی کی گنجائش ہی نہیں رکھتے ۔ سورۃ واقعہ میں پہلے قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ کسقدر عظیم کتاب ہے ۔ اس کے بعد ہے ۔ أَفَبِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَنتُم مُّدْهِنُونَ (٥٦/٨١) اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ کیا تم ایسی کتاب میں خیانت کرتے ہو ۔ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اس کی صحیح تعلیم میں کمی بیشی کرتے ہو ۔ اور دوسرے یہ کہ تم اس کتاب کے ذریعے لوگوں کو ان کے صحیح مقام سے پھسلاتے ہو؟ مفہوم درحقیقت دونوں سے ایک ہی ہے ۔ مذھبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم میں کمی بیشی کرتی ہے اور اسطرح لوگوں کو حق کے مقام سے ھٹا دیتی ہے ۔ اور یہ سب اس لئے کہ اس سے ان کی روٹی کا سامان بہم پہنچتا رہے ۔ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ (٥٦/٨٢) ۔ اس تکذیب کو تم اپنے لئے ذریعہ معاش بناتے ہو؟

اَلدِّهَانُ ۔ سرخ رنگ کی کھال ۔ تیل کی تلچھٹ*۔ سورۃ رحمٰن میں ہے کہ آسمان وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (٥٥/٣٧) ہو جائیگا ۔ دوسری جگہ ہے كَالْمُهْلِ (٧٠/٨) ۔ پگھلی ہوئی دھات کیطرح ہو جائیگا ۔

د ھ ی (و)

دَهَاهُ ۔ دَهْيًا ۔ اس نے اس میں عیب نکالا ۔ اس کی تنقیص کی ۔ اسے سخت تکلیف پہنچائی ۔ اَلدَّاهِيَةُ ۔ امر عظیم ۔ سخت مصیبت ۔ دَوَاهِي الدَّهْرِ ۔ زمانہ کے ہاتھوں جو سخت مصیبتیں آتی رہتی ہیں ۔ اَلدَّهْيُ ۔ اَلدَّهَاءُ ۔ حیرت انگیز ہوشیاری اور چالاکی، نیز رائے کی عمدگی ۔ دَهِيَ ۔ اس نے نہایت درجہ ہوشیاری سے کام کیا** ۔ چنانچہ رَجُلٌ دَاهٍ ۔ انتہائی

*تاج ۔ **تاج و محیط

هوشیار اور چالاک آدمی کو کہتے ہیں* ۔ (دنیا کی مصیبتوں کا بیشتر حصہ عقلِ فریب کار کی چالاکیوں ہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے) ۔

قرآن کریم میں ہے وَ السَّاعَةُ اَدْهٰى (۵۴/۴۶) ۔ وہ انقلاب کی گھڑی سخت مصائب والی ہوگی اور اچانک اور تحیر انگیز طریق سے آئیگی ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ دَهْیٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی ایسی چیز کا سامنے آجانا جو خوشگوار نہ ہو ۔ لیکن حیرت انگیز اور اچانک طریق سے سامنے آنا جس سے انسان بھونچکا رہ جائے ۔ انقلاب کہتے ہی اسے ہیں جو اچانک نمودار ہو اور دیکھنے والے متحیر ہو جائیں ۔

د و ر

دَارَ ۔ یَدُوْرُ ۔ دَوْرًا ۔ کسی چیز کا اسطرح گھومنا کہ وہ گھوم پھر کر وہیں آجائے جہاں سے چلی تھی ۔ اَلدَّوَّارَةُ ۔ پرکار ۔ اَلدَّائِرَةُ ۔ حلقہ (سرکل) اس کی جمع دَوَائِرُ ہے ۔ اَلدَّارُ (جمع دِیَارٌ) ۔ مکان ۔ اس لئے کہ اس میں لوگ گھومتے پھرتے رہتے ہیں ۔ یا گھوم پھر کر وہاں آجاتے ہیں ۔ محلہ ۔ شہر ۔ علاقہ ۔ ٹھہرنے اور سکونت پذیر ہونے کی جگہ ۔ نیز ساری دنیا کو بھی کہتے ہیں ، اور زمانہ کو بھی جو گردش کرتا رہتا ہے ۔ دَارَةٌ ۔ مصیبت گردش ۔ اَلْمَدَارُ ۔ گھومنے کی جگہ** ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کو چاروں طرف سے گھیر لینا ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے عَلَيْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ (۴۸/۶). تباہی اور بربادی نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا ۔ یہاں دائرہ کے معنے ہیں وہ چیز جو کسی کو محیط ہوجائے ۔ جو اسے ہر طرف سے گھیر لے ۔ جیسا کہ دائرہ (سرکل) ہر طرف سے گھیر لیتا ہے ۔ سورۃ توبہ میں ہے یَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَائِرَ (۹/۹۸) ۔ ''وہ تم پر گردشوں کے آنے کا انتظار کرتے ہیں''

سورۃ نوح میں دَيَّارًا (۷۱/۲۶) کے معنے ہیں ، بسنے والا ۔ مکین ۔ نیز یہ نفی کے بعد ، کسی ایک ، کوئی ایک ، کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے** ۔

دَارُ الْاٰخِرَةِ (۶/۳۲) کی اصطلاح قرآن کریم میں متعدد بار آئی ہے ۔ اسکے معنے ہیں ''آخرت کا گھر'' ۔ یعنے مستقبل کی زندگی اور اُس زندگی کی آسائشیں ۔ (دیکھئے عنوان ا ۔ خ ۔ ر) ۔

---

* تاج و محیط ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔

سورۃ بقرہ میں تجارت کے متعلق ہے تُدِیْرُوْنَهَا (۲/۲۸۲) - جس کا تم لوٹ پھیر کرتے ہو - یعنی آپس میں مبادلہ کرتے ہو - چیزوں کو گردش دیتے ہو -

د و ل

اَلدَّالَةُ - شہرت - اَلدَّوْلَةُ - باری اور نوبت - صَارَ الْفَیْئُ دَوْلَةً بَیْنَهُمْ - مال غنیمت ان میں منقسم ہو کر گردش کرنے لگ گیا*۔ دَاوَلَ - پھیرنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جانا۔ قرآن کریم میں ہے تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹) - "یہ وہ حالات ہیں جنہیں ہم لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں" - کبھی اسکی باری کبھی اُسکی باری - تَدَاوَلُوْهُ انہوں نے اسے باری باری لیا*۔

دُوْلَةٌ اور دَوْلَةٌ - بعض نے کہا ہے کہ ان دونوں کے معنے ایک ہی ہیں - یعنی گردش کرنا - پھرتے رہنا - لیکن بعض نے کہا ہے کہ دَوْلَةٌ کے معنے ہیں دو لشکروں کا باری باری ایک دوسرے کو شکست دینا اس طرح کہ پہلے ایک کو شکست ہو لیکن پھر شکست کھانے والا غلبہ حاصل کر لے* - اور دُوْلَةٌ ان طور طریقوں کو کہتے ہیں جو ادلتے بدلتے رہیں - بعض نے کہا ہے کہ دُوْلَةٌ اس چیز کو کہتے ہیں جو مختلف ہاتھوں میں گھومتی پھرتی اور آتی جاتی رہے - اور دَوْلَةٌ اس چیز کے ادلنے بدلنے کو کہتے ہیں*۔

قرآن کریم نے مال کی گردش کے متعلق کہا ہے کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ (۵۹/۷) - تاکہ وہ تم میں سے دولت مندوں کے اندر ہی نہ گھومتا پھرتا رہے - معاشیات (Economics) کا کتنا بڑا اصول ہے جسے قرآن کریم نے چار لفظوں میں بیان کر دیا ہے - معاشرہ کا فساد اسی سے ہوتا ہے کہ دولت ایک خاص (اوپر کے) طبقہ میں گردش کرتی رہتی ہے - قرآن کریم کی رو سے نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت (Surplus Money) رہنی چاہئیے، نہ دولت کو ایک خاص سرکل کے اندر گردش کرنا چاہئیے - علاوہ برین، قرآن کریم میں یہ اصول بالخصوص مالِ فے کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ حکومت کے روپیہ کو بھی اوپر کے طبقہ (یعنی ارباب حل و عقد) کے اندر صرف نہیں ہوتے رہنا چاہئیے - اسے رفاہِ عامہ کے لئے گردش کرنا چاہئیے -

---

* تاج -

د و م

دَوَامٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا ایک حالت پر قائم رہنا ۔ دَامَ الشَّیْءُ اسوقت بولتے ہیں جب کسی چیز پر لمبا زمانہ گزر جائے* ۔ اس سے اَلْمَاءُ الدَّائِمُ ۔ ٹھہرے ہوئے یا ساکن پانی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں ۔ اَلْمُدَامُ اُس بارش کو کہتے ہیں جو لگاتار ہوتی رہے ۔ لہذا اس مادہ میں کسی چیز کا لمبے زمانے تک یا ایک حالت پر رہنے کا تصور ہوتا ہے ۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ دَامَ الشَّیْءُ کے معنے ہوتے ہیں چیز گھومی ۔ نیز یہ فعل تھکنے یا ٹھہرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔ گھومنے کے اعتبار سے ، اَلدَّوَّامَۃُ لٹو کو کہتے ہیں جس سے بچے کھیلتے ہیں ۔ ابن کیسان نے لکھا ہے کہ مَادَامَ میں ، ما کے معنے وقت کے ہوتے ہیں ۔ چنانچہ جب کہتے ہیں قُمْ مَادَامَ زَیْدٌ قَائِماً ۔ تو اسکے معنے ہوتے ہیں جب تک زید کھڑا رہے تم بھی کھڑے رہو** ۔ سورۃ رعد میں جنت کے متعلق ہے اُکُلُهَا دَائِمٌ ($\frac{13}{35}$) ۔ "اس کے پھل قائم رہینگے" ۔ یعنی جنت کی منفعت بخش چیزوں کا سلسلہ جاری رہیگا ۔ کبھی منقطع نہیں ہوگا ۔ وہاں رزق کی کمی نہیں ہوگی ۔ اور سورۃ ہود میں ہے خَالِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ($\frac{11}{108}$) ۔ جب تک زمین و آسمان موجودہ حالت میں رہینگے ۔ یعنی بہت لمبے عرصہ تک کے لئے ۔ (تفصیل خ ۔ ل ۔ د کے عنوان میں دیکھئیے)

سورۃ آلِ عمران میں ہے اِلَّا مَادُمْتَ عَلَیْهِ قَائِمًا ($\frac{3}{74}$) ۔ سوائے اس کے کہ تو اس کے سر پر کھڑا رہے ۔

د و ن

دُوْنَ ۔ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ فَوْقٌ (اوپر) کے برخلاف 'نیچے کے معنوں میں ۔ هُوَ دُوْنَهٗ ۔ وہ اس کے نیچے ہے ۔ کبھی قریب کے معنوں میں ۔ زَیْدٌ دُوْنَکَ ۔ زید تجھ سے (مرتبہ وغیرہ میں) قریب ہے ۔ سامنے کے معنوں میں ۔ مَشٰی دُوْنَهٗ ۔ وہ اس کے آگے آگے چلا ۔ پرے کے معنوں میں ۔ هُوَ اَمِیْرٌ عَلٰی مَادُوْنَ جَیْحُوْنَ ۔ وہ جیحون سے پرے کے علاقہ کا امیر ہے ۔ علاوہ کے معنوں میں ۔ وَیَعْمَلُوْنَ عَمَلاً دُوْنَ ذَالِکَ ۔ وہ اسکے علاوہ اور بھی کام کرتے ہیں ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے کہا ہے کہ یہ لفظ

---

* تاج و راغب ۔ ** تاج ۔

اضداد میں سے ہے اور اس کے معنی پیچھے اور آگے، نیچے اور اوپر' سب آتے ہیں ۔ شَیْءٌ دُوْنٌ ۔ ذلیل چیز کو کہتے ہیں ۔ لیکن اس کے برعکس شریف اور اچھی چیز کو بھی کہتے ہیں * ۔ قرآن کریم میں ہے وَاَنَّا مِنَّا الصَّالِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذَالِكَ (۷۲/۱۱) ہم میں سے بعض صالح ہیں اور بعض اس سے کم تر درجے پر ہیں ۔

علاوہ یا پہلے کے معنوں میں یہ لفظ (۳۲/۲۱) میں آیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ . . . . ہم انہیں عذاب اکبر کے علاوہ۔ یا اس سے پہلے عذاب ادنیٰ کا مزہ بھی چکھائینگے ۔ مِنْ دُوْنِ کے معنے ہیں ''علاوہ'' لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳/۲۷) ۔ ''مومن مومنوں کے علاوہ کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں''۔ یعنی ایسا کبھی نہ کریں کہ مومنوں کو بھی دوست رکھیں اور ان کے ساتھ کفار کو بھی ۔ انہیں مومنوں کو دوست رکھنا ہوگا یا کفار کو۔ اگر وہ کفار کو دوست رکھیں گے تو انہی میں سے ہوجائینگے ۔ قرآن کریم میں مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ بھی اکثر مقامات پر آیا ہے جس کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ یہ لوگ خدا کے ساتھ ساتھ اور قوتوں کی بھی اطاعت اختیار کرتے ہیں اور یہ بھی کہ یہ لوگ خدا کے قانون تک نہیں پہنچتے ۔ اس سے پہلے (یا ورے) ہی انسانوں کے خود ساختہ قانون و شریعت کو اپنے لئے واجب الاتباع مان لیتے ہیں ۔ کتنے معبود ہیں جو انسانوں نے خدا سے ورے ہی اپنی ''پرستش'' کے لئے تجویز کر رکھے ہیں ۔ یہ معبود مٹی اور پتھر کے بت نہیں ۔ انسانی جذبات کے بت، ارباب اقتدار کے بت، مذہبی پیشواؤں کے بت، غرضیکہ ہر آن ایک نیا بت ۔

می تراشد فکر ما هر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بند دگر

یہی وہ بت ہیں جو انسان کو خالص قوانین خداوندی کے اتباع سے روکتے ہیں۔

راغب نے کہا ہے کہ کسی چیز تک پہنچنے سے قاصر رہ جانے کے لئے دُوْنَ بولا جاتا ہے ۔ اس اعتبار سے مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہوئے اس سے ورے ہی اور چیزوں کو اپنا مقصود و منتہٰی قرار دے لینا ۔ نزول قرآن کے بعد خدا تک پہنچنے سے قاصر رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ اس کی کتاب کا اتباع ہے اور وہ کتاب ہر ایک کے سامنے ہے ۔

* تاج ۔

د ی ن

دِیْن۔ یہ لفظ بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ازانجملہ، غلبہ۔ اقتدار۔ حکومت۔ مملکت۔ آئین۔ قانون۔ نظم و نسق۔ فیصلہ۔ ٹھوس نتیجہ۔ جزا و سزا۔ بدلہ، ہیں۔ دوسری طرف یہ لفظ اطاعت اور فرمانپذیری کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے*۔ صاحب لطائف اللغۃ نے بھی اس کے معانی حساب۔ غلبہ۔ تدبیر اور عادت کے لکھے ہیں۔ کتاب الاشتقاق میں اس کے معنی اطاعت۔ روش (دَاْبٌ) اور ملت کے لکھے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ان تمام معانی میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ بقرہ میں، اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ عالمگیرنشو و نما دینےوالےکے قوانین واحکام کے سامنےسر تسلیم خم کر دینے، کو اَلدِّیْنُ کہا گیا ہے (۲/۱۳۱-۱۳۲)۔ اسی کو دوسری جگہ اَلْاِسْلَامُ کہا گیا ہے (۳/۱۸)۔ سورۃ واقعہ میں غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ (۵۶/۸۶) کے معنے ہیں وہ جو کسی کے ماتحت نہ ہوں۔ سورۃ توبہ میں ہے وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ (۹/۲۹)۔ وہ نظام خدا وندی کی اطاعت اختیار نہیں کرتے۔ سورۃ یوسف میں دِیْنِ الْمَلِکِ (۱۲/۷۶) کے معنے بادشاہ کا قانون ہیں۔ اور سورۃ نور میں جہاں زنا کی سزا کا ذکر ہے وہاں دِیْنِ اللّٰہِ (۲۴/۲) کے معنےخدا کا قانون یا ضابطہ حکومت ہیں۔ اسی‌طرح سورۃ توبہ میں، جہاں سال کے بارہ مہینوں اور ان میں سے چار حرمت والےمہینوں کا ذکر ہے، کہا گیا ہے کہ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (۹/۳۶) اسمیں بھی دِیْنُ کے معنے ضابطہ قانون ہے۔ لیکن یَوْمَئِذٍ یُّوَفِّیْهِمُ اللّٰہُ دِیْنَهُمُ الْحَقَّ (۲۴/۲۵) میں دِیْنُ کے معنے اعمال کا بدلہ (جزا و سزا) ہیں۔ (اس میں دین کے معنے حساب بھی ہوسکتے ہیں**۔ اس سے بھی مطلب مکافات عمل ہی ہے۔) سورۃ صٰفٰت میں ہے ءَاِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ (۳۷/۵۳)۔ کیا ہمیں ہمارے اعمال کا بدلہ ملیگا؟ کیا ہمارا حساب ہوگا؟۔

غلبہ و اقتدار اور قانون و اختیار کے مفہوم کے اعتبار سے قرآن کریم نے یَوْمُ الدِّیْنِ کے معنے خود واضح کر دئے ہیں جہاں کہا ہے کہ مَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ۔ ''تجھے کیا معلوم کہ یوم الدین کیا ہے''۔ جواب میں کہا کہ یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ (۸۲/۱۸-۱۹)۔ جس دور میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کیلئے کچھ اقتدار و اختیار نہیں رکھیگا۔ اور تمام معاملات قانون خدا وندی

* تاج و محیط۔ ** ابن قتیبہ (القرطین ج/۱ صفحہ ۴)

کے مطابق فیصل ہونگے ۔ اسی کے متعلق سورۃ فاتحہ میں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (۴/۱) کہا گیا ہے۔ یعنی جس دور میں انسانی زندگی آئین خدا وندی کے مطابق بسرہوگی۔ اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی غلبہ و اقتدار نہیں ہوگا ۔ غلبہ و اقتدار صرف قانون خدا وندی کا ہوگا ۔ کتنی بڑی آزادی ہے جو انسان کو آئین خدا وندی کے تابع حاصل ہوتی ہے!

دِیْنٌ کے معنے عادت مستمرہ کے بھی آتے ہیں ۔ چنانچہ دِیْنٌ اس بارش کو بھی کہتے ہیں جو عادۃً ہمیشہ ایک جگہ آ کر برستی ہو* ۔ اس مفہوم میں بھی قانون اور ضابطہ کی شان جھلکتی ہے ۔ خارجی کائنات میں قوانین خدا وندی کو قوانین فطرت کہا جاتا ہے ۔ انسانوں کی دنیا میں خدا کا قانون وحی کے ذریعے (بوساطت حضرات انبیاء کرامؑ) ملتا ہے ۔ یہ قانون اپنی مکمل اور آخری شکل میں قرآن کریم کےاندر محفوظ ہے۔ اس کا نام اَلدِّیْنُ ہے ۔ اس کے مطابق عمل کرنے کو اَلْاِسْلَامُ کہتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں، نظام معاشرہ ۔ ضابطہ زندگی ۔ قانون حکومت آئین مملکت ۔ عدل وغیرہ کی مختلف اصطلاحات رائج ہیں لیکن قرآن کریم نے ان سب کی جگہ ایک جامع اصطلاح دی ہے ۔ اور وہ ہے الدین ۔ یہی ہمارے معاشرہ کا نظام ۔ ہماری زندگی کا ضابطہ ۔ ہماری حکومت کا قانون اور ہماری مملکت کا آئین ہے ۔ اس آئین کی رو سے، انسانوں کی آزادی اور پابندی کی حدود مقرر کرنے کا پورا اقتدار خدا کو حاصل ہوتا ہے ۔ کسی اور کو نہیں ہوتا ۔ اس لئے الدین میں اقتدار اعلٰی (Sovereignty) خدا کی ہوتی ہے ۔ اس کا یہ اقتدار اعلٰی اس کی کتاب (قرآن کریم) کے ذریعے بروئے کار آتا ہے ۔ اس لئے اسلامی مملکت میں عملاً اقتدار اعلٰی کتاب اللہ کو حاصل ہوتا ہے ۔ اسلامی مملکت، قرآنی اصولوں کو دنیا میں نافذ کرنے کا ذریعہ (Agency) ہوتی ہے ۔ اور چونکہ انسانی اعمال کے غلط اور صحیح ہونے کا معیار بھی یہی کتاب ہے، اس لئے جزا اور سزا (اعمال کے نتائج) بھی اس کی رو سے متعین ہوتے ہیں ۔ اس جہت سے دین کا یہ مفہوم (جزا و سزا) بھی عملاً سامنے آ جاتا ہے ۔ اسے نظام عدل کہا جائیگا جس کا دائرہ صرف عدالتی عدل تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے ۔ اسلامی مملکت کا کانسٹی ٹیوشن قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کا دوسرا نام ہے ۔ اس مملکت کا تمام کاروبار انہی اصولوں کی حدود کے اندر سر انجام پاتا ہے ۔ اور مقصود اس سے نظام عدل و توازن کا قائم رکھنا ہے ۔ اس کا نام الدین ہے ۔

---

* تاج ۔

لہذا، الدین سے مراد ہے خدا کا عطا کردہ نظام زندگی جو ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتا ہے اور جس کے مطابق ہمارے اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں ۔ جس دور میں انسان اپنے آپ کو اس نظام کے تابع لے آئینگے وہ تمام دوسرے انسانوں کی محکومی سے آزاد ہو کر صرف قوانین خداوندی کے محکوم ہونگے ۔اس لئے کہ ''مالک یوم الدین،، خدا کے سوا کوئی اور نہیں ۔ ہر وہ فیصلہ جو قوانین خداوندی کے مطابق ہوگا، دینی فیصلہ کہلائیگا اور عدل کے محکم اصول پر مبنی ہوگا ۔ سورۃ فاتحہ میں دیکھئے ۔ خدا کی صفت ربوبیت، رحمانیت اور رحیمیت کے ساتھ ہی اس کے نظام عدل و قانون (مالک یوم الدین) کا ذکر آگیا ہے ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کو سامان زیست اور اسباب نشو و نما تو بلا مزد و معاوضہ عطا کر دیئے ہیں لیکن انسانی مدارج کا تعین، ان کے اعمال کی رو سے ہوگا ۔ اس کا نام آئین و قوانین کے مطابق عدل کی زندگی ہے۔ اور یہ چیز حیوانیت سے آگے بڑھ کر، خاصہ انسانیت ہے ۔

مَدِیْنَۃٌ کے متعلق بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ لفظ دِیْنٌ کے اس مفہوم سے بنایا گیا ہے جسکا تعلق نظم و نسق سے ہے۔کیونکہ مَدِیْنَۃٌ وہی مرکزی مقام ہوتا ہے جو شہری نظم و نسق کے محاسن رکھتا ہو ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اطاعت کے مفہوم کے اعتبار سے وضع ہوا ہے کیونکہ مَدِیْنَۃٌ (شہر) میں قانون اور ضابطہ کی پابندی کرنی پڑتی ہے* ۔ صاحب کتاب الاشتقاق کے نزدیک یہ لفظ در اصل مَدْیِنَۃٌ تھا ، اور دِیْنٌ سے مشتق ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ دِیْنٌ کے بنیادی معنوں میں اطاعت پائی جاتی ہے اور شہر کو مَدِیْنَۃٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں حکومت کی اطاعت کی جاتی ہے ۔ اور قرض کو دَیْنٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں مقروض کو جھکنا پڑتا ہے ۔

دَیْنٌ ۔ قرضہ ۔ اور تَدَایُنٌ ۔ ایک دوسرے سے قرض کا معاملہ کرنا (۲/۲۸۲) ۔ دَیْنٌ اس قرضہ کو کہتے ہیں جسکی ادائیگی کیلئے مدت مقرر کر لی جائے ۔ جس قرض کیلئے مدت متعین نہ ہو وہ دَیْنٌ نہیں بلکہ قَرْضٌ کہلاتا ہے* ۔ محیط المحیط میں ، تاج کے قول کی تائید کے ساتھ ، یہ بھی لکھا ہے کہ عرف عام میں دَیْنٌ اس قرضے کو کہتے ہیں جو مدت معینہ کیلئے سود پر دیا جائے ۔ لیکن قرآن کریم نے چونکہ ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے اسلئے اسمیں مسلمانوں کے باہمی لین دین میں دَیْنٌ کا لفظ قرضہ بلا سود ہی کے لئے ہے (۲/۲۸۲) ۔

*تاج ۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اسلام کیلئے قرآن کریم نے دِیْنٌ کا لفظ استعمال کیا ہے جسکے معنے ضابطۂ حیات کے ہیں ۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۳/۱۸) ۔ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵/۳) ۔ یہی اَلدِّیْنُ ہے جسے دیگر نبی اکرمؐ کو بھیجا گیا تھا ۔ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ (۹/۳۳) ۔ نیز (۴۸/۲۸) "خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اس دین (نظام حیات) کو، دیگر تمام ادیان (نظام ھائے حیات) پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ چیز کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے"۔ مَذْهَبٌ کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا ۔ اسلئے اسلام کو مذہب نہیں کہنا چاہئے ۔ دِیْنٌ ھی کہنا چاہئے ۔ مَذْهَبٌ اس راستے کو کہتے ھیں جو انسانوں کا وضع کردہ ھو ۔ اور دِیْنٌ اس قانون یا نظام کو کہتے ھیں جو خدا کی طرف سے ملا ھو ۔ (مَذْهَبٌ کے معنے کیلئے دیکھئے عنوان ذ ۔ ھ ۔ ب) ۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب میں مختلف فرقے ہوتے ھیں لیکن دین میں فرقہ سازی کو شرک قرار دیا گیا ہے ۔ (۳۰/۳۲) ۔ جو دین خدا کی طرف سے ملا تھا وہ سب کے لئے ایک ھی تھا۔ اس میں مختلف فرقوں کا کیا سوال ؟ فرقے، مختلف انسانوں کے بنائے ہوئے راستے (مذہب) پر چلنے سے پیدا ہوتے ھیں۔ اقوام سابقہ کے پاس خدا کا دین (بوساطت حضرات انبیاء کرامؑ) آتا رہا لیکن انہوں نے اپنی آسمانی کتابوں کو ضائع کر کے، ان کی جگہ انسانوں کے تراشیدہ راستوں کو اختیار کر لیا ۔ اسطرح ان سے دین گم ھو گیا اور اس کی جگہ مذہب نے لے لی ۔ اللہ تعالیٰ نے دین کو اسکی اصلی شکل میں قرآن کریم میں عطا کر کے اسے محفوظ کر دیا ۔ یہی دین تھا جو اس مملکت کا آئین (Constitution) تھا جسے نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا تھا ۔ اس کے بعد، ھم نے، خدا کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور انسانوں کی دی ہوئی تعلیم کے پیچھے چل پڑے۔ اسطرح ھم نے بھی دین کی جگہ مذہب اختیار کر لیا ۔ اس نہج سے ھم بھی اقوام سابقہ کی سطح پر آ گئے ۔ لیکن ھم میں اور ان میں ایک فرق ہے ۔ ان کے پاس دین اپنی اصل شکل میں موجود نہیں اس لئے وہ اپنے مذہب کو خدا کے عطا کردہ دین سے بدل نہیں سکتے ۔ لیکن ھمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصل شکل میں موجود ہے اس لئے ھم جسوقت بھی چاھیں اپنے مروجہ مذاہب کو دین خداوندی سے بدل سکتے ھیں۔ (اسی طرح دیگر اقوام عالم بھی چاھیں تو اپنے اپنے مذہب کو چھوڑ کر، قرآن کریم میں دئے ہوئے دین کو اختیار کر سکتی ھیں) ۔ جب تک ھم ایسا نہیں کرتے، زندگی کی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

ذ

ذا

ذَا۔ یہ ۔ اس کا مونث ذِہٖ ۔ ذِہِ ۔ ذِھِی ۔ تَا ۔ تِی وغیرہ ھیں ۔ اس کا تثنیہ (دو کے لئے) ذَانِ اور ذَیْنِ ۔ (مونث کے لئے تَانِ ۔ تَیْنِ) آتا ھے ۔ اور جمع اُولَاءِ (دیکھئے عنوان اولاء) اس سے پہلے اکثر ھَا ملا ھوا ھوتا ھے ۔ جیسے ھٰذَا (اس کا مونث ھٰذِہٖ آتا ھے) یہ اشارہ قریب کےلئے ھے ۔ اشارہ بعید کے لئے ذٰلِکَ (مذکر) تِلْکَ (مونث)۔ اس کے آخر میں مخاطب کے مطابق ضمیر بدلتی رھتی ھے ۔ مثلاً ھمارا مخاطب ایک مرد ھے اور ھم اُس سے کہہ رھے ھیں کہ اُس چیز کو دیکھو ۔ تو ھم ذَالِکَ کہینگے ۔ اور اگر مخاطب دو مرد ھوں تو ذَالِکُمَا کہینگے۔ بہت سے ھوں تو ذَالِکُمْ ۔ اسی طرح اگر مخاطب ایک عورت ھو تو ذَالِکِ کہینگے ۔ اور بہت سی عورتیں ھوں تو ذَالِکُنَّ کہینگے ۔

ذَا کے مختلف استعمال یہ ھیں ۔ ذَاکَ ۔ ذَانِکَ ۔ (ھَاتَاکَ ۔ ھَاتِیْکَ) ۔ جمع کے لئے اُولَاکَ یا اُوْلٰئِکَ ۔ کبھی ذَاکَ کے درمیان ل ۔ لاکر ، ذَالِکَ (مونث کے لئے تِلْکَ) بنا لیتے ھیں ۔ اس سے پہلے کاف آنے سے کَذَالِکَ ھو جاتا ھے ۔ اس کے استعمال کی مثالیں یہ ھیں ۔

(۱) مَنْ ذَاالَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ ...... ($\frac{۲}{۲۵۵}$) ۔ وہ کون ھے جو اس کے ھاں کسی کے ساتھ کھڑا ھوسکے ۔

(۲) یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ .... ($\frac{۲}{۲۱۵}$) ۔ تجھ سے پوچھتے ھیں کہ وہ کیا ھے جسے کھلا رکھا جائے ۔

(۳) اِنْ ھٰذَانِ لَسَاحِرَانِ ... ($\frac{۲۰}{۶۳}$) ۔ یہ تو بس دو جادوگر ھیں ۔

(۴) ذَالِکَ الْکِتَابُ ... ($\frac{۲}{۲}$) ۔ یہ وہ کتاب ھے ... تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ ($\frac{۲}{۱۳۴}$) یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی ۔

(ہ) فَذَانِکَ بُرْهَانٰنِ . . . (۲۸/۳۲) ۔ یہ دونوں روشن دلیلیں ہیں۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ذَالِکَ اشارہ بعید (وہ) ہے لیکن یہ اشارہ قریب (یہ) کے لئے بھی آتا ہے۔ قرآن کریم میں ذَالِکَ اشارہ قریب (یہ) کے لئے زیادہ اور اشارہ بعید (وہ) کے لئے کم آیا ہے ۔ مثلاً سورۃ روم میں فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ۔ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ کے بعد ہے ذَالِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (۳۰/۳۰) ۔ یہی دین قیم ہے ۔ یا مثلاً سورۃ بنی اسرائیل میں ماپ تول کے متعلق ضروری ہدایت کے بعد فرمایا ذَالِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (۱۷/۳۵) ''یہ بہتر اور انجام کار بہت خوبی کی بات ہے'' ۔ ان مقامات میں ذَالِکَ اشارہ قریب کے لئے ہے ۔

اس کے برعکس سورۃ کہف میں جہاں حضرت موسیٰؑ کے ایک سفر کا ذکر ہے۔ وہاں (اس مقام پر جہاں آپ کا ساتھی مچھلی پیچھے بھول آیا تھا) کہا کہ ذَالِکَ مَا کُنَّا نَبْغِ (۱۸/۶۴) ''وہی توجگہ تھی جسکی ہمیں تلاش تھی'' ۔ یہاں ذَالِکَ اشارہ بعید کے لئے ہے ۔

راغب نے کہا ہے کہ ذَالِکَ آتا تو ہے بعید کے لئے لیکن اس سے بُعدِ مسافت ہی مراد نہیں ۔ جو شے بلندیٔ مرتبت کی وجہ سے اونچے مقام پر ہو اور یوں دور ہو ، اس کے لئے بھی ذَالِکَ آتا ہے خواہ وہ چیز ویسے قریب ہی رکھی ہو ۔ اسی اعتبار سے ذَالِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْهِ (۲/۲) کے معنے ہونگے یہ کتاب جو بڑی باعظمت اور رفیعُ الشان ہے

ذَالْکِفْل

قرآن کریم نے آپ کا نام انبیاء کرامؑ کے سلسلہ میں لیا ہے (۲۱/۸۵ و ۳۸/۴۸) لیکن مزید تعارف نہیں کرایا ۔ قیاس یہ ہے کہ آپ حزقی ایل نبی ہیں جن کا صحیفہ تورات میں موجود ہے ۔ (نیز دیکھئے عنوان ک ۔ ف ۔ ل)

ذَالنُّوْن

حضرت یونسؑ کا لقب ہے (۲۱/۸۷)۔ تفصیل کےلئے دیکھئے عنوان ''یونس'' اور ''نون'' ۔

ذ أ ب

اَلذِّئْبُ ۔ بھیڑیا (۱۲/۱۳) ۔ اَلذَّاْبُ ۔ ڈرانا۔ مذمت کرنا ۔ سخت آواز*۔ بدزبانی ۔ ذَاَبَ الرَّجُلُ ۔ آدمی زور سے چیخا**۔ ابن فارس نے کہا ہے

* تاج ۔ **محیط ۔

کہ اس کے بنیادی معنے کم ٹھہرنا ، بے قراری ہیں ۔ نیز کسی چیز کی ایسی حرکت جو ایک سمت سے نہ ہو۔ مثلاً تَذَاءَبَتِ الرِّیحُ کے معنی ہیں ہوا ہر طرف سے آئی ۔ بھیڑیے کو ذِئبٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ کبھی ایک طرف سے آتا ہے کبھی دوسری طرف سے ۔

ذ أ م

ذَأَمَهٗ ۔ یَذْاَمُهٗ ۔ کسی کو حقیر و مذموم گرداننا ۔ نیز اسکے معنے عیب لگانے ، رسوا کرنے ، کے آتے ہیں ۔ کسی کو جھڑک کر نکال دینے کے بھی* ۔ راغب نے مَذْؤُم بمعنی مَذْمُوْم لکھا ہے ۔

آذْاَمَهٗ ۔ اسے مرعوب و خوفزدہ کر دیا* ۔

قرآن کریم میں ابلیس کے متعلق ہے ۔ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَدْحُوْرًا (۷/۱۸) ۔ اسکے معنے ذلیل اور حقیر ہی کے ہیں ۔ یا جھڑک کر نکالے ہوئے کے ۔

ذ ب ب

ذُبَابٌ ۔ مکھیاں ۔ واحد ذُبَابَةٌ ۔ صاحب محیط نے جاحظ کے حوالے سے لکھا ہے کہ (عام مکھیوں کی جملہ اقسام کے علاوہ) عربوں کے ہاں ذُبَابٌ کا اطلاق ہر قسم کی بھڑوں، شہد کی مکھیوں اور مچھروں پر بھی ہوتا ہے** ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا (۲۲/۷۳) ۔''وہ مکھی بھی نہیں پیدا کر سکینگے'' ۔ مکھیوں کو ذُبَابٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہیں ہٹایا اور دور کیا جاتا ہے ۔ یا اس وجہ سے کہ انہیں ایک جگہ قرار نہیں ہوتا ۔ اس مادہ میں یہ دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی اضطراب و حرکت کے بھی ہیں ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلذَّبْذَبَةُ معلق شے کے ہلنے کی آواز کو کہتے ہیں ۔ پھر، یہ لفظ ہر حرکت و اضطراب (ترددا ور ڈھلمل یقینی) کے لئے آتا ہے*** ۔ بَعِیْرٌ ذَابٌّ ۔ اُس اونٹ کو کہتے ہیں جو ایک جگہ پر کھڑا نہ رہے**** ۔

ذَبْذَبَةٌ ۔ اگرچہ یہ لفظ ذ ب ذ ب کے تحت آنا چاہئے لیکن بعض اہل لغت نے اسے ذ ب ب کے تحت لکھا ہے ۔ ہر دو میں اشتراک معنی کی وجہ سے ہم بھی اسے یہاں (ذ ب ب کے تحت) درج کر رہے ہیں ۔ قرآن کریم میں منافقین کے متعلق کہا ہے مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذَالِکَ (۴/۱۴۳) اور

---

*تاج و محیط ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****تاج ۔

اسکی تشریح یہ کہکر کر دی ہے۔ لَا اِلٰی هٰؤُلَاءِ وَلَا اِلٰی هٰؤُلَاءِ (۴/۱۴۳)۔ نہ یکسو ہو کر ادھر کے اور نہ ہی یکسو ہو کر اُدھر کے۔ انہی کے متعلق ہے مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ (۲۲/۱۱)۔ جو کنارے پر کھڑے ہو کر (Sitting on the Fence) قوانین خدا وندی کی اطاعت کرے۔ ادھر فائدہ دیکھا تو ادھر جھک گئے۔ اُدھر دیکھا تو اُدھر جھک گئے۔ مکھی کی طرح، کہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ جہاں وہ بیٹھی ہے اسکے بعد اڑ کر کہاں جا بیٹھیگی۔ یہ کیفیت، ایمان اور یقین کی یکسر نقیض ہے۔ ایمان کی کیفیت تو یہ ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (۴۱/۳۰)۔ ایک مرتبہ خدا کی ربوبیت کا اقرار کر لیا تو پھر اس پر جم کر بیٹھ گئے۔ ایمان اور استقامت، یہ ہے مومن کا شعار۔ برعکس منافق کے جو موقع پرست (Opportunist) ہوتا ہے۔

ذ ب ح

ذَبَحَ۔ یَذْبَحُ۔ اندر کی طرف سے سر اور گردن کے جوڑ سے حلق کاٹ دینا۔ چیر دینا۔ پھاڑ دینا۔ شق کر دینا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ ذَبَحَتْهُ الْعَبْرَةُ۔ آنسوؤں نے اسکا گلا گھونٹ دیا۔ اَلتَّذْبِیْحُ۔ بہت زیادہ ذبح کرنا۔ سر کو اسقدر جھکا دینا کہ وہ کمر سے نیچا ہو جائے۔ اَلذِّبْحُ۔ وہ چیز جو ذبح کی جائے*۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ قوم فرعون یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ (۲/۴۹ و دیگر مقامات)۔ ”تمہارے ابناء کو ذبح کر دیتے تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے،،۔ عام طور پر اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جو لڑکے پیدا ہوں انہیں پیدا ہوتے ہی مار دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے۔ سوال یہ ہے کہ یُذَبِّحُوْنَ سے مراد سچ مچ ذبح کر دینا ہے یا اسکے معنے کچھ اور بھی ہیں۔ سورۃ اعراف میں یُذَبِّحُوْنَ کی جگہ یُقَتِّلُوْنَ آیا ہے (۷/۱۴۱)۔ یعنے وہ تمہارے ابناء کو قتل کر ڈالتے تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے اس باب میں ذَبْحٌ اور قَتْلٌ کو مرادف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ قَتْلٌ کے معنے کیا ہیں۔ اس لفظ کے متعلق عنوان ق۔ ت۔ ل میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ وہاں آپ دیکھینگے کہ اسکے

* تاج۔

معنے صرف مار ڈالنا نہیں بلکہ اسکے معنے ذلیل وخوار کرنا۔ کسی کو کمزور اور غیر مؤثر کر دینا ۔ ایسا بنا دینا کہ اسکی موجودگی اور عدم موجودگی برابر ہو۔ کسی کو حقیر کر دینا، بھی ھیں ۔ نیز اسکے معنے کسی کو علم و تربیت سے محروم رکھنا بھی ھیں ۔ (ان معانی کی اسناد ق ۔ ت ۔ ل کے عنوان میں ملینگی) ۔ قرائن سے مترشح ھوتا ھے کہ بنی اسرائیل کے معاملہ میں ذَبْح یا قَتْل سے مراد سچ مچ قتل کر دینا نہیں بلکہ انہیں ذلیل و حقیر کرنا اور کمزور و غیر مؤثر بنا دینا ھیں ۔ سچ مچ قتل کر دینے کے خلاف حسب ذیل قرائن ھیں ۔

(۱) یہ ظاھر ھے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل کی قوم کی تعدادؔ بہت بڑی تھی ۔ اگر کسی قوم کی حالت یہ ھوجائےؔ کہ اسکے تمام لڑکے مار دئیے جائیں اور صرف لڑکیاں زندہ رکھی جائیں تو کچھ وقت کے بعد وہ قوم ھی ختم ھو جائیگی* ۔

(۲) حضرت موسیٰؑ کے بڑے بھائی (حضرت ھارونؑ) بھی زندہ موجود تھے ۔ اور حضرت موسیٰؑ بھی پیدا ھوتے ھی مار نہیں ڈالے گئے تھے ۔ اس سے بھی ظاھر ھے کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ھوتے ھی مار نہیں دیا کرتے تھے ۔

(۳) سورۃ یونس میں ھے کہ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ (۱۰/۸۳) ''موسیٰ پر اسکی قوم کی ذُرِّيَّتْ ایمان لائی'' ۔ ذریت نئی پود (یا نو جوانوں) کو کہتے ھیں ۔ (دیکھئے ذ ۔ ر ۔ ر)۔ اگر بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ھوتے ھی مار دیا کرتے تو یہ ذریت موجود ھی نہ ھوتی ۔ (قوم کے نو جوانوں کے ایمان لانے کی وجہ سمجھنے کے لئے عنوان ذ ۔ ر ۔ ر ۔ دیکھئے) ۔

(۴) جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس آئے ھیں تو اسنے کہا کہ ھم نے تیری پرورش کی اور تجھ پر اسقدر احسانات کئے اور تو ان احسانات کا یہ بدلہ دے رھا ھے ۔ تو اسکے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶/۲۲) ۔ ''یہ وہ نعمت ھے جسے تو مجھ پر جتاتا ھے کہ تونے بنی اسرائیل کو غلام (محکوم) بنا رکھا ھے'' ۔ آپ دیکھئے ۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے خلاف جو الزام عائد کیا ھے وہ بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے کا ھے ۔ اگر وہ ان کے لڑکوں کو قتل کرنے کا مجرم بھی ھوتا تو آپ سب سے پہلے اسکا ذکر

* بعض تفاسیر میں ھے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے نوے ھزار بچوں کو قتل کیا تھا ۔

کرے۔ کیونکہ یہ جرم، قوم کو غلام (محکوم) بنانے سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ لیکن آپ سارے قرآن کریم میں دیکھ جائیے۔ حضرت موسیٰؑ نے کسی جگہ بھی فرعون اور اسکی قوم کو اس جرم سے مطعون نہیں کیا۔

ان شواهد سے ظاہر ہے کہ فرعون اور اسکی قوم بنی اسرائیل کے بچوں کو سچ مچ ذبح نہیں کیا کرتے تھے۔ یعنے انہیں مار نہیں ڈالا کرتے تھے۔ کہا جائیگا کہ اگر یہ بات نہیں تھی تو پھر حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے (خدا کے حکم سے) حضرت موسیٰؑ کو صندوق میں ڈالکر دریا میں کیوں بہا دیا تھا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اسوقت بنی اسرائیل کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو محفوظ رکھنے کیلئے یہ تدبیر کی تھی۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ خود قرآن کریم میں اسکی تصریح موجود ہے کہ فرعون نے یہ حکم (کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کر دیا جائے*) اُسوقت دیا تھا جب حضرت موسیٰؑ اپنی دعوتِ انقلاب لیکر آئے ھیں۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی انقلابی دعوت کا عالمگیر اثر دیکھکر فرعون کے امیروں اور وزیروں نے فرعون سے کہا کہ انکے خلاف کوئی سخت اقدام کیوں نہیں کیا جاتا؟ انہیں اسطرح کھلی چھٹی کیوں دے رکھی ہے کہ یہ جو جی میں آئے کرتے جائیں؟ اسکے جواب میں فرعون نے کہا کہ نہیں! میرے سامنے ایک تجویز ہے۔ اور وہ یہ کہ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَ هُمْ وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَ هُمْ (۷/۱۲۷)۔ "عنقریب ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دینگے اور انکی عورتوں کو زندہ رکھینگے"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تدبیر اسوقت عمل میں لائی گئی تھی جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت پھیلی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت یہ حکم موجود نہیں تھا۔ سورۃ المومن میں اسے اور بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ وھاں کہا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس دعوت لیکر گئے تو اسنے کہا کہ اُقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْیُوْا نِسَآءَ هُمْ (۴۰/۲۵)۔ "جو لوگ موسیٰؑ پر ایمان لائیں انکے بیٹوں کو قتل کر دو اور انکی عورتوں کو زندہ رکھو"۔ اس سے نہ صرف یہی واضح ہے کہ یہ حکم دعوت حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں دیا گیا تھا بلکہ یہ بھی کہ یہ

*جبتک ان الفاظ کا صحیح مفہوم آگے جا کر واضح نہیں ہو جاتا ہم یہی الفاظ لکھتے جائینگے۔ یعنے بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کرنے کا حکم وغیرہ۔

حکم تمام بنی اسرائیل کیلئے نہیں تھا ۔ صرف ان کے متعلق تھا جو حضرت موسٰیؑ پر ایمان لائے تھے* ۔

ان شواھد سے واضح ھے کہ حضرت موسٰیؑ کی پیدائش کے وقت یہ حکم نافذ نہیں تھا ۔ لہذا جب یہ حکم ھی نہ تھا تو یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ حضرت موسٰیؑ کو اسلئے دریا میں بہا دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس تدبیر سے زندہ رکھنا چاھتا تھا ۔

حضرت موسٰیؑ کو دریا میں کیوں بہا دیا گیا تھا ۔ اسکا جواب خود قرآن کریم نے دیا ھے۔ یہ ظاھر ھےکہ بنی اسرائیل مصر میں حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں داخل ھوئے تھے۔ اور حضرت یوسفؑ کو جو وقار مصر میں حاصل تھا اس پر قرآن کریم شاھد ھے ۔ مملکت کے خزانے کی چابیاں ان کے ھاتھ میں تھیں ۔ اس قوم کا وقار حضرت یوسفؑ کے بعد بھی کچھ عرصہ تک باقی رھا ھوگا۔ لیکن اسکے بعد حاکم قوم نے بنی اسرائیل کو محکوم قوم کا درجہ دیدیا ھوگا۔ اگرچہ آج بھی دنیا میں محکوم قوموں کی کوئی حیثیت نہیں ھوتی لیکن اُس زمانے میں تو محکوم قوم کی حیثیت غلاموں کی سی ھوتی تھی۔ نہ اُنکے بچوں کیلئے تعلیم و تربیت کے کوئی مواقع ھوتے تھے، نہ بڑوں کیلئے حکومت کے کاروبار میں عمل دخل کی کوئی صورت۔ مشیت کے پروگرام کے مطابق حضرت موسٰیؑ کو فرعون کے ساتھ ٹکر لینے کیلئے پیدا کیا گیا تھا ۔ اس مقصد کیلئے ضروری تھا کہ انکی تعلیم و تربیت بھی اعلیٰ درجہ کی ھوتی اور انہیں رموز مملکت اور غوامض سیاست سمجھنے کے بھی مواقع حاصل ھوتے ۔ اس مقصد کیلئے تجویز یہ کیا گیا کہ انکی پرورش خود فرعون کے محلات میں ھو اور انکا ابتدائی زمانہ فرعون کے متبنٰی کی حیثیت سے گزرے۔
یہ تھا وہ مقصد جس کیلئے انہیں دریا میں بہا کر فرعون کے محلات تک پہنچایا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ھے کہ یہ اس لئے کیا گیا تھا لِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ (۲۰/۳۹) ''تا کہ تیری تربیت ھماری زیر نگرانی ھو''۔ یعنے اس سے مقصد حسن تربیت تھا (جس پر بنی اسرائیل کے بچوں کے دروازے بند تھے)۔ اور یہ اس پروگرام کی ایک کڑی تھی جسکے مطابق حضرت موسٰیؑ کو اس مہم کیلئے تیار کیا جا رھا تھا ۔ چنانچہ اس سے ذرا آگے ھے ۔ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی (۲۰/۴۰)۔ ''اسطرح آھستہ آھستہ تم، اے موسٰی، ھمارے پیمانے پر پورے اتر آئے''۔

---

*یہ بات آگےچلکر بتائی جائیگی کہ جو لوگ حضرت موسٰیؑ پر ایمان لائے تھے انکے خلاف تو فرعون نے کچھ نہیں کیا ۔ انکے بیٹوں کو قتل کرنے کا حکم کیوں دیا؟ اُن بچوں کا کیا قصور تھا؟ ۔

سورۃ القصص میں البتہ یہ مذکور ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی ماں سے کہا گیا کہ أَرْضِعِيهِ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ (۲۸/۷) - ''تو اس بچہ کو دودھ پلاتی رہ - اور جب تجھے اسکے متعلق خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا'' - اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ خوف اس بات کا تھا کہ فرعون کے لوگ بچے کو قتل کر دینگے - لیکن جب قرآنی شواہد سے یہ ظاہر ہے کہ قتل ابناء کا حکم حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے زمانے کا ہے تو اس سے یہ اندازہ صحیح نہیں ہو سکتا - اس خوف کا باعث کچھ اور سمجھنا ہوگا - اس سے آگے فرعون کی بیوی کے متعلق کہا ہے کہ جب فرعون کے لوگوں نے صندوق پکڑلیا تو اسنے اپنے خاوند سے کہا کہ لَا تَقْتُلُوهُ (۲۸/۹) ''اسے قتل نہ کرو'' - اسے ہم متبنٰی بنا لیتے ہیں - اس سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کیا جاتا تھا - لیکن یہ قیاس اس لئے صحیح نہیں کہ اس بچے کے متعلق (جسے دریا کی لہروں سے اٹھایا گیا تھا) یہ کسطرح معلوم ہو گیا کہ وہ بنی اسرائیل کی قوم کا بچہ ہے نہ قوم فرعون میں سے کسی کا بچہ نہیں - لہذا یہاں لَا تَقْتُلُوهُ کے معنے قتل کرنا نہیں ہونگے بلکہ حقیر سمجھکر پھینک دینے کے ہونگے - (دیکھئے عنوان ق - ت - ل) -

اسکے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَهُمْ کا صحیح مفہوم کیا ہے - یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ فیصلہ اُس زمانے کا ہے جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت عام ہورہی تھی اور فرعون اور اس کی قوم کو اس سے خطرہ لاحق ہو رہا تھا - چنانچہ فرعون کے ارباب حل و عقد نے اس سے کہا تھا کہ اس فتنے کو کب تک اس طرح کھلا رہنے دیا جائیگا - اس کا کچھ علاج کرنا چاہئے (۷/۱۲۷) تو اسکے جواب میں اس نے کہا تھا کہ اس کےمتعلق میں نے ایک تجویز سوچ لی ہے - ہم اس پر عمل پیرا ہونگے - اور وہ تجویز یہی (قتل ابناء کی) تھی - چنانچہ قرآن کریم نے اس تجویز کو كَيْدٌ (۴۰/۲۵) سے تعبیر کیا ہے ، جس کے معنے ہیں ایک گہری چال - یہ چال کیا تھی؟ فرعون کے متعلق سورۃ قصص میں ہے کہ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ (۲۸/۴) - ''وہ اپنی رعایا میں پارٹیاں بناتا رہتا تھا اور ایک گروہ کو کمزور کرتا جاتا تھا'' - اس کے بعد ہے يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ (۲۸/۴) - یعنے ان کے أَبْنَاءَ کو ذبح کرتا تھا اور نِسَاءَ کو زندہ رکھتا تھا - اس کی تدبیر یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو پارٹیوں میں تقسیم

کر دیا جائے تاکہ اُس قوم میں پھوٹ پڑی رہے اور وہ باہمی آویزشوں میں الجھی رہے ۔ یہ وہ چال ہے جو ہر سیاستدان حکمران قوم، قومِ محکوم کے ساتھ کرتی رہتی ہے ۔ اس کے بعد قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اِس پارٹی بازی میں وہ کرتا یہ تھا کہ قوم کا وہ طبقہ جس میں اسے جوہرِ مردانگی نظر آتے ۔ جن کے متعلق وہ سمجھتا کہ اُن کا اُبھرنا خطرناک ہے ۔ انہیں دبانا ۔ اُنہیں ہر طرح حقیر و ذلیل رکھتا ۔ اور جس طبقہ کو دیکھتا کہ وہ مرد نہیں بلکہ عورتوں جیسے ہیں، اُنہیں ابھار کر معزز و مقرب بنا لیتا اور ان کے ہاتھوں انہی کی قوم کا گلا گھونٹتا رہتا ۔ یہ کچھ بھی ہر ماہرِ سیاست حاکم قوم کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ محکوم قوم کے ان افراد کو ذلیل و خوار رکھتی ہے جن میں انہیں جوہر مردانگی نظر آتے ہیں اور ان لوگوں کو جن سے کسی خطرہ کا امکان نہ ہو، آگے بڑھاتی رہتی ہے ۔ قرآن کریم نے اول الذکر طبقہ کو قوم کے اَبْنَاء کہا ہے اور ثانی الذکر کو نِسَاء ۔ اور قَتْلِ اَبْنَاء سے مراد ہے انہیں ذلیل و حقیر رکھنا ۔ اور اِسْتِحْیَاءِ نِسَاء سے مفہوم ہے اس دوسرے طبقہ کو ابھار کر آگے بڑھانا ۔ اس طرح وہ پوری کی پوری قومِ بنی اسرائیل کو کمزور کئے جا رہا تھا ۔

قرآن کریم کے شواہد سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ قَتْل یا ذَبْحِ اَبْنَاء سے یہی مراد ہے ۔ لیکن بہر حال یہ ایک اندازہ ہے جس پر مزید غور کیا جا سکتا ہے ۔ اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ فرعون کے اس حکم کا مطلب کیا تھا کہ جو لوگ موسیٰ پر ایمان لائے ہیں ان کے اَبْنَاء کو قتل کر دیا جائے (۲۵/۴۰) ۔ یعنے اس کی تدبیر یہ تھی کہ اس جماعت میں اس طرح سے پھوٹ ڈالی جائے کہ ان کی پارٹیاں بنا دی جائیں اور اس طرح ان میں جتنے لوگ ایسے ہیں جن سے خطرہ ہوسکتا ہے انہیں ایسا غیر موثر بنا دیا جائے کہ کوئی ان کی بات ہی نہ سنے (قَتْل کے یہ معنے عنوان ق ۔ ت ۔ ل میں دیکھئے) ۔ ورنہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایمان تو لائیں یہ لوگ، اور حکم یہ دیا جائے کہ ان کے پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کر دیا جائے ۔ حالانکہ دوسری طرف جب دربارِ فرعون کے ساحرین ایمان لائے ہیں تو اس نے ان ہی کے متعلق حکم دیا تھا کہ انہیں سولی پر لٹکا دیا جائے ۔ نہ یہ کہ ان کے بچوں کو قتل کر دیا جائے ۔

بہر حال، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ۔ قرآنی شواہد سے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ ذَبْحِ اَبْنَاء اور اِسْتِحْیَاءِ نِسَاء کے الفاظ استعارۃً استعمال ہوئے ہیں ۔ سچ مچ ذبح کر دینے کے معنوں میں استعمال

نہیں ہوئے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے، یہ ہمارا قیاس ہے جس کے دلائل اوپر دئے گئے ہیں ۔ اگر ان دلائل کو قوی نہ سمجھا جائے تو ذَبْح اَبْنَآء کو حقیقی معنوں میں لیا جائیگا ۔ یعنی فرعون، بنی اسرائیل کے لڑکوں کو سچ مچ ذبح کر دیا کرتا تھا ۔ اسوقت تک مصر کی قدیم تاریخ سے جسقدر پردے اٹھے ہیں ان میں بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کر دینے کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا ۔ ممکن ہے جب تاریخ کے مزید اوراق سامنے آئیں تو ان میں اس کے متعلق کوئی ذکر ہو ۔ اسوقت تک صرف تورات میں یہ ملتا ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں کو مار ڈالنے کا حکم دے رکھا تھا (کتاب خروج) لیکن تاریخی نقطہ نگاہ سے موجودہ تورات کی جو حیثیت ہے وہ ارباب علم سے پوشیدہ نہیں ۔

سورۃ مائدہ میں ان جانوروں کو جو بتوں کے استھانوں پر قربانی دئے جاتے تھے مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (۵/۳) کہا ہے ۔

سورۃ صٰفّٰت میں حضرت ابراهیمؑ اور اسمعیلؑ کے تذکار جلیلہ میں ہے کہ جب حضرت ابراهیمؑ اپنے بیٹے کو (اپنے خیال کے مطابق) ہماری راہ میں قربان کرنے اور حضرت اسماعیلؑ اپنے آپکو اسطرح قربان کر دینے کیلئے تیار ہو گئے تو ہم نے انہیں آواز دیکر اس سے روک دیا اور وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (۳۷/۱۰۷) ۔ ''اسماعیل کو ایک ذبح عظیم کے بدلے میں بچا لیا،،۔ جیسا کہ قرآن کریم کے متعدد مقامات سے واضح ہے، اس ذبح عظیم سے مراد یہ ہے کہ انہیں شام کے سر سبز و شاداب علاقہ کی سرداری کی بجائے عرب کی بے برگ و گیاہ سر زمین میں خانۂ کعبہ کی تولیت کیلئے متعین کر دیا ۔ یہ وہ قربانی تھی جو ساری عمر کیلئے تھی ۔ نہ صرف اپنی ساری عمر کے لئے بلکہ اپنی آنے والی نسل کی بھی قربانی ۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ (۳۷/۱۰۸) اسلئے یہ ذبح عظیم تھی ۔ یعنی بہت بڑی قربانی ۔ (مزید تفصیل میری کتاب ''جوئے نور،، میں ملیگی ۔ اور بنی اسرائیل کے حالات ''برق طور،، میں) ۔

ذ خ ر

ذَخَرَ ۔ يَذْخَرُ ۔ کسی چیز کو لے لینا ۔ اپنا لینا ۔ کسی چیز کو اسلئے چھپا رکھنا کہ وہ بوقت ضرورت کام آئے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو محفوظ رکھنے کی غرض سے سمیٹ لینا ۔ إِدَّخَرَ إِدِّخَارًا باب افتعال سے بمعنی ذَخَرَ ہی ہے۔ (إِدِّخَارًا اصل میں

اِدّخارًا تھا) ۔ اَلمُدَّخِرُ ۔ اس گھوڑے کو کہتے ھیں جو دوڑنے میں اپنی پوری طاقت خرچ نہ کرے بلکہ کچھ طاقت بچا رکھے* ۔ اَلْذاخِرُ فربه ۔ موٹا** ۔

سورۃ آل عمران میں ھے مَاتَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ (۳/۴۸)۔ اسکے معنے ذخیرہ کرنے کے ھیں۔ معلوم ھوتا ھے کہ حضرت مسیح[۴] (خدا کے ایک سچے داعیِ انقلاب ھونے کی وجہ سے) یہودیوں کی ذخیرہ اندوزی (Hoarding) سے نالاں تھے۔ اس میں اسی کی طرف اشارہ ھے ۔

ذ ر أ

ذَرَاَ الْاَرْضَ ۔ زمین میں بیج ڈال دیا* ۔ ذَرَاَ اللّٰهُ الْخَلْقَ ۔ اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا اور اسے بڑھایا ۔ کثیر کر دیا* ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ھے ۔ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ (۴۲/۱۱) ۔ ”وہ اسطرح تمہیں بڑھاتا اور پھیلاتا رھتا ھے،، ۔ سورۃ المومنون میں ھے هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۳/۷۹) ۔ ”وھی ھے جس نے تمہیں زمین میں بڑھایا اور پھیلایا ھے،، ۔

ذُرِّيَّةٌ کے متعلق بعض کا خیال ھے کہ یہ ذَرَاَ سے مشتق ھے ۔ لیکن بعض کے نزدیک یہ ذَرٌّ سے مشتق ھے ۔ ھم نے اسے (ذ ۔ ر ۔ ر) کے نیچے لکھا ھے ۔

ذ ر ر

اَلذَّرُّ ۔ بہت چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں ۔ نیز وہ چھوٹے چھوٹے ذرات جو دھوپ میں منتشر نظر آتے ھیں ۔ اَلذَّرُّ کا واحد ذَرَّةٌ ھے ۔ نہایت چھوٹی اور کم وزن چیز کو بھی اسی جہت سے ذَرَّةٌ کہا جاتا ھے ۔ سورۃ زلزال میں مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (۹۹/۷) آیا ھے ۔ ذرہ کے وزن برابر ۔ یعنے خفیف سے خفیف ۔ ذَرَّ ۔ کسی چیز کو چھڑکنا ۔ متفرق کرنا ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی باریکی اور انتشار ھوتے ھیں ۔ ذَرَّالْمِلْحَ عَلَى اللَّحْمِ ۔ اسنے گوشت پر نمک چھڑکا ۔ ذَرَّالْحَبَّ فِي الْاَرْضِ ۔ اسنے زمین میں بیج بکھیر دیا* ۔

اَلذُّرِّيَّةُ ۔ اَلذِّرِّيَّةُ ۔ آدمی کی اولاد اور نسل، خواہ نر ھو یا مادہ ۔ لیکن کبھی اسکا اطلاق انسان کے والدین اور آبا و اجداد پر بھی ھوتا ھے ۔ یعنی یہ لفظ اضداد میں سے ھے* ۔ (اس کے متعلق ذرا آگے چل کر لکھا جائیگا) ۔

*تاج ۔ **محیط ۔

راغب نے کہا ہے کہ اسکے اصلی معنے تو چھوٹے بچے ھیں لیکن یہ کبھی چھوٹے اور بڑے سب بچوں پر بولا جاتا ہے ۔ یہ لفظ ہے تو جمع ھی کیلئے لیکن پھر واحد اور جمع سب کیلئے یکساں آتا ہے ۔ بعض کے نزدیک ذُرِّیَّةٌ کا مادہ ذرأ ہے ۔ جسکے معنے پیدا کرنے اور بڑھانے کے ھیں ۔ (لین) ۔

ذَرَّ الْبَقْلُ ۔ سبزی پھوٹی* ۔

قرآن کریم میں ذُرِّیَّةٌ بمعنے اولاد اور نسل (۲/۱۲۴) میں آیا ہے ۔ سورۃ یٰسین میں جہاں کہا ہے کہ اِنَّا حَمَلْنَا ذُرِّیَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ (۳۶/۴۱)۔ ”ھم نے ان کی ذریت کو کشتی میں سوار کیا“ ۔ تو وھاں ذریت کے معنے (اس نسل کے) چھوٹے بڑے سب ھیں ۔ اس آیت (۳۶/۴۱) ھی کی وجہ سے اھل لغت نے الذُّرِّیَّةُ میں اولاد اور آباء کے معنی تسلیم کئے ھیں اور اسی بناء پر یہ لفظ اضداد میں مانا گیا ہے، لیکن قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ھوتا ہے کہ یہ لفظ کہیں بھی آباء کے لئے نہیں بولا گیا بلکہ آباء کے بالمقابل اولاد کے لئے ھی استعمال ھوا ہے (۶/۸۸)۔ مذکورۃ الصدر آیت (۳۶/۴۱) میں بھی یہ بات صاف ھو جاتی ہے کہ ذُرِّیَّةٌ اولاد ھی کے لئے ہے، جبکہ ھم الفُلْکِ اَلْمَشْحُوْن سے مراد حضرت نوحؑ کی ایک معین کشتی لیں جو وحی کے ذریعہ بنوائی گئی تھی اور ذریتھم سے مراد اُس زمانہ کے انسانوں کی نسل لی جائے ۔ اس طرح اس لفظ میں متضاد معانی باقی نہیں رھینگے ۔

سورۃ یونس میں ہے فَمَا اٰمَنَ لِمُوْسٰی اِلَّا ذُرِّیَّةٌ مِنْ قَوْمِہٖ (۱۰/۸۳) ۔ بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنے ھیں بہت تھوڑے لوگوں نے*** ۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنے ھیں اسکی قوم کے نوجوان**** ۔ ھمارے نزدیک دوسرے معنے زیادہ واضح ھیں ۔ انقلاب آفرین پیغام پر، ابھرنے والی نسلیں جلدی ایمان لاتی ھیں ۔ پرانے لوگ اپنے قدیم معتقدات اور عادات و خصائل میں پختہ ھو چکے ھوتے ھیں ۔ نیز بڑھاپے کی وجہ سے ان میں اپنے اندر نئی تبدیلی پیدا کرنے، یا نئے ماحول سے مطابقت، کی ھمت بہت کم ھوتی ہے ۔ یہ قوم کا نوجوان طبقہ ھوتا ہے جو ظلم و استبداد کے علی الرغم، کسی قسم کا خوف نہ کرتے ھوئے، دعوت انقلاب پر لبیک کہتا اور حالات کی تلاطم انگیزیوں سے نبرد آزما ھوتا ہے ۔ (نیز دیکھئے عنوان ذ ۔ ب ۔ ح) ۔

*تاج و محیط ۔ **راغب ۔ ***ابن عباس ۔ ****ابو الکلام آزاد مرحوم ۔

ذ ر ع

اَلذِّرَاعُ۔ ھاتھ کا کہنی سے لیکر درمیانی انگلی کے آخر تک کا حصہ۔ کلائی کے لئے بھی بولا جاتا ہے، نیز ایک پیمانہ جس سے ناپا جاتا ہے*۔ سورۃ کہف میں ہے وَ کَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ (۱۸/۱۸)۔ "ان کا کتا اپنے دونوں ھاتھ (یعنی اگلی ٹانگیں) بچھائے ہوئے تھا"۔ ذَرْعُهٗ كَذَا۔ اسکا طول اسقدر ہے**۔ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا (۶۹/۳۲)۔ "اسکی پیمائش ستّر ھاتھ ہے"۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ھیں کسی چیز کا لمبا ہونا اور آگے کیطرف حرکت کرنا۔ مَالِيْ بِهٖ ذَرْعٌ۔ مجھے اسکی دسترس نہیں*۔ ضِقْتُ بِهٖ ذَرْعًا۔ کسی کام کی دسترس نہ رکھنا۔ سورۃ ھود میں حضرت لوطؑ کے متعلق ہے ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا۔ (۱۱/۷۷)۔ اسنے ان کے معاملہ میں اپنے آپکو کوتاہ دست پایا۔

اَلذَّرِيْعَةُ۔ اس اونٹنی کو کہتے ھیں جو شکار کیلئے بطور آڑ استعمال کی جاتی ہے*۔ نیز ہر اس شے کو کہتے ھیں جس کے توسط سے مقصد تک ھاتھ پہنچ سکے۔

ذ ر و

ذَرَتِ الرِّيْحُ الشَّيْئَ ذَرْوًا۔ ہوا اس چیز کو اڑا کر لے گئی۔ ذَرَا الْحِنْطَةَ يَذْرُوْهَا ذَرْوًا۔ اسنے گیہوں کو بھوسے سے صاف کرنے کے لئے ہوا میں اڑایا۔ فَتَذَرَّتْ۔ پس گیہوں بھوسے سے الگ ہو کر صاف ہو گیا۔ ذُرَاوَةُ النَّبْتِ۔ پودے کے جھڑے ہوئے خشک اجزاء جو ہوا میں اڑ جائیں۔

ذُرْوَةُ الشَّيْئِ۔ چیز کا بلند تر اور اونچا حصہ*۔

سورۃ کہف میں ہے تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ (۱۸/۴۵)۔ "ہوائیں اسے اڑائے اڑائے پھرتی ھیں"۔ سورۃ ذاریات میں ہے۔ وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا۔ (۵۱/۱)۔ ذَرْوٌ۔ پھیلا دینا۔ بکھیر دینا۔ ذَارٍ (اَلذَّارِيْ) بکھیر دینے والا، پھیلا دینے والا (نشرو اشاعت کرنے والا)۔ وہ قوتیں جو کسی پیغام (یا نظام) کی نشرو اشاعت کا ذریعہ بنتی ھیں۔ جن سے وہ آواز دنیا میں پھیلتی ہے۔ ذرائع رسل و رسائل و مواصلات و نشرو اشاعت۔

*تاج۔ **محیط۔ *تاج و راغب۔

ذ ع ن

آذْعَنَ - اطاعت میں جلدی کرنا - دوڑ کر حکم کی تعمیل کرنا - نَاقَةٌ مِذْعَانٌ - مطیع اونٹنی - مُذْعِنِيْنَ (۲۴/۴۹) لپک کر اطاعت کرنے والے* - آذْعَنَ لَهٗ - اس کے لئے جھکا اور اس کا تابع فرمان ہوا** -

صاحب محیط نے اَلْاِذْعَانُ کے اصطلاحی معنے بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ الاِذْعَانُ اعتقاد یعنی دلی عزم کو کہتے ہیں - اور عزم ، تردد کے بعد ارادے کی پختگی کو کہتے ہیں - اذْعَان کے مختلف مراتب ہوتے ہیں جن میں سے ادنٰی ترین کو ظن اور اعلٰی ترین کو یقین کہا جاتا ہے - اور ان دونوں کے درمیان تقلید اور جہل مرکب کا مرتبہ ہوتا ہے** -

ذ ق ن

اَلذَّقَنُ - ٹھوڑی* - جمع اَذْقَانٌ - (۳۶/۸) - مجازاً چہرے کو بھی کہدیتے ہیں - جیسے يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا (۱۰۷/۱۷) میں منہ کے بل گرنے کیلئے یہ لفظ آیا ہے -

ذ ک ر

اَلذِّكْرُ وَالتَّذْكَارُ - کسی چیز کو محفوظ کر لینا - کسی بات کا دل میں حاضر کر لینا - یہ لفظ نِسْيٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۶/۶۸) - نِسْيٌ کے معنے ہوتے ہیں کسی بات کو بھلا دینا - لہذا ذِکْرٌ کے معنے ہوئے کسی بات کو یاد کرنا -

اِدَّكَرَهٗ - اِسْتَذْكَرَهٗ - تَذَكَّرَهٗ - کے ہم معنے ہیں کسی بات کو یاد کر لینا - لیکن ابواب کے خواص کے لحاظ سے ان کے مفہوم میں لطیف سا فرق ہے - اِدَّكَرَ اصل میں اِذْتَكَرَ ہے - صوتی گرانی کی وجہ سے ذال کو دال کر دیا - پھر تاء کو دال میں مدغم کر دیا - اسی سے مُدَّكِرٌ اسم فاعل ہے -

اَلتَّذْكِرَةُ - جس سے کسی ضرورت کو یاد دلایا جائے - (۴۸/۶۹)

اَلذِّكْرٰى (۶/۶۹) یاد دہانی -

ذَكَرَ حَقَّهٗ - اسکے حق کی حفاظت کی اور اسکو ضائع نہیں کیا -

اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ - تم پر جو خدا کے احسانات ہیں انکی حفاظت کرو اور انہیں ضائع مت کرو* -

---

*تاج و راغب - **محیط -

شہرت کو بھی ذِکْرٌ کہتے ہیں - نیز کسی کے متعلق اچھی بات کہنے کو بھی - اور شرف و عزت کو بھی - اور عبرت و موعظت کو بھی - ذِکْرٌ اُس کتاب کو بھی کہتے ہیں جس میں دین کی تفصیلات اور امتوں کے قوانین درج ہوں* -

اَلذَّکَرُ - قوی اور شجاع مرد - تلوار کی تیزی اور سختی کو بھی کہتے ہیں* - نیز نر ، بمقابلہ الاُنْثٰی (۳/۳۵) میں آیا ہے -

مُذَکَّرٌ - مؤنث کی ضد ہے - نیز سخت مصیبت جس کا مقابلہ مرد ہی کر سکیں* -

قرآن کریم کو الذِّکْرُ کہا گیا ہے (۱۵/۹) - کیونکہ اسمیں اقوام و ملل کے عروج و زوال کے قوانین بھی ہیں اور تاریخی یاد داشتیں بھی - اشیائے فطرت پر غور و فکر کرنے والوں کو لِقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ (۱۶/۱۳) کہا گیا ہے - نیز غیر خدائی قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی کو ذِکْرٌ سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنے ان قوانین خدا وندی کو سامنے لانے کی جد و جہد جنہیں اُنہوں نے پس پشت ڈال رکھا ہے - (۲/۳۴ و ۲/۴۴) - اسلئے میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے اور اسطرح قوانین خداوندی کو عملاً غالب کرنے کو بھی ذِکْرٌ کہا گیا ہے (۸/۴۵) - اسکے معنے یہ بھی ہیں کہ زندگی کے کسی گوشہ میں ، حتٰی کہ میدان جنگ میں بھی، قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو - انہیں ہمیشہ اپنے سامنے رکھو - خود قوانین خدا وندی ذِکْرُ اللّٰہِ (۲۹/۴۵) ہیں - شرف اور عظمت کے معنوں میں یہ لفظ (۳۸/۱) میں آیا ہے - نیز (۴۳/۴۴) میں ، جہاں قرآن کریم کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّهٗ لَذِکْرٌ لَّکَ وَ لِقَوْمِکَ کہ تمہاری اور تمہاری قوم کی عظمت اور بڑائی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ تم قرآن کریم پر عمل پیرا رہو - سورۃ قمر میں مُدَّکِرٌ آیا ہے (۵۴/۱۵) - سورۃ دھر میں جہاں آیا ہے کہ انسان پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا (۷۶/۱) - تو اسمیں مَذْکُوْرًا کے معنے ہیں ایسی چیز جو اپنی ذات سے وجود میں آ گئی ہو اور قائم ہو** - (Existing by Itself) -

سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (۲/۱۵۲) - اسکے معنے یہ ہیں کہ تم میرے قوانین کو اپنے سامنے رکھو تو میں تمہارے حقوق کی حفاظت کرونگا اور تمہیں عظمت و سطوت عطا کرونگا - تم

*تاج - **لین و تاج -

ان قوانین کا اتباع کرو تو انکے خوشگوار نتائج یقیناً تمہارے سامنے آ جائینگے۔ (یہاں، علاوہ دیگر امور کے یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ ابتدا (Initiative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا اسکا جواب دیتا ہے ۔ جس قسم کا عمل انسان سے سرزد ہوتا ہے اسی قسم کا رد عمل خدا کی طرف سے ہوتا ہے) ۔ لہذا ذِکْرُ اللّٰہِ کے معنے قوانین خدا وندی کا اتباع ہیں (نہ کہ تسبیح کے دانوں پر اللہ اللہ گنتے رہنا) ۔ اور اس اتباع کا لازمی نتیجہ شرف و عظمت اور غیر خدائی قوتوں پر غلبہ و تسلط ہے ۔ جیسا کہ سابقہ حوالوں میں بتایا جا چکا ہے، صاحب ضرب کلیمی کا فرعون کے مقابلہ کے لئے جانا، ذکر اور تسبیح ہے ۔ (تَسْبِیْح کیلئے دیکھئے س ۔ ب ۔ ح کا عنوان) ۔ میدان جنگ میں ثابت قدم رہنا ذکر ہے ۔ اشیائے کائنات پر غور و فکر کرنا ذکر ہے ۔ اقوام سابقہ کی تاریخ سے عبرت وموعظت حاصل کرنا ذکر ہے ۔ زندگی کے ہر شعبہ میں، ایک ایک قدم پر قانون خدا وندی کو سامنے رکھنا اور اس کے مطابق فیصلے کرنا ذکر ہے ۔ ان قوانین کا عام چرچا کرنا بھی ذکر ہے ۔ اسی کو آجکل کی اصطلاح میں نشرو اشاعت کرنا کہتے ہیں ۔ یہی وہ ''ذکر اللہ'' ہے جس سے دلوں کو سچا اطمینان حاصل ہوتا ہے ($\frac{13}{28}$)۔ ہم نے اطمینان کے ساتھ ''سچے'' کی تخصیص اس لئے کی ہے کہ جھوٹا اطمینان انسان کو ہر طریق سے حاصل ہو سکتا ہے ۔ اگر جھوٹا اطمینان حاصل نہ ہوتا ہو تو لوگ باطل مذاہب پر جمے کسطرح رہیں؟ سچا اطمینان، علٰی وجہ البصیرت حاصل ہوتا ہے ۔ یعنی جب کسی بات پر علم و بصیرت کی رو سے غور کرنے کے بعد، یا اس کے عملی نتائج سامنے آ جانے کے بعد، ہم اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ وہ بات حق وصداقت پر مبنی ہے، تو اس سے سچا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جو دل اور دماغ دونوں کے لئے وجہ سکون ہوتا ہے ۔ جھوٹا اطمینان، اپنے آپ کو فریب دینے سے حاصل ہوتا ہے ۔ سچا اطمینان، جماعت مومنین کو بدر کے میدان میں حاصل ہؤا تھا جب انہیں اپنے سے تین گنا فوج پر عظیم فتح حاصل ہوئی تھی ($\frac{3}{125}$) ۔ یہ حجروں اور خانقاہوں میں حاصل نہیں ہوتا ۔

ذ ک و

ذَکَاءٌ ۔ کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کا مکمل ہو جانا ۔ خلیل نے کہا ہے کہ اَلذَّکَاءُ فِی السِّنِّ ۔ عمر کے پختہ ہو جانے کو کہتے ہیں جب انسان کی قوتیں کمال تک پہنچ جاتی ہیں ۔ اسی اعتبار سے اَلذَّکَاءُ ذہانت اور فطانت کی تیزی اور تکمیل کو کہتے ہیں ۔ ذَکِیٌّ ۔ تیز فہم ۔

بڑا ذھین - ذَکَتِ النَّارُ - آگ بھڑک اٹھی * - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی تیزی اور نفوذ کے ھوتے ھیں -

اَلتَّذْکِیَۃُ کے معنے جانور کو ذبح کر دینے کے ھوتے ھیں - راغب نے کہا ھے کہ اسکے معنے حرارت غریزی نکال دینے کے ھوتے ھیں * - (ذَکَتِ النَّارُ کی جہت سے) - باب تفعیل کا ایک خاصہ سلب ماخذ ھوتا ھے - یہ اسکی مثال ھے - یعنی ذَکَاءٌ کے معنی حرارت - اور ذکّیٰ کے معنی حرارت نکال لی - سلب کر لی - اسی کو سلب ماخذ کہتے ھیں - یعنی لفظ کے مادہ کی جو خصوصیت ھو اسے سلب کر لینا - قرآن کریم میں ھے اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ (۵/۳) - " بجز اسکے جسے تم ذبح کر لو " -

ذ ل ل

ذِلَّۃٌ - ذَلَالَۃٌ کے معنی ھیں کسی کی سختی اور منہ زوری کا ٹوٹ جانا اور اسکا مطیع و فرمانبردار ھو جانا - راغب نے اَلذُّلّ - زور و قہر کی وجہ سے جھکنے کو کہا ھے اور اَلذِّلّ اس جھکنے کو کہتے ھیں جس میں طبیعت کی تیزی و سختی ازخود مغلوب ھو جائے - اس نے یہ بھی لکھا ھے کہ جب ذُلّ کسی غیر کے دباؤ اور جبر سے نہ ھو تو یہ مذموم صفت نہیں رھتی - ذَلُوْلٌ - (جمع ذُلُلٌ) جو تابع فرمان ھو جائے اور منہ زور نہ رھے * - سورۃ بقرہ میں ھے اِنَّھَا بَقَرَۃٌ لَّا ذَلُوْلٌ (۲/۷۱) " وہ سانڈ ھے جسے ھل میں نہیں جوتا گیا " - عَیْرٌ اَلْمُذَلَّلُ اس گدھے کو کہتے ھیں جس کے اوپر بوجھ لدا ھو اور پیچھے سے لاٹھی سے ھانکا جا رھا ھو ** - اس سے ذِلّت کا صحیح نقشہ سامنے آجاتا ھے -

ذُلِّلَ الْکَرْمُ تَذْلِیْلاً کے معنی ھیں انگور کے خوشے نیچے جھکا دیئے گئے * -

قرآن کریم میں تَذِلُّ ، تُعِزُّ کے مقابلہ میں آیا ھے (۳/۲۵) - اور وھیں ان دونوں لفظوں کا مفہوم بھی بیان کر دیا گیا ھے - یعنی عِزَّت کے معنے ھیں حکومت اور مملکت مل جانا - غلبہ و اقتدار حاصل ھو جانا - اور ذِلّت کے معنے حکومت و مملکت کا چھن جانا - غلبہ و اقتدار کا کھو جانا - سورۃ یٰسٓ میں مویشیوں کے متعلق ھے فَھُمْ لَھَا مَالِکُوْنَ - وَذَلَّلْنٰھَا (۳۶/۷۱-۷۲) - انسانوں کو ان پر غلبہ و اقتدار حاصل ھے - انہیں انسانوں کا مطیع

* تاج - ** محیط -

و فرمانبردار بنا دیا ہے۔سورۃ طہٰ میں نَذِلَّ وَنَخْزٰی (۲۰/۱۳۴)۔ذلت و رسوائی کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں۔میدان جنگ میں کمزوری کیلئے یہ لفظ (۳/۱۲۲) میں آیا ہے۔سورۃ مائدہ میں جماعت مومنین کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (۵/۵۴)۔ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ یہاں اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کے معنے رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (۴۸/۲۹) ہیں۔یعنے ایک دوسرے کے ساتھ مشفق و ہمدرد۔اور مخالفین کے مقابلہ میں سخت۔جَنَاحَ الذُّلِّ (۱۷/۲۴) نرمی تواضع اور مہربانی کے لئے آیا ہے۔

قرآن کریم نے ذلت و مسکنت، محکومی اور کمزوری کی زندگی کو خدا کا غضب قرار دیا ہے۔(۲/۶۱)۔یہ ذلت اسی دنیا کی ذلت ہے جو ہر ایک کو نظر آسکتی ہے (۷/۱۵۲)۔اسکے برعکس کہا ہے کہ مومنین کی زندگی غلبہ و اقتدار اور قوت وسطوت کی زندگی ہے۔وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ (۶۳/۸)۔" غلبہ واقتدار اللہ اور اس کے رسول اور جماعت مومنین کے لئے ہے"۔مومنین کی زندگی اَعْلَوْنَ (۳/۱۳۸)۔سب پر غالب رہنے کی زندگی ہے۔حکومت اور سلطنت کی زندگی ہے (۲۴/۵۵)۔لہذا جس زندگی میں غلبہ واقتدار اور شوکت و حشمت نہیں وہ مومنین کی زندگی نہیں۔اس دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی خدا کا عذاب ہے۔وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْکَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۲/۶۱) " ان پر ذلت و مسکنت کی مار ماری گئی۔یعنی وہ عذاب خداوندی کے مستوجب بن گئے"۔اس دنیا کو اغیار کے حوالے کرکے، بیکسی و بے بسی، محتاجی اور محرومی کی ذلیل زندگی بسر کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس سے انسان کو " روحانی ترقی" حاصل ہوتی ہے، وہ فریب ہے جو مستبد قوتیں کمزوروں اور محکوموں کو دیتی ہیں۔قرآن کریم اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے آیا تھا۔اس نے کھلے الفاظ میں کہا کہ اس دنیا میں عزت و اقتدار سرفرازی و سربلندی۔شوکت و حشمت۔دولت و قوت۔حکومت و سطوت کی زندگی، ایمان و اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ ہے۔اور ذلت و خواری، محکومی و محتاجی کی زندگی خدا کا عذاب۔اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ جو یہاں خدا کے عذاب میں مبتلا ہے وہ عاقبت میں خدا کا مقرب نہیں ہو سکتا۔جس کا حال تاریک ہے اس کا مستقبل بھی تاریک ہوگا۔وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (۲۰/۱۲۴)۔" جو ہمارے قانون سے اعراض برتیگا تو اسکی روزی تنگ ہو جائیگی اور ہم

* تاج۔ ** محیط۔

اسے قیامت کے دن بھی اندھا اٹھائینگے''۔ یہ ایک ایسا معیار ہے جس سے ہم ہر وقت اپنے اعمال کو پرکھ سکتے ہیں۔

ذ م م

ذَمَّهٗ ۔ یَذُمُّهٗ ۔ ذَمًّا ۔ مَذَمَّةً ۔ مَدْحٌ کی ضد ہے۔ برائی کرنا۔ اِسْتَذَمَّ ۔ اسنے قابل مذمت کام کیا۔ بِہٖ ذَمِیْمَةٌ۔ اسے کوئی ایسا عارضہ یا آفت لاحق ہے جسکی وجہ سے وہ باہر نہیں نکل سکتا*۔ مَذْمُوْمٌ (۲۸/۹) میں انہی معانی میں آیا ہے۔

ذِمَّةٌ ۔ ہر وہ ذمہ داری ۔ معاھدہ ۔ قول و قرار جسکے ضائع کر دینے سے مذمت لازم آتی ہو**۔ جس عہد وغیرہ کے توڑ دینے پر انسان کی مذمت کی جاتی ہو***۔

اَلذِّمَّةُ ۔ امان ۔ کفالت ۔ ضمانت ۔ ذِمِّیٌّ ۔ وہ آدمی جسے عہد حاصل ہو۔ جس کی حفاظت کی ذمہ داری لے لی گئی ہو۔ جسے ہر طرح کی ضمانت دیدی گئی ہو۔ قرآن کریم میں ہے لَا یَرْقُبُوْا فِیْکُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۸/۹) ''یہ کسی حق اور حرمت ۔ عہد و پیمان کا خیال نہیں کرتے''۔ (اسکی تشریح کیلئے عنوان ا ل ل دیکھئے)۔

ذ ن ب

اَلذَّنَبُ ۔ دُمْ ۔ ذَنَبَهٗ ۔ وہ اسکے (دُم کے) پیچھے پیچھے رہا۔ مُسْتَذْنِبٌ ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو اونٹوں کی دموں کے پیچھے پیچھے رہے۔ اَلذِّنَابُ ۔ ہر چیز کا پچھلا حصہ نیز اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کی دم کو کجاوہ سے باندھ دیا جائے۔ اس جہت سے اس مادہ کے معنوں میں کسی چیز کے آخری حصہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ذِنَبَةُ الْوَادِیْ ۔ وادی کے آخری حصہ کو کہتے ہیں۔ اور اَلذَّنَابَةُ پیچھے لگنے والے کو۔ انہی معانی کے پیش نظر راغب نے لکھا ہے کہ اَلذَّنْبُ دراصل کسی چیز کے پچھلے حصے یا دم کے پکڑنے کو کہتے ہیں۔ نیز ہر اس کام کو جس کا انجام برا ہو۔ نیز کسی کام کے نتیجہ (انجام) کو بھی ذَنْبٌ کہتے ہیں**۔ اس اعتبار سے یہ لفظ جرم اور معصیت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ (۱۴/۹۱) میں اسکے معنے جرائم کے ہیں۔ یعنی ان کے رب نے ان کے جرائم کی وجہ سے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ نیز ذَنَبٌ ۔ خسیس چیز اور رذیل اور کمینہ کو بھی کہتے ہیں*۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

چونکہ دُم ہمیشہ جانور کے پیچھے لگی رہتی ہے اسلئے ان اتہامات کو بھی ذُنُوْبٌ کہا جا سکتا ہے جو یونہی کسی کے پیچھے چپکا دئے جائیں۔ (جسطرح اَلْقِفُوَۃُ دُم کو کہتے ہیں لیکن اس کے معنی تہمت کے بھی ہیں۔ دیکھئے عنوان ق۔ف۔و)۔ چنانچہ سورۃ فتح میں جہاں نبی اکرمؐ کے متعلق کہا ہے لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ (۴۸/۲)۔ تو اسکے معنے یہ ہیں کہ یہ فتح عظیم اسلئے دی جا رہی ہے کہ ان تمام اتہامات سے تمہاری حفاظت ہو جائے جو تمہارے مخالفین تم پر لگاتے رہے ہیں یا آئندہ لگانا چاہیں۔ مخالفین کہتے تھے کہ (معاذ اللہ) آپ اپنے دعاوی میں جھوٹے ہیں۔ دیوانے ہیں۔ کسی نے ان پر جادو کر دیا ہے۔ یونہی لوگوں کو سبز باغ دکھا کر ورغلاتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ فتح مبین، جس سے مخالفین کی قوتیں ٹوٹ گئی ہیں، ان تمام اتہامات کا جواب ہے کہ دیکھ لو انجام کار کون سچا ثابت ہوا۔ (نیز دیکھئے عنوان ق۔د۔م)۔

ذَنُوْبٌ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جسکی دُم کے بال گھنے ہوں اور وہ بالوں سے بھری ہوئی ہو۔ نیز اس بڑے ڈول کو بھی کہتے ہیں جس میں پانی بھرا ہوا ہو۔ (اگر وہ خالی ہو تو اُسے دَلْوٌ کہا جائیگا)۔ نیز ایسے دن کو بھی کہتے ہیں جس کا شر بہت طویل ہو جائے، اتنا طویل کہ ختم ہوتا نظر نہ آتا ہو۔

سورۃ ذاریات میں ہے فَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحَابِھِمْ (۵۱/۵۹)۔ تاج، محیط اور راغب نے کہا ہے کہ ذَنُوْبٌ کے معنی نصیبہ یا حصہ کے ہیں۔ اس اعتبار سے آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جو لوگ ظلم کر رہے ہیں ان کا نصیبہ بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ان لوگوں کا نصیبہ تھا جو ان کی مثل تھے۔

بعض لوگ اپنے آپ کو، ازرہ کسر نفسی، مُذْنِب (عاصی پرؐ معاصی وغیرہ) کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ذنب یا گناہ، حکومت خدا وندی کے جرم کو کہتے ہیں۔ جب ہم اپنے آپ کو "مجرم" کہنا پسند نہیں کرتے تو مذنب یا عاصی وغیرہ کیوں کہلوائیں؟ اگر ہم سے واقعی کوئی جرم صادر ہو گیا ہے تو اس پر ہمیں ندامت ہونی چاہئے، نہ کہ اسے اپنے لئے نشان امتیاز یا پہچانے جانے کی علامت قرار دیدیا جائے۔

ذ ھ ب

ذَھَاب* کے معنے ھیں چلا جانا ۔ گزر جانا ۔ ذَھَبَ بِہٖ کے معنے ھیں لے جانا ۔ ذَھَبَ عَلَیَّ کَذَا کے معنے ھیں، میں فلاں بات کو بھول گیا ۔ اگر ذَھَبَ کے ساتھ عَنْ آئے تو اسکے معنے چھوڑ دینے کے ھوتے ھیں ۔ اور اگر اسکے ساتھ اِلٰی آئے تو اسکے معنے متوجہ ھوجانے کے آتے ھیں* ۔ صاحب کشاف نے کہا ھے کہ اَذْھَبَہٗ کے معنے ھیں اسکو زائل کر دیا ۔ دور کر دیا ۔ لے گیا ۔ (۳۳/۳۴) ۔ اور ذَھَبَ بِہٖ کے معنے ھیں اسکو اپنے ساتھ لے گیا ۔ یعنے خود بھی اسکے ساتھ چلا گیا** ۔ لیکن قرآن کریم میں جہاں آیا ھے ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ (۲/۱۷) تو اسکے معنے لے جانے کے ھیں۔ ساتھ چلے جانے کے نہیں ۔ اَلْمَذْھَبُ ۔ جانا ، جانے کی جگہ، راستہ، طریقہ، وہ عقیدہ جس کی طرف کسی کا رجحان ھو۔ نیز بیت الخلاء کو بھی کہتے ھیں جہاں قضائے حاجت کیلئے جائیں* ۔ لیکن قرآن کریم میں مَذْھَب* کا لفظ کہیں نہیں آیا ۔ اسلام کیلئے دِیْن* کا لفظ آیا ھے ۔ در حقیقت مذھب کے معنے مکتب فکر (School of Thought) کے ھیں ۔ ابتدائے اسلام میں صرف دِیْن* تھا ۔ بعد میں جب مختلف ائمہ فکر و فقہ کی نسبتوں سے مختلف طریقے پیدا ھوئے تو دِیْن کی جگہ مَذْھَب (طریقہ) نے لے لی ۔ چنانچہ ذَھَبَ فِی الدِّیْنِ مَذْھَبًا کے معنے ھیں اس نے دین کے بارے میں فلاں عقیدہ اختیار کیا ۔ اور فُلَانٌ یَذْھَبُ اِلٰی قَوْلِ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ کے معنے ھیں فلاں شخص امام ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق چلتا ھے*** ۔ اس سے دِیْن* (یعنے وہ ضابطۂ حیات جو خدا کی طرف سے ملا تھا) گم ھو گیا اور مختلف شخصیتوں کی طرف منسوب کردہ مَذَاھِب آگے چل پڑے ۔ جبتک اشخاص کی طرف منسوب کردہ مَذَاھِب نہیں مٹتے دِیْن قائم نہیں ھو سکتا ۔ ''مٹنے'' کے معنے یہ ھیں کہ ان چیزوں کو صرف یہ حیثیت دی جائے کہ یہ اُن حضرات کا دین کے متعلق فہم تھا ۔ یا وہ جزئیات تھیں جنہیں انہوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعین کیا تھا ۔ انکی حیثیت ابدی نہیں ھے۔ ابدی صرف خدا کا دین ھے جو قرآن کریم کے اندر ھے ۔ لہذا، اسلاف کے مختلف مذاھب کے نام سے جو کچھ ھمارے پاس چلا آ رھا ھے اسے قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھنا چاھئے ۔ جس بات کو قرآن کریم صحیح کہے وہ صحیح سمجھی جائے ۔ جسے وہ غلط قرار دے اُسے غلط ٹھہرایا جائے ۔ باقی

*تاج ۔ **محیط ۔ ***لین ۔

رہیں فقہی جزئیات ، تو ان کی حیثیت دائمی ہو ہی نہیں سکتی - ہر دور کی فقہ قرآن کریم کے ابدی اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مرتب ہوگی -

مغرب میں چونکہ عیسائیت ایک (Religion) کی حیثیت رکھتی تھی اسلئے وہاں مذہبِ اسلام کا ترجمہ (Religion of Islam) ہو گیا اور اس سے دین کا تصور بالکل مٹ گیا ، اور اسلام بھی دیگر مذاہب عالم میں سے ایک مذہب سمجھا جانے لگا - حالانکہ اسلام، دین* (ضابطۂ حیات) کا نام تھا - مذہب (Religion) نہیں تھا -

لفظ (Religion) کے بنیادی معنوں کے متعلق علمائے لغت میں اختلاف ہے لیکن اس پر عمومی اجماع ہے کہ اسکے اصلی معنے "دیوتاؤں کی تعظیم" کے ہیں - اسکے بعد کسی مافوق الفطرت ہستی کی پرستش کے قواعد و ضوابط کے مجموعہ کا نام ریلیجن رکھا گیا اور ان ہی معنوں میں یہ لفظ بالعموم رائج ہے (دیکھئے Century Dictionary) - ظاہر ہے کہ اسلام اس معنے میں ریلیجن نہیں - یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات یا زندگی کا قانون ہے - لہذا اسلام کو ریلیجن یا مذہب نہیں کہنا چاہئے - یہ دین* ہے -

"مذہب" درحقیقت اُس زمانے کی یادگار ہے جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا - وہ اسوقت یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کائنات میں فطرت کے جو حوادث رو نما ہوتے ہیں، وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتے ہیں - وہ چونکہ ان کی علت (Cause) کو نہیں سمجھتا تھا اس لئے ان سے ڈرتا اور لرزتا تھا اور خوشامد سے انہیں راضی کرنے کے لئے ان کے سامنے جھکتا اور گڑگڑاتا تھا - ان تک اپنی درخواست پہنچانے کے لئے وسیلے تلاش کرتا تھا - سفارش کرنے والے ڈھونڈتا تھا - انسان کی اپنی تو ہم پرستیوں نے دیوی، دیوتاؤں کی تخلیق کی اور اسی سے ان کی بھگتی یا پرستش کا جذبہ پیدا ہوا - ان میں جو لوگ ذرا زیادہ سمجھدار تھے انہوں نے عوام کی اس سادہ لوحی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو ان دیوتاؤں کے نمائندے یا مقرب بنا کر اپنی پرستش شروع کرا دی - اسطرح مذہبی پیشوائیت اور روحانی اقتدار کے ادارے وجود میں آ گئے - حکمران طبقہ نے ان "خدائی نمائندگان" سے گٹھ جوڑ پیدا کیا توانہوں نے انہیں "ایشورکا اوتار" - "ظل اللہ علی الارض" - اور خدائی اختیارات کا حامل قرار دیکر، عوام کو ان کے حضور جھکنا سکھایا - ان تمام تصورات کے مجموعہ کا نام "مذہب" (Religion) ہے جو انسانوں میں اب تک متوارث چلا آ رہا ہے -

مذہب کے اس باطل تصور کو مٹانے کے لئے، خدا کی طرف سے، بوساطت حضرات انبیاء کرامؑ دین ملتا رہا ۔ اس نے انسان کو، کائنات میں، اس کے صحیح مقام سے شناسا کرایا ۔ اس نے کہا کہ کائنات کا سلسلہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے اور انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ہے ۔ انسان کا کام یہ ہے کہ ان قوانین کی رو سے کائنات کی قوتوں کو مسخر کرے اور انہیں نوع انسان کی نشو و نما اور بہبود و ترفع کے لئے استعمال کرے۔ اس نے (دین نے) اپنی دعاوی کو دلائل و براھین کی رو سے پیش کیا اور علم و بصیرت کی رو سے ماننے کی دعوت دی ۔ خدا کا یہ دین، اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اور ''مذھب،، کے خلاف کھلا ہؤا چیلنج ہے ۔ دنیا میں چونکہ علم و بصیرت عام ہو رہا ہے اس لئے آھستہ آھستہ مذھب کا دور دورہ بھی ختم ہو رہا ہے ۔ اسطرح دین کے قیام کے لئے راستہ صاف ہو رہا ہے ۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ دنیا کسطرح ملوکیت ۔ سرمایہ داری ۔ مذھبی پیشوائیت سے بیزار ہوتی چلی جا رہی ہے؟ یہی قرائن بتا رہے ہیں کہ اب وہ دور آ رہا ہے جب خدا کا دین، اپنی تابانیوں کے ساتھ عالمتاب ہوگا ۔ اب انسان سن شعور کو پہنچ رہا ہے ۔ اب اسے نہ بچپن کی توھم پرستیاں ڈرا سکتی ہیں ، نہ کاغذ کے پھول بہلا سکتے ہیں ۔ اب اس کا اطمینان زندگی کی ٹھوس حقیقتوں ہی سے ہو سکتا ہے اور وہ قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتیں ۔

اَلذَّھَبُ ۔ (۱۸/۳۱) اس سونے کو کہتے ہیں جو کان سے نکال کر صاف کر لیا گیا ہو۔ (جو ابھی کان میں ہو اور گلا کر صاف نہ کیا گیا ہو' اسے تِبْرٌ کہتے ہیں) ۔ جس چیز پر سونے کا ملمع کیا گیا ہو یا سونے کا پترہ چڑھایا گیا ہو اسے مُذَھَّبٌ کہتے ہیں ۔ ذَھِبَ الرَّجُلُ ۔ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص ایک دم کان میں بہت سا سونا دیکھے اور اسے دیکھکر سراسیمہ و مبہوت ہو جائے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) چلے جانے اور (۲) حسن و تازگی کے ہیں۔ سونے کو ذَھَبٌ ان دوسرے معانی کی جہت سے کہتے ہیں ۔ اَلذِّھْبَةُ ۔ ھلکی سی بارش یا سخاوت کو کہتے ہیں* ۔

ذ ھ ل

ذَھَلَہٗ ۔ ذَھَلَ عَنْہُ ۔ کسی چیز سے ربط و ضبط رکھنے کے باوجود اسے چھوڑ دینا ۔ یا جانتے بوجھتے چھوڑ دینا ۔ یا کسی شغل میں منہمک ہو

*تاج ۔

جانے کی وجہ سے بھول جانا ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ذُہُوْلٌ کے معنے ہیں محبوب چیز کی یاد باقی نہ رہنا اور اس کی عدم موجودگی کے باوجود دل کا خوش رہنا اور کسی قسم کی کمی محسوس نہ کرنا* ۔ صاحب محیطؒ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ ذُہُوْلٌ کسی دہشت کی وجہ سے محبوب کو چھوڑ دینا ہے ۔ ذَہِلَ ۔ ہوش و حواس جاتے رہنا** ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں گھبراہٹ اور پریشانی وغیرہ کی وجہ سے کسی چیز سے غافل ہو جانا ۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں انقلاب کے متعلق کہا ہے کہ یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا (۲۲/۲) ۔ "جب تم اسے دیکھو گے اس وقت ہر دودھ پلانے والی اپنے بچہ کو چھوڑ دے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دیگی" ۔ یہ چیز اس انقلابی ساعت کی ہولناکی کے لئے کہی گئی ہے ۔ لیکن اگر اس سے مراد خود انقلابی دور ہو تو اس سے ہمارا زمانہ سامنے آ جاتا ہے جس میں مائیں بچوں کو دودھ نہیں پلاتیں اور کوئی لڑکی (شادی کے باوجود) حاملہ ہونا نہیں چاہتی ۔ اور ان فطری نسوانی فرائض کو چھوڑ کر انہیں کچھ افسوس نہیں ہوتا بلکہ اس سے خوش ہوتی ہیں ۔ اور مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں ان کے دوسرے مشاغل میں حارج نہ ہوں ۔ ذَہَلَ میں یہ تمام معانی آ جاتے ہیں ۔ یا ویسے ہی پریشانی اور اضطراب کا وہ عالم جس میں ہم سب گرفتار رہتے ہیں اور اسطرح اپنی ضروری ذمہ داریوں تک سے غافل ہوجاتے ہیں ۔

ذ و

ذُوْ ۔ صاحب، والا (جیسے ہم ، صاحب اولاد یا عقل و فکر والا ، کہتے ہیں) ۔ اسکی جمع ذَوُوْنَ اور ذَوِيْنَ نیز اُولُوْ آتی ہے ۔ مونث ذَاتٌ ۔ تثنیہ ذَوَاتَانِ ۔ جمع ذَوَاتٌ ۔ قاعدے کی رو سے ذُوْ کبھی ذِیْ اور کبھی ذا ہو جاتا ہے ۔ ذُوْعُسْرَةٍ ۔ (۲/۲۸۰) ۔ صاحب عسرت ۔ جو تنگدستی میں پڑا ہو ۔ فَذُوْ دُعَاءٍ عَرِيْضٍ (۴۱/۵۱) ۔ لمبی چوڑی دعائیں مانگنے والا ۔ ذَوِی الْقُرْبٰی (۲/۱۷۷) ۔ رشتے دار ۔ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ (۱۸/۱۸) دائیں اور بائیں طرف ۔ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۔ (۳/۱۵۴) دلوں کے اندر کی باتیں ۔ یعنی جو کچھ دل کے اندر ہے ۔

ذَوَاتَا أَفْنَانٍ (۵۵/۴۸) ۔ مختلف علوم و فنون والے ۔

* تاج ۔ **محیط ۔

ذوالقرنین

ایران کا وہ خدا ترس بادشاہ جس نے یہودیوں کو بابل کی اسیری سے رھائی دلا کر یروشلم میں دوبارہ آباد کرایا تھا۔ قرآن کریم نے (سورۂ کہف میں) اس کا تفصیلی ذکر کیا ھے (۱۸/۸۳-۱۰۱) (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ق۔ ر۔ ن)۔

ذ و د

اَلذَّوْدُ۔ ھانکنا۔ دفع کرنا۔ جھڑک کر نکالدینا۔ ھٹادینا۔ اَلْمِذْوَدُ۔ وہ جگہ جہاں جانوروں کو چارہ ڈالا جاتا ھے۔ بیل کے سینگ جس سے وہ اپنی مدافعت کرتا ھے، یعنے جس سے وہ دوسروں کو ھٹا کر دور رکھتا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی ھیں کسی چیز کو دوسری چیز سے الگ اور یک سو کردینا۔

سورۂ قصص میں ھے کہ جب حضرت موسیٰؑ مدین پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک پیاؤ (گھاٹ) پر دوسرے لوگوں کے جانور (بعد میں آ کر) پانی پیتے چلے جاتے ھیں لیکن دو لڑکیاں ھیں جو اپنے جانوروں کو روکے کھڑی ھیں (تَذُوْدَانِ ۲۸/۲۳) کہ وہ کہیں آگے بڑھ کر پانی تک نہ پہنچ جائیں۔ اس نقشے کو پھر سامنے لائیے کہ پیاسے جانور پانی کی طرف بڑھنا چاھیں اور ان کا چرواھا انہیں اُدھر جانے سے روکے۔ اسے اَلذَّوْدُ سے تعبیر کیا گیا ھے۔ حضرت موسیٰؑ کو اس پر تعجب ھوا کہ وہ لڑکیاں اپنے جانوروں کو پانی کی طرف آنے سے روک کیوں رھی ھیں۔ انھوں نے ان سے پوچھا تو لڑکیوں نے کہا کہ لَا نَسْقِیْ حَتّٰی یُصْدِرَ الرِّعَآءُ (۲۸/۲۳)۔ ھم اپنے جانوروں کو اس وقت تک پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ (طاقتور چرواھے) اپنے اپنے جانوروں کو اچھی طرح پانی پلا کر واپس نہ لے جائیں۔ اسکے ساتھ ھی اسکی وجہ بھی بتائی کہ وَاَبُوْنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ (۲۸/۲۳)۔ (ھم لڑکیاں ہونے کی وجہ سے کمزور ھیں) اور ھمارا باپ بہت بوڑھا ھے۔ اسلئے ھم کب جرأت کرسکتی ھیں کہ ھمارے جانور پہلے پانی پی لیں۔

غور کیجئے۔ قرآن کریم نے ایک کہانی کے دو ٹکڑوں میں نوع انسانی کی پوری داستان کس حسن و خوبی سے بیان کرکے رکھدی ھے۔ دنیا میں یہی ھوتا چلا آیا ھے اور یہی ھو رھا ھے کہ طاقتور کا جانور پہلے پانی پیتا ھے اور اس سے اگر کچھ بچ جائے تو غریب کے جانور کی باری

---

* تاج۔ محیط۔ راغب۔

آتی ہے - اسمیں استثناء ہے تو اُنھی کی جو آسمانی انقلاب کا پیغام لیکر آتے ہیں - ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ کمزوروں کے جانوروں کو انکی باری پر پانی پلانے کا انتظام کریں - چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے - فَسَقٰى لَهُمَا (۲۸/۲۴) (بلا مزد و معاوضہ) ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا - پیغمبر بھی کچھ کرنے کے لئے آتے تھے - اور ان کا لایا ہوا نظام دنیا میں بھی کچھ کریگا - یعنی رزق کے جن سرچشموں پر ارباب اقتدار اپنا قبضہ جمائے ہوں انہیں نوع انسانی کے مفاد عامہ کے لئے آزاد کرا دینا تاکہ ہر فرزند آدم کی ضروریات یکساں طور پر پوری ہوتی رہیں - اگرچہ حضرت موسیٰؑ اسوقت ابھی منصب نبوت پر سرفراز نہیں ہوئے تھے لیکن طبیعت کا رجحان ایسے ہی کاموں کی طرف تھا -

ذ و ق

ذَاقَ - چکھنا - مزہ معلوم کرنا* - راغب نے لکھا ہے کہ یہ در اصل تھوڑی سی چیز کھانے کے لئے بولا جاتا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو کھا کر اسکی اندرونی حالت کو معلوم کرنا ہیں - یہ اسکے اصلی معنے ہیں - پھر اسکا اطلاق ہر تجربہ پر ہونے لگا** - یعنی کسی چیز کا تجربہ ہو جانا - فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ (۷/۲۲) - جب انہیں "شجرہ" کا تجربہ ہو گیا -

ذَائِقٌ - چکھنے والا - جو تجربہ حاصل کرے (۳/۱۸۴) - (مؤنث ذَائِقَةٌ) -

اَذَاقَ - مزہ چکھانا - تجربہ حاصل کرانا (۱۶/۱۱۲) - قرآن کریم میں یہ لفظ بالعموم عذاب کے ساتھ آیا ہے (اگرچہ بعض مقامات پر رَحْمَةٌ کے ساتھ بھی آیا ہے) - اسکے معنے یہ ہیں کہ انسان اپنے اعمال کے نتائج کو اسطرح محسوس کرے گویا اس نے ان کا مزہ چکھ لیا ہے - اسے اسکا عملی تجربہ ہو جائے کہ فلاں کام کا نتیجہ کیا ہوتا ہے -

ذ ی ع

ذَاعَ - يَذِيعُ - پھیل جانا - ظاہر ہو جانا - عام ہو جانا - اَذَاعَ سِرَّهٗ - اسنے اسکے راز کو افشا کر دیا - ظاہر کر دیا - اور لوگوں میں مشہور کر دیا - زجاج نے کہا ہے کہ اسکے معنے لوگوں میں پکار کر کہدینا اور اعلان کر دینا ہیں*** - (۴/۸۳) میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ - "جب ان تک کوئی امن یا خوف کی بات پہنچتی ہے تو یہ اسے خوب پھیلاتے اور اڑاتے ہیں" -

---

*تاج - **محیط - ***تاج و محیط -

ر

ر أ س

اَلرَّاْسُ۔ (جمع رُءُوْسٌ) سر۔ ہر چیز کا اعلیٰ حصہ۔ سردار قوم*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اکٹھا ہونے اور بلند ہونے کے ہیں۔ رَئِیْسٌ۔ سردار قوم۔ رَاْسُ الْمَالِ۔ اصل مال۔ اَلرَّائِسُ۔ والی۔ حاکم۔ اَلْمَرْؤُوْسُ۔ رعیت*۔

قرآن کریم میں مناسکِ حج کے ضمن میں ہے۔ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ (۲/۱۹۶)۔ اپنے سروں کو نہ منڈاؤ۔ دیکھئے (عنوان ح۔ ل۔ ق)۔

اصلی سرمایہ کیلئے رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ آیا ہے (۲/۲۷۹)۔ یعنی ''سرمایہ،، (تفصیل ر۔ ب۔ و کے عنوان میں دیکھئے)۔

ر أ ف

اَلرَّاْفَةُ۔ رحمت اور رافت مرادف المعنی الفاظ ہیں۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ رَاْفَةٌ تو یہ ہے کہ تم سے ان امور کو دفع کر دیا جائے جو ضرر رساں ہوں اور رَحْمَةٌ یہ ہے کہ تمہیں ایسے امور بہم پہنچائے جائیں جو راحت رساں ہوں**۔ اسکی تائید صاحب المنار نے کی ہے جس میں لکھا ہے کہ رَاْفَةٌ کا نتیجہ دفع بلا ہے اور رَحْمَةٌ سے مراد خوشحالیوں کا زیادہ عطا کرنا ہے***۔ لہذا رَءُوْفٌ اور رَحِيْمٌ سلبی (Negative) اور ایجابی (Positive) دونوں پہلوؤں کو محیط ہو جاتے ہیں۔ ان اسباب و عناصر کا دفع کرنا جو کسی کی نشو و نما کے راستہ میں حائل ہوں اور اسکے ساتھ ہی اس ساز و سامان کا بہم پہنچانا جس سے اسکی نشو و نما ہوتی جائے۔

*تاج۔ **محیط۔ ***المنار جلد۲۔ صفحہ ۱۲۲۔

خدا کی رَاْفَت و رَحْمَت کسطرح ملتی ہے، اسکے متعلق سورۃ بقرہ میں کہدیا کہ وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَکُمْ ۔ اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۲/۱۴۳) ۔ اللہ کبھی ایسا نہیں کرتا کہ وہ کسی کے ایمان کو یونہی بلا حفاظت، چھوڑ دے اور وہ بلا نتیجہ رہ جائے ۔ وہ تو رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ہے ۔ یعنی وہ کرتا یہ ہے کہ انسان کے ایمان کے نتیجہ خیز ہونے کی راہ میں جسقدر موانع آئیں انہیں راستہ سے ہٹائے اور ایمان کے مثبت نتائج پیدا کرتا جائے ۔ لہذا اسکی رَاْفَت اور رَحْمَت ، اِیْمَان کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ یہی انسانیت کی صحیح نشو و نما کا ذریعہ ہے ۔ ایمان کے معنے ہیں قانون خدا وندی کی صداقت پر یقین اور اعتماد رکھنا اور اسکی اطاعت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لینا ۔

چونکہ عام طور پر انسانوں کی تکلیف رفع کرنے کا جذبہ محرکہ، رقتِ قلب (دل کی نرمی) ہوتا ہے اسلئے رَاْفَةٌ کے معنے نرمی کے بھی آتے ہیں ۔ مثلاً سورۃ نور میں زانی اور زانیہ کی سزا کے سلسلہ میں کہا ہے وَلَا تَاْخُذْکُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ (۲۴/۲) ۔ "قانونِ خدا وندی کے نفاذ میں نرمی سے کام مت لو"، ۔ ایسا نہو کہ اس خیال سے کہ یہ سزا اُنہیں تکلیف پہنچائیگی تم مجرمین کو جرم کی سزا ہی نہ دو یا اس میں نرمی برتو ۔ اسلئے کہ اگر ظالمین اور مجرمین کو سزا نہ دی جائے تو مظلوموں کی داد رسی کیسے ہو ۔ عیسائیت نے خدا ترسی کا بھی غلط مفہوم اپنے سامنے رکھا جسکی وجہ سے ظالموں کی رسیاں دراز ہوتی گئیں اور رفتہ رفتہ مذہب کو کلیساؤں اور خانقاہوں کے اندر محبوس ہونا پڑا اور سیاست بے مہار ہو گئی ۔ قرآن کریم نے اسی لئے رہبانیت کے متعلق کہا ہے کہ یہ انکا خود تراشیدہ مسلک تھا اور جذبات رافت و رحمت کی غلط تعبیر کا پیدا کردہ (۵۷/۲۷) ۔ اسلام عدل قائم کرنا سکھاتا ہے جسکے لئے زیادتی کرنے والوں کی قوتوں کو توڑنا پڑتا ہے ۔ لہذا اسمیں رَاْفَت کے ساتھ غِلْظَت (نرمی کے ساتھ سختی) کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔ (دیکھئے عنوان غ ۔ ل ۔ ظ) ۔

ر أ ی

رُؤْیَةٌ ۔ کسی مرئی چیز کا ادراک کر لینا ۔ یہ لفظ آنکھوں سے دیکھنے یا عقل و بصیرت سے معلوم کرنے یا خواب و خیال میں دیکھنے اور تصور کرنے سب کے لئے آتا ہے ۔ جوہری نے کہا ہے کہ جب اس کے ساتھ صرف ایک مفعول آئے تو اس کے معنے آنکھ سے دیکھنا ہوتے ہیں اور جب دو مفعول

آئیں تو اس کے معنے جاننے یا علم حاصل کرنے کے ہوتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ جب اسکے بعد دو مفعول آئیں تو اس میں علم کے معنے ہوتے ہیں اور جب اس کے بعد اِلٰی آئے تو اسکے معنے ہوتے ہیں اس طرح دیکھنا (یا غور و فکر کرنا) کہ اس کے بعد انسان کو عبرت و موعظت حاصل ہو*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ رَاٰی رُؤْیَۃً۔ آنکھ سے دیکھنے کو۔ رُؤْیَا خواب دیکھنے کو، اور رَاْیًا دل سے دیکھنے اور غور کرنے کو کہتے ہیں**۔ اَلْمَرْاٰی والمَرْاٰۃُ۔ منظر۔ اَلْمِرْاٰۃُ۔ آئینہ۔ اَلرُّؤْیَا۔ خواب۔ اَلرَّاْیُ۔ رائے۔ خیال۔ جب کوئی بات یقینی نہ ہو، ظنی ہو تو اس کے دو متناقض پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو اختیار کرلینا رائے کہلاتا ہے*۔ اَرَاَیْتَکَ۔ ($\frac{۴۰}{۱}$) عرب اس معنے میں بولتے ہیں جس معنے میں ہم کہتے ہیں "بتاؤ تو سہی"۔ "ذرا خبر تو دو"۔ اور اَلَمْ تَرَ اِلٰی..... ($\frac{۲۵}{۱}$) تعجب کے موقعہ پر بولتے ہیں "تم نے دیکھا نہیں"! یعنے تمہیں اس بات پر تعجب نہیں آتا؟* لیکن ایسے موقعوں پر اس میں عبرت خیز نظر ڈالنے کی دعوت بھی ہوتی ہے۔ سورۃ آل عمران میں یَرَوْنَھُمْ رَاْیَ الْعَیْنِ۔ ($\frac{۳}{۱۲}$)۔ تاکید اور وضاحت کے لئے آیا ہے۔ جیسے ہم لوگ "آنکھوں دیکھی" وغیرہ بولتے ہیں۔ اور سورۃ مریم میں رِئْیًا ($\frac{۱۹}{۷۴}$) منظر یا ظاہری حالت کے معنوں میں آیا ہے۔ رِئَاءَ النَّاسِ ($\frac{۲}{۲۶۴}$) لوگوں کے دکھانے کے لئے۔ یُرَاءُوْنَ النَّاسَ ($\frac{۴}{۱۴۲}$) لوگوں کو دکھاتے ہیں۔ ھُمْ یُرَاءُوْنَ ($\frac{۱۰۷}{۶}$) وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں (کہ وہ نمازی ہیں) لیکن صلٰوۃ کی حقیقت کو فراموش کر چھوڑتے ہیں۔ یعنی رزق کے جن سرچشموں کو آب رواں کی طرح کھلا رہنا چاہئے انہیں بند لگا کر روکے رکھتے ہیں ($\frac{۱۰۷}{۷}$)۔ سورۃ مومن میں ہے مَآ اُرِیْکُمْ اِلَّا مَآ اَرٰی ($\frac{۴۰}{۲۹}$) "میں تمہیں وہی کچھ بتاتا ہوں جو میں سمجھتا ہوں"۔

سورۃ شعراء میں ہے فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ ($\frac{۲۶}{۶۱}$) "جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا"۔ بَادِیَ الرَّاْیِ ($\frac{۱۱}{۲۷}$) کے لئے دیکھئے عنوان (ب۔ د۔ و)

ر ب ب

رَبٌّ کے معنی نشو و نما دینا ہیں۔ یعنے کسی چیز کو نئی نئی تبدیلیوں سے اسلئے گزارنا کہ وہ بتدریج نشوونما پاتی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچ جائے***۔ جسطرح فطرت، قطرۂ نیساں کو موتی بنانے کے لئے نئی نئی تبدیلیوں

---

* تاج۔ ** محیط۔ ***راغب۔

سے گزارتی اور رفتہ رفتہ اسکی نشوونما کئے جاتی ہے*۔ یہ طریق نشوونما ربوبیت کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں رَبَّ وَلَدَہٗ رَبًّا ورَبَّبَہٗ وتَرَبَّبَہٗ۔ اس نے بچے کی پرورش و تربیت کی۔ نگرانی کی تاآنکہ وہ بالغ ہوگیا۔ حضرت حسان بن ثابت رضؓ کا شعر ہے۔

مِنْ دُرَّۃٍ بَیْضَاءَ صَافِیَۃٍ
مِمَّا تَرَبَّبَ حَائِرَ الْبَحْرِ

یعنی (ممدوح) اس صاف اور سفید موتی سے (بھی زیادہ خوبصورت ہے) جس نے سمندر کی گہرائیوں میں پرورش پائی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کی دیکھ بھال کرنا اور اسے سنوارنا۔ اسی سے الرَّبُّ۔ مالک، خالق، کسی چیز کی نگرانی اور اصلاح کرنے والے کو کہتے ہیں (۲) کسی چیز کا جمے رہنا اور ایک جگہ قائم رہنا۔ چنانچہ کہتے ہیں اَرَبَّتِ السَّحَابَۃُ بِھٰذِہِ الْبَلْدَۃِ۔ بدلی برابر اس شہر پر ٹھہری یا برستی رہی۔ اور (۳) کسی شے کو دوسری شے کے ساتھ ملا دینا۔ لہٰذا تسلسل کے ساتھ نشوونما دیتے چلے جانا اور درست کرتے رہنا ربوبیت ہے۔ مجازاً بچہ کو تھپک کر سلا دینے کے لئے رَبَّتِ الْمَرْاَۃُ صَبِیَّھَا کہتے ہیں*۔ کیونکہ نیند اور آرام و سکون کا وقفہ بچہ کی نشوونما سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔

کسی معاملہ کی اصلاح اور درستگی اور اسکے استحکام کے لئے بھی رَبَّ یَرُبُّ رَبًّا کہا جاتا ہے*۔ اور کسی چیز کو جمع کرنے اور بڑھاتے چلے جانے کو بھی*۔ چنانچہ رِبَابَۃٌ اس تھیلہ کو کہتے ہیں جس میں بہت سے تیروں کو اکٹھا رکھا جائے۔ اور رَبَّ الدُّھْنَ کے معنی ہیں، اس نے تیل کی اصلاح کرکے اسے خوشبودار بنایا**۔

چونکہ نشو و نما کا لازمی نتیجہ شگفتگی اور شادابی ہے اس لئے اَلرِّبَّۃُ اُن پودوں کو کہتے ہیں جو گرمیوں میں بھی مرجھاتے نہیں بلکہ ان کی سرسبزی و تازگی، سردی اور گرمی دونوں میں یکساں رہتی ہے*۔ اور اَلْمَرَبُّ اُس زمین کو کہتے ہیں جہاں درخت اور پودے بکثرت پائے جائیں اور جہاں ہمیشہ سرسبزی و شادابی رہے*۔ اسی طرح اَلرِّبَّۃُ کے معنے ہیں بہت سے گھنے درخت۔ بہت بڑی جماعت (جو دس ہزار یا اس سے لگ بھگ ہو)۔ یا سامان عیش کی کثرت و فراوانی*۔ ابنؔ قتیبہ نے لکھا ہے کہ جماعت کو رِبِّیٌّ کہا جاتا ہے گویا یہ رِبَّۃٌ کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ اسکی جمع

* تاج۔ ** محیط۔

رِبِّیُّوْنَ آتی ہے* ۔ (دیکھئے $\frac{۳}{۱۳۵}$) ۔ اَلرِّبَابَۃُ ۔ تہ بر تہ بادل کے ٹکڑے کو کہتے ہیں** ۔ اور اَلرِّبَبُ ۔ شیریں پانی جو کثرت سے ایک جگہ جمع ہوگیا ہو** ۔ اَلرَّبِیْبَۃُ کے معنے عہد و میثاق اور مملکت کے بھی ہیں*** ۔ کیونکہ اس سے ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ مل جاتی ہے ۔ (ابن فارس) ۔ اَلرَّبِیْبَۃُ ۔ اس کی جمع رَبَائِبُ ہے ($\frac{۴}{۲۳}$) میں یہ لفظ ان لڑکیوں کے لئے استعمال ہوا ہے جو بیویوں کے ساتھ آ جاتی اور ان کے پہلے شوہروں سے ہوں ۔ نیز وہ بکری جسے چراگاہ میں نہ بھیجا جائے بلکہ گھریلو چارہ پر پرورش کیا جائے تاکہ جس وقت ضرورت ہو اسکا دودھ دوہ لیا جاسکے** ۔

مندرجہ بالا تصریحات کے پیش نظر رَبّ کے معنے واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنی نشوونما دینے والا ۔ پایۂ تکمیل تک پہنچانے والا ۔ انتظام کرنے والا ۔ اصلاح کرنے والا ۔ اسلئے قوم کے مدبر اور منتظم سردار کو رَبُّ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے ۔ اور گھر کے مالک کو رَبُّ الْبَیْتِ ** ۔ رَبَّ الْقَوْمَ کے معنی ہیں اس نے قوم کی سیاست کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان پر سیادت کی ** رَبٌّ کی جمع اَرْبَابٌ آتی ہے ($\frac{۱۲}{۳۹}$) ۔

بڑے بھائی کو بھی رَبّ کہا جاتا ہے**** ۔ اس اعتبار سے جہاں بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا کہ (فَاذْھَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلاَ ... $\frac{۵}{۲۴}$) ۔ تو اسکے معنی یہ ہوں گے کہ تو اور تیرا بڑا بھائی (ہارونؑ) دونوں جاؤ اور دشمن سے جنگ کرو ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے طنزاً کہا ہو کہ تو اور تیرا رب دونوں جا کر دشمن سے جنگ کرو ۔ اَلرَّبَّانِیُّ ۔ جس کی نسبت رب کی طرف ہو ۔ یا وہ معلم جو لوگوں کو بڑے بڑے علوم سے پہلے چھوٹے چھوٹے علوم کی غذا دیکر انکی ذہنی نشوونما کرے ۔ ہر صاحب علم کو بھی رَبَّانِیٌّ کہا جاتا ہے ۔ اور راسخ فی العلم کو بھی ** ۔ انہی معنوں میں رِبِّیٌّ بھی استعمال ہوتا ہے ۔

قرآن کریم کی ابتدا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ($\frac{۱}{۱}$) سے ہوتی ہے ۔ یعنی کائنات کا ہر حسین گوشہ خدا کی صفت ربوبیت کا پیکر حمد و ستائش ہے ۔ کائنات میں ہر شے اپنے منہ سے کہہ رہی ہے کہ یہاں ایک عظیم الشان پروگرام کار فرما ہے جس میں ایک ادنیٰ سا بیج اپنی نشوونما کے مختلف مراحل طے کرتا ہوا اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے ۔ اسی کو خدا کا نظام ربوبیت کہتے ہیں ۔ اللہ تعالے اسی لئے قابل حمد و ستائش ہے کہ وہ ہر شے کو ربوبیت عطا کرتا ہے ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جسطرح

* القرطین جلد ۱ صفحہ ۱۰۶ ۔ ** تاج ۔ *** محیط ۔ **** منتہی الارب ۔

خدا کا یہ نظام ربوبیت خارجی کائنات میں از خود کارفرما ہے اسی طرح انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی داخلی اور معاشری دنیا میں اسی نظام ربوبیت کو نافذ کریں۔ اس کا طریق یہ ہے کہ رزق کے تمام سر چشمے تمام افراد کی پرورش کے لئے عام ہو جائیں اور ہر فرد اپنی اپنی استعداد اور صلاحیت کو دوسرے افراد کی نشوونما کے لئے وقف کر دے۔ اس طرح تمام نوع انسانی کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پاتی ہوئی اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائینگی۔ جو لوگ اس نظام کو قائم کر دیں گے وہ رَبَّانِیِّیْنَ کہلائینگے (۳/۷۸)۔ اور اس نظام کا قیام قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے ہوگا۔ یہی قرآن کریم کی ساری تعلیم کا مقصود و منتہیٰ ہے۔ یعنی دنیا میں نظام ربوبیت کا قیام۔ اسی کے لئے وہ معاشرہ وجود میں آتا ہے جسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے مملکت مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ وہ ذریعہ ہوتی ہے افراد انسانیہ کی ربوبیت کا۔ چونکہ ربوبیت میں انسان کی طبعی (جسمانی) زندگی کی پرورش بھی شامل ہوتی ہے اور اس کی ذات کی نشوونما بھی، اس لئے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچائے اور ایسے وسائل و ذرائع، ہر ایک کے لئے یکساں طور پر، مہیا کرے جن سے ان کی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ جب انسانی ذات کی اسطرح نشوونما ہو جائے تو موت سے بھی اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسے حیات آخرت کہتے ہیں۔ خدا کی ربوبیت کا سلسلہ وہاں بھی جاری رہتا ہے۔

"ربوبیت عالمینی"۔ بس یہ ہے اسلامی معاشرہ کا مقصود و منتہٰی۔ یعنی تمام نوع انسانی کی ربوبیت بلا لحاظ نسل و رنگ اور بلا امتیاز خون و وطن۔ جب تک خدا کی یہ صفت، افراد۔ اور ان کے مجموعہ معاشرہ، میں منعکس نہیں ہوتی، ان کی زندگی اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ یہ قرآن کریم کی پہلی آیت اور اس کی تعلیم کا نقطۂ آغاز ہے۔ جس کے اندر یہ صفت خداوندی منعکس ہوتی ہے، وہ پوری محنت سے کماتا ہے اور اپنی ضروریات سے زائد سب کچھ، دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدیتا ہے۔ اسی لئے اس معاشرہ میں، نہ جائدادیں کھڑی کرنے کا تصور پیدا ہو سکتا ہے، نہ دولت اکٹھی کرنے کا خیال۔ نہ رزق کے سرچشموں پر انفرادی ملکیت کا سوال پیدا ہوتا ہے، نہ دوسروں کی محنت کو غصب کر لینے کا خیال۔ قرآن کریم کا مقصود اسی قسم کے معاشرہ کی تشکیل اور قیام ہے

اور یہی معاشرہ ہے جو دنیا کو محسوس طریق پر دکھا سکتا ہے کہ خدا کا تجویز کردہ نظام کسقدر در خور حمد و ستائش ہے - یہ عملی تفسیر ہے - الحمد للہ رب العالمین کی -

رُبَّ (حرف)

رُبَّ - رُبَ - رُبَّمَا - رُبَمَا - یہ ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں ہم اپنے ہاں ''اکثر و بیشتر،، کا لفظ بولتے ہیں - ''اکثر ایسا ہوتا ہے''- ''عام طور پر کہا جاتا ہے''-''عموماً حالت یہ ہوتی ہے''- وغیرہ- نیز یہ تاکید اور شدت کو ظاہر کرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے - جیسے ہم کہتے ہیں، وہ بہتیرا چاہتے رہے - انہوں نے اس کے لئے کتنی ہی بار کوشش کی - وغیرہ- رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ (۱۵/۲) - انکار کرنے والے بہتیرا چاہینگے کہ اے کاش وہ بھی مسلمان ہوتے - یا انکار کرنے والوں کی اکثر یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ بھی مسلمان ہوتے - یا یہ لوگ ہمیشہ اس حسرت میں رہیں گے کہ وہ بھی مسلمان ہوتے - اس کے بر عکس یہ حرف ان معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جن معنوں میں ہم کہتے ہیں ''کبھی کبھی،،- قرآن کریم میں سیاق و سباق سے اس کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ حرف کن معنوں میں استعمال ہؤا ہے -

ر ب ح

رِبْحٌ - تجارت میں چیزوں کے تبادلے سے جو نفع حاصل ہوتا ہے ایسے رِبْحٌ کہتے ہیں* - ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی تجارت میں زیادتی، اضافہ اور کامیابی بتائے ہیں - رِبْحٌ و رَبَاحٌ - تجارت میں اضافہ و ترقی کو کہتے ہیں** - اَرْبَحَ النَّاقَةَ - اسوقت کہتے ہیں جب کوئی شخص صبح کے وقت بھی اونٹنی کا دودھ دوہے اور پھر دوپہر کے وقت بھی - لیکن تَرَبَّحَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں آدمی حیران رہ گیا*** -

قرآن کریم میں آیا ہے فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ (۲/۱۶) - ''ان کی تجارت نے انہیں کوئی نفع نہ دیا،، -

ر ب ص

تَرَبَّصَ - انتظار کرنا - کسی پر خیر یا شر واقع ہونے کا انتظار کرنا**- یا سودے وغیرہ کے سستا یا مہنگا ہونے کا انتظار کرنا یا کسی بات کے واقع ہونے یا زائل ہونے کا انتظار کرنا* -

*راغب - **تاج - ***تاج و محیط -

سورۃ بقرہ میں یہ لفظ ایلاء کے سلسلہ میں انتظار کیلئے آیا ہے۔ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ ... (۲/۲۲۶) ''جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیں ان کے لئے چار ماہ کی مدت تک انتظار ہے''۔ یعنی وہ عورتوں کو اس حالت میں غیر معین عرصہ تک نہیں چھوڑ سکتے۔ انہیں چار ماہ کے اندر قطعی فیصلہ کرنا ہوگا کہ انہیں نکاح میں رکھنا ہے یا آزاد کر دینا ہے۔ مُتَرَبِّصٌ۔ انتظار کرنے والا (۲۰/۱۳۵)۔

ر ب ط

رَبَطَهٗ۔ اسے باندھ دیا۔ اَلرِّبَاطُ۔ وہ چیز جس سے کسی چیز کو باندھا جائے۔ اَلْمُرَابِطَةُ۔ تعلق۔ بندھن۔ ابن فارس نے اس مادے کے بنیادی معنی پختگی سے باندھنا اور جمے رہنا دئے ہیں۔ اَلرِّبَاطُ۔ کسی کام کو مسلسل کرتے رہنا۔ دشمن کی سرحدوں پر مسلسل پہرہ دیتے رہنا۔ رِبَاطُ الْخَيْلِ۔ سرحد پر حفاظت کیلئے فوج کے اڈے بنانا*۔ (۸/۶۰)۔

سورۃ آل عمران میں ہے اِصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا (۳/۱۹۹)۔ اس میں رَابِطُوْا کے معنی اپنی حفاظت کا مستحکم انتظام کرنا، اور ایک دوسرے سے جڑ کر رہنا یا مسلسل مقصد کے لئے سر گرم عمل رہنا ہیں۔

رَبَطَ اللّٰهُ عَلٰى قَلْبِهٖ۔ خدا نے اسے صبر و ضبط کی توفیق دی اور اسکے دل کو مضبوط کر دیا*۔ سورۃ انفال میں ہے وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ يُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۸/۱۱)۔ ''تا کہ وہ تمہارے دلوں کو تقویت دے اور اس کے ذریعے تمہارے قدموں میں ثبات عطا کر دے''۔

اِرْتِبَاطٌ۔ ایک دوسرے کے ساتھ بندھ جانا۔ تعلق*۔

ر ب ع

اَرْبَعَةٌ۔ چار کا عدد (مذکر کیلئے) (۲/۲۶۰) اور اَرْبَعٌ مؤنث کیلئے (۲۴/۶)۔ اَرْبَعُوْنَ و اَرْبَعِيْنَ۔ چالیس۔ (۲/۵۱) اَلرُّبُعُ اور اَلرُّبْعُ ایک چوتھائی* (۴/۱۲) رُبَاعَ۔ چارچار۔ (۴/۳)۔ رَابِعٌ۔ چوتھا (۱۸/۲۲)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ (''چار کے عدد'' کے علاوہ) اس کے بنیادی معنی کسی چیز پر قائم رہنا اور اسے اوپر اٹھانا بھی ہیں۔

*تاج۔

ر ب و

رَبَا ۔ یَرْبُوْ ۔ زیادہ ہونا ۔ بڑھنا ۔ پھولنا* ۔ لِیَرْبُوَا فِی اَمْوَالِ النَّاسِ (۳۰/۳۹) ۔ "تاکہ لوگوں کے اموال میں بڑھوتی ہو" ۔ سبزی کا بڑھنا اور پھولنا (۲۲/۵) ۔ رَبَا السَّوِیْقَ ۔ اس نے ستو میں پانی ملایا اور اس طرح ستو پھولا* ۔ رَابٍ ۔ مونث رَابِیَۃٌ ۔ وہ چیز جو اوپر چڑھ جائے ۔ جو اوپر آجائے ۔ زَبَدًا رَّابِیًا (۱۳/۱۷) ۔ وہ خس و خاشاک یا جھاگ جو اوپر آجائے ۔ اَخْذَۃً رَابِیَۃً ۔ سخت گرفت ۔ بہت زیادہ (بڑھی ہوئی) گرفت* ۔ ایسی گرفت جو انسان کے اوپر چھا جائے اور اسے مغلوب کر دے ۔ (۶۹/۱۰) ۔ اَرْبٰی ۔ زیادہ کثیر ۔ مال و دولت میں زیادہ بڑھا ہوا* ۔ (۱۶/۹۲) ۔ رَبْوَۃٌ ۔ زمین کا بلند حصہ ۔ سطح مرتفع* ۔ (۲۳/۵۰) ۔ رَبَّیْتُہٗ ۔ میں نے اسے بڑھایا ، اسے غذا دی ۔ اسے پالا ۔ پرورش کیا** ۔ (۲۶/۱۸) ۔ اَلرِّبَا (اَلرِّبٰو) ۔ وہ سود جو قرض پر وصول کیا جاتا ہے ۔ رأس المال پر زیادہ لینا*** (تفصیل آگے آتی ہے) ۔

سورۃ آل عمران میں ہے لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً (۳/۱۲۹) ۔ سود مت کھاؤ ۔ تم سمجھتے ہو کہ اس سے دولت میں اضافہ ہوتا ہے ۔ حالانکہ در حقیقت اس سے قومی سرمایہ میں کمی ہوتی ہے ۔ (دیکھئیے عنوان ض ۔ ع ۔ ف) ۔ قرآن کریم نے جو معاشی نظام تجویز کیا ہے اس میں سود کی کہیں گنجائش نہیں ۔ جب اس میں دولت کا جمع کرنا ہی منع ہے تو پھر سود تو کجا، اس میں قرضہ کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا ۔ اس میں فالتو سرمایہ (Surplus Money) کسی فرد کے پاس رہتا ہی نہیں ۔ سارے معاشرے میں بٹ جاتا ہے ۔ قرآن کریم میں قرضہ وغیرہ کے متعلق جو احکام ہیں ، وہ اس عبوری دور سے متعلق ہیں جب ہنوز قرآن کریم کا معاشی نظامِ ربوبیت متشکل نہ ہوا ہو ۔

سود تو ایک طرف ۔ اُس نظام میں کسی کو عطیۃً بھی کوئی چیز اس نیت سے نہیں دی جاسکتی کہ اس سے زیادہ واپس ملیگی ۔ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ (۳۰/۳۹)**** ۔ جو کچھ تم لوگوں کو ان کے واجبات سے زیادہ دو اور اس سے غرض یہ ہو کہ اس میں بڑھوتی ہو تو نظامِ خداوندی میں اس میں بڑھوتی نہیں ہوسکتی ۔ اس کی تفسیر (۴۳/۶) میں یہ کہکر

---

* تاج و محیط ۔ ** اس کے لئے عنوان ر ۔ ب ۔ ب بھی دیکھئے ۔ *** راغب ۔
**** تاج نے اس کے معنی "عطیہ" کئے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ہر اس چیز کے لئے بولا جائے گا جو کسی کے واجب سے زیادہ دی جائے ۔

کر دی کہ لاَ تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرْ۔ کسی پر اس مقصد کے لئے احسان نہ کر کہ تجھے اُس سے زیادہ واپس ملے ۔ اس نظام کی تو بنیاد ھی اِیْتَاۓِ زَکٰوۃ پر ھے ۔ یعنی دوسروں کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچانا ۔ اس لئے (۳۰/۳۹) میں رِبًا کے مقابلہ میں زَکٰوۃ آیا ھے ۔

قرآن کریم نے اَلرِّبٰو کو یہ کہہ کر حرام قرار دیا ھے کہ وَاَحَلَّ اللہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو (۲/۲۷۵)۔ ''خدا نے بیع کو حلال ٹھہرایا ھے اور ربوٰ کو حرام'' ۔ سوال یہ ھے کہ ربٰو کسے کہتے ھیں ؟ اس مقام پر قرآن کریم ربوٰ کو بیع کے مقابلہ میں لایا ھے جس کا مطلب یہ ھے کہ ربوٰ، بیع کی ضد ھے ۔ بیع کیا ھے، اس کی تشریح، عنوان (ب ۔ ی ۔ ع) میں کی جا چکی ھے ۔ اسے ایک نظر دیکھ لیجئے ۔

جو کچھ ھم کسی دوسرے سے لیتے ھیں، اسکی مختلف شکلیں ھو سکتی ھیں ۔ مثلاً عطیہ ۔ اجرت ۔ سود (عام معنوں میں) ۔ منافع (تجارت میں) ۔ جوۓ کی جیت ۔ اب دیکھئے کہ ان میں فرق کیا ھوتا ھے ۔

(۱) عطیہ ۔ اس میں نہ محنت کرنی پڑتی ھے، نہ سرمایہ لگانا پڑتا ھے ۔ دینے والا اسے کچھ واپس لینے کے خیال کے بغیر، تحفۃً دیتا ھے ۔ لہذا اسے لین دین کی مد میں نہیں لایا جا سکتا ۔ اسلئے یہ شکل ھمارے زیر نظر موضوع سے خارج ھے ۔

(۲) اُجرت ۔ یہ محنت (Labour) کا معاوضہ ھوتا ھے ۔ اس میں سرمایہ (Capital) کچھ نہیں لگایا جاتا ۔

(۳) سود ۔ اس میں دوسرے کو سرمایہ (Capital) دیا جاتا ھے اور اس سرمایہ پر، اصل سے کچھ زائد وصول کیا جاتا ھے ۔ اس میں محنت کا کوئی دخل نہیں ھوتا ۔

(۴) منافع (تجارت میں) ۔ اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ھے اور محنت بھی کی جاتی ھے ۔

(۵) قمار ۔ اس میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ھے ۔ نہ محنت کی جاتی ھے ۔

قرآن کریم نے اصول یہ بیان کیا ھے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹) ۔ ''انسان کے لئے وھی ھے جس کے لئے وہ محنت کرے'' ۔ یعنی وہ صرف محنت کا معاوضہ جائز قرار دیتا ھے ۔ سرمایہ (Capital) استعمال کرنے کا معاوضہ جائز نہیں قرار دیتا ۔ چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاھوں کے سامنے

نہیں تھا اس لئے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بیع کے منافع اور ربوٰ میں فرق کیا ہے ؟ ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچدیتا ہے ۔ اسے دس روپے اصل سے زائد ملتے ہیں ۔ دوسرا شخص کسی کو سو روپے قرض دے کر اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے ۔ اس میں بھی اسے دس روپے اصل سے زائد ملتے ہیں ۔ وہ یہ کہتے تھے کہ جب یہ دونوں ، اصل پر زائد ہیں ، تو ان میں فرق کیا ہے ؟ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵)۔ وہ بیع اور ربوٰ کو ایک ھی بات سمجھتے تھے ۔ لیکن قرآن کریم نے کہا کہ یہ دونوں ایک نوعیت کی چیز نہیں ھیں ۔ بیع میں سرمایہ اور محنت دونوں صرف ہوتے ھیں ۔ سرمایہ کے بدلے میں سرمایہ واپس آجاتا ہے ، اور دکاندار کو اسکی محنت کا معاوضہ سرمایہ سے الگ ملتا ہے ۔ یہ حلال ہے ۔ لیکن ربو میں صرف سرمایہ لگتا ہے ۔ محنت کچھ صرف نہیں ہوتی ۔ لہذا اس میں جو کچھ زائد ملتا ہے وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے ، جو حرام ہے ۔ لہذا قرآن کریم کی رو سے اصول یہ ٹھہرا کہ

(۱) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے ۔ اور

(۲) سرمایہ پر زائد لینا حرام ہے ۔

اگر تجارت میں بھی کوئی شخص ، اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے تو وہ ربوٰ ہے ۔ (اس بات کا تعین معاشرہ کریگا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہئے ۔ وہ اس معاوضہ سے زیادہ منافع نہیں لے سکتا) ۔ لہذا ، ہر وہ کاروبار جس میں انسان صرف سرمایہ لگا کر ، اپنے اصل سے زائد وصول کرے ، قرآن کریم کی رو سے الربوٰ میں داخل ہوگا ۔ خواہ وہ زمین کی بٹائی ہو یا کاروبار میں (Sleeping Partner) کا منافع میں حصہ ۔ آجکل کی اصطلاح میں اسے (Un- earned Income) کہتے ہیں ۔ یعنی وہ آمدنی جو محنت سے کمائی نہ جائے ۔

اور جب نہ سرمایہ لگایا جائے نہ محنت کی جائے تو وہ آمدنی جوئے کی ہے ۔ (دیکھئے عنوان ی ۔ س ۔ ر)۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع (تجارت) میں انسان (Risk) لیتا ہے ۔ یعنی اس میں نفع یا نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے ۔ اور ربوٰ میں (Risk) نہیں ہوتا ۔ لیکن یہ معیار تفریق صحیح نہیں ۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط (Risk) ہو تو جوا عین حلال ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں ہر داؤ میں (Risk) ہوتا ہے ۔ بیع اور ربوٰ میں اصل فرق وہی ہے جسے اوپر بیان کیا جا چکا ہے ۔ بیع میں رأس المال+ محنت کا

معاوضہ (اجرت) واپس ملتے ھیں۔ اور ربوٰ میں رأس المال + رأس المال کا معاوضہ ملتا ھے۔ اجرت حلال ھے۔ رأس المال کا معاوضہ حرام ھے، خواہ وہ سود کے نام سے پکارا جائے یا تجارت کے ''منافع'' کے نام سے۔ قرآن کریم کے معاشی نظام میں رأس المال پر اضافہ کسی شکل میں بھی جائز نہیں ھوگا۔ اگر تجارت اُس زمانہ میں ھوگی جب ھنوز افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ نے اپنے اوپر نہیں لی، (یعنی عبوری دور میں) تو رأس المال کے علاوہ اتنے منافع کی اجازت ھوگی جو دکاندار کی دن بھرکی محنت کے معاوضہ کے برابر ھو۔ اور جب دوکاندار کی ضروریات زندگی بھی معاشرہ پوری کریگا تو تجارت میں اشیاء کی فراھمی بلا منافع ھوگی۔ معلوم نہیں انسان کو قرآن کریم کے نظام معاش تک پہنچنے میں ابھی کتنا وقت لگے۔ لیکن جتنا وقت بھی لگے، انسان اپنے خود ساختہ جہنم سے اسی وقت نکل سکے گا جب اس نے قرآنی نظام اختیار کیا۔ موجودہ نظام معیشت جس میں سرمایہ کے استعمال کے معاوضہ کو حلال و طیب سمجھا جاتا ھے، قرآنی نظام کے خلاف اعلان جنگ ھے ($\frac{۲}{۲۷۹}$)۔

ر ت ع

رَتَعَ۔ یَرْتَعُ۔ رَتْعًا۔ سرسبز مقام میں سیر ھو کر کھانا پینا اور حسب مرضی گھومنا پھرنا۔ رَتْعٌ کا لفظ دراصل جانوروں کے کھانے چرنے کیلئے آتا ھے اور جی بھر کر کھانے کے لئے، پھر استعارۃً انسانوں کیلئے بھی استعمال ھوتا ھے*۔ جَمَلٌ رَاتِعٌ (جمع۔ اِبِلٌ رِتَاعٌ) آزادی کے ساتھ کھانے پینے والا اونٹ۔ اَلْمَرْتَعُ۔ چراگاہ۔ اَرْتَعَتِ الْاَرْضُ۔ زمین میں گھاس اور چارہ بکثرت ھو گیا*۔

سورۃ یوسف میں ھے کہ برادران حضرت یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا کہ یوسفؑ کو ھمارے ساتھ باھر جنگل میں جانے کی اجازت دیجئے یَرْتَعْ وَ یَلْعَبْ ($\frac{۱۲}{۱۲}$)۔ تاکہ یہ وھاں ھنسی خوشی سے کھائے پیے اور کھیلے کودے۔ ''یَرْتَعْ وَ یَلْعَبْ''، کا تقریبًا وھی مفہوم ھے جو آجکل ھمارے ھاں پکنک (Picnic) کا ھے۔

ر ت ق

رَتْقٌ۔ شگاف کو بند کر دینا، بھر دینا، ملا دینا۔ نیز جڑی ھوئی اور ملی ھوئی چیز۔ اِرْتَتَقَ الشَّیْءُ۔ چیز مل گئی اور جڑ گئی۔ اس میں

*تاج و محیط و راغب۔

کہیں شگاف نہ رہا* ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلرَّتْقُ جوڑنا اور ملانا ہے خواہ وہ خلقی ہو خواہ مصنوعی** ۔ قرآن کریم میں ارض و سمٰوات کے متعلق ہے کہ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۔ (۲۱/۳۰) ۔ شروع میں اس تمام مادی کائنات کا ہیولٰی ملا جلا تھا ۔ پھر اس میں سے مختلف کرّے الگ الگ ہو گئے ۔ (۴۱/۱۱) ۔ غور کیجئے کہ یہ اعلان چھٹی صدی عیسوی میں ہوتا ہے ۔ جب کسی انسان کے ذہن میں اسکا تصور تک بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ مختلف اجرام شروع میں ایک ہی ہیولٰی تھے اور بعد میں یہ الگ الگ ہوئے ۔ آج سائنس کی تحقیقات نے اس اعلان پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے لیکن اُسوقت اِس حقیقت کو خالقِ کائنات کے سوا اور کون بیان کر سکتا تھا ؟

ر ت ل

اَلرَّتَلُ ۔ دانتوں کا موتیوں کی لڑی کی طرح سفید، آبدار، اور نہایت خوبصورت ترتیب کے ساتھ ہونا ۔ کسی چیز کا حسنِ تناسب کے ساتھ مربوط و مرتب ہونا ، حسنِ ترتیب اور حسنِ نظم لئے ہوئے ہونا ۔ اَلرُّتَيْلَاءُ ۔ ایک قسم کی مکڑی جو اپنے جالے کو نہایت عمدہ حسن اور تناسب سے تنتی ہے*** ۔

قرآن کریم کے متعلق ہے وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (۲۵/۳۲) ۔ ہم نے اسے نہایت عمدہ ترتیب، تناسب اور نظم کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اس کے اجزاء کو نہایت خوبصورتی سے باہمدگر جوڑا ہے ۔ اسکی ساری تعلیم، ایک خاص نظم کے ساتھ، اسکے مرکزی فکر کے گرد گھومتی ہے ۔ نبی اکرمؐ سے کہا گیا وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (۷۳/۴)۔ تم بھی اسے اسی طرح حسنِ نظم و تناسب کے ساتھ عمل میں لاتے چلے جاؤ۔

ر ج ج

اَلرَّجُّ ۔ ہلانا ۔ شدت سے حرکت دینا ۔ زلزلہ ڈال دینا ۔ کسی چیز کو ہلا کر اسکی جگہ سے ہٹا دینا، بے جگہ کر دینا ۔ اِرْتَجَّ الْبَحْرُ ۔ سمندر متموج اور متلاطم ہو گیا ۔ اَلرَّجَاجَةُ ۔ شیر کی کچھار**** ۔

قرآن کریم میں ہے اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (۵۶/۴) ۔ جب زمین سخت حرکت سے متزلزل ہو جائیگی ۔ دوسری جگہ ہے ۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۹۹/۱) ۔ ”جب زمین کو ہلایا جائیگا اس کا ہلایا

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و محیط ۔ ****تاج و محیط و راغب

جانا،، - یعنی پوری شدت سے ہلائی جائیگی - قرآن کریم کے اس قسم کے بیانات سے، کائنات کا طبیعی انقلاب بھی مقصود ہو سکتا ہے اور تمدنی انقلاب بھی -

ر ج ز

رِجْزٌ (اور رُجْزٌ) کے بنیادی معنے اضطراب پیہم اور مسلسل حرکت کے ہیں - اَلرَّجَزُ - اونٹ کی ایک بیماری کا نام ہے جس میں اسکی ٹانگیں یا جسم کا پچھلا حصہ اتنا کمزور ہوجاتا ہے کہ جب وہ کھڑا ہونے لگے تو اسکی ٹانگیں اور رانیں کپکپانے لگ جاتی ہیں اور وہ دو تین مرتبہ کوشش کرنے کے بعد اٹھنے کے قابل ہو سکتا ہے* -

رِجْزٌ - وہ عذاب ہے جس میں کوئی قوم اضطراب پیہم میں مبتلا رہے اور ایسی کمزور ہوتی جائے کہ اس کے لئے اٹھنا دشوار ہو جائے - عَذَابٌ مِنْ رِجْزٍ اَلِيْمٌ (۳۴/۵) - ''وہ عذاب جو درد ناک اضطراب ہے،،- دوسری جگہ ہے - رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ (۲۹/۳۴) - وہ تباہیاں اور بربادیاں جو خارجی حوادث کی رو سے آئیں - سورۃ اعراف میں ان مختلف قسم کی تباہیوں کو رِجْزٌ سے تعبیر کیا گیا ہے جو قوم فرعون کو پیش آئی تھیں - (۷/۱۳۴) -

سورۃ انفال میں ہے کہ ہم نے (بدر کے میدان میں) شیطان کے پیدا کردہ رِجْزٌ کو تم سے دور کر کے تمہارے دلوں میں تقویت اور پاؤں میں استقامت پیدا کر دی (۸/۱۱) - یہاں سے رِجْزٌ کے معنے واضح ہو جاتے ہیں - یعنے پائے استقلال میں لغزش آ جانا - ایسی کمزوری پیدا ہوجانا جس سے دلوں میں اضطراب اور پاؤں میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہوجائے - اسلئے سورۃ المدثر میں جب نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ ''اب تو اس دعوت انقلاب کو لیکر اٹھ،، - تو اسکے ساتھ ہی کہا کہ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (۷۴/۵) - اس کمزوری کو جھٹک کر الگ کر دے جو اٹھنے میں لڑکھڑاہٹ کا موجب بن جائے - تم اور تمہارے رفقاء اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر لو کہ تم اس بار گراں کو لیکر مردانہ وار اٹھ کھڑے ہو - اس سورۃ میں تخاطب تو نبی اکرمؐ سے ہے لیکن یہ تعلیم تمام جماعت کے لئے ہے - ایسا عظیم انقلاب اسی جماعت کے ہاتھوں برپا ہو سکتا ہے جس کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئے -

*تاج -

رج س

اَلرَّجْسُ - سخت آواز - کسی بہت بڑی اور مختلف قسم کی مخلوط چیزوں کی آواز کو کہتے ہیں - جیسے فوج یا سیلاب کا شور یا بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک - رَجَسَتِ السَّمَاءُ - بادل بڑے زور سے گرجا - اِرْتَجَسَ الْبِنَاءُ - عمارت اسطرح ہلی یا لرزی کہ اسکی آواز سنائی دی - اَلرَّجَّاسُ - سمندر کو کہتے ہیں کیونکہ اسمیں سخت اضطراب بھی ہوتا ہے اور شور بھی - لہذا رِجْسٌ کے معنے ہوئے ہیں التباس - شک - تردد - اضطراب - کسی معاملہ کا صاف اور یکسو نہ ہونا - هُمْ فِيْ مَرْجُوْسَةٍ مِنْ اَمْرِهِمْ - وہ لوگ اپنے معاملہ میں شک - اضطراب اور التباس میں ہیں* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اختلاط اور التباس کے ہیں - گندگی کو بھی اَلرِّجْسُ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ لتھڑ اور چپک جاتی ہے - اور خود اس میں بھی کئی آلائشیں ہوتی ہیں - قرآن کریم میں ہے وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۰۰/۱۰)- ”جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان پر اللہ رجس ڈال دیتا ہے،، - یہاں عقل سے کام نہ لینے کا نتیجہ رِجْسٌ بتایا گیا ہے - لہذا معنے واضح ہیں - یعنے شک - التباس - اضطراب - نیز اسکے معنے ایسی باتیں ہیں جن کا ذکر تک بھی قبیح ہو اور ان میں بہت زیادہ قباحت ہو* - نا خوش آئند امور - قرآن کریم نے خَمْرٌ - مَيْسِرٌ - اَنْصَابٌ - اَزْلَامٌ کو رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ کہا ہے (۹۰/۵) - اس میں قباحت ازر نا پسندیدگی بھی ہے اور اضطرابی کیفیت بھی - اسی طرح کھانے کی حرام چیزوں کے متعلق کہا ہے - فَاِنَّهٗ رِجْسٌ (۱۴۶/۶) - رَجَسَهٗ عَنِ الْاَمْرِ کے معنے ہیں ، اُس نے اسے اس کام سے روک دیا* - لہذا رِجْسٌ وہ کام ہیں جن سے انسانی شرف کے نشو و نما میں خلل اور رکاوٹ پیدا ہو جائے - تاج نے کہا ہے کہ اس سے وہ کام مراد ہیں جو انسان کو عذاب (تباہی) کیطرف لے جائیں- بات ایک ہی ہے- مِرْجَاسٌ اس پتھر کو بھی کہتے ہیں جو یہ دیکھنے کے لئے کنویں میں لٹکایا جائے کہ پانی کی گہرائی کس قدر ہے* -

سورۃ احزاب میں اہل بیت نبویؐ کے متعلق ہے يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ (۳۳/۳۳) - خدا چاہتا ہے کہ تم سے رِجْسٌ دور کر دے- یعنے اضطرابات اور التباسات - یا وہ موانع جو تمہاری صحیح

*تاج -

نشو و نما کے راستہ میں حائل ہوں ۔ سورۃ انعام میں ایمان والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کا سینہ اسلام کے لئے کھل جاتا ہے ۔ اس کے بر عکس، غلط راستے پر چلنے والوں کا سینہ تنگ ہوتا ہے۔ ان کی سانس پھول جاتی ہے۔ اس کے بعد ہے كَذَالِكَ يَجْعَلُ اللهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لاَ يُؤْمِنُوْنَ (۶/۱۲۶) ۔ اس سے ظاہر ہے کہ رجس کے اندر دل کی تنگی ۔ تعصب ۔ تنگ نگہی ضد ۔ ہٹ دھرمی ۔ عقل و فکر سے کام نہ لینا ۔ نیز شکوک ۔ اضطراب وغیرہ سب کا مفہوم آ جاتا ہے ۔ اسی بنا پر منافقین کو رجس مجسم کہا گیا ہے (۹/۹۵)۔ یعنی شکوک و اضطراب اور صحیح نظام کے راستے میں خلل اور رکاوٹ۔ بر عکس ایمان والوں کے (۹/۱۲۴-۲۵) ۔

ر ج ع

رُجُوْعٌ کے معنے ہیں پلٹنا ۔ لوٹنا ۔ واپس ہونا ۔ اور رَجْعٌ کے معنی ہیں پلٹانا* ۔ لیکن اس حقیقت کو شروع ہی میں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے ہاں جس مفہوم کیلئے رجعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے وہ اس کا صحیح مفہوم نہیں ۔ ہمارے ہاں رجعت سے مراد ہوتی ہے پسپائی ۔ کسی کا اپنے مقام سے پیچھے ہٹ جانا ۔ (رجعت پسند Re-actionary کو کہتے ہیں) ۔ یعنے اسمیں تنزل ۔ پستی اور اپنے مقام سے پیچھے ہٹ جانے کا پہلو نمایاں ہوتا ہے ۔ بر عکس اسکے عربی زبان میں اسکے معنے یا تو اُسی پہلی حالت کی طرف رجوع کرنے کے ہوتے ہیں ۔ اور یا اُس سے بہتر کیفیت لئے ہوئے ۔ چنانچہ اَلتَّرَجُعَةٌ کسی عورت کو طلاق دینے کے بعد ، پھر ازدواجی تعلق قائم کر لینے (میاں بیوی بن جانے) کو کہتے ہیں ۔ یعنی اُسی پہلی حالت کیطرف لوٹ آنے کو ۔ اور لَيْسَ لِيْ مِنْ فُلاَنٍ رَجْعٌ کے معنے ہیں مجھے اس شخص سے کوئی نفع نہیں پہنچا ۔ یعنی اس کے ہاں سے کوئی چیز پلٹ کر نہیں آئی ۔ اسی طرح عربوں کے ہاں ضرب المثل ہے مَا هُوَ اِلاَّ سَجْعٌ لَيْسَ تَحْتَهُ رَجْعٌ ۔ یہ نرا سجع ہی سجع ہے جسکے تحت کوئی (رجع) فائدہ نہیں ۔ چنانچہ اَرْجَعَتِ الْاِبِلُ اُسوقت کہتے ہیں جب اونٹ لاغر ہو جانے کے بعد پھر فربہ ہو جائے ۔ اور سَفْرَةٌ مُرْجِعَةٌ اس سفر کو کہتے ہیں جس میں فائدہ ہو ۔ مَتَاعٌ مُرْجِعٌ ۔ بہت نفع بخش جنس ۔ رَجِيْعٌ ۔ اس رسی کو کہتے ہیں جسکے بٹ کھل گئے ہوں اور اسے دوبارہ بٹ دیا جائے* ۔

*تاج ۔

رَجْعٌ کے معنی پلٹانا ہیں ۔ جو چیز گردش کرتی ہے وہ پلٹ کر اُسی مقام پر آتی ہے جہاں سے وہ چلی تھی ۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہر گردش میں رَجْعٌ پایا جاتا ہے ۔ سورۃ الطارق میں ہے وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (۸۶/۱۱) ۔ اس کے معنی یہی معلوم ہوتے ہیں کہ کائنات کی بلند فضا یا اس کے اندر جو کرّے ہیں وہ گردش کرتے ہیں ۔ اور جس مقام سے چلتے ہیں پلٹ کر وہیں آ جاتے ہیں ۔ یا اس کے معنی ہیں وہ بلند فضا جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کروں کو یا دیگر اشیا کو پلٹاتی ہے ۔ (اور انکی گردش سے کائناتی زندگی کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں) ۔ پیچھے لوٹنے کے معنوں میں یہ لفظ (۳۶/۶۷) میں آیا ہے جہاں اس کے مقابلہ میں مُضِيًّا ہے جس کے معنی آگے چلنے کے ہیں ۔

رَجَعَ اِلَيْهِ کے معنی ہوتے ہیں کسی کی طرف امداد وغیرہ کیلئے رجوع کرنا ۔ (Having a Recourse to)** ۔ نیز رَجْعٌ کے معنے ردِ عمل (Reaction) یا نتائج مرتب ہوجانے کے بھی ہوتے ہیں ۔ چنانچہ کہتے ہیں رَجَعَ الْعَلَفُ فِي الدَّابَّةِ ۔ جانور پر چارہ کا اثر نمایاں ہو گیا* ۔ رَجَعَ كَلَامِي فِيْهِ ۔ میری بات نے اس پر اثر کیا* ۔ اَلتَّرْجِيْعُ مِنَ الْكَلَامِ کے معنے ہیں وہ بات جو خود کہنے والے کی طرف لوٹا دی جائے* ۔

ژالہ (اولے) کو بھی رَجْعٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ اس پانی کو واپس دیدیتا ہے جو اس نے زمین سے حاصل کیا تھا ۔ نیز بارش کو بھی* ۔ اور اس پانی کو بھی جو سطح ارض پر بہ رہا ہو*** ۔ اس اعتبار سے وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (۸۶/۱۱) کے معنی ہونگے وہ بلندی جو بخارات کو پانی (بارش) کی شکل میں پلٹا دیتی ہے ۔

قرآن کریم میں ہے صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (۲/۱۸) ۔ ایسے مقامات پر يَرْجِعُوْنَ کا مفہوم سمجھنے کے لئے ایک بات کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے ۔ جب نبی اکرم ؐ نے اپنی دعوت پیش کی تو سامنے دو قسم کے لوگ تھے ۔ ایک اہل کتاب، جو کسی وقت میں حق پر تھے لیکن بعد میں حق کے راستے سے ہٹ گئے ۔ ان سے بھی کہا گیا کہ تم پھر حق کیطرف پلٹ کر آ جاؤ ۔ وہ اس سے انکار کرتے تھے تو ان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ حق کی طرف پلٹ کر نہیں آتے ۔ لیکن دوسرا گروہ وہ تھا جن کی طرف حق پہلے پہل آیا تھا ۔ وہ جب حق کیطرف نہیں آتے تھے تو ان کے

*تاج ۔ **لین ۔ ***محیط ۔ ****کتاب الاشتقاق ۔

متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ حق کی طرف رجوع ھی نہیں کرتے ۔ اسکی طرف آتے ھی نہیں ۔ اسکی طرف توجہ ھی نہیں دیتے ۔ اس کے لئے بھی قرآن کریم نے لَا يَرْجِعُوْنَ کا لفظ استعمال کیا ھے ۔ ان مقامات میں صحیح ترجمہ ”رجوع کرنا،، ھوگا ۔ ویسے یہ بھی کہا جا سکتا ھے کہ وہ اپنی موجودہ غلط روش کو چھوڑ کر حق کیطرف نہیں پلٹتے ۔

سورة طٰهٰ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ھے فَرَجَعْنٰكَ اِلٰى اُمِّكَ (۲۰/۴۰) ۔ ” ھم نے تجھے تیری ماں کی طرف لوٹا دیا ۔،، سورة نور میں ھے ۔ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا (۲۴/۲۸) ۔ ”اگر صاحب خانہ تم سے کہیں کہ واپس چلےجاؤ ۔ تو واپس ھوجاؤ“ ۔ حضرت یوسفؑ کے بھائی جب باپ کی طرف لوٹ کر آئے ھیں تو اس کے لئے فَلَمَّا رَجَعُوْا اِلٰى اَبِيْهِمْ ۔ کے الفاظ آئے ھیں (۱۲/۶۳) ۔

سورة النمل میں ھے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے قاصد کو خط دیکر ملکہ سبا کی طرف بھیجا تو اس سے کہا کہ خط دینے کے بعد پیچھے مڑ آنا ۔ اورپھر انتظار کرنا کہ انکا رد عمل کیا ھوتا ھے ۔ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ (۲۷/۲۸) ۔ سورة قٓ میں موت کے بعد دوبارہ زندگی کو رَجْعٌ کہا گیا ھے (۵۰/۳) ۔ یعنے مرنے کے بعد پھر زندگی کی طرف لوٹ آنا ۔ (اس دنیا کی طرف لوٹنا نہیں ۔ بلکہ مرنے کے بعد زندہ ھو جانا) ۔

اس مقام پر اس غلط تصور کا ازالہ ضروری ھے جو رَجْعَتَ اِلَى اللّٰهِ کے غیر قرآنی مفہوم سے عام طور پر ذھنوں میں پیدا ھوتا ھے ۔ ھمارے ھاں کسی کی موت کی خبر سن کر کہا جاتا ھے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۲/۱۵۶) ۔ اور اس کے معنے کئے جاتے ھیں ”ھم اللہ کے ھیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ھیں“ ۔ اس سے ذھن دو صورتوں کی طرف منتقل ھو جاتا ھے ۔ ایک تو یہ کہ ھم پیدا ھونے سے پہلے خدا کے پاس تھے اور مرنے کے بعد (حشر کے دن) ایک میدان میں جمع ھونگے جہاں اللہ تعالےٰ بھی ھونگے اور اس طرح ھم لوٹ کر اُس کی طرف چلے جائینگے ۔ یہ تصور اس لئے غیر قرآنی ھے کہ اس سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ھے کہ خدا کسی ایک مقام میں محدود ھے اور تمام انسانوں کو اس مقام کی طرف لوٹ کر جانا ھے ۔ خدا کے لئے کسی خاص مقام کا تعین باطل تصور ھے ۔ وہ ھر مقام پر ھے ۔ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ (۵۷/۴) ۔ مرنے کے بعد اگلی زندگی کی کیفیت کیا ھوگی ، اعمال کے جزا و سزا کا رنگ کیا ھوگا ۔ یہ وہ باتیں ھیں جن کی ماھیت اس زندگی میں

سمجھ میں نہیں آسکتی ۔ قرآن کریم نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں ۔ لیکن ایک بات بالکل واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ مردوں کا کسی ایسے مقام کی طرف جانا جہاں خاص طور پر خدا موجود ہوگا قرآنی تصور کے مطابق نہیں۔قرآن کریم تو یہ بھی کہتا ہے کہ وَجَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا (۸۹/۲۲)۔ تیرا رب اور ملائکہ صف در صف آئینگے ۔ وَ جِآئَ یَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ (۸۹/۲۳)۔ اُس دن جہنم لائی جائیگی ۔ خدا کے متعلق کسی خاص مقام یا سمت کا تصور جہاں ہم مرنے کے بعد جائینگے، قرآن کریم کی رو سے درست نہیں۔

دوسری صورت جسکی طرف ذہن (اِنَّا لِلّٰہِ . . . . . سے) منتقل ہوتا ہے تصوف کی پیدا کردہ ہے ۔ ویدانت (ہندؤوں کے ''تصوف'') کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ انسانی روح (آتما) درحقیقت روحِ کائنات ، یعنی خدا (پر ماتما) کا ایک جزو ہے ۔ یہ جزو اپنے کل سے جدا ہو کر مادہ کی دلدلوں میں پھنس چکا ہے اور یہاں سے نکلنے کے لئے تناسخ کے چکر کاٹ رہا ہے ۔ آخر الامر یہ جزو پھر اپنے کل میں جا ملیگا جس طرح ، (اپنشد کے الفاظ میں) ''شام کو پرندے اپنے گھونسلوں میں واپس چلے جاتے ہیں'' ۔ ویدانت کا یہی تصور ہمارے تصوف میں آیا جسکی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ '' انسانی روح*'' خدا کا ایک جزو ہے اور یہ جزو اپنے کل سے ملنے کے لئے مضطرب و بیقرار ہے ۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائیہا شکایت مے کند (رومی)

مرنے کے بعد نیک لوگوں کی روح اپنے "کل (خدا) میں جا ملیگی ۔ یہی زندگی کی کامیابی و کامرانی ہے ۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا (غالب)۔

'' اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ '' سے (ان کے نزدیک) مراد ہے جزو کا اپنے کل کی طرف لوٹ جانا اور اُس سے جا کر مل جانا ۔ اسی لئے یہ لوگ موت کو وصال کہتے ہیں ۔ (فلاں صاحب کا وصال ہو گیا ۔ یا فلاں بزرگ واصل بالحق ہو گئے) وصال کے معنے مل جانے کے ہیں ۔

یہ تصور بھی غیر قرآنی ہے، اسلئے کہ انسان اور خدا کا تعلق جزو اور کل کا نہیں ۔ کسی کل سے اگر کوئی جزو الگ ہو جائے تو "کل نا تمام رہ جاتا ہے ۔ اور یہ چیز ذات خداوندی میں نقص کا باعث ہے ۔ لہذا ، اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ کا یہ مفہوم بھی غلط ہے۔

---

* '' انسانی روح ,, کی ترکیب بھی غیر قرآنی ہے ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان (ر-و-ح)۔

سمت یا مقام کا تصور رَاجِعُوْنَ کے علاوہ اِلَیْہِ (اس کی طرف) کے لفظ سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی اسلئے کہ ہم اِلَیْہِ یا اِلَیْنَا سے خود ہی سمت مراد لے لیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں اس کا ہر جگہ یہی مفہوم نہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ۔ تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ تیرا رب سائے کو کسطرح پھیلاتا ہے۔ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا۔ اگر وہ چاہتا تو اپنے قانون مشیت کی رو سے ایسا بھی کر سکتا تھا کہ سائے نہ گھٹتے نہ بڑھتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے سورج کو اس انداز سے بنایا ہے کہ وہ اسکے گھٹنے بڑھنے کی دلیل (موجب) بن گیا ہے۔ اسکے بعد ہے ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا (۲۵/۴۵-۴۶)۔ پھر ہم اسے (یعنے سائے) کو اپنی طرف (اِلَیْنَا) کھینچ لیتے ہیں، نہایت آسانی سے کھینچ لینا۔ اس آیت میں اِلَیْنَا کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ اس سے مراد کوئی خاص سمت نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ خدا کے قانون کائنات کے مطابق سائے سمٹ جاتے ہیں۔ لہذا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا ایک مفہوم ''خدا کے قانون طبعی کے مطابق نقل و حرکت کرنا'' بھی ہے۔ مثلاً سورۃ آل عمران میں ہے وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ (۳/۸۲)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اسکے قانون کے سامنے سربسجود ہے۔ طوعاً و کرہاً۔ اور اسطرح ہرشے کا قدم اُسی مرکز کی طرف اُٹھتا ہے۔ ہر شے اُسی محور کے گرد گردش کر رہی ہے۔ اُسی قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ سورۃ یٰسٓ میں ہے فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (۳۶/۸۳)۔ اللہ کی ذات (انسان کے خود پیدا کردہ غلط تصورات سے) بہت دور اور بلند ہے۔ ہرشے کی باگ ڈور اسی کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ اس لئے ہر شے اس کے مقرر کردہ قانون کے مطابق گردش کرتی ہے۔ اس کا ہر قدم اسی قانون کیطرف اٹھتا ہے۔ اس سے وہ ادھر اُدھر ہٹ نہیں سکتی۔ اور چونکہ ''اشیاء'' میں خود انسان بھی شامل ہیں اسلئے یہ بھی اس قاعدے سے مستثنےٰ نہیں۔ اس کا ہر عمل بھی قانونِ مکافات کی زنجیروں کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اسلئے اس کا ہر قدم بھی اسی کی سمت اٹھ رہا ہے۔ (وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ)۔

اب یہاں سے ہم خارجی کائنات کے قانونِ طبیعی سے آگے بڑھ کر انسانی دنیا کے قانونِ مکافات کیطرف آ گئے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کی متعدد آیات میں اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ (یا اسی قسم کے دیگر الفاظ) آئے ہیں۔ مثلاً

ارشاد ہے کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی ۔ اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی ۔ جب
انسان اپنے متعلق یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں (ہر
ایک سے مستغنی ہے) تو پھر سرکشی اختیار کر لیتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے
کہ وہ لاکھ اپنے آپکو مستغنی سمجھے ۔ اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی (۹۶/۸-۶) ۔
وہ خدا کے قانونِ مکافات کے دائرے سے باہر جا ہی نہیں سکتا ۔ اسے بہرحال
اسی قانون کی طرف آنا ہے ۔ اس حقیقت کو وَ اِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ
(۳۵/۴) سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ یعنی یہاں ہر معاملہ کا فیصلہ اسی کے قانون کے
مطابق ہوتا ہے ۔ سورۃ انبیاء میں ہے کہ تمام نوع انسانی ایک ہی جماعت
اور ایک ہی برادری ہے لیکن لوگوں نے اپنی اپنی مفاد پرستیوں کی بنا پر
اسے الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے ۔ وَ تَقَطَّعُوْٓا اَمْرَھُمْ بَیْنَھُمْ
(۲۱/۹۳) ۔ اسکے بعد ہے کُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ ۔ اور اسکے بعد ہے فَمَنْ
یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ ھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا کُفْرَانَ لِسَعْیِہٖ وَ
اِنَّا لَہٗ کٰتِبُوْنَ (۲۱/۹۴) ۔ پس جو شخص صلاحیت بخش پروگرام پر کاربند
رہتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو اسکی کوششیں بے نتیجہ نہیں رہتیں ۔ ہم ان
سب کو لکھتے رہتے ہیں ۔ اس سے کُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ کا مفہوم
واضح ہو جاتا ہے ۔ یعنی تمام انسانوں کے اعمال کے نتائج ہمارے قانونِ
مکافات عمل کے مطابق مرتب ہوتے ہیں ۔ تمام اعمال اس محور کے گرد
گردش کرتے ہیں ۔ ہر ایک کا قدم اسی کی طرف اٹھتا ہے ۔ کوئی اس سے
بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا ۔ یہ لوگ ہمارے قانون کی خلاف ورزی کر کے
بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری گرفت سے دور جا رہے ہیں حالانکہ
وہ ہمارے قانونِ مکافات کی طرف از خود کھنچے چلے آ رہے ہیں ۔ کُلٌّ
اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ ۔ نیز دیکھئے (۶/۱۶۵ و ۲/۲۸۱-۸۲) جہاں مکافات عمل کا
مفہوم واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے ۔

اعمال کے نتائج کے متعلق بھی ہمارے ذہن میں یہ تصور ہے کہ یہ
نتائج صرف دوسری زندگی میں جا کر مرتب ہونگے ۔ یہ تصور بھی صحیح
نہیں ۔ اعمال کے نتائج، عمل سرزد ہونے کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو
جاتے ہیں ۔ پھر ان میں سے بعض نتائج کا ظہور اسی دنیا میں ہو جاتا ہے اور
بعض کا ظہور اسکے بعد کی زندگی میں ہوتا ہے ۔ لہٰذا قرآن کریم میں جہاں
یہ آیا ہے کہ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ
(۲۹/۸) ۔ اور جس کے معنے یہ کئے جاتے ہیں کہ ”تمہیں میری طرف لوٹ کر آنا
ہے ۔ پس میں تمہیں تمہارے اعمال کی خبر دونگا“۔ تو اسکا یہ مطلب نہیں کہ

جب انسان مرنے کے بعد خدا کی طرف جائیگا تو اعمال کے نتائج سامنے آئینگے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ تمہارے تمام اعمال ہمارے قانونِ مکافات کے گرد گردش کرتے ہیں ۔ اس قانون کی رو سے انکے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ تم اس کے احاطہ سے باہر نہیں رہ سکتے۔ اسی کی رو سے انکے نتائج تمہارے سامنے آجاتے ہیں ۔ چنانچہ خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ (۴۰/۷۷) ۔ ہم ان مخالفین کو جس سزا کی وعید دے رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ اس میں سے کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ظہور میں آ جائے ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا تیری وفات کے بعد ہو۔ لیکن زود ہو یا بدیر ۔ ان کے اعمال کے نتائج بہر حال ہمارے ہی قانون کے مطابق مرتب ہونگے ۔ یہ اس کے دائرے سے باہر جا نہیں سکتے ۔ (فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ) ۔

لیکن جن اعمال کے نتائج انسان کی اس زندگی میں سامنے نہیں آتے وہ اسکے بعد کی زندگی میں سامنے آ جاتے ہیں ۔ یہ ہے وہ مقام جہاں یہ آیا ہے کہ تم مرنے کے بعد بھی اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔ ”خدا کیطرف لوٹو گے“ ۔ یعنی تم یہ نہ سمجھ لو کہ اب تو ہم مر گئے اس لئے اب ہم پر کسی کی گرفت نہیں ۔ تم مرنے کے بعد بھی خدا کے قانون مکافات کی طرف جاؤ گے ۔ اس سے تمہارے لئے کہیں مفر نہیں ۔ یہ ہے قرآن کریم کی رو سے اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کا مفہوم ۔

بعض مقامات پر یہ لفظ ٹھیک ان معنوں میں بھی آیا ہے جن معنوں میں ہمارے ہاں رجوع کرنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (۳۶/۳۱) ۔ یہ لوگ اپنے رسولوں کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔

ان تصریحات کی روشنی میں اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کا صحیح مفہوم سمجھئے ۔ قرآن کریم میں جہاں اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ آیا ہے اس سے پہلی آیات میں یہ ذکر ہے کہ نظام خداوندی کے قیام و استحکام میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے ۔ حتّٰکہ اس میں جان تک بھی دیدینی پڑتی ہے ۔ اس اصولی حقیقت کو بیان کرنے کے بعد جماعتِ مومنین سے کہا گیا ہے کہ تمہارے سامنے بھی زندگی کے مختلف پہلو آئینگے۔ دشمنوں کی طرف سے ایذا رسانی کا خوف۔ بھوک ۔ اموال و ثمرات اور نفوس کا اتلاف۔ یہ سب کچھ ہوگا۔اسکے بعد ہے وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۔ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (۲/۱۵۶)۔تو خوشگوار نتائج کی بشارت دیدے ان لوگوں کوجن کی کیفیت یہ ہے کہ

انہیں جب بھی اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں تو وہ دل کے پورے اطمینان سے کہدیتے ہیں کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ۔ ہماری ساری زندگی خدا (کے نظام) کیلئے وقف ہے ۔ اور ہم ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کیلئے اُسی کے قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ یا یہ کہ جب ہماری ساری زندگی اُسکے نظام کیلئے وقف ہے تو یہ مشکلات و مصائب ہمیں اسکے راستے سے ہٹا نہیں سکتیں ۔ اُن کے علی الرغم ہمارا ہر قدم اُسی کی طرف اٹھتا ہے ۔ ہماری ہر حرکت اسی محور کے گرد گردش کرتی ہے ۔ (اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) ۔ اور ہماری اس جد و جہد کے نتائج بھی اسی کے قانون کے مطابق مرتب ہونگے جس پر ہمیں پورا پورا بھروسہ ہے ۔ جتنے موانعات آنا چاہتے ہیں آئیں ۔ جتنی رکاوٹیں کوئی ڈالنا چاہتا ہے ڈال لے ۔ ہم ان سے گھبرا کر اپنا رخ کسی دوسری سمت کو کبھی نہیں موڑینگے ۔ ہمارا ہر قدم، بہر حال و بہر طور ، اسی منزل کی طرف اٹھیگا جو ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کی ہے اور جو ہماری زندگی کا منتہی و مقصود ہے ۔ (اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) ۔ اس کے بعد ہے اُولٰٓئِکَ عَلَیْہِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّہِمْ وَ رَحْمَۃٌ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُہْتَدُوْنَ ($\frac{2}{155-157}$) ۔ یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ کی طرف سے تبریک و تہنیت کے پھولوں کی بارش ہوتی ہے ۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا قدم صحیح راستے پر اٹھ رہا ہے ۔ ''اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُہْتَدُوْنَ'' خود ''اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ،، کی تشریح کر رہا ہے ۔

قرآن کریم کے ان مقامات سے واضح ہے کہ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کے یہ معنے نہیں کہ خدا کسی خاص مقام میں ہے اور ہم لوٹ کر اُس مقام کی طرف اسکے پاس جائینگے ۔ نہ ہی یہ کہ ہماری ''روح،، اُس کل کا ایک جزو ہے اور یہ جزو آخرالامر اپنے کل سے جا ملیگا ۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ساری زندگی، نظامِ خداوندی کیلئے وقف ہے ۔ (اِنَّا لِلّٰہِ) ۔ اور دنیا بھر کی مشکلات و مصائب کے باوجود ہمارا ہر قدم اُسی نظام کی طرف اٹھتا ہے ۔ اُسی سے ہم توانائیاں حاصل کرتے ہیں اور اس کی رو سے ہمارے اعمال نتیجہ خیز ہوتے ہیں ۔ ہماری زندگی کی ہر حرکت اسی محور کے گرد گھومتی ہے ۔ وہی ہمارے دائرۂ حیات کا مرکز ہے ۔ ہماری تمام تگ و تاز کا رخ اسی قبلہ کی طرف ہے ۔ (اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) ۔ نیز یہ کہ ہمارا ہر عمل اِس کے قانون مکافات کیطرف کشاں کشاں چلا جاتا ہے ۔ وہ اس سے اِدھر اُدھر کہیں ہٹ نہیں سکتا ۔ وہ نتیجہ خیز ہو کر رہتا ہے ،خواہ اس کا نتیجہ اِس زندگی میں سامنے آ جائے یا مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ۔ اس لئے کہ اس کا قانون مکافات اِسی دنیا تک محدود نہیں ۔

ر ج ف

اَلرَّجْفُ ۔ کسی چیز کا متحرک ہو جانا ۔ یا لرز اٹھنا۔ اس میں حرکت کے ساتھ اضطراب اور پریشانی کا ہونا ضروری ہے ۔ رَجْفُ الْقَلْبِ ۔ گھبراہٹ کی وجہ سے دل کا شدید اضطراب*۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلرَّجْفُ ۔ اضطراب شدید کو کہتے ہیں** ۔ اَلرَّاجِفُ ۔ لرزہ کے ساتھ بخار ۔ اَرْجَفَتِ الرِّیْحُ الشَّجَرَ ۔ ہوا نے درختوں کو ہلا ڈالا ۔ رَجَفَتِ الْاَرْضُ ۔ زمین متزلزل ہوئی ۔ اَلرَّجْفَۃُ ۔ زلزلہ ۔ اَلْاَرَاجِیْفُ ۔ فتنوں کو بیدار کرنے والی، بے حقیقت، اضطراب انگیز خبریں* ۔ اس سے فعل اَرْجَفَ آتا ہے۔ اَلْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَۃِ (۳۳/۶۰) ۔ شہر میں ایسی خبریں پھیلانے والے لوگ جن سے خواہ مخواہ اضطراب پیدا ہو جائے* ۔

قرآن کریم میں قوم ثمود کے متعلق ہے فَاَخَذَتْھُمُ الرَّجْفَۃُ (۷/۷۸)۔ ''انہیں زلزلہ نے آن پکڑا،،۔ سورۃ فَالنّٰزِعٰتِ میں ہے ۔ یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَۃُ (۷۹/۶) ۔ ''جس دن کانپ اٹھنے والی کانپ اٹھیگی،، ۔ دوسری جگہ ہے یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ (۷۳/۱۴) ۔ جسوقت نچلے درجہ کے لوگ (عوام) سخت اضطراب میں ہونگے ۔ یا جسدن زمین لرز اٹھیگی ۔

ر ج ل

رِجْلٌ ۔ (جمع اَرْجُلٌ) ۔ پاؤں (۳۸/۴۲) ۔ رِجَالٌ ۔ پا پیادہ چلنے والے (یہ رَاجِلٌ کی جمع ہے) بمقابلہ رُکْبَانًا (۲/۲۳۹) نیز خَیْلٌ (رسالہ) کے مقابلہ میں رَجِلٌ بمعنی پیادہ لشکر(۱۷/۶۴)۔ رَجُلٌ ۔مرد ۔ جمع رِجَالٌ (۲/۲۲۸) لوگ ۔ اشخاص (۷/۴۶) ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ مرد کو اس کی قوت اور بہادری کی بنا پر رَجُلٌ کہا جاتا ہے ۔ اسی بنا پر راغب نے کہا ہے کہ جَآءَ مِنْ اَقْصَی الْمَدِیْنَۃِ رَجُلٌ یَّسْعٰی (۳۶/۲۰) اور وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ (۴۰/۲۸) میں رَجُلٌ کے معنے قوی اور بہادر آدمی کے ہونگے***۔ (ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بیشتر مشتقات ٹانگ کے معنوں سے مشتق ہیں لیکن الرَّجُلُ بمعنی مرد اس معنے سے جداگانہ مفہوم رکھتا ہے۔

ر ج م

رَجْمٌ کے اصلی معنی ہیں پتھروں سے مارنا (ابن فارس) ۔ پھر اس کے معنے قتل کرنے کے بھی ہوگئے ۔ نیز تہمت لگانا اور گالی دینا ۔ جھڑک کر

---

* تاج و محیط ۔ **راغب ۔ ***تاج و راغب و محیط ۔

نکال دینا ۔ کسی کو چھوڑ دینا یعنی قطع تعلق کر لینا* ۔ نیز اَلرَّجْمُ کے معنے ہیں کسی کو مطعون کرنا* ۔ اَلرِّجَامُ ۔ پتھروں کو کہتے ہیں ۔ اورمِرْجَامٌ (Sling) یعنی گوپھیا کو جس سے پتھر کو دور پھینکا جاتا ہے**۔

سورۃ یٰسٓ میں ہے لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ (۳۶/۱۸) ۔ ''اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کردینگے'' ۔ یا قتل کردینگے ۔ سورۃ شعراء میں ہے لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (۲۶/۱۱۶)۔ ''تو ان میں سے ہوگا جنہیں سنگسار یا قتل کر دیا جاتا ہے'' ۔ سورۃ حجر میں شیطان کو رَجِيْمٌ کہا گیا ہے جس کی تفسیر یہ کہکر کر دی گئی اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ (۱۵/۳۴-۳۵) ۔ لہذا رَجِيْمٌ اور مَلْعُوْنٌ ہم معنے ہیں ۔ (مَلْعُوْنٌ کے لئے دیکھئے عنوان ل ۔ ع ۔ ن) ۔ یعنے وہ جو خدا کی نوازشات سے محروم رہ جائے ۔ جو اس سے دور ہو جائے ۔ جس سے قطع علائق کر لیا جائے ۔ جس سے کچھ واسطہ نہ رکھا جائے ۔

رَجْمٌ ۔ اٹکل پچو باتیں کرنا ۔ چنانچہ حَدِيْثٌ مُرَجَّمٌ کے معنے ہیں ایسی ظنی بات جس کی حقیقت معلوم نہ ہوسکے* ۔ رَجَّمَ الرَّجُلُ بِالْغَيْبِ کے معنے ہیں اس آدمی نے غیب کے متعلق ایسی بات کہی جسے وہ جانتا نہیں ۔ قَالَهُ رَجْمًا ۔ اس نے یونہی اٹکل پچو بات کہہ دی**۔ سورۃ کہف میں ہے کہ یہ لوگ جو اصحاب کہف کی تعداد بتاتے ہیں یونہی رَجْمًا بِالْغَيْبِ (۱۸/۲۲) باتیں کہتے ہیں ۔ یعنی قیاس آرائیاں کرتے ہیں ۔ بے جانے بوجھے (حقیقت کا علم رکھے بغیر) اٹکلیں دوڑاتے ہیں ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے بھی اَلرَّجْمُ کے معنی اَلظَّنُّ لکھے ہیں ۔

زمانہ قدیم میں مندروں اور معبدوں میں کاہن ہوتے تھے جو لوگوں کو غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے ۔ (اب بھی مندروں کے پجاری اور خانقاہوں کے پیشوا یہی کچھ کرتے ہیں) ۔ ان کا دعویٰ یہ ہوتا تھا کہ ہم یہ باتیں ''آسمان'' سے سنکر آتے ہیں ۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ یہ سب رَجْمًا باتیں کرتے ہیں ۔ یعنے محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں ۔ ان میں سے کبھی کبھار کوئی بات ٹھیک بھی نکل آتی ہے (جیسے دس قیاسی باتوں میں سے ایک آدہ ٹھیک نکل آیا کرتی ہے) ورنہ انہیں علم و حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ دیکھئے (۱۵/۱۷-۱۸ و ۳۷/۶-۹ و ۶۷/۵ و ۷۲/۸-۹) ۔ نزول قرآن کے بعد علم و بصیرت کا زمانہ آگیا، اس لئے اس قسم کی توہم پرستیوں کیلئے اب کوئی گنجائش نہ رہی ۔ اب ان خرافات کو ''آسمان سے آتشیں کوڑے'' پڑتے ہیں ۔

*تاج ۔ ** لین ۔ *** محیط ۔

جیسا کہ (ل ۔ ع ۔ ن) کے عنوان میں بتایا جائیگا ، قرآن کریم کی رو سے لَعْنَتْ گالی نہیں بلکہ ایک حقیقت کا بیان ہے ۔ یعنی غلط روش کی بنا پر زندگی کی ان خوشگواریوں سے محرومی جو قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں ۔ جسے اس طرح خوشگواریوں سے محروم کر دیا گیا ہو وہ مَلْعُوْنٌ کہلائیگا ۔ یہی معنی رَجِیْمٌ کے ہیں۔ یعنی دور پھینکا ہوا۔ یعنی جو ان خوشگواریوں سے محروم ہو ۔ اسکے متعلق ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ اس سے قطع تعلق کر لیا جائے ۔ اس سے کچھ واسطہ نہ رکھا جائے ۔ اس سے دور دور رہا جائے۔ ہروہ قوت یا جذبہ جو ہمیں قوانین خداوندی کےخلاف سرکشی پر آمادہ کرے یا جہالت اور بےبصری کیطرف مائل کرے ، اس قابل ہے کہ اس سے دور دور رہا جائے ۔ اسی کو ملعون یا رجیم کہا جائیگا ۔

ر ج و

الرَّجَاءُ ۔امید (یَاْسٌ کی ضد ہے)*۔ بالعموم یہ ایسی امید کو کہتے ہیں جو موہوم نہ ہو۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ ایسے ظن کے لئے بولا جاتا ہے جس میں مسرت حاصل ہونے کا امکان ہو ۔ لیکن چونکہ خوشی اور ڈر دونوں لازم ملزوم ہیں اس لئے پھر یہ ایسے ظن کے لئے بھی بولا جانے لگا جس میں خوف ہو۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَمَلٌ اور رَجَاءٌ میں فرق یہ ہے کہ اَمَلٌ تو پسندیدہ امر کے لئے آتا ہے اور رَجَاءٌ پسندیدہ اور غیر پسندیدہ دونوں کے لئے**۔ ازہری نے کہا ہے کہ رَجَاءٌ کے ساتھ اگر حرف نفی ہو تو اسکے معنے خوف کے آتے ہیں *۔ ابن قتیبہ نے بھی لَا یَرْجُوْنَ کے معنی لَا یَخَافُوْنَ کئے ہیں (القرطین ۔ جلد ۱)۔ ابن فارس نے بھی کہا ہے کہ بعض اوقات رَجَاءٌ کا لفظ بول کر خوف، کے معنی مراد لئے جاتے ہیں ۔ اَلْاِرْجَاءُ ۔ موخر کرنا ۔ کسی چیز کو پیچھے ہٹا دینا ۔ معاملہ کو ملتوی کرنا ۔ اَلرَّجَا ۔ کنارہ ۔ کنویں کا کنارہ ، اوپر سے نیچے تک* ۔ طرف ۔ جمع اَرْجَاءٌ ($\frac{69}{17}$) ۔ مُرْجَوًّا ۔ جس سے امیدیں وابستہ ہوں ($\frac{11}{62}$) ۔ مُرْجَوْنَ ۔ جنہیں انتظار میں رکھا جائے ۔ جن کا معاملہ تعویق میں ڈال دیا جائے ۔ ($\frac{9}{106}$) ۔ سورۃ شعراء میں ہے قَالُوْا اَرْجِهْ ($\frac{26}{36}$) ۔ '' انہوں نے کہا کہ اسکے معاملہ کو تاخیر میں ڈال دو'' ۔ (نیز $\frac{7}{111}$) ۔ سورۃ احزاب میں ہے تُرْجِیْ مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِیْ اِلَیْكَ مَنْ تَشَاءُ ($\frac{33}{51}$)۔ یہاں تُرْجِیْ کے معنی ہیں پیچھے رکھنا ۔ الگ ہٹا دینا ۔ کنارے کی طرف ڈال دینا ۔ بمقابلہ تُؤْوِیْ ۔ اپنے پاس جگہ دینا ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔

ر خ ب

رَحُبَ الشَّیْءُ رَحْبًا ۔ وسیع ہونا ۔ اَرْحَبَہٗ ۔ اس نے اسے وسیع کر دیا ۔ ابن فارس نے بھی اس مادے کے بنیادی معنی وسعت اور کشادگی بتائے ہیں ۔ طَرِیْقٌ رَحْبٌ ۔ وسیع راستہ ۔ مَرْحَبًا بِکَ ۔ تو کشادہ جگہ میں آیا ہے ۔ تجھ سے یہاں وسعت اور کشادہ ظرف کا سلوک ہوگا ۔ رَحْبَۃٌ ۔ مکان کا صحن * ۔ قرآن کریم میں ہے وَضَاقَتْ عَلَیْکُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ (۹/۲۵) ۔ ” زمین اپنی فراخیوں کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی “ ۔ سورۃ صٓ میں اہل جہنم کے متعلق ہے لَا مَرْحَبًا بِکُمْ (۳۸/۶۰) ۔ ” تمہارے لئے کشادگی نہیں “ ۔ تمہیں کوئی خوش آمدید نہیں کہتا ۔ یہ ہے جہنم کی زندگی جس میں کوئی ایک دوسرے کو دیکھکر خوش نہ ہو ۔ جہاں کوئی کسی آنے والے کو مرحبا نہ کہے ۔ جہاں نہ دل میں کشادگی ہو نہ نگاہوں میں وسعت ۔ نہ کسی کے لئے پیشانی خندہ ہو نہ لب متبسم ۔ اگر ہوں بھی تو محض دکھاوے کے لئے ۔ دل میں ہر ایک ، دوسرے کیلئے کہے کہ لَا مَرْحَبًا بِکُمْ ۔ یہ مصیبت کہاں سے آگئی ؟

ر ح ق

رَحِیْقٌ ۔ خالص پرانی ، عمدہ خوشبو والی ، بہترین شراب ۔ وہ شراب جس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو ۔ اسی جہت سے ہر خالص شے کو رَحِیْقٌ کہتے ہیں ۔ مثلاً حَسَبٌ رَحِیْقٌ ۔ خالص حسب ۔ مِسْکٌ رَحِیْقٌ ۔ وہ مشک جس میں کچھ ملاوٹ نہ ہو * ۔

قرآن کریم نے اہل جنت کے سلسلہ میں رَحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ (۸۳/۲۵) کہا ہے ۔ یعنی خالص مشروب ، اور پھر اسطرح محفوظ کیا ہوا کہ بعد میں بھی اس میں کسی قسم کی ملاوٹ کا امکان نہ رہے ۔ زندگی کی پاکیزہ سرور آور خوشگواریاں ۔

ر ح ل

اَلرَّحْلُ ۔ (جمع رِحَالٌ) ۔ کجاوہ ۔ ہر وہ چیز جسے اونٹ پر اسلئے باندھا جائے کہ اس پر سوار ہو کر سفر کیا جائیگا ۔ پھر یہ لفظ خود اونٹ کے لئے ، نیز جس چیز پر بیٹھا جائے ، یا جہاں اترا جائے ، نیز مکان کے لئے بولا جاتا ہے * اس لفظ کا اطلاق ان چیزوں پر بھی ہوتا ہے جن میں سامان وغیرہ رکھکر لادا جاتا ہے ۔ مثلاً خرجیں ۔ یا بوریاں * ۔ سورۃ یوسف میں ہے فِیْ رِحَالِہِمْ (۱۲/۶۲) ۔ ” ان کی بوریوں میں “ ۔

---

* تاج و محیط ۔

اَلرِّحْلَةُ - سفر*- نیز وہ جگہ جہاں کا انسان سفر کرے- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سفر جاری رکھنے اور سفر کرتے رہنے کے ہیں - قرآن کریم میں ہے رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ (۱۰۶/۲)- '' گرمی اور سردی کے سفر'' - اَلْمَرْحَلَةُ - وہ مسافت جسے آدمی ایک دن میں عادةً طے کر لیتا ہو*- منزل -

ر ح م

رِحْمٌ و رَحِیمٌ - بطنِ عورت کا وہ خانہ جسمیں بچہ پرورش پاتا ہے اور اس غلاف میں خارجی اثرات سے محفوظ رہتا ہے* - اس معنی میں رُحْمٌ بھی بولا جاتا ہے (راغب) - رَحْمَةٌ وہ عطیہ جو کسی کی ظاہر و باطن کمی کو پورا کر دے (اور جسے ضرورت کے تقاضے کے مطابق دیا جائے)* - عطیہ کے معنے یہ ہیں کہ وہ چیز بغیر قیمت اور بلا مزد یا بے معاوضہ دی جائے - لہذا رَحْمَت وہ سامانِ نشو و نما ہے جو خدا کی طرف سے بلا معاوضہ ملتا ہے - سورة روم میں ہے وَ اِذَا اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا - وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ (۳۰/۳۶) ''اور جب ہم لوگوں کو رحمت سے لطف اندوز کراتے ہیں تو وہ اس پر اترا جاتے ہیں - اور جب ان پر ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے مصیبت آتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں،، - یہاں رحمة بمقابلہ سیئة آیا ہے - لہذا اس سے مراد زندگی کی تمام خوشگواریاں مراد ہیں - لیکن اس سے اگلی آیت میں رزق کی بسط و کشادگی کا ذکر ہے- اس سے ظاہر ہے کہ یہاں رحمة سے مراد رزق (سامان زیست) ہے جو خدا کیطرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے - سورة بنی اسرائیل میں والدین کے سلسلہ میں اولاد کی آرزو بتائی گئی ہے کہ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (۱۷/۲۴)- ''اے میرے رب تو ان کی نشو و نما کر جیسا انہوں نے مجھے اسوقت پالا تھا جب میں چھوٹا سا تھا،،- سامانِ رزق جو بارش سے پیدا ہوتا ہے، یعنے فصلیں، رَحْمَت ہیں (۳۰/۳۶ و ۴۲/۲۸)- زندگی کی خوشگواریاں (نَعْمَاءُ) جو بلا معاوضہ ملتی ہیں، رَحْمَت ہیں - (۱۱/۹،۱۰) - قصہٴ حضرت موسیٰؑ میں ہے کہ دو یتیم بچوں کا خزانہ جو دیوار کے نیچے مدفون تھا، اسے اللہ کے حکم سے اسطرح محفوظ کر دیا گیا تھا کہ وہ انہیں بلوغت کے بعد ملے - اس خدائی انتظام کو رَحْمَت سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۸/۸۲)-

*تاج - **محیط -

نیز رَحْمَةٌ کے معنے کسی کو ڈھانپ لینے اور سامانِ حفاظت بہم پہنچانے کے بھی ہوتے ہیں* ۔ اسی لئے قرآن کریم میں ضَرَرٌ کے مقابلہ میں رَحْمَةٌ آیا ہے (۲۱/۱ و ۴۸/۳۳) اور سَیِّئَةٌ کے مقابلہ میں بھی (۴۶/۳۰) ۔ اور اَھْلَکَ کے مقابلہ میں رَحِیمَ بھی (۲۸/۶۷) ۔

چونکہ خدا کی ربوبیت کے معنے صرف انسانی جسم کی نشو و نما نہیں بلکہ اس کے شرفِ انسانیت (انسانی ذات۔ Self) کی نشو و نما (Development) بھی ہے جو اُس ضابطۂ حیات کی رو سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعہ ملتا ہے ، اسلئے وحی کو بھی رَحْمَت کہا گیا ہے ۔ (۱۰۵/۲ و ۴۳/۳۲) ۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی کی راہ نمائی سب سے بڑا ذریعہ نشو و نما ہے جو یکسر وھبی طور پر ملتا ہے،اس لئے رحمتِ خصوصی ہے ۔

چونکہ خدا رَبُّ الْعَالَمِیْنَ ہے (یعنی تمام کائنات کو نشو و نما دینے والا اور نوع انسانی کی صلاحیتوں کی تکمیل کرنے والا) اس لئے اسنے سامانِ نشو و نما کا وھبی طور پر عطا کرنا اپنے ذمہ لے رکھا ہے ۔ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۵۴/۶)۔ ''تمہارے رب نے سامانِ نشو و نما کا بہم پہنچانا اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے'' ۔ اسطرح وہ کائنات کی ہر شے کو اپنے دامنِ ربوبیت و پردۂ رحمت میں لئے ہوئے ہے (۷/۳) ۔ اسی لئے سورۃ فاتحہ میں، رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کے ساتھ ھی ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ بھی آیا ہے (۱/۱-۲) ۔ زبان کے قاعدے کے لحاظ سے رَحِیْمٌ کے معنے ھونگے عمومی طور پر مسلسل سامانِ نشو و نما بہم پہنچانے والا ۔ اور رَحْمٰنٌ وہ جو کسی ھنگامی ضرورت کے ز[illegible]ـدت اور غلبہ کے ساتھ سامانِ رحمت بہم پہنچائے**۔ اول الذکر طریق[illegible] نشو و نما کا عام ارتقائی ذریعہ اور ثانی الذکر کو انقلابی ذریعہ کہا جا سکتا ہے۔ یا دَوْرِ حاضر کے علم الحیات (Biology) کی اصطلاح میں اول الذکر (Progressive Evolution) ھوگی ۔ اور آخر الذکر فجائی ارتقاء (Emergent Evolution) ۔ یہ فرق تھوڑی سی وضاحت چاھتا ہے ۔ سورۃ الرحمٰن میں ہے یَسْئَلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۔ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (۲۹/۵۵)۔ ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے (اپنی

---

* تاج۔ **المنار۔ رَحْمٰنٌ کا وزن فَعْلَانٌ ہے(جیسے عَطْشَانٌ۔ غَضْبَانٌ) اور رَحِیْمٌ کا وزن فَعِیْلٌ ہے (جیسے عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ وغیرہ) ۔ فَعْلَانٌ ان صفات کے لئے آتا ہے جو شدید اور ھنگامی ھوں اور فَعِیْلٌ ان کے لئے جو لازم و ثابت ھوں ۔

نشو و نما کے لئے) خدا (کے ذرائع ربوبیت) کا محتاج ہے۔ پھر، ان چیزوں کا یہ عالم نہیں کہ وہ ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتی ہیں اس لئے انہیں ایک ہی قسم کا سامانِ نشو و نما ملتا رہتا ہے۔ یہ چیزیں ہر آن تغیر پذیر رہتی ہیں۔ ان کی حالت میں ہر وقت تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے ان کی نشو و نما کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ رحم مادر کے اندر جنین کی نشو و نما کا تقاضا کچھ اور۔ بچے کی پرورش کا تقاضا کچھ اور۔ بڑے کی پرورش کا تقاضا کچھ اور۔ جب تک کوئی شے ایک حالت میں رہتی ہے، خدا کی صفت رحیمیت کے مطابق اس کی نشو و نما ایک انداز سے ہوتی جاتی ہے۔ لیکن جونہی اس کی حالت بدلتی ہے اس کی صفتِ رحمانیت کے مطابق اس کی نشو و نما کے انداز و طریق میں بھی ہنگامی تبدیلی آجاتی ہے۔ یوں عمومی ارتقاء اور ہنگامی ارتقاء کے قوانینِ خداوندی کے مطابق ہر شے اپنے نقطہء آغاز سے منزل تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ہے رب۔ رحمٰن اور رحیم سے مراد۔

رِحْمٌ کے اعتبار سے اس لفظ کا اطلاق قرابت (رشتہ داری) پر بھی کیا جاتا ہے*۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ بَيْنَهُمَا رِحْمٌ (ان دونوں کے درمیان قریبی قرابت داری ہے)۔ اَرْحَامٌ۔ رِحْمٌ کی جمع ہے (۳/۵) یعنی رحم مادر۔ نیز اسکے معنے رشتہ داری کے آتے ہیں۔ (۱/۳)۔ نیز (۱/۴)۔ اُولُوالاَرْحَامِ کے معنے رشتہ داروں کے ہیں (۸/۷۵)۔

چونکہ رِحْمٌ میں نرمی ہوتی ہے اسلئے یہ لفظ سختی کے مقابلہ میں نرمی کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹)۔ مخالفین کے مقابل میں سخت اور باہمدگر بہت نرم۔ سورۃ کہف میں اَقْرَبَ رُحْمًا (۱۸/۸۱) آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں رشتے داری کا زیادہ پاس کرنے والا۔ لیکن ابن فارس نے الرُّحْمُ اور الرَّحْمَةُ ہم معنے بتائے ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ زیادہ مہربان اور ہمدردی کرنے والا، نرم خواورو فا کیش۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رِقت (نرمی) اور تعطف و میلان کے ہیں۔

چونکہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ (اپنے پہلے ماں باپ کے گناہ کی پاداش میں) گنہگار پیدا ہوتا ہے اور یہ گناہ عمل سے زائل نہیں ہوسکتا، اس لئے ان کے نزدیک نجات صرف خدا کے رَحْم (Mercy) سے ملتی ہے۔ رَحْم کا یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے فلاح و فوز (کامیابی و کامرانی) اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ ہے اور یہ سب کچھ خدا

*تاج۔

کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے جسے قانونِ مکافات عمل کہتے ہیں ۔ اس قانون کا بنیادی اصول یہ ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹)۔ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لئے وہ جد و جہد کرے ۔ البتہ اس سعی و عمل کے لئے ، انسان کو مختلف صلاحیتیں ، خارجی کائنات میں سامانِ نشو و نما اور عقل کی راہنمائی کے لئے وحی کی روشنی ، خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتی ہے ، اس لئے یہ سب رَحْمٌ میں داخل ہے ۔ یعنی یہ تمام نشو و نما خدا کی طرف سے مفت ملتا ہے ۔ اب جو شخص ان چیزوں سے فائدہ اٹھا کر خدا کے قانون کے مطابق اپنی ذات کی نشو و نما کرلیگا (جو ایک صحیح معاشرہ کے اندر دوسروں کی ربوبیت سے ہوتی ہے) وہ زندگی کی خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہو جائیگا ۔ جو ایسا نہ کریگا ، وہ ان سے محروم رہ جائے گا ۔ اسے خدا کا قانون مکافات کہتے ہیں ۔ لہذا انسان اپنی منزلِ مقصود تک خدا کی (Grace) سے نہیں بلکہ اپنے اعمال کے نتائج کی رو سے ، خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق پہنچتا ہے ۔ عیسائیت اور اسلام کا یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد همه هیچ
تا جزائے عملِ تست ، چناں چیزے هست

اسی بنیادی تصور سے قرآن کریم ایسی قوم تیار کرتا ہے جو اپنی جنت کے گل و لالہ اپنے خون جگر سے کھلاتی ہے ۔ اور اپنا جہانِ نو خدا کے قانون مکافات کے مطابق اپنی قوت بازو سے پیدا کرتی ہے ۔

ر خ و

اَلرِّخْوُ ۔ نرم چیز ۔ رَخُوَ الشَّیْءُ وَ رَخِیَ ۔ رَخَاً ۔ کسی چیز کا نرم یا ڈھیلا ہو جانا ۔ اِسْتَرْخٰی کے بھی یہی معنی ہیں ۔ اَرْخَاہُ ۔ رَاخَاہُ ۔ اسنے اسکو نرم کردیا اَرْخٰی دَابَّتَہٗ : اسنے اپنے جانور کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی اور اسے اسکی حسب مرضی چلنے دیا ۔ اَلرُّخَاءُ ۔ نرم رفتار ہوا * ۔ قرآن کریم میں ہے تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖ رُخَاءً (۳۸/۳۶)۔ وہ (ہوا) اُس کے حکم سے نرمی اور سبک رفتاری اور آزادی سے چلتی تھی ۔ فَرَسٌ رِخْوَۃٌ ۔ سبک رفتار اور نرم خو گھوڑے کو کہتے ہیں * ۔

ر د أ

اَلرِّدْءُ ۔ بھاری بوجھ جو ایک دوسرے کے ہم وزن ہوں ۔ رَدَاَ الشَّیْءَ بِہٖ ۔ اس نے کسی چیز کے ذریعے کسی چیز کو سہارا دیا ۔ تقویت

* تاج و راغب و محیط ۔

دی ۔ مددگار بنایا ۔ اصل میں اَلرِّدْءُ مددگار، معین اور ناصر کو کہتے ہیں *۔ جب کسی جانور پر اسطرح بوجھ لادا جائے کہ اسکے دونوں طرف کے بوجھ ہم وزن ہوں تو ان میں سے ہر ایک کو رِدْءٌ کہتے ہیں ۔ وہ اسطرح ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں *۔

قرآنِ کریم میں ہے فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً (۲۸/۳۴)۔ "اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیجدے"۔

رَدِیٌّ ۔ پیچھے پیچھے آنے والے کو کہتے ہیں لیکن بعد میں اسے مذموم شے کیلئے استعمال کرنے لگ گئے ** (کیونکہ عموماً پیچھے لگنے والی چیز اگلی سے کمتر ہوتی ہے)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے دو بنیادی معنی ہیں جو ایک دوسرے سے متبائن ہیں (۱) کسی چیز کا خراب یا ردی ہو جانا ۔ اور (۲) مدد کرنا ۔

ر د د

رَدَّ ۔ یَرُدُّ ۔ کسی کو لوٹا دینا ۔ واپس کر دینا ۔ رَدَّهٗ عَنِ الْاَمْرِ ۔ اسنے اسے اس بات سے لوٹا دیا ۔ رَدَّ کے بعد اگر عَلٰی آئے تو اس میں تحقیر اور اہانت کا پہلو ہوتا ہے ۔ مثلاً رَدَّ عَلَیْهِ الشَّیْءَ ۔ اس نے اسکی چیز قبول نہ کی اور حقارت کے ساتھ اسے واپس کر دیا ۔ لیکن اگر اسکے بعد اِلٰی ہو تو اسمیں عزت و اکرام کا پہلو ہوتا ہے ۔ فَرَدَدْنَاهُ اِلٰی اُمِّهٖ (۲۸/۱۳) ہم نے موسٰی کو اسکی ماں کی طرف (عزت و اکرام کے ساتھ) واپس کر دیا ۔ (لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں) اَلتَّرِدُّ ۔ ردی شے ۔ دِرْهَمٌ رِدٌّ ۔ کھوٹا سکہ ۔ لَا مَرَدَّةَ فِیْهِ ۔ اسمیں کوئی فائدہ (Return) نہیں ۔ اِرْتَدَّ الشَّیْءُ ۔ چیز واپس ہو گئی، پلٹ گئی ۔ * راغب نے لکھا ہے کہ الارتداد اسی راستہ پر پلٹنے کو کہتے ہیں جس سے کوئی آیا ہو **۔ تَرَدَّدَ اِلَیْهِ ۔ وہ اسکے پاس بار بار آیا گیا ۔ یہیں سے تَرَدَّدَ فِی الْاَمْرِ کے معنے ہیں کسی معاملہ میں مذبذب رہنا اور کسی فیصلہ تک نہ پہنچ سکنا **۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ (۲/۲۲۸) ان کے خاوندوں کا زیادہ حق ہے کہ انہیں واپس لے لیں ۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے یَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهٗ (۴۲/۴۷) وہ دن جو آ کر پھر واپس نہیں جائیگا ۔ جسے ٹالا نہیں جا سکیگا ۔ (۱۹/۷۶) میں خَیْرٌ مَرَدًّا آیا ہے ۔ اس کے معنی ہیں انجام کار کے لحاظ سے نفع بخش ۔ سورۃ شوریٰ میں ہے هَلْ اِلٰی مَرَدٍّ مِّنْ سَبِیْلٍ (۴۲/۴۴) ۔ "کیا اسکے واپس چلے جانے کی کوئی سبیل ہو سکتی ہے"؟ [فَرَدُّوْا اَیْدِیَهُمْ فِیْ اَفْوَاهِهِمْ (۱۴/۹) کیلئے

* تاج ۔ **راغب ۔

دیکھئے عنوان ی۔ د۔ ی] اس لفظ میں مآل اور انجام کار کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے، اسلئے اعمال کے نتائج کے لئے اس کا استعمال عام طور پر ہوتا ہے۔

سورۃ حمٓ السجدہ میں ہے اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ (۴۷/۴۱) انقلاب کس وقت آئیگا' اسکا علم خدا ہی کیلئے مخصوص ہے۔ اس کا علم اُسی سے متعلق ہے۔ اُسی کی طرف لوٹ کر جاتا ہے، اور کسی کی طرف نہیں جاتا۔ اور کسی کو اس کا علم نہیں ہو سکتا۔ اوروں کو صرف قیاس اور اندازہ ہو سکتا ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان س۔ و۔ ع)

مَرْدُوْدٌ۔ واپس کیا ہوا، لوٹایا ہوا (۱۰/۷۹)۔ سورۃ ہود میں ہے عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ (۷۶/۱۱)۔ جسے واپس نہ کیا جا سکے۔ جو آ کر رہے۔

سورۃ نحل میں ایک آیت ہے جو قرآنی نظام ربوبیت کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ مختلف افراد میں اکتساب رزق کی مختلف استعداد ہوتی ہے [اسکا مقصد ۳۲/۴۳ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے معاشرہ کے چھوٹے بڑے، ہر قسم کے کام چلتے رہتے ہیں دیکھئے عنوان س۔ خ۔ ر] لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ جن لوگوں کو یہ استعداد زیادہ ملی ہے وہ اسکے ماحصل (رزق) کو اپنے ہی لئے مخصوص کر لیں۔ یعنی وہ یہ سمجھ لیں کہ چونکہ یہ ہماری ہنرمندیوں سے حاصل ہوا ہے اسلئے ہم ہی اسکے مالک ہیں۔ یہ غلط ہے۔ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ (۷۱/۱۶)۔ "جن لوگوں کو یہ استعداد زیادہ ملی ہے وہ اپنے رزق کو اپنے زیردستوں کیطرف نہیں لوٹاتے (اس ڈر سے کہ) اسطرح یہ سب اس میں برابر کے شریک ہو جائیں گے"؟ بِرَآدِّيْ کا لفظ غور طلب ہے۔ یہ نہیں کہا کہ انہیں بطور خیرات کے دیدیں۔ کہا یہ ہے کہ یہ فالتو رزق، درحقیقت اُن کیلئے ہے جو ان کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں اور جنہیں اسکی ضرورت ہے، اسلئے جسکے لئے یہ ہے اُسی کی طرف اسے لوٹا دینا چاہیئے۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اسکے معنے یہ ہیں کہ تم اس سے انکار کرتے ہو کہ کمانے کی استعداد اور رزق کے اسباب و ذرائع خدا کی نعمتیں ہیں جو اسکی طرف سے مفت ملی ہیں۔ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۷۱/۱۶)۔ "کیا یہ لوگ جو اپنی زائد از ضرورت دولت کو ان کی طرف نہیں لوٹاتے جنہیں اسکی ضرورت ہے، خدا کی نعمت سے انکار کرتے ہیں"؟ یہ ہے قرآن کریم کا سوشل آرڈر۔ عمرانی اور معاشی نظام۔ (اسکی تفصیل میری کتاب "نظام ربوبیت" میں ملیگی)۔

ر د ف

اَلرِّدْفُ ۔ اَلرَّدِیْفُ ۔ سوار کے پیچھے جو دوسرا شخص سوار ہو وہ اس کا رَدِیْفُ یا رِدْفُ کہلاتا ہے ۔ ایسے ہی ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کے پیچھے ہو ۔ رَدِفَہٗ و رَدَفَہٗ ۔ اس کے پیچھے پیچھے ہونا* ۔ قرآن کریم میں ہے عَسٰۤی اَنْ یَّکُوْنَ رَدِفَ لَکُمْ (۲۷/۷۲) ۔ ''ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارے پیچھے آرہی ہو'' ۔ تمہارے بالکل قریب ہو ۔ ساتھ لگی ہوئی ہو ۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے پیچھے تک بھی پہنچ چکی ہو ۔

مُرْدِفٌ ۔ اپنے پیچھے کسی کو سوار کرنے والا نیز کسی کے پیچھے لگنے والا* ۔ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ مُرْدِفِیْنَ (۸/۹) ۔ ''یکے بعد دیگرے مسلسل آنے والے'' ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْمُرْدِفُ اگلے سوار کو کہتے ہیں جو اپنے پیچھے دوسرے شخص کو بٹھالے** ۔ رَادِفٌ ۔ پیچھے (یا قریب) آنے والا ۔ تَتْبَعُہَا الرَّادِفَۃُ (۷۹/۷) ۔ ''پیچھے آنے والی اس کے پیچھے آئیگی'' ۔ یعنی جزا و سزا کی ساعت ۔ خدا کا قانون مکافات ۔ ظہور نتائج کا وقت ۔ ہر عمل کا نتیجہ جو اسکے پیچھے لگا رہتا ہے ۔

ر د م

اَلرَّدْمُ ۔ کسی خلا یا شگاف کو بند کردینا ۔ سَدٌّ بھی اس کا مترادف ہے ۔ لیکن رَدْمٌ میں سَدٌّ سے کچھ زیادہ مضبوطی پائی جاتی ہے ۔ رَدَمَ الْبَابَ ۔ دروازہ بند کر دینا ۔ اسکا ایک تہائی حصہ بند کردینا*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی شگاف کے بند کردینے کے ہوتے ہیں ۔ سورۃ کہف میں ہے اَجْعَلْ بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَہُمْ رَدْمًا (۱۸/۹۵) ۔ اس سے پہلی آیت میں سَدًّا کہا گیا ہے (۱۸/۹۴) ۔ یعنی اس قوم نے ذوالقرنین سے کہا کہ ہمارے لئے ایک روک سی (سَدًّا) بنا دے ۔ اس نے کہا کہ روک سی کیوں! میں تمہارے لئے اچھی خاصی اونچی دیوار (رَدْمٌ) بنائے دیتا ہوں ۔

ر د ی

رَدَیٰ و تَرَدّٰی ۔ (فِی الْبِئْرِ) وہ کنوئیں میں گر پڑا (اس معنی میں رَدَیٰ کے ساتھ رَدِیَ بھی بولاجاتا ہے) ۔ نیز پہاڑ سے گر کر مر گیا* ۔ مَا یُغْنِیْ عَنْہُ مَالُہٗۤ اِذَا تَرَدّٰی (۹۲/۱۱) ۔ جب وہ تباہیوں کے جہنم میں سر کے بل

---

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** تاج و راغب ۔

گریگا تو اس کا جمع کردہ مال اس کے کسی کام نہ آسکیگا۔ راغب نے کہا ہے کہ تَرَدّٰی کے معنے ہیں اپنے آپ کو تباہیوں کے سامنے پیش کر دینا۔ یعنی جو شخص مال سمیٹ کر رکھتا ہے اور اسے انسانیت کی بہبود کے لئے کھلا نہیں رکھتا وہ تباہیوں کو آواز دیکر اپنے گھر بلاتا ہے۔اَلْمُتَرَدِّيَةُ۔ اس جانور کو کہتے ہیں جو گر کر مرجائے۔ اسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے (۵/۳)۔ اس کے بعد اس لفظ کے معنے عام ہلاکت کے بھی لئے جاتے ہیں۔ رَدِیَ فُلَانٌ۔ وہ ہلاک ہو گیا۔ فَهُوَ رَدٍ۔ وہ ہلاک ہونے والا ہے۔ اَرْدَاهُ غَيْرُهُ۔ اسے کسی نے ہلاک کر دیا**۔اَلرَّدٰی۔ تباہی بربادی۔ ہلاکت*۔ (اَلرِّدَاءُ۔چادر)۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے فَتَرْدٰی(۲۰/۱۶)۔ تو ہلاک ہوجائے۔ سورۃ حٰمٓ السجدہ میں ہے اَرْدَاكُمْ (۴۱/۲۳)۔ اس کے معنے تباہ و برباد کر دینا ہیں۔ اَلْمِرْدٰی۔ پھینکے ہوئے پتھر کو کہتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں بنیادی معنی پھینکنے کے ہوتے ہیں۔ ابن فارس نے اَلتَّرَدِّي کے معنے لاابالی پن سے کسی ہلاکت گاہ میں گر جانا بھی لکھے ہیں۔ رَادَیٰ عَنِ الْقَوْمِ کے معنے ہیں اس نے قوم کی مدافعت میں پتھر پھینکے**۔ (رِدْءٌ۔ کے لئے عنوان دیکھئے ر د ا)۔

ر ذ ل

اَلرَّذْلُ۔ وہ چیز جس سے اس کے ردی اور نکما ہونے کی وجہ سے بے رغبتی کی جائے*۔ اَلرَّذْلُ۔ اَلرُّذَالُ۔ اَلرَّذِيْلُ۔ وہ آدمی جو دوسروں سے کمتر درجہ کا ہو۔ حقیر اور کم مرتبہ انسان**۔ نیز ردی اور نکمی چیز جس میں سے اچھی چیزیں نکال لی گئی ہوں***۔

اَلْاَرْذَلُ۔ بہت زیادہ حقیر گھٹیا اور نکما۔ اس کی جمع اَرْذَلُوْنَ اور اَرَاذِلُ آتیگی۔ قرآن کریم میں ہے کہ قوم نوح کے سرداروں نے حضرت نوحؑ سے کہا تھا کہ جو لوگ تیری جماعت میں شامل ہوئے ہیں ''هُمْ اَرَاذِلُنَا'' (۱۱/۲۷)۔ وہ ہمارے معاشرے کے حقیر اور رذیل لوگ ہیں۔

اَرْذَلِ الْعُمُرِ (۱۶/۷۰) عمر کا ردی حصہ۔ بڑھاپے کا وہ حصہ جس میں حالت یہ ہوجاتی ہے کہ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ (۱۶/۷۰)۔ انسان ان چیزوں کو بھی بھول جاتا ہے جن کا اسے پہلے علم ہوتا ہے۔ حافظہ جاتا رہتا ہے۔

* راغب۔ ** تاج۔ *** محیط۔

ر ز ق

رِزْقٌ - ہر وہ چیز جس سے نفع اٹھایا جائے - یا جو غذا خدا کی طرف سے ذی حیات کو بطور سامان نشو و نما ملے - بارش کو بھی رِزْقٌ کہتے ہیں اور مقررہ آمدنی کو بھی - چنانچہ مُرْتَزِقَةٌ ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کی تنخواہیں یا راشن اور روزینے مقرر ہوں - نیز رِزْقَةٌ اس سامان خوراک کو کہتے ہیں جو فوجی کو بطور راشن دیا جاتا ہے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو وقت مقرر پر دینا - اسکے بعد بلا قید وقت ہر عطیہ پر اس کا اطلاق ہونے لگ گیا -

قرآن کریم نے تمام کھانے پینے کی چیزوں کو رِزْقُ اللّٰهِ (۲/۶۰) کہا ہے - سورۃ حجر میں مَعَايِشَ اور رِزْقٌ ہم معنی استعمال ہوئے ہیں - (۱۵/۲۰) - لیکن چونکہ قرآن کریم کے نزدیک انسان کی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں بلکہ زندگی موت کے بعد بھی مسلسل آگے چلتی ہے اس لئے اس کے نزدیک سامان نشو و نما کی ضرورت صرف طبعی جسم کی پرورش ہی کے لئے نہیں بلکہ انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے بھی ہے - اس لئے قرآن کریم نے مرنے کے بعد انسانی ذات کی نشو و نما کے اسباب و ذرائع کو بھی رِزْقٌ سے تعبیر کیا ہے (۲۲/۵۸) - اس سے یہ بھی واضح ہے کہ جنت، زندگی کے ارتقائی منازل میں سے ایک منزل ہے - وہاں بھی انسانی ذات کی نشو و نما کا سلسلہ جاری رہے گا - (تفصیل ج - ن - ن کے عنوان میں ملیگی) -

لہذا رِزْقٌ سے مراد ہیں وہ تمام اسباب و ذرائع جن سے انسانی جسم اور اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی جائے - حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا میں سامانِ زیست (ضروریات زندگی) کی تقسیم قانونِ وحی کے تابع ہو (جسے نظام ربوبیت کہتے ہیں) تو انسانی جسم کی نشو و نما اور اسکی ذات کی نمود و بالیدگی بلا مشقت ہوتی چلی جاتی ہے - یہ نظام ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے جن کے متعلق فرمایا کہ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲/۳) - جو کچھ سامانِ نشو و نما ہم انہیں دیتے ہیں، وہ اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں - اسے سمیٹ کر نہیں بیٹھ جاتے، اور نہ ہی تالے لگا دیتے ہیں، بلکہ اسے کھلا رکھتے ہیں (دیکھئے عنوان ن - ف - ق) - چونکہ یہ نظام قانونِ خداوندی کے تابع متشکل ہوتا ہے اس لئے اس نظام کی وساطت سے تقسیم رزق کے متعلق

*تاج -

اللہ نے کہا ہے کہ یہ رزق ہماری طرف سے ملتا ہے ۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲ و ۱۷/۳۱) ۔ ”ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی“ ۔ اس طرح خدا کی یہ ذمہ داری کہ وہ ہر متنفس (چلنے والے) کو رزق دیتا ہے (۱۱/۶) بطریق احسن پوری ہوتی چلی جاتی ہے ۔ ورنہ (اگر ایسا معاشرہ قائم نہ ہو اور رزق کی تقسیم انسانوں کے خود ساختہ نظام کی رو سے ہوتو جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں) لاکھوں انسان بھوک سے مرجاتے ہیں اور کروڑوں ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا ۔ غلط معاشرہ میں رزق کی ذخیرہ اندوزی شروع ہو جاتی ہے اور نچلے طبقہ کے لوگ نشو و نما سے محروم رہ جاتے ہیں ۔ صحیح (قرآنی) معاشرہ میں رزق کے سر چشمے تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہتے ہیں (۴۱/۱۰) ۔ اس لئے کہ جو کچھ زمین سے پیدا ہوتا ہے اس میں انسان کی صرف محنت (Labour) ہوتی ہے ۔ باقی سب کچھ قانون خداوندی کے مطابق ہوتا ہے ۔ لہذا انسان صرف اپنی محنت کے ماحصل کا حقدار ہے ۔ باقی سب کچھ خدا کا ہے اور اسے اس کے احکام کے مطابق تقسیم ہو جانا چاہئے ۔ (۵۶/۶۳-۶۴) ۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب نظام ربوبیت میں ملیگی جس میں قرآنی معاشرہ میں تقسیم رزق کے اہم مسئلہ کے مختلف پہلؤں سے بحث کی گئی ہے ۔) بہر حال اسے ایک مرتبہ پھر سن رکھنا چاہئے کہ جو حکومت قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے (اسے اسلامی حکومت کہتے ہیں) اس کا بنیادی منشور یہ ہوتا ہے کہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی (سامان رزق) بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت کے سر ہے ۔ اس نظام میں ، رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے اُمت کی تحویل میں رہتے ہیں اور فاضلہ دولت بھی کسی کے پاس نہیں رہتی ۔ یعنی اس میں ہر شخص پوری محنت سے کام کرتا ہے ۔ اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنی ضروریات کے مطابق رکھکر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتا ہے ۔ یوں مملکت ہر فرد کے رزق کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہوتی ہے ۔ خدا کے دئے ہوئے رزق کی، خدا کے بندوں کی ضروریات کے مطابق تقسیم ، یہ ہے اسلامی حکومت کا بنیادی مقصد ۔

سورۃ واقعہ میں ہے وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ (۵۶/۸۲)۔ راغب نے کہا ہے کہ یہاں اس کے معنے نَصِيْبٌ یعنے حصہ کے ہیں** ۔ لیکن اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تم قرآن جیسی کتاب کو اس لئے جھٹلاتے ہو کہ اس سے تمہاری روٹی چلتی رہے !

**راغب ۔

ر س خ

رَسَخَ ۔ یَرْسَخُ ۔ رُسُوْخاً ۔ کسی چیز کا اپنے مقام پر محکم اور جائے گیر ہو جانا۔ رَسَخَ الْمَطَرُ ۔ بارش کا پانی زمین میں جذب ہو گیا *۔ یہ اسوقت بولینگے جب بارش کا پانی اس حد تک زمین کے اندر چلا جائے کہ وہ زمین کی نمی سے جا ملے۔

قرآن کریم میں اَلرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ آیا ہے (۳/۷)۔ اسکے معنے ہونگے وہ لوگ جو علم میں پختگی حاصل کر لیں اور علم کی تہہ میں اتر جائیں۔ راغب نے کہا ہے کہ رَاسِخٌ فِی الْعِلْمِ وہ ہے جو علم میں اس حد تک تحقیق کر چکا ہو کہ اسکا کوئی شبہ باقی نہ رہا ہو**۔

قرآن کریم اپنی دعوت علی وجہ البصیرت پیش کرتا ہے اور اسے غور و فکر اور علم و تحقیق کی رو سے ماننے کی تلقین کرتا ہے۔ لہذا رَاسِخٌ فِی الْعِلْمِ وہ شخص ہے جو اپنی تحقیق کی رو سے یقینی نتائج تک پہنچ جائے اور اسطرح اسکا ایمان علی وجہ البصیرت محکم ہو جائے۔ (آیت ۳/۷ کے مفہوم کے لئے، عنوان ح۔ک۔م کے تحت، محکمات و متشابہات کی بحث دیکھئے)۔

ر س س

اَلرَّسُّ ۔ کھودنا ۔ دبا دینا ۔ یہیں سے میت کے دفن کرنے کو بھی رَسٌّ کہتے ہیں۔ پرانا کنواں خواہ پختہ ہو یا نہو۔ نیز اَلرَّسُّ کسی چیز کی ابتدا کو بھی کہتے ہیں ۔ رَسُّ الْحُمّٰی وَرَسِیْسُہٗ ۔ بخار کی ابتدائی علامات ۔ جیسے انگڑائیاں آنا *۔ راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنے اس تھوڑے سے اثر کے ہوتے ہیں جو کسی چیز میں موجود ہوتا ہے **۔ اَھْلُ الرَّسِّ ۔ ان لوگوں کو کہتے ہیں جو ابتداءً خود ہی کوئی جھوٹ گھڑیں اور پھر اسکی تشہیر کریں۔ یہ دراصل رَسَّ بَیْنَ الْقَوْمِ سے ماخوذ ہے جسکے معنے فساد اور عداوت پیدا کرنے کے ہوتے ہیں *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی جم جانے کے ہیں۔

قرآن کریم میں اَصْحَابُ الرَّسِّ (۲۵/۳۸) عاد اور ثمود کے ساتھ کسی سابقہ قوم کے لئے آیا ہے ۔ اسکے متعلق، لغت میں بہت سے اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اَلرَّسُّ ایک وادی کا نام ہے۔ ممکن ہے اس وادی میں کوئی پرانا کنواں ہو جس سے اسکا نام ایسا مشہور ہو گیا ہو۔ ** لیکن اگر معنوی

* تاج ۔ ** راغب ۔

خصوصیت مراد لی جائے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ وہ قوم غلط باتیں وضع کرکے لوگوں میں فساد ڈلوایا کرتی تھی۔ یا ایسی قوم تھی جس میں انکے نبی کی تعلیم کا یونہی سا اثر باقی رہ گیا تھا۔

ر س ل

رِسْلٌ کے اصلی معنے ہیں (کسی چیز کے سامنے جو رکاوٹ ہو اس کا دور ہو جانا اور اسطرح اس کا) اطمینان اور نرمی و سکون کے ساتھ چل پڑنا۔* چنانچہ نَاقَةٌ رَسْلَةٌ۔ نرم رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں۔ اِبِلٌ مَرَاسِيْلُ۔ نرم رفتار اونٹوں کو۔ اسی سے رَسُوْلٌ ہے، جس کے معنے ہیں چل پڑنے والا، روانہ ہونے والا۔ پھر کبھی صرف نرمی اور سکون کے لحاظ سے عَلٰی رِسْلِكَ کہہ دیتے ہیں، یعنی تم اپنے حال پر سکون اور اطمینان سے جسطرح جی چاہے رہو۔ اور کبھی صرف چل پڑنے کے لحاظ سے رَسُوْلٌ کہدیا جاتا ہے*۔ نرمی کے اعتبار سے اَلرَّسْلُ۔ نرم رفتار کو کہتے ہیں۔ اَلْاِسْتِرْسَالُ کے معنے ہیں جانور کی رفتار میں آہستگی**

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی انبعاث ہیں۔ یعنی چل پڑنا۔ اسی اعتبار سے جماعت اور گلّہ کو اَلرَّسَلُ کہتے ہیں۔ جَاءَتِ الْخَيْلُ اَرْسَالًا۔ گھوڑے ٹکڑی ٹکڑی آئے**۔ (اس میں تسلسل کا پہلو بھی ہے)۔ اَلْاِرْسَالُ۔ (کسی کی طرف) بھیجنا۔ اَرْسَلَهٗ عَلَيْهِ۔ اسنے اسے کسی پر مسلط کر دیا۔ اَلرَّسُوْلُ۔ جو شخص خدا کی طرف سے بندوں کی طرف بھیجا جائے۔ خود وہ شخص بھی رَسُوْلٌ کہلاتا ہے اور اسکا پیغام بھی رَسُوْلٌ کہلاتا ہے۔ یعنے لفظ رَسُوْلٌ۔ رِسَالَةٌ اور مُرْسَلٌ دونوں معنوں میں آتا ہے**۔ یعنی پیغام اور جسے پیغام دیکر بھیجا گیا ہو، وہ۔ اَلتَّرَسُّلُ فِى الْقِرَاءَةِ کے معنی ہوتے ہیں آہستہ آہستہ سنوار کر پڑھنا**۔ لہذا اَلرَّسُوْلُ کے معنی ہوئے جو شخص اپنے بھیجنے والے کی طرف سے مسلسل، بتدریج، نہایت نرم روی سے پیغام دے۔نیز خود اسکا پیغام بھی اَلرَّسُوْلُ ہے۔

وہ حضرات جنہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے اور اس وحی کو وہ انسانوں تک پہنچاتے ہیں خدا کے رسول کہلاتے ہیں۔ قرآن کریم نے انہیں اَنْبِيَاءُ بھی کہا ہے اور رُسُلٌ بھی۔ نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ ایک ہی ذات کے دو منصب ہیں۔ نبوت خدا کی طرف سے وحی کا

* راغب۔ ** تاج۔ *** محیط۔

ملتا ہے اور رسالت اس وحی کا آگے پہنچانا ۔ نہ نبوت بغیر رسالت کے ہوسکتی ہے اور نہ رسالت بغیر نبوت کے ۔ (تفصیل اس اجمال کی ن ۔ ب ۔ ا کے تحت ملیگی جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ رسول صاحب شریعت ہوتا ہے اور نبی بلاشریعت ، یہ خیال غیر قرآنی ہے ۔ قرآن کریم نے رسول اور نبی میں اس قسم کی کوئی تخصیص نہیں کی ۔ ہر نبی صاحب کتاب تھا (۲/۲۱۳) اور ہر رسول بھی (۵۷/۲۵)

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ، رسول کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خدا کے پیغامات جو اسے بذریعہ وحی ملتے ہیں انسانوں تک پہنچائے۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ میں خدا کیطرف سے رسول ہوں ۔ اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ (۷/۶۲) ۔ ”میں اپنے نشوونما دینے والے کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں“ ۔ نبی اکرمؐ کے متعلق ہے بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (۵/۶۷) ۔ ” جو کچھ تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے تیری طرف نازل ہوا ہے اسے دوسروں تک پہنچا دے“ ۔ لہذا رسول اللہؐ کو جو کچھ خدا کی طرف سے ملا تھا آپ اسے خود اُمت کو دیکر گئے تھے ۔ اسے دوسروں پر نہیں چھوڑا تھا ۔

رسول ، جنہیں انسانوں تک پیغام پہنچانے کے لئے چنا جاتا تھا ، انسان ہوتے تھے (۱۸/۱۱۰) اور انسانوں میں سے بھی مرد (۱۶/۴۳ ; ۱۲/۱۰۹ ; ۲۱/۷) ۔ رسول سب سے پہلے خود اپنی وحی پر ایمان لاتا تھا کہ وہ من جانب اللہ ہے اور صداقتوں سے معمور (۲/۲۸۵) اور سب سے پہلے اس پر عمل پیرا ہوتا تھا ۔ یعنی اس جماعت کا سب سے پہلا رکن ہوتا تھا جسے وہ قوانین خداوندی کی اطاعت اور نظام خداوندی کی تشکیل کے لئے وجود میں لاتا تھا (۳۹/۱۲) ۔ وہ خود بھی اپنی وحی کا اتباع کرتا تھا (۱۰/۱۰۹ ; ۶/۵۰) اور اس وحی کو ایک عملی نظام زندگی بنانے کیلئے دوسروں سے اسکی اطاعت کراتا تھا (۴/۶۴) ۔ وہ اپنے حکم کی اطاعت کسی سے نہیں کراتا تھا ۔ نہ ہی یہ چیز کسی رسولؐ کے شایان شان تھی کہ وہ انسانوں کو قوانین خداوندی کی بجائے اپنے احکام کا محکوم بنائے (۳/۷۹ ; ۷۸) ۔ اسطرح رسول کی وساطت سے قوانین خداوندی کی اطاعت ، خود خدا کی اطاعت قرار پا جاتی تھی (۴/۸۰) ۔ لہذا یہ اطاعت اس نظام کی اطاعت ہوتی تھی جو رسول کے ہاتھوں قوانین خداوندی کی عملی تنفیذ کیلئے متشکل ہوتا تھا ۔

وحی کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا ۔ اسکے بعد وہ نظام آگے چلا جو قرآنی قوانین کی رو سے قائم ہوا تھا ۔ اس نظام میں

خلیفۃ الرسول؀ وہ فرائض سرانجام دیتا تھا جنھیں اپنی زندگی میں رسول؀ سرانجام دیتا تھا۔ یعنی منظم اور اجتماعی طور پر قوانین خداوندی کی اطاعت کرنا اور کرانا۔ اسطرح "اطاعت خدا و رسول" کا یہ سلسلہ قائم رہا۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک باقی نہ رہا۔ اب اگر پھر اسی قسم کا نظام قائم ہو جائے جسمیں قرآنی قوانین عملاً نافذ ہوں تو پھر اُسی اطاعت کا سلسلہ جاری ہو سکتا ہے جسے "خدا اور رسول؀" کی عملی اطاعت کہا جاتا ہے۔ (ان امور کی تفصیل میری کتاب "اسلامی نظام"* میں ملیگی جسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں "اللہ اور رسول" کا ذکر آیا ہے لیکن اس کے بعد ضمیر یا صیغہ واحد کا استعمال ہوا ہے۔ اسکے معنے یہ ہیں کہ "اللہ اور رسول" کی اطاعت دو الگ الگ اطاعتیں نہیں ہوتیں۔ اس سے مراد ہوتی ہے قوانین خداوندی کی اطاعت جو اس نظام کی وساطت سے کی جاتی ہے جسے رسول متشکل کرتا ہے اور جو رسول کی وفات کے بعد اسکے جانشینوں کے ذریعہ آگے چلتا ہے)۔

صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ اَلرَّسُوْلُ اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو تیر اندازی میں تمہارا ساتھی اور موافق ہو**۔ اگرچہ لسان العرب میں ہے کہ اس معنے میں رَسِیْلٌ آتا ہے۔ رَسُوْلٌ نہیں***۔ لیکن خدا اور اسکا رسول، درحقیقت "تیر اندازی" میں ایک دوسرے کے رفیق ہوتے ہیں۔ انسانوں کی دنیا میں خدا کے احکام رسول (اور اسکے متبعین کی جماعت) کے دست و بازو کی قوت سے عملاً نفاذ پذیر ہوتے ہیں۔ اسی لئے بدر کی جنگ کے موقع پر خدا نے کہا تھا کہ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸/۱۷)۔ "وہ تیر تم نہیں چلا رہے تھے خود خدا چلا رہا تھا"۔ خدا اور رسول (اور اسکی جماعت) کی یہی باہمی رفاقت ہے جس سے دنیا میں نظام خداوندی کا قیام عمل میں آتا ہے۔ (اسکی مزید تفصیل قَابَ قَوْسَيْنِ (۵۳/۹) میں دیکھئے۔ عنوان ق۔ و۔ س)۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، قرآن کریم کی رو سے نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن کریم نے نبی یا رسول کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ نبی اور رسول کی الگ الگ خصوصیات نہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کریم کے مختلف مقامات کو

---

* نیز "سلیم کے نام خطوط" (جلد دوم) میں اطاعت رسول سے متعلق خطوط ہیں۔

** تاج و محیط۔ *** لسان العرب

دیکھئے جہاں نبی یا رسول کی خصوصیات یا تفصیلی تذکرہ آیا ہے۔ مثلاً رسول کسی سے اپنا حکم نہیں منواتا، صرف کتاب خداوندی کی اطاعت کراتا ہے (۳/۷۸)۔ وہ اگر کسی معاملہ میں غلطی کرتا ہے تو وہ اسکی ذاتی غلطی ہوتی ہے۔ صحیح راستہ وحی کے ذریعے دکھاتا ہے (۳۴/۵۰)۔ رسول خود اپنی ذات کے لئے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا (۱۰/۴۹)۔ وہ کسی سے اجر رسالت نہیں مانگتا (۱۰/۷۲)۔ رسولوں کے بیوی بچے ہوتے تھے (۱۳/۳۸)۔ تمام رسول اپنے اپنے وقت پر آئے اور تشریف لے گئے (۳/۱۴۴)۔ لیکن نبی آخرالزمانؐ کی بعثت کے بعد، نجات و سعادت حضورؐ پر ایمان اور قرآن کریم پر عمل کرنے ہی سے مل سکتی ہے (۷/۱۵۸)۔ رسول ہمیشہ مرکزی مقامات میں آیا کرتے تھے (۲۸/۵۹)۔ رسول کو رسالت ملنے سے پہلے قطعاً علم و احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے رسالت ملنے والی ہے (۴۲/۵۲ ; ۲۸/۸۶)۔ نبی اکرمؐ نبوت ملنے سے پہلے ان پڑھ تھے (اس کے بعد نہیں)۔ (۲۹/۴۸)۔ نبی اکرمؐ خدا کے آخری نبی تھے (۳۳/۴۰)۔ اس لئے اب نہ کوئی نبی آسکتا ہے نہ رسول۔ رسول صرف خدا کا راستہ دکھاتے تھے۔ دوسروں کو اس راستے پر لگانا ان کے ذمے یا اختیار میں نہیں تھا (۲۸/۵۹)۔ بعض رسولوں پر ایمان لانا اور بعض پر نہ لانا کفر ہے (۴/۱۵۰)۔ یہ اور اس قسم کی دیگر خصوصیات، انبیاء کرام اور رسولوں کے سلسلہ میں قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ حتکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر (بفرض محال) رسول بھی مداہنت برتے یا اپنی وحی میں کسی قسم کی تبدیلی کرلے تو اس پر خدا کا عذاب آجائے (۶۸/۹ ; ۱۰/۱۵ ; ۱۱/۱۱۳ : ۱۷/۷۴)۔

چونکہ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لے لیا ہے اور وہ دین کا مکمل ضابطہ ہے، اس لئے نبوت کے ختم ہو جانے سے انسانی راہ نمائی کے سلسلہ میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ سوال صرف اس نظام کے قائم کرنے کا ہے جسے رسول اللہؐ نے قائم فرمایا تھا۔ وہ آج بھی قائم ہو سکتا ہے۔

اِرْسَال* کے معنے چھوڑ دینے کے بھی ہیں۔ اَرْسَلَ الْخَیْلَ فِی الْغَارَۃِ۔ حملہ میں گھوڑوں کی باگیں کھلی چھوڑ دیں*۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اِمْسَاک* (روک لینے) کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۵/۲) جہاں اسکے معنے کھلا چھوڑ دینے کے ہیں۔ اَرْسَلَ عَلٰی کے معنے ہیں کسی پر مسلط کرنا (۱۹/۸۳)۔

---

* تاج و محیط۔

ر س و

رَسَا الشَّيْئُ يَرْسُوْ - اَرْسٰی - اِرْسَاءً - کسی شے کا قرار گیر ہو جانا - جم جانا - رَسَتِ السَّفِيْنَۃُ تَرْسُوْ - کشتی لنگر انداز ہوگئی - اَرْسَی السَّفِيْنَۃَ : کشتی کو لنگر انداز کیا - ٹھہرایا - اَلْمِرْسَاۃُ - کشتی کا لنگر* - مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰهَا (۱۱/۴۱) - کشتی کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا - سورۃ اعراف میں اَلسَّاعَۃُ کے متعلق ہے اَیَّانَ مُرْسٰهَا (۷/۱۸۷) - اس کا وقوع کب ہوگا - وہ کب رُک کر ہمارے سامنے آئے گی - مُرْسٰی اسم مفعول ہے جو ظرف کے معنوں میں بھی استعمال ہوسکتا ہے - اس کے معنے رکنے کا وقت اور رکنے کا مقام دونوں ہوسکتے ہیں - قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (۳۴/۱۳) - دیگیں جو ایک جگہ مضبوطی سے جمی ہوئی ہوں - رَوَاسِيَ (۱۳/۳) - جمے ہوئے پہاڑ (واحد رَاسِیَۃٌ) -

ر ش د

رَشَدَ یَرْشُدُ - رُشْدًا - نیز رَشِدَ - یَرْشَدُ - رَشَدًا وَرَشَادًا - معاملہ کا صحیح حل ، یا صحیح راستہ، پالینا**- الرُّشْدُ - سختی سے راہ راست پر استقامت کو کہتے ہیں** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی راستہ پر پختگی سے جم جانے کے ہیں - الرَّشَدُ والرُّشْدُ - غَیٌّ کی ضد ہے - یہ صحیح راھنمائی اور ھدایت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے*** - (۲/۲۵۶) - سورۃ نساء میں رُشْدًا (۴/۶) آیا ہے جس کے معنے معاملہ فہمی کی صلاحیت یا عقل کی پختگی کے ہیں - اِسْتَرْشَدَ فُلَانٌ لِاَمْرِہٖ - اس شخص نے اپنے معاملہ کا صحیح حل پا لیا - اَرْشَدْتُہٗ - میں نے اسے ٹھیک راہ بتائی - اَلرَّشِیْدُ (۱۱/۸۷) - صحیح راستہ بتانے والا - نیز وہ شخص جو معاملات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانے یا جس کے اندازہ کئے ہوئے معاملات پوری طرح بغیر کسی کی مدد اور رھنمائی کے انتہا تک پہنچ جائیں** -

سورۃ کہف میں ہے کہ ان نوجوانوں نے خدا سے دعا کی کہ ہماری اس انقلابی مہم میں ہمیں سامانِ رحمت و ربوبیت عطا کر دے اور ہمارے معاملہ میں ہماری راھنمائی کا سامان فراہم کردے - وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا (۱۸/۱۰) - اس کے بعد ہے کہ تمہارا نشو و نما دینے والا تمہیں سامانِ رحمت بھی دے گا - وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا (۱۸/۱۶) - اور تمہارے مقصد کی کامیابی کے لئے آسانیاں بھی بہم پہنچا

---

* تاج و محیط - ** تاج - *** راغب -

دے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ رَشَدًا صرف صحیح راستے کی طرف راہنمائی ہی نہیں بلکہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ضروری تدابیر اور انکی کامیابی کے کے لئے آسانیاں بہم پہنچانا بھی ہے ۔ چنانچہ اَلْمَرَاشِدُ ان راستوں کو کہتے ہیں جو منزل مقصود تک پہنچادیں ۔ قرآن کریم میں رَشَدًا ۔ ضَرًّا ۔ (نقصان) کے مقابلہ میں آیا ہے (۷۲/۲۱) ۔ لہذا رُشْد ایک جامع لفظ ہے جس میں ھدایت ، حکمت و بصیرت سے لیکر منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے عملی تدابیر اور راستے کے خطرات اور نقصانات سے بچنے کے سامان سب آ جاتے ہیں۔ اسی لئے انبیائے کرام (انقلاب خداوندی کی طرف دعوت دینے والوں) کو رُشْدٌ عطا ہوتا تھا (۲۱/۵۱) ۔ اور جماعت مومنین رَاشِدُوْنَ کی جماعت ہوتی ہے (۴۹/۷)۔ یہ سب کچھ قوانین خداوندی کی اطاعت سے ملتا ہے ۔ اس لئے قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ خدا کے سوا نہ کوئی وَلِیًّا ہے اور نہ کوئی مُرْشِدٌ (۱۸/۱۷) ۔ لیکن ہم ہیں کہ انسانوں کو اپنا پیر و مرشد بناتے ہیں ۔ اور اس کا نتیجہ بھی بھگت رہے ہیں!

ر ص د

رَصَدَهٗ ۔ وہ اسکے انتظار میں رہا ۔ اَلرَّاصِدُ ۔ منتظر اور کسی کی نقل و حرکت پر نگرانی کرنے والا ۔ اَلرَّصِیْدُ ۔ درندہ جو حملہ کرنے کا منتظر رہے* ۔ قرآن کریم میں ہے یَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (۷۲/۹) ۔ وہ ایک شعلہ کو اپنے انتظار یا گھات میں بیٹھا ہوا پائیگا ۔ اِرْصَادٌ کے معنے ہیں کسی کا انتظار کرنا اور (انتظار میں) تیاری کرنا* ۔ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (۹/۱۰۷) "خدا و رسول" (نظام خداوندی) کے خلاف جنگ کرنے والے کے لئے گھات بنانے اور تاک میں رہنے کے لئے۔ نیز مخالفانہ کاروائیاں کرنے کے لئے ۔ اَلْمَرْصَدُ ۔ اَلْمِرْصَادُ (۹/۵ و ۸۹/۱۴) وہ راستہ یا جگہ جہاں بیٹھکر دشمن کی تاک لگائی جائے*۔

خدا کے مِرْصَادٌ (گھات) میں ہونے (۸۹/۱۴) کے یہ معنے ہیں کہ اس کا قانونِ مکافات ہر ایک پر نگاہ رکھتا ہے اور جب ظہورِ نتائج کا وقت آتا ہے تو اسے فوراً دبوچ لیتا ہے ۔ کوئی شخص اُس قانون کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ جس راستے سے کسی چیز کو گذرنا ہو وہاں اس کی تاک میں بیٹھنا ۔ انسان

*تاج ۔

کا ہر عمل ، قانونِ خداوندی کے معین کردہ راستے سے گذر کر اپنی منزل و منتھیٰ تک پہنچتا ہے، جسے اس کا نتیجہ کہا جاتا ہے ۔ لہذا کوئی عمل بلا نتیجہ رہ نہیں سکتا ۔

ر ص ص

رَصَّهٗ ۔ یَرُصُّهٗ ۔ رَصًّا ۔ اس نے کسی چیز کے اجزا کو ایک دوسرے میں پیوست کر دیا اور انہیں باھمدگر مضبوطی سے جوڑ کر ملا دیا، جیسے انہیں سیسہ پلا دیا گیا ہو ۔ اَلرَّصَاصُ سیسے کو کہتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں ہے کہ مومن خدا کی راہ میں اس طرح صف بستہ لڑتے ہیں کَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۶۱/۴) ۔ گویا وہ ایک ایسی محکم دیوار ہیں جسے سیسہ پلا دیا گیا ہو ۔ یہ بات اسی صورت میں پیدا ہوسکتی ہے جب قلوب ایک دوسرے سے پیوست ہوں ۔ اور قلوب کی پیوستگی ، مقصدِ زندگی اور ضابطۂ حیات کے ایک ہونے سے ہوتی ہے ۔ آپ غور فرمائیے کہ جس جماعت (اُمت مسلمہ) کی کیفیت یہ ہونی چاہئے تھی وہ آج کس طرح فرقوں میں بٹی ہوئی ہے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو حاملِ قرآن سمجھ رہی ہے!

ر ض ع

رَضِعَ یَرْضَعُ ۔ رَضَعَ یَرْضِعُ ۔ رَضْعًا و رَضَاعًا و رَضَاعَةً ۔ بچہ کا ماں کے پستان کوچوسکردودھ پینا** ۔ اَخَوٰتُکُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ (۴/۲۳) تمہاری دودھ شریک بہنیں (جن سے نکاح حرام ہے) ۔ اَرْضَعَ ۔ دودھ پلانا ۔ الاِسْتِرْضَاعُ ۔ دودھ پلواناچاہا** ۔ وَاُمَّهٰتُکُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَکُمْ (۴/۲۳) ۔ تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے (ان سے بھی نکاح حرام ہے) ۔ مَرَاضِعُ ۔ دودھ پینے کی جگہ ۔ چھاتیاں*** ۔ (واحد ۔ مَرْضَعٌ) سورۃ قصص میں ہے ۔ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ (۲۸/۱۲) ۔ یعنی ہم نے موسیٰ کو دودھ پینے سے روک دیا ۔ اس میں مَرَاضِعُ ۔ مَرْضَعٌ کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور مُرْضِعَةٌ کی بھی ۔ پہلی شکل میں اس کا مفہوم چھاتیاں، اور دوسری شکل میں دودھ پلانے والیاں، ہوگا ۔ مُرْضِعَةٌ ۔ دودھ پلانے والی عورت ۔ انّا ۔ (۲۲/۲) ۔ اس کی جمع بھی مَرَاضِعُ ہے ۔ اِسْتَرْضَعَ ۔ بچے کو (انّا سے) دودھ پلوانا چاہا ۔ (۲/۲۳۳) ۔

---

* تاج و راغب ۔ ** تاج ۔ *** کشاف ۔

ر ض ی

رَضِیَ یَرْضٰی رِضْوَاناً و رِضاً کے معنے ہوتے ہیں کسی سے متفق ہونا۔ کسی کی بات کی تصویب کر دینا۔ (Approve) کر لینا۔ لیکن اس میں دل کی رضامندی اور رغبت وخوشی کا پہلو پایا جاتا ہے جس میں کسی قسم کی کراہت اور جبر نہ ہو۔ تَرَاضَیَاہُ۔ دونوں نے کسی بات پر آپس میں برضا ورغبت اتفاق کر لیا۔ اسے باہمی (Agreement) سے کیا۔ اس پھر دونوں کی رضامندی ہو گئی۔ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (۲/۲۳۲) "جب وہ (میاں بیوی) قاعدے کے مطابق ایک دوسرے سے رضامندی کے ساتھ متفق ہو جائیں"۔ * رَضِیَہُ لِھٰذَا الْاَمْرِ۔ اسے اس کام کا اہل سمجھا۔ اِرْتَضَاہُ لِصُحْبَتِہٖ وَخِدْمَتِہٖ۔ اسے اپنی صحبت اور خدمت کا اہل سمجھا اور اسکے لئے منتخب کر لیا۔ رَضِیْتُ الشَّیْیَٔ وَبِہٖ۔ میں نے اس چیز کو پسند کر لیا اور اسے اختیار کر لیا *۔ لَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَھُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی (۲/۱۲۰)۔ "تجھ سے یہود اور نصاریٰ کبھی متفق نہ ہونگے"۔ تجھ سے کبھی راضی نہ ہونگے۔

قرآن کریم میں مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (۹/۱۰۰)۔ اس کا ترجمہ عام طور پر کیا جاتا ہے "اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے"۔ چونکہ راضی ہو جانا اور ناراض ہو جانا انسانی جذبات ہیں اسلئے اس سے ذہن اسطرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہی جذبات خدا میں بھی ہیں۔ وہ بھی کسی بات سے خوش ہو جاتا ہے اور کسی سے ناراض ہو جاتا ہے۔ خدا خوشی اور ناراضگی کے ان انسانی جذبات سے مبرا ہے۔ اس لئے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ایک بات کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔ جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو اس نے دیوی دیوتا یا خدا کا تصور ایسا ہی پیدا کیا جیسا وہ اپنے سامنے بادشاہ کو دیکھتا تھا، اس لئے کہ اس کے نزدیک بادشاہ سے بڑھ کر قوت اور اقتدار کا مالک کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ذہن نے خدا کو بھی (بادشاہ کیطرح) ایک تخت پر بٹھایا۔ پھر یہ سمجھا کہ بادشاہ کے امراء و وزراء کیطرح خدا کے بھی مقربین ہیں جنہیں اس کے کاروبار میں عمل دخل ہے۔ نیز اس کے حاجب و دربان بھی ہیں۔ بندے اسکی رعایا ہیں جنہیں اس

* لین و تاج۔

کے سامنے دم مارنے کی جا نہیں ۔ اگر انسان نے اپنی کوئی درخواست اُس کے حضور پیش کرنی ہو تو اس کے ساتھ کوئی نذرانہ بھی پیش کرنا ضروری ہوگا۔ نیز اس درخواست کو، بادشاہ کے مقربین میں سے کسی کی وساطت سے وہاں تک پہنچانا ہوگا تاکہ وہ سفارش کرے۔ ان درخواستوں کے فیصلے (یا بادشاہ کے دیگر احکام) کسی قاعدے اور قانون کے مطابق نہیں ہوتے۔ اس کا انحصار بادشاہ کے مزاج پر ہوتا ہے۔ اگر وہ خوش ہوگیا تو گاؤں بخش دیا۔ اگر ناراض ہو گیا تو گدھوں کے ہل چلوا دیئے۔ بادشادہ کی خوشی اور ناراضگی بھی کسی اصول کے مطابق نہیں ہوتی۔ سعدی کے الفاظ میں، مزاج شاہاں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ''گاہے بہ سلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند''۔ کبھی سلام کرنے پر ناراض ہو جاتے ہیں اور کبھی گالی دینے پر انعام دیتے ہیں۔ لہٰذا بندوں کی تمام تر کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ کسی طرح خدا کو راضی رکھیں۔ اسے خوش کر لیں۔ ایشور کی بھکتی۔ ڈنڈوت۔ پوجا پاٹ۔ اس کے چرنوں (قدموں) میں شردھا (عقیدت) کے پھول چڑھانا۔ دیوتاؤں کے استھانوں پر قربانیاں دینا سب اس غرض سے تھا کہ کسی طرح ایشور پرماتما کو خوش رکھا جائے۔ وہ اپنے بھکتوں سے راضی رہے۔

قرآن کریم نے (اور اس سے پہلے انبیاء سابقہؑ کیطرف وحی نے) اس توہم پرستانہ تصور کو مٹا کر، اسکی جگہ خدا کا صحیح تصور دیا۔ اس تصور کی رو سے بتایا گیا کہ خدا مستبد حکمرانوں کیطرح نہیں۔ اس نے ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر کر رکھا ہے اور کائنات کے تمام امور اس کے متعین کردہ قوانین و اصول کے مطابق سر انجام پاتے ہیں۔ انسانی زندگی کے لئے بھی اس نے قوانین مقرر کر رکھے ہیں (جن کا علم انسان کو انبیاء کرامؑ کی وساطت سے دیا جاتا رہا ہے اور اب وہ قوانین قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں)۔ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ان قوانین کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ وہ (بادشاہوں کی طرح) یونہی خوش ہوکر نہ کسی کو انعام دیتا ہے، نہ یونہی ناراض ہوکر عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ خدا نے انسانی زندگی کے سامنے ایک مقصد رکھا ہے اور اس نے جو قوانین عطا کئے ہیں وہ اس لئے ہیں کہ انسان ان کے مطابق زندگی بسر کرکے، اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ انسانوں کے لئے یہ راستہ خدا کا پسندیدہ ہے۔ یعنی اگر انسان اس راستے پر چلتا ہے تو وہ خدا کی منشاء کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر اس کے

خلاف جاتا ہے تو وہ خدا کی منشاء کے خلاف ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں ''خدا کی رضامندی'' (یا اس کے خلاف، غضب وغیرہ) کے الفاظ آئے ہیں تو وہ اسی مفہوم کے ترجمان ہیں۔ مثلاً سورۃ المائدہ میں ہے وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵/۳)۔ ''میں نے تمہارے لئے اسلام کو بطور ضابطۂ حیات پسند کیا ہے''۔ اگر انسان اس ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو وہ خدا کے پسندیدہ راستے پر چلتا ہے۔ اسے ''رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری طرف، ایک مومن کے دل کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کے پسندیدہ راستے کو محبوب رکھتا ہے اور اس کے خلاف دوسرے راستوں کو ناپسند کرتا ہے۔ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَکَرَّہَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ۔ اُولٰئِکَ ھُمُ الرَّاشِدُوْنَ۔ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَنِعْمَۃً۔ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ (۴۹/۸) ''لیکن اللہ نے تمہارے دلوں میں ایمان کو محبوب ومزین بنادیا ہے اور کفر و فسق وعصیان کو نامرغوب۔ ایسے ہی لوگ صحیح راستے پر چلنے والے ہیں۔ یہ اللہ کیطرف سے فضل اور نعمت ہے۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے''۔ ایمان کا دلوں میں اسطرح مرغوب بن جانا، ''رَضُوْا عَنْہُ'' ہے۔

اس سے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (۹/۱۰۰) کا مفہوم سمجھ میں آجائیگا۔ یعنی ''اللہ کے راضی ہونے'' سے مراد یہ ہے کہ خدا کے پسندیدہ راستہ (قرآن کریم) کے مطابق چلا جائے۔ اور انسانوں کے خدا سے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا تجویز کردہ راستہ، ان کے دلوں میں محبوب و مرغوب بن جائے۔ قرآن کریم کے دیگر مقامات سے بھی اس مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ توبَۃ میں منافقین کے متعلق ہے کہ یُرْضُوْنَکُمْ بِاَفْوَاھِہِمْ وَتَاْبٰی قُلُوْبُھُمْ (۹/۸) ''وہ اپنے منہ سے تم کو راضی کرتے ہیں اور ان کے دل انکار کرتے ہیں''۔ یہاں اِرْضَاءٌ بمقابلہ اَبٰی آیا ہے۔ اَبٰی کے معنے ہیں سختی سے انکار کرنا۔ لہذا رِضیٰ کے معنے برضاو رغبت موافقت کرنے اور دلی طور پر ہم آہنگی کے ہونگے۔ یہ مفہوم سورۃ بقرہ سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ پہلے منکرین کے متعلق ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اِتَّقِ اللّٰہَ (۲/۲۰۶)۔ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو، تو وہ ایسا نہیں کرتے۔ اسکے بعد مومنین کا ذکر ہے کہ وہ اِبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ (۲/۲۰۸) کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس سے آگے ہے اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً (۲/۲۰۸)۔ خدا کی اطاعت شعاری میں پورے کے پورے داخل

ہو جاؤ۔ یعنی لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ (۲/۲۰۸)۔ غیر خدائی قوتوں کے احکام و قوانین کا اتباع مت کرو۔ ان تمام ٹکڑوں کو سامنے رکھنے سے مَرْضَاتِ اللّٰہِ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی خدا کے احکام و قوانین کی پوری پوری اور برضا و رغبت اطاعت۔ یہی معنے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کے ہیں۔ یعنی یہ لوگ قوانین خداوندی کے ساتھ بطیب خاطر پوری ہم آہنگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی ان قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ اور قوانین خداوندی کے خوشگوار نتائج ان سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ان کی سعادتیں اور برکتیں ان کے شامل حال ہوتی ہیں۔ اس سے ان کے دلوں میں قوانین خداوندی کی محبت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اسی کو اِتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰہِ (۳/۱۶۱) سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے مقابلہ میں بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰہِ کہا ہے (دیکھئے عنوان س۔ خ۔ ط)۔ سورۃ محمد میں واضح کر دیا ہے کہ رِضْوَانَهٗ کے معنے ہیں مَا نَزَّلَ اللّٰہُ یعنے قرآن۔ پہلے کہا گیا ہے کَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (۴۷/۹)۔ اور اس کے بعد ہے کَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ (۴۷/۲۸)۔ یعنی، رِضْوَانَهٗ قرآن کریم (مَا نَزَّلَ اللّٰہُ) کا اتباع ہے اور سَخَطٌ غیر قرآنی احکام کا اتباع۔ لہذا مومنین کا شعار یہ ہے کہ وہ قرآن کریم (مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ) کا پورا پورا اتباع کرتے ہیں۔ اپنی زندگی کو اس سے پورے طور پر ہم آہنگ اور متفق رکھتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے قانون مکافات کے مطابق زندگی کی خوشگواریاں اور شادابیاں ان کے ہمرکاب ہوجاتی ہیں۔ اسی زندگی کا نام عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ (۱۰۱/۷) ہے۔

سورۃ مریم میں ہے کہ حضرت زکریا نے خدا سے بیٹے کی دعا مانگی اور کہا وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا (۱۹/۶)۔ یہاں رَضِیًّا کے معنے یا تو محبوب و مقبول کے ہیں۔ اور یا یہ کہ وہ تیرے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے والا ہو۔ تاج میں رَضِیٌّ کے معنے مطیع بھی لکھے ہیں۔

سورۃ توبہ میں ہے کہ اللہ نے مومنین سے جَنّٰتٍ اور مَسٰکِنَ طَیِّبَةً کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس کے بعد ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۹/۷۲)۔ اللہ کی "رضوان" ان سب سے بڑھ کر ہے۔ اور یہ ایک عظیم کامرانی (Achievement) ہے۔

یہ آیۃ جلیلہ ایک عظیم حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ سے ہوتا کیا ہے؟

انسان نام ہے اس کی طبعی زندگی (Physical Life) اور انسانی ذات (Self) کا - زندگی کی کامیابی سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی طبعی زندگی بھی خوشگوار رہے اور اس کی ذات کی بھی نشو و نما ہو جائے - انسان کی نشو و نما سے مراد یہ ہے کہ اس میں جس قدر مضمر صلاحیتیں ہیں وہ بیدار ہو جائیں - خدا کی ذات ایک مکمل ترین ذات ہے جس میں اس کی تمام صفات بطریق احسن جلوہ فرما ہیں - وہی صفات انسان کی ذات میں بھی ہیں لیکن علیٰ قدرِ بشریت - یعنی چھوٹے پیمانے پر - انسانی ذات کی نشو و نما کے معنی یہ ہیں کہ اس میں ان صفات کی نمود ہوتی جائے - اب ظاہر ہے کہ انسانی ذات کو جسقدر زیادہ نشو و نما حاصل ہوگی یہ اُتنی ہی زیادہ صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوتی جائے گی -

ایمان و اعمال صالحہ سے ہوتا یہ ہے کہ انسانی ذات کی اس طرح نشو و نما ہوتی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے زندگی کی خوشگواریاں بھی ملتی چلی جاتی ہیں - قرآن کریم کہتا ہے کہ زندگی کی یہ خواشگواریاں بڑی خوش آئند اور مبارک ہیں اور ان کا حاصل ہو جانا بھی بڑی چیز ہے - لیکن حقیقی کامرانی وکامیابی یہ ہے کہ اس سے انسانی ذات، صفاتِ خداوندی سے ہمآہنگ ہو جاتی ہے- ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ - ان اعمال کا بدلہ (یا نتیجہ) ایک تو اس طرح مرتب ہوتا ہے کہ انسان کی خارجی دنیا حسین وخوشگوار ہو جاتی ہے - اور دوسرے یہ کہ اس کی داخلی دنیا میں بھی ایک عظیم انقلاب آجاتا ہے - یہ انقلاب (یعنی انسانی ذات کا نشو و نما پا جانا) بہت بڑی کامرانی ہے - یہی چیز ہے جسے باندازِ دگر یوں کہا گیا ہے کہ لَهُمْ مَا يَشَاؤُنَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (۵۰/۳۵) "جنت میں ان کے لئے وہ سب کچھ ہوگا جس کی وہ خواہش کرتے ہیں - اور ہمارے پاس (اس سے بھی) بڑھ کر (کچھ اور) ہے" - یعنی انسان کی خواہش اس کے علم و جذبات کی موجودہ سطح کے مطابق ہی ہوسکتی ہیں - لیکن جب جنت کی زندگی میں یہ سطح ہی بلند ہوجائیگی تو وہاں جو کچھ ملیگا وہ ان کی موجودہ خواہشوں اور آرزوؤں سے کہیں زیادہ ہوگا - اس کی ذات کی نشو و نما بایں نمط ہوگی کہ اس کے شعور کی موجودہ سطح اس کا اندازہ نہیں کر سکتی -

لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ انسانی ذات کی یہ نشو و نما صرف اس معاشرہ کے اندر ہوسکتی ہے جو قرآن کریم متشکل کرتا ہے - خانقاہوں کی تجردگاہوں میں نہیں ہوسکتی - لہذا بات پھر وہیں آجاتی

ہے کہ رضوان من اللہ یا مرضات اللہ ، قرآن کریم کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کے خوشگوار نتائج کا نام ہے ۔

سورۃ انبیاء میں ہے وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی (۲۱/۲۸) ۔ اس کے لئے عنوان ش ۔ف ۔ ع دیکھئے ۔

ر ط ب

اَلرُّطْبُ ۔ یَابِسٌ (خشک) کی ضد ہے ۔ یعنی تر و تازہ چیز جس میں نمی ہو ۔ نرم و نازک شاخ ۔ ہری بھری گھاس ۔ سرسبز زمین ۔ اَلرُّطَبُ ۔ گدری کھجور* ۔ قرآن کریم میں رُطَبًا جَنِیًّا (۱۹/۲۵) آیا ہے ۔ چنی ہوئی گدری کھجوریں ۔ سورۃ انعام میں ہے وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ (۶/۵۹) ۔ اس کے معنے تازہ اور خشک پھل کے بھی ہوسکتے ہیں، لیکن اس کا مطلب ہر تر اور خشک چیز ہے ۔ یعنی کائنات کی مختلف چیزیں ۔ اور کتاب مبین صحیفہ فطرت یا کائناتی قوانین کا ضابطہ ہے ۔

(رَطْبٌ وَ یَابِسٌ کے لئے ی ۔ ب ۔ س کا عنوان بھی دیکھئے) ۔

آیت (۱۹/۲۵) کو سامنے لائیے ۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اس موسم میں ہوئی تھی جب درختوں پر پکی ہوئی کھجوریں لٹک رہی تھیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ، دسمبر کے مہینے میں نہیں ہوئی تھی ۔ اس زمانے میں فلسطین میں سخت سردی ہوتی ہے اور تازہ کھجوروں کا موسم نہیں ہوتا ۔ اب عیسائی مورخ خود اس کے قائل ہو رہے ہیں کہ ۲۵ دسمبر حضرت عیسیٰؑ کا یوم پیدائش نہیں ۔ عیسائیوں نے بعد میں یہ عقیدہ ایرانیوں سے مستعار لیا تھا جن کے ہاں ۲۵ دسمبر متھرا کا یوم پیدائش تسلیم کیا جاتا تھا ۔ اور ۲۵ مارچ اس کے مر کر جی اٹھنے کا دن ۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ متھرا آخری زمانے میں پھر دنیا میں آئے گا ۔ (دیکھئے معراج انسانیت صفحہ ۱۵)

ر ع ب

رَعَبَ الْحَوْضَ ۔ حوض کو بھر دیا ۔ رَعَبَ السَّیْلُ الْوَادِیَ ۔ سیلاب نے وادی کو بھر دیا ۔ اسکے ایک معنی تو ہیں بھر دینا اور دوسرے معنے ہیں کسی چیز کو کاٹ دینا ۔ رَعَبَ السَّنَامَ ۔ اسنے کوہان کو کاٹ لیا ۔ اَلتَّرْعِیْبَۃُ ۔ کوہان کا کٹا ہوا ٹکڑا* ۔

* تاج ۔

اس اعتبار سے راغب کے نزدیک اَلرَّعْبُ کے معنے ہیں خوف سے بھر جانے کی وجہ سے بول چال سے منقطع ہو جانا *۔ صرف ڈر کو بھی کہتے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا (۱۸/۱۸)۔ "تو ان کی وجہ سے خوف کھا جائے"۔

جماعت مؤمنین کو اسقدر قوت حاصل ہونی چاہیئے کہ میدان جنگ میں مخالفین ان کو دیکھکر رعب سے کانپنے لگ جائیں۔ لیکن یہ چیز صرف اسطرح حاصل ہوتی ہے کہ انسان دنیا میں قانون خداوندی کے علاوہ کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔ اور شرک کا لازمی نتیجہ خوف بتایا گیا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللهِ.... (۳/۱۵۰)۔ "ہم کفار کے دلوں میں رعب ڈال دینگے اس لئے کہ وہ خدا کے ساتھ شرک کرتے ہیں"۔

ر ع د

رَعْدٌ بادل کی گرج۔ اسکے معنے کپکپانے اور تھر تھرانے کے بھی آتے ہیں۔ مجازاً زجر و توبیخ کو بھی کہتے ہیں۔ اَلرَّعَّادُ۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو بہت باتیں بناتا ہو۔ زیادہ بڑ بڑ کرتا ہو۔ ** ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حرکت اور اضطراب کے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ لفظ بادلوں کی آواز کے معنوں میں آیا ہے (۲/۱۹ ; ۱۳/۱۳)۔ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ (۱۳/۱۳)۔ رَعْدٌ اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہتی ہے اور اپنے تعمیری نتائج سے خدا کی حمد و ستائش کی زندہ پیکر بن جاتی ہے۔ (دیکھئے عنوانات س۔ب۔ح اور ح۔م۔د)۔ کائنات کی ہر قوت اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دھی کیلئے سرگرداں رہتی ہے۔ اور ان کی نقل و حرکت کا مجموعی نتیجہ کائنات میں تعمیری اضافے ہوتا ہے۔ ہم جب ان قوتوں کو الگ الگ دیکھتے ہیں تو ہمیں بعض قوتیں محض ڈر اور خوف کا موجب نظر آتی ہیں (جیسے بجلی کی کڑک) لیکن بہ ہیئت مجموعی ان سب کا نتیجہ تعمیری ہے۔ اور یہی چیز خدا کی حمد و ستائش کی مظہر ہے۔

ر ع ن

اَلرُّعُوْنَةُ = حماقت کو کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رُعُوْنَةٌ فکر کی کمی کو کہتے ہیں اور حُمْقٌ بطلانِ فکر کو***۔

---

* راغب۔ ** تاج۔ *** محیط

آلاَرْعَنُ ۔ وہ شخص جس کی باتوں میں بے تکا پن ہو۔ احمق ۔ سست اور ڈھیلا ۔ رَعَنَ الرَّجُلُ ۔ وہ احمق بے تکا اور ڈھیلا ہوا۔ رُعِنَ ۔ وہ بیہوش ہو گیا* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) آگے کو اُبھرا ہوا اور اُونچا ہونا (۲) بے تکا پن، پریشانی اور اضطراب کے ہوتے ہیں ۔

رَاعِنَا (۲/۱۰۴) ۔ ایک کلمہ تھا جس سے یہودی رسول اللہؐ کو مخاطب کیا کرتے تھے۔ اس سے ان کا مقصد رسول اللہؐ کو رعونت سے متہم کرنا ہوتا تھا لیکن وہ اسے اس طرح بولتے تھے جس سے یہ ابہام پیدا ہو کہ وہ رَاعِنَا کہتے ہیں جس کے معنے ہیں ہماری رعایت فرمائیے ۔ ہمارا خیال رکھئیے**۔ (یوں سمجھئیے جیسے انگریزی میں کہتے ہیں (I beg your Pardon) ۔
(رَاعِنَا کے لئے عنوان ر۔ ع ۔ ی بھی دیکھئیے)

ر ع ی

آلرِعْیُ ۔ گھاس ۔ الرَّعْیُ ۔ آلْمَرْعٰی ۔ گھاس چرانا ۔ آلْمَرْعٰی۔ چراگاہ نیز گھاس جو چری جائے ۔ رَعَیَا ۔ یَرْعٰی ۔ رَعْیًا ۔ جانوروں نے چرا، یا جانوروں کو چرایا اور چرنے کے لئے چھوڑا (لازم و متعدی)۔ آلرَّاعِیْ۔ چرواھا ۔ اس کی ایک جمع رِعَاءٌ بھی ہے دیکھئیے (۲۸/۲۳)*۔ راغب نے لکھا ہے کہ رِعْیٌ دراصل حیوان کی دیکھ بھال نگرانی اور ہر طرح سے اس کی حفاظت کرنے کو کہتے ہیں خواہ وہ غذا دیکر اس کی زندگی کی حفاظت کرنا ہو یا دشمنوں سے بچا کر** ۔ لیکن بعد میں یہ ہر چیز کی حفاظت ، نگرانی اور خیال رکھنے کے لئے بولا جانے لگا ۔ مثلاً رعَی آمْرَہٗ : اپنے معاملہ کا خیال رکھا اور اس کی حفاظت کی۔ رَعَی النُّجُوْمَ وَرَاعَاھَا : اس نے تاروں اور انکی رفتار میں غور کیا اور ان کا خیال رکھا*۔ اس سے مُرَاعَاۃٌ کے معنے ہیں کسی بات کا خاص خیال رکھنا ۔ کسی کی حفاظت و نگرانی کرنا ۔ رَاعیٰ آمْرَہٗ ۔ اس نے اپنے معاملہ کی اچھی طرح نگہداشت کی اور اس کے مآل پر نگاہ رکھی ۔ آلرَّعِیَّۃُ ۔ وہ مویشی جن کی نگہداشت کی جائے اور انہیں چرایا جائے ۔ نیز وہ لوگ جنکے امور کا کوئی منتظم و نگران ہو اور جن پر کوئی نگہبان و فرمانروا ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حفاظت اور نگہبانی کرنے کے ہیں ۔

سورۃ طٰہٰ میں ہے وَارْعَوْا آنْعَامَکُمْ (۲۰/۵۴) ۔ "اپنے مویشیوں کو چارہ کھلاؤ" ۔ اور آلْمَرْعیٰ (۸۷/۴) کے معنے ہیں گھاس یا چارہ ۔ سورۃ حدید

---

*تاج ۔ **راغب ۔

میں رھبانیت کے مسلک کے متعلق ھے فَمَا رَعَوْھَا حَقَّ رِعَایَتِھَا (۵۷/۲۷) ''وہ اس کی نگہداشت نہ کرسکے جیسا کہ اس کی نگہداشت کا حق تھا''۔ سورۃ المومنون میں ھے وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رٰعُوْنَ (۲۳/۸)۔ ''جو لوگ اپنی امانات کی حفاظت کرتے ھیں اور اپنے وعدوں کی نگہداشت رکھتے ھیں''۔

سورۃ بقرہ میں جماعت مومنین سے کہا گیا ھے کہ تم (یہودیوں کی طرح) رَاعِنَا مت کہو (۲/۱۰۴)۔ اور (۴/۴٦) میں ھے کہ وہ لوگ (یہودی) رسول اللہ ؐ کو مخاطب کرتے وقت الفاظ کو توڑ مروڑ کر کہا کرتے تھے جس سے ان کا مفہوم بدل جائے۔ انہی الفاظ میں رَاعِنَا کا لفظ بھی شامل تھا۔ یہ ان کی دناءت کی انتہا تھی کہ جوشِ مخالفت میں عام آدابِ معاشرت کو چھوڑ کر بالکل بازاری سطح پر اتر آتے تھے۔ بعض نے کہا ھے کہ وہ رَاعِناً کہدیا کرتے تھے جو رُعُوْنَت سے ھے۔ (دیکھئے عنوان ر-ع-ن)۔ لیکن صاحب المنار نے لکھا ھے کہ راعِنَا، مُرَاعَاۃ سے ھے (جو باب مفاعلہ سے ھے) اور اس باب کی خصوصیت اشتراک ھے۔ اس طرح رَاعِنَا کے معنے یہ ھوئے کہ تم ھماری رعایت کرو تو ھم تمہاری رعایت کرینگے۔ تم ھمارا خیال رکھو تو ھم تمہارا خیال رکھینگے۔ اس قسم کے کلمات رسولؐ خدا کی شان میں استعمال کرنا کھلی بے ادبی اور گستاخی ھے**۔ یعنی انہیں غیر مشروط طور پر اطاعت رسول کا اقرار کرنا چاھئے، جو در اصل اطاعت خدا ھے اور یہی ان کا فریضۂ حیات ھے۔ انہیں رسول سے کہنا یہ چاھئے کہ اُنْظُرْنَا آپ ھم پر نگاہ رکھئے کہ ھم بے راہ نہ ھونے پائیں۔ اور اس کے بعد ان کا فریضہ یہ ھونا چاھئے کہ آپ کے تمام احکامات کو سن کر ان کی اطاعت کریں۔ وَاسْمَعُوْا (۲/۱۰۴)۔

لیکن ھمارا خیال ھے کہ اس آیت میں اھل ایمان کو ایسے قول (لہذا ایسے فعل سے بھی) روکا گیا ھے جس میں غلط اور صحیح ملتبس ھوجائیں اور حق و باطل کا امتیاز واضح نہ ھو۔ اگر کسی قول یا عمل سے اھانتِ رسول یا تنقیص توحید کا شائبہ تک بھی پیدا ھوتا ھو تو اس سے بچنا چاھئے اور محض نیک نیتی کو اس کے جواز کے لئے آڑ نہیں بنانا چاھئے۔ مسلمان کی ھر بات اور ھر عمل کو صاف، واضح اور بین ھونا چاھئے۔ ان امور میں (بالخصوص) شاعری جس قسم کا لائسنس لے لیتی ھے اس کی کبھی اجازت نہیں ھونی چاھئے۔

**المنار - جلد ۱ صفحہ ۳۱۰ -

ر غ ب

رَغْبَةٌ کے اصلی معنے کسی چیز کے وسیع ہو جانے کے ہیں ۔ رَغُبَ الشَّیْیُٔ ۔ چیز وسیع ہو گئی ۔ حَوْضٌ رَغِیْبٌ ۔ وسیع حوض ۔ الرَّغْبَۃَ و الرَّغَبُ ۔ بہت زیادہ چاہنا ، ارادہ کی وسعت*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنے (۱) طلب کرنا ۔ چاہنا (۲) وسعت بتائے ہیں ۔ وَادٍ رَغِیْبٌ ۔ بڑی کشادہ وادی جس میں بہت زیادہ پانی سما جائے ۔ تَرَاغَبَ الْمَکَانُ ۔ جگہ وسیع ہو گئی ۔ اَرْغَبَ اللّٰہُ قَدْرَکَ ۔ خدا تیرے مرتبہ کو بڑھائے ۔ اَلرِّغَابُ بہت دودھ دینے والے اور کثیر المنفعت جانور ۔ نیز ہر وسیع و کشادہ چیز کو رَغِیْبٌ کہتے ہیں**۔ اسی سے راغب نے کہا ہے کہ جب رَغِبَ فِیْہِ یا رَغِبَ اِلَیْہِ کہا جائے تو اس کے معنے ہوئے ہیں ۔ (ارادے کی وسعت کے ساتھ) کسی چیز کو چاہنا اور اس کی حرص کرنا ۔ اِنَّآ اِلَی اللّٰہِ رَاغِبُوْنَ (۹/۵۹) میں بھی یہی معنے ہیں ۔ (نیز ٦۸/۳۲) میں ۔ اور جب رَغِبَ عَنْہُ کہا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے رغبت کو اس سے پھیر لینا* ۔ جیسے وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرٰہٖمَ (۲/۱۳۰)۔ نیز (۱۹/٤٦) میں رَاغِبٌ کے بعد عَنْ آیا ہے ۔ ان مقامات میں اس کے معنی پھر جانا ۔ رغبت ہٹا لینا ہیں ۔

سورۃ نساء میں ہے لَا تُؤْتُوْنَہُنَّ مَا کُتِبَ لَہُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْکِحُوْہُنَّ (٤/۱۲۷) ۔ یہاں تَرْغَبُوْنَ کا صلہ کوئی نہیں (نہ اِلٰی نہ عَنْ) لیکن سیاق عبارت کا تقاضا ہے کہ اس کا صلہ اِلٰی ہو ۔ مطلب یہ ہے کہ تم بیوہ عورتوں اور یتیم لڑکیوں کو وہ کچھ تو دینا نہیں چاہتے جو قانون خداوندی کی رو سے انہیں ملنا چاہئے اور چاہتے یہ ہو کہ ان سے نکاح کر لو ۔ تاج نے صراحت کی ہے کہ رَغِبَ فِیْہِ کے معنوں میں رَغِبَہٗ بغیر فی کے بھی آتا ہے ۔ یعنی اُسے چاہا ۔ اس کا ارادہ کیا ۔

سورۃ انبیاء میں رَغَبًا بمقابلہ رَھَبًا آیا ہے (۲۱/۹۰) رَھَبٌ کے معنی خوف کے ہیں ۔

ر غ د

عِیْشَۃٌ رَغْدٌ و رَغَدٌ ۔ خوشگوار کشادہ اور فراخ روزی ۔ بافراغت روزی ۔ رَغِدَ عَیْشُہُمْ ۔ انکی زندگی خوشگوار اور روزی کشادہ ہو گئی ۔ اَرْغَدُوْا مَوَاشِیَہُمْ ۔ انہوں نے آزادی سے اپنے مویشی چرنے کے لئے چھوڑ دئے ۔

---

*راغب ۔ **تاج ۔

اَرْغَدُوْا : وہ سر سبز و شاداب جگہ پہنچے *۔ اَلرَّغَدُ مال ، پانی ، گھاس ، روزی وغیرہ کا وافر ، کثیر اور بافراط حصہ جو طبیعت میں تکدر نہ پیدا کرے اور وجہ پریشانی نہ ہو**۔

سورۃ بقرہ میں جنّت آدم کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں رزق کی کیفیت رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) تھی۔ یعنے جہاں سے جی چاہے نہایت فراغت سے سامان زیست مل جائے۔ اسی کے متعلق سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ اس میں کھانے پینے کا سامان۔ لباس اور مکان (یعنے انسان کی بنیادی ضروریات زندگی) بغیر جگر پاش مشقت کے مل جاتے تھے (۲۰/۱۱۸)۔ وہ ان ضرویات سے محروم نہیں رہتا تھا۔ سورۃ نحل میں ہے یاْتِیْھَا رِزْقُھَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ (۱٦/۱۱۲)۔ یہ اس دنیا میں جنتی معاشرہ کی بنیادی خصوصیت ہے کہ اس میں ہرفرد کو سامان زیست نہایت فراوانی سے مل جاتا ہے۔ ہر جگہ اور بافراط۔ اس میں لوگ لکیریں کھینچ کھینچ کر رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضے میں نہیں لے سکتے۔ تمام سامان و ذرائع رزق ، نوع انسان کی پرورش اور اسکی صلاحیتوں کی نشو و نما کیلئے کھلے رہتے ہیں اور یہ اُس نظام کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ دیکھے کہ کوئی فرد سامان زیست سے محروم نہ رہنے پائے اور اسے ہر شے افراط اور فراوانی سے ملے۔ رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا۔ جہاں سے چاہے نہایت فراغت سے مل جائے۔

ر غ م

اَلرَّغْمُ۔ (راء کی تینوں حرکتوں۔ زیر۔ زبر۔ پیش کے ساتھ)۔ ناپسندیدگی۔ کراہت۔ جبر۔ اصل میں اَلرَّغْمُ۔ اَلرَّغَامُ۔ خاک کو کہتے ہیں۔ اَرْغَمَہُ الذُّلُّ۔ ذلت نے اسے خاک میں ملا دیا۔ اس سے اسکے معنے کسی سے ذبردستی اطاعت کرانے کے آتے ہیں۔ ویسے اَلْمَرْغَمُ ناک کو کہتے ہیں**۔ اَلْمُرَاغَمُ۔ وہ جگہ جہاں کوئی ، کسی سے ناراض ہو کر یا بھاگ کر چلا جائے۔ اس کے بعد اسکے معنے قلعہ نیز راستہ اور وسعت اور فراخی کے بھی لئے جانے لگے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں (۱) مٹی اور (۲) راستہ یا بھاگنے کی جگہ۔

قرآن کریم میں ہے کہ جو شخص نظام خداوندی کے لئے اپنی جگہ سے ہجرت کرے گا۔ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرَاغَمًا (۴/۱۰۰)۔ اسے دنیا میں بہت سی پناہ گاہیں مل جائینگی جہاں اسے وسعت اور فراخی نصیب ہوگی***۔ اگر

* تاج و محیط۔ ** تاج۔ *** راغب۔

دشمنوں نے اس پر ایک راستہ بند کر دیا ہے تو اسے کئی راستے کشادہ مل جائیں گے۔

ر ف ت

رُفَاتٌ ۔ بھوسہ یا سوکھی چیز میں سے جھڑ جانے والا چورا۔ بوسیدہ ٹکڑے اور ریزے۔ نیز رسّی کے ٹکڑے۔ اِرْفَتَّ التَحْبلُ ۔ رسی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ۔ رَفَتَہٗ ۔ یَرْفُتُہٗ ۔ کسی چیز کو توڑنا ، کوٹنا یا ہاتھ سے بکھیر بکھرا دینا۔ جیسے مٹی کے ڈھیلے یا بوسیدہ ہڈی کو بھر بھرا دیا جاتا ہے *۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا (۱۷/۴۹)۔ کیا جب ہم ہڈیاں ہو جائینگے اور ایسے بوسیدہ کہ یونہی بھر بھرا جائیں یا چورا چورا ہو جائیں (تو اسکے بعد بھی اٹھائے جائینگے)؟۔ عصر حاضر کے مادہ پرستوں (Materialists) کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ زندگی صرف طبیعی عناصر کے سہارے قائم رہ سکتی ہے ۔ اگر یہ سہارے ٹوٹ جائیں تو پھر زندگی کا امکان نہیں رہتا۔ ان کے اس خیال خام کی تردید کی گئی اور کہا گیا کہ جس خدا نے زندگی کو پہلی مرتبہ بلا طبیعی سہاروں کے پیدا کر دیا تھا وہ اس پر قادر ہے کہ اسے موجودہ طبیعی سہاروں کے بغیر (بلا سہارا یا کسی اور نوعیت کے سہاروں کے ساتھ) قائم رکھے ۔ (۱۷/۵۱)۔ اسی کو حیات بعد الممات کہا جاتا ہے۔

ر ف ث

اَلرَّفَثُ ۔ یہ ایک جامع لفظ ہے جو ان تمام باتوں کو محیط ہوتا ہے جو جنسی اختلاط کے سلسلہ میں سرزد ہوتی ہیں ۔ یعنی ابتدائی گفتگو سے لیکر انتہائی منزل تک کی تمام تفاصیل اس میں آجاتی ہیں **۔ محیط میں ہے کہ لغت میں اس کے اصلی معنے ہیں وہ گفتگو جو جماع کی طرف داعی ہو۔ نیز مقدمات جماع ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ فحش باتیں ہیں جن کا ذکر اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً جماع اور دواعی جماع کا ذکر۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلرَّفَثُ کے اصلی معنی جماع ہیں لیکن یہ ہر اس بات کے لئے آتا ہے جس کے ظاہر کرنے سے انسان شرمائے ۔ نیز اَلرَّفَثُ فحش کلامی کو کہتے ہیں ۔ چنانچہ حج کے ضمن میں ہے فَلَا رَفَثَ (۲/۱۹۷)۔ اس سے مراد یہ

* تاج و راغب ۔ ** تاج

ہے کہ حج کے اجتماع میں کوئی فحش خیال یا ایسی بات یا حرکت سرزد نہیں ہونی چاہیئے جس میں جنسی میلان پایا جاتا ہو۔ روزوں کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ (۲/۱۸۷)۔ '' تمہارے لئے روزوں کی رات میں اپنی عورتوں کی طرف رفث حلال کیا گیا ہے ''۔ یہاں قرآن کریم نے إِلَىٰ نِسَائِكُمْ کا ٹکڑا بڑھا کر واضح کر دیا ہے کہ اس سے کنایہ جماع ہے۔

ر ف د

اَلرِّفْدُ ۔ عطا۔ صلہ۔ ایسی چیز جس سے کسی کو سہارا دیا جائے۔ مدد، حصہ و نصیب۔ رَفَدَهُ ۔ يَرْفِدُهُ ۔ رَفْدًا ۔ اسنے اسکی مدد کی۔ اسے دیا۔ اَلْاِرْفَادُ ۔ مدد دینا۔ عطا کرنا۔ اصل میں الارْفَادُ زین یا کجاوہ کے نیچے کپڑا وغیرہ (رِفَادَة) رکھنے کو کہتے ہیں تاکہ جانور کی پیٹھ زخمی نہ ہو جائے۔ اَلرِّفَادَةُ ۔ کپڑے کا ٹکڑا یا پھاھا جس سے زخم کا مداوا کیا جائے۔ نیز وہ عطیہ اور چندہ جو (زمانۂ جاھلیت میں) قریش اکھٹا کرکے اس سے محتاج حاجیوں کے لئے کھانے پینے کا سامان خریدا کرتے تھے۔ اَلْاِرْتِفَادُ ۔ کسب کرنا۔ کمانا *۔

سورۃ ھود میں ہے بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ (۱۱/۹۹) کتنا برا عطیہ اور صلہ ہے۔ کتنی بری مدد ہے جس سے ان کا مداوا کیا گیا ہے اور جس کا انہیں سہارا دیا گیا ہے۔

ر ف ع

رَفَعَ ۔ يَرْفَعُ ۔ بلند کرنا۔ راغب نے کہا ہے کہ رَفْعٌ کبھی تو مادی چیز جو پڑی ہوئی ہو اسے اس کی جگہ سے اٹھا کر بلند کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ کبھی تعمیر کے وقت دیوار وغیرہ کو کھڑا کرنے اور اوپر لے جانے کے لئے۔ کبھی ناموری اور شہرت یا ذکر بلند کرنے کے لئے اور کبھی مرتبہ بلند کرنے کے لئے آتا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں، اونچا کرنا اور اٹھا لینا۔ اسی سے اس کے معنی کسی چیز کو قریب کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ نیز پھیلانے اور ظاہر کرنے کے۔

رَفَعَ ۔ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بنیادی مفہوم میں شدت یا مبالغہ پایا جاتا ہے۔ یعنی جو کام کرنا اسے تیزی اور شدت سے کرنا۔

---

* تاج و راغب۔

مثلاً رَفَعَ الْبَعِیْرُ فِیْ سَیْرِہٖ ۔ اونٹ نے اپنی رفتار (بہت تیز) کر دی ۔ رَفَعَ الْقَوْمُ ۔ لوگ ملک کے بلند علاقوں پر چڑھ گئے ۔ بَرْقٌ رَافِعٌ ۔ بلندی پر چمکنے والی بجلی ۔ اَلرَّفَاعَةُ (را کی تینوں حرکتوں کے ساتھ) آواز کی سختی اور شدت ۔ رَفُعَ ۔ رِفْعَةٌ ۔ شریف اور عالی مرتبہ ہونا* ۔

قرآن کریم میں ہے رَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ (۲/۶۳) ۔ ہم نے تمہارے سر پر طور کا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا ۔ یعنے تم اس کے دامن میں تھے اور پہاڑ تمہارے اوپر تھا ۔ عمارت کی بلندی کے لئے تعمیر کعبہ کے ضمن میں ہے اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهِیْمُ الْقَوَاعِدَ (۲/۱۲۷) ۔ ''جب ابراہیم (اس گھر کی) بنیادیں اُٹھاتا تھا'' ۔ رَفَعَ صَوْتًا ۔ آواز بلند کی ۔ رَفَعَ صَوْتَهٗ فَوْقَ صَوْتِهٖ کے لفظی معنے تو کسی کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنا ہیں لیکن اس سے مراد کسی کی رائے پر اپنی رائے کو فائق کرنا بھی ہوتا ہے (۴۹/۲) ۔ درجات کی بلندی کے لئے حضرت ادریس[ؑ] کے متعلق ہے وَرَفَعْنٰهُ مَکَانًا عَلِیًّا (۱۹/۵۷) ۔ ''ہم نے اسے بلند درجات عطا کر دیئے'' ۔ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ (۴۰/۱۵) کہا ہے ۔ اس میں اگر رَفِیْعٌ کو مَرْفُوْعٌ کے معنے میں لیا جائے تو مطلب ہوگا مَرْفُوْعٌ عَنِ الدَّرَجٰتِ ۔ یعنی وہ بتدریج اپنے مقام بلند تک نہیں پہنچا بلکہ وہ ہے ہی اسی مقام پر مستوی ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تدریج اور ارتقاء کی منازل سے بلند اور بالاتر ہے ۔ اس سے اقتدار اعلیٰ اور بالا دستی بھی مراد ہے ۔ نیز رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ کے معنی عَالِیُ الدَّرَجٰتِ بھی ہو سکتا ہے ۔ یعنی بلند مرتبوں والا ۔ اور اگر ہم رَفِیْعٌ کو بمعنی فاعل (یعنی رَافِعٌ) لیں تو اس کے معنی ہونگے ''درجات کا بلند کرنے والا'' ۔ سورۃ واقعہ میں جہاں خَافِضَةٌ کے مقابلہ میں رَافِعَةٌ آیا ہے (۵۶/۳) وہاں بھی یہی مفہوم ہے ۔ یعنی بلند مدارج و مقام پر لے جانے والی ۔ یہاں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ جہاں حضرت عیسیٰ[ؑ] کے متعلق کہا گیا ہے کہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ (۴/۱۵۸) تو اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ اللہ نے ان کے مدارج بلند کر دیئے اور اس طرح اپنا مقرب بنا لیا ۔ ورنہ اگر رَفَعَ کے معنے جسمانی طور پر اوپر اٹھا لینے کے لئے جائیں تو اِلَیْهِ (خدا کی طرف) کے لفظ سے یہ ماننا پڑیگا کہ خدا کسی ایک مقام پر ہے ۔ اس لئے کہ جب بھی کسی جسمانی شے کے متعلق کہا جائیگا کہ وہ فلاں کی طرف گئی ہے تو جس کی طرف وہ چیز جائیگی اس کا کوئی مقام متعین کرنا ضروری ہوگا ۔ خدا کو کسی ایک مقام میں محدود سمجھنا قرآن کریم کے خلاف ہے ۔

---

*تاج ۔

اس لئے بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کے معنے یہی ہیں کہ اللہ نے اس کے درجات بلند کرکے اسے اپنا مقرب بنا لیا ۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب "شعلہ مستور" میں حضرت عیسیٰؑ کے تذکرہ جلیلہ میں ملیگی) ۔ نبی اکرمؐ کے متعلق ہے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۹۴/۴) ہم نے تیری عظمت کو تیرے لئے بہت بلند کر دیا ۔ (رَفَعَ اور صَعِدَ کے لئے دیکھئے ص ۔ ع ۔ د ۳۵/۱۰)

ر ف ف

رَفٌّ ۔ کے بہت سے معنے ہیں لیکن قرآن کریم میں (۵۵/۷۶) صرف رَفْرَفٌ کا لفظ آیا ہے (جو ثلاثی نہیں رباعی ہے) اس لئے ہم رفٌّ کی بحث کو ضروری نہیں سمجھتے ۔ رَفَّ الطَّائِرُ و رَفْرَفَ ۔ پرند نے فضا میں پر کھولے اور انہیں ہلایا ۔ الرَّفْرَفُ ۔ منتشر پتے ۔ اَلرَّفْرَفُ ۔ فرش ، بچھونے ، گدے تکیے ، نیز سبز رنگ کے گدیلے جو سونے کے لئے دری وغیرہ پر بچھائے جاتے تھے ۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد (خیمہ کے پردے وغیرہ کا) وہ زائد حصہ (جھالر) ہے جو لٹکا رہے لیکن عام طور پر اس کے معنے فرش یا بچھونے ہی کے ہیں* ۔ ابن فارس نے رَفْرَفٌ کے معنی باغیچے ، بچھونے اور سبز کپڑے کے لکھے ہیں ۔

ر ف ق

اَلْمِرْفَقُ (جمع مَرَافِقُ) کہنی ۔ نیز نرمی و سہولت ۔ رَفَقَ النَّاقَةَ ۔ اونٹنی کے بازو (کہنی) کو باندھ دیا تاکہ وہ بھاگ نہ جائے ۔ وہ رسی جس سے اس کے بازو کو (پچھلی ٹانگ کے ساتھ) باندھا جاتا ہے رِفَاقٌ کہلاتی ہے ۔ اسی سے اَلرِّفْقَةُ کے معنے ہم سفر جماعت کے ہیں (کیونکہ چلتے وقت ان کی کہنیاں ایک ساتھ ہلتی ہیں) لیکن جب وہ جماعت ایک دوسرے سے الگ ہو جائے تو پھر ان کے لئے رِفْقَةٌ کا لفظ نہیں بولا جاتا، البتہ ان میں سے ہر ایک ساتھی کو رَفِيْقٌ کہا جاسکتا ہے ۔ اَلرُّفَاقَةُ ۔ جماعت ۔ اِرْتَفَقَ ۔ اس نے کہنی پر ٹیک لگائی ۔ اَلْمُرْتَفَقُ ۔ جس چیز پر ٹیک لگائی جائے ۔ تکیہ، سہارا*** ۔ چونکہ اس طرح ٹیک لگانے سے راحت ملتی ہے اس لئے اِرْتَفَقَ بِهٖ کے معنے ہیں اس سے فائدہ اٹھایا ۔ رَفَقَ بِهٖ یا رَفَقَ عَلَيْهِ ۔ اس کےساتھ نرمی کا برتاؤ کیا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سختی اور تشدد کے بغیر ایک دوسرے کے قریب اور ہمنوا ہونے اور باہم

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

موافقت کرنے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے حَسُنَ اُولٰئِکَ رَفِیْقًا (۴/۶۹)۔ "یہ اچھے ساتھی ہیں"۔ ایسے رفقائے سفر جن کی رفاقت سے انسان کی خامیاں پوری ہو کر اس کی ذات کا اور معاشرہ کا توازن قائم رہے۔ اور یہ سب کچھ بطیبِ خاطر ہو۔ کہنی کے لئے یہ لفظ (۵/۶) میں آیا ہے۔ سورۃ کہف میں ہے یُھَیِّیئ لَکُمْ مِنْ اَمْرِکُمْ مِرْفَقًا (۱۸/۱۶)۔ وہ تمہارے پیش نظر مقصد میں آسانیاں پیدا کر دیگا۔ اسی سورۃ میں جہنم کو سَآءَتْ مُرْتَفَقًا (۱۸/۲۹) اور جنت کو حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (۱۸/۳۱) کہا گیا ہے۔ یعنے ٹیک لگانے کی جگہ۔ جس کے آسرے سے اوپر اٹھا جائے۔ جہنم کی زندگی ایسی ہے جس کے سہارے انسان، زندگی کے ارتقائی منازل طے نہیں کر سکتا۔ جنت کی زندگی ایسی ہے جو انسان کے اوپر اٹھنے اور بلندیوں کی طرف جانے کا بہترین سہارا بنتی ہے۔ ایسا سہارا جس سے کبھی توازن نہیں بگڑتا (حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا)۔ انسان اُسی سہارے سے اوپر اٹھ سکتا ہے جو اُس کے توازن کو قائم رکھے۔ توازن بگڑ جانے سے انسان لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ (سَآءَتْ مُرْتَفَقًا)۔ سہارے تو جہنمی معاشرہ میں بھی ہوتے ہیں لیکن وہ بڑے ناہموار ہوتے ہیں اس لئے انسان ان کے ذریعے اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ ان سے اس کی ذات کی نشو و نما نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف جنتی معاشرے کے سہارے ہیں جن سے افراد کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے اور وہ اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے اوپر اٹھتے اور آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ر ق ب

اَلرَّقَبَۃُ۔ گردن کو کہتے ہیں۔ رَقَبَہٗ۔ اس کی گردن میں رسی ڈالی*۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کی گردن میں رسی ڈال دی جائے تو وہ تابع و منقاد ہوجاتا ہے، چنانچہ عرف عام میں الرَّقَبہ غلام کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ اس کی جمع الرِّقَابُ ہے۔ آیت (۲/۱۷۷) میں الرِّقَاب کے معنے غلام ہی ہیں۔ واحد کے لئے رَقَبَۃٌ (۴/۹۲) وغیرہ میں بمعنے غلام آیا ہے*۔

رَقَبَ۔ یَرْقُبُ۔ کے معنے انتظار کرنا، اور حفاظت و نگہداشت کرنا، دونوں آتے ہیں۔ جیسے وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ۔ (۲۰/۹۴) میں اس کے معنے جہاں انتظار کرنے کے لئے جاسکتے ہیں وہاں نگہداشت کرنا، پاس اور لحاظ رکھنا بھی ہوسکتے ہیں۔ اور (۲۸/۱۸) میں یَتَرَقَّبُ کے بھی یہی معنی ہیں، لیکن باب کی خاصیت کے لحاظ سے اس میں بار بار کوشش اور تجسس سے

*تاج۔

کسی چیز کا انتظار کرنا اور نگہداشت کرنا مراد ہوگا۔ تاج میں اس کے معنی کسی چیز کی توقع کرنا اور اس کا انتظار کرنا لکھے ہیں ۔ راغب نے اسکے معنے انتظار کرتے ہوئے کسی چیز سے بچنا کئے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں بار بار اس کا خیال آتا تھا اور گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتے تھے کہ کوئی آ تو نہیں رہا ۔ الرَّقِیْبُ کے معنے ہیں کسی چیز کی حفاظت اور نگہداشت کرنے والا اور کسی چیز کا انتظار کرنے والا ۔ نگران اور حفاظت کرنے والا ۔ ان معنوں میں وَ کَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا (۳۳/۵۲ و ۴/۱) آیا ہے ۔ (۵۰/۱۸) میں رَقِیْبٌ بھی انہی معنوں میں آیا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کی دیکھ بھال کے لئے کھڑے رہنے کے ہیں۔ گردن کو بھی اَلرَّقَبَۃُ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ایستادہ رہتی ہے ۔

بات کا لحاظ رکھنے اور پاسداری کرنے کے لئے یہ لفظ (۹/۸) میں آیا ہے ۔اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، (۲۰/۹۴) میں بھی اسکے یہ معنے ہوسکتے ہیں ۔

اِرْتَقَبَ الشَّیْءَ ۔ کسی چیز کا انتظار کیا ۔ اِرْتَقَبَ الْمَکَانَ ۔ کسی جگہ کے اوپر چڑھنا ۔ بلند ہونا۔ مَرْقَبَۃٌ ۔ چڑھنے کی جگہ ۔ اِتْرَقَبَۃٌ تحفظ اور ڈرنے گھبرانے، دونوں معنوں میں آتا ہے*سورۃ دخان میں فَارْتَقِبْ آیا ہے (۴۴/۱۰ و ۴۴/۵۹) ۔ اس کے معنے انتظار کرنے کے ہیں ۔ سورۃ یونس میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے قُلْ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ (۱۰/۱۰۲) ۔ "ان سے کہو کہ تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں" ۔

ر ق د

اَلرَّقْدُ ۔ اَلرُّقَادُ ۔ اَلرُّقُوْدُ ۔ سونا (نَوْمٌ)* ۔ قرآن کریم میں یہ مادہ یَقَظٌ (بیداری) کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ وَتَحْسَبُھُمْ اَیْقَاظًا وَّھُمْ رُقُوْدٌ (۱۸/۱۸) ۔ " تو خیال کرتا ہے کہ وہ جاگتے ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں " ۔ مَرْقَدٌ ۔ خوابگاہ (سونے کی جگہ) ۔ سورۃ یس میں ہے مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (۳۶/۵۲) ۔ " ہمیں ہماری خوابگاہوں سے کس نے اٹھا دیا " ۔

راغب نے کہا ہے کہ اَلرُّقَادُ تھوڑی سی خوشگوار نیند کو کہتے ہیں** ۔ ان معانی کے اعتبار سے سورۃ کہف کی آیت (۱۸/۱۸) کا مفہوم واضح ہو

* تاج ۔ ** راغب ۔

جاتا ہے کہ وہ لوگ زیادہ دیر تک نہیں سوتے تھے۔ تھوڑی سی نیند کر لیتے تھے اور وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ باہر سے دیکھنے والا یہی سمجھے کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ وہ اپنی حفاظت سے کسی وقت بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔

ر ق ق

اَلرَّقُّ۔ اَلرِّقُّ۔ باریک جھلی یا کھال جس پر لکھا جاتا ہے۔ اَلرَّقُّ۔ سفید صحیفہ۔ سفید ورق جس پر لکھا ہوا ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پتلا پن اور نرمی ہیں۔

اَلرَّقُّ۔ اَلرَّقِیْقُ۔ پتلی اور باریک چیز۔ اَلرِّقَّۃُ۔ طبیعت کی نرمی۔ اَلرِّقُّ۔ غلامی*۔

قرآن کریم میں ہے وَکِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۵۲/۳)۔ ''لکھی ہوئی کتاب' پھیلی ہوئی باریک جھلی پر''۔

ر ق م

رَقَمَ۔ یَرْقُمُ۔ رَقْمًا۔ لکھنا۔ رَقَمَ الْکِتَابَ: کتاب کو اسطرح لکھا کہ حروف، نقاط، اعراب وغیرہ کے لحاظ سے وہ واضح اور مبین ہوئی**۔ قرآن کریم میں ہے کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۸۳/۹)۔ واضح عبارت میں لکھی ہوئی کتاب یا نشان زدہ کتاب، کیونکہ رَقَمَ الثَّوْبَ کے معنی ہوتے ہیں کپڑے پر دھاریاں بنانا اور قیمت کے تعین کے لئے نشان لگانا۔ دَابَّۃٌ مَّرْقُوْمَۃٌ۔ وہ جانور جس کے پاؤں پر داغنے کے نشانات اور دھاریاں موجود ہوں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تحریر اور لکیریں کھینچنے کے ہیں۔ وہ خلیل کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اَلتَّرْقِیْمُ کے معنی ہیں عبارت کو علامات کے ذریعے واضح کرنا۔ اور کِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ کسی کتاب کو اسوقت کہیں گے جب اس کے حروف پر نقطوں کے ذریعے علامات لگا دی جائیں۔

قرآن کریم میں اَصْحٰبُ الْکَہْفِ وَالرَّقِیْمِ (۱۸/۹) آیا ہے۔ اس کے معنی عام طور پر یہ کئے جاتے ہیں کہ ان غار والوں کے حالات ایک دھات کی تختی پر لکھکر ان کے غار کے باہر لگا دیئے گئے تھے اسلئے انہیں اَصْحٰبُ الرَّقِیْمِ کہنے لگ گئے۔ چنانچہ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی کہا ہے کہ اَلرَّقِیْمُ فَعِیْلٌ کے وزن پر بمعنی مَفْعُوْلٌ یعنی

* تاج و راغب۔ **تاج

مَرْقُوْم آیا ہے ۔ یعنی لکھی ہوئی ۔ لیکن حال کی تحقیقات کا رخ اس طرف گیا ہے کہ یہ لفظ وہی ہے جسے تورات میں رَاقِیْم کہا گیا ہے ۔ یہ ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر پیٹرا کے نام سے مشہور ہوا اور عرب اسے بطرہ کہنے لگے ۔ یہ جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ کے شمال کی طرف سطح مرتفع پر واقع تھا ۔ جب دوسری صدی عیسوی میں رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کیا ہے تو اس شہر نے رومی نوآبادی کی حیثیت سے بڑی شہرت اختیار کرلی ۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس علاقہ کے اثری انکشافات کا سلسلہ شروع ہوا تو وہاں بڑے بڑے وسیع غار ملے ، جن کے اندر اور باہر عمارات کے نشان ملتے ہیں ۔ خیال غالب یہی ہے کہ اَصْحَابُ الْکَہْفِ وَالرَّقِیْمِ (۱۸/۹) انہی غاروں میں سے ایک غار میں جاکر پناہ گزیں ہوئے تھے جہاں بعد میں انکی یادگار کے طور پر معبد بنایا گیا تھا ۔ (نیز دیکھئے عنوان اصحاب الکہف والرقیم) ۔

ر ق و

اَلرَّقْوُ ۔ ریت کا چھوٹا سا ٹیلہ ۔ اَلتَّرْقُوَۃُ ۔ حلق کے نیچے سینے کا بالائی حصہ جہاں سانس پھولتا دکھائی دیتا ہے ۔ ہنسلی (کی ہڈی) ۔ اسکی جمع تَرَاقِیْ اور اَلتَّرَاقِیْ آتی ہے * ۔ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ (۷۵/۲۶) قرآن کریم میں آیا ہے ۔ یعنی '' جب جان سینے کے اوپر کے حصے تک آ پہنچے گی '' ۔ آخری وقت آپہنچے گا ۔ اصل مفہوم اس میں اوپر چڑھنے کا ہے ۔ چنانچہ رَقَاالطَّائِرُ کے معنے ہیں پرندہ اپنی اڑان میں بلند ہو گیا ۔ (اس کے لئے عنوان ر ۔ ق ۔ ی بھی دیکھئے) ۔

ر ق ی

رَقِیَ ۔ یَرْقٰی ۔ رَقْیًا ۔ رُقِیًّا اوپر چڑھنا ۔ نیز اِرْتَقٰی و تَرَقّٰی ۔ اوپر چڑھنا * ۔ قرآن کریم میں ہے اَوْتَرْقٰی فِی السَّمَاءِ (۱۷/۹۳) '' یا تو آسمان پر چڑھ جائے '' ۔ اَلتَّرْقُوَۃُ ۔ ہنسلی ، نیز سینے کے اوپر حلق کے آگے کا حصہ جہاں سانس چڑھتا ہے ۔ جمع تَرَاقِیْ اور التَّرَاقِیْ ** ۔ قرآن کریم میں ہے اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ (۷۵/۲۶) ۔ نیز دیکھئے عنوان (ر ۔ ق ۔ و ۔) اَلرُّقْیَۃُ ۔ جھاڑ پھونک ۔ رَقَاہُ رَقْیًا ۔ وَرُقِیًّا ۔ وَرُقْیَۃً ۔ اسنے اس پر جھاڑ پھونک کی ۔ رَاقٍ ۔ جھاڑ پھونک کرنے والا ۔ * قرآن کریم میں ہے مَنْ رَاقٍ (۷۵/۲۷) ۔

---

* تاج و محیط ۔ ** بعض اہل لغت نے لفظ التراقی کی ت کو اصلی مانا ہے لیکن ہمارا راجح خیال یہ ہے کہ اس میں ت زائد ہے اور اس کا مادہ ر ۔ ق ۔ و ہے ۔

کون ہے جو جھاڑ پھونک سے اسکی جان بچا لے ؟ ابن فارس نے کہا ہے کہ رَقْیٌ کے بنیادی معنی میں (۱) چڑھنا اور (۲) تعویذ منتر وغیرہ شامل ہیں۔ اَلْمَرْقَاۃُ والْمِرْقَاۃُ۔ سیڑھی کو کہتے ہیں *۔ اَلتَّرقَّاءُ۔ پہاڑوں پر چڑھنے والا *۔

ر ک ب

رَکِبَہٗ یَرْکَبُہٗ۔ رُکُوْباً۔ کسی چیز پر چڑھنا، بلند ہونا، سوار ہونا *۔ خواہ جانور پر ہو یا کشتی وغیرہ پر۔ اِذَا رَکِبَا فِی السَّفِیْنَۃِ (۱۸/۷۱)۔ " جب وہ دونوں کشتی پر سوار ہوئے "۔ رَاکِبٌ۔ سوار۔ اسکی جمع ہے اَلرَّکْبُ (۸/۴۲) اور رُکْبَانٌ (۲/۲۳۹) بمقابلہ رِجَالاً۔ یعنی پیدل۔ اَلرِّکَابُ۔ وہ اونٹ جن پر سواری کی جائے (۵۹/۶) (اسکا واحد رَاحِلَۃٌ ہے جو اس مادہ سے نہیں ہے)۔ اَلْمَرْکَبُ (جمع اَلْمَرَاکِبُ)۔ جس پر سواری کی جائے۔ رَکُوْبٌ۔ سواری کا جانور (۳۶/۷۲)۔

رَکَّبَ۔ ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر رکھنا۔ جمانا *۔ چڑھانا **۔ ترکیب دینا۔ (۸۲/۸) مُتَرَاکِباً۔ ایک کے اوپر دوسرا چڑھا ہوا (۶/۱۰۰)۔

انسان کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ وہ مختلف ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اس مقام تک پہنچا ہے اور اب اسکے بعد مزید ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا اور اوپر کو اٹھتا جائیگا۔ اسکے لئے سورۃ انشقاق میں ہے لَتَرْکَبُنَّ طَبَقاً عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹)۔ " تم ایک حالت سے دوسری حالت پر چڑھتے ہوئے درجہ بدرجہ اوپر کو اٹھتے جاؤ گے "۔ انسانی زندگی کا موجودہ مقام اسکا منتہٰی نہیں۔ اسے ابھی بہت آگے بڑھنا اور بلند ہونا ہے۔ اس لئے موت سے سلسلہ حیات ختم نہیں ہو جاتا۔ خاک کے ذرے حیاتیاتی طور پر (Biologically) ارتقائی منازل طے کرتے پیکر انسانی تک پہنچے ہیں۔ لیکن اس پیکر میں انسانی ذات طبعی ارتقاء کا نتیجہ نہیں۔ اس کے بعد اس سلسلہٗ ارتقاء (Evolution) کی اگلی منزل شروع ہوتی ہے۔ یعنی انسانی جسم کے بجائے انسانی ذات (Human Personality) کا ارتقاء۔ یہ ارتقاء اسی زندگی میں شروع ہو کر موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ یعنی اس کے راستے میں طبیعی موت (Physical Death) کوئی رکاوٹ نہیں۔

اس آیت کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ خود انسانیت (Humanity) تہ بہ تہ اوپر کو اٹھتی چلی آرہی ہے۔ تاریخ انہی تہوں کا ریکارڈ ہے۔

* تاج۔ ** محیط۔

ر ک د

اَلرُّکُوْدُ - ساکن ہونا - اَلرَّاکِدُ - ٹھہری ہوئی ساکن چیز جو چلتی نہ ہو* - رَکَدَتِ السَّفِیْنَۃُ - کشتی لنگر انداز ہو گئی** -

اَلرَّوَاکِدُ - چولھے کے تین پتھر جو خانہ بدوش عرب استعمال کرتے ہیں (کیونکہ وہ اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں)** -

قرآنِ کریم میں کشتیوں کے متعلق ہے رَوَاکِدَ عَلٰی ظَہْرِہٖ (۴۲/۳۳) - "سمندر کی پشت پر کھڑی کی کھڑی رہ جائیں" - چل نہ سکیں - یعنی اگر خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوائیں ساکن ہو جائیں تو بادبانوں سے چلنے والی کشتیاں ساکن رہ جائیں -

ر ک ز

اَلرِّکْزُ - دھیمی سی آواز، آہٹ، یا آواز جو زور دار نہ ہو - یا انسان کی وہ آواز جو دور سے سنائی دے، جیسے شکاری کی اپنے کتوں کے لئے آواز** - سورۂ مریم میں ہے اَوْ تَسْمَعُ لَہُمْ رِکْزًا (۱۹/۹۸) - "یا ان کی دھیمی سی آواز (بھنک) بھی تمہیں سنائی دیتی ہے؟" - "خفی" کے اعتبار سے رَکَزْتُ کَذَا کے معنی ہوتے ہیں میں نے اسے مخفی طور پر دفن کر دیا - اور اَلرِّکَازُ مال مدفون کو کہتے ہیں - اور معدنیات کو بھی جنہیں خدا نے زمین میں مدفون رکھا ہے*** - چونکہ جس چیز کو دبایا اور گاڑ دیا جاتا ہے وہ اپنی جگہ بالکل قائم اور ثابت رہتی ہے اسلئے اِرْتَکَزَ کے معنے ہیں وہ اپنی جگہ قائم اور ثابت ہو گیا** - اسی سے رَکَزَ الرُّمْحَ کے معنے ہیں اسنے نیزہ کھڑا کرکے زمین میں گاڑ دیا - اور اَلْمَرْکَزُ - نیزہ گاڑنے کی جگہ کو کہتے ہیں** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کو دوسری چیز میں اسطرح اتار دینا (گاڑ دینا) کہ وہ اس میں مستحکم ہو جائے - (۲) آواز - آہٹ -

ر ک س

اَلرَّکْسُ - کسی چیز کو اسطرح پلٹانا یا موڑنا کہ اسکا اگلا سرا مڑ کر پچھلے سرے کے ساتھ جا ملے - کسی چیز کا اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دینا**** - رِکَاسٌ - اس رسّی کو کہتے ہیں جس کا ایک سرا

---

*تاج و محیط و راغب - **تاج - ***راغب - ****محیط -

اونٹ کی نکیل میں باندھ دیا جاتا ھے اور دوسرا سرا اس کے پاؤں سے اور اسے اتنا تنگ رکھا جاتا ھے کہ اونٹ کا سر بری طرح جھکا رہے اور وہ اسطرح سخت تکلیف میں رہے ۔ یہ کچھ اسے سدھانے کیلئے کرتے ھیں ۔ اِرْتَکَسَ ۔ اس کا سر جھک گیا ۔ وہ الٹ گیا* ۔

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق ھے وَاللّٰہُ اَرْکَسَھُمْ بِمَا کَسَبُوْا (۸۸/۴) ۔ "اللہ نے انکے اعمال کی وجہ سے انکا سر جھکا دیا" ۔ انھیں ذلیل و خوار کر دیا ۔ انھیں سخت مصیبت میں ڈال دیا ۔ یا انھیں پھر کفر میں پلٹا دیا ۔ یہی معنے (۹۱/۴) میں بھی ھیں ۔

ر ک ض

اَلرَّکْضُ ۔ گھوڑے کو تیز دوڑانے کیلئے ایڑھ لگانا ۔ پرندے کا اڑنے کیلئے پروں کو متحرک کرنا ۔ اَلتَّرَکُّضُ ۔ تیز دوڑنا ۔ قرآن کریم میں ھے مِنْھَا یَرْکُضُوْنَ ۔ لَا تَرْکُضُوْا (۲۱/۱۲-۱۳) ۔ اسکے معنے تیزی سے بھاگنے کے ھیں ۔ اَلْمِرْکَضُ ۔ وہ چیز جس سے آگ کو حرکت دیکر بھڑکایا جائے** ۔ سورۃ صٓ میں حضرت ایوبؑ کے قصہ میں ھے اُرْکُضْ بِرِجْلِکَ (۳۸/۴۲) ۔ اس کے معنے چلنے کے ھیں ۔ اپنے پاؤں کو تیزی سے آگے بڑھا ۔ اس کے یہ معنی بھی ھو سکتے ھیں کہ اپنی ٹانگ کو (پانی میں ڈال کر اسے) حرکت دے ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ رکض کے بنیادی معنی آگے کی طرف متحرک ھونا یا متحرک کرنا ھیں ۔

سورۃ انبیاء کی آیت (لَا تَرْکُضُوْا ۔ ۲۱/۱۳) ایک عظیم حقیقت کی ترجمان ھے ۔ ماسبق آیت میں ھے کہ جو قومیں اپنے معاشی نظام کو قوانینِ خداوندی کے تابع رکھنے کی بجائے اپنی تدابیر کے تابع رکھتی ھیں وہ معاشرے میں فساد پیدا کر دیتی ھیں ۔ اس سے دولت کی تقسیم سخت ناھموار ھو جاتی ھے جس کا آخر الامر نتیجہ تباھی ھوتا ھے ۔ لیکن وہ دولت کے نشے میں بدمست اس کا احساس نہیں کرتیں کہ وہ کس تباھی کی طرف کشاں کشاں چلی جا رھی ھیں ۔ تاآنکہ جب وہ تباھی محسوس طور پر ان لوگوں کے سامنے آ کھڑی ھوتی ھے تو وہ اس سے بچنے کے لئے تیزی سے بھاگنے کی کوشش کرتے ھیں ۔ لیکن اس وقت خدا کا قانون مکافات انھیں آواز دیتا ھے کہ لَا تَرْکُضُوْا ۔ مت بھاگنے کی کوشش کرو ۔ تم اب بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے ۔ وَارْجِعُوْا اِلٰی مَآ اُتْرِفْتُمْ فِیْہِ وَمَسٰکِنِکُمْ ۔ چلو واپس اپنے عظیم الشان محلوں میں اور آسائش کے مقامات میں جنھیں تم نے غریبوں کے

---

*تاج ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔

خون کی رنگینی سے مزین بنا رکھا تھا۔ وهیں واپس چلو۔ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ (۲۱/۱۳) تاکہ تم سے وهاں جا کر پوچھا جائے کہ یہ دولت کہاں سے آئی تھی اور ان عیش سامانیوں پر تمہارا کیا حق تھا ؟ ۔

قرآن کریم نے نظام سرمایہ داری کے انجام کا نقشہ کسقدر بین انداز میں آنکھوں کے سامنے کھینچدیا ہے ؟

ر ک ع

رَکَعَ کے معنے ہوتے ہیں منہ کے بل جھکنا یا گر جانا ۔ خواہ اس میں گھٹنے زمین پر لگیں یا نہ لگیں ۔ البتہ سر ضرور جھک جائے ۔ راغب نے کہا ہے کہ رُکُوْعٌ کے معنے جھکنے کے ہیں ۔ یہ لفظ کبھی بالخصوص جسمانی شکل میں جھکنے کے لئے اور کبھی محض عاجزی اور انکساری کے لئے بولا جاتا ہے، خواہ وہ عبادتاً ہو یا بغیر عبادت ۔ یعنے کسی کے حکم کے آگے سر جھکا دینے کے ۔ ویسے بھی بوڑھے شخص کے لئے جو کمزور و نحیف ہو جائے رَکَعَ الشَّیْخُ کہتے ہیں ، کیونکہ ایسی کمزوری میں انسان ذرا جھک جاتا ہے ۔ یا جس شخص کی حالت سقیم و خستہ ہو جائے اس کے لئے بھی رَکَعَ فُلاَنٌ بولا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی جھکنے کے لکھے ہیں صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ جاهلیت کے زمانہ میں عرب ، حنیف شخص کو رَاکِعٌ کہا کرتے تھے جبکہ وہ بتوں کی پرستش نہ کرتا ہو اور کہا کرتے تھے رَاکِعٌ اِلَی اللّٰہِ ۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ اس کے معنے تھے وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوکر مطمئن ہوگیا* ۔ رَاکِعٌ کی جمع رُکَّعٌ آتی ہے ۔

رُکُوْعٌ وَسُجُوْدٌ (دیکھئے عنوان س ۔ ج ۔ د) در حقیقت قوانین خداوندی کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کا نام ہے ۔ سجدہ میں رکوع کی نسبت زیادہ شدت پائی جاتی ہے ۔ یعنے کامل اطاعت ۔ سورۃ بقرہ میں یہودیوں سے کہا گیا ہے وَ اَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ وَ آتُوْا الزَّکٰوۃَ وَ ارْکَعُوْا مَعَ الرَّاکِعِیْنَ (۲/۴۳) ۔ یعنے جو جماعتِ مومنین ، قوانینِ خداوندی کے سامنے اپنا سر جھکائے ہوئے ہے ، تم بھی ان میں شامل ہوکر اسی طرح ان قوانین کی اطاعت کرو ۔

چونکہ انسان کے جسم کی حرکات اس کے دل کے جذبات کی ترجمان ہوتی ہیں ۔ (مثال کے طور پر جب ہم ''نہیں،، کہتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ہمارا سر خود بخود

*تاج ۔

دائیں بائیں ہل جاتا ہے اور جب ''ہاں،، کہتے ہیں تو اس کی حرکت خود بخود اوپر نیچے ہو جاتی ہے)۔ اس لئے قوانین خداوندی کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کی محسوس ترجمانی اجتماعاتِ صلٰوۃ میں رُکُوْعٌ اور سُجُوْدٌ کی شکل میں ہوتی ہے۔ تَرٰاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا . . . سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (۴۸/۲۹) ۔ ''تو انہیں رکوع و سجود کرتے ہوئے دیکھتا ہے . . . اطاعت کے اثر سے ان کی قلبی کیفیات ان کے چہروں پر (ظاہر) ہیں''۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص نماز میں رکوع اور سجدہ تو کرے لیکن اپنی زندگی غیر خدائی قوانین کے تابع بسر کرے، تو اس کے یہ رکوع و سجود منشائے خداوندی کے مطابق نہیں ہونگے۔ یعنی وہ چند منٹ کے لئے (اور وہ بھی بظاہر) خدا کے سامنے جھکتا ہے لیکن اپنی پوری زندگی میں عملاً غیر اللہ کے سامنے جھکتا رہتا ہے۔ اس لئے اس کے یہ رکوع اور سجود خدا کی اطاعت کی علامات نہیں ہیں۔ سچا رکوع اور سجدہ یہ ہے کہ انسان کا دل قوانین خداوندی کے سامنے جھک جائے، اور دل کے جھکنے کے ساتھ اس کا سر بھی تعظیماً جھک جائے۔ اجتماعات صلٰوۃ کی محسوس حرکات سے یہی مقصود ہے۔

ر ک م

اَلرَّكْمُ ۔ کسی چیز کو اوپر تلے رکھنا اور جمع کرنا، حتکہ وہ تہ بہ تہ ڈھیر کی شکل اختیار کر جائے*۔ فَيَرْكُمَهٗ (۸/۳۷) ۔ ''وہ ان سب کو اوپر تلے ڈھیر بنا دیگا''۔ رُكَامٌ۔ اوپر تلے رکھی ہوئی چیزوں کا ڈھیر*۔ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا (۲۴/۴۳) ۔ پھر انہیں اوپر تلے رکھ کر دبیز بادل کی شکل دیدیتا ہے۔ سورۃ طور میں ہے سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ (۵۲/۴۴) ۔ تہ بہ تہ بادل۔ نَاقَةٌ مَرْكُوْمَةٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو بہت فربہ ہو۔ جس پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی ہوں*۔

ر ک ن

رَكِنَ ۔ يَرْكَنُ (اِلَيْهِ) ۔ کسی کی طرف مائل ہونا اور سکون پانا*۔ سورۃ ہود میں ہے وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۱۱/۱۱۳) ۔ جو لوگ سرکش ہیں ان کی طرف مت جھکو۔ ان کی طرف مائل مت ہو۔

*تاج و محیط و راغب۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَ لَوْلَاۤ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا (۱۷/۷۴)۔ ''اگر ہم نے تجھے ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو تو تھوڑا سا ان کی طرف جھک جاتا''۔ رسول کا مقام یہ ہوتا ہے کہ جہاں عام انسان (اپنے مشن کی خاطر ہی سہی) کچھ نہ کچھ دوسروں کی خاطر جھک جاتے ہیں، رسول ایسا کبھی نہیں کرتا۔ (دیکھئے ۶۸/۹ و ۱۰/۱۵)

اَلرُّكْنُ۔ وہ چیز جس سے کسی کو تقویت پہنچتی ہو۔ سہارا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قوت کے ہیں۔ رُكْنٌ کسی چیز کے قوی ترین پہلو کو کہتے ہیں۔ سورۃ ہود میں ہے اٰوِیْۤ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ (۱۱/۸۰) میں ایک محکم سہارے کی پناہ لے لوں۔ ابن فارس نے رُكْنٌ شَدِيْدٌ کے معنی عزت و غلبہ بتائے ہیں جس کی وجہ سے کسی کو تاب مخالفت نہ ہوسکے۔ اَرْكَانُ الشَّيْءِ۔ چیز کے اطراف و جوانب۔ وہ سہارے جن پر وہ چیز قائم ہو*۔

ر م ح

اَلرُّمْحُ۔ (جمع رِمَاحٌ)۔ نیزہ*۔ قرآن کریم میں ہے تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ (۵/۹۴)۔ ''جس تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکتے ہیں''۔

(مجازاً عربوں میں فقر و فاقہ کو بھی اَلرُّمْحُ کہتے ہیں**۔ تاج میں اس معنے کے لئے بجائے رُمْحٌ کے رَمَّاحٌ لکھا ہے)۔

ر م د

اَلرَّمَادُ۔ راکھ کو کہتے ہیں۔ خاکستر*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْاَرْمَدُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کا رنگ غبارآلود اور گدلا ہو، یعنی خاکستری رنگ۔ رَمَادَةٌ۔ ہلاکت۔ تباہی۔ اَرْمَدَ الْقَوْمُ۔ لوگ خشک سالی میں مبتلا ہوئے اور ان کے مویشی تباہ ہوگئے*۔

قرآن کریم میں غلط روشِ زندگی پر چلنے والوں کے اعمال کو ایسی رَمَادٌ سے تشبیہ دی گئی ہے جس پر سخت تیز ہوا چلے (۱۴/۱۸)۔ ظاہر ہے کہ ایسے جھکڑ میں اس خاکستر کا نام و نشان تک باقی نہیں رہ سکتا۔ غلط نظام اور غلط عمل، زمانے کے تند و تیز تقاضوں اور شدید حوادث کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتے، اگرچہ (راکھ کے ڈھیر کی طرح) وہ بہت بڑے اور زیادہ نظر آتے ہیں۔

*تاج و راغب و محیط۔ ** محیط۔

ر م ز

اَلرَّمْزُ کے معنے جنبش و حرکت کے ھیں*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنے حرکت و اضطراب بتائے ھیں۔ اَلرَّمِیْزُ۔ کثیر الحرکت کو کہتے ھیں۔** اسی سے اس کے معنے اشارے کے ھیں خواہ وہ ھونٹوں سے کیا جائے یا آنکھوں سے یا ابروؤں سے یا منہ، ھاتھ اور زبان سے۔ اور اس کے ساتھ آواز نہ ھو۔ اور اگر آواز ھو تو ھلکی سی، جیسے کانا پھوسی میں ھوتی ھے۔**

سورۃ آل عمران میں حضرت زکریا[۳] کے متعلق ھے........ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا (۳/۴۰)۔ "تو تین دن تک لوگوں سے اشارے کے سوا بات نہ کرے گا"۔ شریعت یہود میں، روزے میں بات کرنا بھی منع تھا۔ یا ایسے روزے بھی رکھے جاتے تھے جن میں چپ رھنے کی نیت کی ھو (دیکھئے، ۱۹/۲۶)۔

ر م ض

اَلرَّمَضُ۔ ریت وغیرہ کا سخت دھوپ سے تپ جانا۔ اَلرَّمَضُ۔ اَلرَّمْضَاءُ۔ سخت گرمی اور تپش**۔ شَهْرُ رَمَضَانَ۔ (رمضان کا مہینہ) قدیم عربی میں اس مہینے کو نَاتِق* کہتے تھے۔ جب مہینوں کے نام بدلے گئے (یہ بھی زمانہ قبل از اسلام کی بات ھے) تو چونکہ یہ مہینہ (اس تبدیلی نام کے وقت) سخت گرمی میں پڑتا تھا اسلئے اسکا نام رَمَضَانُ ھوگیا**۔ اس مہینے میں نزولِ قرآن کا آغاز ھوا تھا (۲/۱۸۵)۔

قمری مہینوں کے لحاظ سے کوئی مہینہ ھمیشہ اُسی موسم میں نہیں آسکتا۔ اسلئے اب رمضان کا مہینہ سخت سردی میں بھی آجاتا ھے۔ لیکن باایں ھمہ یہ کہلاتا رمضان ھی ھے۔ (مہینوں کی تبدیلی کے سلسلہ میں دیکھئے عنوان ن۔ س۔ ا)۔

ر م م

رَمَّ الْعَظْمُ: ھڈی گل سڑ گئی اور بوسیدہ ھوگئی۔ رَمَّ الشَّيْءُ رَمًّا و ارْتَمَّهُ۔ اس نے اس چیز کو مکمل طور پر کھا لیا۔ اَلرِّمَّةُ۔ بوسیدہ ھڈیاں۔ اَلرُّمَّةُ۔ بوسیدہ رسی۔ اَلرَّمِيْمُ۔ گذشتہ سال کے پودوں میں سے جو کچھ بچ جائے۔ نیز ھر پرانی اور بوسیدہ چیز کو بھی کہتے ھیں۔ اَلرِّمَّ

*محیط۔ **تاج۔

خشک گھاس کا چورا۔ بھوسہ ۔ پانی کے اوپر بہ جانے والا کچرا ۔ اَلْاِرْمَامُ ۔ خاموش ہو جانا ۔ سکوت ۔ اَلرَّمُّ ۔ بوسیدہ چیز کو درست کر دینا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چار ہوتے ہیں ۔ (۱) چیز کو درست کرنا ۔ (۲) چیز کا بوسیدہ ہو جانا ۔ (۳) خاموش رہنا ۔ اور (۴) باتیں کرنا (اضداد میں سے ہے) ۔

قرآن کریم میں ہے مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ (۳۶/۷۸) ۔ "ہڈیاں جب بوسیدہ ہوجائیں تو انہیں کون زندہ کر سکتا ہے"۔ سورۃ ذاریات میں اُس تباہ کن آندھی کے متعلق ہے جو قوم عاد پر چلی تھی کہ مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِیْمِ (۵۱/۴۲) ۔ "وہ کسی شے کو نہیں چھوڑتی تھی جس پر آتی تھی بجز اس کے کہ اسے چورا کرکے رکھ دیتی تھی" ۔

ر م ن

اَلرُّمَّانُ ۔ انار ۔ (درخت ہوں یا پھل ، واحد رُمَّانَةٌ) ۔ غالباً انار کی تاثیر کی وجہ سے (جو دل کو قرار دیتی ہے) رَمَنَ بِالْمَكَانِ کے معنی ہیں وہ اس جگہ مقیم ہو گیا**۔ قرآن کریم نے انگور ۔ زیتون ۔ اور اناروں کے باغات کا ذکر کیا ہے ۔ وَ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ (۶/۱۰۰) ۔

ر م ی

رَمَی الشَّیْءَ ۔ رَمٰی بِهٖ ۔ کسی چیز کو پھینک دینا یا ڈال دینا۔ یعنی گرا دینا ۔ رَمَی السَّهْمَ عَنِ الْقَوْسِ ۔ کمان سے تیر پھینکا۔ اَلْمِرْمَاةُ چھوٹا تیر۔ خَرَجَ یَتَرَمّٰی ۔ وہ تیر سے شکار کرنے کے لئے نکلا ۔ اَلْمَرْمٰی ۔ وہ نشان (ھَدَف) جسکی طرف تیر پھینکے جاتے ہیں*** ۔

سورۃ مرسلٰت میں ہے اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ (۷۷/۳۲) ۔ "وہ چنگاریاں پھینکتی ہے" ۔ سورۃ فیل میں ہے تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ (۱۰۵/۴) "تو ان پر پتھر پھینکتا تھا"۔ سورۃ انفال میں ہے وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی (۸/۱۷) ۔ جنگ بدر میں جو تیر اندازی تیری طرف سے ہو رہی تھی وہ تیری طرف سے نہیں بلکہ در حقیقت اللہ کی طرف سے تھی ۔ اس لئے کہ یہ تمام

*تاج و محیط و راغب ۔ ** تاج و محیط ۔ ***تاج ۔

لڑائیاں خدا کے حکم کے ماتحت اس کے نظام کو بلند کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں۔ کمانڈر جب حکومت کے حکم سے فوج کشی کرتا ہے تو وہ جنگ اُس حکومت کی طرف سے سمجھی جاتی ہے۔ یا جب فوج کمانڈر کے حکم سے حملہ کرتی ہے تو وہ حملہ کمانڈر کی طرف سے متصور ہوتا ہے۔

اس آیت میں رَمَيْتَ کا کوئی مفعول بہ مذکور نہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ رَمٰی کے بعد مختلف مفعول بہ آنے سے ان کے مطابق ہر جگہ الگ معنی ہوتے ہیں۔ لیکن اس آیت میں میدان جنگ کا ذکر ہے اور پہلے فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ کہہ کر یہ واضح کر دیا ہے کہ یہاں دشمنوں کے قتل کا تذکرہ ہے۔ اس لئے رَمَيْتَ سے تیر اندازی ہی مراد لیا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی (لین نے مختلف اسناد سے لکھا ہے کہ) جب تنہا رَامَيْتُهٗ یا مُرَامَاةٌ کہا جائے تو اس کے معنی تیراندازی یا سنگ باری کے ہوتے ہیں۔

رَمَاهُ بِقَبِيْحٍ۔ اس نے اسے برائی کے ساتھ متہم کیا*۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ (۲۴/۲۳)۔ "جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں"۔ کسی پاکدامن کے خلاف تہمت لگانا، "تیر اندازی" یا "سنگ باری" کی بد ترین شکل ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے اس کی سزا بھی سخت تجویز کی ہے (۲۴/۴)۔

ر و ح

رَاحَ*۔ رَوْحٌ*۔ رُوْحٌ*۔ رِيْحٌ*۔ سب ایک ہی مادہ کے الفاظ ہیں۔ اور انہی سے رَاحَةٌ*۔ رَوْحَةٌ*۔ اِسْتِرَاحَةٌ*۔ تَرْوِيْحَةٌ*۔ رَيْحَانٌ*۔ وغیرہ الفاظ آتے ہیں۔ رَاحَ کے بنیادی معنے ہیں ہوا کا چلنا، ہوا کا آنا، ہوا کا محسوس کرنا*۔ چونکہ ہوا انبساطِ زندگی، حرکت اور قوت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے اس مادہ سے بننے والی مختلف شکلوں میں یہ تمام مفہوم مضمر ہو گئے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی وسعت اور فراخی کے ہیں۔

اَلرَّوْحُ۔ راحت۔ سرور۔ خوشی۔ رحمت۔ وسعت۔ مَكَانٌ رَوْحَانِيٌّ*۔ عمدہ اور پاکیزہ مکان*۔ اَلرِّيْحُ۔ ہوا۔ اَلرَّيْحَةُ۔ ہوا کا کچھ حصہ۔ رِيَاحٌ*۔ اس کی جمع ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں اِرسالِ رِیَاح بیشتر مقامات میں رحمت و شادمانی کے لئے استعمال ہوا ہے اور اِرسال

---

* تاج۔

رِیْحِ عذاب کے لئے* ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ جب ہوا (اَلرِّیْحُ) تند و تیز ہو تو اسے اَلْعَاصِفُ کہا جاتا ہے ۔ جو ہوائیں بادل لاتی ہیں وہ مُبَشِّرَاتٌ کہلاتی ہیں ۔ جو بارش لاتی ہیں انہیں اَلْمُعْصِرَاتُ کہا جاتا ہے ۔ میدانوں اور صحراؤں میں ہلاکت انگیز ہوا کو بھی عَاصِفٌ کہا جاتا ہے ۔ لیکن سمندر میں طوفان لانے والی ہواؤں کو اَلْقَوَاصِفُ کہتے ہیں ۔

اَلرِّیْحُ ۔ نصرت ۔ غلبہ و قوت ۔ گردش ۔ انقلاب ۔ اور باری* ۔ وَ تَذْھَبَ رِیْحُکُمْ (۸/۴۶) ۔ تمہاری ہوا اُکھڑ جائیگی ۔ تمہاری قوت چلی جائے گی ۔ تَرْوِیْحَۃٌ ۔ در اصل بہ بیٹھنے اور آرام کرنے کو کہتے ہیں یعنی سستانے کو ۔ پھر نماز تراویح کی ہر چار رکعت کو کہتے ہیں کیونکہ چار رکعتوں کے بعد تھوڑا سا راحت کا وقفہ ہوتا ہے ۔ اَلرَّوِیْحَۃُ ۔ تنگی کے بعد فراخی مل جانا ۔ رَاحَۃٌ ۔ شام کے وقت مویشیوں کا گھروں کو واپس آنا ۔ چنانچہ اَلرَّوَاحُ ۔ شام یا زوالِ آفتاب کے بعد سے رات تک کا وقت* ۔ سورۃ سبا میں رَوَاحٌ (شام کا سفر) بمقابلہ غُدُوٌّ (صبح کا سفر) آیا ہے ۔ (۳۴/۱۲) ۔

صاحب محیط نے اَلرُّوْحُ کے معنے فرحت و مسرت ، راحت و رحمت کے علاوہ ، بادِ نسیم ، مدد ۔ انصاف و عدل جس سے فریادی کو راحت و سکون نصیب ہو جائے ، بھی لکھے ہیں ۔ اور اَلرُّوْحُ کے معنے (عام انسانی روح کے علاوہ) رحمت ، خدا کی طرف سے وحی اور خود قرآن کریم** ۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ (۱۶/۲) ۔ یہاں اَلرُّوْحُ سے مراد وحی ہے ۔ اور سورۃ شوریٰ میں ہے وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (۴۲/۵۲) ۔ یہاں رُوْحًا سے مراد خود قرآن کریم ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں جہاں کہا گیا ہے وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (۱۷/۸۵) ۔ "تجھ سے اَلرُّوْحُ کے متعلق پوچھتے ہیں ۔ کہدے کہ اَلرُّوْحُ میرے رب کے امر سے ہے" ۔ تو وہاں روح سے مراد انسانی روح (Soul) نہیں بلکہ وحی ہے ۔ اس کی وضاحت اس سے اگلی آیت نے کر دی ہے جہاں اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کہا گیا ہے ۔ (۱۷/۸۶) ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ وحی کی ماہیت سمجھنا چاہتے ہیں ۔ ان سے کہدو کہ اس کا تعلق عالم امر سے ہے ۔ دنیائے محسوسات سے نہیں ۔ اس لئے تم اس کی ماہیت کو نہیں سمجھ

*تاج ۔ **محیط ۔

سکتے۔ اس پر ایمان لانا ہوگا۔ البتہ اس کی تعلیم کو سمجھ سکتے ہو۔ ''ماہیت'' کے معنی یہ ہیں کہ وحی کیسے ہوتی ہے۔ خدا اور نبی کا تعلق کیا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ چیزیں غیر از نبی کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اسی بنا پر صاحب المنار نے لکھا ہے کہ رُوْحُ الْقُدُسِ (۲/۸۷)۔ جسکی تقویت حضرت عیسٰیؑ کو حاصل تھی، تورات اور انجیل کے احکام تھے جو انہیں بذریعہ وحی عطا کئے گئے تھے اور جو نفوس انسانیہ کو مقدس بنا دینے کا موجب تھے۔ بعض نے رُوْحُ الْقُدُسِ سے مراد جبریل لی ہے اور یہی مفہوم سورۃ الشعراء میں الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ (۲۶/۱۹۳) کا لیا ہے* جہاں قرآنِ کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِکَ (۲۶/۱۹۳-۱۹۴)۔ اور اسکی تائید سورۃ بقرہ کی اس آیت سے ہوتی ہے جس میں جبریل کے متعلق ہے فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۲/۹۷) اس سے ظاہر ہے کہ الروح الامین جبریل ہی کا لقب ہے۔ سورۃ نحل میں ہے قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ (۱۶/۱۰۲)۔ لہذا روح القدس بھی جبریل ہی کو کہا گیا ہے۔ ہم چونکہ وحی کی کنہ و ماہیت کو نہیں جان سکتے اسلئے جبریل کی حقیقت سے بھی آشنا نہیں ہو سکتے۔ رُوْحٌ کے لفظ سے اس طرف اشارا ملتا ہے کہ وہ الوہیاتی توانائی ہے جو نبیؐ کے قلب پر انکشاف حقائق کرتی ہے۔ اور ملائکہ وہ کائناتی قوتیں ہیں جو قانون خداوندی کو مشہود بناتی ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم میں مَلٰٓئِکَةٌ اور رُوْحٌ کا الگ الگ بھی ذکر آیا ہے (۷۰/۴ ؛ ۷۸/۳۸ ؛ ۹۷/۴)۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ابتدائی کڑیاں تو وہی ہیں جو عام حیوانات کی تخلیق سے متعلق ہیں۔ لیکن اسکے بعد انسان کو دوسرے حیوانات سے یہ کہکر ممتاز کر دیا گیا ہے کہ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲/۹)۔ اس میں خدا نے اپنی ''روح'' پھونکی۔ اور اسکا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ (۳۲/۹)۔ انسان کو سمع و بصر یعنے ذرائع علم اور قلب عطا کیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں ''روح خداوندی'' سے مراد وہ الوہیاتی توانائی ہے جسے انسانی ذات (Personality) یا نفس (Self) کہتے ہیں اور جس سے انسانی خصوصیات وابستہ ہیں۔ یہ (انسانی خودی) ہر انسان کو یکساں طور پر ملی ہے۔ اسکے بعد دیکھنا یہ ہوگا کہ انسان اسے کس حد تک نشوونما دیتا ہے۔ اسکی کتنی

*تفسیر المنار ـــــ تاج۔

(Deyelopment) کرتا ہے۔ روحانیت سے یہی مراد ہے اور یہ نشو و نما قرآنی معاشرہ کے اندر ہوتی ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس "توانائی" یعنی "رُوْحٌ"، کو "روحنا" (ہماری روح) کیوں کہا ہے؟ کیا یہ چیز "ذاتِ خداوندی"، کا جزو ہے؟ اس سوال کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ کائنات میں ہر جگہ توانائی پائی جاتی ہے۔ جانداروں میں اس کا اظہار زیادہ نمایاں اور محسوس طریق پر ہوتا ہے۔ یہ توانائی مادی اسباب و علل کا نتیجہ ہوتی ہے (یا یوں کہیئے کہ طبیعی قوانین کے مطابق سامنے آتی ہے) اس لئے اسے "مادی توانائی"، کہتے ہیں۔ انسانی جسم کی توانائی بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔ لیکن انسان کے اندر ایک اور توانائی بھی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اختیار اور ارادے کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ توانائی جسم انسانی کی طبیعی توانائی سے زیادہ قوی ہوتی ہے، اس لئے کہ طبعی توانائی، اس خاص توانائی کے تابع کام کرتی ہے۔ اس "توانائی" کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (اسے اس نے "روحنا" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی خدا کی روح یا توانائی) اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ توانائی، مادی قوانین سے متعلق نہیں۔ خدا کی طرف سے براہ راست ملی ہے۔ یہ "انسانی ذات"، ہے۔ اسی کو "الوھیاتی توانائی"، سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "الوھیاتی"، ہمارے ہاں کی ایک قدیم اصطلاح ہے اور اس کے معنی ہیں "اللہ (خدا) کی طرف منسوب۔ لہذا "الوھیاتی توانائی" سے مراد ہے ایسی توانائی جو مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ براہ راست خدا کی طرف منسوب ہے۔ واضح رہے کہ خود مادی توانائی بھی "غیر از خدا" کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وہ اُن قوانین کے ماتحت پیدا ہوتی ہے جو خدا نے مادہ سے متعلق متعین کر رکھے ہیں۔ "انسانی توانائی"، کو اس نے خاص طور پر اپنی طرف اس لئے منسوب کیا ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ "مادی توانائی"، سے الگ اور ممتاز ہے۔

یہ توانائی، خدا کی ذات کا حصہ نہیں۔ "ذات"، کے حصے بکھرے ہو نہیں سکتے۔ اسے ذات خداوندی سے جدا شدہ حصہ سمجھنا، ہندوؤں کے فلسفہٗ ویدانت کا پیدا کردہ تصور ہے۔ انسانی ذات، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ "توانائی"، ہے جو نہ اس کی ذات کا حصہ ہے۔ نہ اس کا منتہیٰ اس کی ذات سے جا کر مل جانا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، یہ توانائی، غیر نشو و نما یافتہ شکل (Un- Developed Form) میں ملتی ہے۔ اور اسے نشو و نما

دینا ، انسانی زندگی کا مقصود ہے ۔ اسی کے لئے قرآنی معاشرہ قائم کیا جاتا ہے ۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اسکی ذات پر مرتب ہوتا ہے ۔ اور اس کی ذات اس کے طبیعی جسم کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی ۔

مادی تصور حیات (Materialistic Concept Of Life) اور قرآنی تصور حیات میں فرق ہی یہ ہے کہ اول الذکر کی رو سے ، انسان عبارت ہے صرف اس کے طبیعی جسم سے ۔ اس جسم کی مشینری ، طبعی قوانین کے تابع سرگرم عمل رہتی ہے اور جب انہی قوانین کے مطابق وہ چلنے سے رک جاتی ہے تو اسے موت کہتے ہیں جس سے اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔ قرآنی تصور حیات کی رو سے ، انسان عبارت ہے اس کے طبیعی جسم اور اسکی ذات سے ۔ اسکی ذات ، طبعی قوانین کے تابع نہیں ہوتی اس لئے جب طبعی قوانین کے مطابق انسانی جسم کی مشینری حرکت کرنے سے رک جاتی ہے تو اس سے اس کی ذات کا کچھ نہیں بگڑتا ۔ وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہے ۔

جسطرح انسانی جسم کی نشو و نما کے لئے قوانین مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے بھی اصول متعین ہیں ۔ ان اصولوں کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے ، جو عقل انسانی کی پیداوار نہیں ۔ یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتے ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں ۔ جسم اور ذات کی نشوونما کے قوانین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود کھائے یا استعمال کرے ۔ اس کے برعکس ، انسانی ذات کی نشو و نما ان چیزوں سے ہوتی ہے جسے انسان دوسروں کی پرورش کے لئے دے ۔ قرآن کریم کے نظام ربوبیت کی عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے ۔ انسانی ذات جوں جوں نشوونما پاتی جاتی ہے اس میں صفات خداوندی (حدود بشریت کے اندر) منعکس ہوتی جاتی ہیں ۔ (مزید تفصیل ن ۔ ف ۔ س کے عنوان میں ملیگی) ۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے کسی جگہ بھی '' انسانی روح ،، کا ذکر نہیں کیا ۔ '' روح خداوندی ،، ہی کا ذکر کیا ہے ۔ جب یہ '' روح خداوندی ،، (الوھیاتی توانائی) انسان کو عطا کر دی جاتی ہے تو اسے ، قرآن کریم کی اصطلاح میں ، نفس کہا جاتا ہے ۔ (۹/۳۲)۔

اسی کو انسانی ذات (Human personality) یا خودی (Self) یا انا (I) کہتے ہیں ۔

یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ جب ہم نے یہ کہا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصود، انسانی ذات کی نشوونما ہے تو اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن کریم کی رو سے انسانی جسم اور اسکی نشوونما کچھ قیمت نہیں رکھتے۔ قرآن کریم کی رو سے انسانی جسم کی پرورش بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ زندگی کی موجودہ سطح پر، انسانی ذات کی نشوونما، انسانی جسم کی وساطت سے ہوتی ہے۔ لہذا انسانی ذات کی نشوونما کے لئے جسم کا توانا ہونا اسی طرح ضروری ہے جسطرح انڈے کے اندر جیتا جاگتا چوزہ بننے کے لئے، انڈے کے خول کا صحیح و سلامت رہنا ضروری ہے۔ البتہ جب کبھی ایسا ہو کہ جسم کے کسی تقاضے اور انسانی ذات کے تقاضے (مستقل اقدار) میں تصادم ہو۔ ان میں (Tie) پڑ جائے، تو اسوقت، جسم کے تقاضے کو ذات کے تقاضے پر قربان کر دینا، شرط انسانیت (ایمان کا تقاضا) ہو جاتا ہے۔ جسطرح، جب انڈے کے اندر چوزے کا ''دم گھٹنے لگے''، تو وہ انڈے کے خول کو چونچیں مار مار کر توڑ دیتا ہے۔ قرآنی تعلیم کا نچوڑ ہی یہی ہے۔ یعنی جب طبعی تقاضوں میں اور مستقل اقدار میں(Tie) پڑے تو مستقل اقدار کے تحفظ کے لئے طبعی تقاضوں کو قربان کر دینا۔ اسی کو کیریکٹر کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں اَلرَّيْحَانُ بھی آیا ہے۔ مثلاً سورۃ رحمٰن میں ہے وَالْحَبُّ ذُوالْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ (۵۵/۱۲)۔ اَلرَّيْحَانُ۔ ایک خوشبودار گھاس ہوتی ہے۔ یا ہر خوشبودار گھاس — نیز سبزی، کے تختے بشرطیکہ ان میں سے خوشبو آرہی ہو اور ان پر ابتدائی پھول آرہے ہوں۔ فراء نے کہا ہے کہ کھیتی کے تنے کو عَصْفٌ کہتے ہیں اور اسکے پتوں کو رَيْحَانٌ۔ اَلرَّيْحَانُ اولاد کو بھی کہتے ہیں اور رزق کو بھی۔

أَرَاحَ۔ اس نے آرام کیا۔ مویشیوں کو شام کے وقت باڑے میں آرام کرنے کے لئے چھوڑا (۱۶/۶)۔

ر و د

رَوْدٌ۔ کسی چیز کی طلب میں بار بار آمد و رفت کو کہتے ہیں۔ یعنی کسی چیز کی طلب میں چلتے رہنا۔ پیہم حرکت میں رہنا*۔ اَلرَّائِدُ۔ چکی کے دستہ کو کہتے ہیں۔ رَائِدُ الْعَيْنِ۔ آنکھ میں پڑ جانے والا تنکا یا کچرا جو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر جاتا رہے۔

* تاج و محیط۔

اَلمَرَادُ۔ وہ جگہ یا راستہ جہاں اونٹوں کی آمد و رفت ہوتی رہے، اونٹوں کی اس آمد و رفت کو رِیَادُ الاِبِلِ کہتے ہیں ۔ اَلرَّائِدُ ۔ وہ شخص جسے پانی یا چارہ کی تلاش میں قافلہ سے آگے بھیجدیا جائے* ۔ چونکہ رَوْدٌ کے بنیادی معنوں میں کسی کام کے لئے حرکت اور تگ و دو کا تصور نمایاں طور پر رہتا ہے لہذا اِرَادَةٌ کے معنے کسی چیز کی خواہش یا طلب کے ہوگئے ، لیکن پھر اِرَادَةٌ اور طَلَبٌ میں فرق یہ ہوگیا کہ طَلَبٌ تو انسان کی کسی بات یا عمل سے ظاہر ہوجاتی ہے اور اِرَادَةٌ کبھی پوشیدہ ہوتا ہے اور کبھی ظاہر** ۔ اِرادةٌ در حقیقت دل کے کسی طرف کھنچنے اور رجحانِ درون کی وجہ سے کسی چیز کی طرف جھکنے کا نام ہے ۔ یا یہ ایسے میلان کو کہتے ہیں جس کے نتیجہ میں نفع کی توقع ہو*** ۔ راغب نے لکھا ہے کہ ارادہ ایسی قوت کو کہتے ہیں جس میں خواہش، ضرورت اور آرزو کے جذبات ملے جلے ہوں ۔ پھر اس سے مراد دل کا کسی چیز کی طرف کھنچنا ہے ، اس فیصلہ کے ساتھ کہ اسے کرنا چاہئے یا نہیں کرنا چاہئے ۔ ازاں بعد یہ کبھی صرف دل کے کسی طرف کھنچنے کے لئے اور کبھی محض فیصلہ کے لئے بولدیا جاتا ہے ****۔ اس سے رَاوَدَہٗ کے معنے ہوئے اسے چاہا، بار بار کسی سے کسی چیز کو طلب کیا۔اس کے بعد عَنْ آنے سے یہ کسی کی مرضی کے خلاف اس سے کوئی چیز طلب کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے مثلاً (۱۲/۶۱) میں جہاں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی یہ بات بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ۔ ''ہم اسے ، اس کے باپ سے اس کی مرضی کے خلاف طلب کرینگے''۔ یعنی ہمارا باپ تو نہیں چاہتا کہ یوسفؑ کے بھائی کو ہمارے ساتھ جانے دے لیکن ہم اس کی مرضی کے خلاف اسے اس سے مانگیں گے۔ اَرَادَ ۔ اس نے ارادہ کیا ، چاہا ۔ یُرِیْدُ ۔ وہ ارادہ کرتا ہے ۔ ان معنوں میں یہ (۳۶/۲۳) میں آیا ہے۔ یعنی اِنْ یُرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ . . . ''اگر رحمٰن مجھے کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے'' ۔

رَاوَدَہٗ عَنْ نَفْسِهٖ وَعَلَیْھَا ۔ کے معنے ہیں فریب دینا ۔ دھوکا دینا ۔ پھسلانا*۔ نیز اس کے معنے ہمبستری کی خواہش کے بھی ہوتے ہیں* ۔ اس سے قرآن کریم کی آیات (مثلاً ۱۲/۲۳ و ۵۴/۳۷) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ پہلی آیت میں قصہ حضرت یوسفؑ کے ضمن میں عزیز کی بیوی کے غلط ارادے کی طرف اشارہ ہے ۔ اور دوسری میں قوم لوط کی غلط روش کی طرف ۔

اَرْوَدَ فِی السَّیْرِ ۔ کے معنی ہیں وہ سفر میں پر سکون رفتار سے چلا*۔

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔ **** راغب

یہیں سے رُوَیْدَ کے معنے مہلت دینے کے ہوگئے - قرآن کریم میں رُوَیْدًا مہلت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے - فَمَهِّلِ الْكَافِرِيْنَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (۸۶/۱۷) - "پس تو کافروں کو مہلت دے - تھوڑی سی مہلت"۔

قرآن کریم میں جہاں "خدا کے ارادوں" کا ذکر آیا ہے ، انہیں انسانی ارادوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہئے - انسانی ارادے بندھتے بھی ہیں ، ٹوٹتے بھی ہیں - صحیح بھی ہوتے ہیں ، غلط بھی - قابل عمل بھی ہوتے ہیں اور محض "شاعرانہ" بھی - لیکن خدا کے ارادے درحقیقت اس کے وہ فیصلے ہیں جو عالم امر سے ، اس کے قوانین مشیت کے مطابق سرزد ہوتے ہیں اور جن کے مطابق کائنات سرگرم عمل ہے -

ر و ع

اَلرَّوْعُ - حیرت و دہشت جو کسی چیز کی کثرت یا جمال کو دیکھ کر پیدا ہو- اَلرَّوْعَةُ - دہشت ، نیز حسن اور جمال کا اثر - اَلرُّوْعُ - دل - خوف اور گھبراہٹ کا مقام*۔

قرآن کریم میں ہے فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرَاهِیْمَ الرَّوْعُ (۱۱/۷۴)- جب ابراہیم کے دل سے حیرانی اور گھبراہٹ جاتی رہی -

ر و م

اَلرُّوْمُ - سلطنت روما الکبریٰ (Roman Empire) - سورۃ روم (۳۰/۲) میں ہے کہ رومی مغلوب ہوگئے - یہ اس شکست کا ذکر ہے جو ایران کے بادشاہ ، خسرو پرویز ، کے ہاتھوں رومیوں کو پہنچی تھی - جس میں رومیوں کا صوبے پر صوبہ فتح ہوتا چلا گیا تھا اور جس کا سلسلہ سنہ ۶۱۵ء تک جاری رہا تھا - قرآن کریم نے عین اس وقت جب رومی انتہائی کمزوری میں تھے ، کہا کہ چند ہی سال کے عرصہ میں وہ پھر ایرانیوں پر غالب آجائیں گے - چنانچہ سنہ ۶۲۳ء میں ھرقل نے نہ صرف اپنے مفتوحہ علاقے واپس لے لئے بلکہ ایران کے اندر داخل ہوکر ان کے بڑے آتشکدے کو تباہ کر دیا - یہ اس سال (سنہ ۲ھ میں) ہوا جب مسلمانوں کو مخالفین عرب پر ، بدر کے میدان میں ، پہلی فتح حاصل ہوئی تھی - عربوں کا قریب ترین حریف ایران تھا - ایران کا اتنی قوت حاصل کرلینا کہ رومن ایمپائر بھی اس کے سامنے نہ ٹھہر

*تاج و راغب -

سکے ، عربوں کے لئے بڑی پریشانی کا موجب تھا ۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں ، انہی عربوں کو، قرآنی نظام کی بدولت اتنی قوت حاصل ہو گئی کہ ان کے سامنے نہ ایرانی سلطنت ٹھہر سکی ، نہ رومن ایمپائر—یہ سب ''نکتۂ ایمان کی تفسیر'' تھا ۔

ر ھ ب

رَھْبٌ ۔ رُھْبٌ ۔ رَھَبٌ ۔ رُھْبَۃٌ ۔ رَھْبَۃٌ وَرُھْبَانٌ ۔ کے معنے ہیں ایسا خوف جس میں احتیاط بھی شامل ہو ۔ (جیسے ہم جلنے کے خوف سے آگ سے محتاط رہتے ہیں)۔ اَلسَّمَرُ ھَوْبٌ ۔ اَلرَّاھِبُ ۔ شیر کو کہتے ہیں * ۔ نیز اسکے معنے کمزور ہو جانے کے بھی آتے ہیں ۔ چنانچہ اَلرَّھْبُ وَالرَّھْبٰی ۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو سفر میں تھک کر لاغر ہو گئی ہو ۔ رَھِبَ اَلْجَمَلُ کے معنے ہیں اونٹ اٹھا لیکن کمر کے کمزور ہونے کی وجہ سے پھر بیٹھ گیا ۔ * اَلرَّھْبَانِیَّۃُ ۔ (مسلک خانقاہیت) میں خوف، احتیاط، کمزوری ، کے تمام پہلو آجاتے ہیں ۔ یعنے (بزعم خویش) خوفِ خدا کی وجہ سے لذائذ دنیوی کو ترک کر دینا (اَلاَ رْھَابُ ۔ اُن پرندوں کو کہتے ہیں جو شکار نہیں کرتے) * اور اسطرح کمزور اور لاغر ہو جانا ۔ اس قسم کے زاھد کو اَلرَّاھِبُ ۔ کہتے ہیں ۔ رُھْبَانٌ اسکی جمع آتی ہے (۹/۳۱) ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رُھْبَانٌ فارسی کا لفظ ہے ۔ اور یہ مرکب ہے رِہٌ اور بَان سے ، جسکے معنے ہیں صاحبِ زھد * ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ فارسی لفظ ہو کیونکہ مجوسیوں کے ہاں بھی مسلک خانقاہیت رائج تھا ۔

قرآن کریم میں ہے وَاسْتَرْھَبُوْھُمْ (۷/۱۱۶) ۔ '' انہوں نے لوگوں کو خوف زدہ کرنا چاہا ''

سورۃ حشر میں ہے لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَھْبَۃً فِیْ صُدُوْرِھِمْ (۵۹/۱۳) ۔ '' تمہارا ڈر ان کے سینوں میں بہت زیادہ ہے ''۔ یہاں بھی رَھْبَۃٌ کے معنے ڈر کے ہیں ۔

بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ اِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ (۲/۴۱) تم صرف مجھ سے ڈرنا ۔ خدا سے ڈرنے کے معنے یہی ہیں کہ اسکے قوانین کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈر کر ان کی نگہداشت کی جائے اور ان سے سرکشی اختیار کرنے سے احتیاط کی جائے (رھب کے بنیادی معنے ڈرنے اور احتیاط

* تاج ۔

کرنے کے ہیں) ۔ چنانچہ سورۃ انبیا میں ہے کہ حضرات انبیاء کرام ؑ کا مسلک یہ ہوتا تھا کہ یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَھَبًا (۲۱/۹۰) ۔ وہ زندگی کی خوشگواریوں کو حاصل کرنے (رَغَبًا) اور اسکی ناخوشگواریوں سے بچنے (رَھَبًا) کیلئے خدا کو پکارا کرتے تھے ۔ دونوں صورتوں میں اُسی کے قانون کی طرف رجوع کیا کرتے تھے ۔ یہ ظاہر ہے انسان کے لئے دفع مضرت اور جلب منفعت ہی وہ بنیادی جذبات ہیں جو عمل کیلئے محرک (Incentive) بنتے ہیں ۔ حضرات انبیاء کرام ان دونوں حالتوں میں قانون خداوندی ہی کا اتباع کرتے تھے ۔ یہی مسلک مومنین کا ہونا چاہیئے ۔ باقی رہا رَھْبَانِیَّت کا مسلک ۔ یعنی ترک دنیا کا مسلک ۔ سو قرآن کریم کہتا ہے کہ اسے عیسائیوں نے خود ہی وضع کر لیا تھا ۔ ہم نے اسے ان کے لئے تجویز نہیں کیا تھا (۵۷/۲۷) ۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ فَمَا رَعَوْھَا حَقَّ رِعَایَتِہَا (۵۷/۲۷) ۔ پھر وہ (اپنے اس خود ساختہ مسلک) کو بھی پوری طرح نباہ نہ سکے ۔ یہ ہے قرآن کریم کا فیصلہ مسلک خانقاہیت کے متعلق جو تصوف کی بنیاد ہے اور جسے (بدقسمتی سے) ہمارے ہاں ”مغز دین“ قرار دیا جاتا ہے ۔ جب مسلمان کے ہاتھ سے قرآن کریم کا دامن چھوٹا تو وہ تمام غیر قرآنی عناصر جنہیں قرآن کریم مٹانے کے لئے آیا تھا ، ایک ایک کرکے اسلام کا جزو بنتے گئے ۔ روما کی ملوکیت ۔ ایران کی نسل پرستی ۔ یہودیوں کی پیشوائیت اور روایت پرستی ۔ اور عیسائیوں اور مجوسیوں کا مسلک خانقاہیت ۔ سب اسلام کے اجزا بن گئے ۔ اور اب اسلام انہی کے مجموعہ کا نام قرار پا چکا ہے ۔ یاللعجب ! لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں ۔ خدا کی طرف سے عطا شدہ دین ، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے ۔ اور قرآن کریم کا ایک ایک لفظ ، بغیر کسی آمیزش کے ، ہمارے پاس موجود ہے ۔ لہذا ہم دین خالص کو ان آمیزشوں سے بآسانی الگ کر سکتے ہیں ، بشرطیکہ ایسا کرنے کی نیت ہو ۔

ر ھ ط

اَلرَّھْطُ ۔ کسی آدمی کی قوم ۔ قبیلہ ۔ بعض نے کہا ہے کہ رَھْطٌ اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں تین سے دس تک یا سات سے دس تک کی تعداد ہو ۔ دوسروں نے کہا ہے اس سے کم پر بھی بولا جاتا ہے اور زیادہ پر بھی ، لیکن اس میں مرد ہی ہوں ، عورتیں شامل نہ ہوں* ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی انسانوں وغیرہ کے اجتماع کے لکھے ہیں ۔ سورۂ ہود میں رَھْطٌ (۱۱/۹۱) ۔ برادری یا قبیلہ کے لئے آیا ہے ۔

---

* تاج و راغب ۔

سورۃ نحل میں قوم ثمود کے سلسلہ میں آیا ہے۔ وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ (۲۷/۴۸) "اور شہر میں نو افراد تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے"۔ ظاہر ہے کہ اس سے ان اکابرین قوم کی طرف اشارہ ہے جن کے ہاتھ میں زمام اقتدار تھی۔ ہر قوم۔ ملک۔ حکومت یا مملکت میں چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو ملک میں ناہمواریاں پیدا کرنے کے موجب ہوتے ہیں۔ باقی ملک انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتا ہے۔

ر ھ ق

رَهِقَهُ۔ يَرْهَقُهُ۔ رَهَقاً۔ اسے ڈھانپ لینا اور اس پرچھا جانا (راغب نے اس میں بزوروجبر چھاجانے کا اضافہ کیا ہے)۔ کسی چیز سے مل جانا۔ اسے آلینا اور اس سے لاحق ہو جانا *۔ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ (۱۰/۲۶)۔ ان کے چہروں پرذلت اورسیاھی نہیں چھا جاتی۔ أَرْهَقَهُ۔ اسے اسکی طاقت سے بالاتر کسی کام کی تکلیف دی اور اس پر مجبور کیا، مشکل میں ڈالا** ۔ سورۃ کہف میں ہے يُرْهِقَهُمَا طُغْيَاناً (۱۸/۸۰)۔ ان پر سرکشی کو چھا دے۔ یا انہیں سرکشی میں مبتلا کر دے۔

رَهَقٌ ۔ بیوقوفی۔ حماقت۔ بد خلقی۔ تندی و طراری۔ شرکا ارتکاب*۔ ابن فارس نے اس کے معنے دھاندلی، جلد بازی اورظلم بتائے ہیں۔ فَزَادُوهُمْ رَهَقاً (۷۲/۶)۔ سو انہوں نے انہیں جہالت میں بڑھایا۔ ازھری نے کہا ہے کہ یہ دراصل اِرْهَاقٌ سے اسم ہے، جسکے معنے ہیں انسان کو کسی ایسے کام کے لئے مجبور کرنا جسکی اس میں طاقت نہ ہو*۔ سَأُرْهِقُهُ صَعُوداً (۷۴/۱۷)۔ میں اسے سخت مشقت میں مبتلا کرونگا۔

ر ھ ن

اَلرَّهْنُ۔ (جمع رِهَانٌ) وہ چیز جو بطور ضمانت تمہارے پاس، اس چیز کے بدلے میں رکھ دی جائے جسے تم سے عاریتاً لے لیا گیا ہو۔ رَهْنٌ لغت میں ثبوت اور استقرار (ٹھہرنے اور جم جانے) کےمعنوں میں آتا ہے،لیکن راغب کے نزدیک رَهْنٌ و رِهَانٌ وہ چیز ہے جو قرض میں بطور ضمانت رکھ لی جائے۔ لیکن اَلرِّهَانُ خاص طور پر اس چیزکو کہتے ہیں جو کسی مقابلہ میں شرط کے طور پر رکھ لی جائے۔ یہ زیادہ ترگھوڑ دوڑ کے لئے مستعمل ہے۔

* تاج و راغب۔ ** محیط۔

اَلرَّاهِنُ - ثابت اور تیار، موجود اور دائم - رَهَنَ الشَّيْءُ - چیز دائم اور ثابت رہی* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کا ایک حالت پر رہنا، خواہ وہ حق کے عوض ہو یا نا حق -

رِجْلُهٗ رَهِيْنَةٌ - اس کا پاؤں مقید ہے* - اَنَا رَهِيْنٌ بِكَذَا - میں فلاں بات میں ماخوذ ہوں** - قرآن کریم میں ہے كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (۵۲/۲۱) - ہر شخص اپنے اعمال کے عوض گرو ہے ، یعنی اس کی زندگی کا فیصلہ اس کے اعمال کے نتائج پر ہے - سورۃ بقرہ میں قرضہ کے سلسلہ میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان کے ضمن میں کہا ہے کہ اگر تم سفر میں ہو اور وہاں کاتب نہ ملے تو فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ (۲/۲۸۳) مستعاردی ہوئی چیزوں کے عوض کچھ چیزیں بطور ضمانت اپنے قبضے میں رکھ لینی چاہئیں- اس سے ہمارے ہاں کے ''رہن بالقبضہ'' کا جواز نکالنا (جو سود ہی کی دوسری شکل ہے) بڑی زیادتی ہے - ''رہن بالقبضہ'' کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ (مثلاً) ایک کسان نے کسی سے کچھ روپیہ بطور قرض لیا اور قرض دینے والے نے اس کی کچھ زمین بطور رہن لے لی - اس کے بعد اس زمین پر قرض دینے والے کا قبضہ ہوگا اور جب تک قرض ادا نہیں ہو جائے گا وہ اس کی پیداوار کھاتا جائے گا - (اور اس پیداوار کو قرض میں محسوب نہیں کرے گا)- اگر یہ ربوٰ نہیں تو اور کیا ہے؟

ر ھ و

اَلرَّهْوُ - دونوں ٹانگوں کے درمیان کی کشادگی - پانی کے جمع ہونے کی جگہ ، نیز سکون ، جس میں جوش و خروش نہ ہو - اَلرَّهَاءُ - ہموار اور کشادہ زمین - عَيْشٌ رَاهٍ - آسودہ و پرسکون زندگی - اَلرَّهْوَانُ - نشیبی زمین - وہ گھوڑا جس کی پشت دوڑتے وقت نرم ہو***- صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے اور ہبوط (نیچے آنا) اور ارتفاع (اوپر جانا) دونوں کے لئے آتا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) اطمینان اور سکون اور (۲) وہ جگہ جو کبھی بلند ہو جاتی ہو اور کبھی پست - قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ جب بنی اسرائیل کو لیکر چلے تو ان سے کہا گیا کہ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (۴۴/۲۴) - اس کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ تو سمندر کو پر سکون حالت میں چھوڑ دے - یعنے جب حضرت

*تاج - **محیط - ***تاج و راغب -

موسیٰؑ وھاں پہنچے ھیں تو سمندر سکون کی حالت میں تھا ۔ اس میں جوش و خروش نہیں تھا ۔ وہ اترا ھوا تھا اور اس طرح اس نے خشک راستہ چھوڑ دیا تھا ۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ میں ھے فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا (۲۰/۷۷)۔ "ان کے لئے سمندر میں خشک راستہ اختیار کر"۔ اور اگر رَهْوًا کے معنے کشادگی کے لئے جائیں تو بھی یہی مفہوم ھوگا کہ سمندر نے (پیچھے ھٹ کر) جو راستہ کشادہ کر دیا ھے انہیں وھاں سے لے چل ۔ جس جگہ پہلے سمندر ھو وہ پست (نشیب) ھوگی اور جب وھاں سے سمندر ھٹ جائیگا تو وہ، دوسری زمین کے مقابلہ میں (جو ھنوز زیرآب ھے) بلند ھو جائیگی۔

ر و ض

رَوْضَةٌ ۔ وہ زمین جہاں خوشنما پھول ، درخت اور پانی ھو ۔ خوشنما باغ جس میں نہر ھو ۔ ہر سبز و شاداب جگہ جس میں، یا جس سے متصل پانی ھو ۔ اس کی جمع رَوْضٌ و رِيَاضٌ و رَوْضَاتٌ ھے ۔ اگر پانی،نہ ھو تو اسے رَوْضَةٌ نہیں کہتے ۔ نیز پانی جمع ھو جانے کی جگہ ۔ أَرَاضَ الْقَوْمَ ۔ اس نے لوگوں کو سیراب کر دیا ۔ أَلتَّرِيَاضَةُ ۔ کسی سے بکثرت کوئی کام لیکر اسے اس کام میں ماھر و مشاق بنانا اور سدھانا*۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں (۱) وسعت اور فراخی (۲) کسی چیز کو نرم یا کسی کام کو آسان کرنا ھیں ۔

قرآن کریم میں ھے ۔ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ (۳۰/۱۵)۔ "وہ سرسبز مقام میں محفل موسیقی سے لطف اندوز ھونگے" اس کی جمع رَوْضَاتٌ (۴۲/۲۲) میں آئی ھے ۔

ر و غ

رَاغَ الرَّجُلُ رَوْغًا ۔ کسی تدبیر کی خاطر چپکے سے ایک طرف ھٹنا یا مائل ھونا اور کترانا** ۔ پھر بقول ابن فارس ، جھکنے اور ایک حالت پر نہ رھنے کے لئے بولا جاتا ھے ۔ رَاغَ فُلَانٌ إِلَى فُلَانٍ ۔ فلاں آدمی فلاں کی طرف چھپ کر مائل ھوا ۔ فراء نے کہا ھے رَاغَ إِلَى أَهْلِهِ کے معنے ھیں وہ اپنے اھل کی طرف اس طرح لوٹا کہ (سامنے والوں سے) اپنی واپسی یا اس کی غرض کو پوشیدہ رکھا ۔ أَرَاغَ ۔ إِرَاغَةً ۔ وَارْتَاغَ ۔ اس نے ارادہ کیا اور طلب کیا ۔ رِوَاغَةٌ ۔ رِيَاغَةٌ ۔ اکھاڑہ** ۔

---

*تاج و راغب ۔ **تاج و محیط و راغب

قرآن کریم میں قصہ حضرت ابراھیم میں ہے فَرَاغَ اِلٰی اٰلِهَتِهِمْ (۳۷/۹۱) ۔ اور فَرَاغَ عَلَيْهِمْ (۳۷/۹۳) ۔ رَاغَ اِلٰی کے معنی ہیں اپنے ارادے کو دل میں رکھ کر کسی کی طرف متوجہ ہونا ۔ اور رَاغَ عَلٰی کے معنی ہیں غلبہ کے ساتھ کسی پر ٹوٹ پڑنا* ۔ لہذا حضرت ابراھیم کی تدبیر ایسی تھی جس میں ارادے کی پوشیدگی کا پہلو بھی تھا اور قوت و غلبہ کا بھی ۔

ر ی ب

رَیْبٌ ۔ یہ اصل میں نفسیاتی الجھن اور اضطرابِ نفس کے معنوں میں آتا ہے** ۔ نیز شک و شبہ اور بے چینی کو بھی رَیْبٌ کہدیتے ہیں*** ۔ نیز گمان اور تہمت کو بھی*** ۔ اسکے علاوہ حوادثِ روزگار گردش زمانہ اور ضرورت و حوائج کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی شک کے ہیں یا شک اور خوف کے ۔ اَلرِّیْبَۃُ ۔ جو چیز شک و اضطراب پیدا کردے ۔ نیز حاجت اور ضرورت کو بھی کہتے ہیں ۔ رَابَنِی الْاَمْرُ رَیْبًا کے معنے ہیں مجھے فلاں معاملہ نے شک و شبہ میں ڈالا*** ۔

سورۃ توبہ میں (مسجد ضرار کے ضمن میں) رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ (۹/۱۱۰) آیا ہے ۔ اس کے معنے اضطراب اور بے چینی کے ہیں ۔ سورۃ ابراھیم (۱۴/۹) اور سورۃ السبا (۳۴/۵۴) نیز دیگر مقامات میں مُرِیْبٌ ، شَکٌّ کی صفت بن کر آیا ہے ۔ شَکٌّ مُرِیْبٌ ۔ یعنے اضطراب اور بے چینی پیدا کر دینے والا شک ۔ (۴۰/۳۴) میں مُرْتَابٌ آیا ہے ۔ یعنی شک کرنے والا ۔ اور (۲۹/۴۸) میں اِرْتَابَ بمعنی شک کیا ۔ سورۃ الطور میں رَیْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰) کے معنے ہیں حوادثِ روزگار یا زمانہ کی اضطراب انگیزیاں جن کا مقابلہ حقائق تو کرسکتے ہیں ، شاعرانہ جذبات پرستی نہیں کرسکتی ۔

لہذا رَیْبٌ کے بنیادی معنے شک و شبہ کی وجہ سے اضطراب نفس کے ہونگے ۔ قرآن کریم نے اپنے متعلق شروع ہی میں کہدیا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ (۲/۲) ۔ یہ وہ ضابطۂ حیات ہے جس میں کوئی بات ایسی نہیں جو شک و شبہ والی ہو اور اس کی وجہ سے انسان کے دل میں کسی قسم کا اضطراب اور کشمکش باقی رہے ۔ اس میں کامل سکون و اطمینان دینے والی تعلیم ہے ۔ اضطراب اور بے چینی کے لئے اس میں کوئی

*تاج و محیط و راغب **محیط ۔ لیکن اقرب الموارد میں یہ معنی الریبة کے دئے ہوئے ہیں ۔ ***تاج ۔

گنجائش نہیں ۔ اس لئے کہ یہ یکسر علم و بصیرت پر مبنی اور دلائل و براھین پر قائم ہے ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح اطمینان علم و براھین ھی سے حاصل ھوسکتا ہے ۔ اندھی عقیدت مندیوں اور توھم پرستیوں سے نہیں ۔

ر ی ش

اَلرِّیْشُ ۔ اَلرِّیَاشُ ۔ پرندے کے پر جن سے خدا ان کے جسم کو چھپاتا ہے * ۔ انسانوں کے لباس فاخرہ اور زینت کو بھی اَلرِّیْشُ کہتے ھیں ۔ نیز خوشحالی اور معاش کی فراخی کو ۔ چنانچہ رَاشَ فُلَانًا کے معنے ھیں معاش کے سلسلہ میں اسکی مدد کی اور اسے تقویت پہنچائی ۔ اسکی حالت کو درست کر دیا اور اسے نفع پہنچایا ۔ رَاشَ الرَّجُلُ ۔ آدمی آسودہ و مالدار ھو گیا * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی خوش حالی کے ھیں ۔ نیز وہ عمدہ چیزیں جنہیں انسان حاصل کرتا ہے ۔

قرآن کریم میں لباس کے متعلق ہے کہ وہ تمہارا ستر بھی ڈھانپتا ہے اور رِیْشًا (۷/۲۶) باعث زینت بھی ہے ۔ قرآن کریم اشیائے کائنات کے صرف افادی پہلو (Utilitarian Aspect) ھی کی اھمیت پیش نہیں کرتا ، ان کے جمالیاتی گوشوں (Aesthetic Aspects) کو بھی برابر کی اھمیت دیتا ہے ۔ حسن فطرت کی تمام رعنائیاں اور دل ربائیاں ، خالق فطرت کے اسی انداز تخلیق کی مظہر ھیں ۔ یعنی ھر شے میں افادی اور جمالیاتی پہلو ۔ مومن کی زندگی بھی ان دونوں گوشوں کی مظہر ھونی چاھیئے ۔

ر ی ع

رَیْعٌ ۔ ھر چیز کا بڑھا ھوا اور زائد حصہ ۔ نیز ھر چیز کا اول اور افضل حصہ ۔ رَاعَ الطَّعَامُ وَغَیْرُہٗ ۔ غلہ وغیرہ زیادہ ھوا ، بڑھا ، بکثرت ھوا ۔ رِیْعٌ ۔ رَیْعٌ ۔ بلند زمین یا بلند جگہ ۔ کَمْ رِیْعُ اَرْضِکَ ۔ تمہاری زمین کی بلندی کسقدر ہے ۔ ھر راستہ یا دو پہاڑوں کے درمیان کا راستہ ، نیز پہاڑ ۔ اَلرِّیْعُ ۔ بلند ٹیلہ ۔ وادی کی بلند جگہ جہاں سے پانی بہ کر نیچے آتا ھو ۔ گرجا ۔ رَیْعَانُ الشَّبَابِ ۔ جوانی کا ابتدائی حصہ ۔ نَاقَۃٌ رَیْعَانَۃٌ ۔ بہت دودھ دینے والی اونٹنی * ۔

قرآن کریم میں ہے اَتَبْنُوْنَ بِکُلِّ رِیْعٍ اٰیَۃً تَعْبَثُوْنَ (۲۶/۱۲۸) "کیا تم ھر بلند مقام پر (اپنی عظمت کی یادگار کے طور پر) کوئی نہ کوئی نشان

* تاج ۔

بنا لیتے ہو؟ اور وہ بھی بلا ضرورت''۔ اس سے مراد بلند عمارتیں ہیں جنہیں بطور یادگار (Memorials) بنایا جاتا ہے۔ اور جن کا مصرف کچھ نہیں ہوتا۔ یادگار وہی بہتر ہو سکتی ہے جو آنے والوں کے لئے نفع بخش ہو۔

ر ی ن

رَیْنٌ۔ وہ زنگ جو کسی صاف چیز پر لگ جائے*۔ میل کچیل کو بھی کہتے ہیں**۔ رانَ ھَوَاہُ عَلٰی قَلْبِہٖ بِرَیْنٍ۔ اسکی خواہشات اسکے دل پر غالب آگئیں۔ رِیْنَ بِالرَّجُلِ۔ آدمی ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو گیا جس سے نکلنا اسکے بس میں نہیں رہا۔ اَلرَّیْنَۃُ۔ شراب کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ عقل پر غالب آجاتی ہے***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ڈھانکنے کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے رَانَ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۸۳/۱۵)۔ "اُن کے اعمال اُن کے دل پر زنگ بن کر چھا گئے"۔ غور کیجئے۔ دلوں پر مہریں کہیں باہر سے نہیں لگتیں۔ انسان کے اپنے اعمال ہی زنگ اور مہریں بن جاتے ہیں۔ اسی کو خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ (۲/۷) کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ خدا کے قانون مکافاتِ عمل کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی انسانوں کے اعمال، جن کا نتیجہ خدا کے قانون مکافات عمل کی رو سے یہ ہوتا ہے کہ انسان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ وہ سطحی جذبات میں ایسا ڈوبتا ہے کہ غور و فکر کے راستے اس پر مسدود ہو جاتے ہیں۔

---

* راغب۔ ** تاج۔ *** محیط۔

ز

ز ب د

اَلزَّبَدُ - پانی وغیرہ کے اوپر آجانے والے جھاگ *۔ قرآن کریم میں ہے زَبَدًا رَّابِیًا (۱۳/۱۷)۔ اوپر آئے ہوئے جھاگ ۔ اَلزُّبْدُ ۔ مسکہ جس سے گھی بنایا جاتا ہے ۔ تَزَبَّدَہٗ ۔ اس نے اس کا خلاصہ لے لیا* ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے ایک چیز سے دوسری چیز پیدا ہونے کے ہیں ۔ راغب نے لکھا ہے کہ بطور استعارہ زَبَدٌ کثیر شے کے لئے بولا جاتا ہے ۔

ز ب ر

اَلزَّبْرُ ۔ لکھنا ۔ اَلتَّزْبِرَۃُ ۔ لکھائی یا تحریر ۔ مِزْبَرٌ ۔ قلم ۔ اَلزَّبُوْرُ ۔ بمعنے مَزْبُوْرٌ ۔ یعنی لکھی ہوئی چیز ۔ کتاب * ۔ اسکی جمع زُبُرٌ ہے ۔

سورۃ نحل میں ہے کہ رسولوں کو اَلْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ دیکر بھیجا گیا (۱۶/۴۴) نیز (۲۶/۱۹۶)۔ یہاں زُبُرٌ کے معنے کتابیں ہیں ۔ دوسرے مقامات پر بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْکِتٰبِ الْمُنِیْرِ (۳/۱۸۳؛ ۳۵/۲۵) آیا ہے ۔ یہاں زُبُرٌ کی تفسیر کتاب منیر سے کی گئی ہے ۔ سورۃ انبیاء میں ہے وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ (۲۱/۱۰۵) ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں زَبُوْرٌ سے مراد حضرت داؤدؑ کی کتاب ہے اور ذِکْرٌ سے مراد تورات ہے ۔ لیکن سعید بن جبیر کا قول ہے کہ زَبُوْرٌ ، تورات ۔ انجیل ۔ قرآن کریم ۔ ہر ایک کتاب الٰہی کو کہتے ہیں * ۔ اسکی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سورۃ نساء میں ہے وَآتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (۴/۱۶۳) اگر زبور سے مراد وہ خاص کتاب ہوتی جو حضرت داؤدؑ کو دی گئی تھی تو

---

* تاج ۔

زَبُوْرًا (ایک کتاب) نکرہ نہ ہوتا بلکہ القرآن اور الانجیل کی طرح الزبور ہوتا ۔ راغب نے لکھا ہے کہ ہر وہ کتاب جس کی کتابت بڑی موٹی ہو زَبُوْرٌ کہلاتی ہے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) لکھنا پڑھنا اور (۲) کسی چیز کو محکم اور مضبوط کرنا ہیں ۔
اَلزُّبْرَۃُ ۔ لوہے کا بڑا ٹکڑا *۔ اسکی جمع زُبَرٌ اور زُبُرٌ آتی ہے ۔ (۱۸/۹۶)۔
اسی سے اسکے معنے فرقے ۔ الگ الگ گروہ ، کے آتے ہیں ۔ (۲۳/۵۳)۔

(چونکہ زُبُرٌ ۔ زَبُوْرٌ کی بھی جمع ہے اس لئے (۲۳/۵۳) میں اس کے معنی الگ الگ کتابیں بھی ہو سکتے ہیں) ۔

ز ب ن

اَلزَّبْنُ ۔ دھکا دینا ۔ دفع کرنا ۔ کسی چیز کو کسی چیز سے دور کر دینا اور ہٹا دینا ۔ اَلزَّبِنُ ۔ سخت دھکا دینے والا ۔ نَاقَۃٌ زَبُوْنٌ ۔ وہ اونٹنی جو دودھ دوھنے والے کو لات مار دے اور دھکا دیدے ۔ حَرْبٌ زَبُونٌ ۔ شدید جنگ جس میں سخت ٹکراؤ ہو*۔ لڑائی کو اسکی صعوبتوں کی وجہ سے زَبُوْنٌ کہتے ہیں ***۔ اَلزِّبْنِیَۃُ ۔ ہر متمرد آدمی ۔ سخت آدمی ۔ سپاہی ۔ اسکی جمع زَبَانِیَۃٌ آتی ہے *۔ (۹۶/۱۸) ۔ وہ مجاہدین جو حق کی مدافعت کے لئے میدان میں نکلیں ۔

ز ج ج

اَلزُّجُّ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے باریک ہونے کے ہیں ۔ نیزہ کی پچھلی طرف لگا ہوا لوہا ۔ نیز کہنی کا نوکیلا سرا ۔ اَلزُّجَاجُ ۔ کانچ اور شیشے اور ان سے بنی ہوئی چیزوں کو کہتے ہیں ۔ واحد زُجَاجَۃٌ ہے****۔ قرآن کریم میں چراغ کے متعلق ہے فِیْ زُجَاجَۃٍ (۲۴/۳۵) ۔ اس سے مراد ہے شیشے کی چمنی یا فانوس ۔

جب پیالہ بھرا ہوا ہو تو اسے کَاْسٌ کہتے ہیں اور جب خالی ہو تو زُجَاجَۃٌ کہلاتا ہے*****۔

ز ج ر

زَجَرَہٗ ۔ یَزْجُرُہٗ ۔ زَجْرًا نیز اِزْدَجَرَہٗ ۔ اسنے اسکو روکا اور منع کیا اور جھڑکا ۔ دراصل اسکے معنے آواز کے ساتھ کسی کو ہانک دینا اور

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** کتاب الاشتقاق ۔ **** تاج و راغب ۔
***** لطائف اللغۃ نیز فقہ اللغۃ ۔ (للثعالبی) ۔

دھتکارنا ھیں۔ زَجَرَ الْبَعِیْرَ ۔ اسنے اونٹ کو ڈانٹ کر ھانکا ۔ اَلزَّجُوْرُ ۔ وہ اونٹنی جو بلا ڈانٹ کھائے دودھ نہ دیتی ھو* ۔ اس لئے اس لفظ میں ڈانٹنے اور جھڑکنے کا پہلو ھوتا ھے ۔

قرآن کریم میں ھے فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا (۳۷/۲) ۔ اس سے مراد وہ جماعت مجاھدین ھے جو سرکش اور مستبد قوتوں کو ان کی دست درازیوں سے ڈانٹ کر روکتی ھے ۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ھے فَاِنَّمَا ھِیَ زَجْرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ (۳۷/۱۹) "وہ صرف ایک ھی ڈانٹ ھوگی" ۔ سورۃ القمر میں ھے مَافِیْہِ مُزْدَجَرٌ (۵۴/۴) ۔ جس میں ایسی باتیں ھیں جو مفاسد سے روکتی ھیں ۔ اس سے ذرا آگے ھے مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ (۵۴/۹)۔ انہوں نے اسے مجنون قرار دیا اور ڈانٹ کر نکال دیا ۔ مفاد پرست گروہ اپنی قوت اور اقتدار کے نشہ میں ھر داعی الی الحق کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کرتے ھیں ۔

ز ج و

زَجَاہُ ۔ یَزْجُوْہُ ۔ زَجْوًا ۔ وَاَزْجٰی اِزْجَاءً ۔ کسی چیز کو نرمی اور آھستگی سے ھانکنا۔ نرمی سے چلانا** ۔ قرآن کریم میں ھے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُزْجِیْ سَحَابًا (۲۴/۴۳) ۔ کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ اللہ بادلوں کو آھستگی اور سہولت سے چلاتا ھے ۔ زَجَا الْاَمْرُ ۔ معاملہ آسان اور سیدھا ھو گیا۔ اَلْمُزْجٰی ۔ قلیل چیز** ۔

بِضَاعَۃٌ مُّزْجَاۃٌ (۱۲/۸۸) ۔ قلیل سرمایہ ۔ تھوڑی سی پونجی** ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کو بغیر کسی روک ٹوک کے پھینکنا اور چلا دینا ھیں ۔ یعنی جسے آسانی سے نکالا اور روانہ کر دیا جائے ۔ بِضَاعَۃٌ مُّزْجَاۃٌ سے مراد ھوگی ایسی پونجی جسے آسانی سے نکال کر دیا جاسکے ۔

ز ح ز ح

زَحْزَحَہٗ عَنْہُ کے معنی ھیں اسے اس سے دور کر دیا ، ھٹا دیا ، ایک طرف کر دیا ۔ ھُوَ بِزَحْزَحٍ مِّنْہُ ۔ وہ اس سے دوری پر ھے ۔ اَلزَّحْزَاحُ دور ۔ بعید ۔*** ابن فارس نے کہا ھے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ھیں ۔

---

*تاج و راغب و محیط ۔ **تاج و راغب ۔***تاج

قرآن کریم میں ہے وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ (۲/۹۶) وہ (طولِ عمر) اس کو عذاب سے دور نہیں رکھ سکتا۔ سورۃ آل عمران میں ہے فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ (۳/۱۸۴)۔ جو تباہیوں سے دور رکھا گیا۔

ز ح ف

زَحَفَ اِلَيْهِ زَحْفًا۔ اس کی طرف آگے بڑھا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے کی طرف بڑھتے چلے آنا ہیں۔ اصل میں زَحْفٌ بچے کے کولھے کے بل گھسٹ گھسٹ کر چلنے کو کہتے ہیں*۔ گھٹنوں کے بل چلنے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے**۔ زَحَفَ الْبَعِيْرُ۔ اونٹ تھکن کی وجہ سے اپنے پاؤں کو گھسیٹ گھسیٹ کر چلنے لگا*۔ اَلزَّحَّافَةُ۔ وہ حیوانات جو زمین پر گھسٹ کر چلتے ہوں۔ جیسے کچھوا وغیرہ**۔ پھر زَحَفَ فوجوں کے چلنے کے لئے بولا جانے لگا کیونکہ وہ کثرت و گرانباری کی وجہ سے آہستہ گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتی ہیں۔ چنانچہ اَزْحَفَ لَنَا بَنُوْ فُلَانٍ کے معنے ہیں، فلاں قبیلہ ہم سے لڑنے کے لئے مذکورہ بالا کیفیت سے آیا۔ تَزَاحَفُوْا فِي الْقِتَالِ۔ وہ جنگ میں ایک دوسرے کے قریب اور بالمقابل ہو گئے۔ مَزَاحِفُ الْقَوْمِ۔ قوم کی لڑائیوں کے مقامات*۔ الزَّحْفُ۔ جرار لشکر کو بھی کہتے ہیں جو دشمن کی طرف بڑھ رہا ہو۔ سورۃ انفال میں ہے اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا (۸/۱۵)۔ جب تمہارا کفار کے ساتھ آمنا سامنا ہو درآنحالیکہ وہ تمہاری طرف بڑھ رہے ہوں۔

ز خ ر ف

اَلزُّخْرُفُ۔ سونا (جسکے زیورات بنتے ہیں)۔ یہ اس کے اصلی معنے ہیں۔ اس کے بعد زیبائش، زینت و آرائش کو بھی زُخْرُفٌ کہنے لگ گئے۔ اور پھر بطور تشبیہ ہر ملمع کی ہوئی جھوٹی بات کو***۔ محیط نے سونا یا زینت دونوں میں سے ایک کے اصلی معنی ہونے میں شک کیا ہے**۔ زُخْرُفٌ کے معنے کسی چیز کے حسن کا کمال بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں زُخْرُفَ الْقَوْلِ (۶/۱۱۳) آیا ہے، جس کے معنے ملمع کی ہوئی باتیں ہیں۔ اور حَتّٰى اِذَا اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا (۱۰/۲۴) میں اس کے معنے سنگھار اور آرائش کے ہیں۔ سورۃ زخرف میں زُخْرُفًا (۴۳/۳۵) کے معنے سامانِ آرائش ہیں یا خود آرائش و نقش و نگار۔ راغب نے زُخْرُفٌ کے معنے مصنوعی زینت کئے ہیں****۔

*تاج۔ **محیط۔ ***تاج و محیط۔ ****راغب۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی زینت کے ہیں اور سونے کو بھی کہا جاتا ہے۔ راغب نے بھی اس کی تائید کی ہے ۔

ز ر ب

اَلزَّرْبُ ۔ داخل ہونے کا راستہ ۔ بکریوں وغیرہ کے لئیے لکڑیوں کا باڑہ ۔ اَلزَّرَابِیُّ ۔ (واحد زُرْبِیٌّ یا زَرْبِیَّۃٌ ہے) گدے ۔ بچھونے ۔ ہر وہ چیز جس پر ٹیک لگائی جائے ۔ فراء نے کہا ہے کہ زَرَابِیٌّ ۔ روئیں دار غالیچوں کو کہتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ یہ معنے اَلزَّرَابِیُّ مِنَ النَّبْتِ ۔ سے تشبیہ کے باعث پیدا ہوگئے ہوں جو ایسے زرد سرخ پودوں کو کہتے ہیں جن میں سبزی ہو* ۔ اَلزَّرْبِیَّۃُ ۔ عمدہ بچھونا یا قالین** ۔ قرآن کریم میں زَرَابِیُّ مَبْثُوْثَۃٌ آیا ہے (۸۸/۱۶) ۔ اعلی درجے کے بچھائے ہوئے فروش ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ زَرْبٌ کے بنیادی معنوں میں راحت کدہ یا آرامگاہ کا تصور مضمر ہے ۔

ز ر ع

زَرَعَ ۔ یَزْرَعُ ۔ زَرْعًا وَ زِرَاعَۃً ۔ زمین میں بیج ڈالنا۔ اَلزَّرْعُ اُگانا* ۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نشو و نما دینے اور بڑھانے کے ہیں۔ لہذا، جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا ، اس کے معنے بیج ڈالنے کے نہیں بلکہ کھیتی اُگانے کے ہونگے ۔ انسان زمین کو تیار کرکے اس میں تخم ریزی کرتا ہے اور مناسب احتیاطیں برتتا ہے لیکن دانے میں سے کونپل پھوٹنا اور اس کا پودا اور پیڑ بن جانا، یہ سب کچھ خدا کے قانونِ ربوبیت کے ماتحت ہوتا ہے جس میں انسان کے کسب و ہنر کو کوئی دخل نہیں ۔ اس لئیے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (۵۶/۶۴) ۔ ”کیا کھیتی کو تم اُگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں !“ تم صرف حَرْثٌ کرتے ہو (۵۶/۶۳) ۔ یعنے تم صرف کھیتی بوتے ہو ۔ اُگاتے ہم ہیں ۔ لہذا تم ساری کی ساری فصل کے مالک کیسے بن سکتے ہو؟ تم اپنی محنت کا حصہ لے لو اور ہمارا حصہ ہمیں دے دو ۔ یعنے اُن لوگوں کو دے دو جنہیں اس کی ضرورت ہے (۵۶/۷۳) ۔

اَلزُّرَّاعُ (۴۸/۲۹) ۔ کھیتی کرنے والے ۔ باغبان ۔ (واحد زَارِعٌ) زَرْعٌ ۔ کھیتی ۔ بونے سے جو کچھ اُگ آئے* ۔ (۱۳/۴ و ۶/۱۴۲) ۔

*تاج ۔ **محیط ۔

ز ر ق

اَلزُّرَقُ - نیلا رنگ - اَلزُّرْقَۃُ : نیلاھٹ - سفیدی - آنکھ کی سیاھی میں سبزی - آنکھ کی سیاھی پر سفیدی کا چھا جانا - زَرِقَ - اس کی آنکھوں کی سیاھی پر سفیدی چڑھی۔ ایسا شخص آزْرَقُ کہلائیگا۔اس کی جمع زُرْقٌ ھے - الزُّرَقُ - اندھے پن کو کہتے ھیں - زَرِقَتْ عَيْنُهُ تَزْرَقُ - آنکھوں کا نیلا ھو جانا* - قرآن کریم میں ھے نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا (۲۰/۱۰۲) - (زُرْقٌ جمع ھے۔ اس کا واحد آزْرَقُ ھے) - حشر میں ھم مجرمین کو اندھا اٹھائینگے ، ان کی آنکھوں کی سیاھی پر سفیدی چھائی ھوگی - راغب نے بھی لکھا ھے کہ زُرْقًا کے معنے ھیں اندھے - جن کی آنکھوں میں نور نہ رھے** - اس سے آیت کا مفہوم واضح ھو جاتا ھے - بعض اھل لغت کا خیال ھے کہ عربوں کی رومیوں سے قدیم دشمنی تھی اور انکی آنکھیں نیلی تھیں اس لئے ھر مبغوض اور دشمن کو آزْرَقُ الْعَيْنِ کہا جانے لگا،خواہ اس کی آنکھ نیلی نہ ھو*** لیکن ھم اول الذکر توجیہ کو بہتر تصور کرتے ھیں،اس لئے کہ اسے قرآنی تائید بھی حاصل ھے۔ چنانچہ اسی سورت میں کچھ آیات کے بعد نَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴) ھے - یعنی "ھم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائینگے" -

ز ر ی

زَرَى عَلَيْهِ عَمَلَهُ - اس کے کسی کام پر اسے ملامت کرنا ، برا بھلا کہنا - عتاب کرنا - حقیر جاننا اور اس پر عیب لگانا۔ اِزْدَرَاهُ - اسے حقیر و بے وقعت گردانا - اَلْمُزْدَرِیُ - حقیر جاننے والا**** -

قرآن کریم میں ھے تَزْدَرِیُ اَعْيُنُكُمْ (۱۱/۳۱)- وہ لوگ جو تمہاری نگاھوں میں حقیر ھیں - (باب افتعال ھے - تاء ، دال سے بدل گئی ھے)

ز ع م

اَلزَّعْمُ - اَلزُّعْمُ - اَلزِّعْمُ - بات - قول - جو حق بھی ھو سکتی ھے اور باطل بھی - لیکن اکثر ان باتوں کو کہا جاتا ھے جن کے بارے میں شک کیا جاتا ھو اور وہ متحقق نہ ھوں - لیث نے کہا ھے کہ جب عرب کہتے ھیں ذَكَرَ فُلَانٌ تو یہ ایسے معاملات کے متعلق بات ھوتی ھے جس کی بابت یقین

*تاج - **راغب - ***محیط و کشاف - ****تاج و محیط و راغب -

ہو کہ وہ حق ہے ۔ لیکن اگر شک ہو اور اس کا یقین نہ ہو کہ کہنے والے نے سچ کہا ہے یا جھوٹ ، تو ایسی جگہ زَعَمَ فُلَانٌ* کہتے ہیں ۔ اس لحاظ سے بعض نے تو یہاں تک کہدیا ہے کہ زَعْمٌ کے معنے ہی جھوٹ ہیں ۔ اَلتَّزَعُّمُ ۔ جھوٹ گھڑنا ۔ علمائے لغت نے کہا ہے کہ زَعَمُوْا ایسی باتوں کو کہتے ہیں جن کی نہ کوئی سند ہو نہ ثبوت ، بلکہ یونہی زبانی نقل ہوتی چلی آرہی ہوں ، کہ اس نے اس سے کہا اور اس نے اس سے* ۔ اصل میں اس کے معنوں میں ظن اور توقع کا پہلو شامل ہوتا ہے ۔

صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلزَّعْمُ ۔ اکثر ان باتوں کو کہا جاتا ہے جن میں شک ہو یا جن کے جھوٹا ہونے کا عقیدہ دل میں ہو ۔ بعض لوگوں نے قول بلا دلیل کو زَعْمٌ کہا ہے ۔ بعض نے ادعائے علم (یعنی کسی بات کے جاننے کا دعویٰ کرنے) کو کہا ہے ۔ بعض کے نزدیک زعم کا تعلق اعتقاد سے ہے ، خواہ صحیح ہو یا غلط** ۔ راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں یہ لفظ ہمیشہ اس موقع پر آیا ہے جہاں کہنے والے کی مذمت مقصود ہو*** ۔

قرآن کریم میں ہے زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا (۶۴/۷) ۔ ''حقیقت سے انکار کرنے والے خیال کرتے ہیں کہ وہ اٹھائے نہیں جائیں گے'' ۔ سورۃ انعام میں ہے بِزَعْمِهِمْ (۶/۱۳۷) ۔ اس کے معنے گمانِ باطل کے ہیں ۔ زَعَمَ بِهٖ : اس کی ذمہ داری لی ، ضامن ہوا ۔ اسی سے اَلزَّعِيْمُ ۔ ذمہ دار اور کفیل کو کہتے ہیں (۱۲/۷۲ و ۶۸/۴۰) ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں (۱) بغیر صحت اور یقین کے کوئی بات کہدینا ۔ اور (۲) کسی چیز کا ذمہ دار اور کفیل بن جانا ۔

ز ف ر

زَفَرَ ۔ يَزْفِرُ ۔ زَفِيْرًا ۔ سانس کو کھینچ کر نکالنا* ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنے ہیں سانس کا بار بار پلٹنا تاآنکہ اس کی وجہ سے سینہ پھول جائے*** ۔ (جیسے سسکیاں بھرنے میں ہوتا ہے) اس کا بیشتر استعمال گدھے کے رینکنے کی ابتدائی آواز پر ہوتا ہے اور اس کے برعکس شھیق اس کی آواز کے آخری حصہ کو کہتے ہیں ، اس لئے کہ زفیر سانس اندر کی طرف

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

کھینچنے کو کہتے ھیں اور شَهِیْق* سانس کے باھرنکالنے کو*۔ قرآن کریم میں زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْق* (۱۱/۱۰۶) اکٹھا آیا ھے ۔ اس کے معنے (آھیں بھرنے ، سسکنے اور واویلا کرتے ھوئے) جھخنے چلانے کے ھیں (۲۱/۱۰۰)۔ اَلزَّفِیْرُ ۔ آگ کے بھڑکنے کی آواز کو بھی کہتے ھیں* ۔ (۲۵/۱۲) ''اور اس کا اطلاق ناگہانی مصیبت کے لئے بھی ھوتا ھے*۔ اَلزِّفْرُ ۔ جو بوجھ کمر پر لدا ھو اسے کہتے ھیں ۔ مسافر کا سامان سفر۔ مشکیزہ جس میں چرواھا اپنے لئے پانی لے جاتا ھے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی بوجھ اور آواز دونوں لکھے ھیں ۔

ز ف ف

اَلزَّفِیْفُ ۔ کے اصلی معنے ھوا کے تیز چلنے کے ھیں ۔ نیز شتر مرغ کی وہ تیز رفتار جس میں وہ چلنے کے ساتھ اڑنے کو بھی ملا دیتا ھے** ۔ زَفَّ الْبَعِیْرُ ۔ اونٹ نے چلنے میں تیزی کی ۔ اَلزَّفُّ زَفَّ ۔ تیز رفتار شتر مرغ ،نیز خوش رفتار اونٹنی ۔ الزَّفِیْفُ ۔ بجلی کی چمک کو بھی کہتے ھیں ۔ زَفَّ الْعَرُوْسَ اِلٰی زَوْجِهَا زَفًّا وَّ زِفَافًا ۔ اس نے دلھن کو شوھر کے پاس پیش کیا* ۔ (اس میں پیش کرنے والوں کے شدت شوق کا پہلو نمایاں ھے)۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی ھر چیز میں پھرتیلا پن اور تیز خرامی کے ھیں ۔

قرآن کریم میں ھے فَاَقْبَلُوْا اِلَیْهِ یَزِفُّوْنَ (۳۷/۹۴) ۔ ''وہ اس کی طرف تیزی سے آئے'' ۔ (اس میں جذبات کی شدت کا پہلو نمایاں ھے)۔

ز ق م

اَلزَّقْمُ ۔ لقمہ بنانا ۔ نگل لینا ۔ اَزْقَمَهُ الشَّیْءَ ۔ اس نے اسے کوئی چیز بطور لقمہ دی اور اسے نگلوائی*۔ راغب نے لکھا ھے کہ زَقَمَ اور تَزَقَّمَ سے مراد کسی ناپسندیدہ چیز کونگلنا ھے** اَلزَّقُّوْمُ ۔ ایک جنگلی پودہ کا نام ھے جس میں کڑوی سی تیز بو ھوتی ھے اور اس کے چھوٹے گول پتوں کے کنارے بہت بدھیئت ھوتے ھیں اور تنے میں موٹی موٹی گانٹھیں ھوتی ھیں۔ قرآن کریم نے کہا ھے طَلْعُهَا کَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیَاطِیْنِ (۳۷/۶۵) ۔ اس کے خوشہ کا خول ایسا ھے جیسے سانپ کا پھن ھو۔ اس سے مترشح ھوتا ھے کہ یہ پودا ناگ پھنی تھوھر کا ھوگا ۔ لیکن پودا کوئی بھی ھو ، قرآن کریم نے جس کیفیت کے لئے تشبیھاً اس لفظ کا استعمال کیا ھے وہ ظاھر ھے ۔ ثعلب نے کہا کہ اَلزَّقُّوْمُ ھر اس کھانے کو کہتے ھیں جو زھریلا اور قاتل ھو* ۔ اور

*تاج ۔ **راغب ۔

صاحب محیط نے لکھا ہے* ۔ کہ عوام میں اسے بطور ضرب المثل اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص ایسی چیز کھا لے یا کوئی ایسا کام کرے جو اس کے لئے وبال جان بن جائے ۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْٓ اَصْلِ الْجَحِیْمِ (۳۷/۶۴) ۔ وہ ایک ایسا درخت ہے جو جہنم (جحیم) کی جڑوں میں اگتا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد کوئی سچ مچ کا درخت نہیں، کیونکہ جہنم کی جڑ میں کونسا درخت اُگ سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد اس قسم کا رزق ہے جس سے انسانیت جل کر راکھ ہو جائے ۔ اس کے خوشے بڑے بڑے سرکش و مستبد لوگوں (شیاطین) کے سروں جیسے ہونگے ۔ یعنی ظلم و استبداد سے حاصل کردہ رزق ۔ اسی کو شَجَرَةٌ مَّلْعُوْنَةٌ بھی کہا گیا ہے (۱۷/۶۰) اور طَعَامُ الْاَثِیْمِ بھی (۴۴/۴۴) ۔ یعنے ایسا رزق جس سے انسان کی قوتیں مضمحل اور صلاحیتیں افسردہ ہوجائیں اور وہ زندگی کی صحیح خوشگواریوں سے محروم رہ جائے ۔ یہ ان لوگوں کا رزق ہے جو اپنے آپ کو (بزعم خویش) بڑا صاحب عزت و تکریم سمجھتے ہیں (۴۴/۴۹) ۔ یعنے مُتْرَفِیْنَ کا طبقہ (۵۶/۴۵) جو دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت اور حکومت کرنے کے خوگر ہوں ۔ اس رزق سے پیٹ تو ضرور بھر جاتا ہے (۳۷/۶۶) لیکن انسانیت نشو و نما نہیں پاسکتی (۳۷/۶۸) ۔

سورة بنی اسرائیل میں جو اَلشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ (۱۷/۶۰) آیا ہے اور جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ، ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد وہ شَجَرَةٍ خَبِیْثَةٍ ہو جس کا ذکر (۱۴/۲۶) میں آیا ہے ۔ یعنی باطل نظریۂ حیات ۔ بہر حال یہ تمام بیانات تشبیہی ہیں ۔

زکریا علیہ السلام

قرآن کریم نے انبیائے بنی اسرائیل کے ضمن میں حضرت زکریا[۴] کا نام بھی لیا ہے (۶/۸۵) ۔ ان کے متعلق سورة آل عمران (۳/۳۷-۴۰) ۔ سورة مریم (۱۹/۲-۱۵) اور سورة انبیاء (۲۱/۸۹-۹۰) میں مذکور ہے کہ وہ خود عمر رسیدہ تھے اور ان کی بیوی عقیم ۔ لیکن ان کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت بیدار کر دی گئی (۲۱/۹۰) اور ان کے ہاں حضرت یحیٰ[۴] پیدا ہوئے ۔ حضرت مریم[۴] کو انہی کی کفالت میں دیا گیا تھا (۳/۳۷) ۔

لوقا کی انجیل میں ہے کہ "یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے قبیلہ میں زکریا نام ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں

*محیط ۔

سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا - ان کے ہاں اولاد نہیں تھی کیونکہ الیشبع بانجھ تھی" -

تورات (عہد نامہ قدیم) میں ذکریاہ نام کے ایک نبی کا ذکر آیا ہے - اسرائیلیوں کے ہاں ہیکل کے ایک بہت بڑے منصب دار کو نبی کہتے تھے جس کا ترجمہ کاهن کیا جاتا ہے - لیکن قرآن کریم کی رو سے نبی کا تصور اس سے بالکل مختلف ہے - حضرت زکریاؑ کو قرآن کریم نے زمرۂ انبیاء کرام میں شمار کیا ہے -

ز ک و

زَكَا الْمَالُ وَالزَّرْعُ - يَزْكُوْ - زُكُوًّا وَاَزْكَىٰ - جانوروں کا اور کھیتی کا پھلنا - پھولنا - بڑھنا - نشو و نما پانا - اَزْكَى اللّٰهُ الْمَالَ وَ زَكَّاهُ - خدا نے مال کو نشو و نما دی - بڑھایا - زَكَا الرَّجُلُ يَزْكُوْ - آدمی آسودہ اور خوش حال ہو گیا - اسکی صلاحیتوں میں نشو و نما آگئی - اسکی زندگی سرسبز و شاداب ہو گئی *-

لهذا زَكَا کے بنیادی معنے نشو و نما پانا - بڑھنا - پھولنا - پھلنا ہیں - راغب نے اس کے یہ معنے لکھکر اسکی مثال میں قرآن کریم کی یہ آیت درج کی ہے - فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا (۱۸/۱۹) یہ دیکھو کہ کونسا کھانا ایسا ہے جو حلال اور خوش انجام ہے ، یعنی جس میں نشو و نما دینے کی زیادہ صلاحیت ہے،جو زیادہ (Nutritious) ہے -

اَلزَّكٰوةُ کے معنے ہیں نشو و نما - بالیدگی - پھولنا - پھلنا *- اسکے معنے پاکیزگی کے بھی آتے ہیں - غالباً اسلئے کہ درختوں کی نشو و نما کے لئے ان کی شاخ تراشی کی ضرورت ہوتی ہے - لیکن یہ اسکے بنیادی معنی نہیں - خود قرآن کریم میں (ایک ہی آیت میں) اَزْكٰى اور اَطْهَرُ کے الفاظ الگ الگ آئے ہیں - اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ (۲/۲۳۲)-اس میں اَطْهَرُ تو پاکیزگی کے لئے ہے اور اَزْكٰى نشو و نما کے لئے - پاکیزگی (طہارت) ایک سلبی صفت (Negative Virtue) ہے - یعنے نقائص اور خرابیوں سے دور رهنا - لیکن زَكٰوةٌ ایجابی صفت (Positive Virtue) ہے - یعنے بڑھنا - پھولنا پھلنا - نشو و نما اور بالیدگی حاصل کرنا - صاحب محیط نے بیضاوی کے حوالہ سے اَلزَّكِيُّ کے معنے لکھے ہیں خیر و خوبی کے ساتھ بڑھنے والا - عمدہ

* تاج نیز ابن قتیبه (القرطین ج/۱ صفحه ۶۲)

صلاحیتوں کے ساتھ ایک عمر سے دوسری عمر تک ترقی کرنے والا ۔ یعنے اس میں بالیدگی اور ارتقا کا پہلو مضمر ہوتا ہے ۔ اَرْضٌ زَکِیَّۃٌ کے معنے ہیں سر سبز زمین جس میں خوب نشوونما ہو ۔ اَزْکیٰ کے معنے ہیں اَنْفَعُ ۔ زیادہ منفعت بخش **۔ اسی اعتبار سے زَکاً اس عدد کو کہتے ہیں جو زوج (جوڑا) ہو **۔

سورۃ کہف میں ہے کہ خدا انہیں ایسا بیٹا دیگا جو انکے پہلے بیٹے کے مقابلہ میں زیادہ صلاحیتوں کا حامل ہوگا ۔ خَیْرًا مِنْہُ زَکٰوۃً (۱۸/۸۱) ۔ نَفْساً زَکِیَّۃً (۱۸/۷۴) کے معنے ہیں اچھا، عمدہ، جوان، نشوونما یافتہ لڑکا ۔ دوسری جگہ غُلٰماً زَکِیًّا (۱۹/۱۹) آیا ہے ۔ سورۃ الشمس میں زَکّٰھَا کے مقابلہ میں دَسّٰھَا کا لفظ آیا ہے (۹۱/۹-۱۰) ۔ تَدْسِیَۃٌ کے معنے ہوتے ہیں دبا دینا ۔ کسی کو زندہ دفن کر دینا (۱۶/۵۹) ۔ اُسکی نشوو نما کو روک دینا ۔ لہذا تَزْکِیَۃٌ کے معنے ہونگے ان تمام موانع کو دور کرکے جو کسی کی راہ میں حائل ہوں، اسکی نشوونما کیلئے حالات کو مساعد کرنا ۔

قرآن کریم میں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوالزَّکٰوۃَ کے الفاظ بار بار آئے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی نظام کے یہی دو ستون ہیں ۔ اقامت صلٰوۃ کے مفہوم کے لئے (ص ـ ل ـ و کے عنوان میں) "صلٰوۃ" کا لفظ دیکھئے ۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اس سے مراد ہے ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا جس میں افراد معاشرہ، قوانین خداوندی کا اتباع کرتے، اپنی منزل مقصود تک جا پہنچیں ۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کا معاشرہ قائم کرنے سے مقصود کیا ہے؟ مقصود ہے "ایتائے زکٰوۃ" ۔ ایتاء کے معنی ہیں دینا ۔ اور (جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں) زکٰوۃ کے معنی ہیں نشوونما ۔ یعنی نوع انسان کی نشوونما (Growth) یا (Development) کا سامان بہم پہنچانا ۔ اس "نشوونما" میں انسان کی طبعی زندگی کی پرورش اور اس کی ذات کی نشوونما، دونوں شامل ہیں ۔ سورۃ حج میں ہے کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوالصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُالزَّکٰوۃَ (۲۲/۴۱) ۔ "یہ (جماعت مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلٰوۃ اور ایتائے زکٰوۃ کرینگے" ۔ یعنی اسلامی مملکت کا فریضہ "ایتائے زکٰوۃ" ہوگا ۔ یعنی دوسروں کو نشوو نما دینا ۔ اپنے افراد معاشرہ اور دیگر نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا ۔ اسی کے

** محیط ۔ نیز ابن فارس ۔

متعلق دوسرے مقام پر ہے کہ مومن وہ ہیں ھُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ (۲۳/۴) جو زکٰوة (یعنی نوع انسان کی نشوونما) کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مملکت اسلامی (یا نظام خداوندی) اپنے اس عظیم فریضہ (نوعِ انسان کو سامان نشوونما بہم پہنچانے کے فریضہ) کو سرانجام کسطرح سے دیگی؟ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے (اولاً) ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں رہینگے تاکہ وہ رزق کی تقسیم لوگوں کی ضرورت کے مطابق کر سکے۔ اور (دوسرے یہ کہ) افراد معاشرہ جو کچھ کمائیں وہ اسے اسطرح کھلا رکھیں کہ مملکت اس میں سے جسقدر ضرورت سمجھے، "ایتائے زکٰوة"، (دوسروں کی نشوونما) کے لئے لے لے۔ اس مقصد کے لئے قرآن کریم نے نہ کوئی شرح مقرر کی ہے نہ نصاب۔ اس میں سوال ضرورت پوری کرنے کا ہے۔ حتکہ اس ضمن میں یہ بھی کہدیا کہ جو کچھ افراد کی ضروریات پورا ہونے کے بعد بچ جائے، عندالضرورت وہ سب کا سب مملکت کی تحویل میں لیا جا سکتا ہے۔ (دیکھئے ۲/۲۱۹)۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو مملکت اسلامی کی تمام آمدنی "ایتائے زکٰوة"، کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوگی۔

لیکن اس قسم کا اسلامی نظام، بتدریج قائم ہوگا۔ جس عرصہ میں یہ ہنوز زیر تشکیل ہوگا، اس میں جماعت کے افراد سے (آج کی اصطلاح میں) چندے اور عطیے لئے جائینگے۔ یا ہنگامی ٹیکس عائد کئے جائینگے۔ ان کے لئے قرآن کریم نے "صدقات"، کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر "صدقات"، اور "زکٰوة" کو مرادف المعنی سمجھا جاتا ہے۔ حتکہ قرآن کریم نے "صدقات" کے خرچ کی جو مدات بتائی ہیں (۹/۶۰) انہیں بھی زکٰوة کے مصرف کی مدات سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے ان اصطلاحات کو الگ الگ مفہوم کے لئے استعمال کیا ہے۔

ان تصریحات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں اسلامی نظام مملکت کے شعبے ہیں۔ انفرادی چیزیں نہیں ہیں۔ انفرادی طور پر انسان جو کچھ ضرورت مندوں کو دیگا وہ خیرات ہوگی۔ اسلامی نظام میں خیرات لینے یا دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کیونکہ تمام ضرورت مندوں کی ضروریات زندگی کا پورا کرنا مملکت کا فریضہ قرار پا جاتا ہے۔ نیز یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ جو کچھ حکومت لیتی ہے وہ مملکت کا ٹیکس ہوتا ہے، اور زکوٰة خدا کا ٹیکس ہے۔ "قیصر اور خدا" کی یہ تقسیم، عیسائیت کی ثنویت

(Dualism) کی پیدا کردہ ہے۔ اسلام میں اسکی قطعاً گنجائش نہیں ۔ اسلام میں ، جو مملکت قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے ، اسے جو کچھ دیا جاتا ہے وہ خدا ہی کو دیا جاتا ہے ۔ (ان امور کی وضاحت کے لئے عنوانات '' ر ۔ ب ۔ ب '' ۔ '' ن ۔ ف ۔ ق '' اور '' ص ۔ د ۔ ق '' بھی دیکھئے) ۔

سورۃ النجم میں ہے فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ ۔ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (۵۳/۳۲)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم خود ہی اپنے متعلق فیصلہ نہ کر لو کہ تمہارا تزکیہ نفس (ذات کی نشوونما) ہو رہا ہے ۔ اس کے لئے معیار، خدا کا مقرر کردہ قانون ہے ۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ اَلَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۹۲/۱۸)۔ تزکیہ اس کا ہوتا ہے جو اپنے مال کو (نوع انسان کی پرورش کے لئے) دیتا ہے ۔ یعنی مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (۹۲/۵)۔ '' جو دیتا ہے اور تقویٰ شعار بنتا ہے .... اس کے لئے راستے آسان ہو جاتے ہیں (۹۲/۷)۔

ز ل ف

اَلزَّلَفُ والزُّلْفٰى والزُّلْفَةُ ۔ قرب ۔ درجہ و مرتبہ ۔ اَلزُّلْفَةُ ۔ شروع رات یا مطلقاً رات کا ایک حصہ (چھوٹا ہو یا بڑا)۔ جمع زُلَفٌ ہے ۔ اَلْمَزَالِفُ ۔ سیڑھیاں ، جن سے انسان بلند بھی ہو جاتا ہے اور اپنی منزل سے قریب بھی ۔ اس میں قرب اور مدارج دونوں آجاتے ہیں (دَرَجَةٌ ۔ بھی سیڑھی کو کہتے ہیں جو اوپر کی طرف لیجائے) ۔ زَلَفَ اِلَيْهِ ۔ وہ اس کی طرف قریب ہوا ۔ اَزْلَفَهٗ اسے قریب کیا ، اکٹھا کیا ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے کسی چیز سے قریب ہونے کے لئے آگے بڑھتے جانا بتائے ہیں* ۔ راغب نے کہا ہے زُلَفٌ رات کی منزلوں کو کہتے ہیں**۔ صاحب کتاب الاشتقاق کے نزدیک اَلزُّلْفَةُ ۔ منزل کو کہتے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً (۶۷/۲۷) ۔ '' جب وہ اسے قریب دیکھینگے '' ۔ سورۃ سبا میں ہے تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰى (۳۴/۳۷) '' جو مرتبہ میں تمہیں ہم سے قریب تر کر دے '' ۔ سورۃ شعراء میں ہے وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ (۲۶/۶۴) '' اور ہم وہیں دوسروں کو قریب لے آئے '' ۔ سورۃ ہود میں ہے اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَىِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ (۱۱/۱۱۴) یعنے دن کے دونوں سرے اور رات کے کچھ حصے ۔ (نیز دیکھئے عنوان د ۔ ل ۔ ک نیز ط ۔ ر ۔ ف)

---

*تاج ۔ **راغب ۔

ز ل ق

زَلِقَ - یَزْلَقُ - زَلَقَ - یَزْلُقُ - زَلَقًا - پھسل جانا - لغزش کھا جانا - اپنی جگہ سے ہٹ جانا - اَلزَّلَقُ - سپاٹ زمین جس پر قدم پھسل جائیں - جس پر کوئی پودا نہ ہو - اَلزَّلَقَةُ - چکنی چٹان - آئینہ* - سورۂ کہف میں ہے فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا (۱۸/۴۰) - "وہ صاف اور چکنا میدان رہ جائے جس میں کوئی سبزی وغیرہ نہ ہو" - آئینہ کی طرح صاف اور چٹیل ہو جائے - اَزْلَقَ فُلَانًا بِبَصَرِہٖ - اس کی طرف بہت تیز (ناراضگی کی) نگاہ سے دیکھا - اس طرح گھور کر دیکھا گویا وہ آنکھوں آنکھوں ہی میں اسے اس کے مقام سے ہٹا دیگا* - سورۃ القلم میں کفار کے متعلق ہے لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ (۶۸/۵۱) - "وہ تمہیں اس طرح گھور کر دیکھتے ہیں گویا اپنی نگاہوں سے تجھے اپنے مقام سے پھسلا دینگے" -

ز ل ل (زلزل)

زَلَّ - زَلِيْلٌ - مَزِلَّةٌ - پھسل جانا - لغزش کھا جانا - اَلْمَزِلَّةُ والمَزَلَّةُ - جس جگہ انسان پھسل جائے - اَزَلَّهُ : اسے پھسلایا (۲/۳۶) - اَلزَّلَّةُ - لغزش کو کہتے ہیں - یعنی اپنی جگہ سے ہل جانا - چنانچہ قرآن کریم میں یہ لفظ ثَبَتَ کے مقابل میں آیا ہے (۱۶/۹۴) - ابن فارس نے کہا ہے کہ ہر وہ لفظ جس میں زاء کے بعد لام آتا ہو ، اُس کے بنیادی معنی ہٹنے کے ہوتے ہیں - گفتگو میں لغزش کر جانے یا اپنی رائے سے ہٹ جانے نیز غلطی کرنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے - راغب نے کہا ہے کہ زَلَّةٌ - اُس لغزش کو کہتے ہیں جو بلا ارادہ سرزد ہو - اِسْتَزَلَّ کے معنے ہیں کسی کو اس کے مقام سے ہٹا دینے اور پھسلا دینے کا قصد و ارادہ کرنا (۳/۱۵۴) - زَلِيْلٌ کے معنے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جانے کے بھی آتے ہیں - قَوْسٌ زَلَّاءُ - وہ کمان جس سے تیر بڑی تیزی کے ساتھ نکل جائے -

زَلْزَلَةٌ کے معنے ہیں کسی چیز کو تیزی کے ساتھ حرکت دیکر ہلا دینا یا اس کی جگہ سے ہٹا دینا** - زَلْزَلَ - یُزَلْزِلُ - زَلْزَلَةٌ وَزِلْزَالاً - اسے ہلایا** - اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۹۹/۱) - "جب زمین ہلا دی جائیگی جیسا کہ اس کا ہلانا (ہوگا)"

*تاج و محیط و راغب - **تاج -

ز ل م

اَلزَّلَمُ ۔ اَلزُّلَمُ ۔ تیر کی لکڑی جس کے پچھلے سرے میں پر نہ لگائے گئے ہوں ۔ (جمع اَزْلَامٌ) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دبلا پتلا اور سپاٹ یعنی ہموار اور چکنا ہونے کے ہیں ۔ پھر اَزْلَامٌ سے مراد وہ تیر تھے جن سے قریش زمانۂ جاہلیت میں فال نکالتے تھے۔ تفصیل یہ ہے کہ تین مذکورہ بالا قسم کے تیر تھیلے میں ڈال دئے جاتے ۔ ان میں سے ایک پر اِفْعَلْ (کر) دوسرے پر لَا تَفْعَلْ (نہ کر) لکھ دیتے اور تیسرا خالی رہنے دیتے ۔ جب کوئی شخص کسی معاملہ کا ارادہ کرتا تو وہ کعبہ کے پجاریوں کے پاس آتا اور ان سے کہتا کہ میرے لئے یہ کام کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں فال نکالو۔ چنانچہ وہ اپنے قاعدے کے مطابق تیر نکالتے اور تیر کی تحریر کے مطابق فال دیکھ کر اسے بتا دیتے ۔ اگر خالی تیر آتا تو دوبارہ فال نکالتے ۔ بعض لوگ خود بھی اپنے پاس اس قسم کے تیر رکھتے اور جہاں ضرورت پڑتی ان سے فال نکال لیتے* ۔ اسی قسم کے تیروں سے قرعہ اندازی بھی ہوتی ۔ اور (جوئے کے) جانوروں کا گوشت تقسیم کیا جاتا (﴿۳﴾)۔ (قرعہ اندازی کے لئے عنوان ق ۔ ل ۔ م بھی دیکھئے) ۔ قرآن کریم نے ان سب باتوں سے منع کر دیا ۔ اس لئے کہ اس سے انسان اپنے اختیار کو چھوڑ کر جبر کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنی فہم و بصیرت سے کسی بات کا فیصلہ کرے اپنے آپ کو اتفاقات (Chances) کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے ۔ اس سے وہ مقام انسانیت سے گر جاتا ہے ۔ قرآن کریم انسان کی عقل و بصیرت کی تربیت کرتا اور اسے حریت و آزادی کی تعلیم دیتا ہے ۔ اس لئے اس نے ان تمام باتوں سے منع کر دیا ہے جس سے اس کی عقل و خرد دب جائے اور حریت فکر و نظر سلب ہو جائے۔ وہ انسان کو پوری آزادی دیتا ہے کہ وہ حدود اللہ (قوانین خداوندی ۔ قرآن کریم کے ضوابط) کے اندر رہتے ہوئے اپنے (انفرادی اور اجتماعی) امور کے فیصلے اپنی عقل و فکر سے کرے ۔ یہ تھی قرآن کریم کی تعلیم ۔ لیکن اب ہماری یہ حالت ہے کہ ہمارے ہاں فال لینا ۔ قرعے ڈالنا ''استخارے کرنا'' (یعنی کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تسبیح کے دانوں کے سپرد کر دینا) عام روش زندگی ہو گیا ہے ۔ گری ہوئی قومیں اپنی قوت بازو ہی کو ترک نہیں کرتیں ، عقل و فکر کو بھی ساتھ ہی چھوڑ دیتی ہیں ۔ اور اس کا خمیازہ بھگتتی ہیں۔ ایک مرد مومن اچھی طرح جانتا ہے

*تاج و محیط ۔

کہ خاک زندہ ہوں میں تابع ستارہ نہیں ۔ وہ اپنے آپ کو اتفاقات اور حوادث کے حوالے نہیں کرتا بلکہ اتفاقات اور حوادث کو اپنے پروگرام کے تابع لاتا ہے ۔

ز م ر

زَمْرٌ ۔ آواز ۔ اَلزَّمَّارَةُ و اَلْمِزْمَارُ ۔ بانسری ۔ زَمَرَ یَزْمُرُ و یَزْمِرُ زَمْراً ۔ بانسری بجانا ۔

اَلزُّمْرَةُ (جس کی جمع زُمَرٌ ہے) منتشر فوج اور جماعت ۔ کیونکہ کوئی جماعت شور سے خالی نہیں ہوتی* ۔ یا انہیں یک جا کرنے کے لئے عموماً بگل (یا صور) سے کام لیا جاتا ہے ۔ راغب نے اس کے معنے تھوڑی سی جماعت کئے ہیں** ۔

قرآن کریم میں ہے وَ سِیْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی جَہَنَّمَ زُمَراً ($\frac{۳۹}{۷۱}$) ۔ جنہوں نے انکار کی روش اختیار کر رکھی ہے انہیں جہنم کی طرف گروہ در گروہ لے جایا جائیگا ۔ (زُمَرٌ کے لفظ سے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے)** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہوتے ہیں (۱) چیز کی کمی ۔ اور (۲) آواز۔

ز م ل

اَلزَّمِیْلُ ۔ اونٹ پر بیٹھنے والا آدمی ۔ نیز تمہارا رفیق سفر جو معاملات میں تمہاری مدد کرتا ہے ۔ زَمَلَہٗ ۔ یَزْمِلُہٗ ۔ زَمْلاً ۔ اس نے اسے اپنے پیچھے سوار کر لیا یا کجاوے میں اپنے ساتھ برابر کی جھولی میں بٹھا لیا ۔ اَلزِّمْلُ ۔ بوجھ ۔ اس سے اِزْدَمَلَ الْحِمْلَ کے معنے ہیں اس نے ایک بار میں سارا بوجھ اٹھا لیا ۔ اَلْمُزَامَلَۃُ ۔ اونٹ پر دونوں طرف ہموزن سواریوں کا بیٹھنا یا ہموزن بوجھ لادنا ۔

ایک اونٹ پر بالعموم دو سواریاں بیٹھتی ہیں ۔ ایسے سفر میں سب سے اہم اور پہلا کام یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ایک اونٹ پر ایسی دو سواریاں بٹھائی جائیں جو ہم وزن بھی ہوں اور ہم خیال بھی تاکہ ان دونوں میں طبعی اور ذہنی، دونوں انداز سے ہم آہنگی ہو ۔ اگر ان کا وزن برابر نہ ہو تو سفر میں اونٹ کو اور خود سواریوں کو بھی تکلیف ہوگی ۔ اور اگر وہ ہم خیال نہ ہوں تو یہ سفر، سَقَر (دوزخ) بن جائیگا ۔ سب سے اچھا سالارِ کارواں وہ ہوتا ہے جو زَمِیْلٌ چننے میں ماہر ہو۔

---

*محیط و تاج ۔ **راغب ۔

رسول اللہؐ کو جب وحی کے ذریعہ قرآنی نظام کا نقشہ سمجھا دیا گیا تو اس کے بعد ان کا سب سے اہم فریضہ یہ قرار پایا کہ وہ رفقائے کار کی تلاش کریں اور ان کے انتخاب میں زَمِیْلَانَہ انداز اختیار کریں ۔ اس لئے کہ ایسے عظیم پروگرام کی کامیابی کا راز رفقائے سفر کے صحیح انتخاب میں تھا ۔ یہ تھا وہ فریضہ جس کی طرف آپ کی توجہ یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ (۷۳/۱) کہکر دلائی گئی ۔ اس کے بعد جس قسم کی تَزْمِیْل رسول اللہؐ نے کی ، دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی ۔

اِزْدَمَلَ ۔ تَزَمَّلَ و اِزَّمَّلَ فِیْ ثِیَابِہٖ ۔ کے معنے یہ بھی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے کپڑوں میں لپٹ گیا ۔ اس اعتبار سے اَلْمُزَّمِّلُ اسے کہتے ہیں جو معاملات میں لا پرواہی برتے اور کاموں میں کوتاہی کرے** ۔ ظاہر ہے کہ یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ میں اَلْمُزَّمِّلُ کے یہ معنے نہیں لئے جاسکتے ، اگرچہ حیرت ہے کہ راغب جیسے بالغ نظر نے بھی لکھ دیا ہے کہ یہ لفظ استعارہ کےطور پر استعمال ہوا ہے اور کنایہ ہے کوتاہی کرنے والے اور معاملات میں لا پرواہی برتنے والے سے** ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی بوجھ اٹھالینے کے لکھے ہیں ۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ اَلزِّمِّیْلُ اس آدمی کو کہتے ہیں کہ جب کوئی مشکل معاملہ پیش آئے تو وہ اپنے بدن پر مزید کپڑے ڈال لے اور اس طرح کپڑوں کی گٹھڑی سی بن جائے اور اَلْمُزَامَلَۃُ کے معنی ہیں اونٹ کے دونوں طرف ہم وزن بوجھ لادنا ۔ اس اعتبار سے اَلْمُزَّمِّلُ کا صحیح مفہوم یہی ہوگا کہ جو فریضہ تَزْمِیْل میں بہت زیادہ احتیاط برتے اور سرگرمی دکھائے ۔ اَلزِّمْلُ بوجھ کو بھی کہتے ہیں اور اِزْدَمَلَ الْحِمْلَ کے معنے ہوتے ہیں اس نے سارے بوجھ کو ایک دم لاد دیا* ۔ اس اعتبار سے مُزَّمِّل وہ ہوگا جو بارِ رسالت کو نہایت حسن و خوبی سے اٹھائے ۔ کشاف میں عکرمہ کے حوالہ سے ہے کہ یاَاَیُّھَاالْمُزَّمِّلُ کے معنے ہیں اے اس عظیم اٹھالینے والے ۔ تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ اس کا مطلب ہے نبوت اور اس کی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے والے ۔ تفسیر خازن نے بھی اسکی تائید کی ہے ۔ تستری نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ اَلْمُزَّمِّلُ کے معنے ہیں وہ شخص جس نے اپنے آپ کو خدا کا ہم رنگ کر لیا ہو ۔ یہ رفاقت کی انتہائی شکل ہے ۔ تفسیر فتح القدیر (شوکانی) میں ہے کہ اس کے معنی مُزَّمِّلٌ بِالْقُرآن ہیں ۔ یعنی قرآن کا بار اٹھانے والا ۔ حامل قرآن ۔ یہ معنی قرطبی نے بھی دئے ہیں اور کہا ہے کہ اسے حضرت ابن عباسؓ نے روایت

*تاج ۔ **راغب ۔

کیا ہے۔ بہر حال، نبی اکرمؐ کو جو یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ کہکر پکارا گیا ہے تو اس میں حضورؐ کے عظیم القدر فرائض رسالت کی طرف اشارہ ہے جن کا مقصد جماعتِ مومنین کو ساتھ لیکر دنیا میں انقلاب عظیم برپا کرنا تھا۔

عام خیال یہ ہے کہ لفظ مُزَّمِّلٌ باب تَفَعَّل سے ہے۔ اصل اس کی مُتَزَمِّلٌ تھی۔

ز م ھ ر

اَلزَّمْھَرِیْرُ۔ سردی کی شدت۔ نیز چاند کو بھی کہتے ہیں*۔ اِزْمَھَرَّ الْیَوْمُ۔ دن سخت سرد ہو گیا۔ اِزْمَھَرَّ الْوَجْہُ۔ چہرہ بری طرح بگڑ گیا اور دانت دکھائی دینے لگے۔

قرآن کریم میں جنت کے متعلق ہے کہ لَایَرَوْنَ فِیْھَا شَمْسًا وَّلَا زَمْھَرِیْرًا (۷۶/۱۳)۔ اس میں نہ تو سخت گرمی ہوگی نہ سخت سردی۔ ویسے اَلْمُزْمَہِرُّ کے معنے ہیں ہنستے ہوئے دانتوں والا*۔ غالباً سردی سے دانت بجنے سے طنزاً لیا گیا ہے۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے " ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ زَھْرٌ سے ہو جس میں میم زیادہ کر لی گئی ہو۔ زَھْرٌ کے معنی چمکنے کے ہوتے ہیں۔ اِزْمَھَرَّتِ الْکَوَاکِبُ۔ ستارے چمکے "۔ جب سردی زیادہ ہو تو ستارے زیادہ روشن اور چمکدار ہوجاتے ہیں۔

زنجبیل

اَلزَّنْجَبِیْلُ۔ ادرک یا سونٹھ کو کہتے ہیں۔ عربوں کے ہاں یہ اعلٰی درجہ کی خوشبودار چیز شمار ہوتی تھی**۔ صاحب محیط کا خیال ہے کہ یہ فارسی لفظ شَنْکَبِیْلُ کا معرب ہے***۔ (یہ لفظ شَنْکَبِیْلُ نہیں بلکہ شَنْگْوِیْر ہے)۔

قرآن کریم میں ہے کَانَ مِزَاجُھَا زَنْجَبِیْلًا (۷۶/۱۷) " اسکی ملونی سونٹھ کی ہوگی "۔ اسکے مفہوم کے لئے عنوان (م۔ ز۔ ج) دیکھئے۔

ز ن م

ابن فارس نے کہا ہے کہ زَنْمٌ کے بنیادی معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ لٹکا دینے کے ہیں۔

---

* تاج و محیط۔ ** تاج۔ ***محیط۔

اَلزَّنِیْمُ - وہ شخص جو کسی قبیلہ سے نسبی تعلق تو نہ رکھتا ہو لیکن اسکے ساتھ یونہی ملحق ہو* - جیسے بکری کے گلے میں جونک کی طرح دو تھن سے لٹک رہے ہوتے ہیں جنہیں زَنَمَتَا الْعَنْزِ کہتے ہیں - عربوں میں نسب کو بڑی اہمیت حاصل تھی - ظاہر ہے کہ ایسا شخص جس کا نسب کچھ اور ہو (یا معلوم ہی نہ ہو) اور وہ یونہی کسی قبیلہ کے ساتھ متمسک ہو جائے، وہ ذلیل اور کمینہ شمار ہوتا تھا- اسی لئے اَلزَّنِیْمُ کمینے آدمی کو کہتے تھے جو اپنی کمینگی اور شرارت میں بدنام ہو* - اَلزَّنْمَۃُ - ایک درخت جس پر پتے نہیں ہوتے * - قرآن کریم میں زَنِیْمٌ کا لفظ (۶۸/۱۳) میں آیا ہے -

ز ن ی

زَنٰی - یَزْنِیْ - زِنًی و زِنَاءً - اس نے بدکاری کی **- بلا عقد معروف کسی سے جنسی اختلاط کیا - قرآن کریم میں ہے وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی (۱۷/۳۲) - '' زنا کے قریب تک بھی نہ جاؤ'' - یعنے یہی نہیں کہ زنا نہ کرو بلکہ مبادیات زنا تک کے بھی پاس نہ جاؤ- سورۃ فرقان میں ہے وَلَا یَزْنُوْنَ (۲۵/۶۸) - ''زنا نہیں کرتے'' - اَلزَّانِیُ - زنا کرنے والا مرد- اَلزَّانِیَۃُ (۲۴/۲) زنا کرنے والی عورت - ان میں سے ہر ایک کی سزا سو سو کوڑے ہیں - (۲۴/۲)- البتہ اگر یہ جرم ایسی شادی شدہ عورت سے سرزد ہو جو پہلے لونڈی رہ چکی ہو (زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق ***) تو اس کی سزا اس سے نصف ہے (۴/۲۵) - اس لئے کہ لونڈیوں کی پرورش اور ترتیب جس پست ماحول میں ہوتی تھی اس سے ان میں اس بلندیِ کردار کی توقع رکھنا جو بلند، شریف اور پاکیزہ ماحول میں پیدا ہوتا ہے، زیادتی تھی - اس سے اندازہ لگائیے کہ قرآن کریم انسان کی اضطراری کمزوریوں پر کسقدر نگاہ رکھتا ہے -

سنگساری (رجم) کی سزا قرآن کریم میں نہیں -

ہمارے زمانے میں اس مسئلہ پر بڑی تحقیق ہوئی ہے کہ جنسی تعلقات کا قوموں کے عروج و زوال پر کسقدر گہرا اثر پڑتا ہے اور جو قومیں مردوں اور عورتوں کی عفت کی پرواہ نہیں کرتیں وہ تہذیب و تمدن کی کس پست سطح پر آجاتی ہیں - (اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے احباب میری کتاب سلیم کے نام خطوط، جلد سوم میں متعلقہ خط ملاحظہ فرمائیں) -

*تاج **تاج و راغب- *** قرآن کریم نے غلام اور لونڈیوں کے وجود (Institution) ہی کو ختم کر دیا - تفصیل م - ل - ك کے عنوان میں ملیگی -

ز ھ د

زَھَدَ (فِیْ وعَنْ) یَزْھَدُ ۔ زُھْدًا ۔ بے رغبت ھونا * ۔ کسی چیز سے اعراض برتنا اور اسے چھوڑ دینا*۔ اس سے فاعل زَاھِدٌ ھے ۔ سورۃ یوسف میں ھے کہ اھل قافلہ نے حضرت یوسفؑ کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیا ۔ اس لئے کہ وَکَانُوْا فِیْہِ مِنَ الزَّاھِدِیْنَ (۱۲/۲۰)۔ وہ حضرت یوسفؑ میں کچھ زیادہ رغبت نہیں رکھتے تھے ۔ اَلزَّھِیْدُ ۔ قلیل اور حقیر* ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کی کمی کے ھیں ۔ اَلزَّاھِدُ وَالزَّھِیْدُ ۔ تنگ اخلاق آدمی ۔ کم خور آدمی* ۔ صاحب محیط نے لکھا ھے کہ زُھْدٌ دراصل کسی چیز کی طرف میلان چھوڑ دینے کو کہتے ھیں ** ۔

زُھْدٌ یا زاھد کا لفظ جن معنوں میں ھمارے ھاں استعمال ھوتا ھے قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ یہ تصوف کی اصطلاح ھے جس میں دنیا سے بے رغبتی کو بڑی فضیلت قرار دیا گیا ھے ۔ یہ تصور قرآنی تعلیم کے خلاف ھے ۔ (خود تصوف ھی اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ھے) قرآن کریم کی رو سے مومن کا فریضہ دنیا کی تسخیر ھے اور اسکی خوش گواریوں سے متمتع ھونا اس کا حق ۔ قرآن کریم واضح الفاظ میں کہتا ھے کہ " ان سے کہو کہ وہ کون ھے جو ان زینت کی چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ھے جنہیں خدا نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا ھے " (۷/۳۲)۔ مومن صرف ان چیزوں سے اجتناب کرتا ھے جن سے خدا نے روکا ھے ۔ ان کے علاوہ، وہ دنیا کی ھر چیز سے فائدہ اٹھاتا اور انہیں اپنے کام میں لاتا ھے ۔

ز ھ ر

اَلزَّھْرَۃُ ۔ اَلزَّھَرَۃُ ۔ پودا ۔ پودے کا پھول ۔ بعض نے کہا ھے کہ زَھْرَۃٌ صرف کھلے ھوئے پھول کو کہا جاتا ھے ۔ اَلزَّھْرَۃُ مِنَ الدُّنْیَا ۔ دنیا کی سرسبزی و تازگی ۔ حسن و زیبائش ۔ شگفتگی و شادابی ۔ حاسان زیب و زینت ۔ (۲۰/۱۳۱)۔ اَلزُّھْرَۃُ ۔ سفیدی * ۔ حسن ۔ درخشندگی ۔ اَلزَّھْرِیَّاتُ مِنَ الْاَیَّامِ ۔ بہار کے دن ** ۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی حسن ۔ روشنی ۔ اور صفائی پر دلالت کرتے ھیں ۔

---

* تاج ۔ ** محیط ۔

ز ھ ق

زُھُوْقٌ - صاحب محیط نے کہا ھے کہ اس کے اصل معنے دشواری کے ساتھ نکلنے کے ھوتے ھیں - چنانچہ زَھَقَتِ النَّفْسُ کا مطلب یہ ھے کہ جان بمشکل نکلی* - اَلزَّاھِقُ - موٹے جانور کو کہتے ھیں جس میں گودا ھو** - نیز اس جانور کو بھی جو بہت لاغر ھو - اس طرح یہ لفظ اضداد میں سے ھے - اَلزَّھُوْقُ - گہرے کنویں کو بھی کہتے ھیں اور بلند پہاڑوں کے درمیانی راستے کو بھی ** - لیکن تیزی سے ھو یا دشواری اور سستی سے، اسکے معنے کسی چیز کے نکل جانے کے ھوتے ھیں ** - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی آگے بڑھنے - گزر جانے اور تجاوز کر جانے کے ھوتے ھیں - زَھَقَتِ الرَّاحِلَةُ زُھُوْقاً - اونٹنی گھوڑوں سے آگے نکل گئی - زَھَقَ السَّھْمُ زُھُوْقاً - تیر نشانے سے آگے نکل گیا - زَھَقَتْ نَفْسُهُ - اسکی جان نکل گئی ** - تَزْھَقُ اَنْفُسُھُمْ (۹/۵۵) - " ان کی جانیں نکلیں " - اَلزَّاھِقُ - شکست خوردہ آدمی کو کہتے ھیں ** - اَلْمُزْھَقُ مقتول کو کہتے ھیں - زَھَقَ الشَّئُ - کوئی چیز تباہ و برباد ھوئی، مضمحل ھوئی ** -

قرآن کریم میں باطل کے متعلق ھے فَاِذَا ھُوَ زَاھِقٌ (۲۱/۱۸) - ھر وہ نظریہ یا پروگرام جو حق کے خلاف، تخریبی نتائج کا حامل ھو، ناکام و نامراد رھتا ھے - مٹ جاتا ھے - شکست کھا جاتا ھے - وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَ زَھَقَ الْبَاطِلُ - اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَھُوْقاً (۱۷/۸۱) " اور کہو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا - حقیقت یہ ھے کہ باطل ھوتا ھی مٹنے والا ھے " - یہاں زَھُوْقٌ کے معنے زَاھِقٌ ھی ھیں، لیکن مبالغہ کے ساتھ - باطل اسوقت تک رھتا ھے جب تک حق (خدا کا تعمیری نتائج پیدا کرنے والا پروگرام) نہیں آتا - اس کے آنے سے باطل شکست کھا کر مٹ جاتا ھے - اس کے اندر حق کے سامنے ٹھہرنے کی صلاحیت ھی نہیں ھوتی - مزید تفصیل (ح - ق - ق) اور (ب - ط - ل) کے عنوانات میں دیکھئے -

اَزْھَقْتُ الْاِنَاءَ کے معنے ھیں، میں نے برتن کو الٹ دیا ** - اس سے بھی اس کے معنے واضح ھیں - راغب نے لکھا ھے کہ زَھَقَتْ نَفْسُهُ کے معنی ھیں رنج و غم سے اسکی جان نکل گئی *** -

ز و ج

زَوْجٌ - دو چیزیں جو ایک دوسرے کے مطابق ھوں (جیسے جوتے کے دونوں پاؤں) - یا ایک دوسرے کے مقابل ھوں (جیسے دن اور رات) وہ زَوْجَان

* محیط - ** تاج - *** راغب -

کہلاتی ہیں ۔ اور ان میں سے ہر ایک ، دوسرے کی زَوْجٌ ہوتی ہے ۔ زَوْجٌ کے اصلی معنے جوڑ کے ہیں ۔ فَرْدٌ (اکیلا) کے خلاف ۔ لہذا زَوْجٌ اس فرد کو کہتے ہیں جس کا کوئی جوڑ (یا ساتھی) ہو ۔ خواہ اس کی مثل یا اسکے مقابل ۔ زَوَّجَ الشَّیْئَ بِالشَّیْئِ کے معنے ہیں اس نے ایک چیز کو اس جیسی چیز کے ساتھ ملا دیا (باندھ دیا) ۔ وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (۸۱/۷) کے معنے ہیں جب ہر انسان اپنے ہمجماعت یا ہم مذاق کے ساتھ ملجائیگا ۔ اور زَوَّجْنَاهُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ (۴۴/۵۴) کے معنے ہیں انہیں حور عین کے ساتھ ہم آہنگ کردیا جائیگا ۔ ساتھی بنا دیا جائیگا ۔ (حُوْرٌ کے معنے (ح ۔ و ۔ ر) کے عنوان کے تحت دیکھئے) ۔ اسی اعتبار سے ہر شے کے امثال و نظائر (یعنے ایک ہی قسم کی چیزوں کو) اَزْوَاجٌ کہتے ہیں* ۔ اُحْشُرُوْا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ (۳۷/۲۲) کے معنے ہیں ظلم کرنے والوں کو اور ان کی ہم کار پارٹیوں کو اکٹھا کرو ۔ (یعنے ان کے مثل و نظیر اور لوگوں کو جو ان جیسے ہیں) ۔ اسی طرح قرآن کریم میں اہل جنت کے متعلق مختلف مقامات میں آیا ہے کہ لَهُمْ فِیْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (۲/۲۵) تو اس کے معنے نیک بیویاں ہی نہیں بلکہ اس کے معنے ہیں پاکیزہ خیالات رکھنے والے ہم مشرب ساتھی ۔ جنتی معاشرہ میں قلب و نگاہ کی پاکیزگی اور ہم آہنگی ہوتی ہے ۔ چونکہ اس معاشرہ میں مرد بھی ہونگے اور عورتیں بھی، اس لئے اَزْوَاجٌ میں میاں بیوی بھی شامل ہونگے ۔ واضح رہے کہ جو جنتی معاشرہ دنیا میں قائم ہوگا اس میں میاں بیوی کے تعلقات میں افزائش نسل کا مقصد بھی شامل ہوگا ۔ لیکن جنتِ آخرت میں میاں بیوی کی مواصلت یا افزائش نسل کا تصور قرآن کریم سے نہیں ملتا ۔ لہذا وہاں کی (مردوں اور عورتوں کی) زوجیت ، باہمی رفاقت (Companionship) کی ہوگی ۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت آخرت کے متعلق جو کچھ قرآن کریم میں آیا ہے وہاں کی نعمتوں کا تمثیلی بیان ہے ۔ اسے یہاں کے اندازِ زیست پر قیاس نہیں کرنا چاہئے ۔ وہاں کی حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ ہی نہیں سکتے ۔

انہی معانی کی بنا پر زَوْجٌ ۔ ہر شے کی قسم اور نوع و صنف (Species) کو کہتے ہیں* ۔ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (۲۰/۱۳۱) کے معنے ہیں قسم قسم کے ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ ۔ یا طرح طرح کی چیزیں جو ایک دوسرے سے مشابہ ہوں ۔ کَمْ اَنْبَتْنَا فِیْهَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ (۲۶/۷) کے معنے ہیں ہم نے زمین میں ہر عمدہ نوع کی کتنی چیزیں پیدا کی ہیں ۔ (ویسے

*تاج و محیط ۔ **راغب و لسان العرب ۔

نباتات میں نرو مادہ کا ہونا ثابت ہے اور بعض جمادات کے متعلق بھی ایسا خیال کیا جاتا ہے) ۔ دوسری جگہ ہے ۔ وَ آخَرُ مِنْ شَكْلِهٖ اَزْوَاجٌ (۳۸/۵۸) اس کے معنے ہیں اس کے علاوہ اسی قسم کی اور رنگا رنگ سزائیں ۔ وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (۵۱/۴۹) کے معنے بھی یہی ہیں کہ ہم نے ہر نوع کی ایسی چیزیں تخلیق کی ہیں جو ایک دوسرے سے وابستہ اور ملتی جلتی ہیں ۔ خواہ ایک دوسرے کے ہم رنگ ہوں اور خواہ ایک دوسرے کی ضد ۔ مثلاً آسمان زَوْجٌ ہے زمین کا ۔ سردی زَوْجٌ ہے گرمی کی ۔ اور جوتے کا ایک پاؤں بھی زَوْجٌ ہے دوسرے پاؤں کا ۔ زَوْجٌ کے معنے ایسے فرد کے بھی ہیں جس کا ساتھی یا نظیر و مثیل ہو ۔ یعنی یہ لفظ دو ساتھیوں میں سے ہر ایک فرد کے لئے بھی اسی طرح مستعمل ہے جس طرح ان دونوں کے لئے ۔ کبھی دونوں کے لئے زَوْجَانِ بھی بولتے ہیں*۔

اِزْدَوَجَ ۔ اور تَزَاوَجَ ۔ وزن یا سجع بندی کے لئے کسی فقرے کے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے مشابہ کرنا ، یا دو قضیوں کا ایک دوسرے سے متعلق ہونا * ۔ زَوْجٌ (جمع اَزْوَاجٌ) ۔ رفیق ۔ ایک دوسرے کے ساتھی*۔ زَوْجٌ (جمع اَزْوَاجٌ) کے معنے شوھر یا بیوی دونوں کے ہیں ۔ شوھر بیوی کا زَوْجٌ ہوتا ہے اور بیوی شوھر کی زَوْجٌ ** ان میں سے ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے ۔ اس کا نام ہے ازدواجی زندگی ۔ قرآن کریم میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے ۔ دیکھئے عنوان (ل ۔ ب ۔ س) (۱۳/۳۸) میں اَزْوَاجًا کے معنے بیویاں ہیں ۔ تَزَوَّجْتُ اِمْرَاَةً کے معنے ہیں ''میں نے ایک عورت سے شادی کی،،۔

اگر یہ دیکھنا ہو کہ قرآن کریم کی رو سے ازدواجی زندگی کس قسم کی زندگی ہوتی ہے تو اسکے لئے صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ تَزَوَّجَهُ النَّوْمُ کے معنے ہیں نیند آنکھوں میں گھل مل گئی *** ۔ لہذا میاں بیوی کی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے آنکھوں میں نیند گھل جائے ۔ (نیز دیکھئے عنوان ، ن ۔ ک ۔ ح) ۔ اس دنیا کے جنتی معاشرہ میں مردوں کے ساتھ عورتیں (بیویاں) بھی ہونگی لیکن وہ بھی قلب و نگاہ کی پاکیزگی کو لئے ہوئے ہونگی اور سفر زندگی میں ایک رفیق کی طرح ساتھ چلنے والیاں ۔ قرآن کریم نے ان رفقائے حیات کی خصوصیات کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے ۔ باقی رہی مرنے کے بعد کی جنت ، سو (جیسا کہ اجمالاً اوپر کہا گیا ہے اور تفصیلاً ج ۔ ن ۔ ن کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے) ہم اپنے ادراک کی موجودہ سطح پر

*لین ۔ ** لطائف اللغۃ *** تاج و محیط

اسکی کیفیات کا کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے ۔ اسی لئے نہیں کہہ سکتے کہ وہاں کے ساتھیوں کی کیسی کیفیت ہوگی ۔ لیکن اس حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہم رنگ اور ہم آہنگ ساتھی کا مل جانا ، جنت ہے ۔

زود

اَلزَّادُ ۔ موجودہ ضرورت سے زائد چیز کو کہتے ہیں جسے دوسرے وقت کے لئے سنبھال کر رکھ لیا جائے* ۔ نیز اس کے معنے کھانے کے ہیں خواہ سفر کا ہو یا حضر کا** ۔ بالخصوص وہ کھانا جو سفر کےلئے تیار کیا جائے ، توشہ***۔ اَلْمِزْوَدُ ۔ توشہ دان کو کہتے ہیں** ۔ زَوَّدْتُہٗ تَزْوِیْدًا ۔ میں نے اسے زاد راہ دیا ۔ تَزَوَّدَ : اس نے توشہ ساتھ لیا** ۔

قرآن کریم میں حج کے سلسلہ میں ہے وَ تَزَوَّدُوْا (۲/۱۹۷) ۔ جانے سے پہلے اپنے زاد سفر کا انتظام کرلیا کرو ۔ (یونہی اٹھکر نہ چل دیا کرو) اس لئے کہ فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی (۲/۱۹۷) ۔ جب تم زاد سفر لے کر چلوگے تو اس سے تم دوسروں کے دست نگر ہونے سے بچ جاؤگے ۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تَزَوَّدَ کے معنی کسی اچھی چیز کو ادھر سے ادھر لے جانا ہیں ۔

زور

اَلزَّوْرُ ۔ سینے کا بالائی حصہ جہاں سینے کی تمام ہڈیاں آکر مل جاتی ہیں ۔ جو شخص کسی کو ملنے کے لئے آتا ہو اسے بھی اَلزَّوْرُ کہتے ہیں ۔ زُرْتُہٗ ۔ میں نے اپنا سینہ اس کے سامنے کیا ، توجہ سے اس کا قصد کیا ، اس سے ملا ۔ اَلزَّوْرُ ۔ اَلزِّیَارَۃُ ۔ اَلْمَزَارُ ۔ ملاقات کرنا ۔ زیارت کرنا ۔ اَلزَّوَرُ ۔ سینے کا ٹیڑھا پن اور ایک طرف کو جھکا ہونا ۔ اَلْاَزْوَرُ ۔ وہ جس کے سینے میں ٹیڑھا پن ہو ۔ جو چلنے میں سینہ کو ایک طرف زیادہ جھکا کر چلتا ہو ۔ نیز کنکھیوں سے دیکھنے والے کو بھی کہتے ہیں ۔ اسی سے اس لفظ کے معنے ایک طرف جھک جانے کے آتے ہیں ۔ نیز سیدھے راستے سے ہٹ کر ایک طرف ہوجانے کے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی طرف جھک جانے اور ایک طرف کو ہٹ جانے کے ہیں ۔ سورۃ کہف میں ہے تَزَاوَرُ عَنْ کَھْفِھِمْ (۱۸/۱۷) ۔ ''سورج ان کے غار سے ایک

*راغب ۔ **تاج ۔ ***ابن فارس ۔

طرف کو ہٹ کر نکل جاتا ہے'' - زَوَّرَ عَنْهُ - وہ اس سے ہٹ گیا - اسی سے اَلزَّوْرُ جھوٹ کو کہتے ہیں - حَبْلٌ لَهُ زُوْرٌ - رسی جس میں بٹ ہو* - سورۃ حج میں ہے وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲/۳۰) - اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ جھوٹی اور بناوٹی بات سے بچو - لیکن اصل کے اعتبار سے اس کے معنے ہیں سیدھے راستے سے ہٹی ہوئی حرکت - انسان کا ہر وہ قدم جو صراط مستقیم سے ہٹ کر کسی دوسری طرف جا پڑے، زُوْرٌ میں آجائیگا - اسلام ، حرکت کا نام ہے - یہ ایک تحریک ہے - لیکن یہ حرکت بلاتعین منزل نہیں کہ جس طرف جی چاہا قدم اٹھا دیا - یہ حرکت ہے ایک متعین منزل کی طرف - اسلئے اس میں زُوْرٌ کا کوئی کام نہیں - اس کی تشریح اگلی آیت نے کر دی جہاں فرمایا حُنَفَاءَ لِلّٰهِ (۲۲/۳۱) - ہر طرف سے منہ موڑ کر اُس نصب العین کی طرف چلنا جو اللہ نے مقرر کیا ہے - غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ (۲۲/۳۱) - اس میں کسی اور خیال ، جذبہ اور میلان کی آمیزش نہ کرنا - اسی کو سورۃ فرقان میں ظُلْمًا وَّ زُوْرًا (۲۵/۴) کہا ہے -

كَلَامٌ مُزَوَّرٌ - بنائی ہوئی اور جھوٹ کا ملمع کی ہوئی بات - زَوَّرَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں کسی بات میں جھوٹ ملا کر اسے مزین بنا دیا - باب تفعیل کا ایک خاصہ سلب ماخذ بھی ہے - اس لئے تَزْوِيْرٌ کے معنی زُوْرٌ کو دور کرنے کے بھی ہیں اس کو اصلاح کہتے ہیں - ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ کسی چیز کو سدھارنا ، خواہ وہ خیر ہو یا شر ، تَزْوِيْرٌ کہلائیگا** - ملنے کے معنے میں یہ مادہ قرآن کریم میں (۱۰۲/۲) میں آیا ہے - جہاں کہا ہے حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ - یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملو -

ز و ل (ز ی ل)

زَالَ - يَزُوْلُ وَ يَزَالُ - زَوَالًا - کسی چیز کا جاتے رہنا - تبدیل ہو جانا - مضمحل ہو جانا - ایک طرف ہٹ جانا - دور ہو جانا - جدا ہو جانا - باز آ جانا - قرآن کریم میں یہ لفظ اَمْسَكَ کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۵/۴۱) جس کے معنے روکنے کے ہیں - اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا - ''یقیناً اللہ (کا قانون) آسمانوں کو اور زمین کو روکے ہوئے ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ نہ جائیں - الگ الگ نہ ہو جائیں'' - زَيَّلَ - الگ الگ کر دینا* -

*تاج و محیط و راغب - **تاج -

لاَ یَزَالُوْنَ (۲/۲۱۷) ۔ وہ ہمیشہ اس حالت میں رہینگے ۔ کبھی باز نہیں آئینگے۔ فَزَیَّلْنَا بَیْنَھُمْ (۱۰/۲۸) ۔ ہم ان میں جدائی ڈال دینگے ۔ لَوْ تَزَیَّلُوْا (۴۸/۲۵) ۔ اگر وہ الگ الگ ہو جاتے ۔

راغب کا کہنا ہے کہ زَوَالٌ اس چیز کی حرکت کے لئے بولا جاتا ہے جو پہلے ثابت ہو اور بعد میں ثابت نہ رہی ہو*۔ (اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہو)۔

ز ی ت

زَیْتٌ (۲۴/۳۵)۔ زیتون کا تیل ۔ زَیْتُوْنَۃٌ (۲۴/۳۵)۔ زیتون کا ایک درخت ۔ یا اس کا ایک پھل **۔ (۸۰/۲۹) ۔ اسے بڑا نفع بخش اور مفید درخت سمجھا جاتا ہے***۔

قرآن کریم میں ہے وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ (۹۵/۱-۳)۔ اس میں اَلزَّیْتُوْنُ۔ زیتا نام پہاڑی ہے جو فلسطین میں واقع ہے****۔ وہاں حضرت عیسٰیؑ مبعوث ہوئے تھے۔ اور اَلتِّیْنُ ۔ حضرت نوحؑ کی بعثت کا مقام ہے ۔ اللہ نے کہا ہے کہ حضرت نوحؑ اور حضرت عیسٰیؑ کی دعوت ۔ اور حضرت موسٰیؑ اور محمد عربیؐ کی دعوت ۔ یہ سب آسمانی دعوتیں اس حقیقت کبریٰ کی شاہد ہیں کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ ..... الخ (۹۵/۴)۔

ز ی د

زَیْدٌ کے معنے ہیں نشوو نما پانا ۔ بڑھنا اور پھولنا پھلنا۔ یعنی زیادہ ہونا ۔ نیز یہ متعدی بھی آتا ہے۔ زَادَ اللّٰہُ خَیْرًا ۔ اور زَیَّدَہٗ کے معنی زیادہ دینا اور زیادہ کرنا ہیں **۔ اِزْدَادَ اِزْدِیَادًا ۔ زیادہ ہونا یا زیادہ کرنا (لازم و متعدی) ***۔

سورۃ رعد میں اِزْدِیَادٌ کے مقابل غَیْضٌ کا لفظ آیا ہے (۱۳/۸) ۔ غَیْضٌ کے معنے کم ہوجانے یا اندر چلے جانے اور جذب ہو جانے کے ہیں ۔ سورۃ یونس میں زِیَادَۃٌ کا لفظ آیا ہے (۱۰/۲۶)۔ اور (۵۰/۳۵) میں مَزِیْدٌ ہے ۔ یعنی وہ اضافہ اور زائد چیز جو کسی چیز کے پورا ہونے کے بعد اس میں بڑھائی جائے ۔ سورۃ آل عمران میں ہے ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا (۳/۸۹) ۔ اس کے معنے زیادہ ہونے ، بڑھ جانے کے ہیں ۔

* راغب ۔ ** تاج ۔ *** محیط ۔ **** لطائف اللغۃ نے اسے جبل الشام لکھا ہے ۔

سورۃ احزاب میں (حضرت) زَیْدٌ کا نام آیا ہے (۳۳/۳۷)۔ یہی ایک صحابیؓ ہیں جن کا نام قرآن میں آیا ہے۔ یہ حارثہ کے فرزند اور نبی اکرمؐ کے خادم اور محبوب متبنّیٰ تھے جن سے آپؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کا نکاح کردیا تھا۔

التّزاد کے لئے عنوان "ز۔و۔د" دیکھئے۔

ز ی غ

زَاغَ۔ یَزِیْغُ۔ زَیْغاً۔ ایک طرف کو جھک جانا۔ زَاغَتِ الشَّمْسُ۔ سورج مائل بزوال ہوا*۔ راغب نے کہا ہے کہ اگرچہ زَالَ۔ مَالَ اور زَاغَ قریب قریب ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں لیکن زَاغَ صرف اس ہٹ جانے اور جھک جانے کو کہتے ہیں جو حق سے باطل کی طرف ہو*۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالے سے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں زَیْغٌ کا لفظ آیا ہے اسکے معنے ایک طرف جھک جانے کے ہیں سوائے زَاغَتِ الْاَبْصَارُ کے کہ اسمیں نگاہوں کے اوپر اٹھے یا کھلے رہ جانے کے معنے ہیں**۔

قرآن کریم میں ہے فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ (۶۱/۵)۔ جب وہ صحیح راستے سے ہٹ گئے تو خدا کے قانون مکافات نے ان کے دلوں کو اسی طرف جھکا دیا۔

یہ آیت قرآنی تعلیم کی ایک عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ عام طور پر سمجھا اور کہا جاتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت دیدے اور جسے چاہے گمراہ کردے۔ اس نے جنہیں گمراہ کرنا ہوتا ہے ان کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے۔ (وغیرہ وغیرہ)۔ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم اور خدا کے قانون مکافات عمل کے یکسر خلاف ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ انسان کو صاحب اختیار وارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے متعلق خود فیصلہ کرتا ہے کہ اسے سیدھے راستے پر چلنا چاہیئے یا کجروی اختیار کرنی چاہیئے۔ جس قسم کا وہ فیصلہ کرتا ہے اسی قسم کا خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ وہ اگر کجروی اختیار کرتا ہے تو اس کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں غلط طریق پر چل کر ضائع ہو جاتی ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے یُؤْفَکُ عَنْہُ مَنْ اُفِکَ (۵۱/۸) "حق سے اس کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھرنا چاہتا ہے"۔ خدا کا قانون یہ نہیں کہ ایک شخص حق سے پھرنا چاہتا ہے لیکن خدا اسے زبردستی حق پر قائم رکھتا ہے۔ یا

* تاج۔ ** محیط۔

ایک شخص حق پر قائم رہنا چاہتا ہے اور خدا اسے حق سے پھرا دیتا ہے۔ حق سے اسی کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھرنا چاہے۔ دل انہی کے ٹیڑھے ہوتے ہیں جو خود ٹیڑھے راستے پر چلنا چاہتے ہیں۔ یہاں ابتداء کار (Initiative) انسان کے ہاتھ میں ہے۔ خدا کا قانون اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ جیسا انسان کا فیصلہ، ویسا خدا کا قانون۔ اقبال کے الفاظ میں

خاک شو نذر ہوا سازد ترا   سنگ شو برشیشه اندازد ترا

جیسا انسان خود، ویسا خدا کا قانون۔ آنکھیں بند کر لو، اندھیرا ہو جائے گا۔ کھول لو، نظر آنے لگ جائیگا۔

سورۃ النجم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (۵۳/۱۷) "نہ تو آپکی نگاہ، حقیقت سے کسی اور طرف کو ہٹی اور نہ ہی حد سے تجاوز کر گئی"۔ مَاطَغٰی نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اگرچہ دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں رسولؐ کا علم (وحی) بہت وسیع ہوتا ہے لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں اس کا علم بھی محدود ہوتا ہے۔ جو حد خدا نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ سورۃ سباء میں ہے وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا (۳۴/۱۲)۔ یہاں اسکے معنے حکم سے پھرنے یا حکم عدولی کرنے کے ہیں۔

عذاب کے وقت افراتفری کے سلسلہ میں زَاغَتِ الْاَبْصَارُ کے الفاظ آئے ہیں (۳۳/۱۰)۔ اس کے یا تو یہ معنے ہیں کہ خوف کے وقت نگاہیں ایک مقام پر جمی نہیں رہتیں بلکہ ادھر اُدھر ہٹ جاتی ہیں۔ اور یا (جیسا کہ صاحب محیط نے لکھا ہے) اسکے معنے یہ ہیں کہ نگاہیں اوپر کو اٹھی کی اٹھی رہ گئیں۔ بہرحال مقصد خوف و ہراس کی کیفیت بیان کرنا ہے۔

کسی کی طرف سے نگاہیں پھر جانے کیلئے یہ الفاظ (۳۸/۶۳) میں آئے ہیں۔ اور زَيْغٌ بمعنی کجی، باطل کی طرف جھکاؤ، کجروی، (۳/۹) میں۔ یعنی قرآنی تعلیم کے نقطۂ ماسکہ پر مرتکز رہنے کے بجائے، ادھر اُدھر ہٹ جانا۔ کسی اور طرف نکل جانا۔ اپنے میلانات اور رجحانات کے پیچھے چلے جانا۔ یہ روش زندگی بڑی تباہ کن ہے۔ صحیح روش یہ ہے کہ ہمارے قلبی اور ذہنی میلانات و عواطف کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو ہمیں قرآن کریم کے مرکز سے ادھر ادھر کبھی نہیں ہٹنا چاہیئے۔ حق وہی ہے جو قرآن کریم کہتا ہے۔ نہ کہ وہ جو ہمارے جذبات و میلانات چاہتے ہیں۔ جو شخص پہلے سے کچھ خیالات یا عقائد ذہن میں رکھ کر قرآن کریم کی طرف اس مقصد سے جائے کہ قرآن کریم سے ان عقائد کی تائید حاصل کرے (خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں) اسے قرآن کریم سے کبھی صحیح راہ نمائی نہیں مل سکتی۔

قرآن کریم سے صحیح راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے ادراک کا بے رنگ ہونا نہایت ضروری ہے - یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے زَیغ* کو ہدایت کی ضد قرار دیا ہے (۳/۷) - (مزید تشریح ح - ک - م کے عنوان میں مُحکَمٰت* کے تحت دیکھئے) -

ز ی ل

دیکھئے عنوان '' ز - و - ل '' -

ز ی ن

اَلزِّینَۃُ - وہ چیز جس سے آرائش کی جائے - بعض نے کہا ہے کہ خود کسی چیز کا نگاہ میں حسین معلوم ہونا بھی زینت کہلاتا ہے - زَیَّنَ - کسی چیز کو آراستہ کرنا - کسی چیز (یا بات) کو خوشنما بنا کر دکھانا* - ابلیس نے کہا تھا کہ لَاُزَیِّنَنَّ لَھُمْ فِی الْاَرْضِ (۱۵/۳۹) - میں (انسان کو) اسکی طبعی زندگی (حیات ارضی) اسقدر خوشنما بنا کر دکھاؤنگا کہ یہ اسی کو نصب العین حیات بنا کر بیٹھ جائیگا - یعنی اسکا تصور حیات بالکل مادہ پرستانہ (Materialistic) ہو جائیگا - اِزَّیَّنَ - آراستہ پیراستہ ہونا - مزین ہونا - (۱۰/۲۴) - یَوْمُ الزِّینَۃِ (۲۰/۵۹) بناؤ سنگھار کا دن - تہوار - روز جشن - قصۂ بنی اسرائیل میں ایک جگہ اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَۃِ الْقَوْمِ (۲۰/۸۷) آیا ہے - یعنی وہ چیزیں جن سے وہ قوم اپنی آرائش کرتی تھی - دوسری جگہ اسی کو حُلِیِّھِمْ (۷/۱۴۸) کہا گیا ہے - یعنے ان کے زیورات -

قرآن کریم ، صرف زندگی کا افادی پہلو (Utilitarian Aspect) ہی سامنے نہیں رکھتا بلکہ جمالیاتی پہلو (Aesthetic Aspect) بھی پیش نظر رکھتا ہے - اسلئے وہ انسان کو نہ صرف اجازت دیتا ہے کہ وہ زیبائش و آرائش کی چیزوں سے اپنے اور کائنات کے حسن میں اضافہ کرے بلکہ اسکا حکم دیتا ہے کہ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (۷/۳۱) - ہماری اطاعت گزاریوں میں حسن و زینت کو اختیار کرو - جو لوگ زندگی کے جمالیاتی پہلو کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کے متعلق بڑی سختی سے کہتا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ (۷/۳۲) - ان سے کہو کہ زیبائش و آرائش کی جن چیزوں کو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے وہ کون ہے جو انہیں حرام قرار دے سکتا ہے ؟ اس نے زیبائش و آرائش کی چیزوں کو کسی خاص دائرہ کے اندر محدود نہیں کیا ، بلکہ فرمایا کہ

* تاج -

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا (۱۸/۷)۔ جو کچھ زمین میں ہے سب اسکے لئے وجہ زینت ہے ۔ اسلئے زمین میں جو کچھ بھی زینت و آرائش کا سامان ہے ، سب انسان کے حسن و زیبائش کے لئے ہے ۔ کسی چیز کی ممانعت نہیں۔ البتہ اس اہم حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہی چیزیں زندگی کا نصب العین نہیں بن جانی چاہئیں (۱۸/۴۶)۔ انہیں اصل نصب العین کے حصول میں مددگار کے طور پر استعمال کرنا چاہئے ۔ یا یوں سمجھئے کہ دنیوی متاع حیات اور زیب و زینت کی اشیاء سے متمتع ہونے کی ممانعت نہیں لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ ان چیزوں میں اور قرآن کی متعین کردہ حدود اور اقدار میں ٹکراؤ ہو، اُسوقت اُن چیزوں کو، ان اقدار کے تحفظ کی خاطر قربان کر دینا ہوگا۔ یہی دین کا مغز اور قرآنی تعلیم کا ماحصل ہے ۔

قرآن کریم میں (پردے کے احکام کے سلسلہ میں) کہا گیا ہے کہ مرد اور عورتیں جب باہر نکلیں تو اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں (۲۴/۳۰)۔ اور عورتیں لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (۲۴/۳۱) اپنی زینت کی چیزوں کو نمایاں نہ کریں ، ہاں جو ان میں سے خود بخود ظاہر ہو جائیں (تو اس کا مضائقہ نہیں)۔ یہاں زینت سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے عورتیں اپنا بناؤ سنگار کرتی ہیں ۔ مثلاً زیورات وغیرہ ۔ اسکی تائید اگلے الفاظ سے ہوجاتی ہے ، جہاں کہا گیا ہے کہ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (۲۴/۳۱)۔ وہ اپنے پاؤں کو اسطرح زمین پر نہ ماریں کہ جو کچھ وہ اپنی زینت میں سے چھپائے ہوئے ہیں وہ ظاہر ہو جائے ۔ پاؤں کو زور سے زمین پر مارنے سے ، چھپے ہوئے زیور (جھانجھن یا چھاگل وغیرہ) کی آواز نمایاں ہو جاتی ہے ۔ باقی رہی جسم کے اوپر کے حصہ کی اشیائے زینت ، سو اس کیلئے کہدیا کہ وہ اپنی اوڑھنیاں سینوں پر ڈال لیا کریں (۲۴/۳۱) یا جلباب اوڑھ لیا کریں (۳۳/۵۹)۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اشیائے زینت کی نمائش نہ کرتی پھریں ۔ البتہ افراد خاندان کے سامنے ان کی نمائش کر لیں تو اس میں ہرج کی بات نہیں (۲۴/۳۱)۔ اس فہرست پر نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوجائیگی کہ قرآن کریم اس باب میں بھی کہاں تک احتیاط برتتا ہے۔

جنسی جذبہ (بھوک اور پیاس کی قسم کا جذبہ) نہیں جو از خود بیدار ہو جائے ۔ یہ جذبہ بیدار کرنے سے بیدار ہوتا ہے ۔ قرآن کریم ان اسباب و ذرائع کی نگرانی کرتا ہے جو اس جذبہ کی بیداری کے محرک بن سکتے ہیں ۔ عورت کیطرف سے غیروں کے سامنے نمود حسن یا اظہار زینت ، سب سے بڑا محرک ہے ۔ قرآن کریم اس پر پابندی عائد کرتا ہے ۔

س

س (حرف)

سَ - یہ حرف مضارع کے شروع میں آتا ہے - عربی میں فعل مضارع حال اور استقبال دونوں زمانے اپنے اندر رکھتا ہے ، جب اس سے پہلے ''س'' آ جائے تو اس میں صرف مستقبل کے معنی باقی رہتے ہیں - جیسے سَیَفْعَلُ وہ کام کریگا - ''س'' عموماً مستقبل قریب کے معنی دیتا ہے - لیکن یہ قریب اور بعید محض اضافی چیزیں ہیں - بعض کے نزدیک یہ استمرار (ھمیشگی) کا مفہوم بھی پیدا کردیتا ہے - مثلاً - سَیَقُوْلُ السُّفَهَاءُ (۲/۱۴۲) یہ بیوقوف کہتے رہینگے کہ . . . - بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب یہ کسی ایسے فعل کے ساتھ آئے جس میں وعدہ یا وعید پایا جائے تو اس سے تاکید کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے - مثلاً فَسَیَکْفِیْکَهُمُ اللّٰهُ (۲/۱۳۷) - اللہ یقیناً ان کے مقابلہ میں تیرے لئے کافی ہوگا -

س أ ل

سَاَلْتُهٗ الشَّیْءَ - کے معنے ہیں میں نے اس سے وہ چیز مانگی - اور سَاَلْتُهٗ عَنِ الشَّیْءِ و بِهٖ کے معنے ہیں میں نے اس سے اس چیز کےمتعلق دریافت کیا - اَسْاَلَهٗ سُؤْلَهٗ - اس کی ضرورت کو پورا کردیا - اَلسَّائِلُ - سوال کرنے والا - ضرورت مند* - اَلْمَسْاَلَةُ - ضرورت - حاجت**-

قرآن کریم میں ہے اَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳/۱۰) - ضرورت مند ، صاحب احتیاج کو (ذلیل و حقیر سمجھ کر) مت ڈانٹو-

سورۃ الرحمٰن میں ہے یَسْئَلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۵۵/۲۹) - کائنات میں ہر شے اپنی ضروریات کے لئےخدا کے سامنےجھولی پھیلائے ہے - ہر شے اپنی نشو و نما کے لئےاس کے نظام ربوبیت کی محتاج ہے - سورۃ

*تاج - **محیط -

سجدہ میں زمین اور اس کی پیداوار کے متعلق کہا ہے کہ یہ سَوَاءً لِلسَّائِلِيْنَ (۴۱/۱۰) ہے۔ یعنے اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ یہ انسانی رزق کا سر چشمہ ہے اس لئے اس سے ہر شخص کی ضروریات پوری ہونی چاہئیں۔ یہی اس کی تخلیق کا مقصد ہے۔ نہ یہ کہ مختلف لوگ اس پر حدبندی کرکے اسے اپنی اپنی ملکیت تصور کر لیں۔ خدا نے ان تمام چیزوں کو، جن کی انسان کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے ضرورت ہے، خود مہیا کر دیا ہے۔ وَ آتٰـكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ (۱۴/۳۴)۔ یہ اس کا نظامِ ربوبیت ہے۔ لہذا اس کی ربوبیت عامہ کو افراد کی ملکیت سمجھ لینا بہت بڑا جرم ہے۔

باہم ایک دوسرے سے دریافت کرنے کے معنوں میں سورۃ النبأ میں ہے عَمَّ يَتَسَاءَلُوْنَ (۷۸/۱)۔ مُسْتُوْلُوْنَ (۳۷/۲۴) جن سے پوچھ گچھ کی جائے۔ سورۃ طٰـہٰ میں ہے قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (۲۰/۳۶)۔ اس میں سُؤْلَ بمعنی مسؤل ہے۔ یعنی جس چیز کی تجھے احتیاج ہے۔ تیری مانگ۔ طلب۔ تیری مانگی ہوئی چیز۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ ''سوال'' کے بنیادی معنی ضرورت اور احتیاج کے ہیں۔ جب ہم کسی سے کچھ دریافت کرتے ہیں تو اس وقت بھی ہمیں ان باتوں کے معلوم کرنے کی احتیاج ہوتی ہے جن کی بابت ہم دریافت کرتے (پوچھتے) ہیں۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ کس جگہ اس کا ترجمہ دریافت کرنا ٹھیک ہوگا اور کس جگہ طلب کرنا۔

س أ م

سَئِمَ۔ يَسْاَمُ۔ اکتا جانا۔ اَسْاَمَهُ۔ اس نے اسے اکتا دیا*۔ بعض نے کہا ہے کہ سَاَمٌ۔ کنایةً کسل کو بھی کہتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کسل (سستی) سے اوپر کی چیز ہے**۔ لَا يَسْئَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ (۴۱/۴۹)۔ انسان مال اور دولت کی طلب سے اُکتاتا ہی نہیں۔ اس کی یہ طلب، اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ جذبۂ منافست کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یعنی ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے جذبہ کی بنا پر۔ اور اس طلب کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۲) تاآنکہ یہ قبر تک پہنچ جاتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَ لَا تَسْئَمُوْا اَنْ تَكْتُبُوْهُ (۲/۲۸۲)۔ قرض کے لکھنے میں سستی نہ کرو۔ اکتا نہ جاؤ۔ دل برداشتہ نہ ہو جاؤ۔

*تاج۔ **محیط۔

سبأ

سَبَاؓ ۔ یمن کی ایک قدیم سلطنت کے دارالخلافہ کا نام تھا جس پر عہد حضرتِ سلیمانؑ میں ایک ملکہ حکمران تھی ۔ قرآن کریم میں اس قوم ، اس کے ملک اور ملکہ سباؓ کا ذکر آیا ہے ۔ (دیکھئے ۲۷/۲۲ و ۳۴/۱۵)۔اس میں اس ملک کی سرسبزی اور زرخیزی کا خاص طور پر ذکر ہے اور پھر سیلاب کی وجہ سے اس کی عبرت انگیز تباہی کا ۔ اُنہوں نے ایک بہت بڑا بند تعمیر کرکے پانی کو روکا تھا جس سے ان کا علاقہ سیراب ہوتا تھا ۔ یہ سیلاب اسی بند کے ٹوٹنے سے آیا تھا ۔ ۱۹۵۰ء میں ایک امریکن ماہر حفریات (Archaeologist) نے ان آثار قدیمہ کا ذکر کیا تھا جو اس نے جنوبی عرب ، بالخصوص یمن کے علاقہ میں دریافت کئے تھے ۔ اس کی کتاب کا نام (Qataban and Sheba) ہے اور مصنف کا نام (Wendell Phillips) ۔ ان تفاصیل سے ان امور پر روشنی پڑتی ہے جن کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے ۔ بالخصوص ان کے تعمیر کردہ بند اور اس کے بعد اس تباہی پر جس سے اس قوم کی صرف داستانیں دنیا میں باقی رہ گئیں ۔ (۳۴/۱۹) ۔

اَلسَّبَّاءُ ۔ شراب کے کاروبار کرنے والے کو کہتے ہیں اور سَبَاَ الْخَمْرَ کے معنی ہیں اس نے شراب خریدی* ۔ اگر سباؓ کے شہر کا نام اسی نسبت سے تھا تو اس سے ذہن ان تاکستانوں کی طرف منتقل ہوتا ہے جن کی وہاں افراط تھی۔ لیکن اَلسَّبْاَۃُ کے معنے لمبے سفر کے بھی ہیں* ۔ قرآن کریم میں ہے کہ وہ لوگ چاہتے تھے کہ رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا (۳۴/۱۹) ۔ اے ہمارے پروردگار! ہمارے سفروں کو لمبا کر دے تاکہ ہمارا تجارتی کاروبار وسیع سے وسیع تر ہو جائے ۔ ممکن ہے اسی نسبت سے ان کے دارالسلطنت کا یہ نام ہو۔ ملکہ سباؓ اور حضرت سلیمانؑ کے روابط کے متعلق عنوان ''سلیمانؑ'' دیکھئے۔

س ب ب

سَبَّهٗ سَبًّا ۔ اسکو قطع کر دیا ۔ کاٹ دیا ۔ اَلسَّبُّ ۔ گالی دینا ۔ (کیونکہ اس سے ایک دوسرے کی کاٹ ہوتی ہے یا تعلقات منقطع ہوتے ہیں)** ۔

اَلسِّبُّ اور اَلسَّبَبُ ۔ رسی ۔ مضبوط اور لمبی رسی جس سے درخت وغیرہ پر اترا اور چڑھا جائے ۔ یا جس سے پانی تک پہنچا جائے۔ اسی سے اسکے

*تاج و محیط ۔ ** تاج ۔

معنے ہر اس ذریعہ کے ہو گئے جس سے کسی تک پہنچا جائے * ۔ اس جہت سے راستے کو بھی سَبَبٌ کہدیا جاتا ہے ** کیونکہ وہ ایک منزل کو دوسری منزل کے ساتھ ملاتا ہے ۔ نیز قرابت کا تعلق ۔ رشتہ داری * ۔

قرآن کریم میں ہے وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ (۲/۱۶۶) ۔ '' ان کے باہمی تعلقات منقطع ہو جائینگے '' ۔ وہ مفاد اور ذرائع جن سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں ختم ہو جائینگے ۔ سورۃ کہف میں ہے ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا (۱۸/۸۹) ۔ '' پھر اس نے ایک اور راستہ اختیار کیا '' ۔

سورۃ الحج میں ہے فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَاءِ (۲۲/۱۵)۔ یہاں اسکے معنے ذریعہ ، سبب ، یا سیڑھی کے ہیں * ۔ سورۃ المومن میں اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ (۴۰/۳۷) آیا ہے ۔ صاحب تاج کے نزدیک اسکے معنے آسمان کی سیڑھیاں یا دروازے ہیں ۔ ابو زید نے کہا ہے کہ اسکے معنے منازل کے ہیں * ۔ اور صاحب محیط نے اسکے معنے سیڑھیاں ، راستے ، اطراف و جوانب یا دروازے لکھے ہیں ** ۔ لیکن ذرائع کا لفظ بڑا جامع ہے ۔ ہمارے ہاں بھی اسباب و ذرائع کہتے ہیں ۔ اور اس مقام پر یہی معنی زیادہ موزوں بھی نظر آتے ہیں ۔

سورۃ کہف میں ہے وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا (۱۸/۸۴) اس کے معنے سامان و ذرائع ہی کے ہیں ۔ گالی دینے کے معنوں میں یہ مادہ (۶/۱۰۹) میں آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ کفار کے معبودانِ باطل کو گالی مت دو ، ایسا نہ ہو کہ وہ زیادتی کر کے ، جہالت کی بناء پر خدا کو گالی دیدیں ۔ اس قسم کے مظاہرے ، مذہبی مناظروں کے میدانوں میں اکثر ہوتے رہتے ہیں ۔

س ب ت

اَلسُّبَاتُ ۔ نیند ۔ اس کے اصلی معنے راحت و سکون کے ہیں ۔ (ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں) ۔ اور چونکہ راحت و سکون کا مطلب یہ تھا کہ انسان حرکت و عمل کو چھوڑ کر آرام کرے اس لئے اس کے معنے ترک عمل اور قطع کرنے کے ہو گئے * ۔

چنانچہ سَبَتَ ۔ يَسْبُتُ ۔ و يَسْبِتُ سَبْتًا ۔ کے معنے ہیں اس نے راحت و آرام کیا * ۔ راغب نے لکھا ہے کہ سَبْتٌ کے معنے کاروبار چھوڑنا

* تاج ** محیط و راغب

بھی ھیں اور سنیچر کے دن میں ھونا ' سنیچر کا دن گذارنا ' سنیچر کے دن میں داخل ھونا' بھی** ۔ سَبَتَ الشَّیْءَ کے معنے ھیں اس چیز کو قطع کر دیا ۔ اَلسَّبْتُ ۔ بال مونڈنے اورسر منڈانے کو بھی کہتے ھیں ۔ اَلْمَسْبُوْتُ ۔ میت کو یا بیہوش آدمی کو کہتے ھیں ۔ نیز اس بیمار کو بھی جو آنکھیں بند کئے پڑا رھے* ۔

یَوْمُ السَّبْتِ ۔ ھفتے کا وہ دن جسے سنیچر کہتے ھیں۔خیال ھے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ اس میں یہودی کاروبار نہیں کرتے* ۔ اس معنے میں یہ لفظ ($\frac{۲}{۶۵}$) ۔ میں آیا ھے۔ اور راحت وآرام کے معنوں میں سُبَاتٌ ($\frac{۷۸}{۹}$) میں ، جہاں کہا ھے وَ جَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا ۔ نیند کو موجب استراحت بنایا ۔ سورۃ فرقان میں بھی یہی کہا ھے اور اس کے مقابلہ میں نُشُوْرًا ($\frac{۲۵}{۴۷}$) کا لفظ آیا ھے ، جس کے معنی چلنا پھرنا ۔ منتشر ھونا ۔ اٹھ کھڑے ھونا ھیں ۔

یہودیوں کے متعلق قرآن کریم میں ھے کہ ان میں سے ایک جماعت نے اپنے سَبْت کی پابندیوں کو توڑا ($\frac{۲}{۶۵}$ و $\frac{۴}{۱۵۴}$) ۔ سورۃ اعراف میں ھے کہ یہ اس دن مچھلیاں پکڑ لیا کرتے تھے ($\frac{۷}{۱۶۳}$) ۔ اس حکم کی خلاف ورزی کی بنا پر ان پر لعنت کی گئی ($\frac{۴}{۴۷}$) ۔ اور یہ وبال اس لئے آیا کہ وہ سب ایک مسلک پر چلنے کے بجائے باھمی اختلاف کرنے لگ گئے تھے ($\frac{۱۶}{۱۲۴}$) ۔ اس سے ظاھر ھے کہ جب زندگی ایک نظام کے ماتحت بسر کی جائے تو اس نظام کی طرف سے عائد کردہ چھوٹی سے چھوٹی پابندیوں پر قائم رھنا بھی ضروری ھوتا ھے ۔ ھفتے میں ایک دن کا کاروباری ناغہ بڑی معمولی سی پابندی ھے لیکن اس سے سیرت وکردار کا امتحان ھو جاتا ھے ۔ جو لوگ اتنی سی طمع (Temptation) کا مقابلہ نہ کر سکیں اور چور دروازوں سے اس پابندی کی خلاف ورزی کرنے لگ جائیں وہ بھلا زندگی کی بڑی بڑی آزمائشوں میں کیا پورے اتریں گے؟ کیریکٹر نام ھی ضبط خویش (Self Discipline) اور ترغیبات کے مقابلہ کا ھے۔واقعہ سبت کے بیان کرنے سے قرآن کریم کا مقصود یہی ھے ۔ (اس ضمن میں بنی اسرائیل پر جو عذاب آیا تھا اس کی تفصیل ق ۔ ر ۔ د کے عنوان میں دیکھئے) ھیسٹنگز نے اپنے انسائیکلو پیڈیا*** میں، عہد نامہ عتیق اورمشنا اورتالمود کے حوالوں سے لکھا ھے کہ سبت،جمعہ کی شام سے شروع ھو جاتا تھا اور سینچر کا پورادن رھتا۔ اس میں کاروبار کے علاوہ ، قریب ۳۸ اور امور بھی تھے جن کا کرنا منع تھا ۔

*تاج۔ ** راغب ***Encyclopaedia of Religions and Ethics (By Hastings)

س ب ح

سَبْحٌ کے معنے ہیں تیرنا ۔ سَبَحَ بِالنَّھْرِ وَ فِی النَّھْرِ سَبْحًا وَّ سِبَاحَۃً کے معنے ہیں نہر میں تیرا ۔ اَسْبَحَہٗ فِی الْمَآءِ ۔ اسے پانی میں تیرا دیا ۔ اَلسَّابِحَاتُ ۔ کشتیوں کو کہتے ہیں ۔ اَلسَّوَابِحُ ۔ وہ گھوڑے جو دوڑنے وقت تیرنے والے کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں آگے بڑھاتے ہیں ۔اَلسَّبَّاحُ ۔ اچھے پیراک کو کہتے ہیں ۔ نیز اس سے مشابہت کی بناء پر تیز رفتار گھوڑے اور اونٹ کو بھی کہتے ہیں* ۔

تلاش معاش کے لئے تگ و دو کرنے اور دوڑنے یا چلنے میں دور تک نکل جانے کو بھی سَبْحٌ کہتے ہیں* ۔ زمین میں چلنے پھرنے اور گھومنے کو بھی اَلتَّسَبُّحُ کہتے ہیں*** ۔ چنانچہ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی دوڑ کی ایک قسم بھی لکھے ہیں ۔ لہذا سَبْحٌ کے معنے ہوئے کسی کام کی تکمیل کے لئے پوری پوری تگ و تاز کرنا ۔ امکان بھر جد و جہد کرنا ۔ ہر وقت سرگرم عمل رہنا ۔ تاج میں ابن شمیل کا خواب مذکور ہے جس میں انہوں نے دیکھا کہ کوئی شخص ان کے لئے سُبْحَانَ اللّٰہِ کی تفسیر بیان کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تم نے گھوڑے کو نہیں دیکھا کہ وہ کسطرح اپنی تیز رفتاری میں تیر رہا ہوتا ہے ۔ یعنی سُبْحَانَ اللّٰہِ کے معنے ہیں خدا کی طرف تیز رفتاری سے جانا اور اس کی اطاعت میں مستعد رہنا* ۔ راغب نے بھی کہا ہے کہ سَبْحٌ اصل میں ''پانی یا ہوا میں تیزی سے گذرنا'' ہے ۔ پھر استعارۃ فلک میں تاروں کی تیز خرامی کے لئے بولا گیا ہے ۔ التسبیح خدا کی اطاعت میں تیزی کرنے کو کہتے ہیں ۔ ازاں بعد اس کا استعمال وسعت اختیار کر گیا اور اسے قولی یا عملی یا اعتقادی عبادات کے لئے بولنے لگ گئے** ۔ حتّٰکہ اب سُبْحَۃٌ اُن دانوں کو کہتے ہیں جو تسبیح میں پرو لئے جاتے ہیں حالانکہ یہ چیز عربوں میں غیر معروف ہے ۔ (تسبیح عیسائی راہبوں کے ہاں، ہوتی تھی جنہوں نے اسے غالباً بدھ مت والوں سے لیا تھا) ۔

قرآن کریم میں اجرامِ سماوی کے متعلق ہے کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (۳۶/۴۰) ۔ ''وہ تمام اپنے اپنے دوائر (Orbits) میں تیزی کے ساتھ تیر رہے ہیں'' ۔ رسول اللہؐ کے متعلق ارشاد ہے اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا (۷۳/۷) ۔ تیرے لئے دن میں بڑا لمبا پروگرام ہوتا ہے ۔ تجھے بڑی جد و جہد کرنی ہوتی ہے ۔ پرندوں کے متعلق ہے کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَ تَسْبِیْحَہٗ (۲۴/۴۱) ۔ ان میں سے ہر ایک ، فضا کی پہنائیوں میں ، اپنے اپنے راستے**** سے بھی واقف

*تاج ۔ **راغب ۔ ***لطائف اللغۃ ۔ ****صلاۃ کے لئے دیکھئے عنوان ص ۔ ل ۔ و ۔

ہے ۔ (حالانکہ وہاں کوئی نشان راہ نہیں لگا ہوتا) یا اپنے اپنے مقاصد کے پیچھے جانے سے واقف ہے ، اور اپنی اپنی جد و جہد کے دوائر اور حصول معاش کے طور طریق سے بھی ۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (۵۷/۱) کے معنے ہیں کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ سب اس پروگرام کی تکمیل میں جو قانون خداوندی کی رو سے ان کے لئے متعین کیا گیا ہے پوری شدت اور تیزی سے مصروف عمل ہیں ۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہر وقت سرگرم عمل رہتے ہیں۔ خارجی کائنات کی چیزیں اس پروگرام کی تکمیل کے لئے ازخود (Instinctively) سرگرم عمل رہتی ہیں (اسی کو قصہ آدم میں فرشتوں کی تسبیح کہا گیا ہے ۲/۳۰ ۔ یا مثلاً رعد کی تسبیح ۔ ۱۳/۱۳) ۔ لیکن انسان کو اس کیلئے اپنے اختیار و ارادہ سے سرگرم عمل رہنا ہے ۔ اس لئے جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (۳۳/۴۲) ۔ تم صبح شام (ہمیشہ) اس پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروف سعی و عمل رہو ۔ یہ پروگرام کیا ہے؟ اس کے متعلق فرمایا فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (۵۶/۹۶) اپنے نشو و نما دینے والے کی صفت ربوبیت عظمیٰ کو، جس پر ساری کائنات کی عمارت استوار ہے ، انسانی معاشرہ میں عملاً متشکل کرنے کے لئے سرگرم عمل رہنا ۔ اس کے راستے میں جو قوتیں مزاحم ہوں ان کے خلاف جد و جہد کو بھی "ذکر و تسبیح" کہا گیا ہے ۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ[۴] فرعون کی طرف جانے لگے ہیں تو انہوں نے اپنی اس مہم کے لئے بھی کہا تھا كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا وَّ نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا (۲۰/۳۴) ۔

قرآن کریم جو نظام زندگی جماعت مومنین کے لئے تجویز کرتا ہے اس میں صلوٰۃ کے اجتماعات کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ یہ اس جماعت کے جذبہ اطاعت خداوندی کے عملی مظاہر ہوتے ہیں ۔ اور اس کا اظہار رکوع و سجود کی شکل میں سامنے آتا ہے ۔ رکوع و سجود میں ایک عبد مومن اپنے خدا سے اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی اُس کے قوانین کی اطاعت اور اُس کے بتائے ہوئے فرائض کی سر انجام دہی کے لئے جد و جہد میں صرف کریگا ۔ یہ اقرار جن الفاظ میں کیا جاتا ہے عام اصطلاح میں انہیں بھی خدا کی تسبیح کہا جاتا ہے ۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص زبان سے اس قسم کے اقرار کرتا رہے اور عملاً ایسا کرکے نہ دکھائے ، تو یہ زبانی قول و اقرار ایک بے نتیجہ رسم سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے ۔ صلوٰۃ میں حرکات و سکنات اور الفاظ ، انسان کے جذبہ عمل کے بیتابانہ اظہار کی شکلیں ہیں ۔ اگر عمل نہ رہے اور انسان ان شکلوں ہی کو مقصود و منتہیٰ سمجھ لے تو اس کا نتیجہ

ظاہر ہے ۔ بہر حال ، یہ تو ظاہر ہے کہ تسبیح کے دانوں پر خدا کا نام گننا ، قرآنی تعلیم کا مقصود نہیں ۔ قرآن کریم کی رو سے تسبیح سے مفہوم ، قوانین خداوندی کی اطاعت میں پوری پوری جد و جہد اور سرگرمیٔ عمل ہے۔

لسان العرب میں ہے کہ تَسْبِیْح کے معنے تنزیہ کے ھیں ۔ نیز یہ لفظ ''سبحان اللہ'' کہنے ، یا صلٰوۃ اور ذکر اللہ ، حمد و مجد و ثنا ، کے لئے استعمال ھوتا ہے ۔ چونکہ اس میں شدت کا پہلو غالب ھوتا ہے اس لئے تنزیہ کے معنے ھونگے ، خدا کو بڑی شدت اور قوت کے ساتھ تمام نقائص سے دور سمجھنا ۔

اس مادہ میں تیزی ۔ مضبوطی ۔ شدت کا پہلو ھوتا ہے ۔ اسی لئے کِسَاءٌ مُسَبَّحٌ کے معنی ھیں بہت مضبوط اور سخت بُنا ھوا کمبل ۔ اس اعتبار سے فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ کے معنی ھونگے ، صفاتِ خداوندی کو نہایت تیزی ، شدت اور مضبوطی کے ساتھ اپنانا اور عام کرنا ۔ مطلب وھی ہے جو پہلے بیان کیا جاچکا ہے ۔

سورۃ صٰفّٰت میں حضرت یونس کے متعلق ہے کہ انہیں بڑی مچھلی نے لقمہ بنا لیا۔ فَلَوْلَا اَنَّهٗ کَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (۳۷/۱۴۳) اگر یہ لفظ (مُسَبِّحِیْنَ) سَبْحٌ سے ھوتا تو اس کے معنی تیراک ھوتے ۔ لیکن سَبَّحَ کے اعتبار سے اس کے معنے ھونگے پوری قوت اور شدت سے جد و جہد کرنے والا ۔ اس میں مچھلی کے منہ سے نکلنے کے لئے پوری جد و جہد کرنے کے بعد ساحل تک پہنچ جانے میں تیرنے کا مفہوم خود بخود آ جاتا ہے ۔

اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ (۳۷/۱۶۶)۔ ھم یقیناً (اسی راہ میں) انتہائی قوت کے ساتھ جد و جہد کرنے والے ھیں۔

ان مقامات سے بھی تَسْبِیْح کے معنی سمجھ میں آسکتے ھیں ۔ شدت ، مضبوطی ، تیزی کے ساتھ خدا کے پروگرام کی تکمیل میں مصروفِ جد وجہد رھنا ۔

سُبْحَانَ مِنْ کَذَا ۔ تعجب کے موقعہ پر بولتے ھیں* ۔ دوری کے اعتبار سے سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ (۳۷/۱۵۹) کے معنے ھیں ، خدا ان تمام غلط تصورات سے بہت دور ہے جو یہ لوگ اس کے متعلق اپنے ذھن میں قائم کرتے ھیں ۔ نیز سُبْحَانٌ (مصدر) کے معنے ھیں ، سرگرم عمل رھنا* ۔

*تاج ۔

فَسُبْحٰنَ اللهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ (۳۰/۱۷) - شام و پگاہ تمہارے لئے ان فرائض کی سر انجام دہی میں مصروف رہنا ہے جو تمہارے لئے اللہ نے مقرر کئے ہیں -

س ب ط

اس مادہ کے اصلی معنی کسی چیز میں زیادتی اور کثرت کے ہیں* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے دراز ہونے کے ہیں - اسی سے اَلسَّبَطُ - ایک درخت یا جھاڑی کو کہتے ہیں جس کی جڑ تو ایک ہوتی ہے لیکن شاخیں بہت پھیلی ہوئی ہوتی ہیں - یہیں سے اس کے معنے نسل اور خاندان کے ہو گئے- یعنی باپ بمنزلہ جڑ کے ہے اور اولاد بمنزلہ شاخوں کے - اَلسِّبْطُ - پوتے اور نواسے دونوں کو کہتے ہیں - یہی لفظ یہود کے قبیلہ کے لئے بولا جاتا ہے - اَسْبَاطٌ کا لفظ بنو اسحٰق (حضرت اسحٰق کی اولاد) کے لئے خاص تھا اور قَبَائِلُ کا لفظ بنو اسمٰعیل کے لئے - عربوں نے یہ تخصیص اس لئے رکھی تھی کہ محض ایک لفظ سے اولادِ حضرت ابراہیم کی دونوں شاخوں میں امتیاز ہوجائے** - قرآن کریم میں بھی قوم حضرت موسیٰ کے لئے اَسْبَاطٌ - کا لفظ آیا ہے (۷/۱۶۰) - نیز عرب السَّبْطُ - عجمی آدمی کو کہتے تھے - جس طرح جَعْدٌ عربوں کو کہتے تھے** -

قرآن کریم میں اولادِ حضرت یعقوب کے لئے اَسْبَاطٌ کا لفظ آیا ہے (۲/۱۳۶) -

س ب ع

سَبْعٌ - سات کے عدد کو کہتے ہیں - بعض کا خیال ہے کہ اسکی اصل سَبُعَةٌ ہے جسکے معنے شیرنی کے ہیں - یہ اسلئے کہ وہ شیر سے بھی زیادہ تیز حملہ کرتی ہے اورعربوں کے ہاں سات کا عدد تامہ (Perfect Number) ہوتا ہے-

اَلسَّبُعُ - یا اَلسَّبْعُ یا اَلسَّبِعُ - درندہ کو کہتے ہیں (۵/۳) - بعض کا خیال ہے کہ یہ اسلئے کہ اتفاق سے عرب میں سات جانور درندے ہوتے تھے - لیکن راغب کا خیال ہے کہ انہیں سَبُعٌ اسلئے کہتے ہیں کہ ان کی قوت مکمل ہوتی ہے اور سات کا عدد بھی مکمل ہے** - لین نے (بیضاوی کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ عربوں میں سَبْعَةٌ سات ہی کو نہیں کہتے بلکہ وہ اسے ان معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں جن معنوں میں ہم کہتے ہیں "کئی

*محیط - **تاج - ثعالبی نے فقہ اللغہ میں بھی اس کی تصریح کی ہے -

ایک " (Several) یا " متعدد " (Many) - اسی طرح سَبْعُوْنَ (ستر) سَبْعُمِائَةٍ - (سات سو) بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے **- جیسے ہماری زبان میں بیسیوں - پچاسوں - سینکڑوں - کے الفاظ بولے جاتے ہیں - اس سے مراد کوئی معین عدد نہیں ہوتا - یا جیسے ہم کہتے ہیں کہ تمہیں سو بار سمجھا چکے ہیں - اس سے مراد ٹھیک سو کی تعداد نہیں ہوتی - چنانچہ جہاں قرآن کریم میں ہے اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (۹/۸۰) تو اسکے یہ معنے نہیں کہ اگر تو ان کے لئے ستر بار مغفرت مانگے تو ہم مغفرت نہیں دینگے اور اگر ستر سے زیادہ مرتبہ مغفرت مانگے تو مغفرت دیدی جائیگی - اسکے یہ معنے ہیں کہ تو ان کے لئے چاہے کتنی مرتبہ مغفرت مانگے انہیں مغفرت نہیں مل سکے گی - ان معانی کے پیش نظر سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (۲/۲۹) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - یعنے متعدد اجرام فلکی - ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں " سات سمندر پار " - (۲/۲۹) میں متعدد کے معنی واضح ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ...... " ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے اپنی دولت کو کھلا رکھتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیں اگائے اور ایک بال میں سو سو دانے ہوں " - ظاہر ہے کہ یہاں سَبْعَ سَنَابِلَ سے مراد متعدد (کئی) بالیں ہے -

قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِىْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (۱۵/۸۷) - اسکے لئے دیکھئے - عنوان (ث - ن - ی -) میں لفظ مثانی -

س ب غ

اَلسَّبْغَةُ - وسعت - فراخی - کشادگی - سَبَغَ الشَّيْئُ سُبُوْغاً - کسی چیز (کپڑے - زرہ وغیرہ) کا لمبا اور لٹکتا ہوا ہونا - اَلسَّابِغَةُ - وہ زرہ جو ٹخنوں تک آجائے یا لمبائی کی وجہ سے زمین پر گھسٹنے لگے - (سَابِغَات اس کی جمع ہے - ۳۴/۱۱) - اَسْبَغَ شَعْرَهُ - اس نے اپنے بالوں کو لمبا کیا اور خوب بڑھایا - شَيْءٌ سَابِغٌ - بھر پور چیز *** - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - سَبَغَتِ النِّعْمَةُ - نعمت کا وسیع اور بھر پور ہونا ***- قرآن کریم میں ہے وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ (۳۱/۲۰) - خدا نے تمہیں اپنی نعمتوں کو بھر پور، کثرت اور فراوانی سے دیا -

* تاج - ** لین - *** تاج - راغب - محیط -

س ب ق

سَبْقٌ* کے بنیادی معنی ہیں دوڑنے میں آگے بڑھ جانا۔ اسکے بعد ہر شے میں آگے بڑھ جانے کیلئے اس کا استعمال ہونے لگا*۔سَبَقَہٗ۔ وہ اس سے آگے بڑھ گیا، بازی لے گیا۔ سَبَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَصَلّٰی اَبُوْبَکْرٍ۔ سب سے پہلے رسول اللہؐ (دنیا سے) تشریف لے گئے اور انکے پیچھے پیچھے (حضرت) ابوبکرؓ چلے گئے۔ اَلسَّبَقُ۔ اس شرط یا انعام کو کہتے ہیں جو گھوڑ دوڑ وغیرہ میں اول آنے والے کیلئے مقرر کر دیا جاتا ہے**۔

اِسْتَبَقَا الْبَابَ ($\frac{12}{25}$)) وہ دونوں دروازہ کی طرف لپکے اور ہر ایک نے کوشش کی کہ وہ آگے بڑھ جائے**۔

محیط میں ہے کہ جب اسکے بعد عَلٰی آتا ہے تو آگے بڑھنے اور پہلے آنے والی چیز نقصان دہ ہوتی ہے اور جب اسکا صلہ لام آتا ہے تو اس میں پہلے آنے والی چیز فائدہ بخش ہوتی ہے***۔سَبَقَتْ لَھُمْ مِنَّا الْحُسْنٰی ($\frac{21}{101}$) ۔ہماری طرف سے خوشگواریوں نے آگے بڑھکر ان کا استقبال کیا۔

سورۃ بقرہ میں ہے فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ($\frac{2}{148}$) خوشگواریاں پیدا کرنے والے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو۔ نفسیاتی طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان کے لئے عمل اور جد و جہد کا جذبۂ محرکہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ مقابلہ (Competition) اور مسابقت (دوسروں سے آگے بڑھنے کا جذبہ) ہی وہ مہمیز ہے جس سے انسان دیوانہ وار مصروفِ سعی و عمل رہتا ہے۔ قرآن کریم بھی انسان کے اس جذبہ کی رعایت کرتا ہے اور اسکی پرورش چاہتا ہے۔ لیکن وہ اسکا رخ بدل دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بجائے اس کے کہ تم ذاتی مفاد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، نوع انسانی کے لئے خوشگواریاں پیدا کرنے والے امور میں سبقت کرو۔ اس سے تمہارے جذبۂ مسابقت کی بھی تسکین ہو جائیگی اور معاشرہ میں وہ فساد بھی برپا نہیں ہوگا جو اپنے اپنے مفاد کی خاطر دوسروں سے آگے بڑھنے کی صورت میں ہوتا ہے۔

سورۃ حجر میں ایک جگہ یہ لفظ (تَسْبِیْقٌ) یَسْتَاْخِرُ (پیچھے رہ جانے) کے مقابلہ میں آیا ہے ($\frac{15}{5}$) اور دوسری جگہ مُسْتَاْخِرِیْنَ کے مقابلہ میں مُسْتَقْدِمِیْنَ آیا ہے ($\frac{15}{24}$)۔ لہذا سَبْقٌ۔ اِسْتِئْخَارٌ (پیچھے رہ

* راغب۔ ** تاج۔ *** محیط۔

جائے) کی ضد اور اِسْتِقْدَامٌ (آگے بڑھنے) کے مرادف ہے۔ سورۃ واقعہ میں مَسْبُوْقِیْنَ (۵۶/۶۰) بمعنے مَغْلُوْبٌ آیا ہے۔ یعنی جس سے کوئی آگے بڑھ جائے۔

سورۃ انبیاء میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَھُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰی (۲۱/۱۰۱)۔ اسکے معنے کئے جاتے ہیں جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے پہلے ہی بھلائی آچکی ہے۔ اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے پہلے ہی مقرر کر دیا ہے کہ فلاں آدمی اچھے کام کرے گا اور فلاں برے کام۔ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اللہ تعالےٰ نے یہ قانون پہلے سے بنا رکھا ہے کہ فلاں کام کا نتیجہ اچھا ہوگا اور فلاں کا نتیجہ برا۔ اور اس کے بعد انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ جس قسم کا کام جی چاہے کرے۔ وہ جس قسم کا کام کریگا اس کے مطابق نتیجہ اس کے سامنے آجائیگا۔ سورۃ انبیاءؑ کی مندرجہ بالا آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صحیح روش پر چلیں ان کیلئے خوشگواریاں ہیں۔ اور یہ چیز (کہ اُس روش کا نتیجہ یہ ہوگا) پہلے سے متعین ہو چکی ہے۔ ہم نے محض ان کی خاطر یہ اصول نہیں اختیار کیا۔

سورۃ حدید میں ہے سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ .... (۵۷/۲۱) اپنے رب کی مغفرت کیطرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

س ب ل

اَسْبَلَ۔ لٹکانا۔ چھوڑ دینا۔ اَسْبَلَ الْاِزَارَ۔ ازار کو لٹکا دیا۔ اَسْبَلَ دَمْعَہٗ۔ اپنے آنسوؤں کو جاری کر دیا، چھوڑ دیا تاکہ وہ آنکھوں سے بہ نکلیں۔ اَسْبَلَتِ السَّمَآءُ۔ آسمان سے موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ اَلسَّبَلُ۔ بارش۔ لیکن وہ بارش جو آسمان سے لٹک کر زمین کی طرف آرہی ہو اور ہنوز زمین پر نہ گری ہو۔ اَلسَّبَلَۃُ۔ وسیع پیمانے پر ہونے والی بارش۔ اَسْبَلَ الزَّرْعُ۔ کھیتی میں خوشے لٹکنے لگ گئے*۔ لہذا اس لفظ کے بنیادی معنی لٹکانے۔ چھوڑنے اور لمبا کرنے کے ہیں (ابن فارس)۔ اس سے اَلسَّبِیْلُ و اَلسَّبِیْلَۃُ کے معنے ہیں راستہ۔ نرم راستہ جس میں سختی نہ ہو، راستہ کا واضح حصہ۔ سَبِیْلٌ۔ مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے لیکن مونث زیادہ مستعمل ہے۔ اس کی جمع سُبُلٌ آتی ہے*۔ ابن

* تاج۔

فارس نے لکھا ھے کہ لمبائی اور دور تک چلے جانے کی وجہ سے راستہ کو سَبِیْل* کہتے ھیں ۔ اَلسَّابِلَۃُ مِنَ الطُّرُقِ ۔ وہ راستہ جس پر لوگ عام طور پر چلتے رھیں یا وہ لوگ جو اپنی ضروریات کے لئے راستے پر آتے جاتے رھیں ۔ راہرو ۔ مسافر* ۔

قرآن کریم میں فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ (۲/۱۹۰) کی اصطلاح متعدد بار آئی ھے ۔ اس کے مقابلہ میں فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ (۴/۷۶) آیا ھے ۔ "مومنین کی جماعت فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جنگ کرتی ھے اور کفار فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ جنگ کرتے ھیں" (۴/۷۶) ۔ اس سے فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کا مفہوم واضح ھو جاتا ھے۔ طاغوت وہ مستبد قوتیں ھیں جو دوسروں کو اپنے احکام کے تابع چلائیں اور دنیا میں باطل کا نظام قائم کریں ۔ لہذا سَبِیْلِ اللّٰہِ کے معنے ھوئے قوانین خداوندی کی اطاعت کے لئے ، نظام خداوندی کے قیام کی خاطر ، اس راستہ پر چلنے اور دوسروں کو چلانے کے لئے جو خدا نے مقرر کیا ھے ، ذاتی مفاد پرستیوں کے بجائے نوع انسانی کی فلاح و بہبود (رب العالمینی) کے لئے ، انسانی بھلائی کے کاموں کے لئے ، مخالفت کی قوتوں کا مقابلہ کرنا۔ مومنین اسی مقصد کے لئے جیتے اور اسی کے لئے اپنی جان دیتے ھیں ۔ اسی سے انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم واضح ھو جاتا ھے ۔ یعنی حق کے اثبات اور نوع انسانی کی بہبود کی خاطر اپنا مال کھلا رکھنا ، کہ جتنا ضروری ھو اس میں سے لے لیا جائے ۔

اِبْنُ السَّبِیْلِ ۔ مسافر جو بہت سفر کرے ۔ بعض کے نزدیک اس سے ایسا مسافر مراد ھوتا ھے جس کا زادِ راہ ختم ھو چکا ھو* ۔ قرآن کریم نے اسلامی معاشرہ کے فرائض میں یہ بھی شامل کیا ھے کہ وہ "اِبْنُ السَّبِیْلِ" کی مدد کرے ۔ حتی کہ صدقات کا ایک مصرف یہ بھی بتایا ھے ۔ (۹/۶۰) ۔ اس میں ھر اس شخص کے لئے جو اسلامی مملکت میں سفر کرے سفر کی سہولتیں بھی آ جاتی ھیں اور جو لوگ سفر میں کسی وجہ سے نادار ھوجائیں انہیں ان کی منزل مقصود تک پہنچانا بھی ۔ محیط نے اس کے معنے مہمان کے بھی دئے ھیں ۔ دور حاضر کی سیاسی اصطلاح میں "ابن السبیل" وہ لوگ ھونگے جو اسلامی مملکت میں عارضی طور پر آئیں جائیں اور رھیں سہیں (Non-Citizens) ۔

سورۃ آل عمران میں اھل کتاب کے متعلق ھے کہ وہ کہتے تھے کہ لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ (۳/۷۴) ۔ یعنی ھم ان غیر اھلِ کتاب

* تاج ۔

عربوں کے خلاف جو جی میں آئے کرلیں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہوگی ۔ یہ وہی ذہنیت ہے جو قبائلی عصبیت کی پیدا کردہ ہوتی ہے ۔ اس کے مطابق جو جرم اپنے قبیلہ کے اندر کیا جائے وہ جرم ہوتا ہے لیکن جو جرم قبیلہ سے باہر کیا جائے وہ جرم نہیں کہلاتا ۔ قبائلی زندگی تو ایک طرف ، خود اہل روما کے ہاں قانون موجود تھا کہ اپنی قوم کے فرد کی چوری جرم ہے اور غیر قوم والوں کے ہاں چوری جرم نہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ گروہ سازی کہیں بھی ہو (خواہ وہ مذہبی فرقہ بندی ہو یا سیاسی قومیت کی گروہ بندی) اس سے یہی ذہنیت پیدا ہوتی ہے کہ ہمدردیاں اور نفع رسانیاں صرف اپنے فرقہ اور اپنی پارٹی کے افراد تک محدود رہنی چاہئیں ۔ اس سے باہر جتنے افراد انسانیہ ہیں ان سے نفرت کی جائے ۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے اور آج سے چار ہزار سال پہلے بھی یہی ہوتا تھا ۔ عصر حاضر کی نیشنلزم اسی جذبہ کی پیداوار ہے ۔ اور اسی نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے ۔ قرآن کریم نےاس ذہنیت کے خلاف آواز بلند کی اور کہا کہ جرم بہر نوع جرم ہے خواہ اپنوں کے خلاف کیا جائے یا دوسروں کے خلاف ۔ اس میں انسان اور انسان ، اور قوم اور قوم میں کوئی فرق نہیں ۔ اسی لئے اس کے نزدیک اچھا کام وہی ہے جو فی سبیل اللہ کیا جائے ۔ یعنی اجر و معاوضہ کے خیال سے بلند ہو کر ، نوع انسانی کی بہبود کی خاطر ۔

قرآن کریم میں جنتی زندگی کے سلسلہ میں ہے عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا (۷۶/۱۸)۔ ''اس میں ایک چشمہ ہے جسے سَلْسَبِيْلٌ کہتے ہیں'' ۔ محیط نے اس کی اصل سَلْ ۔ سَبِيْلًا بتائی ہے جس کے معنی ہونگے راستہ دریافت کرنا** ۔ (پوچھتے ہوئے آگے چلتے جاؤ) ۔ اسی کو دوسری جگہ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ (۸۸/۱۲) سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ جاری چشمہ ۔ ہر وقت بہتا رہنے والا چشمہ ۔ یعنی خود زندگی کی جوئے رواں جو مسلسل آگے بڑھتی جاتی ہے ۔ حیاتِ جاوداں جو ایمان و اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ ہے ۔ جو حرکتِ مسلسل سے عبارت ہے اور جس میں کہیں انقطاع اور حد بندی نہیں ۔ کوئی روک اور رکاوٹ نہیں ۔ اپنے زورِ دروں سے انسانی ذات کا مختلف مراحل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے جانا ۔ ''سَبِيْلُ اللّٰهِ'' بھی یہی راہ ہے ۔ وہ راستہ جس میں انسان ''مَا يَنْفَعُ النَّاسَ'' (۱۳/۱۷) پر عمل پیرا ہوتا اور خدائی صفات کو اپنے اندر منعکس کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے ۔ یہی وہ راہ تھی جس کی طرف رسول اللہ علی وجہ البصیرت دعوت دیتے تھے (۱۲/۱۰۸) ۔ یہ قرآن

*تاج ۔ **محیط ۔

کریم کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم ہے۔ اس سے انسانی صلاحیتیں بھرپور طور پر نشو و نما حاصل کر سکتی ہیں اس لئے کہ مَلَاَ الْکَاْسَ اِلٰی اَسْبَالِھَا : پیالے کو لبالب بھر دینے کو کہتے ہیں*۔

سورۃ نحل میں شہد کی مکھی سے کہا گیا ہے فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا (۱۶/۶۹)۔ اپنے نشو و نما دینے والے کے راستوں پر فرماں پذیری سے چلی جا۔ اس سے واضح ہے کہ قوانینِ فطرت بھی "اللہ کے راستے" ہیں جن پر اشیائے کائنات چلی جا رہی ہیں۔ اور انسانوں کی راہنمائی کے لئے حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے ملی ہوئی وحی صحیح راستے ہیں (۱۴/۱۲)۔

سورۃ عنکبوت میں ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ (۲۹/۶۹)۔ اس کا سادہ ترجمہ یہ ہے کہ "جو لوگ ہمارے لئے جد و جہد کرتے ہیں انہیں ہم اپنے راستے دکھا دیتے ہیں"۔ یوں تو خدا کی طرف جانے والا ایک ہی راستہ ہے جسے اس نے "الصراط المستقیم" کہہ کر پکارا ہے (۱/۵) لیکن انسان کے سامنے، نت نئے دن، زندگی کے نئے نئے مسائل آتے رہتے ہیں جن کا حل اسے تلاش کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے انسانی زندگی کے لئے اصول دئیے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں، زندگی کے ہر پیش آنے والے معاملہ کا حل دریافت کرنا، جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے خارجی کائنات کے احوال و کوائف، اقوام عالم کی تمدنی زندگی، اپنے زمانے کے مقتضیات اور قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں پر گہرے غور و خوض اور فکر و تدبر کی ضرورت ہوگی۔ اس طریق کار سے، معاملات پیش نظر کے متعلق قرآنی راہ نمائی کے لئے جد و جہد کرنا، (اصطلاح میں) اجتہاد کہلاتا ہے۔ خدا کا وعدہ یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح اجتہاد کرینگے، ہم ان کے سامنے زندگی کی صحیح راہیں کشادہ کرتے چلے جائینگے۔ انہی راہوں کو قرآن کریم نے دوسری جگہ "سبل السلام" یعنی امن و سلامتی کی راہیں قرار دیا ہے اور ان کا مقصد یہ بتایا ہے کہ یُخْرِجُھُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِہٖ۔ اسطرح کاروانِ انسانیت، تاریکیوں سے روشنی کی طرف آ جاتا ہے۔ اور آخر میں ہے وَیَھْدِیْھِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵/۱۶)۔ اور یوں انہیں "صراط مستقیم" کی طرف راہنمائی مل جاتی ہے۔ یعنی یہ تمام راستے اُسی صراط مستقیم میں جا کر مل جاتے ہیں۔ یہ تمام جزئیات و تفاصیل جنہیں جماعت مومنین، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مرتب کرتی ہے، قرآنی اصل کی شاخیں ہوتی ہیں اس لئے یہ تمام پگڈنڈیاں اُسی شاہراہِ مقصود میں جا کر مل جاتی ہیں۔

* تاج۔

س ت ت

اَلسِّتُّ - اَلسِّتَّۃُ - چھ - اصل میں سِدْسٌ تھا * - قرآن کریم میں ہے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ (۷/۵۴) - " زمین اور آسمانی کُروں کو چھ ادوار میں پیدا کیا "- اس میں ان ارتقائی ادوار کی طرف اشارہ ہے جن سے گزر کر ھماری زمین اور دیگر اجرام اپنی موجودہ ھیئت تک پہنچے ھیں - (یَوْمٌ کے صحیح مفہوم کیلئے دیکھئے عنوان ی - و - م) - سِتُّوْنَ اور سِتِّیْنَ - ساٹھ - (۵۸/۴) -

س ت ر

سِتْرٌ - اوٹ - آڑ - پردہ جس سے کوئی چیز چھپائی جائے ** - سورۃ کہف میں ہے لَمْ نَجْعَلْ لَّھُمْ مِّنْ دُوْنِھَا سِتْرًا (۱۸/۹۰) - وہ قوم (کھلے میدان میں رھتی تھی اسطرح کہ) ان کے اور سورج کے درمیان کوئی اوٹ یا آڑ نہیں تھی - اَلسِّتَارُ - پردہ - سَتَرَ الشَّیْءَ - اسنے اس چیز کو چھپا دیا - اِسْتَتَرَ - چھپ جانا ** - قرآن کریم میں ہے وَمَا کُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ (۴۱/۲۲) - تم نہیں چھپتے تھے - سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ جب تو قرآن کریم پڑھتا ہے تو تجھ میں اور ان لوگوں میں جو حیات مستقبل پر ایمان نہیں رکھتے حِجَابًا مَّسْتُوْرًا (۱۷/۴۵) حائل ھوجاتا ہے - یعنی ایک ایسا پردہ حائل ھوجاتا ہے جو نگاھوں سے پوشیدہ ھوتا ہے - ان کے قلب و دماغ پر ایسا پردہ چھا جاتا ہے جو آنکھوں سے تو دیکھا نہیں جا سکتا لیکن اُسے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ کیا ہے - ان کی نفسیاتی کیفیت کو حِجَابٌ مَّسْتُوْرٌ سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی غیر مرئی پردہ - نیز مَسْتُوْرٌ بمعنی سَاتِرٌ بھی ہے (چھپانے والا) جیسے مَسْحُوْرٌ بمعنی سَاحِرٌ - خدا کا ایک نام اَلسَّتَّار - بھی مشہور ہے - لیکن یہ لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا -

س ج د

اَلسُّجُوْدُ کے معنی ھیں ، سر کو جھکا دینا - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی ، پست ھونا اور جھک جانا لکھے ھیں - نَخْلَۃٌ سَاجِدَۃٌ - جھکا ھوا کھجور کا درخت ، بالخصوص وہ جو پھلوں کے بوجھ سے جھک جائے * - سَجَدَ الْبَعِیْرُ - اونٹ نے اپنا سر جھکا دیا تاکہ سوار اس پر بیٹھ جائے ** -

---

*تاج - ** تاج و راغب و محیط -

لہذا اس مادہ کے معنی طبعی طور پر (Physically) انسان کے سر (یا کسی اور چیز) کے جھک جانے کے ہیں ۔ لیکن انسانی جسم کی حرکات و سکنات کے پیچھے ایک فلسفہ کار فرما ہے جسے دور حاضر کی علمی اصطلاح میں متوازیت یا (Parallelism) کہتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے نفس (Mind) کے ارادے اور اس کے جسم (Body) کی حرکت میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ دونوں متوازی چلتے ہیں ۔ مثلاً جب آپ لیٹے لیٹے کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اس خیال کے ساتھ ہی اٹھ بیٹھتے ہیں ۔ جب آپ آرام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو بیٹھ یا لیٹ جاتے ہیں ۔ یا جب آپ کسی بات پر ہاں کہتے ہیں تو ساتھ ہی سر ہلا دیتے ہیں (بلکہ یوں کہئیے کہ آپ کا سر خود بخود غیر شعوری طور پر ہل جاتا ہے) جب آپ کسی کا احترام کرتے ہیں تو آپ کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے ، اور اس سے آگے بڑھتے ہیں تو آپ کا سر جھک جاتا ہے ۔ اس حقیقت کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے اور ان الفاظ سے جن کا بدیہی مفہوم جسم کی طبعی حرکت ہوتا ہے ، اس جذبہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے جو اس حرکت کا سبب ہوتا ہے ۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اس نے میرے حکم کے سامنے ” سر جھکا دیا “ تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس حکم کو تسلیم کر لیا اور اس کی تعمیل کر دی ۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ اسنے حکومت کے قانون سے ”سرکشی“ اختیار کی تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس قانون کے ماننے سے انکار کر دیا اور حکومت کے خلاف بغاوت اختیار کر لی ۔ قرآن کریم بھی چونکہ ایک خاص زبان (عربی) میں بات کرتا ہے اس لئے اس کے ہاں بھی اظہار مطالب کا یہی انداز ہے ۔ اس اعتبار سے اس نے سجدہ کا لفظ ، اطاعت اور فرمانپزیری کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے ۔ مثلاً سورۂ نحل میں ہے وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶/۴۹) ” اور جو جاندار کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہیں اور ملائکہ ، سب خدا کے سامنے سر بسجود ہیں اور وہ سرکشی اختیار نہیں کرتے “ ۔ یہاں يَسْجُدُ کا مفہوم لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ نے واضح کر دیا ہے ۔ یعنی وہ احکام خداوندی سے سرکشی اختیار نہیں کرتے بلکہ اس کی اطاعت کرتے ہیں ۔ اس کی مزید وضاحت اس سے اگلی آیت نے کر دی جہاں کہا کہ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰) ” انہیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ ایسے کرتے ہیں “ ۔ اس لئے قرآن کریم میں جہاں جہاں اس مادہ (س ۔ ج ۔ د) کی مختلف شکلیں آئیں وہاں اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئیے کہ یہ لفظ حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا مجازی (فرمان پزیری کے) معنوں میں ۔

اس کے ساتھ ہی ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ جب ذہنِ انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو وہ (بچے کی طرح) محسوس اشیاء ہی کو سمجھتا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار بھی (بیشتر) محسوس طور پر کرتا تھا۔ آج کل کی علمی اصطلاح میں یوں کہئے کہ اس کا علم (Sense-Perceptions) "حواس" کے دائرہ میں محدود تھا۔ وہ ہنوز تصورات (Concepts) کے ذریعے حصولِ علم یا اظہار خیالات کی منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ اس کا اُس زمانے کا مذہب*، محسوسات کے دائرے میں گھرا ہوا تھا۔ یعنی وہ (Formalism) کی منزل میں تھا۔ اس نے "خدا" کے لئے محسوس پیکر تراش رکھے تھے۔ پوجا پاٹ کے طریق اور دیگر مذہبی رسوم و تقاریب میں بھی سارا زور شکل (Form) پر دیا جاتا تھا۔ بلکہ (Form) ہی کو مقصود بالذات سمجھا جاتا تھا۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیم میں انسان کو بالغ تصور کیا ہے۔ یا یوں کہئے کہ وہ اسے عہد طفولیت سے نکال کر سن شعور و بلوغت میں لانا چاہتا ہے۔ وہ علم بالحواس (Perceptual Knowledge) کے ساتھ تصوراتی علم (Conceptual Knowledge) پر بھی زور دیتا ہے۔ اور دین کے معاملہ میں بھی شکل (Form) کی بجائے معنویت (مقصود و مفہوم) کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے۔ لیکن وہ شکل (Form) کو بالکل ترک نہیں کرتا۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ضرور باقی رکھتا ہے۔ یہ اسلئے کہ (جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے) انسان کو تصورات (Ideas) کی تعبیر کے لئے (Form) کے بغیر نہ چارہ ہوتا ہے، نہ تسکین۔ بڑے سے بڑا تصوراتی مفکر (Idealist) بھی جب بات کرتا ہے تو اس کے لئے ہاتھ، پاؤں، سر، آنکھ کی حرکات ناگزیر ہوتی ہیں۔ وہ ان محسوس اشارات کے بغیر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرہی نہیں سکتا۔ (وہ اسیطرح مجرد حقائق(Abstract Truths) کو بھی محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے) ۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے (Form) سے اسقدر بلند ہو جانے کے باوجود، بعض مقامات میں اسے باقی بھی رکھا ہے۔ صلٰوۃ (نماز) میں قیام و رکوع وسجود کی طبعی حرکات اسی حقیقت کی مظہر ہیں۔ مثلاً (سورۃ نساء میں جہاں جنگ کی حالت میں صلٰواۃ کی ادائیگی کا ذکر آیا ہے وہاں کہا ہے) کہ ایک گروہ رسول اللہؐ کی اقتداء میں کھڑا ہو جائے۔ فَاِذَا سَجَدُوْا (۴/۱۰۲)۔ " پھر جب وہ سجدہ کر چکیں " تو وہ پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ نماز میں کھڑا ہو جائے۔

* مذہب اور دین کے فرق کے لئے (ذ - ھ - ب) اور (د - ی - ن) کے عنوانات دیکھئے۔

ظاہر ہے کہ یہاں "سجدہ" سے مراد نماز کا وہ سجدہ ہے جس میں انسان سچ مچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے، اور یہ شکل زمانہ نزول قرآن میں، نبی اکرم اور جماعت مومنین میں رائج تھی۔ قرآن کریم میں، صلٰوۃ اور حج ھی وہ "تقاریب" ہیں جن میں محسوس ارکان (Form) کی تھوڑی سی شکل باقی رکھی گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں (صلٰوۃ اور حج) اجتماعی عمل ہیں اور اجتماعی عمل کے لئے ویسے بھی ضروری ہوتا ہے کہ ان کی محسوس شکل میں یک جہتی اور ہم شکلی ہو۔ اجتماعی عمل میں اگر ہر فرد اپنے اپنے طور پر جسطرح جی چاہے، حرکات و سکنات کرے تو اس سے جسقدر انتشار پیدا ہوتا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ان امور کی مزید تفصیل صلٰوۃ کے عنوان (باب ص۔ ل۔ و) میں ملیگی۔

لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کا اسطرح خدا کے سامنے سر جھکا دینا، اس کے اس جذبہ اور ارادہ کا محسوس مظاہرہ ہوگا کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے سرتسلیم خم کرتا ہے۔ یعنی وہ خدا کی کامل اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ اگر اس کا محسوس سجدہ اس کے اس پر خلوص جذبہ کا بیساختہ مظہر نہیں اور محض (Form) ھی (Form) ہے، تو اس سجدے کے کوئی معنی نہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے لئے قرآن کریم نے واضح طور پر کہدیا کہ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ .... (۲/۱۷۷)۔ "نیکی اور کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ بلکہ نیکی اور کشاد کی راہ اسکی ہے جو خدا، آخرت، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان رکھتا ہے۔ اور مال و دولت کو اس کی محبت کے باوجود، قرابتداروں، یتیموں، مساکین، ابن السبیل اور محتاجوں اور محکوموں کو دیتا ہے ....."۔ یعنی صلٰوۃ درحقیقت انسان کے جذبہ فرمانپذیری اور اطاعت کی محسوس مظہر ہے۔ اگر انسان خدا کی اطاعت تو نہ کرے اور صرف اس محسوس شکل کو مقصود بالذات سمجھ لے، تو خدا کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس، قرآن کریم کہتا ہے کہ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (۱۰۷/۴-۵)۔ "ان نمازیوں کے لئے تباہی ہے جو اپنی نماز کی حقیقت کو نظرانداز کر دیتے ہیں اور نماز کے ظاہرہ ارکان کو لوگوں کے دکھاوے کے لئے ادا کرتے ہیں (اور سمجھ لیتے ہیں کہ صلٰوۃ کا فریضہ ادا ہو گیا۔ عملاً ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ) رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک تک پہنچنا چاہئیے،

(بند لگا کر) روک رکھتے ہیں ''۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے سجدہ سے کیا مفہوم ہے۔

اَلْمَسْجَدُ۔ پیشانی کو کہتے ہیں جو زمین پر رکھی جاتی ہے۔ اور اَلْمَسْجِدُ اس جگہ کو جہاں سجدہ کیا جائے*۔ یہ اسم ظرف ہے جس کے معنی سجدہ کرنے کی جگہ اور سجدہ کرنے کا وقت، دونوں ہو سکتے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے کہ لوگوں نے ان نوجوانوں کے غار کے مقام پر مسجد بنا دی (۱۸/۲۱)۔ یعنی وہ مجاہدین تھے۔ لیکن بعد میں لوگوں کی نگاہوں سے یہ تصور تو اوجھل ہو گیا اور (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) ان کی یادگار میں ایک خانقاہ یا مقبرہ تعمیر کر دیا جو سجدہ گاہ انام بن گیا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہودیوں کے ہیکل کو مسجد کہکر پکارا گیا ہے (۱۷/۷)۔ سورۃ التوبہ میں نبی اکرمؐ کے عہد مبارک کی اس مسجد کا بھی ذکر ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی (۹/۱۰۸) اور اسکا بھی جس کا مقصد مسلمانوں میں فرقہ پیدا کرنا تھا اور جسے قرآن کریم نے کفر سے تعبیر کیا ہے اور خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کے لئے پناہ گاہ کہکر پکارا ہے (۹/۱۰۷)۔ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (۳۰/۳۱) اور واضح طور پر کہدیا ہے کہ مشرکین کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ '' اللہ کی مسجدوں '' کو آباد کریں۔ اس نے اعلان کر دیا کہ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا (۷۲/۱۸) '' مسجدیں صرف اللہ کے لئے ہیں۔ سو اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو''۔ فرقہ بندی شرک اس لئے ہے کہ اس میں خالص خدا کی اطاعت نہیں ہوتی۔ خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرنے سے امت میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

جسطرح سجدہ سے مراد صرف سر کو زمین پر رکھنا نہیں بلکہ اس سے مفہوم قوانین خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا بھی ہے، اسی طرح مسجد سے مراد بھی بالخصوص وہ عمارت نہیں جس میں نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس سے مراد وہ مقام ہے جو اس نظام کا مرکز ہو جس کی رو سے قوانین خداوندی کی اطاعت کی یا کرائی جائے۔ کعبے کو جو مسجدالحرام کہا گیا ہے (۲/۱۲۸) تو اس جہت سے نہیں کہ وہ ایسی عمارت ہے جس میں سجدہ کیا جاتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ خدا کے نظام توحید کا مرکز ہے۔ وہ اُس اُمت کا مرکز محسوس ہے

* تاج۔

جسکی خصوصیت مُسْلِمَۃً لَّکَ (۲/۱۲۸) بتائی گئی ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کے سامنے جھکنے والی۔ چونکہ نبی اکرمؐ کی مکہ سے مدینہ کیطرف ہجرت کے بعد، مدینہ کو حکومت خداوندی کا مرکز قرار پانا تھا اس لئے قرآن کریم میں (شب ہجرت کے تذکرہ کے سلسلہ میں) مدینہ کو مسجداقصیٰ (دور کی مسجد) کہکر پکارا گیا ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (۱۷/۱) ''وہ ذات نقائص سے بہت دور ہے جو اپنے بندے کو ایک رات، مسجدالحرام (مکہ) سے اس مسجد کی طرف لے گیا جو (مکہ سے) بہت دور تھی۔ جس کے ماحول کو ہم نے با برکت بنایا تھا۔ تاکہ ہم اسے اپنی آیات (نشانیاں) دکھائیں''۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں جہاں حضرت موسیٰؑ کو فرعون کیطرف جانے کا حکم دیا گیا ہے وہاں بھی یہی کہا گیا ہے کہ لِنُرِیَکَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْکُبْرٰی (۲۰/۲۳)۔ ''تاکہ ہم تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں''۔ یہ آیات، آویزش حضرت موسیٰؑ اور فرعون میں حضرت موسیٰؑ کی کامیابی تھی۔ یہی وہ آیات خداوندی تھیں جن کا مظہر، ہجرت کے بعد، مدینہ کو بننا تھا۔ یعنی جماعت مومنین کا باطل کی قوتوں پر غلبہ اور کامرانی۔

اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ مسجد کی عمارت بھی صرف نماز پڑھنے کے کام کے لئے مخصوص نہیں۔ اس میں اسلامی مملکت کے مختلف امور سرانجام دئے جا سکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ''عبادت'' اور عام دنیاوی امور میں فرق ہی نہیں کیا جاسکتا۔ عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں (دیکھئے عنوان ع۔ب۔د) اور دنیا کا کوئی کام جو قوانین خداوندی کے مطابق کیا جائے عبادت ہو جاتا ہے۔ اجتماع صلٰوۃ بھی چونکہ قانون خداوندی کی اطاعت ہے اس لئے وہ بھی عبادت ہے۔ ''عبادت'' کے لئے کسی ایسے الگ مکان کی ضرورت نہیں جس میں اور کچھ نہ کیا جا سکے۔

سورۃ اعراف میں ہے یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (۷/۳۱) اس میں ''مسجد'' (ظرف) کو مصدری معنوں میں استعمال کیا گیا ہے*۔ یعنی اطاعت کرنا۔ اس آیت میں ایک عظیم حقیقت کیطرف اشارہ کیا گیا ہے۔ عیسائیت (اور اسی قسم کے دیگر مذاہب) میں رہبانیت

* لسان العرب سے اسکی تائید ہوتی ہے۔

کو اطاعت و عبادت کا منتہٰی قرار دیا گیا تھا ۔ یعنی ترک دنیا ۔ ترک لذت ۔ ترک زیبائش و آرائش ۔ قرآن کریم نے اس غلط تصور کا بطلان کیا اور کہا کہ دنیاوی زیبائش و آرائش ، خدا کی اطاعت کے راستے میں حائل نہیں ہوتی اس لئے اسے ترک کرنا ، اطاعت نہیں ۔ ان چیزوں سے ضرور متمتع ہونا چاہیئے ۔ صرف ان حدود کا خیال رکھنا چاہئے جو خدا نے مقرر کر دی ہیں ۔ اس آیت کے اگلے حصے ، اور اس سے ملحقہ آیت نے اس مفہوم کی وضاحت کر دی ہے ۔ آیت کا باقی حصہ یہ ہے ۔ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (۷/۳۱)۔ ”تم کھاؤ پیؤ ۔ لیکن حد سے تجاوز نہ کرو ۔ خدا حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا“ ۔ اس سے اگلی آیت میں ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ . . . (۷/۳۲) ۔ ”ان سے کہو کہ اللہ کی زینت کی چیزوں کو جنہیں اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے ۔ اور رزق طیب کو کس نے حرام قرار دیا ہے“؟ ۔ دو آیتیں پہلے ہے قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ . . . . . (۷/۲۹) ”ان سے کہدو کہ اللہ نے تمہیں اعتدال پر رہنے کا حکم دیا ہے ۔ اور تم اطاعت گزاری میں اپنی تمام توجہات کو توازن کے ساتھ (اس کی طرف) مرکوز رکھو ۔ اور اطاعت کو خالص اسی کے لئے مختص کرتے ہوئے اسے پکارو“ ۔ ان مقامات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا اس باب میں صحیح مقصود کیا ہے ۔

سورۃ الفتح میں محمد رسول اللہ ؐ والذین معہٗ کے متعلق ہے تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (۴۸/۲۹) ۔ ”تو انہیں رکوع کرتے ہوئے ۔ سجدے کرتے ہوئے دیکھیگا“ ۔ یہاں رکوع اور سجود کے حقیقی معنی لئے جائیں تو مطلب اجتماع صلٰوۃ کے رکوع و سجود ہونگے ۔ اور اگر مجازی معنی لئے جائیں تو ، ذمہ داریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے اور اطاعت شعاری میں سرتسلیم خم کئے ہونگے ۔ اس کے بعد ہے سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (۴۸/۲۹) ۔ اس کے عام معنی ہیں ”ان کی نشانیاں ان کے چہروں پر سجدوں کے اثرات سے ظاہر ہیں“ ۔ مطلب یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی کامل اطاعت سے ان کے قلب میں جو اطمینان و سکون کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں ہیں ۔ یہ نفسیات کا مسئلہ ہے کہ انسان کی داخلی کیفیات و جذبات کا اثر ، اس کے چہرے سے نمایاں ہو جاتا ہے ۔ قرآن کریم میں ہے يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (۵۵/۴۱) مجرم اپنی

علامات سے پہچانے جائیں گے ۔ اس میں اسی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے ۔ اطاعت خداوندی سے قلبی سکون کی کیفیت مینانے رخ سے جھلک کر باہر آجاتی ہے ۔

س ج ر

سَجَرَ التَّنُّوْرَ ۔ یَسْجُرُہٗ ۔ سَجْرًا ۔ اس نے تنور جلا دیا ۔ اُسے گرم کرنے کے لئے اس میں پورا پورا ایندھن ڈال دیا ۔ اسے ایندھن سے بھر دیا ۔ اسی لئے سَجَرَ النَّھْرَ کے معنے ہوتے ہیں ۔ اس نے نہر کو بھر دیا ۔ اَلسَّجُوْرُ ۔ وہ چیز جس سے تنور کو جھونکا جائے ۔ اَلْمِسْجَرُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے تنور میں ایندھن کو الٹا پلٹا جائے تاکہ وہ جلدی گرم ہو جائے ۔ اَلسَّاجِرُ ۔ اَلْمَسْجُوْرُ ۔ ساکن اور بھری ہوئی چیز ۔ (نیز اس کے معنے خالی چیز کے بھی آتے ہیں ۔ اس اعتبار سے یہ اضداد میں سے ہے**)۔ وہ دریا جس کا پانی اُس کے ظرف سے زیادہ ہو ۔ سَجَرْتُ الْاِنَاءَ ۔ میں نے برتن کو بھر دیا ۔ اَلسَّاجِرُ ۔ وہ مقام جہاں سے سیلاب گزرے اور اسے پُر کرتا ہوا چلا جائے ۔ بِئْرٌ سَجِیْرٌ ۔ پُر کنواں* ۔

سَجَرَ الْمَاءُ ۔ پانی کا جدھر جی چاہے راستہ پھاڑ کر نکل جانا* ۔ لہذا اس لفظ کے معنے آگ بھڑکانے کے بھی ہونگے اور بھر دینے اور لبریز ہو جانے کے بھی ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی (۱) بھرنا ۔ (۲) ایک دوسرے کے ساتھ مل جانا اور (۳) بھڑکانا ، ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے ثُمَّ فِی النَّارِ یُسْجَرُوْنَ (۷۲/۴۰) ۔ پھر وہ آگ میں جھونکے جائینگے ۔ سورۃ طور میں اَلْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ (۶/۵۲) آیا ہے ۔ یعنی بھرا ہوا سمندر ۔ یا ایک سے دوسرا ملا ہوا سمندر ۔ سورۃ تکویر میں ہے اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۶/۸۱) ۔ سمندر (آمد و رفت کی کثرت سے) ہر وقت بھرے بھرے نظر آئینگے ۔ (اور اگر بِحَارٌ کے معنے کناروں کی بستیاں لیا جائے ۔ تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ بندرگاہیں آباد ہو جائینگی ۔ مقصد بہر حال دونوں کا ایک ہی ہے) ۔

س ج ل

اَلسَّجْلُ ۔ پانی سے بھرا ہوا بڑا ڈول ۔ سخی آدمی* ۔ اَلسِّجِلُّ ۔ کتاب ۔ صحیفہ ۔ نیز کاتب* ۔

*تاج ۔ **لطائف اللغۃ ۔

اَلسِّجِّيْلُ ۔ یہ لفظ معرب ہے فارسی لفظ سنگِ گل سے ۔ یعنے وہ مٹی جو آگ میں پک کر پتھر بن جائے ۔ زمانہ قدیم میں (جب لکھنے کی ابتدا ہوئی ہے تو) مٹی کی تختیوں کو آگ میں تپا کر پختہ کرلیا کرتے تھے اور انہی پر لکھا جاتا ہے ۔ اسی کو السجل کہتے تھے ۔ بعد میں ہر اس چیز کو جس پر لکھا جائے اَلسِّجِلُّ کہنے لگے**۔

قرآن کریم میں ہے کہ قوم لوط پر حِجَارَۃً مِّنْ سِجِّيْلٍ (۱۱/۸۲) برسائے گئے ۔ انہی کو سورۃ ذاریات میں حِجَارَۃً مِّنْ طِيْنٍ (۵۱/۳۳) کہا گیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ سنگ گل متحجر تھی ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دونوں مقامات پر انہیں مُسَوَّمَۃً عِنْدَ رَبِّکَ (۱۱/۸۳ و ۵۱/۳۴) کہا گیا ہے ۔ یعنے جو خدا کی طرف سے اس مقصد کے لئے نشان زدہ تھے***۔ لیکن اَلسِّجِلُّ میں لکھنے کا جو عنصر شامل ہے ، اس اعتبار سے بھی مُسَوَّمَۃً کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ [ہو سکتا ہے کہ یہ تہ بہ تہ (مَّنْضُوْدٍ ۱۱/۸۲) تختیاں ہی ہوں جو پہاڑ پر کسی لائبریری میں رکھی ہوں اور اس کی آتش فشانی سے سب سے پہلے یہی اڑ کر ان کی بستی پر گری ہوں] ۔

سورۃ انبیاء میں ہے یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ (۲۱/۱۰۴) ۔ یہ وہ دور ہوگا جس میں بلندیوں (یا بلند طبقے کے لوگوں) کو کاغذ کے فائل کی طرح لپیٹ کر رکھدیا جائیگا کہ ان کا زمانہ ختم ہو گیا ۔ اس دور میں معاشرتی ہمواریاں پیدا ہو جائینگی ۔ (۳۹/۱۷) ۔

اگر ان آیات میں کسی کائناتی حادثہ کی طرف اشارہ ہے تو اس سے مقصود آسمانی کُرّوں کا لپیٹے جانا ہوگا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا بھر کر الٹ جانا یا گر جانا ہیں ۔ اس سے مفہوم اور بھی واضح ہوجاتا ہے ۔

س ج ن

سَجَنَ ۔ يَسْجُنُ سَجْنًا ۔ کسی کو قید کر دینا*(۱۲/۲۵ و ۱۲/۳۵) ۔
اَلسِّجْنُ ۔ قید خانہ (۱۲/۳۳) ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***اقوام سابقہ پر جو عذاب طبعی حوادث (سیلاب ، آندھی زلزلہ ، آتش فشاں مادہ) کے ذریعے آتا تھا ، اسے اس قوم کے اعمال زندگی سے کیا تعلق تھا ، اس کے لئے مصنف کی کتاب ''جوئے نور'' دیکھئے ۔

سِجِّیْنٌ - یہ لفظ سورۃ تطفیف میں آیا ہے - مَآ اَدْرٰکَ مَا سِجِّیْنٌ (۸۳/۸) - بعض نے اس کے معنے قید خانہ کئے ہیں - لیکن قرآن کریم نے کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۸۳/۹) کہہ کر خود ہی اس کی تفسیر کر دی ہے - یعنے نامۂ اعمال - لکھی ہوئی چیز* -

س ج و

سَجَا اللَّیْلُ یَسْجُوْ - سَجْوًا - رات کا ساکن ہو جانا - ٹھہرجانا - تاریک ہوجانا - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں سکون اور بند کرنے، ڈھانکنے کا مفہوم بتایا ہے - سَجَا اللَّیْلُ کے معنے ہیں رات کا شدید تاریک اور پرسکون ہونا - اَلْبَحْرُ السَّاجِیْ - پرسکون سمندر - اَلطَّرْفُ السَّاجِیْ - خاموش نگاہ - ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ سَجَی اللَّیْلُ کے معنے ہیں رات کی تاریکی بڑھ گئی* -

قرآن کریم میں ہے وَ اللَّیْلِ اِذَا سَجٰی (۹۳/۲) - رات کی تاریکی اور اس میں فضا کا سکوت ، اور نمودِ صبح سے پہلے اس کی شدید ظلمت ، اس حقیقت پر شاہد ہے کہ (نظامِ خداوندی کے) اس پروگرام کو کامیابی تک پہنچنے میں وقت لگیگا اور وہ اپنے مدارج طے کرتا ہوا مقصود تک پہنچیگا - لہذا اس وقت جو تم دیکھ رہے ہو کہ تمہاری اس قدر محنت اور مشقت کے باوجود معاشرہ کی تاریکیاں چھٹ نہیں رہیں تو اس سے اس نتیجہ پر نہ پہنچ جاؤ کہ قوانین خداوندی نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے - مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی (۹۳/۳) "نہ تو تیرے نشوو نما دینے والے نے تجھے چھوڑ دیا ہے اور نہ ہی (یونہی، خواہ مخواہ) مشقت میں ڈال دیا ہے"- وَالضُّحٰی کے ساتھ آنے سے یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ دن اور رات کے تغیرات اس پر شاہد ہیں کہ ان مخالفین کی یہ حالت ہمیشہ ایسی ہی نہیں رہیگی - اس میں انقلاب آئیگا -

س ح ب

سَحَبَ - اس نے کھینچا - گھسیٹا - اَلْمَرْاَۃُ تَسْحَبُ ذَیْلَھَا - عورت اپنا دامن زمین پر گھسیٹتی (ہوئی چلتی) ہے - اِنْسَحَبَ - وہ زمین پر گھسٹ گیا - اسی سے اَلسَّحَابَۃُ ہے جس کے معنے میں بدلی ، بادل کا ٹکڑا ؛ کیونکہ وہ پانی کو کھینچ کر لاتا ہے - یا ہوائیں اسے کھینچتی ہیں ، یا وہ دامن

*تاج و راغب -

گھسیٹتا ہوا چلتا ہے* ۔ (اس کی جمع سُحُب ہے) قرآن کریم میں لفظ سَحَابٌ مفرد اور جمع دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً اَلسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ (۲/۱۶۴) ''بادل جو مسخر کیا گیا ہے'' اور اَلسَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۳/۱۲) ''بھاری بھاری بادل'' ۔

کھینچنے کے معنوں میں سورۃ المومن میں ہے يُسْحَبُوْنَ فِي الْحَمِيْمِ۔ (۴۰/۷۱) ۔ وہ ''حمیم'' میں گھسیٹ کر یا کھینچکر ڈالے جائینگے ۔ سورۃ قمر میں ہے يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ (۵۴/۴۸)۔ جس دن انہیں آگ میں گھسیٹا جائیگا ۔

س ح ت

اَلسَّحْتُ ۔ کسی چیز کو جڑ سے اکھیڑ دینا ۔ کسی چیز کو آہستہ آہستہ چھیل کر الگ کر دینا ۔ سَحَتَ الشَّحْمَ عَنِ اللَّحْمِ ۔ گوشت کے اوپر سے چربی کو چھیل کر الگ کر دیا* ۔ قرآن کریم میں ہے فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ (۲۰/۶۱) ۔ وہ ایسی سزا دے گا کہ تمہاری جڑ کٹ جائیگی ۔ یا وہ تمہیں آہستہ آہستہ مٹا دیگا ۔

اَلسُّحْتُ ۔ ہر حرام چیز جس کا تذکرہ معیوب ہو، حرام اور گندہ پیشہ جو باعث عار ہو، ہر نا پسندیدہ اور حرام کی کمائی ۔ اس لئے کہ وہ برکت و سعادت کو جڑ سے کاٹ دیتی ہے* ۔ یہود کے متعلق ہے اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (۵/۴۲) ۔ ان کا ذریعۂ معاش بہت برا ہے ۔ عام یہودی سود خوار اور بددیانت تھے اور ان کے مذہبی راہنما دین فروشی کرتے تھے۔ اس سے بڑھکر قابل نفرت ذریعۂ معاش اور کیا ہوسکتا ہے ۔ اور ایک یہودیوں پر ہی کیا موقوف ہے ۔ سرمایہ پرستی اور پیشوائیت جہاں بھی ہو وہاں یہی حالت ہوتی ہے ۔ حَرَامٌ سُحْتٌ ۔ سخت حرام کو کہتے ہیں ۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سُحْتٌ اس حرام کو کہتے ہیں جس کی حرمت میں کوئی اشتباہ نہ ہو بلکہ وہ کھلم کھلا حرام ہو** ۔ اَرْضٌ سَحْتَاءُ ۔ اس زمین کو کہتے ہیں جس میں کچھ پیدا نہ ہو* ۔ عَامٌ اَسْحَتُ ۔ قحط کا سال جس میں چارہ بالکل نہ پیدا ہو* ۔

س ح ر

اَلسِّحْرُ ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اسکے بنیادی معنے موڑنے اور پھیرنے کے ہیں ۔ اور اس سے مطلب ہوتا ہے باطل کو حق کی صورت میں

---

*تاج ۔ **محیط ۔

پیش کرنا*۔ تہذیب میں ہے کہ اسکے اصلی معنے کسی چیز کو اصل حقیقت سے غیر حقیقت کی طرف پھیر دینے کے ہیں ۔ صاحب تاج العروس نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کا ماخذ لطیف اور دقیق ہو۔ یعنی ایسا دھوکا جس میں پتہ نہ چلے کہ دھوکا کسطرح دیا گیا ہے ۔ پھر یہ لفظ عام دھوکے کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا***۔ سَحَرَہٗ وسَحَّرَہٗ کے معنے ہیں اس کو دھوکا دیدیا ۔ اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ (۲۶/۱۸۵-۱۵۳) کے معنے ہیں تم ان لوگوں میں سے ہو جنہیں دھوکا لگ گیا ہے ۔ اور بار بار مبتلائے فریب ہو جاتے ہو۔ عَنْزٌ مَسْحُوْرَۃٌ اس بکری کو کہتے ہیں جس کے تھن تو بڑے بڑے ہوں لیکن وہ دودھ بہت کم دے ۔ اَلْمَسْحُوْرُ اسے کہتے ہیں جس کی عقل میں خرابی ہو گئی ہو*۔

مخالفین ، رسول اللہ ؐ کو رَجُلاً مَّسْحُوْرًا (۱۷/۴۷) کہتے تھے۔ یعنے جیسے دھوکا لگ گیا ہو۔ فریب خوردہ انسان ۔ یا جس پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔ یا جسکی عقل ماری گئی ہو۔ نیز اس کے معنے سَاحِرٌ کے بھی کئے گئے ہیں ۔ جیسے (۱۷/۱۰۱) میں ۔ سورۃ مومنون میں ہے قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (۲۳/۸۹) ۔ ان سے پوچھو کہ تمہیں کہاں (یا کس وجہ سے) دھوکا لگتا ہے ؟ وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے تمہارا رخ حقیقت کی طرف سے مڑ کر دوسری طرف پھر جاتا ہے ؟ دھوکے کے علاوہ اس کے معنے جھوٹ کے بھی ہیں ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۱/۷) ۔ اگر تو ان سے کہے کہ تم موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو جو لوگ اس کے منکر ہیں وہ کہدینگے کہ یہ بالکل جھوٹی بات ہے ۔

اَلسَّحَرُ ۔ سینہ کے اوپر کا حصہ ۔ (پھیپھڑا ۔ دل ، کلیجی وغیرہ)۔ ہر چیز کا کنارہ ۔ اس اعتبار سے رات کے آخری حصہ کو سَحَرٌ کہتے ہیں ۔ یا صبح (فجر) سے ذرا پہلے ۔ راغب نے آخر شب کی تاریکی کو دن کی ابتدائی روشنی میں خلط ملط ہونے کو ، نیز ایسے وقت کو سَحَرٌ بتایا ہے (۵۴/۳۴)۔ اَسْحَارٌ اسکی جمع ہے**(۵۱/۱۸) ۔ دن کا آغاز ۔ ابتدائے کاروبار کا وقت***۔

تاریخ بتاتی ہے کہ انسان کی عمرانی زندگی میں ایک دور گزرا ہے جسے عہد سحر (Magic Age) کہا جاتا ہے۔ مغربی محققین نے اس دور کے متعلق بڑی کثیر معلومات فراہم کی ہیں۔ سحر (یا Magic) کے معنے یہ تھے کہ انسان مختلف طریقوں (جھاڑ۔

* تاج و محیط **تاج ۔ ***ابن قتیبہ (القرطین ج/۱ صفحہ ۲۵۷)

پھونک ۔ تعویذ گنڈا ۔ اوراد و وظائف) سے کائنات کی مؤثر قوتوں کو مجبور کرے کہ وہ اس کی منشاء کے مطابق کام کریں ۔ اسی کو جادو کہتے ھیں ۔ یعنی انسان کا پہلا دور پرستش کا تھا جس میں وہ کائناتی قوتوں سے عاجزی سے گڑگڑا کر مدد مانگتا تھا ۔ لیکن اس کے بعد یہ دوسرا دور آیا جس میں اس نے ان قوتوں کو مجبور کرنے کا طریق اختیار کیا ۔ ان ساحرین کا (پروھتوں کیطرح) معاشرہ میں بہت اونچا مقام تھا ۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو انسان کا '' دور پرستش '' سے '' عہد سحر '' کیطرف آنا ، فکر معقول (Rational Thought) کی طرف آنے کی پہلی اور دھندلی سی کوشش تھی ۔ '' فکر معقول '' سے مراد یہ ھے کہ ھر حادثہ کا سبب معلوم کیا جائے ۔ قانونِ علت و معلول (Cause And Effect) کے مطابق حوادث و واقعات کی وجہ معلوم کی جائے ۔ '' دور پرستش '' میں انسان سمجھتا تھا کہ (مثلاً) بخار اس لئے آتا ھے کہ کوئی دیوتا ناراض ھو جاتا ھے ۔ اسے رفع کرنے کی صورت یہ ھے کہ اس دیوتا کی بھگتی سے اسے خوش کر دیا جائے ۔ اس میں علت اور معلول کا کوئی تصور نہیں تھا ۔ وہ اس سے '' عہد سحر '' کیطرف آیا ۔ یعنی اس نے یہ سوچا کہ (مثلاً) اگر فلاں منتر کو اتنی بار ، اس طریق سے دھرا لیا جائے تو اسکا لازمی نتیجہ فلاں ھوگا ۔ بالفاظ دیگر اسکے ذھن میں عمل اور اس کے نتیجہ میں خاص ربط ھونے کی ذرا سی کرن نمودار ھوئی ۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دین نے یہ بتایا کہ کائنات میں سب کچھ خدا کے بنائے ھوئے قوانین کے مطابق عمل میں آتا ھے ۔ ھر کام کا ایک متعین نتیجہ مرتب ھوتا ھے اور یہ نتیجہ مرتب ھوتا ھے ایک خاص قانون کے مطابق ۔ اگر انسان ان قوانین کا علم حاصل کرلے تو جب جی چاھے اس قسم کا نتیجہ پیدا کر سکتا ھے ۔ یہ وہ تصور ھے جس پر علوم سائنس کی ساری عمارت استوار ھے ، اور جس محور کے گرد انسان کی زندگی اور اس کا مستقبل گردش کرتا ھے ۔ سحر اس لئے باطل ھے کہ اس میں نتیجہ کسی خاص قانون کے مطابق مرتب ھونے کا تصور نہیں ھوتا بلکہ ایک خاص طریق کچھ پڑھنے اور کرنے کا نتیجہ سمجھا جاتا ھے ۔ انسان کو فکر معقول قرآن کریم نے دیا ھے ۔

قرآن کریم میں داستان حضرت موسٰے[ؑ] کے ضمن میں ساحرین قوم فرعون اور ان کی سحرکاریوں کا ذکر تفصیل سے آتا ھے ۔ انہیں سے حضرت موسٰے[ؑ] کا مقابلہ ھؤا تھا ۔ اگر ان مقامات میں سحرؔ سے مراد جادو ھے تو ان تمام واقعات (رسیوں کا چلنا وغیرہ) کو انھی معانی میں سمجھا جائے گا ۔ لیکن اگر اس کے معنی '' باطل پرستی '' ھے تو پھر ان آیات کے مجازی معانی لئے جائینگے ۔ (تفصیل میری کتاب برق طور میں ملیگی) ۔

سِحْرٌ (جادو) کا مفہوم لینے سے ایک اہم چیز سامنے آتی ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ ان جادوگروں نے سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ (۷/۱۱۶)۔ لوگوں کی آنکھوں کو دھوکا دیا۔ یعنی وہ رسیاں سچ مچ چلنے نہیں لگ گئی تھیں۔ انہوں نے (ہاتھوں کے کرتب یا نفسیاتی قوت سے) ایسا کیا کہ لوگوں کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ رسیاں چل رہی ہیں۔ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (۲۰/۶۶)۔ "موسیٰؑ کو ایسا خیال ہوا گویا وہ دوڑ رہی ہیں"۔ یعنی سحر سے صرف دیکھنے والے کی قوت متخیلہ اثر پذیر ہوتی ہے۔ وہ چیزیں فی الواقعہ ایسی نہیں بن جاتیں۔ ساحر دیکھنے، والے کی قوت متخیلہ کو متاثر کر دیتا ہے، اور بس ہمارے زمانے میں نفسیات (Psychology) کی تحقیقات نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ یہ سب انسان کی قوت متخیلہ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے آج سے کتنا عرصہ پہلے اس حقیقت کو واشگاف کیا تھا۔ (نیز دیکھئے عنوان خ۔ ی۔ ل)

یہودیوں کا سارا مذہب سحر و ساحری کا مرقع اور ان کے معبد اس قسم کی کرشمہ سازیوں کی آماجگاہیں تھے۔ وہ ان باتوں کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ "اسم اعظم اور نقوش سلیمانی" ان کی خاص چیزیں تھیں۔ قرآن کریم نے ان سب کی تردید کی اور واضح الفاظ میں بتایا کہ خدا کے نبی ان توہم پرستیوں اور فریب سازیوں سے بہت دور ہوتے ہیں۔ (۲/۱۰۲)۔

قرآن کریم نے تو یہ کہا، لیکن قرآن کریم کی حامل قوم (مسلمانوں) نے گنڈے۔ تعویذ۔ ورد۔ وظائف، غرضیکہ ان تمام توہم پرستیوں کو ایک ایک کرکے اپنے ہاں جمع کر لیا اور اسے "روحانیت" قرار دیکر باطل کو حق کا لباس پہنا دیا۔ یا للعجب!

اوپر بتایا گیا ہے کہ کفار، نبی اکرمؐ کے متعلق کہتے تھے کہ وہ رجل مسحور ہے (۲۵/۸)۔ یعنی اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی ہے (۲۵/۹)۔ نبی کی ذات اسقدر نشو و نما یافتہ اور مستحکم ہوتی ہے اور اسکی قوت ایمانی اسقدر مضبوط کہ اس کے مقابلہ میں ساحرین کی نفسیاتی قوت ایک ثانیہ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتی، چہ جائیکہ وہ نبی کو متاثر کر دے اور وہ ان کے فریب سحر میں آجائے۔ یہ ناممکن ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے قصے میں (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) اتنا ہی کہا

ہے کہ انھوں نے خیال کیا کہ گویا وہ رسیاں چل رہی ہیں - لیکن یہ چیز اور ہے اور کسی کا جادو کے اثر سے مسحور ہو کر بہکی بہکی باتیں کرنے لگ جانا اور بات - نبی پر اس قسم کا اثر کبھی نہیں ہو سکتا -

(قصۂ حضرت موسیٰ میں اگر سحر کے معنی باطل پرستی لئیے جائیں تو پھر بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے)-

س ح ق

سَحَقَہٗ - یَسْحَقُہٗ - سَحْقاً - اسنے اسے کوٹ کر، پیس کر، باریک کر دیا - اِنْسَحَقَ - وہ پس گیا - سَحَقَتِ الرِّیْحُ الْاَرْضَ - ہوا نے زمین کے نشانات مٹا دئے - وہ اس تیزی سے چلی جیسے زمین کی مٹی کو پیس رہی ہو - سَحَقَتِ الدَّابَّۃُ - جانور تیز دوڑا - اسی سے اَلسُّحْقُ - اَلسُّحْقُ کے معنے ہیں دور ہونا - اَسْحَقَ فُلَاناً - اس نے اسے دور کر دیا - ہلاک کر دیا *- ابن فارس نے اسکے بنیادی معنے (۱) بُعد اور دوری (۲) کسی چیز کو اسقدر کمزور کر دینا کہ وہ خستہ ہو جائے، بتائے ہیں - اَسْحَقَ الضَّرْعُ : تھن دودھ سے خشک ہوئے اور مرجھا گئے - راغب نے سَحْقٌ کے معنے کسی چیز کو ریزہ ریزہ کرنا کئے ہیں -

قرآن کریم میں ہے فَسُحْقاً لِاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (۶۷/۱۱) - اہل جہنم کے لئے (زندگی کی خوشگواریوں سے) بُعد اور محرومی ہے - مَکَانٌ سَحِیْقٌ (۲۲/۳۱) - دور دراز جگہ -

س ح ل

سَحَلَہٗ یَسْحَلُہٗ - سَحْلاً - اسنے اسے چھیل دیا اور کھرچ دیا، رِیتا - اَلرِّیَاحُ تَسْحَلُ الْاَرْضَ - ہوائیں زمین (کی سطح) کو کھرچ دیتی ہیں - اَلسَّاحِلُ - دریا یا سمندر کا کنارا جسے پانی چھیلتا اور کھرچتا رہتا ہے**-

قرآن کریم میں ہے فَلْیُلْقِہِ الْیَمُّ بِالسَّاحِلِ (۲۰/۳۹) - دریا اسے کنارے پر ڈال دے گا -

س خ ر

سَخِرَ - یَسْخَرُ سَخْرًا وَ سَخَرًا و سُخْرًا و سُخُرًا کے معنے مذاق کرنا اور بیوقوف سمجھتے ہوئے ہنسی اڑانا ہیں - رَجُلٌ سُخَرَۃٌ

---

* تاج و محیط - **تاج و راغب

وہ آدمی جو بہت زیادہ لوگوں سے مذاق کرے اور انکی ہنسی اڑائے ۔ اس سے اسم السُّخْرِیَّۃ و السُّخْرِیٌّ وَ السِّخْرِیٌّ آتا ہے* ۔ بمعنی ٹھٹھول ، مذاق ۔ سَخَرَہٗ ۔ یَسْخَرُہٗ سِخْرِیًّا و سُخْرِیًّا ۔ و سَخَّرَہٗ تَسْخِیْرًا ۔ کسی کو کسی خاص مقصد کی طرف زبردستی لے جانا ۔ کسی کو مجبور کرکے کسی کام پر لگا دینا ۔ کسی سے کوئی کام بلا معاوضہ (بیگار کے طور پر) کرالینا ۔ کسی کو تابع فرمان کرنا ۔ اپنے حکم کے مطابق چلانا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حقیر سمجھنے اور ذلیل کرنے کے ہیں ۔

محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں یہ مادہ مجرد ثلاثی سے آیا ہے اس سے مراد استہزاء ہے سوائے سورۃ زخرف کے کہ وہاں لِیَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا (۴۳/۳۲) ۔ میں سُخْرِیًّا کا لفظ تسخیر کے معنوں میں ہے** ۔

سورۃ زخرف کی یہ آیت ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مختلف افراد میں کسب و ہنر کی استعداد میں جو فرق ہے وہ اس لئے ہے کہ معاشرہ کے مختلف کام مختلف افراد کرسکیں ۔ اگر تمام افراد کی استعداد ایک جیسی ہوتو کوئی شخص کسی دوسرے کے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق کام ہی نہ کرے ۔ یا تمام افراد ایک ہی قسم کا کام کرنے لگ جائیں ۔ اس طرح معاشرہ کا نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا ۔ لیکن اختلاف استعداد کا مطلب یہ نہیں کہ زیادہ استعداد والے لوگوں کو اجازت دے دی جائے کہ وہ کم استعداد والے لوگوں کو اپنا محکوم اور تابع فرمان بنا کر انہیں اپنی اغراض کے حصول کا آلہ کار بنا لیں ۔ اختلافِ استعداد صرف تقسیم کار کے لئے ہے ورنہ قرآن کریم کی رو سے ہر ابن آدم واجب التکریم ہے ۔ (تفصیل اس کی میری کتاب ''نظام ربوبیت'' میں ملیگی) ۔

قرآن کریم میں ہے سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی ہر چیز کو ایک لگے بندھے قانون کے مطابق چلنے کے لئے پیدا کر رکھا ہے اور وہ اسی کے مطابق چل رہی ہے ۔ یہ اس لئے ہے تاکہ انسان اس قانون کا علم حاصل کر کے (جسے قانون فطرت کہتے ہیں) ان اشیائے کائنات سے اپنے فائدے کے کام لے سکے ۔ لہذا جو قوم ، قوانین فطرت کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرکے اشیائے فطرت کو اپنے کام میں لائیگی وہی ان کی

*تاج ۔ **محیط ۔

تخلیق و تسخیر کے منشا کو پورا کریگی ۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے اس اعلان سے انسانی دنیا میں کس قدر انقلاب عظیم برپا کر دیا ۔ انسان ، کائنات کی قوتوں سے ڈرتا تھا ۔ انہیں اپنا معبود بناتا تھا ۔ ان کے حضور گڑگڑاتا تھا ۔ اپنے آپ کو ان سب کے سامنے کمزور و ناتواں سمجھتا تھا۔ قرآن کریم نے بتایا کہ یہ تصور یکسر باطل ہے ۔ خدا نے کائنات کی تمام قوتوں کو انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھا ہے ۔ یہ قوتیں اس کی معبود نہیں ، اسکی خادم ہیں ۔ ''ملائکہ'' آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں ۔ اس سے انسان کا مقام کائنات کی ہر چیز سے بلند ہو گیا اور اس کے سامنے اشیائے فطرت کی تسخیر کے دروازے کھل گئے ۔ دنیا میں جو قوم بھی قوانین فطرت کا علم حاصل کریگی یہ قوتیں اس کے تابع فرمان ہو جائینگی ۔ اس میں مومن اور کافر کا بھی کچھ فرق نہیں ۔ البتہ مومن ان قوتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق انسانیت کی نشوو نما کے لئے صرف کریگا اور کافر انہیں اپنی مفاد پرستیوں کے کام میں لائیگا ۔ اس سے ظاہر ہے کہ

(۱) مقام آدم (آدمی کا مقام) یہ ہے کہ وہ کائناتی قوتوں کو مسخر کرکے اپنی مرضی کے مطابق ان کا استعمال کرے ۔

(۲) مقام مومن یہ ہے کہ وہ ان قوتوں کو مسخر کرکے منشائے خداوندی کے مطابق ان کا استعمال کرے ۔

(۳) جو ان قوتوں کو مسخر ہی نہ کرے ، اسے مقام مومن تو ایک طرف مقام آدم بھی نصیب نہیں ۔

آج کا مسلمان خود سمجھ لے کہ قرآن کریم کی رو سے اس کا مقام کیا ہے؟

سَخِرَ (مذاق اور استہزاء کے معنوں میں) قرآن کریم کے متعدد مقامات پر آیا ہے (مثلاً ٧٩/٩ و ١٤/٣٧ و ٣٩/١١) ۔ سورۃ مومنون میں لفظ سِخْرِیًّا (١١٠/٢٣) انہی معانی میں آیا ہے ۔

س خ ط

اَلسُّخْطُ ۔ اَلسَّخَطُ ۔ ناپسندیدگی ، کراہت ، نارضامندی ، غضب ، غصہ ۔ سَخِطَ عَلَیْہِ ۔ وہ اس پر ناراض ہوا۔ سَخِطَ ۔ اس نے ناپسند کیا ، کراہت کی ۔ اَسْخَطَہٗ ۔ اس نے اسے ناراض کر دیا ۔ غصہ دلادیا ۔ اَلْمَسْخُوْطُ ۔ مکروہ ۔ ناپسندیدہ*۔ راغب نے کہا ہے کہ سَخَطٌ اس شدید غصے کو کہتے ہیں جو سزا کا مقتضی ہو** ۔

*تاج ۔ **راغب ۔

لیکن جب یہ لفظ خدا کی طرف منسوب ہوگا تو اس کے معنے غصے یا ناراضگی کے نہیں ہونگے۔ اللہ تعالیٰ ان انسانی جذبات سے بہت بلند ہے۔ اس کے معنے سورۃ محمد کی اس آیت سے واضح ہو جاتے ہیں جہاں کہا گیا ہے ذَالِكَ بِاَنَّهُمْ اتَّبَعُوْا مَا اَسْخَطَ اللهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (۴۷/۲۸)۔ ان کی ہلاکت اور تباہی اس لئے ہے کہ یہ لوگ ان باتوں کی پیروی کرتے ہیں جو احکام خداوندی کے مطابق نہیں ہیں۔ جو باتیں ان احکام کے مطابق ہیں یہ انہیں ناپسند کرتے ہیں (كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ) یعنے كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللهُ (۴۷/۹)۔ وحی خداوندی کو نا پسند کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اعمال بلا نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ یعنی وہ خوشگوار نتائج مرتب نہیں کرتے جن کی یہ توقع لگائے رہتے ہیں۔ لہذا مَا اَسْخَطَ اللهَ کے معنے ہوئے وہ امور جو قوانین خداوندی کے مطابق نہیں اور جن کا نتیجہ حبطِ اعمال ہے۔ اس میں غصے اور ناراضگی کا کوئی سوال نہیں۔ (۳/۱۶۱) میں بھی سَخَطٌ بمقابلہ رِضْوَانٌ آیا ہے۔ سورۃ مائدہ میں اَنْ سَخِطَ اللهُ کی تفسیر مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ (۵/۸۰) نے کر دی۔ یعنے مکافات عمل۔ (مزید تفصیل کے لئے عنوان ر۔ض۔ی اور غ۔ض۔ب دیکھئے)۔

س د د

اَلسَّدُّ۔ روک۔ ہر حائل ہونے والی چیز۔ پہاڑ۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلسَّدُّ (س پر زبر سے) وہ روک ہے جو انسانوں کی بنائی ہوئی ہو اور اَلسُّدُّ (س پر پیش سے) وہ پہاڑ یا روک ہے جو قدرتی طور پر بنی ہوئی ہو*۔ لیکن بعض اس فرق کو نہیں مانتے۔ خود قرآن کریم میں پہاڑ کے لئے بھی اَلسَّدُّ آیا ہے (۱۸/۹۳) اور انسانوں کی بنائی ہوئی روک کے لئے بھی (۱۸/۹۴)۔ سورۃ یٰسٓ میں یہ لفظ ایسے اسباب اور عناصر کے لئے آیا ہے جو انسان کی عقل و بصیرت کے راستے میں حائل ہو جائیں۔ (۳۶/۹)۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کے شگاف کو بھر دینا اور اسے ہموار کر دینا۔ سَدَّدَ الرُّمْحَ۔ نیزے کو سیدھا کر دیا۔ درست کر دیا۔ سَدَّدَ الثُّلْمَ۔ شگاف بھر دیا*۔ رَجُلٌ سَدِيْدٌ۔ سیدھی راہ پر چلنے والا آدمی۔ اَمْرٌ سَدِيْدٌ۔ ایسی بات جو ہر اس خلا کو بھر دے جو حقیقت کے بارے میں رہ گیا ہو۔ متوازن اور درمیانہ بات جس میں

*تاج۔

نہ افراط ہو نہ تفریط* ۔ قرآن کریم میں قَوْلاً سَدِیْداً آیا ہے (۹/۴ و ۷۰/۳۳) نہایت متوازن، سیدھی، صاف بات ۔ جس بات سے کوئی خلا باقی نہ رہے ۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ کبھی مبہم، پُر پیچ و خم، ذو معنے، ٹیڑھی میڑھی بات نہ کرو ۔ ہمیشہ سیدھی، صاف، واضح، محکم، متوازن اور ٹھیک ٹھیک معنے بتا دینے والی بات کرو ۔ ایسی بات جس کا تعلق براہ راست صحیح مقصد سے ہو ۔ لایعنی اور بے فائدہ نہ ہو ۔ سَہْمٌ سَدِیْدٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو ٹھیک نشانے پر جا کر لگے* ۔ ڈپلومیسی کی باتیں قرآن کریم کی سیدھی اور واضح تعلیم کے خلاف ہیں ۔

(سَدٌّ اور رَدْمٌ کے فرق کے لئے دیکھئے عنوان ردم)

س د ر

اَلسِّدْرٌ ۔ بیری کے درختوں کو کہتے ہیں ۔ (واحد سِدْرَةٌ) ۔ جب بیری کا درخت بہت گھنا ہو جائے تو اس کا سایہ بہت عمدہ ہوتا ہے اور عرب، صحرا کی سخت گرمی کے ستائے ہوئے اس کے سایہ میں آرام کرتے ہیں ۔ اس اعتبار سے جنت کے آرام اور نعماء کے لئے اسے بطور مثال بیان کیا گیا ہے* ۔ فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (۵۶/۲۸) ۔ ایسے درخت جو پھل سے لدے ہوئے ہوں اور جن کے سایے نہایت گھنے ہوں ۔ یا ایسے درخت جن کا سایہ تو ہو لیکن کانٹے نہ ہوں ۔ بلا خلش آرام و راحت ۔ سایہ کے اعتبار سے دوسری جگہ ہے ۔ وَ نُدْخِلُهُمْ ظِلاًّ ظَلِیْلاً (۴/۵۷) ۔ اس میں آرام اور خوشحالی، دونوں پہلو مضمر ہیں ۔ بیری کا درخت ریگستانی اور سخت گرمی کے خشک علاقہ میں بھی سرسبز رہتا ہے لیکن بقول راغب، اس کا پھل زیادہ مفید غذائیت نہیں رکھتا ۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب سبا کا علاقہ سیلاب کے بعد بنجر ہوگیا تو وہاں سر سبز و شاداب باغات کی جگہ کچھ بیر کے درخت اُگ آئے ۔ وَ شَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ (۳۴/۱۶) ۔ سَدِیْرُ النَّخْلِ کھجوروں کے جھنڈ کو کہتے ہیں** ۔

سَدِرَ ۔ وہ متحیر ہوا ۔ سخت گرمی کی وجہ سے اسے دکھائی نہ دیا ۔ اَلسَّادِرُ ۔ اُس شخص کو کہتے ہیں جو شدت گرمی کی وجہ سے متحیر ہو جائے ۔ سَدِرَ بَصَرُهٗ سَدَرًا ۔ شدت گرمی کی وجہ سے اس کی نگاہیں حیران و ششدر رہ گئیں** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حیرت اور اضطراب رائے کے ہیں ۔ اَلسَّادِرُ ۔ متحیر کو کہتے ہیں ۔

*راغب ۔ **تاج ۔

سورۃ النجم میں مقام نبوت کی کیفیات کو مثالی انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ (واضح رہے کہ وحی کی کیفیت صرف مثالاً اور تشبیہاً ہی بیان کی جاسکتی ہے ، کیونکہ کوئی غیر نبی ، وحی کی کیفیت اور ماہیت کو جان اور پہچان نہیں سکتا ۔ وہ صرف اس کے پیغام کو سمجھ سکتا ہے) ۔ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ نبی کو جس مقام سے وحی ملتی ہے وہاں انسانی عقل و فکر کے لئے سوائے انتہائی حیرت کے اور کچھ نہیں ہوتا ۔ عقل انسانی اُس مقام کی ماہیت کو قطعاً نہیں سمجھ سکتی ۔ اسے وہاں حیرت ہی حیرت ہوتی ہے ۔ اس کے لئے قرآن کریم نے عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (۵۳/۱۴) کے الفاظ استعمال کئے ہیں ۔ یعنی وہ مقام جہاں تحیر اپنی انتہا تک پہنچ جائے ۔ اس کی تشریح ان الفاظ سے کردی کہ اِذْ یَغْشَى السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی (۵۳/۱۶) ۔ جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا ۔ یعنی یہ تمہارے (غیر از نبی انسانوں کے) لئے ممکن نہیں کہ تم جان سکو کہ وہ کیا کیفیت تھی ۔ تمہاری نگاہ کے لئے وہ تحیر کی فراوانی تھی جس نے ساری فضا کو ڈھانپ رکھا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (۵۳/۱۷) ۔ نبی کی آنکھ کسی قسم کا دھوکا نہیں کھاتی ۔ وہ حقائق کو بالکل واضح اور غیر مبہم طور پر دیکھتی ہے ۔ لیکن صرف انہی حقائق کو جو اسے دکھائے جاتے ہیں ۔ وہ ان کی حد سے آگے نہیں بڑھتی ۔ بڑھ سکتی ہی نہیں ۔ کیونکہ اسے یہ چیزیں اس کے ذاتی کسب و ہنر سے نہیں ملتیں کہ وہ جس قدر زیادہ محنت کرتا جائے آگے بڑھتا جائے ۔ اس پر حقائق منکشف کئے جاتے ہیں ، جس قدر منکشف کئے جانے مقصود ہوں ۔ انسانوں کے مقابلہ میں تو علم نبوت (وحی) لاانتہا ہوتا ہے لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں اس کی ایک حد ہوتی ہے جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا ۔ راغب نے اِذْ یَغْشَى السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی (۵۳/۱۶) کی تشریح میں لکھا ہے کہ اس میں اس مکان کی طرف اشارہ ہے جہاں رسول اللہؐ کو افاضہ الٰہیہ سے نوازا گیا تھا ۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہی درخت ہے جس کے نیچے رسول اللہؐ نے بیعت لی تھی (۴۸/۱۸) ۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس میں مکان کے مقابلہ میں کیفیت کا مفہوم زیادہ موزوں ہے ۔ ویسے اَلسِّدْرُ پانی کے منبع ، نہر اور دریا کو بھی کہتے ہیں* ۔ السِّدْرُ ۔ سمندر کو کہتے ہیں* ۔ اس اعتبار سے بھی اس کا مفہوم علم الٰہی کا سرچشمہ (وحی) زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ لہذا سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى وحی کا سرچشمہ ہے جہاں عقل انسانی کے لئے تحیر ہی تحیر ہوتا ہے لیکن چشم نبوت اسے صاف طور پر دیکھتی ہے ۔

*تاج ۔

س د س

اَلسُّدْسُ - اَلسُّدُسُ - چھٹا حصہ (۱/۶) - اَلسِّتَّۃُ - اصل میں سِدْسٌ تھا۔ آخری سین کو تاءً سے بدل کر سِدْتٌ کر لیا - پھر درمیانی دال کو تاء سے بدل کر ادغام کرکے سِتّ بنا لیا - یعنی چھ - سِتُّوْنَ - سِتِّیْنَ - ساٹھ *۔ (۵۵/۳) سَادِسٌ چھٹا (۱۸/۲۲)۔ (نیز دیکھئے عنوان س۔ت۔ت)

س د ی

اَلسَّدَیٰ - کپڑے کے تانے کو کہتے ہیں - قَدْ اَسْدَیَ الثَّوْبَ وَسَدَّاہُ - اس نے کپڑے کا تانا سیدھا کر دیا - اَلسُّدَیٰ - وہ اونٹ جنہیں بغیر چرواہے کے چھوڑ دیا جائے کہ وہ جدھر جی چاہے خود ہی منہ اٹھائے چرتے پھریں * - ذَھَبَ کَلَامُہٗ سُدًی - اسکی بات بیکار چلی گئی **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ سدی کے معنی کسی چیز کو بے قید چھوڑ دینا اور جدھر اس کا منہ اٹھے ادھر چلے جانا ہیں - خلیل نے کہا ہے کہ سَدْوٌ - بچوں کے گولیوں اور اخروٹوں سے کھیلنے پر بولا جاتا ہے جس میں وہ ان چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے پھینکتے اور چھوڑ دیتے ہیں -

قرآن کریم میں ہے اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی (۷۵/۳۶) - اس مادے کے بنیادی معنوں پر غور کیجئے - کپڑا بننے کے لئے تانے اور بانے دونوں کی ضرورت ہوتی ہے - تنہا تانا سو گز لمبا بھی کیوں نہ ہو وہ بیکار ہوتا ہے - جب تک اس میں بانا نہ بُنا جائے وہ کپڑا نہیں بن سکتا - تاریخ عالم پر نگاہ ڈالئے - انسان نے جو نظام بھی بنایا وہ یا تنہا تانا تھا یا تنہا بانا - وہ کبھی ”روحانیت“ حاصل کرنے کیلئے خانقاہوں ، تجرد گاہوں ، اور سمادھیوں کی طرف چلا گیا - اور کبھی خالص دنیا دار بن کر حکومت و سلطنت کی طرف آ گیا - اس نے روح اور مادہ - آتما اور پراکرتی - دین اور دنیا - مذہب اور سیاست کو ہمیشہ الگ الگ رکھا - نتیجہ اس کا یہ کہ اسکی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں - یا وہ تانا رہیں اور یا بانا - وہ ثَوْبٌ (کپڑا) کبھی نہ بن سکیں - قرآن کریم نے آ کر کہا کہ یہ غلط ہے کہ انسان کی زندگی تانا ہی تانا ہے - اس میں بانے کی بھی ضرورت ہے - تانے اور بانے کے امتزاج سے ثَوْبٌ بنیگا - (ثَوَابٌ اور ثَوْبٌ کا مادہ ایک ہی ہے - دیکھئے ث - و - ب) لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ سمجھے کہ اس کے سامنے زندگی کا کوئی عظیم مقصد ہے - وہ یونہی شتر بے مہار نہیں

* تاج - ** محیط

کہ اس پر کسی کی گرفت ہی نہ ہو۔ اس پر خدا کے قانون مکافات کی کڑی گرفت ہے۔ وہ اسکے احاطے سے باہر نہیں جا سکتا۔

لہذا صحیح زندگی دین اور دنیا کے تانے اور بانے سے خدا کے مقرر کردہ ڈیزائن کے مطابق کپڑا بُننے میں ہے۔ یہی ثواب کا کام ہے۔ تنہا عقل انسانی کبھی کامیابی تک نہیں پہنچا سکتی۔ یہ صرف تانا ہی تانا رہتی ہے۔ جب اس سے وحی الٰہی کی روشنی میں کام لیا جائے تو پھر اس سے صحیح تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

اب دوسرے معنوں پر غور کیجئے۔ یعنی اونٹوں کو بغیر چرواہے کے چھوڑ دینا۔ خدا نے انسان کو اسطرح شتر بے مہار نہیں چھوڑ دیا۔ اسکی راہ نمائی کے لئے اپنی طرف سے وحی کا ضابطہ بھیجا ہے۔ لہذا، اسکی زندگی کی صحیح روش یہ ہے کہ اُس ضابطہ کے مطابق چلے۔ اگر یہ اس کے مطابق نہیں چلے گا تو اسکی کوششیں بیکار چلی جائینگی۔ کائنات میں، انسان کے علاوہ دیگر تمام مخلوق کی یہ حالت ہے کہ ان کے لئے جو قوانین خدا نے بنائے ہیں، وہ ان پر چلنے کے لئے مجبور ہیں۔ اسی کو ان اشیاء کی فطرت (یا جبلت) کہتے ہیں۔ خدا نے انسان کے لئے بھی قوانین بنائے ہیں لیکن اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان کے خلاف چلا جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ان قوانین کے خلاف جا کر اپنے اعمال کا نتیجہ اپنی مرضی کے مطابق مرتب کرے۔ وہ ان قوانین کی پرواہ کرے یا نہ کرے، اس کے اعمال کے نتائج بہرحال ان قوانین کے مطابق مرتب ہونگے۔ وہ اس باب میں آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا۔ اس پر خدا کے قانون مکافات کی گرفت بڑی سخت ہے۔

س ر ب

اَلسَّرْبُ۔ چرنے والا اونٹ۔ مویشی اور چوپائے۔ اَلسَّرِبُ۔ بہتا پانی۔ اَلسُّرْبَةُ۔ راستہ۔ جانے کی جگہ۔ اَلسَّارِبُ۔ زمین میں آزادی سے اپنی مرضی پر چلا جانے والا *۔ سورۃ رعد میں ہے سَارِبٌ بِالنَّهَارِ (۱۳/۱۰) دن میں چلنے والا *۔ سورۃ کہف میں ہے فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا (۱۸/٦۱)۔ اس (مچھلی) نے دریا میں اپنا راستہ بنا لیا۔ اس نے دریا کی راہ لی۔ اس لفظ میں کھلم کھلا آزادی سے چلنے کا تصور ہوتا ہے۔ چنانچہ ازہری نے کہا ہے سَرَبَتِ الْاِبِلُ کے معنے ہیں اونٹوں کا کھلم کھلا جدھر

* تاج و راغب۔

چاہے آزادی سے چلے جانا *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں وسعت وکشادگی اور زمین پر چلنے کا مفہوم ہے۔ السَّرَبُ اور السَّرِبُ اس پانی کو کہتے ہیں جو مشکوں وغیرہ سے بہہ نکلے۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں ٹپکنے والا پانی۔

سَرَابٌ۔ وہ چمکتی ہوئی ریت جو صحرا میں بہتے پانی کی طرح دکھائی دیتی ہے اور جوں جوں پیاسا اسکی طرف بڑھتا ہے وہ آگے آگے سرکتی چلی جاتی ہے۔ پیاسا چلتے چلتے تھک جاتا ہے لیکن اسے پانی کا گھونٹ تک نہیں ملتا*۔ قرآن کریم نے غلط روشِ زندگی پر چلنے والوں کے اعمال کو سَرَابٌ سے تشبیہ دی ہے۔ (٢٤/٣٩) ۔ وہ دور سے، بہتے ہوئے پانی کی طرح دکھائی دیتے ہیں (بڑے دلفریب اور خوشنما نظر آتے ہیں)۔ لیکن جب پیاسا ان کے پاس آتا ہے تو وہ اسکی تسکین کا سامان بننے کی بجائے الٹا ہلاکت کا موجب بن جاتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ السَّرَبُ نشیب کی طرف جانے کے لئے بولا جاتا ہے۔ نیز نشیبی جگہ کے لئے بھی**۔ اس میں بھی آزادی سے چلنے کا پہلو موجود ہے، کیونکہ نشیب کی طرف پانی بلا رکاوٹ بہے جاتا ہے۔

س ر ب ل

سَرَابِیْلُ (جمع ۔ اس کا واحد سِرْبَالٌ ہے)۔ کرتہ۔ یا زرہ یا ہر وہ لباس جو (بدن کے بالائی حصہ میں) پہنا جائے۔ مثلاً قمیص***۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ لفظ دونوں معنی میں آیا ہے۔ وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِیْلَ تَقِیْكُمْ بَاْسَكُمْ (١٦/٨١) " اس نے تمہارے لئے پوشاک بنائی جو تمہیں گرمی سے محفوظ رکھتی ہے اور زرہیں بنائیں جو جنگ میں تمہاری حفاظت کرتی ہیں"۔ سورۃ ابراہیم میں سرکش مخالفین اسلام کے متعلق آیا ہے کہ جب ان کی قوتیں ٹوٹ جائینگی تو سَرَابِیْلُهُمْ مِنْ قَطِرَانٍ (١٤/٥٠) ۔ ان کی زرہیں تارکول کی بن جائینگی۔ یعنی وہ زرہیں جو انہیں دشمن کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے تھیں تارکول کی طرح ان کے جسم سے چمٹ کر وبالِ جان بن جائینگی۔

س ر ج

اَلسِّرَاجُ۔ چراغ کو کہتے ہیں اور ہر اس چیز کو جو روشنی دے*۔ (بعض کے نزدیک یہ درحقیقت فارسی لفظ چراغ کا معرب ہے)۔ اَلسِّرَاجُ۔

*تاج و راغب ۔ **راغب ۔ ***تاج و محیط۔

آفتاب کو بھی کہتے ہیں *۔ قرآن کریم میں ہے جَعَلَ فِیْهَا سِرَاجاً (۲۵/۶۱) ۔ بمعنے سورج ۔ اور سورۃ نوح میں ہے وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجاً (۷۱/۱۶) ۔ سورج کو چراغ بنایا ۔ خود نبی اکرم کو بھی سِرَاجاً مُّنِیْراً (۳۳/۴۶) کہا گیا ہے ۔ اَلسَّرْجُ ۔ زین ۔ اَلسَّرَّاجُ ۔ زین ساز ۔ نیز بہت جھوٹ بولنے والا *۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حسن ، زینت اور جمال کے ہوتے ہیں ۔ چراغ کو اَلسِّرَاجُ اسکی روشنی اور خوبصورتی کی وجہ سے کہتے ہیں ۔ زین کو بھی اَلسَّرْجُ اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے جانور کی زینت ہوتی ہے ۔ سَرَّجَ وَجْهَهٗ ۔ اس نے اپنے چہرے کو حسین بنایا ۔

س ر ح

اَلسَّرْحُ ۔ اَلتَّسْرِیْحُ ۔ جانوروں کو صبح کے وقت چراگاہ میں چرنے کیلئے کھلا چھوڑ دینا **۔ (حِیْنَ تَسْرَحُوْنَ (۱۶/۶)) ۔ سَرَاحٌ اور تَسْرِیْحٌ کے معنے ہیں قیدِ نکاح سے آزاد کر دینا ۔ طلاق دےکر رخصت کر دینا ** ۔ وَاُسَرِّحْکُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا (۳۳/۲۸) ۔ " اور تمہیں حسن کا رانہ انداز سے رخصت کردوں "۔ سورۃ بقرہ میں یہ لفظ اِمْسَاکٌ (روک رکھنے) کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ (۲/۲۲۹،۲۳۱) ۔ یعنے قاعدے کے مطابق (نکاح کے ذریعے) روک رکھنا یا قیدِ نکاح سے آزاد کر دینا ۔ طلاق دیکر رخصت کر دینا ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھل جانے اور چل پڑنے کے ہوتے ہیں ۔

س ر د

اَلسَّرْدُ ۔ چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل جوڑتے چلے جانا (ابن فارس) ۔ جیسے زرہ کے حلقوں کو ایک دوسرے میں داخل کرتے ہیں ۔ چنانچہ زرہ بنانے اور جوتے یا دوسرے چمڑے کے سینے کیلئے بھی یہ لفظ آتا ہے ۔ اَلسَّرْدُ ۔ سوراخ ۔ اَلْمِسْرَدُ ۔ سوراخ کرنے کا اوزار ۔ اَلسَّرِیْدَۃُ ۔ چمڑے کا تسمہ جس سے جوتے وغیرہ کو سیا جائے ** ۔

قرآن کریم میں زرہ بنانے کیلئے وَقَدِّرْ فِی السَّرْدِ (۳۴/۱۱) آیا ہے ۔ یعنے اسکا اندازہ رکھو کہ سوراخ بالکل ٹھیک ہوں اور ان میں زرہ کی کڑیاں درست آتی جائیں ۔

---

* تاج و راغب ۔ ** تاج ۔

س ر د ق

اَلسُّرَادِقٌ - وہ شامیانہ یا سائبان جو گھر کے صحن کے اوپر کھینچ دیا جائے - یا ہر وہ دیوار، قنات یا اور ایسی ہی چیز جو کسی چیز کے گردا گرد کھینچدی جائے اور وہ اسے اپنے احاطہ میں لے لے - اسی بنا پر، اس دھوئیں کو بھی کہتے ہیں جو بلند ہو کر کسی جگہ چھا جائے اور اسطرح اسے گھیر لے * - ابن فارس نے اَلسُّرَادِقٌ کے معنے غبار بتائے ہیں - راغب نے لکھا ہے کہ یہ فارسی لفظ ہے جو معرب بنا لیا گیا ہے ** -

قرآن کریم میں ہے نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا (۱۸/۲۹) - جہنم کی آگ جسکے سائبان انہیں چاروں طرف سے گھیر لینگے - جہنم ان پر چاروں طرف سے محیط ہو جائیگی -

س ر ر

اَلسِّرُّ - جو بات دل میں چھپائی جائے * - اس مادہ کے بنیادی معنی چھپانے کے ہیں لیکن کبھی اس کے معنے اس کی ضد (یعنی ظاہر کرنے) کے بھی ہوتے ہیں *** - اَلسُّرُوْرُ وَ الْحُبُوْرُ وَ الْفَرَحُ - ملتے جلتے الفاظ ہیں لیکن اَلسُّرُوْرُ اس خوشی کو کہتے ہیں جو دل ہی دل میں پوشیدہ رہے اور الْحُبُوْرُ اس خوشی کے لئے آتا ہے جس کے اثرات چہرے پر نمایاں ہو جائیں - یہ دونوں قابل تعریف صفات ہیں، مگر فَرَحٌ اس خوشی کو کہتے ہیں جس سے انسان میں اکڑفون پیدا ہو جائے۔ اس لئے یہ مذموم ہوتی ہے **** - سَرَّهٗ - اسے خوش کیا (۲/۶۹) مَسْرُوْرٌ - خوش (۸۴/۹-۱۳) -

اَلسِّرُّ - ہر چیز کی اصل و بنیاد - نیز اس کا خالص حصہ، اندرونی مغز - اس لئے عمدہ زمین کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے - سَرَارَةُ الْوَادِیْ - وادی کا بہترین حصہ - اَلْمَسَرَّةُ - پھولوں کا تختہ - اَلسَّرَّاءُ - آسودگی و خوش حالی - عیش و عشرت کی فراوانی * - بمقابلہ اَلضَّرَّاءُ (۷/۹۵) - اَلسُّرِّيَّةُ - وہ لونڈی جس سے جنسی تعلقات قائم کئے جائیں - اَلسَّرِيْرُ - حکومت و سلطنت - تخت - پلنگ * - کیونکہ یہ آسودہ حال لوگوں ہی کے پاس ہوتا ہے -

سورۃ انعام میں سِرٌّ بمقابلہ جَهْرٌ آیا ہے (۶/۳) - لہذا وہاں سِرٌّ کے معنے محض راز ہیں - سورۃ بقرۃ میں مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (۲/۷۷) آیا ہے - وہاں بھی اس کے معنے پوشیدہ طور پر باتیں کرنے کے ہیں -

* تاج - ** راغب - *** لطائف اللغۃ نیز ابن فارس - **** محیط -

سورۃ ابراھیم میں ہے وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (۱۴/۳۱)۔ خدا نے انہیں جو کچھ دے رکھا ہے، خواہ وہ ان کی غیر مرئی صلاحیتیں ہوں اور خواہ وہ سامان زندگی جو سامنے نظر آ جاتا ہے، وہ ان سب کو نوع انسان کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ (یا اس کا مطلب ہوگا) اعلان کرتے ہوئے اور خاموشی سے۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفٰى (۲۰/۷)۔ وہ راز کو بھی جانتا ہے اور اس سے بھی زیادہ چھپی ہوئی چیز کو بھی۔

سورۃ یونس میں ہے وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ (۱۰/۵۴)۔ وہ (عذاب کو دیکھ کر) ندامت کو چھپائینگے۔ بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ یہ اضداد میں سے ہے اور اس کے معنی ظاہر کرنے کے بھی آتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس مقام پر چھپانے کے معنی زیادہ موزوں ہیں۔

سُرُرٌ کا لفظ تختوں کے لئے آیا ہے جن پر بیٹھتے ہیں (۱۵/۴۷)۔ اس کا واحد سَرِيْرٌ ہوتا ہے۔ اور سَرَائِرُ کے معنے ہوتے ہیں راز کی باتیں۔ (۸۶/۹) اس کا واحد سَرِيْرَةٌ ہوتا ہے۔ اِسْرَارٌ۔ راز کی بات کرنا۔ دوسروں سے چھپا کر خفیہ بات کرنا (۲۶/۳۴)۔

س ر ع

اَلسَّرَعُ۔ اَلسِّرْعُ۔ اَلسُّرْعَةُ۔ تیز ہونا۔ جلد واقع ہونا۔ تیزی، جلدی۔ سَرُعَ۔ وہ تیز ہوا۔ اس نے جلدی کی۔ اَلسَّرَعَانُ مِنَ الْخَيْلِ۔ آگے نکل جانے والے گھوڑے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جلدی کرنے کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں اکثر مقامات پر آتا ہے اللّٰہُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۲/۲۰۲) ”اللہ جلد حساب لینے والا ہے“۔ خدا کے قانون مکافات کی رو سے انسان کا ہر عمل اسی وقت اپنا اثر پیدا کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن اس کے اس اثر اور نتیجہ کا ظہور ایک خاص وقت پر جا کر ہوتا ہے۔ جیسے بیج میں نشو و نما تو اسی وقت شروع ہو جاتی ہے لیکن وہ درخت ایک وقت کے بعد جا کر بنتا ہے اور اس میں پھل بھی ایک وقت کے بعد جا کر لگتا ہے۔ عمل کا فوراً اثر مرتب کرنے لگنا، قانون مکافات کے سَرِيْعُ الْحِسَابِ ہونے کا نتیجہ ہے۔ اس سے انسان کی ذات اُسی وقت متاثر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں قطعاً دیر نہیں لگتی۔

*تاج۔

سورۃ قؔ میں سِرَاعًا (۵۰/۴۴) آیا ہے۔ جس کے معنی تیزی سے (واقع ہو جانے کے) ہیں۔ سَارَعَ۔ مُسَارَعَۃٌ و سِرَاعًا۔ جلدی کرنا۔ ایک دوسرے سے سبقت کرنا۔ وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ (۳/۱۳۲)۔ ''حفاظت کی طرف (جانے میں) جلدی کرو''۔

س ر ف

اَلسَّرَفُ۔ جو حد مقرر کی گئی ہو اس سے آگے بڑھ جانا۔ زیادتی کرنا*۔ نادانی کرنا (ابن فارس)۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔ فَلَا یُسْرِفْ فِی الْقَتْلِ (۱۷/۳۳)۔ وہ قتل میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ یعنی قانون نے جو حدود مقرر کی ہیں ان کے اندر رہے۔ یا وہ نادانی سے از خود ہی قاتل کو قتل نہ کر دے۔ بلکہ معاملہ عدالت کے سپرد کرے۔ اِنَّہٗ کَانَ مَنْصُوْرًا سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ سورۃ الفرقان میں انفاق کے ضمن میں یہ لفظ قَتَرَ کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۵/۶۷)۔ قَتْرٌ۔ بخل اور خرچ میں تنگی کو کہتے ہیں۔ لہذا اسراف، تفریط کے مقابلہ میں افراط ہوگی۔ یعنی جس مقام پر جسقدر ضرورت ہو وہاں اس سے زیادہ خرچ کر دینا۔ اس لئے کہتے ہیں سَرَفَتِ الْاُمُّ وَلَدَھَا۔ ماں نے اپنے بچے کو بہت زیادہ دودھ پلا پلا کر اس کی صحت خراب کر دی*۔ اس سے اس کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کا اس طرح ضائع ہو جانا کہ جو فائدہ اس سے حاصل ہونا تھا وہ حاصل نہ ہو۔ چنانچہ سَرَفُ الْمَاءِ۔ اُس پانی کو کہتے ہیں جو زمین پر اس طرح بہ جائے کہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہو اور وہ بیکار چلا جائے*۔ اسی لئے کسی چیز کو اس مقام میں نہ رکھنا جس کے لئے وہ بنی ہے اِسْرَافٌ کہلاتا ہے۔ اور ایسا کرنے والے کو مُسْرِفٌ کہا جاتا ہے۔ قوم لوط کو اسی لئے قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ (۷/۸۱) کہا گیا ہے، کیونکہ وہ افزائشِ نسل کے مادہ کو اسجگہ (لواطت میں) صرف کرتے تھے جس کے لئے وہ بنا نہیں اور اس طرح سے اس کا مقصد حاصل نہیں ہوتا تھا۔ وہ پانی کھیتوں (حَرْثٌ) کو سیراب کرنے کے بجائے دوسری جگہ ضائع ہو جاتا تھا۔ زمین میں فساد برپا کرنے والوں کو بھی مُسْرِفِیْنَ کہا ہے (۲۶/۱۵۱)۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ اسراف، صرف بیجا (فضول خرچی) ہی کو نہیں کہتے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ انسانی توانائی، وقت، دولت یا کسی اور صلاحیت کا ایسے مقصد کے لئے نہ خرچ کرنا جس سے تعمیری نتیجہ مرتب ہو، بلکہ ایسے تخریبی مقصد کے لئے یا بے فائدہ ضائع کر دینا۔

(اِسْرَافٌ اور تَبْذِیْرٌ کے فرق کے لئے ب۔ ذ۔ ر کا عنوان بھی دیکھئے)۔

*تاج۔

س ر ق

سَرِقَةٌ - کسی دوسرے آدمی کی محفوظ چیز کو خفیہ طریقہ سے لے لینا - اگر اسے کھلے بندوں لے لیا جائے تو یہ عمل اِخْتِلَاسٌ - اِسْتِلَابٌ اِنْتِهَابٌ کہلائیگا - اور اگر مالک اپنی چیز کی حفاظت کے لئے مدافعت کرے لیکن پھر بھی وہ چیز اس سے بزور لے لی جائے تو اسے غَصَبٌ کہینگے* - سَرِقَ الشَّیْئُ - چیز مخفی ہوگئی - ھُوَ یُسَارِقُ النَّظَرَ اِلَیْهِ - وہ اس کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے - اِنْسَرَقَ عَنْهُمْ - چپکے سے کھسک جانا* -

سورۃ یوسف میں ہے اِنَّ ابْنَکَ سَرَقَ (۱۲/۸۱) - "تیرے بیٹے نے چوری کی ہے" - اَلسَّارِقُ - (۵/۳۸) چوری کرنے والا - اِسْتَرَقَ السَّمْعَ - چوری چھپے سننے کی کوشش کرلنا* (۱۵/۱۸) - اسی کو (۳۷/۱۰) میں خَطِفَ الْخَطْفَةَ کہا گیا ہے - یعنی اڑتی ہوئی بات کو اچک لینا - (ذرا سی بات کہیں سن پانا اور اس پر قیاس آرائیوں کی عمارت تعمیر کر دینا) -

(سَارِقٌ کی سزا قَطْعِ یَد (۵/۳۸) کے لئے دیکھئے عنوان ق - ط - ع) -

س ر م د

اَلسَّرْمَدُ - دائم - وہ ہمیشہ رہنے والی چیز جس کا سلسلہ منقطع نہ ہو - لَیْلٌ سَرْمَدٌ - طویل رات - رازی نے کہا ہے کہ سَرْمَدٌ کا اشتقاق سَرْدٌ سے ہوا ہے جسکے معنی پے در پے اور لگاتار کے ہیں - اس پر میم داخل کرکے مبالغہ کا فائدہ حاصل کر لیا گیا ہے - اس اعتبار سے اسکے معنی مسلسل اور لگاتار رہنے والی مدت کے ہونگے** - ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے - صاحب محیط کے نزدیک اَلسَّرْمَدِیُّ اس چیز کو کہتے ہیں جس کا نہ اول ہو نہ آخر*** -

قرآن کریم میں ہے - اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْکُمُ اللَّیْلَ سَرْمَدًا (۲۸/۷۱) - زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنے یہی ہیں کہ اگر اللہ تم پر رات کو بہت طویل کر دے** - یا رات ہی رات رہے اور دن نہ آئے -

س ر ی (و)

اَلسُّرَیٰ - رات کے بیشتر حصے میں چلنا - سَرَیٰ - یَسْرِیْ - سُرًی - رات کو چلنا - اَسْرَیٰ - اِسْرَاءٌ - رات کو چلنا - اَلسَّرِیَّةُ -

*تاج و محیط - ** تاج و راغب - *** محیط -

فوج کا دستہ، کیونکہ وہ رات کو چلتا ہے تاکہ دشمن کو خبر نہ ہونے پائے*۔ اَلسَّرِیُّ ۔ چھوٹی نہر جو نخلستان کی طرف جاتی ہو**۔سورۃ مریم میں ہے تَحْتَكِ سَرِيًّا (۱۹/۲۴)۔ تیرے نشیب کی طرف ایک پانی کی نہر ہے۔ سَرَاةٌ ۔ ہر چیز کا بلند حصہ۔وسیع زمین۔

راغب نیز صاحب محیط نے لکھا ہے کہ سُبْحٰنَ الَّذِىْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ (۱۷/۱) میں اَسْرٰی کا لفظ سَرٰی یَسْرِیْ (رات کے وقت چلنا) سے نہیں بلکہ سَرَاةٌ سے ہے۔ یعنی خدا اپنے بندے کو سَرَاةٌ (کشادہ زمین کی طرف لے گیا) جیسے اَجْبَلَ کے معنی ہوتے ہیں وہ پہاڑ پر چلا گیا۔ اور اَتْهَمَ کے معنے، وہ تہامہ میں چلا گیا***۔مکہ کی سرزمین حضورؐ (اور آپ کی جماعت) پر تنگ ہو چکی تھی اس لئے آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی جہاں کی فضا آپ کے مشن کے لئے وسیع اور کشادہ تھی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ سَرٰی۔ یَسْرِیْ ہی سے ہے اور لَیلًا تاکید مزید کے لئے ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضورؐ نے ہجرت رات کے وقت فرمائی تھی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مردانگی وسخاوت کے معنوں میں (س۔ ر۔ ی) اور (س۔ ر۔ و)دونوں سے آتا ہے۔ نیز اَلسَّرْوُ کے معنی ہیں کسی چیز کو کھولنا۔ سَرَاةُ النَّهَارِ ۔ دن کی بلندی کو کہتے ہیں۔

س ط ح

اَلسَّطْحُ ۔ گھر کی چھت جو ہموار ہو۔ ہر چیز کا اوپر کا حصہ۔ سَطَحَ ۔ یَسْطَحُ ۔ اسے بچھا دیا۔ پھیلا دیا نیز ہموار کیا، لٹا دیا۔ پچھاڑ دیا۔ اَلْمَسْطَحُ ۔ ہموار جگہ جس پر کھجوریں خشک کی جاتی ہیں****۔

قرآن کریم میں ہے وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (۸۸/۲۰)۔ زمین، کہ وہ کسطرح بچھائی گئی ہے۔ اس کی اوپر کی سطح کسطرح ہموار بنائی گئی ہے۔

س ط ر

سَطَرَ ۔ یَسْطُرُ ۔ سَطْرًا (سیدھی لائنوں میں) لکھنا* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی شے کے صف بند ہونے کے ہیں۔ جیسے کتاب کی سطور اور درختوں کی لائن۔ اسی سے اس کے معنی لکھنے کے آتے ہیں۔نٓ ۔ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۶۸/۱)۔نٓ (جسے عام طور پر

* تاج۔ ** محیط ***راغب و محیط ****تاج و راغب۔

دوات سمجھا جاتا ہے) اور قلم اور جو کچھ لکھنے والے لکھتے ہیں (یعنے قرآن کریم اور وہ تمام سرمایہٗ علم جسے انسان لکھ کر محفوظ کر لیتا ہے) اس حقیقت پر شاھد ھیں - سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کَانَ ذَالِکَ فِی الْکِتٰبِ مَسْطُوْرًا (۱۷/۵۸) - یعنے لکھا ہوا - یہی معنے مُسْتَطَرٌ کے ہیں (۵۴/۵۳) - اَلْاَسَاطِیْرُ (اُسْطُوْرَۃٌ کی جمع ہے) قصے کہانیاں * - (بعض نے کہا ہے کہ یہ لغت روم ہے بعنے، Story) - قرآن کریم میں ہے کہ جب ان لوگوں سے کہا جائے کہ تاریخی شواھد پر غور کرو اور سوچو کہ جس قسم کے کام تم کرتے ھو، جن قوموں نے اس قسم کے کام کئے تھے ان کا انجام کیا ہوا ؟ تو یہ کہدیتے ہیں کہ اِنْ ھٰذَا اِلَّا آسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۲۵/۶) - یہ پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں - ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں - حالانکہ ان سے کہا یہ جارہا تھا کہ یہ خدا کا قانون ہے جو تم پر بھی اسی طرح صادق آئیگا جسطرح اقوام سابقہ پر صادق آیا تھا - یہی حال مسلمانوں کا ہے - قرآن کریم نے قانون مکافات عمل کے ضمن میں جو کچھ اپنے اولین مخاطبین کے متعلق کہا ہے، جب ان سے اُس کا ذکر کرو تو یہ کہدیتے ہیں کہ یہ بات یہودیوں کے متعلق ہے - یہ عیسائیوں کے متعلق ہے - یہ مشرکین مکہ کے متعلق ہے - یہ منافقین مدینہ کے متعلق - یعنی ان کے نزدیک سارے کا سارا قرآن انہی لوگوں سے متعلق تھا جو اُسوقت اسکے مخاطب تھے - اب ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں - ہم سے اگر اسکا کوئی حصہ متعلق ہے تو صرف وہ جس میں جنت کا وعدہ کیا گیا ہے - (یعنے وہ جنت جو ان کے خیال میں محض مسلمان کہلانے سے مل جائیگی !) -

چونکہ قصے کہانیاں عام طور پر جھوٹی ہوتی ہیں اسلئے سَطَّرَ - تَسْطِیْرًا کے معنے ہیں جھوٹی باتیں جمع کرنا * - نیز چونکہ سَطْرٌ سیدھی لکیر کو کہتے ہیں اسلئے اَلسَّطْرُ کے معنے تلوار سے سیدھی کاٹ کاٹنے کے بھی آتے ہیں - اَلسَّاطُوْرُ - چھری کو کہتے ہیں * -

سَیْطَرَ عَلَیْہِ کے معنے ہیں کسی کے سر پر سطر کی طرح سیدھے کھڑے رہنا - اسی سے اَلْمُسَیْطِرُ ہے جسکے معنے نگران - محافظ - متسلط - داروغہ کے آتے ہیں ** - قرآن کریم میں ہے لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ (۸۸/۲۲) یا - اَمْ ھُمُ الْمُصَیْطِرُوْنَ (۵۲/۳۷) - اسکے معنے مُتَسَلِّطُوْنَ کے ہیں - یعنی جو کسی پر مسلط ہوں -

قرآن کریم میں اسے صاد سے لکھتے لیکن سین سے پڑھتے ہیں - جو سین، طاء سے پہلے آئے اسے س اور صاد دونوں سے لکھنا جائز ہے * -

* تاج - ** راغب -

س ط و

سَطَاعَلَيْهِ وَبِهٖ - سَطْوًا وَسَطْوَةً - کسی پر حملہ کرنا یا سخت گرفت کے ساتھ غلبہ حاصل کرنا - راغب نے کہا ہے کہ کسی پر ہاتھ اٹھا کر حملہ کرنے کو سَطْوَۃٌ کہتے ہیں - دراصل یہ سَطَا الْفَرَسُ سے ماخوذ ہے جسکے معنے ہیں گھوڑے کا اپنی اگلی ٹانگیں اٹھا کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہونا * - قرآن کریم میں ہے یَکَادُوْنَ یَسْطُوْنَ (۲۲/۷۲) - قریب ہے کہ وہ ان پر حملہ کر دیں - ان پر دست درازی کریں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قہر و غلبہ اور بلندی کے ہوتے ہیں - سَطَا الْمَاءُ کے معنی ہیں پانی بہت بڑھ گیا -

س ع د

سَعَدَهُ اللّٰهُ - یَسْعَدُہٗ - سَعْدًا - اللہ نے اس کی مدد کی اور اسے توفیق دی - سَعِدَ - یَسْعَدُ - سَعْدًا - سَعَادَۃً - وہ مبارک اور با برکت ہوا - اَلْاِسْعَادُ - اَلْمُسَاعَدَۃُ - معاونت کرنا - مدد دینا - فراء نے اس کے معنے بندہ کا اپنے رب کے حکم اور مرضی کی متابعت کرنا بتائے ہیں - اَلسَّاعِدُ - کہنی سے پہنچے تک ہاتھ کا حصہ - (ساری قوت اور برکت اسی میں ہوتی ہے) - اسی سے اَلْمُسَاعَدَۃُ کے معنے ایک دوسرے کی مدد کرنا ہیں - یہ اس لئے کہ جب لوگ کسی کام میں ایک دوسرے کی مدد کے لئے جاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی کلائی پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہیں * -

قرآن کریم میں سَعِیْدٌ، شَقِیٌّ کے مقابلہ میں آیا ہے - وَ مِنْهُمْ شَقِیٌّ وَ سَعِیْدٌ (۱۱/۱۰۵) نیز شَقِیَ، سَعِدَ کے مقابلہ میں (۱۱/۱۰۶-۱۰۸) - یعنی سعید وہ ہے جسے قانون خداوندی کی رفاقت نصیب ہو جائے اور وہ اس کی کلائی پکڑ کر چلے - اور شَقِیٌّ وہ ہے جو اس سے محروم ہو - اس سے بڑا بدقسمت اور کون ہو سکتا ہے جسے قانون خداوندی کی تائید نصیب نہ ہو -

راغب نے اَلسَّعْدُ والسَّعَادَۃُ کے معنے امور الٰہی کا، بھلائی اور خیر تک پہنچنے میں، انسان کی مدد کرنا لکھے ہیں - ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز سعد ہے اور فلاں نحس، فلاں دن سعد ہے اور فلاں نحس - یہ محض توہم پرستی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن کریم آیا تھا - کوئی

* تاج و راغب -

چیز یا کوئی دن نہ سعد ہے نہ نحس ۔ جس کام کا نتیجہ (قانون خداوندی کے مطابق) اچھا ہے، وہ عمل سعد ہے ۔ اور جس دن اس کام کا اچھا نتیجہ سامنے آئے وہ دن مسعود ہے ۔ اسی طرح جس کام کا نتیجہ (قانون مکافات کی رو سے) مضر ہو وہ عمل منحوس ہے، اور جس دن وہ نتیجہ سامنے آئے وہ دن نحس۔ دنوں (ہفتہ ۔ اتوار۔ سوموار وغیرہ) کی اپنی حقیقت ہی کچھ نہیں۔ یہ تو ہم نے اپنی سہولت کی خاطر، وقت (Time) کے گز پر گرہیں لگا رکھی ہیں تاکہ حساب میں آسانی رہے ۔ نہ ہی ستاروں میں کوئی سعد یا نحس ہے ۔ ستارے، قوانین خداوندی کے مطابق گردش کرتے ہیں ۔ ان کی گردش کا انسان کی "قسمت" سے کیا تعلق؟ اقبال کے الفاظ میں

تیرے مقام کو انجم شناس کیا سمجھے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

(مزید تفصیل ن ۔ ح ۔ س کے عنوان میں ملیگی) ۔

س ع ر

اَلسَّعْرُ ۔ آگ کی حرارت ۔ تپش ۔ نیز بھوک ۔ ابن عرفہ نے کہا ہے کہ سُعْرٌ ایسی بات کو کہتے ہیں جو کسی کو پھونک ڈالے ۔ فراء نے اسکے معنے کوفت، مشقت اور سخت تکلیف کے کئے ہیں ۔ سَعَرْنَاهُمْ بِالنَّبْلِ ۔ ہم نے انہیں تیر مار مار کر بھون کر رکھ دیا*۔مَسْعُوْرٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جسے سخت بھوک اور پیاس لگی ہو*۔ نیز جو پیٹ بھرا ہونے کے باوجود کھانے کا حریص ہو ۔ جس کی نیت نہ بھرے** ۔ اَلسُّعَارُ ۔ آگ کی حرارت اور سخت بھوک کو بھی کہتے ہیں ۔ السَّعِيْرُ ۔ آگ ۔ بھڑکتی ہوئی آگ* ۔

سورۃ نساء میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۔ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا (۴/۱۰) ۔ "جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتے ہیں ۔ اور وہ بھڑکائی ہوئی آگ میں داخل ہونگے" ۔ موت کے بعد ان کا کیا حشر ہوگا، یہ وہاں کی بات ہے ۔ اس دنیا میں ایسے لوگوں کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ شدتِ حرص سے ان کی نیت ہی نہیں بھرتی اور وہ مفت کے مال کے پیچھے دیوانوں کی طرح پھرتے ہیں ۔ چنانچہ سُعْرٌ اور سُعُرٌ کے معنے دیوانگی کے بھی آتے ہیں* ۔

*تاج ۔ **محیط ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے مشتعل ہونے ، بھڑک جانے اور بلند ہو جانے کے ہوتے ہیں ۔ اس اعتبار سے سَعَّرَ اور سَعَّرَ النَّارَ وَ الْحَرْبَ ۔ کے معنے ہیں آگ اور جنگ کو بھڑکا دینا*۔ وَ اِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ (۸۱/۱۲) ۔ "اور جب دوزخ بھڑکائی جائیگی"۔ اس میں عذاب کی شدت کی طرف اشارہ ہے ۔ یعنے جس قدر کسی کے جرائم زیادہ سنگین اسی قدر ان کے نتائج زیادہ تباہ کن ۔

س ع ی

سَعْیٌ کے معنے قصد و ارادہ کرنے ، تیز چلنے ، کے ہیں ۔ کسی کام کے لئے اہتمام ، دوڑ دھوپ اور کوشش کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ جب یہ لفظ جانے یا دوڑنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے بعد اِلٰی آتا ہے ۔ جیسے فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ ۔ اور جب یہ کام کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے بعد لام آتا ہے ۔ جیسے سَعٰی لَہَا** ۔ اَلسَّاعِیْ کوشش کرنے والا ۔ نیز صدقات وصول کرنے والے کو بھی کہتے ہیں ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ دوڑنے کے معنوں میں (۲/۲٦۰) میں آیا ہے نیز (۲۰/۲۰) میں ۔ کوشش اور محنت کرنے کے معنوں میں (۱۷/۱۹) میں ۔ یعنے دوڑ دھوپ ۔ جد و جہد ۔ تگ و تاز ۔ سعی و عمل وغیرہ ۔

قرآن کریم میں ایک آیت ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹) "انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے وہ سعی و کاوش کرے" ۔ یہ آیت ایک عظیم اصول کی طرف راہ نمائی کرتی ہے ۔ معاشیات ((Economics) کی دنیا ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسان کو صرف محنت (Labour) کا معاوضہ لینا چاہئے۔ سرمایہ (Capital) کا معاوضہ ، یا یونہی بغیر محنت ۔ کچھ لے لینا ، جائز نہیں۔ اس اصول پر معاشیات کا جو نظام تعمیر ہوتا ہے اس کا اندازہ اہل بصیرت لگا سکتے ہیں ۔

معاشرت اور تمدن کی دنیا میں اس اصول نے یہ بتا دیا کہ معاشرہ میں فرد کا مقام اس کی محنت کے اعتبار سے متعین کرنا چاہئے ، نہ کہ خاندانی یا اسی قسم کی دیگر اضافی نسبتوں سے ۔

"مذہب" کی دنیا میں اس اصول نے یہ بتا دیا کہ نجات و سعادت ، صرف انسان کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہے ۔ یہ کسی کی سفارش سے نہیں مل

---

* تاج ۔ ** تاج و محیط و راغب۔

سکتی ۔ نیز اس نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ عقیدہ کہ ہر بچہ اپنے اولین ماں باپ کے گناہ کا بوجھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ یا پچھلے جنم کے جرائم کی پاداش میں مبتلا ہوتا ہے ، باطل ہے ۔ انسان سفید لوح(Clean Slate) لے کر پیدا ہوتا ہے اور جس قدر وہ سعی و عمل کرے اسی قدر وہ زندگی کی خوشگواریوں کا اہل بن جاتا ہے ۔

نیز اس اصول نے سیاست کی دنیا میں یہ کہدیا کہ ہر انسانی بچے کو سعی و عمل کا یکساں میدان ملنا چاہئے ۔ اس باب میں نہ کسی کو رعایات ملنی چاہئیں اور نہ ہی کسی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنی چاہئیں ۔

آپ نے دیکھا کہ یہ اصول کسقدر عظیم انقلاب کا منشور ہے؟

س غ ب

سَغَبَ ۔ یَسْغُبُ ۔ وسَغِبَ یَسْغَبُ ۔ سَغْبًا ۔ ومَسْغَبَةً ۔ تھکن کے ساتھ بھوکا ہونا ۔ (راغب نے پیاس کا اضافہ بھی کیا ہے) ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی بھوک بتائے ہیں اور المَسْغَبَة کے معنی قحط ۔ قرآن کریم نے کہا ہے اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ (۹۰/۱۴) "ایسے وقت میں انسانوں کی خوراک کا انتظام کرنا جب بھوک اور مشقت عام ہورھی ہو" ۔ قرآن کریم نے اس پروگرام (نظام) کو پہاڑی پر چڑھنے سے تعبیر کیا ہے (۹۰/۱۱-۱۳) ۔ فی الحقیقت یہ چیز کہ انسان محنت اور مشقت سے کمائے اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے فقط اپنی ضروریات کے مطابق لے کر باقی ماندہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے عام کر دے ، بالخصوص ایسے زمانے میں جب چاروں طرف بھوک ہی بھوک نظر آ رہی ہو ، مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ہے ۔ اسی سے انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے اور یہی اسلام کا مقصود ہے ۔اسی کو نظام ربوبیت کا قیام کہتے ہیں ۔ (سورۃ البلد کی یہ آیات ۔(۹۰/۱۱-۱۶) ۔نظام ربوبیت کےسلسلہ میں عظیم حقائق کی مظہر ہیں ۔ ان کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہئے ۔ (تفصیل میری کتاب "نظام ربوبیت" میں ملے گی) ۔

س ف ح

سَفَحَ الدَّمَ ۔ اس نے خون بہایا ۔ خون گرایا ۔ سَفَحَ الدَّمْعَ ۔ اس نے آنسو بہائے ۔ سَفَحَ الدَّمْعُ ۔ آنسو بہ پڑے (لازم و متعدی) ۔ اس سے

*تاج و راغب ۔

اَلْمُسَافَحَۃُ کے معنے زنا کرنے کے آتے ہیں ، کیونکہ اس میں مادہ منویہ کو یونہی ضائع کرکے بہادیا جاتا ہے ۔ چنانچہ جاہلیت میں جب لوگ کسی عورت کو شادی کا پیغام دیتے تھے تو اَنْکَحِیْنِیْ کہتے تھے اور جب زنا کے لئے پیغام دیتے تھے تو سَافِحِیْنِیْ کہتے تھے۔ اَلسَّفِیْحُ ۔ جوئے کے تیروں میں سے چوتھا تیر جس پر کوئی نشان نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی حصہ ہوتا تھا ۔ نہ ہی اس پر کوئی تاوان دینا پڑتا تھا ۔ یہ بلا نتیجہ رہتا تھا* ۔

قرآن کریم نے مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کے سلسلہ میں پہلے ان عورتوں کی فہرست دی ہے جن سے نکاح حرام ہے ۔ اس کے بعد کہا ہے کہ ان کے علاوہ دیگر عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں بشرطیکہ اس تعلق کی شکل مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ (۴/۲۴) ہو۔ مُحْصِنِیْنَ کا مفہوم (ح ۔ ص ۔ ن) کے عنوان میں بیان ہو چکا ہے ۔ پہلے اسے ایک نظر دیکھ لیجئے ۔ مُسَافِحِیْنَ کے معنی ہونگے ، مادہ منویہ کو بہا دینے کے لئے۔ اس سے قرآن کریم ایک عجیب حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے ۔ پہلے آپ یہ دیکھئے کہ نکاح اور زنا کے جنسی تعلق میں فرق کیا ہے ۔ شہوانی لذت تو دونوں میں ہوتی ہے لیکن اول الذکر صورت میں یہ لذت مقصود بالذات نہیں ہوتی ۔ مقصود افزائش نسل ہوتا ہے ۔ لیکن زنا میں لذت مقصود بالذات ہوتی ہے اور زنا کار (مرد اور عورت دونوں) کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ استقرار حمل نہ ہو ۔ یہ معنی ہیں ''مادہ منویہ کو بہا دینے کی خاطر'' ۔ لہذا جنسی اختلاط کی وہ شکل جس میں انسان نکاح کی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرے ۔ انہیں (Avoid) کرے۔ اور مقصود محض جذبہ شہوانی کی تسکین ہو ، قرآن کریم کی رو سے جائز نہیں قرار پاسکتی ۔

اسی سورۃ میں اگلی آیت میں قرآن کریم نے مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (۴/۲۵) کہا ہے ۔ اخدان کے لئے دیکھئے عنوان (خ ۔ د ۔ ن) ۔ مطلب اس سے چھپی آشنائی ہے ۔ (اگرچہ یہ لفظ اس زمانے کی لونڈیوں کے سلسلہ میں آیا ہے لیکن اطلاق اس کا عام ہے) ۔ ان تین اصطلاحات کا مفہوم حسب ذیل ہوگا ۔

(i) مُحْصِنِیْنَ ۔ جنسی اختلاط کی وہ شکل جس میں نکاح کی تمام حدود و قیود ، حقوق و فرائض، غرض و غایت کو ملحوظ رکھا جائے ۔

---

*تاج ۔

(ii) اَلسِّفَاحُ ۔ وہ جنسی اختلاط جس میں مُحْصِنِيْنَ کی شکل نہ ہو ، خواہ کوئی معاشرہ اسے اپنے ہاں معروف (Recognised) ھی قرار کیوں نہ دے لے ۔ اور

(iii) اِتِّخَاذِ اَخْدَانٍ ۔ اختلاط کی وہ شکل جو اس معاشرہ میں بھی معروف نہ ہو ۔

قرآن کریم کی رو سے صرف شکل (i) جائز ہے ۔

س ف ر

اَلسَّفْرُ ۔ کے بنیادی معنے ھیں کسی چیز سے پردہ اٹھا کر اسے واضح اور بے نقاب کر دینا ۔ صاحب محیط نے لکھا ھے کہ اَلسَّفْرُ کسی چیز کے ظاھری حصہ کے واضح کر دینے کو کہتے ھیں اور اَلْفَسْرُ (جس سے تفسیر ھے) کے معنے ھیں کسی چیز کے اندورنی حصہ کو کھول کر واضح کر دینا *۔ بہرحال اس کے بنیادی معنی بے نقاب کرنا ، واضح اور روشن کرنا ھیں ۔ سَفَرَتِ الْمَرْاَۃُ ۔ عورت نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی **۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کھل جانے ۔ چھٹ جانے اور صاف ھو جانے کے ھیں ۔

اسی جہت سے اَلسَّفْرُ کے معنے عوتے ھیں جھاڑو دینا ۔ اَلْمِسْفَرَۃُ ۔ جھاڑو کو کہتے ھیں ۔ نیز سَفَرَ کے معنے پراگندہ کر دینا ھیں ، جیسے سَفَرَتِ الرِّيْحُ الْغَيْمَ ۔ ھوا نے بادلوں کو منتشر کر دیا ۔ اسی سے اَلسَّافِرُ ۔ سفر کرنے والے (مسافر) کو کہتے ھیں ۔ اَلسُّفْرَۃُ ۔ مسافر کا کھانا جو سفر کیلئے تیار کیا جائے ۔ اس کے بعد اسکا اطلاق توشہ دان پر ھونے لگا ۔ اور پھر دسترخوان کو بھی سُفْرَۃٌ کہنے لگے **۔

سَفِيْرٌ ۔ قوم کے درمیان صلح کرانے والا **۔ اس اعتبار سے کہ وہ دونوں فریقوں کے دل کی بات کو باھر نکال کر معاملہ کو صاف کرا دیتا ھے ۔ اَلسِّفَارَۃُ وَالسَّفَارَۃُ ۔ قوم کے درمیان اصلاح یا صلح کی کوشش کرنا **۔ اَلسِّفْرُ ۔ بڑی کتاب یا وہ کتاب جو حقائق کو روشن کرتی ھے ۔ اسکی جمع اَسْفَارٌ ھے (۶۲/۵) سَفَرَ الْكِتَابَ سَفْرًا ۔ کتاب کو لکھا **۔ سَافِرٌ ۔ لکھنے والا (اسکی جمع ھے اَلسَّفَرَۃُ)۔ اَسْفَرَالصُّبْحُ ۔ صبح روشن ھوئی ۔

* محیط ۔ ** تاج ۔

قرآن کریم میں ہے وَالصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ (۳۴/۷۴)۔ "جب صبح اچھی طرح روشن ہو جائے"۔ دوسری جگہ ہے وُجُوْہٌ یَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَۃٌ (۳۸/۸۰)۔ "کچھ چہرے اس دن تابناک ہونگے"۔ اسی سورۃ میں ذرا پہلے ہے بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ (۱۵/۸۰)۔ "لکھنے والوں کے ہاتھوں میں"۔ سورۃ بقرۃ میں عَلٰی سَفَرٍ (۱۸۴/۲) آیا ہے۔ یعنی حالت سفر میں۔

س ف ع

سَفْعٌ۔ کے معنی ہیں پکڑ کر کھینچنا۔ جھلسا دینا۔ داغ لگانا۔ نشان لگانا۔ نیز تھپڑ مارنے کو بھی کہتے ہیں۔ سَفَعَ بِنَاصِیَتِہٖ وَبِرِجْلِہٖ۔ اسے پیشانی کے بال یا ٹانگ پکڑ کر کھینچا *۔ قرآن کریم میں ہے لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِیَۃِ (۱۵/۹۶)۔ ہم بالضرور اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیں گے۔ سختی سے گھسیٹینگے۔ یعنی یہ بڑے بڑے مخالفین آخرالامر ذلیل و خوار ہو کر مغلوب ہو جائینگے اور شکست کھا جائینگے۔ ذلت کے لحاظ سے اَلسُّفْعَۃُ اس کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کو کہتے ہیں جو کھنڈروں میں پڑا رہتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ سیاہی مائل رنگ کے لئے استعمال ہوتا ہے *۔ راغب نے سَفْعٌ کے معنے گھوڑے کی پیشانی کے سیاہ بال پکڑنے کے لکھے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) رنگ (سیاہی مائل) اور (۲) ہاتھ سے کسی چیز کو پکڑ لینا۔

س ف ک

سَفْکٌ۔ بہانا، عموماً خون بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے **۔ اَلسَّفَّاکُ۔ بہت زیادہ خون بہانے والا۔ نیز قادرالکلام آدمی کو بھی کہتے ہیں *۔ قرآن کریم میں یَسْفِکُ الدِّمَاءَ (۳۰/۲) آیا ہے۔ یعنی خونریزی کریگا۔

س ف ل

اَلسُّفْلُ۔ (س کی زیر اور پیش سے) پستی۔ یہ عِلْوٌ اور عُلْوٌ (بلندی) کی ضد ہے۔ اَلْاَسْفَلُ۔ بہت نیچے۔ یہ اَعْلٰی کی نقیض ہے۔ سِفْلَۃُ النَّاسِ۔ کمینے لوگ۔ نیچے درجے کے لوگ *۔ نیز عرب السِّفْلَۃُ خاص طور پر اُس آدمی کو بھی کہتے تھے جسے کھانے کی دعوت دی جائے اور وہ میزبان کے ہاں سے کچھ چرا کر لیجائے ***۔

قرآن کریم میں قوم لوط کے عذاب کے متعلق کہا ہے جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا (۸۲/۱۱)۔ اسکے اوپر کے طبقے کو نیچے کا طبقہ بنا دیا۔ تہہ وبالا

* تاج۔ **تاج و محیط۔ *** محیط۔

کردیا منافقین کے متعلق ہے کہ وہ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۴/۱۴۵)۔ ''جہنم کے سب سے نچلے حصہ'' میں رہتے ہیں۔ قلبی اضطراب کی بدترین حالت میں دن گزارتے ہیں۔ اس دنیا میں بھی ان کی یہ حالت ہے اور مرنے کے بعد بھی وہ بدترین عذاب میں ہونگے۔ فَوْقٌ کے مقابلہ میں اَسْفَلُ (۸/۴۲) میں آیا ہے۔ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ (۹۵/۵)۔ پست سے پست تر۔ ذلیل ترین۔

س ف ن

سَفَنَ الشَّیْءَ۔ یَسْفِنُہٗ سَفْنًا۔ کسی چیز کو چھیلنا یا اوپر سے گھس دینا۔ سَفِیْنَۃٌ اسی سے مشتق ہے۔ اسکے معنے کشتی کے ہیں۔ (شاید اس لئے کہ شروع میں کشتیاں اس طرح بنائی جاتی تھیں کہ درخت کے بہت بڑے تنے کو چھیل چھیل کر اسمیں بیٹھنے کی جگہ بنا لیتے تھے۔ یا پھر اس لئے کہ جب وہ چلتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانی کو چھیلتی پھاڑتی جا رہی ہے۔ سَفَائِنُ الْبَرِّ۔ اونٹوں کو کہتے ہیں۔ (ریگستانی کشتیاں) *۔

قرآن کریم میں ہے رَکِبَا فِی السَّفِیْنَۃِ (۱۸/۷۱)۔ وہ دونوں کشتی میں سوار ہوئے۔ اَمَّا السَّفِیْنَۃُ (۱۸/۷۹)۔ باقی رہا اس کشتی (کا معاملہ)....

س ف ہ

سَفَہٌ کے معنے ہیں عقل کا ہلکا پن، نادانی، جہالت۔ سَفَّہَہٗ کسی کو بیوقوفی اور جہالت پر آمادہ کرنا۔ کسی کو ہلاک کر دینا۔ سَفِہَ الشَّرَابَ سَفَہًا۔ اسوقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی پانی تو بہت پیئے لیکن اسکی پیاس نہ بجھے۔ ثَوْبٌ سَفِیْہٌ۔ جھرے اور خراب بنے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں۔ لیکن اس مادہ کے بنیادی معنے حرکت اور اضطراب کے بھی ہیں۔ (جو کم عقلی کی علامت ہوتی ہے)۔ اس لئے زِمَامٌ سَفِیْہٌ اس مہار کو کہتے ہیں جو اونٹنی کے ہلتے رہنے کی وجہ سے مضطرب رہے۔ حرکت و اضطراب اور تلون کی بنا پر ناپختگیٔ عقل و رائے کو سَفَاھَۃٌ کہتے ہیں**۔

حرکت و اضطراب، نیز ناپختگی عقل کی بنا پر قرآن کریم نے ان لوگوں کو سُفَہَاءُ کہا ہے جن کے دل نفسیاتی کشمکش کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں۔ جو معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ جو ہمیشہ منافقانہ انداز سے دورخی چالیں چلتے ہیں (۲/۱۰-۱۴)۔ یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا عقلمند سمجھتے ہیں لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ ان جیسا بے عقل ہی کوئی نہیں کیونکہ یہ اپنی غلط روش کے تباہ کن نتائج کا شعور و احساس نہیں رکھتے (۲/۱۲)۔

*تاج و محیط و راغب۔ **محیط۔

دوسری جگہ سَفِیْہٌ کا لفظ عام کم عقل لوگوں کیلئے استعمال ہوا ہے (۲/۲۸۲) اور (۶/۱۴۱) میں سَفَہاً کے ساتھ بِغَیْرِ عِلْمٍ کے اضافہ نے بتا دیا کہ سَفَاہَۃٌ یہ ہے کہ انسان علم و عقل سے کام نہ لے۔ قرآن کریم کی رو سے سَفَاہَۃٌ (علم وعقل سے کام نہ لینا) بہت بڑا جرم اور سخت مذموم حرکت ہے۔ مومن وہ ہے جو وحی خداوندی کی روشنی میں علم وعقل سے کام لے۔

سَفَاہَۃٌ (۷/۶۶)۔ حماقت۔ بیوقوفی۔ جہالت۔

سورۃ بقرہ میں ہے وَمَنْ یَرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرَاھِیْمَ اِلَّا مَنْ سَفِہَ نَفْسَہٗ (۲/۱۳۰)۔ ملت ابراھیمی سے اس شخص کے سوا کون بے اعتنائی برت سکتا ہے جس نے اپنی ذات کے بارے میں کبھی غور وفکر سے کام نہ لیا ہو۔ جس نے یہ سوچا ہی نہ ہو کہ ذات کی نشو ونما کیسے ہو سکتی ہے اور یہ کیوں ضروری ہے؟ محیط نے اسکے معنے اپنے نفس کو ذلیل کرنا اور حقیر و بے وقعت سمجھنا کئے ہیں۔ یعنی اپنے نفس کو درخور اعتنا نہ سمجھنا۔ قرآنی تعلیم کا نقطہ ماسکہ، انسانی ذات پر یقین اور اس کے بلند ترین قدر ہونے پر ایمان ہے۔ اگر اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا جائے، یا اسے (Seriously) نہ لیا جائے تو پھر خدا پر ایمان بھی کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ (تفصیل اسی اجمال کی (ن-ف-س) کے عنوان میں ملیگی)

س ق ر

اَلسَّقْرُ۔ آفتاب کی گرمی اور اسکی اذیت۔ سَقَرَتْہُ الشَّمْسُ۔ دھوپ نے اسے پگھلا دیا۔ جھلسا دیا اور اس کے دماغ کو تکلیف پہنچائی۔ اَلسَّاقُوْرُ اس لوہے کو کہتے ہیں جسے تپا کر اس سے جانوروں کو داغ دیتے ہیں۔ نیز اَلسَّقْرُ کے معنے بُعد اور دور ہونے کے بھی ہیں*۔

قرآن کریم میں یہ لفظ جہنم کیلئے آیا ہے۔ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ (۵۴/۴۸)۔ سقر کے ان تھپیڑوں کا مزہ چکھو جو تمہیں زندگی کی خوشگواریوں سے دور (محروم) کر دیتے ہیں۔

س ق ط

سَقَطَ الشَّیْءُ۔ کسی چیز کا گر جانا۔ خواہ (مثلاً) کوئی چھت سے زمین پر آگرے یا کھڑے کھڑے زمین پر گر جائے**۔ سَاقِطَۃٌ چیز کو

* تاج۔ محیط۔ راغب۔ **تاج

لگاتار گرانا *۔ قرآن کریم میں ہے وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَۃٍ (۶/۵۹)۔ کوئی پتہ نہیں گرتا۔ سورۃ مریم میں ہے تُسَاقِطْ عَلَیْکِ رُطَبًا جَنِیًّا (۱۹/۲۵)۔ وہ درخت تجھ پر تازہ کجھوریں لگاتار جھاڑ دیگا۔ سورۃ شعراء میں ہے فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا (۲۶/۱۸۷)۔ ہم پر گرا دے۔ سَاقِطًا ۔ گرنے والا (۵۲/۴۴)۔

سورۃ اعراف میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے وَلَمَّا سُقِطَ فِیْٓ اَیْدِیْھِمْ (۷/۱۴۹)۔ صاحب تاج نے اسکے معنے لکھے ھیں شرمندہ اور متحیر ہونا۔ زجاج نے لکھا ہے کہ اسکے معنے ھیں اپنے کئے پر حسرت اور شرمندگی کے احساس کا پیدا ہونا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے معنے ندامت سے ہاتھ ملنے کے ھیں *۔ صاحب محیط نے بھی اسکے معنے ندامت ھی کے لکھے ھیں۔ اور یہی معنے قرآن کریم میں بھی واضح ہوتے ھیں۔ یعنے اپنی غلطی اور حماقت کے احساس سے ندامت اور پشیمانی۔ آیت کے معنی ہونگے "جب وہ پشیمان ہوئے"۔

س ق ف

اَلسَّقْفُ ۔ چھت (جمع سُقُفٌ ۴۳/۳۳)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں بلند ہونے اور جھکا ہوا ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اَلسَّقِیْفَۃُ ۔ ہر وہ جگہ جس پر چھت ہو۔ بالعموم باہر نکلے ہوئے چھپر کو کہتے ھیں۔ عرب آسمان کو بھی سَقْفٌ کہتے ھیں اس لئے کہ ان کے خیال میں وہ زمین کی چھت ہے **۔ سورۃ انبیاء میں ہے وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (۲۱/۳۲)۔ "ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا"۔ یعنی فضائے کائنات خود محفوظ ہے اور اس کا سلسلہ کچھ اسطرح رکھا گیا ہے کہ اجرام فلکی میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے وہ بالعموم فضا کے چکر میں آکر پس جاتی ہے اور اسطرح ہم اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہ جاتے ھیں۔ گویا یہ فضا ہمارے ارضی مکان کے لئے چھت کا کام دیتی ہے۔ ویسے، آسمان کو سقف کہنے میں عربی محاورہ کی بھی رعایت ہے۔ یعنی عرب اسے چھت سے تعبیر کرتے تھے، اس لئے قرآن کریم نے بھی ان کے محاورہ کی رعایت سے اس کے لئے وھی لفظ استعمال کیا۔ معنی اس کے اسطرح کی چھت نہیں جسطرح مکان کی چھت ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم اوپر واضح کر دیا گیا ہے۔ سماء کے معنی بھی یہ نیلگوں "چھت" نہیں جو ہمیں اپنے سر پر نظر آتی ہے۔ اس سے مراد بلند فضا یا اجرام فلکی ھیں۔ تفصیل (س۔م۔و) کے عنوان میں ملیگی۔

* تاج۔ ** تاج و راغب۔

س ق م

اَلسَّقَامُ - اَلسُّقْمُ - مرض - بیماری - هُوَ سَقِيْمُ الصَّدْرِ عَلَيْهِ - وہ اسکے خلاف دل میں کینہ رکھتا ہے - قَلْبٌ سَقِيْمٌ - ناخوش اور بیزار دل کو کہتے ہیں *-

حضرت ابراہیم کی قوم بت پرست اور ستارہ پرست تھی - حضرت ابراہیم انکے اس شرک کے خلاف انہیں دعوت توحید دیتے تھے - چنانچہ اس ضمن میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ - فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ (۳۷/۸۸) - انہوں نے ستاروں کے معبود ہونے پر غور و فکر کیا - اس کا صحیح صحیح اندازہ کیا اور اس کے بعد کہا کہ میں تمہارے ان معبودانِ باطل سے سخت بیزار ہوں - یہ وہی بات ہے جسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّا بُرَءٰؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۶۰/۴) - میں تم سے اور جن کی تم خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہو ان سے بیزار ہوں * - اسی کو دوسرے مقام پر لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (۶/۷۷) سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی میں ایسے معبودوں کو پسند نہیں کرتا جو ہر آن تغیّر پذیر ہوں -

س ق ی

اَلسَّقْیُ - پلانا - اَلسُّقْيَا - اس سے اسم ہے جس کے معنے ہیں "پلائی" - السَّقْیُ والاِسْقَاءُ - تقریباً ایک ہی معنے ہیں - بعض کا خیال ہے کہ سَقْیٌ منہ کے ذریعے پلانے کو اور اِسْقَاءٌ پانی دے دینے یا پانی بتانے کے لئے بولا جاتا ہے - راغب کے نزدیک سَقْیٌ تو یہ ہے کہ کسی کو پینے کی چیز دے دینا اور پلا دینا ، اور اِسْقَاءٌ یہ ہے کہ تم کسی کو پینے کی چیز دیدو خواہ وہ اسے پئے یا نہ پئے - اس لئے اِسْقَاءٌ میں سَقْیٌ سے زیادہ جامعیت ہے - اَلسِّقَايَةُ - پانی پلانے کی جگہ - یا پانی پلانے کا برتن (۱۲/۷۰) - یا پانی پلانے کا بندوبست - جیسے (۹/۱۹) میں - اَلْاِسْتِسْقَاءُ پینے کے لئے پانی مانگنا یا بارش طلب کرنا - اَلسَّقِيُّ - موسلا دھار برسنے والا بادل** -

سورۃ بقرۃ میں اِسْتَسْقٰی آیا ہے (۲/۶۰) جس کے معنے پانی یا بارش طلب کرنے کے ہیں - سورۃ شعراء میں ہے وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ (۲۶/۷۹) - خدا وہ ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے - سورۃ نحل میں ہے

---

* تاج - **تاج و محیط -

نُسْقِيْكُمْ مِمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ (۱۶/۶۶)۔ ''ہم تمہیں اس چیز سے جو ان کے پیٹ میں ہے (دودھ) پلاتے ہیں''۔ سورۃ شمس میں ناقہؑ حضرت صالحؑ کے متعلق ہے نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا (۹۱/۱۳)۔ یعنی اللہ کی اونٹنی کا خیال رکھو اور اس کے پانی پلانے کا۔ قصہ حضرت یوسفؑ میں سِقَايَةٌ (۱۲/۷۰) کا لفظ ایسے برتن کے لئے آیا ہے جسے صُوَاعٌ بھی کہا گیا ہے (۱۲/۷۲)۔

س ک ب

سَكَبَ الْمَآءَ وَ الدَّمْعَ۔ اس نے پانی اور آنسوؤں کو بہایا۔ سَكَبَ الْمَآءُ۔ پانی بہا (لازم و متعدی)۔ مَآءٌ سَاكِبٌ وَ مَسْكُوْبٌ۔ وہ پانی جو زمین کے اوپر بہہ رہا ہو۔ جسے زمین کھود کر نہ نکالنا پڑے*۔ ارباب لغت نے اس کے معنی اوپر سے گرانے اور بہانے کے بھی کئے ہیں، اس لئے مَآءٌ مَسْكُوْبٌ میں وہ پانی بھی آجاتا ہے جو آبشار کی طرح اوپر سے گرتا ہے۔ قرآن کریم میں مَآءٍ مَّسْكُوْبٍ (۵۶/۳۱) میں آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ جنتی معاشرہ میں سامان زیست، جگر پاش مشقتوں کے بغیر ملیگا (وہاں پانی پینے کے لئے کنواں نہیں کھودنا پڑے گا)۔ لیکن غیر جنتی معاشرہ میں ان چیزوں کے لئے جگر پاش مشقتوں سے گزرنا پڑتا ہے (۲۰/۱۱۷)۔

رَجُلٌ سَكْبٌ۔ سبک روح اور پرنشاط انسان کو کہتے ہیں**۔ فَرَسٌ سَكْبٌ تیز رفتار گھوڑے کو کہتے ہیں۔

س ک ت

اَلسَّكْتُ۔ اَلسُّكُوْتُ۔ خاموش ہونا۔ نہ بولنا۔ سُكُوْتٌ اور صَمْتٌ میں فرق یہ ہے کہ سُكُوْتٌ ان چیزوں کے خاموش ہونے پر بولا جاتا ہے جن میں بولنے کی قدرت ہوتی ہے اور صَمْتٌ میں موخر الذکر شرط نہیں ہے۔ یعنی وہ ہر چیز کی خاموشی پر بولا جاسکتا ہے خواہ وہ بولنے کی طاقت رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو۔ سَكَتَ الْغَضَبُ۔ غصہ ٹھنڈا پڑ گیا*۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ (۷/۱۵۴)۔ جب موسیٰؑ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ راغب نے کہا ہے کہ سُكُوْتٌ میں ایک گونہ سُكُوْنٌ پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہاں غصے کے فرو ہو جانے کے لئے سَكَتَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے***۔

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

س ک ر

سُکْرٌ ۔ نشہ میں ہونا ۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ ایسی حالت ہے جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جاتی ہے ۔ بیشتر یہ اس قسم کی کیفیت کے لئے بولا جاتا ہے جو نشہ آور شراب سے پیدا ہوتی ہے اگرچہ کبھی کبھی ایسی کیفیت غصہ اور عشق سے بھی پیدا ہو جاتی ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حیرت کے ہوتے ہیں ۔ سَکَرٌ ۔ شراب ۔ نشہ آور مشروب (۱۶/۶۷) ۔ سَکْرَۃٌ ۔ غنودگی ۔ بے ہوشی ۔ یہ بھی ایک نشے کی سی کیفیت ہوتی ہے ۔ قرآن کریم میں سَکْرَۃُ الْمَوْتِ آیا ہے (۵۰/۱۸) ۔ یعنی موت کی بے ہوشی ۔ سورۃ نساء میں ہے لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکَارٰی (۴/۴۳) ۔ "صلٰوۃ کے قریب مت جاؤ جب کہ تم سکر کی حالت میں ہو"۔ یہاں سُکَارٰی کے عام معنے حالت نشہ کے کئے جاتے ہیں ۔ لیکن لسان العرب میں ہے کہ اس سے مراد سُکْرُ النَّوْمِ یعنے نیند کا غلبہ ہے ۔ سورۃ حج میں سُکٰرٰی کا لفظ ایسے مدھوش لوگوں کے لئے آیا ہے جو خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے اپنے اوسان کھوچکے ہوں ۔ (۲۲/۲) ۔ اور (۵۰/۱۹) میں وفور جذبات سے پیدا ہونے والی بدمستی کے لئے سَکْرَۃٌ آیا ہے ۔ السَّکْرُ ۔ نہر کو بند کر دینا ۔ سَکِرَتِ الرِّیْحُ ۔ ہوا ساکن ہو گئی ۔ اَلْمَآءُ السَّاکِرُ ۔ ٹھہرا ہوا پانی ۔ سَکَرَ الْبَابَ ۔ دروازہ بند کردیا* ۔

سَکَّرَہٗ ۔ اس کا گلا گھونٹ دیا ۔ سورۃ حجر میں ہے سُکِّرَتْ اَبْصَارُنَا (۱۵/۱۵) ۔ ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے ۔ ہماری نظربندی کر دی گئی ہے ۔

سورۃ نساء کی مذکورہ صدر آیت کو پھر سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکَارٰی ۔ (سُکَارٰی جمع ہے سَکْرَانٌ اور سَکْرَانَۃٌ کی ۔ جب تم پر نیند کا غلبہ ہو تو صلٰوۃ کے قریب نہ جاؤ ۔ اس سے آگے ہے حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (۴/۴۳) ۔ تاآنکہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو ۔ یعنے جس حالت میں تمہیں معلوم ہی نہ ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو ، اس میں صلٰوۃ کا کچھ فائدہ نہیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر انسان صلٰوۃ کے الفاظ کا مطلب نہ سمجھتا ہو تو اس صلٰوۃ سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا ۔ صلٰوۃ کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ تم جو کچھ زبان سے کہہ رہے ہو اس کا مطلب بھی سمجھتے ہو ۔ لہٰذا قرآن کریم کو بلا

*تاج و راغب ۔

سمجھے پڑھنا (خواہ وہ صلٰوۃ میں ہو یا ویسے ہی) کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ قرآن کریم پڑھا اس لئے جاتا ہے کہ سمجھا جائے اور سمجھا اس لئے جاتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ بلا مطلب سمجھے، بعض الفاظ کو دہرانے سے یہ سمجھنا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوتا ہے، عہد سحر (Magic Age) کی توہم پرستی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن کریم آیا تھا۔

س ک ن

سُکُوْنٌ کے معنے ہیں، حرکت نہ رہنا۔ ٹھہر جانا*۔ سَکَنَ سَکَنًا و سُکْنٰی۔ بود و باش اختیار کرنے، رہائش کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے**۔ راغب نے کہا ہے کہ سُکُوْنٌ کسی چیز کا حرکت کے بعد ساکن ہو جانا ہے۔ اسی لئے یہ لفظ کسی مقام کو وطن بنالینے یا کسی جگہ کو گھر بنا لینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اَلسُّکَّانُ کشتی کے پتوار کو کہتے ہیں جس سے اس کا توازن برقرار رہتا ہے۔ اَلسِّکِّیْنُ (۱۲/۳۱)۔ چھری کو کہتے ہیں اس لئے کہ (راغب کے الفاظ میں) اس سے مذبوح کی حرکت، سکون سے بدل دی جاتی ہے۔ مِسْکِیْنٌ اُسے کہتے ہیں جس کی حرکت کو فقر اور محتاجی نے کم کر دیا ہو۔ یہ فَقِیْرٌ سے زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ نیز ذلیل اور کمزور کو بھی مِسْکِیْنٌ کہتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ کہف میں کشتی والوں کو مَسَاکِیْن کہا گیا ہے (۱۸/۷۹) کیونکہ وہ بادشاہ کے استبداد کے مقابلہ میں کچھ نہیں کرسکتے تھے*۔ اَلْمَسْکَنَۃُ۔ سختی اور مشقت کو کہتے ہیں جو انسان کو بے بس کر دیتی ہے***۔ نیز فقر و ذلت اور کمزوری اور مسکینی کی حالت کو*۔

سَکَّنْتُہٗ تَسْکِیْنًا۔ کے معنے ہیں میں نے اس کے اضطراب کو رفع کرکے اس کے دل کو سکون دیدیا۔ یا اسے ثابت و ساکن کر دیا۔ جَعَلَ اللَّیْلَ سَکَنًا (۶/۹۷) کے معنے ہیں خدا نے رات کو ایسا بنایا جس میں تمہیں سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ (۹/۱۰۳) کے معنے ہیں تمہاری دعا ان کے لئے وجہ تسکین ہو جاتی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلسَّکَنُ ہر محبوب چیز کو کہتے ہیں جس سے سکون و قرار حاصل ہو جائے۔ اَلسَّکِیْنَۃُ۔ اطمینان و سکون اور وقار کو بھی کہتے ہیں۔ الرمانی نے اسے اَلتَّثَبُّتُ کا مرادف لکھا ہے***۔ یعنی جمعیت خاطر۔ اِسْتَکَانَ کے معنے ذلیل و کمزور ہو جانا ہیں*۔ (یہ در اصل (ک۔و۔ن) سے ہے۔ (س۔ک۔ن) سے نہیں)۔

*تاج۔ **محیط۔ ***الالفاظ المترادفۃ۔

قرآنِ کریم میں یہ مادہ، کسی جگہ بسنے کے معنے میں آیا ہے۔ جیسے (۲/۳۵) میں (۳/۱۲۵) میں وَھَنَ۔ ضَعُفَ اور اِسْتَکَانَۃ۔ ہم معنی استعمال ہوئے ہیں لیکن جس ترتیب سے یہ الفاظ آئے ہیں (یعنی فَمَا وَھَنُوْا۔۔۔ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَکَانُوْا) اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اِسْتِکَانَۃ انتہائی کمزوری کے لئے آتا ہے۔ (چونکہ اِسْتِکَانَت۔ ک۔ و۔ ن سے ہے۔ اس لئے ہم نے اسے اس عنوان میں بھی لکھا ہے)۔ مَسْکَنَۃ کو خدا کا غضب قرار دیا گیا ہے (۲/۶۱)۔ اس لئے کہ یہ اس جمود و تعطل کا نام ہے جس سے قوم، زندگی اور حرکت سے محروم ہو جاتی ہے۔ سورۃ توبہ میں فُقَرَاءُ اور مَسَاکِیْنُ کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں (۹/۶۰)۔ مسکین وہ ہے جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے۔ یا کسی حادثہ کی وجہ سے وہ زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے کے قابل نہ رہے۔ قرآنی نظام میں کوئی مسکین اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہ سکتا۔ وہ ان چیزوں کو (بطور خیرات نہیں بلکہ) اپنے حق کے طور پر حاصل کرتا ہے۔ سورۃ البلد میں یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَۃٍ۔ اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا مَتْرَبَۃٍ آیا ہے (۹۰/۱۵-۱۶)۔ یعنی وہ جو لوگوں کے قریب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا پائے۔ اور جو ذرا کمزور ہو جانے پر، معاشرہ کے ہاتھوں مٹی میں مل جائے۔ غلط معاشرہ میں ہوتا یہ ہے کہ جو ذرا نیچے گرا، معاشرہ کا ریلا اسے روندتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ قرآنی معاشرہ گرتوں کو اٹھانے کے لئے قائم ہوتا ہے۔

س ل ب

اَلسَّلْبُ۔ کسی سے کوئی چیز زبردستی چھین لینا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ کسی کو غافل پا کر اسکی چیز تیزی سے جھپٹا مار کر لینے کو کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی کسی چیز کو پھرتی سے لینے یا اچک لینے کے ہوتے ہیں۔ اَلسَّلُوْبُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کا بچہ اس سے چھین لیا گیا ہو۔ شَجَرَۃٌ سَلِیْبٌ۔ درخت جس کے پتے اور شاخیں سب جھڑ گئے ہوں۔ اَلسَّلِیْبُ۔ وہ عورت جس کا بچہ مر گیا ہو۔ اَلسَّلْبَۃُ۔ ننگا ہونا۔ بدن پر کپڑے کا نہ ہونا**۔

سورۃ حج میں ہے وَاِنْ یَّسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا (۲۲/۷۳)۔ اگر ان سے مکھی کوئی چیز جھپٹ کر لے جائے۔

---

* محیط۔ ** تاج و راغب۔

س ل ح

اَلسِّلَاحُ ۔ اَلسِّلَحُ ۔ آلہٗ جنگ ۔ یعنی ہر وہ چیز جس سے جنگ کی جائے یا وار کیا جائے ۔ ہتھیار ۔ نیز ہتھیار کا آہنی حصہ ۔ تلوار یا تلوار کی دھار ۔ کمان جس میں تانت نہ ہو ۔ لاٹھی* ۔ (جمع اَسْلِحَۃٌ)۔ وَلْیَاْخُذُوْا اَسْلِحَتَھُمْ (۴/۱۰۲) ۔ "چاہئے کہ وہ اپنے ہتھیار لے لیں" ۔

(سَلَحَ ۔ یَسْلَحُ ۔ پرندوں کے بیٹ کرنے کو بھی کہتے ہیں* ۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آیا) ۔

س ل خ

سَلَخَ ۔ یَسْلُخُ ویَسْلَخُ ۔ کسی جانور کی کھال کھینچ لینا ۔ سَلَخَتِ الْحَیَّۃُ ۔ سانپ نے اپنی کینچلی اتار دی ۔ اَلسِّلْخُ ۔ سانپ کی کینچلی ۔ سَلَخَتِ الْمَرْاَۃُ دِرْعَھَا ۔ عورت نے اپنی قمیض اتار دی** ۔ لہذا اسکے معنے ہیں کسی چیز کو اسطرح الگ کر دینا کہ اس پر دوسری چیز کا نشان تک نہ رہے ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے .... اَللَّیْلُ نَسْلَخُ مِنْہُ النَّھَارَ (۳۶/۳۷) ۔ ہم دن کو رات میں سے اسطرح کھینچ لیتے ہیں (کہ رات میں دن کی روشنی کا ذرا سا نشان بھی نہیں رہتا)۔ اس لئے سَلَخَ الشَّھْرُ وانْسَلَخَ کے معنے ہوتے ہیں مہینہ گزر گیا**۔ (۹/۵) اِنْسَلَخَ مِنْہُ ۔ وہ کسی چیز کو چھوڑ کر، اتار کر اس سے خالی اور ننگا ہو گیا ۔ سورۃ اعراف میں ایک شخص کی حالت کو مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ 'اٰتَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْھَا (۷/۱۷۵) ۔ ہم نے اسے اپنے قوانین دیے اور وہ انہیں الگ چھوڑ کر اسطرح صاف نکل گیا جیسے سانپ کینچلی میں سے نکل جاتا ہے ۔ یہ درحقیقت مسلمانوں ہی کی مثال ہے جنہیں اللہ نے قرآن کریم جیسا ضابطہٗ حیات دیا لیکن انہوں نے اسے اسطرح چھوڑ دیا کہ اسکا کوئی نشان تک بھی انکی ملّی زندگی میں باقی نہ رہا ۔ یہ اس میں سے صاف نکل گئے ۔ انہوں نے اُسے کینچلی کیطرح اتار کر پھینک دیا ۔ لیکن للہ الحمد کہ وہ (قرآن) اپنی اسی حالت میں صحیح وسلامت موجود ہے ۔ اسلئے اُسے جب جی چاہے پھر اسی طرح اوڑھا جا سکتا ہے ۔

س ل س ل

اَلسَّلْسَلَۃُ ۔ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ متصل کرنا ۔ اَلسِّلْسِلَۃُ ۔ زنجیر ۔ تَسَلْسَلَ الْمَاءُ ۔ پانی حلق میں روانی سے اترتا

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔

چلا گیا *۔(سَلٌّ کے معنے کسی چیز کو کھینچنے کے ہوتے ہیں ۔ دیکھئے عنوان (س ۔ ل ۔ ل)۔

قرآن کریم میں سِلْسِلَۃٍ (۶۹/۳۲) ۔زنجیر کے لئے آیا ہے جس کی جمع سَلَاسِلُ ہے (۷۶/۴)۔ زنجیر کا ایک حلقہ دوسرے حلقہ کے ساتھ متصل چلا جاتا ہے اور اسی تسلسل سے وہ زنجیر بن جاتی ہے ۔

س ل ط

اَلسَّلْطُ ۔ اَلسَّلِیْطُ ۔ سخت اور مضبوط ۔ اَلتَّسْلِیْطُ ۔ غالب کر دینا ۔ غلبہ اور اقتدار دیدینا ۔ سَلَّطَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ ۔خدا نے اسے اس پر غلبہ و تسلط عطا کر دیا ۔(۴/۹۰)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی غلبہ اور قوت کے ہوتے ہیں ۔

سُلْطَانُ النَّارِ ۔ آگ کا بھڑکنا **۔ السُّلْطَانُ ۔ حجت ، برہان **۔ دلیل ، ثبوت ، سند۔ محمد بن یزید نے کہا ہے کہ یہ سَلِیْطٌ سے ماخوذ ہے جسکے معنے زیتون کے تیل کے ہوتے ہیں جو روشن ہوتا ہے ۔ اس اعتبار سے وہی حجت و برہان سُلْطَانٌ کہلائیگا جو خود بھی روشن ہو اور بات کو بھی روشن کر دے **۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے ۔ اَمْ لَکُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِیْنٌ (۳۷/۱۵۶) ۔ '' یا تمہارے پاس کوئی کھلی دلیل ہے ''۔ لیکن اَلسَّلْطُ کے اعتبار سے اسکے معنے غلبہ و اقتدار ۔ قوت اور طاقت کے بھی ہیں ۔ ان معانی میں یہ لفظ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے ۔ مثلاً سورۃ ابراہیم میں ہے کہ ہم نے رسولوں کو بَیِّنٰتٌ ، یعنے واضح دلائل ، دیکر بھیجا (۱۴/۹) ۔ لیکن ان کے مخالفین نے یہ کہکر ان سے انکار کر دیا کہ جب تک تم ہم پر غالب نہ آجاؤ ہم تمہاری بات نہیں مانینگے ۔ اسکے لئے سُلْطَانٌ مُّبِیْنٌ (۱۴/۱۰) آیا ہے ۔ یا مثلاً سورۃ حجر میں ہے کہ اللہ نے ابلیس سے کہدیا کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲) ۔ میرے بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہیں ہوگا ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں یہ لفظ '' مجاز قرار دینے '' کے معنوں میں بھی آیا ہے (۱۷/۳۳) جس میں غلبہ کا مفہوم شامل ہے ۔سورۃ نساء میں ہے وَاٰتَیْنَا مُوْسٰی سُلْطَانًا مُّبِیْنًا (۴/۱۵۳) ۔ یہاں بھی اسکے معنے غلبہ و اقتدار کے ہیں ۔ سورۃ الحاقۃ میں بھی سُلْطَانِیَہْ اسی معنی میں آیا ہے (۶۹/۲۹)۔ یعنے سلطانی (میرا سلطان) + ہ (وقف کی ہاء) ۔

سورۃ رحمٰن میں ایک آیت ہے جو ایک عظیم الشان حقیقت پر دلالت کرتی ہے ۔ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۔ اے گروہ جن و انس !

---

* تاج ۔ راغب ۔ ** تاج ۔

اگر تم اسکی طاقت رکھتے ہو کہ ''اقطار السمٰوٰت والارض'' سے آگے نکل جاؤ۔ تو جاؤ۔ ان سے آگے نکل جاؤ۔ (جن و انس کے معنے ہیں وحشی اور مہذب آبادیاں)۔ یہاں انسان سے کہا گیا ہے کہ اگر تم میں یہ طاقت ہے کہ اس مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل سکو تو جاؤ۔ اس سے آگے نکل جاؤ۔ اس سے آگے ہے۔ لَاتَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۵۵/۳۳)۔ تم سُلْطَانٌ کے بغیر ان سے آگے نہیں نکل سکتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل سکتا ہے بشرطیکہ اسے وہ قوت حاصل ہوجائے جسے سُلْطَانٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سُلْطَانٌ اس قوت کا نام ہے جو قوانین خداوندی کے اتباع سے حاصل ہوتی ہے۔ [رسول اللہ ؐ کی زبان مبارک سے کہا گیا ہے وَاجْعَلْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا (۱۷/۸۰) '' اور مجھے اپنے ہاں سے مدد دینے والی قوت عطا فرما دے''] ۔ اس سے معلوم ہوا کہ قوانین خداوندی کے اتباع سے جہاں اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں وہاں اس سے انسان کی ذات میں ایسی قوت اور استحکام پیدا ہو جاتا ہے جس سے یہ مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل کر زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ قوت کسی اور طریق سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ صرف قرآن کریم کے اتباع سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے خانقاہیت والی '' روحانی ترقی '' نہیں سمجھ لینی چاہئے جو انسان کو ارض وسما سے آگے لے جانا تو ایک طرف، اسے خود اس دنیا میں سربزیری اور زیر دستی سکھاتی ہے۔ اس سُلْطَانٌ سے وہ قوت اور غلبہ مقصود ہے جو اس دنیا میں تمام طاغوتی قوتوں کا سر کچل دیتا ہے اور انسانی معاشرہ میں خدا کا قانون عملاً غالب کر دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انسانی ذات میں اس قسم کا استحکام پیدا کر دیتا ہے کہ وہ حیات جاوید حاصل کر لیتی ہے۔ اسی کا نام اقطار السمٰوٰت والارض سے آگے نکل جانا ہے۔ طبعی قوتوں (Physical Forces) سے انسان خواہ چاند تک بھی کیوں نہ جا پہنچے۔ یا اس سے بھی آگے کیوں نہ نکل جائے، وہ اقطارالسمٰوٰت والارض کے اندر ہی رہیگا۔ ان حدود سے باہر، انسانی ذات ہی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس میں وہ سلطان پیدا ہو جائے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔

س ل ف

سَلَفَ الْاَرْضَ و اَسْلَفَهَا۔ زمین میں ہل چلانا یا اسے ہموار کرنا۔ سَلَفَ الشَّیْئُ۔ چیز گزر گئی۔ آگے بڑھ گئی۔ سَلَفَ فُلَانٌ۔ وہ آدمی پہلے گزر گیا۔ اَسْلَفَ اس نے آگے بھیجا، پیش کیا، اَلسَّالِفُ۔

پہلے گزر جانے والا - پیشرو*- اَلسَّالِفَۃُ - جنگ یا سفر میں آگے رہنے والے** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے بڑھنے اور سبقت کرنے کے ہوتے ہیں -

سورۃ بقرہ میں ہے فَلَہٗ مَا سَلَفَ (۲/۲۷۵) - جو پہلے لیا جا چکا ہے وہ اس کا ہے- سورۃ زخرف میں ہلاک شدہ قوموں کے متعلق فرمایا وَجَعَلْنٰھُمْ سَلَفًا وَمَثَلًا (۴۳/۵۶) - ہم نے انہیں پیشرو (یعنی پہلے گزر جانے والے) بنادیا (جن کی داستانیں اب عبرت کے لئے باقی ہیں) - سورۃ الحاقہ میں ہے بِمَآ اَسْلَفْتُمْ (۶۹/۲۴) - جو کچھ تم نے پہلے کیا -

س ل ق

اَلسَّلْقُ - اس مادہ کے بنیادی معنے بلند ہونے اور اوپر چڑھنے کے ہیں***- تَسَلَّقَ الْجِدَارَ- وہ دیوار پر چڑھ گیا - تَسَلَّقَ عَلٰی فِرَاشِہٖ، وہ درد و غم کی وجہ سے اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور اطمینان سے لیٹ نہ سکا - سَلَقَ فُلَانًا بِالسَّوْطِ - اس نے فلاں آدمی کی کوڑوں سے کھال ادھیڑ دی - اَلسَّلِیْقَۃُ - راستہ میں قدموں اور کھروں کے نشانات - پتلی اور باریک کی ہوئی روٹی - نیز طبیعت* - راغب نے لکھا ہے کہ اَلسَّلْقُ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو زبردستی بچھا دینا - خواہ ہاتھ سے ہو خواہ زبان سے**- اور سَلَقَ فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں اس نے فلاں آدمی کے نیزہ مار دیا*- اسی نہج سے قرآن کریم میں ہے سَلَقُوْکُمْ بِاَلْسِنَۃٍ (۳۳/۱۹) یہ لوگ تمہیں اپنی زبانوں کے طعن سے ایذا پہنچاتے ہیں - طعنوں کے تیر و نشتر مارتے ہیں - ان طعن آمیز باتوں سے تمہارے اوپر چڑھ دوڑنا چاہتے ہیں (یہی اسکے بنیادی معنے ہیں اگرچہ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے اس قدر مختلف معنی آتے ہیں کہ ان میں قدر مشترک متعین کرنا مشکل ہے) - لیکن ہمارے نزدیک اس مادہ میں تکلیف پہنچانے کا مفہوم غالب ہے -

س ل ک

سَلَکَ - اس مادہ کے اصل معنے ہوتے ہیں ایک چیز کا دوسری چیز کے اندر چلے جانا یا ڈال دینا - سَلَکَ یَدَہٗ فِی الْجَیْبِ - اس نے اپنا ہاتھ گریبان میں داخل کر لیا* - صاحب محیط نے خَیْطٌ*، سِلْکٌ اور سِمْطٌ* کا فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر ڈورا خواہ سینے کے کام آئے یا

*تاج - **راغب - ***محیط -

ھار بنانے کے خَیْطٌ کہلاتا ھے ، لیکن وہ ڈورا جس میں موتی وغیرہ پروئے جاتے ھیں سِلْکٌ کہلاتا ھے ، اور جس ڈورے میں موتی وغیرہ پروئے ھوئے موجود ھوں وہ سِمْطٌ کہلاتا ھے** ۔اَلسُّلُوْکُ ۔ راستہ میں گھس جانا***۔ سَلَکَ ۔ چلنا یا چلانا ۔ داخل ھونا یا داخل کرنا ۔ (لازم اور متعدی دونوں معنے آتے ھیں) ۔ اَسْلَکَ ۔ چلانا ۔ داخل کرنا* ۔

سورۃ حجر میں ھے کَذٰلِکَ نَسْلُکُهٗ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ (۱۵/۱۲) ۔ اسی طرح ھم اسے مجرمین کے دلوں میں داخل کرتے ھیں ۔ سورۃ طٰہٰ میں ھے وَ سَلَکَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا (۲۰/۵۳) ۔ اور تمہارے لئے اس (زمین) میں راستے چلائے ۔ اور سورۃ نوح میں ھے لِتَسْلُکُوْا مِنْهَا (۷۱/۲۰) ۔ تاکہ تم اس میں چلو ۔

س ل ل

اَلسَّلُّ ۔ کسی چیز کو نرمی اور سہولت کے ساتھ نکال لینا ۔ ابن فارس نے نرمی اور سہولت کے ساتھ چپکے سے خفیہ طور پر نکال لینے کا اضافہ کیا ھے ۔ سَیْفٌ سَلِیْلٌ ۔ نیام سے کھینچی ھوئی تلوار ۔ اَلسُّلَالَۃُ ۔ وہ حصہ جو کسی چیز سے نکالا جائے *۔ اَلْمَسْلُوْلُ ۔ نکالا ھوا ۔ نیز وہ آدمی یا جانور جسے آختہ کر دیا گیا ھو**۔ قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ھے کہ اسے سُلٰلَۃٍ مِنْ طِیْنٍ (۲۳/۱۲) سے پیدا کیا ۔ یعنے وہ شے جو مٹی (جمادات ۔ Inorganic Matter) سے بطور خلاصہ نکالی گئی ھو ۔ اگر انسانی جسم کا تجزیہ کیا جائے تو وہ انہی جامد عناصر (مثل لوھا ۔ چونا ۔ فاسفورس وغیرہ) کا مرکب نظر آئے گا ۔

اِنْسَلَّ وَ تَسَلَّلَ ۔ وہ چھپ کر چلا گیا ۔ آھستہ سے کھسک گیا ۔ اَلسَّلَّۃُ ۔ خفیہ طور پر چرانا ۔ چوری ۔ اَلسَّالُّ ۔ اَلسَّلَّالُ ۔ اَ لْاَسَلُّ ۔ چور کو کہتے ھیں* ۔

سورۃ نور میں ھے اَلَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ (۲۴/۶۳) ۔ جو تم میں سے چپکے سے کھسک جاتے ھیں ۔

س ل م

سَلِمَ****۔ چونکہ یہی وہ مادہ ھے جس سے اِسْلَامٌ کا لفظ آیا ھے اس لئے اس کے بنیادی معانی کو غور سے سمجھ لینا چاھئے کیونکہ انہی معانی سے

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****اس عنوان کے تمام معانی تاج ۔ محیط اور لین سے ماخوذ ھیں ۔

اسْلاَمٌ کے مختلف گوشے واضح ہو جائینگے ۔

(۱) سَلِمَ کے بنیادی معنی ہیں وہ ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک اور صاف ہو گیا ۔ اس کی ہر ایک کمی پوری ہو گئی ۔ سَلَّمَ الدَّلْوَ ۔ اس نے ڈول کو پختگی کے ساتھ تیار کر دیا ۔ سورۃ بقرۃ میں بنی اسرائیل کی گائے کے متعلق ہے مُسَلَّمَةٌ لاَشِيَةَ فِيْهَا (۲/۷۱) ۔ وہ جسمانی نقائص سے منزہ اور بالکل بے داغ ہے ۔ لہٰذا سَلِمَ کے بنیادی معنے ہیں اس طرح مکمل ہو جانا کہ پھر کوئی نقص اور کمی باقی نہ رہے ۔ یعنے انسانی صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما اور تکمیل ۔

(۲) اس مادہ کے دوسرے بنیادی معنے ہیں، ہر قسم کے آفات ۔ خطرات اور حوادث سے محفوظ رہنا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں زیادہ معنی صحت اور عافیت سے متعلق ہیں ۔ سَلِمَ مِنَ الْاٰفَةِ سَلاَمَةً ۔ وہ آفت سے محفوظ رہا ۔ سَلَّمَهُ اللّٰهُ تَسْلِيْمًا ۔ خدا نے اسے آفت سے محفوظ رکھا ۔ قرآن کریم میں خدا کا ایک نام اَلسَّلاَمُ بھی آیا ہے (۵۹/۲۳) جس کا عام طور پر مفہوم لیا جاتا ہے "تمام عیوب و نقائص سے پاک" ۔ لیکن صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے اس کے یہ معنے کئے ہیں انہوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے ۔ کیونکہ سَلاَمٌ اُسے کہتے ہیں جس سے دوسری چیزیں سلامتی حاصل کریں اور سَالِمٌ وہ ہوتا ہے جو دوسرے سے سلامتی حاصل کرے ۔ یعنے وہ جس پر کوئی آفت آ سکتی ہو اور وہ اسکا متوقع بھی ہو لیکن اس سے محفوظ رہنا چاہے ۔ لہٰذا خدا کا نام سَلاَمٌ اس لئے ہے کہ اس نے تمام مخلوق کو اختلال و انتشار سے محفوظ رکھا ہے اور اس کا نظام نہایت حفاظت و صیانت سے چل رہا ہے ۔

لہٰذا سَلاَمٌ کے معنے ہیں آفتوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہنا ۔ یہ اس مادہ کے دوسرے معنی ہوئے ۔

(۳) اَلسُّلَّمُ ۔ سیڑھی کو کہتے ہیں ۔ یعنے کسی بلندی تک پہنچنے کا قابل اعتماد اور محفوظ ذریعہ ۔ لہٰذا اس مادہ کے تیسرے معنے ہیں وہ ذرائع جن سے کوئی شخص نہایت اعتماد اور حفاظت سے بلندیوں تک پہنچ جائے ۔

(۴) اَلسِّلْمُ کے معنے ہیں صلح اور صفائی کے ساتھ رہنے والا ۔ اَلسِّلْمُ کہتے ہی صلح کو ہیں ۔ لہٰذا اس مادہ کے چوتھے معنے ہیں ۔ خود بھی امن و سلامتی سے رہنا اور دنیا میں بھی امن و سلامتی قائم رکھنا ۔ تَسَالَمَتِ الْخَيْلُ کے معنے ہوتے ہیں گھوڑوں کا ایک ساتھ چلنا (پاؤں ملا کر اس طرح چلنا کہ ان میں کامل ہم آہنگی ہو) اور کسی گھوڑے کا ایسی حرکت

نہ کرنا جس سے دوسرے گھوڑے بدک جائیں یا مشتعل ہوجائیں۔ اس سے اسلامی معاشرہ کا صحیح صحیح تصور سامنے آجاتا ہے۔

(۵) اَلتَّسْلِیْمُ وَالسَّلَامُ کے معنے ہیں اطاعت۔ انقیاد۔ سپردگی۔ جھک جانا۔ لہذا اس مادہ کے پانچویں بنیادی معنے ہوئے قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرنا۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ س۔ ل۔ م میں بنیادی طور پر نرمی اور انکسار کا پہلو مضمر ہوتا ہے*۔

(۶) اِسْتَسْلَمَ تَکَمَ الطَّرِیْقِ کے معنے ہیں وہ راستہ کے درمیان میں چلا اور اس سے ادھر اُدھر نہ ہوا۔ قَالُوْا سَلَامًا کے معنے ہیں وہ میانہ روی اختیار کرتے ہیں اور کوئی لغو بات نہیں کرتے۔ لہذا اس مادہ کے چھٹے معنے ہوئے اعتدال اور توازن کی راہ اختیار کرنا اور لغویت اور بیہودگیوں سے بچنا۔

(۷) اِسْتَلَمَ الزَّرْعُ کے معنے ہیں کھیتی کی بالیں نکل آئیں۔ لہذا اس مادہ کے ساتویں معنے ہیں کوششوں کا نتیجہ خیز ہونا۔

(۸) اور اَلسَّلِیْمَۃُ اس عورت کو کہتے ہیں جسکے اعضاء نہایت نرم و نازک اور خوشنما ہوں۔ لہذا اس مادہ کے آٹھویں معنے ہوئے حسن و خوشنمائی۔

ان معانی سے ظاہر ہے کہ اَلْاِسْلَامُ اس نظام حیات کا نام ہے جس سے (۱) انسان کی تمام کمیاں پوری ہو جائیں اور اسکی صلاحیتیں پوری پوری نشو و نما پالیں (۲) جس میں وہ زندگی کی تمام تباہیوں اور بربادیوں سے محفوظ رہے۔ اور (۳) اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا بلندیوں کی طرف بڑھتا چلا جائے۔ (۴) وہ خود اپنی ذات میں بھی امن و سلامتی اور صلح و آشتی سے رہے اور ساری دنیا میں امن و سلامتی قائم کرنے کا موجب ہو۔ وہ سفر زندگی میں دوسرے افراد معاشرہ کے ساتھ پوری ہم آہنگی سے چلے اور کوئی حرکت ایسی نہ کرے جس سے کوئی دوسرا مشتعل ہو اور اسطرح معاشرہ کا نظام خراب کر دے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ (۵) انسان قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرے اور انکے سامنے اپنا سر ہی نہیں بلکہ دل بھی جھکا دے۔ اور یہ کچھ (۶) پورے پورے اعتدال اور توازن سے کرے۔ افراط و تفریط سے کام نہ لے۔ (۷) اسطرح اسکی کوششیں ثمربار ہو جائینگی اور اسکا کوئی عمل رائیگاں نہیں جائیگا اور (۸) اسکی اپنی ذات میں بھی حسن (توازن) پیدا ہو جائیگا اور پورے معاشرے میں بھی۔

* العلم الخفاق۔

یہ ہے وہ روش زندگی جسکے متعلق کہدیا کہ جو شخص اس روش کے خلاف کوئی اور روش اختیار کریگا ، تو وہ اس قسم کے نتائج قطعاً پیدا نہیں کرسکے گی اور وہ آخر الامر نقصان اٹھائیگا (۸۵/۳)۔ یہ روش قرآن کریم کے اتباع کا دوسرا نام ہے ۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی (۴۷/۲۰)

قرآن کریم میں مُسْلِمٌ اور اسکے مشتقات اس کثرت سے آئے ھیں کہ اس مقام پر ان تمام کا درج کرنا مشکل ہے ۔ لہذا ان میں سے جستہ جستہ مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيْهَا (۷۱/۲) "وہ ہر قسم کے نقائص سے منزہ اور بالکل بےداغ ہے"۔ (۲۳۳/۲) میں اِذَا سَلَّمْتُمْ کے معنے ھیں جبکہ تم دے دو ۔ سونپ دو ۔ حوالہ کر دو۔

سورۃ انفال میں ہے کہ تم آپس میں جھگڑنے لگ گئے تھے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ (۴۳/۸) ۔ اللہ نے تمہیں اس کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رکھا ۔ سورۃ الطور میں سُلَّمٌ (۳۸/۵۲) کا لفظ بلند مقامات تک پہنچنے کے ذرائع کیلئے استعمال ہوا ہے ۔

سورۃ انفال میں ہے وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ (۶۱/۸) ۔ اسکے معنے صلح کے ھیں ۔ اطاعت وفرمانبرداری کیلئے یہ مادہ (مثلاً ۱۱۲/۲) میں آیا ہے ۔

سورۃ روم میں ایمان اور اسلام کو الگ الگ بیان کیا ہے (۵۳/۳۰)۔ یعنی اِیْمَانٌ کے معنے ھیں کسی نصب العین کو صحیح مان لینا اور اِسْلَامٌ کا مطلب ہے اس پر پورے پورے طور پر کاربند ہو جانا ۔ اس کے مقابلہ میں ، وہ لوگ جو محض مطیع ہو کر اسلام لائے ہوں اور ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں نہ ہوا ہو، ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ مُسْلِمٌ ھیں ، ابھی مُؤْمِنٌ نہیں ہوئے (۱۴/۴۹) ۔ سورۃ النمل میں مسلمین کا لفظ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ (۳۱/۲۷) کے معنوں میں آیا ہے ۔ یعنی سرکشی اور حدود شکنی اختیار نہ کرنا ۔ فرماں پزیر ہو جانا ۔ سورۃ مریم میں لفظ (سَلَامٌ) اللَّغْوُ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ (۶۲/۱۹) ۔

ان خصوصیات کے حامل انسان کو صاحب قلب سلیم کہا گیا ہے (۸۹/۲۶) ۔ اور ان صفات کی حامل قوم کو اُمَّةٌ مُّسْلِمَةٌ لَّكَ (۱۲۸/۲) یعنی ایسی قوم جو احکامات الٰہی کا اتباع کرتی رہے ۔ اس قوم کے ہر فرد کا فریضۂ حیات یہ ہوگا کہ جس فرد سے اسکا معاملہ پڑے وہ اسے کہے سَلَامٌ عَلَيْكُمْ (۵۴/۶) ۔ میں تمہارے لئے سَلَامٌ کی آرزو کرتا ہوں ۔ یعنی

ان تمام سعادتوں اور خوشگواریوں کی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ۔ اور وہ بھی اس کے جواب میں اس آرزو کا اظہار کرے اور یوں ان کا سارا معاشرہ سَلَاماً سَلَاماً (۵۶/۲۶) کی حیات بخش صداؤں سے گونج اٹھے ۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے کہ وہ یہودی یا نصرانی نہیں تھے ۔ حَنِيْفاً مُّسْلِماً تھے (۳/۶۶) یہی وہ نام ہے جو دین خداوندی کے متبعین کے لئے اللہ نے تجویز کیا تھا ۔ قرآن کریم سے پہلے بھی اور قرآن کریم کے بعد بھی (۲۲/۷۸) ۔ اپنے آپ کو فرقوں سے منسوب کرنا غیر اسلامی شعار ہے ۔ اس لئے کہ فرقہ بندی شرک ہے (۳۰/۳۲) ۔ اور مسلم اور مشرک ایک دوسرے کی ضد ہیں (۳/۶۶) اور کفر اور اسلام بھی ایک دوسرے کی ضد (۹/۷۴) ۔ اسے بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ مسلم کبھی مجرم نہیں ہو سکتا ۔ اسی لئے قرآن کریم میں ہے کہ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ (۶۸/۳۵) ۔ " کیا ہم مسلمین کو مجرمین جیسا بنادینگے ؟ " ۔ لہذا مسلم وہی ہے جو قوانین خداوندی کی اطاعت کرے ۔

الاسلام ، وہ ضابطۂ حیات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے تجویز کیا ہے ۔ اس کے سوا کوئی ضابطۂ حیات خدا کے نزدیک قابل قبول نہیں ۔ سورۃ آل عمران میں ہے اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ ۔ کیا یہ لوگ ، اللہ کے (متعین فرمودہ) ضابطہ حیات کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں ۔ حالانکہ تمام اشیائے کائنات کی کیفیت یہ ہے کہ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعاً وَّكَرْهاً وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۳/۸۲) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے قانون کے سامنے ، طوعاً و کرھاً سر بسجود ہیں اور وہ ہر ہر قدم پر اس قانون کیطرف لوٹائے جاتے ہیں ۔ اس کے بعد ہے وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْناً فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (۳/۸۴) جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور ضابطہ حیات اختیار کریگا اس سے وہ کبھی قبول نہیں کیا جائیگا ۔ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۳/۸۴) ۔ اور اس کا جی چاہے تو تجربہ کرکے دیکھ لے کہ وہ آخرکار ضرور نقصان اٹھائیگا ۔ یہی وہ ضابطہ حیات ہے جو انبیائے سابقہ کو ملتا رہا اور جو آخرالامر قرآن کریم میں آکر مکمل ہوا ۔ اسی کو خدا نے تمام نوع انسان کے لئے منتخب کیا ہے (۵/۳) ۔ لہذا اب ، اس آسمان کے نیچے ، خدا کا تجویز کردہ ضابطہ حیات جسے اس نے الاسلام کہکر پکارا ہے ، قرآن کریم سے باہر کہیں نہیں ۔ اسی دین کے ماننے والوں کو مسلمین کہتے ہیں ۔ مسلم وہ ہے جو قرآن کریم کو خدا کیطرف سے عطا کردہ واحد ، مکمل اور آخری ضابطہ حیات سمجھے ۔

س ل و

سَلْوَیٰ - ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تسلی دے - چنانچہ شہد کو بھی اَلسَّلْوَیٰ کہتے ہیں* - اور گوشت کو بھی** - سَلْوَۃٌ مِنَ العَیْشِ - سہولت اور آرام کی زندگی کو کہتے ہیں جس میں غم و فکر نہ ہو** - سَلَاہٗ عَنْہُ تَسْلِیَۃً - اس نے اسکے غم کو بھلا دیا* - اَلسَّالِیْ - غم و فکر کو بھول جانے والا** - سَلَاہُ - وہ اس کی یاد کو بھول گیا - اس نے اس کے غم کو غلط کر لیا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سہولت کی زندگی اور فراخیٔ عیش کے ہوتے ہیں -

اَلسَّلْوَیٰ - (۲/۵۷) - سفید رنگ کا ایک پرندہ (بٹیر کے مشابہ) جو سینا کی وادیوں میں بنی اسرائیل کو کھانے کو ملتا تھا* - راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ شے ہے جو وجہ تسلی ہو*** - (نیز دیکھئے عنوان - م - ن - ن)

سلیمان علیہ السلام

انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت سلیمانؑ خاص شوکت و حشمت کے مالک تھے - آپ حضرت داؤدؑ کے بیٹے (۳۸/۳۰) اور وارث (جانشین) تھے (۲۷/۱۶) - آپ کو علم اور قوتِ فیصلہ کی فراوانی عطا ہوئی تھی (۲۷/۱۵) - اس لئے انہیں سطوتِ داؤدی کی وراثت محض ان کا بیٹا ہونے کی وجہ سے نہیں مل گئی تھی، اگرچہ بنی اسرائیل میں بادشاہت وراثت میں مل جاتی تھی - شہروں کی مہذب آبادیاں اور وحشی قبائل (جن و انس) آپ کے لشکروں میں جمع رہتے تھے اور گھوڑوں کے رسالے ان پر مستزاد تھے (۲۷/۱۷) - حضرت سلیمانؑ کا بحری بیڑہ بھی بڑا مشہور تھا - قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ہوائیں ان کے تابع فرمان تھیں - (۲۱/۸۱) - یعنی وہ ان سے بادبانی کشتیوں کو چلاتے تھے - پہاڑی قبائل کے سرکش افراد مختلف کاموں پر مامور تھے (۲۱/۸۲) - وہ آپ کے لئے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرتے - مجسمے تراشتے اور تصویریں بناتے تھے (۳۴/۱۲-۱۳) - اس زمانے میں یمن کے مشرقی علاقہ پر قوم سبا کی حکومت تھی جو ستارہ پرست تھی - ایک ملکہ ان پر حکمران تھی - آپ نے اس کے خلاف لشکر کشی کی اور وہ بالآخر مطیع و فرمانبردار ہوگئی (۲۷/۲۰-۴۴) - یہی لشکر وادی نمل میں سے گزرا تھا (۲۷/۱۸-۱۹) - ھُدھُد اسی لشکر میں ایک افسر تھا (۲۷/۲۰-۲۱) -

آپ اس شوکت و عظمت کے مالک تھے لیکن آپ کا جانشین کمزور ثابت ہوا (۳۴/۱۴) - تورات (سلاطین) میں اس کی تفصیل ملتی ہے -

---

*تاج - **محیط - ***راغب -

یہودیوں نے سحر و کہانت کے بہت سے لغو افسانے تراش کر آپ کی طرف منسوب کر رکھے تھے ۔ خود تورات میں بھی اس قسم کی خرافات ملتی ہیں ۔ قرآن کریم نے ان سب کی تردید کی ہے ($\frac{۲}{۱۰۲}$) ۔

س م د

سَمَدَ ۔ سُمُوْدًا ۔ تکبر سے سر کو اٹھائے رکھنا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رکے بغیر آگے بڑھتے چلے جانے کے ہیں ۔ چنانچہ سَمَدَتِ الْاِبِلُ فِیْ سَیْرِھَا کے معنی ہیں اونٹ تیز رفتاری سے ناک کی سیدھ آگے بڑھتے گئے ۔ اس سے اس کے معنی تکبر اور سرکشی کئے جاتے ہیں ۔ نیز من مانی کرنے کے بھی ۔ سَمَدَ ۔ یَسْمُدُ کے معنے ہیں ، بلند ہونا ۔ سَامِدٌ ۔ حیرانی میں کھڑا رہ جانے والے کو بھی کہتے ہیں (شاید اس لئے کہ وہ بھی سر اٹھائے کھڑا رہتا ہے) ۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ اس کے معنے لہو و لعب میں مشغول آدمی کے ہیں جو اپنے فرائض سے غافل ہو جائے* ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ کبھی فکر و حزن سے چہرے کے بگڑ جانے کو بھی اَلسُّمُوْدُ کہتے ہیں** ۔ قرآن کریم میں مخالفین کے متعلق ہے وَتَضْحَکُوْنَ وَلَا تَبْکُوْنَ وَاَنْتُمْ سَامِدُوْنَ ۔ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ($\frac{۵۳}{۶۰-۶۲}$) ۔ تم ہنستے ہو ۔ روتے نہیں ہو ۔ یہ اس لئے ہے کہ تم اس سے بالکل بےخبر ہو کہ تمہارے اعمال کے نتائج کیا سامنے آنے والے ہیں ۔ اس اعتبار سے سَامِدُوْنَ کے معنے غافل اور بے خبر کے آئینگے ۔ لیکن اس کے بعد ہے فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ۔ اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سَامِدُوْنَ کے معنے یہ ہونگے کہ تم بہت متکبر اور سرکش ہو ۔ من مانی کاروائیاں کرتے ہو ۔ تم اس روش کو چھوڑو اور احکام خداوندی کے سامنے جھکو اور اس کی محکومیت اختیار کرو ۔

س م ر

اَلسُّمْرَةُ ۔ گندمی رنگ ۔ اَلسَّمْرَاءُ ۔ گیہوں ۔ اَلسَّمَرُ ۔ رات ۔ رات کی باتیں ۔ رات میں قصے کہانیاں کہنا ۔ اَلسَّامِرُ ۔ شب میں قصہ گوئی کی محفل ۔ نیز قصہ گو ۔ (یہ جمع کے لئے بھی آجاتا ہے) ($\frac{۲۳}{۶۷}$) ۔ اَلسَّمِیْرُ ۔ قصہ گو ۔ داستان زن ۔ اَلْمُسَامِرُ ۔ رات کی قصہ گوئی کی محفل میں تمہارا شریک ۔ سِمَارَةُ اللَّیْلِ ۔ رات کو باتیں کرنا ۔ سَمِیْرٌ کے معنے زمانے کے بھی ہیں*** ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج و راغب

اَلسَّامِرَةُ ۔ اَلسَّمَرَةُ ۔ یہودیوں کی ایک قوم جو اسرائیلی قبائل میں سے ہے ۔ یہ لوگ بعض مسائل میں یہودیوں سے اختلاف رکھتے ہیں ۔ مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا ۔ نیز یہ چھوت چھات کے بھی قائل ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ نابلس کا شہر ہی (جس میں یہ رہتے ہیں) بیت المقدس ہے ۔ ان کے دو فرقے ہیں ۔ کوشان اور دوشان ۔ انہی لوگوں کی طرف وہ سامری منسوب ہے جس نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی کی تعلیم دی تھی* ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلسَّامِرَةُ فلسطین میں ایک مقام بھی ہے اور ایک قبیلہ بھی جو نابلس میں رہتا ہے ۔ ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دوسرے لوگوں سے چھوجانے سے یہ ناپاک ہو جاتے ہیں** ۔ (۲۰/۹۷) میں اس سامری کے متعلق جس نے بنی اسرائیل کو بہکایا تھا ، ایسا ہی کچھ آیا ہے ۔

لیکن عصر حاضر کی اثری تحقیقات کی روشنی میں قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ یہ شخص سمیری قوم کا فرد تھا (بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا) ۔ حضرت مسیحؑ سے قریب ساڑھے تین ہزار سال قبل عراق میں دو قومیں آباد تھیں ۔ ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی عرب تھی اور دوسری جو غالباً شمال سے آئی تھی سمیری کہلاتی تھی ۔ اس کا وطن اگرچہ عراق تھا لیکن یہ دور دور تک پھیل گئی تھی ۔ مصر کے ساتھ ان کے تعلقات تاریخ کی روشنی میں واضح ہو چکے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص (جسے قرآن کریم نے سَامِرِی کہہ کر پکارا ہے ۔ ۲۰/۸۵) مصر میں حضرت موسیٰؑ کا معتقد ہو گیا تھا اور بنی اسرائیل کے ساتھ ہی وہاں سے نکل آیا تھا ۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کی تعلیم اس کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اتری تھی (۲۰/۹۶) ۔

لیکن اگر اَلسَّامِرِیُّ کی اصل سَمَرٌ ہے تو اس کے معنے داستان گو ، یعنے قصے کہانیاں کہنے والے کے ہیں ۔ ''کہانیاں کہنے والے'' جس طرح قوموں کو گمراہ اور برباد کرتے ہیں اس کی تشریح کی ضرورت نہیں ۔ خود ہماری تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے ۔ جب ہم قرآن کریم کے حقائق کو چھوڑ کر، قصوں اور کہانیوں میں الجھ گئے تو قعر مذلت میں گرتے چلے گئے ۔ رفتہ رفتہ اب ہماری حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہمارے ہاں دین نام ہی چند قصوں اور کہانیوں کا رہ گیا ہے اور قرآنی حقائق ہمارے لئے نامانوس شے قرار پا چکے ہیں ۔

---

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔

س م ع

اَلسَّمْعُ - کان کی اس قوت کا نام ہے جس سے انسان آوازوں کو محسوس کرتا ہے - سننے کو بھی ، اور کبھی کبھی خود کان کو بھی کہدیتے ہیں - نیز جو چیز سنی جائے اسے بھی سَمْعٌ کہدیتے ہیں - سَمِیْعٌ کے معنے سننے والا اور سنانے والا دونوں آتے ہیں (اگرچہ بعض علمائے لغت نے دوسرے معنوں کی تردید کی ہے)* - اِسْتَمَعَ اِلَیْهِ کے معنے ہیں کسی کیطرف متوجہ ہونا - کان لگانا اور بغور سننا - لیکن قرآن کریم میں یَسْتَمِعُوْنَ اِلَیْکَ (۴۲/۱۰) سے مراد وہ لوگ ہیں جو بظاہر ایسے دکھائی دیں کہ وہ بڑی توجہ سے سن رہے ہیں لیکن درحقیقت سن نہ رہے ہوں - انہیں وہ بہرا کہتا ہے - یعنی عقل سے کام نہ لینے والے -(۴۲/۱۰)-

اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ - (۴۶/۴) اس کے یہ معنی ہیں کہ تو ہماری بات سن ، اگرچہ تیری بات سنی نہیں جائیگی - راغب نے کہا ہے کہ یہ قول طنزاً بہرا ہو جانے کی بددعا کے لئے ، اور بصورت دیگر دعا کے لئے بولا جاتا ہے - کبھی کبھی سَمْعٌ کا اطلاق خود فہم و تدبر پر بھی ہوتا ہے - یعنے اَسْمَعَ کے معنے اَفْهَمَ (کسی کو سمجھا دینا) بھی آتے ہیں - نیز اس لفظ کا اطلاق اطاعت پر بھی کر دیا جاتا ہے - یعنے اِسْمَعُوْنِ کے معنے اَطِیْعُوْنِ ہوتے ہیں* - (۴/۹۳) - سَمِعَ لَهٗ کے معنی ہیں اس کی بات کو قبول کیا* -

قرآن کریم نے حصول علم کے لئے سمع ، بصر اور قلب کا ذکر کیا ہے - سماعت و بصارت ان حواس (Senses) کی ترجمان ہیں جنکے ذریعہ محسوس اشیاء کے متعلق معلومات ذہن انسانی تک پہنچتی ہیں - یعنے یہ علم محسوسات (Perceptual knowledge) کے ذرائع ہیں - ان ذرائع سے جو معلومات (Sense Data) قلب (Mind) تک پہنچتا ہے وہ اس سے تصورات (Concepts) متعین کرتا ہے - اسطرح سمع ، بصر و قلب سے (Conceptual knowledge) حاصل ہوتا ہے - قرآن کریم علم محسوسات اور علم تصورات پر بڑا زور دیتا ہے اور جو لوگ سمع و بصر و قلب** سے کام نہیں لیتے انہیں جہنمی قرار دیتا ہے (۷/۱۷۹)- لیکن وہ اسکے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ جب انسان پر جذبات غالب آجائیں تو پھراسکے ذرائع علم اسے صحیح نتیجہ تک کبھی نہیں پہنچاتے (۴۵/۲۳؛ ۲۷/۱۰۶)- آپ نے دیکھا ہوگا کہ (مثلاً) غصہ میں انسان کسطرح اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے - یہی حال دوسرے جذبات کا ہے -

* تاج - ** نیز دیکھئے عنوانات ق - ل - ب اور ب - ص - ر

لالچ میں انسان وہ کچھ کر بیٹھتا ہے جس پر ہر ہوشمند ہنستا ہے۔ اور تعصب میں انسان دوسرے کے نقطہ نگاہ کو کبھی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جس طرح نشے کی حالت میں حواس صحیح کام نہیں دے سکتے اسی طرح جذبات سے مغلوب ہونے کی حالت میں عقل بیکار ہو جاتی ہے۔ اسے قرآن کریم خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (۲/۷) سے تعبیر کرتا ہے۔ آنکھوں پر پردے پڑجانا۔ کانوں میں ڈاٹ لگ جانا۔ اور دلوں پر مہریں لگ جانا *۔ علم اُسی وقت صحیح نتائج تک پہنچا سکتا ہے جب اس سے وحی کی روشنی میں کام لیا جائے۔ کیونکہ وحی کے ذریعہ وہ اصولِ زندگی ملتے ہیں جن میں انسانی جذبات کی آمیزش نہیں ہوتی۔ انسان اپنے عقل و فہم سے جو اصول حیات بھی وضع کریگا وہ اسکے جذبات کی آمیزش سے خالی نہیں رہ سکتے۔

سَمَّاعٌ۔ جاسوس کو بھی کہتے ہیں ** (۵/۴۱)۔

سورۃ کہف میں ہے اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ (۱۸/۲۶) کیا خوب اسکا دیکھنا اور کیا خوب اسکا سننا ہے۔

مُسْمِعٍ۔ سنانے والا (۳۵/۲۲)۔ مُسْتَمِعٌ۔ سننے والا (۵۲/۳۸)۔

اِسْتَمَعَ۔ (چھپ کر) سننا (۷۲/۱)۔ کان لگا کر غور سے سننا (۲۰/۱۳)۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلسَّمْعُ اور اَلسِّمْعُ۔ ذکر جمیل اور شہرت کو بھی کہتے ہیں۔

س م ک

اَلسَّمْکُ۔ گھر کی بلندی یا چھت۔ قَدْ سَمَکَہٗ۔ اس نے اسکو بلند کر دیا ***۔ اَلسِّمَاکُ۔ وہ چیز جس سے کسی چیز کو بلند کیا جائے۔ اَلْمِسْمَاکُ۔ لکڑی جو خیمہ میں لگائی جاتی ہے تاکہ وہ اونچا رہے۔ اَلسَّمَکُ۔ مچھلی کو کہتے ہیں **۔ (کیونکہ وہ درمیان سے موٹی اور اونچی ہوتی ہے)۔

قرآن کریم میں ہے رَفَعَ سَمْکَهَا (۷۹/۲۸) خدا نے (آسمان کی) بلندی یا چھت کو اونچا کر دیا۔ فضائے سماوی کو بہت بلندی تک لے گیا۔ [(Space) کی بلندی یا وسعت لامحدود ہے۔]

* دیکھئے عنوان خ۔ت۔م۔ **تاج ***راغب۔

س م م

اَلسَّمُّ - تنگ سوراخ - جیسے سوئی کا ناکہ - (۴۰/۷) - یا کان اور ناک کا سوراخ - نیز زہر کو بھی کہتے ہیں - مَسَامٌّ - جلد کے باریک سوراخ - اَلسَّمَّامُ - ہر ہلکی پھلکی اور تیز چیز - اَلسَّمُوْمُ - تیز گرم ہوا (لُو) جو اکثر گرمی کے دنوں میں چلتی ہے * - قرآن کریم میں ہے فِیْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِیْمٍ (۵۶/۴۲) - سورۃ حجر میں نَارِ السَّمُوْمِ (۱۵/۲۷) آیا ہے -

ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی بتائے ہیں، کسی چیز میں داخل ہونے کی جگہ - وہ لکھتا ہے کہ زہر کو سَمٌّ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بدن میں گھس جاتا ہے، اور سَمُوْمٌ گرم ہوا کو کہتے ہیں، اس لئے کہ وہ تیزی کی وجہ سے بدن میں گھس جاتی ہے - راغب نے لکھا ہے کہ سَمَّهٗ کے معنے ہیں اس میں گھس گیا، نیز سَمُوْمٌ اس گرم ہوا کو کہتے ہیں جو زہر کا سا اثر کرتی ہے ** -

س م ن

سَمِنَ - سَمَانَةً - وہ فربہ ہوا - موٹا تازہ ہوا - سَامِنٌ - سَمِیْنٌ - (جمع سِمَانٌ) فربہ * - قرآن کریم میں ہے بَقَرَاتٍ سِمَانٍ (۱۲/۴۳) - موٹی گائیں - یا بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ (۵۱/۲۶) - موٹا بچھڑا اَسْمَنَ الرَّجُلُ - آدمی موٹا تازہ ہو گیا - سَمَّنَهٗ - وَاَسْمَنَهٗ - اسے موٹا کر دیا * - سورۃ غاشیہ میں جہنم کے کھانے کے متعلق ہے لَا یُسْمِنُ (۸۸/۷) - وہ موٹا نہیں کرتا - بدن کو بڑھاتا نہیں - ذلت و رسوائی کی روٹی سے فربہی کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اَلسَّمْنُ - گھی کو کہتے ہیں جس کے کھانے سے انسان موٹا ہو جاتا ہے -

س م و

سَمَاءٌ (جمع سَمٰوٰتٌ) آسمان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین پر بلند اور سایہ فگن ہوتا ہے - نیز ہر اس چیز کو جو تمہارے اوپر چھائی ہوئی اور سایہ فگن ہو، سَمَاءٌ کہینگے - چنانچہ گھر کی ہر چھت بھی سَمَاءٌ کہلاتی ہے - فقہ اللغۃ میں بھی سَمَاءٌ کی یہی تعریف کی گئی ہے - راغب نے کہا ہے کہ ہر چیز اپنے سے نچلی چیز کی نسبت سے سَمَاءٌ کہلاتی ہے اور اپنے سے اوپر کی چیز کی نسبت سے اَرْضٌ - نیز بادل اور بارش کو بھی سَمَاءٌ کہتے ہیں - پودے اور سبزے کو بھی سَمَاءٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین سے اونچا ہوتا ہے *** -

---

* تاج - ** راغب - ***تاج نیز ابن قتیبہ - القرطین ج/۲ صفحہ ۲۸ -

اِسْمٌ کے معنے ھیں کسی چیز کی علامت جس سے اسے پہچانا جائے۔ پھر نام کو بھی اِسْمٌ کہتے ھیں ، اس کی جمع اَسْمَاءٌ ھے۔ اس کا مادہ بھی س۔م۔و ھے۔ اس جہت سے کہ اسم سے مسمی پہچانا جاتا ھے اوراسی سے اسے بلندی و عزت حاصل ھوتی ھے۔ سَمِیٌّ کے معنے ھمنام اور نظیر و ھم پلہ کے آتے ھیں ۔ مُسَامَاۃٌ کے معنے باھمی مفاخرت کے آتے ھیں* ۔ سَمّٰی تَسْمِیَۃً ۔ نام رکھنا ۔ اَلْمُسَمّٰی کے معنے نام رکھا ھوا ، بتایا ھوا ، نامزد کیا ھوا ۔ نیز معین ، مقرر اور معلوم* ۔

صاحب مفردات نے عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ پر بحث کرتے ھوئے لکھا ھے کہ مَعْرِفَۃُ الْاَسْمَاءِ لَا تَحْصُلُ اِلَّا بِمَعْرِفَۃِ الْمُسَمّٰی ۔ جب تک مسمّٰی کا علم نہ ھو اس کے اَسْمَاء کا تعارف کچھ فائدہ نہیں دیتا*** ۔ اس کا مطلب یہ ھے کہ آدم کو علم اشیاء کی ایسی صلاحیت دی گئی ھے کہ وہ ھر چیز کو اس کی شکل اور اس کے خواص سے معلوم کرکے اس کو پہچاننے کے لئے نام رکھتا ھے ۔

قرآن کریم میں اَرْضٌ وَ سَمَاءٌ بے شمار مقامات میں آتا ھے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ ھماری اس زمین کو بھی ، جس پر ھم رھتے ھیں ، اَرْضٌ کہتے ھیں ۔ لیکن چونکہ ھر بلندی کو (پستی کی نسبت سے) سَمَاءٌ اور ھر پستی کو (اس کی بلندی کی نسبت سے) اَرْضٌ کہتے ھیں ، اس لئے اَرْضٌ وَ سَمَاءٌ کے معنے کائنات کی پستیاں اور بلندیاں ھونگے ۔ اور جب اَرْضٌ کو سَمَاءٌ کے مقابل میں لایا جائیگا تو سَمَاءٌ سے مفہوم کائناتی زندگی اور اس کا نظام بھی ھوگا ، اور اَرْضٌ سے مراد انسان کی معاشرتی ، معاشی اور تمدنی زندگی ۔ نیز سَمَاءٌ یا سَمٰوٰتٌ سے مراد محض اجرامِ فلکی ھی نہیں ھونگے بلکہ فضا کی بلندیوں میں پھیلی ھوئی تمام توانائیاں مثل ایتھر اور ایثم وغیرہ بھی ھونگے ۔ یعنی فضا مع اپنے مشمولات کے ۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں اَرْضٌ وَ سَمَاءٌ کے الفاظ آئے ھیں سیاق و سباق پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آ جائیگا کہ اُس جگہ سَمَاءٌ میں بلندی کا پہلو ھے اور اَرْضٌ میں پستی کا ۔ خواہ وہ محسوس اشیاء میں ھو ۔ خواہ منصب اور مرتبہ کے لحاظ سے اور خواہ کائناتی قوانین کے مقابلہ میں انسان کی معاشرتی زندگی ھو جسے اس نے اپنی مفاد پرستیوں کے سانچے میں ڈھال رکھا ھے ۔ (مزید بحث ارض کے عنوان کے تحت آچکی ھے) ۔

* تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

قرآن کریم میں ہے کہ وَ عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا (۲/۳۱)۔ آدم کو تمام اشیاء کے اَسْمَاء سکھا دیئے گئے۔ آدم سے مراد خود آدمی ہے۔ یعنی انسان (دیکھئے عنوان ا۔ د۔ م) جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، اسماء کا جاننا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا جب تک آپ کو مسمّٰی (جس چیز کا وہ نام ہے) اس کا علم نہ ہو۔ لہذا آدم کو جو علم الاسماء دیا گیا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ انسان میں اشیائے کائنات کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی استعداد رکھ دی گئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملائکہ (کائنات میں کام کرنے والی قوتیں) اس کے سامنے سر بسجود ہیں۔ جب انسان اس قانون سے واقف ہو جاتا ہے جو کائنات میں کارفرما ہے تو جو جو قوتیں اس قانون کے مطابق کام کر رہی ہیں وہ سب اس کے تابع فرمان ہو جاتی ہیں۔ لہذا جس قدر کوئی قوم اشیائے فطرت کے متعلق معلومات بہم پہنچا کر انہیں اپنے تابع فرمان کرلے گی اسی قدر وہ مسجود ملائکہ بنتی جائے گی۔ اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ ان قوتوں کا استعمال کس طرح کیا جائے۔ سو اس کے متعلق فرمادیا کہ فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)۔ جو قوم وحی خداوندی کا اتباع کریگی اسے کوئی خوف و حزن نہیں ہوگا۔ اور جو قوم انہیں اپنی مرضی کے مطابق (اپنی مفاد پرستیوں کے لئے) صرف کرے گی وہ خود بھی ہلاکتوں میں پڑیگی اور دوسروں کے لئے بھی باعثِ مصیبت بن جائے گی۔ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ (۲/۳۹)۔ اگر تسخیر فطرت کرنے والی قوم کو "آدم" (محض آدمی) کہا جائے تو اشیائے فطرت کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنے والی قوم کو "مومن" کہا جائے گا۔ اور جو قوم نہ تسخیرِ فطرت کرے اور نہ ہی اتباعِ قوانین خداوندی تو اسے—؟ کہتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے لیکن بہر حال کہنا ہی پڑتا ہے، کہ اسے دور حاضر کے مسلمان کہا جائے گا! یا للعجب۔

"آدم" کے علم الاسماء کے ضمن میں ایک مغربی ڈاکٹر نے اپنے نقطہ نگاہ سے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

> آدم پر تمام زندہ اشیاء کا نام رکھنے کی ذمہ داری عائد کی گئی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری اور مشکل کام تھا۔ اس لئے کہ جن چیزوں کا نام نہیں رکھا جاتا ان کے خواص بھی غیر متعین رہ جاتے ہیں۔ اور جن چیزوں کے غلط نام رکھے جاتے ہیں، ان سے بڑے نقصان پہنچتے ہیں*۔

*Dr. M. L. Tyler in "Homeo. Drug Pictures" (Preface).

اس سے بھی مراد ، کائنات کے علوم طبعی کی تحصیل ہے جو ''آدمیت'' کی علامت ہے - ''غلط نام'' رکھنے کے ضمن میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ جنہیں تم (خدا کے علاوہ) اپنا معبود سمجھتے ہو وہ بجز ایں نیست کہ اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَ اٰبَاؤُكُمْ (۱۲/۴۰) - ''یونہی کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لئے ہیں''- مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ (۱۲/۴۰) - ''اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی'' - یہ جو ہمارے ہاں بھی بڑے بڑے آستانے اور درگاہیں سجدہ گاہِ انام بن رہی ہیں، ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے نام رکھ دئے گئے ہیں اور ان ناموں کو شہرت دے دی گئی ہے - اگر ان کے ایسے نام نہ رکھے جائیں تو وہ مٹی اور پتھر کی عمارتوں سے زیادہ کچھ حیثیت نہ رکھیں - حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں ہر شے کا صحیح مقام وہی ہے جو اسے خدا کا قانون عطا کرے - کائناتی دنیا میں اس کا قانونِ کائنات، اور انسانی دنیا میں ضابطہ وحی (قرآن عظیم) - باقی سب بتانِ آزری ہیں -

س ن ب ل

اَلسُّنْبُلُ - بالوں اور خوشوں کو کہتے ہیں - اس کا واحد اَلسُّنْبُلَةُ ہے (جمع سَنَابِلُ وسُنْبُلَاتٌ) بال - خوشہ (۲/۲۶۱)- قَدْ سَنْبَلَ الزَّرْعُ - کھیتی میں بالیں پڑ گئیں *-(یہ لفظ غلّے کے لئے آتا ہے - پھلوں کے لئے نہیں)-

س ن د

اَلسَّنَدُ - وہ چیز جسکے ذریعہ کوئی آدمی سہارا لے - سَنَدَ اِلَيْهِ يَسْنُدُ - اسنے ٹیک لگائی * سَنَّدَ الشَّيْءَ - اسنے اس چیز کو سہارا دیکر مضبوط کر دیا - اَلسَّنَدُ - بلند پہاڑ جو تمہارے سامنے ہو - اَلسَّنْدَانُ - لوہار کا اہرن جس پر لوہے کو گرم کرکے کوٹا جاتا ہے **-

اَلسَّنَدُ - چادر کی ایک قسم جو یمن میں بنتی تھی - سَنَّدَ الرَّجُلُ - آدمی نے چادر اوڑھ لی * - قرآن کریم میں منافقین کو خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ (۶۳/۴) سے تشبیہ دی گئی ہے - اسکے یہ معنے بھی ہیں کہ وہ ایسی لکڑیاں ہیں جو دیوار کے سہارے کھڑی کر دی گئی ہوں - اور یہ بھی کہ وہ انسان نہیں ، لکڑیاں ہیں جنہیں کپڑے پہنا دئے گئے ہوں - پہلے معنے زیادہ مناسب نظر آتے ہیں کیونکہ منافق میں خود اعتمادی نہیں ہوتی اور وہ ہمیشہ آسرے

---

* تاج - ** محیط-

ڈھونڈتا رہتا ہے ۔ دوسرے معنی اس جہت سے درست ہیں کہ منافق کے اندر کچھ اور ہوتا ہے اور باہر کچھ اور۔ اور جو کچھ باہر ہوتا ہے اسے وہ خوشنما بنا کر دکھاتا ہے ۔ نیز اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ منافق لکڑیوں کی طرح ایک دوسرے کے سہارے ہی کھڑے رہ سکتے ہیں ۔ اور اندر سے وہ کندہ نا تراش ہوتے ہیں لیکن ان کا ظاہر بڑا مزین اور خوشنما ہوتا ہے ۔

س ن د س

سُنْدُسٌ ۔ باریک اور اعلیٰ قسم کے ریشم کو کہتے ہیں ۔ یہ لفظ معرب ہے * ۔

قرآن کریم میں ہے ثِیَابًا خُضْرًا مِنْ سُنْدُسٍ (۱۸/۳۱) ۔ ''سبز ریشمی کپڑے'' ۔

س ن م

اَلسَّنَامُ ۔ اونٹ کا کوہان ۔ اَلسَّنِمُ مِنَ النَّبْتِ ۔ بلند پودہ جسکے پھول (یا بالیں) نکل آئے ہوں ۔ سَنَّمَ الْاِنَاءَ تَسْنِيْمًا ۔ اسنے برتن کو اس طرح بھر دیا کہ جو چیز اس میں ڈالی گئی تھی (مثلاً غلہ وغیرہ) وہ اس کے کناروں سے بھی اونچی ہو گئی ۔ تَسَنَّمَ الْحَائِطَ ۔ وہ دیوار پر چڑھ گیا ۔ اَسْنَمَتِ النَّارُ ۔ آگ کے شعلے بلند ہو گئے ۔ سَنَامُ كُلِّ شَيْءٍ ۔ ہر شے کا بلند حصہ یا بہترین حصہ ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رفعت اور بلندی کے ہیں ۔

قرآن کریم میں تَسْنِيْمٌ آیا ہے جس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی گئی ہے کہ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (۸۳/۲۸) ۔ ''ایسا چشمہ جس سے مقربین پیتے ہیں'' ۔ اس میں بلندیوں کا تصور ہے ۔ یعنی زندگی کے ارتقائی مدارج ۔ انسانیت کی رفعتیں ۔ صلاحیتوں کی بھرپور نشو و نما ۔

س ن ن

اَلسِّنُّ ۔ دانت * ۔ (۵/۴۵) ۔ چونکہ جانوروں کی عمر دانت دیکھکر بتائی جاتی ہے اس لئے اس کے معنے عمر کے بھی آتے ہیں ۔ اَسَنَّ الرَّجُلُ ۔ آدمی بڑی عمر کا ہو گیا ۔ اَلسُّنَّةُ ۔ چہرہ ۔ صورت ۔ نیز چہرے کا کھلا اور نمایاں حصہ ۔ نیز راستہ ، طریقہ ، دستور ، اور قانون ۔ اس کی جمع سُنَنٌ ہے ۔ اسی

* تاج و محیط ۔ ** تاج و راغب ۔

سے سُنَنٌ الطَّرِیْقِ - (سین کے زبر - زیر اور پیش کے ساتھ - یہ سُنَّۃٌ کی جمع نہیں - ایک الگ لفظ ہے -) راستے کے کھلے واضح اور نمایاں حصہ کو کہتے ہیں* - یہیں سے اس کے معنے طریقہ ، مسلک ، معمول اور قانون کے ہوگئے - وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلًا (۱۷/۷۷) - "تم ہمارے طریقہ (قاعدہ- قانون) میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے" - سورۃ فاطر میں ہے - فَهَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِیْنَ (۳۵/۴۳) - اب لوگوں کو صرف اس کا انتظار ہے کہ جو کچھ ان جیسی پہلی اقوام کے ساتھ ہوا ہے وہی کچھ ان کے ساتھ ہو جائے - سورۃ آل عمران میں ہے - قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِکُمْ سُنَنٌ (۳/۱۳۶) - تم سے پہلے بہت سے مسلک و مشرب طور طریقے ، نظام ہائے حیات گذر چکے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا جاری رہنا - اور سہولت کے ساتھ اس کا یکے بعد دیگرے آتے رہنا - سَنَّ الشَّیْءَ کے معنے کسی چیز کو سہل اور آسان کر دینا ہیں** - اور سَنَّ التُّرَابَ عَلٰی وَجْهِ الْاَرْضِ کے معنی ہیں زمین پر مٹی کو آہستہ اور نرمی سے ڈالا حتّٰکہ وہ بند کی طرح بن گئی** -

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (۱۵/۲۶) آیا ہے - اس کے معنے عام طور پر سڑے ہوئے گارے کے کئے جاتے ہیں - لین نے (مختلف اسناد کے ساتھ) لکھا ہے کہ سَنَنْتُ الْحَجَرَ عَلَی الْحَجَرِ کے معنے ہیں "میں نے پتھر پر پتھر رکھکر گھسا" - اس طرح پتھر پر پتھر رکھ کر (اور پانی ڈال کر) گھسنے سے جو سڑا ہوا مرکب نکلتا ہے اسے سَنِیْنٌ کہتے ہیں - جب وہ کچھ عرصہ تک پڑا رہے تو سخت ہو جاتا ہے**** - بعض نے کہا ہے کہ مَسْنُوْنٌ کے معنے تر اور نم کے ہیں - ابو الہیثم نے کہا ہے کہ سَنَّ الْمَاءُ کے معنے ہیں پانی متغیر ہوگیا* -

قرآن کریم نے کہا ہے کہ انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی سے ہوئی تھی - وہ مٹی جس کے ساتھ پانی ملا تھا - یعنی زندگی کی ابتداء جماد (Inorganic Matter) کے ساتھ پانی کی آمیزش سے ہوئی - جب ان دونوں کی آمیزش کے بعد قرن ہا قرن گزر گئے اور اس میں کافی تغیر و تبدل ہوتا گیا تو اس سے زندگی کی نمود ہو گئی - اس کو حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ سے تعبیر کیا گیا ہے - یاد رہے کہ اس سے اُس طریق کا بتانا مقصود ہے جس سے زندگی محسوس شکل میں ہمارے سامنے آگئی - یہ مطلب نہیں کہ زندگی سادہ (Matter) کی پیداوار ہے -

*تاج - **محیط - ***راغب - ****لین -

قرآن کریم کا یہ اعلان کہ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (۳۵/۴۳)۔ ایک عظیم حقیقت کا اظہار ہے جس پر تمام سائنٹیفک تحقیقات کی عمارت استوار ہے اور جو قانونِ مکافاتِ عمل کی روح ہے ۔ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل یہ کہنا کہ "خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی" کسی انسان کا کام نہیں تھا ۔ انسان تو ابھی کل تک قانون (Law) کے تصور سے نا آشنا تھا ۔ دنیا میں جس قدر سائنٹیفک ایجادات ہوئی ہیں ، اور ہوتی چلی جا رہی ہیں وہ سب اس محکم اصول کی رہینِ منت ہیں کہ قوانین خداوندی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی ۔ یہ اصول اس قدر محکم ہے کہ انسان اس پر کامل اعتماد کر سکتا ہے اور یہی وہ اعتماد ہے جس کے سہارے وہ آسمانی کروں تک جست لگانے سے بھی نہیں جھجکتا ۔ وہ جب ایک دفعہ قانونِ خداوندی کو سمجھ لیتا ہے تو پھر وہ اس یقین کے ماتحت کہ اس قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی ، وہ کچھ ، بلا خوف و خطر ، کرتا چلا جاتا ہے جس کے تصور سے بھی ان لوگوں کی روح کانپتی ہے جو اس حقیقت سے آشنا نہیں ہوتے ۔

جس طرح اس کا یہ اصول خارجی کائنات میں کارفرما ہے اسی طرح انسانی دنیا میں بھی نافذ العمل ہے ۔ اس نے قوموں کے عروج و زوال کے لئے قوانین متعین کر دئے ہیں اور اس کے بعد کہہ دیا ہے کہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی ۔ جو قوم ان کے مطابق زندگی بسر کریگی وہ عروج حاصل کرے گی ۔ جو ان کے خلاف جائیگی ، تباہ ہو جائیگی ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا ۔

اس قانون نے خود خدا کے تصور میں بھی ایسا عظیم انقلاب پیدا کیا ہے جس سے انسانی دنیا بدل گئی ہے ۔ انسان اپنے عہد طفولیت میں خدا کو ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح سمجھتا تھا جو کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں ہوتا ۔ وہ کبھی یونہی بیٹھے بیٹھے ناراض ہو جاتا ہے تو گاؤں کا گاؤں تباہ کر دیتا ہے ۔ خوش ہو جاتا ہے تو مجرموں کو جاگیریں بخش دیتا ہے ۔ ایسے خدا سے انسان ہر وقت ڈرتا اور کانپتا رہتا تھا کہ نہ جانے وہ کس وقت کیا کر دے ۔ اس لئے اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح خدا کو خوش رکھے ۔

قرآن کریم نے آکر یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ بیشک خدا قادرِ مطلق اور حاکم اعلیٰ ہے لیکن اس نے کائنات اور انسانوں کے لئے قوانین مرتب کر دئے ہیں ۔ اور ، بے انتہا اور لامحدود قدرتوں اور قوتوں کا مالک

ہونے کے باوجود ، اس نے یہ کہدیا ہے کہ وہ اپنے ان قوانین میں تبدیلی نہیں کریگا ۔ لہذا ، انسانی زندگی کے فیصلے خدا کے قوانین کے مطابق ہونگے ۔ یعنی انسان کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانون کے مطابق مرتب ہوگا ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۔ اور اس کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔

''قانون کے مطابق سب کچھ کرنے والا خدا''—اور قانون غیر متبدل ۔ سوچئے کہ خدا کے اس تصور نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے ۔ یہ قرآن ہی کا صدقہ ہے ۔

س ن ہ

سَنِهَ الطَّعَامُ وَ الشَّرَابُ سَنْهًا وَ تَسَنَّهَ ۔ کھانے اور پینے کی چیز خراب ہوگئی ۔ بگڑ گئی ۔ اَلتَّسَنُّهُ بھس جانا ۔ سڑ جانا ۔ زمانہ گزرنے سے کسی چیز میں تغیر واقع ہو جانا ۔ یہ لفظ روٹی کے بُھس جانے اور پینے کی چیزوں کے سڑ جانے پر بولا جاتا ہے ۔ طَعَامٌ سَنِهٌ سڑا ہوا کھانا ۔ خُبْزٌ مُتَسَنِّهٌ بھسی ہوئی روٹی ۔ قرآن کریم میں ہے لَمْ يَتَسَنَّهْ ($\frac{2}{259}$) وہ خراب نہیں ہوا ۔ بگڑا نہیں ۔ یعنی اتنی طویل مدت گزرنے کے باوجود وہ متغیر وسالخوردہ نہیں ہوا* ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ سَنَهٌ کے بنیادی معنے زمانہ پر دلالت کرتے ہیں ۔ سَنَهَتِ النَّخْلَةُ ۔ کھجور پر کئی سال گزر گئے ۔

بیشتر علمائے لغت کا خیال ہے کہ سَنَةٌ (بمعنی سال) اسی مادہ سے ہے ۔ لیکن ہم نے سَنَةٌ اور اس کے بعض مشتقات (س ۔ ن ۔ و) کے تحت لکھے ہیں ۔ لہذا اس مادہ کی تکمیل کے لئے اس عنوان (س ۔ ن ۔ و) کو بھی دیکھ لیجئے ۔

س ن و

اَلسَّنَةُ کے معنے ہیں سال (اس کی جمع سَنَوَاتٌ ، سِنُوْنَ اور سِنِيْنَ ہے) ۔ اس کے مادہ کے متعلق اختلاف ہے ۔ ایک رائے تو یہ ہے کہ سَنَةٌ کی اصل (س ۔ ن ۔ ہ) ہے ، کیونکہ اہل عرب کہتے ہیں سَانَهْتُ فُلَانًا ۔ میں نے فلاں سے سالانہ اجرت پر معاملہ کرلیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ سَنَهٌ کے بنیادی معنی زمانہ پر دلالت کرتے ہیں ۔ سَنَهَتِ النَّخْلَةُ ۔ کھجور پر کئی سال گزر گئے ۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس کی

*تاج و محیط ۔

اصل سَنَوٌ ہے جس سے سَنَا ۔ یَسْنُوْ کے معنے ہیں کنویں کے گردا گرد گھومنا ۔ چنانچہ اَلسَّانِیَۃُ ۔ اس جانور کو کہتے ہیں جو پانی نکالنے کیلئے کنویں کے ارد گرد گھمایا جاتا ہے ۔ اسی سے سورج کے ایک دورے کو اَلسَّنَۃُ کہتے ہیں ۔ (اسے دَارٌ بھی کہتے ہیں) ۔ اور چونکہ یہ دورہ ایک سال میں پورا ہوتا ہے اس لئے اَلسَّنَۃُ کے معنے ہیں ایک سال ۔ اَلسَّنَۃُ شمسی سال ہوتا ہے، اور اَلْعَامُ ، قمری سال ۔ نیز اَلسَّنَۃُ ایسے سال کو کہتے ہیں جس میں قحط اور شدت ہو ۔ اور اَلْعَامُ اس سال کو کہتے ہیں جس میں سرسبزی اور خوشحالی ہو ۔ اسی بناء پر کہتے ہیں کہ حضرت نوحؑ کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ فَلَبِثَ فِیْھِمْ اَلْفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا (۲۹/۱۴) ۔ تو اس میں عَامًا وہ مدت ہے جس میں مشکلات سامنے نہیں آئی تھیں اور سَنَۃٌ وہ مدت جو سختیوں کی تھی۔ لین نے لکھا ہے کہ سَنَۃٌ کا اطلاق فصل پر بھی ہوتا ہے جو سال میں چار ہوتی ہیں ۔ اس لحاظ سے اَلْفَ سَنَۃٍ کے معنی ہونگے اڑھائی سو سال ۔ اور عَامٌ پورے سال کو کہتے ہیں ۔ تو اس میں سے خَمْسِیْنَ عَامًا نکال دینے سے باقی دو سو سال رہ جاتے ہیں جو ایک انسان کی عمر ہو سکتی ہے ۔ لیکن یہ بہر حال ان لوگوں کے قیاسات ہیں ۔ جب تاریخ کے مزید شواہد سامنے آئیں گے تو اس وقت یقینی طور پر کہا جاسکے گا کہ قرآن کریم کے اس بیان کا صحیح مفہوم کیا ہے کہ ''حضرت نوحؑ اپنے لوگوں میں پچاس کم ایک ہزار سال رہے'' (۲۹/۱۴) ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مدت ان کے زمانہ تعلیم پر دلالت کرتی ہے ۔ یعنی ان کا زمانۂ نبوت اتنا عرصہ رہا ۔ اس کے بعد دوسرے نبی کا زمانہ شروع ہوا ۔

سَنَّاہٗ ۔ تَسْنِیَۃً کے معنے ہیں اس کو کھول دیا ۔ سہل کر دیا*۔

س ن ی

اَلسَّنٰی ۔ روشنی ۔ اَلسَّنَاءُ والسَّنٰی ۔ بلندی اور رفعت *۔

قرآن کریم میں ہے یَکَادُ سَنَا بَرْقِہٖ یَذْھَبُ بِالْاَبْصَارِ (۲۴/۴۳) ۔ ''قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں میں خیرگی پیدا کر دے'' اس میں سَنَا کے معنے چمک اور خیرگی پیدا کر دینے والی روشنی کے ہیں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلندی اور ارتفاع کے ہیں ۔

س ہ ر

سَھِرَ ۔ یَسْھَرُ ۔ سَھَرًا ۔ (رات کو) جاگنا ۔ سَاھِرٌ ۔ (رات کو) جاگنے والا *۔ اَلسَّاھِرَۃُ ۔ زمین کا بالائی حصہ، روئے زمین۔ دراصل یہ ایسی

* تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔

زمین کے لئے بولا جائیگا جس پر لوگ بکثرت چلتے پھرتے رہیں - گویا وہ انکی وجہ سے بیدار ہے **۔

قرآن کریم میں ہے فَاِذَا ھُمْ بِالسَّاھِرَۃِ (۷۹/۱۴) اُس (نشاۃ ثانیہ) کے بعد زندگی ہی زندگی ہوگی۔ اور بیداری ہی بیداری۔ یا نشو و نما میں تیزی۔ کیونکہ اَرْضٌ سَاھِرَۃٌ اس زمین کو بھی کہتے ہیں جو بہت جلد پودے اگانے والی ہو*۔ چونکہ حیات اُخروی کی کیفیات، انسانی شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ میں نہیں آسکتیں اس لئے قرآن کریم انہیں تشبیہات اور استعارات کے انداز میں بیان کرتا ہے ۔ نگہ بصیرت ان تشبیہات و استعارات کے پردوں میں حقیقت کا خفیف سا پر تو دیکھ لیتی ہے ۔ اس سے زیادہ اس زندگی میں ممکن ہی نہیں ۔

سریانی زبان میں اَلسَّاھُوْرُ چاند (اَلْقَمَرُ) کو کہتے ہیں ***۔ اور عربی میں چاند گہن کو بھی - (لین) ۔

س ھ ل

اَلسَّھْلُ - اَلسَّھِلُ - نرم چیز۔ اَلسَّھْلُ مِنَ الْاَرْضِ - نرم زمین ۔ اسکی جمع سُھُوْلٌ آتی ہے *۔ قرآن کریم میں ہے تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُھُوْلِھَا قُصُوْرًا (۷/۷۴) ۔ " تم ہموار اور نرم زمینوں میں محلات تعمیر کرتے ہو " ۔

س ھ م

سَھْمٌ - حصہ - دراصل سَھْمٌ اس تیر کو کہتے ہیں جس سے قرعہ ڈال کر حصے تقسیم کئے جاتے ہیں - نیز گھر کا گزرنے کا راستہ اَلسُّھَامُ ۔ لاغر ہونا اور رنگ کا متغیر ہو جانا ۔ اصل میں یہ اونٹوں کی ایک بیماری ہوتی ہے جس میں انہیں گرمی اور پیاس کی شدت محسوس ہوتی ہے ۔ اَلسُّھُوْمُ ۔ کسی غم یا فکر کی وجہ سے ترشرو ہونا ۔ سَاھَمَ الْقَوْمَ ۔ اپنے قوم کے ساتھ قرعہ اندازی کی ****۔ تیر اندازی میں مقابلہ کیا نیز باہم ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کی ۔

قرآن کریم میں قصہ حضرت یونسؑ میں ہے فَسَاھَمَ (۳۷/۱۴۱) ۔ عام طور پر اس کے معنی کئے جاتے ہیں ۔ اس نے باقیوں کے ساتھ قرعہ ڈالا ۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ فَسَاھَمَ میں کشتی والوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ۔

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** (کتاب الاشتقاق) نیز ابن فارس ۔ **** تاج و محیط و راغب

اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ (حضرت) یونس[۴] نے ہمارے قانون کا مقابلہ کیا۔ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ - (۳۷/۱۴۱) - وہ لغزش کھا گیا - اس کا پاؤں پھسل گیا۔ حضرت یونس[۴] سے ہجرت کا وقت متعین کرنے میں اجتہادی غلطی ہو گئی تھی۔

س ھ و

سَهَا فِی الْاَمْرِ - کسی چیز کو بھول جانا۔ اہل لغت نے تصریح کی ہے کہ سَهْوٌ، غَفْلَةٌ اور نِسْيَانٌ، تینوں لفظ ہم معنی ہیں۔ لیکن بعض نے تخصیص یہ کی ہے کہ سَهْوٌ ان باتوں سے معمولی سی غفلت کو کہتے ہیں جو حافظہ میں موجود ہوتی ہیں۔ اور نِسْيَانٌ کسی چیز کا حافظہ سے بالکل محو ہو جانا ہے۔ ابن الاثیر نے کہا ہے کہ سَهَا فِی الشَّیْءِ کے معنی ہیں لاعلمی کی وجہ سے کسی چیز کو چھوڑ دینا۔ اور سَهَا عَنْهُ کے معنی ہیں جان بوجھ کر کسی چیز کو چھوڑ دینا *۔ اَلسَّهْوُ کے معنی ہیں ساکن اور نرم ہونا۔ اَلسَّهْوَةُ - آسانی سے کھنچنے والی نرم کمان کو کہتے ہیں *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بیشتر معانی کا تعلق غفلت اور سکون سے ہے۔ جَاءَ سَهْوًا رَهْوًا وہ بڑے سکون کے ساتھ آیا۔

قرآن کریم میں ہے هُمْ فِیْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ (۵۱/۱۱)۔ ”وہ اپنے اشغال میں منہمک، حقیقت سے بے خبر ہیں“۔ دوسری جگہ ہے اَلَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (۱۰۷/۵) - وہ اپنی صلٰوۃ (فرائض منصبی) کیطرف سے یکسر غافل ہیں۔ یا انکی تکمیل میں بہت سست اور ڈھیلے ڈھالے رہتے ہیں (۹/۵۴)۔ یا، وہ صلٰوۃ کی حقیقت سے بیخبر ہیں اور صرف اس کے محسوس و مرئی حصہ (تعدیلِ ارکان - قیام، رکوع - سجود وغیرہ) ہی کو اصل صلٰوۃ سمجھتے ہیں (۱۰۷/۶) کیونکہ یہ بڑی آسانی سے ادا ہو جاتے ہیں اور دیکھنے والوں میں عزت بھی ہو جاتی ہے۔

س و ء

سَاءَهُ - يَسُوْءُهُ - کسی سے ایسی بات کرنا جو اسے ناگوار ہو۔ سَاءَ الشَّیْءُ - کوئی چیز بری ہوتی۔ اَسَاءَ يُسِیْءُ - برا کرنا، ناہمواری پیدا کرنا۔ بگاڑ اور ابتری رونما کرنا (یہ اَحْسَنَ کا ضد ہے) اَلسَّيِّئَةُ - زندگی کی ناخوشگواریاں**۔ یہ حَسَنَةٌ کی ضد ہے۔ اسکا مفہوم سمجھنے کیلئے (ح - س - ن)

* تاج - راغب و محیط۔ **تاج۔

کا عنوان دیکھئے - چونکہ حسن نام ہوتا ہے کسی چیز کے پورے پورے توازن قائم کردینے کا اس لئے سَیِّئَۃٌ توازن کے بگاڑ کو کہتے ہیں - چنانچہ سُوْءٌ کے معنے فساد ، ہلاکت اور ضرر کے ہوتے ہیں*- نیز حَسَنَۃٌ درمیانہ روی کو کہتے ہیں - اس لئے سَیِّئَۃٌ کے معنے ہیں افراط و تفریط**- مَسَاوِیءٌ - ناخوشگوار امور ، عیوب ، نقائص **-

اَلسَّوْءَۃُ - بری خصلت ، معیوب بات یا کام - ہر وہ قول و فعل جسکے ظاہر ہونے پر شرم محسوس ہو - بنابریں مرد اور عورت کی شرمگاہ کو بھی کہتے ہیں** - اسکی جمع سَوْآتٌ ہے (۲۰/۷ ؛ ۲۶/۷)-

قرآن کریم میں سَیِّئَۃٌ بمقابلہ حَسَنَۃٌ - متعدد مقامات پر آیا ہے - (مثلاً ۱۱۹/۳ ؛ ۱۳۱/۷)- نیز اِقْتِصَادٌ (میانہ روی) کے مقابلہ میں سَاءَ (۶۶/۵) -

مغموم یا متردد ہونے کے معنے میں (۷۷/۱۱) میں سِیْٓءَ بِھِمْ آیا ہے -

صحیح روش زندگی کا نتیجہ انسان کی ذات اور معاشرہ میں حسن کی افزائش ہے - یعنی اس سے انسان کی اپنی ذات اور معاشرہ دونوں میں صحیح صحیح توازن قائم ہو جاتا ہے اور زندگی کی ساری خوشگواریاں نصیب ہو جاتی ہیں - اسکے خلاف زندگی بسر کرنے سے توازن بگڑ جاتا ہے اور ناخوشگواریاں پیدا ہو جاتی ہیں - اس لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس قسم کی متضاد زندگیاں بسر کرنے والے کبھی ایک دوسرے کے برابر نہیں ہوسکتے(۵۸/۴۰) - اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی معاشرہ کا توازن بگڑا ہوا ہو تو اسکی اصلاح کی صورت کیا ہے ؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ تم حسن پیدا کرنے والے کام کرتے جاؤ- بگاڑ خود بخود رفع ہو جائیگا- اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ (۹۶/۲۳)- اگر تم بہت زیادہ ہمواریاں پیدا کرو گے تو ناہمواریاں خود بخود مٹ جائینگی - اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ (۱۱۴/۱۱) - سورۃ رعد میں مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ (۲۲/۱۳) - نیز (۵۴/۲۸)- وہ سیئات کو حسنات کے ذریعے دور کر دیتے ہیں - واضح رہے کہ ان آیات سے یہ مفہوم نہیں کہ قرآن کریم '' ایک گال پر طمانچہ مارنے والے کے سامنے دوسرا گال کر دینے '' - یا '' جو کوٹ اتار لے اسے کرتا خود اتار کر دینے '' کی تعلیم دیتا ہے - اس قسم کی تعلیم مجرمین کے حوصلوں کو بڑھا دیتی ہے - اس کے لئے اُس نے قانونِ عدل کی تلقین کی ہے - یعنی جرم

* تاج و لطائف اللغۃ- **تاج

کی سزا دینا تاکہ مجرمین کی جرأتیں بے باک نہ ہونے پائیں - لیکن اس کے لئے بھی اس نے اصول یہ دیا ہے کہ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۴۲/۴۰ - نیز ۱۰/۲۷)- سزا ہمیشہ جرم کی نوعیت اور مقدار کے مناسب اور مطابق ہونی چاہئے- یہ نہیں کہ ذرا سے جرم کی سنگین ترین سزا دیدی جائے - (نیز جہاں اصلاح کا امکان نظر آئے وہاں معاف بھی کر دینا چاہئیے - (۴۲/۴۰) اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس آیت کا یہ مطلب صحیح نہیں کہ جو تم سے برائی کرے تم بھی اس سے اسی طرح کی برائی کرو- اس میں جرم اور اس کی پاداش (تعزیر) کا اصول بیان کیا گیا ہے جو خدا کے قانون مکافات پر مبنی ہے - یعنی سزا ، جرم کی مناسبت سے - وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۴۱/۲۷) ” یقیناً ہم انہیں ان کے اس قسم کے اعمال پر جو وہ کرتے رہے ہیں بدترین سزا دینگے“-

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم انسان کو ایسی زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے جس سے اسکی اپنی ذات میں بھی حسن (ہمواری اور خوشگواری) پیدا ہو اور معاشرہ میں بھی - یہ نتیجہ ہوتا ہے قرآنی پروگرام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا - اس کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی اپنی ذات میں بھی ناہمواریاں اور ناخوشگواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور معاشرہ میں بھی - نیکی یا بدی ، بھلائی یا برائی کا قرآنی تصور یہی ہے -

سُوَاعٌ

قوم نوح کا بت تھا (۷۱/۲۳) - عرب کے لوگ اس بت کے نام سے اچھی طرح متعارف تھے - چنانچہ قبیلہ بنوھذیل کے لوگ اسی نام کے ایک بت کی پرستش کیا کرتے تھے -

س و د

اَلْاَسْوَدُ - اَبْيَضُ کی ضد ہے - یعنی سیاہ - اسکی جمع سُوْدٌ ہے - (۳/۱۰۵) اِسْوَدَّ يَسْوَدُّ- سیاہ ہوا - اَلسَّوَادُ - سیاهی - تاریکی - مال کثیر - شہر کے ارد گرد کے دیہات - بہت بڑی تعداد - عام لوگ - قوم کا بڑا حصہ - اَلسَّائِدُ - سردار یا سَيِّدٌ سے نیچے کا سردار* - اَلسَّيِّدُ - رئیس* - (صاحب سواد - جسکے ساتھ بہت سی جماعت ہو) - بادشاہ - آقا - شوہر-

* تاج-

اَلسِّیَادَۃُ ۔ سرداری ۔ اَلْاَسْوَدُ مِنَ الْقَوْمِ ۔ قوم کا سب سے بڑا اور جلیل المرتبہ آدمی ۔ بزرگ قوم*۔ اَلْاَیَّامُ الْمُسْوَدَّۃُ ۔ بدحالی اور تکلیف کے دن**۔ راغب نے لکھا ہے کہ اِبْیِضَاضُ الْوُجُوْہِ سے مراد مسرت وشادمانی ہوتی ہے اور اِسْوِدَادُ الْوُجُوْہِ سے مراد تکلیف اور غم و حزن***۔ (نیز دیکھئے عنوان ب ۔ ی ۔ ض)۔

سَیِّدًا ۔ بمعنے سردار (۳/۳۸) میں آیا ہے ۔ مراد اس سے صاحب عزت و تکریم ہے ۔ اور شوہر کے معنوں میں (۱۲/۲۵) میں ۔ لیکن وہاں یہ لفظ عزیز مصر کے لئے آیا ہے جو اپنی بیوی کے شوہر ہونے کے ساتھ وہاں کا سردار بھی تھا ۔ عام شوہر کے لئے قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا ۔ سورۃ نحل میں ہے وَجْہُہٗ مُسْوَدًّا ۔ (۱۶/۵۸) کالا ، سیاہ ۔ یعنے مغموم ۔ سورۃ آل عمران میں ہے تَسْوَدُّ وُجُوْہٌ (۳/۱۰۵) ۔ چہروں کا کالا ہونا یعنی ذلیل ہونا ۔ گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ سے چہروں کا رنگ سیاہ پڑ جانا ۔ (بمقابلہ تَبْیَضُّ ۔ سفید ہونا ۔ باعزت ہونا)۔

س و ر

سَارَ ۔ یَسُوْرُ ۔ سَوْرَۃً کے معنے ہیں کسی پر چڑھ جانا ۔ حملہ کرنا ۔ سُرْتُ الْحَائِطَ و تَسَوَّرْتُہٗ کے معنے ہیں میں دیوار پر چڑھ گیا ۔ اَلسُّوْرُ ۔ شہر پناہ کو کہتے ہیں ۔ اسی سے اس کے معنے بلندی ہیں ۔ رفعت ۔ شرف و فضیلت ۔ بلندی و برتری ۔ سَوْرَۃُ السُّلْطَانِ ۔ بادشاہ کی سطوت و شوکت ، جاہ وجلال ، اور زور و دبدبہ کے لئے آتا ہے ۔ اَلسِّوَارُ ۔ کنگن کو کہتے ہیں جو سرداری اور مدارج کی بلندی کا نشان ہوتا تھا ۔ (اَسَاوِرُ اسکی جمع ہے) ۔ اَلْاُسْوَارُ یا اَلْاِسْوَارُ ۔ سوار فوج کے کمانڈر کو کہتے ہیں ۔ نیز بہترین تیر انداز اور عمدہ شہسوار کو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْاِسْوَارُ عربی لفظ نہیں ہے ۔ اَلسُّوْرَۃُ ۔ درجہ و مرتبہ ، قدر و منزلت ، بلندی ۔ نیز اس عمارت کو کہتے ہیں جو خوبصورتی کے ساتھ آسمان کی طرف بلند ہوتی ہوئی اٹھ گئی ہو**۔

قرآن کریم کی سُوْرَۃ کو سُوْرَۃ کہنے کی بہت سی توجیہات بیان کی گئی ہیں ۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کی بلند مرتبگی کی وجہ سے انہیں سُوْرَۃ کہا جاتا ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ پہلی سورۃ بعد میں آنے والی سورۃ کے لئے سیڑھی کا کام دیتی ہے اس لئے اسے سُوْرَۃ کہتے ہیں ۔ بعض کہتے ہیں کہ چونکہ یہ منزل بمنزل آتی ہیں اور ان سب کے مجموعہ

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

سے قرآن کریم کی عمارت کی تکمیل ہوتی ہے اس لئے انہیں سُوْرَۃٌ کہتے ہیں - بعض نے کہا ہے کہ چونکہ ان میں قرآن کریم کے احکام محفوظ ہوتے ہیں ، جس طرح شہر پناہ سے شہر کی حفاظت ہوتی ہے ، اس لئے انہیں سُوْرَۃٌ کہا جاتا ہے* - نیز علامت کو بھی سُوْرَۃٌ کہتے ہیں** -

سُوْرٌ - مضبوط قوی اور شریف النسل اونٹوں کو بھی کہتے ہیں* -

قرآن کریم میں یہ مادہ قرآنی سورۃ کے لئے (۲/۲۳) میں آیا ہے - اور (۲۴/۱) میں بھی - دیوار کے معنوں میں (۵۷/۱۳) میں - اور سرداری (کی علامت یعنے کنگن) کے لئے (۱۸/۳۱ و ۳۵/۳۳ و ۷۶/۲۱) میں - سورۃ ص میں ہے اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ (۳۸/۲۱) - جب وہ دیوار پھاند کر محراب کے اندر آگئے -

جنت میں سونے کے کنگنوں کا جو ذکر آیا ہے (۱۸/۳۱) تو اس کا مطلب وہ قوت و حشمت اور سرفرازی و سربلندی ہے جو جماعت مومنین کو اس دنیا کی جنتی زندگی میں حاصل ہوتی ہے - باقی رہیں اسکے بعد کی زندگی کی سرداریاں اور سرفرازیاں ، تو اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ حقیقت کا تمثیلی بیان ہے - ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح کی رو سے ان چیزوں کی کنہ و حقیقت کو نہیں پا سکتے - (دیکھئے عنوان ج - ن - ن) -

س و ط

اَلسَّوْطُ - بعض چیزوں کو دوسری چیزوں کے ساتھ ملانا - خلط ملط کر دینا - ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی یہی بتائے ہیں - اَلسَّوْطُ - چابک (کوڑا) کیونکہ وہ گوشت کو خون کے ساتھ مخلوط کر دیتا ہے - یا بقول ابن فارس کھال میں گھس جاتا ہے - یا پھر اس لئے کہ وہ خود مختلف تسموں کو ملا کر بنا جاتا ہے - جمع اَسْوَاطٌ - اگرچہ اس کے معنے کوڑوں سے مارنے کے ہیں لیکن عربوں کے ہاں ہر شدید اور درد انگیز سزا کو سَوْطَ عَذَابٍ کہدیتے تھے - یعنی سزا کا کوڑا - لیکن صاحب محیط اور راغب کا خیال ہے کہ قرآن کریم میں جو سَوْطَ عَذَابٍ (۸۹/۱۳) آیا ہے تو اس سے مفہوم انواع و اقسام (طرح طرح) کے عذاب ہیں*** - ابن فارس نے کہا ہے کہ سَوْطَ عَذَابٍ سے مراد ہے عذاب کا ایک حصہ و مقدار -

س و ع (س ی ع)

سَاعَ - یَسُوْعُ - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ میں اصلی معنے ہلاکت اور زوال کے ہوتے ہیں* - چنانچہ کہتے ہیں سَاعَ الشَّیْءُ -

---

*تاج - **محیط - ***تاج راغب و محیط -

چیز ضائع ہوئی* - ھُوَ ضَائِع سَائِع - وہ ضائع اور ھلاک ہونے والا ہے - نَاقَۃٌ مِسْیَاع اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اپنے بچے کو جنگل میں چھوڑ دے کہ اسے درندے ھلاک کردیں - اَسَاعَہٗ - اسے بیکار چھوڑ دیا اور ضائع کردیا - رَجُلٌ مُسِیْعٌ وَ مِسْیَاعٌ لِلْمَالِ - مال کو ضائع کردینے والا آدمی - اَلسَّیْعُ - زمین کے اوپر بہنے والا پانی - سَاعَ الْمَاءُ وَ الشَّرَابُ - پانی اور شراب زمین پر گر کر بہنے لگی - تَسَیَّعَ الْبَقْلُ - سبزیاں خشک ہونے لگیں * -

اَسْوَعَ - وہ ایک گھڑی سے دوسری گھڑی میں منتقل ہوا - یا ایک گھڑی پیچھے ہوا* - سَوْعٌ مِنَ اللَّیْلِ - رات کا ایک (پرسکون) حصہ - اَلسَّاعَۃُ - (واوی ہے، یائی نہیں) وقت کے ایک حصہ کو کہتے ہیں (چونکہ وہ گزر جاتا ہے اور وقت میں ہر لمحہ کمی ہوتی جاتی ہے) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مسلسل گزرنے رہنے کے ہیں - نیز مشقت، بُعد اور دوری کو بھی اَلسَّاعَۃُ کہتے ہیں - اَلسَّاعَۃُ - ھلاک ہوجانے والوں کو کہتے ہیں* -

قرآن کریم میں اَلسَّاعَۃُ کا لفظ کثرت سے آیا ہے - قرآن کریم غلط روش پر چلنے والوں کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ اس روش کا نتیجہ ھلاکت و بربادی کے سوا کچھ نہیں - تم نے اس روش کو نہ چھوڑا تو تم پر تباھی آجائے گی - تمہارے سعی و عمل ضائع ہوجائیں گے - تم ھلاک اور برباد ہوجاؤ گے (اسی کو اِنْذَار کہتے ہیں) - وہ اس انذار پر کان نہیں دھرتے اور اپنی روش پر جمے رہتے ہیں - ان کے غلط اعمال اپنے تباہ کن اثرات مرتب کرتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ وقت آجاتا ہے جب یہ اندر ہی اندر مرتب ہونے والے اثرات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور وہ لوگ تباہ اور برباد ہوجاتے ہیں - اسے اَلسَّاعَۃُ، یا انقلاب کی گھڑی کہا جاتا ہے - یہ ظاہر ہے کہ یہ انقلاب دفعۃً واقع نہیں ہوجاتا بلکہ آہستہ آہستہ ترتیب پا رہا ہوتا ہے - البتہ اس کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ جنہیں حقیقت کا علم نہ ہو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دفعۃً نمودار ہوگیا ہے - چونکہ اکثر اوقات یہ انقلاب اُس جماعت کے ہاتھوں نمودار ہوتا ہے جو حق کی حمایت کے لئے اٹھتی ہے، اس لئے اَلسَّاعَۃُ سے مراد حق اور باطل کی وہ آخری جنگ ہوتی ہے جس میں باطل کی قوتیں شکست کھا کر برباد ہو جاتی ہیں - مختصراً یہ کہ اَلسَّاعَۃُ - ظہورِ نتائج کا نام ہے، جسے ھلاکت انگیز انقلاب کی گھڑی کہا جاتا ہے -

*تاج -

یا حق و باطل کا فیصلہ کن تصادم ۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو تفصیل سے بتایا کہ فرعون کی سرکشی کس حد تک بڑھ چکی ہے ، اور اس کے بعد ان سے کہا کہ اس کے لئے تمہیں کیا کچھ کرنا ہے ۔ اس کے بعد فرمایا اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ (۲۰/۱۵) ۔ اس کا یقین رکھو کہ حق و باطل کی آخری کشمکش کا وقت اب آیا ہی چاہتا ہے ۔ یہ آ کر ہی رہے گا ۔ فرعون کو اس طرح کھلا نہیں چھوڑا جاسکتا ۔ اب یہ انقلاب ضرور آئے گا ۔ اسی طرح مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ سے بھی بار بار کہا گیا کہ تم اپنی جماعت کی پوری تیاری کرو ۔ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ (۱۵/۸۵) ۔ آخری انقلاب کا وقت آنے والا ہے ۔ وہ ضرور آکر رہے گا ۔ یہ مخالفین ضرور تباہ ہوکر رہیں گے ۔

حق و باطل کی کشمکش چھوٹے چھوٹے پیمانوں پر تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہوتی چلی آ رہی ہے ۔ لیکن قرآن کریم سے مترشح ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ جب زمانہ آگے بڑھتا جائے گا اور حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے ، تو نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے تصور اور مفاد پرستیوں میں ایک عالمگیر ٹکراؤ ہوگا جسکے بعد زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی ۔ یہ وہ عظیم اَلسَّاعَةُ ہے جس کا ذکر بڑے ہیبت انگیز انداز سے قرآن کریم میں آتا ہے ۔

چونکہ نہ تو انسانی زندگی موت سے ختم ہو جاتی ہے اور نہ ہی اعمال کے نتائج کا سلسلہ یہیں منقطع ہوجاتا ہے ، اس لئے اس زندگی کے بعد ظہورِ نتائج کو بھی اَلسَّاعَةُ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ، سیاق و سباق سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ وہاں کونسا انقلاب مراد ہے ۔ یعنی اسی دنیا میں ظہورِ نتائج کا وقت (حق و باطل کی کشمکش کا انقلاب) یا آخرت کی زندگی میں ظہورِ نتائج کا وقت ۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ قوموں کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن اثرات ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کا مجموعی نتیجہ (Accomula-tive Effect) ایک وقت پر جاکر ظاہر ہوتا ہے یہ ان کے لئے انقلاب کی گھڑی (الساعۃ) ہوتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس کا علم کسی کو نہیں ہوسکتا کہ یہ گھڑی کب آئے گی ۔ سورۃ اعراف میں ہے يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۔ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۔ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَا اِلَّا هُوَ (۷/۱۸۷) ۔ ”یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ انقلاب کی

گھڑی (جس سے تم ہمیں اس طرح ڈراتے ہو) کب آئے گی - کہو کہ اس کا علم صرف میرے رب کو ہے - اُسے اس کے وقت پر خدا کے سوا کوئی اور ظاہر نہیں کرے گا'' (نیز ۹/۳۳ ، ۳۴/۴۳) - دوسری جگہ ہے يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ - قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ - وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا (۶۳/۳۳) - ''لوگ تجھ سے الساعة کی بابت پوچھتے ہیں - ان سے کہو کہ اس کا علم صرف اللہ کو ہے - اور تجھے کیا معلوم کہ شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو'' - (نیز ۱۷/۴۲) - دیگر مقامات پر بھی یہی کہا ہے کہ اس کا علم خدا ہی کو ہے - (دیکھئے ۳۱/۳۴ و ۴۳/۸۵ و ۴۱/۴۷) -

بنی اسرائیل کے گھرانے میں نبوت اور حکومت قریب ڈیڑھ ہزار سال تک رہی - شروع شروع میں تو وہ قوانین خداوندی کے پابند رہے لیکن بعد میں انہوں نے ہر قسم کی سرکشی اور فساد انگیزی شروع کر دی - انہیں بار بار سمجھایا گیا کہ اس روشِ زندگی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ذلت و مسکنت کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے اور یہ برکات تمہارے گھرانے سے چھن کر دوسری شاخ کی طرف چلی جائینگی - لیکن انہوں نے کسی کی نہ سانی - آخری مرتبہ حضرت عیسٰیؑ نے انہیں خاص طور پر تنبیہ کی اور ان سے برملا کہہ دیا کہ یاد رکھو -

> خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائیگی دے دی جائے گی - (متی باب ۲۱ - آیات ۴۵ - ۴۳)

لیکن انہوں نے حضرت عیسٰیؑ کو اس کا جو جواب دیا وہ تاریخ کے اوراق سے ظاہر ہے - چنانچہ اس کے بعد وہ آخری انقلاب کی گھڑی آ گئی اور اس قوم کی شوکت و حشمت سب چھن گئی - اسی لئے حضرت عیسٰیؑ کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ (۴۳/۶۱) - ''اس کی آمد اس انقلاب عظیم کا علم (دینے کے لئے) تھی -'' (نیز دیکھئے ۴۳/۶۳ - ۶۶ و ۳/۵۵ - ۶۲) اور اگر اِنَّهٗ کی ضمیر سے مراد قرآن کریم لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ قرآن کریم اس انقلاب کا علم دیتا ہے جو اب آنے والا ہے -

س و غ

سَاغَ الشَّرَابُ - يَسُوْغُ - سَوْغًا - پینے کی چیز کا آسانی سے حلق کے نیچے اتر جانا - سَاغَ الطَّعَامُ کھانا آسانی سے حلق سے نیچے اتر گیا -

اَلسِّوَاغُ - جس چیز سے گلے میں اٹکی ہوئی چیز کو نیچے اتارا جائے - شَرَابٌ سَائِغٌ - خوشگوار مشروب جو آسانی سے حلق سے نیچے اتر جائے - طَعَامٌ سَیِّغٌ - خوشگوار کھانا - اسی سے مجازاً سَاغَ النَّهَارُ بولتے ہیں یعنی دن آسانی سے گزر گیا * -

قرآن کریم میں اہل جہنم کے متعلق ہے یَتَجَرَّعُهٗ وَ لَا یَکَادُ یُسِیْغُهٗ (۱۷/۱۴) - وہ اسے گلے سے اتار تو لے گا لیکن بڑی ہی ناخوشگواری سے - (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ج - ر - ع) - سورۃ نحل میں دودھ کے متعلق ہے سَائِغًا لِلشّٰرِبِیْنَ (۱۶/۶۶) - وہ پینے والوں کے لئے بڑاخوشگوار ہے - یابآسانی حلق سے اترجاتا ہے -

سَوْفَ (حرف)

سَوْفَ - یہ بھی سَ کی طرح مضارع پر آتا ہے اور سَ ہی کے معنے پیدا کرتا ہے - بعض کے نزدیک سَ مستقبل قریب کے لئے آتا ہے (یعنی وہ عنقریب یا جلدی ہی ایسا کریگا) اور سَوْفَ مستقبل بعید کے لئے - لیکن یہ کوئی کلّیّہ نہیں - سَوْفَ سے پہلے تاکید کے لئے بعض اوقات لَ بھی آ جاتا ہے جیسے وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی (۹۳/۵) - اور تیرا رب تجھے (اتنا) دے گا کہ تو راضی ہو جائے گا - (وہ تیری آرزو کے عین مطابق ہوگا)

س و ق

اَلسَّاقُ - پنڈلی - اسکی جمع سُوْقٌ ہے - (۳۸/۳۳) - اَلسَّاقُ کے معنی درخت کا تنا بھی ہیں - اسکی جمع بھی سُوْقٌ آتی ہے (۴۸/۲۹) - لیکن عرب جب کسی معاملہ کی شدت کو بیان کرتے تو اسے سَاقٌ سے تشبیہ دیتے * - (اسے ک - ش - ف کے عنوان میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے - وہاں دیکھئے) - قرآن کریم میں یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ (۶۸/۴۲) - اور وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (۷۵/۲۹) - اور کَشَفَتْ عَنْ سَاقَیْهَا (۲۷/۴۴) میں شدت ہی کا مفہوم ہے -

سَاقَ - مویشیوں کو پیچھے سے ہانکنا * - (۵۰/۲۱) - (جسطرح قَادَ کے معنے جانوروں کو آگے سے کھینچکر چلانا ہوتا ہے) - سَائِقٌ ہانکنے والا *

---

* تاج - محیط - راغب -

- (۲۱/۶۵) - مَسَاقٌ - ھانکنا (۷۵/۲۹) - اَلسُّوقُ - (جمع اَسْوَاقٌ - (۲۵/۷) - بازار - کیونکہ لوگ اس جگہ اپنے مویشی وغیرہ ھانک کر بیچنے کیلئے لاتے ھیں * - نواب صدیق حسن خان نے لکھا ھے کہ س - و - ق شدت اور اجتماع کو ظاھر کرتے ھیں ** -

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی ھانکنے کے ھوتے ھیں - پنڈلی کو بھی اَلسَّاقُ اس لئے کہتے ھیں کہ چلنے والا اس پر چلتا ھے -

س و ل

تَسْوِیْلٌ کے معنے ھیں کسی چیز کو حسین اور خوشنما بنا کر دکھانا تاکہ انسان اسکے کرنے کی طرف راغب ھو جائے - کسی ایسی چیز کو جسے نفس چاھے، یا کسی بری شے کو خوبصورت بنا کر پیش کرنا *** - سورۃ یوسف میں ھے بَلْ سَوَّلَتْ لَکُمْ اَنْفُسُکُمْ اَمْرًا (۱۸/۱۲) - وہ یہ ایک ایسی بات ھے جسے تمہاری اپنی خواھشات نے تمہارے سامنے خوشنما بنا کر پیش کر دیا ھے'' - بعض نے کہا ھے کہ یہ سُؤْلٌ سے ھے جسکے معنے تمنا کے ھوتے ھیں جو انسان کو باطل اور پر فریب چیزیں بھی پسندیدہ بنا کر بتاتی ھے *** - سورۃ محمد میں ھے اَلشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَھُمْ (۲۵/۴۷) - ''شیطان نے ایسے ان لوگوں کے سامنے مزین کرکے پیش کیا'' اور اسطرح انہیں گمراہ کر دیا - سورۃ طٰہٰ میں سامری کا یہ قول ھے کہ وَکَذٰلِکَ سَوَّلَتْ لِیْ نَفْسِیْ (۹۶/۲۰) - ''اسی طرح میرے دل نے یہ بات مجھے اچھی بنا کر دکھائی'' -

س و م

سَوْمٌ کے معنے ھیں کسی چیز کی تلاش و جستجو میں جانا - یعنے یہ معنے مرکب ھیں - جانا اور تلاش و جستجو کرنا - لہذا کہیں صرف پہلے معنے مراد لئے جاتے ھیں - جیسے سَامَ الْاِبِلُ کے معنے ھیں اونٹ چرنے کے لئے گئے - یا انہیں چرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا - اور کہیں دوسرے معنے جیسے یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (۴۹/۲) - وہ تمہارے لئے بدترین عذاب کی تلاش میں رھتے تھے - طرح طرح کی مصیبتیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لایا کرتے تھے - کسی کو مشکل اور دوبھر کام کی تکلیف دینا، اس سے ظلم و زیادتی اور برائی کا سلوک کرنا - سَامَتِ الطَّیْرُ عَلَی الشَّیْءِ -

* تاج و محیط - ** العلم الخفاق *** تاج و راغب

پرندے اس چیز پر منڈلاتے رہے*۔ سَامَ فُلاَنًا الاَمْرَ : اسے کسی بات کی تکلیف دی ، اور کوئی بات اس پر لازم کی*۔ اَسَامَ الاِبِلَ ۔ اونٹوں کو چرنے کے لئے چھوڑا۔

تلاش کے اعتبار سے اَلسُّوْمَۃُ ۔ اَلسِّیْمَۃُ ۔ اَلسِّیْمَاءُ ۔ کے معنے ہیں علامت ۔ نشان ۔ سَوَّمَ الْفَرَسَ تَسْوِیْمًا ۔ گھوڑے پر نشان لگا دیا ۔ لیکن سَوَّمَ فُلاَنًا کے معنے ہیں فلاں کو آزاد چھوڑ دیا ۔ اس لئے سورۃ الذّٰریٰت میں جہاں ہے لِنُرْسِلَ عَلَیْہِمْ حِجَارَۃً مِنْ طِیْنٍ مُسَوَّمَۃً ۔ (۵۱/۳۳۔۳۴) ۔ تو اس کے معنے یہ بھی ہیں کہ وہ پتھر خدا کے قانون مکافات کی رو سے اس مقصد کے لئے نشان زدہ (Earmarked) کر دئے گئے تھے ۔ یا یہ کہ انہیں آزاد چھوڑ دیا گیا تھا ۔ (انہیں چلایا گیا تھا) ۔

سورۃ آل عمران میں عذاب دینے والے ملائکہ کو مُسَوِّمِیْنَ (۳/۱۲۴) کہا گیا ہے ۔ اسی سورۃ میں اَلْخَیْلِ الْمُسَوَّمَۃِ (۳/۱۳) آیا ہے ۔ اس کے معنے بھی نشان زدہ گھوڑے یا ایسے گھوڑے ہیں جنہیں چرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہو ۔ سورۃ نحل میں فِیْہِ تُسِیْمُوْنَ (۱۶/۱۰) آیا ہے ۔ یعنی جن میں تم اپنے مویشی چراتے ہو ۔ سِیْمَا (۴۸/۲۹) کے معنے نشان اور علامت کے ہیں ۔

س و ی

اِسْتِوَاءٌ کے معنے ہیں کسی چیز کا اپنی ذات میں پورے پورے اعتدال پر ہونا ۔ ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا اور اس طرح اس چیز کا اپنی انتہائی نشو و نما تک پہنچے ہوئے ہونا* ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنوں میں استقامت اور دو چیزوں کے درمیان اعتدال لکھے ہیں ۔ اِسْتَوَی الرَّجُلُ کے معنے ہیں وہ شخص اپنی پوری طاقت پر پہنچ گیا ۔ اس کا شباب انتہا پر پہنچ گیا ۔ قرآن کریم نے اِسْتَوَی کی تشریح بَلَغَ اَشُدَّہٗ سے کی ہے (۲۸/۱۴) ۔ اسی طرح اِسْتَوَی عَلٰی سُوْقِہٖ (۴۸/۲۹) میں اِسْتَوَی کے معنے واضح ہیں ۔ یعنی پودوں کا مضبوط ہو کر اپنے تنوں پر سیدھا کھڑا ہو جانا ۔ اَلسَّوِیُّ ۔ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک ٹھیک تناسب رکھتی ہو ۔ اسی سے اَلصِّرَاطُ السَّوِیُّ ہے (۲۰/۱۳۵) ۔ یعنی اعتدال کی راہ ۔ رَجُلٌ سَوِیٌّ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی خلقت اور اخلاق و اطوار ، افراط و تفریط سے پاک ہوں ۔

*تاج ۔ **محیط ۔

یعنے وہ متناسب الاعضاء بھی ہو اور سیرت کے اعتبار سے بھی اعتدال پر* ۔ سورۂ مریم میں فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹/۱۷) کے یہی معنے ہیں۔ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ بمقابلہ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖ (۶۷/۲۲) میں آیا ہے ۔

سَوَّاهُ تَسْوِيَةً اور أَسْوَاهُ کے معنے ہیں اس کو معتدل کر دیا ، ہموار برابر اور یکساں کر دیا* ۔ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (۲/۲۹) کے معنے ہیں ان میں ٹھیک ٹھیک اعتدال پیدا کر دیا ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنے ''حکمت کے تقاضوں کے مطابق بنانا'' بھی ہیں ۔ چنانچہ اَلَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ (۸۲/۷) کے معنے ہیں خدا وہ ہے جس نے تجھے (مختلف عناصر کی ترکیب نو سے) پیدا کیا اور ایسا بنا دیا جیسا کہ تناسب و توازن اور حکمت و اعتدال کا تقاضہ ہے* ۔

اِسْتَوٰى اِلَى الشَّيْئِ کے معنے ہیں کسی چیز تک ذاتی طور پر یا تدبیر کے ذریعہ پہنچ جانا* ۔ یا کسی چیز کا قصد و ارادہ کرنا ۔ یا اس کی طرف متوجہ ہونا** ۔ اور اِسْتَوٰى عَلٰى میں غلبہ و تسلط کا مفہوم ہوتا ہے***۔ قرآن کریم میں ہے لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ (۴۳/۱۳)۔ نیز اِسْتَوَيْتَ . . . عَلَى الْفُلْكِ (۲۳/۲۸) ۔ (سواری کے جانور یا) کشتی پر جم کر بیٹھ جانا۔ غالب اور مسلط ہو جانا ۔ (خدا کے عرش پر اِسْتَوٰى کے لئے ع ۔ ر ۔ ش کا عنوان دیکھئے) ۔

سَوَاءٌ کے معنے ہیں دو چیزوں کا باہم دگر برابر ہونا ۔ جیسے سَوَاءٌ زَيْدٌ وَ عَمْرٌو ۔ زید اور عمرو ہم مرتبہ ہیں ۔ ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ اِسْتَوَيَا اور تَسَاوَيَا ۔ دو چیزیں ایک دوسرے کے مانند یا مثل اور نظیر ہوئیں ۔ سَاوَيْتُ بَيْنَهُمَا مُسَاوَاةً ۔ میں نے ایک کو دوسرے کے برابر کر دیا ۔ اس لئے سَوَاءٌ کے معنے عدل کے آتے ہیں ۔ سَوَّيْتُهٗ بِهٖ ۔ یا سَوَّيْتُ بَيْنَهُمَا کے معنے ہیں میں نے ان دونوں میں عدل کیا ۔ فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ ۔ (۸/۵۸) کے معنے ہیں انصاف کو سامنے رکھتے ہوئے (یا برابری کی حالت میں) ان کا معاہدہ ان کی طرف واپس پھینک دو ۔ سورۂ انبیاء میں ہے فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَاءٍ (۲۱/۱۰۹) ۔ میں نے تم سب کو ساری بات یکساں طور پر کہہ دی ہے ۔ زمین کے متعلق قرآن کریم میں ہے سَوَاءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰) ۔ یعنی زمین تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہئے ۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے مَكَانًا سُوًى (۲۰/۵۸) ۔ جس

*تاج ۔ **تاج و محیط ۔ ***راغب ۔

کے معنے یہ ھیں کہ یہ شرائط ھم پر اور تم پر یکساں طور پر عائد ھوں گی۔ یعنی ھم اور تم یکساں پوزیشن میں ھونگے - راغب نے کہا ھے کہ مَکَانٌ سُوًی اس مقام کو کہتے ھیں جس سے دونوں طرف کے فاصلے برابر ھوں - لیکن ابن سیدہ نے لکھا ھے کہ سُوًی اُس مقام کو کہتے ھیں جس پر نشانات لگے ھوں کہ لوگ ان سے اس مقام کا راستہ معلوم کرلیں* - نیز اَلسَّوَاءُ کسی چیز کے وسط اور درمیان کو بھی کہتے ھیں - سَوَاءَ السَّبِیْلِ کے معنے ھیں راستہ کا درمیانی حصہ - اور سَوَاءِ الْجَحِیْمِ (۳۷/۵۵) کے معنے ھیں جہنم کے عین وسط میں*- فَسَوّٰھَا (۹۱/۱۴) - کےمعنے ھیں خدا نے ان کے شہروں کو زمین کے ساتھ ھموار کر دیا - یعنے وہ سب بستیاں تباہ ھوگئیں* - سورۃ نساء میں ھے لَوْ تُسَوّٰی بِھِمُ الْاَرْضُ (۴/۴۲) - اے کاش ان پر زمین ھموار کردی جاتی - یعنے وہ اس سے قبل ھی ھلاک و برباد ھو چکے ھوتے - سورۃ کہف میں سَاوٰی کے معنے ھموار کر دینے کے ھیں - (۱۸/۹۶) -

سِوًی اور اَلسِّوَاءُ کےمعنے غیر کےبھی آتے ھیں - مَرَرْتُ بِرَجُلٍ سِوَاکَ وَ سِوَاءَکَ کے معنے ھیں میں تیرے سوا کسی اور آدمی کے ساتھ گزرا - یعنے تیرے ساتھ نہیں بلکہ ایک اور شخص کے ساتھ* -

سورۃ النجم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ھے فَاسْتَوٰی (۵۳/۶) - اس ایک لفظ میں شرف انسانیت کا انتہائی کمال ، معجزانہ طور پر سمٹ کر آگیا ھے - یعنی حضورؐ سیرت و کردار اور علم و بصیرت کے اعتبار سے انتہائی اعتدال لئے ھوئے تھے اور آپکی ذات میں یہ خصوصیتیں کمال تک پہنچ چکی تھیں - اس کے بعد آپؐ مقامِ نبوت پر فائز ھونے کے اھل قرار پائے تھے - نبوت ھر کس و ناکس کو نہیں مل جایا کرتی تھی - اللہ تعالےٰ جسے اس موھبتِ کبریٰ کے لئے منتخب کرتا تھا اس کی تربیت خدا کی نگرانی میں ھوتی تھی اور اس کی ذات معراجِ انسانیت کی مظہر بن جاتی تھی -

س ی ب

سَابَ - یَسِیْبُ - وہ تیز چلا* - سَابَ الْمَاءُ - پانی بہا اور ھر طرف گیا - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی دوام اور تسلسل کے ساتھ چلتے رھنے کے ھیں - جیسے سَیْبُ الْمَاءِ - پانی کے جاری ھونے کو کہتے ھیں - سَیَّبْتُ - میں نے اس چیز کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جہاں چاھے جائے - اسی مادہ سے اَلسَّائِبَۃُ ھے - ایام جاھلیت میں عرب بعض جانوروں

*تاج -

کو (مقررہ بچے دے چکنے کے بعد یا کسی کٹھن مرحلہ سے بخیر و خوبی گزار دینے کی وجہ سے یا بطور نذر) دیوتاؤں کے نام پر آزاد چھوڑ دیا کرتے تھے اور ان سے کوئی کام نہیں لیتے تھے۔ وہ جہاں سے چاہے کھاتے پیتے۔ کوئی انہیں روکتا نہیں تھا۔ (جیسے ہندوستان میں سانڈ چھوڑ دیتے ہیں) *۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس قسم کی توہم پرستیوں اور مشرکانہ رسوم کی سند خدا نے کہیں نازل نہیں کی۔ یہ سب تمہارے اسلاف کی خود ساختہ رسوم ہیں۔ اسلئے انہیں چھوڑ دو۔ (۵/۱۰۳)۔

س ی ح

سَاحَ الْمَاءُ۔ زمین کے اوپر پانی کا بہنا۔ اَلسَّیْحُ۔ سطح زمین پر بہتا پانی *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بھی مسلسل چلتے رہنے کے ہیں۔ اَلسِّیَاحَۃُ۔ زمین میں چلنا پھرنا۔ سیاحت کرنا (۹/۲)۔ بعض کا خیال ہے کہ اَلْمَسِیْحُ اسی سے ہے۔ لیکن دوسروں نے اسکی تصریح کی ہے کہ یہ عربی لفظ نہیں۔ (نیز دیکھئے عنوان م۔س۔ح) اَلسَّائِحُ۔ سیر و سیاحت کرنے والا *۔ قرآن کریم میں مومنین کی صفات میں اَلسَّائِحُوْنَ (۹/۱۱۲) اور مومن عورتوں کے لئے سٰئِحٰتٌ (۶۶/۵) آیا ہے۔ (اگرچہ بعض کے نزدیک اس سے مراد "روزہ رکھنے والے" ہیں لیکن) راغب نے لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو باقتضائے فرمان خداوندی اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَھُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِھَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِھَا (۲۲/۴۶) عقل و فہم اور عبرت حاصل کرنے کے لئے سفر کرتے ہیں **۔ یہی مفہوم زیادہ قرین قیاس ہے۔ اَلسَّاحَۃُ۔ کھلی جگہ۔ میدان۔ گھروں کے درمیان کی کھلی اور خالی جگہ۔ نیز گھر کے صحن کو سَاحَۃُ الدَّارِ کہتے ہیں *۔ (۳۷/۱۷۷)۔

مومن عورتوں کی صفت سٰئِحٰتٌ (سیاحت کرنے والیاں) کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ یہ نظریہ کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محبوس رکھنا چاہیئے کسقدر غیر قرآنی ہے۔

س ی ر

اَلسَّیْرُ۔ چلنا۔ جانا۔ دن کو ہو یا رات کو۔ [لیکن سَرَیٰ رات کے چلنے کو کہتے ہیں (۱۵/۶۵ ؛ ۱۷/۱)۔ اس کے لئے عنوان س۔ر۔ی دیکھئے]۔

---

* تاج۔ ** راغب۔

سَارَ الرَّجُلُ ۔ آدمی چلا ۔ سَيَّرَهٗ ۔ اس نے اسے چلایا ، ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گیا ۔ سِيْرَةٌ ۔ روش ۔ رفتار ۔ چال ۔ طور طریق ۔ ہیئت ۔ حالت * ۔ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰی (۲۰/۲۱) " ہم اسے اسکی پہلی حالت پر لوٹا دینگے " ۔ راغب نے کہا ہے کہ سِيْرَةٌ ایسی حالت کو کہتے ہیں جو کسی میں طبیعی یا اکتسابی طور پر ہو ۔ اَلسَّيَّارَةُ ۔ ساتھ چلنے والوں کی جماعت ۔ قافلہ (۱۲/۱۹) ۔

قرآن کریم اپنے قوانین کی صداقت کی دلیل میں تاریخی شواھد کو بار بار پیش کرتا ہے ۔ اسکے لئے وہ کہتا ہے کہ سِيْرُوْا فِی الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۶/۱۱) ۔ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ ان قوموں کا انجام کیا ہوا جنہوں نے ہمارے قوانین کو سچا نہیں سمجھا تھا ۔ اس میں تاریخی استقراء اور حفارت (Archaeology) دونوں آجاتے ہیں ۔ یعنی اگر وہ قومیں (طبعی طور پر) زندہ ہیں تو ان کے احوال و کوائف کے مطالعہ سے ، اور اگر وہ باقی نہیں رہیں تو ان کے آثار قدیمہ پر غور و فکر سے ۔

س ی ل

سَالَ الْمَاءُ ۔ پانی بہہ گیا ۔ اَسَالَهٗ کسی نے اسے بہا دیا ۔ مَاءٌ سَيْلٌ ۔ بہنے والا پانی ۔ اَلسَّيْلُ ۔ بہت زیادہ بہتا ہوا پانی ۔ سیلاب ۔ اَلسِّيْلَةُ ۔ پانی کے بہنے کا انداز ۔

سورۃ رعد میں ہے فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ (۱۳/۱۷) ۔ وادیاں بہہ نکلتی ہیں ۔ فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا (۱۳/۱۷) ۔ پس سیلاب جھاگ کو بہا لے جاتا ہے ۔

سورۃ سبا میں سَيْلَ الْعَرِمِ (۳۴/۱۶) آیا ہے ۔ زور کا سیلاب ۔ اسی سورۃ میں ہے وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ (۳۴/۱۲) ۔ ہم نے اس کے لئے تانبے کا چشمہ بہا دیا ۔

سین

اَلسِّيْنُ ۔ ویسے تو ایک حرف (س) ہے جس کے لئے (س) دیکھئے ۔ لیکن يٰسٓ (۳۶/۱) کے معنے " اے انسان " ۔ یا " اے سردار " کے ہوتے ہیں ۔ لغت طے میں يٰسٓ ۔ يَا اِنْسَانُ ! کو کہتے ہیں ۔ یہ دراصل انسان ہی کی مخفف شکل ہے اور عربی زبان میں الفاظ کو اسطرح مخفف کرلینے کا عام

* تاج و محیط و راغب ۔

رواج تھا ۔ مثلا ایک حدیث میں آتا ہے کَفٰی بِالسَّیْفِ شَا ۔ یعنی کَفٰی بِالسَّیْفِ شَاھِدًا ۔ یا کسی شاعر کا ایک مصرعہ ہے ۔ قُلْنَا لَھَا قِفِی لَنَا قَالَتْ قَافْ ۔ یہاں و قَفَتْ کی جگہ اس نے صرف " قَافْ " کہا ہے*۔

اَلسِّیْنُ ۔ ستون اور سہارے کو کہتے ہیں ۔ (مثلاً چھت کی کوئی کڑی کمزور ہو گئی ہے تو جو دوسری لکڑی اسے سہارا دینے کے لئے لگادی جائے اُسے سِیْنٌ کہا جاتا ہے) کیونکہ فینقی زبان میں اسکی شکل بھی ستون کے مشابہ ہوتی تھی** ۔

سِیْنَاءُ ۔ ایک قسم کے پتھر کو کہتے ہیں ۔ وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ (۹۵/۲)۔ وَمِنْ طُوْرِ سَیْنَاءَ ۔ (۲۳/۲۰) سینا (پتھروں کا) پہاڑ ۔ شام میں ایک پہاڑ کا نام ہے ۔ اَلسِّیْنِیْنَةُ ۔ ایک قسم کے درخت کو کہتے ہیں ۔

سَیْنَاء

طُوْرِ سَیْنَاءَ (۲۳/۲۰) یا طُوْرِ سِیْنِیْنَ (۹۵/۲) شام میں ایک پہاڑ ہے جس پر حضرت موسیٰؑ پکارے گئے تھے (دیکھئے عنوان سین) ۔

سِیْنِیْن

طُوْرِ سِیْنِیْنَ (۹۵/۲) ۔ یا طُوْرِ سَیْنَاءَ (۲۳/۲۰)۔ شام میں ایک پہاڑی ہے جس پر حضرت موسیٰؑ پکارے گئے تھے (دیکھئے عنوان سِیْن) ۔

---

* تاج ۔ ** محیط ۔

ش

ش أ م

اَلْيَدُ الشُّؤْمٰى ۔ بایاں ہاتھ۔ یہ اَلْیُمْنٰی (دایاں ہاتھ) کی ضد ہے ۔ اسی اعتبار سے اَلشُّؤْمُ (یُمْنٌ کی ضد ہے)۔ یعنی نحوست ۔ صاحب تاج العروس نے شُؤْمٌ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وہ امور ہیں جن کے انجام کو ناپسند کیا جائے اور اس سے ڈرا جائے ۔ قَدْ شَأَمَهُمْ ۔ اس نے ان پر نحوست مسلط کردی ۔ رَجُلٌ مَشْئُوْمٌ ۔ منحوس آدمی* ۔ (نحوست کے قرآنی مفہوم کے لئے عنوان ن ۔ ح ۔ س دیکھئے)۔

قرآن کریم میں اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ کے مقابلہ میں اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ($\frac{56}{9}$) آیا ہے ۔ بائیں ہاتھ والے ۔ یعنی بدبختی والے ۔ جن کی شَاْمَةِ اعمال ان کے لئے عذاب بن کر آجائے ۔

ملک شام کو شَأْمٌ** اس لئے کہتے ہیں کہ وہ قبلہ سے بائیں جانب واقع ہے*** ۔

ش أ ن

اَلشَّأْنُ ۔ (جمع اَلشُّئُوْنُ) ۔ امر ۔ معاملہ (بالخصوص اہم اور قابل لحاظ) حالت*** ۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ ایسے معاملہ اور حالت کے لئے بولا جاتا ہے جو گرانقدر عظمت کا حامل ہو**** ۔ شَأَنَ شَأْنَهُ ۔ اس نے اس کا قصد کیا ،) اسی سے اہم معاملہ کو شَأْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا قصد کیا جاتا ہے) نیز اس نے وہ کام کیا جسے وہ اچھی طرح انجام دے سکتا تھا ۔ شَأْنُ الرَّأْسِ ۔ کھوپڑی کی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کے ملنے کی جگہ ۔

*تاج نیز ابن فارس ۔ **بعض اسے غیر مہموز بھی بتاتے ہیں۔***تاج ۔ ****راغب ۔

الشّأنُ ۔ ایک رگ کا نام ہے جس سے آنکھ تک خون پہنچتا ہے ۔ نیز وہ راستہ جسکے ذریعہ آنکھوں سے آنسو آتا ہے ۔ شُئُوْنُ الْخَمْرِ ۔ شراب کا وہ حصہ جو جسم کے رگ و پے میں سرایت کر جائے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تلاش ، طلب اور ارادہ کے ہیں ۔

سورۃ رحمٰن میں ہے یَسْئَلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۔ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (۵۵/۲۹) ۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے (انسانوں سمیت) وہ سب اپنی نشو و نما کے لئے ربوبیت خداوندی کے محتاج ہیں ۔ یہ اس آیت کے پہلے حصہ کا ترجمہ ہے ۔ دوسرے حصے میں هُوَ سے مراد اللہ لیا جاتا ہے اور اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ خدا ہر آن ایک جداگانہ شان میں ہوتا ہے ۔ ہمارے خیال میں خدا کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں کہ وہ ہر آن ایک جداگانہ شان میں ہوتا ہے ۔ خدا ایک مستقل بالذات ہستی ہے جو ہمیشہ ایک ہی شان میں رہتی ہے اگرچہ اس کے امر (قدرتوں) کی نمود مختلف مظاہر میں ہوتی رہتی ہے ۔ اس لئے آیت مذکورہ بالا کے دوسرے حصہ میں هُوَ سے مراد مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لیا جائے تو بہتر ہے ۔ اس اعتبار سے پوری آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ کائنات کی ہر شے اپنی نشو و نما کے لئے ربوبیت خداوندی کی محتاج ہے، اور ان اشیاء کی نشو و نما کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں ۔ ان کی مختلف حالتوں میں نشو و نما کے مختلف تقاضے ہوتے ہیں اور ربوبیت خداوندی ان کی ہر ایک حالت کے مطابق ان کی نشو و نما کے سامان فراہم کرتی رہتی ہے ۔ (۲۲/۴۳) ۔ اور اس طرح اشیائے کائنات کی (Development) کا سلسلہ ، قانونِ ارتقاء کے مطابق جاری رہتا ہے ۔

سورۃ یونس میں ہے وَ مَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ (۱۰/۶۱) ۔ تو جس حال میں بھی ہو ۔

ش ب ہ

تَشَابَهَ کے معنے ہیں دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا ایک دوسرے سے اسطرح ملتا جلتا اور مانند اور مشابہ ہونا کہ ان میں التباس ہونے لگے اور امتیاز مشکل ہو جائے ۔ شَبَّهَهٗ اِیَّاهُ کے معنے ہیں اس نے فلاں چیز کو فلاں چیز کی مثل بنا دیا ۔ دونوں کو ایک دوسری سے ملتا جلتا ہوا بنا دیا ۔ اَلشِّبْهُ وَالشَّبَهُ وَالشَّبِیْهُ کے معنے ہیں مثل اور مانند ۔ اور شُبِّهَ عَلَیْهِ الْاَمْرُ کے معنے ہیں بات اس پر مشتبہ ، غیر واضح (ملتبس) ہو

*تاج

گئی * ۔ تَشْبِیْہ کے معنے ہیں کسی چیز کو اس سے ملتی جلتی ہوئی چیز سے مثال دے کر بیان کرنا ۔ مُشَابَہَۃ کے معنے ہیں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونا * ۔

قرآن کریم میں مُتَشَابِہًا (۲/۲۵) کے معنے ہیں باہم ملتا جلتا ۔ اور اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَہَ عَلَیْنَا (۲/۷۰) کے معنے یہ ہیں کہ ہم سمجھ نہیں سکے کہ وہ گائے کس قسم کی ہونی چاہیئے کیونکہ ہمارے لئے سب گائیں ملتی جلتی ہیں اسلئے التباس (شبہ) واقع ہو رہا ہے ۔ تَشَابَہَتْ قُلُوْبُہُمْ (۲/۱۱۸) کے معنے ہیں ان کے دل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں ۔ باہمی مشابہت اور موافقت رکھتے ہیں ۔ اسی طرح مُشْتَبِہًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِہٍ (۶/۱۰۰) کے معنے ہیں آپس میں ملتے جلتے، اور ایسے جو ملتے جلتے نہیں ۔ انہی کو دوسری جگہ مُتَشَابِہًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِہٍ (۶/۱۴۲) کہا گیا ہے ۔

قرآن کریم کی آیات کو مُحْکَمٰت اور مُتَشَابِہَات کہا گیا ہے (۳/۶) ۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث مُحْکَمٰت کے ضمن میں (ح ۔ ک ۔ م) کے عنوان کے تحت کی گئی ہے ۔ [نیز ث ۔ ن ۔ ی کے عنوان میں مُتَشَابِہًا مَّثَانِیَ بھی دیکھئے ۳۹/۲۳]

سورۃ النساء میں حضرت عیسیٰؑ کے تذکرہ میں ہے کہ یہودیوں نے نہ تو مسیحؑ کو قتل کیا اور نہ ہی صلیب دیا وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَہُمْ (۴/۱۵۷) ان پر حقیقت مشتبہ ہو گئی ۔ (بات کیا ہوئی تھی ؟ اس کی تفصیل میری کتاب " شعلہ مستور " میں حضرت عیسیٰؑ سے متعلق حصہ میں دیکھئے) ۔

ش ت ت

شَتَّہٗ ۔ یَشُتُّہٗ ۔ شَتًّا ۔ شَتَاتًا ۔ اس نے اسے الگ الگ اور متفرق کر دیا ۔ دور کر دیا ۔ شَتَّ ۔ وہ متفرق اور جدا جدا ہو گیا (لازم و متعدی) ۔ اَمْرٌ شَتٌّ ۔ متفرق معاملہ * ۔ (اسکی جمع اَشْتَات ہے) ۔ کہتے ہیں جَآءُوْا اَشْتَاتًا ۔ وہ الگ الگ متفرق طور پر آئے ۔ سورۃ النور میں ہے جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (۲۴/۶۱) ۔ اکھٹے یا الگ الگ ۔ سورۃ اللیل میں ہے اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی (۹۲/۴) ۔ تمہاری جد و جہد مختلف اور ایک دوسرے سے جداگانہ (سمتوں میں ہوتی) ہے ۔ یعنی ہر فرد کے سامنے زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے اور اس کی کوششیں اس مقصد کے حصول کے لئے ہوتی ہیں ۔ نیز، ایک فرد کی

* تاج و محیط ۔

زندگی میں بھی مختلف مقاصد ہو سکتے ہیں جن کے حصول کے لئے وہ جدوجہد کرتا ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم کہتا ہے کہ ہر چند یہ مقاصد مختلف اور متنوّع ہوتے ہیں لیکن اگر بہ ہیئت مجموعی ان کی تقسیم کی جائے تو یہ دو بنیادی شقوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک اَعْطٰی کی شق (۹۲/۵) اور دوسری بَخِلَ کی شق (۹۲/۸)۔ اَعْطٰی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشو و نما کے لئے بھی دے۔ اور بَخِلَ سے مراد یہ ہے کہ وہ اسے صرف اپنے مفاد تک محدود رکھے۔ پہلی شق وجہ بالیدگی شرف انسانیت ہے اور دوسری شق، باعث تذلیل انسانیت۔

سورۃ طٰہٰ میں ہے نَبَاتٍ شَتّٰی (۲۰/۵۳)۔ انواع و اقسام کی بوٹیاں اور پودے۔ (شَتّٰی جمع ہے شَتِیْتٌ کی جس کے معنے ہیں جدا کیا ہوا، جداگانہ، الگ۔)

ش ت و

اَلشِّتَاءُ۔ سردی کا موسم۔ عرب والے سال کو دو حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔ ایک شتاء، دوسرا صیف۔ پھر شتاء کے دو حصے، جن میں سے آخری تین مہینے رَبِیْعٌ کے ہوتے۔ اسی طرح صَیْفٌ میں قَیْظٌ کے تین مہینے ہوتے۔ یوں سال چار موسموں میں بٹ جاتا تھا۔ چونکہ بالعموم سردی کے موسم میں عرب سفر کے لئے کم نکلتے تھے اور روزی تلاش کرنے کے بجائے گھروں ہی میں رہتے تھے لہذا اس زمانہ میں غلہ اور چارہ کی دقت ہوتی تھی۔ اس لئے اَلشِّتَاءُ قحط کو بھی کہتے تھے۔ اور صَاحِبُ الشَّتْوَةِ وہ شخص جس کی طرف لوگ سردی اور خشک سالی کے مصائب سے گھبرا کر رجوع کریں**۔

قرآن کریم میں قریش کے قافلوں کے لئے رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ (۱۰۶/۲) آیا ہے۔ یعنے ان کے سردی اور گرمی کے موسم کے سفر۔ اس سے در حقیقت مراد سارا سال ہے۔

ش ج ر

شَجَرٌ۔ ہر وہ چیز جو مجتمع ہو کر پھر کسی وجہ سے متفرق ہوجائے اسے شَجَرٌ کہتے ہیں*۔ اسی سے شَجَرَ بَيْنَهُمْ کے معنے ہیں باہمی اختلاف کی وجہ سے آپس میں جھگڑنا۔ (قرآن کریم میں فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (۴/۶۵) باہمی اختلافات کے معنوں میں آیا ہے)۔

---

*تاج۔ **تاج و محیط۔

شَاجَرَ فُلاَنٌ فُلاَناً ۔ فلاں نے فلاں سے منازعت و مخاصمت کی ۔ اَلشَّجَرُ ۔ کے معنے درخت ھیں* ۔ (یہ جمع ہے ۔ ایک درخت کو شَجَرَةٌ کہینگے) ۔ غالباً اس لئے کہ اس کے تنہ کے ایک ہونے کے باوجود اس کی شاخیں منتشر اور بکھری ہوئی ہوتی ہیں ۔ یہی شَجَرَ کے بنیادی معنی ہیں ۔ اگرچہ تاج العروس میں ہے کہ تَشَاجَرَ کے معنے میدان جنگ میں فوجوں کا باہمی گتھم گتھا ہو جانا ہے اور چونکہ درخت کی شاخیں بھی ایک دوسرے میں گتھم گتھا ہوتی ہیں اس لئے اسے شَجَرٌ کہتے ہیں۔ لیکن اس لفظ کے بنیادی مفہوم کے اعتبار سے پہلی توجیہ زیادہ قرین قیاس نظر آتی ہے ۔ یعنے ایک تنے کے بعد شاخوں کا منتشر ہونا ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز کا بلند ہونا اور اس کے اجزاء کا ایک دوسرے میں گھسے رہنا بتائے ہیں ۔

قرآن کریم میں قصہ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا تھا کہ فَلاَ تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (۲/۳۵) ۔ اس شجر کے قریب نہ جانا ۔ جیسا کہ آدَمُ کے عنوان (دیکھئے ا ۔ د ۔ م) میں لکھا جاچکا ہے ، قصہ آدم در حقیقت نوع انسانی کی تمثیلی سرگزشت ہے ۔ انسان اپنی تمدنی زندگی سے پہلے ایسی حالت میں رہتا تھا کہ اس کی ضروریات بہت قلیل تھیں اور سامانِ خور و نوش بافراط تھا ۔ اس لئے ان میں باہمی افتراق و اختلاف نہ تھا ۔ اس کے بعد جب انسانی شعور نے ذرا ترقی کی تو اس نے تمدنی اور معاشرتی زندگی شروع کی ۔ اس سے مختلف افراد (اور اس کے بعد مختلف قبائل) کے مفاد میں تصادم (Clash of Interests) شروع ہوا اور اس تصادم سے باہمی اختلاف و افتراق پیدا ہوا ۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹) ۔ ''نوع انسانی پہلے ایک ہی جماعت تھی لیکن بعد میں انہوں نے آپس میں اختلافات شروع کر دئے''** ۔ یہ مطلب ہے فَلاَ تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (۲/۳۵) سے ۔ یعنے ان سے کہدیا گیا تھا کہ دیکھنا! تم سب کی اصل ایک ہی ہے ۔ اس لئے تم نے باہمی اختلاف و افتراق پیدا نہ کر لینا ۔ لیکن عقلِ خود بیں (ابلیس) نے ، جو ہر فرد کو اس کے ذاتی مفاد کا تحفظ سکھاتی ہے (برعکس عقلِ جہاں بیں کے جو پوری نوع انسانی کے تحفظ کی فکر کرتی ہے) انہیں انفرادی مفاد پرستیوں کی طرف مائل کر دیا ، اور اس طرح یہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے (۲/۳۶) ۔ لہذا اس مقام پر شَجَرٌ سے مفہوم انسانوں کے وہ باہمی اختلافات ہیں جو ان میں انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں

---

* تاج۔ **(نوع انسانی کو پھر سے ایک ہی جماعت بنکر رہنا ہے لیکن یہ وحدت انسانیہ وحی کے ضابطہ کے بغیر ممکن نہیں - (۲/۲۱۳) -

اور جن کا حل صرف یہ ہے کہ انسانؑ وحی کے نظامؑ کے مطابق زندگی بسر کرے ($\frac{۲}{۳۸}$) ۔ اسی کو ربوبیت عالمینی کہتے ہیں ۔

ش ح ح

اَلشُّحُّ ۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس نقشے کو سامنے لائیے کہ سخت گرمی کا موسم ہو، کسی جگہ تھوڑا سا پانی ہو اور بہت سے پیاسے ۔ ایسی حالت میں دو آدمی جس طرح ایک دوسرے کو دھکیل کر پیچھے ہٹانے اور آگے بڑھ کر اپنی پیاس بجھانے کے لئے کوشش کرتے ہیں اسے تَشَاحَحَا الْمَاءَ یا تَشَاحَّاهُ کہتے ہیں*۔ قرآن کریم کا نظام ربوبیت یہ ہے کہ ہر فرد دوسروں کی نشو و نما کی فکر کرے اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دے۔ لہذا شُحِّ نَفْس اس خصوصیت کی ضد ہوا ۔ یہ مفہوم سورۃ حشر کی اس آیت سے بالکل واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا ہے کہ مومنین کی صفت یہ ہے کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ($\frac{۵۹}{۹}$) ۔ وہ خود تنگی ہی میں کیوں نہ ہوں دوسروں کی ضروریات کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں ۔ اس کے بعد ہے وَ مَنْ يُوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ($\frac{۵۹}{۹}$)۔ یاد رکھو! جو شخص (یا قوم) شُحِّ نَفْس سے اپنے آپ کو بچائے انہی کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں ۔ یعنی دنیا کے عام قاعدے کی رو سے ، اُسی کسان کی کھیتی میں فصل اگتی ہے جو اسے سیراب کرلے۔ لیکن نظام ربوبیت میں اسکی کھیتی پروان چڑھتی ہے جو دوسرے کے کھیت کی میرابی کو اپنے اوپر ترجیح دے ۔ تَشَاحَّ الْقَوْمُ کے معنے ہیں ، لوگوں نے ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کی کہ کہیں ان کے ہاتھ سے چیز نہ جاتی رہے ۔ تَشَاحَّا عَلَى الْاَمْرِ ۔ وہ دونوں اس معاملہ میں جھگڑے اور ان میں سے کوئی بھی اس پر راضی نہ تھا کہ وہ چیز اس کے ہاتھ سے جاتی رہے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی روکنے کے ہوتے ہیں ۔ اس اعتبار سے تَشَاحَّ الْقَوْمُ وغیرہ کے یہی معنی نہیں ہونگے کہ اس قوم نے ایک دوسرے سے بڑھنے میں کوشش کی بلکہ یہ بھی کہ خود آگے بڑھنے کے لئے دوسروں کو روکنے کی کوشش کی ۔ اس سے شُحٌّ کے معنے بھی واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنی یہ نفسیاتی کیفیت کہ آگے بڑھ کر ہر چیز کو اپنے لئے مختص کر لینا اور دوسروں کو روکنا کہ اس چیز تک پہنچ نہ جائیں ۔

*تاج - جشع کے عنوان کے تحت ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

اس بنیادی معنے کے اعتبار سے اَلشُّحُّ - بدترین قسم کی خود غرضی کو کہتے ہیں جس میں بخل اور حرص دونوں شامل ہوتے ہیں - بعض نے کہا ہے کہ بخل صرف مال میں ہوتا ہے لیکن شُحٌّ مال اور دیگر ہر قسم کی بھلائیوں کو اپنے لئے مخصوص کرنے کے لئے آتا ہے* - اپنے لئے مخصوص کرنے اور دوسروں کو ان تک پہنچنے سے روکنے کے لئے - راغب نے کہا ہے کہ شُحٌّ اس وقت کہتے ہیں جب انسان میں یہ کیفیت عادۃً پائی جائے -

اِبِلٌ شَحَائِحُ بہت کم دودھ دینے والی اونٹنیوں کو کہتے ہیں - اور زَنْدٌ شَحَاحٌ اس چقماق کو جس سے آگ نہ نکلے - مَاءٌ شَحَاحٌ - بہت تھوڑا سا پانی** - سورۃ احزاب میں اَشِحَّۃٌ کا لفظ آیا ہے (۳۳/۱۹) - (اس کا واحد شَحِیْحٌ ہے) - یعنے سخت بخیل و حریص -

ش ح م

اَلشَّحْمُ - چربی (جمع شُحُوْمٌ) - اَلشَّحْمَۃُ - چربی کا ٹکڑا - عرب اونٹ کے کوہان کو بھی الشَّحْمُ کہہ دیتے ہیں*** -

قرآن کریم میں یہودیوں کے متعلق ہے حَرَّمْنَا عَلَیْھِمْ شُحُوْمَھُمَا (۶/۱۴۷) - ان پر (گائے اور بکری کی) چربی حرام کر دی گئی تھی -

ش خ ص

شَخْصٌ - ہر دور سے نظر آنے والے جسم کو کہتے ہیں جو بلند ہو - بلندی کے اعتبار سے کہتے ہیں شَخَصَ الْجُرْحُ - زخم اونچا یعنے متورم ہو گیا - شَخَصَ شُخُوْصًا - وہ بلند ہو گیا - شَخَصَ السَّھْمُ - تیر نشانے سے اونچا ہو گیا** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں بلندی پائی جاتی ہے -

شَخَصَ بَصَرَہٗ کے معنے ہیں اس نے بغیر جھپکائے اپنی آنکھوں کو کھلا رکھا - دہشت کے مارے جب کسی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں تو اسوقت بولتے ہیں*** - چنانچہ قرآن کریم میں ہے تَشْخَصُ فِیْہِ الْاَبْصَارُ - (۱۴/۴۲) - اس انقلاب عظیم کے وقت آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائینگی - سورۃ انبیاء میں ہے فَاِذَا ھِیَ شَاخِصَۃٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (۲۱/۹۷) - اس نظام سے انکار کرنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائینگی -

* تاج ** محیط *** تاج و محیط و راغب -

ش ح ن

شَحَنَ السَّفِیْنَۃَ یَشْحَنُھَا ۔ کشتی کو بھر دینا اور جو سامان اس میں لادنا تھا لاد دینا * ۔ قرآن کریم میں اَلْفُلْکِ الْمَشْحُوْنِ (۲۶/۱۱۹) آیا ہے ۔ یعنی بھری اور لدی ہوئی کشتی ۔ اَلشِّحْنَۃُ ۔ وہ مال و اسباب وغیرہ جس سے کشتی کو بھرا جائے ۔ اَلشِّحْنَۃُ ۔ وہ چارہ جو جانوروں کے لئے اکٹھا کرکے رکھ لیا جائے اور ایک رات دن کے لئے کافی ہو۔ شَحَنَ ۔ شَحْنًا کے معنے جھڑک دینے ، دور کر دینے کے بھی آتے ہیں ۔ (غالباً) اسی سے اَلشِّحْنَۃُ ۔ بادشاہ کی طرف سے کسی علاقہ کے ناظم کو کہتے ہیں ۔ اَلْمُشَاحِنُ ۔ بغض و کینہ دل میں بھرا رکھنے والا ** ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں بھر دینا اور دور کر دینا دونوں آتے ہیں، لیکن یہ دونوں الگ الگ ہیں ۔ یعنی ان میں وجہ جامعیت کوئی نظر نہیں آتی ۔

ش د د

اَلشِّدَّۃُ ۔ سختی اور صلابت کو کہتے ہیں ۔ شَدَّ ۔ اس نے مضبوط اور محکم کیا ۔ شَیْئٌ شَدِیْدٌ مُشْتَدٌّ ۔ بہت مضبوط چیز ۔ اَلشَّدُّ ۔ کسی کو مضبوطی سے باندھ دینا ۔ اَلشِّدَّۃُ ۔ بہادری اور ثبات قلب ۔ اَلشَّدِیْدُ شجاع ۔ بہادر ۔ قوی ۔ نیز بخیل کو بھی کہتے ہیں ۔ چنانچہ اِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ (۱۰۰/۸) میں شَدِیْدٌ کے معنے بخیل ہیں ۔ اَلْاَشُدُّ ۔ سن بلوغ ۔ سن رشد ۔ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ (۱۰/۸۸) کے معنے ہیں ان کے دلوں پر مہر کر دے *** ۔

قرآن کریم میں سن بلوغ و سن رشد کے لئے لفظ اَشُدَّ اکثر مقامات پر آیا ہے ۔ (مثلاً ۱۲/۲۲ ؛ ۶/۱۵۳ ؛ ۴/۶)۔ سورۃ نساء میں (۴/۶) میں یتیموں کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب تک وہ '' نکاح کی عمر '' کو نہ پہنچیں ان کے مال کی نگرانی کرو ۔ اور دوسرے مقامات (۶/۱۵۳ ؛ ۱۷/۳۴) میں کہا گیا ہے کہ ان کے مال کی حفاظت کرو جب تک وہ جوانی کو نہ پہنچ جائیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے نکاح کی عمر ، جوانی ہے ، صغر سنی نہیں ۔

(۱۸/۸۲) میں ان یتیموں کے متعلق جن کی دیوار گر رہی تھی اور جسے حضرت موسیٰؑ اور انکے رفیق سفر نے کھڑا کر دیا تھا یہی کہا گیا ہے ۔

---

* تاج و راغب ۔ ** محیط ۔ *** تاج و محیط

(۲۲/۵) میں عام انسانوں کی جوانی کی حالت کے لئے یہ لفظ آیا ہے - (۲۸/۱۴) میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے -

سورۃ یوسف میں شِدَادٌ کا لفظ کٹھن سالوں کے لئے آیا ہے (۱۲/۴۸) - یہ شَدِیْدٌ کی جمع ہے - نیز اسکی جمع أَشِدَّاءُ بھی آتی ہے - سورۃ الفتح میں مومنین کی صفت بتائی گئی ہے أَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ (۴۸/۲۹) - اسکے معنے یہ ہیں کہ وہ مخالفین کے مقابلہ میں بہت قوی اور مضبوط ہوتے ہیں - أَشَدُّ - زیادہ سخت اور مضبوط (۴/۲) - اشْتَدَّ - سختی سے حملہ کرنا ، یا تیزی سے چلنا - (۱۴/۱۸) -

ش ر ب

شَرِبَ - یَشْرَبُ - پینا - سیراب ہونا - اَلشَّرَابُ - ہر وہ پینے کی چیز جسے چبانا نہ پڑے (۲/۲۵۹) - اَلْمَشْرَبُ - پانی - پانی پینا - پانی پینے کا گھاٹ - پینے کا وقت یا پینے کی جگہ - وہ طریقہ جس سے پانی پیا جائے * - طَعَامٌ ذُوْ مَشْرَبَۃٍ وہ کھانا جسکے بعد بہت پیاس لگے **-

قرآن کریم میں مَشْرَبَہُمْ (۲/۶۰) میں آیا ہے ، جسکے معنے پانی پینے کی جگہ ، یا خود پانی کے ہیں - شِرْبٌ (۲۶/۱۵۵) - پانی پینے کا حصہ یا باری - یا پانی پینے کا وقت - پینا - شُرْبٌ (۵۶/۵۵) پینا - شَارِبٌ - (۴۷/۱۵) پینے والا - (اسکی جمع شَارِبُوْنَ اور شارِبِیْنَ ہے)

سورۃ بقرہ میں شَرِبَ کے بعد یَطْعَمْہُ آیا ہے (۲/۲۴۹)- یہاں شَرِبَ کے معنے ہیں سیر ہو کر پینا اور طَعِمَ کے معنی پانی کا چکھنا -

قصہ بنی اسرائیل میں آیا ہے وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْعِجْلَ (۲/۹۳) - اس کے لفظی معنی تو یہ ہیں کہ بچھڑا ان کے دلوں میں پلا دیا گیا - لیکن استعارۃً مفہوم یہ ہے کہ بچھڑے کی عقیدت ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی - اس کی محبت ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر گئی -

ش ر ح

شَرْحٌ - کھولنا - واضح کرنا * - راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنے گوشت کو پھیلا دینے کے ہیں ***- کشادہ اور وسیع کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے - نیز اسکے معنے ہیں سمجھ میں آجانا - شَرَحَ الْبَابَ - دروازہ کھول دیا - شَرَحَ الْکَلَامَ - بات کو سمجھ لیا ****-

* تاج و محیط - ** اقرب الموارد - *** راغب - **** محیط -

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ جسے ہدایت دینا چاہتا ہے، یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ (۶/۱۲۶) - اسلام کیلئے اسکے سینے میں کشادگی پیدا کر دیتا ہے - اس لفظ میں بات کے سمجھنے کی صلاحیت، صحیح بات کو قبول کرنے کی استعداد، اور حق کو اختیار کر لینے کی جرأت، سب خصوصیات آجاتی ہیں - اس کے برعکس غلط راستے پر چلنے والوں کے متعلق فرمایا کہ یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا (۶/۱۲۶) - وہ اس کا سینہ تنگ، بھنچا ہوا کر دیتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ شرح صدر بہت بڑی خصوصیت ہے جسے حاصل ہو جائے - تعصب سے ہٹ کر، بات کو دلائل و بصیرت کی بناء پر (On Merits) سمجھنا - حق و صداقت اور حسن و خوبی جہاں بھی ہو، اُسے (Appreciate) کرنا، اور پھر تمام مخالفتوں کے علی الرغم اسے اختیار کر لینا - نیز اُسے اسی طرح تفصیل و تبیین سے آگے پہنچانا - ہر ایک سے حسن سلوک سے پیش آنا - دشمن تک سے فراخ دلی برتنا - کبھی تنگ نظری کا ثبوت نہ دینا - یہ سب باتیں شرح صدر میں آجاتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ اولو العزم انبیائے کرام نے ہمیشہ خدا سے شرح صدر (وسعت قلب و نگاہ اور رفعتِ عزم و ہمت) کی دعائیں مانگی ہیں (۲۰/۲۵) - اور خود نبی اکرم ؐ سے کہا گیا کہ یہ شرح صدر کی بدولت ہے کہ ان کی اسقدر سخت مہم یوں آسان ہوگئی اور اسطرح ان سے ذمہ داریوں کا وہ بوجھ ہلکا ہو گیا جس سے ان کی کمر ٹوٹ رہی تھی (۹۴/۱-۲) - ورنہ مخالفین کی کمینہ حرکات ایسی تھیں جن سے انسان کا دم گھٹنے لگ جائے (۱۵/۹۷) -

لہذا قرآن کریم کی رو سے معاملات کے آسان ہونے کیلئے شرح صدر نہایت ضروری ہے (۲۰/۲۵-۲۶ ; ۹۴/۱-۲) اور ہر مسلم کا یہی شعار ہونا چاہئے (۶/۱۲۶) - جس شخص میں تنگ نظری اور دون ہمتی ہو، سمجھ لیجئے کہ اس کا سینہ اسلام کی روشنی کے لئے کشادہ نہیں ہوا - (۳۹/۲۲) میں اسے قساوتِ قلب سے تعبیر کیا گیا ہے - نیز شَرَحَ بِہٖ صَدْرًا کے معنی ہیں کسی چیز کو بطیب خاطر قبول کرنا - اس کے لئے اپنا دل کھول دینا - (۱۶/۱۰۶) -

ش ر د

شَرَدَ الْبَعِیْرُ - اونٹ بدک کر بھاگ نکلا - اَلتَّشْرِیْدُ - جھڑک دینا - نکال دینا - منتشر کر دینا - کسی کو بدکا کر بھگا دینا - راغب نے کہا ہے کہ شَرَّدْتُ بِہٖ کے معنے ہیں، میں نے اس سے ایسا برتاؤ کیا کہ اسے دیکھکر دوسرے لوگ اس جیسا کام کبھی نہ کریں - ویسا کام کرنے سے بدکیں اور

باز رهیں ** ۔ قرآن کریم میں ہے فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ (۸/۵۷) ۔ یعنے انہیں ایسا مزہ چکھاؤ کہ جو لوگ ایسے ہی مقصد کیلئے ان کے پیچھے آرہے ہیں وہ ان کی اس حالت کو دیکھکر خود بخود بھاگ جائیں ۔ متوحش ہوجائیں (اس لئے کہ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بدکنا اور دور ہوجانا ہیں) ۔

ش ر ذ م

شِرْذِمَةٌ ۔ تھوڑی سی جماعت ۔ بڑی جماعت سے کٹ کر الگ ہو جانے والی پارٹی ۔ ثِيَابٌ شَرَاذِمُ ۔ پرانے پھٹے ہوئے اور بوسیدہ چیتھڑوں کو کہتے ہیں *** ۔ قرآن کریم میں شِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ (۲۶/۵۴) آیا ہے ۔ یعنے حقیر اور قلیل سی جماعت ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ میں ذال زائد ہے ۔ یہ در اصل شَرَمْتُ الشَّيْءَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی چیز کو پارہ پارہ کر دینا ہیں ۔ چھوٹی سی جماعت کو اس لئے شِرْذِمَةٌ کہتے ہیں کہ وہ بڑی جماعت سے پھٹ کر الگ ہوتی ہے ۔

ش ر ر

شَرٌّ ۔ خَيْرٌ کی ضد ہے (۹۹/۸) ۔ لسان العرب میں ہے کہ شَرٌّ ۔ برائی (سُوْءٌ) کو کہتے ہیں ۔ اور مصباح میں ہے کہ اس کے معنے فساد اورظلم کے ہیں ۔ اَلشَّرَارُ ۔ وَالشَّرَرُ ۔ آگ کی چنگاریاں (جو آگ میں سے نکل کر اڑتی ہیں) ۔ اس کا واحد شَرَارَةٌ اورشَرَرَةٌ ہے* ۔ (۷۷/۳۲) ۔ شَرَّالسِّمَاءُ مِنَ الْقِرْبَةِ ۔ مشکیزہ سے پانی لگا تار ٹپکتا رہا ۔ نیز اَلشَّرُّ کے معنی تیزی ۔ نشاط ۔ غصہ ۔ طیش ۔ حرص ۔ فحش اور سفاہت ہوتے ہیں ۔ نیز اس سے مراد ہر وہ شے ہے جو انسان کی طبیعت کے مطابق نہ ہو ۔ یا وہ اس کی ضروریات کے راستے میں روک بن جائے **** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنے منتشر ہوجانے ، ادھر اُدھر اُڑ جانے اور بکھر جانے کے ہیں ۔

راغب کے نزدیک خَيْرٌ اور شَرٌّ دونوں اضافی الفاظ ہیں ۔ یعنے ہوسکتا ہے کہ ایک ہی چیز ایک آدمی کیلئے خیر ہو اور دوسرے کے لئے شر ***** ۔

چونکہ یہ لفظ خَيْرٌ کی ضد ہے اسلئے اس کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان خ ۔ ی ۔ ر بھی دیکھنا چاہئے ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے جو بنیادی معنی

* تاج **راغب ۔ *** تاج و راغب ۔ **** محیط ۔ *****راغب ۔ عنوان '' خیر '' میں

بتائے ہیں اس اعتبار سے شَرٌّ کے معنے ہوں گے انسان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کا اس طرح صرف (یا ضائع) ہونا ، بکھر جانا اور منتشر ہو جانا کہ ان سے کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہ ہو۔ اس کے برعکس خَیْرٌ کے معنے ہوں گے انسانی توانائیوں کا تعمیری نتائج پیدا کرنا۔ پانی دریا کے ساحلوں کے اندر مقید ہوکر بہے تو اس کا نتیجہ خیر ہی خیر ہوتا ہے لیکن جب وہ سیلاب کی شکل میں ادھر ادھر بکھر جائے تو شر کا موجب ہو جاتا ہے۔ ہوا نرم روی کے ساتھ ایک سمت میں چلے تو موجب خیر ہے لیکن جب جھکڑ اور آندھی بن جائے تو تباہی کا موجب۔ توانائیوں کا بکھر جانا ، قوتوں کا بے لگام ہو کر منتشر ہوجانا شر ہے۔ یہی چیز خود انسانی ذات کے متعلق بھی ہے۔ اگر اس کی قوتیں منتشر (Diffused) ہوں تو اس کی نشو و نما نہیں ہوتی۔ اگر وہ مرتکز (Crystallised) ہو جائیں تو اس میں استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔

سورۃ الفلق میں مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۱۱۳/۲) سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ یعنی جو کچھ پیدا کیا گیا ہے اس کے شر سے حفاظت۔ اس سے ظاہر ہے کہ شر (Evil) کوئی مستقل بالذات شے نہیں جسے الگ پیدا کیا گیا ہو(جیسا کہ مجوسیوں کے ہاں عقیدہ تھا)۔ کائنات کی کوئی شے نہ بجائے خویش شر ہے نہ خیر۔ ہر چیز میں شر کا پہلو بھی ہے اور خیر کا بھی۔ اس کے شر کے پہلو سے بچنا چاہئے اور خیر کا پہلو اختیار کرنا چاہئے۔ پانی اگر کشتی کے نیچے رہے تو خیر ہی خیر ہے لیکن اگر وہ کشتی کے اندر آ جائے تو شر ہو جائیگا۔ کائنات کی ہر قوت کو وحیِ خداوندی کی روشنی میں صرف اور استعمال کرنا ، خیر ہے۔ اور اسے انسانیت کی تخریب کے لئے استعمال کرنا شر۔ باقی رہیں ہماری معاشرتی مصیبتیں ، سو وہ معاشرہ کے غلط نظام کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر معاشرہ کے نظام کو صحیح خطوط پر متشکل کردیا جائے تو یہ تمام مصیبتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہی صورت اس انفرادی دکھ ، درد (Pain) کی ہے جو طبعی طور پر ہوتا ہے۔ جوں جوں انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اور وہ اس کے ذریعے تسخیر فطرت کرتا جاتا ہے ان تکلیفوں میں کمی ہوتی جاتی ہے۔

اب رہیں وہ پریشانیاں جو جذباتی طور پر وجہِ مصیبت بنتی ہیں۔ سو اگر انسان کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے تو وہ ان پریشانیوں پر بھی غالب آ سکتا ہے۔ زاویہ نگاہ کے بدل جانے سے ان چیزوں کا اثر ہی بدل جاتا ہے۔ اس لئے ''ابلیس'' سے کہا گیا ہے کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲)۔ یقیناً میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکیگا۔

خیر اور شر کے ان گوشوں کا ذکر قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ملے گا جہاں سے وہ حقائق واضح ہو جائینگے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے مسئلہ خیر اور شر (Good and evil) کی بحث فلسفیانہ طور پر نہیں کی۔اس لئے کہ اس کا موضوع فلسفہ نہیں۔ اس کا مقصود ایسی راہ نمائی دینا ہے جس سے شر، شر ہی نہ رہے۔ یعنی توانائیاں بکھر کر تخریبی نتائج (Disintegration) نہ پیدا کریں، بلکہ نظم و ضبط کے ساتھ مجتمع ہو کر تعمیری نتائج پیدا کریں۔

واضح رہے کہ ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ کوئی شے فی نفسہ نہ خیر ہے نہ شر، اوران کا طریق استعمال ہے جو انہیں خیر یا شر بنا دیتا ہے، تو یہ چیز اشیائے کائنات یا کائنات اور انسان کی قوتوں کے متعلق ہے۔ جہاں تک ان مستقل اقدار کا تعلق ہے جن پر شرف انسانیت (یا دین) کی عمارت استوار ہے اور جو وحی کے ذریعے عطا ہوئی ہیں، وہ فی نفسہ خیر ہیں۔ مثلاً عدل و احسان فی نفسہ خیر ہیں۔ اور ان کی ضد ذاتی طور پر شر۔ اسی طرح وہ چیزیں جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، شر پیدا کرنے کا موجب ہیں۔

ش ر ط

اَلشَّرْطُ۔ علامت یا نشانی جسے لوگ آپس میں مقرر کرلیں۔ (جمع اَشْرَاطٌ)۔ ہر چیز کا پہلا حصہ۔ اَلشُّرْطَۃُ۔ فوج کا پہلا دستہ جو جنگ میں شریک ہو اور موت کے لئے بالکل تیار ہو۔ گورنر کے اعوان و انصار کی جماعت (کیونکہ وہ اپنے اوپر ایسی علامات لگا لیتے ہیں جن سے وہ پہچانے جائیں)*۔ اس کا واحد شُرْطِیٌّ ہے۔ قرآن کریم میں اَلسَّاعَۃُ (آنے والے انقلاب) کے متعلق ہے فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ($\frac{47}{18}$)۔ اس کی ابتدائی علامات تو آچکی ہیں۔ اب اس کے بعد وہ انقلاب کی گھڑی (وہ فیصلہ کن لڑائیاں جن میں مخالفین (قریش) کو ایسی شکست ہوئی کہ اس کے بعد وہ اُٹھ ہی نہ سکے) جلد آ جائیگی۔

ش ر ع

اَلشَّرِیْعَۃُ۔ وہ گھاٹ جس پر آدمی اور جانور پانی پینے کے لئے آتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے خصوصیت یہ ہے کہ پانی مسلسل بہنے والے چشمہ سے آ رہا ہو جو بند نہ ہوتا ہو، کھلا ہوا اور سطح زمین پر جاری ہو۔ بغیر اسے

*تاج و محیط و راغب۔

حاصل کرنے کے لئے کسی رسی وغیرہ کی ضرورت نہ پڑے ۔ اگر بارش وغیرہ کا جمع شدہ پانی ہو، تو وہ شریعۃ نہیں بلکہ کَرَعٌ کہلائیگا ۔ اسی سے اَلشَّارِعُ ۔ عام راستہ کو کہتے ہیں جس پر سب لوگ چل سکتے ہوں ۔ الشَّرْعُ ۔ سیدھے راستہ کو جو واضح اور کھلا ہو ۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ شَرَعَ کے معنے ظَہَرَ ہیں ۔ یعنی ظاہر ہوگیا ۔ کھل گیا ۔ شُرِعَتِ الرِّمَاحُ کے معنے ہیں نیزے سیدھے کئے گئے ۔ اَشْرَعَ الشَّیْءُ ۔ اس نے اس چیز کو بہت بلند کر دیا ۔ اَلشِّرَاعُ ۔ کشتی کے بادبان کو کہتے ہیں ۔ اَلشَّرِیْعَۃُ ۔ دروازے کی چوکھٹ کو بھی کہتے ہیں ۔ الشَّرِیْعَۃُ و الشِّرْعَۃُ ۔ سیدھا اور واضح راستہ* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو طول کی جانب سے کھول دینا ۔ یعنی اسطرح کھول دینا کہ وہ یہاں سے وہاں تک پوری کی پوری سامنے آ جائے ۔

سورۃ شوریٰ میں ہے شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ (۴۲/۱۳) ۔ خدا نے تمہارے لئے اس نظام زندگی (اَلدِّیْنُ) یا قانون حیات کو نمایاں اور واضح کیا ہے ۔ سورۃ جاثیۃ میں ہے ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِنَ الْاَمْرِ (۴۵/۱۸) پھر ہم نے تجھے الامر (دین کے معاملہ) میں ایک کھلے اور واضح راستے پر لگا دیا ۔

ان آیات میں (شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ ۔ یا شَرِیْعَۃٍ مِنَ الْاَمْرِ سے) مفہوم خود الدین ہے ۔ یعنی خدا کا متعین کردہ راستہ ۔ سورۃ مائدہ میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ''ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے جو ان حقائق کو سچ کرکے دکھانے والی ہے جو اس سے پہلی آسمانی کتابوں میں آ چکے ہیں ۔ اور یہ ان سب کی تعلیم کی محافظ ہے ۔ سو تو ان کے متنازع فیہ معاملات میں ما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ کر ۔ اور جب تمہارے پاس حق آ چکا ہے تو پھر ان کے جذبات و خواہشات کا اتباع مت کرو'' ۔ اس کے بعد ہے لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّ مِنْھَاجًا (۵/۴۸) ۔ ''اور ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شرعۃ (راستہ) اور منہاج (طریقہ) مقرر کیا (تھا)'' ۔ یہاں شِرْعَۃً کے معنی الدین کے وہ غیر متبدل اصول نہیں جو حضرت نوحؑ سے نبی اکرمؐ تک ہر نبی کو یکساں طور پر دئے گئے تھے (۴۲/۱۳) ۔ یہاں اس سے مراد، الدین کے اصولوں کے تابع وہ جزئی احکام ہیں جو انبیائے سابقہ کو وقتی ضروریات کے لئے دئے جاتے رہے اور جن میں زمانے کی

*تاج و محیط ۔

تبدیلی کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہی - قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ یہ لوگ (یہود و نصاریٰ) جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر قرآن کریم منجانب اللہ ہے تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو ہماری شریعت کے خلاف ہیں ، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک چیز ہے دین کے اصول ، اور دوسری چیز ہے جزئی احکام - دین کے اصول ہمیشہ ایک رہے لیکن جزئی احکام میں تبدیلیاں ہوتی رہیں - اس لئے اگر قرآن کریم کا کوئی حکم ، سابقہ اقوام کے کسی جزئی حکم سے مختلف ہے تو اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن کریم منجانب اللہ نہیں - اس مفہوم کی تائید ، سورۃ حج کی وہ آیت کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ ($\frac{۲۲}{۶۷}$) - ''ہم نے ہر قوم کے لئے (دین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے) طریقہ تجویز کیا تھا جس پر وہ چلیں - (اس طریق میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اصل دین میں نہیں) اس لئے یہ تجھ سے الامر (اصل دین) کے بارے میں تو تنازع نہ کریں'' -

اس آیت (لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا) کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دین کے اختیار کرنے پر ہم کسی پر جبر نہیں کرتے - جس جس طریق پر کوئی از خود چلتا ہے ، ہم اس کے اس اختیار و ارادہ میں دخل نہیں دیتے - ہمارا کام الدین دیدینا ہے - یہ انسانوں کی اپنی مرضی ہے کہ وہ الدین کو اختیار کریں یا اپنے اپنے طور طریقوں پر چلتے رہیں - اس مفہوم کی تائید اس سے اگلی آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً ($\frac{۵}{۴۸}$) - اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک اُمت بنا دیتا - لیکن اس طرح تمہارا اختیار و ارادہ سلب ہو جاتا - اور یہ چیز مشیت خداوندی کے خلاف ہوتی -

ہمارے ہاں دین اور شریعت الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں - شریعت سے مراد ، وہ جزئی احکام لئے جاتے ہیں جن پر اُمت کے لئے چلنا ضروری ہے - اسلام کا نظام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں (بجز چند مستثنیات) دین کے صرف اصول دئے ہیں - یہ اصول (اور وہ چند احکام جو قرآن کریم میں دئے گئے ہیں) ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہینگے لیکن ان اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے ، ہر زمانے کی اُمت اپنے لئے جزئی احکام ، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ، باہمی مشورہ سے خود مرتب کریگی - قرآنی اصول غیر متبدل رہینگے اور یہ جزئی احکام تبدیل ہوتے رہینگے - ان احکام کو اگر شریعت کہا جائیگا تو یہ شریعت بدلتی رہیگی اور اصولِ شریعت غیر متبدل رہینگے -

اَلشَّرِیْعَۃُ کے ان معانی کو سامنے لائیے جو شروع میں بیان ہوئے ہیں اور پھر غور کیجئے کہ شریعت کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں ۔ ان معانی کے لحاظ سے اَلشَّرِیْعَۃُ (یعنی الدین کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں ، اسلامی معاشرہ کی مرتب کردہ جزئیات) کو واضح ، سیدھا اور نمایاں ہونا چاہئے۔ نیز ایسا راستہ جو ہر ایک کے لئے یکساں ہو ۔ ایسا پانی جس سے سب سیراب ہو سکیں ۔ جس تک ہر ایک کی رسائی ہو۔ جو مسلسل آ رہا ہو۔ بارش کا ایک جگہ جمع شدہ پانی نہ ہو۔ لہذا شریعت وہ ہوگی جس میں جمود، تعطل نہ ہو۔ جس میں تسلسل ہو۔ جو زمانے کے بہتے ہوئے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے ۔ اگر وہ جوئے رواں ہونے کی بجائے بند پانی کی طرح ہوگی تو اس میں کچھ عرصہ کے بعد فساد کی بو پیدا ہوجائے گی ۔ وہ زندگی بخش نہیں رہے گی ۔

سورۃ اعراف میں حِیْتَانُھُمْ ۔ ۔ ۔ ۔ شُرَّعًا ($\frac{۷}{۱۶۳}$) آیا ہے ۔ شُرَّعًا جمع ہے شَارِعٌ کی اور اس کے معنے ہیں وہ مچھلیاں جو اپنے سر کو اونچا کئے نمایاں طور پر سطح آب کے اوپر آجائیں** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ مچھلیاں جو سر نیچا کئے جا رہی ہوں ۔ (ابن فارس کی عبارت میں تَشْرَبُ ہے جس کے معنی پانی پینے کے ہیں ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ طباعت کی غلطی ہے اور صحیح لفظ تَسْرَبُ ہے) ۔ لیکن جس مقام پر یہ لفظ قرآن کریم میں آیا ہے اس کے اعتبار سے پہلے معانی زیادہ موزوں نظر آتے ہیں ۔ بنی اسرائیل ، سبت کے روز کام کاج سے ناغہ کرتے تھے ۔ اس لئے ان کے ماہی گیر اس دن مچھلیاں نہیں پکڑتے تھے۔ مچھلیوں میں (اور دیگر جانداروں میں بھی) یہ طبعی ملکہ ہوتا ہے کہ جب انہیں پیہم تجربہ سے معلوم ہوجائے کہ ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں تو وہ چھپنے کی بجائے کھلے طور پر ، انسانوں کے قریب پھرتے رہتے ہیں ۔ یہی کچھ وہ مچھلیاں کرتی تھیں ۔ لیکن بنی اسرائیل کے لالچی ، ان کی اس روش سے فائدہ اٹھاتے اور سبت کے علی الرغم انہیں پکڑ لیتے ۔ (تفصیل س ۔ ب ۔ ت میں دیکھئے) ۔

ش ر ق

اَلشَّرْقُ ۔ شگاف کو کہتے ہیں ۔ شَرَقَ الشَّاۃَ ۔ بکری کا کان چیر دیا ۔ اَلتَّشْرِیْقُ ۔ گوشت کو چیرنا پھاڑنا یا کاٹنا ۔ اَیَّامُ التَّشْرِیْقِ ۔ یہیں سے ہے جس سے مراد عیدالاضحیٰ کے تین دن ہیں جن میں قربانی کا

*تاج ۔ **محیط ۔

گوشت چیر کاٹ کر دھوپ میں رکھا جاتا ہے *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی روشن کر دینے اور کھول دینے کے ہیں ۔ شَرَقَتِ الشَّمْسُ ۔ سورج نکل آیا ۔ وَاَشْرَقَتِ الشَّمْسُ ۔ سورج نے روشنی کر دی ۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اَیَّامُ التَّشْرِیْقِ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان دنوں میں لوگ قربانی کے گوشت کو پارچے بنا کر دھوپ میں سکھانے کے لئے پھیلا دیتے تھے ۔ اَلشَّرْقُ کے معنے آفتاب کے بھی ہیں جبکہ وہ طلوع یا روشن ہوگیا ہو ۔ چنانچہ طَلَعَتِ الشَّرْقُ آفتاب نکلنے کے لئے بولتے ہیں ۔ لیکن غَرَبَتِ الشَّرْقُ کبھی نہیں کہتے ۔ اَلشَّرْقُ ۔ آفتاب کا روشن ہونا ۔ وہ جگہ جہاں سے آفتاب طلوع ہوتا ہے ۔ یعنی مشرق ۔ اَلشَّارِقُ ۔ آفتاب ، عین طلوع ہونے کے وقت * ۔

شَرَقَ النَّخْلُ وَاَشْرَقَ ۔ کھجور کے درخت لمبے ہوئے یا ان میں سفید شگوفے نکلے ۔ شَرِقَ الدَّمُ فِیْ عَیْنَیْہِ : اس کی آنکھ سرخ ہوگئی * ۔

اَلْمَشْرِقَانِ ۔ وہ انتہائی دو نقاط جہاں سے سورج سردی اور گرمی میں طلوع ہوتا ہے * ۔

قرآن کریم میں مَشْرِقٌ کے مقابلہ میں مَغْرِبٌ آیا ہے (۲/۱۱۵) اور سورۃ صٓ میں بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ بھی آیا ہے (۳۸/۱۸) ۔ سورۃ رحمٰن میں رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ (۵۵/۱۷) آیا ہے ۔ یعنے سردی اور گرمی میں طلوع اور غروب کے انتہائی نقاط ۔ اس سے مراد تمام روئے زمین ہے ۔ اسطرح مشرقی اور مغربی زمینوں کے لئے مشارق اور مغارب بھی آیا ہے (۷۰/۴۰) اور صرف مَشَارِقٌ بھی (۳۷/۵) ۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ خدا نے بنی اسرائیل کو ارض با برکت کے مشارق و مغارب کا مالک بنا دیا (۷/۱۳۷) ۔ یعنے اس با برکت زمین کے ان حصوں کا جو اسکے شرق و غرب میں واقع تھے ۔ یا اس پورے کے پورے خطہ کا ۔ اسلئے کہ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۔ (۲/۱۱۵) تو اس سے مراد کل کائنات ہے ۔

سورۃ نور میں ، نور خداوندی کے تمثیلی بیان میں لَاشَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ (۲۴/۳۵) آیا ہے ۔ یعنے وہ مشرق و مغرب کی نسبتوں سے بلند و بالا ہے ۔ اسکی روشنی عالمگیر (Universal) اور تمام کائنات کو محیط ہے ۔ جس طرح خدا تمام نوع انسانی کا خدا ہے اسی طرح اس کا ضابطہ قانون (قرآن کریم) بھی تمام نوع انسانی کی آنکھوں کیلئے روشنی ہے اور اسکا نظام

* تاج و محیط ۔

ربوبیت تمام انسانوں کی نشوونما کا ذریعہ - یہی وہ نظام ہے جسکی روشنی سے آخرالامر تمام روئے زمین جگمگا اٹھیگی - وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹) -

اِشْرَاقٌ (۳۸/۱۸) طلوع آفتاب (یا دن چڑھنے) کیلئے آیا ہے - (۱۵/۷۳) میں مُشْرِقِیْنَ آیا ہے - اس کے معنے یہ ہیں کہ عذاب نے انہیں اسوقت گرفت میں لے لیا جب ان پر سورج کی روشنی پڑ رہی تھی - یعنی طلوع آفتاب کے وقت -

ش ر ک

اَلشِّرْکُ کے بنیادی معنی ہیں چمٹے رہنا - خلط ملط ہو جانا* - شَارَکْتُ فُلَانًا کے معنے ہیں میں فلاں کا ساتھی ہو گیا - اور اِشْتَرَکَ الْاَمْرُ کے معنے ہیں معاملہ گڈ مڈ ہو گیا - مُشَارَکَةٌ کے معنے ہیں، ایک کا دوسرے کے ساتھ کسی کام میں شریک ہو جانا - فُلَانٌ شَرِیْکُ فُلَانٍ - فلاں شخص کسی دوسرے شخص کا شریک کار یا ساجھی ہے - نیز اس کے معنی ہیں کسی کی بہن یا بیٹی سے شادی کرکے اس کے خاندان سے رشتہ داری پیدا کر لینے والا - اسکی جمع شُرَکَاءُ آتی ہے - اَلشَّرَکُ - شکاری کے جال کو کہتے ہیں - نیز وہ چھوٹے چھوٹے راستے جو بڑے راستے (اُمُّ الطَّرِیْقِ) سے نکلیں اور آگے جا کر ختم ہو جائیں - ان کا واحد شَرَکَةٌ ہے** -

شِرْکٌ - قرآن کریم کی خاص اصطلاح ہے - اسکے معنے ہیں غیر خدائی قوتوں کو خدا کے ہمسر سمجھنا - جو اختیارات صرف خدا کیلئے مخصوص ہیں ان کا حامل دوسروں کو بھی سمجھنا - انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو، قانون خداوندی کے برابر سمجھنا - خدا کے حق ملکیت میں دوسروں کا حق تسلیم کرنا - قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ اس کائنات میں ہر شے انسان کیلئے تابع فرمان کر دی گئی ہے اور انسان سب برابر ہیں - کسی کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے سے اپنی اطاعت کرائے - لہذا اس کائنات میں، انسان سے برتر کوئی اور قوت نہیں - (انسان سب برابر اور کائنات کی دیگر اشیاء انسان سے فروتر) - بس ایک خدا کی ذات ہے جو انسان سے برتر ہے - لہذا انسان کا خدا کے علاوہ کسی اور کو اپنے سے برتر سمجھنا خود اسکی

---

* محیط - ** تاج -

اپنی تذلیل ہے۔ اسی کو شرک کہتے ہیں۔ شرک سے خدا کی خدائی (خدا ہونے) میں کوئی فرق نہیں آجاتا۔ خود انسان اپنے مقام انسانیت سے گرجاتا ہے۔ اسلئے قرآن کریم کی رو سے شرک سب سے بڑا جرم ہے جو انسان سے اسکا صحیح مقام چھین لیتا ہے (۴/۱۱۶)۔ مشرکین وہی ہیں جو مقام انسانیت سے گر جاتے ہیں اور (خدا کے علاوہ اور) قوتوں کو اپنے سے برتر سمجھنے لگ جاتے ہیں۔بس ایک خدا کے قانون کی اطاعت (جو اسنے وحی کے ذریعہ قرآن کریم میں عطا کر دیا ہے) اور ساری کائنات کی تسخیر۔ یہ ہے توحید۔ اور اس میں ذرا سی بھی خرابی، شرک۔

اَشْرَکَ۔ اس نے شرک کیا، اس سے اسم فاعل مُشْرِکٌ ہے یعنی شرک کرنے والا۔ اسکی جمع مُشْرِکُوْن اور مُشْرِکِیْنَ ہے۔

نزول قرآن کے وقت ایک گروہ تو ان لوگوں کا تھا جو وحی خداوندی کے اتباع کے مدعی تھے۔ انہیں اہل کتاب کہکر پکارا گیا ہے۔ یعنی یہودی۔ نصرانی وغیرہ۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو کسی آسمانی کتاب کے اتباع کے مدعی نہیں تھے۔ وہ اپنے خود ساختہ رسوم وآئین کے متبع تھے۔ وہ اپنے ذہنی تصور کے مطابق خدا کو بھی مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ اور قوتوں کو بھی شریک خیال کرتے تھے۔ انہیں مشرکین کہا گیا ہے۔ (چونکہ یہ دونوں گروہ قرآن کریم کی دعوت سے انکار کرتے تھے اسلئے ان سب کو کافِرِیْنَ کہا گیا ہے)۔ یہ اصطلاحی تعبیریں ان گروہوں میں باہمی امتیاز کیلئے تھیں ورنہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے خود اہل کتاب بھی قانون خداوندی کا اتباع نہیں کرتے تھے بلکہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا اتباع کرتے تھے۔ یعنے اپنے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے مسلک و آئین کا اتباع۔ قانون خداوندی اپنی اصلی شکل میں انکے پاس تھا ہی نہیں۔ اور جتنا کچھ تھا، وہ بھی محض تبرکاً تھا۔ ان کا عمل انکے علماء و مشائخ کی متعین کردہ شریعت پر تھا۔ لہذا عملاً یہ لوگ بھی مشرک تھے۔ اس اعتبار سے قرآن کریم نےانہیں بھی مشرک کہا ہے۔ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا۔ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۲/۱۳۵)۔

دینِ توحید صراط مستقیم ہے۔ اور مختلف فرقے وہ چھوٹے چھوٹے راستے ہیں جو انسان کو صراط مستقیم سے بھٹکا کنر دوسری طرف لیجاتے ہیں اور تھوڑی دور جا کر بند ہو جاتے ہیں۔ اسلئے قرآن کریم نے فرقہ بندی کو

شرک قرار دیا ہے ۔ (۳۰/۳۱-۳۲) ۔ اس لئے کہ فرقوں میں آخری سند انسان ہوتے ہیں ۔ دین میں سند اور حجت صرف خدا کی کتاب ہوتی ہے ۔

لہذا شرک یہی نہیں کہ انسان بتوں کی یا مُرْدوں کی پرستش کرنے لگ جائے ۔ شرک یہ بھی ہے (اور یہ شرک بہت بڑا ہے) کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کو خدا کے قانون کا درجہ دیدیا جائے اور اسطرح دین کو مختلف فرقوں میں بانٹ دیا جائے ۔ ایسا کرنے والوں کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مومن سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت مشرک ہوتے ہیں ۔ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۱۲/۱۰۶) ۔ ان میں سے اکثریت انکی ہے جو خدا پر اسطرح ایمان رکھتے ہیں کہ ایمان کے باوجود مشرک ہوتے ہیں ۔

جسطرح سارے قرآن کریم میں توحید کی تفاصیل کا تذکرہ ہے اسی طرح اس میں شرک اور اسکی جزئیات و تضمنات کا ذکر ہے ۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم شرک کو مٹانا اور توحید کو قائم کرنا ہے ۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے معنے یہی ہیں ۔ ہر غیر خداوندی قانون و آئین کی اطاعت سے انکار اور قانون خداوندی کی اطاعت کا عملی اقرار ۔ مسلم اور مشرک ایک دوسرے کی ضد ہیں (۳/۹۴) ۔ اور غیر خدائی قوتوں پر بھروسہ کرنے والے اور شیطانی اقتدار کو تسلیم کرنے والے مشرک ہیں (۱۶/۹۹-۱۰۰) ۔

ضمناً ایک نقطہ کی وضاحت ضروری ہے ۔ قرآن کریم میں مشرکین کے خلاف جنگ کرنے کا حکم اکثر مقامات میں نظر آئیگا ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمان ، تمام دنیا کے مشرکین سے ہر حال میں جنگ کرتے رہیں ۔ اُن مقامات میں مشرکین سے مراد زمانہ نزول قرآن کے مشرکین ہیں جنہوں نے جنگ کے حالات پیدا کر دئے تھے ۔ اُس کے بعد جنگ صرف انہی سے کی جائیگی جو اُس قسم کے حالات پیدا کر دیں ۔ بالفاظ دیگر ، کسی مشرک سے محض اس کے مشرک ہونے کی بنا پر جنگ نہیں کی جائیگی ۔ جنگ ان قوموں سے کی جائیگی جو جنگ کے حالات پیدا کر دیں ۔ اس کے لئے قرآن کریم نے تفصیلی ہدایات دی ہیں ۔

لیکن اسلامی معاشرہ میں مشرکین (یا غیرمسلموں) کی جو پوزیشن قرآن کریم نے متعین کر دی ہے اور ان سے جس قسم کے تعلقات رکھنے کا حکم دیا ہے ، وہ ہر دور کے مشرکین (یا غیر مسلموں) پر یکساں طور پر منطبق ہوتا ہے ۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ

(۱) جو خصوصیات اور قوتیں خدا کے کے لئے مختص ہیں، ان میں کسی دوسرے کو شریک سمجھنا ، شرک ہے ۔

(۲) اپنے آپ کو خدا کے سوا ، کائنات کی کسی قوت یا کسی انسان کا محکوم اور تابع فرمان سمجھنا اور اس کے سامنے جھکنا، شرک ہے۔

(۳) قرآن کریم کے علاوہ ، کسی اور کی محکومی اختیار کرنا شرک ہے ۔ اس ضابطہ کے علاوہ ، کسی اور ضابطہ کو اپنا ۔ حکم ماننا، شرک ہے ۔

(۴) الدین ، ملت میں وحدت پیدا کرتا ہے ۔ فرقوں میں بٹ جانا اور گروہ در گروہ ہو جانا، شرک ہے ۔

(۵) ایک خدا ۔ اس کا عطا کردہ ایک ضابطہ زندگی ۔ اس پر چلنے والی ایک اُمت ۔ اس اُمت کا ایک نظام ۔ یہ ہے توحید ۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے شرک ہے ۔

ش ر ی

شَرَیٰ کے معنے بیچنے اور خریدنے دونوں کے آئے ہیں۔ (اور یہی مفہوم بَیْعٌ کا بھی ہے) ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خرید و فروخت ، جنس کے عوض جنس سے ہوتی تھی جسے (Barter System) کہتے ہیں ، تو اس میں ہوتا یہ تھا کہ ایک جنس والا جہاں اپنی جنس دوسرے کو دیتا تھا تو اسکے عوض دوسرے سے اسکی جنس خریدتا بھی تھا ۔ اس طرح ان دونوں میں سے ہر ایک خریدتا بھی تھا اور بیچتا بھی تھا ۔ لہذا یہ لفظ خریدنے اور بیچنے دونوں کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا* ۔ شَرَیٰ کا اصلی مطلب ہے کسی چیز کا اپنے قبضے سے نکال کر اس کے عوض دوسری چیز کو اپنے قبضے میں لے لینا ۔ اس اعتبار سے ایک چیز کو چھوڑ کر اس کی جگہ دوسری چیز اختیار کرلینے کو بھی اِشْتِرَاءٌ کہدیتے ہیں** ۔ راغب نے لکھا ہے کہ شَرَیٰ بیچنے کے لئے اور اِشْتَرَیٰ خریدنے کے لئے زیادہ مستعمل ہوتا ہے ۔

قرآن کریم میں ($\frac{۲}{۲۰۸}$) میں یَشْرِیْ نَفْسَہٗ کے معنے اپنے آپ کو فروخت کر دینے کے ہیں ۔ وَ شَرَوْہُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ ($\frac{۱۲}{۲۰}$) میں بھی اس کے معنے فروخت کرنے کے ہیں ۔ لیکن اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرَیٰ ($\frac{۹}{۱۱۱}$) میں اس کے معنے خریدنے کے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْھُدٰی ($\frac{۲}{۱۶}$) میں اس کے معنے ہدایت چھوڑ کر گمراہی اختیار کرنے کے ہیں ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔

نوٹ۔ شَرْیَانٌ (ش کو زبر اور زیر سے) ایک درخت کو کہتے ہیں جس کی لکڑی سے کمان بناتے تھے۔ نیز جسم کی وہ رگ جو پھڑکتی اور حرکت کرتی رہتی ہے۔ اس کی جمع شَرَایِیْنُ ہے۔ شَرَیٰ کے معنے پھیلانا بھی ہیں*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز میں ہیجان پیدا ہو جانا اور اس کا بلند ہونا لکھا ہے۔ نیز شَرِیَ الْبَعِیْرُ فِی سَیْرِہٖ کے معنے ہیں اونٹ تیز چلا**۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)۔ ”بیشک اللہ نے مومنوں سے ان کی جان اور مال بعوض جنت خرید لئے ہیں“۔ یہ محض ذہنی عقیدہ نہیں بلکہ اسلامی نظام مملکت و معاشرت کی اصل و بنیاد ہے۔ اس میں، وہ نظام معاشرہ (مملکت) جو قوانین خداوندی کو عملاً نافذ کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے، افراد مملکت کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے، افراد اپنی جان اور مال کو حکومتِ خداوندی کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں، اور وہ حکومت انہیں اس دنیا میں جنتی زندگی عطا کرنے کی ضمانت دیتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس قوم کی یہاں کی زندگی جنتی ہو جائے اسے آخرت میں بھی جنت مل جاتی ہے۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ”نظام ربوبیت“ میں ملے گی)۔

ش ط أ

الشَّطْءُ۔ کھجور یا کھیتی کی سوئیاں۔ نئے پھوٹنے والے پودے۔ الشَّطْءُ مِنَ الشَّجَرِ۔ درخت کی جڑ کے آس پاس جو شاخیں پھوٹ نکلیں۔ شَطَا الْوَادِیْ وَ النَّهْرِ۔ وادی یا نہر کا کنارہ۔ ساحل***۔

قرآن کریم میں ہے کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ (۴۸/۲۹)۔ کھیتی کی طرح جو اپنی سوئیاں نکالتی ہے۔ مِنْ شَاطِیءِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ (۲۸/۳۰)۔ اس با برکت وادی کے ایک کنارے سے۔

ش ط ر

اَلشَّطْرُ۔ اُس حصہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز سے الگ ہو جائے۔ پھر اس کے بعد کسی چیز کی ایک جانب کو کہنے لگ گئے خواہ وہ اس کے

* تاج و محیط و راغب ** ابن فارس۔ *** تاج و راغب نیز ابن فارس

ساتھ ھی ملی ہو*۔ اور اس طرح اس کے معنے کنارہ ، طرف ، سمت اور جانب ، نیز کسی چیز کا بعض حصہ ہو گئے ۔ الگ ہو جانے کی جہت سے اس میں دور ہوجانے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اَلشَّطِیْرُ کے معنے ہیں پردیسی ، اجنبی۔ نیز دور ، بعید ۔ مَنْزِلٌ شَطِیْرٌ ۔ دور کی منزل ۔ اَلشَّاطِرُ ۔ ڈاک کا تیز رفتار گھوڑا جو لمبی مسافت کو قلیل عرصہ میں طے کر لے **۔ جہت اور سمت کے لئے کہتے ہیں شَطَرَ شَطْرَہٗ ۔ اس نے اس کی طرف جانے کا ارادہ کیا ۔ ویسے اَلشَّطْرُ ۔ کسی چیز کے آدھے حصے کو بھی کہتے ہیں**۔

قرآن کریم میں یہ لفظ سمت اور جہت کے معنوں میں آیا ہے ۔ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۲/۱۴۴) ۔ مسجد الحرام کی سمت ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ سمت کے لئے شَطْرٌ کا لفظ اس وقت بولتے ہیں جب اس میں دوری کا مفہوم بھی شامل ہو ۔

ش ط ط

شَطَّ ۔ یَشُطُّ ۔ شَطًّا ۔ دور ہو جانا ۔ مقدار یا حد مقررہ سے تجاوز کر جانا ۔ حق سے دور نکل جانا ۔ بے انصافی کرنا۔ موخر الذکر معنوں میں اَشَطَّ بھی مستعمل ہے***۔ قرآن کریم میں ہے فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ (۳۸/۲۲) ۔ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور نا انصافی نہ کر۔ یعنی حق سے دور نہ لے جا ۔ سورۃ کہف میں ہے لَقَدْ قُلْنَا اِذًا شَطَطًا (۱۸/۱۴) ۔ ہم ایسی بات کہینگے جو حق سے دور اور ہٹی ہوئی ہوگی ۔ راغب نے شَطَطٌ کے معنے حد سے زیادہ دور کے لئے ہیں ۔

الرمانی نے شطَّ شَطَنَ اور بَعُدَ کو مرادف المعنی لکھا ہے****۔ لہذا اس میں دوری کا مفہوم ہوگا ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں دوری اور میلان اور جھکاؤ دونوں لکھے ہیں ۔ لہذا وَلَا تُشْطِطْ (۳۸/۲۲) کے معنی ہونگے ، کسی ایک طرف مت جھک جاؤ۔

ش ط ن

شَطَنٌ مضبوط بٹی ہوئی لمبی رسی کو کہتے ہیں ۔ بِئْرٌ شَطُوْنٌ ۔ اس کنویں کو کہتے ہیں جس کی گہرائی بہت زیادہ ہو۔ لمبائی کی نسبت سے ہر اس شے کو جو بہت دور ہو ، شَطِیْنٌ یا شَاطِنٌ کہتے ہیں۔ الرمانی نے شَطَّ۔ شَطَنَ اور بَعُدَ (دور ہونے) کو مرادف المعنی لکھا ہے****۔ ابن فارس نے بھی

*محیط ۔ **تاج ۔ ***تاج و محیط و راغب ۔ ****الالفاظ المترادفة ۔

اس کے بنیادی معنی دور ہونے کے لکھے ہیں ۔ شَطَنَ کے معنے ہیں وہ بہت دور چلا گیا ۔ شَطَنَ صَاحِبَہٗ کے معنے ہیں اس نے اپنے ساتھی کے رخ اور قصد کی مخالفت کی ، اس کی نیت کے خلاف اپنی نیت رکھی ۔ یہیں سے اس کے معنے مخالفت اور سرکشی کے لئے جاتے ہیں* ۔ اسی سے لفظ شَیْطَانٌ بنا ہے ۔ جسکے معنے ہونگے (۱) خدا کی رحمتوں سے دور ۔ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم اور (۲) سیدھی راہ چھوڑ کر غلط راستے پر چلنے والا ۔ سرکش ۔

شَیْطٰنٌ ۔ ایک بدصورت سانپ کو بھی کہتے ہیں ۔ اور رُءُوْسُ الشَّیَاطِیْنِ ۔ ناگ پھنی تھوہر کو کہتے ہیں* ۔ (ابن فارس نے بھی اسکے یہی معنے لکھے ہیں) ۔

بعض کا خیال ہے کہ شَیْطَانٌ در اصل شَاطَ ۔ یَشِیْطُ سے مشتق ہے ۔ شَیْطٌ کے معنے ہیں جل جانا ۔ ہلاک ہو جانا ۔ شَاطَ الشَّیْئُ کے معنے ہیں وہ چیز جل گئی ۔ شَاطَ السَّمْنُ وَالزَّیْتُ ۔ گھی یا تیل اس قدر گرم ہوا کہ اس میں آگ سی لگنے لگی ۔ اس سے شَیْطَانٌ کے معنے سرکش ، شعلہ صفت اورتخریبی نتائج پیدا کرنے والے کے ہونگے** ۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا (۱۹/۴۴) ۔ شیطان احکام خداوندی سے سرکشی برتنے والا ہے ۔ سورۃ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے غصہ میں آکر اس قبطی کے مکا مارا جس سے وہ مر گیا تو آپ نے کہا کہ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ (۲۸/۱۵) ۔ یہ تو شیطانی کام ہو گیا ۔ اس سے ظاہر ہے کہ جذبات سے مغلوب ہو کر جو غلط کام کیا جائے اسے شَیْطَنَت سے تعبیر کیاجاتا ہے ۔ (نیز ۱۲/۵) ۔ جو لوگ نظام خداوندی کی مخالفت کرتے تھے ان کے سرغنوں کو بھی شَیَاطِیْنَ کہا گیا ہے ۔ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ (۲/۱۴) ۔ کے یہی معنی ہیں کہ جب یہ لوگ اپنی پارٹی کے لیڈروں کے پاس جاتے ہیں ۔

ان وحشی اور سرکش قبائل کے لوگوں کو بھی جنہیں حضرت سلیمانؑ نے مطیع بنا کر کام میں لگا رکھا تھا شَیٰطِیْنُ کہا گیا ہے (۲۱/۸۲ و ۳۸/۳۷) ۔ سانپ کے لئے یہ لفظ قصہ حضرت ایوبؑ میں آیا ہے (۳۸/۴۱) ۔ غریب القرآن (مرزا ابو الفضل) میں قاموس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شَیْطَانٌ کے معنے پیاس کی شدت کے بھی ہیں ۔ اس لئے حضرت ایوبؑ کے قصے میں اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطَانُ (۳۸/۴۱) کے معنے سانپ کا چھو جانا اور پیاس کا غلبہ دونوں ہوسکتے ہیں

*تاج و لین ۔ **عبرانی زبان میں شیطان کے معنے رکاوٹیں پیدا کرنے والے کے ہیں ۔

نیز (۸/۱۱) میں رِجْزَ الشَّیْطَانِ کے معنے پیاس کی وجہ سے پیدا شدہ کوفت اور نقاہت بھی ہو سکتے ہیں - قرآن کریم میں شَجَرَۃُ الزَّقُّوْمِ کے متعلق کہا گیا ہے طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ (۳۷/۶۵) یعنی اس میں سے جو پھوٹ کر نکلتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے جیسے سانپوں کے سر (پھن) جس طرح ناگ پھنی تھوہر کے چوڑے چوڑے پتے ہوتے ہیں -

کاہنوں اور نجومیوں کو بھی شَیَاطِیْنُ کہا گیا ہے (۳۷/۷ و ۶/۵) -

قرآن کریم کی رو سے ہر وہ قوت جو قانون خداوندی سے سرکشی اختیار کرتی ہے شَیْطَانٌ ہے، خواہ وہ انسان کے اپنے بے باک اور سرکش جذبات ہوں اور خواہ نظام خداوندی کی مخالف جماعتیں اور ان کے سرغنے - سرکشی اور تخریب ان سب کی امتیازی خصوصیت ہے، اور صحیح نظام کے قیام میں رکاوٹیں پیدا کرنا ان کا کام - شیطان اور طاغوت ایک ہی ہیں - اور طاغوت ہر غیر خداوندی قوت کا نام ہے - (۴/۷۶ و ۲/۲۵۶) -

[شَیْطَانٌ کے متعلق مزید بحث اِبْلِیْسُ کے عنوان (ب - ل - س) اور (ع - ب - د) میں دیکھئے] -

ش ع ب

اَلشَّعْبُ - جمع کرنا اور متفرق کرنا - پھاڑنا اور شگاف ڈالنا - (اضداد میں سے ہے) - راغب نے لکھا ہے کہ اَلشَّعْبُ کے معنے جمع کرنے اور متفرق کرنے کے اس لئے آتے ہیں کہ الشَّعْبُ مِنَ الْوَادِیْ، وادی کی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں اس کا ایک کنارہ ملتا ہو لیکن دوسرا کنارہ اس سے جدا ہوتا ہو - جب تم اس مقام کو دیکھو جہاں سے اس کا ایک سرا جدا ہو رہا ہے تو ایسا معلوم ہو کہ جیسے ایک چیز کے ٹکڑے ہو رہے ہیں، اور جب اس سرے کو دیکھو جہاں دوسرا سرا اس سے ملتا ہے تو یوں نظر آئے جیسے دو سرے باہم گر مل رہے ہیں - اس لئے اس کے معنے اکٹھا کرنے اور جدا کرنے، دونوں کے آتے ہیں* - ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے - یعنی اس میں اجتماع کے ساتھ افتراق اور افتراق کے ساتھ اجتماع پایا جاتا ہے -

اَلشَّعْبُ - بڑا قبیلہ - مختلف قبائل کا وہ جدِ اعلیٰ جس کی طرف وہ سب منسوب ہوتے ہیں، اور وہ انہیں ملا دیتا ہے - (جمع شُعُوْبٌ ۴۹/۱۳) - قبیلہ، شَعْبٌ سے چھوٹا ہوتا ہے - شُعْبَۃٌ کے معنے ہیں شاخ، کسی چیز

*راغب -

کا الگ ہوجانے والا ٹکڑا، دو سینگوں یا دو شاخوں کے درمیان کا حصہ ۔ اسکی جمع شُعَبٌ ہے (۷۷/۳۰)۔ نیز الشُّعْبَۃُ مِنَ الشَّجَرِ۔ درخت کی مختلف پھیلی ہوئی شاخیں ۔ اَلشِّعْبُ ۔ پہاڑ کے درمیان راستہ ۔ دو پہاڑوں کے درمیان جو کھلی ہوئی جگہ ہو ۔ شَعْبَانُ ۔ رمضان سے پہلا مہینہ ۔ اس مہینے میں عرب پانی کی تلاش اور لوٹ مار کے لئے منتشر ہو جاتے تھے* ۔ (متفرق ہو جانے کے معنوں میں) ۔

شُعَیْبٌ ۔ ایک نبی کا نام ہے جو قوم مدین کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ (بعض نے کہا ہے کہ یہ حضرت موسیٰؑ کے خسر تھے**) ۔ [مزید تفصیل ''شعیب'' کے عنوان میں ملے گی] ۔

قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ تمام نوع انسان امت واحدہ ، ایک عالمگیر برادری ہے (۲/۲۱۳) لیکن باہمی تعارف کی غرض سے یہ مختلف شعوب و قبائل میں بٹ جاتی ہے ۔ ان شعوب و قبائل کی تقسیم سے مقصد محض تعارف ہے ، جس طرح ہم اپنے بیٹوں کے نام رکھ لیتے ہیں تاکہ ان کے تعارف میں آسانی رہے ۔ اس سے کسی قسم کی برتری یا تفوق مقصود نہیں ہوتا ۔ اس لئے دنیا کی کوئی نسل ، کوئی قبیلہ ، کوئی قوم دوسروں سے افضل نہیں ۔ تمام انسان پیدائش کے لحاظ سے یکساں واجب التکریم ہیں (۱۷/۷۰)۔ مدارج کا معیار اعمال ہیں ۔ اور جو سب سے زیادہ اچھے اعمال و کردار کا حامل ہو وہ سب سے زیادہ واجب الاحترام ہوجاتا ہے ۔ یہ مطلب ہے اس آیت کا جس میں کہا گیا ہے کہ وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹/۱۳)۔ جس طرح کسی شہر کو مختلف محلوں میں بانٹ دینے سے غرض محض تعارف کی آسانی ہوتی ہے اسی طرح انسانوں کی قبائلی تقسیم بغرض تعارف تھی ۔ اگر انسانی تمدن ایسی شکل اختیار کر لے جس میں تعارف کا مقصد قبائلی تقسیم کے بجائے کسی اور طرح حاصل ہوجائے تو پھر اس تفریق کا بغرض تعارف باقی رکھنا بھی ضروری نہیں رہے گا۔ باقی رہا معاشرہ میں مدارج کا تعین ، سو اس کا مدار شرفِ انسانیت ہے ۔

ش ع ر

شَعْرٌ ۔ شَعَرٌ ۔ انسان کے جسم پر جو بال پیدا ہوتے ہیں انہیں کہتے ہیں ۔ (اونٹ کے بالوں کو وَبَرٌ اور بھیڑ کے بالوں کو صُوْفٌ کہتے ہیں ۔

*تاج ۔ **محیط ۔

یہ تینوں الفاظ ۸/۶۱ میں آئے ہیں) ۔ اگرچہ زمخشری کے نزدیک شَعَرٌ کا لفظ انسان اور غیر انسان سب کے بالوں کے لئے استعمال ہو سکتا ہے* ۔

الشِّعْرُ اور الشَّعْرُ ۔ کسی چیز کو سمجھ لینا ، جان لینا ، تاڑ لینا ، معاملات کی باریکیوں کو جان لینا ، حواس کے ذریعہ کسی شے کا ادراک کر لینا۔ اس سے فعل شَعَرَ ۔ یَشْعُرُ و شَعُرَ یَشْعُرُ آتے ہیں ۔ اس کے مصادر میں الشِّعْرُ والشَّعْر و الشُّعُوْرُ و الشِّعْرَی بالخصوص قابل ذکر ہیں ۔ اَشْعَرَهٗ ۔ اسے بتایا ، معلوم کرایا ۔ بعض نے کسی شے کا حواس کے ذریعہ ادراک کرلینا ہی اس کے بنیادی معنے قرار دئے ہیں* ۔ (ذہنی فلسفہ اور تجریدی تصورات عربوں کے ہاں شعور نہیں کہلاتے تھے ۔ ان تصورات کو شعور سے تعبیر کرنا عجمی اصطلاح ہے جو یونانی طرز فکر سے پیدا ہوئی ہے) ۔ پھر الشِّعْرُ کا عام استعمال کلام منظوم پر ہونے لگا ۔ اس کی وجہ راغب نے یہ بتائی ہے کہ شاعری عربوں کی نازک خیالیوں ، پوشیدہ رازوں اور بذلہ سنجیوں کا مجموعہ ہے ۔ شَاعِرٌ کو شاعر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنی فطانت و ذہانت سے ان معانی کا ادراک کر لیتا ہے جن کا ادراک عام لوگ نہیں کر سکتے ۔ کبھی شِعْرٌ سے جھوٹ بھی مراد لیتے ہیں ۔ اور شَاعِرٌ جھوٹ بولنے والے کو کہتے ہیں۔اور چونکہ بیشتر جھوٹ شاعری میں جگہ پاتا تھا اس لئے یہ مثل بن گئی تھی کہ اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَکْذَبُهٗ ۔ یعنی سب سے عمدہ شاعری وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ اپنے اندر رکھتی ہو ۔ مخالفین رسول اللہؐ کو شاعر اور قرآن کریم کو شعر اسی مفہوم کے اعتبار سے کہتے تھے* ۔

شِعَارٌ ۔ جنگ میں جو الفاظ بطور علامت (Code Word) استعمال ہوتے ہیں ، یا سفر میں اپنے قافلہ کو پہچاننے کے لئے جو نشان مقرر کیا جاتا ہے ، انہیں شِعَارٌ کہتے تھے ۔ اسی طرح حج میں لے جائے جانے والے جانور پر نشان لگانے کو اِشْعَارٌ کہتے تھے اور اس جانور کو شَعِیْرَةٌ ۔ اس کی جمع شَعَائِرُ ہے ۔

شِعَارُ الحَجّ ۔ حج کے مناسک و علامت اور آثار و اعمال کو بھی کہتے ہیں ۔ نیز تمام وہ اعمالِ حج جو خدا کی اطاعت کا اظہار کرنے کے لئے ادا کئے جاتے ہیں ۔ ان اعمال و علامات کے مقام کو مَشْعَرٌ کہتے ہیں ۔ اس کی جمع مَشَاعِرُ ہے ۔ اس معنے میں شَعَائِرُ بھی آتا ہے* ۔

شِعْرَیٰ ۔ ایک ستارہ کا نام ہے جو سخت گرمی کے زمانے میں نکلتا ہے اور بہت روشن ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں رَبُّ الشِّعْرَیٰ (۵۳/۴۹) اسی کے لئے

*تاج ۔

آیا ہے۔ جاھلیت میں بعض عرب قبائل اس کی پرستش کیا کرتے تھے*۔ لیکن اگر شِعْریٰ کو شَعَرَ سے مصدر مانا جائے تو اس کے معنے عقل و شعور ہوں گے۔

قرآن کریم میں عقل، شعور، فکر، تدبر، تفقہ، وغیرہ الفاظ مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ ہر مقام پر غور کرنے سے ان کا باریک اور لطیف فرق سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن ایک قدر مشترک سب میں ہے۔ اور وہ یہ کہ جو لوگ عقل و شعور سے کام نہیں لیتے وہ انہیں حیوانات سے بدتر اور جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے۔

قرآن کریم نے جہاں شاعری کی مخالفت کی ہے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ قرآن کریم کی رو سے نثر میں بیان کردہ مفہوم قابل قبول ہے اور نظم میں بیان کردہ مذموم۔ قرآن، اسلوب بیان سے بحث نہیں کرتا۔ مقصودِ بیان سے بحث کرتا ہے۔ شاعری سے اس کی مراد، وہ جذبات پرستی ہے جو حقائق سے بحث نہیں کرتی۔ چنانچہ سورۃ یٰسٓ میں جہاں اس نے کہا ہے کہ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (۳۶/۶۹)۔ ہم نے رسولؐ کو شعر کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی شاعری ایک پیغامبر انقلاب کے شایان شان ہوتی ہے'' تو اسکے ساتھ ہی یہ کہدیا کہ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ (۳۶/۶۹)۔ جو کچھ ہم نے رسولؐ کو دیا ہے وہ تاریخی شواھد اور زندگی کے بنیادی اصول اور واضح قوانین ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰)۔ جن لوگوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے یہ انہیں اسکے ذریعہ زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے۔ یعنے قرآن کریم، تاریخی شواھد اور زندگی کے ٹھوس حقائق سے بحث کرتا ہے۔ اور شاعری اسکے خلاف محض جذبات سے کھیلتی ہے۔ چنانچہ اس نے شاعروں کے متعلق کہدیا کہ وہ ایک ایسے اونٹ کی طرح، جسے جھوٹی پیاس (کی بیماری) اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر لئے لئے پھر رہی ہو**، جذبات کی وادیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں اور انکی ساری عمر ان باتوں میں گزر جاتی ہے جنہیں وہ کرکے کبھی نہیں دکھاتے (۲۶/۲۲۵-۲۲۶)۔ یہ روش زندگی ایک رسولؐ (اور اسکے متبعین) کے شایان شان نہیں۔ (کولرج کے الفاظ میں ***) شاعری کی ضد (Antithesis) نثر نہیں بلکہ سائنس ہے۔ قرآن کریم چونکہ سائنٹفک حقائق سے بحث کرتا ہے اسلئے شاعری (جو ان حقائق کی نقیض ہے) اس کی بارگاہ میں قبول نہیں ہو سکتی۔

---

*لسان العرب۔ ** دیکھو عنوان ھ۔ی۔م۔ *** Coleridge: Biographia Literaria

اس مقام پر اس حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہئیے کہ دیگر اقوام عالم (مثلاً اہل یونان وغیرہ) کیطرح ، عربوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ تھا کہ (کاہنوں اور نجومیوں کی طرح) شاعروں کو بھی الہام ہوتا ہے ۔ جسطرح آج بھی انگریزی زبان میں جب (Poet) کہا جاتا ہے تو اس سے مراد (Inspired) ہوتے ہیں ۔ یعنی (Poet) وہی ہوتا ہے جسے (Inspiration) ہوتا ہو ۔ قرآن ، وحی اور انسانی ملکات میں نہایت شد و مد سے تمییز کرتا ہے تاکہ یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے کہ خدا کیطرف سے براہ راست علم اور انکشافِ حقیقت صرف وحی کے ذریعے ہو سکتا ہے جو ایک نبیؑ کو ملتی تھی ۔ (اور سلسلہ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد ، اب کسی کو نہیں مل سکتی) ۔ وہ نہ کشف و الہام وغیرہ کی اصطلاحات کو تسلیم کرتا ہے اور نہ ہی انہیں خدا کی طرف سے براہ راست علم قرار دیتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سب انسانی جذبات کی پیدا کردہ کرشمہ سازیاں یا نفسیاتی قوت کی افسوں طرازیاں ہیں جنہیں علم و حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ۔ یہ وجہ بھی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ رسول شاعر نہیں ہوتا ، جسطرح وہ کاہن ، ساحر اور نجومی نہیں ہوتا ۔ ان کی طرف شیاطین (انسانی سرکش جذبات) '' وحی '' نازل کرتے ہیں (۲۶/۲۱۰) لیکن رسولؑ کیطرف وحی خدا کیطرف سے ہوتی ہے جس میں اس کے اپنے جذبات و احساسات کی کوئی آمیزش نہیں ہوتی (۵۳/۳-۴)۔ اصل یہ ہے کہ عربوں کے ہاں تصوف کی اصطلاح مروج نہیں تھی لیکن جن عناصر سے تصوف ترتیب پاتا ہے وہ انہیں اپنے ہاں کے شاعروں ، کاہنوں ، ساحروں وغیرہ میں موجود سمجھتے تھے ۔ قرآن کریم نے ان تمام کی تردید سے درحقیقت تصوف کے عناصر کی تردید کی ہے ۔ بالفاظ دیگر اگر عرب ، تصوف کی اصطلاح سے واقف ہوتے تو وہ یہ کہتا کہ تصوف ایک نبی کے شایان شان نہیں ۔ اسکی بجائے اس نے یہ کہا ہے کہ نبی شاعر اور ساحر اور کاہن نہیں ہوتا ۔ وہ خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل کرکے انسانی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیتا ہے ۔ تصوف یہ کچھ نہیں کر سکتا ۔

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق کہا گیا ہے کہ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۔ وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ (۲/۹) ۔ '' یہ لوگ اللہ اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دیتے ہیں ۔ لیکن یہ دھوکا دراصل ان کی اپنی ذات (نفس) کو ہوتا ہے اور یہ اس کا شعور نہیں رکھتے '' ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ لوگ دوسروں کو دھوکا دینے کی تدابیر تو شعوری طور پر کرتے ہیں لیکن غیر شعوری طور پر خود اپنی ذات کو دھوکا دیتے ہیں ۔

غور کیجئے شعور اور غیر شعوری نفسیاتی کیفیات کا یہ لطیف فرق کس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ مائدہ میں ہے لاَ تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ (۵/۲)۔شعائر اللہ کی بے حرمتی مت کرو۔ اسلام ایک دین ہے جو مملکت کی شکل میں متمکن ہوتا ہے۔ ایک مملکت کے کچھ شعائر (یعنی علامات یا Symbols) ہوتے ہیں جن کی تعظیم کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس مملکت کا احترام کرتے ہیں۔ مثلاً کسی سلطنت کا جھنڈا۔ جھنڈا ویسے تو کپڑے کے ایک ٹکڑے سے عبارت ہوتا ہے لیکن یہ نشانی ہوتا ہے اس مملکت کی۔ جھنڈے کے احترام کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس مملکت کا احترام کرتے ہیں۔ انہی علامات کو شَعَآئِرٌ کہا جاتا ہے۔ لہذا شَعَآئِرُ اللّٰہِ سے مراد، اس مملکت کی محسوس علامات ہونگے جو قوانین خداوندی (قرآنی نظام) کے نفاذ کے لئے دنیا میں قائم ہو۔ ان شعائر کا احترام درحقیقت ان قوانین کا احترام ہوگا۔ واضح رہے کہ ان شعائر کی پرستش نہیں کی جائیگی۔ صرف ان کا احترام کیا جائے گا۔ اور وہ بھی اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ یہ شعائر (علامات) فی ذاتہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے ان کا احترام، قوانین خداوندی کے احترام کا محسوس طریق ہے۔ اور بس۔

ش ع ل

اَلشُّعْلَۃُ۔ آگ کی لپک۔ لکڑی یا ایندھن جس میں آگ مشتعل ہو۔ اَلشَّعِیْلَۃُ۔ جلتی ہوئی بتی۔ اَلْمَشْعَلُ۔ قندیل۔ شَعَلَ النَّارَ فِی الْحَطَبِ۔ اسنے لکڑیوں میں آگ بھڑکا دی۔ اِشْتَعَلَتِ النَّارُ۔ آگ لگ گئی اور بھڑکی *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کے کناروں کا منتشر (بکھرا ہوا) ہو جانا۔ آگ کے بھڑکنے میں بھی کیفیت ہوتی ہے۔

اِشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا۔ سر میں سفید بالوں کا بکثرت پھیل جانا اور اسطرح سر کا سفیدی سے بھڑک اٹھنا **۔ یا سر میں سفید بالوں کا نمودار ہوجانا۔ سورۃ مریم میں حضرت زکریاؑ کے متعلق بھی الفاظ آئے ہیں (۱۹/۴)۔

شعیب علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے ہاں (ان کی تیسری بیوی—قطورا—سے) جو اولاد پیدا ہوئی ان میں ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ یہ حجاز کے شمال میں شام سے

* تاج و راغب ** محیط۔

متصل علاقہ میں ، سکونت پذیر ہؤا اور اس کی نسل ، تاریخ کے اوراق میں قومِ مدین کے نام سے متعارف ہوئی ۔ ان کا زمانہ قریب ۲۰۰۰ ق-م سمجھنا چاہئے ۔ یہ قوم بہیں بڑھی پھولی ۔ قریب چار سو سال تک ان کی یہی حالت رہی۔ تاآنکہ ان میں حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی ۔ جب حضرت موسیٰؑ مصر سے بھاگ کر نکلے ہیں، تو مدین کی بستی کی طرف ہی آئے تھے ۔ قرآن کریم میں ہے کہ یہاں انہوں نے ایک مرد بزرگ کے ہاں رہائش اختیار کرلی اور گلہ بانی کی خدمت سنبھال لی ۔ اس مردِ بزرگ نے اپنی بیٹی کا عقد حضرت موسیٰؑ سے کردیا ۔ (دیکھئے (۲۰/۴۰ و ۲۸/۲۲-۲۸) قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ مرد بزرگ کون تھے ۔ لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ آپ حضرت شعیبؑ تھے ۔ توراۃ میں ان کا نام کہیں راعوایل ۔ کہیں یترو اور کہیں حوباب لکھا ہے ۔ مورخین کا خیال ہے کہ آپ کا نام حوباب ہی تھا (توراۃ ۔ کتاب گنتی ۲۹/۱۰) ۔ اور باقی نام ان کے القاب تھے ۔ اور یہی حوباب قرآن کریم میں شعیبؑ کے نام سے موسوم ہیں۔ اس اعتبار سے حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کا زمانہ ایک ہی ہے ۔ یعنی قریب ۱۷۰۰/۱۶۰۰ ق-م ۔

توراۃ میں مذکور ہے کہ مدین کا ایک اور بھائی تھا جس کا نام یقشان تھا ۔ اس کا بیٹا دوان اپنے چچا مدین کے قریب ہی آباد ہوگیا ۔ یہ علاقہ بہت سرسبز و شاداب اور گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہؤا تھا ۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت شعیبؑ قوم مدین کی طرف (۲۹/۳۶) اور اصحاب الایکہ کی طرف (۲۶/۱۷۶-۱۷۷) مبعوث ہوئے تھے ۔ ارباب تحقیق کا خیال ہے کہ اصحاب الایکہ ، بنو دوان ہی تھے ۔ قرآن کریم نے قومِ مدین اور اصحاب الایکہ کا ذکر اس انداز سے کیا ہے گویا یہ ایک ہی قبیلہ کے لوگ تھے ۔

حضرت شعیبؑ نے انہیں جو تلقین کی اُس سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں کس کس قسم کے جرائم پیدا ہوچکے تھے ۔ آپ نے ان سے کہا ۔ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۸۵) ۔ اے میری قوم! اللہ کی محکومی اختیار کرو ۔ اس کے سوا تمہارا کوئی اور الٰہ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۔ ۔ ۔ ۔ (۷/۸۵) ۔ تمہیں چاہئے کہ ماپ تول پورا پورا کرو ۔ لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو ۔ ملک کی اصلاح کے بعد اس میں فساد مت پیدا کرو۔

اس سے واضح ہے کہ اس قوم میں سخت معاشی ناہمواریاں پیدا ہو چکی تھیں جنہیں دور کرنے کے لئے حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے ۔ آپ نے ان

تک اپنی دعوت پہنچائی اور (حسب معمول) قوم کے سرمایہ دار طبقہ (سرداران قوم) نے آپ کی سخت مخالفت کی اور دھمکی دی کہ آپ اور آپ کے ساتھی انہی کا مسلک اختیار کرلیں ورنہ وہ ان سب کو بستی سے نکال دینگے (۷/۸۸)۔

سورۃ ھود میں اسی قوم کی طرف سے ایک ایسا اعتراض کیا گیا ہے ۔ جو اسلام کی ایک عظیم حقیقت کو اپنے آغوش میں لئے ہے ۔ انہوں نے کہا یٰشُعَیْبُ ۔ أَصَلٰوتُکَ تَأْمُرُکَ أَنْ نَتْرُکَ مَا یَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِیْ أَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ..... (۱۱/۸۷) ۔ ''اے شعیب ! کیا تیری صلوٰۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ (ہمیں کہے کہ) ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے آباء و اجداد پوجتے رہے ہیں ۔ یا ہم اپنے مال و دولت میں جس قسم کا تصرف کرنا چاہیں نہ کریں؟

اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں صلوٰۃ اور معاشیات کا تعلق کس قدر گہرا ہے ۔ صلوٰۃ سے مقصود ہے قوانین خداوندی کا اتباع ۔ اور قوانین خداوندی معاشیات کو بھی اپنے دائرے کے اندر رکھتے ہیں ۔ اس لئے صلوٰۃ اور معاشیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔

قوم نے اپنی حالت میں اصلاح نہ کی اور ضد اور سرکشی میں آگے بڑھتی گئی ، تاآنکہ وہ تباہ و برباد ہوگئی ۔ سورۃ اعراف میں ہے فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ (۷/۹۱) ۔ ''انہیں لرزا دینے والی ہولناکی نے آ لیا'' ۔ سورۃ ھود میں اَلصَّیْحَةُ کا لفظ آیا ہے (۱۱/۹۴) ۔ اس کے معنے بھی سخت آواز کے ہیں ۔ سورۃ شعراء میں اسے یَوْمِ الظُّلَّةِ (۲۶/۱۸۹) کہا گیا ہے ۔ ''یعنی سائے والا دن'' ۔ معلوم ہوتا ہے کہ سخت آواز کے ساتھ زلزلہ آیا جس سے آتش فشاں پہاڑوں سے دھوئیں کے بادل نکلے ۔ اور اس طرح یہ قوم تباہ ہوگئی ۔

(طبعی حوادث اور عذاب خداوندی کا باہمی تعلق کیا ہے ۔ اس کے لئے میری کتاب ''جوئے نور'' میں حضرت نوح کا عنوان دیکھئے) ۔

ش غ ف

اَلشَّغَافُ ۔ دل کے غلاف یا پردہ کو کہتے ہیں ۔ نیز دل کا اندرونی حصہ ۔ سویدائے قلب ۔ شَغَفَهٗ ۔ اُس کے غلافِ دل تک پہنچ گیا ۔ شَغَفَهُ الْحُبُّ ۔ محبت اس کے غلاف دل تک پہنچ گئی ۔ محبت نے اس کے غلافِ دل کو شق کر دیا (بیضاوی) اور اندر داخل ہو گئی*۔ اسلئے انتہائے محبت کو اَلشَّغَفُ کہتے ہیں**۔

*تاج ۔ **محیط ۔

سورۃ یوسف میں ہے قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا (۱۲/۳۰) ۔ "محبت کی وجہ سے یوسف اس کے دل کے اندر اتر گیا"۔ یعنی یوسف کی محبت اس کے دل کی گہرائیوں تک اتر گئی ۔

ش غ ل

اَلشُّغْلُ ۔ اَلشُّغُلُ ۔ اَلشَّغْلُ ۔ اَلشَّغَلُ ۔ مشغلہ ، مصروفیت ، ایسا کام جس میں مصروف ہو کر انسان دیگر امور پر توجہ نہ دے سکے۔ اِشْتَغَلَ فِيْهِ السَّمُّ ۔ زہر اس میں سرایت کر گیا ۔ مَالٌ مَشْغُوْلٌ ۔ وہ مال جو تجارت میں لگا ہوا ہو* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ فَرَاغٌ (یعنی خالی ہونا) کی ضد ہے ۔

قرآن کریم میں ہے شَغَلَتْنَا اَمْوَالُنَا (۴۸/۱۱) ۔ ہمارے اموال نے ہمیں اس طرح اپنے آپ میں جذب کر رکھا ہے کہ ہمیں کسی دوسری طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ۔

سورۃ یٰسٓ میں اہل جنت کے متعلق ہے فِىْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ (۳۶/۵۵)۔ وہ (ہر وقت) کسی نہ کسی کام میں مصروف رہینگے اور وہ مصروفیت ان کے لئے کیف آور اور نشاط بخش ہوگی جس میں وہ بطیب خاطر مشغول ہونگے ۔

ش ف ع

شَفْعٌ ۔ اس لفظ کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ دو چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متصل کر دینا اور اس طرح ایک کو دوسرے کا (زَوْجٌ) جوڑا بنا دینا** ۔ وَتْرٌ کے معنے ہیں اکیلا رہنا (طاق ہونا) اور شَفْعٌ کے معنے ہیں زَوْجٌ (جفت) ہونا*** ۔ راغب نے کہا ہے کہ شَفْعٌ کے معنے کسی چیز کو اُس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے اور ضم کر دینے کے ہیں ۔ اور شَفَاعَةٌ کے معنے دوسرے کے ساتھ اس کی مدد کرتے ہوئے یا اس کی خبر گیری کرتے ہوئے مل جانے کے ہیں*** ۔ شُفْعَةٌ کے معنے ہوتے ہیں کوشش کرکے مطلوبہ شے کو اپنی چیزوں میں ملا لینا اور اس طرح اپنی چیز کو بڑھا لینا*** ۔ فقہ کی اصطلاح میں یہ ایک خاص حق ملکیت ہوتا ہے جس کو رکھنے والا وہ قیمت دے کر جائداد کا مالک بنا دیا جاتا ہے جو قیمت دوسرے لوگ اس جائداد کی لگائیں** ۔ عَيْنٌ شَافِعَةٌ ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔

وہ آنکھ جو کمزوری کی وجہ سے ایک چیز کو دو دیکھے ۔ نَاقَۃٌ شَافِعٌ ۔ وہ اونٹنی جس کا ایک بچہ اس کے پیچھے لگا ہو ۔ اور دوسرا پیٹ میں ہو ۔ نَاقَۃٌ شَفُوْعٌ ۔ وہ اونٹنی جو ایک مرتبہ دودھ دوھنے میں دونوں وقت کا دودھ اکٹھا دے دے* ۔ اَلشَّفَائِعُ ۔ مختلف قسم کے گھاس جو دو دو ہو کر اکٹھے اُگیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلشَّاۃُ الشَّافِعُ اس بکری کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی ہو ۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ شَفْعٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جانا اور اس طرح ایک سے دو ہو جانا ۔ اس کے بعد شَفَاعَۃٌ کے معنے سفارش اس لئے ہو گئے کہ اس میں ایک شخص کسی دوسرے شخص کی معاونت کے لئے اس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کے حق میں سفارش کرتا ہے* ۔ نیز اس کے معنے دعا کرنے کے بھی آتے ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ شَفَعَ فَلَانٌ لِفَلَانٍ ۔ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی کسی کے ساتھ اس کا مددگار بن کر آئے اور جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کے حصول کا طلبگار ہو ۔

قرآن کریم انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی سکھاتا ہے کیونکہ فرد کی صلاحیتوں کی نشوونما اور اس کی ذات کی بالیدگی اجتماعی نظام ہی میں ممکن ہے ۔ اس اعتبار سے جماعتِ مومنین کا ہر فرد دوسرے کا شَفِیْعٌ ہوتا ہے ۔ یعنے اس کی معاونت کے لئے ہر وقت اس کے ساتھ ۔ اور اس نظام کا مرکز (امیر) ہر ایک کا شَفِیْعٌ ۔ وہ افرادِ کارواں میں سے کسی کو محسوس ہی نہیں ہونے دیتا کہ وہ تنہا ہے ۔ یہی باہمگی (شفاعت) اس کی بنیادی خصوصیت ہے ۔

اس جماعت کی یہ شَفَاعَۃٌ (معاونت) اپنے حلقہ سے باہر بھی جاتی ہے ۔ اس لئے کہ ان کا فریضہ تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت ہوتا ہے ۔ اسکے لئے ان سے کہا گیا ہے کہ یہ بِرٌّ و تَقْوٰی (کشادگی اور قوانین خداوندی کے مطابق) کاموں میں دوسروں سے تعاون کریں لیکن ان کے برعکس اِثْم وعُدْوَان میں تعاون نہ کریں ($\frac{5}{2}$) ۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا گیا کہ مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً حَسَنَۃً یَّکُنْ لَّہٗ نَصِیْبٌ مِّنْھَا وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً سَیِّئَۃً یَّکُنْ لَّہٗ کِفْلٌ مِّنْھَا ($\frac{4}{85}$) ۔ جو شخص حسن کارانہ انداز میں (اچھے کام میں) کسی دوسرے کے ساتھ مدد کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اسے اس میں سے حصہ مل جاتا ہے ۔ اور جو شخص تخریبی انداز سے (برے کام میں) کسی کا ساتھ دیتا ہے تو اس کو بھی

*تاج ۔

اس میں سے حصہ مل جاتا ہے۔ واضح رہے کہ تعاون میں ایک دوسرے کی مدد کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن شفاعت میں ایک شخص، دوسرے شخص کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

اب اس سے آگے بڑھئے۔ ہمارے ہاں مروجہ عقیدہ یہ ہے کہ جب قیامت میں حساب کتاب ہوگا اور مجرمین کو دوزخ کی سزا کا حکم ہو جائیگا تو خدا کے مقرب بندے، بالخصوص حضرات انبیاء کرام (اور ان میں سے بھی خصوصیت کے ساتھ نبی اکرمؐ) خدا کے حضور ان مجرمین کی سفارش کرینگے اور ان کی سفارش پر اللہ تعالیٰ انہیں بخش دیگا۔ اور وہ جنت میں چلے جائینگے۔ اسے شفاعت کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ دین کی ساری عمارت منہدم کر دیتا ہے جسکی بنیاد قانون مکافات عمل پر ہے۔ مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (۹۹/۷-۸)۔ ہر عمل کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوتا ہے اور سامنے آجاتا ہے۔ نظر آتا ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ ہمارے دور ملوکیت کی پیداوار ہے جب مستبد حکمرانوں کے مقربین ان کے پاس لوگوں کی سفارش کیا کرتے تھے اور انکی سفارش پر مجرمین کو معافی مل جایا کرتی تھی۔ اسکے ساتھ ہی اس عقیدہ کو عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ نے بھی تقویت دی۔ وہ جب کہتے ہونگے کہ ہمارے رسول (حضرت عیسیٰؑ) کو دیکھو کہ جو شخص ان پر ایمان لے آتا ہے وہ اسکے گناہوں کا کفارہ دیکر اسے جہنم سے بچا لیتے ہیں۔ اس کے برعکس تمہارا رسولؐ گنہگاروں کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تو اس اعتراض کے پیش نظر اس قسم کی روایات وجود میں آگئیں کہ قیامت میں جب حساب کتاب ہو چکے گا اور مجرمین دوزخ میں بھیجدئے جائینگے تو نبی اکرمؐ سجدے میں گر جائینگے اور جب تک اللہ تعالیٰ آپ کی امت کے تمام افراد کو دوزخ سے نکال کر جنت میں نہیں بھیجدیگا حضورؐ نہ سجدے سے سر اٹھائیں گے نہ خود جنت میں جائینگے۔ اس سے عیسائیوں کے اعتراض کا تو جواب وضع کر لیا گیا لیکن دین کی ساری عمارت بنیاد سے ہل گئی اور قوم تباہیوں کے جہنم میں جا گری۔ قرآن کریم سے اس قسم کی شفاعت کی کوئی سند نہیں ملتی (نہ ہی اس میں اس قسم کے عقیدہ کی گنجائش ہو سکتی تھی)۔ اس میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ قانون مکافات کی رو سے لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا تُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (۲/۴۸)۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کسی کام نہیں آسکے گا۔ نہ ہی کسی کی شفاعت (سفارش) قبول کی جا

سکے گی نہ ہی کسی سے اسکے گناہوں کا معاوضہ لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اور نہ ہی مجرمین کی کوئی مدد کرسکیگا۔

شفاعت کے عقیدہ کی تائید میں قرآن کریم کی اس قسم کی آیات پیش کر دی جاتی ہیں جن میں (مثلاً) آیا ہے مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲/۲۵۵) - "وہ کون ہے جو اسکے پاس اسکے اذن کے بغیر شفاعت کرے"۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کی اجازت سے شفاعت کی جا سکتی ہے اور حضورؐ اپنی امت کی شفاعت خدا کی اجازت ہی سے کرینگے۔

لیکن ان آیات سے اس قسم کا نتیجہ نکالنا غلط ہے۔ سب سے پہلے تو اسلئے کہ اس قسم کی شفاعت کا عقیدہ قانون مکافات کے یکسر خلاف ہے جو قرآن کریم میں شروع سے آخر تک مسلسل بیان ہو رہا ہے۔ لہذا اگر قانونِ مکافات کے ساتھ شفاعت کا عقیدہ بھی اسی قرآن کریم میں موجود ہو تو اسکے یہ معنے ہوں گے کہ قرآن کریم میں (معاذ اللہ) متضاد عقائد دئے گئے ہیں۔ مثلاً اسی آیت کو دیکھئے جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔ اس سے پہلی آیت یہ ہے "اے ایمان والو! جو کچھ تمہیں اللہ نے دیا ہے اسے (ربوبیت عامہ کیلئے) کھلا رکھو قبل اس کے کہ وہ وقت آجائے لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ (۲/۲۵۴) - جسمیں نہ گناہوں کی قیمت ادا کرکے جنت خریدی جاسکے گی۔ نہ کسی بزرگ کی دوستی کسی کے کام آئیگی۔ اور نہ ہی کسی کی شفاعت۔ اسکے بعد اگلی آیت میں ہے مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲/۲۵۵)۔ اس کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ خدا کی اجازت سے سفارش کی جا سکے گی اور یہ سفارش قبول بھی ہو جائیگی تو ان دونوں آیات میں کھلا ہوا تضاد پایا جائیگا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس (دوسری) آیت کا صحیح مطلب کیا ہے؟ قانون مکافات کی رو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا رہتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے جزا و سزا کی مجرد حقیقت کو سمجھانے کیلئے تشبیہاً ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے ملزموں کی عدالت میں پیشی ہوتی ہے اور مقدمہ کی سماعت کے بعد حکم سنایا جاتا ہے۔ مقدمہ میں حاکم کے علاوہ، ملزم ہوتا ہے۔ مستغیث ہوتا ہے۔ گواہ ہوتے ہیں۔ پولیس کے سپاہی ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم نے اسی قسم کے استعاروں میں حقیقت کو بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ہے کہ جس شخص کا احتساب ہو رہا ہوگا وہ عدالت کے کٹھرے میں اکیلا کھڑا ہوگا۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ ..... وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمْ ... (۶/۹۵)۔ تم ہمارے حضور تنہا پیش ہوگے .... تمہارے ساتھ

کھڑا ہونے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اور ''پولیس کا سپاہی'' تمہیں پیچھے سے ہانکتا ہوا ہمارے سامنے لائیگا۔ وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ . . . . . (۵۰/۲۱) ۔ ''ہر شخص کے ساتھ ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہوگا''۔ اس کے علاوہ گواہ بھی ہونگے . . . . وَشَهِيْدٌ (۵۰/۲۱) ۔ یہ گواہ خود بخود اس شخص کے ساتھ کھڑے نہیں ہوجائیں گے ۔ ان میں سے جسے بلایا جائے گا وہ آجائیگا اور اسے گواہی دینے کی اجازت دی جائیگی۔ یہ ہیں وہ شَفِيْعٌ (ساتھ کھڑے ہونے والے) جن کا ذکر قرآن کریم کی اس قسم کی آیات میں آیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ مَنْ ذَا الَّذِىْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (۲/۲۵۵)۔ ''وہ کون ہے جو خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور کسی کے ساتھ کھڑا ہوسکے''، یہ گواہ رسول بھی ہونگے جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ (۵/۱۰۹) ۔ جس دن اللہ رسولوں کو جمع کریگا اور ان سے پوچھے گا کہ تمہاری دعوت کا جواب کس طرح دیا گیا تھا؟ اور رسولوں کے علاوہ (ملائکہ) کائناتی قوتیں بھی اس طرح بلائی جائیں گی۔ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (۷۸/۳۸) ۔ جس دن ''اَلرُّوْحُ'' اور ملائکہ '' صف باندھے کھڑے ہونگے اور کوئی بات نہ کر سکینگے سوائے اس کے جسے رحمان اجازت دے اور وہ درست بات کہے''۔ لہٰذا ان آیات میں شفاعت کے معنی شہادت کے ہیں۔ اس لئے کہ کسی کے حق میں سچی شہادت دیدینا بھی اس کی بہت بڑی مدد ہوتی ہے۔ اسکی وضاحت خود قرآن نے کردی ہے جہاں فرمایا وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ . . . . . (۴۳/۸۶) ۔ جنہیں یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ اس کا اختیار وہ رکھتا ہے جو حق کے ساتھ شہادت دیتا ہے ۔ یعنی شفاعت کے معنی شہادت ہیں ۔ اسی التباس کے رفع کرنے کے لئے قرآن کریم نے رسول اللہ کو شَهِيْدٌ کہا ہے ۔ (۱۶/۸۹)۔ شَفِيْعٌ کہیں نہیں کہا ۔ اور دوسرے مذاہب کے لوگ جو شفاعت کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کے متعلق متعدد مقامات پر کہہ دیا کہ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (۷۴/۴۸) ۔ انہیں ان کے سفارشیوں کی سفارش کچھ کام نہیں دے سکتی ۔ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۵) ۔ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا ۔ جنت فقط اعمال کے بدلے ملتی ہے ۔ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۷/۴۳) سفارشوں سے جنت حاصل کرنے کا عقیدہ اس قوم میں پیدا ہوتا ہے جو قوتِ عمل سے محروم

ہو جاتی ہے ۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس قسم کا عقیدہ یہودیوں میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب وہ اپنی پستیوں کی انتہا تک پہنچ چکے تھے ۔ وہ کہتے تھے کہ ہم بجز چند دنوں کے کبھی جہنم میں نہیں رہینگے ($\frac{۲}{۸۰}$) ۔ اس پر قرآن کریم نے کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے اس قسم کا کوئی عہد لے رکھا ہے؟ اور پھر خود ہی کہہ دیا کہ ان سے کہدو کہ یہ سب عقائد غلط ہیں ۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو بھی غلط روش اختیار کریگا وہ تباہ و برباد ہوگا ۔ اور جو ایمان کے ساتھ عمل صالح کرے گا وہ جنت کا وارث ہوگا ۔ ($\frac{۲}{۸۱ \cdot ۸۲}$) ۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ

(۱) اس دنیا میں شفاعت کے معنے ہونگے کسی کام میں کسی کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہوجانا ۔ اگر وہ کام اچھا ہے تو اس ساتھ ہونے والے کو بھی اس کا اچھا اجر ملے گا ۔ اگر وہ کام برا ہے تو یہ بھی مجرم کے ساتھ سزا کا کچھ حصہ پائیگا ۔

(۲) آخرت میں شفاعت کا تصور اس قسم کا ہے جیسے کوئی گواہ کسی کے حق میں سچی شہادت دینے کے لئے کھڑا ہو جائے ۔ یہ تمثیلی بیان ہے ۔

(۳) مجرموں کا کسی کی سفارش سے چھوٹ جانا ، یا کسی کی سفارش سے کسی کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ حق دار نہیں ، قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے ، اس لئے شفاعت کا یہ مفہوم صحیح نہیں ۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آئے ، سیاق و سباق سے دیکھ لینا چاہئے کہ وہاں کونسا مفہوم متصور ہے ۔

سورۃ الفجر میں ہے وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ($\frac{۸۹}{۳}$) ۔ اس کے معنے ہیں وہ ستارے جو ملکر رہتے یا چلتے ہیں اور وہ جو الگ الگ رہتے یا چلتے ہیں ۔ یعنی اکٹھے نظر آنے والے اور الگ الگ دکھائی دینے والے ستارے ۔

ش ف ق

اَلشَّفَقَ ۔ وہ سرخی جو غروب آفتاب سے شروع ہوکر کچھ دیر بعد تک رہتی ہے ۔ راغب نے لکھا ہے کہ شَفَق* ، غروب آفتاب کے وقت ، دن کی روشنی کے رات کی تاریکی میں ملنے کو کہتے ہیں ۔ نیز کنارہ کو بھی شَفَق* کہتے ہیں * ۔ قرآن کریم میں ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ($\frac{۸۴}{۱۶}$) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں رقت (کمزوری) کے ہونے ہیں ۔

---

*تاج ۔

اَلشَّفَقُ - اَلشَّفَقَةُ - کسی کے ساتھ بہت زیادہ خیر خواہی کی بناء پر اس قسم کا ڈر کہ ایسے کہیں یہ نہ ہو جائے اور وہ نہ ہو جائے - اَشْفَقَ مِنْہُ - اس سے ڈرا - گھبرایا - اَشْفَقَ عَلَیْہِ - محبت کی وجہ سے اسکی دیکھ بھال کی اور اس پر کوئی تکلیف آنے سے ڈرتا رہا * - ایسے خیر خواہ کو مُشْفِقٌ اور شَفِیْقٌ کہتے ہیں - چونکہ خوف، کمزوری کی علامت ہوتا ہے اس لئے اَلشَّفَقَۃُ کمزوری کو بھی کہتے ہیں - ثَوبٌ شَفَقٌ - کمزور کپڑا ** - چونکہ اس میں خوف اور کمزوری کا پہلو ہوتا ہے اسلئے اس صفت کو خدا کی طرف منسوب نہیں کرتے -

راغب نے کہا ہے کہ جب اس کے بعد مِنْ آئے تو اس میں خوف کا پہلو زیادہ ہوتا ہے اور فِیْ آئے تو خیر خواہی اور مہربانی کا پہلو نمایاں *** - لیکن تاج نے اسی عبارت میں بجائے فِی کے عَلٰی لکھا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے -

سورۃ احزاب میں ہے اَشْفَقْنَ مِنْہَا ($\frac{۳۳}{۷۲}$) - انہوں نے اس سے خوف کھایا - وہ حملِ امانت (امانت میں خیانت کرنے) سے ڈر گئے - سورۃ انبیاء میں ہے وَھُمْ مِنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ ($\frac{۲۱}{۲۸}$) - وہ اس (کے قانون کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج) سے ڈرتے ہوئے اس سے خوف کھاتے ہیں - یعنے وہ اپنی بہتری اسی میں سمجھتے ہیں کہ اس قانون کا اتباع کرتے رہیں -

ش ف ہ

شَفَہَہٗ عَنْہُ شَفْہًا - اس نے اسے کسی کام میں لگا کر اس کی توجہ دوسرے کاموں سے ہٹا دی - شَفَہَہٗ - اس کے ہونٹ پر مارا - شَافَہَہٗ - اس سے بالمشافہہ بات کی - شَفَۃٌ ہونٹ - دو ہونٹوں کو شَفَتَانِ اور شَفَتَیْنِ کہینگے - جمع شِفَاہٌ اور شَفَوَاتٌ آتی ہیں * -

قرآن کریم میں شَفَتَیْنِ ($\frac{۹۰}{۹}$) - دو ہونٹوں کے لئے آیا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلشَّفَۃُ کے مادہ میں آخری حرف واو بھی ہو سکتا ہے اور ھاء بھی جو محذوف ہے **** -

بعض علمائے لغت نے شَفَۃٌ کی اصل شَفَوٌ قرار دی ہے - اس لئے ہم نے اسے ش - ف - و میں بھی لکھا ہے - وہاں بھی دیکھ لیا جائے -

* تاج - ** محیط - *** راغب - **** ابن فارس -

ش ف و

اَلشَّفَا ۔ چیز کا کنارہ ۔ ہر چیز کی حد ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ شَفَا (ش ۔ ف ۔ و) سے ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں فاء ۔ باء سے بدلی ہوئی ہو ۔ یعنی شبا بدل کر شفا ہو گیا ہو ۔ جب سورج غروب ہو رہا ہو تو کہتے ہیں مَابَقِيَ مِنْهُ إِلاَّ شَفًى ۔ یعنے اس کا بہت تھوڑا حصہ باقی رہ گیا ہے* ۔ اس سے اس کے معنے ہلاکت سے قریب ہونے کے آتے ہیں ۔ شَفَتِ الشَّمْسُ ۔ آفتاب غروب ہونے کے قریب ہو گیا** ۔

قرآن کریم میں ہے عَلٰى شَفَا جُرُفٍ (۹/۱۰۹) گرتے ہوئے ساحل کے کنارے پر ۔ نیز شَفَا حُفْرَةٍ (۳/۱۰۲) ۔ گڑھے کے کنارے پر ۔

اَلشَّفَةُ ۔ ہونٹ کو کہتے ہیں جس کی جمع شَفَوَاتٌ اور شِفَاهٌ آتی ہے ۔ اس سے مُشَافَهَةٌ منہ در منہ بات کرنے کو کہتے ہیں** ۔ قرآن کریم میں شَفَتَيْنِ (۹۰/۹) ۔ دو ہونٹوں کے لئے آیا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے (الشَّفَةُ) میں واو محذوف ہو اور یہ بھی کہ ہاء محذوف ہو ۔ (نیز دیکھئے عنوان ش ۔ ف ۔ ہ)

ش ف ی

شَفَاهُ ۔ يَشْفِيهِ ۔ شِفَاءً ۔ اسے شفاء دی ، بیماری سے ٹھیک کیا ۔ اَلشِّفَاءُ کے معنے بیماری سے اچھا ہونے کے ہیں ۔ پھر اسے دوا اور علاج کے معنوں میں بھی استعمال کرنے لگے** ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ مرض کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ (۲٦/۸۰) ۔ ''جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا بخشتا ہے'' ۔ اور دوا کے معنوں میں بھی ۔ فِيْهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ (۱٦/٦۹) ۔ اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کنارے پر آجانے اور اوپر سے جھانکنے کے ہیں ۔ اس کا خیال ہے کہ شفاء مرض پر غالب آنے کی وجہ سے شفاء کہلاتی ہے ۔

ش ق ق

شَقَّهُ ۔ يَشُقُّهُ ۔ شَقًّا ۔ کسی چیز کو پھاڑنا ۔ اس میں شگاف کرنا اِنْشَقَّ ۔ پھٹ گیا ۔ اَلشَّقُّ ۔ صبح** ۔ اِنْشَقَّتِ الْعَصَا ۔ شیرازہ بکھر گیا ۔

---

*محیط ۔ **تاج ۔

باھمی اختلافات شروع ھوگئے۔ شَقَّ عَصَاالْمُسْلِمِیْنَ ۔ اس نے مسلمانوں کی جماعت اور ان کی وحدت میں افتراق و انتشار پیدا کر دیا ۔ اَلْمُشَاقَّةُ وَ الشِّقَاقُ ۔ مخالفت ۔ عداوت ۔ باھمی اختلاف*۔ شِقٌّ ۔ مشقت ۔ صعوبت ۔ کوفت ۔ پوری قوت لگانے اور تگ و دو کرنے سے تھک جانا ۔ تکان ۔ شَقَّ عَلَیْهِ الْاَمْرُ ۔ معاملہ اس پر گراں گزرا ۔ شَقَّ عَلَیْهِ ۔ اسے مشقت میں ڈال دیا *۔

اَلشُّقَّةُ ۔ مسافت کا بُعد ۔ سفرِ بعید* (۴۲/۹) ۔ وہ منزل مقصود جس تک بہ مشقت پہنچا جائے ۔

قرآن کریم میں پتھروں کے پھٹنے کےلئے شَقَّ اور چشموں کے پھوٹنے کے لئے فَجَرَ کے مادے آئے ھیں (۷۴/۲) ۔ سورة صٓ میں شِقَاقٍ (۲/۳۸) مخالفت کے معنوں میں آیا ھے ۔ اور (۳/۵۹) میں شَاقٌّ مخالفت اور اختلاف کے معنوں میں استعمال ھوا ھے ۔ سورة عبس میں ھے ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا (۲۶/۸۰) ۔ ''پھر ھم زمین کومحسوس طور پر پھاڑتے ھیں''۔سورة قصص میں ھے وَمَا اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ (۲۷/۲۸) ۔ میں نہیں چاھتا کہ تم پر کوئی سختی کروں یا کٹھن ذمہ داری ڈالوں ۔ سورة نحل میں شِقٌّ کے معنے مشقت کے آئے ھیں (۷/۱۶)۔

شَاقَّ کے معنے ھیں مخالفت کرنا ۔ عداوت کرنا ۔ جداگانہ روش اختیار کرنا ۔ مَنْ یُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ (۱۱۵/۴) ۔ شِقَاقٌ ۔ اختلاف ایک دوسرے سے جدا ھوجانا (۳۵/۴) ۔ قرآن کریم میں ھے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (۱/۵۴) ۔ انقلاب کی گھڑی قریب آئی اور ''القمر'' شق ھوگیا ۔ اس کے مفہوم کے لئے عنوان (ق ۔ م ۔ ر) دیکھئے ۔

ش ق ی (و)

اَلشَّقَاءُ ۔ شدت اور تنگی ۔ نا مرادی اور محرومی ۔ شَقِیَ ۔ یَشْقٰی ۔ شَقَاوَةً ۔ شِقْوَةً ۔ بد بخت اور بد نصیب ھونا ۔ شَقَاوَةٌ ۔ سعادت کی ضد ھے اور چونکہ شقاوت میں کوفت اور تھکن ھوتی ھے اس لئے کوفت اور مشقت کو بھی شَقَاوَةٌ کہدیتے ھیں ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنے شدت و مشقت برداشت کرنا ھیں ۔ نیز یہ سہولت ، نرمی اور سعادت و خوش بختی کی ضد ھے ۔ اَلْمُشَاقَاةُ ۔ مصیبت جھیلنا ۔ سختی برداشت کرنا ۔اَلشَّاقِی مِنَ الْجِبَالِ ۔ ایسا پہاڑ جواوپر سے باھر کی طرف نکلا اور جھکا ھوا ھو اور جس پر چڑھنا بہت مشکل ھو۔

*تاج ۔

قرآن کریم میں شَقِیٌّ وَ سَعِیْدٌ (۱۱/۱۰۵) آیا ہے ۔ یہاں شقاوت ، سعادت کی ضد ہے ۔ سورۃ مریم میں حضرت زکریا* کا قول ہے کہ وَلَمْ اَکُنْ بِدُعَآئِکَ رَبِّ شَقِیًّا (۱۹/۴) ۔ یہاں محرومی و نامرادی مراد ہے ۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰی (۲۰/۲) ہم نے تجھ پر قرآن اس لئے نہیں نازل کیا کہ تو زندگی کی سعادتوں سے محروم رہ کر مشقتوں میں پڑھ جائے ۔ اس '' تَشْقٰی '' کا مفہوم ذرا آگے چل کر بیان ہوا ہے جہاں آدم سے کہا گیا ہے کہ اس جنت میں تیرے لئے سامانِ زیست بڑی فراوانی سے موجود ہے (۲۰/۱۱۸) ۔ لیکن اگر تو ابلیس کی باتوں میں آ گیا تو یہ تجھے اس جنت سے نکال دیگا ۔ فَتَشْقٰی (۲۰/۱۱۷) ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تو اس تمام سامان سے محروم رہ کر جگر پاش مشقتوں میں پڑ جائیگا ۔ سورۃ اللَّیْل میں ہے کہ جہنم میں وہ جاتا ہے جو اَشْقٰی (۹۲/۱۵) ہوتا ہے ۔ بہت ہی نامرادو ناکام ، بدنصیب ۔ لیکن اس کے مقابلہ میں اَتْقٰی (۹۲/۱۷) آیا ہے ۔ اس لئے اَشْقٰی کے معنے سرکش کے بھی ہو سکتے ہیں سورۃ مریم میں جَبَّارًا شَقِیًّا (۱۹/۳۲) آیا ہے ۔ سورۃ المومنون میں جہنمیوں کے متعلق ہے کہ وہ کہینگے کہ غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا (۲۳/۱۰۶) ہماری بد بختی ہم پر غالب آ گئی ۔ یاد رہے کہ یہ محرومی اور بد بختی ، انسان کے اپنے اعمال کے نتیجہ کا نام ہے ۔ خوش بختی یا بد بختی انسان کے لئے '' مقدر '' نہیں ہوتی ۔

ش ک ر

اَلشُّکْرُ ۔ اس مادہ میں اصلی معنے بھر جانا اور اظہار کرنا ہیں** ۔ ابن فارس نے اس کے مختلف بنیادی معنی بتائے ہیں جن میں سے ایک ، کسی چیز کا بھرا ہوا ہونا اور مقدار میں کثیر ہونا بھی ہیں ۔ شَکِرَتِ النَّاقَۃُ ۔ اونٹنی کے تھن دودھ سے بھر گئے ۔ اَلْمِشْکَارُ ۔ اس دودھ دینے والے جانور کو کہتے ہیں جسے اگرچہ چارہ کم ہی ملے لیکن اس کے تھن دودھ سے بھرے رہیں ۔ ضَرَّۃٌ شَکْرٰی ۔ دودھ سے بھرپور تھن ۔ اَلشَّکِرَۃُ ۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جسکے تھن دودھ سے بھرے ہوں*** ۔

شَکِرَتِ الشَّجَرَۃُ ۔ درخت کے تنہ پر ٹہنیاں نکل آئیں ۔ اِشْتَکَرَتِ السَّمَآءُ ۔ بارش خوب زور سے برسی ۔ اِشْتَکَرَ الْحَرُّ وَالْبَرْدُ ۔ سردی اور گرمی بھرپور ہو گئی ۔ شَکَرَ فُلَانٌ ۔ اس شخص نے دل کھول کر سخاوت کی اور لوگوں کو خوب دیا ۔ صاحب تاج العروس کے نزدیک اس کی

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔

طرف سے شُکْرٌ کے معنے اطاعت و ادائے فرائض، نیز احسان مندی کے جذبات کا اظہار، اور خدا کی طرف سے شُکْرٌ کے معنے پورا پورا بدلہ دینا، یا تھوڑے عمل کا بڑھا کر اجر دینا ھیں ۔ (مثلاً کوئی شخص اگر اپنے آپ کو تنگی میں رکھ کر دوسرے کی تھوڑی سی مدد بھی کرتا ھے تو اس کی یہ قربانی، اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ھوگی جو اپنی ضروریات سے زائد چیز دوسرے کو دیدے ۔ یہ مطلب ھے ''تھوڑے عمل کا زیادہ اجر دینے'' کا)

شُکْرٌ کے بنیادی معنوں کو پیش نظر رکھنے سے ''سعی مشکور'' کا مطلب سمجھ میں آجائیگا ۔ یعنے ایسی کوشش جسکے بھر پور نتائج سامنے آجائیں ۔ ایسے بھرپور جیسے بکری کے تھن دودھ سے بھرے ھوئے ھوں ۔ شَاکِرٌ (فَاِنَّ اللّٰهَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ ۔ ۲/۱۵۸)۔ وہ ھے جو کسی کی کوشش میں بھرپور نتائج پیدا کر دے ۔ اور وہ بھی جسکی کوششیں اس طرح بھرپور نتائج کی حامل ھو جائیں ۔ اسی طرح سورۃ زمر میں شُکْرٌ کا لفظ حبط اعمال (اعمال کے رائیگاں جانے) اور خُسْرٌ کے مقابلہ میں آیا ھے ۔ (۳۹/۶۵-۶۶)۔ اس شخص کو شَکُوْرٌ بھی کہا گیا ھے جسکی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں (۱۴/۵)۔ صیغہ کے لحاظ سے شَکُوْرٌ میں شَاکِرٌ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ھے ۔

چونکہ شُکْرٌ کے معنی نمایاں اور ظاھر کرنا ھیں اس لئے اس کے مقابلہ میں کُفْرٌ کا لفظ آیا ھے (۱۴/۷) جسکے معنے ڈھانپ کر رکھنا اور دبا دینا ھیں ۔ سورۃ بقرۃ میں ھے وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ (۲/۱۵۲)۔ اس کا مطلب یہ ھے کہ خدا کی دی ھوئی نعمتوں کو ھمیشہ بے نقاب رکھو تاکہ اس سے نوع انسانی فائدہ اٹھائے ۔ انھیں چھپا کر اور دبا کر نہ رکھو ۔

خدا کی دی ھوئی نعمتوں میں سب سے پہلے وہ صلاحیتیں آتی ھیں جو خود انسان کے اندر موجود ھوتی ھیں ۔ ان صلاحیتوں کا پورا پورا نشوونما پانا (ور اس طرح ابھر کر سامنے آجانا) ان کا شُکْرٌ ھے ۔ اور یہ چیز اعمال صالحہ سے ھوتی ھے ۔ اس لئے اعمال صالحہ خدا کی نعمتوں کے شُکْرٌ کا موجب بنتے ھیں ۔ سورۃ احقاف میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ھے جب کہا گیا ھے کہ تم دعا مانگا کرو (اسکی آرزو کیا کرو) کہ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ .... وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا (۴۶/۱۵)۔ اے میری نشوونما دینے والے مجھے توفیق عطا کر دے کہ میں تیری دی ھوئی نعمتوں کا ''شکر'' کروں ۔ یعنے میں ایسے کام کروں جن سے میری صلاحیتوں کی نشو و نما ھو جائے ۔ اسی لئے دوسری جگہ کہا ھے کہ

مَنْ يَشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (۳۱/۱۲) - جو خدا کی نعمتوں کو بے نقاب رکھتا ھے اس سے خود اسکی ذات کی نشو و نما ھوتی ھے اور جو ان پر پردے ڈالتا ھے تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا - خود اسکا اپنا ھی نقصان ھوتا ھے - خدا اپنی ذات میں قابل حمد وستائش ھے - تمہارے سہاروں کا محتاج نہیں ھے -

خدا کی نعمتوں کو بے نقاب رکھنے کے معنے یہ ھیں کہ انہیں خدا کے قانون کے مطابق صرف میں لایا جائے - یعنے نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھا جائے - اس حقیقت کو سورۃ نحل میں ایک بستی کی مثال سے واضح کیا گیا ھے - اس بستی میں رزق کی بڑی فراوانی تھی لیکن فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ (۱۶/۱۱۲) - انہوں نے خدا کی نعمتوں پر پردے ڈالنے شروع کر دئے تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب آگیا - ان کی طرف خدا کے رسول آئے لیکن انہوں نے ان کی بھی تکذیب کی - اسکے بعد جماعت مومنین سے کہا گیا ھے کہ تم ایسا نہ کرنا - وَاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ (۱۶/۱۱۴) - تم خدا کی نعمتوں کو بے نقاب رکھنا - اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۱۶/۱۱۴) - اگر تم صرف اسی کے قانون کی اطاعت کرتے ھو تو - اس سے ظاھر ھے کہ شکر نعمت کے معنے ھیں اللہ کی دی ھوئی نعمتوں (سامان رزق وغیرہ) کو خدا کے قانون کے مطابق عام رکھنا - اور کفر نعمت کے معنے ھیں انہیں اپنے خود ساختہ قوانین و نظریات (بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۱۶/۱۱۲) - کے مطابق چھپا چھپا کر رکھنا - اسی کو سورۃ اعراف میں ان الفاظ میں واضح کیا گیا ھے کہ شَاكِرِيْنَ وہ ھیں جو ابلیس کی راھوں پر نہیں چلتے اور اس کے دام فریب میں نہیں آتے (۷/۱۷) -

سورۃ بقرۃ میں بنی اسرائیل کے متعلق ھے کہ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲/۵۶) - ھمنے تمہیں موت کے بعد نئی زندگی عطا کی تاکہ تم "شکر کر سکو" - اس سے ظاھر ھے کہ قوموں کو ان کی موت کے بعد حیات نو اسلئے ملتی ھے کہ وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما کر سکیں - جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ زندہ نہیں کہلا سکتیں - نہ ھی زندہ رہ سکتی ھیں -

تصریحات بالا سے واضح ھے کہ -

(۱) مساعی کے مشکور ھونے سے مراد یہ ھے کہ ان میں بھرپور نتائج پیدا ھو جائیں - وہ پوری طرح ثمر بار اور نتیجہ خیز ھو جائیں -

(۲) انسان کی طرف سے شُکْرٌ کے معنے یہ ہیں کہ وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو بے نقاب کرے یعنے

(الف) وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما کرے اور

(ب) کائنات میں پھیلے ہوئے سامانِ نشوونما کو نوع انسانی کی پرورش کیلئے کھلا رکھے۔ ان پر پردے نہ ڈالے۔

(۳) یہ اسطرح ہوسکتا ہے کہ انسان قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرے۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرے۔ یہ انسان کی طرف سے شُکْرٌ ہوگا۔ اور

(۴) خدا کی طرف سے شُکْرٌ کے معنے یہ ہیں کہ وہ انسانی اعمال میں بھرپور نتائج پیدا کر دے۔ یہ قانون خداوندی کی خصوصیت ہے کہ جو اسکے مطابق چلتا ہے اس کی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کرتی ہیں۔

سورۃ الدھر میں ہے اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا (۷۶/۳)۔ ہم نے انسان کو (وحی کے ذریعے) صحیح راستہ دکھا دیا ہے۔ اب اسکی اپنی مرضی ہے کہ چاہے اسے اختیار کر لے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ یہاں شُکْرٌ سے مراد کسی بہت بڑی نعمت کی قدر کرتے ہوئے اسے اختیار کر لینا ہیں۔ سورۃ نساء میں ہے اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ (۴/۱۴۷)۔ اگر تم اس ہدایت کی قدر کرو اور اس پر ایمان لے آؤ۔ (۳۴/۱۳) میں شَکُوْرٌ بمعنے شَاکِرٌ استعمال ہوا ہے۔ صاحبِ غریب القرآن (مرزا ابوالفضل) نے لکھا ہے کہ اسکے معنے حصولِ نعمت کے اسباب سے فائدہ اٹھانا بھی ہیں۔ مثلاً سورۃ سبا میں ہے اِعْمَلُوْا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا (۳۴/۱۳)۔ اے آل داؤد تم حصولِ نعمت کے اسباب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے (ہمارے قانون کے مطابق) عمل کرو۔ یعنی کائنات کی قوتوں اور مختلف اسباب و ذرائع سے فائدہ اٹھانا، ان کا شکر ادا کرنا ہے۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنوں میں تھوڑی چیز پر اکتفا کر لینا بھی ہیں۔ چنانچہ فَرَسٌ شَکُوْرٌ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جسے فربہی کی بنا پر تھوڑا سا چارہ بھی کافی ہو جاتا ہو۔ صلاحیتوں کے نشوونما پا جانے سے خود بخود یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ تھوڑے سے خارجی سہارے بھی بھرپور نتائج پیدا کر دیتے ہیں۔

ش ک س

شَکَاسَۃُ الْاَخْلَاقِ۔ اخلاق کا درشت اور تنگ ہونا۔ شَاکَسَہٗ۔ اس نے اس سے تنگی کا برتاؤ کیا۔ اَللَّیْلُ وَالنَّھَارُ یَتَشَاکَسَانِ۔ دن

اور رلت اپنک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں ۔ تَشَاکَسُوْا ۔ انہوں نے ایک دوسرے کی مخالفت کی ۔ یا انہوں نے ایک دوسرے سے لین دین اور خرید و فروخت کے معاملہ میں تنگی کا برتاؤ کیا* ۔

قرآن کریم میں ہے شُرَکَآءُ مُتَشَاکِسُوْنَ (۳۹/۲۹) ۔ کاروبار میں حصہ دار جو تند خوئی کی وجہ سے ایک دوسرے سے جھگڑتے رہیں اور معاملات میں تنگ نظری کا ثبوت دیں ۔

ش ک ک

اَلشَّکُّ ۔ یقین کی ضد ہے ۔ راغب نے کہا ہے کہ جب دو متضاد چیزیں کسی شخص کی نگاہ میں ایک جیسی اور یکساں ہو جائیں تو اس کیفیت کو شَکٌّ کہتے ہیں** ۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جس طرح عِلْمٌ سے یقین کی ابتدا ہوتی ہے اسی طرح شَکٌّ سے رَیْبٌ کی ابتدا ہوتی ہے (دیکھئے عنوان ر ۔ ی ۔ ب)۔ یہی وجہ ہے کہ شَکٌّ مُرِیْبٌ تو کہتے ہیں لیکن رَیْبٌ مُشَکِّکٌ نہیں کہتے*** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی چیزوں کا ایک دوسری میں گھس جانا اور داخل ہو جانا بتائے ہیں، چنانچہ شَکَکْتُہٗ بِالرُّمْحِ کے معنے ہیں میں نے اسکے بدن میں نیزہ گھسا دیا۔ اسی سے شَکٌّ ہے کہ اس میں دو چیزیں ایک دوسری میں گھسی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور ان میں سے یقینی شکل، جداگانہ اور واضح نہیں ہوتی****۔ راغب نے لکھا ہے کہ شَکَکْتُ الشَّیْیءَ کے معنے ہیں کسی چیز میں آر پار سوراخ کر دیا اور جب کسی چیز میں یہ کیفیت ہوگی تو اس میں قرار و ثبات نہیں ہو سکے گا اور اس پر پختگی سے بھروسہ نہیں کیا جاسکے گا ۔ یہ خیال بھی صحیح ہوسکتا ہے کہ یہ شَکٌّ سے استعارہ ہو جس کے معنے ہیں بازو کا پہلو سے چمٹ جانا ۔ اس طرح اس کا مفہوم یہ ہو جائے گا کہ ایک دوسرے سے مخالف چیزوں کا باہمدگر مل جانا اور اس طرح عقل و فہم کو ان کے درمیان داخل ہو کر ان میں سے ایک چیز کو جداگانہ دیکھنے کا موقع نہ ملنا***** ۔ شَکُّوْا بُیُوْتَہُمْ کے معنے ہیں انہوں نے اپنے تمام مکانات ایک جیسے بنائے* ۔

ان مثالوں سے شَکٌّ کے معنے واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنی دو متضاد باتوں کا یکساں محسوس ہونا اور اس لئے انسان کا کسی صحیح فیصلہ تک نہ پہنچ سکنا ۔

---

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔ ****ابن فارس ۔ *****راغب ۔

حضرت عیسیٰؑ کے واقعۂ صلیب کے ضمن میں کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ (۴/۱۵۷)۔ اس سے شک کے معنے واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنے وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ (۴/۱۵۷)۔ حضرت عیسیٰؑ میں، اور جس شخص کو انہوں نے گرفتار کیا، اس میں ایسی باہمی مشابہت تھی کہ ان پر اصلِ حال مشتبہ ہو گیا ۔ یہ وجہ ہے کہ وہ اس کی بابت شک میں ہیں کہ انہوں نے سمجھا کیا اور دراصل ہوا کیا تھا ۔ (تفصیل میری کتاب ''شعلۂ مستور'' ۔ ذکر حضرت عیسیٰؑ میں ملیگی) ۔

ش ک ل

اَلشَّکْلُ ۔ (ش پر زبر اور زیر کے ساتھ) کسی کی مثل ۔ اُس جیسا ۔ فِیْ فُلَانٍ شَکْلٌ مِّنْ اَبِیْہِ ۔ فلاں آدمی میں اپنے باپ سے مشابہت ہے*۔ سورۃ صٓ میں ہے وَ آخَرُ مِنْ شَکْلِہٖٓ اَزْوَاجٌ (۳۸/۵۸)۔ اُسی قسم کی، اُس سے ملتی جلتی رنگا رنگ کی اور سزائیں ۔ اس کی جمع اَشْکَالٌ آتی ہے جسکے معنے مختلف معاملات اور ضرورتیں ہیں ۔ شَکَلَ الْاَمْرُ ۔ معاملہ گڈ مڈ اور مشتبہ ہو گیا* ۔

اَلشِّکَالُ ۔ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے جانور کی اگلی اور پچھلی ٹانگیں باندھی جائیں تاکہ وہ اس حد تک قدم اٹھا سکے جس تک یہ رسی اجازت دے۔ شَکَلَ الدَّابَّۃَ ۔ اس نے جانور کی ٹانگیں (شکال سے) باندھ دیں۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے بیشتر الفاظ کے معانی مماثلت اور باہمی مشابہت سے ماخوذ ہیں ۔ وہ کہتا ہے کہ شَکَلْتُ الدَّابَّۃَ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں جانور کی ایک ٹانگ کو اس جیسی دوسری ٹانگ سے باندھا جاتا ہے ۔ اَلشِّکَالُ فِی الرَّحْلِ ۔ وہ رسی جس سے کجاوہ کے اگلے اور پچھلے بندھنوں کو ملا کر باندھا جاتا ہے** ۔ یہ اسم آلہ ہے ۔ اسی مادہ سے اسم فاعل شَاکِلٌ ہے جس کی مؤنث شَاکِلَۃٌ ہے ۔ اس کے معنے ہوئے باندھنے والی ۔ یہ وہی چیز ہے جسے شِکَالٌ کہتے ہیں ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ (۱۷/۸۴)۔ اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے اس حقیقت پر غور کرنا چاہئے کہ کائنات میں ہر چیز کے اندر اس کی ممکنات (Potentialities) رکھدی گئی ہیں ۔ آم کی گٹھلی میں یہ امکانی قوت رکھدی گئی ہے کہ وہ مناسب نشو و نما کے بعد آم کا درخت بن جائے جس میں آم جیسا میٹھا، خوشبودار، رنگین پھل آئے ۔ لیکن کیکر (ببول) کا بیج اگرچہ

*تاج ۔ **راغب ۔

درخت بن جاتا ہے لیکن اس میں کانٹے لگتے ہیں ۔ آم کی گٹھلی کا منتہیٰ (Inner-Destiny) آم کا پھل ہے ۔ کیکر کے بیج کا منتہیٰ کانٹے دار درخت ۔ ان میں سے کوئی شے اپنی اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی جس کا امکان اسکے اندر ہوتا ہے ، جس طرح ایک جانور اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا جس تک اس کی شَاکِلَتَہٗ اسے پہنچنے دیتی ہے ۔ مندرجہ صدر آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہرشے اپنی شَاکِلَتَہٗ کی حد تک پہنچ سکتی ہے ۔ اس سے آگےنہیں جاسکتی ۔ فطرت نے اس کا جو منتہیٰ معین کر دیا ہے وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی ۔

خارجی کائنات میں ہر شے کی شَاکِلَتَہٗ متعین ہوتی ہے ۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے ، اس میں شبہ نہیں کہ اسکے ممکنات کی بھی ایک انتہا ضرور ہے لیکن زندگی کی موجودہ اسٹیج اسکی آخری حد نہیں ۔ یہ اَقْطَارُ السّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۳۳/۵۵) سے بھی آگے جاسکتا ہے ۔ لیکن موروثی اثرات ، ابتدائی ماحول، تربیت، تعلیم، جذباتی رجحانات وغیرہ وہ رسیاں ہیں جن سے اسکا پاؤں بندھ جاتا ہے ۔ لیکن صحیح معاشرہ ان رسیوں میں وسعتیں پیدا کر سکتا ہے ۔ قرآن کریم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جس میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتیں کامل نشو و نما پا جائیں ۔ اس معاشرہ میں جو پابندیاں عائد کی جاتی ہیں وہ درحقیقت اس کی ذات کی صلاحیتوں کی وسعت کے لئے ہوتی ہیں ۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (۲/۲۸۶) کا یہی مفہوم ہے ۔ قرآنی معاشرہ میں ہر فرد پر اس کی شَاکِلَتَہٗ کے مطابق ذمہ داری عائد کی جائیگی اگرچہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کوشش کی جائے گی کہ اس کی حدود کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے ۔ حیوان کے بچے کی نشو و نما کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے باپ جیسا ہوجائے ۔ لیکن انسانی بچہ مناسب نشو و نما سے اپنے اسلاف سے کہیں آگے جا سکتا ہے ۔ انسان کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ موجودہ دور کا انسان بہ ہیئتِ مجموعی اپنی سابقہ نسلوں سے کہیں آگے ہے ۔ اسی طرح آنے والے دور کے انسان موجودہ زمانے کے انسان سے آگے جاسکتے ہیں ، اس طرح ، جہاں ایک دور میں مختلف انسانوں کی مضمر ممکنات مختلف ہوتی ہیں ۔ اسی طرح مختلف ادوار میں نسلِ انسانی کی ممکنات مختلف ہوتی ہیں ۔ اور علم و شعور کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان ممکنات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے ۔ اور اس کے ساتھ ہی اسکی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں ۔ (واضح رہے کہ ان ممکنات سے مراد انسانی ذات کی خصوصیات ہیں جو ہر فرد میں ہمیشہ یکساں ہوتی ہیں ۔)

صاحب لطائف اللغہ نے لکھا ہے اَلشَّوَاکِلُ (جو شَاکِلَتَہٗ کی جمع ہے) ان راستوں کو کہتے ہیں جو ایک شاہراہ سے پھوٹ نکلیں ۔ (نیز تاج) ۔ اس سے مراد زندگی کی مختلف راہیں اور انسانوں کے مختلف طورطریق ہیں جن پر وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق چلتے ہیں ۔

یاد رہے کہ انسانی اختیارات کی ایک حد ضرور ہے (جس طرح وہ ایک پاؤں اٹھا کر تو کھڑا رہ سکتا ہے لیکن دونوں پاؤں اٹھا کر کھڑا نہیں رہ سکتا) ۔ لیکن جس حد تک اسے اختیار دیا گیا ہے اس میں وہ بالکل آزاد ہے ۔ اس کے اختیار و ارادہ میں کوئی دخل انداز نہیں ہوتا ۔ (مزید تفصیل ق ۔ د ۔ ر کے عنوان میں دیکھئے) ۔

ش ک و (ی)

شَکْوَۃٌ ۔ مشک یا چمڑے کا تھیلا جو پانی یا دودھ رکھنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے اور جسکا صرف ایک طرف سے منہ کھلا ہوتا ہے ۔ شَکْوٌ کے معنے ہیں اس مشکیزہ کا منہ کھول دینا تاکہ جو کچھ اس کے اندر ہو وہ باہر آجائے ، یا ظاہر ہو جائے ۔ اس سے شِکَایَۃٌ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ یعنی اپنے دل کی بات کو ظاہر کر دینا *۔ راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنے اپنے پراگندہ حال کے اظہار کے ہیں *۔ سورۃ یوسف میں ہے اِنَّمَا اَشْکُوْ بَثِّیْ وَ حُزْنِیْ اِلَی اللّٰہِ (۱۲/۸۶) ۔ میں اپنی پریشان حالی اور رنج و غم کا اظہار اپنے خدا سے کرتا ہوں ۔ دوسری جگہ ہے وَ تَشْتَکِیْ اِلَی اللّٰہِ (۵۸/۱) ۔ ” وہ اللہ سے اپنی حالت کا اظہار کر رہی تھی “ ۔ اسی مادہ سے اَلْمِشْکٰوۃُ ہے جسکے معنے ہیں دیوار میں ایسا موکھلہ جو آر پار نہ ہو ۔ طاق *۔ بعض نے اسکے معنے چراغدان کئے ہیں ۔ (۲۴/۳۵) ۔ اَلشَّکْوٰی ۔ شکایت **۔

ش م ت

شَمِتَ الْعَدُوُّ وَشَمَاتَۃً ۔ کسی کے دشمن کا اسکی مصیبت پر خوش ہونا ۔ اَشْمَتَہٗ بِعَدُوِّہٖ ۔ اسکے دشمن کو تکلیف پہنچا کر اسے خوش کیا ***۔ جب حضرت موسٰیؑ فرط غضب میں حضرت ہارونؑ کا سر پکڑ کر انہیں اپنی طرف کھینچنے لگے تو حضرت ہارونؑ نے ان سے کہا تھا فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَاءَ (۷/۱۵۰) ۔ تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے اور خوش ہونے کا موقع نہ دے ۔ ویسے اَلتَّشْمِیْتُ ۔ چھینکنے والے کو دعا دینے کو کہتے ہیں ۔ گویا اس دعا سے شماتت کو اس سے دور کرنا مراد ہوتا ہے ۔ جیسے تَمْرِیْضٌ کے معنے مرض کو دور کرنا ہوتے ہیں ****۔

ش م خ

شَمَخَ الْجَبَلُ ۔ پہاڑ کا بہت بلند اور لمبا ہونا ۔ اَلْجِبَالُ الشَّوَامِخُ ۔ بہت بلند اور لمبے پہاڑ ۔ شَمَخَ الرَّجُلُ بِاَنْفِہٖ ۔ اس

---

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔ ****راغب ۔

آدمی نے اپنی ناک چڑھائی - تکبر کیا * - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے بڑا اور بلند ہونا بتائے ہیں - قرآن کریم میں رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ (۲۷/۷۷) آیا ہے - اپنی جگہ مضبوطی سے جمے ہوئے اونچے اور بڑے بڑے پہاڑ -

ش م ز

اَلشَّمْزُ - نفس انسانی کا ناخوش آئند چیزوں سے متنفر ہونا - تَشَمَّزَ وَجْهُهُ - اس کا چہرہ بگڑا، متغیر اور منقبض ہو گیا - اِشْمَأَزَّ - ڈرنا اور گھبرانا - رونگٹے کھڑے ہو جانا ، منقبض ہونا ، گھٹ جانا ، تنگی محسوس کرنا - اِشْمَأَزَّ الشَّيْئَ - اسنے اس چیز کو ناپسند کیا - اَلْمُشْمَئِزُّ - متنفر - ناپسند کرنے والا - دہشت زدہ * -

سورۃ زمر میں ہے اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (۳۹/۴۵) - جب ان لوگوں کے سامنے جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اکیلے خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں - وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۹/۴۵) اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں - انسان شخصیت پرستی سے خوش ہوتا ہے اور خالص قانون کی اطاعت اس پر شاق گزرتی ہے - اس لئے کہ انسانوں کو جذبات کی رو سے خوش کر لینا آسان ہوتا ہے اور قانون کسی کی رعایت نہیں کرتا - قرآن کریم نے جو دین نوع انسانی کیلئے تجویز کیا ہے اس میں خالص قانون خداوندی کی اطاعت مقصود تھی - شخصیت پرستی کا اس میں کوئی دخل نہیں - لیکن انسانی آمیزشوں نے اس دین کی حالت یہ کردی ہے کہ کوئی بات لیجئے ، اسکی آخری سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رک جاتی ہے - خدا کا قانون (قرآن کریم) بہ حیثیت آخری سند (Final Authority) کے کہیں نہیں آتا - حتکہ اگر کسی کو ان ارباب من دون اللہ سے الگ کرکے خالص اطاعت خداوندی کی دعوت دی جائے تو وہ اس داعی کا سخت مخالف ہو جاتا ہے - یہی وہ عظیم حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے (مندرجہ بالا آیت میں) توجہ دلائی ہے -

ش م س

اَلشَّمْسُ - آفتاب (۹۱/۱) دھوپ - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رنگ برنگ اور متلون ہونے اور کم قرار پکڑنے کے ہیں - اَلشَّمُوْسُ مِنَ الدَّوَابِّ وہ چوپایہ جسے قرار نہ ہو - آفتاب کو بھی اَلشَّمْسُ

*تاج - محیط - راغب -

اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ دھوپ کی گرمی۔ لَا یَرَوْنَ فِیْھَا شَمْسًا وَّلَا زَمْھَرِیْرًا (۷۶/۱۳)۔

مَطْلِعَ الشَّمْسِ (۱۸/۹۰) وہ مقام جہاں سے آفتاب طلوع ہوتا معلوم ہو۔ انتہائی شرقی سمت۔ مَغْرِبَ الشَّمْسِ (۱۸/۸۶)۔ وہ مقام جہاں سورج غروب ہوتا نظر آئے۔ انتہائی مغربی سمت۔

صاحبِ غریب القرآن نے لکھا ہے کہ ایرانیوں کا قومی نشان شَمْسٌ تھا جسطرح عرب جاھلیت کا قومی نشان قَمَرٌ تھا **۔ (اس اعتبار سے قَمَرٌ اور شَمْسٌ کے معنی کیلئے ق۔ م۔ ر کا عنوان دیکھئے)۔

ابن کلبی نے کہا ہے کہ اَلشَّمْسُ پرانے زمانے کے ایک بت کا نام ہے ***۔ (شاید اسی کی طرف نسبت کرکے عرب عبد شمس نام رکھتے تھے)۔ بعض کا خیال ہے کہ شَمْسٌ ایک مشہور چشمہ کا نام تھا ***۔

ش م ل

اَلشِّمَالُ۔ بائیں جانب۔ (یَمِیْنٌ کی ضد ہے)۔ (۱۸/۱۷)۔ یَمِیْنٌ (دایاں ھاتھ) یُمْنٌ و سعادت اور خیر و برکت کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ اسلئے اَلشِّمَالُ (بایاں) نحوست کا نشان۔ اسی لئے کہتے ہیں زَجَرْتُ لَہٗ طَیْرَ الشِّمَالِ میں نے اس کے لئے نحوست کے پرندے کو جھڑکا*۔ قرآن کریم میں اَصْحَابُ الشِّمَالِ (۵۶/۴۱) اھل جہنم کے لئے آیا ہے۔ یہی ہیں جن کا اعمال نامہ ان کے بائیں ھاتھ میں دیا جائیگا (۶۹/۲۵)۔ اَلشَّمَالُ۔ شمالی ھوا، جو بالعموم سرد ہوتی ہے۔ مصر میں یہ بادشمال سرد اور خشک ہوتی ہے، اور اگر یہ سات دن تک متواتر چلتی رہے تو مصری کفن تیار کرنے شروع کردیتے ہیں کیونکہ وہ اسے برداشت نہیں کرسکتے *۔

اَلشِّمَالُ۔ اس غلاف کو بھی کہتے ہیں جو بکری کے تھن پر چڑھایا جاتا ہے*۔ اور اَلشَّمْلَۃُ۔ وہ کملی ہے جس میں انسان لپٹ جائے*۔ راغب کا کہنا ہے کہ شِمَالٌ اس کپڑے کو کہتے تھے جس سے بائیں جانب ڈھانپ لیجائے۔ نیز الاِشْتِمَالُ بِالثَّوْبِ کسی کپڑے میں اس طرح لپٹنے کے لئے بولا جاتا ہے کہ اس کا بالائی سرا بائیں جانب ڈالا جائے****۔ پھر یہ کپڑے میں لپٹنے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اسی اعتبار سے اِشْتَمَلَ عَلَی الشَّیْئِ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز پر محیط ہو جانا، اور اسے اپنے اندر شامل کرلینا*****۔

* تاج۔ ** (میرزا ابوالفضل)۔ *** ابن فارس۔ **** راغب۔ ***** محیط۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنوں میں سے ہے۔اَلرَّحِمُ تَشْتَمِلُ عَلَی الْوَلَدِ ۔ رحم نے بچہ کو اپنے اندر لے رکھا ہے (۶/۱۴۴) میں ہے اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَیْہِ اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِ ۔ یا وہ کچھ جو دو ماداؤں کے رحموں میں ہے ۔

طبیعت اور عادت کو بھی اَلشِّمَالُ کہتے ھیں۔اسکی جمع شَمَائِل ہے*۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ (i) عربوں کے ھاں یَمِیْنٌ سعادت اور خوش بختی کی نشانی سمجھا جاتا تھا ۔ اور شِمَالٌ، نحوست کی نشانی ۔ اور (ii) قرآن کریم نے اَصْحَابُ الشِّمَالِ ۔ اہل جہنم کو کہا ہے اور اَصْحَابُ الْیَمِیْنِ اہل جنت کو ۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاھئے کہ قرآن کریم بھی سعد و نحس کو اس طرح تسلیم کرتا ہے جس طرح عرب (عہد جاھلیہ میں) عقیدہ رکھتے تھے ۔ قرآن کریم ، عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے وہ اس زبان کے الفاظ اور محاورات کو انہی معنوں میں استعمال کرتا ہے جن معنوں میں عرب انہیں استعمال کرتے تھے ۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن کریم اس وجہ یا سبب کو بھی تسلیم کرتا ہے جس کی بنیاد پر عرب کسی لفظ کا خاص مفہوم لیتے تھے ۔ یہ بنیادی نقطہ ہے جسے ھمیشہ پیش نظر رکھنا چاھئے ۔

ش ن أ

شَنَأَہٗ ۔ کسی سے سخت بغض رکھنا** ۔ محیط نے کہا ہے کہ یہ ایسے بغض کو کہتے ھیں جس میں دشمنی کے ساتھ بد خلقی بھی شامل ہو ۔ قرآن کریم میں شَنَاٰنُ قَوْمٍ (۵/۲) آیا ہے ۔ یعنے کسی قوم کا شدید بغض یا اس کی بد ترین دشمنی ۔ دوسری جگہ ہے اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ (۱۰۸/۳) ۔ تجھ سے بغض رکھنے والے کی جڑیں کٹ گئیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معنوں میں بغض رکھنا اور گریز کرنا پایا جاتا ہے ۔

ش ھ ب

اَلشُّھَبُ ۔ سفید رنگ جس میں سیاھی کی آمیزش ہو* ۔ (تقریباً ایسا رنگ جیسے آگ کا شعلہ جب اپنی انتہائی حد کو پہنچ جائے تو اس کا رنگ سفید ہو جاتا ہے اور اس کے مرکز میں کچھ سیاھی مائل سا رنگ نظر آتا

*تاج ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔

ہے) ۔ نیز وہ پہاڑ جو برف سے ڈھکا ہوا ہو ۔ سَنَۃٌ شَھْبَاءُ ۔ قحط والا سال جس میں کہیں سبزی نظر نہ آئے اور زمین خشکی کی وجہ سے یکسرسفید ہو چکی ہو ۔ شِہَابٌ آگ کا بلند ہونے والا شعلہ ۔ وہ شعلہ جو رات کو آسمان میں دور تک جاتا نظر آتا ہے ۔ (اسے ٹوٹتا تارا کہتے ہیں)** ۔

زمانہ جہالت میں لوگ سمجھتے تھے کہ انسان کی قسمت ستاروں کے ساتھ وابستہ ہے ۔ چنانچہ نجومی ، ستاروں کی گردش سے انسان کی تقدیر کے زائچے بنایا کرتے تھے ۔ (اب بھی اکثر ایسا ہوتا ہے اورعلم نجوم کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے) ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ایسی باتیں دورِ جہالت میں تو چل سکتی تھیں لیکن جب دنیا میں علم کی روشنی آ جائے تو اس قسم کی ظنی اور قیاسی چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں رہتی ۔ اگر اس وقت کوئی اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے تو علم و یقین کا ایک "شہاب مبین" اس کے پیچھے آجاتا ہے جو اس ظن اور قیاس کی قلعی کھول کر رکھ دیتا ہے ۔ ($\frac{۱۵}{۱۸}$ و $\frac{۳۷}{۹}$ و $\frac{۴۲}{۹}$) ۔

ش ھ د

شَھِدَ یَشْھَدُ کے معنے ہیں حاضر ہونا ۔ موجود ہونا ۔ شَھَادَۃٌ ۔ جو کچھ کسی کو معلوم ہو (بصارت یا بصیرت کی بنا پر) اسے ٹھیک ٹھیک طور پر حاضر (بیان) کر دینا** ۔ ایسا کرنے والے کو شَاھِدٌ اور شَھِیْدٌ کہتے ہیں ۔ مُشَاھَدَۃٌ کےمعنی (اھل لغت کے نزدیک) آنکھوں سے دیکھنا ہیں * ۔ لیکن اس مفہوم کو وسعت دے دی جائے تو اس کے معنی ہونگے کسی چیز کا حواس کی گرفت میں آ جانا ۔

قرآن کریم میں غَیْبٌ کے مقابل میں شَھَادَۃٌ کا لفظ آیا ہے ($\frac{۵۹}{۲۲}$) ۔ غَیْبٌ کے معنے ہیں جو آنکھوں سے اوجھل ہو (دیکھئےعنوان غ ۔ ی ۔ ب) اس لئے شَھَادَۃٌ سے مراد محسوس اشیاء ہونگی اور غَیْبٌ سے مراد وہ توانائیاں یا نتائج جو مضمر ہوں ۔ لہذا شَھَادَۃٌ (یا مَشْھُوْدٌ) وہ نتائج ہیں جو مرتب ہوکر محسوس صورت میں بے نقاب ہو جائیں ۔ غَائِبُ الْفَرَسِ گھوڑے کی اس قوت کو کہتےہیں جسے وہ دوڑنے میں محفوظ رکھ لے اور شَاھِدُ الْفَرَسِ اس قوت کو جسے وہ کام میں لے آئے ۔ نیز شَھِدَ کے معنے گھر پر موجود ہونا اور غَابَ کے معنے سفر میں چلے جانا ہیں*** ۔ چنانچہ روزوں کے احکام کے ضمن میں جو آیا ہے کہ فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ ($\frac{۲}{۱۸۵}$) ۔ تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم میں سے جو

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔ *** لین

حالت سفر میں نہ ھو وہ اس مہینے کے روزے رکھے ۔ (مسافر کے لئے الگ حکم ھے) ۔ اِمْرَأَةٌ مُشْہِدٌ ۔ اس عورت کو کہتے ھیں جس کا خاوند گھر پر موجود ھو* ۔ مَشْہَدٌ ۔ حاضر ھونے کی جگہ کو کہتے ھیں ۔ یا جس مقام پر تمام پوشیدہ امور اور نتائج محسوس شکل میں سامنے آ جائیں (۱۹/۳۷) ۔ یَوْمٌ مَشْہُوْدٌ کے معنے ایسے وقت کے ھیں (۱۱/۱۰۳) ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ھے اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْہُوْدًا (۱۷/۷۸) ۔ یہاں مَشْہُوْدٌ کے معنے یہ ھیں کہ اس کے حقائق محسوس شکل میں سامنے آ جاتے ھیں ۔ (فَجْرٌ کے معنے متعلقہ عنوان میں دیکھئے) ۔ شُہَدَاءَکُمْ (۲/۲۳) ۔ تمہارے مددگار ۔

خدا کو شَہِیْدٌ اس لئے کہا گیا ھے کہ ھر چیز اس کی نگاھوں کے سامنے ھے(۲۲/۱۷)۔ اور رسول اس اعتبار سےشَاھِدٌ (۴۸/۸) ھوتا ھے کہ جن حقائق کو وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بے نقاب دیکھتا ھے (اسی کو نبوت کہتے ھیں) انہیں وہ دوسروں کے سامنے پوری قطعیت کے ساتھ بیان کر دیتا ھے (اسے رسالت کہتے ھیں) ۔ یا اس لئے کہ وہ اپنی جماعت کے اعمال کا نگران (شَہِیْدٌ) ھوتا ھے ۔ (۲/۱۴۳) ۔

اَلشَّھْدُ ۔ وَالشُّھْدُ ۔ شہد (عَسَلٌ) کو بھی کہتے ھیں ۔ جبکہ ابھی وہ چھتے سے باھر نہ نکالا گیا ھو** ۔

شَہِدَ کے معنے گواھی دینے یا تصدیق کرنے کے بھی ھوتے ھیں اور قسم کھانے کے بھی ۔ شَہِدَ عَلَیْہِمْ (۴۱/۲۱) ان کے خلاف شہادت دینگے۔ شَہِدَ عَلٰی کَذَا کے معنے یہ بھی ھیں کہ کسی کے متعلق پوری اور قطعی خبر بتا دینا*** ۔ صاحب غریب القرآن (ابو الفضل) نے (ابن عباس رضؓ کے حوالہ سے) لکھا ھے کہ شَہِدَ کے معنے فیصلہ کرنے کے بھی آتے ھیں ۔ (مثلاً ۱۲/۲۶ میں) ۔ اس اعتبار سے اللّٰہُ شَہِیْدٌ بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ (۶/۱۹) ۔ کے معنے فیصلہ کرنے والا ھونگے ۔ نیز اس کے معنے نگہبان کے بھی ھیں (۲/۱۴۳) ۔

آپنے دیکھا ھے کہ اس لفظ کے استعمال کی صورتیں کتنی ھی متنوع کیوں نہ ھوں ان میں سے ھر ایک میں ، موجود ھونا ۔ حاضر رھنا ۔ نظروں کے سامنے رھنا یا رکھنا ، کا مفہوم ضرور پایا جاتا ھے۔

خدا کی راہ میں جان دینے والوں کو جو شَہِیْدٌ کہا جاتا ھے تو یہ اصطلاح قرآن کریم نے استعمال نہیں کی ۔ یعنی قرآن کریم نے ایسے شخص کو اس لفظ سے مختص نہیں کیا ۔ ویسے معنوی اعتبار سے دیکھا جائے تو

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط و اقرب الموارد ۔

شہید زندہ انسان بھی ہو سکتا ہے اور (جسمانی طور پر) مردہ بھی۔ جو شخص اپنے ما آمَنَ بِہٖ (جس پر وہ ایمان رکھتا ہے) کی عملی شہادت پیش کر دے وہ شہید ہے۔ خواہ جان سے ہو یا مال سے یا کسی اور مطلوب شے سے۔ اور پھر آخر وقت تک اس روش پر قائم رہے۔ راہ خدا میں جان دینا، اپنے ایمان کی صداقت کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

قرآن کریم کی رو سے پوری کی پوری ملت اسلامیہ شُہَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳) ہے۔ یعنی تمام نوع انسانی (مختلف اقوام عالم) کے اعمال پر نگاہ رکھنے والی۔ ان سب پر نگران۔ اور ان کا مرکز (رسولؐ) ان کے اعمال کا نگران (۲/۱۴۳)۔ غور کیجئے کہ ملت اسلامیہ کا دنیا میں فریضہ کیا تھا اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے اس کا مقام کسقدر بلند تھا۔ ایک وہ ملت اسلامیہ تھی اور ایک آج ہم ملت اسلامیہ ہیں کہ دوسروں کے اعمال و کردار کے نگران و محاسب ہونا تو ایک طرف، ہم اپنی ذرا ذرا سی ضرورت کے لئے بھی غیروں کے محتاج ہیں۔ اس کا سبب ظاہر ہے۔ وہ ملت، قرآن کریم کو اپنا ضابطہ حیات سمجھتی تھی اورہم افسانوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔

ش ھ ر

اَلشُّھْرَۃُ۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ اس کے معنے ہیں کسی بری بات کا نمایاں اور مشہور ہو جانا۔ لیکن جوھری نے کہا ہے کہ اس کا استعمال مطلقاً کسی معاملہ کے واضح ہو جانے اور مشہور ہو جانے کیلئے ہوتا ہے۔ (اردو میں عام طور پر شہرت اچھی باتوں کیلئے بولا جاتا ہے اور تَشْھِیْر بری باتوں کے لئے)۔ اَلشَّھِیْرُ۔ مشہور و معروف۔ معزز*۔ اَلشَّھْرُ چاند کو کہتے ہیں کیونکہ اسکے ظہور سے مہینے کی شہرت ہو جاتی ہے۔ نیز مہینہ کو بھی شَھْرٌ کہتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی کسی معاملہ کا واضح ہونا اور روشن ہونا ہوتے ہیں۔ اسی سے اَلشَّھْرُ چاند کو کہتے ہیں۔ شَاھَرَہٗ مُشَاھَرَۃً۔ اس سے ماھانہ اجرت پر معاملہ کیا*۔ قرآن کریم میں شَھْرُ رَمَضَانَ (۲/۱۸۵) مہینے کیلئے آیا ہے جسکی جمع اَشْھُرٌ (۲/۱۹۷)۔ اور شُھُوْرٌ ہے (۹/۳۶)

ش ھ ق

شَھَقَ الرَّجُلُ۔ يَشْھَقُ۔ شَھِيْقاً۔ اسکے سینہ میں رونے کی آواز متردد ہوئی، بار بار اٹک اٹک کر نکلی۔ شَھِيْقُ الْحِمَارِ وَ تَشْھَاقُہٗ۔

*تاج۔

گدھے کے رینکنے کی آواز۔ الشَّهُوْقُ ۔ بلند ہونا۔ الشَّهْقَةُ ۔ چیخ *۔ قرآن کریم میں زَفِیْرٌ وَشَھِیْقٌ (۱۱/۱۰۹) آیا ہے۔ اس سے مراد چیخنا چلانا ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ یہ الفاظ مصیبت زدہ لوگوں کی آوازوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں، اور شَھِیْقٌ کے معنے ہیں کراہنے کی بہت بلند آواز۔ یہ لفظ جَبَلٌ شَاھِقٌ سے ہے جسکے معنے نہایت اونچے اور لمبے پہاڑ کے ہیں جس پر چڑھنا دشوار ہو *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے بلند ہونے کے ہیں۔ نیز فُلَانٌ ذُوْشَاھِقٍ سے مراد ہے وہ سخت غصہ ور ہے۔

قرآن کریم میں جہنم کی آواز کے لئے بھی شَھِیْقٌ کا لفظ آیا ہے۔ (۶۷/۷)۔ جہنمی معاشرہ میں ہر طرف چیخ پکار ہوتی ہے۔ وہ یہاں کا جہنم ہو یا آخرت کا۔

ش ھ و

شَھَاہٌ وَ اشْتَھَاہٌ۔ کسی چیز کی خواہش کرنا۔ اسے چاہنا۔ رغبت کرنا۔ طبیعت کا میلان ہونا۔ راغب نے کہا ہے کہ شَھْوَۃٌ نفس کے ان چیزوں کی طرف کھنچنے کو کہتے ہیں جنہیں وہ چاہتا ہے۔ کبھی اس چیز کو شَھْوَۃٌ کہدیا جاتا ہے جسکی طرف طبیعت کا میلان ہو۔ اور کبھی خود اس جذبہ (میلان) کو شَھْوَۃٌ کہتے ہیں **۔

شَیْئٌ شَھِیٌّ۔ لذیذ چیز۔ طَعَامٌ شَھِیٌّ۔ وہ کھانا جو طبیعت کو مرغوب ہو ***۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ (۳/۱۳) میں، خود شَھَوٰتٌ (شَھْوَۃٌ کی جمع) کے معنے (راغب کے الفاظ میں) مرغوب اشیاء ہیں۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس میں الشَّھَوَات بطور مبالغہ بمعنی مُشْتَھَیَاتٌ (مرغوب چیزیں) ہے۔ دونوں صورتوں میں معنے ایک ہی ہیں۔ یعنی مرغوب اور پسندیدہ چیزیں۔ یا میلانات۔ (۱۹/۵۹) میں یہ لفظ (باقی الفاظ کے ساتھ مل کر) جنسی میلان کیلئے آیا ہے۔

جنتی زندگی کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْ اَنْفُسُکُمْ (۴۱/۳۱)۔ اس میں ہر مرغوب خاطر شے میسر ہوگی۔ جو کچھ تمہارا دل چاہے۔

سورۃ مریم مختلف انبیاء کے تذکرہ کے بعد ہے، فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِھِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوَاتِ (۱۹/۵۹) ان کے بعد ایسے لوگ آگئے

*تاج نیز راغب۔ **تاج۔ ***محیط۔

جنہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور شہوات کے پیچھے لگ گئے۔ اس کے معنی واضح ہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ وہ قوانین خداوندی کے پیچھے چلیں (دیکھئے عنوان ص۔ ل۔ و) وہ اپنے جذبات اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ اگر انسانی خواہشات کو وحی کی روشنی میں پورا کیا جائے تو اس کا نتیجہ جنتی زندگی کی خوشگواریاں ہوتا ہے لیکن اگر انہیں وحی کی پابندیوں کو توڑ کر پورا کیا جائے تو اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا (۱۹/۵۹)۔ [نیز دیکھئے عنوان ھ۔ و۔ ی]

ش و ب

اَلشَّوْبُ۔ خلط ملط کرنا نیز آمیزہ (پانی دودھ وغیرہ کا)۔ شَابَ الشَّیْءَ شَوْبًا۔ اس نے اس چیز کو خلط ملط کر دیا۔ ملا دیا۔ اس اعتبار سے اَلشَّوْبَۃُ دھوکے اور فریب کو کہتے ہیں۔ ملاوٹ والی بات۔ اَلشَّوَائِبُ (جمع ہے شَائِبَۃٌ کی) اسکے معنے ہیں کثافتیں اور غلاظتیں نیز نقائص و عیوب اور خطرات۔ شَوْبٌ۔ شہد کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں خود بھی موم ملا ہوا ہوتا ہے اور اسے ہر دوا کےساتھ ملایا جاتا ہے*۔

قرآن کریم میں اہل جہنم کے متعلق ہے اِنَّ لَھُمْ عَلَیْھَا لَشَوْبًا مِنْ حَمِیْمٍ (۳۷/۶۷)۔ اس کے اوپر سے انہیں گرم آمیزہ دیدیا جائیگا۔ اس سے مراد بے اطمینانی کا جینا، ناگوار مصائب کو برداشت کرنا، نیز کثافت آمیز زندگی ہے، یا زندگی کی کثافتیں۔ پر فریب زندگی کے اثرات۔

ش و ر

شَارَ الْعَسَلَ۔ شہد کو چھتہ سے نکال لیا اور جمع کر لیا۔ اَلْمَشَارُ۔ وہ چھتہ جس سے شہد نکالا جائے۔ اَلشَّوْرُ۔ چھتہ سے نکالا ہوا شہد۔ اَلْمِشْوَارُ۔ وہ لکڑی جس سے شہد نکالا جاتا ہے۔ اَلْمَشْوَارَۃُ چھتہ کو کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے ہیں (۱) کسی چیز کو ظاہر کرنا۔ پیش کرنا اور (۲) کسی چیز کو لے لینا۔

شَاوَرَ۔ مُشَاوَرَۃً۔ تَشَاوَرَ۔ باہمی مشورہ کرنا۔ اصل کے اعتبار سے (یعنی شَارَ الْعَسَلَ۔ چھتہ کو نچوڑ کر اس سے شہد نکالنے کے اعتبار سے)، مشورہ کے معنے ہوئے دوسرے کے خیالات کا نچوڑ حاصل کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا**۔ اور اگر خود شہد سے مفہوم لیا جائے، تو جس طرح شہد کی

* تاج۔ محیط۔ راغب۔ نیز ابن فارس۔ **راغب۔

مکھیاں اپنی اپنی محنت کا ماحصل ایک جگہ جمع کر دیتی ھیں ، مشاورت کے معنے ھونگے مختلف افراد معاشرہ کی اپنی اپنی رائے ، فکر ، خیالات ، اور غور و خوض کے نتائج کو ایک جگہ جمع کر دینا تا کہ اس سے کسی فیصلہ تک پہنچا جائے ۔ روئی دھننے والے کی کمان کی تانت کو بھی اَلْمِیْشْوَارُ کہتے ھیں * ۔ لہذا بشورہ کا مفہوم یہ بھی ھو سکتا ھے کہ آراء کو دھننا اور انہیں کھول کر نتیجہ نکالنا ۔

اَشَارَ اِلَیْہِ ۔ اسکی طرف اشارہ کیا * (۱۹/۲۹) ۔ اَلشَّوْرَۃُ والشَّارَۃُ ۔ حسن و جمال ۔ وضع قطع ۔ ھئیت ۔ لباس ۔ پوشاک ۔ فربہی ۔ زینت ۔ آرائش ۔ شَارَ ۔ یَشُوْرُ ۔ گھوڑے کو سدھایا ، یا خریدار کو بتانے کے لئے اس پر سوار ھوا اور اسے دوڑا کر دکھایا * ۔

قرآن کریم نے نوع انسانی کی راھنمائی کے لئے اصولی قوانین دیئے ھیں جو ھمیشہ کے لئے غیر متبدل ھیں ۔ قرآنی نظام یہ ھے کہ ھر زمانے کے لوگ ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی احکام خود وضع کریں ۔ یہ چیز باھمی مشورہ سے طے ھوگی ۔ اسی لئے جماعت مومنین کے متعلق کہا گیا ھے کہ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (۴۲/۳۸) ۔ ان کے معاملات باھمی مشاورت سے طے ھونگے ۔ چونکہ سب سے پہلے قرآنی نظام خود نبی اکرم ؐ نے قائم کیا تھا ، اسلئے حضور ؐ کو بھی حکم دیا گیا کہ شَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ (۳/۱۵۸) ۔ معاملات میں ان (مومنین) سے مشورہ کیا کرو۔ اس سے ظاھر ھے کہ چونکہ مشورہ کا حکم تمام مومنین کے لئے ھے اس لئے ان کا نظام شریعت کبھی جامد اور متصلب (Rigid and Static) نہیں ھو سکتا۔ ھر دور کے مومنین اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھیں گے۔ اگر انکے زمانے کا تقاضا ھو تو وہ باھمی مشورہ سے، کسی سابقہ دور کے فیصلوں میں ردوبدل بھی کر سکتے ھیں، اور نئے فیصلے بھی کر سکتے ھیں۔ اس طرح قرآن کریم کے غیر متبدل اصول تو اپنی جگہ قائم رھینگے لیکن انکی روشنی میں وضع کردہ جزئیات زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رھیں گی۔ یہ ھے مشاورت کے قرآنی حکم کا عملی مفہوم۔ یہی خود رسول اللہ ؐ نے کیا تھا (جس پر قرآن کا حکم شاھد ھے) اس لئے سنت رسول اللہ ؐ بھی یہی ھے کہ ھر دور کے مسلمان ایسا ھی کریں ۔ یہی وہ سَبِیْلُ الْمُؤْمِنِیْنَ ھے (۴/۱۱۵) جس کے اتباع کا حکم ھے ۔ مغربی انداز حکومت میں، کوئی شے غیرمتبدل نہیں ھوتی۔ قوم جس قسم کے فیصلے چاھے کر سکتی ھے ۔ ان فیصلوں کے اوپر کوئی ایسی پابندی یا حدود نہیں جن کا

*تاج ۔ **راغب ۔

علی حالہ رکھنا ضروری ہو ۔ اس طرز حکومت کو سیکولر (Secular) کہتے ہیں ۔ دوسری طرف ، قدامت پرستی کے مسلک کی رو سے ، شریعت میں کوئی چیز قابل تغیر وتبدل نہیں ۔ جوفیصلے پہلے ہو چکے ہیں وہ من وعن نافذ ہوتے رہیں گے۔ ان دونوں کے برعکس قرآنی نظام یہ ہے کہ، قرآن میں بیان کردہ احکام واصول غیر متبدل ہیں ۔ ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ہر قوم اپنے اپنے زمانے اور حالات کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین خود مرتب کرے گی ۔ اسطرح ثبات (Permanence) اور تغیر (Change) کے امتزاج سے ، انسانی زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی آگے بڑھتی جائیگی ۔

ش و ظ

اَلشُّوَاظُ ۔ اَلشِّوَاظُ ۔ شعلہ جس میں دھواں نہ ہو * ۔ نیز آگ کی گرمی اور دھواں ۔ آفتاب کی گرمی ۔ ویسے چیخنے چلانے کو بھی کہتے ہیں ، اور پیاس کی شدت کو بھی * ۔

قرآن کریم میں ہے یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِنْ نَّارٍ (۵۵/۳۵) ۔ تم دونوں گروہوں پر آگ کا شعلہ بھیجا جائیگا ۔

ش و ک

اَلشَّوْکَۃُ ۔ درخت کا کانٹا ۔ ہتھیار (۸/۷) ۔ اَرْضٌ شَاکَۃٌ ۔ بہت کانٹوں والی زمین * ۔

اَلشَّوْکَۃُ مِنَ الْقِتَالِ ۔ جنگ کی شدت ۔ شَوْکَۃُ السِّلَاحِ ۔ ہتھیار کی تیزی اور دھار * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کھردرا ہونا یا کسی چیز کے کنارے کا دھار دار، تیز اور نوکیلا ہونا ۔

ش و ی

شَوَی اللَّحْمَ یَشْوِیْہِ شَیًّا ۔ گوشت بھوننا ۔ اَلشِّوَاءُ ۔ بھنا ہوا گوشت ۔ شَوَی الْمَاءَ یَشْوِیْہِ ۔ اسنے پانی کو گرم کیا ۔ اَشْوَی الْقَمْحُ ۔ گیہوں اتنے سخت ہوگئے کہ انہیں بالوں سے ، ہاتھ سے مل کر نکالا جا سکے اور بھونا جا سکے ** ۔ سورۃ کہف میں ہے یَشْوِی الْوُجُوْہَ (۱۸/۲۹) جو ان کے چہروں کو جھلسا دیگا ۔

---

* تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔ ** تاج و محیط ۔

اَلشَّوَیٰ - کے معنے چاروں ھاتھ پاؤں اور انسان کی کھوپڑی اور سر کی کھال کے ھیں - اس کا واحد شَوَاۃٌ ھے - بعض کا خیال ھے کہ بدن کے وہ تمام اعضاء جن پر ضرب لگنے سے موت واقع نہ ھو شَوَیٰ ھیں - اسی جہت سے بے قدر اور غیر اھم چیز کو بھی شَوَیٰ کہدیتے ھیں * -

سورۃ المعارج میں جہنم کی آگ کے متعلق ھے نَزَّاعَۃً لِلشَّوَیٰ (۷۰/۱۶) - وہ ھاتھ پاؤں کو زور سے کھینچکر نکال لینے والی ھے - یعنے بالکل بیکار کر دینے والی - یا سر کی کھال کھینچ لینے والی - اس کے معنے ذلت اور مصیبت دونوں کے ھونگے - نیز قوت چھین لینے اور اپاھج بنا دینے کے بھی - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنے معمولی اور بے قدر چیز کے ھونے ھیں -

ش ی أ

شَاءَ - یَشَاءُ - شَیْئًا - وَ مَشِیْئَۃً کے معنے ھیں ارادہ کرنا - اکثر متکلمین نے مشیت اور ارادہ میں کوئی فرق نہیں کیا حالانکہ دونوں میں باعتبار لغت فرق یہ ھے کہ مشیت ، ایجاد (پیدا کرنے) کو کہتے ھیں اور ارادہ کے معنے طلب (چاھنے) کے ھیں* -

اَلشَّیْءُ - راغب کے نزدیک یہ لفظ ھر موجود چیز کے لئے بولا جائے گا خواہ وہ محسوس طور پر موجود ھو - مثلاً مختلف اجسام ، یا محض ذھنی طور پر موجود ھو مثلاً اقوال** - نیز شَیْءٌ کا اطلاق ھر اس چیز پر ھوتا ھے جس کا علم حاصل کیا جاسکے یا جس کے متعلق کچھ خبر دی جاسکے*** - متکلمین نے اس پر بہت بحث کی ھے کہ شَیْءٌ کی ماھیت کیا ھے اور اس کا اطلاق کس کس قسم کی چیزوں پر ھوتا ھے - حتّٰی کہ بعض نے یہاں تک کہ دیا ھے کہ معدوم پر بھی اس کا اطلاق ھوتا ھے - لیکن ھمیں ان موشگافیوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں - اس لئے کہ قرآن کریم ان متکلمانہ بحثوں میں نہیں الجھتا۔

قرآن کریم میں اکثر مقامات پر آیا ھے - اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۲/۲۰) - یہاں شے کے معنے چیز ، معاملہ یا حقیقت کے ھیں - سورۃ بقرہ میں ھے لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا (۲/۴۸) - ’’(جس دن) کوئی شخص کسی دوسرے کے کچھ کام نہیں آنے گا‘‘ -

اس حقیقت کے سمجھ لینے کی بڑی ضرورت ھے کہ ’’خدا کی مشیت‘‘ سے اصل مفہوم کیا ھے؟ ھمارے ذھنوں میں خدا کے قادرِ مطلق ھونے کا تصور یہ

* تاج و محیط - ** تاج - *** راغب -

ہے کہ اس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون ۔ نہ کوئی اصول ہے نہ ضابطہ۔ وہ ایک خودمختار (اور معاذ اللہ) مطلق العنان حاکم کی طرح جو جی میں آئے کرتا چلا جاتا ہے ۔ کبھی خوش ہؤا تو جاگیر بخش دی ۔ ناراض ہوگیا توگاؤں کا گاؤں ہلاک کر دیا ۔(خدا کے قادر ہونے کے مفہوم کے لئے تو ق ۔ د ۔ ر کا عنوان دیکھئے لیکن یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ) خدا کے قادر ہونے کا وہ مفہوم قطعاً نہیں جو اوپر لکھا گیا ہے ۔ اس لئے خدا کی مشیت کا بھی یہ مطلب نہیں کہ اس میں کسی قانون اور ضابطہ کا کوئی دخل نہیں ۔

یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس دنیا کی ہر شے علت اور معلول (Cause and Effect) کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے ۔ لیکن جب ہم اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لے جائیں تو ایک مقام ضرور ایسا آئے گا جہاں یہ سلسلہ ختم ہو جائیگا اور وہاں تسلیم کرنا پڑیگا کہ ایک معلول (Effect) بغیر کسی سابقہ علت (Cause) کے ظہور میں آگیا ہے ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے تمام کائنات کا سلسلہ ، خدا کی مرضی ، منشا ، ارادہ ، اور پوری خود مختاری سے شروع ہوتا ہے۔اگر کوئی پوچھے کہ خدا نے اس سلسلہ کائنات کو کیوں اور کس طرح بنایا تو اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا کہ خدا نے اپنی مرضی سے جس طرح چاہا بنا دیا ۔ اس مقام پر مشیت خداوندی (ہمارے تصورات کے مطابق) کسی قاعدے اور قانون کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی نہیں ہوتی ۔ یہاں یہی کہاجائیگا کہ اِنَّمَا اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۳۶/۸۲) ۔ اس گوشہ میں خدا کا امر اس طرح کام کرتا ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور بس وہ ہو جاتی ہے ۔ (''کہہ دینے،، کے معنی یہ نہیں کہ وہ سچ مچ ''كُنْ،، کا لفظ زبان سے نکالتا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ارادے کے ساتھ ہی اس شے کی پیدائش کا آغاز ہو جاتا ہے)۔

اس سے آگے بڑھئے تو ہمارے سامنے کائنات کا محسوس سلسلہ آتا ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز ایک خاص قانون اور قاعدے کے مطابق عمل کر رہی ہے ۔ اس گوشہ میں خدا نے اپنے امر کو پیمانوں اور اندازوں کے اندر محدود کر دیا ہے ۔ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۹) ۔ یہاں خدا کا امر مقررہ اندازوں کا پابند ہوگیا ۔ یعنے اب کائنات کی ہر شے ان قوانین کے تابع چلنے لگی جنہیں خدا نے اپنی مرضی اور منشا کے مطابق (اول الذکر گوشے میں) بنایا تھا ۔ اس کے لئے کہا گیا ہے کہ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳) ۔ اللہ نے ہر شے کے لئے ایک پیمانہ مقرر

کر دیا ۔ یہ تمام پیمانے (قوانین فطرت) خدا ھی کے مقرر کئے ہوئے ہیں لیکن خدا نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ ان قوانین میں دخل اندازی کی نہیں جائیگی۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲) ۔ ”تو سنت اللہ (خدا کے قاعدوں) میں کبھی تبدیلی نہیں پائیگا“۔ اس گوشے میں مشیت خداوندی کے معنے ہوں گے خدا کے وہ قوانین جن کے مطابق یہ تمام سلسلہ کائنات چل رہا ہے ۔ کائنات کی کسی شے کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرسکے۔ چونکہ اس پہلے گوشے کے متعلق (جہاں سے کائنات کی ابتدا ہوتی ہے اور ہر شے کے لئے قانون مقرر کیا گیا ہے) ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ وہ ہمارے حیطہ ادراک سے باہر ہے ۔ اس لئے ہم خدا کے متعلق جو کچھ جان سکتے ہیں وہ ان قوانین ہی کی رو سے جان سکتے ہیں جو کائنات میں کار فرما ہیں۔ یعنے مشیت خداوندی کا یہ گوشہ ، علم و تجربہ کی بنا پر ہماری سمجھ میں آسکتا ہے ۔

اب ایک اور قدم آگے بڑھئے ۔ انہی قوانین کی رو سے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے خدا نے انسان کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے ۔ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) ۔ جس کا جی چاہے ایمان کی راہ اختیار کرلے اور جس کا جی چاہے کفر کی راہ اختیار کرے ۔ یعنی خارجی کائنات کی چیزوں کے برعکس ، انسان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کی پابندی کرے جو اس کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور چاہے تو ان سے سرکشی برت لے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ فلاں روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا اور فلاں کا نتیجہ کامرانی و کامیابی ۔ یعنے اس گوشے میں انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جونسی روش جی چاہے اختیار کر لے لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ اپنے اعمال کے نتائج بھی اپنی مرضی کے مطابق مرتب کرلے۔ اس کا ہر عمل وہی نتیجہ مرتب کریگا جو اس کے لئے قانون خداوندی (مشیت) نے مقرر کر رکھا ہے ۔ مثلاً اسے اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو سنکھیا کھا لے اور جی چاہے مصری کی ڈلی منہ میں ڈال لے ۔ لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ سنکھیا کھا کر اسکا نتیجہ مصری کی ڈلی کا سا پیدا کرلے ۔ یہ قوانین ، کہ فلاں روش کا نتیجہ کیا ہوگا، انسان کو وحی کے ذریعہ عطا کئے گئے ہیں (جو آج قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں) لہذا جب انسان، خدا کے متعلق کچھ سمجھنا چاہے گا تو اسے قوانین فطرت کو بھی سمجھنا ہوگا جو خارجی دنیا میں کار فرما ہیں اور وحی کے قوانین کو بھی جو اس کی اپنی دنیا سے متعلق ہیں ۔ جب وہ ان دونوں قوانین کو سمجھ لیگا تو یہ حقیقت بھی اس کے سامنے آجائیگی کہ یہ دونوں قوانین در حقیقت ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں ۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں اللہ کے متعلق مَا یَشَآءُ کا لفظ آیا ہے وہاں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ وہ، متذکرہ صدر تینوں گوشوں میں سے کس گوشے سے متعلق ہے۔ جس گوشے سے مَا یَشَآءُ متعلق ہوگا اس کے مطابق اس کا مفہوم لیا جائیگا۔ ہر جگہ اس کے ایک ہی معنے لینے سے ذہن میں وہ تمام الجھاؤ پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ) قرآن کریم میں عجیب تضاد پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں کہیں تضاد نہیں۔ تضاد ہماری اپنی کوتاہ نگہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ (اس جگہ صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل ان امور کی قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ملے گی)۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے یَہْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (۲/۱۴۲)۔ اس کے واضح معنے ہیں کہ جو شخص خدا سے راہ نمائی لینا چاہے خدا اسے راہنمائی دیتا ہے۔ یعنی مَنْ یَّشَآءُ کے معنے ہیں جو شخص چاہے۔ لیکن اگر اس کے معنے یہ کئے جائیں کہ ''اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے'' تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کی طرف سے راہنمائی اس کے قانون مشیت کے مطابق ملتی ہے۔ (یعنی مَنْ یَّشَآءُ کے معنے قانونِ مشیت کے ہونگے)۔ اس قانون کی تفصیل قرآن کریم کی متعدد آیات میں موجود ہے۔ مثلاً سورۃ مائدہ میں ہے یَہْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ (۵/۱۶)۔ یعنی اللہ اس (قرآن) کے ذریعے اسی کو راہنمائی دیتا ہے جو اس کے قانون کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرنا چاہے۔ بات بالکل واضح ہے۔ یعنی اس کے لئے ابتداء (Initiative) ہمیشہ انسان کی طرف سے ہوگی۔ اگر یہ قوانین خداوندی کے مطابق چلتا جائیگا تو اسے صراط مستقیم کی طرف راہ نمائی مل جائے گی۔ اگر یہ اس سے انحراف برتیگا تو اس کا رخ تباہی کی طرف مڑجائیگا۔ فَلَمَّا زَاغُوْا أَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَہُمْ (۶۱/۵)۔ جب وہ ٹیڑھے چلے تو خدا (کے قانون) نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے۔

سورۃ بقرہ میں اس حقیقت کو ایک اور انداز سے واضح کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم پر ایک کمانڈر مقرر کر دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو کمانڈر مقرر کر دیا تو بنی اسرائیل نے اس پر اعتراض کیا کہ اس کا انتخاب کس خصوصیت کی بنا پر ہوا ہے، حالانکہ وہ صاحبِ مال و دولت نہیں ہے۔ اس کے جواب میں نبی نے کہا کہ اسے اس لئے منتخب کیا گیا ہے کہ زَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲/۲۴۷)۔ اللہ نے اسے جسمانی قوت اور علم فراواں عطا کیا ہے۔ یعنی انہیں بتا دیا کہ خدا کا انتخاب یونہی اندھا دھند نہیں ہوتا۔ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا

ہے ۔ اس کی طرف سے جسے جو کچھ ملتا ہے اس لئے ملتا ہے کہ اس میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے ۔ اس کے بعد ہے وَ اللّٰهُ يُؤْتِی مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ (۲/۲۴۷) ۔ اللہ کی طرف سے قوت و ملک اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ملتا ہے ۔ یہاں مَنْ يَّشَآءُ کا مفہوم واضح ہے ۔ یعنی قانون کے مطابق ، یونہی اندھا دھند نہیں ۔ یہاں سے سورۃ آلِ عمران کی اس آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۔ ۔ ۔ ۔ (۳/۲۵) ۔ قوت و اختیار اور عزت و حکومت کا ملنا اور چھننا ''مشیت'' پر موقوف ہے ۔ یعنی یہ سب اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے جسکی بنیاد اس پر ہے کہ جس قوم میں صلاحیت ہوتی ہے اسے اقتدار و اختیار ملتا ہے (۲۱/۱۰۵) ۔ جس میں صلاحیت نہیں رہتی اس سے یہ چھن جاتا ہے ۔

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ مشیتِ ایزدی (قانونِ خداوندی) کے تین گوشے ہیں :—

(۱) وہ گوشہ جہاں ہر شے کے لئے قوانین متعین ہوتے ہیں ۔ اس گوشے میں خدا کا امر کار فرما ہوتا ہے اور سب کچھ اس کے اپنے پروگرام کے مطابق طے پاتا ہے ۔ ہم اس گوشے کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے ۔

(۲) دوسرا گوشہ خارجی کائنات کا ہے جہاں ہر شے ان قوانین کے مطابق چلنے پر مجبور ہے جو اس کے لئے گوشۂ اول میں مقرر ہوتے ہیں ۔ ان قوانین میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا ۔ انسان ان قوانین کا علم حاصل کر سکتا ہے ۔

(۳) تیسرا گوشہ انسانی دنیا کا ہے ۔ اس کے ایک حصہ (انسان کی طبعی زندگی) میں تو وہی قوانین کار فرما ہیں جو خارجی کائنات میں جاری وساری ہیں ۔ لیکن اس کی انسانی سطح پر جن قوانین کی ضرورت ہے انہیں وحی کے ذریعے عطا کیا گیا ہے ۔ یہ قوانین (مستقل اقدار) بھی غیر متبدل ہیں ۔ لیکن انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان کے خلاف چلا جائے ۔ وہ جیسی روش اختیار کریگا اس کے مطابق نتائج مرتب ہوں گے ۔ جتنی صلاحیت پیدا کرے گا اتنی ہی خوبیاں اور بڑائیاں اسے حاصل ہو جائیں گی ۔ اسے خدا کا قانونِ مکافات کہتے ہیں جو غیر متبدل ہے ۔

یہ ہے مشیتِ خداوندی سے مفہوم ۔ واضح رہے کہ جس گوشے میں خدا نے انسان کو آزادی دے رکھی ہے ، وہ (خدا) اس میں کبھی مُخل نہیں

ہوتا ۔ اس میں انسان کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے ۔ اور اس سے کہہ دیا گیا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰) ۔ اس گوشے میں تم اپنی مرضی (مشیت) کے مطابق عمل کرو ۔ '' جو تم چاہتے ہو کرو ۔ ہم مخل نہیں ہونگے '' ۔ البتہ تمہارے اعمال کے نتائج قانونِ مشیتِ خداوندی کے مطابق مرتب ہوں گے ۔ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۴۱/۴۰) ۔

اس ضمن میں البتہ ایک آیت ایسی ہے جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے سے انسان کے ذہن میں عجیب الجھاؤ پیدا ہوتا ہے ۔ سورۃ دہر میں ہے اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۷۶/۲۹) '' یہ قرآن کریم یقیناً ایک یاد دہانی ہے، سو جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف (کا) راستہ اختیار کر لے '' ۔ یہاں تک بات بالکل صاف ہے ۔ یعنی خدا کیطرف سے وحی مل گئی ہے ۔ اس کے بعد انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جی چاہے تو اس وحی کا تجویز کردہ راستہ اختیار کر لے اور جی چاہے تو اس کے خلاف عمل کرے ۔ لیکن اس کے آگے ہے وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ (۷۶/۳۰) ۔ اسکا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے ۔ '' اور تم نہیں چاہتے مگر وہ جو اللہ چاہے '' ۔ اس ترجمہ کی رو سے (ظاہر ہے کہ) نہ صرف یہ کہ یہ دونوں آیات ایک دوسرے کی نقیض بن جاتی ہیں بلکہ انسانی اختیار و ارادہ کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے ۔ یعنی ایک طرف تو قرآن کریم کہتا ہے کہ تم چاہو تو ایسا کر لو اور چاہو تو ویسا ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہدیتا ہے کہ تم اپنی مرضی سے کچھ چاہ نہیں سکتے ۔ تم وہی چاہتے ہو جو اللہ چاہتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جسے تم اپنا فیصلہ کہتے ہو وہ دراصل تمہارا فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ خدا جو فیصلہ چاہتا ہے تم سے کرا لیتا ہے ۔ لہذا انسان مجبور محض ہے ۔

سورۃ دہر کے علاوہ یہ آیت (قریب قریب انہی الفاظ کے ساتھ) سورۃ مدثر (۷۴/۵۵-۵۶) اور سورۃ تکویر (۸۱/۲۸-۲۹) میں بھی آئی ہے ۔

'' مَا تَشَاءُوْنَ '' نفی مضارع ہے جس کے عام معنی ہیں '' تم نہیں چاہتے '' ۔ لیکن عربی گرامر کی رو سے اس کے معنی نہی (مت کرو) کے بھی ہوتے ہیں ۔ یعنی '' تم مت چاہو '' ۔ گرامر کی اصطلاح میں اسے کہتے ہیں خبر کا انشاء کے معنوں میں استعمال ہونا ۔ مختصرالمعانی میں ہے ثُمَّ الْخَبَرُ قَدْ يَقَعُ مَوْقِعَ الْاِنْشَاءِ ۔ اِمَّا لِلتَّفَاؤُلِ اَوْ لِاِظْهَارِ الْحِرْصِ فِيْ وُقُوْعِهٖ كَمَا مَرَّ ۔ اَوْ لِلْاِحْتِرَازِ عَنْ صُوْرَةِ الْاَمْرِ

أَوْ لِحَمْلِ الْمُخَاطَبِ عَلَى الْمَطْلُوْبِ بِاَنْ يَكُوْنَ الْمُخَاطَبُ مِمَّنْ لَا يُحِبُّ أَنْ يُكَذِّبَ الطَّالِبَ (صفحه ۲۳۲) یعنی کبھی کبھی خبر انشاء کی جگہ بھی مستعمل ہو جاتی ہے۔ ایسا بطور تفاول کے ہوتا ہے۔ یا متکلم چاہتا ہے کہ ایسا واقع ہو جائے۔ یا متکلم (صاف صاف) اس (حکم) کی صورت سے بچنا چاہتا ہے۔ یا پھر مخاطب کو اس بات کے لئے بر انگیختہ کرنے کے لئے ہوتا ہے کیونکہ مخاطب ان لوگوں میں سے ہوتا ہے جو متکلم کو جھٹلانا نہیں چاہتے۔

زمخشری نے (اپنی تفسیر کشاف میں) اس نکتہ کی وضاحت کی ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ۔ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا.... ($\frac{2}{83}$)۔ یہاں لَا تَعْبُدُوْنَ نفی مضارع ہے۔ لیکن اس کے معنی نہی کے ہیں۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ "جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ تم اللہ کے سوا اور کسی کی محکومی (عبدیت) اختیار مت کرنا۔ اور والدین اور رشتہ داروں یتامٰی اور مساکین کے ساتھ احسان کرنا"۔ اس کے بعد قُوْلُوْا امر کا صیغہ ہے۔ یعنی "لوگوں کو اچھی بات کہو"۔ زمخشری نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ یہاں اخبار فی معنی النہی ہے۔ یعنی خبر، نہی کے معنوں میں ہے۔ جیسے کہتے ہیں "تَذْهَبُ اِلٰى فُلَانٍ، تَقُوْلُ لَهٗ كَذَا۔ اس میں "تَذْهَبُ"، "تَقُوْلُ"، اگرچہ مضارع کے صیغے ہیں لیکن ان سے مراد امر ہے۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ۔ "وَهُوَ اَبْلَغُ مِنْ صَرِيْحِ الْاَمْرِ وَالنَّهْيِ۔ یعنی یہ انداز امر و نہی کے صیغوں کے ذریعہ صاف حکم دینے یا منع کرنے کے مقابلہ میں زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں اس انداز بیان کی اور مثالیں بھی ہیں مثلاً (اسی) سورۃ بقرہ میں ہے وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ($\frac{2}{272}$)۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ "تم مت خرچ کرو بجز لوجہ اللہ" یعنی مضارع نفی نے نہی کے معنی دئے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی ہم نے تمہیں اس کا اختیار دے رکھا ہے کہ تم جیسا جی چاہے کرو۔ لیکن تمہیں چاہیئے یہ کہ اپنے اختیار و ارادہ کو ہماری مشیت سے ہم آہنگ رکھو۔ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ تم ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔ سورۃ زمر

میں ہے اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۔ اگر تم (قوانین خداوندی) سے انکار کروگے تو (اللہ کا کیا بگاڑ لوگے) اللہ تم سے بے نیاز ہے ۔ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۔ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ (۳۹/۷) ۔ لیکن وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا ۔ وہ تمہارے لئے شکر ہی کو پسند کرتا ہے ۔

لہذا انسان کو چاہئے کہ اپنے اختیار و ارادہ سے ، بطیب خاطر ، مشیت خداوندی (قوانین الہیہ) سے ہم آہنگی کی زندگی اختیار کرے ۔

ش ی ب

اَلشَّيْبُ ۔ بڑھاپا ۔ سفید بال یا بالوں کی سفیدی *۔ سورۃ مریم میں ہے وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا (۱۹/۴) اور سر بالوں کی سفیدی کی وجہ سے (شعلے کی طرح) بھڑک رہا ہے ۔ یا سر میں سفید بال بکثرت نمودار ہوگئے ہیں ۔ سورۃ روم میں شَيْبَةً (۳۰/۵۴) بڑھاپے کیلئے آیا ہے ۔ سورۃ مزمل میں ہے يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا (۷۳/۱۷) جس دن کی سختی بچوں کو بوڑھا کر دے گی ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ مخلوط ہونا اور مل جانا ہیں ۔ شَيْبٌ کو شَيْبٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بالوں کی سفیدی ، سیاہی کے ساتھ مل جاتی ہے ۔

ش ی خ

اَلشَّيْخُ ۔ بوڑھا آدمی ۔ نیز اونٹ کو بھی کہتے ہیں ۔ استاذ ۔ عالم ۔ سردار قوم ۔ ماہر فن کو بھی بزرگی اور فضیلت کی وجہ سے شَيْخٌ کہدیتے ہیں ۔ اَلشَّيْخَةُ ۔ بوڑھی عورت ۔ شَيْخُوْخَةٌ ۔ بڑھاپا *۔

قرآن کریم میں شَيْخٌ (۱۱/۷۲) نیز (۱۲/۷۸)۔ بوڑھے کے لئے آیا ہے ۔ اَلشَّيْخَةُ کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا ۔ اور اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ بمعنی بیاہا (مرد) اور بیاہی (عورت) لغت عرب میں کہیں نظر نہیں آیا ۔

ش ی د

شَادَ الْبِنَاءَ ۔ يَشِيْدُهُ ۔ وَشَيَّدَهُ ۔ عمارت پر چونہ وغیرہ کا پلستر کرکے اسے مضبوط اور بلند کر دینا ۔ اَلشِّيْدُ ۔ اس چونہ وغیرہ کو کہتے ہیں جس سے پلستر کیا جائے ۔ اَلْمَشِيْدُ ۔ جو عمارت چونہ وغیرہ سے بنائی

---

* تاج و محیط ۔

اور بلند کر دی جائے۔ محکم ۔ مضبوط* ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے قَصْرٍ مَّشِيْدٍ (۲۲/۴۵) ۔ اَلْاِشَادَةُ ۔ آواز بلند کرنا* ۔ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (۴/۷۸) کے معنے ہیں اونچے اور محکم قلعے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کو بلند کرنے کے ہوتے ہیں ۔

ش ی ع

شَاعَ الْخَبَرُ فِي النَّاسِ ۔ لوگوں میں خبر پھیل گئی* ۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ (۲۴/۱۹) ۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ نا پسندیدہ باتیں پھیل جائیں ۔

هٰذَا شَيْعُ هٰذَا ۔ یہ اس کی مثل ہے* ۔ سورۃ سبا میں ہے كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ (۳۴/۵۴) ۔ جیسا انہی جیسے لوگوں کے ساتھ ان سے پہلے کیا گیا ۔ سورۃ قمر میں ہے وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا اَشْيَاعَكُمْ (۵۴/۵۱) ۔ ہم تمہارے جیسے لوگوں کو ہلاک کر چکے ہیں ۔

اَلشِّيَاعُ ۔ چرواہے کی بانسری یا اس کی آواز (جس سے وہ منتشر جانوروں کو بلاتا ہے) ۔ بلانے والے ۔ داعی* ۔ نیز اس کے معنے متابعت کرنے ۔ یعنی بلانے والے کے پیچھے پیچھے چلنے کے بھی آتے ہیں ۔ شَيَّعَهُ عَلٰى رَاْيِهٖ ۔ اس نے اس کی رائے کی پیروی کی ۔ اسے تقویت دی ۔ هٰذَا شَيِّعُ هٰذَا ۔ یہ اس بچہ کی پیٹھ پر پیدا ہونے والا بچہ ہے ۔ یہ ایسے اوپر تلے کے ، دو بچوں کے لئے بولا جاتا ہے جنکے درمیان کوئی اور بچہ پیدا نہ ہوا ہو ۔ اَلْمُشَايِعُ ۔ کسی کے ساتھ ساتھ (ملحق) رہنے والا ۔ شَيِّعُ نِسَاءٍ اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ عورتوں میں گھسا رہے ۔ اَلشَّاعَةُ ۔ بیوی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ شوہر کے ساتھ ساتھ یا اس کے پیچھے رہتی ہے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی ہیں ۔

ان معانی سے شِيْعَةٌ کے معنے واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنے وہ لوگ جو کسی کے پیچھے چل کر ایک پارٹی بن جائیں ۔ اور اس طرح ایک دوسرے کی تقویت اور مدد کا موجب ہوں ۔ اگر یہ اتباع قانونِ خداوندی کی ہے جس میں تعاون برّ اور تقویٰ میں ہوتا ہے تو اس پارٹی کا نام جماعت مومنین ہے، جن کے ساتھ شامل ہونا باعث صد فخر و سعادت ہے ۔ چنانچہ قوم نوح کے مومنین کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا اِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ (۳۷/۸۳) ۔ یقیناً ابراہیمؑ ان ہی کے گروہ میں سے تھا ۔ لیکن اگر اس قسم کی گروہ بندی انسانوں

* تاج و محیط ۔

کے پیچھے چل کر بنائی جائے تو قرآن کریم اسے شرک قرار دیتا ہے ۔ چنانچہ اس نے امت مسلمہ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۳) ۔ تم سب کے سب اس کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہو اور فرقوں میں مت بٹ جاؤ ۔ وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۔ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا ۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۲) ۔ (دیکھنا ۔ تم مومن بن جانے کے بعد کہیں) مشرک نہ بن جانا ۔ یعنے ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور گروہوں میں منقسم ہو گئے ۔ (اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ) ہر فرقہ اس پر اکڑتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر ۔ لہذا قرآن کریم کی رو سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کونسا فرقہ حق پر ہے اور کونسا باطل پر ، جبکہ اس کی رو سے خود فرقہ بندی ہی شرک ہے ۔ اسی بنا پر اس نے رسول سے کہدیا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْھُمْ فِیْ شَیْءٍ (۶/۱۶۰)۔ جو لوگ دین میں فرقے پیدا کرلیں اور گروہ گروہ بن جائیں ۔ اے رسول ۔ تیرا ان سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ۔ کہا جا سکتا ہے کہ آج جب کہ مسلمانوں میں اس قدر فرقے پیدا ہو چکے ہیں تو ان میں وحدت کی صورت کیا ہوسکتی ہے؟ وہی صورت جسے قرآن کریم نے خود واضح کر دیا ہے ۔ یعنے اِعْتِصَام بِحَبْلِ اللّٰہِ ۔ خدا کی کتاب کو مرکز قرار دیکر نظام قائم کر لینا ۔ اس سے فرقے خود بخود ختم ہو جائینگے ۔ اگر شخصیتوں کو درمیان سے نکال دیا جائے اور ایک نظام کے ذریعہ اطاعت صرف کتاب اللہ کی کی جائے تو فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا ۔ (''نظام کے ذریعے قرآن کریم کی اطاعت'' کی شرط بڑی اہم ہے ۔ انفرادی طور پر ، اپنے اپنے خیال کے مطابق، خدا کی اطاعت سے فرقے پیدا ہوتے ہیں ۔ نظام کی رو سے اطاعت خداوندی سے وحدت امت برقرار رہتی ہے ۔) یہ بھی واضح رہے کہ فرقوں سے مراد صرف مذہبی فرقے ہی نہیں ، سیاسی پارٹیاں بھی ہیں ۔ مومنین تو ایک طرف ، قرآن کریم نے ہر قوم میں فرقہ بندی ، پارٹی بازی اور گروہ سازی کو خدا کا عذاب قرار دیا ہے (۶/۶۵) ۔ اس نے بتایا ہے کہ دنیا میں ''حکمتِ فرعونی'' ہمیشہ یہی کرتی ہے ۔ یعنے پارٹیاں بناتی اور توڑتی رہتی ہے (۲۸/۴) ۔ (مزید تفصیل ف ۔ ر ۔ ق کے عنوان میں دیکھئے) ۔

قرآن کریم میں شِیَعٌ کا لفظ اقوام یا قبائل کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے (۱۵/۱۰) ۔

(جلد دوم ختم شد)

اس لغات میں

آپ نے مختلف مقامات پر یہ پڑھا ہوگا کہ " اس نکتہ کی وضاحت آپ کو پرویز صاحب کی فلاں کتاب میں ملیگی "۔ چونکہ قرآنی تعلیم سے متعلق یہ مباحث بڑے اہم ہیں اس لئے پرویز صاحب کی ان تصانیف کا مطالعہ بڑا ضروری ہے۔ بالخصوص حسبِ ذیل کتابوں کا مطالعہ۔

انسان نے کیا سوچا؟ گذشتہ اڑھائی ہزار سال میں، دنیا کے مختلف مفکرین، مدبرین، مؤرخین اور سائنسدانوں نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق جو کچھ سوچا اور کہا ہے، اسے نہایت دلنشیں پیرایہ میں اسطرح بیان کیا گیا ہے کہ اس کی روشنی میں قرآنی حقائق کی عظمت خود بخود سامنے آجاتی ہے۔ بڑی جلد کے ۴۳۶ صفحات۔

سلیم کے نام خطوط ۔ ہمارے نوجوان، تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں، اسلام کے متعلق جسقدر شکوک اور سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا نہایت اطمینان بخش جواب ۔ انداز بیان دلچسپ، سلیس اور نہایت شگفتہ ۔ کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ص

صَاحِبُ الْحُوْتِ

حضرت یونسؑ کا لقب ہے۔ (۶۸/۳۸)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "یونسؑ"۔

صالح علیہ السلام

امم سامیہ میں سے جن قبائل نے اندرونِ عرب میں حکومتیں قائم کیں ان میں سب سے مشہور قبیلہ (بلکہ قوم) ثمود کا تھا۔ ان کی ترقی کا زمانہ عادِ اولٰی کے بعد کا ہے (دیکھئے عنوان ہودؑ)۔ یہ قوم عرب کے شمال مغربی حصہ پر حکمران تھی جسے وادیٔ قریٰ کہتے تھے۔ حجر ان کا دار الحکومت تھا جو اس قدیم شاہراہ پر واقع تھا جو حجاز سے شام کی طرف جاتا تھا۔ ان کا علاقہ بڑا پرفضا اور زرخیز تھا (۲۶/۱۴۶-۴۷)۔ یہ لوگ میدانوں میں رفیع و وسیع محلات تعمیر کرتے اور پہاڑوں کے گوشوں میں مستحکم قلعے بناتے تھے جو فن سنگ تراشی کے نمونے تھے (۷/۷۴)۔

اس قوم کی طرف، انہی کے بھائی بند، حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے (۷/۷۳)۔ انہوں نے ان تک وہی پیغام پہنچایا جو اس سے پہلے حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ اپنی اپنی قوم تک پہنچا چکے تھے (دیکھئے عنوانات نوح اور ہود)۔ یعنی یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۷۳)۔ "اے میری قوم! تم اللہ کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں"۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ (۷/۷۴)۔ "ملک میں سرکشی کرتے ہوئے فساد نہ پھیلاتے پھرو"۔ حسب معمول مترفین کے طبقہ (سردارانِ قوم) نے اس دعوت کی مخالفت کی (۷/۷۵)۔

اس زمانے میں مویشی اور چراگاہیں ، چشمے اور کھیت سب سے بڑی دولت ہوتے تھے - ارباب اقتدار کی حالت یہ تھی کہ وہ چراگاہوں اور چشموں کو اپنے مویشیوں کے لئے مختص کرلیتے اور کمزور انسانوں کے جانور بھوکوں مر جاتے - حضرت صالح ؑ نے سرداران قوم سے کہا کہ رزق کے یہ سرچشمے تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں - یہ بات ایسی معقول تھی کہ ان سے اس کا جواب نہیں بن پڑسکتا تھا - چنانچہ انہوں نے اس کا اقرار کیا کہ ایسا ہی ہوگا - حضرت صالح ؑ نے کہا کہ اس کا عملی طریق یہ ہے کہ مختلف لوگوں کے جانوروں کی باریاں باندھ دی جائیں تاکہ کسی پر زیادتی نہ ہو - وہ اس پر بھی راضی ہوگئے تو آپ نے کہا کہ یہ ایک اونٹنی ہے جس کے متعلق یوں سمجھو کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں - خدا کی زمین اور خدا کی اونٹنی - اسے میں اس کی باری کے لئے چھوڑ دیتا ہوں - تم نے اگر اسے آزاد چرنے اور اس کی باری پر پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائیگا کہ تم اپنے معاہدے میں سچے ہو - اگر تم نے اسے ایذا پہنچائی تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ تم اپنی روش کہن پر قائم ہو - (۲۶/۱۵۵) - انہوں نے اس اونٹنی کو ہلاک کر دیا (۲۶/۱۵۷) - اور خدا کے عذاب نے (جو کڑک اور زلزلہ کی شکل میں نمودار ہؤا) انہیں تباہ کر دیا (۲۶/۱۵۸) -

(طبعی حوادث ، مثلاً طوفان آب - آندھی - زلزلہ وغیرہ) ''خدا کا عذاب'' کس طرح بنتے ہیں ، اس کے لئے میری کتاب ''جوئے نور'' میں باب حضرت نوح ؑ ملاحظہ کیجئے) -

ص ب أ

صَبَأَ - یَصْبَأُ - ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونا - اس کے بنیادی معنی نکلنے اور ظاہر ہونے کے ہوتے ہیں - صَبَأَ نَابُ الْبَعِیْرِ - اونٹ کی کچلی نکل آئی (ابن فارس) - نیز کسی کے خلاف بغاوت کرنے اور دشمنی کرنے کے لئے صَبَأَ عَلَیْہِ کہتے ہیں* - صَبَأَ النَّجْمُ - ستارہ نکل آیا* -

اَلصَّابِئُوْنَ - ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونے والے* - صاحب محیط کے نزدیک یہ نصاریٰ کا ایک فرقہ تھا جو ستاروں کی اس طرح تعظیم کرتا تھا جس طرح مسلمان کعبہ کی تعظیم کرتے ہیں - بعض کا

*تاج -

خیال ہے کہ یہ ستارہ پرست یعنی مشرک قوم تھی* ۔ صاحب المنار کا بھی یہی خیال ہے ، اگرچہ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ایک مستقل ملت ہیں جو مشہور انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے عقائد بڑے مبہم سے ہیں** ۔ قرآن کریم میں صَابِئِیْنَ کا ذکر (۲/۶۲) میں آیا ہے ۔ راغب نے یہ بھی لکھا ہے کہ الصَابِئُوْنَ ، حضرت نوحؑ کے دین کی پیروی کرنے والی قوم تھی ۔

ہیسٹنگز کے انسائیکلو پیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کے مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ در حقیقت الکیسائی (Elkesaites) فرقہ کا دوسرا نام ہے ۔ یہ یہودیوں سے نکلا ہؤا ایک فرقہ تھا جسے پہلی صدی عیسوی کے قریب فروغ حاصل ہؤا ۔ گناہوں کو دھونے کے لئے پانی میں بپتسمہ لینا یا غسل کرنا ان کا امتیازی نشان تھا ۔ اس جہت سے عرب انہیں ''مغتسلہ'' کہتے تھے۔ یہودیوں کے ایسینی فرقہ نے اس جدید مذہب کو زیادہ قبول کیا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ (Sampsenes) یا (Sampsites) فرقہ جو چوتھی صدی عیسوی میں بحر میت کے قرب و جوار میں پایا جاتا تھا ، الکیسائی ہی تھا ۔ یہ لوگ خدائے واحد پر ایمان رکھتے تھے اور ہاتھ منہ دھوکر یا غسل کرکے اس کی پرستش کرتے تھے ۔ اس لفظ کے لغوی معنی ، ''سورج کی مانند'' ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ الکیسائی علم نجوم جانتا تھا اس لئے اس کے فرقہ کو ستاروں سے خاص دلچسپی تھی ۔ ظاہر ہے کہ نزول قرآن کے وقت ، عرب اس فرقہ سے اچھی طرح واقف تھے اور انہیں ''صابئین'' کے نام سے پکارتے تھے۔ شاید اس لئے کہ یہ مشہور تھا کہ الکیسائی نے اپنی الہامی کتاب کو اپنے جس جانشین کے سپرد کیا تھا اس کا نام (Sobiai) تھا ۔ ممکن ہے اسی سے انہیں (Sabians) کہا جاتا ہو ۔ یا ان کے پانی میں بپتسمہ لینے کی وجہ سے ۔ ارامی زبان میں اس سے یہی مفہوم تھا ۔

ص ب ب

صَبَّ السَّمَاءَ ۔ اسنے اوپر سے پانی گرا دیا ۔ فَتَصَبَّبَ ۔ چنانچہ پانی گر گیا (لازم ومتعدی) ۔ اَلصُّبَابَۃُ تھوڑی سی پینے کی چیز جو برتن میں باقی رہ جائے ۔ اَلصَّبَبُ ۔ نہر یا راستہ کا ڈھلوان اور نیچے کی طرف جانے والا حصہ ۔ ڈھلوان زمین ۔ اَصَبُّوْا ۔ لوگ ڈھلوان اور نشیبی زمین پر چلے ۔ صُبَّ الرَّجُلُ ۔ آدمی مٹا دیا گیا*** ۔

*محیط ۔ **تفسیر المنار ۔ *** تاج و راغب ۔

سورۃ عبس میں ہے أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا (۸۰/۲۵) ہم نے اوپر سے پانی برسایا ۔ سورۃ فجر میں ہے فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ (۸۹/۱۳) ۔ تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا ۔ سورۃ حج میں ہے ۔ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ (۲۲/۱۹) ۔ انکے سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی گرایا جائیگا ۔ انکے اکڑے ہوئے سروں کو جھکا کر انکی قوتوں کو پراگندہ کر دیا جائیگا ۔

ص ب ح

اَلصُّبْحُ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رنگوں میں سے ایک رنگ کے ہیں ۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ دراصل یہ سرخ رنگ کو کہتے ہیں اور صبح کو صُبْحٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ سرخ ہوتی ہے ۔ اور مِصْبَاحٌ (چراغ کو) اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی سرخ ہوتا ہے ۔ اَلصُّبْحُ ۔ فجر یا دن کا ابتدائی حصہ* ۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ اس وقت کو کہتے ہیں جب افق طلوع آفتاب کی وجہ سے سرخ ہو ۔ صَبَاحٌ ۔ إِصْبَاحٌ کے بھی یہی معنی ہیں* ۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ صَبَاحٌ دن کی روشنی کو کہتے ہیں ۔ قرآن کریم میں یہ تینوں الفاظ آئے ہیں (۸۱/۱۸ ؛ ۳۷/۱۷۷ ؛ ۶/۹۷) ۔ مُصْبِحٌ ۔ وہ جو صبح کے وقت میں داخل ہو* ۔ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ (۱۵/۸۳) ۔ صبح ہوتے ہی انہیں سخت آواز نے آلیا ۔ اَلْمِصْبَاحُ ۔ چراغ ، نیز بتی کی لو* ۔ (۲۴/۳۵) ۔ جمع مَصَابِيحُ ۔ ستارے (۴۱/۱۲) ۔ صَبَّحَ ۔ کسی کے پاس صبح کے وقت پہنچنا* (۵۴/۳۸) ۔ أَصْبَحَ ۔ ہو گیا (یعنی كَانَ اور صَارَ کے معنوں میں) ۔ أَصْبَحَ فُلَانٌ عَالِمًا ۔ فلاں آدمی عالم ہو گیا* ۔ فَأَصْبَحَ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۵/۳۰) وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گیا ۔ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (۳/۱۰۲) ۔ تم خدا کی نعمت (قرآن کریم) کے ذریعے بھائی بھائی بن گئے ۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ، أَصْبَحَ کے عام معنی تو "ہو گیا" ہی ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح کی نسبت سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ آغاز کار ہی سے ایسا ہو گیا ۔ وہ شروع ہی میں ایسا ہو گیا ۔

ص ب ر

صَبْرٌ کے معنے ہیں کسی شخص کا کسی مطلوبہ شے کے حصول کے لئے برابر مصروف کار رہنا* ۔ لہذا اسکے بنیادی معنوں میں استقامت ، ثابت قدمی ،

* تاج ۔

اور مسلسل کوشش داخل ہیں ۔ اسی بنا پر وہ بادل جو چوبیس گھنٹے ایک ہی جگہ کھڑا رہے اور ادھر اُدھر نہ ہو اَلصَّبِيْرُ کہلاتا ہے ۔ اور پہاڑ کوبھی الصَّبِيْرُ کہتے ہیں* ۔ اَلْاَصْبِرَةُ ۔ ان اونٹوں یا بکریوں کو کہتے ہیں جو صبح شام باقاعدہ اپنے مالکوں کے پاس واپس آجائیں اور ان سے دور نہ رہیں*** ۔ اَلصَّبَارَةُ ۔ (ص کی تینوں حرکات کے ساتھ) لوہے یا پتھر کے ٹکڑے کو کہتے ہیں (جو ایک مقام پر جم کر پڑا رہتا ہے) ۔ اَلصَّابُوْرَةُ ۔ اس مٹی وغیرہ کو کہتے ہیں جو اس لئے کشتی میں رکھدی جاتی ہے کہ اس سے کشتی جھکولے نہ کھائے** ۔ جس سے اس کا توازن قائم رہے ۔ ان الفاظ سے صَبْرٌ کا صحیح مفہوم سامنے آجاتا ہے ۔ چونکہ اس قسم کی سعی و کاوش کا نتیجہ بہت عمدہ نکلتا ہے اسلئے اَلصُّبْرَةُ ۔ غلہ کے ڈھیر کو کہتے ہیں* جس کی ناپ اور تول نہ کی گئی ہو* ۔ غور کیجئے کہ یہ کسقدر مسلسل محنت اور استقامت کا نتیجہ ہوتا ہے ۔

جم کر ایک جگہ قائم رہنے کی جہت سے یہ لفظ کسی کو روکنے کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا ۔ اسلئے صَبْرٌ کے معنے قید کرنے کے بھی ہیں (ابن فارس) ۔ یا کسی کو باندھ کر تیروں کا نشانہ بنانا ۔ یَمِیْنُ الصَّبْرِ ۔ اس قَسَمْ کو کہتے ہیں جو کسی کو زبردستی (مجبور کرکے) کھلائی جائے* ۔

سورۃ بقرہ میں ہے فَمَا اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (۲/۱۷۵) ۔ اس کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ان میں آگ کے مقابلہ کی تاب کسقدر ہے ۔ اور یہ بھی کہ وہ کونسی چیز ہے جس نے انہیں آگ کے عذاب کو جم کر برداشت کرنے پر آمادہ کر دیا ۔ ظاہر ہے کہ ان معانی میں جرأت کا مفہوم آجاتا ہے ۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ (۲/۶۱) ۔ ہم ایک ہی کھانے پر ہمیشہ کیلئے نہیں رہ سکتے ۔ اسی سورۃ (بقرۃ) میں ہے رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (۲/۲۵۰) ۔ یہاں "ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا" نے صبر کے معنوں کی وضاحت کر دی ہے ۔ یعنی ثابت قدم رہنا ۔ سورۃ آل عمران میں صَابِرِیْنَ کی تعریف ان الفاظ سے کی گئی ہے فَمَا وَهَنُوْا لِمَا اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا (۳/۱۴۵) ۔ انہیں

*تاج ۔ **محیط ۔ ***لین و تاج ۔

خدا کی راہ میں جسقدر بھی مشکلات کا سامنا ہوا ان سے وہ نہ تو سست گام ہوئے ، نہ ان میں کمزوری آئی ، اور نہ ہی وہ مغلوب ہوئے ۔ اگلی آیت میں اسی کو پھر ”ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا“ سے تعبیر کیا گیا ہے (۳/۱۴۶) ۔ سورۃ الفرقان میں ہے کہ کفار کہتے تھے کہ یہ (رسول) ہمیں ہمارے معبودوں سے بہکا دیتا لَوْلَا اَنْ صَبَرْنَا عَلَیْهَا (۲۵/۴۲) ۔ اگر ایسا نہ ہوتا کہ ہم مستقل مزاجی سے ان کی پرستش پر قائم رہتے۔ یہی معنے سورۃ ص میں وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِهَتِکُمْ (۳۸/۶) کے ہیں ۔ (۱۴/۲۱) میں صَبَرْنَا بمقابلہ جَزِعْنَا آیا ہے ۔ جَزْعٌ کے معنے ہیں رسی کو درمیان سے کاٹ دینا ۔ لہذا صَبْرٌ معنے کسی کام کو مسلسل کئے جانا ہونگے ۔ سورۃ کہف و حجرات میں صبر کا لفظ ان معنوں میں بھی آیا ہے جسکے لئے ہم کہتے ہیں کہ بے صبرے کیوں ہوتے ہو؟(Dont Be Impatient)۔ذرا ٹھہرو۔ یونہی بے چین مت ہو۔ (۱۸/۶۸ ; ۴۹/۵)۔سورۃ انفال میں ہے کہ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ (۸/۶۵) اگر تم میں سے بیس مجاہد بھی ایسے ہوں جو جم کر مقابلہ کریں تو فریق مخالف کے دو سو پر غالب آ جائینگے ۔ انہی کو اَلصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ (۲/۱۷۷) کہا گیا ہے ۔ سورۃ مریم میں ہے وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ (۱۹/۶۵) خدا کی عبادت نہایت استقامت اور ثابت قدمی سے اختیار کرو۔

یہ ہے وہ صَبْرٌ جسکے متعلق کہا گیا ہے کہ اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (۲/۱۵۳) ۔ اپنی قوتوں کی پوری نشو و نما اور اعتدال و تناسب کے لئے صبر اور صلٰوۃ کی راہ اختیار کرو۔ اور اسکے بعد ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۔ اللہ کی نصرت ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو اپنے نصب العین کے حصول کے لئے استقامت اور ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں اور ہر مشکل کا مقابلہ جم کر کرتے ہیں، اور مسلسل ایسا کرتے رہتے ہیں ۔ یہی ہیں وہ صابر جن کے متعلق کہا کہ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ (۲/۱۵۷)۔

یہ ہے صَبْرٌ کا قرآنی مفہوم ۔ اسکے برعکس صبر کے جو معنے ہمارے ہاں مروج ہیں وہ بالکل اس کی ضد ہیں ۔ ہمارے ہاں صبر کے معنے یہ ہیں کہ انسان بے کس اور بے بس، مجبور بن کر بیٹھا رہے اور زبردست اور ظالم کے ظلم و زیادتی کو آنسو بہا بہا کر خاموشی سے جھیلتا چلا جائے ۔ چنانچہ ہم اپنی انتہائی بیچارگی میں کہتے ہیں کہ ۔ ”اچھا ۔ جو تمہارے جی میں آئے کر لو۔ میں صبر کے سوا کیا کر سکتا ہوں“ ۔ اور اسی صبر کی تلقین یہ کہکر کی جاتی ہے کہ ”میاں ! صبر کرو ۔ صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے“ ۔

یعنی صبر انتہائی بیچارگی کا نام ہے ۔ غور کیجئے کہ نگاہوں کا زاویہ بدل جانے سے الفاظ کا مفہوم کیا سے کیا ہو جاتا ہے ؟ قرآنی صبر کا مفہوم تھا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ۔ اور ہمارے صبر کا مفہوم ہے انتہائی بے چارگی میں سپر ڈالدینا ۔

مختصراً یہ کہ صَبْرٌ کے معنی ہیں اپنے پروگرام پر استقامت اور استقلال سے کار بند رہنا اور اسکے راستہ میں جو مشکلات آئیں ان کا ہمت اور استقلال سے اسطرح مقابلہ کرنا کہ پاؤں میں ذرا لغزش نہ آنے پائے ۔ قرآن کریم میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ اِصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا (۳/۱۹۹) ۔ اِصْبِرُوْا کے معنی ہیں ہمت اور استقلال سے اپنے موقف پر قائم رہنا ، اور صَابِرُوْا کے معنی ہیں اس استقلال اور استقامت میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرنا ۔ یا دوسروں کے مقابلہ میں استقامت دکھانا یا ایک دوسرے کی استقامت کا موجب بننا ۔

دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی ، نہ آگے بڑھ سکتی ہے ، جبتک وہ (قرآنی مفہوم میں) اَلصَّابِرُ نہ ہو ۔ اور جو قوم ہمارے مفہوم میں ''صابر و شاکر'' ہو اسے کبھی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی ۔

ص ب ع

اِصْبَعٌ کے معنی ہیں انگلی ۔ نیز انگلی کے بالائی پور کو بھی کہتے ہیں ۔ اس کی جمع اَصَابِعُ آتی ہے * ۔ (جیسے قرآن کریم میں ہے ۲/۱۹) ۔ صَبَعَ فُلَانًا عَلٰی فُلَانٍ کے معنی ہیں اس نے انگلی کے اشارے سے اس کی راہنمائی اُس دوسرے شخص کی طرف کر دی* ۔

ص ب غ

اَلصَّبْغُ کے بنیادی معنی تغیر و تبدل ، یعنی تبدیلی پیدا کر دینے ، کے ہیں ۔ اسی سے اَلصِّبْغُ اور اَلصِّبَاغُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کپڑا وغیرہ رنگا جائے ۔ صَبَغَ الثَّوْبَ کے معنی ہیں کپڑا رنگنا ۔ اَلصَّبَّاغُ ۔ رنگریز کو کہتے ہیں ۔ (نیز کذّاب کو جو باتوں میں رنگ آمیزی کرے) ۔ اَلصِّبْغَةُ ۔ رنگنے کے طریقے کو کہتے ہیں ۔ نیز دین و ملت کو بھی** ۔

چونکہ رنگنے کے لئے کپڑے کو پانی میں ڈبویا جاتا ہے ، اس لئے صَبَغَ یَدَہٗ بِالْمَاءِ کے معنی ہیں اس نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈبولیا ۔ صَبَغَ فُلَانًا فِی النِّعَمِ ۔ فلاں شخص کو نعمتوں میں ڈبو دیا ۔ اسی نہج سے سالن کو

*تاج و محیط ۔ **تاج

صِبْغٌ کہتے ھیں ، کیونکہ اس میں روٹی ڈبو کر کھائی جاتی ھے* ۔ (۲۳/۲۰) ۔ عیسائی اپنے بچوں کو بپتسمہ دینے کے لئے پانی میں غوطہ دیتے ھیں (یا رنگ چھڑکتے ھیں تو) اسے صِبْغَۃٌ یا اِصْطِبَاغٌ کہا جاتا ھے* ۔

قرآن کریم میں ھے صِبْغَۃَ اللّٰہِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً (۲/۱۳۸) ۔ اللہ کا رنگ ۔ اس رنگ سے زیادہ حسن و زیبائی پیدا کرنے والا رنگ اور کون سا ھو سکتا ھے! سوال یہ ھے کہ صِبْغَۃَ اللّٰہِ سے مراد کیا ھے؟ اس کا جواب آیت کے باقی حصے نے خود ھی دے دیا ۔ وَنَحْنُ لَہٗ عٰبِدُوْنَ (۲/۱۳۸) یعنی قوانین خداوندی کی پوری اطاعت اختیار کر لینا ۔ ایسی اطاعت جس طرح رنگ کپڑے کے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتا ھے اور اس میں یکسر تبدیلی پیدا کر دیتا ھے ۔ لہذا قوانین خداوندی کی ھم آھنگی سے انسان کے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا ھو جاتی ھے جو اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ھے اور وہ ایک بالکل ''دوسرا'' انسان بن جاتا ھے ۔ یعنے اس کی مضمر صلاحیتیں نشو و نما پا لیتی ھیں اور اس میں صفاتِ خداوندی کا رنگ منعکس ھوتا چلا جاتا ھے ۔ اور جس طرح اللہ کی ذات میں مختلف اور متضاد قسم کی صفات (مثلاً غفور و رحیم اور جبار و قہار) اس طرح متوازن طور پر جمع ھیں کہ ان میں کبھی ٹکراؤ پیدا نہیں ھوتا ۔ (انہی کو الاسماء الحسنی کہتے ھیں ۔ یعنے مختلف صفات کا حسن کارانہ انداز سے یکجا ھونا) ۔ اسی طرح اس انسان کے اندر بھی متضاد صفات پورے توازن کے ساتھ یک جا رھتی ھیں اور ان میں کبھی کشمکش نہیں ھوتی ۔ لیکن یہ چیز صرف معاشرہ کے اندر ممکن ھے ۔ اس لئے صِبْغَۃَ اللّٰہِ سے مراد کوئی ایسی ''روحانیت'' نہیں جسے خانقاھوں میں چلہ کشی سے حاصل کیا جائے یا اس میں کسی باطنی طریق سے ترقی کی جائے ۔ یہ نام ھے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جو قرآنی معاشرہ کے اندر ممکن ھے ۔ نَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ اور نَحْنُ لَہٗ عٰبِدُوْنَ (۲/۱۳۸) کے یہی معنے ھیں اور انہی کے نتیجہ کا نام صِبْغَۃُ اللّٰہِ ھے ۔ ابن قتیبہ نے اس کے معنی دِیْنُ اللّٰہِ کئے ھیں** ۔

ص ب و

اَلصَّبْوَۃُ ۔ ابتدائے شباب کی نادانی ۔ عشقبازی ۔ صَبَتِ النَّخْلَۃُ ۔ کھجور کا مادہ درخت ، دور کے نر کھجور کے درخت کی طرف جھکا ۔ اَصْبَتْہُ الْمَرْاَۃُ ۔ عورت نے اس مرد کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور اپنی طرف مائل کیا ۔

*تاج ۔ **القرطین ۔ ج/۱ صفحہ ۶۳ ۔

اَلصَّبِیُّ۔ وہ بچہ جس کا دودھ نہ چھڑایا گیا ہو۔ یا جو ابھی بالغ نہ ہوا ہو صَبَا فُلَانٌ یَصْبُوْ ۔ فلاں آدمی کسی چیز کی طرف مائل ہو کر بچوں کے سے کام کرنے لگ گیا* ۔ سورۃ یوسف میں ہے اَصْبُ اِلَیْهِنَّ (۱۲/۳۳) ۔میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں اور لڑکوں کی سی نا سمجھی کی باتیں کرنے لگ جاؤں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) مائل کرنا ۔ جھکانا۔ جھکنا۔ اور (۲) کم عمری۔ مطلب اس سے ہوگا عقل و فکر کی رو سے نہیں بلکہ محض جذبات کے تابع، بچوں کی طرح، کسی چیز کی طرف مائل ہوجانا ۔

ص ح ب

صَحِبَ کے معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ لگ جانا ۔ اَصْحَبْتُهُ الشَّیْئَ ۔ میں نے اسے اس چیز کے ساتھ لگا دیا ۔ صَحِبَهُ ۔وہ اس کے ساتھ رہا ۔ لیکن اس میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جب کم مرتبہ آدمی کسی بڑے مرتبہ والے کے ساتھ رہے تو اس وقت ''اِنَّهُ صَاحَبَ الْاَعْلٰی'' بولتے ہیں ۔ اس کے برعکس بڑا آدمی چھوٹے کا مُصَاحِبٌ نہیں کہلائیگا ، حالانکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ اَلصُّحْبَةُ والمُصَاحَبَةُ کے معنے ہیں ساتھ رہنا ۔ اس میں یہ تخصیص ہے کہ یہ ساتھ رہنا لمبے عرصہ کے لئے ہونا چاہئے ۔ اگر لمبا عرصہ نہیں تو اسے اِجْتِمَاعٌ کہینگے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ساتھ رہنے یا قریب رہنے کے ہوتے ہیں ۔

اَصْحَبَ الرَّجُلَ وَلَهُ کے معنے ہیں وہ اس آدمی کامطیع و فرمانبردار ہو گیا ۔ اَلْمُصَاحِبُ ۔ ہمیشہ ساتھ رہنے والا ۔ مطیع و فرمانبردار ساتھی* ۔ اَصْحَبَ فُلَانًا کے معنے ہیں ، اس کی حفاظت کی ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَلَا هُمْ مِنَّا یُصْحَبُوْنَ (۲۱/۴۳) ۔ ہمارے عذاب سے ان کی کوئی حفاظت نہیں کر سکے گا ۔ اَلصَّاحِبُ (جمع اَصْحَابٌ) ۔کسی کے ساتھ مسلسل رہنے والا، چیز کا مالک ۔ وہ شخص جو اس میں تصرف کا مالک ہو**۔ ساتھ رہنے (معاشرت) کے اعتبار سے بیوی کو صَاحِبَةٌ (۶/۱۰۲) کہا گیا ہے ۔

قرآن کریم میں اَصْحَابُ النَّارِ اور اَصْحَابُ الْجَنَّةِ آیا ہے ۔ اَصْحَابٌ کا لفظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جنت اور دوزخ مادی مقامات کا نام نہیں جن میں رہنا ہوگا ۔ یہ کیفیات کا نام ہے جو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں ، اور لگی رہیں گی ۔ یہی صَحِبَ کے بنیادی معنی ہیں ۔

*تاج و راغب ۔ **تاج و محیط و راغب

انہیں کو اَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ (۵۶/۸) اور اَصْحَابُ الْمَشْئَمَةِ (۵۶/۹) کہا گیا ہے۔ یعنی یمن و سعادت کے مالک اور شامت زدہ لوگ۔ سورۃ ذاریات میں اَصْحَابِهِمْ (۵۱/۵۹) سے مراد ہیں انہی جیسے لوگ۔ راغب نے کہا ہے کہ صَاحِبٌ ہر اُس ساتھ رہنے والے کو کہدیا جاتا ہے جو مستقلاً کسی انسان یا حیوان یا مکان یا زمان کے ساتھ رہے۔ خواہ یہ ساتھ رہنا جسمانی طور پر ہو یا فکری طور پر۔ صَاحِبُ الْحُوْتِ (۶۸/۴۸)۔ ''مچھلی والا'' یعنی جسکے ساتھ مچھلی کا واقعہ گزرا تھا۔ یعنی ذَاالنُّوْنِ (۲۱/۸۷)۔

قرآن کریم میں اَصْحَابُ الْفِيْلِ۔ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ۔ اَصْحَابُ الْاَيْكَةِ۔ اَصْحَابُ الْحِجْرِ۔ مختلف پارٹیوں اور قوموں کے لئے آیا ہے جن کی تفصیل قرآن کریم کے متعلقہ مقامات میں ملے گی۔ علاوہ ازیں اَصْحَابُ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ کا قصہ سورۃ کہف میں آیا ہے۔ (ان سب کے تشریحی مفہوم کے لئے متعلقہ عنوانات دیکھئے)۔

سورۃ توبہ میں اُس واقعہ کا ذکر ہے جب نبی اکرمؐ (ہجرت کے وقت) ایک غار میں تھے اور آپ کے ہمراہ ایک ''ساتھی'' تھا۔ اس ''ساتھی'' کے متعلق کہا گیا ہے اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۹/۴۰)۔ ''جب (رسول اللہؐ نے) اپنے ساتھی سے کہا کہ مت گھبراؤ۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے''۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ اسی بنا پر حضورؐ کے باقی ساتھیوں کو بھی صحابہؓ کہا جاتا ہے۔

ص ح ف

اَلصَّحِيْفُ۔ روئے زمین۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کشادگی اور وسعت بتائے ہیں۔ اَلصِّحَافُ۔ چھوٹے چھوٹے حوض جو پانی جمع کرنے کے لئے بنائے جائیں۔ اَلصَّحْفَةُ بڑا پیالہ۔ پھیلا ہوا چوڑا پیالہ جس سے پانچ آدمی سیر ہو کر دودھ یا پانی پی سکیں*۔ اَلصَّحِيْفَةُ۔ (جمع اَلصَّحَائِفُ والصُّحُفُ)۔ لکھا ہوا کاغذ۔ یہ لفظ عرف عام میں چہرہ اور کتاب کے ورق کے لئے بھی بولا جاتا ہے**۔ یہ دراصل ہر پھیلی ہوئی چیز کو کہتے ہیں***۔ اَلْمُصْحَفُ (میم کی تینوں حرکات کے ساتھ**)۔ متعدد صحیفوں (لکھے ہوئے اوراق) کا مجموعہ***۔ اَلتَّصْحِيْفُ۔ قرآن کریم کو اشتباہ حروف کی وجہ سے اسطرح پڑھنا یا روایت کرنا جسطرح وہ قرآن کریم میں نہیں***۔ قرآن کریم میں صِحَافٌ (واحد صَحْفَةٌ)

* تاج۔ ** محیط۔ *** راغب۔

بڑے بڑے طباق یا پیالوں کے لئے آیا ہے ۔ (۴۳/۷۱) ۔ رسول اللہؐ کے متعلق ہے یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (۹۸/۲)۔ جو پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے ۔ ان لکھی ہوئی آیات قرآنی کی تلاوت کرتا ہے جو ہر قسم کے اسقام و نقائص سے پاک اور ذہن انسانی کی آمیزش سے منزہ ہیں ۔ غور کیجئے ۔ قرآنی آیات کو صحف کہکر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ شروع ہی سے لکھی جاتی تھیں ۔ اسکی تفسیر (۸۰/۱۳-۱۵) میں کر دی ، جہاں فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ کہکر بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ سے اسکی تشریح کر دی کہ وہ ، واجب العزت والتکریم کاتبوں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرمؐ پورے قرآن کریم کو لکھا کر اُمت کو دیکر گئے تھے ۔ یہ صحیح نہیں کہ اسے بعد میں صحابہؓ نے جمع کیا تھا ۔ قرآن کریم کے علاوہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراھیمؑ کی کتابوں کو صُحُفِ اِبْرَاهِیْمَ وَمُوْسٰی ۔ (۸۷/۱۹) کہا گیا ہے ۔ اور عام لکھی ہوئی چیزوں کے لئے یہ لفظ (۸۱/۱۰) اور (۷۴/۵۲) میں آیا ہے ۔

ص خ خ

اَلصَّخُّ ۔ لوہے کو لوہے پر یا کسی اور سخت چیز کو سخت چیز پر زور سے مارنا ۔ (جیسے کارخانوں میں ہوتا ہے)۔ نیز اس طرح دو سخت چیزوں کے لگنے سے پیدا ہونے والی آواز اسی سے اَلصَّاخَّةُ سخت اور کرخت آواز کو کہتے ہیں جو کانوں کو بہرہ کر دے ۔ سخت مصیبت کو بھی کہتے ہیں ۔ چنانچہ صَخَّنِیْ فُلَانٌ بِعَظِیْمَةٍ کے معنے ہیں اس نے مجھ پر بہت بڑا اتہام لگایا * ۔

قرآن کریم میں انقلاب عظیم کیلئے آیا ہے فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ (۸۰/۳۳) ۔ مبہوت کر دینے والی مصیبت ۔ اور اگر اس میں جنگ کی طرف بھی اشارہ ہے تو پھر ہتھیاروں کی جھنکار کا پہلو بھی اس میں مضمر ہے (اور ہماری Machine Age ۔ مشینی دور ، تو ہے ہی صَاخَّةٌ)۔

ص خ ر

اَلصَّخْرَةُ ۔ (جمع صَخْرٌ) بڑا سخت پتھر یا چٹان کا ٹکڑا ۔ اَلصَّاخِرُ ۔ لوہے پر لوہا مارنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے ** ۔ (یہ صَاخَّةٌ کے ہم معنی ہے ۔ دیکھئے عنوان ص ۔ خ ۔ خ)

* تاج ۔ نیز ابن فارس ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔

سورۃ کہف میں ہے اِذْ اَوَیْنَا اِلَی الصَّخْرَۃِ (۱۸/۶۳) - جب ہم نے بڑے پتھر (یا چٹان) کے ٹکڑے کی پناہ لی تھی -

سورۃ فجر میں قوم ثمود کے متعلق ہے جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (۸۹/۹) انہوں نے وادی میں بڑی بڑی چٹانیں تراش کر (مکان بنائے) - صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ صَخْرَۃٌ ہر پتھر کو نہیں کہتے ، صرف بڑی چٹان کو کہتے ہیں - ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے -

ص د د

صَدَّ عَنْہُ - یَصُدُّ - صُدُوْدًا - کسی سے رو گردانی کرنا - اعراض برتنا * - رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًا (۴/۶۱) - تو منافقین کو دیکھے گا کہ وہ تجھ سے پورا پورا اعراض کرتے ہیں - منہ پھیر لیتے ہیں - صَدَّہٗ عَنْہُ - یَصُدُّہٗ - صَدًّا - اسے کسی چیز سے باز رکھا ، ہٹایا ، پھیر دیا ، روک دیا * - وَصَدَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (۲/۲۱۷) - اللہ کی راہ سے روکنا -

صَدَّ - یَصِدُّ صَدِیْدًا - اس نے شور و غوغا کیا - چیخ پکار کی * - اِذَا قَوْمُکَ مِنْہُ یَصِدُّوْنَ (۴۳/۵۷) تیری قوم اس پر چلا اٹھتی ہے -

صَدِیْدٌ - کھولتا ہوا گرم پانی - زخم سے رسنے والا خون آلود پانی - جہنمیوں کی کھالوں سے ٹپکنے والا پانی - نیز پیپ کو بھی کہتے ہیں * - جہنم کے پانی کو مَآءٍ صَدِیْدٍ (۱۴/۱۶) کہا گیا ہے - کھیتیوں کی نشو و نما ہمیشہ ٹھنڈے پانی سے ہوتی ہے - کھولتا ہوا گرم پانی پودوں کو جلا دیتا ہے اور ان کی نشو و نما ختم ہو جاتی ہے - اسلئے جہنم کی زندگی میں انسانوں کو جو کچھ ملتا ہے اس سے ان کی جسمانی زندگی تو قائم رہتی ہے لیکن کشت انسانیت یکسر جھلس کر رہ جاتی ہے - اسی کو دوسری جگہ مَآءً حَمِیْمًا (۴۷/۱۵) کہا گیا ہے - انسانیت کی نشو و نما رک جانے کا نام جہنم ہے (دیکھئے عنوان ج - ح - م)

ص د ر

اَلصَّدْرُ - سینے کو کہتے ہیں (جمع صُدُوْرٌ ہے) - پھر ہر چیز کے اعلیٰ ، مقدم اور اگلے حصہ کو کہنے لگ گئے - صَدْرُ الْقَوْمِ - قوم کا رئیس ** -

---

* تاج و محیط - ** تاج

صَدَرَ - يَصْدُرُ - لوٹنا - واپس ہونا - یہ درحقیقت جانوروں کے پانی پی کر واپس آنے کیلئے بولا جاتا ہے - وُرُوْدٌ - پانی پینے کیلئے گھاٹ پر جانا ، اور صَدُوْرٌ - واپس آنا - اَلصَّادِرُ - لوٹنے والا *۔

لہذا اس لفظ کے معنے آگے جانا - نکلنا اور لوٹنا ہیں - نکل پڑنے کے معنوں میں یہ لفظ (۹۹/۶) میں آیا ہے - اَصْدَرَ - واپس لے جانا ، لوٹانا - جانوروں کو پانی پلا کر واپس لے جانے کے معنوں میں یہ لفظ (۲۳/۲۸) میں آیا ہے -

صَدْرٌ (جمع صُدُوْرٌ) کا لفظ قرآن کریم میں دل کے معنوں میں آیا ہے - اِنْ تُخْفُوْا مَافِیْ صُدُوْرِکُمْ (۳/۲۸)- راغب نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں اللہ نے اَلْقَلْبُ کہا ہے تو اس سے مراد علم و عقل ہے اور جہاں صَدْرٌ کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس میں علم و عقل اور جذبات سب شامل ہیں **- لیکن یہ کُلِّیَّہ نہیں -

قرآن کریم نے اپنے آپ کو شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (۱۰/۵۷) کہا ہے - یعنی تمام ذہنی اور نفسیاتی امراض کے لئے شفا - صاحب محیط نے بَنَاتُ الصَّدْرِ کے معنے تفکرات لکھے ہیں ***۔

(شَرْحِ صَدْرِ کے لئے دیکھئے عنوان ش - ر - ح)

ص د ع

اَلصَّدْعُ - کسی سخت چیز میں شگاف ڈالنا ****- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز میں ''تریڑ'' پڑ جانا ، کسی چیز کا کھل جانا اور اس میں پھٹن پیدا ہو جانا یا بال آ جانا ہیں - اَلصِّدْعُ - لوگوں کی جماعت - چیز کا ایک ٹکڑا - پھاڑی ہوئی چیز کا آدھا حصہ - صَدَعَہٗ صَدْعًا - اس نے اسے پھاڑ دیا - آدھا آدھا کر دیا - اَلْمُتَصَادِعُ سخت زمین میں نرم راستے - تیروں کی انیاں - اَلصُّدَاعُ - دردِ سر - وہ درد جس سے سر پھٹا جارہا ہو - تَصَدَّعَ الْقَوْمُ وَاصَّدَّعُوْا - قوم متفرق ہوگئی - صُدِّعَ الرَّجُلُ - اس کے سر میں درد ہوا *۔

سورۃ حجر میں نبی اکرم ؐ سے کہا گیا ہے فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ (۱۵/۹۴) - آیت کا دوسرا ٹکڑا پہلے کی تشریح کررہا ہے - یعنی اب ان مشرکین عرب سے اعراض برتو - ان سے کنارہ کشی کرلو - اور اپنی الگ جماعتی تنظیم کرو - بعض نے اس کے معنے یہ بھی

* تاج - ** راغب - *** محیط - ****تاج و راغب -

لکھے ھیں کہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ھے اسے کھول کر بیان کرو۔ (لیکن ھمارے نزدیک پہلا مفہوم زیادہ موزوں ھے)۔ سورۃ روم میں ھے یَوْمَئِذٍ یَصَّدَّعُوْنَ (۳۰/۴۳) ۔ جس دن وہ الگ الگ ھو جائینگے ۔ سورۃ واقعہ میں ھے لَا یُصَدَّعُوْنَ عَنْھَا (۵۶/۱۹) ۔ اس سے درد سر نہیں ھوگا ۔ دماغی خلل نہیں ھوگا ۔ سورۃ حشر میں ھے خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا (۵۹/۲۱) ٹکڑے ٹکڑے ھوجانے والا ۔ پھٹا ھوا۔ سورۃ طارق میں ھےوَ الْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ (۸۶/۱۲)۔ ''زمین جو پودوں کے اگنے کے وقت پھٹ جاتی ھے''۔ قرآن کریم نے بتایا ھے کہ کائنات میں ھر شے تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کی گئی ھے ۔ (بِالْحَقِّ) ۔ لیکن ھم دیکھتے ھیں کہ اس میں بعض عمل تخریبی بھی ھوتے ھیں ۔ وہ کہتا ھے کہ یہ تخریب در حقیقت تعمیرھی کی تمہید ھوتی ھے۔ مثلاً ھم زمین میں تخم ریزی کرتے ھیں تو اس کے بعد دانہ پھٹ جاتا ھے اور اس کے ساتھ زمین بھی شق ھوجاتی ھے ۔ بظاھر یہ تخریبی عمل ھے ۔ لیکن اس سے فصل کی ابتداء ھوتی ھے جو یکسر تعمیری نتائج کی حامل ھوتی ھے۔ اسی طرح ھر تعمیر سے پہلے تخریبی عمل ھوتا ھے ۔ اِلَّا اللّٰہُ سے پہلے لَا اِلٰہ ضروری ھے ۔ لیکن اگر کسی پروگرام میں صرف لا ھی لا ھو تو وہ تخریب ھی تخریب پیدا کرتا ھے ۔ اسلئے

لَا و اِلَّا ساز و برگِ امتان　　نفی بے اثبات مرگِ امتان

لہذا ، ارض کا ذَاتُ الصَّدْعِ ھونا، انسانی نشو و نما کے لئے ھے۔

ص د ف

اَلصَّدَفُ ۔ سیپی ۔ ھربلند عمارت یا دیوار یا پہاڑ* ۔ ابن فارس نے الصَّدَف کے معنے پہاڑ کا کنارہ یا جانب کئے ھیں کیونکہ وہ ایک طرف کو جھکا ھوتا ھے ۔ قرآن کریم میں ھے اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ (۱۸/۹۶) ۔ یہاں صَدَفَیْنِ کے معنے دو بلند پہاڑ ھیں ۔ اَلصَّدَفُ ۔ گھوڑے یا اونٹ کی ٹانگوں کی کجی* ۔ ٹیڑھے پن کے اعتبار سے صَدَفَ عَنْہُ کے معنے کسی سے اعراض برتنا ۔ منہ موڑ لینا ھوتے ھیں ** ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی میلان اور جھکاؤ کے ھیں ۔ اور جب اس کے ساتھ عَنْ آئیگا تو اس کے معنی منہ پھیر لینے کے ھوجائینگے (۶/۱۵۸) ۔ بغیر عَنْ کے بھی یہ معنی آجاتے ھیں ۔ صَدَفَ فُلَانٌ وہ جھکا نیز اس نے منہ پھیرلیا۔ جیسے قرآن کریم میں ھے ثُمَّ ھُمْ یَصْدِفُوْنَ (۶/۴۶) ۔ یہ لوگ اس پر بھی اعراض برتتے اور منہ پھیر لیتے ھیں ۔ اَلصَّدُوْفُ ۔ اس عورت کو کہتے ھیں جو اپنا رخ دکھائے اور پھر منہ پھیر لے * ۔

---

* تاج ** راغب ۔

ص د ق

صِدْقٌ۔ کِذْبٌ کی ضد ہے ۔ جیسا کہ کِذْبٌ کے عنوان میں لکھا گیا ہے ، جب انسان کا دل اور اسکی زبان ہم آہنگ نہ ہوں تو اسے کِذْبٌ کہتے ہیں ، خواہ وہ بات جسے وہ بیان کر رہا ہے ، سچی ہی ہو ۔ اس لئے صِدْقٌ کے معنے ہونگے ، دل و زبان کی ہم آہنگی کے ساتھ بات کا نفس واقعہ کے مطابق ہونا ۔ اسی کو سچ کہتے ہیں ۔ لیکن اس کی ایک شکل اور بھی ہے ۔ ایک شخص کو کسی واقعہ کے متعلق جو کچھ معلوم ہے وہ غلط ہے ، لیکن اسے جو کچھ معلوم ہے اسے وہ ٹھیک ٹھیک بیان کر رہا ہے ۔ اس صورت میں اس کے دل اور زبان میں تو ہم آہنگی ہوگی ، لیکن اسکی بات غلط ہو گی۔ اس شخص کو ہم جھوٹا نہیں کہینگے ، البتہ اس کی بات کو غلط کہینگے ۔ نیز صِدْقٌ کے معنے قوت اور شدت کے بھی آتے ہیں *۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہی قوت کے ہیں اور سچ کو الصِّدْقُ اسی لئے کہتے ہیں کہ سچ میں فی نفسہ قوت ہوتی ہے ، اور جھوٹ بودا اور کمزور ہوتا ہے ۔ شَیْءٌ صَدْقٌ ۔ ٹھوس اور سخت چیز کو ، اور رُمْحٌ صَدْقٌ مضبوط نیزہ کو کہتے ہیں ۔ لہذا اس مادہ سے جتنے الفاظ آئینگے ان میں ان بنیادی معانی کا پہلو مضمر ہوگا۔ اسے ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے ۔

الصِّدِّیْقُ ۔ دوست کو کہتے ہیں ۔ الصِّدِّیْقُ ۔ بہت سچ بولنے والا ۔ جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو ۔ سچ کا اس قدر خوگر کہ اس سے جھوٹ کا امکان ہی نہ ہو۔ نیز صِدِّیْقٌ وہ ہے جو اپنے قول و اعتقاد میں سچا ہو اور اس کی سچائی کی تصدیق اپنے عمل سے بھی کر دکھائے ۔ اس لئے کہ صَدَّقَ کے معنے ہیں سچ کرکے دکھا دینا ۔ (تفصیل اس کی آگے چل کر آتی ہے) ، الصَّدَقَةُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو خدا کی راہ میں دی جائے * ۔ بعض کا خیال ہے کہ صَدَقَةٌ وہ ہے جو واجب نہ ہو بلکہ محض بطور خیرات دیا جائے ، اور زَکٰوةٌ وہ ہے جس کا دینا واجب ہو ۔ جیسا کہ زکٰوةٌ کے عنوان (ز ـ ک ـ و) میں بیان ہو چکا ہے ، جب قرآنی نظام اپنی تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں جو کچھ افراد کی ضروریات سے زائد ہو سب کا سب معاشرہ (یا نوع انسانی) کی فلاح و بہبود کے لئے وقف ہو جاتا ہے ۔ لیکن عبوری دور میں اسلامی معاشرہ ایک معین رقم افراد پر واجب قرار دینا ہے ،

* تاج و راغب ۔

جو عام حالات میں وصول کر لی جاتی ہے۔ (اس کے لئے زکٰوۃ کا لفظ بطور اصطلاح استعمال کر لیا گیا ہے) - لیکن ہنگامی حالات (Emergency) میں افراد سے اپیل کی جاتی ہے۔ جو کچھ وہ اس طرح دیتے ہیں وہ صَدَقَةٌ ہے۔ لیکن یہ بھی اجتماعی طور پر وصول اور اجتماعی طور پر خرچ کیا جاتا ہے - (۹/۶۰ ; ۹/۱۰۳) -

صَدَقَ کے معنے ہیں اس نے جو کچھ کہا اس پر عمل کرکے اسے سچ کر دکھایا* - سورۃ احزاب میں ہے مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللهَ عَلَيْهِ (۳۳/۲۳) - مومنوں میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اللہ سے کئے ہوئے عہد کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا - اسی طرح سورۃ آل عمران میں ہے وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللهُ وَعْدَهٗ (۳/۱۵۰) - "یقیناً اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے سچ کر دکھایا" - سورۃ زمر میں ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ (۳۹/۹۴) - "حمد، اللہ کیلئے ہے جس نے اس وعدہ کو جو اس نے ہم سے کیا تھا سچ کر دکھایا" - سورۃ بقرہ میں ہے کہ نیکی اور کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف - کشاد کی راہ یہ ہے کہ تم صحیح تصوراتِ حیات کے بعد، اپنے اعمال و کردار سے انہیں سچ کر کے دکھا دو - ایسے لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا (۲/۱۷۷) - یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کو اپنے عمل سے سچ کر دکھایا - عمل سے سچ کر دکھانے کے علاوہ، اعتقادات و تصورات حیات کے معاملہ میں صادق وہ ہے جو اپنے دعوی کی تائید میں دلیل و برہان پیش کر سکے (۲/۱۱۱) - اسی میں اس دعویٰ کی تقویت کا راز ہے -

کسی واجب کام کے نہ کر سکنے کی وجہ سے جو کچھ بطور کفارہ دیا جاتا ہے اسے بھی صَدَقَةٌ کہا گیا ہے (۲/۱۹۶) - سورۃ بقرہ میں صَدَقَاتٌ کا لفظ الرِّبٰوا (سود) کے مقابلہ میں آیا ہے (۲/۲۷۶) - یعنی رِبٰوا تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارا واجب ہے اس سے زیادہ لو، اور صَدَقَة یہ ہے کہ جو کچھ تم پر واجب ہے (نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے) اس سے بھی زیادہ دو - اسی لئے کہا ہے کہ يَمْحَقُ اللهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ (۲/۲۷۶) ربٰوا (جسے تم بزعمِ خویش سمجھتے ہو کہ ہم نے زیادہ وصول کر لیا) تباہ و برباد ہو کر رہتا ہے۔ اور صَدَقَاتٌ (جسے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے خواہ مخواہ دیدیا) بہت بڑھتے ہیں - اور تَصَدَّقَ واصَّدَّقَ کے معنے ہیں جو کچھ کسی پر تمہارا واجب ہے اسے بھی چھوڑ دینا، بطیب خاطر دیدینا،

*محیط و راغب -

صدقہ کر دینا ۔ مثلاً اگر قرضدار غریب ہو گیا ہے تو اسے قرض معاف کر دیا جائے (۲/۲۸۰) نیز (۴/۹۲ ; ۵/۴۵) ۔ عورتوں کا مہر بھی صَدَقَۃٌ ہے (۴/۴) لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ دال کے ضمّہ (پیش) سے آیا ہے ۔ یعنی صَدُقَۃٌ ۔ واضح رہے کہ مہر کوئی متعین رقم نہیں جس کے عوض عورت کو خریدا جاتا ہے ۔ یہ محض ایک تحفہ (Gift) ہے جسے بطیب خاطر دیا جاتا ہے ۔ لیکن اس کا دینا ضروری ہے ۔ (مہر کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا)۔ صَدُقَۃ میں اخلاص (صدق) اور حق و دوستی اور رفاقت (صداقت) کا مفہوم مضمر ہے ۔

صَدِیْقٌ ۔ دوست کو کہتے ہیں (۲۴/۶۱) (یہ واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے)۔ سورۃ یونس میں ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو مُبَوَّاً صِدْقٍ عطا کیا (۱۰/۹۳) ۔ اس کے معنے ہیں ایسی سرزمین جو قوتوں اور توانائیوں، خوشگواریوں اور صلاحیتوں (Potentialities) سے بھری ہوئی تھی۔ (صاحب تاج العروس نے اسکے معنے مَنْزِلاً صَالِحاً لکھے ہیں)۔

قرآن کریم میں صَدَقَ اور صَدَّقَ دونوں الفاظ ''سچ کر دکھادینے'' کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں ۔ (صَدَقَ کی مثالیں ہم پہلے دے چکے ہیں ۔ نیز سورۃ الفتح میں ہے) لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ .... (۴۸/۲۷) '' یقیناً اللہ اپنے رسول کے خواب کو عنقریب سچا کر دکھائیگا'' *۔ اور سورۃ صافات میں حضرت ابراھیمؑ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا (۳۷/۱۰۵) '' تو نے خواب کو سچ کر دکھایا ''۔ اسی صَدَّقَ سے مُصَدِّقٌ ہے جس کے معنے ہیں سچ کرکے دکھا دینے والا (۳/۳۸) ۔ اللہ تعالٰے نے قرآن کریم کے متعلق بار بار کہا ہے کہ یہ مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَکُمْ (۴/۲) ہے ۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ قرآن کریم اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ اھل کتاب کے پاس ان کی مزعومہ کتابیں بالکل سچی ہیں ۔ یہ معنے اس لئے غلط ہیں کہ خود قرآن کریم میں ان کتابوں کی بابت واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ان میں تحریف و الحاق ہو چکا ہے ۔ لہذا جن کتابوں کو قرآن کریم خود محرّف قرار دے رہا ہو وہ ان کے سچا ہونے کی تصدیق کس طرح کر سکتا ہے ؟ دراصل (مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَکُمْ) میں ایک بہت بڑی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے ۔ عام اخلاقی اصول دُنیا کی ہر قوم کے پاس بالعموم موجود ہیں ۔ سب کی تعلیم یہ ہے کہ سچ بولو ۔ جھوٹ نہ بولو ۔

*صَدَقَ بمعنی صَدَّقَ یعنی تصدیق کی، بھی آتا ہے ۔ آیت (۴۸/۲۷) میں اس معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے رسول کے دیکھے ہوئے خواب کی تصدیق کی اور اسے بتایا کہ تمہارا یہ خواب سچ ہو کر رہے گا ۔ (راغب و کشاف)

چوری نہ کرو۔ حرام نہ کھاؤ۔ کسی کو نہ ستاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کے ہاں یہ تعلیم محض نظری حیثیت سے موجود ہے۔ کوئی عملی نظام ایسا نہیں جو اس تعلیم کو سچا کرکے دکھائے۔ قرآن کریم کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ یہ صرف اس تعلیم کو بیان نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک ایسا عملی نظام بھی دیتا ہے جس میں یہ تعلیم سچ بنکر سامنے آجاتی ہے۔ ساری دنیا کہتی ہے کہ ظالم کبھی پنپ نہیں سکتا، لیکن اس کے باوجود ہم ظالموں کو پنپتا دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ قرآن کریم بھی یہی کہتا ہے کہ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶) لیکن وہ اس کے ساتھ ایک عملی نظام ایسا دیتا ہے جس میں یہ اہم حقیقت (کہ ظالم کی کھیتی کبھی بارآور نہیں ہو سکتی) عملاً سچ بنکر سامنے آجاتی ہے۔ اسے کہتے ہیں مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ۔ یعنی وہ اخلاقی اصول جو دنیا میں محض نظری تعلیم بن کر رہ چکے ہیں قرآنی نظام میں ایک ٹھوس حقیقت بنکر سامنے آجائینگے، اور اس طرح دنیا دیکھ لے گی کہ وہ اصول فی الواقعہ صداقت پر مبنی ہیں۔ اس طرح قرآن کریم ان اصولوں کو سچ کرکے دکھا دینے والا ہے۔ جو اقوام عالم کے ہاں موجود ہیں اور ان اصولوں کو بھی جو ان کے علاوہ، قرآن کریم میں آئے ہیں اور جن سے آسمانی ہدایت عالمگیر اور مکمل ہوئی ہے نیز اس اعتبار سے بھی کہ کتب سابقہ (توراۃ و انجیل) میں ایک آنے والے نبیؐ کے متعلق جس قدر نشانات مذکور تھے قرآن کریم نے ان سب کو نبی اکرمؐ کے ظہور میں سچا ثابت کر دیا۔ علامہ **حمیدالدین** فراہیؒ نے (اپنی کتاب مفردات القرآن میں) اس سلسلہ میں بڑی مفید بحث کی ہے جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:—

مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ۔ یہ دو کلمے ہیں جن کا مفہوم اکثر لوگوں نے نہیں سمجھا۔ انہوں نے خیال کر لیا کہ قرآن کریم نے تحریف و تبدیل شدہ کتابوں کی شہادت دی ہے۔ مُصَدِّقًا کا لفظ شبہ کا موجب ہو سکتا تھا کیونکہ تَصْدِیْق کا لفظ اس مفہوم کے لئے مشترک ہو سکتا ہے۔ اور بَیْنَ یَدَیْهِ کے مفہوم کو لوگوں نے اس لئے نہیں سمجھا کہ اس زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ لوگ عربیت سے واقف نہیں رہے۔

واضح رہے کہ صَدَّقَهٗ کے دو معنی ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ کسی آدمی یا بات کی سچائی کی شہادت دینا، اور دوسرے معنی یہ کہ اس نے اسے اسکی توقعات میں سچا بنا دیا۔ حماسہ میں ہے:-

فَدَتْ نَفْسِیْ وَمَا مَلَکَتْ یَمِیْنِیْ
فَوَارِسَ صَدَّقَتْ فِیْهِمْ ظُنُوْنِیْ

میری جان اور وہ تمام چیزیں جو میرے قبضہ میں ہیں ان شہسواروں پر قربان جن کے متعلق میرے تمام خیالات (توقعات) سچ ثابت ہو گئے۔

اسی معنے میں قرآن کریم میں آیا ہے وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ (۳۴/۲۰) اور ابلیس نے ان کے بارے میں اپنا ظن سچ کر دکھایا۔ سو انہوں نے اس کی پیروی کی'' ۔

اگر آپ اس لفظ کے مواقع استعمال پر غور کرینگے تو معلوم ہو جائیگا کہ یہاں یہ دوسرے معنے ھی مراد ھیں ، کیونکہ نبی اکرمؐ اور قرآنِ کریم بالکل اسی طرح آئے جس طرح تورات نے خبر دی تھی۔ لہذا آپ کی اور قرآن کریم کی آمد نے تورات کو سچ کر دکھایا ۔ اس کے بعد اگر وہ لوگ قرآن کریم اور نبی اکرمؐ کی تکذیب کرتے ھیں تو انکی طرف سے یہ خود ان کی اپنی کتابوں کی تکذیب ہوگی [اس کے بعد علامہ فراھیؒ نے بتایا ھے کہ امام رازی وغیرہ نے ان آیات کے مفہوم میں کس طرح غلطی کھائی ھے ، اور صحیح پوزیشن کیا ھے ۔ ھم بحث کے اس حصے کو چھوڑتے ھیں ۔ جو حضرات اس سے دلچسپی رکھتے ھوں وہ اس بحث کو ان کی مذکورہ بالا کتاب کے صفحات ۶۴ تا ۶۷ پر ملاحظہ فرما سکتے ھیں]

علاوہ ان کے جنکا پہلے ذکر آچکا ھے ، صَدَقَ کی مختلف شکلیں قرآنِ کریم میں اس طرح آئی ھیں ۔ سچ کہنا ۔ تصدیق کرنا ۔ صَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (۳۶/۵۲)۔ سچ کر دکھانا ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا (۲/۱۷۷) ۔ نیز لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا (۴۸/۲۷) ۔ قَدَمَ صِدْقٍ (۱۰/۲) ایسی سبقت جو شرف و فضیلت کو لئے ہو ۔ مُدْخَلَ صِدْقٍ اور مُخْرَجَ صِدْقٍ (۱۷/۸۰) ۔ شرف وفضلیت کے ساتھ آگے بڑھنا اور شرف وفضیلت کے ساتھ مناسب وقت پر پیچھے ھٹنا ۔ یا سچائی کے ساتھ کسی معاملہ وغیرہ میں داخل ھونا اور سچائی کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ھونا اور نکلنا ۔ لِسَانَ صِدْقٍ (۲۶/۸۴) شرف وفضیلت کی بناء پر حقیقی شہرت ۔ مَقْعَدِ صِدْقٍ (۵۴/۵۵) ٹھہرنے کا ایسا مقام جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں موجود ھوں ۔ صَادِقٌ (۱۹/۵۴) سچا ۔ مخلص ۔ اَصْدَقُ ۔ صادق تر ، زیادہ سچا (۴/۸۷) ۔ تَصْدِيْقٌ ۔ سچ کرکے دکھانا (۱۲/۱۱۱) مُتَصَدِّقٌ کسی کو کچھ بطور بخشش دیدینے والا یا جو کچھ اس کا کسی پر واجب (Due) ھو اسے چھوڑ دینے والا (۱۲/۸۸) ۔ سورۃ حدید میں صدقہ دینے والوں کو مُصَّدِّقٌ کہا گیا ھے (۵۷/۱۸) یعنی جو کچھ واجب ھے اس کے علاوہ اور بھی دینے والے ۔ یہ سب اس لئے کہ وہ اپنے اس دعویٰ کو سچا کر

دکھائیں کہ ان کا فریضہ زندگی دوسروں کی نشو و نما کرنا ہے۔ کَذَّبَ کے مقابلہ میں صَدَّقَ (۷۵؍۳۱) میں آیا ہے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ صِدْقٌ کسی شکل میں بھی استعمال ہو، اس میں دل کی ہم آہنگی اوررضامندی کا پہلو ضرور شامل ہوتا ہے۔ یعنی جو کچھ کیا جائے یا دیا جائے وہ بھی دل کی رضامندی اور خوشنودی لئے ہو اور جو کچھ مانا اور تسلیم کیا جائے وہ بھی بطیب خاطر ہو۔ اس میں جبر و اکراہ کا شائبہ تک نہ ہو۔ قرآنی تعلیم کا بنیادی نقطہ ہی یہ ہے کہ انسان کی ہر بات اور ہر عمل دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ یہی وہ عمل ہے جو وجہ تقویت ہو سکتا ہے، خود اس کام کے کرنے والے کے لئے بھی اور نوع انسانی کے لئے بھی۔ اس لئے اس کی رو سے صِدْقٌ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ص د ی

اَلصَّدٰی۔ کے بہت سے معنے ہیں، جن میں سے ایک معنے ہیں صدائے باز گشت (جو کسی مکان یا پہاڑ سے ٹکرا کر واپس آئے)۔ اَصْدَی الْجَبَلُ۔ پہاڑ نے صدا کا جواب دیا۔ اَلصَّدٰی۔ مطلق آواز کو بھی کہتے ہیں۔ اَلتَّصْدِیَةُ۔ تالیاں پیٹنا*۔ راغب نے کہا ہے کہ التَّصْدِیَۃ ہر اس آواز کو کہتے ہیں جو صدی کی طرح ہو، یعنی جس سے کوئی مفہوم نہ نکلتا ہو یا جس میں غنا و خوش الحانی نہ ہو**۔ قرآن کریم میں ہے کہ (عہد جاہلیہ کے عربوں کی صَلٰوۃ) مُکَآءً وَّ تَصْدِیَةً (۸؍۳۵) کے سوا کچھ نہیں رہ گئی تھی۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مفہوم ہے بے معنے آواز اور حرکت**۔ (اس آیت کے مفہوم کے لئے عنوان م۔ ک۔ و دیکھئے)۔ صَادَاہُ۔ سامنے آنا۔ تَصَدّٰی لَہٗ۔ سر اٹھائے ہوئے کسی کے سامنے آنا۔ بار بار کسی کے سامنے آنا۔ صدائے باز گشت کی طرح کسی کی طرف پلٹنا، در پے ہو جانا۔ متوجہ ہونا***۔ فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی (۸۰؍۶)۔ تو اس کی طرف بڑی شدت سے متوجہ ہوتا ہے۔

ص ر ح

اَلصَّرْحُ۔ ہر چیز میں سے خالص۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اس خالص چیز کو کہتے ہیں جو سفید ہو۔ کَاْسٌ صُرَاحٌ۔ وہ پیالہ (شراب وغیرہ کا)

*تاج۔ **راغب۔ ***محیط۔

جو خالص ہو اور اس میں کسی چیز کی ملاوٹ نہ ہو ۔ اَلتَّصْرِیْحُ ۔ (لازم اور متعدی) معاملہ کو واضح کر دینا ۔ معاملہ کا کھل جانا ۔ صاف اور خالص ہو جانا* ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ظاہر ہونے اور کھل جانے کے لکھے ہیں ۔ لَبَنٌ صَرِیْحٌ ۔ خالص دودھ جس کے جھاگ بیٹھ چکے ہوں ۔ اَلصُّرَاحِیَۃُ ۔ خالص شراب ۔ اَلصُّرَاحِیَّۃُ ۔ شراب کا برتن ۔ اَلصَّرْحَۃُ ۔ زمین کا اوپر کا حصہ ۔ پشتِ زمین جو ہموار ہو ۔ اَلصَّرْحُ ۔ بلند ، منقش و مزین شاندار مکان جو دوسرے گھروں سے منفرد اور الگ ہو ۔ بلند عمارت ۔ اس کے بعد یہ لفظ محل کے لئے استعمال ہونے لگا* ۔

سورۃ نمل میں ہے اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ (۲۷/۴۴)۔ یہاں اس کے معنے محل کے ہیں ۔ اور سورۃ مومن میں صَرْحًا (۴۰/۳۶) ۔ بلند عمارت کے لئے آیا ہے ۔

ص ر خ

اَلصُّرَاخُ ۔ سخت آواز یا فریاد کو کہتے ہیں ۔ اَلصَّرْخَۃُ ۔ مصیبت یا فریاد کے وقت سخت چیخ مارنا ۔ اَلصَّارِخُ ۔ فریاد کرنے والا ۔ نیز فریادی کی مدد کے لئے پہنچنے والا ۔ (فریاد رس) ۔ اَلصَّرِیْخُ کے بھی یہی معنی ہیں** ۔ قرآن کریم میں ہے فَلَا صَرِیْخَ لَهُمْ (۳۶/۴۳) ۔ ان کا کوئی فریاد رس نہ ہوگا ۔ صَرِیْخٌ مصدر بھی ہے یعنی اس کے معنے فریاد رسی، چیخ و پکار بھی ہیں ۔ اَلْمُصْرِخُ ۔ فریاد رس ، پکار پر مدد کے لئے پہنچنے والا ۔ وَمَا اَنَا بِمُصْرِخِکُمْ (۱۴/۲۲)۔

اِصْطَرَخَ ۔ چیخنا ۔ چلانا (مدد کے لئے) ۔ وَهُمْ یَصْطَرِخُوْنَ فِیْهَا (۳۵/۳۷) ۔ وہ اس میں مدد کے لئے چیخیں چلائینگے ۔ دھائی دینگے ۔ فریاد اور واویلا کرینگے ۔

اِسْتَصْرَخَ ۔ کسی سے مدد مانگنا ۔ مدد کے لئے چلانا (۲۸/۱۸) ۔

ص ر ر

اَلصِّرَّۃُ ۔ اَلصِّرُّ سردی یا سردی کی شدت**** ۔ وہ سردی (پالا) جس سے کھیتیاں تباہ ہو جاتی ہیں*** ۔ زجاج نے کہا ہے کہ اَلصِّرَّۃُ ۔ سخت چیخنے اور چلانے کو کہتے ہیں ۔ رِیْحٌ صِرٌّ وَ صَرْصَرٌ ۔ سخت آواز والی

*تاج و راغب ۔ **تاج و محیط نیز ابن فارس ۔ ***لین ۔ ****تاج ۔

تیز ہوا - ابن عباس نے کہا ہے کہ سخت گرم ہوا کو بھی کہتے ہیں* - لیکن صَرٌّ کے بنیادی معنی باندھنے کے ہیں - (راغب نے کہا ہے کہ) صَرٌّ صَرٌّ کا لفظ بھی اسی صَرٌّ سے نکلا ہے اس لئے کہ ٹھنڈ سے بھی چیزیں بندھ کر جم جاتی ہیں** - اسی سے اِصْرَارٌ ہے جس کے معنے ہیں کسی بات پر سختی سے جم جانا - اَلصُّرَّةُ - اس تھیلی کو کہتے ہیں جس میں نقدی باندھی جاتی ہے** - اور اس طرح باندھی ہوئی نقدی کو اَلصَّرِیْرَةُ کہتے ہیں* - ابن فارس نے ان معانی کے علاوہ ، اس کے معنی بلند اور اونچا ہونا بھی لکھے ہیں - چنانچہ اَلصِّیْرَارُ ان اونچے مکانوں کو کہتے ہیں جن تک سیلاب کا پانی نہ پہنچ سکے -

قرآن کریم میں سخت سردی کے لئے یہ لفظ (۳/۱۱۶) میں آیا ہے - (۵۴/۱۹) میں رِیْحًا صَرْصَرًا آیا ہے - سورۃ الذّارِیٰتُ میں فِی صَرَّةٍ (۵۱/۲۹) کے معنے ہیں تعجب سے کچھ بولتی ہوئی - لیکن اس میں شدت کے معنے ہونگے - اس کے معنی منہ بسورنے کے بھی آتے ہیں* - اس کے معنے چیخ و پکار ، شور و غل ، تکلیف کی شدت بھی ہیں* - نیز کسی چیز کی بھی شدت - مثلاً حیرت کی شدت ، فرط تعجب -

سورۃ آل عمران میں ہے وَلَمْ یُصِرُّوْا (۳/۱۳۵)- وہ اصرار نہیں کرتے - جم کر نہیں بیٹھ جاتے - غلطی کا احساس ہوجانے پر اس کام سے فوراً ہٹ جاتے ہیں -

ص ر ط

صِرَاطٌ - عام عرب اسے سِرَاطٌ پڑھتے ہیں - صاد کے ساتھ (صِرَاطٌ) قریش کا لغت ہے - سَرَطَ کے معنے ہیں کسی چیز کو بغیر چبائے نگل جانا - چنانچہ سِرَاطٌ (اور صِرَاطٌ) اس لمبی تلوار کو کہتے ہیں جو بہت کاٹنے والی ہو - گویا وہ جس چیز پر پڑتی ہے اسے نگل جاتی ہے - اسی نہج سے کھلے اور واضح راستہ کو بھی صِرَاطٌ کہتے ہیں - (یا تو تلوار کے سیدھے اور لمبے ہونے کی وجہ سے - اور یا اس لئے کہ چلنے والا اسے نگلتا چلا جاتا ہے - یا وہ راستہ ہزارہا راہرووں کو نگلتا چلا جاتا ہے)***-

قرآن کریم نے اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (۱/۵) کو دوسرے مقام پر طَرِیْقٌ مُّسْتَقِیْمٌ (۴۶/۳۰) کہہ کر صِرَاطٌ کے معنے طَرِیْقٌ (راستہ) بتا دیئے ہیں - (مُسْتَقِیْمٌ کے معنوں کیلئے دیکھئے عنوان ق - و - م) -

(قرآن کریم میں ''پل صراط'' کا کوئی ذکر نہیں) -

*تاج - **راغب - ***تاج - دیکھئے عنوان سرط و صرط -

ص ر ع

اَلصَّرْعُ ۔ اَلتَّصْرِیْعُ ۔ زمین پر پٹک دینا ۔ پچھاڑ دینا ۔ اَلصُّرَعَۃُ ۔ وہ شخص جو لوگوں کو بہت زیادہ پچھاڑتا ہو ۔ اَلصَّرِیْعُ ۔ پچھاڑا ہوا ۔ اس کی جمع صَرْعٰی آتی ہے* ۔

قرآن کریم میں ہے فَتَرَی الْقَوْمَ فِیْھَا صَرْعٰی (۶۹/۷) یعنی تم دیکھوگے کہ لوگ اس میں پچھڑے پڑے ہیں ۔ اَلصَّرْعُ ۔ مرگی کی بیماری کو کہتے ہیں ۔ اَلصَّرْعُ ۔ اَلتَّصْرِیْعُ ۔ مثل ۔ برابر کا ۔ ھُمَا صِرْعَانِ ۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مثل اور برابر کے ہیں ۔ اَلْمِصْرَاعَانِ مِنَ الْبَابِ ۔ دروازے کے دونوں پٹ ۔ اَلْمِصْرَاعَانِ مِنَ الشِّعْرِ ۔ شعر کے دونوں مصرعے* ۔

ص ر ف

اَلصَّرْفُ کے معنے ہیں کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیر دینا یا اسے کسی دوسری چیز کے ساتھ تبدیل کر دینا ۔ یعنی یا توخود اسکی حالت میں تبدیلی پیدا کردینا یا اسے کسی اور چیز سے بدل دینا** ۔ نیز لوٹا دینا ۔ رخ پھیر دینا ۔ ھٹا دینا *** ۔ صَرَفَ الصِّبْیَانَ مِنَ الْمَکْتَبِ ۔ بچوں کو مکتب سے لوٹا دیا ۔ واپس کر دیا ۔ صَرَفَ الرَّسُوْلَ ۔ قاصد کو جہاں سے وہ آیا تھا وہیں واپس کر دیا **** ۔ تَصَارِیْفُ الْاُمُوْرِ ۔ معاملات کا الٹ پھیر اور انکو ایک دوسرے کی جگہ رکھنا ۔ اَلْمَصْرِفُ ۔ پلٹنے کی جگہ ۔ ھٹنے کی جگہ ۔ تَصْرِیْفُ الرِّیَاحِ ۔ ہواؤں کے رخ کو ایک طرف سے دوسری طرف موڑ دینا ۔ اِنْصَرَفَ رک گیا ۔ پلٹ گیا ۔ صَرْفُ الْخَمْرِ اور تَصْرِیْفُ الْخَمْرِ ۔ خالص شراب (کچھ ملائے بغیر) پی جانا ۔ اسی سے اَلصَّرِیْفُ ۔ خالص چاندی کو کہتے ہیں اور اَلصَّرَّافُ وَالصَّیْرَفِیُّ ۔ سکے پرکھنے والے ، یا سکوں کے تبادلہ کرنے والے کو ۔ قرآن کریم میں تَصْرِیْفِ الرِّیَاحِ (۲/۱۶۴) متعدد مقامات میں آیا ہے ۔ یعنی ہواؤں کو مختلف سمتوں میں چلانا ۔ یا ان کی حالت بدل دینا ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ (۱۷/۴۱ نیز ۱۷/۸۹ ؛ ۱۸/۵۴) ۔ ھمنے اس قرآن کریم میں حقائق و قوانین کے مختلف پہلوؤں کو لوٹا لوٹا کر بیان کیا ہے ۔ لِیَذَّکَّرُوْا (۱۷/۴۱) تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سے سمجھ

*تاج و محیط و راغب ۔ **راغب ۔ ***تاج ۔ ****محیط ۔

سکیں - تاکہ ان کے تمام پہلو لوگوں کی نگاہ کے سامنے آجائیں - قرآن کریم نے اپنے مطالب کو واضح کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا ہے - یعنی ایک چیز کو بار بار پھرا کر لانا تاکہ اسکے متعدد گوشے سامنے آجائیں - یہ چیز ہے جسے سطح بین نگاہیں " تکرار " ٹھہراتی ہیں -

سورۃ الفرقان میں ہے کہ جن لوگوں کی تم پرستش کرتے ہو وہی تمہیں جھٹلائیں گے کہ ہم نے تمہیں اپنی پرستش کیلئے نہیں کہا تھا فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا (۲۵/۱۹) سو تم میں اسکی قدرت نہیں ہوگی کہ ان کی بات کا رد کر سکو - یا ہمارے عذاب کو دوسری طرف پھیر دو - یا اپنے آپ کو اس پوزیشن سے ہٹا سکو - سورۃ کہف میں ہے وَلَمْ يَجِدُوا عَنْهَا مَصْرِفًا (۱۸/۵۳) - کوئی ایسی جگہ نہیں ہوگی جہاں وہ اس عذاب سے ہٹ کر پناہ لے سکیں -

سورۃ یوسف میں ہے فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ (۱۲/۳۴) - تو خدا نے اس (یوسف) سے ان عورتوں کی سازش کو ہٹا دیا ، اس کا رخ پھیر دیا - یعنی اسے انکی سازشوں کے نقصان سے محفوظ رکھا - سورۃ احقاف میں ہے اِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ ..... (۴۶/۲۹) ہمنے انکا رخ تیری طرف پھیر دیا - ان دونوں آیتوں سے صَرَفَ عَنْ اور صَرَفَ اِلٰی کے معنے واضح ہو جاتے ہیں - سورۃ ہود میں عذاب کے متعلق ہے - لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ (۱۱/۸) - وہ ان سے دوسری طرف نہیں پھریگا - ان سے ٹلیگا نہیں - سورۃ توبہ میں اِنْصَرَفَ آیا ہے (۹/۱۲۷) - یعنی پھر جانا - اور صَرَفَ پھیر دینا -

ص ر م

صَرَمَ - يَصْرِمُ - اسنے (رسی یا پھلوں کے خوشہ وغیرہ کو) کاٹ کر الگ کر دیا - صَرَمَ النَّخْلَ - اسنے کھجور کے پھل کاٹ لئے - صَرَمَ الْحَبْلُ - رسی ٹوٹ گئی - اَصْرَمَ النَّخْلُ - کھجوروں کے پھل کاٹنے کا وقت آگیا - اَلصَّرِيْمَةُ - وہ زمین جس کی کھیتی کاٹ لی گئی ہو - الصَّرِيْمُ - کاٹا ہوا ، مقطوع - کالی زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو - رات اور دن کو بھی صَرِيْمٌ کہتے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے کٹ جاتا ہے - اَلصَّارِمُ - کاٹنے والا - نیز شیر کو بھی کہتے ہیں - اِنْصِرَامٌ - منقطع ہونا * - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے قطع کرنا ہی لکھے ہیں -

قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے قسمیں کھائیں کہ لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ (۶۸/۱۷) - وہ صبح ہوتے ہی اس کی فصل کاٹینگے - ذرا آگے چل

* تاج -

کر ہے اِنْ کُنْتُمْ صَارِمِیْنَ (۶۸/۲۲) - فصل کاٹنے والے - اور دو آیتیں پیچھے ہے - فَاَصْبَحَتْ کَالصَّرِیْمِ (۶۸/۲۰) وہ باغ ایسا ہو گیا جیسے اس کے پھل کاٹ لئے گئے ہوں - اسی کو سورۃ انبیاء میں حَصِیْدًا سے تعبیر کیا گیا ہے (۲۱/۱۵) - (عموماً کھیتی کے لئے حصاد اور باغ کے لئے صرم آتا ہے) - ویسے اَلصَّرِیْمُ رات کو بھی کہتے ہیں*، اور بالعموم وہ سیاہ ہوتی ہے لہذا سوختہ بختی کی نشانی ہے - آیت (۶۸/۲۰) میں اگر اس جہت سے معنے لئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ وہ باغ جل کر رات کی طرح سیاہ ہو گیا -

ص ط ر

دیکھئے س - ط - ر

ص ع د

صَعِدَ (فِیْ السُّلَّمِ اَوِالْجَبَلِ) وَ صَعَّدَ عَلَیْهِ وفیہ - وہ (سیڑھی یا پہاڑ وغیرہ) کے اوپر چڑھا - لیکن صرف چلے جانے کیلئے بھی بولتے ہیں - اَصْعَدَ فِی الْاَرْضِ - وہ دور تک چلا، یا گھوما** - قرآن کریم میں ہے اِذْ تُصْعِدُوْنَ (۳/۱۵۲) - جب تم دور نکلے جا رہے تھے - اَلصَّعِیْدُ زمین کو کہتے ہیں - (۳/۴۳ ؛ ۱۸/۴۰) - مٹی اور غبار کو بھی کہتے ہیں - نیز زمین کے بالائی حصہ کو - اوپر چڑھنے میں چونکہ سانس پھول جاتی ہے اسلئے امر دشوار اور گراں کیلئے صَعُوْدٌ بولتے ہیں - تَصَعَّدَ نِیْ ذَالِکَ الشَّیْءُ - مجھ پر یہ شے بہت ہی مشکل اور گراں ہو گئی** - صَعَدٌ - شدید - سخت** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلندی اور مشقت کے ہیں -

سورۃ جن میں ہے یَسْلُکْهُ عَذَابًا صَعَدًا (۷۲/۱۷) اسے سخت عذاب میں داخل کرتا ہے - یہی معنے صَعُوْدًا کے ہیں (۷۴/۱۷) - سورۃ انعام میں ہے کہ اسلام، سینے کی کشاد سے حاصل ہوتا ہے - تنگ نظر اور تنگ خیال جب اسلام کا تصور کرتا ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَاءِ (۶/۱۲۶) گویا وہ بڑا زور لگا کر بلندی پر چڑھ رہا ہے - ایسی چڑھائی جس کے متعلق پتہ ہی نہیں کہ کہاں جا کر ختم ہو -

سورۃ فاطر میں ہے اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ - خوشگوار نظریۂ حیات، خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق، بلند ہوتا چلا جاتا ہے - لیکن اسطرح اسکی رفتار انسانی حساب کے مطابق بہت سست ہوتی ہے - وَالْعَمَلُ

*راغب - ابن فارس نے بھی یہی معانی لکھے ہیں - **تاج و محیط -

الصّالِحُ یَرْفَعُہٗ (۳۵/۱۰) - عمل صالح اسے بلند کرتا ہے - یعنی خدا کے مقرر کردہ صحیح نظریاتِ زندگی میں اسکی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بلند ہوتے جائیں- اور عام حالات میں وہ خدا کے کائناتی قانون کے مطابق بلند ہوتے رہتے ہیں - لیکن اگر ان کے ساتھ انسانوں کے اعمال صالحہ شامل ہو جائیں تو ان کے ذریعے وہ بہت تیزی سے پروان چڑھ جاتے ہیں - (تدبیر امور کے سلسلہ میں ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ آیا ہے - ۳۲/۵) -

ص ع ر

اَلصَّعَرُ - اونٹوں میں ایک بیماری ہوتی ہے جس سے ان کی گردن ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور منہ ایک طرف کو مڑ جاتا ہے - نیز تکبر اور اکڑ - صَعَرَ (وَجْہَہٗ) - یَصْعَرُ - صَعَرًا - چہرہ کا ٹیڑھا ہوجانا، ایک طرف کو مڑ جانا- اَلصَّعَّارُ - مغرور و متکبر کو کہتے ہیں اس لئے کہ وہ تکبر کی وجہ سے گردن کو ٹیڑھا اور رخسار کو جھکائے رکھتا ہے اور لوگوں سے رخ پھیرتا ہے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مڑ جانے اور ٹیڑھے ہونے کے ہیں -

قرآن کریم میں ہے لَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ (۳۱/۱۸) - تکبر کی بنا پر لوگوں سے اعراض اور روگردانی نہ کرو - لوگوں سے بے رخی نہ برتو -

ص ع ق

صَاعِقَۃٌ* - بجلی کی کڑک** - جمع صَوَاعِقُ - صرف سخت آواز کو بھی کہتے ہیں** - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں- حِمَارٌ صَعِقٌ* - اس گدھے کو کہتے ہیں جو نہایت سخت آواز کے ساتھ رینکے - بیہوش ہو کر گر جانے کو بھی صَعِقَ کہتے ہیں** - اور عقل و خرد کے جاتے رہنے کو بھی** - سورۃ بقرۃ میں جہاں بنی اسرائیل کے متعلق کہا گیا ہے کہ فَاَخَذَتْکُمُ الصَّاعِقَۃُ (۲/۵۵) تو وہاں اس سے مراد بے ہوش ہو کر گر جانا ہیں (نیز دیکھئے عنوان ب - ع - ث اور م - و - ت) صَعِقَتِ الرَّکِیَّۃُ - اس وقت کہتے ہیں جب کنواں ڈھ جائے اور چاروں طرف سے مٹی اس میں گرنے لگے** -

*تاج نیز راغب و محیط - **تاج و محیط -

ہر مہلک عذاب کو بھی صَاعِقَۃٌ کہتے ہیں - اور موت کو بھی* - بجلی کی کڑک کے معنوں میں یہ لفظ (۲/۱۹) میں آیا ہے - اور ہلاکت کے معنوں میں سورۃ الطور میں جہاں کہا ہے کہ فَذَرْھُمْ حَتّٰی یُلٰقُوْا یَوْمَھُمُ الَّذِیْ فِیْہِ یُصْعَقُوْنَ (۵۲/۴۵) - اس میں ان کی اجتماعی بربادی اور قومی تباہی کا مفہوم پایا جاتا ہے - سورۃ زمر میں جہاں نفخۂ صورکا ذکر ہے وہاں کہا ہے فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ (۳۹/۶۸) - صاحب تاج العروس نے اس کے معنے عقل و شعور سے محروم ہو جانے کے بھی لکھے ہیں** - (نفخ صور کے لئے ن - ف - خ اور ص - و - ر کے عنوانات دیکھئے) - سورۃ اعراف میں ہے وَخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا (۷/۱۴۳) - اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا -

ص غ ر

اَلصِّغَرُ - الصَّغَارَۃُ - کِبَرٌ اور عِظَمٌ کی ضد ہے - چھوٹا ہونا*** - (عمر و جسامت میں یا قدر و منزلت میں) - الصَّغَارُ ذلت و رسوائی - محکومی*** - سورۃ اعراف میں ہے فَاخْرُجْ اِنَّکَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ (۷/۱۳) - نکل جا - تیرے حصے میں کبریائی (بڑائی) نہیں آئے گی - کبریائی قانون خداوندی کی اطاعت سے نصیب ہوتی ہے - اس سے سرکشی برتنے کا نتیجہ ذلت و رسوائی ہے - سورۃ انعام میں مجرمین کے متعلق ہے صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰہِ (۶/۱۲۵) - انہیں قانون خداوندی کے سامنے جھکنا پڑیگا - چھوٹا بننا ہوگا - اس کا محکوم ہونا ہوگا - (واضح رہے کہ یہ جھکنا اور محکومی بطیب خاطر نہیں ہوگی بلکہ بے بسی کی وجہ سے مجبوراً ہوگی - مجرم قانون کے سامنے مجبوراً جھکتا ہے) - نیز (۷/۱۱۹) اور (۲۷/۳۷) -

ان مقامات سے واضح ہے کہ صَاغِرُوْنَ کے معنے ہیں سرکشی چھوڑ کر، کسی مملکت میں امن پسند شہری کی حیثیت سے محکوم (یا رعایا) بن کر رہنا - یہ مفہوم سورۃ توبہ سے بھی واضح ہو جاتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ سرکشی برتیں اور جنگ پر اتر آئیں*****- انکے

*تاج و محیط - **لین بحوالہ تاج - ***تاج -

*****یہ چیز کہ قرآن کریم ان لوگوں کے خلاف جنگ کی اجازت دیتا ہے جو سرکشی اختیار کرکے جنگ پر اتر آئیں، قرآن کریم کے متعدد مقامات سے واضح ہے - قرآن کریم کی رو سے جنگ سے مقصود سرکش اور ظالم کو حق و انصاف کے سامنے جھکانا ہے اور بس -

خلاف جنگ کرو - حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ (۹/۲۹) - تاآنکہ وہ اُس امن و آسائش کے بدلے میں جو اسلامی مملکت میں رہنے سے انہیں نصیب ہوگی ، شہری ٹیکس دینا اور پر امن رعایا کی حیثیت سے رہنا قبول کرلیں - ان کا اسلامی مملکت میں برابر کی حیثیت سے نہیں بلکہ محکوم کی حیثیت سے رہنا ان کے لئے چھوٹا ہو جانا ہے - لیکن یہ چھوٹا ہونا سیاسی نقطہء نگاہ سے ہوگا ، ورنہ انہیں وہ تمام حقوق انسانیت حاصل ہونگے جنہیں قرآن کریم ہر فرزند آدم کو عطا کرتا ہے - لیکن وہ امور مملکت میں دخیل نہیں ہوسکینگے -

سورۃ بقرہ میں ہے صَغِیْرًا اَوْ کَبِیْرًا (۲/۲۸۲) - اس کے معنی ہیں تھوڑا یا بہت - اَصْغَرُ - زیادہ چھوٹا (۱۰/۶۱) -

ص غ و (ی)

صَغَا یَصْغُوْ و صَغِیَ یَصْغٰی - مائل ہونا - جھکنا - صَغَتِ الشَّمْسُ سورج مائل بغروب ہوا - صَاغِیَةُ الرَّجُلِ - آدمی کے طرف دار اور حمایتی - صِغْوُهٗ مَعَکَ - اس کا میلان و رجحان تیری طرف ہے - اَصْغٰی حَقَّهٗ - اس نے اپنا حق کم کر دیا* -

قرآن کریم میں ہے وَلِتَصْغٰی اِلَیْهِ اَفْئِدَةُ ..... (۶/۱۱۳) تاکہ ان کے دل اس کی طرف مائل رہیں - (نیز ۶۶/۴) -

ص ف ح

اَلصَّفْحُ - ہر چیز کا چوڑا پہلو - اس کی چوڑی سطح - جانب اور پہلو - اَلصَّفْحُ مِنَ السَّیْفِ - تلوار کی چوڑائی - (دھار نہیں بلکہ چوڑا حصہ) - اَلْمُصَفَّحُ - چوڑی چیز - اَلصَّفْحَةُ - چوڑائی کے اعتبار سے کاغذ کی سطح کو کہتے ہیں - اَلْمُصَافَحَةُ - ہاتھ ملانا** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی چوڑائی کے ہیں -

صَفَحَ - اپنے منہ کو موڑ کر چہرے کا چوڑا حصہ (ایک جانب) دوسرے کے سامنے کرنا - یعنی اس سے اعراض برتنا - پہلو تہی کرنا - صَفَحَ عَنْهُ - اسے چھوڑ دیا - معاف کر دیا - یہ عَفْوٌ سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے کیونکہ عَفْوٌ میں کسی کو مجرم قرار دے کر معاف کرنا ہوتا ہے اور صَفْحٌ میں اسے مجرم گردانا ہی نہیں جاتا ہے** - سورۃ بقرہ میں یہ دونوں الفاظ اکٹھے آئے ہیں - (۲/۱۰۹) -

*تاج - **تاج - محیط - راغب -

سورۃ زخرف میں ہے أَفَنَضْرِبُ عَنكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا (۴۳/۵)۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم تم سے اعراض برتتے ہوئے ان تاریخی حقائق کو تم سے پھیر دینگے؟ سورۃ حجر میں ہے فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ (۱۵/۸۵)۔ ان سے نہایت جمال آفریں انداز سے کنارہ کش ہو کر (اپنی جداگانہ تنظیم کرتے جاؤ)۔ (۱۵/۹۴)۔ یعنی وَ اهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا (۷۳/۱۰)۔ قرآن کریم کا انداز معاشرت ملاحظہ کیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی سے بنا کر رکھنا تو ایک طرف، اگر کسی سے کنارہ کش ہونا ہو تو بھی نہایت حسن کارانہ انداز سے، بڑی خوبصورتی سے، جمال آفرینی کے اسلوب سے الگ ہو۔ جو ضابطہ حیات کسی سے کنارہ کشی کی صورت میں اس انداز کی تلقین کرتا ہو، غور کیجئے کہ وہ دوستداری اور رفاقت کے تعلقات کو کن بلندیوں تک لے جاتا ہوگا اور ان میں کس قدر حسن پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہوگا؟

ص ف د

صَفَدٌ۔ صِفَادٌ (جمع أَصْفَادٌ)۔ چمڑے کا تسمہ یا لوہے کی زنجیر جس سے قیدی کو باندھا جائے۔ بندھن۔ بندش۔ نیز گلے کا طوق یا پٹہ جو چمڑے کا بنا ہوتا تھا۔ صَفَدَهُ۔ يَصْفِدُهُ۔ کسی کو زنجیر وغیرہ سے باندھنا۔ جکڑنا۔ اَلصَّفَدُ۔ عطیہ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس سے انسان معطی کا زیر بار احسان ہو کر مروت کی زنجیر میں بندھ جاتا ہے*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) باندھنا (۲) عطا کرنا لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں مجرمین کے متعلق ہے۔ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ (۱۴/۴۹)۔ وہ زنجیروں میں ایک دوسرے کے ساتھ جکڑے ہونگے۔

ص ف ر

اَلصُّفْرَةُ۔ زردی۔ پیلا پن۔ اَلصَّفْرَاءُ۔ سونا**۔ یہ أَصْفَرُ کا مونث بھی ہے۔ اس صورت میں اس کے معنی "پیلے رنگ والی" ہونگے۔

اَلصِّفْرُ۔ خالی چیز**۔ صَفِرَ اِنَاؤُهُ۔ اس کا برتن خالی ہوگیا۔ محاورہ میں اس کے معنی ہوتے ہیں۔ "اس کے مویشی ہلاک ہوگئے"۔ (ابن فارس)

اَلصَّافِرُ۔ ہر آواز نکالنے والا پرندہ۔ اَلصَّفِيرُ۔ مویشیوں کو پانی کے لئے بلانے کی آواز**۔ سیٹی کی آواز۔

---

* تاج۔ محیط۔ راغب۔ ** تاج

سورۃ بقرۃ میں، بنی اسرائیل کی گائے (یا سانڈ) کے متعلق ہے کہ وہ صفراءٌ تھی یعنی اس کا رنگ زرد تھا (۲/۶۹)۔ اور سورۃ مرسلٰت میں جہنم کے شعلوں کو جِمٰلَتٌ صُفْرٌ۔ زرد اونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ سیاہ اونٹوں کو کہا گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کوئی بھی سیاہ اونٹ ایسا نہیں ہوتا جسکی سیاہی زردی میں ڈوبی ہوئی نہ ہو۔ ایسی ہی زردی کے لئے یہاں صُفْرٌ کہا گیا ہے * (۷۷/۳۳)۔ سورۃ زمر میں زرد کے لئے مُصْفَرًّا آیا ہے (۳۹/۲۱)۔

ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی پانچ چھ لکھے ہیں لیکن قرآن کریم میں یہ مندرجہ بالامعنوں ہی میں آیا ہے۔

ص ف ف

اَلصَّفُّ۔ اَلتَّصْفِيْفُ۔ صف بندی کرنا۔ صف بنانا۔ اَلصَّفُّ۔ صف (قطار) میں کھڑا ہونا۔ اَلصَّفُّ۔ وہ لوگ جو لائن لگا کر کھڑے ہوں **۔ راغب نے کہا ہے کہ ایک سیدھی لکیر پر آدمیوں کو کھڑا کرنا یا درختوں وغیرہ کو لگانا صَفٌّ کہلاتا ہے۔ سورۃ کہف میں ہے وَعُرِضُوْا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا (۱۸/۴۸)۔ وہ تیرے رب کے سامنے صف باندھ کر پیش کئے جائینگے۔

اَلصَّفُّ۔ پرندوں کا فضا میں اپنے بازو پھیلا دینا اور انہیں حرکت نہ دینا۔ صَآفَّاتٌ۔ بازو پھیلائے ہوئے **۔ سورۃ نور میں ہے وَالطَّيْرُ صٰفّٰتٍ (۲۴/۴۱)۔ پرندے جو فضا میں پر پھیلائے ہوں (صَآفَّاتٌ کا واحد صَآفَّةٌ ہے)۔ اَلصّٰٓفّٰتُ۔ صف بستہ جماعتیں (۳۷/۱)۔ صَوَآفُّ (صَوَافِفُ) صف میں کھڑے ہوئے اونٹ (۲۲/۳۶)۔ یہ بھی صَآفَّةٌ کی جمع ہے۔ مَصْفُوْفَةٍ۔ صف میں لگائے ہوئے (۵۲/۲۰)۔ اَلصَّفْصَفُ۔ سپاٹ اور ہموار زمین جس کا گھاس وغیرہ سب صاف کردیا گیا ہو**۔ قرآن کریم میں ہے قَاعًا صَفْصَفًا (۲۰/۱۰۶) ہموار میدان۔

صُفَّةُ الدَّارِ۔ گھر کا برآمدہ *۔

ص ف ن

اَلصَّفْنُ۔ دو چیزوں کو اسطرح اکٹھا کر دینا کہ ان کے بعض حصے دوسرے حصوں کے ساتھ مل جائیں***۔ صَفَنَ الرَّجُلُ۔ آدمی نے اپنے دونوں پاؤں ایک لائن میں رکھے****۔ صَفَنَ الْفَرَسُ يَصْفِنُ۔ صُفُوْنًا۔ گھوڑے کا اس طرح کھڑا ہونا کہ اسکے تین پاؤں زمین پر ہوں اور چوتھے

---

* تاج۔ ** تاج و راغب۔ *** راغب۔ **** محیط

پاؤں کا سُم اسطرح اٹھا ہو کہ اس کا اگلا حصہ (کنارہ) زمین کو مس کرتا رہے*۔ اس طرح کھڑا ہونے والا گھوڑا صَافِن" کہلاتا ہے، جمع صَوَافِن" و صَافِنَات"۔ عربوں کے ہاں اس قسم کے گھوڑے اعلیٰ درجہ کے شمار ہوتے تھے۔ قرآن کریم میں اَلصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ (۳۸/۳۱) ۔ ایسے ہی اصیل گھوڑوں کے لئے آیا ہے۔

ص ف و

اَلصَّفْوُ۔ اَلصَّفَاءُ۔ کسی چیز کا صاف اور خالص حصہ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلصَّفَاءُ کے معنے ہیں کسی چیز کا ہر قسم کی آمیزش سے پاک اور صاف ہونا یہی اس کے بنیادی معنی ہیں (ابن فارس)۔ صَفْوَةُ کُلِّ شَیْءٍ۔ ہر چیز کا خالص حصہ۔

یَوْمٌ صَافٍ وَ صَفْوَانٌ۔ وہ خنک دن جس میں نہ بادل ہوں اور نہ ہی فضا غبارآلودہ ہو۔ اِصْطِفَاءٌ۔ صاف اور خالص چیز کا لے لینا۔ انتخاب کر لینا۔ اِسْتِصْفَاءٌ۔ اسے مخلص سمجھنا۔ اسے چننا۔ انتخاب کیا۔ اَلصَّفِیَّةُ (جمع صَفَایَا) مال غنیمت کی وہ چیز جسے امیر اپنے لئے منتخب کرلے**۔

اَلصَّفَاةُ (جمع صَفَوَاتٌ وَ صَفًا) بڑا صاف، چکنا پتھر جس پر کچھ نہ اگ سکے۔ اَلصَّفْوَانَةُ (جمع صَفْوَانٌ) کے بھی یہی معنی ہیں*۔ (۲/۲۶۴)۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اسم جمع ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الصَّفْوَان کے معنی بڑی چٹان ہوں اور اس کے ایک ٹکڑے کو صَفْوَانَةٌ کہا جاتا ہو۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا (۲/۱۳۰) ہم نے اسے دنیا میں آمیزشوں سے پاک کرکے ایک عظیم مقصد کے لئے منتخب کر لیا۔ مختلف انبیائے کرام کے متعلق فرمایا وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَیْنَ الْاَخْیَارِ (۳۸/۴۷)۔ یہ لوگ ہمارے ہاں منتخب افرادِ انسانیہ ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اَصْفٰکُمْ (۱۷/۴۰)۔ یعنی چن لینا۔ دوسروں سے الگ کرکے مختص کر لینا اور ترجیح و فضیلت دینا۔

سورۃ بقرۃ میں اَلصَّفَا وَالْمَرْوَةَ کو مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ کہا گیا ہے۔ (۲/۱۵۸)۔ یہ مکہ کے قریب دو پہاڑیاں ہیں۔

سورۃ محمد میں ہے عَسَلٍ مُّصَفًّی (۴۷/۱۵) صاف کیا ہوا شہد۔

---

* تاج ** تاج و محیط

ص ک ک

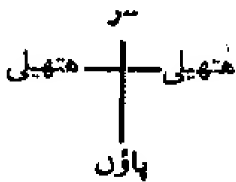
صَکٌّ ۔ کسی چیز، بالخصوص چوڑی چیز کے ذریعے زور سے مارنا ۔ صَکَّ الْبَابَ ۔ اس نے دروازہ بند کر دیا ۔ صَکَّهٗ ، صَکًّا ۔ اسنے اسے دھکا دیا *۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کے متعلق ہے فَصَکَّتْ وَجْهَهَا (۵۱/۲۹)۔ اسنے اپنے چہرہ پر ہاتھ مارا ۔ لیکن یہ عمل از روِ تعجب تھا ۔ جیسا کہ آیت (۱۱/۷۲) سے ظاہر ہوتا ہے ۔

ص ل ب

اَلصُّلْبُ ۔ اَلصَّلِیْبُ ۔ مضبوط اور سخت ۔ هُوَ صُلْبٌ فِیْ دِیْنِهٖ ۔ وہ اپنے دین میں سخت اور مضبوط ہے ۔ صَلَّبَ ۔ اس نے اسے سخت اور مضبوط بنا دیا ۔ اَلصُّلْبُ ۔ ریڑھ کی ہڈی *۔ (جمع اَصْلَابٌ) ابن فارس نے کہا ہے کہ پشت کو بھی اس کی قوت اور سختی کی وجہ سے صُلْبٌ کہتے ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ اَبْنَآئِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ (۴/۲۳) ۔ تمہارے وہ بیٹے جو تمہاری اپنی "پیٹھ" (صلب) سے ہوں ۔

اَلصَّلْبُ ۔ آدمی کو مار دینے کے لئے لٹکانا ۔ سولی چڑھا دینا ۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں اس شخص کی پیٹھ لکڑی کے ساتھ باندھ دی جاتی تھی ۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلصَّلِیْبُ ۔ مردے کے ناک یا منہ میں سے جو پانی سا نکلتا ہے اسے کہتے ہیں ۔ نیز وہ چکنائی جو ہڈیوں سے نکالی جائے *۔ ابن فارس نے مَصْلُوْبٌ کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سولی پر چڑھائے ہوئے کو اس لئے مَصْلُوْبٌ کہتے ہیں کہ اس کے چہرے پر چکنائی آ جاتی ہے ۔ پھر سولی کو بھی صَلِیْبٌ کہتے ہیں ۔ لیکن راغب کی توجیہ بہتر نظر آتی ہے ۔ اس لئے کہ (عیسائیوں کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق) صلیب کی شکل یوں ہوتی تھی ۔



مجرم کو اس تختے پر لٹکا کر اس کے دونوں ہاتھوں اور پاؤوں میں میخیں گاڑ دیتے تھے اور اسے اسی حالت میں رہتے دیا جاتا تھا ۔ تاآنکہ وہ درد و کرب اور ضعف و نقاہت سے دم توڑ دے ۔

یہودیوں کے نزدیک صلیب پر مرنا لعنتی کی موت تھی ۔ ان کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے (حضرت) عیسٰیؑ کو صلیب پر لٹکا کر (معاذ اللہ) لعنتی

* تاج و محیط ۔

کی موت مار دیا ۔ عیسائی اگرچہ (صلیب کی موت کو لعنتی کی موت نہیں کہتے لیکن) اس کے قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے صلیب پر جان دی ۔ قرآن کریم نے یہودیوں اور عیسائیوں، دونوں کی تردید میں کہا کہ یہ قصہ ہی سراسر غلط ہے ۔ وَمَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۴/۱۵۷)۔ ''اور انہوں نے نہ اسے قتل کیا ۔ اور نہ ہی صلیب پر لٹکایا ۔ اصل حقیقت ان پر مشتبہ ہوگئی''۔ حضرت عیسیٰؑ وہاں سے پہلے ہی تشریف لے جا چکے تھے اور انہوں نے جس شخص کو گرفتار کیا تھا وہ کوئی اور تھا ۔ (تفصیل میری کتاب ''شعلہ مستور'' میں ملیگی) ۔

قرآن کریم میں اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت اور فساد فی الارض کی مختلف سزائیں (حسبِ نوعیت جرم) بتائی گئی ہیں ۔ ان میں ایک يُصَلَّبُوْا (۵/۳۳) بھی ہے ۔ یعنی صلیب پر لٹکوا دینا ۔ سولی دیدینا ۔

صَلَبَ ۔ ایک آدمی کو سولی دینے کے لئے ۔ اور صَلَّبَ ۔ زیادہ آدمیوں کو سولی دینے کے لئے بولا جاتا ہے ۔

ص ل ح

اَصْلَحَ اِلَيْهِ کے معنے ہیں اَحْسَنَ اِلَيْهِ ۔ یعنے اس نے ایسا کام کیا جس سے اس (دوسرے آدمی) کی خرابی ، نقص یا کمی دور ہوگئی ۔ حسن کارانہ توازن پیدا کرنے والے کام کرنا ۔ اسی لئے اَلصُّلْحُ باہمی امن و سلامتی اور مسالمت کو کہتے ہیں، کیونکہ زمانہ جنگ کی بہ نسبت ، صلح و امن میں معاملات کے اندر توازن قائم رہتا ہے* ۔ الصَّلَاحُ کے معنے ہیں حالات کا عقل و شرع کے تقاضہ کے مطابق معتدل و مستقیم ہو جانا** ۔ جس چیز کو جس حال میں ہونا چاہئے اس کا ٹھیک ٹھیک اسی حالت میں ہونا ۔ بالکل مناسب ، درست، با ترتیب، ٹھیک حالت میں رہنا***۔

سورة اعراف میں صحیح و سالم اور تندرست بچے کے لئے صَالِحًا کا لفظ آیا ہے (۷/۱۹۰)۔ یعنی ایسا بچہ جو ہر لحاظ سے مناسب اور درست ہو۔ سورة انبیاء میں ، جہاں حضرت زکریا کے ہاں بڑھاپے کے زمانے میں اولاد پیدا ہونے کا ذکر ہے ، وہاں کہا ہے وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (۲۱/۹۰) ۔ ہم نے اس کی بیوی سے اس نقص کو دور کردیا جو اولاد پیدا کرنے سے مانع تھا ۔ سورة نور میں وَ الصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ (۲۴/۳۲) کے معنے ہیں وہ

*تاج ۔ **محیط ۔ ***لین ۔

غلام اور لونڈیاں جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہوں - سورۃ یوسف میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس وقت ہمارے باپ کی ساری توجہ یوسفؑ (اور اس کے بھائی) کی طرف ہے۔ اگر یوسفؑ کو قتل کر دیا جائے یا ملک بدر کردیا جائے تو پھر موجودہ نا همواری دور ہوجائیگی۔ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ (۱۲/۹) - اور بعد میں ہم ایسا گروہ باقی رہ جائینگے جن میں کوئی نا ہمواری نہیں رہے گی ، اور ہمارے کام سنور جائینگے - یہاں صالحین کے لفظ نے اس کے مفہوم کو واضح کر دیا ہے - یعنی نا ہمواریاں دور ہو جانا - معاملات کا سنور جانا -

قرآن کریم میں حَسَنَاتٌ کے مقابلہ میں سَيِّئَاتٌ کا لفظ اکثر آیا ہے - اور (۲/۸۱-۸۲) میں سَيِّئَةٌ کے مقابل میں عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ آیا ہے - لہذا اعمال صالحہ اور حسنات ہم معنی ہیں - اس لئے دوسرے مقام پر مَنْ عَمِلَ صَالِحًا کے مقابل میں مَنْ اَسَاءَ آیا ہے (۴۱/۴۶) - (س - و - ا اور ح - س - ن کے عنوانات میں ان الفاظ کے معنے سامنے آجائینگے) - لہذا اعمالِ صالحہ کے معنے ہیں ایسے کام جن سے انسان کی مضمر صلاحیتیں بیدار ہو جائیں اور اس طرح اس میں زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے - نیز جن سے معاشرہ کا حسن و توازن قائم رہے اور نا ہمواریاں دور ہوجائیں - جو زندگی کی خوشگواریوں کو اپنے ساتھ لائیں - ٹھیک وہ کام کرنا جو اُس وقت کے حالات کے عین مطابق اور قوانین خداوندی سے ہم آہنگ ہو - فساد اس کی ضد ہے (اس کے لئے عنوان ف - س - د دیکھئے) -
قرآن کریم نے فَسَادٌ اور صَلَاحٌ کو ٹھیک ایک دوسرے کے مقابل میں استعمال کیا ہے - (۲/۱۱) - سورۃ قصص میں مُصْلِحِيْنَ کے مقابلہ میں جَبَّارًا فِى الْاَرْضِ آیا ہے (۲۸/۱۹) - اسی سورت میں ذرا آگے ، یہ مادہ خوش معاملگی کے معنوں میں آیا ہے (۲۸/۲۷) -

قرآن کریم میں آپ شروع سے اخیر تک دیکھینگے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ آیا ہے - یعنی قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھنا اور اس کے ساتھ ہی صلاحیت بخش کام کرنا - اس سے واضح ہے کہ ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں - وہ اعمال جن کا سر چشمہ دل کا یقین نہ ہو محض رسم یا عادت کا نتیجہ ہوتے ہیں ، جو میکانکی طور پر (Mechanically) سرزد ہوتے رہتے ہیں - ان سے صحیح نتائج مرتب نہیں ہو سکتے - اسی طرح وہ ایمان جو اعمال صالحہ کا محرک نہیں بنتا ، دل کا یقین نہیں بلکہ محض زبان کے رسمی اقرار کا نام ہے ، جو اُسی طرح بے نتیجہ ہوتا ہے جس طرح اعمال

بلا ایمان بے نتیجہ ہوتے ہیں ۔ سورۃ روم میں قرآن کریم نے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا کے مقابلہ میں مَنْ کَفَرَ لاکر (۳۰/۴۴) ۔ اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اگر اعمال صالحہ ساتھ نہ ہوں تو ایمان ، ایمان نہیں ہوتا ۔

نیز اعمال بھی وہی اعمالِ صالحہ ہیں جنہیں قرآن کریم نے صالح قرار دیا ہے، نہ کہ وہ جنہیں ہم اپنی دانست میں اعمال صالحہ سمجھیں۔ ان اعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد کی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں، معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں ، اور نوع انسانی کے معاملات سنور جاتے ہیں ۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے اعمال صالحہ کی کوئی جامع اور مانع فہرست مرتب کرکے نہیں دیدی ۔ اعمال صالحہ سے اس کی مراد تمام ایسے کام ہیں جو مذکورہ خصوصیات کے حامل ہوں ۔ یعنی جو کام زمانے کے تقاضوں کے عین مناسب ہوں بشرطیکہ وہ قرآنی اصولوں سے نہ ٹکرائیں، کیونکہ اعمال صالحہ کے ساتھ ایمان لاینفک شرط ہے۔ اگر ہم ایمان کے متعلق یہ کہیں کہ یہ ان بلند اقدار کی صداقت پر یقین محکم کا نام ہے جنہیں قرآن کریم نے انسانی ذات کی نشو و نما کے کے لئے متعین کیا ہے اور اعمال صالحہ، ان اقدار کے تحفظ کو کہتے ہیں ، تو یہ چیز حقیقت کے مطابق ہوگی ۔ اسی کو بالفاظ دیگر کیریکٹر کہا جائیگا ۔ لہذا کیریکٹر پیدا نہیں ہوسکتا جب تک زندگی کی بلند اقدار کی صداقت پر یقین نہ ہو ۔ یہ یقین علم و بصیرت کی بنا پر حاصل ہوتا ہے ۔

ص ل د

اَلصَّلْدُ ۔ اَلصَّلِدُ ۔ ٹھوس چکنا پتھر* ۔ (۲/۲۶۴) ۔ اَلصَّلْدَاءُ سخت ٹھوس زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہوسکے* ۔ صَلُوْدٌ ۔ بخیل آدمی ۔ رَأْسٌ صَلْدٌ ۔ وہ سر جس پر بالکل بال نہ ہوں* ۔ لہذا اَلصَّلْدُ وہ چٹان ہوگی جس پر ذرا سی مٹی بھی باقی نہ رہے ۔ سورۃ بقرۃ کی محولہ بالا آیت میں یہ معانی واضح ہیں ۔

ص ل ص ل

اَلصَّلْصَالُ ۔ خالص گیلی مٹی جس میں ریت مل جائے اور پھر خشک ہونے پر اس میں سے آواز آنے لگ جائے ۔ جب اسے آگ میں پکا لیا جائے تو اسے فَخَّارٌ کہتے ہیں ۔ یعنے خشک کچی ٹھیکری صَلْصَالٌ ہوگی ۔ اور پختہ ٹھیکری فَخَّارٌ ** ۔

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے ابتدائی مراحل کے متعلق ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ (۱۵/۲۶) - ہم نے انسان کو کھنکنے والی خشک مٹی سے پیدا کیا - (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں ملیگی) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں تری اور تھوڑا سا پانی شامل ہوتا ہے - زندگی کے ابتدائی جرثومے (Life Cells) محسوس طور پر ، پانی اور مٹی کے اسی امتزاج سے سامنے آتے ہیں - اسی کو قرآن کریم نے کہیں طِیْنٌ (۳۲/۷) اور کہیں طین لازب (۳۷/۱۱) سے تعبیر کیا ہے - یعنی انسان کی حیاتِ طبعی کا محسوس نقطہ آغاز۔

ص ل و (ی)

اگرچہ صلٰوۃ اور اس کے جملہ مشتقات کا تعلق (ص - ل - و) ہی سے ہے لیکن علمائے لغت نے اس ضمن میں بعض ایسے مشتقات بھی بیان کئے ہیں جو (ص - ل - ی) سے متعلق ہیں اور ان سے بھی صلٰوۃ کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ، اس لئے اس عنوان میں مادہ کے آخر کا ''واو'' اور ''ی'' دونوں ہی آگئے ہیں - ویسے ہم نے (ص - ل - ی) کا ایک جداگانہ عنوان بھی رکھا ہے جو آگے آتا ہے - چونکہ ''صلٰوۃ'' دین کا ایک بنیادی گوشہ ہے اور قرآن کریم میں یہ اصطلاح اور اس کے متعلقات بڑی کثرت سے آئے ہیں اس لئے یہ عنوان بڑا اہم ، اور اس کے مباحث خاص غور و فکر کے محتاج ہیں - ہم انہیں نسبتاً تفصیل سے بیان کرینگے -

(۱) اَلصَّلاَ - پشت کا درمیانی حصہ - کولھے کا ڈھلوان یا وہ حصہ جس پر جانور کی دم لگے - دم کے دونوں جانب کے حصے صَلَوَانِ کہلاتے ہیں - اس کی جمع صَلَوَاتٌ یا اَصْلاَءٌ آتی ہے*- صَلاَ - یَصْلُوْ- صَلْوًا کے معنی ہیں صَلاَ (مذکورہ صدر حصہ) پر مارنا - صَلَوْتُہٗ - میں نے اس کے صَلاَ پر مارا -

(۲) اَلصَّلاَ کی نسبت سے، صَلَّی الْفَرَسُ تَصْلِیَةً اس وقت کہتے ہیں جب گھوڑ دوڑ میں ، دوسرے نمبر کا گھوڑا ، پہلے نمبر کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے اس طرح دوڑ رہا ہو کہ پچھلے کی کنوتیاں ، پہلے کی سرین سے مل رہی ہوں - اس گھوڑے کو جو آگے جا رہا ہو ، سَابِقٌ کہتے ہیں اور دوسرے نمبر والے گھوڑے کو اَلْمُصَلِّیْ - اِس سے صَلّٰی کے معنے ہیں

*تاج -

اگلے کے ساتھ ملے ہوئے پیچھے پیچھے آنا ۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی ایک روایت میں ہے سَبَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ۔ وَ صَلّٰی اَبُوْبَکْرٍ وَ ثَلّٰثَ عُمَرُ وَ خَبَطَتْنَا فِتْنَۃٌ ۔ "رسول اللہؐ پہلے تشریف لے گئے ۔ اور آپ کے پیچھے پیچھے ابوبکرؓ اور ان کے پیچھے عمرؓ بھی چلے گئے ۔ اور ہمیں فتنوں نے بد حواس کر دیا*" ۔

(۳) تاج میں ہے کہ صَلِیَ و اصْطَلٰی کے معنی لزوم یعنی وابستگی کے ہیں ۔ یعنی کسی کے ساتھ لگے رہنا اور چمٹے رہنا ۔ اسی بنا پر راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جو ہے لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ (۷۴/۴۳) ۔ "ہم مصلین میں سے نہیں تھے" ۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ "ہم انبیاء کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے نہیں تھے" ۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس جہت سے صلوٰۃ کے معنی ہونگے احکامِ الٰہی سے وابستگی ۔ حدود اللہ کے اندر رہنا اور کتاب اللہ سے چمٹے رہنا ۔ لہذا تَصْلِیَۃٌ کے معنی ہیں اگلے کے پیچھے اس طرح چلنا کہ ان دونوں میں فاصلہ نہ ہو لیکن پیچھے چلنے والا آگے جانے والے سے آگے نہ بڑھے بلکہ وابستگی سے اس کا اتباع کرے۔

(۴) ان تصریحات سے صَلٰوۃٌ کا بنیادی مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ لیکن اس کے سمجھنے کے لئے پہلے ایک مختصر سی تمہید کا سمجھ لینا ضروری ہے ۔ سوال یہ ہے کہ خدا اور بندے کا تعلق کیا ہے؟ خدا ، اس ذات (Personality) کا نام ہے جو بلند ترین ، مکمل ترین ، مستحکم ترین ، اور حسین ترین ہے ۔ اس نے انسان کو بھی ذات (Personality) عطا کی ہے (اور اسے "روحنا" کہکر پکارا ہے ۔ دیکھئے عنوان روح) ۔ یہ ذات ، ذات خداوندی کے مقابلہ میں محدود اور پست درجہ کی ہے ۔ اسے اپنی نشوونما کے لئے صفاتِ خداوندی کو اپنے سامنے بطور نصب العین رکھنا ہوتا ہے ۔ ہم خدا کی ذات کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے البتہ اس نے اپنی جو صفات وحی کے ذریعہ (قرآن کریم میں) بیان کی ہیں ان صفات کا اپنے اندر اجاگر کرتے جانا انسانی ذات کی نشو و نما کا موجب بنتا ہے ۔ قرآن کریم نے صفات خداوندی کو "الاسماء الحسنٰی" سے تعبیر کیا ہے ۔ لہذا انسان کا فریضہ یہ ہے کہ ان اسماء (صفات) خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ کر ، ان کے پیچھے پیچھے چلتا جائے ۔

قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت میں ہمیں جو دعا سکھائی گئی ہے (یعنی جس نصب العین کے حصول کو ہمارے لئے مقصد زندگی تجویز کیا گیا ہے)

---

*تاج ۔

وہ یہ ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱/۵) - یعنےاس توازن بدوش راستے کی طرف راهنمائی کی تمنا جو همیں انسانیت کی منزلِ مقصود تک لے جائے - اور سورۃ هود میں ہے اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۱/۵۶) - "میرا رب صراط مستقیم پر ہے" - یعنےجس صراط مستقیم پر چلنے کےلئے مومنین سے کہا گیا ہے وہ وهی راستہ ہے جس پر خدا کائنات کو چلا رها ہے - هم اس راستے پر کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رهنے سے چل سکتے هیں - لهذا صلٰوۃ کا بنیادی مفهوم ہے کتاب اللہ کے ساتھ پوری وابستگی سے اپنے اندر(علی حد بشریت) صفات خداوندی کا منعکس کئے جانا -

(۵) سورۃ نور میں ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ - كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ (۲۴/۴۱)- "کیا تو نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ وہ ہے کہ اسی کی تسبیح کرتے هیں جو کوئی آسمانوں اور زمینوں میں هیں - اور پر پھیلائے هوئے پرند بھی - هر ایک اپنی اپنی صلٰوۃ اور تسبیح کو جانتا ہے" - یعنی کائنات کی هر شے اپنی صلٰوۃ اوز تسبیح کو اچھی طرح جانتی ہے - یہ ظاهر ہے کہ کائنات کی هرشے (اپنی فطری جبلت کی رو سے) جانتی ہے کہ اس کے فرائض منصبی کیا هیں - اسے کس راستے پر چلنا اور کس منزل تک پهنچنا ہے - اسکی جد و جهد کے دوائر کونسے هیں - اسی چیز کو انکی صلٰوۃ اور تسبیح سے تعبیر کیا گیا ہے (تَسْبِیْح کے لئے دیکھئے عنوان س - ب - ح)-

یہ بھی ظاهر ہے کہ انسان کو ان چیزوں کا علم(حیوانات کی طرح) جبلّی طور پر نہیں دیا گیا - اسے یہ سب کچھ وحی کے ذریعے بتایا گیا ہے - جهانتک اسکی طبعی ضروریات کا تعلق ہے ، انسان ان چیزوں کا علم، عقل و فکر اور تجربہ و مشاهدہ سے حاصل کرسکتا ہے لیکن جهانتک اس کی "انسانیت" کے تقاضوں کا تعلق ہے یہ چیزیں وحی کے ذریعے هی معلوم هو سکتی هیں - لهذا انسان کو یہ جاننے کے لئے کہ اسکی "صلوۃ و تسبیح" کیا ہے ، وحی کا ماننا اور جاننا ضروری ہے - اور اس مقصد کی تکمیل کیلئے وحی کے دیے هوئے پروگرام پر عمل کرنا لازمی ہے - اسے قرآن کریم نے اِقَامَتِ صَلٰوۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے - (وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ ۲/۳)- یعنی قوانین خداوندی کا اتباع کرنا -

لیکن وحی کے دئے هوئے پروگرام پر عمل پیرا هونا (اِقَامَتِ صلٰوۃ) انفرادی طور پر ممکن نہیں - یہ صرف اجتماعی نظام کے ماتحت هو سکتا ہے -

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اسکے لئے جمع کے صیغے استعمال کئے ہیں ۔ حتیٰکہ ایک اسلامی مملکت کا فریضہ ہی یہ بتایا ہے اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (۲۲/۴۱) ۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلٰوۃ اور ایتائے زکٰوۃ کرینگے (زکٰوۃ کے مفہوم کےلئے دیکھئے عنوان ز ک و) ۔ اور معروف کا حکم دینگے اور منکر سے روکینگے "۔ انہی کو دوسری جگہ اَلرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ (۹/۱۱۲) کہا ہے ۔ یعنی رکوع کرنے والے ۔ سجدہ کرنے والے ۔ (رُکُوْعٌ اور سَجْدَۃٌ کیلئے دیکھئے عنوانات ۔ ر ۔ ک ۔ ع اور س ۔ ج ۔ د) ۔ اور یہی وجہ ہے کہ دوسری جگہ اقامت صلٰوۃ اور امور مملکت کیلئے باھمی مشاورت کا اکھٹا ذکر کیا گیا ہے ۔ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (۴۲/۳۸) ۔ " وہ اقامت صلٰوۃ کرتے ہیں اور ان کے معاملات باھمی مشورہ سے طے پاتے ہیں "۔ اور چونکہ جماعت مومنین کی زندگی کے تمام امور قوانین خداوندی (کتاب اللہ) کے مطابق سر انجام پاتے ہیں اسلئے سورۃ اعراف میں تَمَسُّکْ بِالْکِتَابِ اور اقَامَتِ صَلٰوۃ کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے (۷/۱۷۰) ۔ لہذا اقامت صلٰوۃ سے مفہوم ہے ایسا نظام (یا معاشرہ) قائم کرنا جسمیں تمام افراد، قرآن کریم کے قوانین کا اتباع کرتے چلے جائیں، اور یوں کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہیں ۔ اس مقصد کی مزید وضاحت کیلئے قرآن کریم میں صَلّٰی کے مقابلہ میں تَوَلّٰی کا لفظ آیا ہے (۷۵/۳۱-۳۲) ۔ تَوَلّٰی کے معنے ہیں صحیح راستہ سے روگردانی کرنا ۔ گریز کی راہیں نکالنا ۔ پھر جانا ۔ منہ موڑ لینا ۔ اس لئے صَلّٰی کے معنے ہوئے قوانین خداوندی کے مطابق صحیح راستہ پر چلتے جانا ۔ نظام خداوندی کے متعین کردہ فرائض منصبی کو ادا کرتے جانا ۔ علامہ حمیدالدین فراھی ؒ نے اسی اعتبار سے کہا ہے کہ صلٰوۃ کے ایک معنی کسی کی طرف بڑھنے، رخ کرنے اور متوجہ ہونے کے ہیں (مفردات القرآن) ۔ سورۃ علق میں ہے ۔ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی (۹۶/۹-۱۰) ۔ یعنے جب خدا کا بندہ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنا چاھتا ہے تو یہ (مخالف) اسکے راستے میں رکاوٹیں ڈالتا ہے ۔

ان فرائض منصبی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جسکو یہ محیط نہ ہو ۔ چنانچہ سورۃ ھود میں ہے کہ حضرت شعیب ؑ سے ان کی قوم نے کہا کہ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱/۸۷) " کیا تیری صلٰوۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اسے چھوڑ دیں جس کی عبادت ھمارے باپ

دادا اختیار کئے چلے آرھے ھیں - یا ھم اپنے مال و دولت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کریں "؟ یعنی ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ کیسی صلٰوۃ ھے جو معاشیات تک کو بھی اپنے دائرے کے اندر لے لیتی ھے - اس سے بھی صلٰوۃ کا مفہوم واضح ھو جاتا ھے - یعنی زندگی کے ھر شعبے میں ، قوانین خداوندی کے مطابق عمل کرنے کا نام صلٰوۃ ھے - حقیقت یہ ھے کہ (تفصیل اس اجمال کی کتنی ھی طویل کیوں نہ ھو) بات سمٹ سمٹا کر یہاں آجاتی ھے کہ انسان اپنے معاملات کا فیصلہ اپنی مرضی (خواھشات اور جذبات) کے مطابق کرنا چاھتا ھے یا وحی خداوندی کے مطابق ؟ اپنے تمام معاملات کو وحی خداوندی کے تابع رکھنے کا نام " اقامت صلٰوۃ " ھے - چنانچہ سورۃ مریم میں " اقامت صلٰوۃ " اور " اتباع جذبات " کو ایک دوسرے کے مقابل لا کر اس مفہوم کو واضح کر دیا گیا ھے - ارشاد ھے فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ .... ($\frac{19}{59}$) - (انبیائے کرام کے بعد)،،ایسے نا خلف پیدا ھو گئے کہ انہوں نے صلٰوۃ کو ضائع کر دیا اور اپنے جذبات و خیالات (اپنی خواھشات) کے پیچھے چلنے لگ گئے،، گویا انسان کا اپنی خواھشات کے پیچھے چلنا صلٰوۃ کو ضائع کر دینا ھے اور قوانین خداوندی کے پیچھے چلنا صلٰوۃ کا قائم رکھنا ھے - سورۃ انعام میں " محافظت صلٰوۃ " کو آخرت اور کتاب اللہ پر ایمان رکھنے کے مرادف قرار دیا گیا ھے - ($\frac{6}{92}$) - اسی بنا پر ابن قتیبہ نے اِلصَّلٰوۃ کے معنی اَلدِّیْنُ کئے ھیں * - یعنی اقامت صلٰوۃ درحقیقت اقامت دین ھے -

(٦) اَلصَّالٰی کے معنی آگ اور ایندھن کے ھیں - اس سے صَلَّی عَصَاہُ عَلَی النَّارِ کے معنے ھیں ، اس نے اپنی لکڑی (لاٹھی) کو آگ دکھا کر نرم اور سیدھا کیا - سلب ماخذ کے اعتبار سے صَلَّی کے ایک معنی یہ بھی ھیں کہ اس نے آگ کو ھٹایا اور دور کیا - (روح المعانی) -

اس اعتبار سے دیکھئے تو صلٰوۃ کے معنی ھونگے اپنی خامیوں کو رفع کرنا - صاحب المنار نے کہا ھے کہ صلٰوۃ قَولاً و عملاً اس حقیقت کا اعتراف ھے کہ ھم اپنی خامیوں کو رفع کرنے کے لئے ، نقائص سے بالاتر ایک ذات (کی راھنمائی) کے محتاج ھیں - اسی جہت سے قرطبی نے کہا ھے کہ صلٰوۃ در حقیقت خدا کی محکومیت اور اطاعت کو کہتے ھیں -

* القرطین - جلد اول - صفحہ ۳۱ ، یہ معنی محیط اور اقرب الموارد نے بھی دئے ھیں -

(۷) صلوٰۃ کے ایک معنی جھکانا اور کسی کو اپنی طرف مائل کرنا بھی ہیں*۔ اس جہت سے صلوٰۃ کا مفہوم ہوگا۔ کائنات کو مسخر کرنا اور اسے اپنے تابع فرمان بنانا۔

(۸) الصلوٰۃ کے ایک معنی تعظیم کے بھی ہیں**۔ یعنی اپنے عملی پروگرام سے کائنات کو نشو و نما دینے والے (رب العالمین) کی عظمت کو ثابت کرنا۔ اس سے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا باہمی تعلق واضح ہوجاتا ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کے مطابق ایسا پروگرام مرتب کرنا اور اس پر عملاً چلنا جس سے تمام نوع انسان کی نشو و نما ہوتی جائے۔

(۹) صلوٰۃ کے جو مختلف مفاہیم اوپر بیان ہوئے ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ ایک عبد مومن، زندگی کے جس گوشے میں بھی قوانین خداوندی کے مطابق اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے، وہ فریضۂ صلوٰۃ ہی کو ادا کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وقت، مقام یا شکل کا تعیّن ضروری نہیں۔ لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں صلوٰۃ کا لفظ ایک خاص قسم کے عمل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً

(ا) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ (۵/۶)

"اے ایمان والو! جب تم صلوٰۃ کے لئے کھڑے ہو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو۔ اور اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو۔ اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔" اس کے بعد ہے کہ اگر تمہیں پانی نہ ملے تو تیمم کر لیا کرو۔

(ب) سورۃ نساء میں ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ (۴/۴۳)۔

"اے ایمان والو۔ تم صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ درآنحالیکہ تم حالتِ سکر (نشہ یا نیند) میں ہو۔ تاآنکہ تم جو کچھ منہ سے کہو اسے سمجھو (کہ کیا کہہ رہے ہو)"۔ اس کے بعد پھر تیمم کا ذکر ہے۔ (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں مساجد میں جانے کا ذکر ہے۔ لیکن یہ بحث الگ ہے)۔

(ج) نبی اکرمؐ سے ارشاد ہے کہ إِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَعَكَ

---

* محیط۔ **تاج

وَلْيَأْخُذُوْا أَسْلِحَتَهُمْ - فَإِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَرَائِكُمْ - وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ أَسْلِحَتَهُمْ .... (۴/۱۰۲) - ''اور جب تو ان کے درمیان ہو - پھر ان کے لئے قیام صلٰوۃ کرے - تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ تیرے ساتھ کھڑا ہو، اور چاہئے کہ وہ اپنے ہتھیار لے لیں - پھر جب وہ سجدہ کرچکیں تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائیں، اور چاہئے کہ دوسرا گروہ جنہوں نے صلٰوۃ ادا نہیں کی وہ تیرے ساتھ صلٰوۃ ادا کریں- اور وہ اپنے بچاؤ (کا سامان) اور اپنے ہتھیار لئے رہیں''- اس کے بعد ہے فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوْا اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ - فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ .... (۴/۱۰۳) - ''پھر جب تم صلٰوۃ ادا کر چکو تو کھڑے - بیٹھے - لیٹے جس طرح جی چاہے اللہ کا ذکر کرو - پھر جب تم اطمینان کی حالت میں ہو تو قیام صلٰوۃ کرو''-

اس سے پہلی آیت یہ ہے فَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا .... (۴/۱۰۱) - ''اور جب تم زمین میں سفر کرو تو اس میں تمہارے لئے ہرج کی بات نہیں کہ تم صلٰوۃ کو کم کر لو اگر تمہیں ڈر ہو کہ کفار (مخالفین) تمہیں تکلیف پہنچائینگے''- اس ضمن میں (۲/۲۳۹) بھی دیکھئے -

صلٰوۃ کے کم کرنے کا طریق (۴/۱۰۲) میں بیان ہوچکا ہے -

(د) سورۃ مائدۃ میں ہے وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا .... (۵/۵۸) - ''اور جب تم صلٰوۃ کے لئے آواز دیتے ہو تو (مخالفین) اسے ہنسی اور مذاق (کھیل) بنا لیتے ہیں'' - سورۃ الجمعۃ میں ہے إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ - ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ - فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ .... (۶۲/۹-۱۰) - ''جب جمعہ کے دن (یا اجتماع کے وقت) صلٰوۃ کے لئے بلایا جائے تو ''اللہ کے ذکر'' کی طرف جلدی آ جایا کرو اور کاروبار کو چھوڑ دیا کرو - اگر تمہیں (اس کی اہمیت کا) علم ہو(تو تم اس حقیقت کو محسوس کر لوگے کہ) یہ تمہارے لئے (کسقدر) بہتر ہے - پھر جب صلٰوۃ ختم ہو جائے تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو - اور

''اللہ کا بہت ذکر کرو'' ۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ''۔ اس کے بعد ہے کہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انہیں جب کاروبار یا کھیل تماشا نظر آجاتا ہے تو اس کی طرف بھاگ جاتے ہیں اور تجھے کھڑا چھوڑ جاتے ہیں ۔ ان سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے ہاں سے تمہیں مل سکتا ہے وہ کھیل اور کاروبار سے کہیں بہتر ہے ۔ اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے ۔ ($\frac{62}{11}$) ۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں صلٰوۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں عام طور پر نماز کے اجتماعات کہا جاتا ہے ۔ (نماز کا لفظ عربی زبان کا نہیں ۔ پہلوی زبان کا ہے) ۔ ان اجتماعات کے سلسلہ میں ایک بات خاص طور پر سمجھنے کے قابل ہے ۔ جیسا کہ (ع ۔ ب ۔ د) کے عنوان میں وضاحت سے بتایا جائیگا ، قرآن کریم کی رو سے ''خدا کی عبادت'' سے مفہوم اس قسم کی ''پرستش'' یا ''پوجا پاٹ'' نہیں جو عام طور پر اہل مذاہب کے ہاں پائی جاتی ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے ''عبادت'' کا مفہوم خدا کے قوانین و احکام کی اطاعت ۔ یا ''اللہ کی محکومیت اختیار کرنا ہے''۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی یہ محکومیت ، زندگی کے ہر سانس اور کاروبار حیات کے ہر شعبہ میں اختیار کی جائے گی ۔ اس کی عملی شکل وہ نظام مملکت ہے جو قرآنی اصولوں کے مطابق متشکل کیا جاتا ہے ۔ اسی نظام کے حاملین کے متعلق فرمایا وَ الَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ($\frac{42}{38}$) ۔ ''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نشو و نما دینے والے کی اطاعت کرتے ہیں ۔ اور اقامتِ صلٰوۃ کرتے ہیں ۔ اور ان کا معاملہ باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے ۔ اور جو کچھ ہم انہیں دیتے ہیں وہ اسے (نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے) کھلا رکھتے ہیں''۔ ان آیات میں ، اطاعت خداوندی ۔ اقامتِ صلٰوۃ اور امور مملکت کے طے کرنے کے لئے باہمی مشاورت کا ارتباط غور طلب ہے ۔ ظاہر ہے کہ قوانین خداوندی کے نفاذ کے متعلق ضروری امور کا فیصلہ کرنے کے لئے باہمی مشاورت کی ضرورت ہوگی، اور مشاورت کے لئے اجتماعات بھی ضروری ہونگے ۔ وسیع معنوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ اجتماعات بجائے خویش ''اقامت صلٰوۃ'' ہی کا ایک حصہ ہونگے ۔ لیکن ان اجتماعات میں ایک اور حقیقت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے ۔ جیسا کہ (ر ۔ ک ۔ ع) اور (س ۔ ج ۔ د) کے عنوانات میں لکھا جا چکا ہے،انسان اپنے جذبات کا اظہار جسم کے اعضا کی محسوس حرکات سے بھی کرتا ہے ، اور یہ چیز اس میں ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ اس سے یہ حرکات خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہیں ۔ غم و غصہ ، خوشی ، تعجب ، عزم و ارادہ ، ہاں اور نہ ،

وغیرہ قسم کے جذبات اور فیصلوں کا اظہار، انسان کی طبعی حرکات سے بلا ساختہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت جذبات عزت و احترام اور اطاعت و انقیاد کے اظہار کی ہے۔ تعظیم کے لئے انسان کا سر بلا اختیار نیچے جھک جاتا ہے۔ اطاعت کے لئے ''سر تسلیم خم'' ہوجاتا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم عمل کی روح اور حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے، اور محض (Formalism) کو کوئی وزن نہیں دیتا، لیکن جہاں کسی جذبہ کی روح اور حقیقت کے اظہار کے لئے (Form) کی ضرورت ہو، اس سے روکتا بھی نہیں، بشرطیکہ اس (Form) ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لیا جائے۔ صلٰوۃ کے سلسلہ میں قیام و سجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آئی ہے، وہ اسی مقصد کے لئے ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ان جذبات کا اظہار، اجتماعی شکل میں ہو، تو اظہار جذبات کی محسوس حرکات میں ہم آہنگی کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے، ورنہ اجتماع میں انتشار ابھرتا دکھائی دیگا۔ احترام و عظمت، انقیاد و اطاعت، اور فرماں پذیری و خود سپردگی کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم و ضبط کا ملحوظ رکھنا، بجائے خویش بہت بڑی تربیت نفس ہے۔ یہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

یہ ہے جذبات اطاعت و تسلیم کے اظہار کی وہ منضبط شکل (صلٰوۃ) جسے قرآن کریم، جماعت مومنین کی مجالس و مشاورت کا ضروری حصہ قرار دیتا ہے۔ (جسطرح آجکل ہمارے ہاں جلسوں کی کاروائی کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے کیا جاتا ہے اگرچہ یہ چیز محض رسمًا ادا کر دی جاتی ہے)۔ (وَ الَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ) ان اجتماعات کی اہمیت کے پیش نظر، قرآن کریم نے انہیں كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (۴/۱۰۳) کہا ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں ''خاص طور پر مقرر کردہ فریضہ''۔ اور دوسرے معنی ہیں ''ایسا فریضہ جو وقت پر ادا کیا جاتا ہے''۔ اجتماعات کے لئے وقت کی پابندی جس قدر ضروری ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی لئے سورۃ الجمعہ کی جو آیت پہلے درج کی جا چکی ہے، اس میں خاص طور پر کہا گیا ہے کہ جب اس اجتماع کے لئے بلایا جائے، تو اسے تمام دیگر مصروفیات پر ترجیح دو۔ تمام کاروبار چھوڑ کر فوراً اس طرف آجاؤ اور جب تک اس سے فارغ نہ ہوجاؤ کسی اور کام کی طرف دھیان مت دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا امیر، تمہارے سامنے ضروری معاملات پیش کر رہا ہو، ان کی اہمیت سمجھا رہا ہو، اور تم کاروبار کے لئے باہر نکل جاؤ۔ (وَ تَرَكُوْكَ قَآئِمًا)۔

یوں تو جماعتِ مومنین کی ساری زندگی—دن رات—صبح شام—قوانین خداوندی کی اطاعت اور انکے نفاذ کی تگ و تاز میں گذرتی ہے، لیکن اجتماعات کے لئے خاص اوقات کا تعین ضروری ہوتا ہے—خواہ یہ اجتماعات معمولاً منعقد ہوں یا ھنگامی طور پر بلائے جائیں—ذہن انسانی کی توہم پرستیوں نے ، جہاں زندگی کے اور گوشوں میں ''سعد و نحس'' کے افسانے تراشے تھے وہاں دن اور رات کے بعض اوقات کے لئے بھی اسی قسم کے تصور قائم کر رکھے تھے - سورج نکلتے وقت فلاں کام نہیں کرنا چاھئے - زوال کے وقت یوں نہیں کرنا چاھئے - دن اور رات کے ملتے وقت فلاں کام نہیں کرنا چاھئے - وغیرہ وغیرہ - قرآن کریم نے جہاں اور توہم پرستیوں کا خاتمہ کر دیا وہاں اوقات کے سلسلہ میں بھی یہ کہہ کر بات واضح کر دی ہے کہ دن اور رات میں نہ کوئی ساعت نحس ہے نہ سعد - اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں وقت فلاں کام نہیں کرنا چاھئے - جہاں تک اجتماعات صلٰوۃ کا تعلق ہے - أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ . . . . (۱۷/۷۸) تم ''دلوک الشمس'' سے رات کی تاریکی تک اقامتِ صلٰوۃ کر سکتے ھو - اور صبح کے وقت کا قرآن بھی—(د - ل - ک) کے عنوان میں آپ دیکھ چکے ھیں کہ ''دلوک'' میں ، صبح سے شام تک کا سارا وقت آجاتا ہے ؛ بالخصوص جب سورج کے بلند ہونے - نصف النہار تک پہنچنے ، مائل بہ زوال ہونے اور غروب ہوجانے کی مختلف منازل کو (خاص طور پر) اس میں شامل کرنا مقصود ھو - ان مختلف منازل کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود ، ان توہم پرستیوں کی تردید تھا جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے - انہی کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ (۱۱/۱۱۴) - ''دن کے دونوں اطراف اور رات کے حصوں میں اقامت صلٰوۃ کرو'' -

ان اوقات کا ذکر تو خصوصیت سے لفظ صلٰوۃ کے ساتھ کیا گیا ہے ، ویسے اقامت دین کے سلسلہ میں جماعت مومنین کی تگ و تاز کے سلسلہ میں (جسے قرآن کریم تسبیح ، تحمید و تذکیر کے اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے) دن ، رات کے تمام اوقات کا ذکر آیا ہے - دیکھئے (۳۰/۱۹) و (۲۰/۱۳۰) و (۵۰/۳۹) و (۵۲/۴۹) وغیرہ -

سورۃ نور میں صلٰوۃ الفجر اور صلٰوۃ العشاء کا ذکر (ضمناً) آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ تمہارے گھر کے ملازمین کو چاھئے کہ وہ تمہاری (Privacy)

کے اوقات میں ، اجازت لیکر کمرے کے اندر آیا کریں - یعنی مِنْ قَبْلِ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ وَحِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَکُمْ مِّنَ الظَّھِیْرَۃِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوۃِ الْعِشَاءِ (۲۴/۵۸) ''صلٰوۃ الفجر سے پہلے- اورجب تم دوپہر کو کپڑے اتار دیدیتے ھو - اور صلٰوۃ العشاء کے بعد'' - اس سے واضح ھے کہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں اجتماعات صلٰوۃ کے لئے (کم از کم) یہ دو اوقات متعین تھے - جبھی تو قرآن کریم نے ان کا ذکر نام لیکر کیا ھے -

جہاں تک صلٰوۃ میں کچھ پڑھنے کا تعلق ھے ، یہ ھم دیکھ چکے ھیں کہ قرآن کریم نے کہا ھے کہ تمہیں معلوم ھونا چاھئیے کہ تم کیا پڑھ رھے ھو (۴/۴۳)- دوسرے مقام میں ھے وَلَا تَجْھَرْ بِصَلَاتِکَ وَلَا تُخَافِتْ بِھَا - وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا (۱۷/۱۱۰) -''اور اپنی صلٰوۃ کو نہ تو بلند آواز سے ادا کر اور نہ خاموشی سے - ان دونوں کے درمیان راستہ اختیار کر'' بعض لوگوں کا خیال ھے اس آیت میں صلٰوۃ سے مراد عام دعا یا ذکر ھے - نماز نہیں - لیکن یہ خیال صحیح نظر نہیں آتا - ''ذکر'' کے متعلق قرآن کریم میں بہ صراحت موجود ھے (۷/۲۰۵) کہ اسے خاموشی سے دل میں کرنا چاھئے - بہ آواز بلند نہیں - (ذکر سے مراد ، قانون خداوندی کی یاد ھے) - اسلئے مندرجہ بالا آیت میں صلٰوۃ سے مراد '' نماز '' ھی ھوسکتی ھے - قرطبی نے اس کے معنی قرأت لکھے ھیں -

تصریحات بالا سے ظاھر ھے کہ ان مقامات میں صلٰوۃ سے مراد اجتماعات صلٰوۃ ھیں - (اس کے لئے فعل صَلّٰی - یُصَلِّیْ آتا ھے) - اس کا مطلب یہ ھے کہ قرآن کریم نے جہاں '' اقیموالصلٰوۃ '' کہا ھے وھاں ، بہ ھیئتِ مجموعی ، اس سے مراد ھے ، اقامت دین - (یعنی نظام خداوندی کی تشکیل و استحکام) - قوانین و احکام خداوندی کا اتباع - ان فرائض منصبی کی ادائیگی جو ایک عبد مومن پر عائد ھوتے ھیں - لیکن بعض مقامات پر اس سے مراد ھیں اجتماعاتِ صلٰوۃ جو خود دین کے نظام کا جزو ھیں - متعلقہ مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ھوگا کہ وھاں اقامت صلٰوۃ سے مقصود کیا ھے - اسی طرح جہاں جہاں '' مصلین '' آیا ھے وھاں بھی یہ دیکھنا ھوگا کہ اس سے مراد جماعت مومنین (بہ ھیئتِ مجموعی) ھے یا صرف اجتماعاتِ صلٰوۃ میں شرکت کرنے والے ، اس لئے کہ قرآن کریم نے ان ''مصلّین'' کا بھی ذکر کیا ھے جو شرف انسانیت کی بلندیوں پر ھیں (دیکھئے ۷۰/۲۲-۳۵) - اور ان کا بھی جن کے لئے تباھی ھے (۱۰۷/۴) -

(۱۰) صَلّٰی عَلَیْهِ ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں تعظیم کرنا ۔ دعا دینا ۔ حوصلہ افزائی کرنا ۔ پروان چڑھانا ۔ نشوونما دینا ۔ کسی قسم کی خرابی یا فساد پیدا نہ ہونے دینا * ۔

ان معانی کو سامنے رکھنے سے قرآن کریم کے ان مقامات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جن میں یہ مادہ علیٰ کے صلہ کے ساتھ آیا ہے ۔ مثلاً سورۃ احزاب میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُهٗ ...... (۳۳/۴۳) ۔ '' خدا اور اس کے ملائکہ (کائناتی قوتیں) تمہاری حوصلہ افزائی کرتے ہیں ۔ تمہاری نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں ۔ تمہاری کوششوں کو پروان چڑھاتے ہیں '' ۔ یہ ان مومنین کے متعلق ہے جن کی بابت دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ جب انہیں اقامت دین کے سلسلہ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ ان سے گھبراتے نہیں ۔ حوصلہ نہیں ہارتے ، بلکہ ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں ۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (۲/۱۵۷) ۔ یہ لوگ خدا کے نزدیک مستحق تبریک و تہنیت ہیں ۔ انہیں خدائی تائید و نصرت حاصل ہے ۔ خدا ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے ۔ ان کی کوششوں کو کامیاب بناتا ہے ۔ ان کی نشو و نما کرتا ہے ۔

یہ تو رہا عام جماعت مومنین کے متعلق ۔ خود نبی اکرمؐ کے متعلق ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ......(۳۳/۵۶) ۔ خدا اور اس کے ملائکہ نبیؐ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ۔ اس کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچاتے ہیں ۔ اس کے بعد ہے ۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۔ (۳۳/۵۶) ۔ '' اے جماعت مومنین ! تم بھی اپنے نبیؐ کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں اس کا ساتھ دو ۔ اس کی کوششوں کو پروان چڑھانے میں اسکی مدد کرو ۔ اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اس کی پوری پوری اطاعت کرو'' ۔ (۳/۱۳۱) ۔ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ (۴۸/۹) ۔ (تاکہ) تم اسکی مدد کرو ۔ اسکی عزت و توقیر کرو ۔ مومنین کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ (۷/۱۵۷) ۔ ''جنہوں نے اسکی تائید و تعظیم کی ۔ اس کی مدد کی'' ۔ اسطرح کہ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗ (۷/۱۵۷) ''جو روشن (کتاب) ہم نے اس کے ساتھ نازل کی ہے اس کا اتباع کیا'' ۔ یہ ہے مومنین کی طرف سے صَلُّوا عَلَیْهِ کے فریضہ کی ادائیگی کا طریق ۔

یہ ہے خدا اور اس کے ملائکہ کے صَلَوٰتٌ جماعت مومنین پر اور خود نبی اکرمؐ پر ۔ اور یہ ہے جماعت مومنین کا صلوۃ و سلام نبی اکرمؐ پر ۔

* راغب و تاج ۔

آپ نے غور فرمایا کہ صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا کا حکم کتنے عظیم عملی پروگرام کا متقاضی ہے - یعنی قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت سے اس دین کو تمام ادیان عالم پر غالب کرنا جسے نبی اکرمؐ لیکر تشریف لائے تھے - دوسری طرف نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ جب جماعت مومنین کے افراد ، انفاق فی سبیل اللہ کے لئے تیرے پاس اپنی کمائی لیکر آئیں تو اسے قبول کر ، وَصَلِّ عَلَيْهِمْ - اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (۹/۱۰۳) - اوران کی حوصلہ افزائی کر - اس لئے کہ تیری طرف سے حوصلہ افزائی (Encouragement) ، تحسین و تبریک (Appreciation) ، ان کے لئے موجب تسکین ہوتی ہے - وہ اس انفاق فی سبیل اللہ کو قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ (۹/۹۹) کا موجب سمجھتے ہیں - یعنی قرب خداوندی کا باعث اور رسول کی طرف سے تحسین و تبریک اور حوصلہ افزائی کا موجب -(''قرب خداوندی'' کے لئے ق - ر - ب کا عنوان دیکھئے) -

(۱۱) لغت عبرانی میں صَلَوٰتٌ یہودیوں کی عبادت گاہوں کو بھی کہتے ہیں - (۲۲/۴۰) میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے -

ص ل ی

صَلَى اللَّحْمَ يَصْلِيْهِ بِالنَّارِ صَلْيًا - اسنے گوشت کو بھون لیا - اسنے گوشت کو بھوننے کیلئے اسے آگ میں ڈال دیا * -

اَلصَّلْيُ کے اصل معنے آگ جلانے کے ہیں - صَلِيَ بِالنَّارِ - اس نے آگ کی تکلیف برداشت کی - وہ آگ میں جلا - صَلَيْتُ الشَّاةَ - میں نے بکری کو بھون لیا ** - اَصْلَاهُ النَّارَ وَصَلَّاهُ - اس نے اسے جلنے کیلئے آگ میں داخل کر دیا - اسکا ٹھکانہ آگ میں بنا دیا *** -

اَلصِّلَاءُ - بھنی ہوئی چیز - آگ جلانے کیلئے ایندھن * -

صَالٍ - وہ جو آگ میں بھنے - جو جہنم کی طرف جائے - مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ (۳۷/۱۶۳) - الصِّلِيُّ : جلنا ، آگ کی تکلیف برداشت کرنا (۱۹/۷۰) -

سورۃ اعلی میں ہے اَلَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى (۸۷/۱۲) جو بہت بڑی آگ میں داخل ہوتا (یا بھنتا) ہے -

سورۃ حاقۃ میں ہے ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ (۶۹/۳۱) - پھر اسے جہنم میں داخل کرو - سورۃ مدثر میں ہے سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ (۷۴/۲۶) - میں اسے دوزخ میں

* تاج - ** راغب - *** محیط -

داخل کرونگا ۔ سورۃ واقعہ میں ہے تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ (۵۶/۹۴) جہنم میں جلانا ۔ اِصْطَلَى (اِصْتَلٰى) آگ تاپنا اور اس سے گرمی حاصل کرنا ۔ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ (۲۷/۷) ۔

ص م ت

اَلصَّمْتُ ۔ اَلصُّمُوْتُ ۔ اَلصُّمَاتُ ۔ خاموش ہونا ۔ (سَكَتَ اور صَمَتَ کے فرق کیلئے دیکھئے عنوان س ۔ ک ۔ ت) ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ابہام اور اغلاق کے ہوتے ہیں ۔ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ (۷/۱۹۳) تم چپکے رہو ۔ اَلصَّامِتُ ۔ سونے چاندی (یعنی نہ بولنے والی دولت) کو کہتے ہیں ۔ اس کے برخلاف اَلنَّاطِقُ ۔ وہ دولت جو جانوروں کی شکل میں ہو ۔ الصَّمُوْت ۔ گڑ جانے والی تلوار ۔ حَائِطٌ مُصْمَتٌ ۔ وہ دیوار جس میں کوئی روشن دان ، دروازہ یا شگاف نہ ہو *۔

ص م د

اَلصَّمْدُ ۔ بلند جگہ جو، سخت ہو لیکن اتنی اونچی نہ ہو کہ پہاڑ کی حد تک پہنچ جائے ۔ اَلصَّمْدَةُ ۔ پتھر کی محکم چٹان ۔اَلصَّمَدُ ۔ وہ سردار جسکی اطاعت کی جائے اور جسکے بغیر کسی معاملہ کا فیصلہ نہ کیا جائے ۔ وہ ہستی جس کی طرف ضروریات کیلئے رجوع کیا جائے ۔ وہ ہستی جس سے کوئی مستغنی نہ ہو سکے ۔ وہ شخص جسے جنگ میں نہ بھوک ستاتی ہو نہ پیاس ۔ نَاقَةٌ مِصْمَادٌ ۔ وہ اونٹنی جو سردی کی شدت اور چارہ کے کم ہونے کے باوجود برابر دودھ دیتی رہے * ۔ صِمْدُ الْمِحْرَاثِ ۔ ہل کی وہ لکڑی جسے ہل چلاتے وقت ہالی ہاتھ سے پکڑتا ہے * ۔ اَلصَّمْدُ ۔ قصد اور ارادہ کرنا * ۔

قرآن کریم میں اللہ کیلئے اَلصَّمَدُ آیا ہے ۔ اللّٰہُ الصَّمَدُ (۱۱۲/۲) ۔ '' اللہ ہی صمد ہے '' ۔ اَلصَّمَدُ کے ان معانی پر غور کیجئے جو اوپر بیان ہوئے ہیں اور پھر دیکھئے کہ قرآن کریم نے اس ایک لفظ سے خدا کے متعلق کیسا وسیع اور بلند تصور پیش کیا ہے ۔ یعنے ایسی بلند اور محکم چٹان کہ جب ہر طرف سے سیلاب کا پانی گھیر لے اور کہیں پناہ کی جگہ نہ ملے تو لوگ اسکی طرف رجوع کریں اور انھیں وہاں پناہ مل جائے ۔ نیز وہ ذات جو دوسروں کی تمام ضروریات کو تو پورا کرے لیکن خود ان سب سے مستغنی ہو ۔ نیز ، اسکی نوازشات غیر منقطع ہوں اور اسکی ربوبیت مسلسل جاری رہے ۔

* تاج ۔ محیط ۔

جو قوم اپنے اندر اس خصوصیت کو پیدا کر لے اسکے مقام بلند کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ اپنے مقصد کے حصول میں بھوک اور پیاس کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہو اور دوسروں کی نشو و نما میں سردی اور قحط بھی اس کے راستے میں حائل نہ ہو سکیں ۔ چٹان کی طرح محکم اور سب بے آسروں کا آخری سہارا ۔ اور قابل اعتماد آسرا ۔ لیکن دوسروں کے سہاروں سے مستغنی ۔

خدا کے متعلق قرآن کریم نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ (۱۱۲/۱-۲) کہکر ایک اور بلند حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے ۔ اَحَدٌ کے معنے ہیں منفرد ۔ یگانہ (Unique) ۔ اس انفرادیت میں مخلوق سے بے ہمگی (Transcendence) کا پہلو مضمر ہے ۔ لیکن صمدیت کے معنے یہ ہیں کہ مخلوق کی ایک ایک سانس اسکی ربوبیت سے وابستہ ہے ۔ اس سے اسکی باہمگی (Immanence) کا پہلو نمایاں ہے ۔ لہذا وہ ذات باہمہ بھی ہے اور بے ہمہ بھی ۔ یہی صفت مومن کی ہونی چاہئیے ۔ اقبال کے الفاظ میں ۔

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است
اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو با ہمہ رو

یعنے اَحَدِیَّت اور صَمَدِیَّت دونوں ۔

اللہ تعالیٰ کی ذات مکمل ترین اور بلند ترین ہے ۔ یعنی (The Most Developed, Complete, and Perfect Personality) اس نے انسان کو بھی ذات (Personality) عطا کی ہے ، لیکن غیر نشو و نما یافتہ شکل (Un-Developed Form) میں ۔ صفات خداوندی (الاسماء الحسنیٰ) جو قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں ، ذات خداوندی کے مختلف گوشے (Facets) ہیں ۔ ان میں بعض تو ایسے ہیں جو صرف خدا کی ذات سے مخصوص ہیں ۔ (مثلاً هُوَ الْاَوَّلُ) ۔ لیکن دوسری صفات ایسی ہیں جو (حدود بشریت کے اندر) انسانی ذات میں منعکس ہو سکتی ہیں ۔ ان میں صمدیت بھی شامل ہے ۔ یعنی جوں جوں انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی جائیگی وہ خارجی سہاروں سے مستغنی ہوتی جائیگی اور دوسروں کو سہارا دینے کا موجب بنتی جائیگی ۔ حریت اور استغناء (Freedom and Independance) ذات کے بنیادی خصائص (Basic Characteristics) ہیں ۔ (مزید تفصیل ر ۔ و ۔ ح اور ن ۔ ف ۔ س کے عنوانات میں دیکھئے) ۔

ص م ع

اَلْاَصْمَعُ ۔ چھوٹے کانوں والا آدمی ۔ ظَبْیٌ مُصَمَّعٌ ۔ ہرن جس کے سینگ اوپر سے پتلے اور باریک ہوں ۔ اَلصَّقْرُ مَصَعَةٌ ۔ عقاب ، کیونکہ وہ بلندی

پر اڑتا ہے ۔ صَوْمَعَةٌ ۔ خانقاہ ، چونکہ اسکا منارا اوپر سے لمبا اور نوکدار بنایا جاتا تھا ۔ (جیسے گرجا یا مندر کا منارہ) ۔ یا اسکی تنگی کی وجہ سے ، جس طرح اس آدمی کا سر ہوتا ہے جسکے کان چھوٹے چھوٹے ہوں ۔ لیکن بلندی کی جہت سے یہ مفہوم زیادہ مناسب نظر آتا ہے، کیونکہ کہتے ہیں صَوْمَعَ بِنَاءَهُ ۔ اسنے اپنی عمارت کو بلند کیا ۔ اَصْمَعُ ۔ معزز ترین مقام پر ترق کرنے والا ۔ صَمِعَ ۔ وہ اپنی دھن میں سر اٹھائے بے پروائی کے ساتھ گزر گیا * ۔ صَوْمَعَةٌ کی جمع صَوَامِعُ آتی ہے (۲۲/۴۰) ۔ خانقاہیں، یعنی راہبوں کی کوٹھڑیاں ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں باریکی اور لطافت اور اتصال پایا جاتا ہے ۔ یعنی کسی شے کا باریک ہونا اور ساتھ ہی اس کے اجزا کا باہمدگر پیوست ہونا ۔

ص م م

صَمَمٌ کے معنے ہیں کان کا بند ہو جانا اور ثقلِ سماعت ۔ صِمَامُ الْقَارُوْرَةِ ۔ شیشی کے ڈاٹ کو کہتے ہیں جس سے اس کا منہ بند کیا جاتا ہے ۔ صَخْرَةٌ صَمَّاءُ ۔ ٹھوس اور سخت چٹان جس میں کوئی شگاف نہ ہو ۔ اَلْاَصَمُّ ۔ بہرہ ۔ اس کی جمع صُمٌّ ہے ۔ نیز ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو اپنی مرضی کرے اور کسی کی نہ سنے اور جس سے یہ توقع نہ رہے کہ اسے اس کی خواہشات سے باز رکھا جاسکے گا *** ۔

اَلْمُصَمِّمُ ۔ وہ اونٹ جو بڑبڑائے نہیں اور نہایت استقامت سے چلتا جائے *** ۔

قرآن کریم میں صُمٌّ کا لفظ بہروں کے لئے آیا ہے ، نیز ان لوگوں کے لئے بھی جو حق کی آواز نہ سنیں اور اپنی مرضی کرتے چلے جائیں ۔ وہ لوگ جو جانوروں کی طرح ہوں اور عقل و فکر سے کام نہ لیں (۸/۲۲) ۔ قرآن کریم اندھے ، بہرے ، گونگے ، حتکہ مُردے ، ان لوگوں کو کہتا ہے جو عقل و بصیرت اور دلائل و براہین سے کام نہ لیں اور جذبات سے مغلوب ہوکر ، یا تقلیدی طور پر ، غلط راہوں پر چلتے جائیں۔

اَصَمَّ ۔ بہرہ کر دینا (۴۷/۲۳) ۔

ص ن ع

صَنْعٌ کے معنے کسی کام کو (قاعدے اور قانون کے مطابق نیز فن کے اعتبار سے) اچھی طرح کرنے کے ہیں ۔ اس لئے یہ لفظ فِعْلٌ (کام کرنے) سے خاص ہے اور حیوانات کے لئے نہیں بولا جاتا ***** ۔

*تاج ۔ محیط و راغب ۔ **لطائف اللغہ ۔ ***تاج و محیط ۔ *****راغب ۔

صُنْعٌ - بہت اچھی کاریگری کو کہتے ہیں* - صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ (۲۷/۸۸) - خدا کی (کیسی عجیب و غریب) صنعت کاری ہے جس نے ہر شے کو نہایت کمال و مہارت سے محکم طور پر بنایا ہے -

صَنْعَةٌ - کسی چیز کا عمدگی سے بنانا (۲۱/۸۰) - اَلْمَصَانِعُ - عمارات - حوض یا تالاب جن میں بارش کا پانی جمع کر لیا جائے - محلات - قلعہ - پختہ آبادیاں نیز صنعت گاہیں اور کارخانے - ابن فارس نے لکھا ہے کہ آبپاشی کے لئے جو کنواں وغیرہ بنایا جائے یہ اس کے لئے بولا جاتا ہے - راغب نے اسکے معنے بلند اور معزز و پرجلال مقامات کئے ہیں - (۲۶/۱۲۹) - صَنَعَ الْفَرَسَ - گھوڑے کی عمدہ طریقہ سے دیکھ بھال ، نگرانی اور تربیت کرنا - ھُوَ صَنِیْعِیْ - وہ میرا پروردہ و تربیت یافتہ ہے* - سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ ہم نے تجھے فرعون کے محلات میں پہنچا دیا تاکہ وہاں ہماری زیر نگرانی تمہاری تربیت ہو اور تم سلطنت کے امور اور مملکت کے انداز سیکھ سکو - لِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ (۲۰/۳۹) - اس سے ظاہر ہے کہ ، ہونے والے رسول کی پیدائش خدا کے پروگرام کے مطابق ہوتی تھی اور شروع ہی سے اس کی تربیت اس انداز سے کی جاتی تھی کہ وہ آگے چل کر نبوت جیسی عظیم القدر ذمہ داری کا اہل بن سکے - اسی لئے حضرت موسیٰ کی قبل از نبوت زندگی کے مختلف مراحل کا ذکر کرنے کے بعد کہا - ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی (۲۰/۴۰) - اتنی کٹھالیوں میں تاؤ کھانے - فَتَنّٰکَ فُتُوْنًا (۲۰/۴۰) کے بعد تب کہیں جاکر تم نبوت کے پیمانے پر پورے اترے - لہذا یہ سمجھنا محض ''شاعری'' ہے کہ - آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے - اس سے آگے ہے وَاصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ (۲۰/۴۱) اَلْاِصْطِنَاعُ کے معنے ہیں کسی چیز کے سدھارنے میں انتہائی زور اور توجہ صرف کرنا - بہت زیادہ غور اور احتیاط سے اصلاح و تربیت کرنا** - لہذا آیت کے معنے یہ ہیں کہ تمہاری تربیت خاص پروگرام کے مطابق کی گئی ہے - اس لئے کہ ہمیں تجھ سے ''اپنا کام'' لینا تھا - یہ سب کچھ ہم نے اپنے ایک مقصد کے لئے کیا ہے - وہ مقصد کیا ہے؟ اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (۲۰/۲۴) - فرعون کی طرف جاؤ - اس نے حد اعتدال سے نکل کر بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے - یعنی استبداد و سرکشی کی قوتوں کو مغلوب کرکے مظلوم انسانیت کو ان کے آہنی پنجہ سے چھڑانا ، اور پھر ان کی ایسی تربیت کرنا کہ وہ شرف انسانیت کے اہل بن جائیں - یہ ہے وہ مقصد عظیم جس کے لئے ایک نبی کی تربیت کی جاتی تھی -

*تاج - **راغب -

اور جسے خدا نے خود ''اپنا کام'' کہا ہے ۔ (واضح رہے کہ نبی کو اس دوران میں کچھ علم نہیں ہوتا تھا کہ اسے نبوت کے لئے تیار کیا جارہا ہے ۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ انسان اپنی سعی و عمل سے مقام نبوت تک پہنچ سکتا ہے مقام نبوت سے ناواقفیت کی دلیل ہے) ۔

ص ن م

اَلصَّنَمُ (جمع اَصْنَامٌ) ۔ بت ۔ صَنَّمَ الصُّوْرَۃَ کے معنے ہیں تصویر کوخوشنما اور جاذب بنا دینا** ۔ نیز کسی چیز کی بُو کے خراب ہو جانے کو بھی کہتے ہیں* ۔ راغب نے بعض حکماء کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو خدا سے بیگانہ بنا دے اور اس کی توجہ کو کسی دوسری طرف پھیر دے ، صَنَمٌ کہلاتی ہے*** ۔ لہذا اَصْنَامٌ وہ تمام جاذبیتیں اور مفاد پرستیاں ہیں جو انسان کو قانون خداوندی سے بیگانہ بنا دیتی ہیں ۔ چنانچہ راغب نے کہا ہے کہ حضرت ابراهیمؑ نے جو دعا مانگی تھی کہ وَاجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (۱۴/۳۵) ۔ اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو اس سے محفوظ رکھنا کہ ہم اصنام کی عبودیت اختیار کرلیں تو اس سے مراد ایسی ہی چیزوں کے پیچھے لگ جانا تھا ، کیونکہ حضرت ابراهیمؑ کو اس کا اندیشہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اور انکی اولاد بت پرستی شروع کر دے گی*** ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (۱۲/۱۰۶) ۔ ان میں سے اکثر کی یہ حالت ہے کہ وہ خدا پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ مشرک کے مشرک بھی رہتے ہیں ۔ ہم اس آیت کو پڑھ کر آگے گزر جاتے ہیں کہ یہ ہمارے متعلق نہیں ۔ ہم تو کسی بت کی پرستش نہیں کرتے ۔ یعنی ہماری نگاہ مٹی اور پتھر کے بتوں کی طرف رہتی ہے اور ان بتوں کو کبھی نہیں دیکھتی جو ہر آن ہمارے قلب و دماغ کے صنمکدوں میں ڈھلتے رہتے ہیں اور جنہیں ہم اپنی آستینوں میں لئے لئے مسجدوں میں سجدے اور حرمِ کعبہ میں طواف کرتے رہتے ہیں۔ اس سے بڑی اصنام پرستی اور اس سے سنگین ترشرک اور کیا ہوسکتا ہے؟ یہی وہ بت پرستی تھی جس کا خدشہ حضرت ابراهیمؑ کے دل میں (اپنی اولاد کی طرف سے) پیدا ہوا تھا اور ہم (ملت ابراهیمی کے مدعی) ان کے اس خدشہ کو سچا کرکے دکھلا رہے ہیں !

*تاج ۔ **کتاب الاشتقاق ۔ ***راغب ۔

ص ن و

اَلصِّنْوُ - کھجور وغیرہ کی جڑ سے جو مختلف شاخیں پھوٹتی ھیں ان میں سے ھر ایک کو صِنْوٌ کہتے ھیں - اس کی جمع صِنْوَانٌ ھے* - لہذا نَخِیْلٌ صِنْوَانٌ (۱۳/۴) ایسی کھجوروں کو کہینگے جن میں ایک ھی اصل سے دو دو یا زیادہ تنے پھوٹتے ھوں اور غَیْرُ صِنْوَانٍ (۱۳/۴) انہیں جو الگ الگ جڑوں سے تنہا نکلتی ھوں - اَلصِّنْوَةُ - حقیقی بہن ، بیٹی ، یا پھوپھی کو کہتے ھیں اور اَلصِّنْوُ حقیقی بھائی ، بیٹے اور چچا کو - کیونکہ یہ سب ایک ھی اصل کی شاخیں ھوتے ھیں* -

ص ھ ر

اَلصَّھْرُ - گرم - شَیْئٌ صَھْرٌ - گرم چیز - اَلصَّھْرُ - چربی وغیرہ کو گرم کرکے پگھلانا - صَھَرَتْہُ الشَّمْسُ تَصْھَرُ - دھوپ کی سخت تپش نے اس کے دماغ کو کھولا دیا ، یا اس کی چربی پگھلادی - صَھَرْتُہٗ بِالنَّارِ میں نے اسے آگ پر پکا کر گلا دیا - اَلصُّھَارَةُ - پگھلائی ھوئی چربی* - سورۃ حج میں ھے یُصْھَرُ بِہٖ مَا فِیْ بُطُوْنِھِمْ (۲۲/۲۰) اس کے ذریعے جو کچھ ان کے اندر ھے اسے گلایا اور پکادیا جائیگا - ان کی شدت اور سختی پگھلا دی جائیگی -

اَلصِّھْرُ - قرابت - اس کے متعین مفہوم کے لئے بہت سے اقوال آئے ھیں لیکن اکثریت کا خیال اسی طرف ھے کہ بیوی کے خاندان والے اَصْھَارٌ کہلاتے ھیں اور شوھر کے خاندان والے اَخْتَانٌ - قرآن کریم میں ھے فَجَعَلَہٗ نَسَبًا وَّ صِھْرًا (۲۵/۵۴)- نسب سے مراد وہ رشتہ داری ھے جو اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے ھو اور صِھْرٌ سے مراد وہ رشتہ داری ھے جو شادی کی وجہ سے پیدا ھو جائے* - قرآن کریم عائلی زندگی کو بڑی اھمیت دیتا ھے - اس اعتبار سے وہ میاں بیوی دونوں کے رشتہ داروں کو مشترکہ رشتہ دار قرار دیتا ھے -

ص و ب

صَابَ - یَصُوْبُ - صَوْبًا کے معنے ھیں گرنا - اوپر سے نیچے آنا - نیز قصد و ارادہ کرنا بارش کا گرنا - صَوْبٌ وصَوَابٌ - خطا کی ضد بھی ھے - یعنے صحیح بات - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی

*تاج و محیط و راغب -

چیز کے اترنے اور اتر کر اپنے مستقر تک جا پہنچنے کے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ بات یا کام جو اپنی صحیح جگہ پر پہنچ کر ٹھہر جائے صَوَابٌ کہلائیگا۔ سَہْمٌ صَائِبٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو ٹھیک نشانہ پر جالگے۔ نیز صَوْبٌ کے معنے بہانے (گرانے) اور اوپر سے اترنے کے بھی آتے ہیں۔ آسمان سے بارش ہونے کے معنوں میں بھی یہ لفظ آتا ہے۔ مُصِیْبَۃٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو نشانہ پر جا کر بیٹھ جائے۔ اس کے بعد ہر حادثہ اور واقعہ کو مُصِیْبَۃٌ کہنے لگے۔ تَصْوِیْبٌ کے معنے ہیں کسی بات کی تصدیق کرنا کہ وہ ٹھیک ہے۔ اَلصَّیِّبُ بارش کو کہتے ہیں *۔ لسان العرب میں ہے کہ صَیِّبٌ دراصل اس بادل کو کہتے ہیں جو بارش برسائے۔ اسکی تائید ابن فارس نے بھی کی ہے۔ اَصَابَ مِنَ الْمَرْاَۃِ کے معنے ہیں عورت کو چوما اور اس سے مجامعت کی۔ یعنے اپنی حاجت اس سے پوری کر لی **۔

قرآن کریم میں صَیِّبٌ۔ بارش (یا بادل) کے معنوں میں (۲/۱۸) میں آیا ہے۔ سورۃ نحل میں ہے فَاَصَابَہُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِہِمْ مَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَہْزِءُوْنَ (۱۶/۳۴)۔ جو کچھ بد عملیاں وہ لوگ کرتے تھے ان کے نتائج ان تک آپہنچے اور جن آنے والے واقعات کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے انہوں نے انہیں آ کر گھیر لیا۔ یہاں اَصَابَ کے معنے ہیں کسی بات کا واقع ہونا۔ اَصَابَہُ الْکِبَرُ (۲/۲۶۶) کے معنے ہیں اس پر بڑھاپا آگیا۔ سورۃ ص میں حَیْثُ اَصَابَ (۳۸/۳۶) کے معنے ہیں جسطرف کا وہ قصد کرتا تھا۔ اور سورۃ نبا میں قَالَ صَوَابًا (۷۸/۳۸) کے معنے ہیں وہ درست اور ٹھیک بات کہے۔

سورۃ نساء میں مُصِیْبَۃٌ کے مقابلہ میں فَضْلٌ کا لفظ آیا ہے (۴/۷۲-۷۳) لہذا مُصِیْبَۃٌ کے معنے معاشی بدحالی یا ناکامی کے ہوئے۔ اور (۹/۵۰) میں مُصِیْبَۃٌ کے مقابلہ میں حَسَنَۃٌ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے اسکے معنے ہوئے زندگی کی ناہمواریاں اور ناخوشگواریاں۔ سورۃ تغابن میں ہے مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (۶۴/۱۱) یعنے کائنات میں جو حوادث و واقعات ظہور میں آتے ہیں وہ سب خدا کے قانون کی رو سے رونما ہوتے ہیں۔ اس میں مُصِیْبَۃٌ کے معنے حادثہ یا واقعہ (Event) کے ہیں۔ (اذن بمعنی قانون کے لئے عنوان ا۔ ذ۔ ن دیکھئے)

سورۃ یوسف میں ہے نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ (۱۲/۵۶)۔ ہم اپنی رحمت اپنے قانون مشیت کے مطابق جسے چاہتے ہیں پہنچاتے ہیں۔ اس کے

* تاج۔ ** محیط۔

بعد وَلاَ نُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۲/۵۶) کہکر بات واضح کر دی کہ خدا کی یہ رحمت، حضرت یوسفؑ کی حسن کارانہ زندگی اور کردار کا نتیجہ تھی۔ البتہ نبوت، انسان کے کسی عمل کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ مُصِیْبٌ (اسم فاعل) واقع ہونے والا۔ پہنچنے والا۔ (۱۱/۸۱)۔

ص و ت

اَلصَّوْتُ۔ آواز (جمع اَصْوَاتٌ)۔ یہ لفظ انسان اور غیر انسان دونوں کی آواز کیلئے بولا جاتا ہے۔ اَلصَّائِتُ۔ چیخنے والا۔ رَجُلٌ صَاتٌ۔ سخت آواز والا آدمی *۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ جو کچھ منہ سے نکلے اگر وہ کسی حرف پر مشتمل نہ ہو تو اسے صَوْتٌ کہتے ہیں **۔ راغب نے کہا ہے کہ دو جسموں کے ٹکرانے سے دب جانے والی (منضغط) ہوا کو صَوْتٌ کہتے ہیں ***۔ (لیکن راغب کا مفہوم واضح نہیں)۔

قرآن کریم میں ابلیسی قوتوں کے لئے بھی صَوْتٌ کا لفظ آیا ہے (۱۷/۶۴)۔ اسکے معنے ہر قسم کا غلط پراپگنڈا ہوگا۔ انسان کی آواز کے لئے بھی (۳۱/۱۹) اور گدھے کی آواز کیلئے بھی (۳۱/۱۹) جہاں اسے اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ کہا گیا ہے، یہ لفظ آیا ہے۔

سورۃ حجرات میں ہے لاَ تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ (۴۹/۲)۔ اپنی آواز کو نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو۔ اگر اس میں صَوْتٌ کے حقیقی معنی لئے جائیں تو یہ حکم آداب معاشرت سے متعلق ہوگا۔ اور اگر مجازی معنی لئے جائیں تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ اپنے فیصلے کو رسولؐ کے فیصلے پر فائق نہ سمجھو۔ مشورہ میں رائے دو لیکن اطاعت اُس کے فیصلے کی کرو۔ (۳۳/۳۶ ؛ ۴/۶۵)۔

ص و ر

اَلصُّوْرَۃُ۔ شکل۔ ہیئت۔ کسی شے کی حقیقت۔ صفت۔ نوع۔ وہ خد و خال جس سے انسان کو پہچانا جائے اور دوسروں سے اس کا امتیاز کیا جائے ****۔ (۸۲/۸)۔ صَوَّرَ۔ صورت بنانا۔ (۳/۵)۔ اَلْمُصَوِّرُ۔ صورت بنانے والا۔ خدا کی صفت ہے (۵۹/۲۴)۔ کوئی شے، صورت (Form) کے بغیر محسوس و مرئی ہو نہیں سکتی۔ اسلئے اللہ تعالیٰ کے تخلیقی پروگرام میں مصوریت کا مقام وہ ہے جہاں غیر مرئی و غیر محسوس قوتوں کو ایک خاص ترتیب دیکر (خلق) محسوس و مرئی بنا دیا جائے۔

---

* تاج۔ ** محیط۔ *** راغب۔ **** تاج و راغب و محیط

صُوْرَةٌ ۔ کی جمع صُوَرٌ بھی آتی ہے اور صُوْرٌ بھی** ۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں نُفِخَ فِی الصُّوْرِ کا ذکر آیا ہے (مثلاً یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ۲۰/۱۰۲) ۔ تو اسکے معنے ہونگے جب صورتوں میں روح پھونکی جائے گی* ۔ جب اقوام کے مردہ پیکروں میں قانون خداوندی کے مطابق تازہ قوتیں پیدا ہو جائینگی ۔ جب انہیں (نظام خداوندی کی رو سے) حیات تازہ مل جائیگی ۔ اس دنیا میں حیات تازہ بھی اور مرنے کے بعد حیات نو بھی ۔ نیز صُوْرٌ اس نرسنگھے کو کہتے ہیں جو لڑائی کے وقت بجایا جاتا ہے* ۔ اور جس سے مراد اعلان جنگ ہوتا ہے ۔ ان معانی کے اعتبار سے جب نُفِخَ فِی الصُّوْرِ (۱۸/۹۹) کا تعلق اس دنیا کے حوادث سے ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب نظامِ خداوندی کے انقلاب کیلئے باطل کی قوتوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جائیگا ۔

صَارَ الشَّیْئَ یَصُوْرُہٗ ۔ کے معنے ہیں چیز کو مائل کر دینا ۔ ایک طرف جھکا دینا ۔ صَوِرَ یَصْوَرُ ۔ مائل ہونا ۔ صُرْتُ اِلَی الشَّیْئِ ۔ میں اس چیز کی طرف مائل ہوا ۔ صُرْ اِلَیَّ ۔ میری طرف متوجہ ہو ۔ اسی لئے عُصْفُوْرٌ صَوَّارٌ اس چڑیا کو کہتے ہیں جو بلانے والے کی آواز پر آجائے ۔ اور اَلصِّوَارُ گایوں کے گلہ کو کہتے ہیں (جو چرواہے کی آواز پر چلتا ہے) ۔ سورہ بقرہ میں حضرت ابراھیمؑ سے کہا گیا کہ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْکَ (۲/۲۶۰) ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ان پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کر لے ۔ اپنے سے ھلالے ۔ اپنی طرف ایسا مائل کرلے کہ وہ تیری آواز پر چلتے آئیں* ۔

ابن فارس نے ان تمام معنی کو لکھنے کے بعد کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی اسقدر ایک دوسرے سے مختلف ہیں کہ ان میں قیاس نہیں چلتا ۔

ص و ع

اَلصَّاعُ ۔ اَلصِّوَاعُ ۔ اَلصُّوَاعُ ۔ ایک پیمانہ ہے جس سے غلہ ناپا جاتا ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلصِّوَاعُ سے غلہ نہیں ناپا جاتا بلکہ یہ اس برتن کو کہتے ہیں جس سے پیا جاتا ہے* ۔ قرآن کریم میں صُوَاعَ الْمَلِکِ (۱۲/۷۲) آیا ہے ۔ یعنے شاہی پیمانہ جس سے پانی بھرنے کا کام بھی لیا جاتا تھا ۔ اس مادہ کے دوسرے بنیادی معنی پھٹ جانے اور جدا ہو جانے کے بھی ہیں (ابن فارس)

*تاج ۔ راغب و محیط ۔ ** ابن قتیبہ (القرطین ج/۱ صفحہ ۱۶۵)

ص و ف

اَلصُّوْفُ۔ اون۔ (جمع اَصْوَافٌ ۱۶/۸۰)۔ صُوْفٌ۔ بھیڑ کی اون کو کہتے ھیں۔ شَعْرٌ۔ بکری کی اون کو۔ اور وَبَرٌ۔ اونٹ کی اون کو*۔ سورۃ نحل (۱۶/۸۰) میں ان تینوں کا ذکر ھے۔ (بعض کے نزدیک اَلصُّوفِیُّ۔ صُوْفٌ۔ کی طرف منسوب ھے**۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ (صوفی) کہیں نہیں آیا۔ تصوف کا تصور ھی غیر قرآنی ھے اور دوسروں سے مستعار لیا گیا ھے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''سلیم کے نام خطوط''۔ جلد سوم)۔

ص و م

صَامَ۔ رک جانا۔ ٹھہرجانا، باز رھنا۔ کہتے ھیں۔ صَامَ عَنِ الْکَلاَمِ۔ بات کرنے سے رکا، خاموش رھا۔ صَامَ عَنِ النِّکَاحِ۔ نکاح سے باز رھا۔ صَامَ عَنِ السَّیْرِ۔ چلنے سے رکا۔ صَامَ الْمَاءُ۔ پانی کھڑا ھوگیا۔ مَصَامٌ کھڑے ھونے کی جگہ*۔

قرآن کریم میں صِیَامٌ کو فرض قرار دیا گیا ھے (۲/۱۸۳)۔ اس کے لئے بتا دیا کہ یہ صبح سے رات تک کھانے پینے اور جنسی اعمال سے مجتنب رھنے کا نام ھے (۲/۱۸۷)۔ یہ رمضان کے مہینے کے روزے ھیں جس میں قرآن کریم نازل ھونا شروع ھوا تھا (۲/۱۸۵)۔ جوشخص مقیم ھو۔ (سفر میں نہ ھو) اورتندرست ھو (مریض نہ ھو) اوراس کی طبعی حالت ایسی ھو کہ اسے روزہ رکھنے میں مشقت نہ اٹھانی پڑے (۲/۱۸۴) تو اس پر روزہ فرض ھے۔ مسافر سفر سے واپسی پر اور مریض شفایاب ھونے کے بعد گنتی کو پورا کرے (۲/۱۸۴) لیکن جو بمشقت روزہ رکھ سکتا ھو وہ اس کے بدلے کسی مسکین کو کھانا کھلا دے (۲/۱۸۴)۔

روزے درحقیقت جماعت مومنین کو جہاد کی مشقت انگیز زندگی کا خوگر بنانے کے لئے سالانہ عسکری ٹریننگ کے مرادف ھیں۔ ان کا مقصد قرآن کریم نے خود واضح کر دیا جہاں کہا کہ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (۲/۱۸۳) تاکہ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کے قابل ھو جاؤ۔ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدَاکُمْ (۲/۱۸۵) تاکہ تم قرآن کریم کی روشنی میں قوانین خداوندی کو انسانوں کے خود ساختہ قوانین و نظام ھائے حیات پر غالب کر سکو۔ وَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (۲/۱۸۵) تاکہ تمھاری کوششیں بھر پور نتائج پیدا کر سکیں۔

* تاج۔ ** محیط۔

صَائِمٌ (۳۳/۳۵) روزہ رکھنے والا یا اپنے آپ کو غلط راستوں سے روک لینے والا ۔ اپنے آپ پر کنٹرول (ضبط نفس) رکھنے والا ۔ حدود اللہ کے اندر رہنے والا ۔

ص ی ح

اَلصَّیْحَةُ ۔ پورے زور سے نکالی ہوئی سخت آواز ۔ صَاحَ ۔ یَصِیْحُ ۔ چیخنا ۔ اونچی آواز نکالنا ۔ صِیْحَ بِهِمْ ۔ ان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی ۔ صِیْحَ فِیْهِمْ ۔ وہ سب ہلاک ہو گئے ۔ اَلصَّیْحَةُ ۔ لوٹ مار جبکہ وہ کسی قبیلہ پر یکبارگی ڈال دی جائے*۔ راغب نے کہا ہے کہ صَیْحٌ دراصل آواز پھاڑنے کو کہتے ہیں ۔ اسی سے اِنْصَاحَ الْخَشَبُ اَوِالثَّوْبُ ۔ ہے ۔ یعنی لکڑی یا کپڑا پھٹا اور اس سے آواز نکلی** ۔ اَلصَّائِحَةُ ۔ نوحہ کی چیخ و پکار کو کہتے ہیں* ۔ قرآن کریم میں اَلصَّیْحَةُ کا لفظ عذاب کے لئے آیا ہے ، یا اس آواز کےلئے جو زلزلہ کے وقت آتی ہے ، یا کوہ آتش‌فشاں کے پھٹنے کے وقت آتی ہے ۔ چنانچہ سورۃ ہود میں اَلصَّیْحَةُ آیا ہے (۱۱/۹۴) ۔ اور اسی کو سورۃ اعراف میں اَلرَّجْفَةُ (۷/۷۸) کہا گیا ہے ۔ یعنی زلزلہ ۔ سورۃ یٰسٓ میں یہ لفظ ایسی تباہی اور عذاب کے لئے آیا ہے جو یک لخت آجائے (۳۶/۲۹) ۔ کیونکہ ایسے مواقع پر چیخ و پکار مچ جاتی ہے ۔

ص ی د

صَادَہٗ ۔ یَصِیْدُہٗ وَ یَصَادُہٗ ۔ اِصْطَادَہٗ ۔ کسی کو چال اورحیلہ یا جال کے ذریعہ پکڑ لینا ۔ شکار کر لینا ۔ اَلصَّیْدُ ۔ شکار کرنا ۔ نیز ہر وحشی جانور کو کہتے ہیں خواہ وہ شکار کر لیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو ۔ نیز شکار کئے ہوئے جانور کو بھی کہتے ہیں ***۔ قرآن کریم میں صَیْدُ الْبَحْرِ اور صَیْدُ الْبَرِّ (۵/۹۶) آیا ہے ۔ یمنی زبان میں اَلصَّیْدُ مچھلی کو کہتے ہیں*** ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ صَیْدٌ وہ چیزیں ہیں جو اپنی آپ حفاظت کریں اور ان کا کوئی مالک نہ ہو ۔ راغب نے کہا ہے کہ صَیْدٌ ان حیوانات کے پکڑنے کو کہتے ہیں جو اپنی حفاظت کریں اور کسی کی ملکیت نہ ہوں***۔ صِدْنَا مَاءَ السَّمَاءِ ۔ ہم نے بارش کا پانی لے لیا*** ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا بغیر ادھر اُدھر التفات کئے اپنی مرضی سے سیدھے چلے جانا ۔ شکار کو بھی صَیْدٌ

*تاج ۔ **راغب ۔ *** تاج و محیط

اس لئے کہتے ہیں کہ وہ جانور ادھر اُدھر نہیں دیکھتا ۔ سیدھا بھاگتا چلا جاتا ہے ۔

ص ی ر

صَارَ ۔ کسی شے کا کسی خاص حالت تک پہنچ جانا ۔ یا کسی خاص مقام تک پہنچ جانا ۔ کسی شے کا ایک متعین شکل اختیار کر لینا ۔ اَلْمَصِیْرُ وہ مقام جہاں سب اطراف کے پانی آکر مل جائیں* ۔ جمع ہونے کی جگہ* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مآل اور مرجع کے ہیں ۔ یعنی لوٹنا اور انجام پذیر ہونا ۔ اَلصِّیْرُ ۔ منتہائے امر ۔ انجام ۔ مآل ۔ اَلصَّیُّوْرُ ۔ آخر شے ۔ منتہائے شے ۔ کسی چیز کا انجام ، مرجع و مآل ۔ یہی معنی اَلْمَصِیْرُ کے بھی ہیں ۔ مَصِیْرُ الْاَمْرِ ۔ معاملہ کا انجام ۔ آخری مقام ۔ اسی سے صَارَہٗ ۔ یَصِیْرُہٗ ۔ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو قطع کر دینا* ۔

راغب نے کہا ہے کہ صَارَ سے مراد ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونا ہے ۔ اسی سے المَصِیْرُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز انتقال و حرکت کے بعد پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے** ۔

قرآن کریم میں اِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ (۳/۲۷) متعدد مقامات پر آیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شرف انسانیت کی تکمیل صرف اس راستے پر چلنے سے ہوسکتی ہے جو خدا کی طرف جانے والا ہے ۔ انسان کی آخری منزل ، منتہائے سفر، یہ ہے کہ وہ صفات خداوندی کے رنگ میں رنگ جائے ۔ اسی میں اس کی تکمیل کا راز ہے ۔ اس مقام اور منزل کے علاوہ ، اور جو مقام اور حالت ہے وہ بِئْسَ الْمَصِیْرُ (۲/۱۲۶) نہایت بری منزل اور بڑی خراب حالت ہے ۔ اسی کو جہنم کہا گیا ہے ۔ یعنی اگر انسانی زندگی کا مآل اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو وہ کیفیت جہنمی ہے ۔ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرکے صفات خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرتے چلے جانا ، اور اس طرح اپنی تکمیل ذات کر لینا ، یہ ہے اِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ ۔ اس کے متعلق سورۃ شوریٰ میں ہے اِلَی اللّٰہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ (۴۲/۵۳)۔ تمام معاملات کا مآل بالآخر قانون خداوندی کے مطابق ہوتا ہے ۔ اہل جنت کے متعلق ہے کَانَتْ لَهُمْ جَزَاءً وَّ مَصِیْرًا (۲۵/۱۵)۔ جنت انکے اعمال کی جزا اور وہ مقام ہے جہاں ان کی ذات کی تکمیل ہوگی ۔ اور یہی انسانی تگ و تاز کا منتہیٰ ہے ۔

* تاج و محیط ۔ **راغب ۔

ص ی ص

الصِّیْصَۃُ وَ الصِّیْصِیَۃُ۔ گائے اور ہرن کا سینگ (جس سے وہ اپنی حفاظت کرتے ھیں)۔ اس سے ہر اس چیز کو صِیْصِیَۃٌ کہتے ھیں جس کے ذریعہ انسان اپنے آپ کو محفوظ کرے ۔ مثلاً حفاظت گاہ ، قلعہ ۔ اس کی جمع اَلصَّیَاصِی آتی ھے*۔ قرآن کریم میں ھے مِنْ صَیَاصِیْھِمْ (۳۳/۲۶) ۔ یعنی ان کے قلعوں سے جن میں وہ محفوظ ھو گئے ھیں ۔

ص ی ف

اَلصَّیْفُ ۔ گرمی کا موسم*۔ (یہ شِتَآءٌ یعنی سردی کے بالمقابل ھے)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "ش ۔ ت ۔ و" ۔ قرآن کریم میں رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیْفِ (۱۰۶/۲) آیا ھے ۔ یعنی قریش کے سردی اور گرمی کے زمانے کے سفر ۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ھیں ۔ (۱) زمانہ اور موسم (گرما) ۔ اور (۲) جھکنا اور ھٹ جانا ۔ صَافَ عَنِ الْھَدَفِ کے معنی ھیں تیر نشانہ سے ایک طرف ھٹ گیا ۔ یَوْمٌ صَائِفٌ ۔ گرم دن ۔

---

*تاج و راغب ۔

ض

ض أ ن

ضَائِنٌ (جمع ضَأْنٌ) - بھیڑ (۶/۱۴۴)۔ ضعیف اور کمزور کو بھی ضَائِن کہتے ھیں*۔ جیسے بُز دل ، (بکری جیسے دل والا) ڈرپوک کو کہتے ھیں -

ض ب ح

ضَبَحَتِ الْخَيْلُ ضَبْحًا ۔ تیزی سے بھاگنے والے گھوڑے ھانپے - ابو عبیدہ نے کہا ھے کہ ضَبْحٌ اور ضَبْعٌ گھوڑے کا اپنے بازوؤں کو پوری طرح پھیلا کر دوڑنے کو کہتے ھیں، حتکہ ایسا محسوس ھو کہ اس کی ٹانگیں اس کے جسم کی سیدھ میں آ گئی ھیں ۔ سرپٹ دوڑنا ۔ لیکن سھیلی نے کہا ھے کہ ضَبْحٌ گھوڑے یا اونٹ کے تھکنے کے بعد ھانپنے کی آواز کو کہتے ھیں**۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی دو ھیں (۱) آواز اور (۲) آگ کے اثر سے رنگ کا بدل جانا ۔ نیز یہ بھی کہ یہ دراصل ضَبَعَ تھا (جس کے معنی اوپر دئیے جاچکے ھیں)۔ قرآن کریم میں ھے وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا (۱۰۰/۱) ۔ اس سے تیز رفتار گھوڑے مراد ھیں جو میدان جنگ میں دشمن کے مقابلہ کے لئے نکلیں -

ض ج ع

ضَجَعَ وَاضْطَجَعَ ۔ اس نے اپنا پہلو زمین پر رکھ دیا (لیٹ گیا)۔ اَلْمَضْطَجَعُ ۔ پہلو رکھنے یا لیٹنے کی جگہ* ۔ یہی معنے اَلْمَضْجَعُ کے بھی ھیں ۔ اس کی جمع اَلْمَضَاجِعُ ھے (۴/۳۴) ۔ سورۃ آل عمران میں مَضَاجِعِهِمْ (۳/۱۵۴) سے مراد ان کی قتل گاھیں ھے ۔ یعنے وہ مقام جہاں قتل

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔

کر کے لٹا دیا جائے۔ اَلْمُضَاجَعَۃُ سے مراد مجامعت بھی ہوتی ہے*۔ یعنے هم بستر ہونا۔ سورۃ نساء میں جہاں وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ آیا ہے (۴/۳۴) تو اس سے مراد زنا شوئی کے تعلقات منقطع کرنا ہے۔

ض ح ک

ضَحِکَ۔ یَضْحَکُ۔ ضَحِکًا۔ خوشی کی وجہ سے چہرہ کا انبساط، اور دانتوں کا کھل جانا۔ ہنسنا۔ ضَحِکٌ (ہنسی)، کا پہلا درجہ تبسم ہوتا ہے۔ ضَحِکَ کے معنے تعجب کرنے یا تعجب سے ہنسنے کے بھی ہیں*۔ ضَحِکَ الرَّجُلُ۔ اس آدمی کو تعجب ہوا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھلنے اور ظاہر ہونے کے ہیں۔

سورۃ توبہ میں ہے فَلْیَضْحَکُوْا قَلِیْلًا (۹/۸۲) انہیں چاہئے کہ تھوڑا ہنسیں۔ تھوڑی خوشیاں منائیں۔ اس کے مقابل وَلْیَبْکُوْا کَثِیْرًا (۹/۸۲) ہے۔ یعنی بہت زیادہ روئیں۔ ضَاحِکًا (۲۷/۱۹) خوش ہو کر۔ سورۃ تطفیف میں ہے کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ (۸۳/۲۹)۔ وہ ایمان والوں پر ہنسا کرتے تھے۔ اِمْرَاَۃٌ ضَاحِکٌ۔ وہ عورت جسے حیض آ رہا ہو**۔ سورۃ ھود میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کی عمر رسیدہ بیوی کو لڑکے کی بشارت ملی فَضَحِکَتْ (۱۱/۷۱)۔ بعض نے اس کے معنے یہ کئے ہیں کہ انہیں حیض جاری ہوگیا* اور اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ ان میں ہنوز اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ لیکن راغب نے لکھا ہے کہ جس مفسر نے ضَحِکَتْ کے معنے حَاضَتْ (حائضہ ہوگئی) کئے ہیں تو یہ اس لفظ کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس سے حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کی حالت کا بیان مقصود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی از رہ تعجب ہنسی تھیں، جس کی تائید اس سے اگلی آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے۔ اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ*** (۱۱/۷۳)۔ ان لوگوں کا حیض کی طرف (غالباً) اس لئے خیال گیا ہے کہ انہی حالات میں جب حضرت زکریاؑ کو بیٹے کی خوشخبری دی گئی تو وہاں آیا ہے وَاَصْلَحْنَا لَہٗ زَوْجَہٗ (۲۱/۹۰)۔ ہم نے اس کے لئے اسکی بیوی کو درست کر دیا۔ جو نقص تھا اسے رفع کردیا۔ اور بیشتر یہ نقص حیض کا رک جانا ہی ہوتا ہے، اس لئے ایسے موقع پر جو لفظ بھی آیا اس سے مفہوم حیض جاری ہونا لے لیا گیا۔ یہ صحیح نہیں۔

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

ض ح و (ی)

اَلضَّحْوُ ۔ اَلضَّحْوَۃُ ۔ اَلضَّحِیَّۃُ ۔ اَلضُّحیٰ ۔ دن چڑھے کا وقت ، طلوع آفتاب کے بعد کا وقت ۔ بعض کا قول ہے کہ اَلضُّحیٰ طلوع آفتاب سے لیکر دن چڑھنے تک کے وقفہ کو کہتے ہیں* ۔ راغب نے کہا ہے کہ الضُّحیٰ دھوپ کے پھیل جانے اور دن کے چڑھ جانے کو کہتے ہیں* ۔ نیز اس وقت کو بھی ضُحیٰ کہتے ہیں ۔ اَلضَّحَاءُ ۔ نصف النہار سے پہلے پہلے کا وقت ۔ یا جب سورج طلوع کے بعد رُبعِ سماء پر ہو ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنے دن چڑھے کا وقت ہیں جب دھوپ کھل جائے اور ہر چیز واضح ہو جائے ۔ وَ اَخْرَجَ ضُحٰھَا (۷۹/۲۹) ۔ ''اور اس کی روشنی نکالی'' ۔ دن کو روشن کیا ۔ ضَحِیَ ۔ دھوپ لگنا ، دھوپ کے سامنے آنا ، دھوپ سے تکلیف اٹھانا ۔ وَ لَا تَضْحٰی (۲۰/۱۱۹) ۔ ''نہ دھوپ کی تکلیف اٹھائیگا'' ۔ فَعَلَہٗ ضَاحِیَۃً ۔ اس نے اسے کھلم کھلا کیا ۔ ضَحَا الطَّرِیْقُ ضُحُوًّا ۔ راستہ واضح اور ظاہر ہو گیا* ۔

لَیْلَۃٌ ضَحْیَاءُ ۔ روشن رات جس میں بادل نہ ہوں یا جس میں شروع سے آخر تک چاندنی رہے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ظاہر اور واضح ہونے کے ہیں ۔

ض د د

اَلضِّدُّ ۔ ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کے برعکس ہو ۔ یعنی جو دونوں بیک وقت ایک ہی جگہ میں اکٹھی نہ ہو سکیں ۔ جیسے سیاہی اور سفیدی ۔ موت اور حیات ۔ بعض کے نزدیک ضِدٌّ ایک دوسرے کی ٹکر کی چیزوں کو بھی کہتے ہیں ۔ اَلضِّدُّ ۔ مخالف ۔ اَلْقَوْمُ عَلَیْہِ ضِدٌّ وَّاحِدٌ ۔ لوگ اسکے خلاف متفق ہو کر جمع ہو گئے ۔ ھُمَا مُتَضَادَّانِ ۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہیں** ۔

سورۃ مریم میں ہے وَ یَکُوْنُوْنَ عَلَیْھِمْ ضِدًّا (۱۹/۸۲) ۔ وہ ان کے مخالف ہونگے ۔

ض ر ب

ضَرْبٌ کے بہت سے معانی آتے ہیں جن میں سے مشہور معنی مارنے کے ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ڈھالنے کے بھی ہیں ۔ اسی اعتبار

*تاج ۔ **تاج و محیط و راغب ۔

سے اَلضَّرْبُ اور اَلضَّرِیْبُ - مثل اور مشابہ کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں ایک بات دوسری بات کے قالب میں ڈھالی جاتی ہے۔ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا (۳۶/۱۳) کے معنے ہیں انکے لئے ایک مثال بیان کرو۔ یعنی اس بات کو مثال دیکر واضح کرو۔ اور يَضْرِبُ اللهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ (۱۳/۱۷) کے معنے بھی یہی ہیں ۔ یعنی خدا حق اور باطل کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتا ہے ۔ اگرچہ اس کے معنی باہمی ٹکرانے کے بھی ہو سکتے ہیں ۔ ضَرَبَ الطَّيْرُ ۔ پرند تلاش رزق میں کہیں چلے گئے ۔ ضَرَبَ فِي الْاَرْضِ ۔ اُس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص تلاش معاش میں سفر پر چلا جائے* ۔ اَضْرَبَ الرَّجُلُ فِي الْبَيْتِ کے معنے ہیں اس شخص نے گھر میں قیام کیا ۔ ضَرَبَ عَنِ الشَّيْئِ کے معنے ہیں وہ اس شے سے باز رہا ۔ اعراض کیا ۔ یہی اَضْرَبَ عَنْهُ کے معنی بھی ہیں، نیز ضَرَبَ عَنْهُ الذِّكْرَ وَاَضْرَبَ عَنْهُ کے، یعنی اس سے ذکر کو پھیر دیا ، ہٹا دیا ، روک دیا ۔ (اسی سے جدید لغت میں اِضْرَاب کے معنی ہیں اسٹرائک کرنا) ضَرَبْنَا عَلَى اٰذَانِهِمْ ۔ ہم نے انہیں آواز سننے سے روک دیا ۔ ضَرَبَ اِلَيْهِ ۔ وہ اسکی طرف مائل ہوا ۔ اِضْطَرَبَ کے معنی ہیں کسی چیز کے ایک حصہ کا دوسرے حصہ کے ساتھ ٹکرانا ۔ نیز اسکے معنے کمانے اور حاصل کرنے کے بھی آتے ہیں۔ اِضْطَرَبَ اَمْرُهٗ کے معنے ہیں اس کا کام خراب ہو گیا* ۔ مُضْطَرِبٌ ۔ متحرک کو کہتے ہیں* ۔ سورۃ انفال میں ہے فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ (۸/۱۲) ۔ اسکے معنے مارنے کے ہیں ، اور ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (۲/۶۱) کے معنے ذلت وخواری کی مار مارنے کے ہیں ۔ سورۃ نساء میں ہے اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ (۴/۱۰۱) ۔ اسکے معنے سفر کرنے کے ہیں ۔ سورۃ نحل میں ہے وَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ (۱۶/۷۴) ۔ اللہ کی مثل اور مانند کسی کو قرار نہ دو ۔ اس کی ذات کے متعلق اپنے ذہن میں تصورات پیدا نہ کرو کہ وہ ایسا ہے اور ویسا ہے ۔

ضَرَبَ عَنْهُ ۔ روک لینا ۔ بند کرنا ۔ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ (۴۳/۵) ۔ کیا ہم اس ضابطہ ہدایت کو تم سے روک لینگے ؟ کیا ہم قرآن کریم کے قوانین (مکافات عمل) کو تم پر لاگو (نافذ) نہیں کرینگے اور تمہیں کھلی چھٹی دیدینگے کہ تم جو جی میں آئے کرتے رہو اور جس روش پر جی چاہے چلتے رہو ! ایسا نہیں ہوگا۔

---

* تاج ۔ محیط ۔ لین ۔

ضَرَبَ مَثَلاً کے معنے ہیں مثال کے ذریعہ بات کو واضح کرنا ۔ لیکن بعض مقامات پر صرف ضَرَبَ کے بھی یہی معنے آتے ہیں ۔ مثلاً کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ (۱۳/۱۷) ۔ اسطرح اللہ حق و باطل کی وضاحت کرتا ہے ۔ یا بات کو سمجھاتا ہے ۔ اگرچہ (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) اس کے معنی حق و باطل کی کشمکش کے بھی ہیں ۔ اسی طرح سورۃ زخرف میں ہے مَا ضَرَبُوْہُ لَکَ اِلَّا جَدَلاً (۴۳/۵۸) ۔ یہ لوگ تجھے بات نہیں سمجھاتے (مثال پیش نہیں کرتے) بلکہ محض جھگڑا کرتے ہیں ۔ اسی سے (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ) سورۃ نساء میں جو عورتوں کے متعلق ہے کہ وَاضْرِبُوْھُنَّ (۴/۳۴) تو اسکے معنے ہیں مختلف طریقوں سے مثالیں دیکر انہیں سمجھاؤ ۔ یعنی وَاضْرِبُوْا لَھُنَّ مَثَلاً ۔ لیکن یہ معنے اس لئے کمزور ہیں کہ سمجھانے کے لئے اس سے پہلے فَعِظُوْھُنَّ آچکا ہے ۔ لہذا فَاضْرِبُوْھُنَّ سے مراد وہ بدنی سزا (Corporal Punishment) ہے جو عدالت کیطرف سے بعض جرائم کی سزا میں دی جاتی ہے ۔ عورتوں کا بلاعذر اپنے فطری وظائف زندگی (اولاد پیدا کرنے) سے سرکشی برتنا اور مرد بننے کی خواہش کرنا (جیسا کہ یورپ میں ہو رہا ہے) ایک معاشرتی جرم ہے جس کا بذریعہ عدالت روکا جانا ضروری ہے ۔

سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ہے فَاضْرِبْ لَھُمْ طَرِیْقاً فِی الْبَحْرِ یَبَساً (۲۰/۷۷) ۔ انہیں سمندر میں خشک راستے سے لے جا ۔ اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اِضْرِبْ بِعَصَاکَ الْبَحْرَ (۲۶/۶۳) ۔ (نیز ۴۴/۲۴) ۔ اپنی جماعت (عَصَا ۔ دیکھئے عنوان ع ۔ ص ۔ و) کو سمندر سے پار لے جا ۔ یا، تو عصا ٹیکتا ہوا پایاب چلے جا ۔ اسی طرح دوسری جگہ ہے اِضْرِبْ بِعَصَاکَ الْحَجَرَ (۲/۶۰ ؛ ۷/۱۶۰) جس کے معنے یا تو یہ ہیں کہ اپنی جماعت کو پہاڑ کیطرف لے جا ۔ وہاں انہیں پانی کے چشمے مل جائینگے ۔ اور یا یہ کہ اپنے عصا کو چٹان پر مار، اس سے مٹی اور پتھر وغیرہ میں شگاف ہوجائیگا اور اندر کا پانی باہر نکل آئیگا ۔

ض ر ر

ضَرَّ ۔ یَضُرُّ ۔ نقصان پہنچانا ۔ اَلضَّرُّ ۔ اَلضُّرُّ ۔ نقصان ۔ اَلضَّرُّ ۔ عام طور پر مالی نقصان یا خارجی مصیبت کو کہتے ہیں اور اَلضُّرُّ ۔ اس مصیبت یا بدحالی کو کہتے ہیں جو انسان کی ذات سے متعلق ہو ۔ اَلضَّرَّاءُ ۔ قحط ۔ نقصان کی شدت ۔ بدحالی ۔ اَلضُّرُّ ۔ لاغری ۔ معذوری ۔ اَلضَّرَّاءُ ۔ معذور ہونا ۔

لنگڑا ہونا ۔ نیز اس کے معنی تنگی ۔ سختی ۔ بدحالی کے بھی ہیں ۔ اَلضَّرِیْرُ ۔ نابینا ۔ مریض ۔ لاغر ۔ مصیبت زدہ* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلضَّرِیْرُ ۔ قوت نفس اور صبر کو کہتے ہیں ۔

اَلضَّرَرُ ۔ تنگی ۔ اَلضَّرُوْرَۃُ ۔ حاجت ۔ اَلْاِضْطِرَارُ ۔ شدت احتیاج سے مجبور ہونا* ۔ اَلضَّرَّتَانِ ۔ چکی کے دونوں پاٹ ۔ ایک مرد کی دو بیویاں* ۔ اَلْاِضْرَارُ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی (یعنی اس کی سوت) لانا ۔ تَزَوَّجْتُ الْمَرْأَۃَ عَلٰی ضِرٍّ ۔ میں نے اس عورت سے پہلی بیوی کی موجودگی میں شادی کی ۔ اس سے ظاہر ہے کہ خود عربوں کو بھی ایک سے زیادہ بیویوں کی مضرت رسانی کا احساس تھا ۔

اَلْمُضِرُّ ۔ قریب ہونے والا* ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ نَفْعٌ کے مقابلہ میں ($\frac{2}{102}$) میں آیا ہے ۔ خَیْرٌ کے مقابلہ میں ($\frac{6}{17}$) میں اور نِعْمَتٌ کے مقابلہ میں ($\frac{16}{53}$) میں ۔ جسمانی تکلیف کے لئے ($\frac{21}{83}$) میں ۔ اُضْطُرَّ ($\frac{2}{173}$) میں ۔ جس کے معنے اضطراری حالت میں پہنچنے کے ہیں ۔ سورۃ بقرہ میں ہے ۔ وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ ($\frac{2}{282}$) ۔ کاتب کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے ۔ (اس باب کا خاصہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کا ہے ۔ اس لئے اس سے مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نہ تم میں سے کوئی اس کاتب (اور گواہ) کو تکلیف پہنچائے اور نہ ہی وہ کاتب (اور گواہ) تمہارے لئے کسی تکلیف کا باعث بنیں) ۔ سورۃ نساء میں ہے غَیْرَ اُولِی الضَّرَرِ ($\frac{4}{95}$) جنہیں کوئی جسمانی تکلیف (بیماری) نہ ہو ۔ سورۃ توبہ میں ضِرَارًا آیا ہے ($\frac{9}{107}$) ۔ یعنی باہم نقصان پہنچانے کی خاطر ۔ یہ نقصان اجتماعی ہے ۔ سورۃ نساء میں ہے غَیْرَ مُضَآرٍّ ($\frac{4}{12}$) جو ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانے والا نہ ہو ۔

سورۃ بقرہ میں ہے ثُمَّ اَضْطَرُّہٗٓ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ ($\frac{2}{126}$) میں انہیں بے بس کرکے جہنم کے عذاب کی طرف لیجاؤنگا ۔ دوسری جگہ ہے فَمَنِ اضْطُرَّ ($\frac{2}{173}$) ۔ جو مجبور ہوجائے ۔ مُضْطَرٌّ ($\frac{27}{62}$) بے بس مجبور ۔

ض ر ع

اَلضَّرْعُ ۔ گائے بکری وغیرہ کا تھن ۔ (اونٹنی کے تھن کو خِلْفٌ کہتے ہیں)** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نرمی کے ہیں

*تاج و محیط ۔ **تاج

اور تھن کو ضَرْعٌ اس کی نرمی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ ضَرَعَ الْبَهْمُ کے معنے ہیں چوپاؤں کے بچوں نے اپنی ماں کے تھن کو منہ میں لے لیا**۔ اس سے تَضَرُّع اِلَی اللّٰہِ کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنی اپنی نشو و نما کے لئے ربوبیت کے حقیقی سرچشمہ کی طرف رجوع کرنا۔ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَ خُفْيَةً (۷/۵۵)۔ یعنے اپنی نشو و نما کے لئے خدا کے قانون ربوبیت کی طرف رجوع کرو (اس کی مزید تشریح کے لئے ع۔ و۔ ذ کے عنوان میں تَعَوُّذَ بھی دیکھئے)۔ اس سے آگے ہے اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (۷/۵۵)۔ وہ حدود فراموش کرنے والے سرکشوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ تَضَرُّعًا کے اندر اطاعت خداوندی کا بنیادی تصور شامل ہے۔ سورۂ انعام میں ہے لَوْلَا اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا (۶/۴۳) جب ان پر (ان کے اعمال کی وجہ سے) ہمارے قانون مکافات کے مطابق سختی آئی تو انہوں نے اس وقت ہمارے قانون کی اطاعت کیوں نہ اختیار کرلی۔

اَلضَّرِيْعُ۔ حجاز میں کانٹوں والا پودا ہوتا ہے۔ چوپائے اس کے پاس نہیں پھٹکتے۔ اگر اسے کھا لیتے ہیں تو اس سے کمزور ہو جاتے ہیں۔ یا ایک قسم کی بد بودار گھاس کو کہتے ہیں جو ٹھہرے ہوئے پانی میں پیدا ہوتی ہے اور مویشی اسے نہیں کھاتے*۔ بعض اوقات سمندر اس قسم کے گھاس کو باہر پھینک دیتا ہے اور جو مویشی اسے کھاتا ہے وہ لاغر اور کمزور ہو جاتا ہے**۔ سورۃ غاشیہ میں اہل جہنم کی غذا کو ضَرِيْعٌ کہا گیا ہے (۸۸/۶)۔ یعنے دوسروں کے ردی سمجھکر پھینکے ہوئے ٹکڑے جن سے نشو و نما ہونے کی بجائے انسانی صلاحیتیں اور بھی پژمردہ ہوجائیں۔ محکوم اور کمزور اقوام کو اسی طرح کی غذا ملتی ہے۔ (نشو و نما رک جانے کے اعتبار سے لفظ جَحِيْمٌ عنوان ج۔ ح۔ م میں دیکھئے)۔

کمزوری اور لاغری کے اعتبار سے اَلضَّارِعُ وَ الضَّرِعُ۔ ہر نحیف اور کمزور چیز کو کہتے ہیں*۔ ضَرِعَ لَهٗ وَ ضَرَعَ۔ اس سے کچھ مانگا اور مانگنے کے ساتھ اپنے عجز و تذلل کا اظہار کیا۔ اَلضُّرُوْعُ۔ لاغر ہونا۔ مَا لَهٗ زَرْعٌ وَلَا ضَرْعٌ۔ اس کے پاس کچھ نہیں*۔ اَضْرَعَ لِفُلَانٍ مَالًا کے معنے ہیں اس کے لئے مال خرچ کیا***۔

بہر حال، انسان کا خدا کی طرف تَضَرُّعًا جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی نشو و نما کے لئے خدا کے قانون ربوبیت کی طرف رجوع کرے اور

*تاج۔ **لین۔ ***محیط۔

دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ اس کے قوانین کی اطاعت کرے ۔ اگر ایسا نہ کریگا تو اسے ضَرِیْع کھانے کو ملیگا۔ یعنی وہ ذلت کی روٹی جس سے شرف انسانیت کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں ۔

ض ع ف

اَلضَّعْفُ ۔ اَلضُّعْفُ ۔ اَلضَّعَفُ ۔ کمزوری* ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ ضَعْفٌ ۔ رائے کی کمزوری کو کہتے ہیں اور ضُعْفٌ ۔ بدن کی کمزوری کو** ۔ سورۃ الروم میں قُوَّۃٌ کے مقابلہ میں ضُعْفٌ آیا ہے (۳۰/۵۴) ۔ اور سورۃ انفال میں فوجی کمزوری کے لئے ضَعْفٌ (۸/۶۶) ۔ سورۃ ابراھیم میں مُسْتَكْبِرِیْنَ کے مقابلہ میں ضُعَفَاءُ آیا ہے (۱۴/۲۱)۔ ضِعَافٌ (جس کا واحد ضَعِیْفٌ ہے) ۔ کمزور (۴/۹) ۔ ضَعِیْفٌ (جمع ضُعَفَاءُ اور ضِعَافٌ) کمزور (۴/۲۸) اس مقام پر یہ لفظ جذبات سے مغلوب ہو جانے کے معنوں میں آیا ہے ۔ اِسْتَضْعَفَہٗ ۔ اسے کمزور سمجھا ۔ حقیر جانا ۔(۷/۱۵۰)۔ مُسْتَضْعَفٌ ۔ جسے کمزور سمجھا جائے (۴/۷۵) ۔ ظاہر ہے جسے کمزور خیال کیا جاتا ہے اس کے حقوق بھی غصب کئے جاتے ہیں اور اس کی کمزوری سے ناجائز فائدے بھی اٹھائے جاتے ہیں ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں (۱) کمزوری اور (۲) کسی چیز کو دگنا کردینا۔ اس اعتبار سے ضِعْفٌ (جمع اَضْعَافٌ) کے معنی ہیں کسی چیز کے مانند اور اس کا مثل۔ برابر کا حصہ ۔ اتنا ہی اور۔ اس طرح دگنا ہو جانا ۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد صرف دگنا نہیں بلکہ دگنے سے زیادہ تگنا چوگنا ۔ نیز غیر محدود طور پر زیادہ ہونے کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے* ۔ چنانچہ سورۃ بقرۃ میں ہے فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً (۲/۲۴۵) ۔ اس کے معنے کئی گنا ہیں ۔ سورۃ اعراف میں ضِعْفٌ دگنے کے معنوں میں آیا ہے (۷/۳۸) ۔ ضِعْفَیْنِ ۔ دو چند (۲/۲۶۵) ۔

سورۃ آل عمران میں ہے ۔ لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً (۳/۱۲۹) ۔ اس کے عام معنے کئے جاتے ہیں بڑھا بڑھا کر سود (در سود) نہ کھاؤ ۔ لیکن راغب کا کہنا ہے کہ مُضَاعَفَۃً دراصل ضَعْفٌ سے ہے ۔ ضِعْفٌ سے نہیں ۔ اس لئے آیت کے معنے یہ ہیں کہ رِبٰو، جسے تم سمجھ رہے ہو کہ وہ اپنے روپیے کو بڑھاتا ہے ۔ بڑھاتا نہیں بلکہ درحقیقت ضَعْفٌ (یعنی) کم کرتا ہے*** ۔ سود سے معاشرہ کی دولت کم ہوتی ہے اور سود خوار

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

کی انسانی صلاحیتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے ۔ ربٰو سے قومی دولت گھٹتی ہے اور کمزوریوں پر کمزوریاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں ۔

ض غ ث

ضَغَثَ الْحَدِیْثَ ۔ بات کو خلط ملط کر دینا ۔ مجازاً الضِّغْثُ کسی چیز کے اجزاء کے باہمدگر ملتبس اور گڈ مڈ ہونے کے لئے بولا جاتا ہے ۔ اصل میں ضَغَثَ السَّنَامَ ۔ اس وقت بولتے ہیں جب اونٹنی کے متعلق واضح نہ ہو کہ وہ کمزور ہے یا موٹی اور اس کے کوہان کو مٹھی بھر کر دیکھا جائے کہ اس میں چربی ہے یا نہیں ۔ اس لئے ، غیرواضح اور ملتبس بات کو کَلَامٌ ضِغْثٌ کہتے ہیں* ۔ (جمع اَضْغَاثٌ) ۔ قرآن کریم میں اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ (۱۲/۴۴) آیا ہے ۔ یعنے ایسے خواب جن کا مطلب واضح نہ ہو ۔ پریشان خواب ۔

ضِغْثٌ ۔ اتنی گھاس، گلدستہ یا شاخیں جو آدمی کی مٹھی میں آ جائیں ۔ مٹھی بھر چیز* ۔ سورۃ صٓ میں حضرت ایوبؑ کے تذکرہ میں ہے خُذْ بِیَدِکَ ضِغْثًا (۳۸/۴۴) مٹھی بھر گھاس لے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلضِّغْثُ ۔ تنکوں یا شاخوں کے مٹھے کو کہتے ہیں ۔ طب قدیم میں ، (اور آجکل بھی) کئی جسمانی تکالیف کا علاج جڑی بوٹیوں اور درختوں کے پتوں سے کیا جاتا ہے ۔ لسان العرب میں ہے کہ اس کے معنے تھوڑی سی متاع دنیا بھی ہے ۔ یونہی مٹھی بھر ۔

ض غ ن

اَلضِّغْنُ** ۔ شدید کینہ ۔ سخت عداوت ۔ انتہائی بغض ۔ ضَغَنَ عَلَیْہِ ۔ اس نے اس سے شدید بغض رکھا ۔ سخت کینہ رکھا ۔ فَرَسٌ ضَاغِنٌ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو بغیر مار کھائے اپنی چال ہی نہ نکالے ۔ اِضْطَغَنَہٗ ۔ اس نے اس چیز کو بغل کے نیچے دبا لیا ۔ یا گود میں لے لیا* ۔

قرآن کریم میں ہے یُخْرِجَ اللّٰہُ اَضْغَانَھُمْ (۴۷/۲۹ ; ۴۷/۳۷)[1] اللہ ان کے کینوں کو باہر نکالیگا ۔ یا جو کچھ بغل کے نیچے دبائے ہوئے ہیں اُسے باہر نکالیگا ۔ یعنی ان کی مخالفانہ سازشیں اور پوشیدہ ارادے طشت از بام کردیگا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کجی یا ٹیڑھ پن کے ساتھ کسی چیز کو ڈھانپ دینا ہوتے ہیں ۔ چنانچہ قَنَاۃٌ ضَغِنَۃٌ ۔ ٹیڑھے نیزے کو کہتے ہیں ۔ ٹیڑھ پن اور ڈھانپے ہوئے (مستور) ہونے کی جہت سے اَلضِّغْنُ ۔ کینہ اور عداوت کو کہتے ہیں ۔

---

* تاج ۔ راغب ۔ محیط ۔ ** اَلضِّغْنُ کے معنی گود اور اونٹ کی بغل کے بھی ہیں ۔ نیز شوق اور میلان کے بھی ۔

[1] ۴۷/۳۷ میں یُخْرِجْ اَضْغَانَکُمْ ہے ۔

ض ف د ع

اَلضِّفْدَعُ ۔ اَلضِّفْدَعُ ۔ (جمع ضَفَادِعُ ۷:۱۳۳)۔ مینڈک * ۔

ض ل ل

اَلضَّلَالَةُ ۔ حیرت ۔ متحیر ہونا ۔ سرگردان پھرنا ۔ (Perplexed; Confused)
کسی چیز کا پوشیدہ اور غائب ہونا ، مختلف چیزوں کا اسطرح مل جانا کہ پھرانہیں الگ الگ نہ کیا جا سکے ۔ مثلاً ضَلَّ الْمَاءُ فِی اللَّبَنِ ۔ پانی دودھ میں گھل مل کر غائب ہو گیا ۔ دلیل نہ سوجھنے، نیز کسی بات کے بھول جانے اور حافظہ سے گم ہو جانے کے لئے بھی یہ فعل بولا جاتا ہے **۔
ضَلَالَةٌ ۔ سیدھی راہ سے ہٹ جانا ۔ (عمداً ہو یا سہواً ۔ تھوڑا ہو یا بہت)۔
چونکہ صحرا میں راستہ کھو جانے والا اپنی تمام تگ و دو کے باوجود منزل کے قریب نہیں ہونے پاتا اس لئے کوشش کے ناکام و نامراد رہ جانے کو ضَلَّ سَعْیُہٗ کہتے ہیں ۔ اور چونکہ ریگستان میں اسطرح پھرنے کا نتیجہ ہلاکت و تباہی ہوتاہےاس لئےاسے ان معنوں میں بھیاستعمال کرنے لگے ***۔
نیز ضائع ہونا ۔ رائگاں جانا ۔ مثلاً ذَھَبَ دَمُہٗ ضِلَّۃً ۔ اسکا خون یونہی رائگاں گیا ۔ کیونکہ اسکا قصاص یا انتقام نہیں لیا جا سکا * ۔ ضَلَّنِیْ فُلَانٌ ۔ وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا اور میں اس پر قادر نہ رہا * ۔ اَلضَّلَلُ ۔ وہ پانی جو کسی چٹان یا درختوں کے نیچے بہ رہا ہو اور اس پر دھوپ نہ پڑے ۔ اَلْمَضَلُّ ۔ اَلْمُضِلُّ ۔ سراب جو ریگستان میں پانی کی طرح دکھائی دیتا ہے * ۔

جب رسول اللہؐ نبوت سے پہلے تلاش حقیقت میں حیران و سرگردان پھرتے تھے تو قرآن کریم نے اس کیفیت کو وَجَدَکَ ضَالًّا (۹۳:۷) سے تعبیر کیا ہے ۔ ایک ہونے والا نبی ، نبوت سے پہلے بھی ، غلط تصورات زندگی سے غیر مطمئن ہوتا ہے لیکن چونکہ صحیح تصورات اس کے سامنے نہیں ہوتے اس لئے وہ ان کی تلاش میں سرگردان رہتا ہے ۔ اس کے بعد اسے خدا کی طرف سے راہ نمائی مل جاتی ہے تو یہ سرگردانی ختم ہو جاتی ہے ۔

سورۃ بقرہ میں ضَلَالَۃٌ ۔ ھُدًی کے مقابلہ میں آیا ہے (۲:۱۶) ۔ اس نے "راہ گم کردن" کے مفہوم کو واضح کر دیا ہے ۔ سورۃ ابراھیم میں کوششوں کے ناکام اور اعمال کے بے نتیجہ رہ جانے کو ضَلَالٌ سے تعبیر

* تاج۔ ** تاج نیز ابن قتیبہ ۔ القرطین ج/۱ صفحہ ۵　*** لین ۔

کیا گیا ہے (۱۳/۱۸) ۔ سورۂ کہف میں ضَلَّ سَعْيُهُمْ (۱۸/۱۰۴) سے بھی اس مفہوم کی وضاحت ہوجاتی ہے ۔ سورۂ ابراہیم میں اسے ثَبَاتٌ کے مقابل میں لاکر بتایا گیا ہے کہ اسکے معنے ہلاکت و بربادی ہیں (۱۴/۳) ۔ سورۂ حجر میں ضَلَالَتٌ کا نتیجہ نعمائے خداوندی سے محرومی و مایوسی بتایا گیا ہے (۱۵/۵۶) ۔ سورۂ اعراف میں ضَلُّوْا عَنَّا (۷/۳۷) کے معنے ہیں وہ ہم سے جاتے رہے یا غائب ہو گئے ۔ اور سورۂ السجدہ میں جہاں کفار کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ (۳۲/۱۰) تو اس کے معنے ہیں کہ کیا جب ہم مرنے کے بعد مٹی میں مل کر ضائع ہو جائینگے (ختم ہو جائینگے) ؟ ۔ تَضْلِيْلٌ ۔ ضائع کر دینا ۔ ناکام بنا دینا ، بھٹکا دینا اور غلط راہ پر لگا دینا (۱۰۵/۲) ۔ لہذا ضَالِّيْنَ (۱/۶) سے مراد ایسے لوگ ہیں جو وحی کی راہنمائی کے بجائے اپنے ذہنی قیاسات کی تجربہ گاہوں یا توہم پرستانہ عقیدتمندیوں کی بھول بھلیوں میں اس طرح مارے مارے پھرتے ہیں جسطرح لق و دق صحرا میں ایک راہ گم کردہ مسافر حیران و پریشان پھرتا ہے ۔ وہ دن بھر چلتا رہتا ہے لیکن شام کے وقت اسکی منزل اس سے اور دور ہو چکی ہوتی ہے ۔ اسطرح اسکی تمام کوششیں رائگاں چلی جاتی ہیں اور وہ انجام کار ہلاک ہو جاتا ہے ۔ اس کے مقابلہ میں منعم علیہ ہیں (۱/۶) جن کی کیفیت ان لوگوں کے برعکس ہوتی ہے ۔

سورۂ بقرہ میں ہے (۲/۲۸۲) کہ لین دین کے معاملہ میں دو مرد بطور گواہ ہونے چاہئیں اور اگر دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں ۔ دو عورتیں اس لئے کہ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى (۲/۲۸۲) ۔ اگر ان میں سے ایک کسی تفصیل میں (Confused) ہوجائے تو دوسری اسے یاد دلا دے ۔ وہ اُس بات کو سامنے لے آئے ۔ اس سے حافظہ کی کمزوری (بھول جانا) مراد نہیں بلکہ (عورت کے زیادہ جذباتی اور حیاءدار ہونے کی وجہ سے) گھبراہٹ میں (Confused) ہو جانا مقصود ہے ۔ اسی کے لئے قرآن کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ وَهُوَ فِى الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ (۴۳/۱۸) ۔ وہ جھگڑے (متنازعہ فیہ معاملہ) میں واضح طور پر مافی الضمیر کو بیان کرنے والی نہیں ہوتی ہے ۔ جھگڑے میں جذبات کی شدت ہوتی ہے جس سے وہ اپنے معاملہ (Case) کو بھی اچھی طرح بیان نہیں کر سکتی ۔ واضح رہے کہ لطیف جذبات کی زیادتی عورت کے فطری وظائف زندگی (اولاد کی پرورش) کے لئے ضروری ہے ۔ اس لئے یہ عورت کا نقص نہیں ۔ البتہ مناسب تعلیم و تربیت سے اس کے یہ جذبات بھی باقی رہتے ہیں اور وہ فصیح البیان بھی ہو سکتی ہے (۵/۳۴ ۔ دیکھئے عنوان ع ۔ ر ۔ ب)

ض م ر

اَلضُّمْرُ - اَلضُّمُرُ - لاغر ہونا - پیٹ کا کمر کے ساتھ لگ جانا - ضَمَرَ الْفَرَسُ - گھوڑے کا لاغرہونا اور اسکے پیٹ کا کمر سے لگنا - قَضِیْبٌ ضَامِرٌ - مرجھائی ہوئی شاخ جسکی تروتازگی جاتی رہی ہو* - قرآن کریم میں ہے عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ (۲۲/۲۷) - پتلی دبلی سواریوں پر - راغب نے کہا ہے کہ الضَّامِرُ مِنَ الْفَرَسِ - اس چھریرے گھوڑے کو کہتے ہیں جسکا دبلا پن لاغری کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اسے سدھانے کے لئے جو مشقت کرائی جاتی ہے اس کی وجہ سے ہو** -

اَلضَّمِیْرُ - مرجھایا ہوا انگور - ہر وہ بات جسے تم اپنے دل میں چھپاؤ - اَضْمَرَہٗ - اس نے اسے چھپا لیا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) پتلا پن اور باریک ہونا اور (۲) کسی چیز کا چھپ جانا -

ض م م

اَلضَّمُّ - ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا - اِضْطَمَّ الشَّیْئَ - کسی چیز کو اپنے لیے اکھٹا کیا - ضَمَمْتُہٗ اِلٰی صَدْرِیْ - میں نے اسے اپنے گلے سے لگایا* - ضَمَّ عَلَی الْمَالِ - اس نے سارے مال پر قبضہ کر لیا** - ضُمَّ جَنَاحَکَ عَنِ النَّاسِ - لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ اور اپنا پہلو ، ان کے لئے نرم رکھو* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو چیزوں میں موافقت اور مناسبت کے ہیں -

سورۃ طٰہٰ میں ہے وَاضْمُمْ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ (۲۰/۲۲) - اور سورۃ القصص میں ہے اُسْلُکْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ وَّاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھْبِ (۲۸/۳۲) - [" یَدٌ بَیْضَآءُ " کے مفہوم کیلئے عنوان ی - د - ی دیکھئے - نیز ۲۷/۱۲ ؛ ۷/۱۰۸ - اور جَنَاحٌ کیلئے دیکھئے عنوان ج - ن - ح] (۲۸/۳۲) کا مفہوم یہ ہے کہ خوف کی حالت میں مضطرب و متردد مت ہو (پھڑ پھڑاؤ نہیں) بلکہ اسطرح اطمینان سے رہو جسطرح پرندہ حالت امن میں اپنے بازو سمیٹ کر بیٹھتا ہے - اور (۲۰/۲۲) کا مجازی مفہوم بھی یہ ہے کہ اس آنے والے معرکہ میں ضبط و تحمل

* تاج - ** راغب -

ہے کام لو۔ پریشان مت ہو۔ اور بشارتیں دینے والے درخشندہ اصول زندگی کو (جو وحی کے ذریعے تمہیں دیئے گئے ہیں) پیش کرتے جاؤ۔ تم ہر مشکل و مصیبت سے محفوظ باہر نکل آؤ گے۔ دشمن کا شر تمہیں کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا سکیگا۔ ویسے، آیت (۲۸/۳۲) کے لفظی معنی یہ ہیں۔ ''تم اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈالو۔ وہ بغیر کسی خرابی کے سفید نکل آئے گا۔ اور تم خوف سے اپنے بازؤں کو سمٹائے رکھو''۔

ض ن ک

اَلضَّنْکُ۔ تنگ (جو کشادہ نہ ہو)۔ اَلضَّنِیْکُ۔ وہ شخص جو جسم، عقل، رائے وغیرہ میں کمزور ہو۔ وہ خادم جو محض روٹی کے معاوضہ میں کام کرتا ہو۔ رَجُلٌ مُتَضَنِّکٌ۔ لاغر آدمی*۔

قرآن کریم میں ہے جو شخص (یا قوم) قوانین خداوندی سے اعراض برتیگی۔ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا (۲۰/۱۲۴) ان کی معیشت تنگ ہو جائیگی۔ ظاہر ہے کہ جن اقوام کی معیشت تنگ ہے (اور مسلمانوں کا نمبر ان میں اسوقت سب سے آگے ہے) وہ قوانین خداوندی سے اعراض برت رہی ہیں۔ یہ ایک ایسا محسوس اور واضح معیار ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

ض ن ن

ضَنَّ بِالشَّیْءِ یَضَنُّ۔ کسی پسندیدہ اور مرغوب شے سے بخل کرنا۔ اَلضَّنِیْنُ۔ وہ بخیل آدمی جو نفیس چیزوں کے ساتھ بخل کرے۔ اَلضِّنُّ۔ نفیس شے جسکے ساتھ بخل کیا جائے**۔ جسے بچا کر رکھا جائے۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے کہ وَمَا ھُوَ عَلَی الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ (۸۱/۲۴)۔ اسے خدا کیطرف سے جو وحی ملتی ہے وہ اسکے عام کرنے میں بخل نہیں برتتا۔ وہ اسے ہر اس شخص کو دیتا ہے جو لینا چاہے۔

ض ھ ی (أ)

اَلضَّھْیَاءُ۔ وہ عورت جسے نہ حیض آتا ہو نہ بچے پیدا ہوتے ہوں۔ یا جس کی چھاتیوں میں ابھار نہ ہو اور اسطرح وہ مردوں سے مشابہ ہو۔ اسی

* تاج۔ محیط۔ راغب۔ ** تاج۔

سے ضَاهَاهُ مُضَاهَاةً۔ وضَاهَا ءَهُ۔ مُضَاهَئَةً کے معنے ہیں وہ اس کے مشابہ اور ہمشکل ہوا۔ هُوَ ضَهِيئُكَ۔ وہ تیرا ہمشکل اور تجھ سے مشابہ ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز کے مشابہ ہونا ہیں۔

قرآن کریم میں ہے يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ (۹/۳۰)۔ یہ انہی جیسی بات کرتے ہیں (انہی کے ہم رنگ بنتے ہیں) جنہوں نے ان سے پہلے کفر کی روش اختیار کی تھی۔ یہ سب ہم رنگ ہیں۔

بعض لوگوں نے اسے ناقص یائی مانا ہے اور بعض نے مہموز*۔ چنانچہ لین نے اسے ضهى اور ضهأ دونوں عنوانوں کے تحت لکھا ہے۔ راغب نے اسکی اصل ہمزہ بھی بتائی ہے۔

ض و أ

ضَوْءٌ یا ضُوْءٌ۔ نور اور روشنی کو کہتے ہیں۔ (جیسا کہ ن۔و۔ر کے عنوان میں بھی بتایا گیا ہے)۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ ضَوْءٌ کا لفظ نُوْرٌ سے زیادہ شدت اور قوت رکھتا ہے۔ نیز ضَوْءٌ کسی کی ذاتی روشنی کو کہتے ہیں اور نُوْرٌ اس روشنی کو جو دوسرے سے اکتساب کی گئی ہو**۔ غالباً اسی جہت سے شَمْسٌ کو ضِيَاءٌ اور قَمَرٌ کو نُوْرٌ کہا گیا ہے (۱۰/۵)۔ کیونکہ چاند کی روشنی اپنی نہیں ہوتی، سورج سے مستعار لی ہوئی ہوتی ہے۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ تَوْرَاتٌ کو نُوْرٌ کہا گیا ہے (۵/۴۴) اور دوسری جگہ اسے ضِيَاءٌ کہا گیا ہے (۲۱/۴۸)۔

اَضَاءَ کے معنے روشن کرنا ہیں۔ فَلَمَّا اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ (۲/۱۷)۔ ''جب اس نے اس کے گرد و پیش کو روشن کردیا''۔ نیز اس کے معنی روشن ہونے کے بھی ہیں۔ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْءُ (۲۴/۳۵)۔ ''قریب ہے اس کا تیل کہ وہ روشن ہو جائے''۔

ض و ز (ضیز)

ضَازَ فُلَانًا حَقَّهُ۔ اس نے اسکا حق کم کردیا۔ قِسْمَةٌ ضِيْزٰى۔ وہ ظالمانہ تقسیم جس میں کسی کو نقصان میں رکھا جائے۔ وہ تقسیم جو عدل پر مبنی نہ ہو۔ اَلضُّوَازَةُ۔ مسواک کے اس ریشہ کو کہتے ہیں جو دانتوں

*تاج و محیط۔ **تاج۔

میں رہ جائے*۔ (گویا اتنی سی کمی بھی ظلم ہو جاتی ہے)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) کجی اور (۲) کمی اور نقصان کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ (۵۳/۲۲)۔ یہ تقسیم تو پھر بڑی ہی بے انصافی کی تقسیم ہوئی۔

ض ی ر

اَلضَّيْرُ ۔ مضرت ۔ گزند ، ضَارَہٗ وَضَرَّہٗ کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی کسی کو تکلیف اور نقصان پہنچانا*۔ قرآن کریم میں ہے لَا ضَيْرَ ۔ (۲۶/۵۰)۔ کچھ ہرج نہیں۔ قطعاً کوئی تکلیف یا مضرت کی بات نہیں۔

ض ی ع

ضَاعَ ۔ يَضِيعُ ۔ ضَيْعًا۔ ہلاک اور تلف ہو جانا۔ ضَاعَ الشَّيْءُ۔ چیز بے کار چھوڑ دی گئی اور اس کی خبر گیری نہ ہوئی۔ ضَاعَ الْعِيَالُ۔ اہل و عیال کی نگرانی خبر گیری اور تربیت نہ کی گئی اور انہیں ویسا ہی چھوڑ دیا گیا۔ تَرَكْتُهٗ بِضَيْعَةٍ ۔ میں نے اسے بلا خبر گیری کے چھوڑ دیا۔ اَلضِّيَاعُ (ضَائِعٌ کی جمع ہے) وہ چیزیں جنکی خبر گیری نہ کی جائے اور وہ اس طرح ضائع ہو جائیں***۔ اَلضَّيْعَةُ ۔ جائداد کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اگر اسے ربوبیت عامہ کے لئے کھلا نہ رکھا جائے تو وہ مآل کار ضائع ہو جاتی ہے۔

سورۃ بقرۃ میں ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ (۲/۱۴۳)۔ اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمانوں کو ویسے ہی چھوڑ دے، ان کا خیال ہی نہ رکھے اور وہ اس طرح بغیر کوئی نتیجہ مرتب کئے برباد ہو جائیں۔ سورۃ مریم میں ہے کہ انبیا کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (۱۹/۵۹)۔ انہوں نے نظام صلٰوۃ کی کوئی پرواہ ہی نہ کی۔ اسے ویسے ہی چھوڑ دیا اور اپنے اپنے خیالات و مفاد کے پیچھے پڑ گئے۔

ض ی ف

اَلضَّيْفُ ۔ مہمان ۔ جمع اور واحد دونوں کے لئے آتا ہے***۔ سورۃ ہود میں ہے لَا تُخْزُونِ فِي ضَيْفِي (۱۱/۷۸)۔ یہاں ضَيْفٌ جمع کے لئے آیا ہے۔

*تاج ** تاج و محیط و راغب ۔ *** تاج و محیط

ضَافَ اِلَیْہِ ۔ وہ اس کی طرف مائل ہوا ۔ جھکا ۔ قریب ہوا ۔ ضَیَّفَ ۔ مہمان بنانا ۔ مہمان نوازی کرنا* ۔

سورۃ کہف میں ہے فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْھُمَا (۱۸/۷۷) ۔ انہوں نے ان کی مہمان نوازی کرنے سے انکار کردیا۔ اَلْمُضَافُ ۔ جائے پناہ ۔ جس کو کسی کی طرف مائل کیا جائے، جھکایا جائے۔ نیز وہ شخص جس کو جنگ میں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہو* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی مائل ہونے کے ہیں ۔

ض ی ق

ضَاقَ ۔ یَضِیْقُ ۔ ضِیْقًا ۔ تنگ ہو جانا ۔ ضَیَّقَ ۔ تنگ کرنا ۔ اَلضِّیْقُ و الضَّیِّقُ ۔ تنگی ۔ یہ اَلشَّرْحُ کی ضد ہے ۔ لہذا اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ش ۔ ر ۔ ح کا عنوان دیکھئے ۔ یہ دونوں مادے (۶/۱۲۶) میں ایک دوسرے کے بالمقابل آئے ہیں۔ ضَیِّقًا (۶/۱۲۶) تنگ ۔ ضَیْقٌ (۱۶/۱۲۷) تنگی۔ ضَآئِقٌ ۔ وہ جو تنگ ہو (۱۱/۱۲) ۔ ان میں حزن ، غم اور ملال کا مفہوم آجاتا ہے ۔ ضَاقَ بِھِمْ ذَرْعًا (۱۱/۷۷) اس نے ان کی حفاظت کے لئے اپنی طاقت کو تنگ (کم) پایا ۔ کوتاہ دست ہو گیا ۔ ضَاقَتْ عَلَیْھِمُ الْاَرْضُ (۹/۱۱۸) ان پر زمین تنگ ہو گئی ۔ وَ ضَاقَتْ عَلَیْھِمْ اَنْفُسُھُمْ (۹/۱۱۸) وہ خود اپنے آپ سے تنگ آ گئے ۔ سورۃ طلاق میں ہے وَلَا تُضَآرُّوْھُنَّ لِتُضَیِّقُوْا عَلَیْھِنَّ (۶۵/۶) ۔ انہیں تنگ کرنے کے لئے تکلیف نہ دو ۔

---

*تاج و محیط ۔

ط

طَالُوْتُ

طَالُوْتُ ۔ انہیں اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کی اُن افواج کا کمانڈر مقرر کیا تھا جو جالوت کے مقابلہ کے لئے جا رہی تھیں ۔ ان میں علم بھی تھا اور جسمانی توانائی بھی ۔ اور یہی چیزیں ایک کمانڈر کے لئے ضروری ہوتی ہیں ۔ ان کے اس تقرر کے خلاف بنی اسرائیل نے یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ دولتمند نہیں ۔ یعنی وہ (Aristocrat) طبقہ میں سے نہیں ۔ اس کے جواب میں اللہ تعالی نے کہا کہ کمانڈر کی صفات ، فنونِ حرب کا علم اور توانائی ہیں، نہ کہ مال و دولت کی فراوانی ۔ ($\frac{2}{247}$) ۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ عجمی لفظ ہے ، عربی نہیں * ۔ راغب نے بھی اسکی تائید کی ہے ۔

ط ب ع

اَلطَّبْعُ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کو تمثیلاً کسی چیز کی انتہا کے لئے استعمال کرتے ہیں ، یعنی جہاں پہنچ کر وہ چیز ختم ہو جائے اور پوری ہو جائے ۔ پیمانے کے لبالب بھر جانے کو طَبْعٌ کہتے ہیں ۔ تَطَبَّعَ النَّهْرُ ۔ نہر بھر گئی ۔ اس اعتبار سے اَلطَّبْعُ مہر لگانے کو کہتے ہیں ۔ ابو اسحق نے کہا ہے کہ طَبْعٌ اور خَتْمٌ ہم معنی ہیں ۔ یعنی کسی چیز کو بند کر دینا اور ڈھانپ دینا اور اس کا یقین اور اطمینان کر لینا کہ اب اس میں کوئی چیز داخل نہ ہو سکے گی ۔ مثلاً کہتے ہیں طَبَعْتُ الْمِكْيَالَ ۔ میں نے پیمانے کو لبالب بھر دیا اور اس میں اب کوئی اور چیز نہیں آسکتی** ۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ طَبْعٌ ۔ خَتْمٌ سے زیادہ عام ہے اور نَقْشٌ سے زیادہ خاص** ۔ اَلطَّابِعُ والطَّابَعُ اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے بکریوں وغیرہ کے پہلو پر داغ دیکر نشان کیا جائے ۔

* محیط ۔ ** تاج ۔

اَلطَّبَّاعَةُ - ڈھلائی، چھپائی کا کام - اَلطَّبَّاعُ - ڈھلائی کا کام کرنے والا*۔
اصل میں جب کسی چیز کو ڈھال کر یا گھڑ کر پہلی شکل دی جائے تو اسے
اَلطَّبْعُ کہتے ہیں -

مہر لگانے کے اعتبار سے قرآن کریم میں ہے - فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ
فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (۶۳/۳) - ان کے دلوں پر مہر لگ گئی جس کا نتیجہ یہ
ہے کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہیں رہی - اسی کو خَتَمَ
اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (۲/۷) کہا گیا ہے (دیکھئے عنوان خ - ت - م) - جب انسان
ضد اور ہٹ، نفرت اور تعصب کی روش اختیار کر لیتا ہے تو پھر اس کی کیفیت یہ
ہو جاتی ہے کہ اس میں کسی بات کے صحیح طور پر سمجھنے اور ٹھیک نتیجہ
تک پہنچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی - اسی کو دل و دماغ پر مہریں
لگ جانے سے تعبیر کیا گیا ہے اور صاف الفاظ میں بتا دیا ہے کہ یہ انسان
کی اپنی روش کا نتیجہ ہوتا ہے - بلکہ یہ روش خود ہی مہر بن جاتی ہے -
رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸۳/۱۴) - " ان کے اعمال ان کے
دلوں پر زنگ بنکر بیٹھ گئے " - وہ غلط اعمال جو برضا و رغبت اور بلا جور
و اکراہ کئے جائیں (۱۶/۱۰۶-۱۰۸) وہ زنگ بن جاتے ہیں -

ط ب ق

اَلطَّبَقُ - ہر چیز کا ڈھکنا جو اس پر فٹ آجائے - طَبَّقَهٗ تَطْبِيْقًا -
اس نے اسے ڈھانپ دیا - فَانْطَبَقَ - پس وہ ڈھک گیا - اَلطَّبَقُ مِنْ
كُلِّ شَيْءٍ - ہر وہ چیز جو کسی چیز کے برابر اور مطابق ہو - طَابَقَهٗ
مُطَابَقَةً وَطِبَاقًا - وہ اس کے موافق اور مساوی ہو گیا - اَلطَّبَقُ - روئے
زمین - تھالی یا طباق جس پر کھانا رکھا جائے - زمانہ کی ایک صدی یا قرن -
حالت - اَلْمُطَابَقَةُ - موافق و مطابق ہونا - گھوڑے کا اسطرح چلنا کہ
جہاں اگلا پاؤں پڑا تھا وہیں پچھلا پاؤں پڑے - اُس آدمی کا چلنا جسکے
پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں - اُس کے قدم بالکل برابر برابر اٹھتے ہیں -
اَلْمُطَابَقَةُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ - دو چیزوں کو ایک دوسرے کے مطابق بنانا
یا اوپر تلے رکھنا * -

قرآن کریم میں ہے اَلَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (۶۷/۳) اس کے
معنی ہیں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہوئے - سورۃ انشقاق میں انسان
کی ارتقائی منازل کے متعلق ہے - لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹) -

* تاج -

" تم ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بلند ہوتے چلے جاؤ گے " - تم مختلف طبقات میں سے گذرتے ہوئے اوپر چڑھتے چلے جاؤ گے - یا خود انسانیت (Humanity) تہ در تہ اوپر کو اٹھتی چلی جائیگی - تاریخ انہی تہوں کے ریکارڈ کا نام ہے (نیز دیکھئے عنوان ر - ک - ب)

ط ح ی (و)

طَحٰی - یَطْحٰی - طَحْیاً - کسی چیز کو پھیلانا - بچھانا - نیز پھیل جانا - بچھ جانا - (لازم و متعدی) اَلطَّاحِیْ - زمین پر پھیلی ہوئی چیز - وہ شے جو ہر چیز کو اپنی کثرت سے پُر کر دے - چنانچہ مَظَلَّةٌ طَاحِیَۃٌ - بڑے پھیلاؤ والے سائبان کو کہتے ہیں - اور اَلْقَمَرُ الطَّاحِیْ - بلند چاند کو، جس کی روشنی پھیل رہی ہو* - قرآن کریم میں ہے وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰھَا (۹۱/۶) - زمین اور وہ چیز جس نے اسے پھیلا دیا - یعنی وہ مختلف ادوار و مراحل جن سے گذر کر زمین کا آتشیں گولہ رہائش کے قابل ہوا۔

ط ر ح

طَرَحَ - یَطْرَحُ - طَرْحاً - پھینک دینا - دور کر دینا - اَلطِّرْحُ - پھینکی ہوئی چیز (جسکی کسی کو ضرورت نہ ہو) - دِیَارٌ طَوَارِحُ - دور دراز شہر - اَلطَّرَحُ - دوری - دور کی جگہ - قَوْسٌ طَرُوْحٌ - وہ کمان جو تیر کو بہت دور تک پھینکے - طَرْفٌ مِطْرَحٌ - دور تک دیکھنے والی نگاہ **۔

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ یوسفؑ کو قتل کر دو اَوِ اطْرَحُوْہُ اَرْضاً (۱۲/۹) - یا اسے کسی دور دراز ملک کی طرف نکال دو۔

ط ر د

اَلطَّرْدُ - کسی کو حقیر سمجھ کر دور کر دینا - نکال دینا - ہٹا دینا - طَرَدْتُہٗ - میں نے اسے نکال دیا - اَلطَّرِیْدَۃُ - وہ اونٹ جنہیں کوئی حملہ کر کے ہنکا لے جائے - یا چرائے ہوئے اونٹ - وہ شکار وغیرہ جس کا تعاقب کیا جائے - اَطْرَدَہُ السُّلْطَانُ - بادشاہ نے اسے شہر بدر کر دیا - اِسْتَطْرَدَ لَہٗ - وہ پیچھے اس لئے ہٹا کہ فریق مخالف پر پھر سے حملہ کرے لیکن ظاہر ایسا کیا گویا وہ شکست کھا کر بھاگ گیا ہے *** - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ نصاریٰ کی اصطلاح میں مذہب کی بنا پر کسی کو سزا دینے کو اَلطَّرْدُ کہتے ہیں ****۔

*تاج نیز کتاب الاشتقاق - **تاج و محیط و راغب ***تاج و راغب - ****محیط -

قرآن کریم میں ہے۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ (۶/۵۲) ۔ جو لوگ اپنے نشوونما دینے والے کو پکارتے ہیں انہیں حقیر و ذلیل سمجھ کر اپنے سے دور نہ رکھو۔ انہی کے متعلق حضرت نوحؑ کی زبان سے کہلوایا گیا کہ وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۶/۱۱۴) ۔ میں ان مومنین کو حقیر سمجھ کر اپنے پاس سے نہیں نکالوں گا۔

غیر قرآنی نظام حیات میں قُرب و بُعد کا معیار، دولت اور وجاهت ہے۔ لیکن قرآنی معاشرہ میں قرب و یگانگت کا معیار قلب و نگاہ کی ہم آهنگی (آئیڈیالوجی کا اشتراک) ہے۔ اس میں امیر اور غریب کا کوئی امتیاز نہیں۔ یہی بات ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی جنہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جاتی تھی۔ وہ کہتے کہ کیا ہم اس نظام میں آکر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھیں جنہیں ہم اپنے معاشرہ میں ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں؟ چنانچہ ان کا مطالبہ تھا کہ آپؐ ان لوگوں کو اپنے ہاں سے الگ کر دیجئے، پھر ہم آئینگے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہاں معیار ہی کچھ اور ہے۔ میں تمہاری خاطر ان لوگوں کو حقیر سمجھ کر الگ نہیں کر سکتا جن کے دل متاع ایمان سے بھرپور ہیں۔ اس نظام میں اقدار بدل جاتی ہیں۔ یہاں زندگی کی بلند اقدار کی صداقت پر یقین، خلوص اور حسن عمل سب سے زیادہ گراں بہا متاع ہیں۔

ط ر ف

اَلطَّرْفُ ۔ آنکھ ۔ نگاہ *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز کا کنارہ اور (۲) کسی عضو کا حرکت کرنا۔ دراصل یہ آنکھ جھپکنے کے لئے آتا ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلطَّرْفُ درحقیقت پلکیں جھپکنے کو کہتے ہیں۔ اسی سے دیکھنے کو بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے *۔ سورۃ النمل میں ہے۔ قَبْلَ اَنْ يَرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ (۲۷/۴۰) ۔ تیری آنکھ جھپکنے سے پہلے ۔ یعنی بہت جلد ۔ سورہ شوریٰ میں ہے يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ (۴۲/۴۵)۔ کنکھیوں سے دیکھنا ۔ اَلطَّرَفُ ۔ ہر چیز کا وہ سرا جہاں وہ ختم ہو جاتی ہو ۔ آخری کنارا *۔ قرآن کریم میں طَرَفَيِ النَّهَارِ (۱۱/۱۱۴) اور اَطْرَافَ النَّهَارِ (۲۰/۱۳۰) آیا ہے۔

اَطْرَافُ الْاَرْضِ ۔ ملک کے سردار اور اشراف **۔ اَلطِّرْفُ ۔ شریف آدمی ۔ عمدہ نسل کا گھوڑا ۔ اعلیٰ نسب کا انسان ۔ سردار شریف *۔

* تاج ۔ ** (تاج و صحاح و البستان)

سورہ رعد میں ہے ۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (۱۳/۴۱) ۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم کسطرح (آہستہ آہستہ) زمین (معاشی وسائل - رزق کے سرچشموں) کو ان بڑے بڑے لوگوں کے پاس سے کم کرتے جارہے ہیں جو انہیں اپنے قبضے میں لئے بیٹھے ہیں ۔ قرآن کریم نے تیرہ سو برس ہوئے جب یہ بتا دیا تھا کہ دنیا کا وہ معاشی نظام جس میں رزق کے سر چشمے بڑے بڑے لوگوں کے قبضہ میں رہتے ہیں باقی نہیں رہے گا۔ یہ چیزیں آہستہ آہستہ ان کے ہاتھوں سے نکلتی جائیں گی اور اسطرح کم ہوتی ہوتی ایک دن ان کی ذاتی ملکیت سے نکل کر معاشرہ کی تحویل میں چلی جائیں گی ۔ اور قرآنی معاشرہ ان سے حاصل شدہ رزق کو ربوبیت عامہ کیلئے صرف کریگا ۔ (۴۱/۴۴) میں اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ۔

نیز طَرَفٌ کے معنی گروہ اور جماعت کے بھی ہیں (قاموس) ۔ نیز کسی چیز کا ایک حصہ (اقرب الموارد) ۔ الطَّرَفُ ۔ منتخب چیز کو بھی کہتے ہیں*۔ سورہ آل عمران میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے ۔ طَرَفًا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۳/۱۲۶) ۔ ان کا ایک حصہ - یا ایک گروہ ۔ نیز اس کے معنی کفار کے بڑے بڑے لیڈر اور منتخب افراد بھی ہو سکتے ہیں (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) ۔

ط ر ق

اَلطَّرْقُ ۔ کے اصل معنے مارنے کے ہیں ۔ ہتوڑے سے مارنا ۔ چٹاخ سے مارنا ۔ اَلطَّرْقُ ۔ کاہن کا اپنی کہانت کے لئے کنکریاں مارنا ۔ اَلْمِطْرَقُ ۔ اَلْمِطْرَقَةُ ۔ وہ لکڑی جس سے اون کو مار مار کر دھنا جائے ۔ نیز ہتھوڑا ۔ اَلطَّرْقُ ۔ اَلطُّرُوْقُ ۔ رات کو آنا ۔ اَلطَّارِقُ ۔ رات کو آنے والا ۔ اسے طَارِقٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اسے بالخصوص دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت پڑتی ہے ۔ راغب نے کہا ہے کہ طَارِقٌ راستہ چلنے والے کو کہتے ہیں، بالخصوص اس مسافر کو جو رات کو آئے ۔ ستارے کو بھی اَلطَّارِقُ کہتے ہیں کیونکہ وہ رات میں آتا ہے **۔ قرآن کریم میں ہے وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ (۸۶/۱) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے چار بنیادی معنی ہیں (۱) شام کو آنا ۔ (۲) مارنا ۔ (۳) کسی چیز کا ڈھیلا ہونا ۔ اور (۴) کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ سی دینا ۔

اَلطَّرْقَةُ ۔ کسی چیز کی طرف پہنچنے کا راستہ ۔ طریقہ ۔ عادت ۔ چلن ۔ نیز اَلطَّرِيْقُ ۔ اَلطَّرِيْقَةُ جسکی جمع اَلطَّرَائِقُ آئیگی ۔ سورہ طٰہٰ میں

* تاج ۔ ** تاج و راغب و محیط ۔

ہے فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِى الْبَحْرِ يَبَسًا (۲۰/۷۷) ۔ پھر تو انہیں سمندر میں خشک راستہ سے لے جا ۔ یہاں طریق کے معنی راستہ ہیں ۔ نیز اس کے معنی قوم کے رؤساء اور معزز لوگ ہیں جو دوسروں کے لئے نمونہ بنیں ۔ هٰؤُلَاءِ طَرِيْقَةُ قَوْمِهِمْ وَطَرَائِقُ قَوْمِهِمْ ۔ یہ قوم کے اشراف ہیں ۔ مِطْرَاقُ الشَّيْئِ ۔ چیز کا مثل اور نمونہ * ۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ سرداران قوم فرعون نے حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت ہارون ؑ کے متعلق کہا کہ يَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى (۲۰/۶۳) ۔ یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے مسلک و مذہب کو جو بہترین ہے ختم کر دیں ۔ یا تمہاری قوم کے بہترین رؤسا و اشراف کو ختم کر دیں ۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً (۲۰/۱۰۴) ۔ بہترین طریقے پر چلنے والا ۔ سورہ جن میں ہے لَوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ (۷۲/۱۶) ۔ اگر وہ (صحیح) راستے پر قائم رہتے ۔ ذرا پہلے ہے كُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا (۷۲/۱۱) ۔ ہم متفرق راستوں پر تھے ۔ مختلف مسلک رکھتے تھے ۔

اَلطَّرِيْقَةُ ۔ وہ چیز جو ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہو ۔ اَلْمَطَارِيْقُ ان اونٹوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے ہوں ۔ اِطَّرَقَتِ الْاِبِلُ ۔ اونٹ ایک دوسرے کے پیچھے چلے ۔ اِطَّرَقَتِ الْاَرْضُ ۔ زمین میں مٹی کے اوپر مٹی چڑھ گئی ۔ اَلطِّرَاقُ ۔ جوتے کا پرتلہ جو ایک کے اوپر دوسرا رکھ کر سی لیا جائے * ۔ قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ (۲۳/۱۷) ۔ یہاں طَرَائِقُ کے معنی اوپر تلے مختلف طبقات بھی ہو سکتے ہیں ۔ یعنی اجرام فلکی جو ایک دوسرے کے اوپر ہیں ۔ یا وہ اجرام سماوی جو ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے ہیں ۔

ط ر ی (و)

اَلطَّرِىُّ ۔ نیا ۔ نرم اور تروتازہ ۔ طَرِىَ اللَّحْمُ وطَرُوَ طَرَاوَةً ۔ گوشت کا نرم اور ترو تازہ ہونا ** ۔ قرآن کریم میں سمندر کے متعلق ہے کہ اس میں سے لَحْمًا طَرِيًّا (۱۶/۱۴) حاصل ہوتا ہے ۔ ترو تازہ گوشت یعنی مچھلی وغیرہ ۔

ط ع م

اَلطَّعَامُ ۔ اہل عرب جب اسے مطلقاً بولتے ہیں تو اس سے مراد گیہوں یا کھجور ہوتی ہے ۔ ورنہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کھائی جائے اور جس

* تاج ۔ ** تاج و راغب

سے انسان کے جسم کی پرورش ہو سکے۔ اَلطُّعْمَۃُ ۔ کھانے کی چیز۔ رزق۔ ذریعہ معاش۔ طَعْمُ الشَّیْئِ ۔ چیز کا مزہ۔ اس لئے طَعِمَ اور تَطَعَّمَ کے معنی چکھنا بھی ہوتے ہیں *۔ نیز طَعِمَ کے معنی ہیں اس نے پیٹ بھرا۔ طَاعِمٌ کے معنی ہیں جس کا پیٹ بھرا ہؤا ہو۔ نیز مستغنی *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔

نیز اَلطُّعْمُ ۔ قدرت اور اختیار کو بھی کہتے ہیں۔ طَعِمَ عَلَیْہِ ۔ وہ اسپر قادر ہوا *۔ قرآن کریم میں طَعَامٌ (۲/۶۱) کھانے کی چیز کے لئے آیا ہے۔ اور (۲/۲۴۹) میں پینے یا چکھنے کے معنوں میں۔ اَطْعَمَ (۱۰۶/۴) اس نے کھانا کھلایا۔ اِسْتَطْعَمَ (۱۸/۷۷) اس نے کھانا مانگا۔

اس کے عمومی معنی ہر قسم کے سامان پرورش کے ہیں۔ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (۱۰۷/۳) کے معنی صرف روٹیاں کھلانے کے نہیں۔ اس کے معنے ہیں ان لوگوں کی پرورش کا سامان بہم پہنچانا یا ضروریات سے مستغنی کر دینا جو نقل و حرکت سے معذور ہو جائیں یا جن کی زندگی کی گاڑی رک جائے۔

سورۃ مائدہ میں ہے کہ اُحِلَّ لَکُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُہٗ (۵/۹۶) ۔ اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ پانی کے وہ جانور جن کا تم شکار کرو یا وہ جنہیں پانی ازخود اچھال کر باہر پھینکدے، حلال ہیں۔ (ابن جریر) صاحب البستان نے بھی یہی لکھا ہے۔ تاج نے کہا ہے کہ جس جگہ سے سمندر کا پانی ہٹ جائے، وہاں جو کچھ رہ جائے اور بغیر شکار کئے مل جائے وہ طَعَامُ الْبَحْرِ ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ طعام البحر ہے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جنکی زندگی کا دارومدار سمندر پر ہو۔

ط ع ن

طَعَنَہٗ بِالرُّمْحِ یَطْعَنُ ۔ اسکے نیزہ مارا، چبھو دیا۔ گھونپ دیا *۔ طَعَنَ فِیْہِ ۔ کسی میں عیب نکالنا۔ طنز کرنا *۔ طَعْنًا فِی الدِّیْنِ (۴/۴۶) ۔ دین میں عیب نکالتے ہوئے۔ طعن کرتے ہوئے۔ طنز کرتے ہوئے۔

ط غ ی (و)

طَغٰی ۔ حد اور پیمانے سے باہر ہو جانے کو کہتے ہیں۔ اسی لئے دریا وغیرہ کے پانی کا بڑھکر مقررہ اندازہ سے زیادہ بلند ہوجانے یا ساحل سے باہر آجانے کو طُغْیَانٌ کہا جاتا ہے۔ اَطْغٰی ۔ اسے حد سے متجاوز اور حدود شکن

* تاج۔

بنایا۔ اسے طغیان و سرکشی پر ابھارا ۔ الطَّاغِیُ ۔ حد سے متجاوز اور قانون شکن آدمی کو کہتے ہیں ۔ اس کی جمع الطَّاغُوْنَ اور الطَّاغِیْنَ ہے ۔ طَغْیَۃٌ اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر چڑھنا دشوار ہو۔ طَاغِیَۃٌ ۔ جبّار و متکبر اور احمق و سخت گیر، نیز معاند انسان کو کہتے ہیں۔ بجلی کی شدید کڑک اور مہیب طوفان کو بھی ۔ طَغْوٰی کے معنی سرکشی اور حدود شکنی کے ہیں*۔ یہیں سے لفظ طَاغُوْتٌ ہے جو (صاحب مفردات کے نزدیک) ہر حدود شکن، نیز اللہ کے سوا ہر باطل معبود کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ نیز اس کے لئے جو کسی کو سیدھی راہ سے بہکا کر غلط راستے پر لگا دے** ۔ جوھری کے نزدیک سرکشوں کے ہر سرغنہ کو طَاغُوْتٌ کہا جاتا ہے* ۔ زجاج نے کہا ہے کہ خدا کے سوا جس کسی کی بھی اطاعت اختیار کی جائے وہ طَاغُوْتٌ ہے ۔ یعنی ہر غیر خداوندی طاقت* ۔

قرآن کریم میں فرعون کے متعلق ہے اِنَّهٗ طَغٰی (۲۰/۲۴) ۔ یعنی وہ بےحد سرکش ہو چکا ہے ۔ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ (۲/۱۵) میں طُغْیَانٌ کے معنی سرکشی ہیں ۔ اور (۳۸/۵۵) میں لِلطَّاغِیْنَ سرکشوں کے لئے آیا ہے ۔

قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اللہ کے مقابلہ میں اَلطَّاغُوْتُ کا لفظ آیا ہے جس سے اس کا مفہوم واضح ہے ۔ یعنی ہر غیر خدائی قانون اور نظام، ہر وہ قوت جو خدا کے قانون سے سرکشی اختیار کر جائے ۔ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ (۲/۲۵۶) میں یہ مفہوم واضح ہے ۔ یعنی جو خدا پر ایمان لائے اور ہر غیر خدائی قوت (نظام ۔ قانون) سے انکار کر دے ۔ لَاۤ اِلٰہَ ۔ اِلَّا اللّٰہُ کے یہی معنی ہیں ۔ اسی کو دوسری جگہ اُعْبُدُوا اللّٰہَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (۱۶/۳۶) سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ نیز (۴/۷۶) میں ہے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ ۔ یہاں سبیل اللہ اور سبیل الطاغوت نے بتا دیا کہ طاغوت کے معنی ہر غیر خدائی اقتدار و نظام ہے ۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کو جو سبیل الطاغوت (غیر خدائی نظام کی خاطر) جنگ کرتے ہیں ، اَوْلِیَآءَ الشَّیْطٰنِ (۴/۷۶) کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ طَاغُوْتٌ اور شَیْطَانٌ مرادف المعنیٰ ہیں ۔ اس کی تشریح میں، یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْۤا اِلَی الطَّاغُوْتِ (۴/۶۰) ''یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں '' کہہ کر یہ بھی واضح کر دیا کہ طاغوت یا شیطان محض ذہنی تصورات نہیں بلکہ طاغوت کے معنی ہیں تمام

---

*تاج و محیط و لسان ۔ **راغب ۔

وہ حاکم ، وہ عدالتیں ، وہ حکومتیں ، وہ نظام ، جو خدا کے قانون (قرآن) کے علاوہ دوسرے قوانین کی رو سے معاملات کے فیصلے کریں ۔ ان کی طرف رجوع کرنا خدا سے انکار اور طاغوت کی عبادت ہے ۔ جو لوگ اس قسم کے نظام کی تقویت کے لئے کوشش کرتے ہیں وہ اَوْلِیَاءُ الشَّیْطٰنِ (یعنی غیر خدائی اقتدار کے رفقائے کار) ہیں ۔

سورۃ حاقہ میں ہے لَمَّا طَغَا الْمَاءُ (۶۹/۱۱) جب سیلاب آگیا ۔ (۶۹/۵) میں اَلطَّاغِیَۃُ بجلی کی شدید کڑک کے لئے آیا ہے جس سے قوم ثمود کی ہلاکت ہوئی تھی ۔ لیکن یہ عذاب خود ان کی سرکشی کی وجہ سے تھا ۔ چنانچہ سورۃ شمس میں ان کے متعلق ہے ۔ کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَا (۹۱/۱۱) ۔ ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر حق کی تکذیب کی ۔ سورۃ النجم میں رسول اللہؐ کے متعلق ہے ۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (۵۳/۱۷) ۔ اس کی آنکھ نہ تو صحیح مقام سے ادھر ادھر ہٹی اور نہ ہی اپنی حد سے بڑھی ۔ یعنی نبی بذریعہ وحی، حقیقت کی ٹھیک ٹھیک نشاندھی کرتا ہے لیکن اسی حد تک جس حد تک خدا اسے لے جاتا ہے ۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں نبی کا علم (وحی) بہت وسیع ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ وحی کا سرچشمہ سرحدِ ادراک سے ماوراء ہوتا ہے ۔ لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں وہ محدود ہوتا ہے ۔ خدا نبی کو بھی اتنا ہی علم دیتا ہے جتنا علم دیا جانا مقصود ہو ۔ نبی اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا ۔

ط ف أ

طَفِئَتِ النَّارُ ۔ وَانْطَفَأَتْ ۔ آگ کا شعلہ بیٹھ گیا اور وہ سرد ہو گئی ۔ اَطْفَأَ النَّارَ ۔ اس نے آگ کو بجھا دیا ۔ اَطْفَأَ نَارَ الْحَرْبِ ۔ اس نے جنگ کی آگ کو بجھا دیا* ۔ قرآن کریم میں ہے کُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (۵/۶۴) ۔ ”جب بھی وہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں خدا اسے بجھا دیتا ہے“ ۔ استعارۃً اَطْفَأَ الْفِتْنَةَ فتنہ فرو کرنے کو کہتے ہیں** ۔ علمائے لغت نے کہا ہے کہ جب آگ کے شعلے اٹھنا بند ہوجائیں مگر اس کے انگارے روشن ہوں تو اس آگ کو خَامِدَۃٌ کہتے ہیں ۔ لیکن جب آگ کے شعلے ساکن ہو جائیں اور اس کے انگارے بھی ٹھنڈے پڑ جائیں تو اسے هَامِدَۃٌ اور طَافِئَۃٌ کہتے ہیں* ۔

---

* تاج ۔ ** محیط ۔

راغب نے کہا ہے کہ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ (۹/۳۲) کے معنے یہ ہیں کہ وہ خدا کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں۔ اور یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ (۶۱/۸) کے معنے یہ ہیں کہ وہ کوئی ایسی تدبیر کرنا چاہتے ہیں جس کے ذریعہ وہ خدا کے نور کو بجھا سکیں *۔ لیکن اللہ اپنے نور کو پورا (مکمل) کر کے رہے گا اور یہ اس طرح ہوگا کہ اس کا بھیجا ہوا نظام، باقی تمام نظامہائے عالم پر غالب آجائے۔ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ (۹/۳۳ ؛ ۶۱/۹)۔

ط ف ف

اَلطَّفِیْفُ۔ تھوڑی چیز۔ نامکمل و ناقص چیز۔ اَلطَّفَافَةُ۔ برتن کے بھرنے میں جسقدر کمی رہ جائے۔ طَفَّ النَّاقَةَ یَطُفُّهَا۔ اس نے اونٹنی کے پاؤں باندھ دیئے۔ اَطَفَّتِ النَّاقَةُ۔ اونٹنی نے نا تمام بچہ دیا۔ طَفَّفَ الْمِکْیَالَ۔ اس نے پیمانہ کو پورا نہیں بھرا۔ اس میں کمی کی **۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ (۸۳/۱) "مطففین" کے لئے تباہی ہے۔ اور اس سے اگلی دو آیتوں میں خود ہی اسکی تشریح کر دی کہ مطففین وہ ہیں کہ جب وہ لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا ناپ کر لیتے ہیں، اور جب دیتے ہیں تو ناپ اور وزن میں کمی کر دیتے ہیں (۸۳/۳-۲)۔ قرآن کریم نے اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی بتایا ہے (وَیْلٌ)۔ یہ اس معاشرہ کا ذکر ہے جس میں نظام زندگی کا یہ انداز ہو کہ سرمایہ دار اور صاحب اقتدار طبقہ دوسروں کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دیں بلکہ ان کی محنت کی کمائی سے اپنے عیش و عشرت کا سامان بہم پہنچائیں۔ نظام سرمایہ داری میں کسی کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا ہی نہیں جاتا۔ اگر پورا معاوضہ دیدیا جائے تو سرمایہ دار کو کیا ملے؟ وہ کام کرنے والوں کو کم از کم دیتا ہے اور خود زیادہ سے زیادہ رکھتا ہے۔ اسی سے سرمایہ داری قائم رہتی ہے۔ قرآن کریم اسے تَطْفِیْفٌ کہتا ہے اور اس نظام کا انجام تباہی اور بربادی بتاتا ہے۔ پھر اس لفظ کے معنی (اونٹنی کے پاؤں باندھنے) میں اسطرف بھی اشارہ ہے کہ اس سے کام کرنے والوں کی صلاحیتیں زنجیروں میں جکڑی رہتی ہیں اور کبھی بھی اپنی حقیقی جولا نگاہ کی انتہائی وسعت تک نہیں پہنچنے پاتیں۔ وہ سمٹی، سکڑی، بندھی اور ناتمام رہ جاتی ہیں۔ لہذا تَطْفِیْف کے معنی صرف معاشی ناہمواریاں ہی نہیں بلکہ اس میں انسان کے احترام اور عزت میں کمی کرنا بھی داخل ہے۔ جس انداز اور طریق سے بھی شرف

---

* راغب۔ ** تاج و راغب۔

انسانیت میں کمی واقع ہو جائے وہ تَطْفِیْفٌ ہے۔ جس معاشرہ میں تکریم آدمیت اور احترام انسانیت میں کمی ہو (یعنی انسان کا پورا پورا احترام بہ حیثیت انسان نہ کیا جائے) وہ مطففین کا معاشرہ ہے جس کا انجام تباہی ہے۔

ط ف ق

طَفِقَ یَفْعَلُ کَذَا۔ وہ ایسا کرنے لگا۔ یہ اسوقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کام کو کرنا شروع کر دے اور پھر اس میں مسلسل لگا رہے۔ طَفِقَ الْمَوْضِعَ۔ وہ اس جگہ جم کر رہا اور وہاں سے نہ ہٹا*۔

قرآن کریم میں ہے وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ..... (۲۲/۷)۔ وہ لگے ایسا کرنے۔

ط ف ل

اَلطَّفْلُ۔ ہر نرم اور نازک چیز۔ طَفُلَ۔ طَفَالَةً۔ طُفُوْلَةً۔ نرم و نازک ہونا۔ اَلطِّفْلُ۔ ہر چھوٹی چیز۔ بچہ۔ جمع اَطْفَالٌ (۲۴/۵۹)۔ (طِفْلٌ خود بھی جمع کیلئے آتا ہے) راغب نے کہا ہے کہ بچہ کو طِفْلٌ اس وقت تک کہتے ہیں جب تک کہ وہ نرم و نازک ہو**۔ قرآن کریم میں ہے۔ ثُمَّ نُخْرِجُکُمْ طِفْلًا (۲۲/۵)۔ پھر تمہیں ایک بچے کی حیثیت سے پیدا کرتے ہیں۔

ط ل ب

اَلطَّلَبُ۔ کسی چیز کے حصول کی خواہش، اسطرح کہ اس کے حاصل کرنےمیں کوشش کرنی پڑے***۔ یا کسی چیز کے پانے کی تلاش اور جستجو****۔ کسی چیز کا متلاشی ہونا اور اسے پا لینا۔ طَلَبَ اِلَیْہِ۔ اس نے اس سے مانگا۔ کَلَأٌ مُطْلِبٌ۔ اس گھاس کو کہتے ہیں جو پانی سے بہت دور ہو اور اس تک پہنچنے کے لئے تکالیف اٹھانی پڑے۔ اُمُّ طِلْبَۃٍ۔ عقاب کو کہتے ہیں۔ اس میں تلاش اور دوری دونوں آجاتے ہیں*۔

سورۃ کہف میں ہے۔ فَلَنْ تَسْتَطِیْعَ لَہٗ طَلَبًا (۱۸/۴۱)۔ یہاں طلب کے معنی تلاش کے بعد حاصل کرنے کے ہیں۔ سورہ حج میں اَلطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (۲۲/۷۳) آیا ہے۔ طلب کرنے والا اور جسے طلب کیا جائے۔

---

*تاج و محیط۔ **تاج و راغب۔ نیز ابن فارس۔ ***محیط۔ ****راغب۔

ط ل ح

اَلطَّلْحُ - ابن شمیل نے کہا ھے کہ یہ ایک لمبا درخت ھوتا ھے جس کے سائے میں لوگ بیٹھتے ھیں - اس پر پتے تھوڑے اور کانٹے زیادہ ھوتے ھیں۔ ببول کے درخت جو اونٹوں کے چارے کا کام دیتے ھیں۔ لیکن ابو اسحق نے کہا ھے کہ اس سے مراد کیلے کا درخت ھے - نیز طَلْحٌ بمعنی طَلْعٌ بھی آتا ھے (دیکھئے ط - ل - ع)۔ رَجُلٌ طَالِحٌ - خراب آدمی کو کہتے ھیں جس میں کوئی بھلائی نہ ھو - یہ صَالِحٌ کی ضد ھے - اور بَعِیْرٌ طِلْحٌ - تھکے ماندہ لاغر اونٹ کو کہتے ھیں - لیکن دوسرے معانی کے لحاظ سے اَلطَّلَحُ - نعمت کو کہتے ھیں * - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) ایک قسم کا درخت اور (۲) کمزوری اور لاغری کے ھیں -

قرآن کریم میں جنت کے ذکر میں ھے طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ (۵۶/۲۹)۔ تہ بہ تہ کیلے یا ترتیب سے جمائے ھوئے کیلوں کے درخت۔

ط ل ع

طَلَعَ طُلُوْعًا - نکلنا - ظاھر ھونا (سورج وغیرہ کا) * - (۲۰/۱۳۰)۔ مَطْلَعٌ اور مَطْلِعٌ - طلوع ھونے کی جگہ - (۱۸/۹۰) - یا طلوع ھونے کا وقت - یہ مصدر بھی ھے - یعنی اس کے معنے طلوع ھونا ، اور ظاھر ھونا بھی ھیں- سورۃ قدر میں اس کے معنی طلوع کے وقت کے ھیں (۹۷/۵)۔ طَلَعَ الْجَبَلَ - وہ پہاڑ پر چڑھ گیا - اِطَّلَعَ عَلَی الْاَمْرِ کے معنی ھیں وہ کسی معاملہ سے واقف و باخبر ھوا۔چنانچہ اصمعی نے کہا ھے کہ کبھی مُطَّلَعٌ اُس سیڑھی کو کہتے ھیں جس پر نیچے سے اوپر کی طرف چڑھا جائے *** - اِطَّلَعَ عَلَیْہِ کے معنے ھیں وہ اس کے اوپر پہنچا اور وھاں سے نیچے کی طرف جھانک کر دیکھا، اور مُطَّلِعٌ اس طرح جھانکنے والے کو بھی کہتے ھیں - (۳۷/۵۴-۵۵) -

فراء نے کہا ھے کہ اِطِّلَاعٌ اور بُلُوْغٌ کے ایک ھی معنی ھیں - یعنی کسی تک پہنچنا - (۲۸/۳۸) - تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (۱۰۴/۷) جو دلوں تک پہنچ جاتی ھے - اِطَّلَعَ عَلٰی بَاطِنِہٖ - اس کی اندرونی حالت سے واقف ھو گیا * - اَلتَّطَلُّعُ - بلندی اور سرفرازی کے ساتھ نمودار ھونا * - نَخْلَۃٌ مُطْلِعَۃٌ - وہ کھجور کا درخت جو اپنے ارد گرد کے کھجوروں کے درختوں سے اونچا ھو-** - اَلطَّالِعُ - وہ تیر جو نشانہ سے ھٹ کر اس کے اوپر کی جانب جا کر لگے * - اَطْلَعَہٗ عَلَی الْاَمْرِ - اسے معاملہ سے باخبر کیا (۳/۱۷۸)۔

---

* تاج و محیط - ** محیط - *** تاج

اَلطَّالِعُ ۔ کھجور کے درخت پر غلاف جیسی ایک چیز نکلتی ہے جس کے اندر اس کا خوشہ ہوتا ہے ۔ اس کا ایک سرا نوکیلا ہوتا ہے * ۔ (۵۰/۱۰ - ۳۷/۹۵ - ۲۶/۱۴۸) ۔

ط ل ق

طَلَقَ ۔ آزاد ہو گیا ۔ طَلَقَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ زَوْجِهَا ۔ عورت اپنے شوہر سے جدا ہو گئی ۔ اَطْلَقَ الْاَسِیْرَ ۔ قیدی کو رہا کر دیا ۔ نَاقَةٌ طَالِقٌ ۔ بلا نکیل کے اونٹنی ۔ اَلطَّالِقَةُ ۔ وہ اونٹنی جسے آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ جہاں سے جی چاہے کھانے پئے ۔ اَلطَّلْقُ ۔ ہرن (جو آزاد ہوتا ہے) ۔ نیز وہ اونٹنی جو مقید نہ ہو ۔ لِسَانٌ طَلْقٌ ۔ وَطَلَقٌ ۔ تیز چلنے والی زبان ۔ مُطْلَقٌ ۔ مُقَیَّدٌ کی ضد ہے * ۔ یعنی جو محدود و مقید نہ ہو ۔

سورۃ کہف میں ہے فَانْطَلَقَا (۱۸/۷۱) ۔ وہ دونوں روانہ ہو گئے ۔ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ (۳۸/۶) بڑے بڑے سردار (تیزی سے) کہنے لگے ۔ حضرت موسیٰ ؑ نے اللہ سے کہا تھا کہ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ (۲۶/۱۳) ۔ میری زبان آزادی یا روانی سے نہیں چلیگی ۔ (اس لئے کہ انہیں جنگلوں اور صحراؤں میں رہتے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا یا کم از کم متمدن دنیا سے دور رہتے ہوئے ۔ اسلئے انہیں خیال تھا کہ وہ فرعون کے دربار میں شاید اس روانی اور طلاقت سے گفتگو نہ کر سکیں جس کی وہاں ضرورت تھی) ۔

راغب نے طلاقٌ کے بنیادی معنیٰ کسی بندھن سے آزاد کرنا اور نجات دینا بتائے ہیں ۔ پھر یہ استعارۃً شوہر کا بیوی کو نکاح کے بندھن سے آزاد کرنے کے لئے بولا جاتا ہے (۲/۲۳۰) ۔ طَلَّقَ کے معنی ہیں طلاق دیدینا ۔ (۲/۲۳۷) ۔ مُطَلَّقَةٌ ۔ طلاق دی ہوئی عورت ، اسکی جمع مُطَلَّقٰتٌ ہے (۲/۲۴۱) ۔

قرآن کریم کی رو سے نکاح ایسے معاہدہ کا نام ہے جو بالغ مرد اور عورت کی باہمی رضامندی سے طے پاتا ہے (دیکھئے عنوان ن ۔ ک ۔ ح) اس لئے اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ان کی ازدواجی زندگی ناممکن ہوجائے تو یہ معاہدہ ٹوٹ بھی سکتا ہے ۔ قرآن کریم نے اس کے متعلق تفصیلی احکام دئے ہیں کہ اس معاہدہ کے فسخ ہونے کی کیا کیا صورتیں ہیں اور اس کے لئے طریق کار کیا ہے ۔ لیکن یہ جو ہمارے ہاں رواج ہے کہ مرد نے جب جی چاہا طلاق ۔ طلاق ۔ طلاق ۔ کہدیا اور نکاح ٹوٹ گیا ۔ اور اس کے

* تاج و محیط ۔

بعد اس جوڑے کا باھمی ملاپ نہیں ھو سکتا جب تک یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح (حلالہ) کرکے ایک شب اس سے ھم آغوشی نہ کر لے۔ تو یہ قرآن کریم کے خلاف ھے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ۔ کے قرآنی مفہوم کے لئے عنوان م۔ ر۔ ر، دیکھئے۔ یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ھوگا کہ طلاق کا لفظ اسوقت بولا جائے گا جب میاں بیوی عقد نکاح سے آزاد ھو جائیں۔ طلاق کے ارادے یا اس کے ابتدائی مراحل کو طلاق نہیں کہا جائیگا۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی ضروری ھے کہ لفظ طَلَاقٌ ایک تو طَلَقَ سے مصدر ھے جس کے معنی ھیں آزاد ھو جانا۔ اور دوسرے یہ لفظ طَلَّقَ سے اسم ھے۔ اس اعتبار سے اس کے معنی آزاد کرانا ھونگے۔ قرآن کریم سے معلوم ھوتا ھے کہ عقد نکاح کا فسخ کرنا میاں بیوی کا نجی معاملہ نہیں ھے۔ س کے لئے عدالت کی طرف رجوع کرنا ھوتا ھے۔ اور طلاق کا فیصلہ عدالت کی طرف سے ھوتا ھے۔ اس طرح لفظ طَلَاقٌ کے معنی آزاد کرانا بالکل صحیح بیٹھتے ھیں۔

ط ل ل

اَلطَّلُّ۔ بہت ھلکی سی بارش۔ پھوھار۔ بلکہ اوس جو کھلی فضا میں پڑتی ھے *۔ (۲/۲۶۵)۔ اَلطَّلَالَۃُ۔ سرور۔ خوشی۔ حسن و جمال۔ ترو تازگی۔ زندگی کی خوشگواری *۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) تر و تازگی اور نرمی و نزاکت۔ (۲) جھانکنا اور (۳) کسی چیز کو باطل کر دینا ھیں۔ اور اَلطَّلُّ ھلکی سی بارش کو کہتے ھیں کیونکہ اس سے زمین کو زینت اور تازگی حاصل ھوتی ھے۔

ط م ث

اَلطَّمْثُ۔ چھونا۔ ھٰذَا جَمَلٌ مَا طَمَثَہٗ حَبْلٌ قَطُّ۔ یہ اونٹ ھے جسے رسی نے قطعاً نہیں چھوا۔ طَمَثَ الْمَرْاَۃَ۔ اس نے اس عورت کی بکارت زائل کر دی۔ بعض نے اس کے معنی عام جماع کرنے کے لئے ھیں۔ (عورت کو چھونے سے کنایہ یہی ھوتا ھے)۔ اَلطَّمْثُ تہمت، گندگی، اور فساد کو بھی کہتے ھیں **۔

*تاج۔ ** تاج و محیط و راغب۔

جنتی معاشرہ کی عورتوں کی عفت و عصمت کے ضمن میں کہا ہے کہ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ (۵۵/۵۶)۔ اس سے قبل کسی انسان نے (جن و انس میں سے کسی نے) انہیں چھوا نہیں ہوگا۔ کیسا فردوس آفریں ہے یہ اطمینان کہ جس لڑکی سے میں شادی کر رہا ہوں اسے اس سے پہلے کسی نے نہیں چھوا۔

ط م س

طَمَسَ ۔ مٹ گیا ۔ اس کا نام و نشان باقی نہ رہا ۔ طَمَسْتُهُ طَمْسًا ۔ میں نے اسے مٹا دیا ۔ اس کا نام و نشان تک ختم کر دیا (لازم و متعدی)*۔ سورہ نساء میں ہے قَبْلَ اَنْ نَطْمِسَ وُجُوْهًا (۴/۴۷)۔ قبل اس کے کہ ہم ان کے بڑے بڑے لوگوں کا نام و نشان تک مٹا دیں ۔ انہیں تباہ و برباد کر دیں**۔ سورہ یونس میں ہے ۔ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰى اَمْوَالِهِمْ (۱۰/۸۸)۔ ان کے مال و دولت کو تباہ و برباد کر دے۔

طَمِيْسٌ ۔ مَطْمُوْسٌ ۔ اندھا ، جسے کچھ نظر نہ آئے*۔ سورہ قمر میں قوم لوط سے متعلق ہے ۔ فَطَمَسْنَا اَعْيُنَهُمْ (۵۴/۳۷)۔ سدوم کے آتش فشاں پہاڑوں سے آگ اور گندھک کے دھوئیں کا ایسا طوفان اٹھا کہ اس سے ان کی آنکھیں بیکار ہو گئیں۔ ہو سکتا ہے کہ شدت جذبات سے اندھا ہو جانے کیطرف بھی اشارہ ہو۔ اس لئے کہ بصیرت کے ختم ہو جانے کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے ۔ (دیکھئے ۳۶/۶۶) ۔ سورہ مُرْسَلٰت میں ہے فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ (۷۷/۸) ۔ جب ستاروں کی روشنی جاتی رہیگی ۔

ط م ع

طَمَعٌ ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنے ہوتے ہیں نفس انسانی کا کسی چیز کی طرف خواہش کے ساتھ میلان اور جھکاؤ**۔ اس میں حرص اور امید دونوں پہلو ہوتے ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنے دل میں کسی چیز کی پرزور امید کے ہیں۔ اَلْمَطْمَعُ ۔ وہ چیز جسکی طمع کی جائے۔ جس چیز کی طرف نگاہ کھنچکر چلی جائے* ۔ چنانچہ اس پرندے کو بھی اَلْمَطْمَعُ کہتے ہیں جسے جال کے اوپر رکھ دیا جاتا ہے تا کہ اسے دیکھ کر دوسرے پرندے جال میں پھنس جائیں***۔

*تاج ۔ **راغب ۔ ***لین

قرآن کریم میں یہ لفظ خَوْف* کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۳/۱۲) - خَوْف* - نقصان کے احساس کو کہتے ہیں، اس لئے طَمَع* نفع کی امید ہے - آرزو رکھنے (خواہش کرنے) کے معنوں میں سورۃ معارج میں ہے- اَیَطْمَعُ کُلُّ امْرِیءٍ مِنْھُمْ (۷۰/۳۸) - کیا ان میں سے ہر شخص اسکی آرزو رکھتا ہے؟ اور توقع رکھنے کے معنوں میں - ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ (۷۴/۱۵) - پھر وہ اس کی توقع بھی رکھتا ہے کہ میں اسے زیادہ کرتا جاؤں!

ط م م

طَمَّ الْمَاءُ یَطِمُّ - طَمًّا - پانی نے کسی چیز کو ڈھانپ لیا اور اس کے اوپر چھا گیا - طَمَّ السَّیْلُ الرَّکِیَّۃَ - سیلاب نے کنوئیں کو پاٹ دیا اور برابر کر دیا * - طَمَّ الْبِئْرَ - کنوئیں کو مٹی سے بھر کر برابر کر دیا (ابن فارس) - طَمَّ الطَّائِرُ الشَّجَرَ - پرندہ درخت کے بالائی حصہ پر جا بیٹھا - اَلطِّمُّ - سمندر - بکثرت پانی - اَلطَّامَّۃُ ایسی چیخ کی آواز جو ہر شے پر چھا جائے * -

قرآن کریم میں انقلاب عظیم کے لئے اَلطَّامَّۃُ الْکُبْرٰی (۷۹/۳۴) آیا ہے - یعنی وہ بہت بڑی مصیبت کی گھڑی جو سیلاب کی طرح چھا جائے گی اور سب پر غالب آ جائے گی - مندرجہ بالا معانی کی رو سے اس حادثہ کو بھی طَامَّۃ* کہا جا سکتا ہے جو اونچ نیچ برابر کر دے -

ط م ن (طمأن)

اَلْمُطْمَئِنُّ - ساکن - فِیْہِ تَطَامُنٌ* - اس میں سکون اور وقار ہے ** - سورۃ بقرہ میں ہے کہ حضرت ابراہیم* نے اللہ سے کہا کہ مجھے بتا کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے - اللہ نے کہا کیا تیرا اس پر ایمان نہیں؟ انہوں نے جواب دیا - "بَلٰی" - ایمان تو ہے - وَلٰکِنْ لِیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ (۲/۲۶۰) - ولے میں اپنا اطمینانِ قلب چاہتا ہوں - اس سے (اِطْمِئْنَان*) کا صحیح مفہوم واضح ہو جاتا ہے - یعنی تسکینِ قلب کی وہ کیفیت جو علی وجہ البصیرت حاصل ہو - جو علم و فکر، دلائل و براہان، بلکہ مشاہدہ اور تجربہ کا نتیجہ ہو - یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اطمینانِ قلب کو اِکْرَاہ* کی ضد قرار دیا ہے (۱۶/۱۰۶) - اِکْرَاہ* کے معنے ہیں کسی بات کو زبردستی منوانا - (*دیکھئے عنوان ک - ر - ہ*) *لہٰذا اطمینانِ* قلب کے معنی ہوئے کسی بات کو دل کی پوری رضامندی سے ماننا - اسی سورۃ (النحل) میں ذرا

* تاج - راغب - محیط - **تاج

آگے چل کر آمْنٌ* اور اِطْمِئْنَان* کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ (۱۱۲/۱۶)،
اگرچہ اطمینان کے لئے آمْنٌ* (بے خوفی) کو ضروری شرط قرار دیا گیا ہے(۱۰۳/۴)۔
اس سے ظاہر ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ ملک میں امن ہو تو قلوب کو بھی
اطمینان ہو۔ امن خارجی خطرات سے محفوظ ہونے کا نام ہوگا۔ لیکن
(اِطْمِئْنَان*) اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان اپنی داخلی کشمکش
سے محفوظ ہو، اور یہ چیز فریبِ نفس سے حاصل نہ ہوئی ہو بلکہ علم وحقیقت
کی بنا پر ہو۔ انسانی ذات (نفس) کی بھی وہ کیفیت ہے جسے "جنت کی
زندگی" سے تعبیر کیا گیا ہے (۲۷/۸۹)۔ لیکن اس حقیقت کو ساتھ ہی واضح کردیا
گیا ہے کہ یہ چیز خلوت گاہوں اور خانقاہوں میں حاصل نہیں ہوسکتی۔
یہ معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے حاصل ہوگی۔ اسی لئے ارشاد ہے کہ فَادْخُلِی
فِی عِبَادِی۔ وَادْخُلِی جَنَّتِی (۲۹-۳۰/۸۹)۔ جنت میں داخلہ کی پہلی
شرط یہ ہے کہ انسان "خدا کے بندوں" کے ساتھ شامل ہو۔ اور پھر یہ
سب ملکر قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اَلَا
بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۲۸/۱۳)۔ "اسے اچھی طرح سمجھ رکھو کہ
صحیح اطمینانِ قلب قوانین خداوندی ہی سے نصیب ہوسکتا ہے"۔ (دیکھئے عنوان
ذ۔ ک۔ ر) جہاں سے یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ اللہ کے ذکر سے مراد،
تسبیح پر اللہ۔ اللہ پکارنا یا دل پر ضربیں لگانا، نہیں۔ اس سے مفہوم خدا کے
قانون (قرآن) کو ہر وقت سامنے رکھنا ہے۔ اس کا پہلا نتیجہ رزق کی فراوانی
ہوتا ہے۔ (۱۱۲/۱۶)۔ اگر مقصودِ حیات ہر فرد کا اپنا اپنا اطمینانِ قلب ہو تو
دنیا سے خیر و شر کی تمیز ہی اٹھ جائے۔ ایک ڈاکو یا ٹھگ جب کسی کی
جان لیکر کالی دیوی کے استھان پر مقررہ نذر چڑھا دیتا ہے، یا برھمن بت
کی پوجا کر لیتا ہے تو اسے ایسا اطمینان نصیب ہوجاتا ہے جو ایک خداپرست
کے اطمینان سے کسی طرح بھی کم نہیں ہوتا۔ لہذا مقصد زیست اپنا
اطمینان نہیں (جو بسا اوقات فریب نفس ہوتا ہے)۔ مقصد ایک ایسے معاشرہ
کا قیام ہے جس میں ہر معاملہ عدل و احسان کی رو سے طے ہو اور اس طرح ہر
فرد کو صحیح اطمینان میسر آجائے۔

مُطْمَئِنِّيْنَ (۹۵/۱۷) اطمینان سے سکونت پذیر ہونے والے۔ اقامت پذیر
ہونے والے۔

ط ھ ر

اَلطَّهَارَةُ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز سے نجاست کا دور ہوجانا*۔
ابن فارس نے اس کے معنی ستھرا پن اور میل کچیل کا زائل ہوجانا بتائے

*تاج۔

ہیں۔ صاحب تاج نے کہا ہے کہ طَهَّرَهُ۔ طَحَرَهُ کے معنی میں بھی آتا ہے، اور طَحَرَهُ کے معنی ہیں اَبْعَدَهُ۔ یعنی اسے دور کر دیا۔

قرآن کریم میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا (۳/۵۴)۔ جس کے معنی ہیں خدا تجھے ان لوگوں سے الگ ہٹا کر دور لے جائیگا جو تیری صداقت کا انکار کرتے ہیں۔ یا تیرے خلاف جو اتہام تراشتے ہیں ان سے خدا تجھے بری کر دیگا۔ اسی نہج سے تَطْهِيْرٌ کے معنی کسی شے سے نجاست اور آلائش وغیرہ کو دور کرکے اسے پاک اور صاف کرنا ہیں۔ طَاهِرٌ کے معنی ہیں پاک اور صاف۔ مُطَهَّرَةٌ میں طَاهِرَةٌ سے زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ یعنی بہت زیادہ پاکیزہ۔ طَهُوْرٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے پاکیزگی حاصل کی جائے۔ یا اس کے معنی ہیں وہ چیز جو خود پاک ہو اور دوسری چیزوں کو پاک کر دے۔ (کیونکہ فَعُوْلٌ کے وزن میں فَاعِلٌ کے مقابلہ میں زیادہ مبالغہ اور شدت ہوتی ہے)*۔ چنانچہ قرآن کریم میں بارش کے پانی کو مَاءً طَهُوْرًا (۲۵/۴۸) کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ خود بھی کشید کردہ (لہذا صاف) ہوتا ہے اور ہر شے کو پاک اور صاف کر دیتا ہے۔ طُهْرٌ۔ وہ حالت یا زمانہ جس میں عورت حیض سے پاک ہو۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ عورت جب حیض سے فارغ ہو جائے تو طَهُرَتْ کہا جاتا ہے اور جب اس کے بعد غسل کر لے تو تَطَهَّرَتْ کہا جاتا ہے*۔ چنانچہ قرآن کریم میں جو ہے وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ ...... (۲/۲۲۲) تو اس میں یہی لطیف فرق ہے۔

قرآن کریم میں طَهَارَتٌ کا لفظ صرف جسمانی پاکیزگی کے لئے ہی نہیں استعمال ہوا بلکہ اس میں قلبی اور ذہنی پاکیزگی بھی شامل ہے۔ چنانچہ سورہ المائدہ میں ہے لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ (۵/۴۱)۔ یہ پاکیزگی قلب کی شہادت ہے۔ سورۂ واقعہ میں قرآن کریم کے متعلق ہے کہ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶/۷۹)۔ تو اس سے مراد یہی ہے کہ قرآن کریم کی صداقتوں سے وہی لوگ مس رکھتے ہیں، وہی ان تک پہنچ سکتے ہیں، وہی ان سے باخبر ہو سکتے ہیں*، جن کا ظاہر و باطن پاکیزہ ہو۔ جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ اس کی طرف آئیں۔ جو متوازن دل و دماغ کے مالک ہوں۔ جو اپنے ذہن کو تمام تعصبات سے خالی کرکے اور اپنے دلوں کو تمام ذاتی رحجانات و میلانات سے منزہ رکھ کر اسے سمجھنا

* تاج۔

چاهیں ۔ اگر ذهن پهلے هی سے غیر قرآنی تصورات کی آماجگاہ ہے اور دل ذاتی مفاد پرستیوں سے آلودہ ، تو پھر قرآن کریم کے حقائق سمجھ میں نہیں آسکتے ۔(دیکھئے عنوان م ۔ س ۔ س) ۔ جو لوگ زندگی کی آلودگیوں اور تباہ کاریوں سے بچنے کا احساس رکھتے ہوں انہیں مُتَّقِیْنَ کہا جاتا ہے ۔ اور قرآن کریم مُتَّقِیْنَ هی کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے ۔(هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۲/۲) اس کی بنیادی شرط ہے ۔

رَجُلٌ طَاهِرُ الثِّیَابِ ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو نہایت پاکیزہ نفس ہو* ۔ کیونکہ عرب عام طور پر ثِیَابٌ کا لفظ انسانی ذات یا شخصیت کے لئے بولتے ہیں * ۔ اس لئے وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ (۷۴/۴) کے معنی ہونگے ، اپنی ذات کو تمام پست خیالات سے بلند کرکے پاکیزگی قلب و نگاہ کا پیکر بناؤ ۔ اور اگر ثِیَابٌ کے معنی دعوت کے لئے جائیں تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اپنی اس انقلابی دعوت کو تمام ایسے لوگوں سے دور رکھو جن کے قلب ودماغ پاکیزہ نہیں ۔ اس جماعت میں وهی لوگ شامل ہو سکتے ہیں جو اپنے دل اور دماغ کو تمام غیر خدائی تصورات سے پاک اور صاف رکھیں ۔ نیز اس دعوت میں نظری طور پر بھی کوئی غلط تصور شامل نہ ہونے پائے ۔ (ثِیَابٌ کے معانی کے لئے ث ۔ و ۔ ب کا عنوان دیکھئے) ۔

سورۂ احزاب میں رسول اللہ ؐ کے اہل خانہ کے متعلق ہے وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا(۳۳/۳۳) ۔ خدا تمہیں ہر قسم کے الزامات سے دور رکھے گا اور قلب و نظر کی پاکیزگی عطا کریگا ۔

جنتی معاشرہ کے پاکیزہ سیرت اور تربیت یافتہ هم نشینوں کو اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (۲/۲۵) کہا گیا ہے ۔ اس میں بیویاں بھی شامل ہیں اور دوسرے رفقائے کار بھی ۔ (دیکھئے عنوان ز ۔ و ۔ ج) ۔

ط و د

اَلطَّوْدُ ۔ بلند پہاڑ ۔ ریت کا اونچا ٹیلہ ۔ اَلطَّادُ ۔ بوجھل اور جمی ہوئی چیز جو اپنی جگہ پر محکم ہو ۔ طَادَ الشَّیْءُ ۔ وہ چیز ایک جگہ پر جم گئی ۔ بِنَاءٌ مُّنْطَادٌ ۔ بلند عمارت ** ۔

قرآن کریم میں کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ (۲۶/۶۳) آیا ہے ۔ یعنی بڑے تودہ (یا ٹیلہ) کی طرح ۔

* محیط ۔ ** تاج و راغب ۔

ط و ر

اَلطُّوْرٌ - سر سبز پہاڑ - اگر پہاڑ سرسبز نہ ہو تو اسے طُوْرٌ نہیں کہتے * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے لمبا ہونے اور بڑھنے کے ہیں خواہ وہ زمان سے متعلق ہو یا مکان سے - اور پہاڑ کو طُوْرٌ اس کے طول ، عرض اور بلندی میں پھیلنے اور بڑھنے کی وجہ سے کہتے ہیں - اَلطُّوْرٌ - اَیْلَہْ کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے جو سَیْنَاء یا سِیْنِیْنَ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے * - (۲۳/۲۰ ; ۹۵/۲) - دعوتِ حضرت موسیٰؑ کی ابتدا وہیں سے ہوئی تھی - اسی (طُوْرٌ) کے دامن میں بنی اسرائیل سے اس دعوت پر ایمان کا عہد لیا گیا تھا (۲/۶۳) - اَلطَّوْرٌ - بار - دفعہ - مرتبہ - طَوْرًا بَعْدَ طَوْرٍ - ایک بار کے بعد دوسری بار - دوسری مرتبہ - یا دوسری دفعہ - نیز جو کسی چیز کے بالمقابل یا اس کے برابر ہو - طُوْرٌ بھی اس معنی میں آتا ہے - اَطْوَارٌ - مختلف حدود یا اقسام - مختلف مدارج و احوال یا اندازے *- قرآن کریم میں ہے قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (۷۱/۱۴) - خدا نے تمہیں مختلف ارتقائی منازل میں سے گذار کر انسانی منزل تک پہنچایا ہے - تمہاری تخلیق مختلف احوال ومدارج سے گذر کر ہوئی ہے - یا تمہیں مختلف احوال میں پیدا کیا ہے - طَارَ بِہٖ (یَطُوْرُ) کے معنی قریب ہونا ہیں **-

ط و ع

طَاعَ کے معنے ہوتے ہیں کسی شے کا وسیع ہو جانا - طَاعَ لَہٗ الْمَرْتَعُ - چراگاہ اس کے لئے وسیع ہو گئی اور وہ جہاں سے اس کا جی چاہا چر سکا * - اس سے '' اطاعت ،، کا بنیادی مفہوم سامنے آ جاتا ہے - یعنی دل کی کشاد سے کسی کام کا کرنا - چنانچہ قرآن کریم میں طَوْعًا کے مقابلہ میں كَرْهًا (۳/۸۳) نے اس حقیقت کو واضح کردیا - كَرْهًا کے معنی ہیں کسی کام کو ناگواری اور دل کے جبر سے کرنا - لہذا طَوْعًا کے معنے ہوئے کسی کام کو بطیبِ خاطر ، دل کی کشاد اور پسندیدگی سے کرنا - اسی لئے اَطَاعَ النَّخْلُ کے معنے ہوتے ہیں کھجوریں پک گئیں *- (اب انہیں زور لگا کر توڑنا نہیں پڑیگا - وہ ٹوٹنے کے لئے خود ہی آمادہ ہیں) - اَطَاعَ - کسی کے حکم کی بطیب خاطر تعمیل کرنا - اور طَاوَعَہٗ اس کی موافقت کرنا * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی کے ساتھ لگنے اور تابعدار ہو جانے کے ہیں -

---

* تاج - ** محیط -

اِسْتَطَاعَ - راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں کسی کام کے کرنے کے لئے جن قوتوں ، صلاحیتوں اور اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے ان سب کا موجود ہونا - اگر ان میں سے کوئی چیز ہے اور کوئی نہیں تو اسے صرف ایک حیثیت سے مُسْتَطِیْعٌ کہا جائیگا* -

سورۃ بقرہ میں ہے - وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا (۲/۱۵۸) - اس کے معنے ہیں تھوڑی سی تکلیف اٹھا کر عمل خیر کرنا - اس میں دل کی رضامندی توبہرحال ہوگی لیکن اس میں اگر تھوڑی سی مشقت بھی اٹھانی پڑے (جو قابل برداشت ہو) تو ایسا عمل خیر بھی کر لینا چاہئیے (۲/۱۸۴) - سورۃ النحل میں غیر خدائی قوتوں کے متعلق ہے لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ (۱۶/۷۳) - اس کے معنی صاحب اقتدار و اختیار کے ہیں - یعنی کسی کام کو پورا کرنے کے لئے جن قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں نہیں ہیں - سورۃ بقرہ میں ہے یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (۲/۲۱۷) - اگر ان کے اختیار میں ہو تو وہ تمہیں تمہارے دین سے پھرا دیں - سورۃ مائدہ میں ہے فَطَوَّعَتْ لَہٗ نَفْسُہٗ (۵/۳۰) - اس کے جذبات نے اسے اس امر پر آمادہ کر لیا ، یا راضی کر لیا -

قرآن کریم میں قوانین خداوندی کی اِطَاعَۃٌ پر زور دیا گیا ہے - درحقیقت سارے قرآن کی تعلیم کا منشا ہی یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی اطاعت کی جائے - اطاعت کے معنی ہم دیکھ چکے ہیں - یعنی کسی کام کو دل کی پوری پوری رضامندی،وسعت اور کشادگی سے کرنا - ظاہر ہے کہ اس قسم کی اطاعت کسی مستبد حاکم کی فرمانبرداری نہیں، بلکہ اپنے دل کی مرضی سے خود اختیار کردہ حدود و قیود(Self-imposed Restrictions) کی پابندی ہے - (اسی کو اسْلَامٌ کہتے ہیں) - یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کی اطاعت نہ زبردستی کرائی جا سکتی ہے نہ اندھے، طور پر کی جا سکتی ہے - اسی لئیے قرآن کریم نے کتاب (قانون) کے ساتھ حِکْمَتٌ (اسکی علت غائی - اس کے نتائج) کو بھی خود ہی واضح کر دیا ہے تاکہ ہر شخص علٰی وجہ البصیرت دیکھ لے کہ ان حدود کی پابندی میں کیا کیا فوائد مضمر ہیں اور اس کے بعد اپنے دل کی پوری رضامندی سے ان پر عمل پیرا ہو جائے - یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن کے مطابق قرآن،نظام خداوندی قائم کراتا ہے - یعنی اس جماعت کے ہاتھوں جس کے افراد ، دل کی پوری کشاد کے ساتھ، علٰی وجہ البصیرت،اس نظام کے نتائج سےمتفق ہوں اور کامل رضامندی سے اس کے قیام

*تاج -

و استحکام کے لئے کوشاں ۔ یہ ہے اطاعت کا صحیح مفہوم ۔ یعنی پکے ہوئے پھل کی طرح خود بخود کسی کی جھولی میں گر پڑنا ، نہ کہ اسے کھسوٹ کر حاصل کرنا ۔ اس کے مقابل میں تَوَلّٰی کا لفظ آیا ہے (۳۱/۳) ۔ یعنی منہ موڑ لینا یا گریز کی راہیں نکالنا ۔ اصل یہ ہے کہ اگر کسی کام کے کرنے میں ذرا سا بھی تردد ۔ تامل ۔ تذبذب ۔ ہچکچاہٹ ۔ یا کبیدگی خاطر ہو تو اسے اطاعت نہیں کہینگے، کیونکہ اطاعت کی بنیاد میں دل کی رضامندی شامل ہے ۔ (۴/۶۵) اطاعت کی جاتی ہے ، کرائی نہیں جاتی ۔ نا دانستہ یا لغزش سے کسی حکم کی خلاف ورزی اور بات ہے، لیکن جو شخص دل کی رضامندی سے نظام خداوندی (اسلام) میں نہ رہنا چاہے اُسے زبردستی نہیں رکھا جا سکتا ۔ نہ ہی کسی کو اسکے اندر زبردستی لایا جاسکتا ہے ۔ اس لئے دین میں اکراہ نہیں (۲/۲۵۶)۔ جو لوگ بطیب خاطر اس نظام کو قبول نہ کریں، وہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت سے رہیں گے ۔ انہیں تمام حقوق انسانیت حاصل ہوں گے لیکن اس نظام میں ان کا کوئی عمل دخل نہ ہوگا۔

مُطَاعٍ (۸۱/۲۱)۔ جس کی اطاعت کی جائے ۔ مُطَّوِّعٌ (۹/۷۹) جو دل کی کشاد سے کسی کام میں لگ جائے ۔

سورۃ مائدہ میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے کہا هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً (۵/۱۱۲) ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں کیا خدا ہماری اس عرض کو قبول کر لے گا ؟ اس کی تائید میں سورۃ مومن کی یہ آیت لکھی ہے مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (۴۰/۱۸) ۔ یعنی ایسا جس کی بات مانی جاسکے ۔

سورۃ کہف میں اِسْطَاعَ بجائے اِسْتَطَاعَ آیا ہے (۱۸/۹۷) ۔

ط و ف

طَوْفٌ کے معنی گھومنے اور چکر لگانے کے ہیں ۔ طَافَ ۔ اِسْتَطَافَ ۔ تَطَوَّفَ ۔ طَوَّفَ ۔ گھومنا ۔ چکر لگانا* ۔ کسی چیز کے ارد گرد بکثرت چلنا** ۔ اَلْمَطَافُ ۔ گھومنے کی جگہ ۔ اَلطَّائِفُ ۔ چوکیدار یا کوتوال جو رات کو حفاظت کے لئے پہرہ دے ۔ (یہ لفظ اگرچہ واحد ہے لیکن جمع کے لئے بھی آتا ہے)* ۔ ابن فارس نے بھی اس کے یہ معنی لکھے ہیں ۔ اَلطَّائِفَةُ ۔ کسی چیز کا ٹکڑہ ۔ لوگوں کی جماعت جو ہم آہنگیِ فکر وخیال یا اشتراک مذہب کی بناء پر متحد ہو اور اس سبب سے دوسروں سے ممتاز ہو** ۔ ابن فارس نے

* تاج ۔ ** محیط ۔

لکھا ہے کہ عرب طائفۃ کو کسی معین تعداد میں محدود نہیں کرتے تھے۔ نیز وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ بہرحال اس سے تھوڑی اور معمولی مقدار یا تعداد ہی مراد لی جاتی ہے۔ اَلطَّوَّافُ ۔ ایسا خادم جو نہایت نرمی اور عنایت سے خدمت کرے**۔ اَلطُّوْفَانُ ۔ ہمہ گیر موت ، وہ مصیبت یا حادثہ جو قوم کو چاروں طرف سے گھیر لے اور ہر شے پر چھا جائے، مثلاً غرقابی ، قتل و غارتگری ، بارش جو زور دار ہونے کی وجہ سے بستیوں کو بہا لے جائے ۔ نیز رات کی سخت تاریکی *۔ قرآن کریم میں قوم حضرت نوحؑ کے متعلق ہے فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ (۲۹/۱۴) انہیں طوفان نے آپکڑا ۔

طَافَ ۔ يَطُوْفُ کے معنی رفع حاجت کے لئے جانا بھی ہیں *۔

قرآن کریم میں ہے يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ (۳۷/۴۵) ۔ ان پر دور جام چلایا جائیگا۔ سورہ نور میں ہے طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۲۴/۵۸) ۔ وہ تمہارے ارد گرد پھرتے پھراتے رہتے ہیں ۔ سورہ القلم میں ہے ۔ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ (۶۸/۱۹) تیرے رب کی طرف سے ایک آفت ان پر پھر گئی ۔ ایک مصیبت طاری ہو گئی ۔ ایک حادثہ نے انہیں گھیر لیا ۔ سورہ اعرف میں ہے طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ (۷/۲۰۱)۔اس کے معنی ہیں سرکش جذبات کا کوئی خیال جو یونہی گھومتے گھماتے ذہن میں آجائے ۔ طَآئِفَةٌ ۔ گروہ اور جماعت کے معنوں میں (۳/۱۲۱) میں آیا ہے ۔

سورہ بقرہ میں ہے کہ خانہ کعبہ طَآئِفِيْنَ اور عٰكِفِيْنَ کے لئے مرکزی مقام ہے (۲/۱۲۵) ۔ طَآئِفِيْنَ کے معنی ہیں نوع انسانی کے چوکیدار۔ وہ لوگ جو انسانیت کے حقوق کی حفاظت کرنے والے ہوں ۔ اور عٰكِفِيْنَ کے معنی ہیں وہ جماعت جو نوع انسانی کے شیرازہ کو بکھرنے نہ دے ، بلکہ اسے ایک رشتہ میں پروئے رکھے ۔ ان کے معاملات کو درست رکھے ۔ دنیا کے نظم و نسق میں درستگی اور آراستگی پیدا کرے (دیکھئے عنوان ع۔ک۔ف)۔ قرآن کریم نے امت اسلامیہ (جماعت مومنین) کو ایک بین الاقوامی امت قرار دیا ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کے احوال و کوائف اور اعمال و افعال کی نگرانی کرے اور ان کے معاملات کو درست رکھے ۔ اس مقصد کے لئے وہ جس نظام کی تشکیل کرتے ہیں اس کا مرکز کعبہ کو قرار دیا ہے (۲/۱۴۳) ۔ لہذا اس نظام کو قائم کرنے والی جماعت ، طَآئِفِيْنَ کی جماعت ہے۔ یعنی نوع انسانی کی چوکیداری کرنے والی ۔ حقوق انسانیت کی حفاظت کرنے والی ۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم ؑ نے

*تاج ۔ ** محیط ۔

خدا سے پوچھا کہ ان کی اولاد میں بھی خانہ کعبہ کی تولیت (اور نوع انسانی کی امامت) کا منصب جاری رهیگا تو ان سے کہدیا کہ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ ($\frac{۲}{۱۲۴}$) - جو لوگ حقوق انسانیت میں کمی کرینگے وہ اس منصب کے اهل نہیں رهینگے -

یہ ہے طواف کعبہ کا صحیح مفہوم جس کی تمثیلی شکل (Symbolical Form) خانہ کعبہ کے گرد گھوم کر اس فریضہ کی یاد تازہ کرنا ہے - جس طرح صلٰوۃ کے اجتماعات میں رکوع وسجود اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ ہم قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں اور اس کے سوا اور کسی کے آئین و قانون کے سامنے نہیں جھکتے ، اسی طرح حج کے ان مناسک سے مراد یہ ہے کہ ہمارا یہ اجتماع ، نوع انسان کی حفاظت کے لئے نظام خداوندی کا عملی نشان ہے -

ط و ق

اَلطَّوْقُ - وہ حلقہ جسے گردن میں ڈال دیا جائے - ہر وہ چیز جو کسی کو اپنے گھیرے میں لے لے - راغب نے کہا ہے کہ دراصل طَوْق اس حلقہ کو کہتے ہیں جو پیدائشی طور پر گردن میں بنا ہوتا ہے، جیسے قمری کی گردن کا حلقہ - یا مصنوعی حلقہ ، جیسے سونے چاندی کا گلے میں ڈالا جانے والا حلقہ ہوتا ہے - تَطَوَّقَ - طوق پہن لینا * - طَوَّقَ گردن میں طوق پہنانا - ($\frac{۳}{۱۷۹}$)

اَلطَّاقَةُ - صاحب تاج العروس ، صاحب محیط ، راغب اور اقرب الموارد اس پر متفق ہیں کہ اَلطَّاقَةُ اس قوت کا نام ہے جس سے کوئی کام بہ مشقت کیا جاسکے - یعنی وہ کام اس پر اتنا شاق گذرے جیسے کسی نے اس کی گردن میں طوق ڈال دیا ہو - اسی سے انہوں نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں آیا ہے کہ لَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ($\frac{۲}{۲۸۶}$) - تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم پر ایسی ذمہ داری نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم میں قدرت ہی نہ ہو - اس کے معنی ہیں ایسے کام جنہیں ہم بہ مشقت کرسکیں - جن کا کرنا ہمارے لئے دشوار ہو** -

روزوں کے احکام کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے - وَعَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ ($\frac{۲}{۱۸۴}$) - اس کے عام طور پر

* تاج - ** تاج - محیط - راغب -

معنی یہ کئے جاتے ہیں کہ جن لوگوں کو (روزہ رکھنے یا فدیہ دینے کی) طاقت ہو وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ اس کا فدیہ دیدیں ۔ یہ معنی بالبداہت غلط ہیں ۔ اگر وہ لوگ جنہیں روزہ رکھنے کی طاقت ہے یا جو فدیہ دے سکتے ہیں روزہ سے مستثنیٰ ہیں تو پھر روزہ کن پر فرض ہے ؟ کیا انہی پر جو روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں یا اتنے غریب ہوں کہ فدیہ بھی نہ دے سکیں ؟

اس کے صحیح معنی یہ ہیں کہ جو لوگ بہ مشقت روزہ رکھ سکیں وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ اس کے بدلے میں فدیہ دیدیں ۔ اس لئے کہ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (۲/۱۸۵) ۔ خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے، مشقتیں نہیں چاہتا ۔

اس آیت کی تفسیر میں صاحب المنار نے لکھا ہے کہ عرب أَطَاقَ الشَّيْئَ اسوقت کہتے ہیں جب قوت اتنی کم ہو کہ اسکی وجہ سے کسی کام کے کرنے میں شدید مشقت کا متحمل ہونا پڑے ۔ اَلَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد ہیں ضعیف ۔ بوڑھے ۔ وہ اپاہج جن کے امراض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو ۔ وہ کاریگر یا مزدور جن کی ہمیشہ کی معاش مشقت انگیز کاموں میں ہو ۔ نیز وہ مجرم جنہیں مشقت کے کاموں پر لگایا جائے ۔ ان لوگوں پر جب روزہ رکھنا شاق ہو اور وہ فدیہ دے سکیں تو وہ اس حکم میں داخل ہیں * ۔ اس آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ (۲/۱۸۴) ۔ جو شخص قابل برداشت مشقت سے نیک کام کرے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے ۔ اس میں يُطِيْقُوْنَ اور تَطَوَّعَ کا فرق قابل غور ہے ۔ یطیقون سے مراد سخت مشقت ہے اور تطوع سے مراد ایسی اطاعت جس میں ذرا سی تکلیف کا پہلو ہو ، (دیکھئے عنوان ط ۔ و ۔ ع)

ط و ل

طَالَ ۔ يَطُوْلُ ۔ طُوْلًا ۔ دراز ہونا ۔ لمبا ہونا ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلطِّوَلُ رسی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ لمبی ہوتی ہے ۔ أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ (۲۰/۸۶) ۔ وہ عہد جو تم نے مجھ سے کیا تھا ، کیا اس پر بہت لمبا عرصہ گذر گیا جو تم نے سمجھ لیا کہ اب اس پر قائم رہنے کی کیا ضرورت ہے ؟ اس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ کیا مجھے تم سے گئے ہوئے اتنا لمبا عرصہ گذر گیا تھا ؟ یعنی عہد کے معنی زمانہ کے بھی ہوسکتے ہیں

* تفسیر المنار ج/۲ صفحہ ۱۵۶ ** تاج ۔

طَوْلٌ* ۔ وسعت ۔ فراخی ۔ خوش حالی ۔ استطاعت * ۔(۲۵/۴) ۔ نیز قوت ۔ طاقت * ۔(۴۰/۳) ۔ تَطَاوَلَ ۔ لمبا عرصہ گذر جانا (۲۸/۴۵) ۔ سورہ بنی اسرائیل میں پہاڑ کی اونچائی کے لئے یہی لفظ طُوْلًا آیا ہے (۱۷/۳۷)۔

ط و ی

طَوَى الصَّحِيْفَةَ يَطْوِيْهَا طَيًّا ۔ اس نے صحیفہ کو لپیٹ دیا ۔ اِطَّوٰى ۔ وَ انْطَوٰى ۔ وہ لپیٹ گیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ مجازاً کہتے ہیں طَوٰى عَنِّي الْحَدِيْثَ وَالسِّرَّ ۔ یعنی اس نے مجھ سے بات اور راز کو چھپایا ۔ نیز طَوَى الْبِلَادَ طَيًّا ۔ اس نے شہروں کی مسافت کو قطع کیا۔ یعنی راستوں کو لپیٹا۔ نیز طَوَى اللّٰهُ الْبُعْدَ لَنَا ۔ خدا نے ہمارے لئے مسافت کو سمیٹ کر دوری کو قریب کر دیا * ۔ اَلطِّيَّةُ ۔ نیت اور مقصد ۔ لپیٹنے کی ہئیت ۔ منزلِ مقصود ** ۔ طَوَى اللّٰهُ عُمْرَهٗ ۔ خدا نے اس کی عمر ختم کر دی ۔ اس کی مدت عمر کو لپیٹ دیا ** ۔

سورة انبیاء میں ہے يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (۲۱/۱۰۴) ۔ جس دن ہم سَمَآء کو لپیٹ دیں گے جس طرح لکھے ہوئے کاغذوں کا طومار لپیٹ دیا جاتا ہے ۔ اور سورۃ الزمر میں ہے وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ (۳۹/۶۷) ۔ اس دن (یوم القیٰمة) میں اَرْض سب کی سب اللہ کے قبضہ میں ہوگی ۔ اور سَمَاوَات بھی اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے ۔ ان دونوں مقامات کے ملانے سے بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جب قرآن کے قوانین کے مطابق انسانی معاشرہ متشکل ہوگا تو اس انقلابی دور میں معاشی ذرائع اوراخلاقی اقدار (اَرْض اور سَمَآء) دونوں کا مرکز ایک ہی ہوگا ۔ یہ دونوں ایک ہی مرکز کے کنٹرول میں ہونگے ۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ معاشی ذرائع ایسے نظام کے ہاتھوں میں ہیں جس نے اخلاقی اقدار کو الگ رکھ چھوڑا ہے ۔ لیکن اس دور میں یہ دونوں یک جا ہو جائیں گے اوراس طرح توحید عملاً متشکل ہو جائے گی ۔ اسی لئے اس کے بعد کہا ہے کہ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۳۹/۶۷) ۔ یہ لوگ جو معاشی نظام اور اخلاقی اقدار کو الگ الگ رکھکر عملاً شرک کرتے ہیں،خدا ان سے بہت دور اوربہت بلند ہے ۔ لیکن اگر یوم القیمة سے مراد دنیا کا طبعی انجام لیا جائے تو ارض و سماء سے مراد طبعی کائنات لی جائیگی ۔

* تاج ۔ ** محیط ۔

سورۃ "طٰہٰ" میں ھے کہ جب حضرت موسیٰ[4] کو نبوت سے سرفراز کئے جانے کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اِنَّکَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّس اس سے عقلی طریق تحقیق اور وحی کے عمل انکشاف کا فرق نکھر کر سامنے "طوی" (۲۰/۱۲)۔ آجاتا ھے ۔ عقلی طریق تجرباتی ھوتا ھے جس میں مسافت بڑی لمبی ھوتی ھے۔ لیکن وحی اس مسافت کو لپیٹ کر راستے کو بہت مختصر کردیتی ھے۔ اقبال کے الفاظ میں (It Economises Human Efforts) - عقل کی راھیں بڑی پرپیچ و خم ھوتی ھیں - وحی صراط مستقیم کے ذریعے سیدھے منزل تک لے جاتی ھے - عقل کے تجرباتی طریق سے مطلب یہ ھے کہ (مثلاً) آپ کے سامنے کوئی معاملہ آتا ھے ۔ آپ اس کا ایک حل تجویز کر کے اس پر عمل پیرا ھو جاتے ھیں - اس تجربہ میں کافی وقت صرف ھوتا ھے ۔ محنت بھی کرنی پڑتی ھے ۔ ایک مدت کے بعد جب نتیجہ سامنے آتا ھے تو معلوم ھوتا ھے کہ تجربہ ناکام رھا ، وہ حل غلط تھا ۔ آپ پھر دوسرا تجربہ شروع کر دیتے ھیں وقس علیٰ ھذا ۔ اس طرح عقل کے تجرباتی طریق سے آپ کی مسافت بڑی لمبی ھو جاتی ھے ۔ لیکن وحی شروع ھی میں آپ کے سامنے صحیح حل رکھ دیتی ھے اور اس طرح آپ کو ان تمام ناکام تجارب سے بچا لیتی ھے جو آپ کو عقل کے طریق کار کی رو سے کرنے تھے ۔ اس طرح سفر حیات میں آپ کی مسافت بہت مختصر ھو جاتی ھے ۔ نبی کے سامنے حقیقت اپنے آپ کو خود بخود منکشف کر دیتی ھے ۔ اس طرح تلاش حقیقت میں اس کی مسافتیں سمٹ جاتی ھیں ۔ لہذا نبوت سے سرفرازی کے معنی یہ ھیں کہ نبی سے عقلی تجربات کے لمبے راستوں کو چھڑا کر اسے ''الوادالمقدس طوی'' میں پہنچا دیا جاتا ھے۔ جہاں مسافتیں لپیٹ کر رکھ دی جاتی ھیں ۔ اس اعتبار سے اس وادی کو "طوی" کہا گیا ھے ۔ راغب نے بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ھے اس نے یہ بھی لکھا ھے کہ اگر "طویٰ" (کو "نُوْدِیَ" کے ساتھ ملا دیا جائے جو اس سے پہلی آیت میں ھے تو اس کے) معنے یہ ھوں گے کہ میں نے موسیٰ کو دو مرتبہ پکارا ۔ یا پھر یہ کہ اس وادی کو دوبار مقدس بنایا گیا ھے ۔ لیکن یہ معنی کچھ دور ازکار سے ھیں ۔

ط ی ب

طَیِّب* ۔ راغب نے کہا ھے کہ اس کے اصل معنی ھیں وہ چیز جس سے انسان کے حواس بھی لذت یاب ھوں اور نفس بھی * ۔ یعنی ھر وہ چیز جو

---

* راغب ۔

دیکھنے ، سننے ، سونگھنے ، کھانے میں بھی پسندیدہ ہو اور اس سے انسانی نفس بھی کیف اندوز ہو۔ اَلْاَطَایِبُ اور اَلْمَطَایِبُ ۔ پسندیدہ اور بہترین چیزیں ۔ اَلطُّوْبٰی ۔ یہ مصدر بھی ہوسکتا ہے اور اَطْیَبُ کا مؤنث بھی۔ معنی ہیں بہت زیادہ پسندیدہ اور دائمی خوش حالی کی زندگی۔ خوش بختی۔ طَعَامٌ طَیِّبٌ ۔ وہ کھانا جو حلق میں سہولت سے اتر جائے ۔ مَاءٌ طَیِّبٌ ۔ خوشگوار پانی ۔ اَلطَّیِّبُ ۔ خوشبو* ۔

طَابَتِ الْاَرْضُ طِیْبًا ۔ زمین زرخیز ہو گئی ۔ اس پر گھاس اُگ آئی *۔ قرآن کریم میں ہے وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (۷/۵۸) زرخیز زمین سے خدا کے قانون کے مطابق سبزی اُگتی ہے ۔ اس کے مقابلہ میں خَبِیْثٌ کا لفظ آتا ہے ۔ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا ۔(۷/۵۸) ۔ اورجو زمین نکمی ہو اس میں (اول تو سبزہ پیدا ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے) تو بہت تھوڑا ۔ یہاں سے طَیِّبٌ اور خَبِیْثٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ اسی طرح سورہ ابراہیم میں شَجَرَۃٌ طَیِّبَۃٌ کی تعریف یہ بتائی گئی ہے کہ اسکی جڑیں زمین میں مضبوط ہوتی ہیں اور شاخیں فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی ۔ اور وہ ہمیشہ ثمربار رہتا ہے ۔ اس کے برعکس شَجَرَۃٌ خَبِیْثَۃٌ وہ ہے جس کی جڑیں زمین کے اوپر ہی اوپر ہوں اور ذرا سا جھٹکا اسے اکھا ڑ پھینکے (۱۴/۲۴،۲۶) ۔

سورہ سبا میں بَلْدَۃٌ طَیِّبَۃٌ (۳۴/۱۵) اس شہر کو کہا گیا ہے جس کے دائیں بائیں باغات ہوں اور اس میں سامان رزق کی فراوانی ہو۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جب قرآن کریم نے کہا ہے کہ ہم مومنین کو حَیٰوۃً طَیِّبَۃً (۱۶/۹۷) عطا کرتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے ۔ یعنی ایسی زندگی جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں نصیب ہوں ۔ جس میں انہیں تمام عمدہ اور پسندیدہ چیزیں بافراط میسر ہوں ۔ ایسی چیزیں جن سے حواس اور دل دونوں لذت یاب ہوں ۔

حلت و حرمت کے متعلق قرآن کریم نے اصول یہ بیان کیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز حلال ہے بجز ان کے جنہیں قرآن کریم نے حرام قراردیدیا ہے ۔ لیکن اس نے حلال کے ساتھ طَیِّبٌ کا بھی اضافہ کیا ہے (کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۔ ۲/۱۶۸) ۔ یعنی حلال چیزوں میں سے جو چیزیں تمہیں خوشگوار اور پسندیدہ ہوں وہ کھاؤ۔ لہذا ان چیزوں کو چھوڑ کر

* تاج ۔

جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے ، دنیا کی ہر خوشگوار چیز سے متمتع ہوا جا سکتا ہے ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ نہ تو کوئی شخص کسی حلال شے کو حرام قرار دے سکتا ہے اور نہ ہی اسے مجبور کر سکتا ہے کہ وہ ہر حلال شے کو بالضرور کھائے ۔ اگر کوئی حلال شے کسی کو مرغوب نہیں یا نقصان دہ ہے تو اس کے لئے کسی قسم کی مجبوری نہیں کہ وہ اسے ضرور کھائے ۔ وہ جس چیز کو خوشگوار سمجھے اسے کھائے ۔ اس معاملہ میں نہ خدا کی طرف سے کوئی جبر ہے نہ کسی انسان کی طرف سے کوئی جبر ہونا چاہئے ۔

فَعَلْتُ بِطِيْبَةِ نَفْسِي کے معنی ہیں میں نے اسے کسی خارجی جبر و اکراہ کے بغیر اپنی مرضی سے کیا ہے *۔ سورہ نساء میں ہے فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ (۴/۳)۔ جن عورتوں کا ذکر پہلے آچکا ہے ان میں سے اپنی پسند کے مطابق (جو تمہیں خوش آئند نظر آئیں) اپنے نکاح میں لاؤ۔ نکاح کے لئے پسندیدگی اور دل کی رضامندی ضروری ہے ۔ رضامندی (دل کی خوشی) کے معنوں میں اس سے ذرا آگے ہے ۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ (۴/۴) وہ اگر دل کی رضامندی سے تمہارے لئے کچھ چھوڑ دیں ۔ سورہ آل عمران میں ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (۳/۳۸) کہا گیا ہے ۔ ایسی اولاد جو دل و دماغ ، اخلاق و اطوار اور جسمانی صحت ہر لحاظ سے خوش آئند ، اور ماں باپ کے لئے سکون قلب کا باعث ہو ۔

مومنین کی کامرانی کے متعلق کہا گیا ہے طُوْبٰى لَهُمْ (۱۳/۲۹) ۔ ان کے لئے ہر قسم کی خوشگواریاں اور سعادتمندیاں ہیں ۔ کتنا جامع ہے یہ لفظ جس میں جنت کی ساری وسعتیں سمٹ کر آ گئی ہیں ۔

ط ی ر

طَارَ ۔ يَطِيْرُ طَيَرَانًا ۔ پرندہ کا اپنے پروں کے ساتھ ہوا میں حرکت کرنا ۔ اڑنا (۶/۳۸) ۔ اَطَارَهُ ۔ طَيَّرَهُ ۔ اڑا دینا ۔ یا کسی کو لے اڑنا ۔ اَلطَّيْرُ ۔ طَائِرٌ کی جمع ہے لیکن اس کا اطلاق واحد پر بھی ہو جاتا ہے (۳/۴۸) ۔ جمع کے طور پر یہ لفظ (۶/۱۹) میں آیا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ہوا میں ہلکا ہونے کے ہیں ۔ اس کے بعد استعارۃً اس کا استعمال ہر تیزی کے لئے ہوتا ہے ۔ اِسْتَطَارَ ۔ کسی چیز کا متفرق اور منتشر ہو جانا *۔ اَلْمُسْتَطِيْرُ ۔ بلند اور منتشر ۔ ہوا میں تیزی کے ساتھ پھیلنے والا ۔ جس سے ساری فضا متاثر ہو چکی ہو ۔ (۷۶/۷)۔ اَلطَّائِرُ ۔ دماغ ۔ ہر

* تاج ۔

چیز جس سے نیک یا بد شگون لیا جائے*۔ دماغ کی رعایت سے مجازاً اس کے معنی بلند پرواز انسان کے لئے جاسکتے ہیں ۔ چنانچہ سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے کہا کہ اِنِّیْ اَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ ..... (۳/۴۸) ۔ اس کے لفظی معنی ہیں ''میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی مانند بناتا ہوں'' ۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں تمہارے لئے اسی آب و گل سے ایسے نظام نو کی تخلیق کرونگا جس سے تم اپنی اس موجودہ پستی (خاک نشینی) سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں بال کشا ہو جاؤ گے اور اس طرح تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ہو جائینگی ۔ (آپ اناجیل میں دیکھئے ۔ حضرت مسیحؑ کا انداز تبلیغ یہ تھا کہ آپ تمثیلات اور استعارات میں حقائق بیان کیا کرتے تھے ۔)

اَلطَّائِرُ کے معنی نحوست (اعمال کے تباہ کن نتائج)یا شامت اعمال کے بھی لئے جاتے ہیں * ۔ اَلطَّائِرُ ۔ عربوں کے نزدیک بخت یا نصیبہ کو بھی کہتے ہیں، لیکن قرآن کریم میں اسے اعمال نامہ کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے ۔ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ (۱۷/۱۳) ۔ اس میں انسانی اعمال کو طَائِر کہا گیا ہے ۔ اس لئے بھی کہ عمل سے پہلے تو انسان کو اس پر اختیار ہوتا ہے کہ اسے کرے یا نہ کرے۔ لیکن اس کے سرزد ہو جانے کے بعد اسے اس کا اختیار نہیں رہتا کہ اسے واپس لے لے (یعنی اس کے نتیجہ سے بچ جائے) ۔ یعنی وہ اس کے ہاتھوں سے اڑ جاتا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسکی گردن میں لٹکا ہوا ہوتا ہے کیونکہ اس عمل کا نتیجہ تو اس انسان سے جدا نہیں ہوتا ۔ اَلطِّيَرَةُ ۔ بری فال سے جو بد شگونی لی جاتی ہے ۔ تَطَيَّرَ بِهٖ وَمِنْهُ وَاطَّيَّرَ ۔ اس نے اس چیز سے بد شگونی لی * ۔(۷/۱۳۱-۳۶/۱۸) و (۲۷/۴۷) میں بد شگونی کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے جو خدا کے قانون مکافات کے مطابق مرتب ہوتا ہے ۔ اس کے سوا ''شگون'' کی کوئی حقیقت نہیں ۔

فَرَسٌ مُطَارٌ ۔ طَيَّارٌ ۔ ہوشیار اور تیز رفتار گھوڑا ** ۔ سورہ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے لشکر جِنٌّ ۔ اِنْسٌ اور طَيْرٌ پر مشتمل تھے ۔ جِنٌّ سے مراد وحشی قبائل ہیں ۔ اِنْسٌ مہذب آبادیاں ۔ اور طَيْرٌ تیز رفتار گھوڑے (رسالے) ۔ اسی طرح حضرت داؤدؑ کے متعلق ہے وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً (۳۸/۱۹) ۔ اسکے پاس نہایت تیز رفتار گھوڑوں کا لشکر جمع تھا ۔

* تاج ۔ ** محیط ۔

حضرت سلیمانؑ نے انہی کے متعلق کہا تھا کہ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (۲۷/۱۶) اس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ہمیں الطیر کی بولی سکھائی گئی ۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں گھوڑوں کے لشکر (رسالہ) کے قواعد و ضوابط سکھائے گئے ہیں ۔ اسی طرح سورہ (نمل) میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق ہے وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَالِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ (۲۷/۲۰) ۔ اس میں طَیْرٌ انہی تیز رفتار گھوڑوں (کے رسالوں) کے لئے استعمال ہوا ہے ۔ هُدْهُدٌ انہی رسالوں کے ایک رسالدار کا نام تھا (اس زمانہ میں پرندوں کے نام پر انسانوں کے نام عام طور پر رکھے جاتے تھے جیسا کہ تورات ۔ کتاب سلاطین سے ظاہر ہے) ۔ نیز لسان العرب میں ہے کہ هُدْهُدٌ یمن کے ایک قبیلہ کا نام تھا ۔ اسی رعایت سے اس کے ہر فرد کو ھد ھد کہا جاتا تھا، جیسے قزلباش ایک قبیلہ کا نام ہے لیکن اس قبیلہ کے افراد کو بھی قزلباش کہتے ہیں ۔

ط ی ن

اَلطِّيْنُ ۔ گیلی مٹی *۔ راغب نے کہا ہے کہ الطِّیْنُ پانی میں ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں خواہ اس سے پانی کا اثر زائل ہی کیوں نہ ہو جائے ۔ یعنی اگر وہ قدرے خشک ہوجائے تو بھی اسے طِیْنٌ کہدیا جائیگا** ۔ اَلطِّيْنَةُ ۔ ایسی مٹی کا ٹکڑہ ۔ نیز یہ ایک قسم کی ٹھوس مٹی کو بھی کہتے ہیں جس سے دستاویز وغیرہ پر مہر لگائی جاتی ہے ۔ نیز مجازاً انسان کی جبلّت اور فطرت کو بھی کہا جاتا ہے * ۔ (قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آیا) ثعالبی نے فقہ اللغۃ میں کہا ہے کہ طِیْنٌ (مٹی) جب خشک ہو تو اسے صَلْصَالٌ کہتے ہیں ۔ جب آگ میں پکی ہوئی ہو تو اَلْفَخَّارُ کہلاتی ہے ۔ اور جب گارے کی طرح چپچپی ہو تو وہ لَازِبٌ کہلاتی ہے ۔

قرآن کریم میں ہے بَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (۳۲/۷) ۔ تخلیق انسانی کی ابتدا طِیْنٌ سے ہوئی ہے ۔ (اسکی تفصیل کے لئے میری کتاب ”ابلیس و آدم“ ۔ عنوان انسان دیکھئے ۔ نیز عنوان ص ۔ ل ۔ ص ۔ ل)

حضرت عیسٰیؑ نے جب اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے کہا کہ میں تمہیں طِیْنٌ سے طَائِرٌ بنا دونگا (۳/۴۸) تو اس سے مفہوم خاک نشینی کی پست حالت سے نکال کر عروج و پرواز عطا کر دینا تھا ۔ (دیکھئے عنوان ط ۔ ی ۔ ر ۔)

---

* تاج ۔ ** راغب ۔

ظ

ظ ع ن

ظَعَنَ - يَظْعَنُ - ظَعْنًا - کسی مقصد کے لئے سفر کرنا - پانی کے لئے ، چراگاہ کی تلاش میں ، ایک چشمہ سے دوسرے چشمے کی طرف یا ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف جانا - ظَاعِنٌ - سفر میں جانے والا ، مسافر - اَلظَّعِيْنَةُ - وہ هودج جس میں کوئی عورت سوار ہو- یا خود وہ عورت جو اس میں سوار ہو - راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ کنایۃً عورت کے لئے بولا جاتا ہے خواہ وہ هودج میں نہ ہو-اَلظَّعُوْنُ - وہ اونٹ جسے سفر کے لئے تیار کیا جائے - (ابن فارس)- اَلظَّعِنَةُ - حالت سفر* - سورۃ نمل میں ہے يَوْمَ ظَعْنِكُمْ (۱۶/۸۰) سفر کے دن - (بمقابلہ اِقَامَةٌ) -

ظ ف ر

اَلظُّفْرُ - اَلظُّفُرُ - انسانوں اور دوسرے جانوروں کا ناخن - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ غیر شکاری جانوروں کے ظُفُرٌ ہوتے ہیں اور شکاری جانوروں کے مِخْلَبٌ (پنجہ) - اَلْاَظْفَرُ - لمبے چوڑے ناخنوں والا - ظَفَرَهٗ - اس نے اس کے (چہرے میں) ناخن گاڑ دیا - اَلظُّفْرَةُ - ایک پودا جو زمین سے نکلتے وقت ناخن کے مشابہ ہوتا ہے** -

قرآن کریم میں ہے وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِىْ ظُفُرٍ (۶/۱۴۷) - اور ہم نے یہودیوں پر تمام ناخن دار جانور حرام کر دئے تھے - یہ ان کی سرکشی کی وجہ سے بطور سزا کے تھا (جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ (۶/۱۴۷))- قرآن کریم نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں ذِىْ ظُفُرٍ کا ذکر نہیں-

اَلظَّفَرُ - کامیاب ہونا - مطلوب کو پا لینا**- راغب نے لکھا ہے کہ یہ مفہوم دراصل ناخن گاڑ دینے سے لیا گیا ہے (اس لئے کہ جس چیز میں پنجہ

*تاج - راغب - محیط - **تاج - محیط -

گاڑ دیا جائے وہ قبضہ میں آجاتی ہے)***۔ اَلْاِظْفَارُ۔ کامیاب کر دینا ۔ سورۃ فتح میں ہے مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ (۴۸/۲۴) ۔ اس کے بعد کہ تمہیں انپر غالب کر دیا ۔ ان کے مقابلے میں کامیاب بنا دیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں قہر ۔ کامیابی ۔ غلبہ اور قوت شامل ہیں ۔

ظ ل ل

اَلظِّلُّ ۔ (جمع ظِلَالٌ) سایہ ۔ دھوپ نہ ہونا ۔ عام طور پر جو سایہ مغرب کی طرف پڑے (یعنی زوال آفتاب تک کےوقت کا سایہ) وہ ظِلٌّ کہلاتا ہے اور جو مشرق کی طرف پڑے (یعنی زوال آفتاب کے بعد مغرب تک کے وقت کا سایہ) اسے فَیْءٌ کہتے ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز کو چھپا لینا ۔

چونکہ عرب کا ملک نہایت گرم ہے اور درختوں کی وہاں بہت کمی ہے اس لئے ان کے ہاں سایہ ، راحت و آسائش کے عظیم ترین اسباب میں سے ہے ۔ اس بنا پر وہ راحت وآسائش کی ہر چیز کو کنایۃً ظِلٌّ سے تعبیر کرتے ہیں** ۔ حتٰی کہ جنت کو بھی ظِلٌّ کہتے ہیں ۔ اور عزت ۔ حفاظت ۔ ہر قسم کی خوش حالی اور مرفہ الحالی کو بھی ۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ (۷۷/۴۱) ۔ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۔ گھنا سایہ ۔ بہت زیادہ آسائشیں (۴/۵۷) ۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا (۱۳/۳۵) ۔ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِىْ ظِلٰلٍ (۳۶/۵۶) میں زندگی کی آسائشیں اور خوشگواریاں مراد ہیں ۔ اَظَلَّنِىْ فُلَانٌ کے معنے ہیں اس نے مجھے اپنے زیر سایہ لے لیا ۔ اس نے میری حفاظت کی اور بڑی عزت سے رکھا* ۔

ظِلٌّ ۔ ہر وہ جگہ جہاں دھوپ نہ پہنچے ۔ ہر وہ چیز جو کسی کو ڈھانک لے اور اس پر سایہ فگن ہو ۔ یہ اچھے اور برے دونوں موقعوں کے لئے عام ہے*** ۔ اَلظِّلَالُ مِنَ الْبَحْرِ ۔ سمندر کی بڑی بڑی موجیں ۔ اَلظَّلَلُ وہ پانی جو درختوں کے سایہ تلے ہو* ۔ ظُلَّةٌ (جمع ظُلَلٌ) ۔ ہر ڈھانپ لینے والی چیز* ۔ نیز بدلی جو سایہ ڈالے* ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کا استعمال نا خوشگوار مواقع پر ہوتا ہے ۔ چنانچہ قوم شعیب کے عذاب کےمتعلق ہے ۔ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ (۲۶/۱۸۹) ۔ انہیں اس دن کے عذاب نے پکڑ لیا جب اوپر سے آجانے والی چیز نے انہیں ڈھانپ لیا تھا ۔ جس دن ان کے اعمال کے نتائج ان پر پوری طرح چھا گئے تھے ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

ظَلَّ یَفْعَلُ کَذَا کے معنی ہیں وہ ہمیشہ ایسا کرتا رہا*۔ سورۃ شعراء میں ہے کہ قوم حضرت ابراہیمؑ نے کہا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ (۲۶/۷۱)۔ ہم ہمیشہ ان (بتوں) کی پرستش کرتے رہیں گے۔ سورۃ النحل میں ہے کہ جب ان میں سے کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خبر ملتی ہے ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا (۱۶/۵۸)۔ اس کا چہرا سیاہ ہو جاتا ہے۔ سورۃ الحجر میں ہے، وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ (۱۵/۱۴)۔ ''اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں پھر وہ اس میں چڑھنے لگیں''۔ ان مثالوں میں مداومت اور استمرار کا پہلو غالب ہے۔ یعنی ہمیشہ ایسا ہوتا ہے یا ایسا ہوگا۔ اس کی بعض شکلوں میں ایک ہی لام رہ جاتا ہے۔ مثلاً فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ (۵۶/۶۵) ''تم پشیمان ہو جاؤ گے''۔

ظِلٌّ بمقابلہ حَرُوْرٌ (گرمی)۔ (۳۵/۲۱) میں آیا ہے۔ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ (۳۹/۱۶)۔ آگ کے شعلوں کو کہا گیا ہے جو چھا جائیں یا ڈھانپ لیں۔

فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (۲۶/۴) کے معنی ہیں ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں۔

ظ ل م

ظُلْمٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی دوسرے کی ملکیت میں بے جا تصرف کرنا۔ حد سے تجاوز کرنا۔ بعض آئمہ لغت نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نقص اور کم کرنے کے آتے ہیں۔ اور امام راغب نے کہا ہے کہ ظُلْمٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے مخصوص مقام پر نہ رکھنا خواہ کمی زیادتی کرکے یا اسے اس کے صحیح وقت اور اصلی جگہ سے ہٹا کر۔ کسی چیز کا توازن بگاڑ دینا**۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) تاریکی (۲) حد سے تجاوز کرکے کسی چیز کو بے جگہ رکھ دینا، بتائے ہیں۔

پہلے معنی (یعنی کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرنا) کے اعتبار سے مَظْلِمَةٌ اس چیز کو کہتے ہیں جسے کوئی زبردستی دوسرے سے چھین کر لے جائے۔ اَلظَّالِمُ (جمع اَلظَّالِمُوْنَ اَلظَّالِمِيْنَ الظَّلَمَةُ) ان لوگوں کو کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق کو دبالیں***۔

ظَلَمَ فُلَانًا حَقَّهٗ، فلاں کا حق کم کیا۔ اسی سے ہے لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا (۱۸/۳۳)۔ اور انہوں نے اس میں کچھ کمی نہیں کی***۔ اس نہج سے ظَالِمٌ کے معنی ہیں حقوق انسانیت میں کمی کرنے والا۔ دوسروں کے واجبات کو پورا پورا نہ دینے والا۔

---

* محیط **تاج و محیط و راغب۔ ***تاج۔

کسی چیز کو اس کے اصلی مقام پر نہ رکھنے کے معانی میں یہ لفظ عام طور پر استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً عربوں میں ایک مثل ہے کہ مَنِ اسْتَرْعَی الذِّئْبَ فَقَدْ ظَلَمَ ۔ جس نے بھیڑئے سے توقع کی کہ وہ گلہ کی نگہبانی کرے گا ، اس نے ظلم کیا ۔ یعنی بھیڑئے کو اس کے صحیح مقام پر نہیں رکھا ۔ یا ظَلَمَ الْاَرْضَ اس وقت کہتے ہیں جب زمین کو ایسے مقام سے کھودا جائے جہاں سے اسے کھودنا نہیں چاہئیے تھا۔ اس قسم کی زمین کو مَظْلُوْمَۃٌ کہتے ہیں ۔ ظَلَمَ الْبَعِیْرَ ۔ اس نے اونٹ کو بغیر کسی بیماری کے یونہی ذبح کر دیا ۔ ظَلَمَ الْوَادِیْ اس وقت کہتے ہیں جب پانی اس مقام تک پہنچ جائے جہاں تک وہ اس سے پہلے نہیں پہنچا تھا ۔ (اس اعتبار سے ظُلْمٌ کے معنی حدود شکنی اور تجاوز کے ہوں گے)۔ نیز ظَلَمْتُہٗ کے معنے ہیں میں نے اسے وقت سے پہلے ہی استعمال کر لیا۔ الظَّلِیْمَۃُ والمَظْلُوْمَۃُ اس دودھ کو کہتے ہیں جسے جمنے کے لئے رکھا جائے اور دھی بننے سے قبل ہی پی لیا جائے *۔

اَلظُّلْمَۃُ اور اَلظُّلُمَۃُ کے معنے ہیں اندھیرا۔ تاریکی۔ (جمع ظُلُمٰتٌ)۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں روشنی کا معدوم ہونا (یعنی اس جگہ روشنی کا نہ ہونا جس کو روشن رہنا چاہئیے تھا)* ۔ اس نہج سے اَمْرٌ مُظْلِمٌ اس معاملہ کو کہتے ہیں جسکے متعلق معلوم ہی نہ ہوسکے کہ اسے کہاں سے گرفت میں لیا جائے۔یعنی تاریک اور غیر واضح معاملہ ، اور یَوْمٌ مُظْلِمٌ اس دن کو کہتے ہیں جس میں سخت مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ چنانچہ ظُلُمَاتُ الْبَحْرِ کے معنی ہیں شَدَائِدُ الْبَحْرِ (سمندر کی مشکلات)* ۔ شَعْرٌ مُظْلِمٌ نہایت سیاہ بالوں کو کہتے ہیں ، اور نَبْتٌ مُظْلِمٌ ایسے پودے کو جو گہری سبزی کی وجہ سے سیاہی کے قریب پہنچ جائے * ۔

قرآن کریم میں ظَالِمِیْنَ کا لفظ بکثرت آیا ہے جس کےمعنی ہیں قانون شکنی، حدود فراموشی ، دوسروں کی ملکیت پر ناجائز تصرف کرنے والے ، حقوق انسانیت میں کمی کرنے والے ، دوسروں کے واجبات کو پورا پورا ادا نہ کرنے والے ، دوسروں کی محنت کو اپنے مصرف میں لے آنے والے ، دوسروں پر زیادتی کرنے والے ، اور اس طرح اپنی ذات کی نشو و نما میں کمی کرنے والے ۔

سورہ بقرہ میں ہے وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ($\frac{2}{272}$) ۔ تم اپنے مال میں سے جسقدر بھی نوع انسانی

*تاج ۔

کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھو گے وہ پورا پورا تمہاری طرف لوٹا دیا جائیگا - یعنی جو کچھ تم نے دیا ہے اس میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائیگی - یہاں لَا تُظْلَمُوْنَ کا مفہوم یُوَفَّ اِلَیْکُمْ نے واضح کر دیا - اسی طرح دوسرے مقام پر ہے - ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (۲/۲۸۱) - یہاں بھی تُوَفّٰی کے مقابلہ میں لَا یُظْلَمُوْنَ لا کر بات واضح کر دی - سورہ کہف میں باغات کی مثال میں ہے - آتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا (۱۸/۳۳) - وہ اپنے پھل (پورے پورے) دیتے تھے اور اس میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے -

سورہ بقرہ میں ہے - مَنْ یَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲/۲۲۹) - جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ ظَالِمْ ہیں - ظَالِمِیْنَ کی یہ بڑی جامع تعریف (Definition) ہے - اس لئے کہ انسانیت کے حقوق کا تعین، قوانین خداوندی ہی کی رو سے ہو سکتا ہے - اور جو شخص ان قوانین کو توڑتا ہے وہ حقوق انسانیت میں غصب کرتا ہے - لہذا حدود اللہ (قوانین خداوندی) کو توڑنے والا ظَالِمْ ہے کیونکہ وہ حقوق انسانیت میں کمی کرتا ہے - اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا کہ جو حقوق انسانیت میں کمی کرتا ہے وہ سمجھتا تو یہ ہے کہ میں دوسروں کی کسی چیز میں کمی کر رہا ہوں اور اپنے ہاں اضافہ - لیکن درحقیقت وہ شخص خود اپنی ذات (نفس) کی نشوونما میں کمی کرتا ہے - وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ - (۳/۱۱۶) -

چونکہ حقوق انسانیت میں کمی کر دینے سے معاشرہ کا توازن بھی بگڑ جاتا ہے اور خود انسانی ذات کا توازن بھی قائم نہیں رہتا اس لئے قرآن کریم میں ظُلْمٌ کو سُوْءٌ کا مرادف قرار دیا ہے اور اس کے مقابلہ میں حُسْنًا کا لفظ آیا ہے (۲۷/۱۱) - '' حسن '' تناسب و توازن کی بہترین شکل کا نام ہوتا ہے -

سورہ بقرہ میں نُوْرٌ کے مقابل میں ظُلُمٰتٌ کا لفظ آیا ہے (۲/۱۷) جس کے معنی تاریکیاں ہیں - نُوْرٌ وحی خداوندی ہے اور ظُلُمَاتٌ ذہن انسانی کی پیدا کردہ توہم پرستیاں اور غلط اندیشیاں - وحی کی تعلیم ایک ہی ہوتی ہے ، لیکن ذہن انسانی کی پیدا کردہ تاریکیاں مختلف قسموں کی ہو سکتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ نُوْرٌ کی جمع کہیں نہیں آئی لیکن ظُلُمَاتٌ بطور جمع آیا ہے - حقیقت ہمیشہ ایک ہوتی ہے - افسانے مختلف ہوتے ہیں -

آیت (۲/۲۰) میں اَضَاءَ کے مقابلہ میں اَظْلَمَ کا لفظ آیا ہے۔ اَظْلَمَ کے معنی ہیں تاریک ہو جانا اور تاریک کر دینا۔ نیز تاریکی میں داخل ہو جانا۔ چنانچہ مُظْلِمُوْنَ کے معنی ہیں اندھیرے میں رہ جانے والے (۳۶/۳۷)۔ سورۂ انبیاء میں ظُلُمٰتٌ کا لفظ ایسے مصائب و مشکلات کے معنوں میں آیا ہے جن کا حل انسان کو سجھائی نہ دے (۲۱/۸۷)۔

سورہ ابراہیم میں ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۱۴/۳۴)۔ یعنی انسان اگر وحی کے تابع نہ چلے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق کرتا رہے تو اسکی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کو غصب کرتا ہے اور جو کچھ اسے حاصل ہو جاتا ہے اسے دبا دبا کر، چھپا چھپا کر رکھتا ہے۔ اس کے برعکس، وحی کی تعلیم یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں حاصل ہو اسے نوع انسانی کی پرورش کیلئے کھلا رکھو اور کسی کے حقوق میں کمی نہ کرو۔ ظَلُوْمٌ میں مبالغہ پایا جاتا ہے۔ یعنی بہت زیادہ ظلم کرنے والا۔ اسی طرح ظَلَّامٌ کے بھی یہی معنی ہیں۔ (۳/۱۸۱)۔ قطعاً ظلم نہیں کرتا۔

دنیا میں جہاں جہاں ظلم ہو رہا ہو، خواہ اسکی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس ظلم کو مٹانا اور اسکی جگہ نظام عدل و احسان قائم کرنا، یہ ہے قرآنی تعلیم کا منشا۔

ظ م أ

ظَمِئَ۔ يَظْمَأُ۔ ظَمْئًا۔ ظَمَأً۔ پیاسا ہونا۔ یا سخت پیاسا ہونا۔ ظَمِئٌ۔ ظَمْآنٌ۔ پیاسا (۲۴/۳۹)۔ ظَمَأٌ۔ پیاس (۹/۱۲۰)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مرجھا جانے اور کم آب ہو جانے کے ہیں۔ "آدم" کی جنت کے متعلق ہے کہ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا (۲۰/۱۱۸)۔ تو اس میں پیاس محسوس نہیں کرتا۔ پانی بافراط ملتا ہے۔ پانی کی کمی اور فراوانی کی اہمیت کا ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس کا اندازہ صحراؤں کے رہنے والے ہی لگا سکتے ہیں جن کی زندگی کا دارو مدار پانی پر ہوتا ہے۔ ان کے لئے پانی کی قلت سب سے بڑی مصیبت اور پانی کی فراوانی سب سے بڑی خوش حالی ہوتی ہے۔ جنتی معاشرہ میں کسی کو بنیادی ضروریات زندگی (کھانا پینا۔ لباس۔ مکان وغیرہ) کے لئے جگر پاش مشقتیں نہیں اٹھانی پڑتیں، نہ ہی ان سے کوئی محروم رہتا ہے۔ (۲۰/۱۱۸)۔ اَلظِّمْءُ۔ دو مرتبہ پانی پینے کے درمیان کا وقفہ *۔

* تاج و راغب۔

ظ ن ن

ظَنٌّ۔ (جمع ظُنُوْنٌ)۔ غیر یقینی عقیدہ کے دونوں سروں میں سے جو زیادہ قوی ہو اسے ظَنٌّ کہتے ہیں ۔ ظَنٌّ واضح اور صاف صاف یقین نہیں ہوتا ۔ صاف یقین کو عِلْمٌ کہتے ہیں ۔ مناوی نے کہا ہے کہ ظنٌّ اس راجح عقیدہ کو کہتے ہیں جس میں احتمالِ نقیض ہو ۔ نیز یہ شک اور یقین دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے بھی اس کی تائید کی ہے ۔ اور ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی یہ دونوں لکھے ہیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ کسی چیز کے علامات سے جو نتیجہ (Inference) حاصل کیا جائے اسے ظَنٌّ کہتے ہیں ۔ جب یہ علامات قوی ہوں تو نتیجہ سے عِلْمٌ کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور جب بہت کمزور ہوں تو ان سے مستنبط نتیجہ وہم سے آگے نہیں بڑھتا ۔ لیکن جوہری نے کہا ہے کہ کبھی کبھی یہ لفظ علم کی جگہ بھی استعمال ہو جاتا ہے *۔

آپ نے اوپر دیکھا ہے کہ اہل لغت نے یہ کہا ہے کہ ظن کا لفظ ایک طرف شک اور قیاس کے معنوں میں آتا ہے اور دوسری طرف علم اور یقین کے معنوں میں ۔ لیکن یہ ان لوگوں کی محض خیال آفرینی اور قیاس آرائی ہے ۔ قرآن کریم نے (جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا) ظن کا لفظ علم اور یقین اور حق کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے ۔ اس لئے ظن کبھی علم اور یقین کے معنوں میں نہیں آسکتا ۔ دراصل (جیسا کہ راغب نے کہا ہے) جب کسی حقیقت کے متعلق پورا یقین نہ ہو تو اس کے دو پہلو ہوتے ہیں ۔ انسان کبھی حقیقت کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی اس سے دور ہٹ جاتا ہے ۔ اس لحاظ سے ان دونوں پہلوؤں کو ظن کہتے ہیں ۔ راغب نے یہ بھی کہا ہے کہ جب اس کے بعد اَنْ یا اَنَّ آئے تو اس میں علم کی طرف رجحان غالب رہتا ہے اور وہ تقریباً یقین کے قریب پہنچ جاتا ہے ۔ قرآن کریم میں اسکی مثالوں کے لئے دیکھئے (۲/۴۶) ; (۲/۲۴۹) ; (۶۹/۲۰) وغیرہ ۔

یقین اور قیاس کے ملے جلے پہلو کے اعتبار سے اَلظَّنُوْنُ اس باشرف عورت کو کہتے ہیں جس سے باوجود زیادہ عمر ہونے کے شادی کرلی جائے اور یہ امید ہو کہ اس سے اولاد ہو سکتی ہے ۔ نیز اس کنویں کو کہتے ہیں جس کے متعلق معلوم نہ ہوکہ اس میں پانی ہے یا نہیں ۔ نیز اس قرضے کو الدَّیْنُ الظَّنُوْنُ کہتے ہیں جس کے متعلق اطمینان نہ ہو کہ قرضہ لینے والا اسے ادا کریگا یا نہیں **۔

* تاج و راغب ۔ ** تاج و محیط ۔

قرآن کریم میں لفظ ظَنُّوْنٌ قیاس آرائیوں کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے ۔ وَ تَظُنُّوْنَ بِا للّٰہِ الظُّنُوْنَا (۳۳/۱۰)۔ ”اور تم خدا کے بارے میں طرح طرح کے گمان اور قیاس آرائیاں کرنے لگ گئے“۔ یعنی تمہارے دل میں یقین کے بدلے شکوک اور وساوس پیدا ہونے شروع ہو گئے ۔ سورۃ بقرہ میں ظَنٌّ بمقابلہ عِلْمٌ آیا ہے ۔ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتَابَ اِلَّا اَمَانِیَّ وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ (۲/۷۸) ۔ ”وہ کتاب کو اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ محض (ناظرہ) پڑھ لیتے ہیں ۔ وہ صرف قیاس آرائیاں کرتے ہیں“۔ سورہ النساء میں ہے مَالَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (۴/۱۵۷) ۔ انہیں اسکی بابت یقینی علم نہیں ، وہ محض ظن کے پیچھے چلتے ہیں ۔ سورہ یونس میں ظَنٌّ بمقابلہ حَقٌّ آیا ہے ۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (۱۰/۳۶) ظن ، حق کے مقابلہ میں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا ۔

دین کی ساری عمارت علم اور یقین کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے ۔ اگر کسی معاملہ کے متعلق آپ کو یقینی طور پر علم نہ ہو کہ اس کی بابت خدا کا کیا حکم ہے تو آپ کے اعتقاد و عمل کی ساری عمارت متزلزل رہیگی ۔ اس لئے دین کا یقینی ہونا ضروری ہے ۔ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے اسی لئے لیا ہے (۱۵/۹) کہ ہمیں یقینی طور پر علم رہے کہ اس کا ایک ایک حرف وہی ہے جسے خدا نے نازل کیا تھا ۔ رسول اللہؐ نے اسی قرآن کریم کو مرتب شکل میں امت کو دیا تھا اور اسکے علاوہ اور کچھ نہیں دیا تھا ۔ اس لئے دین میں صرف قرآن کریم یقینی ہے ۔ اور سب ظنیات ہیں ۔ اور اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (۱۰/۳۶) خدا کا ارشاد ہے ۔ اس لئے قرآن کریم کے مقابلہ میں کوئی دوسری چیز دین نہیں ہو سکتی ۔ دین وہی ہے جو قرآن کریم کے اندر ہے ۔ خارج از قرآن ، جو باتیں قرآن کریم کے مطابق ہوں انہیں صحیح مانا جا سکتا ہے اور جو اس کے خلاف ہوں وہ غلط ہونگی ۔

اَلظَّنِیْنَۃُ تہمت کو کہتے ہیں ۔ اَلظَّنِیْنُ ۔ متہم شخص ، جس سے بدگمانی کی بنا پر عداوت رکھی جائے *۔

ظ ھ ر

اَلظَّھْرُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ ۔ ہر چیز کا بیرونی اور بالائی حصہ (اندونی حصہ کی ضد) ۔ انسان کے جسم کا شانوں سے لیکر سرین کے اوپر تک کا حصہ

* تاج و محیط ۔

پیٹھ ۔ پشت) ۔ سواری کو بھی کہتے ہیں ۔ اور مال کثیر کو بھی جو نمایاں طور پر نظر آجاتا ہے ۔ اَلظِّھْرَۃُ ۔ مددگار ۔ پشت پناہ* ۔

ظِہْرِیٌّ وہ فالتو اونٹ جسے سفر میں احتیاطاً (بطور Extra) ساتھ رکھ لیا جاتا ہے کہ اگر کسی وقت ضرورت پڑ جائے تو اسے استعمال کرلیا جائے ۔ یعنی اس کی حیثیت مقدم نہیں ہوتی ، ثانوی ہوتی ہے ۔ اسی سے اس کے معنی کسی کو پس پشت ڈال دینے یا نظر انداز کر دینے کے آتے ہیں ۔ اِتَّخَذَ حَاجَتَہٗ ظِہْرِیًّا ۔ اس کی ضرورت کو ناقابل توجہ سمجھا* ۔

ظَھَرَ الشَّیْیُٔ ۔ چیز ظاہر ہوگئی ۔ نمایاں ہوگئی ۔ ابھر کر سامنے آگئی ۔ واضح ہوگئی* ۔ ظَھَرَ عَلَیَّ ۔ اس نے میری مدد کی ۔ ظَھَرَ بِہٖ ۔ ظَھَرَ عَلَیْہِ ۔ اس پر غالب آگیا ۔ ظَھَرْتُ الْبَیْتَ ۔ میں مکان کے اوپر چڑھ گیا ۔ ظَھَرَ عَلَی السِّرِّ ۔ وہ راز سے واقف اور مطلع ہوا ۔ اَظْھَرَہٗ عَلَیْہِ اسےاس پر غالب کردیا ۔ اَلظُّھْرُ ۔ زوال آفتاب کا وقت ، یہ ظَھِیْرَۃُ الشَّمْسِ (دھوپ کی سخت تپش اور حرارت) سے ماخوذ ہے کیونکہ وہ سخت گرمی کا وقت ہوتا ہے* ۔ اَظْھَرَ ۔ ظہر کے وقت میں داخل ہونا ۔ (۳۰/۱۸) ۔ ظَاھَرَ و تَظَاھَرَ عَلَیْہِ ۔ اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کی ۔ اَلظَّھِیْرُ ۔ مددگار ۔ (یہ واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے) اَلظِّھَارُ مِنَ الْمَرْاَۃِ ۔ خاوند کا بیوی سے یہ کہنا کہ تو میرے لئے ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت ۔ عربوں میں زنا شوئی کے تعلقات منقطع کرنے کے لئے ایسا کہا جاتا تھا* ۔

ظَاھِرُ الْجَبَلِ ۔ پہاڑ کی چوٹی یا بالائی حصہ ۔ اَلظَّاھِرَۃُ ۔ اونچی زمین* ۔ کسی چیز کے زیادہ ہونے ، عام ہونے اور پھیل جانے کو بھی ظَھَرَ کہتے ہیں** ۔

قرآن کریم میں ہے تَظَاھَرُوْنَ عَلَیْھِمْ (۲/۸۵) ۔ تم ان کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو ۔ سورۃ المومن میں ہے ظَاھِرِیْنَ فِی الْاَرْضِ (۴۰/۲۹) ۔ ملک میں غالب قوم ۔ سورۃ زخرف میں ہے ۔ مَعَارِجَ عَلَیْھَا یَظْھَرُوْنَ (۴۳/۳۳) ۔ سیڑھیاں جن پر وہ چڑھتے ہیں ۔ اورسورۃ نورمیں ظَھِیْرَۃ کا لفظ (گرمی کی) دوپہر کے لئے آیا ہے (۲۴/۵۸) ۔ سورۃ احزاب میں تُظَاھِرُوْنَ (۳۳/۴) کے معنی ہیں بیوی کے متعلق ظِھَارٌ کا اعلان کر دینا ۔ اس کا اعادہ (۵۸/۲-۳) میں ہوا ہے ۔ سورۃ نور میں ہے لَمْ یَظْھَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ (۲۴/۳۱) ۔ وہ عورتوں کے پردہ کی باتوں سے واقف نہیں ہیں ۔ سورۃ جن

*تاج ۔ **راغب ۔

میں ہے فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا (۲۶/۷۲) - وہ اپنے غیب سے کسی کسو مطلع نہیں کرتا - سورۃ بقرہ میں اَبْوَابٌ (دروازوں) کے مقابلہ میں ظُهُوْرٌ (پچھواڑے) آیا ہے (۱۸۹/۲) - یعنی مکان کی پشت کی طرف سے -

قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا (۳۱/۲۴) - وہ اپنی زینت (آرائش) کی چیزوں کی نمائش نہ کریں، بجز ان کے جو (خود بخود) ظاہر ہو جائیں - اسے مثال دیکر یوں سمجھا دیا کہ وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ (۳۱/۲۴) - اور وہ اپنے پاؤں کو (زمین پر) اس طرح مار کر نہ چلیں کہ جو کچھ وہ اپنی زینت کی اشیاء سے چھپائے ہوئے ہیں ان کا دوسروں کو علم ہوجائے - ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ آوازدار زیور ہے جسے پنڈلیوں پر پہنا جاتا ہے اور جو معمولاً ڈھنپا رہتا ہے - اس کی نمود کا طریق یہ ہے کہ زمین پر زور سے پاؤں مار کر چلا جائے جس سے اس زیور (چھاگل - جھانجھن وغیرہ) سے آواز پیدا ہوجائے - یہ وہ اشیائے زینت ہیں جو شلوار وغیرہ سے ڈھکی رہتی ہیں- باقی رہیں وہ اشیائے زینت جو اوپر کے حصے میں پہنی جاتی ہیں ، سو ان کے لئے کہدیا کہ وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ (۳۱/۲۴) - وہ اپنے سر کی چادروں کو جیب گریبان (سینے پر) ڈال لیا کریں - دوسری جگہ ہے یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ (۵۹/۳۳)- وہ اوپر اوڑھے ہوئے (یا اور کوٹ کی طرح پہنے ہوئے) کپڑے کو جسم کے ساتھ لگائے رکھیں -

ان اشیائے زینت کے اظہار کی ممانعت ، باہر کے لوگوں سے ہے - اپنے گھر کے لوگوں سے نہیں- (۳۱/۲۴)- اب رہیں وہ چیزیں جو خود بخود ظاہر ہوجاتی ہیں تو انکی مثال ہاتھ کی انگوٹھی یا کنگن کی سمجھئے - یا ناک کے کسی زیور کی- اس لئے کہ اوڑھنی یا جلباب سے ہاتھ اور چہرہ بہرحال کھلے رہتے ہیں اور قرآن نے انہیں چھپانے کا حکم نہیں دیا - بلکہ یہ جو اس نے کہا ہے کہ مرد اور عورتیں اپنی نگاہیں نیچی رکھیں - انہیں بیباک نہ ہونے دیں (یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ۳۰/۲۴-۳۱) تو اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا منشا یہ نہیں کہ چہرہ کو بھی چھپایا جائے - اس لئے کہ اگر عورتیں اپنے چہرے کو بھی چھپا کر باہر نکلیں تو مردوں کو اپنی نگاہیں نیچی رکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی-

یہ ہیں اظہار زینت کے متعلق قرآن کریم کی ہدایات - ممانعت ، نمود آرائش کی ہے - خود بخود ظاہر ہو جانے والی اشیائے زینت کی نہیں -

سورة ھود میں ھے کہ حضرت شعیب ؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم نے خدا کو محض بطور ظِھْرِیًّا (۱۱/۹۲) رکھ چھوڑا ھے - یعنی تمہارے نزدیک اھمیت تو تمہارے اپنے فیصلوں کی اور انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی ھے لیکن خدا کو (محض بطور E x t r a) ساتھ اس لئے رکھ چھوڑا ھے کہ اگر کبھی ضرورت پڑے تو اسے بھی اپنے مفاد کے لئے استعمال کر لیا جائے - غور کیجئے کہ یہی چیز آج ھم پر بھی کس طرح صادق آتی ھے -

سورة حدید میں اللہ کی ایک صفت اَلظَّاھِرُ بھی آئی ھے - ھُوَ الظَّاھِرُ (۵۷/۳) - اس میں اَلظَّاھِرُ کے معنی آنکھوں سے نظر آ جانے والا نہیں - اس لئے کہ جب بنی اسرائیل نے تقاضا کیا تھا کہ ھم اللہ کو جَھْرَۃً (اپنی آنکھوں سے) دیکھنا چاھتے ھیں (۲/۵۵) تو ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ ان کا تقاضا طفلانہ ھے - خدا کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا - لہذا یا تو اَلظَّاھِرُ کے معنی ھیں وہ ذات جس کی ھستی پر کائنات کی مرئی اور مشہود اشیاء دلیل ھیں یا اس کے معنی ھیں سب پر غالب - لیکن اُس کا غلبہ ایسا ھے کہ وہ غیر محسوس طور پر کام کرتا ھے - کیونکہ وہ اَلظَّاھِرُ کے ساتھ (اَلْبَاطِنُ) بھی ھے (۵۷/۳) - جیسا کہ (ب - ط - ن) کے عنوان میں بھی لکھا جا چکا ھے ، خدا اپنے تخلیقی مظاھر (Created World) کی رو سے سامنے آتا ھے - اس کا یہ مطلب نہیں کہ اشیائے کائنات خود خدا ھیں - مطلب یہ ھے کہ یہ اشیاء اپنے خالق کی ھستی کی علامات (آیات اللہ) ھیں - اور جو قانونِ خداوندی رگِ کائنات میں خونِ حیات بن کر دوڑ رھا ھے وہ اُس کے اقتدار و اختیار کی زندہ شہادت ھے - اسی اعتبار سے خدا اَلظَّاھِرُ ھے - لیکن خدا کی ذات کی کنہ و حقیقت سے کوئی واقف نہیں ھو سکتا - اس اعتبار سے وہ اَلْبَاطِنُ ھے - اس سے (Immanence and Transcendence of God) کا وہ مسئلہ بھی حل ھو جاتا ھے جو مفکرین الٰہیات کےلئے اس قدر وجہ پیچ و تاب بنا رھتا ھے - یعنی یہ مسئلہ کہ خدا کائنات میں حاضر و موجود ھے یا اس سے الگ (کہیں اور - مثلاً عرش پر) بیٹھا ھے - وہ (اپنے قانون و اقتدار کے اعتبار سے) کائنات کے اندر ھے لیکن اس میں محبوس نہیں - اور (اپنی ذات کے اعتبار سے) کائنات سے بالا ھے لیکن اس سے الگ (Excluded) نہیں - وہ بیک وقت اَلظَّاھِرُ بھی ھے اور اَلْبَاطِنُ بھی - (Immanent) بھی ھے اور (Transcendent) بھی - وہ اپنی ذات (Personality) رکھتا ھے لیکن مشخص (Personified) نہیں - اس کا اقتدار ، ایک توانائی (Divine Energy) ھے لیکن بغیر ذات (Personality) کے نہیں -

---

ع

عاد

جیسا کہ تذکرہ قوم ثمود (عنوان ث - م - د) میں لکھا جاچکا ہے، تاریخ کے ابتدائی ایام میں عرب اور اس کے گرد و پیش کے علاقہ (شام - عراق وغیرہ) میں امم سامیہ پھیلی ہوئی تھیں - ان میں سب سے اہم اور مقتدر قوم، عاد کی تھی جو ایکطرف حضر موت اور یمن کے علاقہ سے شروع ہو کر خلیج فارس کے ساتھ ساتھ عراق تک جا پہنچی تھی اور دوسری طرف عرب سے نکل کر مصر و شام پر حکمران تھی - قریب دو اڑھائی ہزار (ق - م) تک ان علاقوں پر اس قوم کا تسلط نظر آتا ہے - سام کے بیٹے ارم کی نسبت سے انہیں عاد ارم بھی کہا جاتا ہے - قرآن کریم نے انہیں قوم نوح کا جانشین بتایا ہے (۷/۶۹) جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی ابتداء بہت قدیم زمانہ میں ہوئی تھی - اس قوم (عاد) کیطرف حضرت ہود[ع] مبعوث ہوئے تھے - ان کا مقام بعثت و تبلیغ احقاف کا علاقہ تھا - احقاف ریتیلے بل کھاتے ہوئے ٹیلوں اور ریگستانی صحرا کو کہتے ہیں - عرب کا وہ طویل و عریض ریگستان جسے اب ربع خالی کہا جاتا ہے، احقاف کہلاتا تھا - قرآن کریم کا بیان ہے کہ اس قوم کو (اُس زمانے کے لحاظ سے) سامان زیست افراط سے حاصل تھا - آبپاشی کے لئے قدم قدم پر چشمے - پھلوں سے لدے ہوئے باغات - اولاد اور مواشی کی کثرت (۲۶/۱۳۲-۱۳۴) - وہ ہر بلند مقام یا شاہ راہ عام پر بڑی بڑی عمارات بناتے تھے (۲۶/۱۲۸) - وہ علم و بصیرت بھی رکھتے تھے (۴۶/۲۶) لیکن ان کی مفاد پرستیوں نے انہیں ایسی غلط روش پر ڈال رکھا تھا کہ ان کا علم و بصیرت صحیح کاموں میں صرف نہیں ہوتا تھا (۲۹/۳۸) - حضرت ہود[ع] نے انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا لیکن انہوں نے ان کی ایک نہ مانی اور ان پر ایسی مسلسل آندھی چلی کہ وہ تباہ و برباد ہوگئے (۶۹/۶-۸) - انہیں قرآن کریم نے عاد اولیٰ کہا ہے (۵۳/۵۰) - ان میں سے جو حضرت ہود[ع] پر ایمان لا کر بچ گئے تھے ان کی نسل آگے چلی - انہیں عاد ثانیہ کہا جاتا ہے -

(ان امور کی تفصیل - نیز اس نکتہ کی وضاحت کہ ان اقوام سابقہ کے اعمال ، اور حوادث طبعی کے ذریعے ان کی تباہی میں باہمی ربط کیا تھا - میری کتاب ''جوئے نور'' میں ملیگی)

ع ب أ

اَلْعِبْءُ - بار - بوجھ - وزن ، سامان وغیرہ کا - مَاعَبَأْتُ بِہٖ - میرے نزدیک اسکا کوئی وزن نہیں - مجھے اسکی کچھ پرواہ نہیں *- قرآن کریم میں ہے مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ (۲۵/۷۷) - میرے نشوونما دینے والے کے نزدیک تمہارا وزن ہی کیا ہے - اس کی نگاہوں میں تمہاری قدروقیمت کیا ہے - وہ تمہاری پرواہ کیا کرتا ہے - (ابن فارس)

ع ب ث

اَلْعَبَثُ ہر اس کام کو کہتے ہیں جس کی کوئی صحیح غرض نہ ہو ، یا ایسا کام جس کا فائدہ معلوم نہ ہو ، یا ایسا کام جس کے کرنے والے کے سامنے اسکی کوئی غرض متعین نہ ہو - اسے معلوم نہ ہو کہ میں اسے کیوں کر رہا ہوں - بغیر مقصد اور غرض و غایت متعین کئے کوئی کام کرنا - اسی لئے کھیل کود کو عَبَثٌ کہتے ہیں *- اصل میں عَبَثَہٗ بِالشَّیْءِ کے معنی ہیں اسے کسی چیز میں ملایا - خلط ملط کیا *- ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی خلط ملط کرنا ہی بتائے ہیں*- جب کوئی کام مقصد اور غایت کو سامنے رکھکر کیا جائے تو انسان اس میں کسی ایسی بات کو نہیں ملاتا جس سے وہ مقصد حاصل نہ ہوتا ہو- لیکن جب کوئی مقصد اور منزل ہی متعین نہ ہو تو پھر اس کام میں جو کچھ چاہے ملتا جائے - عَبِيْثَةٌ النَّاسِ - مختلف قبائل کے ملے جلے لوگ جو ایک جداعلٰے کی اولاد نہ ہوں - اَلْعَبِيْثَةُ - ملی جلی بکریاں - لہذا اَلْعَبَثُ کے معنی ہیں غیر مفید کام ، وہ کام جس سے کوئی غرض و مقصد مطلوب نہ ہو*-

قرآن کریم کی رو سے یہ تمام کائنات ایک متعین مقصد اور غایت کو سامنے رکھکر پیدا کی گئی ہے اور انسانی تخلیق کی بھی ایک خاص غایت اور خاص مقصد ہے - صحیح روش زندگی وہ ہے جو انسان کو اس غایت اور مقصد کی طرف لے جائے - لیکن مادی نظریۂ حیات کی رو سے کائنات اور انسان کی تخلیق یونہی اتفاقیہ عمل میں آگئی ہے - اسکی نہ کوئی غرض ہے نہ

* تاج - راغب - محیط -

غایت ۔ لہذا انسان اپنی طبعی آسائش کے لئے جو روش بھی اختیار کرلے صحیح ہے ۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ قرآنی تصور زندگی اور مادی نظریہ حیات میں یہی بنیادی فرق ہے اور اسی بنیاد پر دونوں نظریوں کے مطابق زندگی کی پوری کی پوری عمارت (الگ الگ انداز سے) اٹھتی ہے ۔ قرآن کریم نے اسی فرق کو واضح کرنے کے لئے کہا ہے کہ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا (۲۳/۱۱۵) ۔ کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے غرض و غایت پیدا کر دیا ہے ؟ اور پوری کائنات کے متعلق ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ (۲۱/۱۶ - نیز دیکھئے (۴۴/۳۸) جس میں السماء کی جگہ السمٰوٰت ہے) ۔ ہم نے اس سلسلہ کائنات کو بطور کھیل تماشا کے نہیں بنا دیا ۔ اسکی تخلیق کا ایک خاص مقصد ہے ۔ اسے بِالْحَقِّ پیدا کیا گیا ہے (۴۴/۳۹) ۔ یعنی ایک غیر متبدل محکم پروگرام کے مطابق تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے ۔ ہندو فلسفہ کی رو سے یہ تمام کائنات " ایشور کی لیلا " ہے ۔ یعنی خدا کا رچایا ہوا ناٹک ، جس میں وہ خود سب سے بڑے ایکٹر کا پارٹ ادا کر رہا ہے ۔ اسی لئے اسے " نٹ راجن " کہا جاتا ہے ۔ یعنی نٹوں (کھلاڑیوں) کا بادشاہ ۔ قرآن کریم نے اس تصور کی خاص طور پر تردید کی ہے اور زندگی کی ٹھوس حقیقت (Seriousness) پر بڑا زور دیا ہے ۔ اسی بنیاد پر انسان کے وہ تمام ایسے کام جو یونہی ، بلا صحیح غرض و غایت ، عمل میں آتے رہیں ، اُس کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتے ۔ چنانچہ اس نے قوم عاد کا ایک جرم یہ بھی بتایا ہے کہ وہ بڑی بڑی بلند عمارتیں محض اس لئے بناتے تھے کہ وہ بطور یادگار قائم رہیں ۔ اسے اس نے تَعْبَثُونَ سے تعبیر کیا ہے (۲۶/۱۲۸) ۔ یعنی عمارت کا کوئی افادی مقصد ہونا چاہئے ۔ یونہی ایک عظیم الشان مقبرہ بنا دینا جو کسی مصرف میں نہ آسکے ، فعل عبث ہے ۔ کسقدر عبرت انگیز ہے یہ حقیقت کہ جس قوم (مسلمانوں) کو اس قسم کی تعلیم دی گئی تھی ان کی سلطنت کے باقیات ، مقبروں کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔ اور ان پر ہم فخر کرتے ہیں ۔ یادگار ایسی ہونی چاہیئے جس سے منفعت بخش اور جمال آفریں نتائج مسلسل طور پر جاری رہیں ۔ اسی لحاظ سے زندگی کا ہر کام جو نوع انسانی کے لئے نفع رساں نہیں فعل عبث ہے ۔ (اس سلسلہ میں عنوانات (ث ـ و ـ ب) ۔ (ل ـ ع ـ ب) اور (س ـ د ـ ی) بھی دیکھئے)

ع ب د

عَبْدٌ ۔ در اصل ایک خوشبودار پودے کو کہتے ہیں جو اونٹوں کے لئے بڑی کشش رکھتا ہے ۔ اس کے کھانے سے اونٹ فربہ ہو جاتے ہیں اور

ان کا دودھ بھی زیادہ ہو جاتا ہے - خاصیت کے اعتبار سے اس پودے کا مزاج گرم ہوتا ہے اس لئے جب اونٹ اسے کھاتے ہیں تو وہ پیاسے ہو جاتے ہیں اور پانی مانگتے ہیں - اس اعتبار سے اس پودے میں تین خصوصیتیں ہیں - (۱) کشش و جاذبیت - (۲) ابتداءً پیاس کی تکلیف لیکن آخر الامر (۳) فربہی اور دودھ کی فراوانی - لہذا اس کے بنیادی معنوں میں ابتداءً تکلیف لیکن آخر الامر نفع بخشی کے پہلو مضمر ہیں - اسی بنیادی معنی کے پیش نظر عرب، کشتی پر تیل یا چربی یا تارکول ملتے تھے تو اس سے کشتی بد صورت ہو جاتی تھی لیکن نتیجہ کے اعتبار سے اس کی لکڑی پانی کے اثرات سے محفوظ ہوجاتی تھی - اسی لئے ایسی کشتی کو سَفِیْنَۃٌ مُعَبَّدَۃٌ کہتے تھے * - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں دونوں باتوں کو شامل کیا ہے - یعنی نرمی و ذلت اور سختی و غلظت - (یعنی اس طرح کی نرمی کہ جس سے درحقیقت سختی آتی جائے) اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے عِبَادَۃٌ کے معنی ایسا کام کرنا ہیں جو دل کے شوق اور رغبت سے سر انجام دیا جائے (کیونکہ عَبْدٌ پودا اپنی خوشبو کی وجہ سے اپنے اندر خاص کشش رکھتا ہے) اور وہ نتائج کے لحاظ سے نہایت منفعت بخش ہو اگرچہ اس کے لئے تھوڑی سی مشقت بھی برداشت کرنی پڑے - لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ($\frac{۲}{۲۸۶}$) عبادت کے اس مفہوم کو واضح کر رہا ہے - یعنی انسان، قوانین خداوندی کی اطاعت سے جو پابندیاں اپنے اوپر عائد کرتا ہے، بظاہر ان میں مشقت اور تکلیف ہوتی ہے لیکن در حقیقت وہ نفس انسانی کی وسعت اور کشود کے لئے ہوتی ہیں -

قرآن کریم نے عبادت کے اس مفہوم کو تین آیتوں میں واضح کر دیا ہے - اس نے پہلے کہا کہ وَ ذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ ($\frac{۵۱}{۵۵}$) - ان کے سامنے خدا کا ضابطہ قانون (واضح طور پر) پیش کرتا رہ کیونکہ یہ ان کے لئے نہایت منفعت بخش ثابت ہوگا - اس کے بعد بتادیا کہ وہ منفعت بخش اصول حیات کیا ہے - وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ - ($\frac{۵۱}{۵۶}$) - ان سے کہدے کہ ہم نے تمام انسانوں کو، خواہ وہ حضری ہوں یا بدوی**، اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے - یہ وہ کام ہیں جن میں ابتداءً مشقت اٹھانی پڑیگی (اس لئے کہ السابقون الاولون کو ہمیشہ مشقت اٹھانی پڑتی ہے) لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ مشقت اس لئے ہے کہ تم محنت کرو اور ہم تمہاری محنت کی کمائی کھائیں - بالکل نہیں - مَا اُرِیْدُ مِنْھُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا اُرِیْدُ اَنْ یُطْعِمُوْنِ ($\frac{۵۱}{۵۷}$) -

*تاج - **(جن و انس کے معانی کے لئے ان الفاظ کو اپنے اپنے مقام پر دیکھئے)

ھم ان سے رزق نہیں چاھتے ۔ یعنی ھم یہ نہیں چاھتے کہ یہ کمائیں اور ھم کھائیں ۔ ان کی یہ مشقت خود انہی کے فائدے کے لئے ھے (تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ) ۔ آپ پہلے پہل جو پابندی بھی اپنے اوپر عائد کرینگے اس سے آپ کو اپنے سابقہ معمول سے ہٹنا پڑیگا اور یہ گراں گذریگا ۔ لیکن اس کے بعد جب اس پابندی کی نفع رسانیاں آپ کے سامنے آئیں گی تو وہ عین راحت بن جائیں گی ۔

''مشقت اور منفعت'' کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر عَبَّدَ کے معنی سمجھئے ۔ تَعْبِيْدٌ کے معنی ھیں اونٹ (یا گھوڑے) کو سدھا کر جوتنے کے قابل بنا دینا* (اسے انگریزی میں Breaking یا Harnessing) کہتے ھیں ۔ یعنی اس جانور کا اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اس پروگرام کی تکمیل کے لئے صرف کرنا جو اس کے لئے متعین کیا گیا ھو ۔ اسی طرح سڑک کو کسوٹ کر ھموار کر دینا تاکہ لوگ اس پر آسانی سے چل سکیں، یہی تَعْبِيْدٌ کہلاتا ھے* ۔ آپ دیکھئے کہ ان کاموں میں ابتداءً کس قدر محنت اور مشقت درکار ھوتی ھے لیکن آخر الامر ان کا نتیجہ کس قدر منفعت بخش ھوتا ھے ۔ قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے میں بھی یہی ھوتا ھے ۔

لہذا عبادت کے معنے یہ ھیں کہ انسان اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (سرکش و بے باک رکھنے کے بجائے) قوانین خداوندی کے قالب میں ڈھال کر ایک سدھائے ھوئے گھوڑے کی طرح منشائے خداوندی کے مطابق صرف کرے جس کا نتیجہ منفعت عامہ ھوگا ۔ چنانچہ قرآن کریم نے اُعْبُدُوْا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوْا الطَّاغُوْتَ (۱۶/۳۶) سے اس مفہوم کو واضح کردیا ۔ طَاغُوْتٌ** کے معنی ھیں سرکش قوتیں ۔ لہذا آیت کے معنی یہ ھیں کہ اپنی قوتوں کو سرکش و بےباک رکھنے کی بجائے، یا سرکش قوتوں کے منشاء کے مطابق صرف کرنے کے بجائے، قوانین خداوندی کے تابع رکھ کر صرف کرو ۔ دوسری جگہ ھے لَاتَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ (۱۹/۴۴) ۔ اس کے معنی بھی یہی ھیں کہ سرکش قوتوں کی اطاعت مت کرو*** ۔ ''شیطان'' کا یہ مفہوم آیت کے اگلے ٹکڑے نے

* لین و تاج ** اسکے معنی (ط ۔ غ ۔ ی) کے تحت دیکھئے ۔ *** اسکے معنی یہ نہیں کہ شیطان کی پرستش مت کرو ۔ دنیا میں شیطان کی پرستش کوئی بھی نہیں کرتا ۔ عراق میں (موصل کے قریب) ایک باطن فرقہ (یزیدی) کے متعلق مشہور ھے کہ وہ شیطان کی پرستش کرتے ھیں ۔ لیکن ایک انگریز خاتون نے ان لوگوں کے کوائف و معتقدات کا ذاتی طور پر مطالعہ کر کے (''ملک طاؤس'' کے نام سے) ایک کتاب شائع کی ھے جس میں بتایا گیا ھے کہ یہ لوگ شیطان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس سے ڈرتے بہت ھیں اور اس وجہ سے اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے ۔

واضح کر دیا کہ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا (۱۹/۴۴) کیونکہ شیطان خدا کے قوانین و احکام سے سرکشی اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس میں خارجی قوتوں کے علاوہ انسان کے اپنے جذبات بھی آجاتے ہیں جو قانون خداوندی سے سرکشی برتیں (دیکھئے عنوان ش۔ط۔ن)۔ نیز قرآن کریم کی وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ (۲۵/۴۳) کیا تو نے اسے بھی دیکھا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا؟ سورۃ نحل کی مندرجہ بالا آیت (۱۶/۳۶) یوں ہے۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ۔ یعنی خدا کی طرف سے جو رسول بھی آتا تھا وہ یہی پیغام لاتا تھا کہ "اللہ کی عبودیت اختیار کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو"۔ اس تقابل سے "اللہ کی عبودیت" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ ہے کہ ذرا ان لوگوں کا حال دیکھو جو اپنے ذہن میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قرآن پر اور کتب سابقہ پر ایمان رکھتے ہیں وَيُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ (۴/۶۰)۔ اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خدائی قوانین کی رو سے کرائیں، حالانکہ انہیں حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ غیر خدائی قوتوں سے اجتناب کریں (۲/۲۵۷)۔ اس سے ظاہر ہے کہ طاغوت سے اجتناب کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے معاملات کے فیصلے نہ تو اپنے ذاتی جذبات و خیالات کے مطابق کرے اور نہ ہی غیر خدائی قوانین کے مطابق کرائے، بلکہ ان کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق کرائے۔ اسی کو اُعْبُدُوا اللَّهَ کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کی عبودیت اختیار کرنا۔ یہ ہے عبادت کا قرآنی مفہوم۔

قرآن کریم نے "خدا کی عبادت" کی اصطلاح ٹھیک ان معنوں میں استعمال کی ہے جن معنوں میں آجکل "حکومت" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ سورۃ کہف میں ایک جگہ ہے کہ وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (۱۸/۱۱۰)۔ "ان کو چاہئے کہ وہ اپنے رب کی "عبادت" میں کسی کو شریک نہ کریں" اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸/۲۶)۔ "وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا"۔ اسی طرح سورۃ یوسف میں پہلے کہا گیا کہ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (۱۲/۴۰)۔ "حکومت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی"۔ اور اس کے بعد کہا "أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ (۱۲/۴۰)۔ "اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت (محکومیت) اختیار نہ کرو"۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم

کسطرح ''حکومت'' اور ''عبادت'' کے الفاظ مرادف معانی میں استعمال کرتا ھے ۔ قصہ' حضرت موسیٰؑ میں ھے کہ آپ نے فرعون سے کہا کہ تم اپنے جو احسانات جتا رھے ھو، تو وہ ان کے سوا کیا ھیں اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (۲۶/۲۲) کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا ھے! اسی طرح قوم فرعون کا یہ قول قرآن کریم نے نقل کیا ھے کہ (انہوں نے کہا کہ) کیا ھم ان دو (بھائیوں) کی بات مان لیں جو ھمارے جیسے انسان ھیں ۔ وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ (۲۳/۴۷) ۔ اور ان کی قوم ھماری محکوم ھے ۔ ان مقامات میں بھی یہ مادہ، حکومت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ھے ۔ قرآن کریم کا مقصود یہ ھے کہ انسان صرف قوانین خداوندی کی محکومی اختیار کرے ۔ کافر اور مومن میں یہی فرق ھے ۔ اس کا واضح ارشاد ھے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) ۔ جو قوم قرآن کریم کے مطابق حکومت نہیں کرتی ، تو یہی لوگ کافر ھیں ۔ اسی لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہدیا ھے کہ جماعت مومنین کو حکومت اسی لئے دی جائے گی کہ (۱) ان کے دین کا تمکن ھوسکے (۲) یہ خدا کی ''عبادت'' کر سکیں (يَعْبُدُوْنَنِیْ) ۔ اور (۳) اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں (لَا يُشْرِكُوْنَ بِیْ شَيْئًا ۲۴/۵۵) ۔ ظاھر ھے کہ اگر ''عبادت'' سے مراد محض پرستش ھو تو اس کے لئے اپنی حکومت کا ھونا ضروری نہیں ھوتا ۔ پرستش تو ھر حکومت میں ھوسکتی ھے ۔ ھمیں انگریز کی غلامی کے زمانے میں بھی ''خدا کی پرستش'' کی پوری پوری آزادی حاصل تھی ۔ لہذا ''اللہ کی عبادت'' سے مفہوم اس کے احکام کی محکومیت اختیار کرنا ھے ۔ یعنی قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرنا ۔

ظالم اور جابر بادشاھوں اور سرداروں کے خلاف جنگ کرکے ان کی مظلوم رعایا کو اپنی حفاظت میں لے لیا جاتا تھا تو ان پناہ میں آئے ھوئے لوگوں کو عَبِيدٌ کہتے تھے (اس لئے کہ ان لوگوں کو مستبد حاکموں کے پنجہ' استبداد سے چھڑانے کے لئے سخت مشقت اٹھانی پڑتی تھی لیکن یہ چیز آخر الامر ان مظلوموں کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ھوتی تھی ۔ عَبِيدٌ اور عِبَادٌ ۔ عَبْدٌ کی جمع ھیں ۔ عَابِدٌ کی جمع عَابِدُوْنَ اور عَبَدَةٌ ھیں) ۔ پناہ دینے کا یہ جذبہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا اور اس طرح ھاتھ میں آئے ھوئے مظلوموں کو لوگ غلام بنانے لگ گئے ۔ اب انہی کو عَبْدٌ اور عَبِيدٌ کہنے لگے ۔ یوں اس لفظ میں غلامی اور محکومی کے معنے پیدا ھو گئے* ۔ چنانچہ قرآن کریم میں عَابِدٌ کے معنی محکوم (۲۳/۴۷) ۔ عَبَّدَ کے معنی محکوم بنانا (۲۶/۲۲) اور

*تاج ۔

عَبْدٌ کے معنی غلام (۸۲/۱) واضح ہیں ۔ اس سے اس لفظ میں اطاعت شعاری کا مفہوم آگیا ہے ۔ چنانچہ اب تَعَبُّدٌ اور تَذَلُّلٌ ہم معنی استعمال ہوتے ہیں ۔ (یعنی مطیع و منقاد ہو جانا ، قانون کے سامنے جھک جانا) ۔ تعبد و تذلل کا یہی جذبہ ، پرستش کے اندر کارفرما ہوتا ہے ۔ اس سے عِبَادَۃٌ کے معنی پرستش ہوگئے ۔ قرآن کریم میں ہے قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا ۔ (۲۶/۷۱) ۔ انہوں نے کہا ، ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں ۔ یہ بت در حقیقت مظاہر ہوتے ہیں ان معبودوں کے جو ان لوگوں کے ذہن میں مجرد شکل (Abstract Form) میں موجود ہوتے ہیں اور جن کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ انہیں نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں ۔ لہذا وہ ان کے سامنے طمع یا خوف (جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت) کے خیال سے جھکتے ہیں ۔ یہی بنیاد کسی کی محکومی اختیار کرنے کے لئے بھی ہوتی ہے ۔

ابتدائی مشقت کے پیش نظر اسی مادہ سے عَبِدَ یَعْبَدُ آتا ہے جس کے معنی نفرت یا بیزاری کا اظہار کرنا ہیں** ۔ چنانچہ سورۃ زخرف میں ہے قُلْ اِنْ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ (۴۳/۸۱) ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے کہدو کہ اگر کوئی رحمان ایسا ہو سکتا ہے جسکے یہاں اولاد بھی ہوتی ہو تو میں سب سے پہلا شخص ہونگا جو اس قسم کے رحمٰن سے نفرت و بیزاری کا اظہار کردے*** ۔ (ایسے رحمٰن کو دور ہی سے سلام ہے) ۔ واضح رہے کہ اگر عَابِدِیْن کو عَبَدَ ۔ یَعْبُدُ ہی سے فاعل مانا جائے تو اس کے معنی فرمان بردار کے ہونگے ۔ اس شکل میں اس جملہ شرطیہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہو سکتا ہے تو میں سب سے پہلے اس کا فرمان بردار ہوں ، لیکن چونکہ اس کا کوئی بیٹا ہو ہی نہیں سکتا اس لئے اس بیٹے کے فرمان بردار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

اَلْعَبْدُ کے پہلے معنی انسان کے ہیں خواہ وہ آزاد ہو یا غلام ۔ پھر رفتہ رفتہ یہ غلام کے لئے استعمال ہونے لگا* ۔

لہذا قرآن کریم میں

(۱) جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہوگا اس کے معنی ہونگے قوانین خداوندی کی برضا و رغبت اطاعت جس سے نہایت منفعت بخش نتائج مرتب ہونگے ۔ چونکہ جذباتِ اطاعت و فرمان پذیری کے اظہار کے لئے کوئی محسوس انداز اختیار کرنا ۔ (مثلاً جھکنا) انسان کے لاشعور میں چلا آرہا ہے اس لئے قرآن کریم

*تاج ۔ **تاج و لین لیز کتاب الاشتقاق ۔ ***ابن قتیبہ (القرطین ج/۲ صفحہ ۱۲۵)

نے بھی اظہار جذبات کے اس محسوس انداز کا لحاظ رکھا ہے - لیکن اس نے اسے بھی ایک اجتماعی حیثیت دے دی ہے - (تفصیل کے لئے دیکھئے صَلٰوۃ جو ص - ل - و کے عنوان کے ماتحت درج ہے) - یعنی خدا کے سامنے جھکنا (رکوع و سجود) اس حقیقت کا محسوس مظاہرہ ہے کہ ہم قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں - ہم ان کی اطاعت اور فرماں پذیری کو قبول کرتے ہیں - سورۃ بقرہ میں دیکھئے اَسْلَمْتُ اور نَعْبُدُ مرادف معانی میں استعمال ہوئے ہیں -اسی کو آلدِّین کہا گیا ہے ($\frac{2}{131-133}$) - نیز مُسْلِمُوْنَ اور عَابِدُوْنَ اور مُخْلِصُوْنَ بھی ($\frac{2}{136-138}$) -

(۲) جہاں طاغوت اور شیطان کی عِبَادَت کا ذکر ہوگا اس سے مفہوم یا تو انسان کے خود اپنے جذبات کی اطاعت ہوگی یا دوسرے انسانوں کے احکام کی اطاعت - ان میں مستبد حکمرانوں کی محکومیت اور مذہبی پیشواؤں کی عقیدتمندانہ اطاعت بھی شامل ہوگی - اس کے مقابلہ میں ”خدا کی عبادت“ سے مراد ہوگی اس کے قوانین کی اطاعت - خدا کی محکومیت -

(۳) جہاں بتوں یا دیوی دیوتاؤں کی عبادت کا ذکر ہوگا وہاں ان کی توہم پرستانہ پرستش مفہوم ہوگا- ان کی پرستش کا جذبۂ محرکہ بھی وہی ہوتا ہے جو بادشاہوں کے سامنے جھکنے کا ہوتا ہے -

(۴) عِبَادُ الرَّحْمٰن کے معنی ہونگے وہ لوگ جو صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کریں - جو اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اُس راستہ (Channel) پر ڈال دیں جو اس کے قانون نے متعین کیا ہے - اسی سے اِیَّاکَ نَعْبُدُ ($\frac{1}{4}$) کا مفہوم واضح ہے - یعنی ہم صرف تیرے قوانین کے سامنے جھکتے ہیں - ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں - ہم اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح) اُس مقصد کے حصول کے لئے صرف کرتے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے -

اجتماعات صلٰوۃ میں اٹھنا اور جھکنا انہی جذبات اطاعت و فرماں پزیری کا محسوس مظہر ہے - لیکن خدا کی عبادت اسی حد تک محدود نہیں- اُسکی عبادت سے مقصود یہ ہے کہ انسان ، زندگی کے ہر سانس میں قوانین خداوندی کی اطاعت کرے - وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ($\frac{51}{56}$) سے یہی مقصود ہے -

اتنا اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ ” قوانین خداوندی کی محکومیت“ اختیار کرنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں جنت کی

خوشگواریوں کی زندگی نصیب ہو جائے اور اس کی ذات کی ایسی نشو و نما ہو جائے جس سے یہ مرنے کے بعد، زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔ یہ "محکومی" درحقیقت، زندگی کی بلند، مستقل، اقدار کو از خود اپنے اوپر عائد کرنا ہوتا ہے۔ یہ (Self - Imposed Restrictions) ہوتی ہیں۔ کسی کی خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں ہوتیں۔ نہ ہی اس میں (Worship) کا وہ مفہوم ہوتا ہے جسے زمانہ قدیم کے انسان نے، فطرت کی قوتوں سے ڈر کر، انہیں خوش کرنے کے لئے، اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔

ع ب ر

عَبَرَ کے معنی ہوتے ہیں ایک مقام (یا حالت) سے دوسرے مقام (یا حالت) تک پہنچ جانا۔ عَبَرَ النَّھْرَ۔ اس نے نہر کو عبور کر لیا۔ اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔ عَبَرَ السَّبِیْلَ۔ اس نے راستہ قطع کیا، طے کیا۔ اَلْمِعْبَرُ۔ وہ چیز جس کے ذریعے نہر کو عبور کیا جائے۔ کشتی یا پل وغیرہ*۔ اس اعتبار سے راغب نے لکھا ہے کہ عِبَارَۃٌ وہ کلام ہے جو متکلم کے منہ سے نکل کر فاصلہ عبور کرکے سامع کے کان میں پہنچتا ہے۔ اور عِبْرَۃٌ اس حالت کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کسی دیکھی چیز کی وساطت سے آن دیکھے نتائج وغیرہ تک پہنچا جائے**۔ اس سے اِعْتَبَرَ الشَّیْءَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اچھی طرح سے پرکھنا اور اس کی کسی مثال کو سامنے لا کر اسکے مطابق اس کا فیصلہ کرنا***۔ اَلتَّعْبِیْرُ۔ خواب کا انجام بتانا۔ اس سے فعل عَبَرَ یَعْبُرُ عَبْرًا وَعِبَارَۃً بھی آتا ہے**۔ ابن فارس نے اس معنی کی تائید میں خلیل کا یہ قول نقل کیا ہے عَبَّرْتُ الدَّنَانِیْرَ تَعْبِیْرًا۔ جس کے معنی دیناروں کو ایک ایک کر کے تولنے کے ہیں۔ یعنی باٹ کو دیکھکر دینار کے وزن کا اندازہ کر لینا۔

خواب کی تعبیر کے لئے یہ مادہ ($\frac{۱۲}{۴۳}$) میں آیا ہے۔ عِبْرَۃٌ ($\frac{۱۱}{۶۶}$) میں۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ ($\frac{۵۹}{۲}$) میں۔ یعنی مظاہر فطرت یا تاریخی شواھد کے مطالعہ سے زندگی کی غرض و غایت اور قوانین خداوندی کے مقصود و مطلوب تک پہنچ جانا ارباب بصیرت کا کام ہے۔

عَبَرَ السَّبِیْلَ (راستہ قطع کرنے) سے، عَابِرِیْ سَبِیْلٍ آیا ہے ($\frac{۴}{۴۳}$) جس کے معنے ہیں، راستے کو پار کرنے والے۔

* راغب۔ ** تاج۔ *** محیط۔

ع ب س

عَبَسَ وَجْهَہٗ ۔ اسنے اپنا چہرہ بگاڑ لیا ۔ عَبَّسَ تَعْبِيْساً کے بھی یہی معنی ہیں ۔ اَلْعَبَّاسُ ۔ وہ شخص جس کے چہرے پر ہر وقت شکن پڑی رہے ۔ شیر کو بھی کہتے ہیں ۔ اَلْعَبَسُ دراصل اس گوبر اور پیشاب کو کہتے ہیں جو اونٹ کی دم کے ساتھ لگ جائے اور خشک ہو جائے*۔

قرآن کریم میں ہے ثُمَّ عَبَسَ (۲۲/۷۴) ۔ پھر اس نے تیوری چڑھائی یا چہرہ بگاڑا ۔ دوسری جگہ ہے ۔ يَوْماً عَبُوْساً قَمْطَرِيْراً (۱۰/۷۶) ۔ ایسا دن جس کا چہرہ سخت شکن آلود ہو ۔ بڑا بھیانک دن ۔ جسکی سختی سے لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ سینہ کی تنگی سے چہرے کے بگڑنے کو کہتے ہیں**۔

ع ب ق ر

عَبْقَرٌ ۔ صحراء میں ایک چشمہ یا آبادی کا نام تھا جسکے متعلق عربوں میں مشہور تھا کہ وہاں جن رہتے ہیں ۔ وہ جب کوئی ایسی چیز دیکھتے جسکا بنانا دشوار ہوتا اور اسمیں نادرہ کاری کا نمونہ ہوتا تو وہ کہدیتے کہ یہ انسانوں کی بنائی ہوئی نہیں ، یہ تو عَبْقَرٌ والوں کی بنائی ہوئی ہے ۔ یعنی جنوں کی ۔ ابن سیدہ نے عَبْقَر ، یمن کے ایک شہر کا نام بتایا ہے جہاں کپڑوں اور فروش پر نقاشی ، کڑھائی اور زری کا کام کیا جاتاتھا ، وہاں کے کپڑے حسن و رعنائی میں ضرب المثل تھے ۔ چنانچہ جب کسی چیز میں انتہائی حسن و جودت پائی ہوتی تو اسکی طرف نسبت کردی جاتی تھی ۔ اس کے بعد اَلْعَبْقَرِيُّ ۔ ہر کامل ، غیر معمولی ، اور سب سے اعلیٰ شے ، نیز قبیلے کے سردار اور بلند مرتبہ شخص کو کہنے لگ گئے ۔ فراء نے کہا ہے کہ اسکے معنی نہایت عمدہ دبیز فرش کے ہیں یا دیباج کے***۔ قرآن کریم نے عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ کہا ہے (۷۶/۵۵) ۔ حسین اور نادر فروش ۔

ع ت ب

اَلْعَتَبَةُ ۔ دروازہ کی چوکھٹ ۔ اَلْعَتَبَةُ ۔ (کسی معاملہ میں) سختی ۔ یا نہایت ناخوشگوار بات ۔ چنانچہ سخت اور پتھریلی زمین کو بھی اَلْعَتَبُ کہتے ہیں**** ۔ نیز ایسی زمین کو بھی جو وہاں اترنے والے کے لئے سازگار نہ ہو** ۔ اَلْعَتْبُ ۔ اونٹ کا تین پاؤں پر چلنا جبکہ اسکا ایک

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج ۔ راغب ۔ محیط ۔ ****تاج و محیط ۔

پاؤں بندھا ہوا یا زخمی ہو۔ آدمی کا ایک پاؤں اٹھا کر دوسرے پاؤں پر کود کود کر چلنا۔ تَعَتَّبَ عَلَيْهِ ۔ وہ اس پر ناراض ہوگیا۔ اَلتَّعَاتُبُ وَالْمُعَاتَبَةُ ۔ باہم غصہ اور ناراضگی کو بیان کرنا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سختی اور صعوبت کے ہیں۔ چنانچہ سیڑھی کے درجات کو عَتَبَاتٌ کہتے ہیں۔ نیز پہاڑوں میں پتھروں کی جو سیڑھیاں بنی ہوں انہیں بھی عَتَبَاتٌ کہتے ہیں۔ دروازہ کی چوکھٹ کو بھی اس لئے عَتَبَةٌ کہتے ہیں کہ وہ نشیبی جگہ سے ذرا اونچی ہوتی ہے۔

اَلْعُتْبٰى کے معنی رضامندی ہیں۔ اِسْتَعْتَبَهُ ۔ اس کی رضامندی اور خوشنودی چاہی۔ نیز اس کے معنی اپنی ناراضگی دور کرکے اس سے راضی ہوگیا بھی ہیں*۔

قَدْ اَعْتَبَنِىْ فُلَانٌ ۔ جن باتوں کی وجہ سے میں فلاں آدمی پر ناراض تھا اس نے وہ باتیں چھوڑ دیں اور مجھے راضی کرلیا*۔ اِلْاِسْتِعْتَابُ رضامندی طلب کرنا۔ معافی چاہنا۔ کسی سے یہ خواہش کرنا کہ وہ اس ناگواری، ناراضگی اور عتاب کو دور کر دے جو وہ محسوس کر رہا ہے۔ اَلْمُعْتَبُ ۔ راضی کیا ہوا۔ جس سے عتاب دور کر دیا جائے*۔

قرآن کریم میں ہے وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ($\frac{41}{24}$)۔ اگر وہ ان باتوں کو دور کرنا چاہیں جو ان کے لئے وجہ ذلت و عذاب ہوئی تھیں اور اسطرح ہماری رضامندی طلب کرنا چاہیں تو وہ (ایسا کر نہیں سکینگے)۔ ذلت اور عذاب ان سے چھوٹ نہیں سکیگا۔ ان سے عتاب دور نہیں کیا جائے گا۔ (نیز $\frac{16}{84}$)۔

ع ت د

عَتِيْدٌ ۔ تیار۔ موجود۔ حاضر۔ قریب**۔ ($\frac{50}{18}$)۔ اَعْتَدَ ۔ تیار کرنا۔ حاضر رکھنا**۔ ضرورت کی چیزوں کا پہلے سے ذخیرہ کر لینا***۔ ($\frac{4}{18}$)۔ جہنم چونکہ انسان کے اپنے اعمال کے نتائج سے مرتب ہوتی ہے اس لئے وہ اعمال کے ساتھ ساتھ تیار ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم میں ہے کہ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ($\frac{4}{18}$)۔ ان کے لئے درد انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے خدا نے وہاں اپنے طور پر الگ تیار کر رکھا ہے۔ اس کا مفہوم وہی ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ہر شخص اپنی جنت یا جہنم، زندگی کے ہر سانس

*تاج و محیط۔ **تاج۔ ***راغب۔

میں ساتھ کے ساتھ تیار کرتا رہتا ہے۔ اور یہ سب کچھ خدا کے قانون مکافات کے مطابق ہوتا ہے۔ (تفصیل کے لئے عنوانات جہنم وغیرہ دیکھئے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ آج بھی ہر فرد جہنم کے سامنے موجود اور اس کے قریب ہے)۔ ابن فارس کے نزدیک اس مادہ کے بنیادی معنی قرب اور موجودگی ہیں۔

ع ت ق

اَلْعِتْقُ ۔ حریت ۔ آزادی ۔ شرافت ۔ نجابت ۔ عزت ۔ جمال ۔ عَتَقَ الْعَبْدُ یَعْتِقُ ۔ غلام آزاد ہؤا ۔ آزاد ہونے والا غلام عَتِیْقٌ وَعَتَائِقُ کہلائیگا *۔ قرآن کریم میں خانہء کعبہ کوالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ کہا گیا ہے (۲۲/۲۹)۔ یعنی نظام خداوندی کا وہ مرکز جو دنیا میں ہر قسم کی غلامی اور محکومی سے آزاد ہے ۔ جس پر کسی کا اثر و غلبہ نہیں ۔ نہ ذہنی نہ حکمرانی ۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی انہی معانی کی تائید کی ہے ۔ کسقدر بلند ہے وہ مقام جو ہر قسم کی غلامی سے آزاد ہو ۔ اور کسقدر صاحب شرف وعظمت ہے وہ قوم جس کے مرکز کی یہ شان ہو ۔ رَاحٌ عَتِیْقٌ ۔ وہ سربند شراب جسکی مہر کسی نے نہ توڑی ہو ۔ شراب کہنہ ۔ عَتَقَ الْفَرَسُ عِتْقًا ۔ گھوڑا چلنے میں آگے نکل گیا *۔ تعریفات میں ہے کہ عِتْقٌ کے معنی لغت میں قوت کے آتے ہیں **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ (i) ساخت اور اخلاق دونوں اعتبارات سے معزز و مکرم ہونے کے لئے ۔ اور (ii) قدیم ہونے کے لئے آتا ہے ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلْعَتِیْقُ ہر پیشرو چیز کو کہتے ہیں خواہ اس کا تقدم زمان کے اعتبار سے ہو، خواہ مکان کے اعتبار سے، یا رتبہ کے اعتبار سے***۔ لہذا کعبہ کے الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ۔ (۲۲/۲۹) ہونے میں اس کا آزاد، صاحب قوت، اور شرف و عظمت نیز زمان کے اعتبار سے سب سے بلند اور آگے ہونا، تمام معانی آجاتے ہیں ۔ یہی مقام اقوام عالم میں امت مسلمہ کا تھا ۔ اس لئے کہ کعبہ درحقیقت نشان (Symbol) ہے نظام خداوندی کا اور اس قوم کا جس کا وہ مرکز ہے ۔ جسطرح دارالسلطنت یا عَلَمٌ کسی مملکت کا نشان ہوتا ہے ۔ اور عَلَمٌ کی سربلندی سے مراد خود اُس مملکت کی سربلندی ہوتی ہے ۔

زمان (Time) کے لحاظ سے کعبہ کے متقدم ہونے کے معنی یہ ہونگے کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے قومی مرکز (بیت المقدس) سے بہت پہلے (ملت ابراہیمی کے مرکز کی حیثیت سے) وجود میں آیا تھا ۔

---

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔

ع ت ل

اَلْعَتَلَۃُ - لوہے کا ایک موٹا سا ڈنڈا جس کا ایک سرا آگے سے ذرا چوڑا ہو (گینتی)۔ اس سے زمین یا دیوار کھودی یا ڈھائی جاتی ہے۔ نیز اس سے کھجور کی شاخیں کاٹی جاتی ہیں - اَلْعَتْلُ - کسی کو نہایت بیدردی اور بیرحمی سے گھسیٹنے اور اٹھا لینے، نیز ہانکنے میں نہایت سختی اور طاقت سے زیادہ زور ڈالنے کے معنوں میں آتا ہے - اَخَذَ بِزِمَامِ النَّاقَۃِ فَعَتَلَہَا - اس نے اونٹنی کی مہار پکڑی اور اسے نہایت بے دردی کے ساتھ کھینچا - ابن السکیت نے کہا ہے کہ عَتَلَہٗ کے معنی ہوتے ہیں کسی کو جیلخانے کی طرف نہایت بے دردی سے کھینچ کر لے جانا یا دھکے دیکر لیجانا - ھُوَ مِعْتَلٌ - وہ بیدردی کے ساتھ کھینچنے کی طاقت رکھتا ہے * - راغب نے کہا ہے کہ اَلْعَتْلُ کے معنی ہیں کسی چیز کو اس مقام سے پکڑنا جہاں اس کے مختلف حصے جمع ہو جاتے ہوں اور بزور اسے گھسیٹنا ** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی شدت اور قوت کے ہیں -

سورہ دخان میں ہے فَاعْتِلُوْہُ اِلٰی سَوَاءِ الْجَحِیْمِ (۴۴/۴۷) - اسے کھینچکر دوزخ کے اندر لے جاؤ۔

اَلْعُتُلُّ - بہت کھانے والا اور مال کو روک کر رکھنے والا - خیر خواہی کی باتوں سے اعراض کرنے والا - بہت جھگڑالو *** - بیرحم - بیدرد - سخت گیر - اس میں یہ تمام معانی آجائینگے - قرآن کریم میں ہے عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِکَ زَنِیْمٍ (۶۸/۱۳) - (زَنِیْمٌ کے لئے دیکھئے عنوان ز - ن - م)

ع ت و

عَتَا - یَعْتُوْ - عِتِیًّا وَ عُتُوًّا - حد سے تجاوز کر جانا - حکم عدولی کرنا - عَتَتِ الرِّیْحُ - ہوا تندی و تیزی میں حد سے بڑھ گئی - یعنی جھکڑ اور آندھی بن گئی *** - سورۃ حاقہ میں قوم عاد کے متعلق ہے فَاُھْلِکُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَۃٍ (۶۹/۶) - انہیں سخت زبردست آندھی کے طوفان نے ہلاک کر دیا - لَیْلٌ عَاتٍ - سخت تاریک رات کو کہتے ہیں *** - مَلِکٌ عَاتٍ - جابر اور سنگ دل بادشاہ کو **** - سورۃ طلاق میں ہے عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّھَا (۶۵/۸) - اپنے نشو و نما دینے والے کے حکم سے سرکشی کی -

---

*تاج و محیط - **راغب - *** تاج - ****محیط -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تکبر اور غرور کے ہیں ۔ سورۃ فرقان میں ہے وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا (۲۵/۲۱) ۔ انہوں نے سخت سرکشی اختیار کی ۔ سورۃ مریم میں ہے أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا (۱۹/۶۹) جو رحمٰن کے خلاف سرکشی میں سب سے زیادہ سخت تھے ۔ لیکن دوسری جگہ یہ لفظ صرف شدت اور انتہا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا (۱۹/۸) ۔ میں بڑھاپے کی انتہا تک پہنچ گیا ہوں ۔ یعنی بہت بوڑھا ہو چکا ہوں ۔ راغب کہتا ہے کہ اس کے معنی ہیں بڑھاپے کی ایسی حالت تک پہنچ جانا جہاں اصلاح اور مداوا کا امکان نہ رہے ۔

ع ث ر

عَثَرَ الْعِرْقُ ۔ رگ پھڑکی ۔ عَثَرَ عُثُوْرًا ۔ کسی بات پر بغیر قصد کے مطلع ہو جانا ۔ عَثَرَ عَلَى السِّرِّ ۔ وہ راز سے واقف ہوا ۔ اَعْثَرَهٗ ۔ اسے آگاہ اور مطلع کیا ۔ کہتے ہیں اَعْثَرْتُ فُلَانًا عَلٰى كَذَا ۔ میں نے فلاں کو اس چیز سے باخبر اور اس پر مطلع کر دیا* ۔ قرآن کریم میں ہے وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ (۱۸/۲۱) ۔ اس طرح ہم نے لوگوں کو ان پر مطلع کر دیا ۔ یعنی لوگوں کو ان کی خبر مل گئی ۔ ان کا پتہ چل گیا ۔ دوسری جگہ ہے فَاِنْ عُثِرَ عَلٰى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا اِثْمًا (۵/۱۰۷) ۔ اگر تمہیں یہ محسوس ہو، یا اس کا علم ہو جائے کہ انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہے ۔ اَلْعِيْثَرُ کسی چیز کے اثر خفی کو کہتے ہیں ۔ نیز مٹی ۔

ع ث ی

عثٰی کے معنی ہیں سخت فساد پیدا کرنا ۔ شیرازہ بکھیرنا* ۔ راغب نے کہا ہے کہ (ع ۔ ث ۔ ی) اور (ع ۔ ی ۔ ث) کا مفہوم قریب قریب ایک ہی ہے، تاہم بیشتر یہ لفظ (یعنی عَثّی) ذہنی اور فکری فساد کے لئے بولا جاتا ہے*** ۔ صاحب المنار نے لکھا ہے کہ عَثًا کے معنے ہیں شر اور فساد پھیلانا ، شرارت اور بد معاشی عام کرنا**** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی فساد کے لکھے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۲/۶۰) ۔ ملک میں انتشار پیدا نہ کرو ۔ معاشرہ میں فساد مت پھیلاؤ ۔

---

*تاج ۔ **محیط نیز ابن فارس ۔ ***راغب ۔ ****المنار ، ج-۱ ، ص-۳۲۷ ۔

ع ج ب

اَلْعَجْبُ ۔ جانور کی دم کا وہ حصہ جو سرین سے ملا ہوا ہو۔ ہر چیز کا آخری حصہ* ۔ تَعَجُّبٌ اس حیرت کو کہتے ہیں جو کسی بات کا سبب معلوم نہ ہونے کی وجہ سے انسان کو لاحق ہو جاتی ہے ۔ یا اس کیفیت کو کہ تم کسی چیز کو دیکھو اور وہ تمہیں پسند آئے اور تم سمجھو کہ تم نے ایسی چیز پہلے کبھی نہیں دیکھی ۔ جس چیز سے تعجب کیا جاتا ہو، یا جس سے پہلے کبھی سابقہ نہ پڑنے کی وجہ سے اس سے اظہار حیرت و انکار کیاجائے ، اسے عَجَبٌ کہتے ہیں**۔ اس گھبراہٹ کو بھی عَجَبٌ کہتے ہیں جو کسی کام کو بہت بڑا سمجھنے سے طاری ہوتی ہے ۔ جس جیسی چیز عام طور پر نہ دیکھی جاتی ہو اسے عَجِیْبٌ کہتے ہیں۔ اَلْعُجْبُ کے معنی غرور اور تکبر۔ خودرائی اور خود پسندی کے ہوتے ہیں*۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عَجِیْبٌ اس بات کو کہتے ہیں جس سے تعجب پیدا ہو اور عُجَابٌ اسے کہتے ہیں جو عَجِیْبٌ کی حد سے تجاوز کر گیا ہو۔

قرآن کریم میں ہے مَنْ یُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (۲/۲۰۴) ۔ اس کے معنی حیرت میں ڈالنے یا بھلی معلوم ہونے کے ہیں ۔ یعنی دنیاوی زندگی کے متعلق جس کی بات تمہیں حیرت میں ڈالتی ہے ۔ سورۃ جن میں ہے اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۷۲/۱) ۔ اس میں اس حیرت کی طرف اشارہ ہے جس کا سبب معلوم نہ ہو۔ یعنی وحی کی ماہیت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے تعجب ، کہ یہ قرآن کریم اس قسم کا عجیب و غریب کس طرح بن گیا؟

سورۃ احزاب میں ہے وَلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ (۳۳/۵۲) خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے ۔

ع ج ز

عَجْزٌ کے اصلی معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانے یا اسے ایسے وقت میں حاصل کرنے کے ہیں جب کہ وہ بالکل ہاتھ سے نکل رہا ہو۔ لیکن عام طور پر یہ لفظ کسی بات سے قاصر رہ جانے اور اسے کرنے کی طاقت نہ ہونے

---

*تاج و راغب ۔ **قرآن کریم (۷۲/۱) میں جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں اس کے یہی معنی موزوں نظر آتے ہیں اگرچہ کتب لغت میں یہ معنی نہیں ملتے۔ اس کے مصدری معنی بھی کئے جا سکتے ہیں ۔

کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) کمزوری اور (۲) کسی چیز کا پچھلا حصہ لکھے ہیں - پیچھے رہ جانا خود عَجْزٌ کی دلیل ہے - چنانچہ اَلْعِجْزَةُ - بوڑھے آدمی کے سب سے آخری بچے کو کہتے ہیں - تَعَجَّزْتُ الْبَعِیْرَ - میں اونٹ کے پچھلے حصے پر سوار ہو گیا* - اَلْعَجُوْزُ کے قریب ایک سو معانی کتب لغت میں لکھے ہیں - قرآن کریم میں یہ لفظ (عَجُوْزٌ عَقِیْمٌ ۵۱/۲۹) - بوڑھی یا کمزور اور ضعیف عورت کے لئے آیا ہے - اَلْعَجُزُ - کولھا - کسی چیز کا آخری حصہ - اس کی جمع اَعْجَازٌ ہے - نیز درخت کے تنے کے آخری حصہ کو بھی کہتے ہیں جو زمین سے متصل ہوتا ہے - اَعْجَازُ نَخْلٍ (۵۴/۲۰) کے معنے ہیں کھجور کے درختوں کے جڑ والے تنے - اَعْجَزَ - عاجز کرنا - کمزور کرنا - کمزور سمجھنا- اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ (۸/۵۹) - وہ عاجز نہیں کرسکتے - مُعْجِزٌ - عاجز کرنے والا - شکست دینے والا (۹/۲)- نیز مُعَاجِزِيْنَ (۲۲/۵۱)- ایک دوسرے کو شکست دینے اور بے بس کرنے کی کوشش کرنے والے -

قرآن کریم کا دعوٰی یہ ہے کہ غلط روش پر چلنے والے جو جی میں آئے کرلیں ، وہ کبھی قانون خداوندی کو شکست نہیں دے سکتے - جو قانون انسانوں سے شکست کھا جائے وہ خدا کا قانون کیا ہوا؟ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر انسانوں کی جماعت اس قانون کے نفاذ کی کوشش کرے تو وہ اپنے نتائج انسانی پیمانوں کے مطابق (جلدی) سامنے لے آتا ہے، اور اگر وہ کائناتی طریق پر کارفرما رہے تو اس کے نتائج کائناتی پیمانوں کے مطابق برآمد ہوتے ہیں (جن کی رو سے ایک ایک ''یوم'' ہزار ہزار سال کا بھی ہوتا ہے) - شکست اس قانون کو کبھی نہیں ہوسکتی -

ہمارے ہاں جن معنوں میں معجزہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے ، (یعنی نبی سے کسی ایسی خارق عادت بات کا سرزد ہونا جسے دیکھ کر دوسرے عاجز آ جائیں) قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آیا -

ع ج ف

اَلْعَجَفُ - موٹاپے کا جاتے رہنا - اَعْجَفُ** (جمع عِجَافٌ) - دبلا، لاغر،***- سورۃ یوسف میں سَبْعٌ عِجَافٌ (۱۲/۴۳) آیا ہے - یعنی سات دبلی پتلی (گائیں) - عَجَفَ نَفْسَهُ عَنِ الطَّعَامِ - اس نے بھوک کی خواہش ہوتے ہوئے اپنے آپ کو کھانے سے روک لیا*** - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (i) لاغری اور (ii) ضبط خوہش کے لکھے ہیں -

*تاج و راغب-**بظاہر یہ عجیف کی جمع معلوم ہوتی ہے جس کے معنی لاغر ہیں-***تاج و محیط-

ع ج ل

اَلْعَجَلُ ۔ اَلْعَجَلَةُ ۔ جلدی ۔ تیزی ۔ راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنی ہیں کسی چیز کو اسکے وقت سے پہلے ہی حاصل کر لینے کی خواہش ۔ اَعْجَلَتِ النَّاقَةُ ۔ اونٹنی نے وقت سے پہلے ہی نا تمام بچہ دیدیا ۔ اَلْاِعْجَالُ فِی السَّیْرِ ۔ اونٹ کا اٹھ کھڑے ہونے میں جلدی کرنا ۔ یعنی سواری ابھی اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پائے اور اونٹ اٹھ کھڑا ہو ۔ اَلْمِعْجَالُ ۔ وہ کھجور کا درخت جسکا پھل پہلے پک جائے ۔ اَلْعُجَیْلُ ۔ وہ تھوڑا سا کھانا جو کھانے سے پہلے یونہی سہارے کے لئے پیش کیا جائے ۔ مُسْتَعْجَلَاتُ الطَّرِیْقِ ۔ قریب اور مختصر راستے *۔

قرآن کریم میں تَعَجَّلَ بمقابلہ تَاَخَّرَ آیا ہے (۲/۲۰۳) ۔ اور عَاجِلَةٌ بمقابلہ آخِرَةٌ (۱۹-۱۸/۱۷)؛(۲۱-۲۰/۷۵) ۔ قرآن کریم کی یہ دو اصطلاحات (عَاجِلَةٌ اور آخِرَةٌ) بڑی غور طلب ہیں ۔ (انکے تفصیلی مفہوم کیلئے أ ۔ خ ۔ ر اور د ۔ ن ۔ و کے عنوانات دیکھئے) ۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ دو کسان ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک من گیہوں ہے جو انہوں نے بیج کے لئے رکھے ہیں ۔ انکے ہاں کھانے کی تنگی ہے ۔ ان میں سے ایک کسان اٹھتا ہے اور اپنا گیہوں چکی میں پسوا لاتا ہے ۔ اسکے گھر میں گھنٹہ بھر میں روٹیاں ہی روٹیاں ہو جاتی ہیں ۔ لیکن دوسرا کسان اس وقتی تنگی کو برداشت کر لیتا ہے اور اس گندم کو اپنے کھیت میں بو دیتا ہے ۔ اس پر چھ سات مہینے کا زمانہ تو بڑا سختی کا گزرتا ہے لیکن اسکے بعد اسکے گھر دانے ہی دانے ہو جاتے ہیں اور وہ بڑی فارغ البالی کی زندگی بسر کرتا ہے ۔

اول الذکر کسان نے عجلت سے کام لیا ۔ یعنی اسکی نگاہ مفاد عاجلہ پر تھی ۔ ایسے مفاد پر جو جلدی سے ہاتھ آجائیں ۔ لیکن دوسرے کسان کی نگاہ مفاد آخرہ پر تھی، یعنی مستقبل کی خوش حالی اور فارغ البالی پر ۔ یہ ہے فرق عَاجِلَةٌ اور آخِرَةٌ کا ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جن لوگوں کی نگاہ صرف مفاد عاجلہ (پیش پا افتادہ مفاد) پر ہوتی ہے ہم انہیں مفاد عاجلہ دیدیتے ہیں ۔ لیکن مستقبل کی خوشگواریوں میں انکا کوئی حصہ نہیں ہوتا (۱۷/۱۸ ؛ ۲/۲۰۰) ۔ اسکے برعکس جو لوگ مستقبل کی خوشگواریوں پر نگاہ رکھتے ہیں تو انکا مستقبل بھی درخشندہ ہو جاتا ہے اور (ابتدائی محنت کے بعد) حال بھی خوشگوار (۱۷/۱۹ ؛ ۲/۲۰۱) ۔ یہی دو گروہ ہیں جنکا تقابل سارے قرآن کریم میں نظر آتا ہے ۔

* تاج و محیط ۔

ایک پیش پا افتادہ، قریبی مفاد کیطرف لپکنے والے۔ (تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ۔ (۷۵/۲۰-۲۱؛ ۷۶/۲۸) ۔ اور دوسرے، مستقبل کی خوشگواریوں کیلئے کوشش کرنے والے۔ '' مستقبل '' میں دونوں باتیں آجاتی ہیں ۔ اس زندگی میں موجودہ نسل کے بعد آنے والی انسانیت (Humanity) ۔ اور اس زندگی کے بعد دوسری زندگی۔ قرآن کریم وہ پروگرام دیتا ہے جسمیں عَاجِلَۃ اور آخِرَۃ۔ حال اور مستقبل ۔ دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہو جائیں ۔ یا یوں سمجھئے کہ ایک گروہ وہ ہے جو انسانی زندگی کو محض طبیعی زندگی (Physical Life) قرار دیتا ہے جس کے مفاد اور تقاضے پیش پا افتادہ ہوتے ہیں ۔ دوسرا گروہ، انسان کو عبارت سمجھتا ہے اسکی طبیعی زندگی اور اسکی ذات سے ۔ طبیعی زندگی، موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے لیکن انسانی ذات مرنے کے بعد آگے چلتی ہے ۔ اس لئے جن مفادات کا تعلق انسانی ذات سے ہے وہ عاجلہ کے مقابلہ میں آخرہ ہیں ۔ یہ مستقل اقدار سے حاصل ہوتے ہیں ۔ قرآن کریم ایسا پروگرام دیتا ہے جس میں انسان کی طبیعی زندگی کے تقاضے بھی بطریق احسن پورے ہو جاتے ہیں اور انسانی ذات کی نشوو نما بھی ہوتی جاتی ہے ۔ یوں '' دنیا اور آخرت '' دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں ۔

اَلْعَجَلُ ۔ لغت حمیر میں مٹی کو کہتے ہیں ۔ اسی لئے خَلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (۲۱/۳۷) کے معنی کئے گئے ہیں انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے*۔ (اسکی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے ہوتی ہے جہاں تخلیق انسانی کی ابتدا طین ۔ مٹی ۔ سے بتائی گئی ہے ۔ ۳۲/۷) ۔ لیکن سورہ بنی اسرائیل میں ہے ۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۷/۱۱) ۔ انسان جلدباز ہے ۔ اس لئے (۲۱/۳۷) میں بھی اسکے یہی معنی لئے جائیں تو زیادہ مناسب نظر آتا ہے ۔ بالخصوص جب اسی آیت میں فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بھی آیا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو وہ ہمیشہ مفاد عاجلہ کے پیچھے جاتا ہے ۔ یہ صرف وحی کا قانون ہے جس کے تابع چلنے سے اسکی نگاہ مستقبل پر بھی رہتی ہے ۔ دوسری طرف، اسی عجلت کا نتیجہ ہے کہ وہ ہمیشہ یہ اعتراض کرتا ہے کہ اسکی غلط روش کے نتائج فوراً سامنے کیوں نہیں آتے ۔ حالانکہ خدا کے قانون مہلت کی رو سے ہر عمل اور اس کے نتیجے میں ایک وقفہ ہوتا ہے (جسطرح بیج اور اسکے پھل کے درمیان ایک مہلت کی مدت ہوتی ہے) ۔ جن کی نگاہ خدا کے اس قانون پر ہوتی ہے وہ اس سے نہیں گھبراتے کہ مخالفین کی غلط روش کا نتیجہ فوراً کیوں نہیں سامنے آتا ؟ انہیں خدا کے محکم قانون کی نتیجہ خیزی پر یقین ہوتا ہے ۔

* محیط ۔

اَلْعِجْلُ - بچھڑا - بعض کا خیال ہے کہ ایک ماہ تک کی عمر کے گائے کے بچے کو عِجْلٌ کہتے ہیں *- (۹۲/۲) ; (۸۸/۲۰) - لیکن بعض کا خیال ہے کہ ایک سال تک کی عمر کے گوسالہ کو عِجْلٌ کہتے ہیں **- راغب نے کہا ہے کہ اس میں عجلت کا تصور موجود ہے - یعنی بچھڑا پھرتیلا اور تیز ہوتا ہے اور یہ پھرتی اور تیزی بیل بننے کے بعد اس میں باقی نہیں رہتی ***-

سورہ القیٰمۃ میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ (۱۶/۷۵) - اس کے لفظی معنی ہیں ، تو اپنی زبان کو اسکے ساتھ حرکت نہ دے تاکہ اسے جلدی لے لے - لیکن (جیسا کہ ح - ر - ک کے عنوان میں بھی لکھا گیا ہے) اس کے معنی (۱۱۴/۲۰) کو ساتھ ملانے سے واضح ہو جاتے ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ، یعنی تو (کسی نقطہ کے متعلق) عملی قدم اٹھانے میں عجلت نہ کر تاآنکہ اس کے متعلق پورا پروگرام بذریعہ وحی تجھے دیدیا جائے - جب وحی سارا پروگرام سامنے لے آئے پھر اس کے متعلق عملی اقدام کرو -

ہم نے (ح - ر - ک)کے عنوان میں ضمناً یہ بھی کہا ہے کہ اس سے انسانی اعمالنامہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے - اس صورت میں (۱۶/۷۵) کا (۱۱۴/۲۰) سے تعلق نہیں ہوگا - لیکن (۱۱۴/۲۰) کا مفہوم اس کے بغیر بھی واضح ہے -

ع ج م

لغت عرب میں (ع - ج - م) کا مادہ ابہام اور اخفاء کیلئے آتا ہے - یعنی وضاحت اور بیان کے خلاف - اَلْاَعْجَمُ - وہ آدمی جسکی بات فصیح اور واضح نہ ہو اگرچہ وہ عرب ہی کیوں نہ ہو (جمع اَعَاجِمُ - اَعْجَمُوْنَ اَعْجَمِيْنَ) - پھر اسکے بعد اَلْعَجَمِيُّ ہر غیر عرب کیلئے بولا جانے لگا خواہ وہ فصیح ہی کیوں نہ ہو - اَلْاَعْجَمُ - گونگا -

لطائف اللغۃ میں ہے کہ اَلْعَجَمِيُّ غیر عرب کیلئے بولا جاتا ہے خواہ وہ فصیح البیان ہی کیوں نہ ہو - اور اَلْاَعْجَمِيُّ غیر فصیح ، خواہ وہ عربی ہی کیوں نہ ہو - اَعْجَمَ فُلَانٌ الْكَلَامَ - فلاں نے بات مبہم رکھی - بَابٌ مُّعْجَمٌ - بند دروازہ - اِسْتَعْجَمَتِ الدَّارُ - گھر سونا ہو گیا اور اسمیں جواب دینے والا کوئی نہ رہا ****- ابن فارس نے سکوت اور خاموشی

* تاج - ** محیط - *** راغب - **** تاج - محیط و راغب -

کو اس کے بنیادی معنوں میں لکھا ہے ۔ قرآن میں اَعْجَمِیٌّ بمقابلہ عَرَبِیٌّ مُبِیْنٌ آیا ہے (۱۶/۱۰۳) ۔ نیز دیکھئے (۲۶/۱۹۸ ؛ ۴۱/۴۴) ۔ اَلْعَرَبِیُّ کے معنی فصیح ہیں (دیکھئے عنوان ع ۔ ر ۔ ب)

ع د د

اِعْدَادٌ کے معنی ہیں تیار کرنا ۔ مہیا کرنا ۔ اَعْدَدْتُ لِحَوَادِثِ الدَّھْرِ مِنَ الْمَالِ وَالسِّلَاحِ کے معنی ہیں میں نے حوادث زمانہ کے لئے مال و ہتھیار کی پوری پوری تیاری کر لی ۔ اِسْتَعَدَّ لَہٗ کے معنی بھی یہی ہیں ۔ یعنی اس کے لئے مستعد اور تیار ہو گیا ۔ عَدَّ یَعُدُّ عَدًّا کے معنی ہیں شمار کرنا ۔ گنتی کرنا ۔ عَدَدٌ اور عَدِیْدٌ اس سے اسم آیا ہے * ۔ (وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا (۱۴/۳۴) ۔ مَعْدُوْدٌ ۔ گنے ہوئے * ۔ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً (۲/۸۰) گنتی کے دن * ۔ وہ دن جن کی تعداد معلوم ہو ۔ چنانچہ جب حضرت یوسفؑ کو قافلہ والوں نے بازار مصر میں بیچا ہے تو اس کے لئے قرآن کریم میں دَرَاھِمَ مَعْدُوْدَۃٍ (۱۲/۲۰) آیا ہے ۔ یعنی انہوں نے ایسے چند گنتی کے سکوں کے عوض بیچڈالا ۔ روزوں کے لئے بھی اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ آیا ہے (۲/۱۸۴) ۔ لیکن اس کی تشریح ذرا آگے چل کر کردی گئی ہے جہاں کہا گیا کہ فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ (۲/۱۸۵) ۔ یعنی جو تم میں اس مہینہ (رمضان) میں اپنے مکان پر موجود ہو اسے چاہئیے کہ اس کے روزے رکھے ۔ اس سے واضح ہے کہ روزے رمضان کے پورے مہینے کے ہیں ۔ عِدَّۃٌ اس شمار کی ہوئی مدت کو کہتے ہیں جس میں عورت دوسری جگہ نکاح نہیں کر سکتی * ۔ اور اَلْعُدَّۃُ اس مال و دولت یا ساز و سامان کو کہتے ہیں جسے حوادثِ زمانہ کا مقابلہ کرنے کےلئے انسان تیار رکھے * ۔ عَدًّا ۔ شمار کرنا ۔ (۱۹/۸۴) ۔ عَدَدًا ۔ متعدد ، گنے ہوئے ، (۱۸/۱۱) ۔ عِدَّۃٌ ۔ تعداد ۔ گنتی (۹/۳۶) ۔ عُدَّۃٌ ۔ سامان جو تیار ہو ۔ جو کسی حادثہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رکھا جائے ۔ (۹/۴۶) ۔ اَعَدَّ ۔ تیار کرنا ۔ مہیا کرنا (۹/۱۰۰) ۔ اِعْتَدَّ ۔ شمار کرنا (۳۳/۴۹) ۔

ع د س

اَلْعَدَسُ ۔ مسور کو کہتے ہیں * ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ (۲/۶۱) میں آیا ہے ۔

---

*تاج و محیط ۔

ع د ل

اَلْعِدْلُ ۔ اونٹ کے دونوں طرف جو بوجھ لادا جاتا ہے اور جو ایک دوسرے کے بالکل برابر ہوتا ہے ۔ ان میں سے ہر ایک عِدْلٌ کہلاتا ہے ۔ لہذا اس کے بنیادی معنی ہیں برابر ہونا ۔ عَدَّلَ الْمِیْزَانَ ۔ میزان کو برابر کر دیا ۔ فَاعْتَدَلَ ۔ پس میزان برابر ہو گئی ۔ عَادَلَہٗ مُعَادَلَۃً ۔ اس کے ہموزن اور برابر ہوا۔ عَادَلَ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ ۔ دو چیزوں کو باہمدگر ہم وزن کیا ۔ برابر کیا ۔ نیز دو چیزوں کا موازنہ کیا۔ عَدَّلَہٗ فِی الْمَحْمِلِ وَ عَادَلَہٗ ۔ محمل میں کسی دوسرے کے ساتھ سوار ہونا اور اس کے ساتھ وزن میں برابر ہونا۔ اَلْعَدْلُ ۔ اَلْعِدْلُ ۔ اَلْعَدِیْلُ ۔ مثل اور نظیر ۔ ہموزن ۔ اِعْتِدَالٌ ۔ کمیّت و کیفیت کے لحاظ سے دو حالتوں کے درمیان ہونا ۔ تناسب و توازن ۔ قرآن کریم میں ہے فَعَدَلَکَ (۸۲/۷) ۔ خدا نے انسان کو متناسب الاعضاء بنایا ۔ اس میں پورا پورا توازن و تناسب قائم رکھا۔ اسے سیدھا کھڑا کیا ۔ اس کے لئے توازن کا برقرار رہنا ضروری ہوتا ہے ۔

کسی چیز کے برابر اس کا معاوضہ عَدْلٌ کہلاتا ہے ۔ اَوْ عَدْلُ ذٰلِکَ صِیَامًا (۵/۹۵) ۔ ''یا اس کے برابر روزے رکھنا'' ۔ ابن فارس نے عَدْلٌ کے معنے فدیہ بھی بتائے ہیں ۔ لَا یُؤْخَذُ مِنْھَا عَدْلٌ (۲/۴۸) ۔ اس سے معاوضہ یا فدیہ نہ لیا جائیگا ۔ یا وَ اِنْ تَعْدِلْ کُلَّ عَدْلٍ (۶/۷۰)۔ اور اگر وہ ہرقسم کا معاوضہ دینا چاہے ۔ سورۃ حجرات میں عَدْلٌ اور قِسْطٌ کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں (۴۹/۹) ۔ (قِسْطٌ کا مفہوم عنوان ق ۔ س ۔ ط میں بیان کیا جائیگا) ۔ قرآن کریم نے عَدْلٌ اور اِحْسَانٌ کا حکم دیا ہے (۱۶/۹۰)۔ کسی کو پورا پورا معاوضہ دے دینا عَدْلٌ ہے اور اس کی کمی کو پورا کرکے اس کے توازن (حسن) کو قائم کر دینا اِحْسَانٌ ہے (دیکھئے عنوان ح ۔ س ۔ ن)۔

مثل اور نظیر کے معنوں میں یہ لفظ سورۃ انعام میں آیا ہے جہاں مشرکین کے متعلق کہا ہے کہ وَهُمْ بِرَبِّھِمْ یَعْدِلُوْنَ (۶/۱۵۱) ۔ یہ لوگ دوسروں کو خدا کے برابر ٹھہراتے ہیں ۔

عَدَلَ عَنِ الطَّرِیْقِ کے معنی ہیں راستہ سے ہٹ جانا ۔ عَدَلَ الطَّرِیْقُ ۔ راستہ ایک طرف کو مڑا یا جھکا* ۔ عَادَلَ الشَّیْئُ ۔ وہ چیز ٹیڑھی ہوگئی** ۔ سورۃ النمل میں ہے بَلْ ھُمْ قَوْمٌ یَعْدِلُوْنَ (۲۷/۶۰)۔

*تاج ۔ **محیط ۔

یہ وہ لوگ ہیں جو سیدھے راستے سے ایک طرف ہٹ گئے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں - یعنی ہموار ہونا - اور ٹیڑھا ہونا - لیکن غالب یہ ہے کہ ٹیڑھا ہونے کا مفہوم عَنْ سے پیدا ہوتا ہے ، خواہ وہ مقدر کیوں نہ ہو -

قرآنی معاشرہ کی بنیادیں عدل و احسان پر استوار ہوتی ہیں - اس معاشرہ میں ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملتا ہے - کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوتی - لیکن اس معاشرہ کے افراد نے شروع ہی سے یہ عہد کر رکھا ہوتا ہے کہ وہ اپنی محنت کا معاوضہ اتنا ہی لینگے جو ان کی ضروریات کے لئے کافی ہو - باقی سب نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دینگے - (۲/۲۱۹) - یہ بقایا ان لوگوں کے لئے ہوگا جو کسی وجہ سے محنت کرنے کے قابل نہیں رہے اور جن کی محنت کا ماحصل ان کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہوسکتا - ان کی اس کمی کو پورا کردینے کا نام اِحْسَانٌ ہے - یہ احسان کسی پر "احسان" نہیں ہوتا - نہ ہی اس کی شکل خیرات کی ہوتی ہے - ان تمام افراد معاشرہ نے اس امر کا عہد کر رکھا ہوتا ہے کہ ان کی محنت کا ماحصل سب کی نشو و نما کے لئے کھلا رہے گا - یہ سب کچھ نظام معاشرہ کی تحویل میں رہتا ہے اور تمام افراد معاشرہ کی نشوونما کے کام آتا ہے - یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے عدل و احسان کے حکم کے ساتھ ہی کہدیا ہے کہ فَحْشَاء اور مُنْكَر سے باز رہو (۱۶/۹۰) - فَحْشَاءُ کہتے ہیں- بخل کو ، اور مُنْكَرٌ کہتے ہیں عقلِ فریب کار کی حیلہ جوئیوں کو جو انسان کو زیادہ سے زیادہ سمیٹ لینے پر اکساتی رہتی ہے -

ع د ن

عَدَنَ - يَعْدُنُ وَ يَعْدِنُ - کسی جگہ قیام کرنا - ٹھہرنا - جَنَّاتُ عَدْنٍ - ایسے باغات جن میں جم کر قیام کیا جاسکے - اَلْمَعْدِنُ - کان - (Mine) - ہر چیز کی جگہ جہاں اس کی پیداوار ہو اور وہ وہاں مستقل طور پر پائی جائے - ہر چیز کا مرکز - اَلْمَعَادِنُ - جڑیں * - قرآن کریم میں جَنّٰتِ عَدْنٍ (۹/۷۲) آیا ہے- اس کے معنی ہیں راحت و آرام کی قیام گاہیں - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی "قیام کرنے کے باغ" لکھے ہیں - یعنی ایسے باغیچے جن میں قیام بھی کیا جاسکے -

*تاج و محیط و راغب - کتاب الاشتقاق -

ع د و

اَلْعَدَاءُ وَ الْعَدَوَاءُ کے معنے ہیں دوری ۔ اَلْعِدَیٰ ۔ اجنبی لوگ جو ایک دوسرے سے الگ ہوں ۔ اَلْعُدْوَۃُ ۔ دور جگہ ۔ اَلْعُدْوَۃُ (ع پر تینوں حرکتیں) کنارہ ۔ اَلْعِدَیٰ ۔ وہ لکڑی جو دو لکڑیوں کے درمیان دیدی جاتی ہے (اس طرح وہ دونوں لکڑیاں ایک دوسرے سے دور رہتی ہیں) ۔ تَعَادَیٰ کے معنی ہیں ایک دوسرے سے دور ہونا* ۔ گویا اس مادہ میں ایک بنیادی مفہوم دوری کا پایا جاتا ہے ۔

اسی بُعد اور افتراق کی وجہ سے عَدُوٌّ دشمن کو کہتے ہیں ۔ یعنی صَدِیْقٌ (دوست) کی ضد ۔ نیز وَلِیٌّ کی ضد (یعنی جو مددگار نہ ہو) ۔ تَعَادَی الْقَوْمُ ۔ قوم نے ایک دوسرے سے دشمنی رکھی* ۔ اَلْعِدَیٰ ۔ وہ دشمن جس سے تمہاری جنگ ہو ۔ اَلْعَادِیَاتُ ۔ مجاہدین کے دوڑنے والے گھوڑے ۔ (یعنی دور دور تک دوڑ کر چلے جانے والے) ۔

عَدَا ۔ یَعْدُوْ ۔ عَدْوًا ۔ عَدَوَانًا ۔ تَعْدَاءٌ کے معنی ہیں تیز چلنا ۔ دوڑنا ۔ تَعَادَوْا کے معنی ہیں انہوں نے تیز رفتاری میں ایک دوسرے کا مقابلہ کیا* ۔ راغب نے کہا ہے کہ عَدْوٌ کے اصلی معنی حد سے بڑھنا اور باہمی تطابق و ہم آہنگی نہ ہو سکنا ہیں ۔ اگر یہ صورت محض رفتار کے اعتبار سے ہو تو اسے عَدْوٌ کہا جاتا ہے اور اگر دلی کیفیت کے اعتبار سے ہو تو یہ عَدَاوَۃٌ کہلاتی ہے ، اور اگر عدل و انصاف میں ابتری سے ہو تو عُدْوَانٌ کہلائیگی* ۔ عَدَا عَلَیْہِ کے معنی ہیں اس نے اس پر ظلم کیا ۔ یعنی حد سے تجاوز کیا ۔ تَعَدَّاہُ ۔ وہ اس سے تجاوز کر گیا ، آگے بڑھ گیا ۔ اور اِعْتَدَیٰ عَلَیْہِ کے معنی ہیں اس پر ظلم و زیادتی کی* ۔ عُدْوَانٌ کے معنی بزور اور بدترین طریقہ سے ، حد سے تجاوز کرنا بھی ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز میں حد سے بڑھنا اور ایسے معاملہ میں آگے بڑھ جانا جس میں ایک خاص حد میں رہنا چاہئے تھا ۔

اَعْدَی الْاَمْرَ ۔ وہ ایک معاملہ سے دوسرے کی طرف بڑھ گیا ۔ اَعْدَاہُ الدَّاءُ ۔ بیماری اس کے ساتھ دوسرے کو لگ گئی ۔ مرض متعدی ہو گیا* ۔ التَّعَادِیْ نا ہموار جگہوں کو کہتے ہیں* ۔ اَلْعَدْوَیٰ کے معنی ہیں بیماری کا متعدی ہونا ۔ نیز کسی والی یا امیر سے ظالم کے خلاف مدد طلب کرنا** ۔

*تاج ۔ **محیط ۔

قرآن کریم میں قصہ* آدم میں ہے کہ جب انسانوں نے "امت واحدہ" کے بجائے باہمی تشتت و افتراق (مشاجرت) کی زندگی شروع کردی تو ان کی انفرادی مفاد پرستیاں ایک دوسرے کے درمیان حائل ہو گئیں اور ان میں دوری اور بُعد پیدا ہوگیا ۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ* (۲/۳۶) ۔ اس کے برعکس زندگی اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ (۳/۱۰۲) کی ہے ، جس میں دلوں کو اس طرح ایک دوسرے سے پیوست کر دیا جائے جس طرح بادل کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے میں جذب ہو جاتا ہے ۔ باہمی عَدَاوَةٌ سے اَلتَّعَادِيْ ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ اس لئے یہ مادہ مَوَدَّةٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۶۰/۷) ۔

سورۃ بقرۃ میں اِعْتِدَاءٌ اورعِصْيَانٌ مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں (۲/۶۱) ۔ یعنی سرکشی اور حدود فراموشی ۔ اسی طرح عُدْوَانٌ کا لفظ تَقْوٰی کے مقابل میں آیا ہے (۵/۲) ۔ تقوٰی کے معنی ہیں قوانین خداوندی (حدود اللہ) کی نگہداشت کرنا ۔ لہذا عُدْوَانٌ کے معنی ہوئے حدود فراموشی۔ حد سے تجاوز کر جانا ۔ (۲/۱۹۳) میں یہ لفظ (عُدْوَانٌ) اس زیادتی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جسے سزا کہا جاتا ہے ۔ یعنی ظالموں کو خود ان کا عدوان گھیر لیتا ہے ۔ سورۃ مائدہ میں عَدَاوَةٌ اور بَغْضَاءُ اکٹھا آیا ہے (۵/۶۴) ۔ سورۃ کہف میں ہے وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ (۱۸/۲۸) ۔ تم انہیں نہ کرو ۔ نظر انداز نہ کرو ۔ (Over Look) (۸/۴۲) میں عُدْوَةٌ کے معنی کنارہ ہیں ۔

قرآن کریم میں جرم کے لئے اِثْمٌ اور عُدْوَانٌ کے الفاظ بالعموم اکٹھے آئے ہیں (مثلاً ۲/۸۵) ۔ اِثْمٌ کے معنے ہیں ایسا کام جس سے انسان کی صلاحیتوں میں کمی آجائے اور اس لئے وہ دوسرے افرادِ کارواں کے ساتھ نہ چل سکے بلکہ ان سے پیچھے رہ جائے (دیکھئے عنوان ا ـ ث ـ م) ۔ اور عُدْوَانٌ کے معنی ہیں سرکشی کرکے آگے بڑھ جانا ۔ اسْلَام کا نظام یہ ہے کہ تمام افراد امت باہمدگر ، بانہوں میں بانہیں ڈالے، ایک دوسرے کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں (دیکھئے عنوان س ـ ل ـ م) ۔ جو شخص جماعت سے بچھڑ کر پیچھے رہ گیا (اِثْمٌ) وہ بھی مجرم ہے اور جو سرکشی اختیار کرکے ان سے آگے نکل گیا (عُدْوَانٌ) وہ بھی مجرم ہے ۔ اور اگر عُدْوَان کو تَعْدِيَةٌ سے لیا جائے تو اس سے مراد ہونگے ایسے جرائم جن کا اثر متعدی ہو، یعنی جن کے

*تفصیل ان امور کی ا ـ د ـ م اور ش ـ ج ـ ر کے عنوانات میں دیکھئے۔

اثرات سے دوسرے افراد معاشرہ بھی متاثر ہوں ، اور اِثْمٌ سے مراد ہونگے ایسے جرائم جن کا اثر اس شخص کی ذات تک محدود رہے ۔ (مزید تفصیل ا ۔ ث ۔ م کے عنوان میں دیکھئے) ۔

عَادٍ (۲/۱۷۳) ۔ حدود شکنی یا سرکشی کرنے والا ۔ تَعَدّٰی (۲/۲۲۹) تجاوز کرنا ۔ حد سے آگے بڑھ جانا ۔ اِعْتَدٰی (۲/۱۷۸) زیادتی کرنا ۔ مُعْتَدٍ (۲/۱۹۰) ۔ زیادتی کرنے والا ۔ اس کی جمع مُعْتَدُوْنَ اور مُعْتَدِیْنَ ہے ۔

ع ذ ب

اس مادہ کے بنیادی معنوں میں تین باتیں شامل ہیں (۱) پانی کی خوشگواری اور شیرینی جو پیاس کو روک دیتی ہے ۔ (۲) اذیت اور تکلیف جو زندگی کے آرام میں حائل ہوتی ہے ۔ اور (۳) بندش ، منع کرنا ، اور رکاوٹ * ۔ ان معانی کو سمجھنے کیلئے صحرائے عرب کی زندگی کا سامنے رکھنا ضروری ہے ۔ وہاں پانی بہت کمیاب تھا ، اور پھر شیریں پانی ؟ یہ نعمت بڑی تلاش و جستجو، محنت و مشقت اور لڑائی جھگڑوں کے بعد ملا کرتی تھی ۔ کئی کئی دن اس سے رکنا پڑتا تھا (یعنی بغیر پانی کے رهنا پڑتا تھا) تب کہیں جا کر آب شیریں حاصل ہوتا تھا ۔ اس نقشہ کو سامنے رکھئے اور پھر اس مادہ کی تفصیلات پر غور کیجئے ۔ اَلْعَذْبُ ۔ خوشگوار شیریں پانی ۔ قرآن کریم میں ہے ھٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ (۲۵/۵۳) ۔ یہ خوشگوار اور شیریں (پانی والا) ہے ۔ اِسْتَعْذَبَ الرَّجُلُ مَاءَهٗ ۔ وہ شخص میٹھا پانی لایا ۔ اور اَعْذَبَ الْحَوْضَ کے معنی ہیں تالاب میں پانی کے اوپر جو تنکے وغیرہ پڑ گئے ہوں انہیں صاف کر دینا ۔ اَلْاَعْذَبَانِ ۔ دو خوشگوار چیزیں ۔ یعنی کھانا اور لذت جماع ۔ یا شراب اور لعابِ دہن * ۔

اب اذیت اور تکلیف کا پہلو لیجئے ، عَذَبٌ ان تنکوں (یا کوڑے کرکٹ) کو کہتے تھے جو پانی کے اوپر پڑجائیں اور اسطرح اسے مکدر کر دیں ۔ ان کپڑے کی چندیوں کو بھی کہتے ہیں جسے نوحہ کرنے والی عورتیں اپنے ساتھ رکھتی ہیں ۔ عَذْبَةٌ ایک درخت جسے کھا کر اونٹ مر جاتے ہیں ۔ عَذَابٌ ۔ سزا ، نیز بھوک ، پیاس اور تکلیف کو بھی کہتے ہیں * ۔

اب بندش اور رکاوٹ کے مفہوم کو لیجئے ۔ عَذُوْبٌ اور عَاذِبٌ اُس آدمی یا اونٹ یا گھوڑے کو کہتے ہیں جو پیاس کی شدت کی وجہ سے

---

*تاج و محیط ۔

کھانا پینا چھوڑ دے۔ جو بغیر کچھ کھائے رات گذار دے اسے بھی عَاذِبٌ کہتے ھیں *۔ نیز اسے بھی جسے حفاظت اور سایہ کے لئے چھت نصیب نہ ھو**۔ لہذا بھوک ، پیاس ، تکلیف ، خانماں خرابی ، سب کیلئے عَذَابٌ کا لفظ آیا ھے۔ روکنے کیلئے عَذَبَہٗ عَنِ الشَّیْءِ وَ اَعْذَبَہٗ وَ اسْتَعْذَبَہٗ کہتے ھیں۔ یعنی اسے کسی چیز سے روک دیا***۔ لیکن ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے معانی کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا نہ ھی ان سب کو کسی ایک معنی پر متحد کیا جا سکتا ھے۔

قرآن کریم نے ان تمام سختیوں اور تکلیفوں کیلئے جو فرعون کی قوم غالب اپنی محکوم قوم بنی اسرائیل پر روا رکھا کرتی تھی عَذَابٌ کا لفظ استعمال کیا ھے (مثلاً ۲/۴۹)۔ اور سورۂ بقرہ کے شروع ھی میں مُفْلِحُوْنَ (کامیاب اور کامران گروہ) کے مقابلہ میں لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۲/۷) لا کر بتا دیا ھے کہ عَذَابٌ کے معنی زندگی کی خوشگواریوں سے محرومی و ناکامی ھیں۔ ایسی محرومی کہ پھر زندگی کی شیرینیوں سے متمتع ھونے کی صلاحیت ھی نہ رھے۔

نیز یہ لفظ جرم کی اس سزا کے لئے بھی آیا ھے جو عدالت سے ملتی ھے (۲۴/۲ ; ۵/۳۳)۔ اس میں اذیت کے مقابلہ میں روکنے کا پہلو زیادہ نمایاں ھے کیونکہ سزا سے مقصود ھی جرائم کی روک تھام ھے۔

خدا کیطرف سے عَذَابٌ کے معنی ھیں انسانوں کے غلط کاموں کے تباہ کن اور ھلاکت انگیز نتائج ۔اس اعتبار سے اللہ کو مُعَذِّبٌ کہا گیا ھے (۸/۳۳)۔ اورجو اسطرح تباہ و برباد ھوجائے وہ مُعَذَّبٌ ھے (۲۶/۲۱۳)۔

قرآن کریم کی رو سے دنیاوی زندگی میں ذلت و خواری ، خدا کا عذاب ھے (۲۰/۱۳۴)۔ بھوک اور خوف ، عذاب ھے (۱۶/۱۱۲)۔ برکاتِ سماوی اور ارضی کے دروازوں کا بند ھو جانا عذاب ھے (۷/۹۶)۔ گروہ بندی اور پارٹی بازی عذاب ھے (۶/۶۵)۔ باھمی اختلاف، عذاب ھے (۳/۱۰۴)۔ [اختلافات کا مٹ جانا رحمت ھے۔ ۱۱/۱۱۸، ۱۹]۔ یہ عذاب خداوندی کی صرف چند شکلیں ھیں۔ تفصیل اس کی قرآن کریم کے صفحات میں شروع سے آخر تک پھیلی ھوئی ھے۔

ع ذ ر

اَلْعُذْرُ ۔ ایسی کوشش جس سے انسان اپنی کوتاھیوں اور گناھوں کو مٹا دینا چاھے****۔ نیز وہ حجت جسے انسان بطور اعتذار پیش کرے*****۔

* تاج و لین۔ ** لین۔ ***تاج و محیط۔ ****راغب۔ *****محیط۔

ابن فارس نے اس کے معنی لکھے ہیں انسان کا محض باتوں سے ان اعتراضات و الزامات کو رفع کرنے کی کوشش کرنا جو اس پر عائد کئے جائیں۔ عَذِرَةٌ کے اصلی معنی مکانات کے سامنے کا کھلا میدان ہیں۔ اس کے بعد ان نجاستوں اور گندگیوں کو کہنے لگے جو ان میدانوں میں پھینکی جاتی ہیں*۔ عَذَّرَ الشَّيْءَ۔ چیز کو گندگی سے آلودہ کر دیا۔ پھر (سلب خاصیت کے طور پر) باب افعال سے نجاست اور آلودگی کو الگ کرنے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ أَعْذَرَ الْغُلَامَ إِعْذَارًا کے معنی ہیں اس نے لڑکے کا ختنہ کر دیا۔ لڑکی کے پردہ بکارت کو بھی عُذْرَةٌ کہتے ہیں۔ دوسری طرف أَعْذَرَ الرَّجُلُ إِعْذَارًا کے معنی ہیں اس آدمی کے عیوب بہت زیادہ ہوگئے۔ أَعْذَرَتِ الدَّارُ۔ گھر میں غلاظت بہت ہو گئی۔ إِعْتَذَرَتِ الْمَنَازِلُ۔ مکانوں کے نشانات مٹ گئے**۔ اس مادہ کے اسی قسم کے مختلف معانی کے پیش نظر ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں قیاس کو بالکل دخل نہیں، بلکہ اس کا ہر لفظ اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔

الغرض اس کے معنوں میں آلودگیوں کا زیادہ ہو جانا بھی ہیں اور آلودگیوں کے نشان کا مٹ جانا بھی۔

سورۃ مرسلٰت میں ہے عُذْرًا أَوْ نُذْرًا (۷۷/۶)۔ سورۃ روم میں مَعْذِرَتُهُمْ (۳۰/۵۷) آیا ہے۔ یہاں مَعْذِرَةٌ مصدر بمعنی عذر ہو سکتا ہے۔ نیز اس کے معنے عذرخواہی اور معذرت کے علاوہ حجت بھی ہیں**۔ اور سورۃ قیامۃ میں مَعَاذِيْرَهُ (۷۵/۱۵) ہے، جس کا واحد مِعْذَارٌ ہے۔ لغت یمن میں مَعَاذِيْرُ کے معنے پردے اور حجابات ہیں۔ اس طرح أَلْقَىٰ مَعَاذِيْرَهُ کے معنے اصل حقیقت پر پردے ڈالنا ہونگے۔ نیز اس کے معنے حجتیں پیش کرنا بھی ہیں۔

سورۃ توبہ میں ہے لَا تَعْتَذِرُوْا (۹/۶۶) جس کے معنے بہانہ سازیاں کرنا ہیں۔ عَذَّرَ کے معنی ہیں ایسا عذر پیش کرنا جو ثابت نہ ہو**۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں مُعَذِّرُوْنَ (۹/۹۰)۔ کے یہی معنی ہیں۔ یعنی جھوٹے عذر پیش کرنے والے۔ بہانہ سازیاں کرنے والے۔ کوتاہیاں کرنے والے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ان لوگوں کے ہیں جن کے پاس کوئی عذر تو نہ تھا لیکن وہ بتکلف عذر بناتے تھے۔ تَعَذَّرَ الْأَمْرُ عَلَيْهِ۔ اس پر کام مشکل یا دشوار ہوا۔

* راغب۔ **تاج۔

لہذا عُذْرٌ جہاں سچے دل سے ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس شخص کو اپنی خطا کا احساس ہے اور وہ صحیح طور پر بتاتا ہے کہ اس سے ایسا کیوں ہؤا ، یہ عذر مستحسن ہے ۔ لیکن دوسری قسم کا عذر یہ ہے کہ انسان جان بوجھ کر اپنے قصور کی غلط توجیہ کرتا ہے اوراس طرح محض باتوں سے اس کا ازالہ کر دینا چاہتا ہے ۔

ع ر ب

اَلْعَرَبُ ۔ اَلْعُرْبُ ۔ اہل عرب ۔ راغب نے لکھا ہے کہ حضرت اسمٰعیل ؑ کی اولاد کو اَلْعَرَبُ کہتے ہیں* ۔ لیکن صاحب تاج کے نزدیک یَعْرُبُ بْنُ قَحْطَانَ کی اولاد عرب عاربہ کہلاتی ہے ۔ یہ شخص یمنی قبائل کا جد اعلیٰ تھا اور اسی نے پہلے پہل عربی زبان میں گفتگو کی تھی** ۔ (لیکن یہ توجیہ کچھ وقیع نظر نہیں آتی)۔ اَلْاَعْرَابُ ۔ اَعْرَابِیٌّ کی جمع ہے ۔ یہ لفظ بادیہ نشین (یعنی دیہات اور جنگلوں میں رہنے والے) عربوں کے لئے مختص ہوگیا*** ۔ قرآن کریم میں اَلْاَعْرَابُ (۹/۹۷) انہی بادیہ نشینوں کو کہا گیا ہے ۔

اَلْعَرَبِیُّ ۔ واضح کرنے والا ۔ فصیح* ۔ اَلْاِعْرَابُ ۔ کسی بات کو صاف اور واضح کر دینا ۔ بولنے میں غلطی نہ کرنا ۔ عَرَّبْتُ لَهُ الْكَلَامَ ۔ میں نے اس سے بات کھول کر کہدی** ۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں آتا ہے حُكْمًا عَرَبِيًّا (۱۳/۳۷) یا قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (۱۲/۲)۔ یا لِسَانًا عَرَبِيًّا (۴۶/۱۲)۔ تو اس کے معنے صرف عربی زبان کا قرآن نہیں، بلکہ اس کے معنے ہیں واضح کتاب ۔ ایسی کتاب جو ہر بات کو صاف صاف بیان کرتی ہے ۔ چنانچہ سورۃ زمر میں قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا کے ساتھ غَيْرَ ذِي عِوَجٍ (۳۹/۲۸) کہکر اس کی وضاحت کردی ۔ یعنی ایسی واضح کتاب جس میں کوئی پیچیدگی نہیں ۔

اَلْعَرُوْبُ ۔ وہ بیوی جو اپنے شوہر کو محبوب ہو ۔ اس کی عاشق ہو ۔ اپنی محبت کو ظاہر کرتی ہو ۔ اس کے ساتھ ہنستی بولتی ہو**** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنے (۱) کھولنا اور واضح کرنا (۲) نشاط اور طیب نفس (۳) جسم یا عضو میں خرابی کے ہیں ۔ نشاط اور طیب نفس سے، عَرُوْبٌ خوش دل اور پر نشاط عورت کو کہینگے، لیکن عَرِبَتْ مَعِدَتُهٗ کے معنے ہیں اس کا معدہ خراب ہوگیا ۔ اس اعتبار سے اِمْرَاَةٌ عَرُوْبٌ خراب اور بد اطوار عورت کو بھی کہتے ہیں ۔ عَرُوْبٌ کی جمع عُرُبٌ ہے ۔

*راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔ ****ابن قتیبہ (القرطین ۔ ج/۲ صفحہ ۱۵۴) ۔

''جنت'' کی بیویوں کے متعلق ہے عُرُبًا اَتْرَابًا (۵۶/۳۷) - لیکن سیاق عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ (محبت اور پیار کے علاوہ ، جو ایک اچھی بیوی کی بنیادی صفت ہے) اس سے مراد شائستہ ، مہذب ، فصیح الکلام ، واضح اور صاف باتیں کرنے والیاں بھی ہیں - اس لئے کہ قرآن کریم نے عہد جاہلیہ کی (غیر تربیت یافتہ) عورت کو غَیْرُ مُبِیْنٍ (۴۳/۱۸) کہا ہے - یعنی جو متنازعہ فیہ امور میں اپنی بات کوواضح طور پر بیان نہ کرسکے- اس کے بعد انہی عورتوں کو جب قرآنی معاشرہ میں صحیح تربیت ملی تو وہ نہایت فصیح اور واضح باتیں کرنے والی ہو گئیں -

اَلتَّعْرِیْبُ - صرف واضح بات کرنے ہی کو نہیں کہتے، بلکہ دلیل کے ساتھ بات کرنے کو بھی کہتے ہیں* - لہذا قرآنی معاشرہ میں مرد اور عورتیں سب کی باتیں صاف ، واضح اور دلیل کے ساتھ ہوتی ہیں -

ع ر ج

عَرَجَ - اوپر چڑھنا- عَرَجَ فِی الدَّرَجَۃِ - سیڑھی پر چڑھنا- مَعْرَجٌ سیڑھی (جمع مَعَارِجُ) - مِعْرَاجٌ بھی سیڑھی کو کہتے ہیں (قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا) - عَرَجَ - یَعْرُجُ - اس کے پاؤں میں کوئی چیز لگ گئی اور اس کی وجہ سے وہ لنگڑا کر چلنے لگ گیا - یہ لنگڑا پن عارضی ہوگا - مستقل طور پر لنگڑانے کے لئے عَرِجَ یَعْرَجُ کہینگے - اَعْرَجُ - لنگڑا* - (یعنی وہ آدمی جو ہموار زمین پر ایسے چلے جسطرح کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا ہو) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) عارضی یا مستقل جھکاؤ اور ٹیڑھے پن (۲) بلندی اور ارتقاء کے ہیں - اَلْعَرَجُ- لنگڑا ہونا ، اس اعتبار سے ہے کہ لنگڑا آدمی ٹیڑھا چلتا ہے -

قرآن کریم میں اشیائے کائنات کے سلسلہ ٔ ارتقاء کے ضمن میں آیا ہے - یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ - خدا کسی اسکیم کو اپنے قانون مشیت کی رو سے طے کرتا ہے- پھر اس کا آغاز پست ترین نقطہ سے کرتا ہے - ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْہِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗٓ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲/۵) - پھر وہ شے اس نقطہ ٔ آغاز سے بتدریج بلندیوں کی طرف اٹھتی ہے اور ایک ایک مرحلہ کو ہزار ہزار سال (اور پچاس ہزار سال (۷۰/۴) کی مدت میں طے کرتی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے - اسی نہج

*تاج -

سے خدا نے اپنے آپ کو ذِی الْمَعَارِجِ (۷۰/۳) کہا ہے۔ "سیڑھیوں والا خدا"۔ یعنی جو اس طرح بتدریج تمام اشیاء کو ان کی ارتقائی منازل طے کراتا ہے۔ وہ خدا صراط مستقیم پر بھی ہے (۱۱/۵۶)۔ یعنی ایک توازن بدوش سیدھے راستے پر۔ اور اس کے ساتھ ہی ذِی الْمَعَارِجِ بھی "صراط مستقیم" پر ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے سلسلہ کائنات کو آگے کی طرف بڑھا رہا ہے۔ یہ نہیں کہ اس نے ایک دفعہ اس کائنات کو بنا دیا اور اب یہ کائنات فضا کی پہنائیوں میں ایک ساکن اور جامد ڈھیلے کی طرح پڑی ہے، بلکہ یہ کہ اس میں حرکت ہے اور یہ آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ (Dynamic) ہے۔ نیز اس کی حرکت خط مستقیم پر (Linear) ہے۔ دوری (Cyclic) نہیں۔ یہ تصور یونانیوں کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ یہ اوپر کی طرف بھی چڑھ رہی ہے۔ یعنی اس میں ارتقاء بھی ہے۔ یہ ہے کائنات کا تصور جو قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ یعنی ہر آن آگے بڑھنے والی اور اوپر چڑھنے والی۔ قوانین خداوندی کی یہی راہ ہے جس پر چلنے کی تاکید انسان کو کی گئی ہے۔ یعنی انسان کو بھی ساکن اور جامد نہیں رہنا چاہئے۔ اسے آگے بڑھنا اور بلندیوں کی طرف جانا چاہئے (Progressive and Ascending)۔

اَعْرَجُ بمعنی لنگڑا سورۃ نور میں آیا ہے۔ وَلَا عَلَی الْاَعْرَجِ (۲۴/۶۱)۔ چونکہ لنگڑے کی ٹانگ میں خم ہوتا ہے اس لئے کھجور کے خوشے کی خمیدہ ڈنڈی کو عُرْجُوْنٌ (۳۶/۳۹) کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اِنْعَرَجَ الطَّرِیْقُ کے معنے ہیں راستہ ٹیڑھا ہو گیا۔

اَلْعَرْجُ اسّی سے نوے تک اونٹوں کو کہتے ہیں۔ (ابن فارس)

ع ر ج ن

عُرْجُوْنٌ۔ (دیکھئے ع - ر - ج)۔ کھجور کے خوشے کی ٹیڑھی ڈنڈی۔ (۳۶/۳۹)

ع ر ر

اَلْعَرُّ۔ اَلْعُرُّ۔ اَلْعُرَّۃُ۔ خارش کی بیماری۔ اَلْمَعَرَّۃُ۔ ہر قسم کی مضرت، تکلیف، اذیت، گزند یا نقصان۔ نیز گناہ و قصور کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ عَرَّہٗ اس نے اسے تکلیف دی*۔ سورہ فتح میں ہے فَتُصِیْبَکُمْ مِّنْھُمْ مَّعَرَّۃٌ (۴۸/۲۵)۔ تمہیں ان کی وجہ سے کوئی نقصان پہنچ جائے۔ عَرَّہٗ۔ اِعْتَرَّہٗ۔ کسی کے پاس جانا اور بغیر سوال کئے اس کا احسان طلب

* تاج و راغب۔

کرنا ۔ بخشش طلب کرنے کے لئے کسی کے سامنے آنا ۔ ابن القطاع نے کہا ہے کہ اَلْمُعْتَرُّ ملنے والے کو کہتے ہیں، لیکن اہل لغت کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اَلْقَانِعُ تو وہ ہے جو سوال کرے (دیکھئے ق ۔ ن ۔ ع) اور مُعْتَرٌّ وہ ہے جو تم سے کچھ لینے کیلئے تمہارا چکر لگائے خواہ زبان سے اپنی حاجت بیان کرے یا نہ کرے* ۔ اس کا مطلب مصیبت زدہ یا حاجت مند ہی ہے ۔ قرآن کریم میں اَلْقَانِعُ وَالْمُعْتَرُّ (۲۲/۳۶) اکٹھا آیا ہے، مطلب مصیبت زدہ ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس محتاج کو کہتے ہیں جو ہر وقت تمہارے ساتھ چمٹا رہے اور تمہارا پیچھا لیے لے ۔ اس لئے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی "کسی چیز کو کسی خراب چیز کے ساتھ لتھیڑ دینے" کے بھی آتے ہیں ۔

ع ر ش

اَلْعَرْشُ ۔ کسی چیز کا رکن ۔ ستون ۔ گھر کی چھت ۔ یا وہ سہارے جس پر چھت کھڑی ہو ۔ سائبان* ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْعَرْشُ دراصل ہر چھت والی چیز کو کہتے ہیں ۔ اسکی جمع عُرُوْشٌ ہے ۔ نیز بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ (تخت) کو بھی کہتے ہیں**۔ اسی سے اسکے معنی حکومت و سلطنت اور قوت و اقتدار کے ہو گئے ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے اس کے معنی غلبہ اور قوت کے کئے ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی بنائی ہوئی چیز میں بلندی کے ہیں ۔

سورہ النمل میں ملکۂ سبا کے متعلق ہے وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ (۲۷/۲۳) ۔ اسکا بہت بڑا تخت تھا ۔ سورہ بقرہ میں ایک اجڑی ہوئی بستی کے متعلق ہے وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا (۲/۲۵۹) ۔ اس بستی کے مکانات اپنی چھتوں یا ستونوں پر گرے پڑے تھے ۔ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ (۶/۱۴۲) ۔ ایسے باغات جن میں اس قسم کی بیلیں ہوں جو بانس وغیرہ کی ٹٹیوں پر چڑھائی جائیں ۔ جیسے انگور کی بیلیں ۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے عَرْشٌ کا لفظ متعدد بار آیا ہے ۔ مثلاً هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۹/۱۲۹) ۔ اسکے معنی اقتدار اعلیٰ ۔ مرکزی کنٹرول کے ہیں ۔ یعنی ساری کائنات کا خالق بھی وہی ہے اور اسکا اقتدار اور کنٹرول بھی اسیکے ہاتھ میں ہے ۔ اور یہ کنٹرول اسکی بڑی محکم گرفت

*تاج و راغب ۔　**راغب ۔

میں ہے، جس میں کسی قسم کی کمزوری نہیں آسکتی ۔ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (۷/۵۴) ۔ اِسْتَوٰی کے معنی کسی چیز پر جم کر بیٹھنا ۔ یعنی پوری طرح غالب آجانا ہیں ۔

سورہ ھود میں ہے وَ کَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ (۱۱/۷) ۔ اسکا عرش (مرکزی اقتدار) پانی پر ہے ۔ یہ نکتہ سمجھنے کے قابل ہے ۔ سورہ انبیاء میں ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (۲۱/۳۰) ۔ ہم نے ہر شے کو پانی سے زندگی عطا کی ہے ۔ یعنی حیات کا سرچشمہ پانی ہے ۔ اسکی تائید دور حاضر کی تحقیق سے ہو رہی ہے کہ پانی کے بغیر زندگی ناممکن ہے ۔ حیات کی جل پری نے آنکھ ہی پانیوں میں کھولی ہے ۔ لہذا جب قرآن کریم نے کہا کہ خدا کا عرش پانی پر ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ سرچشمہٗ حیات پر واحد کنٹرول خدا کا ہے ۔ خدا کا یہ کنٹرول اسکے قانون کی رو سے کار فرما ہے ۔ اسنے ہر شے کے لئے ایک قانون بنا دیا ہے اور کسی کو مجال نہیں کہ اس قانون کی خلاف ورزی کر سکے ۔ خارجی کائنات کیطرح انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کیلئے بھی خدا کا قانون ہے (جسے وحی کہتے ہیں) ۔ انسان کو چونکہ صاحب اختیار بنایا گیا ہے اسلئے اسے اسکا اختیار ہے کہ یہ جی چاہے تو خدا کے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے تو اپنے لئے کوئی اور قانون وضع کر لے ۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ ، قانون خداوندی کے خلاف چلنے سے زندگی کے خوشگوار نتائج مرتب کر لے ۔ نتائج ہمیشہ قانون خداوندی کے مطابق ہی مرتب ہونگے ۔ اس پر صرف خدا کا کنٹرول ہے ، کسی اور کا نہیں ۔ خدا کا عرش تمام کائنات پر بچھا ہوا ہے ۔

ع ر ض

عَرْضٌ کے معنے ہیں کسی چیز کا ظاہر ہو جانا ، یا کسی کے سامنے پیش کرنا (۳۳/۷۲) ۔ عَرَضَ لَہٗ کَذَا ۔ اسے ایسا ماجرا پیش آیا ۔ سرسری طور پر کوئی چیز اسے نظر آئی ۔ عَرَضَ عَلَیْہِ کَذَا ۔ اسے فلاں چیز دکھلائی ۔ عَرَضَ الشَّیْءُ ۔ چیز ظاہر ہوگئی ۔ اَلْعَارِضُ ۔ وہ چیز جو تمہیں پیش آئے یا تمہارے سامنے آئے ۔ اَلْعَارِضَۃُ ۔ دروازے کی چوکھٹ کی بالائی لکڑی جس میں دروازہ گھومتا ہے ۔ اَلْعَارِضُ ۔ وہ بادل جو افق میں پھیلا ہوا ہو* (۴۶/۲۴) ۔ اَلْعَرْضُ ۔ کسی چیز کی چوڑائی کو کہتے ہیں* ۔ قرآن

* تاج

کریم میں جنت کے متعلق ہے عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَ الْأَرْضِ (۲۱/۵۷) جسکی وسعت اور کشادگی تمام ارض و سماء (ساری کائنات) جتنی ہے۔

أَعْرَضَ عَنْهُ۔ اس سے اعراض کرلیا۔ پیٹھ موڑ لی۔ عَرَضَ الْفَرَسُ فِیْ عَدْوِهٖ۔ گھوڑا اپنی دوڑ میں سر اور سینے کو ایک طرف ٹیڑھا کرکے دوڑا۔ یعنی اپنے آپ کو سیدھا رکھنے کے بجائے چوڑائی (عرض) میں رکھ کر دوڑا*۔

اِعْتِرَاضٌ۔ کسی چیز کا اس طرح سامنے آجانا کہ اس سے راستہ رک جائے*۔ عُرْضَةً (۲۲۴/۲)۔ آڑ۔

اَلْعَرَضُ۔ گھر کا ساز و سامان۔ مال و دولت*۔ (۳۳/۴)۔ سورۃ اعراف میں ہے يَأْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْأَدْنٰى (۱۶۹/۷)۔ یہ لوگ پیش پا افتادہ مفاد (ساز و سامان) حاصل کر لیتے ہیں (اور مستقبل کا خیال نہیں رکھتے)۔ یہاں عَرَضٌ کے معنے ساز و سامان ہیں۔ راغب نے العَرَضُ کے معنے ناپائدار شے بھی لکھے ہیں**۔ سورۃ توبہ میں ہے لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا (۴۲/۹) اگر کوئی فائدہ یا سامان ایسا ہو جو جلد مل جائے۔ یہاں بھی عَرَضٌ کے معنے واضح ہیں***۔

قرآن کریم نے مُعْرِضُوْنَ کی تشریح تَوَلَّيْتُمْ سے کردی ہے (۸۳/۲ و ۲۳/۳)۔ یعنی روگردانی کرنے والے۔ گریز کی راہیں نکالنے والے۔ پھر جانے والے۔ ایک طرف ہٹ جانے والے۔ أَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (۹۴/۱۵) کے معنی ہیں فَاصْفَحْ (۸۵/۱۵)۔ ان سے الگ ہٹ جاؤ۔ ایک طرف ہو جاؤ۔

ع ر ف

اَلْعَرْفُ۔ بو (مہک) کو کہتے ہیں۔ عَرَفْتُهُ۔ میں نے اس کی بُو پالی۔ یہیں سے اس کے معنے پہچاننے کے آتے ہیں۔ راغب کے نزدیک، کسی چیز کی علامات و آثار پر غور و فکر سے اس کا ادراک کرلینا، مَعْرِفَةٌ یا عِرْفَانٌ کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا جاننا عِلْمٌ سے کم درجے کا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اَللّٰهُ يَعْلَمُ کہتے ہیں (خدا کو اس کا علم ہے)۔ اَللّٰهُ يَعْرِفُ (خدا کو اس کی معرفت ہے) نہیں کہتے، کیونکہ خدا کا علم (ہر شے کے متعلق) یقینی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس خدا کی ذات کا علم انسان کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ البتہ کائنات پر غور و فکر کرنے سے اس کی صفات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اسے خدا کی معرفت کہہ سکتے ہیں*۔ (قرآن کریم میں اللہ کے لئے معرفت کا لفظ نہیں آیا)۔

---

*تاج۔ **راغب۔ ***لطائف اللغۃ۔

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں عَارِفٌ بِاللّٰہِ (خدا کی معرفت رکھنے والوں) کے متعلق جو عام تصور ہے کہ وہ خدا کی ذات کا علم رکھتے ہیں ، کسقدر غلط ہے ۔ کائنات کے مشاہدہ اور قرآنی حقائق پر غور و فکر سے قوانین خداوندی کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے ۔ خود ذات خداوندی کے متعلق کوئی کچھ نہیں جان سکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے خدا پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے ۔ اس کے عرفان کا نہیں ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز کا یکے بعد دیگرے ۔ پے در پے ہونا ۔ اور (۲) سکون اور اطمینان ۔ چنانچہ اَلْعُرْفُ (اور اَلْعُرُفُ) گھوڑے کی ایال کو کہتے ہیں، کیونکہ اس میں بال یکے بعد دیگرے ، پے در پے ، ہوتے ہیں ۔ عَرَفَ کے معنی پہچاننا اس لئے ہیں کہ نہ جانی پہچانی چیز سے انسان کو وحشت ہوتی ہے اور جانی پہچانی سے سکون و اطمینان ہوتا ہے ۔ اَلْعَرْفُ ۔ عمدہ خوشبو کو کہتے ہیں ۔

عَرَفَ یَعْرِفُ ۔ مَعْرِفَةً وَ عِرْفَانًا ۔ کسی چیز کو پہچان لینا ۔ مَعَارِفُ الْاَرْضِ ۔ زمین کے جانے پہچانے راستے* ۔ تَعَارَفُوْا ۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو پہچان لیا ۔ اَمْرٌ عَرِیْفٌ ۔ جانا پہچانا ہوا کام** ۔ اَلْعَرِیْفُ ۔ جو اپنے آدمیوں کو پہچانتا ہو ۔ (یا ان کا تعارف کراتا ہو) ۔ رئیس قوم ۔ نقیب جو سردار کے نیچے ہوتا ہے ۔ اَلتَّعْرِیْفُ ۔ کسی چیز کو پہچنوا دینا** ۔

پہچاننے کے اعتبار سے بلند چیز کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ اَلْعُرْفُ ۔ ریت کا بلند ٹیلہ یا بلند جگہ ۔ اَلْاَعْرَافُ ۔ بلند جگہ ۔ نیز جو کھیتی ڈولوں اور کناروں پر ہو ۔ قُلَّةٌ عَرْفَاءُ ۔ بلند چوٹی ۔ نَاقَةٌ عَرْفَاءُ ۔ بلند کوہان والی اونٹنی ۔ اَلْمَعْرِفَةُ ۔ دو چیزوں کے درمیان کی حد** ۔

اِعْتَرَفَ بِذَنْبِہٖ ۔ اس نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا ** ۔ (۹/۱۰۲) ۔ عَرَفَ فُلَانًا ۔ فلاں کو اس کے جرم کی سزا دی** ۔

آگے پیچھے آنے کو بھی عُرْفًا کہتے ہیں ۔ جَاءَ الْقَوْمُ عُرْفًا ۔ قوم آگے پیچھے آئی ۔ اس سے بعض نے کہا ہے کہ وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا (۷۷/۱) کے معنی ہیں وہ فرشتے جو یکے بعد دیگرے آئیں** ۔

قرآن کریم میں یَعْرِفُوْنَ بمقابلہ یُنْکِرُوْنَ آیا ہے (۱۶/۸۳) ۔ اسی سے اَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهْیٌ عَنِ الْمُنْکَرِ متعدد مقامات پر آیا ہے ۔

*تاج ۔ ** تاج و راغب ۔

(مثلاً ۳/۱۰۴) ۔ سورۃ اعراف میں اَلْمَعْرُوْفُ کی جگہ اَلْعُرْفُ آیا ہے (۱۹۹/۷)۔ مَعْرُوْفٌ سے مراد ہیں وہ تمام امور جنہیں ایک قرآنی معاشرہ اپنے ہاں تسلیم (Recognise) کرلے ۔ اور مُنْکَرٌ ۔ وہ تمام باتیں جنہیں وہ صحیح تسلیم نہ کرے ۔ جنہیں وہ (Recognise) نہ کرے ۔یہ قرآن کریم کی ایک جامع اصطلاح ہے جسمیں قرآنی نظام کے نافذ کردہ احکام و قوانین سے لیکر اس معاشرہ کے روزمرہ کے رسوم و آداب تک سب آجاتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان رسوم و آداب کے بنیادی اصول تو غیر متبدل رہینگے کیونکہ وہ قرآن کریم نے متعین کر دئے ہیں، لیکن ان کی شکل و صورت اور تفاصیل و جزئیات زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہینگی ۔ لہذا ایک قرآنی معاشرہ جن آئین و آداب کو اپنے وقت میں (Recognise) کرلے وہ معروف ہونگے ، خواہ وہ پہلے سے موجود ہوں یا وہ انہیں خود تجویز کرے ، حتکہ کسی قوم یا ملک کے رسم و رواج کو بھی وہ اپنے ہاں رائج رہنے دے تو وہ بھی مَعْرُوْفٌ کے ذیل میں آجائینگے۔ لیکن اس کے ساتھ اس شرط کو بھی پیش نظر رکھئے کہ ان میں سے کوئی چیز قرآن کریم کے اصول و احکام کے خلاف نہیں ہونی چاہئے ۔ ایسی بات منکر ہو جائیگی (دیکھئے عنوان ن ۔ ک ۔ ر) ۔

قرآن کریم میں ایک مقام پر اَلْاَعْرَافُ کا بھی ذکر آتا ہے ۔ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ (۴۶/۷) ۔ عام طور پر اَعْرَافٌ اس مقام کو کہا جاتا ہے جو جنت اور دوزخ کے بین بین ہے اور ان لوگوں کو اعراف والے سمجھا جاتا ہے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر برابر ہونگی اور ان کا معاملہ ہنوز طے نہیں ہوا ہوگا کہ اُنہیں کدھر بھیجا جائے ۔ لیکن یہ مفہوم درست نہیں ۔ قرآن کریم میں صرف اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اور اَصْحٰبُ النَّارِ کے دو گروہوں ہی کا ذکر ہے ۔ کسی ایسے (تیسرے) گروہ کا ذکر نہیں جو بین بین معلق ہو۔ دوسرے یہ کہ ان اہل اعراف کا مقام اتنا بلند بتایا گیا ہے کہ وہ تمام اہل جنت اور اہل جہنم کو انکی نشانیوں سے پہچانتے ہونگے ۔ لہذا بلندی کے اعتبار سے (جو اَعْرَافٌ کا صحیح مفہوم ہے ۔ یعنی بلند مقامات*)۔ یہ طبقہ بلند ترین انسانوں کا ہے ۔ یہ حضرات اپنے اپنے گروہوں پر بطور شاہد سامنے آئینگے (۴۱/۴) ۔ یہ گروہ ، اَصحٰبُ الجنہ میں سے غالباً وہ طبقہ ہے جسے اَلسَّابِقُوْنَ اور اَلْمُقَرَّبُوْنَ کہکر پکارا گیا ہے (۱۱-۱۰/۵۶)۔ یہ وہ جماعت مومنین ہے جسے شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (۱۴۳/۲) کہا گیا ہے ۔

*ابن قتیبہ (القرطین ۔ ج/۱ صفحہ ۱۷۸) ۔

حج کے اجتماع میں عَرَفَاتٍ کا بھی ذکر ہے (۲/۱۹۸) - یہ وہ میدان ہے جس میں تمام دنیا کی ملت اسلامیہ کے نمائندوں کا باہمی تعارف ہوتا ہے -

سورۃ محمد میں جنت کے متعلق ہے، عَرَّفَهَا (۴۷/۶) - راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جنت جسے ان کے لئے خوشگوار بنایا گیا ہے - اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ جنت ان کی جانی پہچانی ہے، کیونکہ اس کا تعارف قرآن کریم نے کرا دیا ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے جنت کو خوشبو سے بسا دیا - لیکن اس کے معنے متعارف کے زیادہ موزوں نظر آتے ہیں -

ع ر م

عُرَامُ الْجَيْشِ - لشکر کی تندی و تیزی، شدت اور کثرت - اَلْعُرَامُ مِنَ الرَّجُلِ - آدمی کی تندی و درشتی، سختی اور اذیت رسانی - اَلْعَرِمُ - بند یا دیگر رکاوٹیں جو وادیوں میں بنا دی جائیں - نیز سخت بارش جسے برداشت نہ کیا جاسکے* -

قرآن کریم میں سَيْلَ الْعَرِمِ (۳۴/۱۶) آیا ہے - جسکے معنی نہایت تند و تیز سیلاب کے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سختی اور تیزی کے ہیں -

ع ر و

عُرْوَةٌ - بیری وغیرہ کی قسم کی خار دار جھاڑیوں یا پیلو کی قسم کے درختوں کا جھنڈ (جن کی جڑیں زمین میں پائیدار رہتی ہوں اور) جن کے پتے سردی میں بھی نہ گریں - چنانچہ جب جانوروں کے لئے کوئی اور چارہ نہ رہے تو یہی درخت ان کی جان بچاتے ہیں - ان پر ہر موسم میں اعتماد کیا جا سکتا ہے - اس نہج سے ہر وہ شے جس پر بھروسہ کیا جا سکے عُرْوَةٌ کہلاتی ہے - نیز ڈول وغیرہ کا دستہ جس سے اسے پکڑا جائے عُرْوَةٌ کہلاتا ہے** - ہر وہ سہارا جسے پکڑ کر کوئی لٹک جائے*** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چمٹے رہنے اور جم کر باقی رہنے کے ہیں - اسی جہت سے عُرْوَةٌ کاج کو بھی کہتے ہیں جس میں بٹن اٹکا رہتا ہے -

سورہ بقرہ میں خدا پر ایمان کو اَلْعُرْوَةُ الْوُثْقٰى (۲/۲۵۶) کہا ہے - یعنی ایسا محکم آسرا جس پر کامل بھروسہ کیا جا سکے - زندگی کا ایسا قانون

---

* تاج - محیط - راغب - **تاج - ***راغب -

جو اپنی نتیجہ خیزی میں کبھی خطا نہ کرے۔ جسکی محکمیت پر پورا پورا اعتماد ہو۔ جو کبھی دغا نہ دے۔ جو راستہ ہی میں نہ ٹوٹ جائے۔

عَرَاہٗ۔ اِعْتَرَاہٗ۔ اس کے سامنے آیا۔ پیش آیا۔ یعنی وہ بات اس کے سامنے اسطرح آگئی کہ اس کے اور اس بات کے درمیان کوئی آڑ نہ رہی**۔ سورہ ہود میں ہے اِعْتَرَاکَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوْءٍ (۱۱/۵۴)۔ ”ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تجھ پر کوئی مصیبت ڈال دی ہے“۔

ع ر ی

اَلْعُرْیُ۔ ننگا ہونا۔ عَرِیَ۔ یَعْرَی۔ عُرْیاً۔ ننگا ہونا*۔ قرآن کریم میں ہے لَا تَعْرَی (۲۰/۱۱۸)۔ تو ننگا نہ رہیگا۔ لباس کی محتاجی نہ ہوگی۔ جنتی معاشرہ میں جو بنیادی ضروریات ہر ایک کو میسر ہونگی ان میں لباس بھی ہے۔ (نیز کھانا پینا اور مکان (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)۔ اَلْعَرَاءُ۔ کھلی جگہ جہاں کوئی چیز آڑ کے لئے نہ ہو*۔ قرآن کریم میں ہے فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَاءِ (۳۷/۱۴۵)۔ ہم نے اسے کھلے میدان میں ڈال دیا۔ نیز نُبِذَ بِالْعَرَاءِ (۶۸/۴۹)۔ اَلْعَرَی کے معنے ہیں کنارہ، گوشہ، صحن، آنگن نیز دیوار۔ اَعْرَاءُ الْاَرْضِ۔ زمین کے ابھرے ہوئے حصوں کو کہتے ہیں*۔

[عَرَاہٗ اور اِعْتَرَاہٗ کے لئے دیکھئے عنوان ع۔ ر۔ و]

ع ز ب

عَزَبَ۔ یَعْزُبُ۔ غائب ہو جانا۔ پوشیدہ ہو جانا۔ دور ہو جانا۔ چلا جانا۔ اَلْمِعْزَابُ۔ وہ آدمی جو اپنے جانوروں کو لیکر لوگوں سے بہت دور چراگاہ میں چلا جائے۔ اَلْعَزِیْبُ۔ وہ آدمی جو اپنے اہل و عیال سے بہت دور چلا جائے۔ اِبِلٌ عَزِیْبٌ۔ وہ اونٹ جو شام کو اپنے گھروں پر نہ آئیں***۔

قرآن کریم میں ہے وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّکَ ...... (۱۰/۶۱) تیرے رب (کے علم) سے کوئی چیز بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ دور نہیں جاسکتی۔ غائب نہیں ہو سکتی۔ یعنی خدا کے قانون کی دسترس سے کوئی چیز باہر نہیں رہ سکتی۔

ع ز ر

اَلْعَزْرُ کے بنیادی معنی کسی کو روکنے (منع کرنے) کے ہوتے ہیں۔ عَزَرْتُ الرَّجُلَ۔ میں نے اس آدمی کو روک دیا۔ اسی سے تَعْزِیْرٌ

---

* تاج۔ ** راغب۔ *** تاج۔ محیط۔ راغب۔

کے معنی تادیب کے آتے ہیں - یعنی کسی کو حد شرعی سے کم سزا دینا تاکہ وہ آئندہ جرم سے رک جائے - چونکہ یہ تادیبی کاروائی درحقیقت اُس آدمی کی اصلاح کے لئے ایک قسم کی مدد ہوتی ہے، اس لئے اَلتَّعْزِیْرُ نصرت کو بھی کہتے ہیں جس میں تعظیم کا جذبہ شامل ہو** - قرآن کریم میں ہے وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ (۵/۱۲) - تم نے ان کی مدد کی تعظیم کے ساتھ - صاحب تاج العروس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں قوت بہم پہنچانا - تلوار اور زبان سے مدد دینا* - ابن فارس نے اسکے بنیادی معنوں میں تعظیم ونَصْر اور تعزیر (مار کی سزا) دونوں لکھے ہیں -

سورہ اعراف میں ہے فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ (۷/۱۵۷) - اور سورہ فتح میں ہے لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (۴۸/۹) - ان آیات میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے رسول ؐ کی مدد کریں (نصرت) - تعظیم کریں (توقیر) - اور عَزَّرُوْهُ - اس کے معنی ہیں رسول ؐ کی ایسی مدافعت کرنا جس سے اس کی ذات اور اس کا پیغام تمام شرپسند عناصر کی تخریب سے محفوظ رہے - یعنی رسول اللہ ؐ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ ہونے دی جائے جس سے حضور ؐ کی ذات پر کسی قسم کا طعن آئے یا آپ ؐ کی تعظیم پر کوئی اعتراض وارد ہو-

ع ز ز

اَلْعِزُّ - قوت - شدت - غلبہ - رفعت اور حفاظت کو کہتے ہیں - بصائر میں ہے کہ عِزَّةٌ اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو مغلوب ہونے سے محفوظ رکھے - (یعنی اپنے اندر ایسی سختی پیدا ہو جانا کہ کسی کے دبائے سے دب نہ سکے) - صاحب کتاب الاشتقاق نے اس کے معنی صلابت اور شدت کے لکھے ہیں - اسیلئے کہتے ہیں اِسْتَعَزَّ الرَّمْلُ - ریتیلا ٹیلہ اپنی جگہ پر مستحکم رہا اور ڈھیلا ہو کر نیچے نہیں گرا***- اَلْمَعْزُوْزَةُ سخت زمین - اس زمین کو کہتے ہیں جس پر بارش ہونے سے اسکی مٹی یا ریت جم جائے اور وہ سخت ہو جائے - تَعَزَّزَتِ النَّاقَةُ - اونٹنی کے تھنوں کے سوراخ تنگ ہوئے اور ان سے مشکل سے دودھ نکلا - تَعَزَّزَ اللَّحْمُ - گوشت سخت ہوا - لہذا عَزَّهٗ یَعِزُّهٗ کے معنی ہیں کسی پر غالب آجانا - اسے اپنی صلابت اور سختی کی وجہ سے زیر کر لینا (۳۸/۲۳) - اسیلئے اَلْعَزِیْزَةُ - عقاب کو کہتے ہیں ***- عَزَّ کے معنی ہیں قوی ہوا - عَزَّزَهٗ - اسے تقویت دی (۳۶/۱۴)

* تاج - ** راغب - ***تاج و محیط -

عَزَّ عَلَیَّ اَنْ تَفْعَلَ کَذَا - مجھ پر یہ بات بڑی ھی گراں گذری کہ تم ایسا کرو*۔

قرآن کریم میں یہ لفظ ذِلَّةٌ کے مقابلہ میں آیا ھے (۳/۲۵) اور اسکے معنی بتائے ھیں قوت و اختیار کا ملجانا (۳/۲۵) - سورہ کہف میں اَعَزُّ نَفَرًا (۱۸/۳۴) آیا ھے - یعنی قبیلہ اور جتھے کے اعتبار سے میں زیادہ صاحب اقتدار ھوں - سورہ صٓ میں ھے فِیْ عِزَّةٍ وَ شِقَاقٍ (۳۸/۲) - قرآن کریم کی مخالفت کرنے والے اپنی قوت کے نشہ میں بد مست ھو کر اسکی مخالفت پر اتر آئے ھیں - سورہ التوبہ میں نبی اکرمؐ کے متعلق ھے عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ (۹/۱۲۸) - جس بات سے تمہیں تکلیف پہنچے وہ اس پر سخت شاق گزرتی ھے -

قرآن کریم میں خدا کیلئے اَلْعَزِیْزُ آیا ھے - (۲/۱۲۹) - یعنی کائنات میں غلبہ و اقتدار صرف اسکے قانون کو حاصل ھے اور کوئی طاقت ایسی نہیں جو اسکے قانون پر غالب آسکے - انسانی معاشرہ میں اس قسم کا غلبہ واقتدار اس جماعت کو حاصل ھو سکتا ھے جو ایک مرکز کے ماتحت، قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے (۶۳/۸) - جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ھے؛ اقتدار اور غلبہ صرف خدا کیلئے ھے - لیکن اس نے ایسے قوانین بنا دئے اور بتا دئے ھیں جنکے مطابق چلنے سے انسان کو بھی اپنے دائرے میں غلبہ اور اقتدار حاصل ھو جاتا ھے - یہ قوانین طبعی دنیا سے بھی متعلق ھیں اور انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے بھی متعلق - جو قوم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی اسے غلبہ و اقتدار حاصل ھو جائیگا - یہ معنی ھیں وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ (۳/۲۵) کے - یعنی اللہ اپنے قانون مشیت کے مطابق عزت اور ذلت عطا کرتا ھے - یونہی اندھا دھند کچھ نہیں ھوجاتا -

سورہ یوسف میں اَلْعَزِیْزُ (۱۲/۳۰) وھاں کے رئیس کے لئے آیا ھے - یعنی صاحب اقتدار - اسی رئیس کی بیوی نے حضرت یوسفؑ پر ڈورے ڈالنے چاھے تھے - اس عورت کا نام قرآن کریم میں نہیں آیا - اسے صرف اِمْرَاَتُ الْعَزِیْزِ کہا گیا ھے - (۱۲/۳۰) یعنی عزیز کی عورت -

اَلْعُزّٰی (۵۳/۱۹) ایک بت کا نام ھے جسکی عہد جاھلیت میں قبیلہ غطفان پرستش کرتے تھے - (یہ لفظ اَلْاَعَزُّ کا مؤنث بھی ھے)-

* تاج و محیط -

العُزّٰی

عرب کے زمانہ جاہلیت میں، قبیلہ غطفان کا ایک بت تھا۔ (۵۳/۱۹)
(دیکھئے عنوان ع۔ ز۔ ز)

ع ز ل

عَزَلَهٗ عَنِ الْعَمَلِ وَعَزَّلَهٗ۔ اسے کام سے الگ کر دیا۔ فَاعْتَزَلَ۔ پس وہ الگ ہو گیا۔ یعنی اسے ایک طرف ہٹا دیا اور وہ ہٹ گیا۔ مَعْزُوْلٌ۔ الگ کیا ہوا۔ ہٹایا ہوا۔ اَلْعُزْلَةُ۔ الگ ہو جانا۔ علیحدگی۔ اَلْاِعْتِزَالُ۔ کسی چیز کا ایک طرف ہو جانا۔ اَلْعَزْلُ۔ ضبط ولادت کے لئے مادہ تولید کو رحم تک نہ پہنچنے دینا *۔

سورہ کہف میں ہے وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ (۱۸/۱۶)۔ جب تم ان سے الگ ہو گئے۔ سورہ شعراء میں ہے اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (۲۶/۲۱۲)۔ وہ سننے سے الگ ہٹا لئے گئے۔ سننے سے روک دئے گئے۔ سورہ ھود میں ہے وَكَانَ فِیْ مَعْزِلٍ (۱۱/۴۲)۔ وہ ان لوگوں سے ہٹ کر کسی الگ جگہ میں تھا۔ سورہ احزاب میں ہے مِمَّنْ عَزَلْتَ (۳۳/۵۱)۔ جن سے تو نے علیحدگی اختیار کی تھی۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ حیض کے دوران میں فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ۔ عورتوں سے الگ رہو۔ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ (۲/۲۲۲)۔ اس کے معنی واضح ہو گئے۔ یعنی جب تک وہ حیض سے پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ۔

ع ز م

اِعْتَزَمَ الرَّجُلُ۔ وہ دوڑنے، چلنے نیز دیگر امور میں درمیانہ روی پر قائم رہا۔ اِعْتَزَمَ الطَّرِيْقَ۔ وہ راستہ پر بغیر مڑے سیدھا چلتا چلا گیا۔ عَزَمَ عَلَى الْاَمْرِ وَاعْتَزَمَ عَلَيْهِ۔ کسی کام کو قطعی طور پر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس اعتبار سے عَزْمٌ اور عَزِيْمَةٌ کے معنی ہیں کسی بات کا فیصلہ کرکے اس پر پختگی سے جم جانا۔ مَالِفُلَانٍ عَزِيْمَةٌ۔ فلاں آدمی کسی بات پر جمتا ہی نہیں۔ اَلْعَزَّامُ۔ ارادے کا دھنی۔ شیر *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی معاملہ کو حتمی اور قطعی کرنے کے ہوتے ہیں۔

* تاج۔ محیط۔ راغب۔

سورہ بقرہ میں ہے وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (۲/۲۲۷) - اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں - سورہ طٰہٰ میں آدم کے متعلق ہے وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (۲۰/۱۱۵) - ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی نہیں پائی - سورہ بقرہ میں ہے وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ (۲/۲۳۵) - تم نکاح کی گرہ کو پختہ مت کرو - اُولُوا الْعَزْمِ (۴۶/۳۵) - عزم و استقلال والے - عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۳/۱۸۶) - معاملات میں پختگی اور عزیمت -

قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرام اور مومنین کی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ صاحب عزیمت (بڑی ہمت اور استقلال کے مالک) ہوتے ہیں - اور ان کے عزائم بڑے بلند ہوتے ہیں - لیکن اب عَزِیْمَةٌ کے معنے ہیں تعویذ، اور عَزَائِمُ الْقُرْاٰنِ کے معنی ہیں قرآن کریم کی آیات جن سے تعویذ لکھے جاتے ہیں اور جھاڑ پھونک کی جاتی ہے ** - اور اَلْمُعَزِّمُ کے معنی ہیں جھاڑ پھونک کرنے والا ** -

ع ز و

اَلْعِزَةُ - لوگوں کا گروہ - جماعت - فرقہ - اسکی جمع (حالت رفعی میں) عِزُوْنَ اور (حالت نصبی اور جری میں) عِزِیْنَ آتی ہے - یعنی جماعتیں جو متفرق ہوں* - (۷۰/۳۷) - راغب کا خیال ہے کہ یہ عَزَوْتُهٗ سے مشتق ہے جسکے معنی ہیں منسوب کیا ** - اس طرح یہ لفظ ایسی جماعت کیلئے بولا جائیگا جو کسی کی طرف منسوب ہو، لیکن راغب ہی نے دوسرا خیال یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ عَزَاءٌ سے مشتق ہے جسکے معنے صبرو تسلی حاصل کر لینے کے ہیں ** - اس طرح اس سے مراد وہ جماعت بھی ہو سکتی ہے جو کسی خاص عقیدہ وغیرہ پر مطمئن ہو، یا وہ جماعت جسکے افراد آپس میں ایک دوسرے سے صبرو تسلی حاصل کر لیتے ہوں - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی منسوب ہونے اور وابستہ ہونے کے لکھے ہیں -

عزیر

سورۃ توبہ میں ہے وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ (۹/۳۰) - "یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے" -

عزیر یہودیوں میں بڑی عظیم شخصیت کے مالک ہیں - جب یہودی بابل کی اسیری کے بعد، یروشلم میں واپس آئے تو کتاب مقدس (تورات کا

* تاج و محیط - ** راغب -

مجموعہ کتب) ان سے ضائع ہو چکا تھا۔ کتاب یحمیاہ۔ (باب ۸) میں تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ تورات کے سلسلہ اول کی پانچ کتابوں کو عزرا نبی (یا عزرا فقیہ) نے دوبارہ مرتب کیا۔ موجودہ تورات میں خود کتاب عزرا بھی موجود ہے جس میں عزرا نبی نے بتایا ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو کیسے از سر نو مرتب کیا۔ یہ قریب ساڑھے چار سو سال قبل مسیح کا واقعہ ہے (تفصیل میری کتاب ''معراج انسانیت'' کے باب اول ''ظَہَرَ الْفَسَادُ'' میں ملے گی)۔

یہود لٹریچر میں ان کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز بیانات ملتے ہیں۔ جیوئش انسائیکلو پیڈیا نے تو یہاں تک لکھدیا ہے کہ اگر حضرت موسیٰؑ پر شریعت نازل نہ ہوئی ہوتی تو عزیر پر نازل ہوتی۔

قرآن کریم نے ان کا مزید تعارف نہیں کرایا۔ نہ ہی زمرۂ انبیائے کرام میں ان کا نام لیا ہے۔ اس لئے ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ آپ (قرآن کی اصطلاح میں) نبی تھے یا نہیں۔ یہودیوں کے ہاں ''نبی'' ہیکل کے ایک بڑے منصب دار کو کہتے تھے جس کا کام کہانت ہوتا تھا۔

''ابنیت عزیر'' کا سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ یہودی قرآن کریم کے اس بیان کو چیلنج کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہوں نے کبھی عزیر نبی کو ابن اللہ نہیں مانا۔ ہمارے ہاں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ مدینہ میں کچھ یہودی اس قسم کا اعتقاد رکھتے تھے۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ یہودیوں کا صدوقی فرقہ جو یمن میں تھا اس کا یہ عقیدہ تھا*۔ لیکن یہودیوں کا کہنا ہے کہ یہ روایات ان کے لئے سند نہیں قرار پا سکتیں۔ یہودیوں کے موجودہ لٹریچر سے بھی ان کے اس عقیدہ کی شہادت نہیں ملتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہودی (اور نصرانی) لٹریچر میں جس طرح مسلسل رد و بدل ہوتا چلا آ رہا ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے پہلے ان کے ہاں اس قسم کا عقیدہ موجود ہو اور بعد میں انہوں نے اسے اپنی کتابوں سے خارج کر دیا ہو۔ نیز ہمارے زمانے میں جس انداز سے عہد قدیم کے تاریخی انکشافات ہو رہے ہیں ان کے پیش نظر کون کہہ سکتا ہے کہ کل کو کونسی تاریخی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آنے والی ہے؟ اس حقیقت کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ (فرعون کی لاش کی طرح) مزید تحقیقات کے بعد یہودیوں کے اس عقیدہ کی بھی نقاب کشائی ہو جائے۔

*(ارض القرآن سید سلیمان ندوی)۔

لیکن حال ہی میں بعض محققین کا خیال اس طرف گیا ہے کہ قرآن کریم نے جس عزیر کے متعلق کہا ہے کہ یہودی اسے ''ابن اللہ'' مانتے تھے ، اس سے مراد عزرا نبی نہیں بلکہ مصر کا ''عزیر دیوتا'' ہے جس کی وہاں پرستش ہوتی تھی اور انہی کی دیکھا دیکھی یہودیوں نے بھی اس کی پرستش شروع کر دی تھی ۔ ہیرو ڈوٹس نے ، آج سے قریب اڑھائی ہزار سال قبل ، اس دیوتا کا نام (Osiris) یعنی عزیرس لکھا ہے ۔ یونان میں اسماء کے بعد ''س'' ہمیشہ زائد ہوتی ہے ۔ اس صورت میں اس دیوتا کا اصل نام عزیر ہے جو قرآنی عزیر کے بالکل مشابہ ہے ۔ مصر کے آثار قدیمہ میں اس کا نام ''ایزاری'' آیا ہے ۔ اسکے نام پر جو سانڈ بیل پوجا جاتا تھا اس کا نام ''ایزار ہاپی''۔ یعنی عجل عزیر تھا ۔ اس بچھڑے کو عزیر کی روح کا مظہر اور ''فتاح'' یعنی خالق خدا کا اوتار اور بیٹا (ابن اللہ) مانا جاتا تھا ۔ مصر سے یہ اعتقادات نکل کر شام اور فلسطین کے علاقوں میں پھیل چکے تھے اور یہی وہ عجل (بچھڑا) تھا جس کی پرستش یہودیوں نے حضرت موسیٰؑ کی غیر حاضری میں شروع کردی تھی (اس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے) ۔ حضرت موسیٰؑ نے یہود کو اس گوسالہ پرستی سے روک دیا لیکن آپؑ کے بعد اس کی پرستش دوبارہ شروع ہو گئی ۔ چنانچہ یہودیوں کی سلطنت کی تقسیم کے بعد ، شمالی سلطنت کے بادشاہ یروبعام اول (۹۳۳ ق - م) نے عجل پرستی کو شاہی مذہب قرار دے دیا اور سونے کے دو بچھڑے بنا کر ان کی پرستش عام کردی ۔ یہی وہ عزیر دیوتا ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے ۔ موجودہ زمانے میں بائبل کے عبرانی نسخوں کے تراجم کی جو تصحیح ہوئی ہے اس کے پیش نظر اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بائبل میں بھی بنی اسرائیل کی عزیر پرستی کا ذکر موجود تھا لیکن (غلطی سے) لفظ عزیر کو ''اسیر'' سمجھ کر اس کا ترجمہ ''قیدی'' کردیا گیا ۔ اب لیگارڈ نے اپنے یونانی ترجمہ میں اس کی تصحیح کی ہے ۔

مصر کے آثار قدیمہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ دنیا میں غالباً سب سے پہلے، عزیر ہی کو ابن اللہ مانا گیا ہے ۔ چنانچہ کم و بیش چار ہزار سال قبل مسیح، عزیر کے متعلق یہ اعتقاد ملتا ہے کہ یہ دیوتا خداوند اعلیٰ ''آمن رع'' کی نسل سے اور خداوند ارض کا بیٹا تھا ۔ مصر سے اب ایک صحیفہ بھی برآمد ہؤا ہے جس میں عزیر کے حالات درج ہیں ۔

ان تصریحات سے ذہن کا رخ اسی طرف جاتا ہے کہ عزیر سے مراد مصر کا دیوتا ہے نہ کہ عزرا نبی ۔ بہر حال ، یہ تاریخی قیاسات ہیں ۔ ہوسکتا ہے کہ بعد میں مزید انکشافات حقیقت کو حتم و یقین کے ساتھ بے نقاب کردیں۔

ہمارا ایمان بہرحال یہ ہے (اور یہی ہونا چاہئے) کہ قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے وہ حرفاً حرفاً سچ ہے اور اگر کسی زمانے تک کا علم انسانی اس کے کسی بیان کی تصدیق نہیں کرتا تو یہ علم کی کوتاہ دستی کا قصور ہے نہ کہ قرآن کریم کے تخیل بلند کا گناہ*۔

ع س ر

اَلْعُسْرُ ۔ یہ یُسْرٌ کے مقابلہ میں آتا ہے جس کے معنی نرمی، کشادگی، فارغ البالی کے ہیں (دیکھئے عنوان ی۔ س۔ ر) لہذا عُسْرٌ کے معنی تنگی، سختی، مصیبت، مشقت، کے ہیں**۔ (۲/۱۸۵ ؛ ۹۴/۵) ۔ سورہ الفرقان میں ہے وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِيْنَ عَسِيْرًا (۲۵/۲۶)۔ وہ دن کافرین کے لئے بڑی سختی کا ہوگا۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ معاملات میں کشادہ روئی کی کمی، اور اخلاق کی تنگی، ہو جانے کو بھی عُسْرٌ کہتے ہیں***۔ سورہ طلاق میں ہے وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ (۶۵/۶) ۔ اگر تم ایک دوسرے سے تنگی محسوس کرو۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سختی اور شدت کے ہوتے ہیں ۔ اگر سُوت الجھ جائے اور سلجھ نہ سکے تو کہینگے قَدْ تَعَسَّرَ الْغَزْلُ ۔ تنگ حالی اور تنگدستی کو عُسْرَةٌ کہتے ہیں ۔

قرآن کریم نے آسانیاں حاصل کرنے کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ تم مشکلات کا سامنا کرو۔ جو مشکلات کا سامنا نہیں کرتا اسے آسانیاں نصیب نہیں ہو سکتیں ۔ (۹۴/۵) ۔ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے ۔ یہ نہیں کہ جب یُسر (آسانیاں) مل جائیں تو انسان مطمئن ہو کر بیٹھ جائے ۔ اُسوقت بھی انسان کے سامنے مشکلات آئینگی جن پر غلبہ پانے کے لئے اسے سعی و عمل کی ضرورت ہوگی ۔ حیات جاوداں اندر ستیزاست ۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۹۴/۵۔۶) ۔ یقیناً تنگی کے ساتھ آسانی ہے ۔ فی الواقعہ تنگی کے ساتھ آسانی ہے ۔

---

*اس عنوان میں ہم نے شیخ عبد القادر صاحب کے ایک مقالہ سے مدد لی ہے جو رسالہ الفرقان کی اگست ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا ۔ مقالہ نگار نے اپنے مضمون میں انسائیکلو پیڈیا برٹانکا (لفظ Apis) ۔ لے گیسی آف ایجپٹ (Glanuille) ارلی ہسٹری آف ایجپٹ (Sidney Smith) ۔ اور آکسفورڈ جونیئر انسائیکلو پیڈیا کے حوالے دئے ہیں ۔ **تاج ۔ ***محیط۔

ع س ع س

عَسْعَسَ اللَّيْلُ - رات آئی یا ختم ہو گئی - بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی گذر جانے کے ہیں، اور دوسروں کا خیال ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے اور اسکے معنی آنے اور چلے جانے دونوں کے آتے ہیں - چنانچہ صاحب لطائف اللغۃ نے بھی اسے اضداد میں سے کہا ہے - لغت میں العَسْعَسَۃُ کے معنی تاریکی کے ہلکا ہونے کے بھی ہیں اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب رات جانے والی اور صبح آنے والی ہو، یا دن جانے والا اور رات آنے والی ہو* - ابن فارس نے عَسْعَسَ کے معنے آنے ہی کے لکھے ہیں اور کہا ہے کہ جانے کے لئے جو عَسْعَسَ بولا جاتا ہے وہ دراصل سَعْسَعَ ہے - عَسْعَسَ الشَّیْءَ - اسنے اس چیز کو حرکت دی - عَسْعَسَ الذِّئْبُ - بھیڑیا رات میں گھوما* - قرآن کریم میں ہے وَاللَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ (۸۱/۱۷) اسکے معنی رات کی تاریکی جانے کے ہی ہونگے کیونکہ اس سے آگے وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (۸۱/۱۸) ہے - یعنی طلوع فجر - قرآن کریم نے ان مظاہر فطرت کو شہادت میں پیش کرنے کے بعد کہا ہے کہ اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ (۸۱/۱۹) یہ ایک صاحب عزت و تکریم رسول کی (زبان سے تم تک پہنچی ہوئی) بات ہے - یعنی جسطرح فطرت کے قوانین خدا کے متعین فرمودہ اور اٹل ہیں اسی طرح قرآنی حقائق بھی خدا کے نازل کردہ اور غیر متبدل ہیں -

ع س ل

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) اضطراب اور (۲) شہد کے ہیں - اول الذکر کے اعتبار سے ہلنے والے لچکدار نیزہ کو رُمْحٌ عَسَّالٌ کہتے ہیں - نیز جو بلبلے ہوا کے زور سے سطح آب پر چلنے لگ جائیں انہیں اَلْعَسَلُ کہتے ہیں - العَسَلُ شہد کو کہتے ہیں - اَلْعَسَّالُ - شہد کا چھتہ توڑنے والا - عَسَلَ اللہُ فُلَانًا - خدا فلاں آدمی کو لوگوں میں محبوب بنانے - اَلْعَسُوْلُ وَالْعَنْسَلُ - تیز رفتار اونٹنی - اَلْعُسُلُ نیک اور صالح لوگ - اَلْعَاسِلُ - نیک عمل انسان جسکی تعریف بھلی اور شیریں سمجھی جائے - ھُوَ عَلٰی اَعْسَالٍ مِنْ اَبِیْہِ - وہ اپنے باپ کی خصوصیات کا حامل ہے*** -

قرآن کریم میں جنت کی انہار کے متعلق ہے - اَنْھٰرٌ مِنْ عَسَلٍ مُّصَفًّی (۴۷/۱۵) - عام معنی ہیں صاف کردہ شہد کی نہریں - لیکن چونکہ یہ

---

* تاج - ** محیط - *** تاج - محیط - راغب -

سب بیان تمثیلی ہے (مَثَلُ الْجَنَّةِ..... ۴۷/۱۵) اسلئے اس سے مراد پاکیزہ، شیریں اور قابل ستائش اوصاف و خصوصیات بھی ہو سکتے ہیں۔ ویسے اس دنیا کے جنتی معاشرہ میں رزق کی فراوانیاں بھی مقصود ہیں۔ " وہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں" انتہائی فراوانی کے لئے بولا جاتا ہے۔

عسی

عَسٰی۔ یہ عام طور پر ان معنوں میں آتا ہے جن معنوں میں ہم اپنے ہاں کہتے ہیں (۱) قریب ہے کہ ایسا ہو جائے۔ (۲) امید ہے کہ ایسا ہو جائے۔ (۳) ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ..... (۴) شاید ایسا ہو جائے۔ مثلاً عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ (۱۷/۷۹) قریب ہے یا امید ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر کھڑا کر دے۔ یا مثلاً سورہ تحریم میں ہے عَسٰی رَبُّهٗ اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْکُنَّ..... (۶۶/۵)۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ اگر وہ تمہیں طلاق دیدے تو اس کا رب اُسے تم سے بہتر بیویاں دیدے۔ یا عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ (۲/۲۱۶)۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں کوئی چیز نا پسند ہو لیکن وہ درحقیقت تمہارے فائدے کی ہو۔ دوسری جگہ اسی سورۃ میں ہے۔ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا (۲/۲۴۶)۔ تم سے کچھ بعید نہیں کہ اگر تم پر جنگ کرنا ضروری قرار دیدیا جائے تو تم جنگ نہ کرو۔ یا اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ " کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر......

ع ش ر

اَلْعَشَرَةُ وَالْعَشْرُ۔ دس۔ اَلْعِشْرُوْنَ۔ بیس۔ اَلْعَشِیْرُ وَالْعُشْرُ۔ دسواں حصہ*۔ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ (۱۱/۱۳)۔ دس سورتیں لاؤ۔

عَاشَرُوْا۔ وہ لوگ مل جل کر رہے*۔ یہیں سے مُعَاشَرَةٌ ہے۔ عَشِیْرَةُ الرَّجُلِ کے معنی ہیں آدمی کے باپ کی قریبی اولاد یا قبیلہ۔ راغب نے اس کے معنے آدمی کے اقرباء پر مشتمل جماعت لکھے ہیں۔ اَلْمَعْشَرُ۔ جماعت۔ گروہ*۔

---

* تاج۔

ذَهَبَ الْقَوْمُ عَشَارَيَاتٍ ۔ قوم ہر طرف متفرق ہو کر منتشر ہو گئی** ۔ عَشِيْرَةٌ (۲۶/۲۱۴) قبیلہ ۔ کنبہ ۔ نیز ساتھ رہنے والے ۔ اَلْعَشِيْرُ (۲۲/۱۳) رفیق ۔ ساتھی ۔ مَعْشَرٌ (۶/۱۳۰) جماعت ۔ گروہ ۔ مِعْشَارٌ (۳۴/۴۵) دسواں حصہ ۔ عِشَارٌ (۸۱/۴) دس ماہ کی گابھن (حاملہ) اونٹنیاں ۔ عَاشَرَ (۴/۱۹) ۔ مل جل کر رہنا سہنا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) دس اور (۲) باہمی اختلاط ہیں ۔

ع ش و (ع ش ی)

اَلْعَشَا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آجانا۔ اندھا ہوجانا* ۔ عَشَا عَنْهُ ۔ وہ اسکی طرف سے پلٹ کر کسی دوسرے کی طرف مائل ہو گیا۔ اس سے اعراض برتا**۔ چنانچہ سورۃ زخرف میں ہے وَ مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۴۳/۳۶) ۔ جو خدائے رحمٰن کے قانون سے آنکھیں پھیر لے ۔ جو اس کی طرف سے ہٹ کر کسی دوسرے قانون کو اختیار کرلے ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں جو خدا کے ذکر سے آنکھیں بند کرلے ۔ اس کی طرف سے اندھا ہو جائے*** ۔ مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی قانون خداوندی سے اعراض برتنا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دھندلکا (روشنی کا کم ہو جانا) ۔ اور کسی چیز کا کم واضح ہونا ہیں ۔

اَلْعِشَاءُ ۔ عام طور پر اس سے مراد رات سمجھی جاتی ہے لیکن اس کا اطلاق مختلف اوقات پر ہوتا ہے۔ مثلاً ابتدائی تاریکی، مغرب سے عشاء کیوقت تک ۔ زوال آفتاب سے طلوع فجر تک کا وقت ۔ اَلْعَشِيُّ وَ الْعَشِيَّةُ ۔ دن کا آخری حصہ ۔ مغرب سے عشاء کے وقت تک ۔ اَلْعَشِيُّ ۔ زوال آفتاب سے صبح تک کا وقت ۔ زوال آفتاب سے غروب آفتاب ۔ کبھی عَشِيٌّ سے مراد رات بھی ہوتی ہے کیونکہ اس مادہ میں عِشَاءٌ کے معنی تاریکی کے ہیں ۔ شام کے کھانے کو اَلْعَشَاءُ کہتے ہیں ۔ صَلَاتَا الْعَشِيِّ سے مراد ظہر اور عصر کی نمازیں ہیں ۔ لیکن اَلْعِشَاآنِ ۔ مغرب اور عشاء کی نمازوں کو کہتے ہیں****۔

سورۃ آل عمران میں ہے وَ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ (۳/۴۰) ۔ یہاں عَشِيٌّ بمقابلہ اِبْكَارٌ (دن کا پہلا حصہ) آیا ہے ۔ سورۃ النّٰزِعٰت میں عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا (۷۹/۴۶) آیا ہے۔ یعنی صبح کے مقابلہ میں شام ۔ سورۃ صٓ میں عَشِيٌّ کا لفظ (۳۸/۳۱) دن کے پچھلے حصے کے لئے آیا ہے ۔ سورۃ روم میں عَشِيًّا کا لفظ حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (۳۰/۱۸) کے ساتھ آیا ہے ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****یہ تمام معانی تاج نے مختلف حوالوں سے نقل کئے ہیں ۔

سورۃ یوسف میں خالی عِشَاءً آیا ہے (۱۲/۱۶)۔ اس سے مراد پچھلا پہر، شام کا وقت یا رات کا وقت لیا جاسکتا ہے۔ سورۃ نور میں مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ کے مقابلہ میں مِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ آیا ہے (۲۴/۵۸)۔

ع ص ب

اَلْعَصَبُ۔ بدن کے پٹھے بالخصوص جو جوڑوں کو تھامے ہوتے ہیں، قوم کے بہترین آدمی۔ عَصْبٌ کے بنیادی معنی موڑنے۔ لپیٹنے اور بل دینے کے ہیں۔ نیز کس کر باندھنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ عَصَبَ الشَّجَرَةَ کے معنے ہیں درخت کی متفرق شاخوں کو یکجا کرکے رسی سے کس کر باندھنا پھر اس کے پتے جھاڑنے کے لئے اسے جھنجھوڑنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ لمبائی یا گولائی میں باندھنے کے ہوتے ہیں۔ اَلْعِصَابَةُ۔ پٹی (جو باندھی جاتی ہے)*۔ اَلْاَمْرُ الْعَصِيْبُ۔ سخت معاملہ*۔ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ (۱۱/۷۷)۔ یہ سخت دن ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے وہ دن مراد ہے جس نے ہر طرف سے ان کو باندھ رکھا ہو اور انہیں گھیر لیا ہو۔ یعنی جس سے بچ نکلنا ان کے لئے دشوار ہو۔ اَلْعَصَبِيَّةُ۔ آدمی کا اپنے خاندان کی مدد کےلئے لوگوں کو بلانا اور حق و ناحق، بہر طور، اپنی جماعت ہی کی حمایت و مدافعت کرنا۔ عُصْبَةٌ۔ جماعت*۔ (ایک قدر مشترک کے ساتھ بندھے ہوئے افراد)۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ نَحْنُ عُصْبَةٌ (۱۲/۸)۔ ہم ایک اچھی خاصی جماعت ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لئے وجہ تقویت ہیں۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ کم از کم دس مردوں پر مشتمل جماعت کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس سے کم تعداد پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔

ع ص ر

عَصْرٌ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تین ہیں (۱) وقت اور زمانہ۔ (۲) کسی چیز کو دبانا یا نچوڑنا۔ اور (۳) کسی چیز کے ساتھ چمٹ جانا۔ عَصَرَ الْعِنَبَ۔ انگور کا شیرہ نچوڑ لیا**۔ سورۃ یوسف میں ہے اِنِّیْ اَرَانِیْ اَعْصِرُ خَمْرًا (۱۲/۳۶)۔ میں نے اپنے آپ کو شراب کشید کرتے ہوئے دیکھا۔ نیز (۱۲/۴۹)۔ اَلْعَصْرُ۔ دن۔ رات۔ صبح۔ شام

---

*تاج و راغب۔ **تاج۔

کا وقت آفتاب کے سرخ ہونے تک - ہر طویل مدت جو غیر محدود ہو اور کچھ اُمتوں (قوموں) پرمشتمل ہو جن کے ختم ہوجانے سے وہ عصر بھی ختم ہو جائے*۔ (Age or Period) - صاحب کتاب الاشتقاق نے اس کے معانی اَلدَّھْرُ (زمانہ) کئے ہیں - قرآن کریم میں ہے وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۱۰۳/۱۰۲) - زمانہ (یعنی تاریخ انسانیت) اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان (جو وحی کی روشنی کے بغیر چلتا ہے) وہ ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے - اَلْعَصْرُ کے معنے روکنے کے بھی ہوتے ہیں* - (یعنی وقت کی وہ حدیں جن کے اندر کوئی واقعہ رکا ہؤا ہو) - اَلْعَصْرُ - قبیلہ اور خاندان کو بھی کہتے ہیں* - اَلْعَصَرُ جائے پناہ کو کہتے ہیں (ابن فارس) - اَلْاِعْصَارُ - بگولا - (جو تند و تیز ہو) - گرد و غبار والی تندھوا - (۲/۲۶۶) - اَلْمُعْصِرَاتِ - بادل یا وہ ھوائیں جو بادلوں کو لاتی ہیں* - وہ بادل جو برستے ہیں** - (۷۸/۱۵) - صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ اَلْمُعْصِرَاتُ وہ ھوائیں ہیں جو بارش لاتی ہیں اور اَلْمُبَشِّرَاتُ وہ جو بادل لاتی ہیں -

ع ص ف

اَلْعَصْفُ - کھیتی کی سبزی - کھیتی کے پودوں کے تنوں کے پتے جو سوکھ کر جھڑتے اور چورہ چورہ ہو جاتے ہیں - پودوں کے تنوں کے پتے - کھیتی کے پتے - بھوسہ - (غلے کے دانوں کے اوپر جو چھلکا ہوتا ہے اس کے بھوسے کو کہتے ہیں) - خود بال کو بھی کہتے ہیں - قرآن کریم میں اصحاب الْفِیْلِ کے متعلق ہے کہ انہیں کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ (۱۰۵/۵) کر دیا- یعنی جیسے کھایا ہوا بھس ہو - یا وہ کھیتی جس کے دانے کھالئے گئے ہوں، یا اسے کیڑا لگ گیا ہو - کلیات میں ہے کہ ہر چیز کے پتے عَصْفٌ کہلاتے ہیں- اسی سے دانے نکلتے ہیں۔ پہلی شکل یہ ہوتی ہے کہ پتے نمودار ہوتے ہیں ، پھر تنا بنتا ہے ، پھر اس میں سے دانوں یا پھلوں کے خول نکلتے ہیں*** - اسی اعتبار سے قرآن کریم میں وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ (۵۵/۱۲) آیا ہے - یعنی وہ دانے جو چھلکے کے اندر ہوں- بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد پودوں کے تنوں کے وہ پتے ہوتے ہیں جو خشک ہو کر چورا چورا ہو جائیں* - راغب نے لکھا ہے کہ کھیتی اور پودوں میں سے جو کچھ ٹوٹ کر گر چکا ہو اسے عَصْفٌ کہتے ہیں**** -

*تاج - **محیط نیز (ابن فارس) - ***محیط - ****راغب -

اَلْمُعْصِفَاتُ ۔ وہ ہوائیں جو بادلوں، پتوں، اور خشک پتوں کے چورے کو اڑا کر لاتی ہیں*۔ رِیْحٌ عَاصِفٌ ۔ تیز چلنے والی ہوا ۔ آندھی ۔ جھکڑ ۔ (۲۲/۱۰) ۔ اس کے مقابل میں رِیْحٌ طَیِّبَۃٌ آیا ہے (۲۲/۱۰) ۔ یعنی خوشگوار ہوا۔ سورۃ مرسلٰت میں ہے فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا (۲/۷۷) ۔ غبار اور خس و خاشاک کو اڑا کر لے جانے والی آندھیاں ۔ اَلْعَصْفُ ۔ تیزی اور سرعت کو بھی کہتے ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں ۔

صاحب لطائف اللغۃ نے کہا ہے کہ اَلْعَوَاصِفُ وہ تند و تیز ہوائیں ہیں جو میدانوں یا صحراؤں میں طوفان برپا کردیں اور اَلْقَوَاصِفُ وہ ہوائیں جو سمندروں میں طوفان لے آئیں ۔

ع ص م

عِصْمَۃٌ کے اصلی معنی روکنے یا منع کرنے ، نیز کسی چیز کو باندھنے کے ہیں۔ گردن کے پٹھے کو بھی کہتے ہیں ۔ اس کی جمع اَعْصَامٌ ہے ۔ اَلْعِصَامُ ۔ محمل کی اس رسی کو کہتے ہیں جو محمل کو جمانے کے لئے اسکے ایک طرف باندھی جاتی ہے ۔ ایسی دو رسیوں کو عِصَامَانِ کہتے ہیں۔ اَلْعِصَامُ مِنَ الدَّلْوِ وَالْقِرْبَۃِ ۔ ڈول یا مشک کی وہ رسی جس سے باندھ کر انہیں اٹھایا جاتا ہے ۔ عَصَمَ الشَّیْئَ یَعْصِمُہٗ ، کے معنی ہیں کسی چیز کو روک دینا ۔ عَصَمَہُ اللّٰہُ مِنَ الْمَکْرُوْہِ ۔ خدا نے نا پسندیدہ اور تکلیف دہ چیز سے اس کی حفاظت کی اور بچا لیا ۔ عَصَمَ اِلَیْہِ اور اِعْتَصَمَ بِہٖ کے معنے ہیں کسی چیز کو ہاتھ سے پکڑ کر مضبوطی سے تھام لینا ۔ (اِعْتِصَامٌ کے یہی معنی ہیں) ۔ اِعْتَصَمَ بِاللّٰہِ کے معنی ابن فارس نے خدا کی حفاظت میں آکر محفوظ ہو جانے کے لکھے ہیں ۔ اَعْصَمَ بِفُلَانٍ ۔ اس نے فلاں کو پکڑ لیا اور اس سے چمٹا رہا ۔ اَعْصَمَ بِالْفَرَسِ ۔ اس نے گھوڑے کی ایال پکڑ لی تاکہ وہ گھوڑے کی تیز رفتاری کی وجہ سے اس پر سے گر نہ پڑے** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی پکڑلینا ، تھام لینا ، روکنا اور ساتھ لگے رہنا ہیں ۔

سورۃ آل عمران میں ہے وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ھُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۰۰/۳) ۔ جس نے قانون خداوندی کو مضبوطی سے تھام لیا اُسے زندگی کی متوازن راہ کی طرف راہ نمائی مل گئی۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا (۱۰۲/۳) کے بھی یہی معنی ہیں ۔ سورۃ مائدہ میں ہے وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (۶۷/۵) (اسے رسول تو اس قانون خداوندی کو لوگوں تک

*تاج ۔ **تاج و محیط و راغب ۔

پہنچائے جا . . . . .) وہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا ۔ ظاہر ہے کہ یہاں حضورؐ کے جسم کی حفاظت مراد نہیں ۔ اس لئے کہ آپؐ کے متعلق خود قرآن کریم میں ہے أَفَإِيْن مَاتَ أَوْ قُتِلَ (۳/۱۴۴) ۔ تو کیا اگر وہ مرجائے یا قتل کردیا جائے۔یعنی اس میں قتل کردئے جانے کے امکان کی وضاحت ہے، لہذا (۵/۶۷) میں حضورؐ کے جسم کی حفاظت کی طرف اشارہ نہیں بلکہ حفاظتِ رسالت (پیغامات خداوندی) مقصود ہے ۔

عَاصِمٌ ۔ حفاظت کرنے والا (۱۱/۴۳) ۔ اِسْتَعْصَمَ ۔ اس نے اپنے آپکو بچائے رکھنا چاہا ۔ (۱۲/۳۲) ۔ تاج نے اِسْتَعْصَمَ کے معنے انکار کیا ، باز رہا بھی لکھے ہیں ۔ عِصَمٌ جمع ہے عِصْمَةٌ کی ۔ اس کے معنی عقد نکاح کے ہیں (۶۰/۱۰) ۔ یعنی وہ عورتیں جو تمہارے نکاح میں ہیں لیکن وہ مسلمان نہیں ہونا چاہتیں ، انہیں روکے نہ رکھو ۔ بلکہ انہیں عقد نکاح سے آزاد کر دو ۔

ع ص و

عَصَا کے اصلی معنی اجتماع اور ائتلاف کے ہیں ۔ لاٹھی کو اس لئے عَصَا کہتے ہیں کہ اسے پکڑنے کے لئے انگلیوں کو اکٹھا ہونا پڑتا ہے ۔ عَصَوْتُ الْقَوْمَ کے معنی ہیں میں نے قوم کو جمع کر لیا * ۔ اَلْعَصَا ۔ جماعت کو کہتے ہیں ۔ شَقَّ الْعَصَا ۔ جماعت میں افتراق پیدا کر دینا * ۔ اَلْقٰى الْمُسَافِرُ عَصَاهُ ۔ اس کے لفظی معنی ہیں مسافر نے اپنی لاٹھی ڈالدی ۔ لیکن یہ محاورہ ہے یہ بتانے کے لئے کہ وہ منزل پر پہنچکر ٹھہر گیا اور پڑاؤ ڈالا * ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے اَلْعَصَا کے معنی اَلْوَبِيْلُ (یعنی سخت ۔ گراں) کئے ہیں ۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ (۲/۶۰) اس کے ایک معنی تو یہ ہیں اپنی جماعت کو ساتھ لیکر پتھریلی زمین کی طرف چلا جا ۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اپنے عصا سے چٹان کو مار ۔ اس سے اسکی اوپر کی مٹی اتر جائیگی اور چشمے کا پانی باہر نکل آئیگا ۔ اسی طرح اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ (۲۶/۶۳) کے ایک معنی ہیں اپنی جماعت کو لیکر سمندر (یا دریا) کیطرف چلا جا ۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اپنا عصا ٹیکتا ہوا سمندر کے راستے چلا جا ۔

عصائے حضرت موسیٰؑ کا ذکر قرآن کریم میں اور بھی متعدد مقامات پر آیا ہے ۔ (مثلاً ۲۰/۱۸) اگر اسے حقیقی معنوں پر محمول کیا جائے تو اس سے

* تاج و راغب ۔ تاج نے لکھا ہے کہ "اَلْعَصَا۔ جَمَاعَةُ الْاِسْلَامِ" یعنی عصا سے مراد اسلامی جمعیت ہے۔ راغب نے محاورہ "شَقَّ الْعَصَا" کے معنی جماعت سے الگ ہوجانا کئے ہیں۔

مراد لاٹھی ہوگی ۔ لیکن اگر اسے مجازی معنوں میں لیا جائے تو اس سے مفہوم وہ ضابطۂ خداوندی (وحی کا پیغام) ہوگا جو آپ کی زندگی کا سہارا اور قوم کے لئے وجۂ تقویت تھا اور جس کے سامنے ساحرین فرعون کی باطل تعلیم کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی ۔ اس اعتبار سے قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سیاق و سباق کے مطابق معانی متعین کئے جا سکتے ہیں ۔

ع ص ی

عَصٰی ۔ یَعْصِیْ ۔ عِصْیَانًا ۔ وَمَعْصِیَۃً ۔ سرکشی کرنا ۔ نافرمانی کرنا * ۔ وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ (۲۰/۱۲۱) آدم نے اپنے نشوونما دینے والے کی نافرمانی کی ۔ اصل میں اَلْعَاصِیْ اس اونٹ کے بچے کو کہتے ہیں جو اپنی ماں کے پیچھے پیچھے نہ چلے ۔ ادھر ادھر نکل جائے * ۔ عَصٰی الطَّائِرُ ۔ پرندہ اڑ گیا ۔ عَصٰی الْعِرْقُ ۔ رگ سے خون بند نہیں ہوا اور برابر جاری رہا** ۔ اِعْتَصَتِ النَّوَاۃُ ۔ گٹھلی سخت ہو گئی ۔ تَعَصّٰی الْاَمْرُ ۔ معاملہ شدید ہو گیا * ۔ ان مثالوں سے اَلْعِصْیَانُ کے معنے واضح ہو جاتے ہیں ۔ سورہ حجرات میں ہے کہ جو (مؤمن) کفر و فسوق و عصیان سے نفرت کرتے ہیں، وہ اَلرَّاشِدُوْنَ ہیں (۴۹/۷) ۔ یعنی خدا کے تجویز کردہ صحیح راستہ پر ۔ سورہ مجادلہ میں مَعْصِیَۃِ الرَّسُوْلِ (۵۸/۸) سے روکا گیا ہے ۔ سورہ مریم میں عَصِیًّا (۱۹/۱۴) نافرمان بردار کے معنوں میں آیا ہے ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ معصیت کا اطلاق بعض اوقات لغزش پر بھی ہو جاتا ہے ۔ اصل یہ ہے کہ جو لوگ قانون خداوندی کا اتباع کرتے ہیں وہ صحیح راستہ پر چلتے ہیں ۔ جو اس راستہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر نکل جاتے ہیں وہ زندگی کی تباہ کن روش اختیار کرتے ہیں ۔ یہی مَعْصِیَۃٌ ہے ۔

راغب نے عَصٰی کو عَصَا (ع ۔ ص ۔ و) کے تابع لکھا ہے اور کہا ہے کہ عَصٰی کے معنی اطاعت سے نکل جانے کے ہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ جو شخص نافرمانی کرتا ہے وہ اپنی لاٹھی (عَصَا) سے اپنا بچاؤ کرتا ہے ۔ نیز اس شخص کے لئے جو جماعت سے علیحدگی اختیار کرے فُلَانٌ شَقَّ الْعَصَا کہتے ہیں ۔ یہیں سے عَصٰی کے معنے نافرمانی کے لئے جانے لگے*** ۔ لیکن یہ توجیہ کچھ جچتی نہیں ۔ عَصًا کے لئے عنوان (ع ۔ ص ۔ و) دیکھئے ۔

ع ض د

اَلْعَضُدُ ۔ ہاتھ کا کہنی سے لیکر کندھے تک کا حصہ ۔ (بازو) مجازاً عَضَدَہٗ کے معنے ہیں اسکی مدد و اعانت کی، دستگیری کی ۔ اَلْعَضُدُ ۔

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔

حامی و مددگار ۔ کسی کا دست و بازو *۔ قرآن کریم میں ہے وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا (۱۸/۵۱) ۔ میں ایسا نہیں تھا کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو بناتا ۔

اَعْضَادُ الْحَوْضِ وَغَيْرِهٖ ۔ حوض وغیرہ کے ارد گرد جو پشتہ مضبوطی اور حفاظت کی خاطر بنا دیا جاتا ہے ۔

ع ض ض

عَضٌّ ۔ کسی چیز کو دانتوں سے پکڑلینا ۔ دانتوں سے کاٹنا ۔ عَضَّ عَلٰى يَدِهٖ غَيْظًا ۔ اسوقت بولتے ہیں جب کوئی شخص کسی سے انتہائی عداوت رکھے اور دشمنی میں بہت زیادتی سے کام لے **۔ سورہ آل عمران میں ہے ۔ عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ (۳/۱۱۸) ۔ یعنی تمہارے خلاف ان کی دشمنی کا یہ عالم ہے کہ یہ غصے سے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں ۔ دراصل یہ محاورہ اسوقت بولا جاتا ہے جب کوئی غصے میں اپنا ہی کچھ بگاڑلے ، اپنے مقابل پر اس کا بس نہ چل سکے ۔

ع ض ل

اَلْعَضَلَةُ ۔ پٹھا جسکے ساتھ موٹا گوشت ہو (مچھلی جو پنڈلی اور بازو وغیرہ میں ہوتی ہے) **۔ عَضَلْتُهٗ ۔ میں نے اسکی مچھلی پر مارا ۔ اسکے بعد اسکے معنی ہو گئے کسی کو زبردستی اور سختی سے (کسی کام سے) روک دینا ۔ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ (۲/۲۳۲) انہیں مت روکو ۔ نیز اس کے معنی تنگ کرنے اور مجبور کرنے کے بھی ہیں **۔ عَضَلَ عَلَيْهِ ۔ اس نے اس پر تنگی کی ۔ اسے روکا اور باز رکھا ۔ اَلْمُعْضِلَاتُ ۔ مشکل اور پرپیچ مسائل جنہیں سلجھایا نہ جاسکے ۔ سختیاں ۔ مصیبتیں **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سختی اور معاملہ میں پیچیدگی کے ہوتے ہیں ۔

ع ض و

اَلْعُضْوُ ۔ اَلْعِضْوُ ۔ بدن کا ٹکڑا ۔ جسم کا کوئی ایک حصہ **۔ (مثلاً ہاتھ ، کان ، ٹانگ وغیرہ) ۔ مجموعہ کا ایک فرد ۔ جماعت کا ایک فرد ***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے حصے کر دینے کے ہوتے ہیں ۔ اَلتَّعْضِيَةُ ۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ۔ تقسیم کر دینا ۔

---

* تاج و راغب و محیط ۔ ** تاج ۔ *** محیط ۔

متفرق کر دینا۔ اَلْعِضَۃُ ۔ چیز کا ٹکڑہ ۔ لوگوں کا فرقہ ۔ جھوٹ ۔ (یہ دراصل عِضْوَۃٌ تھا) اسکی جمع عِضُوْنَ اور عِضِیْنَ ہے ۔ نیز یہ عِضَۃٌ (ھاء کے ساتھ) کی بھی جمع ہو سکتی ہے جسکے معنی سحر (جادو) کے ہوتے ہیں ۔ اَلْعَاضِہُ ۔ ساحر *۔ غالباً اس لئے کہ جادو ٹونا عام طور پر گوشت کے ٹکڑے (یا ھڈی) پر کیا جاتا ہے ۔

سورہ حجر میں ہے اَلَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ (۹۱/۱۵) ۔ جنہوں نے قرآن کریم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے ***۔ جس بات سے اپنا مطلب حل ہوتا ہو اسے مان لیا ۔ جو بات اپنے مفاد کے خلاف جاتی ہو اسکی جگہ اپنی خود ساختہ شریعت کا اتباع کر لیا ۔ ایسی روش کا جو نتیجہ ہوتا ہے اسے (۸۵/۲) میں دیکھئے ۔

یا اسے محض منتروں کی طرح پڑھنے یا تعویذ گنڈے لکھنے کے لئے رکھ چھوڑا *۔

ع ط ف

عِطْفٌ ۔ ایک جانب ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مڑنے اور ٹیڑھا ہونے کے ہیں ۔ عِطْفَا الرَّجُلِ ۔ آدمی کے دونوں پہلو (Sides) ۔ سر سے لیکر سرین تک ۔ عِطْفَا کُلِّ شَیْئٍ ۔ ہر چیز کے دونوں جانب ۔ اَلْعَطْفُ ۔ لوٹنا ۔ مڑنا *۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ اسوقت بولا جاتا ہے جب کسی چیز کا ایک سرا دوسرے سرے کی طرف موڑ دیا جائے ****۔ قرآن کریم میں ہے ثَانِیَ عِطْفِہٖ (۹/۲۲) ۔ پہلو تہی کرتے ہوئے ۔

عَطَفَ ۔ یَعْطِفُ ۔ عَطْفاً کے معنی مائل ہونے کے ہوتے ہیں ۔ اَلْعَاطِفَۃُ ۔ مہربانی ۔ شفقت ۔ صلہ رحمی *۔

ع ط ل

عَطَلٌ ۔ عُطُوْلٌ ۔ زیور سے خالی ہونا ۔ عَطِلَتِ الْمَرْاَۃُ ۔ عورت زیور سے خالی ہوئی ۔ ایسی عورت کو اَلْعَاطِلُ اور العُطُلُ کہتے ہیں ۔ (اَلْمِعْطَالُ اس عورت کو کہتے ہیں جو زیور کے بغیر رہنے کی عادی ہو)۔ اَلتَّعْطِیْلُ ۔ خالی کر دینا ۔ بیکار کرکے چھوڑ دینا ۔ چنانچہ اس ڈول کو جس کی رسیاں ٹوٹ چکی ہوں اور اس سے پانی نہ نکالا جا سکے اَلْعَطِلَۃُ کہتے ہیں ۔ قَوْسٌ عُطُلٌ ۔ وہ کمان جس پر تانت نہ ہو۔ بِئْرٌ مُعَطَّلَۃٌ ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***ابن قتیبہ (القرطین ۔ ج/۱ صفحہ ۲۴۱) ****راغب ۔

وہ کنواں جس کے آس پاس آبادی نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیکار ہو چکا ہو، اور اس سے پانی نہ بھرا جاتا ہو*۔ (۸۱/۴)۔ سورہ تکویر میں ہے اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (۸۱/۴) جب حاملہ اونٹنیوں کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دیا جائیگا۔ اَلْعِشَارُ ان اونٹنیوں کو کہتے ہیں جو بچہ دینے کے قریب ہوں۔ عربوں میں اونٹ کی جو اہمیت تھی وہ واضح ہے۔ اور ایسی اونٹنیاں جو بچہ دینے کے قریب ہوں ان کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ اس قسم کی اونٹنیوں کو بیکار سمجھ کر چھوڑ دینے سے مفہوم یہ ہے کہ اس دور میں خود اونٹوں کی قدر و قیمت ہی نہیں رہیگی۔

عَطَلَ الْاَجِيْرُ۔ مزدور کا بیکار رہنا**۔

ع ط و

اَلْعَطْوُ۔ لینا۔ کسی چیز کو لینے کے لئے سر اور ہاتھوں کو اوپر اٹھا دینا۔ ظَبْیٌ عِطْوٌ۔ (عین کی تینوں حرکتوں کے ساتھ) وہ ہرن جو درخت سے پتے کھانے کے لئے اپنے سر کو اوپر اٹھائے*۔

اَلْاِعْطَاءُ۔ دینا۔ اَلْعَطَاءُ وَالْعَطِيَّةُ۔ جو کچھ دیا جائے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اِيْتَاءٌ (دینے) اور اِعْطَاءٌ میں فرق یہ ہے کہ اِيْتَاءٌ کسی واجب کے ادا کرنے پر بھی بولا جاتا ہے اور ایسی چیز پر بھی جو محض تفضلاً دی جائے۔ لیکن اِعْطَاءٌ صرف تفضلاً دینے کو کہتے ہیں*۔ اَلْاِعْطَاءُ۔ سپردگی۔ اَعْطٰى الْبَعِيْرُ۔ اونٹ نے منہ زوری ختم کی اور مطیع ہوگیا۔ قَوْسٌ عَطْوَىٰ۔ نرم اور آسانی سے کھنچ جانے والی کمان*۔

قرآن کریم میں ہے وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷/۲۰)۔ جو سامان زیست نوع انسانی کی نشوونما کے لئے خدا کیطرف سے مفت عطا ہوا ہے (یعنی رزق کے قدرتی وسائل) ان پر کوئی روک نہیں۔ جب خدا نے انہیں عالمگیر انسانیت کی نشوونما کے لئے عام کر دیا ہے تو ان پر روک کون ڈال سکتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے نظام ربوبیت کو قائم کرنے والوں کے متعلق کہا کہ مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (۹۲/۵) جو دیتا ہے اور اس طرح زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہنا چاہتا ہے اسی کے لئے آسانیاں ہیں۔ برخلاف اس کے مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى (۹۲/۸)۔ جو سب کچھ سمیٹ کر اپنے ہی لئے رکھتا ہے اور اس طرح دوسروں سے بے نیاز ہو جانا چاہتا ہے تو اس کے لئے دشواریاں ہی دشواریاں ہیں۔

* تاج و راغب۔ ** محیط

یہ ظاہر ہے کہ انسانی جسم کی پرورش کا مدار ہر اس چیز پر ہے جسے انسان اپنے لئے لیتا ہے۔ جسے وہ خود کھاتا پیتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ نوالہ آپ کے منہ میں جائے اور پرورش میرے جسم کی ہوتی جائے۔ لیکن اس کے بالکل برعکس، انسانی ذات (Self) کی نشو و نما ہر اُس شے سے ہوتی ہے جسے وہ شخص دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیتا ہے۔ اور برضا و رغبت دیتا ہے۔ اسی کو اِعْطَاءٌ کہتے ہیں۔ قرآنی نظام کی یہی اصل و بنیاد ہے۔ پوری پوری محنت کرنا لیکن اپنی محنت کے ماحصل سے اپنی ضروریات کے مطابق لیکر باقی سب نوع انسانی کی نشو و نما کے لئے دیدینا۔ یہ ہے جماعت مؤمنین کا شعار زندگی۔

اَلتَّعَاطِیْ۔ جس چیز کا حق نہ ہو اسے لے لینا۔ باہم کسی چیز کو لینے کے لئے کشمکش کرنا۔ پاؤں کے پنجوں پر کھڑے ہونا اور ہاتھ بڑھانا۔ بہت بڑی جرأت کرنا*۔ سورہ قمر میں اس سرکش کے متعلق ہے جس نے اس اونٹنی کو جسے حضرت صالح ؑ نے خدا کے نام پر چھوڑا تھا قتل کر دیا تھا کہ فَتَعَاطٰی فَعَقَرَ (۵۴/۲۹)۔ اس نے بڑی جرأت کرکے ہاتھ بڑھایا اور اونٹنی کو مار دیا۔ یعنی اس چیز کو جا لیا جس کا اسے حق نہیں تھا (ابن فارس)

ع ظ م

عَظْمٌ۔ ہڈی کو کہتے ہیں جو انسان کے جسم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ عَظْمُ الْفَدَّانِ۔ کسان کے ہل کی اس چوڑی لکڑی کو کہتے ہیں جسکے آگے لوہے کا پھل لگا ہوتا ہے۔ ہل میں اس لکڑی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ عَظَمَاتُ الْقَوْمِ۔ قوم کے سرداروں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اساسی حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ عَظَمُ الطَّرِیْقِ۔ راستہ کے کشادہ حصے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ راستہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ عَظَمَةٌ کے معنی تکبر و غرور۔ بڑائی۔ نیز عزت و حرمت کے بھی ہیں۔ اَلْعَظِیْمَةُ۔ سخت پیش آنے والی بات یا حادثہ*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی بڑا ہونے اور قوی ہونے کے ہیں۔

قرآن کریم میں عَظْمٌ (جمع عِظَامٌ اور اَعْظُمٌ) ہڈیوں کے معنی میں متعدد مقامات پر آیا ہے (مثلاً ۱۷/۴۹؛ ۱۹/۴؛ ۳۶/۷۸؛ ۵/۳۰)۔ سورہ نور میں ھَیِّنٌ (آسان) کے مقابلہ میں عَظِیْمٌ کا لفظ اہمیت کا مفہوم لئے ہوئے ہے (۲۴/۱۵)۔ اور النَّبَاِ الْعَظِیْمِ (۷۸/۲) میں سخت حادثہ یا انقلاب عظیم کے معنوں میں۔

* تاج۔

اور اَلْقُرْآنَ الْعَظِیْمَ (۱۵/۸۷) کے معنی ہیں زندگی کے بنیادی حقائق کا ضابطہ۔ '' عَظْمُ الْفَدّانِ '' کی رعایت سے، قرآن کریم وہ ضابطہ ہے جس سے زندگی کی سنگلاخ زمین قابل کاشت ہو جاتی ہے۔ جس سے راستے کشادہ ہو جاتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں خدا کے متعلق ہے وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (۲/۲۵۶)۔ یعنی بلندیوں اور عظمتوں کا مالک اور انسان کو شرف کی بلندیاں اور زندگی کی بنیادی قوتیں عطا کرنے والا۔ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ (۹/۱۲۹)۔ جس کے قبضۂ قدرت میں کائنات کی اساس و بنیاد کا کنٹرول ہو۔

ع ف ر

اَلْعَفَرُ۔ مٹی۔ عَفَرَہٗ فِی التُّرَابِ یَعْفِرُہٗ۔ اسے مٹی میں لت پت کر دیا۔ مٹی میں دبا دیا۔ اَلْمَعْفُوْرُ۔ وہ چیز جس پر مٹی مل دی گئی ہو۔ اَلْعُفْرُ۔ موٹا۔ مضبوط آدمی۔ نیز بہادر چست آدمی۔ رَجُلٌ عِفْرٌ و عِفْرِیْنٌ۔ (نیز عِفِرِّیْنٌ) وَ عِفْرِیْتٌ۔ چالاک اور شریر آدمی۔ نہایت تیز و طرار آدمی۔ حیرت انگیز ہوشیاری کے ساتھ معاملات میں گھس جانے والا آدمی۔ نیز ضبط کرنے والا، قوی تند خو انسان جو اپنے مد مقابل کو زیر کرلے*۔

سورۃ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے درباریوں میں سے ایک کے لئے عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ (۲۷/۳۹) آیا ہے۔ یعنی وحشی اور پہاڑی قبائل میں سے ایک مضبوط، قوی ہیکل، اور چست و چالاک آدمی، جس میں قوت اور معاملات کے اندر تک گھسجانے کی صلاحیت بدرجۂ اتم تھی۔ تیز و طرار۔ زیرک اور ہوشیار۔ انتہائی معاملہ فہم۔

عِفْرِیْت

حضرت سلیمانؑ کے لشکر کا ایک زبردست اور شاہ زور (پہاڑی قبیلہ کا سردار (۲۷/۳۹) جو بہت تیز طرار اور معاملہ فہم تھا۔ دیکھئے عنوان (ع۔ف۔ر)۔

ع ف ف

العِفَّۃُ۔ نفس کا ایسی حالت میں پہنچ جانا جس کے ذریعہ وہ غلبۂ شہوت سے محفوظ رہے**۔ عِفَّۃٌ۔ عَفَافٌ کے معنی ہیں حرام و نازیبا چیزوں

---

*تاج و محیط و راغب۔ **راغب۔

سے خود کو روکنا ۔ قبائح سے رک جانا** ۔ ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے ۔ اِعْتَفَقْتِ الْاِبِلُ الْيَبِيْسَ ۔ اونٹوں نے اپنی زبانوں سے خشک گھاس کو مٹی سے صاف کرتے ہوئے اٹھا لیا** ۔ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں رک جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے ۔ چنانچہ اَلْعُفَافَةُ اس تھوڑے سے دودھ کو کہتے ہیں جو دودھ دوہ لینے کے بعد تھنوں میں رک کر رہ جائے** ۔ عَفَّ الرَّجُلُ ۔ آدمی نامناسب چیزوں سے رکا ۔ تَعَفَّفَ ۔ کے معنی ہیں تھوڑی چیز پر کفایت کرلینا* ۔ بتکلف اپنے نفس کو روکنا اور کسی چیز سے دور رکھنا**۔ بےجا باتوں سے شرم و حیا کرنا ۔ ضرورت کے باوجود کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرنا ۔ (۲۷۳/۲) ۔ سورۃ نور میں ہے وَ اَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ (۶۰/۲۴) اگر وہ اس کی بھی احتیاط رکھیں تو زیادہ اچھا ہے ۔ نیز وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا (۳۳/۲۴) ۔ جو نکاح کا سامان نہیں پاتے انہیں چاہئے کہ اپنے آپ کو بچائے رکھیں ۔ اسی کو عفت (پاکبازی) کہتے ہیں ۔

قرآن کریم انسانی عفت پر بڑا زور دیتا ہے ۔ یعنی جنسی اختلاط کے صرف ایک طریقے کو جائز قرار دیتا ہے جسے نکاح کہا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ جنسی اختلاط سخت جرم ہے ۔ وہ کھانے پینے کے معاملہ میں اضطراری حالت کو تسلیم کرتا ہے اور اس میں حرام تک کھانے کی اجازت دیتا ہے ۔ لیکن جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے اضطراری حالت کو تسلیم نہیں کرتا ، اس لئے وہ اس کی تسکین کے لئے ناجائز اختلاط کی اجازت نہیں دیتا ۔ بھوک اور پیاس انسان کے اپنے کنٹرول میں نہیں ہوتی ۔ لیکن جنسی جذبہ انسان کے اپنے خیال سے ابھرتا ہے ۔ اگر اس کا خیال نہ کیا جائے تو یہ کبھی بیدار نہیں ہوتا ۔ اس لئے جس جذبہ پر انسان کا اپنا کنٹرول ہو اس میں اضطراری حالت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

ع ف و

عَفْوٌ ۔ اس کے اصلی معنی ''ترک'' کے ہیں ۔ عَفَا عَنْهُ ۔ اسے سزا دئے بغیر چھوڑ دیا اور جانے دیا ۔ معاف کر دیا***۔ قرآن کریم میں عَفْوٌ اور صَفْحٌ کے لفظ اکٹھے آئے ہیں (۱۰۹/۲) ۔ ان دونوں لفظوں میں فرق یہ ہے کہ صَفْحٌ بلیغ تر ہے ۔ یعنی بالکل چھوڑ دینا ، اور عَفْوٌ میں یہ ہوسکتا ہے کہ کچھ کہہ سن کر چھوڑ دیا جائے ***۔ صاحب محیط کے نزدیک عَفْوٌ اور مَغْفِرَةٌ میں فرق یہ ہے کہ غُفْرَانٌ میں سزا قطعاً نہیں ہوتی اور عَفْوٌ

*راغب ۔ **محیط و تاج ۔ ***تاج ۔

سزا سے پہلے بھی ہو سکتا ہے اور سزا کے بعد بھی** ۔ (سزا کے بعد عَفْوٌ سے مراد ہوگا سزا کے اثرات کو مٹا دینا ۔ کیونکہ عَفْوٌ کے معنی مٹا دینا بھی ہیں ۔ اور مَغْفِرَۃٌ کے معنی ہونگے ان اثرات سے شروع ہی سے بچائے رکھنا)۔

عَفْوٌ ۔ مٹا دینا ۔ نیز مٹ جانا ۔ عَفَا اَثَرُہٗ ۔ وہ ہلاک ہو گیا ۔ اسکا نشان تک مٹ گیا ۔ اَلْعَفَاءُ ۔ وہ بارش جو آثار منازل تک کو مٹا دے* ۔

صحاح میں ہے کہ عَفْوُ الْمَالِ اس مال کو کہتے ہیں جو کسی کے خرچ سے زائد ہو ۔ اَعْطَیْتُہٗ عَفْوَ الْمَالِ کے معنی ہیں میں نے اسے بغیر مانگے مال دیا * ۔ ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے ۔ اَلْعَفْوُ مِنَ الْمَاءِ ۔ وہ پانی جو پینے والوں سے بچ جائے اور بلا کلفت و مزاحمت حاصل ہوسکے ۔ عَفَا شَعْرُ الْبَعِیْرِ ۔ اونٹ کے بال لمبے اور زیادہ ہو گئے ۔ عَفَا عَلَیْہِ فِی الْعِلْمِ ۔ وہ علم میں اس سے آگے بڑھ گیا اور اس کی معلومات پر اضافہ کیا ۔ عَفَا الصُّوْفَ ۔ اون کو زیادہ بڑھا کر کاٹا* ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے اسے اضداد میں سے لکھا ہے ۔ یعنی اس کے معنی مٹا دینے کے بھی ہیں اور زیادہ کرنے کے بھی ۔

لہذا اسکے معنی ہیں ضرورت سے زائد ۔ قرآن کریم میں ہے کہ یہ لوگ دریافت کرتے ہیں کہ ہم کسقدر مال و دولت نوع انسانی کی نشو و نما کے لئے کھلی رکھیں اور کس قدر خود اپنے لئے رکھیں ۔ اس کے جواب میں کہا کہ قُلِ الْعَفْوَ ($\frac{۲}{۲۱۹}$) ۔ ان سے کہہ دو کہ جسقدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب ۔ یہ ہے قرآن کریم کے نظام ربوبیت کا اصل الاصول ۔ یعنی ہر فردِ معاشرہ پوری پوری محنت کرے اور اس کے بعد اپنی محنت کے ماحصل سے اپنے لئے صرف اس قدر لے جس سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہو جائیں ۔ باقی سب دوسروں کی ضروریات کے لئے قرآنی نظام کے حوالے کر دے ۔ نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد فاضلہ دولت (Surplus Money) ہے ۔ قرآنی نظام میں فاضلہ دولت کسی فرد کے پاس رہنے نہیں پاتی ۔ تمام افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری نظام کے سر پر ہوتی ہے اور افراد اپنی محنت کا ماحصل اس نظام کی تحویل میں دے دیتے ہیں ۔ اس لئے نہ کوئی شخص بھوکا مرتا ہے اور نہ ہی کسی کے پاس زائد از ضرورت دولت رہتی ہے ۔

اَلْعَافِیَۃُ وَالْمُعَافَاۃُ کے معنی ہیں دوسروں کی ایذاء سے محفوظ رکھنا ۔ بیماریوں اور آفتوں سے بچانا* ۔ ابن اثیر نے اس کا یہ مفہوم بنایا ہے

*تاج ۔ **محیط ۔

کہ لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے سے مستغنی کر دینا ۔ ایک کی اذیت سے دوسرے کو محفوظ کرنا ۔ گویا نہ کوئی تمہارا محتاج ہو اور نہ تم کسی کے محتاج ہو ۔ اَلْمُعْتَفِّيْ ۔ وہ شخص جو تمہارے ساتھ رہے لیکن تم سے کسی سلوک کا طلبگار نہ ہو* ۔ طلبگار نہ ہونے کے اعتبار سے اَعْطَيْتُهٗ عَفْوًا کے معنی ہیں میں نے اس کو بے مانگے دے دیا ۔ نیز عَفْوٌ کے معنے بہترین چیز کے ہوتے ہیں ۔ نیز وہ چیز جس میں کسی قسم کی تکلیف و مشقت نہ اٹھانی پڑے* ۔

سورۃ بقرہ میں بنی اسرائیل کی خطاکاری کے بعد کہا ہے ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ (۲/۵۲) ۔ یعنی اس غلطی کے مضر اثرات کو مٹا دیا ۔ اسے معاف کرنا یا در گزر کرنا کہتے ہیں (واضح رہے کہ یہ اثر اس طرح سے مٹتا ہے کہ کوئی ایسا اچھا کام کیا جائے جس کے خوشگوار نتائج پہلی غلطی کے مضر نتائج کی تلافی کر دیں ۔ (دیکھئے عنوان ح ۔ س ۔ ن اور س ۔ و ۔ أ) ۔ اپنے حق کو چھوڑ دینے کے معنوں کے لئے (۲/۲۳۷) دیکھئے ۔ آگے بڑھ جانے کے معنوں میں یہ لفظ (۷/۹۵) میں آیا ہے ۔ یعنی وہ تعداد میں زیادہ ہو گئے ۔ ترقی کر گئے ۔

سورۃ شوریٰ میں ہے وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۔ یعنی قانون عدل کا اصول یہ ہونا چاہئے کہ سزا ہمیشہ جرم کی نسبت سے دی جائے ۔ جیسا جرم ویسی سزا ۔ اس کے بعد ہے وَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (۴۲/۴۰) ۔ لیکن اگر مستغیث معاف کردے اور اس طرح مجرم کی اصلاح کردے اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کرنے کا موجب بن جائے، تو اس کا اجر اللہ سے ملیگا ۔ یعنی عدل سے مقصد تلافی مافات ہوتا ہے یا اصلاح ۔ انتقامی سزا اس صورت میں دی جاتی ہے جب اول الذکر صورتوں کا امکان نہ ہو ۔ [گناہوں کے معاف ہو جانے کے متعلق عنوانات (ت ۔ و ۔ ب) و (غ ۔ ف ۔ ر) اور (ح ۔ س ۔ ن) دیکھئے ۔]

ع ق ب

اَلْعَقِبُ ۔ اَلْعَاقِبُ ۔ اَلْعُقْبَةُ ۔ اَلْعُقْبٰى ۔ ان الفاظ کے معنی ہیں ہر چیز کا آخر ۔ یہی اس مادہ کے اصلی معنی ہیں ۔ باقی تمام معانی (جو بہت سے ہیں) اسی مرکزی مفہوم کے گرد گھومتے ہیں ۔ اَلْعَقِبُ ۔ ایڑھی (جمع اَعْقَابٌ) ۔ اولاد ۔ نسل جو انسان کے پیچھے آتی ہے ۔ بیٹے پوتے ۔ اَلْعَاقِبُ ۔ ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کی جانشین ہو ۔

*تاج ۔

اسکے پیچھے آئے ۔ مثلاً بیٹا ۔ سردار قوم کے پیچھے آنے والا افسر ۔ عَقَبَہٗ ۔ وہ اسکا جانشین ہوا ۔ تَعَاقَبَ الْمُسَافِرَانِ عَلَی الدَّابَّۃِ ۔ دو مسافر یکے بعد دیگرے ایک سواری پر سوار ہوئے ۔ اَلْعُقْبَۃُ ۔ دن کو بھی کہتے ہیں اور رات کو بھی ، کیونکہ دونوں یکے بعد دیگرے آتے ہیں ۔ نیز اس کے معنی باری یا بدل کے بھی ہیں ۔ تَعْقِیْبٌ ۔ ادھر ادھر دیکھنا یا مڑ کر پیچھے کو دیکھنا یا لوٹنا ۔ تَعَقُّبٌ ۔ کسیکا پیچھا کرنا ۔ نیز کسی کو جرم کی وجہ سے گرفتار کرنا اور اسے جرم کی سزا دینا * ۔

راغب نے کہا ہے کہ اَلْعُقْبُ وَالْعُقْبٰی ۔ اچھے بدلے کیلئے مخصوص ہوتے ہیں ۔ نیز عَاقِبَۃٌ بھی ۔ اور عِقَابٌ اور عُقُوْبَۃٌ سزا کیلئے ** ۔ لیکن یہ کلیہ نہیں ۔ قرآن کریم میں عُقْبٰی کا لفظ مومنین کی جزا اور کفار کی سزا دونوں کے لئے آیا ہے (۱۳/۳۵) ۔ محیط میں اَلْمُعَقِّبُ کے معنے ثالِثٌ مثول کرنے والے کے بھی ہیں *** ۔ قرآن کریم میں ہے وَاللّٰہُ یَحْکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکْمِہٖ (۱۳/۴۱) ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے فیصلے کی کہیں اپیل نہیں ہو سکتی ۔ اس کے فیصلے کے بعد کسی اور کا فیصلہ نہیں آسکتا ۔ اَلْعَقَبَۃُ ۔ پہاڑ پر چڑھنے کا دشوار گذار راستہ * ۔ (۹۰/۱۱) ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنوں میں بلندی ، سختی اور صعوبت بھی لکھے ہیں ۔

قرآن کریم نے اعمال کے نتائج کیلئے اس مادہ کے مشتقات استعمال کرکے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف راہ نمائی کی ہے ۔ قانون مکافات کے معنی یہ ہیں کہ ہر عمل کا نتیجہ اسکے ساتھ ہی لگا ہوا ہوتا ہے ۔ یعنی آگے آگے کام جاتا ہے اور اسکے پیچھے پیچھے اسکا نتیجہ چلا جاتا ہے ۔ اسے جزا اور سزا کہتے ہیں ۔ لہذا جزا یا سزا کہیں خارج سے نہیں آتی ۔ خود اعمال کے اندر ہی پوشیدہ ہوتی ہے ۔ اعمال کا جزء ہوتی ہے ۔ جیسے ورزش کا نتیجہ (صحت) خود اس عمل کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے ۔ اسیلئے سورہ رعد میں کہا ہے کہ لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ یَحْفَظُوْنَہٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ (۱۳/۱۱) ۔ ہر انسان (یا اسکے عمل) کے ساتھ اسکے آگے اور پیچھے ایسی قوتیں لگی ہوئی ہیں جو خدا کے قانون کے مطابق اسکی نگرانی کرتی ہیں اور اس کے ہر عمل کو آخری نتیجہ تک پہنچا کر چھوڑتی ہیں ، اسی کو مآل کار ، یا کام کا آخری نتیجہ کہتے ہیں ۔ یہی ہر انسانی عمل کی عَاقِبَۃٌ یا عُقْبٰی ہے ۔

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔

یعنی اس کا آخری نتیجہ۔ تِلْکَ عُقْبَی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا (۱۳/۳۵)۔ یہ مآل (انجام) ہے ان لوگوں کا جو قانون خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔ لہذا عُقْبٰی کے معنی اس دنیا کے بعد دوسری دنیا ہی نہیں۔ اس کے معنی ہر کام کا نتیجہ یا انجام ہیں۔ خواہ وہ انجام اسی دنیا میں سامنے آجائے۔ (یا اس کے بعد کی زندگی میں)۔ چنانچہ (۱۳/۲۲) میں جو آیا ہے اُولٰٓئِکَ لَہُمْ عُقْبَی الدَّارِ تو اسکے معنی یہی ہیں کہ ان کے لئے اس دنیا کا انجام نہایت اچھا ہے۔ یہی معنی عَاقِبَۃُ الدَّارِ (۶/۱۳۹) کے ہیں جہاں یہ کہہ کر بات واضح کردی ہے کہ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ تمہیں جلدی معلوم ہوجائیگا۔ یعنی اسی زندگی میں بات واضح ہو جائیگی کہ دنیا کی خوشگواریاں کس کے لئے ہیں۔

یَنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْہِ۔ اپنی ایڑھیوں پر لوٹ جانا۔ بمقابلہ اتباع (۲/۱۴۳)۔ اس کے معنی پھر اسی حالت کی طرف لوٹ جانا، پھر اسی روش زندگی کو اختیار کرلینا ہیں جس پر کوئی پہلے ہو۔ یعنی جاہلیت کے بعد اسلام قبول کرنا، اور اسلام کے بعد پھر جاہلیت کی طرف لوٹ جانا۔ (۳/۱۴۳) میں یہی معنی ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ اسلام کا نظام، رسول اللہؐ کی زندگی تک ہی نہیں کہ ان کی وفات کے بعد تم پھر نظام جاہلیت کی طرف لوٹ جاؤ۔ یہ نظام علیٰ حالہٖ جاری رہیگا۔ اس سے قرآن کریم نے اس حقیقت عظمٰی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نظام، افراد یا شخصیتوں کی زندگی سے وابستہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اصولوں کے زور پر آگے چلتا ہے۔ شخصیتیں آتی ہیں اور جاتی ہیں۔ لیکن جب تک وہ اصول قائم رہتے ہیں جن پر وہ نظام متشکل ہوا تھا، وہ نظام رواں دواں آگے بڑھتا رہتا ہے۔ البتہ جب ان اصولوں کو ترک کردیا جائے تو پھر وہ نظام ختم ہوجاتا ہے۔ ختم نبوت کے معنی ہی یہ تھے کہ اب یہ نظام (اسلام) شخصیتوں کے سہاروں کا محتاج نہیں رہیگا۔ یہ اپنے محکم اصولوں کی قوت پر آگے چلے گا۔ جب تک امت ان اصولوں پر قائم رہی وہ نظام آگے بڑھتا گیا۔ جب اس نے وہ اصول چھوڑ دئے تو وہ نظام بھی ختم ہو گیا۔ اب اس کے احیاء کی صورت یہی ہے کہ قرآن کریم کے اصولوں کو پھر سے ضابطۂ حیات بنا لیا جائے۔

ع ق د

عَقْدٌ۔ مضبوطی سے گرہ باندھنا۔ یہ حَلٌّ (گرہ کھولنا) کی ضد ہے۔ پھر اسکے معنی کسی بات کو مؤکد کرنے کے ہو گئے۔ عَقَدَ الْعَہْدَ۔

اسنے عہد کو مضبوط کر دیا * ۔ اَلَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ (۴/۳۳) وہ لوگ جن سے تم نے محکم عہد باندھ رکھا ہے ۔ اَلْعَقْدُ ۔ عہد و پیمان * ۔ (جمع عُقُوْدٌ) ۔ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۵/۱)۔ اپنے عہدو پیمان کو پورا کرو ۔ اَلْعُقْدَۃُ ۔ (جمع عُقَدٌ) گرہ * ۔ عُقْدَۃَ النِّکَاحِ (۲/۲۳۵)۔ نکاح کی گرہ ۔ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ (۲۰/۲۷)۔ میری زبان کی گرہ کھول دے۔اسے روانی اور طلاقت عطا کر دے۔ تاکہ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ (۲۰/۲۸) اہل فرعون میری (حضرت موسیٰ ؑ کی) بات کو سمجھ لیں ۔

عُقْدَۃٌ ۔ ارادے کو پختہ کرنا ۔ حکومت ۔ حکومت کی بیعت وفاداری ۔ (جمع عُقَدٌ) ۔ اَلنَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (۱۱۳/۴) ۔ وہ جماعتیں جو کسی حکومت کو کمزور کرنے یا اسکی وفاشعاری میں تذبذب پیدا کرنے کی کوشش کریں ۔ یا نفسیاتی اثرات سے کسی کے محکم یقین کو متزلزل کر دیں ۔ اَلْعَقِیْدَۃُ ۔ دل میں مضبوطی سے جمی ہوئی بات** ۔ (قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا) ۔

ع ق ر

عَقَرَ النَّخْلَۃَ ۔ کھجور کے درخت کے بالائی حصہ کو گابھے کے ساتھ کاٹ دینا ، جس کے بعد وہ خشک ہو جاتا ہے * ۔ اور راغب کے نزدیک اس کے معنی ہیں کجھور کے درخت کو جڑ سے کاٹ دینا *** ۔ بہرحال دونوں صورتوں میں اس کے معنی اسے اسطرح کر دینے کے ہیں کہ وہ پھل نہ لاسکے ۔ اس لئے اَلْعَقْرَۃُ کے معنی ہیں رحم کا عقیم (بانجھ)ہو جانا ۔ حمل قبول کرنے کی صلاحیت نہ رکھنا ۔ اَلْعَقْرُ ۔ زخمی کرنا ۔ نَاقَۃٌ عَقِیْرٌ ۔ وہ اونٹنی جس کی کونچیں کاٹ دی گئی ہوں * ۔ قرآن کریم میں عَاقِرٌ بانجھ عورت کے لئے (۳/۳۹ ; ۱۹/۵) میں آیا ہے ۔ اور عَقَرَ اونٹنی کی کونچیں کاٹ دینے (یا اسے قتل کر دینے) کے لئے (۵۴/۲۹ ; ۹۱/۱۴) میں ۔

ع ق ل

عَقْلٌ کے معنی ہیں روکنا ۔ منع کرنا ۔ عِقَالٌ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کی ٹانگ کے نچلے حصہ کو موڑ کر اس کی پنڈلی کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے ۔ اُعْتُقِلَ لِسَانُہٗ ۔ اسکی زبان رک گئی ۔ وہ بول نہ سکا عَقَلَ ۔ اس نے عقل سے کام لیا ۔ عَقَلَ الشَّیْءَ ۔ کسی چیز کو سمجھنا ، اس میں غور و تدبر کیا ۔ عَقَلَ فُلَانًا ۔ فلاں کو روک دیا ۔ بند کر دیا ۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

قید کر دیا ۔ اَلْعِقَالَۃُ ۔ وہ چیز جس سے کسی کو باندھ دیا جائے ۔ مثلاً بیڑی وغیرہ ۔ اَلْمَعْقِلُ ۔ جائے پناہ (کیونکہ آدمی اس میں پناہ گیر ہوتا اور رک جاتا ہے ۔ نیز اس لئے کہ وہ جگہ دشمن کو وہاں آنے سے روک دیتی ہے) ۔ بلند پہاڑ کو بھی کہتے ہیں جو روک بن جاتا ہے * ۔

قرآن کریم میں عقل و فکر سے کام لینے کی بڑی تاکید آئی ہے ۔ جو عقل سے کام نہیں لیتے انہیں حیوانات سے بدتر قرار دیا گیا ہے ، اور ان کا مقام جہنم بتایا گیا ہے (۷/۱۷۹) ۔ قرآنی حقائق کو نہ ماننے والوں (کفار) سے بار بار کہا گیا ہے کہ تم عقل و فکر سے کام کیوں نہیں لیتے ۔ تم قرآن کریم میں غور و تدبر کیوں نہیں کرتے ۔ انہیں چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو اس کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو ۔ (۲۷/۶۴) ۔ اس اعتبار سے عقل کا مقام بہت بلند ہے ۔ خود عربوں کے ہاں بھی اَلْعَقِیْلَۃُ اس صاحب شرف و عزت خاتون کو کہتے تھے جو پردہ نشین ہو ۔ نیز قوم کے سردار کو ۔ بلکہ ہر اعلیٰ اور بہترین چیز کو * ۔ عَقِیْلَۃُ الْبَحْرِ ۔ موتی کو کہتے ہیں ۔ اور اَلْعَاقُوْلُ ۔ سمندر کے گہرے اور بہت پانی والے حصہ یا سمندر کی موج کو * ۔ واضح رہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں کے اعتبار سے ان تمام الفاظ میں یہ مفہوم مشترک ہوگا کہ ان کے بیش قیمت ہونے کی وجہ سے لوگ ان کی زیادہ حفاظت کرتے ہیں اور انہیں روک کر رکھتے ہیں ۔

عقل کا صحیح منصب یہ ہے کہ وہ انسان کو نا مناسب باتوں سے روکے ۔ لیکن یہی عقل اگر جذبات کے تابع ہو جائے تو تباہیوں اور بربادیوں کا موجب بن جاتی ہے (۲۹/۳۸) ۔ ایسا انسان (یا قوم) علم و عقل کے باوجود زندگی کی غلط روش پر چل نکلتا ہے ۔ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (۴۵/۲۳) ۔ اور اسکے ذرائع علم اسے کچھ فائدہ نہیں دیتے ۔ (۴۶/۲۶) ۔ جسطرح نشے کی حالت میں انسان کے حواس صحیح کام نہیں کرتے اسی طرح جذبات سے مغلوب ہو کر اسکی عقل صحیح کام نہیں کرتی ۔ وہ جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں اس کے حصول کا ذریعہ ۔ اس مقام پر عقل ، انسان کو اسکی انفرادی مفاد پرستیوں کے زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے اور اسے ربوبیت عامہ (عالمگیر انسانیت کی نشو و نما) سے روکتی ہے ۔ لہذا عقل کا صحیح مقام یہ ہے کہ اسے وحی کے تابع رکھا جائے ۔ یعنی انسان اپنے جذبات کو وحی کے تابع رکھے تو اسکی عقل اسے صحیح فائدہ پہنچا سکتی ہے (۲۸/۵۰) ۔

---

* تاج و محیط ۔

بالفاظ دیگر، عقل کو اپنی راہ نمائی کے لئےاسی طرح وحی کی روشنی کی ضرورت ھے جسطرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت ھے ۔ یہ ھے تعلق عقل اور وحی کا ۔ اس طرح عقل سے کام لینے والوں کو مومن کہا گیا ھے (۱۰/۶۵) ۔ جو عقل وحی کے تابع نہیں چلتی اسے شَیْطَان* اور اِبْلِیْس* کہا گیا ھے ۔ (دیکھئے عنوانات ب ۔ ل ۔ س اور ش ۔ ط ۔ ن) ۔

ع ق م

عُقْمٌ* ۔ دراصل اس خشکی کو کہتے ھیں جو کسی چیز کا اثر قبول کرنے میں مانع ھو ۔ عَقِیْمٌ* ۔ وہ عورت جو مرد کا مادہ قبول نہ کرے* ۔ لیکن اس لفظ کا استعمال عورت تک ھی محدود نہیں ۔ رَجُلٌ* عَقِیْمٌ* وَعِقَامٌ* ۔ اس مرد کو بھی کہتے ھیں جسکےاولاد نہ ھو ۔ رِیْحٌ* عَقِیْمٌ* ۔ خشک ھوا جو بادلوں کو ساتھ نہیں لاتی یا بارش نہیں برساتی ، یا درختوں کو بار دار نہیں کرتی ۔ یَوْمٌ* عَقِیْمٌ* ۔ سخت دن ۔ ایسا دن جس میں ٹھنڈ (سامان راحت) نہ ھو** ۔ صاحب محیط نے کہا ھے کہ عُقْمٌ* کے اصل معنی بند کرنا ، روکنا ۔ اور قطع کرنا ھیں*** ۔ لیکن ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی نمایاں نہ ھونا ۔ تنگ ھونا اور سخت ھونا ھیں ۔ حضرت ابراھیمؑ کی بیوی کے متعلق ھے عَجُوْزٌ* عَقِیْمٌ* ۔ (۵۱/۲۹) ۔ بڑھیا بانجھ ۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ آیا ھے (۵۱/۴۱) ۔ بمقابلہ رِیَاحٌ* لَوَاقِحُ* (۱۵/۲۲) کے جو پانی برساتی ھیں ۔ سورہ حج میں عَذَابُ* یَوْمٍ عَقِیْمٍ (۲۲/۵۵) آیا ھے ۔ ''تباہ کرنے والے دن کا عذاب'' ۔ یعنی ایسا عذاب جس سے اس قوم کی نشوونما کی صلاحتیں سلب ھو جائیں ۔ جس سے اسکی جڑ کٹ جائے ۔ وہ عقیم رہ جائے ۔

ع ک ف

عَکَفَ ۔ کسی چیز کو روکنا ، یا رکنا ۔ عَکَفَ عَلَیْهِ ۔ اسکی طرف مسلسل بڑھا اور اس سے اپنا رخ نہ پھیرا ۔ عَکَّفَ ۔ کسی چیز کو بکھرنے سے بچانے کیلئے لڑی میں پرو دینا ، جسطرح موتیوں کو پرو دیا جاتا ھے ۔ عَکَفَ الْجَوْهَرَ فِی النِّظَمِ ۔ گوھر لڑی میں پر گیا ۔ شَعْرٌ* مَعْکُوْفٌ* ۔ کنگھی کئے ھوئے ، گندھے ھوئے بال (برخلاف پریشان اور بکھرے ھوئے بالوں کے) ۔ اسلئے عَکَفَ کے معنی ھیں (معاملات کو) درست کرنا** ۔ راغب

* راغب ۔ ** تاج ۔ *** محیط ۔

نے لکھا ہے کہ اَلْعُکُوْفُ۔ تعظیماً کسی شے کی طرف بڑھنے اور اس سے مستقل طور وابستہ ہونے کو کہتے ہیں **۔ عَکَفَ الْقَوْمُ حَوْلَہٗ۔ قوم نے اسکے گرد گھیرا بنا لیا *۔

قرآن کریم میں ہے اَلْھَدْیَ مَعْکُوْفًا (۴۸/۲۵) وہ جانور جسے کعبہ لئے جارہے ہوں لیکن اسے راستے میں روک دیا گیا ہو۔ یہاں اسکے معنی روکنے کے ہیں۔ سورہ حج میں ہے کہ کعبہ کو سَوَآءَ نِ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ (۲۲/۲۵) بنایا ہے۔ یعنی وہاں رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں، سب کے لئے یکساں۔ وہ تمام نوع انسانی کے لئے مشترکہ طور پر جائے پناہ ہے اور کسی پر اسکے دروازے بند نہیں۔ نہ ہی کسی کے حقوق زیادہ ہیں۔ سورہ طٰہٰ میں عَاکِفِیْنَ کا لفظ (۲۰/۹۱) میں آیا ہے جسکے معنی ہیں کسی کام پر مسلسل لگے رہنا۔ جمے رہنا۔

کعبہ کے متعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراھیمؑ اور اسمعیلؑ سے کہا کہ اسے طَآئِفِیْنَ اور عَاکِفِیْنَ کے لئے پاکیزہ بنا دیں۔(۲/۱۲۵)۔ عَاکِفِیْنَ کے معنی ہیں وہ جماعت جو نوع انسانی کا شیرازہ بکھرنے نہ دے بلکہ انہیں ایک رشتہ میں پرو کر انکے معاملات کو درست حالت میں رکھے۔ ان کے الجھے اور بکھرے ہوئے بالوں کی مشاطگی کرے اور اسطرح گیسوئے انسانیت کو سنوار دے۔ (تفصیل اسکی ط۔ و۔ ف کے عنوان میں دیکھئے)۔ یہ ہے منصب امت مسلمہ کا جس کے نظام کا مرکز کعبہ ہے۔ یعنی یہ امت اپنے آپ کو اپنے مرکز نظام خداوندی (کعبہ) سے متمسک رکھتی ہے، اور نوع انسانی کے معاملات کو سنوارتی ہے۔ اسی کو شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (۲/۱۴۳) بھی کہا ہے۔ یعنی تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگران۔ لیکن دوسروں کے اعمال کی نگران وہی جماعت ہوسکتی ہے جو خود قوانین خداوندی پر جم کر رہے اور اپنی تمام توجہات کو اسی نقطہ پر مرکوز رکھے۔

ع ل ق

اَلْعَلَقُ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی بلند چیز کے ساتھ کسی چیز کو باندھنا یا وابستہ کر دینا ہیں۔ اَلْعَلَقُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس پر کنویں کی چرخی لگی ہوتی ہے۔ یا چرخی مع اپنے ضروری سامان کے۔ اَلْعَلَقُ۔ خون (خواہ کسی قسم کا ہو)۔ یا تیز سرخ

* تاج۔ ** راغب۔

یا گاڑھا یا جما ہوا خون جو ابھی خشک نہ ہوا ہو بلکہ لوتھڑے کی قسم کا ہو۔ نیز جونک جو خون چوس لیتی ہے۔ نیز وہ مٹی جو ہاتھ سے چمٹ جائے۔ اَلْمِعْلَاقُ۔ ہر وہ چیز جس کے ساتھ کسی چیز کو لٹکایا جائے۔ مثلاً ڈول کے دونوں کنارے جن میں رسیاں بندھی ہوتی ہیں انہیں اَلْمِعْلَاقَانِ کہتے ہیں۔ اَلْعُلَّيْقُ۔ ایک قسم کی درخت پر چڑھنے والی بیل یا جھاڑی جس میں کانٹے بہت ہوتے ہیں۔ جب کوئی چیز اس میں الجھ جائے تو اس کا بسلامت نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اَلْعِلَاقَةُ۔ اَلْعَلَاقَةُ۔ محبت کو کہتے ہیں جو دل کے ساتھ چمٹ جاتی ہے۔ اَلْمُعَلَّقَةُ۔ وہ عورت جو شوہر کے مفقود الخبر ہونے کی وجہ سے نہ شادی شدہ کی طرح ہو نہ مطلقہ کی طرح۔ ازھری نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ عورت ہے جس کا خاوند نہ اس کے ساتھ انصاف کرے، نہ اسے چھوڑے۔ اور اس طرح اس کی حالت شادی شدہ اور بے شوہر والی عورت کے درمیان ہوجائے اور وہ ادھر لٹکتی رہے*۔ قرآن کریم میں ہے فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (۴/۱۲۹)۔ تو تم اسے معلقہ کی طرح چھوڑ دو۔

سورۃ مومنون میں انسانی بچہ (جنین) کی جو مختلف حالتیں بتلائی گئی ہیں ان میں دوسری حالت عَلَقَةً کی ہے (۲۳/۱۴)۔ یعنی جونک کی طرح (Sole-Shaped)۔

سورۃ علق میں ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (۹۶/۲)۔ عَلَقٍ کے معنے اگر خون کے لوتھڑے کے لئے جائیں تو آیت میں انسان کی طبیعی خلقت کی طرف اشارہ ہوگا۔ اور اگر اس کا وسیع مفہوم لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کو اگر (بغیر وحی کی راہ نمائی کے) علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو اس کی ہوس کا یہ عالم ہوتا ہے کہ یہ اپنے مفاد کے ساتھ جونک کی طرح چمٹا اور خون پیتا رہتا ہے اور ہر جگہ شکار پھانسنے کی فکر میں رہتا ہے۔ چنانچہ اَعْلَقَ الصَّائِدُ کے معنی ہیں شکاری کے جال میں شکار پھنس گیا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْعَلَقُ عشق و محبت (جس میں کسی کو جی چاہتا ہے اور اس سے بندھ جاتا ہے یا، بقول تاج، جو دل میں جم جاتی ہے) کو بھی کہتے ہیں۔

ع ل م

عِلْمٌ (عَلِمَ۔ يَعْلَمُ)۔ کسی چیز کو کماحقہ جاننا۔ پہچاننا۔ حقیقت کا ادراک کرنا۔ یقین حاصل کرنا۔ محسوس کرنا۔ محکم طور پر

---

*تاج و محیط و راغب **تاج۔

معلوم کرنا* - اس طرح ادراکِ حقیقت کرنے والے کو عَالِم* کہتے ہیں جس کی جمع عَالِمُوْنَ آتی ہے - اور عَلِیْم* کی جمع عُلَمَاء* یعنی گہرا اور پختہ علم رکھنے والے - اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز پر ایسے نشان کے ہیں جس سے وہ شے دیگر اشیاء سے متمیز ہو سکے۔ (ابن فارس)

عربوں کے نزدیک عِلْم* کا درجہ معرفت اور شعور سے زیادہ بلند ہے - یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ کے لئے عِلْم* کا لفظ استعمال کرتے ہیں - معرفت یا شعور کا نہیں - چنانچہ خدا کو عَالِم* یا عَلِیْم* کہہ سکتے ہیں ، عَارِفٌ (معرفت رکھنے والا) یا شَاعِر* (شعور رکھنے والا) نہیں کہہ سکتے - عِلْم* اور مَعْرِفَة* میں (انکے نزدیک) ایک فرق یہ بھی ہے کہ مَعْرِفَت کسی چیز کے آثار و قرائن میں غور و فکر کرکے اس کا ادراک کرنے کو کہتے ہیں لیکن علم کے لئے یہ ضروری نہیں - ثانیاً معرفت کا لفظ بیشتر اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کوئی چیز ادراک کے بعد دھیان سے نکل جائے اور پھر دوبارہ اس کا ادراک ہو، لیکن عِلْم* میں یہ صورت نہیں ہوتی**۔ (اس علم کی مثال جو تدبر و تفکر سے حاصل نہیں ہوتا وحی ہے - (۴۲/۵۲) -

قرآن کریم نے (۱۷/۳۶) سمع ، بصر اور قلب کو حصول علم کے ذرائع قرار دیا ہے (جو ایمان تک پہنچنے کا ضروری ذریعہ ہے) - دوسرے مقام پر قَلْب* کی جگہ فُؤَاد* بھی کہا ہے (۱۶/۷۸) *** - اس میں علم بذریعہ حواس (Perceptual Knowledge) اور بذریعہ تصورات (Conceptual) دونوں آجاتے ہیں - اور فُؤَاد* کی نسبت سے اس میں احساسات بھی آجاتے ہیں (دیکھئے عنوان ف - أ - د) - لیکن چونکہ علم اس وقت عِلْم* کہلا سکتا ہے جب وہ یقین کے درجے تک پہنچ جائے اس لئے قرآن کریم نے وحی کو عِلْم* کہا ہے اور اس کی ضد کو أَهْوَاء* (۲/۱۲۰) - یعنی انسان کے خود ساختہ تصورات یا جذباتی عقیدت مندیاں جن کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں ہوتی - یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم خارجی کائنات کے متعلق علم حاصل کرنے پر بڑا زور دیتا ہے - اس لئے کہ اس علم کی بنیاد دلائل و براہین اور حقائق و شواہد پر ہوتی ہے - جذباتی عقیدت مندی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا - وہ اپنے ہر دعوے کو دلیل و برہان کے زور پر پیش کرتا ہے (۴/۱۷۵) - اور ان دعاوی سے انکار کرنے والوں سے بھی دلائل و براہین طلب کرتا ہے (۲/۱۱۱) - اسے اپنے دعاوی کی محکمیت پر اتنا یقین ہے (اور یقین علم

*تاج و محیط - **تاج - ***قلب اور فؤاد کے فرق کے لئے ف - أ - د کا عنوان دیکھئے۔

سے پیدا ہوتا ہے) کہ وہ ان دعاوی سے انکار کرنے والوں کے متعلق علانیہ کہہ دیتا ہے کہ وہ ان کی تردید میں کوئی برہان پیش نہیں کر سکتے (۲۳/۱۱۷) ۔ اسی لئے قرآن کریم کی دعوت ، علی وجہ البصیرت دعوت ہے (۱۲/۱۰۸) ۔ یعنی (Rational) طریق ۔

اَلْعَلَمُ وَ الْعَلَامَةُ ۔ ایسی نشانی جس سے کوئی شے پہچانی جا سکے ۔ دو کھیتوں کے درمیان جو ڈول بنا دی جائے* ، اسی طرح ریگستانوں یا دوسرے راستوں میں راہ کی پہچان کے لئے جو چیزیں کھڑی کر دی جاتی تھیں انہیں بھی عَلَامَةٌ یا عَلَمٌ کہتے تھے* ۔ بڑے اور لمبے پہاڑ کو بھی عَلَمٌ کہتے ہیں ۔ اسکی جمع اَعْلَامٌ ہے (۵۵/۲۴) ۔ اور جھنڈے کو بھی اسی لئے عَلَمٌ کہتے ہیں کہ اس سے ایک جماعت دوسری کو پہچانتی ہے ۔ نیز وہ اثر یا نشان جس سے راستہ کا پتہ چلایا جا سکے مَعْلَمٌ کہلاتا ہے* ۔ اَعْلَمُ اُس اونٹ کو کہتے ہیں جس کا بالائی ہونٹ پھٹا ہو* ۔ قدیم عرب ، جنگ میں گھوڑے پر رنگین اون لٹکا دیتے تھے ۔ اس عمل کے لئے اَعْلَمَ الْفَرَسَ کہتے تھے* ۔ اَعْلَمَ نَفْسَہٗ ۔ اپنے اوپر وہ نشان لگایا جو جنگ میں شریک ہونے والے لگاتے ہیں**** ۔

اسی سے عَالَمٌ ہے (جس کی جمع عَالَمِیْنَ ہے) ۔ اسم آلہ کا ایک وزن فَاعَلٌ بھی ہے جیسے خاتَمٌ ۔ مَایُخْتَمُ بِہٖ ۔ قَالَبٌ ۔ مَایُقْلَبُ بِہٖ ۔ وغیرہ ۔ عَالَمٌ بھی اسی طرح ہے جس کے معنی ہیں مَا یُعْلَمُ بِہٖ ۔ یعنی وہ شے جس کے ذریعے کسی چیز کا علم حاصل کیا جائے ۔ چونکہ خدا کا علم ، کائنات کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اس لئے ساری کائنات عَالَمٌ کہلائی جانے لگی ۔ نیز کائنات کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں میں سے ہر ایک بھی عَالَمٌ کہلائیگا ۔ مثلاً عالم انسان ۔ عالم ماء ۔ عالم نار وغیرہ ۔ اس کی جمع مذکر سالم لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انسان بھی شامل ہے ۔ اور جب کسی لفظ میں دوسری مخلوقات کے ساتھ انسان بھی شامل ہوں تو انسانوں کو غالب رکھا جاتا ہے** ۔ اسی لئے نسل یا قوم کو بھی عَالَمٌ کہا گیا ہے ۔ (اور قرن اور صدی کو بھی) ۔ ۔ قرآن کریم نے عَالَمِیْنَ کو اکثر اَقْوَامٌ کے معنی میں استعمال کیا ہے ۔ یعنی کسی ایک زمانہ (Age) کے ہم عصر انسان ۔ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْنَ ۔ (۲/۴۷) یعنی بنی اسرائیل کو (اُس زمانے میں) ان کی ہم عصر اقوام پر فضیلت دی ۔ نیز مختلف قسم کے لوگ یا دنیا بھر کے لوگ ۔ (۲۵/۱) ۔ اس جہت سے

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** المنار ۔ **** محیط ۔

رَبُّ الْعَالَمِيْنَ (۱/۱) کے معنی، دور حاضر کی اصطلاح میں "بین الاقوامی انسانیت کی نشو و نما دینے والا" بھی ہوسکتے ہیں - یعنی خدا کی عالمگیر ربوبیت انسانیہ - اور تمام کائنات کا نشو و نما دینے والا بھی جس میں انسان بھی شامل ہونگے -

اتنا سمجھ لینا چاہئیے کہ اگرچہ عَالَمٌ کا لفظ کائنات کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن اہلِ عرب ہر موجود شے مثلاً پتھر - مٹی کے لئے اسے نہیں بولتے بلکہ وہ اس لفظ کا اطلاق ہر ایسے جداگانہ مجموعہ پر کرتے ہیں جسکے افراد اگر عاقل نہ ہوں تو عاقل سے قریب تر ضرور ہوں - مثلاً عَالَمُ الْاِنْسَانِ - عَالَمُ الْحَیَوَانِ یا عَالَمُ النَّبَاتِ کہہ سکتے ہیں - اور یہ ظاہر ہے کہ یہی وہ چیزیں ہیں جن میں خدا کی صفت ربوبیت کا جلوہ نظر آتا ہے کیونکہ ان اشیاء میں صفت ربوبیت کو اپنانے کے لئے بنیادی صلاحیت موجود ہے - اور یہ صفت حیوان میں نمایاں ہے - مثلاً زندگی - غذا حاصل کرنا - سلسلہ ٔ تولید - وغیرہ -

لہذا خدا کی رَبُّ الْعَالَمِیْنِی کی صفت محسوس اور مشہود شکل میں سامنے آنی چاہئیے - محض ذہنی تصور یا عقیدہ میں نہیں رہنی چاہئیے - اسی سے حَمْدٌ کی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے (دیکھئے عنوان ح - م - د) -

قرآن کریم میں ہے عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّهَا (۲/۳۱) - اللہ نے آدم (آدمی) کو تمام اشیائے کائنات کا علم عطا کردیا - یا عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (۹۶/۵) - اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا - اور عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶/۴)- اسے قلم سے (لکھنا) سکھایا- عَلَّمَهُ الْبَیَانَ (۵۵/۴)- اُسے بولنا (اپنے آپ کو (Express) کرنا) سکھایا - ان مقامات کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس طرح سکھایا جس طرح ایک استاد بچے کو تعلیم دیتا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کے اندر ان باتوں کی صلاحیت رکھدی - اسے ان کی استعداد عطا کردی - اسکی واضح مثال سورۃ مائدہ میں ملیگی جہاں فرمایا کہ تم اپنے شکاری کتوں کو (شکار پکڑنا) سکھاتے ہو مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰهُ (۵/۴) - اس علم کی رو سے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے - ظاہر ہے کہ اللہ کسی انسان کو شکاری کتوں کو سدھانے کا طریقہ نہیں سکھاتا - اس نے انسان میں اسکی استعداد رکھ دی ہے جس سے انسان اس علم کو خود حاصل کرتا ہے -

لہذا ایک علم تو وہ ہے جو نبی کو خدا کی طرف سے براہ راست ملتا ہے - اسے وحی کہتے ہیں - اور دوسرا علم وہ ہے جس کی استعداد تمام انسانوں

میں رکھ دی گئی ہے ، اور جو انسان چاہے اسے حاصل کرسکتا ہے ۔ قرآن کریم کے ان مقامات میں اس فرق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ یعنی یہ فرق کہ کس مقام پر علم سے مراد وحی کا علم ہے اور کس مقام پر عام انسانی استعداد ۔ یہی فرق ایک نبی کے علم میں بھی ہوتا ہے ۔ ایک علم اسے بذریعہ وحی ملتا ہے جس میں کوئی غیر از نبی شریک نہیں ہوتا ۔ اور اس کا دوسرا علم انسانی استعداد ہوتی ہے جس میں اس کی حیثیت نبی کی نہیں ہوتی ، بشر کی ہوتی ہے ۔ یہی وہ حیثیت ہے جس میں اسے دوسروں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے ($\frac{3}{159}$) ۔

سورۃ فاطر میں ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ۔ کیا تو نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ اللہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے مختلف اقسام کے پھل پیدا کرتا ہے ۔ وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِیْبُ سُوْدٌ ۔ اور پہاڑوں (میں دیکھو کہ کس طرح) سفید اور سرخ خطے (یا طبقات) ہیں جن کی مختلف اقسام ہیں اور بعض ان میں سے بہت سیاہ ہیں۔ وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۔ اور اسی طرح انسانوں میں ، اور دیگر جانداروں میں اور مویشیوں میں بھی مختلف اقسام ہیں ۔

ان مقامات میں دیکھئے۔ قرآن کریم نے ان علوم کا ذکر کیا ہے جنہیں دور حاضر کی اصطلاح میں خالصتاً علوم سائنس کہا جاتا ہے ۔ اس کے بعد ہے اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا . . . ($\frac{35}{27-28}$) ۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کے بندوں میں سے صرف وہی اس (کی عظمت و قدرت) کے سامنے لرزہ براندام رہتے ہیں جو ''علماء'' ہیں ۔ یعنی جو ان علوم کا علم رکھتے ہیں۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے ''علماء'' کا لفظ ٹھیک ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں آجکل سائنسدان (Scientist) کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ قرآن کریم علم الاشیاء کو بڑی بنیادی اہمیت دیتا ہے ۔ (تفصیل ان امور کی ''سلیم کے نام خطوط'' میں ملیگی) ۔

ع ل ن

عَلَنَ الْاَمْرُ ۔ بات ظاہر ہو گئی اور پھیل گئی ۔ اَلْعَلَانُ ۔ اَلْاِعْلَانُ ۔ کسی کام کو کھلم کھلا کرنا* ۔ اَلْعَلَانِیَۃُ ۔ ظاہر و آشکارا ۔ یہ سِرٌّ کی ضد ہے ، یعنی پوشیدہ یا چھپ کر ۔ نیز راز ** ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ

* تاج ۔ ** محیط و راغب ۔

سِرًّا کے مقابل میں آیا ہے (۲/۲۷۴)۔ اَسَرَّ کے بالمقابل اَعْلَنَ ۔ یعنی برملا کہنا، کھول کر کہنا۔ (۹/۱۰)۔

ع ل و

عِلْوُ الشَّیْءِ۔ چیز کا بلند ترین حصہ۔ (سِفْلٌ کی ضد ہے)۔ اَلْعَلَاءُ۔ شرف۔ بلندی۔ اَعْلَاۃٌ۔ عَالٰی بِہٖ۔ اِسْتَعْلَاءٌ۔ کسی چیز کے اوپر چڑھ گیا۔ اِسْتَعْلٰی۔ بلند ہوا۔ غالب ہوا۔ اَعْلَاہُ۔ اسے بلند کر دیا۔ تَعَالٰی۔ وہ بلند ہوا (۶/۱۰۰)۔ اَلْعِلَاوَۃُ۔ پورے بوجھ کے بعد اوپر سے جو زائد رکھا جائے۔ نیز یہ زائد یا اوپر سے، کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔

مَا عَلَوْا (۱۷/۷) جس چیز پر بھی وہ غالب آجائیں۔

عُلُوًّا (۱۷/۴) سرکشی۔ لیکن جب یہی لفظ خدا کے لئے بولا جائے تو اس کے معنی عظمت اور بلندی کے ہونگے (۱۷/۴۳)۔ عَالِیْنَ (۲۳/۴۶) سرکشی کرنے والے (اس کا واحد عَالٍ (اَلْعَالِیْ) ہے اور مؤنث عَالِیَۃٌ)۔ لَتَعْلُنَّ تم ضرور سرکشی اختیار کرو گے (۱۷/۴)۔ وَجَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا (۱۱/۸۲) ہم نے اس کے بالائی حصہ کو نیچے کا حصہ بنایا۔ اَلْمُتَعَالِ (۱۳/۹) بہت بلند۔ عالی مرتبت۔ اَلْاَعْلٰی (۸۷/۱) ۔سب سے بلند۔ سب پر غالب۔

عَلَا (۲۳/۹۱)۔ غالب ہوا (ایک دوسرے پر)۔

عِلِّیُّوْنَ عِلِّیِّیْنَ (۸۳/۱۸، ۱۹)۔ بلندیوں کے اوپر بلندیاں*۔ لیکن (۸۳/۲۰) میں عِلِّیُّوْنَ کی تفسیر کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ سے کی گئی ہے۔ لہذا اس کے معنی اعمال نامہ کے ہونگے۔ لکھی ہوئی کتاب۔ لیکن ایسا اعمال نامہ جو انسان کو بلندیوں کیطرف لے جائے۔ اس کے برعکس سِجِّیْنٌ ایسا اعمالنامہ ہے جو انسانی نشو و نما کو جکڑ کر رکھ دے۔ (۸۳/۷۔۹)۔

سورہ النمل میں ہے اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ (۲۷/۳۱)۔ اس میں تَعْلُوْا کے معنی ہیں سرکشی اختیار کرنا، اور مُسْلِمِیْنَ کے معنی مطیع و فرمانبردار ہو جانا۔

تَعَالَ۔ عربوں میں جب کوئی بلندی سے نیچے والوں کو آواز دیتا تو یہ لفظ کہتا تھا۔ لیکن کثرت استعمال کے بعد یہ امتیاز باقی نہ رہا اور ہر بلانے والا اس لفظ کو استعمال کرنے لگا **۔ چنانچہ سورہ احزاب میں ہے فَتَعَالَیْنَ (۳۳/۲۸) تم سب عورتیں آؤ۔

---

* تاج۔ ** محیط۔

واضح رہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں بلندی اور غلبہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ لیکن غلبہ دوقسم کا ہوتا ہے۔ ایک ظالم پر غلبہ پا کر مظلوم کی حمایت کرنا۔ یہ غلبہ مستحسن ہے اور جماعت مومنین کا شعار۔ دوسرا غلبہ یہ ہے کہ کمزورں اور ناتوانوں پر غلبہ پاکر انہیں اپنے استبداد کا نشانہ بنانا۔ یہ غلبہ مذموم ہے اور فرعونیت کی علامت۔ اس قسم کے غلبہ کو ہم نے سرکشی سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس میں اپنی قوت کو قوانین خداوندی کے خلاف صرف کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۸) تم افسردہ خاطر مت ہو۔ اور مت گھبراؤ۔ (آخرالامر) تم ہی غالب ہوگے، اس لئے کہ تم قوانین خداوندی کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہو۔ اس میں اسی غلبہ کی طرف اشارہ ہے جو طاغوتی قوتوں کو شکست دیکر، دنیا میں نظام عدل و مساوات قائم کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مومن کبھی کافر سے مغلوب نہیں رہ سکتا۔ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۴/۱۴۱) "اور اللہ ہرگز کافروں کو مومنوں پر غلبہ کی راہ نہیں دیگا"۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی معرکہ میں جماعت مومنین کو ہنگامی طور پر شکست ہوجائے (۳/۱۳۹)۔ لیکن کفار کا مؤمنین پر غالب رہنا، ناممکن ہے۔ لہذا اگر اپنے آپ کو "مؤمن" کہنے والے مستقلاً کفار سے مغلوب ہیں (خواہ کفار کا غلبہ حکمران کا ہو یا معاشی و معاشرتی) تو انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ قرآن کریم کی رو سے مؤمن کی (Definition) پر پورے نہیں اترتے۔ کفار سے مغلوب ہونا تو ایکطرف، مومن کی یہ کیفیت ہے کہ، اقبال کے الفاظ میں

مومنے بالائے ہر بالاترے غیرت او برنتابد همسرے

(عَلٰی۔ حرف ہے جو الگ لکھا گیا ہے۔ دیکھئے عنوان "عَلٰی")

عَلٰی (حرف)

عَلٰی۔ یہ حرف بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) پر۔ اوپر۔ خواہ حقیقتاً ہو۔ جیسے عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ (۲۳/۲۲) تم کشتیوں کے اوپر سوار کرائے جاتے ہو (سوار ہوتے ہو)۔

خواہ مجازاً۔ جیسے فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۲/۲۵۳) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

(۲) قریب کے معنوں میں — اَوْ اَجِدُ عَلَی النَّارِ هُدًی (۲۰/۱۰) یا میں اس آگ کے قریب کسی راہ نما کو دیکھوں (دیکھئے عنوان ھ۔ د۔ ی)

(۳) باوجود کے مفہوم میں۔ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ (۲/۱۷۷) مال کی محبت کے باوجود اسے (دوسروں کو) دے۔

(۴) مِنْ (سے) کے معنوں میں۔ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ (۸۳/۲) جب وہ لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں۔

(۵) "کی وجہ سے" کے معنوں میں۔ لِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰکُمْ (۲/۱۸۵) تاکہ تم اللہ (کے نظام) کو بلند کرو، اس وجہ سے (یا اس بنیاد پر) کہ اس نے تمہیں راہ نمائی دی ہے۔ (لیکن یہاں اس کے معنی ذریعے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی تم ہدایت خداوندی (قرآن) کے ذریعے اللہ کے نظام کو بلند کرو۔ (دیکھئے نمبر ۱۳)۔ (نیز "کے مطابق" بھی۔ دیکھئے نمبر ۱۱)

(۶) فِیْ (میں) کے معنوں میں وَدَخَلَ الْمَدِیْنَةَ عَلٰی حِیْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا (۲۸/۱۵) وہ اسوقت شہر میں داخل ہوا جب اسکے رہنے والے بیخبر تھے۔ ان کی بےخبری کی حالت میں۔۔۔۔۔۔

(۷) "کے ساتھ۔ کے متعلق" کے معنوں میں۔ حَقِیْقٌ عَلٰی اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ (۷/۱۰۵) مجھ پر واجب ہے کہ میں اللہ کے متعلق حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔ اس میں عَلٰی اَنْ لَّآ اَقُوْلَ کا مطلب ہے بِاَنْ لَّآ اَقُوْلَ۔ یعنی یہ کہ میں کچھ نہ کہوں۔ (سوائے حق کے)۔

(۸) اِلٰی (تک) کے معنوں میں۔ وَعَلَی اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ (۱۶/۹) اور درمیانی (سیدھی) راہ اللہ تک پہنچتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ کہا ہے۔ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ (۱۵/۴۱) یہ سیدھا راستہ مجھ تک پہنچتا ہے۔

(۹) سامنے۔ روبرو۔ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ (۲۰/۳۹) تاکہ تیری تربیت میرے سامنے ہو۔

(۱۰) خلاف۔ لَا تَفْتَرُوْا عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا (۲۰/۶۱) تم اللہ کے خلاف جھوٹ تو نہ تراشو۔

(۱۱) کے مطابق۔ اِعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ (۶/۱۳۵) تم اپنی طاقت کے مطابق (یا اپنی جگہ پر) کام کرو۔

(۱۲) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے (یعنی اسکے کچھ معنی نہیں ہوتے)۔

(۱۳) بذریعہ۔ کے ذریعے۔ مثلاً سورہ آل عمران میں ہے رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ (۳/۱۹۳)۔ اے ہمارے پروردگار! جو کچھ تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے وعدہ کیا تھا، وہ ہمیں عطا کر۔

(۱۴) عَلَیْہِ۔ اس کے خلاف۔ عربی زبان میں "ل" کسی کے فائدہ کے لئے آتا ہے اور اس کے برعکس "عَلٰی" آتا ہے۔ قرآن کریم میں عورتوں کے حقوق (مفاد) اور ذمہ داریوں کے متعلق آیا ہے۔ وَلَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ (۲/۲۲۸)۔ جسقدر ان کی ذمہ داریاں ہیں اسی کے مثل ان کے حقوق ہیں۔

(۱۵) عَلَیْکُمْ بِالصِّدْقِ۔ تم پر سچائی واجب ہے۔ تم ہمیشہ سچائی کے ساتھ رہو، اور اسے نہ چھوڑو۔ (یہ اسم فعل ہے)

قرآن کریم میں ہے عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ (۵/۱۰۵)۔ تم پر اپنی ذات (کی اصلاح) واجب ہے۔

عَمَّا (حرف)

دیکھئے عَنْ اور مَا۔

ع م د

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادے کے بنیادی معنی استقامت و استواری (سیدھا کھڑے ہو جانا) ہیں، خواہ وہ محسوس چیزوں میں ہو یا رائے اور ارادے میں۔ اَلْعَمُوْدُ۔ اس لکڑی (بلّی) کو کہتے ہیں جو خیمہ کے وسط میں ہوتی ہے اور جس کے سہارے خیمہ کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَعْمِدَۃٌ عَمَدٌ۔ عُمُدٌ آتی ہے۔ اَلْعَمَدُ۔ سنگ مرمر کے ستونوں کو بھی کہتے ہیں*۔ قرآن کریم میں ہے رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا (۱۳/۲)۔ خدا نے فضائی کرّوں کو بغیر مرئی (Visible) اور محسوس ستونوں کے کھڑا کر رکھا ہے۔ ان کے ستون، وہ باہمی کشش و جذب ہے جو آنکھوں سے نہیں دیکھی جاسکتی۔ اس میں عَمَدٌ جمع ہے عَمُوْدٌ کی یا عِمَادٌ کی۔ سورۃ الھمزہ میں ہے فِیْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَۃٍ (۱۰۴/۹)۔ لمبے لمبے ستونوں میں۔

*تاج۔

اَلْعَمُوْدُ - وہ سردار جس پر معاملات میں بھروسہ کیا جائے - رئیس لشکر - طَوِیْلُ الْعِمَادِ - لمبے تڑنگے آدمی کو کہتے ہیں - عِمَادٌ کے معنے طول اور لمبائی بھی ہیں* - قرآن کریم میں قوم عاد کے متعلق ہے اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (۸۹/۷) - اس کے معنوں میں مختلف اقوال ہیں۔ اَلْعِمَادُ بلند عمارتوں کو کہتے ہیں* - اس کا واحد عِمَادَۃٌ ہے - اس سے اس کے معنے ہونگے وہ قوم جو بڑی بڑی بلند عمارتوں کی مالک تھی - عِمَادٌ خیموں کو بھی کہتے ہیں - اس سے اس کے معنے ہونگے وہ لوگ جو خیموں میں رہا کرتے تھے* - یا وہ لوگ جن کے قد لمبے تھے* - راغب نے کہا ہے کہ اَلْعِمَادُ اس چیز کو کہتے ہیں جس پر ٹیک لگائی جائے اور بھروسہ کیا جائے۔ لہذا ذَاتِ الْعِمَادِ کے معنے ہونگے ان چیزوں کے مالک جن پر انہیں بڑا بھروسہ تھا** - اَلْعُمْدَۃُ - جس پر اعتماد یا بھروسہ کیا جائے*** -

اَلْعَمْدُ - اَلتَّعَمُّدُ - وہ کام جو مقصد و نیت سے کیا جائے - یہ خَطَأً کے مقابلہ میں آیا ہے (۴/۹۲-۹۳ و ۵/۹۵) - (قتل عمد اور قتل خطا کے لئے دیکھئے عنوان ق - ت - ل)۔

ع م ر

اَلْعِمَارَۃُ - خَرَابٌ کی ضد ہے - خَرَابٌ کے معنی ہیں ویران اور برباد کرنا - لہذا عِمَارَۃٌ کے معنی ہیں آباد کرنا - اَلْعُمْرُ - اس مدت کا نام ہے جس میں بدن حیات کے ساتھ آباد رہے** - عَمَّرَہُ اللّٰہُ - خدا نے اس کی عمر دراز کی - اسے باقی رکھا* - ابن فارس کے نزدیک اس مادہ کے بنیادی معنی دو ہیں - (۱) بقاء اور درازی زمانہ اور (۲) اونچی اور بلند ہونے والی چیز، خواہ وہ آواز ہو یا اس کے سوا کوئی اور چیز - سورۃ بقرہ میں ہے لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَۃٍ (۲/۹۶) - ''کاش! اُسے ہزار سال تک جیتا رکھا جائے'' - اَعْمَرَ الْاَرْضَ - زمین کو آباد پایا - اَلْعِمَارَۃُ - جس سے جگہ کو آباد کیا جائے۔ اَلْعُمْرَۃُ - ملاقات - کسی آباد جگہ جانا - شرعاً حج کے علاوہ کعبہ کی زیارت اورطواف وغیرہ کرنے کو کہتے ہیں - اِعْتَمَرَ (۲/۱۵۸) - عمرہ کرنا تَعْمِیْرُ الثَّوْبِ - کپڑے کی بناوٹ کا عمدہ کرنا - اَلْعَمْرُ - دین - چنانچہ جہاں قرآن کریم میں ہے لَعَمْرُکَ اِنَّھُمْ لَفِیْ سَکْرَتِھِمْ یَعْمَھُوْنَ (۱۵/۷۲) تو اس کے معنی یہی ہیں کہ تیرا دین اس حقیقت پر شاہد ہے* - (اگرچہ عرب عام طور پر لَعَمْرُکَ - تیری حیات و بقاء کی قسم کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں) -

*تاج - **راغب - ***محیط -

قرآن کریم میں ہے مَا کَانَ لِلْمُشْرِكِیْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ (۹/۱۷) ۔ مشرکین کا کام نہیں کہ وہ اللہ کی مساجد کو آباد کریں۔ مسجد ، خدا کے نظام توحید کا مرکز ہے ۔ یعنی اس نظام کا جس میں اطاعت صرف خدا کے قوانین کی کی جاتی ہے ۔ لہذا جو لوگ ان قوانین کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو بھی شامل کریں وہ ان مراکز کی آبادی کا باعث کیسے بن سکتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس مسجد کو جو امت میں تفرقہ پیدا کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی ، جہنم کا ایندھن بتایا ۔ (۹/۱۰۷-۱۰۹)۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی رو سے فرقہ پرستی بھی شرک ہے ۔ (۳۰/۳۲)

سورۂ طور میں وَ الْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ (۵۲/۴) آیا ہے۔ آباد کیا ہوا گھر۔ آباد رکھنے کی جگہ ۔ وہ جگہ جو ہمیشہ آباد رہیگی ۔ (یعنی خانہ کعبہ)۔

قرآن کریم میں آل عمران کا ذکر آیا ہے (۳/۳۳) ۔ کہتے ہیں کہ عمران حضرت موسیٰؑ کے والد کا نام تھا ۔ اس لئے آل عمران سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ اِمْرَاَتُ عِمْرَانَ (۳/۳۴) ۔ آل عمران کی ایک عورت یا عمران کی بیوی ۔ اِبْنَتَ عِمْرَانَ (۶۶/۱۲)۔ آل عمران کی ایک لڑکی (حضرت مریمؑ) ۔ یا عمران کی بیٹی ۔

ع م ق

اَلْعَمْقُ ۔ اَلْعُمْقُ ۔ اَلْعُمُقُ ۔ کنویں وغیرہ کی گہرائی ۔ راغب نے کہا ہے دراصل عَمْقٌ نیچے کی طرف دوری (گہرائی) کو کہتے ہیں ۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ جب عَمْقٌ راستے کی صفت ہو تو اس کے معنی دوری کے ہوتے ہیں اور جب کنویں کی صفت ہو ، تو اس کے معنی گہرائی کے ہوتے ہیں* ۔ (بحوالہ ابن فارس) ۔

قرآن کریم میں ہے مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ (۲۲/۲۷)۔ اسکے معنی ہیں ہر دور دراز راستے سے ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْعَمْقُ ۔ اَلْعَمَاقَةُ کے معنی لمبا ہونا ۔ بعید ہونا ۔ اور پھیلا ہوا ہونا، نیز گہرا ہونا ہیں** ۔

ع م ل

عَمَلٌ کے معنی کام کاج ، ہنرمندی ، مہارت اور ہوشیاری سے کام کرنا ہیں ۔ بعض لغویین کا خیال ہے کہ عمل کا لفظ فعل سے زیادہ خاص ہے

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔

اس لئے کہ عمل ایک گونہ مشقت سے کسی کام کو کرنے کے لئے بولا جاتا ہے ۔ اسی لئے عَمِلَ کا لفظ خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا ۔ فَعَلَ کا لفظ کیا جاتا ہے ۔ (فَعَلَ اور عَمِلَ میں جو اور فرق ہیں اسے ف ۔ ع ۔ ل کے عنوان میں لکھا گیا ہے ۔ علاوہ بریں) راغب نے کہا ہے کہ عَمَلٌ ہر وہ کام ہے جو کسی جاندار سے ارادۃً سرزد ہو ، اسکے برعکس فِعْلٌ کا لفظ حیوانات کی طرف اُس وقت بھی منسوب ہو سکتا ہے جب ان سے کوئی کام بلاقصد سرزد ہو ۔ حتّٰی کہ جمادات کی طرف بھی ۔ عَمَلٌ کا لفظ ان کی طرف بہت کم منسوب ہوتا ہے*۔ صاحب محیط نے تو بعض اہل لغت کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ عَمَلٌ در حقیقت عِلْمٌ کی مقلوب شکل ہے ۔ لہذا عَمَلٌ کے لئے علم لاینفک شرط ہے** ۔ (جیسا کہ ف ۔ ع ۔ ل کے عنوان میں کہا گیا ہے) عَمَلٌ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کام محض ہنگامی طور پر سرانجام نہ دیا گیا ہو بلکہ وہ عام طور پر (ہمیشہ کے لئے) کیا جاتا ہو ۔ عَامِلٌ ۔ کام کرنے والا ۔ (جمع عَامِلُوْنَ اور عَامِلِيْنَ) وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا (۹/۶۰) ۔ ٹیکس وصول کرنے والے ۔

قرآن کریم آعْمَال کے نتائج بتاتا ہے ۔ یعنی ان کاموں کے نتائج جنہیں انسان قصد اور ارادے کے ساتھ کرے ۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۶/۹۷) ۔ جو کوئی صلاحیت بخش کام کرتا ہے ، مرد ہو یا عورت ، اور وہ مومن بھی ہے ، تو ہم بالضرور انہیں خوشگوار زندگی عطا کرینگے اور بالضرور انہیں باحسن طریق ان کے ان کاموں کا اجر دینگے جنہیں وہ کرتے رہے ۔ قرآنی تعلیم کا نقطہ ماسکہ ہی ایمان اور عمل ہے ۔ یعنی قوانین خداوندی (یا مستقل اقدار) کی صداقت پر یقین اور ان کے حصول اور بقا کے لئے مسلسل عمل ، اس یقین کے ساتھ کہ ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے ۔ یہ ہے اسلام ۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان اعمال پر استقامت کے ساتھ قائم رہا جائے ، کیونکہ (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) عمل کی معنوی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کام ہمیشہ کے لئے کیا جاتا ہو ۔

ع م م

آلْعَمُّ ۔ باپ کا بھائی ۔ چچا ۔ (اسکی جمع اَعْمَامٌ ۔ عُمُوْمَةٌ ۔ اور اَعُمٌّ آتی ہے)۔ آلْعَمَّةُ ۔ باپ کی بہن یعنی پھوپھی ۔ اسکی جمع عَمَّاتٌ ہے۔

*تاج ۔ **محیط ۔

راغب نے کہا ہے کہ اس کی اصل عُمُوْمٌ سے ہے جس کے معنی شامل ہونے کے ہوتے ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی طول ، کثرت اور بلندی کے ہوتے ہیں ۔ اَلْعَمِیْمُ لمبے پودے کو کہتے ہیں ۔ اور لمبے کھجور کے درخت کو عَمِیْقَةٌ کہتے ہیں ۔ عَمَّ الشَّیْءُ عُمُوْمًا ۔ شے عام ہو گئی ۔ یعنی تمام افراد اس میں شامل ہوگئے ۔ اَلْعَامَّةُ ۔ عام لوگوں کو کہتے ہیں ۔ العِمَامَةُ ۔ ہر وہ چیز جسے سر پر لپیٹ لیا جائے *۔

قرآن کریم میں عَمّٰتُکُمْ (۴/۲۳) باپ کی بہنوں (پھوپھیوں) سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے ۔

ع م ہ

عَمَہٌ کے معنی ہیں راستہ کھوکر ، یا تحیر میں ، ادھر ادھر پھرنا یا نگاہ دوڑانا لیکن یہ نہ معلوم ہونا کہ صحیح رخ کونسا ہے ۔ اَرْضٌ عَمْھَاءُ اُس سر زمین کو کہتے ہیں جس پر راستہ دکھانے والے نشانات نہ ہوں ۔ اور ذَھَبَتْ اِبِلُہٗ الْعُمَّھٰی اُسوقت کہتے ہیں جب کسی کے اونٹ اسطرح کھو جائیں کہ پتہ ہی نہ لگ سکے کہ وہ کدھر چلے گئے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں راستہ کی طرف کم راہ نمائی ہونا اور حیرانگی ۔ یعنی معاملہ پیش نظر کے متعلق انسان کی سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے اور اسکی وجہ سے وہ حیران و پریشان ہو ۔

اس اعتبار سے بصیرت کے اندھے پن کو عَمَہٌ کہتے ہیں اور بصارت کے اندھے پن کو عَمًی***۔ اگرچہ راغب اور زمخشری کے نزدیک عَمًی کا لفظ بصارت و بصیرت دونوں کے اندھے پن کیلئے بولا جاسکتا ہے اور یہی درست ہے ۔ قرآن کریم میں ہے لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ (۲۴/۶۱) ۔ یہاں اَعْمٰی سے مراد بصارت کا اندھا ہے ۔ اور سورہ بقرہ میں ہے صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ (۲/۱۸) ۔ یہاں عُمْیٌ سے مراد بصیرت کا اندھا ہے ۔ عَمِہَ فُلَانٌ ۔ اُسوقت کہتے ہیں جب کسی شخص کو اپنی بات ثابت کرنیکے لئے دلیل نہ مل سکے اور وہ اسطرح حیران رہ جائے**۔

سورہ بقرہ میں فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ (۲/۱۵) ۔ راستہ کھو کر حیران و سرگرداں پھرنے کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے ۔ سورہ المومنون میں پہلے کہا کہ یہ لوگ عَنِ الصِّرَاطِ لَنَاکِبُوْنَ (۲۳/۷۴) ہیں ۔ یعنی

*تاج و راغب ۔　**تاج و محیط ۔　***لطائف اللغة ۔

سیدھے راستہ سے ہٹ جانے والے۔ اور اس کے بعد کہا فِیْ طُغْیَانِہِمْ یَعْمَہُوْنَ (۲۳/۴۵)۔ اس سے عَمَہٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی سیدھا راستہ کھو کر یا اس سے ہٹ کر صحیح راستہ نہ ملنے کی وجہ سے حیران و پریشان پھرنا۔

ع م ی

عَمِیَ ۔ یَعْمٰی۔ عَمًی کے معنی ہیں دونوں آنکھوں سے نابینا ہوجانا۔ اگر کوئی شخص ایک آنکھ سے اندھا ہو جائے تو اسے اَعْمٰی نہیں کہہ سکتے۔ اگرچہ (جیسا کہ صاحب لطائف اللغۃ نے کہا ہے) بصیرت کے زائل ہونے کو عَمَہٌ کہا جاتا ہے اور بصارت کے چلے جانے کو عَمًی ، لیکن اَلْعَمٰی دل کی بصیرت کے زائل ہو جانے کو بھی کہتے ہیں (دیکھئے عنوان ع۔م۔ہ)۔ عَمِیَّۃٌ کے معنی ہیں گمراہ ہو جانا۔ باطل پر مصر ہو جانا۔ اَلْاَعْمَاءُ۔ وہ افتادہ زمینیں جہاں آبادی کا نشان تک دکھائی نہ دے۔ اَلْاَعْمَیَانِ۔ سیلاب اور آتش زدگی کی تباہی کو کہتے ہیں کیونکہ جب یہ (دونوں) آتے ہیں تو نہ نیک کو دیکھتے ہیں نہ بد کو۔ اندھا دھند آگے بڑھے چلے جاتے ہیں۔ اَلْعَامِیُّ ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جسے راستہ نہ مل سکے *۔

عَمِیَ عَلَیْہِ الْاَمْرُ کے معنی ہیں اس پر فلاں معاملہ غیر واضح اور مشتبہ ہو گیا **۔ اَلْعَمَایَۃُ ۔ گمراہی ، بے راہ روی اور ہٹ دھرمی۔ نیز ظلمت شب کے آخری باقیماندہ حصے کو بھی کہتے ہیں *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے ہیں۔

صاحب لسان العرب کے نزدیک قَوْمٌ عَمُوْنَ اسوقت کہتے ہیں جب قوم تاریکی میں ہو اور حالات کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکنے کے قابل نہ رہے ***۔

قرآن کریم میں ہے وَمَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا (۱۷/۷۲)۔ جو شخص اس دنیا کی زندگی میں اندھا ہے وہ آخرت کی زندگی میں بھی اندھا ہوگا اور بالکل راہ گم کردہ۔ فراء کا قول ہے کہ اس آیت میں اَعْمٰی کے معنی ہیں دنیاوی نعمتوں سے محروم ، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو قوم اس دنیا میں نعمتوں اور آسائشوں سے محروم ہے وہ مستقبل کی زندگی میں بھی نعمتوں سے محروم رہیگی۔ وہ شاہراہ حیات سے اسقدر بھٹکی ہوئی ہوگی کہ صحیح راستہ سے بہت دور جا پڑے گی ***۔

*تاج۔ **محیط۔ ***لسان العرب۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں وَأَضَلُّ سَبِيْلًا کے ٹکڑے نے أَعْمٰی کا مفہوم واضح کر دیا ہے ۔ جو شخص سیدھے راستہ سے بھٹک کر غلط راہوں میں دور نکل جائے ، وہ بھوک پیاس خستگی اور واماندگی جیسی صدھا مشکلات سے دوچار ہوتا ہے اور زندگی کی نعمتوں سے محروم رہ جاتا ہے ۔ اسے صحرائے حیات میں کوئی نشان راہ دکھائی نہیں دیتا ۔ اسکی تشریح خود قرآن کریم نے دوسرے مقام پر کر دی ہے جہاں کہا ہے کہ وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَعْمٰی (۲۰/۱۲۴) ۔ جو ہمارے قانون حیات سے اعراض برتیگا تو اس کی معیشت تنگ ہو جائیگی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائینگے ۔ لہذا قانون خداوندی کے چھوڑ دینے سے دنیاوی زندگی میں محتاجی اور ذلت نصیب ہوتی ہے ، اور جس کی دنیاوی زندگی یوں ذلیل ہو اسکی آخرت بھی ذلیل ہوتی ہے ۔

قرآن کریم میں صُمٌّ ۔ بُكْمٌ کے ساتھ عُمْيٌ کا لفظ آیا ہے (۲/۱۸) (نیز عُمْيَانًا ۔ ۲۵/۷۳) جسکے معنی اندھے کے ہیں ۔ عُمْيٌ اور عُمْيَانٌ أَعْمٰی کی جمع ہیں ۔ سورہ طٰہٰ میں أَعْمٰی کے مقابلہ میں بَصِيْرٌ کا لفظ آیا ہے (۲۰/۱۲۵) ۔ اور سورہ انعام میں بتا دیا گیا ہے کہ جو وحی کی روشنی میں چلے وہ بَصِيْرٌ ہے اور جو اسکا اتباع نہ کرے وہ أَعْمٰی ہے (۶/۵۰) ۔ سورہ حم السجدہ میں الْعَمٰی کے مقابلہ میں الْهُدٰی کا لفظ آیا ہے ۔ (۴۱/۱۷) ۔ یہاں الْعَمٰی کے معنی گمراہی (صحیح راستے سے بھٹک جانا) ہیں ۔ (۲۷/۸۱) میں ضلالت کو اندھا پن کہا گیا ہے ۔ (۱۳/۱۹) میں ہے کہ جو شخص قرآن کریم کی حقیقت ثابتہ پر یقین نہیں رکھتا وہ أَعْمٰی ہے ۔ سورہ قصص میں ہے فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَاءُ (۲۸/۶۶) انپر معاملات مشتبہ ہو گئے ۔ یہی معنی (۱۱/۲۸) میں فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ کے ہیں ۔ یعنی ایسے واضح دلائل تمہیں صاف صاف دکھائی نہیں دیتے ۔ سورہ حج میں اس کیفیت کو "دل کی آنکھوں کے اندھا ہوجانے" سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (۲۲/۴۶) ۔ یعنی حقائق کا آنکھوں سے اوجھل ہوجانا یا صاف صاف دکھائی نہ دینا ۔

لہذا ، قرآن کریم کی رو سے جسطرح انسان کے سر کی آنکھوں کے لئے سورج (یا چراغ) کی روشنی کی ضرورت ہے ۔ یعنی اگر روشنی نہ ہو تو آنکھیں اندھی (بیکار) ہو جاتی ہیں ۔ اسیطرح عقل کی آنکھ کیلئے وحی کی روشنی کی ضرورت ہے ۔ وہی عقل ، بینا قرار دی جا سکتی ہے جو وحی کی روشنی میں زندگی کے منازل طے کرے ۔ نیز جو قومیں حقائق کا صحیح صحیح اندازہ

نہیں کرتیں اور اسطرح اندھی بن جاتی ہیں وہ دنیا کی نعمتوں اور آسائشوں سے محروم رہ جاتی ہیں ۔ اور جس قوم کا امروز تاریک اور بھیانک ہو اس کا فردا (مستقبل) بھی تاریک ہوتا ہے ۔ یہ تو ضرور نہیں کہ جس قوم کو اس دنیا کی آسائشیں اور نعمتیں میسر ہو جائیں اس کا مستقبل (حیات آخرت) بھی درخشندہ ہو ۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ مستقبل اسی قوم کا درخشندہ ہوگا جس کا امروز شاندار ہو ۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی قوم کی دنیاوی زندگی ذلت و رسوائیوں میں گذر رہی ہو اور وہ آخرت میں جنت کی آسائشوں کی مالک بن جائے ۔ ایمان اور عمل صالح کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشگواریاں اور شادابیاں اور اس کے بعد کی زندگی کی درخشانیاں اور تابناکیاں ہیں ۔ یاد رکھئے ۔ مومن کا مقام ، آدم (آدمی) کے مقام سے اونچا ہے ۔ اس لئے جو کچھ آدمی کو میسر ہو مومن کو وہ کچھ بھی میسر ہونا چاہئے اور اس سے زیادہ کچھ اور بھی ۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ ملائکہ ، آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں ۔ لہذا مقام آدم یہ ہے کہ کائناتی قوتیں اس کے سامنے جھکی ہوئی ہوں ۔ وہ اشیائے فطرت کو مسخر کر لے ۔ اور مومن کا مقام یہ ہے کہ وہ اشیائے فطرت کو مسخر کرکے انہیں قوانین خداوندی کے مطابق صرف میں لائے ۔ لہذا اگر کسی قوم کا اشیائے فطرت پر تصرف نہیں تو وہ قوم مقام آدم تک بھی نہیں پہنچ سکی ، چہ جائیکہ اسے مقام مومن نصیب ہو ۔ جس قوم کو اس دنیا کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں نصیب نہیں اسے مقام آدم حاصل نہیں ۔ چہ جائیکہ مقام مومن ۔ اس لئے ایسی قوم کی آخرت کی زندگی کسطرح روشن ہو سکتی ہے ۔ لیکن جس قوم کو مقام آدم نصیب ہے لیکن مقام مومن نصیب نہیں تو اسکی اس دنیا کی زندگی پر آسائش ہوگی ۔ آخرت کی زندگی اسکی بھی تاریک ہوگی ۔ مومن کی دنیا اور آخرت دونوں کی زندگی تابناک ہوگی ۔

عَنْ (حرف)

عَنْ ۔ یہ بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً ۔

(۱) يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ (۲۴/۶۳) ۔ وہ اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ۔

(۲) ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ۔ منتقل ہونا ، ہٹ جانا جیسے عَنِ الصِّرَاطِ لَنَاكِبُوْنَ (۲۳/۷۴) ۔ وہ راستہ سے ایک طرف ہٹ جانے

والے ہیں۔ اور ذَھَبَ عَنْ اِبْرَاھِیْمَ الرَّوْعُ۔ ابراھیمؑ سے خوف ھٹ گیا، چلا گیا اور دور ھو گیا (۱۱/۷۴) ۔ سَافَرْتُ عَنِ الْبَلَدِ ۔ میں نے شہر سے سفر کیا ۔ وھاں سے کسی دوسری جگہ گیا ۔

(۳) ''بدلے میں'' یا ''کی طرف سے'' کا مفہوم ۔ یَوْمًا لَاتَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَیْئًا (۲/۴۸) جس دن کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے بدلے میں کفایت نہیں کریگا ۔ یا اس کی طرف سے جزا (معاوضہ) نہیں دے سکیگا ۔

(۴) سبب ظاھر کرنے کے لئے (کی وجہ سے ۔ کے سبب) ۔ وَمَانَحْنُ بِتَارِکِیْ اٰلِھَتِنَا عَنْ قَوْلِکَ (۱۱/۵۳) ۔ھم تیرے کہنے کی وجہ سے اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑنے والے ۔

(۵) اوپر یا بعد کے معنوں میں ۔ لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹) ۔ تم ایک حالت سے اوپر دوسری حالت میں جاؤ گے ۔ یا تم ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں پہنچو گے ۔

(۶) مِنْ (سے) کے معنوں میں ۔ ھُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِہٖ (۴۲/۲۵) اور وھی ھے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ھے ۔

(۷) ب ۔ (سے) کے معنوں میں ۔ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی (۵۳/۳) ۔ وہ اپنے جذبات و خیالات سے بات نہیں کرتا ۔(''ساتھ ، ذریعہ'' یا ''کی مدد سے'' کے معنوں میں بھی آتا ھے جیسے رَمَیْتُ عَنِ الْقَوْسِ یعنی رَمَیْتُ بِالْقَوْسِ ۔ میں نے کمان کے ذریعہ تیر پھینکا) ۔

(۸) فِیْ (میں) کے معنوں میں بھی آتا ھے ۔

(۹) زائد بھی ھوتا ھے (یعنی کوئی معنی نہیں دیتا) کتب لغت میں ان کی مثالیں دی ھوئی ھیں ۔

ع ن ب

اَلْعِنَبُ ۔ (واحد ، عِنَبَةٌ)۔ انگور ۔ یہ انگور کے پھل اور اس کی بیل کے لئے بھی بولا جاتا ھے*۔ اَعْنَابٌ (۲/۲۶۶)۔ عِنَبٌ کی جمع ھے ۔ اَلْعِنَبُ ۔ (انگور کی) شراب* ۔

*تاج و راغب ۔

ع ن ت

اَلْعَنَتُوْتُ ۔ وہ ٹیلہ جس پر چڑھنا دشوار ہو۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں مشقت ، توڑ پھوڑ اور تکلیف کا مفہوم ہے اور اس میں سہولت ، آرام اور درستی کا مفہوم نہیں ہے ۔ چنانچہ اس میں کمزوری اور شکستگی کے معنے بھی ہیں اور دشواری اور مشقت کے بھی* ۔ عَنِتَ الْعَظْمُ ۔ ہڈی کمزور ہو کر ٹوٹ گئی ۔ عَنِتَتْ یَدُہٗ ۔ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا ۔ اور عَنَّتَہٗ کے معنی ہیں اس نے اسے مشکل میں ڈالا یا اس کے ذمہ ایسا کام لگا دیا جس کا کرنا اس کے لئے سخت دشوار ہوا* ۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ اِعْنَاتٌ کے معنی ہیں کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف کرنا* ۔ صاحب مفردات نے لکھا ہے کہ مُعَانَتَۃٌ کے معنی تقریباً مُعَانَدَۃٌ کے ہیں یعنی مسلسل عداوت و کشمکش کے ، لیکن معانَتَۃٌ بلیغ تر ہے کیونکہ اس میں خوف و ہلاکت کا پہلو بھی ہوتا ہے ۔ چنانچہ عَنَتَ فُلَانٌ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص ایسے معاملہ میں پھنس جائے جس میں ہلاکت کا ڈر ہو** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مشقت اور دشواری وغیرہ کے ہوتے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے لَاَعْنَتَکُمْ (۲/۲۲۰) ۔ تم مشقت میں پڑ جاتے یا ہلاک ہو جاتے ۔ دوسری جگہ ہے وَدُّوْا مَاعَنِتُّمْ (۳/۱۱۷) وہ دل سے چاہتے ہیں کہ تم خطرناک مصیبت یا ہلاکت میں پڑ جاؤ ۔ سورۃ نساء میں جنسی اختلاط کے احکام کے ضمن میں فرمایا ۔ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ (۴/۲۵) ۔ یہ احکام اس کے لئے ہیں جو ہلاکت میں پڑنے سے ڈرتا ہے ۔ عَنَتٌ ایک جامع لفظ ہے جس کے معنوں میں فساد ۔ گناہ ۔ ہلاکت ۔ غلطی ۔ لغزش ۔ ظلم و زیادتی نیز سخت مشقت اور دشواری کا مقابلہ کرنا شامل ہیں* ۔

ع ن د

عَنَدَ (نون پر تینوں حرکتوں کے ساتھ) ۔ عُنُوْدًا ۔ عَنَدًا ۔ عَنِ الطَّرِیْقِ ۔ وہ راستہ سے دور ہو گیا ۔ ہٹ گیا ۔ الگ ہو گیا ۔ منحرف ہو گیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں حد سے آگے بڑھ جانے اور صحیح راستہ کو چھوڑ دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے ۔ عَنَدَتِ النَّاقَۃُ ۔ اونٹنی باقی اونٹوں سے الگ ہٹ کر تنہا چرتی رہی ۔ عَنَدَ الرَّجُلُ ۔ آدمی نے سرکشی کی اور

---

*تاج ۔ **راغب ۔

جان بوجھ کر حق کو رد کر دیا اور اس کی مخالفت کی۔ ایسا شخص عَنِیْدٌ کہلائیگا۔ اَلْعَانِیدُ۔ وہ اونٹ جو راستہ سے ھٹ جائے۔ اَلْمُعَانَدَۃُ وَالعِنَادُ۔ الگ ھو جانا۔ مسلسل مخالفت کرنا۔ عَنَدَ الرَّجُلُ عَنْ اَصْحَابِہٖ۔ اس نے سفر میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیا، یا ان سے پیچھے رہ گیا۔ عَانِدَۃُ الطَّرِیْقِ۔ وہ راستہ جو سیدھے راستے سے ایک طرف کو ھٹا ھؤا ھو۔ اَلْعَنَدُ۔ آڑے آ جانا۔ حائل ھوجانا*۔

سورۃ مدثر میں ھے اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا (۷۴/۱۶)۔ وہ ھمارے قوانین سے سرکشی اختیار کرتا تھا۔ سورۃ ابراھیم میں ھے۔ وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۱۴/۱۵) ھر مستبد اور سرکش تباہ و برباد ھو گیا۔

عِنْدَ (ظرف)

عِنْدَ۔ ظرف ھے، بمعنی پاس۔ قریب۔ نزدیک۔ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ (۴۳/۸۵)۔ علم الساعت خدا کے پاس ھے۔ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (۳/۷۸)۔ خدا کی طرف سے۔ اللہ کے پاس سے۔ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ (۶/۵۸) ان سے کہو کہ جس کے لئے تم جلدی مچا رھے ھو وہ اگر میرے پاس ھوتا تو۔ . . . . . .

ع ن ق

ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا بڑھنا اور پھیلنا بتائے ھیں، خواہ وہ اونچائی میں ھو یا زمین پر پھیلنا ھو۔ اَلْعُنُقُ (جمع اَعْنَاقٌ) گردن*۔ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ (۸/۱۲)۔ ان کی گردنوں کے اوپر (یعنی سروں پر) مارو۔ نیز اس کے معنی جماعت کثیر ھیں۔ الاَعْنَاقُ پیش پیش رھنے والے آدمی، نیز رؤسائے قوم کو بھی کہتے ھیں*۔ فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ (۲۶/۴)۔ ان کے اکابرین قوم عاجز و درماندہ ھوکر اس کے سامنے جھک جائیں۔ اکابرین کو ھمارے ھاں بھی ''گردن فراز'' کہتے ھیں۔

ع ن ک ب

اَلْعَنْکَبُوْتُ۔ مکڑی*۔ قرآن کریم نے مشرکین کے مسلک کو تارِ عنکبوت سے تشبیہ دی ھے (۲۹/۴۱) جو ذرا سے تنکے یا انگلی کے اشارے سے درھم برھم ھو جاتی ھے۔ یہ مسلک، دلیل و برھان اور علم و بصیرت کے

*تاج۔

بجائے توہم پرستی اور جہالت پر قائم ہوتا ہے، اس لئے علم و فکر کی ذرا سی جنبش اسے پارہ پارہ کر دیتی ہے ۔ شرک کا عملی مفہوم ہے کائنات میں ایک سے زیادہ ہستیوں کو صاحب اقتدار تسلیم کرنا اور یہ سمجھنا کہ یہاں ایک سے زیادہ قوانین نافذ ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام کائنات میں قانون صرف ایک خدا کا رائج ہے ۔ اس لئے انسانوں کی دنیا میں بھی صرف خدائے واحد کا قانون نافذ ہونا چاہئے ۔ یہ توحید ہے اور نہایت محکم نظریۂ حیات ۔ اس کے خلاف ہر نظریۂ زندگی ، تارِ عنکبوت ہے ۔

ع ن و

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا نہایت توجہ اور شدید خواہش سے ارادہ کرنا ۔ (۲) عاجزی ۔ (۳) کسی چیز کا ظاہر ہونا اور نکلنا ۔ عاجزی کے اعتبار سے اَلْعَنْوُ ۔ اَلْعَنَاءُ کے معنی ہیں قید ہوجانا ۔ مطیع و فرمانبردار ہو جانا ۔ اَلْعَنْوَۃُ ۔ قہر اور زبردستی ۔ صاحب تاج العروس کے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ عَنْوَۃٌ کے معنی کسی چیز کو زبردستی لے لینے کے ہیں ۔ لیکن ابن سیدہ نے اس کے معنی محبت کے بھی بتائے ہیں ۔ اس صورت میں یہ لفظ اضداد میں سے ہو جاتا ہے جو قہر و جبر کے علاوہ تسلیم و اطاعت کے معنوں میں بھی آئے گا* ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ عَنَا الشَّیْءَ کے معنی ہیں اس نے اس شے کو ظاہر کر دیا** ۔ عَنَتِ الْاَرْضُ بِالنَّبَاتِ تَعْنُو ۔ زمین نے پودے نمودار کئے* ۔

قرآن کریم میں ہے وَ عَنَتِ الْوُجُوْہُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ (۲۰/۱۱۱) ۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی جھک جانے کے کئے ہیں اور بعض نے کھڑے ہو جانے اور کام کرنے کے* ۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ نظام خداوندی کے قیام کے لئے بطیب خاطر کھڑے ہو جائیں گے اور قوانین الٰہیہ کی اطاعت دل کے پورے جھکاؤ سے کرینگے ۔ اس میں قانون کا غلبہ و قوت ، اور قانون ماننے والوں کی تسلیم و اطاعت ، دونوں پہلو آجاتے ہیں ۔ بلکہ '' ظاہر ہو جانے '' کے اعتبار سے یہ بھی کہ لوگوں کی مضمر صلاحیتیں اس مقصد کی تکمیل کے لئے ابھر کر سامنے آجائینگی ۔

ع ھ د

عَہِدَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں کسی چیز کی مسلسل حفاظت اور خبر گیری کرنا ۔ اس کی پیہم نگہداشت کرنا ۔ ان بنیادی معنوں کی رو سے عَہْدٌ کا

*تاج ۔ **محیط ۔

استعمال اس پختہ وعدہ کے لئے بھی ہونے لگا جس کی نگہداشت ضروری ہو* ۔ جب اس لفظ کے بعد اِلٰی آئے تو اس کے معنی حکم کرنے کے ہوجاتے ہیں**۔ جیسے عَہِدْنَا اِلٰی اِبْرَاہِیْمَ (۲/۱۲۵) ۔ ہم نے ابراہیم کو حکم دیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اِلٰی کے ساتھ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کو اس بات کی ہدایت کرنا جس کی نگہداشت اس پر واجب کی جائے ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی سے عہد و پیمان لیکر اسے اس کے ایفاء کی تاکید کرنا ۔ ذمہ داری اور امان کو بھی عَہْدٌ کہتے ہیں** ۔ جیسے لَا یَنَالُ عَہْدِی الظّٰلِمِیْنَ (۲/۱۲۴) ۔ جو ہمارے قانون سے سرکش ہو جائے اس کے بارے میں ہماری یہ ذمہ داری پوری نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اَوْفُوْا بِعَہْدِیْ اُوْفِ بِعَہْدِکُمْ (۲/۴۰) کے معنی ہیں تم اپنے اس عہد کو پورا کرو جو تم نے میرے ساتھ استوار کر رکھا ہے ، اور میں ان ذمہ داریوں کو پورا کرونگا جو میں نے تمہاری بابت لے رکھی ہیں ۔ عَہْدٌ وفاداری کو بھی کہتے ہیں ** ۔ وَ مَا وَجَدْنَا لِاَکْثَرِھِمْ مِنْ عَہْدٍ (۷/۱۰۲) ۔ ہم نے ان میں سے اکثر کو وفا شعار ، یعنی اپنے عہد کا پابند ، نہیں پایا۔ عُہْدَۃٌ کے معنی بھی ذمہ داری کے آتے ہیں** ۔ والیوں اور حکام کے لئے جو شاہی فرامین لکھے جاتے ہیں انہیں عَہْدٌ کہتے ہیں ۔ نیز عَہْدٌ کے معنی جان پہچان یا ملاقات کے بھی آتے ہیں۔ عَہِدَ الشَّیْءَ چیز کو پہچان لیا** ۔

ع ہ ن

اَلْعِہْنُ ۔ رنگین اون ۔ مختلف رنگوں سے رنگی ہوئی اون ۔ اَلْمُہْنَۃُ ۔ شاخ کا مڑجانا اور ٹوٹ جانا یا بغیر جدا ہوئے ٹوٹ جانا ۔

اَلْعَاہِنُ ۔ فقیر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ شکستہ حال ہوتا ہے ۔ نیز اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے اعضاء ڈھیلے ڈھالے ہوں*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نرمی اور سہولت کے ہیں ۔ چنانچہ قَضِیْبٌ عَاہِنٌ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس میں خمیدگی اور شکستگی ہو ۔

قرآن کریم میں ہے وَ تَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِہْنِ (۷۰/۹) ۔ پہاڑ رنگین (یا مختلف رنگوں والی) اون کی طرح ہوجائینگے۔ دوسری جگہ اَلْعِہْنِ الْمَنْفُوْشِ (۱۰۱/۵) آیا ہے ۔ دھنی ہوئی رنگین اون ۔ ٹکڑے ٹکڑے کی ہوئی مختلف رنگوں والی اون ۔ ان کی خستگی اور شکستگی کی طرف اشارہ ہے ۔

*محیط ۔ **تاج ۔ ***تاج و راغب ۔

ع و ج

عَوِجَ - يَعْوَجُ - ٹیڑھا ہونا - العِوَجُ فِی الْاَرْضِ - زمین کا ناہموار ہونا - عَاجَ عَنْہُ - اس سے لوٹ گیا - پلٹ گیا ، باز آیا *- مَا اَعُوْجُ بِکَلَامِہٖ - میں اسکی بات کی طرف ملتفت نہیں ہوتا ہوں - اِنْعَاجَ عَلَیْہِ - وہ اسکی طرف مڑ گیا **- راغب نے لکھا ہے کہ اَلْعَوَجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو آنکھ سے دیکھا جا سکے اور اَلْعِوَجُ اس ٹیڑھے پن اور ناہمواری کو جو عقل و بصیرت سے دیکھی جاسکے ، جیسے معاشرہ کی ناہمواریاں اور نظام زندگی کا ٹیڑھا پن***- ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْعَوَجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو سیدھی اور کھڑی چیز (مثلاً دیوار یا لکڑی وغیرہ) میں ہو - اور اَلْعِوَجُ اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو بچھی ہوئی چیز یا کسی معاملہ میں ہو -

سورہ کہف میں قرآن کریم کے متعلق ہے وَلَمْ یَجْعَلْ لَہٗ عِوَجاً (۱۸/۱) یہ ایسا ضابطہ زندگی ہے جس میں کہیں پیچ و خم نہیں - اس کے مقابلہ میں قَیِّماً آیا ہے (۱۸/۲) - اس کے مخالفین کے متعلق کہا کہ یَبْغُوْنَہَا عِوَجاً (۷/۴۵) - وہ چاہتے ہیں کہ اس کے راستہ میں ناہمواریاں اور خمیدگیاں پیدا ہو جائیں - لیکن جب وہ انقلاب آئیگا جسکی طرف قرآن کریم دعوت دیتا ہے تو ان بڑے بڑے لوگوں کی خود اپنی خمیدگیاں اور ناہمواریاں صاف کر دی جائینگی - ان کے بل نکل جائینگے - (۲۰/۱۰۵-۱۰۷) - یہ اسوقت اس داعی کے پیچھے پیچھے چلیں گے جس کی دعوت میں کوئی ٹیڑھا پن نہیں (۲۰/۱۰۸)-

قرآن کریم جس صراط مستقیم کیطرف راہ نمائی کرتا ہے اس میں کوئی پیچ و خم نہیں - وہ بالکل صاف اور سیدھا راستہ ہے - لیکن مفاد پرست گروہ اس میں خواہ مخواہ پیچیدگیاں پیدا کرنا چاہتا ہے -

ع و د

اَلْعَوْدُ - لوٹنا - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اَلْعَوْدُ کسی کام کو ابتداءً کرنے کے بعد دوبارہ کرنا ہوتا ہے - لیکن راغب اور زمخشری کی تحقیق ہے کہ یہ لفظ ابتداءً (پہلی مرتبہ) کسی کام کے کرنے پر بھی بولا جاتا ہے *- چنانچہ صاحب محیط نے بھی اسکی تائید کی ہے اور شہادت میں حضرت شعیبؑ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے مخالفین سے کہا کہ قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰہِ کَذِباً اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِکُمْ (۷/۸۹) -

*تاج - **محیط - ***راغب -

''اگر ہم نے تمہارے مسلک کو اختیار کر لیا تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہم نے خدا کے خلاف جھوٹا اتہام باندھا''۔ اسمیں عُدْنَا کے معنی ان کی ملت میں دوبارہ جانا نہیں، کیونکہ حضرت شعیبؑ ان کی ملت (مذہب) پر کبھی تھے ہی نہیں۔ اسلئے اسکے معنی یہ ہیں کہ ہم تمہارے مشرب کو کبھی قبول نہیں کریں گے *۔ لیکن اس آیت میں ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ اس میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ جواب جماعت (حضرت) شعیبؑ کیطرف سے ہے اور اس میں خود حضرت شعیبؑ شامل نہیں اگرچہ جواب انہی (حضرت شعیبؑ) کے الفاظ میں ہے۔ یعنی ان کا یہ جواب ان کی جماعت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اگر یہ مفہوم لیا جائے تو پھر عُدْنَا کے معنی پلٹ کر واپس جانا ہونگے کیونکہ حضرت شعیبؑ کے ساتھی، پہلے ان مخالفین ہی کا مسلک رکھتے تھے۔

صاحب تاج العروس نے یہ بھی لکھا ہے کہ عاد کے معنی ویسے تو پلٹنے کے ہیں، لیکن بعد میں صَارَ کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے۔ یعنی ''ہو گیا''۔ عام اس کے کہ وہ پہلے بھی ویسا تھا یا نہیں۔

سورہ مجادلہ میں ہے۔ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا (۵۸/۳) پھر وہ اپنی کہی ہوئی بات کی طرف پلٹتے ہیں۔ عَائِدٌ۔ لوٹ جانے والا، اسکی جمع عَائِدُوْنَ ہے (۴۴/۱۵)۔ أَعَادَ۔ يُعِيْدُ (۸۵/۱۳)۔ لوٹانا۔ نیز اسکے معنی منزل مقصود تک پہنچانے کے بھی ہوسکتے ہیں کیونکہ مَعَادٌ کے معنی ٹھکانا یا انجام ** نیز آخری مقام کے بھی ہیں۔ سورہ قصص میں ہے لَرَآدُّكَ إِلٰى مَعَادٍ (۲۸/۸۵)۔ اسکے معنی (لوٹنے کی جگہ کے اعتبار سے) یہ کئے جاتے ہیں کہ آپ (نبی اکرمؐ) پھر اسی مکہ میں داخل ہونگے جہاں سے کفار نے آپکو نکالا تھا۔ اسکے معنی وطن اور جائے پیدائش کے بھی لئے جاتے ہیں ***۔ لیکن اگر اس میں مَعَادٌ کے معنی منزل مقصود کے لئے جائیں تو وطن یا جائے پیدائش کی بہ نسبت ''منزل مقصود'' زیادہ مناسب ہونگے، اس لئے کہ ایک نبی، وطن کی نسبتوں سے بلند ہوتا ہے، اور وہ فضا جو اس کے مشن کے لئے زیادہ مساعد ہو اس کا وطن بن جاتی ہے۔ لہذا آپ کا مکہ کیطرف لوٹنا اپنے وطن کی طرف مراجعت نہ تھی بلکہ آپؐ کے مشن کی تکمیل تھی۔ بہرحال یہ واضح ہے کہ يُعِيْدُ سے مراد تکرار نہیں (یعنی بار بار لوٹانا نہیں) بلکہ ہر شے کو مختلف گردشیں دے کر (مختلف مراحل سے گزار کر)

*تاج و محیط۔ ** غریب القرآن۔ مرزا ابوالفضل۔ *** تاج۔

اسکی ابتدا سے آخری نقطہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ ایسا کرنے والے کو رَبّ
کہتے ہیں۔ اس ضمن میں (ر۔ج۔ع) کا عنوان بھی دیکھئے۔

اَلْعَائِدَۃُ کے معنی احسان اور سلوک، مہربانی اور منفعت کے ہیں*۔
چنانچہ کہتے ہیں هٰذَا الْاَمْرُ اَعْوَدُ عَلَيْكَ۔ یہ کام تمہارے لئے
زیادہ منفعت بخش ہے۔ نیز یہ کہ فُلَانٌ مَا يُبْدِئُ وَمَا يُعِيْدُ۔ فلاں
آدمی کے پاس کوئی حیلہ اور تدبیر نہیں ہے۔ نہ وہ پہلی مرتبہ کوئی کام
کر سکتا ہے نہ اسکی تکرار کر سکتا ہے*۔ اَلْمُعِيْدُ اسے کہتے ہیں
جو اسکام کی طاقت رکھے جسکا وہ عادی ہو چکا ہے۔ دراصل مُعِيْدٌ اس
نر اونٹ کو کہتے ہیں جو بار بار جفتی کھانے پر بھی تھکنے والا نہ ہو۔
نیز معاملات سے واقف اور تجربہ کار آدمی کو بھی کہتے ہیں*۔ اَعَادَ
لِلْاَمْرِ۔ اسکام کی طاقت رکھی**۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ (۸۵/۱۳) میں تکرار اور
اعادہ ہی مراد نہیں بلکہ پوری قوت اور طاقت، تدبیر اور واقفیت سے
آخری نقطہ (انجام) تک پہنچانا بھی مراد ہے۔ یہ ہے ہر شے کا مَعَادٌ۔
(مَبْدَأٌ اور مَعَادٌ کیلئے دیکھئے عنوان ب۔د۔أ)۔ اَلْعِيْدُ۔ وہ
وقت جسمیں خوشی یا غم لوٹ کر آئے*۔ [العُوْدُ۔ ہر پتلی اور
باریک لکڑی کو کہتے ہیں۔ نیز اس لکڑی کو بھی جس سے دھونی
دی جائے] ***۔

ع و ذ

عَائِذٌ۔ ہر وہ مادہ جس نے حال ہی میں بچہ دیا ہو۔ اسکی جمع
عُوْذٌ ہے***۔ عَاذَتْ بِوَلَدِهَا کے معنی ہیں مادہ کا اپنے بچہ کے پاس
کھڑے رہنا اور اسکی حفاظت کرتے رہنا جبتک وہ چھوٹا رہے*۔ اَلْمُعَوَّذُ
اونٹوں کی اس چراگاہ کو کہتے ہیں جو مکانات کے آس پاس ہو (تاکہ اونٹ
ہر وقت نگاہ میں رہیں)۔ ان معانی کے اعتبار سے تَعَوَّذَ اور اِسْتَعَاذَ کے
معنی ہوتے ہیں کسی کی پناہ لینا۔ اسکی حفاظت میں محفوظ ہو جانا، اور
عَاذَ بِالشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کے ساتھ چمٹے رہنا۔ یعنی اسے لازم
پکڑ لینا۔ مستقل طور پر اختیار کر لینا****۔

یوں تو نظام خداوندی قائم کرنے والی جماعت کو ہمیشہ اپنے نظام
کی حفاظت کیلئے قوانین خداوندی کی تائید و نصرت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن

* تاج۔ ** محیط۔ *** ابن فارس۔ **** تاج و محیط۔

اس نظام کے قیام کی ابتدائی منازل میں، جبکہ انکی اپنی قوت ہنوز کم اور مخالفین کی مخالفت شدید تر ہوتی ہے، انہیں ان قوانین کے ذریعے اپنی حفاظت و پرورش کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے (جیسے ایک نوزائیدہ بچے کو شروع شروع میں اپنی ماں کی حفاظت و پرورش کی ہر وقت ضرورت ہوتی ہے)۔ یہ ہے وہ مرحلہ جسمیں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳/۱)۔ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۱۴/۱)۔ کی تعلیم دی گئی ہے۔ یعنی ہر وقت قوانین خداوندی اور نظام کے ساتھ چمٹے رہنا۔ اس سے ذرا دور نہ ہٹنا۔ ذرا سے خطرے اور آہٹ کے وقت جھٹ سے اسکے آغوش میں آجانا اور اسطرح مخالفین کی سرکش قوتوں سے محفوظ ہو جانا۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ قرآنی نظام کے قیام کی ابتدائی منازل میں تعوّذ کی ضرورت خاص طور پر زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ قیام نظام کے بعد تعوّذ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قرآن کریم سے دور لے جانے والے میلانات و جذبات اور طاغوتی قوتوں سے پناہ جوئی کی ضرورت تو زندگی کے ہر سانس میں رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نظام کے ابتدائی ایام میں چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے لئے بھی مرکز کیطرف رجوع کرنا پڑتا ہے لیکن جب ایک طرف حقائق واضح ہو جائیں اور دوسری طرف نظام محکم ہو جائے، تو پھر چھوٹے چھوٹے خطرات کا مقابلہ ازخود ہوتا جاتا ہے۔

سورہ نحل میں ہے فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (۱۶/۹۸)۔ اس کے عام معنی یہ کئے جاتے ہیں کہ جب تم قرآن کریم پڑھنے لگو تو پہلے اعوذ پڑھ لیا کرو۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم سے متمسک رہنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے سرکش جذبات کے اثرات اور مستبد قوتوں کا آلۂ کار بننے سے محفوظ رہے۔ چنانچہ اسکی تشریح اگلی آیت میں یہ کہکر کر دی گئی کہ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۱۶/۹۹)۔ شیطان (یا ان سرکش قوتوں) کا غلبہ ان لوگوں پر کبھی نہیں ہو سکتا جو ایمان رکھتے ہیں اور قوانین خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ تھا جس کے ذریعے حضرت موسٰیؑ نے فرعون کے استبداد سے حفاظت حاصل کی تھی جب کہا تھا کہ اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ (۴۰/۲۷)۔ میں ہر متکبر (کے استبداد سے بچنے کے لئے) اپنے اور تمہارے نشو و نما دینے والے کی حفاظت میں جاتا ہوں۔

یہ ہے تَعَوُّذ کا قرآنی مفہوم - یعنی خطرے کے وقت اپنے نظام سے اور زیادہ شدت سے متمسک ہو جانا اور قوانین خداوندی کی اور زیادہ پابندی سے اطاعت کرنا - اس کے برعکس ہمارے ہاں تَعَوُّذ سے مقصود صرف اتنا رہ گیا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے اَعُوْذُ پڑھ لیا جائے ، یا قرآن کریم کی آیات کے تَعْوِیْذ لکھکر گلے میں ڈال لئے جائیں - (ذرا تَعْوِیْذ کے مفہوم پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے ؟) - یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت (پڑھنا) ضروری ہے (تاکہ اسے سمجھا جائے اور سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے) اور جسطرح ہر عبد مومن ہر کام کی ابتدا خدا کے تصور سے کرتا ہے اسی طرح ، قرآن کریم کی تلاوت کا آغاز بھی غیر خدائی قوتوں سے حفاظت خداوندی (تَعَوُّذ) کے احساس سے کیا جائے (اور اس کے لئے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کے الفاظ کہ لئے جائیں تو یہ انسان کے جذبات کے اظہار کا طریق ہو جائیگا) - لیکن یہ سمجھ لینا کہ مقصود صرف ان الفاظ کا دہرا لینا ہے ، ٹھیک نہیں - الفاظ ، اظہار مقصد کا ذریعہ ہیں - مقصود بالذات نہیں - اعوذ اور بسم اللہ درحقیقت قرآن کریم کی اس بنیادی تعلیم کا اعلان ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶) - جو شخص ہر غیر خدائی قوت سے انکار کرے اور صرف خدا کے قوانین کو تسلیم کرے ، تو اس نے ایک ایسا محکم سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا -

ع و ر

اَلْعَوَرُ - ایک آنکھ کی بینائی کا جاتے رہنا - اَعْوَرُ - کانا - نیز کوّے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ عربوں میں کانا اور کوا دونوں منحوس شمار کئے جاتے تھے - اسی سے کمزور ، بزدل اور گاؤدی آدمی کو بھی کہتے ہیں جس سے کبھی کوئی بھلائی کا کام نہ ہو سکتا ہو - نیز وہ راستہ بتانے والا جسے خود بھی راستہ اچھی طرح معلوم نہ ہو - اَلْاَعْوَرُ مِنَ الْکُتُبِ - مٹی ہوئی کتاب - اَلْاَعْوَرُ مِنَ الطُّرُقِ - وہ راستہ جس پر کوئی نشان نہ ہو - اَلْعَائِرُ - ہر وہ چیز جو آنکھ کو تکلیف دے - اَلْعَوْرَةُ - ملک کی سرحد میں اس قسم کا خلل جہاں سے دشمنوں کے حملہ آور ہونے کا اندیشہ ہو - صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ عَوْرَةُ الْقَوْمِ اس مقام کو کہا جاتا ہے جہاں سے کسی قوم کو دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ ہو -

چنانچہ سورۃ احزاب میں جو ھے کہ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَۃٌ (۳۳/۱۳) ۔ تو اس کے یہی معنی ھیں ۔ ابن فارس نے بھی لکھا ھے کہ اَلْعَوْرَۃُ ھر اس چیز کو کہتے ھیں جس کے خالی ھونے کی وجہ سے اس کی نگہداشت ضروری ھو ۔ اَعْوَرَ الشَّیْیُٔ ۔ کسی چیز کا اس طرح نمایاں ھو جانا کہ دوسرا اس پر حملہ کرسکے ۔ ان معانی کے اعتبار سے اَلْعَوْرَۃُ ھر اس شے کو کہتے ھیں جس میں کوئی ایسا خلل یا نقص ھو جس سے خوف کا امکان ھو ۔ نیز ھر وہ شے جس سے شرم و حیا کی جائے ۔ جو باعث عار ھو ۔ عورت یا مرد کے مقامِ ستر کو بھی کہتے ھیں* ۔

قرآن کریم میں عَوْرَاتِ النِّسَآءِ (۲۴/۳۱) آیا ھے جس کے معنی ھیں عورتوں کی جنسیات (Sex) کے متعلق باتیں جنہیں عام طور پر پوشیدہ رکھا جاتا ھے ۔ دوسرے مقام پر ھے کہ صبح کی نماز سے پہلے ۔ عشا کی نماز کے بعد ۔ اور دوپہر کے وقت جب تم کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹتے ھو ثَلٰثُ عَوْرَاتٍ لَّکُمْ (۲۴/۵۸) ۔ یہ تین ایسے اوقات ھیں جن میں تم کپڑے اتار کر بلا تکلف لیٹتے ھو ۔ تمہارا پورا پورا ستر نہیں ھوتا ۔ مطلب (Privacy) سے ھے ۔

ع و ق

اَلْعَوْقُ ۔ روک دینا ۔ لوٹا دینا ۔ واپس کر دینا ۔ نیز وہ آدمی جس میں کوئی بھلائی نہ ھو ۔ نیز وہ جو لوگوں کو بھلے کاموں سے روکے ۔ عَاقَنِیْ عَنِ الْاَمْرِ الَّذِیْ اَرَدْتُ ۔ اس نے مجھے اس کام سے روک دیا جس کا میں نے ارادہ کیا تھا ۔ اَلتَّعْوِیْقُ ۔ روکنا ۔ مُعَوِّقٌ ۔ روکنے والا* ۔ قرآن کریم میں اَلْمُعَوِّقِیْنَ (۳۳/۱۸) آیا ھے ۔ عَوَائِقُ الدَّھْرِ ۔ وہ حوادثِ زمانہ جو انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیں اور انہیں دوسری مصروفیتوں سے روک دیں* ۔

یَعُوْقُ ۔ قبیلہ کنانہ کے بت کا نام تھا ۔ بعض نے کہا ھے کہ یہ قوم نوح کے بت کا نام تھا* ۔ (۷۱/۲۳) ۔

ع و ل

اَلْعَوْلُ ۔ ھر وہ چیز جو انسان کو گرانبار کردے ۔ جس کے بوجھ تلے وہ دب جائے** ۔ عَالَ الشَّیْیُٔ فُلَانًا ۔ فلاں پر وہ چیز غالب آگئی اور اس پر بوجھ بن گئی جس کی وجہ سے وہ فکر مند ھوگیا ۔ اَلْعِیَالُ ۔ وہ افراد جن کے اخراجات کا انسان ذمہ دار ھو ۔ جن کے بوجھ کے نیچے وہ دبا ھوا ھو ۔ اسی سے

*تاج و محیط و راغب ۔ **راغب ۔

أَعَالَ الرَّجُلُ کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ وہ آدمی کثیر العیال ہو گیا اور یہ بھی کہ وہ فقیر اور محتاج ہو گیا ۔ عَالَ الْمِیْزَانُ کے معنی ہیں ترازو میں کان ہوئی (یعنی اس میں پاسنگ کی ضرورت ہو گئی) اور اس کے پلڑوں کا وزن برابر نہ رہا ۔ یہاں سے اس کے معنی بے انصافی کرنے کے آتے ہیں- عَالَ فِی الْحُکْمِ ۔ اس نے فیصلہ کرنے میں ظلم کیا* ۔

سورۃ نساء میں جہاں معاشرہ کی ہنگامی حالت میں اجتماعی مشکل کے حل کے لئے ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی گئی ہے اس کے ساتھ ہی کہا گیا ہے کہ اگر تم سمجھو کہ ان میں عدل نہیں کرسکوگے تو ایک ہی بیوی رکھو ۔ اس کے بعد ہے ذَالِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا (۳/۴) ۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ یہ اس لئے کہا گیا ہے کہ تم حق سے نہ ہٹ جاؤ ۔ اور دوسرے معنی یہ کہ تم کثیر العیال ہو کر بوجھ کے نیچے نہ دب جاؤ** ۔

(نوٹ ۔ ع ۔ ی ۔ ل کا عنوان بھی دیکھئے)۔

ع و م

اَلْعَوْمُ ۔ تیرنا ۔ اَلسَّبْحُ پانی کے اوپر تیرنے کو کہتے ہیں جس میں آدمی غوطہ نہ کھائے اور اَلْعَوْمُ اس تیرنے کو کہتے ہیں جس میں آدمی پانی کے نیچے بھی چلا جائے ۔ اَلْعَامَةُ ۔ چھوٹی سی کشتی کو کہتے ہیں جس پر دریا عبور کیا جائے ۔ اَلْعَوَّامُ ۔ سبک رفتار گھوڑا** ۔

قرآن کریم میں اجرام فلکی کے متعلق ہے کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (۳۳/۲۱) ۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیرتا پھر رہا ہے ۔ اسی تیرنے کی جہت سے اَلْعَامُ کے معنی سال ہوئے ۔ یعنی وہ مدت جس میں ''آفتاب'' تیر کر اپنا دورہ پورا کرلیتا ہے*** ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْعَامُ اور اَلسَّنَةُ میں فرق یہ ہے کہ اَلسَّنَةُ کا لفظ اکثر اس سال پر بولا جاتا ہے جس میں قحط سالی ہو اور اَلْعَامُ اس سال کے لئے جس میں فراخی اور فارغ البالی ہو** ۔ لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں ۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلسَّنَةُ شمسی سال کے لئے بولا جاتا ہے اور اَلْعَامُ عربی مہینوں (قمری سال) کے لئے ۔ اس لئے اَلْعَامُ ، سَنَةٌ کے مقابلہ میں چھوٹا ہوتا ہے** ۔

سورۃ عنکبوت میں حضرت نوحؑ کے متعلق ہے فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا (۱۴/۲۹) ۔ اس میں سَنَةٌ اور عَامٌ دونوں آگئے ہیں ۔

*تاج نیز کتاب الاشتقاق ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔

راغب کی توجیہ کے مطابق سَنَۃٌ سختیوں کا دور ہے اور عَامٌ خوشحالی کا زمانہ* ۔ (اس کی مزید تشریح کے لئے عنوان س ۔ ن ۔ و (ہ) بھی دیکھئے) ۔

ع و ن

عَوْنٌ کے معنی ہیں مدد نیز مددگار** ۔ عَوَانٌ ادھیڑ کو کہتے ہیں ۔ یعنی جو جوانی اور کبرسنی کے درمیان ہو* ۔ (جیسے قرآن کریم میں ہے لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَالِكَ ۔ وہ سانڈ (یا گائے) نہ بوڑھا ہے نہ نوجوان ، بلکہ ان کے بین بین عَوَانٌ ہے ۔ یعنی ادھیڑ عمر کا ۔ (۲/۶۸) ۔ مُتَعَاوِنَۃٌ ۔ اُس عورت کو کہتے ہیں جو اگرچہ عمر میں زیادہ ہو لیکن اس کی جسمانی ساخت میں اعتدال ہو اور جسم ایسا بھرا ہوا ہو کہ نیچے کی ہڈیاں نظر نہ آئیں* ۔ یعنی اس میں نہ بچپن کا الھڑ پن ہو ۔ نہ جوانی کی تیزی اور تلون ۔ اور نہ ہی بڑھاپے کی کمزوریاں ہوں ۔ بلکہ اس میں درمیانی عمر کی پختگی آچکی ہو یہ تو اسکی ذہنی حالت ہو ، اور جسمانی ساخت میں اعتدال اور بھراؤ ہو ۔

اِسْتَعَانَ (۱/۴) کے معنی ہیں اپنی ذات کے لئے اعتدال کی خواہش کرنا اور اس مقصد کے لئے کسی کی مدد طلب کرنا ۔ اسی نہج سے اللہ کو اَلْمُسْتَعَانُ (۲۱/۱۱۲) کہا گیا ہے ۔ اَعَانَ (۱۸/۹۵) کے معنے ہیں کسیکی مدد کرنا ۔ اور تَعَاوَنَ (۵/۲) کے معنیٰ ہیں ایک دوسرے کی مدد کرنا ۔

اِسْتَعَانَ کے ان معانی کو پیش نظر رکھئے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں ۔ اس سے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (۱/۴) کا مفہوم واضح ہوجائیگا ۔ یعنی ہم اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو قانون خداوندی کی متعین کردہ راہ میں صرف کرتے ہیں ۔ ان قوانین کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں ۔ (دیکھئے ع ۔ ب ۔ د) اور انہی کے ذریعے اپنی صلاحیتوں اور ذات میں اعتدال چاہتے ہیں ۔ اس قسم کا اعتدال کہ اس میں پختگی اور حسن دونوں صحیح صحیح توازن و تناسب لئے ہوں ۔ ان دونوں آرزؤں سے ایسا دائرہ بن جاتا ہے جس میں ساری زندگی ایک نہج پر چلتی ہے ۔ یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت سے اپنی مضمر صلاحیتوں میں اعتدال پیدا کرنا ۔ اور ان صلاحیتوں کو قوانین خداوندی ہی کے مطابق صرف کرنا تاکہ ان سے کائنات کے حسن میں اضافہ ہو اور عالمگیر انسانیت صحیح اعتدال کی روش اختیار کرسکے ۔ آپ نے اس کا اندازہ کرلیا ہوگا کہ اس میں اطاعت اور اطاعت کے ساتھ استقامت

*تاج ۔ **محیط ۔

دونوں شرطیں آجاتی ہیں ۔ اسی کے لئے کہا گیا ہے کہ وَ اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ (۲/۴۵) ۔ صلٰوۃ اور استقامت کے ذریعے اپنی صلاحیتوں میں اعتدال اور پختگی طلب کرو ۔ یہی طریق تمہارا معین و مددگار ہوسکتا ہے۔ اس سے خدا کی معاونت حاصل ہوتی ہے ۔

نیز جہاں برّ و تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کی تاکید کی گئی ہے، وہاں تعاون سے بھی یہی مراد ہے ۔ یعنے کسی شخص میں جن امور کی کمی وہ گئی ہو، اس کمی کو پورا کرنے میں اس کی مدد کرنا تاکہ اس کا اعتدال برقرار ہو جائے اور اس کی خامی پختگی سے بدل جائے ۔

ع ی ب

اَلْعَیْبُ ۔ نقص ۔ برائی ۔ خرابی ۔ عَابَ الشَّیْءُ ۔ وہ شے عیب دار ہو گئی ۔ عِبْتُہٗ ۔ میں نے اسے عیب دار بنا دیا ۔ یا میں نے اس میں عیب نکالا * ۔ سورہ کہف میں ہے فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِیْبَهَا (۱۸/۷۹) ۔ میں نے چاہا کہ اسے عیب دار بنا دوں۔

اَلْعَیْبَةُ مِنَ الرَّجُلِ ۔ آدمی کے راز کی جگہ ۔ اَلْعِیَابُ ۔ سینے اور قلوب ۔ دھنیے کی وہ لکڑی جسے تانت پر مار کر وہ روئی دھنتا ہے * ۔ (اس سے نکتہ چینی اور عیب جوئی کا مفہوم ابھر کر سامنے آجاتا ہے ۔)

ع ی ر

اَلْعَیْرُ ۔ گدھا ۔ اَلْعِیْرُ ۔ قافلہ ۔ اونٹ جو غذائی سامان لاد کر لاتے ہیں ۔ وہ جانور جن پر غذائی سامان لاد کر لایا جاتا ہے خواہ وہ اونٹ یا گدھے ہوں یا خچر* ۔ سورہ یوسف میں ہے اَیَّتُهَا الْعِیْرُ (۱۲/۷۰) ۔ اے قافلہ والو! ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں ۔ (۱) کسی چیز کا ابھرا اور اوپر کو نکلا ہوا ہونا ۔ اور (۲) آنا جانا ۔ آمدو رفت ۔ اَلْعَیْرُ ابھری ہوئی ہڈی کو کہتے ہیں ۔ مثلاً شانے کے وسط کی ہڈی ۔ پاؤں کے پشت پر ابھری ہوئی ہڈی ۔ اسی سے بوجھ لادنے والے جانوروں کو اس لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ اور آمد و رفت کی جہت سے قافلہ کو۔

عیسیٰ (علیہ السلام)

عیسیٰ ۔ جوہری کا خیال ہے کہ یہ عبرانی یا سریانی لفظ ہے ۔ لیث کا خیال ہے کہ یہ ایشوع سے معدول ہے * ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ عَیْسُوْ کی

* تاج ۔

بگڑی ہوئی شکل ہو۔ راغب کا خیال ہے کہ اگر یہ لفظ عربی الاصل ہے تو ہو سکتا ہے کہ یہ اَلْعِيْسُ سے ماخوذ ہو جس کے معنی ایسے سفید اونٹ ہیں جنکی سفیدی میں قدرے سیاہی کی آمیزش ہو**۔ لیکن تاج نے کہا ہے کہ جنکی سفیدی میں قدرے بھورا پن ملا ہوا ہو*۔ قرآن کریم میں یہ لفظ حضرت مسیح ؑ کے نام کے لئے آیا ہے (۳/۵۲)۔ دوسرے مقام پر آپ کو اَلْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ (۴/۳) بھی کہا گیا ہے۔ آپ انبیائے بنی اسرائیل کے سلسلۃ الذھب کی آخری کڑی ہیں۔ جب قوم بنی اسرائیل کے انفرادی اور اجتماعی جرائم اپنی انتہا تک پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان میں بطور اتمام حجت، حضرت عیسیٰ ؑ کو مبعوث کیا۔ آپ نے انہیں اس آسمانی انقلاب کیطرف دعوت دی جو حضرت نوح ؑ سے لیکر آخر تک تمام انبیائے کرام پیش کرتے چلے آرہے تھے۔ یعنی ملوکیت۔ پیشوائیت۔ سرمایہ داری کی لعنتوں کو مٹا کر معاشرہ کو قوانین خداوندی کے مطابق متشکل کرنے کے لئے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوت (مفاد پرست اور غلط بیں) یہودی پیشواؤں کے بھی خلاف جاتی تھی اور رومی سلطنت کے بھی خلاف۔ چنانچہ انہوں نے ملکر سازش کی اور چاہا کہ حضرت عیسیٰ ؑ کو جرم بغاوت میں صلیب کی سزا دے دی جائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس تدبیر کو ناکام کر دیا اور حضرت عیسیٰ ؑ ان کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے پہلے ہی ہجرت کرکے کسی اور مقام کی طرف تشریف لے گئے۔

جب یہودی اپنی اس تدبیر میں ناکام رہ گئے تو انہوں نے دوسری چال چلی۔ پال ایک متشدد یہودی تھا۔ اس نے مذہب عیسوی اختیار کیا اور رفتہ رفتہ سینٹ کے درجے پر پہنچ گیا***۔ اس کے بعد اس نے بتدریج اس دین کے بجائے جو حضرت عیسیٰ ؑ نے پیش کیا تھا ایک نیا مذہب پیش کر دیا جس میں ابنیت مسیح۔ الوہیت مسیح۔ کفارہ کا عقیدہ۔ خانقاہیت کا مسلک، عیسائیت کے بنیادی عناصر قرار پا گئے۔ قرآن کریم نے آکر ایکطرف ان اتہامات اور الزامات کی تردید کی جو یہودی حضرت مریم ؑ اور حضرت مسیح ؑ کی طرف منسوب کرتے تھے اور دوسری طرف ان تمام باطل عقائد کی تکذیب کی جنہیں سینٹ پال (اور اس کے متبعین نے وضع کرکے) عیسائیت کا نقاب اڑھا رکھا تھا۔ تاریخی حقائق سے جوں جوں پردے اٹھتے جاتے ہیں****یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ کی زندگی اور تعلیم کے متعلق جو کچھ یہودی

---

* تاج۔ ** راغب۔ ***عیسائیت میں سینٹ مرنے کے بعد بنتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ سینٹ بنتا وہی ہے جو اپنی زندگی میں اس مقام تک پہنچ چکا ہو۔

**** حال ہی میں، بحر میت کے قریب غاروں سے جو قدیم دستاویزیں ملی ہیں وہ بھی اصلی حقیقت پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

اور عیسائی مانتے چلے آرہے تھے (اور اب بھی مان رہے ہیں) وہ غلط ہے اور صحیح پوزیشن وہی ہے جسے قرآن کریم نے پیش کیا ہے (تفصیل ان تمام امور کی میری کتاب "شعلۂ مستور" میں ملیگی)۔

ع ی ش

عَاشَ - يَعِيْشُ - عَيْشًا - مَعَاشًا - مَعِيْشَةً - اس نے زندگی گزاردی - اَلْعَيْشُ - زندگی - زندگی گزارنا - چونکہ روٹی کے بغیر زندگی نہیں گزاری جاسکتی اسلئے آجکل اَلْعَيْشُ روٹی کو بھی کہتے ہیں - اَلْمَعِيْشَةُ - کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جن پر زندگی بسر کیجاتی ہے - سامان زیست*- (جمع مَعَايِشُ) قرآن کریم میں اَرْضٌ کے متعلق ہے وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (۷/۱۰ و ۱۵/۲۰) اس میں تمہارے لئے سامان زندگی پیدا کیا - لہذا ہمارے دور میں جن چیزوں کو وسائل پیداوار (Means of Production) کہتے ہیں وہ سب اَرْضٌ کے اندر آجاتی ہیں - (دیکھئے عنوان ارض) - اَلْمَعَاشُ - اسباب زندگی کے تلاش کرنے کا موقع* - وَ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (۷۸/۱۱) - عِيْشَةٌ - زندگی - طریقۂ بود و ماند - فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۶۹/۲۱) - تو اس کا طریق زندگی قوانین خداوندی سے ہم آہنگ ہے - یا ایسا ہے جس سے وہ خوش ہے -

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ آدم جس جنت میں تھا اس میں سامان زیست (روٹی - کپڑا - مکان وغیرہ) بڑی فراوانی سے ملتا تھا اور اسکے لئے اسے جگرپاش مشقتوں سے نہیں گزرنا پڑتا تھا (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) - یہ انسان کی قدیمی زندگی تھی جس میں افراد کے باہمی مفاد میں تصادم نہیں ہوتا تھا - اس کے بعد اس نے تمدن و معاشرت کی زندگی شروع کردی جس میں سامان زیست کے حصول کے لئے باہمی مقابلہ شروع ہوگیا اور انسان مشقتوں میں پڑگیا - اس کا علاج یہ بتایا گیا کہ جو ضابطۂ قوانین خدا کی طرف سے ملے اس کا اتباع کرو - اس سے رزق کی فراوانی ہو جائیگی (۲۰/۱۲۳) اس کے بعد ہے وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (۲۰/۱۲۴) - اور جو قوم ہمارے اس ضابطۂ قوانین سے اعراض برتیگی تو اس کی معشیت تنگ ہو جائیگی - وَ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴) - اور ہم اسے قیامت میں بھی اندھا اٹھائینگے -

کسقدر واضح ہے قرآن کریم کا یہ فیصلہ کہ جو قوم خدا کے قانون کے خلاف زندگی بسر کرتی ہے اس کی روزی تنگ ہوجاتی ہے - اسے سامان زندگی کی

*تاج -

محتاجی ہوتی ہے۔ وہ مفلس اور مفلوک الحال ہوجاتی ہے۔ اور پھر اس کی عاقبت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ لہذا دنیاوی زندگی افلاس اور محتاجی کی گذارنا اور اپنے آپ کو یہ کہکر اطمینان دے لینا کہ ہماری "روحانی ترقی" ہورہی ہے قرآن کریم کی رو سے کھلا ہوا فریب ہے۔ اس دنیا کی خوشگواریاں مومن کی زندگی کی لازمی شرط بلکہ ایمان و عمل کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اور یہاں کی محتاجی اور زبون حالی قرآن کریم کو چھوڑ دینے کی زندہ شہادت۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے انسان کی معاشی زندگی کو اس قدر اہمیت دی ہے اور اس کے لئے مکمل نظام عطا کردیا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس سے وہ تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں جن میں اس وقت پوری انسانی دنیا گرفتار ہے۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب "نظام ربوبیت" میں ملے گی)۔ نیز دیکھئے عنوان (ع - م - ی)۔

ع ی ل

اَلْعَیْلَةُ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی فاقہ اور حاجت کے ہیں۔ عَالَ۔ یَعِیْلُ۔ محتاج اور ضرورت مند ہو جانا۔ عَائِلٌ۔ ضرورت مند۔ محتاج*۔ وَ وَجَدَکَ عَائِلاً فَاَغْنٰی (۹۳/۸)۔ خدا نے تجھے ضرورت مند پایا تو تجھے اتنا دیا کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا۔ اَلْعَیْلَةُ۔ محتاجی۔ تنگ دستی (۹/۲۸)۔ اَلْعَالَةُ۔ فاقہ۔ اَلْعِیَالُ (عَیِّلٌ کی جمع ہے)۔ وہ لوگ جن کی کفالت کی جائے۔ جن کا خرچ اٹھایا جائے*۔

ع ی ن

عَیْنٌ کے بہت سے معنی آتے ہیں۔ سو سے بھی اوپر۔ اسکے اصلی معنی آنکھ کے ہیں۔ باقی سب اس سے مستعار ہیں*۔ قرآن کریم میں یہ لفظ آنکھ۔ چشمہ۔ جاری پانی کیلئے اور مَعِیْنٌ۔ سرسبز و شاداب (زمین) کے معنوں میں آیا ہے۔ مثلاً عَیْنًا (۷۶/۶) بمعنی چشمہ۔ عَلٰٓی اَعْیُنِ النَّاسِ (۲۱/۶۱) لوگوں کی آنکھوں کے سامنے۔ انکے روبرو۔ سورہ المومنون میں ہے ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیْنٍ (۲۳/۵۰)۔ ہموار اور سرسبز و شاداب زمین۔ سورہ کہف میں ہے تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ (۱۸/۸۶) یعنی جھیل یا سمندر میں۔ کَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ (۳۷/۴۵) کے معنی ہیں جاری پانی سے لبریز پیالہ۔ [مَعِیْنٌ کو اہل لغت عَیْنٌ سے بھی بتاتے ہیں

*تاج۔

اور مَتْعَنٌ سے بھی - اس لئے اسے م - ع - ن کے تحت بھی لکھ دیا گیا ہے -
مَاعُوْنَ کے لئے دیکھئے عنوان م - ع - ن -]

أَعْيَنُ کے معنی ہیں وہ مرد جس کی آنکھ جنگلی گائے کی آنکھ جیسی ہو* - عربوں کے ہاں ایسی آنکھ بڑی خوبصورت سمجھی جاتی تھی اسکی جمع عِيْنٌ ہے - یہ لفظ (۳۷/۴۸) میں آیا ہے - نیز (۵۲/۲۰) میں حُوْرٍ عِيْنٍ آیا ہے - (اسکے معنی کیلئے عنوان ح - و - ر دیکھئے) - عِيْنٌ - أَعْيَنُ کی بھی جمع ہے جو مذکر کے لئے بولا جاتا ہے اور عَيْنَاءُ کی بھی جو مؤنث کے لئے آتا ہے - اسی طرح حُوْرٌ بھی مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے آتا ہے -

ع ی ی

عَيَّ الرَّجُلُ بِالْاَمْرِ - آدمی کسی کام کو نہ کر سکا اور اسکے کرنے سے عاجز رہا - عَيِيَ عَنْ حُجَّتِهٖ - وہ اپنی دلیل و حجت پیش کرنے سے عاجز رہا یا اسے پختگی سے پیش نہ کر سکا - أَعْيَا عَلَيْهِ الْاَمْرُ - وہ کام اسپر دشوار ہو گیا - أَعْيَا الْمَاشِيْ - چلنے والا تھک گیا * - اَلْاِعْيَاءُ - کمزوری اور تکان جو چلنے سے پیدا ہو جائے ** - سورہ احقاف میں ہے لَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ (۴۶/۳۳) اللہ (کائنات کی) تخلیق کے بعد تھک نہیں گیا یا اسکے بنانے سے عاجز نہیں رہا - سورہ قٓ میں ہے أَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ (۵۰/۱۵) - کیا ہم پہلی تخلیق سے تھک گئے یا عاجز رہے (جو یہ لوگ خلق جدید کے متعلق شبہ میں ہیں) - اس میں ضمناً بائبل کے اس تصور کی بھی تردید کر دی گئی جس کی رو سے اس میں کہا گیا ہے کہ خدا نے چھ روز میں زمین اور آسمان پیدا کئے اور ساتویں دن تھک کر آرام کیا - (اسے یوم سبت کہا جاتا ہے جس میں یہودی کام کاج نہیں کرتے) - خدا تھکتا نہیں - نہ ہی اسے نیند یا اونگھ آتی ہے (۲/۲۵۵) -

---

* تاج - ** راغب -

غ

غ ب ر

غَبَرَ الشَّیْءُ ۔ کوئی چیز باقی رہ گئی ۔ ٹھہر گئی ۔ اَلْغَابِرُ مِنَ اللَّیْلِ ۔ رات کا بقیہ ۔ اَلْغَبَرُ وَالْغُبَارُ وَالْغَبَرَۃُ ۔ مٹی ۔ گرد و غبار ۔ اَلْغِبْرُ ۔ کینہ (جو دل میں باقی رہ جاتا ہے) * ۔ دَاھِیَۃُ الْغَبَرِ ۔ باقی رہنے والی آفت جسکے ازالہ کی کوئی شکل نہ ہو سکے * ۔ وہ مصیبت جو گذر جانے کے بعد بھی اپنا اثر چھوڑ جائے ** ۔ سورہ اعراف میں حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق ہے کَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ (۷/۸۳) ۔ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی ۔

سورہ عبس میں ہے عَلَیْھَا غَبَرَۃٌ (۸۰/۴۰) ۔ چہروں پر گردوغبار پڑا ہوگا ۔ بمقابلہ مُسْفِرَۃٌ ۔ ضَاحِکَۃٌ ۔ مُسْتَبْشِرَۃٌ (۸۰/۳۸-۳۹) ۔ یعنی درخشندہ متبسم اور نوید آمیز چہروں کے مقابلہ میں افسردہ ، غمناک اور حسرت آگیں چہرے ۔

غ ب ن

اَلْغَبْنُ ۔ کسی مشترکہ معاملہ میں اپنے ساتھی کے مفاد یا حقوق میں پوشیدہ طور پر کمی کرنا ۔ اگر یہ کمی مال میں ہو تو غَبَنَ فُلَانًا کہتے ہیں اور اگر یہ کمی رائے وغیرہ میں ہو تو غَبِنَ کہتے ہیں ۔ بعض نے کہا ہے کہ غَبْنٌ کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں اور اَلْغَبَنُ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز چھپائی جائے ** ۔ چنانچہ اَلْمَغَابِنُ بغل اور کنج ران کو کہتے ہیں ۔ غَبَنَہٗ فِی الْبَیْعِ غَبْنًا ۔ اس نے بیع میں اسے دھوکا دیا ۔ یعنی اسے چیز کم یا خراب دیدی * ۔ غَبِنَ رَأْیَہٗ ۔ اسکی ذکاوت اور فطانت کم ہو گئی *** ۔

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔

قرآن کریم نے قیامت کو یَوْمُ التَّغَابُنِ (۶۴/۹) کہا ہے ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس دن ظاہر ہو جائیگا کہ لوگوں نے جو معاملہ اپنے خدا کے ساتھ کیا تھا [یعنی اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھوں بیچ کر اسکے بدلے میں جنت لے لی - (۹/۱۱۱)] اس میں کس نے کسقدر کمی کی ہے ۔ یا اس کے معنی ہیں وہ دن جب چیزیں ان مقادیر (پیمانوں) کے خلاف ظاہر ہونگی جن کے مطابق وہ دنیا میں اندازہ لگا رہے تھے* ۔

قرآن کریم نے ظہور نتائج کے وقت کے متعلق کہا ہے کہ ہر شخص کو اپنے اعمال کا وزن معلوم ہو جائیگا اور نظر آجائیگا کہ کامیابی کے معیار تک پہنچنے کے لئے ان میں کسقدر کمی رہ گئی ہے (۱۰۱/۶-۸) ۔ اس لئے یَوْمُ التَّغَابُنِ (۶۴/۹) کے معنی ہونگے وہ وقت جب تمام لوگوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں معلوم ہو جائیگا کہ کس میں کسقدر کمی رہ گئی ہے ۔ اعمال کے وزن کی کمی درحقیقت ان صلاحیتوں کی کمی ہے جن کے پورا ہونے سے انسان زندگی کی آگلی منزل طے کرنے کے قابل ہو سکتا ہے ۔ لہذا یَوْمُ التَّغَابُنِ ۔ظہور نتائج کا وقت ہے جب ایک دوسرے کی کمی نمایاں ہو کر سامنے آجائیگی ، خواہ وہ اس دنیا میں باطل کی قوتوں سے ٹکراؤ کا وقت ہو اور خواہ اس کے بعد کی زندگی میں انسانی صلاحیتوں کی جانچ کا وقت ۔ اس زندگی میں تو قدم قدم پر تَغَابُنٌ کا مرحلہ ہوتا ہے ۔

تَغَابُنٌ کے لفظی معنی ہیں باہم غبن کرنا ۔ یعنی ایک دوسرے کے حقوق یا مال میں کمی کرنا ۔ ایک دوسرے کی تغلیط کرنا ۔ ایک دوسرے کو خفیہ طریق سے دھوکا دینا ۔ قیامت کے دن (یعنی مرنے کے بعد ظہور نتائج کے وقت) مختلف افراد یا گروہوں کا ایک دوسرے پر الزام دھرنے (ایک دوسرے کو کم عقل بتانے) کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے ، اس لئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اس اعتبار سے یَوْمُ التَّغَابُنِ کہا گیا ہو۔ البتہ وہاں ایک دوسرے کے حقوق میں کمی کرنے یا دھوکا دینے کا موقع نہیں ہوگا ۔ اس لئے ان معانی کے اعتبار سے بھی سمجھا جائیگا کہ لوگوں نے ایک دوسرے کو جو دھوکے پہلے دئے تھے ان کے نتائج وہاں سامنے آجائینگے ۔

غ ث و

اَلْغُثَاءُ ۔ جھاگ اور کوڑا کچرا ۔ وہ کوڑا کرکٹ اور بوسیدہ پتے وغیرہ جسے سیلاب بہا کر لائے ۔ گندی گلی سڑی چیز کو بھی کہتے ہیں** ۔

*راغب **تاج و محیط ۔

اور خس و خاشاک کو بھی جو کسی کام کا نہ رہے ۔ یہ ہر اس چیز کے لئے ضرب المثل ہے جو کسی موسمی کے عالم میں ضائع اور فنا ہو جائے اور اس کی کوئی پرواہ نہ کی جائے* ۔ قرآن کریم میں اس قوم کے متعلق جو مکافات عمل کی وجہ سے تباہ ہو چکی ہو کہا گیا ہے فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً (۲۳/۴۱) ۔ ہم نے انہیں خس و خاشاک بنا دیا ، اور اسطرح وہ تباہ و برباد ہو کر رہ گئے ، جیسا کہ سورہ الرعد میں ہے کہ سیلاب آتا ہے تو خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے (۱۳/۱۷)

یہ حالت تو اس قوم کی ہے جو یکسر تباہ ہو جائے ۔ لیکن ایسی قومیں بھی ہوتی ہیں جو دوسروں کی محکوم بنکر زندگی گزارتی ہیں ۔ ان کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے سیلاب کے ساتھ بہنے والا خس و خاشاک کہ وہ بالکل بے دست و پا ہوتا ہے اور اسے جسطرف سیلاب کی موجیں لے جانا چاہیں مجبوراً چلا جاتا ہے ۔

غ د ر

غَدْرٌ ۔ کسی چیز میں خلل واقع کردینا اور اسے چھوڑ دینا ۔ اَغْدَرَهٗ وَ غَادَرَهٗ ۔ اس نے اسے چھوڑ دیا** ۔ قرآن کریم میں ہے فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا (۱۸/۴۷) ۔ ہم نے ان میں سے کسی کو نہ چھوڑا ۔

اَلْغُدَرُ ۔ بڑا عہد شکن اور بے وفا ۔

اَلْغَدِيْرُ ۔ تالاب یا پانی کا وہ حصہ جسے سیلاب چھوڑ جائے ۔

اَلْغَدْرُ ۔ کسی کا ساتھ چھوڑ دینا ۔ وفا کی ضد ہے ۔ یعنی بے وفائی** ۔ چنانچہ غَدِرَتِ الشَّاةُ کے معنے ہیں بکری دوسری بکریوں سے پیچھے رہ گئی*** ۔

غ د ق

اَلْغَدَقُ ۔ بہت زیادہ ۔ وافر ۔ فراواں**** ۔ ہمہ گیر بارش***** ۔ اَغْدَقَ الْمَطَرُ ۔ بارش بہت برسی ۔ غَدِقَتِ الْاَرْضُ ۔ زمین سرسبز ہو گئی ۔ هُمْ فِیْ غَدَقٍ مِنَ الْعَيْشِ ۔ وہ لوگ آسودگی و خوش حالی کی زندگی بسر کرتے ہیں ۔ انہیں وسعتِ رزق نصیب ہے***** ۔

---

* راغب ۔ ** تاج و راغب ۔ *** ابن فارس ۔ **** راغب نیز ابن فارس ۔
*****تاج نیز کتاب الاشتقاق ۔

قرآن کریم میں ہے لَاَسْقَیْنٰھُمْ مَّاءً غَدَقًا (۷۲/۱۶) ۔ ہم انہیں رزق فراواں عطا کرتے ۔ انہیں سرسبز و شاداب زندگی بسر کراتے ۔

غ د و

اَلْغُدْوَۃُ ۔ صبح سویرے ۔ دن کا ابتدائی حصہ*** ۔ غَدَا عَلَیْہِ غُدُوًّا ۔ اسکے پاس صبح سویرے گیا* ۔ وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَھْلِکَ (۳/۱۲۰) ۔ اَلْغَدُ ۔ کل (آنے والا ۔ فردا) مستقبل کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ مَاقَدَّمَتْ لِغَدٍ (۵۹/۱۸) ۔''اس نے مستقبل کے لئے کیا کچھ آگے بھیجا ہے''۔ غَدَاءٌ ۔ دن کا کھانا ، جو صبح جلدی کھایا جائے ۔ (۱۸/۱۳) ۔

غَدَا ۔ فعل ناقص کے طور پر بھی مستعمل ہوتا ہے جس کے معنی صَارَ کے ہوتے ہیں** ۔ سورۃ اعراف میں غُدُوٌّ (غُدْوَۃٌ کی جمع) کے مقابلہ میں اٰصَالٌ آیا ہے (۷/۲۰۵) ۔ اور سورۃ انعام میں غَدَاوۃٌ کے مقابلہ میں عَشِیٌّ (۶/۵۲) ۔ یعنی صبح ۔ شام (لفظ غَدَاوۃٌ کا واؤ نہیں پڑھا جاتا ۔ نہ ہی اس پر کوئی حرکت ہوتی ہے ۔ اس کا تلفظ غَدَاۃٌ ہوگا) ۔ سورۃ سبا میں غُدُوٌّ (مصدر) کے مقابل میں رَوَاحٌ آیا ہے (۳۴/۱۲) ۔ یعنی صبح کا جانا اور شام کا آنا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی زمانہ پر دلالت کرتے ہیں ۔

غ ر ب

اَلْغَرْبُ ۔ لغت عرب میں اس لفظ کے بہت سے معانی ہیں لیکن ان میں سے ۔ (۱) مغرب (اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے غَرْبِیٌّ کہا جاتا ہے) ۔ (۲) چلے جانا ۔ (۳) علیحدہ ہو جانا ۔ زیادہ مشہور ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے کلمات کسی خاص قاعدہ اور قیاس کے ماتحت نہیں ہیں ۔ غُرُوْبُ الشَّمْسِ ۔ سورج کا غائب ہو جانا ۔ غَرَبَتِ الشَّمْسُ تَغْرُبُ ۔ سورج غروب ہوا ۔ مَغْرِبُ الشَّمْسِ نیز مَغْرِبَانُ الشَّمْسِ و مُغَیْرِبَانُھَا آفتاب غروب ہو جانے کی جگہ یا وقت* ۔ (قرآن کریم میں جہاں یہ لفظ شرق کے مقابلہ میں آیا ہے اس کے لئے دیکھئے عنوان ش ۔ ر ۔ ق) ۔

غَرَبَ فُلَانٌ غُرْبَۃً و غَرْبًا ۔ وہ شخص وطن سے دور چلا گیا* ۔ اس سے غَرِیْبٌ ۔ مسافر اور اجنبی کو کہتے ہیں اور غُرْبَۃٌ مسافری اور اجنبیت کو ۔ اسی سے اردو میں غریب الوطن بولا جاتا ہے ۔ لیکن اردو میں جو

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

''غریب'' کے معنی مفلس لئے جاتے ہیں یہ ہمارے ہاں کا اپنا استعمال ہے - عربی میں اس کے معنی مسافر اور اجنبی کے ہونگے -

غُرَابٌ کوّے کو کہتے ہیں (۵/۳۱) - اس لئے کہ وہ دور دور تک چلا جاتا ہے** - اور اس کی رنگت کی وجہ سے غِرْبِیْبٌ سیاہ کو کہتے ہیں*- قرآن کریم میں ہے غَرَابِیْبُ سُوْدٌ (۳۵/۲۷) - بہت زیادہ سیاہ - کالے بجھنگ-

سورة طٰہٰ میں طُلُوْعِ الشَّمْسِ کے مقابلہ میں غُرُوْبِہَا آیا ہے (۲۰/۱۳۰) -

غ ر ر

غَرَّہٗ - یَغُرُّہٗ - اسے فریب دیا اور بے بنیاد امیدیں دلائیں* - چنانچہ اَلْمَغْرُوْرُ اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو کسی عورت سے یہ سمجھ کر شادی کر لے کہ وہ آزاد ہے لیکن بعد میں معلوم ہو کہ وہ تو لونڈی تھی* - اسی سے غَرُوْرٌ ہر اس شخص یا چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان دھوکا کھا جائے یا جو انسان کو فریب میں مبتلا کردے - غَارَّتِ النَّاقَۃُ کے معنی ہیں اونٹنی کا دودھ کم ہوگیا حالانکہ اس کے متعلق یہ گمان نہ تھا کہ اس کا دودھ کم ہو جائیگا - گویا اونٹنی نے دھوکا دیا** - لہذا اس مادہ میں غلط امیدوں کے ساتھ فریب دینے یا فریب کھا جانے کا مفہوم ہوتا ہے - سورة آل عمران میں ہے وَ غَرَّہُمْ (۳/۲۳) - ان کی افتراء پردازی نے انہیں دھوکا دے دیا -

سورة لقمٰن میں غَرُوْرٌ (۳۱/۳۳) کے معنی دھوکا دینے والا ہیں (ہر وہ چیز جس سے انسان دھوکا کھا جائے) - اور سورة بنی اسرائیل میں غُرُوْرًا (۱۷/۶۴) کے معنی ہیں دھوکا - یا دھوکا دیتے ہوئے -

سورة انفطار میں انسان کے متعلق ہے مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ (۸۲/۶) - اس کے معنی ہیں تجھے اپنے رَبِّ کَرِیْم کے بارے میں کس بات نے دھوکا دے رکھا ہے - مغالطے میں ڈال رکھا ہے - لیکن صاحب محیط نے لکھا ہے کہ مَا غَرَّکَ بِفُلَانٍ کے معنی ہوتے ہیں تو فلاں پر کسطرح جری ہوگیا - اس کے خلاف تجھے یہ جرأت کیسے ہوگئی* - لہذا اس آیت (۸۲/۶) کے یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ تو نے جو خدا کی ربوبیت اعلیٰ کے خلاف اپنے قوانین خود بنا لئے تو تجھے کس بات نے اس قدر جرأت دلادی؟

*تاج - **راغب -

اَلْغَرُّ ۔ کپڑے کی تہ کو کہتے ہیں ۔ اَلْغُرَّۃُ ۔ ہر چیز کا بہترین حصہ ۔ سفیدی* ۔ (قرآن کریم میں یہ الفاظ استعمال نہیں ہوئے) ۔

غ ر ف

اَلْغَرْفَۃُ ۔ ایک مرتبہ (چُلّو سے) پانی نکالنا ۔ اَلْغِرْفَۃُ ۔ چُلّو میں پانی لینے کا انداز یا نوعیت و حالت ۔ اَلْغُرْفَۃُ ۔ (چُلّو سے) جو کچھ نکالا جائے ۔ (اسکی جمع اَلْغِرَافُ ہے) ۔ اِغْتَرَفَ الْمَاءَ بِیَدِہٖ (۲۴۹) ۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے پانی نکالا ۔ نَاقَۃٌ غَارِفَۃٌ ۔ تیز رفتار اونٹنی ۔ اَلْغَرَّافُ ۔ ایسی ندی جس میں بکثرت پانی ہو ۔ اَلْغُرْفَۃُ ۔ (جمع غُرَفٌ وَغُرُفَاتٌ) اوپر کا کمرہ ۔ بالا خانہ**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے مختلف معانی کسی قاعدے اور قیاس کے تحت نہیں آتے ۔

سورۂ فرقان میں مومنین کے متعلق ہے اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَۃَ بِمَا صَبَرُوا ($\frac{۲۵}{۷۵}$) ۔ انہیں ان کی استقامت کے بدلہ میں اَلْغُرْفَۃُ دیا جائیگا ۔ اس میں فراوانی اور بلندی سب کچھ آگیا ۔ یعنی بلندیاں ۔ روانیاں ۔ فراوانیاں (نیز $\frac{۲۹}{۵۸}$ ؛ $\frac{۳۲}{۳۷}$ ؛ $\frac{۳۹}{۲۰}$) ۔ مصاف زندگی میں آگے آگے بڑھتے جانا اور ارتقائی منازل کا حسن و خوبی سے طے کرنا ۔ آپ غور کیجئے کہ اس ایک جامع لفظ سے قرآن کریم نے کیا کچھ بیان کر دیا ہے ۔ سامانِ زیست کی فراوانیاں ۔ سرفرازیاں ۔ زندگی کی جوئے رواں کا یہاں (دنیا) سے وہاں (آخرت) تک مسلسل آگے بڑھتے، اور سطح زندگی کا بلند ہوتے چلے جانا ۔

غ ر ق

غَرِقَ ۔ یَغْرَقُ ۔ غَرَقًا ۔ پانی میں تہ نشین ہو جانا ۔ بعض نے کہا ہے کہ غَرَقٌ کے اصلی معنی ناک کے راستہ اتنا پانی بھر جانا ہیں جس سے دم گھٹ جائے اور اس طرح انسان مرجائے ۔ لیکن (جیسا کہ ابن فارس نے کہا ہے) اس مادہ کے اصلی معنی کسی چیز میں اس کے آخری حصہ اور انتہا تک پہنچ جانے کے ہیں ۔ مثلاً اَلْغَرِقَۃُ اُس زمین کو کہتے ہیں جو انتہائی سیراب ہو ۔ اَغْرَقَ النَّازِعُ فِی الْقَوْسِ کے معنی ہیں کمان کھینچنے والے نے کمان کو اس کی آخری حد تک کھینچا ۔ اِغْرَاقٌ کہتے ہیں کمان کو پوری طاقت سے آخری حد تک کھینچ دینا ۔ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ($\frac{۷۹}{۱}$) ۔ میں غَرْقًا در اصل اِغْرَاقًا کی جگہ استعمال ہوا ہے**۔ یعنی آخری حد تک کھینچتے ہوئے ۔

---

*ابن فارس ۔ **تاج ۔

اَغْرَقَهُ اُسے ڈبو دیا * ۔ سورۃ یونس میں فرعون کے متعلق ہے اِذَا اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ (۱۰/۹۰) "جب اسے غرقابی نے آ لیا" ۔ یہاں غَرَقٌ کے معنی پانی میں ڈوبنے کے ہیں ۔ ڈبونے کے لئے سورۃ اعراف میں ہے فَاَغْرَقْنٰهُمْ (۷/۱۳۶) ۔ سو ہم نے انہیں غرق کردیا ۔ ڈبوئے ہوئے کو مُغْرَقٌ کہینگے ۔ اس کی جمع مُغْرَقُوْنَ اور مُغْرَقِیْنَ ہے (۴۴/۲۴)۔

غ ر م

اَلْغُرْمِیْلُ ۔ گراں بار عورت ۔ اَلْغَرَامُ ۔ دائمی شر ۔ سختی اور مصیبت ۔ وہ شدید مصیبت جو انسان کا پیچھا نہ چھوڑے اور اس سے نجات حاصل کرنا مشکل ہو جائے ۔ اَلْغُرْمُ ۔ تاوان ۔ جرمانہ ۔ بیگار کی چٹی جس کا ادا کرنا ضروری ہو ۔ مفت کا جرمانہ ۔ ایسی مصیبت جس سے چھٹکارا نہ ہو ۔ اَلْغَرِیْمُ ۔ مقروض اور قرض خواہ دونوں کے لئے آتا ہے ۔ مقروض تو اس لئے کہ وہ قرض کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہوتا ہے ۔ اور قرض خواہ اس لئے کہ اَلْمُغْرَمُ ، اسیرِ محبت کو کہتے ہیں جو محبوب کے پیچھے پیچھے پھرتا رہے** ۔ قرضخواہ کو اسی طرح مقروض کے پیچھے پیچھے پھرنا پڑتا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ساتھ ساتھ لگے رہنے اور چمٹے رہنے کے ہیں۔

قرآن کریم میں اَلْغَارِمِیْنَ (۹/۶۰) آیا ہے ۔ اس کے معنی مقروض کے بھی ہو سکتے ہیں اور مصیبت زدہ کے بھی ، نیز وہ جس پر تاوان پڑ گیا ہو یا ویسے ہی کوئی نقصان ہوگیا ہو ۔ کیونکہ غَرِمَ فِی التِّجَارَةِ کے معنی ہوئے ہیں تجارت میں نقصان ہوا ۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر مَغْرَمًا (۹/۹۸) ۔ آیا ہے جس کے معنی مفت کا تاوان یا جرمانہ ہیں ۔ سورۃ واقعہ میں ہے اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ (۵۶/۶۶) ۔ ہم پر مفت میں تاوان پڑ گیا ۔ سورۃ فرقان میں عذاب جہنم کے متعلق ہے اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (۲۵/۶۵) ۔ اس کا عذاب ایسا ہے جو ہر وقت پیچھے لگا رہے گا ۔ جس سے نجات حاصل کرنا مشکل ہوگا ۔

غ ر و

غِرَاءٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو دوسری چیز کے ساتھ چمٹا دیا جائے (مثلاً لئی ۔ سریش وغیرہ)*** ۔ اسی سے اِغْرَاءٌ کے معنی ہیں کسی کو کسی کے پیچھے لگا دینا ۔ اَغْرَی الْكَلْبَ بِالصَّیْدِ ۔ کتے کو شکار کے پیچھے لگا دیا * ۔ لہذا اس کے معنی کسی کے ساتھ یا پیچھے

*تاج ۔ ** تاج و محیط ۔ ***راغب ۔

لگا دینے کے آتے ہیں۔ سورۃ مائدہ میں ہے فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَۃَ (۵/۱۴)۔ ہم نے ان کے درمیان عداوت کو لازم کر دیا، پیوست کر دیا۔ اَغْرَاہُ بِہٖ۔ اسے کسی چیز کا دلدادہ و شیفتہ بنانا، اس پر ابھارنا اور اکسانا، شوق دلانا**۔ اسے کسی کے پیچھے لگا دینا، لپکا دینا*۔ یہ ان تمام معانی کے لئے آئے گا۔ سورۃ احزاب میں ہے لَنُغْرِیَنَّکَ بِهِمْ (۳۳/۶۰)۔ ہم تجھے ان کے خلاف اٹھا کھڑا کریں گے۔ انہیں سزا دینے کے لئے تجھے ان کے پیچھے لگا دیں گے۔

غ ز ل

غَزْلٌ۔ روئی وغیرہ کاتنا۔ غَزْلٌ کاتا ہوا سوت***۔ قرآن کریم میں ہے نَقَضَتْ غَزْلَهَا (۱۶/۹۲)۔ جس نے اپنے کاتے ہوئے سوت کے بل کھول دئے، اسے ادھیڑ دیا۔ اَلْغَزَلُ۔ عورتوں سے دلبستگی کی باتیں کرنا۔ اَلْغَزَالُ ہرنوٹا (یا عرنوٹی یعنی ہرنی کا بچہ) جبکہ وہ حرکت کرنے اور چلنے پھرنے لگے۔ اَلْغَزَالَۃُ۔ آفتاب کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی کرنوں کسو (سوت کی طرح) روئے زمین پر بکھیرتا ہے***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ تینوں اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں اور تینوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

سورۃ نحل میں ہے وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّۃٍ اَنْکَاثًا (۱۶/۹۲)۔ دیکھنا! کہیں تمہاری مثال اس عورت کی سی نہ ہو جائے جو نہایت محنت و مشقت سے سوت کاتتی ہے اور اس کے بعد اسے خود ہی ادھیڑ دیتی ہے۔ غور کیجئے، (وحی کے مقابلہ میں) عقل کے تجرباتی طریق کا نقشہ کس حسن و خوبی سے کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے۔ عقل ایک نظریہ کو لیتی ہے۔ ساری دنیا میں ڈنکا بج جاتا ہے کہ اس نظریہ میں انسانیت کی مشکلوں کا حل پا لیا گیا ہے۔ وہ اس پر تجربہ کرتی ہے۔ اس میں بےانتہا توانائی صرف ہوتی ہے۔ وقت لگتا ہے۔ کتنے انسان قربانی دیتے ہیں۔ کتنے مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ اس میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ اس پر یہی عقل اپنے کئے کرائے کو خود اپنے ہاتھوں سے برباد کر دیتی ہے اور ایک اور نظریہ پر عمل کرنا شروع کر دیتی ہے۔ (Trial and Error) کے اسی تجرباتی طریق سے وہ ہزاروں برس میں جا کر کہیں کسی صحیح نتیجہ پر پہنچتی ہے۔ انسانی ترقی کی ساری تاریخ اسی ''ادھیڑ بن'' کی صبر آزما داستان ہے۔ اس کے برعکس وحی براہ راست

*تاج۔ **محیط۔ ***تاج و محیط۔

حقیقت کو سامنے لے آتی ہے اور انسان کو ان تمام جانکاہ مراحل سے بچالیتی ہے جن میں سے اسے عقل کے تجرباتی طریق کے ذریعے گذرنا ناگزیر تھا ۔ وحی اور عقل میں یہی فرق ہے ۔ اقبال کے الفاظ میں ۔

ہر دو امیر کارواں ، ہر دو بہ منزلے رواں
عقل بہ حیلہ می برد ۔ عشق برد کشاں کشاں

غ ز و

غَزَاہُ ۔ غَزْوًا ۔ اس کا ارادہ کیا ۔ اس کا قصد کیا ۔ اسے طلب کیا ۔ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ یعنی قصد اور طلب ۔ غَزْوِیْ کَذَا ۔ میرا مقصد اس طرح کا ہے* ۔ مَغْزَی الْکَلَامِ ۔ بات کا مقصد اور مطلب* ۔ اسکے بعد اس سے مراد دشمن کے خلاف جنگ کے قصد کے ہو گئے ۔ غَزَا الْعَدُوَّ ۔ وہ دشمن سے جنگ کرنے کے ارادے سے نکلا* ۔

آپ نے دیکھا کہ غَزْوٌ میں مقصد و ارادہ کے ساتھ جنگ کا مفہوم شامل ہے ۔ جماعت مومنین کا قصد اور ارادہ : قوانین خداوندی کے تابع ہوتا ہے اس لئے ان کے غزوات دنیا سے ظلم و استبداد مٹانے کے لئے ہونگے ، نہ کہ کمزوروں کو ستانے اور لوٹنے کی خاطر ۔

سورۃ آل عمران میں ہے اَوْ کَانُوْا غُزًّی (۳/۱۵۵) ۔ یا وہ جنگ میں شامل ہوں ۔ جنگ کر رہے ہوں ۔

غ س ق

اَلْغَسَقُ ۔ ابتدائے شب کی تاریکی* ۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی سخت تاریکی کے ہیں** ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی تاریکی بتائے ہیں* ۔ قرآن کریم میں ہے اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ (۱۷/۷۸) ۔ یعنی (شروع) رات کی تاریکی تک ۔ اَلْغَاسِقُ ۔ چاند جبکہ وہ گہن لگ کر سیاہ ہو جائے ۔ تاریک رات* ۔ قرآن کریم میں ہے مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (۱۱۳/۳) ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد رات کے وقت پیش آنے والی مصیبت یا حادثہ کے ہیں ۔ جیسے طَارِقٌ رات کے وقت آنے والے کو کہتے ہیں** ۔ نیز غَاسِقٌ کے معنی ٹھنڈے کے ہوتے ہیں ۔ چنانچہ رات

---

* تاج ۔ ** راغب ۔

کو غاسِق* اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ دن سے نسبتاً ٹھنڈی ہوتی ہے *۔
غَسَّاق*۔ نہایت ٹھنڈی چیز۔ جس کی ٹھنڈ جلا دے۔ چنانچہ سورہ النّبا میں جہنم کے متعلق ہے کہ اس میں حَمِیْماً وَ غَسَّاقاً (۷۸/۲۵) ہوگا۔ اس میں غَسَّاق* کے معنی شدید ٹھنڈے کے ہیں۔ جسکی ٹھنڈ سُن کرکے رکھدے۔ یعنی جہنم میں شدت کی گرمی اور شدت کی ٹھنڈ ہے۔ یہ دونوں نشو و نما کے لئے ہلاکت کا موجب ہوتی ہیں۔ کھیتی کو جسطرح گرمی جھلسا دیتی ہے اسی طرح اسے پالا بھی مار دیتا ہے۔ نشو و نما کے لئے ضروری سامان، اور اس کے استعمال میں تناسب، دونوں لازمی ہوتے ہیں۔ پانی سے کھیتی پروان چڑھتی ہے لیکن یہی پانی جب زیادہ دیدیا جائے تو وہ گل سڑ جاتی ہے۔ ہوا سے درخت لہلہاتے ہیں لیکن جب یہی ہوا جھکّڑ بن جائے تو وہ جڑوں سے اکھڑ جاتے ہیں۔ پودوں کی نشو و نما کے لئے حرارت ناگزیر ہے لیکن یہی حرارت جب تیز ہو جائے تو انہیں جھلسا دیتی ہے۔ لہذا جہنم، سامان نشو و نما سے محرومی ہی کا نام نہیں۔ سامان کی فراوانی کے ساتھ اگر صحیح صحیح توازن و تناسب نہ ہو تو اس کا نتیجہ بھی وہی ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر۔ ہم سامان سے محروم ہیں، مغرب والے اعتدال سے محروم۔ یہاں فالج ہے، وہاں سرسام۔ جہنم بہرحال دونوں جگہ ہے۔ سامان زیست کی فراوانی اور اس کی تقسیم اور استعمال میں صحیح صحیح تناسب، یہ دونوں خدا کے نظام ربوبیت سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس سے یہ دنیا جنت بنتی ہے۔ جنتِ اُخروی میں بھی یہی کیفیت ہوگی۔

غ س ل

غَسَلَ۔ دھونا، پانی بہا کر کسی چیز کو میل کچیل سے پاک کرنا *۔ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ (۵/۶) اپنے چہروں کو دھوؤ۔ اِغْتَسَلَ۔ غسل کرنا *۔ (۴/۴۳)۔ مُغْتَسَلٌ*۔ وہ جگہ جہاں نہایا جائے یا وہ پانی جس سے نہایا جائے **۔ (۳۸/۴۲)۔

سورہ الحاقہ میں اہل جہنم کے متعلق ہے وَلَا طَعَامٌ* اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ (۶۹/۳۶)۔ اس کے عام معنی کئے جاتے ہیں، دھوون یا غسالہ۔ یا وہ پانی جس سے زخم دھویا گیا ہو۔ لیکن قاموس میں ہے کہ اس کے معنی ہیں انتہائی گرم ***۔ (اس کے مفہوم کے لئے غ۔ س۔ ق کا عنوان بھی دیکھئے)

* تاج۔ ** راغب۔ *** بحوالہ غریب القرآن مرزا ابوالفضل۔

غ ش ی (و)

غَشِيَ کے معنی کسی چیز کو (پوری طرح سے) ڈھانپ لینا یا اس پر (بالکلیہ) چھا جانا ہیں ۔ غِشَاوَۃٌ اس پردے کو کہتے ہیں جو کسی کو ڈھانپ دے اور اس پر چھا جائے (۲/۷) ۔ غَاشِیَۃٌ اس جھلی کو کہتے ہیں جو دل پر بطور غلاف چڑھی ہوتی ہے ۔ ایسے ہی اس چمڑے کو بھی کہتے ہیں جو تلوار کے نیام پر مڑھ دیا جاتا ہے ۔ غُشِيَ عَلَیْہِ ۔ اسوقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی بیہوش ہو جائے کیونکہ اسوقت اس کے ہوش و حواس بالکل مستور ہو جاتے ہیں ۔ غَشِيَ فُلَانًا کے معنی ہیں وہ شخص فلاں آدمی کے پاس آیا ۔ اور غَشِیَہَا اور تَغَشّٰہَا کے معنی عورت سے مجامعت کرنے کے آتے ہیں کیونکہ اس حالت میں مرد اسے ڈھانپ لیتا ہے*۔سورۃ اعراف میں ہے تَغَشّٰہَا (۷/۱۸۹) ۔ سورہ نوح میں ہے وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَہُمْ (۷۱/۷) انہوں نے اپنے دلوں کو ڈھانپ لیا ۔ انہیں غلافوں میں بند کر لیا ۔

قرآن کریم میں غِشَاوَۃٌ (۲/۷) کے معنی پردہ ہیں ۔ اور غَشِيَ کے معنی ڈھانپ لینا (۸/۳۴) ۔ سورہ اعراف میں مِہَادٌ (بچھونے) کے مقابل میں غَوَاشٍ کا لفظ آیا ہے (۷/۴۱) جس کے معنی اوڑھنے کے ہونگے ۔ اَلْغَاشِیَۃُ (۸۸/۱) ہر طرف سے چھا جانے والی مصیبت ۔ یعنی اعمال کے ان نتائج کا ظہور جو انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں [جیسے وَاللّٰہُ مُحِیْطٌ بِالْکَافِرِیْنَ کہا گیا ہے ۔ (۲/۱۹) یعنی خدا کا قانون مکافات کفار کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے ۔ یا اِنَّ جَہَنَّمَ لَمُحِیْطَۃٌ بِالْکٰفِرِیْنَ (۹/۴۹)۔ جہنم کفار کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے] ۔

غ ص ب

غَصَبَہٗ ۔ یَغْصِبُہٗ ۔ غَصْبًا ۔ کسی سے کوئی چیز ظلماً و قہراً چھین لینا ۔ اصل میں غَصَبَ الْجِلْدَ کے معنی ہوتے ہیں کھال پر سے بالوں کو یا اون کو نوچ نوچ کر اتارنا **۔ (اسی لئے اس میں نوچنے اور کھسوٹنے کا پہلو ہوتا ہے) ۔ غَصَبَ الرَّجُلُ الْمَرْاَۃَ ۔ مرد نے اس عورت کے ساتھ زبردستی زنا کیا ***۔

سورہ کہف میں ہے ۔ یَاْخُذُ کُلَّ سَفِیْنَۃٍ غَصْبًا (۱۸/۷۹) ۔ وہ (بادشاہ) ہر ایک کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا ۔ انسانوں کے خود ساختہ نظام

* تاج ۔ نیز ابن فارس ۔ ** تاج ۔ *** محیط ۔

حکومت میں ہوتا ہی یہ ہے کہ طاقتور، کمزوروں کے وسائل رزق کو زبردستی چھین لیتے ہیں ۔ خدا کا نظام اس لئے آتا ہے کہ کمزوروں پر کسی قسم کا ظلم اور استبداد نہ ہونے پائے اور غصب و سلب (Exploitation) کا دور دورہ ختم ہو جائے ۔

غ ص ص

اَلْغُصَّةُ ۔ کھانے کی چیز کا حلق میں پھنس کر رہ جانا ۔ (پینے کی چیز کے اٹک جانے کو شَرَقٌ کہتے ہیں اور ہڈی وغیرہ کے اٹک جانے کو شَجًا۔ لیکن بیشتر یہ فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا*) ۔ غصہ کی وجہ سے بھی گلے کے بند ہو جانے کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے**۔ اَغَصَّ فُلَانٌ عَلَيْنَا الْاَرْضَ ۔ فلاں آدمی نے ہم پر زمین کو تنگ کر دیا ۔ فَغَصَّتْ بِنَا ۔ چنانچہ زمین ہم پر تنگ ہو گئی * ۔ اَلْغُصَّةُ ۔ غم اور فکر کو بھی کہتے ہیں **۔

قرآن کریم میں جہنم کے متعلق ہے وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ (۷۳/۱۳) ۔ حلق میں اٹک جانے والا کھانا ۔ اس دنیا میں بے عزتی کی روٹی جسے انسان نہ نگل سکے نہ اُگل سکے ۔ ناجائز کمائی جس سے شرف انسانیت کا گلا گھٹ جائے، اور اُخروی زندگی میں انسان آگے بڑھنے کے قابل نہ رہے ۔ غور کیجئے ! وہی رزق جو انسانی نشو ونما کا موجب ہوتا ہے، جب گلے میں اٹک جائے تو انسان کی موت کا باعث بن جاتا ہے ۔ انسانی ذات کیلئے رزق حلال اور اکل حرام میں یہی فرق ہے ۔

غ ض ب

غَضْبٌ کے معنے شیر ہیں ۔ نیز سرخ یا ہر گہرے سرخ رنگ کی چیز* ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی شدت و قوت بتائے ہیں ۔ غَضَبٌ رضا کی ضد ہے ۔ بعض نے اس کی تعریف ''انتقامًا دل میں خون کا جوش مارنا'' کی ہے ۔ اللہ کے غضب سے مراد نافرمانی پر اس کی گرفت اور سزا ہے* ۔ کنایۃً غَضِبَتِ الْفَرَسُ عَلَى اللِّجَامِ کے معنے ہیں گھوڑے نے غصے میں آکر اپنی لگام چبائی ۔ اسی طرح آگ کے بھڑک اٹھنے پر بھی غَضَبٌ کا اطلاق ہوتا ہے۔ آنکھ کے بالائی پپوٹے پر نکلنے والا پیدائشی دانہ غَضْبَةٌ کہلاتا ہے ۔ نیز ایک جلدی بیماری جس میں سارا بدن سرخ

* تاج ۔ ** محیط۔

ہو جاتا ہے غِضَابٌ* کہلاتی ہے ۔ مَغْضُوْبٌ* اسے کہتے ہیں جسے چیچک نکل آئے یا مذکورہ بالا بیماری ہو جائے ۔ غُضَابٌ* اس شخص کو کہتے ہیں جس کی کھال موٹی اور سخت ہو ۔ غَضَابِیٌّ اسے کہتے ہیں جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ تند مزاج اور تلخ کام ہو اور مخالفین کے ساتھ سخت* ۔ اَلْغَضْبَۃُ* ۔ سخت چٹان کو کہتے ہیں اور اَلْغَضُوْبُ* بڑے سانپ کو (ابن فارس) ۔

قرآن کریم نے غَضَبٌ* کو نِعْمَۃٌ* کے مقابل میں لا کر ($\frac{1}{7}$) واضح کر دیا ہے کہ خدا کے غضب (یعنی اس کے قانون سے سرکشی اور انکار) کا نتیجہ کیا ہوتا ہے ۔ یعنی نِعْمَت کے ہر پہلو کی ضد ۔ سورۃ بقرہ میں ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَ الْمَسْکَنَۃُ کے بعد غَضَبٍ مِنَ اللّٰہِ ($\frac{2}{61}$) کہکر بتا دیا کہ ''اللہ کے غضب'' کا نتیجہ ذلت اور محتاجی ہوتا ہے ۔ دوسری جگہ اسے عَذَابٌ* مُّھِیْنٌ* ($\frac{2}{90}$) ۔ یعنی رسوا کن عذاب ، سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ سورۃ اعراف میں قوم عاد پر ''اللہ کے غضب'' کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے ۔ وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ($\frac{7}{71-72}$) یعنی ہم نے اس قوم کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جو ہمارے قوانین کی تکذیب کرتی تھی ۔

اس سے واضح ہے کہ ''خدا کے غضب'' کا نتیجہ انفرادی اور اجتماعی تباہی اور بربادی ہے ۔ اس لئے کہ اس سے خدا کے قانونِ مکافات کی بے پناہ قوت کا مظاہرہ ہوتا ہے ۔ اسے سمجھ لینا چاہئے کہ جب خدا کی طرف غَضَبٌ* کی نسبت ہوگی تو اس کا مطلب وہ ہیجانی کیفیت نہیں ہوگی جو انسان پر غصہ کی حالت میں طاری ہوتی ہے ۔ خدا ، انسانی جذبات اور ان کی پیدا کردہ کیفیات سے بہت بلند ہے ۔ اس لئے ''خدا کے غضب'' سے مراد اس کے قانون کی خلاف ورزی کے فطری نتائج ہیں ، جس طرح ''خدا کی خوشنودی'' کا مطلب اس کے قوانین کے مطابق چلنے کے خوشگوار نتائج ہیں ۔

سورۃ اعراف میں غَضْبَانَ آیا ہے ($\frac{7}{150}$)۔ یعنی غصہ میں بھرا ہوا ۔ پُر جوش ۔ اور سورۃ انبیاء میں مُغَاضِبًا آیا ہے ($\frac{21}{87}$) ۔ یعنی ناراض ہو کر ۔ لیکن یہ دونوں لفظ خدا کے متعلق نہیں ۔ پہلا حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے اور دوسرا حضرت یونسؑ کے متعلق ۔

---

*تاج ۔

غ ض ض

اَلْغَضُّ کے معنے ہیں کمی کرنا، خواہ آنکھوں سے دیکھنے میں ہو، خواہ آواز میں یا کسی برتن کی چیز میں* ۔ غَضَّ مِنْهُ یَغُضُّ ۔ اس نے اس میں سے کم کر دیا ۔ غَضَّ الْغُصْنَ ۔ اس نے شاخ کو توڑ دیا ۔ لیکن یہ اس طرح توڑنے کو کہتے ہیں کہ وہ اچھی طرح سے نہ ٹوٹے ۔ لہذا اس کے بنیادی معنوں میں جھکانا اور کم کرنا ہیں ۔ اَلْغَضِیْضُ مِنَ الطَّرْفِ ۔ وہ نگاہ جس میں پلکیں جھکی رہیں ۔ اَلْغَضُّ ۔ ایسی تر و تازہ چیز جس پر ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو ۔ اِنْغِضَاضُ الطَّرْفِ ۔ آنکھوں کا بند ہوجانا** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی روکنا اور کم کرنا لکھے ہیں، نیز تازگی و طراوت ۔

قرآن کریم میں یہ مادہ اَبْصَارٌ کے لئے (۲۴/۳۰) میں آیا ہے جہاں اس کے معنے نگاہوں کو نیچا رکھنے، یا آنکھ کو ان چیزوں کے دیکھنے سے روکنے کے ہیں جن کا دیکھنا اس کے لئے جائز نہیں*** ۔ اور صَوْتٌ کے لئے (۳۱/۱۹) میں ۔ یعنی آواز کا پست رکھنا ۔ دونوں میں سرکشی اور بے باکی کے مقابلہ میں شرافت کے جھکاؤ کا پہلو ہے ۔ جھکانا، کم کرنا، سمیٹ کر رکھنا، بے باک نہ ہونے دینا، نگاہوں کو بھی اور آواز کو بھی ۔ یہ ہوگا قرآنی معاشرہ میں عورتوں اور مردوں کا انداز ۔ نہ چلنے پھرنے میں ان کی نگاہیں بیباک اور آوارہ ہونگی، نہ بات چیت کرنے میں ان کی آواز اعتدال سے اونچی ہوگی ۔

غ ط ش

غَطَشَ ۔ یَغْطِشُ ۔ تاریک ہؤا ۔ اَغْطَشَ یُغْطِشُ ۔ تاریک کیا ۔ لَیْلٌ غَاطِشٌ ۔ اندھیری رات ۔ فَلَاۃٌ غَطْشَاءُ ۔ ایسا صحرا جس میں راستہ نہ ملتا ہو ۔ اَلْغَطَشُ فِی الْعَیْنِ ۔ آنکھ کا چندھیا پن ۔ ایسے چندھے آدمی کو اَغْطَشُ کہتے ہیں**** ۔

قرآن کریم میں ہے اَغْطَشَ لَیْلَهَا (۷۹/۲۸) ۔ اس کی رات کو اس نے تاریک کر دیا ۔

غ ط و (ی)

اَلْغِطَاءُ ۔ وہ چیز جس کے ذریعے دوسری چیز کو ڈھانپ دیا جائے ۔ ڈھکنا ۔ راغب نے کہا ہے کہ غِطَاءٌ ۔ طباق وغیرہ کی قسم کی چیز کو

*راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔ ****تاج و راغب ۔

کہتے ہیں جو بطور ڈھکنے کے کام میں لائی جائے اور غِشَاءٌ ، لباس کی قسم کی چیز کو کہتے ہیں جسے کسی دوسری چیز کے اوپر ڈال دیا جائے ۔ مصباح میں ہے کہ غِطَاءٌ پردے کو کہتے ہیں ۔ اَلْغِطَایَۃُ ۔ وہ اندرونی لباس (مثلاً بنیان وغیرہ) جس سے عورتیں اپنے جسم کو ڈھانپ کر ان کے اوپر دوسرے کپڑے پہنتی ہیں ۔ جوھری نے کہا ہے کہ جو چیز بلند ہو اور کسی دوسری چیز سے لمبائی میں اوپر آجائے تو اس کے لئے غَطَا عَلَیْہِ کہتے ہیں ۔ اسی سے غَطَتِ الشَّجَرَۃُ کے معنے ہیں درخت کی شاخیں لمبی ہوگئیں اور زمین پر پھیل گئیں ۔ غَطَا اللَّیْلُ ۔ رات تاریک ہوگئی* ۔ قرآن کریم میں لفظ غِطَاء ، پردے (جہالت) کے لئے آیا ہے ۔ کَانَتْ اَعْیُنُھُمْ فِیْ غِطَاءٍ عَنْ ذِکْرِیْ (۱۸/۱۰۱) ۔ ان کی آنکھیں میرے قوانین کیطرف سے پردے (تاریکی) میں تھیں ۔ یعنی اس کی طرف سے ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے ۔ عَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ (۲/۷) ۔ "ان کی آنکھوں پر پردہ ہے"

غ ف ر

غَفْرٌ ۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی کو ایسی چیز پہنا دینا ہے جس سے وہ غلاظت وغیرہ سے محفوظ رہے** ۔ لہذا اس میں چھپانے اور محفوظ رکھنے کا مفہوم شامل ہوتا ہے ۔ غَفْرٌ ۔ چھپانا ، پردہ ڈالنا ۔ غَفَرَ الْمَتَاعَ فِی الْوِعَاءِ ۔ سامان کو کسی برتن میں ڈال کر چھپا دینا*** (اور اسطرح اسکی حفاظت کر دینا) ۔ المِغْفَرُ وَالْغِفَارَۃُ ۔ زرہ کی طرح آہنی حلقوں سے بنی ہوئی جالی جو خود کے نیچے پہنی جاتی ہے اور جو گردن اور مونڈھوں کو ڈھانپ لیتی ہے تاکہ ان پر تلوار وغیرہ کا اثر نہ ہو اور اس کا پہننے والا حملہ آور کے وار سے محفوظ رہے ۔ اَلْغِفَارَۃُ ۔ ایک پٹی سی ہوتی ہے جسے عورتیں اسلئے سر پر باندھ لیتی ہیں کہ ان کی اوڑھنی تیل سے محفوظ رہے ۔ اس کے اوپر اَلْخِمَارُ (چادر) اوڑھتی ہیں ۔ اَلْجَمَّاءُ الْغَفِیْرُ ۔ وہ خَوْد جو سارے سر کو اپنے اندر لے لے اور اسطرح اسکی حفاظت کر دے*** ۔ اَلْغَفْرُ ۔ وَالْغُفْرَانُ ۔ ایک ہی معنی میں آتے ہیں (ابن فارس)

اس سے مَغْفِرَۃٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنی حفاظت ۔ جب کوئی قوم غلط روش اختیار کرتی ہے تو اس روش کے مضر اثرات مرتب

*تاج و راغب و محیط ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔

ہونے شروع ہو جاتے ہیں ۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اثرات اس حد تک آگے بڑھ جائیں کہ ان کی ہلاکت یقینی ہو جائے ، اگر وہ قوم اس غلط روش کو چھوڑ کر قانون خداوندی کے مطابق صحیح روش اختیار کر لیتی ہے تو اس سے اس پر دُہرے اثرات مرتب ہونے شروع ہو جاتے ہیں ۔ ایک تو اسکی سابقہ روش کے مضر اثرات سے اس کی حفاظت ہو جاتی ہے اور دوسرے ایسے زندگی کے خوشگوار نتائج ملنے شروع ہو جاتے ہیں ۔ ان نتائج کے استحکام کے لئے بھی حفاظتی پہلو کا ساتھ ساتھ رہنا نہایت ضروری ہوتا ہے ۔ یوں سمجھئے جیسے مرض کے علاج کے لئے پہلے حفاظتی تدابیر (Preventives) اور اس کے بعد اصلاحی تدابیر (Curatives) اختیار کی جاتی ہیں ۔ اسی طرح تندرست انسان کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ وہ صحت کو خراب کرنے والے مضر عناصر سے محفوظ رہے اور اسے ایسی غذا ملتی رہے جس سے اسکی نشو و نما ہوتی چلی جائے ۔ لہذا ۔

(۱) اگر غلط روش پر چلنے والی قوم کسی مقام پر پہنچکر اپنے اصلاح حال کی فکر کرکے قانون خداوندی کی طرف رجوع کرتی ہے (جسے تَوْبَةٌ کہتے ہیں ۔ دیکھئے عنوان ت ۔ و ۔ ب) تو اس سے اس کے اندر ایسی توانائی پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے جس سے وہ اپنی سابقہ غلط روش کے مضر اثرات سے محفوظ ہو جاتی ہے ۔ یہ اسکی مَغْفِرَةٌ ہے ۔ اور

(۲) قانون خداوندی کے مطابق چلنے والی قوم ان تخریبی قوتوں کی مذموم کوششوں سے محفوظ رہتی ہے جو اس کی تباہی و بربادی کی تدابیر کرتی رہتی ہیں ۔ یہ ان کی مَغْفِرَةٌ ہے ۔ اور

(۳) قوانین خداوندی کے اتباع سے اپنی ذات کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کرتے رہنا جس سے انسان تخریبی عناصر کے مضر اثرات سے محفوظ رہے ، اور اجتماعی طور پر ملت اور اس کے نظام کے استحکام کے لئے سامان حفاظت بہم پہنچاتے رہنا ، اِسْتِغْفَارٌ (مَغْفِرَت طلب کرنا) ہے ۔ چنانچہ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَلْاِسْتِغْفَارُ کے معنی ہیں قول اور عمل سے کسی فساد انگیز بات کی اصلاح کی خواہش کرنا ۔ حفاظت چاہنا ۔ اور مَغْفِرَةٌ کے معنی ہیں بندہ کی لغزشوں سے تجاوز کرکے اس سزا سے اسکو بچا لینا جس کا وہ مستحق ہو چکا ہو* ۔ اور (تاج العروس میں ہے کہ) غَفَرَ الْاَمْرَ بِغُفْرَتِهٖ کے معنی ہیں اس نے اس معاملہ کو اسطرح درست کر دیا جسطرح اسے درست کرنا چاہئے تھا** ۔

* محیط ۔ ** تاج ۔

ہمارے ہاں مَغْفِرَةٌ کے معنی لئے جاتے ہیں ''خدا کا بندے کے گناہوں کو بخش دینا'' (اللہ مغفرت کرے۔ '' یا '' خدا بخشے ''۔ ہم روز بولتے ہیں)۔ '' بخشش'' کا تصور قرآن کریم کے پیش کردہ قانون مکافاتِ عمل کے خلاف ہے۔ قانون مکافات کی رو سے انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ غلط عمل مضر نتائج پیدا کرتے ہیں اور صحیح عمل خوشگوار نتائج۔ غلط اعمال کے مضر نتائج کا '' بخش دینا '' بے معنی سی بات ہے۔ '' بخشش'' کا یہ تصور ملوکیت کی فضا کا پیدا کردہ ہے جس میں بادشاہ خوش ہو کر مجرموں کے گناہ بخش دیا کرتا تھا۔ قرآن کریم کی رو سے '' جنت'' انسانی اعمال کا فطری نتیجہ ہے۔ یہ کسی سے '' بخشش'' کے طور پر نہیں مل سکتی۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ حسنِ عمل سے انسان کے اندر وہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ تخریبی قوتوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ ہے مَغْفِرَت کا قرآنی مفہوم۔ ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ جو شخص کمزور ہو جاتا ہے اس پر ہر بیماری فوراً حملہ کر دیتی ہے۔ اس میں قوت مدافعت باقی نہیں رہتی۔ وہ جراثیم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اس میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ وہ ان جراثیم کا مقابلہ کر سکے۔ اس قسم کی طاقت کا اپنے اندر پیدا کر لینا اِسْتِغْفَارٌ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ چیز تسبیح کے دانوں پر اَسْتَغْفِرُاللہ۔ اَسْتَغْفِرُاللہ کے الفاظ دہرانے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسے کام کرنے سے حاصل ہوسکتی ہے جس سے انسانی صلاحیتوں میں نشو و نما پیدا ہو جائے۔ خدا غَفُوْرٌ ہے۔ یعنی اس کے قانون پر عمل پیرا ہونے سے اس قسم کی قوتِ مدافعت اور سامان حفاظت مل جاتا ہے۔ اور مومنین کا شیوہ اِسْتِغْفَارٌ ہے۔ یعنی اس قسم کی قوت اور حفاظت کا طلب کرتے رہنا۔ اس کے لئے جدو جہد کرتے رہنا۔ لہذا قرآن کریم میں مَغْفِرَةٌ ($\frac{2}{221}$) اور غُفْرَانٌ ($\frac{2}{285}$) کے معنی ہونگے حفاظت اور پناہ۔ غَافِرٌ ($\frac{40}{3}$) غَفُوْرٌ ($\frac{3}{30}$) اور غَفَّارٌ ($\frac{20}{82}$) کے معنی ہونگے حفاظت دینے والا۔ محفوظ رکھنے والا، اس فرق کے ساتھ کہ غَافِرٌ اسم فاعل ہے اور غَفُوْرٌ وَ غَفَّارٌ اسم مبالغہ۔ اِسْتِغْفَارٌ ($\frac{9}{114}$) کے معنی ہونگے حفاظت طلب کرنا۔

جیسا کہ (ع - ف - و) کے عنوان میں بتایا جاچکا ہے، عَفْوٌ کے معنی ہیں سزا کے بعد اس کے اثرات کو مٹا دینا۔ لیکن مَغْفِرَةٌ کے معنی ہیں شروع ہی سے ان اثرات سے محفوظ رکھنا۔ اسی لئے قرآن کریم میں مَغْفِرَةٌ۔ عَذَابٌ کے مقابلہ میں آیا ہے ($\frac{2}{175}$ ؛ $\frac{3}{128}$)۔ سورہ بقرہ میں مَغْفِرَةٌ بمقابلہ فَقْرٌ آیا ہے ($\frac{2}{268}$)۔ یعنی احتیاج و افلاس سے محفوظ رکھنا

غ ف ل

غَفَلَهُ' تَغْفِيْلاً ۔ اس کو ڈھانپ دینا ۔ چھپا دینا ۔ اس پر پردہ ڈال دینا * ۔ یہ اسکے بنیادی معنی ہیں ۔ اَغْفَلَهُ' ۔ اس کو غافل کیا ۔ قرآن کریم میں ہے لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ (۲۲/۵۰) ۔ تم اس سے " غافل " تھے سو ہم نے تمہارے پردوں کو اٹھا دیا ۔ غَفْلَةٌ ۔ کسی چیز کو چھوڑ دینا اور اسکو بھول جانا ۔ راغب نے کہا ہے کہ غفلت اس سہو کو کہتے ہیں جو قلتِ احتیاط و تحفظ کی بناء پر ہوتا ہے * ۔ دراصل اس کا مطلب کسی چیز کے متعلق (یا کسی کی طرف سے) لا پرواہ (Un-mindful) ہو جانا ہے ۔ چنانچہ اَلْغَفُوْلُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں کہ جو بچہ چاہے اس کا دودھ پی جائے اور جو آدمی چاہے اس کا دودھ دوہ کر لے جائے اور وہ اس کا کچھ خیال نہ کرے * ۔ اَلْغُفْلُ وہ شخص جس سے نہ بھلائی کی امید ہو نہ شر کا اندیشہ ۔ وہ تیر جس پر کوئی نشان نہ ہو (جوئے میں ایسے تیر کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا ۔ یعنی نہ اس سے کوئی فائدہ ہوتا تھا نہ نقصان) ۔ وہ راستہ جس پر نشان راہ نہ ہوں ۔ وہ زمین جس پر کوئی آبادی نہ ہو ۔ وہ مویشی جس پر شناخت کا نشان نہ ہو ۔ وہ شخص جس کا حسب نہ ہو ۔ وہ شعر جس کا کہنے والا معلوم نہ ہو * ۔ ان معانی سے اس لفظ کا اصل مفہوم سامنے آجاتا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معنی بھول کر کسی چیز کو چھوڑ دینے کے ہیں ، اور کبھی کبھی یہ عمداً چھوڑ دینے کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔

لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ بے خبری اور ناواقفیت کے لئے بھی آیا ہے جس میں مذمت کا کوئی پہلو نہیں ۔ مثلاً سورہ یوسف میں ہے کہ ہم تجھے وحی کے ذریعے داستان یوسف بتاتے ہیں وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (۱۲/۳) ۔ اگرچہ تو اس سے پہلے اس سے باخبر نہ تھا ۔ اسی طرح قرآن کریم میں اکثر مقامات پر ہے ۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲/۷۴) ۔ اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ۔ سورہ نور میں اَلْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ (۲۴/۲۳) ان باعصمت خواتین کے متعلق آیا ہے جو بدکرداری کی باتوں سے واقف تک نہ ہوں ۔ غَافِلٌ ۔ غَفَلَ سے اسم فاعل ہے ۔

سورۃ انبیاء میں کفار کے متعلق ہے کہ وہ کہینگے ۔ قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِنْ هٰذَا ۔ (۲۱/۹۷) ۔ ہم اس سے لا پرواہ رہے ۔ یعنی جس بات کو

* تاج ۔

ھمیں ھر وقت دھیان میں رکھنا چاھئے تھا اسے ھم نے دھیان میں نہ رکھا۔
لغت میں غَفْلَةٌ کے معنی یہ بھی ھیں ۔

غ ل ب

غَلَبَةٌ کے اصل معنی ھوتے ھیں کسی کی گردن کے موٹے حصے کو بڑی مضبوطی سے پکڑ لینا *۔ چنانچہ غَلِبَ ۔ یَغْلَبُ کے معنی ھیں وہ موٹی ، چھوٹی ، اور ایکطرف کو جھکی ھوئی گردن والا ھوا ۔ نَاقَةٌ غَلْبَاءُ ۔ موٹی گردن والی اونٹنی کو کہتے ھیں **۔ اس سے غَلَبَةٌ کے معنی قہر و بالا دستی ، کسی پر مستولی اور قابض ھو جانے یا کسی کو شکست دیدینے کے آتے ھیں ۔ یہ غَلَبَ کا مصدر ھے ۔ سورہ کھف میں ھے۔ اَلَّذِیْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓی اَمْرِهِمْ ($\frac{18}{21}$) ۔ وہ لوگ جنھوں نے انکے معاملہ پر غلبہ پا لیا ۔ سورہ روم میں ھے مِنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ ($\frac{30}{3}$) ۔ اپنے مغلوب ھوجانے کے بعد ۔ مَغْلُوْبٌ ($\frac{54}{10}$) ۔ جس پر دوسرا غالب آجائے ۔

اَلْغَلْبَاءُ ۔ (اسکی جمع غُلْبٌ ھے) گھنا باغیچہ **۔ وَحَدَآئِقَ غُلْبًا ($\frac{80}{30}$) گھنے باغات ۔

غ ل ظ

اَلْغِلْظَةُ (غین کی تینوں حرکتوں کے ساتھ اگرچہ کسرہ زیادہ مشہور ھے) موٹاپا ۔ سختی ۔ شدت ۔ اَغْلَظَ الثَّوبَ ۔ اس نے کپڑے کو موٹا پایا * ۔ غَلِیْظٌ کے معنی سخت ، موٹے کے علاوہ گاڑھا بھی ھیں ۔ یعنی ایسی چیز جس کے منتشر اجزاء سمٹ کر کم جگہ میں جمع ھو جائیں اوراسطرح ان کی قوت بڑھ جائے ۔ اَلْغَلْظُ ۔ سخت اور ناھموارزمین کو کہتے ھیں (یعنی جو پتھریلی تو نہ ھو لیکن اس کے باوجود سخت ھو) ۔ یہاں سے اس کے معنی سختی اور درشتی کے ھو گئے * ۔ قرآن کریم میں ھے کہ جماعت مومنین کو ایسا طاقتور ھونا چاھئے کہ مخالفین ان میں سختی محسوس کریں ۔ وَلْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً ($\frac{9}{123}$) ۔ لیکن ان کے مزاج میں سختی اور بد خلقی نہیں ھونی چاھئے ۔ انھیں غَلِیْظَ الْقَلْبِ نہیں ھونا چاھئے ($\frac{3}{158}$) ۔ مخالفین کے مقابلہ میں بہت مضبوط ، محکم اور سخت ھونا چاھئے اور ان کی شدت سے روک تھام کرنی چاھئے۔ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ ($\frac{9}{73}$) ۔ اسی طرح جیسے خدا کے قوانین مکافات اعمال کے نتائج مرتب کرنے میں غِلَاظٌ شِدَادٌ واقع ھوئے ھیں ($\frac{66}{6}$)۔

* راغب ۔ ** تاج ۔

اِسْتَغْلَظَ۔ کسی چیز کا موٹا اور سخت اور مضبوط ہو جانا (جو بالعموم کسی چیز کے کمال پر پہنچنے سے ہوتا ہے) دراصل یہ فعل گیہوں وغیرہ کے خوشوں میں دانوں کے موٹے ہو کر سخت ہو جانے پر بولا جاتا ہے*۔ قرآن کریم میں اسلام کے شجرِ طیب کے متعلق ہے۔ فَاسْتَغْلَظَ (۴۸/۲۹)۔ وہ مضبوط، سخت اور موٹا ہو گیا۔

غ ل ف

اَلْغِلَافُ۔ محافظ۔ وہ چیز جو کسی دوسری چیز پر چھائی ہوئی ہو۔ مثلاً انڈے کا چھلکا۔ کلی کے اوپر کا سبز خول۔ (جمع) غُلْفٌ و غُلُفٌ۔ سَیْفٌ اَغْلَفُ۔ تلوار جو غلاف میں ہو۔ اَلْغَلَفُ۔ کثرت سے سرسبزی*۔

قرآن کریم نے یہودیوں کا قول نقل کیا ہے۔ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (۲/۸۸)۔ یہ اَغْلَفُ کی جمع ہے۔ یعنی غلافوں میں بند ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں اس لئے ہم پر قرآن کریم کی باتوں کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل خود علوم و معارف کے بھرے ہوئے برتن (اور مخزن) ہیں اس لئے ہمیں کسی نئے علم کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارے علوم سے بے نیاز ہیں**۔ مطلب دونوں کا ایک ہی ہے کہ ہم اس نئی دعوت کو درخور اعتناء ہی نہیں سمجھتے۔ ہمیں اسکی ضرورت ہی نہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ کسی دعوت یا نظریہ کے رد و قبول کا فیصلہ فکر و بصیرت اور غور و تدبر کے بعد کیا جائے اس کے متعلق بلا دیکھے بھالے کہدینا کہ ہمیں اسکی ضرورت ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا طرز عمل علم و بصیرت کی بارگاہ میں کبھی قابل ستائش قرار نہیں پاسکتا۔ اور قرآن کریم ہے ہی سرتاپا علم و بصیرت۔

غ ل ق

اَغْلَقَ الْبَابَ یُغْلِقُهٗ۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ بَابٌ غَلَقٌ۔ بند دروازہ***۔ سورہ یوسف میں عزیز کی بیوی کے متعلق ہے۔ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ (۱۲/۲۳)۔ راغب نے کہا ہے کہ غَلَّقَ اسوقت بولا جائیگا جب بہت سے دروازوں کو بند کیا گیا ہو۔ یا ایک ہی دروازہ کو بار بار بند کیا ہو۔ یا دروازہ کو بڑی مضبوطی سے بند کر دیا ہو***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز میں پھنس جانا یا اٹک جانا ہیں۔

* تاج۔ ** راغب۔ *** تاج و راغب۔

غ ل ل

غَلَلٌ کے اصلی معنی ھیں کسی چیز کا درمیانی خلاؤں میں چلے جانا ۔ چنانچہ غَلَلٌ اس پانی کو کہتے ھیں جو درختوں کے درمیان سے بہہ رھا ھو ۔ اَلْغُلُّ اس چیز کو کہتے ھیں جس کے ذریعہ کسی کو قید کر دیا جائے کیونکہ اس طرح قیدی کے اعضاء اسکے بیچ میں آجاتے ھیں ۔ اسکی جمع اَغْلاَلٌ آتی ھے * ۔ (۷/۱۵۷) ۔ غَلَّ ۔ اسے غُلٌّ کے ذریعہ قید کر دیا * ۔ مَغْلُوْلٌ ۔ بندھا ھوا ، مقیّد (۵/۶۴) ۔ اَلْغِلُّ ۔ دل میں چھپی ھوئی دشمنی کو کہتے ھیں ** ۔ (۵۹/۱۰) ۔ نیز دھوکا اور فریب (جو چھپا کر کیا جاتا ھے) ۔ یعنی اس میں چھپانے کا پہلو غالب ھوتا ھے ۔ چنانچہ کہتے ھیں لاَ یَذْھَبُ کَلاَ مُنَا غَلَلاً ۔ ھماری بات لوگوں سے مخفی نہیں رھنی چاھئے ** ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا درمیان سے گزرنا اور کسی چیز کا جم جانا ھیں ۔ غَلَّ یَغِلُّ کے معنے ھیں کینہ رکھنا اور غَلَّ یَغُلُّ کے معنے ھیں خیانت کرنا * ۔

سورہ آل عمران میں ھے وَمَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَغُلَّ (۳/۱۶۰) ۔ اس کے معنی عام طور پر یہ کئے جاتے ھیں کہ کسی نبی کے شایان شان نہیں کہ وہ (مال غنیمت میں) خیانت کرے ۔ لیکن صاحب المنار نے بعض مفسرین کے حوالہ سے لکھا ھے کہ اس سے مراد غنیمت میں خیانت کرنا نہیں بلکہ وحی میں سے کچھ مخفی رکھنا ھیں ۔ یہاں مفسرین نے غُلُوْلٌ کے معنی کِتْمَانٌ (چھپانے) کے کئے ھیں ۔ مطلب یہ ھے کہ نبی کا کام تبلیغ رسالت ھے ۔ جو وحی اسکی طرف بھیجی جاتی ھے وہ بلا کم و کاست اسے لوگوں تک پہنچا دیتا ھے ۔ اب اگر اس میں کوئی بات ایسی ھے جو کسی کے معتقدات یا مفاد کے خلاف جاتی ھے تو اس میں رسول کا کوئی قصور نہیں ۔ وہ یہ کر ھی نہیں سکتا کہ وحی کا کچھ حصہ چھپا کر رکھ لے اور کچھ حصہ ظاھر کردے ۔ وہ وحی کو بہ تمام و کمال ظاھر کردیگا ۔ وہ اس میں کوئی تبدیلی بھی نہیں کر سکتا (۱۰/۱۵)

نبی اکرمؐ کے متعلق ھے یَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالاَغْلاَلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ (۷/۱۵۷) ۔ وہ ان بوجھوں کو اتار دیگا جن کے نیچے نوع انسانی دبی ھوئی چلی آرھی تھی اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالیگا جن میں انسانیت جکڑی ھوئی تھی ۔ یعنی وہ نوع انسان کو ، جسم اور قلب و دماغ

*راغب ۔ **تاج ۔

کی ہر قسم کی غلامی سے آزاد کرکے انہیں فقط قوانین خداوندی کی اطاعت پر لے آئیگا اور اسطرح انہیں صحیح آزادی عطا کر دیگا ۔ کسقدر بلند تھا مقصد بعثتِ نبوی ؐ کا اور کسقدر کامیاب اور حسین تھا وہ طریق جس سے حضور ؐ نے اس بلند مقصد کو پورا کیا ۔ لیکن اس کے بعد مسلمانوں کو دیکھئے کہ انہوں نے ان زنجیروں کے ایک ایک ٹکڑے کو (جنہیں قرآنی نظام نے اس حسن و خوبی سے توڑ کر رکھ دیا تھا) مژگانِ عقیدت سے اکٹھا کیا اور ان اغلال و سلاسل کو انتہائی تعظیم کے ساتھ اپنے گلے میں ڈال لیا ۔ اُس ابتداء کی یہ انتہاء کسقدر عبرت ناک اور تاسف انگیز ہے !

غ ل م

اَلْغُلْمَۃُ ۔ جنسی خواہش کی شدت کو کہتے ہیں ۔ قَدْ غَلِمَ الرَّجُلُ ۔ اسوقت کہتے ہیں جب آدمی جنسی خواہش سے مغلوب ہوجائے ۔ اَغْلَمَ الْبَحْرُ کے معنی ہیں دریا پرجوش ہو گیا اور موجیں مارنے لگا * ۔ اِغْتَلَمَ الشَّرَابُ ۔ شراب تند و تیز ہو گئی ** ۔ اس اعتبار سے اَلْغُلاَمُ اس لڑکے کو کہتے ہیں جسکی مسیں بھیگ چکی ہوں *** ۔ لیکن صاحبِ تاج العروس کے نزدیک پیدائش سے لیکر جوان ہونے تک بچے کو غُلاَمٌ ہی کہتے ہیں ۔ نیز کبھی (بڑے بوڑھے اپنے بیٹوں کو خواہ وہ) ادھیڑ عمر کے ہی کیوں نہ ہوں غُلام کہدیتے ہیں * ۔ صاحب فقہ اللغۃ نے بھی کہا ہے کہ اگرچہ جنین سے لیکر بالغ ہونے تک بچے کے لئے مختلف الفاظ آتے ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی اسے غُلاَمٌ ہی کہتے ہیں ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ محض بیٹے کے معنوں میں بھی آیا ہے ۔ مثلاً ($\frac{3}{39}$) ۔ اور نوجوان کے معنوں میں بھی ($\frac{18}{80}$) ۔ غِلْمَانٌ کا لفظ خدمت گار لڑکوں کے لئے آیا ہے ۔ ($\frac{52}{24}$) ۔ یعنی وِلْدَانٌ مُخَلَّدُوْنَ ($\frac{56}{17}$) ۔ ہو سکتا ہے کہ ان سے مراد اہل جنت کے بیٹے ہی ہوں ۔ کیونکہ جنت میں آباء و ازواج و ذرّیات بھی تو ساتھ ہونگے بشرطیکہ وہ بھی صالح ہوں ($\frac{13}{23}$) ۔ (جنت کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ج ۔ ن ۔ ن ۔)

غ ل و (ی)

غُلُوٌّ کے اصلی معنی حد سے بڑھ جانے اور تجاوز کرنے کے ہیں ۔ اگر یہ حد سے تجاوز اشیاء کے نرخ میں ہو تو اسے غَلاَءٌ کہتے ہیں ۔ اور

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔

قدر و منزلت میں ہو تو غُلُوٌّ ۔ اور تیر میں ہو (یعنی وہ اپنی مقررہ حد سے آگے نکل جائے) تو غَلْوٌ ۔ اَلْمِغْلَی ۔ اس تیر کو کہتے ہیں جسے کمان کے ذریعہ ہاتھ کو خوب تان کر انتہائی حد سے آگے جانے کے لئے پھینکا جائے*۔ اَلْغَلْوَۃُ ۔ اُس انتہائی حد کو کہتے ہیں جس تک تیر پھینکا جا سکے**۔ اَلْغَلَیَانُ ۔ ہانڈی کے ابال اور جوش کھانے کو کہتے ہیں***۔
سورہ دخان میں ہے یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ کَغَلْیِ الْحَمِیْمِ (۴۴/۴۶-۴۵) " وہ پیٹ میں کھولیگا ابلتے ہوئے پانی کے کھولنے کی مانند " (واضح رہے کہ یہ یائی ہے ۔ واوی نہیں ۔ بعض علمائے لغت کی طرح ہم نے بھی اسے واوی کے تحت ہی لکھدیا ہے ۔)

اِغْتَلَی الْبَعِیْرُ کے معنی ہیں اونٹ تیز چلا اور اونچا ہو کر چلا حتیٰ کہ وہ رفتار کے حسن کی حد سے گزر گیا*۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب قرآن کریم نے کہا کہ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ (۴/۱۷۱) ۔ تو اس کا کیا مطلب ہے ؟ دین سکھاتا یہ ہے کہ انسان اپنی مختلف قوتوں میں کسطرح صحیح توازن و تناسب پیدا کرے اور اسطرح اپنے معاشرہ کو بھی متوازن و متناسب رکھے۔ اسی کو حُسْنٌ کہتے ہیں ۔ کیونکہ حسن نام ہی صحیح تناسب کا ہے (دیکھئے عنوان ح ۔ س ۔ ن)۔ توازن ، افراط اور تفریط دونوں سے بگڑ جاتا ہے ۔ لہٰذا دین میں غلو سے اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے ۔ اسی لئے دوسری جگہ کہا ہے کہ وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ (۷/۱۸۰) ۔ جو لوگ خدا کی صفات میں کسی ایک طرف کو جھک جاتے (یا نکل جاتے)ہیں ان کو چھوڑ دو۔ اس لئے کہ خدا اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کا مالک ہے۔ اس کی تمام صفات میں انتہائی درجہ کا توازن اور حسن ہے ۔ اس لئے ان میں نہ افراط جائز ہے نہ تفریط ۔ غُلُوٌّ خواہ عقائد میں ہو خواہ عمل میں ، حسن کو بگاڑ دیتا ہے ۔ دوسری جگہ آیاتِ خداوندی میں الحاد (ایکطرف نکل جانے) سے روکا گیا ہے (۴۱/۴۰)۔ ہر شے کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا ، ہر بات کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنا ، اور ہر عمل میں حسن پیدا کرنا اور اسے برقرار رکھنا ، یہ ہے اعتدال کی راہ ۔ یہ چیز صرف وحی کی روشنی میں ہو سکتی ہے ۔ اس کے بغیر نہیں ۔

غ م ر

اَلْغَمْرَۃُ ۔ اسکے بنیادی معنی اس چیز کے ہوتے ہیں جو کسی چیز پر چھا جائے اور اسے ڈھانپ لے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس چھپانے

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔

میں قدرے سختی اور شدت کا پہلو ہونا ضروری ہے ۔ عربوں میں قاعدہ تھا کہ جب سفر میں پانی کم رہ جاتا اور اسے رفقائے سفر میں ماپ ماپ کر تقسیم کرنا پڑتا تو ایک پیالے میں چھوٹا سا پتھر رکھدیتے اور اس میں پانی ڈالتے ۔ جتنے پانی سے پتھر ڈوب جاتا اسے ایک حصہ قرار دیتے ۔ اس پانی کو غَمْرَةٌ کہتے تھے** ۔ اور اُس پیالہ کو اَلْغُمَرُ** ۔ اس سے کثیر پانی کو بھی غَمْرٌ کہنے لگے ، اس لئے کہ وہ اپنے اندر جانے والے کو چھپا لیتا ہے اور اس پر چھا جاتا ہے۔ اسی سے مَوْتُ الْغَمْرِ۔ ڈوب کر مرنے کو کہتے ہیں** ۔ غَمَرَاتٌ ۔ شدائد اور سختیاں* ۔ ناگواریاں ۔ غَمْرَةُ الشَّيْءِ ۔ کسی چیز کی شدت اور اس کا ہجوم** ۔ قرآن کریم میں غَمَرَاتُ الْمَوْتِ آیا ہے (۶/۹۳) ۔ سورۂ مومنون میں ہے ۔ فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ حَتَّى حِيْنٍ (۲۳/۵۴) ۔ جن چیزوں میں یہ لوگ ڈوبے ہوئے ہیں (جن مفاد پرستیوں میں یہ منہمک ہیں) انہیں سردست انہی میں چھوڑ دو ۔ وقت آنے پر سب کچھ ٹھیک ہوجائیگا ۔ راغب نے کہا ہے کہ یہاں غَمْرَةٌ کے معنی جہالت کے ہیں جو آدمی پر چھا جاتی ہے* ۔

غ م ز

غَمْزٌ کے معنی ہیں کسی چیز کی عیب جوئی کرتے ہوئے اس کیطرف ہاتھ یا آنکھ سے اشارہ کرنا* ۔ اور غَمَزَ الْكَبْشَ کے معنی ہوتے ہیں اس نے مینڈھے کو ہاتھ سے دبا کر دیکھا کہ اس میں چربی ہے یا نہیں** ۔ صاحب محیط نے غَمْزٌ کے معنی چبھونے ، دبانے اور بھینچنے کے لکھے ہیں*** ۔ اَلتَّغَامُزُ کے معنی ہیں باہم کسی کے کمزور پہلوؤں کیطرف آنکھوں یا ہاتھوں سے اشارہ کرنا ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز میں دوسری چیز سے ٹھوکے مارنا ۔ اس کے بعد استعارةً کسی کی عیب جوئی کرنے کے لئے استعمال ہونے لگا ۔

قرآن کریم میں ہے اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ (۸۳/۳۰) ۔ جب وہ ان کے پاس سے گزرتے تو ایک دوسرے کو آنکھوں سے اشارہ کرتے ۔ چشمکیں کرتے ۔

غ م ض

اَلْغَامِضُ ۔ بہت نشیبی زمین ۔ اَغْمَضَ النَّظَرَ ۔ اس نے باریک بینی اور تعمق نظر سے کام لیا ، گہری نظر ڈالی* ۔ جب کوئی شخص عمدہ اور

*راغب ۔ ** تاج ۔ *** محیط ۔

ٹھیک رائے دے تو اس کے لئے کہتے ہیں قَدْ أَغْمَضَ النَّظَرَ - ابن فارس نے اسکے معنے نشیب اور اندر کو گھس جانا بتائے ہیں - اَلْغُمْضُ - نیند کا جھونکا - بقول ابن فارس ، اتنی مقدار جس میں آنکھیں بند کر لی جائیں - غَمَضَ عَيْنَهُ وَاَغْمَضَهَا : اس نے اپنی آنکھ بند کی - اسی بناء پر اِغْمَاضٌ کے معنی ڈھیل دینا ، نرمی برتنا ، تغافل و تساھل اور چشم پوشی کے ھو گئے - اور اَلتَّغْمِيْضُ عَنِ الاِسَاءَةِ - کسی کے برا کرنے پر چشم پوشی کر لینا - الاِغْمَاضُ فِي الْبَيْعِ یعنی خرید و فروخت میں کسی عیب دار یا ردی چیز کو خریدتے وقت یہ مطالبہ کرنا کہ اسکی قیمت کم کر دی جائے کیونکہ اس میں فلاں نقص ہے *- ($\frac{۲}{۲۶۷}$) میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے - یعنی انفاق فی سبیل اللہ میں ایسی ردی چیزیں نہ دو کہ جنہیں تم خود بھی لینا پسند نہ کرو اور اگر کہیں لینی بھی پڑ جائیں تو ان کے نقص کی وجہ سے ان کی قیمت گھٹا کر دو -

غ م م

غَمَّ الشَّيْئَ غَمًّا - اسے ڈھانپ لیا - چھپا لیا - یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - غُمَّ الْهِلَالُ - چاند بادل کے نیچے آگیا اور دیکھا نہ جاسکا - اَلْغَمَامَةُ - بدلی یا سفید بدلی کو کہتے ہیں - اسکی جمع غَمَامٌ ہے - ($\frac{۲}{۵۷}$) - أَغَمَّتِ السَّمَاءُ - آسمان ابر آلود ہو گیا - اَلْغِمَامَةُ - اس چھینکے کو کہتے ہیں جو اونٹ وغیرہ کے منہ پر چڑھا دیتے ہیں تاکہ وہ کچھ کھا نہ سکے - نیز اس کپڑے کو جس سے اونٹنی کی آنکھیں باندھ دی جاتی ہیں - اس سے اَلْغُمَّى اس مصیبت کو کہتے ہیں جس سے انسان نکل نہ سکے ، نیز وہ پیچیدہ مسئلہ جس کا حل نہ نظر آئے - اور اَلْغَمَّى - غبار اور تاریکی کو - نیز جنگ کی شدت جو قوم پر چھا جائے - لہذا اَلْغَمُّ کے معنی ہیں حزن و کرب (جو چار سُو سے کسی پر چھا جائے)- سورہ آل عمران میں یہ لفظ اَمَنَةٌ کے مقابلہ میں آیا ہے ($\frac{۳}{۱۵۳}$) - اَلْغُمَّةُ - تحیر و التباس کو کہتے ہیں، نیز تاریکی و تنگی کو**- سورہ یونس میں ہے لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ($\frac{۱۰}{۷۱}$) - تمہارا معاملہ تم پر مشتبہ اور حیران کن نہ رہے -

غ ن م

اَلْغَنَمُ - بکریاں - (اس کا واحد شَاةٌ ہے جو اس مادہ سے نہیں آتا)- صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس کا اطلاق بھیڑوں اور بکریوں دونوں پر

*تاج و راغب - **تاج و محیط -

ھوتا ھے **۔(۲۰/۱۸)۔ اَلْغَنِیْمُ ۔ اَلْغَنِیْمَةُ ۔ اَلْغُنْمُ ۔ مال غنیمت جو جنگ میں ھاتھ آئے *۔ چونکہ عربوں کے معاشرہ میں مویشی ھی سب سے بڑی دولت تھی اس لئے جنگ میں بھی زیادہ تر یہی ھاتھ آتے تھے ۔ اس اعتبار سے اس مال کو غَنِیْمَةٌ کہنے لگے ۔ غَنِمَ ۔ کسی چیز کو بطور مال غنیمت پا لینا ۔ کسی چیز کو بغیر بدل و مشقت کے حاصل کر لینا *۔ اَنَّمَا غَنِمْتُمْ (۸/۴۱) اَلْمَغْنَمُ ۔ جمع مَغَانِمُ ۔ مال غنیمت (۴/۹۴)۔

(مال غنیمت کے سلسلہ میں عنوانات (ف ۔ ی ۔ ا) اور (ن ۔ ف ۔ ل) بھی دیکھئے)

غ ن ی

اَلْغِنٰی ۔ حاجات سے بے نیازی ۔ تونگری ۔ آسودگی ۔ یہ فقر (محتاجی) کی ضد ھے ، احتیاج نہ ھو ، غَنِیٌّ کہلاتا ھے ۔ نیز آسودہ ، خوش حال ، تونگر بھی ۔ (۴/۱۳۵) و (۴/۶)۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کافی ھونا ھیں ۔ اَلْغَانِیَةُ اس عورت کو کہتے ھیں جو اپنے ذاتی حسن و جمال کی وجہ سے خارجی زیبائش و آرائش سے مستغنی ھو*۔ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (۲۹/۶)۔ خدا کو بندوں کی اطاعت کی ضرورت نہیں ۔ ان کی اطاعت خود انکی اپنی ذات کے نفع کے لئے ھے ۔ خدا کو کائنات میں کسی چیز کی احتیاج نہیں ۔ اَغْنٰی ۔ مستغنی کر دینا (۹۳/۸)۔ اَغْنٰی عَنْهُ غَنَاءَ فُلَانٍ ۔ اسکی جگہ لی ، قائم مقامی کی ، اسکے جیسا کام دیا ۔ اَغْنٰی عَنْهُ کَذَا ۔ اس کے لئے فلاں چیز کافی ھوئی ، اس نے اسے فائدہ پہنچایا ۔ مَا اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ (۱۱۱/۲)۔ اسکے مال نے اسے کچھ فائدہ نہ پہنچایا ۔ اس کے کسی کام نہ آیا ۔ لَا یُغْنِیْ عَنْکَ شَیْئًا (۱۹/۴۲)۔ جو تیرے کسی کام نہیں آسکتا ۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (۵۳/۲۸)۔ یقیناً حق کے مقابلہ میں باطل کوئی کام نہیں دے سکتا ۔ باطل ، حق سے قطعاً بے نیاز نہیں کر سکتا ۔ سورہ عبس میں ھے لِکُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ (۸۰/۳۷)۔ اسدن ھر شخص اپنے اپنے دھندے میں اسقدر مشغول ھوگا کہ وہ کام اس کی ساری توجہات جذب کر لینے کے لئے کافی ھوگا ۔ یا دوسروں سے بے نیاز کر دیگا ۔ اَلْمُغْنِیْ (اسم فاعل) وہ جو کفایت کرے ۔ کام آئے ۔ فائدہ پہنچائے ۔ اسکی جمع مُغْنُوْنَ ھے ۔ سورۃ ابراھیم میں ھے کہ عذاب کو دیکھکر متبعین اپنے لیڈروں سے کہینگے فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ (۱۴/۲۱)۔ "کیا تم خدا کے عذاب کے

*تاج ۔ **محیط ۔

مقابلہ میں ہمارے کسی کام آسکتے ہو یا کفایت کر سکتے ہو؟ - لیکن آغْنیٰ عَنْہُ کذا کے معنے اس سے کسی چیز کو ہٹا دیا ، دور کر دیا بھی ہیں** - اس لحاظ سے اس آیت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ "کیا تم ہم سے اللہ کے عذاب میں سے کچھ بھی دور کر سکتے ہو؟" - (نیز ۲۴/۴۰)۔ اِسْتَغْنیٰ - بے نیاز ہو جانا (۸۰ : ۶/۵)۔ غَنِیَ بِالْمَکَانِ وَ فِیْہِ - اس نے اس جگہ طویل مدت تک اقامت کی - کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْھَا (۱۱/۶۸ ؛ ۹۲/۷)۔ گویا وہ ان مکانات میں کبھی بسے ہی نہ تھے - اس مادہ کے بنیادی معنوں کی رعایت سے اس جگہ معنے صرف طویل مدت تک اقامت کرنا ہی نہیں بلکہ آسودگی و خوش حالی کی زندگی بسر کرنا بھی ہیں - اَلْغَنَاءُ - کفایت - پوری صلاحیت و استعداد کے ساتھ کسی کی جگہ لے لینا اور اس کا سا کام دینا - اَلْغِنَاءُ - گانا -

غ و ث

اَلْغَوْثُ وَالْغِیَاثُ - مدد - اِسْتَغَاثَنِیْ فُلَانٌ فَاَغَثْتُہٗ - فلاں نے مجھے مدد کے لئے پکارا تو میں نے اسکی مدد کی - اَلْاِسْتِغَاثَۃُ - طلب غوث - مدد طلب کرنا * - اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ (۹/۸) - جب تم اپنے رب کو مدد کے لئے پکارتے تھے - سورہ کہف میں ہے وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَاءٍ کَالْمُھْلِ (۱۸/۲۹) - راغب کہتا ہے کہ یہ غَوْثٌ سے بھی ہو سکتا ہے (مدد مانگنا) اور غَیْثٌ سے بھی (پانی مانگنا)۔ اسی طرح یُغَاثُوْا میں بھی دونوں معنی ہو سکتے ہیں***- [دیکھئے عنوان غ - ی - ث]

غ و ر

اَلْغَوْرُ - ہر چیز کی گہرائی - عمق - بُعد - رَجُلٌ بَعِیْدُ الْغَوْرِ - گہرا آدمی جو بڑا علم و تجربہ رکھتا ہو - اَلْغَوْرُ - اَلْغِیَارُ - کسی چیز کے اندر گھس جانا - پانی کا زمین کے اندر اترجانا**** - قرآن کریم میں ہے اِنْ اَصْبَحَ مَاؤُکُمْ غَوْرًا (۶۷/۳۰) - اگر تمہارا پانی زمین کے بہت نیچے اتر جائے (اور اوپر ہی نہ آئے تو تم کیا کرلو) - اَلْغَارُ - غار - (۹/۴۰)۔ اَلْمَغَارَۃُ - غار - اس کی جمع مَغَارَاتٌ ہے - (۹/۵۷) - "اندر تک گھس جانے" کے اعتبار سے اَغَارَ تیز رفتار ہونے کے لئے بولا جاتا ہے اور فَرَسٌ مِغْوَارٌ نہایت تیز رفتار گھوڑے کو کہتے ہیں - اَلْغَارَۃُ - حملہ آور

*تاج - **محیط - ***راغب - ****تاج و کتاب الاشتقاق -

سواروں کا دستہ ۔ نیز حملہ ۔ أَغَارَ عَلَى الْقَوْمِ ۔ قوم پر حملہ کیا* ۔ قرآن کریم میں ہے فَالْمُغِيْرَاتِ صُبْحًا (۱۰۰/۳) ۔ حملہ کرنے اور دشمن کی صفوں کے اندر جا گھسنے والے گھوڑے ۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) گہرائی اور (۲) کسی کے مال کو جبراً اور قہراً لینے کے لئے اقدام کرنا ہیں ۔

غ و ص

اَلْغَوْصُ ۔ اَلْمَغَاصُ ۔ پانی کے نیچے اترنا ۔ غوطہ لگانا ۔ اَلْمَغَاصُ غوطہ لگانے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں ۔ اَلْغَوَّاصُ ۔ غوطہ خور** ۔ قرآن کریم میں حضرت سلیمانؑ کے تذکرہ میں ہے وَ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَغُوْصُوْنَ لَهٗ (۲۱/۸۲) ۔ وہ سرکش اقوام کے لوگ جنہیں (حضرت) سلیمانؑ نے اپنا فرمانبردار بنا لیا تھا اور وہ اس کے لئے غوطہ خوری کرتے تھے ۔ انہی کو دوسری جگہ غَوَّاص کہا گیا ہے (۳۸/۳۷) ۔ اسکے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ بڑی بڑی مہموں میں درّانہ گھس جاتے تھے ۔

جو شخص کسی گہرے اور پیچیدہ معاملہ کی تہ تک پہنچ جائے اور اسے حل کر لے یا نیچے کی جگہ سے کوئی چیز نکال لائے ، اسے بھی غَائِص کہتے ہیں*** ۔ اصل میں اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں نشیب کی طرف تیزی سے جانا**** ۔ اس سے یہ لفظ ، ہر چیز کے اندر داخل ہونے کے لئے بولا جانے لگا ۔

غ و ط

اَلْغَوْطُ ۔ اَلْغَائِطُ ۔ نشیبی ، اور وسیع زمین ۔ چونکہ اہل عرب قضائے حاجت کے لئے نشیبی زمین تلاش کرتے تھے تاکہ اوٹ میں ہو کر رفع حاجت کر لیں ، اسی لئے بیت الخلاء کو بھی غَائِط کہنے لگے ۔ نیز ایسی نشیبی زمین ہی میں وہ فضلہ پھینکتے تھے اس لئے انسانی فضلہ کو بھی غَائِط کہنے لگے* ۔ (۴/۴۳) ۔ میں جَآءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَائِطِ سے مراد ہے جائے ضرور سے فارغ ہو کر آنا ۔

غَاطَ ۔ يَغُوْطُ ۔ داخل ہوجانا ۔ اندر چلے جانا ، دھنس جانا ، اَلْغَوْطُ ۔ کھودنا***** ۔ بِئْرٌ غَوِيْطَةٌ ۔ گہرا کنواں* ۔

*تاج ۔ **تاج و محیط ۔ ***راغب ۔ ****ابن فارس ۔ *****محیط ۔

غ و ل

غَالَ ۔ اس کے بنیادی معنی دھوکے سے پکڑنے یا کسی کو بے خبری کی حالت میں گرفتار کرنے کے ہیں ۔ اَلْغَوْلُ ۔ میدان یا ریگستان کی وسعت یا دوری کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں سے گزرنے والا اس طرح ہلاک ہوجاتا ہے کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا ۔ (ابن فارس)۔ اس بناء پر اَلْغَوْلُ ۔ ہلاکت ۔ مصیبت و آفت کو بھی کہتے ہیں ۔ غَالَتْہُ غَوْلٌ ۔ ہلاکت نے اسے برباد کر دیا ۔ غَالَ الشَّیْیَٔ ۔ اس نے اس چیز کو تباہ کردیا ۔ اَلْغَوْلُ ۔ درد سر ۔ مستی ۔ ہر وہ شے جس سے عقل جاتی رہے ۔ اَلْغَوَائِلُ ۔ مصائب ۔ تباہیاں ۔ غُوْلٌ ۔ عرب بھوت ، چڑیل کو کہا کرتے تھے ۔ نیز سانپ کو* ۔

قرآن کریم میں ''جنت کی شراب'' کے متعلق ہے لَا فِیْھَا غَوْلٌ (۳۷/۴۷) ۔ اس میں نہ مستی ہوگی نہ سرگرانی ۔

غ و ی

غَوَیٰ غَیًّا ۔ بھٹک جانا ۔ دھوکا کھا جانا** ۔ بھٹک جانے اور گمراہ ہو جانے کے اعتبار سے غَیٌّ کا لفظ رُشْدٌ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (۲/۲۵۶) ''صحیح اور غلط راستے نکھر کر الگ الگ ہوگئے'' ۔ اور دھوکہ کھا جانے کے معنوں میں مَاضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَ مَا غَوَیٰ (۵۳/۲) ۔ ''تمہارا رفیق نہ تو تلاش حقیقت میں سرگرداں ہے اور نہ ہی اس نے دھوکا کھایا ہے'' ۔ نیز تباہ اور برباد ہوجانا** ۔ جیسے وَعَصٰی آدَمُ رَبَّہٗ فَغَوَیٰ (۲۰/۱۲۱) ۔ راغب اور لسان العرب میں اس کے معنی فَسَدَ عَیْشُہٗ لکھے ہیں*** ۔ یعنی معیشت کا تنگ ہو جانا ۔ زندگی خراب ہو جانا ۔ روزی کا درہم برہم ہوجانا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) صحیح سمت کی طرف راہ نمائی نہ ہونا ۔ کسی معاملہ کا تاریک ہونا ۔ اور (۲) کسی چیز میں فساد ہونا ۔ سورۃ مریم میں جو ہے فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا (۱۹/۵۹) ۔ تو اس میں راغب کے نزدیک غَیًّا کے معنی عذاب یا تباہی کے ہیں** ۔ یعنی اتباع شہوات اور اضاعت

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج و راغب ۔ ***بحوالہ غریب القرآن ۔ مرزا ابوالفضل ۔ لیکن تاج میں فَسَدَ عَیْشُہٗ کی بجائے فَسَدَ جَوْفُہٗ ہے یعنی اسکا پیٹ خراب ہوگیا ۔

صلٰوۃ کا خمیازہ۔ غَوِیٌّ ۔ غلط رو*۔ (۲۸/۱۸) ۔ تباہ و برباد ہو جانے والا۔ غَاوٍ (جمع غَاوُوْنَ) بھٹک جانے والے*۔ (۲۶/۹۴) ۔ آغْوَیٰ ۔ گمراہ کرنا (۴۵/۳۴) ۔ لیکن (۱۱/۳۴) میں جو ہے یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَکُمْ ۔ تو صاحب تاج العروس اور راغب دونوں کے نزدیک اس کے معنی اعمال کے نتیجہ میں تباہ و برباد کر دینے کے ہیں*۔ اَلْغَوَیٰ ۔ بد ھضمی ۔ پیاس*۔ اَلْغَاوِیْ ۔ ٹڈی دل*۔

سورۃ شعراء میں ہے وَالشُّعَرَاءُ یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوُوْنَ (۲۶/۲۲۴)۔ اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ شاعروں کے پیچھے لگنے والے فریب خوردہ ہیں ۔ اس لئے کہ (جیسا کہ عنوان ش ۔ ع ۔ ر میں بتایا جاچکا ہے) شاعری اس ذہنیت کا نام ہے جس میں حقائق کی بجائے صرف جذبات سے کام لیا جاتا ہے اور زندگی کا کوئی غیر متبدل نصب العین سامنے نہیں رکھا جاتا ۔ اس لئے ایسے لوگوں کے پیچھے لگنے والے (جو ان جذبات پرستیوں کو حقائق سمجھ لیتے ہیں) فریب خوردہ ہوتے ہیں ۔ لیکن پیاس کی جہت سے اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کی پیاس کبھی نہیں بجھ سکتی ، کیونکہ پیاس کی تسکین صرف مثبت حقائق سے ہوسکتی ہے ۔ مشتعل جذبات سے نہیں ۔ اسی لئے خود شاعروں کو بھی یَھِیْمُوْنَ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے (۲۶/۲۲۵) ۔ یعنی پیاسے اونٹ کی طرح سخت پریشانی میں مبتلا اور مارے مارے پھرنے والے (دیکھئے عنوان ھ ۔ ی ۔ م) ۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ خود شاعروں کو بھی اپنے مدح سراؤں سے دھوکا لگ جاتا ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ فی الواقعہ ہمارے متبعین ہیں حالانکہ وہ محض ٹڈی دل کی طرح ہوتے ہیں ۔ دیکھنے میں لاکھوں ، لیکن بالکل بغیر کسی نصب العین کے ۔ ان سب کا آخری نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے ۔ ''بدھضمی'' کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ شعراء کا اتباع کرنے والوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ حاصل کرتے ہیں وہ ان کی فکر کا جزو نہیں بنتا بلکہ یونہی بلا نتیجہ ضائع ہو جاتا ہے ۔ چند الفاظ جو ذہن کو وقتی لذت دیکر موجب تباہی بن جاتے ہیں ۔

اَلْغَیَایَۃُ ۔ غبار آلودگی اور تاریکی جو چھاجائے ۔ اَلْغَایَۃُ جھنڈے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں پر سایہ کرتا ہے ۔ پھر کسی چیز کی انتہا کو بھی غَایَۃٌ کہنے لگ گئے کیونکہ جھنڈا فوج کا آخری سہارا اور ان

---

*تاج و راغب

کی ہستی کا آخری نشان ہوتا ہے۔ (ابن فارس)۔ [واضح رہے کہ غایۃ غ۔ی۔ی سے ہے لیکن اسے اسی باب میں لکھ دیا گیا ہے]۔ غَوِیَ الْفَصِیْلُ وَ غَوَیَ غَوَایَۃً وَ غَوِیٌ کے معنے ہیں اونٹ کے بچے نے بہت زیادہ دودھ پی لیا جس سے اسے بد ہضمی ہو گئی اور اس کا پیٹ بگڑ گیا *۔ اس سے بھی غَوَایَۃٌ کی تباہی کا اندازہ ہو سکتا ہے جس کا شکار مُتْرَفِیْنَ ہوتے ہیں۔ اسکے برعکس غَوِیَ الْجَدْیُ کے معنی ہیں بکری کے بچے کو دودھ سے روک دیا گیا حتی کہ وہ لاغر اور مرنے کے قریب ہو گیا*۔ اس سے بھی مکافاتِ عمل کی وجہ سے تباہی اور بربادی کا تصور سامنے آجاتا ہے (نیز دیکھئے عنوان ع۔ذ۔ب)۔

قرآن کریم میں اس مادہ کے الفاظ جس جس مقام پر آئے ہیں، ان میں ایک چیز بقدر مشترک ملیگی۔ یعنی اس میں، قوانین خداوندی کے اتباع کے بجائے، انسان اپنے مفاد، خیالات اور جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور حق کی راہ چھوڑ کر دوسری طرف جھک جاتا ہے۔ صحیح راستے سے بھٹک جاتا ہے۔ دھوکا کھا جاتا ہے۔ اس میں یہ تمام باتیں آجاتی ہیں۔

غ ی ب

ہر وہ چیز جو نگاہوں سے اوجھل ہو، غَیْبٌ کہلاتی ہے۔ اگر وہ چیز تصور میں موجود ہے لیکن نگاہوں سے پوشیدہ ہے تو پھر بھی غَیْبٌ ہی کہلائیگی۔ غَیْبٌ نشیبی زمین کو بھی کہتے ہیں۔ غَابَۃٌ۔ ایسی نشیبی زمین جس سے پہلے اونچی زمین آجائے اور اس لئے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ غَابَۃٌ۔ گھنے جنگل کو بھی کہتے ہیں جس میں درختوں کی وجہ سے زمین نظر نہیں آتی۔ گڑھے اور کنوئیں کی ترائی اور گہرائی، نیز ہر چیز جو کسی کو چھپا لے، اسی لئے غَیَابَۃٌ کہلاتی ہے (۱۲/۱۰)۔ غَیِّبَاتُ الشَّجَرِ۔ درختوں کی ان جڑوں کو کہتے ہیں جو زمین کے اندر پھیلی ہوئی ہوں اور نظر نہ آئیں**۔

قرآن کریم نے غَیْبٌ کے مقابلہ میں شَہَادَۃٌ کا لفظ لا کر (۵۹/۲۲) اس کے معنی واضح کر دئے ہیں۔ یعنی غَائِبٌ وہ ہے جو مشاہدہ میں نہ آیا ہو۔ جو مشہود نہ ہو۔

فَرَسٌ غَائِبٌ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو دوڑ میں اپنی کچھ قوت چھپا کر (Reserve) رکھ لے۔ اور فَرَسٌ شَاہِدٌ وہ جو ساری قوت کو نمایاں طور پر سامنے لے آئے***۔

---

*تاج۔ محیط۔ راغب۔ **تاج۔ ***لین۔

غَیْبٌ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کہیں موجود ضرور ہو لیکن آنکھوں سے اوجھل ہو۔ جب غَیْبٌ آنکھوں کے سامنے آجائیگا تو مَشْہُوْدٌ ہو جائیگا۔ اگر اس کا کہیں وجود ہی نہیں تو پھر اسے غَیْبٌ نہیں کہا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ غِیْبَۃٌ کسی کی عدم موجودگی میں اس کے کسی ایسے برے وصف کے ذکر کرنے کو کہتے ہیں جو اس میں موجود تو ہو لیکن اس کا ذکر کرنا اسے ناگوار گزرے۔ اگر وہ بات اس میں سرے سے موجود ہی نہ ہو تو اسے غِیْبَت نہیں بلکہ تُہْمَت کہا جائیگا*۔ غیبت کرنے کے لئے فعل اِغْتَابَ آتا ہے (۴۹/۱۲)۔

قرآن کریم نے اللہ کے لئے عَالِمُ الْغَیْبِ کہا ہے (۵۹/۲۲)۔ اس لئے ایمان بالغیب (۲/۳) کے معنی ”ان دیکھے خدا پر ایمان“ ہی نہیں۔ اس سے ایک تو مراد ہیں انسانی اعمال کے وہ نتائج جو مرتب تو اسی وقت ہونے شروع ہو جاتے ہیں جب وہ عمل سرزد ہو لیکن مشہود ہو کر سامنے اپنے وقت پر آتے ہیں۔ اسی طرح نظام خداوندی کے خوشگوار نتائج اس کے اندر تو ہر وقت موجود ہوتے ہیں لیکن جب تک اس نظام کو متشکل نہ کیا جائے وہ مشہود ہو کر سامنے نہیں آتے۔ مومنین کی جماعت اس نظام کے ان دیکھے نتائج پر یقین محکم رکھتی ہے اور اس یقین کے ماتحت اس نظام کے قیام کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دئے جاتی ہے۔ اگر انہیں اس نظام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان نہ ہو تو وہ اس کے لئے ایک قدم بھی نہ اٹھائیں۔ لہذا اس نظام کو عملاً متشکل کرنے کے لئے اس کے ان دیکھے نتائج پر ایمان اولین شرط ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (۲/۳)۔ ایک کسان، سردی۔ گرمی۔ دن رات۔ مسلسل محنت کرتا ہے، صرف اس لئے کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ بیج جسے اس نے بویا ہے ایک دن ثمربار ہو کر رہے گا۔ اگر اسے اس کا یقین نہ ہو تو وہ اس کھیتی کے لئے ایک دن بھی محنت نہ کرے۔ جو جماعت نظام خداوندی کو متشکل کرنے کے لئے پہلے پہل اٹھتی ہے اس کے سامنے اس نظام کے نتائج موجود نہیں ہوتے۔ یہ نتائج اس وقت سامنے آنے والے ہوتے ہیں جب وہ نظام متشکل ہو جائے۔ وہ اس نظام کی تشکیل کے لئے صرف اسی بناء پر قربانیاں دئے جاتے ہیں کہ انہیں اس کی بار آوری پر یقین محکم ہوتا ہے۔ اسی کو ایمان بالغیب کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے، اَلْغَیْبُ سے مراد وہ تمام اشیاء یا حقائق ہیں جو عالم محسوسات سے ماوراء ہیں۔ اس اعتبار سے اس میں خود ذات خداوندی بھی آجاتی ہے۔

سورہ ہود میں ہے وَلِلّٰہِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۱/۱۲۳)۔ اس سے مراد ہیں کائنات کی تمام وہ چیزیں اور قوتیں جو ہنوز انسان کی نگاہوں

*تاج۔

سے پوشیدہ ھیں لیکن مستقبل میں سامنے آجانے والی ھیں۔ انہی کو مَفَاتِیحُ الْغَیْبِ (۶/۵۹) اور غَآئِبَۃٌ (۲۷/۷۵) کہا گیا ھے۔ زمانہ مستقبل کے لئے یہ لفظ (۱۰/۲۰) میں آیا ھے اور گذشتہ زمانہ کی ان باتوں کے لئے جو لوگوں کی نگاھوں کے سامنے نہیں آئی تھیں (۳/۴۳) میں، جہاں کہا ھے کہ ذَٰلِکَ مِنْ أَنْبَآءِ الْغَیْبِ۔ سورہ یوسف میں ھے۔ لَمْ أَخُنْہُ بِالْغَیْبِ (۱۲/۵۲)۔ میرے پیٹھ پیچھے اسکی خیانت نہیں کی۔ غَیَابَۃٌ (۱۲/۱۰)۔ کنویں کی گہرائی۔

قرآن کریم میں ھے کہ اللہ کے سوا غیب کا علم کسی کو نہیں۔ قُلْ لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَیْبَ إِلَّا اللّٰہُ ... (۲۷/۶۵)۔ " ان سے کہو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اللہ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں جو غیب جانتا ہو"۔ حتی کہ رسولوں کو از خود غیب کا علم نہیں ہوتا۔ ان کا اعلان ہوتا ھے کہ لَا أَعْلَمُ الْغَیْبَ (۶/۵۰) " میں غیب نہیں جانتا "۔ البتہ اللہ تعالٰے انہیں غیب کی بعض باتوں کا علم وحی کے ذریعے عطا کر دیتا ھے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران میں ھے ذَٰلِکَ مِنْ أَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوحِیْہِ إِلَیْکَ (۳/۴۳) " یہ غیب کی ان باتوں میں سے ھے جنہیں اللہ نے تیری طرف وحی کیا ھے۔ چونکہ وحی تمام تر قرآن کریم کے اندر آگئی اور اس کے بعد اس کا سلسلہ ختم ہو گیا اس لئے اب کسی شخص کو غیب کا علم ہونے کا سوال ھی پیدا نہیں ہوتا۔ اس قسم کا دعوےٰ قیاس آرائیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اسے قرآن کریم نے رَجْمًا بِالْغَیْبِ (۱۸/۲۲) کہہ کر پکارا ھے۔ یعنی یونہی اندھیرے میں تیر چلانا۔ اٹکلیں دوڑانا۔ قیاس آرائیاں کرنا، جن میں سے کبھی اتفاقاً کوئی ٹھیک بھی نکل آتی ھے۔ البتہ تحقیقات کے ذریعے فطرت کی پوشیدہ قوتوں کا علم حاصل کیا جاسکتا ھے۔ جب تک وہ قوتیں دریافت نہیں ہونگی " غیب " سے متعلق ہونگی۔ جب دریافت ہو کر، محسوس طور پر سامنے آجائینگی، مشہود ہو جائینگی۔ لیکن بعض " غیب " ایسے ھیں جنہیں محسوسات کے دائرے میں لانا انسان کے حیطہ امکان سے باھر ھے۔ مثلاً ذات خداوندی یا مرنے کے بعد کی زندگی کی کنہ وحقیقت۔ وغیرہ۔

[نیز دیکھئے عنوان ش۔ ھ۔ د]

غ ی ث

اَلْغَیْثُ۔ بارش۔ وہ بارش جو دور دور تک ہو اور جو بڑی منفعت بخش ہو۔ وہ گھاس جو اس بارش سے پیدا ہو۔ غَاثَ اللّٰہُ الْبِلَادَ۔ خدا نے

شہروں پر پانی برسایا ۔ فَرَسٌ ذُوْغَيِّثٍ ۔ گھوڑا جو اپنی رفتار کو یکے بعد دیگرے نکالتا رہے اور اسکی رفتار کی تیزی بڑھتی جائے ۔ بِئْرٌ ذَاتُ غَيِّثٍ ۔ وہ کنواں جس کے اندر چشمہ ہو*۔

قرآن کریم میں ہے وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ (۳۱/۳۴)۔ خدا بارش برساتا ہے ۔ سورہ کہف میں ہے وَاِنْ يَسْتَغِيْثُوْا (۱۸/۲۹)۔ راغب کہتا ہے کہ یہ غَوْثٌ (مدد مانگنا) سے بھی ہو سکتا ہے اور غَيْثٌ (پانی مانگنا) سے بھی ۔ اسی لئے ہم نے اسے عنوان (غ ۔ و ۔ ث) میں بھی لکھ دیا ہے ۔

غ ی ر

غَيْرٌ ۔ عام طور پر سوا ، بجز اور علاوہ کے معنوں میں آتا ہے*۔ مَالَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهُ (۷/۵۹) ۔ تمہارے لئے خدا کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ۔

غَيَّرَ ۔ بدل دینا ۔ تبدیل کر دینا * ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ (۱۳/۱۱) ۔ اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا (جب تک .....)۔ تَغَيَّرَ ۔ بدل جانا * ۔ لَمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ (۴۷/۱۵)۔ جس کا مزہ نہیں بدلا جاتا ۔

قرآن کریم میں قوموں کے عروج و زوال کے متعلق اہم اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱ ; ۸/۵۳)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک کوئی قوم خود اپنی نفسیاتی کیفیت نہیں بدلتی اس کی حالت میں تبدیلی نہیں آتی ۔ لیکن اس میں ایک باریک پہلو ہے ۔ عرب اونٹوں پر سفر کرتے تھے ۔ انہی پر اپنا مال وغیرہ لادتے تھے ۔ اونٹ پر کجاوہ باندھا ہو یا مال لدا ہو ، چلتے چلتے وہ ضرور ڈھیلا ہو جاتا ہے ۔ کبھی کبھی ان چیزوں کو یا ان کی رسیوں کو مرمت کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے ۔ چنانچہ وہ لوگ چلتے چلتے اس بات کو ہمیشہ نگاہ میں رکھتے کہ کونسی رسی ڈھیلی ہو گئی ہے ۔ کونسا کجاوہ اپنی حالت پر نہیں رہا ۔ جہاں ضرورت سمجھتے فوراً اونٹ کو بٹھاتے اور اس کا کجاوہ یا بوجھ درست کر دیتے ۔ اسے وہ کہتے غَيَّرَ عَنْ بَعِيْرِهٖ ۔ اس نے اونٹ پر سے کجاوہ اتارا اور اسے درست کر (کے پھر باندھ) دیا ** ۔ يَاتَرَكَ الْقَوْمَ يُغَيِّرُوْنَ ۔ اس نے لوگوں کو اس حالت میں چھوڑا کہ وہ اپنے اونٹوں کے کجاووں (سامان سفر) کی دیکھ بھال کر رہے تھے تا کہ ہر چیز کو ٹھیک ٹھاک کرکے چلیں ** ۔

---

* تاج و محیط ۔ ** تاج ۔

قوموں کی زندگی میں بھی یہی حالت ہے - جو قوم اپنے سفر زندگی میں اپنے ساز و سامان پر نگاہ رکھتی ہے اور ساتھ کے ساتھ اس کی مناسب مرمت اور (Adjustment) کرتی جاتی ہے وہ حسن و خوبی سے منزل مقصود تک پہنچ جاتی ہے - لیکن جو اس سے غافل ہو جاتی ہے "اس کے اونٹ کا بوجھ" راستے میں گر پڑتا ہے -

ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں (۱) دو چیزوں کے درمیان اختلاف - اور (۲) اصلاح اور منفعت - چنانچہ غَارَهُمْ اللهُ بِالْغَيْثِ کے معنی ہیں خدا نے بارش سے ان کی حالت کو درست کر دیا - اور اَلْغِيْرَةُ اس رسد یا سامان خوراک کو کہتے ہیں جس سے اہل و عیال کی حالت سدھاری جائے - اس بنا پر اِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ ..... میں تبدیلی بغرض اصلاح ہوگی - غَارَ - يَغَارُ (عَلَيْهِ) - کے معنی ہیں غیرت کھانا - غَيْرَةٌ اسی سے اسم ہے - یعنی جو چیز اپنی ہو اس میں جب کوئی دوسرا دخیل ہو تو اس کے خلاف اپنی حفاظت کے لئے جو جذبہ پیدا ہوتا ہے اسے غَيْرَةٌ کہتے ہیں -

غ ی ض

غَاضَ - يَغِيْضُ - غَيْضًا - کسی چیز کا کم یا ناقص ہو جانا، نیز کسی چیز کو کم کر دینا (لازم و متعدی) - غَاضَ السَّمَاءُ - پانی جذب ہوگیا یا خشک ہو گیا - اَلْغَيْضُ - وہ نا تمام حمل جو ساقط ہو جائے * - ابن فارس نے اس کے معنے کسی چیز میں کمی ہونا اور اس کا تہ نشین ہوجانا بتائے ہیں - قرآن کریم میں ہے مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ($\frac{13}{8}$)- رحم جس جنین کو تکمیل تک نہیں پہنچاتے بلکہ نا مکمل گرا دیتے ہیں - یا جنہیں وہ بڑھاتے ہیں - اس سے وہ جنین مراد لئے جا سکتے ہیں جو معینہ مدت (نو ماہ) سے کم میں پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ جنین جو معینہ مدت (نوماہ) سے زیادہ مدت لیتے ہیں- نیز شکم مادر میں ایک بچہ یا اس سے زائد بچوں کا وجود بھی مراد لیا جا سکتا ہے - راغب نے مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ کے معنے کئے ہیں ، وہ جسے رحم بگاڑ کر ضائع کر دیتے ہیں - سورۂ ھود میں طوفان حضرت نوح ؑ کے ضمن میں ہے وَغِيْضَ الْمَآءُ ($\frac{11}{44}$) - پانی کم ہو گیا - یا خشک ہو گیا -

* تاج و راغب -

غ ی ظ

اَلْغَیْظُ - غضب کو کہتے ہیں * - راغب نے کہا ہے کہ غَیْظ شدید ترین غضب کو کہتے ہیں یعنی وہ حرارت جو انسان اپنے دل کے دوران خون تیز ہونے پر محسوس کرتا ہے ** - بعض نے کہا ہے کہ ابتدائی غضب یا جوش غضب کو غَیْظ کہا جاتا ہے - دوسروں کا خیال ہے کہ غَیْظ چھپا ہوا غصہ ہوتا ہے اور غَضَب ظاہر - یا یہ کہ غَضَب صاحب قدرت آدمی کے غصے کو کہتے ہیں اور غَیْظ عاجز آدمی کے غصے کو * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اُس کرب اور بیچنی کے ہوتے ہیں جو کسی کو دوسرے کی طرف سے پہنچے - غَاظَہٗ - اسے غصے میں لایا - برہم کیا - (۳۲/۱۵) - غَائِظ - وہ جو کسی کو غصے میں لائے - اسکی جمع غَائِظُوْنَ ہے (۲٦/۵۵) - اَلتَّغَیُّظُ - اظہار غیظ جو کبھی ایسی آواز کے ساتھ ہوتا ہے جو سنائی دے ** - یعنی جوش و خروش - (۲۵/۱۲) -

---

*تاج **راغب -

ف

فَ (حرف)

فَ - یہ حسب ذیل مفہوم پیدا کرتا ہے :-

(۱) ترتیب کے لئے۔ یعنی یہ ہؤا - پھر یہ ہؤا - پھر یہ ہؤا - جیسے ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰماً فَكَسَوْنَا الْعِظٰامَ لَحْماً . . . . (۲۳/۱۴)۔پھرہم نطفہ کو لوتھڑا بناتے ہیں، پھرلوتھڑے کو گوشت کاٹکڑا، پھر گوشت کے ٹکڑے (میں) ہڈیاں پیدا کرتے ہیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ لیکن یہ کلیہ نہیں کہ فَ۔ ہر حال میں ترتیب کے لئے آتا ہے۔ بعض اوقات ترتیب نہیں بھی پائی جاتی۔ مثلاً سورہ اعراف میں ہے وَكَمْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنٰهَا فَجَاءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتاً أَوْ هُمْ قَائِلُوْنَ (۷/۴) - اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا سو ہمارا عذاب ان پر رات کے وقت آیا ، یا اس وقت جب وہ دوپہر کے وقت آرام کر رہے تھے - اس میں ترتیب نہیں ہے -

(۲) تعقیب کے لئے۔ یعنی ایک واقعہ کے بعدجتنی مدت میں دوسرا واقعہ ہونا ہو وہ اس مدت میں واقع ہوجائے تواس کا بھی۔فَ - سے اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً - تَزَوَّجَ فَوُلِدَ لَهُ ۔ اس نے شادی کی - پھر مدت صحیح کے بعد اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا - اگر وہ مدت کم و بیش ہو تو پھر فَ - نہیں لایا جائے گا۔

سورہ مریم میں ہے۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَاناً شَرْقِيّاً - فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَاباً فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَراً سَوِيّاً (۱۹/۱۶-۱۸) . . . . فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَاناً قَصِيّاً - فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ . . . . . (۱۹/۲۲-۲۳) فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَّا تَحْزَنِي . . . . . . (۱۹/۲۴-۲۵) - '' اور قرآن کریم میں قصۂ مریم کو

بیان کر - جب وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر جانب مشرق ایک جگہ چلی گئی۔ پس اس نے ان سے پردہ کر لیا۔ سو ہم نے اپنی "روح" کو اس کی طرف بھیجا۔ تو وہ اسے ایک صحیح سالم انسان کی شکل میں متمثل ہو کر دکھائی دیا . . . . پھر مریم کو اس (بچہ) کا حمل ہوا۔ سو وہ اسکے ساتھ الگ ہو کر دور چلی گئی۔ پھر درد زہ اسے کھجور کے درخت کی طرف لے آیا . . . . پھر اسے نچلی سمت سے ایک آواز آئی کہ غم نہ کر . . . ." ان آیات سے مطلب یہ نہیں کہ یہ تمام واقعات ، یکے بعد دیگرے ، مسلسل ، ایک ہی وقت میں ہوتے چلے گئے ، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایک واقعہ کے بعد دوسرے واقعہ کے لئے جسقدر مدت درکار ہوتی ہے ، ٹھیک اس مدت کے بعد دوسرا واقعہ ہوا۔

(۳) ایک واقعہ کا دوسرے واقعہ کے لئے سبب بن جانا - مثلاً میں نے اسے تھپڑ مارا تو اسے غش آ گیا - قرآن کریم میں ہے - فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ (۲۸/۱۵) - پس موسیٰؑ نے اسے مارا اور اس کا کام تمام کر دیا - یعنی اس کی موت حضرت موسیٰ کی مار سے واقع ہوئی -

(۴) واو عاطفہ (اور) کے معنوں میں — فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ (۲/۳۶) پس شیطان نے ان دونوں کو اس سے پھسلا دیا اور اس طرح انہیں وہاں سے نکال دیا جس میں وہ تھے - (اگرچہ فَأَخْرَجَ میں ف ، سبب کے لئے بھی ہو سکتا ہے -)

(۵) جب یہ اِنْ (اگر) کے بعد آئے تو اس کے معنی۔ تو۔ کے ہوتے ہیں۔ جیسے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي (۳/۳۱) اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو - یا مثلاً (اِنْ) کے بغیر ہی - تو - کے معنوں میں - وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ (۳/۱۱۵) اور جو کچھ وہ عمل خیر کریں گے تو اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی (اس کا بدلہ ضرور دیا جائے گا)۔

(۶) بعض اوقات یہ زائد بھی ہوتا ہے - بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ (۳۹/۶۶) بلکہ اللہ ہی کی محکومی اختیار کرو -

(۷) بعض اوقات یہ قسم کی تاکید کے لئے آ جاتا ہے - مثلاً قَالَ فَبِعِزَّتِكَ (۳۸/۸۲) اس نے کہا تیرے غلبہ و اقتدار کی قسم - (یہاں فَ کو زائد بھی کہا جا سکتا ہے - یعنی یہ محض بات کے تسلسل کے لئے آیا ہے)۔

ف أ د

فَاَدَ الْخُبْزَ يَفْاَدُهٗ - روٹی کو بھوبھل میں سینکا - فَاَدَ اللَّحْمَ بِالنَّارِ - گوشت کو آگ میں بھون لینا - اَلْخُبْزُ الْمَفْئُوْدُ - بھوبھل میں پکائی ہوئی روٹی - اَلْفَئِیْدُ - آگ* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بخار - شدت اور حرارت کے ہیں -

قرآن کریم میں دل کے لئے قَلْبٌ اور فُؤَادٌ (جمع اَفْئِدَةٌ) آیا ہے (۱۱۱/۶) - اگرچہ ان دونوں کے استعمال میں کوئی خاص خطِ امتیاز نہیں کھینچا جاسکتا ، لیکن (جیسا کہ راغب نے لکھا ہے) دل کو فُؤَادٌ اس وقت کہینگے جب اس میں بھڑکنے کے معنے پائے جائیں** - تاج نے لکھا ہے کہ فاد کے اصلی معنی ہلنا اور ہلانا ہیں - اس سے فؤاد دل کو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بہت ہلتا اور دھڑکتا رہتا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسانی جذبات کی طرف اشارہ ہوگا تو فُؤَادٌ آئے گا اور جب انسانی فکر کے متعلق بات ہوگی تو قَلْبٌ - چنانچہ فَاَدَ زَیْدًا کے معنی ہیں زید کے دل پر چوٹ لگائی - فَاَدَ الْخَوْفُ فُلَانًا - فلاں آدمی کو خوف نے بزدل بنا دیا* - ان چیزوں کا تعلق جذبات سے ہے -

لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) - قَلْبٌ اور فُؤَادٌ کی یہ تقسیم عمومی ہے - ورنہ ان دونوں کا استعمال دل کے معنوں میں ہوتا ہے - قرآن کریم میں سیاق و سباق کے رو سے دیکھنا چاہئیے کہ کس مقام پر عقل وفکر مراد ہے اور کس مقام پر جذبات -اسی فرق کی رو سے قَلْبٌ اور فُؤَادٌ کے معنی کرنے چاہئیں - ہمارے ہاں کے لفظ ''دل'' کے مقابلہ میں انگریزی کا لفظ (Mind) زیادہ جامع ہے -

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ - اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶) ''جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو- یاد رکھو- سماعت - بصارت - اور فؤاد ان میں سے ہر ایک کی بابت پوچھا جائے گا'' - اس میں سمع اور بصر، حواس(Sense Perceptions) کے ذرائع ہیں اور فؤاد سے مراد (Mind) ہے یا جذبات - (Mind) اس لئے کہ حواس کے ذریعے جو اطلاعات بہم پہنچتی ہیں وہ ان سے نتیجہ نکالتا ہے - اور ''جذبات'' اس لئے کہ اگر

*تاج - **راغب -

ان اطلاعات کو جذبات متاثر کر دیں تو انسان کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا ۔ اسی لئے قرآن کریم نے ایمان کے لئے حواس اور فؤاد دونوں کی ضرورت بتائی ہے ۔ یعنی ان حقائق کو عقل و فکر سے پرکھا جائے اور دل کے جھکاؤ سے قبول کیا جائے ($\frac{۶}{۱۱۱-۱۱۴}$) ۔

سورۃ ھود میں ہے کہ انبیائے سابقہ کے احوال و کوائف اس لئے بیان کئے جاتے ہیں کہ مَا نُثَبِّتُ بِہٖ فُؤَادَکَ ($\frac{۱۱}{۱۲۰}$) ۔ اس سے ہم تیرے دل کو مضبوط کرتے ہیں ۔ سورۃ قصص میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے جب بچے کو دریا میں بہا دیا تو اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰی فٰرِغًا ($\frac{۲۸}{۱۰}$) تو اس کا دل صبر و ضبط سے خالی ہوگیا ۔ اس کے بعد ہے لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰی قَلْبِھَا ($\frac{۲۸}{۱۰}$)۔ اگر ہم اس کے قلب کو مضبوط نہ کر دیتے تو وہ اپنی بیچینی کا اظہار کر دیتی۔ (اس کے ساتھ ق ۔ ل ۔ ب کا عنوان بھی دیکھئے)

ف أ و

اَلْفِئَۃُ ۔ جماعت ۔ اس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد ایک دوسرے کی طرف تعاون و تناصر کے لئے رجوع کریں۔ نیز اس جماعت کو بھی کہتے ہیں جو فوج کے پیچھے ٹھہری ہوئی ہوتی ہے تاکہ شکست کے وقت اس کی طرف پناہ لی جاسکے* ۔ ($\frac{۸}{۱۶}$) ۔ اِنْفِیَاءٌ ۔ کھل جانا* ۔

ف ت أ

مَافَتَأَ ۔ مَافَتِیءَ ۔ مَا اَفْتَأَ یَفْعَلُ کَذَا ۔ وہ (اس کام کو) برابر کرتا رہا ۔ اسے ہمیشہ کرتا رہا۔ فَتِیءَ عَنِ الْاَمْرِ ۔ وہ اس بات سے رک گیا ۔ اہل لغت نے تصریح کی ہے کہ فَتِیءَ سے پہلے ہمیشہ نفی آتی ہے**۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں ہے ۔ تَاللّٰہِ تَفْتَؤُا تَذْکُرُ یُوْسُفَ ($\frac{۱۲}{۸۵}$) ۔ تو وہاں تَفْتَؤُ سے پہلے لا محذوف ہے۔ یعنی یہ اصل میں لَاتَفْتَؤُ ہے ۔ اہل عرب اس سے عام طورپر حرف نفی محذوف کر دیتے ہیں** ۔ آیت کے معنی ہیں ''تم یوسف کی یاد سے کبھی باز نہیں آؤ گے ۔ اسے کبھی نہیں بھلاؤ گے ۔ ہمیشہ یاد کرتے رہوگے'' ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی تسلسل کے ہوتے ہیں ۔ یعنی کسی کام کو مسلسل کئے جانا ۔

*محیط و تاج ۔ **تاج و محیط و راغب ۔

ف ت ح

فَتَحَ - يَفْتَحُ فَتْحًا - کھول دیا۔ فَتَّحَ - کھولنے میں شدت کے لئے آتا ہے - اِنْفَتَحَ - کھل گیا* -

اَلْفَتْحُ - زمین کے بالائی حصہ پر بہتا ہؤا پانی- مدد - نُصْرت - دوجھگڑنے والوں کے درمیان فیصلہ کر دینا - (یعنی بات کھول دینا کہ کون جیتا ہے)۔ فَتَحَ الْحَاكِمُ بَيْنَهُمْ - حاکم نے ان کے درمیان فیصلہ کردیا - اَلاِسْتِفْتَاحُ - کھلوانا چاہنا - فیصلہ یا غلبہ طلب کرنا - مدد طلب کرنا - (۸۹/۲) - اَلْمِفْتَحُ - خزانہ - اَلْفَتَّاحُ - حاکم - بڑا فیصلہ کرنے والا ، مشکل اور پُر پیچ معاملات کو کھولنے والا اور حقائق کو ظاہر کرنے والا - خدا کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے - (۲۶/۳۴) - اَلْفَتْحُ - رزق جسے خدا کسی کے لئے کھول دے* -

سورۃ بقرہ میں ہے - بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ (۷۶/۲) - وہ باتیں جنہیں اللہ نے تم پر واضح کیا ہے - جن کے دروازے تم پر کھول دئے ہیں -

سورۃ اعراف میں ہے - رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا (۸۹/۷) - اے ہمارے نشو و نما دینے والے ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان آخری فیصلہ کن بات لے آ - سورۃ ابراہیم میں ہے وَاسْتَفْتَحُوْا - (۱۵/۱۴) - انہوں نے آخری فیصلہ کن بات طلب کرلی - سورۃ سجدہ میں اسی کو يَوْمَ الْفَتْحِ (۲۹/۳۲) کہا گیا ہے - یعنی فیصلہ کن انقلاب کی گھڑی - سورۃ قصص میں قارون کے خزانوں کے لئے مَفَاتِحُ کا لفظ آیا ہے (۷۶/۲۸) - سورۃ نور میں ہے اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَفَاتِحَهٗ (۶۱/۲۴) جن کے مال واسباب کے تم نگہدارہو- یا جن پر تمہارا کنٹرول ہو- (۲/۳۵) میں یہ مادہ اِمْسَاكٌ (روکنے) کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے -

سورۃ الفتح میں ہے - اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (۱/۴۸) - اسکے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ ہم نے تیرے لئے زندگی کی راہیں کھول دی ہیں - یا علوم و معارف کے دروازے (وحی کے ذریعے) کھول دئے ہیں** - یا ایک واضح ، فیصلہ کن انقلاب عطا کردیا ہے - بہر حال ، قوانین خداوندی کی رو سے مشکلات کا رفع ہو جانا ، رکاوٹوں کا دور ہو جانا ، زندگی کی راہیں کھل جانا ، حقائق کا منکشف ہو جانا ، ایک فیصلہ کن انقلاب برپا ہوجانا اور اسطرح حق و باطل کا نکھر کر الگ الگ ہوجانا ، فَتْحٌ ہے۔

*تاج - **راغب -

ف ت ر

فَتَرَ - يَفْتُرُ - فُتُوْراً - تیزی کے بعد ساکن ، سختی کے بعد نرم ، ہو جانا - کسی چیز کا دھیما پڑ جانا - اسکی شدت میں کمی آجانا - فَتَرَ الْمَآءُ - پانی کی گرمی کم ہو گئی - اَلْفَاتِرُ - نیم گرم پانی کو کہتے ہیں - فَتَرَ جِسْمُہٗ - اسکے جسم کے جوڑ بند ڈھیلے پڑ گئے - طَرْفٌ فَاتِرٌ - کمزور نگاہ - (یہ اچھی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے - جیسے چشم نیم باز)- اَفْتَرَ الشَّرَابُ - شراب خوار کے نشہ کی مستی ختم ہو گئی ، اور وہ کمزور ہونے لگا * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز میں کمزوری آجانا -

سورۂ انبیاء میں کائناتی قوتوں (ملائکہ) کے متعلق ہے - يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ (۲۱/۲۰) - وہ ہمیشہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں تہایت تیزی سے سرگرم عمل رہتے ہیں اور ان میں کبھی سستی نہیں آتی - فَتَّرَالْعَذَابَ - عذاب کو کم کیا یا اسکے زور کو ہلکا کیا - (۴۳/۷۵) -

نبی اکرمؐ کی بعثت کے متعلق ہے کہ آپ عَلٰی فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ (۵/۱۹) تشریف لائے - یعنی اس زمانہ میں جبکہ گذشتہ انبیاء بنی اسرائیل کی رسالت کا اثر دھیما پڑ چکا تھا - رسول اللہؐ سے پہلے آسمانی تعلیم میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لئے ایک نئے نبی کی ضرورت ہوتی تھی ، کیونکہ علاوہ دیگر وجوہ و عناصر) اس فَتْرَةٌ کے زمانہ میں سابقہ نبی کا پیغام بھی اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہتا تھا - لیکن رسول اللہؐ کے بعد اس دعوت میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لئے کسی نبی کی ضرورت نہیں رہی - اسلئے کہ حضورؐ کا پیغام قیامت تک اپنی اصلی شکل میں موجود رہیگا - لہذا اس میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لئے اس پیغام (قرآن کریم) کو ابھار کر سامنے لانے کی ضرورت ہوگی ، اور یہ کام وارثین کتاب (امت محمدیہ) کے کرنے کا ہوگا - اس کا عملی طریقہ یہ ہوگا کہ پھر سے اسی نظام کو قائم کر دیا جائے جسے نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کے مطابق قائم کیا تھا -

ف ت ق

فَتَقَہٗ - يَفْتِقُ - (يَفْتُقُ) - اس نے اسکو پھاڑ دیا * -

* تاج -

فَتَقَ الثَّوْبَ - کپڑے کو ادھیڑ دیا اور اسکے ٹکڑوں کو الگ الگ کر دیا**- اَلْفَتْقُ - دو ملی ہوئی چیزوں کو الگ کر دینا***- کسی چیز میں کھلاپن اور کشادگی پیدا ہو جانا (ابن فارس)- قرآن کریم میں ارض وسماوات کے متعلق ہے - كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (۲۱/۳۰) - پہلے یہ تمام کائنات ایک ہی ہیولٰی تھی - بعد میں اس سے مختلف کُرے پیدا ہو گئے (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ر - ت - ق)-

ف ت ل

فَتَلَ - يَفْتِلُ - (رسی وغیرہ کو) بٹنا - بل دینا****- ابن فارس نے یہی اس کے بنیادی معنے بتائے ہیں - اَلْفَتِيْلُ - وہ باریک سی سفید چیز جو کھجور کی گٹھلی کے شگاف میں ہوتی ہے - عرب اس سے قلیل اور حقیر شے کی مثال دیا کرتے ہیں*- قرآن کریم میں ہے - وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (۴/۴۹)- ان کی ذات کی نشوونما میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کی جائےگی- انہیں پورا پورا بدلہ دیا جائیگا - (۱۷/۷۱)

ف ت ن

فَتْنٌ کے بنیادی معنی ہیں سونے یا چاندی کو آگ میں گلانا تاکہ اس کا کھوٹ الگ ہو جائے - چنانچہ وَرِقٌ فَتِيْنٌ جلائی تپائی ہوئی چاندی کو کہتے ہیں - اور دِيْنَارٌ مَفْتُوْنٌ وہ دینار جو آگ میں تپایا گیا ہو*- اسی سے اس کے معنی کسی چیز کی اصلیت کو ظاہر کرنے کے آتے ہیں - چنانچہ اَلْفَتَّانَةُ - کسوٹی کو کہتے ہیں جس پر سونا چاندی کو گھس کر انکی اصلیت کو ظاہر کیا جاتا ہے**- یہیں سے فِتْنَةٌ کے معنی تاؤ دیکر پرکھنے اور آزمائش کرنے کے آتے ہیں*-

نیز اس کے معنی جلانے کے بھی آتے ہیں - فَتَنَتِ النَّارُ الرَّغِيْفَ - آگ نے روٹی جلا دی - اس سے فِتْنَةٌ کے معنی عذاب، مصیبت اور جنگ کے بھی آتے ہیں - نیز گمراہ کر دینے کے*-

فَتَنَهُ - اَفْتَنَهُ کے معنی ہیں اسے پسند کر لیا - اسکو پسند آگیا - چنانچہ کہا گیا ہے کہ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۱۰/۸۵) کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان لوگوں کو ہم پر غلبہ حاصل ہو گیا تو یہ اس فریب میں مبتلا رہینگے کہ یہ ہم سے بہتر ہیں اس لئے اپنے کفر کو

* تاج - ** محیط - *** راغب - ****تاج و ابن فارس-

اور زیادہ پسند کرنے لگ جائیں گے *۔ یا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اس قوم کا تختہ مشق مت بنا۔

قرآن کریم میں یہ مادہ جنگ کے معنوں میں (۴/۹۱) آیا ہے۔ اور جنگ کے مصائب و مشکلات کے معنوں میں یُفْتَنُوْنَ (۹/۱۲۶) میں۔ صحیح راستے سے ہٹا کر غلط راستے پر لگا دینے کے معنوں میں یہ مادہ (۳۷/۱۶۲) میں آیا ہے۔ نیز فِتْنَۃٌ (۳۹/۴۹) میں اس کے معنی گمراھی کے ہیں۔ یہی معنی اس مادہ کے (۵/۴۹) اور (۱۷/۷۳) میں ہونگے جہاں اس سے مراد صحیح راستے سے ہٹا دینا ہیں۔ خَیْرٌ کے مقابلہ میں فِتْنَۃٌ (۲۲/۱۱) میں آیا ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے وَفَتَنّٰکَ فُتُوْنًا۔(۲۰/۴۰) ہم نے تجھے کئی کٹھالیوں میں سے گذار کر تیری تربیت کی اور اسطرح تجھے مقام نبوت کے شایان شان بنایا۔ یعنی فِتْنَۃٌ کے معنی ہیں ایسے مواقع بہم پہنچانا جن سے انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نمود ہو جائے اور انسان پر ظاہر ہو جائے کہ اس کی کس حد تک ربوبیت ہوئی ہے۔ جہانتک انسانی معاشرہ کا تعلق ہے اس کا قوانین خداوندی کے مطابق نہ رہنا، فِتْنَۃٌ ہے۔ نیز فتنہ انگیزی (۲/۱۹۳ ; ۸/۳۹)۔ بہ ہیئت مجموعی، یہ لفظ قرآن کریم میں ان رکاوٹوں کے لئے آیا ہے جو دین خداوندی کی راہ میں حائل کی جاتی ہیں۔

ایذا، مصیبت اور تکلیف کے معنوں میں (۲۲/۱۱) میں۔ عذاب (سزا) کے معنوں میں (۳۷/۶۳) میں۔ دھوکا اور فریب کے معنوں میں (۲/۱۰۲) میں۔ نیز المَفْتُوْنُ (۶۸/۶) میں بمعنی فریب خوردہ و گمراہ۔ سزا دینے کے معنوں میں یہ مادہ (۵۱/۱۳) میں آیا ہے اور (۶/۲۳) میں لفظ فِتْنَۃٌ معذرت اور حجت کے معنوں میں آیا ہے۔

ف ت ی

اَلْفَتَاءُ۔ جوانی۔ شباب۔ اَلْفَتِیُّ۔ نوجوان۔ اس کے بعد یہ لفظ غلام کے لئے استعمال ہونے لگا، خواہ وہ کسی عمر کا ہو۔ یعنی فَتًی۔ غلام، اور فَتَاۃٌ لونڈی **۔

فَتًی۔ بمعنی نوجوان لڑکا (۱۸/۶۰) میں آیا ہے۔ اس کا تثنیہ فَتَیَانِ ہے (۱۲/۳۶)۔ فِتْیَۃٌ جمع ہے (۱۸/۱۰)۔ نیز فِتْیَانٌ بھی جمع آتی ہے۔ (۱۲/۶۲)۔ فَتَاۃٌ کی جمع فَتَیَاتٌ آتی ہے۔ (۴/۲۵)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دو ہیں۔ (۱) تازگی اور نیا ہونا۔ شباب اور نوجوانی کا مفہوم اسی سے ہے۔ اور (۲) فیصلہ یا حکم کو واضح کر دینا۔

---

*تاج۔ **تاج و محیط۔

اَفْتٰی - کسی بات کا حکم بیان کر دینا - فتوی دیدینا - کسی سوال کا جواب دیدینا - کہتے ہیں کہ اسکی اصل فَتیٌ یعنی نوجوان ہے * جو قوت و تازگی رکھتا ہے - گویا فتوی دینے کے لئے علمی قوت و تازگی کی ضرورت ہے ، یا پھر یہ اَلْفُتُوَّۃُ سے ہے جس کے معنی سخاوت کے ہیں * - اَفْتٰی حکم دینا - قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ (۴/۱۲۷) - اِسْتَفْتٰی - فتویٰ (حکم یا فیصلہ) طلب کرنا (۴/۱۲۷) -

ف ج ج

اَلْفَجُّ - دو پہاڑوں کے درمیان وسیع راستہ - فِجَاجٌ اسکی جمع ہے** - قرآن کریم میں ہے مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (۲۲/۲۷) - " ہر دور دراز راستے سے " - اَلْفُجَاجُ بھی اسی کو کہتے ہیں - اَلْفَجُّ - دو چیزوں کے درمیان کشادگی کر دینے اور فاصلہ بڑھا دینے کو کہتے ہیں - اَلْفَجَّۃُ - دو پہاڑوں کے درمیان کشادگی ** - قرآن کریم میں ہے وَجَعَلْنَا فِیْھَا فِجَاجًا (۲۱/۳۱) - ہم نے پہاڑوں میں کشادہ راستے بنائے -

ف ج ر

اَلْفَجْرُ کے اصلی معنی پھاڑنے اور شق کر دینے کے ہیں - نیز اس میں میلان اور جھکاؤ (ایک طرف ہٹ جانے) کا مفہوم بھی ہوتا ہے - چنانچہ پہلے مفہوم کی رو سے فَجَرَہٗ - یَفْجُرُہٗ کے معنی ہیں پانی کو پھاڑ کر بہایا - فَجَّرَہٗ تَفْجِیْرًا - شدت سے پانی کو پھاڑ کر بہایا - اَفْجَرَ الْیَنْبُوْعَ - چشمہ کو پھاڑ کر نکالا - اِنْفَجَرَتْ عَلَیْھِمُ الدَّوَاھِیُ - ان پر ہر طرف سے مصیبتیں پھوٹ پڑیں - اَلْفَجْرُ - صبح کی روشنی جو تاریکی کو پھاڑ کر باہر نکل آتی ہے - روشنی کے اعتبار سے طَرِیْقٌ فَجْرٌ واضح راستے کو کہتے ہیں اور پھٹنے کے مفہوم سے اَلْفِجَارُ خود راستوں کو کہتے ہیں * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی کسی چیز میں کشاد اور کھلا پن ہونے کے ہیں -

ایک طرف ہٹ جانے یا جھک جانے کے مفہوم سے فَجَرَ الرَّاکِبُ فُجُوْرًا کے معنی ہیں سوار اپنی زین سے ایک طرف ہٹ گیا - اور فَجَرَ عَنِ الْحَقِّ کے معنی ہیں وہ حق سے ہٹ گیا * - فَاسِقٌ وفَاجِرٌ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے -

---

*تاج و محیط - **تاج -

لیکن اَلْفَجْرُ کے معنی مال و دولت کی فراوانی اور جُود و سخا اور عطیہ کے بھی ہیں ۔ اور اَلْفَاجِرُ ۔ مال دار آدمی کو بھی کہتے ہیں ۔ نیز فِجَارَاتُ الْعَرَبِ ۔ عربوں کے مفاخرات کو۔ فَجَرَ الرَّجُلُ ۔ آدمی سخی ہو گیا ۔ تَفَجَّرَ بِالْكَرَمِ ۔ اس نے بہت سخاوت کی*۔

قرآن کریم میں پہاڑ سے چشمے پھوٹ نکلنے کے لئے یہ مادہ (۲/۶۰ ; ۲/۷۴) میں آیا ہے ۔ زمین سے چشمے بہہ نکلنے کے لئے (۵۴/۱۲) میں ۔ اور نہریں نکلنے کے لئے (۱۸/۳۳) میں ۔

سورۃ شمس میں نفسِ انسانی (انسانی ذات) کے متعلق ہے ۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۹۱/۸) اس کے معنے یہ کئے جاتے ہیں کہ خدا نے انسان کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز کا علم رکھ دیا ہے ۔ (یہ مفہوم کسطرح قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے اس کےلئے ل ۔ ھ ۔ م کا عنوان دیکھئے) ۔ اس مقام پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اس آیت میں فُجُوْرَهَا اور تَقْوٰهَا کہا گیا ہے جو نفس انسانی (انسانی ذات Human Personality) کی دو کیفیتوں کا نام ہے ۔ فَجَرَ کے معنی پھاڑ دینا ہیں۔ لہٰذا انسانی ذات کا فُجُوْرُ اس کا منتشر (Disintegrate) ہو جانا ہے ۔ اور تَقْوٰهَا چونکہ اس کے مقابل میں آیا ہے اس لئے اس کے معنے ہوں گے انسانی ذات کا تشتت و انتشار سے محفوظ رہنا ۔ (Disintegrate نہ ہونا) ۔ اسی وجہ سے دوسری جگہ مُتَّقِيْنَ کے مقابلہ میں فُجَّارٌ آیا ہے (۳۸/۲۸) ۔ فَاجِرٌ کا لفظ (۷۱/۲۷) میں آیا ہے جس کے معنی ہیں خدا کی راہ سے ہٹا ہوا ۔

درحقیقت ، جو انسان خدا کی راہ سے ہٹتا (اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا) ہے اس کی ذات (Personality) میں انتشار (Disintegration) واقع ہو جاتا ہے ۔ اس لئے فاجر وہ ہے جس کی ذات مستحکم ہونے کے بجائے منتشر ہو جائے ۔ نشو و نما یافتہ ذات (Developed Personality) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ (Integrated) ہوتی ہے ۔ لہٰذا سورہ شمس کی مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ انسانی ذات میں بننے اور بگڑنے کی صلاحیت رکھدی گئی ہے۔ اب جو شخص چاہے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت سے اپنی ذات کی نشو و نما کر کے اسے مستحکم کر لے ۔ اورجو چاہے اس سے منحرف ہو کر اسے منتشر و متفرق (Disintegrate) کر دے ۔ نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی صلاحیت انسانی ذات میں نہیں ۔ اسکی تمیز صرف وحی کی رو سے ہو سکتی ہے ۔

*تاج و محیط ۔

یعنی وحی بتا سکتی ہے کہ خیر کسے کہتے ہیں اور شر کیا ہے ۔ وحی کی راہ نمائی کے بغیر انسان مطلق خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتا ۔ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو وحی کی روشنی کے بغیر خیر اور شر میں تمیز کر سکے۔

ف ج و

اَلْفَجْوَۃُ ۔ کشادگی ۔ دو چیزوں کے درمیان کھلی جگہ ۔ زمین کا وسیع حصہ ۔ فراخ جگہ ۔ وسیع میدان اور صحن ۔ فَجَا بَابَہٗ فَجْوًا ۔ اس نے اپنا دروازہ کھول دیا ۔ اَلْفَجَا ۔ دونوں رانوں یا گھٹنوں یا پنڈلیوں کے درمیان کا فاصلہ* ۔

قرآن کریم میں اصحاب کہف کے متعلق ہے ۔ وَ ھُمْ فِیْ فَجْوَۃٍ مِنْہُ (۱۸/۱۷) ۔ وہ اس غار کے اندر ایک کھلی جگہ میں تھے ۔

ف ح ش

اَلْفُحْشُ ۔ حد سے بڑھ جانا ۔ زیادتی کر بیٹھنا ۔ کسی بات کا حد سے تجاوز کر جانا ۔ گفتگو میں آداب و احترام کے حدود پھاند جانا ۔ فَحُشَ الْاَمْرُ ۔ معاملہ حد سے تجاوز کر گیا ۔ اَلْفَاحِشُ ۔ حد سے تجاوز کر جانے والا** ۔ قرآن کریم میں فَحْشَآءُ ۔ عَدْلٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۶/۹۰) ۔ اور قِسْطٌ کے مقابلہ میں بھی (۷/۲۸-۲۹) ۔ سورۂ احزاب میں یہ لفظ قَنَتَ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ (۳۳/۳۰-۳۱) ۔ قَنَتَ کے معنی قوانین خداوندی کی اطاعت ہیں ۔ (دیکھئے عنوان ق ۔ ن ۔ ت) ۔ اس لئے فُحْشٌ کے معنی حدود خداوندی سے تجاوز اور سرکشی کے ہیں ۔ یعنی خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی فُحْشٌ میں داخل ہے ۔ یا کوئی ذلیل اور شرمناک حرکت (۳/۱۳۴) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں برائی یا شناعت کے ہیں ۔

فَحْشَآءُ کے معنی بخل ہیں ۔ بخیل کو فَاحِشٌ کہتے ہیں** ۔ اَفْحَشَ اس نے بخل کیا*** ۔ ان معنوں میں یہ لفظ قرآن کریم میں فَضْلٌ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ (۲/۲۶۸) ۔ فَضْلٌ کے معنی ہیں رزق کی کشائش ، وسعت ۔ لہذا فُحْشٌ کے معنی ہونگے رزق کی تنگی ۔ کمی ۔ یا اس کے خرچ میں ہاتھ روک لینا ۔ اسی کو بخل کہتے ہیں۔ یا اس آیت (۲/۲۶۸) میں فَحْشَآءُ کے معنی ہونگے ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنا ۔

---

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

اَلْفَوَاحِشُ - فَاحِشَةٌ کی جمع ہے ۔ اور اَلْفَحْشَاءُ ، فَاحِشَةٌ کا اسم ہے* ۔ یعنی حدود فراموشی ۔

سورۃ بنی اسرائیل میں زنا کو فَاحِشَةٌ میں شمار کیا گیا ہے (۱۷/۳۲) ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں فَاحِشَةٌ کا لفظ آیا ہے وہاں اس کے معنی زنا ہی کے ہونگے ۔ سورۃ انعام میں ہے ''وَلَا تَقْرَبُوْا الْفَوَاحِشَ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ (۶/۱۵۲) ۔ ''تم فواحش کے قریب مت جاؤ ۔ جو ان میں سے ظاہر ہو اور جو چھپی ہوئی ہو'' ۔ ان کے قریب مت جاؤ ۔ لہذا فواحش میں ہر قسم کی حدود شکنی اور بے حیائی آجاتی ہے ۔ اسی بنیاد پر سورۃ نساء میں جہاں فرمایا کہ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْکُمْ (۴/۱۵) ۔ ''اور تمہاری عورتوں میں سے جو فاحشہ کی مرتکب ہوں تو ان کے خلاف اپنوں میں سے چار گواہ لاؤ'' ۔ تو اس میں فَاحِشَةٌ سے مراد زنا نہیں ۔ اس لئے کہ اول تو زنا کے لئے چار عینی شاہدوں کا ملنا ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ہے ۔ دوسرے زنا کی سزا دوسرے مقام پر سو دُرّے لکھی ہے (۲۴/۲) ۔ لیکن اس جگہ فَاحِشَةٌ کے جرم کی سزا صرف گھروں میں روک لینا کہا گیا ہے ۔ اس لئے یہاں فَاحِشَةٌ سے مراد زنا سے ورے بے حیائی کی باتیں ہیں جنہیں اگر روکا نہ جائے تو وہ زنا تک منتج ہو سکتی ہیں ۔ قوم لوط کے متعلق کہا گیا ہے اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ (۷/۸۰) ۔ اور اس سے اگلی آیت میں بتا دیا ہے کہ اس سے مراد لواطت ہے (۷/۸۱) ۔ نہ کہ زنا ۔ اور جس طرح دو مردوں کا اختلاط فاحشہ ہے اسی طرح عورتوں کا باہمی اختلاط (سحاقت) بھی فاحشہ ہے ۔

نیز لفظ فَوَاحِش (بطور جمع) خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ فاحشۃ صرف زنا ہی نہیں ، دوسرے بے حیائی کے کام بھی فاحشۃ میں داخل ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ (پیشہ ور عورتوں سے قطع نظر) فعل زنا کا ارتکاب یک لخت (فوری طور پر) ظہور میں نہیں آجاتا ۔ اس کے لئے (غیر) مرد اور عورت باہمی (ملنے جلنے) کے تعلقات قائم کرتے ہیں ۔ پھر ذرا بات آگے بڑھتی ہے تو ہم آغوشی وغیرہ کی نوبت آتی ہے ۔ اس طرح رفتہ رفتہ جنسی اختلاط (زنا) تک بات پہنچتی ہے ۔ قرآن کریم ان مبادیات کو روکنا چاہتا ہے تاکہ بات آگے بڑھنے نہ پائے ۔ یہ وہ فواحش ہیں جن کا ذکر اوپر (۴/۱۵) میں آیا ہے ۔

*تاج ۔

ف خ ر

اَلْفَخُوْرُ ۔ وہ اونٹنی یا بکری جس کے تھن تو بڑے بڑے ہوں لیکن ان میں دودھ بہت کم ہو* ۔ اور دھار بھی پتلی ہو*** ۔ اس سے اَلْفَخْرُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنی باتیں بڑی بڑی کرنا لیکن جوہر ذاتی کا بہت کم ہونا ۔ ایسی باتوں پر ناز کرنا جو انسان کے ذاتی جوہر نہ ہوں بلکہ اضافی ہوں ۔ مثلاً حسب و نسب ۔ دولت و حکومت وغیرہ* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی پرانی باتوں کو شمار کرنا ہیں ۔ سورۃ نساء میں بخیل کو فَخُوْرٌ کہا گیا ہے (۴/۳۶) ۔ یعنی جس کے تھن بڑے بڑے ہوں لیکن ان میں سے دودھ بہت کم نکلے ۔ سورۃ حدید میں تَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ (۵۷/۲۰) آیا ہے ۔ یعنی ایک دوسرے سے بڑا بننے کی کوشش ، ذاتی خصوصیات کے اعتبار سے نہیں بلکہ اضافی نسبتوں کی بنیاد پر ۔ ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ انسان کے اندر ہے ، لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ یونہی نمائشی نسبتوں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کے بجائے جوہر ذاتی میں بڑھنے کی کوشش کرو ۔ (۲/۱۴۸) ۔

اَلْفَخَّارُ ۔ مٹی کے برتنوں کے ٹھیکرے ۔ اصل میں فَخَّارٌ مٹکوں (ٹھلیوں) کو کہا جاتا ہے ** جو اندر سے خالی ہوتے ہیں لیکن بولتے بڑے زور سے ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ (۵۵/۱۴) ۔ انسان کو ٹھیکری جیسی سوکھی ہوئی مٹی سے پیدا کیا ۔ (تفصیل اس کی میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں ملیگی) ۔

ف د ی

فَدَاہُ ۔ یَفْدِیْہِ ۔ فِدَاءً وَفِدًی ۔ اس نے کچھ خرچ کر کے اسے کسی مصیبت سے بچا لیا ۔ تَفَادٰی مِنْہُ ۔ اس سے بچا ۔ اِفْتَدٰی بِہٖ بِکَذَا ۔ اس نے خود کو مال کے عوض چھڑا لیا ۔ فَادَاہُ مُفَادَاۃً ۔ اہل لغت نے فَادَاہُ کے مختلف معنی لکھے ہیں ۔ یہ بھی کہ اس نے کچھ دیکر اسے چھڑا لیا ۔ اور یہ بھی کہ اس نے کچھ لے کر اسے چھوڑ دیا ۔ بعض نے کہا ہے کہ مُفَادَاۃٌ یہ ہے کہ تم ایک آدمی دیکر اس کے عوض دوسرا آدمی چھڑا لو ۔ اور فِدًی یہ ہے کہ تم روپیہ دیکر اسے خرید لو ۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں **** ۔ بہرحال اس میں کسی کو

*تاج ۔ **راغب ۔ ***ابن فارس ۔ ****تاج و محیط ۔

بچا لینے کا پہلو بنیادی ہوتا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی یہی ہیں کہ کسی چیز کی حفاظت اور بچاؤ کے لئے اسکی جگہ کسی دوسری چیز کو دے دینا ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ قیدیوں کو کفارہ دیکر چھڑانے کے معنوں میں آیا ہے (۲/۸۵)۔ حضرت اسماعیلؑ کے متعلق ہے ۔ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (۳۷/۱۰۷)۔ یعنی ہم نے اسے ایک بہت بڑی قربانی کے لئے بچا لیا ۔ انہیں حضرت ابراہیمؑ کی چھری سے محفوظ کر لیا اور تولیت کعبہ کی خدمت عظیم ان کے سپرد کر دی (۲/۱۲۵) ۔ یہ بہت بڑی قربانی تھی جس میں تمام آرام اور چین چھوڑ کر اپنے آپ کو عمر بھر کے لئے اس مقصد عظیم کے لئے وقف کر دینا تھا ۔ *یہ تھی وہ قیمت جو اُن سے اُن کی جان کے عوض بطور فدیہ لی گئی تھی ۔*

جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کریم میں ہے ۔ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً ۔ (۴۷/۴)۔ انہیں یا تو بطور احسان چھوڑ دو اور یا ان کا معاوضہ لیکر (قیدیوں کے عوض قیدی یا مال لیکر چھوڑ دو) بہرحال انہیں چھوڑنا ہوگا ۔ لہذا جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا لینے کا خیال قرآن کریم سے کھلی ہوئی بغاوت ہے ۔ غلامی کا یہی ایک دروازہ تھا ۔ اسے قرآن کریم نے اسطرح ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان م ۔ ل ۔ ک)

واضح رہے کہ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً سے یہ مراد نہیں کہ جنگ کے قیدیوں کو گرفتاری کے فوری بعد رہا کر دینا ہوگا ۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ انہیں غلام بنا کر نہیں رکھا جاسکتا ۔ بہ تقاضائے حالات انہیں قید میں رکھا جاسکتا ہے (فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۔ ۴۷/۴) اس کے بعد جب اثخان (غلبہ) حاصل ہوجائے تو پھر ان کی (Disposal) کا سوال سامنے آئیگا جس کا بہ تقاضائے حالات فیصلہ کیا جائیگا کہ انہیں احساناً چھوڑ دیا جائے یا فدیہ لیکر ۔

ف ر ت

اَلْفُرَاتُ ۔ نہایت شیریں پانی ۔ زمخشری نے کہا ہے کہ اسے فُرَاتٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ (يَفْرُتُ الْعَطَشَ) پیاس کو تسکین دیتا ہے *۔ اسکی تیزی کو توڑ دیتا ہے *۔ سورہ مرسلٰت میں مَآءً فُرَاتًا (۷۷/۲۷) آیا ہے ۔ سورہ فرقان میں عَذْبٌ فُرَاتٌ (۲۵/۵۳) آیا ہے ۔ یعنی بہت شیریں ۔

* تاج ۔ راغب ۔ محیط ۔

ف ر ث

اَلفَرْثُ ۔ غذا جب وہ اوجھڑی کے اندر رہے *۔ سورہ نحل میں ہے کہ تم دیکھو کہ جانور کے پیٹ میں فرث اور خون جیسی اشیاء میں سے کس طرح دودھ جیسی صاف اور لطیف غذا تیار ہوتی رہتی ہے ۔ (۱۶/۶۶) ۔ ویسے اَلْفَرْثُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو ریزہ ریزہ ہو گئی ہو (ابن فارس) فَرَثَ ۔ اس نے بکھیر دیا ۔ فَرَثَ الْحُبُّ كَبِدَهٗ ۔ محبت نے اس کے جگر کے ٹکڑے کر دئے ۔ لہذا فَرْثٌ ، غذا کی وہ حالت ہے جس میں وہ معدہ میں ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے ۔ اہل لغت نے اس سے گوبر مراد لیا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس سے مراد جانور کی خوراک کی وہ حالت ہے جس میں وہ ہضم ہونے کے لئے ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے ۔ (لین نے یہی تصریح کی ہے)۔

ف ر ج

اَلْفَرْجُ وَالْفُرْجَةُ ۔ دو چیزوں کے درمیان شگاف یا کشادگی**۔ بَابٌ مَفْرُوْجٌ ۔ کھلا ہوا دروازہ ۔ تَفَارِيْجُ الاَصَابِعِ ۔ انگلیوں کے درمیانی شگاف ۔ اَلْفَرْجُ ۔ شرمگاہ ، خواہ مرد کی ہو یا عورت کی ۔ نیز ہر خطرہ کی جگہ ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ اِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ ۔ (۷۷/۹) جب آسمان پھٹ جائے گا ۔ کھولدیا جائے گا ۔ دوسری جگہ ہے ۔ اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ (۸۴/۱) "جب آسمان شق ہو جائیگا" ۔ سورۃ قٓ میں ہے مَالَهَا مِنْ فُرُوْجٍ (۵۰/۶) ۔ ان میں کہیں کوئی شگاف نہیں ۔ مطلب نقص اور خرابی سے ہے ۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ (۶۷/۳) ۔ "کیا تجھے کہیں کوئی خرابی نظر آتی ہے ؟"

قرآن کریم میں حفاظتِ عصمت پر بڑا زور دیا گیا ہے اور اس کے لئے یہی الفاظ آئے ہیں ۔ چنانچہ مردوں کے متعلق ہے ۔ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ (۲۴/۳۰) ۔ اور عورتوں کے متعلق ہے يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (۲۴/۳۱) وہ اپنی عصمت کی حفاظت کریں ۔ حضرت مریم کی پاک دامنی کا اظہار بھی انہی الفاظ سے کیا گیا ہے ۔ وَالَّتِيْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (۲۱/۹۱) جس نے اپنی عصمت کا تحفظ کیا ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و محیط ۔

ان مقامات سے ظاہر ہے کہ فَرْجٌ مقام مخصوص ہی کو نہیں کہتے بلکہ عربی محاورہ میں یہ لفظ عصمت کے لئے عام طور پر بولا جاتا ہے۔ برخلاف ہماری زبان کے جس میں فَرْجٌ کا لفظ صرف عورت کی شرم گاہ کے لئے آتا ہے۔ قرآنی آیات میں جہاں یہ لفظ آیا ہے، ان کے ترجمہ میں اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

ف ر ح

اَلْفَرَحُ۔ لسان میں ہے کہ یہ حُزْنٌ کی ضد ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ فوری یا عارضی لذت پر انشراحِ صدر کو کہتے ہیں۔ اور سُرُوْرٌ اس انشراح صدر کو جس میں دل کو فوری اور دیر پا دونوں قسم کا اطمینان حاصل ہو، لیکن کبھی (اس فرق کی رعایت کے بغیر) یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوجاتے ہیں *۔ سورہ یونس میں قرآن کریم کے متعلق ہے۔ فَبِذَالِکَ فَلْیَفْرَحُوْا (۱۰/۵۸)۔ انہیں چاہئے کہ اس قرآن کریم کے ملنے پر خوشیاں منائیں۔

نیز اس کے معنی اترانے کے بھی ہیں *۔ سورۂ نمل میں ہے۔ بَلْ اَنْتُمْ بِھَدِیَّتِکُمْ تَفْرَحُوْنَ (۲۷/۳۶)۔ تم اپنے اس تحفہ پر بڑا ناز کرتے ہو (کہ یہ بہت بڑی چیز ہے)۔ سورۃ قصص میں ہے کہ قارون سے (اسکی قوم کے لوگوں نے) کہا۔ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ (۲۸/۷۶)۔ ان مقامات سے ظاہر ہے کہ اس میں اس اوچھے پن کے مظاہرے کی طرف اشارہ ہے جو کم ظرف انسان میں مال و دولت کے مل جانے سے پیدا ہوجاتا ہے۔

سورہ روم میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ تم نے کہیں ایمان لانے کے بعد پھر مشرک نہ بن جانا۔ یعنی فرقوں میں نہ بٹ جانا، جس میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۲) ہر فرقہ اپنے مسلک پر اتراتا ہے اور مگن ہو رہتا ہے کہ یہی مسلک حق ہے۔ باقی سب باطل پر ہیں۔ بس میرا فرقہ ناجی ہے باقی سب جہنمی ہیں۔

سورہ آل عمران میں یَفْرَحُوْا بِھَا کے مقابلہ میں تَسُؤْھُمْ آیا ہے (۳/۱۱۹)۔ یعنی برا لگنا۔ اور (۱۳/۳۶) میں اس کے مقابلہ میں یُنْکِرُ آیا ہے۔ یعنی ناگوار گزرنا۔ سورۂ روم میں اس کے مقابلہ میں یَقْنَطُوْنَ آیا ہے (۳۰/۳۶)۔ نا امید ہو جانا۔ اور سورہ حدید میں تَاْسَوْا (۵۷/۲۳)۔ "افسوس کرنا"۔ اس تقابل سے فَرَحٌ کے معنی اور بھی واضح ہو جاتے ہیں۔

---

*تاج۔

ف ر د

اَلْفَرْدُ - تنہا - اکیلا - زَوْجٌ جوڑے کو کہتے اور ان میں سے ہر ایک فَرْدٌ ہوتا ہے - وہ چیز جس کی مثال و نظیر نہ ہو- نَاقَۃٌ فَارِدَۃٌ - وہ اونٹنی جو چراگاہ میں سب سے الگ اکیلی چرتی ہو *- راغب نے کہا ہے کہ اَلْفَرْدُ اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی دوسری چیز نہ ملائی گئی ہو- یہ لفظ وَتْرٌ سے عام اور وَاحِدٌ سے اخص ہے - مُنْفَرِدٌ کے معنی یکتا (دوسروں سے الگ) ہونگے ** - سورہ انبیاء میں ہے کہ حضرت زکریا نے دعا کی رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا (۲۱/۸۹) - اے میرے نشوو نما دینے والے مجھے تنہا نہ چھوڑ- لیکن چونکہ انہوں نے اولاد کے لئے دعا مانگی تھی اس لئے یہاں اس کے معنی بے اولاد کے ہونگے - سورۃ مریم میں ہے "کُلُّھُمْ اٰتِیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَرْدًا" (۱۹/۹۵) - یعنی اعمال کے ظہور نتائج کے وقت کوئی شخص کسی دوسرے کے نتیجہ میں شریک نہیں ہو سکے گا- نہ ہی اس کا کوئی حمایتی ہوگا- (اسے (۶/۹۵) میں دہرایا گیا ہے)- قانون مکافات کے سلسلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ہر نفس اپنے اعمال کے نتائج سے خود متاثر ہوتا ہے - اس سے نفس انسانی (Self) کی یکتائی (Uniqueness) اور انفرادیت (Individuality) ثابت ہوتی ہے - حقیقت یہ ہے کہ حریت (Freedom) اور یکتائی ، ذات(Personality) کی بنیادی خصوصیات ہیں - قرآن کریم میں ہے - وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ (۶/۹۵) " اور یقیناً تم ہمارے پاس اسی طرح انفرادیت لئے ہوئے آتے ہو جسطرح ہم نے تمہیں پہلی دفعہ منفرد حیثیت سے پیدا کیا تھا "- اس میں انسانی ذات کی انفرادیت کی طرف اشارہ کیا ہے - انسان اپنی مفاد پرستیوں کے لئے بہت سے لوگوں کو اپنا ساتھی بنا لیتا ہے اور بہت سے مال‌واسباب کو ان کے حصول کا ذریعہ - لیکن ان اعمال کا اثر اسکی اپنی‌ذات پر مرتب ہوتا ہے جس میں نہ کوئی دوسرا شریک ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کا مال و اسباب اسے اس سے محفوظ رکھ سکتا ہے -

قرآن کریم کا قانون مکافات ایک عظیم حقیقت ہے جسکی بنیادوں پر انسانیت کی ساری عمارت اٹھتی ہے - ہر عمل کا اثر اس فرد کی اپنی ذات پر ہوتا ہے - اس میں سے نہ آپ کوئی حصہ کسی دوسرے کی طرف منتقل کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے کے عمل کا اثر آپ کی طرف منتقل ہو کر آسکتا ہے - یہ انسانی ذات کی انفرادیت کی دلیل ہے -

---

* تاج - ** راغب -

ف ر د س

اَلْفَرْدَسَةُ ۔ وسعت اور فراخی ۔ صَدْرٌ مُفَرْدَسٌ ۔ وسیع اور کشادہ سینہ ۔ رَجُلٌ فُرَادِسٌ ۔ بڑی چوڑی چکلی ہڈیوں والا آدمی ۔ اَلْفُرْدُوْسُ ۔ کھانے میں برکت ۔ ضیافت ۔ کَرْمٌ مُفَرْدَسٌ ۔ انگوروں کی بیلیں جو ٹٹیوں پر چڑھائی گئی ہوں ۔ فِرْدَوْسٌ ۔ سرسبز وادی ۔ باغ اور بستان جس میں ہر قسم کے درخت ہوں ۔ اہل شام بستانوں اور انگوروں کے باغات کو فَرَادِیْسُ کہتے ہیں ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ رومی یا سریانی ہے ۔ لیکن ابن القطاع نے کہا ہے کہ یہ عربی ہے اور اَلْفَرْدَسَةُ سے مشتق * ۔

قرآن کریم میں جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ (۱۸/۱۰۷) آیا ہے ۔ یعنی وسیع اور فراخ ، سرسبز اور شاداب باغات ۔ اس دنیا میں ایسا جنتی معاشرہ جس میں ہر قسم کی وسعتیں اور فراخیاں ، سرسبزیاں اور شادابیاں ہوں ۔ اور اخروی زندگی میں ہر قسم کی وسعت اور شادابی ۔

ف ر ر

اَلْفَرُّ ۔ اَلْفِرَارُ ۔ کسی چیز سے ڈر کر بھاگنا ** ۔ دراصل اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے کھولنے (کَشْفٌ) کے ہیں *** ۔ فَرَّ کے بنیادی معنی جانور کے دانتوں کو کھولنا ہے ۔ اس سے اِفْتِرَارٌ کے معنی ہیں ہنسنے میں دانتوں کا کھل جانا ****۔ ممکن ہے کہ کھل جانے سے ، بھاگ جانے کے معنی لئے گئے ہوں ۔

اَلْفَرُّ ۔ بھاگنے والے۔ فَارٌّ کی جمع ہے۔ (خود اَلْفَرُّ بھی واحد کے لئے مستعمل ہے) ۔ کَتِیْبَةٌ فَرٌّ ۔ شکست خوردہ فوج جو بھاگ اٹھے *** ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ بھاگنے کے معانی میں استعمال ہوا ہے ۔ سورہٴ کہف میں فِرَارًا (۱۸/۱۸) آیا ہے ۔ سورہٴ مدثر میں ہے فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (۷۴/۵۱) ۔ شیر سے ڈر کر بھاگے ہیں ۔ سورہٴ نوح میں ہے فَلَمْ یَزِدْھُمْ دُعَآئِیْٓ اِلَّا فِرَارًا (۷۱/۶)۔ میں نے جتنا انہیں اپنی طرف بلایا یہ اتنا ہی مجھ سے دور بھاگے۔ سورہٴ قیامة میں ہے اَیْنَ الْمَفَرُّ (۷۵/۱۰) ۔ بھاگنے کی جگہ کونسی ہے ؟ یا بھاگ کر کہاں جانا ہے ؟ سورہٴ ذاریٰت میں ہے فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰهِ (۵۱/۵۰)۔ اس کے معنی رجعت الی اللہ ۔ یا قانونِ خداوندی کی طرف لوٹنے کے ہیں ۔ (مزید تشریح ر ۔ ج ۔ ع ۔ کے عنوان میں دیکھئے)

---

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔ ***محیط و ابن فارس ****راغب ۔

ف ر ش

فَرْشٌ کے معنی ھیں کسی چیز کو بچھانا ۔ کسی چیز کو پھیلانا ۔ چنانچہ اَلْفَرْشُ اس فرش کو کہتے ھیں جو گھروں میں بچھایا جائے ، نیز کھیتی جو زمین پر خوب پھیل جائے ۔ اور وسیع اور کشادہ فضا کو بھی ۔ اَلْفَرِیْشُ ۔ اس بیل کو کہتے ھیں جو زمین پر پھیل جاتی ھے* ۔

اَلْفَرَاشَۃُ ۔ اُڑنے والے کیڑے مکوڑے کو کہتے ھیں (مثلاً پروانہ ۔ تتلی وغیرہ) ۔ اَلْفَرَاشُ اسکی جمع ھے ۔ (۱۰۱/۴) ۔ فِرَاشٌ ھر اُس چیز کو کہتے ھیں جو بچھائی جائے* ۔

سورۃ انعام میں ھے ۔ وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَۃً وَ فَرْشًا (۶/۱۴۲) ۔ فراء نے کہا ھے کہ اس میں حَمُوْلَۃً سے مراد ایسے جانور ھیں جو بوجھ لادنے اور سواری کرنے کے قابل ھوں اور فَرْشًا سے مراد وہ چوپائے ھیں جو اس قابل نہ ھوں ۔* صاحب محیط نے کہا ھے کہ فَرْشًا سے مراد چھوٹی عمر کے اُونٹ ھیں** ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس سے مراد وہ چوپائے ھیں جو ذبح کرنے اور کھانے کے لئے ھی موزوں ھوں ۔

سورۃ رحمٰن میں ھے مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی فُرُشٍ (۵۵/۵۴) ۔ یہ فِرَاشٌ کی جمع ھے ۔ یعنی بچھائی ھوئی چیزیں ۔ سورۃ ذاریٰت میں ھے ۔ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰھَا (۵۱/۴۸) ۔ ھم نے زمین کو پھیلا رکھا ھے ۔ سورۃ واقعہ میں ھے ۔ وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَۃٍ (۵۶/۳۴) ۔ یہاں فُرُشٌ سے مراد بیگمات ھیں ۔ اور مَرْفُوْعَۃٍ کے معنے ھیں عالی مرتبت ۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اَلْفِرَاشُ ، میاں بیوی میں سے ھر ایک کو کہتے ھیں ، لیکن اس کا صحیح انطباق بیوی پر ھوتا ھے ۔

ف ر ض

اَلْفَرْضُ ۔ کے بنیادی معنی کسی سخت چیز کو کاٹنے کے ھیں ۔ چونکہ جس چیز کو کاٹا جاتا ھے اس کا پہلے اندازہ کیا جاتا ھے کہ اسے کہاں سے اور کیسے کاٹنا چاھئے اس لئے یہ لفظ اندازہ کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ھونے لگا ۔ اندازہ کرنے کے اعتبار سے اَلْفَرِیْضَۃُ مقررہ حصہ کو کہتے ھیں ۔ نیز ھر وہ چیز جسے معین و مقرر کر دیا جائے ۔ اَفْرَضَ لَہٗ ۔ اس کے لئے کسی چیز کو معین و مقرر کر دیا ۔ فَرَضَ لَہٗ فِی الدِّیْوَانِ ۔ اسکی

* تاج ۔ ** محیط ۔

تنخواہ کا رجسٹر میں اندراج کیا ۔ اِفْتَرَضَ الْجُنْدُ ۔ فوج نے اپنی تنخواہ یا واجبات وصول کر لئے *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ چونکہ کاٹنے سے چیز نشان زدہ اور متعین ہو جاتی ہے اس لئے اَلْفَرْضُ کو فرض اسی جہت سے کہا جاتا ہے کہ اس کے حدود اور نشانات متعین ہوتے ہیں ۔

قرآن کریم میں عورتوں کے مہر کے لئے فَرِیْضَۃٌ کا لفظ آیا ہے (۲/۲۳۶) ۔ کیونکہ اس کی متعینہ مقدار اپنے اوپر لازم کر لی جاتی ہے ۔ ترکہ کے حصہ کو نَصِیْبًا مَفْرُوْضًا (۴/۷) کہا گیا ہے کیونکہ وہ بھی مقررہ حصہ ہوتا ہے ۔ سورہ توبہ میں جہاں صدقات کی تقسیم کا اصول بیان ہوا ہے اسے فَرِیضَۃً مِنَ اللّٰہِ (۹/۶۰) کہا گیا ہے ۔ خدا کی طرف سے مقرر کردہ اصول تقسیم ۔ سورہ نور میں ہے سُوْرَۃٌ اَنْزَلْنٰھَا وَ فَرَضْنٰھَا ۔ (۲۴/۱) ۔ وہ سورۃ جو خدا کی طرف سے نازل ہوئی اور اس میں درج شدہ احکام کو فرض ٹھہرایا گیا ۔ لیکن یہ چیز کسی ایک سورت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ۔ سارے کا سارا قرآن اسی طرح فرض کر دیا گیا ہے ۔ اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ (۲۸/۸۵) ۔ بےشک وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن کریم کو فرض قرار دیا ہے ۔ یعنی یہ فرض قرار دے دیا ہے کہ اس کے تمام احکام پر پورا پورا عمل کیا جائے ۔

سورہ بقرۃ میں بنی اسرائیل کی گائے (یا سانڈ) کے متعلق ہے ۔ لَا فَارِضٌ وَّلَا بِکْرٌ (۲/۶۸) ۔ بِکْرٌ جوان کو کہتے ہیں ۔ یا چھوٹی عمر والی کو ۔ اس لئے فَارِضٌ کے معنی ہوئے بڑی عمر والی ۔ معمر و سن رسیدہ ۔ جوہری نے کہا ہے کہ بڑی چیز یا ہر پرانی چیز کو فَارِضٌ کہتے ہیں ، کیونکہ اسی درخت کو کاٹا جاتا ہے جو پرانا اور بڑا ہو چکا ہو* ۔

قرآن کریم نے جس کام کے کرنے کا حکم دیدیا ہے وہ فرض ہے اور جس سے روک دیا ہے وہ ممنوع ہے ۔ لہذا فَرْضٌ کے ساتھ دوسری اصطلاحات (مثلاً واجب ۔ مستحب وغیرہ) ۔ یا دوسری طرف ، حرام کے ساتھ اس قسم کے اصطلاحات (مثلاً مکروہ تحریمی ۔ مکروہ تنزیہی وغیرہ) فقہ کی اصطلاحات ہیں ، قرآنی نہیں ۔

سورہ تحریم میں ہے قَدْ فَرَضَ اللّٰہُ لَکُمْ تَحِلَّۃَ اَیْمَانِکُمْ (۶۶/۲) ۔ اس کے معنی ہیں کہ اللہ نے یہ فرض قرار دیا ہے کہ اس قسم کی قسمیں جن میں حلال کو حرام کر لیا ہو، (کفارہ دیکر) توڑ دی جائیں ۔ سورہ احزاب میں ہے مَا کَانَ عَلَی النَّبِیِّ مِنْ حَرَجٍ فِیْمَا فَرَضَ اللّٰہُ لَہٗ (۳۳/۳۸) ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جن باتوں کو اللہ نے رسول کے لئے معین

*تاج و محیط ۔

کر دیا ہو ان میں درحقیقت کوئی تنگی نہیں - واضح رہے کہ یہ ایک عمومی بات ہے (جیسا کہ اگلی آیت سے ظاہر ہے) - اس کا سابقہ آیت (قصہ حضرت زید رضؓ) سے خصوصی تعلق نہیں -

ف ر ط

فَرَطَ - اس مادہ میں اصل معنی سبقت کرنے اور آگے بڑھ جانے کے ہیں *- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو اسکی جگہ سے ہٹا دینے اور ایکطرف کر دینے کے ہیں - سبقت کرنے والا، دوسروں کو پیچھے ہٹا کر خود آگے بڑھتا ہے - اَلْفُرُطُ - تیز رفتار گھوڑا جو دوسرے گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ کر سب سے آگے بڑھ جائے ** - اِفْرَاطٌ اور تَفْرِیْطٌ میں فرق یہ ہے کہ اِفْرَاطٌ اس حد سے بڑھ جانے کو کہتے ہیں جو زیادتی اور کمال کی سمت میں ہو، اور تَفْرِیْطٌ اس حد سے بڑھ جانے کو کہتے ہیں جو کمی کی جہت میں ہو* - فَرَطَ عَلَیْہِ کے معنی ہیں کسی پر زیادتی کی - جلدی میں اسکے ساتھ ناروا سلوک کیا ** - قرآن کریم میں ہے - اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَفْرُطَ عَلَیْنَا (۲۰/۴۵) - ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کرے - اسکے برعکس فَرَّطَ کے معنی ہیں کسی بات میں کمی کرنا - کوتاہی کرنا - اسے ضائع کر دینا - صاحب لطائف اللغۃ نے بھی کہا ہے کہ فَرَّطَ کے معنی ہیں کمی کرنا - اور اَفْرَطَ کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا - قرآن کریم میں ہے قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا (۶/۳۱) - وہ کہیں گے ہمیں سخت ندامت ہے کہ ہم نے (قانون مکافات کے صحیح اندازہ لگانے میں) کسقدر کمی کی - فَرَّطَ اور اَفْرَطَ کے معنی یہ بھی ہیں کہ کسی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور پھر اس کا خیال تک نہ کیا جائے - فَرَطَتِ النَّخْلَۃُ - کھجور اور اسکے خوشے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا - اَفْرَطَ الْاَمْرَ - وہ اسبات کو بھول گیا - اس نے اس بات کو چھوڑ دیا* - قرآن کریم میں ہے وَ اَنَّهُمْ مُفْرَطُوْنَ (۱۶/۶۲) - اور وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہونگے - یعنی دوسرے لوگ ان سے آگے بڑھ جائینگے - جنت اور جہنم میں یہ بنیادی فرق ہے - یعنی جنت میں انسان زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے اور جہنم میں انسان کی نشوونما رک جاتی ہے - اور وہ متحرک کی بجائے جامد ہو جاتا ہے اَلْاَمْرُ الْفُرُطُ - وہ بات جس میں آدمی حد سے بڑھ جائے * - قرآن کریم

* محیط - ** تاج -

میں ہے وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا (۱۸/۲۸) ۔ اس کا معاملہ حد سے گزر چکا ہے ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْفَرْطُ ۔ قصداً آگے بڑھنے کو کہتے ہیں ۔ یعنی اس میں مقصد اور ارادہ کا ہونا ضروری ہے**۔

سورہ انعام میں کہا گیا ہے کہ زمین پر چلنے والے جانور اور ہوا میں اڑنے والے پرندے، تمہاری ہی طرح امم ہیں ۔ اس کے بعد ہے مَافَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (۶/۳۹) " ہم نے کتاب میں کسی شے کی کمی نہیں چھوڑی " ۔ سیاق کے اعتبار سے یہاں الکتاب سے مراد، کتاب فطرت ہو سکتی ہے ۔ لیکن اگر اس سے مراد خود قرآن کریم ہے تو بھی بات بالکل واضح ہے ۔ قرآن کریم میں جو کچھ بیان ہوا ہے مکمل طور پر بیان ہوا ہے ۔ اس میں کوئی کمی نہیں رکھی گئی ۔ اسکی تائید کئی ایک دیگر مقامات سے بھی ہوتی ہے ۔

ف ر ع

فَرْعُ كُلِّ شَيْءٍ ۔ ہر چیز کے بلند ترین حصے کو کہتے ہیں ۔ چنانچہ اَلْفَرْعَةُ ۔ پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں ۔ فَارِعَةُ الْجَبَلِ ۔ پہاڑ کا بلند ترین حصہ* ۔ بلندی کے علاوہ لمبائی کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے ۔ چنانچہ اَلْمُفْرِعُ ۔ ہر لمبی چیز کو کہتے ہیں* ۔ فَرْعُ الشَّجَرِ ۔ درخت کی شاخ کو کہتے ہیں** ، اس لئے کہ وہ اصل (جڑ) کے مقابلہ میں اونچی ہوتی ہے اور ویسے لمبی بھی ہوتی ہے ۔ قرآن کریم میں آیا ہے أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (۱۴/۲۴) ۔ اسکی جڑ مضبوط و محکم ہے اور شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں ۔

فرعون

قدیم شاہان مصر کا لقب ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "موسیٰ" ۔

ف ر غ

فَرَغَ ۔ فُرُوغًا ۔ خالی ہونا ۔ فَارِغٌ ۔ خالی* ۔ وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَارِغًا ۔ (۲۸/۱۰) موسیٰ کی والدہ کا دل صبر سے خالی ہوگیا ۔ (بیچین ہوگیا) ۔ فَرَغَ لَهُ وَ إِلَيْهِ ۔ ہر طرف سے فارغ ہو کر کسی کی طرف توجہ دینا یا اس کام کا ارادہ کرنا* ۔ سورۂ رحمٰن میں سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَ الثَّقَلَانِ (۵۵/۳۱) آیا ہے ۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اے ثقلان جب تمہاری باری آئیگی تو ہم تمہاری طرف توجہ کرینگے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی دوسرے کام میں اس طرح مصروف ہے ← ہے کہ ثقلان کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ ملتی ہو

*تاج ۔ **راغب ۔

اَلْفِرَاغُ - ڈول کی وہ سمت جدھر سے پانی انڈیلا جاتا ہے*۔ اَفْرَغَ انڈیلنا - بہانا*۔ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا (۲/۲۵۰) - ہم پر ہمت و استقامت فراوانی سے انڈیل دے۔ اَلْفِرَاغُ - چمڑے کا بڑا وسیع حوض یا برتن*۔

سورۃ الانشراح میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ اب جو تجھ سے ان تمام تفکرات کو دور کر دیا گیا ہے جن سے تیری کمر ٹوٹ رہی تھی (یعنی نظام خداوندی کے متشکل کرنے کی راہ میں جو مشکلات تھیں انہیں آسان کر دیا گیا ہے) تو اب اپنے پروگرام پر جم کر عمل کر۔ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (۹۴/۷) - یعنی آپ کے پروگرام کا پہلا حصہ جس میں قدم قدم پر مزاحمت ہوتی تھی، اور اس لئے تعمیری کاموں کے لئے یکسوئی نہیں ملتی تھی، ختم ہو گیا ہے۔ اب پورے اطمینان کے ساتھ اس پروگرام کے تعمیری حصہ پر تمام توجہات کو مرکوز کر دیں۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جب مشکلات کا دور ختم ہو جاتا ہے تو پھر انسان اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن نظام خداوندی میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب تخریبی پروگرام کے ابتدائی مراحل ختم ہوتے ہیں اور مخالفتوں پر قابو پا لیا جاتا ہے تو پھر اس پروگرام کا تعمیری حصہ شروع ہوتا ہے۔ اور اس میں پہلے سے بھی زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ تعمیری پروگرام، پوری انسانیت کی نشو و نما پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ کوئی چھوٹا کام نہیں۔

ف ر ق

اَلْفَرْقُ - سر کی مانگ جس سے دونوں طرف کے بال ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں۔ یہ ہیں اس کے بنیادی معنی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادے کے بنیادی معنی ایک چیز کو دوسری چیز سے جدا کرنا اور الگ کر دینا ہیں۔ اَلْمَفْرَقُ - مانگ نکالنے کی جگہ۔ مَفْرَقُ الطَّرِيْقِ - راستہ کی وہ جگہ جہاں سے اس میں سے نیا راستہ پھٹتا ہو۔ اَلْفَارِقُ - وہ بدلی جو دوسری چھائی ہوئی بدلیوں سے الگ ہو کر برسے۔ اَرْضٌ فَرِقَةٌ - وہ زمین جس کے پودے ایک دوسرے سے فاصلہ پر ہوں*۔

اس اعتبار سے اَلْفَرْقُ کے معنی ہوتے ہیں الگ الگ کرنا۔ فیصلہ کرنا۔ بات کو واضح طور پر الگ الگ کرکے بیان کرنا۔ فَرَقَ لَهُ الطَّرِيْقُ - اس کے لئے دو راستوں میں سے صحیح راستہ واضح ہوگیا۔ فَرَقَ لَهُ اَمْرٌ - بات واضح ہوگئی اور اچھی طرح اس کی سمجھ میں آگئی*۔ فَرَّقَهُ - اسے الگ کیا۔

---

*تاج۔

اَلْفَرْقُ اور اَلْفَرَقُ ۔ ایک پیمانے کو کہتے تھے جو مدینہ منورہ میں مستعمل تھا ۔ اس سے فَرِقَ کے معنی ہیں اس نے پیمانے (برتن) سے پانی پیا * ۔ اَلْفَرِیْقُ ۔ اس جماعت کو کہتے ہیں جو دوسروں سے الگ ہو جائے ۔ تَفْرِیْقٌ کے معنی ہیں فساد کی غرض سے الگ الگ کر دینا ۔ انتشار و تفرق پیدا کر دینا * ۔ اَلْفِرْقُ ۔ الگ ہو جانے والا ٹکڑہ (۲۶/۶۳) ۔ اَلْفِرْقَۃُ ۔ جماعت ۔ گروہ (۹/۱۲۲) ۔

قرآن کو فُرْقَانٌ ۔ کہا گیا ہے (۳/۳) ۔ اس اعتبار سے کہ یہ غلط اور صحیح (حق و باطل) کو بالکل الگ الگ کر دیتا ہے ۔ اور یا اس لئے کہ یہ وہ پیمانہ ہے جس سے ہر شے کی قیمت ماپی جاتی ہے ۔ یعنی مستقل اقدار کا مجموعہ ۔ کتاب موسیٰؑ کو بھی فُرْقَانٌ کہا گیا ہے ۔ (۲/۵۳ و ۲۱/۴۸) ۔ خدا کی وحی فُرْقَانٌ ہوتی ہے ۔ یعنی وہ حق و باطل میں فرق کر دیتی ہے ۔ یَوْمُ الْفُرْقَانِ (۸/۴۱) ۔ اس سے جنگ بدر کا دن مراد لیا جاتا ہے جس میں حق و باطل میں کھلا کھلا امتیاز ہو گیا تھا ۔

سورۃ انفال میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ اگر تم نے قوانین خداوندی کی نگہداشت کی تو یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (۸/۲۹) ۔ اللہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کر دے گا ۔ مومن ، دنیا میں امتیازی زندگی بسر کرنے کے لئے آتا ہے ۔ ایسی بلند کردار کی زندگی جسے دیکھکر ہر شخص پکار اٹھے کہ یہ عام انسانوں سے ممتاز انسان ہے ۔ مومن کی زندگی ، حق و باطل میں امتیاز کا معیار ہونی چاہئیے ۔ دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان ۔

قرآن کریم میں ہے کہ خدا نے مسلمانوں کو ایک جماعت (ملت واحدہ) بنایا ہے ۔ اسی جماعت میں الگ الگ فرقوں اور پارٹیوں کا وجود، قرآن کریم کے واضح الفاظ میں شرک ہے (۳۰/۳۲) ۔ اور ایسا کرنے والے مشرکین ہیں (۳۰/۳۲) جن سے اللہ اور رسول کا کوئی واسطہ نہیں رہتا ۔ (۶/۱۶۰) ۔ قرآن کریم کے اس کھلے ہوئے فیصلے کے بعد فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے متعلق کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی ۔ وحدت خالق کا عملی ظہور وحدت امت (بلکہ وحدت انسانیت) کی شکل میں ہونا ضروری ہے ۔ لہذا جسطرح الوہیت کے ٹکڑے کرنا شرک ہے اسی طرح وحدتِ اُمت کو پارہ پارہ کرنا بھی شرک ہے ۔ امت کی وحدت کی بنیاد ایک خدا کے ایک ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنے پر ہوتی ہے ۔ امت میں تفرقہ کے معنی یہ ہیں کہ مختلف فرقے ، اپنی زندگی مختلف ضوابط کے ماتحت بسر کرتے ہیں ، اور یہ شرک ہے ۔

---

* تاج ۔

سورۃ توبہ میں قَوْمٌ یَفْرَقُوْنَ آیا ہے (۹/۵۶) - راغب نے فَرَقٌ کے معنے خوف سے دل کا منتشر ہونا کئے ہیں - یعنی خوف سے بد حواس ہو جانے ہیں*- نیز اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ خوف زدہ لوگ ہیں جن سے امن نے مفارقت کرلی ہو -

فَارَقَ - چھوڑ دینا - علیحدہ ہو جانا - فَارِقُوْهُنَّ (۶۵/۲) - ان سے الگ ہو جاؤ -

ف ر ہ

فَرُهَ - یَفْرُهُ - حاذق اور ماہر ہونا - چست اور پھرتیلا ہونا - حسین و جمیل ہونا - اس سے اسم فاعل فَارِهٌ آتا ہے ، اس کی جمع فَارِهُوْنَ اور فَارِهِیْنَ ہے - اَلْفَارِهَةُ - حسین و ملیح نوجوان لونڈی - نیزبہت زیادہ کھانے والی کو بھی کہتے ہیں - فراء نے کہا ہے کہ فَرِهَ میں ھاء دراصل حاء کی جگہ ہے - یعنی فَرِحَ - جس کے معنے اکڑنا اور اترا کرچلنا ہیں**- قرآن کریم میں قوم ثمود کے متعلق ہے وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ (۲۶/۱۴۹) - اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تم بڑی مہارت سے پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں محلات اور قلعے بناتے ہو ، اور دوسرے معنی یہ کہ تم پہاڑوں میں اتنے اتنے بڑے مکانات بناتے ہوجن پر تمہیں خاص طور پر فخر ہوتا ہے - اور اگر دونوں معانی کو یک جا سامنے رکھا جائے تو اس سے مراد ایسی حسین و جمیل عمارات ہونگی جنہیں نہایت صنعت کاری اور فخر کے ساتھ بنایا جائے -

ف ر ی

اَلْفَرْیُ - کھال (یا کپڑے) کو کاٹنا (یا پھاڑنا) ، درست کرنے اور سینے کے لئے - اور اَلْاِفْرَاءُ - اسے خراب کرنے کے لئے کاٹنا یا پھاڑنا - اَلْاِفْتِرَاءُ - کتربیونت کرکے کچھ کا کچھ بنا دینا - یہ اصلاح اور فساد دونوں کے لئے آتا ہے ، لیکن اس کا زیادہ استعمال خرابی ہی کے معنوں میں ہوتا ہے***- راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں افتراء جھوٹ ، شرک اور ظلم کے موقعوں پر استعمال کیا گیا ہے -

اَلْفَرِیُّ - گھڑی ہوئی بناوٹی بات - عظیم اور اہم بات - نیز حیرت انگیز اور عجیب سی بات کو کہتے ہیں - چنانچہ کہتے ہیں هُوَ یَفْرِیْ الْفَرِیَّ -

---

*راغب - **تاج و محیط و راغب - ***تاج و راغب

وہ حیرت انگیز اور تعجب خیز کام کرتا ہے* ۔ سورۃ مریم میں ہے کہ ہیکل کے پیشواؤں نے حضرت مریمؑ سے کہا کہ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا (۱۹/۲۷) ۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہوسکتے ہیں کہ انہوں نے حضرت مریمؑ سے کہا کہ تو نے یہ عجیب حرکت کی ہے کہ رسم و آئین خانقاہیت کے خلاف راہبہ بنکر متاہل زندگی بسر کرنا شروع کردی ۔ اور دوسرے معنی یہ کہ انہوں نے خود حضرت عیسیٰؑ سے متعلق کہا کہ وہ عجیب و غریب سا بچہ ہے جسے حضرت مریمؑ لیے کر آئی ہے ۔ اَلْفَرِیٰ ۔ حیران اور مبہوت ہو جانے کو کہتے ہیں (ابن فارس) ۔ اَلْمُفْتَرِیْ ۔ افتراء کرنے والا ۔ کتربیونت کرکے کچھ کا کچھ بنا دینے والا ۔ قَالُوْا اِنَّمَا اَنْتَ مُفْتَرٍ (۱۶/۱۰۱) ۔ اور مُفْتَرًی (۲۸/۳۶) بنایا ہوا ۔ افتراء کیا ہوا ۔ اِفْتَرٰی عَلٰی ۔ کسی کے خلاف بہتان تراشنا ۔ کوئی بات خود وضع کرکے اسے کسی اورکی طرف منسوب کر دینا ۔ (۳/۹۳) ۔

ف ز ز

فَزَّ فُلَانًا عَنْ مَوْضِعِہٖ ۔ فلاں آدمی کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا ۔ فَزَّ عَنْہُ ۔ وہ اس سے الگ ہوگیا ۔ ایک طرف ہٹ گیا ۔ فَزَّ الظَّبْیُ یَفِزُّ ۔ ہرن گھبرا گیا* ۔ اِسْتَفَزَّہٗ ۔ اسے اس کے گھر سے نکال دیا اور بے قرار کیا ۔ اسے ہلکا اور بے وزن سمجھا ، یا اسے ہلایا اوراپنے ساتھ رکھنا چاہا ۔ اِسْتَفَزَّہُ الْخَوْفُ ۔ اسے خوف نے پریشان کردیا ، اس کی جگہ سے ہٹا دیا اور اپنے ساتھ لئے لئے پھرا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہلکا ہونے کے ہیں ۔ لہذا اس لفظ کے معنوں میں دل کا اضطراب بھی شامل ہے اور محسوس طور پر اپنی جگہ سے ہٹ جانا بھی ۔ ہلکاہوکر اپنے مقام سے اکھڑ جانا دونوں میں شامل ہوتا ہے ۔ یعنی کسی کو گڑبڑا دینا اور اس طرح اسے اس کے مقام سے اکھیڑ دینا ۔ قرآن کریم میں ابلیس سے کہا گیا ہے کہ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ (۱۷/۶۴) ۔ ان میں سے جس پر تیرا زور چل سکے اسے گڑبڑا کر اس کے صحیح مقام (یا راستہ) سے ہٹا دے ۔ فرعون کےمتعلق ہے ۔ فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (۱۷/۱۰۳) ۔ اس نے چاہا کہ انہیں گڑبڑا کر ان کے مقام سے اکھیڑ ڈالے** ۔ نیز اس کے معنے کسی کی تاک میں رہنے اور دھوکہ دے کر اسے ہلاکت میں ڈال دینے کے بھی آتے ہیں*** ۔

*تاج و محیط ۔ **تاج و راغب ۔ ***تاج ۔

ف ز ع

اَلْفَزَعُ ۔ گھبراہٹ ۔ ڈر ۔ مبرد نے اپنی کتاب کامل میں لکھا ہے کہ اصل میں فَزَعٌ خوف کو کہتے ہیں ۔ پھر کنایۃً دشمن وغیرہ کے اچانک حملہ سے مدافعت کے لئے لوگوں کا تیزی سے باہر نکلنا بھی فَزَعٌ کہلانے لگا ۔*
راغب نے کہا ہے کہ فَزَعٌ اس انقباض اور وحشت و پریشانی کو کہتے ہیں جو کسی خوفناک چیز کی وجہ سے واقع ہو** ۔ اَلْفَزَعُ ۔ کسی سے فریاد کرنا ۔ اور کسی کی فریاد رسی کرنا ۔ دونوں معنی آتے ہیں (اضداد میں سے ہے) ۔ فَزِعَ اِلَيْهِمْ ۔ اس نے ان سے فریاد کی ۔ مدد مانگی ۔ فَزَعَهُمْ ۔ اس نے ان کی مدد کی ۔ ان کی فریاد رسی کی ۔ اَفْزَعَهُمْ کے بھی یہی معنی ہیں ۔ نیز اس کے معنے انہیں ڈرایا اور ان سے ڈر کو دور کیا ، بھی ہیں ۔ فَزَّعَهُ ۔ اس نے اسے ڈرایا اور گھبرا دیا ۔ فَزَّعَ عَنْهُ ۔ اس سے خوف اور گھبراہٹ کو دور کر دیا * ۔ (یعنی اس میں سلب ماخذ کا خاصہ ہے)

قرآن کریم میں ہے لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (۲۱/۱۰۳) ۔ سب سے بڑی گھبراہٹ بھی انہیں کبیدہ خاطر نہیں کر سکیگی ۔ سورۃ النمل میں ہے ۔ وَهُمْ مِنْ فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ (۲۷/۸۹) ۔ وہ اس دن گھبراہٹ سے محفوظ و مامون رہیں گے ۔ اسی سورۃ میں ہے ۔ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (۲۷/۸۷) ۔ کائنات کی ہر چیز گھبرا اٹھیگی ۔ سورۃ سبا میں ہے ۔ حَتّٰى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ (۳۴/۲۳) ۔ جب ان کے دل سے گھبراہٹ دور کر دی جائے گی ۔

ف س ح

اَلْفُسْحَةُ ۔ اَلْفَسَاحَةُ ۔ وسعت اور فراخی ۔ فَسُحَ الْمَكَانُ ۔ جگہ وسیع ہو گئی ۔ اِنْفَسَحَ صَدْرُهٗ ۔ اسکا سینہ کھل گیا ۔ انشراح صدر ہوا ۔ فَسَحَ لَهٗ فِي الْمَجْلِسِ ۔ اس نے محفل میں اس کے لئے جگہ کر دی * ۔
قرآن کریم میں ہے ۔ اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ (۵۸/۱۱) ۔ جب تم سے کہا جائے کہ مجالس میں کھل کر بیٹھو تو تم کھل کر بیٹھ جایا کرو ۔ اللہ تمہارے لئے کشادگی اور وسعت پیدا کر دے گا ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔

ف س د

فَسَدَ الشَّیْءُ کے معنی ھیں کسی چیز کا مضمحل ھو جانا ۔ اس کا اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رھنا ۔ لَحْمٌ فَاسِدٌ اس گوشت کو کہتے ھیں جو گل سڑ کر بدبودار ھوگیا ھو اور کسی کام کا نہ رھا ھو ۔ فَسَادٌ درحقیقت صَلَاحٌ کی ضد ھے ۔ صَلَاحٌ کے معنی ھیں حالات کا مستقیم و متوازن رھنا ۔ لہذا فَسَادٌ کے معنی ھیں توازن کا بگڑ جانا ۔ بے ترتیبی (Disorder) پیدا ھو جانا * ۔ [اس کے واضح مفہوم کے لئے ص ۔ ل ۔ ح کا عنوان دیکھئے کیونکہ جب تک صَلَاحٌ کا صحیح تصور ذھن میں نہ آئے اس کی ضد (فَسَادٌ) کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا] ۔

قرآن کریم نے مُفْسِدِیْنَ کے مقابلہ میں مُصْلِحِیْنَ کا لفظ استعمال کیا ھے (۲/۱۱) ۔ حرث و نسل کے تباہ کر دینے کو بھی فَسَادٌ قرار دیا ھے (۲/۲۰۵) ۔ ماپ تول کو پورا نہ رکھنا ۔ دوسروں کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دینا ۔ معاشی ناھمواریاں پیدا کر دینا ۔ لوگوں کے حقوق کو دبا لینا ۔ یہ سب فَسَادٌ ھے (۷/۸۵ ؛ ۲۶/۱۸۳) ۔ صالح نظام کو درھم برھم کر دینا ۔ صحیح ترتیب کو الٹ دینا بھی فَسَادٌ ھے ۔ (۲۷/۳۴) ۔ ارتکاب جرم کو بھی فَسَادٌ سے تعبیر کیا گیا ھے ۔ (۱۲/۷۳) ۔ فَسَادٌ درحقیقت معاشرہ میں ناھمواریاں پیدا ھونے کا نام ھے ، خواہ اسکی شکل کوئی بھی ھو ۔ اس سے معاشرہ کا توازن بگڑ جاتا ھے ۔ دولت کے نشہ میں بدمست ھو کر لوگ ایسا ھی کرتے ھیں ۔ (۷/۷۴) ۔ نیز ،، حکمت فرعونی ،، کا بھی یہی شیوہ ھوتا ھے کہ ملک میں مختلف پارٹیاں پیدا کرکے معاشرہ کے توازن کو بگاڑتے رھیں (۲۸/۴) ۔ منشائے خداوندی کے مطابق صحیح زندگی یہ ھے کہ خدا کے عطا فرمودہ رزق کے سرچشموں سے بقدر ضرورت لیا جائے اور اس سے زیادہ پر قبضہ کرکے معاشرہ کا توازن نہ بگاڑا جائے ۔ (۲/۶۰) ۔

سورہ شعراء میں مُسْرِفِیْنَ کو مُفْسِدِیْنَ کہا گیا ھے (۲۶/۱۵۱-۱۵۲) اور سورہ قصص میں یہ لفظ اَحْسَنَ کے مقابلہ میں آیا ھے ۔ (۲۸/۷۷) ۔ سورہ بقرہ میں ھے کہ ملائکہ نے کہا کہ آدم ارض میں فساد مچائیگا اور خون ریزیاں کریگا ۔ اس کے برعکس، نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ (۲/۳۰) ۔ ھم تیری مشیت کے پروگرام کو سزاوار حمد وستائش بنانے کے لئے ھر وقت مصروف عمل رھتے ھیں اور اس کے لئے جہانتک بھی جانا پڑے جاتے ھیں ۔

*محیط ۔ تاج ۔ لین ۔

اس سے ظاہر ہے کہ اللہ نے جو پروگرام انسانوں کے لئے (بذریعہ وحی) تجویز کیا ہے، اسکی خلاف ورزی کرنا فَسَادٌ ہے۔ اس سے انسان کی اپنی ذات میں انتشار (Chaos) پیدا ہوتا ہے اور معاشرہ میں بد نظمی (Disorder)۔ کائنات کا یہ عظیم القدر اور محیرالعقول سلسلہ اس نظم وضبط اور حسن و خوبی سے اس لئے چل رہا ہے کہ اس میں صرف ایک خدا کا قانون نافذالعمل ہے۔ اگر اس میں متعدد "خداؤں" کا اقتدار کارفرما ہوتا تو اس میں فساد برپا ہو جاتا۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَا آلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۲۱/۲۲)۔ انسانی زندگی بھی اسی حسن و خوبی سے اسی صورت میں بسر ہو سکتی ہے جب یہ خدائے واحد کے ضابطۂ واحد کے ماتحت بسر کی جائے۔

ف س ر

اَلْفَسْرُ۔ واضح کرنا۔ چھپی ہوئی چیز کو کھول دینا۔ فَسَرَ۔ يَفْسِرُ اور يَفْسُرُ۔ واضح کرنا۔ فَسَّرَ کے بھی یہی معنی ہیں، لیکن اس میں مبالغہ کا مفہوم بھی ہوتا ہے۔ اَلتَّفْسِرَةُ۔ قارورہ کا امتحان (Test) کرنا *۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے متعلق کہا ہے وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا (۲۵/۳۳)۔ اسکی نہایت عمدہ و ضاحت اور تشریح خود خدا نے کر دی ہے۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۷۵/۱۹) اسے ظاہر اور واضح کرنا بھی ہمارے ہی ذمے ہے۔ قرآن کریم کی یہ تفسیر و توضیح، تصریف آیات کے ذریعے ہوتی ہے۔ یعنی ایک بات کو مختلف آیات میں پھیر پھیر کر بیان کرنے سے۔ (۶/۱۰۶؛ ۶/۶۵)۔ اس لئے قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن کریم ہی سے ہوگی۔ اور اس کے دعاوی کی تائید اور شہادت کائنات کے نظم و نسق اور تاریخی شواہد سے۔ یا اس کے نظام کو عملاً متشکل کرنے سے جو درخشندہ نتائج سامنے آئیں، ان سے۔

ف س ق

فِسْقٌ۔ دائرہ حق سے باہر نکل جانا۔ فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ عَنْ قِشْرِهَا۔ گدری کھجور اپنے چھلکے سے باہر نکل گئی۔ کھجور کے پھل کے اوپر ایک چھلکا ہوتا ہے جس کے اندر وہ پھل نشو و نما پاتا اور پختگی تک پہنچتا ہے (یہی صورت ہر پھل کے ساتھ ہوتی ہے)۔ وہ چھلکا گویا اس پھل کا قالب (Pattern) ہوتا ہے جس کے اندر اس کی صلاحیتوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ پھل ایک طرف سے

*تاج۔ محیط۔ راغب۔

چھلکے سے باہر نکل جاتا ہے اور اس طرح اپنی پختگی تک نہیں پہنچتا - عرب اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ عَنْ قِشْرِهَا کہتے تھے - جاھلیت عرب میں یہ لفظ اسی مفہوم کے ادا کرنے کے لئے بولا جاتا تھا - انسانوں کے لئے نہیں بولا جاتا تھا* - قرآن کریم نے اسے انسانوں کے لئے استعمال کیا - قرآن کریم ایک ایسا نظام معاشرہ یا زندگی کا قالب عطا کرتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے افراد کی صلاحیتوں کی صحیح صحیح نشو و نما ہو جاتی ہے - جو فرد (یا گروہ) اس نظام کے قالب سے باہر نکل جائے اسے فَاسِقٌ کہتے ہیں - اس کی صحیح نشو و نما نہیں ہوسکتی - لہذا ہرشخص جو قانون خداوندی کے دائرے سے باہر نکل جائے وہ فاسق ہے - قرآن کریم میں جہاں یہ لفظ پہلی مرتبہ آیا ہے وہاں اسکی تشریح ان الفاظ سے کی گئی ہے - اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ($\frac{۲}{۲۷-۲۶}$) - یعنی فاسقین وہ ہیں جواللہ سے پختہ عہد باندھ کر اسے توڑ دیتے ہیں اور جس رشتہ کو ملانے کا خدا نے حکم دیا ہے (یعنی نوع انسانی کا رشتہ) اسے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں - اور انسان کی تمدنی زندگی میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے ہیں - اسی طرح ذرا آگے چل کر ظَالِمِيْنَ کو بھی فَاسِقِيْنَ کہا گیا ہے ($\frac{۲}{۵۹}$) - اور کَافِرِيْنَ کو بھی ($\frac{۲}{۹۹}$) - نیز معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے گریز کی راہیں نکالنے والوں کو بھی ($\frac{۳}{۸۱}$) - سورۃ المائدہ میں فِسْقٌ کا لفظ احکام خداوندی کی خلاف ورزی کے لئے بولا گیا ہے خواہ وہ حکم چھوٹا ہو یا بڑا ($\frac{۵}{۳}$) - یعنی ہر مجرم فاسق ہے - اس لئے کہ کھجور کے چھلکے میں ذرا سا شگاف بھی پھل میں نقص پیدا کر دیتا ہے - مومن اور فاسق ایک دوسرے کی ضد ہیں - ($\frac{۳}{۱۰۹}$) -

سورۃ بقرہ میں ہے - "لَا فُسُوْقَ وَ لَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ" - ($\frac{۲}{۱۹۷}$) - اسکے عام معنی گالی گلوچ کئے جاتے ہیں - لیکن اس کا مفہوم یہی ہے کہ حج میں کوئی بات بھی ایسی نہیں کرنی چاھئے جس سے انسان صحیح راستے سے ذرا بھی ادھر ادھر ہوجائے - ایک دوسرے سے سخت کلامی اور سب و شتم بھی اس کے اندر آجاتے ہیں -

ف ش ل

فَشِلَ - يَفْشَلُ - کمزور اور بزدل ہو جانا * - اصل میں اَلْفِيْشَلُ ھودج کے پردے کو کہتے ہیں جس کے پیچھے عورتیں بیٹھتی ہیں، یا وہ گدا

*تاج و محیط -

جسے ہودج میں بچھا کر اس پر عورتیں بیٹھتی ہیں ۔ اسلئے فَشِلَ کے معنی ہوئے عورتوں کی طرح بزدل ہو جانا ۔ اَلْيَدُ الْفَشْلَاءُ ۔ بائیں ہاتھ کو کہتے ہیں جو عموماً (دائیں کی نسبت) کمزور ہوتا ہے** ۔ (یہ عوام کی بولی ہے ، فصیح نہیں) ۔ اس لئے فَشَلٌ میں کمزوری کے ساتھ بزدلی کا مفہوم پایا جاتا ہے*** ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا (۸/۴۶) ۔ آپس میں چھینا جھپٹی (تنازع اور جھگڑا) مت کرنے لگ جاؤ ۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کمزور اور بزدل ہو جاؤ گے ۔ عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر بیٹھ جاؤ گے ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ تَفَشَّلَ الْمَاءُ کے معنی ہیں پانی بہ پڑا ۔ اس سے بھی کمزوری اور عدم استحکام کا مفہوم واضح ہے ، یعنی قوتوں کے بیکار ضائع ہو جانے سے کمزور ہو جانا ۔

ف ص ح

اَلْفَصْحُ ۔ واضح اور ظاہر ہونا ۔ آئمہ اشتقاق نے کہا ہے کہ اس ترکیب میں ''ظہور'' یعنی ظاہر ہونے کا مفہوم مضمر ہوتا ہے ۔ ایسی زبان جس سے مطلب بالکل ظاہر اور واضح ہو جائے فَصِيْحٌ کہلائیگی ۔ نیز وہ آدمی بھی فَصِيْحٌ کہلائیگا جو بات کو واضح اور کھول کر بیان کرے اور اس کے بیان میں کوئی نقص اور خامی نہ ہو ۔ اَلْفَصَاحَةُ بات کا واضح اور صاف ہونا ۔ خوش بیانی ۔ اَفْصَحَتِ الشَّاةُ ۔ (پیوسی ۔ یعنی بچہ دینے کے بعد ایک دو دن تک جس قسم کا دودھ ہوتا ہے ۔ اس کے بعد) بکری نے صاف دودھ دیا ۔ اَفْصَحَ الصُّبْحُ ۔ صبح روشن اور نمودار ہوگئی ۔ فَصْحٌ اس دودھ کو بھی کہتے ہیں جس کے اوپر سے جھاگ اتار کر بالکل صاف کر لیا جائے ۔ اس لئے کسی چیز کو ان چیزوں سے صاف کردینا جو اس میں بالعموم مل جاتی ہیں اَلْفَصْحُ کہلاتا ہے**** ۔

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کا قول (حضرت ہارونؑ کے متعلق) ہے ۔ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ (۲۸/۳۴) ۔ وہ مجھ سے زیادہ فصیح ہے ۔

ف ص ل

اَلْفَصْلُ ۔ دو چیزوں کے درمیان روک جو یہ بتا دے کہ یہاں تک پہلی چیز ختم ہوگئی اور اسی کے بعد دوسری چیز شروع ہوگئی (لطائف اللغۃ) ۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****تاج و محیط و راغب ۔

دو چیزوں میں سے ایک کو دوسری سے اس طرح الگ کر دینا کہ ان کے درمیان فاصلہ ہو جائے اور اس طرح ایک دوسری سے الگ اور متمیز ہو جائے* ۔ اَلْفَاصِلَةُ ۔ اس موتی کو کہتے ہیں جو دو موتیوں کے درمیان امتیاز کے لئے ڈال دیا جائے ۔ اَلْمَفَاصِلُ ۔ جسم کے جوڑ ۔ نیز پہاڑوں کے درمیان کی جگہیں جن سے پانی بہتا ہے ۔ فَصْلُ الْخِطَابِ (۳۸/۲۰) ۔ فیصلہ کن بات ۔ اَلتَّفْصِيْلُ ۔ جدا جدا کر دینا، واضح کر دینا، متمیز کر دینا ۔ آیَاتٌ مُفَصَّلاَتٌ ۔ واضح آیات ۔ اَلْاِنْفِصَالُ ۔ انقطاع ۔ جدا ہوجانا ۔ فِصَالٌ بچے کا دودھ چھڑانا* ۔ (۲/۲۳۳) ۔ فَصَّلَ الشَّيْءَ ۔ چیز کو الگ الگ حصوں میں متمائز کر دینا ۔ فَصَّلَ الْكَلاَمَ ۔ کلام کو واضح کر دینا ۔ کھول کر بیان کر دیا** ۔ فَصِيْلَةُ الرَّجُلِ ۔ خاندان (۷۰/۱۳)* ۔ فَصَلَ مِنَ الْبَلَدِ ۔ وہ شہر سے روانہ (جدا) ہو گیا* ۔ (۲/۲۴۹) ۔

قرآن کریم کے متعلق تَفْصِيْلَ الْكِتَابِ (۱۰/۳۷) ۔ نیز اَلْكِتَابَ مُفَصَّلاً (۶/۱۱۵) کہا گیا ہے ۔ عام طور پر تفصیل کے معنی (Details) لئے جاتے ہیں اور مفصل کے معنی (Detailed) ۔ اس لئے جب قرآن کریم کو مُفَصَّلٌ کہا جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اس میں تمام باتوں کی تفاصیل (Details) دی ہوئی ہیں ۔ لیکن، جیسا کہ اوپر دیکھا جاچکا ہے، تَفْصِيْلٌ کے معنی وضاحت ہیں اور مُفَصَّلٌ کے معنی واضح ۔ یعنی جس میں ہر بات نکھار کر اور الگ الگ کرکے (Distinctly) بیان کی گئی ہو*** ۔ قرآن کریم ایک واضح کتاب ہے جس کے مطالب میں کوئی ابہام (Confusion) نہیں ۔ لیکن اس میں تمام امور کی تفاصیل (Details) نہیں دی ہوئیں ۔ اس نے (بجز چند احکام کے) اصولی قوانین بیان کئے ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں ۔ ان اصولی قوانین کی تفاصیل و جزئیات قرآنی نظام کو قائم کرنے والی جماعت اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے، خود طے کریگی ۔ ان تفاصیل میں زمانہ کے تغیرات کے ساتھ ساتھ مناسب رد و بدل ہوتا رہے گا لیکن قرآن کریم کے اصول اپنی جگہ غیر متبدل رہیں گے ۔ یہی اَلدِّيْنُ الْقَيِّمُ ہے (۳۰/۳۰) اور یہی مستقل اقدار ۔ كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (۹۸/۳) ۔

پھر سمجھ لیجئے کہ تَفْصِيْلٌ کے معنی توضیح اور تشریح کے ہیں اور مُفَصَّلٌ کے معنی واضح اور صاف، متمیز، نکھرا ہوا ۔ (Distinct) نہ کہ (Detailed) ۔ *یعنی ایسا جس میں ہر اصولی حکم کی جزئیات تک بھی دی گئی ہوں۔*

---

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***ابن قتیبہ القرطین ج/۱ صفحہ ۲۰۴ ۔

ف ص م

فَصَمَ ۔ کسی چیز کو اس طرح توڑ دینا کہ وہ دو ٹکڑے نہ ہو بلکہ جڑی رہے ۔ یہ لفظ بالعموم ایسے موقعوں پر استعمال ہوتا ہے جب کسی کڑی یا حلقے کا منہ کھل جائے لیکن وہ ٹوٹے نہیں ۔ ابوعبید نے کہا ہے کہ اَلْفَصْمُ یہ ہے کہ کوئی چیز صرف تڑخ جائے اور وہ جدا نہ ہو ۔ اور اَلْقَصْمُ ۔ اس طرح توڑنے کو کہتے ہیں کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے ۔ اِنْفَصَمَ ۔ ٹوٹ گیا ۔ کٹ گیا* ۔

سورۃ بقرۃ میں خدا پر ایمان کے متعلق ہے کہ یہ اس قابل اعتماد قانون حیات پر ایمان ہے ، لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶) ۔ جس کا ٹوٹنا تو ایک طرف اس میں تڑخ تک بھی نہیں آسکتی ۔ اس پر پورا پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے ۔

ف ض ح

اَلْاَفْضَحُ ۔ ایسی سفید چیز جسکی سفیدی شدید نہ ہو ۔ اَفْضَحَ الصُّبْحُ ۔ صبح ظاہر اور روشن ہوگئی ۔ چنانچہ اَلْفَضَحُ خود صبح کو کہتے ہیں ۔ اس سے فَضَحَهُ فَضْحاً کے معنی ہوتے ہیں کسی کے عیب کو ظاہر کر دینا ۔ اِفْتَضَحَ کے معنے ہیں آدمی کا کسی برے کام کو کرنا اور اس کے ساتھ مشہور ہو جانا ۔ اسکی برائیوں کا کھل جانا ۔ اَلْفَضِيْحَةُ ۔ رسوائی کو کہتے ہیں ۔ یعنی برائیوں کا کھل جانا** ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ رسوا کرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ فَلَا تَفْضَحُوْنِ (۱۵/۶۸) ۔ تم میری فضیحت نہ کرو ۔ مجھے رسوا نہ کرو ۔ یعنی لَا تُخْزُوْنِ (۱۵/۶۹) مجھے شرمندہ نہ کرو ۔

ف ض ض

اَلْفَضُّ ۔ بکھیر دینا ۔ مجتمع ہونے کے بعد متفرق کر دینا ۔ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ۔ اِنْفَضَّ ۔ ٹوٹ کر بکھر جانا ، متفرق ہو جانا ۔ فَضٌّ مِنَ النَّاسِ ۔ متفرق لوگ* ۔

سورہ آل عمران میں ہے لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (۳/۱۵۸) ۔ وہ تیرے ارد گرد سے بکھر جاتے ۔ تجھ سے الگ ہوجاتے ۔ سورۃ جمعۃ میں ہے ..... اِنْفَضُّوْا اِلَيْهَا (۶۲/۱۱) ۔ (مجمع کو چھوڑ کر) اس چیز کیطرف متفرق و منتشر ہو کر چل دیتے ہیں ۔

---

*تاج ۔ **تاج و محیط ۔ *راغب ۔

فِضَّةٌ - چاندی (۳/۱۳) - فَضَّضَ الشَّيْءَ - کسی چیز پر چاندی چڑھائی -

ف ض ل

اَلْفَضْلُ - نقص (کمی) کی ضد ہے - راغب نے کہا ہے کہ فَضْلٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا متوسط ضرورت سے زائد ہونا - فَضْلٌ زیادہ تر اچھی باتوں میں استعمال ہوتا ہے - اور فُضُوْلٌ بری باتوں میں - اَلْفَضِيْلَةُ کے معنی مرتبہ کی بلندی اور برتری کے ہیں - (یہ نَقِيْصَةٌ کی ضد ہے -) یعنی بھلائی کی کثرت اور زیادتی - تَفَضَّلَ عَلَيْهِ - وہ اس سے فضیلت و برتری میں بڑھ گیا - یا اس کے معنی ہیں اس نے اسپر احسان کیا اور اپنے زیادہ مال سے اسے دیدیا - فَوَاضِلُ الْمَالِ - مال کا منافع - مثلاً زمین کی پیداوار، جانوروں کا کرایہ، دودھ یا اون وغیرہ* -

قرآن کریم میں یہ مادہ باب تفعیل سے فضیلت دینے کے معنوں میں آیا ہے - وَفَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ (۲/۴۷) میں نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر فضیلت اور برتری عطا کی - رسول اللہؐ کو وحی کے وہبی طور پر ملنے کو بھی فَضْلٌ کہا گیا ہے - (۲/۹۰) - لیکن عام طور پر یہ مادہ معاشی خوش حالی کے معنوں میں آیا ہے - مثلاً لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (۱۶/۱۴) کے معنی ہیں تلاش معاش - میدان جنگ کی فتوحات کو بھی فَضْلٌ کہا گیا ہے (۳/۱۷۴) - مصائب اور ناخوشگوار حوادث کے مقابلہ میں بھی یہ لفظ آیا ہے (۳/۱۷۴-۱۷۳) - اور فَحْشَاءُ (بخل) کے مقابلہ میں بھی (۲/۲۶۸) -

لہذا فَضْلٌ کا عمومی مفہوم زندگی کی خوش حالیاں اور معاشی فارغ البالیاں ہیں جن کے حاصل کرنے کی مؤمنین کو تاکید کی گئی ہے (۶۲/۱۰) - سورہ بنی اسرائیل کی آیات (۱۸-۲۱/۱۷) میں اس مفہوم کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، جہاں مختلف روش پر چلنے والی قوموں کیطرف اشارہ کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ - دیکھو ہم نے کسطرح ایک قوم کو دوسری قوم کے مقابلہ میں زیادہ خوش حالیاں عطا کی ہیں - یہ اس کا عمومی مفہوم ہے - خصوصی مفہوم ہر وہ نعمت ہے جو خدا کی طرف سے انسان کو ملے جس میں وحی بھی شامل ہے کیونکہ وہ سب سے بڑی نعمت ہے جو انسان کو عطا کی گئی ہے - تمام قومی امتیازات اور ملی سرفرازیاں خدا کا فضل ہیں - اور اپنی ہم عصر اقوام کے مقابلہ میں ممتاز پوزیشن کا حاصل ہو جانا بھی اسکی نعمت ہے (۲/۴۷) -

---

*تاج - **محیط -

سورۂ النحل میں ہے وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعۡضَکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ فِی الرِّزۡقِ۔ یعنی جہانتک رزق کمانے کی استعداد کا تعلق ہے وہ مختلف انسانوں میں مختلف ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جس شخص کو خدا نے زیادہ استعداد دی ہے وہ یہ سمجھ لے کہ وہ اس استعداد سے جسقدر زیادہ کمالے وہ اس کا مالک ہے اور اس میں کسی اور کا حصہ نہیں۔ فَمَا الَّذِیۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّیۡ رِزۡقِہِمۡ عَلٰی مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُمۡ فَہُمۡ فِیۡہِ سَوَآءٌ۔ جن لوگوں کو زیادہ استعداد دی گئی ہے وہ زائد رزق کو اپنے ماتحتوں کی طرف نہیں لوٹاتے اس خیال سے کہ اسطرح رزق سے فائدہ اٹھانے کے معاملہ میں سب مساوی ہو جائینگے۔ ان لوگوں کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ اَفَبِنِعۡمَۃِ اللّٰہِ یَجۡحَدُوۡنَ (۱۶/۷۱)۔ یہ لوگ خدا کی دی ہوئی نعمت سے انکار کرتے ہیں۔ یعنی زیادہ رزق کمانے کی استعداد، خدا کی طرف سے بلامعاوضہ ملی تھی۔ یہ لوگ اس استعداد کے ماحصل کو اپنی واحد ملکیت قرار دیکر اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بلامعاوضہ ملی تھی۔

یہ آیت (اوراسی قسم کی دیگر آیات۔ مثلاً ۵۶/۵۸؛ ۴۳/۳۲؛ ۵۹/۷ تا ۱۰؛ ۴۱/۱۰ وغیرہ) قرآن کریم کے معاشی نظام کی اساس و بنیاد ہیں۔ اس نظام کی رو سے ہر شخص صرف اپنی محنت کے ماحصل کا حقدار ہے۔ مؤمنین کا فریضہ یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرکے کمائیں اور اپنی ضرورت سے زائد رزق، دوسرے لوگوں کی پرورش کے لئے کھلا چھوڑ دیں۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب نظام ربوبیت میں ملیگی)۔

ف ض و

اَلۡفَضَآءُ۔ صحن۔ وسیع زمین۔ وسیع جگہ*۔ اَلۡفِضَآءُ۔ پانی جو زمین پر بہہ رہا ہو*۔ اَفۡضٰی فُلَانٌ اِلٰی فُلَانٍ۔ فلاں آدمی فلاں تک پہنچ گیا*۔ اسی سے کنایۃً اَفۡضَی الرَّجُلُ اِلَی الۡمَرۡاَۃِ عورت سے جماع کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اَلۡاِفۡضَآءُ درحقیقت آخر تک پہنچنے کو کہتے ہیں اور یہ کنایہ ہے خلوت اور مباشرت سے*۔ وَقَدۡ اَفۡضٰی بَعۡضُکُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ (۴/۲۱) میں یہی مفہوم ہے۔ یعنی آزاد فضا میں بے روک ٹوک تم ایک دوسرے سے ملتے رہے۔

ف ط ر

اَلۡفَطۡرُ۔ پھاڑنا۔ شق کرنا۔ پہلی مرتبہ پھاڑنا۔(پہلی مرتبہ کی خصوصیت اس کے بنیادی معنوں میں داخل ہے) چنانچہ ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ

*تاج۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کیا ہوتا ہے ، حتیٰ کہ میرے پاس دو اعرابی (بدو) آئے جو ایک کنویں کے متعلق جھگڑ رہے تھے ۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اَنَا فَطَرْتُھَا ۔ یعنی اس کے کھودنے کی ابتداء میں نے کی تھی ۔ لہذا فَطَرَ کے معنی ہیں کسی چیز کو پہلی مرتبہ کرنا ۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے اَنَا اَوَّلُ مَنْ فَطَرَ ھٰذَا ۔ میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے اسکی ابتدا کی ہے*۔ اس لئے فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ($\frac{1}{14}$) کے معنی ہیں وہ خدا جس نے پہلی مرتبہ کائنات کی تخلیق کی ہے ۔ اسی کو بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہا گیا ہے ($\frac{6}{102}$) ۔ سورہ بنی اسرائیل میں فَطَرَکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ($\frac{17}{51}$) کہکر اسکی وضاحت کر دی ۔ لہذا فِطْرَۃٌ کے معنی ہوئے خدا کا قانون تخلیق ۔ وہ قانون یا طریقہ جس کے مطابق اس نے کائنات کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ۔ کائنات کی تخلیق کی ابتداء کی ۔

اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے ۔ فطرت کے معنی عام طور پر (Nature) کے لئے جاتے ہیں ۔ مثلاً کہتے ہیں انسان کی فطرت یہ ہے ۔ اس سے مراد ہوتی ہیں ایسی خصوصیتیں جو ہر انسان میں پیدائشی طور پر موجود ہوں اور جو بدلی نہ جاسکتی ہوں ۔ لیکن لفظ فطرت کا یہ مفہوم بعد کی پیداوار ہے ۔ جب یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہوا تو اس میں (Nature) کا لفظ آیا ۔ اس لفظ کا ترجمہ '' فطرت'' کے لفظ سے کیا گیا اور اسطرح جو مفہوم لفظ (Nature) کا تھا وہی مفہوم لفظ فطرت کا ہو گیا ۔

نیچر (Nature) کے بھی دو مفہوم ہیں ۔ ایک تو وہ قوانین جو کائنات میں جاری وساری ہیں ۔ انہیں قوانین فطرت (Laws of Nature) کہا جاتا ہے ۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں اور ہر شے کے اندر رکھ دیئے گئے ہیں ۔ مثلاً یہ کہ پانی کی فطرت یہ ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے ۔ فطرت کے اس مفہوم میں کوئی حرج نہیں ۔ اس مفہوم کے روسے حیوانات کی جبلت (Instinct) کو بھی ان کی فطرت کہ دیا جاتا ہے ۔ اس لئے کہ وہ بھی غیر متبدل ہوتی ہے ۔ مثلاً یہ کہ بکری گھاس کھاتی ہے اور شیر گوشت ۔ یہاں تک بھی کچھ مضائقہ نہیں ۔ انسان میں بہت سا حصہ حیوانی زندگی کا ہے ۔ یعنی اس کا جسمانی نظام کم و بیش وہی ہے جو حیوانات کا ہے ۔ لہذا جو قوانین اس کے جسمانی نظام سے متعلق ہیں انہیں قوانین فطرت کہدینے میں بھی کچھ حرج نہیں ۔ یعنی

*تاج ۔

وہ قوانین جن کے مطابق انسان کی طبعی زندگی کی مشینری چل رہی ہے اور جو غیر متبدل ہیں ۔ مثلاً کھانا ۔ پینا ۔ سونا ۔ افزائش نسل ۔ بیماری ۔ موت ۔ وغیرہ۔

لیکن جب اس سے آگے بڑھ کر خود "انسان" کی فطرت کا تصور سامنے لایا جاتا ہے تو یہ چیز محل نظر اور قابل اعتراض ہو جاتی ہے ۔ کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے ۔ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے ۔ اسلام اسی فطرت کے مطابق دین ہے ۔ یہ خارجی اثرات کا نتیجہ ہے کہ بچہ بڑا ہو کر کسی دوسری روش پر چل پڑتا ہے ۔ یعنی اگر کسی انسانی بچہ کو خارجی اثرات سے بالکل محفوظ رکھا جائے تو وہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کریگا ۔ یہ بات بالبداہت غلط ہے ۔ اگر آپ کسی بچے کو پیدا ہوتے ہی کسی ایسے جنگل میں چھوڑ دیں جہاں کوئی اور انسان نہ ہو اور وہیں اسکی پرورش ہو تو آپ دیکھیں گے کہ وہ بڑا ہو کر بالکل جانور بن جائیگا ۔ چنانچہ اس قسم کے کئی بچے ملے ہیں جن کی پرورش جانوروں کے اندر ہوئی ۔ وہ بالکل جانوروں کی مانند تھے ۔ اسوقت (۱۹۶۰ میں) اس قسم کا ایک بچہ ہندوستان کے ایک ہسپتال میں زیر علاج اور زیر مشاہدہ ہے ۔ یہ بالکل حیوانوں کی سی عادات و خصائل رکھتا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر انسان کو اسکی "پیدائشی فطرت" پر چھوڑ دیا جائے تو وہ جانور ہوگا ۔ لہذا اگر یہی وہ "فطرت اللہ" (خدا کی فطرت) ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے تو یہ تو کوئی قابل شرف بات نہیں ۔ (نیز خود خدا کے متعلق یہ کہنا کہ اسکی بھی "فطرت" ہے بڑی گستاخی ہے) ۔

اس سے بھی آگے بڑھئے ۔ خود قرآن کریم نے انسان کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کبھی "فطرت اللہ" کے مظاہرے نہیں ہو سکتے ۔ (واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہ کچھ اس انسان کے متعلق کہا ہے جو وحی کی راہ نمائی میں نہیں چلتا بلکہ اپنے جذبات کے پیچھے چلتا ہے) ۔ مثلاً اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعاً (۷۰/۱۹) ۔ انسان بڑا ہی بے صبرا ہے ۔ اسکی نیت ہی نہیں بھرتی ۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْماً جَهُوْلاً (۳۳/۷۲) ۔ بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے ۔ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ (۸۰/۱۷) ۔ بڑا ہی ناشکرا ہے ۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلاً (۱۷/۱۱) ۔ بڑا ہی جلد باز ہے ۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلاً (۱۸/۵۴) ۔ اکثر باتوں میں جھگڑتا رہتا ہے ۔ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (۳۶/۷۷) ۔ بڑا ہی جھگڑالو ہے ۔ یہ کچھ قرآن کریم نے "الانسان" کے متعلق کہا ہے ۔ اگر یہ مانا جائے

کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے، تو اس سے خود "خدا کی فطرت" کے متعلق جو تصور سامنے آتا ہے وہ (نعوذ باللہ) بڑا گھناؤنا ہے۔ لہذا، قرآن کریم کی رو سے یہ نظریہ صحیح نہیں کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ خیال اس قدیم تصور سے متاثر ہو کر پیدا ہوا جس کی رو سے کہا جاتا تھا کہ "خدا نے آدم کو اپنی شکل پر ڈھالا تھا"۔

اسی (غلط) تصور کی بنا پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان کے اندر ایک چیز ہے جو اسے نیکی اور بدی کا علم دیدیتی ہے۔ اسے "انسانی فطرت" کہتے ہیں۔ اور چونکہ انسانی فطرت خود خدا کی فطرت ہے اس لئے اس کے اندر کی آواز، خود خدا کی آواز ہے۔ یہ تصور بھی غلط ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو مطلق حق (Absolute right) اور مطلق باطل (Absolute wrong) میں تمیز کر دے۔ اگر یہ قوت ہر انسان کے اندر موجود ہوتی تو پھر انسانوں کے لئے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ چیز حیوانوں تک تو چلی آتی ہے۔ یعنی حیوانات وغیرہ کو ان کے فرائض اور وظائف زندگی کا علم جبلی طور پر دیا جاتا ہے۔ لیکن انسان کو وحی خارج سے ملتی ہے۔ یعنی ایک فرد (نبی) کے ذریعے باقی افراد کو۔ انسان کے اندر یہ امکانی قوت موجود ہے کہ وہ چاہے تو حق کو اختیار کر لے اور چاہے باطل کو اختیار کر لے۔ یہی اختیار انسان کی بنیادی خصوصیت ہے جو حیوانات کو حاصل نہیں۔ اگر انسان وحی کی راہنمائی کو اختیار نہ کرے تو اپنے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور تباہیاں خریدتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ يَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ (۱۷/۱۱) وہ بھلائی کو بلانے کے بجائے شر کو آوازیں دیکر بلاتا رہتا ہے۔ اگر انسان کے اندر "خیر و شر" کی تمیز ودیعت کرکے رکھ دی جاتی تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا۔ اسے ایسا کرنے کی آزادی ہی نہ ملتی۔ جسطرح حیوانات کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اس روش کے خلاف چلیں جس پر چلنے کی تمیز ان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ (مزید تفصیل ل۔ ھ۔ م کے عنوان میں ملیگی)۔

لہذا، یہ تصور غلط ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی "فطرت" پر پیدا کیا ہے اور اسلام دین فطرت ہے۔ یعنی اگر انسان کو علی حالہ چھوڑ دیا جائے تو وہ خود بخود اسلام کے مطابق زندگی بسر کریگا۔

ان حقائق کو سامنے رکھنے کے بعد اس آیت کی طرف آئیے جس سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ جس

دیکھ چکے ہیں کہ عربی زبان میں (جس میں قرآن کریم نازل ہوا ہے) لفظ فِطْرَۃٌ کے معنی ہیں وہ قانون یا قاعدہ جس کے مطابق کسی چیز کی پہلی مرتبہ تخلیق کی جاتی ہے۔ خدا فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے۔ لہذا فطرت اللہ کے معنی ہوئے خدا کا قانونِ تخلیق۔ آیت یہ ہے فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ۔ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (۳۰/۳۰)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا وہ قانونِ تخلیق جس کے مطابق اس نے انسان کو پیدا کیا۔ یعنی جس طرح اس نے تمام ارض و سما (کائنات) کو ایک خاص قانون کے مطابق پیدا کیا اسی طرح اس نے انسان کو بھی پیدا کیا۔ اس کے قانونِ تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ ہے دینِ قیم یعنی محکم نظام۔ تم ہر طرف سے منہ موڑ کر اس قانون پر سیدھے چلتے جاؤ۔ فَاَقِمْ وَجْہَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا (۳۰/۳۰)۔ اور اس کی تفسیر یہ ہے مُنِیْبِیْنَ اِلَیْہِ۔ وَاتَّقُوْہُ۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (۳۰/۳۱)۔ اس کی طرف توجہ کئے ہوئے۔ سو تم اس کے قوانین کی نگہداشت کرو۔ اور نظامِ صلٰوۃ کو قائم کرو۔ اور مشرکین میں سے مت ہو جاؤ۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ تصور کہ انسان کی ایک غیر متبدل فطرت ہے۔ وہ فطرت ''اللہ کی فطرت'' کے مطابق ہے۔ اور اس فطرت کی رو سے انسان خیر اور شر، حق اور باطل، میں از خود تمیز کر سکتا ہے۔ اور اسلام اس فطرت کا دین ہے۔ یہ سب غلط عمارت اسی بنیاد پر اٹھی ہے کہ ہم نے لفظِ فطرت کے وہ معنی لے لئے جو یونانی لفظ نیچر کے معنی تھے۔ اگر اس لفظ کے وہ بنیادی معنی سامنے رکھے جائیں جو عربوں کے ہاں رائج تھے تو ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔ یاد رکھئے! ان حیوانی رجحانات کے علاوہ جو انسان کی طبعی زندگی کا خاصہ ہیں، انسان کی کوئی غیر متبدل فطرت نہیں۔ اسے اپنی راہ نمائی وحی سے حاصل کرنی ہے۔ اور اس کا اسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اس راہ نمائی کو قبول کر لے اور چاہے اس سے انکار کر کے اپنے لئے کوئی اور راہ اختیار کر لے۔ اختیار و ارادہ کی صلاحیت (The Capacity to Choose) وہ خصوصیت ہے جو صرف انسان کو دی گئی ہے۔ اور کسی کو نہیں دی گئی۔ اس میں ہر انسان، بہ حیثیت انسان ہونے کے شریک ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ کسی انسان کو دی گئی ہو اور کسی کو نہ دی گئی ہو۔ لیکن یہ خصوصیت مضمر شکل (Un - Developed Form) میں دی گئی ہے جس کی نشو و نما کی جا سکتی ہے۔ یہ ہے وہ خاص ساخت جس کے مطابق خدا نے انسان کو پیدا

کیا ہے اور جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ۔ اگر انسان کی کوئی ''فطرت'' ہوتی تو اسے اختیار و ارادہ کی صلاحیت کبھی نہ ملتی ۔ ''فطرت'' اور اختیار و ارادہ دو متضاد باتیں ہیں ۔ خارجی کائنات میں ہر شے کی ایک فطرت ہے اس لئے ان میں سے کسی کو اختیار و ارادہ کی صلاحیت حاصل نہیں ۔ انسان کو اختیار و ارادہ کی صلاحیت حاصل ہے اس لئے اس کی کوئی فطرت نہیں ۔ انسان کے اندر بہت سی امکانی قوتیں ہیں جنہیں نشو و نما دینا اور قانونِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا ، مقصد زندگی ہے ۔ (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ''سلیم کے نام خطوط'' میں ایک خط میں ملے گی) ۔

ہم نے دیکھا ہے کہ اِنْفَطَرَ کے معنی کھودنے ۔ پھاڑنے ۔ شق کرنے کے ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (۸۲/۱) ۔ جب آسمان پھٹ جائے گا ۔ نیز (۱۹/۹۰) ۔

مُنْفَطِرٌ ۔ پھٹ جانے والا ۔ (۷۳/۱۸) ۔ فُطُوْرٌ ۔ شگاف ۔ عیوب ، خلل ، (۶۷/۳) ۔

ف ظ ظ

اَلْفَظُّ ۔ اونٹ کی اوجھ میں جمع رہنے والا پانی جسے ، صحرا میں جہاں پانی نہ ملے اور جان کا خطرہ لاحق ہو جانے کی صورت میں ، اس کا پیٹ چاک کرکے نچوڑ لیا جائے اور ایسے ہی لیا جائے ۔ یہ پانی مجبوراً اور بادلِ ناخواستہ پیا جاتا تھا ، لہذا اس لفظ کو ایسے شخص کے لئے بھی استعمال کیا جانے لگا جس کے پاس خوشی سے نہ بیٹھا جائے بلکہ اشد ضرورت میں بادلِ ناخواستہ پہنچا جائے ۔ اسی سے یہ لفظ تند خو ، جفا پیشہ ، درشت مزاج شخص کیلئے بولا جاتا ہے ۔

اِفْتَظَّ الرَّجُلُ کے معنی ہیں اس نے اونٹ کو پانی پلایا اور پھر اس کا منہ باندھ دیا تا کہ وہ جگالی نہ کرسکے ۔ پھر جب سفر میں پانی نہ ملا تو اس کا پیٹ چاک کرکے اس پانی کو پی لیا* ۔

قرآن کریم میں رسول اللہ ؐ کے متعلق کہا ہے کہ آپ اپنے رفقاء کے لئے نرم واقع ہوئے ہیں (لِنْتَ لَهُمْ) ۔ فَظًّا نہیں ہیں (۳/۱۵۸) ۔ یہی راہنما کی شان ہوتی چاہئے کہ لوگ اس میں کشش و جاذبیت پائیں اور اسے اپنا بہترین مشیر اور اچھا رفیق سمجھیں ۔ نہ ایسا کہ وہ اپنی پیاس بجھانے کی خاطر اپنے رفقاء کا پیٹ چاک کرکے پانی نکال لے ۔

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔

صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْفَظُّ اُس شخص کو کہتے ہیں جو سخت ، بد مزاج ، سنگدل ، درشت کلام ہو لیکن اس کے ساتھ ایسا بزدل بھی ہو کہ ڈرنے کے مقام پر ڈرنا تو ایک طرف ، جس جگہ کسی قسم کا خطرہ نہ ہو وہاں بھی ڈرے*** - ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنے ناپسندیدگی اور کراہت کے ہیں -

ف ع ل

فِعْلٌ* کے معنی انسان کا حرکت کرنا ہیں - اور اس کا مطلب ہے کوئی کام کرنا - فِعْلٌ* کی صحیح تعریف کرنے اور عَمَلٌ اور صَنَعٌ اور فَعَلٌ کا فرق بتانے میں علمائے لغت نے بڑی بحث کی ہے - مثلاً صاغانی کہتا ہے کہ کسی چیز کو وجود میں لے آنا فعل ہے خواہ وہ عمل ہو یا غیر عمل - اس طرح یہ عمل سے زیادہ خاص ہے - المحکم میں ہے کہ یہ کنایۃً ہر کام اور عمل کے لئے بولا جاتا ہے خواہ وہ عمل متعدی ہو یا غیر متعدی - ابن الکمال کا کہنا ہے کہ کسی چیز پر اثر ڈالنے سے اثر ڈالنے والے پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اسے فعل کہتے ہیں* - راغب نے فعل کے معنے کسی اثر انداز کی طرف سے اثر اندازی کے لئے ہیں - اس میں عمومیت ہے، یعنی خواہ وہ عمدگی سے کی جائے یا بغیر عمدگی کے - علم سے کی جائے یا بغیر علم کے - قصداً کی جائے یا بغیر قصد کے - اس میں انسان ، حیوان ، جمادات سب یکساں ہیں - وہ کہتا ہے کہ یہی مفہوم عمل کا بھی ہے اور صنع اس سے زیادہ خاص ہے** - محیط میں کلیات کے حوالہ سے سادہ ''عمل'' کے تحت ہے کہ عَمَلٌ* اس کام کو کہتے ہیں جو فکر و تدبر اور علم و ارادہ کے ساتھ سرزد ہو - فِعْلٌ* میں یہ شرط نہیں - نیز عَمَلٌ* ایسے کام کو کہتے ہیں جو طویل مدت تک ہوتا رہے - اس کے برعکس فعل ایک دفعہ بھی کسی کام کے کرنے کے لئے بولا جاتا ہے*** - (اس کے ساتھ ع - م - ل کا عنوان بھی دیکھئے) -

لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہو سکتا - اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ کے لئے فِعْلٌ* آیا ہے (عَمَلٌ* نہیں آیا) - اور اس کا ہر فعل ، علم و ارادہ پر مبنی ہوتا ہے اور بیشتر امور ایسے ہوتے ہیں جن میں استمرار اور دوام بھی ہوتا ہے - لہذا فِعْلٌ* کی وہ خصوصیات جو آئمہ لغت نے بتائی ہیں ، انسانوں تک تو درست ہو سکتی ہیں - افعال خداوندی کے لئے نہیں -

---

*تاج - **راغب - *** محیط -

مَنْ فَعَلَ (۲۱:۵۹) کس نے کیا ہے؟ فِعْلٌ (۲۱:۷۳) کام ۔ فَعْلَۃٌ (۲۶:۱۹) ایک حرکت ۔ ایک دفعہ کام کرنا ۔ فَاعِلٌ (۲۳:۴) کرنے والا ۔ فَعَّالٌ (۸۵:۱۶) بہت زیادہ کرنے والا ۔ زبردست کام کرنے والا ۔ کَانَ مَفْعُوْلاً (۴:۴۷) ۔ جو کام کیا جاچکا ہے ۔ جو مکمل ہو چکا ہے ۔

قرآن کریم میں یہ مادہ اس کثرت سے آیا ہے کہ اس کا احصاء اس مقام پر ممکن نہیں ۔ نہ ہی اس کی کوئی خاص ضرورت ہے ۔ جہاں یہ مادہ آیا ہے وہاں اس کا مفہوم خود بخود واضح ہوجاتا ہے ۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں جس کے لئے اس کی وضاحت یا تشریح کی ضرورت لاحق ہو ۔

ف ق د

فَقَدَ ۔ یَفْقِدُ ۔ فَقْدًا ۔ کسی موجود شے کو گم کر دینا* ۔ راغب نے فَقْدٌ اور عَدَمٌ کا فرق یہ بتایا ہے کہ فَقْدٌ تو کسی چیز کے وجود کے بعد اس کا نہ پایا جانا ہے، لیکن عَدَمٌ فَقْدٌ کو بھی کہتے ہیں اور کسی چیز کے سرے سے موجود ہی نہ ہونے کو بھی** ۔ سورۃ یوسف میں ہے ۔ مَاذَا تَفْقِدُوْنَ ۔ (۱۲:۷۱) تم نے کیا چیز کھودی ہے ۔ تم کیا چیز نہیں پارہے ہو؟ اِفْتَقَدَ وَ تَفَقَّدَ ۔ کسی گم گشتہ کا تلاش کرنا ۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ اَلتَّفَقُّدُ کے معنی ہیں یہ معلوم کر لینا کہ فلاں چیز گم ہو گئی ہے* ۔ لسان العرب میں ہے کہ اس کے معنی ہیں اس چیز کا طلب یا تلاش کرنا جو غائب ہو ۔ چنانچہ سورۃ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق ہے وَ تَفَقَّدَ الطَّیْرَ (۲۷:۲۰) ۔ اس کے یہ معنی ہونگے کہ حضرت سلیمانؑ نے تیز رفتار گھوڑوں کے ہرکاروں کو (جو اس وقت وہاں نہیں تھے) طلب کیا ۔ (دیکھئے عنوان ط ۔ ی ۔ ر)

ف ق ر

اَلْفِقْرَۃُ ۔ ریڑھ کی ہڈی کا ایک منکا ۔ اَلْفَقِیْرُ ۔ وہ شخص جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہو ۔ کمر شکستہ ۔ نیز اَلْفَقِیْرُ اُس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں کھجور کا پودا لگایا جاتا ہے* ۔ اسی طرح کنوئیں ، نیز ہر گڑھے کو جس میں پانی بھر جاتا ہو فَقِیْرٌ کہتے ہیں ۔ اَلْفَقْرُ ۔ اَلتَّفْقِیْرُ ۔ گڑھا کھودنا ۔ نیز موتیوں میں سوراخ کرنا ۔ اونٹ کی ناک چھیدنا تا کہ اس میں نکیل ڈال دی جائے* ۔ اور ایسے اونٹ کو اَلْفَقِیْرُ کہتے ہیں* ۔ ان

*تاج ۔ **راغب ۔

معانی سے فَقْرٌ - اور فَقِيْرٌ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - قرآن کریم میں فُقَرَاءُ اور مَسَاكِيْنُ کے الفاظ الگ الگ آئے ہیں (۹/۶۰) جس کی وجہ سے ائمہ لغت اور فقہ نے ان کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے - لیکن ان میں کوئی متعین خط امتیاز نہیں کھنچ سکا - عام طور پر یہ کہا گیا ہے کہ فَقِيْرٌ وہ ہے جس کے پاس کچھ موجود ہو لیکن نہ اتنا کہ وہ اسکی ضروریات کو پورا کر سکے - اسکی جمع فُقَرَاءُ ہے - لیکن مِسْكِيْنٌ وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو - مِسْكِيْنٌ کے معنی کے لئے دیکھئے عنوان س - ک - ن وہاں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک اپنی ہاں کے محتاج کو فَقِيْرٌ کہتے ہیں اور غیر قوم کا شخص جو اسلامی مملکت میں آکر بس گیا ہو اور صاحب احتیاج ہو مِسْكِيْنٌ کہلاتا ہے -

قرآن کریم میں فَقْرٌ - بمقابلہ غِنٰی آیا ہے (۳/۲۶۸ ؛ ۳/۱۸۰) - (غِنٰی کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان غ - ن - ی) - لہذا فَقْرٌ کے معنی احتیاج کے ہوں گے - ضرورتوں کا کما حقہ پورا نہ ہو سکنا - یعنی فُقَرَاءُ معاشرہ کے وہ افراد ہیں جو پوری پوری محنت کرنے کے بعد بھی اتنا نہ کما سکیں کہ وہ ان کی ضروریات کے لئے مکتفی ہو سکے - اصحاب احتیاج (۲/۲۷۳) - لیکن اس کے معنی صرف طبعی ضروریات کی احتیاج ہی نہیں بلکہ انسان کی نشوونما کے لئے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہو ان کی احتیاج بھی فَقْرٌ ہے - چنانچہ حضرت موسٰی نے خدا سے عرض کیا تھا کہ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (۲۸/۲۴) - جو کچھ بھی تو نے میرے لئے خیر میں سے بھیجا ہے میں اس کی احتیاج رکھتا ہوں - اس میں طبعی ضروریات اور شرف انسانیت کے اسباب و وسائل دونوں آجاتے ہیں - اس اعتبار سے کائنات کی ہر شے اور ہر انسان اپنی نشو و نما اور تکمیل ذات کے لئے ربوبیت خداوندی کا محتاج ہے - يَسْئَلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۵۵/۲۹) - کائنات کی ہر شے اس کی محتاج ہے - سورہ فاطر میں تمام نوع انسان سے کہا گیا ہے کہ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَى اللّٰهِ - وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ - (۳۵/۱۵) - تم سب اپنی نشو و نما کے لئے عطایائے خداوندی کے محتاج ہو ، اور اللہ کسی معاملہ میں بھی تمہارا محتاج نہیں - طبعی ضروریات کے لئے انسان ، فطرت کے عطا کردہ سامان پرورش کا محتاج ہے - اور شرف انسانیت کی نشو و نما کے لئے وحی کی راہ نمائی کا محتاج -

قرآنی معاشرہ میں فُقَرَاء وہ ہونگے جو پوری پوری محنت کے باوجود اتنا پیدا نہ کر سکیں جو ان کی ضروریات کے لئے کافی ہو - معاشرہ ان کی

ضروریات کے فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوگا - اور چونکہ ان کی سب ضروریات پوری ہوتی رہیں گی اس لئے اس معاشرہ میں در حقیقت فَقِیْرٌ (محتاج) کوئی نہیں رہے گا - یہ صرف اسوقت تک ہونگے جب تک قرآنی معاشرہ وجود میں نہیں آئیگا -

فَاقِرَةٌ - کمر توڑ دینے والی مصیبت (۷۵/۲۵) -

ف ق ع

فَاقِعٌ - ہر تیز رنگ کو فَاقِعٌ کہتے ہیں - یا خالص اور صاف رنگ کو* (جس میں دوسرے رنگ کی آمیزش نہ ہو) - قرآن کریم میں یہ لفظ صَفْرَاءُ کے ساتھ آیا ہے (۲/۶۹) جس کے معنی ہیں گہرا زرد رنگ -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے الفاظ کسی قاعدہ اور قیاس کے ماتحت نہیں آتے - چنانچہ فَوَاقِعُ الدَّهْرِ - زمانہ کے مصائب و آلام کو کہتے ہیں -

ف ق ہ

اَلْفِقْهُ - کسی چیز کو جان لینا اور سمجھ لینا* - قرآن کریم میں ہے - لَایَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا (۴۸/۱۵) - یہ بہت کم سمجھتے ہیں - اصل میں یہ اس قسم کی سمجھ اور پہچان کو کہتے ہیں جس طرح حیوان اپنی جبلی استعداد (Instinct) سے اپنی پہچان اور تمیز میں کبھی غلطی نہیں کرتے - چنانچہ فَحْلٌ فَقِیْهٌ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو صحیح طور پر پہچان لے کہ کونسی اونٹنی حاملہ ہے اور کونسی اختلاط کے قابل * -

راغب نے کہا ہے کہ اَلْفِقْهُ - علم حاضر سے علم غائب کی طرف پہنچنے کو کہتے ہیں ** - یعنی محسوسات کے مشاہدہ سے نتائج اخذ کرکے ان کے ذریعے مجرد حقائق (Abstract Truths) کا سمجھنا ** - تَفَقُّهٌ فِی الدِّیْنِ (۹/۱۲۲) کا یہی طریقہ ہے - یعنی زمانہ کے ٹھوس واقعات پر غور کرکے یہ سمجھنا کہ ان پر دین کے کون سے حقائق و قوانین کا اطلاق ہوتا ہے - قرآن کریم نے تفقہ فی الدین کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ ہر مقام سے کچھ لوگ مرکز میں آئیں اور دین میں تفقہ حاصل کریں - پھر یہ واپس جا کر باقی لوگوں کو اس سے آگاہ کریں (۹/۱۲۲) - یعنی تفقہ فی الدین کسی خاص گروہ کا اجارہ (Monopoly) نہیں - دین میں تفقہ حاصل کرنے کا یہ طریقہ ان حالات میں بتایا گیا تھا جو ابتدائے اسلام میں تھے - ویسے از روئے قرآن کریم تفکر - تدبر - تفقہ ہر مؤمن کے لئے ضروری ہے -

---

*تاج - **راغب -

فقہ ایک قانونی اصطلاح تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں زمانے کے تقاضوں (اور روز مرہ کے حالات کے مطابق) جزئی قوانین مستنبط کئے جائیں۔ یہ کام اسلامی نظام کا تھا۔ لیکن اب فقہ کے معنی ہیں کسی خاص امام کا مسلک۔ مثلاً فقہ حنفی کے معنی ہیں امام ابو حنیفہؒ کا مسلک۔ یا ان فقہاء کے فتاویٰ جو امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے پیرو تھے۔ اہل فقہ، اہل حدیث کے مقابلہ میں ایک فرقہ ہیں۔ غور کیجئے، قرآن کریم کی رو سے تفقہ فی الدین کا مفہوم کیا تھا۔ اور اب اس کا مفہوم کیا رہ گیا ہے! جب دین، ایک نظام اجتماعی کی بجائے انفرادی چیز بن جائے تو اس میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

ف ک ر

فَكَّرَ۔ أَفْكَرَ۔ فَكَّرَ۔ تَفَكَّرَ فِيْهِ۔ کسی چیز یا (معاملہ) میں اطمینان سے (ایک خاص ترتیب کے ساتھ) غور کرنا اور عقل و نظر سے کام لینا* (اور اس سے صاف نتیجہ اخذ کرنا)۔ صاحب مفردات کے نزدیک ہم انہی چیزوں پر فکر کر سکتے ہیں جن کا کوئی تصور دل میں قائم ہو سکے۔ جن چیزوں کا تصور قائم نہ ہو سکے ان میں فکر نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تَفَكَّرُوْا فِي آلَاءِ اللّٰهِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِي اللّٰهِ۔ اللہ کی قدرتوں (مظاہر فطرت وغیرہ) پر تو غور و فکر کرو، لیکن اللہ کی ذات کے متعلق کچھ نہ سوچو، کیونکہ اس کا تصور ہی ذہن انسانی میں نہیں آ سکتا**۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ تَفَكَّرَ کے معنے عبرت حاصل کرنے کے لئے دل کو گھمانا اور ادھر ادھر پلٹنا ہیں۔

قرآن کریم کو شروع سے آخر تک دیکھتے جائیے۔ قدم قدم پر آپ کو غور و فکر کی دعوت ملے گی۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل و برہان کے ساتھ پیش کرتا اور اسے فکر و تدبر کے بعد ماننے کی تاکید کرتا ہے۔ اس نے غور و فکر پر کس قدر زور دیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ نبی اکرمؐ کی زبان سے کہلواتا ہے کہ قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ (۳۴/۴۶) ان سے کہدو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی تلقین کرنا چاہتا ہوں۔ غور کیجئے کہ اتنا بڑا جلیل القدر رسولؐ کہتا ہے کہ میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ بات جو کہی جائے گی کس قدر اہم ہوگی۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ بات ایسی نہیں کہ تم یونہی چلتے چلتے سن لو۔

*تاج۔ **راغب۔

اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ۔ (۳۴/۴۶) اس کے لئے ضروری ہے کہ تم جس سیلاب میں بہے جا رہے ہو اس میں بہے نہ جاؤ۔ کھڑے ہوجاؤ۔ یعنی پہلی بات جس کی تاکید کی جاتی ہے یہ ہے کہ یونہی اندھا دھند نہ چلے جاؤ، بلکہ رکو۔ تھمو۔ ٹھہرو۔ کھڑے ہو جاؤ۔ سب کے سب نہیں تو ایک ایک۔ دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ لیکن خالصۃً للہ ۔ دل میں کوئی اور خیال ، جذبہ یا مقصد لئے ہوئے نہیں ۔ اور پھر؟ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (۳۴/۴۶) ۔ پھر تم سوچو ۔ غور کرو ۔ بس یہ ہے وہ بات جسکی میں تاکید کرنا چاہتا ہوں ۔ اس کے بعد ہے مَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ (۳۴/۴۶)۔ یہ دعوت فکر جو تمہیں دی جارہی ہے وہ اس داعی کے جنون کا نتیجہ نہیں ۔

اس قدر تاکید تھی غور و فکر کی !

لیکن اب ہماری حالت یہ ہے کہ غور و فکر ہم پر حرام قرار پا چکا ہے ۔ کوئی معاملہ ہو ۔ کوئی مسئلہ ہو ۔ قرآن کریم کی کوئی آیت ہو ۔ اس کے متعلق پہلا سوال یہ ہوگا کہ اس کی بابت اسلاف نے کیا کہا ہے ۔ اگر آپ غور و فکر کے بعد کوئی ایسی بات کہیں جس کی سند اسلاف کے ہاں سے نہ ملتی ہو ۔ تو آپ فتنہ پرداز ۔ ملحد ۔ بے دین ۔ قرار پا جاتے ہیں ۔ یعنی زندگی کے معاملات ، حتکہ قرآن کریم کے متعلق ، جو کچھ سوچا سمجھا جانا تھا وہ سب سوچا سمجھا جاچکا ہے ۔ اب ہمارا کام فقط یہ ہے کہ ہم اس کی اندھی تقلید کرتے جائیں ۔ خود نہ کچھ سوچیں نہ سمجھیں ۔ حالانکہ بات بالکل واضح ہے کہ قرآن کریم نے جو غور و فکر کا حکم دیا تھا تو وہ کسی خاص زمانے کے انسانوں تک محدود نہیں تھا ۔ وہ تمام زمانوں کے انسانوں کے لئے یکساں حکم تھا ۔ اس لئے (قرآن کریم کی رو سے) جس طرح ہم سے پہلے گزرے ہوئے لوگ (اسلاف) غور و فکر کے لئے مکلف تھے اسی طرح ہم پر بھی غور و فکر لازم ہے ۔ اگر ہم غور و فکر نہیں کرتے تو یہ روش قرآن کریم کے واضح حکم کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے ۔

لیکن ہم ہیں کہ غور و فکر کو الحاد اور بیدینی قرار دئے رہے ہیں ! اصل یہ ہے کہ جب قومیں قوت عمل سے محروم ہوجاتی ہیں تو وہ اندھی تقلید ہی میں عافیت سمجھتی ہیں ۔ غور و فکر بجائے خویش ایک عمل ہے جس میں ذہن کو بڑی محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے ۔ پھر ، غور و فکر سے زندگی کی نئی نئی راہیں سامنے آتی ہیں جنہیں حرکت و عمل ہی سے طے کیا جاسکتا ہے ۔ بے عمل قوم اس سے بھی گھبراتی ہے ۔ غور و فکر سے بھاگنے کی اصل وجہ

تو یہ ہوتی ہے لیکن انسان کی خوئے بہانہ سازی اسے ''سلف صالحین'' کا اتباع قرار دیکر جھوٹے اطمینان کا موجب بنا دیتی ہے۔

یاد رکھئے۔ جو قوم غور و فکر سے محروم رہ جاتی ہے وہ انسانیت کی سطح سے نیچے گر جاتی ہے۔ انسان و حیوان میں فرق ہی یہ ہے کہ انسان کو غور و فکر کی استعداد دی گئی ہے اور حیوان اس سے محروم ہے۔ ہم اپنے اسلاف کے غور و فکر کے نتائج سے مستفید ہوسکتے ہیں، لیکن ان کا غور و فکر ہمارے لئے حرفِ آخر نہیں ہوسکتا کہ اس سے اختلاف، الحاد و بیدینی قرار پاجائے۔ زمانے کی علمی اور فکری سطح بلند ہو رہی ہے۔ اس لئے ہر آنے والی نسل سابقہ نسل سے، علم و فکر میں آگے ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم چونکہ قیامت تک کے انسانوں کے لئے ضابطہ حیات ہے اس لئے اس پر مسلسل غور و فکر ہوتے رہنا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں غور و فکر کے لئے اس قدر کثرت سے تاکید آئی ہے کہ ان مقامات کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اس کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ جب آپ قرآن کریم کا مطالعہ کرینگے تو وہ تمام مقامات آپ کے سامنے آجائینگے اور ان سے آپ اندازہ کرسکینگے کہ اس میں غور و فکر نہ کرنے والوں کے خلاف کتنی سخت تنبیہات آئی ہیں۔ (مزید تفصیل (ع۔ ق۔ ل)۔ (ع۔ ل۔ م)۔ (د۔ ب۔ ر) اور (ق۔ ل۔ د) کے عنوانات میں ملیگی)۔

ف ک ک

فَکَّهٗ۔ یَفُکُّهٗ۔ فَکًّا۔ اس نے اسے جدا کر دیا۔ فَانْفَکَّ۔ تو وہ اس سے جدا ہوگیا۔ فَکَکْتُ الشَّیْءَ۔ میں نے اس چیز کو چھڑا دیا۔ اسے اس کی جگہ سے ہٹا دیا۔ فَکَّ الْاَسِیْرَ۔ اس نے قیدی کو چھڑا دیا۔ فَکَّ یَدَهٗ۔ اس نے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ یعنی مٹھی میں جو چیز تھی اسے ظاہر کر دیا۔ فَکَّ الْخَتْمَ۔ اس نے مُہر کو توڑ دیا*۔

قرآن کریم میں فَکُّ رَقَبَةٍ (۹۰/۱۳) آیا ہے جس کے لفظی معنی کسی گردن کا آزاد کرنا ہیں۔ اس میں مظلوموں کو استبداد سے چھڑانے اور زبردستوں کو ظلم سے بچانے کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔

دوسرے مقام پر ہے۔ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ وَ الْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَھُمُ الْبَیِّنَةُ (۹۸/۱)۔ اہل کتاب اور مشرکین اپنے باطل عقائد و رسوم کی خود ساختہ زنجیروں

---

* تاج و راغب۔

سے رہا نہیں ہو سکتے تھے جب تک ان کے پاس (اَلْبَیِّنَۃ) خدا کا یہ قانون نہ آتا۔ اسی لئے رسول اللہؐ کے متعلق کہا ہے۔ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلَالَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷/۱۵۷)۔ یہ اس لئے آیا ہے کہ انسانوں نے اپنے اوپر جو (خواہ مخواہ کے) بوجھ لاد رکھے تھے اور اپنے آپ کو زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا یہ انہیں ان سے آزادی دلائے۔ قرآن کریم کا مقصد یہ تھا کہ نوع انسانی کو انسانوں کے ہر قسم کے (ذہنی و جسمانی) استبداد سے نجات دلائے۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے ایسا کرکے دکھا دیا۔ لیکن اس کے بعد ہم نے ان تمام زنجیروں کو جو آپؐ نے توڑی تھیں، ایک ایک کرکے اکٹھا کیا اور پھر سے انہیں اپنی گردنوں میں ڈال لیا۔ اب ہم ان جکڑ بندیوں کے ہاتھوں سخت نالاں ہیں، لیکن وہ ایسی مقدس بن چکی ہیں کہ انہیں اتار پھینکنے کی ہمت کسی میں نہیں پڑتی۔ ان زنجیروں کو صرف قرآن کریم کی تعلیم توڑ سکتی ہے، اور قرآن کریم کی طرف ہم آنا نہیں چاہتے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

ف ک ہ

فَکِہَ الرَّجُلُ۔ وہ خوش مزاج، ہشاش بشاش اور پُر مزاح ہوا۔ ایسا شخص فَکِہٌ اور فَاکِہٌ کہلائیگا۔ اَلْفَاکِهَۃُ۔ ہر قسم کا پھل۔ جمع فَوَاکِہُ (۲۳/۱۹)۔

اَلْفُکَاهَۃُ۔ دلچسپ اور دل کو شگفتہ کرنے والی باتیں۔ خوش گپی۔ مزاح، فَاکَهَہٗ مُفَاکَهَۃً۔ ایک نے دوسرے سے مزاح کیا*۔

قرآن کریم میں اہل جنت کے متعلق ہے۔ فِیْ شُغُلٍ فٰکِهُوْنَ (۳۶/۵۵)۔ وہ کام میں لگے ہوئے خوش ہونگے۔ ایک دوسرے سے نہایت خندہ پیشانی سے خوشی کی باتیں اور مزاح کرینگے۔ یا فرحت و انبساط سے بھرے ہونگے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْمُفَاکَهَۃُ خوش مزاجی اور شیریں کلامی کو کہتے ہیں۔

تَفَکَّهَ مِنْ کَذَا۔ اس نے فلاں چیز سے تعجب کیا۔ تَفَکَّهَ الرَّجُلُ۔ وہ نادم ہوا*۔ اَلْاُفْکُوْهَۃُ۔ تعجب کی بات۔ پُر مزاح بات۔ سورۃ واقعہ میں ہے فَظَلْتُمْ تَفَکَّهُوْنَ (۵۶/۶۵) تم تعجب کرنے لگ جاؤ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ عربی زبان میں ابتداءً یہ لفظ تَفَکَّنُوْنَ تھا۔

*تاج و راغب و محیط۔

بعد میں نون ھاء سے بدل گیا اور یہ تَفَکَّھُوْنَ بولا جانے لگا۔ تَفَکَّنُوْنَ کے معنی ھیں شرمندہ ہونا۔ اَلْفَکِہُ۔ اترانے والا۔ اکڑ فون کرنے والا*۔ قرآن کریم میں ہے اِنْقَلَبُوْا فَکِہِیْنَ (۸۳/۳۱) اترانے ہوئے لوٹتے ھیں۔

ف ل ح

فَلْحٌ کے معنی ھیں پھاڑنا۔ شگاف کرنا۔ چاک کر دینا۔ اسی لئے فَلَّاحٌ کاشتکار کو کہتے ھیں کیونکہ وہ کھیتی کے لئے زمین میں ھل چلا کر اسے پھاڑتا ہے۔ فَلَاحَۃٌ۔ کاشتکاری اور کھیتی باڑی کرنے کو کہتے ھیں**۔

چونکہ فَلَّاحٌ (کسان) کی محنت کا صلہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت ایک ایک دانہ کے بدلے سو سو دانوں سے اس کی جھولیاں بھر دیتی ہے، اس لئے فَلَاحٌ کا لفظ کامیابی اور بقاء کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ (ابن فارس)

مُفْلِحُوْنَ۔ وہ ھیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھ جائیں۔ جن کی محنت ثمر بار ہو جائے۔ جنہیں کامیابی اور بقاء نصیب ہو جائے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مومنین کے متعلق ہے۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲/۵)۔ یہی لوگ کامیاب ھیں۔ نفس انسانی کے نشو ونما پا کر انسان کے کامیاب و کامران ہونے کے متعلق ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا (۹۱/۹)۔ جس نے اس کی نشو و نما کی وہ کامیاب ہو گیا۔

قرآن کریم نے انسانی سعی و عمل کا حاصل ''نجات'' نہیں بتایا۔ نجات کے معنی ہوتے ھیں کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرلینا۔ یعنی یہ صرف سلبی (Negative) چیز ہوتی ہے۔ ایک شخص اچھا بھلا بیٹھا ہے۔ وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا۔ اس کے بعد اس نے دوڑ دھوپ کی اور اسے اس مصیبت سے نجات مل گئی۔ اس طرح وہ شخص پھر اپنی پہلی حالت میں پہنچ گیا۔ اس دوڑ دھوپ سے اسے کوئی مثبت (Positive) فائدہ نہیں ہوا۔ یہ قرآنی تصور نہیں۔ یہ عیسائیت کا تصور ہے جو ھر انسانی بچہ کو پیدائشی طور پر گناہ گار قرار دیتی ہے۔ اس کا ان گناہوں کی مصیبت سے چھوٹ جانا نجات (Salvation) ہے۔ یا ھندوؤں کا تصور ہے جو یہ مانتے ھیں کہ ھر شخص اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا کے جیل خانے میں مُحبوس ہے۔ اس قید و بند سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام مکتی (نجات) ہے۔ یہی تصور بدھ مت میں ہے۔ ویدانت (تصوف) کی رو سے بھی انسانی سعی و کاوش سے یہی مقصود ہے۔

---

*تاج و محیط و راغب۔ **تاج۔

یعنی انسان کی روح اپنی اصل (ذات خداوندی) سے الگ ہو کر مادہ کے دلدل میں پھنسی ہوئی چیخ رہی ہے - اس کا اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنی اصل سے جا ملنا مقصود حیات ہے - لیکن قرآن کریم کا یہ تصور نہیں - اس کا تصور یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک صاف سلیٹ لے کر آتا ہے - وحی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے سے اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما اور اس کی ذات کی تکمیل ہوتی ہے - اس سے اُسے اس زندگی کی تمام خوشگواریاں بھی حاصل ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں آگے بڑھنے کی صلاحیت بھی - یہ سب مثبت نتائج ہیں ، اس لئے انہیں فَلَاحٌ سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی کھیتی کا پروان چڑھنا - اس کا ثمر بار ہونا - یا فَوْزٌ سے (دیکھئے عنوانات ف - و - ز اور ن - ج - و) -

سورۂ بقرہ میں جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ اس نظام قرآنی کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان لاتے ہیں (۲/۳) - پھر وہ اس نظام کو عملاً متشکل کرتے ہیں اور جب اس کے مرئی و محسوس نتائج ان کے سامنے آجاتے ہیں تو ان کا ایمان بالغیب (یعنی کسی پر اعتماد کرکے اس کی بات مان لینا) یقین میں بدل جاتا ہے (۲/۴) - ان کی مثال اس کسان (فلاح) کی سی ہے جو اپنے ایمان محکم کی رو سے بیج کو مٹی میں ملا کر مہینوں اس پر محنت کرتا رہتا ہے اور بالآخر اس کی محنت کے نتائج فصل بن کر اس کے سامنے آجاتے ہیں - اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ - (۲/۵) - ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ اَلْفَلَاحُ کے معنی اَلْبَقَاءُ ہیں - یعنی ثابت اور محکم طور پر باقی رہنا - اور مُفْلِحُوْنَ کے معنی ہیں وہ لوگ جو عیش جاوداں کے مالک ہوں * - یاد رہے کہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جاچکا ہے) یہ کامیاب زندگی اس دنیا کی بھی ہے اور موت کے بعد کی بھی- اسی طرح ''آخرت'' سے مراد اس دنیا میں مستقبل کی زندگی بھی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی بھی-

ف ل ق

فَلَقَ الشَّیْءَ - یَفْلِقُهٗ وَفَلَّقَهٗ - اس نے کسی چیز کو پھاڑ دیا - فَانْفَلَقَ - چنانچہ وہ چیز پھٹ گئی **- فَالِقُ الْاِصْبَاحِ (۶/۹۶) - رات کی تاریکیوں کو پھاڑ کر صبح کو نمودار کرنے والا - زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی خَالِقٌ کے بھی ہوسکتے ہیں **- اَلْفَلَقُ - صبح - زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی صبح کا واضح ہو جانا ہیں - اس کے معنی

*القرطبی ج/۱ صفحہ ۱۳ - **تاج و محیط -

مخلوق کے بھی ھیں - نیز اس کے معنی مشکلات کے بعد حق کے واضح ھو جانے کے بھی ھیں * - چنانچہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ - (۱۱۳/۱) میں یہی مفہوم مراد ھے -

کائنات میں سلسلۂ ارتقاء اس طرح جاری ھے کہ ایک چیز پھٹتی ھے تو اس میں سے نئی زندگی کی نمود ھوتی ھے جو آگے بڑھتی اور اوپر کو اٹھتی ھے - پھر اس میں سے اسی طرح ایک اور زندگی کی نمود ھوتی ھے - دانے میں سے کونپل نکلتی ھے - پھر اس میں سے شاخ پھوٹتی ھے - شاخ میں سے پتہ پھوٹتا ھے - پھر شگوفہ - پھر پھول - پھر اس میں پھل لگتا ھے - پھل میں بیج پیدا ھوتا ھے - بیج سے پھر ایک نئے درخت کا سلسلہ شروع ھو جاتا ھے - اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی - یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ (۶/۹۶) - ''الله دانه اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ھے - زنده کو مرده سے نکالتا ھے اور مرده کو زنده سے نکالنے والا ھے'' - یه ھے خدا کا متعین کرده قانون حیات و ارتقاء - اور یه ھے رَبِّ الْفَلَقِ (۱۱۳/۱) -

ف ل ک

اَلْفَلَکُ - ھر چیز کا بڑا اور گول حصه - سمندر کی مضطرب و متردد موج - ستاروں کا مدار ** - قرآن کریم میں ھے کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَسْبَحُوْنَ (۳۶/۴۰) - تمام کرے اپنے اپنے مدار (Orbit) میں نہایت تیزی سے تیرتے ھوئے چلے جاتے ھیں - اَلْفُلْکُ (۲/۱۶۴) - کشتی کو کہتے ھیں (مذکر و مؤنث دونوں طرح بولا جاتا ھے نیز واحد و جمع کے لئے یکساں مستعمل ھے) ** -

ف ل ن

فُلَانٌ وَ فُلَانَةٌ - انسانوں کے ناموں کے لئے بطور کنایه بولا جاتا ھے - اول الذکر مذکر کے لئے اور ثانی الذکر مؤنث کے لئے - اور الف - لام کے ساتھ (یعنی اَلْفُلَانُ وَالْفُلَانَةُ) انسانوں کے علاوہ دوسری چیزوں مثلاً بہائم وغیرہ کے لئے بطور کنایه استعمال ھوتا ھے *** -

صاحب محیط نے کہا ھے که فُلَانٌ اور فُلَانَةٌ بغیر الف - لام کے ذوی العقول کے نام کی جگه کنایةً استعمال ھوتا ھے - اگر کسی ایسی چیز سے کنایه مقصود ھو جو صاحب عقل وشعور نه ھو تو فُلَانٌ اور فُلَانَةٌ پر الف - لام کا اضافه کر لیتے ھیں **** -

*تاج و محیط - **تاج و ابن فارس - ***تاج - ****محیط المحیط -

قرآن کریم میں ہے یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا (۲۵/۲۸) "ہائے میری تباہی! کاش، میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا"۔ زجاج نے کہا ہے کہ یہاں فُلَانًا سے مراد شیطان ہے کیونکہ اس سے آگے ہے وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا (۲۵/۲۹)۔ "اور شیطان آخر انسان کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے"۔ لیکن [جیسا کہ "شیطان" کے باب (عنوان ش ۔ ط ۔ ن) میں بتایا جا چکا ہے] ہر شریر انسان شیطان ہے ۔ اس لئے اس میں سرکشوں اور شرارت پسندوں کی دوستی کیطرف اشارہ ہے ۔

ف ن د

اَلْفَنَدُ ۔ بوڑھا ہونا ۔ بڑھاپے یا بیماری کیوجہ سے عقل کا ناکارہ ہو جانا ۔ بات یا رائے میں غلطی کرنا ۔ سٹھیا جانا *۔ لسان العرب میں ہے کہ فَنَدٌ کے معنی جھوٹ کے ہیں *۔ راغب نے اس کے معنی کمزوری رائے بتائے ہیں **۔ فَنَّدَہٗ ۔ اسے جھوٹا، کمزور رائے والا یا فاترالعقل بتایا ۔ اَفْنَدَ ۔ جھوٹ بولا ۔ بوڑھا آدمی جب بہت بوڑھا ہوجاتا ہے تو اسے کہتے ہیں قَدْ اَفْنَدَ ۔ کیونکہ وہ ایسی باتیں کرتا ہے جو صحت کی راہ سے ہٹی ہوتی ہیں ۔ لیکن بوڑھی عورت کو مُفْنِدَۃٌ نہیں کہتے کیونکہ (عربوں کے خیال کے مطابق) عورت جوانی کے زمانے میں کونسی صائب الرائے ہوتی ہے جو اسے بڑھاپے میں مُفْنِدَۃٌ کہا جائے؟ اصمعی نے کہا ہے کہ جب بوڑھا ہونے کی وجہ سے آدمی بہت زیادہ باتیں کرنے لگے تو اسے مُفْنِدٌ کہتے ہیں *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بوجھل اور سخت ہونے کے ہیں ۔ نیز اس بڑھاپے کے بھی جس کے ساتھ عقل کا فتور شامل ہو ۔

سورہ یوسف میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے لوگوں سے کہا کہ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ (۱۲/۹۴)۔ اگر تم میرے متعلق یہ نہ کہو کہ بڑھاپے کی وجہ سے میری عقل میں فتور آگیا ہے اور میں بہکی باتیں کرنے لگ گیا ہوں تو......

ف ن ن

اَلْفَنُّ (جمع فُنُوْنٌ وَاَفْنَانٌ) حالت ۔ قسم ۔ نوع ۔ عجیب معاملہ ۔ اَلْفَنَنُ اس شاخ کو کہتے ہیں جس میں تر و تازہ پتے ہوں ۔ (جمع اَفْنَانٌ

*تاج ۔ **راغب ۔

وَأَفَانِيْنُ)۔ اَلْفُنُوْنُ۔ مختلف قبیلوں کے ملے جلے لوگوں کو کہتے ھیں۔ رَجُلٌ مِفَنٌّ۔ حیرت انگیز و تعجب خیز کام کرنے والا مرد۔ اَفَانِيْنُ الْكَلَامِ۔ کلام کے مختلف اسالیب اور طریقے*۔ اس سے علوم و فنون کا مفہوم واضح ھے۔

قرآن کریم میں جنت (بلکہ جَنَّتَانِ) کے متعلق ھے کہ وہ ذَوَاتَا أَفْنَانٍ (۵۵/۴۸) ھے۔ جسکی مختلف شاخیں ھوں۔ جہاں مختلف علوم وفنون عام ھوں۔ قرآن کریم کی رو سے جنتی معاشرہ کی یہ بھی خصوصیت ھے کہ وہ مختلف فنون کی آماجگاہ ھوگا۔

ف ن ی

اَلْفَنَاءُ۔ بَقَاءٌ کی ضد ھے۔ بَقَاءٌ کے معنی ھیں کسی چیز کا اپنی اصلی حالت پر قائم رھنا۔ (دیکھئے عنوان ب۔ ق۔ ی)۔ یعنی اس کا تغیر پذیر نہ ھونا۔ لہذا اَلْفَنَاءُ کے معنی ھونگے کسی چیز میں تغیرات واقع ھوتے رھنا۔ اسکا اپنی اصل حالت پر نہ رھنا بلکہ اس میں تغیر و تبدل واقع ھوتے رھنا۔ قرآن کریم میں ھے كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ۔ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ (۵۵/۲۶-۲۷)۔ فَانٍ۔ اسم فاعل ھے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ایک وقت ایسا آئیگا کہ زمین پر جو کچھ ھے سب معدوم ھو جائیگا اور صرف خدا کی ذات باقی رہ جائیگی۔ اس کے معنی یہ ھیں کہ کائنات میں جو کچھ ھے اس میں ھر آن تغیرات واقع ھوتے رھتے ھیں۔ لیکن خدا کی ذات ایسی ھے جو تغیر پذیر نہیں۔

جسے ''تغیر'' (Change) کہا جاتا ھے، اگر غور سے دیکھا اور سمجھا جائے تو یہ کسی شے کے اندر تبدیلی نہیں ھوتی۔ اس طریق (Process) سے ھوتا یہ ھے کہ جس چیز میں تبدیلی آتی ھے وہ چیز معدوم ھو جاتی ھے اور اسکی جگہ ایک نئی چیز وجود میں آجاتی ھے۔ لیکن یہ دونوں کام اسطرح بیک وقت ھوتے ھیں کہ یہ پتہ ھی نہیں چلتا کہ پہلی چیز کب معدوم ھوئی اور اسکی جگہ دوسری چیز کب وجود میں آئی۔ (برگسان نے اس نکتہ کی بڑی عمدہ تشریح کی ھے) لیکن (برگسان کے فلسفہ کی رو سے) ذات (Personality) ایسی شے ھے جس میں نشوونما اور ارتقاء تو ھوتا رھتا ھے لیکن اس کے باوجود ایسا کبھی نہیں ھوتا کہ وہ معدوم ھو جائے (It does not cease to exist) اسی کو بارد بونے (Changelessness in change) سے تعبیر کیا ھے۔ اور خدا چونکہ

*تاج و راغب۔

مکمل اور مطلق ذات ہے اس لئے اس میں تغیر اور معدوم ہو کر پھر سے متشکل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ ہمارے دور میں ہنوز فلسفہ یہیں تک پہنچا ہے ۔ لیکن اس سے بھی قرآن کریم کی مندرجہ صدر آیات (۵۵/۲۶-۲۹) کے مفہوم پر کافی روشنی پڑ جاتی ہے ۔

چونکہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) جس چیز میں تبدیلی آتی ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے اور اسکی جگہ تبدیل شدہ چیز لے لیتی ہے ، اس اعتبار سے اَلْفَنَاءُ ۔ کسی چیز کے ختم ہو جانے پر بھی بولا جاتا ہے ۔ نیز اَلْفَانِیُّ ۔ بہت بوڑھے آدمی کو بھی کہتے ہیں جو قریب الختم ہوتا ہے ۔ اور فِنَاءُ الدَّارِ ۔ گھر کے سامنے کے وسیع میدان کو کہتے ہیں کیونکہ وہاں گھر کی عمارت ختم ہو جاتی ہے * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس باب کے کلمات کسی قیاس کے مطابق نہیں آتے ۔

ف ہ م

فَهِمَ ۔ یَفْهَمُ ۔ فَهْماً ۔ کسی چیز کو جان لینا اور دل سے پہچان لینا ۔ بعض لوگوں نے علم اور فہم میں یہ فرق کیا ہے کہ علم تو مطلق ادراک (کسی چیز کو جان لینے) کو کہتے ہیں اور فہم کہتے ہیں خارجی اشیاء پر غور کے بعد ذہن کا دوسری چیزوں کی طرف تیزی سے منتقل ہو جانا ۔ بعض نے کہا ہے کہ الفاظ سے جو تصور ذہن میں آتا ہے اُسے فَہْمٌ کہتے ہیں ۔ بعض کے نزدیک فَہْمٌ ذہن کی اس خوبی کو کہتے ہیں جس سے وہ مطالب کو تیزی اور عمدگی سے اخذ کر لیتا ہے ** ۔ فَهَّمْتُهُ ۔ میں نے اسے سمجھا دیا ** ۔ قرآن کریم میں ہے فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ (۲۱/۷۹) ۔ ہم نے سلیمان کو معاملہ سمجھا دیا ۔

ف و ت

فَاتَهُ الْاَمْرُ ۔ وہ معاملہ اسکی گرفت سے جاتا رہا ۔ ہاتھ سے نکل گیا ۔ دسترس سے دور ہو گیا *** ۔ (۳/۱۵۲) ۔ دراصل فَاتَهُ الْاَمْرُ کے معنی ہیں اس کام کو کرنے کا وقت نکل گیا *** ۔ اَلْفَوْتُ کے معنی ہیں کسی چیز کا انسان سے اتنا دور ہو جانا کہ اس کا حاصل کر لینا اس کے لئے دشوار ہو **** ۔ (۳۴/۵۱) ۔ چنانچہ محاورہ ہے هُوَ فَوْتَ فَمِهٖ اَوْفَوْتَ رُمْحِهٖ ۔ وہ اسے نظر تو آرہا ہے لیکن اسکی دسترس سے باہر ہے *** ۔ اَلْفَوْتُ ۔ شگاف ۔

*تاج و محیط ۔ **تاج و راغب ۔ ***تاج ۔ ****راغب ۔

نیز دو انگلیوں کے درمیانی خلا کو کہتے ہیں *۔ تَفَاوُتٌ کے معنی عدم مطابقت اور عدم تناسب کے ہوتے ہیں**۔ سورۃ الملک میں ہے۔ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ۔ (۶۷/۳)۔ تم خدا کی پیدا کردہ کائنات میں کہیں بھی عدم تناسب نہیں دیکھو گے۔ ہر جگہ توازن و تناسب نظر آئے گا۔

ف و ج

اَلْفَوْجُ۔ اَلْفَائِجُ۔ لوگوں کی جماعت۔ رؤساء کے متبعین۔ جمع اَفْوَاجٌ ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جمع ہونے اور اکٹھا ہو جانے کے ہیں۔ اَفَاجَ۔ وہ تیز رفتار ہوا۔ فَاجَ الْمِسْکُ۔ مشک کی خوشبو پھیل گئی۔ اس لئے اَلْفَوْجُ تیزی سے گزرنے والی جماعت کو کہتے ہیں***۔ قرآن کریم میں ہے۔ یَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ فَوْجًا (۲۷/۸۳)۔ ”جس دن (یا جس دور میں) ہم ہر اُمت میں سے ایک گروہ کو اکٹھا کرینگے“۔ یہاں اس کے معنی گروہ اور جماعت کے ہیں۔ سورۃ النصر میں ہے یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا۔ (۱۱۰/۲)۔ ”اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہوتے ہیں“۔ یہاں اس میں تیزی اور کثرت دونوں کا مفہوم ہے۔ نظام خداوندی کی تشکیل میں پہلا مرحلہ تو وہ ہے جس میں داعی الی الحق کی بڑی محنت اور مشقت کے بعد، اکا دکا کرکے، مدت مدید میں، کچھ افراد جمع ہوتے ہیں۔ پھر ان کی محنت شاقہ اور سعیٔ پیہم سے، اس نظام کے اولین مراحل طے ہوتے ہیں۔ یہ السابقون الاولون کی جماعت ہوتی ہے جنہیں قدم قدم پر سینکڑوں قسم کے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان کی اس سعی مسلسل کے بعد، جب یہ کھیتی پروان چڑھتی ہے تو اس کے درخشندہ و تابناک نتائج کو دیکھ کر، لوگ جوق در جوق اس نظام میں داخل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ منزل جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا۔

ف و ر

فَارَ۔ فَوْرًا۔ جوش مارنا۔ پھوٹ کر نکل پڑنا۔ فَارَتِ الْقِدْرُ۔ ھانڈی جوش کھانے لگی۔ اَلْفَوَّارَۃُ۔ وہ جگہ جہاں سے چشمہ جوش مار کر نکلے*۔ رَجُلٌ فَیُّوْرٌ۔ تیز مزاج اور جلد غصہ میں آجانے والا آدمی**۔

*تاج۔ **محیط۔ ***تاج و محیط و راغب۔

سورة هود میں ہے ۔ فَارَ التَّنُّوْرُ (۱۱/۴۰) ۔ زمین میں سے جوش کے ساتھ چشمے ابل پڑے ۔ سورة آل عمران میں ہے ۔ وَ يَاْتُوْكُمْ مِنْ فَوْرِهِمْ (۳/۱۲۴) ۔ وہ اپنے پورے جوش میں تم پر حملہ کریں ۔ سورة ملک میں ہے ۔ وَ هِيَ تَفُوْرُ (۶۷/۷) ۔ وہ جوش مار رہی ہوگی ۔ ابن فارس کے نزدیک اس کے بنیادی معنی جوش مارنے کے ہیں ۔

فَوْرٌ کے معنی جلدی اور بغیر رکے کسی کام کو کرنے کے بھی ہیں ۔ عربی زبان میں عَلَى الْفَوْرِ اور مِنْ فَوْرِهِ اور اردو میں فوراً بولتے ہیں ۔ عجلت کا مفہوم اس لئے پیدا ہوا کہ جوش میں عجلت ہی سے کام لیا جاتا ہے ۔

ف و ز

اَلْفَوْزُ ۔ اگرچہ اس کے معنی کسی مصیبت سے چھٹکارا پا لینے کے بھی ہیں * ۔ لیکن اس کا دوسرا مفہوم اپنی آرزو یا خیر کو حاصل کر لینا ، مقصود کو پا لینا ہے * ۔ مصیبت سے رہائی پالینا محض ایک سلبی (Negative) چیز ہے لیکن قرآن کریم ، جنت کی زندگی کو ایک ایجابی (Positive) مقصد کا حصول (Achievement) قرار دیتا ہے ۔ اس لئے وہ اہلِ جنت کو فَائِزُوْنَ (۵۹/۲۰) کہتا ہے ۔ یعنی وہ جو فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا (۳۳/۷۱) کے حامل ہیں ۔ اس میں اس دنیا کا مال و متاع اور خوشگواریاں بھی شامل ہیں ، جیسا کہ قرآن کریم نے (۴/۷۳) میں خود واضح کر دیا ہے ۔ دوسری جگہ اسے مَفَازًا کہا ہے ۔ (۷۸/۳۱) ۔ سورة آل عمران میں ہے کہ جو شخص تباہیوں سے محفوظ رہا اور ''جنت میں داخل ہوگیا'' ۔ فَقَدْ فَازَ (۳/۱۸۴) تو یہ ہے جسے کامیاب کہا جائے گا ۔ دیکھئے، اس میں دونوں پہلو موجود ہیں ۔ تباہیوں سے بچنا اور زندگی کی خوشگواریوں کا حاصل ہوجانا ۔ یہ ہے کامیابی ۔ اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ۔ يُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ (۳۹/۶۱) ۔ متقیوں کو اللہ تباہیوں سے بچاتا ہے، اُن کی کامیابی کے ساتھ ۔ یعنی وہ تخریبی قوتوں کے شر سے بھی محفوظ رہتے ہیں اور اپنے مقاصد کو حاصل بھی کرتے ہیں ۔

دنیائے مذاہب میں زندگی کا مقصد ان مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کرلینا ہے ۔ جن میں انسان گرفتار ہوتا ہے ۔ لیکن قرآن کریم اس چیز کو مقصودِ حیات قرار نہیں دیتا ۔ اس کے نزدیک ان تباہیوں سے بچ کر اپنے مقصد کو

*تاج نیز ابن فارس ۔

حاصل کرنے (Positive Achievement) کا نام کامیابی ہے - (دیکھئے عنوان ف - ل - ح اور ن - ج - و) - یہ مثبت کامیابی ، اس دنیا میں سربلندی اور سرفرازی کی زندگی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت - یہی فوزعظیم ہے -

ف و ض

فَوَّضَ اِلَیْہِ الْاَمْرَ تَفْوِیْضًا - اس نے معاملہ اس کی طرف لوٹا دیا ، اس کے حوالہ کردیا* - اس معاملہ کا فیصلہ اس کے اوپر چھوڑ دیا - اَلْمُفَاوَضَۃُ کے معنے ہوتے ہیں ایک دوسرے کے برابر اور شریک کار ہونا- مَتَاعُھُمْ فَوْضٰی بَیْنَھُمْ - ان کا سامان اس طرح ان کے درمیان مشترک ہے کہ اس میں بلا تخصیص غیرے سب برابر کے شریک ہیں - اسلئے قَوْمٌ فَوْضٰی اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں تمام لوگ برابر ہوں - کوئی کسی پر حکم نہ چلائے ، نہ کوئی کسی سے مشورہ کرے - اور نہ ان کا کوئی حاکم اور لیڈر ہو* - ان لوگوں کو بھی کہتے ہیں جن کا معاملہ غیر واضح اور گڈ مڈ ہو - ان میں سے کوئی اپنی ذمہ داری کا احساس نہ کرتا ہو اور ایک دوسرے پر کام ڈالتا ہو - اسی سے آجکل فَوْضَوِیَّت انارکی (Anarchy) کو کہتے ہیں -

قرآن کریم میں ہے وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ ($\frac{۴۴}{۴۰}$) - میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں - اسے اپنے معاملہ کا مختار بناتا ہوں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی پر تکیہ کرنا اور اس کے سپرد کر دینا ہیں - جماعت مومنین قوانینِ خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کرتی ہے اور اپنے معاملات کو انہی کے سپرد کردیتی ہے -

ف و ق

فَوْقٌ - تَحْتٌ کی ضد ہے - تَحْتٌ کے معنی نیچے اور فَوْقٌ کے معنی اوپر - قرآن کریم میں یہ لفظ اَسْفَلَ کے مقابلہ میں بھی آیا ہے ($\frac{۳۳}{۱۰}$) - فَاقَ فَوْقًا کے معنی ہیں کسی سے کسی بات میں زیادہ ہونا - فَوْقٌ کے معنے کبھی دُوْنٌ یعنی ورے اور کمتر کے بھی ہوتے ہیں - چنانچہ جب کوئی کہے کہ فُلَانٌ صَغِیْرٌ (وہ چھوٹا ہے) اور اس کے جواب میں کہا جائے وَ فَوْقَ ذَالِکَ تو یہاں فوقَ سے مراد ہوگا اس سے بھی چھوٹا (جتنا تم

---

*تاج و محیط و راغب -

بتا رہے ہو)* - (٢/٢٦) میں یہی مفہوم ہے - لیکن بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ اس آیت میں بھی یہ اوپر ہی کے معنے رکھتا ہے - یعنی مچھر سے بڑے مثلاً مکڑی وغیرہ -

اَلْفَائِقُ - ہر چیز کا بہترین حصہ - تَفَوَّقَ عَلٰی قَوْمِہٖ کے معنی ہیں وہ رتبہ میں اپنی قوم پر بلند ہوگیا - اس اعتبار سے قرآن کریم میں لفظ فَوْقٌ غلبہ و تسلط کے معنوں میں آیا ہے - یَخَافُوْنَ رَبَّھُمْ مِنْ فَوْقِھِمْ (١٦/٥٠) - ان پر خدا کا جو غلبہ و تسلط ہے اس سے خائف رہتے ہیں - اَفَاقَۃٌ - فَوَاقٌ اور فُوَاقٌ اس وقفے کو کہتے ہیں جو اونٹنی کے دو مرتبہ دودھ دوھنے کے درمیان ہو - یا یہ کہ اونٹنی جنگل سے چر کر آئے تو اسے تھوڑی دیر آرام کرنے کےلئے چھوڑ دیا جائے اور اس کے بعد اس کا دودھ دوھا جائے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دوسرے بنیادی معنی لوٹ آنا بھی ہیں - چنانچہ فَوَاقُ النَّاقَۃِ کے معنی ہیں دودھ دوھنے کے بعد دودھ کا پھر تھنوں میں لوٹ آنا - سورۃ اعراف میں ہے - فَلَمَّا اَفَاقَ (٧/١٤٣) - جب اسے غش کے بعد ہوش آیا - جب اس میں سکون پیدا ہوا - نیز فُوَاقٌ ھچکی کو کہتے ہیں* - سورۃ ھود میں ہے مَالَھَا مِنْ فَوَاقٍ (٣٨/١٥) - اس میں وقفہ نہیں ہوگا - ابن فارس نے اس کے معنے رجوع اور پلٹ کر آنا لکھے ہیں - یعنی تکرار اور دوبارہ ہونا - اَلْفَاقَۃُ - فقر اور ضرورت کو کہتے ہیں - اِفْتَاقَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں وہ آدمی فقیر اور حاجت مند ہوگیا* -

ف و م

اَلْفُوْمُ - بعض کا خیال ہے کہ اس میں فاء، ثاء سے بدل دی گئی ہے اور اصل میں یہ لفظ ثُوْمٌ (بمعنی لہسن) ہے - مگر صحیح یہ ہے کہ اَلْفُوْمُ گیہوں کو کہتے ہیں اور روٹی کو بھی - نیز ان تمام غلوں کو کہتے ہیں جن کی روٹی پکائی جاتی ہے - بعض نے کہا ہے کہ اَلْفُوْمُ چنے کو کہتے ہیں** -

قرآن کریم میں یہ لفظ (٢/٦١) میں آیا ہے -

ف و ہ

فَاہٌ - فُوْہٌ - فِیْہٌ - سب کے معنی مُنہ (فَمٌ) کے ہیں - جمع اَفْوَاہٌ - اَلاَفْوَاہُ - مسالے نیز وہ چیزیں جو خوشبو کے لئے ڈالی جائیں - قسم قسم

*تاج و راغب - **تاج -

کے پھول اور کلیاں۔ انواع و اقسام کی چیزیں *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں کھلن کے ہیں۔ (یعنی کسی چیز کا بند نہ ہونا بلکہ کھلا ہونا)

راغب نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں کسی کی بات (قَوْلٌ) کو فَمٌ یا فُوْہٌ کی طرف منسوب کیا ہے وہاں اس کے جھوٹ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ صرف زبان سے ایسا کہتے ہیں۔ ان کے دل کی تائید اس کے ساتھ شامل نہیں**۔ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (۳/۱۶۶)۔ وہ زبان سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں۔

فِي (حرف)

فِيْ۔ (۱) ظرفِ مکان یا ظرفِ زمان کے لئے آتا ہے۔ جیسے، مسجد میں۔ یا چند سال کے عرصہ میں۔ فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ (۲۸/۱۸)۔ پس وہ صبح کے وقت شہر میں آیا۔ یا غُلِبَتِ الرُّوْمُ ..... فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ (۳۰/۲-۴) رومی مغلوب ہو گئے، (اور وہ مغلوب ہونے کے بعد غالب آجائینگے) چند سال کے عرصہ میں۔ یا ویسے ہی "میں" کے معنوں میں۔ مثلاً وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ (۲/۱۷۹)۔ تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔

(۲) معیت (ساتھ) کے معنوں میں۔ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْ اُمَمٍ (۷/۳۸)۔ ان سے کہیگا کہ تم (سابقہ) امم کے ساتھ (جہنم میں) داخل ہو جاؤ۔ یعنی انہی میں شامل ہو جاؤ۔

(۳) سبب کے لئے۔ قالت فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ (۱۲/۳۲)۔ (عزیز کی عورت نے) کہا کہ یہی وہ ہے جس کی وجہ سے تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔

(۴) عَلٰى (اوپر) کے معنوں میں۔ وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ (۲۰/۷۱)۔ میں تمہیں کھجور کے تنوں پر صلیب دونگا۔

(۵) اِلٰى (تک۔ کی طرف) کے معنوں میں۔ فَرَدُّوْا اَيْدِيَهُمْ فِيْ اَفْوَاهِهِمْ (۱۴/۹)۔ تو وہ اپنے ہاتھ ان کے منہ تک لئے گئے۔

(۶) مِنْ (سے) کے معنوں میں۔ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا۔ جس دن (۱۶/۸۹)۔ ہم ہر امت میں سے شاہد کھڑے کرینگے۔

*تاج۔ **راغب۔

(۷) مقابلہ کے لئے ۔ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (۹/۳۸) ۔ متاع دنیا آخرت کے مقابلہ میں قلیل ہے ۔

(۸) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے ۔ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا (۱۱/۴۱) ۔ اس نے کہا کہ اس (کشتی) میں سوار ہو جاؤ ۔ فِيْ اس لئے زائد ہے کہ خالی ارْكَبُوْهَا کے بھی وہی معنی ہیں ۔

(۹) سورۂ عنکبوت میں ہے ۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹) ۔ اس کے معنی ہونگے ، جو لوگ ہمارے لئے یا ہماری راہ میں یا ہماری (متعین کردہ منزل) کی طرف آنے کے لئے جد و جہد کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں کی طرف راہ نمائی کر دیتے ہیں (یہ مثال لغت کی کسی کتاب میں نہیں ملی)۔

ف ی أ

فَيْءٌ ۔ سایہ ۔ محیط میں ہے کہ طلوع آفتاب سے لیکر زوال آفتاب تک کے سایہ کو ظِلٌّ کہتے ہیں ، اور زوال آفتاب سے غروب آفتاب تک کے سایہ کو فَيْءٌ ۔ چونکہ سایہ لوٹ کر آتا ہے اسی لئے فَاءَ کے معنی لوٹنے یا واپس آنے کے ہوتے ہیں اور اَفَاءَ کے معنے لوٹانے اور پلٹانے کے ۔ فَيْءٌ کے معنی اچھی حالت کی طرف لوٹ آنے کے ہوتے ہیں ۔ مال غنیمت اور خراج کو بھی فَيْءٌ کہتے ہیں ، اسلئے کہ وہ کفار کی طرف سے مسلمانوں کی طرف لوٹ آتا ہے ۔

سورۂ نحل میں ہے ۔ يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ (۱۶/۴۸) ۔ اس کا سایہ دائیں بائیں لوٹتا رہتا ہے ۔

سورۂ حجرات میں ہے ۔ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۔ (۴۹/۹) ۔ تاوقتیکہ وہ قانون خداوندی کی طرف لوٹ نہ آئے ۔

قرآن کریم نے فَيْءٌ اور غنیمت کا الگ الگ ذکر کیا ہے ۔ مال فیء کے متعلق سورۂ حشر میں ہے وَمَا اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَا اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ..... (۵۹/۶) ۔ "اور اللہ نے اپنے رسول کو ان سے جو مال فیء دلایا تو تم نے اس پر نہ گھوڑے دوڑائے تھے نہ اونٹ ۔ لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلط دیدیتا ہے" ۔ اس سے ظاہر ہے کہ مال فیء وہ ہے جو بغیر لشکر کشی کے حاصل ہو جائے ۔ ہو سکتا ہے کہ

اس میں (دشمن سے حاصل کردہ مال کے علاوہ) وہ مال بھی شامل ہو جو صوبے، اپنی ضروریات سے فاضل، مرکز کیطرف بھیجدیں۔ مال فیٔ کی تقسیم کے متعلق فرمایا کہ یہ "اللہ کے لئے اور رسولؐ کے لئے اور ذی القربیٰ۔ یتامیٰ۔ مساکین اور ابن السبیل کے لئے ہے"۔ اس کے بعد ہے کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ۔ "تاکہ یہ مال تم میں سے دولتمندوں کے اندر ہی گردش نہ کرتا رہے"۔ یہ اصول قومی معیشت کے ایک بنیادی نکتہ کو بیان کرتا ہے۔ یعنی دولت کی گردش (Circulation) اوپر کے طبقہ ہی میں نہیں ہوتی رہنی چاہئے۔ اس کے بعد ہے وَمَا آتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (۵۹/۷)۔ "جو کچھ تمہیں رسولؐ دے اسے لے لو۔ اور جس سے وہ تمہیں روکے اس سے رک جاؤ"۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگرچہ قرآن کریم نے مملکت کی دولت کے مصارف کی اصولاً نشاندہی کر دی ہے لیکن اس کی تفصیلی تقسیم کا حق مرکز کو دیا ہے جو مقتضائے حالات کے مطابق خرچ کریگا۔

مالِ غنیمت کے متعلق سورۃ انفال میں ہے وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ... (۸/۴۱)۔ اور سمجھ لو کہ جو کچھ تمہیں بطور غنیمت ملے، تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہے، اور رسولؐ کے لئے اور ذی القربیٰ کے لئے۔ یتامیٰ۔ مساکین اور ابن السبیل کے لئے"۔

صدقات کے مصارف کے متعلق سورہ توبہ میں ہے کہ وہ "فقراء۔ مساکین۔ اور صدقات کے کارکنوں کے لئے ہیں۔ اور ان کے لئے جنکی تالیف قلوب ضروری ہے۔ اور بندھنوں میں جکڑے ہوئے لوگوں کو آزاد کرانے کیلئے۔ اور مقروض و مصیبت زدوں کے لئے۔ اور "اللہ کی راہ" میں خرچ کرنے کے لئے اور ابن السبیل کے لئے..... (۹/۶۰)۔

مال فیٔ اور غنیمت کے مصارف میں "ذی القربیٰ" کے متعلق استاذ محمدؐ عزّۃ دروزہ نے اپنی کتاب "الدستورالقرآنی" میں لکھا ہے کہ اس سے مراد "رشتہ دار" نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو اسلام میں پیش پیش رہے ہوں اور جنہوں نے اسلام اور ملت کے لئے مفید خدمات سرانجام دی ہوں۔ لیکن قرآن کریم کے دیگر مقامات سے اس مفہوم کی تائید نہیں ملتی۔ البتہ اس نے جو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد رسول اللہؐ کے رشتہ دار نہیں، تو یہ چیز قرآنی مفہوم کے مطابق ہے۔

ف ی ض

فَاضَ السَّمَاءُ ۔ یَفِیْضُ ۔ فَیْضًا ۔ فُیُوْضًا ۔ کسی جگہ پانی کا بہت زیادہ جمع ہوکر وہاں سے نکل پڑنا اور بہہ نکلنا ۔ آنسوؤں کے بہنے کے لئے بھی آتا ہے (۵/۸۳) ۔ حَوْضٌ فَائِضٌ ۔ لبالب بھرا ہوا حوض ۔ بَحْرٌ فَائِضٌ ۔ پر جوش سمندر جس کا پانی اوپر سے اچھل کر نکل رہا ہو ۔ اَلْفَیْضُ دریا اور نہر کو کہتے ہیں ۔ فَیَّاضٌ ۔ بہت پانی والی نہر ۔ فَاضَ الْمَالُ یَفِیْضُ ۔ مال بہت زیادہ ہوگیا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آسانی سے بہنے کے ہیں ۔ یہیں سے یہ لفظ لوگوں کے کثیر تعداد میں ادھر ادھر جانے کے لئے استعمال ہونے لگا ۔ چنانچہ اَلْاِفَاضَۃُ کے معنی ہیں کثیر آدمیوں کا تیزی کے ساتھ چلنا ۔ یکبارگی چل پڑنا ۔ یکبارگی روانگی اور واپسی کو اِفَاضَۃٌ کہتے ہیں ۔ نیز باتوں میں بہ جانے (مشغول ہوجانے) کو بھی* ۔ در اصل الاِفَاضَۃُ کے معنے لنڈھانا ، اوپر سے گرانا اور بہانا ہیں (۷/۵۰) ۔

چل پڑنے کے معنوں میں قرآن کریم میں یہ لفظ (۲/۱۹۹) میں آیا ہے ۔ باتوں میں لگ جانے کے لئے (۸/۳٦) میں ۔ اور باتوں میں مشغول ہو جانے اور چرچا کرنے ، دونوں معنوں میں (۲۴/۱۴) میں ۔

ف ی ل

اَلْفِیْلُ ۔ ہاتھی* ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ ''پیل'' سے معرب ہے ۔ اور جو لفظ فِیْلٌ عربی الاصل ہے اس کے معنی کمزوری کے ہوتے ہیں ۔ رَجُلٌ فِیْلُ الرَّاْیِ ۔ کمزور رائے والا آدمی ۔

قرآن کریم میں اَصْحَابُ الْفِیْلِ (۱۰۵/۱) آیا ہے ۔ اس کے متعلق تاریخ میں ہے کہ ابرھۃ الاشرم حبشی اپنی ہاتھیوں کی فوج لیکر کعبہ کو مسمار کرنے کے لئے مکہ پر چڑھ آیا تھا اور اس کے لئے اس نے پہاڑیوں کی اوٹ میں ، خفیہ راستہ اختیار کیا تھا ۔ لیکن گدھوں کے جھنڈ ، جو اپنی جبلی ذہانت سے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ فوج کسی طرف جا رہی ہے اس لئے ہمیں ان کے ساتھ جانے سے بہت سا سامان خوراک (لاشیں) ملینگی ، ان کے اوپر منڈلاتے ہوئے آگئے ۔ انہیں دیکھ کر قریش عرب نے بھانپ لیا کہ کوئی لشکر ادھر آرہا ہے ۔ چنانچہ وہ اپنی پہاڑیوں پر چڑھ گئے اور وہاں سے زور

---

*تاج ۔

کا پتھراؤ کیا ۔ کچھ تو خود ان پتھروں سے ، اور کچھ اس طرح کہ ان سے ہاتھی بھڑک اٹھے اور اپنی فوج کو کچلتے ہوئے بھاگے ، وہ فوج بھس کی طرح ہوگئی ۔ یہ سارا واقعہ سورۃ فیل میں بیان ہوا ہے ۔ واقعہ ایسا تھا جسے مخاطبین عرب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ، اس لئے وہ جانتے تھے کہ قرآن کریم کیا کہہ رہا ہے ۔ قرآن کریم کا اس سے مقصد یہ بتانا تھا کہ تم اس دین حق کی مخالفت چھوڑدو ورنہ تم بھی اسی طرح تباہ و برباد ہوجاؤ گے ۔

ق

قارون

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسٰیؑ کو فرعون ، ھامان اور قارون کی طرف بھیجا گیا تھا (۴۰/۲۴)۔ اور ان دونوں کی طرح قارون بھی ہلاک ہونے والوں میں سے تھا (۲۹/۳۹)۔ قارون قوم موسٰیؑ میں سے تھا اور سرمایہ داری کی لعنت کا مجسمہ ۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر اسی خصوصیت کے ساتھ کیا ہے (۲۸/۷۶-۷۷)۔ تورات میں ہے کہ قارون (قرح بن ظہار بن قیات بن لاوی) حضرت موسٰیؑ کے مقابلہ کے لئیے اٹھا (گنتی ۱۶/۱-۳) ۔ یہودیوں کا مشہور مؤرخ جوزیفس ، اپنی تاریخ (Antiquity of the jews) میں لکھتا ہے کہ

> قارون جسکی شہرت اس کے نسب اور اسکی دولت دونوں وجہ سے تھی ، عبرانیوں کے مشاھیر میں سے تھا ۔ اسے حضرت موسٰیؑ سے حسد پیدا ھوا اور اس نے تمام بنی لاوی کو اور اپنے اھل خاندان کو ان کے خلاف ابھارا (حصہ ۴ ۔ باب ۳ ۔ فصل ۲)
>
> جیوئش انسائکلوپیڈیا میں ہے

> قرح کا نام بہ حیثیت غیر معمولی دولت کے مالک کے آتا ہے ۔ حضرت یوسفؑ نے جو خزانے مصر میں دفن کئیے تھے ان میں سے ایک خزانہ اس کے ھاتھ لگ گیا تھا ۔ تین سو خچروں کی ضرورت تو محض اس کے خزانے کی کنجیاں اُٹھانے کیلئے ہوتی تھی ۔ (جلد ۷ ۔ صفحہ ۵۵۶)۔

چونکہ حضرات انبیائے کرامؑ کی دعوت انقلاب ، نظام سرمایہ داری (Capitalism) کو مٹانے کیلئے ہوتی تھی اسلئے قرآن کریم نے خصوصیت سے قارون کا ذکر کیا ہے ۔ سرمایہ پرست کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ (وہ سمجھتا ہے کہ) میں جو کچھ کماتا ھوں وہ میری اپنی ہنر مندی اور چابکدستی کا نتیجہ ہے اس لئیے وہ میری واحد ملکیت ہے جس میں کسی اور کا حق اور حصہ

نہیں - میں جتنا جی چاہے جمع کروں اور اسے جسطرح جی چاہے صرف کروں۔ قارون (جسے قرآن کریم نے اس ذہنیت کے ایک ترجمان کی حیثیت سے پیش کیا ہے) یہی کہتا تھا۔ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸/۷۸)۔ ''وہ کہتا تھا کہ یہ سب کچھ مجھے اپنی ہنر مندی سے ملا ہے''۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ (۳۹/۴۹) یہ ان لوگوں کی بڑی غلط نگہی اور گمراہی ہے - جس چیز کو انسان اپنی ہنر مندی اور ذاتی صلاحیت کہتا ہے ذرا سوچئے تو سہی کہ اس میں کتنا حصہ اس کا اپنا ہے اور کتنا حصہ قدرت کا عطیہ۔ خود انسانی ذہن اور اسکی استعداد کو لیجئے - یہ کسی فرد کی نہ اپنی پیدا کردہ ہوتی ہے نہ زر خرید - یہ خالصۃً موہبت خداوندی (عطیہ فطرت) ہے - اس سے آگے وسائل پیداوار (زمین اور مافیہا) کو لیجئے تو یہ تمام کے تمام فطرت کے عطا کردہ ہیں - اس لئے اگر بغور دیکھا جائے تو انسان جو کچھ حاصل کرتا ہے اس میں محنت (Labour) اسکی اپنی ہوتی ہے ، باقی سب کچھ خدا کا عطا کردہ - لہذا اس میں اسکا صرف حق المحنت ہوتا ہے - باقی سب کچھ خدا کا ہوتا ہے - خدا ''اپنے حصے'' کے متعلق کہتا ہے کہ اسے نوع انسانی کی عام پرورش (ربوبیت عامہ) کے لئے کھلا رکھنا چاہئے - لہذا قارونی (سرمایہ دارانہ) ذہنیت ، قرآن کے نظام ربوبیت کی ضد ہے ، اور اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی - اسی لئے قرآن کریم نے قارون کے اس قول کے بعد جسے اوپر درج کیا گیا ہے کہا ہے کہ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا (۲۸/۷۸)۔ '' کیا اسے علم نہ تھا کہ اللہ نے اس سے پہلے ایسی ایسی قوموں کو تباہ کردیا جو طاقت اور جمعیت میں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں - یعنی نظام سرمایہ داری کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے اس لئے یہ نظام کبھی پنپ نہیں سکتا -

ق ب ح

اَلْقَبِيْحُ - وہ چیز جسے نگاہ دیکھنا پسند نہ کرے اور وہ عمل جس سے انسان کا دل نفرت کرے - مَقْبُوْحٌ - وہ شخص جسے ذلیل و خوار سمجھا جائے اور دھتکار دیا جائے - وہ چیز جسے بدنما بنا دیا گیا ہو - نیز جسے خیر سے دور رکھا جائے*۔ ابن فارس نے قَبْحَهٗ کے معنے اسے ہٹایا اور دور کر دیا لکھے ہیں ، اور اس مادہ کے بنیادی معنے حسن کی ضد بتائے ہیں - نَاقَةٌ قَبِيْحَةُ الشَّخْبِ وہ اونٹنی جس کے تھنوں کے سوراخ بہت وسیع ہوں - قَبَحَ الْبَيْضَةَ - اس

*راغب و تاج و محیط -

نے انڈے کو توڑ ڈالا ۔ نیز ہر چیز کو توڑنے پھوڑنے کے لئے بھی یہ لفظ بول دیا جاتا ہے ۔ اَلْقُبْحُ ۔ حسن کی ضد ہے * ۔

قرآن کریم میں مجرمین کے متعلق ہے ھُمْ مِنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ (۲۸/۴۲) ۔ وہ زندگی کی تمام خوشگواریوں سے محروم کر دئے جائیں گے ۔ وہ ذلیل و خوار ہوں گے ۔ ان کی صلاحیتیں ضائع چلی جائیں گی۔

ق ب ر

اَلْقَبْرُ ۔ میت کو دفن کرنے کی جگہ ۔ اَلْمَقْبَرَۃُ ۔ قبرستان ۔ قَبَرَہٗ ۔ یَقْبِرُہٗ وَ یَقْبُرُہٗ ۔ اس نے اسے دفن کر دیا * ۔ سورۂ عبس میں ہے ۔ ثُمَّ اَمَاتَہٗ فَاَقْبَرَہٗ (۸۰/۲۱) ۔ پھر خدا اسے مارتا ہے (موت دیتا ہے) اور اسے قبر میں رکھواتا ہے ۔ اس کے لئے قبر مہیا کرتا ہے یا اسے قبر میں دفن کرنے کا کہتا ہے ۔ یہاں قَبَرَہٗ نہیں کہا بلکہ اَقْبَرَہٗ کہا ہے ۔ کیونکہ قَبَرَہٗ اُس وقت کہتے ہیں جب کوئی کسی کو اپنے ہاتھ سے دفن کرے ۔ مَقْبَرَۃٌ کی جمع مَقَابِرُ آتی ہے ۔ سورہ تکاثر میں ہے زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۔ (۱۰۲/۲) ۔ قرآن کریم میں مَنْ فِی الْقُبُوْرِ (۲۲/۷ ; ۳۵/۲۲) کنایۃً ان کے لئے بھی آیا ہے جو زندگی کی شادابیوں سے محروم ہو چکے ہوں یا جہالت اور تعصب میں اس درجہ آگے بڑھ چکے ہوں کہ ان پر کوئی نصیحت کارگر نہ ہو ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے ۔ م ۔ و ۔ ت اور ح ۔ ی ۔ ی کے عنوانات)

واضح رہے کہ قرآن کریم نے مُردوں کے متعلق قبر یا مرقد وغیرہ کے جو الفاظ استعمال کئے ہیں (مثلاً مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۔ ۳۶/۵۲) ۔ تو اس سے مراد یہ نہیں کہ مردے کسی خاص مقام (قبروں) سے اٹھائے جائینگے ۔ اگر یہ مراد ہو تو ان مُردوں کی بابت کیا کہا جائیگا جنہیں دفن نہیں کیا جاتا ؟ دفن کرنا تو مُردوں کی (Disposal) کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے ۔ اس کے علاوہ مختلف اقوام کے ہاں اور طریقے بھی رائج ہیں ۔ قرآن کریم کا مقصد موت کے بعد کی زندگی کو بیان کرنا ہے ۔ عربوں کے ہاں چونکہ مُردے قبروں میں گاڑے (دفن کئے) جاتے تھے اس لئے قرآن کریم نے قبروں کا ذکر کیا ہے، ورنہ حیات بعد الممات کے لئے نہ کسی مقام کی خصوصیت ہے نہ اس جسم کی ضرورت جو موت کے ہاتھوں تلف ہوجاتا ہے ۔ موت کے بعد زندگی یقینی ہے لیکن اس زندگی کے لئے پیکر یا مظہر کس قسم کا ہوگا، ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس کا ادراک نہیں کر سکتے ۔ ویسے بھی اصل مقصد تو زندگی سے ہے، نہ کہ اس کے مظاہر سے ۔

* تاج و راغب و محیط ۔

ق ب س

اَلْقَبَسُ ۔ آگ کا شعلہ (یا چنگاری) جسے کسی بڑی آگ سے حاصل کیا جائے ۔ اَلْمُقْتَبَسُ ۔ آگ کی چنگاری * ۔ سورہ طٰہٰ میں ہے ۔ آتِیْکُمْ مِنْھَا بِقَبَسٍ (۲۰/۱۰) میں اس آگ سے تمہارے پاس شعلہ لے آؤں ۔ اِقْتَبَسَ ۔ اس نے بڑی آگ سے کچھ آگ لے لی * ۔ سورہ حدید میں ہے ۔ نَقْتَبِسْ مِنْ نُوْرِکُمْ (۵۷/۱۳) ۔ ہم تمہاری روشنی سے کچھ روشنی لے لیں ۔ تمہارے دیے سے اپنا دیا جلا لیں ۔ اس سے اِقْتَبَسَ الْعِلْمَ کے معنی ہیں کسی سے علمی استفادہ کرنا * ۔

ق ب ض

قَبَضَ عَلَیْہِ بِیَدِہٖ ۔ اس نے اسے اپنے پورے پنجے سے پکڑ لیا ۔ گرفت میں لے لیا ۔ قَبَضَ یَدَہٗ عَنْہُ ۔ اس نے اسے پکڑنے سے اپنے ہاتھ کو سکیڑ لیا ۔ یا کھینچ لیا ۔ دراصل قَبَضَ کے معنی کھینچ لینے یا سکیڑ لینے کے ہوتے ہیں ** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) کسی چیز کو لے لینا اور (۲) کسی چیز کا سکڑ اور سمٹ کر مجتمع ہو جانا بتائے ہیں ۔ یہ بَسَطَ کی ضد ہے (۲/۲۴۵) جس کے معنی پھیلانے اور وسیع کرنے کے ہیں ۔ سورہ فرقان میں ہے ۔ ثُمَّ قَبَضْنٰہُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا (۲۵/۴۶) پھر ہم اسے آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں ۔

قَبْضَۃٌ ۔ ملکیت ۔ سورہ زمر میں ہے ۔ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِہٖ (۳۹/۶۷) ۔ آسمانی انقلاب کے دور میں معاش کے تمام ذرائع اسی خدا کی ملکیت میں ہونگے جس کے تصرف میں کائناتی نظام ہے ۔ یعنی اس وقت انسانی معاش بھی خدا ہی کے قانون کے تابع ہوگی ۔ یہ نہیں ہوگا کہ کائنات میں خدا کا قانون چل رہا ہو اور زمین (انسانی معاش) میں انسانوں کا خود ساختہ قانون ۔ یہ شرک ہے ۔

قَبْضَۃٌ ۔ اختیار کرنا ۔ سورہ طٰہٰ میں سامری کے متعلق ہے کہ اس نے کہا کہ فَقَبَضْتُ قَبْضَۃً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ (۲۰/۹۶) ۔ میں نے رسول (حضرت موسٰیؑ) کے نقش قدم (مسلک و مشرب) میں سے بہت تھوڑا سا اختیار کیا ۔ یعنی میں نے ان کی بہت تھوڑی سی پیروی کی ۔ فَنَبَذْتُھَا ۔ اور پھر اسے بھی چھوڑ دیا *** ۔

مَقْبُوْضَۃٌ ۔ قبضہ کی ہوئی ۔ ہاتھ میں لی ہوئی ۔ (۲/۲۸۳) ۔

---

* تاج و محیط و راغب ۔ ** تاج ۔ *** ابو مسلم اصفہانی بحوالہ غریب القرآن ۔ میرزا ابو الفضل ۔

سورۂ ملک میں پرندوں کے متعلق ہے۔ صٰفّٰتٍ وَّیَقْبِضْنَ (۶۷/۱۹)۔ اس کے عام معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے پر پھیلاتے ہیں اور سکیڑتے ہیں۔ لیکن صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ قَبَضَ الطَّائِرُ کے معنی ہیں پرندے نے اڑنے میں تیزی کی۔ اسی طرح فَرَسٌ قَبِیْضٌ اَلشَّدِّ کے معنی ہیں تیزی سے پاؤں اٹھانے والا گھوڑا*۔ ابن فارس نے بھی اس کے یہی معنی لکھے ہیں۔

ق ب ل

قَبْلُ۔ بَعْدُ کی ضد ہے۔ قرآن کریم میں ہے لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ (۳۰/۴)۔ ''پہلے اور پیچھے اللہ ہی کا امر ہے''۔ نیز قَبْلُ کے معنی ''بغیر'' کے بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ (۱۸/۱۰۹) جس کے معنی ہیں ''بغیر اس کے کہ میرے رب کے کلمات پورے ہوسکیں**۔ (اگرچہ یہاں اس کے معنی ''قبل اسکے'' بھی ہوسکتے ہیں)۔ اَلْقُبُلُ اَلْقُبْلُ۔ (یہ الدُّبُرُ و الدُّبْرُ پیچھے کی ضد ہے۔ یعنی) آگے۔ سورۃ یوسف میں ہے وَاِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ (۱۲/۲۶)۔ ''اگر اس کی قمیص آگے سے پھٹی ہے''۔

اَلْقُبْلُ۔ پہاڑ کا دامن (عرض میں)۔ اَلْقُبُلُ مِنَ الزَّمَنِ۔ زمانہ کا اولین حصہ۔ اَلْقُبْلَةُ۔ بوسہ۔ قَوَابِلُ الْاَمْرِ۔ کسی معاملہ کے ابتدائی امور۔ مبادیات۔ اَلْقَابِلَةُ۔ آنیوالی شب۔ نیز وہ عورت جو بچہ جنائے**۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا دوسری چیز کے آمنے سامنے ہونا ہیں۔ رہ گیا قَبْلُ کا لفظ جو بَعْدُ کی ضد ہے تو وہ اس بنیادی معنی کے تحت نہیں آتا۔ لہذا وہ خلاف قیاس ہے، اگرچہ یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ جو چیز پہلے واقع ہوتی ہے وہ زمانہ کے سامنے آرہی ہوتی ہے۔ لیکن یہ توجیہ قرین قیاس نظر نہیں آتی***۔

قِبَلٌ کے معنی ہیں آمنے سامنے۔ نیز طرف، جہت، رخ، سمت۔ یہ بمعنی عِنْدَ بھی آتا ہے۔ یعنی پاس، نزدیک۔ اس کے معنی تاب و تواں اور طاقت کے بھی ہیں۔ سورۃ حدید میں ہے وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ (۵۷/۱۳)۔ اس کے معنی ''باہر کی جہت'' یا باہر کی طرف، سامنے سے عذاب،

*تاج۔ **تاج و محیط۔ ***ابن فارس۔

دونوں آسکتے ھیں ۔ اسی طرح سورۃ بقرہ میں قِبَلَ الْمَشْرِقِ (۲/۱۷۷) آیا ھے ۔ اس کے معنی مشرق کی سمت ھیں ۔ لیکن اگر قِبَلٌ کو قِبْلَةٌ کی جمع تصور کرلیا جائے تو اس کے معنی ''مشرق و مغرب کے تمام قبلے'' ھونگے ۔ (تفصیل آگے چل کر آئیگی) ۔

تَقَبَّلَهُ و قَبِلَهُ ۔ اس نے اسے لے لیا ۔ منظور کر لیا ۔ قبول کر لیا*۔ قرآن کریم میں ھے وَ هُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ (۴۲/۲۵) ۔ ''اور وھی ھے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ھے'' ۔ دوسری جگہ ھے قَابِلِ التَّوْبِ (۴۰/۳) ۔ ''توبہ قبول کرنے والا'' ۔ تَقَبَّلَ ۔ کسی چیز کو اسطرح قبول کرنا کہ وہ اجر و ثواب کی مستحق ھو* ۔ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (۵/۲۷) ۔ ''اللہ صرف متقین کا عمل قبول کرتا ھے'' ۔ ان آیات میں ''قبول کرنے'' سے مراد کسی چیز کا لے لینا ھیں (جیسے ھم کسی کا نذرانہ لے لیتے ھیں) ۔ مطلب یہ ھے کہ ان اعمال کا خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق عمدہ نتیجہ مرتب ھوتا ھے جو اعمال اس کے مقرر کردہ قانون اور قاعدے کے مطابق سرزد ھوں وھی خوشگوار نتائج کے حامل ھوتے ھیں ۔

قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے تذکرہ کے ضمن میں ھے ۔ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ (۳/۳۶) ۔ ''خدا نے اسے اچھی قبولیت سے قبول کیا'' ۔

قَبِيلٌ وَقُبُلٌ ۔ کھلم کھلا ۔ رو در رو ۔ آمنے سامنے ۔ (نیز قَبِيلٌ کے معنی ذمہ دار ۔ کفیل ۔ اور نمائندہ کے بھی ھوتے ھیں)* ۔ قرآن کریم میں ھے ۔ وَ حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا (۶/۱۱۲) ۔ ''ھم سب چیزوں کو ان کے سامنے لا اکٹھا کرتے'' ۔ اَلْقِبَلُ ۔ طاقت اور قوت* ۔ فَلَنَأْتِيَنَّهُمْ بِجُنُودٍ لَا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا (۲۷/۳۷) ۔ اس کے معنی یہ ھیں کہ ان میں ھمارے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ھوگی ۔ وہ ان کا مقابلہ کرنے پر قادر نہیں ھوسکینگے ۔ اَلْقَبِيلُ ۔ شوھر ۔ نیز تین یا تین سے زیادہ آدمیوں کی جماعت جو مختلف قبیلوں اور قوموں یا ایک ھی جد اعلیٰ سے متعلق ھوں ۔ اَلْقَبِيلَةُ ۔ خاندان ۔ ایک باپ کی اولاد (جمع قَبَائِلُ ۔ ۴۹/۱۳) ۔ قَبَائِلُ الرَّأْسِ سر کی ھڈیاں جوایک دوسرے کےساتھ مل جاتی ھیں ۔ زجاج نے کہا ھے کہ اولاد اسماعیلؑ کے لئے قَبِيلَةٌ کہتے ھیں اور اولاد اسحٰقؑ کے لئے سِبْطٌ (جمع أَسْبَاطٌ) ۔

اَلقَبِيلَةُ ۔ کنوئیں کے منہ پر رکھی ھوئی بڑی چٹان ۔ أَقْبَلَ إِلَيْهِ ۔ وہ اس کی طرف آیا ۔ أَقْبَلَ الرَّجُلُ ۔ اسے حماقت کے بعد عقل آگئی ۔

*تاج و محیط ۔

قَابَلَهٗ - مُقَابَلَةً - وہ اس کے آمنے سامنے ہوا - رو بہرو ہوا - اَقْبَلَ عَلَيْهِ - اس کی طرف متوجہ ہوا - اَقْبَلَ عَلَى الْاَمْرِ - وہ اس کام میں لگ گیا اور اسے چھوڑا نہیں - اسے اپنے سامنے رکھ لیا - تَقَابَلَا - وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے* - قرآن کریم میں ہے اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِيْنَ (۱۵/۴۷)- یعنی وہ بھائیوں کی طرح تختوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہونگے -

اَلْقِبْلَةُ - اس لفظ کے اصل معنی جہت یا سمت کے ہوتے ہیں - لیکن عرف عام میں اس جگہ کو کہتے ہیں جس کی طرف نماز میں رخ کیا جائے* - جسے سامنے رکھا جائے - جو ''پیش نظر'' رہے - جو مقصودِ نگاہ یا نصب العین ہو -

دین کے نظام میں قبلہ کو خاص اہمیت حاصل ہے - ہر نظام، ہر مملکت، ہر حکومت کا ایک مرکز ہوتا ہے جس کی طرف تمام افراد معاشرہ کی نگاہیں اٹھتی ہیں - جو ان میں وحدتِ فکر و عمل پیدا کرتا ہے - یہ در اصل نشان (Symbol) ہوتا ہے اس نظام یا حکومت کا جسے ہر وقت پیش نظر رکھنا ہوتا ہے - اسے پیش نظر رکھنے سے مقصود اس نظام یا حکومت سے اپنی وابستگی اور وفاشعاری کا اظہار ہوتا ہے - حکومت خداوندی کا محسوس قبلہ، اس مقام کے علاوہ اور کونسا مقام ہوسکتا تھا جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳/۹۵) یعنی—دنیا کے بتکدہ میں پہلا وہ گھر خدا کا—جسے تمام اقوام عالم کے لئے راہ نمائی کا نشان بنایا گیا - جس کی خصوصیت یہ ہے کہ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (۳/۹۶) - ''جو اس میں داخل ہوگیا اسے دنیا جہاں کی آفات سے امن مل گیا'' - قبلہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے اتباع کو قرآن کریم نے دین کے اتباع سے تعبیر کیا ہے - چنانچہ سورۃ بقرہ میں ایک جگہ ہے وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ - وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ....... (۲/۱۴۵) - ''اگر تو ان لوگوں کے پاس جنہیں کتاب دی گئی ہے تمام آیات (دلائل) بھی لے آئے تو بھی وہ تیرے قبلہ کا اتباع نہیں کرینگے - اور نہ تو ان کے قبلہ کے تابع ہوگا - اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کے تابع ہیں - دوسری جگہ ہے وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (۲/۱۲۰) -

*تاج و محیط -

''یہود اور نصاریٰ تجھ سے ہرگز راضی نہ ہونگے جب تک تو ان کی ملت (مسلک) کا اتباع نہ کریگا'' - اس سے ظاہر ہے کہ قبلہ ، در حقیقت ملت و مسلک (دین) کا محسوس نشان ہے اور اتباع قبلہ سے مراد اتباع دین ہے -

جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ وہ زندگی کے کسی شعبے اور دنیا کے کسی گوشے میں ہوں ، وہ اپنی توجہات کو اپنے دین کے مرکز (قبلہ) کی طرف مرکوز رکھیں - وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (۲/۱۵۰) - ''تم جہاں کہیں بھی ہو اپنے رخ اسی کی طرف رکھو'' - یعنی اپنی توجہات کو اس کی طرف مرکوز کرو - تمہارا نصب العین حیات ایک ہو اور یہی وحدت نصب العین تمہاری وحدت ملت کی بنیاد قرار پائے - اسی کی محسوس شکل، اجتماعات صلٰوۃ میں کعبہ کی طرف رخ کرنا ہے - یہ بھی اپنی جگہ ضروری ہے لیکن اسے مقصود بالذات نہیں سمجھ لینا چاہئے - یہی وہ حقیقت ہے جس کی تبئین کے لئے فرمایا کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ . . . . (۲/۱۷۷) - ''کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق کی طرف کرنے ہو یا مغرب کی طرف'' - [اگر قِبَلٌ کو قِبْلَةٌ کی جمع تصور کرلیا جائے تو اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مشرق و مغرب میں جس قدر قبلے ہیں، وہ کسی قوم کے یا کسی مذہب کے ہوں ، ان کی ساری اہمیت اضافی ہے - ذاتی نہیں] - بات بالکل واضح ہے - جو چیزیں کسی نظام کے لئے محسوس نشانات کا کام دیتی ہیں جب تک وہ نظام قائم رہے ، ان نشانات کی اہمیت حتمی اور یقینی، اور ان کا احترام و التزام نہایت ضروری ہوتا ہے - (اسی کو دوسری جگہ شعائر اللہ کہا گیا ہے - دیکھئے عنوان ش - ع - ر) لیکن جب وہ نظام باقی نہ رہے تو ان نشانات کا احترام محض ایک رسم بنکر رہ جاتا ہے - یہ ہے وہ لطیف اور اہم نکتہ جس کی وضاحت کے لئے قرآن کریم نے ایک جگہ تاکیداً کہا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو اپنا رخ اپنے دین اور نظام کے محسوس مرکز کی طرف رکھو - اس سے معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری وفا شعاریوں کا مرکز کیا ہے - لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ اس مرکز کی طرف منہ کرنا مقصود بالذات ہے -

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب نظام گم ہو جائے اور قوم انفرادی زندگی بسر کر رہی ہو ، لیکن اس کے دل میں اس نظام کے قیام کی آرزو ہو ، تو اس وقت قِبْلَة کسے بنایا جائے؟ یعنی اس وقت اجتماعی زندگی کی ابتدا کہاں سے کی جائے؟ قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کے سلسلہ میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جہاں کہا ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی

کہ ایسے حالات میں وَ اجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ أَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (۱۰/۸۷) - یعنی ''اپنے گھروں کو اپنی توجہات کا مرکز بناؤ اور وہیں سے نظام صلٰوۃ کے قیام کی ابتدا کردو''۔ یعنی اس نظام کا آغاز اپنے اپنے گھروں سے (ایک خاندان کو وحدت (Unit) تصور کرکے) کرو ۔ رفتہ رفتہ یہ نظام پوری کی پوری قوم کو محیط ہو جائیگا اور سب کے لئے ایک قبلہ قائم ہوجائیگا ۔

یہودیوں کے لئے یہ اجتماعی مرکز بیت المقدس تھا ۔ لیکن یہودیوں نے دین خداوندی کو اپنی نسل تک محدود کر لیا ، لہذا یہ مرکز بھی ان کا قومی مرکز بن کر رہ گیا ۔ عالمگیر انسانی برادری کا مرکز نہ رہا ۔ ایک یہود پر ہی کیا موقوف ، اُس وقت دنیا کے کسی مذہب اور کسی قوم کے سامنے بھی عالمگیر انسانیت کی وحدت کا تصور نہیں تھا ۔ ان کے برعکس ، قرآن کریم کے پیش نظر تمام نوع انسان کو ایک مرکز پر جمع کرنا تھا ، اس لئے وہ مختلف قومی مراکز میں سے کسی کو بھی اپنا مرکز قرار نہیں دے سکتا تھا ۔ وہ اس کعبہ کو مرکز قرار دے سکتا تھا جس کی بناء حضرت ابراهیمؑ کے ہاتھوں اسی مقصد کے لئے رکھائی گئی تھی ۔ (۲/۱۲۷) ۔ اس مقام کو مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَ اَمْنًا (۲/۱۲۵) قرار دیا گیا تھا ۔ یعنی تمام نوع انسان کے لئے مرجع اور پناہ گاہ ۔ یہ سَوَاءَنِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ (۲۲/۲۵) تھا ۔ یعنی وہاں کے باشندوں اور باہر سے آنے والوں ، سب کے لئے یکساں ۔ یہ بنایا ہی تمام انسانوں کے فائدے کے لئے گیا تھا (۳/۹۵) ۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے کعبہ کو دین خداوندی کا مرکز (قبلہ) بنایا گیا ۔

جہاں تک خود امت مسلمہ کا تعلق ہے ، تعیین قبلہ کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (۲/۱۴۳)۔ ''اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنا دیا تاکہ تم تمام اقوام عالم کے اعمال کی نگران رہو اور رسول (تمہارا مرکز ملت) تمہارے اعمال کا نگران رہے'' ۔ اس آیۃ جلیلہ میں مسلمانوں کے مقصد حیات ، مقام اور طریق عمل کو ابھار اور نکھار کر سامنے لایا گیا ہے ۔ کعبہ کو قبلہ اس لئے بنایا گیا ہے کہ دین ، قومی دوائر سے نکل کر عالمگیر انسانیت کو محیط ہو جائے ۔ اس دین کی حامل اُمت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دیگر اقوام عالم کے اعمال کی نگران رہے کہ کونسی قوم (نوع انسان کے لئے) کیا کچھ کرتی ہے ۔ اس مقصد کے لئے اجتماعی نظم کی ضرورت ہے ۔ اس نظم کا مرکز رسول (اور رسول کے بعد اس کے

سچے جانشین) ہیں ۔ جب تک یہ نظام قائم رہا ، تعیین قبلہ کا منشأ پورا ہوتا رہا ۔ جب یہ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا نہ اس اُمت کا وہ مقام رہا ، نہ اس کے قبلہ کی وہ حیثیت ۔

رہ گئی رسم اذاں ، روح بلالی نہ رہی

اس ''رسم'' میں روح پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پھر سے اُسی نظام کو زندہ اور قائم کیا جائے ۔ قرآن کریم کی موجودگی میں اس نظام کا احیاء کچھ بھی مشکل نہیں ۔ قرآن کریم کو ہمیشہ کے لئے محفوظ اسی لئے رکھا گیا ہے کہ اس پر متفرع نظام ہمیشہ قائم رہے اور اگر یہ کسی وقت (بدقسمتی) سے موجود نہ رہے تو اس کی دوبارہ تشکیل کی جاسکے۔ دنیا اب اپنی قوسی تنگناؤں سے دل برداشتہ ہوکر ، کسی عالمگیر نظام کی متمنی ہوتی جارہی ہے ۔ اس نظام کے لئے ایک مشترکہ ضابطۂ حیات کی ضرورت ہے ۔ یہ ضابطہ حیات ، قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا ۔ جس دن دنیا نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ، عالمگیر نظام حکومت کے خواب کی تعبیر سامنے آجائیگی ۔ لیکن اس کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم پر ایمان رکھنے والی اُمت اپنے اندر وحدت پیدا کرکے اس قسم کے نظام کو متشکل کرکے دکھائے ۔ اگر اسی قوم کے ''قبلے'' مختلف رہے تو ساری دنیا کا ایک قبلہ کس طرح بن سکے گا ؟

ق ت ر

اَلْقَتْرُ ۔ اَلتَّقْتِیْرُ ۔ صرف گذر بسر کے قابل معیشت یا نفقہ ۔ قَتَرَ وَقَتَّرَ ۔ گذر بسر کے لئے ضرورت سے کم خرچ کرنا ، خرچ میں تنگی کرنا ۔ لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا (۲۵/۶۷) ۔ نہ ہی وہ بے جا خرچ کرتے ہیں اور نہ ہی مناسب خرچ میں تنگی کرتے ہیں ۔ اَلْمُقْتِرُ (۲/۲۳۶) تنگ دست ، بمقابلہ اَلْمُوْسِعُ ۔ صاحب وسعت ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے ۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (۱۷/۱۰۰)۔ انسان (اگر وحی کے تابع نہ چلے تو) بخل کرتا ہے اور اپنی دولت کو نوع انسان کی منفعت کے لئے کھلا نہیں چھوڑتا ۔

اَلْقَتَرُ ۔ غبار ۔ سیاہی ۔ دھندلا ، دھوئیں جیسا رنگ ۔ مٹیالا رنگ* ۔ اَلْقَتَرَۃُ ۔ غبار بمعنی قَتَرٌ ۔ بقول بعض یہ قَتَرٌ کا واحد ہے ۔ تَرْهَقُهَا قَتَرَۃٌ (۸۰/۴۱ و ۱۰/۲۶) انہیں (ذلت کی) سیاہی ڈھانپ لے گی ۔ ان پر افسردگی چھاجائے گی ۔ اَلْقَتِیْرُ ۔ زرہ کے حلقوں کے کنارے* ۔ رَجُلٌ قَاتِرٌ ۔ ضعیف آدمی** ۔

*تاج ۔ **راغب ۔

ق ت ل

اَلْقَتْلُ ۔ هتهیار کی ضرب ، یا پتهر ، یا زهر ، وغیره سے کسی کو مار ڈالنا ۔ جان نکال دینا ، قَاتَلَهٗ ۔ اس سے جنگ کی* ۔ ایک نے دوسرے کو قتل کرنا چاها*۔ راغب نے کہا هے کہ اس کے معنی ذلیل و حقیر کرنے اور جهکا دینے کے بهی آتے هیں*** ۔ ابن فارس نے کہا هے کہ اس کے بنیادی معنی ذلیل کرنے اور مار ڈالنے کے هیں ۔ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ (۸۰/۱۷) ۔ میں قوانین خداوندی سے انکار کرنے والوں کی ذلت و حقارت اور تباهی و بربادی هی کا بیان هے ۔ اسی طرح قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ (۹/۳۰) کے معنی هیں خدا انهیں ذلیل و حقیر کرے ۔ خدا انهیں تباه و برباد کرے ۔ خدا انهیں مغلوب کرے ۔ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ (۵۱/۱۰) کے بهی یہی معنی هیں ۔ اسی طرح راغب نے لکها هے کہ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (۱۷/۳۱) نیز وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (۶/۱۵۲) میں قتل اولاد سے مراد بچوں کو سچ مچ قتل کر دینا نهیں بلکه انهیں علم و تربیت سے محروم رکهنا هے ۔ اور اس کے مقابله میں ان کا اِسْتِحْيَاء (زنده رکهنا) انهیں علم و بصیرت عطا کرنا هے*** ۔ یعنی اس خیال سے بچوں کو تعلیم سے محروم رکهنا کہ اس کے اخراجات سے هم غریب هوجائینگے ۔

تذلیل و تحقیر کے مفهوم کی رو سے قرآن کریم کی ان آیات کا مطلب بهی صاف هو جاتا هے جهاں بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا ذکر هے ۔ (اس کے لئے دیکهئے عنوان ذ ۔ ب ۔ ح)۔

تذلیل و تحقیر کے اعتبار سے قَتْلٌ کے معنی هیں کسی کو ایسا کردینا کہ اس کی بات پر کوئی دهیان نه دے ۔ اس کی کوئی پرواه نه کرے ۔ اس کا کچھ اثر باقی نه رهے ۔ وه (Ineffective) هو جائے ۔ اُقْتُلُوْا فُلَانًا کے معنی هیں اُسے ایسا کر دو گویا وه مُردوں میں شامل هو چکا هے ۔ یعنی اس کی موجودگی اور عدم موجودگی برابر هو جائے ۔ قَتَلَ الشَّرَابَ کے معنی هیں شراب میں پانی ملا کر اس کی تندی اور کیف آوری کو کم اور هلکا کردیا* ۔

قَتَلَ الشَّیْءَ خُبْرًا ۔ اس نے اس چیز کا پورا پورا علم حاصل کرلیا ۔ اِنَّهٗ لَقَتِلٌ شَرٍّ ۔ وه شر کو اچهی طرح جانتا هے ۔ اسی نهج سے حضرت عیسیٰ کے متعلق جو آیا هے ۔ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا (۴/۱۵۷) ۔ تو اس کے

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

معنی یہ ہیں کہ انہیں حقیقت کا یقینی علم بالکل نہیں ۔ یعنی مَا قَتَلُوْا عِلْمَهُمْ يَقِيْنًا* ۔ اَلْبُسْتَان میں بھی مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا کے معنی لکھے ہیں لَمْ يُحِيْطُوْا بِهٖ عِلْمًا ۔ اَلْمُقَتَّلُ اُس آدمی کو کہتے ہیں جو بہت تجربہ کار اور اشیاء کی حقیقت کا علم رکھنے والا ہو* ۔

لہذا قرآن کریم میں جہاں قَتْلٌ کا لفظ آئے گا ہر جگہ اس کے معنی مار ڈالنے کے نہیں ہونگے ۔ سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کے معنی متعین کئے جائینگے ۔ کہیں مار ڈالنا ۔ کہیں ذلیل و حقیر کرنا ۔ غیر موثر بنا دینا ۔ تباہ و برباد کر دینا ۔ کہیں علم و تربیت سے بے بہرہ رکھنا ۔ اور کہیں پورا پورا علم حاصل کرنا ، وغیرہ ۔ حتیٰ کہ انتہائی کوشش کرنا بھی، چنانچہ اِسْتَقْتَلَ فِی الْاَمْرِ کے معنے ہیں اس نے اس معاملہ میں جان کی بازی لگا کر کوشش کی* ۔

سورۃ بقرہ میں یہودیوں کے متعلق ہے ۔ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۲/۶۱) تو اس کے یہ معنی بھی ہونگے کہ وہ اپنے انبیاء کی تحقیر و تذلیل کرتے تھے اور یہ بھی کہ وہ ان کے درپے قتل ہوتے تھے یا قتل کر دیتے تھے ۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق دوسری جگہ ہے کہ انہیں یہودیوں نے قتل نہیں کیا تھا ۔ نہ ہی آپؑ کو صلیب دی گئی تھی (۴/۱۵۷)۔ اسی سورت میں دوسری جگہ فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (۲/۵۴) آیا ہے ۔ اس کے معنی ہیں اپنے آپ کو قوانین خداوندی کے تابع لے آؤ ۔ اس لئے کہ راغب نے کہا ہے کہ قَتَلْتُ فُلَانًا کے معنی ذَلَّلْتُهٗ آتے ہیں ۔ یعنی اسے مطیع و فرمانبردار بنا لیا** ۔

سورۃ نساء میں ہے کہ ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ ۔ اس کے بعد ہے وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ (۴/۲۹)۔ یعنی اس طرح اپنے آپ کو تباہ نہ کرو ۔ یا ایک دوسرے کو تباہ و برباد نہ کرو ۔ یا اپنی ذات کو ہلاک نہ کرو ۔ جس معاشرہ میں لوگ ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طریقوں سے کھانے لگ جائیں ، اس میں سب کچھ تباہ ہوجاتا ہے ۔

قرآن کریم میں جنگ کرنے کے لئے بالعموم قِتَالٌ کا لفظ آیا ہے (۲/۲۱۶) لیکن (۳/۱۵۳) میں جو کہا ہے كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ ۔ تو اس کے معنی ہیں وہ لوگ (جماعت مومنین) جن پر (قتل کرنا) جنگ واجب قرار دی گئی تھی ۔ یہ معنی نہیں کہ ”جن کا قتل ہونا مقدر ہوچکا تھا“ ۔ اول تو اس

*تاج ۔ **راغب ۔

لئے کہ کُتِبَ عَلَی کے معنی کسی بات کو واجب قرار دینے کے ھیں ۔ دوسرے یہ کہ قَتْلٌ کے معنی قتل ہونے ھی کے نہیں ۔ قتل کرنے کے بھی ھیں ۔ جیسے اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ میں ھے (۲/۱۹۱) ۔ تیسرے یہ کہ اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ ''ان کے لئے قتل ہوجانا مقدر ہوچکا ھے'' تو یہ تصور قرآن کریم کی ساری تعلیم کے خلاف جاتا ھے جس کی رُو سے انسان اپنے اعمال میں صاحب اختیار ھے ۔ مجبور نہیں ۔

(سزائے قتل کے لئے دیکھئے عنوان ق ۔ ص ۔ ص میں لفظ قصاص) ۔

ق ث أ

قِثَّاءٌ ۔ قُثَّاءٌ ۔ کھیرے کو کہتے ھیں** ۔

قرآن کریم میں قِثَّاءٌ (۲/۶۱) میں آیا ھے ۔

ق ح م

اَلْاِقْتِحَامُ ۔ کسی خوفناک اور شدید معاملہ کے اندر گھس جانا ۔ قَحَمَ الرَّجُلُ فِی الْاَمْرِ ۔ اس نے اپنے آپ کو اس معاملہ میں بے سوچے سمجھے یکبارگی ڈال دیا ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز پر ذرا سختی سے اقدام کرتے ہوئے پہنچنا ھیں ۔ تَقَحَّمَتْ بِہٖ النَّاقَۃُ کے معنی ہوتے ھیں اونٹنی اسے لے کر وحشیانہ طور پر بھاگ کھڑی ہوئی ۔ قَحَّمَتْہُ الْفَرَسُ اسے گھوڑے نے منہ کے بل گرا دیا** ۔ راغب نے لکھا ھے کہ اس کے معنی ھیں گھوڑا ، سوار کو لیکر خوفناک مقام میں گھس گیا* ۔

ان معنوں میں یہ لفظ سورہ صٓ میں آیا ھے جہاں کہا ھے کہ ھٰذَا فَوْجٌ مُقْتَحِمٌ مَّعَکُمْ (۳۸/۵۹) ۔ یہ ایک ایسی جماعت ھے جو اندھا دھند تمہارے ساتھ داخل ہونے والی ھے ۔ مِحَالَۃٌ قَحُوْمٌ ۔ اس چرخی کو کہتے ھیں جو تیزی کے ساتھ گھومتی ہو ۔ اِقْتَحَمَ الْمَنْزِلَ کے معنی ھیں وہ گھر میں گھس پڑا ۔ (اس میں سختی اور شدت کا پہلو ہوتا ھے) ** ۔ یعنی تیزی کے ساتھ کسی مقصد کی طرف آنا ۔ ان معنوں میں سورہ بلد میں ھے ۔ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَۃَ (۹۰/۱۱) ۔ انسان (خدا کے مقرر کردہ نظام ربوبیت کی) گھاٹی پر چڑھنے کے لئے (جس کی تفصیل اگلی آیت میں دی گئی ھے) تیزی

---

*راغب ۔ **تاج ۔

سے دوڑ کر نہیں آتا وہ اس میں ، ہر مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہؤا درّانہ نہیں گھستا ۔ (حالانکہ اگر اسے حقیقت کا علم ہو جائے تو یہ وہ منزل ہے جس کی طرف اسے والہانہ آنا چاہئے) ۔

قَدْ ۔ (لَقَدْ) ۔ (حرف)

قَدْ ۔ (۱) ماضی کو ماضی قریب بنا دیتا ہے ۔ قَدْ ضَرَبَ ۔ اس نے مارا ہے ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَمَا لَنَا اَلاَّ نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَاءِنَا (۲/۲۴۶) ۔ اب ہمارے لئے کونسی وجہ باقی ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں جبکہ ہم اپنے گھر بار اور بال بچوں سے جدا کر دئے گئے ہیں ۔

(۲) فعل ماضی کے ساتھ تحقیق کے معنوں میں ۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (۲۳/۱) ۔ مومن یقیناً کامیاب ہیں (یا کامیاب ہونگے) ۔

(۳) مضارع کے ساتھ تحقیق کے لئے ۔ قَدْ یَعْلَمُ مَآاَنْتُمْ عَلَیْہِ (۲۴/۶۴) ۔ اللہ یقیناً جانتا ہے کہ تم کس حال میں ہو ۔

(۴) اکثر یا بکثرت کے معنوں میں ۔ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْہِکَ فِی السَّمَآءِ ۔ (۲/۱۴۴) ۔ ہم نے تجھے اکثر (یا بار بار یا بکثرت) آسمان کی طرف نظر لگائے دیکھا ہے ۔

(۵) بعض اوقات یہ (الف) ''کبھی کبھی'' کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً ۔ قَدْ یَصْدُقُ الْکَذُوْبُ ۔ جھوٹا بھی کبھی کبھی سچ بول لیتا ہے ۔ یا (ب) قَدْ یَقْدَمُ الْغَائِبُ ۔ اسکی توقع ہے کہ جو اسوقت یہاں نہیں وہ آجائے گا ۔ یا (ج) قَدْ فَعَلَ ۔ وہ یہ کام پہلے ہی کر چکا ہے ۔ یا مثلاً (د) جب کوئی پوچھے کہ فلاں کا کیا حال ہے ۔ یا فلاں زندہ ہے یا مر گیا ۔ تو اس کے جواب میں کہا جائیگا ۔ قَدْ مَاتَ فلانٌ ۔ وہ تو مر چکا ہے ۔ وہ مر گیا ۔

(۶) لَقَدْ ۔ قَدْ پر لَ ۔ بڑھانے سے تاکید بڑھ جاتی ہے ۔ یعنی زیادہ یقین سے کہا جاتا ہے ۔

ق د ح

اَلْقِدْحُ ۔ تیر کی ڈنڈی جس میں ابھی نہ پر لگے ہوں نہ پھل ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) کسی چیز میں نقص

کی وجہ سے سوراخ ، شگاف یا گڑھا پڑ جانا ، اور (۲) کسی چیز کو چمچہ وغیرہ سے نکالنا ۔ اَلْقَدَحُ ۔ پیالہ (خالی پیالے کو قَدَحٌ اور بھرے ہوئے کو کَاْسٌ کہتے ہیں ۔) قَدَحَ بِالزَّنْدِ ۔ اس نے چقماق سے آگ نکالی ۔ قَدَحَ فِیْ فُلَانٍ قَدْحاً ۔ اس نے اس شخص میں طعن کیا ۔ اسکی عیب چینی اور تنقیص کی * ۔

قرآن کریم میں ہے فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحاً (۱۰۰/۲) ۔ یہ قَدَحَ بِالزَّنْدِ سے ہے ۔ یعنی وہ گھوڑے جو پتھروں پر اس طرح سُم ماریں کہ ان سے آگ کی چنگاریاں نکلیں ۔

ق د د

اَلْقَدُّ ۔ کاٹنا ۔ کسی چیز کو طول میں شق کرنا یا چیرنا ۔ میدان کو قطع کر لینا ۔ کلام کو قطع کر دینا ۔ نیز قد و قامت یا کسی چیز کی کاٹ تراش ** ۔ سورہ یوسف میں ہے ۔ وَقَدَّتْ قَمِیْصَهٗ (۱۲/۲۵) ۔ اس عورت نے اسکی قمیص پھاڑ دی ۔ اَلْقِدَّةُ ۔ ٹکڑا ۔ فرقہ ۔ لوگوں کا گروہ ، ٹولی ۔ (اسکی جمع قِدَدٌ ہے) قرآن کریم میں ہے کُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ۔ (۷۲/۱۱) ۔ ہم مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے ۔ ہم متفرق راستے اختیار کئے ہوئے تھے ۔ ایسے لوگ جو مختلف مقاصد رکھتے ہوں اور اس لئے ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہوں ** ۔

ق د ر

قَدْرٌ کے بنیادی معنی ہیں اندازہ ۔ پیمانہ ۔ قَدَرْتُ الشَّیْءَ کے معنی ہیں میں نے اس چیز کو ماپا ۔ اس کا اندازہ کیا ۔ اس کی لمبائی چوڑائی جسامت ، کمیت وغیرہ کو متعین کیا ۔ بتایا کہ وہ کیسی ہے ، کتنی ہے ، اس کا تناسب کیا ہے ۔ اور قَدَرَ الشَّیْءَ بِالشَّیْءِ کے معنی ہیں اس نے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ رکھکر ماپا اور اسطرح اندازہ کیا کہ وہ اس کے برابر ہے یا نہیں ۔ یا ان دونوں کا باہمی تناسب کیا ہے ۔ قَدَرْتُ عَلَیْهِ الثَّوْبَ کے معنی ہیں اس نے اس شخص کے ماپ کے مطابق کپڑے بنائے ۔ قَدَّرْتُ عَلَیْهِ الشَّیْءَ کے معنی ہیں میں نے اس چیز میں ایسی مناسب تبدیلیاں کر دیں کہ وہ اس پر بالکل فٹ آگئی ۔ لہذا تَقْدِیْرٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے مطابق بنا دینا ۔ اور مِقْدَارٌ

*تاج ۔ **تاج و کتاب الاشتقاق ۔

اس پیمانے یا ماڈل یا (Pattern) کو کہتے ہیں جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے* ۔ قَدْرٌ کے معنی ہیں کسی شے کا اندازہ ۔ پیمانہ ، حجم ، جسامت ۔ طول ، عرض ، وغیرہ ۔ هٰذَا قَدْرُ هٰذَا کے معنی ہیں یہ چیز اس دوسری چیز کے اندازے ، پیمانے ، جسامت ، وغیرہ کے بالکل برابر ہے ۔ اس کے عین مطابق ہے ۔ دونوں ایک ہی قالب میں ڈھلی ہوئی ہیں ۔ جَآءَ عَلٰی قَدْرٍ کے معنی ہیں وہ بالکل اندازے کے مطابق آیا ۔ اور جَاوَزَ قَدْرَهٗ کے معنی ہیں اس نے اپنے اندازے ، حدود ، پیمانے سے تجاوز کر لیا ۔ اس سے آگے نکل گیا ۔ اَقْدَرُ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو اپنی رفتار میں اس اندازہ اور توازن سے چلے کہ اس کے پچھلے پاؤں ٹھیک اس جگہ پڑیں جہاں اس کے اگلے پاؤں پڑے تھے ۔ قَدَارٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو مناسب اور معتدل قد کا ہو ۔ نہ زیادہ لمبا نہ چھوٹا ۔ اَلْمُقْتَدَرُ ۔ ہر چیز کے درمیانی حصہ کو کہتے ہیں ۔ کَمْ قَدَرَةٌ نَخْلِكَ ۔ تمہاری کھجوروں کے درختوں کے درمیان کسقدر معین فاصلہ ہے* ۔ عوام کی بولی میں اَلْمُقَدِّرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو کھیتی اور درختوں کا اندازہ کرکے بتائے کہ غلے کی کتنی مقدار پیدا ہونے کی امید ہے ۔ قِدْرٌ ۔ ہانڈی یا دیگ کو کہتے ہیں ۔ اسکی جمع قُدُوْرٌ ہے ۔ قَدِیْرٌ ۔ اس گوشت کو کہتے ہیں جو (مناسب مسالوں کے ساتھ) ہنڈیا میں پکایا جائے ۔ قَدَارٌ ۔ ایسا کھانا پکانے والے کو کہتے ہیں (نیز قصائی کو بھی)* ۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ قَدْرٌ اور تَقْدِیْرٌ کے معنی ہیں اندازہ اور پیمانہ ۔ یا کسی چیز کو اندازہ اور پیمانے کے مطابق بنا دینا ۔ نیز کسی چیز کے تناسب اور توازن کا ٹھیک ٹھیک قائم رکھنا ۔ متوازن اور معتدل رهنا ۔ ان بنیادی معنوں کو پیش نظر رکھنے سے قرآن کریم کے متعدد مقامات آسانی سے سمجھ میں آجائینگے ۔

(۲) چونکہ کسی چیز کو کسی خاص پیمانے اور اندازے کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس چیز پر پوری پوری مقدرت حاصل ہو ، اس لئے قَدْرٌ کے معنی کسی چیز پر اقتدار و اختیار رکھنے کے بھی ہیں ۔ قَدَرْتُ عَلَی الشَّیْءِ کے معنی ہیں مجھے اسقدر قوت حاصل تھی کہ میں اس چیز کو اپنی مرضی یا پیمانے کے مطابق بنا دیتا ۔ مَالِیْ عَلَیْكَ مَقْدَرَةٌ (یا مَقْدَرَةٌ ۔ یا مَقْدِرَةٌ یا قُدْرَةٌ) کے معنی ہیں مجھے تم پر کوئی

*تاج ۔ محیط ۔ ابن ۔ راغب ۔

اقتدار و اختیار حاصل نہیں ۔ اس بنا پر قَدَّرَ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو تیار و ہموار کرنے یا کسی معاملہ کو سرانجام دینے کے لئے اس پر غور و فکر کرنا ۔ اسی سے اس کے معنی فیصلہ کرنے کے آتے ہیں *۔

(۳) ایک چیز کو آپ بغیر ناپے تولے یونہی دیدیتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اس میں کشادگی یا فراخی کا پہلو ہوتا ہے ۔ لیکن دوسری چیز کو آپ ناپ تول کر دیتے ہیں ۔ اس میں تنگی کا پہلو ہوتا ہے ۔ اس لحاظ سے قَدْرٌ کے معنی تنگی کے بھی آتے ہیں ۔ یعنی کسی کو ماپ تول کر دینا *۔ نیز اس کے معنی تعظیم کرنے کے بھی آتے ہیں ۔ یعنی جس مقام پر کوئی ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ رکھنا *۔

سورہ رعد میں ہے ۔ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا (۱۳/۱۷) اللہ بادلوں سے بارش برساتا ہے تو ندی نالے اپنے اپنے ظرف (قَدَرٌ) کے مطابق بھر کر بہ نکلتے ہیں ۔ یہاں سے قَدَرٌ کے معنی اندازے ۔ یعنی ظرف اور پیمانہ کے واضح ہیں ۔ سورہ حجر میں ہے ۔ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵/۲۱) ۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس کے ہمارے ہاں خزانے موجود نہ ہوں لیکن ہم اسے ایک متعین اندازے اور پیمانے کے مطابق باہر لاتے رہتے ہیں ۔ سورہ سبا میں ہے کہ وحشی اقوام کے کاریگر، حضرت سلیمانؑ کے لئے منجملہ دیگر اشیاء قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (۳۴/۱۳) ۔ یعنی ایسی دیگیں جو ایک جگہ گڑی رہیں ، بنایا کرتے تھے ۔ یہاں قِدْرٌ کے معنی دیگ کے ہیں ۔

کسی پر غلبہ و اقتدار حاصل کر لینے کے معنوں میں سورہ مائدہ میں ہے ۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ (۵/۳۴) ۔ قبل اس کے کہ تم ان پر غلبہ حاصل کر لو ۔ سورہ انبیاء میں ہے ۔ فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ (۲۱/۸۷) ۔ اس نے خیال کیا کہ ہم اس پر قابو نہ پاسکیں گے ۔ یا اس سے کوئی مواخذہ نہ کر سکیں گے ۔

سورہ بنی اسرائیل میں ہے ۔ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (۱۷/۳۰) ۔ یہاں قَدْرٌ ۔ بمقابلہ بَسْطٌ آیا ہے ۔ بَسْطٌ کے معنی ہیں فراخی اور کشادگی ۔ لہذا قَدْرٌ کے معنی ہیں تنگی یا کسی چیز کا نپا تلا ملنا ۔

تَقْدِيْرٌ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے عنوان (ش ۔ ی ۔ أ) میں مَشِيّت کے معنی دیکھئے اور ان تینوں گوشوں پر غور کیجئے جن کا وہاں

*تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔

ذکر کیا گیا ہے ۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ گوشۂ اول وہ ہے جہاں امر الٰہی کے مطابق ہر شے وجود میں آتی ہے اور اس کے لئے قواعد و ضوابط (قوانین) اور خواص متعین ہوتے ہیں ۔ یہی قواعد و ضوابط و خواص ان اشیاء کے پیمانے ہیں ۔ انہی کو ان کی ''تقدیریں'' کہا جاتا ہے ۔ آگ کی تقدیر یہ ہے کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے ۔ پانی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ سیّال ہے، نشیب کیطرف بہتا ہے، ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچکر بھاپ بن جاتا ہے اور جب اسے ٹھنڈ پہنچائی جائے تو پتھر کی طرح سخت ہو کر برف بن جاتا ہے ۔ سورہ فرقان میں ہے خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (۲۵/۲) ۔ اللہ نے ہر شے کو پیدا کیا ۔ پھر ان کے لئے پیمانے اور اندازے مقرر کر دئے ۔ امام راغب نے اس پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ اشیاء کے متعلق تقدیر الٰہی (پیمانوں) کی دو شکلیں ہیں ۔ ایک تو یہ کہ کسی شے کو کامل طور پر یکبارگی بنا دے اور اس میں کوئی کمی بیشی واقع نہ ہو تاوقتیکہ خدا اسے فنا کرنا یا بدلنا نہ چاہے ۔ (جیسے سَمٰوٰتٌ) ۔ اور دوسری یہ کہ کسی شے میں کچھ بننے کی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں اور وہ رفتہ رفتہ اپنی انتہائی شکل تک پہنچ جاتی ہے اور اس کے سوا کچھ اور نہیں بن سکتی ۔ جیسے بیج میں درخت بننے کی صلاحیت ۔ یہی اسکی تَقْدِيرٌ ہے ۔

امام راغب نے جو پہلی بات لکھی ہے (کہ بعض چیزوں کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکی ہیں) سو وہ جس زمانے میں گذرے ہیں اس میں وہ یہی کچھ کہہ سکتے تھے ۔ ہمارے زمانے میں انکشافات جدیدہ کا رخ اس طرف ہے کہ جن چیزوں کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ ان میں کوئی تغیرات نہیں ہوتے ان میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں ۔ لیکن یہ تغیرات بڑے غیر محسوس اور غیر مرئی طریقہ سے واقع ہوتے ہیں ۔ بہر حال اس بحث سے قطع نظر تَقْدِيرٌ کے معنی ہیں کسی شے کو ترقی دیتے ہوئے اس قَدْرٌ (Pattern) کے مطابق بنا دینا جو اس کے لئے متعین ہے ۔ یعنی اس کی ممکنات (Potentialities) کا مشہود (Actualise) ہو جانا اور اس طرح اس کا اپنے آخری نقطہ تک پہنچ جانا ۔ قَدْرٌ ۔ اس چیز کو کہتے ہیں جو رفتہ رفتہ اپنے پیمانے کے مطابق سامنے آتی رہے ۔

قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کے تذکار جلیلہ کے ضمن میں ہے کہ جب انہیں پہلی مرتبہ طور پر (نبوت سے سرفراز کرنے کے لئے) بلایا گیا تو ان سے کہا گیا کہ نبوت تمہیں یونہی اتفاقیہ نہیں مل گئی کہ۔آگ لینے کو آئے پیمبری مل جائے۔اس کے لئے تمہیں شروع سے تیار کیا جارہا تھا۔

راغب

چنانچہ تم اس طرح پیدا ہوئے۔ اس طرح تمہاری پرورش ہوئی۔ اسطرح تم مدین کی طرف آئے ۔ اسطرح وہاں تم نے گلہ بانی کی ۔ اسطرح تمہاری تربیت ہوئی ۔ اور یوں ان مختلف منازل میں سے گذر کر ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی (۲۰/۴۰) ۔ تم ، اے موسیٰ! اس اندازے پر پہنچ گئے ۔ اس پیمانے کے مطابق بن گئے جو نبوت کے لئے مقرر کیا گیا ہے ۔ اور یہ سب خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق ہوا* ۔ یہاں لفظ قَدَرٌ نے اپنا مفہوم بالکل واضح کردیا ۔

سورۃ اعلیٰ میں ہے ۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۔ وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی (۸۷/۲-۳) ۔ اللہ وہ ہے جو مختلف اشیائے کائنات کی تخلیق کرتا ہے ۔ پھر ان میں مناسب اعتدال پیدا کرتا ہے ۔ پھر ان کے لئے ان کے پیمانے اور اندازے مقرر کرتا ہے ۔ اور انکی اس راستے کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے جس پر چل کر وہ ان پیمانوں اور اندازوں کے مطابق بن جائیں ۔ یہ ہے خدا کا نظامِ ربوبیت جو کائنات میں جاری و ساری ہے اور جس کی رو سے کائنات کی ہر شے اپنی اپنی تَقْدِیْرٌ تک پہنچتی چلی جاتی ہے ۔ انسان کے اندر بھی کچھ بننے کی صلاحیتیں (Potentialities) رکھ دی گئی ہیں ۔ لیکن اسے دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور نہیں کر دیا گیا کہ وہ صرف اس راستہ پر چلے جس پر چلنے سے اس کی یہ تمام صلاحیتیں نشو و نما پا کر تکمیل تک پہنچ جائیں ۔ اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو یہ راستہ اختیار کرے، اور چاہے دوسرا راستہ جس سے اس کی یہ صلاحیتیں دب کر رہ جائیں ۔ ان دونوں راستوں میں امتیاز ، وحی کی رو سے ہوتا ہے ۔ (جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے) ۔ اب انسان جو راستہ اختیار کرے گا ، یا اس راستے میں جس مقام پر ٹھہر جائے گا ، اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جائے گا ۔ جسطرح مثلاً جب تک پانی سیال رہتا ہے تو اس پر سیالیت (Liquidity) کا قانون نافذ رہتا ہے اور جب منجمد ہو جاتا ہے تو پھر جمادیت (Solidity) کا قانون اس پر نافذ ہوجاتا ہے ۔ یعنی انسان جو کچھ بننا چاہے اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے ۔ ابتداء (Initiative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا کا قانون اس کا اتباع (Follow) کرتا ہے ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے ۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ (۶۱/۵) ۔ جب انہوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کرلیا تو اللہ نے ان کے دلوں

*واضح رہے کہ حضرت موسیٰؑ کو اس کا کچھ علم نہیں تھا کہ انھیں کن مراحل میں سے گذارا جارہا ہے اور کس مقصد کے لئے گذارا جارہا ہے ۔ اس لئے کہ نبی کو نبی ہونے سے پہلے اس کا علم و احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ نبوت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے ۔ نبوت وہبی ہوتی ہے ۔ کسب و ہنر سے حاصل نہیں کی جا سکتی ۔

کو ٹیڑھا کر دیا ۔ دوسری جگہ ہے ۔ یُؤْفَکُ عَنْہُ مَنْ اُفِکَ (۹:۵۱) ۔ اس (صحیح راستے) سے اسی کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھر جاتا ہے ۔ یعنی انسان جو راستہ اختیار کرتا ہے ، اس کے مطابق خدا کا قانون اس پر نافذ ہوجاتا ہے ۔ انسان کی ممکنات (Realisable Possibilities) کا میدان بہت وسیع ہے ۔ اس لئے اس کے لئے تقدیرات (یعنی قوانین خداوندی) کے انتخاب کا میدان بھی لامحدود ہے ۔ یہ جیسا خود بن جائے گا ویسی اس کی ''تقدیر'' بن جائے گی ۔ اقبال کے الفاظ میں :—

حرفِ باریکش بہ رمزے مضمر است   تو اگر دیگر شوی او دیگر است

خاک شو نذرِ ہوا سازد ترا   سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا

شبنمی ! افتندگی تقدیرِ تست   قلزمی ! پائندگی تقدیرِ تست

تم اگر کسی ایک حالت میں ہو اور اس کے مطابق قانونِ خداوندی کے نتائج تمہارے لئے ناخوشگوار ہیں تو تم اپنے اندر تبدیلی پیدا کرلو ۔ اس سے خدا کا دوسرا قانون (تقدیر) تم پر منطبق ہوجائیگا اور تمہاری تقدیر بدل جائے گی ۔

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر   خواہ از حق حکمِ تقدیرے دِگر

تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست   زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہا است

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے تَقْدِیْرٌ کا مفہوم ۔ لہذا جب کہا جائے گا کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کا قانون ہر شے پر حاوی اور غالب ہے اور اس شے کو اس کی آخری منزل تک لئے جارہا ہے ۔ انسان بھی جس مقام پر اپنے آپ کو رکھے گا اس کے مطابق خدا کا قانون (تَقْدِیْرٌ) اس پر حاوی ہوگا ۔ اب یہ بات انسان کے اپنے اختیار کی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کس مقام پر رکھنا چاہتا ہے ، اور اس طرح خدا کی کون سی تقدیر اپنے لئے منتخب کرتا ہے ۔ لیکن وہ اپنے آپ کو کسی مقام پر رکھے ، خدا کی تقدیر (قانون) سے اپنے آپ کو باہر نہیں لے جاسکتا ۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۔

قرآن کریم کا یہ اہم اعلان کہ کائنات میں ہر شے کے لئے پیمانے (قوانین ، اندازے ، تناسب ، توازن) مقرر ہیں ، علمی دنیا میں ایک عظیم الشان حقیقت کا علمبردار ہے ۔ آج سائنس کی تحقیقات اور منکشفات قدم قدم پر اس کی شہادت

بہم پہنچا رہی ہیں کہ کائنات میں قانون کی کارفرمائی ہے - یونہی اندھیر گردی نہیں - یعنی تمام کائنات (Rational Basis) پر چل رہی ہے - آپ (Rational) کے لفظ پر غور کیجئے - اس کے معنی ہیں جو (Ratio) کے مطابق ہو - اور (Ratio) قدر، پیمانے، اندازے، تناسب ہی کو کہتے ہیں - وَ کَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۸) اللہ کا ہر معاملہ ایک خاص اندازے کے مطابق مقرر کردہ ہے - یہاں ہر بات (Rational) ہے - اندھی فطرت (Blind Nature) کارفرما نہیں - نہ ہی انسان مجبور اور مقہور ہے - ''پہلے سے لکھا ہوا'' صرف قانون ہے (کہ فلاں عمل کا نتیجہ یہ ہوگا)- انسان کی ''قسمت'' نہیں- اپنی قسمت ہر انسان (خدا کے قانون مکافات کے مطابق) خود بناتا ہے - ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ قانونِ خداوندی کو قرآن کریم نے قَدْرٌ کہہ کر پکارا ہے - یہ قوانین جسطرح خارجی کائنات میں جاری و ساری ہیں (جنہیں قوانین فطرت یا (Laws of Nature) کہا جاتا ہے) اسی طرح انسانی دنیا میں بھی کارفرما ہیں - مستقل اقدار (Permanent Values) خدا کے بھی غیر متبدل قوانین ہیں جن کے مطابق انسانی اعمال نتیجہ خیز ہوتے ہیں - نزولِ قرآن کریم سے مقصد یہ تھا کہ نوع انسان تک ان مستقل اقدار کو پہنچا دیا جائے - اسی وجہ سے نزولِ قرآن کریم کی ''رات'' کو لَیْلَۃُ الْقَدْرِ کہا گیا ہے (۹۷/۱) - وہ ''شب'' (یا تاریک زمانہ جس میں وحی کی روشنی کہیں موجود نہیں تھی) جس میں دنیا کو نئی اقدار عطا ہوئیں- یہ مستقل اقدار ہی ہیں جن کے احترام اور پابندی سے انسان حیوانی سطح زندگی سے بلند ہو کر، انسانیت کی سطح پر آتا ہے، اور جب کسی مستقل قدر اور طبعی (حیوانی) زندگی کے تقاضا میں تصادم ہوتا ہے (Tie پڑتی ہے) تو وہ طبعی زندگی کے تقاضا کو، بلند قدر کی خاطر قربان کر دیتا ہے - حتیٰ کہ عند الضرورت، جان تک کو بھی- دین، نام ہی قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تحفظ کا ہے -

ق د س

قَدَسَ فِی الْاَرْضِ کے معنی ہیں وہ بہت دور تک چلا گیا* - اس لئے قَدَّسَہٗ کے معنی ہیں اس نے اس سے تمام نقائص و اسقام کو دور کر دیا - قرآن کریم میں جہاں ملائکہ نے کہا ہے کہ نُقَدِّسُ لَکَ (۲/۳۰) تو زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تیرے لئے خود بھی پاک و صاف

*لین - بحوالہ بیضاوی -

ہوتے ہیں اور ہر اس شخص کو پاک اور صاف کرتے ہیں جو تیری اطاعت کرے* ۔ (لیکن ہمارے نزدیک اس کا مفہوم وہ ہے جو آگے چل کر درج کیا جاتا ہے) ۔ قُدُّوْسٌ (۵۹/۲۳) ۔ خدا کی صفت ہے ، جس کے معنی ہیں ہر قسم کے نقائص و اسقام سے دور ، منزہ ۔ اَلْقَدَاسُ ۔ گرانقدر اور محکم شرف ، نیز اُس پتھر کو بھی کہتے تھے جو حوض میں یا اس کے دھانہ میں لگا دیتے تھے تاکہ اس سے پانی کا اندازہ ہو جائے اور اس طرح وہ آپس میں پانی کی تقسیم کرلیں** ۔

سورۃ بقرۃ میں نُسَبِّحُ اور نُقَدِّسُ ساتھ ساتھ آئے ہیں (۲/۳۰) ۔ اس لئے اس کے ساتھ (س ۔ ب ۔ ح) کا عنوان بھی دیکھئے تاکہ مفہوم واضح ہو جائے۔ مختصر الفاظ میں اس کے معنی ہونگے ، خدا کے کائناتی پروگرام کو درخورِ حمد و ستائش بنانے کے لئے دور دور تک چلے جانا ۔ بڑی تگ و تاز کرنا ۔ انتہائی جد و جہد کرنا ۔

رُوْحُ الْقُدُسِ کے لئے دیکھئے عنوان (ر ۔ و ۔ ح) ۔

الاَرْضُ الْمُقَدَّسَةُ (۵/۲۱) ۔ وہ سرزمین جہاں زندگی کے ہر طرح کے سامان و اسباب بافراط موجود ہوں ۔ بابرکت زمین (دیکھئے عنوان ب ۔ ر ۔ ک) مصر اور فرات کا درمیانی حصہ**۔ عام طور پر فلسطین کے علاقہ کو کہتے ہیں ۔

ق د م

اَلْقَدَمُ ۔ پاؤں (۸/۱۱) ۔ اسکی جمع اَقْدَامٌ ہے ۔ قَدَمَ ۔ آگے بڑھنا ۔ پہل کرنا ۔ مُقَدِّمَةُ الْجَيْشِ (دال کے زیر اور زبر سے) فوج کا ہراول دستہ ۔ مُقَدَّمَةٌ ۔ ہر شے کا ابتدائی حصہ ۔ قَدَّمَ ۔ آگے بڑھانا ۔ پیش کرنا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے بڑھنے اور سبقت کرنے کے ہیں ۔

سورہ حجر میں ہے ۔ مَاتَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ (۱۵/۵) ۔ اور سورہ اعراف میں ہے فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لاَ يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلاَ يَسْتَقْدِمُوْنَ (۷/۳۴) ۔ قَدَمٌ کے معنی ہیں سبقت کرنا ۔ اور آگے بڑھتے چلے جانا ۔ یہ اُخُرٌ ۔ پیچھے کی ضد ہے ۔ اسی لئے دوسری جگہ مُسْتَقْدِمِيْنَ کے مقابلہ میں مُسْتَاْخِرِيْنَ (۱۵/۲۴) آیا ہے ۔

قرآن کریم میں مَاقَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ (۲/۹۵) متعدد مقامات میں آیا ہے ۔ اس کے معنی ہیں جو کچھ ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ۔ اس سے

*لین ۔ **تاج ۔

مراد اعمال انسانی ہیں ۔ چونکہ انسان کی موت اس کے ان تمام اعمال کے بعد ہوتی ہے جو اس سے اس دنیا کی زندگی میں سرزد ہوتے ہیں ، اس لئے اعمال انسان سے آگے آگے چلتے ہیں ۔ اس میں ماضی (Past) کا زمانہ پایا جاتا ہے ۔ نیز ہر عمل جو سرزد ہو جاتا ہے ، ماضی (گذرے ہوئے زمانے) سے متعلق ہوجاتا ہے ، اور انسان کی دسترس سے باہر ۔ اور چونکہ اعمال کے نتائج بھی ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتے رہتے ہیں اسی لئے ان نتائج کو بھی '' پہلے بھیجے ہوئے '' کہکر پکارا گیا ہے ۔ مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا (۳۸/۶۱) ۔ جس نے اسے ہمارے لئے آگے بھیجا ہے ۔ جس کی وجہ سے ہم پر یہ عذاب آیا ہے ۔ لہذا ، جنت اور دوزخ کو انسان خود اپنے ہاتھوں سے ساتھ کے ساتھ تعمیر کرتا جاتا ہے ۔ البتہ ان کی نمود اپنے وقت پر ہوتی ہے ۔ اس زندگی میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی ۔

سورہ یونس میں ہے ۔ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۱۰/۲) ۔ ایمان والوں کو بشارت دو کہ ان کے لئے ان کے نشو و نما دینے والے کے ہاں قَدَمَ صِدْقٍ ہے ۔ یہاں قَدَم کے معنی بزرگی ، شرف اور بلندی مدارج بھی ہیں ، اور سبقت بھی ۔ یعنی صلاحیتوں کی ایسی نشوونما جس سے انسان ، زندگی کے آئندہ مراحل طے کرنے (آگے بڑھنے) کے قابل ہو جائے ۔ نیز ثبات و استحکام ۔

قدیم اور حادث کی اصطلاحات قرآنی نہیں ۔ متکلمین کی ہیں ۔ البتہ قرآن کریم میں قَدِيْم کا لفظ پرانی ، یعنی اس چیز کے متعلق استعمال ہوا ہے جو پچھلے زمانہ سے چلی آرہی ہو ۔ مثلاً اَلْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ (۳۶/۳۹) ۔ خوشہ کی کہنہ اور خشک شاخ ۔ اِفْكٌ قَدِيْمٌ (۴۶/۱۱) ۔ وہ جھوٹ جو شروع سے چلا آرہا ہے ۔ اَقْدَمُوْنَ (۲۶/۷۶) اگلے زمانے کے لوگ ۔ آبا و اجداد ۔

سورہ فرقان میں ہے ۔ وَقَدِمْنَا اِلٰى مَا عَمِلُوْا ۔ (۲۵/۲۳) ۔ اس کے معنی متوجہ ہونے کے ہیں ۔ یعنی آگے بڑھ کر لینا ۔ سورہ حجرات میں ہے ۔ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۴۹/۱) ۔ خدا اور رسول (نظام خداوندی) کے احکام کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ترجیح نہ دو ۔ یا ان کی باتیں کاٹ کر نہ چلو ۔ ان کی اطاعت کرو ۔

سورہ فتح میں ہے مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ (۴۸/۲) ۔ وہ نازیبا باتیں جو ان لوگوں نے پہلے سے تیرے پیچھے لگا رکھی ہیں ۔ یعنی وہ باتیں درحقیقت

درست نہیں بلکہ ان لوگوں نے یونہی تہمت کے طور پر تمہارے پیچھے لگا رکھی ہیں (مثلاً ساحر ۔ مجنون ۔ شاعر ۔ کاذب ۔ مفتری ۔ وغیرہ) ۔ ذَنْبَکَ کے یہی معنی ہیں ۔ اس انداز بیان کی مثالیں قرآن کریم میں موجود ہیں ۔ مثلاً سورۃ نحل میں ہے ۔ آیْنَ شُرَکَائِیَ الَّذِیْنَ کُنْتُمْ تُشَاقُّوْنَ فِیْھِمْ (۱۶/۲۷) ۔ یہاں شُرَکَائِیْ کے معنی '' میرے شریک '' نہیں ۔ اس کے معنی ہیں وہ معبود جنہیں تم بزعم خویش میرے شریک سمجھتے تھے ۔ (یا جو بزعم خویش میرے شریک بنتے تھے) ۔ شُرَکَاءُ کُمْ الَّذِیْنَ کُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۶/۲۳) ۔ وہ جنہیں تم بزعم خویش خدا کے شریک قرار دیا کرتے تھے ۔ لہذا ذَنْبَکَ (۴۸/۲) کے معنی '' تیری نازیبا باتیں '' نہیں ۔ اس کے معنی ہیں وہ نازیبا تہمتیں جن سے یہ مخالفین تجھے مطعون کرتے رہتے ہیں ۔ (نیز دیکھئے عنوان ذ ۔ ن ۔ ب)۔

ق د و

اَلْقِدْوُ ۔ درخت کی اصل جس سے شاخیں نکلتی ہیں ۔ اسی سے اَلْقَدْوَۃُ کے معنی آگے بڑھنے کے ہیں ۔ اور چونکہ یہ شاخیں سیدھی نکلتی ہیں اس لئے تَقَدَّتْ بِہٖ دَابَّتُہٗ کے معنی ہوتے ہیں سواری کا جانور اسے لیکر سیدھے راستے پر چلتا رہا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے مطابق بن جانا اور اس سے رہنمائی حاصل کرنا ہیں ۔

اَلْقُدْوَۃُ ۔ وہ جس کی پیروی کی جائے ۔ جسکے پیچھے پیچھے چلا جائے* ۔ اِقْتَدَیٰ ۔ پیروی کرنا ۔ قرآن کریم میں تمام انبیائے سابقہ کے ذکر کرنے کے بعد رسول اللہؐ سے کہا گیا ہے ۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ (۶/۹۱) ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنی راہ نمائی (وحی) عطا کی تھی ۔ پس انہی کی راہ نمائی کی پیروی تو کر ، یعنی جو راہ نمائی انہیں دی گئی تھی اب وہی راہ نمائی اس قرآن کریم میں تجھے دی گئی ہے ۔ لہذا قرآن کریم کی راہ وہی ہے جس پر تمام انبیائے سابقہ چلتے رہے ہیں ۔ قرآن کریم پر چلنا انبیاء کی راہ پر چلنا ہے ۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کبریٰ کو واضح کیا ہے کہ اصل کے اعتبار سے تمام انبیاء کرام کو ایک ہی دین ملتا رہا ہے ۔ وہ دین اپنی اصل شکل میں باقی نہ رہا ۔ اب وہی اصول (جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے) اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم

*تاج ۔

میں دے دیئے گئے * ۔ اس لئے جو شخص قرآن کریم کا اتباع کرتا ہے وہ اسی راستے پر چلتا ہے جس پر انبیاء کرامؑ چلتے رہے ہیں ۔ یہی معنی فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (۶/۹۱) کے ہیں ۔ اقتداء اس ہدایت کی ہے جو خدا کی طرف سے انبیاء کو ملتی رہی ہے ۔ اس کے خلاف دوسری راہ اشخاص کی اقتداء کی ہے جس کی مخالفت قرآن کریم نے جا بجا کی ہے ۔ (مثلاً ۴۳/۲۳) ۔ لیکن ہم وہی کچھ کر رہے ہیں جس سے قرآن کریم نے روکا تھا ۔ یعنی خدا کی طرف سے ملی ہوئی راہ نمائی (قرآن کریم) کے بجائے، زندہ اور مردہ اشخاص کی اقتداء ۔

ق ذ ف

قَذْفٌ ۔ تیر یا پتھر وغیرہ کو پھینکنا ** ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنے دور پھینکنا ہیں *** ۔ اسی طرح یہ لفظ کسی بات کو منہ سے نکالنے اور پھینکنے، نیز کسی چیز کو ڈالنے کے لئے بولتے ہیں ۔ اور استعارۃً الزام یا تہمت لگانے کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے **، جیسے اس مفہوم کے لئے رَمْیٌ * کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ اسی طرح قَذْفٌ گالی دینے اور عیب جوئی کرنے کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے *** ۔ چنانچہ قَذَفَ الْمُحْصِنَةَ کے معنی ہیں اس نے پاکباز عورت پر بد چلنی کی تہمت لگائی ۔ اَلْقَذَّافُ ۔ منجنیق وغیرہ جس سے کوئی چیز دور پھینکی جائے ** ۔

سورہ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ (۲۰/۳۹) ۔ اسے تابوت میں رکھدے اور پھر اس صندوق کو دریا میں بہا دے ۔

سورہ انبیاء میں ہے ۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ (۲۱/۱۸) ہم حق کو باطل پر مارتے رہتے ہیں ۔ حق اور باطل میں باہمی تصادم و تزاحم، باہمی کشمکش، ہوتی رہتی ہے ۔ تعمیری اور تخریبی قوتیں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں اور تعمیری قوتیں آخرالامر غالب آجاتی ہیں ۔

دور رکھنے کے معنوں میں سورہ الصّٰفّٰت میں ہے ۔ وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ (۳۷/۸) انہیں ہر طرف سے دور رکھا جاتا ہے ۔

---

* جن سابقہ احکام میں (اصول نہیں بلکہ ان اصولوں کی روشنی میں احکام ہیں) کسی رد و بدل کی ضرورت تھی ان میں رد و بدل کرکے نئے احکام قرآن کریم میں دے دئے گئے ہیں ۔ لہذا، اب اطاعت خداوندی صرف قرآن کریم کی رو سے ہو سکتی ہے ۔ اور کسی مبینہ آسمانی کتاب کی رو سے نہیں ہو سکتی ۔ نیز دیکھئے عنوان (ن ۔ س ۔ خ) ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔

ق ر أ

قَرْءٌ کے بنیادی معنی ہیں جمع کرنا (ابن فارس) ۔ اَقْرَأَتِ النَّاقَةُ کے معنی ہیں نر کا مادہ منویہ اونٹنی کے رحم میں قرار پا گیا اور جمع ہو گیا۔ قَرَأَتِ النَّاقَةُ ۔ اونٹنی حاملہ ہوگئی ۔ خون کے رحم میں جمع ہونے کو بھی قَرْءٌ کہتے ہیں ۔ اَقْرَأَتِ الْمَرْاَةُ اس وقت کہتے ہیں جب عورت کو قَرْءٌ بمعنی حیض آجائے*۔ قَرْءٌ کی جمع قُرُوْءٌ آتی ہے (۲/۲۲۸)۔ صاحب لطائف اللغۃ نے کہا ہے کہ یہ لفظ (قَرْءٌ) اس وقت بھی بولتے ہیں جب عورت حیض سے پاک ہو جائے ۔

زجاج نے کہا ہے کہ قُرْآنٌ بھی یہیں سے فُعْلَانٌ کے وزن پر مصدر ہے ۔ اس کے معنی جمع کرنے کے ہیں ۔ قُرْاٰنٌ کو قُرْاٰنٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ سورتوں کو جمع کرتا ہے ۔ اور انہیں ایک دوسرے سے ملاتا ہے ۔ ابن الاثیر نے کہا ہے کہ کتاب اللہ کو قرآن اس لئے کہتے ہیں کہ اس نے اپنے اندر قصص ، امر ، نہی ، وعدہ ، وعید ، اور آیات اور سورتوں کو باہمدگر جمع کر دیا ہے*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کا نام قرآن اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ خدا کی تمام نازل کردہ کتابوں کے ثمرہ کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے ۔ بلکہ تمام علوم کے ماحصل کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے**۔ قرآن کریم میں ہے ۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (۷۵/۱۷-۱۸)۔ اس کا جمع کرنا اور حفاظت سے رکھنا (جسطرح رحم میں تخم حفاظت سے رکھا جاتا ہے) ہمارے ذمہ ہے ۔ سو جب ہم اسے جمع کر دیں (اور اسے تمہارے سینے میں محفوظ اور ثبت کر دیں) تو تم اس جمع شدہ وحی کی پیروی کرنا** ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۷۵/۱۹) ۔ پھر اس کا لوگوں کے سامنے کھول کر لانا (اس کی نمود اور ظہور) بھی ہمارے ہی ذمہ ہے ۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم خود رسول اللہؐ کی زندگی میں جمع ، مرتب اور محفوظ شکل میں وجود میں آچکا تھا ۔ یہ صحیح نہیں کہ رسول اللہؐ اسے منتشر شکل میں چھوڑ گئے تھے اور اسے بعد میں یک جا کیا گیا تھا ۔ علاوہ دیگر شواہد، خود لفظ قرآن اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ جمع شدہ (کتاب کی) شکل میں تھا ۔

اَلْقِرَاءَةُ ۔ حروف اور الفاظ کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے اور جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ ابن عباس نے فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ کے معنی اس پر عمل کرنے اور اس کی پیروی کرنے کے بتائے ہیں** ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔ نیز ابن قتیبہ ۔ القرطین ۔ ج/۱ صفحہ ۹۰ و ج/۲ صفحہ ۱۹۳ ۔

بعض کا خیال ہے کہ قَرَاَ عبرانی لفظ ہے جس کے معنی اعلان کرنے کے ہیں* - اس اعتبار سے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ (۹۶/۱) کے معنی ہونگے تو اپنے نشو و نما دینے والے کی صفت ربوبیت کا عام اعلان کردے - یہ وہی چیز ہے جسے سورۃ مدثر میں قُمْ فَاَنْذِرْ - وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ (۷۴/۲-۳) سے تعبیر کیا گیا ہے - اس سے قُرْاٰن کے معنی اعلانِ عام کے ہونگے -

قرآن کریم وہ الکتاب (ضابطہ حیات) ہے جس میں ہر بات یقینی ہے اور اس سے ہر قسم کا تذبذب اور نفسیاتی الجھن ختم ہو جاتی ہے (۲/۲) - جو کچھ خدا نے حضور ؐ پر وحی کیا تھا وہ قرآن کریم میں محفوظ ہے (۶/۱۹) - مومنین کو اسی کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کے اتباع کی اجازت نہیں دی گئی (۷/۳) - رسول اللہ ؐ کو بھی قرآن کریم ہی کے اتباع کا حکم تھا (۱۰/۱۰۹)- حضور ؐ اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے (۵/۴۸) - جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا ، تو ایسے لوگ مومن نہیں کافر ہیں - (۵/۴۴)- اس میں تعلیم خداوندی مکمل طور پر آگئی ہے اور کوئی شخص اس میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کر سکتا - (۶/۳۴ و ۶/۱۱۶) - یہ سابقہ تعلیمات کا مہیمن ہے (۵/۴۸) - اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (۴/۸۲) اور تمام اختلافات اسی سے رفع ہوسکتے ہیں (۴۲/۱۰)- اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی وضاحت خود خدا نے کردی ہے (۷۵/۱۹) - اسی لئے اسے تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (۱۶/۸۹) کہا گیا ہے - ایسا تصریف آیات کی رو سے کیا گیا ہے - یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانے سے (۶/۱۰۶ و ۱۷/۴۱) - رسول اللہ ؐ ہر اختلافی معاملہ کی وضاحت قرآن کریم سے کرتے تھے (۱۶/۶۴) - اور اسی سے لوگوں کو نصیحت کرتے تھے (۵۰/۴۵) - یہ خود روشنی ہے (۵/۱۵) جو اس لئے دی گئی ہے کہ انسان اس روشنی میں سفرِ حیات طے کرے (۶/۱۲۳) - اسی لئے اس میں تدبر و تفکر کا حکم دیا گیا ہے (۴۷/۲۴) - یہ نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان ہے (۵۴/۱۷) - لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے دل و دماغ کو انسانی خیالات سے پاک و صاف کرکے اس سے راہ نمائی حاصل کرنے کی کوشش کرے (۵۶/۷۹) - قرآن کریم میں غیر قرآنی خیالات و نظریات و تصورات و معتقدات کی آموزش شرک ہے (۴۲/۲۱)- لیکن جب انسان شخصیت پرستی کا شکار ہوجائے تو اسے یہی بات سخت ناگوار گذرتی ہے (۱۷/۴۶ و ۳۹/۴۵ و ۴۰/۱۲) - چنانچہ جو شخص ان کے سامنے قرآن کریم پیش کرے تو وہ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں (۲۲/۷۲)- اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اس کی بات قطعاً نہ سنو اور شور مچاؤ تاکہ دوسرے لوگ بھی قرآن کریم کی آواز نہ سننے پائیں (۴۱/۲۶) - اس طرح وہ خود بھی قرآن کریم

*غریب القرآن مرزا ابوالفضل

سے دور رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کے قریب آنے سے روکتے ہیں (٦/٢٦)۔ قرآن کریم کی مثل کوئی چیز نہیں (٦/٩٢)۔ مخالفین چاہتے تھے کہ رسول اللہؐ قرآن کریم میں کچھ تبدیلی کر دیں لیکن حضورؐ ایسا نہیں کرسکتے تھے۔ نہ حضورؐ نے ایسا کیا (١٠/١٥)۔

قرن اول کی جماعت مومنین کے شرف و عظمت کا راز تمسک بالقرآن میں تھا (٣/٣٣)۔ لیکن جب بعد میں آنے والوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تو ذلیل و خوار ہو گئے۔ یہی وہ شکایت ہے جو نبی اکرمؐ خدا سے کرینگے (٢٥/٣٠)۔ اس لئے کہ الدین وہی ہے جو قرآن کریم کے اندر تھا۔ اسے چھوڑ دینے سے الدین ہی چھوٹ گیا۔ آج پھر اسی الدین سے تمسک ہوسکتا ہے اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ الدین اور قرآن کریم ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ دین، قرآن کریم کے اندر ہے اور جو بات قرآن کریم کے اندر نہیں وہ دین نہیں۔ اور قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لے رکھا ہے (١٥/٩)۔

ق ر ب

قَرِيْبٌ بمقابلہ بَعِيْدٌ (٢١/١٠٩)۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی بتائے ہیں۔ اَلْقُرْبُ۔ فاصلہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا۔ بمقابلہ بُعد، اور اَلْقُرْبَةُ۔ رتبہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا۔ اور اَلْقُرْبیٰ وَالْقَرَابَةُ رشتہ کے اعتبار سے کسی کے قریب ہونا۔ یعنی رشتہ داری۔ ذِی الْقُرْبیٰ (٢/٨٣) کے معنی ہیں جس سے رشتہ داری ہو۔ یعنی رشتہ دار۔ سورۃ شوریٰ میں ہے۔ قُلْ لَّا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبیٰ (٤٢/٢٣)۔ اس کے معنی عام طور پر کئے جاتے ہیں کہ (اے رسول) ان سے کہدو کہ میں پیغامِ رسالت پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، بجز اس کے کہ میرے رشتہ داروں سے محبت کرو۔ یہ معنی نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہیں بلکہ خود لُغت کے بھی خلاف ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، اَلْقُرْبیٰ کے معنی رشتہ داری ہیں، نہ کہ رشتہ دار۔ چنانچہ لسان العرب میں اس آیت کے معنی لکھے ہیں کہ اے پیغمبر! کہدو کہ میں تم سے رسالت کا اجر نہیں مانگتا مگر وہ حقوق تو ادا کرو جو میری قرابت داری کی وجہ سے تم پر عائد ہوتے ہیں*۔

اس کے ایک معنی اور بھی ہوسکتے ہیں۔ اٰتِ ذَا الْقُرْبیٰ حَقَّهٗ (١٧/٢٦) کے معنی ہیں "تو اپنے رشتہ دار کو اسکا حق دیدے"۔ یعنی ذا قُرْبًا کَ۔

* تاج۔

اسی طرح آتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی (۲/۱۷۷) کے معنی ہیں ''اس نے اپنے رشتے داروں کو مال دیا'' ۔ یعنی ذوی قُرْباہُ ۔ اس اعتبار سے لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی میں ''تمہارا اپنا رشتہ'' مراد ہوگا ۔ یعنی قُرْبَاکُمْ ۔ یعنی تم اپنے رشتے ناطے کے حقوق مؤدت ادا کرو تو یہی میرا اجر ہے ۔ یہ وہی بات ہے جس کے متعلق سورۃ سبأ میں کہا گیا ہے کہ قُلْ مَاسَاَلْتُکُمْ مِنْ اَجْرٍ فَھُوَ لَکُمْ (۳۴/۴۷) ۔ ''ان سے کہدو کہ میں تم سے جو اجر مانگتا ہوں تو وہ خود تمہارے اپنے ہی فائدے کے لئے ہے'' ۔

بہر حال بات پہلی ہو یا دوسری ، حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہؐ لوگوں سے اجر رسالت قطعاً نہیں مانگتے تھے ۔ آپ قرآن کریم میں دیکھئے ۔ ہر ایک نبی کا پہلا اعلان یہ ہوتا تھا کہ میں تم سے اجرِ رسالت کچھ نہیں مانگتا ۔ (مثلاً ۲۶/۱۰۹ ؛ ۲۶/۱۲۵ ؛ ۲۶/۱۶۴ ؛ ۲۶/۱۸۰ ؛ ۳۸/۸۶ ؛ ۵۲/۴۰ ؛ ۳۶/۲۱) ۔

اَلتَّقَرُّبُ کے معنی ہیں کسی کے قریب ہونا چاہنا اور اس سلسلہ میں ذرائع اختیار کرنا * ۔ اَلْمُقَارَبَۃُ ۔ ایک دوسرے کے قریب ہو جانا ۔ اَلْقُرْبَانُ ۔ وہ چیز جس سے خدا کا قرب چاہا جائے* ۔

سورۃ مائدہ میں ''آدم'' کے دو بیٹوں کا ذکر ہے (یعنی دو آدمیوں کا) جن کے متعلق کہا کہ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِھِمَا (۵/۲۷)۔ ''جب انہوں نے کوئی قربانی پیش کی ۔ سو ان دونوں میں سے ایک کی قربانی قبول کر لی گئی'' ۔ قرآن کریم نے اس قربانی کی تفصیل نہیں دی کہ وہ کیا چیز تھی اور کس طرح پیش کی گئی تھی ۔ یہ کوئی چیز بھی ہوسکتی ہے جسے نذرانے کے طور پر پیش کیا گیا ہو ، یا کوئی عملِ خیر بھی جسے بغرض حصول قرب خداوندی کیا گیا ہو ۔

ہمارے ہاں عید الاضحیٰ کی تقریب پر جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں ان کے لئے قربانی کا لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا ۔

قُربِ الٰہی سے مراد فاصلہ اور مکان کے اعتبار سے خدا کے نزدیک ہونا نہیں ۔ اس لئے کہ خدا کسی خاص مقام پر نہیں جہاں سے قُرب اور بُعد ماپا جاسکے ۔ انسان جسقدر اپنے اندر خدا کی صفات منعکس کرتا جاتا ہے اسی قدر وہ ''خدا سے قریب'' ہوتا جاتا ہے ۔ اور صفاتِ خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان قوانین خداوندی کا اتباع کرے ۔ چنانچہ

سورۃ علق میں ہے "لا تُطِعْهُ وَ اسْجُدْ وَاقْتَرِبْ" (۹۶/۱۹) تو اس شخص کی بات نہ مان (جو گریز کی راہیں نکالتا ہے۔ بلکہ خدا کے قوانین کی) اطاعت کر اور اسطرح (خدا کے) قریب ہوجا۔ یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت سے اپنے اندر صفاتِ خداوندی پیدا کئے جا۔ اسی کا نام انسانی ذات کی بیداری اور اس کا استحکام ہے۔ اسی کو قرب خداوندی کہتے ہیں جو ہر مومن کو حاصل ہوسکتا ہے۔ اس لئے ''مقربین بارگاہ خداوندی'' کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا، جس طرح ''اولیاء اللہ'' کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا بلکہ ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ قوانین خداوندی کا اتباع معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے ایک نظام کے تابع ہوتا ہے۔ تجرد کی خانقاہوں میں یا ویسے ہی انفرادی طور پر نہیں ہوسکتا۔ نہ ہی خدا کا قرب کسی اور ''الٰہ'' کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے۔ (دیکھئے ۲۸/۳۶)۔ الٰہ، صرف ایک ہے اور وہ خدائے واحد ہے۔

قُرْبَةٌ۔ جمع قُرُبَاتٌ (۹/۹۹)۔ قرب حاصل کرنے کا ذریعہ۔ عَرَضًا قَرِيْبًا (۹/۴۲)۔ جلدی حاصل ہوجانے والا فائدہ۔ پیش پا افتادہ مفاد۔ مفاد عاجلہ۔

زمانہ قدیم میں لوگ جانوروں کو ذبح کرکے اپنے معبودوں کے حضور پیش کرتے تھے تاکہ ان کی خوشنودی حاصل کریں۔ یہودی ان ذبح شدہ جانوروں کو آگ میں جلا دیتے تھے۔ چنانچہ سوختنی قربانی کا ذکر اکثر تورات میں آتا ہے۔ سورۃ آل عمران میں بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ (۳/۱۸۲) سے اسی قسم کی قربانی کی طرف اشارہ ہے جس کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ اگر وہ قبول ہو جائے تو اسے آگ بھسم کر دیتی ہے۔

(خدا کے انسان سے قریب ہونے کے متعلق عنوان د ـ ع ـ و دیکھئے)۔

ق ر ح

اَلْقَرْحُ۔ اَلْقُرْحُ۔ ہتیار وغیرہ کا زخم۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلْقَرْحُ زخم کے نشان کو کہتے ہیں اور اَلْقُرْحُ سوزش اور جلن نیز درد و الم جو زخم کی وجہ سے ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں بِہٖ قَرْحٌ مِنْ قُرْحٍ۔ اسے زخم کی وجہ سے درد ہو رہا ہے*۔ راغب نے اسکی تائید کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ خارجی اثر سے ہونے والا زخم قَرْحٌ اور اندرونی طور پر ہونے والا پھوڑا پھنسی قُرْحٌ ہے۔

*تاج۔ نیز ابن فارس۔

قرآن کریم میں جنگ میں نقصان ہو جانے کے لئے یہ لفظ آیا ہے۔ (۳/۱۳۹)۔ یا اس نقصان کی وجہ سے جو تکلیف اور پریشانی ہو۔ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

ق ر د

اَلْقَرَدُ۔ جھڑ جانے والی یا الجھی ہوئی، ردی اون* جو کاتی نہ جا سکے اور اس لئے اسے بیکار ہونے کی وجہ سے پھینکدیا جائے۔ اس سے یہ لفظ حقارت اور ذلت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

اَقْرَدَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں عاجزی و درماندگی کی وجہ سے وہ شخص ساکن ہوگیا۔ ذلیل ہوگیا اور جھوٹ موٹ مردہ بن گیا*۔ اَلْقِرْدُ۔ بندر کو کہتے ہیں۔ اسکی جمع اَلْقِرَدَۃُ ہے۔ اور اَلْقُرَادُ۔ چیچڑی کو کہتے ہیں جو اونٹوں وغیرہ کے چمٹ جاتی ہے*۔

قرآن کریم میں ہے کہ جن یہودیوں نے سبت کے احکام کی خلاف ورزی کی تھی** انہیں قِرَدَۃً خَاسِئِیْنَ بنا دیا (۲/۶۵)۔ (خَاسِئٌ کے معنی ہیں ذلیل۔ کمینہ۔ بیکار۔ دیکھئے عنوان خ۔ س۔ أ)۔ سورہ نساء میں ہے کہ ان پر لعنت کی گئی تھی (۴/۴۷)۔ یعنی وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہوگئے تھے۔ اسکی تشریح میں (۷/۱۶۳-۱۶۷) میں کہا ہے کہ اللہ نے حکم دیدیا کہ ان پر ایسے لوگ مسلط رہیں جو انہیں طرح طرح کا عذاب دیتے رہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ وہی عذاب تھا جسے دوسری جگہ ذِلَّۃ* اور مَسْکَنَۃ* کا عذاب کہا ہے (۲/۶۱)۔ سورہ مائدہ میں منافقین کو بھی قِرَدَۃ کہا ہے۔ اور اسکی تشریح عَبَدَ الطَّاغُوْتَ سے کر دی گئی ہے (۵/۶۰)۔ یعنی غیر خدائی قوتوں کے غلام اور محکوم۔ اسی چیز کو ان پر لعنت اور غضب کہا گیا ہے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ کُوْنُوْا قِرَدَۃً خَاسِئِیْنَ (۲/۶۵) کے معنی یہ نہیں کہ انہیں سچ مچ کے بندر بنا دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ذلتوں اور رسوائیوں کی مار ماری گئی تھی۔ یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ وہ یک نگہی اور یک مرکزی کی زندگی بسر کرنے کی بجائے باہمی اختلافات کیا کرتے تھے۔ (۱۶/۱۲۴)۔ اور یہ حالت ہر اس قوم کی ہو جاتی ہے جو آئین و قوانین کی خلاف ورزی شروع کر دے۔ اس سے ان میں کیریکٹر ہی نہیں رہتا۔ یہودیوں کا قواعدِ سبت کی پابندی سے گریز کی راہیں نکالنا اسی عدم کردار کا مظہر تھا۔

---

*تاج۔ **سبت کے لئے دیکھئے عنوان س۔ ب۔ ت۔

ق ر ر

اَلْقَرَارُ۔ کسی چیز کا ٹھہرنا ، جمنا ۔ یا کسی چیز کے ٹھہرنے کی جگہ ۔ اَلْقَرَارَۃُ ۔ نشیبی زمین جہاں پانی ٹھہر جائے ۔ اس معنی میں قَرَارٌ بھی مستعمل ہے ۔ قَرَّ بِالْمَکَانِ ۔ کسی جگہ سکونت اختیار کرنا ، وہاں ٹھہر جانا اور جم کر رہنا ۔ اِسْتِقْرَارٌ ۔ ٹھہر جانا ، جم جانا ۔ اَقَرَّ کے معنی ہیں کسی چیز کو ٹھہرانا اور جما دینا ، نیز اس کے معنے اعتراف اور اقرار کرنے کے ہیں۔ جیسے ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ (۲/۸۴) پھر تم نے اقرار کیا۔ مُسْتَقَرُّ الْحَمْلِ ۔ رحم کا وہ آخری حصہ جہاں حمل قرار پا جاتا ہے*۔ وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ (۲/۳۶) تمہارے لئے زمین میں قرار و ثبات کا مقام ہے ۔ تم کو یہاں ٹھہرنا اور رکنا ہے ۔ اس آیت میں اِلٰی حِیْنٍ (ایک وقت کے لئے) کے اضافہ نے یہ بتا دیا کہ زمین ابدی قیام گاہ نہیں ۔ صرف ایک وقت تک کے لئے ٹھہرنے اور رکنے کی جگہ ہے ** ۔ [مُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ (۶/۹۹) کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان و ۔ د ۔ ع] ۔ لِکُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ (۶/۶۷) کے معنی ہیں ہر خبر کا ایک منتہٰی ہوتا ہے جہاں پہنچکر اسکی صداقت یا عدم صداقت آشکارا ہو جاتی ہے ۔ ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے ۔ ہر واقعہ ایک خاص حد تک جاتا ہے جہاں پہنچکر وہ رک جاتا ہے اور اس کے نتائج ظہور میں آجاتے ہیں ۔ یہی اس کا مستقر ہوتا ہے ۔ اَلشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (۳۶/۳۸) سورج (اپنی محوری گردش کے علاوہ) اپنے نظام کو لے کر ایک مستقر (Destination) کی طرف تیزی سے جا رہا ہے ۔ اَلْقُرُّ ۔ کجاوہ اور زین کے بین بین ایک چیز جسے سواری پر رکھ کر اس میں مرد بیٹھتے ہیں ۔ نیز ہودہ کو بھی کہتے ہیں* جو عورتوں کے اونٹ پر بیٹھنے کی جگہ ہوتی ہے ۔

اَقَرَّ اللّٰهُ عَیْنَہٗ کے معنی ہیں خدا اسے اتنا مال دے دے کہ اسکی نگاہ ٹھہر جائے اور وہ اپنے سے زیادہ مالدار لوگوں کیطرف للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھتا پھرے* ۔ اس کا دوسرا مفہوم ہے ''خدا اُسے خوش رکھے'' ۔ اس سے آنکھوں کی ٹھنڈک مراد ہوتی ہے ۔ یعنی مطمئن و مسرور ۔ قُرَّۃُ الْعَیْنِ ۔ جس سے آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں ۔ قرآن کریم میں ہے قُرَّۃَ اَعْیُنٍ (۲۵/۷۴) ۔ وَقَرِّیْ عَیْنًا (۱۹/۲۶) ۔ اپنی آنکھ کو ٹھنڈک پہنچا ۔ اَلْقُرُّ ۔

*تاج ۔ نیز ابن فارس ۔ ** اس کا یہ مطلب نہیں کہ ''آدم'' پہلے کسی اور جگہ (جنت میں) تھا اور اسے پھر زمین پر بھیجدیا گیا ، یہ ساری داستان اسی زمین (ارض) سے متعلق ہے ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ا د م میں لفظ آدم ۔

ٹھنڈ - (اَلْقَرُّ - سردی کے موسم کی ٹھنڈ کو کہتے ھیں اور بَرْدٌ ھر ٹھنڈ کو کہتے ھیں خواہ سردی کی ھو یا گرمی کی*) - قَرَّعَلَيْهِ السَّمَاءَ کے معنی ھیں اس پر پانی ڈال دیا - اَلْقَارُوْرَةٌ ھر اس برتن کو کہتے ھیں جس میں شراب رکھی جائے - بالخصوص شیشہ کا برتن - اسکی جمع قَوَارِيْرُ ھے (۱۵-۱۶/۷۶)- پھر خود شیشے کو قَوَارِيْرُ کہنے لگ گئے - (۴۴/۲۷) - اھل عرب مجازاً عورتوں کو بھی قَوَارِيْرُ کہدیتے تھے* - یعنی آبگینے -

ق ر ش

کتب لغت میں اس لفظ کے بہت سے معانی لکھے ھیں - فرّاء کا قول ھے کہ قُرَيْشٌ کا لفظ قَرْش سے بنا ھے جس کے معنی ادھر ادھر سے چیزیں جمع کرنا اورسمیٹنا ھیں - کہا جاتا ھے کہ قریش چونکہ حرم میں جمع ھوتے تھے اس لئے ان کا یہ نام پڑ گیا - اسی سے تَقَرَّشَ الْقَوْمُ ھے - یعنی لوگ اکٹھے ھوئے - بعض کا خیال ھے کہ وہ سامان تجارت خریدنے میں جلدی اور پہل کرتے تھے اس لئے قریش کہلائے ، کیونکہ تَقَرَّشَ کے معنی ھیں سامان تجارت کو پہلے خریدنا - بعض نے کہا ھے کہ نضر بن کنانہ (قریش کے جد امجد) ایک دن کپڑے میں لپٹ کر سمٹ گئے اس لئیے ان کا نام قریش پڑ گیا - بعض کا خیال ھے کہ ایک دن نضر اپنی قوم کے پاس آئے تو لوگوں نے کہا کَاَنَّهٗ جَمَلٌ قُرَيْشٌ - ایسا معلوم ھوتا ھے کہ وہ مضبوط اونٹ ھے - چنانچہ اس کا لقب قریش پڑ گیا - بعض نے کہا ھے کہ قُصَيّ کو " قرشی " کہا جاتا تھا اور اس نے یہ نام قریش کو دیا - یا یہ لفظ قِرْش نامی دریائی جانور (وہیل مچھلی) کی تصغیر ھے جس سے تمام سمندری جانور ڈرتے ھیں - یا یہ نام " قریش بن مخلد بن غالب بن فہر " کی وجہ سے پڑا جو ان کے تجارتی قافلہ کا مالک تھا اور لوگ کہا کرتے تھے قَدِمَتْ عِيْرُ قُرَيْشٍ وَ خَرَجَتْ عِيْرُ قُرَيْشٍ " - قریش کا قافلہ آیا اور قریش کا قافلہ گیا - ازھری وغیرہ نے کہا ھے کہ تجارت اور کاروبار اور تلاش رزق کے لئے سفر کرنے کی بنا پر ان کا نام قریش پڑا ھے - بعض کا قول ھے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ ان کا دارومدار ھی تجارت پر تھا اور ان کے پاس گذارا کرنے کے لئے زمین اور مویشی نہیں تھے - اس سے ھے فُلَانٌ يَتَقَرَّشُ الْمَالَ - فلاں شخص مال جمع کرتا ھے*-

حضرت ابراھیم ؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل ؑ کو تولیت کعبہ کے لئے سرزمین حجاز میں بسا دیا - ان کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے قیدار بڑا

*تاج العروس-

نامور تھا - بنو قیدار کی شاخ پھیلتے پھیلتے وسیع خاندانوں میں منقسم ہوگئی - ان میں قریش کا خاندان نہایت معزز اور ممتاز شمار کیا جاتا تھا - ان میں فہر (قریب ۲۰۰ء) اور قصیٰؓ بن کلاب (قریب ۴۰۰ء) بڑے مشہور ہیں - نبی اکرمؐ اسی خاندان کے چشم و چراغ (اور تمام دنیا کے لئے سراج منیر) تھے -

کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے قریش دور و نزدیک کے ممالک میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے - تجارت ان کا کاروبار تھا - اس کے لئے مختلف قبائل و اقوام نے ان سے معاھدے کر رکھے تھے کہ ان کے قافلے محفوظ رہینگے - قرآن کریم نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ (۱۰۶/۱-۲)- ‘‘ان عہد و پیمان کی وجہ سے جو (دوسری اقوام نے) قریش سے اس لئے کر رکھے ہیں کہ وہ کعبہ کے متولی ہیں) ان کے قافلے سردی گرمی میں محفوظ طور پر سفر کرتے ہیں’’ - اس کے بعد قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہیں یہ مقام کعبہ کا متولی ہونے کی وجہ سے حاصل ہے ، لہذا انہیں چاہئے کہ وہ رب کعبہ کے احکام و قوانین کی اطاعت کریں - فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ (۱۰۶/۳-۴) - وہ رب کعبہ جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے امن عطا کیا -

کیسی عمدہ دلیل ہے یہ - یعنی یہ لوگ خدا کے نام پر اتنے مفاد حاصل کرتے ہیں لیکن اطاعت خدا کو چھوڑ کر اوروں کی کرتے ہیں - یہ تو کچھ اچھی بات نہ ہوئی - اگر خدا کے نام سے مفاد حاصل کرتے ہیں تو خدا کے قوانین کی اطاعت بھی کریں - اور اگر اطاعت کسی اور کی کرنی ہے تو خدا سے اپنی نسبت ختم کریں -

ق ر ض

اَلْقَرْضُ - قطع کرنا - کاٹنا - قَرَضَ الْمَكَانَ - وہ کسی جگہ سے کترا کر نکل گیا - قَرَضَ فِي سَيْرِهِ - وہ چلنے میں دائیں بائیں جھکا *- (۱۸/۱۷) قَرْضٌ - کوئی چیز جو دی جائے ، یا کوئی کام جو کیا جائے ، اس امید پر کہ وہ چیز واپس مل جائیگی یا اس کام کا بدلہ ملیگا*- أَقْرَضَ - کوئی چیز دینا ، یا کوئی کام کرنا ، اس امید پر کہ وہ واپس مل جائیگی یا اسکا بدلہ ملیگا - عربوں کے محاورہ میں قَرْضٌ حَسَنٌ کے معنی اچھا سلوک اور معاملہ بھی ہوتے ہیں-

*تاج -

قرآن کریم میں بھی اس معنی میں یہ محاورہ آیا ہے (مثلاً ۲/۲۴۵)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب نظام ربوبیت کے قیام کے لئےجدو جہد شروع کی جائےتو اسکی ضرورت ہوتی ہے کہ جماعت میں جس جس چیز کی کمی ہو اسے ملکر پورا کیا جائے۔ ہر قسم کی کوشش، ہر قسم کا جانی اور مالی ایثار جو درکار ہو، اسے بطیب خاطر پیش کر دیا جائے۔ یہ سب کچھ قَرْضٌ حَسَنٌ ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ اگر قرض کے دیگر معنی بھی ملا لئے جائیں تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ اَلْقَرْضُ کے معنی ہیں چبانا *۔ اَلْقَرِیْضُ۔ چارے کا وہ گولہ جسے اونٹ اپنے پیٹ میں سے لوٹا کر منہ میں لاتا ہے۔ پھر اسے چباتا رہتا ہے۔ (جگالی کرتا ہے) اور جب وہ ہضم کے قابل ہوجاتا ہے تو اسے معدہ میں لوٹادیتا ہے کہ وہ جزو بدن بن جائے*۔ نظام ربوبیت کے قیام میں، فرد جو کچھ معاشرہ کو دیتا ہے اسے یوں سمجھئے کہ وہ قَرِیْضٌ کی شکل میں ہوتا ہے۔ معاشرہ اسے مناسب مقامات میں صرف کرکے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ بہترین نتائج کا حامل بن جائے۔ اسطرح افراد نے جو کچھ دیا تھا وہ بہترین شکل میں پھر افراد کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اسی لئے کہا ہے کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضاً حَسَناً فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ اَضْعَافاً کَثِیْرَۃً۔ (۲/۲۴۵)۔ کوئی ہے جو اللہ کو ''قرض حسنہ'' دے تو وہ اسے اس کے لئے کئی گنا بڑھا دے! یہ بڑھانا نتائج کے اعتبار سے ہے۔ اللہ کو کوئی قرض نہیں دیا جاتا، اس کے بندوں کو دیا جاتا ہے۔ لہذا وہ معاشرہ جو اللہ کے قانون کے مطابق متشکل ہو وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے جو خدا نے بندوں کے متعلق اپنے اوپر لے رکھی ہیں، اور ان واجبات کو وصول کرتا ہے جو خدا نے بندوں پر عائد کر رکھے ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے افراد معاشرہ جو کچھ ایثار کریں اور جس حسن کردار کا ثبوت دیں، وہ سب ''اللہ کے لئے قرض حسنہ'' ہوگا۔

ق ر ط س

اَلْقِرْطَاسُ۔ اَلْقِرْطِسُ۔ اَلْقَرْطَسُ۔ کاغذ۔ ہر وہ چیز جس پر لکھا جائے**۔ (جمع قَرَاطِیْسُ ۶/۹۱)۔ اَلْقِرْطَاسُ اس کھال کو بھی کہتے ہیں جسے تیر اندازی کے لئے نصب کرتے تھے*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْقِرْطَاسُ اس وقت بولتے ہیں جب کہ اس پر کچھ لکھا ہو، ورنہ بلا لکھے کو طِرْسٌ اور کاغَذٌ کہتے ہیں۔ (اگرچہ اس کے برعکس بھی ہے)***۔

*تاج۔ **تاج و راغب۔ ***تاج و محیط۔

قرآن کریم میں ہے وَلَوْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ کِتَابًا فِیْ قِرْطَاسٍ (۶/۷) ۔ اگر ہم تم پر کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی نازل کردیتے ۔

ق ر ع

اَلْقَرْعُ ۔ ایک چیز کو دوسری چیز پر مارنا*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں ۔ قَرَعَ رَأْسَہٗ بِالْعَصَا ۔ اس کے سر پر لاٹھی ماری ۔ قَرَعَ الْبَابَ قَرْعًا ۔ دروازہ کھٹکھٹایا ۔ اَلْقَرَّاعَۃُ ۔ وہ پتھر (چقماق وغیرہ) جسے رگڑ کر آگ نکالی جائے ۔ اَلْمِقْرَاعُ ۔ ہتھوڑا وغیرہ جس سے پتھر توڑے جائیں ۔ یہاں سے اس مادہ میں شدت اور سختی یا مصیبت کے معنی پیدا ہو گئے۔ چنانچہ اَلْقَرْعَاءُ اس باغیچے کو کہتے ہیں جسے جانوروں نے چر ڈالا ہو۔ اور رِیَاضٌ قُرْعٌ ان باغات کو جن میں ہریاول قطعاً نہ رہی ہو۔ اور اَلْاَقْرَعُ عمدہ تیز تلوار کو** ۔

قرآن کریم میں قَارِعَۃٌ کا لفظ سخت مصیبت کے لئے آیا ہے جو قوموں پر ان کی شامتِ اعمال سے (غلط روش کے تباہ کن نتیجہ کے طور پر) آتی ہے ۔ سورۃ رعد میں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تُصِیْبُھُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَۃٌ (۱۳/۳۱) ۔ ان کے اعمال کی وجہ سے انہیں کوئی نہ کوئی مصیبت پہنچتی رہے گی ۔ سورۃ حاقہ میں ہے ۔ کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَۃِ (۶۹/۴)۔ اس سے مراد وہ تباہی ہے جو قانونِ مکافات عمل کی رو سے ان پر آنے والی تھی ۔ یہی اَلْقَارِعَۃُ تھی جو قریش کی سرکشی کی وجہ سے ان پر آئی اور یہی وہ قَارِعَۃٌ ہے جو ہر سرکش قوم پر ان کے ظلم و استبداد کی بنا پر ہمیشہ آتی ہے ۔ اور جو آجکل قوموں کے باہمی تصادم (ٹکراؤ) سے آئے دن واقع ہوتی رہتی ہے ۔ سورۃ القارعۃ (۱۰۱) میں جو تفصیل دی گئی ہے اس سے اس دنیا میں واقع ہونے والے تصادمات کے علاوہ اُخروی زندگی کا محاسبہ بھی شامل ہے ۔

اَلْقُرْعَۃُ ۔ حصہ ، نصیبہ ۔ اسی سے اِلْقَاءُ الْقُرْعَۃِ قرعہ اندازی کو کہتے ہیں*** ۔ اس لئے کہ اس سے حصہ متعین ہوجاتا ہے، یا پھر اس لئے کہ قرعہ اندازی میں کسی سخت چیز (پانسہ) کو دوسری چیز کے ساتھ ٹکرایا جاتا ہے ۔

قرآن کریم میں قرعہ اندازی کے لئے یہ لفظ (قرعہ) نہیں آیا ۔ قصہٗ حضرت مریمؑ کے ضمن میں ایک جگہ ہے اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَھُمْ (۳/۴۳) ۔ ”جب

---

*راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

وہ اپنے تیر یا قلمیں ڈالتے تھے''۔ اس سے قرعہ اندازی مراد لی جاتی ہے ۔ یہودی بہت سے امور کے فیصلے قرعہ اندازی سے کیا کرتے تھے ۔ اس کا ذکر انجیل میں ملتا ہے ۔ قرآن کریم ، عقل و دانش اور فہم و تدبر سے فیصلے کرنے کی تعلیم دیتا ہے ۔ اس تعلیم کی رو سے ، فیصلوں کے لئے ایسے طریق اختیار کرنا جس میں انسان اپنی عقل و فکر اور اختیار و ارادہ کو اتفاقات (Chances) کے سپرد کر دے ، مستحسن عمل قرار نہیں پاسکتا ۔

ق ر ف

اَلْقِرْفُ ۔ درخت کی چھال ۔ انار وغیرہ کا چھلکا ۔ اَلْقِرْفُ مِنَ الْاَرْضِ ۔ وہ مٹی جو سبزیوں اور ان کی جڑوں کے ساتھ زمین سے اکھڑ آئے ۔ اَلْقِرْفَةُ ۔ کمانے اور حاصل کرنے کے معنوں میں آتا ہے ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا خلط ملط ہوجانا اور کسی چیز کو اوپر ڈال لینا، پہن لینا ، بتائے ہیں ۔ اِقْتَرَفَ کے معنے کمانا ہیں ۔ اِقْتَرَفَ الْمَالَ ۔ اس نے مال جمع کر لیا ۔ رَجُلٌ قَرِفَةٌ ۔ کماؤ مرد*۔ راغب نے لکھا ہے کہ اقْتَرَفَ کے معنے محنت سے کمانا اور کام کرنا ہیں ، خواہ اچھا کام ہو یا برا ، لیکن اس کا بیشتر استعمال برے کام کرنے کے لئے ہوتا ہے** ۔

سورۃ انعام میں ہے ۔ وَلِيَقْتَرِفُوا مَا هُمْ مُقْتَرِفُونَ (۶/۱۱۴) تاکہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ کئے جائیں ۔ جن چیزوں میں لگے ہوئے ہیں ان میں لگے رہیں ۔

ق ر ن

اَلْقَرْنُ ۔ جانور کا سینگ ۔ انسان کے سر کا وہ حصہ جہاں جانور کے سینگ ہوتے ہیں ۔ سر کا بالائی حصہ۔ اَلْقَرْنُ مِنَ الْقَوْمِ ۔ قوم کا سردار*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) وہ چیز جو قوت اور شدت کے ساتھ ابھر آئے اور (۲) ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ اکٹھا کردینا ۔

اَلْقَرْنُ ۔ زمانہ معینہ ۔ اس زمانہ کی مدت میں اختلاف ہے ، لیکن عام طور پر ایک سو سال (صدی) کی مدت کو کہا جاتا ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ زمانہ کا کچھ حصہ قَرْنٌ کہلاتا ہے جسکی حد نہیں مقرر کی جاتی*۔ یا ہمعصر

*تاج ۔ **راغب ۔

یا ایک امت جو ختم ہوچکی ہو۔ اَلْقِرْنُ ہم سر، ہم پلہ*۔ سورۃ انعام میں ہے۔ اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ (۶/۶) ۔ اس کے معنی اقوامِ سابقہ ہیں۔ قَرْنٌ کی جمع قُرُوْنٌ ہے۔

اَلْقَرْنُ۔ کسی چیز کو کسی چیز کے ساتھ باندھ دینا اور ملا دینا۔ دو اونٹوں کو ایک رسی میں باندھ دینا*۔ قُرِّنَتِ الْاُسَارٰی فِی الْحِبَالِ۔ قیدیوں کو اکٹھا کرکے رسیوں سے باندھ دیا گیا**۔ قرآن کریم میں ہے مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ (۱۴/۴۹)۔ زنجیروں میں اکٹھے جکڑے ہوئے۔

قَرْنُ الشَّیْطَانِ۔ شیطان کی امت یا اس کی قوت*۔ اَقْرَنَ لِلْاَمْرِ اسے معاملہ پر قدرت و طاقت حاصل رہی۔ اس نے کسی کام کی طاقت رکھی*۔ قرآن کریم میں مُقْرِنِیْنَ (۴۳/۱۳) کے معنی ہیں طاقت اور اقتدار رکھنے والے۔ اَلْقَرِیْنُ۔ ساتھی۔ رفیق۔ ایک رسی میں بندھے ہوئے یا ایک جوئے میں جتے ہوئے*۔ قرآن کریم میں قَرِیْنًا بمعنی ساتھی اور رفیق آیا ہے (۴/۳۸)۔ اَلْقَرِیْنَةُ۔ بیوی کو کہتے ہیں**۔

سورۃ کہف میں ذِی الْقَرْنَیْنِ کا ذکر آیا ہے۔ (۱۸/۸۳)۔ کتب لغت اور تفاسیر میں اس کے متعلق اتنے مختلف بیانات ملتے ہیں کہ کثرت تعبیر سے خواب پریشان ہو گیا ہے۔ لیکن دورِ حاضر کی تحقیقات سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے مراد شاہنشاہ کیخسرو (خرس یا سائرس) ہے۔ اور اس کے دو سینگوں سے مراد میڈیا اور فارس کی دو سلطنتیں ہیں جن پر وہ حکمرانی کرتا تھا۔ کوئی سو برس کا عرصہ ہوا، اصطخر کے کھنڈرات سے شاہنشاہ خرس کا ایک مجسمہ برآمد ہوا ہے جس کے سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں***۔ اس لئے کہ ایران میں مملکت کو قَرْنٌ (سینگ) سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ یہی وہ شاہنشاہ تھا جس نے یہودیوں کو بابل کی المناک اسیری سے نجات دلائی تھی اور جس کے ہاتھوں دانیال، یسعیاہ اور یرمیاہ نبی کی پیش گوئیاں پوری ہوئی تھیں۔ یہ پیش گوئیاں تورات میں آجکل بھی موجود ہیں۔ دانیال نبی نے اپنے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک مینڈھا ہے جس کے دو بڑے بڑے سینگ ہیں۔ جبریل نے انہیں اس خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ یہ، میڈیا اور فارس کی دو سلطنتوں کا شاہنشاہ ہے جس کے ہاتھوں یہودیوں کو اہل بابل کی غلامی سے نجات ملیگی۔ چنانچہ یہ نجات دہندہ یہودیوں کے ہاں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا۔ یسعیاہ نبی کی پیش گوئی میں اس ''دو سینگوں'' والے کا نام

*تاج۔ **محیط۔ ***(Sir Percy Sykes) نے اپنی کتاب (A History of Persia) کی جلد اول کے شروع میں (Cyrus) کے اس مجسمہ کا فوٹو دیا ہے۔

خرس لکھا ہے ۔ چنانچہ جب خرس نے بابل فتح کر کے یہودیوں کو آزادی دلائی تو دانیال نبی نے اسے یسعیاہ نبی کی پیش گوئی دکھائی جو اس واقعہ سے قریب ڈیڑھ سو سال پہلے کی گئی تھی ۔

یہ بادشاہ پہلے ایران سے مغرب کی طرف چلا اور خشکی کا تمام سفر طے کرتا ہوا لیڈیا (ایشیائے کوچک کی شمال مغربی مملکت) کے دار الحکومت سارڈس کو فتح کر کے سمندر کے کنارے تک جا پہنچا جہاں شام کے وقت سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے (۱۸/۸۶) ۔ پھر اس نے مشرق کی سمت لشکر کشی کی اور باختر کے علاقہ کی طرف گیا (۱۸/۹۰) ۔ اس کی تیسری لشکر کشی سلسلۂ کوہ کاکیشیا کی طرف تھی جہاں اس نے درۂ کوہ میں ایک دیوار بنائی تاکہ شمالی علاقہ کے وحشی قبائل ان لوگوں پر حملہ آور نہ ہوسکیں (۱۸/۹۴) ۔ یہ شاہنشاہ زرتشت کا متبع تھا ۔ قرآن کریم کی کشادہ نگہی دیکھئے کہ اس نے اس کی بلندئ سیرت و کردار کا کس خوبی سے اعتراف اور ذکر کیا ہے (۱۸/۹۸-۹۵) ۔ (مزید تفصیل میری کتاب "برق طور" میں ذوالقرنین کے عنوان کے تحت ملاحظہ کیجئے)

بہر حال ، جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے یہ وہ قیاسات ہیں جن تک دورِ حاضر کی تحقیق پہنچاتی ہے ۔ ممکن ہے اس کے بعد مزید تحقیقات سے کچھ اور واقعات بھی بے نقاب ہوجائیں جو قیاسات کو یقین میں بدل سکیں ۔ قرآن کریم نے جس مقصد کے لئے ذی القرنین کا ذکر کیا ہے وہ مقصد اس تعین کے بغیر بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ اس سے کونسی تاریخی شخصیت مراد ہے ۔

ق ر ی

اَلْقَرْیَةُ ۔ بڑا شہر ۔ شہر ۔ وہ جگہ جہاں ٹھہرنے کے لئے بہت سے مکانات ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں* ۔ بستی ۔ اسکی جمع قُرًی ہے ۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں لوگ جمع ہوجائیں ۔ نیز خود جمع ہونے والے آدمیوں کو بھی کہتے ہیں*** ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَلْمَدِیْنَةُ اس شہر کو کہتے ہیں جس کے گرد شہر پناہ ہو ۔ اور قَرْیَةٌ اور بَلْدَةٌ اسے کہتے ہیں جس میں یہ نہ ہو** ۔ (لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں) ۔ قَرْیٌ کے معنی جمع کرنے کے ہوتے ہیں ۔ قَرَی الْمَاءَ فِی الْحَوْضِ ۔ حوض میں پانی جمع کر دیا ۔ اسی اجتماعیت کے اعتبار سے بستی کو قَرْیَةٌ کہتے ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی جمع کرنے اور مجتمع ہونے کے ہوتے ہیں ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

سورہ بقرہ میں قَرْیَۃٍ (۲۵۹/۲) بستی کے لئے آیا ہے ۔ اور سورہ انبیاء میں قَرْیَۃٍ (۶/۲۱) سے مراد اہل قریہ (بستی کے لوگ) ہیں ۔ سورہ زخرف میں اَلْقَرْیَتَیْنِ (۳۱/۴۳) آیا ہے جس سے مراد مکہ اور طائف کی بستیاں ہیں ۔ اہل لغت نے اسکی تصریح کی ہے کہ قریش جب بھی اَلْقَرْیَتَیْنِ کہتے تو اس سے ان کی مراد مکہ اور طائف کی دونوں بستیاں ہی ہوتیں***۔

ق س ر

قَسَرَہٗ عَلَی الْاَمْرِ ۔ اس نے اسے اس بات پر مجبور کر دیا ۔ قَسَرَہٗ ۔ وہ اس پر غالب آگیا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی شدت کے ساتھ غلبہ اور تسلط کے ہیں ۔ اَلْقَسْوَرَۃُ ۔ شیر کو کہتے ہیں ۔ نیز شکاری اور تیر انداز کو** ۔ قرآن کریم میں ہے فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَۃٍ ۔ (۵۱/۷۴) شیر سے بھاگ رہے ہوں (کہ کہیں کھا نہ جائے)۔

ق س س

اَلْقِسُّ ۔ کسی چیز کو طلب کرنا ۔ اسکی تلاش کرنا ۔ فُلَانٌ قَسُّ اِبِلٍ ۔ فلاں آدمی اونٹوں کا عالم ہے ۔ یعنی جو اونٹوں کے ساتھ ہمیشہ رہے* اور ان کی عادات و اطوار سے خوب واقف ہو ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے اصلی معنی کسی چیز کی رات کے وقت جستجو کرنے کے ہیں** ۔ اَلْقِسِّیْسُ ۔ علم اور شریعت میں نصاریٰ کا سردار (۸۲/۵) ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ سریانی لفظ ہے ۔ اس کے معنی "شیخ" کے آتے ہیں ۔ کلیسا کے عہدوں میں اس کا درجہ اسقف (Bishop) سے نیچے ہوتا ہے***۔

۰ق س ط

اَلْقِسْطُ ۔ مبنی برعدل حصہ** ۔ حصہ، نصیبہ، مقدار*** ۔ تَقَسَّطُوْا الشَّیْءَ بَیْنَہُمْ ۔ انہوں نے اس چیز کو آپس میں برابر برابر تقسیم کرلیا**** ۔ چنانچہ قِسْطَاسٌ ترازو کو کہتے ہیں ۔ (۳۵/۱۷ ; ۱۸۲/۲۶) بلکہ (صاحب لطائف اللغۃ کے قول کے مطابق) سب سے زیادہ صحیح ترازو ۔ اَقْوَمُ الْمَیَازِیْنِ ۔ اَلْقِسْطُ عَدْلٌ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ چنانچہ سورہ مائدہ میں فَاحْکُمْ بَیْنَہُمْ بِالْقِسْطِ ۔ (۴۲/۵) اور سورہ اعراف میں قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ ۔ (۲۹/۷) اسی سے ہے ۔ اَقْسَطَ ۔ اس نے عدل کیا ، انصاف کیا ۔ سورہ حجرات میں ہے کہ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَہُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (۹/۴۹) ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔ ****تاج و محیط ۔

لیکن قَسَطَ یَقْسِطُ کے معنی ظلم کرنے اور حق سے ہٹ جانے کے بھی آتے ہیں *۔ (یعنی یہ لفظ اضداد میں سے ہے ۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے) ۔ آیت (۷۲/۱۵) میں قَاسِطُوْنَ کے معنی ظلم کرنے والے ہیں ۔ اس کے مقابل میں مُسْلِمُوْنَ آیا ہے (۷۲/۱۴)۔ یعنی مسلم وہ ہے جو کبھی ناانصافی نہیں کرتا ۔ اَلْقَسَطُ کے معنی ہوتے ہیں گردن کا سوکھ جانا ۔

جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے ، قِسْطٌ اور عَدْلٌ دونوں کے معنی انصاف کے ہیں لیکن ان میں جو باریک فرق ہے اسے یوں سمجھئے کہ عَدْلٌ کے معنی ہونگے دو آدمیوں میں برابر برابر کا سلوک کرنا ۔ اور قِسْطٌ کے معنی ہونگے کسی کے حقوق و واجبات کا پورا پورا ادا کر دینا ۔ چنانچہ سورہ نساء میں جو آیا ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی (۴/۳) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم دیکھو (تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ تم) یتیم بچوں اور بے شوہر کی عورتوں کے حقوق و واجبات کو پورا نہ کر سکو گے ۔ (یعنی معاشرہ میں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ان کے مسئلے کا منصفانہ حل نہ کر سکو ۔ ان کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکو) ۔ یعنی اس میں کسی دوسرے کے ساتھ تقابل کا سوال نہیں ۔ خود اُن کے حقوق کو پورا کرنے کا سوال ہے ۔ اس سے آگے ہے وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ (۴/۱۲۹) تمہیں اس کی استطاعت نہیں کہ عورتوں میں عدل کر سکو ۔ یہاں مختلف عورتوں میں برابر کے سلوک کا سوال ہے ، اس لئے عَدْلٌ کا لفظ آیا ہے ۔

ق س م

قَسَمَ ۔ یَقْسِمُ ۔ کسی چیز کے حصے کر دینا ۔ بانٹ دینا ۔ فَانْقَسَمَ چنانچہ وہ حصوں میں تقسیم ہو گئی ۔ اَلْقِسْمَةُ ۔ تقسیم ، بانٹ** ۔ قِسْمَةٌ ضِیْزٰی (۵۳/۲۲) ۔ بے انصافی کی تقسیم ۔ قرآن کریم میں ہے نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (۴۳/۳۲) ۔ "ہم نے انکی دنیاوی زندگی میں ان کے درمیان ان کا سامان زیست تقسیم کیا ہے" ۔ اس کے معنے یہ نہیں کہ خدا یونہی (معاذ اللہ) اندھا دھند رزق کی تقسیم کر دیتا ہے ۔ اس کی تقسیم کے لئے اس کا قانون مقرر ہے ۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹) ۔ انسان کو وہی کچھ ملیگا جس کے لئے وہ

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔

کوشش کرے۔ یہ جو ہم دنیا میں اس اصول کے خلاف تقسیم رزق دیکھتے ہیں، تو یہ تقسیم، قانون خداوندی کے مطابق نہیں ہے۔ انسانوں کی خود ساختہ ہے۔

مَقْسُوْمٌ۔ تقسیم کیا ہوا (۱۵/۴۴)۔ مُقَسِّمٌ۔ تقسیم کرنے والا۔ (۵۱/۴)۔ اَلْمُقْتَسِمِیْنَ (۱۵/۹۰) آپس میں بانٹ لینے والے۔ اِسْتَقْسَمَ۔ تقسیم چاہنا۔ جاہلیت میں جانور کو ذبح کرکے، تیروں یا پانسوں کے ذریعے اس کے حصے کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم نے اس سے منع کیا ہے۔ اس لئے کہ اس سے انسان اپنے اختیار کو چھوڑ کر جبر کے طریق کار کو اختیار کرتا ہے۔ اور اپنی فہم و بصیرت کی رو سے فیصلے کرنے کے بجائے اپنے آپ کو اتفاقات (Chances) کے سپرد کر دیتا ہے جو وجہ تذلیل انسانیت ہے۔ اسی لئے قرآن کریم کی رو سے قماربازی اور فال لینا ناجائز ہیں (قماربازی کے لئے دیکھئے عنوان ی۔ س۔ ر اور فال لینے کے لئے ز۔ ل۔ م)۔

قَسَمٌ۔ دلیل و شہادت** جو حق اور باطل کو الگ الگ کرکے رکھ دے۔ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ (۵۶/۷۶) اگر تم سمجھ سکو تو یہ شہادت (جسے میں پیش کر رہا ہوں) ایک عظیم الشان شہادت ہے۔ اَقْسَمَ بِالشَّیْءِ۔ کسی چیز کو بطور دلیل و شہادت پیش کرنا (۹۰/۱)۔ لیکن یہی لفظ جب عام لوگوں کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنی قسم کھانے کے ہوجاتے ہیں۔ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ (۳۰/۵۵) مجرمین قسمیں کھائینگے۔ ابلیس کے متعلق ہے۔ وَ قَاسَمَهُمَا (۷/۲۱)۔ اس نے ان دونوں سے قسم کھا کر کہا۔

مومنین کا شیوہ قسمیں کھانا نہیں بلکہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل و شہادات پیش کرنا ہے۔ قسم توڑنے کا جو کفارہ مقرر کیا گیا ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ حتی الامکان قسمیں کھائی ہی نہ جائیں تاکہ بعد میں کفارہ ادا نہ کرنا پڑے۔

ق س و

قَسْوَةٌ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا سخت ہو جانا۔ پھر قَسْوَةٌ سے مراد قَسْوَةُ الْقَلْبِ ہوتی ہے، یعنی سنگدلی۔ حَجَرٌ قَاسٍ۔ ٹھوس اور سخت پتھر۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ ق۔ س۔ و کا خاصہ

*تاج۔ **غریب القرآن (مرزا ابو الفضل)۔

قوت اور اجتماع ہے**۔ اَرْضٌ قَاسِيَةٌ۔ سخت زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔ لَيْلَةٌ قَاسِيَةٌ۔ سخت اندھیری رات*۔

قرآن کریم میں ہے ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَالِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (۲/۷۴)۔ ''پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ سو وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھ کر''۔ اس میں قساوت کے معنی واضح ہیں۔ یعنی كَالْحِجَارَةِ۔ پتھر کی طرح سخت۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ سورۃ الحج میں ہے وَالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ (۲۲/۵۳)۔ جن کے دل سخت ہیں۔ سورۃ الزمر میں یہ کہہ کر اس کی تشریح کردی کہ یہ اُن لوگوں کی ضد ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ مَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (۳۹/۲۲)۔ اللہ جن کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کردے۔ لہذا دل کی قساوت کے یہ معنی ہیں کہ بلا غور و فکر اپنی بات پر اڑے رہنے، اور دوسرے کی نہ سننے کی وجہ سے انسان میں حق کے سمجھنے اور اس کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ رہے۔ اسی کا نام ضد، تعصب، ہٹ دھرمی ہے۔ (دیکھئے عنوان ش۔ ر۔ ح اور ص۔ د۔ ر)۔

ق ش ع ر

اَلْقَشَاعِيْرُ وہ جو چھونے میں درشت اور کھردرا ہو*۔ اِقْشَعَرَّ جِلْدُهٗ۔ اس کی جلد پر کپکپی آگئی*۔ اقرب الموارد میں لکھا ہے کہ اس سے کنایۃً خوف بھی مراد لیا جاتا ہے۔

سورۃ زمر میں ہے تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ...... (۳۹/۲۳)۔ اس سے ان کے بدن پر کپکپی چھا جاتی ہے۔

ق ص د

قَصْدٌ کے اصلی معنی ہیں ارادہ کرنا۔ توجہ کرنا۔ کسی چیز کی طرف بڑھنا اور اس کے لئے اُٹھ کھڑے ہونا۔ خواہ یہ اعتدال کے ساتھ ہو یا نہ ہو۔ اَلْقَصْدُ فِى الْاَمْرِ۔ کسی معاملہ میں میانہ روی اور اعتدال اختیار کرنا۔ مثلاً قَصَدَ فُلَانٌ فِىْ مَشْيِهٖ۔ اس نے اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کی۔ سَفَرًا قَاصِدًا (۹/۴۲) معتدل سفر۔ چنانچہ اَلْقَصْدُ و اَلتَّقْصِيْدُ کے معنی ہیں کسی چیز کو کاٹ دینا یا بیچ سے توڑ کر آدھا آدھا کر دینا*۔

*تاج۔ **العلم الخفاق۔

اِقْتَصَدَ فِیْ اَمْرِہٖ ۔ وہ اپنے معاملہ میں مستقیم، معتدل اور میانہ رو رہا۔ ادھر اُدھر نہیں جھکا ۔ اسی سے اَلْقَصْدُ کے معنی ھیں راستہ کا سیدھا اور واضح ھونا* ۔ قرآن کریم میں ہے عَلَی اللّٰہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ (۱۶/۹) ۔ ٹھیک سیدھی اور مستقیم راہ کو واضح کرنا اللہ کے ذمے ہے ۔ اس نے ایسا کردیا ہے اور وھی ایسا کرسکتا ہے ۔ (لیکن لوگ اس سیدھی راہ کو چھوڑ کر ٹیڑھی راھیں اختیار کر لیتے ھیں) ۔ اگر اس آیت میں علیٰ بمعنی الیٰ لئے جائیں تو مطلب یہ ھوگا کہ اللہ تک پہنچنے والا راستہ صرف درمیانی ہے ۔ ادھر اُدھر کی ٹیڑھی راھیں نہیں ۔

راغب نے لکھا ہے کہ اَلْاِقْتِصَادُ دو طرح کا ھوتا ہے ۔ ایک مطلقاً محمود ھوتا ہے جس میں افراط و تفریط کے دو سرے ھوتے ھیں اور ان کو چھوڑ کر درمیانی راہ اختیار کی جاتی ہے ، جیسے ۔ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ (۳۱/۱۹) ۔ اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو ۔ یہ محمود ہے ۔ اس لئے کہ رفتار میں نہ تیزی اچھی ھوتی ہے نہ سستی ۔ لیکن دوسری قسم کے اقتصاد کے دو سروں میں سے ایک محمود اور دوسرا مذموم ھوتا ہے ۔ مثلاً عدل اور ظلم کے بین بین رھنا۔ ایسے شخص کو جو ان دو سروں کے درمیان آتا جاتا رہے مُقْتَصِدٌ کہا جائیگا** ۔

راغب نے جو کچھ کہا ہے وہ ذرا وضاحت طلب بھی ہے اور غور طلب بھی ۔ (مثلاً) ایک طرف اسراف ہے اور دوسری طرف بخل ۔ یہ دونوں سرے مذموم ھیں (Extremities) ۔ محمود راستہ ان دونوں کے بین بین ہے ۔ یعنی جود و سخا ۔ نہ بے جا اور فضول خرچ کرنا اور نہ ھی سب کچھ اپنی ذات کے لئے رکھ چھوڑنا ۔ یہ اقتصاد (درمیانہ روی) قابلِ تعریف ہے ۔ اب دوسری مثال لیجئے ۔ ایک طرف حق ہے اور دوسری طرف باطل ۔ ان میں سے صرف ایک سمت (حق) ھی محمود ہے ۔ دوسری سمت (باطل) محمود نہیں ۔ لہذا ان دونوں کے بین بین چلنا خوبی کی بات نہیں ۔ قابل ستائش وھی ہے جو حق پر چلے ، نہ وہ جو حق اور باطل کی درمیانی راہ چلے ۔ حق اپنے مقام پر اٹل ھوتا ہے ۔ جو شخص اس سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ھٹ جاتا ہے وہ باطل پر چلا جاتا ہے ۔

ایک اور مثال لیجئے ۔ ایک طرف عدل ہے اور دوسری طرف ظلم ہے ۔ قابلِ ستائش وہ ہے جو عدل پر چلے ۔ لیکن ایک شخص عدل اور ظلم کی درمیانی راہ چلتا ہے ۔ یعنی کبھی عدل کرتا ہے کبھی ظلم کرتا ہے ۔ یا نہ عدل کرتا ہے

*تاج ۔ **راغب ۔

نہ ظلم کرتا ہے ۔ ایسے معاملات میں (Indifferent) رہتا ہے ۔ اس شخص کو اگر عدل کے پیمانہ سے ماپا جائے تو اس کا یہ عمل محمود نہیں ۔ لیکن اگر ظلم کے پیمانہ سے ماپا جائے تو یہ بہر حال ، ظالم سے بہتر ہوگا ۔ اس کی مثال ہمیں سورۃ فاطر میں ملتی ہے جہاں کہا ہے کہ ہم نے وراثت کتاب کے لئے اپنے بندوں میں سے ایک قوم کو چن لیا ۔ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۔ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ ......(۳۵/۳۲) ۔ ''سو ان میں سے کوئی وہ ہے جو اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے ۔ کوئی میانہ رو ہے اور کوئی نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے'' ۔ (نیز دیکھئے ۵/۶۶) ۔ ظاہر ہے کہ ان تین گروہوں میں سے قابل ستائش (اور قرآنی معیار کے مطابق) سابق بالخیرات کا گروہ ہے ۔ اور ظلم کرنے والے بدتر ہیں ۔ لیکن ان کے بین بین ایک طبقہ ہے جو نہ بھلائی کے کاموں میں آگے بڑھتا ہے اور نہ ہی اس کا شمار گروہ اول میں ہوتا ہے ۔ یہ طبقہ ، گروہ اول سے ذرا اونچا ہوگا اور تیسرے گروہ سے بہر حال نیچے ۔ لیکن اس کی اس روش کو قرآن کریم کی رو سے قابل ستائش نہیں کہا جائیگا ۔ قرآنی معیار پر وہی پورے اترینگے جو ''سابق بالخیرات'' ہونگے ۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ یہ جو عام طور پر اسلام کے متعلق مطلقاً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اعتدال کا راستہ ہے اور اُمَّةً وَّسَطًا وہ قوم ہے جو درمیان کی راہ چلتی ہے ، تو یہ صحیح نہیں ۔ اسلام ، حق کا راستہ ہے ، نہ کہ حق و باطل کی درمیانی راہ ۔ اور امۃ وسطًا ، حق پر چلنے والی جماعت ہے ، نہ کہ حق و باطل اور عدل و ظلم کے بین بین چلنے والی جماعت ۔ (وسط کے لئے دیکھئے عنوان و ۔ س ۔ ط) البتہ جہاں دونوں سمتیں مذموم ہوں (مثلاً اسراف اور بخل) وہاں اسلام درمیانی راہ کی تعلیم دیتا ہے کیونکہ وہی راہ محمود ہوتی ہے ۔

ق ص ر

اَلْقَصْرُ ۔ اَلْقِصَرُ ۔ طویل نہ ہونا ۔ کوتاہ اور مختصر ہونا ۔ اَلْقَصْرُ روکنا ، بند کرنا (کسی حد میں محدود رکھنا) ۔ قَصَرَ الشَّيْءَ ۔ کسی چیز کی لمبائی میں کمی کرنا ۔ قَصَرَ الشَّعْرَ ۔ بال چھوٹے کردئے* ۔ سورۃ نساء میں ہے اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ (۴/۱۰۱) تم صلٰوۃ کو مختصر کردو ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا اپنی انتہا یا مقررہ حد تک نہ پہنچنا اور (۲) روکنا ۔ قید کرنا ۔ اِمْرَاَةٌ مَقْصُوْرَةٌ ۔ پردہ نشین عورت* ۔

*تاج و راغب ۔

اَلْمَقْصُوْرَةُ ۔ محفوظ دیواروں سے گھرا ہوا وسیع گھر یا چھوٹا کمرہ*۔ قرآن کریم میں جنتی معاشرہ کی عورتوں کے متعلق ہے مَقْصُوْرَاتٌ فِی الْخِیَامِ (۵۵/۷۲) ۔ خیموں میں بہ حفاظت رکھی ہوئیں ۔ دوسری جگہ انہیں قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ کہا ہے (۳۸/۵۲) ۔ اپنی نظروں کو حیا کی وجہ سے سمٹا کر رکھنے والیاں* ۔ جو نگاہوں کو بے باک نہ ہونے دیں ۔ اَلْقَصْرُ ۔ موٹی موٹی (جلانے کی) لکڑیاں ۔ بڑے درختوں کی جڑیں* ۔ قرآن کریم نے جہنم کے شعلوں کو اس سے تشبیہ دی ہے (۷۷/۳۲) ۔ قَصَرَ عَنِ الْاَمْرِ ۔ کسی بات سے باز رہنا ۔ ابن السکیت نے کہا ہے کہ قَصَرَ عَنْہُ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص کسی کام کے کرنے سے عاجز ہو ۔ یعنی ایسے کرنے کی قدرت نہ رکھے، اور اَقْصَرَ عَنْہُ ۔ جب اُسے کرنے کی قدرت تو رکھے لیکن اسکے باوجود باز رہے*۔ سورۃ اعراف میں ہے ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ (۷/۲۰۲) ۔ وہ رکتے نہیں، کمی اور کوتاہی نہیں کرتے ۔

سورۃ فتح میں مُقَصِّرِیْنَ آیا ہے (۴۸/۲۷) ۔ یعنی بال کتروانے والے ۔ قَصَرَ سَہْمُہٗ عَنِ الْہَدَفِ ۔ اس کا تیر نشانے تک نہ پہنچ سکا* ۔ اس سے تَقْصِیْرٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں جس کا استعمال ہمارے ہاں عام طور پر ہوتا ہے ۔ اور ''قصور'' کے معنی بھی ۔

ق ص ص

قَصَّ اَثَرَہٗ یَقُصُّ قَصًّا وَقَصَصًا ۔ کسی کے پیچھے پیچھے اس کے نقوش قدم پر چلنا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا پیچھا کرنے اور جستجو کے ہوتے ہیں ۔ قرآن کریم میں دیکھئے (۱۸/۶۴ ; ۲۸/۱۱)

قَصَّ عَلَیْہِ الْخَبَرَ قَصَصًا ۔ اسے وہ خبر بتا دی ۔ اسے اس پر مطلع کر دیا* ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ (۱۲/۳) ۔ ہم تجھے بہترین انداز سے واقعات بتاتے ہیں ۔ اَلْقَاصُّ ۔ قصہ گو ۔ ایک حدیث میں ہے اِنَّ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ لَمَّا قَصُّوْا ھَلَکُوْا ۔ بنی اسرائیل جب قصہ گوئی میں پڑ گئے تو ھلاک ہو گئے ۔ یا جب انہوں نے (خدا کی سند کو چھوڑ کر) اسلاف کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا تو ھلاک ہو گئے* ۔ (یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا) ۔ اَلْقِصَّۃُ ۔ معاملہ ۔ خبر ۔ واقعہ* ۔

---

*تاج ۔

قَصَّ الشَّعْرَ ۔ اس نے بال کاٹے ۔ اَلْمِقَصُّ ۔ قینچی کو کہتے ھیں*۔

اَلْقِصَاصُ ۔ مجرم کا اسطرح پیچھا کرنا کہ اسے اس کے جرم کی سزا مل کر رہے ۔ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دیدینا ۔ قانون عدل کا مجرم کے پیچھے پیچھے چلنا ۔ راغب نے اس کے معنے خون کے پیچھے خون بہا (بدلہ) کا آنا کئے ھیں ۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو جرم قتل کی سزا کے سلسلہ میں استعمال کیا ہے ۔ چونکہ یہ ایک اھم موضوع ہے اس لئے اس کے متعلق ھم ذرا تفصیل سے گفتگو کرنا ضروری سمجھتے ھیں ۔

قرآن کریم کی رو سے انسانی زندگی کو اسقدر اھمیت حاصل ہے کہ اس نے کہدیا کہ مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعاً ۔ جس نے کسی متنفس کو مار ڈالا ، بجز اس کے کہ اسے کسی جان کے بدلے (جرم قتل کی سزا میں) مارا گیا ھو یا ملک میں فساد برپا کرنے کی سزا کے طور پر ، تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوع انسان کو قتل کر ڈالا ۔ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعاً (۵/۳۲)۔ اور جس نے کسی ایک متنفس کو موت سے بچا لیا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو موت سے بچا یا ۔ اس سے ظاھر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(۱) قتل بہت بڑا سنگین جُرم ہے ۔

(۲) جو شخص کسی دوسرے شخص کو قتل کر دے ، یا ملک میں فساد برپا کر دے ، اُسے قتل کیا جا سکتا ہے ۔

فسادفی الارض (بغاوت) کے متعلق (۵/۳۳) میں احکام دیئے گئے ھیں لیکن چونکہ یہ موضوع اس وقت زیر بحث نہیں اس لئے ھم اس سے آگے بڑھ کر انفرادی قتل کے جرم کیطرف آتے ھیں ۔

جرم قتل کے متعلق پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى (۲/۱۷۸)۔ " تم پر مقتولین کے بارے میں قصاص فرض قرار دیا گیا ہے " ۔ اس آیت میں لفظ قصاص سے مراد عام طور پر سزائے موت لی جاتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ، قِصَاصٌ کے معنی کسی کے پیچھا کرنے کے ھیں ۔ لہذا قصاص کا مطلب عوا مجرم کا پیچھا کرنا ۔ اس کا تعاقب کرنا ۔ اُسے ایسے ھی نہ چھوڑ دینا کہ وہ اپنے کئے کی سزا نہ پا سکے ۔ اس آیت میں خطاب

*تاج ۔

یاآیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (جماعت مومنین) سے ہے۔ جس معاشرہ میں اجتماعی قوانین رائج نہ ہوں، اس میں جرائم اور اس کے بدلے کو افراد پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی شخص نے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اب یہ چیز مقتول کے وارثوں کے لئے ہے کہ وہ مجرم کا پیچھا کریں۔ اگر ان میں ہمت ہو تو اسے پکڑ کر اس سے بدلہ لے لیں۔ اور اگر مجرم ان سے بالادست ہو تو پھر صبر شکر کرکے بیٹھ رہیں۔ لیکن قرآن کریم ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے اس لئے اس میں جرم کا بدلہ لینا افراد پر نہیں چھوڑا گیا۔ وہ معاشرہ سے کہتا ہے کہ جرم کا ارتکاب خود معاشرہ کے خلاف ہوا ہے (کسی فرد کے خلاف نہیں ہوا) اس لئے یہ معاشرہ کا فریضہ ہے (نہ کہ مقتول کے وارثین کا انفرادی کام) کہ وہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ معاشرہ پر فرض قرار دیاجاتا ہے کہ وہ مقتول کے بدلہ لینے کا انتظام کرے۔ دور حاضر کی اصطلاح میں کہا جائیگا کہ قرآن کریم نے جرم قتل کو ''قابل دست اندازیِ پولیس'' قرار دیا ہے جس میں مستغیث خود حکومت ہوتی ہے (Crown vs ....)۔ لہذا آیت کے اتنے ٹکڑے کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم قتل کے مرتکب کا پیچھا کرکے اس سے بدلہ لے۔

اس سے آگے ہے اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی۔ اس حصہ کا تعلق بھی سزا سے نہیں بلکہ اس میں اس اہم اصول کو بیان کیا گیا ہے کہ اس باب میں مجرم اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے۔ مجرم خواہ کتنا ہی بڑا اور مقتول کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، بدلے کے معاملہ میں دونوں کو یکساں سمجھا جائے۔ اس لئے کہ ہر انسانی زندگی (وہ مرد آزاد کی ہو یا غلام کی۔ عورت کی ہو یا مرد کی) یکساں قیمتی ہے۔

خونِ شہ رنگیں تر از مزدور نیست

اسے پھر دھرا دینا ضروری ہے کہ آیت کے اس حصے میں اسلام کا اصول مساوات بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی مرد آزاد (حُرّ) قتل کر دیا گیا ہے تو اس کے بدلے کسی مرد آزاد (حُرّ) کو قتل کیا جائے، خواہ قاتل کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر مقتول غلام ہے تو کسی غلام کو پھانسی چڑھایا جائے، خواہ قاتل، مرد آزاد ہی کیوں نہ ہو۔ یہ مفہوم بالبداہت غلط ہے۔ قرآنِ کریم نے یہاں اہم اصولِ مساوات پر زور دیا ہے اور اس کے لئے اصولی انداز بیان اختیار کیا ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ سزا کے معاملہ میں قاتل اور مقتول کی پوزیشن کا کوئی خیال نہ کیا جائے۔

اس کے بعد ہے فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۔ جس شخص کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معاف دیدی جائے تو اسے چاہئیے کہ قاعدے کے مطابق اس کی پیروی کرے اور حسن کارانہ انداز سے اس کی ادائیگی کرے۔ یہ تمہارے نشو و نما دینے والے کیطرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ ظاہر ہے کہ سزا کا اس میں بھی ذکر نہیں ۔ سزا میں سے کچھ معاف کر دینے کا ذکر ہے ۔ "کچھ معاف کر دینا" ۔ (شیءٌ) اس کی دلالت کرتا ہے کہ اس کا تعلق سزائے موت سے نہیں ۔ اس لئے کہ سزائے موت میں سے "کچھ معاف کر دینے" (اور کچھ باقی رہنے دینے) کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ "کچھ معاف کر دینے" کی شکل اسی صورت میں پیدا ہوسکتی ہے کہ سزا، مال (جرمانہ) کی ہو۔ اسے دیت یا خون بہا کہا جاتا ہے۔

جرم قتل کی سزا کا ذکر سورہ نساء میں ہے جہاں جرم کی مختلف نوعیتوں اور ان کے مطابق سزا کا بیان ہے ۔ ارشاد ہے مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً ۔ کسی مومن کے یہ شایاں ہی نہیں کہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر ڈالے ۔ ہاں غلطی سے ایسا ہو سکتا ہے ۔ وَمَن قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَن يَصَّدَّقُوا ۔ "اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خون بہا ادا کرے جسے اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائیگا ۔ بجز اس کے کہ وہ معاف کر دیں ۔ یہاں سے بات صاف ہو گئی کہ قتل خطا (غیر ارادی طور پر، بھولے سے قتل) کی سزا موت نہیں، بلکہ خون بہا ہے جو اس کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ خون بہا کی جو رقم عدالت مقرر کرے، مقتول کے وارثوں کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس میں سے کچھ (یا سب کا سب) معاف کر دیں ۔ لہذا سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۸ میں جو فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ کہا گیا ہے تو وہ قتل خطا کی صورت میں ہے جس کی سزا خون بہا ادا کرنا ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۹۲ کے باقیماندہ حصہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر مقتول اس قوم سے متعلق ہو جو تمہاری دشمن ہو یا اس سے جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس صورت میں کیا سزا ہوگی (سزا اس صورت میں بھی خون بہا ہی مقرر کی گئی ہے) ۔

اس سے اگلی آیت میں ہے وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ۔ (۴/۹۳) اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کر ڈالے تو اس

کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہیگا اور اس پر اللہ کا غضب ہے ، اور اس کی لعنت ۔ اور اس کے لئے سخت سزا تیار کی گئی ہے "۔ یہاں قرآن کریم نے قتل عمد کے لئے انتہائی سزا بتائی ہے۔ اس میں دیت (خون بہا) نہیں ہے ۔ البتہ قتل عمد میں بھی جرم کی نوعیتیں مختلف ہو سکتی ہیں ۔ مثلاً ایک شخص نہایت ٹھنڈے دل سے سوچتا ہے کہ اگر فلاں آدمی کو قتل کر دیا جائے تو اس کی تمام جائیداد مجھے مل جائیگی ۔ وہ اس کے لئے اسکیم بناتا ہے اور سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق اسے قتل کر دیتا ہے ۔ اس قسم کے (Cold-Blooded Murder) کی سزا سخت ترین ہونی چاہیئے ۔ اس کے برعکس ایک شخص دیکھتا ہے کہ کسی نے اس کی بیوی کی عصمت پر حملہ کیا ہے ۔ وہ غیرت میں آکر اسے فوراً قتل کر دیتا ہے ۔ قتل عمد یہ بھی ہے لیکن اس میں اور اول الذکر میں بڑا فرق ہے ۔ اس لئے ہر قتل عمد کی سزا ایک جیسی نہیں ہوگی ۔ جرم کی نوعیت اور احوال و ظروف (Circumstances) کے اختلاف سے سزا میں اختلاف ہوگا ۔ اس سے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ قرآن کریم نے قتل عمد کی سزا میں جَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ کے بعد اللہ کا غضب ۔ اس کی لعنت ۔ اور سخت سزا کا جو ذکر کیا ہے تو یہ سزاؤں کی مختلف نوعیتیں ہیں ۔ مثلاً عبور دریائے شور ۔ قید تنہائی ۔ قید بامشقت ۔ معاشرہ کے حقوق سے محروم کر دینا (Disqualify) (لعنت کے بھی معنی ہیں) وغیرہ وغیرہ۔

ممکن ہے کہدیا جائے کہ یہاں سزائے جہنم کا ذکر ہے (جس کا تعلق آخرت سے ہے اس دنیا سے نہیں) ۔ لیکن دوسری جگہ قرآن کریم نے اس کی صراحت کر دی ہے کہ قتل عمد کی سزا بالعموم ، موت (قتل) ہے ۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے فَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۔ جس جان کا مارنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے (یعنی بے گناہ کا قتل) اُسے قتل مت کرو ۔ بجز اس کے کہ انصاف کا تقاضا ایسا ہو ۔ فَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا ۔ جو ظلم سے قتل کیا جائے تو قاتل یہ نہ سمجھے کہ مقتول کے وارثوں کا کوئی حمایتی اور مدد گار نہیں ، اس لئے میں اب جس طرح جی چاہے دندناتا پھروں ، مجھے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ۔ اسے اس زعم باطل میں نہیں رہنا چاہیئے ۔ مقتول کے ورثاء کے لئے ہم نے معاشرہ کو "سلطان" بنایا ہے ۔ معاشرہ (نظام حکومت) کا غلبہ و اقتدار (سلطان) مقتول کے وارثوں کا پشت پناہ ہوگا ۔ اِنَّهُ كَانَ مَنْصُوْرًا (۱۷/۳۳) ۔ اس طرح یہ معاشرہ خود مقتول کی (اور اس کے وارث کی) مدد کرے گا اور قاتل سے بدلہ لے کر چھوڑے گا ۔ لیکن معاشرہ کو اس کی بھی تاکید کر دی گئی ہے کہ

قاتل کو سزائے موت دینے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔ فَلَا یُسْرِفْ فِی الْقَتْلِ ۔مثلاً ایک شخص نے جان بوجھ کر کسی شخص کے خاندان کے چار پانچ افراد کو بے رحمی سے قتل کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اثبات جرم کے بعد عدالت کو قاتل کے خلاف سخت غصہ ہوگا۔ لیکن عدالت کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ قاتل کے خاندان کے چار پانچ افراد کو اسی طرح قتل کر دے۔ یہ ''اسراف فی القتل'' ہوگا۔

نہ ہی آیت کے اس ٹکڑے (فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا) کے یہ معنی ہیں کہ مقتول کے وارث کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جا کر قاتل کو خود قتل کر دے۔ بالکل نہیں ۔ قصاص کا حکم معاشرہ کے لئے ہے ۔ افراد متعلقہ کے لئے نہیں ۔ قتل کا جرم ، معاشرہ (نظام حکومت) کے خلاف جرم ہے ۔ انفرادی جرم نہیں ۔ مقتول کے وارثوں کی حیثیت (زیادہ سے زیادہ) استغاثہ کے گواہوں کی ہوگی ۔ مستغیث کی نہیں ہوگی ۔ مستغیث خود حکومت ہوگی ۔ لہذا فَلَا یُسْرِفْ فِی الْقَتْلِ کا حکم بھی معاشرہ (عدالت) کے لئے ہے ۔

اس آیت سے دو باتیں واضح ہو گئیں ۔

۱- وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا سے واضح ہے کہ یہاں قتل عمد کا ذکر ہے ۔ اس لئے کہ قتل خطا میں، قاتل کو ظالم اور مقتول کو مظلوم نہیں کہا جائے گا ۔ جس شخص سے محض سہواً ، نادانستہ ، بھول چوک میں ، غلطی سے کسی کا قتل ہو جائے وہ ظالم نہیں ہوتا ۔ وہ تو اپنے کئے پر خود نادم ہوتا ہے ۔ لہذا مقتول اسی صورت میں مظلوم کہلائے گا جب اسے کسی نے عمداً قتل کیا ہو۔

۲- معاشرہ کے طاقتور لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ اپنی قوت کے بل بوتے پر جسے چاہیں قتل کر ڈالیں ۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ۔ معاشرہ کا پورا غلبہ و اقتدار (سلطان) مقتول کے وارث کا پشت پناہ ہوگا ، اور اس طرح قاتل سے بدلہ لینے میں اس کا حامی و مددگار بنے گا۔

۳- قتل عمد کی سزا قتل (موت) ہے ۔ لیکن اس میں حد سے نہیں بڑھا جائے گا۔

اس آیت کو جب سورہ نساء کی آیت فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ سے ملا کر پڑھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہاں جہنم کی سزا سے مراد سزائے موت ہے ۔ اور '' اللہ کا غضب و لعنت اورعذاب عظیم '' وغیرہ اس کے ساتھ ، یا اس سے الگ ، یا اس سے نچلے درجہ پر ، دوسری سزائیں ہیں جن کی نوعیت معاشرہ خود متعین کرے گا۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(i) قتل کا جرم انسانیت کے خلاف سنگین جرم ہے۔

(ii) جرم قتل، افراد کے خلاف جرم نہیں خود معاشرہ کے خلاف جرم ہے۔ لہذا، مجرم کا پیچھا کرکے اسے سزا دینا، مقتول کے وارثوں کا کام نہیں بلکہ نظام حکومت کا فریضہ ہے۔

(iii) اس بات کا فیصلہ عدالت کرے گی کہ قتل بلا ارادہ (خطا) تھا یا قتل عمد۔

(iv) قتل خطا کی صورت میں سزا خون بہا (دیت) ہوگی۔ اس کے لئے مقتول کے وارثوں کو اختیار ہوگا کہ وہ مجرم کو بالکلیہ معاف کر دیں یا خون بہا کی رقم میں سے کچھ کم کر دیں۔

(v) قتل عمد کی سزا دیت نہیں اس لئے اس میں مقتول کے وارثوں کا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اس کی سزا عدالت کی طرف سے مقرر ہوگی جو سزائے موت (یا جرم کی نوعیت اور حالات کے پیش نظر) اس سے کم درجہ کی سزا (قید وغیرہ) ہوگی۔

(vi) یہ جو کہا گیا ہے کہ "کسی مومن کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کر دے۔ مگر غلطی سے"۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ مومن غیر مومنوں کو یونہی قتل کرتا پھرے۔ اس کی اسے کھلی چھٹی ہے۔ قطعاً نہیں۔ مومن و غیر مومن، کسے باشد، ہر ایک کی زندگی قرآن کریم کی رو سے یکساں قیمتی ہے (۵/۳۲)۔ اس آیت میں مومنین کی اس خصوصیت کا ذکر ہے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ایک بھائی کو یہ زیب ہی نہیں دیتا کہ وہ دوسرے بھائی کو قتل کر دے۔ ہاں ایسا غلطی سے ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اسے خون بہا ادا کرنا ہوگا تاکہ آئندہ ایسی غلطی سے محتاط رہے۔ لیکن اگر کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا سخت ہوگی۔

(vii) قرآن کریم نے انسانی زندگی کی اس قدر و قیمت اور اہمیت بتانے کے باوجود اسے تسلیم کیا ہے کہ بالحق زندگی لی جا سکتی ہے۔ یعنی جہاں حق و انصاف کا تقاضا ہو، یعنی بے گناہ کے قتل عمد کی سزا کے طور پر، یا دشمن سے جنگ میں، یا نظام اسلامی کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو فساد سے روکنے کے لئے، وغیرہ۔ لیکن اس کا فیصلہ بھی معاشرہ کرے گا (نہ کہ

افراد از خود) کہ بالحق کسے قتل کیا جا سکتا ہے ۔ لہذا مقتول مظلوم کے وارثوں کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ از خود قاتل کو قتل کر دیں ۔ یہ ہے وہ قِصَاصٌ جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس میں تمہاری اجتماعی زندگی کا راز پوشیدہ ہے (۲/۱۷۹)

ق ص ف

قَصَفَ يَقْصِفُ ۔ قَصْفًا ۔ کسی چیز کو توڑنا ۔ رَعْدٌ قَاصِفٌ ۔ سخت آواز والی گرج۔ اَلْقَصِيْفُ ۔درخت کے خشک ہو کر ٹوٹ جانے والے ٹکڑے ۔ نیز ہر وہ چیز جو آدھوں آدھ یے دو حصوں میں ٹوٹ گئی ہو ۔ عَصَفَتِ الرِّيْحُ فَقَصَفَتِ السَّفِيْنَةَ ۔ تیز آندھی چلی اور اس نے کشتی کو توڑ دیا * ۔ قرآن کریم میں قَاصِفًا مِنَ الرِّيْحِ (۱۷/۶۹) انہی معنوں میں آیا ہے ۔ یعنی ایسی تیز ہوا جو (کشتی کو) توڑ ڈالے ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ اَلْعَوَاصِفُ وہ ہوائیں ہیں جو میدانوں اور صحراؤں میں طوفان برپا کر دیں اور اَلْقَوَاصِفُ وہ ہوائیں جو سمندروں میں تلاطم پیدا کر دیں ۔

ق ص م

قَصَمَ يَقْصِمُ قَصْمًا ۔ کسی چیز کو توڑ دینا (ابن فارس) ، خواہ وہ ٹوٹ کر الگ ہو جائے یا نہ ہو** ۔ هُوَ اَقْصَمُ الثَّنِيَّةِ ۔ اس کا سامنے کا دانت آدھا ٹوٹا ہوا ہے ۔ سَيْفٌ قَصِيْمٌ ۔ وہ تلوار جس کی دھار ٹوٹی ہوئی ہو** ۔ اسی سے کہتے ہیں قَصَمَهُ اللّٰهُ ۔ خدا اسے ذلیل کرے** ۔ سورۂ انبیاء میں ہے وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ (۲۱/۱۱) ۔ کتنی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے ذلیل و خوار کر دیا ۔ یعنی انہیں ہم نے تباہ و برباد کر دیا ۔ ان کا شیرازہ بکھیر دیا (ان کے جرائم کی پاداش میں) ۔

ق ص و

قَصَا عَنْهُ ۔ وہ اس سے دور ہوا ۔ قَصَا الْمَكَانُ ۔ جگہ دور ہو گئی (ابن فارس)۔ قَصِيٌّ ۔ دور، بعید۔ جمع اَقْصَاءٌ ۔ اَلْقُصْوٰى ۔ آخری حد تک دور۔ انتہائی بعید*** ۔ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى (۸/۴۲) ۔ دور کے کنارے پر ۔ مَكَانًا قَصِيًّا (۱۹/۲۲) ۔ دور جگہ*** ۔ اَلْمَسْجِدِ الْاَقْصَا (۱۷/۱) بہت دور کی مسجد ۔ عام طور پر اس سے مراد بیت المقدس لیا جاتا ہے ۔ لیکن ہمارے نزدیک اس سے مراد

* تاج ۔ **تاج و محیط و راغب ۔ ***تاج و کتاب الاشتقاق ۔

مدینہ منورہ ہے جو مکہ سے قریب تین سو میل دور ہے، اور جس کی طرف نبی اکرمؐ رات کے وقت ہجرت کر کے تشریف لے گئے تھے اور جسے اب اس جماعت کی سجدہ گاہ بننا تھا۔ یعنی ان کے نظام اطاعت و فرماں پذیری کا مرکزی مقام۔

ق ض ب

قَضَبَہٗ۔ اس نے اسے کاٹ دیا۔ فَانْقَضَبَ۔ چنانچہ وہ کٹ گیا۔ قُضَابَۃُ الشَّیْءِ۔ جو حصہ کسی چیز سے کاٹ دیا جائے۔ جو کچھ درخت کی شاخوں سے کٹ کر گرے۔ اَلْقَضْبُ۔ وہ شاخیں جو کسی درخت سے تیر اور کمان بنانے کے لئے کاٹی جائیں۔ یا ایک درخت جس کی لکڑی تیر کمان بنانے کے کام آتی ہے۔ یا ہر لمبا اور پھیلا ہوا درخت *۔ لیکن راغب نے لکھا ہے کہ درخت کی شاخوں کو قَضِیْبٌ اور سبزیوں ترکاریوں کی شاخوں کو قَضْبٌ کہا جاتا ہے **۔ چنانچہ قرآن کریم میں عِنَبًا وَّقَضْبًا (۸۰/۲۸) آیا ہے، تو اس کے معنی ترکاریوں کے ہیں۔ فراء نے کہا ہے کہ اہل مکہ ایک چارہ (قَتٌّ) کو قَضْبٌ کہتے تھے *۔

ق ض ض

قَضٌّ یَقُضُّ۔ قَضًّا۔ کسی چیز کو کوٹنا اس میں سوراخ کرنا۔ قَضَّ الْوَتِدَ۔ اس نے میخ کو اکھاڑ لیا۔ اَلْقَضَّۃُ۔ چھوٹی چھوٹی کنکریاں۔ کنکریوں میں سے جو کچھ ٹوٹ کر گرتا ہے۔ اِنْقَضَّ الْجِدَارُ۔ دیوار میں شگاف آ گیا مگر وہ ابھی تک گری نہیں***۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے اور خود تاج میں بھی ہے کہ اس کے معنی ہیں دیوار گر گئی۔ قرآن کریم میں ہے جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ (۱۸/۷۷) دیوار جو گرا ہی چاہتی تھی۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی تین ہیں۔ (۱) کسی چیز کا نیچے کی طرف گرنا۔ (۲) چیز میں کھردرا پن اور نا ہمواری ہونا۔ (۳) چیز میں سوراخ کرنا۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے سورۂ کہف میں یہ لفظ گرنے کے معنوں میں استعمال ہؤا ہے۔

ق ض ی

اَلْقَضَاءُ کے مختلف معنی آتے ہیں۔ لیکن ان تمام معانی کی اصل کسی چیز کا منقطع ہونا، ختم ہو جانا، اور مکمل ہو جانا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے

*تاج **راغب۔ ***تاج و محیط و راغب۔

کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو محکم اور مضبوط کرنا اور اسے اُس کی جہت پر نافذ کرنا ہیں - یعنی جس طرف اسے جانا چاہئیے اُدھر لے جانا - راغب نے القضاء کے معنے جدا کرنا اور قطع کرنا لکھے ہیں - قَدْ قَضٰی دَیْنَہٗ کے معنے ہیں اس نے اپنے قرض کو پورا پورا چکا دیا اور اس طرح قرض خواہ کا جو معاملہ اس کے ساتھ تھا اسے ختم کر دیا - اسی لئے اس کے معنے حتمی اور آخری فیصلہ کے آتے ہیں - چنانچہ اَلْقَضِیُّ موت کو کہتے ہیں - قَضٰی اِلَیْہِ کے معنی ہیں معاملہ کو اس تک پہنچا دیا * -

اَلْقَضَاءُ کے معنی کسی چیز کو پورے طور پر بنا دینا اور اس کا اندازہ مقرر کر دینا بھی ہیں - نیز اس کے معنی کسی بات کو بالکل واضح کر دینا بھی ہیں * -

اَلتَّقَاضِیْ کے معنی ، طلب کرنے کے ہیں * -

قرآن کریم میں خدا کے متعلق ہے - اِذَا قَضٰی اَمْرًا (۲/۱۱۷) - جب وہ کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے - سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ دربار فرعون کے ساحرین نے فرعون سے کہا کہ فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ (۲۰/۷۲) جو کچھ تو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر دے -

سورۂ قصص میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے قبطی کو مکا مارا - فَقَضٰی عَلَیْہِ (۲۸/۱۵) - اس کا کام تمام کر دیا - ذرا آگے ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے خسر سے کہا کہ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ (۲۸/۲۸) - ان دونوں مدتوں میں سے جو مدت بھی میں پوری کر دوں - سورہ زخرف میں یہ لفظ مَاکِثُ کے مقابلہ میں آیا ہے جس کے معنی باقی رہنے کے ہیں - اس لئے یَقْضِ (۴۳/۷۷) کے معنی ختم کر دینے کے ہوں گے -

چونکہ انسانی دنیا کے متعلق خدا کے فیصلے انسانوں تک وحی کے ذریعے پہنچتے ہیں اس لئے وَقَضَیْنَا اِلَیْہِ (۱۵/۶۶) کے معنی ہیں " ہم نے اس کی طرف وحی کی " یا وحی کے ذریعے اپنا قطعی فیصلہ بتا دیا - اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل میں ہے - قَضَیْنَا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْکِتٰبِ (۱۷/۴) ہم نے بنی اسرائیل کی طرف اس فیصلہ کو بذریعہ وحی ، کتاب میں بھیجدیا تھا - اسی طرح ذرا آگے چل کر ہے - وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ (۱۷/۲۳) تیرے رب نے وحی کے ذریعے اپنے اس حکم کو انسانوں تک پہنچا دیا کہ اس کے قانون کے علاوہ اور کسی کی اطاعت نہ کریں -

---

* تاج -

سورهٔ قصص میں ہے ۔ اِذْ قَضَيْنَا اِلٰى مُوْسٰى (۲۸/۴۴) ۔ جب ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی ۔

سورهٔ حٰم سجدہ میں ہے فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (۴۱/۱۲) ۔ ''سو انہیں متعدد کُرّے بنا دیا'' ۔ یہاں اس کے معنی ، بنانا ، مکمل کرنا ، اور اندازہ مقرر کرنا ہیں ۔ سورۃ انعام میں ہے ۔ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰى اَجَلًا (۶/۲) ۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق کی ابتداء مٹی سے کی اور پھر ایک میعاد ٹھہرا دی ۔ یعنی اس کا فیصلہ کر دیا کہ نوع انسان کو زمین پر ایک مدت تک رہنا ہے ۔ [وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۲/۳۶) ۔ تمہارے لئے زمین میں ایک مدت تک ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے] ۔

سورهٔ مومن میں ہے وَاللّٰهُ يَقْضِىْ بِالْحَقِّ (۴۰/۲۰) ۔ اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے ۔ سورۃ مریم میں ہے ۔ اَمْرًا مَّقْضِيًّا (۱۹/۲۱) فیصلہ شدہ بات طے شدہ معاملہ ۔ مقررہ قانون ۔

ق ط ر

اَلْقَطْرُ ۔ بوندیں ۔ قطرے (واحد قَطْرَةٌ ہے) یا جو چیز قطرہ قطرہ جمع ہو کر بنے ۔ بارش (کا پانی) ۔ سَحَابٌ قَطُوْرٌ ۔ بہت برسنے والا بادل ۔ اَلْقِطْرُ اَلْقَطِرُ ۔ پگھلا ہوا تانبہ ۔ یا تانبہ کی کوئی قسم * (۳۴/۱۲) ۔ اَلْقَطِرَانُ ۔ اَلْقَطْرَانُ ۔ رال ۔ ایک قسم کا چکنا سیال مادہ جو صنوبر وغیرہ کے پھلوں سے نچوڑے ہوئے رس کو پکا کر تیار کیا جاتا ہے* (۱۴/۵۰) ۔

اَلْقُطْرُ ۔ کنارہ ۔ جانب ، جمع اَقْطَارٌ (۵۵/۳۳) ۔ اطراف و جوانب ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس باب کے الفاظ کسی قاعدے کے ماتحت نہیں ہیں ۔

ق ط ط

اَلْقَطُّ ۔ کسی چیز کو چوڑائی میں کاٹنا (ابن فارس نے اس میں تیزی سے کاٹنے کا اضافہ کیا ہے) ۔ طول میں کاٹنے کو قَدٌّ کہتے ہیں ۔ اِنْقَطَّ الشَّيْئُ ۔ چیز کٹ گئی ۔ اَلْقِطُّ ۔ معین حصہ (کاٹ کر الگ کیا ہوا) ۔ صحیفہ جس پر کسی آدمی کو دیا جانے والا انعام لکھا ہو ۔ ہر لکھا ہوا صحیفہ ۔ بعض نے کہا ہے کہ کتابِ محاسبہ کو قِطٌّ کہتے ہیں** ۔

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ رَبَّنَا عَجِّل لَّنَا قِطَّنَا (۳۸/۱۶) ۔ جہاں اس کے معنی حصہ یا حساب نامہ کے ہیں ۔ یعنی ''اے ہمارے نشو و نما دینے والے ! ہمارا حساب چکا دے ۔ یعنی ہمارا حصہ ہمیں جلدی سے دے دے ۔ اس میں عجلت کردے'' ۔

ق ط ع

قَطَعَ الشَّیْءَ کے معنی ہیں اس چیز کو کاٹ دیا ۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ ایسی چیزوں کے کاٹنے پر بھی بولا جاتا ہے جنہیں ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں ۔ جیسے قَطَعَ اللَّحْمَ ۔ گوشت کاٹنا ۔ اور ان چیزوں پر بھی جو معنوی طور پر کٹ جاتی ہیں، جیسے قَطَعَ السَّبِیْلَ ۔ ڈاکہ مار کر راستہ کی آمد و رفت کاٹ دینا ۔ قَطَعَ لِسَانَہٗ ۔ کسی پر احسان کرکے اس کی زبان بند کر دینے* کو بھی کہتے ہیں** ۔ قرآن کریم میں یَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ (۲/۲۷) میں ، یہی معنوی انقطاع مراد ہے ۔ یعنی انسانیت کے وہ رشتے جنہیں خدا نے ایک دوسرے کے ساتھ ملائے رکھنے کا حکم دیا تھا انہیں کاٹ کر الگ الگ کر دیتے ہیں ۔ نوع انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں ۔

قَطَعَ خَصْمَهٗ بِالْحُجَّةِ ۔ اس نے دلائل و براہین سے فریق مقابل کو لا جواب کر دیا* ۔ قَطَعَ رَحِمَهٗ قَطِیْعَةً ۔ اس نے اپنے رشتہ داروں سے تعلقات منقطع کر لئے ۔ چنانچہ اُقْطُوْعَةٌ اس چیز کو کہتے ہیں جو قطع تعلقات کی نشانی کے طور پر بھیجی جائے (ابن فارس) ۔ قَطَعَ عُنُقَ دَابَّتِهٖ کے (یہ معنی نہیں کہ اس نے اپنے جانور کا گلا کاٹ دیا ۔ بلکہ مجازاً اس کے) معنی ہیں اس نے اپنے جانور کو فروخت کر دیا* ۔ قُطِعَتْ لِسَانُهٗ کے معنی ہیں کہ وہ زبان جو پہلے قینچی کی طرح چلتی تھی اب اس میں وہ بات نہیں رہی* ۔ قُطِعَتْ یَدُهٗ کے معنی ہیں اس کے ہاتھ میں کوئی ایسی بیماری ہو گئی کہ ہاتھ بیکار ہو گیا* ۔ چنانچہ سورۃ یوسف میں جہاں ہے قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ (۱۲/۳۱) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر

---

*تاج ۔ ** غزوۂ حنین کا واقعہ ہے کہ حضورؐ نے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت عباس بن مرداس کو چالیس اونٹ دئے ۔ وہ بہت غصہ ہؤا اور ایک قصیدہ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔آپ نے فرمایا جاؤاور جسطرح ہو میری طرف سےاس کی زبان کاٹ لو۔ صحابہرضؓ گئے اور وہ جتنے میں راضی ہؤا اُسے دیکر راضی کر لیا۔ یہ تھا مطلب قطع لسان کا ۔ (بحوالہ اصح السیر عبدالرؤف دانا پوری ۔ صفحہ ۲۹۶) ۔

الگ کر کے پھینک دئیے ۔ اس کے معنی ہیں ان کے ہاتھ کام کرنے سے رک گئے ۔ (یا فرط حیرت میں انہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لئے ۔ ہمارے ہاں بھی ہاتھ کاٹ لینے سے مراد ہاتھ زخمی کر لینا ہوتا ہے) ۔ اسی طرح قُطَّاعُ الطَّرِیْقِ ۔ ڈاکوؤں کو کہتے ہیں جو راستہ روک کر راہزنی کرتے ہیں*۔ قرآن کریم نے (قوم لوط کے ضمن میں) اسے قَطْعُ السَّبِیْلِ کہا ہے (۲۹/۲۹) ۔ یا اس آیت میں تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ کے معنی ہیں خلاف وضع فطری سے افزائش نسل انسانی کے راستے بند کر دینا ۔ قُطِعَ بِہٖ کے معنی ہیں اس کے اور اس کی امیدوں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو گئی ۔ وہ مایوس ہو گیا ۔

قِطْعٌ مِنَ اللَّیْلِ سے مراد رات کا حصہ ہے جوشروع رات سے تہائی رات تک ہوتا ہے ۔ نیز آخری رات کو بھی کہتے ہیں* ۔ (دیکھئے ۸۱/۱۱) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی رات کا کوئی حصہ ہے ۔

قُطِعَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں آدمی نا امید ہو گیا اور عاجز رہ گیا** ۔ قَطَعَ الْاَمْرَ کے معنی ہیں کسی بات کا آخری فیصلہ کرنا ۔ اسی سے آیت (۲۷/۳۲) میں ہے مَاکُنْتُ قَاطِعَۃً اَمْرًا ۔ میں کسی معاملہ کا قطعی فیصلہ کرنے والی نہیں . . . . . .

سورۃ المائدہ میں چوری کی سزا کے متعلق ہے فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَھُمَا (۵/۳۸) جس کے معنی عام طور پر یہ لئے جاتے ہیں کہ ان کے ہاتھ کاٹ کر الگ کر دو ۔ لیکن لفظ قَطْعٌ اور قَطْعُ یَدٍ کے مذکورہ صدر معانی کے پیش نظر اس کے یہ معانی بھی ہوسکتے ہیں کہ کوئی ایسا طریق اختیار کرو جس سے ان کے ہاتھ چوری سے رک جائیں ۔ اس مفہوم کی تائید آیت کے باقی ماندہ ٹکڑے سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے "جَزَآءً بِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِنَ اللّٰہِ (۵/۳۸) ۔ یہ ان کے جرم کی سزا ہے قانون خداوندی کی طرف سے بطور ایک روک کے ۔ (نَکَالًا کے لئے دیکھئے عنوان ن ۔ ک ۔ ل) ۔ یعنی چوری کی سزا میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے چور کے ہاتھ چوری کرنے سے رک جائیں ۔ اس لئے کہ اس سے آگے ہے فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِہٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَتُوْبُ عَلَیْہِ (۵/۳۸) ۔ اور جو مجرم ارتکاب جرم کے بعد پشیمان ہو جائے اور اپنی اصلاح کرلے تو اسے قانون خداوندی کی رو سے معاف کر دینا چاہئے ۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی یہ پشیمانی اور اصلاح سزا ملنے سے پہلے بھی ہو سکتی ہے اور سزا ملنے کے بعد بھی ۔ لیکن اگر سزا میں اس کے

*تاج ۔ **محیط ۔

ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں تو اُسے معاش مل جانے سے کیا حاصل ہوگا؟ اور اگر آیْدِی کے معنی اختیار اور مقدرت کے لئے جائیں (دیکھئے عنوان ی ۔ د ۔ ی) تو قطع ید کے معنی ہونگے ان اختیارات کا سلب کر لینا یا اس مقدرت کا چھین لینا جس کی رو سے انسان چوری کرتا ہے ۔ اس میں چوری کے علاوہ ہرقسم کی خیانت بھی آ جاتی ہے ۔

اسی سورۃ مائدہ میں نظام مملکت کے خلاف بغاوت کرنے والوں* کے متعلق ہے آنْ یُّقَتَّلُوْا اَوْ یُصَلَّبُوْا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (۵/۳۳) ۔ انہیں قتل کردو ۔ یا صلیب پر لٹکا دو ۔ یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے قطع کردو یا انہیں جلا وطن کر دو ۔ اس میں قتل کرنے ، صلیب دینے، اور جلا وطن کرنے کے علاوہ ایک سزا قَطْعِ اَیْدِی و اَرْجُل کی بھی ہے ۔ اس کے معنی الٹی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر قید کر دینے کے بھی لئے جاسکتے ہیں ۔ یہی الفاظ ساحرینِ دربارِ فرعون کی سزا کے بارے میں آئے ہیں ۔ بناء بریں ، قطع ید کے معنی یہ بھی لئے جاسکتے ہیں کہ ایسا طریقہ اختیار کرو جس سے چور کے ہاتھ چوری کرنے سے رک جائیں ۔ ہماری زبان میں بھی بولتے ہیں کہ تم نے دستخط کرکے (یا فلاں بات کرکے) اپنے ہاتھ کٹوادئے ۔ یعنی تم بے بس ہو گئے ۔ یا اس کی خلاف ورزی کرنے سے رک گئے ۔ اور اگر قطع ید سے مراد سچ مچ ہاتھ کاٹ دینے کے ہیں تو یہ وہ انتہائی سزا ہے جو اُس وقت دی جاسکے گی جب یہ جرائم ایسے عام ہو جائیں کہ اس قسم کی عبرت انگیز سزا کے سوا ان کی روک تھام کی اور کوئی صورت نہ رہے ۔ جیسے کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں (Smuggling) اسقدر عام ہوگیا ہے کہ اسکی روک تھام کے لئے انتہائی اقدامات ناگزیر ہو گئے ہیں ۔ اس مقصد کے لئے بارڈر پولیس کو اجازت ہے کہ وہ (Smuggler) کو موقعہ پر گولی مار کر ھلاک کر دے ، حالانکہ ظاہر ہے کہ عام حالات میں موت کی سزا ، قتلِ عمد یا بغاوت کے جرم میں دی جاسکتی ہے ، اور وہ بھی اس وقت جب پوری تحقیقات (اور مجرم کو اپنی مدافعت کا موقع دینے کے بعد) جرم ثابت ہوجائے ۔ لہذا ، ایسے حالات میں چوری کی سزا، قطع ید ناگزیر ہو جائیگی ۔

یا مثلاً جب ملک میں نظام خداوندی قائم ہو جائے جس میں ہر فرد کی ضروریات زندگی کے پورا کرنے کی ذمہ داری خود مملکت پر ہو تو ایسی صورت

*بعض کے نزدیک ان میں ڈاکو اور رہزن بھی شامل ہیں ۔

میں کسی کی چیز چرانا فی الواقعہ ایک سنگین جرم ہوگا جس کی انتہائی سزا دی جانی چاہئے۔ قرآن کریم کا معاشی نظام قائم نہ کرنا اور فاقہ کش چوروں کو قطع ید کی سزا دینا، کل کو چھوڑ کر صرف جزو پر عمل کرنے کے مترادف ہے، جس کا نتیجہ (۲/۸۵) میں مذکور ہے۔

ق ط ف

قَطْفٌ۔ کسی چیز کو (بالخصوص پھلوں کو) توڑ لینا یا کاٹ لینا۔ (ابن فارس)۔ اَلْقِطْفُ۔ انگور کا خوشہ جو ابھی ابھی توڑا گیا ہو۔ اسکی جمع قُطُوْفٌ ہے*۔ قرآن کریم میں قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ (۶۹/۲۳) آیا ہے۔ ان کے خوشے قریب ہیں۔ اَلْمِقْطَفُ اس درانتی کو کہتے ہیں جس سے پھل کاٹتے ہیں*۔

ق ط م ر

اَلْقِطْمِيْرُ۔ کھجور کی گٹھلی میں جو شگاف ہوتا ہے اسے کہتے ہیں۔ یا کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ایک نشان سا ہوتا ہے اسے کہتے ہیں۔ یا اس باریک سی جھلی کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے اوپر ہوتی ہے۔ اس لفظ کو تھوڑی سی چیز کے لئے بطور مثال بولتے ہیں**۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ۔ (۳۵/۱۳)۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ ذرہ بھر بھی اختیار نہیں رکھتے۔ اتنا بھی نہیں جتنی اُڑد پر سفیدی۔

ق ع د

اَلْقُعُوْدُ۔ بیٹھنا۔ نیز یہ اَلْقَاعِدُ کی جمع ہے۔ یعنی بیٹھنے والے۔ اَلْمَقْعَدُ۔ بیٹھنا نیز بیٹھنے کی جگہ۔ اسکی جمع مَقَاعِدُ ہے۔ قُعُوْدٌ اور جُلُوْسٌ ہم معنی الفاظ ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ کھڑے سے بیٹھ جانے کو قُعُوْدٌ کہتے ہیں اور لیٹے سے بیٹھنے، یا سجدہ سے اٹھ کر بیٹھنے کو جُلُوْسٌ کہتے ہیں۔ بعض علماء لغت نے کہا ہے کہ قُعُوْدٌ ایسے بیٹھنے کو کہتے ہیں جس میں دیر اور ٹھہراؤ پایا جائے۔ اسی لئے گھر کی بنیادوں کو قَوَاعِدُ الْبَيْتِ کہتے ہیں، جَوَالِسُ الْبَيْتِ نہیں کہتے۔ اَلْقَاعِدَةُ۔ وہ جڑ جس پر عمارت کی بنیاد رکھی جاتی ہے، اسکی جمع قَوَاعِدُ ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ قَوَاعِدُ الْبَيْتِ ان ستونوں کو کہتے ہیں جن پر عمارت استوار کی جاتی ہے***۔ قرآن کریم میں (۲/۱۲۷) میں، اَلْقَوَاعِدُ مِنَ الْبَيْتِ ہے۔

---

*تاج و راغب۔ **تاج۔ محیط۔ راغب۔ ***تاج۔

اُقْعِدَ الرَّجُلُ ۔ وہ صاحب فراش ہو گیا، اور بیماری کی وجہ سے اس میں اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کی طاقت ہی نہ رہی ۔ قرآن کریم میں قَعَدَ، اِنْبِعَاثٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۹/۴۶) ۔ قَعَدَ لِلْحَرْبِ کے معنی ہوتے ہیں اس نے جنگ میں لڑنے والے بہادروں کو تیار کیا*۔ سورہ بروج میں ہے ۔ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ (۸۵/۶)۔ جب وہ لوگ (جنگ کی آگ بھڑکانے کے لئے) بالکل تیار بیٹھے تھے ۔ راغب نے کہا ہے کہ کسی کام میں سستی کرنے والے کو قَاعِدٌ کہا جاتا ہے **۔ سورہ النساء میں اَلْقَاعِدُوْنَ، اَلْمُجَاهِدُوْنَ کے مقابلہ میں انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے (۴/۹۵) ۔

اَلْقَعِيْدُ ۔ وہ شخص جو تمہارے ساتھ بیٹھتا ہو ۔ محافظ ۔ نگران * ۔ (۵۰/۱۷) میں یہ لفظ انہی معانی میں استعمال ہوا ہے ۔

اَلْقَاعِدُ (مِنَ النِّسَاءِ) اُس معمر عورت کو کہتے ہیں جو اولاد، حیض، اور شوہر سے مایوس ہو چکی ہو ۔ اسکی جمع اَلْقَوَاعِدُ (مِنَ النِّسَاءِ) ہے (۲۴/۶۰) ۔ مَقَاعِدُ ۔ مرکزی مقامات (۳/۱۲۰) ۔ سورہ قمر میں ہے فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ (۵۴/۵۵) ۔ ایسا مقام جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں موجود ہوں ۔ (دیکھئے عنوان ص ۔ د ۔ ق) ۔ لیکن یہ مقام (جنت) محض بیٹھنے کی جگہ، یعنی تھوڑی دیر تک سستانے کا مقام ہے ۔ آخری منزل نہیں ۔

سورہ جن میں کاہنوں اور نجومیوں کی رصدگاہوں کے لئے مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ (۷۲/۹) آیا ہے ۔

ق ع ر

اَلْقَعْرُ ۔ کسی چیز کی انتہائی گہرائی ۔ قَعْرُ الْبِئْرِ ۔ کنوئیں کی تہ ۔ قَعَرَ النَّخْلَةَ ۔ اس نے کھجور کے درخت کو جڑ سے اکھاڑ دیا ۔ فَانْقَعَرَتْ ۔ پس وہ جڑ سے اکھڑ گئی***۔

قوم عاد پر جو آندھی کا سخت طوفان آیا تھا اس کے متعلق ہے کہ وہ لوگوں کو اس طرح اپنے مقام سے اکھاڑتا چلا جاتا تھا، كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ (۵۴/۲۰) ۔ گویا وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں ۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ اس طرح اکھڑتے چلے جاتے تھے گویا وہ ایسی کھجوروں کے تنے تھے جو پہلے ہی جڑوں سے اکھڑی ہوئی پڑی تھیں ۔ اور یہ بھی کہ وہ اسطرح اکھڑ رہے تھے جس طرح ایسی کھجوریں اکھڑیں جن کی جڑیں بڑی گہرائی تک زمین میں گئی ہوئی ہوں ۔ یعنی وہ قوم اپنے

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و راغب ۔

آپ کو بڑی مستحکم سمجھتی تھی ۔ وہ خیال کئے بیٹھی تھی کہ اس کی جڑیں بہت مضبوط ہیں اس لئے اسے کون اکھیڑ سکتا ہے ۔ لیکن اسے ایک ہی آندھی کے طوفان نے اکھیڑ کر رکھ دیا ۔ سورہ حاقہ میں اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (۶۹/۷) کہا گیا ہے ۔ یعنی کھوکھلی کھجوروں کے تنے ۔

ق ف ل

قَفَلَ ۔ يَقْفِلُ و يَقْفُلُ ۔ قُفُوْلاً ۔ کسی کا سفر سے واپس آجانا ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ قُفُوْلٌ جہاد اور جنگ سے فوج کے واپس آنے کو کہتے ہیں ۔ اَقْفَلَ الْجَيْشُ ۔ لشکر واپس آگیا ۔ اَلْقَافِلَةُ ۔ وہ رفقائے سفر جو سفر سے واپس آرہے ہوں (ابن فارس) ۔ لیکن سفر پر جانے والوں کو بھی کہتے ہیں ، اس فالِ نیک کے اعتبار سے کہ ۔ یہ سلامت روی و باز آئی ۔ یعنی ان کی خیریت سے واپسی کی آرزو کے لحاظ سے انہیں جاتے وقت بھی اَلْقَافِلَةُ ہی کہتے ہیں * ۔ قَفَلَ الطَّعَامَ ۔ اس نے کھانے کی چیزوں کا ذخیرہ کر لیا ۔ قَفَلَ الشَّيْئَ ۔ اس نے چیز کا اندازہ اور تخمینہ لگایا ۔ اَقْفَلَ الْبَابَ ۔ اس نے دروازہ کو بند کر لیا ۔ اَلْقُفْلُ ۔ تالا جس سے دروازہ بند کیا جاتا ہے * ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۴۷/۲۴) ۔ کیا ان کے دلوں پر ان کے تالے پڑے ہوئے ہیں جو وہ قرآن کریم میں غور و خوض نہیں کرتے ۔ اِسْتَقْفَلَ الرَّجُلُ ۔ آدمی نے بخل کیا ۔

ق ف و

اَلْقَفَا ۔ اَلْقَافِيَةُ ۔ گُدّی ۔ گردن کا پچھلا حصہ ۔ اَلْقِفْوَةُ ۔ دم ۔ اسی سے اس کے معنی تہمت کے بھی ہیں ۔ قَفَوْتُهُ قَفْوًا ۔ میں اس کے پیچھے چلا ۔ قَفَّيْتُهُ زَيْدًا ۔ و بِزَيْدٍ میں نے اس کے پیچھے پیچھے زید کو بھیجا ۔ هُوَ قَفِيُّهُمْ ۔ وہ ان کا جانشین و پسماندہ ہے * ۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے پیچھے پیچھے چلنے کے لکھے ہیں ۔ اَلْقَفِيَّةُ برتری کو بھی کہتے ہیں * ۔

سورة حدید میں ہے ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰى آثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا (۵۷/۲۷) ۔ پھر ہم نے ان کے نقش قدم پر ان کے پیچھے اور رسول بھیجے ۔ (نیز ۵/۴۶) ۔

---

* تاج و راغب ۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے ۔ وَ لاَ تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ* إِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولاً (۱۷/۳۶) ۔ ''اور جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو ۔ (یاد رکھو) سماعت ، بصارت اور قلب سب سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا'' ۔ قرآن کریم نے اس آیت میں عظیم حقائق بیان کئے ہیں ۔ پہلی بات تو یہ کہ محض قیاس و گمان کی بنا پر ، تقلیداً اور رسمًا کسی بات کے پیچھے نہیں لگ جانا چاہئے ۔ اس کے متعلق خود تحقیق کرنا چاہئے ۔ دوسرے یہ کہ قرآن کریم نے عِلْمٌ* کی تعریف یہ بتائی ہے کہ اس میں سماعت و بصارت و قلب کی شہادت موجود ہونی چاہئے ۔ سماعت و بصارت میں علم بذریعہ حواس (Per-ceptual Knowledge) آجاتا ہے، اور قلب (Mind) میں (Conceptual Knowledge) نیز یہ بھی کہ حواس کے ذریعے جو معلومات تم تک پہنچیں ، ان سے نتیجہ مستنبط کرنے میں اپنے جذبات کو دخل مت دینے دو (اس لئے کہ فؤاد میں جذبات کا پہلو بھی شامل ہوتا ہے) ۔ ہر معاملہ کے متعلق پوری پوری خارجی معلومات بہم پہنچاؤ اور پھر جذبات سے الگ ہو کر ، اس سے نتیجہ نکالو ۔

راغب نے بھی اس آیت کی شرح میں لکھا ہے کہ محض قیافہ اور گمان کی بنا پر کسی بات کا فیصلہ نہ کرو ۔ وہ لکھتا ہے کہ قِيَافَةٌ* دراصل اِقْتِفَاءٌ* کا مقلوب ہے ۔

ق ل ب

قَلْبٌ* کے بنیادی معنی ہیں الٹنا پلٹنا ۔ لوٹ پوٹ کرنا ۔ کسی چیز کو ادلتے بدلتے رہنا ۔ چنانچہ قَلَبَ الشَّيْءَ يَقْلِبُهُ کے معنی ہیں کسی شے کو الٹ پلٹ کر دینا ۔ یعنی اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دینا ۔ قَلَّبَ کے بھی یہی معنی ہیں، لیکن مبالغہ کے ساتھ ۔ تَقَلَّبَ کے معنی ہیں الٹ پلٹ ہونا ، جیسے تیز گرم ریت پر سانپ لوٹ پوٹ ہوتا ہے ۔ قَلَبَ الْخُبْزَ ۔ اس وقت کہتے ہیں جب روٹی اوپر سے پک جائے اور اندر سے پکانے کے لئے اسے الٹ پلٹ کیا جائے ۔ مِقْلَبٌ* اس لوہے کو کہتے ہیں جس سے کسان کھیتی کرنے کے لئے زمین کی مٹی کو الٹ پلٹ کرتا ہے* ۔

چونکہ انسان کا دل کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا بلکہ لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے اس لئے اسے بھی قَلْبٌ* کہتے ہیں ۔ اور (چونکہ عقل و بصیرت

*تاج ۔

کا کام یہ ہے کہ وہ اشیاء اور اس کے خواص کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھے اور پھر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچے اس لئے) عقل کو بھی قَلْبٌ کہہ دیتے ہیں* ۔

ابن ھشام نے قَلْبٌ کے معانی میں سے چار بیان کئے ہیں (۱) دل (۲) عقل (۳) ہر چیز کا خلاصہ اور (۴) ہر چیز کا بہترین حصہ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں دو بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا خالص اور گراں قدر حصہ (۲) کسی چیز کو ایک رخ سے دوسرے رخ پر پھیرنا ۔ چنانچہ اہل عرب کہتے ہیں ۔ ھٰذَا عَرَبِیٌّ قَلْبٌ ۔ یہ شخص خالص عرب ہے ۔ کھجور کے درخت میں ایک سفید سا مغز (گابھا) ہوتا ہے جو اس کا بہترین حصہ ہوتا ہے ۔ اسے قَلْبُ النَّخْلَةِ کہتے ہیں* ۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ ہر خالص شے کو قَلْبٌ کہتے ہیں ۔

قرآن کریم میں قَلْبٌ اور فُؤَادٌ دو لفظ آئے ہیں (فُؤَادٌ ۔ فَاَدَ سے ہے جس کے معنی بھوننے کے ہیں ، یعنی تپش و خلش ۔ سوز و گداز ۔ درد و داغ) ان دونوں لفظوں میں ایک موٹا سا امتیازی خط کھینچنا ہو تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ قَلْبٌ فہم و بصیرت اور عقل و فکر کا سرچشمہ ہے اور فُؤَادٌ جذباتِ سوز و گداز کا منبع ۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں اہل جہنم کے متعلق ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں ۔ لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا (۷/۱۷۹) ۔ قلب تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے ۔ سورۃ کہف میں ہے ۔ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اَکِنَّةً اَنْ یَّفْقَھُوْہُ (۱۸/۵۷) یعنی ان کے دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی ۔ اسی طرح سورۃ حج میں بتایا گیا ہے کہ قَلْبٌ سے عقل و فکر کا کام لیا جاتا ہے ۔ لَھُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِھَا (۲۲/۴۶) ۔ سورۃ النحل میں ہے قُلُوْبُھُمْ مُّنْکِرَةٌ (۱۶/۲۲) ۔ فریب کار یا بے باک عقلیں ۔ (دیکھئے عنوان ن ۔ ک ۔ ر) نیز قلب کے سرچشمہ عقل و فکر ہونے کے لئے (س ۔ م ۔ ع) اور (ب ۔ ص ۔ ر) کے عنوانات بھی دیکھئے ۔

سورۃ بقرہ میں منافقین کے ضمن میں ہے فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ (۲/۱۰) ۔ اس سے ان کی نفسیاتی کیفیت کی طرف بھی اشارہ ہے اور ذہنی کیفیت کی طرف بھی ۔ اس لئے کہ اس سے پہلے ان کے متعلق کہا ہے وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ (۲/۹) ۔ ''وہ اپنے آپ کے سوا اور کسی کو

* تاج ۔ ** دیکھئے ف ۔ أ ۔ د ۔

دھوکا نہیں دیتے لیکن اسے سمجھتے نہیں"۔ اس میں دونوں (نفسیاتی اور ذہنی) کیفیات کے بگاڑ کا ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے قَلْبٌ کا لفظ عقل اور جذبات دونوں کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی زبان کا لفظ (Mind) قَلْبٌ اور فُؤَادٌ دونوں کے لئے بولا جاسکتا ہے۔ نیز قرآن کریم میں بھی قَلْبٌ اور فُؤَادٌ کو مرادف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے(نیز دیکھئے عنوان ف۔ ا۔ د)۔

تَقَلُّبٌ۔ جد و جہد کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ (۱۶/۴۶ ؛ ۴۰/۴)۔ سورۃ شعراء میں ہے اَلَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَ تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ (۲۶/۲۱۸-۲۱۹)۔ "تو جب ان لوگوں میں جو قوانین خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں، کھڑا ہوتا ہے یا مصروف تگ و تاز ہوتا ہے، تو خدا تجھے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ سورۃ بقرۃ میں ہے قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ (۲/۱۴۴) ۔ جب تو بار بار بے تابانہ اپنی نظریں آسمان کیطرف اٹھاتا تھا تو ہم تیرے اضطراب کو دیکھ رہے تھے"۔ لہذا تَقَلُّبَ میں جسمانی اور قلبی دونوں قسم کی جد و جہد آ جائیگی۔ مُنْقَلَبٌ کے معنی ہیں لوٹنے کی جگہ (۱۸/۳۶)۔ مُنْقَلِبٌ۔ پلٹا کھانے والا۔ سورۃ توبہ میں ہے وَ قَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ (۹/۴۸)۔ یہ لوگ تیرے لئے الٹ پھیر کی تدبیریں کرتے رہے۔ یہ لوگ سوچ بچار کرتے رہے کہ کس طرح تیرے معاملات میں بگاڑ پیدا کیا جاسکتا ہے (انہیں الٹایا جاسکتا ہے)۔ سورۃ کہف میں ہے یُقَلِّبُ كَفَّیْهِ (۱۸/۴۲)۔ وہ اپنے ہاتھ ملتا رہ گیا۔ سورۃ محمد میں مُتَقَلَّبَكُمْ (۴۷/۱۹) آیا ہے۔ یعنی معاملات میں سرگرداں رہنے کی جگہ یا وقت۔

ق ل د

قَلَّدَ الْحَبْلَ۔ رسّی کو بٹ دینا۔ اَلْاِقْلِیْدُ۔ اونٹنی کی ناک کی نتھنی جس میں نکیل کی رسی ڈالی جاتی ہے۔ اَلْمِقْلَادُ (جمع مَقَالِیْدُ)۔ کنجی۔ نیز خزانہ *۔ قرآن کریم میں ہے کہ۔ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳۹/۶۳)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے خزانے سب خدا کے لئے ہیں۔ اَلْقِلَادَةُ۔ ہار جوگردن میں ڈالا جائے (اس کی جمع اَلْقَلَائِدُ آتی ہے)*۔ قرآن کریم میں ہے وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآئِدَ (۵/۲)۔ راغب نے لکھا ہے کہ قِلَادَةٌ کے معنی بٹی ہوئی ڈور یا چاندی وغیرہ کا تار ہیں جو گلے میں ڈالا جائے لیکن بعد میں ہر اس چیز کو کہنے لگے جسے گلے میں پہنا جائے یا جو کسی چیز کا احاطہ کر لے۔ اُسے اپنے گھیرے میں لے لے**۔

*تاج و محیط۔ **راغب۔

اس سے تَقْلِيْدٌ کے معنے سمجھ میں آسکتے ہیں ۔ یعنی نکیل کی نتھنی جیسے ناک میں ، یا پٹا جیسے اپنے گلے میں ، ڈال لیا جائے اور رسی دوسرے کے ہاتھ میں دے دی جائے ، اور پھر اس کے پیچھے انسان جانور کی طرح چلتا جائے ۔ چنانچہ اسی نہج سے کہتے ہیں تَقْلِيْدُ الْوُلَاةِ الْاَعْمَالَ ۔ یعنی والیوں کا ملازموں کو مختلف کاموں پر تعینات کرنا * ۔ صاحبِ محیط نے لکھا ہے کہ اَلتَّقْلِيْدُ ۔ یہود اور نصاری کے نزدیک ان عقائد اور شعائر کو کہتے ہیں جو ان کی کتابوں میں کہیں مدون نہیں لیکن جنہیں انہوں نے اپنے اسلاف سے زبانی حاصل کیا ہے اور یہ سلسلہ اس طرح متوارث چلا آ رہا ہے** ۔

قرآن کریم اس لئے آیا تھا کہ نوع انسانی کے گلے سے وہ تمام زنجیریں اتار دے جو اس نے اشخاص پرستی کی رو سے پہن رکھی تھیں اور جن میں وہ غلاموں کی طرح جکڑے چلی آرہی تھی (۷/۱۵۷) ۔ چنانچہ نبی اکرم ؐ نے قرآن کریم کے ذریعے ان تمام زنجیروں کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا لیکن مسلمانوں نے ان ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اپنی مژگانِ عقیدت سے اکٹھا کیا ، اور پہلے سے بھی زیادہ کڑی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ لیا ۔ اسی کو تقلید کہتے ہیں جس سے انسانیت کا جوہرِ حریتِ فکر و عمل جل کر راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے ۔ قرآن کریم ، قانونِ خداوندی کی اطاعت اور ساری کائنات پر حکومت کا سبق دیتا ہے ، نہ کہ انسانوں کی غلامی کا سبق ۔ تقلید ، غلامی کی بد ترین شکل ہے ۔ اس لئے کہ غلامی میں انسان کا صرف جسم مقید ہوتا ہے ، لیکن تقلید میں اس کی عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے ۔ قرآن کریم ، قدم قدم پر تدبر و تفکر کا حکم دیتا ہے اور اسلاف کی اندھی تقلید کو منکرین کا شیوہ بتاتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ جب بھی کسی رسول نے خدا کی طرف دعوت دی تو یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی گئی کہ تمہاری یہ دعوت اُس مسلک کے خلاف ہے جو ہمارے ہاں وراثةً آبا و اجداد سے آ رہا ہے ۔ حضرت نوح ؑ کو یہی جواب ملا (۲۳/۲۴) ۔ یہی جواب حضرت صالح ؑ کو ملا (۱۱/۶۲ ، ۱۰/۶۱) ۔ یہی حضرت ابراهیم ؑ سے کہا گیا (۲۱/۵۳) ۔ یہی حضرت شعیب ؑ سے (۱۱/۸۷) ۔ اور حضرت موسیٰ ؑ سے (۱۰/۷۸) ۔ یہی رسول اللہ ؐ سے کہا گیا (۳۸/۷) ۔ غرضیکہ ہر رسول کی مخالفت یہی کہہ کر کی گئی (۴۳/۲۲-۲۳) ۔ قرآن کریم کی دعوت کے خلاف کوئی دلیل اور برهان نہیں لائی گئی ۔ محض یہ کہہ کر اسے ٹھکرا دیا گیا کہ یہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے (۵/۱۰۴ ؛ ۲/۱۷۰) ۔ قرآن کریم کہتا ہے

---

*تاج و محیط ۔ **محیط ۔

کہ یہ روش ، انسانی سطح زندگی کی نہیں ، حیوانی سطح کی ہے ۔ لہذا جہنم کی زندگی (۹/۱۲۹) ۔ اس میں انسان کی آنکھیں پیچھے کی طرف رہتی ہیں (۳۳/۶۶) ۔ وہ سامنے کا راستہ دیکھ ہی نہیں سکتا (۳۶/۸-۹) ۔ یعنی اس مسلک کی رو سے اُس قوم کو اپنا ماضی تو درخشندہ نظر آتا ہے لیکن مستقبل تاریک ۔

غور کیجئے کہ کیا آج ہماری بھی بعینہٖ یہی حالت نہیں! کیا قرآن کریم کی دعوت کی ہر جگہ یہی کہہ کر مخالفت نہیں ہوتی کہ یہ آواز اُس مسلک کے خلاف ہے جو ہمارے ہاں وراثۃً چلا آرہا ہے؟ ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ جو کچھ ہمارے ہاں اسلاف سے چلا آ رہا ہے اسے اٹھا کر پھینک دینا چاہئے ۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں جو کچھ ان سے ورثہ میں ملا ہے اسے قرآن کریم کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لینا چاہئیے ۔ جو کچھ اس کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھنا چاہئیے ۔ جو اس کے خلاف ہو اسے غلط ۔ یہ دلیل کہ اُن بزرگوں نے جو کچھ کہا تھا قرآن کو سمجھ کر ہی کہا تھا ، بڑی کمزور ، بلکہ باطل ہے ۔ قرآن کریم کو قیامت تک کے لئے محفوظ اسی لئے رکھا گیا تھا ، اور ہر نسل کو اس پر غور و تدبر کا حکم اسی لئے دیا گیا تھا کہ وہ ہر بات کو خود قرآن کریم کے آئینے میں دیکھے ۔ یاد رکھئے ، ہم قرآن کریم پر ایمان لانے کے مکلف ہیں ، اس لئے ہمارے لئے حق و باطل کی سند صرف خدا کی کتاب ہے ۔ اسلاف کا احترام بجا اور درست ۔ لیکن وہ ہمارے لئے سند نہیں قرار پا سکتے ۔

ق ل ع

قَلَعَ قَلَّعَ اِقْتَلَعَ ۔ کسی چیز کو اس کی بنیاد سے اکھیڑ دینا اور اسے اسکی جگہ سے ہٹا دینا ۔ اَلْمَقْلُوْعُ ۔ معزول شدہ امیر ۔ اَلْقَلْعُ ۔ وہ محفوظ جگہ جہاں چرواھا اپنا سامان رکھتا ہے ۔ اَلْقَلْعَۃُ ۔ کھجور کا وہ پودا جسے کھجور کے درخت کی جڑ سے اکھیڑ لیا جائے ۔ اَلْاِقْلَاعُ عَنِ الْاَمْرِ ۔ کسی کام سے رک جانا * ۔ قرآن کریم میں حضرت نوحؑ کے طوفان کے ذکر کے بعد ہے ۔ یٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ (۱۱/۴۴) ۔ بارش سے کہا گیا کہ تو رک جا ۔ تھم جا ۔

ق ل ل

اَلْقِلُّ ۔ تھوڑا ۔ قلیل ۔ اَلْقِلَّۃُ ۔ کثرت کی ضد ہے ۔ کمی ۔ قَلَّ ۔ یَقِلُّ ۔ کم ہونا ۔ قَلِیْلٌ ۔ کم ۔ اَقَلَّہٗ قَلَّلَہٗ ۔ اسکو کم کر دیا ۔ اَلْاَقَلُّ ۔ بہت کم ** ۔

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔

اَلْقَلَّةُ ۔ سر یا کوھان یا پہاڑ کا بالائی حصہ ۔ جماعت *۔ اَلْقِلَّةُ ۔ غصہ یا طمع کی وجہ سے جو کپکپی سی آتی ہے * ۔ اِسْتَقَلَّ الرَّجُلُ ۔ وہ آدمی فرط غضب میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا ۔ اِسْتَقَلَّهٗ ۔ اسکو اٹھا لیا ، بلند کردیا ۔ اِسْتَقَلَّتِ السَّمَاءُ ۔ آسمان بلند ہوگیا ۔ اَلْاِسْتِقْلَالُ ۔ بلند ہو جانا ۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جانا ۔ کسی چیز کو اپنے لئے خاص کرلینا ۔ هُوَ لَا يَسْتَقِلُّ بِهٰذَا ۔ اسے اسکی قدرت حاصل نہیں ۔ وہ اسے اٹھا نہیں سکتا * ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) کسی چیز کا کم ہونا ، اور (۲) ایک جگہ نہ ٹھہرنا لکھے ہیں ۔

قَلَّ ۔ تھوڑا ہونا ۔ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ (۳/۱۹۶) ۔ قَلَّلَ ۔ تھوڑا کرنا ۔ کم کرنا (۸/۴۴) ۔ اَقَلَّ ۔ اٹھا لینا * (۷/۵۷) ۔ یعنی اسے ھلکا سا سمجھ کر اٹھا لینا ۔

ق ل م

قَلَمٌ ۔ کسی چیز کو چھیل کر اور درست کرکے ھموار کر دینا ۔ (ابن فارس) ۔ اَلْقَلَمُ ۔ قلم جس سے لکھا جاتا ہے ۔ قینچی ۔ بے پھل اور بے پر کا تیر ۔ تیروں میں وہ بھی شامل ہیں جن سے جوا کھیلا جاتا تھا ۔ (اسکی جمع اَقْلَامٌ ہے) * ۔ سورہ آل عمران میں ہے کہ ھیکل کے پجاری حضرت مریمؑ کی کفالت کے لئے قرعہ اندازی کرتے تھے ۔ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ (۳/۴۳) ۔ اس میں اَقْلَام کے یہی معنی ہیں ۔ دوسرے مقامات پر قَلَمٌ سے مراد وہ قلم ہے جس سے لکھا جاتا ہے ۔ مثلاً نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۶۸/۱) یا اَلَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶/۴) ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ قَلَمٌ کو قلم صرف اس وقت کہتے ہیں جب اسے تراش کر لکھنے کے قابل بنا لیا جائے ، ورنہ اس سے پہلے کلک کو يَرَاعَةٌ یا قَصَبَةٌ کہتے ہیں ** ۔ یہ الفاظ خود اس پر شاہد ہیں کہ اُس زمانہ میں عربوں میں لکھنے کا رواج تھا ۔ خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے تاکید کی ہے کہ عام لین دین کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو ۔ (۲/۲۸۲)

سورہ العلق کی اس آیت پر غور کیجئے جس میں کہا گیا ہے کہ اَلَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶/۴) " اللہ وہ ہے جس نے قلم کے ذریعے انسان کو سکھایا " ۔ اس میں ایک تو تحریری علم کی اھمیت واضح ہے ۔ دوسرے یہ کہ خدا ، انسان کو براہ راست قلم سے لکھنا نہیں سکھاتا ۔ اس لئے اس آیت (اور اس

*تاج ۔ **محیط ۔

قسم کی دیگر آیات) سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کے اندر اس طرح علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھدی ہے ۔ اس نقطہ کو پیش نظر رکھنے سے قرآن کریم کے بہت سے مقامات واضح ہو جائینگے۔

ق ل ی

اَلْقِلٰی ۔ شدت بغض کو کہتے ہیں ۔ ابن فارس نے اس کے معنے کسی چیز سے دور ہٹنا اور اسکے پاس سے چلا جانا لکھے ہیں ۔ قَلٰی یَقْلِی ۔ کسی سے بغض رکھنا اور انتہائی ناپسندیدگی ظاہر کرنا اور اسے چھوڑ دینا ۔ بعض نے کہا ہے کہ قَلٰی یَقْلِی چھوڑ دینے کے معنوں میں آتا ہے اور قَلِیَہٗ یَقْلاہُ ۔ بغض رکھنے کے معنوں میں ۔ اصل میں قَلْیٌ کے معنی ہوتے ہیں گوشت وغیرہ کو بھوننا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ھلکا ہونے اور تیز ہونے کے ہیں ۔ قَلاہُ اس نے اسے کڑھائی میں بھونا یا تلا ۔ اَلْقَلّاءُ ۔ کڑھائیاں بنانے والا ۔ اَلْمِقْلٰی ۔ اَلْمِقْلاۃُ ۔ پیتل یا مٹی کی بنی ہوئی کڑھائی جسمیں گوشت وغیرہ تلا جائے* ۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی (۹۳/۳) ۔ تیرے رب نے نہ تجھے چھوڑا ہے اور نہ ھی وہ تجھ سے ناراض ہے ۔ سورہ شعراء میں حضرت لوطؑ کا یہ قول مذکور ہے کہ اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِنَ الْقَالِیْنَ (۲۶/۱۶۸) ۔ میں تمہارے ان کرتوتوں سے سخت بیزار ہوں ۔ میں تم سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاھتا ۔

ق م ح

قَمَحَ الْبَعِیْرُ قُمُوْحاً ۔ اونٹ نے حوض پر سر اونچا کر لیا اور پانی پینے سے باز رہا ۔ قَامَحَتْ اِبِلُكَ ۔ تمہارے اونٹوں نے حوض پر آنے کے باوجود پانی نہیں پیا اور وہ سر اٹھائے کھڑے رہے ۔ اَقْمَحَ الرَّجُلُ ۔ آدمی نے اپنا سر اٹھایا اور آنکھیں نیچی کر لیں ۔ اَقْمَحَ الْغُلُّ الْاَسِیْرَ ۔ بیڑیوں نے تنگ ہونے کی وجہ سے قیدی کے سر کو اٹھا ہوا رہنے دیا* ۔ اس زمانہ میں بیڑیوں کے ساتھ گردن میں طوق ڈالے جاتے تھے جو اگر سخت یا تنگ ہوتے تو سر اونچے کا اونچا اٹھا رہ جاتا ۔ قرآن کریم میں انہی کے متعلق ہے ۔ فَهُمْ مُقْمَحُوْنَ (۳٦/۸) ۔ ان کے سر کھنچے ہوئے اور اوپر اٹھے ہوئے ہیں ۔

*تاج ۔ محیط و راغب ۔

دراصل قَمْحٌ گیہوں کو کہتے ہیں اور جو ستو اس گیہوں سے بنایا جاتا ہے اسے قَمِيْحَةٌ کہتے ہیں - ستو پھانکنے کے لئے سر کو اوپر اٹھایا جاتا ہے - اسے اَلْقَمْحُ کہتے ہیں - اسکے بعد محض سر اٹھانے کو (خواہ کسی وجہ سے ہو) قَمْحٌ کہنے لگے * - لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ لفظ (گیہوں کے معنوں میں) خلاف قیاس استعمال ہوتا ہے -

ق م ر

اَلْقَمَرُ - ہرمہینے کی تیسری رات سے پچیس کی رات تک کا چاند - پہلی دوسری اور چھبیس ستائیس تاریخ کے چاند کو هِلاَلٌ کہتے ہیں **- تَقَمَّرَ الْمَرْاَةَ - عورت سے شادی کرلی اور اسے لے گیا - نیز چاند رات میں شبِ زفاف بسر کرنے کو بھی کہتے ہیں ** - راغب نے لکھا ہے کہ اس کے یہ معنی قَمْرَةٌ سے ماخوذ ہیں جس کے معنے غالب آجانے کے ہیں - لہذا چاند کو قَمَرٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی روشنی دوسرے ستاروں پر غالب آجاتی ہے ***- قَمَرْتُ فُلاَنًا - میں نے فلاں آدمی کو دھوکا دےدیا ***- (چاند کے ساتھ جنون کا تعلق قدیمی تصور ہے - انگریزی زبان میں Lunatic کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے) - اسی سے اَلْقِمَارُ جوئے کو کہتے ہیں - اَلْقَمِيْرُ - مُقَامِرٌ - جوا کھیلنے والا **** -

صاحب غریب القرآن نے لکھا ہے کہ ایام جاہلیت میں عربوں کا قومی نشان قَمَرٌ تھا - جیسے ایرانیوں کا قومی نشان شَمْسٌ تھا - اس اعتبار سے جہاں قرآن کریم نے کہا ہے - اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ (۵۴/۱) - تو اس میں بتایا گیا ہے کہ جماعت مومنین اور قریش میں آخری تصادم کا وقت قریب آ رہا ہے - (دیکھئے عنوان س - و - ع) - اس وقت عرب جاہلیت کا تمام اقتدار ختم ہو جائے گا اور اسلام کا پرچم بلند ہو جائے گا - (دیکھئے عنوان ش - ق - ق) - وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ (۷۵/۹) میں عربوں اور ایرانیوں کے اکٹھے ہونے کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کے ایران فتح کرلینے کے بعد ہوا -

لیکن اگر ان آیات میں شَمْسٌ اور قَمَرٌ کے حقیقی معنی سورج اور چاند کے لئے جائیں تو ان میں طبعی کائنات کے بعض ہونے والے تغیرات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے - اس کے متعلق ہم اس وقت متعین طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے -

---

*تاج و محیط و راغب - **تاج - ***راغب - ****محیط -

ق م ص

قَمَصَ الْفَرَسُ يَقْمُصُ و يَقْمِصُ قَمْصًا وَ قِمَاصًا ۔ گھوڑے کا اپنے دونوں ہاتھوں کو یکبارگی اٹھانا اور پھر ان کو ایک ساتھ زمین پر پٹک دینا۔ اَلْقِمَاصُ ۔ اچھلنا ۔ کودنا ۔ نیز قلق و اضطراب کو بھی کہتے ہیں ۔ اَلْقَمُوْصُ ۔ وہ جانور جو اپنے سوار کو لے کر کودنے لگے ۔ اَلْقَمِيْصُ ۔ بہت اچھلنے کودنے والا خچر* ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دو ہوتے ہیں ۔ ایک تو کسی چیز کو پہننا اور اس میں لپٹ جانا ۔ اور دوسرے کسی چیز کا اچھلنا اور ہلنا ۔ قَمَصَ الْبَحْرُ بِالسَّفِيْنَةِ ۔ دریا نے موج کے ذریعے کشتی کو اچھالا** ۔

اَلْقَمِيْصُ کرتے کو کہتے ہیں جو پہنا جاتا ہے ۔ عربی میں یہ لفظ مذکر استعمال ہوتا ہے اگرچہ کبھی کبھی مؤنث بھی استعمال کرلیا جاتا ہے ۔ اس کی جمع قُمُصٌ ۔ اَقْمِصَةٌ اور قُمْصَانٌ آتی ہے ۔ ابن الجزری نے کہا ہے کہ اَلْقَمِيْصُ اس سلے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں جس میں دو آستینیں ہوتی ہیں اور نیچے سے کھلا ہوا نہیں ہوتا ۔ یہ کپڑا روئی یا کتان کا ہونا چاہئے ۔ اگر یہ کپڑا اون کا ہو تو پھر اسے قَمِيْصٌ نہیں کہتے ۔ لیکن ابن حجر مکی نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کپڑا زیادہ تر اون کا نہیں ہوتا۔ یہ مطلب نہیں کہ اون کا ہو ہی نہیں سکتا ۔ اَلْقَمِيْصُ ۔ غلاف قلب کو بھی کہتے ہیں* ۔ قرآن کریم میں قصہ حضرت یوسف[ؑ] کے ضمن میں ہے ۔ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا (۱۲/۹۳) ۔ (حضرت یوسف[ؑ] نے کہا) میرے اس کرتہ کو لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے سامنے رکھ دو۔ اس پر ساری بات کھل جائے گی ۔ اس زمانے میں (اور آج بھی) ان لوگوں کا لباس امتیازی نشان رکھتا تھا جو بلند مناصب پر فائز ہوں ۔ حضرت یوسف[ؑ] کی قمیص ان کے جاہ و مرتبت کا نشان تھی ۔ اس لئے انہوں نے اپنی قمیص کو باپ کے پاس بھیجدیا تاکہ وہ اس سے ان کے مقام بلند کا اندازہ کرکے سمجھ لیں کہ ان کا بیٹا (یوسف) کہاں پہنچ چکا ہے ۔ لیکن اس آیت کا ایک اور مفہوم بھی ہوسکتا ہے اس سے پہلے (۱۲/۸۴ میں) کہا گیا ہے وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ يُوسُفَ[ؑ] کے غم سے یعقوب[ؑ] کی بینائی کم ہوگئی ، غم و حزن کا یہ نتیجہ ہو جایا کرتا ہے کہ انسان کے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں ۔ اسکے بعد جب حضرت یعقوب[ؑ] کے سامنے حضرت یوسف[ؑ] کی قمیص آئی تو فرطِ مسرت سے ایسا نفسیاتی اثر ہوا کہ انکے اعصاب میں

*تاج ۔ **مقاییس اللغۃ ۔

تقویت آ گئی اور کمزور بینائی پھر سے اپنی اصلی حالت پر آ گئی - فوری خوشخبری سے ایسی کیفیت عام طور پر پیدا ہو جایا کرتی ہے -

داستان حضرت یوسف ؑ میں پہلے آپ کی قمیص کا ذکر اس وقت آتا ہے جب آپ کے بھائی اسے ''جھوٹے خون'' میں لت پت کرکے باپ کے پاس لے آئے تھے (۱۲/۱۸) - دوسری دفعہ آپکی قمیص آپکی پاکدامنی کی شہادت بنکر سامنے آتی ہے (۱۲/۲۶-۲۷)- اوراب تیسری مرتبہ انکی زندگی اور جاہ و منصب کی خوشخبری بن کر -

قَمَّصَه' قَمِيْصًا فَتَقَمَّصَ - اس نے اسے کرتہ پہنایا اور اس نے وہ کرتہ پہن لیا - بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ اگر کرتہ کا گریبان سینہ پر ہو تو اسے دِرْع * کہتے ہیں اور اگر گریبان مونڈھے پر ہو تو اسے قَمِيْص * کہتے ہیں * -

اَلْقُمَاص ُ - اونٹ کی ایک بیماری کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک جگہ پر کھڑا نہیں رہ سکتا بلکہ بے چین و بے قرار رہتا ہے ** -

ق م ط ر

اَلْقِمَطْرُ - اس لکڑی کی بیڑی کو کہتے ہیں جو مجرموں کے پاؤں میں ڈال دی جاتی تھی تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں *** - اس سے انہیں چلنے پھرنے میں سخت اذیت پہنچتی تھی - پھر اس سے یہ لفظ تکلیف ، پریشانی، سختی اور اذیت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا - سختی کی وجہ سے آنکھوں اور ابروؤں پر جو شکنیں پڑجاتی ہیں، انہیں بھی قَمْطَرِيْر ٌ کہتے ہیں - اِقْمَطَرَّ الْيَوْمُ - دن سخت ہوگیا ، شَرٌّ مُقْمَطِرٌّ کے معنی ہیں ، شدید شر *** -

قرآن کریم میں ظہور نتائج کے دن کو يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا (۷۶/۱۰) کہا گیا ہے - بڑی سختی اور پریشانی کا زمانہ - ابن فارس نے بھی اس کے یہی بنیادی معنے دئے ہیں -

ق م ع

اَلْمِقْمَعَةُ - لوہے کا گُرز - یا آنکس جس سے ہاتھی کو مارا جاتا ہے - اس کی جمع مَقَامِعُ آتی ہے *** - قرآن کریم میں اہل جہنم کے متعلق ہے - وَ لَهُمْ مَقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ (۲۲/۲۱) - ان کے لئے لوہے (حدید) کے گرز ہونگے - یہ وہی حدید (فولاد) ہے جسے اللہ نے نظام عدل قائم رکھنے کے لئے پیدا کیا ہے - (۵۷/۲۵) - یعنی قانون اور اس کے ساتھ تنفیذی قوت - قَمَعَه' قَمْعًا - وہ اس پر غالب آگیا اور اس نے اسے ذلیل کردیا - قَمَعَ فُلَانًا - اس نے فلاں آدمی کو اسکے ارادہ سے روک دیا - اَلْمَقْمُوْعُ - ذلیل - مردود مقہور *** - لہذا مَقَامِعُ (۲۲/۲۱) اس قوت کا نام ہے جس سے کسی سرکش کو

---

* محیط - ** راغب - *** تاج و محیط و راغب -

اس کی سرکشی سے روک دیا جائے۔ مستبد اور ظالم کو مغلوب کرکے اسے بےبس بنا دیا جائے اور اس طرح مظلوموں کو اس کے ظلم سے محفوظ کر دیا جائے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ کسی کو ذلیل اور مغلوب کرنا اس مادہ کے بنیادی معنوں میں سے ہے۔

ق م ل

اَلْقَمْلُ جوں۔ اَلْقُمَّلُ (۱۳۳/۷)۔ چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں۔ چیچڑی۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ایک کیڑا ہے جو فصل میں لگ جاتا ہے اور اسے بالکل خراب کر دیتا ہے*۔ کشاف میں اسکے معنے پسو اور گھن بھی دیئے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ چھوٹی مکھیاں ہوتی ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ سے چند الفاظ آتے ہیں جو حقارت اور ذلت پر دلالت کرتے ہیں۔

ق ن ت

قَنَتَ کے معنی ہیں کھڑا ہونا اور بات کرنے سے رک جانا۔ چنانچہ زجاج نے کہا ہے کہ قَائِمٌ بِاَمْرِ اللّٰہِ کو قَانِتٌ کہتے ہیں۔ یعنی قوانین خداوندی کو قائم کرنے والا۔ احکام خداوندی کو لیکر کھڑا ہو جانے والا*۔ اور سِقَاءٌ قَنِیْتٌ اس مشکیزے کو کہتے ہیں جو پانی کو اسطرح روک لے کہ اس میں سے ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہو*۔ لہذا اس کا صحیح مفہوم ہے اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھنا اور صرف قانون خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ اس قسم کی اطاعت کو اَلْقُنُوْتُ کہتے ہیں*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْقُنُوْتُ سے مراد ہوتا ہے کسی کام کو دوام اور التزام سے کرنا اور استقامت رکھنا***۔

قرآن کریم میں اشیائے کائنات کے متعلق ہے کُلٌّ لَّہٗ قَانِتُوْنَ (۱۱۶/۲)۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اپنی قوتوں کو ضائع نہیں کرتی اور صرف قانون خداوندی کے مطابق صَرْف کرتی ہے۔ سب خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ تمام کی تمام نظام کائنات کو قائم رکھنے کے لئے کھڑی ہیں۔ یہی خصوصیت مومن مردوں اور عورتوں کی ہوتی ہے۔ اَلْقَانِتِیْنَ وَالْقَانِتٰتِ (۳۵/۳۳)۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے۔ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِّلّٰہِ (۱۲۰/۱۶)۔ وہ ایک فرد نہیں تھا بلکہ اس کی ذات میں پوری امت سموئی ہوئی تھی۔

---

*تاج۔ **راغب۔ ***محیط۔

ایسی امت جو دعوت خداوندی کو لیکر کھڑی ہو اور اپنی تمام قوتوں کو اسی مصرف میں لانے کے لئے روکے ہوئے ہو۔ کامل اطاعت گذار اور فرمان پذیر امت۔ چنانچہ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی اطاعت کے دئے ہیں۔
اس مضمون کے لئے دیکھئے تتمہ میں مادہ "ا م م"۔

ق ن ط

اَلْقَنَطُ۔ روکنا۔ قَنَطَ مَاءً عَنَّا۔ اس نے ہم سے پانی روک لیا۔ اسی سے اَلْقَنُوْطُ کے معنی ہیں بھلائی سے ناامید ہو جانا۔ قَنَطَ يَقْنُطُ۔ (نیز قَنَطَ يَقْنِطُ۔ اور قَنِطَ يَقْنَطُ) سخت مایوس ہو جانا۔ قَانِطٌ۔ مایوس ہو جانے والا *۔ (۱۵/۵۵-۵۶)۔

سورۃ حم سجدہ میں يَئُوْسٌ قَنُوْطٌ (۴۱/۴۹) اکھٹا آیا ہے۔ سورہ زمر میں ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا۔ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۳۹/۵۳)۔ (اے رسول) میرے ان بندوں سے جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کر لی ہے کہدو کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ (کا یہ قانون کہ حسنات، سیئات کو بہا لے جاتی ہیں) تمہاری تمام لغزشوں کے تخریبی اثرات سے تمہاری حفاظت کریگا۔ یقیناً وہ حفاظت اور رحمت کا مالک ہے۔ مسلمانوں نے اس آیت کو گناہوں کے لئے لائسنس سمجھ رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گناہ کرو اور خوب گناہ کرو۔ خدا کی رحمت ان سب کو معاف کر دیگی۔ جو شخص گناہ کرکے سمجھتا ہے کہ خدا اسے معاف نہیں کریگا وہ خدا کی رحمت سے مایوس ہے۔ اور خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

یہ تصور قرآن کریم کی کھلی ہوئی تعلیم اور دین کی اساس و بنیاد (یعنی قانون مکافات عمل) کے جسقدر خلاف ہے اسکی تشریح کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم نے اس آیت (۳۹/۵۳) میں عیسائیت کے اس غلط عقیدہ کی تردید کی ہے جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ آدم نے جو گناہ کیا تھا اسکی رو سے ہر انسانی بچہ گناہ گار پیدا ہوتا ہے اور یہ گناہ مٹ ہی نہیں سکتا۔ اسکی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انسان حضرت مسیح[4] کے کفارہ پر ایمان رکھے۔ اسی طرح ہندو دھرم میں بھی یہ عقیدہ ہے کہ انسان سے جو گناہ ایک دفعہ سرزد ہو جائے، کوئی عمل اس کا ازالہ نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے انسان کو تناسخ کے چکر میں مبتلا رہنا پڑتا ہے۔ یہودیوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ ہے کہ ان کے اسلاف نے (گوسالہ پرستی کا) جو گناہ کیا تھا اس کی

*تاج۔

پاداش میں انہیں کچھ دنوں کے لئے جہنم میں رہنا ہوگا۔ قرآن کریم نے پہلے تو اس غلط عقیدہ کی تردید کی کہ انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ۔ یا سابقہ جنم کے گناہوں کا بوجھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس نے یہ کہا کہ اگر انسان سے کبھی لغزش ہو جائے تو اس سے انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے باز آفرینی کے مواقع ساری عمر موجود رہتے ہیں۔ اس لئے جو خدا کی رحمت سے ہم کنار ہونا چاہتا ہے اسے کبھی یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس پر رحمت کے سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ رحمت کے دروازے کھلتے کسطرح ہیں؟ اسکا جواب خود قرآن کریم نے دوسری جگہ دیدیا ہے کہ وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ (۱۵/۵۶)۔ رحمت کے دروازے ان پر بند رہتے ہیں جو خدا کی راہ نمائی کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چلتے رہتے ہیں۔ لہذا اسکی رحمت کا مستحق وہ ہوگا جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا۔ اس کے سوا رحمت خداوندی سے بہرہ‌یاب ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ جتنی اور صورتیں ہم نے اپنے ذہن سے تراش رکھی ہیں وہ فریب نفس کے سوا کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱/۱۱۵) برائیوں کے اثرات زائل کرنے کے لئے بھلائی کے کام کرو۔ بھلائیوں کا زندگی بخش نتیجہ، لغزشوں کے تخریبی اثر کو زائل کر دیگا۔ (مزید تفصیل کے لئے عنوان ر۔ح۔م دیکھئے)۔

سورہ روم میں قَنِطَ۔ فَرِحَ کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۰/۳۶)۔ صاحب لطائف اللغۃ نے کہا ہے کہ یَاْسٌ عمومی معنوں میں آتا ہے اور قُنُوْطٌ خصوصی معنوں میں۔ یعنی یہ، یاس سے زیادہ خصوصیت رکھتا ہے۔

ق ن ط ر

اَلْقَنْطَرَةُ۔ پل یا بلند عمارت۔ قَنْطَرَ عَلَیْنَا۔ وہ ہمارے پاس طویل عرصہ تک جم کر مقیم رہا *۔ لہذا اس لفظ میں کثرت کا تصور نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے۔ اسی لئے راغب نے لکھا ہے کہ اَلْقَنْطَرَةُ مِنَ الْمَالِ۔ مال کی اس مقدار غیر متعین کو کہتے ہیں جو کسی کے لئے کافی ہو**۔ (اسکی جمع اَلْقَنَاطِیْرُ آتی ہے)۔ اَلْقَنَاطِیْرُ الْمُقَنْطَرَةُ۔ (۳/۱۴) وہ مال جو قنطار قنطار کرکے جمع کیا گیا ہو**۔ اس میں مبالغہ پایا جاتا ہے***۔ یعنی بہت زیادہ۔

*تاج۔ **راغب۔ ***محیط۔

اس آیت (۹/۳۴) میں باقی چیزوں کے علاوہ، مال و دولت کو انسان کے لئے وجہ جاذبیت بتایا گیا ہے۔ قرآن کریم، دولت سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا۔ وہ ہر فرد سے کہتا ہے کہ وہ اکتساب دولت میں پوری کوشش کرے۔ لیکن اپنی کمائی ہوئی دولت کو اپنی ذات کے لئے محبوس نہ کر لے۔ اس میں سے اپنی ضروریات کے مطابق لے اور باقی سب نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا چھوڑ دے۔ چنانچہ اسی آیت کے تسلسل میں (۳/۱۶) مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اَلْمُنْفِقِيْنَ ہوتے ہیں۔ یعنی اپنی دولت کو کھلا رکھنے والے۔ یہ ہے قرآن کریم کی رو سے سونے چاندی کے ڈھیر (۳/۱۴) کا مقصد۔ یعنی اسے نوع انسان کی پرورش کے لئے عام رکھا جائے۔ جو ایسا نہیں کرتے ان کے لئے دردناک عذاب کی وعید ہے (۹/۳۴)۔ یعنی اسطرح سے (Hoard) کی ہوئی دولت، جہنم کی آگ بن جاتی ہے۔

ق ن ع

قِنَاعٌ۔ اس اوڑھنی کو کہتے ہیں جس سے عورتیں اپنا سر ڈھانپتی ہیں*۔ راغب نے کہا ہے کہ جس چیز سے سر ڈھانکا جائے وہ قِنَاعٌ ہے۔ اس سے قَنَعَ کے معنی ہیں اس شخص نے اپنے فقر کو چھپانے کے لئے سر پر کچھ اوڑھ لیا**۔ لہذا قَانِعٌ وہ شخص ہوگا جو اپنی احتیاج کو دوسروں پر ظاہر نہ ہونے دے۔ اور اَلْقَنَاعَةُ اخفائے حاجت کا نام ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی راغب نے لکھا ہے کہ قَنَعَ کے معنی ہیں اس نے اپنی اوڑھنی کو اٹھا دیا اور اپنا سر کھول دیا۔ یعنی اپنی احتیاج کو لوگوں پر ظاہر کردیا*۔ لیکن قُنُوْعٌ اسے بھی کہتے ہیں کہ انسان اپنے حصے پر راضی رہے اور تھوڑی سی بخشش پر خوش ہوجائے*۔ چنانچہ اَلْقَانِعُ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے ساتھ رہے، اس کا بچا کھچا کھا کر گذارہ کرے، اور اس سے زیادہ کچھ نہ مانگے۔ اس سے قَنَاعَةٌ کے معنی تھوڑی سی چیز پر راضی ہوجانے کے ہونگے*۔ قَانِعٌ اس سائل کو بھی کہتے ہیں جو باصرار نہ مانگے اور جو کچھ مل جائے اس پر راضی ہوجائے** (۳۶/۲۲)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی اپنی ضرورت کے لئے کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہونا ہیں۔

سر سے کپڑا اٹھانے کی جہت سے سر کو اٹھا کر چلنے کو بھی اِقْنَاعٌ کہتے ہیں۔ چنانچہ اَقْنَعَ رَاْسَهٗ کے معنی ہیں اس نے اپنے سر کو اونچا کیا۔ لیکن یہ اضداد میں سے بھی ہے۔ یعنی اس کے معنی نیچا کرنا بھی ہیں۔

*تاج۔ **راغب۔

اَقْنَعْتُ الْاِنَاءَ فِی النَّهْرِ کےمعنی ہیں میں نے اپنے برتن کے منہ کو ندی کے بہاؤ کی طرف کرکے رکھدیا (ٹیڑھا کردیا) تاکہ اس میں پانی بھر جائے۔ اس اعتبار سے کسی کی طرف مائل ہونے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ قَنِعَتِ الْاِبِلُ کے معنی ہیں اونٹ اپنی چراگاہ، یا باڑے کی طرف مائل ہوگئے*۔

سورۃ ابراہیم میں قرآن کریم نے اس بد حواسی کا نقشہ کھینچا ہے جو جنگ میں شکست خوردہ قوم پر چھاجاتی ہے اور اس سے اس میں افرا تفری پھیل جاتی ہے۔ اس ضمن میں کہا ہے کہ اُس وقت ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِىْ رُؤُسِهِمْ (۱۴/۴۳)۔ مُهْطِعِيْنَ کےمعنی ہیں بد حواس بھاگے جانا (دیکھئے ھ۔ط۔ع)۔ مُقْنِعِىْ رُؤُسِهِمْ کے معنی بعض نے کئے ہیں سر اٹھا کر بھاگے جانا۔

ق ن و

اَلْقِنْوَةُ۔ اَلْقُنْوَةُ۔ کمائی۔ قَنَوْتُهُ۔ میں نے اسے کمایا، حاصل کیا اور اپنے لئے جمع کیا۔ اِقْتِنَاءُ الْمَالِ۔ مال حاصل کرنا اور جمع کرنا۔ اَلْقَنَاةُ۔ ڈنڈا۔ قَنَاءُ الْحَائِطِ۔ دیوار کی وہ جانب جس پر سایہ آجاتا ہو۔ نیز قَنَاةٌ اُس کظیمہ (نالی) کو کہتے ہیں جس سے پانی نکلتا ہے**۔ اَلْقِنْوُ و القُنْوُ۔ خوشہ (کھجور کا)۔ جمع اَلْقِنْوَانُ و القُنْوَانُ۔ قرآن کریم میں قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ (۶/۹۹) قریب جھکے ہوئے خوشوں کے لئے آیا ہے۔

ق ن ی

اَلْقِنْيَةُ۔ اَلْقُنْيَةُ۔ جو کچھ آدمی کما کر حاصل کرے۔ نیز جمع کیا ہوا مال۔ قَنَى الْمَالَ يَقْنِيْ۔ وہ مال کماتا ہے۔ اَقْنَاهُ اللّٰهُ۔ خدا نے اسے وہ چیزیں دیدیں جن کے حاصل ہو جانے کے بعد اسے سکون اور اطمینان نصیب ہوگیا۔ ان سے اس کی فوری ضروریات بھی پوری ہوگئیں اور وہ انہیں جمع کرکے بھی رکھ سکا۔ اَرْضٌ مَقْنَاةٌ اس زمین کو کہتے ہیں جو اترنے والے کے لئے بالکل موافق ہو جائے۔ جس میں اُسے سب کچھ مل جائے اور اس طرح وہ اس سے راضی ہو جائے۔ اسی اعتبار سے اَقْنٰى کےمعنی راضی کرنے کے بھی آتے ہیں**۔

---

*تاج۔ **تاج و راغب۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَ اَقْنٰى (۵۳/۴۸) ۔ خدا ہی غنی کرتا ہے اور وہ کچھ دیتا ہے جس سے انسان کو سکون اور اطمینان حاصل ہوجائے اور اسطرح وہ راضی ہو جائے ۔

ق ھ ر

اَلْقَاهِرَةُ ۔ ہر چیز کے اوپر کے حصے کو کہتے ہیں ، جیسے ہنسلی اور سینہ وغیرہ ۔ اسی سے اس کے معنی بلندی کے آتے ہیں ۔ جیسے جِبَالٌ قَوَاهِرُ ۔ بلند پہاڑ ۔ اور غلبہ کے معنی بھی ۔ اَلْقَهْرُ ۔ کسی کو مغلوب کرنے کےلئے اوپر سے پکڑ لینا ۔ لہذا اس کے معنی تسلط ۔ اقتدار ۔ غلبہ ۔ گرفت کے ہیں ۔ قَهَرَهٗ ۔ وہ اس پر غالب آگیا ۔ نیز اس کے معنی تابع کرنے کے بھی آتے ہیں ۔ لَحْمٌ مُقْتَهُوْرٌ ۔ وہ گوشت جسے بھوننے کے لئے آگ پر رکھا جائے اور اس میں سے ہنوز پانی رس رہا ہو* ۔

قرآن کریم میں خدا کی ایک صفت اَلْقَهَّارُ بھی آتی ہے ۔ (۱۳/۳۹) ۔ جَبَّارٌ کے معنی پہلے لکھے جا چکے ہیں (عنوان ج ۔ ب ۔ ر) ۔ یعنی جو ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو قانون کے شکنجے میں کسکر جوڑ دے ۔ اور اَلْقَهَّارُ کے معنی ہونگے وہ جس کا قانون سب پر غالب ہو ۔ جسے کوئی شکست نہ دے سکے ۔ جسے کوئی مغلوب نہ کرسکے ۔ سورۃ انعام میں ہے ۔ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (۶/۱۸) ۔ وہ اپنے بندوں پر غالب ہے ۔ یہ قہاریت خدا کے تو شایان شان ہے کیونکہ ساری کائنات پر اسی کا غلبہ و اقتدار ہے ۔ لیکن جب کوئی انسان اس قہاریت کا دعویٰ کرے تو اس کا نام فرعونیت ہوتا ہے ۔ چنانچہ قرآن کریم نے فرعون کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ (۷/۱۲۷) ۔ ''اور ہم ان (بنی اسرائیل) پر غالب ہیں'' ۔ یہ خالص استبداد ہے جس سے قرآن کریم نے منع کیا ہے جب کہا ہے کہ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ (۹۳/۹) ۔ جو معاشرہ میں اکیلا رہ جائے ، اسے بے یار و مددگار سمجھ کر اس پر سختی نہ کرو ۔ نہ ہی اسے ذلیل سمجھو ۔ یتیموں پر سختی نہ کرو ۔ اس ضمن میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اشیائے کائنات کو اپنے تابع تسخیر کرنا تو بالکل ٹھیک ہے ۔ لیکن کسی انسان کا دوسرے انسان پر استبداد کرنا یا اسے ذلیل سمجھنا ٹھیک نہیں ہے ۔ مگر ظلم کی قوتوں پر غلبہ حاصل کرنا نہایت ضروری ہے ۔ ان معنوں میں یہ صفت جماعت مومنین کےلئے محمود صفت ہوگی اور صفت خداوندی کا عکس ۔ یاد رکھئے ۔ قوت فی ذاتہٖ شر نہیں ہے ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

(خدا کی کوئی صفت بھی ، معاذ اللہ ، شر نہیں) - اس کا استعمال اس کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ کرتا ہے - اگر اسے کسی کمزور پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کرو تو وہ شر ہے - اور اگر اسے ظالم کا ظلم روکنے کے لئے صرف کرو تو عین خیر - خدا چونکہ خیر ھی خیر ہے ، اس لئے اس کی ہر قوت ، حسن اور تعمیر کے لئے ہوتی ہے - یہی صورت جماعت مومنین کی ہوتی ہے -

ق و ب

قَابٌ - کمان کے درمیانی حصے (دستے) اور ایک کنارے کا درمیانی فاصلہ - نیز مقدار* -

قرآن کریم میں مقام نبوت کے متعلق ہے - فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی - (۹/۵۳) ایام جاہلیت میں عربوں کا قاعدہ تھا کہ جب وہ ایک دوسرے سے محکم عہد باندھتے تو وہ دو کمانیں لیتے - ایک کو دوسری کے ساتھ ملا دیتے اور اسطرح ان دونوں کا قابٌ ایک کر دیتے - پھر ان دونوں کمانوں کو اکٹھا کھینچکر ایک تیر چلاتے - یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا کہ ہم ایک جان دو قالب ہیں - ایک کی رضامندی دوسرے کی رضامندی ہے - جو ایک چاہتا ہے وہی دوسرا چاہتا ہے - ہم دونوں ہم آہنگ زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے ہیں** - قرآن کریم نے نبی کے متعلق بتایا کہ وہ احکام الٰہیہ کا اس قدر متبع ہوتا ہے اور اپنی زندگی کو قوانین خداوندی کے ساتھ اس درجہ ہم آہنگ کر دیتا ہے کہ اس کا اور خدا کا تعلق گویا ان ساتھیوں کا سا تعلق ہو جاتا ہے جنہوں نے قَابَ قَوْسَیْنِ والا عہد کیا ہو - اَوْ اَدْنٰی - بلکہ ان سے بھی زیادہ قریب تر تعلق - یہی وجہ ہے کہ حق کا استحکام جو نبی کی قوت بازو سے ہوتا ہے اسے خود خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے - فَلَمْ تَقْتُلُوْھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَھُمْ - وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (۸/۱۷) - بدر کے میدان میں مخالفین حق کو تم نے قتل نہیں کیا اللہ نے قتل کیا تھا - تم نے ان پر تیر نہیں چلائے تھے ، اللہ نے چلائے تھے - نبی اور خدا کا تعلق اسی قسم کی رفاقت اور ہم آہنگی کا تعلق ہے - غالب کے الفاظ میں -

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق است
اما کشاد آں ز کمان محمدؐ است

یہ مقام نبی کو حاصل ہوتا ہے - اور نبی پھر اس مقصد کے لئے اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت تیار کرتا ہے - اسطرح انسانی دنیا میں خدا کے پروگرام

---

*تاج و راغب - **بحوالہ روح المعانی -

اس جماعت کے ہاتھوں سے تکمیل تک پہنچتے ہیں جو نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے وجود میں آتی ہے۔ حق کا علَمْ انہی کے ہاتھوں سے بلند ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو وحیِ خداوندی کے ساتھ اس درجہ ہم آہنگ کر دیتے ہیں کہ ان کے فیصلے اور عمل دنیا میں خیر و شر کا معیار بن جاتے ہیں، اور ان کی ''تیر اندازی'' خود خدا کی تیر افگنی ہو جاتی ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، خدا اور بندے کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے۔ نبی اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق، جو حضورؐ نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری سانس میں فرمایا تھا، خدا رفیقِ اعلیٰ ہے۔ انسان کا فریضہ ہے کہ خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہے۔ خدا کے ساتھ اسی عہد کا نام ایمان، اور اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ ''خدا کا قرب اور رضا جوئی'' ہے۔ یعنی خدا کے پروگرام سے ہم آہنگ ہوجانا۔

ق و ت

اَلْقُوْتُ (جمع اَقْوَاتٌ)۔ اتنی خوراک جس سے انسان زندہ رہ سکے*۔ قرآن کریم میں ارض کے متعلق ہے۔ وَ قَدَّرَ فِیْھَا اَقْوَاتَھَا (۴۱/۱۰)۔ اس میں خوراک پیدا کرنے کے پیمانے مقرر کر دیئے۔ ایسا قانون بنا دیا جس کی رو سے وہ مختلف موسموں میں خوراک پیدا کرتی چلی جائے۔

اَلْمُقِیْتُ۔ محافظ۔ نگران۔ وہ جو ہر شخص کو اس کی روزی یا ضرورت کی اشیاء پہنچاتا ہے۔ وہ جو مخلوقات کو ان کا رزق دیتا ہے*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو کسی چیز کی نگرانی و حفاظت کرے اور اس کی خوراک کا بند و بست کرے**۔ قرآن کریم میں ہے وَ کَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا (۴/۸۵)۔ اس کے معنی ہوں گے کائنات کی ہر شے کو اسبابِ زیست بہم پہنچانے والا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی محافظ اور قادر کے بھی ہیں۔

ق و س

اَلْقَوْسُ۔ کمان*** [قر]آن کریم میں قَابَ قَوْسَیْنِ (۵۳/۹) آیا ہے۔ اس کے مفہوم کے لئے عنوان (ق۔و۔ب) دیکھئے۔

قَاسَ الشَّیْءَ بِغَیْرِہٖ۔ کسی چیز کا کسی دوسری چیز سے اندازہ کرنا* (نیز ابن فارس)۔ [گو]یا اس قَاسَ یَقُوْسُ کو قَاسَ یَقِیْسُ پر قیاس کرلیا

*تاج۔ **راغب۔ ***تاج و راغب

جائے گا۔ دونوں ہم معنی ہیں۔ اَلْمِقْوَسُ۔ وہ جگہ جہاں سے گھوڑے گھوڑ دوڑ کے لئے چھوٹتے ہیں۔ اس کی اصل یہ ہے کہ وہاں ایک رسی کمان کی شکل کی باندھ دی جاتی ہے اور اس رسی کے پیچھے سے گھوڑوں کو چھوڑا جاتا ہے*۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ (ق۔و۔س) کا خاصہ شدت اور اجتماع ہے۔ قَوْسٌ (کمان) میں سختی بھی پائی جاتی ہے اور اس کے دونوں سروں کے ملے ہوئے ہونے کے اعتبار سے اجتماعیت بھی**۔

ق و ل

قَوْلٌ۔ زبان سے کچھ کہنا، خواہ وہ مفرد ہو یا جملہ ہو۔ جو بات ابھی ذہن میں ہو اور زبان تک نہ لائی گئی ہو اسے بھی قَوْلٌ کہتے ہیں۔ نیز عقیدے، خیال اور رائے کو بھی۔ جیسے فُلَانٌ یَقُوْلُ بِقَوْلِ الشَّافِعِیِّ وغیرہ***۔

اس کے مجازی معنی بہت سے آتے ہیں۔ مثلاً مارنا۔ غالب آنا۔ مرجانا۔ راحت پانا۔ متوجہ ہونا۔ وغیرہ***۔

تَقَوَّلَ عَلَیْہِ قَوْلاً کے معنی ہیں اپنی طرف سے بات بنا کر دوسرے کی طرف منسوب کرنا ($\frac{69}{44}$)۔

دل میں خیال کرنے کے لئے قرآن کریم میں ہے وَ یَقُوْلُوْنَ فِیْ اَنْفُسِهِمْ ($\frac{58}{8}$)۔ قَوْلٌ کی جمع اَقْوَالٌ اور اس کی جمع اَقَاوِیْلُ ہے ($\frac{69}{44}$)۔ قِیْلٌ۔ کہنا۔ بات چیت۔ دل کی پکار ($\frac{43}{88}$)۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ (ق۔و۔ل) کا خاصہ حرکت کرنا اور پھڑ پھڑانا ہے۔ قَوْلٌ میں زبان یا ہونٹوں کی حرکت موجود ہوتی ہے**۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، یہ اس کے ابتدائی اور حقیقی معنی ہیں۔ مجازی طور پر تو دل کے عقیدہ پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوجاتا ہے۔

قرآن کریم میں یہ مادہ بے شمار مقامات میں آیا ہے۔ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن ہر مقام پر اس کا مفہوم آسانی سے متعین ہوجائے گا۔ اس لئے ہمیں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

*تاج و راغب۔ **العلم الخفاق۔ ***تاج۔

ق و م

قَامَ ۔ قِیَامًا ۔ کھڑا ہونا ۔ متوازن ہونا ۔ کسی معاملہ کا اعتدال اور توازن پر ہونا ۔ محکم اور استوار ہونا ۔ ثابت اور دائم رہنا ۔ کسی کام کو ہمیشہ کرتے رہنا ۔ رک جانا ۔ کسی جگہ ٹھہر جانا ۔ بارونق ہونا* ۔ اَقَامَ ۔ درست اور سیدھا کیا ۔ کھڑا کیا * ۔

قَامَ الرَّجُلُ الْمَرْاَۃَ وَقَامَ عَلَیْھَا ۔ مرد نے عورت کی کفالت کی ، اسکی ضروریات کو پورا کیا اور ان کا ذمہ دار ہوا ۔ اس کے لئے رسد لایا ۔ قَوَّامٌ ۔ سامان رزق مہیا کرنے والا ، کیونکہ رزق سے معاشرتی زندگی کا توازن قائم رہتا ہے * ۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (۴/۳۴) کے یہی معنی ہیں ۔ یعنی تقسیم کار کی رو سے مردوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریات زندگی کے کفیل ہوں کیونکہ انہیں بچوں کی پرورش اور تربیت میں مصروف رہنا پڑتا ہے ۔ اس کے معنی حاکم یا داروغہ نہیں ہیں ۔ نیز قَوَّمَ الشَّیْءَ کے معنی ہیں کسی چیز کو صحیح طور پر برابر اور ہموار کر دینا یا درست کر دینا*۔

قَوَامٌ ۔ عدل و توازن ۔ وہ سامان جس کے ذریعے زندگی گذاری جائے ۔ اتنا کچھ جس سے صرف ضروریات زندگی پوری ہو سکیں ۔

قِوَامٌ ۔ وہ چیز جس پر کسی معاملہ کا دارو مدار ہو ۔ وہ جس کے سہارے کوئی معاملہ کھڑا رہ سکے ۔ اتنی روزی جو انسان کو کھڑا رکھ سکے ۔ چنانچہ فُلَانٌ قِوَامُ اَھْلِ بَیْتِہٖ کے معنی ہیں فلاں شخص اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے والا ہے * ۔

قَامَۃٌ ۔ آدمی کا قد ۔ قد کا متوازن طول ۔ حسن قامت * ۔ قِیْمَۃٌ ۔ کسی چیز کا بدل * ۔ جب ایک چیز کی جگہ دوسری چیز رکھدی جائے اور وہ اسکے برابر تصور کر لی جائے ، تو وہ اسکی قِیْمَۃٌ ہو جائیگی ۔ اِسْتَقَامَ الْاَمْرُ ۔ کسی معاملہ کا معتدل و متوازن ہو جانا * ۔ مُسْتَقِیْمٌ ۔ معتدل و متوازن ۔ ٹھیک ٹھیک توازن و تناسب لئے ہوئے * ۔ تَقْوِیْمٌ ۔ عدل و توازن برقرار کرنا * ۔ (تَقْوِیْمُ الْبُلْدَانِ ۔ جغرافیہ کے نقشہ کو کہتے ہیں ۔ اور آجکل تَقْوِیْمٌ کا لفظ کیلنڈر ، جنتری ، کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے)** ۔

مَقَامٌ ۔ کھڑے ہونے کی جگہ * ۔ قَیُّوْمٌ ۔ وَقَیَّامٌ ۔ اپنی مخلوق کے معاملات کی اسطرح تدبیر کرنے والا کہ انکی پیدائش ، اور روزی بہم پہنچانے کا بند و بست کرے اور ان کے رہنے کے مقامات کا علم رکھے ۔ جو ہر چیز

---

*تاج ۔ **محیط ۔

پر نگران ہو۔ نیز قَیُّوْمٌ کے معنے قائم بالذات بھی ہیں۔ یعنی جو اپنے قیام کے لئے کسی کا محتاج نہ ہو، لیکن اس کے بغیر کسی چیز کے قیام کا تصور بھی نہ کیا جا سکے۔ (۲/۲۵۵؛ ۲۰/۱۱۱) ***۔ اَمْرٌ قَیِّمٌ کے معنی ہیں مستقیم و مستوی امر۔ معتدل و متوازن کام *۔ خُلُقٌ قَیِّمٌ۔ متوازن اخلاق۔ دِیْنٌ قَیِّمٌ۔ ایسا دین جس میں ہر شے متوازن و متناسب ہو۔ کُتُبٌ قَیِّمَةٌ۔ وہ مستقیم و متوازن قوانین جو حق کو باطل سے واضح کر دیں *۔ قَوْمٌ۔ مردوں اور عورتوں کی جماعت۔ یا صرف مردوں کی جماعت جس میں عورتیں نہ ہوں *۔

مفردات امام راغب میں ہے کہ قِیَامٌ لِلشَّیْءِ سے کسی چیز کی رعایت اور حفاظت مقصود ہوتی ہے اور کبھی قِیَامٌ عزم اور پختہ ارادے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور قِیَامٌ اور قِوَامٌ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز مضبوط اور مستحکم رہ سکے۔ قَیُّوْمٌ۔ ہر چیز کا نگران۔ نیز اسے استحکام و توازن بخشنے، حفاظت کرنے اور وہ تمام چیزیں مہیا کرنے والا جو اسکی بقا و استحکام کے لئے ضروری ہیں۔

قِیَامَةٌ کا اصلی مفہوم ہے انسان کا یکبارگی اٹھ کھڑے ہونا۔ یہ لفظ قِیَامٌ کے آخر میں "ۃ" کے اضافہ سے بنا ہے جس سے مطلب ہے یکبارگی ہونا۔ القِیَامَةُ سے مراد اس خاص گھڑی کا واقع ہو جانا ہے جس میں انسان اسطرح یکبارگی کھڑا ہو جائے۔

اِقَامَةُ الشَّیْءِ۔ کسی چیز کا پورا پورا حق ادا کر دینا۔ نیز الاِقَامَةُ فِی الْمَکَانِ کسی جگہ جم کر رہنے کے معنوں میں آتا ہے **۔ اس سے مُقِیْمٌ، ہمیشہ رہنے والے کے لئے آتا ہے۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی توازن قائم رکھنے کے ہیں۔ لہذا اس مادہ سے جتنے الفاظ آئیں گے ان میں یہ بنیادی مفہوم ضرور موجود رہے گا۔ خواہ یہ توازن جسمانی ہیئت و پیکر کا ہو، یا معاشرتی اور تمدنی توازن، یا نفسیاتی توازن۔ جس چیز کا توازن بگڑ جائے وہ قائم (کھڑی) نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ قصہٗ حضرت موسیٰؑ کے ضمن میں یتیم بچوں کی دیوار کے متعلق ہے۔ جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ (۱۸/۷۷) وہ دیوار گرا چاہتی تھی تو اس نے اسے قائم (کھڑا) کر دیا۔ اسی سورہ (کہف) کے شروع میں قَیِّمًا کے پہلے لَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (۱۸/۱-۲) سے واضح کر دیا کہ قَیِّمٌ وہی چیز ہو سکتی ہے جس میں کسی قسم کی کجی نہ ہو۔ اسی سے دِیْنُ الْقَیِّمَةِ (۹۸/۵) اور کُتُبٌ قَیِّمَةٌ۔ (۹۸/۳) کے معنی واضح ہیں۔ خود قرآن کریم کے متعلق ہے کہ وہ ایسی راہ بتاتا ہے جو

*تاج۔ **راغب۔ ***تاج و لطائف اللغه

اَقْوَمُ (۹/۱۷) ھے - یعنی سب سے زیادہ سیدھی اور معتدل - اور انسان کے متعلق ھے کہ اسے اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (۴/۹۵) میں پیدا کیا گیا ھے - یعنی بہترین توازن کا حامل - اَلْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ (۳۵/۱۷) '' سیدھی ترازو '' سے مُسْتَقِیْمٌ کے معنی واضح ھیں - یعنی سیدھی راہ ھی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اسقدر متوازن کہ ذرا سی افراط و تفریط بھی اس کا توازن بگاڑ دے - جسطرح سورہ فرقان میں افراط و تفریط کی دو راھوں کے درمیان ، اعتدال کی روش کو کَانَ بَیْنَ ذَالِکَ قَوَاماً (۶۷/۲۵) کہا گیا ھے -

سورہ بقرہ میں مَشْیٌ کے مقابلہ میں قَامَ لاکر (۲/۲۰) بتا دیا ھے کہ اس کے معنی رک جانے اور ٹھہرجانے کے ھیں - نیز ظَعْنٌ (کوچ) کے مقابلہ میں اِقَامَۃٌ سے اس کا مفہوم واضح کر دیا ھے (۸۰/۱۶) - اسی طرح سورہ ھود میں اجڑی ھوئی بستیوں (حَصِیْدٌ) کے مقابلہ میں قَائِمٌ (۱۰۰/۱۱) لاکر یہ واضح کر دیا ھے کہ اسکے معنی آباد اور پر رونق کے ھیں - نیز سَبِیْلٍ مُقِیْمٍ (۷۶/۱۵) کے معنی بھی بارونق اور چلتے ھوئے راستے کے ھیں - سورہ تکویر میں لِمَنْ شَاءَ مِنْکُمْ اَنْ یَسْتَقِیْمَ (۲۸/۸۱) سے صِرَاطٌ مُسْتَقِیْمٌ (۵/۱) پر چلنے کی وضاحت ھو جاتی ھے -

قِیَامَۃٌ کا لفظ قرآن کریم کی ان بنیادی اصطلاحات میں سے ھے جن کا مفہوم بڑا جامع ھوتا ھے - جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ھے ، (امام راغب کے قول کے مطابق) اس کا مفہوم ھے ایسا قیام جو یکبارگی واقع ھو جائے - اس دنیا میں قِیَامَۃٌ کسی قوم کی وہ نشاۃِ ثانیہ (حیات جدید) ھے جو انقلاب کی رو سے ظہور میں آئے - یعنی وہ قوم یکبارگی اٹھ کھڑی ھو - اور مرنے کے بعد دوسری زندگی تو ھے ھی ایک انقلابی ظہور - قیامت ، آخرت ، ساعت ، بعث ، وغیرہ الفاظ کا مفہوم قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سامنے آجاتا ھے - ان مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ھوگا کہ متن کے اعتبار سے متعلقہ لفظ کے معنی اس دنیا میں انقلاب اور نشاۃِ ثانیہ ھیں یا اخروی زندگی کا بعث و قیام - [شاہ ولی اللہؒ - حجۃ اللہ البالغہ - کتابُ الفِتَن میں لکھتے ھیں کہ '' زبانِ شریعت میں حشر کے دو معنی ھیں - ایک ملک شام میں لوگوں کا جمع ھونا - قیامت سے پیشتر یہ واقعہ اسوقت ھوگا جب زمین پر لوگوں کی قلت ھو جائیگی تو بعض لوگ مختلف تقریبوں کی وجہ سے اور بعض لوگ آگ (جنگ) کی وجہ سے وھاں جمع ھونگے* - دوسرے حشر کے معنی ھیں موت کے بعد اکٹھا

* غالباً مغلوں کے شام پر حملہ کیطرف اشارہ ھے جو تیمور کی زیر سر کردگی ھوا تھا - خود شاہ صاحب نے اس کا ذکر چند سطور آگے چل کر کیا ھے -

ہونا"۔] اسی طرح قیامت کا لفظ بھی اس دنیا میں قیام اور موت کے بعد کے قیام کے لئے بولا جائیگا۔

قوم۔ قومیت۔ جب انسان نے انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر تمدنی اور اجتماعی زندگی شروع کی تو اس کا آغاز لامحالہ خاندان اور قبیلہ سے ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک خاندان (اور خاندان سے آگے بڑھ کر ایک قبیلہ) کے افراد ایک وحدت قرار پا گئے جن میں وجہ جامعیت خون کا رشتہ (یا نسبی تعلق) تھا۔ جب مختلف گروہوں میں باہمی مفاد کا تصادم ہوا تو ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن بن گیا۔ اسطرح ایک قبیلہ کے افراد میں باہمی عصبیت اور دوسرے قبیلہ کے افراد کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات بیدار ہوگئے۔ اور یوں انسانی وحدت (مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر) پارہ پارہ ہو گئی۔ یہ سلسلہ آجتک جاری ہے۔ دور حاضر کی سیاسی اصطلاح میں اسے قومیت یا نیشنلزم کہتے ہیں، جس نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ اس میں صرف اسقدر اضافہ ہوا ہے کہ بعض ممالک میں (ایک نسل کے بجائے) ایک وطن کی چار دیواری میں رہنے والے افراد کو ایک قوم قرار دیدیا جاتا ہے۔

اسلام نے انسانوں کی تقسیم کا یہ اصول بدل دیا اور کہدیا کہ ایک نظریۂ زندگی کے ماننے والے انسان (بلا لحاظ نسل۔ زبان۔ وطن) ایک برادری کے افراد ہیں اور اس کے برعکس نظریہ کے قائل، دوسری برادری کے افراد۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اسے ایمان اور کفر کی تفریق، اور دور حاضر کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی کی تمیز کہتے ہیں۔ لہذا، قرآن کریم کی رو سے دنیا میں قومیں دو ہی ہیں۔ ایک وہ جو قرآنی ضابطۂ حیات کو صحیح مانتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس کے خلاف کسی اور مسلک حیات کے قائل ہیں (۶۴/۲)۔ جب حضرت نوحؑ سے کہا گیا تھا کہ خود تیرا بیٹا بھی تیرے اپنوں میں سے نہیں (۱۱/۴۶) کیونکہ وہ ایمان نہیں لایا تھا، تو وہ اسی اصول کا اعلان تھا۔ اسی طرح جب حضرت لوطؑ سے کہا تھا کہ تیری بیوی بھی تیرے اپنوں میں سے نہیں کیونکہ وہ ان کی جماعت میں داخل نہیں ہوئی تھی، تو وہ بھی اسی اصول کی بنا پر تھا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اپنے باپ اور پھر ساری قوم سے کہدیا تھا کہ تم میرے اپنے نہیں ہوسکتے جب تک تم خدا پر ایمان نہ لاؤ، تو وہ بھی اسی حقیقت کا اظہار تھا (۶۰/۴)۔ اس کے برعکس انہوں نے اس اصل عظیم کا اعلان کیا تھا کہ میرے اپنے وہ ہیں جو میرا اتباع کرتے ہیں (۱۴/۳۶)۔ اسی معیار کے مطابق، خدا کے آخری نبیؐ نے ایک عالمگیر برادری کی تشکیل کی جب کہا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (۴۹/۱۰) "سب مومن آپسمیں بھائی بھائی ہیں" خواہ ان کا رنگ، نسل، زبان، وطن، کوئی بھی ہو۔

یہ ہے صحیح قومیت کا معیار جس کی رو سے قرآن کریم، انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل کرنا چاہتا ہے۔ اب دنیا، قومیت کے غلط اصول سے تنگ آکر خود اس حقیقت کی معترف ہو رہی ہے کہ انسانوں کے لئے صحیح وجہ جامعیت ہم آہنگی فکر و نظر (آئیڈیالوجی کی یکسانیت) ہے، نہ کہ اشتراک رنگ و وطن۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دنیا قرآنی اصول زندگی کو اختیار نہیں کرتی عالم انسانیت میں کبھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی سے وہ عالمگیر برادری وجود میں آسکتی ہے جو انسانوں کی خود ساختہ حدود و قیود سے بلند ہو کر، وحدت انسانیت کے اصول کی حامل ہوگی۔ یہی قرآنی معاشرہ کا مقصود و منتہٰی ہے۔

قرآن کریم نے جماعت مومنین کے مسلک اور روش زندگی کو "صراط مستقیم" سے تعبیر کیا ہے (۱/۵)۔ یعنی سیدھی اور متوازن ہدوش راہ۔ یہ چیز ایک عظیم حقیقت کیطرف دلالت کرتی ہے۔ قرآن کریم سے پہلے، ارباب فکر اور اہل مذاہب، زندگی کی حرکت کو دوری (Cyclic) تسلیم کرتے تھے۔ حکمائے یونان نے جب دیکھا کہ آسمان کے مختلف کرے گول ہیں تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ مقصود فطرت "دائرہ" ہے، سیدھا چلنا نہیں۔ اس اعتبار سے انہوں نے سب سے پہلے یہ نظریہ ایجاد کیا کہ کائنات کی حرکت دوری ہے۔ یعنی وہ ایک متعین دائرے میں گردش کر رہی ہے، آگے نہیں بڑھ رہی۔ اسی سے فیثا غورث نے تناسخ کا نظریہ قائم کیا۔ یعنی یہ نظریہ کہ انسانی روح، جون بدل بدل کر، بار بار اس دنیا میں، مختلف قالبوں میں آتی ہے۔ روح کو اس چکر سے نجات مل جانا، مقصود حیات ہے۔ یہی تصور ہندؤں کے فلسفہ کی بنیاد ہے اور اسی پر ان کے تصوف (یوگ) کی عمارت بھی استوار ہوتی ہے۔ یعنی انسانی روح درحقیقت خدا کی روح (پرم آتما) کا ایک جزو ہے جو اپنی اصل سے الگ ہو کر، زندگی کے چکر میں پھنس چکی ہے۔ اس کا ان چکروں سے آزادی حاصل کر لینا اور پھر سے اپنے کل سے جا ملنا، مقصود زندگی ہے۔ یہی تصور مجوسیوں کے ہاں پایا جاتا ہے اور اسی سے "وحدت الوجود" کا نظریہ مستعار لیا گیا ہے جو ہمارے تصوف کی بنیاد ہے۔ یہی "چکر" عیسائیت اور یہودیت میں ملتا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر بچہ اپنے اولین ماں باپ (آدم و حوا) کا گناہ، پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اگر وہ حضرت مسیح کے کفارہ پر ایمان لے آتا ہے تو وہ گناہ اس سے دھل جاتا ہے اور وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے اسلاف سے جو چند دنوں کے لئے (گوسالہ پرستی کی) غلطی ہوگئی تھی اس کی پاداش میں انہیں چند دنوں کے لئے جہنم میں جانا پڑے گا۔

آپ نے دیکھا کہ ان تمام نظریات کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی زندگی کا منتہیٰ اور مقصود وہ کچھ ہو جانا ہے جو وہ پہلے تھی۔ یعنی اس میں آگے بڑھنے یا ترقی کرنے کا سوال نہیں۔ (As you were) ہوجانا مقصودِ حیات ہے۔ دوری حرکت (Cyclic Movement) سے بھی مراد ہے۔ یعنی ایک دائرے میں گردش کرتے ہوئے جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ جانا۔

قرآن کریم نے اربابِ فکر اور اہلِ مذاہب کے اس غلط نظریہ کی تردید کی اور کہا کہ زندگی کولھو کے بیل کی طرح، ایک دائرے میں گردش کرنے کا نام نہیں۔ آگے بڑھنے اور بلند ہونے کا نام ہے۔ خدا، کائنات کو صراط مستقیم پر لئے جارہا ہے۔ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۱/۵۶)۔ اس میں نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ (۳۵/۱)۔ اور انسان کو بھی صراط مستقیم پر چلنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں زندگی کی ممکنات (Possibilities) ودیعت کر دی گئی ہیں اور جد و جہد کا وسیع میدان دے دیا گیا ہے۔ جو شخص، قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گا، اس کی ممکنات، مشہود ہوتی جائیں گی اور وہ سفر زندگی میں آگے بڑھتا جائیگا۔ اس طرح اس کا سفر، ایک دائرے میں نہیں، بلکہ سیدھے اور متوازن راستے پر ہوگا۔ اس سے اس کی زندگی کی سطح بلند ہوتی جائے گی اور وہ ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا جائیگا۔ لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹) "تم ضرور منزل بہ منزل۔ درجہ بہ درجہ۔ بلند ہوتے چلے جاؤ گے"۔ اس لئے، خدا صرف صراط مستقیم (سیدھی اور توازن بدوش) راہ ہی کا مالک نہیں۔ وہ ذِی الْمَعَارِجِ (۷۰/۳) بھی ہے۔ یعنی "سیڑھیوں والا"۔ بلندیوں کی طرف لے جانے والا۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے، زندگی کا منتہیٰ (As you were) ہو جانا نہیں۔ بلکہ ارتقائی منازل طے کرکے آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔ کائنات میں خدا کا قانونِ ارتقاء کار فرما ہے۔

زندگی کی دوری حرکت کا تصور، عہد کہن کے انسانی ذہن ہی کا مغالطہ نہیں تھا۔ اس زمانے میں بھی جہاں انسانی فکر نے وحی سے روشنی نہیں لی، وہ اسی چکر میں پھنس گیا ہے۔ جرمنی کے مشہور فلاسفر نیٹشے کا "تکرارِ ازلی" (Eternal Recurrence) کا نظریہ اسی مغالطہ کا رہین منت ہے۔ ہیگل کا نظریۂ اضداد بھی اسی کا مظہر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ایک تصور (Idea) پیدا ہوتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنے شباب پر پہنچتا ہے تو اس میں سے اس کی ضد دوسرا نظریہ پیدا ہو جاتا ہے جو پہلے نظریہ کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر جب یہ دوسرا نظریہ پروان چڑھتا ہے تو اس میں سے اس

کی ضد پیدا ہوتی ہے ۔ تصورات (Ideas) کا یہی چکر ہے جو کائنات میں کارفرما ہے ۔ ہیگل (Hegel) کے متبع مارکس (Marx) نے کہا کہ یہ چکر تصورات میں نہیں بلکہ نظامہائے زندگی (Social Orders) میں کار فرما ہے ۔ دنیا میں ایک معاشی نظام قائم ہوتا ہے ۔ پروان چڑھتا ہے ۔ پھر اس میں سے اس کی ضد دوسرا نظام پیدا ہوتا ہے جو پہلے نظام کے لئے پیغام مرگ بن جاتا ہے ۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری ہے ۔ پہلے نظام سرمایہ داری کا دور دورہ تھا ۔ جب وہ نظام شباب تک پہنچ گیا تو اس میں سے اس کی ضد ، نظام اشتراکیت پیدا ہوگیا ۔ اب اس کی باری ہے ۔

آپ نے غور کیا کہ تنہا عقل انسانی نے جب بھی زندگی کے متعلق کوئی تصور قائم کرنا چاہا ہے تو اس نے اس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں ۔ یہ صرف وحی کی روشنی ہے جو انسان کو صحیح نظریہ زندگی عطا کر سکتی ہے ۔ اور وہ نظریہ زندگی ہے ''صراطِ مستقیم'' پر چلنا ۔ یعنی نہ ایک مقام پر کھڑے رہ کر جامد اور متصلب (Static) ہو جانا ، اور نہ ہی دائرے میں گردش کرتے رہنا ۔ بلکہ زندگی کے سیدھے اور ہموار راستے پر چلتے جانا اور اسطرح آگے بڑھتے چلے جانا ۔ ''حرکت اور ارتقاء'' یہ ہے قرآنی نظریہ زندگی کا ماحصل جسے اس نے ''صراط مستقیم'' سے تعبیر کیا ہے ۔

ق و ی

قُوَّۃٌ ۔ دراصل رسی کے ایک بٹ کو کہتے ہیں** ۔ (جس کی جمع اَلْقُوَیٰ ہے) ۔ حَبْلٌ قَوٍ ۔ مختلف بٹوں والی رسی ۔ یہیں سے اَلْقُوَّۃُ کے معنی قدرت کے ہیں ۔ یہ ضُعْفٌ کی ضد ہے ، خواہ جسمانی ہو یا عقلی ۔ اسکی جمع قِوًی اور قُوًی ہے ۔ اَلْقَوِیُّ طاقتور اور قوت والے کو کہتے ہیں ۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے ، اس لئے کہ کمالِ قوت اور ہر قسم کی طاقت کا وہی تنہا مالک ہے (۱۱/۶۶) ۔ فَرَسٌ مُقْوٍ ۔ طاقتور گھوڑا* ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے ایک بنیادی معنی تو سختی ، قوت اور زور کے ہیں لیکن دوسرے بنیادی معنی قلت خیر ۔ یعنی مال و دولت اور عمدہ چیزوں کی کمی کے ہیں ۔ اس اعتبار سے القَوَاءُ ویران زمین کو کہتے ہیں اور اَلْقَوَیٰ بھوک کو کہتے ہیں ۔ اصل میں اس کے معنی خالی ہونے کے ہیں ۔

*تاج و محیط ۔ **بٹ کے معنے بھی سمجھ لینے چاہئیں ۔ مثلاً تین باریک رسیوں کو بل دیکر ایک موٹی رسی بنائی جائے ۔ تو ان تین رسیوں میں سے ہر ایک کو اس موٹی رسی کا بٹ کہینگے ۔

اَقْوَتِ الدَّارُ۔ گھر خالی ہوگیا۔ اس اعتبار سے چٹیل میدان کو بھی اَلْقَوَاءُ کہتے ہیں جو سبزی سے خالی ہو چکا ہو۔ اَلْقَاوِیَۃُ۔ انڈے کے خالی چھلکے کو کہتے ہیں جس سے بچہ نکل چکا ہو۔ اَلسَّنَۃُ الْقَاوِیَۃُ۔ اُس سال کو کہتے ہیں جس میں بارش بہت کم ہوئی ہو۔ اَقْوَی الرَّجُلُ۔ بے آب و گیاہ زمین میں اس کا توشہ ختم ہوا۔ وہ بھوکا اور نادار ہوا۔ اس کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا، خواہ وہ ایسی ناداری کی حالت میں اپنے گھر اور اپنی قوم کے درمیان ہی کیوں نہ ہو*۔

قرآن کریم نے زمین کی پیداوار کے متعلق کہا ہے کہ وہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ (۵۶/۷۳) ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ کے ان افراد کے لئے ہے جن کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہو۔ یعنی زمین کی پیداوار انسانی پرورش کے لئے ہے نہ کہ ذاتی املاک بنا لینے کے لئے۔ صاحب محیط نے مُقْوِیْنَ کے معنی لکھے ہیں وہ جن کے پیٹ یا توشہ دان کھانے سے خالی ہوں**۔ یا وہ لوگ جو بے برگ و گیاہ میدان میں اتریں جہاں کھانے کو کچھ نہ ہو۔ مفہوم دونوں کا ایک ہے۔ یعنی معاشرہ کے ضرورت مند افراد۔ اسی کو دوسری جگہ سَوَاءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۴۱/۱۰) کہا گیا ہے۔ یعنی زمین کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔

قُوَّۃٌ۔ کے لئے قرآن کریم میں ہے۔ خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ (۱۹/۱۲)۔ اس ضابطۂ خداوندی کو نہایت مضبوطی سے پکڑو۔ پختہ عزم کرو کہ اس کی تعمیل کرو گے۔ ذُوالْقُوَّۃِ الْمَتِیْنِ (۵۱/۵۸)۔ زبردست قوت والا۔ خدا۔ شَدِیْدُ الْقُوٰی (۵۳/۵)۔

لہذا، مومن بھی (حد بشریت کے اندر) صاحب قوت ہوتا ہے۔ کمزور اور ناتواں نہیں ہوتا۔ جو قوم کمزور اور ناتواں ہو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ قرآنی معیار کے مطابق جماعت مومنین نہیں ہے۔ لیکن ان کی قوت دنیا میں نظام عدل و مساوات قائم کرنے کے لئے ہوگی، نہ کہ کمزوروں کو لوٹنے کھسوٹنے اور ناتوانوں کا گلا گھونٹنے کے لئے۔ قوت جب ظالم کا ظلم روکنے کے لئے صرف کی جائے تو خیر ہوگی اور جب مظلوم کو لوٹنے کے لئے استعمال کی جائے تو شر ہوجائیگی۔

ق ی ض

اَلْقَیْضُ۔ انڈے کے اوپر کا خشک اور سخت چھلکا۔ قَیَّضَ۔ کسی کو کسی دوسری چیز کے ساتھ اسطرح لگا دینا کہ وہ اس کے ساتھ چپکی بھی رہے

*تاج و محیط۔ **ابن قتیبہ نے بھی یہی معنی لکھے ہیں (القرطین۔ ج/۲ صفحہ ۱۵۵)

اور اس پر غالب بھی رہے ، جسطرح انڈے کا چھلکا اس کی زردی و سفیدی پر مستولی رہتا ہے* ۔ قرآن کریم میں ہے وَ قَیَّضْنَا لَھُمْ قُرَنَاءَ (۴۱/۲۵) ۔ اور ہم نے ان کے لئے ان کے ساتھی لازم کر رکھے ہیں جو ان پر مستولی رہتے ہیں ۔

ق ی ع (ق و ع)

اَلْقَاعُ ۔ ہموار نشیبی زمین جو وسیع ہو اور اس میں نشیب و فراز نہ ہو ۔ نہ اس میں کنکریاں ہوں نہ پتھر اور نہ ہی اس میں درخت پیدا ہوتے ہوں ۔ صاف چٹیل میدان جس میں ٹیلے اور پہاڑ نہ ہوں ۔ قَاعَۃُ الدَّارِ ۔ گھر کا صحن یا میدان ۔ صاغانی نے کہا ہے کہ ق ۔ و ۔ ع کی ترکیب کسی جگہ میں پھیلنے پر دلالت کرتی ہے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جگہ میں کشادگی کے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے قَاعًا صَفْصَفًا (۲۰/۱۰۶) ۔ صاف چٹیل میدان جسکی تمام اونچ نیچ ختم ہو جائے ۔ اس کی جمع قِیْعَۃٌ آتی ہے ۔ ویسے قِیْعَۃٌ قَاعٌ کے ہم معنی بھی ہے ۔ سورۃ نور میں ہے ۔ کَسَرَابٍ بِقِیْعَۃٍ (۲۴/۳۹) ۔ چٹیل میدان میں سراب کی طرح ۔

ق ی ل

قَالَ ۔ یَقِیْلُ ۔ قَیْلًا ۔ قَیْلُوْلَۃً ۔ دوپہر کو سونا ۔ یا دوپہر کے وقت محض استراحت کے لئے لیٹنا ، خواہ اس میں سو یا نہ جائے ۔ اَلْقَیْلُ ۔ دودھ جو دوپہر کو پیا جائے ۔ یا دوپہر میں کوئی چیز پینا ۔ اَلْمَقِیْلُ ۔ قیلولہ کرنے کی جگہ** ۔ (۲۵/۲۴) ۔ قرآن کریم میں ہے اَوْ ھُمْ قَائِلُوْنَ (۷/۴) ۔ یا جبکہ وہ دوپہر کو آرام کررہے ہوں ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔

ک

کَ (حرف)

کَ ۔ حرف جر ہے ۔ حسب ذیل معنوں کے لئے آتا ہے ۔

(۱) تشبیہ کے لئے۔ اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ (۷/۱۷۹)۔ وہ مویشیوں کی طرح ہیں ۔ ان کی مثل ۔ ان جیسے ۔

(۲) سبب یا مقصد (تعلیل) کےلئےبھی آتا ہے ۔ وَاذْکُرُوْهُ کَمَا هَدٰىکُمْ (۲/۱۹۸)۔ تم اسے یاد کرو (اس کے قوانین کو سامنے رکھو) اس لئے کہ اس نے تمہیں راہ نمائی دی ہے (یہ معانی مرزا ابوالفضل نے اخفش کے حوالہ سے لکھے ہیں) ۔ اگرچہ اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ تم اسے یاد کرو جسطرح اس نے تمہیں ہدایت دی ہے ۔

(۳) کبھی یہ زائد ہوتا ہے ۔ مثلاً لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (۴۲/۱۱) ۔

کَ (ضمیر)

کَ ۔ ضمیر منصوب متصل ہے ۔ واحد مذکر حاضر کے لئے آتی ہے ۔ ضَرَبَکَ ۔ اس نے تجھے مارا ۔

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے ۔ غُلَامُکَ ۔ تیرا غلام ۔

قرآن کریم میں ہے اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ (۲/۱۸۶) ۔ ”جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں“ ۔ دوسری جگہ ہے اُسْکُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُکَ الْجَنَّةَ (۲/۳۵) ”تو اور تیری بیوی جنت میں رہو“ ۔

کِ (ضمیر)

کِ ۔ ضمیر منصوب متصل ہے ۔ واحد مؤنث حاضر کےلئے استعمال ہوتی ہے ۔ قرآنکریم میں حضرت مریمؑ کےمتعلق ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىکِ وَطَهَّرَکِ (۳/۴۲)۔ ”اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاک کیا“ ۔

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے ۔ مثلاً لِیَذَنْبِکَ (۱۲/۲۹) ۔ ''اپنے قصور کے لئے'' ۔

ک ا س

اَلْکَأْسُ ۔ پینے کا برتن جبکہ اس میں پینے کی چیز موجود ہو ۔ اگر پینے کی چیز موجود نہیں تو اسے کَأْسٌ نہیں کہا جائے گا قَدَحٌ کہا جائے گا* ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے کہا ہے کہ خالی پیالے کو زُجَاجَۃٌ کہا جائیگا ۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ خالی پیالہ یا صرف شراب (پینے کی چیز) کو بھی کَأْسٌ کہدیا جاتا ہے** ۔ خود تاج نے بھی اسکی تائید کی ہے ۔ قرآن کریم میں کَأْسٍ مِنْ مَعِیْنٍ (۳۷/۴۵) آیا ہے ۔ آب رواں سے بھرا ہوا پیالہ ۔

کَأَنَّ ۔ (حرف)

کَ (تشبیہ) + اَنَّ (تاکید) سے مرکب ہے ۔ اس کا استعمال اس موقع پر ہوتا ہے جہاں تشبیہ بہت قوی ہو ۔ قَالَتْ کَاَنَّهٗ هُوَ (۲۷/۴۲) ۔ اس نے کہا کہ یہ تو بالکل ویسا ہی ہے ۔ گویا وہی ہے ۔ کبھی اس کی تشدید (شد) کو دور بھی کر دیتے ہیں ۔ جیسے کَاَنْ لَّمْ یَدْعُنَا (۱۰/۱۲) گویا ہمیں پکارا ہی نہ تھا ۔ محیط نے لکھا ہے کہ اگر کَاَنَّ کی خبر اسم جامد نہ ہو تو اس کے معنے ظن کے ہوتے ہیں ۔

کَاَیِّنْ

کَاَیِّنْ ۔ کتنے ہی ۔ یہ زیادہ تر تعداد میں ابہام اور کثرت ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے ۔ وَ کَاَیِّنْ مِنْ نَّبِیٍّ (۳/۱۴۵) ۔ کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں ۔ یعنی تعداد متعین تو نہیں لیکن کم بھی نہیں ۔

ک ب ب

کَبَّهٗ یَکُبُّهٗ کَبًّا ۔ اس نے اسے اوندھا کر دیا ۔ کَبَّهٗ لِوَجْهِهٖ فَانْکَبَّ ۔ اس نے اسے منہ کے بل گرا دیا تو وہ منہ کے بل گر گیا ۔ کَبْکَبَ الشَّیْءَ ۔ اس نے اس چیز کو اوپر سے نیچے کی طرف گڑھے میں پھینک دیا ۔ کَبْکَبَهٗ ۔ اسے الٹا اور پچھاڑ دیا ۔ اہل لغت نے

*تاج ۔ **راغب ۔

کہا ہے کہ کَبْکَبَ میں بار بار اوندھا ہونے کا تصور پایا جاتا ہے۔ یعنی جس چیز کو پھینکا جائے وہ بار بار اوندھی ہو کر نیچے کی جگہ قرار گیر ہو جائے *۔ اس ''قرار گیر ہونے'' کا مفہوم اس سے پیدا ہوتا ہے کہ ابن فارس کے نزدیک اس مادہ کے بنیادی معنی اکٹھا کرنے کے ہیں۔ [کَبْکَبَ رباعی ہے اس لئے اسے الگ لکھنا چاہئے تھا لیکن چونکہ بعض ائمّہ لغت نے اسے کبب کے تحت لکھا ہے اس لئے ہم نے بھی یہیں لکھنا مناسب سمجھا ہے]۔

اَلْمُکِبُّ وہ آدمی جس کا سر جھکا ہو اور اس لئے اسکی نگاہیں زمین کیطرف رہیں۔ اَکَبَّ الرَّجُلُ۔ وہ منہ کے بل گر گیا۔ اَکَبَّ الرَّجُلُ عَلٰی عَمَلٍ۔ وہ کسی کام میں لگ گیا *۔

قرآن کریم میں اہل جہنم کے متعلق ہے۔ فَکُبْکِبُوْا فِیْهَا (۲۶/۹۴)۔ انہیں اس میں اوندھے منہ ڈالا جائے گا۔ (خاسر و نامراد اور ذلیل و خوار)۔ سورہ نمل میں ہے۔ فَکُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ۔ (۲۷/۹۰) انہیں اوندھا کرکے داخل جہنم کر دیا گیا۔ سورہ ملک میں مَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖ، کے مقابل میں ہے، مَنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۶۷/۲۲)۔ اس سے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس غلط روش پر چلنے والے جو تباہیوں اور بربادیوں کی طرف لے جائے۔ اوندھی کھوپڑی کے لوگ جو ذرا عقل و بصیرت سے کام نہ لیں اور سر نیچا کئے، بلا سوچے سمجھے، غلط راستے پر چلتے جائیں۔ ان کے مقابلہ میں وہ لوگ ہیں جو صحیح، سالم سیدھے متوازن راستے پر چلے جائیں۔

ک ب ت

کَبْتٌ۔ کے اصلی معنی کَبَّ کے آتے ہیں۔ یعنی منہ کے بل گرا دینا۔ رسوا اور ذلیل کر دینا۔ شکست دیکر لوٹا دینا۔ ازہری نے کہا ہے کہ کَبْتٌ کی اصل کَبْدٌ ہے۔ (دال کو تاء سے بدل دیا گیا ہے) جس کے معنی جگر ہیں جو غیظ و غضب کا مخزن ہے۔ لہذا اس کے معنی ہیں دشمن کو اسکے غیظ و غضب سمیت لوٹا دینا**۔ راغب نے لکھا ہے کہ اسکے معنی کسی کو تشدد اور تذلیل کے ساتھ واپس کر دینے کے ہیں***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ذلیل کرنے اور کسی چیز سے ہٹا دینے اور پھیر دینے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے اَوْ یَکْبِتَهُمْ (۳/۱۲۶) یا انہیں ذلیل کر دے گا۔

*تاج۔ راغب۔ محیط۔ **تاج۔ ***راغب۔

سورہ مجادلہ میں ہے۔ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۵/۵۸) جسطرح ان سے پہلے لوگ جو حق کی مخالفت کیا کرتے تھے، ذلیل و خوار ہوئے تھے، اسی طرح یہ بھی ذلیل و رسوا کئے جائیں گے۔

ک ب د

اَلْكَبْدُ۔ وَالْكِبْدُ وَالْكَبِدُ۔ جگر۔ اَلْكُبَادُ۔ درد جگر۔ اَلْكَبَدُ۔ مشقت۔ سختی۔ ٹیلہ یا آسمان کا وسط۔ نیز اس کے معنی استقامت اور اعتدال کے آتے ہیں *۔ راغب نے كَبَدٌ بمعنی كُبَادٌ یعنی درد جگر بھی لکھا ہے **۔ قرآن کریم میں ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ (۴/۹۰) فراء نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو ایسا پیدا کیا ہے کہ اس میں پورا پورا اعتدال اور تناسب ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے انسان کو ایسا پیدا کیا ہے کہ وہ تمام مشکلات اور موانع کا مقابلہ کر سکتا ہے *۔ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے انسان کو اسطرح پیدا کیا ہے کہ اس کی ذات کی نمود اور نشوو نما سختیوں سے تصادم میں ہوتی ہے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں شدت اور قوت کے بتائے ہیں۔

ک ب ر

كِبَرٌ اور كُبْرٌ کے معنی ہیں بڑا ہونا۔ صِغَرٌ کی ضد ہے۔ اَلْكَابِرُ اور اَلْكَبِيْرُ۔ بڑا۔ واضح رہے کہ كَبُرَ کے معنی ہیں بڑا ہونا (مرتبہ یا جسامت وغیرہ میں) اور كَبِرَ کے معنی ہیں معمر ہونا۔ اَلْكِبْرُ۔ کسی چیز کا بڑا حصہ۔ وَ الَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ (۱۱/۲۴)۔ ان میں سے جس نے اس معاملہ کا بڑا حصہ اپنے سر لیا۔ یعنی جس شخص پر اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ كِبْرِيَاءٌ کے معنی حکومت اور مملکت کے ہیں۔ اس کا مفہوم، آج کی اصطلاح میں، حاکمیت اعلیٰ (Sovereignty) ہے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وَ لَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳۷/۴۵) ''ارض و سما (جملہ کائنات) میں اقتدار اعلیٰ صرف خدا کا ہے۔ وہ (بڑے) غلبہ والا، حکمت والا ہے''۔ وہ اَحْكَمُ الْحَاكِمِيْنَ ہے (۸/۹۵)۔ یہی مفہوم لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ کا ہے۔ یہی اقتدار خدا کے علاوہ کسی اور کا نہیں۔

---

*تاج و محیط۔ **راغب۔

جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو حق کی دعوت دی تو اس نے (اسکی قوم نے) کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ تمہارا منشاء کیا ہے - تم (دونوں بھائی) چاہتے ہو کہ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِی الْاَرْضِ (۱۰/۷۸) - "ملک میں اقتدار اعلیٰ تم دونوں کا ہو جائے" -

تَكَبَّرَ اور اِسْتَكْبَرَ کے معنی ہیں بڑا بننا - سرکشی اختیار کرنا - اَبیٰ وَ اسْتَكْبَرَ (۲/۳۴) - كَبُرَ عَلَيْهِ الْاَمْرُ - معاملہ اس پر شاق گذرا - گراں گزرنے کے معنوں میں (۶/۳۵ و ۱۰/۷۱ و ۴۲/۱۳) میں آیا ہے - اَلْكَبِيْرُ - سردار - نیز معلم اور استاد کو بھی کہتے ہیں - اَكْبَرَتِ الْمَرْاَةُ - اس وقت کہتے ہیں جب عورت کو حیض آجائے - اور اَكْبَرَ الرَّجُلُ جب مرد کو "مادہٗ مردمیت" آنے لگے - چنانچہ اول الذکر معانی کی رو سے مجاہد نے کہا ہے کہ سورۃ یوسف میں جو ہے کہ جب عورتوں نے یوسف کو دیکھا - اَكْبَرْنَهٗ (۱۲/۳۱) - تو اس کے معنی ہیں انہیں حیض آگیا (یا مادہ خارج ہوگیا) - یعنی اَكْبَرْنَ کے معنی ہیں حِضْنَ - اور ہاء وقف کیائے ہے * - لیکن ہمارے نزدیک یہ مفہوم بے معنی اور رکیک ہے - اس کے معنی صاف ہیں کہ جب ان عورتوں نے حضرت یوسفؑ کو دیکھا تو انہیں بہت بڑا پایا -

قرآن کریم میں اِسْتَكْبَرَ، سجدہ اور اطاعت کے مقابلہ میں آیا ہے - (۲/۳۴ و ۴/۱۷۲) - اور ضعیف اور کمزور لوگوں کے مقابلہ میں بھی لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا (۱۴/۲۱) آیا ہے - اَدْنیٰ کے مقابلہ میں اَكْبَرُ (۳۲/۲۱) میں آیا ہے -

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا - اَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِیْ صُدُوْرِكُمْ (۱۷/۵۱) - یا کوئی اور ایسی مخلوق جس کے متعلق تم خیال کرتے ہو کہ اس کا زندہ ہونا بہت ہی مشکل ہے -

اَلْمُتَكَبِّرُ (۵۹/۲۳) - خدا کی صفت ہے - تمام عظمتوں اور بڑائیوں کا مالک - اور چونکہ خدا کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرنا مومن کی اصل زندگی ہے اس لئے اس معنی میں مُتَكَبِّر ہونا مستحسن ہے - (معیوب نہیں) یعنی —

مومنے بالائے ہر بالا ترے غیرت او بر نتابد ہمسرے

اسی کو قرآن کریم نے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (۳/۱۳۸) کہا ہے - تکبر وہ بُرا ہے جس کی رو سے انسان یہ چاہے کہ بغیر تعمیری نتائج پیدا کئے لوگوں

* تاج -

سے اپنی بڑائی منوائے۔ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (۷/۱۴۶)۔ یہ استبداد ہے۔

لیکن اگر اس کا مفہوم اقتدار اعلیٰ لیا جائے تو پھر ''تکبر'' کسی انسان کے لئے جائز نہیں ہوگا۔ صرف خدا کے لئے مختص ہوگا۔ اس اعتبار سے آیت (۷/۱۴۶) کے معنی یہ ہونگے کہ تکبر (اقتدار اعلیٰ) صرف اَلْحَقّ کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ یعنی اقتدار اعلیٰ صرف قوانین خداوندی کو حاصل ہوسکتا ہے۔ کسی انسان کو نہیں۔ کِبْرٌ کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی کے نیچے نہ رہنا۔ یہ بھی انسان کے لئے جائز نہیں کیونکہ اسے قوانین خداوندی کے تابع رہنا چاہئے۔

کُبَّارٌ۔ بہت ہی بڑا (۷۱/۲۲)۔ اَلْکُبَرُ۔ بہت بڑی مصیبتوں۔ (۷۴/۳۵)۔ سورۃ مدثر میں ہے کہ نبی اکرم سے کہا گیا ہے کہ قُمْ فَاَنْذِرْ (۷۴/۲) اُٹھ، اور لوگوں کو ان کی غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کردے۔ اس کے بعد ہے۔ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ (۷۴/۳)۔ پہلا حصہ (یعنی لوگوں کو ان کی غلط روش سے باز رکھنا) تخریبی یا تمہیدی تھا۔ یہ دوسرا حصہ مثبت یا تعمیری ہے۔ یعنی ایسا نظام قائم کردے، ایسی صورتِ حالات پیدا کر دے، ایسا نقشہ جمادے، ایسا معاشرہ متشکل کردے، کہ جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ فی الحقیقت خدا کا قانون اور اس کا نظام تمام قوانین و نظام ہائے عالم سے بلند و برتر ہے۔ نظری اعتبار سے تو دنیا کی ہر قوم یہی کہتی ہے کہ ہمارا نظام (یا مذہب) سب سے اونچا ہے۔ لیکن تم ایسا کرکے دکھا دو جس سے ہر شخص بے ساختہ پکار اُٹھے کہ بے شک ہر قسم کی عظمتیں اور بڑائیاں قانون خداوندی کے لئے ہیں۔ اسی کو وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا کہا گیا ہے (۱۷/۱۱۱)۔ اور وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (۲۹/۴۵)۔ اذان اور صلٰوۃ میں اللّٰہُ اَکْبَرُ* اسی حقیقت کا اعلان ہے کہ دنیا میں سب سے اونچا، بڑا، اور غالب نظام صرف خدا کا نظام ہے جس کے قیام اور استحکام کے لئے ہم اٹھے ہیں۔ یہی وہ اعلان (تَکْبِیْرٌ) تھا جس سے، نبی اکرم کی مدنی زندگی کے دس سالہ دور میں، اسلامی مملکت میں قریب پونے تین سو مربع میل یومیہ کے حساب سے وسعت ہوتی گئی تھی۔ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کا رقبہ قریب بائیس لاکھ مربع میل تک پھیل گیا تھا۔ اور قرآنی نظام، ایرانی

*یہ لفظ (اکبر) خدا کے لئے قرآن کریم میں نہیں آیا۔ لیکن اس کے اکبر ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اکبر ہے ہی وہی۔

اور روسی نظاموں پر غالب آ گیا تھا ۔ غور کیجئے کہ کس قدر عظیم القدر تھا یہ اعلان اور عزم جو آج ایک بے روح رسم بن کر رہ گیا ہے ۔ اقبال نے کسقدر صحیح کہا ہے کہ

ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

ک ت ب

کَتَبَ ۔ عرب اپنی اعلیٰ نسل کی اونٹنیوں کی شرمگاہ میں لوہے کا چھلہ سا ڈال دیتے تھے تاکہ وہ ہر قسم کے اونٹوں سے حاملہ نہ ہونے پائیں ۔ اسے کَتَبَ النَّاقَةَ کہتے تھے ۔ ابن فارس نے بھی اس معنی کی تائید کی ہے ۔ ہمارے ہاں گھوڑیوں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں ۔ اسی طرح جب وہ اونٹنی کے نتھنوں کو چمڑے کے باریک تسمہ سے سی کر بند کر دیتے تھے تاکہ وہ اپنے بچہ کو سونگھ نہ سکے تو اسے بھی کَتَبَ کہتے تھے* ۔ اسی سے مشکیزہ یا بوری کے منہ کو سی کر بند کر دینے کے لئے بھی کَتَبَ کہتے تھے ۔ یہیں سے لفظ کِتَابٌ ہے ، جس سے مراد منتشر اوراق کی حلقہ بندی کر کے انہیں اس طرح مجتمع اور یکجا کر دینا تھا جس طرح بوری میں سامان بند کر کے اسے اوپر سے سی دیا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں ۔ اس سے کِتَابٌ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔

اس سے ظاہر ہے کہ جب قرآن کریم نے اپنے آپ کو کِتَابٌ کہا ہے تو قرآن کریم منتشر اوراق یا کھجوروں کے پتوں یا ہڈیوں کے ٹکڑوں پر بکھرا ہوا نہیں تھا ، بلکہ ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب و مدون تھا ۔ منتشر حالت میں اسے کِتَابٌ کہا ہی نہیں جا سکتا تھا ۔

کَتْبٌ ۔ چونکہ منتشر خیالات کو لکھ کر ایک جگہ محفوظ کیا جاتا ہے اسلئے کَتَبَ کے معنی ''اس نے لکھا'' ہو گئے ۔ اور اِکْتَتَبَ کے معنی ہیں اس نے خود لکھا یا کسی سے لکھوایا یا کسی سے کہا کہ وہ بولتا جائے اور یہ لکھتا جائے ($\frac{۲۵}{۵}$) ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی گھڑ لینے کے ہیں ۔

کِتَابٌ کے معنی فیصلہ اور حکم کے بھی آتے ہیں* ۔ قرآن کریم میں کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ ($\frac{۲}{۱۷۸}$) ۔ یا کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ($\frac{۲}{۱۸۳}$) ۔ فرض اور ضروری قرار دینے کے معنوں میں آیا ہے ۔ یعنی جو کام قانوناً

لازم قرار دیا جائے۔ اسی لئے مجموعہ قوانین کو کِتَابٌ کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں گوناگوں احکام و اوامر جمع ہوتے ہیں۔ ابن فارس نیز صاحب لطائف اللغۃ نے بھی اَلْكِتَابُ کے معنی اَلْفَرْضُ اور اَلْحُكْمُ لکھے ہیں۔ لہذا، جب قرآن کریم کو کِتَابٌ کہا گیا ہے تو اس کے معنی ضابطۂ قوانین کے ہیں۔

سورۃ نور میں ہے وَ الَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ (۲۴/۳۳) یعنی (تمہارے غلاموں میں سے) جو آزادی حاصل کرنے کے لئے معاہدہ کرنا چاہئیں۔ تحریر مانگیں۔ (۲/۲۳۵) میں حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتَابُ اَجَلَهٗ کے معنی ہیں جب عدت کی حد جو از روئے قانون خداوندی مقرر ہو گئی ہے، اپنی آخری میعاد تک پہنچ جائے۔

سورۃ یونس میں ہے لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (۱۰/۴۹)۔ ''ہر قوم کے لئے ایک میعاد ہے''۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر قوم کے مقدر میں یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس نے اتنی مدت تک عروج حاصل کرنا ہے اور اس کے بعد ختم ہو جانا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتٰبٌ (۱۳/۳۸) ہر میعاد کے لئے خدا کا ایک قانون ہے۔ یعنی قوموں کی موت اور حیات خدا کے قانون کے مطابق متعین ہوتی ہے۔ جو قوم چاہے اس قانون کے مطابق اپنی میعاد کو بڑھالے۔ جو چاہے اسے گھٹالے۔ خدا کی طرف سے صرف قانون مقرر ہے۔ اس قانون کے مطابق اپنی مدتِ حیات کو گھٹانا بڑھانا، ہر قوم کے اپنے اختیار میں ہے۔

اسی طرح سورہ آلِ عمران میں ہے مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (۳/۱۴۴)۔ کوئی شخص خدا کے قانون (طبعی) کے بغیر مر نہیں سکتا۔ یہی قانون اس کی میعاد کا تعین کرتا ہے۔ وَ مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ (۳۵/۱۱)۔ عمر کا گھٹنا بڑھنا، خدا کے مقرر کردہ قانونِ طبعی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس قانون کا علم انسان کو دیدیا گیا ہے۔ سو جس کا جی چاہے اس کے مطابق اپنی عمر بڑھالے، جس کا جی چاہے اسے گھٹالے۔ (انسان جب جی چاہے خود کشی کر کے مر سکتا ہے۔ اور بد پرہیزی سے اپنی عمر کم کر سکتا ہے)۔ لیکن جب (اس قانون کے مطابق) کسی کی مدتِ عمر کا خاتمہ ہو جائے تو پھر اس کی موت میں تاخیر نہیں ہو سکتی (۶۳/۱۱)۔

تفسیر المنار میں ہے کہ کِتَابٌ بمعنی مَكْتُوْبٌ ہے۔ یہ اسم جنس ہے ان چیزوں کے لئے جو لکھی جائیں۔ اور ذٰلِكَ الْكِتَابُ (۲/۲) سے اشارہ کرنے میں

حکمت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے صرف قرآن کریم ہی لکھنے کا حکم فرمایا تھا * ۔ قرآن کریم کے علاوہ اور کچھ لکھنے کا حکم نہیں تھا ۔ لہذا مکتوب صورت میں صرف قرآن کریم ہی موجود تھا جسکی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔

قرآن کریم میں کِتابٌ کا لفظ قانونِ خداوندی یا ضابطہٗ قوانینِ خداوندی کیلئے آیا ہے ۔ اور چونکہ قرآن کریم خود ضابطہٗ قوانین الٰہیہ ہے اسلئے یہ کتاب اللہ ہے ۔ یعنی قوانینِ خداوندی کا مجموعہٗ مرتب اور محفوظ شکل میں ۔

قرآن کریم کی تعلیم کا بنیادی نقطہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے ۔ یعنی یہ قانون کہ انسان کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا ۔ قرآن کریم میں اس نکتہ کی وضاحت مختلف انداز سے کی گئی ہے ۔ سورہٗ انفطار میں ہے وَ اِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۔ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ ۔ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ($\frac{۸۲}{۱۰-۱۲}$) تم پر (خدا کی طرف سے) ایسی قوتیں مسلط ہیں جو تمہیں ہر طرح اپنی نگرانی میں لئے ہیں ۔ وہ ''معزز لکھنے والے'' ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ تم کیا کرتے ہو ۔ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ کی تفسیر یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ نے کردی ۔ یعنی علم رکھنے والے ۔ جاننے والے ۔ ان معنوں میں یہ لفظ (کَتَبَ) اور جگہ بھی آیا ہے ۔ مثلاً سورۃ طور میں ہے اَمْ عِنْدَھُمُ الْغَیْبُ فَھُمْ یَکْتُبُوْنَ ($\frac{۵۲}{۴۱}$) ۔ یہاں یَکْتُبُوْنَ کا مفہوم ''جاننا'' ہے ۔ یا سورۃ انبیاء میں ہے وَ اِنَّا لَہٗ کَاتِبُوْنَ ($\frac{۲۱}{۹۴}$) ۔ سورۃ نمل ($\frac{۲۷}{۲۸}$) میں کِتَابٌ کا لفظ خط کیلئے آیا ہے ۔ یہی وہ کتاب (چٹھی) ہے جس کے علم کا ذکر ($\frac{۲۷}{۴۰}$) میں آیا ہے ۔

قرآن کریم میں کِتَابٌ اور حِکْمَتٌ آیا ہے ۔ اور دونوں کو منزل من اللہ کہا گیا ہے ۔ (دیکھئے عنوان ح ۔ ک ۔ م) ۔ کِتَابٌ کے معنی ہیں قانون ۔ اور حِکْمَتٌ کے معنی ہیں اُس قانون کی غرض ، غایت ، مقصد ، نتیجہ ۔ (The why of it) ۔ مثلاً کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کے بعد ہے لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ($\frac{۲}{۱۸۳}$) ۔ تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں (یہ کِتَابٌ یا قانون ہے ۔ اور) لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ تاکہ تم تقویٰ شعار ہو جاؤ ۔ اس قانون کی حکمت ہے ۔ یعنی اس قانونِ خداوندی سے مقصد یہ ہے ۔ اس کی غایت یہ ہے ۔ اس کی علت یہ ہے ۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ تم ایسے ہو سکو ۔ قرآن کریم نے قانون کے ساتھ اس کی حکمت (یعنی نتیجہ) کو بھی خود ہی بیان کر دیا تاکہ ہم ہر وقت دیکھتے رہیں کہ قانون کا منشاء پورا ہو رہا ہے یا نہیں ۔ اگر قانون پر عمل پیرا ہونے سے وہ نتیجہ

*تفسیر المنار ج/۱ ۔ صفحہ ۱۲۳ ۔

مرتب ہو رہا ہے جیسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس قانون پر صحیح معنوں میں عمل ہو رہا ہے ۔ لیکن اگر اس سے وہ نتائج مرتب نہیں ہو رہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ اس قانون کی محض رسم پوری ہو رہی ہے ، فی الحقیقت اس پر عمل نہیں ہو رہا ۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت تھی جسے قرآن کریم نے بیان کیا تھا ۔ اسی کے نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے کہ ہماری نمازیں اور روزے اس طرح بے نتیجہ رہ گئے ہیں ۔ اور ہم انہیں اسی طرح ادا کئے جا رہے ہیں ، اور مطمئن ہیں کہ اگر ان کے نتائج یہاں مرتب نہیں ہوتے تو نہ سہی ، ان کا پھل آخرت میں جا کر ملے گا ۔ حالانکہ قرآن کریم نے ان کے نتائج اسی دنیا میں مرتب ہونے کا بھی کہا ہے اور آخرت میں بھی ۔ اگر ان کے نتائج (قرآن کریم کے بیان کے مطابق) اس دنیا میں مرتب نہیں ہو رہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہو رہا ۔ لہذا ان کے نتائج آخرت میں بھی مرتب نہیں ہونگے ۔

کِتَابٌ اور حِکْمَتٌ (قانون اور اس کے نتائج) دین کا بنیادی نقطہ ہے ۔ یعنی قرآن کریم اور اس پر عمل پیرا ہونے کے درخشندہ نتائج جو اس دنیا میں سامنے آ جاتے ہیں اور جن کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے ۔ اس لئے جہاں قرآن کریم سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ فلاں معاملہ میں خدا کا حکم (قانون) کیا ہے وہاں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس حکم (قانون) پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا برآمد ہوگا ۔ اگر قرآن کریم سے یہ معلوم اور متعین کر لیا جائے اور پھر ہم اس کے مطابق اپنا (انفرادی اور اجتماعی) محاسبہ کرتے جائیں تو ہمیں ہر وقت معلوم ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم پر ٹھیک ٹھیک عمل ہو رہا ہے یا نہیں ۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو نفس کا جھوٹا اطمینان غلط عمل کو بھی صحیح بنا کر دکھا سکتا ہے ۔

ک ت م

کَتْمٌ کے معنی ہیں چھپانا ۔ رَجُلٌ کَتُوْمٌ ۔ راز کو چھپانے والا آدمی ۔ سِرٌّ کَاتِمٌ ۔ پوشیدہ اور چھپا ہوا راز*۔ قرآن کریم میں کَتْمٌ ۔ بمقابلہ اِبْدَاءٌ آیا ہے (۲/۳۳) ۔ نیز اِخْرَاجٌ (باہر نکالنے) کے مقابلہ میں ۔ (۲/۷۲) ۔ نیز بَیَّنَ (ظاہر کرنے) کے مقابلہ میں (۳/۱۸۶ ؛ ۲/۱۵۹) ۔ اور جَہْرٌ کے مقابلہ میں بھی (۲۱/۱۱۰) ۔ اس سے کَتْمٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ کَتْمٌ معانی کے پوشیدہ رکھنے کو کہتے ہیں اور سَتْرٌ محسوس اشیاء کے پوشیدہ رکھنے کو ۔

---

*تاج ۔

سورہ آل عمران میں ہے لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ (۳/۷۰) ۔ تم حق کو باطل کے ساتھ ملاتے کیوں ہو۔ اور حق کو چھپاتے کیوں ہو؟ یعنی حق کی باطل کے ساتھ آمیزش بھی جرم ہے اور حق کو چھپانا بھی جرم ۔ حق کو ہمیشہ بلا آمیزش رکھنا چاہئے اور اسے ظاہر کرتے رہنا چاہئے ۔ قرآن کریم حق بلا آمیزش ہے ۔ لہذا قرآن کریم کے ساتھ کسی اور چیز کو نہیں ملانا چاہئے ۔ اور اسے نکھار اور ابھار کر سامنے لانا چاہئے۔

ک ث ب

اَلْکَثْبُ ۔ کسی چیز کو اکٹھا کرنا اور ڈھیر بنا دینا ۔ پانی وغیرہ کو اوپر سے گرا دینا ۔ اِنْکَثَبَ الرَّمْلُ ۔ ریت اکٹھی اور مجتمع ہو گئی ** ۔ اَلْکَثِیْبُ ۔ ریت کا ٹیلہ ۔ اَلْکُثْبَاءُ ۔ مٹی * ۔ قرآن کریم میں ہے کہ انقلاب عظیم کے وقت یہ بڑے بڑے سردارانِ قوم (جِبَالُ) کَثِیْبًا مَّهِیْلًا (۷۳/۱۴) ہو جائیں گے ۔ یعنی ایسے ریت کے تودے جو نیچے سے سرکتے ہوئے چلے جائیں اور اس طرح رفتہ رفتہ اپنا مقام چھوڑ کر نیچے گر جائیں ۔ اَکْثَبَ الصَّیْدُ کے معنی ہیں شکار، شکاری کے ہتھے چڑھ آگیا ۔ (ابن فارس و راغب)

ک ث ر

کَثْرَۃٌ ۔ قِلَّت کی ضد ہے ۔ اسکے معنی ہیں زیادہ ہونا ، فراوانی ، بہتات ۔ اَکْثَرَ الرَّجُلُ ۔ آدمی بہت مالدار ہو گیا ۔ اِسْتَکْثَرَ مِنَ الشَّیْءِ ۔ کسی چیز میں سے زیادہ لینے کی رغبت کرنا * ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ (۷۴/۶) ۔ زیادہ لینے کی نیت سے کسی پر احسان نہ کر۔ اَلْکَوْثَرُ ۔ ہر چیز جو کثیر ہو ۔ خیر کثیر ۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنی تفسیر المقام المحمود میں لکھا ہے کہ الکوثر سے مراد خود قرآن کریم ہے ، کیونکہ حکمت کو خدا نے خیر کثیر کہا ہے اور قرآن کریم سرتاپا حکمت ہے ۔ چنانچہ جب نبی اکرمؐ اور آپ کی جماعت پر مخالفین کی طرف سے دنیا تنگ کی جارہی تھی اور حالات سخت ناسازگار ہو رہے تھے ، حتکہ نظر آتا تھا کہ آپ کو اپنا وطن تک بھی چھوڑنا پڑیگا ، توعین اس عسرت کے زمانہ میں آپ سے کہا گیا کہ آپ اطمینان رکھیں ، نظام خداوندی کی تشکیل

*تاج ۔ **محیط ۔

کا ابتدائی دور عنقریب ختم ہوا چاہتا ہے ۔ اس کے بعد اس کے نتائج مرتب ہونے شروع ہو جائیں گے اور تمہیں زندگی کی خوش گواریاں بڑی افراط سے ملینگی ۔ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱۰۸/۱) ۔ چنانچہ ہجرت کے بعد کی زندگی میں یہ وعدہ حقیقت ثابتہ بنکر سامنے آگیا ۔

یہ خیال بھی ہے کہ عبرانی زبان میں کوشر حلال ذبیحہ کو کہتے ہیں ۔ (چنانچہ یہودیوں کا ذبیحہ اب بھی کوشر کہلاتا ہے) اور کوثر اسی سے معرب ہے ۔ اس اعتبار سے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (۱۰۸/۱) کے معنی ہونگے "ہم نے تجھے (اونٹ) بطور حلال ذبیحے کے عطا کیا" ۔ (اس کی وضاحت کے لئے دیکھئے عنوان ، ن ۔ ح ۔ ر) لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کے معنی خیر کثیر زیادہ موزوں ہیں ۔

کَثُرَ ۔ بہت ہونا۔ زیادہ ہونا (۴/۷) ۔ کَثَّرَ ۔ بڑھانا ۔ زیادہ کر دینا ۔ (۷/۸۶) ۔ اَكْثَرَ ۔ زیادہ کرنا ۔ (۱۱/۳۲) ۔ تَكَاثُرٌ ۔ ایک دوسرے سے مال و دولت میں بڑھنے کی کوشش کرنا (۱۰۲/۱) ۔ اِسْتَكْثَرَ ۔ بہت زیادہ حاصل کر لینا (۶/۱۲۸) ۔ بہت فائدہ اٹھا لینا (۷/۱۸۸) ۔*

قرآن کریم میں ہے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (۱۰۲/۱) ۔ ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس تمہیں زندگی کے مقصد سے غافل کر دیتی ہے ۔ قرآن کریم کی روسے مال و دولت زندگی کی زینت کا باعث ہیں (۱۸/۴۶) اس لئے ان کے حصول کی خواہش کوئی بری بات نہیں ۔ لیکن زندگی کا مقصد یہ قرار دے لینا کہ ہم زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹتے چلے جائیں تاکہ ہم دوسروں سے بڑھ جائیں اور ان کے مقابلہ میں فخر کر سکیں (۵۷/۲۰) بڑی پست سطح کی ذہینت ہے ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جب انسان میں اس قسم کی خواہش پیدا ہو جائے تو کوئی مقام ایسا نہیں آتا جہاں پہنچکر اس کی ہوس کی تسکین ہو جائے ۔ انسان ساری عمر اس میں آگے ہی بڑھتا جاتا ہے ۔ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۲) حتکہ یہ قبر تک پہنچ جاتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ بھی معیوب نہیں لیکن اس کا میدان اور ہے ۔ تم ایک دوسرے سے بڑھنا چاہتے ہو تو ذاتی جوہر اور نوع انسان کی عالمگیر بھلائیوں کے کام میں بڑھنے کی کوشش کرو جس کا نتیجہ جنت کی زندگی ہے (۸۳/۲۶) ۔ مال ، مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے ۔ مقصود بالذات نہیں ۔ حتکہ انسان کی پوری طبیعی زندگی ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ (Means) ہے ۔

*تاج ۔

بجائے خویش مقصد (End) نہیں ۔ مال (یا طبیعی زندگی) کو مقصود بالذات اور زندگی کا منتہٰی سمجھ لینا بڑی غلطی ہے ۔ مقصود ، انسانی ذات کا نشوونما ہے جو عالمگیر انسانیت کی ربوبیت سے ہوتی ہے ۔ مال کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ رہنا چاہیئے ۔

ک د ح

اَلْکَدْحُ ۔ سعی و مشقت ۔ کوشش ۔ سعی پیہم ، مسلسل جدوجہد ۔ کَدَحَ رَأْسَهٗ بِالْمُشْطِ ۔ اس نے کنگھے سے اپنے بالوں کو سلجھایا ۔ کَدَحَ لِعِیَالِہٖ ۔ اس نے بڑی دوڑ دھوپ سے اپنے اهل و عیال کے لئے کمایا* ۔ اس میں دراصل ایسی مشقت کا پہلو ہوتا ہے جو جگر پاش ہو ۔ کیونکہ '' بِہٖ کَدْحٌ '' کے معنی ہوتے ہیں اس پر ذرا گہرا زخم لگا ہوا ہے* ۔

قرآن کریم میں ہے یَآ اَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ (۸۴/۶) ۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ '' جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں هاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب آسان ہوجائیگا اور وہ اپنے ساتھیوں کی طرف خوش و خرم واپس آجائیگا ۔ لیکن جس کا نامۂ اعمال اس کی پیٹھ پیچھے سے دیا جائیگا وہ ھلاکت کو پکاریگا'' ۔

اس آیت (۸۴/۶) کا مفہوم دو طرح پر لیا جاسکتا ہے ۔ تاج اور محیط میں ہے کہ کَدَحَ لِنَفْسِہٖ کے معنی ہیں ''اس نے اپنے لئے اچھے یا برے کام کئے'' ۔ اس اعتبار سے آیۂ زیر نظر کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان خواہ اچھے کام کرے خواہ برے ، ان کے نتائج اس کے سامنے آکر رهینگے ۔ '' خدا کی ملاقات '' کے معنی اس کے قانونِ مکافات کا سامنا کرنا ہیں ۔

لیکن اگر آیت کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ ''اے انسان! تجھے اپنے رب کی طرف جانے کے لئے مشقتیں اٹھاتی ہوں گی ۔ انہیں برداشت کر کے پھر اپنے رب کے سامنے جا سکیگا'' ۔ تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان کو بہرحال اس منزل تک پہنچنا ہے جو اس کے رب نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے ۔ لیکن اسکے لئے اسے مشقتیں اٹھانی پڑینگی ۔ اگر اس نے وحی کا اتباع کیا تو مخالفین کی طرف سے اسے تکلیفیں پہنچیں گی ۔ لیکن یہ راستہ مقابلۃً آسان ہوگا ۔ اور اگر اس نے وحی کا اتباع نہ کیا اور عقل کا تجرباتی طریقہ اختیار کیا تو اس سے اسے بڑی جگر پاش مشقتوں اور زخموں اور جراحتوں

---

* تاج و راغب نیز ابن فارس ۔

کے بعد وہاں تک پہنچنا نصیب ہو گا ۔ اس کی مفاد پرستیاں اس کا رخ پیچھے کی طرف موڑینگی اور زمانے کے تقاضے اسے آگے کی طرف کھینچیں گے ۔ انسانیت کی تاریخ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے ۔ انسان رفتہ رفتہ اسی منزل کی طرف آ رہا ہے لیکن چونکہ اس نے وحی کے بجائے عقل کا تجرباتی طریق اختیار کر رکھا ہے اس لئے اسے اس کے لئے خون کے دریا پیرنے اور آگ کی خندقیں پھاندنی پڑ رہی ہیں ۔ غور کیجئے ! کسقدر کشت و خون کے بعد اس کا ایک قدم صحیح منزل کی طرف بڑھتا ہے ۔ اگر یہ وحی کی سمت اختیار کرتا تو اس کا راستہ مقابلۃً آسان ہو جاتا ۔

ک د ر

اَلْکُدْرَۃُ مِنَ الْاَلْوَانِ ۔ گدلا پن (خواہ کسی رنگ میں ہو) رنگ کا صاف نہ ہونا ۔ بعض نے کہا ہے کہ کُدْرَۃٌ کا استعمال خصوصیت کے ساتھ رنگ میں ہوتا ہے اور کُدُوْرَۃٌ کا استعمال پانی اور چشمہ میں ۔ اور کَدَرٌ کا استعمال ہر چیز میں ۔ کَدِرٌ کَدِیْرٌ ۔ گدلی اور میلی چیز جو صاف نہ ہو ۔ اَلْکَدَرَۃُ مِنَ الْحَوْضِ ۔ تالاب کی تہ نشیں مٹی یا اس پر چڑھ جانے والی کائی ۔ اَلْکَدَرَۃُ ۔ مٹی کا بڑا سا ڈھیلا یا بڑا پتھر جسے زمین سے اکھیڑ کر الگ کر لیا گیا ہو ۔ اِنْکَدَرَ ۔ وہ تیزی سے نیچے کی طرف جھپٹا ۔ اَلْاِنْکِدَارُ ۔ کسی چیز کے بکھر جانے سے جو تغیر واقع ہوتا ہے اسے کہتے ہیں** ۔ اِنْکَدَرَ عَلَیْہِ الْقَوْمُ ۔ قوم گروہ گروہ ہو کر اس پر ٹوٹ پڑی* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) گدلا پن، صفائی کی ضد اور (۲) حرکت کے ہیں ۔ نیز اِنْکَدَرَ کے معنی ہیں تیز رفتار ہوا ۔

قرآن کریم میں ہے وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ (۸۱/۲) ۔ اس کے لفظی معنی ہیں جب ستارے گدلے ہو جائیں گے ۔ یعنی ان کی روشنی مدھم پڑ جائے گی ۔ یا جب وہ بکھر جائینگے ۔ اگر " نجوم " کے مجازی معنی لئے جائیں تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب چھوٹی چھوٹی ریاستیں ختم ہوجائینگی ۔ ان کی قوت ماند پڑ جائے گی ۔ کیونکہ اگر اَلْقَمَرُ سے مراد عربوں کی ریاست اور اَلشَّمْسُ سے ایران کی سلطنت لی جائے (دیکھئے عنوان ق ۔ م ۔ ر اور ش ۔ م ۔ س) تو اَلنُّجُوْمُ سے مراد چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہوں گی ۔ لیکن اگر اس سے مراد کائنات کا طبعی انقلاب ہے تو پھر ان الفاظ کے حقیقی معنی لئے جائیں گے ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔

ک د ی

اَلْکُدْیَۃُ - سخت زمین - بڑی سخت چٹان - اَکْدَی الرَّجُلُ - اس نے بخل کیا۔ اَکْدَی الْحَافِرُ - زمین کو کھودنے والا اس مقام پر جا پہنچا جہاں سخت زمین یا چٹان آگئی اور وہ مزید کھدائی سے رک گیا۔ اَکْدَی الْمَطَرُ - بارش کم ہو گئی***۔ قرآن کریم میں ہے اَعْطٰی قَلِیْلًا وَّ اَکْدٰی (۵۳/۳۴) - وہ تھوڑا سا دیتا ہے اور پھر پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے - پھر ہاتھ روک لیتا ہے (ابن فارس)۔ مومن کی روش زندگی تو یہ ہے کہ وہ صرف اپنی ضروریات کے لئے رکھتا ہے اور باقی سب کچھ نوع انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے دے دیتا ہے - لیکن جو شخص اس نظام پر دل سے یقین نہیں رکھتا، صرف مصلحتاً اس جماعت کے ساتھ رہتا ہے، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ گریز کی راہیں نکالتا رہتا ہے - (تَوَلّٰی - ۵۳/۳۴) - یعنی تھوڑا سا دیدیا اور اس کے بعد پھر ہاتھ روک لیا اور بہانہ سازیاں شروع کر دیں -

ک ذ ب

الکَذِبُ کے معنی ہیں جانتے بوجھتے کسی چیز کے متعلق خلاف حقیقت خبر دینا - لیکن بعض کا خیال ہے کہ عمداً ہو یا سہواً، دونوں صورتوں میں کَذِبٌ* کا لفظ بولا جائیگا* - اَکْذَبَ الرَّجُلُ اس وقت کہتے ہیں جب کسی آدمی کو پکارا جائے اور وہ سوتے ہوئے کی طرح چپ سادھ لے۔ کَذَّابَۃٌ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو مختلف رنگوں میں رنگا یا چھاپا جائے** - کَذَبَ فِیْ سَیْرِہٖ کے معنی ہیں اونٹ سست رفتار ہو گیا - یعنی جس رفتار سے وہ چل سکتا تھا اس رفتار پر نہیں چلا یا وہ بری چال چلا*** - بعض اوقات کَذَبَ کے معنی واجب ہونے کے بھی آتے ہیں***۔

قرآن کریم نے سورۃ منافقون میں کہا ہے کہ (اے رسول) جب یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ تو خدا کا رسول ہے - اس کے بعد ہے کہ خدا کو اس کا علم ہے کہ تو واقعی اس کا رسول ہے لیکن وہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (۶۳/۱)۔ یہ منافق یقیناً کاذب ہیں - یہاں سے کِذْبٌ کے معنی واضح ہو گئے - یعنی کسی کی کوئی بات اگرچہ خارجی واقعہ کے عین مطابق ہو لیکن اگر اس میں اس کے دل اور زبان کی ہم آہنگی نہیں تو وہ کِذْبٌ

*محیط - **اقرب الموارد - ***تاج -

ہے ۔ اور اگر کسی معاملہ میں دل اور زبان ہم آہنگ ہیں لیکن وہ بات واقعہ کے خلاف ہے تو اسے کِذْبٌ نہیں کہینگے۔ وہ بات اس کے عدمِ علم پر محمول کی جائیگی ۔ یعنی یہ کہینگے کہ اسے صحیح واقعہ کا علم نہیں ۔ یہ بھی یاد رہے کہ قرآن کریم نے اس کی بھی سخت تاکید کی ہے کہ جس بات کا علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگ جایا کرو (۱۷/۳۶) ۔ اس لئے وہی بات زبان سے نکالنی چاہئے جس کے متعلق تحقیق کر لی جائے ۔

سورۃ یوسف میں ہے بِدَمٍ کَذِبٍ (۱۲/۱۸) ۔ جھوٹ موٹ کا خون یعنی ایسا خون جو اس کا نہ تھا جس کا وہ بتایا گیا تھا ۔ کَاذِبٌ ۔ جھوٹا (۱۱/۹۳) ۔ کَذَّابٌ ۔ بہت بڑا جھوٹا (۴۰/۲۸) ۔ مَکْذُوْبٌ ۔ جھوٹ کہا ہوا (۱۱/۶۵) ۔ کَذَّبَ ۔ جھٹلایا (۲۳/۲۵) ۔ تَکْذِیْبٌ ۔ جھٹلانا (۸۵/۱۹) ۔ مُکَذِّبٌ ۔ وہ جو جھٹلائے جائے اور کبھی نہ مانے (۵۶/۵۱) ۔

وحی (قرآن کریم) اپنے ہر دعویٰ کو علم و بصیرت کی بنیادوں پر پیش کرتا ہے اور دلیل و برہان سے اس کی تائید کرتا ہے ۔ وہ اپنے مخالفین سے بھی یہی کہتا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو ۔ (۲/۱۱۱)۔ یہ ہے حقیقت تک پہنچنے کا صحیح طریقہ ۔ لیکن اگر کوئی شخص پہلے ہی سے یہ فیصلہ کرلے کہ مجھے فریقِ مقابل کے دعویٰ کو بہرحال جھٹلانا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ کبھی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا ۔ یہ ہے وہ تَکْذِیْبٌ جسے قرآن کریم نے سخت جرم قرار دیا ہے ۔ علم و بصیرت کی بارگاہ میں اس سے بڑا جرم اور کونسا ہوگا؟

نیز تکذیب یہ بھی ہے کہ انسان جس بات کی صداقت کا قائل ہو اور اس پر ایمان کا مدعی ، اس کا عمل اس کے اس ایمان کی شہادت نہ دے ۔ سورۃ الماعون میں دیکھئے ، کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ (۱۰۷/۱) ۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ اس کے بعد بتایا کہ یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا ۔ یہ وہ نمازی ہیں جو صلٰوۃ کی غرض و غایت کو فراموش کئے ہوئے ہیں۔ جو اس کے ظاہری ارکان و حرکات ہی کو اصلِ صلٰوۃ سمجھے ہوئے ہیں ، اور رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک کے لئے کھلا رہنا چاہئے تھا ، بند لگا کر روک لیتے ہیں (۱۰۷/۲-۷) ۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ قرآن کریم کی رو سے "تکذیب دین" کون کرتا ہے ۔ اور یہ بھی کہ خود ہمارا شمار کن لوگوں میں ہے؟

ک ر ب

اَلْکَرْبُ ۔ شدید غم کو کہتے ہیں ۔ اس کی اصل کَرْبُ الْاَرْضِ سے ہے۔ جس کے معنی زمین میں ہل چلانے کے ہیں ۔ یا یہ کَرَبَتِ الشَّمْسُ سے ماخوذ ہے ۔ جس کے معنے ہیں سورج غروب ہونے کے قریب ہوگیا ۔ اَلْکَرْبُ ۔ رسی بٹنے کو بھی کہتے ہیں ، نیز بیڑی کو تنگ کرکے سختی سے باندھنے کے لئے بھی ۔ کَرَبٌ ۔ اُس رسی کو بھی کہتے ہیں جو ڈول کے ساتھ بندھی رہتی ہے اور ہر مرتبہ پانی میں ڈوبتی ، بھیگتی اور اس طرح جلد گل سڑجاتی ہے۔ کَرَبَ النَّاقَةَ ۔ اس نے اونٹنی پر بوجھ لاد دیا ۔ اَلْکَرِیْبُ ۔ وہ زمین جس پر کبھی کاشت نہ کی گئی ہو* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی شدت اور قوت کے ہونے ہیں ۔

ان معانی سے اَلْکَرْبُ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ یعنی شدید غم ، جس سے انسان بری طرح جکڑا جائے ۔ گرانبار ہو جائے ، اس کے آسرے ٹوٹ جائیں ۔ اس کا قلب الٹ پلٹ ہوجائے۔ یہ ہے وہ کَرْبٌ جس کے متعلق کہا ہے کہ اس سے نجات کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ ہے قانون خداوندی کی اطاعت۔ قُلِ اللّٰهُ یُنَجِّیْکُمْ مِنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ (۶/۶۴) ۔ اسی طریق سے خدا کے بندوں کو کرب سے نجات ملتی ہے (۲۱/۷۶) ۔

اَلْکَرُوْبِیُّوْنَ ۔ عبرانی زبان کا لفظ کَرُوْبِیْمُ ہے ۔ جس سے مراد مقرب فرشتے ہیں** ۔ (قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا) ۔

ک ر ر

اَلْکَرُّ ۔ کسی چیز کو پلٹانا، موڑدینا، لوٹادینا، پھیردینا۔ موٹی رسی یا رسی کو کَرٌّ کہتے ہیں**۔ اَلتَّکْرِیْرُ ۔ و التَّکْرَارُ ۔ کسی چیز کو بار بار دھرانا ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنے اکٹھا کرنا اور پلٹانا بتائے ہیں ۔ تکرار اور تاکید میں فرق یہ ہے کہ تاکید اسے کہتے ہیں کہ ایک بات کہی جائے اور اس کے ساتھ ہی اس پر زور دیا جائے نیز تاکید تین بار سے زیادہ نہیں کی جاتی ۔ لیکن تکرار میں یہ دونوں باتیں ضروری نہیں*** ۔

قرآن کریم میں کفار کی اس حسرت کو متعدد مقامات پر دھرایا گیا ہے کہ لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً (۲/۱۶۷) ۔ اگر ایک مرتبہ زندگی کو پیچھے کی طرف لوٹا کر پھر وہی حالات پیدا کر دئیے جائیں تو ہم یہ کریں اور وہ کریں ۔

---

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔

لیکن اسکی نفی کی گئی ہے (۳۹/۵۸-۵۹) - اسلئے کہ زندگی جوئے رواں ہے - اسکا جو پانی ایک مرتبہ آگے نکل گیا وہ پھر واپس نہیں آسکتا - اسی طرح دنیا کی اس اسٹیج پر کوئی فرد دوبارہ نہیں آسکے گا - اس لئے تناسخ (آواگون - دنیا میں بار بار آنے) کا تصور قرآن کریم کے خلاف ہے - قانونِ ارتقاء میں اعادہ اور تکرار نہیں - یا آگے بڑھنا ہے (جسے جنت کہتے ہیں) یا ایک مقام پر رک جانا (جسے جہنم کہتے ہیں) -

سورۂ النّٰزعٰت میں ہے - تِلْكَ اِذاً كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ (۷۹/۱۲) - یہ مر کر پھر زندہ ہونا تو بہت نقصان دہ ہوگا - سورۂ بنی اسرائیل میں ہے - ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ (۱۷/۶) - پھر ہم نے حالات کو ایسا پلٹا دیا کہ وہ تمہارے حق میں ہو گئے اور تمہارے دشمنوں کے خلاف -

ک ر س

اَلْكِرْسُ - اصل و بنیاد* - اَلْكُرْسِيُّ - کرسی جس پر بیٹھتے ہیں - اَلْكُرْسِيُّ وَالْكِرْسِيُّ - حکومت و اقتدار - یا علم - چنانچہ اس صحیفہ کو جس میں علم ہوتا ہے كُرَّاسَةٌ کہتے ہیں - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ كُرَّاسَةٌ ان اوراق کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے سے ملا دئے گئے ہوں - کیونکہ اَلتَّكْرِيْسُ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے ملا دینا* - آج کل کاپی کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے اوپر تلے جم جانا یا اکٹھا ہو جانا بتائے ہیں -

قرآن کریم میں ہے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۲/۲۵۵) - خدا کی ''کرسی'' تمام کائنات کو محیط ہے - اس میں كُرْسِيُّهُ کے معنی باعتبار لغت بھی اور صاحب المنار کے نزدیک بھی ، علمِ خداوندی ہیں - اگرچہ اسی کے معنے حکومت و اقتدار بھی ہوسکتے ہیں - ''علم'' کا مفہوم اس لئے قابلِ ترجیح ہے کہ اس سے پہلے یہ آیا ہے وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ - '' وہ اس کے علم میں سے کسی چیز پر احاطہ نہیں کرسکتے مگر اس کے قانونِ مشیت کے مطابق'' -

سورۃ صٓ میں حضرت سلیمانؑ کے تختِ حکومت کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے (۳۸/۳۴) - اس میں بھی كُرْسِيِّهٖ کے معنے تخت یا ''بیٹھنے کی جگہ'' کے نہیں ، بلکہ اقتدارِ حکومت ہے - ''تخت'' - ''کرسی'' وغیرہ الفاظ ، اقتدار اور منصب کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں -

---

*تاج و محیط و راغب -

ک ر م

اَلْکَرَمُ اس صفت کو کہتے ہیں جو کمینگی کے خلاف ہو۔ عربوں میں کمینگی بد ترین خصلت تھی ، اس لئے کَرَمٌ بہترین صفت تھی۔ دراصل اس کے معنی تھے کسی ایسے بوجھ کو اٹھا لینا جس سے قوم کے خون اور اس کی جان کی حفاظت ہوتی ہو۔ یعنی بڑے گرانقدر اجتماعی امور اور رفاہ عامہ کے لئے خرچ کرنا یا سعی و کوشش کرنا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ کَرَمٌ کسی کو بغیر ذاتی غرض و منفعت کے بقدر ضرورت فائدہ پہنچانا ہے۔ اس کے معنی خلوص کے بھی ہیں۔ اَلْاِکْرَامُ وَ اَلتَّکْرِیْمُ۔ کسی کو اسطرح نفع پہنچانا کہ اس میں اس کی کسی طرح کی سبکی یا ذلت نہ ہو، ساتھ ہی یہ کہ جو نفع پہنچایا جائے وہ بلند اور با شرف ہو*۔ اس اعتبار سے عربوں کے ہاں اَلْکَرِیْمُ ایک ایسی جامع صفت ہے جس میں ہر قسم کی بھلائیاں، فضیلتیں اور شرف شامل ہیں۔ چنانچہ یہ ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جس میں کسی قسم کی مذموم صفت نہ پائی جاتی ہو۔ نیز الکَرِیْمُ کے معنے ہیں آزاد اور شریف۔ نجیب۔ سخی۔ خوش نہاد۔ جو اپنے آپ کو احکام خداوندی کی خلاف ورزی سے محفوظ رکھے، نرم خو، خلیق، وسیع الظرف، عمدہ حسب و نسب والا، پسندیدہ صفات کا مالک، با عزت۔ وہ گھوڑا جس پر جہاد کیا جائے۔ وہ اونٹ جس پر پانی لاد کرلایا جائے۔ نیز ہر پسندیدہ اور منتخب چیز*۔ کثیر بارش کو بھی کَرِیْمٌ کہتے ہیں۔ اَرْضٌ مَکْرَمَۃٌ۔ ایسی زمین جسے جوت کر، کھاد وغیرہ ڈال کر اچھی طرح تیار کر لیا جائے۔ نیز وہ عمدہ زمین جس میں بہت اچھی پیداوار ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ کَرُمَتْ اَرْضُہُ الْعَامَ۔ کھاد ڈالنے کی وجہ سے اس سال اس کی زمین بڑی زرخیز ہوئی اور اس میں بہت فصل ہوئی۔ کَرَّمَ السَّحَابُ تَکْرِیْمًا۔ بادل خوب اچھی طرح برسا*۔ راغب نے کہا ہے کہ کسی شخص کو اس وقت تک کَرِیْمٌ نہیں کہا جاسکتا جب تک اس سے کَرَمٌ کا ظہور نہ ہو چکا ہو**۔

قرآن کریم نے جہنم کے دخانی سایہ کے متعلق کہا ہے۔ لَابَارِدٍ وَّلَا کَرِیْمٍ (۵۶/۴۴)۔ جس میں نہ ٹھنڈک ہے نہ خوشگواری یا نفع بخشی۔ مومنین کی صفات میں ہے۔ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا (۲۵/۷۲)۔ جب کسی لایعنی اور لغو بات سے ان کا گذر ہو جائے تو وہ نہایت شریفانہ انداز سے گذر جاتے ہیں۔

*تاج۔ **راغب۔

سورۃ علق میں خدا کو اَلْاَکْرَمُ (۹۶/۳) کہا گیا ہے ۔ اسی کو ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ (۵۵/۲۷) سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ کَرَّمْتَ (۱۷/۶۲) اور اَکْرَمَ (۸۹/۱۵) کے معنی عزت و تکریم عطا کرنا ۔ بمقابلہ اَهَانَ (۸۹/۱۶) ۔ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ (۲۱/۲۶) ۔ معزز بندے ۔

مُکْرِمٌ (۲۲/۱۸) عزت دینے والا ۔ رِزْقٌ کَرِیْمٌ (۸/۴) ۔ رزقِ باشرف ۔ عزت کی روزی ۔ جنتی معاشرہ کے خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ وہاں رزق کریم ملے گا ۔ یعنی سامانِ زیست بکثرت اور فراواں بھی اور عزت و توقیر کے ساتھ بھی ۔ کیسی خوش بخت ہے وہ قوم جسے رزق کریم میسر ہو ۔ لیکن یہ نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے ہی سے مل سکتا ہے ۔ (اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد بھی) ۔

قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ۔ ہم نے تمام فرزندان آدم کو صاحب کرم بنایا ہے ۔ یعنی خدا نے ہر فرزندِ آدم کو محض آدمی ہونے کی جہت سے واجب التکریم بنایا ہے ۔ تکریم آدمیت کا یہ اعلان عظیم سب سے پہلے قرآن کریم ہی کی طرف سے ہوا ۔ یعنی ہر انسان بہ حیثیت انسان ہونے کے قابل احترام ہے ۔ ہر فرد کو عزت و شرف کا یہ بنیادی حق (Fundamental Right) قرآن کریم کی بارگاہ سے عطا ہوا ۔ یہ انسان کا پیدائشی حق ہے ۔ اس کے بعد اس عزت و تکریم کے مدارج ، جو ہر ذاتی اور اعمال کریمانہ کے اعتبار سے قائم ہوتے ہیں ۔ جو جتنا زیادہ قوانین الٰہیہ کی نگہداشت کرتا ہے اتنا ہی زیادہ واجب التکریم ہوجاتا ہے ۔ حتٰی کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ (۴۹/۱۳) جو سب سے زیادہ ان قوانین کی نگہداشت کرتا ہے وہ سب سے زیادہ عزت و تکریم کا مستحق ہو جاتا ہے ۔ غور کیجئے ۔ قرآن کریم نے کس طرح عزت و شرف کے پرانے معیاروں (حسب و نسب ۔ مال و دولت وغیرہ) کو بدل کر ان کی جگہ احترام و تکریم کے نئے پیمانے دے دئے ، جن کی رو سے ہر انسان ، بحیثیت انسان ہونے کے ، واجب الاحترام ہے اور جو جس قدر زیادہ قانونِ خداوندی کی پابندی کرتا ہے وہ اسی قدر زیادہ واجب التکریم ہوتا جاتا ہے ، یعنی عزت کا معیار جوہرِ ذاتی قرار پا گیا ، نہ کہ اضافی نسبتیں ۔ اسی ایک معیار سے بادشاہت ، برھمنیت ، پیشوائیت ، سرمایہ داری کے تمام نظام کہن حرف غلط کیطرح مٹ جاتے ہیں ۔ یعنی ہر انسانی بچہ ، خواہ وہ بادشاہ کے گھر میں پیدا ہو یا فقیر کے ۔ برھمن کا بیٹا ہو یا چمار کا ۔ انسان ہونے کی جہت سے یکساں تکریم کا مستحق ہے ۔ اور باپ کی وجاہت یا عزت اسے دوسرے بچوں سے ممتاز نہیں کر سکتی ۔ دوسروں کے مقابلہ میں اس کا زیادہ با عزت ہونا اس کے ذاتی جوہر اور عمل کی بنا پر ہوگا ۔

ک ر ہ

اَلْکَرْہُ ۔ اَلْکُرْہُ ۔ سخت نا پسندیدگی ۔ مشقت ۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ جس کام پر خود تمہارا نفس ناخواستہ طور پر تمہیں مجبور کرے ، وہ کُرْہٌ ہے اور جس پر کوئی دوسرا مجبور کرے وہ کَرْہٌ ہے ۔ راغب نے کہا ہے کہ جو تکلیف کسی انسان پر خارج سے پہنچے اور اس پر زبردستی لاد دی جائے تو وہ کَرْہٌ ہے اور جو اسے خود اپنے آپ سے پہنچے وہ کُرْہٌ ہے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ کُرْہٌ تو مشقت کو کہتے ہیں اور کَرْہٌ یہ ہے کہ تم کو کسی بات کے کرنے کے لئے کہا جائے اور تم اسے بادل ناخواستہ کرو ۔ قرآن کریم میں طَوْعًا کے مقابلہ میں کَرْھًا آیا ہے ۔ (۳/۸۲) ۔ طَوْعًا کے معنی ہیں بہ طیب خاطر اور کَرْھًا کے معنی زبردستی ۔ سورۃ بقرہ میں ہے ۔ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ (۲/۲۱۶) تم پر جنگ کو قانوناً ضروری قرار دیا گیا ہے حالانکہ تمہاری طبیعتیں اسے بادل ناخواستہ قبول کرتی ہیں ، یا حالانکہ وہ تمہاری طبیعتوں پر ناگوار گذرتی ہے ۔ سورۃ احقاف میں جنین کے متعلق ہے حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ کُرْھًا وَّ وَضَعَتْهُ کُرْھًا (۴۶/۱۵) ۔ اس کی ماں بڑی مشقت سے حمل کے دن گزارتی ہے اور وضع حمل میں بھی تکلیف اٹھاتی ہے ۔ سورۃ نحل میں اِکْرَاہٌ زبردستی کے معنوں میں آیا ہے ۔ یعنی جو کام دل کی مرضی سے نہ کیا جائے (۱۶/۱۰۶) ۔ سورۃ بقرۃ میں کَرِہَ کا لفظ اَحَبَّ کے مقابلہ میں آیا ہے (۲/۲۱۶) ۔ اسی طرح (۴۹/۷) میں کَرَّہَ حَبَّبَ کے مقابلہ میں ۔ کَارِھُوْنَ (۸/۵) نا پسند کرنے والے ۔ مَکْرُوْہٌ (۱۷/۳۸) نا پسندیدہ ۔

قرآن کریم جس جماعت کے ہاتھوں آسمانی انقلاب کو لاتا ہے اس کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس انقلاب اور نظام کو اپنے دل کی مرضی سے (بلا جبر و اکراہ) اپنی زندگی کا نصب العین بناتی ہے ۔ لہذا اس کا اعلان یہ ہے کہ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (۲/۲۵۶) ۔ اس سوسائیٹی کا ممبر بطیب خاطر بنا جاسکتا ہے ، کسی قسم کے جبر و اکراہ سے نہیں ۔ رسول اکرمؐ سے کہا گیا کہ اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۱۰/۹۹) ۔ کیا تو لوگوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں؟ اکراہ ، طبعی (Physical) بھی ہوتا ہے ۔ جیسے کسی کے گلے پر تلوار رکھکر اس سے بات منوا لی جائے ۔ اور ذہنی بھی ۔ جیسے کسی کو شعبدہ دکھا کر اس سے اپنی بات منوا لی جائے ۔

*تاج ۔

تیسری قسم کا اکراہ یہ ہے کہ معاشرہ میں جو روایات چلی آتی ہیں اور جو تصورات اور نظریات ، معتقدات و خیالات ، ہمیں اسلاف سے وراثتاً ملتے ہیں ، انہیں ہماری تعلیم و تربیت کا جزو بنا کر دلوں میں راسخ کر دیا جائے ، عام اس کے کہ انہیں خدا کی کتاب کی سند حاصل ہے یا نہیں - یا وہ علم و بصیرت اور عقل و فکر کے معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں - یہ اکراہ کی سنگین ترین شکل ہے - غلط تعلیم و تربیت سے بڑھ کر شدید اکراہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ قرآنی جماعت میں داخل کرنے کے لئے کسی قسم کے اکراہ کی بھی اجازت نہیں - وہ ہر بات کو دلائل و براہین سے پیش کرتا اور دل و دماغ کے کامل اطمینان کے بعد منواتا ہے - اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس جماعت میں داخل ہونے پر کسی قسم کا جور و اکراہ روا نہیں رکھا جا سکتا ، اس میں سے نکلنے کے لئے بھی پوری آزادی ہونی چاہئیے - اگر آپ اس سے نکلنے کی راہیں بند کر دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کو جور و اکراہ سے اس کے اندر رکھتے ہیں - لہذا ہمارے ہاں جو سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے تو یہ چیز قرآن کریم کے خلاف ہے - قرآن کریم نہ کسی کو زبردستی مسلمان بناتا ہے اور نہ ہی اس شخص کو مسلمان رہنے پر مجبور کرتا ہے جس کا دل اسلام پر مطمئن نہ ہو - ایمان نام ہی دل و دماغ کے کامل اطمینان اور رضامندی کا ہے -

سورۃ نحل میں ہے مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ - وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ($\frac{16}{106}$) - جو شخص اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس سے انکار کرتا ہے - تو یہ ان لوگوں میں سے ہے جن پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے سخت عذاب ہے - لیکن ان میں وہ شخص شامل نہیں جس کا دل ایمان پر مطمئن ہو لیکن اسے کفر (انکار) پر مجبور کر دیا جائے - کفر اُس کا کفر ہے جو اپنے سینے کی کشاد (دل کی پوری رضامندی) سے کفر اختیار کرے - اب ظاہر ہے کہ اگر جور و اکراہ سے کسی سے کفر کا اقرار کرا لینا اُسے کافر نہیں بنا دیتا ، تو جور و اکراہ سے کسی سے ایمان کا اقرار لے لینا ، یا اسے اس مسلک پر رہنے پر مجبور کر دینا ، اُسے کس طرح مومن بنا سکتا ہے - مومن وہی ہے جو بطیب خاطر قرآن کریم کی صداقتوں کا اقرار کرے اور پھر دل کی پوری رضامندی سے اس مسلک پر قائم رہے - جہاں ذرا سا بھی جور و اکراہ آیا ، وہاں ایمان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - قرآن کریم تو ان لوگوں کو بھی مومن قرار

نہیں دیتا جو اسلامی مملکت کی شان و شوکت کو دیکھکر (خود عہد نبوی میں) اسلام لے آئے تھے - وہ ان سے کہتا ہے کہ تم یوں کہو کہ ہم اس جدید نظام کے تابع فرمان ہو گئے ہیں (أَسْلَمْنَا) - یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں ، کیونکہ ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں نہیں ہوا - (۴۹/۱۴) - وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ جب ان کے سامنے (اور تو اور) خود آیات خداوندی پیش کی جاتی ہیں ، لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا (۲۵/۷۳) - تو ان پر بہرے اور اندھے بنکر نہیں گر پڑتے - یعنی انہیں بھی آنکھیں کھول کر قبول کرتے ہیں -

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی شخص کو اسلامی نظام میں مجبوراً داخل نہیں کیا جا سکتا - لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کوئی شخص اس نظام میں بطیب خاطر داخل ہو گیا ہے ، تو اس کے بعد اسے اس کے احکام و قوانین کی اطاعت پر بھی مجبور نہیں کیا جا سکتا - وہ جب تک اس نظام کا ممبر رہیگا ، اس کے قواعد و ضوابط کی پابندی اس پر لازمی ہوگی - اگر وہ ان کی پابندی نہیں کرنا چاہتا تو وہ اس نظام کے دائرے سے باہر نکل جائے - لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کسی نظام یا سوسائٹی کا ممبر بھی رہے اور اس کے قواعد و ضوابط میں سے جسے چاہے تسلیم کرے اور جسے چاہے مسترد کر دے -

ک س ب

كَسْبٌ کے اصلی معنی جمع کرنا ہیں - اس کے بعد اس کے معنی تلاش معاش کے بھی آتے ہیں - اور کسی چیز کو حاصل کر لینے اور اسے پا لینے کے بھی * -

وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (۲/۷۹) انہوں نے جس چیز کو (یعنی دین میں تحریف کو) اپنے لئے وجہ معاش بنا رکھا ہے وہ ان کے لئے تباہی اور بربادی کا موجب ہے - اس سے ذرا آگے ہے - مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً (۲/۸۱) - جس نے ناہمواریاں پیدا کیں - یہاں كَسَبَ کے معنی "کرنے" کے ہیں - یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے اپنے لئے ناہمواریوں کو اکٹھا کر لیا -

قرآن کریم میں آتا ہے - لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶) - اس کے عام معنی تو یہی ہیں کہ جس نے اچھے کام کئے ان کا فائدہ

*تاج - نیز ابن فارس -

اس کے لئے ہے (لَہَا) اور جس نے برے کام کئے اس کا نقصان بھی اسی کے لئے ہے (عَلَیْہَا) ۔ لیکن یہاں '' نیک اعمال ،، اور ان کے فائدوں کے لئے کَسَبَ آیا ہے اور '' برے کام ،، اور ان کے نقصانات کے لئے اِکْتَسَبَ ۔ راغب نے لکھا ہے کہ کَسْبٌ ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جسے انسان اپنی ذات کے فائدے کے لئے اور اس کے ساتھ ہی دوسروں کے فائدے کے لئے کرے۔ اور اِکْتِسَابٌ ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں جس میں انسان صرف اپنے مفاد کو پیش نظر رکھے ۔ راغب کے اس مفہوم کے اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ نفع مند صرف وہی کام ہو سکتے ہیں جن میں اپنا اور دوسروں کا (سب کا) فائدہ مد نظر ہو ۔ لیکن جن کاموں میں صرف اپنا ذاتی مفاد ہی پیش نظر ہو ان سے انسان کی ذات کی نشو و نما نہیں ہوتی ۔ وہ اس کے لئے موجب نقصان ہوتے ہیں (عَلَیْہَا کے یہی معنی ہیں) ۔ یہ چیز قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے عین مطابق ہے جس کی رو سے اس نے کہا ہے کہ وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) ۔ بقاء صرف ان کاموں کے لئے ہے جو تمام نوع انسان کے لئے نفع بخش ہوں ۔

صاحب لطائف اللغة نے بھی کہا ہے کہ کَسَبَ ، خیر کے لئے آتا ہے اور اِکْتَسَبَ ، شر کے لئے ۔

لیکن راغب یا صاحب لطائف اللغة نے کسب اور اکتساب کے معنوں میں جو فرق بتایا ہے وہ کلیہ نہیں ۔ قرآن کریم میں ان شکلوں کا استعمال اس کے خلاف بھی ہوا ہے ۔

ک س د

کَسَدَ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے اسقدر معمولی ، گھٹیا ، اور بے قدر ہونے کے ہیں کہ کوئی اسکی طرف رغبت نہ کرے۔ تہذیب میں ہے کہ کَسَادٌ کے اصلی معنی خراب ہوجانے اور بگڑ جانے کے ہیں ۔ پھر اس کا استعمال ، سامان اور بازار کے چالو نہ رہنے کے معنوں میں ہونے لگ گیا ۔ کَسَدَ الْمَتَاعُ ۔ بازار میں اس سامان کا چلن نہیں رہا ۔ کَسَدَتِ السُّوْقُ ۔ بازار سرد پڑ گیا ۔ اَلْکَسِیْدُ ۔ گھٹیا ۔ کم درجہ ۔ کمینہ * ۔ قرآن کریم میں (سورہ توبہ) میں ہے وَ تِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا (۹/۲۴) ۔ وہ تجارت جس کی کساد بازاری (مندا پڑ جانے) سے تم ڈرتے ہو۔

---

*تاج و محیط ۔

ک س ف

اَلْکِسْفَۃُ - چیز کا ٹکڑا۔ جمع کِسَفٌ وکِسْفٌ (۱۷/۹۲ ; ۳۰/۴۸)*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں ایسی خرابی آجانے کے ہوتے ہیں جو پسندیدہ نہ ہو۔ نیز ایک چیز کو دوسری چیز سے کاٹ دینا اور الگ کر دینا - سورۂ الطور میں ہے - اِنْ یَّرَوْا کِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ (۵۲/۴۴) - اور سورۃ شعراء میں ہے فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ (۲۶/۱۸۷) - اس کے معنی عذاب ناگہانی یا تباہی و بربادی کے ہیں - کَسَفَ الثَّوْبَ کے معنی ہیں اس نے کپڑے کو کاٹا - کَسَفَتِ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ - سورج اور چاند گہن میں آگئے - کَسَفَتْ حَالُہٗ - اس کا حال خراب ہو گیا - رَجُلٌ کَاسِفُ الْبَالِ - بد حال آدمی - یَوْمٌ کَاسِفٌ - نہایت ہولناک اور شدت کی تکلیف کا دن* - جس دن آسمان پھٹ پڑے -

ک س ل

اَلْکَسَلُ - کسی ایسے کام میں واماندگی اور گرانباری کا اظہار کرنا جس میں گرانباری اور تکان کا اظہار کرنا نہیں چاہئیے - اَلْکِسْلُ - روئی دھننے کی کمان کی تانت جو کمان سے الگ کر دی گئی ہو**- ظاہر ہے کہ اُس وقت کمان اور تانت دونوں موجود ہوتی ہیں لیکن ان میں باہمی رابطہ نہ رہنے سے روئی نہیں دھنی جا سکتی - دونوں بیکار ہوتی ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی کام کے کرنے سے گرانباری محسوس کرنا اور اس کی تکمیل سے، یا اسے کرنے سے جی چرانا -

اس مفہوم کو سامنے رکھئیے اور پھر اس آیت پر غور کیجئے جس میں منافقت برتنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ - اِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی (۴/۱۴۲) - نیز (۹/۵۴) - یہ نظام صلٰوۃ میں شریک تو ہوتے ہیں لیکن اس انداز سے کہ کمان الگ ہے اور تانت الگ - یعنی ظاہری طور پر سب کچھ ہو رہا ہے لیکن نتیجہ کچھ مرتب نہیں ہوتا -

یہ نقشہ، جسے ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ یہ "رسول اللہؐ کے زمانے کے منافقین" کی حالت کا بیان ہے، در حقیقت ہماری

* تاج و راغب - ** تاج و محیط -

ھی حالت کا نقشہ ھے ۔ غور کیجئے کہ کیا ھماری نمازیں بے تانت کی کمان نہیں ۔ [نیز دیکھئے سَاهُوْنَ (۱۰۷/۵) عنوان س ۔ ہ ۔ و]

ک س و

اَلْكَسْوَةُ ۔ اَلْكِسْوَةُ ۔ لباس ، کپڑا جو پہنایا جائے* ۔ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ (۲/۲۳۳) ۔ ان کا کھانا اور کپڑا ۔ كَسَاهُ كَسْوًا ۔ اسے کپڑا پہنا دیا* ۔ فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ۔ (۲۳/۱۴) ھم (جنین کی) ھڈیوں کو گوشت کا پہناوا پہناتے ھیں ۔

ک ش ط

اَلْكَشْطُ ۔ کسی چیز پر سے اس پر چھائی ھوئی چیز اٹھا دینا ۔ كَشَطَ الْغِطَاءَ عَنِ الشَّيْئِ ۔ اس نے اس چیز سے ڈھکنا ھٹا دیا ۔ كَشَطَ الْجِلْدَ عَنِ الْجَزُوْرِ ۔ اس نے ذبح کردہ اونٹ سے کھال اتار دی ۔ اَلْكِشَاطُ ۔ اتاری ھوئی کھال ۔ كَشَطَهُ ۔ اس نے اسکو کھول دیا** ۔ اِنْكَشَطَ رَوْعُهُ ۔ اس کا خوف جاتا رھا*** ۔

قرآن کریم میں ھے ۔ وَاِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ۔ (۸۱/۱۱) اس کے معنی ھیں جب "آسمان" سے پردہ اٹھا دیا جائیگا ۔ جب اس کا پوست اتار دیا جائیگا (اور اسطرح فضائے کائنات کے اندر کی چھپی ھوئی قوتیں بے نقاب ھوجائینگی) ۔

ک ش ف

اَلْكَشْفُ ۔ پردہ اٹھا دینا ۔ کسی بات کو ظاھر کر دینا** ۔ قرآن کریم میں ھے فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ (۵۰/۲۲) ۔ ھم نے (تیری آنکھوں سے) پردہ اٹھا دیا اور اسطرح حقائق تجھ پر منکشف ھو گئے ۔ نیز اسکے معنی ھٹا دینے ، دور کر دینے کے بھی ھیں ۔ سورہ اعراف میں ھے لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ (۷/۱۳۴) ۔ اگر تو ھم سے یہ عذاب دور کر دے ۔ كَشْفُ الضُّرِّ (۵۶/۱۰) تکلیف کا دور کر دینا ۔ كَاشِفٌ ۔ دور کر دینے والا (۶/۱۷) ۔

قرآن کریم میں ایک جگہ ملکہ سبا کے متعلق ھے وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا (۲۷/۴۴) ۔ اور دوسری جگہ سورہ قلم میں ھے يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ (۶۸/۴۲) ۔ یہ عربوں کا محاورہ تھا جسے وہ اسوقت بولتے تھے جب کوئی سخت مرحلہ سامنے آجائے* ۔ چنانچہ راغب نے لکھا ھے کہ اسکی اصل

* تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔

قَامَتِ الْحَرْبُ عَلٰی سَاقٍ ہے - جسکے لفظی معنے ھیں جنگ اپنی پنڈلی پر کھڑی ھو گئی مطلب یہ ہے کہ پورے زور و شور سے شروع ھو گئی - گھمسان کا رن پڑا - اسی سے سَاقٌ* اس شدید کے لئے آتا ہے - بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اسکی اصل تَنْمِیْرُ النَّاقَۃِ سے ہے جس سے مراد ہے آدمی کا اونٹنی کے رحم میں ھاتھ ڈال کر بچہ نکالنا - ایسے موقع پر کُشِفَ عَنِ السَّاقِ کہا جاتا ہے** - بہرحال ، اس کے معنی شدت کی سختی اور گھبراھٹ کے ھیں -

یہ جو ھمارے ھاں کشف و الہام کا عقیدہ ہے اسکی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی - ختم نبوت کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ کوئی شخص خدا سے براہ راست ھمکلام ھو سکتا ہے اور براہ راست حقائق کا علم حاصل کر سکتا ہے ، ختم نبوت کی مہر کو توڑ دینا ہے - اب انسانوں کے لئے علم کے سر چشمے صرف دو ھیں - قرآن کریم (جو وحی پر مشتمل ہے) اور عقل انسانی (مزید تفصیل عنوان ل - ہ - م - میں دیکھئے)

ک ظ م

اَلْکَظْمُ - اَلْکَظَمُ - حلق - منہ - سانس کے باھر نکلنے کا راستہ - مخرج *** - اس اعتبار سے اسکے معنے کسی چیز کے باھر نکلنے کے ھیں - لیکن دوسری طرف اَلْکُظُوْمُ سانس کے رک جانے کو بھی کہتے ھیں ** - کَظَمَ الْبَعِیْرُ کے معنی ھیں اونٹ کا جگالی نہ کرنا ، اور جو کھایا ھو اسے اندر روک لینا ** - اس سے کَظَمَ الْبَابَ کے معنی ھیں دروازہ بند کر دینا *** - اسی سے اَلْکُظُوْمُ کے معنی خاموش ھو جانے کے آتے ھیں **** - اَلْکَاظِمُ اس اونٹ کو بھی کہتے ھیں جس کے پیٹ کا پانی خشک ھو گیا ھو اور وہ سخت پیاسا ھو * - لیکن کَظِیْمٌ اور مَکْظُوْمٌ کے معنی سخت غمگین و فکر مند اور مضطرب و بیقرار انسان کے ھیں - **** بے چینی اور بیقراری کے معنوں میں سورہ المومن میں ہے - اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَی الْحَنَاجِرِ کَاظِمِیْنَ (۴۰/۱۸) - جب قلوب اچھل کر گلے تک آجائیں گے اور وہ لوگ سخت مضطرب و بیقرار ھونگے - یا وہ اپنے قلوب کو دبا رہے ھونگے کہ کہیں وہ باھر ھی نہ نکل پڑیں - سورہ القلم میں ہے - وَھُوَ مَکْظُوْمٌ (۶۸/۴۹) - وہ بے چین اور بیقرار تھا - سورہ یوسف میں حضرت یعقوبؑ کے متعلق ہے فَھُوَ کَظِیْمٌ (۱۲/۸۴) - وہ یوسف کی جدائی میں بیقرار تھا -

---

*تاج - **راغب - ***تاج و لطائف اللغۃ و راغب - ****محیط -

سورہ آل عمران میں مومنین کی صفت بتائی گئی ہے۔ کَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ (۳/۱۳۳)۔ عام طور پر اس کے معنی کئے جاتے ہیں غصہ کو دبانے والے۔ یہ مفہوم صحیح نہیں۔ قرآن کریم غصے کو دبانے (Suppression) کی تلقین نہیں کرتا۔ اس کے صحیح مفہوم کے لئے کِظَامَةٌ کے معنی سمجھ لینے ضروری ہیں۔ جن زمینوں میں پانی کم ہو (جیسا کہ عرب کی سرزمین) وہاں ایک کنویں کے قریب ہی دوسرا کنواں کھود دیتے ہیں اور ان کنوؤں کے نیچے زمین دوز راستہ (Subterranean Channel) بنا دیتے ہیں جس سے ایک کنواں دوسرے کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اگر ایک کنویں میں پانی کم رہ جاتا ہے اور دوسرے میں زیادہ ہوتا ہے تو اس کا زائد پانی اس دوسرے کنویں کی طرف آجاتا ہے۔ اس زمین دوز نالی کو کِظَامَةٌ کہتے ہیں *۔ لہذا اَلْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ کے معنی یہ ہیں کہ جب کسی وجہ سے ان (مومنین) کی مشتعل ہونے والی قوتیں بڑھ جاتی ہیں تو بجائے اس کے کہ یہ ان قوتوں کو وحشیوں کی طرح یونہی تخریب میں صرف کردیں وہ انہیں دوسری طرف منتقل کر دیتے ہیں اور اس طرح ان سے تعمیری کام لیتے ہیں۔ اسے کِظَامَةٌ کہا جائیگا۔ اسی کو دور حاضر کے علم النفس (سائیکالوجی) کی اصطلاح میں (Sublimation) کہتے ہیں۔ یعنی زائد قوتوں کا دوسری طرف منتقل کرکے توازن قائم رکھنا۔ توازن کے اعتبار سے ترازو کے اس حلقے کو بھی اَلْکِظَامَةٌ کہتے ہیں جس میں پلڑے کی رسیاں اکٹھی کرکے باندھی جاتی ہیں۔ نیز اس میخ کو بھی جس کے ساتھ ترازو کی زبان گھومتی ہے اور بتاتی ہے کہ دونوں پلڑوں میں سے کونسا بھاری اور کونسا ہلکا ہے۔ جب ان کا وزن برابر ہو جاتا ہے تو یہ زبان درمیان میں ٹھہر جاتی ہے *۔ نیز اَلْکَظِیْمَةٌ۔ توشہ دان کو کہتے ہیں جسمیں زائد کھانا رکھ لیا جاتا ہے۔ لہذا کَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ کے معنی ہیں زائد توانائیوں کو اس طرف منتقل کرکے جہاں ان کی ضرورت ہو، اپنی ذات اور معاشرہ کے توازن کو قائم رکھنے والے۔ قرآنی معاشرہ کا کام یہ ہے کہ وہ مختلف افراد کی توانائیوں کا جائزہ لیتا رہے۔ جہاں جہاں ان کی ضرورت ہے انہیں اسطرف منتقل کرکے، کظامت کے ذریعے، معاشرہ کا توازن قائم رکھے اور معاملات میں درستگی پیدا کرتا رہے۔ اس طرح ایک فرد کی ذات میں بھی توازن قائم رہے گا اور سارے معاشرہ میں بھی۔ یوں جماعت مومنین اَلْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ ہو جائیگی۔ واضح رہے کہ جس چیز کو (Rational) کہا جاتا ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ اسمیں صحیح (Ratio) ہوتی ہے۔ جماعت

---

*تاج۔ نیز ابن فارس۔

مومنین چونکہ اپنی ذات اور معاشرہ میں صحیح صحیح توازن رکھتی ہے اسلئے
اسکی ہر بات (Rational) ہوتی ہے اور یہ (Ratio) کظامت کے ذریعے برقرار
رکھی جاتی ہے - توازن یا تناسب (Ratio) کے صحیح ہونے کا نام حسن
ہے - اسی سے قرآن کریم نے ,, نیکیوں اور بھلائیوں " کے لئے حسنات کا
لفظ استعمال کیا ہے - اور صفات خداوندی کو الاسماء الحسنٰی سے تعبیر کیا ہے -
(تفصیل ان نکات کی ح - س - ن کے عنوان میں ملیگی) -

ک ع ب

اَلْکَعْبُ - ہڈیوں کا ہر جوڑ - ابھری ہوئی ہڈی جو پاؤں کے اوپر یا
پنڈلی اور پاؤں کے جوڑ پر ہوتی ہے - یا بالخصوص پاؤں کا ٹخنہ - سورۃ مائدہ
میں کَعْبَیْنِ - دونوں ٹخنوں کے لئے آیا ہے (۵/۶) - اَلْکَعْبُ - اَلْکَعْبَۃُ -
مربع ہڈی (جس پر نشانات لگے ہوتے ہیں اور) جسے کھیلنے میں پھینکا جاتا
ہے* - (عام طور پر ان سے جؤا کھیلا جاتا ہے - انہیں پانسہ کہتے ہیں) کَعْبَۃٌ -
اونچی اور مربع جگہ کو کہتے ہیں - ہر چوکور مکان کو** - لیکن اَلْکَعْبَۃُ
خانۂ کعبہ کےلئے مخصوص ہو گیا - اَلْکَعْبُ - شرف اور بزرگی کو بھی کہتے ہیں* -
اَلْکَعْبُ - ابھرا ہوا پستان - اسی جہت سے اَلْکَاعِبُ - نوجوان لڑکی
کو کہتے ہیں - جمع کَوَاعِبُ - سورۃ النبأ میں جنتی معاشرہ کی عورتوں
کے لئے کَوَاعِبَ اَتْرَابًا آیا ہے (۷۸/۳۳) - انہی کو دوسری جگہ عُرُبًا
اَتْرَابًا کہا گیا ہے (۵۶/۳۷) - اور اس کی تفسیر ذرا پہلے فُرُشٍ مَّرْفُوْعَۃٍ
کہکر کر دی گئی ہے (۵۶/۳۴) - یعنی عالی مرتبت ، بلند پایہ خواتین - اس لئے
کَوَاعِبُ میں جوانی کی تندرستی کے ساتھ ساتھ شرف و مجد (اَلْکَعْبُ)
کی طرف بھی اشارہ ہے - (نیز دیکھئے ع - ر - ب اور ت - ر - ب) قرآن کریم کی رو
سے کعبہ کا صحیح مقام کیا ہے ، اس کے لئے عنوان ، (ق - ب - ل) ، میں لفظ
قِبْلَۃٌ دیکھئے -

ک ف أ

کَافَأَہٗ عَلَی الشَّیْءِ - مُکَافَأَۃً - کِفَاءً - اس نے اس چیز پر اسے بدلہ
دیا - کَافَأَہٗ - اس نے اس کی برابری کی - اس کا ہم پلہ ہؤا - تَکَافَأَ الشَّیْئَانِ -
دونوں چیزیں برابر سرابر ہو گئیں - یہ اس کے بنیادی معنی ہیں (ابن فارس) -

*تاج - **لطائف اللغۃ -

اسی لئے کُفُوٌ و کَفُوءٌ و کِفُوءٌ کے معنی اس کی مثل و نظیر اور اس کے ہم پلہ کے ہیں ۔ اَلْکَفَاءَۃُ فِی النِّکَاحِ اسی سے ماخوذ ہے ۔ یعنی شوہر کا اپنی بیوی سے حسب ، نسب ، گھرانے وغیرہ میں برابر ہونا* ۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے ہے ۔ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ (۱۱۲/۴)۔ اس کے برابر، ہمسر ، ہم پلہ کوئی نہیں۔ یہ چیز ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے۔ ہر (Personality) منفرد (Individual) اور یگانہ (Unique) ہوتی ہے ۔ اور خدا کی ذات چونکہ مطلق اور مکمل ہے اس لئے اس کی انفرادیت بھی یکسر مکمل اور بے نظیر ہے ۔ سورۃ اخلاص بالخصوص ، ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیات (Characteristics) کی شارح ہے ۔ اس میں احدیت ، ذات کی یگانگت (Uniqueness) پر دلالت کرتی ہے ۔ صمدیت ، اس کی آزادی (Freedom) کی شہادت دیتی ہے ۔ عدم تولد ، یہ بتاتا ہے کہ ذات ، انسانی جسم کی طرح سلسلۂ توالد و تناسل کی رو سے وجود میں نہیں آتی ۔ اور کفواً اس کی انفرادیت (Individuality) کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ (مزید تشریح متعلقہ عنوانات میں دیکھئے) ۔

ک ف ت

کَفَتَ الشَّیْءَ اِلَیْہِ ۔ اس نے چیز کو اپنے اندر لے لیا ۔ کَفَتَ الشَّیْءَ ۔ اس چیز پر قبضہ کر لیا** ۔ جمع کر لیا **۔ راغب نے لکھا ہے کہ کَفْتٌ تیز ہانکنے کو بھی کہتے ہیں ۔ کَفَتَ الطَّائِرُ ۔ پرندے نے اڑنے میں پر سمیٹے اور تیز اڑا ۔ اَلْکِفَاتُ ۔ وہ جگہ جہاں کسی چیز کو جمع کیا جائے ۔ چنانچہ عرب کِفَاتُ الْاَحْیَاءِ مکانوں کو اور کِفَاتُ الْاَمْوَاتِ قبروں کو کہتے تھے** ۔

قرآن کریم میں ہے اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ کِفَاتًا (۷۷/۲۵) ۔ کیا ہم نے زمین کو کِفَاتٌ نہیں بنایا ۔ یعنی اس میں ہر قسم کی چیزیں جمع کر دیں ۔ جمادات ۔ نباتات ۔ حیوانات ۔ پانی ۔ ہوا وغیرہ ۔ نیز جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ، کَفَتَ الطَّائِرُ کے معنی ہیں پرندے نے اڑنے میں تیزی کی (اڑنے میں پروں کو سمیٹا) ۔ فَرَسٌ کَفْتٌ ۔ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو یک بارگی اچھل پڑے اور سوار کا اس پر قابو پانا مشکل ہو جائے*** ۔ اس اعتبار سے زمین کے کِفَاتٌ سے مراد یہ ہوگی کہ یہ تیزی سے چل رہی ہے ۔ یا دونوں معانی کو یک جا کرنے سے مطلب یہ ہوگا کہ یہ تمام چیزوں کو اپنے اندر لئے ہوئے نہایت تیزی سے چل رہی ہے ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔ ***راغب و ابن فارس

ک ف ر

کُفْرٌ کے معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے آتے ہیں ۔ الرمانی نے اَخْفٰی ۔ سَتَرَ اور اَجَنَّ کو کَفَرَ کا مرادف لکھا ہے** ۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی چھپانے اور ڈھانپنے کے کئے ہیں ۔ چنانچہ اس شخص کو جو اس طرح ہتھیاروں میں ڈوب جائے کہ اس کا بدن نظر نہ آئے کَافِرٌ کہا جاتا ہے۔ رات کو بھی کَافِرٌ کہتے ہیں کیونکہ اس کی تاریکی تمام چیزوں پر پردہ ڈال دیتی ہے ۔ سیاہ بادل کو بھی کَافِرٌ کہتے ہیں ۔ نیز دریا اور سمندر کو بھی کیونکہ یہ اپنی اندرونی چیزوں کو چھپائے ہوئے ہیں ۔ کسان کو بھی کَافِرٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ بیج کو مٹی میں چھپا دیتا ہے* ۔ تاج، نیز صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ قبر کو بھی اَلْکَفْرُ کہتے ہیں ۔ ان معانی کے اعتبار سے مومن کے مقابل میں کَافِرٌ اُسے کہا جائے گا جو ٹھوس سچائیوں کو پس پردہ رکھنا چاہے ۔ جو خدا کے دئے ہوئے ابدی حقائق کو پوشیدہ رکھے اور انہیں ابھر کر سامنے نہ آنے دے ۔ یا جو اپنی یا دوسروں کی صلاحیتوں کو چھپائے اور انہیں بروئے کار نہ آنے دے ۔ ان کی نشو و نما نہ ہونے دے ۔

چھپانے کے مفہوم کی وجہ سے اس کے معنی انکار کرنے کے بھی ہو گئے۔ اِیْمَانٌ کے مقابل میں کُفْرٌ کے یہی معنی ہوتے ہیں ۔ یعنی قرآنی صداقتوں کا انکار کرنا ۔

کُفْرٌ بمقابلہ شُکْرٌ بھی آتا ہے ۔ اس لئے کہ شکر کے معنی ہیں کسی چیز کا ابھر کر سامنے آ جانا (دیکھئے ش ۔ ک ۔ ر) ۔ لہذا کُفرانِ نعمت کے معنی ہیں نعمتوں کا چھپا لینا ۔ انہیں نوع انسانی کے فائدے کے لئے کھلا نہ رکھنا ۔

کَفَّارَۃٌ کو کفارہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ غلط کام کے ضرر رساں نتیجہ کو ڈھانپ لیتا ہے* ۔ کَفَرَ کے تین مصدر ہیں ۔ (۱) کُفْرَانٌ ۔ (۲) کُفْرٌ اور (۳) کُفُوْرٌ ۔ کُفْرَانٌ کا استعمال عام طور پر انکارِ نعمت کے لئے ہوتا ہے اور کُفْرٌ کا استعمال دینی معاملات کا انکار کرنے کے لئے ۔ اور کُفُوْرٌ ان دونوں میں استعمال ہوتا ہے* ۔ صاحب تاج نے البصائر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بیشتر کَافِرٌ (بمعنی کافرِ دین) کی جمع کُفَّارٌ آتی ہے ۔ (۴۸/۲۹) اور کَافِرٌ (بمعنی کافرِ نعمت) کی جمع کَفَرَۃٌ* ۔ (مثلاً ۸۰/۴۲ میں)۔ لیکن

*تاج ۔ **الالفاظ المترادفۃ ۔ ***راغب ۔

ھمارا خیال ھے کہ قرآن کریم میں کُفَّارٌ - کَفَرَةٌ اور کَافِرُوْنَ سب ھی جمعیں بلا تفریق، کافر دین کے لئے استعمال ھوئی ھیں - کَافُوْرٌ - ویسے تو اس خول کو کہتے ھیں جو شگوفہ کو اپنے آغوش میں چھپائے ھوئے ھوتا ھے* لیکن یہ ایک مشہور خوشبودار دوائی کا بھی نام ھے جس کا اثر حدت کو کم کر دینا ھوتا ھے -

کَفُوْرٌ - بڑا ناشکرا ، بڑا منکر حق - اس میں کافر سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ھے ($\frac{۳۱}{۴۲}$) - اور کَفَّارٌ بھی کَفُوْرٌ کے ھم معنی ھے ، بلکہ اس میں کبھی کَفُوْرٌ سے بھی زیادہ مبالغہ پایا جاتا ھے ($\frac{۵}{۲۴}$)** -

قرآن کریم میں کُفْرٌ بمقابلہ اِیْمَانٌ متعدد مقامات پر آیا ھے (مثلاً $\frac{۲}{۶}$; $\frac{۲}{۴}$ میں) - اور شُکْرٌ کے مقابل بھی ($\frac{۱۲}{۷}$) - سورہ انبیاء میں مومن کے متعلق کہا ھے کہ فَلاَ کُفْرَانَ لِسَعْیِہٖ ($\frac{۲۱}{۹۴}$) - یعنی اسکی کوششوں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا - وہ بے نتیجہ نہیں رھینگی (اس لئے کہ شُکْرٌ کے معنی ھیں کوششوں کے بھر پور نتائج مل جانا) - اسی طرح وَمَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلَنْ یُّکْفَرُوْہُ ($\frac{۳}{۱۱۴}$) کے بھی یہی معنی ھیں - یعنی ان کا ھر عمل خیر پورا پورا نتیجہ مرتب کریگا -

سورہ بقرہ میں اِیْمَانٌ بِاللّٰہِ کے مقابلہ میں کُفْرٌ بِالطَّاغُوْتِ کی تاکید آئی ھے ($\frac{۲}{۲۵۶}$) - اس کُفر بالطاغوت کی تشریح دوسرے مقام پر وَاجْتَنِبُوْا الطَّاغُوْتَ ($\frac{۱۶}{۳۶}$) کہکر کر دی - یعنی غیر خدائی قوتوں سے اجتناب کرو - اس کی تفسیر سورہ نساء میں ان الفاظ سے کر دی کہ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ ($\frac{۴}{۶۰}$) یہ لوگ چاھتے ھیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خدائی قوانین سے کرائیں حالانکہ ان سے کہدیا گیا ھے کہ وہ غیر خدائی قانون سے اجتناب کریں - اُن سے انکار کر دیں - کہدیں کہ ھم انہیں صحیح تسلیم نہیں کرتے -

لہذا اِیْمَانٌ بِاللّٰہِ (یا اللہ کی عبادت)*** کے معنی ھیں خدا کے قانون کے مطابق معاملات کے فیصلے کرنا اور کُفْرٌ بِالطَّاغُوْتِ کے معنی ھیں غیر خدائی قانون سے اجتناب کرنا - اس سے ظاھر ھے کہ ایمان اور کفر محض اعتقادی چیزیں نہیں جو انسان کے ذھن تک محدود ھوں - ان کا تعلق زندگی کے نظری اور عملی دونوں مسائل سے ھے - قرآن کریم کے قانون کی صداقت کو

---

*تاج - **راغب - ***وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلاً اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ($\frac{۱۶}{۳۶}$) -

تسلیم کرنا اور پھر اس کے مطابق زندگی کے معاملات کا فیصلہ کرنا ایمان ہے اور اسکے خلاف فیصلہ کرنا کفر ہے ۔ چنانچہ (۳۰/۴۴) میں کَفَرَ کے مقابلہ میں عَمِلَ صَالِحًا آیا ہے ۔

انکار کے لحاظ سے اس کے معنی بری الذمہ ہونے کے بھی آتے ہیں ۔ سورۂ ابراہیم میں ہے اِنِّی کَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَکْتُمُوْنِ (۱۴/۲۲)۔ تم نے جو مجھے شریک بنایا تو میں اس سے بری الذمہ ہوں ۔ کاشتکار کے معنوں میں کُفَّارٌ جو کَافِرٌ کی جمع ہے (۵۷/۲۰) میں آیا ہے ۔ کَافِرَۃٌ کی جمع کَوَافِرُ (۶۰/۱۰) میں آئی ہے ۔ کَفَّارَۃٌ (۵/۴۵) ۔ وہ عمل یا شے جس سے کسی سابقہ لغزش کی تلافی ہو جائے ۔

سورۂ دھر میں "جنت کی شراب" کا مزاج کَافُوْرًا بتایا گیا ہے (۷۶/۵) ۔ یعنی جلد مشتعل ہو جانے والے جذبات میں سکون پیدا کرنے والی ۔ لیکن یہ انسانی ذات کی اصلاح کا پہلا مرحلہ ہے ۔ اس سے اگلا مرحلہ وہ ہے جس میں اس "شراب" کا مزاج زَنْجَبِیْلًا ۔ (۷۶/۱۷) بتایا گیا ہے ۔ یعنی مناسب قوت اور حدت پیدا کرنے والی ۔ برودت اور حدت (ٹھنڈک اور گرمی) کے معتدلانہ امتزاج کا نام ہے ، سیرتِ مومن ۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

قرآن کریم کی رو سے کافر کا لفظ کوئی گالی نہیں بلکہ ایک حقیقتِ نفس الامری کا بیان (Statement of Fact) ہے ۔ آپ ایک پارٹی بناتے ہیں ۔ جو لوگ اس میں شامل ہوتے ہیں انہیں اس کا ممبر کہا جاتا ہے ۔ جو اس میں شامل نہیں ہوتے وہ غیر ممبر (Non-Members) کہلاتے ہیں ۔ یہی فرق مومن اور کافر کا ہے ۔ اسلامی معاشرہ کے ممبروں کو مومن کہا جاتا ہے ۔ اور جو اس معاشرہ میں داخل ہونے سے انکار کر دیتے ہیں وہ "نان ممبرز" (کافر) ہوتے ہیں ۔

ان "غیر ممبروں" (کافروں) کے متعلق جس جس عذاب (تباہیوں) کا ذکر آیا ہے وہ ان کی غلط روش کے نتائج ہوتے ہیں جسے وہ صحیح راستہ کے انکار سے اختیار کرتے ہیں ۔ یعنی صحیح راستہ کی پیروی چھوڑ کر (۲/۳۸) غلط راستہ اختیار کر لینا (۲/۳۹) اور اس طرح تباہیوں میں جا گرنا ۔ (۲/۳۹) ۔

کَفَّرَ عَنْہُ کے معنی ہیں دور کر دینا ۔ (۲/۲۷۱) ۔

اس حقیقت کو ایک بار پھر سامنے لے آئیے کہ قرآن کریم نے کفر کا لفظ عملِ صالح کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے (۳۰/۴۴) ۔ لہذا ایمان اور کفر صرف نظری (Theoretical) اعتقاد نہیں بلکہ عمل اور بے عملی (یا صحیح

عمل اور غلط عمل) کا نام ہے ۔ یہیں سے سورۃ البقرہ کی اس آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے جس کے مروجہ ترجمہ اور غلط مفہوم سے طرح طرح کے شکوک اور اعتراضات پیدا ہو جاتے ہیں ۔ سورۃ بقرۃ کے شروع میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے بچنے کی خواہش رکھتے ہیں ، انہیں قرآن کریم صحیح روش کی طرف راہ نمائی دیتا ہے ۔ اس سے اگلی آیت میں ہے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۶/۲) ۔ اس کا عام طور پر ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ''جو لوگ کافر ہوگئے ان کے لئے برابر ہے چاہے تو ان کو ڈرائے یا نہ ڈرائے ۔ وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے'' ۔ ''کافروں'' سے مراد لئے جاتے ہیں ''غیر مسلم''۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے ۔ مسلمان نہیں ہوتے ۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر غیر مسلموں (کافروں) کو رسول کا انذار کچھ فائدہ نہیں دے سکتا تو پھر رسالت اور تبلیغ ہے کن لوگوں کے لئے؟ مومنین کو اس کی ضرورت نہیں رہتی اور کافروں کو یہ کچھ فائدہ نہیں دیتا! نیز جب نبی اکرم ؐ نے انذار شروع کیا ہے تو اس وقت ساری دنیا ''کافر'' ہی تھی ۔ اگر حضورؐ کا انذار کفار کے لئے بےسود تھا تو حضورؐ کی بعثت کا مقصد ہی (معاذ اللہ) کچھ نہیں تھا ۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس آیت میں کفار سے مطلب سب غیرمسلم نہیں ۔ یہ غیر مسلموں کے ایک مخصوص گروہ کا نام ہے ۔ جہاں تک ''غیر مسلموں'' کا تعلق ہے ، افریقہ اور آسٹریلیا کے قدیم قبائلی باشندے ، یا قطب شمالی کے اسکیمو، جنہوں نے ابھی تک اسلام یا قرآن کریم کا نام بھی نہیں سنا، وہ بھی غیر مسلم ہیں ۔ لیکن ان کا شمار کفار کے زمرے میں نہیں ہوگا ۔ جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے ، کفر ، ایمان کے مقابلہ میں آتا ہے ۔ ایک شخص کے سامنے قرآن کریم کی صداقتیں پیش کی جاتی ہیں ۔ اسے ان کا مفہوم اور مطلب سمجھایا جاتا ہے ۔ وہ ان پر غور و فکر کرتا ہے اور اس کے بعد برضا و رغبت انہیں تسلیم کر لیتا ہے ۔ اسے ایمان کہتے ہیں ۔ اس کے برعکس دوسرا شخص ہے ۔ اس کے سامنے بھی اسی طرح قرآنی صداقتیں پیش کی جاتی ہیں ۔ لیکن وہ انہیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے ۔ اسے کافر کہینگے ۔ ان لوگوں کے انکار کی کئی وجوہات اور متعدد محرکات ہوتے ہیں ۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے ۔ نیز یہ بھی بتایا ہے کہ یہ لوگ حق کی مخالفت پر اتر آتے ہیں ۔ اس سے سرکشی برتتے ہیں ۔ خود بھی اس راستے سے رکتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی طرف آنے سے روکتے ہیں ۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ ہر غیرمسلم، کافر نہیں ہوتا ۔ کافر وہی ہوتا ہے جس کے سامنے حق کو پیش کیا جائے لیکن وہ تمام دلائل و براہین کے باوجود، اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور پھر لاکھ کوشش کرو، وہ اپنی ضد پر اڑا رہے ۔ کفار کی اس ذہنیت، اور اس کے بعد حق کی مخالفت میں ان کی تگ و تاز کا ذکر، قرآن کریم نے متعدد مقامات میں کیا ہے ۔ مثلاً

(۱) وہ اہل کتاب کے متعلق کہتا ہے فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ (۲/۸۹) ۔ ''جب ان کے پاس وہ آیا جسے وہ پہچانتے تھے، تو انہوں نے اس سے انکار (کفر) کر دیا'' ۔ دوسری جگہ ہے کہ یہ اہل کتاب چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو، ان کے ایمان لانے کے بعد، پھر کفر کی طرف لوٹا دیں، مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ .... (۲/۱۰۹) ''بعد اس کے کہ حق ابھر کر ان کے سامنے آگیا'' ۔ سورۃ محمد میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى (۴۷/۳۲) ۔ ''یقیناً جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ...... بعد اس کے کہ ہدایت ان کے سامنے ابھر کر آچکی ہے ...'' ۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ، حق اور صداقت (ہدایت) کے واضح طور پر سامنے آجانے کے بعد، اس سے انکار کئے جانا، کفر کہلاتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے کفر اور ایمان کے امتیاز کا ذکر ہی حق کے سامنے آجانے کے بعد کیا ہے ۔ سورۃ کہف میں ہے و قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ... (۱۸/۲۹) ۔ ''اور (ان سے کہو کہ) حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا ہے ۔ اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کی راہ اختیار کرلے'' ۔ سورۃ دہر میں ہے اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (۷۶/۳) ۔ ''ہم نے (انسان کو) راستہ دکھا دیا ہے ۔ اب اس کا جی چاہے تو اس کا قدردان بن جائے اور چاہے تو اس سے انکار کردے'' ۔ سورۃ زخرف میں ہے وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ ۔ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۴۳/۳۰) ۔ ''اور جب حق ان کے پاس آیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ جھوٹ ہے اور ہم اس سے انکار کرتے ہیں'' ۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ حق کے واضح طور پر سامنے آجانے کے بعد اس سے انکار کرنا، کفر کہلاتا ہے ۔ جن لوگوں کے سامنے حق آیا ہی نہیں وہ غلط راستے (ضلالت) پر تو ہیں لیکن انہیں کافر نہیں کہا جائے گا ۔ ان کا شمار ضَآلِّيْن میں ہوگا ۔ یعنی راہ گم کردہ ۔ غلط راستے پر چلنے والے ۔

(۲) سورۃ توبہ میں ایمان والوں سے کہا گیا ہے کہ تم اپنے باپ اور بھائیوں کو بھی اپنا دوست نہ بناؤ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ (۲۳/۹) - اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو پسند کریں - اس سے واضح ہے کہ کفر، اس انکار کی راہ کا نام ہے جسے انسان اپنی پسندیدگی سے اختیار کرے - اسی طرح سورۃ النحل میں ہے کہ کفر اس کا ہے مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا (۱۰۶/۱۶) - ''جس کا سینہ کفر کے لئے کھل جائے'' - لہذا کفر وہ ہے جسے انسان اپنے اختیار و ارادہ (Choice) سے پسند کرے -

(۳) اس قسم کے انکار کے کئی محرکات ہوتے ہیں - مثلاً اہل کتاب کے متعلق ہے کہ وہ بَغْيًا ایسا کرتے ہیں (۹۰/۲) - یعنی ضد اور سرکشی کی بنا پر - یا حَسَدًا ایسا کرتے ہیں (۱۰۹/۲) - عام مخالفین حرب کے متعلق ہے کہ وہ اس دعوت سے انکار کرتے تھے اِسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ (۴۳/۳۵) - ''تکبر کرتے ہوئے اور بری تدبیریں کرتے ہوئے'' - یعنی انہوں نے ظلم اور استبداد، اور دجل و فریب سے جو قوت اور دولت حاصل کر رکھی تھی، وہ اس کے نشے میں بدمست ہو کر اسلام کی مخالفت کرتے تھے کیونکہ اس سے ان کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی - (نیز دیکھئے ۳۴/۹) - سورۃ نمل میں ہے کہ وَ جَحَدُوا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا (۱۴/۲۷) - ''انہوں نے محض ظلم اور سرکشی کی بنا پر ہماری آیات سے انکار کر دیا حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا'' -

(۴) بعض اوقات انسان، محض بات کی پچ میں حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا چلا جاتا ہے - یعنی اگر ایک دفعہ منہ سے نہ نکل گئی تو پھر (محض اپنی بات پر جمے رہنے کی خاطر) نہ کرتے چلے گئے - سورۃ اعراف میں انہی لوگوں کے متعلق ہے کہ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ - فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ (۱۰۱/۷) - ''اور یقیناً انکے پاس رسول واضح دلائل لیکر آئے - مگر وہ ایسے نہ تھے کہ جس بات کو انہوں نے پہلے جھٹلا دیا تھا، اس پر ایمان لے آتے'' - اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں - كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ (۱۰۱/۷) -

(۵) یہ لوگ، ضد - حسد - ہٹ دھرمی اور تکبر کی بنا پر حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے بعد، دوسروں کو بھی روکتے ہیں کہ وہ اسے تسلیم نہ کر لیں - وَ هُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ يَنْئَوْنَ عَنْهُ (۲۶/۶) - '' وہ دوسروں کو بھی اس سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور

رھتے ھیں ''۔ دوسری جگہ ھے اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ .... (۴۷/۳۴) '' یقیناً وہ لوگ جنھوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو بھی اللہ کی راہ سے روکتے ھیں '' (وہ اپنا ھی نقصان کرتے ھیں ، اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے) ۔ ان کی کیفیت یہ ھوتی ھے کہ وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِھٰذَا الْقُرْاٰنِ ۔ وہ لوگوں کو تاکید کرتے رھتے ھیں کہ اس قرآن کریم کو مت سنو ۔ وَالْغَوْا فِیْہِ ۔ اور (جہاں کہیں اس کا چرچا ھوتا ھو) اس میں شور مچاؤ ۔ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶) ۔ شاید تم (اس طریق سے ان پر) غالب آسکو ۔

یہ ھیں وہ لوگ کہ سَوَاءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۲/۶) ۔ چاھے تو انہیں (ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے) آگاہ کرے یا نہ کرے ، ان کے لئے برابر ھے ۔ یہ کبھی ایمان نہیں لائینگے ۔ اسلئے کہ ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ ان میں سمجھنے ، سوچنے ، دیکھنے ، سننے کی صلاحیت ھی باقی نہیں رھتی (۲/۷) ۔ یہی وہ لوگ ھیں جن کے متعلق قرآن کریم کہتا ھے کہ لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا ۔ وَلَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا ۔ وَلَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا ۔ اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ (۷/۱۷۹) ۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ھے (۷/۱۷۹) ۔ '' ان کے دل ھیں لیکن وہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے ۔ اور ان کی آنکھیں ھیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں ۔ اور ان کے کان ھیں لیکن ان سے سنتے نہیں ۔ یہ لوگ (یونہی شکل و صورت سے انسان نظر آتے ھیں ورنہ درحقیقت) حیوانات کی سطح پر زندگی بسر کرتے ھیں ۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ '' (کیونکہ وہ کم از کم اپنی جبلت پر توقائم رھتے ھیں)

سوال یہ ھے کہ یہ کفر کی زندگی ھے کیا ؟ یہ حقیقت متعدد مقامات پر سامنے لائی جا چکی ھے کہ ایک تصور زندگی یہ ھے کہ انسانی زندگی بس یہی طبیعی زندگی ھے ۔ کھایا ، پیا ، زندہ رھے ، بچے پیدا کئے اور مر گئے ۔ اس کے بعد ختم ۔ دوسرا تصور زندگی یہ ھے کہ انسان ، اسی طبیعی جسم کا نام نہیں جو موت کے ساتھ ختم ھو جاتا ھے ۔ اس میں ایک اور چیز بھی ھے جسے انسانی ذات (Personality) کہا جاتا ھے ۔ اس ذات کی نشوونما سے انسان حیات جاوید حاصل کر سکتا ھے ۔ موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا ۔ حیوانات کو '' ذات '' نہیں دی گئی ۔ یہ صرف انسانوں کا خاصہ ھے ۔

پہلا تصور زندگی ، کفر ھے ۔ اس میں انسان ، حیوانات کی سطح پر رھتا ھے ۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ ۔ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ (۴۷/۱۲) ۔ '' جو لوگ کفر کی روش اختیار

کرتے ہیں ، وہ سامان زیست سے متمتع ہوتے ہیں ، اور حیوانات کی طرح کھا پی کر (مر جاتے ہیں)۔ جہنم ان کا ٹھکانہ ہے ''۔ یہ زندگی کی بلند اقدار پر ایمان نہیں رکھتے (کیونکہ ان کی ضرورت تو صرف ذات کی نشوونما کے لئے ہوتی ہے)۔ وہ اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے رہتے ہیں ، اور ان جذبات میں ایسے ڈوبتے ہیں کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی۔ سورہ الجاثیہ میں ہے اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰىہُ ۔ کیا تو نے اسکی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا ؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ ۔ خدا کا قانون ، اس کے علم کے باوجود ، زندگی کی صحیح راہ اس کے سامنے نہیں لاتا ۔ وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً ۔ (جذبات میں بہ جانے سے اسکی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ) اس کے کانوں پر اور دل پر مہریں لگ جاتی ہیں اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں ۔ فَمَنْ یَّھْدِیْہِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰہِ ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کے قانون کے علاوہ کوئی اور قانون صحیح راستے کیطرف اسکی راہ نمائی نہیں کر سکتا ۔ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ۔ کیا یہ لوگ اس سے نصیحت نہیں پکڑتے ؟ ($\frac{45}{23}$)

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ اسطرح جذبات کے پیچھے کیوں بہ جاتے ہیں اور زندگی کی بلند اقدار کا اتباع کیوں نہیں کرتے ؟ اس لئے کہ وَقَالُوْا مَا ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا ۔ اور کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے ۔ نَمُوْتُ وَنَحْیَا ۔ ہم (طبیعی قوانین کے ماتحت) مرتے اور جیتے ہیں ۔ وَمَا یُھْلِکُنَا اِلَّا الدَّھْرُ ۔ وقت گزرنے سے ہمارے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور ہم مرجاتے ہیں ۔

یہ ہے ان کا تصور زندگی ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ وَمَا لَھُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ ($\frac{45}{24}$) ۔ انہیں حقیقت کا کچھ علم نہیں ۔ یونہی اپنے قیاسات سے باتیں کرتے ہیں ۔ (نیز دیکھئے $\frac{6}{29}$)

اسی کا نام کفر ہے ۔ یعنی انسان کا اپنی ذات سے انکار ۔ اس انکار کے بعد نہ خدا پر ایمان کی ضرورت رہتی ہے ، نہ وحی اور رسالت پر ۔ اور آخرت کی زندگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ لہذا ، کفر درحقیقت مادی تصور حیات کا دوسرا نام ہے ۔ یعنی (Materialistic Concept of Life) ۔ اس تصور زندگی کے ماتحت اپنے جذبات کی تسکین ، انسان کا منتہائے زندگی قرار پا جاتا ہے اور زندگی کی بلند اقدار یا غیر متبدل اصولوں کی پابندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

جب انسان اس تصور زندگی کو عین حقیقت سمجھ لے ، تو جن امور سے بلند انسانی زندگی کو نقصان پہنچتا ہے ، اسے ان سے آگاہ کرنا یا نہ کرنا برابر ہوتا ہے ۔ حیوان کو آپ کیا سمجھا سکتے ہیں کہ دیانتداری کی زندگی بہت بلند ہوتی ہے اور بددیانتی سے شرف انسانیت کا زیاں ہوجاتا ہے !

ک ف ف

اَلْکَفُّ ۔ (۱۳/۱۴) ۔ پہنچے تک ہاتھ کو کہتے ہیں ، کیونکہ اس کے ذریعے انسان اپنی مدافعت کرتا اور دوسرے انسان کو ایذا پہنچانے سے روکتا ہے ۔ کَفَفْتُهٗ عَنْهُ (۵/۱۱) ۔ میں نے اسے اس بات سے روک دیا ۔ ہٹا دیا ۔ موڑ دیا ۔ فَکَفَّ هُوَ ۔ پس وہ رک گیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پکڑنا اور سکڑنا ہیں ۔ ہاتھ کو کَفٌّ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ چیزوں کو پکڑ لیتا ہے ۔ اَلْکُفَّةُ ۔ کسی چیز کے آخری کنارے کو کہتے ہیں جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتی ۔ اسی کو کِفَافُ الشَّیْءِ بھی کہتے ہیں ۔ کِفَّةٌ ۔ ترازو کے ایک پلڑے یا بازو کو کہتے ہیں ۔ کَافَّةٌ اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو اُس کی انتہا تک لے جا کر روک دے ۔ اسی لئے قرآن کریم میں جو ہے وَقَاتِلُوا الْمُشْرِکِیْنَ کَآفَّةً کَمَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ کَآفَّةً (۹/۳۶) ۔ تو اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ " مشرکین سے ایسی جنگ کرو جو انہیں ظلم و ستم سے روک دے ۔ یا جو تمہیں ان کے اثرات سے روک دے ۔" اس صورت میں کَآفَّةً صفت ہوگی حَرْباً یا مقاتلةً کی جو مقدر ہے ۔ اسی کو حد آخر تک جنگ کرنا کہا جائیگا ۔ اور (جیسا کہ راغب نے آگے چل کر لکھا ہے) یہ بھی کہ مشرکین سے اجتماعی قوت سے (جماعةً) جنگ کرو ۔

عام لغت و تفسیر کی رو سے اس آیت میں کَآفَّةً کے معنی ہیں " کل ۔ تمام کے تمام ۔ جمیع " ۔ لیکن قرآن کریم میں انہی مشرکین سے جنگ کرنے کا کہا گیا ہے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں ۔ یہ نہیں کہ جو مشرک جہاں بیٹھا ہو اس پر دھاوا بول دیا جائے ۔

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً (۲/۲۰۸) کے معنی ہیں ، تم اسلام میں وہاں تک پہنچ جاؤ جہاںتک اس کے شرائع کی آخری حدود ہیں * ۔ یعنی اس کی انتہا تک پہنچ جاؤ ۔ یونہی تھوڑا سا چل کر رک نہ جاؤ ۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ بعض نے اس کے معنی جَمَاعَةً بھی کئے ہیں ۔ یعنی اجتماعی طور پر** ۔ لیکن اس کے معنی روکنے یا حد آخر کے مفہوم سے

*تاج ۔ **راغب ۔

زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ خود راغب نے آیت وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ۔ (۳۴/۲۸) کے معنی کئے ہیں ہم نے تمہیں معاصی سے روکنے والا بنا کر بھیجا ہے***۔

روکنے کے معنی میں يَكُفُّوْنَ (۲۱/۳۹) میں آیا ہے۔ اور (۳۸/۴۴) میں بھی۔ نیز بَسْطٌ کے مقابلہ میں (۵/۱۱) میں۔ اَلْكَفَافُ مِنَ الرِّزْقِ۔ رزق کی اتنی مقدار جو انسان کو دوسرے انسانوں کا محتاج بننے سے روک دے*۔ اسی لئے اَلْكَفُّ کے معنی نعمت کے ہیں*۔

ک ف ل

اَلْكَفَلُ۔ کھولھے یا کولھے کے نچلے حصے کو کہتے ہیں*۔ اِكْتَفَلَ بِهٖ۔ اسے پیچھے کر دیا*۔ اسی سے اَلْكَافِلُ اور اَلْكَفِيْلُ کے معنی ذمہ دار اور ضامن کے آتے ہیں۔ كَفَّلَهٗ۔ اسکی خبرگیری کی۔ اس پر خرچ کیا۔ اسکا انتظام کیا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے دوسری چیز کے اندر شامل ہو جانے اور متضمن ہو جانے کے ہیں۔

سورہ قصص میں ہے يَكْفُلُوْنَهٗ (۲۸/۱۲)۔ جو اسے پالیں۔ اسکی پرورش اور نگہ پرداخت کریں۔ سورہ نحل میں ہے۔ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا (۱۶/۹۱)۔ تم اللہ کو اپنا ضامن قرار دے چکے ہو۔ سورہ صٓ میں ہے اَكْفِلْنِيْهَا (۳۸/۲۳)۔ اس (دُنبی) کو میری کفالت میں دیدے۔ میرے سپرد کر دے۔ میری ملکیت بنا دے۔ سورہ آل عمران میں ہے۔ وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا (۳/۳۶)۔ مریم کو زکریا کی کفالت میں دیدیا۔

اَلْكِفْلُ۔ حصہ۔ نصیب۔ یہ اسوقت بولتے ہیں جب کسی کے ساتھ دوسرے کو بھی اتنا ہی حصہ دیا جائے*۔(۴/۸۵)۔ كِفْلَيْنِ۔ دو حصے۔ دوگونہ حصے (۵۷/۲۸)۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہاں كِفْلَيْنِ سے مراد دو عدد نہیں بلکہ تواتر و تسلسل نعمت مراد ہے اور اس میں حسب ضرورت کا مفہوم بھی ہے***۔

سورہ انبیاء میں ذَا الْكِفْلِ (۲۱/۸۵) کا نام زمرہ انبیاء میں آیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ شاید یہ حزقیل نبی ہیں جن کا ذکر توریت میں آتا ہے****۔

---

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔ ****بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ذوالکفل سے مراد کپل و ستو والا (یعنی گوتم بدھ) ہیں۔

چونکہ قرآن کریم نے ان کے احوال و کوائف بیان نہیں کئے اس لئے اگر متعین طور پر نہ بھی کہا جاسکے کہ یہ کون تھے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ۔ نیز دیکھئے عنوان ذَا الْکِفْل ۔

ک ف ی

اَلْکِفَایَۃُ ۔ وہ چیز جس سے ضرورت پوری ہو جائے اور مقصود حاصل ہو جائے *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا اتنی مقدار میں ہونا کہ وہ ضرورت کو پورا کر دے اور اس سے زیادہ کی ضرورت نہ ہو ۔ کَفَاکَ الشَّیْءُ یَکْفِیْکَ ۔ تجھے وہ چیز کافی ہے ۔ اَلْکُفْیَۃُ ۔ غذا جو زندگی کے لئے کافی ہو ۔ کَفَاہُ مَؤُنَتَہٗ ۔ فلاں آدمی نے اس کے ہرمشقت کام کو اپنے سر لےلیا اور اسے اس سے بچا دیا**۔ کَفَیْتُہٗ شَرَّعَدُوِّہٖ میں نے اسے اس کے دشمن کے شر سے محفوظ رکھا اور بچا لیا ***۔ رَجُلٌ کَافٍ وَ کَفِیٌّ ۔ جو تمہارے لئے کافی ہو اور اسکے بعد تمہیں کسی کی ضرورت نہ ہو ۔ کَافَاہُ مُکَافَاۃً ۔ وہ اسکو کافی ہو گیا *** ۔ اَلْکَفِیُّ ۔ بارش**۔ کَفٰی عَنْہُ الشَّیْءُ ۔ اس چیز کو اس سے ہٹا دیا یا پھیر دیا**۔

قرآن کریم میں ہے ۔ اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَھْزِءِیْنَ (۱۵/۹۵) ۔ یہ لوگ جو تیرے خلاف شرارتیں کرکے خوش ہوتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں ہم ان کی مخالفت سے تیری مدافعت کرنے کے لئے کافی ہیں ۔ ہمارا قانون جس پر تو چل رہا ہے ان کے مقابلہ میں تیری حفاظت بھی کریگا اور تیرا مقصود بھی حاصل ہو جائیگا ۔ (کَفٰی میں دونوں باتیں شامل ہیں) ۔ انہی معنی میں ہے فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ (۲/۱۳۷) ۔ سورہ زمر میں ہے اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (۳۹/۳۶) ۔ خدا کے احکام کی اطاعت کرنے والے (عَبْدَہٗ) کو خدا کا قانون مکافات تمام تخریبی عناصر سے محفوظ بھی رکھتا ہے اور اسے اسکی منزل مقصود تک بھی پہنچا دیتا ہے ۔ اسکی تشریح اس سے اگلے ٹکڑے نے یہ کہکر کر دی کہ وَیُخَوِّفُوْنَکَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ (۳۹/۳۶)۔ یہ لوگ تجھے غیر خدائی قوتوں سے ڈراتے ہیں ۔ ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ۔

یہ ہے قوانین خداوندی کے اتباع کی بنیادی خصوصیت ۔ سورہ رعد میں ہے ۔ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا (۱۳/۴۳) ۔ شہادت (یا نگرانی) کے لئے خدا کافی ہے ۔

---

*راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

انسان کے لئے کسقدر اطمینان اور سکون کا موجب ہے یہ بات کہ اسے ایسا ضابطۂ زندگی مل جائے جو اسے تمام تخریبی عناصر سے محفوظ بھی رکھے اور اسے اسکی منزل مقصود تک بھی پہنچا دے۔ اور اسطرح اسے دنیا کی ہر آستاں سے مستغنی کر دے۔

ک ل أ

کَلَأَہٗ۔ یَکْلَأُ۔ کَلْأً۔ وَکِلَاءً وکِلَاءَۃً۔ حفاظت کرنا۔ چوکیداری کرنا۔ نگرانی کرنا*۔ اَلْمُکَلَّأُ۔ نہر کا کنارا۔ ساحل۔ بندرگاہ۔ ہر وہ مقام جہاں ہوا سے پناہ لی جائے**۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنوں میں دیکھ بھال کرنا اور چوکیداری کرنا لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے۔ مَنْ یَّکْلَؤُکُمْ (۴۲/۲۱)۔ تمہاری حفاظت کون کرتا ہے؟ کون تمہارا نگران ہوتا ہے؟

ک ل ب

اَلْکَلْبُ۔ ہر چیر پھاڑ کرنے والے جانور (درندے) کو کہتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ لفظ کتے کے لئے ہی استعمال ہونے لگا (۷/۱۷۶)۔ ویسے شیر کو بھی کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ سختی سے لٹک جانا ہیں۔ چنانچہ اَلْکَلْبُ آنکڑے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ سامان لٹکایا جاتا ہے۔ اَلْکَلْبَۃُ مِنَ الْعَیْشِ۔ روزی کی تنگی*۔ اَلْمُکَلِّبُ۔ کتوں کو شکار کے لئے سدھانے والا*۔ پھر یہ عام شکاری جانوروں (اَلْجَوَارِحُ) کو سدھانے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ سورۃ المائدہ میں ہے وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُکَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰہُ ۔ ۔ ۔ ۔ (۵/۴)۔ اور (تمہارے لئے حلال کیا گیا ہے) جو تم شکاری جانوروں کو شکار کی تعلیم دیتے ہوئے سکھاؤ۔ تم ان کو سکھاتے ہو اس (علم) کی رو سے جو تمہیں اللہ نے سکھایا ہے۔

(ضمناً) اس آیت میں ایک چیز اور بھی غور طلب ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ تم شکاری جانوروں کو جو شکار کرنا سکھاتے ہو تو یہ اس علم کی رو سے ہے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ نے یہ علم، شکاریوں کو خود نہیں سکھایا۔ اس نے اس کے سیکھنے کی استعداد انسان کے اندر رکھ دی ہے۔ اب جو انسان چاہے اس علم کو سیکھ لے۔ اللہ نے اس کی نسبت اپنی

---

*تاج۔ **محیط۔

طرف اس لئے کی ہے کہ اس علم کی تحصیل کی استعداد انسان کو اس نے دی ہے۔ لہذا ، انسان جو کچھ اللہ کے مقرر کردہ قانون اور قاعدے کی رو سے کرتا ہے، اسے اللہ اپنی طرف بھی منسوب کرلیتا ہے۔ اس نکتہ کے سمجھ لینے سے قرآن کریم کے بہت سے مقامات واضح ہو جاتے ہیں۔ (مثلاً دیکھئے ۲/۲۲۲) ۔

ک ل ح

کَلَحَ یَکْلَحُ ۔ کُلُوْحًا وَ کَلَاحًا ۔ ترش روئی کے ساتھ ہونٹوں کا اوپر کو اُٹھ جانا اور دانتوں کا نظر آنے لگنا ، بُرا منہ بنانا ۔ بڑی شدت سے منہ بگاڑنا ۔ اَلْکَلُوْحُ ۔ بد نما آدمی ۔ اَلْکَلَاحُ ۔ قحط سالی کو کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی ترشروئی اور چہرے کے بد نما ہونے کے لکھے ہیں ۔

سورۃ مومنون میں ہے ھُمْ فِیْھَا کَالِحُوْنَ (۲۳/۱۰۴) ۔ وہ اس میں برا منہ بنا رہے ہونگے ۔

ک ل ف

اَلْکَلَفُ ۔ سیاہی مائل زردی ۔ اَلْکُلْفَۃُ ۔ سیاہی مائل زرد ۔ مشقت کے باوجود جس کام کو برداشت کیا جائے ۔ ہر مصیبت یا حق جسے بدقت و صعوبت برداشت کیا جائے۔ اَلْکَلُوْفُ ۔ امر شاق ۔اَلتَّکْلِیْفُ ۔ ایسے کام کا پابند کرنا جو کسی پر گراں گزرے ۔ تَکَلَّفَ الْاَمْرَ ۔ اس نے ایسے کام کو باوجود مشقت و تنگی برداشت کرلیا جس کا کرنا اس پر گراں گزرتا تھا**۔ تَکَلَّفُ الشَّیْءِ ، کسی کام کو اظہار شیفتگی کے ساتھ کرنا اگرچہ اس کے کرنے میں اسے مشقت پیش آئے ۔ اسی لئے عرف عام میں کُلْفَۃٌ مشقت کو کہتے ہیں اور تَکَلُّفٌ اس کام کے کرنے کو جو مشقت ، تصنع یا اوپرے جی سے دکھاوے کے لئے کیا جائے ۔ چنانچہ سورۃ صٓ میں جو ہے ۔ کہ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَکَلِّفِیْنَ (۳۸/۸۶) تو اس کے معنی یہی ہیں کہ میں دکھاوے کے لئے یہ کچھ نہیں کر رہا ۔

قرآن کریم میں کئی ایک مقامات میں آیا ہے ۔ لَا یُکَلِّفُ اللہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (۲/۲۸۶) ۔ اس کے عام معنی یہ ہیں کہ اللہ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کا پابند نہیں کرتا ۔ اس میں یہ سمجھ لینا ضروری ہوگا کہ ایک فرد کی وسعت کی حد وہ ہوگی جس تک وہ اپنی انتہائی کوشش اور محنت کے بعد

*تاج و راغب ۔ **تاج و محیط ۔ ***راغب ۔

پہنچے - یہ نہیں کہ انسان کسی حکم کی تعمیل میں پوری پوری کوشش نہ کرے اور یہ کہکر اپنے آپ کو اطمینان دے لے کہ مجھے اللہ اس سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا - لیکن راغب نے لکھا ہے کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ، انسان پر جو پابندیاں عائد کرتا ہے تو وہ اس لئے ہوتی ہیں کہ ان سے انسانی ذات میں وسعت اور کشاد پیدا ہو۔ یعنی وہ پابندیاں اس کی آزادی سلب کرنے کے لئے نہیں ہوتیں ، بلکہ اس کی ذات کی قوتوں اور صلاحیتوں میں وسعتیں پیدا کرنے کےلئے ہوتی ہیں، جس طرح نہر کی ٹھوکر (Fall) اس کے پانی کی رفتار میں مزید تیزی پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے -

قرآن کریم کے مختلف مقامات میں سیاق و سباق سے دیکھ لینا چاہئے کہ کس مقام پر کون سے معانی زیادہ موزوں ہیں -

ک ل ل

کُلٌّ - کسی چیز کے تمام اجزاء - سب کا سب - مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے - کبھی کبھی اس کا استعمال بَعْضٌ کے معنوں میں بھی ہوتا ہے*- ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنوں میں سے ایک معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے گھیر لینا بتائے ہیں -

کَلٌّ کے معنی وکیل - بت - نو پیدا مصیبت - یتیم بچہ - صاحب عیال آدمی کے بھی آتے ہیں - نیز ایسانکما شخص جودوسرے پر بوجھ ہی بوجھ ہو اور اس میں کوئی بھی خوبی نہ ہو*- هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰهُ (۱۶/۷۶) - وہ اپنے آقا پر سراسر بوجھ ہے -

کَلَّ - كَلَالٌ - كَلَالَةٌ کے معنی ہیں عاجز آ جانا ، تھک جانا*-

اَلْكَلَالَةُ - قرآن کریم میں احکامِ وراثت کے ضمن میں اَلْكَلَالَةُ کا ذکر دو جگہ آیا ہے - ایک (۴/۱۲) میں اور دوسرا (۴/۱۷۶) میں - مفسرین نے اس باب میں بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں کہ کلالہ کسے کہتے ہیں - (چونکہ احکامِ وراثت ایک فنی موضوع ہے اور ہم اس مقام پر اس کے متعلق تفصیلی گفتگو نہیں کر رہے اس لئے ہم ان بحثوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے - مختصراً یہ سمجھ لینا کافی ہوگا کہ ان میں سے) ایک گروہ کا خیال ہے (اور اکثریت اسی خیال کی حامل ہے) کہ کلالہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کے نہ ماں باپ ہوں نہ اولاد - ابن قتیبہ نے ابو عبیدہ کے حوالہ سے لکھا ہے

*تاج -

کہ یہ مصدر ہے تَکَلَّلَہُ النَّسَبُ سے ، جس کے معنی ہیں ''نسب اس کے اطراف تک پہنچ گیا'' ۔ باپ اور اولاد آدمی کی دونوں طرفین ہوتی ہیں ۔ جب آدمی مر جائے اور نہ باپ چھوڑے اور نہ اولاد تو وہ اسطرح مر گیا کہ اس کی دونوں طرفیں چلی گئیں ۔ اسے کلالہ کہتے ہیں* ۔

المغرب (لغت کی مشہور کتاب) جلد ۲ ۔ صفحہ ۱۵۹ میں ہے کہ والد اور ولد کے سوا جو وارث بھی ہو وہ کلالہ ہے ۔ اور اس کا اطلاق وارث اور موروث دونوں پر ہوتا ہے ، اس قرابت (نسبی) کے اعتبار سے جو والد اور ولد کی حیثیت سے نہ ہو ۔ لسان العرب میں (اخفش اور فراء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ) کلالہ ، قرابت (نسبی) کی رو سے ہر وہ قرابت مند ہے جو والد اور ولد کے سوا ہو ۔ یہ تو رہی لغت کی بحث ۔ قرآن کریم نے چار لفظوں میں اس کی وضاحت کردی ہے کہ کَلَالَۃٌ کسے کہتے ہیں ۔ سورۃ نساء میں ہے اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا . . . . . ($\frac{۴}{۱۷۶}$) ۔ ''اگر کوئی شخص مرجائے ۔ اس کی اولاد کوئی نہ ہو ۔ اور اس کی بہن ہو تو (اس کا حصہ یوں ہوگا) ۔ اسی سورت کے شروع میں ہے . . . . وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ . . . . . ($\frac{۴}{۱۲}$) ۔ ''اور اس کا بھائی یا بہن ہوں تو'' ۔ یعنی کلالہ ہونے کے لئے دو شرطیں ہیں ۔ ایک یہ کہ اس کی اولاد نہ ہو اور دوسرے یہ کہ اس کا بھائی یا بہن ہو ۔ والدین کے ہونے یا نہ ہونے کی کوئی شرط نہیں ۔ اگر اس کے ماں باپ ہونگے تو ($\frac{۴}{۱۲}$) کے مطابق ترکہ کی تقسیم اور طرح ہوگی ۔ اور اگر وہ نہ ہونگے تو ($\frac{۴}{۱۷۶}$) کے مطابق تقسیم اور ہوگی ۔

اَلْاِكْلِيْلُ ۔ تاج** ۔ اور اَلْكَلَلُ ۔ حالت ۔ کیفیت** ۔

اوپر کہا گیا ہے کہ کُلٌّ کے معنی سب کے سب ہیں لیکن کبھی کبھی اس کا استعمال بَعْضٌ کے معنوں میں بھی ہوتا ہے ۔ مثلاً قرآن کریم میں حضرت ابراهیمؑ کے قصہ میں ہے کہ ان سے کہا کہ چار پرندے لو اور انہیں سدھاؤ ۔ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ ($\frac{۲}{۲۶۰}$) ۔ اس میں کُلِّ جَبَلٍ سے مراد بعض پہاڑ ہیں ۔ لیکن یہاں کُلِّ کے معنے سب بھی ہوسکتے ہیں ، اس لئے کہ کُلِّ اضافی اسم ہے اور جب کسی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد اس کے حلقہ میں جس قدر ہوں وہی کل ہو جاتے ہیں ۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ جس مقام کا یہ ذکر ہے وہاں پہاڑ ہی دو چار ہوں ۔ اس اعتبار سے کُلٌّ کے معنی کُل ہی ہونگے ۔ دوسری طرف سورۃ کہف میں ذوالقرنین کے متعلق ہے ۔ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ($\frac{۱۸}{۸۴}$) ۔ ہم نے اسے ہر

*القرطبین ۔ جلد اول ۔ صفحہ ۱۱۶ ۔ **تاج

قسم کا سامان دے رکھا تھا ۔ اس میں "کُلِّ شَيْءٍ" سے مراد دنیا کی تمام چیزیں نہیں ، بلکہ مقصد یہ ہے کہ استحکام مملکت وغیرہ کے تمام ضروری سامان دے رکھے تھے اور ان ضروری سامانوں میں سے بھی ہر ایک سامان کا کچھ حصہ ۔ لفظ مِنْ کا مطلب ''کچھ حصہ'' ہے ۔

"کُلٌّ" کے پہلے اِنْ نافیہ اور بعد میں اِلَّا آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''کوئی بھی ایسا نہیں تھا'' ۔ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ (۳۸/۱۴) ۔ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے رسولوں کو نہ جھٹلایا ۔ سب نے جھٹلایا ۔

"کُلَّمَا" ۔ جب کبھی ۔ "كُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيْهِ" (۲/۲۰) ۔ جب کبھی وہ انہیں روشنی دیتی ہے تو وہ اس میں چلنے لگتے ہیں ۔

كَلَّا اور كِلَا ۔ دو جداگانہ الفاظ ہیں ۔ انہیں الگ عنوانات میں دیکھئے ۔

كَلَّا (حرف)

كَلَّا ۔ (۱) یہ عام طور پر ان معنوں میں آتا ہے جن معنوں میں ہم اپنے ہاں کہتے ہیں '' نہیں بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ'' ۔ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۸۹/۱۷) ۔ ہر گز ایسا نہیں ۔ بلکہ بات یہ ہے کہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے تھے ۔ (اس میں جھڑکنے ، تنبیہ کرنے ۔ یا باز رکھنے ۔ یا مذمت کرنے کا پہلو ہوتا ہے) ۔

(۲) ''حقیقت یہ ہے'' ۔ ''واقعہ یہ ہے'' ۔ كَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى (۹۶/۶) ۔ حقیقت یہ ہے (یہ امر واقعہ ہے) کہ انسان سرکشی اختیار کرتا ہے ۔

(۳) میرزا ابوالفضل نے نضربن شمیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنی نَعَمْ (ہاں) کے بھی ہوتے ہیں ۔ سورہ تکاثر میں تین بار كَلَّا آیا ہے (كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۔ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۔ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۔ (۱۰۲/۳-۵)) ۔ ان آیات سے كَلَّا کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ یعنی خلاف حقیقت تصور کی تردید اور حقیقت کے متعلق حتم و یقین ۔

کلا

كِلَا (مذکر) ۔ كِلْتَا (مونث) ۔ ''دونوں'' کے معنوں میں آتا ہے ۔ كِلَاهُمَا ۔ (۱۷/۲۳) دونوں (ماں اور باپ) ۔ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ (۱۸/۳۳) ۔ یہ دونوں باغ ۔

ک ل م

کَلِمَۃٌ کے معنی ہیں ایک لفظ۔ ایک بات۔ ایک جملہ یا ایک قصیدہ۔ یا ایک خطبہ۔ کَلِمَۃٌ یا کَلْمَۃٌ یا کِلْمَۃٌ۔ تینوں طرح آتا ہے۔ کَلاَمٌ کے معنی ہیں بات*۔ کَلِمٰتٌ (کَلِمَۃٌ کی جمع) کے معنی امور کے بھی آتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے۔ وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرٰھِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ (۲/۱۲۴)۔ جب ابراہیمؑ کو اس کے نشو و نما دینے والے نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں نمود ذات کے مواقع بہم پہنچائے۔ یعنی اسکے سامنے مختلف امور آئے۔ وہ مختلف حوادث سے دو چار ہوا۔ مختلف قسم کی باتوں سے اس کا واسطہ پڑا۔ مختلف امور اس کے ذمہ لگائے۔ مختلف معاملات اسکے سپرد کئے۔ کَلِمٰتٌ میں یہ تمام معنی پوشیدہ ہیں۔

اَلْکَلْمُ کے معنی ہیں زخمی کرنا*۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی (۱) بات کرنا اور (۲) زخمی کرنا لکھے ہیں۔ سورہ نمل میں ہے۔ اَخْرَجْنَا لَھُمْ دَآبَّۃً مِّنَ الْاَرْضِ تُکَلِّمُھُمْ (۲۷/۸۲)۔ یہاں تُکَلِّمُ کے معنی زخمی کرنے کے بھی ہو سکتے ہیں اور بات کرنے کے بھی۔ (آیت کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان د۔ ب۔ ب) نواب صدیق حسن خان نے کہا ہے کہ ک۔ ل۔ م کی خاصیت شدت اور قوت ہے۔ اس کی مثال اَلْکَلْمُ ہے۔ اَلْکُلاَمُ سخت زمین کو بھی کہتے ہیں**۔

آج کل کی اصطلاح میں جس چیز کو نظریہ زندگی۔ تصور حیات۔ یا آئیڈیالوجی (Ideology) کہا جاتا ہے اسے کَلِمَۃٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسے سورہ ابراہیم میں ہے۔ مَثَلاً کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ (۱۴/۲۴)۔ خوش گوار اور ثمر بار نظریہ زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سرسبز و شاداب درخت جسکی جڑیں مستحکم ہوں اور جسکی شاخیں فضا کی پہنائیوں میں جھوم رہی ہوں۔

کَلَّمَ۔ کسی سے بات کرنا (۱۹/۲۶)۔ تَکَلَّمَ۔ کسی سے بات کرنا (۲۳/۱۹)۔ تَکْلِیْمٌ کسی سے بات کرنا (۴/۱۶۴)۔ نیز یہ شبہ کے اظہار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے مجھے اس میں کلام ہے۔ یا یہ روایت متکلم فیہ ہے۔

سورہ آل عمران میں ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ (۳/۴۴) (اے مریم) خدا تمہیں اپنی طرف سے ایک بات کی خوش خبری دیتا ہے۔

* تاج و محیط۔ **العلم الخفاق۔

(اس سے آگے ہے کہ جس کے متعلق خوش خبری دی تھی اس کا نام عیسیٰ[۳] تھا) ۔ عیسائیت میں کَلِمَةٌ (Word) یا (Logos) ایک خاص اصطلاح ہے جس کے گرد (حضرت) عیسیٰ[۴] کی ابنیت اور الوہیت کا تمام فلسفہ گردش کرتا ہے ۔ لیکن قرآن کریم اس قسم کی دور ازکار فلسفیانہ بحثوں میں نہیں الجھتا ۔

سورہ یونس میں (نیز دیگر مقامات میں) ہے وَكَذَالِكَ حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ (۳۳/۱۰) ۔ اسطرح تیرے رب کی بات ان پر صادق آگئی ۔ ان مقامات میں خدا کے کَلِمَة کے سیدھے سادے معنی ”خدا کی بات“ ہی ہیں ۔ لیکن ظاہر ہے کہ خدا کی بات سے مراد خدا کا قانون ہے ۔ چنانچہ یہ لفظ ”قانونِ خداوندی“ کے معنوں میں عام طور پر استعمال ہوا ہے ۔ قوانین خداوندی کا ایک حصہ خارجی کائنات میں نافذ العمل ہے ۔ انہیں (Laws of Nature) کہا جاتا ہے ۔ اور دوسرا حصہ وہ ہے جو انسانی دنیا سے متعلق ہے ۔ یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں ۔ خود قرآن کریم کے متعلق ہے وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (۱۱۶/۶) ۔ قوانین خداوندی صدق و عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئے ۔ اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۱۱۶/۶) ۔ اس سے ختم نبوت لازم آتی ہے ۔ یعنی جب ضابطہ خداوندی کی تکمیل ہو گئی اور اس کے بعد اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تو کسی نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ نیز اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ مومن فرد یا جماعت جن حدود و قیود (خدا کے قوانین واصول) کے اندر رہتے ہوئے زندگی بسر کرنے پر مکلف ہے ، ان حدود کو کوئی نہیں بدل سکتا ۔ یہی حدود اسلامی مملکت کی آزادی اور پابندی بھی متعین کرتی ہیں ۔ انہیں مملکت بھی نہیں بدل سکتی۔ لیکن ان کی چار دیواری کے اندر رہتی ہوئی وہ آزاد ہوتی ہے کہ اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ، اپنے معاملات ، باہمی مشاورت سے طے کرے۔

کَمْ

كَمْ ۔ (۱) کتنی (مقدار) (۲) کتنی (تعداد) (۳) کتنی (دیر)۔ كَمْ لَبِثْتُمْ فِى الْاَرْضِ (۱۱۲/۲۳) ۔ تم کتنی مدت تک زمین میں رہے ہو۔ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً (۲۴۹/۲) ۔ کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں تھیں جو بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں ۔ (”کئی“ یا ”بہتیری“ سے بھی مفہوم واضح ہو جاتا ہے)

کُمْ (ضمیر)

کُمْ - ضمیر منصوب متصل ہے - جمع مذکر حاضر کیلئے آتی ہے - ضَرَبَکُمْ اس نے تم سب کو مارا - وَعَدَکُمُ اللہُ - اللہ نے تم سے وعدہ کیا (۴۸/۲۱) -

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے - غُلَامُکُمْ - تم سب کا غلام - سورہ آل عمران میں ہے مِنْ رَّبِّکُمْ (۳/۵۰) تمہارے رب کی طرف سے -

کُمَا (ضمیر)

کُمَا ضمیر منصوب متصل ہے - تثنیہ حاضر کیلئے آتی ہے - اور مذکر و مؤنث دونوں کیلئے استعمال ہوتی ہے - ضَرَبَکُمَا - اس نے تم دونوں (مردوں یا عورتوں) کو مارا - یَاْتِیٰکُمَا (۱۲/۳۷) -

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل ہے - غُلَامُکُمَا - تم دونوں کا غلام - (مذکر و مؤنث دونوں کیلئے) - سورہ طٰہٰ میں ہے اِنَّنِیْ مَعَکُمَا ... (۲۰/۴۶) "میں تم دونوں کے ساتھ ہوں" - اس سے ذرا آگے ہے فَمَنْ رَّبُّکُمَا یٰمُوْسٰی (۲۰/۴۹) - "اے موسیٰ - تم دونوں (بھائیوں) کا رب کون ہے"؟

ک م ل

اَلْکَمَالُ - پورا ہونا - اَلتَّمَامُ کے معنی بھی پورا ہونا ہوتے ہیں - (ان دونوں میں جو باریک فرق ہے اس کے لئے عنوان - ت - م - م دیکھئے) -

کَمُلَ - کامل ہونا - پورا ہونا - اَکْمَلَہٗ - وَکَمَّلَہٗ - اسے پورا کر دیا اور خوش نما بنا دیا - اَعْطَاہُ الْمَالَ کَمَلًا - اسے پورا پورا مال دے دیا* - راغب نے کہا ہے کہ جب کہا جاتا ہے کَمُلَ ذَالِکَ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو کچھ اس سے غرض تھی وہ حاصل ہو گئی** -

روزوں کی گنتی پورا کرنے کے لئے کہا ہے - لِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ - (۲/۱۸۵) - سورۃ المائدہ میں ہے اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (۵/۳) - اس کے دونوں معنی ہوسکتے ہیں - ایک تو یہ کہ تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل

*تاج - **راغب - ** العلم الخفاق فی علم الاشتقاق -

کر دیا۔ اس سے اسلام کے آخری اور مکمل دین (ضابطۂ حیات) ہونے کی شہادت ملتی ہے ۔ اور دوسرے یہ کہ ''اب تمہیں مخالفین پر پورا پورا غالب کردیا ۔ تمہارے غلبہ کو مکمل کردیا'' ۔ یہ اُس وقت کی جماعت مومنین کے متعلق ہے ۔ اسی لئے ، اس کے بعد کہا گیا ہے کہ تمہارے مخالف اب بالکل مایوس ہو چکے ہیں (۵/۳) ۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ ک ۔ م ۔ ل کا خاصہ شدت اور قوت ہے ۔ کسی شے کے کمال میں اس کی قوت کا راز پوشیدہ ہوتا ہے** ۔

ک م م

اَلْکُمُّ ۔ آستین ۔ اَلْکِمُّ ۔ وہ غلاف یا خول جس سے پھول یا کلی ڈھکی ہوتی ہے ۔ اسکی جمع اَکْمَامٌ ہے ۔ (۵۵/۱۱ و ۴۱/۴۷) ۔ کُمَّتِ النَّخْلَۃُ ۔ کھجور میں بند کلیاں لگ گئیں ۔ ایسا درخت مَکْمُوْمٌ کہلائیگا ۔ اَلْکِمَامُ ۔ اونٹ کے منہ پر جو غلاف (یا چھینکا) چڑھا دیا جاتا ہے تاکہ وہ کسی کو کاٹے نہیں ۔ اَلْکُمَّۃُ ۔ گول ٹوپی* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ڈھانپنے والی چیز کے ہونے ہیں ۔

ک م ہ

اَلْکَمَہُ ۔ پیدائشی اندھا پن ۔ ایسے اندھے کو اَلْاَکْمَہُ کہینگے ۔ لیکن بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ پیدائشی اور غیر پیدائشی دونوں کے لئے آتا ہے ۔ کَمِہَ النَّھَارُ ۔ آفتاب پر غبار چھا گیا اور دن اندھیرا ہوگیا ۔ کَمِہَ فُلَانٌ ۔ فلاں آدمی کی عقل جاتی رہی ۔ (یعنی بصیرت گم ہوگئی) ۔ اَلْکَامِہُ ۔ وہ شخص جو اٹھ کر ، جدھر اس کے جی میں آئے چل دے* ۔

سورۃ آل عمران میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا ''وَ اُبْرِیُٔ الْاَکْمَہَ'' (۳/۴۸) ۔ میں اندھوں کو نگاہ عطا کروں گا ۔ جس کی بصیرت گم ہو چکی ہے میں اُسے واپس لا دونگا ۔ جو بغیر راستہ معلوم کئے یونہی چلے جا رہے ہیں میں انہیں راستہ دکھا دوں گا ۔ میں ان کے لئے منزل متعین کرونگا ۔ رسول کا یہی کام ہے جسے وہ وحی کے ذریعے سر انجام دیتا ہے ۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر راہ گم کردہ لوگوں کو اندھے اور صحیح راستے پر چلنے والوں کو آنکھوں والے کہا ہے ۔

*تاج و راغب و محیط ۔ **العلم الخفاق

ک ن د

کَنَدَ الشَّیْءَ یَکْنُدُہٗ - اس نے اس چیز کو کاٹ دیا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ کَنَدَ النِّعْمَۃَ - اس نے کفران نعمت کیا - اَلْکَنُوْدُ اُس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو تنہا خور ہو۔ لوگوں کی مدد نہ کرے اور غلاموں کو مار پیٹ کرتا رہے - یا وہ جو مصیبتوں کو گنتا رہے اور بخششوں کو بھلا دے* - یعنی ناقدرا - نیز وہ زمین جہاں کچھ پیداوار نہ ہوتی ہو** - اَلْکِنْدَۃُ پہاڑ کے ٹکڑے کو کہتے ہیں* -

قرآن کریم میں ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّہٖ لَکَنُوْدٌ (۱۰۰/۶) - یعنی انسان کو اگر عَلٰی حَالِہٖ چھوڑ دیا جائے تو وہ اس شخص کے مانند ہوجاتا ہے جو تنہا خور ہو اور اپنے نشو و نما دینے والے کے عطا کردہ سامانِ رزق میں کسی اور کو شریک نہ کرنا چاہے - وہ ایسی سنگلاخ زمین بن جاتا ہے جس سے ربوبیت عامہ کی کونپلیں نہیں پھوٹتیں - یہ ہے ''رب کی ناقدر شناسی'' -

ک ن ز

اَلْکَنْزُ - زمین کے نیچے مدفون مال - (جمع کُنُوْزٌ)- یہ اس کے اصلی معنی ہیں - کَنَزَ - یَکْنِزُ - دولت جمع کرنا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں اکٹھا ہونے کے ہیں - وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ .... ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ ...... مَاکُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ (۹/۳۴-۳۵) میں مال و دولت جمع کرنے ہی کے معنی ہیں - قرآن کریم کی رو سے افراد کے لئے ، مفاد خویش کی خاطر ، دولت جمع کرنا جہنم تیار کرنا ہے - قرآنی نظام معیشت میں افراد کے پاس فاضلہ دولت (Surplus Money) کی گنجائش ہی نہیں ہوتی - اس میں ہر فرد پوری پوری محنت کرتا ہے - اس کے ماحصل سے اپنی ضروریات کے مطابق لیتا ہے اور باقی سب نوع انسانی کی پرورش کے لئے نظام معاشرہ کے حوالے کر دیتا ہے - یہ نظام عند الضرورت اس کی اور اس کی اولاد کی تمام بنیادی ضروریات زندگی کی ضمانت دیتا ہے - لہذا اس نظام میں دولت جمع کرنے یا جائدادیں بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - واضح رہے کہ جائداد بھی منجمد شکل میں جمع شدہ دولت ہی ہوتی ہے -

سورۃ کہف میں ہے - کَنْزٌ لَّھُمَا (۱۸/۸۲) - ان کی مدفون دولت - دبا ہوا خزانہ - سورۃ قصص میں کُنُوْزٌ اور مَفَاتِحُ ایک ہی معنوں میں

*تاج و محیط - **محیط و راغب -

استعمال ہوئے ہیں (۲۸/۹) ۔ یعنی خزانے ۔ اَلْكَنِيْزُ ۔ وہ کھجوریں جو ٹوکروں یا برتنوں میں بھر کر سردی کے لئے محفوظ کرلی جائیں* ۔

ک ن س

كَنَسَ الظَّبْيُ يَكْنِسُ ۔ ہرن اپنے چھپنے کی جگہ (جھاڑیوں میں) چھپ گیا ۔ اَلْكِنَاسُ ۔ گھنے درخت جہاں جنگلی جانور پناہ لیتے ہیں ۔

اَلْكُنَاسَةُ ۔ گھورا ، جہاں کوڑا کرکٹ ڈال دیا جاتا ہے ۔ نیز خود اس کوڑے کو بھی کہتے ہیں** ۔ (غالباً اس لحاظ سے کہ ایسے مقامات کو ڈھانپ کر، یا نظروں سے اوجھل رکھا جاتا ہے) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کے بالائی حصہ سے کسی چیز کو ہٹا دینا اور (۲) چھپا دینا ۔

قرآن کریم میں اَلْجَوَارِ الْكُنَّسِ (۸۱/۱۶) آیا ہے ۔ ایسے ستارے جو چلتے چلتے غروب ہو جائیں ۔ چھپ جائیں ۔ (نیز دیکھئے عنوان خ ۔ ن ۔ س)۔

اَلْكَنِيْسَةُ ۔ یہودیوں یا نصرانیوں کی عبادت گاہ**** ۔ (نیز خوبصورت عورت کو بھی کہتے ہیں)** ۔ صاحبِ محیط نے کہا ہے کہ یہ لفظ اِكْلِيْسِيَا کا معرب ہے جو یونانی الاصل ہے اور جس کے معنی جماعت کے ہوتے ہیں*** ۔

ک ن ن

اَلْكِنُّ ۔ اَلْكِنَّةُ ۔ اَلْكِنَانُ ۔ ہر چیز کا غلاف اور پردہ ۔ اَلْكِنُّ ۔ وہ جگہ جہاں کسی چیز کو محفوظ رکھا جائے** ۔ اَلْكِنُّ کی جمع اَكْنَانٌ اور اَلْكِنَانُ کی جمع اَكِنَّةٌ آتی ہے ۔ (۱۸/۵۷ ; ۱۶/۸۱ ; ۴۱/۵) ۔ حفاظت کی جگہ (۸۱/۱۶) ۔

كَنَّهُ ۔ اَكَنَّهُ ۔ اُسے چھپا دیا** ۔ (۲۸/۶۹) میں یہ لفظ بمقابلہ يُعْلِنُوْنَ آیا ہے ۔ (اِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ) ''یقیناً تمہارا رب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں'' ۔ یعنی اسکے معنی مخفی رکھنے کے ہیں۔

مَكْنُوْنٌ ۔ حفاظت سے رکھا ہوا ۔ محفوظ (۳۷/۴۹) ۔ قرآن کریم کو كِتَابٌ مَكْنُوْنٌ کہا گیا ہے (۵۶/۷۸) ۔ یعنی محفوظ کتاب ۔ اس کے لئے فِيْ لَوْحٍ مَحْفُوْظٍ بھی کہا گیا ہے (۸۵/۲۲) ۔

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔ ****لطائف اللغۃ ۔

كُنَّ (ضمیر)

كُنَّ ۔ ضمیر منصوب متصل ہے ۔ جمع مؤنث حاضر کیلئے آتی ہے ۔ ضَرَبَكُنَّ ۔ اس نے تم سب عورتوں کو مارا ۔ قرآن کریم میں ہے طَلَّقَكُنَّ (۶۶/۵) ۔ وہ تمہیں طلاق دیدے۔

(۲) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے ۔ سورہٴ یوسف میں ہے اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ (۱۲/۲۸) ۔ "یقیناً تم عورتوں کی خفیہ سازش (مکر) بہت بڑی ہوتی ہے" ۔

ک ہ ف

اَلْكَهْفُ ۔ پہاڑ میں بڑا غار ۔ چھوٹے کو غَارٌ کہتے ہیں ۔ یا پہاڑ میں کھود کر جو گھر جیسا بنا لیا جائے ۔ جائے پناہ ۔ تَكَهَّفَ ۔ اِكْتَهَفَ ۔ وہ غار میں داخل ہو گیا یا کہف میں رہا * ۔

قرآن کریم میں اَصْحَابُ الْكَهْفِ (۱۸/۹) ان نوجوانوں کے لئے آیا ہے جنہوں نے آبادی سے باہر غار میں جاکر پناہ لی تھی ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ر ۔ ق ۔ م وَاَصْحَابُ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ)

ک ہ ل

اَلْكَهْلُ ۔ ادھیڑ عمر کو کہتے ہیں ۔ تیس سال کی عمر یا تینتیس سے پچاس سال تک کی عمر ۔ ازھری نے کہا ہے کہ اس عمر والے کو كَهْلٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں انسان انتہائے شباب اور اپنی بھرپور صلاحیتوں پر پہنچ جاتا ہے اور اس کے بعد اس پر انحطاط شروع ہوجاتا ہے ۔ نَعْجَةٌ مُكْتَهِلَةٌ ۔ بھیڑ جو پوری عمر کی ہو چکی ہو** ۔ نَبْتٌ كَهْلٌ ۔ وہ پودا یا درخت جو اپنے بڑھنے پھولنے کی آخری عمر تک پہنچ چکا ہو*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ كَهْلٌ کے بنیادی معنی کسی چیز میں قوت پیدا ہونے اور اس کی ساخت کے محکم و مجتمع ہونے کے ہیں ۔ اَلْمُكَاهَلَةُ ۔ شادی کر لینا*** ۔ سورہ آل عمران میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا (۳/۴۵) ۔ کم عمری میں بھی اور پوری عمر کو پہنچ کر لوگوں سے باتیں کریگا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ابتدائی عمر ھی سے معاشرہ کی خرابیوں کے خلاف باتیں کرنا شروع

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

کر دی تھیں - ویسے بھی (تاریخ بتاتی ہے کہ) انہیں نبوت مقابلۃً کم عمر میں مل گئی تھی (یعنی قریب تیس سال کی عمر میں) لیکن قرآن کریم نے اس کا ذکر نہیں کیا - کَہْلًا کہکر قرآن کریم نے اسطرف اشارہ کیا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ انہیں (۳۱/۳۲) برس کی عمر میں صلیب دی گئی اور وہ (یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق) صلیب پر وفات پا گئے یا (عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق) آسمان پر چلے گئے ، تو یہ صحیح نہیں - وہ ادھیڑ عمر تک لوگوں کے درمیان رہے اوران سے باتیں کرتے رہے -

ک ہ ن

اَلْکَاہِنُ - وہ شخص جو کائنات میں رونما ہونے والے واقعات کی خبریں دیتا اور معرفت اسرار کا مدعی ہوتا تھا * - لیکن راغب کا کہنا ہے کہ کَاہِنٌ اس شخص کو کہتے تھے جو ماضی کی خفیہ باتوں کے متعلق بتاتا تھا - اور عَرَّافٌ اُسے جو آئندہ کے متعلق خبریں دیتا تھا** - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور دیگر اقوام میں کَاہِنٌ اس شخص کو کہتے تھے جو پجاریوں کی طرف سے قربانیاں دیتا اور جانوروں کو قربان گاہ میں پیش کرتا تھا - اور عربوں کے ہاں کَاہِنٌ اسے کہتے تھے جو " کنکریاں پھینک کر " غیب کی خبریں بتایا کرتا تھا*** -

چونکہ عرب ، مقام نبوت کا صحیح صحیح علم نہیں رکھتے تھے اس لئے وہ رسول اکرمؐ کو کَاہِن - شَاعِر - اور مَجْنُوْن کہا کرتے تھے - قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور کہا کہ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّکَ بِکَاہِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (۵۲/۲۹) - تو خدا کے فضل و احسان سے کاھن اور مجنوں نہیں - (نبی کے معنی بھی پیش گوئیاں کرنے والا نہیں بلکہ ایسا شخص ہے جو بلند مقام پر کھڑا ہو - تفصیل متعلقہ عنوان میں ملیگی) - لیکن اب ہمارے ہاں پیش گوئیاں کرنے والوں کو مقربین بارگاہ خداوندی سمجھا جاتا ہے - کسقدر غیر قرآنی ہیں ہمارے نظریات و معتقدات ؟

ک و ب

اَلْکُوْبُ - پیالہ جس کا دستہ نہ ہو**** - اسکی جمع اَکْوَابٌ ہے - قرآن کریم میں اَکْوَابٌ (۴۳/۷۱) اسی قسم کے پیالوں کے لئے آیا ہے -

*تاج - **راغب - ***محیط - ****تاج و راغب -

ک و د

کَادَ (کَ وِ دَ) کا استعمال بطور فعل مقارب کے ہوتا ہے اور اس سے صرف ماضی اور مضارع کے فعل آتے ہیں ؛ دوسرے نہیں آتے ۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''وہ کسی کام کے کرنے کے قریب ہوگیا'' ۔ (اسی لئے اسے فعل مقارب کہتے ہیں) ۔ کَادَ یَفْعَلُ ۔ قریب تھا کہ وہ اس کام کو کر گزرتا ۔ وہ اسے کرنے والا ہی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے معنی رکنے کے بھی ہوتے ہیں ۔ یعنی وہ ایسا کرنے والا ہی تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ۔ وہ اس سے رک گیا* ۔ کَادَ زَیْدٌ یَفْعَلُ ۔ قریب تھا کہ زید ایسا کام کر بیٹھتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے لَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْهِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا (۱۷/۷۴) ۔ ''اگر ہم تجھے ثابت قدم نہ رکھتے تو ہوسکتا تھا کہ تو ان کی طرف تھوڑا بہت جھک جاتا ۔ لیکن تو نے ایسا نہیں کیا'' ۔

نیز اس کے معنے ارادہ کرنے کے بھی آتے ہیں ۔ وَ اِنْ کَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَکَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْکَ مِنْهَا (۱۷/۷۶) ۔ ''انہوں نے اس کا ارادہ کرلیا تھا کہ تمہارے پاؤں اکھاڑ کر تمہیں ملک سے نکال باہر کرتے'' ۔

سورۃ طٰهٰ میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف جانے اور اس کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا تو اس سلسلہ میں فرمایا اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَکَادُ اُخْفِیْهَا لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی (۲۰/۱۵) ۔ اس میں اَکَادُ اُخْفِیْهَا کا ٹکڑا غور طلب ہے ۔ کَادَ کے عام مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنی یہ ہونگے کہ میں نے اسے مخفی رکھنا چاہا تھا لیکن ایسا نہ ہوسکا ۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس بات کی نسبت اپنی طرف کی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوسکتے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ظہورِ نتائج کے وقت (اَلسَّاعَةُ) کو اس انداز سے رکھا ہے کہ وہ عام طور پر ، اور عام لوگوں کی نگاہوں سے مخفی رہتا ہے ۔ لیکن جو لوگ علم و بصیرت سے کام لیں وہ اس آنے والی گھڑی کا پہلے سے اندازہ کر سکتے ہیں ۔ نیز خدا کے کائناتی قانون کی رو سے ایسے حالات بھی پیدا ہوجاتے ہیں جن کی وجہ سے یہ گھڑی بے نقاب ہوکر سامنے آجاتی ہے ۔ اَکَادُ اُخْفِیْهَا کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے اسے اس اندازہ سے رکھا ہے کہ وہ مخفی بھی ہے اور مشہود بھی ہے ۔

---

*تاج و محیط

ک و ر

كَوْرُ العِمَامَةِ ۔ صافے کو گھمانا اور لپیٹنا ۔ اس کے لئے تَكْوِيْرُ العِمَامَةِ بھی آتا ھے*۔ کسی چیز کو اوپر چڑھانے اور چھا دینے کے لئے بھی یہ فعل استعمال ہوتا ھے ۔ اِكْتَارَ الرَّجُلُ ۔ آدمی نے عمامہ باندھ لیا۔ اَلْمِكْوَارُ ۔ عمامہ کو کہتے ھیں ۔ اور اَلْكَوْرُ ۔ عمامہ کی ایک لپیٹن کو*۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی گھومنے اور اکٹھا ھونے کے ھیں ۔

قرآن کریم میں ھے يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ (۳۹/۵) ۔ وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر لپیٹتا رہتا ھے ۔ زمین کی گردش کے اعتبار سے دن اور رات کے پھیر کو تَكْوِيْرٌ کہنا کتنی بڑی بلاغت اور کیسی عظیم حقیقت ھے ۔ گویا دن اور رات زمانہ کی پگڑی ھے جسے وہ لپیٹتا چلا جا رہا ھے ۔

كَوَّرَهٗ تَكْوِيْرًا کے معنی پچھاڑ دینے کے بھی آتے ھیں ۔ كَوَّرَ الرَّجُلَ تَكْوِيْرًا ۔ اس نے اس آدمی کو نیچے گرا دیا ۔ كَوَّرْتُهٗ فَتَكَوَّرَ ۔ میں نے اسے گرایا پس وہ گر گیا*۔ قرآن کریم میں ھے اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (۸۱/۱) ۔ اس کے معنی یہ بھی ھوسکتے ھیں کہ جب ''شمس'' کو لپیٹ لیا جائے گا اور یہ بھی کہ جب اسے گرا دیا جائے گا۔ دونوں معانی کے اعتبار سے مفہوم ایک ھی ھے ۔ یعنی (مسلمانوں کے ھاتھوں) ایران کی سلطنت کا خاتمہ ۔ اُس سلطنت کے جھنڈے کا (جس کا نشان شمس ، سورج تھا) لپیٹ دیا جانا ۔ یا اس کا گر جانا ۔ (دیکھئے عنوان ش ۔ م ۔ س) ۔ اور اگر اَلشَّمْسُ کے حقیقی معنی (سورج) لئے جائیں تو اس میں کسی آنے والے کائناتی تغیر کی طرف اشارہ ھے ۔

ک و ک ب

اَلْكَوْكَبُ ۔ ستارہ*۔ راغب نے لکھا ھے کہ یہ ظاھر اور نمودار ھونے والے ستارہ کے لئے بولا جاتا ھے** (۶/۷۶) ۔ جمع كَوَاكِبُ ۔ اَلْكَوْكَبَةُ زھرہ ستارہ ۔ اَلْكَوْكَبُ ۔ مجازی طور پر بہت سے معانی میں استعمال ھوتا ھے ۔ مثلاً آنکھ میں پڑجانے والی پھلئی ۔ لمبے لمبے درخت ۔ قوم کا سردار یا شہ سوار۔ گرمی کی شدت ۔ تلوار۔ پانی ۔ پہاڑ ۔ مسلح مرد ۔ کنویں کا چشمہ ۔ وغیرہ* ۔ اَلْكَوْكَبَةُ ۔ جماعت کو بھی کہتے ھیں*** ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔

ک و ن

كَانَ ۔ یہ فعل ناقص ہے ۔ ذیل کے معنوں میں آتا ہے :—

(۱) ''ہے'' کے معنوں میں ۔ كَانَ اللهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۳۳/۵۱) ۔ اللہ علیم و حکیم ہے ۔

(۲) ''تھا'' کے معنوں میں ۔ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ (۱۶/۱۲۰) ۔ یقیناً ابراہیم (ایک فرد نہیں بلکہ) پوری کی پوری فرماں بردار امت تھا ۔

(۳) ''ہوگا'' کے معنوں میں ۔ كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا (۷۶/۷) ۔ جس کا فتنہ اڑ کر لگنے والا ہوگا ۔ (یہاں اس کے معنی ''ہے'' بھی ہوسکتے ہیں) ۔

(۴) ''ہوگیا'' کے معنوں میں ۔ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (۲/۳۴) ۔ اس نے انکار کیا ۔ سرکشی اختیار کی ۔ اور اس طرح نہ ماننے والوں میں سے ہوگیا ۔

(۵) ''سزاوار''۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللهُ الْكِتٰبَ . . . . . . (۳/۷۸) ۔ کسی انسان کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب و حکومت و نبوت دے اور وہ . . . . .

(۶) تاکید کے لئے بھی آتا ہے ۔ اور کبھی زائد بھی ہوتا ہے ۔ وَ مَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲۶/۱۱۳) ۔ مجھے کیا علم ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں ۔ یہاں كَانُوْا زائد ہے ۔ صرف بِمَا يَعْمَلُوْنَ کے بھی یہی معنی ہیں ۔ لیکن اگر اس کے معنی ہوں ''جو کچھ یہ لوگ کرتے رہے تھے'' تو پھر كَانُوْا زائد نہیں ہوگا ۔

كُنَّ ۔ جمع مؤنث غائب ۔ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ (۲/۲۲۸) اگر وہ خدا پر ایمان رکھتی ہیں ۔

اَكُ ۔ واحد متکلم ۔ وَلَمْ اَكُ بَغِيًّا (۱۹/۲۰) ۔ میں قانون شکن نہیں ہوں ۔ اس میں نون گر گیا ہے دراصل اَكُنْ تھا ۔

تَكُ ۔ مذکر حاضر اور مؤنث غائب دونوں کے لئے آتا ہے ۔ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ (۱۱/۱۰۹) ۔ تو شک میں نہ رہ (دراصل تَكُنْ تھا)

يَكُ ۔ واحد مذکر غائب ۔ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا (۸/۵۳)۔ وہ نعمت کو بدلنے والا نہیں ہوتا ۔ (دراصل يَكُنْ تھا)

نَکُ ۔ جمع متکلم۔ لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ (۷۴/۴۳)۔ ہم مصلین نہیں تھے۔

یہ تو ہؤا کَانَ (فعل ناقص)۔ لیکن یہ فعل تام بھی ہوتا ہے۔ اس کی بحث آگے آتی ہے۔

کَانَ ۔ کسی چیز کا پیدا ہو جانا۔ واقع ہو جانا۔ کَوْنٌ اُس چیز کو کہتے ہیں جو یکبارگی اور دفعتاً واقع ہو جائے۔ لیکن جب کوئی چیز بتدریج پیدا ہو تو اسے حَرَکَت کہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ کَوْنٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا مادی صورت اختیار کر لینا۔ راغب نے کہا ہے کہ کَوْنٌ کا لفظ اسوقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی جوہر اپنے سے بلند تر جوہر میں تبدیل ہو جائے۔ لیکن اگر اپنے سے پست جوہر میں تبدیل ہو جائے تو اسے فَسَادٌ کہتے ہیں۔ کَوَّنَ اللّٰہُ الْاَشْیَاءَ کے معنی ہیں خدا نے اشیاء کو ایجاد کیا۔ اَلْکَائِنَۃُ کے معنی ہیں حادثہ۔ یعنی دفعتاً نمودار ہو جانا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی واقعہ کی خبر دینے کے ہیں۔ خواہ وہ ماضی میں ہؤا ہو یا حال میں۔

قرآن کریم میں ہے بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲/۱۱۷)۔ یعنی خدا وہ ہے جو اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ (اِبْدَاعٌ۔ کسی چیز کو ایجاد کرنا۔ پہلی مرتبہ وجود میں لانا)۔ یہ کسطرح ہوا؟ اسے اس آیت کے اگلے ٹکڑے میں بیان کر دیا۔ وَاِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (۲/۱۱۷)۔ یعنی جب وہ ایک اَمْرٌ کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے (اس اَمْرٌ سے) کہتا ہے (یَقُوْلُ لَہٗ) کُنْ۔ (ہو جا)۔ تو وہ ہو جاتا ہے (فَیَکُوْنُ)۔ یعنی "امر" کی حالت وہ ہے جس میں اشیاء نے ہنوز صورت اختیار نہیں کی ہوتی۔ جب وہ اَمْرٌ (خدا کے پروگرام کے مطابق) متشکل ہو جاتا ہے (صورت اختیار کر لیتا ہے) تو وہ شَیْءٌ بن جاتا ہے۔ ہم کسی شے کا تصور بغیر اسکی صورت (Form) کے کر ہی نہیں سکتے۔ خدا کے "عالم امر" کی کیا کیفیت ہے، ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اسلئے کہ وہاں صورت (Form) نہیں ہوتی۔ خدا اس (Formless) اَمْرٌ کو صورت (Form) عطا کرتا ہے۔ (اسی لئے اسے اَلْمُصَوِّرُ کہا گیا ہے (۵۹/۲۴)۔ اور وہ امر شے بنکر ہمارے حیطۂ ادراک میں آجاتا ہے۔ یہاں سے کَوْنٌ کے معنی ہیں اشیاء کا پہلی مرتبہ صورت اختیار کرنا۔ یہ سب خدا کے اس قانون کے مطابق ہوتا ہے جو اس نے اشیاء کے پیدا کرنے کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔

---

*تاج و محیط۔

اَلْمَكَانُ ۔ جگہ ۔ مقام ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ اسی مادہ سے مشتق ہے ۔ اور بعض م ۔ ک ۔ ن سے بتاتے ہیں ۔ اس سے تَمَكَّنَ وغیرہ افعال بنا لئے گئے ہیں * ۔ (ہم نے م ۔ ک ۔ ن کا عنوان الگ لکھا ہے ۔ اس کے تحت ان الفاظ کو دیکھئے)

اَلْاِسْتِكَانَةُ کے معنی ہیں خشوع و خضوع کرنا * ۔ یا عاجزی کا اظہار کرنا (۳/۱۴۵) ۔ (بعض کے نزدیک یہ لفظ سَكَنَ سے ہے ۔ اس لئے ہم نے اسے اس عنوان کے تحت بھی لکھا ہے ۔) اَلْمَكَاوَنَةُ ۔ جنگ و جدال کو کہتے ہیں * ۔

ک و ی

كَوَاهُ يَكْوِيْهِ كَيًّا ۔ اسے گرم لوہے وغیرہ سے داغ دیا ۔ اَلْمِكْوَاةُ ۔ داغ دینے کا آلہ ** ۔ ابن فارس نے ان معانی کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ كَوَاهُ بِعَيْنِهِ کے معنی ہیں اس نے اسکی طرف گھور کر دیکھا ۔

قرآن کریم میں ہے کہ جو لوگ مال و دولت جمع کرتے ہیں (اور اسے نوع انسانی کی پرورش کے لئے کھلا نہیں رکھتے) ان کے اس مال کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا ۔ فَتُكْوٰى بِهَا .... (۹/۳۵) ۔ اور اس سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائیگا ۔ (جسطرح اُس زمانے میں بڑے بڑے مجرمین کو داغا جاتا تھا) تا کہ ان کی دور ہی سے پہچان ہو جائے اور لوگ انکی تباہ کاریوں سے محفوظ رہیں ۔ قرآن کریم کی رو سے سرمایہ داری سنگین جرم ہے اور ایسا کرنے والے معاشرہ کے بدترین مجرم ۔

كَیْ ۔ (حرف)

كَيْ ۔ سبب ظاہر کرنے کے لئے (تا کہ ۔ کے معنوں میں) ۔ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (۵۹/۷) ۔ تا کہ مال تم میں سے دولتمندوں کے اندر ہی گردش نہ کرتا رہے ۔

لِكَيْلَا ۔ لِ + كَيْ + لَا ۔ تا کہ ایسا نہ ہو ۔ (۵۷/۲۳)

ک ی د

كَيْدٌ ۔ حیلہ اور تدبیر کو کہتے ہیں * ۔ محیط نے تعریفات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے معنے خفیہ طریقہ سے کسی دوسرے کو نقصان

---

* تاج ۔ ** تاج و محیط ۔

پہنچانے کا ارادہ کرنا ہیں **۔ نیز یہ لفظ کوشش اور جد و جہد کے معنوں میں بھی آتا ہے ۔ بعض علمائے لغت نے کَیْدٌ اور مَکْرٌ کو ہم معنی قرار دیا ہے ۔ بعض کا خیال ہے کہ کَیْدٌ ضرر رسانی، اور مَکْرٌ خفیہ تدبیر اور ضرر رسانی کو کہتے ہیں ۔ بعض کا خیال ہے کہ کَیْدٌ کے معنے خفیہ طور پر گرفت کرنا ہیں لیکن اس میں یہ شرط نہیں کہ ایسی تدبیر کرنے والا بظاہر اس کے خلاف کرے جو وہ بہ باطن چاہتا ہے ۔ مگر یہ شرط مَکْرٌ میں ضروری ہے *۔ (لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں)۔ راغب نے کہا ہے کہ کَیْدٌ ایک قسم کی چارہ سازی اور حیلہ جوئی کو کہتے ہیں یہ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور برے معنوں میں بھی ۔ اور بالعموم برے معنوں میں آتا ہے ***۔

کَادَ کے معنی ارادہ کرنے کے بھی آتے ہیں * ۔ جنگ کرنے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے *۔

قرآن کریم میں دشمنوں کی خفیہ یا عام تدبیر کو کَیْدٌ کہا گیا ہے ۔ لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا (۳/۱۲۹) ۔ ان کی سازشیں یا تدبیریں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکینگی ۔ ساحرین فرعون کی شعبدہ بازی کو بھی کَیْدٌ کہا گیا ہے ۔ اِنَّمَا صَنَعُوْا کَیْدُ سٰحِرٍ (۲۰/۶۹) جو کچھ انہوں نے بنایا ہے وہ سحر (باطل) کی شعبدہ بازی ہے ، اور بس ۔ سورہ یوسف میں عزیز مصر نے اپنی بیوی سے کہا ہے کہ اِنَّهٗ مِنْ کَیْدِکُنَّ ۔ اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ (۱۲/۲۸) ۔ یہ محض تمہاری سازش ہے ۔ اور تم عورتوں کی سازشیں بڑی ہی گہری ہوتی ہیں ۔

دوسری طرف خدا نے خود اپنی تدبیر کو بھی کَیْدٌ کہا ہے ۔ اِنَّهُمْ یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا وَّاَکِیْدُ کَیْدًا (۸۶/۱۵-۱۶) ۔ یہ بھی ایک تدبیر میں لگے ہوئے ہیں اور میں بھی ایک تدبیر کر رہا ہوں ۔ سورہ یوسف میں ہے کَذٰلِکَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ (۱۲/۷۶) ۔ اس طرح ہم نے ایک عمدہ تدبیر پیدا کر دی جس میں یوسف کا فائدہ تھا ۔ یا وہ اس کے حسب منشا تھی ۔

سورہ انبیاء میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا وَتَاللّٰهِ لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ (۲۱/۵۷) بخدا! میں تمہارے بتوں کو نقصان پہنچانے کی تدبیر کرکے رہونگا ۔

سورہ طور میں مَکِیْدُوْنَ آیا ہے ۔ (۵۲/۴۲) ۔ یعنی وہ جو سازش (یا تدبیر) کا شکار ہو جائیں ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

کَیفَ (حرف)

کَیْفَ - کیسے - کیونکر - کسطرح کے معنوں میں - کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ (۲/۲۸) - تم اللہ کا کسطرح انکار کر سکتے ہو - دوسری جگہ ہے - کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ (۱۰۵/۱)- تیرے رب نے کیونکر کیا؟ (ان سے) کیسا معاملہ کیا ؟

ک ی ل

کَالَ الطَّعَامَ - یَکِیْلُہٗ - کَیْلاً - غلے کو ناپا* - اِذَا کَالُوْھُمْ (۸۳/۳) - جب انہیں ماپ کر دیتے ہیں - اِکْتَالَ (عَلَیْ) - کسی سے ماپ کر لینا (۸۳/۲) - تاج نے کَالَ اور اِکْتَالَ دونوں ہم معنے بتا کر فرق یہ کیا ہے کہ کَالَ کے معنے ہیں ، خود ناپ کر دوسرے کو دینا اور اِکْتَالَ کے معنے ہیں اپنے لئے خود ناپ کرلینا* - راغب نے کِلْتُ لَہُ الطَّعَامَ کے معنے بتائے ہیں میں نے اس کے لئے غلہ ناپا ، اور کِلْتُہُ الطَّعَامَ کے معنے، میں نے اسے غلہ (ناپ کر) دیا ، اور اِکْتَلْتُ عَلَیْہِ - میں نے اس سے ناپ کر لیا** - ابن فارس نے اس کی تائید کی ہے- کَیْلٌ - مِکْیَالٌ - پیمانہ جس سے غلہ وغیرہ کو ماپا جائے - (۱۱/۸۵) خود (اس طرح ماپے ہوئے) غلہ کو بھی کہتے ہیں (۱۲/۵۹) - کَیْلَ بَعِیْرٍ (۱۲/۶۵)- ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر غلہ -

قرآن کریم میں بڑی تاکید سے حکم ہے کہ لَا تَنْقُصُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ (۱۱/۸۴) - اس میں اگرچہ ترازو اور پیمانے کا ذکر ہے (کہ ماپ اور تول میں کمی نہ کرو) لیکن اصولاً اس میں معاشی عدل کا بنیادی قانون آگیا ہے - معاشی عدل کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو اس کے حق سے کم نہ دیا جائے، اور نہ ہی اپنے حق سے زیادہ لیا جائے- اس اصول کے ماتحت، سرمایہ داری کا خاتمہ ہوجاتا ہے- اس لئے کہ (مثلاً) اگر ایک زمیندار یا کارخانہ دار کام کرنے والے کو وہ سب کچھ دے دے جو اس نے پیدا کیا ہے تو اس سے اسے خود کچھ نہیں ملتا - یہی قرآن کریم کا منشأ ہے - یعنی معاوضہ محنت کا ملیگا - روپے کا نہیں - کام کرنے والے کی محنت کے ماحصل سے کچھ رکھ لینے والے مُخْسِرِیْنَ ہیں (۲۶/۱۸۱) -

جلد سوم ختم شدہ

---

*تاج - **راغب -

اس لغات میں

آپ نے مختلف مقامات پر یہ پڑھا ہوگا کہ ''اس نکتہ کی وضاحت آپ کو پرویز صاحب کی فلاں کتاب میں ملیگی'' - چونکہ قرآنی تعلیم سے متعلق یہ مباحث بڑے اہم ہیں اس لئے پرویز صاحب کی ان تصانیف کا مطالعہ بڑا ضروری ہے - بالخصوص حسب ذیل کتابوں کا مطالعہ -

انسان نے کیا سوچا؟ گذشتہ اڑھائی ہزار سال میں، دنیا کے مختلف مفکرین، مدبرین، مؤرخین اور سائنسدانوں نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق جو کچھ سوچا اور کہا ہے، اسے نہایت دلنشیں پیرایہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اسکی روشنی میں قرآنی حقائق کی عظمت خود بخود سامنے آ جاتی ہے -

سلیم کے نام خطوط - ہمارے نوجوان، تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں، اسلام کے متعلق جس قدر شکوک اور سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا نہایت اطمینان بخش جواب - انداز بیان دلچسپ، سلیس اور نہایت شگفتہ - کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے -

ابلیس و آدم - اس میں، انسانی تخلیق اور نظریہ ارتقاء - قصہ آدم - ملائکہ - ابلیس - شیطان - جنات - وحی - نبوت - رسالت - عقل اور وحی کے دوائر عمل جیسے اہم موضوعات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے -

جوئے نور - قرآنی تعلیم کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے انبیائے سابقہ کے احوال و کوائف اور اقوام گذشتہ کے وقائع و حوادث کا جاننا ضروری ہے - یہ کتاب اسی سلسلہ زریں کی پہلی کڑی ہے جس میں حضرت نوح؈ سے لیکر حضرت موسیٰ؈ سے پہلے تک کے انبیاء کرام؈ کے حالات آ گئے ہیں -

(مسلسل)

برقِ طور ۔ اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے جس میں بنی اسرائیل کی پوری داستان اور ان کے انبیائے کرام کے احوال و کوائف شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ در حقیقت قوموں کے عروج و زوال کے متعلق قرآنی اصول و قوانین کا بصیرت افروز مرقع ہے۔

شعلۂ مستور ۔ اس سلسلہ کی اگلی کڑی ہے جس میں آسمانی انقلاب کے عظیم داعی، حضرت عیسیٰ کی حیات طیبہ کے وہ گوشے سامنے لائے گئے ہیں جو اس سے پہلے عام طور پر نگاہوں سے اوجھل تھے۔ حضرت مریم کا "جرم"۔ جناب مسیح کی پیدائش۔ معجزات۔ کشمکش۔ واقعہ صلیب اور رفع الی السماء۔ نزولِ مسیح سے متعلق تمام مباحث آگئے ہیں۔

معراجِ انسانیت ۔ یہ عظیم کتاب نبی اکرم کی اس سیرتِ مقدسہ پر مشتمل ہے جو قرآن کریم کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔ اس میں قرآنی فکر و نظام کے تمام گوشے نہایت حسین و جمیل انداز میں سامنے آگئے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے ولایتی کاغذ پر بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات پر جگمگاتی ہوئی کتاب ہے۔

ان کے علاوہ

پرویز صاحب کی دیگر تصانیف اور ماہنامہ طلوع اسلام

کیلئے ایک کارڈ لکھ کر تفاصیل معلوم کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ل

لَ - (حرف)

لَ - لِ - حسب ذیل معانی پیدا کرنے کے لئے آتا ہے :-

(۱) اِستحقاق - اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (۱/۱) - حمد کا حق صرف اللہ ہی کو حاصل ہے -

(۲) کسی کے لئے کسی چیز کا مخصوص ہونا - وَلَہُمْ مَا یَشْتَہُوْنَ (۱۶/۵۸) - خصوصیت سے اپنے لئے وہ چیز چاہتے ہیں کہ جو ان کے نزدیک پسندیدہ ہے -

(۳) اظہار ملکیت کے لئے - لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۲/۳۴) - کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کی ملکیت ہے -

(۴) فائدہ حاصل کرنے کے لئے - وَاَلَنَّا لَہُ الْحَدِیْدَ (۳۴/۱۰) - ہم نے اس کے لئے لوہے کو نرم کر دیا - یعنی لوہے کو نرم کر دیا تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے (لامِ ملکیت اور لامِ انتفاع کے فرق کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے)-

(۵) سبب ظاہر کرنا ("تاکہ" کے معنوں میں)- وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ (۱۶/۴۴) - اور ہم نے تیری طرف یہ قرآن کریم نازل کیا ہے تاکہ تو اسے لوگوں کے فائدے کے لئے ظاہر کر دے-

(۶) نفی کی تاکید کے لئے - مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُطْلِعَکُمْ عَلَی الْغَیْبِ (۳/۱۷۸) - اللہ تمہیں غیب پر ہرگز مطلع نہیں کرتا -

(۷) اِلٰی (کیطرف) کے لئے ۔ بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَھَا (۹۹/۵) ۔ کیونکہ تیرے رب نے اسکی طرف وحی کی ہے ۔

تک کے معنوں میں ۔ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی (۱۳/۲) ۔ ہر ایک وقت مقررہ تک چل رہا ہے ۔ دوسری جگہ اِلٰی اَجَلٍ (۳۱/۲۹) آیا ہے جس کے معنی '' وقت مقررہ تک '' ہیں ۔

(۸) عَلٰی (اوپر) کے معنوں میں ۔ وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ (۳۷/۱۰۳) ۔ اور اس نے اسے پیشانی کے ایک کنارے پر (کے بل) لٹایا ۔

مجازی طور پر عَلٰی اسوقت آتا ہے جب کوئی بات کسی کے خلاف جائے ۔ اور ۔ ل ۔ اس وقت آتا ہے جب وہ بات کسی کے فائدے کے لئے ہو۔ جیسے لَھَا مَاکَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَااکْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶) ۔ '' جو کچھ کوئی اچھا کام کرے وہ اس کے فائدے کے لئے ہے اور جو کچھ کوئی برا کام کرے وہ اسکے خلاف جائیگا ۔ اس کا نقصان اسے ہوگا '' ۔ لیکن بعض اوقات لَ بھی عَلٰی کے معنوں میں آجاتا ہے ۔ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَھَا (۱۷/۷) ۔ اگر تم برائی کروگے تو اسکا نقصان تمہیں ہی ہوگا ۔ یا وَلَھُمُ اللَّعْنَةُ وَلَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (۴۰/۵۲) ۔ ان کے لئے محرومی ہے ۔ ان کے لئے بہت برا گھر ہے ۔

(۹) فِیْ (میں) کے معنوں میں ۔ وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ (۲۱/۴۷) ۔ اور ہم قیامت کے دن (قیامت میں) انصاف کی میزانیں کھڑی کرینگے ۔

(۱۰) عِنْدَ (کے پاس ۔ کے قریب) اور بَعْدَ کے مفہوم کے لئے ۔ جیسا کہ بعض کے نزدیک ۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ (۱۷/۷۸) میں لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ سے مراد ہے دلوک شمس کے قریب ۔ یا دلوک شمس کے بعد ۔ لیکن ۔ ل ۔ بعض اوقات مِنْ (سے) کے معنوں میں بھی آتا ہے ۔ اس لئے اسکے معنی دلوک شمس سے لیکر غسق لیل تک بھی ہو سکتے ہیں ۔

(۱۱) مفعول کو واضح کرنے کے لئے ۔ جیسے لَاتَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ (۲/۱۵۴) نہ کہو اس شخص کو جو قتل کر دیا جائے ۔

(۱۲) اِنَّ یا قسم کے بعد تاکید کے لئے ۔ لَعَمْرُكَ اِنَّھُمْ لَفِیْ سَکْرَتِھِمْ یَعْمَھُوْنَ (۱۵/۷۲) ۔ تیری عمر* کی قسم ۔ وہ اپنی بد مستی

*دیکھئے عنوان ع ۔ م ۔ ر ۔

میں اندھے ہو رہے تھے - نیز فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ (۱۹/۶۸) تیرے رب کی قسم ہم بالضرور انہیں اکٹھا کر لائینگے -

(۱۳) کبھی زائد بھی ہوتا ہے - قرآن کریم میں اسکی بہت سی مثالیں ہیں - جیسے - هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ (۲۳/۳۶) - یہاں مَا تُوْعَدُوْنَ کا بھی وہی مفہوم ہے -

(۱۴) کبھی یہ ابتدائے کلام کے لئے بھی آتا ہے (کہ ، کے معنوں میں) - إِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَأَخُوْهُ .... (۱۲/۸) - جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اسکا بھائی ....

(۱۵) کبھی یقیناً کے معنوں میں (تاکید کے لئے) آتا ہے - لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى (۹/۱۰۸) - یقیناً وہ مسجد کہ جسکی بنیاد ہی تقویٰ پر رکھی گئی ہو -

لَا (حرف)

لَا - نہی کے لئے آتا ہے - لَا تَضْرِبْ - مت مار - اس کے علاوہ ذیل کے معانی کے لئے بھی آتا ہے -

(۱) نفی جنس کے لئے - یعنی جس چیز کی یہ نفی کرتا ہے اس کی پوری کی پوری جنس کی نفی کرتا ہے - لَا رَيْبَ فِيْهِ (۲/۲) - اس میں کسوئی شک و شبہ یا اضطراب کی بات نہیں -

(۲) لَيْسَ (نہیں) کے معنوں میں - لَا أَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۱۰/۶۱) - نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی - وہ سب ایک واضح کتاب کے اندر ہیں -

(۳) لَا جَرَمَ - محاورہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے - اس کے معنی ہوتے ہیں - "حق یہ ہے کہ" - جیسے (۱۱/۲۲) میں -

(۴) کبھی یہ جملے کے شروع میں اسطرح آتا ہے جیسے کسی کی بات کا جواب دیا جا رہا ہو - مثلاً لَا أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ (۹۰/۱) - نہیں ! میں اس شہر کو شہادت میں پیش کرتا ہوں -

(۵) کبھی یہ زائد ہوتا ہے - مثلاً مَا مَنَعَكَ أَلَّا (أَنْ + لَا) تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ (۷/۱۲) - جب میں نے تجھے حکم دیا تھا تو پھر وہ کونسی بات تھی جس نے تجھے سجدہ کرنے سے منع کردیا - اگر یہاں "لا" نہ ہو جب بھی وہی معنی ہونگے - جیسے (۳۸/۷۵) میں ہے - مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ -

اللَّاتُ

اللّات ۔ عہد جاہلیت میں طائف میں قبیلہ ثقیف کا بت تھا ۔ یہ مؤنث ہے (۵۳/۱۹) ۔ اسلئے اسے دیوی کہنا چاہئے ۔

لات (حرف)

لَاتَ ۔ نہیں کے معنوں میں ۔ قرآن کریم میں ہے وَلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ (۳۸/۳) ۔ خلاصی کا وقت نہیں رہا تھا ۔ بعض نے کہا ہے کہ لات میں لَا نفی (نہیں) کے لئے ہے اور تاء (تَ) زائد ہے ۔ مگر یہ زائد تاء حِیْنَ کے ساتھ ہی آتی ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ (لَاتَ) فعل ماضی ہے جس کے معنی نَقَصَ کے ہیں ۔ (جیسا کہ ل ۔ ی ۔ ت کے عنوان میں بیان ہوگا) ۔ بعد میں یہ صرف نفی کے لئے استعمال ہونے لگا ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لَیْسَ ہے ۔ سین کو تاء اور یاء کو الف سے بدل کر لَاتَ بنا لیا ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک مستقل لفظ ہے اور نفی کے لئے آتا ہے * ۔

ل أ ل أ

لَأْلَأَتِ الْمَرْأَةُ بِعَیْنَیْهَا ۔ عورت نے اپنی آنکھوں کو چمکایا ۔ لَأْلَأَتِ النَّارُ ۔ آگ بھڑکی اور روشن ہوگئی** ۔ اَللُّؤْلُؤُ ۔ (جمع لَآلِیُ)۔ موتی ۔ کیونکہ وہ چمکدار ہوتے ہیں * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چمکدار ہونے کے ہیں ۔

سورۃ حج میں جنتی معاشرہ کے اسبابِ زینت میں لُؤْلُؤٌ (۲۲/۲۳) بھی آیا ہے ۔ سونے کے کڑے ۔ موتی ۔ ریشم کا لباس ۔ یعنی سرداریوں اور سرفرازیوں کے تمام نشان و سامان ۔ یہ ہیں جنتی معاشرہ کے سامانِ زینت و اسبابِ آرائش و زیبائش ۔ یعنی وہ معاشرہ جس میں قوت و سطوت اور آسائش و آرائش کے تمام سامان بافراط موجود ہوں اور ان کی تقسیم اور استعمال قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو ۔

لئلاَّ (حرف)

لِئَلَّا ۔ (لِ + أَنْ + لَا) ایسا نہ ہو کہ ۔ یا ۔ تاکہ نہ ۔ لِئَلَّا یَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتٰبِ (۵۷/۲۹) ۔ تاکہ اہل کتاب جان لیں کہ . . . . . اس مثال میں لا زائد ہے ۔

---

* تاج ۔ ** تاج و راغب و محیط ۔

ل ب ب

اَلَبَّ عَلَى الْاَمْرِ ۔ کسی بات پر پختگی سے جما رہا اور اسے نہ چھوڑا ۔ رَجُلٌ لَبٌّ ۔ وہ شخص جو اپنے کام کاج میں لگا رہے اور اسے چھوڑے نہیں ۔ اَللَّبُّ ۔ کسی امر پر قائم رہنے والا ، اِسی لئے اسکے معنی قیام کرنے کے بھی ہوتے ہیں ۔ اَلَبَّ بِالْمَکَانِ ۔ اس نے فلاں مقام پر قیام کیا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) جمع رہنے اور ساتھ لگا رہنے اور (۲) خالص اور عمدہ ہونے کے ہیں ۔

لَبَّیْکَ ۔ میں آپ کی فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم سمجھتا ہوں ۔ میں آپ کی اطاعت پر قائم ہوں ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دَارِیْ تَلُبُّ دَارَہٗ سے ماخوذ ہے ۔ یعنی میرا گھر اس کے گھر کے سامنے ہے ۔ لہذا لَبَّیْکَ کے معنی ہیں میرا رخ آپ کی طرف ہے * ۔

لُبٌّ ۔ ہر چیز کے خالص حصے کو کہتے ہیں ۔ نیز مغز ، گری ۔ لَبَّ اللَّوْزَ ۔ بادام کو توڑ کر اس کا مغز نکال لیا * ۔ اللَّبَبُ ۔ سینہ کا وہ حصہ جس پر ہار پہنتے ہیں * ۔

اَللُّبُّ عقل کو کہتے ہیں ۔ اسکی جمع اَلْبَابٌ ہے ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ لفظ سریانی کے لِبُّوْ یا عبرانی کے لِبْ سے ماخوذ ہے جن کے معنی دل کے آتے ہیں ۔ عربی میں دل کو اَللُّب اس لئے کہتے ہیں کہ وہ (بادام کے مغز کی طرح) چربی سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے ** ۔ راغب نے کہا ہے کہ لُبٌّ تیز اور خالص عقل کو کہتے ہیں جو آمیزش سے پاک ہو *** ۔ (یعنی جو جذبات کی آمیزش سے پاک ہو ۔ جو جذبات کے تابع نہ چلے) ۔

قرآن کریم نے اُولِی الْاَلْبَابِ (۳/۱۸۹) کو خاص امتیاز کا حامل قرار دیا ہے اور ان کی بڑی تعریف کی ہے ۔ یہ وہ صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں جو عقل کو جذبات کی لونڈی بنانے کے بجائے اُس سے وحی کی روشنی میں کام لیتے ہیں ۔ اسطرح یہ عقل ، عقل خود بیں کے بجائے عقلِ جہاں بین بن جاتی ہے ۔ عقلِ خودبیں انسان کو صرف اس کے انفرادی مفاد کے حصول کی راہیں بتاتی ہے اور عقلِ جہاں بیں اُسے نوع انسانی کی ربوبیت عامہ پر آمادہ کرتی ہے ۔ اسی لئے قرآن کریم نے اُولِی الْاَلْبَابِ کے بعد کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ . . . . (۳/۱۸۹-۱۹۰) یعنی وہ صاحبانِ عقل و بصیرت جو اٹھتے ،

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

بیٹھتے ، لیٹے ، ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں - وحی کی روشنی میں عقل کی آنکھ سے کام لینا ، یہ ہے مومن کا شعارِ زندگی - ان میں سے اگر ایک چیز کی بھی کمی ہو تو وہ مومن نہیں کہلا سکتا -

ل ب ث

لَبِثَ یَلْبَثُ لَبْثًا وَ لُبْثًا و لَبَثًا - رہنا - ٹھہرنا - رکنا - نیز دیر کرنے اور انتظار کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے - اَلتَّلَبُّثُ - توقف - اقامت - توقف کرنے کے معنوں میں (۳۳/۱۴) میں آیا ہے * - لَبِثَ بِالْمَکَانِ - کسی مقام پر جم کر ٹھہرا - وہاں مستقل رہا ** - لَابِثٌ - ٹھہرنے والا - قیام کرنے والا - اس کی جمع لَابِثُوْنَ اور لَابِثِیْنَ ہے (۲۳/۷۸) -

مخالفین عرب، نبی اکرمؐ سے آپ کے دعوائے نبوت کی دلیل مانگتے - یعنی وہ کہتے کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ آپ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں - اس کے جواب میں نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶) - میں نے (دعوائے نبوت سے) قبل، تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے - کیا تم اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس قسم کی زندگی ایک سچے انسان کی زندگی ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟ تم اگر عقل و خرد سے کام لو تو میری زندگی میری صداقت کی زندہ شہادت بن کر تمہارے سامنے آ جائے - میں تم میں کوئی اجنبی نہیں ہوں کہ تمہیں معلوم نہ ہو کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا -

غور کیجئے کہ کسقدر زبردست ہے یہ شہادت جسے نبی اکرمؐ نے اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کیا ہے - ایسی شہادت کہ اس کے خلاف کوئی ایک حرف بھی نہیں کہہ سکتا - سچے کی نشانی یہ ہے کہ وہ (دوستوں کی محفل میں نہیں بلکہ) مخالفین کے بھرے مجمع میں پوری جرأت سے کہہ سکے کہ میری زندگی میری صداقت کا سب سے بڑا ثبوت ہے -

ل ب د

لَبَدَ بِالْمَکَانِ - کسی جگہ قیام کرنا اور اس جگہ سے چمٹ جانا - لِبْدٌ - نمدہ کو کہتے ہیں جس میں اون کو گتھ گتھ کر جمایا جاتا ہے - اسی سے مَالٌ لُبَدٌ کے معنی ہیں کثیر دولت - بہت زیادہ جمع شدہ مال * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا اوپر تلے جمع

* تاج - ** راغب -

ہونا ہیں - قرآن کریم میں ہے اَھْلَکْتُ مَالاً لُّبَدًا (۶/۹۰) - میں نے بہت سا جمع کردہ مال ضائع کر دیا - اَلنَّاسُ لُبَدٌ کے معنی ہیں لوگ یکجا جمع ہیں - اوپر تلے اکٹھے ہیں * - قرآن کریم میں ہے یَکُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا (۱۹/۷۲) - وہ اس پر ہجوم کرکے ٹوٹ پڑتے - لَبِدَ الْقَوْمُ بِالرَّجُلِ - لوگوں نے اس آدمی کو گھیر لیا اور اس کے پاس سے نہ ہٹے**-

ل ب س

لَبَسَ - یَلْبِسُ - لَبْسًا کے معنی ہیں خلط ملط مت کر دینا - مشتبہ کر دینا * - اس کے اصلی معنی چھپانے کے ہیں - اسی سے خلط ملط کر دینے اور مشتبہ بنا دینے کا مفہوم آگیا ** - وَلَا تَلْبِسُوْا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (۴۲/۲) حق اور باطل کو باہم خلط ملط مت کرو - مشتبہ کرنے کے معنوں میں یہ لفظ (۹/۶) میں آیا ہے - وَلَلَبَسْنَا عَلَیْهِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ - ''انہوں نے جس اشتباہ میں اپنے آپ کو ڈال رکھا ہے ، ہمارا (قانون مکافات) انہیں اس اشتباہ میں مبتلا رکھیگا''- لَبِسَ - یَلْبَسُ - لُبْسًا کے معنی ہیں پہننا - اَللُّبُوْسُ - اَللِّبَاسُ - جو کچھ پہنا جائے * - اَللِّبَاسُ - شوہر اور بیوی کو کہتے ہیں * - قرآن کریم میں ہے - هُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۱۸۷/۲)- میاں بیوی کا ایک دوسرے کا ساتھ بدن اور لباس کا ساتھ ہے (کہ ان کے درمیان کوئی تیسری چیز حائل نہیں ہوتی - ان میں گہری راز داری ہوتی ہے) - اَللَّبُوْسُ - زرہ اور ہتیار کو بھی کہتے ہیں *- قرآن کریم میں زرہ بنانے کے لئے صَنْعَةَ لَبُوْسٍ آیا ہے (۸۰/۲۱) - لَبِسَ فُلَانٌ اِمْرَاَةً - فلاں شخص ایک عرصہ تک عورت سے متمتع ہوتا رہا **- (ان کا باہمی اختلاط رہا) -

اَمْرٌ مُّلْبِسٌ اور مُلْتَبِسٌ - مشتبہ امر * - اَلتَّلْبِیْسُ - حقیقت کی پردہ پوشی کرنا اور ایسے خلاف واقعہ بنا کر دکھانا ** -

بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ (۵۰/۱۵) - یہ لوگ حیات نو (نئی پیدائش) کے بارےمیں شبہے میں ہیں - انہیں اس باب میں کچھ (Confusion) سی ہے -

قرآن کریم ہر بات کو نکھار کر سامنے لاتا اور ہر شے کو الگ الگ کر کے دکھاتا ہے تاکہ حقیقت کے سمجھنے میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہ رہ جائے - کہیں ابہام نہ ہو - التباس نہ ہو - ہر بات واضح ، کھلی کھلی اور

* تاج - ** محیط -

صاف صاف ہو۔ اسکے نزدیک کیتمان حقیقت (حقیقت کو چھپانا) ہی جرم نہیں بلکہ حق کو باطل کے ساتھ مخلوط کرنا بھی جرم ہے (۲/۴۲)۔ لہذا حق کی باطل کے ساتھ مفاہمت (Compromise) کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ حق، حق ہے اور باطل، باطل۔ دونوں آپس میں مل نہیں سکتے، چہ جائیکہ حق کو چھپایا اور باطل کو حق بنا کر دکھایا جائے۔ حق کو باطل کے ساتھ ملانے (تلبیس حق و باطل) کے معنی یہ ہیں کہ وحی (قرآن کریم) کے ساتھ غیر از وحی امور کو بھی دین بنا دیا جائے۔ ہم نے یہی کچھ کر رکھا ہے، اور اس کا نتیجہ بھگت رہے ہیں۔

ل ب ن

اَللَّبَنُ۔ دودھ*۔ (اَللَّبِنُ۔ اینٹ جس سے عمارت بنائی جاتی ہے)۔ قرآن کریم میں ہے۔ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشّٰرِبِیْنَ (۱۶/۶۶)۔ خالص دودھ جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے۔

ل ج أ

لَجَاَ وَ الْتَجَاَ اِلَیْہِ۔ اس نے اس کی طرف پناہ لی۔ اَلْجَاَہٗ اِلٰی کَذَا۔ اسے کسی چیز کی طرف مجبور کیا۔ اَلْجَاَ فُلَانًا۔ اس نے فلاں کو بچا لیا۔ اپنی حفاظت میں لے لیا**۔ تَلَجَّاَ مِنْھُمْ۔ وہ ان سے الگ اور ان کے زمرہ سے علیحدہ ہو کر دوسرے لوگوں کی طرف مائل ہو گیا*۔ اَلْمَلْجَاُ وَ الْمُلْتَجَاُ۔ جائے پناہ۔ بچنے اور محفوظ رہنے کی جگہ* (۹/۵۷)۔

ل ج ج

اَللُّجُّ وَ اللُّجَّۃُ۔ گہرا پانی۔ لُجُّ الْبَحْرِ۔ دریا کے درمیان وہ گہرے پانی کا مقام جہاں سے اس کا کنارہ نظر نہ آئے۔ بَحْرٌ لُجَاجٌ۔ وسیع گہرے پانی والا دریا۔ اَللَّجَاجُ۔ جھگڑے میں بڑھتے چلے جانا، خواہ اپنی غلطی بھی واضح کیوں نہ ہو جائے۔ جھگڑے یا مخالفت کرنے میں برابر اصرار کئے جانا**۔ اس سے فعل لَجَّ فِی الْاَمْرِ استعمال ہوتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا اپنے اجزاء پر بار بار پلٹنا اور پلٹانا ہیں۔ اَللَّجَاجُ۔ اصرار کو کہتے ہیں۔ لُجُّ الْبَحْرِ۔ سمندر کے بڑے حصے کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں سمندر کے اجزاء اوپر تلے پلٹتے رہتے ہیں۔

*تاج۔ **تاج و محیط۔

راغب نے لَجَّةٌ کے معنے بار بار پلٹنے اور آتے رہنے کے کئے ہیں اور اس سے لُجَّةُ الْبَحْرِ کے معنے سمندر کی موجوں کے بار بار آنے اور پلٹنے کے ہیں - نیز اس نے لَجَاجٌ کے معنے منع کئے ہوئے کام سے باز نہ آنے اور اسے کرتے چلے جانے کے کئے ہیں** -

سورۃ ملک میں ہے - بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّ نُفُوْرٍ (۶۷/۲۱) - وہ اپنی نفرت اور سرکشی میں موج در موج آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں - سورۃ نمل میں ہے - حَسِبَتْهُ لُجَّةً (۲۷/۴۴) - اس نے اسے گہرا پانی سمجھا - سورۃ نور میں ہے بَحْرٍ لُّجِّیٍّ (۲۴/۴۰) - گہرا اور وسیع سمندر -

ل ح د

اَللَّحْدُ - وہ کھڈا یا شگاف جو قبر کے ایک پہلو میں عرضاً کھود کر بنایا جاتا ہے اور اس میں مردہ دفن کیا جاتا ہے - (بر خلاف ضَرِیْحٌ کے جو درمیان میں کھودا جاتا ہے) - لہذا ، بقول ابن فارس ، اس مادہ کے بنیادی معنی درمیان سے ہٹ کر ایک طرف کو مڑ جانا ہیں - لَحَدَ اِلَیْهِ - وہ اس کی طرف مائل ہو گیا - جھک گیا* - یہی معنی اِلْتَحَدَ اِلَیْهِ کے ہیں** - اَلْحَدَ - وہ دین حق سے مڑا اور ہٹا - اَلْاِلْحَادُ کے اصل معنے مڑنا ، ہٹنا اور جھک جانا ہیں - درمیانہ روی کو چھوڑ کر ظلم کی طرف مائل ہونا* - سورۃ اعراف میں ہے اَلَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِهٖ (۷/۱۸۰) - جو لوگ صفات خداوندی کے بارے میں اعتدال سے ہٹ کر ایک طرف کو جھک جاتے ہیں (جیسے عیسائی ، کہ انہوں نے خدا کو صرف رحم کا پیکر تصور کرلیا اور اس کے قانونِ مکافات سے الگ ہٹ گئے) اسی کا نام غلوف الدین ہے (۴/۱۷۱) - دوسری جگہ ہے - اَلَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا (۴۱/۴۰) - جو لوگ ضابطہ خداوندی میں الحاد برتتے ہیں - اعتدال کی راہ چھوڑ کر ایک طرف کو ہٹ جاتے ہیں - انحراف کرتے ہیں - سورۃ حج میں ہے وَ مَنْ یُّرِدْ فِیْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ (۲۲/۲۵) - جو کوئی اس میں ظلم کے ساتھ کجروی اور بے باکی کا ارادہ کرے - جو سیدھے راستے سے ہٹ کر اسے (کعبہ کو) غلط مقاصد کے لئے استعمال کرنے لگ جائے - سورۃ نحل میں ہے - لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ ...... (۱۶/۱۰۳) - وہ شخص جس کے متعلق یہ اعتراضاً کہتے ہیں کہ وہ رسول اللہ کو قرآن کریم سکھا جاتا ہے ، اس کی زبان (تو عجمی ہے) - یہاں اَلْحَادٌ کے معنی ہیں کسی غلط بات کو کسی کی طرف بطور اعتراض منسوب کرنا - یعنی راستی سے ہٹ کر ، کسی کی طرف غلط بات کو منسوب کر دینا -

---

*تاج - **راغب -

مُلْتَحَدًا (۱۸/۲۷) پناہ گاہ - وہ جگہ جسکی طرف انسان (اپنے راستے سے ہٹ کر) پناہ کے لئے جائے - سرنگ یا زمین دوز راستہ کو بھی کہتے ہیں* -

سورۃ اعراف کی جس آیت کو اوپر درج کیا گیا ہے اُسے ایک بار پھر سامنے لائیے کیونکہ وہ ایک عظیم حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے - پوری آیت یوں ہے - وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا - وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ - سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۷/۱۸۰)- تمام صفات پورے اعتدال اور تناسب کے ساتھ، اللہ کے لئے ہیں - اُسے انہی صفات کے ساتھ پکارو- اور جو لوگ اس کی صفات میں (اعتدال سے ہٹ کر) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں، انہیں چھوڑ دو - انہیں ان کی اس غلط روش کا نتیجہ بہت جلد مل جائیگا-

خدا کی ذات تمام صفات کی حامل ہے، اور وہ صفات انتہائی اعتدال اور تناسب کے ساتھ اس میں جمع ہیں - تم ان صفات کو خود اپنی ذات میں اجاگر کرتے جاؤ لیکن اسی اعتدال و تناسب کے ساتھ- جو لوگ صفاتِ خداوندی کے تو قائل ہیں لیکن ان میں اعتدال اور تناسب کو ملحوظ نہیں رکھتے، وہ ملحد ہیں - تمہارا ان سے کوئی واسطہ نہیں - ان کی اس غلط روش کا نتیجہ ان کے سامنے آ جائے گا - تم نے ان کی پیروی نہ کرنا -

غور کیجئے کہ یہ کتنی بڑی حقیقت ہے جسے سامنے لایا گیا ہے - ملحد وہ نہیں جو خدا کی ذات یا اس کی صفات کا منکر ہے - ملحد وہ ہے جو انہیں مانتا ہے لیکن کسی ایک صفت میں افراط سے کام لیکر تناسب کو بگاڑ دیتا ہے - یہ غلط روش ہے - اسلام کے معنی یہ ہیں کہ صفات ہوں یا قوانین (۲/۳۰) دونوں میں پورے پورے تناسب کو قائم رکھا جائے -

ل ح ف

اَللِّحَافُ - سردی میں جس کپڑے کو اوڑھا جائے اور اس میں لپٹا جائے - لحاف، کمبل وغیرہ جو تمام کپڑوں کے اوپر اوڑھے جاتے ہیں* - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی لپٹ جانے، ساتھ چمٹے اور لگے رہنے کے بتائے ہیں - لَحَفَہٗ - اس نے آسے لحاف سے ڈھانپ دیا - اِلْتَحَفَ بِہٖ - وہ اس میں لپٹ گیا* -

سورہ بقرہ میں ہے - لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (۲/۲۷۳) - وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے - مانگتے ہوئے چمٹ نہیں جاتے - استعارۃً اسکے معنی ہوتے ہیں کسی کام کو بہت مبالغہ (شدت اور زیادتی) سے کرنا** -

*تاج - **راغب -

ل ح ق

لَحِقَهٗ ۔ يَلْحَقُهٗ وَاَلْحَقَهٗ اِلْحَاقًا ۔ کسی چیز کو پا لینا ۔ اس سے جا ملنا ۔ اَلْحَقَهٗ بِهٖ ۔ اسے اس کے پیچھے لگایا ، اس سے ملا دیا ۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح مستعمل ہے ۔ اَلْمُلْحَقُ ۔ وہ آدمی جو اپنے خاندان کو چھوڑ کر کسی دوسرے خاندان کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہو ۔ لہذا اس کے معنی کسی کے ساتھ مل جانے کے ہیں ۔ تَلَاحَقَتِ الرِّكَابُ ۔ سواریاں ایک دوسرے سے ملتی چلی گئیں * ۔ سورہ یوسف میں حضرت یوسف[ؑ] کی دعا ہے ۔ وَاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (۱۲/۱۰۱) ۔ مجھے صالحین کے ساتھ ملادے ۔ مجھے ان کے زمرے میں شامل کر دے ۔ سورہ جمعہ میں نبی اکرم[ؐ] کے متعلق ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کے لئے بھی رسول ہیں ۔ وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (۶۲/۳) ۔ اور ان اقوام کے لئے بھی جو ابھی ان سے نہیں ملیں ۔ یعنی ان کے بعد آنے والی اقوام ۔ اس لئے کہ حضور[ؐ] خاتم النبیین ہیں اور تمام نوع انسانی کے لئے رسول ہیں ۔ اس لئے آپ کی رسالت تمام آنے والی اقوام کے لئے بھی اسی طرح ہے جسطرح اسوقت کی مخاطب قوم کے لئے تھی ۔ اس لئے حضور[ؐ] کے بعد کسی اور نبی کے آنے کا عقیدہ باطل اور قرآنِ کریم کے یکسر خلاف ہے ۔

ل ح م

لُحْمَةٌ ۔ قرابت ۔ رشتہ داری ۔ نیز کپڑے کا باتا ، جو تانے کے ساتھ ملکر کپڑا بناتا ہے ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز میں گھسنا اور گتھ جانا بتائے ہیں ۔ گوشت کو اَللَّحْمُ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے اجزاء باھمدگر پیوست ہوتے ہیں ۔ اَلْمَلْحَمَةُ ۔ گھمسان کا رن ۔ قتل وغارتگری کا بڑا واقعہ ** ۔

قرآن کریم میں لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ (سؤر کے گوشت) کی حرمت آئی ہے ۔ (۲/۱۷۳) ۔ اَللَّحِيْمُ ۔ وہ گھر جہاں لوگوں کی بہت غیبتیں کی جائیں ** ۔ قرآن کریم نے بھی غیبت کو '' مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے '' تشبیہ دی ہے ۔ (۴۹/۱۲) ۔ لَحْمٌ کی جمع لُحُوْمٌ ۔ آتی ہے ۔ (۲۲/۳۷) ۔

ل ح ن

اَللَّحْنُ ۔ اس مادہ کے اصلی معنی ہوتے ہیں صحیح جہت اور راہ اعتدال سے کسی ایک طرف کو مڑجانا یا مائل ہو جانا * ۔ اور اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے

*تاج و راغب و محیط ۔　**تاج ۔

کہ بات کو اس کے صحیح اسلوب اور مستعمل طریقہ سے ھٹا دینا ۔ اسکی ایک شکل یہ ھے کہ خفیہ طور پر بعض الفاظ کے خاص معنی مقرر کر لئے جائیں ۔ جب وہ لفظ بولا جائے تو عام لوگ اس کا مطلب اور لیں اور جسے وہ خاص معنی معلوم ھیں وہ اس کا مطلب دوسرا لے۔ اسکی دوسری شکل یہ ھے کہ خود لفظ کی ھیئت میں تبدیلی کر دی جائے ۔ اور تیسری شکل یہ کہ الفاظ کا مفہوم بدل دیا جائے ۔ یا انہیں بطور تعریض استعمال کیا جائے ۔ اسی سے ایسے آدمی کو جو بہت ذھین ھو اور تعریض سے صحیح مقصود سمجھ جائے لَحِنٌ کہدیتے ھیں**۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی دو ھیں (۱) کسی چیز کو اس کے صحیح رخ سے موڑ دینا ۔ اور (۲) ذھانت اور ذکاوت ۔

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق ھے کہ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ (۴۷/۳۰) یعنی وہ جسطرح الفاظ کو موڑ توڑ کر کہتے ھیں اور صریح مفہوم کو چھوڑ کر کلام کا تعریضی مفہوم لیتے ھیں ، اس سے وہ پہچانے جا سکتے ھیں ۔ چنانچہ یہودیوں کے متعلق سورہ نساء میں ھے یَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ (۴/۴۶) ۔ اسی قسم کی ذو وجہین باتیں منافقین کیا کرتے تھے ۔

اَللَّحْنُ ۔ زبان اور بولی کو بھی کہتے ھیں ۔ اور پڑھنے میں غلطی کرنے کو بھی چنانچہ لَاحِنٌ ۔ غلط بولنے والے کو کہتے ھیں ۔ قَدْ لَحَنَ لَهٗ لَحْنًا کے معنی ھیں اس نے اس سے اشاروں کنایوں میں اسطرح بات کی کہ وہ تو بات سمجھ جائے لیکن کوئی دوسرا آدمی نہ سمجھ سکے***۔

ل ح ی

لَحْیٌ ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اسکے بنیادی معنی دو ھوتے ھیں ۔ (۱) بدن کا ایک ٹکڑہ یعنی جبڑا ۔ اور (۲) کسی چیز کو چھیل دینا ۔ چنانچہ اَللِّحَاءُ درخت کی چھال کو کہتے ھیں ۔ اَللِّحْيَةُ ۔ ڈاڑھی ۔ اَللَّحْيُ ۔ جبڑا ۔ ڈاڑھی اُگنے کی جگہ ۔ لَحَيْتُ فُلَانًا اَلْحَاهُ ۔ میں نے اسکو ملامت کی ۔ لَاحٍ ۔ ملامت کو ۔ مَلْحِيٌّ ۔ ملامت کردہ شخص ۔ لَاحَاهُ مُلَاحَاةً ۔ اس نے اس سے جھگڑا کیا ۔ ایک دوسرے کو برا بھلا کہا ۔ لعنت ملامت کی*۔

قرآن کریم میں ھے ۔ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ (۲۰/۹۴) اس کے لفظی معنی ھیں میری ڈاڑھی مت پکڑ ۔ اور مفہوم یہ ھے کہ میری ملامت مت کر ۔ ھماری زبان میں بھی ڈاڑھی نوچنا یا نچوانا اور پگڑی اچھالنا انہی معنوں میں بولتے ھیں ۔

*تاج و محیط ۔ **راغب ۔ ***تاج ۔

اگرچہ سورہ اعراف میں جو ہے وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗ اِلَیْهِ (۷/۱۵۰)۔ " اس نے اپنے بھائی کے سر کو پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچا"۔ تو اس سے زبانی ملامت کے ساتھ ہاتھوں کی حرکت کا بھی اشارہ ملتا ہے۔

ل د د

اَلَدّ کے اصلی معنے ایسے شخص کے ہیں جس کی گردن کا پہلو بڑا سخت ہو اور اس کی وجہ سے اسے اس کے ارادہ سے موڑا نہ جاسکے۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو بڑا جھگڑا لو اور خود سر ہو اور کسی کی بات مانے ہی نہیں۔ اسکی جمع لُدّ آتی ہے *۔ اَللَّدِ یْدَانِ۔ گردن کے دونوں پہلو جو کانوں کے نیچے ہوتے ہیں **۔ نیز وادی کے دونوں کنارے۔ اس نہج سے لُدّ کے معنی "حق سے ہٹے ہوئے" (جمع) آتے ہیں۔ نیز بات کو نہ سننے والے بہروں کو بھی کہتے ہیں۔ جھگڑا لو بھی گویا بہرہ ہوتا ہے، دوسرے کی نہیں سنتا اور اپنی کہے جاتا ہے۔ اِلْتَدَّ عَنْهُ۔ وہ اس سے ہٹ گیا۔ آلْدَدْتُهٗ۔ میں نے اسے بہت جھگڑا لو پایا **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے (۱) جھگڑا کرنا۔ اور (۲) کسی چیز کا کنارہ ہیں۔

سورۃ بقرہ میں ہے هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲/۲۰۴)۔ وہ بہت ہی سخت جھگڑا لو ہے۔ سورۃ مریم میں قَوْمًا لُدًّا (۱۹/۹۷) آیا ہے۔

لَدُنْ (لَدٰی)

لَدُنْ۔ پاس۔ نزدیک۔ مِنْ لَدُنْ۔ طرف سے۔ ہاں سے۔ مِنْ لَدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ (۱۱/۱)۔ خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے۔

ہمارے ہاں (تصوف میں) "علمِ لدنی" کی ایک اصطلاح رائج ہے جس کا مطلب ہوتا ہے وہ علم جو کوئی شخص براہ راست خدا سے حاصل کرے۔ مفہوم اس سے کشف یا الہام ہوتا ہے۔ جیسا کہ اِلْہَام (ل۔ ہ۔ م کے عنوان) میں لکھا گیا ہے، ختمِ نبوت کے بعد الہام یا کشف کا تصور غیر قرآنی ہے۔ اب انسان جو علم خدا سے براہ راست حاصل کرتا ہے وہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص خدا سے براہ راست علم حاصل نہیں کر سکتا۔ خدا سے براہ راست علم کا نام وحی ہے جس کا سلسلہ نبی اکرمؐ پر ختم ہو گیا۔

* راغب۔ ** تاج۔

لَدَیٰ - لَدُنْ کے معنوں میں آتا ہے - لَدَی الْحَنَاجِرِ (۱۸/۴۰) - گلوں تک - حلق کے نزدیک - حلق کے پاس - لَدَا الْبَابِ (۲۵/۱۲) - دروازہ کے قریب -

ل ذ ذ

اَللَّذَّةُ - خواہش - وہ مزہ جو طبیعت و مزاج کے مطابق ہو - اَلَمٌ کی ضد ہے - لَذَّہٗ - لَذَّبِہٖ - اس نے اسے لذیذ پایا* لذیذ سمجھا - قرآن کریم میں ہے وَ تَلَذُّ الْاَعْیُنُ (۷۱/۴۳) - اس سے آنکھیں لذت یاب ہوتی ہیں - اَللَّذَّةُ بمعنی لذیذ بھی آتا ہے ، قرآن کریم میں ہے لَذَّةٍ لِلشّٰرِبِیْنَ (۴۶/۳۷) پینے والوں کے لئے لذیذ - صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ کسی مناسب و موافقِ طبع چیز کے ، اس حیثیت سے کہ وہ موافق طبع ہو ، ادراک کر لینے کو لَذَّةٌ کہتے ہیں - مثلاً قوت ذائقہ کے لئے شیرینی کا مزہ الخ ......** -

ل ز ب

لَزْبٌ کے بنیادی معنی کسی چیز کے قائم اور ثابت رہنے ، جمے رہنے اور ساتھ لگے رہنے کے ہوتے ہیں - لَازِبٌ - لازم کو کہتے ہیں - (ابن فارس)- اَللُّزُوْبُ - چمٹنا - طِیْنٍ لَازِبٍ (۱۱/۳۷) - چمٹنے والی مٹی - اَللَّازِبُ - وہ چیز جو کسی کے ساتھ جم جائے - اس سے چمٹ جائے ، اوراس پر ثبت ہوجائے - لَزِبَ الطِّیْنُ - مٹی جم گئی اور سخت ہوگئی - اَللَّزْبَةُ - سخت قحط سالی کو کہتے ہیں جو شدید طور پر چمٹ جاتی ہے*** - (کیونکہ مصیبت کے دن جلدی نہیں گذرا کرتے) -

انسانی تخلیق کے سلسلہ میں سورۃ الصافات میں ہے کہ اسے طِیْنٍ لَازِبٍ سے پیدا کیا گیا ہے (۱۱/۳۷) - جب مٹی پانی کے ساتھ ملتی ہے تو اس میں زندگی کے اولین جرثومہ کی نمود ہوتی ہے - جیسے جوہڑوں کے کنارے چپچپی مٹی سے چھوٹے چھوٹے جرثومے (Life - Cells) پیدا ہوجاتے ہیں - ان سے زندگی (Life) ارتقائی طور پر اوپر کو ابھرتی ہوئی پیکر انسانی میں آگئی ہے - (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں عنوان - انسان) -

ل ز م

لَزِمَ - یَلْزَمُ - لُزُوْمًا - کسی چیز کا جمنا ، ہمیشہ رہنا ، ساتھ لگے رہنا اور جدا نہ ہونا - اَلْمِلْزَمُ - شکنجہ - اَلْمُلَازِمُ - کسی کے ساتھ لگا

*تاج - **محیط - ***تاج و راغب -

رہنے والا - نیز گلے ملنے والے کو بھی کہتے ہیں* - لَزِمَ الشَّیْئُ - چیز ثابت اور دائم رہی - لَزِمَ الْمَالُ فُلَانًا - فلاں آدمی پر مال واجب ہوگیا**- لُزُوْمُ الشَّیْئِ - کسی شے کا طویل عرصہ تک رہنا***- الْتِزَامُ جو چیز آکر چپک جائے اور پھر الگ نہ ہو- (۲۵/۷۷) -

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ جو دعوت تم پر صاف اور واضح نہ ہوئی ہو اَنُلْزِمُکُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا کَارِهُوْنَ (۱۱/۲۸) کیا میں اسے زبردستی تمہارے گلے منڈھ سکتا ہوں ؟ سورۃ فتح میں ہے وَ اَلْزَمَهُمْ کَلِمَةَ التَّقْوٰی (۴۸/۲۶)- اس نے انہیں تقوٰی کی بات پر لگا دیا یعنی انہوں نے تقوٰی اختیار کرلیا - وہ اس پر مضبوطی سے جم گئے- سورۃ طٰہٰ میں عذابِ خداوندی کےمتعلق ہے - لَکَانَ لِزَامًا (۲۰/۱۲۹) - وہ ان کے ساتھ آکر چپک جانے والا تھا -

ل س ن

اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کی ایسی لمبائی کے ہیں جو نہایت لطیف ہو اور منقطع نہ ہو (ابن فارس) - لِسَانٌ (جمع اَلْسِنَةٌ) - زبان (Tongue) - (۹۰/۹) - لغت (Language) (۱۴/۴) - قوتِ گویائی* (۲۸/۳۴) - سورۃ مریم میں حضرات انبیاء کرامؑ کے تذکرہ کے بعد فرمایا - وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِیًّا (۱۹/۵۰) - صاحبِ تاج کے نزدیک یہاں لِسَانٌ کے معنی تعریف و توصیف ہے - یعنی انہیں ایسا مقام عطا کر دیا کہ دنیا ان کا نام مدح و ستائش سے لیتی ہے - یا یہ کہ انہوں نے ہمیشہ خدا کی صداقتوں کو بلند کیا اور دنیا کے سامنے صدق کو پیش کیا -

قرآن کریم نے اختلافِ الوان و السنہ کو خدا کی نشانیاں قرار دیا ہے (۳۰/۲۲) - دنیا کی مختلف زبانوں کے متعلق تحقیقات کا سلسلہ تو ایک مدت سے جاری تھا لیکن ہمارے زمانہ میں (Language) نے زبان سے آگے بڑھ کر فلسفہ کی سی حیثیت اختیار کرلی ہے ، جسے (Ernst Cassirer) کے الفاظ میں (The Philosophy of Symbolic Forms) کہاجاتا ہے****- اس فلسفہ کی رو سے ”زبان“ کےمتعلق عجیب و غریب حقائق منکشف ہو رہے ہیں - علاوہ بریں ، ڈاکٹر بک (Bucke) نے اپنی کتاب (The Cosmic Consciousness) میں زبانوں کے تجزیہ سے قوموں کی تہذیب و ثقافت کے متعلق جو اصول بیان کئے ہیں ان سے بھی یہ

*تاج - **محیط - ***راغب- ****یہ خود (Cassirer) کی ایک کتاب کا بھی نام ہے -

حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ اختلافِ السنہ کس طرح آیَۃٌ مِنْ آیَاتِ اللہِ ہے ۔ ابھی ان علوم کی ابتدا ہے ۔ جب ان کی تحقیقات کا سلسلہ آگے بڑھا تو پھر قرآن کریم کے یہ حقائق اور بھی اُبھر کر سامنے آجائینگے ۔

ل ط ف

لَطَفَ ۔ یَلْطُفُ کے معنی ہیں کسی سے نرمی اور مہربانی سے پیش آنا ۔ اور لَطُفَ ۔ یَلْطُفُ کے معنی ہیں کسی چیز کا چھوٹا اور باریک ہونا * ۔ اَللَّطِیْفُ ۔ خدا کے اسمائے حسنٰی میں سے ہے ۔ اسکے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ خفیف اور دقیق امور تک سے واقف ہے اور یہ بھی کہ وہ انسانوں کو راہ نمائی دینے میں نہایت لطیف انداز اختیار کرتا ہے اور نرمی اور مہربانی کا برتاؤ کرتا ہے** ۔ صاحب محیط نے اس کے معنی صاف اور شفاف کے بھی لکھے ہیں *** ۔ خدا کے لطیف ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اس کا قانون تدریج و امہال محسوس نہیں ہوتا ۔ درخت بڑھتا ہے ۔ اس سے پتے نکلتے ہیں ۔ پھل لگتے ہیں ۔ سورج '' چلتا ہے '' ۔ ساری کائنات میں تغیرات کا سلسلہ جاری ہے ۔ ارتقاء ہو رہا ہے ۔ اعمال اپنے نتائج مرتب کر رہے ہیں ۔ لیکن ان تمام حرکات ، اعمال اور تغیرات کی رفتار ایسی غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتی ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا ۔ یہ سب کچھ نہایت لطیف انداز سے واقع ہوتا رہتا ہے ۔

اَللَّطِیْفُ مِنَ الْکَلَامِ ۔ بڑی لطیف اور دقیق بات * ۔ اَللَّطَائِفُ ۔ وہ باتیں جن کا ادراک انسانی حواس نہ کر سکیں** ۔

سورہ انعام میں ہے ۔ لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (۶/۱۰۴) ۔ انسانی نگاہیں خدا کا احاطہ نہیں کر سکتیں ۔ اور وہ تمام نگاہوں کا احاطہ کرتا ہے ۔ (اس لئے کہ) وہ لطیف و خبیر ہے ۔ یہاں سے اَللَّطِیْفُ کے معنی واضح ہو گئے ۔ یعنی باریک بیں ۔

سورہ کہف میں ہے کہ اصحاب کہف نے کہا کہ ہم میں سے ایک آدمی بستی کیطرف جائے اور وہاں کے حالات کا پتہ کرے اور کچھ کھانے کے لئے لائے ۔ وَلْیَتَلَطَّفْ وَلَا یُشْعِرَنَّ بِکُمْ اَحَدًا (۱۸/۱۹) ۔ وہ احتیاط اور ہوشیاری سے کام لے تاکہ کسی کو تمہارا پتہ نہ لگ جائے ۔ اس سے بھی لُطْفٌ کا مفہوم سامنے آجاتا ہے ۔ یعنی کسی کام کو غیر محسوس طور پر سرانجام دینا ۔

---

*تاج ۔ **راغب ***محیط ۔

ل ظ ی

اَللَّظٰی ۔ آگ یا آگ کا شعلہ ۔ راغب نے اسکے معنے آگ کا خالص شعلہ بتائے ھیں ۔ یعنی جس میں دھوئیں کی آمیزش نہ ھو ۔ لَظِیَتِ النَّارُ وَ تَلَظَّتْ ۔ آگ بھڑک اٹھی * ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ کَلَّا اِنَّھَا لَظٰی (۷۰/۱۵) ۔ شعلہ انگیز آگ ۔ دوسری جگہ نَاراً تَلَظّٰی (۹۲/۱۴) آیا ہے ۔ یعنی ایسی آگ جو بھڑک رھی ہے ۔

ل ع ب

اس مادہ کی اصل لُعَابٌ ہے جو منہ سے بہنے والی رال کو کہتے ھیں ۔ لَعِبَ فُلَانٌ ۔ اس نے بغیر صحیح مقصد کے کام کیا** ۔ صاحب محیط نے اس کی تائید کرتے ھوئے لکھا ہے کہ یہ ایسے کام کرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے جس سے قطعاً کوئی فائدہ نہ ھو ۔ نیز اس کے معنی ھیں غیر موزوں کاموں سے دلبستگی پیدا کرنا اور اس سے مسرت حاصل کرنا ۔ یا سود مند چیزوں کو چھوڑ کر غیر سود مند چیزوں کی طرف لگ جانا*** ۔ لَاعِبٌ ۔ کھیل کھیلنے والا**** ۔ لَعِبٌ ، جِدٌّ کی ضد ہے جِدٌّ کے معنی ھوتے ھیں کسی کام کو (Seriously) کرنا ۔ لہذا ، لَعِبٌ کے معنی ھوئے کسی معاملہ میں (Serious) نہ ھونا ۔ لَعِبَ بِنَا الْمَوْجُ ۔ اسوقت کہتے ھیں جب موجیں کشتی کو منزل مقصود کیطرف نہ لے جائیں ۔ اس بنا پر ، لَعِبٌ کے معنی یہ ھوں گے کہ حرکت تو ھو لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلے ۔ قدم تو اٹھیں لیکن منزل قریب نہ آئے ۔ بلا مقصد کام ، بلا نتیجہ عمل ۔ اِنَّمَا اَنْتَ لَاعِبٌ ۔ تم یونہی مذاق کر رہے ھو ۔ تم اسے سنجیدگی سے (Seriously) نہیں لے رہے**** ۔

لَعِبٌ کے ساتھ لَھْوٌ کا عنوان (ل ۔ ھ ۔ و) بھی دیکھئے ۔ کلیات میں ہے کہ لَھْوٌ حق سے روگردانی کو کہتے ھیں اور لَعِبٌ باطل کی طرف متوجہ ھو جانے کو*** ۔

سورہ مائدہ میں ہے کہ جو لوگ تمہارے دین کو ھُزُوًا وَّ لَعِبًا لیتے ھیں (۵/۵۷) انہیں اپنا دوست نہ بناؤ ۔ یعنی جو اسے سنجیدگی سے (Seriously) نہیں لیتے ۔ سورہ انعام میں ہے وَذَرْھُمْ فِیْ خَوْضِھِمْ یَلْعَبُوْنَ (۶/۹۲) " تو انہیں چھوڑ دے کہ یہ اپنی بیہودہ باتوں سے (زندگی سے) کھیلتے رھیں " ۔ یہ ان لوگوں کے متعلق ہے جنہوں نے زندگی کو محض کھیل تماشا سمجھ رکھا ہے ۔ اسے مذاق قرار دے رکھا ہے ۔

---

*تاج و محیط ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔ ****تاج و لین ۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ زندگی کی صحیح روش یہ ہے کہ انسان ہمیشہ مستقبل پر نگاہ رکھے ۔ مستقبل کے اندر بہت سی باتیں آجاتی ہیں ۔ اس زندگی میں عیش امروز کی بجائے فکر فردا ۔ آنے والی نسلوں کے مفاد کا خیال ۔ پوری نوع انسانی کی بہبود کی فکر ۔ اور اس زندگی کے بعد مستقبل کی زندگی کا خیال ۔ طبیعی زندگی کے مفاد عاجلہ کے مقابلہ میں بلند اقدار کا تحفظ ۔ اس کے برعکس دوسری روش یہ ہے کہ انسان مستقبل کی کچھ پرواہ نہ کرے اور اپنی ساری توجہ طبیعی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد اور عیش امروز پر رکھے ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ روش زندگی کھیل تماشے سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی ۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ (۶/۳۲) اپنی تمام تگ و تاز کو طبیعی زندگی کی آسائشوں کی نذر کر دینا ، بے مقصد زندگی ہے ۔ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ (۶/۳۲) ۔ جو لوگ تباہیوں سے بچنا چاہتے ہیں انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ مستقبل کی زندگی کا مفاد ہی اس قابل ہے کہ اس کے حصول کے لئے کوشش کی جائے ۔ لَهْوٌ اس بات کو کہتے ہیں جو انسان کی توجہ کو اس چیز کی طرف سے ہٹا کر جو اس کے لئے ضروری ہے اُس چیز کی طرف منعطف کرا دے جو غیر ضروری اور بے مقصد ہے ۔ ان آیات سے (جن میں الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا کو لہو و لعب کہا گیا ہے) یہ مراد نہیں کہ قرآن کریم دنیاوی زندگی کو قابل نفرت قرار دیتا ہے ۔ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے ۔ وہ اس دنیا کی زندگی کی خوشگواریوں کے حصول اور کائناتی قوتوں کی تسخیر کو مومن کی زندگی کی خصوصیت قرار دیتا ہے (دیکھئے عنوان د ۔ ن ۔ و) ۔ ان آیات کا مفہوم وہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے ۔ یعنی اپنی نگاہ کو مستقبل کے مفاد سے ہٹا کر مفاد عاجلہ اور فوری عیش پر مبذول کر لینا ۔ زندگی کو محض طبیعی زندگی سمجھنا اور حیوانی سطح پر جینا ۔ جب طبیعی زندگی کے کسی مفاد اور بلند انسانی قدر میں تصادم ہو تو بلند قدر کو طبیعی مفاد پر قربان کر دینا ۔ یہ روش غلط ہے ۔ جو قومیں مستقبل کی پرواہ نہیں کرتیں وہ برباد ہو جاتی ہیں ۔ یہی حالت افراد کی ہے ۔ قرآن کریم ہمیشہ مستقبل کے مفاد کی تاکید کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ دنیاوی مفاد ضرور حاصل کرو ۔ طبیعی زندگی کی خوشگواریوں سے متمتع ہو ۔ لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ اس قسم کی خوشگواریوں میں اور کسی بلند انسانی قدر میں (جو وحی کے ذریعے ملتی ہے) (Tie) پڑ جائے ۔ تصادم ہو جائے ۔ تو اسوقت بلند قدر کے تحفظ کی خاطر طبیعی زندگی کے مفاد کو قربان کر دینا چاہئے ۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم انسانی زندگی کو محض مذاق سمجھ رہے ہو ۔

سورہ انبیاء میں ہے۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِيْنَ (۲۱/۱۶)۔ اور ہم نے اس سلسلۂ کائنات کو یونہی، لَاعِبِیْنَ، نہیں بنا دیا۔ ایسے ہم نے کھیل تماشا کے طور پر پیدا نہیں کر دیا۔ یہ مذاق نہیں۔ یہ بلا مقصد نہیں۔ اسکا ایک عظیم الشان مقصد ہے۔ یہ ایک اہم پروگرام کے ماتحت عمل میں آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔ (۲۱/۱۸)۔ یہاں ہو یہ رہا ہے کہ تعمیری قوتیں، تخریبی قوتوں پر برابر ضرب کاری لگاتی رہتی ہیں۔ اس سے تخریبی قوتیں نیست و نابود ہو جاتی ہیں اور تعمیری سلسلہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ یوں یہ سلسلۂ کائنات، اس تعمیری طریق سے ارتقائی منازل طے کرتا چلا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز محض کھیل تماشے کے طور پر بلا مقصد و بلا منزل پیدا کر دی گئی ہو اس کی صورت یہ نہیں ہؤا کرتی۔

اس آیت میں قرآن کریم نے اس غلط تصور کی بھی تردید کی ہے جو ہندؤوں کے ہاں رائج ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ کائنات اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایشور نے ایک لیلا رچا رکھی ہے۔ یعنی محض کھیل ہے۔ اسی لئے ان کے ہاں ایشور کو ”نٹ راجن“ کہتے ہیں۔ یعنی کھلاڑیوں کا بادشاہ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ تصور لغو ہے۔ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ (۲۱/۱۸)۔ یہ باتیں بے حد قابل افسوس اور تباہی کا باعث ہیں۔ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ (۳۰/۸) کائنات کی تخلیق حق کے ساتھ ہوئی ہے۔

لہذا کائنات اور انسانی زندگی کے ہر مسئلہ کو ہمیشہ (Seriously) لینا چاہئے۔ مذاق نہیں سمجھنا چاہئے۔ اور اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے۔ قرآن کریم نے انسانی زندگی اور کائنات کو حقیقت (Reality) قرار دیکر انسان کے سامنے ایک عظیم پروگرام رکھ دیا ہے۔ اس سے افلاطون (Plato) کا وہ طلسم بھی یکسر ٹوٹ گیا جس کی رو سے اس کائنات کو محض فریب سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے ٹوٹنے سے ویدانت (ہندی تصوف)۔ خانقاہیت اور تصوف کی عمارت بھی نیچے آگری۔ دوسری طرف مغرب کے نظریہ مادیت (Materialism) کا بھی بطلان کر دیا جس کی رو سے زندگی محض طبیعی زندگی (Physical Life) ہے اور بس۔

لَعَلَّ (حرف)

لَعَلَّ۔ یہ حرف حسب ذیل معانی پیدا کرتا ہے۔

(۱) ”تاکہ“ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۲/۱۸۹)۔ تم

قانون خداوندی کی نگہداشت کرو تا کہ تمہاری کھیتیاں برو مند ہوں۔ یہ توقع اور ترجّی (امید) کے لئے آتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا ترجمہ ہوتا ہے ''امید ہے کہ''۔۔۔۔۔ ''توقع ہے کہ''۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ کتاب اور حکمت دونوں منزل من اللہ ہیں (مثلاً ۔ ۲/۱۱۳ ؛ ۱۷/۳۹ ؛ ۲/۲۳۱)۔ کتاب کے معنی ہیں قانون اور حکمت کے معنی ہیں اس قانون کی غرض و غایت ۔ مصلحت ۔ وہ مقصد جس کے لئے وہ قانون دیا گیا ہے ۔ لَعَلَّ بھی حکمت بتانے کے لئے آتا ہے ۔ وَ اتَّقُوْا اللّٰہَ ۔ کتاب ہے (یعنی قانون ۔ یا حکم) اور لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ اس کی حکمت (مقصد یا غایت یا وہ نتیجہ جو اس حکم یا قانون کی اطاعت سے لازمی طور پر مرتب ہونا چاہئے)۔

(۲) ''شاید'' یا ''ہوسکتا ہے کہ'' کے معنوں میں ۔ وَ مَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ (۴۲/۱۷) اور تجھے کیا خبر ہے ، شاید وہ انقلاب کی گھڑی قریب ہی ہو۔ (ہوسکتا ہے کہ وہ قریب ہی ہو)۔

(۳) استفہام انکاریہ کے لئے۔ یعنی ایسا سوال جس کا جواب (یا اس سے مراد) نہیں ہوتا ہے ۔ فَلَعَلَّکَ تَارِکٌ بَعْضَ مَا یُوْحٰی اِلَیْکَ (۱۱/۱۲)۔ توکیا تو (ان لوگوں کی خاطر) اپنی وحی کا کچھ حصہ ترک کردیگا ؟ ۔ (ہرگز نہیں ۔ تو ایسا کبھی نہیں کریگا)۔

(۴) بعض اوقات یہ ''گویا کہ'' اور ''جیسے'' کے معنوں میں بھی آتا ہے ۔ اس کے لئے قرآن کریم کی یہ آیت مثال میں پیش کی جاتی ہے ۔ وَ تَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّکُمْ تَخْلُدُوْنَ (۲۶/۱۲۹)۔ اور تم صنعت کاری کے بڑے بڑے کام کرتے ہو گویا تمہیں یہاں ہمیشہ رہنا ہے ۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم یہ صنعت کاری اس لئے کرتے ہو تا کہ تمہیں دوام و استمرار نصیب ہو جائے ۔ یہ چیزیں تمہاری بقا کا ذریعہ بن سکیں ۔

ل ع ن

لَعَنَ کے معنی ہوتے ہیں کسی کو ناراضگی کی بنا پر اپنے سے دور کر دینا*۔ خدا کی طرف سے لعنت سے مراد یہ ہوگی کہ انسان زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہو گیا ۔ ظاہر ہے کہ یہ محرومی قوانین خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ ہوگی ۔ اس لئے لَعْنَتٌ کے معنی ہونگے قانون مکافات کی رو سے زندگی کی شادابیوں سے محروم ہو جانا ۔

*راغب ۔ **تاج ۔

دور رکھنے کے اعتبار سے اَللَّعِيْنُ (Scare - Crow) کو کہتے ہیں - یعنی وہ لکڑیاں سی جنہیں انسانی لباس پہنا کر کھیتوں میں کھڑا کر دیا جاتا ہے تاکہ پرندے فصل سے دور دور رہیں اور اسے خراب نہ کریں* -

قرآن کریم نے ابلیس کے متعلق پہلے کہا ہے فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ (۱۵/۳۴) - اور اس کے بعد ہے اِنَّ عَلَیْکَ اللَّعْنَةَ (۱۵/۳۵) - رَجْمٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو دور پھینک دینا - اس سے بھی لَعْنَتٌ کے معنی واضح ہوجاتے ہیں -

سورۃ بقرہ میں ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ ہم قرآنی تعلیم سے کبھی اثر پذیر نہیں ہوسکتے - ہمارے دل غلافوں کے اندر ہیں - قرآن کریم نے کہا کہ بَل لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِکُفْرِهِمْ (۲/۸۸) - نہیں! بات یہ نہیں جو وہ کہتے ہیں - بات یہ ہے کہ وہ اپنے انکار و سرکشی کی وجہ سے سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیتوں سے محروم کر دئیے گئے ہیں - اور یہ خدا کے قانون مکافات کے مطابق ہوا ہے - لہذا جو لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں خدا کافروں پر ''لعنتیں'' برساتا ہے تو انہوں نے لَعْنَتٌ کے قرآنی مفہوم کو نہیں سمجھا - خدا (معاذ اللہ) گالیاں نہیں دیا کرتا - اس سے خدا کے قانونِ مکافات عمل کا بیان مقصود ہے - اور وہ قانون یہ ہے کہ جو شخص غلط راہوں پر چلتا ہے وہ زندگی کی انسانیت ساز خوشگواریوں سے دور ہٹ جاتا ہے - ان سے محروم رہ جاتا ہے - اس کے غلط اعمال کے اس نتیجہ کو لعنت کہتے ہیں اور ایسے شخص (یا قوم) کو ملعون -

مَلْعُوْنٌ دور کیا ہوا - اس کی جمع مَلْعُوْنُوْنَ وَ مَلْعُوْنِیْنَ ہے (۳۳/۶۱) - دور کئے ہوئے -

ل غ ب

لَغَبَ - لَغْبًا - لُغُوْبًا - بہت زیادہ درماندہ ہونا اور تھک جانا - شدید تکان ہو جانا** - اَلنَّصَبُ - جسمانی تکان کو کہتے ہیں اور اَللُّغُوْبُ ذہنی یا نفسیاتی تکان کو* - سَهْمٌ لَغِیْبٌ - وہ تیر جس کے پر بہت کمزور اور خراب ہوں - رَجُلٌ لَغِیْبٌ - کمزور اور بیوقوف آدمی** -

قرآن کریم میں اہل جنت کا قول ہے کہ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ (۳۵/۳۵) - اس میں نہ جسمانی مشقت ہوگی نہ ذہنی

*تاج - **راغب -

اور نفسیاتی تکان - غور کیجئے کہ انسانی زندگی کے اگلے مراحل جن کی طرف قرآن کریم لے جاتا ھے ، زندگی کی موجودہ سطح سے کسقدر بلند اور لطیف ھیں - طبیعی (Physical) اضمحلال بھی نہیں اور ذھنی (Mental) یا نفسیاتی (Psychological) تکان (Exhaustion) بھی نہیں- جب ''زندگی کے اگلے مراحل'' سے مراد مرنے کے بعد کی زندگی ھوگی ، تو اس میں یہ کیفیت کسطرح پیدا ھوگی اسکا ھم ، اپنے شعور کی موجودہ سطح پر رھتے ھوئے ، اندازہ نہیں کر سکتے لیکن یہ ظاھر ھے کہ اس میں حیات (Life) کی توانائیاں بھر پور ھونگی -

ل غ و

اَللُّغَۃُ - آوازیں جن سے ھر قوم اپنے مطالب کی تعبیر کرتی ھے - بولی - لَغَوْتُ لَغْوًا - میں نے بات کی- بعض کا خیال ھے کہ اَللَّغْوُ کے معنی پھینکنے اور ڈالنے کے ھیں - کلام کو اس لئے لَغْوٌ کہتے ھیں کہ اسے پھینکا جاتا ھے* - صاحب محیط کا خیال ھے کہ کوئی بعید نہیں کہ اَللُّغَۃُ یونانی لفظ لُوْغُوْس (Logos) سے ماخوذ ھو جس کے معنی کَلِمَۃٌ کے ھیں** - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی دو ھیں - (۱) ناقابل اعتناء چیز اور (۲) کسی چیز سے شیفتگی - یعنی ھر وقت اسی کی باتیں کرتے رھنا - چنانچہ پہلے مفہوم کی جہت سے اَللَّغْوُ اونٹ کے ان بچوں کو کہتے ھیں جو خون بہا میں ناقابل اعتناء ھوں - اور دوسرے مفہوم کے اعتبار سے اَللُّغَۃُ بولی کو کہتے ھیں اس لئے کہ ھر ایک اپنی بولی پسند کرتا اور اسے بولتا رھتا ھے -

اَللَّغَا اور اَللَّغْوُ - پرندے کی آواز کو کہتے ھیں - اَلطَّیْرُ تَلْغُو بِاَصْوَاتِھَا - پرندے اپنی آوازوں سے شور مچاتے ھیں - اس اعتبار سے بےمعنی باتیں جو کسی گنتی میں شمار بھی نہ ھوں ، لَغْوٌ کہلاتی ھیں - یا وہ باتیں جو زبان سے یونہی بلا ارادہ نکل جائیں* - راغب نے کہا ھے کہ لَغْوٌ وہ باتیں ھیں جو سوچ سمجھکر نہ کی جائیں - اس لئے وہ (بغیر ارادہ کے) کسی قطار و شمار میں نہ ھوں - خلیل نے کہا ھے کہ لَغْوٌ اس بات کو کہتے ھیں جو یونہی منہ سے نکل جائے* -

کَلِمَۃٌ لَاغِیَۃٌ بیہودہ بات کو کہتے ھیں - لَغَا فِیْ قَوْلِہٖ کے معنی ھیں وہ اپنی بات میں غلطی کر گیا - اَلْغَاہُ - اسے نامراد کر دیا - ناکام بنا دیا - بیکار کر دیا - اَللَّغِیُّ - گری پڑی چیز* -

*تاج - **محیط -

سورۃ بقرہ میں ہے لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (۲/۲۲۵) ۔ اللہ تمہاری لغو قسموں پر مؤاخذہ نہیں کرتا ۔ ان پر مؤاخذہ کرتا ہے جو تمہارے دل کا فعل ہوں ۔ یہاں سے لَغْوٌ کے معنی واضح ہیں ۔ یعنی وہ باتیں جو یونہی بلاارادہ منہ سے نکل جائیں ۔ دوسری جگہ لَغْوٌ کے بعد ہے وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ (۵/۸۹) ۔ جو تم پختہ معاہدہ کرو ۔ جو تم دل سے عہد کرو ۔ جو بات سوچ سمجھ کر دل کے ارادہ سے کرو ۔ اس سے بھی لَغْوٌ کے معنی واضح ہیں ۔

جنت کی ''شراب'' کے متعلق کہا ہے ۔ لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ (۵۲/۲۳) ۔ اس سے انسان نہ تو بے معنی بکواس کریگا اور نہ ہی اس سے اضمحلال پیدا ہوگا (نیز ۵۶/۲۵) ۔ دوسری جگہ جنت کے متعلق ہے ۔ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا (۱۹/۶۲) ۔ یعنی اس میں ہر بات ایسی ہوگی جس سے سلامتی پیدا ہو ۔ وہاں کوئی بات لَغْوٌ نہیں ہوگی ۔ یہاں لَغْوٌ بمقابلہ سَلٰمٌ آیا ہے ۔ سورۃ غاشیہ میں لَغْوٌ کی جگہ لَاغِيَةٌ آیا ہے (۸۸/۱۱) ۔ مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵/۷۲) ۔ اگر انہیں کبھی لَغْوٌ کے پاس سے گذرنا پڑ جاتا ہے تو وہ نہایت متانت سے اپنی عزت کو بچاتے ہوئے وہاں سے گذر جاتے ہیں ۔ یہاں لَغْوٌ سے مراد ہر بیہودہ اور بے معنی بات کے ہیں ۔

ان مقامات سے لَغْوٌ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ بیہودہ باتیں ۔ ایسی باتیں جو شریف انسانوں کے شایانِ شان نہ ہوں ۔ بے معنی باتیں ۔ ایسی باتیں جن میں آواز ہی آواز ہو ، مطلب کچھ نہ ہو ۔ ایسی گفتگو جو بے سوچے سمجھے کی جائے ۔ ایسے کام جن کا کوئی وزن اور شمار نہ ہو ۔ جماعتِ مومنین کے جنتی معاشرہ میں اس قسم کی باتوں کا کوئی دخل نہیں ہوگا ۔

قرآن کریم میں ایک جگہ کفار کے متعلق ہے کہ وہ اپنے ہم مشربوں کو تلقین کیا کرتے تھے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ ۔ اس قرآن کریم کو مت مانو ۔ وَالْغَوْا فِيْهِ ۔ جہاں قرآن کریم کی آواز بلند ہو تم شور مچا دو ۔ بے معنی باتیں کرنے لگ جاؤ ۔ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶) ۔ شاید اس طرح تم قرآن والوں پر غالب آ جاؤ ۔ حیرت ہے کہ جو مسلک کفار کا تھا مسلمانوں کو بھی آج کل اس کی تلقین کی جاتی ہے ۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ جہاں سے تمہیں یہ آواز سنائی دے کہ قرآن کریم کی طرف آؤ ، تم اس کی بات

مت سنو ، بلکہ شور مچا دو کہ کوئی اور بھی یہ آواز نہ سننے پائے ۔ یہ طریقہ ہے جس سے تم ان لوگوں پر غالب آجاؤ گے ۔ اس لئے کہ اگر لوگوں نے قرآن کریم کی آواز سن لی تو وہ پھر تمہارے خود ساختہ مذہب سے کبھی مطمئن نہیں ہوسکیں گے ۔

لہذا ہر وہ بات ، وہ عمل ، وہ تصور ، وہ نظریہ ، وہ عقیدہ جو انسان کو قرآن کریم سے دور رکھے لَغْوٌ ہے ۔ یہی وہ لغویات ہیں جن میں ہم صدیوں سے الجھے چلے آ رہے ہیں ۔ جب تک ہم اپنے دل و دماغ کو ان لغویات سے پاک اور صاف نہیں کرلیں گے ، دینِ خالص تک کبھی نہیں پہنچ سکینگے ۔

ل ف ت

لَفَتَہٗ یَلْفِتُہٗ ۔ کسی کو اس کی سمت سے موڑ دینا ۔ جس رخ پر وہ ہو اس سے پھیر دینا ۔ لوٹا دینا ۔ واپس کر دینا ۔ لَفَتَہٗ عَنِ الشَّیْءِ ۔ اسے کسی چیز سے ہٹا دیا ، پھیر دیا * ۔ قرآن کریم میں ہے اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا (۱۰/۷۸) ۔ کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اپنے اسلاف کے راستے سے موڑ کر کسی اور طرف لے جائے ۔ اِلْتِفَاتٌ اسی سے ہے جسکے معنے ہیں رخ موڑنا * ۔ لِفْتُہٗ مَعَہٗ ۔ اس کا میلان اسکی طرف ہے ** ۔ اَللَّفُوْتُ وہ عورت جسکے ساتھ پہلے شوہر کا بچہ ہو اور اسکی طرف توجہ کرنے کی وجہ سے وہ دوسرے شوہر کی طرف توجہ نہ کرسکے ۔ نیز اُس اونٹنی کو کہتے ہیں جو دودھ دوہنے والے کی طرف باربار مڑ کر دیکھے ، اسے کاٹے اور چلائے اور بمشکل دودھ دوہائے ، کیونکہ اس کا بچہ مرچکا ہے* ۔ سورۂ ہود میں اصحابِ حضرت لوط سے کہا گیا ہے کہ تم ان لوگوں کو چھوڑ کر یہاں سے نکل جاؤ ۔ وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْکُمْ اَحَدٌ (۱۱/۸۱) ۔ اور پھر تم میں سے کوئی ادھر منہ موڑ کر بھی نہ دیکھے ۔ ان چیزوں کو ایسا چھوڑ دو کہ پھر ان کی طرف تمہارا خیال بھی نہ آئے ۔ تمہاری یہ حالت ہو کہ ۔ از گوشۂ بامے کہ پریدیم ، پریدیم ۔

ل ف ح

لَفْحٌ ۔ سخت گرم ہوا کی لپٹ ۔ لسان میں ہے کہ لَفْحٌ ہر گرم چیز کو کہتے ہیں اور نَفْحٌ ہر ٹھنڈی چیز کو ۔ محیط میں اصمعی کے حوالہ سے ہے کہ جس ہوا کو لَفْحٌ کہا جائے وہ گرم ہوگی اور جسے لَفْحٌ کہا

*تاج ۔ **محیط ۔

جائے وہ ٹھنڈی ہوگی ۔ لَفَحَتْهُ النَّارُ بِحَرِّهَا ۔ آگ نے اپنی گرمی سے اسے جھلسا دیا *۔ سورۂ مومنون میں ہے ۔ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۔ (۲۳/۱۰۴) ۔ آگ ان کے چہروں کو جھلس دیگی ۔

ل ف ظ

لَفَظَهُ ۔ يَلْفِظُهُ مِنْ فِيْهِ ۔ اس نے اسے اپنے منہ سے نکال کر پھینکدیا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو ڈالدینے اور پھینکدینے کے ہوتے ہیں ۔

اَللَّافِظَةُ ۔ سمندر (کیونکہ جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے وہ اسے کناروں پر پھینک دیتا ہے) ۔ چوگا دینے والے پرندے، کہ وہ جو کچھ منہ میں لاتے ہیں اپنے بچوں کو دیدیتے ہیں ۔ چکّی (کیونکہ جو کچھ دانہ وغیرہ اس میں ڈالا جاتا ہے وہ آٹا بنا کر اسے باہر پھینک دیتی ہے) ۔ نیز وہ بکری جو چارہ کھا رہی ہو اور دودھ دوہنے والا آجائے تو جو گھاس اس کے منہ میں ہو وہ اسے بھی چھوڑ دے اور دودھ دینے کے لئے تیار ہوجائے۔ اَللُّفَاظَةُ ۔ جو کچھ منہ سے پھینکا جائے ** ۔ لَفْظٌ ۔ منہ سے نکلی ہوئی آواز چونکہ اس میں آواز کا ہونا ضروری ہے اس لئے لَفْظُ اللهِ نہیں کہتے بلکہ كَلِمَةُ اللهِ کہتے ہیں *** ۔

قرآن کریم میں ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ (۵۰/۱۸) ۔ وہ کوئی بات بھی نہیں بولتا ہے ۔

ل ف ف

اللَّفُّ ۔ لپیٹنا ۔ (نَشْرٌ کی ضد ہے) ۔ لَفَّ الشَّيْءَ بِالشَّيْءِ ۔ اس نے اس چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دیا ۔ اَللَّفِيْفُ ۔ جماعت ۔ جماعت ۔ گروہ ۔ مجتمع لوگ ۔ اَللَّفِيْفُ ۔ ملے جلے اکھٹے لوگ ۔ مختلف قبائل کے ایک جگہ جمع ہونے والے لوگ ۔ اَللِّفَافَةُ ۔ پٹی وغیرہ جو لپیٹی جائے ۔ اَلْاَلْفَافُ ۔ گتھے ہوئے درخت ۔ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۔ گھنے، گنجان، بکثرت درختوں والے باغیچے ۔ (۷۸/۱۶) ۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے ۔ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا (۱۷/۱۰۴) ۔ ہم تمہیں چاروں طرف سے اکٹھا کر کے لائینگے ۔ اِلْتَفَّ ۔ ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ لپٹ جانا ۔ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (۷۵/۲۹) شدت پر شدت جمع ہوتی گئی ۔ مشکلات اکٹھی ہوتی چلی گئیں ۔ ساق پنڈلی کو بھی کہتے ہیں ۔****

*تاج و راغب و محیط ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔ ****تاج و راغب ۔

ل ف ی

اَلْفَاهُ کَاَذْبًا ۔ اس نے اسے جھوٹا پایا ۔ وَاَلْفَیَا سَیِّدَ ھَا لَدَی الْبَابِ (۱۲/۲۵) ۔ ان دونوں نے اس کے شوہر کو دروازہ کے قریب پایا * ۔

سورۃ بقرہ میں ہے ۔ مَا اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَاءَنَا (۲/۱۷۰) ۔ جس مسلک پر ہم نے اپنے آبا و اجداد کو پایا ہے ۔

تَلاَفَی التَّقْصِیْرَ ۔ اس نے تقصیر کی تلافی کر دی ۔ اَلتَّلاَفِی ۔ بدلہ لے لینا * ۔ تلافی کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جو چیز ہاتھ سے نکل گئی تھی اسے دوبارہ پا لیا گیا ہے ۔ تلافیِ مافات ۔ جو کچھ ہاتھ سے چلا گیا تھا اسے دوبارہ پا لینا ۔ اَللَّفَاءُ ۔ مٹی اور ہر گری پڑی گھٹیا چیز کو کہتے ہیں* ۔ یعنی جو چیز یونہی پا لی جائے ۔

ل ق ب

اَللَّقَبُ ۔ وہ نام جو کسی کا اصلی نہ ہو بلکہ بعد میں پڑ جائے ۔ جمع اَلْقَابٌ * ۔ اس نام میں معنی کی رعایت ہوتی ہے ، بخلاف اَعْلاَمٌ کے جس میں معنی کی رعایت نہیں ہوتی** ۔ لَقَبٌ تین طرح کے ہوتے ہیں ۔ لقب تشریف ۔ لقب تعریف ۔ اور لقب تسخیف ۔ تیسری قسم سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس میں ذلت کا پہلو ہوتا ہے *** ۔ قرآن کریم میں ہے وَلاَ تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (۴۹/۱۱) ۔ ایک دوسرے کے برے نام نہ رکھا کرو ۔ (دیکھئے عنوان ن ۔ ب ۔ ز)

ل ق ح

لِقَاحٌ ۔ گھوڑے یا اُونٹ کے مادہٗ منویہ کو کہتے ہیں ۔ اَللَّقَحُ ۔ حمل ۔ لاَقِحٌ ۔ حاملہ ۔ (جمع لَوَاقِحُ) ۔ لَقِحَتِ النَّاقَۃُ ۔ اونٹنی حاملہ ہوئی ۔ اَلْقَحَتِ الرِّیَاحُ الشَّجَرَ وَالسَّحَابَ ۔ ہواؤں نے درختوں اور بادلوں کو بار آور بنا دیا**** ۔ (درختوں کو اسطرح کہ ہوائیں نر درختوں کا زیرہ ، مادہ درختوں پر لا کر ڈال دیتی ہیں جس سے ان میں پھول آ جاتے ہیں اور پھل پیدا ہوتے ہیں ۔ اور بادلوں کو اس طرح کہ ہوائیں سمندر سے پانی اٹھا کر بادلوں کو بار آور کر دیتی ہیں ۔ یہ ابن فارس کی تشریح ہے) ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے ۔ وَ اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ (۱۵/۲۲) ۔ ہم بار آو

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔ ****تاج و راغب ۔

ہواؤں کو بھیجتے ہیں ۔ اس کے مقابلہ میں آندھی اور جھکڑ کی ہوا کو اَلرِّیْحَ الْعَقِیْمَ (۵۱/۴۱) کہا گیا ہے ۔ بانجھ ہوا ۔

ل ق ط

لَقَطَ ۔ یَلْقُطُ ۔ لَقْطًا ۔ کسی (گری پڑی) چیز کو زمین سے بلا محنت و مشقت اٹھا لینا ۔ اَللُّقْطَةُ ۔ وہ پڑی ہوئی چیز جو کسی کو ملے اور وہ اسے اٹھالے ۔ نیز پھینکا ہوا نوزائیدہ بچہ ۔ اسے اَللَّقِیْطُ بھی کہتے ہیں * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں اس چیز کو زمین سے اٹھا لینا جسے اچانک دیکھا ہو اور اسے لینے کا پہلے سے کوئی ارادہ نہ ہو ۔ اگرچہ بعض اوقات یہ مقصد اور ارادے کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے ۔

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت یوسف[ؑ] کے بھائیوں نے کہا کہ اسے اندھے کنوئیں میں ڈالدو ۔ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ (۱۲/۱۰) ۔ کوئی قافلہ اسے پڑی ہوئی چیز دیکھ کر اٹھا کر لئے جائیگا ۔ اسی طرح حضرت موسیٰ[ؑ] کے متعلق ہے کہ جب ان کی والدہ نے انہیں دریا میں بہا دیا ۔ فَالْتَقَطَهٗ اٰلُ فِرْعَوْنَ (۲۸/۸) ۔ فرعون کے لوگوں نے اسے اٹھا لیا ۔

ل ق ف

لَقِفَ ۔ یَلْقَفُ ۔ کسی چیز کو جلدی سے لے لینا ۔ جو چیز تمہاری طرف پھینکی جائے اسے تیزی سے (ہاتھ سے یا منہ سے) اُچک لینا ۔ راغب نے اسکے معنی کسی چیز کو مہارت اور ہوشیاری سے لے لینا لکھے ہیں ۔ اَلتَّلَقُّفُ ۔ اَلتَّلْقَافُ ۔ کھانے کو نگل لینا ۔ اَلتَّلْقِیْفُ ۔ گھوڑے یا اونٹ کا تیزی سے دوڑنے میں اگلی ٹانگوں کو تیزی سے چلانا اور پیٹ کی طرف پوری طرح نہ جانے دینا** ۔ تَلَقَّفَ الشَّیْءَ ۔ کسی چیز کو تیزی اور پھرتی سے لینا** ۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ[ؑ] کے "عصا" کے متعلق ہے ۔ فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ (۷/۱۱۷) وہ فریق مقابل کے باطل (دلائل) کو ہولہی نگل گیا ۔ وہ دلیلیں اس کے سامنے نہ ٹھہر سکیں ۔ اسنے انہیں ہاتھ بڑھا کر اُچک لیا ۔ ساحرین نے جو کچھ جھوٹ موٹ بنا رکھا تھا (ڈھونگ رچا رکھا تھا) اس نے اسے تیزی سے اُچک لیا ۔ ساحرین کے جھوٹ موٹ کے "سانپوں" کو موسیٰ[ؑ] کا "اژدھا" جھٹ سے نگل گیا ۔

* تاج و محیط ۔ **تاج و راغب ۔ ***محیط ۔

ل ق م

اَللَّقْمُ - جلدی اور تیزی سے کھانا - لَقِمَہٗ - اسے اپنے منہ سے کھینچا اور جھٹ سے کھا لیا - اِلْتَقَمَہٗ - اس نے اسے نگل لیا ، مہلت کے ساتھ * - یعنی پہلے منہ میں رکھا اور پھر نگلا - اس اعتبار سے لَقِمَ اور اِلْتَقَمَ - منہ میں لینے کو کہتے ہیں *** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہاتھ کے ذریعے منہ تک کھانا لے جانے کے ہیں - قرآن کریم میں قصہ حضرت یونس ؑ میں ہے - فَالْتَقَمَہُ الْحُوْتُ (۱۴۲/۳۷) - بڑی مچھلی نے اسے لقمہ بنایا - منہ میں لے لیا - لَقَمَ الطَّرِیْقَ - اس نے راستہ کا منہ بند کر دیا * - اَلْقَمَہٗ الْحَجَرَ - جھگڑے وقت حریف مقابل کو لاجواب اور خاموش کر دیا ** -

لقمان

قرآن کریم نے علم و حکمت کی باتوں کے سلسلہ میں ایک شخصیت کا ذکر کیا ہے جس کا نام لقمان ہے - (وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ . . . ۱۲/۳۱) قرآن کریم نے انھیں نبی نہیں کہا - نہ ہی ان کا تفصیلی تعارف کرایا ہے - انھوں نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت آمیز باتیں کہی ہیں فقط ان کا ذکر کیا ہے (۱۹-۱۲/۳۱) -

بعض نے کہا ہے کہ آپ حضرت ایوب ؑ کے بھانجے تھے - بعض کہتے ہیں کہ آپ حضرت داؤد ؑ کے زمانہ میں پیدا ہوئے - بعض کا خیال ہے کہ آپ حبشی غلام تھے - مستشرقین میں سے سیل کا خیال ہے کہ یہ یونانی ایساپ (Aesop) ہی ہیں - ڈاکٹر (Spanger) نے کہا ہے کہ یہ ایبونہ کے الکسائی (Elxai) ہی کا دوسرا نام ہے - پروفیسر ہتی (Hitti) بھی اسی خیال کا مؤید ہے - تورات کی کتاب الامثال میں یاقہ کے بیٹے اجور (امثال ۱/۳۰) اور طوایل بادشاہ (۱/۳۱) کی حکمت کی باتیں عرب کے لقمان کی نصائح سے ملتی جلتی ہیں - اس قیاس کے مطابق جناب لقمان کو بنی اسمٰعیل میں سے ہونا چاہئے -

لیکن یہ سب قیاسات ہیں - بعد کی تحقیق کسی فیصلہ کن نتیجہ تک پہنچا سکیگی - ایک بات البتہ بالکل واضح ہے - اگر لقمان ، صاحبِ وحی تھے (جس کا ذکر قرآن کریم نے نہیں کیا) تو حکمۃ کے معنی وحی ہونگے - اور اگر وہ صاحب وحی نہ تھے (جیسا کہ قرآن کریم سے ظاہر ہے) تو حکمۃ

*تاج و راغب - **محیط - ***لسان العرب -

کے معنی یہ ہونگے کہ وہ، وحی کے احکام کے حکیمانہ نتائج کو سمجھنے کی عمدہ صلاحیت رکھتے تھے۔ جب الحکمۃ منزل من اللہ ہو تو وہ وحی ہی کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ اور جب یہ لفظ عام انسانوں کیطرف منسوب ہو تو اس سے عام دانش اطواری مراد ہوتی ہے۔

ل ق ی

لِقَاءٌ۔ امام رازی نے کہا ہے کہ کسی جسم کا دوسرے جسم تک اس طرح پہنچنا کہ وہ آپس میں مس کر جائیں، لِقَاءٌ کہلاتا ہے*۔ لیکن امام راغب کے نزدیک مس کرنا ضروری نہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے ہونا لِقَاءٌ ہے۔ بعض کے نزدیک کسی بات کا حس اور بصر یا بصیرت سے ادراک کرلینا** (Perception)۔ یا کسی بات کا پا لینا بھی لِقَاءٌ ہے۔ تِلْقَاءٌ کے معنی ہیں۔ سامنے*۔ يَوْمُ التَّلَاقِ (۴۰/۱۵) کے معنی ہیں ایک دوسرے کے سامنے آنے کا دن۔ یعنی جب اعمال کے نتائج محسوس طور پر سامنے آجائیں۔

اِلْقَاءٌ کے معنی کسی چیز کو اس طرح ڈال دینا ہیں کہ وہ دوسرے کے سامنے آجائے**۔ جوہری کے نزدیک مطلق کسی چیز کو پھینک دینے کو بھی کہتے ہیں*۔ نیز لِقَاءٌ کا لفظ جنگ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، جب فوجوں کی ایک دوسرے سے مٹھ بھیڑ ہو جاتی ہے***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تین ہیں (۱) دو چیزوں کا ملنا۔ آمنے سامنے ہونا۔ (۲) کسی چیز کو ڈال دینا۔ اور (۳) ٹیڑھا پن، جس سے اَللَّقْوَةُ ہے۔ (لیکن موخرالذکر واوی ہے)۔

قرآن کریم میں ہے اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۲/۱۴)۔ جب وہ مومنین کے سامنے آتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (۲/۳۷) اس میں تَلَقّٰى کے معنی قوانین خداوندی کے حصول (پالینے) کے ہیں۔ زمین کے متعلق جہاں ہے وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ (۱۵/۱۹)۔ وہاں اِلْقَاءٌ کے معنی ڈال دینا یا بنا دینا ہیں۔ ڈال دینے کے معنوں میں یہ لفظ (۳۴/۲) میں استعمال ہوا ہے۔ سورۂ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ہرکارے کو اپنا خط دیا اور کہا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ (۲۷/۲۸) "یہ خط ان کے سامنے ڈال دے"۔ یعنی (Deliver) کر دے۔ اس کے بعد ملکۂ سبا کا قول ہے اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ (۲۷/۲۹) "میری طرف ایک باعزت خط بھیجا گیا ہے۔" سورۂ نحل میں۔ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ (۱۶/۸۶) کے معنی ہیں، ان کی طرف بات ڈالنا یعنی کہنا۔

---

*تاج۔ **راغب۔ ***محیط۔

سورۂ کہف میں ہے کہ فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْ لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا (۱۸/۱۱۰) - اس کے معنی ہیں جو شخص یہ چاہتا ہے کہ خدا کا (قانون یا) نظام ربوبیت، محسوس شکل میں اسکے سامنے آجائے تو اسے چاہئیے کہ وہ (قانون خداوندی کے متعین کردہ) صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہے اور اپنی تمام صلاحیتوں کو اس قانون کے مطابق صرف میں لائے اور اس میں کسی اور جذبہ یا مفاد پرستی کی کشش کو شریک نہ ہونے دے - لہذا، لِقَاءِ رَبّ کے معنی ہیں خدا کے نظام ربوبیت کا محسوس شکل میں سامنے آجانا - یا قانون خداوندی کی رو سے انسانی اعمال کے نتائج کا محسوس شکل میں سامنے آجانا - نیز انسان کا ہر وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا کہ وہ اپنے ہر عمل کے لئے خدا کے قانون مکافات کے سامنے جواب دہ ہے - لِقَاءِ رَبّ سے انکار (کفر) کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی زندگی کے عملی پہلوؤں میں قانون خداوندی کا سامنا کرنے سے گریز کی راہیں نکالے - اس کا سامنا کرنے سے کترائے اور قانون مکافات کے سامنے جواب دہی سے انکار کرے - واضح رہے کہ قانون مکافات کی رو سے اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی سامنے آجاتے ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی - اس لئے ان معانی میں لِقَاءِ رَبّ یہاں بھی ہوتا ہے اور مرنے کے بعد بھی - جہاں تک اُس لِقَاءِ رَبّ کا تعلق ہے جس میں خدا کے قانون ربوبیت کو مشہود طور پر دیکھا جاتا ہے، اس کے لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم نظام کائنات پر غور کرو - اس میں ریسرچ کرو - اس کے نظم و نسق کو سمجھو - اس سے یہ قانون اور نظام تمہارے سامنے آجائیگا - (دیکھئے ۱۳/۲) - لیکن ایسا وہی کر سکیگا جو پیش پا افتادہ مفاد ہی کو مقصود زندگی نہ سمجھ لے (۱۰/۷-۸) - ایسے لوگ خدا کے عطا کردہ سامانِ نشوونما سے محروم رہ جاتے ہیں (۲۹/۲۳) -

قرآن کریم کے مختلف مقامات میں یہ دیکھنا چاہئیے کہ لِقَاءِ رَبّ سے مراد نظام کائنات میں خدا کے قانون ربوبیت کو بے نقاب دیکھنا ہے - یا اس کے قانون مکافات کی رو سے اعمال کے نتائج کو اپنے سامنے دیکھنا (خواہ اس زندگی میں ہو یا اس کے بعد کی زندگی میں) - بعض لوگ ''لِقَاءِ رب'' سے متعلق آیات سے یہ مفہوم لیتے ہیں کہ آخرت میں انسان کو خدا کا دیدار ہوگا - یعنی وہ اور خدا ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونگے - ہم اس ضمن میں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ نہ تو خدا کی ذات مادی ہے اور نہ ہی ہمیں یہ معلوم ہے کہ حیات اُخروی میں انسانی زندگی کی کیفیت کیا ہوگی - اس لئے یہ تصور کرنا کہ اس زندگی میں انسان اور خدا اسطرح آمنے سامنے

ھونگے جسطرح یہاں دو انسان ایک دوسرے کے سامنے ھوتے ھیں ، غلط ھوگا۔ اگر وھاں '' لِقَاءِ رب '' ھوگا تو ھم نہیں کہہ سکتے کہ اسکی کیفیت کیا ھوگی ۔

ھمارے ھاں عام طور پر '' بزرگوں '' کے متعلق کہا جاتا ھے کہ فلاں بات کو خدا نے ان کی طرف '' اِلقا کیا '' ۔ اس سے مراد یہ ھوتی ھے کہ اس بات کا علم انہیں خدا کیطرف سے بذریعہ الہام ھوا ۔ یعنی انہوں نے اپنے علم و عقل سے اسے دریافت نہیں کیا بلکہ یہ علم انہیں براہ راست خدا کیطرف سے عطا ھوا ۔ اسی کو الہام یا کشف کہا جاتا ھے جس کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی ۔ خدا کیطرف سے براہ راست علم صرف وحی کے ذریعے ملتا تھا جس کا سلسلہ نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ھو گیا ۔ اب وہ علم قرآن کریم کے اندر ھے ۔ اب یہ کہنا کہ کسی کو خدا کیطرف سے الہام یا القا ھوتا ھے مہر نبوت کو توڑنا ھے ۔ [تفصیل اس اجمال کی (و ۔ ح ۔ ی) اور (ل ۔ ھ ۔ م) کے عنوانوں میں ملیگی] ۔

واضح رھے کہ یہ جو ھم کہدیا کرتے ھیں کہ میرے دل میں بیٹھے بیٹھے یونہی خیال آیا کہ فلاں کام کرو ، تو اس کا تعلق وحی ، الہام ، القا وغیرہ سے کچھ نہیں ۔ یہ انسان کے نفس لاشعور (Un - Conscious Mind) کا عمل ھوتا ھے جس کے متعلق ھمارے زمانے میں تحقیقات کے نئے باب کھل رھے ھیں ۔ وحی کی نوعیت اس سے یکسر مختلف ھوتی ھے ۔ وہ ایک یقینی علم ھوتا ھے جو خدا کیطرف سے نبی کو براہ راست ملتا تھا ۔

یُلَقّٰی کے معنی توفیق دئے جانے کے بھی آتے ھیں ۔ وَمَا یُلَقّٰھَا اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا (۴۱/۳۵) اس (اھم کام) کی توفیق انہیں ھی ملتی ھے جو قوانین خداوندی کی استقامت سے اطاعت کرتے ھیں ۔ اسے وھی لوگ حاصل کر سکتے ھیں ۔

سورہ یونس میں ھے ۔ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ (۱۰/۱۵) ۔ اس کے معنی ھیں ، اپنی طرف سے ۔

لٰکِنَّ (حرف)

اَلٰکِنْ ۔ لٰکِنَّ ۔ '' مگر یا لیکن '' کے معنوں کے لئے آتا ھے ۔ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ۔ وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی (۷۵/۳۱-۳۲) ۔ تو وہ نہ تصدیق کرتا ھے نہ سیدھے راستے پر چلتا ھے ۔ لیکن جھٹلاتا ھے اور گریز کی

راھیں نکالتا ھے۔ (''لیکن'' کے مقابلہ میں یہاں ''بلکہ'' ترجمہ کیا جائے تو زیادہ موزوں رھیگا لہذا) یہ ''لکن'' اور ''بلکہ'' دونوں معنوں میں آتا ھے۔ سورہ بقرہ کی آیت — بَلْ أَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۲/۱۵۴) میں اس کے معنی ''لیکن'' یا ''مگر'' کے ھیں۔ یعنی وہ زندہ ھیں لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس بات کو سمجھ نہیں سکتے۔

لَمْ (حرف)

لَمْ۔ یہ مضارع پر آتا ھے تو اس کے معنی ماضی منفی کے کر دیتا ھے۔ مثلاً۔ لَمْ يَلِدْ (۱۱۲/۳)۔ اس نے نہیں جنا۔ يَلِدْ۔ مضارع ھے جس کے عام طور پر معنی ''جنتا ھے'' ھونگے۔ لیکن لَمْ سے اس کے معنی ''جنا'' (ماضی) کے بھی ھو گئے اور نفی (نہیں) کے بھی۔ یعنی، نہیں جنا۔

لَمَّا

لَمَّا۔ (۱) ''جب'' کے معنوں میں۔ لَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ (۲۸/۲۳)۔ جب وہ مدین کے پانی (گھاٹ) پر پہنچا۔

(۲) ھنوز ''نہیں'' (اب تک نہیں) کے معنوں میں۔ لَمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ (۳۸/۸)۔ ابھی تک انہوں نے میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا۔

(۳) الاّ (مگر) کے معنوں میں۔ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (۸۶/۴)۔ کوئی متنفس ایسا نہیں مگر اس پر نگران موجود ھے۔ یعنی کوئی متنفس ایسا نہیں کہ جس پر نگران موجود نہ ھو۔ ھر متنفس پر نگران موجود ھے۔

(۴) ''سب کے سب'' کے معنوں میں۔ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ (۱۱/۱۱۱)۔ یقیناً تیرا رب ان سب کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیگا۔

(۵) بعض اوقات زائد بھی ھوتا ھے۔ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۴۳/۳۵)۔ اور یہ سب طبعی زندگی کا سازوسامان ھے۔ یہاں اگر لَمَّا نہ بھی ھو تو بھی یہی معنی ھونگے۔ یہ بھی ھو سکتا ھے کہ یہاں اِنْ نافیہ ھو اور لَمَّا بمعنی اِلاَّ۔ (جیسا کہ نمبر (۳) میں لکھا جاچکا ھے)۔

ل م ح

لَمَحَ اِلَيْهِ کسی کی طرف تیزی سے دیکھنا۔ نیز عجلت کے ساتھ دیکھنا۔ اَللَّمْحَةُ۔ عجلت کے ساتھ دیکھنا۔ اَلْمَحَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ

وَجْهِهَا ۔ عورت نے اپنے محاسن کی جھلک دکھائی پھر انہیں چھپا لیا ۔ ایسا بالعموم حسینہ اپنے عاشق کے ساتھ کرتی ہے* ۔

اَللَّمْحُ ۔ بجلی کے چمکنے کسو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں بھی اظہار و اخفاء کی یہی کیفیت ہوتی ہے** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی کسی چیز کے چمکنے کے ہیں ۔ لَمَحَ الْبَصَرُ ۔ نگاہ کا کسی چیز کی طرف اٹھنا*** ۔ قرآن کریم میں اَمْرُ السَّاعَةِ ۔ (آنے والے انقلاب) کے متعلق ہے ۔ كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ (۱۶/۷۷) ۔ وہ آنکھ جھپکنے کی طرح ہے یا اس سے بھی قریب تر ۔

ل م ز

اَللَّمْزُ ۔ اس کے اصلی معنے آنکھ ، سر یا ھونٹوں سے اشارہ کرتے ہوئے خفیہ بات کرنا ہیں ۔ منہ پر عیب چینی کرنا ۔ بعض نے اس کے معنی غیبت کرنے کے بھی لکھے ہیں ۔ لُمَزَةٌ اُس چغلخور کو کہتے ہیں جو جماعت میں تفریق ڈالے اور دو دوستوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکائے**** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی عیب کے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے مَنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (۹/۵۸) ۔ جو صدقات (کی تقسیم) کے معاملہ میں تیرے خلاف اعتراض کرتے ہیں اور اس طرح جماعت میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ سورہ حجرات میں ہے لَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ (۴۹/۱۱) ۔ آپس میں ایک دوسرے کی عیب چینی نہ کرو ۔ مذاق نہ اڑاؤ ۔ سورہ همزہ میں هُمَزَةٍ لُمَزَةٍ (۱۰۴/۱) آیا ہے ۔ کچوکے لگانے والے ۔ عیب تراشنے والے (تاکہ جماعت میں انتشار پیدا ہو) ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی دوسروں کے عیوب کی تلاش کرنا ہے** ۔

ل م س

لَمَسَ ۔ يَلْمِسُ ۔ ھاتھ سے چھونا ۔ کسی چیز کو ادھر اُدھر تلاش کرنا***** ۔ سورہ جن میں ہے اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ (۷۲/۸) ۔ ہم نے آسمان کو ٹٹولا ۔ (غیب کی خبروں کے لئے قیاس آرائیاں کیں) ۔ اِلْتَمَسَ ۔ کسی شے کو طلب کرنا ۔ تلاش کرنا***** ۔ ابن فارس نے ابن درید کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تو کسی چیز کو ھاتھ سے چھونے کے ہیں لیکن پھر ہر متلاشی اور جستجو کرنے والے کو مُلْتَمِسٌ کہدیتے ہیں ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔ **** تاج و محیط ۔ ***** تاج و راغب ۔

سورہ حدید میں ہے ۔ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا (۵۷/۱۳) ۔ تم روشنی کو تلاش کرو ۔ اَلْمُلَامَسَةُ ۔ ایک دوسرے کو ہاتھ سے چھونا ۔ نیز یہ کنایةً مجامعت کے لئے بولا جاتا ہے*۔ اسی معنی میں قرآن کریم میں اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (۴/۴۳) آیا ہے ۔

ل م م

لَمَّهٗ یَلُمُّهٗ لَمًّا ۔ اس نے اسکو جمع کر دیا ۔ لَمَّ الشَّعَثَ ۔ منتشر معاملات کو سمیٹ کر قریب قریب کر دیا ۔ دَارٌ لَامَّةٌ ۔ ہمارا گھر لوگوں کو جمع کر لینے والا اور ان کی پرورش کرنے والا ہے ۔ رَجُلٌ مِلَمٌّ ۔ قوم اور کنبہ کو جمع کر لینے والا آدمی **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اکٹھا ہونے ، قریب قریب ہونے اور ملا ہوا ہونے کے ہیں ۔

سورہ فجر میں ہے ۔ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (۸۹/۱۹) ۔ تم اس مال کو جو تمہیں میراث میں ملتا ہے ، سمیٹ کر خود ہی کھا جاتے ہو ؟ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنی نظامِ معیشت میں میراث انفرادی چیز نہیں رہتی ۔ قرآن کریم میں وراثت کے متعلق جو احکام ہیں وہ اس عبوری دور سے متعلق ہیں جن میں نظام قرآنی ابھی مکمل طور پر قائم نہ ہوا ہو ۔ اس نظام کی تشکیل کے بعد فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہتی اس لئے ترکہ میں مال اور جائداد چھوڑنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ (تفصیل متعلقہ عنوانات میں دیکھئے)۔ اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم ترکہ سے مختلف وارثوں کا حق نہیں دیتے ۔ سارے کا سارا خود ہی کھا جاتے ہو ۔ اس صورت میں یہ آیت اس دور سے متعلق ہوگی جس میں میراث اور اس کی تقسیم کا ہنوز عمل جاری ہوگا ۔ ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظام بھی بعض حالات میں اس عمل کو جاری رکھے ۔ نیز مال و دولت اور جائداد کے علاوہ عام مستعملہ اشیاء بھی تو ترکہ میں آسکتی ہیں ۔

"قریب ہونے" کے اعتبار سے اَلَمَّ الرَّجُلُ کے معنی ہیں ، آدمی گناہ کے قریب ہوگیا ۔ یعنی اس کا مرتکب تو نہیں ہوا ، البتہ اس نے اسکا ارادہ کر لیا تھا ۔ بعض نے کہا ہے کہ لَمَمٌ کے معنی یہ ہیں کہ انسان کبھی کبھار کوئی غلطی کر بیٹھے لیکن اس پر اصرار نہ کرے ۔ اِلْمَامٌ کے معنی ہیں ، کسی وقت کوئی کام کر لینا لیکن اس پر اصرار نہ کرنا ۔ چنانچہ کہتے ہیں

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔

مَا يَزُوْرُنَا اِلَّا لِمَامًا ۔ وہ ہمارے ہاں بلاپابندی کبھی کبھار آجاتا ہے ۔ کلبی نے کہا ہے کہ لَمَمٌ کے معنی بلا ارادہ غیر محرم کو دیکھ لینے کے ہیں ۔ جوہری نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں بلا ارادہ کسی معصیت کے قریب ہو جانا لیکن اس کا ارتکاب نہ کرنا ۔ '' قریب ہو جانے '' کے اعتبار سے لَمَمٌ کے معنی بوسہ لینے کے بھی آتے ہیں * ۔

قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳/۳۲) ۔ وہ لوگ بڑی بڑی لغزشوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے مجتنب رہتے ہیں ، بجز اُن غلطیوں کے جو انسان سے کبھی کبھار بلا ارادہ سرزد ہو جائیں ۔ ایسی غلطیاں معصیت نہیں ہوتیں لیکن معصیت کے قریب ضرور لے جاتی ہیں ۔ اس لئے ان کی بابت بھی احتیاط برتنی چاہئے کہ بار بار ایسا نہ ہو ۔ غور کیجئے قرآن ، نفسیاتی اصلاح کے لئے کسقدر تدریجی تدابیر اختیار کرتا ہے ۔ ایک دم سختی نہیں کر دیتا ۔

(لَمْ ۔ لَمَّا ۔ حروف ہیں ۔ انہیں انکے عنوانات کے تحت دیکھئے) ۔

لَنْ (حرف)

لَنْ ۔ یہ مضارع پر آتا ہے تو (۱) اسے مستقبل کے معنی دیتا ہے ۔ (۲) نفی (نہیں) کا مفہوم پیدا کرتا ہے اور (۳) اس نفی میں شدت پیدا کرتا ہے ۔ جیسے لَنْ تَفْعَلُوْا (۲/۲۴) تم ہرگز ایسا نہیں کرو گے ۔

ل ہ ب

لَهَبٌ ۔ آگ کا شعلہ ۔ لَهِيْبٌ ۔ اس شعلہ کی حرارت ۔ اَلْهَبَ النَّارَ ۔ اس نے آگ کو بھڑکایا ۔ فَالْتَهَبَتْ ۔ پس وہ بھڑک اٹھی * ۔ نیز دھوئیں کی طرح اوپر اڑنے والے غبار کو بھی لَهَبٌ کہتے ہیں * ۔ راغب نے لَهَبٌ کے معنی دھواں بھی لکھے ہیں ** ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ (۷۷/۳۱) ۔ وہ آگ کے شعلے سے نہیں بچا سکتا ۔ سورہ لہب میں اَبِيْ لَهَبٍ (۱۱۱/۱) آیا ہے ۔ جس کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۱۱۱/۳) میں داخل ہوگا ۔ ابی لہب ، نبی اکرمؐ کے چچا (عبدالعزی بن عبدالمطلب) کی کنیت تھی ، غالباً اسکی شعلہ مزاجی کی وجہ سے ۔ وہ اسلام کا سخت مخالف تھا ۔ وہ بدر کی لڑائی کے کچھ دنوں بعد ایک وبائی مرض میں مر گیا ۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر

*تاج ۔ **راغب

خصوصیت سے کیا ہے، اس لئے کہ وہ ایک خاص ٹائپ کے لوگوں کا ترجمان تھا۔ کعبہ کا متولی، جسے معلوم تھا کہ اسلام کی کامیابی سے اسکی عیش سامانیاں سب چھن جائینگی، کیونکہ اسلام پیشوایت کا سخت دشمن تھا۔ بد دیانت ایسا (جیسا کہ عام طور پر وہ تمام لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کی محنت پر زندگی بسر کریں) کہ کعبہ کے اندر سے سونے کا ایک ہرن (جو وہاں چڑھاوا چڑھا ہوگا) چرا لیا۔ بزدل ایسا (جیسا کہ کام نہ کرنے والا طبقہ ہو جاتا ہے) کہ بدر کی جنگ میں جس میں قریش کے قریب قریب تمام سردار شامل تھے، یہ شریک نہ ہوا اور اپنی طرف سے ایک ایسے شخص کو مرنے کے لئے بھیج دیا جو اس کا مقروض تھا۔ بخیل بے حد تھا۔ چنانچہ جب مرا ہے تو خود اس کے اپنے عزیز اس کی لاش کے قریب تک نہیں آئے اور حبشیوں سے اٹھوا کر اسے دفن کرایا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ رسول اللہؐ کی قرابت داری اس کے کسی کام نہ آسکی۔ کیونکہ اسلام میں قرب کا معیار ایمان ہے، نہ کہ رشتہ داری۔

اس قسم کے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَّتَبَّ ۔ مَآ أَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ (۱۱۱/۱-۲)۔

ل ھ ث

اَللَّهَاثُ ۔ اَللَّهَثُ ۔ پیاس ۔ اَللُّهَاثُ ۔ پیاس کی گرمی کی شدت ۔ پیاس کی وجہ سے زبان باہر نکالنا ۔ ہانپنا ۔ تھک جانا ۔ درماندہ ہو جانا*۔ راغب نے کہا ہے کہ لَهَثَ کے معنی پیاس سے زبان لٹکانے، تھکنے اور پیاس کے ہیں**۔ تاج نے راغب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تھکن سے سانس کا پھولنا لَهَثَ کہلاتا ہے۔

لَهَثَ الْكَلْبُ ۔ کتّے کا زبان باہر نکال کر ہانپنا*** (۷/۱۷۶)

ل ھ م

لَهِمَهٗ يَلْهَمُهٗ ۔ لَهْمًا ۔ کسی چیز کو یکبارگی نگل لینا ۔ رَجُلٌ لَهِيمٌ ۔ بہت کھانے والا آدمی****۔ اَلْهَمَهُ الشَّيْءَ ۔ اس نے اسے کوئی چیز نگلوا دی ۔ اسی سے اِلْهَامٌ ہے*****۔

قرآن کریم میں نفس انسانی کے متعلق ہے ۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۹۱/۸)۔ اس کے عام طور پر یہ معنی کئے جاتے ہیں کہ اللہ نے انسان

*تاج ۔ **راغب ۔ ***ابن قتیبہ (القرطین ۔ ج/۱ صفحہ ۱۸۳) ۔ ****تاج و راغب ۔ *****محیط ۔

کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی ، خیر اور شر ، حق اور باطل کی تمیز کی استعداد رکھدی ہے ۔ یہ معنی بوجوہ غلط ہیں ۔ کائنات میں انسان کے علاوہ ، ہر شے کو بطور جبلت (Instinct) اس راستے کی راہ نمائی عطا کر دی گئی ہے جس پر اسے چلنا ہے ۔ پانی کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے ۔ بکری کی جبلت میں یہ چیز داخل ہے کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت سے پرھیز کرے۔ اگر اسی طرح انسان کے اندر بھی خیر و شر کی تمیز رکھدی جاتی تو ہر انسان ایک ہی راستے پر چلتا ۔ (جسطرح ہر بکری گھاس ہی کھاتی ہے)۔ اور اس میں اس کے اختیار اور ارادے کا کوئی دخل نہ ہوتا ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ صورتِ حال ایسی نہیں ۔ ہر انسان ایک ہی راستہ پر نہیں چلتا ۔ اس سے ظاہر ہے کہ حق اور باطل کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر داخل نہیں کی گئی ۔

کہا جاتا ہے کہ یہ تمیز انسان کی فطرت کے اندر تو ہے لیکن ماحول اور تعلیم کا اثر اس کی فطرت کو مسخ کر دیتا ہے اور انسان وہ کچھ بن جاتا ہے جو کچھ اسے اس کے ماں باپ یا معاشرہ بنا دے۔ اگرانسان پر یہ خارجی اثرات نہ ہوتے تو ہر بچہ حق کے راستے پر از خود چلتا۔ یہ بھی غلط ہے۔ ایسے بچے پائے گئے ہیں جو پیدائش کے ساتھ ہی (کسی حادثے کی وجہ سے) انسانوں کی بستیوں سے الگ ہو کر جنگل میں چلے گئے اور وہاں ان کی پرورش انسانی اثرات سے یکسر دور رہ کر ہوئی ۔ لیکن جب وہ بڑے ہوئے تو بالکل جانور تھے ۔ حق و باطل کی تمیز تو ایک طرف ، ان میں کھانے پینے کے معاملہ میں بھی انسانی بچوں کی سی تمیز نہ تھی ۔ لہذا یہ تصور صحیح نہیں کہ خیرو شر کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر رکھدی گئی ہے ۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے لفظ فِطْرَت" عنوان ف ۔ ط ۔ ر۔ میں)

اس آیت (۹۱/۸) کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اس انداز سے ہوئی ہے کہ اس کے اندر وہ قوتیں بھی رکھدی گئی ہیں جن سے انسانی ذات (Personality) ٹکڑے ٹکڑے (Disintegrate) ہو جاتی ہے ۔ (فُجُوْرَھَا ۔ دیکھئے عنوان ف ۔ ج ۔ ر) اور وہ قوتیں بھی جن کی رو سے یہ اس انتشار (Disintegration) سے محفوظ رہ سکتی ہے ۔(تَقْوٰھَا۔ دیکھئے عنوان و۔ ق ۔ ی)۔ فُجُوْرَھَا اور تَقْوٰھَا کی "ھا" خود، اسکی دلالت کرتی ہے کہ یہ دونوں "نفس" کی کیفیات ہیں ۔ اس لئے اس کے معنی یہی ہیں کہ نفس انسانی (انسانی ذات) میں یہ ہر دو ممکنات رکھ دئے گئے ہیں ۔ اس کے بعد ، یہ انسان

کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ ان ممکنات یا مضمر قوتوں (Latent Faculties) کو نشو نما دیکر انہیں کس راستے میں صرف کرتا ہے ۔ وہ انسے اپنی ذات کی نشو نما کا کام لیتا ہے یا اس کی تخریب اور تدسیہ کا ۔ (قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱/۹-۱۰))۔

باقی رہا یہ تصور کہ فلاں بزرگ کو خدا کیطرف سے الہام ہوتا ہے تو اس کی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی ۔ قرآن کریم کی رو سے ، علم کے سر چشمے دو ہی ہیں ۔ ایک وحی ۔ یعنی خدا کی طرف سے براہ راست علم کا ملنا ۔ یہ حضرات انبیاء کرام ؑ کے ساتھ مخصوص تھا اور ختم نبوت کےساتھ اسکا سلسلہ بھی ختم ہو گیا ۔ دوسرا ، عقلِ انسانی (Human Intellect)۔ اس میں ہر انسان شریک ہوتا ہے ۔ لہذا ، ختم نبوت کے بعد ، اب دو چیزیں ہمارے پاس رہ گئیں ۔ ایک تو وحی کی رو سے ملی ہوئی تعلیم ، جو قرآن کریم کے اندر ہے ۔ اور دوسرے عقل انسانی ۔ اب صحیح راستہ یہ ہے کہ زندگی کے معاملات کا حل قرآن کریم کی روشنی میں انسانی عقل و بصیرت کے رو سے کیا جائے ۔ بنابریں، یہ تصور کہ رسول اللہؐ کے بعد ، کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست کوئی علم عطا ہوتا ہے (جسے کشف یا الہام کہتے ہیں) ایسا عقیدہ ہے جس سے ختم نبوت کی مہر ٹوٹتی ہے ۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اسکی کوئی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی ۔ نہ ہی کشف ، الہام ، وحیِ خفی ، وغیرہ اصطلاحات کا کوئی ذکر رسول اللہؐ کے زمانہ میں ملتا ہے ۔ یہ سب اصطلاحات بعد کی وضع کردہ ہیں اور دوسروں سے مستعار لی ہوئی ۔ (دیکھئے عنوانِ و ۔ ح ۔ ی)۔

انسان اگر اپنی قوت خیال یا قوت ارادی کو ایک خاص طریق سے (Develop) کر لے تو اس سے بعض ایسی باتیں سرزد ہونے لگتی ہیں جو عقلِ عامہ کی رو سے مستبعد ہوتی ہیں۔ لوگ انہیں خوارقِ عادات یاکرامات سمجھنے لگ جاتے ہیں ، اور جس سے ایسی باتیں سرزد ہوں ، اسے صاحب کشف والہام قرار دیتے ہیں، اور ''روحانی قوتوں'' کا مالک ۔ لیکن ان باتوں کو ''روحانیت'' (یا دین) سے کوئی تعلق نہیں ۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ، یہ محض قوتِ ارادی کی نشو و نما (Development) کے کرشمے ہیں جسے ہر انسان (بلا تمیز مذھب و ملت) خاص مشق کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اب مغرب (بالخصوص امریکہ) میں ، اسے بطور فن کے حاصل کرنے کی درسگاہیں قائم ہو رہی ہیں اور اس سے اعصابی بیماریوں کے علاج میں مدد لی جاتی ہے ۔

اسے پھر اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہئیے کہ خدا سے براہ راست علم ، صرف وحی کے ذریعے مل سکتا ھے جو حضرات انبیاء کرام[ؑ] سے مخصوص ھے ۔ اور چونکہ اب نبوت کا دروازہ بند ھو چکا ھے اس لئے اب کسی شخص کو خدا سے براہ راست علم حاصل نہیں ھو سکتا ۔ وحی کو الہام بھی نہیں کہنا چاہئیے ۔ اور نہ ھی یہ عقیدہ رکھنا چاہئیے کہ اب کسی شخص کو خدا بذریعہ الہام براہ راست علم عطا کرتا ھے ۔

ل ھ و

لَهْوٌ اور لَعِبٌ ۔ دونوں ھم معنی الفاظ ھیں (دیکھئیے عنوان ل ۔ ع ۔ ب) لیکن علمائے لغت نے ان میں فرق کیا ھے ۔ وہ کہتے ھیں کہ ان دونوں میں یہ چیز مشترک ھے کہ انسان بے سود اور بے معنی باتوں میں مشغول ھوتا ھے اور جذباتی اور عارضی مسرت کے پیچھے پڑتا ھے ۔ لیکن لَهْوٌ کا لفظ لَعِبٌ سے عام ھے ۔ بعض لوگوں نے کہا ھے کہ لَعِبٌ سے مراد ھے جلدی سے مسرت حاصل کرنا اور اس سے دل کو راحت و آرام پہنچانا اور لَهْوٌ سے مقصود ھے خواھشات اور طرب جو انسان کی توجہ اور فکر کو مصروف کر دیں ۔ اس کے برعکس طرسوسی کا کہنا ھے کہ لَهْوٌ اس لذت کو کہتے ھیں جو ناپائدار ھو یا وہ لذت جو انسان کی توجہ اھم کاموں سے ھٹا کر غیر اھم کاموں کی طرف منعطف کر دے ۔ یا ایسے کاموں کو کہتے ھیں جن کی کوئی صحیح غرض نہ ھو * ۔ راغب نے بھی یہی کہا ھے کہ لَهْوٌ سے مراد ایسے امور ھیں جو انسان کو اھم کاموں سے باز رکھیں ** ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی دو ھیں (۱) کسی چیز کے ذریعہ دوسری چیز سے توجہ کا ھٹ جانا (۲) کسی چیز کو ھاتھ سے چھوڑ دینا ۔

قرآن کریم نے کہا ھے کہ انسان کی زندگی ایک عظیم مقصد لئے ھوئے ھے اس لئے اسے بڑی سنجیدگی سے (Seriously) لینا چاہئیے ۔ لہذا ھر وہ کام جس سے یونہی پیش پا افتادہ مفاد یا ناپائدار مسرت تو حاصل ھو جائے لیکن زندگی کا اصل مقصود نگاھوں سے گم ھو جائے ، لَهْوٌ اور لَعِبٌ میں داخل ھے ۔ اسی لئے قرآن کریم نے اَلْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۔ یعنی فوری عیش اور مفادات عاجلہ کی زندگی (یا محض حیوانی سطح پر طبعی زندگی) کو لَعِبٌ وَلَهْوٌ کہا ھے (۶/۳۲) ۔ واضح رھے کہ قرآن کریم اس دنیا کی زندگی کو بھی بڑی اھمیت دیتا ھے ۔ وہ جس بات کو لَهْوٌ وَلَعِبٌ قرار دیتا ھے وہ یہ

*تاج ۔ **راغب ۔

نظریہ ہے کہ انسان زندگی کے بلند مقصد کو چھوڑ کر عارضی طرب انگیزیوں کے پیچھے پڑ جائے۔ یعنی زندگی کو حیوانی سطح پر رکھے۔ اسے بلند انسانی سطح پر نہ لے جائے۔ انہی باتوں کو اس نے لَهْوَ الْحَدِيْثِ (۳۱/۶) کہا ہے۔ لیکن اگر اس آیت میں اَلْحَدِيْث کے معنی قرآن کریم لئے جائیں تو لَهْوَ الْحَدِيْثِ کے معنی ہونگے ایسی باتیں جو انسان کو قرآن کریم سے غافل کر دیں۔

اس زاویہ نگاہ کو جس کی رو سے انسان زندگی کے اہم حقائق کو سنجیدگی سے (Seriously) نہ لے لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ (۲۱/۳) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی سے اَلْهٰى کے معنی ہیں، مصروف رکھنا۔ مشغول کر دینا۔ مقصد کو نگاہوں سے اوجھل کرکے دوسری باتوں میں لگا دینا۔ قرآن کریم میں ہے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۱-۲)۔ "تکاثر" نے زندگی کے اہم مقاصد کو تمہاری نظروں سے اوجھل کرکے تمہیں اور ہی طرف لگا رکھا ہے اور تم اسی روش پر چلے جاتے ہو تاآنکہ تم قبر تک پہنچ جاتے ہو۔ تَكَاثُرٌ کے معنی ہیں ایک دوسرے سے مال و دولت میں بڑھ جانے کی ہوس۔ غور کیجئے، قرآن کریم نے کسطرح دو لفظوں میں انسان کی پوری تگ و تاز اور نوع انسانی کی تاریخ کی داستان کا نقشہ کھینچ کر رکھدیا ہے۔ آپ ان لوگوں کو دیکھئے جن کے پاس اتنا کچھ جمع ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر کے لئے ان کی اور انکی اولاد کی ضروریات زندگی کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھینگے کہ وہ دولت سمیٹنے کے لئے دیوانہ وار مارے مارے پھر رہے ہونگے۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ محض دوسروں سے آگے بڑھ جانے کے لئے۔ یہی جذبہ دنیا میں ساری تباہیوں کا موجب ہے۔ افراد کے لئے بھی اور اقوام کے لئے بھی۔ مسابقت (دوسروں سے آگے بڑھ جانے) کا جذبہ انسان کے اندر ہے۔ قرآن کریم بھی اس جذبہ کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے لیکن اس کے لئے میدان دوسرا تجویز کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (۲/۱۴۸)۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنا ہے تو ان کاموں میں بڑھو جن میں نوع انسانی کی وسعتوں اور بھلائیوں کا راز پوشیدہ ہو۔

تَلَهّٰى عَنْهُ۔ کسی سے بے رخی برتنا۔ توجہ کو اسکی طرف سے ہٹا کر دوسری طرف مبذول کر لینا (۸۰/۱۰)۔ اَللَّهْوُ وَاللَّهْوَةُ۔ وہ عورت جس سے لَهْوٌ اور دلبستگی کا کام لیا جائے۔ پھر لَهْوٌ مجازاً عورت کو کہنے لگے *۔

*تاج۔

چنانچه صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ سورہ انبیاء میں جو ہے لَوْ أَرَدْنَا أَنْ نَتَّخِذَ لَهْوًا (۲۱/۱۷) ۔ تو اس میں لَهْوًا سے مراد عورت ہے *۔ (لیکن یہ تکلف ہے ۔ وہاں بھی لَهْوًا کے معنی بے مقصد و بے حقیقت شے کے ہیں)۔ ابن قتیبہ نے لَهْوٌ کے معنی بیٹا ، عورت اور نکاح کے لکھے ہیں** ۔ راغب نے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے اس سے عورت یا بیٹا مراد لیا ہے انہوں نے اس لفظ کی عمومیت کو بعض چیزوں میں مخصوص کر دیا ہے ۔

(لَهْوٌ کے ساتھ ل ۔ ع ۔ ب کا عنوان بھی دیکھئے تاکہ پوری حقیقت بیک وقت سامنے آجائے)

لَوْ (حرف)

لَوْ ۔ (۱) اِنْ (اگر) کے معنوں میں ۔ فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۲۶/۱۰۲) ۔ سو اگر ہمیں ایک بار لوٹ کر جانے کی مہلت مل جائے تو ہم مومنوں میں سے ہو جائیں ۔ واضح رہے کہ لَوْ بالعموم ایسے امور کے لئے آتا ہے جن کا وقوع میں آنا ممکن نہ ہو ۔ یعنی محض فرضی طور پر ایسا کہا جائے ۔ جیسا کہ اوپر کی آیت میں آیا ہے ۔ یعنی ان کا لوٹ آنا ممکنات میں سے نہیں ۔ اس کا ترجمہ ''بفرض محال'' کیا جائے تو بہتر ہوگا ۔

(۲) ''اگر'' کے ساتھ ۔ ''اے کاش'' (تمنا) کے معنوں میں ۔ مندرجہ بالا مثال میں بھی تمنا پائی جاتی ہے ۔ ''اے کاش اگر کہیں ایسا ہو جائے تو''۔ جیسے لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ (۱۵/۲) ۔

(۳) أَنْ (کہ) کے مفہوم میں ۔ وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا (۲/۱۰۹) ۔ اہل کتاب میں سے اکثر وہ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان لانے کے بعد پھر سے کافر بنا دیں ۔ (اگرچہ یہاں کاش کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے) ۔

(۴) لَوْ کے ساتھ لائے نفی بھی آتا ہے ۔ لَوْلَا أَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ (۳۴/۳۱) اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے ۔

(۵) ''کیوں نہیں'' کے معنوں میں ۔ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ (۶/۸) اسکی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہ اُتارا گیا ۔

*تاج ۔ **القرطین ج/۲ صفحہ ۱۹ ۔

(٦) لَوْلاَ - نہیں کے معنوں میں - فَلَوْلاَ کَانَتْ قَرْيَةٌ . . . . (۱۰/۹۸) - ایسی کوئی بستی نہ ہوئی . . . .

(۷) بعض اوقات - لَوْلاَ کی بجائے لَوْمَا بھی آتا ہے - لَوْمَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلاَئِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۱۵/۷) - اگر تو سچوں میں سے ہے تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتا ؟

ل و ح

اس مادہ کے اہم بنیادی معنی ظاہر ہونے اور چمکنے کے ہیں - آَلاَحَ الْبَرْقُ - بجلی چمکی (ابن فارس) - اَللَّوْحُ - ہر پھیلی ہوئی ، چوڑی لکڑی یا ہڈی - جمع اَلْوَاحٌ*- سورۃ اعراف میں ہے وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَوْعِظَةً (۷/۱۴۵) - ہم نے تمام امور کے اخلاقی اقدار ، موسیٰ ؑ کے لئے تورات میں فرض قرار دے دیئے ، جو تختیوں پر لکھی ہوئی تھی - یا ہم نے انہیں موسیٰ کے لئے تختیوں میں جمع کر دیا تھا - حضرت نوح ؑ کی کشتی کو ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ (۵۴/۱۳) کہا گیا ہے - یعنی جو تختوں اور کیلوں سے بنائی گئی تھی -

قرآن کریم کے متعلق ہے - فِي لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۸۵/۲۲) - اسی کو دوسری جگہ کِتَابٍ مَّكْنُوْنٍ (۵۶/۷۸) کہا گیا ہے - اس سے مراد ہے علم خداوندی جو ہر قسم کے خارجی اثرات سے محفوظ اور فنا اور تغیر سے مصؤن ہے - یہ کتاب (قرآن) علم خداوندی ہی میں محفوظ نہیں بلکہ ہمارے پاس (کتابی شکل میں) بھی محفوظ ہے -

اَللَّوْحُ کے معنی چمکنا نیز دیکھنا بھی ہیں - لاَحَهُ بِبَصَرِهِ لَوْحَةً - اُس نے اُسے دیکھا پھر وہ چیز چھپ گئی ، یعنی اس کی ایک جھلک دیکھی - نیز اس کے معنی پیاس کے بھی ہیں* - لَوَّحَهُ بِالنَّارِ تَلْوِيْحًا - اس کو آگ میں تپایا - یہیں سے لَوَّاحٌ کے معنی ہیں جلا اور جھلسا کر رنگ متغیر کر دینے والا* - قرآن کریم میں دوزخ کی آگ کے متعلق ہے - لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (۷۴/۲۹) - چمڑے کو جھلسا کر اس کا رنگ بدل دینے والی - ابن فارس نے کہا ہے کہ لَوَّحَهُ الْحَرُّ کے معنی ہیں گرمی نے اُسے جلا دیا اور سیاہ کر دیا حتکہ وہ دور سے نظر آنے لگ گیا - لَوَّحَ الرَّجُلُ تَلْوِيْحًا - اُس آدمی نے دور سے اشارہ کیا** - آَلاَحَ الْبَرْقُ - بجلی کوندی - لاَحَ النَّجْمُ

*تاج - **محیط -

ستارہ چمکا*۔ لہذا لَوْحٌ میں روشنی اور چمک کا پہلو بھی ہے ۔ ہر آسمانی کتاب میں روشنی اور چمک ہوتی ہے ۔ قرآن کریم کو (۳/۱۷۵) اور تورات کو (۶/۹۲) میں نور کہا گیا ہے ۔

ل و ذ

اَللَّوْذُ بِالشَّيْءِ ۔ کسی چیز کے پیچھے چھپ جانا اور اس طرح محفوظ ہو جانا ۔ اَللَّوْذُ ۔ پہاڑ کا کنارہ ۔ وادی کا موڑ ۔ اَلْمَلَاذُ ۔ جائے پناہ ۔ قلعہ ۔ اَلْمَلَاوَذَةُ وَ اللِّوَاذُ ۔ ایک دوسرے کی آڑ لینا ، چھپنا اور ایک دوسرے کی آڑ میں آنا ۔ کترانا اور چال چلنا* ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا (۲۴/۶۳) ۔ جو تم میں سے چپکے چپکے کھسک کر نکل جاتے ہیں ۔ لیکن زجاج نے کہا ہے کہ اس کے معنی مخالفت کرنے کے ہیں اور اس پر آیت کے اگلے الفاظ دلالت کرتے ہیں* ۔ لیکن پہلے معنوں میں بھی عدول حکمی کا مفہوم واضح ہے ، کیونکہ چپکے چپکے وہی کھسکتے ہیں جو تعمیلِ حکم نہیں کرنا چاہتے ۔

لوط علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے برادر زادہ ، حضرت لوطؑ ، اول الذکر کے ساتھ ہجرت کر کے فلسطین کیطرف تشریف لے آئے تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی شرف نبوت سے سرفراز فرمایا اور سدوم کی طرف جانے کے لئے حکم دیا ۔ یمن سے بحر احمر (Red Sea) کے کنارے کنارے قدیمی تجارتی قافلوں کی ایک سڑک حجاز اور مدین سے گزر کر عقبہ وغیرہ تک چلی گئی ہے ۔ سدوم کی بستی اسی شاہراہ پر واقع تھی ۔ قیاس ہے کہ یہ علاقہ بحر میت (Dead Sea) کے قریب تھا ۔ زلزلوں کی وجہ سے اس کا بہت سا حصہ سمندر کے نیچے آ گیا ۔ جس قوم کی طرف حضرت لوطؑ نبی بنا کر بھیجے گئے تھے وہ اس علاقہ میں آباد تھی ۔ قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قوم میں آپ سے پہلے اور رسول بھی آچکے تھے اور حضرت لوطؑ ان میں اتنا لمبا عرصہ رہے کہ انہیں ان کا بھائی بند (أَخُوْهُمْ) کہہ کر پکارا گیا (۲۶/۱۶۰) ۔

یہ قوم (لواطت کی) شرمناک فحاشی میں مبتلا تھی (۲۶/۱۶۵) ۔ اس کے علاوہ، وہ "قطع السبیل" ۔ رہزنی اور قزاقی کے جرائم کی بھی مرتکب ہوتی تھی ۔ (۲۹/۲۹)

---

*تاج و راغب ۔

آپ نے انہیں ان اعمال شنیعہ سے رکنے کی تلقین کی لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ اور وہ تباہ ہوگئی۔

قوم سدوم کا علاقہ آتش فشاں پہاڑوں اور گندھک کی کانوں سے پٹا پڑا تھا۔ جب یہ پہاڑ پھٹتے ہیں تو ان کے دھانے سے راکھ اور پتھروں کا مینہ برسنے لگ جاتا ہے جس کی بوچھاڑ دور دور تک جاتی ہے۔ قوم لوطؑ کی تباہی کے وقت بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آتش فشاں پہاڑوں سے اسی قسم کی سنگ باری ہوئی۔ گندھک کی کانوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ پھر ایسے زلزلے آئے جن سے زمین نیچے دھنس گئی اور بحر میت کا پانی اوپر چڑھ آیا۔ قرآن کریم نے ان تفاصیل کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا (۷/۸۴)۔ ''ہم نے ان پر سخت مینہ برسایا''۔ دوسری جگہ ہے اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِنْ سِجِّيلٍ مَنْضُودٍ (۱۱/۸۲)۔ ''ہم نے اس قوم پر آگ میں پکے ہوئے پتھروں کا مینہ برسایا''۔ سورۃ حجر میں ہے فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ (۱۵/۷۳)۔ ''ایک ہولناک آواز نے انہیں آلیا''۔ سورۃ قمر میں ہے اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا (۵۴/۳۴)۔ ''ہم نے ان پر سنگ باری کا طوفان بھیجا''۔

(طبعی حوادث کس طرح خدا کا عذاب بنتے ہیں، اس کے لئے میری کتاب ''جوئے نور'' میں حضرت نوحؑ کا عنوان ملاحظہ کیجئے)۔

ویسے لَاطَ الشَّيْئُ بِقَلْبِي کے معنی ہیں ''وہ چیز میرے دل کے ساتھ چمٹ گئی''*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں۔

ل و م

لَامَ۔ ملامت کرنا۔ کسی کو بہت زیادہ برا بھلا کہنا**۔ قرآن کریم میں ہے۔ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْا اَنْفُسَكُمْ (۱۴/۲۲)۔ تم مجھے ملامت نہ کرو۔ خود اپنے آپ کو ملامت کرو۔

لَوْمَةٌ۔ ملامت۔ لَائِمٌ۔ ملامت کرنے والا۔ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (۵/۵۴)۔ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ لَوَّامٌ۔ وہ جو بہت زیادہ ملامت کرے۔ مَلُوْمٌ۔ ملامت کیا ہوا (۵۱/۵۴)۔ مُلِيْمٌ۔ قابل ملامت (۳۷/۱۴۲)۔ يَتَلَاوَمُوْنَ (۶۸/۳۰)۔ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔

---

*تاج و محیط۔ **تاج۔

لَوْمَۃٌ انتظار کو کہتے ہیں *۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی عتاب اور ملامت اور (۲) دیر کرنے کے لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں اَلنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ آیا ہے (۷۵/۲)۔ اسکے تفصیلی مفہوم کے لئے (ن ۔ ف ۔ س) کا عنوان دیکھئے۔ یہاں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو اسے از خود یہ بتا دے کہ فلاں بات حق اور فلاں باطل ہے۔ اسکی راہ نمائی ہمیں صرف وحی سے مل سکتی ہے۔ (دیکھئے عنوان ل ۔ ھ ۔ م)۔ البتہ انسان کے اندر ایک ایسی قوت ہے کہ جس بات کو وہ غلط سمجھتا ہے اس کے ارتکاب پر وہ اسے ملامت کرتی ہے۔ اسی کو ضمیر یا (Conscience) کہا جاتا ہے۔ لہذا ضمیر کی آواز حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتی۔ وہ اسبات کی تائید کریگی جسے آپ اچھا سمجھتے ہیں اور اس پر ملامت کریگی جسے آپ برا سمجھتے ہیں۔ وہ جینی کے بچے کو گوشت کھانے کے ارادہ پر ملامت کریگی لیکن مسلمان کے بچے کو گوشت کھانے پر آمادہ کریگی۔ اس لئے ضمیر کی آواز حق و باطل کا معیار نہیں قرار پا سکے گی۔ " فتوی " ہمیشہ وحی سے لینا چاہئے، نہ کہ اپنے دل سے۔ ٹھگوں کا دل انہیں کبھی مسافر کشی پر ملامت نہیں کرتا۔ ڈاکو کا دل اسے رہزنی پر کبھی نہیں ٹوکتا۔ عصر حاضر کے مہذب ٹھگوں اور ڈاکوؤں (بالا دست اقوام کے " محب الوطنوں ") کا دل انہیں کبھی اس پر ملامت نہیں کرتا کہ وہ کمزور اقوام کے خون کو اپنی قوم کے محلات کی آرائش کا موجب نہ بنائیں۔ لہذا غلط اور صحیح کا فیصلہ خدا کی وحی کر سکتی ہے، انسان کا دل نہیں۔

ل و ن

اَللَّوْنُ۔ ہر وہ خصوصیت جو کسی چیز کو دوسری چیز سے ممتاز کردے۔ نوع ۔ صنف ۔ قسم *۔ لیکن چونکہ مختلف چیزوں کا سب سے پہلا امتیازی نشان ان کا رنگ ہوتا ہے اسلئے لَوْنٌ کے معنی رنگ کے ہو گئے۔

اِلْوَنَّ۔ رنگدار ہوگیا۔ اَلْمُتَلَوِّنُ۔ وہ جو ایک حالت پر قائم نہ رہے۔ رنگ بدلتا رہے *۔

قرآن کریم نے اختلاف السنہ (زبانوں) اور اَلْوَان (رنگوں) کو صاحبانِ علم و بصیرت کے لئے ادراک حقیقت کی نشانیاں قرار دیا ہے (۳۰/۲۲)۔ اس میں رنگ (اَلْوَانٌ) سے مراد نسلیں (Races) ہیں جن سے متعلق تحقیق،

---

*تاج۔

علم الانسان کا بہت بڑا شعبہ ہے ۔ لیکن اگر اَلْوَانٌ کے معنی عام رنگ (Colours) لئے جائیں تو بھی اس آیت میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے ۔ دورِ حاضر کی تحقیق یہ ہے کہ انسانیت کے ارتقائی مراحل میں اگر یہ دیکھنا ہو کہ فلاں دور میں فلاں قوم کی ذہنی سطح کیا تھی تو اس کے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس دور میں وہ قوم کتنے مختلف رنگوں (Colours) کو پہچانتی تھی ۔ وہ قوم جتنے زیادہ رنگوں سے متعارف ہو ، اتنی ہی بلند اسکی ذہنی سطح ہوگی ۔ یعنی رنگوں کی تمیز کا انسان کی ذہنی نشو و نما سے خاص تعلق ہے ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر (Bucke) کی کتاب (Cosmic Consciousness)

سورہ نحل میں ہے وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ۔ (۱۶/۱۳) اس کے معنی انواع و اقسام کے ہیں ۔

ل و ی

لَوَى الْحَبْلَ يَلْوِيهِ لَيًّا ۔ رسّی کو بٹا اور دوہرا کر دیا ۔ لَوَى بِرَأْسِهِ ۔ اس نے اپنا سر پھیر لیا ۔ یعنی اعراض کیا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو موڑ دینے کے ہیں (۱۳/۵) ۔ لَوَى لِسَانَهُ بِكَذَا ۔ کنایہ ہے جھوٹ بولنے اور اٹکل پچو باتیں بنانے سے** ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے ۔ يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ (۳/۷۷) ۔ اور لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ (۴/۴۶) ۔ اس سے بھی مطلب ہے ۔ یعنی زبان کو توڑ مروڑ کر باتیں کرنا ۔ جھوٹ بولنا ۔ افترا پردازی کرنا ۔

ل ی ت

لَاتَهُ ۔ يَلِيتُهُ عَنْ كَذَا ۔ اسے کسی چیز سے پھیرا ، موڑا ۔ لَاتَهُ وَ أَلَاتَهُ ۔ اسے کم کیا ۔ اس کا پورا حق نہ دیا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَللِّيتُ گردن کے ایک پہلو کو کہتے ہیں ۔ اور اَللَّيْتُ ۔ کم کردینے کو ۔ اور یہ کہ ان دونوں معانی میں کوئی قیاس نہیں چلتا ۔ سورۃ حجرات میں ہے لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا (۴۹/۱۴) ۔ وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی کمی نہیں کریگا ۔ سورۃ طور میں ہے وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ (۵۲/۲۱) ۔ اس کے معنی بھی کمی کرنے کے ہیں ۔ (بعض نے کہا ہے کہ یہ أَلَتَ سے ہے اور لَاتَ اور أَلَتَ کے ایک ہی معنی ہیں ۔ بعض نے اسے وَلَتَ سے کہا ہے ۔ چنانچہ اسے وہاں بھی لکھ دیا گیا ہے) ۔

*تاج ۔ **راغب ۔

لے (مزید) لَوَى رَأْسَهُ کے بھی یہی معنی ہیں لیکن اس میں لَوَى سے زیادہ شدت و مبالغہ پایا جاتا ہے ۔

لَیْتَ (حرف)

لَیْتَ ۔ اے کاش (یہ حرف تمنا ہے) ۔ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا (۱۹/۲۳) ۔ اے کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی ۔ ۔ ۔ ۔

لَیْسَ

لَیْسَ ۔ نہیں کے معنوں میں آتا ہے ۔ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ ۔ ۔ ۔ ۔ (۲/۱۷۷) ۔ یہ کشاد کی راہ نہیں ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔

اس فعل سے صرف ماضی کی شکلیں استعمال ہوتی ہیں ۔ مثلاً لَسْتَ ۔ لَسْتُ ۔ لَیْسُوْا ۔ لَسْتُمْ ۔ لَسْتُنَّ ۔ وغیرہ ۔

ل ی ل

اَللَّیْلُ وَ اللَّیْلَۃُ ۔ رات ، جو غروب آفتاب سے طلوع فجر صادق تک یا طلوع آفتاب تک ہوتی ہے *۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ عبرانی میں رات کو لَیِل کہتے ہیں اور سریانی میں لِلْیَا** ۔ لَیْلٌ کی جمع لَیَالٍ اور اللَّیَالِیْ آتی ہے ۔

سورہ مریم میں حضرت زکریاؑ کے متعلق ہے ۔ لَا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا (۱۹/۱۰) ۔ اس کے معنی تین راتیں نہیں بلکہ تین شب و روز ہیں (متواتر تین دن تک جن میں راتیں بھی شامل ہیں) ۔ اس لئے کہ (۳/۴۰) میں اسے ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ کہا گیا ہے ۔ لیکن ان دونوں آیات کے مضمون میں ذرا سا باریک فرق بھی ہے ۔ (۳/۴۰) میں کہا گیا ہے کہ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَۃَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۔ اور (۱۹/۱۰) میں اِلَّا رَمْزًا نہیں ہے ۔ اس لئے دنوں کے لئے حکم الگ تھا اور راتوں کے لئے الگ ۔

سورہ ابراہیم میں نزول قرآن کریم کا مقصد بتایا گیا ہے لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (۱۴/۱) ۔ تاکہ تو نوع انسانی کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے ۔ یعنی نزولِ قرآن کے وقت نوع انسانی تاریکی میں تھی ، قرآن کریم کی راہ نمائی انہیں روشنی میں لے آئی ۔ اس جہت سے ، اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کو جس میں قرآن کریم دنیا کو ملا ، لَیْلٌ کہہ کر پکارا ہے ۔ یعنی وہ زمانہ جس میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی ۔ روشنی کا

*تاج ۔ **محیط ۔

کہیں نشان تک نہیں تھا ۔ اس دور میں قرآن کریم نازل ہوا جس نے دنیا کو نئی اقدار سے روشناس کرایا ۔ تاریکی میں انسان کے لئے (حقیقی یا محض خیالی) خطرات بھی ہوتے ہیں ۔ روشنی کی وجہ سے یہ خطرات سلامتی میں تبدیل ہو گئے ۔ پھر، اس روشنی کی تکمیل اسطرح سے ہوئی کہ رات کا کوئی حصہ باقی نہ رہا ۔ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷/۵) ۔ ساری دنیا خدا کے نور سے جگمگا اٹھی ۔ اسطرح یہ تاریک دور، قرآن کریم کی روشنی کی وجہ سے نوع انسان کے لئے سلامتی اور برکات کا دور بن گیا (۳/۳۳) ۔

ل ی ن

لَانَ الشَّیْءُ ۔ چیز نرم ہوئی ۔ اَلَنْتُہٗ ۔ میں نے اسے نرم کر دیا *۔ اللِّیْنُ ۔ نرم ۔ قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے لِنْتَ لَھُمْ (۳/۱۵۸) ۔ تو ان کے لئے نرم واقع ہوا ہے ۔ یعنی فظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ نہیں (۳/۱۵۸) ۔ (دیکھئے عنوان ف ۔ ظ ۔ ظ اور غ ۔ ل ۔ ظ) ۔ لیکن یہ لینت ان کے لئے تھی جو حق وصداقت کے سامنے جھک کر حضورؐ کے ساتھ شامل ہو گئے تھے ۔ جو لوگ حق کی مخالفت میں نبردآزما تھے ان کے مقابلہ میں حضورؐ اور آپ کے ساتھی "اشداء" تھے (۴۸/۲۹) ۔

حضرت داودؑ کے متعلق ہے ۔ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ (۳۴/۱۰) ۔ ہم نے اس کے لئے لوہے کو نرم کر دیا ۔ یعنی اسے، لوہا گلا کر یا تپا کر، اسلحہ سازی وغیرہ کی صنعت کا علم دیدیا ۔ سورہ طٰہٰ میں ہے ۔ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (۲۰/۴۴) ۔ تم دونوں اس (فرعون) سے نرمی سے بات کرنا ۔

اَللِّیْنَۃُ ۔ کھجور کا درخت *۔ تاج نے تصریح کی ہے کہ یہ اس کھجور کے درخت کو کہتے ہیں جو دو اعلیٰ قسم کی کھجوروں کے علاوہ ہو (۵۹/۵) ۔ بیشتر اہل لغت نے اسے (ل ۔ و ۔ ن) میں دیا ہے ۔

---

*تاج و محیط۔

م

مَا

مَا ۔ (۱) جو کچھ ۔ (اَلَّذِی) کے معنوں میں ۔ مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ (۱۶/۹۶) ۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ جاتا رہے گا ۔

(۲) مَنْ (جو ۔ جس) کے معنوں میں ۔ وَلَا تَنْکِحُوْا مَا نَکَحَ اٰبَاؤُکُمْ مِنَ النِّسَآءِ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۴/۲۲) ۔ جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے تم نکاح مت کرو ۔

(۳) ''کیا چیز ۔ کونسی چیز ۔ کس چیز'' کے معنوں میں (استفہامیہ) ۔ وَمَا تِلْکَ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۲۰/۱۷) ۔ اور یہ کیا چیز ہے ۔

(۴) شرط کے معنوں میں ۔ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَکُمْ فَاسْتَقِیْمُوْا لَهُمْ (۹/۷) ۔ جب تک وہ تمہارے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں پر قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں پر قائم رہو ۔

(۵) تعجب (کیسے) کے معنوں میں ۔ فَمَا اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ (۲/۱۷۵) ۔ سو ان کا تباہ کن روش پر قائم رہنا کیسا تعجب انگیز ہے ۔ دراصل یہ پورا مرکب اظہار تعجب کے لئے بولا جاتا ہے (اکیلا مَا نہیں بلکہ مَا اَفْعَلَ کے وزن پر) ۔

(۶) ''جہاں تک'' کے معنوں میں ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (۶۴/۱۶) ۔ جہاں تک تمہاری استطاعت میں ہو قانون خداوندی کی نگہداشت کرو ۔

(۷) لَیْسَ (نہیں) کے معنوں میں ۔ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ (۲/۱۶) ۔ سو ان کی تجارت فائدہ مند ثابت نہ ہوئی ۔

(۸) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے ۔ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ (۷/۱۰) ۔ تم میں سے بہت کم شکرگذار ہوتے ہیں ۔ اگرچہ یہاں مَا (اَلَّذِی) کے معنوں میں بھی ہو سکتا ہے ۔

(نوٹ) ۔ کبھی مَا کی جگہ صرف مَ ھی آجاتا ہے ۔ جیسے بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ (۲۷/۳۵) ''قاصد (جواب میں) کس چیز کے ساتھ واپس آتے ہیں'' ۔

(۹) مَاذَا ۔ ''کیا'' (استفہامیہ) کے معنوں میں ۔ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ (۲/۲۱۵) ۔ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا (یا کسقدر) کھلا رکھیں؟ مَا + ذَا ۔ مَا استفہامیہ اور ذَا بمعنی موصول ہے ۔ اور دونوں کا مرکب استفہام کا مفہوم دیتا ہے ۔ یہ وہی ہے جو اوپر (۳) میں گذر چکا ہے ۔ صرف اس کے آگے ذَا بڑھایا گیا ہے ۔

م أ ی

مَاْیٰ فِیْہِ ۔ مبالغہ کیا اور تعمق سے کام لیا ۔ اَلْمِائَۃُ ۔ ایک سو ۔ زمخشری نے کہا ہے کہ یہ مَاَیْتُ الْجِلْدَ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں میں نے کھال کو پھیلایا ۔ اور سو (۱۰۰) بھی ایک بڑی اور وسیع تعداد ہوتی ہے ۔

مِائَۃَ عَامٍ (۲/۲۵۹) ۔ ایک سو سال ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ''سو'' بھی ہیں اور قوم میں فساد ڈالنا بھی ہیں ۔ ہمارا خیال ہے کہ سو (۱۰۰) کو اَلْمِائَۃُ شاید اس لئے کہتے ہوں کہ اس سادگی کے دور میں جس شخص کے پاس سو تک درہم و دینار یا اونٹ وغیرہ ہوتے ہونگے وہ (سرمایہ داروں کی طرح) قوم میں فساد کا موجب بن جاتا ہوگا ۔ ہمارے ہاں بھی کہا کرتے تھے کہ جس کے پاس سو روپے ہوں وہ ایک قتل کے لئے بیباک ہوجاتا ہے ۔

مَأْجُوْج

دیکھئے یَاْجُوْجُ ۔ عنوان (ا ۔ ج ۔ ج) ۔

مَارُوت

اَلْمَرْتُ ۔ وہ لق و دق صحراء جس میں کسی قسم کی سرسبزی نہ ہو ۔ اَلْھَرْتُ وَ الْمَرْتُ ۔ توڑنا* ۔

مَارُوْتُ ۔ یہ عجمی لفظ ہے* (۲/۱۰۲) ۔ (دیکھئے عنوان ہاروت) ۔

م ت ع

مَتَاعٌ ۔ ضرورت کا ساز و سامان ۔ ہر وہ ضرورت کی چیز جس سے فائدہ حاصل کیا جائے (۱۶/۸۰) ۔ اس کے بنیادی معنی ، وہ سامان ہے جو ضروریات

*تاج ۔

سفر کے لئے کافی ہو**۔ اسی لئے اَلْمَتَاعُ اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے تھوڑا فائدہ حاصل کیا جائے لیکن وہ باقی رہنے والی نہ ہو، بلکہ جلد ختم ہو جائے**۔ اَلْمُتْعَۃُ۔ ضروریات سفر۔ مثل ڈول، رسی، مشکیزہ، قلیل توشہ*۔ نیز عورت کو طلاق دینے کے بعد جو نان و نفقہ شوہر سے ملتا ہے اسے بھی مُتْعَۃٌ کہتے ہیں*۔ اور گذر بسر کے قابل روزی کو بھی۔ اَلْمَرْاَۃُ تُمَتِّعُ صَبِیَّھَا کے معنی ہیں وہ عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہے*۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز سے منفعت اور اس سے طویل مدت تک نفع اٹھانے کے ہیں۔ نیز جس فائدہ میں لذت کا پہلو مضمر ہو۔ یا جس میں ارتفاع و ترقی ہو۔ اس میں بہرحال فائدہ اٹھانا قدر مشترک ہے۔

قرآن کریم نے اَرْضٌ (زمین) کو جو مَتَاعٌ کہا ہے ($\frac{۲}{۳۶}$) تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ نوعِ انسانی کے لئے سامان پرورش مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن اس پر قابض نہیں ہو سکتا۔ یہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ($\frac{۴۱}{۱۰}$) ہے۔ یعنی تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں (طور پر کھلی)۔

چونکہ مَتَاعٌ میں پرورش کا پہلو غالب ہے اس لئے اَلْمَاتِعُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیزوں سے بہتر اور طویل تر ہو۔ جسکی نشوونما اچھی ہو چکی ہو۔ عمدہ بٹی ہوئی رسی۔ یا تیز سرخ شراب کو بھی کہتے ہیں**۔ مَتَعَ النَّھَارُ کے معنی ہیں دن چڑھ گیا۔ مَتَعَ الْحَبْلُ۔ رسی مضبوط اور سخت ہو گئی۔ اَلتَّمْتِیْعُ کے معنی ہیں لمبا کرنا۔ عمر دراز کرنا۔ آباد کرنا۔ (اس کے علاوہ اس کے اور معنی بھی لغت میں دئے گئے ہیں) اس سے مَتَاعٌ اسم آسکتا ہے جس کے معنی فائدہ دینا ہیں**۔ اَفَرَءَیْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰھُمْ سِنِیْنَ ($\frac{۲۶}{۲۰۵}$)۔ کیا تو نے اس پر بھی غور کیا کہ اگر ہم برسوں ان کو دنیا سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیں۔

اَلْمَتْعُ۔ خفیہ تدبیر کو بھی کہتے ہیں*۔ اَسْتَمَعَ عَنْہُ کے معنی ہیں وہ اس سے مستغنی ہو گیا*۔

م ت ن

اَلْمَتْنُ۔ سخت بلند اور ہموار زمین۔ مَتُنَ۔ یَمْتُنُ۔ وہ سخت اور مضبوط ہوا۔ اَلتَّمْتِیْنُ۔ خیموں کی رسیاں یا ڈوریاں۔ نیز خیمے نصب کرنے

*تاج۔ **محیط۔

کو بھی کہتے ھیں - اَلْمِیتَانُ - دو ستونوں کے درمیان کا حصہ - اَلْمَتَانَۃُ - شدت اور قوت - سختی اور مضبوطی - سَیْفٌ مَتِیْنٌ - مضبوط پشت والی تلوار - ثَوْبٌ مَتِیْنٌ - مضبوط اور سخت کپڑا * - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنوں میں امتداد پایا جاتا ھے -

قرآنِ کریم میں ھے - اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ (۷/۱۸۳) - میری تدبیر بڑی محکم مضبوط اور شدید ہوا کرتی ھے - کوئی اسے توڑ نہیں سکتا - اسی اعتبار سے خدا کو اَلْمَتِیْنُ کہتے ھیں (۵۱/۵۸) - یعنی وہ جس کے محکم قوانین کے سہارے کائنات کے خیمے ایستادہ ھیں - یعنی خود بھی محکم اور دوسروں کو بھی قوت اور استحکام عطا کرنے والا - بعض نے کہا ھے کہ ذُوالْقُوَّۃِ وہ ھوتا ہے جس کی قوت دوسروں پر بھی اثر انداز ھو - اور مَتِیْنٌ اسے کہتے ھیں جو اپنی ذات میں محکم اور مضبوط ھو * - لیکن ھمارا خیال ھے کہ مَتِیْنٌ میں دونوں باتیں آسکتی ھیں -

متی

مَتٰی - کب - مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ (۳۶/۴۸) - یہ وعدہ کب (پورا) ھوگا؟ (کبھی یہ - جب - کے معنوں میں بھی آتا ھے - اُسوقت یہ شرطیہ ھوتا ھے)

م ث ل

مِثْلٌ - کسی کے مشابہ یا مانند یا برابر - مَثَلٌ کے معنی کسی چیز کی (Description) ھیں جو کسی دوسری چیز کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے بیان کی جائے - مِثَالٌ کے معنی ھیں انداز ، اسلوب ، شکل و صورت - وہ نمونہ جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے - قالب (Pattern) - وہ مقدار جس کے مطابق کوئی چیز ماپی جائے یا قطع کی جائے - نیز (Example) ** - اَمْثَلُ کے معنی افضل کے ھیں - اس کا مؤنث مُثْلٰی ھے - اَلطَّرِیْقَۃُ الْمُثْلٰی - اس طریقہ کو کہتے ھیں جو حق و عدل کے مطابق اور اس سے زیادہ مشابہ ھو - تَمْثِیْلٌ کے معنی تصویر بنانا اور تَمَثُّلٌ کے معنی ھیں کسی کے مانند بن جانا - اِمْتِثَالٌ - کسی کے طریقہ کی پوری پوری پیروی کرنا - مَثَلَ الرَّجُلُ کے معنی ھیں وہ آدمی سیدھا کھڑا ھو گیا * - (نیز زمین سے چپک جانے کے لئے بھی بطور اضداد استعمال ھوتا ھے) * - مُثْلَۃٌ کے معنی ھیں کسی کو قتل کرکے اسکے ھاتھ پیر کاٹنا اور اسکی صورت بگاڑ دینا * - مَثُلَۃٌ (اور مَثْلَۃٌ) جسکی جمع مَثُلَاتٌ ھے *** - عبرتناک سزائیں نیز تاریخ کے وہ واقعات جو شاھراہ زمانہ پر اسطرح کھڑے ھوں کہ ان سے ھر رھرو عبرت حاصل کرے * (۱۳/۶) -

*تاج - **لین و تاج و محیط - ***محیط -

تِمْثَالٌ - تصویر کو کہتے ہیں جسکی جمع تَمَاثِیْلُ ہے - صاحب تاج العروس کے نزدیک قرآن کریم میں تماثیل سے مراد انبیاء کرام[ؑ] کی تصاویر ہیں* - لیکن عیسائیوں کے نزدیک تَمَاثِیْلُ مجسموں (Statues) کو کہتے ہیں - اور تصاویر (Paintings) کو** -

قرآن کریم میں مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا (۲/۱۷) میں مَثَلٌ کے معنی مثال کے ہیں - یعنی مشابه اور مانند - اور (۲/۲۶) میں مِثْلِهَا کے معنی ہیں جو اس جیسا ہو - سورہ رعد میں مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِی وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ (۱۳/۳۵) میں مَثَلٌ کے معنی تمثیلی بیان کے ہیں -

سورة طٰہٰ میں بِطَرِیْقَتِكُمُ الْمُثْلٰی (۲۰/۶۳) کے معنی وہ راستہ ہیں جوحق و عدل اور توازن و تناسب سے زیادہ قریب ہو - اقرب الموارد میں کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مَثُلَ کے معنی فَضَلَ ہے - یعنی بڑھا - زیادہ ہوا اور غالب آیا - اس اعتبار سے اَمْثَلُ کے معنی اَفْضَلُ اور اَغْلَبُ ہو گئے (اس کا مؤنث مُثْلٰی ہے) - لہذا بِطَرِیْقَتِكُمُ الْمُثْلٰی کے معنی ہوئے ایسا مسلک و مشرب جو دیگر مسالک و مشارب پر غالب ہو - ہر غالب قوم اپنے مسلک و مذہب کو افضل اور غالب سمجھتی ہے خواہ وہ کیسا ہی باطل کیوں نہ ہو - اَمْثَلُهُمْ طَرِیْقَةً (۲۰/۱۰۴) کے معنی ہیں وہ شخص جو اعلیٰ درجہ کے طریقہ پر ہو - سورۃ نحل میں ہے کہ جو لوگ مستقبل کی زندگی پر یقین نہیں رکھتے ان کا کرداری ڈھانچہ بہت ہی برا ہے - اس کے لئے مَثَلُ السَّوْءِ (۱۶/۶۰) کے الفاظ آئے ہیں - ان کے برعکس وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی (۱۶/۶۰) - جو عملی ڈھانچہ خدا کے قانون کے مطابق بنتا ہے وہ نہایت بلند ہوتا ہے - اس لئے کہ کائنات کے جس قدر بلند ڈھانچے ہیں سب قانون خداوندی کے قالب میں ڈھلے ہوئے ہیں -

سورۃ انبیاء میں ان بتوں کے لئے تَمَاثِیْلُ کا لفظ آیا ہے (۲۱/۵۲) جن کی پرستش قوم ابراھیم کیا کرتی تھی - اس سے ظاہر ہے کہ تَمَاثِیْلُ کے معنی مجسمے ہیں - اس لئے (۳۴/۱۳) میں جہاں آیا ہے کہ حضرت سلیمان[ؑ] تماثیل بنوایا کرتے تھے تو اس سے مراد مجسمے ہی ہیں - سورۃ مریم میں جہاں ہے فَاَرْسَلْنَا اِلَیْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا (۱۹/۱۷) - تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضرت مریم[ؑ] کی نگاہ میں ایک متوازن انسان کی شکل میں سامنے آیا - اندازہ یہ ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے - یعنی حضرت مریم[ؑ] نے یہ کچھ اپنے خواب میں دیکھا -

---

* تاج - ** لین و تاج و محیط -

سورۃ آل عمران میں ہے - مِثْلَيْهِمْ (۳/۱۲) - یعنی اپنے سے دگنے -

قرآن کریم میں ہے وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِنْ مِثْلِهِ..... (۲/۲۳) - "جو کچھ ہم نے اپنے بندے کی طرف نازل کیا ہے اگر تم اس کی بابت شک میں ہو (کہ یہ منجانب اللہ نہیں ہے) تو تم اس کی مثل ایک سورت (بنا کر) لاؤ" - اس کے بعد خود ہی کہدیا کہ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا.... (۲/۲۴) - لیکن اگر تم ایسا نہ کرو - اور تم ایسا ہرگز ہرگز نہیں کر سکو گے—تو... (اس چیلنج کو دیگر مقامات پر بھی دھرایا گیا ہے - دیکھو ۱۰/۳۸ و ۱۱/۱۳) -

یہ قرآن کریم کا چیلنج ہے جو اس نے اپنے زمانہ نزول کے (عرب) مخاطبین کو بھی دیا اور اس کے بعد ساری دنیا کو دیتا چلا آ رہا ہے ، لیکن تاریخ اس پر شاہد ہے کہ نہ تو اس زمانے کے عربوں نے (جو اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے) اسے قبول کیا اور نہ ہی اس کے بعد آجتک کسی میں اس کی ہمت پڑی ہے کہ اس کی مثل ایک سورت بنا کر دکھائے - یہ چیلنج لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ہے - معنوی حیثیت سے قرآنی حقائق ان بلندیوں پر ہیں جن کا تصور بھی فکر انسانی نہیں کر سکتا - جہاں تک اس کے اسلوب بیان کا تعلق ہے ، اس کی مثل و نظیر تو ایک طرف پروفیسر گب (H. A. R. Gibb) کے بیان کے مطابق اس کا ترجمہ بھی دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہوسکتا***- حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا اسلوب بالکل نرالا ہے - یہ نہ نثر ہے نہ نظم - نہ ہی اس اسلوب کی عربی لٹریچر میں کوئی مثال ملتی ہے (نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد) - اس لئے قرآن اپنے لفظوں اور معنوں ، دونوں کے ساتھ ، خدا کا کلام اور بے مثل و بے نظیر ہے - اس کی مثل کچھ ہو ہی نہیں سکتا -

م ج د

اَلْمَجْدُ - اس کے اصلی معنی کثرت کے ہوتے ہیں* - یہ دراصل مَجَدَتِ الْاِبِلُ سے ماخوذ ہے جو اس وقت بولتے ہیں جب اونٹ کسی وسیع اور نہایت سرسبز چراگاہ میں داخل ہوجائیں جہاں چارہ کثرت سے ہو**- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی صفاتِ محمودہ (مثلاً کرم و شرافت وغیرہ) میں انتہا تک پہنچ جانا ہیں - اس نے مَجَدَتِ الْاِبِلُ کے معنی "اونٹ شکم سیر ہونے کے قریب ہوگیا" دئے ہیں -

---

*محیط - **راغب - ***Modern Trends in Islam. p. 4

اَمْجَدَ نَا فُلَانٌ* کے معنی ہیں ہمیں فلاں آدمی نے مہمانی کے طور پر اتنا دیا جوہمیں کافی ہوگیا اور بچ بھی رہا۔ نیز اَمْجَدَ الْعَطَاءَ۔ اسے بکثرت بخشش دی ۔ اَمْجَدَ الاِبِلَ ۔ اونٹوں کو پیٹ بھر چارہ دیا*۔ عربوں میں چونکہ سخاوت (کسی کو دینا) بہت بڑا شرف تھا اس لئےان کے ہاں اَلْمَجْدُ بلند ترین شرف کو کہتے تھے****۔ اہل لغت نے مجد اور شرف کو ہم معنی لکھا ہے اور دونوں کے متعلق کہا ہے کہ ان میں آبائی شرف بھی شامل ہے ۔ لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے مَجِیْدٌ آیا ہے ۔ شَرِیْفٌ کہیں نہیں آیا ۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ مجد جوہر ذاتی ہے جس میں آبائی شرف کو دخل نہیں ۔

قرآن کریم نے خدا کی صفت مَجِیْدٌ بتائی ہے (۱۵/۸۵ و ۱/۵۰) ۔ یعنی سامان ربوبیت (خواہ وہ طبعی زندگی سے متعلق ہو یا انسانیت کی راہ نمائی کے متعلق) کو نہایت کثرت اور فراوانی سے دینے والا ۔ وسعت اور فراخیاں پیدا کرنے والا ۔ انتہا تک پہنچا دینےوالا ۔ اور اسی بناء پر وہ حَمِیْدٌ ہے ۔ یعنی تعریف اور ستائش کا مالک ۔

م ج س

اَلْمَجُوْسِیَّةُ ۔ ایک قدیم مذہب جسکی تجدید جناب زرتشت نے کی تھی۔ اس مذہب کے ماننے والوں کو مَجُوْسٌ کہتے ہیں ***۔ زرتشت کے بعد جب اس مذہب کی شکل بگڑی تو اس میں خیر و شر کے لئے اہرمن و یزداں کی دو مستقل قوتوں کو تسلیم کیا گیا ۔ قرآن کریم میں اَلْمَجُوْسُ (۱۷/۲۲) کا ذکر یہودیوں ، نصرانیوں اور صابیوں کے ساتھ آیا ہے ۔ قرآن کریم نے ان کا تفصیلی تعارف نہیں کرایا ۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں اس مذہب کے پیرو موجود تھےجس سے عرب اچھی‌طرح واقف‌تھے۔ اب اس سےعام طور پر پارسی مراد لئے جاتے ہیں جو جناب زرتشت کے متبعین ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ لفظ فارسی زبان کا ہے ۔

م ح ص

اَلْمَحْصُ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو اس کے عیوب سے پاک کرنا **۔ مَحَصَ الذَّهَبَ بِالنَّارِ ۔ سونے کو آگ میں گلا کر اس کے کھوٹ کو اس سے الگ کر دیا اور اسطرح سونے کو خالص کر لیا **** ۔

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و محیط ۔ ****محیط ۔

مَحَصَ السِّنَانَ - اس نے نیزے کو جلادی ، چمکایا * - قرآن کریم میں ہے - وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ (۳/۱۵۴) - تاکہ جو کچھ تمہارے دلوں میں کھوٹ ہے اسے نکال دے -

نیز حَبْلٌ مَحِيصٌ - اس رسی کو کہتے ہیں جس کا چبھنے والا رواں استعمال سے صاف ہو گیا ہو اور وہ اسطرح نرم ہو گئی ہو - اور فَرَسٌ مَحْصٌ ومُمَحَّصٌ - مضبوط جسم والا گھوڑا* - اس اعتبار سے مَحْصٌ کے معنی مضبوط اور طاقتور بنانے کے آئیں گے - سورہ آل عمران میں یہ لفظ مَحْقٌ کے مقابل میں آیا ہے (۳/۱۴۰) - مَحْصٌ اور مَحْقٌ دونوں میں کمی کرنے کا مفہوم ہوتا ہے - لیکن مَحْصٌ میں کسی کی کمزوریوں کو کم کرکے اسے محکم بنانا مقصود ہوتا ہے اور مَحْقٌ میں کسی کو مٹا دینا مفہوم ہوتا ہے - (دیکھئے عنوان م - ح - ق)

م ح ق

مَحَقَهُ - اسے مٹا دیا حتکہ اس میں سے کچھ بھی باقی نہ رہا* - اسے بتدریج تھوڑا تھوڑا کم کیا*** - اَلْمَحْقُ - کسی چیز کا تمام کا تمام ضائع ہو جانا حتکہ اس کا کچھ حصہ بھی نظر نہ آئے - مَحَقَ الْحَرُّ الشَّيْءَ - گرمی نے اس چیز کو جلا کر تباہ کر دیا - اِمْتَحَقَ النَّبَاتُ - سخت گرمی کے باعث پودے سوکھ کر جل گئے * - اَلْمَحْقَةُ - ہلاکت* - راغب کے نزدیک اس کے معنی کم ہو جانے کے ہیں** - ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے - چنانچہ اَلْمَحَاقُ (م کی تینوں حرکات کے ساتھ) - قمری مہینوں کی ان آخری راتوں کو کہتے ہیں جن میں چاند نمودار نہیں ہوتا -

سورہ بقرۃ میں ہے يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا (۲/۲۷۶) - خدا کا قانون ربٰو کی بنا پر حاصل شدہ سرمایہ کو کم کر دیتا یا برباد کر دیتا ہے - وہ معاشرہ کبھی ثمر بار نہیں ہو سکتا جس کا معاشی نظام ربٰو پر قائم ہو - یہاں يَمْحَقُ بمقابلہ يُرْبِي آیا ہے جس کے معنی بڑھانے اور زیادہ کرنے کے ہیں - سورہ آل عمران میں يَمْحَقُ بمقابلہ يُمَحِّصُ آیا ہے (۳/۱۴۰) جس کے لئے دیکھئے عنوان (م - ح - ص)

م ح ل

اَلْمَحْلُ - خفیہ تدبیر - مکر - چال - شدت - شدید بھوک - قحط سالی - بارش کا بند ہو جانا اور زمین کا خشک ہو جانا - زَمَانٌ مَاحِلٌ - خشک

*تاج - **راغب - ***محیط -

زمانہ جس میں بارش نہ ہو۔ اَرْضٌ مَحِلٌ ۔ وہ زمین جہاں وقت پر بارش نہ ہوئی ہو اور اس وجہ سے وہاں قحط ہو گیا ہو۔ اَمْحَلَ الْقَوْمُ ۔ وہ قوم قحط سالی میں مبتلا ہو گئی۔ مَاحَلَہٗ مِحَالاً ۔ اس نے اس سے دشمنی کا برتاؤ کیا۔ اس سے زور آزمائی کی تا کہ معلوم ہو جائے کہ دونوں میں سے کون زیادہ طاقتور ہے۔ چنانچہ اَلْمَاحِلُ ۔ جھگڑا کرنے والے حریف کو کہتے ہیں *۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے وَ هُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ (۱۳/۱۳) ۔ اس کے معنی ہیں سختی سے گرفت کرنے والا ۔ سختی سے سزا دینے والا ۔ بڑی قوت کے ساتھ مواخذہ کرنے والا ۔ جس کا قانون مکافات بڑی قوتوں کا مالک ہو اور جو اعمال کے نتائج مرتب کرنے میں بڑی سختی برتتا ہو اور کسی سے رعایت نہ کرتا ہو۔ اس میں سختی کے ساتھ قوت کا پہلو بھی ہوتا ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں مَحِّلْنِي يَافُلَانُ ۔ اے شخص! مجھے قوت پہنچا * ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مِحَالٌ دراصل حَوْلٌ اور حِيْلَةٌ سے مشتق ہے اور اس میں میم زیادہ ہے ۔ (اسکے لئے دیکھئے ح - و - ل) لیکن یہ بہت بعید ہے ۔

م ح ن

مَحْنٌ کے اصلی معنی کوڑے مارنے کے ہوتے ہیں۔ اَلْمِحْنَةُ اسم ہے جس کی جمع مِحَنٌ آتی ہے ۔ یعنی وہ مشقتیں جن سے کسی کی آزمائش کی جائے۔ مَحَنَ الْبِئْرَ مَحْنًا ۔ اس نے کنوئیں کی مٹی وغیرہ نکال کر اسے صاف کر دیا** ۔

مَحَنَ الْاَدِيْمَ ۔ اس نے چمڑے کو نرم کر دیا ۔ اسے چھیل کر صاف کر دیا ۔ اس نے چمڑے کو کھینچکر وسیع کر دیا ۔ مَحَنَ الْفِضَّةَ ۔ اس نے چاندی کو آگ میں تپا کر صاف اور خالص کر دیا ** ۔

قرآن کریم میں ہے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى (۴۹/۳) ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ نے تقویٰ کے لئے پاک اور صاف کر دیا ۔ یا انہیں نرم اور کشادہ کر دیا ۔

اِمْتِحَانٌ کے معنی کسی کے اندرونی حالات معلوم کرنے یا آزمانے کے ہیں ۔ سورہ الممتحنہ میں ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ (۶۰/۱۰) ۔ اے جماعت مومنین!

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔

جب مومن عورتیں تمہارے پاس ھجرت کرکے آئیں تو ان کے اندرونی حالات معلوم کر لیا کرو۔

م ح و

مَحَاهُ یَمْحُوْهُ مَحْواً۔ اس نے اس کے اثر اور نشان کو مٹا دیا اور ختم کر دیا، زائل کر دیا۔ اَلْمَحْوَۃُ۔ بارش جو خشک سالی کے آثار مٹادے۔ مَحَا الصُّبْحُ اللَّیْلَ۔ صبح نے نمودار ھو کر رات کو مٹا دیا۔ اَلْمَحْوُ۔ اس سیاہ نشان کو کہتے ھیں جو چاند کے اندر نظر آتا ھے*۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو لے جانے اور غائب کر دینے کے ھیں۔

قرآن کریم میں مَحْوٌ بمقابلہ اِثْبَاتٌ آیا ھے۔ یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ (۱۳/۳۹)۔ خدا اپنے قانون مشیت کے مطابق (نہ رکھنے کے قابل چیز کو) مٹا دیتا اور رکھنے والی چیز کو قائم رکھتا ھے۔ مٹاتا اسے ھے جو تخریبی نتائج پیدا کرے اور باقی اسے رکھتا ھے جو تعمیری نتائج کی حامل ھو (۴۲/۲۴)۔ یعنی جو نوع انسان کے لئے منفعت بخش ھو (۱۳/۱۷)۔ محو و اثبات کا یہ اٹل قانون، کارگہ فطرت کے ھر گوشے میں کارفرما ھے اور اسی قانون کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے بھی فیصلے ھوتے ھیں۔ یعنی بقائے نافع (۱۳/۱۷)۔ بقا اس کے لئے ھے جو نوع انسان کے لئے نفع رساں ھو۔ تھوڑا سا غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ھو جائے گی کہ ”بقائے نافع“ کا اصول ”بقائے اصلح“ (Survival of the Fittest) کے اس اصول سے بہت بلند ھے جسے ڈارون (اور اس کے متبعین نے) طبیعیاتی قانون ارتقا میں دیکھا تھا۔ انسانی دنیا کے لئے صحیح اصول یہی ھے کہ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) ”زمین میں وھی چیز (وھی نظریہ۔ وھی نظام) ٹھہرتی ھے جو نوع انسانی کے لئے نفع بخش ھو“۔ یعنی وہ نظریہ زندگی اور نظام حیات جو نفع بخش ھو اور اسکی نفع بخشیاں کسی خاص گروہ، پارٹی، قوم، یا ملک تک محدود نہ ھوں، پوری کی پوری انسانی دنیا کو محیط ھوں۔ دنیا کے تمام انسان ان سے متمتع ھوں۔

م خ ر

مَخْرٌ۔ شق کرنا۔ پھاڑنا۔ چیرنا۔ یہی اس کے بنیادی معنی ھیں**۔ مَخَرَتِ السَّفِیْنَۃُ۔ کشتی پانی کو چیرتی ھوئی نکل گئی۔ مَخَرَ السَّابِحُ

*تاج۔ **محیط و ابن فارس۔

تیرنے والے نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی کو چیرا* - قرآن کریم میں ہے وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ (١٦/١٤) - اس میں مَوَاخِرَ مَاخِرَةٌ کی جمع ہے جس کے معنے ہیں سینہ بحر کو چیر کر چلنے والی (کشتیاں) -

م خ ض

مَخَضَ اللَّبَنَ - دودھ (دھی) کو بلویا - اسی سے مَخَضَ الشَّيْئَ مَخْضًا کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو سختی سے ہلانا - اس طرح حرکت دینا جس طرح دھی کو بلوتے وقت حرکت دیتے ہیں - تَمَخَّضَ الْوَلَدُ - بچے نے حاملہ کے پیٹ میں اس طرح حرکت کی جس سے معلوم ہوا کہ اس کی پیدائش کا وقت قریب آ رہا ہے - اَلْمَاخِضُ - وہ حاملہ جس کے وضع حمل کا وقت قریب آگیا ہو- مَخَضَتِ الْمَرْاَةُ - عورت کو درد زہ شروع ہوگیا**- سورۃ مریم میں اَلْمَخَاضُ (١٩/٢٣) انہی معنوں میں آیا ہے - یعنی دردِ زہ -

م د د

مَدٌّ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو لمبائی میں کھینچنا اور کسی چیز کا دوسری سے طول میں ملے ہوئے ہونا - اسی نسبت سے مَدٌّ کے معنی سیلاب کے آتے ہیں کیونکہ اس میں پانی دور تک مسلسل بڑھتا چلا جاتا ہے - بڑھانے اور اضافہ کرنے کو بھی مَدٌّ کہتے ہیں - مَدُّ الْبَحْرِ - سمندر کے چڑھاؤ کو کہتے ہیں - یہ اَلْجَزْرُ (اتار) کی ضد ہے - مَدٌّ کے معنے بچھانے اور پھیلانے کے بھی ہیں - مَدَّ نَظَرَهُ اِلَيْهِ - اس کی طرف جھانک کر دیکھا - نظر اٹھا کر دیکھا - مَدٌّ اور اِمْدَادٌ کے معنی مہلت دینے کے بھی آتے ہیں - مَدِيْدٌ - لمبی پھیلی ہوئی یا کھینچی ہوئی چیز کو کہتے ہیں - مِدَادٌ - روشنائی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ قلم سے برابر آتی رہتی ہے اور بعد میں آنے والی روشنائی پہلی روشنائی سے ملتی رہتی ہے - مَدٌّ کے معنی مدد دینے کے بھی آتے ہیں** -

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ مَدٌّ بیشتر شر کے لئے آتا ہے اور اِمْدَادٌ خیر کے لئے*** - (مثالیں آگے آتی ہیں) -

مَادَّةٌ - ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیز کو بڑھائے**- اہل لغت نے اس کے معنی اَلزِّيَادَةُ الْمُتَّصِلَةُ بھی بتائے ہیں - اس کے معنی ہیں وہ شے جو اسطرح بڑھے کہ اس کے اجزاء باہمدگر ملے رہیں - یہ لفظ (Matter) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے - قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا -

---

*تاج و راغب و محیط - **تاج و محیط - ***راغب -

سورۃ النمل ۔ (۲۷/۵۴) میں یہ مادہ ''بڑھاپے'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ سورۃ حجر میں ہے ۔ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ (۱۵/۸۸) ۔ تو اپنی آنکھوں کو (اس طرف) مت بڑھا ۔ یعنی ان چیزوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے مت دیکھ ۔ روشنائی کے معنوں میں مِدَادٌ (۱۸/۱۰۹) میں آیا ہے ۔ ''پھیلے ہوئے'' کے معنوں میں (۵۶/۳۰) میں ۔ یعنی ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۔ اِمْدَادٌ خیر اور بھلائی کے معنوں میں ۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (۱۷/۲۰) میں آیا ہے ۔ اس لئے کہ یہ امداد ربوبیت اور پروردگاری کے سرچشمہ سے متعلق ہے ۔ آیت کے معنی ہیں ''ہم سب کو مدد دیتے ہیں ۔ آگے بڑھاتے ہیں ۔ ان کو بھی اور اُن کو بھی ۔ یہ تیرے رب کی عطا سے ہوتا ہے'' ۔ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ (۱۷/۶) میں اَمَدَّ بھی خیر اور بھلائی کے لئے آیا ہے ۔ آیت کے معنی ہیں ''اور مال اور اولاد سے تمہیں مدد دی ۔ آگے بڑھایا'' ۔ اس کے برعکس ، سورۃ مریم میں ہے قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا (۱۹/۷۵) ۔ ''کہو کہ جو کوئی گمراہی میں رہے تو رحمٰن اس کے لئے مہلت کا عرصہ لمبا کرتا جائے گا'' ۔ اس میں مَدَّ شر کے لئے آیا ہے ۔ اسی طرح ذرا آگے چل کر ہے سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا (۱۹/۷۹) ۔ یہاں بھی مَدَّ شر کے لئے آیا ہے ۔ یعنی ''ہم اسے لکھتے جائینگے جو وہ کہتا ہے اور اس کے لئے عذاب کو لمبا کھینچتے جائینگے'' ۔

هُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ (۱۳/۳) میں مَدَّ کے معنی پھیلانے اور ہموار کرنے کے ہیں ۔ ''اللہ وہ ہے جس نے زمین کو پھیلایا ہے'' ۔ اور وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ (۲/۱۵) میں اس کے معنی مہلت دینے اور دور تک لے جانے کے ہیں ۔

سورۃ کہف میں مَدَدًا (۱۸/۱۰۹) اضافہ کے معنوں میں آیا ہے ۔

م د ن

مَدَنَ بِالْمَكَانِ ۔ اس نے اس جگہ قیام کیا ۔ اَلْمَدِيْنَةُ (۳۶/۲۰) ۔ بڑا شہر اس کی جمع مَدَائِنُ ہے ۔ یعنی بہت سے شہر (۲۶/۱۱۱) ۔ قلعہ ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دِيْنٌ سے مشتق ہے (دیکھئے عنوان د ۔ ی ۔ ن) ۔ مَدَائِنُ ایران (فارس) کے ایک بڑے شہر کا نام تھا جو بغداد کے قریب تھا ۔ مَدْيَنُ حضرت شعیبؑ کے قریہ کا نام* (۷/۸۵) ۔ تَمَدْيَنَ الرَّجُلُ ۔ آدمی آسودہ

*محیط و راغب و تاج ۔

و خوش حال هوا ۔ تَمَدَّنَ الرَّجُلُ ۔ اس آدمی نے شہر والوں کی عادات اختیار کرلیں ۔ دیہاتی پن چھوڑ کر شہریت و شائستگی اختیار کی ۔ مَدَّنْتُ مَدِيْنَةً ۔ میں نے شہر بنایا** ۔ اسے آباد کیا اور بسایا* ۔

مَدْيَنُ

وہ قوم جس کی طرف حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے (۷/۸۵) ۔ نیز وہ علاقہ جس کی طرف حضرت موسیٰؑ گئے تھے (۲۸/۲۲) ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ''شعیبؑ'' ۔ نیز عنوان ''موسیٰؑ'' ۔

م ر أ

اَلْمَرْءُ ۔ (میم پر تینوں حرکتیں جائز ہیں) نیز اُمْرُؤٌ ۔ انسان یا مرد ۔ اَلْمَرْاَةُ اور اَلاِمْرَاَةُ عورت کو کہتے ہیں ۔ مُرُوْءَةٌ ۔ انسانیت ۔ آدمیت کمالِ مردانگی ۔ مَرِیَٔ الطَّعَامُ مَرَاءَةً ۔ کھانا خوشگوار ہوگیا ۔ هَنِیْئٌ ۔ لذیذ کھانے کو کہتے ہیں ۔ اور مَرِیْءٌ اس کھانے کو جس کا نتیجہ عمدہ ہو* ۔ هَنِیْئًا مَرِیْئًا (۴/۴) ۔

م ر ج

مَرْجٌ ۔ ملانا ۔ خلط ملط کر دینا ۔ مَرَجٌ کے معنے گڈ مڈ ہونے ، مل جانے اور اختلاط کے ہیں (راغب نے یہ معنی اَلْمُرُوْجُ کے دئے ہیں) ۔ اسی سے اَلْمَرَجُ کے معنی اضطراب اور التباس کے ہیں ۔ نیز فتنہ و فساد کے*** ۔ سورۃ قٓ میں ہے کہ یہ لوگ حق کی تکذیب کرتے ہیں فَھُمْ فِیْٓ اَمْرٍ مَّرِیْجٍ (۵۰/۵) ۔ وہ پیچیدہ معاملہ کے اندر ہیں ۔ وہ بڑے الجھاؤ اور پریشانی کی حالت میں ہیں ۔ انہیں التباس ہو رہا ہے ۔ وہ اسی اضطراب میں ہیں جو بے یقینی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے ۔ اَلْمَارِجُ ۔ مختلط چیز ۔ بلند اور تندو تیز شعلہ*** ۔ (لیکن ، جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا ۔ مَرْجٌ کے معنی کھلا چھوڑ دینے کے بھی آتے ہیں ۔ اسی لئے اَلْمَارِجُ ۔ آگ کے آزاد شعلے کو کہینگے جس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ ہو) ۔ سورۃ رحمٰن میں ہے ۔ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۵۵/۱۵) ۔ آگ کے مخلوط یا بھڑکنے والے شعلے سے ۔ لیکن اَلْمَرَجُ وسیع چراگاہ اور کھلی جگہ کو بھی کہتے ہیں جس میں جانور آزادانہ (کھلے طور پر) چرتے پھرتے رہیں*** ۔ (غالباً اس لئے کہ اس طرح کھلے طور

*تاج ۔ **ابن فارس ۔ ***تاج و راغب ۔

پر چرنے پھرنے سے ایک دوسرے کے جانور آپس میں مخلوط ہو جاتے ہیں) ۔ اَمْرَجَہَا ۔ اُس نے جانوروں کو چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا کہ وہ جہاں چاہیں چلیں پھریں ۔ چنانچہ اَلْمَرَجُ اُن اونٹوں کو کہتے ہیں جو بغیر چرواہے کے آزاد چر پھر رہے ہوں ۔ اسی سے اَلْمَرْجُ کے معنی جاری کرنے چلانے اور کھلا چھوڑنے کے بھی ہوتے ہیں * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آنے جانے اور اضطراب کے ہیں ۔

قرآن کریم میں مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ (۲۵/۵۳) ; (۵۵/۱۹) آیا ہے ۔ جس کے معنی ہیں اس نے دو دریا جاری کر رکھے ہیں جو آپس میں ملتے ہوئے بہہ رہے ہیں ۔

م ر ح

اَلْمَرَحُ ۔ اس خوشی اور نشاط کو کہتے ہیں جس میں شدت اور زیادتی سے انسان اپنی حدود سے متجاوز ہو جائے (اور اس میں اوچھے پن یا اترانے کی کیفیت پیدا ہو جائے) ۔ اکڑنے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے اس کے معنے ایسی خوشی بتائے ہیں جس میں فرط طرب سے آدمی آپے سے باہر نکل جائے ۔ فَرَسٌ مِمْرَحٌ ۔ طاقت کی مستی میں اٹھلا کر چلنے والا پر نشاط گھوڑا ۔ قَوْسٌ مَرُوْحٌ ۔ کڑی کمان ** ۔ جو انتہائی تیزی سے تیر پھینکتی ہو ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا (۱۷/۳۷) ۔ زمین میں اکڑ کر نہ چلو ۔ اسکی تفسیر دوسری جگہ ان الفاظ سے کر دی ۔ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ (۴۰/۷۵) ۔ یعنی یہ لوگ بغیر ایسے کام کئے جو تعمیری نتائج مرتب کریں ، یونہی اکڑتے رہتے ہیں ۔ انہی کے متعلق دوسری جگہ ہے ۔ وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (۳/۱۸۷) ۔ چاہتے ہیں کہ ان کاموں کی بنا پر ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے کئے نہیں ۔

م ر د

مَرَدَ ۔ يَمْرُدُ کے معنی ہیں سرکشی کرنا ۔ مَرَدَ عَلَى الشَّيْءِ کے معنی ہیں وہ اس چیز کا عادی ہوگیا ۔ وہ اسے برابر کرتا رہا ۔ تَمَرُّدٌ کے اصلی معنی مشتاق ہو جانے اور عادی ہوجانے کے ہیں *** ۔ چنانچہ قرآن کریم

* تاج و راغب ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔ *** تاج ۔

میں ہے۔ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ (۹/۱۰۱) ۔ وہ منافقت کے عادی ہوچکے ہیں۔ اَلْمَرْدَاءُ ۔ اُس عورت کو کہتے ہیں جس کے سر پر بال نہ ہوں * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے چھلکے یا اوپر کے روئیں اور بالوں کو صاف کر دینا ہوتے ہیں ۔ اس سے اَلْاَمْرَدُ اس نوجوان کو کہتے ہیں جس کی ڈاڑھی نمودار نہ ہوئی ہو ۔ قرآن کریم نے شیطان کو مَرِیْدٌ کہا ہے (۴/۱۱۷)۔ پہلے معنوں کے اعتبار سے اس کا مطلب ہوگا سرکش ۔ راغب نے اسے شَجَرَۃٌ مَرْدَاءُ سے ماخوذ بتایا ہے جس کے معنے ہیں وہ درخت جس کے پتے نہ ہوں ۔ ان معنوں کے اعتبار سے اس کا مفہوم ہوگا وہ جو ہر قسم کی بھلائیوں اور خوشگواریوں سے محروم ہو چکا ہو ۔ یہ معنی رَجِیْمٌ اور لَعِیْنٌ کے مرادف ہیں ۔ (دیکھئے عنوانات ر ۔ ج ۔ م اور ل ۔ ع ۔ ن)

اَلْمَرِیْدُ ۔ کھجور جو دودھ میں بھگو دی جائے تاکہ نرم ہو جائے۔ اصمعی نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جسے مَل دیا جائے حتٰکہ وہ نرم ہوجائے مَرِیْدٌ کہلاتی ہے * ۔ قرآن کریم میں صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ آیا ہے (۲۷/۴۴) ۔ اس کے معنی ہیں ہموار یا چکنا کیا ہؤا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی لمبی عمارت کے بھی ہیں ۔ ویسے اَلتَّمْرِیْدُ فِی الْبِنَاءِ کے معنی ہوتے ہیں عمارت کو چکنا اور ہموار کرنا ۔ اس پر پلاسٹر لگانا ۔ اَلْمَارِدُ ۔ بلند ۔ نیز سرکش ۔ خیر سے عاری * (۳۷/۷) ۔

م ر ر

مَرَّ ۔ مَرَّبِهٖ ۔ مَرَّعَلَيْهِ ۔ اس کے پاس سے گزر گیا ۔ اَلْمَرَّۃُ ۔ ایک بار ۔ مَرَّتَانِ ۔ دو بار ۔ فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ ۔ ہر بار ۔ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۔ پہلی بار ۔ اَلْمُرُّ ۔ کڑوا* ۔ اِسْتَمَرَّ الشَّیْءُ ۔ چیز ہمیشہ رہی ۔ مسلسل رہی ۔ ایک ہی طریقہ پر چلتی رہی*** ۔ سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (۵۴/۲) وہی جھوٹ جو ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے ۔ یعنی اِفْكٌ قَدِيْمٌ (۴۶/۱۱) ۔

سورۃ بقرہ میں ہے ۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ...... (۲/۲۲۹) ۔ طلاق دو ہی بار ہوسکتی ہے ۔ اس کا عام طور پر مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اگر کوئی آدمی دو مرتبہ طلاق ، طلاق کہدے (یا ایک ایک مہینہ کے وقفہ کےبعد دو بار طلاق کا اعلان کردے) تو اس سے طلاق نہیں پڑتی (واپسی ہو سکتی ہے) لیکن اگر تین مرتبہ کہدے تو پھر معاملہ ختم ہوجاتا ہے ۔ اس کے بعد اگر یہ (سابقہ میاں بیوی) پھر باہمی نکاح کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ عورت کسی

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔

دوسرے مرد سے نکاح کرے اور اس سے ہم بستر ہو۔ (اسے حلالہ یا تحلیل کہتے ہیں) ۔ یہ خیال اور طلاق کا طریق قرآن کریم کے خلاف ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے طلاق کے لئے ایک خاص طریقہ مقرر ہے ۔ یعنی پہلے باہمی افہام و تفہیم ۔ پھر ثالثوں کے ذریعے مصالحت کی کوشش ۔ پھر عدالت کے ذریعے فیصلہ ۔ جب معاملہ اس حد تک پہنچ جائے اور باہمی نباہ کی کوئی صورت نہ ہو تو میاں بیوی میں علیحدگی ہو جاتی ہے ۔ اسے طلاق کہتے ہیں ۔ اس کے بعد بھی اگر یہی مرد اور عورت چاہیں تو باہمی نکاح کرسکتے ہیں ۔ لیکن ایسا ، اس جوڑے کی ازدواجی زندگی میں صرف دو مرتبہ ہوسکتا ہے ۔ اگر تیسری مرتبہ بھی طلاق کی نوبت آ گئی تو پھر یہ میاں بیوی آپس میں نکاح نہیں کرسکتے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرنے کے بعد مطلقہ یا بیوہ ہو جائے تو پھر وہ اپنے پہلے خاوند سے نکاح کرسکتی ہے ۔ یہ ہے قرآن کریم کا مطلب اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ سے ۔ جب تک طلاق (قید نکاح سے آزادی) عمل میں نہ آجائے اسے طلاق کہا ہی نہیں جاسکتا ۔ اس لئے اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ کے معنی واضح ہیں ۔ یعنی قیدِ نکاح سے ایسی آزادی دو مرتبہ ہوسکتی ہے جس میں لوٹ آنے کی اجازت ہو ۔ تیسری مرتبہ کی آزادی کے بعد اس کی اجازت نہیں ۔

اَلْمَرَّةُ ۔ رسی کو بھی کہتے ہیں ۔ اَمْرَرْتُ الْحَبْلَ ۔ میں نے رسی کو بٹ دیا ۔ اس سے اس کے معنی قوت اور استحکام کے آتے ہیں ۔ اِسْتَمَرَّ مَرِيْرُهٗ ۔ اس کا ارادہ مستحکم ہوگیا ۔ اِسْتَمَرَّ بِالشَّيْءِ ۔ وہ اس چیز کے اٹھانے پر قادر ہوگیا ۔ اہل عرب کہا کرتے ہیں اَرْجَى الْغِلْمَانِ الَّذِيْ يَبْدَأُ بِحُمْقٍ ثُمَّ يَسْتَمِرُّ ۔ سب سے ہونہار لڑکا وہ ہے جو ابتداءً بیوقوفی کرے اور پھر درست ہو جائے ۔ اس سے اَلْمِرَّةُ کے معنی خلقی قوت و شدت اور عقل و اصالت کے آتے ہیں*۔ چنانچہ صاحب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ مِرَّةُ الْاِنْسَانِ آدمی کی قوت کو کہتے ہیں ۔ سورة القمر میں جو آیا ہے فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (۵۴/۱۹) ۔ تو اس کے معنی سخت شدت کا دن ہیں (اس کے معنی ہیں ایسا دن جس کی نحوست مسلسل رہے)۔ نیز اس نے لکھا ہے کہ سورة اعراف میں جو ہے حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ (۷/۱۸۹) ۔ تو اس میں فَمَرَّتْ بِهٖ کے معنی سختی یا شدت کو محسوس کرنا ہیں ۔

سورة النجم میں اللہ تعالیٰ کو ذُوْ مِرَّةٍ (۵۳/۶) کہا گیا ہے ۔ اس کے معنی صاحب قوت و حکمت بھی ہوسکتے ہیں ۔ یعنی وہ جس کے ارادے مستحکم

*تاج ۔

اور تدبیریں قوی ہوں ۔ اور یہ بھی کہ جو زندگی کی مختلف گزرگاہوں کا مالک ہو ۔ اس لئے کہ "مُرُوْرٌ" کے بنیادی معنی گزر جانے کے ہیں ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ "مِرَّةٌ" کے معنی ایسی حالت کے ہیں جس پر کوئی چیز مستقلاً چلتی رہے ۔ اس اعتبار سے اس کے معنے قوانین خداوندی (سنۃ اللہ) کے ہونگے جن میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی ۔

م ر ض

مَرَضٌ ۔ توازن اور اعتدال کا اس طرح بگڑ جانا کہ کسی قوت میں اضمحلال ، ضعف یا کمی واقع ہوجائے ۔ کمی کے لحاظ سے شَمْسٌ مَرِيْضَةٌ ۔ سورج کو اس وقت کہتے ہیں جب گرد و غبار سے اس کی روشنی مدھم پڑ گئی ہو ۔ اور اَرْضٌ مَرِيْضَةٌ ۔ ایسی زمین کو جس میں طاقت کم ہو ۔ یا جس میں پیداوار کم ہوتی ہو ۔ نیز وہ زمین جہاں بد امنی ہو ۔ مَرَضٌ کے معنی ظلمت اور تاریکی کے بھی آتے ہیں ۔ اور شک اور نفاق کے بھی* ۔

قرآن کریم میں مَرَضٌ بمقابلہ شِفَآءٌ آیا ہے ($\frac{26}{80}$) جہاں اس کے معنی جسمانی مرض کے ہیں ۔ اور فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ ($\frac{2}{10}$) ۔ جہاں اس کے معنی قلب و نگاہ کے توازن کے بگاڑ اور نفسیاتی الجھاؤ کے ہیں ۔ لہذا ، جسمانی بیماری ہو یا ذہنی اورقلبی فتور ، دونوں کے لئے مَرَضٌ کا لفظ آتا ہے ۔ سورۃ بقرہ میں سطحی جذبات پرستوں یا مفاد پرستوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ ($\frac{2}{10}$)۔ اس قسم کی ذہنیت یا سیرت کو، قلب (Psyche) یا (Mind) کا مرض کہنا ایک ایسی حقیقت کا انکشاف ہے جس سے (بیسویں صدی سے پہلے) انسانی علم بالعموم بے بہرہ تھا ۔ اسی جہت سے قرآن کریم نے اپنے متعلق کہا ہے شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ($\frac{10}{57}$)۔ اس میں "قلب کے امراض" کا علاج اور شفاء ہے ۔

اگر اس کا علاج وحی کی رو سے نہ کیا جائے تو یہ مرض اپنے زور دروں سے از خود بڑھتا رہتا ہے ($\frac{2}{10}$) ۔

م ر و

صَفَا اور مَرْوَۃ مکہ میں مسجد حرام سے باہر دو پہاڑیاں ہیں ۔ صَفَا (صَفَاةٌ کی جمع) صاف پتھروں کو کہتے ہیں اور مَرْوٌ چھوٹے چھوٹے سفید براق کنکروں کو ۔ مراسم حج کے سلسلہ میں قرآن کریم نے انہیں

---

*تاج ۔

میں شَعَائِرِ اللهِ (۲/۱۵۸) کہا ہے۔ شَعَائِر، کسی نظام یا مملکت کی اُن محسوس علامات (نشانات) کو کہتے ہیں جو تقاریب اور مراسم میں اُس نظام یا مملکت کے قائمقام سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً کسی سلطنت کا جھنڈا اُس کے شعائر میں سے ہوتا ہے۔ جھنڈے کے احترام کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے دل میں اُس سلطنت کا احترام ہے۔ قرآن کریم نے جن محسوس علامات کو شعائر اللہ قرار دیا ہے اُن سے یہی مقصود ہے کہ وہ حکومتِ خداوندی (قرآنی نظام مملکت) کے محسوس نشان ہیں جن کا احترام درحقیقت حکومتِ خداوندی کے احترام کا مرادف ہے۔ اس سے زیادہ ان محسوس علامات (Symbols) کی کچھ حیثیت نہیں ہوتی۔ (نیز دیکھئے عنوان ش۔ ع۔ ر)۔

م ر ی

مَرَیٰ النَّاقَةَ یَمْرِیْهَا مَرْیاً۔ اونٹنی کے تھنوں کو ہاتھ سے سہلانا (مس کرنا) کہ وہ دودھ دیدے۔ یہ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں۔ چنانچہ اَلْمِرْیَةُ۔ اور اَلْمَرْیَةُ۔ اس دودھ کو کہتے ہیں جو اسطرح نکالا جائے**۔

اس سے اس کے معنی ہیں تردد اور کوشش سے کسی بات کا نکالنا۔ چنانچہ مِرْیَةُ الْفَرَسِ کے معنی ہیں وہ چال جو گھوڑا وغیرہ کھانے سے گھوڑا نکالے**۔ لہذا مِرْیَةٌ کسی معاملہ میں تردد کو کہتے ہیں۔ نیز شک اور جھگڑے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ راغب نے ان معانی کی یہی توجیہ کی ہے اور کہا ہے کہ مِرْیَةٌ شک سے خاص ہوتا ہے*۔ جھگڑے کے مفہوم میں مناوی نے کہا ہے کہ مِرَاءٌ دوسرے کے کلام میں اظہار خلل کے لئے طعن کرنے کو کہتے ہیں اور اس سے مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے آدمی کی تحقیر کی جائے، اور بس۔ اِمْتَرَیٰ فِیْهِ وتَمَارَیٰ کے معنی شک کرنے کے ہیں۔ فراء نے تَتَمَارَیٰ کے معنی تکذیب کرنے کے بتائے ہیں**۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یُمَارُوْنَ فِی السَّاعَةِ (۴۲/۱۸)۔ جو لوگ اَلسَّاعَةُ کے بارے میں شک اور تردد میں پڑے ہیں۔ سورہ کہف میں ہے۔ فَلَا تُمَارِ فِیْهِمْ (۱۸/۲۲)۔ ان سے ان کے بارے میں جھگڑا مت کر۔ سورہ بقرہ میں ہے۔ فَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ (۲/۱۴۷)۔ جھگڑا کرنے والوں یا شک اور تردد کرنے والوں میں سے نہ ہوجا۔

مریم

مَرْیَمُ۔ یہ سریانی لفظ ہے جس کے معنی بلند مرتبہ ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جو شخص کوئی بہت ہی عجیب بات کرتا ہے اسے عرب

*راغب۔ **تاج۔

یَا مَرْیَمُ کہکر خطاب کرتے ہیں ۔ اور اَلْمَرْیَمُ مِنَ النِّسَاءِ اُس عورت کو کہتے ہیں جو مردوں کے ساتھ باتیں کرنا پسند کرے لیکن برائیوں سے دور رہتی ہو* ۔

قرآن کریم نے حضرت عیسٰی کی والدہ ماجدہ کا نام مریم بتایا ہے ۔ (۳/۳۵) ۔ آپ (حضرت مریم) کی والدہ کو اِمْرَاَتُ عِمْرَانَ (۳/۳۴) کہکر پکارا گیا ہے ۔ اس کے معنی '' عمران کی بیوی ،، یا '' آل عمران کی عورت ،، کے ہیں ۔ سورہ مریم میں ہے کہ آپ کی قوم کے لوگوں نے آپ کو یااُخْتَ ھٰرُوْنَ (۱۹/۲۸) '' اے ھارون کی بہن ،، بھی کہا تھا ۔ اس کے بھی دو معنی ہو سکتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ آپ کے کسی بھائی کا نام ھارون تھا ۔ اور دوسرے یہ کہ حضرت ھارون (مورث اعلیٰ) کیطرف نسبت کی وجہ سے ایسا کہا گیا تھا ۔ سورہ تحریم میں آپ کو اِبْنَتَ عِمْرَانَ (۶۶/۱۲) کہا گیا ہے ۔

آپ کی والدہ نے آپ کی پیدائش سے پہلے منت مانی تھی جس کی بنا پر آپکو ھیکل کی خدمت کے لئے مختص کر دیا گیا (۳/۳۵-۳۶) ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ح ۔ ر ۔ ر)

حضرت عیسیٰ کو قرآن کریم میں عام طور پر ''ابن مریم،، کہکر پکارا گیا ہے ۔ رینان اپنی کتاب (Life of Jesus) میں اس ضمن میں لکھتا ہے ۔

''آپ (حضرت عیسیٰ) طبقہ عوام سے متعلق تھے۔ آپکے والد ، یوسف اور والدہ ، مریم ، دونوں غریب گھرانے کے افراد تھے ۔ دستکاری ان کا پیشہ تھا ۔ . . . . آپ کے والد کا انتقال جلدی ہو گیا ۔ اس کے بعد حضرت مریم ہی خاندان کی سرپرست رہ گئیں ۔ یہ وجہ ہے کہ حضرت مسیح عام طور پر '' ابن مریم ،، کے نام سے موسوم ہوئے ۔ یعنی جب آپکو آپکے ھمنام بچوں سے متمیز کرنا ہوتا تھا تو ''یسوع ابن مریم ،، یا ابن مریم کہا جاتا تھا ،، ۔

حضرت مریم کی زندگی کے متعلق تفصیلی حالات میری کتاب ''شعلہ مستور '' میں ملیں گے ۔

م ز ج

اَلْمَزْجُ ۔ ملانا ۔ مَزَجَ الشَّرَابَ بِالْمَاءِ ۔ اس نے شراب میں پانی ملا دیا۔ مِزَاجٌ ۔ وہ شے جو(شراب میں) ملائی جائے** ۔ مِزَاجُ الْخَمْرِ کَافُوْرٌ ۔ اس شراب میں کافور کی خوشبو ہے*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

دو ملی ہوئی چیزوں میں سے ہر شے دوسری کیلئے مِزَاجٌ کہلاتی ہے ۔ قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے کہ ۔ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ کَانَ مِزَاجُھَا کَافُوْرًا (۷۶/۵) ۔ وہ ایسے پیالہ سے پیتے ہیں جس میں کافور کی آمیزش ہوتی ہے ۔ کَافُوْر (دیکھئے ک ۔ ف ۔ ر) کی تاثیر یہ ہے کہ وہ حدت کو برودت (ٹھنڈک) میں تبدیل کر دیتا ہے ۔ ایک منظم اور بامقصد جماعت کی پہلی منزل اپنے اوپر پابندیاں عائد کرکے ڈسپلن پیدا کرنے کی ہوتی ہے ۔ پھر اس کے بعد اگلی منزل یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کی مدافعت میں ، نظامِ خداوندی کے مخالفین کے مقابلہ میں سخت گرم جوشی دکھاتے ہیں ۔ اس کے لئے کہا کہ وَیُسْقَوْنَ فِیْھَا کَاْسًا کَانَ مِزَاجُھَا زَنْجَبِیْلًا (۷۶/۱۷) یہ اس پیالہ سے پیتے ہیں جس میں زنجبیل (سونٹھ) کی آمیزش ہوتی ہے ۔ سونٹھ کی تاثیر حدت پیدا کرنا ہوتی ہے ۔ اس جماعت کے لئے یہ دونوں منزلیں ضروری ہیں ۔ یا یہ کہ وہ اپنوں کے ساتھ ٹھنڈک کا برتاؤ کرتے ہیں اور مخالفین کے مقابلہ میں گرمی کا ۔ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (۴۸/۲۹) ۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان (اقبال)

متضاد اور مخالف قوتوں میں صحیح صحیح امتزاج سے مومن کی سیرت تعمیر ہوتی ہے ۔ اسی کو اپنے اندر الاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کا منعکس کرنا کہتے ہیں ۔ یعنی مختلف صفات خداوندی کا خاص تناسب و توازن سے اپنے اندر اجاگر کئے جانا ۔

م ز ق

مَزَقَہٗ ۔ یَمْزِقُہٗ ۔ اس نے اسکو پھاڑ دیا ۔ یا اس میں سوراخ کردیا ۔ فَتَمَزَّقَ ۔ پس وہ پھٹ گیا ۔ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ۔ اَلْمِزَقُ ۔ پھاڑے ہوئے کپڑے وغیرہ کے ٹکڑے ۔ تَمَزَّقَ الْقَوْمُ ۔ قوم منتشر اور پراگندہ ہو گئی * ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ اِذَا مُزِّقْتُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ (۳۴/۷) ۔ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہو جاؤ گے ۔ اس دنیا میں قومی ضعف و انتشار ، اور مرنے کے بعد طبعی انتشار ، دونوں کو محیط ہو سکتا ہے ۔

*تاج ۔ **محیط ۔ *تاج و محیط ۔

م ز ن

اَلْمُزْنُ ۔ وہ سفید اور روشن بادل جس میں پانی ہو۔ اس قسم کے بادل کا ٹکڑا مُزْنَۃٌ کہلائیگا*۔ فُلَانٌ یَتَمَزَّنُ۔ فلاں آدمی بادل کی مشابہت اختیار کرتا ہے ۔ یعنی بتکلف سخاوت کرتا ہے**۔ قرآن کریم میں پانی کے متعلق ہے ۔ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْہُ مِنَ الْمُزْنِ .... (۵۶/۶۹)۔ کیا اُسے بادل میں سے تم نیچے لاتے ہو...؟ یعنی سامانِ رزق سب کا سب خدا کی طرف سے ملتا ہے۔

م س ح

اَلْمَسْحُ ۔ پونچھنا ۔ کسی لتھڑی ہوئی چیز پر ھاتھ پھیر کر اس کی آلائش کو صاف کر دینا، جیسے مَسَحْتُ رَأْسِیْ مِنَ الْمَاءِ وَجَبِیْنِیْ مِنَ الرَّشْحِ ۔ میں نے پانی کو اپنے سر سے اور پسینے کو اپنی پیشانی سے پونچھ ڈالا ۔ ابو زید نے کہا ہے کہ کلام عرب میں مَسَحَ کے معنی تر کرنے یا دھونے کے بھی ھیں ۔ یعنی آلائش کو پانی کے ساتھ صاف کردینا ۔ مَسَحْتُ یَدِیْ بِالْمَاءِ ۔ میں نے اپنے ھاتھ کو پانی سے دھویا ۔ اور تَمَسَّحْتُ بِالْمَاءِ ۔ میں نے غسل کیا* ۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ مَسَحْتُہٗ بِیَدِیْ کے معنے ھیں ، میں نے اس پر اپنا ھاتھ پھیرا ۔ سورۃ صٓ میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق ہے کہ جب ان کے گھوڑے ان کے سامنے آئے فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَ الْاَعْنَاقِ (۳۸/۳۳) ۔ تو وہ ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ھاتھ پھیرنے لگا ۔ (جیسے سوار اپنے گھوڑوں پر ھاتھ پھیرتے ھیں)۔

اَلْمَسْحُ ۔ اَلْمِسَاحَۃُ ۔ ناپنا ۔ مَسَحَ الْاَرْضَ ۔ اس نے زمین کی پیمائش کی* ۔ اس کا (Survey) کیا ۔ اَلْمَسِیْحُ ۔ راستے کو کہتے ھیں اور اَلْمَسِیْحُ اس شخص کو جو بہت چلنے والا (سیر و سیاحت کرنے والا) ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ھیں کسی چیز کو پھیلا کر کسی چیز پر چلانا۔

حضرت عیسیٰؑ کو مَسِیْحٌ بھی کہتے ھیں (۳/۴۴) ۔ صاحب قاموس نے اس کے اشتقاق میں قریب پچاس اقوال نقل کئے ھیں* ۔ ان میں ایک یہ بھی ہے (اور راغب نے اس کی تائید کی ہے کہ) چونکہ آپ بہت چلنے والے تھے اس لئے آپ کو مَسِیْحٌ کہا گیا ہے ۔ اس کے بعد راغب لکھتا ہے

*تاج ۔ **راغب ۔

کہ اُن کے زمانہ میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو ہمیشہ گھومتے پھرتے رہتے تھے ۔ انہیں مَشَّائِیْن اور سَیَّاحِیْن کہا جاتا تھا**۔ اور حضرت مسیح[۴] بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے ، اس لئے انہیں مَسِیْح* کہا گیا ہے*** ۔ لیکن صاحب محیط نے کہا ہے کہ قدیم زمانہ میں کاہنوں اور بادشاہوں کے بدن پر تیل وغیرہ کی مالش کی جاتی تھی ۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ[۴] کے بدن پر بھی مالش کی گئی تھی اس لئے آپ کو مَسِیْح* کہا گیا (The Annointed) ****۔ (نیز دیکھئے عنوان س ۔ ی ۔ ح جس میں لکھا گیا ہے کہ مَسِیْح* غالباً عربی لفظ نہیں) ۔

سورۃ مائدہ میں ہے کہ جب تم صلٰوۃ کے لئے اٹھو تو فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ ۔ اپنے چہروں کو اور کہنیوں تک ہاتھوں کو دھو لیا کرو ۔ اس کے بعد ہے وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ (۶/۵) ۔ یہاں چونکہ وَ امْسَحُوْا ۔ فَاغْسِلُوْا سے الگ آیا ہے اس لئے اس کے معنی دھونے کے نہیں ہونگے ۔ صرف پونچھ لینے کے ہونگے ۔

اس سے آگے ہے کہ اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو ، یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے ، یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو ۔ فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا ۔ تو پاکیزہ مٹی کا قصد کرو ۔ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ (۶/۵ و ۴۳/۴) ۔ ''پاکیزہ مٹی کا قصد کرو'' ۔ بات تو قرآن کریم نے اتنی ہی کہی ہے لیکن اس اشارہ سے مقصود یہ ہے کہ بدن کی آلائش کو پاکیزہ مٹی سے صاف کر لیا کرو ۔ اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کر لیا کرو'' ۔ یعنی پونچھ لیا کرو ۔

اصل یہ ہے کہ صلٰوۃ سے پہلے وضو سے جہاں مقصود ہاتھ پاؤں کو پاک اور صاف کرنا ہے وہاں اس سے مراد ایک نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنا بھی ہے جو کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے تمہیداً ضروری ہوتی ہے ۔ پانی نہ ملنے (یا اس سے پرہیز) کی صورت میں ہاتھ پاؤں دھونے کا مقصد حل نہیں ہو سکتا، لیکن '' تیمم '' سے صلٰوۃ کی تیاری کا نفسیاتی پہلو ضرور سامنے آجاتا ہے ۔ یعنی اس سے انسان کے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے ۔

م س خ

اَلْمَسْخُ ۔ کسی کی شکل و صورت بدل دینا اور بگاڑ دینا ۔ یعنی پہلی شکل کے مقابلہ میں زیادہ بد نما اور قبیح بنا دینا*****۔ راغب نے کہا ہے کہ

*تاج۔ **راغب ۔ ***اس فرقہ کا نام (Essenes) ایسینی تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب شعلہ مستور (تذکرہ حضرت عیسیٰ)۔ ****محیط۔ *****تاج و راغب و محیط

بگاڑنے اور قبیح بنانے کا یہ عمل جسمانی ساخت میں بھی ہوتا ہے اور عادات و اخلاق میں بھی۔ لیکن دونوں صورتوں میں، یہ تبدیلی قباحت کو لئے ہوئے ہوگی۔ اس نہج سے اَلْمَسِیْخُ مِنَ النَّاسِ اس آدمی کو کہتے ہیں جس میں حسن اور ملاحت نہ ہو۔ یا جو کمزور اور احمق ہو۔ لَحْمٌ مَسِیْخٌ۔ وہ گوشت جس میں کوئی مزہ نہ ہو*۔ طَعَامٌ مَسِیْخٌ۔ وہ کھانا جس میں نہ نمک ہو، نہ رنگ نہ مزہ۔ اِنْمِسَاخُ حَمَاةِ الْفَرَسِ۔ گھوڑے کی ٹانگ کی مچھلی کا لاغر ہو جانا (تاج)۔ قرآن کریم میں ہے۔ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰی مَکَانَتِهِمْ (۳۶/۶۷)۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم ان کی قوت و مقدرت کے باوجود انہیں کمزور و عاجز کر دیں۔ ان کی قوت و مقدرت مبدل بہ ضعف و درماندگی ہو جائے۔

م س د

اَلْمَسْدُ۔ بٹنا۔ مَسَدَ الْحَبْلَ۔ اس نے رسی کو بٹ دیا۔ اَلْمَسَدُ۔ کھجور کے پٹھے جنہیں بٹ کر رسی بنائی جاتی ہے۔ اس طرح بٹی ہوئی رسی کو بھی کہتے ہیں**۔

قرآن کریم میں حَبْلٌ مِنْ مَسَدٍ (۱۱۱/۵) آیا ہے۔ یعنی کھجور کے پٹھوں کی بٹی ہوئی رسی۔ قانونِ مکافات کی محکم گرفت مراد ہے۔

م س س

مَسٌّ۔ چھونا۔ کسی چیز تک پہنچنا**۔ راغب نے لکھا ہے کہ مَسٌّ لَمْسٌ کے ہم معنی ہے۔ فرق یہ ہے کہ لَمْسٌ تلاش کرنے اور ٹٹولنے کو بھی کہتے ہیں اور اس میں یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کو تلاش کیا جا رہا ہو وہ مل بھی جائے، برخلاف مَسٌّ کے کہ اس کا استعمال اسی وقت ہوتا ہے جب کہ حاسۂ لمس کے ذریعہ اس چیز کا ادراک بھی کر لیا جائے۔

(۱) کسی چیز کا جو ابتدائی اثر ہو اسے بھی مَسٌّ کہتے ہیں۔ وَجَدَ فُلَانٌ مَسَّ الْحُمّٰی۔ اسے بخار کی ابتدائی کیفیت محسوس ہوئی۔ لَمْ یَجِدْ مَسًّا مِنَ النَّصَبِ۔ اسنے ذرا سی بھی تھکن محسوس نہ کی۔ نیز، ہر پیش آنے والی چیز اور اذیت کو مَسٌّ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مجازاً اس کا اطلاق جنون پر بھی ہوتا ہے**۔

---

*تاج و محیط و راغب۔ نیز ابن فارس۔ **تاج و راغب۔

اَلتَّمَاسٌ باہم ایک دوسرے کو چھونا - کنایۃً مجامعت کو کہتے ہیں * (۵۸/۳)۔ مجامعت کے لئے مَسٌّ اور مَاسٌّ بھی استعمال ہوتا ہے** - (۲/۲۳۶) میں مجامعت کے لئے تَمَسُّوْهُنَّ آیا ہے -

سورہ طٰہٰ میں ہے کہ جس سامری نے بنی اسرائیل کے لئے بچھڑا بنایا تھا اسے سزا یہ دی گئی تھی اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ (۲۰/۹۷)۔ تاج العروس میں ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو کہتا رہے کہ میں کسی کو نہیں چھوتا اور کوئی مجھے نہ چھوئے - مطلب یہ ہے کہ اسے برادری سے خارج کر دیا گیا تھا اور اسطرح وہ ”اچھوت“ (Un- Touchable) بن گیا تھا - یعنی اُس سے سب نے معاشرتی تعلقات منقطع کر لئے تھے -

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ لَمْسٌ ہاتھ سے چھونے کے لئے خاص ہے اور مَسٌّ عام ہے - یعنی ہاتھ سے چھونے اور بدن کے کسی عضو سے چھونے کے لئے بھی آتا ہے -

قرآن کریم میں ہے لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶/۷۹) - اسکے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کے علاوہ جو پاکیزہ سیرت اور پاکیزہ خیال ہوں دوسرے لوگ قرآنی حقائق پر مطلع نہیں ہو سکتے - یعنی یہاں قرآن کریم کو مس کرنے کے معنی اسے چھونا نہیں، اس کے حقائق سے باخبر ہونا ہے**- روح المعانی سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے - حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے فکر و نظر کی تطہیر اور قلب و دماغ کی پاکیزگی اولین شرط ہے - جو شخص غیر قرآنی خیالات اور نظریات کو لیکر قرآن کریم کی طرف آئیگا، قرآنی حقائق اس پر کبھی بے نقاب نہیں ہونگے - فکر و ادراک کی پاکیزگی کے ساتھ ہی قلب و نگاہ کی عفت و تطہیر بھی ضروری ہے - جو قلب انسانیت سوز خیالات کی آماجگاہ ہو وہ قرآن کریم کی روشنی سے منور نہیں ہو سکتا - قرآن کریم سے راہ نمائی وہی حاصل کر سکتا ہے جو خالی الذہن ہو کر اسکی طرف آئے اور اس کے دل میں تلاش حقیقت کی سچی تڑپ ہو - پاکبازوں کے سوا کسی کو قرآن کریم سے مس نہیں ہو سکتا -

م س ک

اَلْمَسْكُ - کھال (جس میں گوشت اور ہڈیاں وغیرہ بند رہتی ہیں یا جس کی مشک وغیرہ بنائی جاتی ہے) - چونکہ مشک وغیرہ پانی کو روک لیتی ہے اس لئے مَسَكَ بِهٖ - اَمْسَكَ - تَمَاسَكَ - اِسْتَمْسَكَ - تَمَسَّكَ - مَسَّكَ کے معنی ہیں کسی کو پکڑ لینا - کسی چیز سے چمٹ

*تاج و راغب - **محیط و تاج -

جانا * ۔ اَلاِمْسَاکُ ۔ بخل کرنا ** ۔ اَلْمِسْکُ ۔ مُشک * (کیونکہ وہ اُس خون سے ترتیب پاتی ہے جو ہرن کے نافہ میں رک گیا ہو) ۔

سورۂ بقرہ میں اِمْسَاکٌ بمقابلہ تَسْرِیْح آیا ہے (۲/۲۲۹) ۔ یعنی نکاح میں رکھنا ۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہ اِنْفَاقٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۷/۱۰۰) ۔ سورۂ فاطر (۳۵/۲) میں یہ فَتَحَ (کھولدینے) کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ اور (۳۵/۴۱) میں زَالَ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ اور زَالَ کے معنی اپنی جگہ سے ہٹ جانا ہیں ۔ سورۂ صٓ (۳۸/۳۹) میں مَنَّ (احسان کرنے) کے مقابلہ میں اَمْسَکَ آیا ہے ۔ اس میں بھی بخل کا مفہوم پایا جاتا ہے ۔ سورۂ تطفیف میں جنت کی ''شراب'' کے متعلق ہے خِتٰمُہٗ مِسْکٌ (۸۳/۲۶) ۔ اس کی مہر مشک کی ہے ۔

سورۂ مائدہ میں شکاری جانوروں کے شکار کے سلسلے میں ہے فَکُلُوْا مِمَّآ اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ ...... (۵/۴) ۔ ''جس شکار کو وہ تمہارے لئے پکڑ رکھیں ۔ اس میں سے کھاؤ'' ۔

م س و (ی)

اَلْمَسَاءُ ۔ شام کے وقت کو کہتے ہیں ۔ صَبَاحٌ کی ضد ہے ۔ مَسَاکَ فُلَانٌ وَاَمْسٰی وَمَسّٰی ۔ فلاں آدمی نے تجھ سے کسی بات کا وعدہ کیا مگر پھر اس نے اس کے پورا کرنے میں دیر لگا دی ۔ مَسَّاکَ اللّٰہُ بِالْخَیْرِ ۔ خدا تمہاری شام بھلائی کے ساتھ گزارے ۔ اَلْمُمْسٰی وَالْمِسٰی ۔ شام کا وقت *** ۔ اَمْسٰی ۔ وہ شام کے وقت میں داخل ہوا ۔

ابن القوطیہ نے کہا ہے کہ اَلْمَسَاءُ ظہر سے مغرب تک کے درمیانی وقت کو کہتے ہیں ۔ محمد نے کہا ہے کہ اَلْمَسَاءُ کا لفظ دو وقتوں پر بولا جاتا ہے ۔ ایک تو زوالِ آفتاب کے وقت پر اور دوسرے اس وقت پر جب آفتاب غروب ہو ** ۔ عرب کے لوگ مَسَاءٌ کا لفظ کِنَایَۃً تباہی اور شر کے لئے ، اور صَبَاحٌ کا لفظ مسرت اور خیر و برکت کے لئے بولتے ہیں ** ۔

قرآن کریم میں ہے فَسُبْحٰنَ اللّٰہِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ (۳۰/۱۷) ''پس اللہ کے لئے پاکیزگی ہے جب تم شام کے وقت میں داخل ہوتے ہو اور جب تم صبح کرتے ہو'' ۔ یہ اس کا عام ترجمہ ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات زمان (Time) کے تعینات سے بلند ہے ۔ صبح ، شام (یا رات دن) کے امتیازات تمہارے لئے ہیں ۔ خدا کی ذات ان تحدیدات اور تعینات سے بہت بلند ہے ۔

---

* تاج و محیط ۔ ** محیط ۔ *** تاج ۔

۴

مسیح

حضرت عیسیٰ ؑ کا دوسرا نام (۳/۴۴) یا لقب ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان م ۔ س ۔ ح ۔ نیز عیسیٰ ؑ ۔ (آپ کی زندگی کے تفصیلی حالات میری کتاب شعلۂ مستور" میں ملینگے)۔

م ش ج

مَشَجَ بَيْنَهُمَا ۔ اس نے دونوں کو باھمدگر خلط ملط کر دیا ۔ ملا دیا *۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ھیں ۔ شَيْئٌ مَشِيْجٌ ومَشْجٌ ۔ ملی ھوئی چیز ۔ اسکی جمع اَمْشَاجٌ ھے *۔

قرآن کریم میں ھے ۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ اَمْشَاجٍ (۷۶/۲) ۔ ھم نے انسان کو اس نطفه (ماده) سے پیدا کیا جس میں مختلف جوھر امکانی شکل میں(Potentialities)مخلوط ھوتے ھیں ۔ اس سے رحم مادر میں جنین وجود میں آجاتا ھے ۔نَبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا(۷۶/۲)۔ پھرھم ایسا انتظام کر دیتے ھیں کہ جنین کے ان مضمر جوھروں کی نمود ھو جائے تا آنکه وه صاحب سماعت و بصیرت بن جائے ۔

م ش ی

مَشْيٌ ۔ پیدل چلنا ۔ راغب نے کہا ھے کہ مَشْيٌ کے معنی ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف اپنے ارادے سے منتقل ھونے کے ھیں ۔ مجازاً مَشْيٌ کے معنی راہ پا جانے اور رھنمائی حاصل کرنے کے بھی آتے ھیں **۔ اَلْمَاشِيَةُ (جمع اَلْمَوَاشِي) اونٹ بکری وغیرہ چوپایوں کو کہتے ھیں ۔ تاج العروس میں ھے کہ دراصل مَشَاءٌ کے معنی کثرت اور نشوو نما کے ھیں ۔ چنانچه اِمْرَاَةٌ مَاشِيَةٌ اس عورت کو کہتے ھیں جس کے بہت بچے ھوں **۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) انسان وغیرہ کی حرکت ۔ اور (۲) نمو اور زیادتی کے ھیں ۔

قرآن کریم میں قَامُوْا کے مقابله میں مَشَوْا آیا ھے (۲/۲۰)۔ یعنی چلنا۔ سوره اعراف میں ھے ۔ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَمْشُوْنَ بِهَا (۷/۱۹۵)۔ کیا ان کے پاؤں ھیں جن کے ذریعه وه چل سکتے ھیں ؟

*تاج و راغب ۔ **تاج و محیط ۔

سورہ قلم میں مَشَّآءٍ بِنَمِیْمٍ آیا ہے (۶۸/۱۱)۔ اسکے معنی ہیں وہ شخص جو بہت زیادہ ادھر کی باتیں اُدھر پہنچاتا رہے ۔ کبھی اس کے پاس پہنچے کبھی اُس کے پاس جائے ، اور اسطرح لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرے ۔

م ص ر

اَلْمِصْرُ ۔ دو چیزوں کے درمیان حد کو کہتے ہیں ۔ شہر کو مِصْرٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ مَمْصُوْرٌ یعنی محدود ہوتا ہے ۔ اس کے گردا گرد حد بندی کی جاتی ہے ۔ مِصْرٌ کے معنی ہیں کوئی شہر یا علاقہ ۔ اور مِصْرُ ۔ ملک مصر (Egypt) کو کہتے ہیں ۔ سرخ مٹی کو بھی مِصْرٌ کہتے ہیں *۔

قرآن کریم میں مِصْرٌ (بمعنی شہر) سورہ بقرہ (۲/۶۱) میں آیا ہے ۔ میدانوں کی بے پایاں وسعتوں کے مقابلہ میں ، محدود بستی ۔

مُصَيْطِرٌ

اسکا مادہ س ۔ ط ۔ ر ہے ۔ اسے اُسی عنوان کے تابع دیکھئے ۔

م ض غ

اَلْمُضْغَةُ ۔ گوشت کا ٹکڑا ۔ (گوشت کے علاوہ دوسری چیزوں کے ٹکڑے کو بھی کہہ سکتے ہیں)۔ مُضْغَةٌ مِنَ اللَّحْمِ ۔ گوشت کی اتنی مقدار کو کہتے ہیں جو چبانے کے لئے منہ میں ڈالی جا سکے ۔ اَلْمَضَاغُ ۔ جو چیز چبائی جائے ۔ مَضَغَهُ، یَمْضَغُهُ، مَضْغاً ۔ کسی چیز کو دانتوں سے چبانا * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں ۔

قرآن کریم میں جنین (رحم میں بچے) کی مختلف حالتوں میں سے ایک حالت کو مُضْغَةٌ (۲۲/۵) کہا گیا ہے ۔ یعنی وہ حالت جس میں جنین ایک گوشت کے لوتھڑے کے مانند ہوتا ہے (اور اس میں ہنوز ہڈیاں سخت نہیں ہوتیں) ۔

م ض ی

مَضَى الشَّيْءُ ۔ يَمْضِي ۔ کسی چیز کا (پہلے) گزر جانا اور چلے جانا ۔ مَضَى السَّيْفُ مَضَاءً ۔ تلوار نے کاٹ دیا (تیز ہونے کی وجہ سے)۔

*تاج و محیط و راغب ۔

اَلْمَاضِیْ - شیر ، کیونکہ وہ اپنی جرأت کی وجہ سے آگے ہی آگے رھتا ھے اور جو ارادہ کرتا ھے اسے کر گزرتا ھے - تلوار (جو تیز ھو) کیونکہ وہ جس چیز پر ماری جاتی ھے اُسے کاٹ دیتی ھے * -
قرآن کریم میں ھے - فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ (۸/۳۸) - امم سابقہ کی سنت گذر چکی ھے - تاریخی وقائع و حوادث سے مراد ھے -

م ط ر

اَلْمَطَرُ - بارش * - (۴/۱۰۲) - اَلْاِمْطَارُ - عذاب کی بارش کے لئے بھی بولتے ھیں * - راغب نے کہا ھے کہ مَطَرَ اس بارش کے لئے بولتے ھیں جسکے نتائج خوش گوار اور بھلے ھوں - اور اَمْطَرَ اس کے لئے جو نقصان رساں ھو** - ابن فارس کہتا ھے کہ اُمْطِرَ (مجہول) صرف عذاب ھی کے لئے آتا ھے -
قرآن کریم میں قوم لوط کے عذاب کے متعلق ھے - وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَطَرًا (۷/۸۴) ،، اور ھم نے ان پر ایک بارش برسائی - مُمْطِرٌ - بارش لانے والا - هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (۴۶/۲۴) - یہ بادل ھم پر مینہ برسانے والا ھے -

م ط ی (و)

مَطَا - مَطْوًا - اس نے چلنے میں پورا زور لگایا اور تیز چلا - مُطَوَاءٌ - انگڑائی - بیشتر بخار کے وقت آنے والی انگڑائی کو کہتے ھیں - اسی سے مَطَا وَتَمَطّٰی کے معنی بڑھنا ، لمبا ھونا ، دراز ھونا ، ھو گئے - ابن فارس نے کہا ھے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ھیں - چنانچہ تَمَطَّی النَّهَارُ کے معنی ھیں دن نے انگڑائی لی - یعنی طلوع آفتاب کے بعد اس نے بڑھنا شروع کیا - اَلتَّمَطِّیْ کے معنی ھیں اکڑ کر چلنا - اتراتے ھوئے جانا - چلنے میں ھاتھوں کو بڑھانا اور پھیلانا *** - راغب نے لکھا ھے کہ المَطَا پشت کو کہتے ھیں اور تَمَطّٰی کے معنے ھیں اپنی پیٹھ کو اونچا کرنا اور بڑھانا - (اکڑنے میں یہ کیفیت پیدا ھو جاتی ھے) - قرآن کریم میں ھے - ذَهَبَ اِلٰی اَهْلِهٖ یَتَمَطّٰی (۷۵/۳۳) - ،، وہ اپنے ساتھیوں کی طرف اتراتا ھوا گیا '' -

مع

مَعَ - ساتھ - یہ لفظی و معنوی دونوں معیتوں کے لئے بولا جاتا ھے - جسمانی معیت کے لئے قرآن کریم میں ھے - دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَیٰنِ (۱۲/۳۶) - ،،اس کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان داخل ھوئے'' - اور معنوی معیت

*تاج **راغب - ***تاج و راغب -

کے لئے - وَ اللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (۸/۶۶) - ''اور اللہ صابرین کے ساتھ ہے''۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ اور صابرین کسی مقام پر (ایک جگہ) اکٹھے ہوجاتے ہیں - یا اللہ صابرین کے زمرے میں شامل ہوجاتا ہے - اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ کی تائید و نصرت صابرین کے ساتھ ہوتی ہے -

کبھی یہ عِنْدَ - یعنی ''پاس''- کے معنوں میں بھی آتا ہے - جیسا کہ کہتے ہیں - جِئْتُ مِنْ مَعِ الْقَوْمِ - میں قوم کے پاس سے آیا

م ع ز

مَعْزٌ (جمع - واحد مَاعِزٌ) بکری* - (۶/۱۴۴) - گٹھیلے بدن والے قوی آدمی کو بھی اَلْمَاعِزُ کہتے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں شدت اور صلابت کے ہیں - اور بکری کو اَلْمَعْزُ اس لئے کہتے ہیں کہ ضَأْنٌ (بھیڑ) کے مقابلہ میں اس میں ایک طرح کی سختی ہوتی ہے -

م ع ن

اَلْمَعْنُ - معمولی اور حقیر چیز - ایک طرف یہ قصیر اور قلیل کے لئے استعمال ہوتا ہے اور دوسری طرف ، طویل اور کثیر کو بھی کہتے ہیں - زمین کے اوپر بہنے والا پانی - اَلْمَاعُوْنُ - ہر بھلائی - بارش - کیونکہ وہ خدا کی طرف سے بلا مشقت مل جاتی ہے - پانی - ہر وہ چیز جس سے نفع اٹھایا جائے - ہر وہ چیز جو یونہی بلا مشقت مل جائے اور اس سے نفع اٹھایا جائے- وہ چیزیں جو مانگنے والوں سے روکی نہ جائیں - سامانِ نشو و نما - مَعَنَ الْفَرَسُ - گھوڑا دوڑتے ہوئے دور نکل گیا - مَعَنَ الْمَاءُ - پانی بہا - مَعَنَ النَّبْتُ - پودے پانی سے سیراب ہو گئے - مَعِیْنٌ - جاری پانی جو کھلا ہوا بہ رہا ہو**- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے بہنے یا چلنے وغیرہ میں سہولت کے ہیں - یعنی آسانی سے کسی کام کا ہو جانا -

قرآن کریم میں ہے - ذَاتِ قَرَارٍ وَ مَعِیْنٍ (۲۳/۵۰)- ایسی سر زمین جو ہموار ہو اور اس میں پانی جاری ہو - سورۃ ماعون میں ہے وَ یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۷) - وہ ان چیزوں کو روک رکھتے ہیں جو خدا کی طرف سے منفعتِ عامہ کے لئے ملی ہیں - یعنی سامان نشو و نما جسے بہنے پانی کی طرح عام ہونا چاہئے*** - جسے آبِ رواں کی طرح ہر ضرورتمند کے دروازے کے سامنے سے گزرنا چاہئے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق لے لے -

---

*تاج - **تاج و محیط و لطائف اللغۃ- ***ابن قتیبہ (القرطین - ج/۲ صفحہ ۲۱۹)

بعض نے کہا ہے کہ مَعِیْنٌ عَیْنٌ سے ہے* ۔ اسی لئے اسے مَعِیْنٌ (ع ۔ ی ۔ ن) کے عنوان کے تحت بھی لکھا گیا ہے ۔ وہاں بھی دیکھ لینا چاہئے ۔

م ع ی

اَلْمَعْیٌ ۔ اَلْمِعیٰ ۔ آنت ۔ (جمع اَمْعَاءٌ) ۔ اَلْمَاعِیَۃُ ۔ ٹکڑے ٹکڑے کاٹی ہوئی چیز ۔ تَمَعّٰی الشَّرُّ فِیْمَا بَیْنَھُمْ ۔ شر اُن کے درمیان پھیل گیا ** ۔ قرآن کریم میں جہنم کے گرم پانی کے متعلق ہے کہ وہ حیات بخش ہونے کی بجائے ہلاکت آفرین ہوگا ۔ فَقَطَّعَ اَمْعَاءَ ھُمْ (۴۷/۱۵) ۔ اور اُن کی انتڑیاں کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیگا ۔ ان کی حیاتِ انسانی منقطع ہو جائیگی ۔ یا زندگی بخش ذرائع ختم ہو جائینگے ۔ سامان و ذرائعِ نشوونما سے محرومی ہو جائیگی ۔ (غذا کو جزوِ بدن بنانے کا بڑا ذریعہ انتڑیاں ہوتی ہیں) ۔

م ق ت

اَلْمَقْتُ ۔ سخت بغض اُس شخص کے خلاف جسے تم دیکھو کہ وہ برے کام کا خوگر ہوگیا * ۔ نِکَاحُ الْمَقْتِ ۔ باپ کے مر جانے پر اسکی منکوحہ سے نکاح کر لینا ، جاہلیت میں عربوں میں ایسے نکاح ہوتے رہتے تھے *** ۔ قرآن کریم نے اسکی سخت ممانعت کی ہے (۴/۲۲) ۔ ویسے عام نفرت اور بیزاری کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے ۔ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَکْبَرُ مِنْ مَّقْتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ (۴۰/۱۰) ۔ اللہ کی بیزاری تمہاری اپنی بیزاری سے کہیں بڑھ کر ہے ۔ لیکن مَقْتُ اللّٰهِ کے معنی ہونگے انسان کے برے اعمال کے ناخوش گوار نتائج جو قانون خداوندی کے مطابق مرتب ہوتے ہیں ۔ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۶۱/۳) ۔ " اللہ کے نزدیک یہ نہایت ناپسندیدہ بات ہے کہ تم وہ کچھ کہو جو کچھ کرتے نہیں ہو " ۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوانات غ ۔ ض ۔ ب اور س ۔ خ ۔ ط وغیرہ) ۔

م ک ث

اَلْمَکْثُ ۔ کسی جگہ پر انتظار کے ساتھ جم کر رہنا ۔ اَلْمَاکِثُ ۔ کسی جگہ انتظار میں ٹھہرنے والا ۔ اَلْمُتَمَکِّثُ ۔ منتظر ۔ اَلْمَکَاثُ ۔ دیر کرنا ۔ ٹھہرنا ۔ انتظار کرنا ۔ اَلتَّمَکُّثُ ۔ کسی کے انتظار میں ٹھہرے رہنا **** ۔

---

* راغب ۔ ** تاج و محیط ۔ *** تاج ۔ **** تاج و محیط و راغب ۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم بقا چاہتے ہو۔ تمہاری آرزو یہ ہے کہ جریدۂ عالم پر تمہارا دوام ثبت ہو جائے ۔ تم زندۂ جاوید ہو جاؤ۔ تمہارے کارنامے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہیں ۔ تو اس کے لئے اس بنیادی اصول کو سمجھ لو کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)۔ جو چیز تمام نوع انسانی کے لئے نفع رساں ہوگی وہی دنیا میں باقی رہے گی۔ طبعی دنیا میں بقائے اصلح (Survival of the fittest) کا قانون کارفرما ہے۔ لیکن دنیائے انسانیت میں ''بقائے نافع'' کا قانون نفاذ پذیر ہے۔ لہذا باقی رہنا چاہتے ہو تو وہ کچھ کرو جو انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو۔ جس سے ربوبیتِ عامہ ہو جائے۔ اسکی نفع بخشیاں کسی خاص گروہ ، خاص قوم ، خاص ملک تک محدود نہ ہوں بلکہ وہ تمام نوع انسانی کے لئے یکساں طور پر کھلی ہوں ۔ یہی اسلام کا مقصود اور قرآنی نظام ربوبیت کا مطلوب ہے ۔ کیونکہ اس کا خدا ''رب العالمین '' ہے ۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے ۔ وَ قُرْآنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا (۱۷/۱۰۶)۔ قرآن کریم کو ہم نے بتدریج نازل کیا ہے ۔ اور اس کے مضامین کو الگ الگ بیان کیا ہے تاکہ تو اسے اسی طرح سے ، ٹھہر ٹھہر کر ، بتدریج لوگوں کے سامنے پیش کرے ۔ سورۃ نمل میں ہے ۔ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ (۲۷/۲۲)۔ وہ تھوڑا عرصہ ٹھہرا ۔ سورۃ قصص میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے اہل سے کہا اُمْكُثُوْا (۲۸/۲۹)۔ تم یہاں ٹھہرو ۔

م ک ر

اَلْمَكْرُ ۔ خفیہ تدبیر ۔ چنانچہ جب غلہ کو گھروں میں چھپا کر رکھ لیا جائے (احتکار) تو اسے بھی اَلتَّمْكِيْرُ کہتے ہیں ۔ جنگ کی تدبیر اور حیلہ کو بھی اَلْمَكْرُ کہتے ہیں*۔

صاحب المنار نے لکھا ہے کہ مَكْرٌ اس خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں جو اس شخص کو جس کے خلاف یہ تدبیر کی جائے اس مقام تک پہنچا دے جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو**۔

قرآن کریم میں ، نظام خداوندی کی مخالفت کرنے والوں کی سازشوں کو مَكْرٌ کہا گیا ہے ۔ اور جماعتِ مومنین کی طرف سے ان کے جواب یا خدا

---

*تاج ۔ **المنار ج/۳ صفحہ ۳۱۵ ۔

کے قانون مکافات کی رو سے ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج کو بھی مَکْر ہی سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ وَ یَمْکُرُوْنَ وَ یَمْکُرُ اللہُ ۔ وَ اللہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ (۸/۳۰)۔ وہ تمہارے خلاف تدبیریں کر رہے تھے اور خدا (کا قانون) ان کے خلاف تدبیریں کر رہا تھا ۔ خدا کی تدبیریں بہترین ہوتی ہیں ۔ بڑی مؤثر اور کارگر۔

م ک ک

مَکَّ الْعَظْمَ ۔ اس نے ہڈی کو اس طرح چوس لیا کہ اس کا گودا سب صاف کر دیا* ۔ (ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں ۔) مَکَّ الْفَصِیْلُ مَا فِیْ ضَرْعِ اُمِّہٖ ۔ اونٹنی کے بچے نے وہ تمام دودھ چوس لیا جو اس کی ماں کے تھن میں تھا ۔ مَکَّہٗ ۔ اس نے اسے ہلاک کر دیا ۔ کم کر دیا* ۔

مَکَّۃُ ۔ یعقوب نے کہا ہے کہ مَکَّۃُ پورے حرم کو کہتے ہیں ۔ اور بَکَّۃُ شہر مکہ کو کہتے ہیں ۔ مَکَّۃُ کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے ۔ مثلاً (۱) اسے اس لئے مَکَّۃُ کہتے ہیں کہ وہ گناہوں کو کم کر دیتا یا فنا کر دیتا ہے ۔ (۲) چونکہ اس شہر میں پانی بہت کم تھا اس لئے یہاں کے باشندے یہاں کا پانی گویا چوس ڈالتے تھے یا سب کا سب نکال لیتے تھے ۔ (۳) مَکَّ کے معنی جذب کرنے اور کھینچنے کے بھی آتے ہیں ۔ یہ شہر چونکہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا اور جذب کرتا ہے اس لئے اسے مَکَّۃُ کہتے ہیں ۔ (۴) بَکَّ کیطرح مَکَّ بھی اژدھام کو کہتے ہیں ۔ اور چونکہ اس شہر میں لوگوں کا ھجوم ہوتا ہے اس لئے اسے مَکَّۃُ یا بَکَّۃُ کہتے ہیں ۔ (۵) مُکَاکٌ اور مُکَاکَۃٌ ۔ ہڈی سے نکالے ہوئے مغز اور گودے کو کہتے ہیں* جو ہڈی کے وسط میں ہوتا ہے ۔ چونکہ یہ شہر دنیا کے شہروں کا مغز ہے اس لئے اسے مَکَّۃُ کہتے ہیں ۔ قرآن کریم میں مَکَّۃُ اس شہر کے لئے آیا ہے جس میں مسجد حرام ہے ۔ (۴۸/۲۴) ۔ اسی کو بَکَّۃُ بھی کہا گیا ہے (۳/۹۵) ۔ [دیکھئے عنوان ب ۔ ک ۔ ک] ۔

مَکَّۃ

مکہؐ معظمہ ۔ (دیکھئے عنوان م ۔ ک ۔ ک اور ب ۔ ک ۔ ک) ۔

---

*تاج و راغب ۔

م ک ن

المَكِينَةُ ۔ تمکن و اقتدار کو اور المُكْنَةُ ۔ قدرت و استطاعت کو کہتے ہیں ۔ اَلْمَكَانَةُ ۔ وقار اور سکون کو کہتے ہیں ، اور المَكَانُ اس جگہ کو جو کسی چیز کو محیط اور اس پر حاوی ہو*۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اَلْمَكُنَاتُ پرندوں کے گھونسلوں کو کہتے ہیں ۔ [بعض کے نزدیک مَكَانٌ کا مادہ (ک ۔ و ۔ ن) ہے] ۔ نیز اس کے معنی سمت اور جہت کے بھی آتے ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے وَ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ (۱۴/۱۷) ۔ ہر سمت سے اس کی طرف موت آ رہی ہوگی ۔ (یہ مَكَانٌ ک ۔ و ۔ ن سے ہے) ۔

سورۃ نساء میں ہے زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ (۴/۲۰) ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی ۔ سورۃ یونس میں مَكَانَكُمْ (۱۰/۲۸) ۔ اپنی جگہ پر ٹھہرنے کے لئے آیا ہے ۔

مَكُنَ الشَّيْءُ ۔ چیز قوی اور مضبوط ہو گئی ۔ راسخ ہو گئی ۔ اپنی جگہ پر جم گئی ۔ اَمْكَنَ فُلَانًا الْاَمْرُ ۔ فلاں آدمی کے لئے وہ کام آسان اور سہل ہو گیا ۔ اسے اس پر قدرت حاصل ہو گئی ۔ تَمَكَّنَ مِنَ الْاَمْرِ ۔ وہ اس پر قادر اور کامیاب ہو گیا** ۔

اس اعتبار سے مکان کے معنی قدر و منزلت اور رتبہ اور درجہ کے آتے ہیں ۔ وَ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (۱۹/۵۷) ۔ اور ہم نے اسے بلند مرتبہ عطا کیا ۔ استطاعت اور مقدرت کے معنوں میں سورۃ انعام میں ہے ۔ اِعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ (۶/۱۳۵) ۔ تم اپنی استطاعت بھر، اپنی پوری پوری طاقت کے مطابق، جو کچھ کرنا چاہتے ہو اپنے پروگرام کے مطابق کرو ۔ سورۃ یٰسٓ میں ہے ۔ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ (۳۶/۶۷) ۔ ہم ان کی طاقت اور مقدرت کے باوجود انہیں مٹا ڈالیں ۔ ان کی قوت و مقدرت کو کمزور و ناتوان بنا دیں ۔

مَكِيْنٌ ۔ زبردست قدرت اور منزلت والا ۔ جو اپنی جگہ پر مضبوطی سے جم کر بیٹھ جائے ۔ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ (۸۱/۲۰) ۔ صاحب عرش کے نزدیک قدر و منزلت والا ۔ مَكَّنَ ۔ جما دینا ۔ مضبوط بنا دینا ۔ قرار گیر بنا دینا ۔ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمْ (۲۴/۵۵) ۔ وہ ان کے دین کو ان کے لئے قائم اور مضبوط کر دیگا ۔ جو نظام زندگی ان کے لئے تجویز کیا گیا ہے اسے متمکن فی الارض کر دیگا ۔ نیز اس کے معنی حکومت عطا کرنا بھی ہیں ۔ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ (۱۲/۵۶) ۔ اسطرح ہم نے یوسف کو اس

*تاج ۔ **محیط ۔

ملک میں حکمرانی عطا کر دی۔ اسے صاحب اختیارات بنا دیا ۔ اَمْكَنَهُ مِنَ الشَّيْءِ۔ اُسے کسی چیز پر غلبہ اور قابو دے دیا ۔ سورہ انفال میں ہے ۔ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ (۸/۷۱) سو اللہ نے ان پر قابو پا لیا ۔

قرآن کریم نے اپنی صداقت کے پرکھنے کے لئے تین معیار بتائے ہیں۔ یا تو اپنے دور کے علمی دلائل سے اس پر غور کرو۔ یا تاریخی شواہد سے دیکھو کہ سابقہ اقوام نے جب غلط روش اختیار کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ اور یا استنتاجی طریق (Pragmatic test) کے ذریعے اسکی صداقت کو پہچانو (۳۹/۴۰)۔ استنتاجی طریق کے معنی یہ ہیں کہ اس نظام کو قائم ہو کر اپنے نتائج پیدا کرنے دو۔ نتائج سے خود بخود معلوم ہو جائیگا کہ اس کا دعوی سچا ہے یا نہیں ۔ اسے اپنے دعوی کی صداقت پر اسقدر محکم یقین ہے کہ وہ اس استنتاجی طریق پر بڑا زور دیتا ہے ۔ چنانچہ نبی اکرمؐ اپنے مخالفین سے بار بار کہتے ہیں کہ اِعْمَلُوا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۔ تم اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق اپنی جگہ، اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ۔ اِنِّي عَامِلٌ۔ میں اپنی جگہ، اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ (۶/۱۳۶) ۔ عنقریب (نتائج سے) معلوم ہو جائے گا کہ انجام کار اس گھر (دنیا) کی کامیابی و کامرانی کس کے حصہ میں آتی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶) ۔ تم دیکھ لو گے کہ خدا کا یہ قانون کسقدر سچا ہے کہ جو قوم نوع انسانی کے حقوق میں کمی کرتی ہے اور خدا کے قوانین سے سرکشی برتتی ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ اسلام کو سچا ثابت کرنے کا یہ طریقہ تھا ۔ یعنی اس کے عملی نظام کے نتائج سے دنیا پر واضح کر دینا کہ یہ نظام کسطرح بے مثل و بے نظیر ہے ۔ یہ تھا اسلام کا دعوی ۔ اور اب حالت یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کے نظری دلائل سے کچھ متاثر بھی ہوتے ہیں وہ مسلمانوں کی عملی حالت دیکھ کر اس سے منہ پھیر لیتے ہیں کہ جس "مذہب" پر چلنے والوں کی یہ حالت ہو وہ کس طرح نوع انسانی کی فلاح و فوز کا ضامن بن سکتا ہے ؟ اور اس پر بھی جب مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ تم جس "مذہب" پر چل رہے ہو یہ خدا کا وہ دین نہیں جو اس نے رسول اللہؐ کی وساطت سے بھیجا تھا تو انہیں اسقدر غصہ آجاتا ہے کہ وہ مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں ۔ اس لئے کہ انہوں نے اعمال کو ان کے نتائج سے پرکھنے کے قرآنی معیار کو نظر انداز کر رکھا ہے ۔ اب ان کے پاس کوئی کسوٹی ہی نہیں جس سے اس کا فیصلہ کیا جاسکے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ

ٹھیک ہے یا غلط ۔ اسکی کسوٹی صرف ایک ہے ۔ اور وہ یہ کہ اعمال کے جو نتائج قرآن کریم نے بتائے ہیں ، اگر ہمارے اعمال سے وہ نتائج مرتب ہو رہے ہیں تو وہ اعمال صحیح طور پر سرانجام پا رہے ہیں ۔ اگر وہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے ، تو وہ اعمال صحیح طور پر سرانجام نہیں پا رہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض اعمال کے نتائج مرنے کے بعد مرتب ہونگے لیکن یہ صحیح نہیں کہ تمام اعمال کے نتائج مرنے کے بعد ہی مرتب ہونگے اور اس دنیا میں کسی عمل کا نتیجہ سامنے نہیں آئیگا ۔ قرآن کریم کی رو سے اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی نتیجہ خیز ہوتے ہیں اور یہی وہ نتائج ہیں جن سے اعمال کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے ۔ اس دنیا کی ذلت و خواری خدا کا عذاب ہے اور قرآنی پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے بعد یہ باقی نہیں رہ سکتی ۔

م ک و

مَكَا ۔ يَمْكُوْ ۔ مُكَاءً ۔ سیٹی بجانا * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ہاتھوں کو ایک خاص ہیئت سے اکھٹا کرکے سیٹی کی آواز نکالنے کو کہتے ہیں ۔ راغب نے مَكَا الطَّيْرُ کے معنی پرندہ کے سیٹی جیسی آواز نکالنے کے لکھے ہیں** ۔ اَلْمُكَّاءُ ۔ ایک چھوٹا سا پرندہ ہوتا ہے جو باغات میں رہتا ہے * ۔ (اس کا یہ نام اس لئے پڑا ہے کہ اسکی آواز سیٹی کی آواز سے مشابہ ہوتی ہے) ۔ قرآن کریم میں عہد جاہلیہ کے عربوں کے متعلق ہے ۔ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً (۸/۳۵) ۔ خانہ کعبہ کے قریب ان کی صلوۃ بے معنی آوازوں اور بے مطلب حرکتوں کے سوا کچھ نہیں ۔ یعنی ایسی نماز جس میں محض چند الفاظ (بلا سمجھے) دھرا لئے جائیں اور چند حرکات ادا کر دی جائیں ۔ سوچئے کہ کیا آج ہماری نمازیں بھی بالعموم بھی کچھ بن کر نہیں رہ گئیں ؟ چند الفاظ کا دھرانا جنکا مفہوم نہ سمجھا جائے۔ اور چند حرکات جن کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے جس صلواۃ کا حکم دیا تھا وہ قلب و دماغ کی تطہیر اور معاشرہ میں صالح انقلاب لانے کا ذریعہ تھی ۔ اس میں ہر شخص کو معلوم ہوتا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں ۔ کیوں ایسا کر رہا ہوں ۔ اور اس کا نتیجہ کیا مرتب ہوگا ۔ دین (نظام خداوندی) کے پروگرام کی ہر کڑی ایک غایت لئے ہوتی ہے اور انسانیت کے بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے ۔ لیکن جب دین کا مقصود نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو اس کے پروگرام کی یہ

*تاج ۔ **راغب ۔

حیات بخش کڑیاں ، محض رسم بنکر رہ جاتی ہیں جن کی ادائیگی مقصود بالذات سمجھ لی جاتی ہے ۔ اس مقام پر دین ، '' مذہب'' بنکر رہ جاتا ہے ۔

م ل أ

مَلَأَ الشَّيْءَ يَمْلَأُهُ مَلْأً ۔ کسی چیز کو بھر دیا ۔ فَامْتَلَأَ ۔ پس وہ بھر گئی ۔ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ (۱۸/۷) ۔ میں ضرور جہنم کو بھر دونگا ۔ مِلْءٌ ۔ وہ مقدار جس سے کوئی چیز بھر جائے* ۔ مِلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا (۳/۹۰) ۔ زمین بھر سونا ۔ مَالِئُوْنَ ۔ بھرنے والے (۵۶/۶۶) ۔

اَلْمَلَأُ ۔ باہم مشورہ کرنا ۔ نیز جماعت ۔ جتھا ۔ قوم کے سردار و شرفاء ۔ رؤساء و امراء و اکابر وغیرہ* ۔ اَلْمَلَاُ الْاَعْلٰی (۳۸/۶۹) ۔ بڑے بڑے سردار ۔ بالاتر گروہ کے افراد ۔ لیڈر قسم کے لوگ ۔ دوسری جگہ نجومیوں اور کاہنوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اَلْمَلَاِ الْاَعْلٰی کی باتیں نہیں سن سکتے (۳۷/۸) ۔ یہاں اس سے مراد ہے عالم بالا کی بلند جماعتیں ۔ یعنی خدا کے عالم امر کے متعلقین ۔ مدبرات امور السمٰوٰت ۔ المِیْلَاءُ و المُمْلَاءُ ۔ مال دار لوگ ۔ وہ جن کے پاس ضرورت کی تمام چیزیں بھری ہوئی ہوں ۔ جن کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں* ۔ قرآن کریم میں اَلْمَلَاُ بھی انہی معنوں میں آیا ہے ۔ یعنی وہ لوگ اَتْرَفْنٰهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (۲۳/۳۳) ۔ جنہیں سامان زیست کی فراوانیاں حاصل تھیں ۔

قرآن کریم میں ہے کہ جس قوم میں بھی کوئی رسول آیا سب سے پہلے اس قوم کے دولت مند طبقہ نے اس کی مخالفت کی ۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ کٰفِرُوْنَ (۳۴/۳۴) ۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ ایسا پیغام لاتے تھے جس کی سب سے بڑی زد دولت مند طبقہ پر پڑتی تھی ۔ اسی لئے وہ بڑھ چڑھ کر ان کے پیغام کی مخالفت کرتے تھے ۔ اگر محض ''پوجا پاٹ'' کا سوال ہوتا تو دولت مندوں کا اس سے کیا بگڑتا تھا جو وہ اس کی مخالفت کرتے ۔ دولت مند تو بلکہ ایسے کاموں میں پیش از پیش حصہ لیتے ہیں اور چندے دیتے ہیں ۔ قرآن کریم کی تصریحات اس پر شاہد ہیں کہ حضرات انبیاء کرامؑ جس انقلاب آفریں پروگرام کو لے کر آتے تھے اس میں رزق کے سرچشمے دولت مندوں کے ہاتھوں سے چھن

---

*تاج ۔

کر خدا کے قانونِ ربوبیت کے ہاتھوں میں آجانے تھے ۔ یہ وجہ تھی کہ یہ طبقہ ہمیشہ اس انقلاب کی مخالفت کرتا تھا کیونکہ اس کی کامیابی میں انہیں اپنی موت دکھائی دیتی تھی ۔

یہی ہوتا چلا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ آج بھی جہاں قرآنی انقلاب کی آواز اٹھیگی سرمایہ دار طبقہ اس کی مخالفت کرے گا اور مذہبی پیشوائیت اس مخالفت میں ان کے ساتھ ہوگی ۔

(نیز دیکھئے عنوان ت ۔ ر ۔ ف) ۔

م ل ح

اَلْمِلْحُ ۔ نمک ۔ سخت نمکین (کڑوا) پانی جو شیریں پانی کی ضد ہوتا ہے ۔ اَلْمَلَّاحُ ۔ نمک فروخت کرنے والا ۔ کشتی چلانے والا کیونکہ وہ ہمیشہ شور پانی میں رہتا ہے ۔ عرب ، نمک کو بڑی اہمیت دیتے تھے اس لئے ذمہ داری اور پاس خاطر کے لئے بھی اَلْمِلْحُ کا لفظ بولتے تھے، اور حسن لطیف کے لئے بھی* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سفید ہونے کے ہیں اور نمک کو مِلْحٌ اس کے سفید ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں ۔

قرآن کریم میں کڑوے ، سخت نمکین پانی کے لئے مِلْحٌ کا لفظ آیا ہے۔ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ (۲۵/۵۳) ۔ وہ بہت سخت کھاری ہے ۔

م ل ق

مَلَقَ ۔ يَمْلِقُ ۔ مٹا دیا ۔ نرم کیا ۔ اَلْمَالَقُ ۔ اس لکڑی کے تختے کو کہتے ہیں جس سے ہل چلائی ہوئی زمین کو ہموار کیا جاتا ہے ۔ مَلَّقَ الْاَرْضَ تَمْلِيْقًا ۔ لکڑی کے تختے سے زمین کو ہموار کرنا ۔ اسی سے، کسی شخص کو ہموار (یا خوش) کرنے کے لئے جو چاپلوسی کی جاتی ہے اسے بھی تَمَلُّقٌ و مَلَقٌ کہتے ہیں ۔ اِنْمَلَقَ کے معنے ہیں چکنا اور ہموار ہونا ۔ اَلْمَلَقَةُ ۔ چکنے پتھر کو کہتے ہیں**۔ اَلْمَلِقُ ۔ ضعیف اور کمزور کو کہتے ہیں جسے حوادث زمانہ نے رگید کر نرم وخوار کردیا ہو ۔ اور اَلْمُمْلِقُ اس شخص کو جس کے پاس کچھ نہ ہو ۔ اَمْلَقَ مَامَعَهٗ ۔ جو کچھ اس کے پاس تھا اسے خرچ کر دیا اور اس میں سے کچھ بھی نہ روکا ۔ اسی سے رَجُلٌ اَمْلَقُ مِنَ الْمَالِ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے پاس کچھ مال و دولت نہ رہے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے کسی چیز سے عاری ہونے اور کسی چیز کے نرم ہونے کے ہیں۔ اِمْلَاقٌ ۔ مفلسی۔

---

*تاج ۔ **تاج و محیط ۔

قرآن کریم میں ہے کہ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (۶/۱۵۲)۔ اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے۔ یعنی اس خدشہ سے کہ تم اس سے مفلس ہو جاؤ گے (۱۷/۳۱) مار نہ ڈالو یا علم و تربیت سے محروم نہ رکھو۔ یاد رکھو! قرآنی نظام میں یہ ذمہ داری نظام کی ہوگی کہ تمہارے رزق کا بھی کفیل ہو اور تمہاری اولاد کے رزق کا بھی۔ نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَاِیَّاھُمْ (۶/۱۵۲)۔ "ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں (تمہاری اولاد کو) بھی"۔ خدا کی اس قسم کی ذمہ داریاں، اس نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں جو اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہو۔

م ل ک

مُلْکٌ۔ قوت رکھنا۔ کسی چیز پر قادر اور مستولی ہو جانا *۔ اختیار و ارادہ۔ اتھارٹی۔ (Authority)۔ بنیاد محکم۔ وہ سہارا جس پر کوئی چیز قائم ہو**۔ اسی لئے پانی اور غذا نیز دیگر اسباب و ذرائع کو بھی مِلْکٌ کہا جاتا ہے۔ عرب، لِیْ فِی الْوَادِیْ مِلْکٌ کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس وادی میں چراگاہ، پانی، مویشی، سب موجود ہیں۔ چونکہ صحرا میں زندگی کا سب سے بڑا سہارا پانی ہوتا ہے اس لئے پانی کو مِلْکٌ کہتے ہیں۔ لَیْسَ لَھُمْ مِلْکٌ کے معنی ہیں ان کے پاس پانی نہیں۔ ان کے ہاں محاورہ ہے اَلْمَاءُ مَلَکَ اَمْرَہٗ۔ پانی ہر معاملہ کو درست کر دیتا ہے۔ یعنی جس کے پاس پانی ہو وہ اپنے معاملات میں آزاد ہوتا ہے اور اس کے سب کام ٹھیک ہو جاتے ہیں***۔

جس ذریعے (یا چیز) سے کوئی معاملہ درست ہو جائے اور کمال کو پہنچ جائے۔ اسے مِلَاکُ الْاَمْرِ کہتے ہیں۔ اسی لئے مِلَاکٌ گارے کو بھی کہتے ہیں***۔ (کیونکہ اس سے پتھروں کو جوڑتے اور درست کرتے ہیں تاکہ حوض یا تالاب کا پانی ضائع نہ ہونے پائے)۔

مَلَکَ الْعَجِیْنَ یَمْلِکُہٗ۔ آٹے کو اچھی طرح گوندھنے کو کہتے ہیں جس سے اس کے سب اجزا یکساں ہو جائیں***۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ (م۔ ل۔ ک) کا خاصہ قوت اور شدت ہے****۔

مَلْکُ الطَّرِیْقِ (میم کی تینوں حرکات کے ساتھ)۔ راستہ کی حد، نیز راستے کے درمیانی یا بڑے اور واضح حصے کو کہتے ہیں***۔ مَلَکُوْتٌ۔

*محیط۔ **لین۔ ***تاج و ابن فارس۔ ****العلم الخفاق۔

عزت و اقتدار ۔ حکومت و سلطنت ۔ نیز ملک عظیم کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ھے ۔ لیکن یہ اللہ تعالی کی مملکت کے لئے مخصوص ھے * ۔ اس لئے کہ کائنات میں تمام اختیار و اقتدار اسی کا ھے ۔ وھی اسکی بنیاد اور سہارا ، اور اسکی تمام کارفرمائیوں کا مالک ھے ۔

مَالِکٌ کے معنی ھیں صاحب اختیارواقتدار ۔ سورہٗ نحل میں لاَ یَمْلِکُ کی تفسیر لاَ یَسْتَطِیْعُوْنَ (۱۶/۷۳) نے کر دی ھے ۔ اسی طرح مَمْلُوْکٌ کی تشریح لاَیَقْدِرُ عَلٰی شَیْئٍ (۱۶/۷۵) نے کر دی ۔ یعنی جسے کسی چیز پر کوئی اختیار نہ ھو ۔ اور سورہ یس میں فَھُمْ لَھَا مَالِکُوْنَ کے بعد وَذَلَّلْنٰھَا (۳۶/۷۲) نے واضح کر دیا کہ مَالِکٌ وہ ھے جس کے تابع دوسرا ھو جائے ۔ سورہ بقرہ میں (حضرت طالوت کے تذکرہ کے ضمن میں) جہاں بنی اسرائیل نے کہا ھے کہ وَابْعَثْ لَنَا مَلِکًا ۔ (۲/۲۴۶)۔ تو اس کے معنی یہ ھیں کہ ھمارا کوئی کمانڈر مقرر کر دیجئے (نُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ) تاکہ ھم اس کی زیر کمان خدا کی راہ میں جنگ کریں ۔ کمانڈر، صاحب اقتدار ھی کو کہتے ھیں ۔ اس سے متصل آیت (۲/۲۴۷) میں بھی مُلْکٌ کے معنی اقتدار و اختیار (Authority) کے ھیں ۔ اسی طرح مَااَخْلَفْنَا مَوْعِدَکَ بِمَلْکِنَا (۲۰/۸۷) کے معنی ھیں " ھم نے جو وعدہ تیرے ساتھ کیا تھا اسکی خلاف ورزی اپنے اختیار و ارادے سے نہیں کی " * ۔

تصریحات بالا سے واضح ھے کہ خدا کے مَالِکٌ ھونے میں جہاں اس کے کامل اختیار و اقتدار کا تصور ھے اسکے ساتھ ھی یہ تصور بھی ھے کہ اسکی یہ مالکیت استبداد کے لئے نہیں بلکہ کائنات کی اصلاح اور درستگی کے لئے ھے تا کہ اس کا نظم و نسق ٹھیک ٹھیک قاعدے اور قانون کے مطابق چلتا رھے اور ھر شے کو اسکی زندگی کی بنیادی ضروریات بہم پہنچتی رھیں ۔

قرآن کریم میں ایک اصطلاح آتی ھے ۔ مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ۔ اس کے لفظی معنی ھیں " جن کے مالک تمہارے دائیں ھاتھ ھوئے " ۔ یہ اصطلاح متعدد معانی میں استعمال ھوئی ھے ۔ مثلاً —

(۱) ان لوگوں کے لئے جو کسی کی ماتحتی میں کام کر رھے ھوں ۔ (Subordinates) ۔ جو کسی کی اسکیم کو بروئے کار لانے کے لئے اس کی ھدایات کے مطابق کام کریں ۔ گھر کے ملازم وغیرہ بھی اسی ضمن میں آجاتے ھیں ۔ (دیکھئے (۴/۳۶ ؛ ۱۶/۷۱ ؛ ۲۳/۳۱ ؛ ۲۴/۵۸ ؛ ۳۰/۲۸) ۔

*تاج ۔

(۲) اُن عورتوں کے لئے جو نکاح میں آچکی ہوں (۳۳/۵۲) ۔ اسی طرح سورہ نساء میں جہاں محرمات کی فہرست کے بعد کہا ہے کہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (۴/۲۴) ۔ تو اس میں اگر مُحْصَنٰتُ کے معنی "پاک دامن عورتیں" لئے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پر تمام پاک دامن عورتیں حرام ہیں بجز ان کے جو تمہارے نکاح میں آجائیں ۔ اور اگر "مُحْصَنٰتُ" کے معنی شوہر دار عورتیں ہوں (دیکھئے عنوان ح ۔ ص ۔ ن) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم پر تمام شوہردار عورتیں حرام ہیں بجز ان لونڈیوں کے جو اس سے پہلے تمہارے ہاں آچکی ہوں اگرچہ ان کے پہلے شوہر کہیں موجود ہوں ۔ (دیکھئے شق نمبر ۳) ۔

لیکن سورہ ممتحنہ میں ہے کہ اگر کفار مکہ کی مومن عورتیں تمہاری طرف آجائیں تو انہیں ان کافروں کی طرف نہ لوٹاؤ ۔ صرف ان کا خرچ کیا ہوا مال انہیں دیدو اور ان سے نکاح کر لو ۔ (۶۰/۱۰) یہ وہ "شوہر دار عورتیں" ہیں جن سے (اُن کے شوہروں کے ہوتے ہوئے) نکاح کی اجازت دی گئی تھی ۔ اس اعتبار سے (۴/۲۴) میں اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سے مراد یہ عورتیں بھی ہو سکتی ہیں جن سے اسطرح نکاح کیا گیا تھا ۔

(۳) مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۔ لونڈیوں کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے (مثلاً ۲۳/۶ ؛ ۷۰/۳۰ ، ۳۳/۵۰) ۔ لونڈیوں کے ضمن میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کے معاشرہ میں غلام اور لونڈیوں کا رواج عام تھا ۔ جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو وہ لونڈیاں جو ان کے معاشرہ کے رواج کے مطابق ان کے گھروں میں موجود تھیں اسی طرح ان کے گھروں میں رہیں ۔ اگر ان لونڈیوں کو گھروں سے نکال دیا جاتا تو اس سے معاشرہ میں بڑی خرابیاں پیدا ہوجاتیں ۔ اس لئے انہیں علی حالہ رہنے دیا گیا ۔ قرآن کریم نے ان لونڈیوں کے لئے بھی مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کی اصطلاح استعمال کی ہے ۔

یہ غلام اور لونڈیاں جنگ کے قیدی ہوتے تھے ۔ سورہ محمد میں جنگ کے قیدیوں کے متعلق واضح حکم آگیا کہ انہیں احساناً یا فدیہ لیکر رہا کرنا ہوگا (۴۷/۴) ۔ اس حکم کے بعد جنگ کے قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج ختم ہو گیا اور اس طرح اسلام نے غلامی کے دروازے کو یکسر مسدود کر دیا ۔ کسی انسان کو خرید کر غلام بنا لینے کا تصور ہی اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے جو شرف و تکریم آدمیت کا علمبردار (۱۷/۷۰) ہے اور جو کسی انسان کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسان پر اپنا حکم چلائے (۳/۷۸) ۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں جہاں مَامَلَکَتْ آیْمَانُکُمْ کے الفاظ لونڈیوں کے لئے آئے ہیں وہ انہی لونڈیوں کے لئے ہیں جو نزول قرآن کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھیں ۔ ان لونڈیوں کو آہستہ آہستہ آزاد معاشرہ کا جزو بنا لیا گیا ، اور نئی لونڈیاں بنانے کا سلسلہ از روئے قرآن ختم ہو گیا ۔ لہذا اب مسلمانوں کے ہاں لونڈیوں کا سوال ہی باقی نہیں رہا ۔ اب جو لوگ مَامَلَکَتْ آیْمَانُکُمْ سے لونڈیوں کے جواز کی سند لاتے ہیں وہ قرآن کریم پر ظلم کرتے ہیں ۔ اب قرآن کریم میں مَامَلَکَتْ آیْمَانُکُمْ سے متعلق ہدایات کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی قوم حلقہ اسلام میں داخل ہو جس کے ہاں لونڈیاں موجود ہوں تو قرآن‌کریم کی یہ ہدایات ان کے لئے خضر راہ بنینگی ۔

(مَامَلَکَتْ آیْمَانُکُمْ کے ضمن میں ی ۔ م ۔ ن ۔ کا عنوان بھی دیکھئے)

[مَلٰئِکَۃٌ کے لئے دیکھئے عنوان أ ۔ ل ۔ ک]

م ل ل

اَمْلَلْتُ الْکِتَابَ عَلَی الْکَاتِبِ ۔ میں نے کاتب کو کتاب املاء کرائی ۔ لکھائی* ۔ اس معنی میں یہ مادہ قرآن کریم میں (۲/۲۸۲) میں آیا ہے ۔ راغب نے کہا ہے کہ مِلَّۃٌ کی اصل اسی سے ہے** ۔ اس صورت میں مِلَّۃٌ کے معنی ہونگے لکھا ہوا قانون ۔

طَرِیْقٌ مَلِیْلٌ ۔ اس واضح راستے کو کہتے ہیں جس پر بکثرت آمد و رفت ہوتی ہو ۔ اس اعتبار سے مِلَّۃٌ کے معنی طریقہ اور راستہ کے ہونگے ۔ ان معانی کو ابو اسحٰق نے لکھا ہے ۔ اور اساس میں بھی اس کی تائید آئی ہے ۔ یہیں سے مَلَّۃٌ کا لفظ نکالا گیا ہے جس کے معنی ایسی جگہ کے ہیں جہاں روٹی پکائی جاتی ہے کیونکہ اس جگہ پر آمد و رفت کی کثرت سے راستہ کے نشان پڑ جاتے ہیں ۔ نیز اَلْمَلَّۃُ ۔ گرم ریت کو بھی کہتے ہیں جس میں روٹی پکائی جاتی ہے*** ۔ مناوی نے لکھا ہے کہ مَلَالٌ اس تکان اور دل برداشتگی کو کہتے ہیں جو کسی کام کو مسلسل کرنے سے پیدا ہو جائے*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اکتا جانے اور تھک جانے کے ہیں ۔

قرآن کریم میں مِلَّۃٌ کا لفظ مشرب و مسلک اور دینی طریقہ کے لئے آیا ہے ۔ حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (۲/۱۲۰) ۔ تا آنکہ تو ان کے طریقے (یا دین) کی پیروی کرنے لگے ۔ اسلام کو مِلَّۃَ اِبْرَاهِیْمَ (۲/۱۳۵) کہا گیا ہے ۔ یعنی وہ طریقہ جسے وحی خداوندی کی رو سے حضرت ابراہیم نے اختیار کیا تھا ۔

*محیط ۔ **راغب ۔ ***تاج ۔

م ل و (ی)

اِمْتِلَاءٌ کے معنی بڑھانے (ڈھیلا چھوڑنے اور مہلت دینے) کے آتے ہیں۔ اس لئے مدت طویلہ کو مَلَاوَۃٌ مِنَ الدَّهْرِ وَ مَلِيٌّ مِنَ الدَّهْرِ کہتے ہیں*۔ اَلْمَلِيُّ۔ زمانہ کی طویل مدت**۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی بھی لکھے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (۱۹/۴۶)۔ تو ایک طویل مدت تک مجھ سے الگ ہو جا۔ اَمْلَيْتُ الْبَعِيْرَ۔ میں نے اونٹ کی پیکڑی میں (جس سے وہ بندھا تھا) کشادگی پیدا کر دی۔ یعنی اسے ڈھیلا کر دیا**۔ اس سے یہ لفظ مہلت دینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ وسعت کے معنوں میں سورۃ محمد میں شیطان کے متعلق ہے وَ اَمْلٰى لَهُمْ (۴۷/۲۵)۔ وہ ان سے لمبے لمبے وعدے کرتا رہتا ہے۔ بڑی اور لمبی چوڑی امیدیں بندھاتا رہتا ہے۔ مہلت کے معنوں میں سورۃ اعراف میں ہے۔ وَ اُمْلِيْ لَهُمْ (۷/۱۸۳) میں انہیں مہلت دیتا ہوں۔

اَمْلَيْتُ الْكِتَابَ۔ میں نے کتاب کو لکھوایا۔ املاء کروایا۔ یہ اصل میں اَمْلَلْتُ ہے*۔ سورۃ بقرۃ میں ہے فَلْيُمْلِلْ (۲/۲۸۲)۔ چاہئے کہ وہ لکھوائے۔ سورۃ فرقان میں ہے فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ (۲۵/۵)۔ (اس کے لئے م۔ ل۔ ل کا عنوان بھی دیکھئے)۔

مَهْمَا

دیکھئے عنوان مَنْ اور عنوان مَا۔ (مَنْ + مَا = مِمَّا) کبھی اس کے آخر کا الف حذف ہو جاتا ہے اور یہ مِمَّ رہ جاتا ہے۔

مَنْ

مَنْ۔ جو۔ جس۔ جو کوئی۔ وَ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۱/۱۹)۔ جو کوئی (یا جو کچھ) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہے وہ اللہ کے لئے ہے۔

(۲) استفہامیہ معنوں میں۔ یعنی کون، کس۔ جیسے مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (۳۶/۵۲)۔ ہمیں کس نے ہماری خوابگاہ سے اٹھا دیا؟

*راغب۔ **تاج۔

مِن

مِنْ - حسب ذیل معانی کے لئے آتا ہے :-

(۱) "سے" کے معنوں میں - مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۱۷/۱) - مسجد حرام سے (یعنی وہ آغاز سفر کا مقام تھا) -
اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمَانَ (۲۷/۳۰) - وہ سلیمان کی طرف سے ہے -

(۲) کل میں سے بعض (اسے تبعیض کہتے ہیں) - مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ (۲/۲۵۳) - ان میں سے (بعض) وہ بھی ہیں جن سے خدا ہم کلام ہوا -

(۳) پوری جنس کے لئے (اسے تبیین کہتے ہیں) - مثلاً - مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ (۳۵/۲) - اللہ جو رحمت بھی انسانوں کے لئے کھولتا (بھیجتا) ہے - اس کے یہ معنی نہیں کہ رحمت میں سے کوئی ایک حصہ بھیجتا ہے - رحمت جو بھی ہوگی اسے رحمت ہی کہا جائے گا - رحمت کا حصہ نہیں کہا جائے گا - اسی طرح سورۃ اعراف میں ہے - مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ (۷/۱۳۲) جو نشانی بھی تو ہمارے پاس لائے . . . . . . یعنی ہم تمام نشانیوں سے ایسا ہی برتاؤ کرینگے - لہذا تبیین میں کل کا مفہوم ہوتا ہے - یعنی اس قسم کی پوری کی پوری چیز - (مِنْ کے استعمال میں تبعیض اور تبیین کے فرق کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے) -

(۴) "کی وجہ سے" کے مفہوم کے لئے - مِمَّا خَطِيْٓئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا (۷۱/۲۵) - وہ اپنی خطا کاریوں کی وجہ سے غرق کئے گئے - یعنی ان کے غرق ہونے کی وجہ ان کی خطا کاریاں تھیں -

(۵) ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لئے - وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (۲/۲۲۰) - اللہ جانتا ہے کہ کون مفسد ہے اور کون مصلح - یعنی وہ مفسدین اور مصلحین کو الگ الگ پہچانتا ہے -

(۶) ایک کے بدلے میں دوسرا - اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ (۹/۳۸) - کیا تم مستقبل کے بدلے میں (یا اس کے مقابلہ میں) قریبی مفاد پر رضا مند ہوگئے؟ نیز (۴۳/۶۰) -

(۷) نفی (نہیں) کی تاکید کے لئے - وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ (۳/۶۲) - اللہ کے سوا کوئی بھی الٰہ نہیں -

(۸) ب (کے ساتھ) کے معنوں میں - يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ (۴۲/۴۵) - وہ دزدیدہ نگاہ سے (یا خفی نگاہ سے یا گوشہ چشم سے) دیکھتے ہونگے - (نیز ۹۰/۴)۔

(۹) عَلٰی (پر) کے معنوں میں - وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ . . . . . (۲۱/۷۷) - اور ہم نے اسے اس قوم پر غالب کردیا -

(۱۰) فِیْ (میں) کے مفہوم میں - اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ (۶۲/۹) - جب جمعہ کے دن تمہیں صلٰوۃ کے لئے آواز دی جائے -

(۱۱) عَنْ (سے) کے مفہوم کے لئے - قَدْ كُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا (۲۱/۹۷) - ہم اس کی طرف سے غفلت میں رہے -

(۱۲) عِنْدَ (کے نزدیک - کے ہاں) کے معنوں میں - لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا (۵۸/۱۷) - اللہ کے ہاں (یا اللہ کے مقابلہ میں) ان کے اموال و اولاد ان کے کسی کام نہ آسکینگے -

(۱۳) زائد بھی ہوتا ہے - مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ (۶/۵۹) - کوئی پتا نہیں گرتا کہ . . . . . . (اسے تاکید کے لئے بھی کہہ سکتے ہیں) -

م ن ع

مَنْعٌ کے معنی ہیں کسی شخص اور اس چیز کے درمیان حائل ہو جانا جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے - ابن فارس نے لکھا ہے کہ یہ اِعْطَاءٌ کی ضد ہے - یعنی نہ دینا - راغب نے بھی اسکی تائید کی ہے - اِمْتَنَعَ اِمْتِنَاعاً - باز رہنا - رک جانا - مَانِعٌ - مَنَّاعٌ - مَنُوْعٌ - روکنے والا * - مَنَّاعٌ اور مَنُوْعٌ میں (بمقابلہ مَانِعٌ) مبالغہ پایا جاتا ہے - یعنی بہت زیادہ روکنے والا - روکنے کی جہت سے بخیل آدمی کو مَانِعٌ اور مَنَّاعٌ کہتے ہیں** - المَنْعَىٰ - رکنا - محفوظ ہو جانا - مَنُعَ الرَّجُلُ - آدمی محفوظ ہو گیا - حِصْنٌ مَنِيْعٌ - محفوظ اور مضبوط قلعہ - اَلْمُمَانَعَةُ - ایک دوسرے کو روکنے کے لئے جھگڑنا * -

قرآن کریم میں ہے - وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ (۲/۱۱۴) - " اس سے بڑھ کر زیادتی کرنے والا کون ہے جو (لوگوں کو) اس سے روکتا ہے کہ وہ مساجد میں اللہ کا نام لیں " - اس میں مَنْعٌ کے معنی رکاوٹ ڈالنا ، حائل ہونا ہیں - سورہ نساء میں ہے

---

*د - **راغب -

وَنَمْنَعْكُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۴/۱۴۱) - اسکے معنی حفاظت یا مدافعت کرنے کے ہیں - " (کیا) ہم نے مومنوں سے تمہاری حفاظت نہیں کی ؟ "

سورۂ الماعون میں ہے - وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۷) - جو چیزیں بہتے پانی کی طرح عام ہونی چاہئیں یہ ان کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں اور انہیں روک کر اپنی ملکیت میں لے لیتے ہیں - سورہ معارج میں انسان کی عام نفسیاتی کیفیت کے متعلق ہے کہ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (۷۰/۲۱) - جب اسکے پاس مال و دولت آتا ہے تو وہ اسے نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھنے کے بجائے اسے روک کر بیٹھ جاتا ہے - اس سے اگلی آیت میں ہے کہ اس ذہنیت کا علاج نظام صلٰوۃ کی رو سے ہو سکتا ہے - جیسا کہ (۷۰/۲۵) میں بھی کہا گیا ہے - اسی کو سورہ ق میں مَنَّاعٍ لِلْخَيْرِ (۵۰/۲۵) کہا گیا ہے - اسکے برعکس جنّتی معاشرہ کے متعلق ہے کہ اس میں سامان خور و نوش بڑی کثرت سے ہوگا (۲/۳۵ ; ۲۰/۱۱۸) - اور کوئی اسکے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالے گا - کوئی اسے روک کر نہیں رکھے گا - (۱۰۷/۷ ; ۵۶/۳۳) وہ سب کی پرورش کے لئے عام ہوگا (۴۱/۱۰) -

م ن ن

مَنّ - ہر اس احسان الہٰی کو کہتے ہیں جس کے حاصل کرنے میں کسی قسم کی محنت و مشقت نہ اٹھانی جائے - مَنَّ عَلَيْهِ - اس پر احسان کیا - یعنی بلا مزد و معاوضہ کچھ عطا کر دیا - اِمْتَنَّ عَلَيْهِ کے بھی یہی معنی ہیں - نیز مَنّ کے معنی احسان جتلانے کے بھی ہیں ، جو معیوب ہے - اَلْمَنُوْنُ - بہت احسان جتانے والا - نیز زمانہ اور موت کو بھی کہتے ہیں - اسی سے رَيْبُ الْمَنُوْنِ - حوادث روز گار کو کہتے ہیں - اَلْمَنَّانُ - بہت زیادہ انعامات عطا کرنے والا * -

قرآن کریم میں وحی کو بھی مَنّ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے بلا کسب و ہنر محض وہبی طور پر عطا ہوتی ہے (۱۴/۱۱) - یہ مَنّ رسول پر ہے - اور رسول کا اس وحی کو لیکر انسانوں کے پاس آنا ، ان انسانوں پر خدا کا مَنّ ہے (۳/۱۶۳) - قوم بنی اسرائیل کا فرعون کے استبداد سے نجات پا لینا خدا کا مَنّ تھا (۲۸/۵) -

سورہ محمد میں جنگ کے قیدیوں کے متعلق ہے کہ انہیں مَنًّا چھوڑ دو ، یا فِدَاءً (۴۷/۴) - یعنی بطور احسان (بلا معاوضہ) یا فدیہ لیکر - سورہ

* تاج و محیط - اقرب الموارد

ص ' میں یہ لفظ اَمْسِکْ کے مقابل میں آیا ہے جسکے معنی روک رکھنے کے ہیں (۳۸/۳۹) - اس سے ظاہر ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو بہرحال چھوڑنا ہوگا - زرفدیہ لیکر ہو یا احساناً - سورہ المدثر میں ہے وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۷۴/۶) - "اس نیت سے احسان نہ کر کہ اسکے بدلے میں تجھے اس سے زیادہ واپس ملے گا" - یہاں سے مَنّ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں - سورہ بقرہ میں ہے کہ مومن وہ ہیں جو "اللہ کی راہ" میں اسطرح صرف کرتے ہیں کہ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى (۲/۲۶۲) - وہ نہ اس کے معاوضہ کا خیال کرتے ہیں اور نہ ہی احسان جتا کر وجہ اذیت بنتے ہیں - مَنّ دراصل ایک بھاری وزن ہوتا ہے *- لہذا احسان جتانے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو (احسان کے) بھاری بوجھ کے نیچے دبا دیا جائے -

اس بوجھ کے اعتبار سے مَنّ کے معنی ہوتے ہیں تھکا دینا - لاغر اور کمزور کر دینا - مَنّ النَّاقَةَ - اونٹنی کو سفر کی تکلیف سے تھکا دیا اور لاغر اور کمزور کر دیا - مَنّ السَّيْرُ فُلَانًا - اسے چلنے نے کمزور کر دیا - ذَهَبَ بِمُنَّتِهٖ - اسکی طاقت زائل کر دی - اَلْمَنِيْنُ - کمزور رسی یا کمزور آدمی - ثَوْبٌ مَنِيْنٌ - کمزور اور بوسیدہ کپڑا - اَلْمَنِيْنَةُ - مکڑی - مَنَّ الشَّيْءُ - چیز کم ہو گئی - اسی اعتبار سے مَنُوْنٌ موت کو کہتے ہیں، نیز زمانہ کو - مَنَّ الْحَبْلَ کے معنی ہیں رسی کو کاٹ دیا - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) کاٹنا اور (۲) احسان کرنا ، لکھے ہیں - قرآن کریم میں ہے فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (۴۱/۸ ; ۸۴/۲۵ ; ۹۵/۶) - ان کے لئے ایسا اجر ہے جس میں کمی نہیں ہوگی - غیر منقطع - مسلسل جاری رہنے والا - (سلسلہ ارتقاء میں کوئی چیز آگے بڑھ کر پیچھے نہیں آسکتی - یا وہ رک جائیگی اور یا آگے بڑھتی جائیگی) - اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ اجر انہیں بطور احسان نہیں ملےگا بطور استحقاق ملے گا -

رَيْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰) - زمانے کی اضطرابی کیفیتیں - گردش زمانہ - مرور وقت - حوادث روز گار - واضح رہے کہ یہ لفظ متضاد معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے - یعنی اَلْمُنَّةُ - قوت کو بھی کہتے ہیں - بالخصوص دل کی قوت کو - اسلئے مَمْنُوْنٌ کے معنی کمزور اور قوی دونوں آتے ہیں ** - الرمانی نے اَلْمَنُوْنُ کے معنی موت لکھے ہیں *** - صاحب لطائف اللغۃ نے اسکے معنی اَلدَّهْرُ یعنی زمانہ کے دئے ہیں -

*تاج و محیط و اقرب الموارد **تاج و راغب - ***الالفاظ المترادفۃ -

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ ان پر مَنّ نازل ہوتا تھا۔ (۲/۵۷)۔ یہ شیر خشت یا ترنجبین کی قسم کی ایک میٹھی گوند تھی جو درختوں پر جم جاتی تھی *۔ (یہ اب بھی ہوتی ہے اور لذیذ ہوتی ہے۔) لیکن راغب نے اس معنے کے ساتھ دوسرا مفہوم یہ بھی بتایا ہے کہ مَنّ اور سَلْوٰی سے خدا کے انعامات کی طرف اشارہ ہے۔ مَنّ۔ احسان اور سَلْوٰی۔ تسلی کا سامان *۔

مَنٰوۃ

مَنٰوۃ۔ جاہلیت عرب میں قبیلہ ہذیل و خزاعہ کا بت تھا **۔ (۵۳/۲۰)۔ لات قبیلہ ثقیف کا اور عزّٰی قبیلہ غطفان کا۔ ان تینوں کا ذکر (۵۳/۱۹-۲۰) میں آیا ہے۔

م ن ی

مَنَاہُ یَمْنِیْہِ مَنْیًا۔ اسکا اندازہ کیا۔ اَلْمَانِیْ۔ اندازہ کرنیوالا۔ اَلْمَنٰی۔ اللہ کا اندازہ۔ اَلْمَنِیَّۃُ۔ موت کو کہتے ہیں کیونکہ اس کا اندازہ مقرر کر دیا گیا ہے*۔ اَلْمُنٰی (واحد مُنْیَۃٌ) مقاصد۔ خواہشات۔ آرزوئیں۔ یعنی وہ کام جن کا پہلے سے اندازہ کر لیا جائے۔ تَمَنَّاہُ تَمَنِّیًا۔ اس کا ارادہ کیا۔ اس کی تمنا کی۔ اُمْنِیَّۃٌ (جمع اَمَانِیّ)۔ خواہش۔ آرزو۔ ارادہ*۔ نیز اس کے معنی جھوٹ اور کذب کے بھی ہیں۔ تَمَنَّی الْحَدِیْثَ۔ بات گھڑ لی۔ اَلْاَمَانِیّ۔ وہ باتیں جن کی تمنا کی جائے اور اکاذیب۔ دونوں معنی ہیں*۔

اَلْمَنِیّ۔ نطفہ (خواہش اور ارادہ کے اعتبار سے۔ یا اس اعتبار سے کہ اس سے انسان کی پیدائش کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ابن فارس)۔

تَمَنَّی الْکِتَابَ۔ کتاب کو پڑھا۔ اُمْنِیَّۃٌ۔ کتاب کی تلاوت۔ جو کچھ پڑھا جائے ***۔ اس معنی کے لئے تاج العروس نے خاص طور پر اشعار بطور سند نقل کئے ہیں۔ اور ابن فارس نے کہا ہے کہ پڑھنے سے کتاب کے مفہوم کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَ مِنْھُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتَابَ اِلَّا اَمَانِیَّ (۲/۷۸)۔ "ان میں ان پڑھ لوگ بھی ہیں جو صرف کتاب کی تلاوت کر سکتے ہیں"۔ (اس کے مطالب کو سمجھ نہیں سکتے)۔ سورۃ حج میں ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ فَیَنْسَخُ اللّٰہُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ (۲۲/۵۲)۔ اور ہم نے تجھ سے

*تاج و راغب۔　**تاج و محیط۔　***ابن قتیبہ (القرطین ج/۲ صفحہ ۳۱) نیز ابن فارس۔

پہلے جس رسول اور نبی کو بھیجا تو اس کے ساتھ یہی ہوا کہ (اس کے جانے کے بعد) شیطان (دین سے منحرف کرنے والے لوگ) اس کی کتاب میں (یعنی جس کی وہ تلاوت کرتا تھا** - اس وحی میں) اپنی طرف سے کچھ ملا دیتے - اس کے لئے اللہ پھر ایک رسول بھیجتا جو اس غیر خدائی تبدیلیوں اور اضافوں کو مٹاتا اور اس طرح وحی کو پھر اس کی منزہ شکل میں پیش کردیتا - اس آیت میں اللہ نے بتایا ہے کہ کس طرح مفاد پرست اور سرکش لوگ وحی میں رد و بدل کر دیتے تھے اور کس طرح دوسرا رسول آ کر ان تبدیلیوں کو مٹاتا تھا - یہ سلسلہ جاری رہا تاآنکہ قرآن کریم آیا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے لی - اب اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے اس آیت کا صحیح مفہوم - لیکن بہت سے مفسرین نے پہلے، اُمْنِیَّتِہٖ کے معنی ''آرزو'' کر کے خود ہی ایک مشکل پیدا کرلی اور پھر اس مشکل سے نکلنے کے لئے اس قسم کا قصہ وضع کیا جس کے تصور سے بھی روح کانپتی ہے - چونکہ اس قصہ سے حضور رسالتمآب ؐ کی شان اقدس پر طعن پڑتا ہے اس لئے ہم اسے یہاں دھرانا نہیں چاہتے -

مَنِیٌّ - نطفہ - اَلَمْ یَکُ نُطْفَۃً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی (۷۵/۳۷) - ''کیا وہ (انسان) منی کا ایک نطفہ نہیں تھا جو ڈالی جاتی ہے'' -

م و ت

مَوْتٌ - در اصل حیات کی ضد ہے - مجازاً یہ سکون کے لئے بھی بولا جاتا ہے* - ہر وہ چیز جس میں جمود کی وجہ سے حرکت و ارتقاء رک جائے، مردہ ہے - چنانچہ کہتے ہیں مَاتَتِ الرِّیْحُ - یعنی ہوا رک گئی اور ساکن ہو گئی - مَاتَتِ النَّارُ - آگ بجھ گئی - مَاتَتِ الْخَمْرُ - شراب کا جوش جاتا رہا - نیند پر بھی اسکا اطلاق ہوتا ہے - چنانچہ مَاتَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں وہ سو گیا* - دراصل حیات کے مقابلہ میں موت کی بھی کئی قسمیں ہیں - مثلاً (۱) قوت نامیہ (بڑھنے پھولنے کی قوت) کا زائل ہو جانا - جیسے وَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا (۳۰/۱۹) - اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے - (۲) محسوس کرنے کی قوت کا زائل ہو جانا - جیسے قَالَتْ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا وَ کُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا (۱۹/۲۳) - مریم نے کہا کہ اے کاش میں اس سے پہلے ہی مرجاتی اور بھولی بسری ہو جاتی - اور اس درد و کرب کو محسوس نہ کرسکتی - (۳) عقل و شعور کا زوال - جیسے فَاِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی (۳۰/۵۲) - تو مردوں کو نہیں سنا سکتا - یعنی ان لوگوں کو جو عقل و شعور

*تاج و محیط نیز راغب - **ابن قتیبہ القرطین ج/۲ ص ۳۱

سے کام نہیں لیتے - (۴) حزن اور خوف جو زندگی کو مکدر کردے - یعنی ہر مشقت حالات ، افلاس ، ذلت ، محکومی کی زندگی وغیرہ جیسے - وَ یَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (۱۴/۱۷) - یعنی چاروں طرف سے ذلت و افلاس اور تباہیاں اور بربادیاں امنڈ امنڈ کر آرہی ہونگی لیکن موت نہیں آئے گی - اس لئے کہ بھوک کے ٹکڑوں سے اتنا کچھ مل جائے گا جس سے طبیعی زندگی باقی رہے* - (یہ جہنم کی زندگی کا نقشہ ہے) - مَوْتٌ - غشی اور جنون کو بھی کہتے ہیں - اَلْمَيِّتَةُ - وہ جانور جو بلا ذبح کئے مر جائے* - اَلْمَوْتَةُ - جنون کے مشابہ ایک کیفیت ہوتی ہے جو بعض آدمیوں کی ہو جاتی ہے - (ابن فارس)-

قرآن کریم میں موت کا لفظ حیات (زندگی) کے مقابلہ میں آیا ہے (۲/۲۸)- جس طرح حیات صرف سانس لینے کا نام نہیں بلکہ اس کے گونا گوں پہلو ہیں اسی طرح موت بھی صرف سانس بند ہو جانے کا نام نہیں - اس کے بھی مختلف پہلو ہیں - اور بدترین موت ہے قوموں کی اجتماعی زندگی کی موت جس میں وہ نہ زندہ ہوتی ہیں اور نہ مرتی ہی ہیں - یہ زندگی جہنم کی زندگی ہے - ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (۸۷/۱۳) - قرآن کریم کا پیغام حیات آور انہی اقوام کے لئے ہے جن میں زندگی کی صلاحیت باقی ہو - لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳٦/۷۰) -

قرآن کریم میں جہاں یہ لفظ آئے ، اس کے سیاق و سباق سے یہ متعین کرنا ہوگا کہ وہاں اس کے کون سے معانی مراد ہیں - ہر مقام پر موت کے معنی طبیعی موت (Physical Death) نہیں ہونگے -

(نیز دیکھئے عنوان ح - ی - ی) -

م و ج

اَلْمَوْجُ - لہر - مَاجَ الْمَوْجُ - لہر بلند ہوئی - اَلْمَوْجُ - سمندر کی موجوں کا اضطراب - مَاجَ يَمُوْجُ - اضطراب اور تحیر کو کہتے ہیں** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اضطراب کے ہیں - مَوْجَةُ الشَّبَابِ - جوانی کی لہر کو کہتے ہیں - عنفوان شباب** -

قرآن کریم میں مَوْجٌ کا لفظ دریا یا سمندر کی لہروں کے لئے آیا ہے - (۱۱/۴۲) -

*تاج و محیط نیز راغب - ** تاج -

م و ر

مَارَ الشَّیْءُ یَمُوْرُ۔ کسی چیز کا بار بار آنا۔ متردد ہونا ۔ اَلْمَوْرُ۔ گھومنا ۔ موج و اضطراب ۔ زمین پر تیزی سے بہنا اور بہ سرعت متحرک ہونا ۔ مَارَ مَوْرًا۔ وہ آنے جانے لگا ۔ اَلْمَوْرُ ۔ روندا ہؤا ، ہموار راستہ ۔ تیز رفتاری ۔ سرعت ۔ نیز نرم روی ۔ اَلْمُوْرُ ۔ مٹی جسے ہوا آڑائے* ۔

قرآن کریم میں ہے یَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا (۵۲/۹) ۔ جس (انقلاب کی گھڑی میں) بلندیوں والے اپنے مقام سے ہل کر سخت مضطرب اور اور متردد ہوجائیں گے۔ (یہ مفہوم سماء کے مجازی معنی کی رو سے لیا گیا ہے) ۔

موسیٰ علیہ اسلام

اَلْمُوْسٰی ۔ اُسترا ۔ مَاسَ رَاْسَہٗ ۔ اس نے اس کے سر کو استرے سے مونڈ دیا ** ۔

مُوْسٰی ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ۔ یہ عبرانی لفظ مُوْشَی کا معرب ہے جسکے معنی کھینچکر نکالا ہوا ہوتے ہیں** ۔ چونکہ فرعون کے لوگوں نے حضرت موسیٰؑ کو دریا سے نکالا تھا اس لئے آپ کا یہ نام قرار پا گیا***۔

حضرت ابراہیمؑ کے پوتے ، حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا ۔ آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں ۔ آپ کے ایک بیٹے کا نام یہودہ (Juda) تھا ۔ یہودہ اور بن یامین) کا قبیلہ ، فلسطین کے علاقہ (Judea)) میں آباد تھا ۔ ان دونوں قبائل کے افراد کو اسی نسبت سے یہودی کہتے تھے اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل ۔ لیکن بعد میں یہ تفریق باقی نہ رہی ۔ اب بنی اسرائیل اور یہودی سے بالعموم ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے ۔

حضرت یعقوبؑ کا وطن کنعان (فلسطین) تھا ۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے (جو مشیت کی تدبیر کے ماتحت عجیب حالات میں مصر پہنچ گئے تھے ۔ دیکھئے عنوان یوسفؑ) اپنے والدین اور دیگر اہل خاندان کو مصر بلا لیا تھا ۔ اس طرح بنی اسرائیل مصر میں آباد ہوئے اور بڑھتے بڑھتے ایک کثیر التعداد قوم بن گئے ۔

مصر میں فراعنہ کی حکومت تھی ۔ " فرعون " کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں تھا بلکہ شاہان مصر کا لقب تھا ۔ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

کرتے تھے '' آمن رع '' (سورج کا دیوتا) ان سب میں بڑا تھا ۔ مصر کے بادشاہ دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے ۔ اس اعتبار سے ان کا لقب فارا ع (یعنی سورج دیوتا کا اوتار) قرار پا گیا ۔ قریب تین ہزار سال قبل مسیح سے لیکر اسکندر کے زمانہ (۳۳۲ ۔ ق ۔ م) تک فراعنہ کے قریب تیس خاندان مصر پر حکمران رہے ۔ حضرت یوسف[ؑ] کے زمانہ میں ہیکسوس (Hyksos) کا خاندان برسر حکومت تھا جنہیں عمالقہ کہتے تھے ۔

مصر میں بنی اسرائیل کی ابتداء تو ایک معزز گھرانے کی حیثیت سے ہوئی لیکن رفتہ رفتہ یہ قوم فرعون کے محکوم ہو گئے اور ان کے ساتھ وہی سلوک ہونے لگا جو دنیا کا ہر فرعون ، محکوم قوم کے ساتھ کرتا ہے ۔ جب ان پر ظلم و تشدد اپنی انتہا تک پہنچ گیا تو ان میں حضرت موسیٰ[ؑ] پیدا ہوئے جو خدا کے برگزیدہ رسول اور عظیم الشان داعی انقلاب تھے ۔

آپ[ؑ] پیدا تو ہوئے محکوم بنی اسرائیل کے گھرانے میں لیکن مشیت ایزدی نے آپ کی تربیت کا انتظام فرعون کے محلات میں کر دیا تا کہ آپ[ؑ] اسرار و رموز مملکت و سیاست سے اچھی طرح باخبر ہو جائیں (۲۸/۷-۱۴)۔ یہاں سے آپ نکلے تو مدین کے علاقہ میں پہنچے (۲۸/۲۲) ۔ جہاں آپ کی شادی ہوئی اور آپ نے آداب شبانی سیکھے ۔

مدین سے واپسی پر ، کوہ طور پر آپ نبوت سے سرفراز فرمائے گئے (۲۰/۱۲-۱۳) اور آپ کو حکم ہوا کہ آپ فرعون کیطرف جائیں اور بنی اسرائیل کو اسکے پنجۂ استبداد سے نجات دلائیں ۔ آپ آئے اور اپنے بھائی ہارون[ؑ] کے ساتھ فرعون کے پاس پہنچے (۲۸/۳۲ ; ۲۰/۴۳-۴۴) ۔ فرعون اور اسکے پیشوایان مذہب کے ساتھ آپ کے معرکے رہے اور بالآخر آپ ، بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر فلسطین کیطرف آگئے (۲۰/۷۷) اور وہاں ان کی تعلیم و تربیت کی ۔ اور خدا نے بنی اسرائیل کو اُس با برکت زمین کے مشارق و مغارب کا مالک بنا دیا (۷/۱۳۷)۔ تورات کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ[ؑ] نے موآب کی سرزمین میں ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی (دیکھئے استثناء ۳۴/۵) ۔ حضرت ہارون[ؑ] کی وفات اس سے پہلے ہو چکی تھی ۔ (قرآن کریم نے ان تفاصیل کا ذکر نہیں کیا)۔

تورات کے بیان کے مطابق حضرت یوشع بن نون آپ کے جانشین ہوئے۔ اس کے بعد ، قوم بنی اسرائیل کا عروج ، طبقاً عن طبقٍ بلند سے بلند تر ہوتا گیا ۔ یہی وہ دور تھا جس میں یہ سطوت داؤدی[ؑ] اور شوکت سلیمانی[ؑ] کے وارث ہوئے ۔ پھر انہوں نے حبل اللہ سے تمسک، یعنی قوانین خداوندی کا اتباع

چھوڑ دیا تو ذلت و مسکنت کی لعنت ان کے پیچھے لگ گئی - ان کی پہلی تباہی بخت نصر (بابلی) کے ہاتھوں ۵۹۹ ق - م میں ہوئی - اس نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور یہودیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا - قریب ایک سو سال کے اندر، فارس کے تین شہنشاہ، خورس (ذوالقرنین) دارا اور ارتخششتا ان کی امداد پر آمادہ ہوگئے اور اسطرح یہ پھر یروشلم میں آکر آباد ہوگئے - (سورہ بقرہ آیت ۲۵۹ میں تمثیلی انداز میں ان کی اس تباہی اور باز آفرینی کا ذکر کیا گیا ہے) - ۳۳۲ ق - م میں اسکندر (یونانی) نے یہودیوں کی مرکزیت پر پھر ایک کاری ضرب لگائی - پھر ۳۲۰ ق - م میں بطلیموس نے مصر کے راستے یروشلم پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کر لیا - انٹی گونس کے عہد میں یہ تمام علاقہ یونانیوں کے قبضہ میں آگیا اور یہودیوں پر سخت مظالم شروع ہوگئے - ٦٦ ق - م میں ان کی آخری تباہی کی تمہید شروع ہوگئی - پامپئی رومی بڑھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا - اس تاخت و تاراج میں قریب بارہ ہزار یہودی تباہ ہوگئے - پھر ۵۰ ق - م کے قریب ایک اور یورش میں قریب تیس ہزار یہودی غلام بنا لئے گئے - فطرت کی طرف سے انہیں باز آفرینی کا موقعہ دیا گیا جب ان میں حضرت عیسیٰؑ جیسے جلیل القدر رسول مبعوث ہوئے لیکن انہوں نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ دنیا پر روشن ہے - اس اتمام حجت کے بعد ان کی تباہی کا آخری وقت آگیا - چنانچہ رومیوں کے گورنر طیطوس (ٹائٹس) نے ۷۰ء میں ایسا وار کیا جس سے اس قوم پر اجتماعی ھلاکت کی مہرثبت ہوگئی -

سورہ بنی اسرائیل میں بخت نصر کے ہاتھوں پہلی بربادی اور اس آخری بربادی کے متعلق ذکر آیا ہے (دیکھئے ع-ب-د) -

حضرت موسیٰؑ خدا کے نبی تھے - انہیں اللہ نے کتاب دی تھی - وَاِذْ آتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ (۲/۵۳) حضرت هارونؑ بھی نبی تھے - انہیں بھی کتاب ملی تھی - چنانچہ سورہ صٰفٰت میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت هارونؑ دونوں کے تذکرہ کے سلسلہ میں ہے وَآتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ (۳۷/۱۱۷) "اور ہم نے ان دونوں کو واضح کتاب عطا فرمائی" - قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ یا حضرت هارونؑ کی کتاب کا نام مذکور نہیں - اَلتَّوْرَاةَ کا ذکر ہے (۵/۴۴) - لیکن تورات درحقیقت ان کتابوں کے مجموعہ کا نام ہے جو حضرت موسیٰؑ سے لیکر حضرت عیسیٰؑ سے پہلے مختلف انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوتی رہیں - ان کے مجموعہ کو عہد نامہ عتیق (Old Testament) کہتے ہیں -

یہودیوں نے اس کتاب میں تحریف کر دی تھی ۔ لفظی تحریف بھی (۴/۴۶) اور معنوی بھی (۲/۷۵) ۔ نیز اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کردئیے تھے (۲/۷۹)۔ اور یوں تلبیسِ حق و باطل ہوگئی تھی (۳/۷۱) ۔ اس لئے اس میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے تھے (۱۱/۱۱۰) ۔ ان کی تبئین و توضیح قرآن کریم نے آکر کی (۵/۱۵) ۔ [نیز دیکھئے عنوان " تَوْرَات "]

م و ل

اَلْمَالُ ۔ ہر وہ چیز جس کے تم مالک ہو جاؤ ۔ اس کی جمع اَمْوَالٌ آتی ہے ۔ ابن الاثیر نے کہا ہے کہ دراصل مَالٌ اس سونے چاندی کو کہتے ہیں جس کا کوئی مالک بن جائے ۔ اس کے بعد دوسری چیزوں کے ذخیرہ کو بھی مَالٌ کہنے لگ گئے ۔ ویسے عربوں کے ہاں زیادہ تر اونٹوں کے گلے کو مَالٌ کہتے تھے کیونکہ ان کے مال زیادہ تر اونٹوں ہی کی شکل میں ہوتے تھے ۔ رَجُلٌ مَّيِّلٌ ۔ بڑا مال دار آدمی ۔ مُلْتُهٗ ۔ میں نے اسے مال دے دیا ۔ تَمَوَّلْتُ اور اِسْتَمَلْتُ کے معنے ہیں ، میں بہت مالدار ہو گیا ۔ مَوَّلَهٗ ۔ اس نے اسے مال دار کر دیا* ۔ عام ائمہ لغت کے نزدیک اَلْمَالُ کے مادہ کا درمیانی لفظ واو ہی ہے ۔ لیکن راغب نے اسے اَلْمَيْلُ کے تحت لکھا ہے اور بتایا ہے کہ مال کو مال اس لئے کہتے ہیں کہ وہ کبھی ایک کی طرف مائل رہتا ہے اور کبھی دوسرے کی طرف** ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے اس لئے مال کہا گیا ہو کہ اس کی خاطر انسان کو کسی ایک طرف جھکنا پڑتا ہے ۔ لیکن اگر راغب کی تحقیق صحیح ہوتی تو مَالٌ کی جمع اَمْيَالٌ ہوتی نہ کہ اَمْوَالٌ ۔

نظام خداوندی کے قیام کے لئے جد و جہد کرنے میں جماعت مومنین کو جن مشکلات سے دو چار ہونا پڑتا ہے ان میں نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ (۲/۱۵۵) بھی ہے ۔ یعنی مال و دولت میں کمی ہو جانا ۔ لیکن اس کے بعد اس جماعت کو ، ان کے مخالفین کے اَمْوَالٌ کا مالک بنا دیا جاتا ہے اور انہیں ہر طرح کی فراوانی حاصل ہو جاتی ہے (۳۳/۲۷) ۔ لہذا مال کی فراوانی ، نظام خداوندی کا لازمی نتیجہ اور خدا کی رحمت ہے ۔ لیکن وہی مال جو نظام ربوبیت کی اجتماعی تحویل میں ہو (۹/۱۱۱) ۔ اگر ہر فرد اپنا اپنا مال اپنے ہی مفاد کی خاطر جمع کرے تو اس مال سے وہ جہنم تیار ہوتی رہتی ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں (۱۰۴/۲-۷) ۔ اسی کا نام سرمایہ داری ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن کریم آیا تھا ۔ (۹/۳۴-۳۵) ۔

---

*تاج و محیط ۔ **راغب ۔

م و ہ

مَاءٌ ۔ دراصل مَوَہٌ تھا ۔ واو کو الف سے بدل دیا اور ھاء کو ھمزہ سے ۔ اس طرح یہ لفظ مَاءٌ بن گیا ۔ اس کے معنی ھیں ۔ پانی ۔ اس کی جمع مِیَاہٌ آتی ھے ۔ مَاھَتِ السَّفِیْنَۃُ کے معنی ھیں کشتی میں پانی بھر گیا ۔ بَنُوْ مَاءِ السَّمَاءِ ۔ عربوں کو کہتے تھے کیونکہ وہ بارش کی تلاش میں رھتے اور جہاں بارش کا پانی ملتا وھیں پہنچ جاتے* ۔

قرآن کریم میں ھے کَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَاءِ (۱۱/۷) ۔ خدا کا عرش پانی پر تھا ۔ اس کے مفہوم کے لئے ع ۔ ر ۔ ش کا عنوان دیکھئے ۔

م ہ د

مَھْدٌ کے معنی ھیں جگہ کو ھموار اور نرم بنانا ۔ اَلْمَھْدُ ۔ نرم اور ھموار زمین ۔ اَلْمِھَادُ ۔ بستر کو کہتے ھیں کیونکہ وہ نرم اور ھموار ھوتا ھے**۔ بچھی ھوئی اور ھموار ھونے کی جہت سے قرآن کریم میں زمین کو مِھَادًا کہا گیا ھے (۷۸/۶) ۔ یعنی وسیع بچھائی ھوئی اور ھموار ۔ چونکہ بچے کا بستر ھموار اور نرم ھوتا ھے اس لئے اسے اَلْمَھْدُ کہتے ھیں ۔ یعنی گہوارہ*** ۔

تَمْھِیْدُ الْاَمْرِ کے معنی ھیں کسی معاملہ کو ھموار کرنا اور درست کرنا ۔ تاج نے راغب کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ھے کہ مجازاً اس سے مراد مال و جاہ میں فراخی کرنے کے ھو جاتے ھیں** ۔ یعنی نرم اور پُر آسائش زندگی بنانا ۔ قرآن کریم میں ھے ۔ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِھِمْ یَمْھَدُوْنَ (۳۰/۴۴) ۔ جو صلاحیت بخش کام کرتے ھیں وہ اپنی ذات کے لئے آسائشیں بہم پہنچاتے ھیں اور اسکی اصلاح اور ھمواری کی کوشش کرتے ھیں ۔ سورۃ بقرہ میں جہنم کو بِئْسَ الْمِھَادُ (۲/۲۰۶) کہا ھے ۔ یہاں اس کے معنی رھنے یا ٹھہرنے کے مقام کے ھیں ۔

قرآن کریم میں اللہ کو مَاھِدٌ کہا گیا ھے ۔ وَ الْاَرْضَ فَرَشْنٰھَا فَنِعْمَ الْمٰھِدُوْنَ (۵۱/۴۸) ۔ اور ھم نے زمین کو بچھایا اور ھم کیا اچھے آسائشیں بہم پہنچانے والے ، یا ٹھکانا مہیا کرنے والے ھیں ۔

سورۃ مریم میں ھے کہ حضرت مریمؑ اپنے بیٹے حضرت عیسیٰؑ کو ساتھ لے کر ھیکل کے پجاریوں کے پاس آئیں تو وہ (احبار و رھبان) ان کے پیچھے پڑ گئے (کہ انہوں نے ھیکل کی راھبہ کی زندگی چھوڑ کر آئین خانقاھیت کے خلاف

*تاج نیز ابن فارس ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

متاهل زندگی کیوں اختیار کرلی تھی) - انہوں نے خود جواب دینے کی بجائے حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کردیا کہ تمہارے اعتراضات کا یہ جواب دیں گے - اس پر ھیکل کے شیوخ نے نہایت طنز آمیز لہجے میں کہا کَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا (۱۹/۲۹) - ''ہم اس سے کسطرح بات کریں جو ابھی کل کا بچہ ہے'' - یہ ہمارے شایانِ شان نہیں کہ اس سے (جو ہماری سِن رسیدگی کے مقابلہ میں یوں ہے جیسے گود میں کھیل رہا ہو) جو کل ابھی ہمارے سامنے بچہ تھا - جو ہمارے ہاتھوں کا کھلایا ہوا ہے - اس سے ہم مناظرہ شروع کردیں - اس سے ''في المهد'' (جھولے میں) کے معنی واضح ہیں - ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں ''ابھی تو اس کے دودھ کے دانت ہیں'' - یا ''جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش'' - خود صَبِيًّا کے معنی بھی دودھ پیتا بچہ نہیں - (دیکھئے عنوان ص - ب - و)

یہی ''تکلم في المهد'' ہے (یعنی کم عمری میں لوگوں سے اہم حقائق پر گفتگو کرنا) جس کی طرف (۵/۱۱۰ و ۳/۴۵ میں) اشارہ کیا گیا ہے -

احبار و رهبان کے سوال کے جواب میں حضرت عیسیٰؑ نے جو کچھ کہا وہ خود اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ باتیں سچ مچ گہوارے میں لیٹے ہوئے نہیں کی گئی تھیں - آپ نے فرمایا اِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ - آتَانِيَ الْكِتَابَ وَ جَعَلَنِي نَبِيًّا . . . . (۱۹/۳۰) - میں خدا کا بندہ ہوں - اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے - اس سے ظاہر ہے کہ یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب حضرت عیسیٰؑ کو نبوت مل چکی تھی -

[مزید تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''شعلهٔ مستور''] -

م ہ ل

اَلْمَهْلُ - اَلْمَهَلُ - اَلْمُهْلَةُ - سکون - اطمینان - نرمی - اَمْهَلَهُ - اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا ، اس پر سختی نہیں کی - اسے مہلت دے دی - ڈھیل دیدی - تَمَهَّلَ فِي عَمَلِهِ - اس نے اپنے کام میں جلدی نہ کی ، اطمینان اور سکون سے کام لیا - اَلْمَهْلُ - سکینت اور وقار - نیز اچھے کام میں آگے بڑھنا - اَلْمَاهِلُ - تیز رو - آگے بڑھنے والا* - سورۃ طارق میں ہے فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (۸۶/۱۷) - ان مخالفین سے نرمی کا برتاؤ کرو اور انہیں تھوڑی سی مہلت دے دو - عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے - اسی کو مہلت کہتے ہیں - یہ خدا کے قانونِ تدریج و امہال کے مطابق طے پاتا ہے -

---

*تاج و راغب -

(غالباً) سکون و جمود کے لحاظ سے ، ہر دھات کو اَلْمُھْلُ کہتے ہیں - بعض نے کہا ہے کہ یہ پگھلے ہوئے پیتل ، تانبے یا لوہے کے لئے آتا ہے۔ دوسروں کے نزدیک یہ زیتون کے تیل اور اس کی تلچھٹ کے لئے آتا ہے - نیز یہ اس راکھ اور انگاروں کو بھی کہتے ہیں جو روٹی سے اس وقت جھڑتی ہے جب اسے بھوبھل سے نکالتے ہیں - قبیلہ عامر اس لفظ کو زہر کے لئے بولتا ہے* - بہر حال اس میں ہلاکت کا پہلو نمایاں ہے - سورۃ معارج میں ہے یَوْمَ تَکُوْنُ السَّمَآءُ کَالْمُھْلِ (۷۰/۸)- یہاں مُھْلٌ کے معنی پگھلی ہوئی دھات کے لئے جائیں تو زیادہ موزوں ہوگا- یعنی بڑے بڑے فلک نشین سرداروں کی قوتیں پگھل کر پانی ہو جائیں گی - سورۃ کہف میں ہے یُغَاثُوْا بِمَآءٍ کَالْمُھْلِ (۱۸/۲۹)- اہل جہنم کو جو پانی دیا جائے گا وہ مُھْلٌ کیطرح ہوگا - یہاں اس کے معنی زہر کئے جائیں تو بھی ٹھیک ہے اور اگر آتشین لاوا کئے جائیں تو بھی مناسب ہے - مطلب یہ ہے کہ مُمِدِّ حیات چیزیں بھی ان کے حق میں ہلاکت آفریں ہونگی-

مَھْمَا

مَھْمَا - (کہتے ہیں کہ یہ مَا اور مَا کا مرکب ہے اور پہلے مَا کا الف ہاء سے بدل دیا گیا ہے)- '' جو کوئی (چیز) بھی '' - '' جو کچھ بھی '' - وَقَالُوْا مَھْمَا تَاْتِنَا بِہٖ مِنْ اٰیَةٍ (۷/۱۳۲)- انہوں نے کہا کہ جو کوئی نشانی بھی تو لائے گا . . . . نیز اس کے معنی '' جب کبھی '' بھی ہوتے ہیں -

م ہ ن

مَاھَنَہٗ - اُس نے اسے اچھی طرح استعمال کیا - خوب رگڑا - اِسْتَھَنَہٗ - اس نے اس سے خدمت یعنی کام لیا اور اسطرح اسے کمزور کر دیا - اَلْمَتَھِیْنُ - اُس اونٹ کو کہتے ہیں جو کثرت محنت سے اسقدر کمزور ہو چکا ہو کہ اس سے اونٹنی کو حاملہ نہ کرایا جائے تا کہ کمزور بچے پیدا نہ ہوں - اَلْمَاھِنُ - غلام اور خدمتگار - اَلْمِھْنَةُ - خدمت کرنے میں مہارت و ہوشیاری - اَلْمَھِیْنُ مِنَ الرِّجَالِ - حقیر آدمی - ذلیل آدمی - قلیل الرائے - قلیل التمیز* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بے وقعتی اور حقارت کے ہوتے ہیں -

قرآن کریم میں اس مادہ کے لئے جس سے انسان کی (رحم میں) تخلیق ہوتی ہے سُلٰلَةٍ مِنْ مَآءٍ مَھِیْنٍ (۳۲/۸) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں -

*تاج و محیط -

یعنی کمزور اور حقیر پانی سے نکالے ہوئے جوہر کے ذریعے۔ تقابل کی غرض سے ایسا کہا گیا ہے۔ یعنی اس قسم کے حقیر سے قطرہ سے، اس قسم کا جیتا جاگتا، خوبصورت، ہونہار، سمیع و بصیر بچہ پیدا کر دینا، خدا کے قانونِ تخلیق کا کرشمہ ہے۔ کہاں وہ قطرۂ آب، کہاں یہ دُرِّ شاہوار!

م ی د

مَادَ قَوْمَہٗ۔ وہ اپنی قوم کے لئے سامان خوراک لایا۔ مَادَھُمْ یَمِیْدُھُمْ بمعنی مَارَھُمْ ہے۔ یعنی انہیں سامان خوراک دیا۔ اسی سے اَلْمُمْتَادُ۔ سامان خوراک لینے والے کو کہتے ہیں۔ مِدْتُہٗ۔ وَاَمَدْتُہٗ۔ میں نے اسے عطا کیا۔ مَادَنِیْ فُلَانٌ۔ فلاں نے مجھ پر احسان کیا*۔ راغب نے اسکے معنے "اس نے مجھے کھلایا" بھی لکھے ہیں**۔ مَادَ کے معنی شدت سے ہلنا اور حرکت کرنا بھی ہیں، نیز جھکنا۔ مَادَتْ بِہِ الاَرْضُ کے معنی ہیں زمین اسے لیکر گھومی۔ اَلْمَائِدَۃُ۔ کھانا۔ خواہ اس کے ساتھ خوان ہو یا نہ ہو۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ اَلْمَائِدَۃُ اس خوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا ہو۔ اگر اس پر کھانا نہ ہو تو اسے مائدۃ نہیں بلکہ خِوَانٌ کہیں گے۔ ابو عبید نے کہا ہے کہ اسے مَائِدَۃٌ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ میزبان کی طرف سے عطا اور تفضل کے طور پر مہمان کو دیا جاتا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں (۱) حرکت اور (۲) نفع پہنچانا ہیں۔

اَلْمَائِدَۃُ کے ان معانی کو سامنے رکھنے سے قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَائِدَۃً مِّنَ السَّمَاءِ (۵/۱۱۲) "وہ ہم پر آسمان سے مائدہ نازل کرے"۔ ہر نبی کی طرح، حضرت عیسیٰؑ بھی اپنی جماعت سے کہ رہے تھے کہ اگر وہ وحی کا اتباع کرتے رہے تو خدا انہیں رزق کریم دیگا۔ دنیا کی سرفرازیاں عطا کریگا۔ لیکن وہ جماعت جس قسم کے نامساعد حالات کا شکار ہو رہی تھی ان کے پیش نظر، یہ بعید دکھائی دیتا تھا کہ انہیں اس کشائش سے سامان زیست مل سکیگا۔ چنانچہ اس احساس کے ماتحت انہوں نے کہا کہ کیا ایسے حالات میں بھی یہ ممکن ہے کہ ایسا نظام قائم ہو جائے جس میں سب کو سامان نشو و نما انسانوں کی طرف سے نہ ملے بلکہ نظام خداوندی کی طرف سے ملے تاکہ انہیں روٹی کے بدلے انسانوں کی

*تاج۔ **راغب۔

غلامی اختیار نہ کرنی پڑے۔ حضرت عیسیٰؑ نے کہا کہ تم مومن ہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰہَ (۵/۱۱۲) ۔ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ خدا نے کہا کہ وہ یقیناً ایسا انتظام کردیگا (یعنی تقویٰ کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا) لیکن فَمَنْ یَّکْفُرْ بَعْدُ مِنْکُمْ فَاِنِّیْ اُعَذِّبُہٗ عَذَابًا . . . . . . (۵/۱۱۵) جو ہمارے اسطرح کے دئے ہوئے رزق پر پردہ پوشی کرنے لگیگا اور اس نظام سے سرکشی برتیگا، تو اسے سخت عذاب دیا جائیگا۔ لہذا مَائِدَۃً مِنَ السَّمَاءِ ، نظامِ ربوبیت کا دوسرا نام ہے اور تقویٰ کا لازمی نتیجہ۔

ویسے ان آیات کے جو عام معنی لئے جاتے ہیں انہیں قرآن کریم کے کسی اردو ترجمہ سے دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ ہم نے ان کا مفہوم بیان کیا ہے۔

سورہ نحل میں زمین کے متعلق ہے۔ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ (۱۶/۱۵) ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ تم اس پر اطمینان سے سکونت پذیر رہو اور یہ تمہیں لیکر گھومتی رہے*۔

کھلی اور فراخ جگہ کو اَلْمَیْدَانُ ۔ اَلْمِیْدَانُ کہتے ہیں *۔ لہذا مَائِدَۃٌ میں فراخی کا پہلو بھی ہے۔

م ی ر

اَلْمِیْرَۃُ ۔ کھانے کی چیزیں جنہیں کوئی شخص لاد کر لائے۔ مَارَ عِیَالَہٗ یَمِیْرُ ۔ مَیْرًا ۔ وہ اپنے گھر والوں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں لایا*۔ سورۃ یوسف میں ہے وَنَمِیْرُ اَھْلَنَا (۱۲/۶۵) ۔ ہم اپنے گھر والوں کے لئے غلہ (سامان خوراک) لائینگے۔

م ی ز

مَازَ یَمِیْزُ ۔ کسی چیز کو الگ کرلینا۔ علیحدہ کرلینا۔ فَامْتَازَ ۔ پس وہ چیز الگ ہوگئی*۔ راغب نے اس کے معنے ملتی جلتی چیزوں کو ایک دوسری سے الگ کرنے کے کئے ہیں**۔ قرآن کریم میں ہے حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ (۳/۱۷۸) ۔ تاآنکہ (خدا) خبیث کو طیب سے الگ کردے۔ سورۃ یٰسٓ میں ہے۔ وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّھَا الْمُجْرِمُوْنَ (۳۶/۵۹) ۔ اے مجرمو! تم اب الگ ہو جاؤ۔ تَمَیَّزَ ۔ الگ الگ ہو جانا۔ تَمَیَّزَ الرَّجُلُ مِنَ الْغَیْظِ ۔ وہ غصہ کی شدت سے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوا*۔ تَکَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ (۶۷/۸) ۔ قریب ہے کہ وہ جوش میں پھٹ پڑے۔ اَلتَّمْیِیْزُ ۔ ملتی جلتی چیزوں میں فصل کرنا**۔

*تاج و محیط۔ **راغب۔

مِیْکَالُ

سورۃ بقرہ میں جِبْرِیْلَ وَ مِیْکٰلَ آیا ہے (۲/۹۸)۔ اس فرشتہ (Michael) کو یہودی اپنا دوست سمجھتے تھے۔

م ی ل

مَالَ ۔ وہ جھکا۔ مَالَ اِلَیْہِ ۔ وہ اس کی طرف جھکا ۔ اس کی طرف مائل ہوا ۔ متوجہ ہوا ۔ مَالَ عَلَیْہِ ۔ وہ اس کے خلاف جُھکا ۔ اس پر ظلم کیا ۔ اُس پر حملہ آور ہوا (۴/۱۰۲) ۔ مَالَ عَنِ الْحَقِّ ۔ وہ انصاف کی راہ سے ہٹ گیا۔ اعراض برتا ۔ اَمَالَہٗ ۔ اسے جھکا لیا ۔ مَالَتِ الشَّمْسُ ۔ سورج مغرب کی طرف جھک گیا ۔ زوالِ آفتاب سے مراد ہے ۔ مَیَّلَ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ ۔ اس نے دو معاملوں میں تردد کیا کہ اس کام کو کرے یا اس کام کو ۔ یعنی اس کا دل کبھی اس کی طرف جُھکا اور کبھی اُس کی طرف*۔ مَیْلَۃٌ ۔ ایک بار جھکنا (۴/۱۰۲) ۔

اَلْمِیْلُ ۔ میل ۔ زمین کا ایک معین فاصلہ (مختلف مقامات پر اس فاصلہ کے تعین میں اختلاف ہے) ۔ وہ مینار جو راستہ پر مسافروں کی راہ نمائی کے لئے بنا دیا جاتا ہے ۔ نیز زمین کی طویل اور لامحدود مسافت کو بھی کہتے ہیں ۔ اور سرمہ کی سلائی کو بھی* ۔

راغب نے اَلْمَالُ کو بھی مَیْلٌ کے تحت ہی لکھا ہے اور بتایا ہے کہ مال کو اس لئے مَالٌ کہتے ہیں کہ وہ کبھی ایک کی طرف مائل رہتا ہے اور کبھی دوسرے کی طرف** ۔ لیکن ہم نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ (دیکھئے عنوان م ۔ و ۔ ل) ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

ن

ن

دیکھئے عنوان ، (ن - و - ن)

ن أ ی

نَاَیْتُهٗ وَ نَاَیْتُ عَنْهُ - میں اس سے دور ہوا - نَاٰی بِہٖ - اسے ہٹایا ، دورکیا ، ایک طرف کیا* - قرآن کریم میں ہے وَ هُمْ یَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ یَنْئَوْنَ عَنْهُ (۶/۲۶) - وہ (لوگوں کو اس قرآن کریم سے) روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں - اَلْمُنْتَاٰی - مقام بعید کو کہتے ہیں - اَلنُّؤْیُ - دراصل اس گڑھے یا نالے کو کہتے ہیں جو خیمہ کے ارد گرد اس غرض سے کھودا جاتا ہے کہ بارش کا پانی خیمہ کے اندر نہ آنے پائے - اس سے دور دور رہے - اسی سے اس کے معنی مفارقت کے بھی آتے ہیں* - اور اعراض برتنے کے بھی** - قرآن کریم میں ہے - اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِہٖ (۱۷/۸۳) - اعراض برتا اور سرکشی کرتے ہوئے اپنے آپ کو دور لے گیا - پہلو تہی کی - نَاَیٰ فِی الْاَرْضِ - وہ ملک میں دور چلا گیا* -

نا (ضمیر)

نَا - (۱) ضمیر مرفوع متصل ہے - جیسے فَعَلْنَا - ہم نے کیا - یہ تثنیہ - جمع - مذکر - مؤنث - سب کے لئے آتی ہے -

(۲) ضمیر منصوب متصل ہے - تثنیہ و جمع متکلم کے لئے آتی ہے - اور مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتی ہے - اَضَلّٰنَا - ان دونے ہمیں گمراہ کیا -

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے - رَبَّنَا - اے ہمارے رب - (تثنیہ و جمع - مذکر و مؤنث - متکلم کیلئے) -

---

*تاج - **راغب نیز ابن فارس -

قرآن کریم میں ہے وَ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا رَبَّنَا اَرِنَا الَّذَیْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ...... (۴۱/۲۹) - ''اور جو کافر ہیں وہ کہینگے - ''اے ہمارے رب! ان کو، جنہوں نے جن و انس میں سے ہمیں گمراہ کیا تھا ہمیں دکھا'' - دوسری جگہ ہے کَیْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ ..... (۱۴/۴۵)- ''ہم نے ان سے کیا معاملہ کیا...'' -

ن ب أ (ن ب و)

نَبَأٌ کے معنی ہیں خبر دینا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے کے ہیں - خبر کو بھی النَّبَأُ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے - راغب نے کہا ہے کہ نَبَأٌ - ہر خبر کو نہیں کہتے، بلکہ اس خبر کو کہتے ہیں جسمیں بڑا فائدہ ہو، اور اس سے علم حاصل ہو جائے یا وہ کم از کم ظن غالب تک پہنچ جائے - یہ خبر جھوٹ سے خالی ہونی چاہئے - جیسے تواتر یا خدا یا رسول کی دی ہوئی خبر* - لیکن یہ کلیہ صحیح نہیں - قرآن کریم میں ہے اِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا... (۴۹/۶) - ''اگر کوئی فتنہ جو تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اسکی تحقیق کرلیا کرو'' - یہاں فاسق کی لائی ہوئی خبر کو بھی نَبَأٌ کہا گیا ہے - اَنْبَأَ اور نَبَّأَ کے معنی خبر دینے کے ہیں* - نَبِّئْ عِبَادِیْ (۱۵/۴۹)- میرے بندوں کو یقینی طور پر بتا دے - وَ اتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ (۲۶/۶۹)- انہیں (کتاب اللہ سے) ابراھیم کی خبر (سرگزشت، یقینی واقعات) بتا دے -

نَبَأَ - نُبُوْءًا - کے معنی ہیں بلند ہونا - مرتفع ہونا - اَلنَّبْأَةُ - اونچی زمین کو کہتے ہیں - اَلنَّبِیْئُ - مرتفع جگہ اور واضح راستے کو کہتے ہیں جو ابھر کر سامنے آجاتا ہے* -

یہاں تک بات ن - ب - أ (مادہ) کے متعلق تھی - لیکن عربی زبان میں ایک مادہ نبو (ن - ب - و) بھی ہے - نُبُوٌّ - نَبْوَةٌ کے معنی ہیں بلند ہونا - مرتفع ہونا** - اَلنَّبَاوَةُ - اس زمین کو کہتے ہیں جو دوسری زمینوں سے اونچی ہو - اَلنَّبِیُّ - بلند جگہ کو کہتے ہیں - نیز بلند نشان راہ جس سے رهنمائی حاصل کی جائے* -

قرآن کریم میں اَلنَّبِیُّ کا لفظ رسول کے لئے آیا ہے - بعض کا خیال ہے کہ یہ نَبَأٌ سے مشتق ہے اور اسلئے اس کے معنی ہیں خبریں دینے والا - لیکن یہ تورات کا

*تاج و لطائف اللغۃ نیز اقرب الموارد - **تاج و ابن فارس -

دیا ہوا تصور ہے۔ یہودیوں میں نَبِیؐ ہیکل کے ایک خاص منصبدار کا لقب تھا۔ جو پیش گوئیاں کیا کرتا تھا۔ اسی لئے انگریزی میں نبی کو (Prophet) کہتے ہیں۔ یعنی پیش گوئیاں (Prophecies) کرنے والا۔ لیکن قرآن کریم نے نبوت کا جو تصور پیش کیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ نَبَاوَۃٌ سے مشتق ہے جس کے معنے ہیں بلند مقام۔ لہذا نبیؐ کے معنے ہیں مقام بلند پر کھڑا ہونے والا۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرمؐ سے کہا یا نَبِیءُ اللہ (ہمزہ سے، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ لفظ نبأٌ سے مشتق ہے) تو حضورؐ نے فرمایا لَسْتُ بِنَبِیءِ اللہ وَ لٰکِنْ نَبِیُّ اللہ۔ اس سے واضح ہے کہ یہ لفظ نَبَاوَۃٌ سے مشتق ہے۔ نبی اس مقام بلند پر ہوتا ہے جہاں سے اسے عالَمَ الغیب و الشهادة (دنیائے محسوس و غیر محسوس) دونوں کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف (وحی کے ذریعے) کائنات کے بنیادی حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے اور دوسری طرف ان حقائق کو دنیائے محسوسات تک پہنچاتا اور انہیں انسان کی تمدنی زندگی پر منطبق کرتا ہے۔ رسول اللہؐ نے جب اپنی نبوت کا اعلان قریش کے سامنے کیا تو اس سے اسی حقیقت کا اظہار مقصود تھا۔ آپ ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہو گئے اور قوم سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑ کی دوسری طرف ایک دشمن کا لشکر جرار تم پر حملہ آور ہونے کے لئے چلا آرہا ہے تو تم میری بات کا یقین کرو گے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ ضرور کرینگے۔ (ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے آپ پہاڑ کی دوسری جانب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اور ہم دامن کوہ سے اسکی دوسری سمت نہیں دیکھ سکتے)۔ اور دوسرے اس لئے کہ آپ نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ آپ نے فرمایا کہ پھر اسی طرح اس حقیقت کو بھی مان لو کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری موجودہ روش زندگی کے نتائج، ہلاکتوں اور بربادیوں کا ایک لشکر جرار اپنے ساتھ لئے تمہاری طرف بڑھے چلے آرہے ہیں۔ لہذا تم اس روش کو چھوڑ کر زندگی کی صحیح روش اختیار کرو۔

اس سے مقام نبوت کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ یعنی نبی، علم کے اس مقام بلند پر ہوتا ہے جہاں وہ (وحی کے ذریعے) حقائق کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ یہ مقام نبوت ہے۔ پھر وہ اس علم (وحی) کو لیکر انسانوں کی دنیا کی طرف آتا ہے تاکہ ان تک ان حقائق کو پہنچائے۔ اور عملاً متشکل کرکے دکھائے۔ یہ منصب رسالت ہے (یعنی وحی کا دوسروں تک پہنچانا)۔ نبوت، رسول اللہؐ پر ختم ہو گئی۔ اب کوئی انسان خدا کی طرف سے وحی نہیں پا سکتا۔ (اسلئے کہ جسقدر وحی کی ضرورت تھی وہ دیدی

گئی اور اسے قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دیا گیا)۔ باقی رہا فریضۂ رسالت۔ یعنی اس وحی کو عملاً متشکل کرنا اور دوسروں تک پہنچانا ۔ تو یہ فریضہ اس امت کے سپرد ہو گیا جسے کتاب اللہ کا وارث قرار دیا گیا ۔ (اسے تبلیغ اور اقامت دین کہا جائیگا ۔ '' رسالت'' کہنے سے غلط فہمی کا امکان ہوتا ہے)۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا ۔ رسول میں نبوت اور رسالت ایک ہی ذات کے اندر مجتمع ہوتی ہے اس لئے قرآن کریم کی رو سے ہر نبی رسول ہوتا ہے اور ہر رسول نبی ۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا ۔ ختم نبوت کے بعد اب کوئی نبی نہیں ہو سکتا ۔ نہ ہی اس معنی میں رسول ۔ لیکن تبلیغ (یعنی وحی کو دوسروں تک پہنچانے) کا فریضہ امت کے سپرد ہے ۔ لہذا امت اپنے نظام کی وساطت سے '' فریضۂ رسالت '' کی ادائیگی کے لئے رسول اللہ کی جانشین ہے ۔ قرآن کریم میں حضور خاتم النبین کی نبوت محفوظ ہے اور امت کے قرآنی نظام کے ذریعے '' فریضۂ رسالت '' قیامت تک مسلسل آگے جاسکتا ہے ۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رسول وہ ہے جو اپنے ساتھ کتاب بھی لائے اور نبی وہ ہے جو کتاب نہ لائے ۔ یہ خیال قرآن کریم سے بے خبری پر مبنی ہے ۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اللہ نے تمام انبیاء کو کتاب دی تھی ۔ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۔ ۔ ۔ ۔ (۲/۲۱۳)۔ یہی الفاظ رسولوں کے لئے آئے ہیں (۵۷/۲۵) ۔ انبیاء کی انہی کتابوں کو مَآ أُوتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ (۲/۱۳۶) کہا گیا ہے اور اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے ۔ حضرت عیسٰے نے کہا تھا آتٰنِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا (۱۹/۳۰) '' اللہ نے مجھے الکتاب دی ہے اور (اسطرح) مجھے نبی بنایا ہے''۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ ہر نبی صاحب کتاب ہوتا ہے ۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ، نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں ۔ اسی لئے حضرات انبیاء کرام کو (مثلاً خود نبی اکرم کو) کہیں نبی کہا گیا ہے (۶۵/۱) اور کہیں رسول ۔ (۴۸/۲۹)۔ حتکہ حضرت اسماعیل کے متعلق ہے وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (۱۹/۵۴) ۔ '' ایک پیغامبر (رسول) جسے نبوت عطا کی گئی تھی'' ۔ ختم نبوت (۳۳/۴۰) کے معنی یہ ہیں کہ اب کسی شخص کے لئے ممکن نہیں کہ وہ خدا سے براہ راست علم حاصل کرے۔ علم جسقدر وحی کے ذریعے دیا جانا مقصود تھا ، وہ سب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے ۔ لہذا الہام یا کشف وغیرہ کے ذریعے خدا سے براہ راست علم پانے کا عقیدہ ختم نبوت کے عقیدہ کے منافی ہے ۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ نَبِيٌّ کا لفظ نَبَاوَةٌ سے مشتق ہے ۔ لیکن اگر اسے نَبَأٌ سے مشتق مانا جائے تو اس میں بھی بلندی مقام اور اخبار

عن الغیب (غیب کی باتوں سے باخبر کرنے) کے دونوں مفہوم آجائینگے۔ اس '' غیب'' کے معنی وحی ہونگے جو نبی کو خدا کیطرف سے ملتی ہے۔ (دیکھئے عنوان غ۔ ی۔ ب)۔ نہ کہ پیش گوئیاں جن کے مدعی (مسلم اور غیر مسلم) ہر جگہ ملتے ہیں۔

ن ب ت

اَلنَّبْتُ۔ اَلنَّبَاتُ۔ ہر وہ چیز جو زمین سے اُگے *۔ اَلْمَنْبِتُ۔ اگنے کی جگہ۔ اس مادہ میں ابھرنے اور نمایاں ہونے کے معنی بھی ہیں۔ چنانچہ لڑکی کے سینہ کے ابھرنے کے لئے نَبَتَ ثَدْیُ الجَارِیَةِ کہا جاتا ہے اور لڑکے کے بالغ ہو جانے کو بھی نَبَتَتْ عَانَةُ الغُلَامِ اور اَنْبَتَ الغُلَامُ سے تعبیر کرتے ہیں۔ نیز التَّنْبِیْتُ کے معنی تربیت کرنے کے آتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بوئی ہوئی چیز میں نشو و نما ہونے کے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے وَاَنْبَتَتْ مِنْ کُلِّ زَوْجٍ بَهِیْجٍ (۲۲/۵)۔ زمین ہر قسم کی خوشنما روئیدگی اگاتی ہے۔ سورہ آل عمران میں حضرت مریمؑ کے متعلق ہے وَاَنْبَتَهَا نَبَاتاً حَسَناً (۳/۳۶)۔ (اس کے رب نے) اُسے عمدہ پرورش سے پروان چڑھایا۔ یہاں جسمانی پرورش اور اخلاقی تربیت دونوں مقصود ہیں۔

نوع انسان کے متعلق ہے وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ نَبَاتاً (۷۱/۱۷)۔ اس کے یہ معنی بھی ہیں کہ اللہ تمہیں نباتات کی طرح نشو و نما دیتا ہے اور یہ بھی کہ اللہ نے نوع انسان کو تمام کرہ ارض پر درخت کی شاخوں کیطرح پھیلا دیا ہے جس کی جڑ اور تنا ایک ہی ہوتا ہے۔ نیز اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اللہ نے انسانوں کو زمین سے اسی طرح اگایا ہے جسطرح نباتات اگتے ہیں۔ قرآن کریم کے دوسرے مقامات میں ہے کہ تخلیق انسانی کی ابتداء مٹی سے ہوئی۔ اور اسطرح یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ (انسانی تخلیق اور نظریہ ارتقاء کے متعلق تفصیلات میری کتاب '' ابلیس و آدم'' میں ملیگی)۔

ن ب ذ

نَبَذَ۔ کسی چیز کو اسلئے پھینکدیا کہ اسکی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ چنانچہ اَلْمَنْبُوْذُ ایسے بچے کو کہتے ہیں جسے راستے میں پھینکدیا گیا ہو ***۔ (یعنی ولدالزنا)۔ لہذا اسکے معنی ہیں کسی چیز کو حقارت کی وجہ سے

*راغب۔ **تاج۔ ***تاج و راغب۔

توجہ کے قابل نہ سمجھنا ۔ نَبَذَ العَھْدَ ۔ عہد کو توڑ دیا ۔ نَبَذَ الاَمْرَ ۔ کسی کام کو بیکار چھوڑ دینا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پھینکنے اور ڈالنے کے ہیں ۔

اَلاِنْتِبَاذُ ۔ ایک طرف ہٹ جانا ۔ کنارہ کش ہو جانا ۔ (۱۹/۱۶) ۔ اَلنَّبْذُ ۔ کھجور یا کشمش کو پانی میں ڈال کر ایک طرف رکھ چھوڑنا تاکہ وہ نبیذ بن جائے**۔

کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَۃِ (۱۰۴/۴) ۔ سرمایہ دار اور اُس کا تمام مال ایک بے قدرو قیمت متاع کی طرح بیکار رہ جائیگا ۔ (حُطَمَۃٌ کے لئے دیکھئے ح ۔ ط ۔ م)

سورہ انفال میں قوم مخالف سے معاہدات کے ضمن میں ہے کہ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَۃً فَانْۢبِذْ اِلَیْھِمْ عَلٰی سَوَاءٍ . . . (۸/۵۸) ۔ اگر تمہیں کسی قوم سے بدعہدی کا خدشہ ہو تو ان سے برابری کی حالت میں معاہدہ کو ان کی طرف پھینکدو ۔ یعنی خیانت کے خدشہ سے تم ، بلا تنبیہہ ، یونہی معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرنے لگ جاؤ ۔ نہ ہی انہیں نقصان پہنچانے کی فکر کرو ۔ بلکہ جس برابری کی حیثیت سے تم نے ان سے معاہدہ کیا تھا ، اسی حیثیت سے ان سے کہدو کہ ہمیں تم پر اعتماد نہیں رہا اس لئے تمہارا اور ہمارا معاہدہ کالعدم سمجھا جائے ۔ عَلٰی سَوَاءٍ (یعنی انہیں برابری کی حیثیت دو ۔ یا یکبارگی معاہدہ کوکالعدم قرار دینے سے انہیں اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو از روئے عدل و انصاف انہیں اس نقصان سے بچاؤ) کی شرط جس اصولِ عدل کی گواہی دیتی ہے وہ قرآن کریم ہی کی خصوصیت ہو سکتی ہے ۔ اس کے برعکس ، غیر مسلموں (زمانہ نبویؐ کے اہل کتاب) کی حالت یہ تھی کہ اَوَ کُلَّمَا عٰھَدُوْا عَھْدًا نَّبَذَہٗ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ . . . (۲/۱۰۰) '' جب کبھی وہ کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو ان میں کا ایک گروہ اس معاہدہ کو (ردی کی ٹوکری میں) پھینکدیتا ہے ۔ ان دونوں آیتوں میں خالی نَبَذَ اور نَبَذَ عَلٰی سَوَاءٍ کا فرق بین طور پر سامنے آجاتا ہے ۔

ن ب ز

اَلنَّبْزُ ۔ کسی کا نام دھرنا ۔ کوئی برا لقب دینا ۔ اَلتَّنَابُزُ ۔ ایک دوسرے کو عار دلانا ۔ ایک دوسرے کو عار دلانے والے القاب سے یاد کرنا ۔ ایک دوسرے کے مذموم نام رکھنا ۔ اَلنَّبِیْزُ ۔ اخلاق اور حسب کے اعتبار سے کمینہ ۔ اَلنَّبْزُ ۔ کھجور کے درخت کا بالائی چھلکا* ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **محیط ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْاَلْقَابِ (۴۹/۱۱) ۔ آپس میں ایک دوسرے کے طنز و تحقیر آمیز نام نہ دھرا کرو ۔

ن ب ط

اَلنَّبَطُ ۔ وہ پانی جو کنواں کھودنے پر پہلے پہل نکلے ۔ اَنْبَطَ الْحَافِرُ کھودنے والا کھودتے کھودتے پانی تک پہنچ گیا ۔ اسی سے اس کے معنی ہوتے ہیں بات کو گہرائی سے نکال لینا اور ظاہر کر دینا* ۔ تحقیقات کے بعد بات کی اصل تک پہنچ جانا اور اسے ظاہر کر دینا ۔ قرآن کریم میں ہے اَلَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (۴/۸۳) ۔ ان میں سے وہ لوگ جو تحقیقات کے بعد بات کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں ۔ زجاج نے کہا ہے اس کے معنی استخراج کے ہیں* ۔ یہی معنی ابن فارس نے بھی لکھے ہیں ۔ یعنی پیش نظر واقعات سے خاص نتیجہ نکالنا ۔ اس کے غوامض تک پہنچ جانا ۔

ن ب ع

اَلنَّبْعُ ۔ چشمہ سے پانی کا نکلنا ۔ اَلْيَنْبُوْعُ ۔ چشمہ ، جہاں سے پانی نکلتا ہو (جمع يَنَابِيْعُ)* ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا (۱۷/۹۰) ۔ "تو ہمارے لئے اس زمین سے چشمہ بہا دے" ۔ سورۃ زمر میں ہے ۔ فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ (۳۹/۲۱) ۔ "پھر اسے (پانی کو) چشمے بنا کر زمین میں بہاتا ہے" ۔ مَنْبَعُ الْمَاءِ ۔ پانی پھوٹنے کی جگہ* ۔

ن ت ق

نَتَقَ ۔ يَنْتِقُ ۔ (يَنْتُقُ) ۔ کسی چیز کو سخت حرکت دینا ۔ اور ہلانا* ۔ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ (۷/۱۷۱) ۔ جب ہم نے اس پہاڑ میں زلزلہ پیدا کیا جو ان کے سروں کے اوپر تھا ۔ اَلنَّاتِقُ مِنَ الْخَيْلِ ۔ وہ گھوڑا جو اپنے سوار کو اچھال اچھال کر اس کا کچومر نکال دے ۔ یا اُسے گرا دے ۔ اَلنَّتْقُ کے معنے اکھاڑ دینے کے بھی آتے ہیں اور ہلا کر جھاڑ دینے کے بھی* ۔ یہ سب حرکت ہی کے مظاہرے ہیں ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو اس طرح کھینچنے کے ہیں کہ وہ ڈھیلی ہوجائے** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو کھینچنے ، ہلانے اور اسے اس کی جڑ سے اکھاڑنے کے ہیں ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

ن ث ر

نَثَرَ - يَنْثُرُ - نَثْرًا وَ نِثَارًا - کسی چیز کو بکھیر دینا - فَانْتَثَرَ - پس وہ بکھر گئی - اَلنَّثَرُ - راز کی باتوں کو پھیلانا - بہت زیادہ باتیں کرنا - اَلْمُنْتَثِرُ - کمزور آدمی جس میں کوئی بھلائی کی بات نہ ہو - اَلْمِنْثَارُ - اس کھجور کے درخت کو کہتے ہیں جس سے کچی کھجوریں گر جائیں - یعنی وہ پکنے سے پہلے ہی گر جائیں اور اس طرح اس کا پھل کسی کام نہ آئے* - قرآن کریم میں مجرمین کے اعمال کے متعلق ہے فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (۲۵/۲۳) ہم انہیں بے نتیجہ اور رائیگاں جانے والا بنا دینگے - مکافاتِ عمل کی میزان میں ان کا کچھ وزن نہیں ہوگا - وہ فضا میں منتشر ذرات کی طرح ہو جائیں گے - یعنی وہ کوئی تعمیری نتیجہ پیدا نہیں کرسکینگے - (''بے نتیجہ'' رہ جانے سے یہی مطلب ہے) -

بکھرنے کے معنوں میں سورۃ انفطار میں ہے - اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (۸۲/۲) - جب ستارے بکھر جائینگے - ان کا شیرازہ منتشر ہوجائیگا -

ن ج د

اَلنَّجْدُ - زمین کا وہ حصہ جو بلند اور سخت ہو - نیز بلند ، کھلے اور واضح راستے اور ، ماہر راھنما کو بھی کہتے ہیں** -

نَجَدَ الْاَمْرُ يَنْجُدُ - معاملہ واضح اور ظاہر ہو گیا** - قرآن کریم میں ہے - وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰/۱۰) ہم نے انسان کو (حق و باطل کے) دونوں راستے (وحی کے ذریعے) دکھا دئے - اب اس کے بعد وہ صاحب اختیار ہے کہ ان میں سے جونسا راستہ چاھے اپنے لئے اختیار کرلے - واضح رہے کہ حق و باطل کے راستے ، وحی (قرآن) کی رو سے دکھائے گئے ہیں - انسان کے اپنے اندر اس کی صلاحیت نہیں کہ وہ وحی کی روشنی کے بغیر از خود خیر و شر میں تمیز کر سکے - (دیکھئے عنوان ل - ھ - م اور ف - ط - ر) -

نیز ، خدا کا کام صرف راستے دکھا دینا ہے - صحیح راستہ پر چلا دینا نہیں - یہ انسان کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ جونسا راستہ چاھے اختیار کر لے - یہی اختیار ، انسان کو اس کے ہر فیصلہ اور عمل کا ذمہ دار بنا دیتا ہے اور اسی سے وہ اپنے اعمال کے (اچھے اور برے) نتائج کا مستحق قرار پاتا ہے -

---

*تاج و محیط و راغب - **تاج و راغب -

ن ج س

اَلنَّجَسُ۔ یہ طَاھِرٌ کی ضد ہے (جس کے لئے دیکھئے عنوان ط۔ ھ۔ ر) قَدْ نَجِسَ ثَوْبُہٗ۔ اس کا کپڑا ناپاک ہوگیا*۔ راغب نے کہا ہے کہ نَجَاسَۃٌ۔ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو وہ جس کا ادراک حاسہ (بصارت) سے کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرے وہ جس کا ادراک بصیرت سے کیا جا سکتا ہے۔ جیسے دل کی آلودگی۔ نگاہ کی ناپاکی۔ انہی معنوں میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ (۹/۲۸) ''مشرکین یقیناً آلودگیوں سے بھرے ہوئے ہیں''۔ دَاءٌ نَاجِسٌ۔ ایسی بیماری جس سے انسان اچھا نہ ہو*۔

اھل عرب اپنے بچوں کے گلے میں آسیب اور نظر بد وغیرہ سے بچنے کے لئے تعویذ پہنا دیا کرتے تھے۔ یہ تعویذ گندی چیزوں کے ہؤا کرتے تھے۔ مثلاً مردوں کی ھڈیاں۔ یا حیض کا کپڑا وغیرہ۔ ایسے وہ اَلتَّنْجِیْسُ کہتے تھے**۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ازالۂ نجاست کی وجہ سے اس عمل کو اَلتَّنْجِیْسُ کہا گیا ہو۔

ن ج م

اَلنَّجْمُ۔ ستارہ جب وہ نکلا ہوا ہو۔ جمع اَنْجُمٌ اور نُجُوْمٌ۔ نیز اَلنَّجْمُ اُس پودے کو کہتے ہیں جسکا تنہ نہ ہو اور وہ زمین پر پھیل جائے۔ برخلاف اَلشَّجَرُ کے جسکا تنہ ہوتا ہے***۔ اَلنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَانِ (۵۵/۶) کے یہی معنی ہیں۔ (یہ دونوں لفظ اسم جمع ہیں۔ ان کا واحد ''ۃ'' سے بنتا ہے۔ اگرچہ، جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے، اَلنُّجُمُ کی جمع بھی آتی ہے۔ ویسے، اسم جمع بالعموم لفظاً واحد استعمال ہوتے ہیں اور معناً جمع۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نکلنے اور ظاہر ہونے کے ہیں۔ اَلنَّجْمَۃُ کلمہ (لفظ اور بات) کو بھی کہتے ہیں***۔ قرآن کریم کے آہستہ آہستہ بالاقساط نازل ہونے کو بھی اَلنَّجْمُ کہاجاتا ہے***۔ لیکن قرآن کریم میں اس مفہوم کے لئے یہ لفظ نہیں آیا۔

نَظَرَ فِی الْاَمْرِ ۔ کسی معاملہ میں اس غرض سے غور و فکر کرنا کہ اسکی تدبیر کس طرح سے کی جائے۔ چنانچہ سورہ صٰفّٰت میں حضرت ابراھیمؑ کے متعلق جو ہے کہ فَنَظَرَ نَظْرَۃً فِی النُّجُوْمِ (۳۷/۸۸) تواسکے معنی غوروفکر

*تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔

کرنے کے ہیں * ۔ لیکن ہمارے نزدیک اسکا صحیح مفہوم وہ ہے جسے ہم نے (ن ۔ ظ ۔ ر) کے عنوان میں لکھا ہے ۔ یعنی نکتہ چینی کرنا ۔ عیب نکالنا تنقید کرنا ۔

صاحب غریب القرآن نے لکھا ہے کہ اَلنُّجُوْمُ رؤسائے قوم یا چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو کہتے ہیں**۔ برخلاف اَلشَّمْسُ کے جس سے مراد ایران کی سلطنت ہے (۸۱/۱-۲) ۔

ن ج و

نَجَاءٌ ۔ نَجَاةٌ نَجَايَةٌ ۔ کسی ایسی چیز سے محفوظ رهنا جس میں خطرہ ہو ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ نَجْوَةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں بلند جگہ ۔ اَلنَّجْوَةُ وَالْمَنْجٰی ۔ اس بلند جگہ کو کہتے ہیں جس کی بلندی کی وجہ سے اس تک سیلاب کا پانی نہ پہنچ سکے ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلنَّجْوَةُ وَالنَّجَاةُ ۔ اس جگہ کو کہتے ہیں جو اپنی بلندی کی وجہ سے ارد گرد سے الگ اور ممتاز نظر آئے ***

نَجَا ۔ یَنْجُوْ ۔ نَجَاءٌ ۔ تیز چلنے اور آگے نکل جانے کو بھی کہتے ہیں ۔ ایک حدیث میں ہے اِذَا سَافَرْتُمْ فِی الْجَدْبِ فَاسْتَنْجُوْا ۔ جب تم کسی خشک اور قحط زدہ زمین میں سفر کرو تو وہاں سے تیزی سے گذر جاؤ ۔ اسی لئے نَاقَةٌ نَاجِيَةٌ ۔ تیز رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں***۔

راغب نے کہا ہے کہ نَجَاءٌ کے اصلی معنی کسی چیز سے الگ ہو جانے کے ہیں ****۔ نَجَا غُصُوْنَ الشَّجَرَةِ ۔ درخت کی شاخیں کاٹ دیں ۔ نَجَا الْجِلْدَ کے معنی ہیں کھال کھینچ دی ***۔ ابن فارس نے اس کے دو بنیادی معنی لکھے ہیں جو باہمدگر متضاد ہیں ۔ (۱) کسی چیز کو چھیل دینا اور کھول دینا ۔ اور (۲) چھپانا اور پوشیدہ کرنا ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اسکا استعمال بلندی کے معنوں میں بھی بتایا ہے ۔

اس لفظ کے بنیادی معنوں کو سامنے رکھنے سے نجات کا قرآنی مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ دوسرے مذاہب میں انسان کے متعلق تصور یہ ہے کہ وہ دنیا کے جیل خانے میں بری طرح قید ہے ۔ اسے اس قید سے رهائی مل جانے کا نام نجات ہے ۔ ہندو دھرم کا عقیدہ ہے کہ انسان دنیا میں ، اپنے سابقہ جنم کے گناهوں کی سزا بھگتنے کے لئے آتا ہے ۔ اس سزا سے خلاصی مل جانے کا نام نجات ہے ۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر ابن آدم پیدائشی طور پر اپنے

*تاج ۔ **غریب القرآن (میرزا ابوالفضل ۔) ***تاج و محیط ۔ ****راغب ۔

اولین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہوں کو اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے آتا ہے اور اس کثافت سے اسکا چھٹکارا ناممکن ہے جب تک وہ حضرت عیسیٰؑ کے کفارہ پر ایمان نہ لائے۔ ویدانت (یعنی ہندوؤں کے تصوف) کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی روح (آتما) اپنی اصل (پرماتما) سے الگ ہو کر مادہ کی دلدل میں پھنسکر چیخ پکار کر رہی ہے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا پاکر جزو کا اپنی اصل سے جا کر مل جانا نجات ہے۔ ایسا ہی تصور بدھ مت میں ہے جنکا عقیدہ ہے کہ ہر آرزو ایک مصیبت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ انسان، ترک آرزو سے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ اسے نروان کہتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ان مذاہب نے تصور یہ دیا ہے کہ انسان اس دنیا میں آنے سے پہلے اچھی حالت میں تھا۔ اس میں آ کر یہ مصیبت میں پھنس گیا۔ اب اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرکے، پھر سے اپنی پہلی حالت میں پہنچ جانا (نجات) مقصود حیات ہے۔ قرآن کریم ان تمام تصورات کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان نہ تو اپنے کسی سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آتا ہے اور نہ ہی اپنے اولین ماں باپ کے گناہوں کی آلودگی کو اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس لئے دنیا جیل خانہ نہیں جس سے چھٹکارا حاصل کرنا مقصود حیات ہو۔ نہ ہی انسانی روح، خدا کی روح کا جزو ہے جو مادہ کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے اور یہاں سے خلاصی پا لینے کا نام نجات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسانی بچہ ایک سادہ لوح (Clean Slate) لیکر دنیا میں آتا ہے۔ اسے فطرت کیطرف سے کچھ صلاحیتیں ملتی ہیں۔ اس میں ''کچھ بننے'' کی امکانی وسعتیں (Realiseable Possibilities) ہوتی ہیں۔ ان (Potentialities) کو مشہود بنانا (Actualised کرنا) مقصود حیات ہے تا کہ انسان اس زندگی سے بلندتر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے۔ مقصود زیست (As you Were) ہونا نہیں۔ ترقی کرنا اورآگے بڑھنا ہے۔ زمین کی زندگی انسان کی تربیت گاہ ہے۔ اس میں اسکی ذات کی نشوونما (Development) ہوتی ہے جس سے یہ اس دنیا کی تمام خوشگواریاں اور شادکامیاں حاصل کر لیتا ہے اور اس زندگی سے اگلی زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ہو جاتا ہے۔ لہذا دنیا سے چھٹکارا حاصل کر لینا مقصودِ حیات نہیں۔ اس دنیا کو مسخر کرکے اسکی نعمتوں کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنا اور اسطرح اپنی ذات کی نشو و نما اور انسانیت کی فوز و فلاح حاصل کرنا مقصود حیات ہے۔

دنیا میں باطل کی قوتوں کے ساتھ کشمکش لازمی ہے۔ اور اس کشمکش ہی سے انسانی ذات کا استحکام ہوتا ہے۔ جو جماعت، قانون خداوندی کے

مطابق زندگی بسر کرتی ہے اسے ان مستبد قوتوں کی گرفت سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور تباہی اور بربادی سے مصئون - اس کے لئے قرآن کریم نے نجات کا لفظ استعمال کیا ہے - بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم اپنی غلط روش کی وجہ سے مستبد قوتوں کے فولادی پنجے میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن اسکے بعد پھر قوانین خداوندی کی طرف رجوع کر لیتی ہے تو اسے ان سرکش قوتوں کے دام بلا سے رہائی مل جاتی ہے - اس کے لئے بھی نجات کا لفظ آیا ہے - (جیسے بنی اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے رستگاری نصیب ہو جانا ان کی نجات تھی)۔

اب رہی مرنے کے بعد جہنم کی سزا سے نجات - سو اس کے متعلق یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی بعض لغزشوں کی وجہ سے کچھ وقت کے لئے جہنم میں رہیں گے اور اس کے بعد، جب اس سزا کی مدت ختم ہو جائے گی یا ان گناہوں کی کثافتیں دور ہو جائینگی تو پھر جنت میں چلے جائینگے (۳/۲۴)۔ یعنی ان کے ہاں جہنم سے مفہوم یہ ہے کہ یا تو انسان اس میں ایک مدت معینہ تک سزا بھگتنے کے لئے بھیجا جائیگا اور یا اس لئے کہ اس کے گناہ دھل جائیں اور وہ پاک و صاف ہو کر جنت میں چلا جائے - اسکا نام ان کے ہاں نجات ہے -

یہ دونوں تصور بھی قرآن کریم کے خلاف ہیں - قرآن کریم کی رو سے انسان جہنم میں نہ تو ایک قیدی کی طرح ایک مدت معینہ تک سزا بھگتنے کے لئے جاتا ہے اور نہ ہی جہنم دھوبی کی بھٹی ہے جس میں گناہوں کی کثافتیں صاف ہوتی ہیں تاکہ انسان پاک و صاف ہو کر جنت میں جائے - قرآن کریم کا تصور یہ ہے کہ جب قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کی مضمر صلاحیتوں (ذات) کی اتنی نشوونما ہو جائے کہ وہ زندگی کی اگلی منزل (یعنی سلسلۂ ارتقاء کی اگلی کڑی) تک پہنچنے کے قابل ہو جائے تو اسے جنت کی زندگی کہتے ہیں جس میں اسکی نشوونما مزید ترقی حاصل کرتی رہتی ہے - لیکن اگر وہ غیر خداوندی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرے تو اسکی نشو و نما رک جاتی ہے - اسے جہنم کی زندگی کہتے ہیں* - جس کی نشوونما رک جاتی ہے وہ زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل نہیں رہتا - وہ اسی مقام پر رکا رہتا ہے - اس لئے کسی کے "جہنم" سے نکلنے

*واضح رہے کہ جنت اور جہنم کی زندگی اس دنیا میں بھی ہوتی ہے اور اس کے بعد کی زندگی (آخرت) میں بھی - اس مقام پر جس جنت اور جہنم کی زندگی کا ذکر ہے اس کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے -

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے نجات کا وہ تصور بھی غیر قرآنی ہے جسکی رو سے (یہودیوں کی طرح) سمجھا جاتا ہے کہ انسان اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے (یا پاک و صاف ہونے) کے لئے کچھ وقت کے لئے جہنم میں جائیگا اور پھر وہاں سے چھٹکارا پا کر جنت میں چلا جائیگا۔ (اس مقام پر صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے تفصیل ان امور کی جہنم اور جحیم وغیرہ عنوانات میں ملے گی)۔

نَجْوٰی کے معنی سرگوشی اور رازداری کی باتیں کرنے کے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ بستی سے باہر جا کر کسی بلند مقام پر بیٹھ کر آپسمیں رازداری کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اور اسکیمیں بنایا کرتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ نَجَاۃٌ سے ماخوذ ہے۔ اس طرح نَجْوٰی کا مطلب ہوگا ، مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ اِنْتَجٰی کے معنی بلند مقام پر بیٹھنے کے ہیں *۔ نَجِیٌّ۔ ہم راز جس کے ساتھ سرگوشی کی جائے (۱۹/۵۲)۔ اسی سے فعل نَاجٰی وتَنَاجٰی۔ باہم سرگوشی کرنے کے لئے آتا ہے۔ قرآن کریم میں نجوی کا لفظ راز اور مشوروں کے معنی میں کئی جگہ آیا ہے (مثلاً ۔ ۹/۷۸ ; ۵۸/۷)۔

سورہ یونس میں فرعون۔ حضرت موسیٰؑ کی غرقابی کے سلسلہ میں ہے فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً (۱۰/۹۲)۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ اس میں نُنَجِّيْكَ کے معنی ہیں کسی بلند جگہ پر پھینکدینا۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اگرچہ فرعون غرق ہو گیا تھا لیکن اس کی لاش کو محفوظ کر لیا گیا تھا تاکہ وہ بعد میں آنے والوں کے لئے آیۃ عبرت بن سکے۔ مصر کے تہ خانوں سے ، فراعنہ کی جو لاشیں ملی ہیں اس میں فرعون حضرت موسیٰؑ کی لاش بھی موجود ہے (دیکھئے انسائکلوپیڈیا برٹانیکا۔ عنوان ممّی) ۔ چونکہ یہ انکشاف حال ہی کا ہے اور ہمارے قدیم مفسرین کو اس کا علم نہیں تھا ، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اس آیت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے۔ (یہی وجہ ہے کہ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی اس آیت میں بَدَنٌ کے معنی زرہ کے کئے ہیں۔ یعنی فرعون کی زرہ پانی سے باہر ، بلند جگہ پر پھینک دی گئی تھی۔ لیکن مذکورہ صدر انکشاف نے حقیقت حال کو بے نقاب کر دیا ہے کہ بَدَنٌ سے مراد فرعون کی لاش ہی ہے)۔

---

*تاج۔

قرآن کریم نے اپنے حقائق کے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ جوں جوں انفس و آفاق میں خدا کی نشانیاں بے نقاب ہوتی جائینگی، قرآنی حقائق کی وضاحت ہوتی جائیگی (۴۱/۵۳)۔ ان "نشانیوں" کے بے نقاب ہونے کا ایک طریق تاریخی شواہد کا سامنے آنا بھی ہے، جیسا کہ فرعون کی لاش کے سلسلہ میں ہوا۔

ن ح ب

اَلنَّحْبُ۔ وہ نذر (منت) جس کے واجب ہونے کا فیصلہ کرلیا جائے*۔ نَحَبَ الرَّجُلُ يَنْحُبُ۔ آدمی نے نذر مانی**۔ اَلتَّنْحِيْبُ۔ لگاتار سرگرمی اور انہماک سے کام کرنا۔ اَلنَّحْبُ۔ موت۔ جوا اور قماربازی کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں شرط باندھی جاتی ہے جس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

اَلنَّحْبُ۔ خطرۂ عظیم***۔ بلند آواز سے رونا***۔ ابن فارس نے بھی یہ دونوں معانی لکھے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ۔ (۳۳/۲۳)۔ ان میں وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنی نذر (واجبات) کو پورا کر دیا۔ حق کی خاطر جان دے دی۔

ن ح ت

نَحَتَ يَنْحِتُ و يَنْحَتُ۔ کسی چیز کو چھیلنا۔ تراش کر ہموار کرنا***۔ اَلنَّحْتُ۔ بڑھئی کے لکڑی چھیلنے کو کہتے ہیں****۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا (۷/۷۴)۔ تم پہاڑوں کو کاٹ اور تراش کر ان میں مکانات بناتے ہو۔

ن ح ر

نَحْرُ الصَّدْرِ۔ سینے کا اوپر کا حصہ۔ سینہ پر جہاں ہار پہنا جاتا ہے۔ نَحَرَ الْبَعِيْرَ يَنْحَرُهٗ نَحْرًا۔ اس نے اونٹ کے سینہ سے متصل اس جگہ پر نیزہ مارا جہاں سے حلق شروع ہوتا ہے۔ (اونٹوں کو اسی طرح ذبح کرتے ہیں)***۔ ابن فارس نے بھی لکھا ہے کہ اس مادہ سے کئی الفاظ آتے ہیں۔ سینے کو بھی کہتے ہیں اور سینے کے چیر دینے کو بھی۔

قرآن کریم میں ہے۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (۱۰۸/۲)۔ اس میں وَانْحَرْ کی بہت سی تفاسیر صاحب تاج نے لکھی ہیں۔ مثلاً (۱) نماز میں کھڑا

*راغب۔ **محیط۔ ***تاج۔ ****لسان العرب۔

ھو کر سینے کو باھر کی طرف نکالنا ۔ (۲) نماز میں دایاں ھاتھ بائیں پر رکھنا ۔ (۳) قربانی کے جانوروں (اونٹوں) کو ذبح کرلینا ۔ (۴) نماز میں سینے پر ھاتھ باندھنا ۔ (۵) نماز میں (نحرتک) ھاتھ اٹھانا ۔ (۶) اپنے سینہ کو قبلہ رخ رکھ کر کھڑے ھونا ۔ (۷) خواھشات کا قلع قمع کرنا ۔ (۸) دن کے ابتدائی حصہ میں (قبلہ رخ) کھڑے ھونا* ۔ لیکن تَنَحَّرَ کے معنی ھیں دسترس پیدا کرنا ۔ کسی بات پر حاوی ھوجانا ۔ اسے اچھی طرح حاصل کرلینا ۔ تَنَحَّرْتُ الشَّیْءَ عِلْمًا ۔ میں علم کے ذریعے اس معاملہ پر حاوی ھوگیا** ۔ تَنَحَّرَ الْاُمُوْرَ عِلْمًا ۔ اس نے معاملات کو اچھی طرح سمجھ لیا*** ۔ چنانچہ اَلنِّحْرُ ۔ وَالنِّحْرِیْرُ کے معنی ھیں ماھر ۔ عقل مند ۔ تجربہ کار ۔ ھر چیز کو سمجھنے اور دیکھنے والا اور مضبوطی سے اس پر عمل کرنے والا*** ۔ اس لئے وَ انْحَرْ (۱۰۸/۲) کے معنی ھونگے ، اس پروگرام کے متعلق تمام امور پر علم و عقل اور تجربہ و بصیرت سے پوری پوری طرح حاوی ھوکر ، ان پر نہایت مضبوطی سے عمل پیرا رھو ۔

لیکن اگر اس آیت میں وَ انْحَرْ سے مراد ”اونٹ کا ذبح کرنا“ لیا جائے تو اس سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ھے ۔ ھجرت کے بعد جب رسول اللہؐ مدینہ تشریف لائے تو حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی جماعت (انصار اور مہاجر دونوں) غریب اور کمزور تھی اور مدینہ میں یہودیوں کا بڑا زور تھا ۔ ایسے حالات میں کمزور جماعتیں ھمیشہ طاقتور جماعتوں کے سہارے ڈھونڈھتی ھیں اور اس کے لئے اپنے اصولوں تک کو قربان کردیتی ھیں ۔ یہودیوں کے ھاں اونٹ حرام تھا اور مسلمانوں کے ھاں حلال ۔ وہ اونٹ کے ذبیحہ کو قابلِ اعتراض سمجھتے تھے ۔ وہ مدینہ میں اپنی قوت کی بنا پر سمجھتے تھے کہ مسلمان ان سے دب کر رھینگے اور اونٹ کو ذبح کرنے سے محتاط رھینگے ۔ قرآن کریم نے ھین اس مقام پر حکم دیا کہ مدینہ میں ”اونٹ ذبح کرو“ ۔ یعنی دین کے معاملہ میں یہودیوں سے مفاھمت کا خیال نہ کرو ۔ چنانچہ اس کمزور جماعت نے تھوڑے ھی دنوں میں اتنی قوت پیدا کرلی کہ یہودی (جو اپنی فتنہ پردازیوں سے باز نہیں آتے تھے) مدینہ چھوڑنے پر مجبور ھوگئے ۔ [اس ضمن میں بعض نے کہا ھے کہ عبرانی زبان میں ”کوشر“ حلال ذبیحہ کو کہتے ھیں ۔ اَلْکَوْثَرَ (۱۰۸/۱) اسی سے معرب ھے اس اعتبار سے اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ (۱۰۸/۱) کے معنے ھونگے ”ھم نے تجھے (اونٹ) بطور حلال ذبیحے کے عطا کیا“ ۔ لیکن ھم نے اس مفہوم کو ترجیح نہیں دی ۔ دیکھئے عنوان (ک ۔ ث ۔ ر)] ۔

*تاج ۔ **اساس زمخشری بحوالہ غریب القرآن مرزا ابو الفضل ۔ ***محیط ۔

ن ح س

اَلنُّحَاسُ (نون پر تینوں حرکتیں جائز ہیں) ۔ پگھلا ہوا تانبہ ۔ پیتل یا لوہے کو جب کوٹا جائے تو اس میں سے جو چنگاریاں اڑتی ہیں انہیں بھی کہتے ہیں ۔ نیز اس اونچے ہو جانے والے دھوئیں کو بھی کہتے ہیں جس میں خفیف حرارت ہو لیکن لپٹ اور شعلہ نہ ہو*۔ راغب نے اسکے معنی ایسے شعلہ کے لکھے ہیں جس میں دھواں نہ ہو۔ یہیں سے نَحْسٌ ہے ، جس کے معنی یہ ہیں کہ افق آسمان نُحَاسٌ کی طرح سرخ ہو جائے ۔ اسے عرب نحوست کی نشانی سمجھتے تھے**۔ اسی سے اَلنَّحْسُ ہر تاریک معاملہ کو کہتے تھے ۔ اور مشقت ، تکلیف ، نقصان ، ضرر اور تکان کو بھی ۔ چنانچہ کہتے ہیں نَحَسَتِ الْاِبِلُ فُلَانًا ۔ اونٹوں نے فلاں آدمی کو تھکا دیا ۔ اَلنَّحْسُ ۔ اُن تین راتوں کو کہتے جن کا بڑا حصہ چاند نہ ہونے کی وجہ سے تاریک ہوتا ہے ۔ تَنَاحَسَ فُلَانٌ ۔ فلاں آدمی اوندھا ہو گیا ۔ تَنَحَّسَ الرَّجُلُ ۔ آدمی بھوکا رہا ۔ نَحَسَهٗ نَحْسًا ۔ اس نے اس کے ساتھ بے مروتی کی ۔ جفا کی ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَیَّامٍ نَحِسَاتٍ سخت سردی کے دنوں کو بھی کہتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سعادت کی ضد ہیں ۔ اَلنُّحَاسُ پیتل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ سونا چاندی کے مقابلہ میں قدر و قیمت کے لحاظ سے کم تر ہوتا ہے ۔

قرآن کریم میں نُحَاسٌ (۵۵/۳۵)۔ دھوئیں یا چنگاریوں کے معنوں میں بھی آیا ہے ۔ یعنی جہنم کا عذاب ۔ سورہ قمر میں قوم عاد کے عذاب کے سلسلہ میں کہا ہے کہ ان پر سخت جھکڑ آیا فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (۵۴/۱۹) ان کی مسلسل مصیبت کے دن میں ۔ (یَوْمِ نَحْسٍ مرکب اضافی ہے) اسی کو دوسری جگہ اَیَّامٍ نَحِسَاتٍ (۴۱/۱۶) کہا گیا ہے ۔ پرمشقت ایام ۔ (مرکب توصیفی) ۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے سعد و نحس کا مفہوم وہ نہیں جو ہمارے ہاں عام طور پر رائج ہے ۔ ہمارے ہاں (مثلاً) کہتے ہیں کہ منگل کا دن منحوس ہوتا ہے ۔ یہ خالص ہندوانہ تصور ہے اور توہم پرستی پر مبنی ۔ کوئی دن یا کوئی گھڑی فی ذاتہ نہ سعید ہوتی ہے نہ منحوس۔ جسدن کسی پر اس کے کسی غلط کام کی وجہ سے مصیبت آتی ہے وہ دن اس کے لئے منحوس ہوتا ہے (یعنی مصیبت کا دن) اور جسدن کامیابی اور

*تاج ۔ **راغب ۔

شادکامی اسکے سامنے آئے وہ دن سعید - لہذا سعادت اور نحوست انسان کے اپنے اعمال ھی کے نتائج کا نام ھے - (نیز دیکھئے عنوان س - ع - د)

ن ح ل

اَلنَّحْلُ - شہد کی مکھیاں* - (۱۶/۶۸) - اَلنِّحْلَۃُ اَلنَّحْلَۃُ - وہ عطیہ جو بغیر کسی قسم کے معاوضہ کے دیا جائے**- سورہ نساء میں ھے وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَۃً (۴/۴)- عورتوں کو ان کے مہر بطور عطیہ ، بلا بدل دے دو - اس کا مطلب یہ ھے کہ مہر وہ عطیہ (Gift) ھے جو مرد کی طرف سے عورت کو کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر تحفۃً دیا جاتا ھے*- اَلْعَطَاءُ بِلَا عِوَضٍ (لطائف اللغۃ)- تاج اور ابن فارس نے النَّحْلُ کے یہی معنی لکھے ھیں- راغب نے لکھا ھے کہ یہ لفظ نَحْلٌ ھی سے مشتق ھے - یعنی جسطرح شہد کی مکھی بلا کسی معاوضہ کے شہد جیسی مفید چیز عطا کر دیتی ھے ، اسی طرح نِحْلَۃٌ وہ شیریں تحفہ ھے جو عورت کو بطیب خاطر اور بغیر کسی معاوضہ کے خیال کے دیا جاتا ھے - یہ ھے مہر کی حقیقت - (قرآن کریم میں مہر کا لفظ نہیں آیا)- یعنی یہ کوئی معین رقم نہیں جو بطور معاوضہ دی جائے - بلکہ تحفہ ھے جو کسی معاوضہ کے خیال کے بغیر، مودت اور محبت کے اظہار کے لئے دیا جائے - اور جس پر دونوں فریق رضامند ھو جائیں - مقصود اس سے عورت کا وزن بڑھانا ، اس کے وقار میں اضافہ کرنا ھے -

نَحْنُ (ضمیر)

نَحْنُ - ضمیر مرفوع منفصل ھے - تثنیہ (دو) اور جمع متکلم کیلئے آتی ھے اور مذکر و مؤنث دونوں کیلئے یکساں طور پر استعمال ھوتی ھے - نَحْنُ رَجُلَانِ - ھم دو مرد ھیں - نَحْنُ امْرَأَتَانِ - ھم دو عورتیں ھیں - نَحْنُ رِجَالٌ - ھم سب مرد ھیں - نَحْنُ نِسْوَۃٌ - ھم سب عورتیں ھیں -

سورہ بقرہ میں ھے نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (۲/۱۴) - " ھم تو مذاق کرتے ھیں " -

ن خ ر

نَخَرَ - يَنْخِرُ - آواز یا سانس کو ناک میں کھینچنا - ناک سے نکلنے والی آواز نَخِيْرٌ کہلاتی ھے - النُّخْرَۃُ خود ناک کو بھی کہتے ھیں -

*تاج - **راغب -

نَخْرَۃُ الْاَنْفِ ۔ ناک کے اگلے حصے اور اسکی نوک کو کہتے ہیں*۔ ناک کا شگاف ۔ نتھنا***۔ اسی سے عَظْمٌ نَخِرٌ اس بوسیدہ ہڈی کو کہتے ہیں جو اندر سے بالکل کھوکھلی ہو چکی ہو*۔ قرآن کریم میں عِظَامًا نَّخِرَۃً (۷۹/۱۱) ۔ بوسیدہ ہڈیوں کے لئے آیا ہے ۔ نَخِرَتِ الشَّجَرَۃُ ۔ درخت میں سے آواز نکلی ۔ یہ اسوقت ہوتا ہے جب درخت بوسیدہ اور کھوکھلا ہو جائے اور اس میں ہوا کے گذرنے کے لئے سوراخ ہو جائیں ، تو ہوا کے چلنے سے اس میں سے آواز نکلے**۔

ن خ ل

نَخَلَہٗ ۔ اسے صاف کیا ۔ پسند کر لیا*۔ نَخَلَ الدَّقِیْقَ ۔ آٹے کو چھلنی میں چھان لیا*۔ اَلْمُنْخَلُ اور اَلْمُنْخُلُ ۔ چھلنی ۔ اَلنَّخْلُ ۔ اَلنَّخِیْلُ (واحد نَخْلَۃٌ) ۔ کھجور کے درخت ۔ جو درخت کھجور کے مشابہ ہوں مثلاً ناریل وغیرہ ، ان کے لئے بھی یہی لفظ بولتے ہیں (۲/۲۶۶ ؛ ۱۹/۲۵ ؛ ۵۵/۶۸) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی منتخب کرنا اور پسند کرنا ہیں ۔ کھجور کے درختوں کو اَلنَّخْلُ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ تنے دار درختوں میں سب سے زیادہ بلند و برتر ہوتے ہیں ۔

ن د د

نِدٌّ کے معنی ہیں کسی کی مثل اور نظیر ۔ لیکن یہ اسی مثل کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی کے جوہر و بنیاد (Basic characteristics, or Essence) میں شریک ہو ۔ اور چونکہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں انتشار و تنفر بھی پایا جاتا ہے ، مثلاً نَدَّ الْبَعِیْرُ ۔ اونٹ بدکا اور جدھر منہ اٹھا چل پڑا ۔ نَدٌّ ۔ نفرت ، مخالفت ، اور علیحدگی کو کہتے ہیں ۔ اس لئے نِدٌّ مد مقابل کو کہتے ہیں ۔ یعنی ایسا شخص جو تمہاری مخالفت کرے ۔ تم اسے ایک طرف لے جانا چاہو اور وہ تمہیں دوسری طرف کھینچے ۔ اور جسقدر تم اسے اپنی طرف لے جانے میں زور لگاؤ اسی قدر وہ تمہیں اپنی طرف لے جانے میں کوشش کرے ۔ چنانچہ اَلتَّنَادُّ کے معنی ہیں متفرق ہونا ۔ ایک دوسرے سے متوحش ہونا****۔ ابن فارس نے بھی کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی انتشار و افتراق کے ہیں ۔ تَنْدِیْدٌ کے معنی ہیں کسی کی برائیوں کو اچھالنا اور شہرت دینا ۔ لَیْسَ لَہٗ نَادٌّ کے معنی ہیں اسکے پاس رزق نہیں ۔ یعنی کوئی بدکنے والا جانور نہیں****۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***ابن فارس ۔ ****تاج و محیط ۔

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ تمہارے لئے رزق پیدا کرتا ہے۔ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا (۲/۲۲)۔ سو تم خدا کے مقابلہ میں ایسی طاقتوں کو تسلیم نہ کرو جنہیں تم (بزعم خویش) سمجھتے ہو کہ اسکی مثل و نظیر ہیں۔ یعنی خدا کی اس بنیادی خصوصیت (رزاقیت) میں شریک ہیں۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (۲/۱۶۵)۔ یہاں اَنْدَادٌ سے مراد ہیں تمام وہ قوتیں جو خدا کے مد مقابل ٹھہرائی جاتی ہوں اور انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہوں (حُبٌّ کے یہی معنی ہیں)۔ یا وہ جاذبیتیں جن کی طرف انسان کھنچکر چلا جاتا ہے۔ لہذا جس قوت کے سامنے آپ اس کے خوف سے جھکیں یا نفع کی امید سے اسکی طرف کھنچیں اور اس میں قانون خداوندی کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو وہ خدا کے مقابلہ میں نِدٌّ ہو جائیگی۔ ایسا عقیدہ، تصور یا نظام جس میں کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کو وہ اقتدار اور اختیار حاصل ہو جائے جو قوانین خداوندی کے لئے مخصوص ہے، "اندادا من دون اللہ" کا مظہر ہے۔

[يَوْمَ التَّنَادِ کے لئے دیکھئے عنوان ن۔د۔و]

ن د م

نَدَامَةٌ۔ اس افسوس کو کہتے ہیں جو کسی ہاتھ سے نکل جانے والے معاملہ پر رائے بدل جانے سے پیدا ہو*۔ نیز اپنی کوتاہی پر نفس کو برا بھلا کہنا، یا ایسا غم جس میں انسان یہ کہے کہ جو کچھ اس سے ہو گیا وہ نہ ہوا ہوتا تو اچھا تھا**۔ پچتانا۔ پشیمان ہونا۔ سورۃ یونس میں ہے وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ (۱۰/۵۴)۔ "وہ ندامت کو چھپائینگے (یا ندامت ظاہر ہو جائیگی)"۔ نَادِمٌ۔ جسے ندامت ہو۔ اس کی جمع نَادِمِيْنَ ہے۔ (۵/۳۱)۔

اَلنَّدِيْمُ۔ ساتھ بیٹھ کر شراب پینے والا*۔

ن د و (ی)

اَلنَّدٰى کے بنیادی معنی ہیں رطوبت، نمی، شبنم۔ نَدَى الْاَرْضِ۔ زمین کی نمی۔ شَجَرٌ نَدْيَانٌ۔ تر و تازہ درخت***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) اکٹھا اور یک جا ہونے (۲) رطوبت اور نمی کے ہیں۔

---

*تاج وراغب۔ **تاج۔ ***تاج و محیط و راغب۔

چونکہ جس شخص کے منہ میں رطوبت زیادہ ہو وہ بڑی اچھی باتیں کرتا ہے اور اس کی آواز بھی بلند ہوتی ہے اس لئے اَلنِّدَاءُ کے معنی خالی آواز بلند کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی محض اونچی آواز، جس میں الفاظ نہ ہوں*۔

آواز دینے کے مفہوم سے اس کے معنی ایک مجلس میں اکٹھے ہو کر باتیں کرنے کے ہو گئے۔ نَادَاہُ مُنَادَاۃً۔ کسی کے ساتھ مجلس میں بیٹھا۔ اَلنَّدِیُّ والنَّدْوَۃُ۔ جہاں قوم جمع ہو کر بیٹھے اور باتیں کرے۔ نیز اَلنَّدْوَۃُ جماعت کو بھی کہتے ہیں۔ دَارُ النَّدْوَۃِ۔ مکہ میں ایک مکان تھا جس میں قریش مشورہ کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ اَلنَّادِیْ۔ قبیلہ (جسے مدد کے لئے آواز دی جاتی ہے)۔ یا ہم نشین۔ اَلنَّدَیٰ۔ سخاوت اور کرم کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْمُنْدِیَاتُ۔ رسوا اور ذلیل کرنے والے کام جن سے پیشانیاں عرق آلود ہوجائیں*۔

قرآن کریم میں نِدَاءً (۲/۱۷۱) بمعنی آواز آیا ہے۔ اور نَادٰی یُنَادِیْ نِدَاءً پکارنے (آواز دینے) کے معنوں میں (۱۸/۵۲ و ۱۹/۵۲) میں۔ سورۃ مریم میں اَحْسَنُ نَدِیًّا (۱۹/۷۳) کے معنی ہیں، باعتبار مجلس و اجتماع بہترین اور نہایت عمدہ۔ سورۃ العنکبوت میں نَادِیْکُمُ (۲۹/۲۹) کے معنی مجلس اور محفل و اجتماع ہیں۔ سورۃ العلق میں ہے۔ فَلْیَدْعُ نَادِیَہٗ (۹۶/۱۷)۔ وہ اپنے مصاحبوں کو یا قبیلہ والوں کو بلائے۔

تَنَادٰی۔ باہم آوازیں دینا اور ایک دوسرے کو پکارنا۔ قرآن کریم میں ہے۔ تَنَادَوْا (۶۸/۲۱)۔ انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا۔

سورۃ المؤمن میں یَوْمَ التَّنَادِ (۴۰/۳۲) آیا ہے جس کے معنی یہ کہکر بتا دئے گئے ہیں کہ یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ (۴۰/۳۳)۔ جس دن تم منہ پھیر کر بھاگ رہے ہوگے۔ یعنی جس دن تم ایک دوسرے کو مدد کے لئے پکاروگے لیکن کوئی کسی دوسرے کی مدد کے لئے نہیں آئیگا۔ سب، دہشت اور خوف کے مارے، منہ پھیرے، الٹے پاؤں بھاگ رہے ہونگے۔ مَالَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ عَاصِمٍ (۴۰/۳۳)۔ (اس دن) "تمہیں خدا کی گرفت سے (مکافات عمل سے) بچانے والا کوئی نہیں ہوگا"۔ یہ ہے یوم التناد۔ جس دن ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہو اور کوئی کسی کو لاکھ آوازیں دے، اس کی مدد کے لئے پہنچنا تو درکنار، وہ اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے۔

*تاج و محیط و راغب۔

ن ذ ر

نَـذْرٌ ۔ (نقصان سے بچنے کے لئے) جو کچھ اپنے اوپر واجب قرار دے لیا جائے ۔ نیز کسی شرط پر کوئی وعدہ کرنا بھی نَـذْرٌ کے معنوں میں داخل ہے* ۔ مثلاً کوئی شخص اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے کہ میرا بچہ تندرست ہو گیا تو میں یوں کروں گا ، تو یہ نَـذْرٌ کہلاتی ہے ۔ راغب نے لکھا ہے کہ کسی معاملہ کے پیش آنے پر کسی ایسی چیز کو اپنے اوپر واجب کرلینا جو واجب نہ ہو** ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی ڈرنے اور ڈرانے کے لکھے ہیں* ۔ اور یہ کہ جو کچھ واجب ہو اسے نَـذْرٌ کہا جاتا ہے ۔

نَـذِرَ بِالشَّيْءِ ۔ کسی چیز کو جانا اوراس سے ہوشیار اور چوکنا رہا ۔ اِنْـذَارٌ کے معنی ہیں کسی کوکسی ضرر رساں یا نقصان دہ بات کے انجام سے قبل از وقوع آگاہ (Warn) کر دینا اوراس کے خوفناک نتائج سے ڈرانا ۔ لشکر سے آگےآگےجو ہراول دستہ جاتا تھاتاکہ دشمن کی نقل و حرکت کو بھانپ کر اپنے لشکرکو آگاہ کرتا رہے اسے نَـذِيْـرَةُ الْجَيْشِ کہتے تھے ۔ اَلنَّذِيْـرُ ۔ آگاہ کرنے والا ۔ نیز کمان کی آواز (کیونکہ اسے سن کر شکارخطرہ سے آگاہ ہوجاتا ہے)۔ نیز بڑھاپے کو بھی نَذِيْرٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ آنے والی موت سے آگاہ کر دیتا ہے* ۔

لہذا نَـذِيْرٌ کے معنی ہیں غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دینے والا ۔ خواہ وہ کوئی انسان ہو یا واقعہ ۔ اس کی جمع نُـذُرٌ آتی ہے (۵۳/۵۶) ۔ (برخلاف بَشِيْـرٌ کے جو صحیح روشِ زندگی کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دیتا ہے) ۔

قرآن کریم میں نَـذْرٌ (نُـذُوْرٌ) بمعنی واجبات کئیایک مقام پر آیا ہے ۔ (مثلاً (۲۲/۲۹ و ۷۶/۷) ۔ یعنی وہ امور جواپنے آپ پر واجب قرار دے لئے جائیں ۔ اِنْـذَارٌ (تباہ کن نتائج سے آگاہ کرنے) کے لئے متعدد مقامات پر آیا ہے ۔ (مثلاً ۳۶/۱۱)۔ لیکن قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ اِنْـذَار (Warning) انہی کو فائدہ دے سکتی ہے جن میں زندگی کے آثار موجود ہوں ۔ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰) ۔ جن میں زندہ رہنےکی صلاحیت باقی نہ ہو انہیں ان نتائج سے آگاہ کرنا یا نہ کرنا یکساں ہوتا ہے (۲/۶) ۔ اِنْـذَارٌ اُسی کے لئے ہے جو اپنے اوپر کچھ واجب کرلے اور اسے ادا نہ کرے ۔ اُس سے کہا جا سکتا ہے کہ عدمِ ادائیگیٔ فریضہ سے کیا نقصان

*تاج ۔ **راغب ۔

ہوگا۔ لیکن جس نے انسانی فرائض کو اپنے اوپر واجب ہی نہیں سمجھا ، اُسے اُس کی روش کے تباہ کن نتائج سے متنبہ کرنا کیا نتیجہ خیز ہوسکتا ہے؟ یا مثلاً جو شخص خود کشی پر آمادہ ہو اس سے یہ کہنا کہ دریا میں نہ کودنا، ڈوب کر مر جاؤ گے ، بے معنی ہے ۔ دریا کی ہلاکت انگیزیوں سے انتباہ اسی کے لئے مفید ہوسکتا ہے جو ہلاکت سے بچنا چاہے ۔ (اسے متقی کہتے ہیں) ۔

نَذِیْرٌ کی جمع نُذُرٌ آتی ہے (۵۴/۵ و ۵۳/۵۶) ۔ مُنْذِرٌ ۔ آگاہ کرنے والا ۔ اس کی جمع مُنْذِرِیْنَ ہے (۲۶/۱۹۴ و ۳۷/۷۲) ۔ مُنْذَرٌ ۔ جسے آگاہ کیا جائے ۔ اس کی جمع مُنْذَرِیْنَ ہے (۳۷/۷۳) ۔

قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرام کے متعلق کہا ہے کہ وہ بشیر اور نذیر ہوتے ہیں ۔ ان حضرات کا فریضہ یہ تھا کہ وہ (از روئے وحی) لوگوں کو بتائیں کہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج کس قدر خوشگوار ہونگے (اسے خوشخبری یا بشارت کہتے ہیں) اور ان کی خلاف ورزی کا انجام کس قدر ہلاکت آفرین ہوگا (یہ تنبیہ یا انذار کہلاتی ہے) ۔ جو لوگ زندگی کی ہلاکتوں سے بچنا چاہتے (انہیں متقین کہا جاتا ہے) وہ ان کی انذار سے فائدہ اُٹھا کر ، صحیح روش اختیار کر لیتے۔ جو ان ہلاکتوں کی پرواہ نہ کرتے ، وہ اس انذار پر کان نہ دھرتے ۔ انہی کے متعلق کہا گیا ہے کہ سَوَاءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۲/۶) ۔ آج تبشیر و انذار کا فریضہ قرآن کریم ادا کرتا ہے ۔ اس نے واضح الفاظ میں بدلائل و شواہد بتا دیا ہے کہ فلاں روشِ زندگی کا نتیجہ کیا ہوگا اور فلاں کا انجام کیا ۔ اور اس کے بعد کہہ دیا ہے کہ تم جونسی روش جی چاہے اختیار کرلو ۔

ن ز ع

نَزَعَ ۔ کسی چیز کو اس کی جگہ سے اکھیڑ کر، نکال کر، الگ کر دینا ۔ ہٹا دینا ۔ نیز کھینچنے کے معنوں میں بھی آتا ہے ۔ اس معنی میں اِنْتَزَعَ بھی آتا ہے ۔ نیز اِنْتَزَعَ لازم بھی ہے ۔ یعنی اس کے معنی اکھڑنا اور اکھڑ جانا دونوں ہی ہیں ۔ نَزَعَ فِی الْقَوْسِ ۔ کمان کو کھینچا ۔ اِنْتَزَعَ الشَّیْئَ ۔ وہ کسی چیز سے رکا اور باز رہا ۔

سورۃ اعراف میں ہے یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا (۷/۲۷) ۔ ان سے ان کا لباس کھینچ لیا یا اتروا دیا ۔ سورۃ معارج میں ہے ۔ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی

(۷۹/۱) - زور سے کھینچنے والی - کھینچکر نکال لینے والی - وَ النّٰزِعٰتِ غَرْقًا (۷۹/۱) - کھینچنے والے - ابن درید نے ابو عبیدہ کے حوالہ سے النّٰازِعٰتُ اور اَلنّٰاشِطٰاتُ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وہ تارے ہیں جو ایک مقام سے نکل کر دوسرے مقام کی طرف جاتے اور ایک جگہ ڈوب کر دوسرے مقام میں طلوع ہوتے ہیں* - مولانا عبید اللہ سندھی کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ انقلابی جماعتیں ہیں جو ان صلاحیتوں اور قوتوں کو جو نیچے دب کر رہ گئی ہوں ، کھینچ کر اوپر لاتی ہیں اور اس طرح معاشرہ کو پھر سے صالح بنا دیتی ہیں - (المقام المحمود - صفحہ ۱۷)

نَزْعٌ - چھین لینا - بمقابلہ اِیْتَاءٌ (دینا) (۳/۲۵) - سورۃ الطور میں جنت کی زندگی کے ضمن میں فرمایا - یَتَنَازَعُوْنَ فِیْھَا کَاْسًا (۵۲/۲۳) - "وہ اس میں ایک دوسرے سے پیالہ لینگے" - اگر اس کے عام معنی لئے جائیں تو یہ نقشہ ہے ان دوستانہ صحبتوں کا جس میں پورے خلوص و محبت کے ساتھ بے تکلفی سے چھین جھپٹ ہوتی ہے اور لطف صحبت دوبالا ہو جاتا ہے (لیکن اس میں لغویت کا شائبہ تک نہیں ہوتا - جیسا کہ اس سے اگلی آیت سے ظاہر ہے) - علاوہ ازیں ، تَنَازُعٌ کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ "لو- یہ پیالہ تم پیؤ" - وہ جواب میں کہتا ہے "نہیں - تم پیؤ"- یہ باہمی پیش کش اور اصرار و انکار ایسا حسین تنازع ہے جس کی داد اہل ذوق ہی دے سکتے ہیں - یہ ہے جنتی معاشرہ میں اربابِ ذوق و محبت کی مخلصانہ محفلوں کا رنگ -

اور اگر اس سے ذرا بلند ہو کر دیکھا جائے تو یَتَنَازَعُوْنَ فِیْھَا کَاْسًا کے معنی یہ ہونگے کہ یہ (جماعتِ مؤمنین کے افراد) ایک دوسرے سے زندگی کی مئے حیات بخش کا پیالہ لینگے- جنتی زندگی ، انفرادی زندگی نہیں جس میں ہر ایک کو نفسا نفسی پڑی ہوتی ہے - وہاں تمام افراد ایک دوسرے سے وہ سامان لیتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو برو مندی عطا کرتا ہے - لیکن اگر ہر شخص خود غرض بن جائے اور ہر ایک کی نیت یہ ہو کہ دوسرے سے سب کچھ چھین کر خود ہی رکھ لے ، تو یہ تَنَازُعٌ وہ ہے جس سے سختی سے روکا گیا ہے (۸/۴۶) - یعنی جنتی معاشرہ میں یہ سب کچھ بطیبِ خاطر ہوگا ، اور ایک دوسرے کی نشو و نما کی خاطر - لیکن غلط معاشرہ میں ہر فرد کی نیت یہ ہوگی کہ میں دوسرے سے سب کچھ چھین جھپٹ لوں - اس مفہوم کے اعتبار سے اَلنَّزَائِعُ ان ہواؤں کو کہتے ہیں جو اپنی صحیح سمتوں

---

*تاج -

سے ھٹ کر چلتی ھیں*** ۔ (اور ایک دوسرے سے ٹکراتی رھتی ھیں) ۔ یہاں سے تنازعہ کے معنی واضح ھیں ۔ اسلامی معاشرہ میں یہ ٹکراؤ نہیں ھوتا (۸/۴۶) ۔ بلکہ باھمی ھم آھنگی اور اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ (۳/۱۰۲) کی زندگی ھوتی ھے ۔

ن ز غ

نَزْغٌ کے اصل معنی چبھونے، کھونپنے اور طعن کرنے کے ھیں، اور بقیہ تمام معانی اسی سے ماخوذ ھیں* ۔ چنانچہ پھر اس کے معنی آتے ھیں کسی کام میں خرابی پیدا کرنے کے لئے اُس میں گھسنا** ۔ نَزَغَ بَیْنَھُمْ نَزْغًا ۔ ان کے درمیان فساد ڈال دیا ۔ یا ایک کو دوسرے کے خلاف اُبھار دیا*** ۔ ابن فارس نے بھی اسکے بنیادی معنی لکھے ھیں ۔ سورۃ یوسف میں ھے مِنْ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ اِخْوَتِیْ (۱۲/۱۰۰) ۔ بعد اس کے کہ شیطان (حسد کے جذبہ) نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال دیا ۔ سورۃ اعراف میں ھے ۔ وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ (۷/۲۰۰)۔ جب (انفرادی مفاد پرستی کا جذبہ) کوئی ایسی بات دل میں ڈالے جس سے فساد کا اندیشہ ھو ۔ یا ایک کو دوسرے کے خلاف ابھارنے کا جذبہ ۔ ۔ ۔ نیز (۴۱/۵۳)۔ اَلْمِنْزَغَۃُ ۔ اس لوھے کی سلاخ کو کہتے ھیں جس سے روٹی پکانے والا روٹیوں میں چھید کرتا ھے*** ۔ اور روٹی کو اس میں اٹکا کر تنور سے باھر نکالتا ھے ۔

ن ز ف

نَزْفٌ ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے ختم ھو جانے اور منقطع ھو جانے کے ھیں ۔ نَزَفَ مَاءَ الْبِئْرِ ۔ اس نے کنویں کا تمام پانی کھینچ کر نکال لیا ۔ نَزَفَتِ الْبِئْرُ ۔ کنواں پانی سے خالی ھوگیا ۔ اسی سے نُزِفَ فُلَانٌ کے معنی ھوتے ھیں فلاں آدمی کی عقل جاتی رھی ۔ وہ مست اور بے ھوش ھوگیا ۔ اَنْزَفَ الرَّجُلُ ۔ آدمی مست اور بے ھوش ھوگیا ۔ اس کی عقل کا چشمہ خشک ھوگیا۔ اَلْمِنْزَفَۃُ ۔ ڈھیکلی ۔ وہ چھوٹا ساڈول جو ایک لمبی لکڑی کے سرے میں باندھا جاتا ھے، پھر اس لکڑی کو درمیان سے ایک دوسری زمین میں گڑی ھوئی لکڑی سے باندھا جاتا ھے اور اس سے پانی نکالا جاتا ھے**** ۔

قرآن کریم میں ھے ۔ وَ لَا ھُمْ عَنْھَا یُنْزَفُوْنَ (۳۷/۴۷) ۔ ''شرابِ جنت'' سے وہ بد مست نہیں ھونگے ۔ سَکْرَانُ نَزِیْفٌ ۔ وہ بد مست آدمی جس کی عقل بدمستی کی وجہ سے جاتی رھی ھو** ۔

*محیط ۔ **راغب ۔ ***تاج ۔ ****تاج و محیط ۔

واضح رہے کہ سورۃ الصّٰفّٰت میں وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ آیا ہے (۳۷/۴۷) جو مجہول ہے - اور سورۃ واقعہ میں وَلَا يُنْزِفُوْنَ (۵۶/۱۹) آیا ہے جو معروف ہے - اس کے معنی یہ ہونگے کہ جنت کی شراب کے پیالے (یا نہریں) کبھی خشک نہیں ہوں گی - یا اس شراب کے خواص (لذت و سرور) میں کمی واقع نہیں ہوگی -

زندگی جوئے روان است و روان خواهد بود
این مئے کہنہ جوان است و جوان خواهد بود

ن ز ل

نَزَلَ - بلندی سے نیچے کی طرف آنا - چنانچہ قرآن کریم میں نُزُوْلٌ - عُرُوْجٌ کے مقابل میں آیا ہے (۳۲/۳) - نُزُلٌ - منزل کو کہتے ہیں - نیز جن چیزوں سے مہمان کی تواضع کی جائے - اس کے معنی برکت اور عطاء کے بھی آتے ہیں (۳/۱۹۷ و ۱۸/۱۰۲) - نیز - نُزْلٌ کھیتی کے بڑھنے، پھولنے پھلنے کو کہتے ہیں - اَرْضٌ نَزِلَةٌ اس زمین کو کہتے ہیں جس میں بڑی فراوانی سے کھیتی اُگے - اَلنَّزَلُ بارش کو کہتے ہیں - نَزْلَةٌ - ایک مرتبہ کے نزول کے معنوں میں آتا ہے (۵۳/۱۳) - نَزِيْلٌ مہمان کو کہتے ہیں* - مَنْزِلٌ - اترنے کی جگہ - جمع مَنَازِلُ (۳۶/۳۹) -

اُنْزِلَ اور نُزِّلَ میں عام طور پر فرق یہ ہے کہ تَنْزِيْلٌ (نَزَّلَ) آہستہ آہستہ اتارنے کو کہتے ہیں، اور اِنْزَالٌ میں یہ شرط نہیں (لطائف اللغۃ) - نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً (۲۶/۱۳) - بادلوں سے پانی ایک دم نیچے نہیں گر پڑتا، آہستہ آہستہ بارش کی شکل میں برستا ہے - تَنْزِيْلٌ (۲۶/۱۹۲) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلتَّنْزِيْلُ کے معنی کسی چیز کو ترتیب سے رکھنے اور اس کے مقام پر رکھنے کے ہیں -

لیکن قرآن کریم میں اس کے معنی ''اوپر سے نیچے اتارنے'' ہی کے نہیں - اس کے معنی عطا کرنے کے بھی ہیں - (وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ (۵۷/۲۵) - ہم نے لوہا عطا کیا - نیز مختلف چیزوں کے برآمد ہونے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے - سورۃ حجر میں ہے کہ ہمارے پاس مختلف چیزوں کے خزانوں کے خزانے رکھے ہیں - وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵/۲۱) - لیکن ہم انہیں ایک مناسب اندازے کے مطابق برآمد کرتے رہتے ہیں - ظاہر ہے کہ جو چیزیں کائنات میں موجود نہیں ان کے نازل کرنے کے معنے یہ ہونگے

*تاج -

کہ انسان اپنی تحقیقات اور سعی و کاوش کے ذریعے انہیں حاصل کرتا جائے۔ لہذا ان مقامات میں اِنْزَال کے معنی ان اسباب کا بہم پہنچانا ہے جن سے انسان ان چیزوں کو حاصل کر سکتا ہے۔ ان چیزوں کے ذخیرے کائنات میں موجود ہیں۔ ان کا حصول، انسان کی محنت پر منحصر ہے۔

قرآن کریم کے لئے تَنْزِیْل (نازل کرنے) کا جو لفظ آیا ہے تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ وحی، رسول کے اپنے ذہن کی پیدا کردہ (Subjective) چیز نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ اسے خارج سے (Objectively) ملتی ہے۔ وحی ایک خارجی حقیقت ہے، انسان کی اپنی پیدا کردہ نہیں۔ اس لئے وحی کسب و ہنر سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ یہ صرف منزل من اللہ (خدا کی طرف سے عطا کردہ) ہوتی ہے۔ مادی کائنات میں انسان اپنی سعی و کاوش سے چیزوں کے اوپر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاتا ہے۔ اسے (Discovery) کہتے ہیں۔ لیکن وحی میں حقیقت خود اپنے آپ کو نبی پر منکشف (Reveal) کرتی ہے۔ اس لئے اس کے لئے اِنْزَال کا لفظ آیا ہے۔ یعنی انسان خود بلند ہوتا ہوا حقیقت کے چہرے سے پردہ کشائی نہیں کرتا بلکہ حقیقت خود نیچے اتر کر اس کے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے۔ یہ چیز وحی کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔ اور چونکہ وحی کا سلسلہ رسول اللہؐ کی ذات پر ختم ہوگیا، اس لئے اب انسانوں کے پاس عِلم کے دو ہی ذریعے رہ گئے۔ ایک قرآن کریم کے اندر محفوظ حقائق اور دوسرے خارجی کائنات میں انسانی علم و عقل کی رو سے منکشف کردہ حقائق۔ ان کے علاوہ کوئی تیسرا ذریعۂ علم انسان کے پاس نہیں۔ باطنی کشف کا دعویٰ در حقیقت وحی ہی کا دعویٰ ہے، فرق صرف الفاظ کا ہے۔ قرآن کریم میں "کشف و الہام" کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے اس قسم کا دعویٰ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ انسان میں بعض قوتیں ایسی ہیں (مثلاً قوتِ خیالی یا قوت ارادی) کہ اگر خاص مشقوں کے ذریعے ان کی نشو و نما (Development) کرلی جائے تو ان میں ایسی خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو دوسرے لوگوں میں نہیں ہوتیں۔ ایسے لوگ کشف و کرامات سمجھنے لگتے اور "روحانی قوت" کا مظاہرہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ "روحانیت" سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ نہ ہی دین سے کوئی واسطہ۔ اسلئے کہ جو انسان بھی چاہے وہ ان مشقوں کے ذریعے ایسی قوت حاصل کرسکتا ہے، خواہ وہ مشرک، کافر اور دہریہ بھی کیوں نہ ہو۔ دین کا مقصود اس قسم کی قوتیں پیدا کرنا نہیں، آدمی کو انسان بنانا ہے۔

مُنَزِّلٌ۔ اوپر سے نیچے اتارنے والا۔ نازل کرنے والا۔ عطا کرنے والا (۵/۱۱۵)۔ نیز مُنْزِلٌ (۲۹/۲۴)۔ مُنَزَّلٌ۔ اتارا ہوا (۶/۱۱۵)۔ نیز مُنْزَلٌ

اتارا هوا (۳/۱۲۴) ۔ یہ ، ظرف مکان (جگہ) یا زمان (وقت) ۔ اور مصدر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَکًا (۲۳/۲۹) ۔ "اے میرے رب مجھے برکت والا اتارنا اتارئیو" ۔ سورۃ یوسف میں مُنْزِل بمعنی مہمان نواز آیا ہے ۔ وَ اَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ (۱۲/۵۹) ۔ "اور میں بہت اچھا مہمان نواز ہوں" ۔

تَنَزُّل ۔ آہستہ آہستہ اترنا ۔ اسی سے تَنَزَّلُ (۹۷/۴) میں ہے ۔

ن س أ

نَسَأٌ ۔ جھڑک دینا ۔ ہانکنا ۔ پیچھے ہٹا دینا ۔ نَسَأَ الشَّیْئَ ۔ کسی چیز کو پیچھے ہٹا دینا ۔ مؤخر کر دینا ۔ اَنْسَأَهُ ۔ اُسے حوض سے ہٹا دیا ۔ پیچھے کر دیا ۔ نَسَأْتُهُ الْبَیْعَ ۔ میں نے بیع میں اس سے ادھار کا معاملہ کیا اور اسطرح رقم کے لین دین کو مؤخر کر دیا ۔ اَلنَّسِیْئَةُ ۔ تاخیر ۔ پیچھے کرنا * ۔ اسی جہت سے ادھار کے لئے بھی بولا جاتا ہے کہ اس میں قیمت کی ادائیگی مؤخر کر دی جاتی ہے ۔ بَاعَهُ بِنَسِیْئَةٍ ۔ اس کے ساتھ ادھار کا سودا کیا ۔ (یہ اس قسم کے سودے کو کہتے ہیں جس میں قیمت یا چیز بعد میں دی جائے) ۔ اَلْمِنْسَاَةُ ۔ لاٹھی ، جس سے جانوروں کو پیچھے ہٹایا جاتا ہے (۳۴/۱۴) ۔ ابن فارس نے بھی یہ تمام معانی دئے ہیں ۔

سورۂ توبہ میں ہے اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْکُفْرِ (۹/۳۷) ۔ "یقیناً نسئی کفر میں ایک اضافہ ہے" ۔ اَلنَّسِیْٓءُ ۔ عربی معاشرہ کی ایک خاص چیز تھی ۔ ویسے تو قرآن کریم نے یہ کہکر اسکی تشریح کر دی ہے کہ یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ یُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا (۹/۳۷) ۔ "ایک سال اسے حلال قرار دیتے ہیں ۔ ایک سال اُسے حرام کر دیتے ہیں" ۔ لیکن اس کی تفصیل کا سمجھنا ضروری ہے ۔ عربوں میں قمری مہینے رائج تھے ۔ رَبِیْعٌ ۔ جُمَادَیٰ ۔ رَمَضَانُ ۔ وغیرہ مہینوں کے نام ہی بتاتے ہیں کہ ان کا تعلق موسموں سے تھا ۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہر سال وہی مہینہ اُسی موسم میں صرف اُسی صورت میں آ سکتا ہے جب سال شمسی ہو ۔ قمری ہونے کی صورت میں ایک ہی مہینہ مختلف موسموں میں آتا رہتا ہے ۔ عرب اسے پسند نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ (دیگر مہینوں کے علاوہ) حج کی تقریب ایک ہی موسم میں ہو ۔ اس کے لئے (یہودیوں کے اتباع میں) کرتے یہ تھے کہ ہر تیسرے سال ایک مہینہ خالی چھوڑ دیتے تھے [زیادہ صحیح الفاظ میں آٹھ سال میں تین مہینے ۔

*تاج ۔

کیونکہ قمری سال شمسی سال سے قریب گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے] اور اسطرح اپنے مہینوں کو پھر موسموں کے مطابق کر لیتے تھے ۔ یہ مہینہ (جسے خالی چھوڑتے تھے) بالعموم ذوالحجہ کے بعد ہوتا تھا ۔ اس ''آگے پیچھے کرنے'' کے عمل کو وہ نَسِیْئٌ کہتے تھے ۔ یعنی سال کو ایک مہینہ پیچھے ہٹا لینا ۔

نیز ان کے ہاں سال میں چار مہینے (رجب ۔ ذی قعدہ ۔ ذوالحجہ اور محرم) واجب الاحترام مہینے تھے جن میں لوٹ مار اور جنگ و قتال منع تھا ۔ کیلنڈر کا یہ اہتمام بنو کنانہ کی ایک جماعت کے سپرد تھا جنہیں نَسَأَۃٌ کہتے تھے ۔ یہ نَسَأَۃٌ کبھی تو ان محترم مہینوں میں تغیر و تبدل کردیتے ۔ مثلاً حج کے بعد محرم کے متعلق کہدیتے کہ اس سال اسکی بجائے ربیع الاول کا مہینہ محترم ہوگا ۔ وقس علی ھذا ۔ اور کبھی اس تیسرے سال کے خالی مہینے کو آگے پیچھے کر دیتے ۔ اس سے معاشرہ کے نظام میں گڑ بڑ ہو جاتی اور جن لوگوں کو یہ پہلے بتا دیتے کہ اس سال یوں کیا جائیگا وہ اس سے بڑا فائدہ اٹھا لیتے ۔ اس کو بھی نَسِیْئٌ کہتے تھے ۔

قرآن کریم نے ان دونوں قسموں کی نَسِیْئٌ کو ختم کر دیا ۔ ایک طرف اس نے اعلان کر دیا کہ اِنَّ عِدَّۃَ الشُّھُوْرِ عِنْدَ اللّٰہِ اثْنَا عَشَرَ شَھْرًا (۹/۳۶) ۔ '' قوانین خداوندی کی رو سے مہینوں کی تعداد بارہ ہے '' ۔ اس لئے ہر تیسرے سال ایک مہینے کا خالی چھوڑ دینا بے معنی بات ہے ۔ چنانچہ اس اعلان (۱۰ ھ) کے بعد عربی کیلنڈر میں سال کے بارہ مہینے قرار پا گئے ۔ اور مہینے قمری رہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ قمری سال کے مہینوں کے نام تو وہی ہیں ، لیکن وہ اب التزاماً اُن موسموں میں نہیں آتے جن کی نسبت سے ان کے نام رکھے گئے تھے ۔ (مثلاً رَمَضَانُ ۔ رَمْضٌ سے ہے جسکے معنی شدت کی گرمی ہیں ۔ لیکن اب رمضان گرمی میں بھی آتا ہے اور سردی میں بھی) ۔

اگر یہ کیلنڈر قمری کی جگہ شمسی ہو تو پھر ہر مہینہ ہمیشہ اُسی موسم میں آتا رہے ۔ اور سال کے بارہ مہینے بھی پورے ہو جاتے ہیں ۔ یعنی جس مدت میں زمین سورج کے گرد اپنا ایک دور ختم کرتی ہے اسکے بارہ حصے ہو جاتے ہیں ۔ واضح رہے کہ قرآن کریم کی رو سے شمسی اور قمری دونوں میں سے جونسا کیلنڈر جی چاہے اختیار کر لیا جاسکتا ہے ۔ (دیکھئے ۶/۹۷ ; ۱۰/۵ ; ۱۷/۱۲) ۔

اس نَسِیْئٌ کے علاوہ جس کا ذکر اوپر آیا ہے ، قرآن کریم نے اس نَسِیْئٌ کو بھی ختم کر دیا جس کی رو سے وہ قابل احترام مہینوں میں تقدم و تاخر کر دیا کرتے تھے ۔ اسے قرآن کریم نے زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ (۹/۳۷) قرار دیدیا ۔ اسطرح معاشرہ محکم بنیادوں پر استوار ہو گیا ۔

قرآن کریم کا یہ اصولی قانون اب بھی موجود ہے کہ اگر کہیں جنگ چھڑ جائے تو وہ مسلسل نہ چلتی رہے بلکہ بین الاقوامی قانون کی رو سے یہ طے کر دیا جائے کہ فلاں فلاں وقت کے لئے جنگ کو روک دینا ہوگا۔ اس التواء اور قطع تسلسل کے بڑے فائدے ہیں۔ اور اکثر صورتوں میں ہوسکتا ہے کہ اس سے وہ جنگ ختم ہی ہو جائے۔ اس التواء کے عرصہ کا احترام تمام اقوام کے لئے ضروری ہوگا اور کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ التواء کے وقت کو مقدم یا موخر کر سکے۔ اس لئے کہ یہ نَسِیْئی ہوگی جسے قرآن کریم نے کفر، یعنی معاہدات کے عملی انکار، سے تعبیر کیا ہے۔

ن س ب

اَلنَّسَبُ۔ اَلنِّسْبَۃُ۔ قرابتداری جو خصوصیت کے ساتھ آباو اجداد میں ہو۔ باپ یا ماں کی طرف سے قرابتداری۔ یہ اسکے اصل معنی ہیں۔ پھر، دو ایسی چیزوں کے لئے جو کسی اعتبار سے بھی باہم مشابہت اور تعلق رکھتی ہوں ان کے اس تعلق کے اظہار کے لئے بھی النِّسْبَۃُ بولدیتے ہیں۔ اَلنَّیْسَبُ۔ چیونٹیاں، جبکہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے چل رہی ہوں۔ چیونٹیوں کا راستہ*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز سے اتصال ہیں۔ نَسَبٌ۔ خاندانی اتصال کو کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں نَسَبًا۔ بمعنی قرابتداری (۲۵/۵۴) میں آیا ہے۔ اور (اسکی جمع) اَنْسَابٌ (۲۳/۱۰۱) میں۔

ن س خ

نَسْخٌ کے معنی ہیں ایک چیز کو مٹا دینا اور اسکی جگہ دوسری چیز کو لے آنا۔ دوسری چیز کو اسکے قائم مقام کر دینا (ابن فارس)۔ نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ۔ آفتاب نے سایہ کو ہٹا دیا اور اسکی جگہ روشنی لے آیا۔ یا کسی چیز میں تبدیلی کر دینا۔ نَسَخَتِ الرِّیْحُ آثَارَ الدِّیَارِ۔ ہوا نے آبادی کے آثار (نشانات و علامات) کو تبدیل کر دیا۔ (یعنی وہ کھنڈرات وغیرہ جن سے آبادی کا پتہ نشان ملتا تھا انہیں ریت سے ڈھانک کر دگرگوں کر دیا)۔ نَسَخَ الْکِتَابَ۔ ایک کتاب کو نقل کر کے اس جیسی دوسری کتاب مرتب کر لینا۔ اسی سے اَلنُّسْخَۃُ۔ منقول (Copied) کتاب کو کہتے ہیں**۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّا کُنَّا نَسْتَنْسِخُ (۴۵/۲۹)

*تاج و راغب۔ **تاج۔ محیط و راغب۔

" ہم لکھوا لیتے تھے" ۔ مٹا دینے یا زائل کر دینے کے معنوں میں یہ لفظ (۲۲/۵۲) میں آیا ہے ۔ فَیَنْسَخُ اللّٰہُ ۔ " اللہ مٹا دیتا ہے" ۔

لہذا نَسْخٌ کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کی جگہ دوسری چیز لے آنا ۔ اس لفظ کی اہمیت اس لئے ہے کہ ہمارے ہاں ناسخ و منسوخ کا عقیدہ چلا آرہا ہے اور اسے دین کے مہمات میں سے سمجھا جاتا ہے ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہے بھی بہت اہم ۔ اس لئے کہ اس کا غلط مفہوم دین کو اس کی جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے ۔ اور اسکا صحیح مفہوم قرآن کو خدا کے دین کا آخری اور واحد ضابطہ ثابت کر دیتا ہے ۔

ناسخ و منسوخ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد آیات ایسی ہیں (بعض کے نزدیک ان کی تعداد پانچ سو تک ہے) جو پڑھی تو جاتی ہیں لیکن جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے ۔ پھر سن لیجئے کہ (اس عقیدہ کے مطابق) قرآن کریم میں پانچ سو کے قریب ایسی آیات ہیں جنہیں محض " ثواب" کی غرض سے پڑھ لیا جاتا ہے لیکن ان میں جو احکام ہیں وہ سب منسوخ ہو چکے ہیں ۔ بعض احکام قرآن کریم کی دوسری آیات نے منسوخ کر دئے ہیں اور بعض احکام احادیث نے منسوخ کر دئے ہیں ۔ اسکے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر موجود نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے ۔ (مثلاً آیۂ رجم ۔ یعنی زانی کو سنگسار کرنے کے حکم والی آیت) ۔ اس عقیدہ کی رو سے قرآن کریم کی شکل یوں بنتی ہے کہ :—

(۱) قرآن کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے احکام تو منسوخ ہو چکے ہیں لیکن جن کی تلاوت ہوتی رہتی ہے ۔ اور

(۲) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر تو نہیں لیکن انکا حکم موجود ہے ۔ دوسری قسم کی آیات کے لئے تو دلیل صرف روایات کی ہے ۔ لیکن پہلی قسم کی آیات کے لئے خود قرآن کریم ہی کی ایک آیت سے دلیل لائی جاتی ہے ۔ اور وہ آیت یہ ہے ۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۔ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲/۱۰۶)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے —

ہم جس آیت کو بھی منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی اور آیت لے آتے ہیں ۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے ۔

اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن کریم میں کسی بات کا حکم دیا ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کر دینا چاہئیے ۔ چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل کر دی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا ۔ یہ حکم اس سے پہلے حکم سے بہتر ہوتا تھا ۔ واضح رہے کہ اس نئی آیت میں یہ کہیں نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس سے فلاں آیت کو منسوخ سمجھا جائے ۔ اس لئے قرآن کریم میں منسوخ آیات بھی اُسی طرح سے موجود ہیں اور ناسخ آیات بھی ۔ اللہ نے ان کے متعلق کہیں نہیں بتایا کہ فلاں آیت منسوخ ہے فلاں آیت سے ۔ یہ تعین بعد میں روایات کی رو سے یا مفسرین کے اپنے خیالات کی رو سے کیا گیا ۔ چنانچہ ان آیات کی تعداد ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی ۔ حتکہ شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک ان کی تعداد صرف پانچ ہے ۔

باقی رہا ” فراموش کرا دینے “ کا سوال ۔ سو اس کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آیات نازل ہوتی تھیں لیکن رسول اللہؐ (معاذ اللہ) انہیں بھول جاتے تھے ۔ تو پھر انہی جیسی آیات اور نازل ہو جاتی تھیں ۔ یہ مراد ہے اَوْ نُنْسِهَا سے ۔ اسکی دلیل میں یہ آیۃ پیش کی جاتی ہے ۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ . . . . . (۸۷/۶-۷) جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ۔ ہم تجھے پڑھائینگے سو تو نہ بھولیگا ، ہاں مگر جو اللہ چاہتا ہے ۔

اس عقیدہ کی رو سے آپ دیکھئیے کہ خدا ، قرآن کریم اور رسول اللہؐ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے ۔ خدا کا تصور اس قسم کا کہ وہ آج ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات بتا دیتے ہیں کہ وہ حکم ٹھیک نہیں تھا اس لئے وہ قرآن کریم کے اُس حکم کو منسوخ کرکے اُسکی جگہ دوسرا حکم دے دیتا ہے ۔

قرآن کریم کے متعلق یہ کہ اس میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تلاوت برابر ہو رہی ہے ۔ اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی ناسخ ۔ اسے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اس کا فیصلہ کریں کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی اسکی ناسخ ۔

اور رسول اللہؐ کے متعلق یہ تصور کہ حضورؐ خدا کی طرف سے نازل کردہ قرآنی آیات کو بھی بھول جایا کرتے تھے ۔ یا للعجب !

ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم آگے آئے گا ۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى کے صحیح مفہوم کے لئیے عنوان ن ۔ س ۔ ی دیکھئیے جہاں اسکی تشریح کر دی گئی ہے ۔

اب دیکھئے اس آیت (مَا نَنْسَخْ ....) کا صحیح مفہوم - پیچھے سے سلسلۂ کلام یوں چلا آتا ہے کہ اہل کتاب (بالخصوص یہود) قرآن کریم اور رسالت محمدیہؐ پر مختلف اعتراضات کرتے ہیں (قرآن کریم ان اعتراضات کا جواب دیتا ہے)۔ اسی سلسلہ میں ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا (اور یہ اعتراض بڑا اہم تھا) کہ جب خدا نے انبیاء سابقین (مثلاً حضرت موسیٰؑ وغیرہ) پر اپنے احکام نازل کر دئے تھے، اور وہ احکام تورات وغیرہ میں موجود ہیں - تو پھر ان کی موجودگی میں اس نئے رسول اور نئی کتاب کی ضرورت کیا تھی؟ اس آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے - ان سے کہا گیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت حضرت نوحؑ کے زمانے سے مسلسل چلا آرہا ہے - لیکن اس کی صورت یہ رہی ہے کہ مختلف انبیاء کی وساطت سے جو وحی بھیجی جاتی تھی ان میں ایک حصہ ان احکامات پر مشتمل ہوتا تھا جو وقتی ہوتے تھے اور ان کا تعلق خاص اسی قوم سے ہوتا تھا جس کی طرف وہ احکام بھیجے جاتے تھے - اور انہیں انہی حالات میں نافذ العمل رہنا ہوتا تھا جو اس زمانے کے تقاضے سے پیدا ہوئے تھے - بعد میں، جب وہ قوم نہ رہتی یا زمانے کے تقاضوں سے وہ حالات بدل جاتے تو ایک اور رسول آجاتا اور وہ ان احکام کی جگہ دوسرے احکام لے آتا - اسطرح یہ جدید وحی اُس سابقہ وحی کی قائمقام (ناسخ) بن جاتی - یہ سلسلہ شروع ہی سے ایسا چلا آرہا ہے - چنانچہ تم خود دیکھ رہے ہو کہ تورات کے کتنے احکام ہیں جنہیں حضرت عیسیٰؑ نے آکر بدل دیا (یہ بدلے ہوئے احکام انجیل میں موجود ہیں)۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانیت کے تقاضے اور اسکی ذہنی سطح بھی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر کو اٹھتی چلی آرہی ہے - اس لئے ہر قوم کو اس کے حالات اور ارتقائی سطح کے مطابق ہی احکام دئے جاتے تھے - ان کی سطح سے بلند احکام و قوانین روک لئے جاتے تھے - تاآنکہ ان کے بعد دوسری قوم آتی جو ارتقائی منزل میں ان سے آگے ہوتی - تو وہ "روکے ہوئے" احکام و قوانین اُس وقت نازل کر دئے جاتے - تنزیل وحی میں یہ اصول بھی کار فرما رہا ہے -

نیز یہ شکل بھی ہوتی کہ ایک رسول کے چلے جانے کے بعد، اُسکی قوم اس کی وحی کے بعض حصوں کو ترک کر دیتی - بعض کو فراموش کر دیتی - اس لئے ان ترک کردہ یا فراموش کردہ حصوں کو (جن میں کسی تغیر

و تبدل کی ضرورت نہ ہوتی) بعد میں آنے والے رسول کی وحی سے از سر نو تازہ کر دیا جاتا ۔

یہود سے کہا گیا کہ وحی کا سلسلہ اسطرح چلا آرہا ہے ۔ اب وہ دور آگیا ہے جس میں انسانی شعور پختگی حاصل کرلیگا ۔ لہذا اب انتظام یہ کیا گیا ہے کہ ۔

(۱) سابق انبیاء کی وحی کے وہ تمام احکام جو ان کی قوم کے حالات اور ان کے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ مخصوص تھے منسوخ کرکے ان کی جگہ، دوسرے احکام و قوانین بھیج دئے جائیں ۔ اور چونکہ وحی کا یہ سلسلہ اب ختم ہورہا ہے اس لئے یہ احکام وقتی اور ہنگامی نہیں ہوں گے بلکہ ابدی طور پر انسانیت کا ساتھ دینے والے ہونگے ۔ اس لئے یہ احکام و قوانین سابقہ احکام سے بہتر ہوں گے ۔

(۲) وہ قوانین جنہیں پہلے روک لیا گیا تھا کیونکہ ہنوز انسانیت اس سطح پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ انہیں سمجھ سکے یا اپنا سکے ، اب انہیں بھی نازل کر دیا جاتا ہے ، کیونکہ قرآن کریم انسانیت کی بلند ترین سطح تک اس کا ساتھ دے گا ۔

(۳) اور سابق انبیاء کی وحی کے وہ احکام و قوانین جنہیں ان کی قوموں نے ترک کر دیا تھا ۔ یا فراموش کر دیا تھا (یا جن میں انہوں نے تحریف کر دی تھی) ان کی تجدید کردی گئی ہے ۔ (ان کی مثل احکام دیدئے گئے ہیں) ۔

یہ ہے وہ ضرورت جس کے لئے ایک نئے رسول اور نئی کتاب کو بھیجا گیا ہے ۔ اور یہ ہے وہ وجہ کہ اب تمام سابقہ کتابوں کی جگہ اسی قرآن کریم پر ایمان لانا اور اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے ۔ اب اس کے سوا ہدایت کی کوئی اور راہ نہیں ۔ فَاِنْ آمَنُوْا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ (۲/۱۳۷) ۔ اگر یہ بھی اسی طریق پر ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ ہدایت پاسکیں گے ۔ اور اگر اس راہ سے اعراض برتیں گے تو پھر خدا کے راستے کے مخالف سمت جائیں گے ۔

یہ ہے صحیح مفہوم مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا کا ۔ اب دیکھئے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی کس طرح اس مفہوم کے آئینہ دار بنتے ہیں ۔

نَسَخَ کے معنی ہم نے اوپر دیکھ ہی لئے ہیں - کسی چیز کی جگہ کسی دوسری چیز کو لے آنا - آیَتٌ کے معنی صرف قرآن کریم کی آیات نہیں - قرآن کریم نے ہر رسول کی وحی کو آیَاتُ اللّٰہِ کہا ہے - مثلاً اسی سورۃ بقرہ میں قصہ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا - فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (2/38) - جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو کوئی اس ہدایت کی اتباع کریگا اسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا - اور اس سے آگے ہے - وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا . . . (2/39) ان کے برعکس، جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کرینگے اور ان سے انکار کریں گے . . . یہاں سے ظاہر ہے کہ جہاں اور جب بھی خدا کی طرف سے ہدایت آئی ہے اُسے آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے - لہذا مَانَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ میں آیات سے مراد قرآن کریم کی آیات نہیں بلکہ اس سے مراد ہے کسی سابق وحی کی آیات کی تبدیلی بعد کی وحی کی آیات سے - جیسا کہ سورۃ نحل میں کہا گیا ہے - وَاِذَا بَدَّلْنَا اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ - (16/101) - "اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں" -

اس کے بعد لفظ نُنْسِھَا ہے - یہ لفظ نَسِیَ سے ہے - نَسِیَ کے معنے کسی چیز کو ترک کر دینا ، یا فراموش کر دینا ، آتے ہیں - (دیکھئے عنوان ن - س - ی) - اس لفظ میں یہ ساری حقیقت آجاتی ہے کہ سابقہ کتبِ آسمانی اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہتی تھیں - چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ جو رسول بھی آیا اس کے ساتھ یہی ہوا کہ اس کی وحی میں سرکش اور مفسد لوگوں نے اپنی طرف سے کچھ ملا دیا - لیکن خدا کی طرف سے ایسا ہوتا رہا کہ ان کی اس آمیزش اور ملاوٹ کو الگ کر دیا جاتا اور اس طرح اللہ اپنی آیات کو از سر نو محکم کر دیتا (22/52) - یا وہ اس وحی کے کچھ حصے کو ترک ہی کردیتے تھے - اس حصہ کو خدا نئے رسول کی وحی میں پھر شامل کردیتا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت (یا اس کی مثل اس جیسی آیت) سے مراد سابق وحی کی آیات ہیں نہ کہ قرآن کریم کی ایک آیت کی جگہ دوسری آیت -

نَسِیَ کے معنی کسی چیز کو علیٰ حالہ چھوڑ دینے کے بھی ہیں - اس اعتبار سے آیت نُنْسِھَا سے مفہوم یہ ہوگا کہ جن سابقہ احکام کے متعلق ہمارا فیصلہ یہ ہوتا کہ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے ، انہیں ہم نئے رسول کی وحی میں اسی طرح شامل کر دیتے۔

اس اعتبار سے قرآن کریم ایک طرف تمام انبیاء سابقہ کی وحی کا مُهَيْمِن ہے (۵/۴۸) - یعنی اس کے اندر وہ تمام قوانین محفوظ ہوگئے ہیں - اور دوسری طرف خدا کو جس قدر احکام نوع انسانی کے لئے دینے تھے ، ان سب کی تکمیل ہوگئی ہے - وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَ عَدْلًا (۶/۱۱۶) - اور اب اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہوسکتا - لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶)- نہ خدا کی طرف سے اب کسی تبدیلی کی ضرورت باقی ہے اور نہ انسانوں میں سے کوئی اس میں رد و بدل کر سکے گا - کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے (۱۵/۹) -

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ خدا نے وحی کے سلسلہ کو اس طرح کیوں رکھا - تو اس کا جواب یہ کہکر دیدیا کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۲/۱۰۶) - خدا کے ہاں ہر بات کے اندازے مقرر ہیں - وہ جانتا ہے کہ انسانوں کو کس زمانے میں کس قسم کے احکام ملنے چاہئیں اور وہ دور کب آئے گا جب انہیں مکمل ضابطۂ حیات دیدیا جائے - یہ سب کچھ اُن اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر اُسے پوری پوری مقدرت حاصل ہے -

یہ ہے ناسخ ومنسوخ کا صحیح مفہوم - جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس میں ایک لفظ بھی منسوخ نہیں - اس کا ہر حکم اپنی جگہ محکم و غیر متبدل ہے - البتہ ہر حکم خاص حالات کے ماتحت نفاذ پذیر ہوتا ہے - جب حالات بدل جائیں تو اسکی جگہ قرآن کا دوسرا حکم نافذ ہو جاتا ہے - مثلاً صلٰوۃ کے لئے وضو کرنے کا حکم ہے - لیکن اگر پانی نہ ملے یا انسان مریض ہو تو وضو کی جگہ تیمم کا حکم ہے (۵/۶) - ان حالات میں وضو کا حکم پیچھے ہٹ جائے گا اور تیمم کا حکم آگے آجائے گا - جب پانی مل جائے گا (یا مرض جاتا رہے گا) تو پھر وضو کا حکم آگے آجائیگا اور تیمم کا حکم پیچھے چلا جائے گا -

یا مثلاً قرآن کریم نے چور اور زانی (وغیرہ) کے لئے سزا مقرر کی ہے - ظاہر ہے کہ اگر کسی معاشرہ میں چوری اور زنا کی وارداتیں نہ ہوں تو قرآن کریم کے (سزاؤں کے متعلق) احکام نافذ العمل نہیں ہونگے - یا مثلاً اگر کسی معاشرہ میں مفلس ، محتاج ، گداگر نہ رہیں تو خیرات وغیرہ سے متعلق احکام نافذ نہیں ہونگے - یا مثلاً اگر کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر نہ مرے تو وراثت کے احکام اس پر نافذ نہیں ہونگے - اسی طرح اگر کوئی ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے جس میں فالتو دولت یا جائداد کسی کے پاس نہ ہو تو وراثت کے احکام نافذ نہیں ہونگے - ظاہر ہے کہ ان امور کو ''ناسخ و منسوخ'' سے کچھ واسطہ نہیں -

یہ احکام اپنی جگہ موجود رہتے ہیں ۔ جب وہ حالات پھر پیدا ہو جائیں جن کے ماتحت انہیں نافذ ہونا تھا ، تو وہ پھر نافذ ہو جاتے ہیں۔ ''منسوخ'' اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے ساقط ہو جائے اور کبھی نافذ نہ ہوسکے ۔ قرآن کریم میں ایسا کوئی حکم نہیں ۔

مَا نَنْسَخْ والی آیت (۲/۱۰۶) ۔ یا سورۃ النحل کی آیت اِذَا بَدَّلْنَا آیَۃً مَّکَانَ آیَۃٍ (۱٦/۱۰۱) میں اگر آیۃ سے مراد کائناتی حوادث و وقائع لئے جائیں (جنہیں قرآن کریم متعدد مقامات پر ''آیات اللہ'' کہکر پکارتا ہے) تو ''نسخ آیت'' سے مراد ہوگا نظام کائنات کے کسی ایک طریق یا مظہر کی جگہ کسی دوسرے طریق یا مظہر کا آجانا ۔ ارباب علم و تحقیق سے پوشیدہ نہیں کہ کائنات میں اس قسم کے تبدلات کسطرح آئے دن ہوتے رہتے ہیں ۔

لیکن چونکہ ہر دو مذکورہ بالا آیات کے سیاق و سباق کا تعلق وحی سے ہے اس لئے ہم پہلے بیان کردہ مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں ، اگرچہ دوسرے مفہوم کی رو سے معانی میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے ۔

اول الذکر مفہوم ہو یا ثانی الذکر ، یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جو منسوخ ہو ۔ اس غیر متبدل صحیفہ آسمانی کا ایک ایک حرف اپنے مقام پر اٹل ہے اور اٹل رہے گا ۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید ۔

ن س ر

اَلنَّسْرُ ۔ گدھ کو کہتے ہیں ۔ لیکن عربوں میں مختلف قسم کے گدھوں کے لئے الگ الگ نام ہیں ۔ اس گدھ کی صفت میں اہل لغت نے لکھا ہے کہ یہ بڑی تیز نظر رکھتا اور بلند پرواز ہوتا ہے ۔ نیز نَسْرٌ قبیلہ ذی الکلاع کا ایک بت تھا جو سرزمین حمیر میں تھا * ۔ قرآن کریم میں اس بت کا نام قوم حضرت نوح ؑ کے ذکر میں آیا ہے (۷۱/۲۳) ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اچک لینے اور چھین لینے کے ہیں ۔ اور اَلنَّسْرُ ۔ چند ستاروں کے جھمکے کو نیز گدھ کو کہتے ہیں ۔ قرآن کریم میں بہرحال یہ لفظ قوم حضرت نوح ؑ کے بت کے لئے آیا ہے ۔

ن س ف

نَسَفَ الْبِنَاءَ یَنْسِفُہٗ ۔ اس نے عمارت کو جڑ سے اکھیڑ دیا ۔ اَلْمِنْسَفَۃُ ۔ وہ اوزار جس سے عمارت کو اکھاڑا جاتا ہے ۔ نَسَفَ الطَّعَامَ ۔

---

*تاج ۔

اس نے غلے کو پھٹکا ۔ اَلْمِنْسَفُ ۔ چھاج ۔ نَسَفَتِ الرِّیْحُ الشَّیْءَ ۔ ھوا نے اس چیز کو اڑا دیا ۔ اکھیڑ کر منتشر کر دیا ۔ نَسَفَ الْبَعِیْرُ الْاَرْضَ بِمُقَدَّمِ رِجْلِہٖ ۔ اونٹ نے اپنے پاؤں کے اگلے سرے سے مٹی کو پھینکا اور اڑایا***۔ اَلنُّسَافَۃُ ۔ پھٹکنے سے جو کچھ اُڑے ۔ اَلْمِنْسَفَۃُ ۔ چھلنی کو بھی کہتے ھیں ۔ اور نَسَفَ الشَّیْءَ کسی چیز کے چھاننے کو*۔ اَلنَّسِیْفُ ۔ وہ نشان جو ایڑ ہ لگانے سے اونٹ کے پہلو پر (بال اڑنے سے) پیدا ھو جاتا ھے ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے کشف یعنی کھولنا اور ظاھر کرنا لکھے ھیں ۔

سورہ طٰہٰ میں ھے ۔ لَنَنْسِفَنَّہٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا (۲۰/۹۷) ۔ ھم اسے دریا میں بہا دینگے ۔ اسکے اجزا منتشر کرکے دریا برد کردینگے ۔ ذرا آگے چل کر ھے ۔ یَنْسِفُھَا رَبِّیْ نَسْفًا (۲۰/۱۰۵) ۔ تیرا رب انہیں جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھدیگا ۔

ن س ک

نَسَکَ الثَّوْبَ ۔ اس نے کپڑے کو دھو کر پاک اور صاف کر لیا ۔ صاحب محیط نے لکھا ھے کہ اس مادہ کے اصلی معنی دھونے اور صاف کرنے کے ھیں ۔ باقی تمام معانی اسی اصول پر متفرع ھیں**۔ اَرْضٌ نَاسِکَۃٌ ۔ سرسبز و شاداب زمین جس پر نئی نئی بارش ھوئی ھو*۔

اس بنیادی معنی کی رو سے اس سے مراد کسی معاملہ کو درست اور ٹھیک کر لینا ھوتا ھے ۔ نَسَکَ السَّبْخَۃَ کے معنے ھیں اس نے زمین شور کو درست کیا ۔ نَسَکَ اِلٰی طَرِیْقَۃٍ جَمِیْلَۃٍ ۔ اس نے اچھا طریقہ اختیار کر لیا اور پھر اس پر مداومت کی*۔

راستہ اختیار کر لینے کی جہت سے کلام عرب میں مَنْسَکٌ ھر اس مقام کو کہتے ھیں جس کی طرف آنے جانے کے لوگ عادی ھو چکے ھوں ۔ خواہ یہ خیر میں ھو یا شر میں ۔ اس کے بعد امور و مراسم حج کو مَنَاسِکُ کہنے لگے ۔ اور نُسُکٌ یا نَسِیْکَۃٌ ۔ ذبیحہ کو یا خون کو*۔

اسکے بعد یہ لفظ ھر اس بات کے لئے بولا جانے لگا جو خدا کی طرف سے واجب ھوئی ھو ۔ لہذا مَنَاسِکُ کے معنی واجبات خداوندی کے طور طریقے ھو گئے**۔ ابن قتیبہ نے کہا ھے کہ اس کے معنی ھر اس چیز کے ھیں جس

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

کے ذریعے خدا کا تقرب حاصل کیا جائے*۔ قرآن کریم میں احکام حج کے ضمن میں آیا ہے۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ (۲/۲۰۰)۔ جب تم حج کے واجبات سے فارغ ہو چکو۔ اس سے ذرا پہلے ہے فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (۲/۱۹۶)۔ اس کا فدیہ روزے یا صدقہ یا ذبیحے ہونگے۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ یہاں نُسُكٍ سے مراد ذبیحے ہونگے*۔ ابن فارس نے بھی اس کے معنی تقرب حاصل کرنے اور ذبیحہ کے لکھے ہیں۔ لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ اس کے معنی ذبیحہ کے کیوں مختص کر لئے جائیں۔ اس سے مراد کوئی عمل خیر ہو سکتا ہے جسے وہ اپنے اوپر واجب قرار دے لے۔

سورہ انعام میں ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶/۱۶۳)۔ ان سے کہدو کہ میری صلٰوۃ اور میرے نُسُك۔ میری زندگی اور میری موت۔ سب خدا کے عالم گیر نظام ربوبیت کے لئے وقف ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں صلٰوۃ سے مراد جملہ احکام خداوندی کی اطاعت ہے اور نُسُك سے مراد زندگی کا ہر طور طریقہ **۔

سورہ حج میں ایک جامع آیت ہے۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ (۲۲/۶۷)۔ " ہم نے ہر امت کے لئے ایک طریقہ مقرر کر دیا تھا جس پر انہیں چلنا تھا۔ سو یہ لوگ تم سے امر کے معاملہ میں جھگڑا نہ کریں۔ تو انہیں اپنے رب کی طرف دعوت دیتا رہ"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امر تو اصل قانون ہے جو ہمیشہ غیر مبدل رہا ہے۔ اور مَنَاسِك اس کی وہ جزئیات و فروعات (طور طریقے) ہیں جو زمان اور مکان کے تقاضوں کے مطابق اس امر کو نافذ کرنے کے لئے اختیار کی جاتی ہیں۔ مَنَاسِك تو مختلف رہے ہیں، لیکن امر متنازعہ فیہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام کی دعوت بنیادی طور پر اس امر کی طرف تھی جسے اہل مذاہب نے چھوڑ کر صرف مَنَاسِك کو دین بنا لیا تھا۔ اصل دین کی یہی وہ توازن بدوش راہ ہے جو قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ (۲۲/۶۷)۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص اس اصل کو تسلیم کر لے تو پھر اُسے اس نظام (دین) کی جزئیات پر بھی عمل پیرا ہونا ہوگا۔ کیونکہ جب دین، اجتماعی نظام کا نام ٹھہرا تو یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی فرد اس اجتماعی نظام کا رکن ہو لیکن اس

---

* ابن قتیبہ (القرطین - ج/۱ صفحہ ۱۲۵)۔ ** شاہ عبدالقادر - شاہ رفیع الدین اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے تراجم میں مناسک کا ترجمہ عبادت کے طور طریقے یا ارکان حج کیا ہے۔ مؤخرالذکر نے نسکی کا ترجمہ "میرا حج" کیا ہے۔

کی جزئیات میں اختلاف کرے۔ اس سے نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ بایں ہمہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ جب مناسک مختلف اقوام میں بدلتے رہے ہیں تو امت کے مختلف ادوار میں بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان مناسک میں تبدیلی ہو سکتی ہے جنہیں قرآن کریم نے متعین نہ کیا ہو بلکہ وہ کسی زمانے میں باہمی مشاورت سے متعین کئے گئے ہوں۔ یہ تبدیلی قرآنی نظام کیطرف سے ہوگی۔ افراد کو اس کا حق نہیں ہوگا۔

ن س ل

اَلنَّسْلُ۔ کسی چیز کا الگ ہوجانا۔ جدا ہو جانا۔ نَسَلَ الْوَبَرُ عَنِ الْبَعِیْرِ۔ اونٹ سے بال جھڑ کر الگ ہوگئے۔ نَسَلَ الْقَمِیْصُ عَنِ الْاِنْسَانِ۔ قمیص انسان سے الگ ہو گئی*۔ اَلنُّسَالَۃُ۔ وہ اون جو گر پڑے۔ یا پرندے کا پر جو جھڑ جائے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا آسانی سے نکل جانا اور نکالنا۔

نَسَلَ۔ یَنْسِلُ۔ تیز رفتار ہوا۔ دوڑا۔ اَنْسَلَ الْقَوْمَ وہ قوم سے آگے بڑھ گیا۔ ذِئْبٌ نَسُوْلٌ۔ تیز دوڑنے والا بھیڑیا***۔ اَلنَّسَلَانُ۔ تیز رفتار۔ اَلنَّسَلُ۔ وہ دودھ جو تھن کے سوراخ سے خود بخود ٹپکنے لگ جائے**۔

اولاد کو نَسْلٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے آباء و اجداد سے نکلتی ہے۔ یا اس لئے کہ آباء و اجداد چلے جاتے ہیں اور وہ آگے بڑھ جاتی ہے۔

قرآن کریم میں یُھْلِکَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ (۲/۲۰۵) آیا ہے۔ یہاں نَسْلٌ کے معنی ذریت۔ مخلوق۔ اولاد۔ انسانی آبادی ہیں۔ یعنی نسلِ انسانی۔ لہذا، قرآن کریم کی رو سے کھیتی اور نسلِ انسانی کا (بغیر حق کے) تباہ کرنا سنگین جرم ہے۔

سورۃ انبیاء میں ہے وَ ھُمْ مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَنْسِلُوْنَ (۲۱/۹۶)۔ وہ ہر بلندی سے تیزی سے نکل پڑینگے۔ طوفان کی طرح موجیں مارتے ہوئے امنڈ پڑینگے۔ سورۃ یٰسٓ میں ہے۔ اِلٰی رَبِّھِمْ یَنْسِلُوْنَ (۳۶/۵۱)۔ اپنے رب کی طرف تیزی سے نکل دوڑینگے۔

ن س و

اَلنِّسْوَۃُ۔ اَلنِّسَاءُ۔ اَلنِّسْوَانُ۔ یہ سب الفاظ اَلْمَرْاَۃُ کی غیرلفظی جمع ہیں۔ یعنی اَلْمَرْاَۃُ کے معنی ہیں ایک عورت اور اَلنِّسَاءُ

*راغب۔ **محیط۔ ***تاج۔

(وغیرہ) کے معنی ہیں بہت سی عورتیں ۔ اَلْمَرْأَۃُ کی جمع ۔ اور اَلنِّسَاءُ وَ النِّسْوَۃُ و النِّسْوَانُ کا واحد ان کے مادوں سے نہیں آتا* ۔

قرآن کریم میں نِسَاءٌ کا لفظ اضافت کے ساتھ عام عورتوں کے علاوہ بیویوں کے لئے بھی آیا ہے مثلاً اِلیٰ نِسَائِکُمْ ($\frac{۲}{۱۸۷}$) ۔ ''تمہاری بیویاں'' ۔

مجازی معنوں میں یہ لفظ قوم کے اس طبقے کے لئے استعمال ہوا ہے جو جوہرِ مردانگی سے عاری ہو ۔ (اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ذ ۔ ب ۔ ح) اور (ب ۔ ن ۔ و) ۔

ن س ی

نِسْیَانٌ کے اصلی معنی ترک کردینے اور چھوڑ دینے کے ہیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے پاس رکھی ہوئی چیز کی حفاظت کرنا چھوڑ دے تو اسے بھی نِسْیَانٌ کہتے ہیں ۔ یعنی حفاظت کرنا چھوڑ دینا ۔ چنانچہ وَ لَقَدْ عَہِدْنَا اِلیٰ آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا ۔ ($\frac{۲۰}{۱۱۵}$) ۔ ''اور یقیناً ہم نے پہلے آدم کو حکم دیا تھا لیکن اس نے اسے ترک کردیا ۔ اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا'' ۔ اس میں نَسِیَ کے معنی ترک کر دینے کے ہیں، کیونکہ بھول جانے پر مواخذہ نہیں ہوسکتا (نیز یاد رکھنے کے لئے عزم کی ضرورت نہیں ہوتی) ۔ اسی طرح نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَھُمْ ($\frac{۹}{۶۷}$) کے معنی ہیں انہوں نے قوانین خداوندی کو چھوڑ دیا تو خدا نے ان کی حفاظت کو چھوڑ دیا** ۔ ہمارے ہاں بھی یہ کہتے ہیں کہ میں نے تمہیں کتنی باتوں کی تاکید کی لیکن تم نے ان سب کو بھلا دیا ۔ یہاں بھلا دیا، سے مراد یہ نہیں کہ وہ تمہارے حافظہ سے محو ہوگئیں ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم نے ان پر عمل نہیں کیا ۔ یا کچھ عرصہ تک عمل کرکے انہیں چھوڑ دیا ۔ نیز اس کے معنے کسی چیز کو علیٰ حالہٖ رہنے دینے کے بھی ہیں۔ اس کی تائید میں صاحب غریب القرآن (مرزا ابو الفضل) نے حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول بھی نقل کیا ہے ۔

سورۃ بقرہ میں سابقہ انبیاء کرامؑ کے سلسلۂ وحی کے متعلق ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ آیَۃٍ اَوْ نُنْسِہَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْہَا اَوْ مِثْلِہَا ($\frac{۲}{۱۰۶}$) ۔ ہم جس سابقہ حکم کو منسوخ کرتے ہیں تو اس کے بعد اس سے بہتر حکم دیدیتے ہیں اور جسے علیٰ حالہ چھوڑ دیتے ہیں تو اس جیسا حکم

*تاج ۔ **ابن قتیبہ القرطبین ج/۱ صفحہ ۱۹۸

دوسرے نبی کی وحی میں دے دیتے ہیں ۔ (تفصیل ن ۔ س ۔ خ کے عنوان میں دیکھئے) اسی طرح سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسىٰ (۸۷/۶) کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس وحی کو اس طرح محفوظ رکھیں گے کہ تو اس میں سے کسی بات کو بھی چھوڑ نہیں سکے گا ۔ اس میں سے کچھ بھی چھوٹنے نہیں پائے گا ۔ سب ایک جگہ جمع ہو جائے گا ۔ اس کی حفاظت کی شہادت دوسری جگہ موجود ہے جہاں کہا گیا ہے کہ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ (۱۷/۸۶) اگر ہم چاہیں تو جو کچھ تجھے بذریعہ وحی دیا گیا ہے اس میں سے کچھ لے جائیں (لیکن ہماری مشیت ایسی نہیں) ۔ اسی سے (۸۷/۶) ۔ کے بعد اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهُ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ یعنی اس میں سے اُسی صورت میں کچھ ترک ہوسکتا تھا کہ خدا کی مشیت ایسی ہوتی ۔ لیکن خدا کی مشیت یہ تھی ہی نہیں (۱۷/۸۶) ۔ اس لئے اس میں سے کچھ بھی ترک نہیں ہوا* ۔

صاحب المنار نے لکھا ہے کہ اگر اس کے معنی بھول جانے کے بھی لئے جائیں تو بھی اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهُ اس کی نفی کر دیتا ہے ۔ کیونکہ ''استثناء بالمشیت'' اسلوب قرآن میں ہر جگہ ثبوت اور استمرار کے لئے آتا ہے ۔ (یعنی جہاں اِلَّا کے بعد مَاشَاءَ اللّٰهُ وغیرہ ہو جس سے مراد خدا کی مشیت ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسا پہلے کہا گیا ہے اس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا) ۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے خَالِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَاءَ رَبُّكَ ۔ عَطَاءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ (۱۱/۱۰۸) ۔ یعنی غیر مقطوع ۔ اور استثناء میں نکتہ یہ ہے کہ یہ ظاہر کر دینا مقصود ہے کہ یہ امور جو ثابتہ اور دائمہ ہیں خدا کی مشیت سے ایسے ہیں ۔ اپنی طبیعت کے لحاظ سے ایسے نہیں ہیں ۔ اگر خدا اس کے خلاف چاہتا تو ان کو ویسا ہی بنا دیتا ۔ (المنار جلد اول صفحہ ۴۱۹ - ۴۱۶ - زیر نَنْسَخْ وَنُنْسِهَا) ۔

کسی چیز کی حفاظت کو ترک کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ اس چیز کو قابل اعتناء نہیں سمجھا گیا ۔ اسے حقیر و غیر اہم سمجھا گیا ۔ اس لئے اَلنِّسْیُ کے معنی ہیں ایسی چیز جس سے بےاعتنائی برتی جائے ۔ اس کی جمع اَنْسَاءٌ ہے ۔ چنانچہ جب عربوں کا قافلہ کوچ کرنے لگتا تو وہ کہا کرتے تھے تَتَبَّعُوْا اَنْسَاءَكُمْ ۔ اپنی چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کو جنہیں زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی ، تلاش کرلو* ۔

*تاج ۔

اس عدم اهمیت کی بناء پر اس کے معنے بھول جانے کے ہوگئے۔ اَنْسَاہُ اِیَّاہُ اس نے اس کو بھلا دیا ۔ نَسَّاءٌ ۔ بہت بھول جانے والا* ۔ نَسْیًا مَّنْسِیًّا (۱۹/۲۳) ۔ بھولی بسری ۔

ترک کر دینے کے معنوں میں قرآن کریم کی آیات اوپر درج کی جاچکی ہیں ۔ ان کے علاوہ (۲/۲۳۶ اور ۲۳/۱۴) میں بھی یہی مفہوم ہے ۔ یعنی ناقابل التفات سمجھ کر چھوڑ دینا ۔ ذِکرٰی کے مقابلہ میں اِنْسَاءٌ (۶/۶۸) میں آیا ہے ۔ یعنی بھلا دینا ۔ بلا ارادہ بھول جانا خطا نہیں ہوتی (۲/۲۸۶) ۔

ن ش أ

نَشَأَ یَنْشَأُ ۔ نَشْأَۃً ۔ زندہ ہونا ، نیا ہونا ، رو بہ نما ہونا ، بلند ہونا ، بڑھنا ، بتدریج ترقی کرنا ، نشو و نما پانا ۔ نَشَأَتِ السَّحَابَۃُ نَشْأً ۔ بادل اٹھا ۔ اَلنَّاشِیُٔ ۔ لڑکی یا لڑکا جو بچپن کی حد سے گزر کر جوانی میں قدم رکھ رہا ہو ، یا رکھنے کے قریب ہو ۔ اَلنَّاشِئَۃُ ۔ ہر وہ ساعت جس میں آدمی رات کے وقت کھڑا رہے ۔ یعنی سوئے نہیں ۔ سونے کے بعد اٹھنے کو بھی کہتے ہیں ۔ نیز ہر واقعہ جو رات کے وقت سرزد یا رو نما ہو ۔ تَنَشَّأَ فُلَانٌ لِحَاجَتِہٖ ، فلاں آدمی اپنے کام کے لئے اٹھا اور چل پڑا ۔ اَلْمُنْشَأُ ۔ بلند نشان یا جھنڈا ۔ اَلْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ (۵۵/۲۴) ۔ بلند بادبانوں والی کشتیاں ۔ اَلْاِنْشَاءُ ۔ کسی چیز کو ایجاد کرنا اور اس کی تربیت کرنا** ۔ اَلنَّشْءُ ۔ نسل*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بلند ہونے کے ہیں ۔

سورۃ انعام میں ہے ۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ (۶/۹۹) ۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ''نفس واحد'' سے پیدا کیا ۔ یا آگے بڑھایا ۔ (اس کی تفصیل میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں ملے گی) ۔ سورۃ واقعہ میں ہے اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۔ (۵۶/۳۵) ۔ ہم نے انہیں ایک خاص انداز سے نئی پیدائش دی ۔ یا ہم نے ان کی خاص تربیت کی ۔ نہایت عمدگی سے پروان چڑھایا ۔ اس سے ذرا آگے ہے وَنُنْشِئَكُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۵۶/۶۱) ۔ تمہیں اس انداز سے ایک نئی پیدائش دیں جو تمہارے علم میں بھی نہیں ۔ ضمناً مَا لَا تَعْلَمُوْنَ سے ظاہر ہے کہ جہاں تک اس زندگی میں انسانی علم کی سطح کا تعلق ہے اس کی رو سے ہم جان نہیں سکتے کہ دوسری زندگی کی کیفیت اور ماہیت کیسی ہوگی ۔ اسی کو دیگر مقامات میں خلق جدید ، ایک نئی تخلیق سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ (۲۹/۲۰ و ۱۸/۹۸ و ۳۲/۱۰) ۔

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔

سورۃ واقعہ میں ذرا آگے چل کر ہے۔ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ (۵۶/۷۲)۔ کیا تم اس کے درخت کو اگانے اور نشو و نما دیتے ہو، یا ہم دیتے ہیں۔

سورۃ زخرف میں ہے مَنْ يُنَشَّؤُا فِى الْحِلْيَةِ (۴۳/۱۸) جس کی پرورش و تربیت زیورات میں ہوئی ہو۔ یا جس کی تربیت عورتوں کی طرح ہوئی ہو۔ سورۃ رعد میں ہے۔ وَ يُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۳/۱۲)۔ وہی بھاری بھاری بادلوں کو (سمندر کی سطح سے فضا میں) بلند کرتا ہے۔ سورۃ رحمٰن میں جَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ (۵۵/۲۴) آیا ہے۔ یعنی بلند بادبانوں والی کشتیاں۔ سورۃ مزمل میں نَاشِئَةَ اللَّيْلِ آیا ہے (۷۳/۶)۔ یعنی رات کا اٹھنا۔ اِنْشَاءٌ نشو و نما دینا۔ بتدریج آگے بڑھانا۔ اور پروان چڑھانا خدا کی صفت ربوبیت کا نتیجہ ہے۔ کائنات کی ہر شے خدا کے پروگرام کے مطابق، اُس کے قانون کی رو سے نشو و نما پاتی اور بتدریج اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہی کچھ انسان کو اپنی دنیا میں کرنا ہوگا۔ یعنی اپنی اور اپنے ساتھ ہر فرد انسانی کی نشو و نما۔ اس کی صلاحیتوں کی برومندی اور انہیں تکمیل تک پہنچانا۔ یہی اسلام کا مقصود ہے۔

ن ش ر

اَلنَّشْرُ۔ ہوا۔ خوشبودار ہوا۔ مہک۔ دراصل اس میں پھیلنے کا پہلو غالب ہوتا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو کھولدینے اور اس کے شاخ در شاخ ہو جانے کے ہیں۔ چنانچہ اَلتَّنْشِيْرُ کے معنی ہیں کسی چیز کو کھول دینا۔ پھیلا دینا۔ نَشَرَ الْخَشَبَةَ۔ اس نے لکڑی کو چیر دیا۔ اَلْمِنْشَارُ۔ آرے کو کہتے ہیں اور اَلنُّشَارَةُ اس برادے کو جو لکڑی چیرنے سے گرتا ہے۔ اَلنَّشْرُ۔ خبر کو پھیلا دینا۔ یا پتوں کا پھیلنا۔ درختوں کا پتے لے آنا۔ نَشَرَتِ الْاَرْضُ نُشُوْرًا۔ موسم بہار آنے سے زمین میں جان آگئی اور خوب پودے اُگ آئے۔ اَلنَّشْرُ۔ اس خشک گھاس کو کہتے ہیں جو گرمی کے آخر میں بارش پڑنے سے دوبارہ سبز ہو جائے۔ اور اَلنَّشِيْرُ۔ کاٹ کر جمع کی ہوئی کھیت کی پیداوار جسے گاھا نہ گیا ہو۔ اَنْشَرَ الْاَرْضَ۔ اس نے پانی دیکر زمین کو حیات نو عطا کر دی۔ اسی سے اَلنُّشُوْرُ۔ حیات تازہ کو کہتے ہیں*۔

*تاج و محیط و راغب۔

قرآن کریم میں یہ لفظ ان تمام معانی میں استعمال ہوا ہے جنکا اوپر ذکر کیا گیا ہے - سورہ بنی اسرائیل میں کِتَابًا . . . مَنْشُوْرًا (۱۷/۱۳) آیا ہے - کھلی ہوئی کتاب - سورہ طور میں فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۵۲/۳) آیا ہے - پھیلے ہوئے صحیفہ میں - سورہ قمر میں ہے - جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ (۵۴/۷) - بچھی ہوئی یا چھا جانے والی یا بکھری ہوئی ٹڈیاں ۔ سورہ احزاب میں ہے فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا (۳۳/۵۳) - جب کھانا کھا چکو تو پھر متفرق ہو جاؤ - سورہ مرسلٰت میں ہے - وَالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا (۷۷/۳) - دور دور تک پھیلانے والی قوتیں - سورہ فرقان میں ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے نیند کو آرام کا باعث بنایا وَجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا (۲۵/۴۷) - اور دن کو نُشُوْرٌ - اس کے معنی چلنے پھرنے اور متفرق ہونے کے بھی ہو سکتے ہیں اور نیند کے بعد حیات تازہ کے بھی - اسی سورۃ میں غیرخدائی معبودوں کی بے بسی کے متعلق ہے - لَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (۲۵/۳) - وہ موت و حیات اور موت کے بعد حیات نو کی قدرت نہیں رکھتے - یہ حیات نو (مثالاً) اسی طرح ملتی ہے جس طرح بارش کے چھینٹے سے زمین کے عروق مردہ میں خونِ زندگی دوڑ اٹھتا اور اس کے آغوش میں خوابیدہ سبزہ لہلہا اٹھتا ہے - چنانچہ سورہ فاطر میں زمین کی اسی حالت کو بیان کرنے کے بعد فرمایا - كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ (۳۵/۹) - اسی طرح سے تمہاری حیات تازہ کی مثال ہے - حیات تازہ کی یہ مثال کس قدر بلیغ اور بصیرت افروز ہے - یعنی اُس شے کے اندر زندگی کے ممکنات تو موجود ہوتے ہیں لیکن اپنی خوابیدہ شکل میں - اس نئے طریق (Process) سے اسکی خوابیدگی کو بیداری سے بدل دیا جاتا ہے - (مردہ قوموں کو حیات تازہ ملنے کی بھی یہی صورت ہے) - موت کے بعد حیات سے انکار کرنے والوں کا قول ہے کہ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ (۴۴/۳۵) - ہمیں حیات تازہ نہیں مل سکتی - ہم مر کر نہیں جی سکتے - کہا کہ یہ غلط ہے - خدا وہ ہے - اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (۸۰/۲۲) جو موت کے بعد انسان کو اپنے قانون مشیت کے مطابق حیات تازہ عطا کرتا ہے -

مردہ، جامد ہوتا ہے - زندہ بڑھتا اور پھیلتا ہے - زندگی کی علامت کشاد اور وسعت، بڑھنا اور پھیلنا (اَلنَّشْرُ) ہے - جس میں وسعت اور کشاد نہیں وہ زندگی سے محروم ہے - جو قوم اپنی جگہ پر جم کر بیٹھتی ہے اور حرکت کرکے آگے نہیں بڑھتی وہ مردہ ہے -

ن ش ز

اَلنَّشْزُ - وَالنَّشَزُ - بلند اور اونچی جگہ - نَشَزَ - وہ اونچی جگہ پر چڑھ گیا (اور محفوظ ہو گیا) - نَشَزَ الرَّجُلُ - آدمی بیٹھے سے کھڑا ہو گیا -

نَشَزَ بِالْقَوْمِ فِي الْخُصُوْمَةِ - وہ قوم کے ساتھ جھگڑا کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا*۔ راغب نے لکھا ہے کہ کسی چیز کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا نَشَزَ کہلاتا ہے۔ اسی سے نُشُوْزٌ کے معنی ہیں میاں بیوی میں سے ایک کا مخالفت پر اتر آنا، نافرمانی کرنے لگنا، متنفر ہونا، جھگڑنا، بدسلوکی کرنا، ایک دوسرے کے خلاف یا سامنے کھڑے ہو جانا۔ عورت کا مرد کے مقابل میں ($\frac{4}{34}$)۔ اور مرد کا عورت کے مقابلہ میں ($\frac{4}{128}$)۔ سورۂ مجادلہ میں یہ لفظ مجلس سے اٹھ کھڑے ہونے کے لئے آیا ہے ($\frac{58}{11}$)۔ سورۂ بقرہ میں ہڈیوں کو اٹھانے، بلند کرنے اور ابھارنے کے معنوں میں آیا ہے ($\frac{2}{259}$)۔

ن ش ط

نَشَطَ مِنَ الْمَكَانِ - وہ اس جگہ سے نکل گیا۔ اَلنَّاشِطُ۔ اُس جنگلی بیل کو کہتے ہیں جو ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف چلا جائے۔ اس سے اَنْشَطَ الْعُقْدَةَ کے معنی ہیں اس نے گرہ کو کھول دیا**۔ اَنْشَطَ الْبَعِيْرَ مِنْ عِقَالِهِ - اس نے اونٹ کو اسکی رسی سے کھول کر آزاد کر دیا***۔ نَشْطٌ - ایسی گرہ باندھنے کو کہتے ہیں جو آسانی سے کھل جاتی ہو****۔ اسی سے نَشِطَ - يَنْشَطُ - نَشَاطاً کے معنی ہیں کسی کام کے لئے انسان کا مستعد اور خوش دل ہونا۔ راغب ہونا۔ اُس کام سے خوش ہونا۔ دلچسپی لینا۔ دل کی گرہوں کا کھل جانا**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جھومنے اور حرکت کرنے کے ہیں۔

قرآن کریم میں اَلنّٰشِطٰتِ نَشْطاً ($\frac{79}{2}$) آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ سیارے جو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر آتے جاتے رہتے ہیں اور تیزی سے چلتے ہیں۔ کیونکہ تَنَشَّطَتِ النَّاقَةُ فِيْ سَيْرِهَا کے معنی ہیں اونٹنی اپنی رفتار میں تیز رہی**۔ نیز اِنْتَشَطَ الْحَبْلُ کے معنی ہیں اس نے رسی کو اس حد تک کھینچا کہ وہ کھل گئی۔ نَشَطَ الدَّلْوَ مِنَ الْبِئْرِ۔ اس نے کنوئیں سے پانی کا ڈول کھینچا***۔ (چرخی کے بغیر کھینچنے کے لئے بولا جاتا ہے)

اس اعتبار سے وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطاً میں ستاروں کی باہمی کشش کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یعنی تیز رفتاری سے ادھر اُدھر جانے والے اور اس کے ساتھ ہی اپنی کشش کو بھی قائم رکھنے والے۔ ان کی گرہیں کھلی ہوئی بھی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ باہمی کشش سے ایک دوسرے کے ساتھ

*تاج و ابن فارس۔ **تاج۔ ***محیط۔ ****راغب۔

بندھے ہوئے بھی ہیں - تیز رفتاری اور کشادگی بھی ہے اور نظم و ضبط کی پابندی بھی - دیکھئے ایک لفظ نَشْطٌ میں ان سیارگانِ فلک کی خصوصیات کی پوری دنیا کس طرب و نشاط سے جھلمل جھلمل کر رہی ہے -

مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطاً سے مراد یہ ہے کہ انسان کی ترقی کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں ، یہ انقلابی جماعت انہیں ہٹا دیتی ہے - اس کا مشن یہ ہوتا ہے کہ جو چیزیں انسانیت کے راستے میں حائل ہوں انہیں ہٹا دے* -

ن ص ب

اَلنَّصْبُ - کسی چیز کو کھڑا کرکے رکھنا - ابھار کر رکھنا ** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو ہموار اور سیدھا کھڑا کر دینے کے ہیں - نَصَبَ الشَّجَرَۃَ - درخت زمین میں لگا دیا *** - اَلنَّصْبُ گاڑا ہوا جھنڈا - اَلنُّصُبُ (وَالنَّصِیْبَۃُ) - ہر وہ چیز جسے نصب کر دیا جائے اور اس طرح وہ نشان اور علامت بن جائے - اسکی جمع اَلْاَنْصَابُ ہے - ان پتھروں کو بھی جو کعبہ کے گرد نصب کئے گئے تھے اور جن پر جانور ذبح کئے جاتے تھے اَلْاَنْصَابُ کہتے تھے **** - اَلنَّصِیْبُ - پتھر جو کسی چیز پر ابھار کر رکھ دئے جائیں - اس سے اسکے معنی متعینہ (قائم کردہ) حصہ کے ہو گئے ** - اَلنِّصَابُ - ہر چیز کا اصل اور مرجع *** - جَعَلْتُہٗ نُصْبَ عَیْنِیْ - میں نے اسے اپنی نگاہ کے سامنے قائم کر لیا کہ نہ اسے بھول سکتا ہوں نہ اس سے غافل رہ سکتا ہوں **** - یعنی اسے نصب العین بنا لیا -

نَصِبَ یَنْصَبُ - تھک جانا اور عاجز و درماندہ رہ جانا **** - (غالباً اس لئے کہ تھک جانے والا ایک جگہ کھڑا ہو جاتا ہے) - اَلنَّصَبُ - مشقت - تھکن - کوفت - عَیْشٌ نَاصِبٌ - ایسی زندگی جسمیں مشقت ہو - اَلنَّصْبُ وَالنُّصْبُ وَالنَّصَبُ - بیماری - مضرت - مشقت - ابتلاو آزمائش **** - قرآن کریم میں ہے - لَا یَمَسُّھُمْ فِیْھَا نَصَبٌ ($\frac{15}{48}$) - جنت میں انہیں مشقت ، تکان یا کسی قسم کی تکالیف چھونیگی نہیں - نَصِیْبٌ بمعنی حصہ ($\frac{2}{202}$; $\frac{4}{7}$) میں آیا ہے - سورہ نساء میں نَصِیْبٌ اور کِفْلٌ مرادف آئے ہیں ($\frac{4}{85}$) - سورہ مائدہ میں ہے وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ ($\frac{5}{3}$) - اسکے معنی وہ پتھر یا استھان ہیں جن پر غیر اللہ کے نام پر قربانیاں دی جاتی تھیں - سورہ

*المقام المحمود صفحہ ۱۸ ، **راغب - ***محیط - ****تاج -

معارج میں ہے کَاَنَّهُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ (۷۰/۴۳)۔ گویا وہ اس قسم کے استھانوں کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ سورہ غاشیۃ میں ہے عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (۸۸/۳) وہ لوگ جو محنت و مشقت کرکے تھک جائیں۔ محنت اور مشقت ہر کام میں کرنی پڑتی ہے۔ اگر یہ محنت صحیح راستے پر کی جائے تو اس کام کا نتیجہ حسب منشا مرتب ہو جاتا ہے۔ اس محنت سے انسان میں تکان پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن اگر وہی محنت غلط طریق پر کی جائے تو اس کا صحیح نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اور اسطرح وہ محنت انسان کو بری طرح تھکا دیتی ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (۱۸/۱۰۵)۔ ان کے اعمال رائگاں گئے۔ انہوں نے صحیح نتیجہ پیدا نہ کیا۔ یہ ہیں عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (۸۸/۳)۔ وہ لوگ جنہوں نے قوانین خداوندی کے مطابق کام نہ کیا اس لئے ان کے حصے میں تکان اور ماندگی کے علاوہ کچھ نہ آیا۔

سورہ صٓ میں ہے کہ حضرت ایوب[ؑ] نے خدا کو پکارا کہ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ (۳۸/۴۱) مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے جس کی وجہ سے مجھے سخت تکلیف ہے۔ سورہ فاطر میں نَصَبٌ اور لُغُوْبٌ (۳۵/۳۵) ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ یعنی جسمانی مشقت اور نفسیاتی تکان۔ سورہ کہف میں ہے کہ حضرت موسیٰ[ؑ] نے اپنے ساتھی سے کہا۔ لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا (۱۸/۶۲)۔ ہمیں اس سفر سے تکان ہو گئی ہے۔ سورہ انشراح میں ہے فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (۹۴/۷)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب جو مخالفتوں کے بادل چھٹ چکے ہیں تو تمہارے پروگرام کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے لئے تم مزید جد و جہد شروع کرو۔ نَصِبَ۔ یَنْصَبُ فِی الْاَمْرِ کے معنی جد و جہد کرنا ہیں*۔ عام طور پر جب مخالفت ختم ہو جائے تو پروگرام مکمل ہو جاتا ہے، لیکن اقامت نظام خداوندی کے پروگرام کا دوسرا حصہ مخالفت ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مخالفت کا ختم ہونا گویا حصہ لاَ ہے۔ اس کے بعد حصہ اِلاَّ (یعنی مثبت پروگرام) شروع ہوتا ہے۔ یوں اس جماعت کی ساری زندگی جد و جہد میں گذرتی ہے۔

ن ص ت

نَصَتَ الرَّجُلُ یَنْصِتُ وَاَنْصَتَ (نَصَتَ کے مقابلہ میں اَنْصَتَ زیادہ فصیح ہے)۔ خاموش ہو جانا۔ چپ رہنا۔ کسی کی بات سننے کے لئے خاموش ہو جانا**۔ وَاَنْصِتُوْا (۷/۲۰۴)۔ جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اسے سنو اور خاموش رہو۔

---

*محیط۔ **تاج و محیط۔

ن ص ح

نَصْحٌ - شہد صاف کرنے اور کپڑا سینے کو کہتے ہیں - پہلے معنوں میں نَصَحَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں چیز خالص ہوگئی - اَلنَّاصِحُ - شہد خالص - اور دوسرے معنوں میں نَصَحَ الْخَيَّاطُ الثَّوْبَ - درزی نے کپڑے کو سیا ، یا عمدگی سے سیا *- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو چیزوں کے درمیان موافقت پیدا کرنا اور انہیں درست کرنا ہوتے ہیں - نیز النُّصْحُ والنَّصِيْحَةُ ضد ہے فریب اور دھوکا دینے کی - اَلنَّاصِحُ واَلنَّصَّاحُ - درزی کو کہتے ہیں - النِّصَاحُ - دھاگہ - اَلْمِنْصَحَةُ - سوئی - نَصْحٌ - رفو کرنا* - لہذا نَصِيْحَةٌ کے معنی ہوئے کسی کے چاک گریباں کا نہایت خلوص کے ساتھ رفو کرنا - کسی کے پھٹے ہوئے کپڑے کو دل کی پوری صفائی کے ساتھ سی دینا - کسی کا ساز گار اور خیر خواہ ہونا *- رسول اپنی قوم سے یہی کہتے تھے کہ وَاَنْصَحُ لَكُمْ (۷/۶۲) - میں تمہاری چارہ سازی اور سازگاری کے لئے آیا ہوں - میں نہایت خلوص سے تمہارے پیرہن انسانیت کی رفو گری کی کوشش کر رہا ہوں - تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَصُوْحاً (۶۶/۸) - تم خدا کی راہ کی طرف اسطرح واپس آؤ کہ اس سے ہٹ کر پھر کسی اور راستے کو اختیار نہ کرو - اپنے آپ کو اس راستے کے ساتھ نہایت اخلاص کے ساتھ متمسک کر لو - اس سے پیوست ہو جاؤ -

ن ص ر

نَصَرَ الْغَيْثُ الْاَرْضَ - بارش نے زمین کو سرسبز و شاداب کردیا - اَرْضٌ مَنْصُوْرَةٌ - وہ زمین جہاں بارش ہو چکی ہو - اَلنَّوَاصِرُ (نَاصِرٌ یا نَاصِرَةٌ کی جمع) وہ ندی نالے جوکسی وادی میں دور سے آئیں - ابو حنیفہ نے کہا ہے کہ نَاصِرٌ اور نَاصِرَةٌ اس پانی کو کہتے ہیں جو دورو دراز جگہ سے آئے اور سیلاب کو آگے بڑھنے میں مدد پہنچائے* - ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ نَصْرٌ کے معنے رزق پہنچانے کے ہوتے ہیں** - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے خیر لانا اور خیر دینا ، بتائے ہیں - نیز النَّصْرُ کے معنے عطیہ و بخشش لکھے ہیں -

لہذا اس کے بنیادی معنی زمین کی وہ سیرابی ہے جس سے وہ سرسبز و شاداب ہو جائے - قرآن کریم نے اس جماعت کو جو اس کے قوانین کے مطابق زندگی

---

*تاج و محیط - **القرطین ج/۲ صفحہ ۲۹ -

بسر کرتی ہے مُفْلِحُوْنَ کہا ہے (۲/۵) ۔ یعنی وہ لوگ جن کی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہوں ۔ جن کی فصلیں کامیاب ہو جائیں ۔ (دیکھئے ف ۔ ل ۔ ح)۔ اس لئے خدا کا قانون وہ بارش ہے جس سے ان کی سعی و عمل کی کھیتی ثمر بار ہوتی ہے۔ اسی کو نصرت خداوندی کہتے ہیں ۔ انسان کی وہ کوشش جو قانونِ خداوندی کے مطابق نہ ہو، اس کسان کی محنت کی طرح ہے جس کی زمین پانی سے محروم رہ جائے ۔ انہی کو قرآن کریم نے اَخْسَرِیْنَ اَعْمَالاً اور ضَلَّ سَعْیُهُمْ (۱۸/۱۰۴-۱۰۳) کہا ہے ۔ یعنی جن کی کوششیں رائیگاں چلی گئیں ۔ اور ان کے کاروبار نے انہیں سخت نقصان پہنچایا ۔ سورۃ آلِ عمران میں نَصَرَ بمقابلہ خَذَلَ آیا ہے ۔ خَذَلَ کے معنی ہیں کسی کا ساتھ چھوڑ دینا ۔ اس لئے نَصَرَ کے معنی ہیں کسی کا ساتھ دینا ۔

چونکہ پانی ، کھیتی کے اُگنے میں مدد دیتا ہے اسی لئے نَصْرٌ کے معنی اعانت اور مدد کرنا ہیں ۔ محیط نے معونت اور نصرت میں فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ نُصْرَت دفع مضرت کے لئے خاص ہے ، اور معونت عام ہے ۔ اِسْتِنْصَارٌ ۔ مدد طلب کرنا ۔ اِسْتَنْصَرَهٗ عَلٰی فُلَانٍ اس سے فلاں کے خلاف مدد مانگی ۔ اِنْتَصَرَ ۔ وہ ظالم کے ظلم سے محفوظ رہا ۔ اس نے انصاف حاصل کرلیا ۔ اس نے انتقام لے لیا* ۔ سورۃ انبیاء میں ہے وَ انْصُرُوْا اٰلِهَتَكُمْ (۲۱/۶۸) ۔ اپنے معبودوں کا بول بالا کرو۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ خدا کی نصرت ، ان ثمرات کو کہتے ہیں جو اس کے قانون کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔ لہٰذا خدا کی نصرت (یا تائید غیبی) یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتی ۔ خدا کا ارشاد ہے یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ (۴۷/۷) ۔ اے ایمان والو ۔ اگر تم نے خدا کی مدد کی تو وہ تمہاری مدد کریگا ۔ خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے متعین کردہ نظام کو دنیا میں قائم کرو ۔ اس کے قوانین کے مطابق عمل کرو ۔ اگر تم نے یہ کر دیا تو اس نظام اور قانون کی برکات تمہارے شامل حال ہو جائینگی ۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (۴۷/۷) ۔ وہ تمہارے پاؤں جما دے گا ۔ تمہیں ثابت قدمی عطا کر دے گا ۔ اس کے برعکس ، جو لوگ اس قانون کے مطابق چلنے سے انکار کریں گے ۔ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷/۸) ۔ ان کے اعمال بے نتیجہ رہ جائینگے ۔

*تاج و محیط ۔ **القرطین ۔ ج/۲ صفحہ ۲۹ ۔

سورۃ ھود میں ہے مَنْ یَنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰہِ (۱۱/۳۰) ۔ اس کے معنی ھیں مجھے خدا کے عذاب سے کون بچا سکتا ہے ۔ یا خدا کے خلاف میری کون مدد کرسکتا ہے ۔ مفہوم دونوں کا ایک ھی ہے ۔ یعنی اگر میں قانون خداوندی کے خلاف چلوں تو میری اس غلط روش کے تباہ کن نتائج سے مجھے کون بچا سکتا ہے ۔ سورۃ شوریٰ میں ہے وَ الَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ (۴۲/۳۹) ۔ جب ان پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو وہ اپنی حفاظت کرتے ھیں ۔ سورۃ محمد میں ہے وَ لَوْ یَشَاءُ اللّٰہُ لَا نْتَصَرَ مِنْھُمْ (۴۷/۴) ۔ اس کے معنے ظالم سے بدلہ لینے کے ھیں ۔ سورۃ قمر میں ہے اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (۵۴/۱۰) ۔ ''میں مغلوب ھوں سو تو میرا بدلہ لے'' ۔

اَلْاَنْصَارُ ۔ (۹/۱۰۰) قرآن کریم میں یہ لفظ مہاجرین کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ اس سے مراد (مدینہ کے) وہ مومنین ھیں جنھوں نے مہاجرین کی مدد کی اور اس طرح نظامِ خداوندی وھاں متمکن ھوا ۔ ویسے اَنْصَارُ اللّٰہِ (۳/۵۲) کے معنی ھیں ، دین خداوندی کی مدد کرنے والے ۔

نصاریٰ

نَصَارٰی حضرت عیسیٰؑ کے متبعین بخلاف ھُوْد (۲/۱۱۱)۔ واحد نَصْرَانِیٌّ ہے (۳/۶۷) ۔ یَھُوْدِیٌّ کے بالمقابل ۔ نَصْرَانٌ اور نَصْرَانِیٌّ دونوں کی جمع نَصَارٰی ہے ۔

ن ص ف

نِصْفٌ ۔ نَصْفٌ ۔ نُصْفٌ ۔ کسی چیز کی دو شقوں میں سے ایک شق یا اس کے دو (برابر) اجزاء میں سے ایک جزو ۔ یعنی آدھا* ۔ قرآن کریم میں ہے فَلَھَا النِّصْفُ (۴/۱۱)۔ اس (مؤنث) کے لئے نصف (آدھا) ہے ۔ اَلْاِنْصَافُ فِی الْمُعَامَلَۃِ اسے کہتے ھیں کہ جسقدر فائدہ کسی سے حاصل کرے اتنا فائدہ اسے پہنچائے بھی ۔ جسقدر کسی سے اجرت لے اسی قدر اس کا کام بھی کرے ۔ کسی سے حقوق مانگے تو اس کے واجبات ادا کرے** ۔ قرآن کریم میں عَدْل اور قِسْط کے الفاظ آئے ھیں ۔ انصاف کا لفظ نہیں آیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْاِنْصَافُ فِی الْمُعَامَلَۃِ کے معنی ھیں آدھے پر راضی ھو جانا ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

ن ص و

اَلنَّاصِيَۃُ ۔ سر کا اگلا حصہ ۔ یا سر کے اگلے حصے کی وہ آخری حد جہاں بال اُگے ہوئے ہوتے ہیں* ۔ (لیکن دیگر لغات میں سر کے اگلے حصہ کی قید نہیں ہے) ۔ پیشانی کے بال ۔ (جمع اَلنَّوَاصِیْ) مجازاً یہ لفظ عزت و شرف کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے* ۔ فُلَانٌ نَاصِیَۃُ قَوْمِہٖ وہ اپنی قوم کا سردار ہے** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بہتر چیز کو انتخاب کرنے یا کسی چیز میں بلندی اور شان و اہمیت ہونے کے ہیں ۔ اَخَذَ بِنَاصِیَتِہٖ ۔ پیشانی کے بال پکڑنا ۔ کسی کو بے بس کرکے قبضے میں رکھنا ۔ سورۃ ھود میں ہے وَ مَا مِنْ دَابَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِھَا (11/56) ۔ یعنی ہر ذی حیات خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے ۔ ہر ایک پر اس کا قانون حاوی ہے ۔ کوئی اس کے قانون کی حد سے باہر نہیں ۔ سب اس کے قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں ۔

سورۃ رحمٰن میں ہے فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَ الْاَقْدَامِ (55/41) ۔ وہ پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑے جائینگے ۔ ان پر پوری پوری گرفت ہوگی ۔

ن ض ج

نَضِجَ الثَّمَرُ ۔ پھل اچھی طرح پک گیا ۔ ھُوَ نَضِیْجُ الرَّأْیِ ۔ وہ پختہ اور محکم رائے والا ہے* ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو آخری حد تک پکانا بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ بعد ازاں یہ استعارۃً ہر چیز کے انتہائی پختہ ہو جانے کے لئے بولا جاتا ہے ۔ یعنی در اصل یہ لفظ آگ وغیرہ کی تپش سے جلانے اور پکانے کے لئے بولا جاتا ہے ۔ اَنْضَجَ الطَّاھِیْ اللَّحْمَ کے معنے ہیں پکانے والے نے گوشت کو اتنا پکایا کہ وہ گل گیا اور اس کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ ہوگئے* ۔

سورۃ نساء میں ہے کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ (4/56) ۔ یہاں نَضِجَ کے معنی پک کر پختگی تک پہنچنا نہیں ۔ اس کے معنی گل کر ریزہ ریزہ ہوجانا ہیں ۔ یعنی ان کی قوت اور صلابت ختم ہوجائے گی (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ج ۔ ل ۔ د) ۔

---

*تاج ۔ **راغب ۔

ن ض خ

نَضَخَہ ۔ یَنْضَخُہ ۔ اس پر چھڑکا ۔ نَضَخَ الْمَاءُ ۔ پانی کا جوش مار کر ابلنا ۔ پانی کا چشمہ سے ابل کر بہنا ۔ عَیْنٌ نَضَّاخَةٌ ۔ جوش مار کر ابلنے والا چشمہ* ۔ ابن فارس نے لکھا ہے ۔ کہ اس کے معنی کثیر پانی والا چشمہ ہیں ۔

قرآن کریم نے ''جنتی باغات'' کے متعلق کہا ہے کہ ان میں عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ (۵۵/۶۶) ہیں ۔ جوش مار کر ابلنے والے چشمے ۔ وہ قوتیں جو فوارہ کی طرح اپنے زورِ دروں سے بلندیوں کی طرف لے جائیں ۔

ن ض د

نَضَدَ مَتَاعَہٗ یَنْضِدُ ۔ اپنے سامان کو اوپر تلے رکھنا ۔ بعض چیزوں کو بعض پر ترتیب سے رکھنا ۔ اس طرح ترتیب سے رکھا ہوا سامان نَضِیْدٌ ومَنْضُوْدٌ کہلائیگا ** ۔ یعنی، تہ بہ تہ (۵۰/۱۰ ; ۵۶/۲۹)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چند چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ نظم و ترتیب کے سے ملا کر رکھنے کے ہوتے ہیں، خواہ انہیں کھڑا رکھا جائے یا چوڑائی میں رکھا جائے ۔

اَلْاَنْضَادُ مِنَ الْجِبَالِ ۔ پہاڑوں کی وہ چٹانیں یا پتھر جو ایک دوسرے کے اوپر تلے ہوں ۔ اَلْاَنْضَادُ مِنَ السَّحَابِ ۔ وہ بادل جو تہ بہ تہ ایک دوسرے کے اوپر ہوں** ۔ سورہ ہود میں ہے وَاَمْطَرْنَا عَلَیْھَا حِجَارَةً مِنْ سِجِّیْلٍ مَنْضُوْدٍ (۱۱/۸۲) ہم نے ان پر پے درپے اور مسلسل پتھروں کی بارش کی ۔ یا ایسے پتھر برسائے جن کی مختلف تہیں (Layers) تھیں ۔

ن ض ر

اَلنَّضْرَةُ ۔ خوش حالی و آسودگی ۔ روزی ۔ تونگری ۔ حسن ۔ دراصل النَّضَارَةُ کے معنی چہرہ کا حسن اس کی آب و تاب اور تروتازگی ہے ۔ اَلنَّاضِرُ گہرے سبز رنگ والے کو کہتے ہیں ۔ اَلنَّضَارُ ۔ سونے وغیرہ کا خالص جوہر ۔ قَدْ اَنْضَرَ الشَّجَرُ ۔ درخت کے پتے سرسبز ہوئے** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معنی حسن و جمال اور خالص ہونے کے ہیں ۔

---

*تاج و محیط ۔ **تاج و محیط و راغب ۔

قرآن کریم میں ہے وُجُوۡہٌ یَوۡمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ (۷۵/۲۲) ۔ اس دن کچھ چہرے ترو تازہ ، ہشاش بشاش ہونگے ۔ یعنی وَلَقّٰہُمۡ نَضۡرَۃً وَّسُرُوۡرًا (۷۶/۱۱) ۔ انہیں شادابی اور مسرت حاصل ہوگی ۔ تَعۡرِفُ فِیۡ وُجُوۡہِہِمۡ نَضۡرَۃَ النَّعِیۡمِ (۸۳/۲۴) ۔ '' تو ان کے چہروں پر نعمتوں کی شادابی دیکھیگا '' ۔ یہ ان کی پہچان کی علامت ہوگی ۔ یہ ہے جنتی زندگی کی کیفیت ۔

ن ط ح

نَطَحَ یَنۡطِحُ ۔ اس نے سینگ مارا ۔ اَلنَّطِیۡحَۃُ ۔ وہ جانور جو کسی دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے مر جائے* ۔ قرآن کریم نے اسے حرام قرار دیا ہے (۵/۳) ۔ اَلنَّوَاطِحُ ۔ شدائد و مصائب* ۔

ن ط ف

اَلنُّطۡفَۃُ ۔ صاف پانی ، کم ہو یا زیادہ ۔ ازہری نے کہا ہے کہ عرب تھوڑے سے پانی کو بھی نُطۡفَۃٌ کہتے ہیں اور زیادہ پانی کو بھی ، لیکن یہ لفظ تھوڑے پانی کے لئے خاص ہے ۔ اَلنُّطۡفَۃُ ۔ دریا ۔ سمندر ۔ آدمی کا مادۂ منویہ ۔ نَطَفَ الۡمَاءُ ۔ پانی بہ گیا ۔ تھوڑا تھوڑا کرکے ٹپک گیا** ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے اصل معنوں میں نمی اور تری بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ بعد میں استعارۃً اَلنَّطَفُ لتھڑ جانے کو کہتے ہیں اور بیشتر یہ مذموم طور پر بولا جاتا ہے ۔ شَیۡءٌ نَطِیۡفٌ ۔ عیب دار چیز ۔

قرآن کریم میں انسانی خلقت کے ایک مرحلہ کے متعلق متعدد مقامات پر آیا ہے کہ اسے نُطۡفَۃٌ سے پیدا کیا (۱۶/۴) ۔ یعنی اس سے جنین کی پیدائش ہوتی ہے ۔

ن ط ق

نَطۡقٌ ۔ آواز دار حروف کے ساتھ بولنا جس سے معنی سمجھ میں آئے ہوں ۔ حیوانات کے بولنے کو نُطۡقٌ نہیں بلکہ صَوۡتٌ کہتے ہیں ۔ اَنۡطَقَہُ اللّٰہُ ۔ خدا نے اسے بلوایا*** ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ نُطۡقٌ کا لفظ انسان کے کلام کے ساتھ مخصوص ہے ۔ ویسے کسی بات کے واضح کر دینے کو بھی کہتے ہیں ۔ جیسے نَطَقَ الۡکِتَابُ کے معنی ہیں کتاب نے بیان کر دیا اور واضح کر دیا**** ۔ اَلنَّاطِقَۃُ کوکھ کو کہتے ہیں اور اَلنِّطَاقُ اس پٹکے (یا لہنگے ازار وغیرہ) کو جو کمر کے ساتھ باندھ لیا جائے*** ۔ اس

*تاج و محیط و ابن فارس ۔ **تاج و محیط و راغب ۔ ***تاج ۔ ****محیط ۔

اعتبار سے راغب نے کہا ہے کہ نُطْق؎ وہ لفظ ہے جو معنی کو اپنے گھیرے میں لے لینے کی وجہ سے نِطَاق؎ کیطرح ہو***۔ ابن فارس نے بھی اس کے بھی دو بنیادی معنی لکھے ہیں۔ یعنی (۱) کلام یا کلام کے مشابہ کوئی چیز۔ اور (۲) ایک قسم کا لباس۔ یعنی النِّطَاق۔ ازار۔

قرآن کریم میں ہے اِنْ کَانُوْا یَنْطِقُوْنَ (۲۱/۶۳)۔ اگر وہ بولتے ہیں تو۔ سورہ جاثیہ میں ہے هٰذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (۴۵/۲۹) یہ ہماری کتاب (تمہارا اعمالنامہ) ہے جو تمہارے خلاف ہر بات کو حق کے ساتھ بتا دیتی (یا واضح کر دیتی) ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ اہل جہنم اپنے جسموں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کس طرح شہادت دی۔ وہ کہیں گے کہ اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (۴۱/۲۱)۔ ہمیں اسی خدا نے بولنے کی قوت دی جس نے تمام اشیاء کو قوت گویائی عطا کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں نُطْق؎ سے مراد زبان سے باتیں کرنا نہیں بلکہ کسی طرح حقیقت کو واضح کرنا ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ تمہاری ہر نقل و حرکت اسکی شہادت دیتی ہے کہ .....

سورہ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمان؎ کو مَنْطِقُ الطَّيْرِ (۲۷/۱۶) سکھائی گئی تھی۔ اس کے معنی ہیں قبیلہ طیر کی بولی۔ (یا بطور استعارہ گھوڑوں کے لشکر (رسالہ) کے قواعد و ضوابط)۔ (دیکھئے عنوان ط۔ی۔ر)۔ اگر اس سے مفہوم ''پرندوں کی بولی'' لیا جائے تو اس سے مراد ہوگی وہ علم جس سے انسان، پرندوں کی نقل و حرکت اور آوازوں سے ان کی کیفیات کا اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ چیز، پرندوں کے احوال و کوائف کے مطالعہ اور مشاہدہ سے حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم پہلے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں۔

ن ظ ر

نَظَرَ۔ یَنْظُرُ۔ آنکھ سے دیکھنا۔ کسی چیز میں غور کرنا۔ اندازہ کرنا اور دوسری چیزوں کے ساتھ ملا کر اس کی بابت قیاس کرنا۔ چنانچہ اَلنِّظَارُ فراست کو کہتے ہیں۔ توجہ دینے کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اُنْظُرْنِیْ۔ میری طرف توجہ دو۔ میری طرف التفات کرو*۔ ابن فارس نے بھی کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی غور کرنا اور معائنہ کرنا ہیں۔

نیز اس کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ نَظَرْتُہ وَ انْتَظَرْتُہ۔ میں اس کی آمد کا منتظر رہا۔ اسی سے مہلت دینے کے معنوں میں اَنْظَرَہ

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

استعمال ہوتا ہے ۔ یعنی اس کو مہلت دیدی ۔ قَالَ رَبِّ فَانْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ (۱۵/۳۶) ۔ ''اس (ابلیس) نے کہا ۔ میرے رب تو مجھے یوم البعث تک مہلت دے دے ۔ (اللہ تعالیٰ نے) کہا کہ تو ان میں سے ہے جنہیں مہلت دی گئی ہے'' ۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ اگر مقروض تنگ دست ہو تو فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ (۲/۲۸۰) ۔ ''اسے فراخی تک مہلت دیدینا چاہئے'' ۔

تَنَاظَرَ کے معنے ہیں آمنے سامنے ہونا ۔ اَلنَّظِیْرُ ۔ مثل اور مشابہ ۔ اَلنِّظْرُ کے بھی یہی معنی آتے ہیں* ۔

اَلنَّظْرَۃُ کے معنی ہیں عیب اور بدھیئتی ۔ اَلْمَنْظُوْرُ ۔ عیب دار ۔ معیوب* ۔ حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں جہاں کہا گیا ہے فَنَظَرَ نَظْرَۃً فِی النُّجُوْمِ (۳۷/۸۸) ۔ تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ قوم ستاروں کی پرستش کرتی تھی ۔ حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کی ماہیت پر غور و فکر کیا اور انہیں بتایا کہ ان میں وہ کیا کیا کمزوریاں ہیں جن کی وجہ سے وہ معبود بن سکنے کے قابل نہیں ہوسکتے۔ (مثلاً یہ کہ وہ خود مجبور ہیں ۔ ان کا طلوع و غروب بھی ان کے اپنے اختیار میں نہیں۔ وہ آفِلِیْنَ ڈوب جانے والے ہیں وغیرہ وغیرہ)۔ اور اس کے بعد کہا اِنِّیْ سَقِیْمٌ (۳۷/۸۹) ۔ میں اس قسم کے معبودوں سے بیزار ہوں ۔ میں ان کی پرستش نہیں کرسکتا ۔

نَظَرَ لَھُمْ ۔ کے معنی ہیں ان کی وجہ سے درد مند ہوا اور ان کی مدد کی ۔ اور نَظَرَ بَیْنَھُمْ کے معنی ہیں ان کے درمیان فیصلہ کردیا* ۔

اگرچہ نَظَرَ کے معنی غور کرنے کے بھی ہیں لیکن چونکہ اس کے اولین معنی صرف دیکھنے کے ہیں اس لئے قرآن کریم نے نَظَرَ اور بَصَرَ میں فرق کرکے بتا دیا ۔ سورۃ اعراف میں ہے وَ تَرٰھُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَ ھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۷/۱۹۸) ۔ تو دیکھے گا کہ وہ صرف تیری طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں (لیکن جو کچھ تو کہتا ہے اس پر) چشم بصیرت سے غور نہیں کر رہے ہوتے ۔ اس طرح کے ''دیکھنے والوں'' کو قرآن کریم اَلْعُمْیُ کہتا ہے ۔ یعنی اندھے (۵۰/۶۴) ۔ وہ جن کی ''دل کی آنکھیں'' اندھی ہوجاتی ہیں(۲۲/۴۶)۔

ن ع ج

اَلنَّعَجُ ۔ موٹا ہونا ۔ نَعِجَتِ الْاِبِلُ ۔ اونٹ فربہ ہوئے ۔ اَلنَّاعِجَۃُ نرم اور ہموار زمین جہاں پیداوار بہت اچھی ہوتی ہو ۔ اَلنَّعْجَۃُ ۔ مادہ بھیڑ ۔

*تاج و راغب ۔

ھرنی ۔ نیل گائے یا پہاڑی بکری* ۔ (جمع نِعَاج*) ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (واحد اور جمع) ($\frac{۳۸}{۲۳ \cdot ۲۴}$) میں آیا ھے۔

ن ع س

اَلنُّعَاسُ ۔ نیند کی گرانی سے حواس میں جو سکون اور خاموشی سی پیدا ھونے لگتی ھے* ۔ صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ھے کہ نَوْمٌ تو نیند کی وہ حالت ھے جسمیں انسان کے حواس قطعاً معطل ھو جاتے ھیں اور نُعَاسٌ اس کی ابتدائی حالت کو کہتے ھیں ۔ بعض نے کہا ھے کہ سِنَةٌ ۔ سر میں نیند کی گرانی کو کہتے ھیں ۔ نُعَاسٌ ۔ آنکھ میں ھوتی ھے اور نَوْمٌ دل میں** ۔ راغب نے نُعَاسٌ کو نَوْمٌ قَلِیْلٌ کہا ھے ۔ ھلکی سی نیند ۔ اور لکھا ھے کہ قرآن کریم کی آیت ($\frac{۸}{۱۱}$) میں اس سے مراد سکون و اطمینان ھے***۔ قرآن کریم میں ھے اِذْ یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً ($\frac{۸}{۱۱}$) ''جب خدا نے امن و سکون کے لئے تم پر نُعَاسٌ طاری کردی ۔ (نیز $\frac{۳}{۱۵۴}$) ۔ اس سے مراد سکون و اطمینان ھے نہ کہ اونگھ۔

ن ع ق

نَعَقَ الرَّاعِیْ بِغَنَمِہٖ ۔ یَنْعِقُ ۔ نَعْقاً ۔ چرواھے کا بھیڑ بکریوں کو (ھانکنے کے لئے) جھڑکنا اور آواز دینا ****۔

سورہ بقرہ میں ان لوگوں کا ذکر ھے جو اپنی عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اور آنکھیں بند کئے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ھیں ۔ انہیں بھیڑ بکریوں سے تشبیہ دی ھے جن کی کیفیت یہ ھوتی ھے کہ وہ چرواھے کی آواز پر نقل و حرکت کرتی ھیں ، اپنی سمجھ بوجھ سے کچھ نہیں کرتیں ۔ چرواھے کی یہ آواز بھی محض '' آواز '' ھوتی ھے جسکے معنی کچھ نہیں ھوتے ۔ اندھی تقلید کرنے والے بھی الفاظ کے مفہوم کو نہیں سمجھتے ۔ ان کے متعلق جو کچھ انہیں بتا دیا جاتا ھے (کہ یہ کہا جائے تو اسکا مطلب یہ ھوگا اور وہ کہا جائے تو وہ) اسکے مطابق کرتے چلے جاتے ھیں ۔ مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ($\frac{۲}{۱۷۱}$) ۔ '' حقائق سے انکار کرنے والوں کی مثال ایسے شخص کی سی ھے جو ایسے آواز دے رھا ھو جو بجز پکار اور آواز کے کچھ نہیں سنتا ۔ '' (یعنی صُمٌّ ۔ بُکْمٌ عُمْیٌ ۔ فَھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۔ بہرے ۔ گونگے ۔ اندھے ۔ جو عقل سے کام

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****تاج و محیط و ابن فارس ۔

نہیں لیتے)۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے ہمارے مروجہ مذہب کی کیسی عمدہ تصویر کھینچی ہے ۔ عوام بھیڑ بکریاں ہیں اور انکے پیشوا چرواہے جنہوں نے اپنے آباء سے چند الفاظ سن رکھے ہیں جنہیں وہ بلا سمجھے بوجھے دھراتے رہتے ہیں ۔ اور عوام ان کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کرتے رہتے ہیں ۔

ن ع ل

نَعْل* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے نشیبی ہونے اور نچلا حصہ ہونے کے ہیں ۔ اَلنَّعْلُ ۔ جوتا ۔ ہر وہ چیز جس سے پاؤں کا زمین پر لگنے سے بچاؤ کیا جائے* ۔ سورہ طٰہٰ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ (۲۰/۱۲) ۔ اپنے دونوں جوتے اتار دو ۔ (ذرا اطمینان سے بیٹھو ۔ اور سکون سے بات سنو) ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان خ ۔ ل ۔ ع)

ن ع م

نَعِمَ بِهٖ عَيْنًا ۔ اس نے کسی چیز یا منظر کو ایسی کیفیت لئے ہوئے پایا جس سے اسکی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور حاصل ہوا ۔ دراصل تَنْعِيْمَةٌ* ایک پودا ہوتا ہے جسکے پتے نرم و نازک اور سرسبز و شاداب ہوتے ہیں اور وہ پانی پر پیدا ہوتا ہے جس سے اسکی تروتازگی میں کبھی فرق نہیں آتا ۔ ثَوْبٌ نَاعِمٌ* ۔ اُس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو بہت نرم اور آرام دہ ہو ۔ اور نُعَامٰی ۔ جنوبی ہوا کو کہتے ہیں جو بڑی خوشگوار اور تمام ہواؤں سے زیادہ مرطوب ہوتی ہے ۔ ان معانی کے اعتبار سے النَّاعِمَةُ ۔ اَلْمُتَنَاعِمَةُ والمُنَعَّمَةُ ۔ آسودگی اور خوشگوار زندگی گذارنے والی خوش خوراک عورت کو کہتے ہیں** ۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں بلندی اور سرفرازی کا مفہوم بھی ہے ۔ اَلنَّعَامَةُ ۔ بلند عمارت جو کسی پہاڑ پر چھجے کیطرح ہو ۔ کنوئیں پر جمائی ہوئی ابھری ہوئی چٹان ۔ اونچا نشان یا جھنڈا جس سے راستے کا پتہ چلایا جائے** ۔ اِبْنُ النَّعَامَةِ ۔ وہ پانی پلانے والا جو کنوئیں پر کھڑا رہتا ہے** ۔

قوم کی اجتماعیت اور باہمی اتفاق کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے** ۔ کہتے ہیں شَالَتْ نَعَامَتُهُمْ ۔ ان کا شیرازہ بکھر گیا ۔ اَلنِّعْمَةُ ۔ وہ حالت جس میں انسان لذت محسوس کرتا ہے*** ۔ نیز مسرت ۔ مال و دولت آسودگی و خوش حالی اور احسان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے* ۔

*تاج ۔ **تاج و محیط ۔ ***راغب ۔

ان معانی سے واضح ہے کہ معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کا خوشگوار، کشادہ، ملائم، آسودہ، بلند اور اذیت و تکلیف سے دور ہو جانا نِعْمَتْ ہے۔ چنانچہ سورہ نحل میں دنیاوی زندگی کے مختلف ساز و سامان کے تذکرہ کے بعد کہا ہے کَذَالِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ (۸۱/۱۶)۔ اس سے نِعْمَتْ کے معنی واضح ہیں۔ سورۂ لقمان میں اس سامان کو نِعْمَتُ اللهِ کہا گیا ہے جو کشتیوں کے ذریعے ادھر سے ادھر منتقل کیا جاتا ہے (۳۱/۳۱)۔ سورہ آل عمران میں میدان جنگ کی فتوحات اور مال غنیمت کو بھی نِعْمَتْ کہا گیا ہے (۱۷۴/۳)۔ سورۂ نحل میں نِعْمَتْ کے مقابل ضَرَّ لا کر اسکے مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے (۵۳/۱۶)۔ یعنی زندگی کی اذیتوں اور تکلیفوں سے دور رهنا۔

سورة دخان میں زندگی کی تمام آسودگیوں اور خوش حالیوں کو نَعْمَةٌ سے تعبیر کیا گیا ہے (۲۷/۴۴)۔ سورة غاشیہ میں نَاعِمَةٌ کے مقابلہ میں خَاشِعَةٌ اور نَاصِبَةٌ (تھکے ماندے۔ افسردہ و غمگین۔ ذلیل و خوار) لا کر، زندگی کی تر و تازگی اور شادابی و شگفتگی کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ دیکھئے (۸۸/۲۰۸)۔

بلندی اور رہنمائی (هدایت خداوندی) کے مفہوم کی وضاحت کے لئے سورة ابراهيم میں نِعْمَةُ اللهِ کے مقابلہ میں كُفْرٌ کا لفظ آیا ہے (۲۸/۱۴)۔ اس مقام پر کفر کے معنے زندگی کی خوشگواریوں کی ناقدر شناسی بھی ہوسکتے ہیں۔

نَاعِمَةٌ (۸/۸۸)۔ تر و تازہ خوشگواریاں لئے ہوئے۔ نَعْمَةٍ (۲۷/۴۴) آسودگی۔ نِعْمَةٌ (۲۲/۲۶) فضل و کرم۔ احسان۔ اس کی جمع اَنْعُمٌ آتی ہے۔ کائنات کی هر شے جسے انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے نِعْمَةٌ ہے (۳۴/۱۴-۳۳)۔ نیز اقوام عالم پر فضیلت مل جانا بھی نعمت ہے (۲/۴۷)۔

طبعی آسائشوں کے علاوہ ذهنی صلاحیتوں کے عمدہ ہونے کے لئے بھی نِعْمَةٌ کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً (۲۹/۵۲ و ۲/۶۸)۔ اور جسمانی صفائی اور تندرستی کے لئے بھی (۶/۵)۔

قرآن کریم نے اس قوم کو جو زندگی کے بہترین اور بلند ترین مقام پر هو، مُنْعَمٌ عَلَيْهِ سے تعبیر کیا ہے۔ اور انہی کے راستے پر چلنے کی دعائیں سکھائی گئی ہیں (۱/۶)۔ نِعْمَةٌ کے ان تمام معانی کو پیش نظر رکھنے سے جو اوپر لکھے جا چکے ہیں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایسی قوم کن خصوصیات کی حامل اور کس مقام پر سرفراز ہوگی۔ انہی لوگوں کو قرآن کریم

مؤمن کہتا ہے ۔ لہذا ، جنہیں یہ کچھ حاصل نہیں یا جو اس کے حصول کی جد و جہد نہیں کرتے ۔ سمجھ لیجئے کہ وہ قرآن کریم کی رو سے مؤمن نہیں ۔

نِعْمَ کے معنے ہیں ''بہت ہی اچھا ہے'' ۔ نِعْمَ الْمَاهِدُوْنَ (۵۱/۴۸) ۔ بہت ہی اچھے ہیں ہم سامانِ زندگی کے بہم پہنچانے والے ۔ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ (۴/۵۸) بہت ہی اچھی بات ہے جسکی تمہیں نصیحت کر رہا ہے ۔ (یہ در اصل نِعْمَ + مَا ہے ۔ یہ مَا موصولہ ہے) ۔

نَعَمٌ و نَعْمٌ جمع اَنْعَامٌ کے عام معنی مال مویشی کے ہیں ۔ عرب عام طور پر یہ لفظ اونٹ ، بکری اور گائے کے لئے بولتے تھے ۔ بعض نے ان میں بھیڑ اور دنبہ کو بھی شامل کیا ہے ۔ لیکن بعض نے اسے صرف اونٹوں کےلئے مخصوص قرار دیا ہے* ۔ قرآن کریم نے اونٹ ۔ گائے ۔ بھیڑ اور بکری ۔ چاروں کو اس میں شامل کیا ہے (۶/۱۴۴-۱۴۳ و ۳۹/۶) ۔

قرآن کریم میں ہے اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ (۵/۱ ؛ ۲۲/۳۰-۲۸) ۔ تمہارے لئے بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ حلال کئے گئے ہیں ، بجز ان کے جن کے متعلق قرآن کریم میں الگ حکم دیا گیا ہے ۔ یہ الگ حکم اسی سورت میں دو آیات آگے چل کر ہے جس میں مُردار ۔ خون ۔ خنزیر ۔ کے گوشت کو اور ہر اس چیز کو جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام قرار دیا گیا ہے (۵/۳) ۔

جیسا (کہ ب ۔ ہ ۔ م) کے عنوان میں لکھاجاچکا ہے ، بَهِيْمَةٌ کےمعنے ہیں وہ جو بول نہ سکے ۔ اس اعتبار سے بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ کےمعنی ہونگے ، مویشی ، جو بول نہیں سکتے ۔ انگریزی میں جیسے (Dumb Cattle) کہا جاتا ہے ۔ یعنی یہ لفظ (بَهِيْمَةٌ) اَنْعَامٌ کی صفت ہے ۔ اس سے یہ مفہوم نہیں کہ اَنْعَامٌ میں سے جو بَهِيْمَةٌ (گونگے) ہیں وہ حلال ہیں ۔ باقی نہیں ۔ اَنْعَامٌ تو سب کے سب بَهِيْمَةٌ (گونگے) ہوتے ہیں ۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ، قرآن کریم نے اونٹ ، گائے ، بھیڑ اور بکری کو انعام میں شامل کیا ہے ۔ لیکن (جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا) بهيمة الانعام میں تمام وہ حیوان شامل ہیں جو چرتے چگتے ہیں ۔

سورۃ فاطر میں اَنْعَامٌ کو انسان اور دَوَابٌّ سے الگ بتایا گیا ہے (۳۵/۲۸) ۔ اگرچہ دَوَابٌّ میں مجموعی طور پر تمام جاندار آجاتے ہیں (دیکھئے عنوان د ۔ ب ۔ ب) ۔ لیکن یہاں دواب کے معنے پیٹ کے بل چلنے والے جانور ہونگے ۔ لہذا ، اَنْعَامٌ سے مراد چارپائے ہونگے ۔

*تاج ۔

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ نباتات میں سے تم خود بھی کھاؤ اور اپنے اَنْعَام کو بھی کھلاؤ۔ کُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَکُمْ (۲۰/۵۴ نیز ۷۹/۲۳ ; ۸۰/۳۲ ; ۳۲/۲۷ ; ۸۰/۳۲)۔ اس سے ظاہر ہے کہ اَنْعَام چرنے، چگنے والے جانور ہیں۔ جنہیں تم چرا کر لاتے ہو۔ (۱۶/۶)۔

سورۃ نحل میں ہے کہ تم اَنْعَام کا دودھ پیتے ہو (۱۶/۶۶)۔ سورۃ المؤمنون میں ہے کہ تم ان کا دودھ بھی پیتے ہو اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد حاصل کرتے ہو۔ ان میں سے تم کھاتے بھی ہو اور سواری بھی کرتے ہو (۲۳/۲۱)۔ ان کی اُون سے کپڑے بناتے ہو (۱۶/۵)۔ ان کی کھالوں کے خیمے بناتے ہو (۱۶/۸۰)۔ ان سے بار برداری کا کام لیتے ہو (۱۶/۷)۔ ان میں حَمُوْلَۃً بھی ہیں اور فَرْشًا بھی (۶/۱۴۳)۔ یعنی جو بوجھ لادنے اور سواری کرنے کے کام آئیں۔ (دیکھئے عنوان ح۔ م۔ ل)۔ اور جو ان کاموں کے لئے چھوٹے، یعنی زمین گیر ہوں (دیکھئے عنوان ف۔ ر۔ ش)۔ (۴۳/۱۲) میں اَنْعَام کے متعلق ہے کہ تم ان کی پیٹھ پر سوار ہوتے ہو۔ سورۃ یٰسٓ میں ان تمام فوائد کو اکٹھا بیان کر دیا گیا ہے جہاں فرمایا فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ۔ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ (۳۶/۷۲-۷۳)۔ ان میں سے ان کے لئے سواری کا کام دینے والے ہیں۔ اور وہ بھی جنہیں یہ کھاتے ہیں۔ اور ان کے لئے ان میں (اور) بہت سی فائدہ کی چیزیں ہیں اور (پینے کا) دودھ بھی۔ اسی طرح سورۃ مومن میں ہے اللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ (۴۰/۷۹-۸۰)۔ اس میں بھی چوپایوں کے کھانے، ان سے سواری کا کام لینے، بوجھ لادنے اور دیگر فوائد کا ذکر ہے۔

سورۃ نحل میں ان مویشیوں کو الگ بیان کیا گیا ہے جنہیں وہ لوگ (عرب) صبح و شام چرایا کرتے تھے (۱۶/۶)۔ اور بوجھ اٹھانے والوں کا ذکر الگ ہے (۱۶/۷)۔ اور خَیْل (گھوڑے) بِغَال (خچر) اور حَمِیْر (گدھے) کے متعلق ہے لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً (۱۶/۸)۔ وہ تمہارے لئے سواری کا کام دیتے ہیں اور باعث زینت بھی ہیں۔ اسی طرح سورۃ آل عمران میں اَلْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ (۳/۱۳) الگ الگ آیا ہے۔ یعنی پلے ہوئے نشان زدہ گھوڑے اور مال مویشی۔ سورۃ مومن میں ہے اللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۴۰/۷۹)۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے چارپائے بنائے تاکہ تم ان میں سے بعض پر سوار ہو۔ اور بعض کو تم کھاتے بھی ہو۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے اَلْاَنْعَامُ سے مراد چرنے چگنے والے مویشی ہیں - ان کا دودھ پیا جاتا ہے - سواری اور باربرداری کا کام لیا جاتا ہے - ان کی اون سے کپڑے بنائے جاتے ہیں - کھالوں سے خیمے بنائے جاتے ہیں - نیز یہ وجہ زینت بھی ہوتے ہیں اور ان سے خوراک کا کام بھی لیا جاتا ہے - (یعنی اس زمانہ کے عرب اَلْاَنْعَامُ سے یہ کام لیا کرتے تھے) - اَلْاَنْعَامُ میں سے بجز ان کے جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے ، سب کھانے کے لئے حلال ہیں - خنزیر، چرنے چگنے والا حیوان ہے اس لئے بهیمۃ الانعام میں شامل ہے - (نیز دیکھئے عنوان ح - ر - م)-

نَعَمْ (حرف)

نَعَمْ - ہاں - قَالُوْا نَعَمْ (۷/۴۴) - انہوں نے کہا - ہاں (ایسا ہی ہوا ہے) - یہ حرف ایجاب ہے -

[نِعْمَ اور نِعِمَّا عنوان، ن - ع - م میں دیکھئے] -

ن غ ض

نَغَضَ الشَّیْءُ یَنْغُضُهٗ - کسی چیز کو متحرک کیا - نَغَضَ الشَّیْءُ - کوئی چیز متحرک و مضطرب ہوئی - (لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے) - نَغَضَ رَأْسَهٗ - اس نے اپنے سر کو حرکت دی - اخفش نے کہا ہے کہ تھرتھراھٹ کے ساتھ ہلنے کو نَغْضٌ کہتے ہیں - نَغْضٌ شتر مرغ کو کہتے ہیں کیونکہ جب وہ چلتا ہے تو اس کا سر بہت ہلتا ہے* - ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے - اَنْغَضَ رَأْسَهٗ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی کسی کی بات سن کر اس سے انکار کرتے ہوئے اپنا سر ہلا دے - اور بعض نے کہا ہے کہ تعجب سے یا کسی بات کا مذاق اڑاتے ہوئے سر ہلانے کو کہتے ہیں*- قرآن کریم میں ہے فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ (۱۷/۵۱) - یہ تیری بات کا مذاق اڑاتے اور انکار کرتے ہوئے اپنے سروں کو تیرے سامنے ہلا دینگے - تعجب کرتے ہوئے اپنے سروں کو ہلا دینگے -

ن ف ث

نَفَثَ - یَنْفُثُ - پھونک مارنا - اسطرح آہستہ سے پھونک مارنا کہ اسکے ساتھ لعاب دھن باہر نہ نکلے - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ، منہ

*تاج و راغب -

وغیرہ سے کسی معمولی سی چیز کے ، ھلکی سی آواز کے ساتھ نکلنے کے لئے بولا جاتا ھے ۔ اگر اس سے کچھ زیادہ ھو جائے تو اسے تَفَلْ* کہینگے۔ اسی سے نَفَثَ الشَّیْءَ فِی الْقَلْبِ کسی بات کو ھولے سے کسی کے دل میں ڈال دینے کو بھی کہتے ھیں ۔ کسی کے کان میں کچھ پھونک دینا ۔ اِمْرَأَۃٌ نَفَّاثَۃٌ ۔ جادوگرنی کو کہتے ھیں جو گرھوں میں پھونکیں مار مار کر تعویذ گنڈے تیار کرتی ھے**۔ نَفْثٌ ۔ پھونک مارنا ۔ جادو کرنا ۔ دل میں کوئی بات ڈالنا **۔

قرآن کریم میں مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (۱۱۳/۴) آیا ھے ۔ عُقَدٌ کے معنی ھیں پختہ گرھیں ۔ لہذا نَفّٰثٰتٌ کے معنی ھوئے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی سے ان کے عزم راسخ کو کمزور کر دیں ۔ جو محکم ارادوں میں پھونک مار دیں ۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ھے کہ اس سے مراد وہ قومیں یا جماعتیں ھیں جو اپنے جھوٹے پراپیگنڈہ سے انسانوں کی فطری ترقی کو روک دیتی ھیں ۔ انھوں نے یہ بھی کہا ھے کہ اس قسم کے عمل کو جس سے دوسرا کمزور پڑ جائے ، عرب سحر یا جادو کہتے تھے***۔

ن ف ح

نَفْحٌ کے بنیادی معنی کسی چیز کے چل پڑنے یا اٹھانے کے ھیں ۔ (ابن فارس) ۔ نَفَحَ الطِّیْبُ یَنْفَحُ ۔ خوشبو پھیلی ۔ نَفَحَتِ الرِّیْحُ ۔ ھوا چلی ۔ رِیْحٌ نَفُوْحٌ ۔ تیز چلنے والی ھوا ۔ نَفْحٌ ۔ ھر ٹھنڈی ھوا کو کہتے ھیں ۔ اور لَفْحٌ گرم ھوا کو ۔

اَلنَّفْحَۃُ مِنَ الرِّیْحِ ۔ ھوا کا جھونکا ۔ نَفْحَۃُ الدَّمِ ۔ خون جو پہلی بار یکبارگی تیزی سے نکل پڑے *۔ قرآن کریم میں نَفْحَۃٌ مِنَ الْعَذَابِ (۲۱/۴۶) آیا ھے ۔ یعنی عذاب خداوندی کی ایک لپٹ ۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ۔ عذاب کی جھلک ۔

ن ف خ

نَفَخَ ۔ یَنْفُخُ ۔ منہ سے ھوا نکالنا ۔ پھونک مارنا ۔ جیسے نَفَخَ فِی النَّارِ ۔ اس نے آگ میں پھونک ماری****۔ سورہ کہف میں ھے اُنْفُخُوْا (۱۸/۹۶) ۔ اسے دھونکو ۔

*تاج و راغب ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔ ***المقام المحمود صفحہ ۲۱۲
**** تاج و محیط ۔

اِنْتَفَخَ الشَّيْءُ - چیز پھول گئی* - اِنْتَفَخَ النَّهَارُ - دن چڑھ گیا** - اَلنَّفْخَاءُ مِنَ الْاَرْضِ - بلند زمین - اَلنُّفَّاخَةُ - وہ پتھر جو پانی کی سطح سے اونچے ہوں - نیز بلبلے* - ابن فارس نے اس مادہ کے معنی پھولنے اور بلند ہونے کے لکھے ہیں -

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں متعدد مقامات پر نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲/۹) یا نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (۱۵/۲۹) کے الفاظ آئے ہیں - جیسا کہ رُوْح کے عنوان میں بتایا جاچکا ہے، رُوْح سے مراد الوھیاتی توانائی (اختیار و ارادہ وغیرہ کی قوت - انسانی ذات یا Personality) ہے جو تمام مخلوقات میں صرف انسان کو ملی ہے - اس لئے نَفْخِ رُوْح سے مراد ہوا کی طرح کچھ پھونکنا نہیں بلکہ انسانی قوتوں اور توانائیوں کا عطا کرنا ہے جس سے بلندیاں نصیب ہو جائیں - یہی وہ چیز ہے جسکی طرف سورہ آل عمران میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں حضرت عیسٰیؑ نے بنی اسرائیل سے کہا ہے کہ میں تمہیں ایسی ترتیب نو عطا کرونگا جس سے تمہارے اندر زندگی کی تازگی اور توانائی پیدا ہو جائیگی - جس سے تمہیں دنیا میں بلندیاں نصیب ہوجائینگی - اَنِّيْ اَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ - فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۳/۴۸) - میں تمہیں ایسی نئی زندگی عطا کرونگا جس سے تم اپنی موجودہ خاک نشینی کی پستی سے ابھر کر فضا میں اڑنے کے قابل ہو جاؤ گے - میں تم میں ایسی روح پھونکونگا جس سے تمہیں قانون خداوندی کی رو سے، بے انتہا بلندیاں نصیب ہو جائینگی - اقبال کے الفاظ میں -

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشت پرے داری
بیامن باتو آموزم طریق شاہبازی را

قرآن کریم میں نَفْخِ صُوْر کا بھی ذکر کئی جگہ آیا ہے - جیسا کہ (ص - و - ر) کے عنوان میں لکھا جاچکا ہے، اس کے معنی وہ نرسنگھا (بگل) بھی ہیں جسے اعلان جنگ کے لئے بجایا جاتا تھا - اور یہ لفظ صورت (Form) کی جمع بھی ہے - اول الذکر مفہوم کے اعتبار سے نَفْخِ صُوْر کے معنی ہونگے حق و باطل کے درمیان اعلان جنگ - اور ثانی الذکر مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنی ہونگے حیات تازہ عطا کرنا - نئی توانائیاں بخشنا، جس سے بلندیاں نصیب ہو جائیں (۶۹/۱۳) - (دیکھئے عنوان ص - و - ر)

*تاج و محیط . **راغب -

ن ف د

نَفِدَ الشَّیْءُ یَنْفَدُ نَفَاداً ۔ چیز کا فنا ہو جانا ۔ جاتے رہنا ۔ زمخشری نے کہا ہے کہ جن الفاظ میں فاءکلمہ نون ہو اور عین کلمہ فاء۔ تو ان الفاظ کے معنی جاتے رہنے اور نکل جانے کے ہونگے**۔ (مثلاً نَفِدَ ۔ نَفَذَ ۔ نَفَرَ۔ نَفَشَ ۔ نَفَضَ نَفَقَ وغیرہ)۔

اَنْفَدَ الْقَوْمُ ۔ لوگوں کا توشہ اور مال ختم ہو گیا * ۔ قرآن کریم میں ہے مَاعِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَاعِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ (۱۶/۹۶) ۔ جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائیگا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے ۔ اسی بَاقٍ کی تفسیر دوسری جگہ مَالَہٗ مِنْ نَفَادٍ (۳۸/۵۴) سے کر دی یعنی جو ختم ہی نہ ہو۔

ن ف ذ

اَلنَّفَاذُ ۔ کسی چیز کے آر پار ہوجانا ۔ جیسے تیر کا نشانے میں ایک طرف سے گھس کر اس کے دوسری طرف سے باہر نکل جانا (خواہ وہ ذرا سا بھی باہر کیوں نہ نکل جائے) ۔ طَعْنَۃٌ نَافِذَۃٌ۔ نیزے کی ایسی مار کو کہتے ہیں جو آر پار ہو جائے***۔

اَنْفَذَ الْقَوْمَ کے معنے ہیں وہ (پیچھے سے چل کر اس گروہ میں شامل ہوا اور تیزی سے چلتا ہوا) انہیں پیچھے چھوڑ کر ان سے آگے نکل گیا ۔ اَلنَّافِذَۃُ ۔ کمرے کا سوراخ یا روشندان جس سے روشنی اندر آتی ہو۔ نَفَذَ الشَّیْءَ ۔ اس نے کسی چیز کو پھاڑ دیا*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز میں سے گزر جانا ہیں ۔

قرآن کریم میں ایک عظیم آیت ہے جس سے انسانی ارتقاء کے ممکنات پر روشنی پڑتی ہے ۔ سورۃ رحمٰن میں ہے یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۔ اے گروہ جن و انس! (یعنی وہ انسان جو شہروں کے رہنے والے ہوں یا صحرا نشین)۔ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۔ اگر تم اس کی استطاعت رکھتے ہو کہ آسمان و زمین (یعنی اس مادی کائنات) کے کناروں کو چیر کر آگے نکل جاؤ، تو نکل جاؤ ۔ لیکن یہ

---

*تاج و راغب ۔ **فعل ۔ تینوں حرفوں سے ملکر بنا ہے ۔ اس میں پہلا حرف فا کلمہ، دوسرا ع کلمہ ۔ اور تیسرا ل کلمہ ہے ۔ ''فا کلمہ ن ہو'' کے معنی ہیں پہلا حرف ن ہو ۔ اور ''ع کلمہ فا'' کے معنی ہیں دوسرا حرف فا (ف) ہو جیسے نفد ۔
*** تاج و راغب و محیط ۔

یاد رکھو کہ ۔ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۵۵/۳۳)۔ تم سُلْطَانٌ ۔ (قدرت و غلبہ) کے بغیر نہیں نکل سکو گے ۔ قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ انسان کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس مادی کائنات کے حدود سے باہر چلا جائے۔ لیکن اس کے لئے اسے ایک خاص قوت کی ضرورت ہوگی جو مادی موانعات پر غالب آسکے ۔ یہ قوت وحی کے اتباع سے حاصل ہو سکتی ہے (اس لئے قرآن کریم نے خود وحی کو سُلْطَانٌ کہا ہے ۔ دیکھئے عنوان س ۔ ل ۔ ط) ۔ یعنی وحی کے اتباع سے انسانی ذات میں ایسی نشو و نما آسکتی ہے کہ وہ مادی چاردیواری سے آگے نکل کر زندگی کے دیگر مراحل طے کرنے اور حیاتِ جاوید حاصل کرنے کے قابل ہو جائے ۔ حیوانی سطح پر زندگی محض آب و گل کی طبعی زندگی ہوتی ہے لیکن انسانی سطح (یعنی مومن کی سطح) پر اس میں حیات جاوید کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اسی کا نام وہ سُلْطَانٌ ہے جس سے زندگی آب و گل کی چاردیواری سے نکل کر آگے جاسکتی ہے ۔ یاد رکھئے۔ مادی کائنات سے باہر نکلنے سے مراد انسان کے جسم کی پرواز نہیں ۔ اس سے مراد اس کی ذات (Personality) کا ارتقاء ہے ۔ جسمانی پرواز سے انسان جتنا اونچا جی چاہے اڑ جائے ، وہ بہر حال مادی کائنات کی چاردیواری کے اندر ہی رہے گا۔ مادی کائنات سے آگے نکل جانا انسانی ذات ہی کے لئے ممکن ہے ۔ یعنی موت کے بعد حیات جاوداں حاصل کرنا ۔ اس زندگی میں انسان کے لئے مادی کائنات کے حدود سے باہر نکل جانا ناممکن ہے ۔ یہ چیز مرنے کے بعد ، اگلی زندگی ہی میں حاصل ہو سکتی ہے ۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنی ''روحانی قوت'' سے مادی کائنات کے حدود سے باہر چلے جاتے ہیں ، وہ محض اپنے خیالات کی رو سے ایسا سمجھتے ہیں ۔ اپنے تخیل میں آپ جہاں جی چاہے چلے جائیے اس کے لئے کسی قوت (سلطان) کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ۔ قرآن کریم کی رو سے انسان مادی کائنات سے باہر مرنے کے بعد ہی جاسکتا ہے۔ اُسی زندگی میں پہنچکر اسے حیاتِ جاوید حاصل ہو سکتی ہے ۔

ن ف ر

اَلنَّفْرُ ۔ بے قرار ہونا اور اپنی جگہ سے اٹھ جانا ، ہٹ جانا* ۔ جدا ہو جانا** ۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی الگ ہو جانا اور دور ہوجانا بتائے ہیں ۔ کسی چیز سے بے رخی برتنا اور اس سے الگ ہونا ۔ نَفَرَ اِلَى الشَّيْءِ کسی چیز کی طرف تیزی سے جانا** ۔ نَفَرَتِ الدَّابَّةُ و

*راغب ۔ **تاج و محیط و راغب ۔

اِسْتَنْفَرَتْ - جانور کا کسی سے گھبرانا اور دور چلے جانا - نَفَّرْتُہٗ - اِسْتَنْفَرْتُہٗ - میں نے اسے متوحش کردیا اور بھگا دیا - مُسْتَنْفِرٌ - متوحش ہوکر بھاگ جانے والا * - قرآن مجید میں ہے حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَۃٌ (۷۴/۵۰) - بدکنے والے گدھے - نَفَرُوْا لِلْاَمْرِ - وہ اس معاملہ کے لئے نکل کھڑے ہوئے * (۹/۴۱) - اَلنَّفَرُ (۱۷/۶) - وہ جتھا یا گروہ جو کسی کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہو - نَفِیْرٌ بھی اسی معنی میں ہے ** (۱۷/۶) - نُفُوْرٌ - گھبرا کر بھاگنا - نفرت کرنا (۱۷/۴۱) - اَلْمُنَافَرَۃُ - مفاخرت (اس لئے کہ لوگ اَیُّنَا اَعَزُّ نَفَرًا کہا کرتے تھے)* -

ن ف س

صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ نَفْسٌ کے بہت سے معنی ہیں - منجملہ ان کے یہ لفظ انسانی شخصیت کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے - نیز وہ توانائی جس سے تمیز کی صلاحیت (شعور اور احساس کی قوت) پیدا ہوتی ہے - عقل - علم اور قلب کے معنوں میں بھی آتا ہے*** - اور عَیْنُ الشَّیْءِ کے معنوں میں بھی - جیسے جَاءَنِیْ الْمَلِکُ بِنَفْسِہٖ - بادشاہ میرے پاس بنفس نفیس آیا - نیز عظمت اور بڑائی ، ہمت ، غیرت ، ارادہ اور عقوبت (سزا) کے معنوں میں بھی - نیز نَفْسٌ کے معنی بھائی بند کے بھی ہوتے ہیں *** - اسکے علاوہ خون کے معنوں میں بھی - چنانچہ نِفَاسٌ اُس خون کو کہتے ہیں جو ولادت کے بعد عورتوں کو آتا ہے ***- خود ولادت (عورت کے بچہ جننے) کے معنوں بھی یہ لفظ آتا ہے - نَفَسٌ - سانس کو کہتے ہیں - اسکی جمع اَنْفَاسٌ آتی ہے *** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہلکی اور نرم ہوا کے نکلنے کے ہیں - نَفَسٌ کے معنی وسعت اور کشادگی کے بھی ہیں - ایک کش اور گھونٹ کو بھی کہتے ہیں - اور طویل چیز کو بھی - نَفِیْسٌ مال کثیر کو کہتے ہیں اور شَیْءٌ نَفِیْسٌ وہ عمدہ چیز جسکی طرف انسان لپک کر جائے - تَنَفَّسَ کے معنے ہیں سانس لینا - نیز تَنَفَّسَ الصُّبْحُ کے معنی ہیں صبح کا واضح اور روشن ہو جانا (۸۱/۱۸) - نَافَسَ اور تَنَافَسَ کے معنی کسی اچھے کام میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہیں (۸۳/۲۶) ***-

نیز اس کے معنی عِنْدِیْ (میرے پاس) کے بھی ہوتے ہیں - تاج العروس نے اسکی مثال کے لئے سورہ مائدہ کی آیت تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ (۵/۱۱۶) لکھی ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ (اے میرے رب)

*تاج و محیط و راغب - **تاج و ابن فارس - ***تاج و لسان العرب -

جو کچھ میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے لیکن جو کچھ تیرے ہاں (پاس) ہے میں اسے نہیں جانتا ۔

اس کے علاوہ اس کے معنی عقوبت (یا سزائے اعمال) کے بھی ہیں ۔ مثلاً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ (۳/۲۸) ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا تمہیں اپنے آپ سے یا اپنی ذات سے ڈراتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہیں اپنے قانون مکافات کی رو سے مرتب ہونے والے تباہ کن نتائج سے محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہے*۔

اَلنَّفْسُ کے معنی بھائی بند بھی ہیں (۲/۸۴) اور خود اپنا آپ بھی (۲/۴۴)۔ اس قسم کے مقامات میں یہ ان معانی میں استعمال ہوتا ہے جن معنی میں انگریزی زبان میں مثلاً (Myself) یا (Yourself) یا (Himself) وغیرہ استعمال ہوتے ہیں ۔

علاوہ بریں اس لفظ (نَفْسٌ) کو قرآن کریم نے اس '' شے '' کے لئے بھی استعمال کیا ہے جسے ہم انسانی ذات (Human Personality) یا (اقبال کی اصطلاح میں) خودی (Self) یا انا (I-am -ness) کہتے ہیں ۔ یہ مفہوم وضاحت طلب ہے ۔

اگر یہ کہا جائے کہ دین کی اصل و بنیاد انسانی ذات کے اقرار پر استوار ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا ۔ دنیا میں اصولی طور پر دو قسم کے تصورات حیات پائے جاتے ہیں ۔ ایک تصور حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی محض طبیعی زندگی (Physical life) ہے ۔ انسان طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے ۔ انہی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی پرورش ہوتی ہے اور انہی قوانین کی رو سے یہ آخرالامر مرجاتا ہے ۔ اور جب اس کے تنفس (سانس) کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ عصر حاضر کی زبان میں اسے مادی نظریہ حیات (Materialistic Concept of life) کہتے ہیں ۔ جسے عام طور پر '' مغربی تہذیب '' کہا جاتا ہے وہ اسی نظریہ حیات کی مظہر ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی رو سے انسان کو نہ خدا پر ایمان لانے کی ضرورت پڑتی ہے نہ وحی کو تسلیم کرنے کی حاجت ۔ اس نظریہ کے قائل اگر خدا کی ہستی کا اقرار بھی کرینگے تو (زیادہ سے زیادہ) اس حد تک کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور یہ اس کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ خدا پر اس قسم کے ایمان سے

*تاج و لسان العرب ۔

انسانی زندگی پر کچھ اثر نہیں پڑتا ۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ اس کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ نہیں ! یہ یونہی اتفاقیہ طور پر وجود میں آگئی ہے ، تو اس اقرار اور انکار سے ان کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس قسم کے ایمان کو ایمان تسلیم نہیں ہی کرتا ۔ (دیکھئے مثلاً ۲۶/۶۱-۱۲ ; ۲۳/۸۳-۸۸ ; ۳۱/۲۵ ; ۳۹/۳۸ ; ۳۳/۹) ۔ اسی طرح جو شخص یہ کہتا ہے کہ زندگی بس اسی طبیعی زندگی کا نام ہے ۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔ تو اس کے نزدیک خیر اور شر کا معیار بھی خود ساختہ ہو جاتا ہے ۔ خیر وہ جس سے اسے فائدہ پہنچے ، یا زیادہ سے زیادہ ، جسے معاشرہ (سوسائٹی) اچھا کہدے ۔ اور شر وہ جس سے اسے نقصان پہنچے ، یا جسے سوسائٹی معیوب سمجھے ۔ اس کے نزدیک اس کے اپنے فیصلوں یا معاشرہ کے متعین کردہ قوانین و ضوابط سے بالا کوئی قانون نہیں ہو سکتا ۔ اس کی زندگی کا مقصد اپنے جذبات کی تسکین ہوتا ہے ، اور بس ۔ قرآن کریم اسے کفر کی زندگی قرار دیتا ہے ۔ سورہ الجاثیہ میں ہے ۔ اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰهُ کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو اپنے جذبات ہی کو اپنا اِلٰہ بنا لیتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ ۔ وہ قانون خداوندی کے مطابق ، اپنے علم کے باوجود غلط روش زندگی پر چلتا ہے ۔ وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۔ اور جذبات پرستی کا طوفان اس کے کان اور دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں ۔ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۔ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ (۴۵/۲۳) اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اس حالت تک پہنچ جائے ، اسکی صحیح راستے کی طرف ، بجز خدا کے قانون کے اور کون راہ نمائی کر سکتا ہے ۔ سو کیا تم ایسے شخص کی حالت دیکھکر نصیحت حاصل نہیں کرتے ۔ یہ وہ لوگ ہیں وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِکُنَا اِلَّا الدَّهْرُ ۔ جو کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے ۔ ہم (قوانین طبیعی کے مطابق) مرتے ہیں اور جیتے ہیں ۔ اور مرور زمانہ (وقت) ہمیں ہلاک کر دیتا ہے ۔ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ ۔ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ (۴۵/۲۴) انہیں حقیقت حال کا کچھ علم نہیں ہوتا ۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لیکر اس قسم کا تصور قائم کر لیتے ہیں ۔

قرآن کریم اس زندگی کو حیوانی سطح زندگی قرار دیتا ہے ۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) ۔

جو لوگ (بلند سطح زندگی سے) انکار کرتے ہیں وہ حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے اور سامان زیست سے فائدے اٹھاتے (اور پھر مر جاتے) ہیں ۔

اس کے برعکس ، دوسرا تصور زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف اس کے جسم کی زندگی نہیں ۔ جسم کے علاوہ انسان میں ایک اور " شے " بھی ہے جسے اس کی ذات ، یا نَفْس کہتے ہیں ۔ یہ قوانین طبیعی کے ماتحت نہیں ہوتی ۔ نہ ہی جسم کی موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔ اس سے انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے ۔ اگر اسکی مناسب نشو و نما کی جائے تو انسان کی موجودہ زندگی بھی خوشگوار اور سرسبز و شاداب ہوتی ہے اور مرنے کے بعد ، وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے ۔ انسانی ذات کی نشو و نما ان قوانین کی رو سے ہوتی ہے جو خدا کیطرف سے ، حضرات انبیاء کرام[ؑ] کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتے ہیں (اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں) ۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ انسانی ذات پر " ایمان " اور خدا ، وحی ، نبوت اور آخرت پر ایمان کسطرح لازم و ملزوم ہیں ۔

" انسانی ذات کیا ہے " ۔ یہ نہ بتایا جا سکتا ہے نہ سمجھا جا سکتا ہے ۔ اس لئے کہ یہ کوئی مادی شے نہیں ۔ انسانی ذات کا مظاہرہ اس کے اختیار و ارادہ سے ہوتا ہے ۔ اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی غیر مادی " شے " ہے جو اختیار و ارادہ کی استعداد کی حامل ہے ۔ اختیار و ارادہ (بصورت مطلق اور کُلّی طور پر) خدا کو حاصل ہے اور اس کا عطا کردہ ، (محدود شکل میں) انسان کو حاصل ہے ۔ اس کے سوا ، کائنات میں کسی اور کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں ۔ اسی لئے اسے خدا نے " روحنا " کہہکر پکارا ہے ۔ یعنی الوہیاتی توانائی (Divine energy) (دیکھئے عنوان ر ۔ و ۔ ح) ۔ اگر انسان ، قوانین خداوندی کا اتباع کرے تو اس کی ذات میں (حد بشریت کے اندر) صفات خداوندی منعکس ہوتی جاتی ہیں ۔ اسی کو اسکی ذات کا نشو و نما کہتے ہیں ۔ واضح رہے کہ انسانی ذات ، ذات خداوندی کا جزو نہیں ۔ ذات (وہ خدا کی ہو یا انسان کی) ایک غیر منقسم وحدت (Indivisible whole) ہوتی ہے جس کے حصے بخرے ہو نہیں سکتے ۔

چونکہ انسان کے ہر عمل کی بنیاد اس کے ارادہ پر ہوتی ہے ، اس لئے اس کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے ۔ حتکہ اس کے دل میں گذرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانت تک کا بھی ($\frac{۴۰}{۱۹}$) ۔ یہی اس کا " اعمالنامہ " ہے جو اسکی گردن میں لٹکا رہتا ہے ۔ ($\frac{۱۳}{۱۷}$) ۔ اسی کو وہ ظہور

نتائج کے وقت پڑھیگا ۔ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷/۱۴) ۔ ” تو آج اپنی کتاب پڑھ ۔ آج تیرا نفس خود تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے“ ۔ (نیز ۲۵/۱۵ ؛ ۳۰/۱۳) ۔ اسی سے انسانی ذات کی انفرادیت (Individuality) ثبت ہوتی ہے (۶/۹۵ ؛ ۹۱/۹۵) ۔ یعنی ہر انسانی ذات منفرد (Unique) ہوتی ہے اور اس کے ہر عمل کا اثر اس کے اپنے اوپر ہوتا ہے، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا ۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۵) ۔ ہر نفس کو اپنے اعمال کا خمیازہ خود بھگتنا پڑتا ہے ۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا ۔ (اس ضمن میں حسب ذیل آیات بھی دیکھئے ۔ (۶/۱۰۵ ؛ ۱۰/۱۰۸ ؛ ۱۷/۷ ؛ ۱۷/۱۵ ؛ ۲۷/۹۲ ؛ ۲۹/۶ ؛ ۳۰/۴۴ ؛ ۳۱/۱۲ ؛ ۳۵/۱۸ ؛ ۳۹/۴۱ ؛ ۴۱/۴۶ ؛ ۴۵/۱۵ ۔ نیز ۳۵/۱۸ ؛ ۳۹/۷ ؛ ۵۳/۳۸) ۔ جب اتباع قوانین خداوندی سے انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے تو (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس میں زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اسے مرنے کے بعد جنت کی زندگی کہتے ہیں ۔ لیکن جس ذات کی نشو و نما نہیں ہوتی، وہ آگے بڑھنے سے رک جاتی ہے ۔ یہ جہنم یا جحیم کی زندگی ہے ۔ [دیکھئے عنوانات (ج ۔ ن ۔ ن) ؛ (ج ۔ ح ۔ م) ؛ (جہنم)] ۔ یوں تو انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے پورے کے پورے ضابطۂ قرآنی کا اتباع ضروری ہے (اور یہ اتباع قرآنی معاشرہ کا جزو بنکر ہی کیا جاسکتا ہے) لیکن قرآن کریم نے اس باب میں ایک بنیادی نکتہ بیان کیا ہے جو بڑا اہم ہے ۔ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ فرد خود کھاتا (یا لیتا) ہے ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کھاتا جاؤں اور آپ کے جسم کی پرورش ہوتی جائے ۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی نشو و نما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے ہم دوسروں کی نشو و نما کے لئے دیں ۔ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۔ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۹۲/۱۷) ۔ جہنم سے اسے بچایا جاتا ہے جو اپنے مال کو (یا جو کچھ اس کے پاس ہے اسے) اپنی نشو و نما کے لئے دیتا ہے ۔ تقویٰ شعار بھی وہی ہوتا ہے جو ” دیتا ہے“ ۔ مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (۹۲/۶) ” جو دیتا ہے اور (اسطرح) تقویٰ اختیار کرتا ہے“ ۔ (نیز دیکھئے (۵۹/۹ ؛ ۶۴/۱۶) ۔

یاد رہے کہ انسانی ذات، ایک ملکہ، صلاحیت، استعداد، یا امکانی قوت ہے جو بجائے خویش نہ خیر ہے نہ شر ۔ دوسری ہر قوت کی طرح، اس کا استعمال اسے خیر یا شر بنا دیتا ہے ۔ جب انسان اسے انسانیت کی بلند اقدار (Higher Values) کے تحفظ اور استحکام کے لئے عمل میں لاتا ہے، تو یہ خیر کا موجب بن جاتی ہے (اسی سے اسکی نشو و نما ہوتی ہے) ۔ اور

جب انسان اپنے اختیار و ارادہ کو ، پست مفادِ خویش کے خاطر استعمال کرتا ہے (جس میں بلند اقدار کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے) تو یہ شر کا مظہر بن جاتی ہے۔ اس صورت میں (محض تمیز کی خاطر) ہم انسانی ذات کو ایغو(Ego) سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایغو ، حیوانی سطح زندگی پر ہوتا ہے اور ذات ، انسانی سطحِ زندگی پر۔ جب انسانی جذبات (Emotions) ایغو کے تابع چلتے ہیں تو قرآن کریم انہیں ''ہویٰ'' کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ (اس مادہ میں ''پستی'' کا مفہوم ہوتا ہے۔ دیکھئے عنوان ہ۔ و۔ ی)۔ اور جب عقل (Intellect) ایغو کی خادمہ بنتی ہے تو مکر و فن کہلاتی ہے۔ اس کے برعکس جب جذبات انسانی ذات کے ماتحت رہتے ہیں تو بلند ترین جوہر انسانیت بن جاتے ہیں اور جب عقل ، انسانی ذات کے تابعِ فرمان رہتی ہے تو انسانی زندگی اور معاشرہ جنت بداماں ہو جاتا ہے۔ (اقبال اول الذکر عقل کو ، عقلِ خود بیں اور ثانی الذکر کو عقلِ جہاں بیں ، یا خرد ''ادب خوردہ دل'' کہکر پکارتا ہے)۔

جب ایغو ، کسی مستقل قدر کو پس پشت ڈال کر ، پست مفاد کیطرف جاتا ہے تو اسے عام طور پر ''نفس امارہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح قرآن کریم کی اس آیت سے لی گئی ہے جس میں اس نے ، عزیز مصر کی بیوی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ (۱۲/۵۳)۔ یقیناً نفس ، برائی کا حکم دیتا رہتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ نفس انسانی ہے ہی برائی کا حکم دینے والا۔ بالکل نہیں۔ یہ ایغو کے متعلق کہا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ہے اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ (۱۲/۵۳)۔ بجز اس کے جس پر خدا کی رحمت ہو۔ یہ نفس کی وہ سطح ہوگی جسے ہم نے ''انسانی ذات'' سے تعبیر کیا ہے۔

بعض اوقات نفس انسانی کی یہ کیفیت بھی ہوتی ہے کہ جب اس سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو اس کے بعد اس میں احساس ندامت بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ، ایغو اور ذات میں ایک قسم کی کشمکش کی حالت ہوتی ہے۔ اسے قرآن کریم نے نفس لوّامہ کہا ہے (۷۵/۲)۔ یعنی ''ملامت کرنے والا نفس''۔ اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانی ذات میں اس کی استعداد نہیں کہ وہ خیر اور شر میں خود تمیز کرسکے۔ خیر و شر کی تمیز صرف وحی کی رُو سے ہو سکتی ہے۔ نفس لوامہ اُسی بات پر ملامت کریگا جسے وہ معیوب سمجھتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو وہ معیوب سمجھتا ہے وہ درحقیقت معیوب ہو ، اور جسے وہ محمود قرار دیتا ہے وہ درحقیقت ممدوح ہو۔ [تفصیل اس اجمال کی (ل۔ ہ۔ م) اور (ف۔ ط۔ ر) کے عنوانات میں ملیگی]۔

جب انسان، خالص قوانین خداوندی کا اتباع کرتا ہے، تو ابغو اور ذات کی کشمکش ختم ہو جاتی ہے۔ ذات، پست جاذبیتوں پر غالب آ جاتی ہے۔ (۲۹/۳۹) - اسے قرآن کریم نے نفس مطمئنہ سے تعبیر کیا ہے (۸۹/۲۷) جس کی زندگی جنت کی زندگی ہے (۸۹/۲۹) - اسے، عصر حاضر کی علم النفس کی زبان میں (Integrated Personality) کہا جائے گا - اس کے برعکس (Disintegrated Personality) ہوگی - قرآن کریم نے نفس کی ان دونوں کیفیتوں کو فُجُوْرَھَا و تَقْوٰھَا (۹۱/۸-۹) سے تعبیر کیا ہے - (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ل - ھ - م)۔ اور ذات کی نشو و نما (Development) کو انسانی زندگی کا مقصود اور کامیابی و کامرانی بتایا ہے (۹۱/۱۰) -

چونکہ انسانی ذات، امکانی شکل (Realiseable Form) میں ہر انسانی بچہ کو پیدائش کے ساتھ یکساں طور پر ملتی ہے، اس لئے اس کی بنا پر ہر فرزند آدم، محض آدمی ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے - وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)۔ "ہم نے تمام فرزندان آدم کو واجب التکریم بنایا ہے" - ذات کی تکریم کے معنے یہ ہیں کہ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اپنا محکوم بنائے - انسانی اختیار و ارادہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے - اس لئے کسی کے اختیار و ارادہ کو سلب کرلینا، اس سے اپنے فیصلے منوانا (اسی کو محکومی کہتے ہیں) اُسے شرف انسانیت سے محروم کردینا ہے - قرآن کریم کی رُو سے اطاعت یا محکومی، صرف قوانین خداوندی کی ہوسکتی ہے - (اسی کو عبادت کہتے ہیں - دیکھئے عنوان ع - ب - د) - یہ اطاعت، کسی مستبد حاکم کی عائد کردہ پابندیوں کا نام نہیں ہوتا - انسان ان پابندیوں کو اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے - (اطاعت کے معنے ہی بطیب خاطر، برضا و رغبت، اپنے اوپر کسی پابندی کا عائد کرنا ہے) اور اس لئے عائد کرتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے - لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (۲/۲۸۶) سے بھی مراد ہے - یعنی قوانین خداوندی انسان پر جو پابندیاں عائد کرتے ہیں تو اس سے مقصد، خود انسانی ذات میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے - نہ کہ اس کی آزادی کو سلب کرنا - [دیکھئے عنوان ک - ل - ف] - قرآنی معاشرہ اس قسم کی فضا پیدا کرتا ہے جس میں کوئی کسی کا محکوم نہیں ہوتا اور اس طرح انسانی ذات کی وسعتیں حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہیں - اس سے انسان کو اس دنیا میں بھی جنتی زندگی حاصل ہو جاتی ہے اور آخرت میں بھی جنتی زندگی۔ خانقاہیت کی تجرد گاہوں میں انسانی ذات کی نشو و نما کبھی نہیں ہوسکتی۔ جنت کے لئے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ (۸۹/۲۹) پہلی شرط ہے -

سورۃ زمر میں ایک آیت ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى (۳۹/۴۲) "اللہ موت کے وقت نفوس کو موقوف کر دیتا ہے اور جو مرتے نہیں ان کی نیند کی حالت میں ایسا کر دیتا ہے - پھر جن پر موت کا حکم ہوجاتا ہے تو انہیں روک لیتا ہے اور دوسروں کو ایک وقت مقرر تک واپس بھیجدیتا ہے" - سوال یہ ہے کہ اس آیت میں "نفس" سے کیامطلب ہے جسےموت اور نیند دونوں حالتوں میں موقوف کر دیا جاتا ہے اور جب انسان جاگ اٹھتا ہے تو اسے واپس کر دیا جاتا ہے ، لیکن بصورتِ موت اسے واپس نہیں کیا جاتا - جہاں تک نیند کا تعلق ہے ہم جانتے ہیں کہ اس میں انسان کا سب کچھ موجود ہوتا ہے، بجزشعور (Consciousness) کے - (حتکہ اس میں تحت الشعور بھی باقی ہوتا ہے) - اس لئے ظاہر ہے کہ اس آیت میں "نفس" سے مراد اسکی شعوری حالت ہے - یعنی نیند اور موت دونوں حالتوں میں انسان کا شعور باقی نہیں رہتا - سونے والا جب جاگ اٹھتا ہے تو اس کا شعور پھر رو بہ عمل ہوجاتا ہے ، لیکن موت کی صورت میں شعور کا تعلق اس جسم کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے - موت کے بعد ، شعور کے رو بہ عمل ہونے کو حیات بعد الممات کہتے ہیں - اس زندگی میں شعور (یا نفس) کس طور پر رو بہ عمل ہوتا ہے ، ہم اپنےشعور کی موجودہ سطح پر اسے نہیں سمجھ سکتے - اس لئے کہ اس وقت ہمارے شعور کے رو بہ عمل ہونے کا ایک ہی ذریعہ ہے - اور وہ ہے ہمارا مادی جسم - ہم اس وقت ، جسم کے توسط کے بغیر ، شعور کی کارفرمائی کا تصور ہی نہیں کرسکتے - قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ حیات بعد الممات میں شعور کی کارفرمائی کا ذریعہ کیا ہوگا - نہ ہی اس کے بتانے سے کوئی فائدہ تھا - اس لئے کہ جس بات کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ ہی نہیں سکتے اس کے بتانے سے حاصل کیا ہو سکتا ہے - لیکن مرنے کے بعد نفس کی کارفرمائی کو قرآن کریم ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر بیان کرتا ہے - اس پر ہمارا ایمان ہے اور یہی دین کی اصل و بنیاد ہے -

ن ف ش

نَفَشٌ - اون یا روئی وغیرہ کو انگلیوں سے پراگندہ کرنا - (لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے) - بعض نے کہا ہے کہ نَفَشٌ - ہر اس چیز کے منتشر ہو جانے کو کہتے ہیں جسکا منتشر ہو جانا مشکل نہ ہو - جیسے روئی - اون وغیرہ* - قرآن کریم میں الْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ (۱۰۱/۵) آیا ہے - یعنی

*تاج و راغب و محیط -

دھنی ھوئی (منتشر شدہ) رنگین اون - (ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی منتشر ھونا لکھے ھیں -

ابن السکیت نے کہا ھے کہ نَفْشٌ کے معنی ھیں رات کے وقت بکریوں یا اونٹوں کا چرواھے کے علم کے بغیر ادھر اُدھر منتشر ھوکر چرنا - (نَفْشٌ میں رات کے وقت ایسا ھونے کی تخصیص ھے - ھَمْلٌ میں رات یا دن کی تخصیص نہیں ھوتی) - قرآن کریم میں ھے اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ (۲۱/۷۸) جب لوگوں کی بکریاں اس میں رات کے وقت چرتے ھوئے منتشر ھوگئیں -

ن ف ع

اَلنَّفْعُ - ضُرٌّ وَضَرٌّ (نقصان) کی ضد ھے - لیکن درحقیقت نَفْعٌ اس ذریعے کو کہتے ھیں جس سے کسی خوشگواری (خیر) تک پہنچا جائے - چنانچہ اَلنَّفْعَةُ - لاٹھی کو کہتے ھیں**- چرواھوں کی لاٹھی جسطرح ''خیر'' تک پہنچنے کا ذریعہ ھوتی ھے وہ ظاھر ھے -

قرآن کریم میں یہ لفظ ضرر کے مقابلہ میں آیا ھے (۲/۱۰۲) - اور اِثْمٌ کے مقابلہ میں (۲/۲۱۹) بھی - لہذا ضَرَرٌ کی طرح نَفْعٌ بھی خارجی اور داخلی دونوں حالتوں کی خوشگواری کے لئے آئے گا - (مَنَافِعُ (واحد مَنْفَعَةٌ) - فوائد - کام کی چیزیں - (۲/۲۱۹) -

ن ف ق

نَفَقٌ - اس سرنگ کو کہتے ھیں جس کے داخل ھونے اور نکلنے کے دونوں راستے کھلے ھوں - (جس سرنگ میں نکلنے کا راستہ نہ ھو اسے سَرَبٌ کہتے ھیں) - اَلنَّافِقَةُ - وَالنَّافِقَاءُ - جنگلی چوھے کے بل کے متعدد سوراخوں میں سے ایک سوراخ کو کہتے ھیں جس پر وہ مٹی کی باریک سی پپڑی بچھا کر اسے بند رکھتا ھے اور اسے اس وقت سر مار کر کھول لیتا ھے جب اس کا کوئی دشمن اسے بل کے اندر سے پکڑنے کی کوشش کرے- نَیْفَقٌ اس نیفہ کو کہتے ھیں جس کے دونوں کنارے کھلے ھوں - (بعض کا خیال ھے کہ یہ نیفہ سے معرب ھے) - اسی لئے مُنَافِقٌ اُس شخص کو کہتے ھیں جو کسی نظام (یا سوسائیٹی) میں داخل ھونے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ اس سے باھر نکلنے کا راستہ کون سا ھے - نَفَقَتِ السُّوْقُ - بازار گرم ھوا ، اوراس کے سامان کی مانگ ھوئی - (یعنی جو اشیاء کی درآمد اور برآمد کے لئے ھر وقت

*تاج و محیط و راغب - ** تاج -

کھلا رہے ۔ ہر وقت مال آتا رہے اور اس کا نکاس ہوتا رہے ۔) لہذا اِنْفَاق*
کے معنی ہیں اپنی دولت کو کھلا رکھنا ۔ عام کر دینا ۔ باقی نہ رکھنا ۔
ختم کر دینا *۔ قرآن کریم نے اس کے مقابل میں اِمْسَاک* (روک رکھنے)
کا لفظ لا کر اس کے معانی کو واضح کر دیا ہے (۱۷/۱۰۰) ۔

چونکہ روپے کو کھلا رکھنے کا نتیجہ سرمایہ کی نفی (ختم ہو جانا)
یا کمی ہوتا ہے ، اس لئے نَفَاق* کے معنی کسی چیز کے کم ہو جانے یا
ختم ہو جانے کے بھی لئے جانے لگے* ۔ یہاں تک کہ ان معانی کو بنیادی
معنی کی سی اہمیت حاصل ہو گئی ۔ چنانچہ اَنْفَقَتِ الْاِبِلُ* اُسوقت کہتے
ہیں جب موٹاپے کی وجہ سے اونٹوں کی اون جھڑ جائے ۔ یعنی منتشر اور پراگندہ
ہو کر ضائع ہو جائے* ۔

قرآن کریم میں اِنْفَاق* کے بنیادی معنی اپنی محنت کے ماحصل کو
ربوبیت عالمینی کے لئے کھلا رکھنا ہیں ۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ
قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال و دولت
(ربوبیت عامہ کے لئے) کھلا رکھیں ۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری ضرورت
سے زائد ہے سب کا سب ۔ یعنی فاضلہ دولت (Surplus money) جو سرمایہ
داری کی بنیاد ہے ، سب کی سب ربوبیت عامہ کے لئے وقف ہونی چاہئے ۔ یہ کسی
کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتی ۔

یہ قرآنی نظام کا بنیادی نقطہ ہے ۔ مومن کی ہمیانی کے دونوں سرے کھلے
رہتے ہیں اور یہ ہمیانی نظام کے ہاتھ میں رہتی ہے ۔ اس میں ہر فرد اپنی
محنت کا ماحصل ڈالتا جاتا ہے اور نظام ربوبیت اسے نوع انسانی کی نشو و نما
کے لئے صرف کرتا جاتا ہے ۔ چونکہ اس نظام میں ہر فرد کی تمام ضروریاتِ
زندگی کی ذمہ داری خود نظام پر ہوتی ہے اس لئے کسی فرد کو کچھ بچا کر
رکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ۔ نہ ہی اسے اپنے یا اپنی اولاد کے مستقبل کے
متعلق کوئی خدشہ یا اندیشہ رہتا ہے ۔ یہ تمام ذمہ داریاں نظام کے سر ہوتی
ہیں جو قوانین خداوندی کے مطابق قائم ہوتا ہے ۔

بناء بریں ان مقامات میں اِنْفَاق* کے معنی خرچ کرنے کی بجائے کھلا
رکھنا زیادہ مناسب ہیں ۔ " کھلا رکھنے " کا مطلب ہوگا نوع انسانی کی
ربوبیت عامہ کے لئے نظام خداوندی کی تحویل میں رکھنا ۔ نَفَقَة* (۹/۱۲۱) ۔
ہر وہ چیز جسے اسطرح کھلا رکھا جائے ۔ بعض مقامات میں اس کے معنی
خرچ کرنے کے بھی آئینگے ۔

---

*تاج و ابن فارس ۔

نَافَقَ - منافق ہونا (۳/۱۶۶) - معاشرہ میں منافق سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں - ایک تو وہ لوگ ہیں جو دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ نظام خداوندی سے وابستہ ہو جاتے ہیں - یہ مومن ہیں - دوسرے وہ ہیں جو کھلے بندوں اس نظام سے باہر رہتے اور اس کی مخالفت کرتے ہیں - انہیں کافر کہئے - تیسرے وہ ہیں جو محض اپنی مطلب براری کے لئے جماعت مومنین کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں - منافع میں ان کے برابر کے شریک رہتے ہیں اور جہاں کسی مشکل کا سامنا ہوا، تو یا جماعت کا ساتھ چھوڑ کر صاف نکل گئے، اور یا اس میں بد دلی پھیلانے اور فتنہ پردازی کرنے لگ گئے - یہ منافق ہیں اور بدترین خلائق - اسی لئے قرآن کریم نے ان کا مقام جہنم کا سب سے نچلا طبقہ بتایا ہے (۴/۱۴۵) - قرآن کریم نے (سورہ فاتحہ کے بعد) سب سے پہلے انہی تینوں جماعتوں (مومن - کافر - منافق) کا ذکر واضح الفاظ میں کیا ہے - اس کے بعد، سارے قرآن کریم میں ان تین جماعتوں کا ذکر ہے - یہ جماعتیں زمانہ نزول قرآن تک محدود نہ تھیں - یہ ہمیشہ رہی ہیں اور ہمیشہ رہینگی - ان کی خصوصیات اسقدر طول طویل ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں -

ن ف ل

اَلنَّفْلُ - ہر وہ عمل جو (واجب) سے زیادہ ہو - اَلنَّفَلُ - مالِ غنیمت - ہبہ - عطیہ - دونوں کی جمع اَنْفَالٌ آئے گی - نَفْلٌ کے معنوں میں نَافِلَةٌ بھی آتا ہے - قرآن کریم میں ہے - وَ مِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (۱۷/۷۹) - تورات کے کچھ حصے میں (قرآن کریم کو) لے کر اٹھ - یہ تیرے لئے "نفل" کے طور پر ہے - اَلنَّافِلَةُ - پوتا - کیونکہ بیٹا تو اصل ہوتا ہے اور پوتا اس پر زائد ہوتا ہے (۲۱/۷۲) -

اَنْفَالٌ (۸/۱) - بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنے مالِ غنیمت کے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ یہ مالِ غنیمت سے الگ (اور خاص) ہوتی ہے - عام طور پر اس کے معنے مالِ غنیمت یا ہبہ یا عطیہ کے لئے جاتے ہیں* - لیکن ہمارا خیال ہے کہ اسے جنگ کے ساتھ مختص کر دینے کی ضرورت نہیں - اس سے مراد مملکت کی وہ تمام آمدنی ہو سکتی ہے جو متعین کردہ واجبات کے علاوہ ہو -

اَلنَّوْفَلُ - دریا - سمندر - عطیہ - بہت عطا کرنے والا آدمی** -

*تاج - **محیط -

نَفَلَ فُلَانًا ۔ فلاں کو عطیہ کے طور پر کچھ دیا جس کے معاوضے کا وہ خواہاں نہیں** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی عطیہ اور عطا کرنا ہیں ۔

ن ف ی

نَفَیَ ۔ یَنْفِی ۔ نَفْیًا ۔ ایک طرف کردینا ۔ نکال دینا ۔ الگ کردینا۔ دور کردینا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے ہٹا دینے یا دورکردینے کے ہیں ۔ اَلنَّفِیُّ ۔ وہ اُبال جو ھانڈی باھر پھینک دے۔ وہ کنکریاں وغیرہ جو جانوروں کے ٹھوکر لگنے سے ادھر ادھر اُڑتی ھیں ۔ وہ مٹی جسے ھوا درختوں کی جڑوں میں لاکر پھینک دیتی ھے ۔ بڑے لشکر سے جو حصہ کٹ کر الگ ھو جائے اور ایک طرف کو رہ جائے ۔ نَفَیَ شَعْرُ فُلَانٍ ۔ فلاں آدمی کے بال پریشان اور پراگندہ ھوگئے ۔ یا گرگئے۔ نَفَیَ السَّیْلُ الْغُثَاءَ ۔ سیلاب کوڑا کرکٹ بہا کر لے گیا ۔ اسی سے نَفَیَ کے معنی انکار کردینے کے آتے ھیں ۔ نَفَیَ الْاَبُ الْاِبْنَ ۔ باپ نے بیٹے کو اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکارکردیا* ۔

قرآن کریم میں ان لوگوں کےمتعلق جو نظام خداوندی (اسلامی مملکت) کے خلاف بغاوت کریں اور نظام کو درھم برھم کرنے کی کوشش کریں کہا گیا ھے کہ انہیں قتل کر دو ۔ یا سولی چڑھا دو ۔ یا ’’قطع ید و رجل‘‘ کردو ۔ (دیکھو عنوان ق ۔ ط ۔ ع) ۔ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (۵/۳۳) ۔ نَفْیٌ کے ان معانی کے لحاظ سے جو اوپر درج کئے گئے ھیں اس کے معنی ھونگے ملک سے الگ کردینا ۔ جلاوطن کردینا ۔ صاحب محیط نے نَفَیَ فُلَانًا کے معنی فلاں کو قید کردیا بھی لکھے ھیں* ۔ لیکن مندرجہ بالا آیت میں مِنَ الْاَرْضِ کے اضافہ سے ظاھر ھے کہ اس کے معنے ملک بدر کردینے کے ھونگے یا یہ کہ اسے آزادی اور دیگر مراعات سے محروم کردیا جائے ۔ (اس طرح زمین سے الگ کردینے کا مفہوم ھوگا اسے باقی آبادی سے الگ کردینا) ۔

ن ق ب

نَقْبٌ ۔ (دیوار میں) سوراخ کرنے کو کہتے ھیں ۔ اورخود سوراخ کو بھی* ۔ سورۃ کہف میں ھے وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَہٗ نَقْبًا (۱۸/۹۷) ۔ وہ اس دیوار میں سوراخ نہیں کرسکتے تھے ۔ تَنَقَّبَ عَنِ الشَّیْئِ کے معنی

---

*تاج ۔ **محیط ۔

ھیں کسی چیز کی تلاش میں بہت زیادہ کوشش کرنا - مارے مارے پھرنا**- سورۃ قٓ میں ھے - فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ (۵۰/۳۶) - انھوں نے شہروں کو چھان مارا کہ کوئی پناہ کی جگہ مل جائے - ابن فارس نے کہا ھے کہ نَقَّبَ کے معنی ھیں نُقُوْبٌ (پہاڑوں کے تنگ راستوں یا دروں) میں چلنا - اَلنَّقِيْبُ بانسری (کیونکہ اس میں چھید ھوتے ھیں) - اَلنَّقِيْبُ کے معنی ھیں قوم کا نگران - ضامن - سردار - لوگوں کے احوال معلوم کرنے والا - چھان بین کرنے والا* - بنی اسرائیل کے متعلق ھے وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا (۵/۱۲) - ھم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کردئے -

اَلنَّقْبَةُ - سوراخ - چہرے کو بھی کہتے ھیں - غالباً اسی لئے کہ اس میں کئی سوراخ ھیں - اور اَلنِّقَابُ - اس کپڑے کو جس سے عورت اپنے چہرے کو چھپاتی ھے - النِّقَابُ کے متعلق ابن فارس نے کہا ھے کہ یہ معنی خلاف قیاس ھیں - اَلْمَنْقَبَةُ - قابل فخر بات - بلند کارنامہ - خوبی - اچھی خصلت* -

ن ق ذ

نَقَذَهٗ و اَنْقَذَهٗ و اسْتَنْقَذَهٗ - اسے چھڑانا، چھٹکارا دلانا، نجات دلانا - نَقَذَ الرَّجُلُ - آدمی نے نجات پائی اور سلامت رھا*** - راغب نے لکھا ھے کہ یہ کسی سخت مشکل اور مصیبت و تباھی سے رھائی حاصل ھونے پر بولا جاتا ھے****- لغزش کھانے اور پھسل کر گرنے والے کو بطور دعا نَقْذًا لَكَ کہا جاتا ھے، یعنی خدا تجھے سلامت رکھے - اَلنَّقِيْذَةُ اس گھوڑے کو کہتے ھیں جسے دشمن کے قبضہ سے چھڑا لیا جائے***- قرآن کریم میں ھے - فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا (۳/۱۰۲) "اس نے تمھیں اس سے بچا لیا" - نیز (۳۹/۱۹ و ۳۶/۴۳) - سورۃ حج میں ھے لَا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ (۲۲/۷۳) - "وہ اسے چھڑا نہیں سکتے" -

ن ق ر

نَقَرَهٗ نَقْرًا - اس کو مِنْقَار (سل راھنے کے آلہ) سے مارا - اَلنَّقْرُ - چکی یا سل کو راھنا - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی ھیں کسی چیز کو ٹھوکنا جس سے اس میں گڑھے پڑجائیں - پھر اس کے معنوں میں وسعت ھوگئی - اَلْمِنْقَارُ - اس آلے کو کہتے ھیں جس سے سل وغیرہ راھتے ھیں - نیز چونچ کو - چونکہ اس سے کھٹ کھٹ کی آواز پیدا ھوتی ھے اس

*تاج - **محیط - ***تاج و محیط - ****راغب -

لئے آواز کے معنوں میں بھی یہ مادہ استعمال ہوتا ہے ۔ بالخصوص ایسی آواز جو زبان کو تالو سے چمٹا کر نکالی جائے اور اس سے گھوڑے کو ہانکا جائے۔ یا چٹکی کی آواز ۔ اَلنَّقِیْرُ ۔ سیٹی جیسی آواز* ۔ لسان العرب میں ہے کہ نَاقُوْرٌ بگل کو کہتے ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ (۷۴/۸) ۔ جب سرکش قوتوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے گا ۔

اَلنَّقَارَۃُ ۔ وہ ذرا سی چیز جسے پرندہ ایک مرتبہ اپنی چونچ میں اٹھالے*۔ اس سے اَلنَّقِیْرُ اس چھوٹے سے نقطہ کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے* ۔ اس سے مراد ہوتی ہے بہت تھوڑی اور حقیر سی شے۔ سورۃ نساء میں ہے ۔ لَا یُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِیْرًا (۴/۵۳) ۔ ''لوگوں کو اتنا بھی نہیں دینگے جتنی اُڑد کے دانے پر سفیدی'' ۔

ن ق ص

اَلنَّقْصُ ۔ حصہ میں کمی ہونا ۔ ابن القطاع نے لکھا ہے کہ نَقْصٌ کے معنی ہیں کسی چیز کے مکمل ہوجانے کے بعد اس میں سے کچھ جاتے رہنا ۔ اور اَلنُّقْصَانُ اس مقدار کو کہتے ہیں جو اس شے میں سے جاتی رہے ۔ اَلنَّقِیْصَۃُ کے معنی عیب ہیں* ۔ تَنَاقَصَ الشَّیْءُ ۔ چیز آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی** ۔ نَقَصَ ۔ یَنْقُصُ ۔ کم کیا ۔ کم ہوا ۔ (لازم اور متعدی دونوں کے لئے آتا ہے) ۔

قرآن کریم میں ہے نَقْصٍ مِنَ الْاَمْوَالِ (۲/۱۵۵) ۔ مال میں کمی آجانا ۔ نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے جد و جہد کرنے میں اس جماعت کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں اموال کا نقصان بھی ہے ۔ لیکن اس نظام کےقیام کے بعد انہیں ہر طرح کی فراوانیاں حاصل ہو جاتی ہیں ۔ اگر کسی نظام کا نتیجہ لوگوں کے لئے رزق کی کمی ہو تو وہ نظام فرعونی ہے اور رزق کی کمی خدا کا عذاب ، جیسا کہ (۷/۱۳۰) سے واضح ہے ۔ کسی نظام کے قیام میں مشکلات اور مصائب کا سامنے آنا اور بات ہے اور اس کے نتائج کا نقصان دہ اور ضرر رساں ہونا اور بات ۔ قرآنی نظام کے نتائج نہایت خوش گوار ہوتے ہیں اگرچہ اس کے قیام میں مخالفین کی طرف سے پیش کردہ بہت سی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے ۔ ان میں نقصِ مال بھی شامل ہے ۔

ن ق ض

نَقْضٌ کے معنے ہیں ڈھا دینا ۔ توڑ دینا ۔ کھول دینا ۔ عہد کرکے اسے توڑ دینا* ۔ اَلنِّقْضُ ۔ مسمار شدہ عمارت یا اس کا ملبہ ۔ نیز وہ اونٹ جو

*تاج ۔ **محیط ۔

مسلسل چلنے سے لاغر ہو گیا ہو ۔ اَلنَّقِیْضُ ۔ آدمی کے جوڑوں کی آواز* ۔ اَلَّذِیْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (۹۴/۳) ۔ وہ بوجھ (ذمہ داری) جس نے تمہاری کمر توڑ دی تھی ۔ تَنَاقُضٌ ۔ توافق کی ضد ہے ۔ ایک دوسرے کی مخالفت ۔ یعنی جس میں ایک بات دوسری بات کو توڑ رہی ہو ۔

قرآن کریم میں نَقْضٌ کا لفظ عہد شکنی کے لئے عام طور پر آیا ہے (۲/۲۷ و ۹/۱۶) ۔ نیز نَقَضَتْ غَزْلَهَا (۹۲/۱۶) کے معنی ہیں سوت کے ٹکڑے ٹکڑے کردئے ۔ یا اس کے بل کھول دئے ۔

ن ق ع

اَلنَّقْعُ ۔ عمدہ خالص مٹی والی زمین جس میں پانی اکٹھا ہو جائے ۔ کسی جگہ اکٹھا ہو جانے والا پانی ۔ اوپر اٹھنے والا غبار* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی سیال چیز کا اپنی جگہ ٹھہر جانا اور (۲) ایک قسم کی آواز ۔ اس لفظ کے اور بھی بہت سے معانی ہیں ۔ لیکن قرآن کریم میں جہاں یہ لفظ آیا ہے ۔ یعنی فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا (۴/۱۰۰) ۔ وہاں اسکے معنی گرد و غبار اڑانے ہی کے ہیں ۔ یعنی مجاہدین کے وہ گھوڑے جو گرد و غبار اڑاتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس جاتے ہیں ۔

ن ق م

اَلنَّقَمُ ۔ وسطِ طریق ۔ راستے کا درمیانی حصہ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معنی ہیں کسی چیز کو ناپسندیدہ قرار دینا اور اسے معیوب بتانا ۔ اس اعتبار سے اِنْتِقَامٌ کے معنی ہونگے بری بات کو برا کہنا اور برائی کرنے والے کو برائی کا بدلہ دینا ۔ اَلنَّقِمَةُ ۔ جرم کی سزا دینا** ۔ اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کو ذُوانْتِقَامٍ (۳/۴) کہا گیا ہے ۔ یعنی وہ جس کے قانون کے مطابق اعمال اپنے نتائج برآمد کرتے ہیں اور مجرموں کو سزا ملتی ہے ۔ ہمارے ہاں انتقام کا لفظ اس سے مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ اس لئے جب یہ لفظ اللہ کے لئے بولا جائے تو اس کا وہ مفہوم نہیں لینا چاہئے جو ہم اپنے ہاں لیتے ہیں ۔ اس کا مفہوم مکافات عمل ہے ۔ سورہ اعراف میں قوم فرعون کے متعلق ہے فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (۷/۱۳۶) ۔ ہم نے انہیں ان کی غلط روش زندگی کا بدلہ دیا ۔ اسی طرح سورہ سجدہ میں ہے ۔ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِیْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (۳۲/۲۲) ۔ ہم مجرمین کو ان کے اعمال کا بدلہ

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔

دیتے ہیں ۔ نَقَمَ کے معنی ہیں کسی بات کو ناپسند کرنا ۔ برا سمجھنا ۔ اعتراض کرنا (۵/۵۹) ۔ سورہ بروج میں ہے وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّا اَنْ يُّؤْمِنُوا بِاللّٰهِ . . . . (۸۵/۸) ۔ اور یہ (کفار) ان (مومنین) کو اس وجہ سے ناپسند کرتے ہیں کہ یہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ، یعنی وہ ان کے ایمان لے آنے کو معیوب سمجھتے ہیں ۔

ن ک ب

نَكَبَ عَنْهُ يَنْكُبُ و نَكِبَ يَنْكَبُ ۔ ہٹ جانا ۔ صحیح رخ پر نہ رہنا ۔ طَرِيْقٌ يَنْكُوْبٌ ۔ منزل مقصود سے ہٹا ہوا راستہ ۔ اَلنَّكْبَاءُ ۔ ہر وہ ہوا جو اپنے صحیح رخ سے ہٹ کر چلے*۔ (نیز ابن فارس) ۔ قرآن کریم میں ہے عَنِ الصِّرَاطِ لَنَاكِبُوْنَ (۲۳/۷۴) ۔ وہ صحیح راستے سے ہٹے ہوئے ہیں ۔ اعراض برتتے ہیں ۔ اَلْمَنْكِبُ ۔ ہر چیز کا کنارہ نیز کندھا (کاندھا) ۔ مَنَاكِبُ الْاَرْضِ ۔ زمین کے اطراف و جوانب *۔ قرآن کریم میں ہے ۔ فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا (۶۷/۱۵) ۔ اس کے اطراف و جوانب میں چلو پھرو ۔ بعض نے اس کے معنی پہاڑوں کے بھی کئے ہیں ۔ کیونکہ اَلْاَنْكَبُ اُس شخص کو کہتے ہیں جس کا ایک کندھا دوسرے سے اونچا ہو**۔

ن ک ث

اَلنِّكْثُ ۔ پرانے کمبل یا دیگر اونی کپڑے وغیرہ جن کی بنائی کو کھول دیا جائے تاکہ انہیں دوبارہ بنا جاسکے ۔ نَكَثَ الْعَهْدَ ۔ عہد کو توڑ دیا ۔ نَكَثَ الْحَبْلَ ۔ رسی کو کھول دیا ۔ اَلنَّكِيْثَةُ ۔ وعدہ خلافی ۔ نیز رسی کے لڑ یا بٹ کو کہتے ہیں*** ۔ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو توڑنے کے ہیں (ابن فارس) ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۷/۱۳۵) ۔ وہ عہد توڑ دیتے ہیں ۔ اَنْكَاثًا (۱۶/۹۲) ۔ ادھیڑی ہوئی اون وغیرہ کے ٹکڑے ۔

ن ک ح

نِكَاحٌ کے معنی ملانے اور جمع کرنے کے ہیں**۔ لیکن اس طرح ملانا جس طرح نیند آنکھوں میں گھل مل جاتی ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں نَكَحَ النُّعَاسُ ۔ نیند اس کی آنکھوں میں گھل گئی ۔ یا جس طرح بارش کے قطرے

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔

زمین کے اندر جذب ہو جاتے ہیں ۔نَکَحَ الْمَطَرُ الْاَرْضَ ۔ بارش کا پانی زمین میں خوب جذب ہو گیا ۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب بارش کا پانی زمین کی بالائی خشک سطح سے نیچے گزر کر زمین کی نمی تک جا پہنچے** ۔

ان مثالوں کے بعد سمجھ میں آسکتا ہے کہ قرآن کریم نے مرد و عورت کی عائلی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں نِکَاحٌ سے مراد کیا ہے؟ اس سے مراد ہے میاں بیوی کا ایسا تعلق جیسا آنکھ اور نیند کا ہوتا ہے ۔ ایک دوسرے میں اس طرح جذب ہو جانا جس طرح آنکھوں میں نیند گھل جاتی ہے ۔ جس طرح بارش زمین میں جذب ہو جاتی ہے ۔ ایسا تعلق (اور وہ عمر بھر کے لئے) اسی صورت میں پیدا ہو سکتا (اور قائم رہ سکتا) ہے جب میاں بیوی میں فکر و نظر کی کامل آہنگی اور ذوق اور مزاج ، خیالات و تصورات اور نظریات و معتقدات کی یک جہتی ہو۔ یہ نکاح کی بنیادی شرط اور خصوصیت ہوگی ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب ''طاہرہ کے نام خطوط'') ۔

ظاہر ہے کہ ایسے تعلق کے لئے باہمی رضامندی اولین اور بنیادی شرط ہوگی ۔ چنانچہ قرآن کریم نے خود اس کی تصریح کر دی ہے کہ اس میں تراضیِ مابین ضروری ہے ۔ (۳/۳ و ۴/۱۹) ۔ اور رضامندی اسی وقت ہوسکتی ہے جب لڑکی اور لڑکا خود فیصلہ کرنے کے قابل (یعنی بالغ) ہو چکے ہوں ۔ چنانچہ قرآن کریم نے بلوغت کے لئے ترکیب ہی بَلَغُوْا النِّکَاحَ (۴/۶) کی استعمال کی ہے ۔ دوسری جگہ اس کی تشریح یہ کہکر کر دی ہے ۔ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّہٗ (۶/۱۵۲ و ۱۷/۳۴) اور اَشُدَّہٗ کے معنی دوسری جگہ یہ کہکر بیان کر دئے کہ وہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان کی عمر ہے (۲۲/۵) ۔ لہذا نہ نابالغ کے نکاح کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی لڑکے یا لڑکی کی طرف سے کسی دوسرے کی رضامندی ، خود ان کی رضامندی تصور کی جا سکتی ہے ۔

راغب نے کہا ہے کہ نِکَاحٌ کا لفظ عَقْدٌ کے لئے آتا ہے ۔ جماع کے لئے اس کا استعمال بطور استعارہ ہوتا ہے* ۔ قرآن کریم نے عُقْدَۃُ النِّکَاحِ (۲/۲۳۵) بھی کہا ہے ۔ یعنی نکاح کی گرہ ۔

سورۃ نور میں لَا یَجِدُوْنَ نِکَاحًا (۲۴/۳۳) آیا ہے ۔ جس کے معنے شادی کا انتظام ہیں ؛ یا نکاح کا سامان ۔ اس کے معنے رشتہ بھی ہوسکتے ہیں اور وہ اخراجات بھی جو ایک میاں بیوی کے لئے گھریلو زندگی میں ضروری ہوتے ہیں ۔ نیز بیوی کا مہر ۔ (باقی رہا نکاح کی تقریب پر خرچ اخراجات تو یہ محض

*محیط ۔ **تاج ۔

معاشرتی رسم ہے) ۔ قرآن کریم کی رو سے ، بالغ (صاحب عقل و ہوش) لڑکے اور لڑکی کا یہ معاہدہ کہ وہ ان تمام حقوق و فرائض کے ساتھ جو اس باب میں خدا نے عائد کئے ہیں ، ازدواجی زندگی بسر کرینگے ، نکاح کہلائیگا ۔ اس کے لئے قرآن کریم نے نہ کوئی تقریب مقرر کی ہے نہ رسم ۔ رسوم و تقاریب معاشرتی چیزیں ہیں ۔ البتہ بعد کی پیچیدگیوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس معاہدہ کی شہادت بھی ہو اور اسے کہیں منضبط (درج) بھی کر لیا جائے ۔

ن ک د

نَكِدَ عَيْشُهُ ۔ اس کی زندگی تنگ اور سخت ہو گئی ۔ نَكِدَتِ الْبِئْرُ ۔ کنویں کا پانی کم ہو گیا ۔ اَلنُّكْدُ ۔ وہ اونٹنیاں جن کے بچے زندہ نہ رہیں* ۔ یا جن کا دودھ بہ مشقت دوہا جاسکے** ۔ اس کے بنیادی معنوں میں کمی اور مشقت دونوں ہیں ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے کسی چیز کا اس کے طالب کے لئے بدقت نکلنا بتائے ہیں ۔ نیز نَاقَةٌ نَكْدَاءُ کے معنے وہ اونٹنی ہیں جس کے دودھ نہ ہو ۔ اَرْضُوْنَ نِكَادٌ ۔ بہت کم پیداوار والی زمینیں* ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَ الَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا (۷/۵۸) ۔ خراب زمین سے بہت تھوڑی پیداوار ہوتی ہے ۔ یعنی جس پر محنت زیادہ کرنی پڑے اور حاصل کم ہو** ۔

ن ک ر

اَلنُّكْرُ ۔ اَلنَّكْرُ ۔ بہت زیادہ چالاکی ۔ عقل کی فریب کاری ۔ رَجُلٌ نَكِرٌ ۔ بہت چالاک اور طرار آدمی ۔ اَلْمُنَاكَرَةُ ۔ ایک دوسرے کو فریب دینا* ۔ قرآن کریم میں ہے ۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ۔ (۲۹/۴۵) ۔ یقیناً صلٰوۃ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے ۔ اس کے عام معنی ہوں گے ہر وہ بات جو حد سے تجاوز کر جائے اور ناپسندیدہ حرکت ۔ لیکن فَحْشَاءُ کے معنی بخل بھی ہیں (دیکھئے عنوان ف ۔ ح ۔ ش) ۔ اور مُنْكَرٌ کے معنی ہیں عقل خود بین کی فریب کاریاں جن سے وہ انسان کو ہمیشہ یہ سکھاتی رہتی ہے کہ تجھے صرف اپنے مفاد کی حفاظت کرنی چاہئے ۔ دوسرے اپنی فکر آپ کریں ۔ ان معانی کی وضاحت (۷۰/۱۹-۲۲) سے ہو جاتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ انسان کو اگر تنہا (اس کی عقل اور مرضی پر) چھوڑ دیا جائے تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے

*تاج ۔ **راغب ۔

تو واویلا مچا دیتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو اپنا ہاتھ روک لیتا ہے ۔ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۷۰ / ۲۲-۲۵) ۔ ''لیکن مصلین کی یہ کیفیت نہیں ہوتی ۔ یعنی ان لوگوں کی جو نظام صلٰوۃ کے ہمیشہ پابند رہتے ہیں اور ان کے اموال میں ضرورت مندوں اور محروموں کا حق ہوتا ہے جس کا سب کو علم ہوتا ہے'' ۔

نَكُرَ الْاَمْرُ ۔ معاملہ دشوار ہو گیا ۔ اَلنَّكْرَاءُ ۔ مصیبت اور سختی ۔ نَكْرَاءُ الدَّهْرِ ۔ زمانہ کی سختی اور مصیبت* ۔ سورۃ کہف میں عَذَابًا نُّكْرًا آیا ہے (۱۸ / ۸۷) ۔ یعنی سخت عذاب جسے پہلے انہوں نے نہ دیکھا ہوگا ۔ اسی طرح سورۃ قمر میں شَيْءٍ نُّكُرٍ آیا ہے (۵۴ / ۶) ۔ سخت مصیبت انگیز بات ۔

نُكْرٌ ۔ ایسی بات جو خوش آیند نہ ہو ۔ جسے دل قبول نہ کرے ۔ جو طبیعت پر ناگوار گزرے (ابن فارس) ۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ لفظ فَرَحٌ (خوشی) کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۳ / ۳۶) ۔ سورۃ کہف میں ہے لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا (۱۸ / ۷۴) ۔ تو نے یہ بڑی ہی ناخوش آئند بات کی ہے ۔ اَنْكَرُ ۔ بہت زیادہ ناخوش آئند (۳۱ / ۱۹) ۔ اَلنَّكِيْرُ ۔ انکار* ۔ سورۃ شوریٰ میں ہے مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ (۴۲ / ۴۷) ۔ ''تم سے انکار نہیں ہوسکے گا'' ۔ نیز حق بات سے انکار کرنے کی سزا (یعنی تباہی اور بربادی) ۔ نَكِيْر کے معنے یہ بھی ہیں کہ جو کچھ برا لگے اسے بدل دیا جائے* ۔ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (۲۲ / ۴۴) ۔ سو میری سزا کیسی تھی؟ ان کی بد اعمالیوں پر میرا رد عمل کیسا ہوا؟

اَلنَّكِرَةُ ۔ کسی چیز کو نہ پہچاننا ۔ اَلْاِنْكَارُ ۔ در حقیقت عِرْفَانٌ کی ضد ہے ۔ یعنی نہ پہچاننا ۔ چنانچہ سورۃ یوسف میں ہے ۔ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (۱۲ / ۵۸) ۔ یوسف نے انہیں (بھائیوں کو) پہچان لیا لیکن وہ اسے نہیں پہچان رہے تھے ۔ سورۃ ہود میں ہے ۔ نَكِرَهُمْ (۱۱ / ۷۰) ۔ اس نے انہیں اجنبی سمجھا ۔ ان پر اظہار تعجب کیا ۔ اسی طرح سورۃ حجر میں قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ (۱۵ / ۶۲) کے بھی یہی معنی ہیں ۔ یعنی اجنبی لوگ ۔

تَنْكِيْرٌ ۔ کسی چیز کو اس طرح بدل دینا کہ وہ پہچانی نہ جاسکے** ۔ (۲۷ / ۴۱) ۔

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔ نیز ابن قتیبہ ۔ القرطین ج/۲ صفحہ ۵۸ ۔

قرآن کریم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اکثر مقامات میں آیا ہے۔ (مثلاً ۳/۱۰۴)۔ ان الفاظ (مَعْرُوْفٌ اور مُنْکَرٌ) کا صحیح مفہوم (ع۔ ر۔ ف) کے عنوان میں بتایا جاچکا ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ قرآنی معاشرہ اپنی زندگی کے معمولات کے لئے قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں آئین و قوانین اور قواعد و ضوابط مرتب کرتا ہے۔ جو باتیں اسطرح سے قابل قبول ٹھہرائی جاتی ہیں انہیں معروف کہا جاتا ہے۔ یعنی (Recognised by the Society) اور جن باتوں کو ناپسندیدہ یا ناقابل قبول قرار دیا جاتا ہے انہیں مُنْکَرٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی ان ہر دو جامع اصطلاحات (مَعْرُوْفٌ اور مُنْکَرٌ) کے تحت ایک اسلامی معاشرہ کے تمام محمود و نامحمود، معقول و نامعقول، مقبول و نامقبول، پسندیدہ اور غیرپسندیدہ امور آجاتے ہیں۔ اوراس تقسیم و تفریق کا معیار ہوتا ہے قرآن کریم کا غیر متبدل ضابطہ۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ مَعْرُوْفٌ وہ ہیں جنہیں انسان کی "فطرت" پہچان لے کہ وہ صحیح ہیں۔ اور مُنْکَرٌ وہ ہیں جن سے اس کی "فطرت" ابا (یا نفرت) کرے۔ تو یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو حق اور باطل کا امتیاز از خود کرسکے۔ اگر اس کے اندرکوئی ایسی چیز ہوتی (جیسے حیوانات میں جبلت ہوتی ہے) تو اس کےلئے وحی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ (دیکھئے عنوانات ف۔ ط۔ ر اور ل۔ ھ۔ م) مَعْرُوْفٌ وہ ہے جسے وحی قابل قبول قرار دے دے۔ اور مُنْکَرٌ وہ ہے جسے وہ ناپسندیدہ ٹھہرا دے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ان میں مملکت کے قوانین و آئین سے لے کر معاشرہ کے عام قواعد و ضوابط اور رسوم و رواج سب آجاتے ہیں۔ وحی نے (بجز چند احکام) ان باتوں کی فہرستیں مرتب کرکے نہیں دیں۔ اس نے عام اصول دے دئے ہیں جن کے ماتحت قرآنی معاشرہ اس قسم کی فہرستیں خود مرتب کرتا ہے۔

لہذا مَعْرُوْفٌ وہ جسے قرآنی معاشرہ (Recognise) کرے۔ اور مُنْکَرٌ وہ جسے وہ (Recognise) نہ کرے۔ چنانچہ وہ جو سورۃ ممتحنہ میں کہا گیا ہے کہ مَعْرُوْفٌ میں رسول کی معصیت (نافرمانی) نہیں کی جائیگی (۶۰/۱۲) تو اس کے معنے یہی ہیں کہ ہر اُس بات میں اطاعت کی جائیگی جسے قرآنی نظام قانونی حیثیت دے دے۔ اورقرآنی نظام صرف انہی باتوں کو قانونی حیثیت دے سکتا ہے جو قرآنی اصول و قوانین و احکام کے مطابق ہوں۔ جو بات قرآن کریم کے خلاف ہوگی وہ معروف نہیں بلکہ منکر ہوگی۔ یہی معروف و منکر کا اٹل معیار ہے۔

ن ک س

نَكَسَ يَنْكُسُ ۔ کسی چیز کو الٹ دینا ۔ اوندھا کر دینا ۔ اِنْتَكَسَ فُلَانٌ ۔ فلاں اپنے سر کے بل گر پڑا ۔ اَلْمُنْتَكِسُ ۔ وہ گھوڑا جو چلتے وقت کمزوری سے سر اور گردن جھکا کر چلے ۔ وہ گھوڑا جو دوڑ میں دوسرے گھوڑوں کے ساتھ چل نہ سکے ۔ اَلنِّكْسُ ۔ وہ جسکا سر جھکا ہوا ہو*۔

سورہ انبیاء میں ہے کہ حضرت ابراهیمؑ نے اپنی قوم کے سربرآوردہ افراد کو دلائل و براهین سے سمجھا دیا کہ بت پرستی کس طرح وجہ تذلیل انسانیت ہے ۔ اور وہ ان دلائل سے اپنے دل میں قائل بھی ہو گئے ۔ لیکن پھر ان کی مفاد پرستیاں اور عزت نفس ان کے سامنے آگئی اور وہ اپنی بات کی طرف لوٹ گئے۔ اسے قرآن کریم نے ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ (۲۱/۶۵) سے تعبیر کیا ہے ۔ یعنی وہ فکر و نظر کی ان بلندیوں تک پہنچ جانے کے بعد پھر اوندھے گر گئے ۔ پھر انہی پستیوں میں آگرے جہاں وہ پہلے تھے ۔

سورہ السجدہ میں مجرمین کے متعلق ہے نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ (۳۲/۱۲) ذلت سے اپنے سر جھکائے ہوئے ۔ سورہ یٰسٓ میں ہے ۔ وَمَنْ نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِی الْخَلْقِ (۳۶/۶۸) ۔ جو بڑھاپے کی عمر تک پہنچ جاتا ہے وہ (قویٰ وغیرہ کے لحاظ سے جوانی کی) بلندیوں سے پھر پستیوں کی طرف آجاتا ہے ۔ جن باتوں کا پہلے علم ہوتا ہے انہیں بھی بھول جاتا ہے (۱۶/۷۰ ؛ ۲۲/۵) ۔ یہ بڑھاپے کی وجہ سے قویٰ کے مضمحل ہو جانے کا عام بیان ہے ۔

ن ک ص

نَكَصَ عَنِ الْاَمْرِ ۔ کسی کام سے ہچکچانا ۔ اور پیچھے ہٹ جانا ۔ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۔ لوٹ گیا ۔ پلٹ گیا ۔ کہا گیا ہے کہ یہ لفظ خیر اور بھلائی سے پلٹ جانے کے لئے خاص ہے لیکن عام طور پر یہ لفظ لوٹ جانے کے معنوں میں آتا ہے**۔ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۔ (۸/۴۸) ۔ اُلٹے پاؤں پھر جانے کے معنوں میں آیا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں ڈر اور بزدلی کی وجہ سے پیچھے ہٹنے کا مفہوم ہے اور ابن درید کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کا استعمال بھلائی سے پلٹ جانے کے لئے ہوتا ہے ۔

ن ک ف

نَكَفَ کے بنیادی معنی کسی چیز کو الگ کر دینے ، کاٹ دینے اور ایکطرف کر دینے کے ہوتے ہیں***۔ ابن فارس نے بھی اسکی تائید کی ہے ۔

---

* تاج و راغب و محیط ۔ **تاج و محیط ۔ ***راغب ۔

نَكَفْتَ الدَّمْعَ - انگلی سے آنسوؤں کا رخسار پر سے الگ کر دینا (پونچھ دینا) * - اسی سے اِسْتَنْكَفَ کے معنی ہیں رک جانا - کسی کام سے عار آنا - اسے برا محسوس کرنا اور خود کو اس سے بالاتر سمجھنا ** - رَجُلٌ نِكْفٌ وہ آدمی جس سے نفرت کی جائے ** -

قرآن کریم میں ہے لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ أَنْ يَكُوْنَ عَبْدًا لِلّٰهِ (۴/۱۷۲) - مسیح (کہ جسے، تم اے نصاریٰ، خدا یا خدا کا بیٹا کہتے ہو) اسے اس سے قطعاً عار و انقباض نہیں کہ وہ خدا کا عبد ہو - لہذا یہ مدعی سست اور گواہ چست کا عجیب معاملہ ہے کہ وہ تو خدا کا عبد بننے میں فخر محسوس کرے اور تم اسے خدا بنا لو -

ن ک ل

اَلنِّكْلُ - مضبوط بھاری سخت بیڑی (جمع اَنْكَالٌ) - ایک سخت قسم کی لگام یا لگام کا لوہا - اس سے نَكَّلَهُ کے معنی ہیں کسی کو اس روش سے روک دینا جس پر وہ چل رہا ہو - نَكَلَ عَنْهُ - اس سے الٹے پاؤں لوٹ جانا - نَكَّلَ بِهٖ کے معنی ہیں اسے جرم کی عبرت انگیز سزا دی، کیونکہ سزا سے خود مجرم آیندہ کے لئے اس جرم کے ارتکاب سے رک جاتا ہے اور دوسرے بھی اسی سے عبرت پکڑتے ہیں *** -

قرآن کریم میں مخالفین قریش کے متعلق ہے - اِنَّ لَدَيْنَا اَنْكَالًا (۷۳/۱۲) - ہمارے پاس ان کے لئے سخت بیڑیاں ہیں - ظاہر ہے کہ یہ بیڑیاں وہ ہیں جو جنگ بدر و حنین وغیرہ میں انہیں پہنائی گئیں - یا وہ تمام تدبیریں جن سے یہ لوگ اس مخالفت سے روکے گئے[1] - سورہ النّٰزِعٰت میں ہے - فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (۷۹/۲۵) - خدا نے سزا دے کر فرعون کو ”آخرۃ و اولیٰ“ کے لئے عبرت بنا دیا - (یہاں اخذ کے وہی معنی ہونگے جو اتَّخَذَ کے ہیں) -

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے نَكَالٌ میں ہر وہ تدبیر شامل ہوگی جس سے کسی کو اسکی غلط روش سے روک دیا جائے اور عبرتناک سزا دی جائے - چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے کہ یہودیوں میں سے جن لوگوں نے احکام سبت کی خلاف ورزی کی تھی انہیں ایسی ذلت آمیز سزا دی گئی کہ وہ دوسروں کے لئے نَكَالًا بن گئی (۲/۶۶) - یعنی موجب عبرت - اسی طرح چوری (سرقہ) کی سزا کے متعلق ہے نَكَالًا مِنَ اللّٰهِ (۵/۳۸) - یہ خدا کی تجویز کردہ ایسی سزا ہے جس سے وہ مجرم آئندہ ارتکاب جرم سے رک جائے - یہ اس قسم کے جرائم کے لئے روک کا کام دیگی - یعنی مقصد اس جرم کی روک تھام، انسداد ہے،

---

*راغب - **تاج - ***تاج و ابن فارس -

[1] (مسلسل پڑھیئے) یہ بیڑیاں ہر اس دشمن کو پہنائی جائینگی جو حق کی مخالفت کریگا - آخرت میں یہ بیڑیاں اس کے ارتقاء کے راستے میں حائل ہونگی - اسی کو جہنم کہا جاتا ہے -

جس طریق سے بھی یہ مقصود حاصل ہو جائے ۔ ارتکاب جرم کے بعد عبرتناک سزا بھی انسداد جرم کا ایک طریق ہوتا ہے ۔ اور مناسب حالات میں (احساس ندامت رکھنے والے) مجرم کو معاف کرکے اسکی اصلاح کر دینا بھی ایک طریقہ ۔ (۳۸-۳۹/۵) میں یہ دونوں باتیں آگئی ہیں ۔

ن م ر ق

اَلنُّمْرُقُ ۔ اَلنُّمْرُقَۃُ ۔ گدّہ ۔ تکیہ ۔ وہ نمدہ وغیرہ جسے سوار کجاوہ کے نیچے اونٹنی کے پشت پر بچھاتا ہے*۔ قرآن کریم میں نَمَارِقُ مَصْفُوْفَۃٌ (۸۸/۱۵) آیا ہے یعنی صف میں بچھے ہوئے گدّے یا تکیے ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ میں قاف زیادہ ہے ۔ اسکی اصل نَمِرَۃٌ ہے جس کے معنی دھاری دار کمبل کے ہیں ۔ (غالباً وہ گدہ اس قسم کے کمبلوں کا بنتا ہوگا) ۔

ن م ل

اَلنَّمْلُ ۔ نَمْلَۃٌ کی جمع ہے ۔ چیونٹیاں** ۔ قرآن کریم میں حضرت سلیمان کے قصہ میں ہے حَتّٰی اِذَا اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَۃٌ یٰاَیُّھَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰکِنَکُمْ (۲۷/۱۸) ۔ صاحب تاج کے نزدیک وادی النمل ، جبرین اور عسقلان کے درمیان ہے* ۔ بعض کا قول ہے کہ وہ ارض شام میں ہے ۔ لیکن اگر یہ وادی اُس راہ گزر پر واقع تھی جو ملکہ سبا کے ملک کی طرف جاتی تھی تو اس کا محل وقوع یمن کے نواح میں ہوگا ۔ بہرحال وادی نمل چیونٹیوں کی جگہ نہیں ، بلکہ ایک قبیلہ کے مسکن کا نام ہے ۔ اور اَلنَّمْلُ اُس قبیلہ کا نام ۔ نَمْلَۃٌ ۔ اس قبیلہ کی ایک عورت ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں عام طور پر عورتیں قبائل کی رئیس ہوتی تھیں ۔ جیسا کہ ملکہ سبا کے واقعہ سے ظاہر ہے ۔ یعنی ان قبائل کا تمدن (Matriarchal) تھا ۔

اَنَامِلُ (اَنْمُلَۃٌ کی جمع ہے) ۔ انگلیوں کے بالائی سرے ۔ (۳/۱۱۸) ۔

ن م م

اَلنَّمُّ ۔ بھڑکانا اور برانگیختہ کرنا ۔ فساد پیدا کرنے کے لئے بات کو پھیلانا ۔ بات میں جھوٹ ملا کر اسے مزین بنانا ۔ اَلنَّمِیْمَۃُ ۔ چغلی ۔ آہستہ بات کی آواز ۔ لکھنے کی آواز یا ترکش کی آواز کو بھی کہتے ہیں ۔ اَلنَّامَّۃُ ۔

*تاج ۔ **تاج و قاموس ۔ دیکھئے مادہ ''و د ی''

حس و حرکت ۔ حیات نفس*۔ اَلنَّمَّامُ ۔ جو شخص اپنے پیٹ میں بات نہ رکھ سکے**۔ ادھر ادھر باتیں کرتا رہے ۔ چغلخور۔

قرآن کریم میں ہے ۔ مَشَّاءٍ بِنَمِيْمٍ (۶۸/۱۱) ۔ چغل خور ۔ ادھر کی باتیں اُدھر بہت زیادہ پہنچانے والا ۔ (یہاں نَمِيْمٌ بمعنی نَمِيْمَةٌ ہے)۔ لوگوں میں فساد پیدا کرنے کے لئے بہت زیادہ جھوٹی باتیں، اور باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش، کرنے والا ۔

ن و ء

نَاءَ ۔ يَنُوْءُ ۔ نَوْءًا ۔ دشواری اور مشقت سے اٹھنا ۔ نَاءَ بِالْحِمْلِ ۔ وہ بوجھ کو لیکر گراں باری سے اٹھا ۔ نَاءَ بِهِ الْحِمْلُ ۔ بوجھ نے اسے گرانبار کر دیا اور جھکا دیا***۔ قرآن کریم میں قارون کے خزانے کے متعلق ہے ۔ لَتَنُوْءُ بِالْعُصْبَةِ (۲۸/۷۶) ۔ انہیں ایک مضبوط طاقتور جماعت بھی بمشکل اٹھا سکتی تھی ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ نَاءَ کے معنی ہیں وہ بوجھل چیز کو لیکر اٹھا ۔

ن و ب

اَلنَّوْبُ ۔ کسی چیز کا بار بار لوٹنا ۔ شہد کی مکھیوں کو اسی لئے نَوْبٌ کہتے ہیں کہ وہ بار بار اپنے چھتے کی طرف آتی ہیں ۔ حادثہ یا واقعہ کو نَائِبَةٌ ۔ (جمع نَوَائِبُ) کہتے ہیں کہ یہ چیز انسانی زندگی میں بار بار پیش آتی رہتی ہے ۔ نَوْبَةٌ ۔ نیز (نَوْبَةٌ) باری کو کہتے ہیں ۔ (دراصل پانی پلانے کی باری کو کہتے ہیں)۔ اَلْمُنْتَابُ ۔ پانی کی طرف جانے کا راستہ کیونکہ لوگ اس پر باری باری سے گذرتے ہیں ۔ اَلنِّيَابَةُ ۔ قائم مقامی کرنا ۔ باری ۔ اَنَابَ زَيْدٌ عَنْهُ وَكِيْلًا ۔ زید نے اپنی جگہ وکیل کو قائم مقام کر دیا****۔

اِنَابَتْ اِلَى اللهِ ۔ قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح ہے ۔ اَنِيْبُوْا اِلٰى رَبِّكُمْ (۳۹/۵۴) ۔ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ (۳۰/۳۱) ۔ وغیرہ ۔ اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے شہد کی مکھی (نَوْبٌ) کی مثال سامنے لائیے ۔ وہ فضا کی پہنائیوں میں سینکڑوں میل ادھر اُدھر نکل جاتی ہے ۔ مختلف وادیوں میں پھرتی اور مختلف باغات میں گھومتی ہے ۔ لیکن اپنی محنت کے ماحصل کو لیکر ہر بار اپنے چھتہ (مرکز) کے طرف لوٹتی ہے ۔ وہ کہیں ہو اسکا چھتہ

*تاج و راغب ۔ **ابن فارس ۔ ***تاج و محیط ۔ ****تاج و راغب و محیط ۔

اسکی نگاہوں کا مرکز اور اس کی گردش کا محور ہوتا ہے۔ وہ اسکی نظروں سے ایک ثانیہ کے لئے بھی اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ اسکی تمام توجہات کا قبلہ ہوتا ہے۔ یہی کیفیت، سفر زندگی میں ایک مرد مومن کی ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے کسی شعبے اور دنیا کے کسی گوشے میں ہو، اسکی توجہات کا مرکز اور گردشوں کا محور خدا کا قانون (اور اسے نافذ کرنے والا نظام) ہوتا ہے۔ وہ ہر فیصلہ کے لئے اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنی متاعِ حیات اور حاصل تگ و تاز کو لیکر اس کی طرف لوٹتا ہے۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (۲/۱۵۲)۔ "اور جہاں کہیں تم ہو اپنی توجہات کو اسی طرف مرکوز رکھو"۔ مومن کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

پرد در وسعت گردوں یگانہ نگاہ او بشاخ آشیانہ

بعینہ یہی کیفیت شہد کی مکھی کی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (۱۶/۶۹)۔ "تو تمام پھلوں (پھولوں) کا رس چوس، اور اپنے رب کے راستے پر فرمانبرداری سے چلی جا"۔ ایک مومن دنیا بھر کے علوم و فنون کا اکتساب کرتا ہے لیکن ان کے ماحصل کا مرکز قرآن کریم کو بناتا ہے۔ قرآنی نظام اسے پھر تمام نوع انسانی کی منفعت کے لئے استعمال میں لاتا ہے۔

یہ ہے اِنَابَت اِلَی اللہ کا صحیح مفہوم۔ زندگی کے ہر دوراہے پر فیصلہ کے لئے اسی کی طرف رجوع کرنا۔ وہیں سے راہ نمائی لینا۔ اور اپنی محنتوں کے ماحصل کو لیکر اسی کی طرف لوٹنا۔

صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ توبہ، لغزش کے بعد ندامت کے لئے آتا ہے اور انابت، مستقبل میں لغزشوں سے محفوظ رہنے کے لئے۔ یعنی توبہ میں انسان، غلط قدم اٹھ جانے کے بعد، واپس آکر صحیح راستے پر گامزن ہوتا ہے اور انابت میں قدم اٹھانے سے پہلے ہی سوچ لیتا ہے کہ صحیح راستہ کونسا ہے اور پھر اسی راستے پر چلتا ہے۔ یہ حفظ ما تقدم (Preventive) ہے، وہ تدبیر بعد مرض (Curative)۔

ن و ح

نَاحَ۔ وہ چیخ چیخ کر رویا۔ نَوْحٌ۔ وہ عورتیں جو نوحہ کرنے کے لئے جمع ہوں۔ نیز نوحہ کرنا۔ اَلنِّيَاحَةُ۔ نوحہ کرنا۔ اَلتَّنَاوُحُ۔ ایک

دوسرے کے آمنے سامنے ہونا (جسطرح عورتیں نوحہ کرتے وقت ہوتی ہیں)* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں (یعنی ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونا) ۔

نُوْحٌ ۔ حضرت نوح ؑ (۵۹/۷) ۔ یہ غیر عربی لفظ ہے ۔ اگرچہ بعض نے کہا ہے کہ یہ ان کا لقب ہے کیونکہ وہ بہت روتے اور گڑگڑاتے رہتے تھے* ۔ لیکن زیادہ صحیح یہی نظر آتا ہے کہ یہ غیر عربی لفظ ہے ۔

قرآن کریم نے سلسلۂ نبوت کا آغاز بالعموم حضرت نوح ؑ کے تذکرہ سے کیا ہے ۔ مثلاً سورہ نساء میں ہے اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ كَمَا اَوْحَيْنَا اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ . . . . (۱۶۳/۴) ۔ ’’ بیشک ہم نے تیری طرف وحی کی ہے جسطرح نوح کیطرف اور اس کے بعد دیگر انبیاء کیطرف وحی کی تھی ‘‘ . . . . . ۔ (البتہ قرآن کریم میں ایک مقام پر حضرت نوح ؑ کے ساتھ آدم کا بھی نام آیا ہے ۔ اس کے لئے دیکھئے عنوان (ا ۔ د ۔ م) ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوع انسانی میں سلسلۂ رشد و ہدایت کی ابتداء قوم نوح سے ہوئی ۔

انسانی آبادی کی ابتدا کس خطۂ زمین اور کونسی نسل سے ہوئی ، یہ مسئلہ ایک مدت سے ارباب علم و تحقیق کے پیش نظر ہے ۔ لیکن اب فیصلہ کا رخ اس طرف ہے کہ اسکی ابتدا عرب کے علاقہ سے ہوئی جہاں کی سامی نسل انسان کی تمدنی زندگی کی مؤسس تھی ۔ اسی قوم میں دجلہ اور فرات کی وادیوں میں ، آج سے قریب چھ سات ہزار سال قبل ، حضرت نوح ؑ مبعوث ہوئے ۔ یہ تحقیق صرف تاریخی ہے ۔ قرآن کریم (ان معاملات میں) نہ زمان سے بحث کرتا ہے نہ مکان سے ۔ وہ قوموں کی زندگی اور موت کے اصولوں کے متعلق گفتگو کرتا ہے ۔ تاریخی جزئیات سے بحث نہیں کرتا ۔

حضرت نوح ؑ اپنی قوم کے ایک فرد تھے ۔ اسی لئے قرآن کریم انہیں ان کے مخاطبین کا بھائی کہکر پکارتا ہے ۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ . . . . (۱۰۶/۲٦) ۔ ’’ جب ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا ‘‘ ۔

اگرچہ قرآن کریم نے سلسلۂ نبوت کا آغاز حضرت نوح ؑ کے تذکرہ سے کیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے پہلے بھی اس قوم میں خدا کے رسول آچکے تھے ۔ قرآن کریم میں ہے وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ . . . . (۳۷/۲۵) ۔ ’’ قوم نوح نے جب رسولوں کی تکذیب کی تو ہم نے انہیں غرق کردیا ‘‘ ۔

*تاج و راغب ۔

ایسا نظر آتا ہے کہ اس زمانے میں ذہن انسانی ہنوز اپنے عالمِ طفولیت میں تھا اور وہ لوگ تمدنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی ضروریات بھی اپنی عقل سے پوری نہیں کر سکتے تھے ۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کو وحی کے ذریعے بتایا گیا کہ وہ کشتی کسطرح بنائیں ۔ ۔ ۔ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا ۔ ۔ ۔ ۔ (۱۱/۳۷) ”ہم نے نوح کی طرف وحی کی کہ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہماری زیر نگرانی ہماری وحی کے مطابق کشتی بنائے“ ۔

حضرت نوحؑ کا پیغام وہی تھا جو تعلیم ربّانی کا اصل الاصول ہے ۔ یعنی يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ ۔ ۔ (۷/۵۹) ۔ ”اے میری قوم ۔ تم خدا کی محکومیت اختیار کرو ۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی الٰہ نہیں“ ۔ قوم مختلف بتوں کی پرستش کرتی تھی (۷۱/۲۳) ۔ اگر دعوت حضرت نوحؑ کا مقصد صرف اتنا ہوتا کہ وہ لوگ بتوں کی پرستش چھوڑ کر ”خدا کی پرستش“ میں لگ جائیں تو (ظاہر ہے کہ) اس کی مخالفت ساری قوم کی طرف سے ہونی چاہئے تھی ۔ لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ قوم کے نچلے طبقہ نے اس دعوت پر لبیک کہا (۲۶/۱۱۱) اور ارباب دولت و حشمت (سرداران قوم) کی طرف سے اسکی مخالفت ہوئی (۱۱/۲۷) ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ دعوت ایسی تھی جس میں مترفین (آسودہ حال سرمایہ داروں) کا طبقہ اپنی ہلاکت دیکھتا تھا اور غریبوں کا طبقہ اپنے لئے زندگی کے آثار پاتا تھا ۔ یہ وہ طبقہ تھا جو اعلیٰ طبقہ کے نزدیک قابل نفرت شمار ہوتا تھا کیونکہ وہ انہیں اراذل (کمینے) کہتے تھے (۲۶/۱۱۱ ; ۱۱/۲۷) ۔

مترفین کے طبقہ نے اس دعوت کی سخت مخالفت کی ۔ حضرت نوحؑ کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں (۵۴/۹) ۔ اور یہ مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ حضرت نوحؑ نے محسوس کیا کہ وہ مغلوب ہوجائینگے (۵۴/۱۰) ۔ اس کے بعد طوفان آیا (۵۴/۱۱-۱۲) ۔ مخالفین غرق ہوگئے اور حضرت نوحؑ اور ان کے متبعین کشتی میں سوار ہوکر صحیح و سلامت خشکی پر اتر گئے ۔

اسی سلسلہ میں قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ ”غیر“ جو حضرت نوحؑ کی دعوت پر ایمان لائے تھے ان کا شمار ”اپنوں“ میں ہوگیا تھا اور خود حضرت نوحؑ کا بیٹا اور آپ کی بیوی (جو آپ پر ایمان نہیں لائے تھے) ان کے متعلق کہ دیا کہ وہ آپ کے اہل میں سے نہیں (۶۶/۱۰ ; ۱۱/۴۶) ۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی نے پہلے دن سے اس حقیقت کا اعلان کر دیا تھا کہ ملت کی تشکیل آئیڈیالوجی کے اشتراک سے ہوتی ہے ۔ وطن اور خون کے رشتوں سے نہیں ہوتی ۔

حضرت نوحؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا (۲۹/۱۴) ”وہ ان میں پچاس کم ایک ہزار برس رہا“۔ اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی عمر ساڑھے نوسو سال کی تھی۔ لیکن قدیم زمانے کی تاریخ میں ”بادشاہوں کی عمر“ سے مراد ہوتا تھا وہ زمانہ جس میں حکومت ان کے خاندان میں رہتی۔ اس اعتبار سے ساڑھے نوسو برس کا زمانہ وہ مدت ہے جس میں شریعت حضرت نوحؑ کا دور دورہ رہا۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ سَنَةٌ کے معنی سال کی چار فصلوں میں سے ایک فصل (چوتھائی سال) کے بھی ہیں لہذا ”أَلْفَ سَنَةٍ“ کے معنی ہوئے اڑھائی سو برس۔ اس میں سے پچاس سال نکال دینے سے باقی عمر دو سو سال رہ جاتی ہے جو مستبعد نہیں۔ [مزید تفصیل (س۔ ن۔ و) اور (ع۔ و۔ م) کے عنوانات میں دیکھئے]۔

ن و ر

اَلنُّوْرُ۔ روشنی، جس قسم کی بھی ہو۔ یا روشنی کی شعاع۔ زمخشری نے کہا ہے کہ ضِیَاءٌ میں نُوْرٌ سے زیادہ زور اور شدت ہوتی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ضِیَاءٌ ذاتی روشنی کو کہتے ہیں اور نُوْرٌ اس روشنی کو جو ذاتی نہ ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں سورج کے لئے ضِیَاءٌ اور چاند کے لئے نُوْرٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے*۔ (نیز دیکھئے عنوان ض۔ و۔ أ)۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا (۱۰/۵)۔ ”اللہ نے سورج کو درخشندہ اور چاند کو نورانی بنایا“۔ واضح رہے کہ ضیاء اور نور کا یہ فرق وہاں ہی ہوگا جہاں ان الفاظ کو ایک دوسرے کے مقابل لایا جائے گا۔ ورنہ نور کے معنے روشنی ہونگے۔ نُوْرٌ اسے کہتے ہیں جو خود واضح اورظاہر ہو اوردوسری چیزوں کوروشن اور واضح کردے*۔اللہ نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کو نُوْرٌ کہا ہے سورۃ مائدہ میں ہے قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ (۵/۱۵)۔ ”یقیناً تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی یعنی واضح کتاب آگئی“۔ روشنی کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی دلیل آپ ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو دکھانے کے لئے کسی اور روشنی کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس لئے قرآن کریم اپنی دلیل آپ ہے اور اس قدر روشن اور واضح ہے کہ اسے اپنی وضاحت کے لئے کسی خارجی روشنی کی ضرورت نہیں۔ روشنی کا

*تاج۔

دوسرا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر شے کے اصلی مقام کو متعین کر دیتی ہے اور اس کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک واضح کر دیتی ہے ۔ اس لئے قرآن کریم، انسانی زندگی میں ہر شے کے متعلق بتا دیتا ہے کہ اس کا صحیح مقام کیا ہے اور قیمت کیا ۔ اسی کا نام ہدایت یا راہنمائی ہے ۔ یعنی غلط اور صحیح میں امتیاز کر دینا ۔ لہذا جہاں اللہ نے قرآن کریم کو نور کہا ہے تو اس کے ساتھ ہی بتا دیا کہ اس نور (روشنی) سے مقصود کیا ہے ۔ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۵/۱٦)۔ "اللہ اس روشنی کے ذریعے ، ہر اس شخص کو جو اس کے قانون سے ہم آہنگ ہوتا ہے سلامتی اور تکمیلِ ذات کے راستوں کی طرف راہنمائی کردیتا ہے اور اس طرح انہیں (ہر قسم کی) تاریکیوں سے نکال کر (زندگی کی) روشنی کی طرف لے آتا ہے"** ۔ یعنی انہیں زندگی کی متوازن شاہراہ کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے ۔ یہ لوگ اسی مشعل ہدایت کو لے کردنیا میں چلتے پھرتے ہیں ۔ جَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ (٦/۱۲۳) ۔

مَنَارَةٌ اور مَنَارٌ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سے روشنی نکلے (اس کے بعد مجازاً اذان دینے کی جگہ کو بھی مَنَارَةٌ ۔ کہنے لگے)* ۔ مَنَارٌ ۔ ان حدود کو بھی کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لئے قائم کی جائیں* ۔ مُنِيرٌ ۔ خوش رنگ اور روشن چیز یا آدمی کو کہتے ہیں*۔ نیز روشن کرنے والا ۔

اَلنَّارُ ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ نَارٌ اور نُوْرٌ دونوں لفظ ایک ہی اصل سے ہیں ۔ (۲/۳) ۔ نَارٌ کے معنے ہیں شعلے کی لپٹ جو نظر آجائے* ۔ نیز اَلنَّارُ کے معنی علامت اور نشانی کے بھی آتے ہیں، اس لئے کہ عرب اپنے اونٹوں کو گرم لوہے سے داغ دے کر نشان لگایا کرتے تھے* ۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ نَارٌ اور نُوْرٌ کے الفاظ بعض اوقات ایک ہی معنی میں استعمال ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے لئے اسکی دلیل کچھ وزنی نہیں۔ نُوْرٌ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ نَارٌ میں نفرت اور وحشت کا پہلو پایا جاتا ہے ۔ اسی لئے نَارَتِ الْمَرْأَةُ تَنْوُرُ کے معنی ہیں عورت کا متنفر اور متوحش ہونا ۔ ہرن نیز ، وحشی (غیر مانوس) جانوروں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے ۔ بَقَرَةٌ نَوَارٌ ۔ اُس گائے کو کہتے ہیں جو نر سے متنفر ہو۔ حتیٰ کہ مُنَاوَرَةٌ کے معنی آپس میں گالی گلوچ کے ہیں ۔ نیز نَائِرَةٌ کے معنی

---

*تاج ۔ **موت کی تاریکی اور زندگی کی روشنی کے لئے دیکھئے (٦/۱۲۳)۔

عداوت ، بغض اور فتنہ کے ہیں کیونکہ عداوت اور بغض بھی ایک اندرونی آگ ہے ۔ نَائِرَۃٌ اَلحَرْبِ ۔ سے مراد جنگ کا شر اور ہیجان ہے* ۔ نَارُ الحَرْبِ ۔ اُس آگ کو کہتے تھے جسے عرب پہاڑ کی چوٹی پر جلاتے تھے اور جس سے مراد اعلانِ جنگ ہوتا تھا** ۔ نَارَ الْقَوْمُ کے معنے ہیں قوم نے شکست کھالی** ۔

اس سے عَذَابُ النَّارِ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنی انسانی اعمال کے وہ تباہ کن نتائج جن سے متاعِ حیات جل کر راکھ کا ڈھیر ہوجائے۔ (بمقابلہ جنت کے جس کے نیچے پانی کی نہریں ہیں ۔ پانی اور آگ کا تقابل مفہوم کو واضح کردیتا ہے ۔ دیکھئے عنوان ن ۔ ھ ۔ ر)۔ اس میں اس دنیا کی زندگی کی تباہی و بربادی بھی شامل ہے اور اس کے بعد کی زندگی کی ہلاکت سامانی بھی۔ اَصْحٰبُ النَّارِ وہ ہیں جو خوف و حزن کے عذاب میں مبتلا ہوں ($\frac{۳۸-۳۹}{۲}$)۔ یہ آگ دلوں کو محیط ہوتی ہے ۔ نَارُ اللهِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ ($\frac{۶-۷}{۱۰۴}$) ۔ ''قانون خداوندی کی بھڑکائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں'' ۔ (مزید تفصیل جَهَنَّمُ اور ج-ح-م کے عنوانات میں ملیگی) ۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ ابلیس کی تخلیق نَارٌ سے ہوئی ہے ($\frac{۳۸}{۷۶}$)۔ اس لئے جہاں نَارٌ سے بچنے کی تاکید ہے تو اس کے معنی ابلیسی روش سے بچنا ہے ۔ ابلیس تخریبی قوت کا مظہر ہے ۔ اسی لئے عَذَابُ النَّارِ تخریبی اعمال کے تباہ کن نتائج کا نام ہے جس سے انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کا نقشہ بھی بگڑ جاتا ہے اور خود اس کی اپنی ذات کی صلاحیتیں بھی جھلس جاتی ہیں ۔ اِس طرح اس کی دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہو جاتی ہیں ۔

سورۃ حجر میں ہے ۔ وَ الْجَانَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ($\frac{۲۷}{۱۵}$) ۔ جَانٌّ سے مراد وہ تمام چیزیں یا قوتیں ہیں جو انسان کی نگاہ سے پوشیدہ (Invisible) ہیں ۔ اس آیت میں نَارِ سَمُوْمٍ (سخت تیز آگ) سے مراد وہ حرارت ہوسکتی ہے جو مادہ کی اُس حالت میں ہوتی ہے جب اس نے ہنوز کوئی متشکل صورت اختیار نہ کی ہو ۔ ایٹم وغیرہ کی حرارتیں اسی قبیل سے ہیں ۔ نیز جان سے مراد وہ مخلوق بھی ہوسکتی ہے جو انسان سے پہلے اس دنیا میں آباد تھی اور جو اب نابود (Extinct) ہوچکی ہے ۔ انسان اس مخلوق کا جانشین ہے (دیکھئے عنوان خ ۔ ل ۔ ف) ۔ چونکہ اس زمانے میں زمین کی

*تاج ۔ **محیط ۔ ***روح المعانی ۔

سطح نسبتاً زیادہ گرم تھی اس لئے اُس مخلوق میں حرارت برداشت کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوگی ۔ ہوسکتا ہے کہ اس اعتبار سے بھی یہ کہا گیا ہو کہ اسکی تخلیق نار سے تھی ، جس طرح انسان کی تخلیق کے متعلق کہا کہ اس کی ابتدا مٹی سے کی گئی ہے ۔

(ابلیس اور جان وغیرہ کے مفہوم کے لئے متعلقہ عنوانات ب ۔ ل ۔ س اور ج ۔ ن ۔ ن دیکھئے) ۔ سورۃ نور میں ہے اللہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ . . . . . (۲۴/۳۵)۔ اس سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اللہ نے اس مثال سے اپنی ذات کو سمجھایا ہے ۔ لیکن یہ صحیح نہیں ۔ ذاتِ خداوندی کے متعلق انسانی ذہن کچھ تصور نہیں کرسکتا ۔ یہاں خدا نے مَثَلُ نُوْرِہٖ کہا ہے ۔ یعنی اس کے نور کی مثال ایسی ہے (جیسی آگے بیان کی گئی ہے) ۔ نورِ خداوندی بڑا جامع لفظ ہے اور قرآن کریم میں مختلف مقامات پر اسکا استعمال آیا ہے۔ اسکی جامعیت کے اعتبار سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ کائنات میں جہاں کہیں بھی "روشنی" ہے اس کا سرچشمہ خدا ہے ۔ عقل کی روشنی ۔ علم کی روشنی ۔ وحی کی روشنی وغیرہ ۔ یہ سب خدا کی عطا کردہ ہیں ۔ اس "روشنی" میں خدا کی کتاب (قرآن کریم) بھی شامل ہے ۔ اس مثال میں قرآن ہی کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے ۔ خود مثال کے مختلف حصے اور تشبیہات اس کی تائید کرتی ہیں ۔

ن و ش

اَلنَّوْشُ ۔ کسی چیز کو لے لینا ۔ تَنَاوَشَہٗ ۔ اس نے اسے لے لیا ۔ اَلنَّوْشُ ۔ طلب کرنا ۔ اَلنَّوُوْشُ ۔ قوی آدمی جسکی گرفت سخت ہو ۔ نَاشَ بِہٖ یَنُوْشُ ۔ وہ اس سے چمٹ گیا اور لٹک گیا *۔ نَاشَ فُلَانًا ۔ اس نے فلاں کو پکڑا تا کہ اس کی ڈاڑھی اور سر کو کھینچے **۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَاَنّٰی لَھُمُ التَّنَاوُشُ (۳۴/۵۲) ۔ اب وہ ایمان کو کیسے پا سکتے ہیں ۔ اب وہ ان کی دسترس سے بہت دور نکل گیا "۔

ن و ص

اَلنَّوْصُ ۔ پیچھے ہٹنا ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے آمد و رفت بتائے ہیں ۔ اَلنَّوْصُ ۔ بھاگنا ۔ نَاصَ یَنُوْصُ نَوْصًا ۔ متحرک ہونا اور کہیں چلے جانا ۔ بھاگ کر چھٹکارا حاصل کرلینا ۔ نَاصَ عَنْہُ ۔ وہ اسکے پاس سے پلٹ گیا ، کترا کر نکلا اور بھاگ گیا ۔ ایک طرف ہو گیا۔ نَاصَ اِلٰی کَذَا ۔ اسنے اسکی طرف پناہ لی***۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج و راغب ۔

قرآن کریم میں ہے وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ۔ (۳۸/۳) پیچھے ہٹنے اور بھاگ کر کہیں پناہ لینے کا وقت نہیں رہا تھا** ۔ مَنَاصٌ کے معنیٰ بھاگنے کی جگہ بھی ہیں اور خود بھاگنا بھی ۔

ن و ق

اَلنَّاقَةُ ۔ اونٹنی ، جب وہ جوان ہو جائے (تقریباً چوتھے برس میں) ۔

اَلتَّنِيْقَةُ ۔ کھانے اور لباس کو بہت زیادہ عمدہ ، خوشگوار اور پسندیدہ بنانا ۔ نفاست ۔ پختگی ۔ عمدگی ۔ مہارت ۔ باریک بینی ۔ تَنَوَّقَ فِى الْاَمْرِ کے معنے ہیں کسی کام میں انتہا کرنا ، نہایت باریک بینی سے کام لینا ۔ تاج نے ابن فارس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ نَاقَةٌ ہی سے بنایا گیا ہے کیونکہ عربوں کے ہاں اونٹنی نہایت پسندیدہ اور عمدہ شے مانی جاتی تھی ۔ جسطرح جَمَلٌ (اونٹ) سے جَمَالٌ (حسن اور خوبصورتی) اور اَجْمَلُ سب سے زیادہ حسین اور خوبصورت ہے ، اسی طرح نَاقَةٌ سے تَنَوَّقَ اور اَلْمُنَوَّقُ ہے جس کے معنے ہیں صاف کیا ہوا کھجور کا خوشہ* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی بلند اور اونچا ہونے کے ہیں ۔ ممکن ہے اونٹنی کو اَلنَّاقَةُ اسکی بلندی کی وجہ سے کہتے ہوں ۔

قومِ ثمود کے ہاں پانی کی قلت تھی (دیکھئے ث ۔ م ۔ د) ۔ جتنا کچھ پانی جمع ہوتا ، قوم کے بڑے بڑے لوگ اسے اپنے مویشیوں کے لئے مخصوص کر لیتے اور غریبوں کے جانور پیاسے مرجاتے ۔ حضرت صالح ؑ نے ان لوگوں سے کہا کہ جو چارہ اور پانی خدا نے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے بلا قیمت دیا ہے ، اسے کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص کر لینا ظلم ہے ۔ تم اس روش سے باز آجاؤ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے ۔ چنانچہ بہت سی حیل حجت کے بعد وہ لوگ اس پر آمادہ ہو گئے کہ پانی میں سب کی باری مقرر کر دی جائے ۔ اس کے لئے حضرت صالح ؑ نے کہا کہ بہت اچھا ۔ یہ ایک اونٹنی ہے ۔ میں اسے چھوڑتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ تم اسے اسکی باری پر پانی پینے دیتے ہو یا نہیں ۔ اگر تم نے اسے پانی پینے دیا تو سمجھ لیا جائیگا کہ تم اپنے عہد پر قائم ہو اور اگر تم نے اسے روک دیا تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے یہ عہد محض زبان سے کر لیا ہے ، دل سے اسے نہیں مانتے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ، اور انہوں نے اس اونٹنی کو بے دردی سے قتل کر دیا ۔

اسے قرآن کریم میں نَاقَةُ اللّٰهِ (۷/۷۳) کہا گیا ہے ۔ خدا کی مخلوق میں سے وہ اونٹنی جو اس بات کی علامت تھی (لَكُمْ اٰيَةً) کہ وہ لوگ اپنے اس

---

*تاج و محیط ۔ **ابن فارس ۔

معاهدہ پر جو انہوں نے خدا سے کیا تھا کار بند رہتے ہیں یا نہیں ۔ جسطرح کعبہ کو خدا نے بَیْتِیْ (میرا گھر) کہا ہے اسی طرح اس اونٹنی کو نَاقَۃُ اللہ کہکر پکارا گیا ہے ۔

ن و ل (ن ی ل)

اَلنَّیْلُ ۔ اَلنَّائِلُ ۔ عطیہ جو کچھ انسان کو مل جائے یا پہنچ جائے ۔ نَالَ اس نے پا لیا ۔ نَالَ مِنْ عَدُوِّہٖ مَطْلُوْبَہٗ ۔ وہ اپنے دشمن کو جو گزند پہنچانا چاہتا تھا وہ اسنے پہنچا دیا *۔ اور یوں اپنا مقصد پورا کر لیا ۔ اَنَلْتُہٗ اِیَّاہٗ وَنِلْتُہٗ ۔ میں نے اسے کوئی چیز حاصل کرائی، دیدی یا پہنچا دی ۔ نَالَ الرَّحِیْلُ ۔ روانگی قریب آگئی* ۔ تَنْوِیْلٌ ۔ عطا کرنا ۔ اَلنَّوَالُ ۔ عطاء**۔

اَلنِّیْلُ ۔ مصر کا مشہور دریا ۔ نیز عِظْلِیْمٌ کا درخت جس سے نیل (رنگ) بنایا جاتا ہے* ۔ یہ ھندی لفظ نیل سے معرب ہے ۔

سورہ بقرہ میں ہے ۔ لَا یَنَالُ عَہْدِی الظّٰلِمِیْنَ (۱۲۴/۲) ۔ میرا عہد ظالمین کو نہیں پہنچے گا ۔ یعنی جو لوگ میرے قوانین سے سرکشی اختیار کر جائینگے اور انسانی حقوق میں کمی کرینگے انکے لئے میرا یہ وعدہ نہیں کہ انہیں نوع انسانی کی امامت ملیگی ۔ سورہ توبہ میں ہے ۔ لَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّیْلًا (۱۲۰/۹) ۔ نہ وہ دشمن کو کوئی نقصان پہنچاتے ہیں ۔ سورہ اعراف میں ہے ۔ لَا یَنَالُہُمُ اللہُ بِرَحْمَۃٍ (۴۹/۷) ۔ ”اللہ ان پر رحمت نہیں کریگا“۔

ن و م

اَلنَّوْمُ نیند (۲۵۵/۲) نیز (۵۸/۲۴) ۔ مَنَامٌ ۔ سونے کی جگہ یا وقت ۔ یا نیند اور خواب (۱۰۲/۳۷ ؛ ۴۳/۸) ۔ نیز اس کے معنی آنکھ کے بھی آتے ہیں اس لئے کہ نیند کی جگہ آنکھ بھی ہے***۔ چنانچہ سورہ انفال میں جو ہے اِذْ یُرِیْکَہُمُ اللہُ فِیْ مَنَامِکَ (۴۳/۸) ۔ تو اس کے معنی بعض مفسرین نے آنکھ ہی کے لئے ہیں *** ۔ یعنی جب اللہ انہیں تیری نگاھوں میں (کم) دکھاتا تھا ۔

نَامَتِ الرِّیْحُ ۔ ہوا سو گئی یعنی ساکن ہو گئی ۔ نَامَتِ النَّارُ ۔ آگ کی تپش اور تندی ماند پڑ گئی ۔ نَامَ عَنْ حَاجَتِہٖ ۔ وہ اپنی ضرورت سے غافل ہو گیا ۔ اَلنُّوْمَۃُ ۔ جسے در خور اعتناء نہ سمجھا جائے ۔ اَلنَّوِیْمُ ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **ابن فارس ۔ ***تاج ۔

جو شخص اپنی چیزوں کی طرف سے غفلت برتے ۔ نیز گمنام* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی جمود اور حرکت کے ٹھہر جانے کے ہیں ۔ اِسْتَنَامَ اِلیٰ فُلاَنٍ ۔ فلاں کیطرف پہنچکر اس نے اطمینان حاصل کرلیا ۔

ن و ن

نُـوْنٌ ۔ اسے عبرانی اور سریانی زبان میں بھی نُـوْنٌ ہی کہتے ہیں ۔ اس کے معنی بڑی مچھلی کے آتے ہیں۔ اس حرف (ن) کی قدیم شکل بہت کچھ مچھلی سے مشابہت رکھتی تھی**۔ قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کو ذَا النُّوْنِ (۲۱/۸۷) بھی کہا گیا ہے ۔ اور صَاحِبِ الْحُوْتِ بھی (۶۸/۴۹)۔ یعنی مچھلی والا ۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں انہیں یونس کے نام سے پکارا گیا ہے (۳۷/۱۳۹)۔

تعریفات میں ہے کہ نُـوْنٌ علم اجمالی کو کہتے ہیں جس سے مراد دوات ہے ، کیونکہ وہ حروف جو علم کی صورت اختیار کرتے ہیں اجمالی طور پر اس کی روشنائی میں موجود ہوتے ہیں ۔ یعنی معنی اس کے دوات ہیں اور مراد اس سے اجمالی علم ہے**۔ سورۃ القلم میں ہے نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَ (۶۸/۱) ۔ ''دوات اور قلم اور جو کچھ لوگ ان سے لکھتے ہیں (یعنی علم) اس پر شاہد ہے کہ . . . . '' (ہوسکتا ہے کہ یہاں ن مقطعات میں سے ہو) ۔ تاج اور اقرب الموارد میں ہے کہ نُـوْنٌ کے معنی تلوار کے پھل (یا دھار) کے بھی ہیں ۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ن ۔ وَ الْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَ کے معنی یہ ہونگے کہ سیف (تلوار) اور قلم یعنی جو کچھ اس سے لکھتے ہیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ . . . (دین خداوندی کی بالآخر کامیابی ہوگی) ۔ تلوار سے مراد قوتِ نافذہ اور قلم سے مراد قانونِ خداوندی ہے ۔ ''قرآن کریم اور تلوار'' وہ محکم شہادات ہیں جن کی موجودگی میں اسلام کا کوئی دعویٰ بلا دلیل نہیں رہ سکتا ۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبال نے یہ کہہکر توجہ دلائی ہے کہ

درکمر تیغِ دو رُو ، قرآن بدست — تن بدن ہوش و حواس اللہ مست
ایں دو قوت حافظ یک دیگراند — کائنات زندگی را محور اند

سورۃ حدید میں اسی ضمن میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے رسولوں کو بھیجا ۔ ان کے ساتھ ضابطہ قوانین نازل کیا ۔ اور فولاد (شمشیر) بھی ۔ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵)۔ جس میں سخت قوت ہے اور نوع انسانی کے لئے فوائد کثیر ۔ واضح رہے کہ قرآن کریم اور شمشیر کے ساتھ ساتھ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کریم کو شمشیر کے زور سے منوایا جائے گا ۔ اس

*محیط ۔ **محیط و لسان العرب ۔

کے معنی یہ ہیں کہ ایک معاشرہ قائم کیا جائے گا جس میں قرآنی اصول و قوانین نافذ کئے جائیں گے۔ اسی قوت نافذہ کو شمشیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ قوت جو دنیا میں عدل قائم رکھنے کا موجب بنتی ہے اور جس سے مجرمین کو تباہ کاریوں سے روکا جاتا ہے۔

ن و ی

نَوَى الشَّيْئَ يَنْوِيْهِ۔ کسی چیز کا قصد اور دل میں عزم کرنا۔ پختہ ارادہ کرنا، اور اس کی طرف دل سے متوجہ ہونا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں۔ (۱) کسی چیز کا قصد اور (۲) کسی چیز کی گٹھلی۔ اَلنِّیَّۃُ۔ وہ سمت جس کی طرف سفر کیا جائے*۔ دل سے کسی کام کا عزم کرنا۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کے معنی ہیں دل کا جلبِ منفعت اور دفعِ ضرر کے لئے کسی مناسب کام کے لئے آمادہ ہونا**۔ نَوَاکَ اللّٰہُ۔ خدا سفر میں تیرے ساتھ رہے اور تیری حفاظت کرے۔ اَلنَّوِیُّ۔ رفیق یا رفیقِ سفر*۔ ہم نیت۔ اَلنَّوَاۃُ۔ گٹھلی۔ اس کی جمع اَلنَّوٰی ہے۔ (۶/۹۶)۔ نَوَاۃُ التَّمْرِ۔ کھجور کی گٹھلی۔

ن ھ ج

اَلنَّهْجُ۔ اَلْمِنْهَاجُ۔ واضح راستہ۔ اَنْهَجَ الطَّرِيْقُ وَالْاَمْرُ۔ راستہ اور معاملہ واضح ہو گیا۔ نَهَجَ الْاَمْرُ کے بھی یہی معنی ہیں۔ فُلَانٌ اِسْتَنْهَجَ طَرِيْقَ فُلَانٍ۔ فلاں آدمی فلاں کے طریق پر چلا***۔

قرآن کریم میں ہے لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا (۵/۴۸)۔ "ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک منہاج مقرر کیا"۔ (اس کے تفصیلی مفہوم کے لئے عنوان ش۔ ر۔ ع دیکھئے)۔

ن ھ ر

نَهْرٌ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے کھلنے یا کھولنے کے ہیں۔ اَنْهَرْتُ الدَّمَ۔ میں نے خون کو کھول دیا اور بہا دیا۔ نَهْرٌ کے معنے ہیں پانی بہنے کی جگہ۔ بعض نے کہا ہے کہ نَهْرٌ در اصل پانی کو کہتے ہیں اور اس کے بہنے کی جگہ کو مجازاً نَهْرٌ کہہ دیتے ہیں۔ اس کی جمع اَنْهَارٌ ہے۔ اَلنَّهَرُ۔ بمعنی نَهْرٌ ہے۔ نیز اس کے معنی وسعت و فراخی اور روشنی بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں ہے

*تاج۔ **محیط۔ ***تاج و محیط و راغب۔

إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ (۵۴/۵۴) - تو اس میں نَهَرٌ کے معنی روشنی اور فراخی کے ہیں - اَلنَّهِيْرُ کے معنی ہیں کثیر اور وافر* - روشنی کی جہت سے اَلنَّهَارُ دن کے لئے بولا جاتا ہے - یعنی لَيْلٌ کی ضد - اَلنَّهْرَةُ کے معنے کسی چیز کو اچک کرلے جانا بھی ہیں - اسی لئے نَهَرَ الرَّجُلَ نَهْرًا کے معنی ہیں اس آدمی نے دن میں حملہ کیا* - غالباً اسی جہت سے نَهَرَ الرَّجُلَ کے معنی ہیں اس نے آدمی کو جھڑک دیا - اَلْمَنْهَرَةُ - مکانات کے سامنے کی کھلی جگہ جہاں کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے* - یہاں سے وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳/۱۰) کے معنی واضح ہوجاتے ہیں - یعنی صاحبِ احتیاج کو ذلیل و حقیر نہ سمجھو - اور (۲۳/۱۷) میں والدین کے متعلق جو کہا ہے فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۲۳/۱۷) تو وہاں بھی لَا تَنْهَرْ کے معنے واضح ہو جاتے ہیں - یعنی انہیں جھڑکو نہیں - ان کی تحقیر مت کرو - اور ان سے شرافت سے بات کرو -

قرآن کریم میں جنت کے متعلق بار بار آتا ہے تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۲/۲۵) - ان باغات کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی- پہلی چیز تو یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارے ہاں نہر کا ایک خاص مفہوم ہے لیکن عربی زبان میں نَهْرٌ اس پانی کو کہتے ہیں جو دو ساحلوں کے درمیان بہ رہا ہو- اس میں دریا ، ندی ، نہر سب ہی آجاتے ہیں ، جن سے کھیت یا باغات سیراب ہوتے ہیں**-

قرآن کریم کے ان مقامات میں جہاں جہاں جنت سے مراد دنیوی زندگی میں جنتی معاشرہ ہے ، اس کی انہار سے مراد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے گا - اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا (۱۳/۳۵) - اس کے پھل اور آسائشیں سدا بہار ہونگی - تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ (۱۴/۲۵) - وہ اپنے پھل ہمیشہ دیتا رہتا ہے -

اور جہاں جنت سے مراد اُخروی جنت ہے، - تو اس کی تمام تفاصیل تمثیلی ہیں - (۱۳/۳۵ و ۴۷/۱۵) - لہذا وہاں بھی اَنْهَارٌ سے مراد اس‌قسم کی نہریں نہیں جو ہمارے ذہن میں ہیں -

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے پانی کو زندگی کہا ہے (۲۱/۳۰) اور اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے - اس لئے جس معاشرہ میں آبِ رواں کی فراوانی ہو اس میں زندگی کی فراوانی ہوگی - ''باغات میں نہریں رواں ہونے'' سے مراد زندگی کی شادابیاں اور سرسبزیاں ہیں -

---

*تاج - **لین -

ن ھ ی

نَهَاهُ يَنْهَاهُ نَهْياً۔ أَمَرَ کی ضد ہے۔ روکنا۔ منع کرنا۔ باز رکھنا۔ اِنْتَهٰی۔ رک جانا۔ باز آجانا۔ اَلنُّهْيَةُ۔ کسی چیز کی انتہا اور آخری حد کو کہتے ہیں۔ اَلنِّهَايَةُ کے بھی یہی معنی ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں۔ یعنی انتہا تک پہنچ جانا۔ انتہا تک پہنچکر ہر بات رک جاتی ہے۔ اس لئے اس کے معنی رک جانے کے آتے ہیں۔ اَلنُّهْيَةُ۔ عقل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ انسان کو بعض امور سے روکتی ہے۔ اسکی جمع النُّهَی ہے*۔ (خود عَقْلٌ کے معنی بھی روکنے کے ہیں۔ دیکھئے عنوان ع۔ ق۔ ل)۔ رَجُلٌ مَنْهَاةٌ۔ وہ شخص جس کی رائے پر لوگ اعتماد کریں*۔

قرآن کریم میں ہے فَاِنِ انْتَهَوْا ($\frac{2}{193}$)۔ "اگر وہ لوگ لڑائی سے رک جائیں"۔ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ بمقابلہ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ($\frac{3}{109}$) آیا ہے۔ یعنی معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا۔ یہ امت مسلمہ کا فریضہ ہے۔ (مَعْرُوْفٌ اور مُنْكَرٌ کے لئے دیکھئے عنوانات (ع۔ ر۔ ف) اور (ن۔ ک۔ ر)۔ اُولِی النُّهٰی ($\frac{20}{54}$)۔ صاحبانِ عقل و بصیرت۔ اِنْتَهٰی ($\frac{2}{275}$) رک جانا۔ اَلْمُنْتَهٰی۔ انتہائی کنارہ۔ آخری حد۔ ($\frac{53}{14}$)۔ (سِدْرَةٌ کے لئے عنوان س۔ د۔ ر دیکھئے)

---

*تاج۔

و

وَ (حرف)

وَ ۔ (۱) ''اور'' (And) کے معنوں میں ۔ أَنْعَامُهُمْ وَ أَنْفُسُهُمْ (۳۲/۲۷) ۔ ان کے چوپائے اور وہ خود ۔ ۔ ۔

(۲) مَعَ (ساتھ) کے معنوں میں ۔ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَ شُرَكَاءَكُمْ (۱۰/۷۱) ۔ تم اپنے معاملہ کو اپنے شرکاء کے ساتھ مل کر بالکل پختہ کرو ۔

(۳) أَوْ (یا) کے معنوں میں ۔ بِحَبْلٍ مِنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِنَ النَّاسِ (۳/۱۱۱) ۔ اللہ کے عہد کے ذریعہ یا لوگوں کے عہد کے ذریعے ۔

(۴) تاکہ ۔ کے معنوں میں ۔ يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ (۶/۲۷) اے کاش ہم واپس بھیجدئے جاتے تاکہ ہم پھر تکذیب نہ کرتے ۔ (یہاں دراصل كَيْ یا لامِ تعلیل محذوف ہے)۔

(۵) یعنی ۔ کے معنوں میں ۔ اسے واوِ تفسیری کہتے ہیں اور اس کا استعمال خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ واو عاطفہ (اور کے معنوں میں) ہے یا واو تفسیری (یعنی کے معنوں میں)۔ مثلاً قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَ سَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ (۲۱/۶۹) ۔ اس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ۔ اے آگ ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا ۔ اور یہ بھی کہ ۔ اے آگ ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی یعنی سلامتی والی (نقصان نہ پہنچانے والی ٹھنڈک) ہو جا ۔ لیکن مفہوم کے اعتبار سے یہاں واو کا ترجمہ یعنی زیادہ موزوں ہے ۔

(۶) قسم کے لئے ۔ وَ الْعَصْرِ (۱۰۳/۱) ۔ زمانہ کی قسم ۔ یا زمانہ اس پر شاہد ہے کہ ۔

(۷) کبھی یہ زائد بھی ہوتا ہے ۔ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِيْنِ وَنَادَيْنَاهُ (۱۰۴-۱۰۳/۳۷) ۔ سو جب وہ دونوں جھک گئے اور اس نے (بیٹے کو) کنپٹی کے بل لٹا دیا تو ہم نے آواز دی ۔ (یہاں ۔ وَ ۔ کے بغیر بھی معنے وہی رہتے ہیں) ۔

(۸) "حالانکہ" ۔ "دراں حالیکہ" ۔ کے معنوں میں (اسے واو حالیہ کہتے ہیں) ۔ وَأَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتَابَ (۴۴/۲) ۔ دراں حالیکہ تم کتاب کی پیروی (یا تلاوت) کرتے ہو ۔ نیز وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۴۲/۲) ۔ دراں حالیکہ تم (خوب) جانتے ہو ۔

و أ د

اَلْوَأْدُ وَالْوَئِيْدُ ۔ بلند اور سخت آواز ۔ اونٹ کی بڑبڑاہٹ ۔ وَأَدَ فُلَانًا ۔ اس نے فلاں آدمی کو گرانبار کر دیا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ چنانچہ بوجھ لیکر چلنے والے اونٹوں کی گراں رفتاری وَئِيْدٌ کہلاتی ہے ۔ یہیں سے وَأَدَ الْبِنْتَ يَئِدُ وَأْدًا کے معنی ہیں (لڑکی کو) زندہ زمین میں دفن کر دیا ۔ اور مٹی تلے دبا دیا ۔ مٹی کا بوجھ اس پر ڈال دیا ۔ عرب جاہلیت میں قبیلۂ کندہ کے لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے* ۔ اس لڑکی کو جسے اس طرح زندہ دفن کر دیا جاتا اَلْمَوْءُوْدَةُ وَالْوَئِيْدَةُ کہتے تھے* ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے ۔ وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (۸۱/۸-۹) ۔ جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تجھے کس جرم کی سزا میں یوں مار دیا گیا تھا ۔ رسول اللہؐ عورتوں سے عہد لیا کرتے تھے کہ وہ اولاد کو قتل نہیں کریں گی ۔ (۱۲/۶۰) ۔ اس سے (غالباً) بھی لڑکیاں مراد ہیں، بجز اس کے کہ یہاں قَتْلٌ سے مراد اولاد کو تعلیم و تربیت سے بے بہرہ رکھنا ہو ۔ (دیکھئے عنوان ق ۔ ت ۔ ل و ذ ۔ ب ۔ ح) ۔

اس سے مراد صرف عرب جاہلیت کے زمانہ کی لڑکیاں ہی نہیں بلکہ وہ تمام لڑکیاں ہیں جنہیں ہمارے معاشرہ میں "زندہ در گور" کر دیا جاتا ہے ۔ جو اپنی ساری عمر اس طرح بسر کردیتی ہیں کہ نہ مردہ ہیں نہ زندہ ۔ وہ گھروں میں نہیں ہوتیں ، قبروں میں دفن شدہ ہوتی ہیں جہاں سے ان کی نجات کی کوئی شکل نہیں ہوتی ۔ جب تک ہمارے معاشرہ میں نکاح و طلاق وغیرہ کے قوانین قرآن کریم کے مطابق نہیں ہوتے ، بیچاری بے زبان لڑکیوں کی حالت ایسی ہی رہے گی ۔ اور ان کی نشو و نما کی صلاحیتیں دفن ہی رہینگی ۔

*تاج و محیط ۔

و أ ل

وَئَلَ اِلَيْهِ - يَئِلُ وَاْلاً - کسی کی طرف پناہ لی - اس کی طرف تیزی سے گیا ، اس کی طرف پلٹا - وَأَلَ مِنْهُ۔ اس سے نجات چاهنا - اَلْوَاْلُ وَ الْمَوْئِلُ وَ الْمَوْ اَلَۃُ - نجات اور پناہ کی جگہ - جائے پناہ - اَلْاَلَۃُ الرَّجُلِ - آدمی کے گھر والے جن کی طرف وہ پناہ لیتا ہے* - ابن فارس نے اس کے معنی مجتمع ہونے اور پناہ لینے کے لکھے ہیں -

سورۃ کہف میں مَوْئِلاً (۱۸/۵۸) پناہ اور بچاؤ کی جگہ کے معنوں میں آیا ہے -

و ب ر

اَلْوَبَرُ (جمع اَوْبَارٌ) ۔ اونٹ ، خرگوش اور لومڑی کے بال - اَهْلُ الْوَبَرِ - بادیہ نشین** - قرآن کریم میں اَوْبَارٌ - (۱۶/۸۰) آیا ہے - (نیز دیکھئے عنوان ص - و - ف) -

و ب ق

وَبَقَ - يَبِقُ - وَبَقًا و وُبُوْقًا وَ مَوْبِقًا - ہلاک ہونا - اَلْمَوْبِقُ - ہلاکت گاہ - مَوْبِقٌ روک اور آڑ کو بھی کہتے ہیں ، اور قید خانہ کو بھی - اَوْبَقَهٗ اس نے اسے روک دیا - قید کر دیا - نیز ہلاک کردیا*** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْمَوْبِقُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو جائے - اور وَبَقَ کے معنی ہیں ہلاک ہو جانا - سورۃ کہف میں ہے - وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَوْبِقًا (۱۸/۵۲) - اس کے دونوں معنی ہوسکتے ہیں - یعنی ان کے درمیان آڑ یا روک بنا دی یا ان کے باہمی تعلقات کو ان کے لئے وجہ ہلاکت بنا دیا - سورۃ شوریٰ میں ہے - اَوْ يُوْبِقْهُنَّ (۴۲/۳۴) - یا انہیں تباہ و برباد کردے - چنانچہ اَلْمُوْبِقَاتُ ہلاک کرنے والے گناہوں کو کہتے ہیں*** -

و ب ل

اَلْوَبْلُ - اَلْوَابِلُ - موسلا دھار بارش** - (۲/۲۶۴) - اَلْوَبِيْلُ - شدید** - تَاَخَذْنَاهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا (۷۳/۱۶) - ضَرْبٌ وَبِيْلٌ - سخت مار - وَبِيْلٌ دراصل دھوبی کی اس موگری کو کہتے ہیں جس سے وہ کپڑوں کو کوٹتا ہے** - اسی

*تاج و محیط و اقرب الموارد - **تاج - ***تاج و محیط و راغب -

سے اَلْوَبَالُ ۔ شدت ، سختی ، ناپسندیدہ ، فساد ، نیز بمعنی مصیبت اور ناموافق وناسازگار آتا ھے*۔ وَبَالَ اَمْرِہٖ (۶۵/۵) ۔ اپنے کام کا برا نتیجہ ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنوں میں شدت (سختی) پائی جاتی ھے ۔ نیز اکٹھا ھونا ۔

و ت د

اَلْوَتَدُ ۔ کھونٹا اسکی جمع اَوْتَادٌ ھے ۔ وَتَدَ الْوَتِدَ یَتِدُہٗ وَتْدًا ۔ اس نے زمین یا دیوار میں میخ یا کھونٹی گاڑ دی ۔ اَلْمِیْتَدُ ۔ وہ ھتھوڑی جس سے میخ یا کھونٹی ٹھونکی جائے ۔ اَلْوَاتِدُ ۔ ثابت (محکم گڑی ھوئی) چیز ۔ وَتَدَ فُلَانٌ رِجْلَہٗ فِی الْاَرْضِ ۔ فلاں نے زمین میں اپنا قدم جما لیا ۔ اسی سے اَوْتَادُ الْاَرْضِ پہاڑوں کو کہتے ھیں اور اَوْتَادٌ مِنَ الْبِلَادِ شہروں کے رؤساء اور امراء کو**۔

قرآن کریم نے فرعون کو ذُوالْاَوْتَادِ (۳۸/۱۲) کہا ھے ۔ اس کے معنی ھیں بڑی محکم قوتوں کا مالک۔ جسکے کھونٹے دور دور تک گڑے ھوئے تھے ۔ اور پہاڑوں کو بھی اَوْتَادًا (۷/۷۸) کہا ھے کیونکہ وہ بھی کھونٹوں کیطرح زمین میں گڑے ھوئے ھیں ۔

(اھل تصوف کے ھاں جو ابدال اور اوتاد کی اصطلاحات ھیں وہ قرآنی نہیں) ۔

و ت ر

اَلْوَتْرُ ۔ اَلْوِتْرُ ۔ فرد ، یعنی اکیلی چیز ۔ (شَفْعٌ کے خلاف)**۔ قرآن کریم میں وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۸۹/۳) آیا ھے ۔ عددِ طاق (Odd) ۔ برخلاف عددِ جفت ۔ وَتَرَہٗ مَالَہٗ وَحَقَّہٗ ۔ اس نے اس کا مال اور حق کم کر دیا ۔ قرآن کریم میں ھے وَلَنْ یَّتِرَکُمْ اَعْمَالَکُمْ (۴۷/۳۵)۔ وہ تمہارے اعمال (کے ثمرات) کو کم نہیں کریگا ۔ وَتَرَ کے معنی بدلہ لینا اور اس میں زیادتی کرنا بھی ھیں ۔ نیز جوڑے کو الگ الگ کر دینا** ۔ اَلْوِتْرُ ۔ قتل کے سبب سے عداوت اور دشمنی***۔

تَتْرَی (اصل میں وَتْرَی تھا۔ واو ، تاء سے بدل گئی) چیزوں کا اسطرح پے درپے آنا کہ ان کے درمیان کچھ وقفہ ھو ۔ اگر وہ مسلسل طور پر آتی رھیں تو انہیں مُتَوَاتِرٌ نہیں کہینگے بلکہ مُتَتَابِعٌ یا مُتَدَارِکٌ یا مُتَوَاصِلٌ کہینگے ۔ جَاءَتِ الْخَیْلُ تَتْرَی کے معنی ھوئے ھیں

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔ ***محیط ۔

گھوڑے یکے بعد دیگرے کچھ کچھ وقفہ کے بعد آئے۔ مُوَاتَرَةُ الصَّوْمِ۔ ایک دن روزہ رکھنا اور پھر ایک یا دو دن کا ناغہ کر دینا۔ مُوَاتَرَةٌ میں وقفہ لازمی ہے۔ اگر وقفہ نہ ہو تو اسے مُدَارَكَةٌ ومُوَاصَلَةٌ کہینگے***۔ قرآن کریم میں ہے ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (۲۳/۴۴)۔ پھر ہم نے اپنے رسولوں کو وقفوں کے ساتھ متواتر بھیجا۔ اَلْوَتِيْرَةُ۔ کسی کام پر مداومت کرنا***۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے جو مختلف الفاظ آتے ہیں ان میں عدم مشابہت کی بنا پر قیاس کام نہیں کرتا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ الگ الگ معنی رکھتے ہیں۔

و ت ن

اَلْوَاتِنُ۔ اپنی جگہ مقیم، ثابت اور ہمیشہ رہنے والی چیز۔ اَلْمَاءُ الْوَاتِنُ۔ ہمیشہ بہنے والا پانی جو ختم نہ ہو۔ اَلْوَتِيْنُ۔ رگ جان، جس کے کٹ جانے سے انسان مرجاتا ہے*۔ قرآن کریم میں ہے ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ (۶۹/۴۶)۔ پھر ہم اسکی رگِ جان کاٹ دیتے۔

و ث ق

وِثَاقٌ۔ یا وَثَاقٌ۔ اس رسی، بیڑی یا بندھن وغیرہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو کس کر باندھا جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ وَثَاقٌ باندھنے کو اور وِثَاقٌ رسی کو کہتے ہیں۔ أَوْثَقَهُ۔ اسے رسی سے کس کر باندھ دیا*۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ (۸۹/۲۶ نیز ۴۷/۴)۔ وَثُقَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں وہ چیز محکم اور مضبوط ہو گئی*۔ قرآن کریم میں الْعُرْوَةُ الْوُثْقٰى کی تفسیر لَا انْفِصَامَ لَهَا نے کردی (۲/۲۵۶)۔ یعنی جو ٹوٹ نہ سکے۔ مِيْثَاقٌ اور مَوْثِقٌ کے معنی ہیں پکا وعدہ۔ مستحکم عہد۔ وَثِقَ بِهٖ کے معنی ہیں کسی پر اعتماد کرنا۔ اسے امانت دار سمجھنا*۔ اِسْتَوْثَقَ مِنْهُ۔ اس سے قابل اعتماد عہد حاصل کرلیا*۔ كَلَأٌ مُوْثِقٌ۔ اتنا وافر چارہ جس پر اعتماد کرلیا جائے کہ یہ سال بھر کے لئے کافی ہو جائیگا۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْمِيْثَاقُ اس عہدو پیمان کو کہتے ہیں جو قسموں کے ساتھ موکد ہو**۔

*تاج۔ **راغب۔ ***تاج و راغب۔

و ث ن

وَثَنَ بِالْمَكَانِ ۔ وہ کسی جگہ قیام پذیر ہو گیا ۔ اَلْوَاثِنُ ۔ مقیم اور جما ہوا ۔ جو حرکت نہ کرے۔ اسی سے وَثَنٌ بُتٌ کو کہتے ہیں جو حرکت نہیں کر سکتا *۔ (جمع اسکی اَوْثَانٌ ہے ۲۹/۱۷) ۔ تاج نیز صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ وَثَنٌ چھوٹے صَنَمْ (بت) کو کہتے ہیں ۔ اس بنیادی مفہوم کی رو سے ہر وہ تصور، یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وَثَنٌ ہے ۔ ذہنی جمود کہ جسے تقلید کہتے ہیں بدترین قسم کا وَثَنٌ ہے جسکی پرستش ہر مردہ قوم میں ہوتی رہتی ہے ۔

قرآن کریم تمام نوع انسان کے لئے مستقل ضابطہ حیات ہے جسے جب عملی شکل دی جائے تو ایک متحرک معاشرہ وجود میں آتا ہے ۔ '' متحرک '' کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتا ہوا زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتا رہتا اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (Dynamic Movement) کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے ، اس میں جمود پیدا ہو جائے ، تو یہ '' وثنیت '' ہوگی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ بدقسمتی سے ہم پتھر کے بتوں کو تو دیکھتے اور انہیں معیوب سمجھتے ہیں لیکن اپنے قلب و دماغ میں رکھے ہوئے بتوں پر کبھی نگاہ نہیں ڈالتے!

و ج ب

وَجَبَ الْبَعِيْرُ تَوْجِيْبًا ۔ اونٹ نے اپنے آپ کو زمین پر ڈال دیا اور جم کر بیٹھ گیا * ۔ اَلْمُوَجِّبُ ۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو فربہی کی وجہ سے اٹھ نہ سکے ۔ اس اعتبار سے وَجَبَ الْحَائِطُ کے معنی ہیں دیوار گر پڑی ۔ وَجَبَ الرَّجُلُ وُجُوْبًا ۔ آدمی مر گیا ۔ (یعنی ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا) ۔ اَلْوَجْبَةُ ۔ کسی چیز کا آواز کے ساتھ گرنا ۔ اَلْمَوْجِبُ موت کو کہتے ہیں * ۔ قرآن کریم میں ذبح کر دہ اونٹوں کے متعلق ہے فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا (۲۲/۳۶) ۔ جب وہ اپنے پہلوؤں پر گر پڑیں، یعنی ٹھنڈے ہو جائیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ گر پڑنا اور واقع ہو جانا اس کے بنیادی معنوں میں سے ہے ۔ وَجَبَ الشَّيْءُ ۔ کسی چیز کا پختہ طور پر جمنا اور

---

*تاج و راغب ۔

لازم اور ضروری ہونا ۔ اَوْجَبَہٗ ۔ وَجَّبَہٗ ۔ اس نے اسے جمایا اور لازم کر دیا۔ اِسْتَوْجَبَہٗ ۔ وہ اسکا مستحق ہو گیا * ۔ نیز اس کے معنی ہیں ، اس نے اُسے واجب سمجھا * ۔ وَاجَبَ لِفُلَانٍ حَقَّہٗ ۔ اس نے اسکے حق کی رعایت کی ** ۔

و ج د

وَجَدَ وُجُوْدًا کے بنیادی معنی کسی چیز کو پا لینا ہیں ۔ کبھی کسی چیز کو جاننے اور اس کا علم حاصل کر لینے کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔ لیکن یہ فعل، مصدر و ابواب یا صلوں کے فرق کے ساتھ اور معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً مَوْجِدَۃً وَ وِجْدَانًا غصے کے لئے آتا ہے ۔ وَجَدَ عَلَیْہِ ۔ وہ اس پر ناراض ہوا ۔ نیز وَجَدَ یَجِدُ کے معنی مالدار اور فارغ البال ہونا بھی ہیں ۔ چنانچہ اَلْوِجْدُ ۔ اَلْوَجْدُ اور اَلْوُجْدُ ۔ مالداری ۔ فراخی ۔ اور وسعت کو کہتے ہیں ۔ وَجَدَ بِہٖ وَجْدًا ۔ اس سے محبت کی ۔ اِنَّہٗ لَیَجِدُ بِفُلَانَۃَ وَجْدًا شَدِیْدًا ۔ وہ فلاں عورت کی محبت کرتا اور اس کی جدائی میں غمکین رہتا ہے ۔ وَجَدَ بِہٖ ۔ اس نے اسے چاہا اور غمکین ہوا ۔ اَلْوَجِیْدُ ۔ ہموار زمین کو کہتے ہیں *** ۔ اَلْوَاجِدُ ۔ غنی ۔ تونگر ۔ دولتمند *** ۔ وُجْدٌ ۔ استطاعت ، مقدرت (65/6) ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ (2/96) تو انہیں سب سے زیادہ حریص پائیگا ۔ یہ لفظ زیادہ تر انہیں معانی میں استعمال ہوا ہے ۔ وُجُوْدٌ یا مَوْجُوْدٌ وغیرہ الفاظ قرآن کریم میں نہیں آئے ۔ یہ متکلمین کی اصطلاحات ہیں ۔

و ج س

اَلْوَجْسُ ۔ خفی آواز یا دل کی گھبراهٹ کو کہتے ہیں۔ اس سے اَلْوَاجِسُ دل میں گذرنے والی بات کو کہتے ہیں ۔ اَلْاِیْجَاسُ ۔ دل ہی دل میں کسی بات کو محسوس کرنا اور اسے پوشیدہ رکھنا ۔ یونہی ذرا سا احساس ہونا یا خیال گذرنا جس میں خوف کا بھی شائبہ ہو* ۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے وَاَوْجَسَ مِنْھُمْ خِیْفَۃً (11/70)۔ اس نے ان کی طرف سے دل ہی دل میں ذرا خوف محسوس کیا۔

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج و محیط ۔

و ج ف

وَجَفَ الشَّيْئُ ۔ چیز کا مضطرب ہونا ۔ قَلْبٌ وَاجِفٌ ۔ مضطرب (تیز دھڑکنے والا) دل*۔ قرآن کریم میں ہے ۔ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ (۷۹/۸) ۔ اس دن دل مضطرب و پریشان ہونگے ۔

وَجَفَ الْفَرَسُ ۔ گھوڑے کا تیز دوڑنا ۔ اَوْجَفْتُهُ ۔ میں نے اسے تیز دوڑایا* ۔ سورۃ حشر میں ہے ۔ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ (۵۹/۶) ۔ تم نے اس پر گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے ۔ لشکر کشی نہیں کی ۔

و ج ل

اَلْوَجَلُ ۔ گھبراہٹ اور خوف ۔ وَجِلَ ۔ يَوْجَلُ ۔ گھبرانا ۔ ڈرنا ۔ ڈرنے اور گھبرانے والے کو وَجِلٌ کہتے ہیں ، اس کی جمع وَجِلُوْنَ ہے ۔ (۱۵/۵۲) ۔ اَلْوَجِيْلُ ۔ اَلْمَوْجِلُ ۔ گڑھا جس میں پانی اکٹھا ہو جائے ۔ اَلْوَجُوْلُ ۔ بوڑھے لوگ**۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلْوَجَلُ ۔ دل ہی دل میں خوف کے احساس کرنے کو کہتے ہیں***۔

قرآن کریم میں مومنین کی صفت یہ لکھی ہے کہ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (۸/۲) ۔ جب ان کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل میں خوف کا احساس پیدا ہو جاتا ہے ۔ جیسا کہ دوسرے مقامات میں بتایا گیا ہے ، خدا کے خوف سے مراد یہ ہے کہ اگر اس کے قوانین کے خلاف روش اختیار کی جائے تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے ۔ اس تباہی اور بربادی کے احساس سے انسان کے دل میں خوف اور گھبراہٹ ہوتی ہے ۔ اسی کو خدا کا خوف کہتے ہیں ۔ یعنی قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے نتائج و عواقب کا احساس ۔

و ج ہ

وِجَاهُ الشَّيْئِ ۔ کسی چیز کے سامنے یا بالمقابل****۔ اَلْوَجْهُ ۔ کسی چیز کا وہ حصہ جو سب سے پہلے سامنے آئے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کے سامنے آنے کے ہیں ۔ اس جہت سے اَلْوَجْهُ انسان کے اس حصۂ جسم کو کہتے ہیں جو سب سے پہلے سامنے آتا ہے ۔ اور

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔ ****محیط ۔

چونکہ انسان کا چہرہ نمایاں طور پر سامنے آتا ہے اس لئے اسے وَجْہٌ کہتے ہیں *۔ لیکن اس کے بعد یہ لفظ خود نفس شے یا ذات کے لئے بھی بولا جانے لگا**۔ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ (۲/۱۱۲) میں وَجْہٌ کے معنی پورا اپنا آپ ہیں نہ کہ اپنا چہرہ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ (۱۷/۷) کے معنی بھی یہ ہیں کہ وہ تمہارا برا حال کردیں۔ یا یہ کہ وہ تمہارے سرداروں کا برا حال کردیں۔ وَجْهُ الْقَوْمِ۔ قوم کے معزز اور شریف فرد یا سردار کو کہتے ہیں۔

وَجْہُ النَّهَارِ۔ دن کا ابتدائی حصہ۔ اَلْوَجْهُ مِنَ الدَّهْرِ۔ زمانہ کا ابتدائی حصہ۔ یعنی زمانہ کا وہ حصہ جو سب سے پہلے سامنے آئے**۔

اَلْوَجْهُ۔ جاہ۔ مرتبہ اور عزت کو بھی کہتے ہیں۔ اَلْوَجِيْهُ۔ صاحب جاہ۔ صاحب وجاہت۔ اَلْوَجِيْهَةُ۔ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو دونوں طرف سے ایک جیسا ہو۔ حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے۔ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا (۳۳/۶۹)۔ اس کے معنے صاحب عزت کے ہیں۔

وَجْہٌ کے معنی ہوتے ہیں مقصد (Purpose)۔ مطلوب (Object)۔ راستہ، جو مقصد تک پہنچنے کے لئے اختیار کیا جائے (Course)۔ سمت (Direction) جس طرف کوئی جا رہا ہو۔ وہ منزل مقصود جس کی طرف کوئی جا رہا ہو۔ چنانچہ وَجْهُ الطَّرِيْقِ۔ اس منزل کو کہتے ہیں جس کی طرف راستہ لے جا رہا ہو***۔ اور وَجْهُ الْاَمْرِ کسی بات کے مقصد اور اس کے صحیح رخ کو کہتے ہیں۔ (جِهَةٌ اور وِجْهَةٌ کے بھی یہی معنے ہوتے ہیں۔ سمت۔ مقصد۔ وجہ۔ سبب)۔ مُتَوَجَّهٌ۔ وہ مقام جس کی طرف کوئی جا رہا ہو۔

قرآن کریم نے انسانی اعمال کی غایت یہ بتائی ہے۔ اِبْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ (۲/۲۷۲)۔ عام طور پر اسکا ترجمہ کیا جاتا ہے خدا کی رضا جوئی یا خوشنودی کے لئے۔ اس سے ذہن انسانوں کے خوشی یا ناراضگی کے جذبات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے جذبات سے بلند و بالا ہے۔ وَجْهُ اللّٰهِ کا صحیح مفہوم ہے وہ مقصود جو اللہ نے مقرر کردیا ہے۔ وہ منزل جسکی طرف قوانین خداوندی لے جاتے ہیں۔ یعنی انسان کا ہر عمل اس مقصد کے حصول کے لئے ہونا چاہئے جو اس کے لئے خدا نے مقرر کردیا ہے۔ اس کا ہر کام اس منزل تک پہنچنے کے لئے ہونا چاہئے جو قوانین خداوندی نے اس کے

*محیط۔ **تاج نیز لطائف اللغۃ۔ ***لین۔

لئے مقرر کر دی ہے۔ سورۃ روم میں ہے وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ (۳۰/۳۹)۔ جو کچھ تم نوعِ انسانی کی نشو و نما کے لئے کرتے ہو، اس مقصد کے پیش نظر کہ تم اُس منزل تک پہنچ جاؤ جو قوانین خداوندی نے مقرر کر رکھی ہے۔ یعنی اس سے خود تمہاری اپنی ذات کی نشو و نما اور صلاحیتوں کی نمود ہو جائے۔ اسی سے اس آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا ہے کہ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۲۸/۸۸)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے وہ تغیر پذیر ہوتا ہے (ھَلَكَ کے یہی معنی ہیں) لیکن استمرار اور دوام ان اعمال کو حاصل ہوتا ہے جو اس منزل کے حصول کے لئے سرزد ہوں جو خدا نے مقرر کر رکھی ہے۔ یا یہ کہ دنیا کا ہر راستہ تغیر پذیر ہوتا ہے، بجز اس راہ کے جو خدا کی مقرر کردہ منزل کی طرف لے جاتی ہے*۔ یہی مفہوم سورۃ رحمٰن کی ان آیات کا ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (۵۵/۲۶-۲۷)۔ دنیا کا ہر نظام اور ہر راستہ تغیر پذیر ہے بجز اس راستے کے جو خدائے ذوالجلال و الاکرام کی ربوبیت اعلیٰ کی طرف لے جائے*۔ اسی کو ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى (۹۲/۲۰) کہا گیا ہے۔ دنیا میں ہر شخص کا اپنا اپنا مقصود و مطلوب اور ہر قوم کی اپنی اپنی منزل ہے۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا (۲/۱۴۸)۔ جماعت مومنین وہ ہے کہ وہ زندگی کے جس گوشے اور کار و بارِ حیات کے جس شعبے میں بھی ہو اس کے سامنے ہمیشہ وہ منزل مقصود رہتی ہے جو قوانینِ خداوندی نے متعین کر دی ہے۔ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (۲/۱۱۵)۔

و ح د

اَلْوَاحِدُ۔ گنتی میں پہلا عدد۔ ایک۔ وَاحِدٌ اور اَحَدٌ دونوں کے معنی "ایک" ہیں لیکن ان کے استعمال کا فرق اس مثال سے سمجھ میں آجائے گا کہ جب کہا جاتا ہے کہ مَا اَتَانِيْ مِنْهُمْ اَحَدٌ تو اس کے معنی ہونگے میرے پاس ان میں سے کوئی بھی نہیں آیا۔ لیکن جب کہا جائے گا کہ جَاءَنِيْ مِنْهُمْ وَاحِدٌ تو اس کے معنی ہونگے ان میں سے میرے پاس صرف ایک شخص آیا (دو نہیں آئے)**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ هُوَ وَاحِدُ قَبِيْلَتِهٖ کے معنی ہیں وہ اپنے قبیلہ میں یکتا ہے۔

---

*وَجْهُ رَبِّكَ یا وَجْهَهٗ کے معنی خود ذاتِ خداوندی بھی ہیں [دیکھئے عنوانات (ب - ق - ی) اور (ف - ن - ی)] لیکن راغب نے ان معانی کو ترجیح دی ہے جو اوپر لکھے گئے ہیں۔ ** تاج۔

قرآن کریم میں اللہ کے لئے وَاحِدٌ بھی آیا ہے (۱۲/۳۹) اور آحَدٌ بھی (۱۱۲/۱)۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ آحَدٌ وہ ہے جسکی ذات میں کوئی اور شریک نہ ہو اور وَاحِدٌ ایسے کہتے ہیں جسکی صفات میں کوئی اور شریک نہ ہو*۔ چنانچہ آحَدٌ کے معنی ہونگے وہ ذات جو بے مثل و بے نظیر ہو۔ جو یگانہ ہو۔ ذات (Personality) کی بنیادی خصوصیت (Basic characteristic) یہ ہے کہ وہ یگانہ (Unique) ہو۔ قُلْ ھُوَاللہُ آحَدٌ (۱۱۲/۱) میں ذات خداوندی کی اس بنیادی خصوصیت، یعنی اسکی یگانگت (Uniqueness) کا ذکر ہے۔

آلْاُحْدَانُ ان تیروں کو کہتے ہیں جو یکتا اور بے نظیر ہوں**۔ آلْمِیْحَادُ۔ اس ٹیلے کو کہتے ہیں جو دوسرے ٹیلوں سے بالکل الگ تھلگ کھڑا ہو*۔ اِتَّحَدَ الشَّیْئَانِ۔ دونوں چیزیں خلط ملط ہو کر ایک ہو گئیں۔ مجازاً یہ لفظ متفق ہونے کے لئے بھی بولا جاتا ہے*۔

قرآنی تعلیم کی بنیاد خدا کی وحدت پر ہے، یعنی اس حقیقت کے اعتراف اور یقین پر کہ کائنات میں صرف ایک قوت ہے جس کا اقتدار و اختیار ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کسی اور قوت کا آئین و قانون نہیں چلتا۔ لہذا انسانوں کی دنیا میں بھی اُسی کا قانون و آئین چلنا چاہئے۔ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖ آحَدًا۔ (۱۸/۲۶) وہ اپنے حکم اور قانون میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ اسلئے مومن وہ ہے جو لَا یُشْرِکْ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖ آحَدًا (۱۸/۱۱۰)۔ جو اپنے رب کی محکومیت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ جو خدا کے قوانین کے علاوہ (جنہیں اس نے قرآن کریم میں بیان کر دیا ہے) اور کسی کے قانون کے سامنے نہیں جھکتا۔

(نیز دیکھئے عنوان ا۔ ح۔ د)۔

و ح ش

آلْوَحْشُ۔ جنگلی جانور جو انسانوں سے مانوس نہ ہو۔ جمع وُحُوْشٌ ہے۔ ایک کو وَحْشِیٌّ کہتے ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ (مَکَانٌ وَحْشٌ) بے آباد ویران جگہ سے منسوب چیز کو وَحْشِیٌّ کہتے ہیں۔ مَکَانٌ وَحْشٌ۔ خالی جگہ۔ بَلَدٌ وَحْشٌ۔ وہ علاقہ جو ویران ہو اور وہاں کوئی آبادی نہ ہو۔ بَاتَ وَحْشًا۔ اس نے بھوکے رات گذار دی۔ وہ خالی پیٹ رہا**۔ آلْوَحْشُ۔ آلْاِنْسُ کی ضد ہے***۔ یعنی نامانوس، وحشی، جنگلی۔ ذَالِکَ مِنْ وَحْشِ النَّاسِ۔ یہ آدمی رذیل اور آدم بیزار لوگوں میں سے ہے*۔

*محیط۔ **تاج۔ ***راغب۔

قرآن کریم میں ہے وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (۸۱/۵) ۔ اس میں وُحُوْشٌ کے معنی نامانوس جانور بھی ہو سکتے ہیں اور وحشی اور جنگلی لوگ بھی ۔

و ح ی

اَلْوَحْیُ ۔ اشارہ ، جس میں تیزی اور سرعت ہو ۔ وَحَیْتُ لَکَ بِخَبَرٍ کَذَا ۔ میں نے تمہیں فلاں بات کا اشارا کر دیا ۔ یا چپکے سے مطلع کردیا* ۔ چنانچہ سورہ مریم میں حضرت زکریا ؑ کے متعلق ہے کہ ان سے کہدیا گیا تھا کہ وہ لوگوں سے بات نہ کریں ۔ فَاَوْحٰی اِلَیْھِمْ (۱۹/۱۱) لہذا اس نے لوگوں کو اشارہ سے کہا ۔

(۲) راغب نے کہا ہے (اور صاحب تاج نے بھی اسکی تائید کی ہے) کہ اَلْوَحْیُ کے معنی تیز اشارہ کے ہیں ۔ اسی لئے شَیْءٌ وَحِیٌّ کے معنی ہیں وہ چیز جو جلدی سے آجائے ، اور اَمْرٌ وَحِیٌّ ۔ تیز رفتار معاملہ ۔ اَلْوَحٰی جلدی ۔ تیزی کرنا ۔ اَوْحٰی الْعَمَلَ ۔ اس نے کام میں جلدی کی* ۔

(۳) اَلْوَحْیُ کے معنی کتابت (یعنی لکھنا) بھی ہیں ۔ وَحَیْتُ الْکِتَابَ ۔ میں نے کتاب کو لکھا ۔ واحٍ ۔ لکھنے والا (کاتب) ۔ اَلْوَحْیُ لکھی ہوئی چیز یا نامہ ۔ چنانچہ جوھری نے کہا ہے کہ اَلْوَحْیُ کے معنی اَلْکِتَابُ ہیں ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے ۔ اور ابن فارس اور راغب نے بھی ۔ سورہ مائدہ میں جو ہے وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ (۵/۱۱۱) ۔ تو اس میں وحی کے معنی "لکھے ہوئے حکم" کے ہیں* ۔ یعنی اس وحی کے ذریعے جو (بقول راغب) حضرت عیسٰی ؑ کی وساطت سے (انجیل میں لکھی ہوئی) بھیجی گئی تھی ۔

(۴) اَوْحٰی کے معنی حکم کرنا ۔ امر کرنا ۔ چنانچہ صاحب تاج نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا آیت (۵/۱۱۱) میں حواریوں کی طرف وحی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے انہیں حکم دیا تھا* ۔ اور یہ وحی حضرت عیسٰی ؑ کی وساطت سے حواریوں کو ملی تھی ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ وہ چیز جسے تم کسی کی طرف پہنچا دو اور اسے اس کا علم ہو جائے ، وَحْیٌ کہلاتی ہے خواہ اسے پہنچانے کی کیفیت کچھ ہی ہو ۔ مخفی طور پر یا ویسے ہی ۔

سورہ حٰمٓ سجدہ میں ہے وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا (۴۱/۱۲) "اس نے ہر سماء میں اس کا امر وحی کر دیا" اس میں امر وحی (یا وحی

*تاج و راغب ۔ **راغب ۔

امر) کے معنی مامور کرنے کے ہیں ۔ یعنی وہ قانون خداوندی جسکی رو سے خارجی کائنات کی ہر شے اپنے اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں ہے ۔ اسی کو سورہ النور میں اسطرح بیان کیا گیا ہے ۔ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيْحَهُ (۲۴/۴۱) ۔ کائنات کی ہر شے جانتی ہے کہ اس کے فرائض کیا ہیں اور وہ مقصد کیا ہے جس کے حصول کے لئے انہیں سرگرم عمل رہنا ہے ۔ یہی وہ وحی ہے جو ان میں جاری و ساری ہے ۔ یعنی امر خداوندی ۔ خدا کا قانون ۔ اس کے متعلق سورہ زلزال میں ہے ۔ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (۹۹/۵) ۔ یعنی اس مقصد کے لئے خدا نے زمین کی طرف وحی کی ہے ۔ زمین کو اسکا حکم دے رکھا ہے ۔ زمین کے متعلق خدا کا قانون یہ ہے ۔ اسی طرح سورہ النحل میں ہے وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (۱۶/۶۸) ۔ شہد کی مکھی کی طرف خدا نے وحی کر رکھی ہے ۔ یعنی اس کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ یہ کچھ کرے ۔

کائنات میں ہر شے خدا کے امر (حکم) کے مطابق سرگرم عمل ہے ۔ یہ خدا کی وہ وحی ہے جو ہر شے میں ازخود ودیعت کر دی گئی ہے ۔ اسی کو قانون فطرت کہتے ہیں ۔ یا ، جانداروں کے لئے جبلت ((Instinct) ۔ یہ قانون ان چیزوں کا خود پیدا کردہ نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہوتا ہے ۔

انسان بھی کائنات کا ایک حصہ ہے اسلئے اسکے لئے بھی ضروری ہے کہ یہ ایک ایسے قانون کے مطابق زندگی بسر کرے جو اسکا خود پیدا کردہ نہ ہو بلکہ اسے خارج سے ملے ۔ جہاں تک اس کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے اس پر وہی قانون فطرت عائد ہوتا ہے جو دوسرے حیوانات پر ہوتا ہے ۔ کھانا ، پینا ۔ سونا ، جاگنا ۔ افزائش نسل ۔ بیماری ، موت ۔ سب اسی قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے ۔ یہ قانون انسان کا اپنا وضع کردہ نہیں ۔

لیکن انسان کی زندگی طبیعی زندگی (Physical life) ہی نہیں بلکہ اسکی معاشرتی اور تمدنی زندگی بھی ہے ۔ نیز اس کی ذات (Personality) بھی ہے ۔ اس کے لئے بھی ایسے قانون کی ضرورت ہے ، اور وہ قانون ایسا ہونا چاہئے جو اس کا خود ساختہ نہ ہو بلکہ قانون فطرت کی طرح اسے خارج سے ملا ہو ۔ اس قانون کا نام بھی وَحْیٌ ہے ۔ لیکن فرق یہ ہے کہ :—

(۱) یہ وحی ہر فرد کو الگ الگ نہیں ملتی ۔ اس کے لئے خدا کی طرف سے قاعدہ یہ مقرر ہوا تھا کہ یہ وحی کسی ایک انسان کو دی جائے اور وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے ۔ اس انسان کو نبی اور رسول کہتے ہیں ۔ یہ وحی انہیں حضرات سے مخصوص ہے ۔

(۲) کائنات کی کسی چیز کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ چاہے تو اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے جو اس کے لئے وحی کیا گیا ہے اور چاہے تو اس کے خلاف کوئی اور طریقہ اختیار کرے۔ لیکن انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اس وحی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اس کے خلاف کوئی دوسری روش اختیار کرے۔ یہ اسلئے کہ انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا اختیار و ارادہ استعمال کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی کے لئے یہ جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ وہ ہر فرد کو براہ راست نہ ملے بلکہ رسول کی معرفت دوسرے انسانوں تک پہنچے تو اس میں بھی یہی مصلحت پوشیدہ ہے کہ انسان وحی کے راستے پر اپنے اختیار و ارادہ سے چلے۔ اس لئے کہ اشیائے کائنات کو جو وحی براہ راست دے دی جاتی ہے، تو انہیں اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اس سے سرکشی برتیں۔ انہیں بہر حال اس کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔

(۳) انسان کو یہ تو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو وحی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اس کے خلاف روش اختیار کرے، لیکن یہ اسکے بس میں نہیں کہ وہ وحی کے خلاف زندگی بسر کرکے وہ نتائج حاصل کر لے جو وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ جس طرح اسے اس کا تو اختیار ہے کہ وہ سنکھیا کی ڈلی نگل جائے یا اسے اٹھا کر پھینک دے، لیکن اس کا اختیار نہیں کہ وہ سنکھیا کھا کر اس کا اثر مصری کی ڈلی کا سا پیدا کرلے۔

خدا کا قانون جو حضرات انبیاء کرام ؑ کی وساطت سے انسانوں کو ملتا ہے۔ اَلْوَحْیُ کہلاتا ہے۔ اس کے خدا سے پانے میں نبی کے سوا کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہوتا۔ یعنی انبیاء کے سوا کسی اور کو وحی نہیں مل سکتی، اور اس وحی کو انبیاء کرام ؑ اپنے کسب و ہنر سے حاصل نہیں کرتے بلکہ یہ انہیں خارج سے اسی طرح ملتی ہے جس طرح اشیائے کائنات کو از خود خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں کہ وحی منزل من اللہ ہوتی ہے۔ خدا کی طرف سے نازل شدہ۔ یعنی یہ شخص اپنی کوشش سے وحی کے مقام تک نہیں پہنچتا بلکہ وحی خود اتر کر اس تک پہنچتی ہے۔ بالفاظ دیگر، اس میں انسان کی داخلیت (Subjectivity) کو دخل نہیں ہوتا۔ اس میں یکسر خارجیت (Objectivity) ہوتی ہے۔ منزل من اللہ کہنے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ انسان اپنی کوشش سے طبعی دنیا کے پوشیدہ حقائق کو منکشف (Discover) کرسکتا ہے لیکن جو حقائق اسے وحی کے ذریعے ملتے ہیں

وہ صاحب وحی پر (Revealed) ہوتے ہیں ۔ یعنی وحی کے ذریعے حقیقت خود اپنے آپ کو صاحب وحی پر منکشف کرتی ہے ۔ یہ اپنا ہاتھ بڑھا کر عروس حقیقت کے چہرے سے پردہ نہیں اٹھا سکتا ۔ اسی کو نزولِ وحی کہتے ہیں ۔ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (۲/۹۷) ۔ اسے جبریل نے تیرے قلب پر نازل کیا ہے ۔ چونکہ وحی صرف حضرات انبیاء کرامؑ کو ملتی ہے اس لئے ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے کہ اس کی کیفیت اور ماہیت کیسی ہوتی ہے ، وہ کس طرح ملتی ہے ۔ ہمیں صرف اس بات پر ایمان رکھنا ہوتا ہے کہ وہ نبی کو منجانب اللہ ملتی ہے ۔ (البتہ ہم علم و بصیرت ۔ دلائل و براہین نیز وحی کے نتائج سے (Pragmatically) اس کی صداقت کو علیٰ وجہ البصیرت دیکھ سکتے ہیں) ۔ انبیاء کو یہ وحی کبھی ''اشارہ سریعہ'' کے ذریعے ملتی تھی، کبھی ''من وراء حجاب''۔ لیکن ہمیں یہ وحی صرف رسول کی وساطت سے مل سکتی ہے ۔ اسی حقیقت کو قرآن کریم نے سورۃ شوریٰ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (۴۲/۵۱) ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بشر (انسانوں) کے ساتھ خدا کس طرح کلام کرتا ہے ۔ بشر کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک انبیاء اور دوسرے غیر انبیاء ۔ پہلے انبیاء کا ذکر ہے کہ ان تک خدا کا کلام یا تو وحی (فرشتے) کے ذریعے پہنچتا ہے (جیسے رسول اللہؐ کے متعلق فرمایا) اور یا براہ راست پردے کے پیچھے سے بات سنائی دیتی ہے (جیسے حضرت موسیٰؑ کی صورت میں ہوا) ۔ باقی رہے غیر انبیاء تو ان تک صرف رسولوں کے ذریعے سے خدا کا کلام پہنچتا ہے ۔ یہ کلام اب قرآن کریم کے اندر ہے، اسکے باہر اور کہیں نہیں ۔ اس اعتبار سے یہی قرآن کریم ہم پر بھی نازل ہوا ہے (يُنَزِّلَ عَلَيْكُمْ ۲/۱۰۵ و ۳/۲۹)۔ یعنی رسول اللہؐ کی وساطت سے ہماری طرف نازل ہوا ہے ۔ چونکہ رسول اللہؐ کے بعد نبوت کا سلسلہ بند ہوگیا اس لئے اب کسی انسان کو براہ راست وحی نہیں مل سکتی ۔ اب انسان کے پاس علم کے دو ہی سرچشمے رہ گئے ۔ ایک اس کی اپنی عقل اور دوسری خدا کی وحی جو قرآن کریم کے اندر ہے ۔ اس کے علاوہ کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست علم نہیں ملتا ۔ الہام ۔ کشف وغیرہ کے تصورات کی سند قرآن کریم سے نہیں ملتی ۔ (الہام کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ل ۔ ہ ۔ م) ۔ قرآن کریم اور عقل کے ملنے سے انسانی علم مکمل ہو جاتا ہے ۔ نیز یہ تصور بھی غیر قرآنی ہے کہ خود رسول اللہؐ کو جو وحی ملی تھی اس کی دو قسمیں تھیں ۔ ایک وحی متلو (جو قرآن کریم کے اندر ہے) اور دوسری وحی غیر متلو جو قرآن کریم سے باہر (روایات کے اندر) ہے ۔

قرآن کریم میں وحی کی اس تقسیم کا کوئی ذکر نہیں ۔ اسکی رو سے صرف قرآن کریم وحی کے ذریعے ملا ہے (۶/۱۹) ۔ یہ تصور یہودیوں کے ہاں رائج تھا ، اور وہیں سے مسلمانوں کے ہاں آ گیا ۔ رسول اللہ ؐ کے زمانے میں وحی متلو اور وحی غیر متلو کی اصطلاحات کا کہیں ذکر نہیں ملتا ۔

(اس مقام پر وحی کے متعلق انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ اگر آپ مزید تفاصیل معلوم کرنا چاہیں تو میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں وحی کا باب ملاحظہ کیجئے جس میں اس موضوع پر بڑی وضاحت سے لکھا گیا ہے) ۔

اَوْحىٰ اِلَيْهِ ۔ کے معنے رسول بنا کر بھیجنے کے بھی ہیں ۔ چنانچہ اَوْحىٰ الرَّجُلَ کے معنی ہیں اس نے اپنے معتمد پیامی کو اپنے معتمد غلام کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا* ۔ ابن الانباری نے کہا ہے کہ وحی کو وحی اسلئے کہتے ہیں کہ فرشتہ اسے پوشیدہ طور پر مخلوق میں سے اسی شخص کو پہنچاتا ہے جس کی طرف وہ بھیجی جاتی ہے ۔ اِيْحَاءٌ کے اصلی معنی ایک کا دوسرے کے ساتھ علیحدگی میں خفیہ باتیں کرنا ہیں ۔ ابو اسحٰق نے بھی کہا ہے کہ وحی کے اصلی معنی اِعْلَامٌ فِيْ خَفَاءٍ ہیں* ۔ اسی لئے قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرام ؑ کے مخالفین کے متعلق ہے يُوْحِىْ بَعْضُهُمْ اِلىٰ بَعْضٍ (۶/۱۱۳) ۔ اس کے معنی خفیہ سازشوں کے ہیں (نیز ۶/۱۲۲) ۔ اِخْفَاءٌ کے اعتبار سے اس کے معنی ہوتے ہیں کسی بات کو دل میں ڈال دینا ۔ چنانچہ اَوْحَتْ نَفْسُهُ کے معنے ہیں اس کے دل میں خوف پیدا ہو گیا ۔ اس کے دل میں خدشہ پیدا ہو گیا ۔

قرآن کریم میں حضرت موسیٰ ؑ کی والدہ کے متعلق ہے کہ اَوْحَيْنَا اِلىٰ اُمِّ مُوْسىٰ (۲۰/۳۸ و ۲۸/۷) ۔ ہم نے ام موسیٰ کی طرف وحی کی ''کہ اس بچے کو دودھ پلا اور جب تجھے اس کے متعلق کوئی خطرہ لاحق ہو تو اسے صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دینا'' ۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ، وَحْیٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی کی طرف بھیجی جائے اور اس طرح اسے اس کا علم کرا دیا جائے ، یا اس کی طرف حکم بھیجا جائے خواہ اس کی کیفیت یا طریق کچھ ہی ہو ۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ ؑ کے حواریوں کی طرف وحی بھیجنے کے معنے ہیں ، حضرت عیسیٰ ؑ کی وساطت سے حکم بھیجنا ۔ اسی طرح والدہ موسیٰ ؑ کی طرف وحی بھیجنے کے معنی ہونگے ان کی طرف کسی کی وساطت سے حکم بھیجنا یا باخبر کر دینا ۔ جس انداز سے انبیاء کی طرف وحی ہوتی تھی وہ

*تاج ۔

انہی سے مخصوص تھی۔ محض اَوْحَيْنَا کے لفظ سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ غیر نبی کی طرف بھی (اسی قسم کی) وحی ہو سکتی ہے قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔

یاد رکھئے وحی، جسکے معنی خدا کی طرف سے براہ راست راہ نمائی حاصل ہونے کے ہیں وہ آخری مرتبہ رسول اللہ ؐ کو مل گئی اور اب وہ قرآن کریم کے اندر کتابت شدہ شکل میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد انسانوں کو ان کی راہ نمائی کے لئے خدا کی طرف سے کچھ اور نہیں ملا۔ نہ ملے گا۔ جو اس کا دعویٰ کرتا ہے وہ یا تو خود فریب خوردہ ہے، یا دانستہ لوگوں کو فریب دیتا ہے۔

چونکہ وحی میں کسی انسانی خیال یا آرزو کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس لئے قرآن کریم نے اسے ایسا اَلْعِلْمُ کہا ہے جو انسانی خیالات اور خواہشات سے یکسر متمیز ہوتا ہے ($\frac{2}{120}$)۔ اس کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ رسول کی وحی میں اس کے اپنے خیالات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ($\frac{53}{3-5}$)۔ وہ اپنی خواہش سے نہیں کہتا بلکہ یہ وہ وحی ہے جو اسکی طرف بھیجی گئی ہے۔ بڑی قوتوں والے (خدا) نے اسے اس کا علم دیا ہے“۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) نبی کے علاوہ اور کسی کو یہ علم نہیں مل سکتا۔ اس لئے رسول کا اعلان یہ ہوتا ہے کہ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ($\frac{7}{62}$)۔ ”میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے“۔ لہذا جو حقائق وحی کی رو سے ملتے ہیں عقلِ انسانی انہیں دریافت نہیں کر سکتی۔ عقلِ انسانی کو وحی کی روشنی کی اسی طرح ضرورت ہے جسطرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔ عقل کے لئے قابل اعتماد راستہ وہی ہے جو وحی نے متعین کر دیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ انبیاء کرام ؑ کو وحی بالفاظ ملتی تھی۔ یعنی وحی کے الفاظ بھی خدا کیطرف سے ہوتے تھے۔ اَلْوَحْيُ کے معنی اَلطَّرِيْقُ الْمُعْتَمَدُ قابل اعتماد راستہ بھی ہیں (لطائف اللغة)۔

و د د

اَلْوُدُّ۔ اَلْوَدَادُ۔ دوستی۔ محبت۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز سے محبت کرنا اور اسکے ہوجانے کی تمنا کرنا ہیں۔ اَلْمَوَدَّةُ محبت۔ اَلْوَدُّ۔ میخ کو کہتے ہیں اگرچہ بعض کا خیال ہے کہ یہ اَلْوَتِدُ کا ایک لغت ہے (جس کا مادہ و۔ت۔د ہے)*۔

* تاج۔

قرآن کریم میں ہے ۔ یَوَدُّ اَحَدُھُمْ (۲/۹۶) ۔ ان میں سے ہر ایک کی یہ تمنا ہے ۔ سورہ مریم میں ہے سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (۱۹/۹۶) ۔ خدائے رحمٰن ان کے لئے جاذبیت اور محبت پیدا کر دیگا ۔ اَلْوَدُوْدُ خدا کی صفت ہے ۔ (۸۵/۱۴) ۔ یعنی بہت زیادہ محبت کرنے والا ۔

سورہ روم میں میاں بیوی کے تعلقات کے متعلق ہے کہ جَعَلَ بَیْنَکُمْ مَوَدَّۃً (۳۰/۲۱) ۔ تم میں باہمی مودّت پیدا کر دی ۔ تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ اسطرح جوڑ دیا کہ تم ایک دوسرے کے لئے تقویت (Support) کا موجب بن گئے ۔ سورہ ممتحنہ میں مَوَدَّۃٌ بمقابلہ عداوت آیا ہے (۶۰/۷) ۔

سورہ شوریٰ میں ہے قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی (۴۲/۲۳) ”تم ان سے کہدو کہ میں تم سے اس (رسالت) کا کوئی اجر نہیں مانگتا ۔ میں صرف رشتہ داری کے تعلقات (مودت) چاہتا ہوں“ ۔ اس کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان ق ۔ ر ۔ ب دیکھئے ۔

و د

وَدٌّ ۔ سُوَاعٌ ۔ یَغُوْثُ ۔ یَعُوْقُ اور نَسْرٌ قومِ نوحؑ کے بت تھے ۔ (۷۱/۲۳) ۔ عرب ان بتوں کے ناموں سے بخوبی متعارف تھے ۔ چنانچہ وَدٌّ نام کے ایک بت کی پرستش دومۃالجندل میں قبیلہ بنو کاب کے ہاں ہوتی تھی ۔

و د ع

وَدَعَ ۔ یَدَعُ ۔ کوئی چیز ٹھہر گئی ۔ قرار پا گئی ۔ وَدَعَ وَوَدَّعَ ۔ چھوڑا ۔ ترک کیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی چھوڑنے اور خالی کر دینے کے ہیں ۔ تَوَادَعَ الْفَرِیْقَانِ ۔ دونوں فریقوں نے ترک جنگ کا معاہدہ کر لیا ۔ اس عہد و پیمان کو وَدِیْعٌ کہتے ہیں ۔ پھر اَلْوَدِیْعُ ہر عہد و پیمان کو کہنے لگے ۔ اور اَلْوَدِیْعَۃُ ۔ امانت کو جو کسی کے پاس حفاظت کے لئے رکھی جائے ۔ تَوْدِیْعُ الثَّوْبِ ۔ کپڑے کو محفوظ جگہ رکھکر اسے گرد و غبار سے بچا لینا ۔ تَوَدَّعَہٗ ۔ اسے محفوظ مقام میں رکھ دیا* ۔

اَلْوَدِیْعُ ۔ پرسکون اور باوقار آدمی ۔ الوَدْعُ ۔ قبر یا مقبرہ ، جہاں مردہ سکون اور آرام سے پڑا رہتا ہے ۔ اَلْمُسْتَوْدَعُ ۔ وہ مقام جہاں کسی چیز کو بحفاظت رکھ دیا جائے* ۔ قرآن کریم میں ہر جاندار شے کے مُسْتَقَرٌّ

---

*تاج و محیط ۔

اور مُسْتَوْدَعٌ کا ذکر ہے۔ (دیکھئے۔ $\frac{6}{99}$ ؛ $\frac{11}{6}$)۔ جاندار اشیاء کے سلسلہ ارتقاء (Organic evolution) کا اصول یہ ہے کہ ہر شے کچھ وقت کے لئے ایک خاص مقام میں، ایک خاص حالت میں، ٹھہرتی ہے۔ پھر وہاں سے نشو و نما پاتی ہوئی اگلی منزل میں پہنچتی ہے۔ اور اسطرح منزل بہ منزل آگے بڑھتی ہوئی اپنی تکمیل تک جا پہنچتی ہے۔ یہ راستے میں رکنے کے مقامات اس کے مُسْتَقَرٌّ ہیں اور آخری منزل اسکی مُسْتَوْدَعٌ۔ جسے ہم '' راستے میں رکنے کا مقام'' (مُسْتَقَرٌّ) کہتے ہیں اس میں بھی وہ شے جمود کی حالت میں نہیں ہوتی۔ وہاں بھی اسمیں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن وہ تبدیلی ایسی غیر مرئی ہوتی ہے کہ ہم اسے محسوس نہیں کرتے۔ ہمیں اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ تبدیلی نمایاں شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسے ہم اس کی اگلی منزل کہتے ہیں۔

وَدَعَهٗ وَدْعاً۔ اور وَدَّعَهٗ تَوْدِيعاً۔ کسی کو الوداع کہنا۔ کسی کو رخصت کرنا۔ (وَدْعٌ کا ایک مصدر دَعَةٌ ہے جسکے معنی فراخی عیش اور راحت و آرام کے ہیں)۔ اَلتَّوْدَاعُ کہنے والا، مسافر کو یہ دعا دیتا ہے کہ خدا اسے سفر کی مشقت سے محفوظ رکھے اور آرام کی حالت میں پہنچا دے۔ یہ تھی اس لفظ کی اصل۔ بعد میں یہ لفظ مسافر کو رخصت کرنے اور چھوڑنے کے لئے بولا جانے لگا۔ اور اس کے بعد صرف چھوڑ دینے (ترک کر دینے) کے معنی میں استعمال ہونے لگا***۔ چنانچہ سورہ الضحٰی میں مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَاقَلٰى ($\frac{93}{3}$)۔ اور سورہ احزاب میں دَعْ اَذٰهُمْ ($\frac{33}{48}$) کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں۔

و د ق

وَدَقَ اِلَيْهِ۔ اس کے قریب ہوا۔ وَدَقَ الْمَطَرُ۔ آسمان سے بارش برسی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آنے اور مانوس ہونے کے ہیں۔ آسمان سے آنے کی وجہ سے بارش کو الوَدْقُ کہا جاتا ہے۔ محیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے اصلی معنی قریب آنا اور مائل ہونا ہیں**۔ وَدَقَتِ الدَّابَّةُ وَاسْتَوْدَقَتْ کے معنی ہیں مادہ چوپایہ کا، نر کی خواہش کے وقت، رطوبت باہر نکالنا۔ جب سخت بارش ہو رہی ہو اور اس میں غبار سا نظر آئے تو اس غبار کو وَدْقٌ کہتے ہیں۔ اسی طرح جب گرمی کی شدت سے ہوا میں لہریں سی نظر آئیں تو انہیں وَدِيْقَةٌ کہتے ہیں***۔

*تاج و محیط۔ **محیط۔ ***راغب۔

تاج میں ہے کہ ہر قسم کی بارش خواہ زوردار ہو یا ہلکی وَدْقٌ کہلاتی ہے۔ قرآن کریم میں اَلْوَدْقُ بارش کے لئے آیا ہے جب وہ بادلوں میں سے نکلے (۲۴/۴۳)۔

و د ی

وَدَى الشَّيْءُ وَدْيًا۔ وہ چیز بہ پڑی*۔ اَلْوَادِيْ۔ وہ جگہ جہاں پانی بہتا ہو۔ یہ اسکے اصل معنی ہیں۔ اس کے بعد دو پہاڑوں کے درمیان کشادہ زمین کو وادی کہنے لگے**۔ اس کی جمع اَوْدِيَةٌ آتی ہے (۲۲/۳۶)۔ پھر استعارةً طریقہ، مسلک اور اسلوب کو بھی وَادٍ کہدیتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں فُلَانٌ فِيْ وَادٍ غَيْرِ وَادِيْكَ۔ فلاں آدمی تمہارےطریقہ سے جداگانہ طریقہ رکھتا ہے**۔ قرآن کریم میں شاعروں (جذبات پرست انسانوں) کے متعلق کہا ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ (۲۶/۲۲۵)۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ کسطرح ایک ایسے اونٹ کیطرح جسے پیاس کی بیماری بری طرح ستا رہی ہو اور اسکی کہیں تسکین نہ ہوتی ہو مختلف خیالات کی وادیوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ (مزید تفصیل ہ-ی-م کے عنوان میں دیکھئے)۔

اَوْدَاهُ۔ اس نے اس کا خون بہا دیا۔ اسے ہلاک کر دیا**۔ اَوْدَى الرَّجُلُ۔ آدمی ہلاک ہو گیا*۔ یہیں سے اَلدِّيَةُ اس مال کو کہتے ہیں جو مقتول کی جان کے عوض قاتل کی طرف سے مقتول کے ولی کو دیا جاتا ہے***۔ یعنی خون بہا (۴/۹۲)۔

و ذ ر

اَلْوَذْرَةُ۔ گوشت کی چھوٹی بوٹی جس میں ہڈی نہ ہو۔ ذَرْهُ۔ اسے چھوڑ دے۔ هُوَ يَذَرُهُ۔ وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اس لفظ کا مصدر نیز ماضی اور اسم فاعل مستعمل نہیں ہوتے۔ صرف امر اور مضارع مستعمل ہوتے ہیں****۔ (یہ لفظ تَرَكَ کا مرادف ہے)۔

سورۂ المزمل میں ہے وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ (۷۳/۱۱)۔ ہمارے قانون کو جھٹلانے والوں کو ہم پر چھوڑ دو۔ انہیں ہمارے حوالے کر دو۔ ان کے متعلق تم فکر مت کرو۔ ہمارا قانون ان سے خود نپٹ لیگا۔

وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا۔ (۲/۲۳۴)۔ اور اپنی بیویوں کو پیچھے چھوڑجائیں۔

*تاج۔ **راغب۔ ***محیط۔ ****تاج و محیط۔

و ر ث

وَرِثَ اَبَاہُ ۔ وہ اپنے باپ کا وارث ہوا ۔ اَوْرَثَہُ اَبُوْہُ ۔ اسکے باپ نے اسے وارث بنایا ۔ اَلْوِرْثُ ۔ اَلْاِرْثُ ۔ اَلتُّرَاثُ ۔ میراث ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وَرْثٌ اور مِیْرَاثٌ تو مال میں ہوتی ہے اورارْثٌ حسب میں ہوتی ہے ۔ اَلْوَرْثُ ۔ تازہ چیز ۔ اَلْوَارِثُ خدا کی صفت ہے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا کسی کی ملکیت میں ہونا اور پھر اس کے پاس سے دوسروں کی طرف منتقل ہونا ہیں ۔ اس اعتبار سے خدا کے لئے اَلْوَارِثُ کے معنی واضح ہیں ۔

راغب نے کہا ہے کہ وراثتِ حقیقی یہ ہوتی ہے کہ انسان کو کوئی ایسی چیز حاصل ہو جائے جس میں اس پر نہ تو کوئی ذمہ داری عائد ہو اور نہ ہی اس پر اس سے محاسبہ کیا جائے ۔ نیز ہر وہ چیز جو بلا محنت و مشقت حاصل ہو جائے اس کے لئے قَدْ وَرِثَ کَذَا کہتے ہیں ، اور کسی کو خوشگوار چیز بطور عطیہ دینے کے لئے اَوْرَثَ کہا جاتا ہے ۔ وراثت صرف مال ہی میں نہیں ہوتی ۔ وَرِثْتُ عِلْمًا مِنْ فُلَانٍ بھی کہتے ہیں ۔ یعنی میں نے فلاں آدمی سے علم کا استفادہ کیا** ۔ حضرت زکریاؑ نے جب خدا سے دعا کی تھی کہ میرے ہاں بیٹا عطا کردے تاکہ وہ یَرِثُنِیْ وَ یَرِثُ مِنْ آلِ یَعْقُوْبَ (۱۹/۶) ۔ تو وراثت سے ان کی مراد اس خاندان کے علم و فضل کی وراثت تھی ، نہ کہ نبوت کی ۔ کیونکہ نبوت کسی کو ورثہ میں نہیں مل سکتی تھی ۔ یعنی جس طرح بیٹا باپ کی جائداد کا وارث ہو جاتا ہے محض بیٹا ہونے کی جہت سے ، اسی طرح نبی کا بیٹا ، محض اس کا بیٹا ہونے کی جہت سے نبی نہیں ہو سکتا تھا ۔ نبوت خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی ۔ یہ الگ بات تھی کہ ایسے شخص کو بھی خدا نبوت کے لئے منتخب کرلیتا تھا جس کا باپ نبی تھا ۔ اسے یہ منصب باپ سے وراثت میں نہیں ملتا تھا ۔ خدا سے وہبی طور پر ملتا تھا ۔

سورۃ بقرہ میں اَلْوَارِثُ (۲/۲۳۳) ۔ متوفی کے ترکہ کے وارث کے لئے آیا ہے ۔ سورۃ آل عمران میں ہے وَ لِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۳/۱۷۹) ۔ اس میں میراث کے معنے ملک کے ہیں ۔ سورۃ الفجر میں ہے وَ تَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا (۸۹/۱۹) ۔ یہ لوگ میراث کو سمیٹ کر کھا جاتے ہیں ۔ سورۃ

*تاج و محیط ۔ **راغب ۔

اعراف میں ہے۔ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۷/۴۳)۔ یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں ، تمہارے اپنے اعمال کے بدلے میں ، وارث بنایا گیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ وارث کے معنے صرف کسی کے ترکہ کا وارث نہیں بلکہ اپنی محنت کے ماحصل کے مالک کو بھی وارث کہا گیا ہے ۔ وراثت ارض کے بھی یہی معنی ہیں ، جس کے لئے صلاحیت شرط ہے ۔ (۲۱/۱۰۵)۔

و ر د

اَلْوَرْدُ ۔ ہر درخت کے پھول ۔ (اس کا واحدہ وَرْدَةٌ ہے) لیکن بعد میں یہ لفظ گلاب کے پھول کے لئے زیادہ بولا جانے لگا* ۔ اور پھر سرخ یا گلابی رنگ کے لئے ۔ قرآن کریم میں ہے فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (۵۵/۳۷) ۔ وہ دِهَانْ کی طرح سرخ ہوجائے گا ۔ (دھان کے لئے دیکھئے عنوان د ۔ ھ ۔ ن)۔

اَلْوِرْدُ ۔ گھاٹ ۔ (جانوروں کا) پانی کے گھاٹ پر پہنچنا ۔ خواہ اس میں داخل ہوا جائے یا نہ ہوا جائے* ۔ ابن فارس نے بھی لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز تک پہنچ جانے کے ہیں ۔ وہ لوگ یا جانور جو پانی پر آئیں ۔ انہیں بھی اَلْوِرْدُ کہتے ہیں۔ اَلْمَوْرِدَةُ اَلْوَارِدَةُ۔ راستہ ۔ پانی یا گھاٹ تک پہنچنے کا راستہ ۔ اَلْمَوَارِدُ ۔گھاٹ یا راستے۔ اَلْوَارِدُ۔ گھاٹ پر پہنچنے یا اترنے والا ۔ جری ۔ آگے بڑھنے والا* ۔ جو شخص پہلے منزل پر پہنچ کرقافلہ کے جانوروں کے لئے پانی کھینچکر تیار رکھے** ۔ اَوْرَدَهٗ اس کو گھاٹ پر لایا ۔ اَلْوَرِيْدُ ۔ قلب کی رگ* ۔

سورۃ ھود میں ہے وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ (۱۱/۹۸)۔ کتنا برا ہے وہ گھاٹ جس پر اُترا جائیگا۔ سورۃ مریم میں ہے ۔ وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا (۱۹/۸۶) ۔ ہم مجرمین کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح ہنکا کر لائیں گے ۔ سورۃ یوسف میں قافلے کے آگے جا کر پانی وغیرہ لانے والے کے لئے وَارِدٌ کا لفظ آیا ہے (۱۲/۱۹) ۔

سورۃ مریم میں جہنم کے متعلق ہے وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (۱۹/۷۱) ۔ تم میں سے کوئی نہیں جو اس پر وارد نہ ہو۔ اس آیت سے عام طور پر یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ تمام انسان (مومن و کافر سب) جہنم میں داخل ہونگے۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔　**راغب ۔

پھر مومنوں کو اس سے نکال لیا جائے گا اور کافر اس میں رہیں گے (اس کی تائید کے لئے اس سے اگلی آیت - ۱۹/۷۲ - پیش کی جاتی ہے) - لیکن یہ خیال بوجوہ غلط ہے - اس لئے کہ قرآن کریم سے، جہنم سے نکلنے کا ثبوت کہیں نہیں ملتا - جہنم ایسی ''جگہ'' نہیں جہاں سے سزا بھگتنے کے بعد نکل آنا ہوگا - جہنم درحقیقت سلسلۂ ارتقاء میں پیچھے رہ جانے کی کیفیت (State) ہے - یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے کہ اُولٰٓئِکَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَهَا (۲۱/۱۰۱-۱۰۲) - وہ اس سے دور رکھے جائینگے - اتنی دور کہ اس کی آہٹ تک بھی نہ سن سکیں گے - اس اعتبار سے آیت (۱۹/۷۱) میں مِنْکُمْ سے مراد تمام نوع انسانی نہیں بلکہ (جیسا کہ پیچھے سے سلسلۂ کلام چلا آ رہا ہے) اس سے مراد وہی کفار اور سرکش مجرم ہیں جو حیات بعد الممات جیسی اہم حقیقت کے منکر تھے - اور اس کے بعد (۱۹/۷۲ میں) جو ہے ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا تو اس میں ثُمَّ کے معنی ''اس کے بعد'' نہیں - یہ ایک الگ بات کا ذکر ہے - (دیکھئے عنوان ثُمَّ) - نیز نجات کے معنے عذاب سے محفوظ رکھنے کے بھی ہیں - (دیکھئے عنوان ن - ج - و) -

لیکن اگر اس پر اصرار کیا جائے کہ (۱۹/۷۱) میں مِنْکُمْ سے مراد تمام انسان (مومن و کافر سب) ہیں تو، جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، وِرْدٌ میں اندر داخل ہونا ضروری نہیں - اس سے مراد کسی مقام تک صرف پہنچنا ہیں -

اس اعتبار سے یوں سمجھا جائیگا کہ جنت، خواہ دنیوی ہو خواہ اُخروی، اس تک پہنچنے کے لئے تکلیفوں اور مصیبتوں کی بھٹی سے گزرنا پڑے گا - آگ اور خون میں کھیلنا ہوگا - یہ ''پل صراط'' دنیا میں ایک ایک قدم پر موجود ہے جس سے گزر کر جنت کا دروازہ ملتا ہے - جو شخص ان پُر خار وادیوں میں ذرا غیر محتاط (غیر متقی) ہؤا - یا مشکلات و مصائب سے گھبرا کر بھاگ اٹھا - وہ تباہیوں کے جہنم میں گر جائے گا - جو احتیاط برتے گا اور مصائب میں ثابت قدم رہے گا وہ اس سے محفوظ رکھا جائے گا - قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اس حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے کہ جنت میں داخل ہونے سے پہلے سخت دشوار گذار مراحل سے گذرنا ہوگا - (مثلاً ۲/۲۱۴ و ۳/۱۴۱ و ۹/۱۶ و ۳۳/۱۰) - اس کے یہ معنی نہیں کہ مرنے کے بعد کی زندگی میں پہلے مشقتوں اور تکلیفوں سے گذرا جائے گا اور اس کے بعد جنت میں پہنچا جائے گا - اسکے معنی یہ ہیں کہ اس دنیامیں حق و صداقت کے پیامبروں کو مخالفین کی طرف سے تکالیف پہنچائی جائینگی - جو ان تکالیف کو برداشت کرکے جادۂ حق و صداقت

پر قائم رہے گا وہ جنت کا مستحق قرار پائے گا ۔ وہ مرنے کے بعد سیدھا جنت میں چلا جائے گا ۔ جنت اور جہنم کا فیصلہ انسان کے اس دنیا کے اعمال کرتے ہیں ۔

جو حقیقت اوپر بیان ہوئی ہے اسے فلسفہ کی زبان میں یوں کہا جائیگا کہ تخلیق (Creation) کا طریق (Process) یہ ہے کہ ہر تخلیقی تصور (Creative Idea) کے مشہود (Manifest) ہونے سے پہلے ایک داخلی ہیجان اور خلجان ہوتا ہے ۔ (اسے Labour Pains کہئے) ایک کامیاب نابغہ (Genius) اس تکری خلجان اور ہیجان سے کامیاب باہر نکل آتا ہے ۔ خام اور ناکام اس کشمکش میں کھو کر رہ جاتا ہے ۔ تاریخ پر نگاہ ڈالئے ۔ کتنے ہی خامکار مفکر اس گرداب میں پھنسے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔

نبوت اس طریق (Process) سے ماورا ہوتی ہے کیونکہ وہ صاحب وحی کی خود پیدا کردہ فکر نہیں ہوتی ۔

و ر ق

اَلْوَرَقُ درخت کے پتے ۔ ایک پتے کو وَرَقَةٌ کہتے ہیں * ۔ قرآن کریم میں ہے وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ (۶/۵۹) ۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ اَلْوَرَقُ چاندی کو کہتے ہیں خواہ وہ ٹھپہ لگی ہوئی ہو یا نہ ہو ۔ ابوالہیثم نے کہا ہے کہ اَلْوَرَقُ ۔ اَلْوَرِقُ اور اَلرِّقَةُ ۔ خصوصیت کے ساتھ دراہم کو کہتے ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) خیر اور مال ۔ اور (۲) خاکستری رنگ کے ہیں ۔ سورۂ کہف میں ہے فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ (۱۸/۱۹) ۔ اس کے معنی سکّے کے ہیں ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ کلام قدیم میں وَرَقٌ ان جھلیوں اور کھالوں کو کہتے تھے جن پر لکھا جاتا تھا** ۔ اسی سے کتاب کے اوراق ہیں ۔

و ر ی

اس مادہ میں چھپنے اور ظاہر ہونے کے ، دونوں معنی پائے جاتے ہیں ۔ وَرَتِ النَّارُ ۔ آگ بھڑکی ۔ اَوْرَى النَّارَ ۔ آگ بھڑکائی ۔ اور وَرَّاهُ تَوْرِيَةً ۔ اس کو چھپا دیا ۔ دراصل اس میں چھپانے اور ظاہر کرنے کے دونوں پہلو بیک وقت موجود ہوتے ہیں ۔ مثلاً چقماق کے اندر آگ پوشیدہ ہوتی ہے ۔ اور جب اس سے نکلتی ہے تو روشن ہوجاتی ہے ۔ اس لئے کہتے ہیں

* تاج ۔ ** محیط ۔

وَرَیَ الزَّنْدُ - چقماق سے آگ نکلی - اسی بناء پر وَرَّیَ الْخَبَرَ کے معنی ہیں اصل بات کو چھپا کر اسے کسی اور طریق سے ظاہر کیا*- وَارَاہُ اسے چھپایا - یُوَارِیْ (۵/۳۱) چھپائے - تَوَارَیٰ - چھپا*- تَوْرِیَۃٌ - ایہام*- ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ کسی قیاس کا پابند نہیں -

اَلْوَرَاءُ - پوتے کو کہتے ہیں***- وَمِنْ وَّرَاءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ (۱۱/۷۱) کی یہی تفسیر کی گئی ہے - یعنی حضرت ابراہیمؑ کو ان کے بیٹے اسحٰقؑ کی بشارت ملی اور اسحٰقؑ سے آگے ، ایک پوتے یعقوبؑ کی -

تَوْرَاۃٌ کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اسی مادہ سے ہے* - ایسی صورت میں اس کے معنے ہوں گے - وہ شے جس سے آگ یا روشنی حاصل کی جائے - (کتاب تورات کے لئے دیکھئے عنوان تَوْرَاتٌ) - وَرَاءَ ذٰلِکَ - یعنی سِوَیٰ ذٰلِکَ - اس کے سوا کچھ اور** - وَیَکْفُرُوْنَ بِمَا وَرَاءَہٗ (۲/۹۱) - اس کے علاوہ اور جو کچھ بھی ہے اس سے انکار کرتے ہیں -

سورۃ واقعہ میں ہے - اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ (۵۶/۷۱) - کیا تم نے آگ پر غور کیا جسے تم روشن کرتے ہو - اور سورۃ عادیات میں ہے - فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا (۱۰۰/۲) - وہ گھوڑے جن کے ٹاپ مارنے سے آگ کی چنگاریاں نکلتی ہیں -

وَرَاءٌ - وَرْیٌ کے بنیادی معانی (چھپنے اور ظاہر ہونے) کے لحاظ سے وَرَاءُ کے معنی بھی پیچھے اور آگے دونوں آتے ہیں* - قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ، سیاق و سباق کے لحاظ سے اس کے معانی متعین کئے جائینگے -

و ز ر

اَلْوَزَرُ - بلند اور محفوظ پہاڑ - وہ پہاڑ جس میں پناہ لی جائے - ہر جائے پناہ یا حفاظت گاہ *- چنانچہ قرآن کریم میں ہے کَلَّا لَا وَزَرَ (۷۵/۱۱) - کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں بھاگ کر پناہ لی جائے****-

اَلْوِزْرُ - بار گراں - بہت بڑی ذمہ داری - اسکی جمع اَوْزَارٌ ہے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) ملجا ، جائے پناہ اور (۲) کسی چیز میں گرانی اور بھاری پن کے ہیں - وَزَرَ - اس نے بوجھ اٹھایا - وَازِرٌ بوجھ اٹھانے والا *- قرآن کریم میں ہے لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۶/۱۶۵) - کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا-

---

*تاج - **محیط - ***ابن قتیبہ (القرطین - جلد ۱) - نیز ابن فارس - ****کتاب الاشتقاق -

ہر ایک کو اپنی اپنی ذمہ داری خود پوری کرنی ہوگی۔ اور کسی کو کسی دوسرے کے اعمال کی سزا نہیں ملے گی۔ نہ ہی کوئی کسی دوسرے کے اعمال کی جزا اور سزا میں حصہ دار ہوگا۔ قانون مکافات کا یہ عظیم الشان اصول ہے جسکا قرآن کریم نے اسطرح اعلان کیا ہے۔ اپنی اپنی ذمہ داری اور اپنے اپنے کئے کا پھل۔ آج کے جہنمی معاشرہ کا سا حال نہیں کہ — دانہ این می کارد، آن حاصل برد۔ محنت کوئی کرے، عیش کوئی اڑائے۔ جرم کوئی کرے، سزا کوئی بھگتے۔ غلطیاں کسی سے ہوں، اسکے نتائج کوئی برداشت کرے۔ تنخواہ کوئی پائے، ذمہ داریاں کوئی اٹھائے۔ قرآنی معاشرہ میں یہ کچھ نہیں ہوگا۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰى وہاں کا غیر متبدل اصول ہوگا۔

وَزِيرٌ و مُوَازِرٌ۔ جس پر ذمہ داری ہو۔ وہ جو کسی کے بوجھ میں شریک ہو*۔ راغب نے المُوَازَرَة کے معنی معاونت بتائے ہیں اور وَزِيرٌ کے معنی معاون و مدد گار۔ نیز امیر کا بوجھ اور ذمہ داریاں اٹھانے والا**۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ اَهْلِي (۲۰/۲۹)۔ "میرے اہل میں سے میرا بوجھ بٹانے والا بنا دے"۔

اَوْزَارُ الْحَرْبِ۔ جنگ کے ہتھیار (۴۷/۴)۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ جماعت مومنین ضرورۃً جنگ اس لئے کرتی ہے کہ "خود جنگ اپنے ہتھیار رکھدے"۔ یعنی جنگ کا امکان نہ رہے۔ دنیا میں امن و سلامتی ہو جائے۔ حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۴۷/۴)۔ "تاآنکہ جنگ اپنے ہتھیار رکھدے"

و ز ع

وَزَعْتُهُ اَزَعُهُ وَزْعاً۔ میں نے اس کو روک دیا۔ منع کردیا۔ فَاتَّزَعَ۔ پس وہ رک گیا۔ اَلْوَازِعُ۔ روکنے اور باز رکھنے والا۔ اس جہت سے یہ حاکم اور والی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ نیز ان سپاہیوں اور سرکاری کارندوں کے لئے بھی جو لوگوں کو بے قانون ہونے سے روکیں۔ نیز وہ شخص جو فوجی امور کی تدبیر کرے اور فوج کو نظم و ضبط میں رکھے۔ کمانڈار***۔ سورہ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے جیوش و عساکر (لشکروں) کے متعلق ہے فَهُمْ يُوزَعُونَ (۲۷/۱۷) اس کے یا تو یہ معنی ہیں کہ وہ نہایت ترتیب سے صف در صف رہتے تھے، ادھر ادھر بکھرے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ یا یہ کہ انہیں ایسے نظم و ضبط میں رکھا تھا کہ وہ کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی کسی پر ظلم و زیادتی کرتے تھے۔ اسی سورۃ میں ذرا

*تاج۔ **راغب۔ ***تاج و راغب۔

آگے چل کر حضرت سلیمانؑ کی یہ دعا مذکور ہے کہ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ (۲۷/۱۹) - اس کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے نشو و نما دینے والے مجھے ایسی تمام چیزوں سے روک دے جو تیرے شکر کے راستے میں حائل ہوتی ہوں - مجھے اتنا ضبط عطا کر دے کہ میں اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف تیرے متعین کردہ راستے میں صرف کروں - اھل لغت نے کہا ہے کہ یہاں اَوْزِعْنِیْ کے معنی توفیق دینا - سمجھانا - اور کسی چیز کا شیدائی بنانا بھی ہیں - جب کسی کو غلط راستے پر چلنے سے روک دیا جائے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اسے صحیح راستے پر لگ جانے کی توفیق دیدی -

سورہ حم سجدہ میں اھل جہنم کے متعلق ہے کہ فَھُمْ یُوْزَعُوْنَ (۴۱/۱۹) وہ روک دیئے جائینگے (اس کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ج - ح - م میں جَحِیْمٌ) -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے الفاظ کسی قیاس اور قاعدے کے پابند نہیں -

و ز ن

اَلْوَزْنُ - ھاتھ سے کسی چیز کے ھلکے یا بھاری ھونے کا اندازہ کرنا*- کسی چیز کی مقدار معلوم کرنا** - بعض نے کہا ہے کہ وَزْنٌ - ھلکا یا بھاری ھونے کو کہتے ہیں ، لیکن لیث کا قول ہے کہ وَزْنٌ ایک چیز کے بوجھ کا دوسری چیز کے بوجھ کے برابر ھو جانا ہے - وَزَنَ - یَزِنُ - وزن کرنا - وزن کرکے دینا * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی استقامت اور تناسب و اعتدال کے ہیں نیز دو چیزوں کے وزن کو برابر کرنے کے -

قرآن کریم نے وَزْنٌ کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے خاص اصولی معنوں میں استعمال کیا ہے - نظام کائنات پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ سارا سلسلہ تَوَازُن کی رو سے قائم ہے - اگر مختلف اشیاء کا باھمی توازن بگڑ جائے تو یہ سارا نظام درھم برھم ھو جائے - اس کے لئے فرمایا - وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَ وَضَعَ الْمِيْزَانَ (۵۵/۷) - خدا نے اس سلسلہ کائنات کو ان بلندیوں پر قائم کیا اور تمام اشیاء میں ایک توازن رکھ دیا - مختلف فضائی کرّوں اور اجرام فلکی کی باھمی جذب و کشش اس عظیم المثال توازن کی زندہ شہادت ہے - چونکہ انسان بھی کائنات ہی کا ایک جزو ہے اس لئے ضروری ہے کہ اسکی دنیا میں بھی یہی توازن (Equilibrium) قائم رہے -

---

*تاج - **راغب -

اَلَّا تَطْغَوا فِی الْمِیْزَانِ (۵۵/۸) ۔ لہذا تم اپنی تمدنی، معاشرتی اور معاشی دنیا میں ہمیشہ اس اصول کو پیش نظر رکھو وَ اَقِیْمُوْا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوْا الْمِیْزَانَ (۵۵/۹)۔ معاشرتی اور معاشی توازن کو عدل و انصاف کے ساتھ برقرار رکھو اور معاشرہ کا توازن کبھی بگڑنے نہ دو۔ ظاہر ہے کہ معاشرہ کا یہ توازن صرف قانون کے الفاظ سے قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک عملی نظام قائم کیا جائے جو اس توازن کے قیام کا ذمہ دار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ خدا نے صرف ضابطہ' قوانین ہی نازل نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ اَلْمِیْزَانُ بھی نازل کی ہے۔ یعنی معاشرہ میں توازن قائم رکھنے کا ذمہ دار عملی نظام۔ وہی نظام وہ معیار بنتا ہے جس سے ہر شے کا صحیح صحیح ''وزن'' متعین ہوتا ہے۔ وَ اَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتَابَ وَ الْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷/۲۵)۔ لیکن دنیا میں کوئی نظام قوت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اس لئے کہا کہ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ (۵۷/۲۵)۔ اس کے لئے ہم نے فولاد (کی شمشیر) بھی نازل کی۔ یہ ہے قرآنی نظام کا صحیح نقشہ۔ یعنی خدا کی طرف سے ابدی قوانین کا ضابطہ (الکتاب)۔ اس ضابطہ کو عملی طور پر متشکل کرنے کے لئے نظام (المیزان)۔ اور اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے قوت (الحدید)۔ حدید کے متعلق فرمایا کہ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵)۔ اس کی شدت اور سختی، فتنہ و فساد برپا کرنے والے عناصر کے لئے روک تھام کا کام دیتی ہے اور یوں یہ قوت، نوع انسانی کے لئے فی الجملہ۔ باعث منفعت بن جاتی ہے۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جو کچھ ملتا ہے سعی و عمل کے مطابق ملتا ہے۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ۔ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ۔ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ (۱۰۱/۶-۹)۔ جس کی سعی و عمل کا پلڑا بھاری ہوگا اسے عیش فراواں کی زندگی نصیب ہوگی۔ جسکا پلڑا ہلکا ہوگا وہ ذلت و رسوائی کے آغوش میں چلا جائیگا۔ (مَوَازِیْنُ۔ مِیْزَانٌ کی جمع ہے)۔ اس نظام میں ہر چیز کا وزن ٹھیک ٹھیک، یعنی ہر عمل کا نتیجہ صحیح صحیح مرتب ہوگا۔ وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ (۷/۸)۔ اور تمام وہ کوششیں جو خدا کے نظام ربوبیت عامہ کے خلاف ہوں گی بے نتیجہ ہو کر رہ جائینگی۔ فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا (۱۸/۱۰۵)۔ اسطرح یہ معاشی اور معاشرتی نظام، کائناتی نظام سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے جس میں ہر شے موزون ہے۔ وَاَنْبَتْنَا فِیْهَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ (۱۵/۱۹)۔ یعنی ایک خاص تناسب (Proportion) کو لئے ہوئے۔

توازن کے اعتبار سے وَزِیْنُ الرَّأْیِ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی رائے بہت صحیح اور وزندار ہو۔ اور رَاجِحُ الْوَزْنِ اس شخص کو جو کامل العقل اور کامل الرائے ہو*۔ اور اَوْزَنُ الْقَوْمِ۔ قوم کے بہترین و معزز ترین فرد کو کہتے ہیں**۔

و س ط

اَلْوَسَطُ۔ ہر چیز کا درمیانی حصہ۔ وہ نقطہ جو دونوں اطراف سے برابر فاصلے پر ہو۔ وُسُوْطُ الشَّمْسِ۔ آفتاب کا آسمان کے درمیان آ جانا۔ مُتَوَسِّطُ الْبَیْتِ۔ وہ چیز جو خصوصیت سے گھر کے درمیان واقع ہو*۔ محیط میں ہے کہ اَلْوَسَطُ اور اَلْوَسْطُ اس درمیانی جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے تمام اطراف کا فاصلہ برابر ہو**۔

چونکہ ہر چیز کا اوسط (درمیانی نقطہ) نقطۂ اعتدال ہوتا ہے، یعنی افراط و تفریط کے بالکل درمیان، اس لئے یہ لفظ ہر عمدہ اور بہترین چیز کے لئے بولا جاتا ہے۔ وَاسِطَةُ الْقِلَادَةِ۔ ہار کا درمیانی موتی جو نفیس ترین ہوتا ہے۔ وَسَاطَةُ الدَّنَانِیْرِ۔ بہترین دینار*۔ اَلْوَاسِطَةُ۔ درمیانی۔ بیچ میں پڑنے والا۔ علت (کسی چیز کا ذریعہ اور سبب)**۔ اَلْوَسِیْطُ۔ وہ شخص جو جھگڑا کرنے والوں کے بیچ میں پڑے*۔ قرآن کریم میں جنگ کے گھوڑوں کے متعلق ہے فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (۱۰۰/۵)۔ وہ دشمنوں کی صفوں کے اندر جا گھستے ہیں۔

قرآن کریم میں امت مسلمہ کے متعلق ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳)۔ اس طرح ہم نے تمہیں ایک امت وَسَط بنایا ہے جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگرانی کرے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ اس قوم کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو اور وہ ہر قوم سے برابر فاصلے پر ہو (Equidistant)۔ یعنی نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی اور نہ کسی سے کھنچی ہوئی۔ اس کی نگاہوں میں سب برابر ہوں، جس طرح دائرے کے مرکز سے محیط کا ہر نقطہ برابر فاصلے پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پوزیشن اس قوم کو حاصل ہو سکتی ہے جو عدل اور انصاف کے راستے سے ذرا بھی ادھر ادھر نہ ہٹے۔ اس قسم کی قوم صحیح معنوں میں اقوام عالم کے اعمال و افعال کی نگران اور محتسب ہو سکتی ہے۔ لہذا امت وَسَط سے مراد ایسی قوم ہے جسے بین الاقوامی

*تاج۔ **محیط۔

اور مرکزی پوزیشن حاصل ہو۔ جو تمام اقوام کے افعال و حرکات کی نگران ہو اور بین الاقوامی معاملات کو پورے پورے عدل و انصاف سے سلجھائے۔ قرآن کریم نے یہ مقام متعین کیا تھا جماعت مومنین کا۔

یہ نقطہ بھی غور طلب ہے کہ قرآن کریم نے اس قسم کا بین الاقوامی نظام اور اقوام عالم کے متنازعہ فیہ امور کے تصفیہ کے لئے اس قسم کا انتظام اس زمانے میں تجویز کیا تھا جب دنیا ہنوز "بین الاقوامی" تصور تک سے نا آشنا تھی۔

و س ع

وَسِعَ۔ یَسَعُ۔ سَعَۃٌ۔ قدرت رکھنا۔ طاقت رکھنا۔ اختیار رکھنا۔ مَا اَسَعُ ذَالِکَ۔ میں اس کی قدرت نہیں رکھتا۔ هٰذَا الْاِنَاءُ یَسَعُ عِشْرِیْنَ کَیْلًا۔ اس برتن میں بیس پیمانہ بھر چیز سمانے کی گنجائش ہے۔ اَلْوَاسِعُ۔ اَلْوَسِیْعُ۔ فراخ۔ کشادہ۔ اَلْوَسْعُ اَلْوُسْعُ اَلْوِسْعُ اَلسَّعَۃُ۔ ان سب کے معنی، فارغ البالی۔ کشادگیٔ رزق۔ قدرت اور طاقت کے ہیں۔ اَلْوَسَاعُ۔ اُس گھوڑے کو کہتے ہیں جو لمبی لمبی ڈگ بھرتا ہوا تیزی سے دوڑے*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی تنگی اور بدحالی کی ضد بتائے ہیں۔

راغب نے لکھا ہے کہ وُسْعٌ اس طاقت کو کہتے ہیں جو اس کام سے ذرا زیادہ ہو جو اس کے سپرد کیا جائے۔ اس لئے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ($\frac{2}{286}$) کے معنی یہ ہیں کہ خدا بندے کے ذمہ اتنا ہی کام لگاتا ہے جو اس کی طاقت سے ذرا کم ہوتا ہے**۔ (اس کا صحیح مفہوم آگے آتا ہے)۔ اَلْمُوْسِعُ۔ صاحب اختیار و وسعت*۔ اَلْوَاسِعُ۔ خدا کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے*۔

قرآن کریم میں اَلْمُوْسِعُ۔ اَلْمُقْتِرُ۔ کے مقابلہ میں آیا ہے ($\frac{2}{236}$)۔ یعنی وہ جسے رزق کی کشادگی نصیب ہو۔ یہی معنی سورۃ نور میں اُولُوا السَّعَۃِ کے ہیں ($\frac{24}{22}$)۔ یعنی آسودہ حال اور کشائش والے لوگ۔ سورۃ ذاریٰت میں ہے اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ($\frac{51}{47}$)۔ ہم صاحب وسعت ہیں۔ یعنی ہماری قدرت اور اختیارات بھی وسیع ہیں اور ہم رزق میں فراخی اور کشادگی بھی عطا کرتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ($\frac{2}{255}$)۔ اس کا علم تمام کائنات کو محیط ہے۔ علم ہی نہیں بلکہ رحمت (سامان ربوبیت) بھی ($\frac{7}{156}$)۔

---

*تاج۔ **محیط۔

قرآن کریم میں ہے ۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (۲/۲۸۶ و ۶/۱۵۳ و ۷/۴۲ و ۲۳/۶۲) ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ خدا جو اپنے احکام و قوانین کی اطاعت چاہتا ہے تو اس سے اس کا اپنا کوئی فائدہ مطلوب نہیں ۔ یہ صرف اس لئے ہے کہ انسانی ذات میں وسعت پیدا ہوجائے ۔ اس کی قدرت و اختیارات کا دائرہ وسیع ہو جائے ۔ اسے کشادگی اور فراخی نصیب ہوجائے** ۔ سورۃ اعراف میں اس کے ساتھ کہا گیا ہے اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ (۷/۴۲)۔ ان وسعتوں اور فراخیوں کا نام جنت کی زندگی ہے ۔ یعنی اس دنیا میں رزق اور زندگی کی خوشگواریوں کی وسعت اور کشاد ، اورخود انسانی ذات (Personality) کے اختیارات و ممکنات کے دائرے کی وسعت ، جس سے انسان اُخروی زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے ۔ یہ وہ جنت ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو محیط ہے ۔ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ (۵۷/۲۱) ۔

راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا کےمعنی یہ ہیں کہ ان احکام کا ثمرہ وسعت ہے۔ یعنی جنت ۔ یہ اسی مفہوم کی تائید میں ہے جیسے دوسری جگہ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (۲/۱۸۵) سے ادا کیا گیا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا کے یہ معنے بھی ہیں کہ خدا ایسے احکام دیتا ہے جو کسی کی قوت برداشت سے زیادہ نہ ہوں ۔ اس آیت کا عام مفہوم بھی لیا جاتا ہے ۔ لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات پر پہلا مفہوم زیادہ موزوں نظرآتاہے ۔ قرآنی تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ انسانی ذات کی نشو و نما ہے جس سے اس کی صلاحیتوں اور ممکنات کا دائرہ بڑا وسیع ہو جاتا ہے ۔

و س ق

وَسَقَ یَسِقُ وَسْقًا ۔ چیزوں کو ملانا ۔ متفرق چیزوں کو اکٹھا اور جمع کرنا ۔ نیز بوجھ اٹھانا ۔ کسی چیز کو اپنے اندر لے لینا ۔ وَسَقَتِ النَّاقَۃُ ۔ اونٹنی نے نر کے جنسی مادہ کو اپنے اندر رحم میں جمع کرکے اس کا منہ بند کر لیا ۔ یعنی وہ حاملہ ہوگئی۔ اِسْتَوْسَقَتِ الْاِبِلُ ۔ اونٹ جمع ہوگئے* ۔ نواب صدیق خاں نے لکھا ہے کہ (و ۔ س ۔ ق) کا خاصہ شدت اور اجتماع ہے*** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو اٹھا لینا بتائے ہیں ۔

*تاج و راغب ۔ **راغب ۔ ***العلم الخفاق ۔

قرآن کریم میں ہے وَ اللَّیْلِ وَمَا وَسَقَ (۸۴/۱۷) ۔ رات اور ہر وہ شے جسے وہ جمع کرلیتی ہے ۔ یعنی تاریکیاں ۔ یا ستارے اور چاند ۔ وَسْقٌ ۔ ایک اونٹ کا بار ۔ ساٹھ صاع ۔ اِتِّسَاقٌ ۔ ہر چیز کے مل جانے اور اس کے اجزاء کے اکٹھے ہو جانے کو کہتے ہیں*۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ (۸۴/۱۸)۔ اس میں چاند کے کامل ہو جانے کا مفہوم ہے ۔ اِتِّسَاقُ الْقَمَرِ ۔ چاند کے بھر پور ، کامل اور برابر ہو جانے کو کہتے ہیں ۔ یہ حالت تیرھویں سے سولھویں رات تک ہوتی ہے ۔

و س ل

اَلْوَسِیْلَۃُ ۔ کسی چیز کی طرف رغبت کے ساتھ پہنچنا ۔ لہذا مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ اَلْوَصِیْلَۃُ سے زیادہ خاص ہے کیونکہ وَصِیْلَۃٌ کے معنی کسی چیز تک پہنچنا ہیں اور وَسِیْلَۃٌ کے معنی رغبت کے ساتھ پہنچنا*۔ اس کے معنی منزلت ۔ مقام ۔ مرتبہ کے ہیں *۔ نیز ہر وہ چیز جس کے ذریعے کسی دوسرے سے قرب حاصل کیا جائے ۔ نیز قُرْبَۃٌ ۔ یعنی قدرو منزلت کے اعتبار سے کسی سے قریب ہونا**۔ تَوَسَّلَ اِلَیَّ بِکَذَا ۔ اس نے میری طرف فلاں چیز کے ذریعے قرب حاصل کیا***۔ صاحب تاج العروس اور محیط نے وَسِیْلَۃٌ کے معنی مرتبہ ۔ درجہ ۔ قرب ۔ تعلق کے لکھے ہیں ۔ تَوَسَّلَ اِلَی اللّٰہِ تَوَسُّلًا ۔ اس نے کوئی ایسا کام کیا جس سے اسے خدا کا قرب حاصل ہوگیا ۔ اَلْوَاسِلُ ۔ رغبت کرکے کسی کا قرب حاصل کرنے والا **۔

سورہ مائدہ میں ایک آیت ہے جس کے غلط (مروجہ) مفہوم نے ، اسلام جیسے حیات بخش دین (نظام زندگی) کو اشخاص پرستی کا طلسم بنا کر رکھ دیا ہے ۔ وہ آیت یہ ہے ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵/۳۵) ۔ اس کا سیدھے سادے الفاظ میں ترجمہ یہ ہے ۔ ”اے ایمان والو ! تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو ۔ اور اس کی طرف ” وسیلہ “ طلب کرو ۔ اور اس کی راہ میں جہاد کرو ۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ “ ۔ ہم نے اس میں لفظ ” وسیلہ “ کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا ہے کیونکہ اسی کے غلط مفہوم پر اشخاص پرستی کی وہ عمارت قائم کی جاتی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ۔ لفظ ” وسیلہ “ کے جو لغوی معنی اوپر دئے گئے ہیں ان کی رو سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے ایمان والو! تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو ۔ اور خدا کے ہاں درجہ مرتبہ ، قرب ، منزلت طلب کرو ۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کے راستے

* راغب ۔ ** تاج و محیط ۔ ***ابن قتیبہ (القرطین جلد اول صفحہ ۱۳۱) ۔

میں پوری پوری جدو جہد کرتے رہو۔ اس سے تم مقصد زندگی کے حصول میں کامیاب ہو جاؤ گے ۔ یعنی خدا کے ہاں قدرو منزلت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی راہ میں مسلسل جدو جہد کرتے رہو۔

اور اگر لفظ " وسیلہ " کا ترجمہ " ذریعہ " کیا جائے تو بھی مطلب یہ ہوگا کہ تم اللہ کے ہاں عزت و منزلت ۔ درجہ اور مرتبہ حاصل کرنے کا ذریعہ طلب کرو۔ یعنی اس کے راستے میں جہاد کرو۔ دونوں صورتوں میں مفہوم ایک ہی ہے ۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ وہ عمل صالح ہے جو خدا کے ہاں درجہ اور مرتبہ ملنے کا ذریعہ بنتا ہے ۔ اس طریق سے تم خدا کے مقرب بن سکتے ہو۔ لیکن ہمارے ہاں اس آیت کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لئے " وسیلے " کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اور وہ وسیلہ ہے " پیرو مرشد " ۔ لہذا مرشد (پیر طریقت) کے بغیر خدا تک نہیں پہنچا جا سکتا ۔

اور جب " وسیلہ " کے معنی " پیر پکڑنے " کے کر لئے تو " جَاهِدُوْا " کے معنی ہو گئے " اپنے نفس سے جہاد کرنا " ۔ جسے جہاد اکبر قرار دیا جاتا ہے ۔ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ، انسانوں کو قرار دینے والے اس دین (اسلام) کے نام لیوا ہیں جو دنیا سے شخصیت پرستی کو مٹا کر ، خدا اور بندے کا براہ راست (قرآن کریم کے ذریعے) تعلق پیدا کرنے کے لئے آیا تھا ۔ اس دین کے عطا کرنے والے خدا کا اعلان یہ تھا کہ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ۔ " جب میرے بندے تجھ سے (اے رسول) میری بابت پوچھیں تو (کہدو کہ) میں ان سے قریب ہوں " اتنا قریب کہ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۔ " میں ہر شخص کی پکار کا ، جو مجھے پکارتا ہے ، جواب دیتا ہوں " ۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ ۔ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ (۲/۱۸۶) " انہیں چاہئے کہ میری فرمانبرداری کریں ۔ اور مجھ پر ایمان رکھیں ۔ تا کہ انہیں رشدوھدایت مل جائے " ۔ بات کسقدر صاف ہے ۔ جو شخص قوانین خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور ان کی اطاعت کرتا ہے ، اسے وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے جس کے لئے دوسرے لوگ " مرشد " تلاش کرتے رہتے ہیں ۔ (یَرْشُدُوْنَ کا لفظ اسی طرف اشارہ کرتا ہے)۔ خدا کے علاوہ کوئی " مرشد " (راہ بتانے والا) نہیں (دیکھئے ۱۸/۱۷) ۔ خدا کے قوانین کی اطاعت اس نظام کی رو سے ہوتی ہے جو اس کے قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے ۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں (حضرت عمرؓ کے الفاظ میں) " خدا اور بندے کے درمیان کوئی اور طاقت حائل نہیں رہتی " ۔ یہی وہ صحیح آزادی

ہے جسے عطا کرنے کے لئے نبی اکرمؐ مبعوث ہوئے تھے (۷/۱۵۷) ۔ لیکن ہم نے اس آزادی کی جگہ ، انسان پرستی کی مقدس زنجیروں سے اپنے آپ کو اس طرح جکڑ لیا کہ ہمارے فکر و عمل کا کوئی گوشہ بھی آزاد نہ رہ سکا ۔ یاد رکھئے ۔ مسلمان ، دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل صرف اس وقت ہو سکے گا جب اس نے انسانوں کی چوکھٹوں سے سر اٹھا کر صرف اللہ کے سامنے جھکنے کا مسلک اختیار کر لیا ۔

و س م

اَلْوَسْمُ ۔ تپائے ہوئے لوہے سے داغ دینا یا نشان لگانا ۔ اَلْوِسَامُ ۔ وہ نشان جو داغ دینے سے پڑ جائے ۔ وَسَمَ یَسِمُ وَسْماً ۔ جانور کو لوہے سے داغ دیکر نشان زدہ کرنا ۔

اَلسِّمَۃُ ۔ علامت ۔ نشانی ۔ فُلَانٌ مَوْسُوْمٌ بِالْخَیْرِ ۔ فلاں آدمی پر بھلائی کا نشان ہے ۔ مَوْسِمُ الْحَجِّ ۔ وہ زمانہ جو اجتماعِ حج کے لئے نشان زد کر دیا جائے ۔ تَوَسُّمٌ فراست و ذکاوت کو کہتے ہیں ۔ اَلْوَسْمِیُّ ۔ موسمِ بہار کی ابتدائی بارش (جس سے زندگی اور حسن کی نمود کی نشان دہی ہو جاتی ہے) * ۔

قرآن کریم میں ہے سَنَسِمُہٗ عَلَی الْخُرْطُوْمِ (۶۸/۱۶) ۔ ہم اس کی ناک پر داغ دینگے ۔ (ذلت و خواری مفہوم ہے) ۔ سورۃ حجر میں ہے ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ (۱۵/۷۵) ۔ اس میں صاحبان فراست کے لئے نشانیاں ہیں ۔ ان لوگوں کے لئے جو آثار و قرائن سے حقائق کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

و س ن

اَلْوَسَنُ ۔ اَلسِّنَۃُ ۔ نیند کی ابتدا یا اونگھ یا نیند کے جھونکے کو کہتے ہیں ۔ اس کا اگلا درجہ نَوْمٌ ہوتا ہے ۔ نیز اس کے معنی غفلت ہونے ہیں ۔ ھُوَ فِیْ سِنَۃٍ ۔ وہ غفلت میں ہے * ۔ اسکے معنے نیند کی گرانی اور شدت بھی ہیں ** ۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے ۔ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ (۲/۲۵۵) ۔ بے خبر ہونا تو ایک طرف وہ کسی شے سے غافل تک بھی نہیں ہوتا ۔

---

* تاج و راغب ۔ ** تاج ۔

و س و س

اَلْوَسْوَاسُ - ہلکی سی آہٹ - شکاری کی آہٹ - دبے پاؤں چلنے سے پیدا ہونے والی خفیف سی آہٹ - چلنے میں زیور کے بجنے کی ہلکی آواز کو بھی کہتے ہیں (جس سے سننے والے کے دل میں عجیب سے خیالات پیدا ہوتے ہیں)*- دل میں مختلف قسم کے خیالات گذرنے کو بھی کہتے ہیں - نیز ہر غیر واضح کلام کو جس میں مختلف آوازیں مل گئی ہوں - نیز ایسی گفتگو کو جو بغیر نظم و ترتیب کے ہو* - راغب نے الوَسْوَسَةُ کے معنی برے خیال کا دل میں گذرنا لکھے ہیں -

قرآن کریم میں ہے فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ (۲۰/۷) - "پھر شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا" - اس سے مراد وہ خیالات ہیں جو خود غرضی کے جذبات انسان کے دل میں پیدا کرتے ہیں - یا جنہیں شرپسند لوگ کسی کے دل میں پیدا کریں - اَلْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُوْرِ النَّاسِ (۱۱۴/۵-۴) - وہ جو دبے پاؤں آکر چپکے سے لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال دیتا ہے - ایسے لوگ اسلامی معاشرہ میں فتنہ و فساد پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں - ان سے محتاط اور محفوظ رہنے کی سخت تاکید کی گئی ہے -

و ش ی

اَلْوَشْیُ - کپڑے پر (مختلف رنگوں سے) نقش و نگار بنانا - یہ اس کے بنیادی معنی ہیں** - راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز میں اس کے تمام رنگ کے خلاف کوئی رنگ لگانا ہیں*** - اسکے بعد یہ لفظ رنگ آمیزی کے معنوں میں استعمال ہونے لگا - چنانچہ کہتے ہیں وَشَی النَّمَّامُ كَلَامَهُ - چغلخور نے اپنی بات میں جھوٹ بول کر رنگ آمیزی کی**- قرآن کریم میں بنی اسرائیل کی گائے کے متعلق ہے - مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا (۷۱/۲) - وہ بالکل صحیح اور سالم ہے اور اس پر کوئی داغ نہیں ہے - یعنی کسی ایسے رنگ کا نشان نہیں جو اسکے سارے بدن کے رنگ کے خلاف ہو -

و ص ب

وَصَبَ يَصِبُ - وُصُوْبًا - کسی چیز کا دائم اور ثابت رہنا - اَوْصَبَ کے بھی یہی معنی ہیں - (یہ متعدی بھی ہو جاتا ہے) - وَصَبَ عَلَى الْأَمْرِ - اس نے اس بات پر مداومت کی اور حسن کارانہ اسے انجام دیا -

*تاج و محیط و راغب - **تاج - ***راغب -

مَفَازَةٌ وَاصِبَةٌ ۔ بہت ھی لمبا چوڑا لق و دق بیابان جسکی انتہا نہ ہو۔ اَلْوَصَبُ ۔ ہمیشہ رہنے والی بیماری ۔ اسی سے اَلْاَوْصَابُ بیماریوں کو کہتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا (۱۶/۵۲) ۔ کائنات کی ہر شے خدا کی فرمان پذیری کر رہی ہے اور ایسا مداومت سے ہو رہا ہے ۔ مسلسل و پیہم ایسا ہو رہا ہے ۔ (انسان کے لئے بھی ایسا کرنا ضروری ہے) ۔ دوسری جگہ ہے وَلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ (۳۷/۹) ۔ لازم ہو جانے والا عذاب ۔

و ص د

اَلْوَصِيْدُ ۔ صحن ، آنگن ۔ دروازے کی چوکھٹ ۔ پتھروں سے بنایا ہوا احاطہ ، جو اونٹوں کے لئے پہاڑ میں بنا لیا جاتا ہے* ۔ سورۃ کہف میں ہے کہ ان کا کتا اپنے ہاتھ پھیلائے وَصِيْدٌ میں رہتا تھا (۱۸/۱۸) ۔ اسکے معنی غار کے صحن یا دروازے کی چوکھٹ کے ہیں ۔ چوکھٹ سے مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا ہے ۔ اَوْصَدَ الْبَابَ وَ اَصَدَهٗ کے معنی ہیں اس نے دروازہ بند کر دیا ۔ اَوْصَدَ الْقِدْرَ ۔ اس نے ہانڈی کو ڈھانپ دیا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے کے ہیں ۔

[اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ (۱۰۴/۸) کے لئے دیکھئے عنوان أ ۔ ص ۔ د]

و ص ف

وَصَفَ الشَّيْئَ يَصِفُهٗ وَصْفًا ۔ کسی چیز کا حلیہ اور کیفیت بیان کرنا ۔ اَلصِّفَةُ ۔ کسی چیز کی حالت ۔ کیفیت** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کا حلیہ بیان کرنے کے ہیں ۔ نیز الصِّفَةُ کے معنے ہیں وہ علامت جو کسی چیز سے مستقل لگی رہے ۔

خدا کو دنیا میں قریب قریب ہر شخص مانتا ہے ۔ لیکن جس جگہ پہنچ کر اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہے کیسا؟ کوئی انسان اپنی عقل کی رو سے یہ نہیں جان سکتا کہ خدا کیسا ہے ۔ اس لئے کہ خدا انسانی عقل کی حد سے ماوراء ہے ۔ لہذا خدا کے متعلق صرف وہی بات یقینی طور پر صحیح ہو سکتی ہے جسے خود خدا بتائے ۔ اور اس کا ذریعہ وحی کے سوا اور کچھ

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔

نہیں - اور وحی اب آخری شکل میں قرآن کریم کے اندر ہے - لہذا خدا کا صحیح تصور وہی ہے جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے - جو تصور اس تصور کے خلاف ہوگا وہ غلط ہوگا ، اور خدا کی طرف اس کا انتساب باطل - چنانچہ اس قسم کے (ذہن انسانی کے پیدا کردہ) تصورات کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کریم کہہ دیتا ہے کہ سُبْحَانَہٗ وَ تَعَالیٰ عَمَّا یَصِفُوْنَ (۶/۱۰۱)- خدا کے متعلق جو تصور یہ لوگ پیش کرتے ہیں وہ اس سے بہت دور اور بلند ہے - وہ اس سے مبرا اور منزہ ہے -

یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم ان لوگوں کو بھی ''خدا پر ایمان'' لانے کی دعوت دیتا ہے جو خدا کو مانتے ہیں - اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خدا کے متعلق صحیح صحیح تصور رکھو - اور یہ تصور وہی ہوسکتا ہے جسے خدا نے خود قرآن کریم میں پیش کیا ہے - یہ اس کی صفات یا اَلْاَسْمَاءُ الْحُسْنیٰ ہیں - بالفاظ دیگر ، خدا کی ذات کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے - کوئی محدود (Finite) لا محدود (Infinite) کو حیطۂ ادراک میں لا نہیں سکتا - اسی لئے خدا نے صرف اپنی صفات بیان کی ہیں - اور انہی صفات سے ہم اس کے متعلق اندازہ کر سکتے ہیں - خدا ، علیم ہے - خبیر ہے - بصیر ہے (وغیرہ) لیکن خود خدا ، جو علیم و خبیر و بصیر ہے ، ہے کیا ؟ ہم اس کے متعلق نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں ، نہ سمجھا سکتے ہیں -

و ص ل

وَصْلٌ - ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا - جوڑ دینا - (فصل اور قطع کی ضد) - اَوْصَلَہٗ اِیْصَالاً - اس کو اس تک پہنچا دیا ، یا اس کے ساتھ ملا دیا - قَطْعٌ کے مقابلہ میں اِیْصَالٌ قرآن کریم میں (۲/۲۷) میں آیا ہے - وَصَلَ الشَّیْئَ یا اِلیٰ الشَّیْئِ - اس چیز کی طرف پہنچ گیا - قَطَعَ الرَّحِیْمَ کے مقابلہ میں وَصَلَ فُلَانٌ رَحِمَہٗ بولتے ہیں* - (قطع رحم کے لئے دیکھئے عنوان ق - ط - ع) -

اَلْوَصِیْلَۃُ (۵/۱۰۳) - وہ بکری جو لگاتار سات بطن میں دو دو مادہ بچے دے اور ساتویں بطن میں ایک نر اور ایک مادہ بچہ دے - جاہلیت عرب میں اس نر بچہ کو ذبح نہیں کرتے تھے اور اس بکری کے دودھ کو عورتیں نہیں پیتی تھیں - اس بکری کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا* - (بعض

*تاج -

ائمہ لغت نے اس بکری کا تعارف اور طرح سے بھی کرایا ہے ۔ بعض نے بکری کے بجائے اونٹنی بھی بتایا ہے* ۔ بہرحال اس سے مقصود ان توہمات کا ذکر کرنا ہے جو اسلام سے پہلے وہاں رائج تھے ۔

ہمارے ہاں کسی بزرگ کی وفات پر عام طور پر کہتے ہیں کہ ان کا "وصال" ہوگیا ۔ یہ تصور ہندوؤں کے تصوف (ویدانت) سے آیا ہے جس کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ انسانی روح خدا کی روح کا ایک جزو ہے جو بدقسمتی سے مادی جسم کے جیل خانے میں محبوس ہوگئی ہے ۔ اس جسم سے علیحدگی کے بعد یہ جزو اپنے کل سے جا کر مل جائے گا ۔ اس ملاپ کے لئے وِصَال کا لفظ بولا جاتا ہے ۔ یعنی فلاں واصل بالحق ہوگیا ۔ خدا کے ساتھ مل گیا ۔ وحدت وجود کے مسلک کی یہی تعلیم ہے ۔ یہ تمام تصورات غیر قرآنی ہیں ۔ اسی طرح "عُرس" کا تصور ہے جو عیسائیوں کے مسلک خانقاہیت سے آیا ہے ۔ اس کے معنی شادی کرنے کے ہوتے ہیں ۔ عیسائیوں میں راہبہ عورتوں (Nuns) کے متعلق یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ان کی شادی ان کے خدا (یسوع مسیح) سے ہو چکی ہوتی ہے ۔ اور وہ گویا خدا کی عروس (دُلہن) ہیں ۔ یہی تصور ہمارے تصوف میں آگیا جہاں یہ سمجھ لیا گیا کہ "اللہ والے" کی وفات کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کی شادی (عرس) خدا سے ہوگئی ۔ یعنی خدا سے اس کا وصال ہوگیا ۔ یہ سب تصورات غیر قرآنی ہیں ۔

و ص ی

وَصَى الشَّيْئُ بِہٖ وَصْيًا ۔ متصل ہوجانا ۔ مل جانا ۔ وَصَاهُ بِہٖ يَصِيْہٖ ۔ اسے اس سے ملا دینا ۔ (لازم و متعدی) ۔ وَصَى النَّبْتُ ۔ پودے گتھ گئے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے ۔ اَرْضٌ وَاصِيَةٌ ۔ وہ زمین جس کے پودے قریب قریب ، اور باہم گتھے ہوئے ہوں ۔ فَلَاۃٌ وَاصِيَةٌ ۔ وہ بیابان جو دوسرے بیابان سے ملا ہوا ہو*** ۔

اس سے راغب نے کہا ہے کہ اَلْوَصِيَّةُ کے معنی ہیں کسی واقعہ کے پیش آنے سے پہلے کسی کو ایسی ہدایات دینا جن میں نصیحت بھی شامل ہو** ۔ امر و حکم اور فریضہ کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ اسی سے اَوْصٰى يُوْصِىْ کے معنی واجب قرار دینے ، معاملہ سونپ دینے کے آتے ہیں ۔ نیز اَوْصٰى وَوَصّٰى کے معنی عہد و پیمان کرنے کے آتے ہیں ۔ اور کسی کو (اپنے مرنے کے بعد) کسی چیز کا مالک بنا دینے کے*** ۔ اَلْوَصِىُّ ۔ وصیت کرنے والا ۔ نیز جسے وصیت کی گئی ہو (اس کے دونوں معنی آتے ہیں) ۔

*تاج ۔ **راغب ۔ *** تاج و محیط

قرآن کریم میں ہے وَ وَصّٰى بِهَا اِبْرَاهِيْمُ بَنِيْهِ (۲/۱۳۲)۔ ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اس کا حکم دیا۔ اس بات کو مسلسل ان تک آگے بڑھا دیا۔ سورۃ نساء میں ہے۔ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِىْ اَوْلَادِكُمْ (۴/۱۱)۔ اللہ اولاد کے بارے میں تمہیں حکم دیتا ہے۔ سورۃ یٰسٓ میں تَوْصِيَةً کا لفظ آیا ہے (۳۶/۵۰)۔ سورۃ العصر میں جماعت مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳/۳)۔ اس کے عام معنے تو یہی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین و تاکید کرتے ہیں لیکن اس مادہ کے بنیادی معانی کے لحاظ سے اس میں یہ پہلو بھی مضمر ہے کہ وہ حق و استقامت کی بنا پر ایک دوسرے سے ملے ہوئے رہتے ہیں۔ ان میں باہمی ربط و ضبط کا ذریعہ حق و استقامت ہے۔ ان کی وجہ جامعیت قوانین خداوندی کی رو سے تعمیری نظام پر ثابت قدم رہنا ہے۔

مُوْصٍ۔ وصیت کرنے والا (۲/۱۸۲)۔

قرآن کریم میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (۲/۱۸۰)۔ ”تم میں سے جس کے سامنے موت آ موجود ہو۔ اور وہ مال چھوڑے۔ اس پر فرض قرار دے دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ اور دیگر اقربا کے لئے قاعدے کے مطابق وصیت کرے ایسا کرنا متقیوں کے لئے لازم ہے“۔ اس سے واضح ہے کہ ترکہ کے لئے ماں باپ اور دیگر اقرباء کے لئے وصیت کرنا خدا کی طرف سے فرض قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اگر ایسی صورت پیش آجائے کہ کوئی وصیت نہ کرسکے۔ یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہو (Cover نہ کرے)۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے وارثین کے لئے خود حصے مقرر کر دئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان حصوں کو بیان کرتے وقت قرآن کریم میں بار بار آیا ہے کہ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوْصِىْ بِهَا اَوْ دَيْنٍ (۴/۱۱۔۱۲)۔ ”وصیت جو اس نے کی ہو اس کے بعد۔ یا قرضے کی ادائیگی کے بعد“۔ یہ حکم اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اس میں کسی قسم کی تاویل و تفسیر کی گنجائش نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کہا یہ جاتا ہے کہ وصیت صرف ایک تہائی (⅓) مال میں کی جاسکتی ہے اور وہ بھی وارثوں کے لئے نہیں۔ اس کی سند میں ایک روایت پیش کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ رسول اللہ ؐ کا کوئی ارشاد قرآن کریم کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ لیکن اس روایت کو صحیح قرار دینے کے لئے کہا جاتا ہے کہ حدیث قرآن کریم کو منسوخ کرسکتی ہے۔ اس لئے اس حدیث نے قرآن کریم کی آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ اس قسم کے عقیدے کے

متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ خدا ہماری حالت پر رحم کرے۔ یاد رکھئے۔ قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔ اس کی کسی آیت کو نہ کوئی دوسری آیت منسوخ کرتی ہے نہ قرآن کریم سے باہر کوئی اور چیز منسوخ کرسکتی ہے۔ خدا کے کلام کا ایک ایک لفظ اپنےمقام پر محکم ہے۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ن۔ س۔ خ)۔ لیکن اگر رسول اللہؐ نے ایسی بات کہی بھی ہو تو ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے کسی صحابیؓ کے مخصوص حالات کے پیش نظر یہ مشورہ دیا ہو کہ وہ اپنے مال کے ایک تہائی حصہ سے متعلق فلاں کےحق میں وصیت کردے۔ اس صورت میں یہ چیز دائمی حکم کی حیثیت نہیں رکھیگی۔ محض وقتی مشورہ ہوگا۔

یہ بھی واضح رہے کہ وصیت اور وراثت کے احکام اسی وقت نافذ العمل ہوں گے جب افراد کے پاس فاضلہ دولت ہوگی۔ جب معاشرہ ایسا قائم ہوجائے جس میں ہر فرد اپنی فاضلہ دولت کو قرآن کریم کے حکم کے مطابق قرآنی نظام کے حوالے کردے۔ (دیکھئے عنوان ع۔ ف۔ و) تو اس وقت ترکہ کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ چنانچہ خود نبی اکرمؐ نے ایسا ہی کیا تھا۔ نہ حضورؐ نے زائد از ضرورت دولت اپنے پاس رکھی، نہ ترکہ چھوڑا۔ نہ جائداد بنائی، نہ وہ وراثت میں کسی کی طرف منتقل ہوئی۔ اسطرح آپؐ پر ترکہ اور وراثت کے احکام عائد نہیں ہوئے۔ یہی کیفیت تمام مومنین کی اس وقت ہوگی جب قرآنی نظام ربوبیت قائم ہوگا۔ اس وقت تک قرآن کریم کی رو سے ہر مومن پر، جو کچھ مال چھوڑے، وصیت کرنا فرض ہے۔ اور وصیت کے معاملہ میں اسے پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنےمعاملات کو فرد متعلقہ سب سے بہتر سمجھ سکتا ہے۔ ایک شخص نے اپنے بڑے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ ولایت بھیجا۔ بیرسٹر کرایا۔ وہ اب بڑا امیر اور خوش حال ہے۔ دوسرا بیٹا حال ہی میں پیدا ہؤا ہے۔ اس کی پرورش، تعلیم، تربیت وغیرہ کے تمام اخراجات باقی ہیں۔ یہ شخص اپنی وصیت کی رو سے اپنا پورا ترکہ اس نوزائیدہ بچے کو دے سکتا ہے۔ لیکن اگر اسے حق وصیت نہ دیا جائے تو اس کے ترکہ کا آدھا حصہ بڑا بیٹا لے جائیگا۔ وصیت کے متعلق اس انفرادی حق کے بعد، قرآن کریم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی وصیت میں یکسر ظلم اور جانبداری سے کام لے تو معاشرہ (عدالت) کو اختیار ہے کہ عدل و انصاف کے مطابق، وارثین میں مصالحت کی صورت پیدا کردے (۲/۱۸۲)۔ وصیت کو قرآن کریم نے اتنی اہمیت دی ہے کہ سورۃ المائدہ میں اس کے لئے شہادت کا تفصیلی طریقہ بھی خود ہی بیان کر دیا ہے۔ (۵/۱۰۶)۔

و ض ع

وَضَعَ الشَّیْئَ مِنْ یَدِہٖ یَضَعُہٗ۔ اس نے کسی چیز کو ھاتھ سے گرا دیا۔ نیچے رکھ دیا*۔ وَضَعَ الشَّیْئَ فِی الْمَکَانِ۔ کسی چیز کو کسی جگہ رکھ دیا*۔ سورۃ کہف میں ھے وُضِعَ الْکِتَابُ (١٨/٤٩)۔ سورۃ رحمٰن میں ھے۔ وَضَعَ الْمِیْزَانَ (٥٥/٧)۔ وضع حمل کے لئے یہ لفظ (٣/٣٥) میں آیا ھے۔ وَضَعَ عَنْہُ (٩٤/٢)۔ دور کر دینا۔ ھٹا دینا۔ گرا دینا۔ وَضْعُ ثِیَابٍ۔ کپڑے اتار کر رکھ دینا۔ (٢٤/٦٠)۔ مَوْضِعٌ جمع مَوَاضِعُ۔ جگہیں۔ موقعے۔ (٤/٤٦)۔ مَوْضُوْعَۃٌ۔ رکھے ہوئے (٨٨/١٤)۔

وَضَعَتِ النَّاقَۃُ۔ اونٹنی تیز رفتاری سے چلی۔ وَضَعَ الرَّجُلُ۔ آدمی دوڑا۔ اَوْضَعْتُہٗ۔ میں نے اسے دوڑایا*۔ سورۃ توبہ میں ھے۔ وَلَاَوْضَعُوْا خِلٰلَکُمْ (٩/٤٧)۔ وہ (فتنہ پیدا کرنے کے لئے) تمہارے اندر تگ و تاز کرتے۔ سرگرم عمل رھتے۔ بھاگ دوڑ کرتے۔

و ض ن

وَضَنَہٗ۔ اس نے اسے ترتیب وار، ایک دوسرے کے اوپر تلے رکھ دیا۔ اَلْمَوْضُوْنَۃُ۔ بنی ھوئی زرہ۔ یعنی جس کے حلقے ایک دوسرے میں ترتیب وار پڑے ھوں۔ یا وہ چیز جس میں جواھرات ٹانکے گئے ھوں۔ یا وہ چیز جسے تہ بہ تہ جما کر رکھا گیا ھو۔ چنانچہ سَرِیْرٌ مَوْضُوْنٌ۔ دھرے بنے ھوئے پلنگ کو کہتے ھیں**۔

قرآن کریم میں سُرُرٍ مَوْضُوْنَۃٍ (٥٦/١٥) آیا ھے۔ یعنی دھرے اور مضبوط بنے ھوئے پلنگ۔ یا جواھرات سے مرصّع پلنگ۔

و ط أ

وَطِئَہٗ یَطَؤُہٗ وَطْأً۔ پاؤں سے کسی چیز کو روندنا۔ وَطِیئَ الْمَرْاَۃَ یَطَؤُھَا۔ عورت سے وطی (جماع) کرنا۔ وَطُؤَ یَوْطُؤُ۔ نرم اور سہل ھونا* ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کو دبا کر پھیلانے اور ھموار کرنے کے ھیں۔ سورۃ فتح میں ھے۔ لَمْ تَعْلَمُوْھُمْ اَنْ تَطَئُوْھُمْ (٤٨/٢٥)۔ جنہیں تم لاعلمی میں پامال کردیتے۔

---

*تاج و راغب۔ **تاج و راغب و محیط۔

. وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا (۳۳/۲۷) ـ ایسی زمینیں جنہیں تم نے اپنے پاؤں سے نہیں روندا ـ ان تک ہنوز تمہارے قدم نہیں پہنچے۔ اَلْمَوْطَأُ وَ الْمَوْطِئُ ـ قدم رکھنے کی جگہ* ـ وَ لَا يَطَئُوْنَ مَوْطِئًا (۹/۱۲۰) ـ نہ وہ کسی ایسی سرزمین پر چلتے ہیں ـ مُوَاطَاۃٌ* ـ دراصل یہ کسی کے قدم پر قدم رکھنے کو کہتے ہیں۔ رَجُلٌ مُوَطَّأُ الْعَقِبِ ـ وہ شخص جس کی پیروی اوراتباع کی جاتی ہو*۔ اس سے مُوَاطَاۃٌ* کے معنی موافقت اور مطابقت کرنے کے آتے ہیں*۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں ہے ـ لِيُوَاطِئُوْا عِدَّةَ (۹/۳۷) ـ تاکہ اس طرح وہ اسے (مہینوں کی) گنتی کے مطابق کرلیں ـ سورۃ مزمل میں ہے ـ اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً (۷۳/۵) ـ رات کے وقت اپنی صلاحیتوں کی نشو ونما کے لئے اٹھنا ، سرکش جذبات کو بہت زیادہ مغلوب کر دیتا ہے ـ یا انسان کی قوتِ عمل اس کے ارادوں اور فیصلوں کا مَرْكَبٌ بن جاتی ہے (کیونکہ وَطَاَ الْفَرَسَ کے معنی ہیں وہ گھوڑے پر سوار ہوا) ** ـ یہ نبی اکرمؐ کی اس جد و جہد کا بیان ہے جب حضورؐ (نظام خداوندی کے ابتدائی مراحل میں) دن رات مصروفِ کار رہتے تھے ـ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے رات کا آرام بھی قربان کر دینا ، انسانی جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کی واضح شہادت ہے ، بالخصوص جب یہ قربانی اپنے کسی ذاتی مفاد کے لئے نہ ہو ، بلکہ نوع انسان کی نجات و سعادت اور فلاح و بہبود کے لئے ہو۔

و ط ر

اَلْوَطَرُ ـ حاجت ـ ایسی ضرورت جس کے پورا کرنے کی فکر اور خاص اہتمام ہو*** ـ اہم ضرورت**** ـ

قرآن کریم میں ''قضائے وطر'' (۳۳/۳۷) میں آیا ہے جس کے معنے ضرورت پورا کرلینا ہیں ـ یعنی قطعِ تعلق کر لینا ـ یا وظیفہٴ ازدواج کی خواہش و ضرورت کو پورا کرلینا ـ یعنی یہ فیصلہ کرلینا کہ اب اسے اس کی ضرورت نہیں رہی ـ اسی کو قطع تعلق کا فیصلہ کہینگے ـ

و ط ن

اَلْوَطَنُ ـ انسان کے رہنے اور بسنے کی جگہ ـ اقامت گاہ ـ مجازاً بیل اور بکریاں باندھنے کی جگہ کو بھی کہہ دیتے ہیں ـ وَطَنَ بِهٖ ـ يَطِنُ ـ اَوْطَنَ ـ قیام کرنا ـ اِسْتَوْطَنَہٗ وَ اِتَّطَنَہٗ وَ تَوَطَّنَہٗ وَ تَوَطَّنَ بِهٖ ـ اس نے اُس جگہ کو وطن بنا لیا ـ اَلْمَوَاطِنُ مِنَ الْحَرْبِ ـ جنگ کے میدان*** ـ

*تاج و راغب ـ **محیط ـ ***تاج و محیط ـ ****راغب ـ

قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے ۔ سورۃ توبہ میں ہے ۔ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ (۹/۲۵) ۔''یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے بہت سے جنگ کے میدانوں میں تمہاری مدد کی'' ۔

و ع د

وَعَدَ ۔ يَعِدُ ۔ وَعْدًا وَعِدَةً ۔ کوئی وعدہ کرنا ۔ خواہ اچھی بات کا ہو یا بری بات کا ۔ اگر وَعَدَ کے ساتھ خیر یا شر کا ذکر نہ کیا جائے تو خیر کے لئے وَعَدَ کہتے ہیں اور شر کے لئے أَوْعَدَ (لطائف اللغة) ۔ اَلْمِيْعَادُ ۔ وعدہ کا زمانہ یا مقام* ۔ مَوْعِدٌ کے معنی وعدہ اور عہد کے آتے ہیں، نیز وعدہ گاہ ، وعدہ کا وقت* ۔ سورۃ کہف میں یہ لفظ ''وعدہ پورا ہونے کے وقت'' کے لئے آیا ہے (۱۸/۵۸) ۔

اَلْوَعِيْدُ ۔ حملہ کے وقت نر اونٹ کا بڑبڑانا ۔ یہ لفظ ہر دھمکی اور تہدید کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ أَوْعَدَهٗ اور تَوَعَّدَهٗ کسی کو دھمکانا ۔ ڈراوا دینا* ۔

سورۃ بقرہ میں ہے وَاعَدْنَا مُوْسٰى (۲/۵۱) ۔ اس میں اللہ کی طرف سے وقت مقرر کرنا اور حضرت موسیٰؑ کی طرف سے اس کا قبول کرنا اور اتباع کرنا دونوں شامل ہیں ۔ اسی لئے یہ باب مُفَاعَلَة* سے آیا ہے ۔ ویسے مُوَاعَدَة* کے معنی باہمی عہد و پیمان کرنے کے ہیں ۔

خدا کے وعدوں سے مراد ہیں وہ نتائج جو اس کے قوانین پر عمل کرنے سے مرتب ہوتے ہیں اور جن میں کبھی خطا نہیں ہوتی ۔ اسی طرح ان قوانین سے سرکشی برتنے کے نتائج وعید ہیں ۔

قرآن کریم میں اعمالِ صالحہ کے خوشگوار نتائج کے لئے بھی وَعَدَ کا لفظ آیا ہے (۲۴/۵۵) ۔ اور غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج کے لئے بھی (۹/۶۸) ۔

سورۃ توبہ میں ہے اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ (۹/۱۱۴) ۔ ''(یہ) صرف ایک وعدہ کی وجہ سے تھا جو اس نے اس سے کیا تھا'' ۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں جہاں یہ آئے گا کہ خدا تم سے اس بات کا وعدہ کرتا ہے ۔ یا خدا نے اس کا وعدہ کیا تھا ۔ تو اس کے معنی یہ

*تاج و محیط ۔

ہوں گے کہ خدا کے قانون پر عمل کرنے کا لازمی طور پر یہ نتیجہ ہوگا ۔ گویا ''اپنے وعدہ'' سے خدا ، اپنے قانون اور اس قانون کے فطری اور حتمی نتیجہ کا اظہار کرتا ہے ۔ یہ نہیں کہ جسطرح ہم ایک دوسرے سے کسی بات کا وعدہ کرتے ہیں اسی طرح خدا بھی انسانوں سے وعدہ کرتا ہے ۔ اسی سے یہ بھی واضح ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ ''خدا کے وعدے سچے ہیں'' تو اس کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ قوانین خداوندی اپنے ٹھیک ٹھیک نتائج پیدا کرکے رہتے ہیں ۔ ان میں کبھی خلاف ورزی نہیں ہوسکتی ۔

و ع ظ

وَعَظَ کے معنی ہیں کسی کو کسی کام کے اچھے انجام اور مضر عواقب و نتائج سے آگاہ کرکے اس کے دل کو نرم کرنا ۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے کہا ہے کہ اَلْوَعْظُ کہتے ہیں انذار و تخویف کو ۔ نیز اس طرح خیر کی باتیں بیان کرنا جس سے دل میں نرمی پیدا ہو جائے ۔ صاحب محیط کے نزدیک اس کے معنی محض '' وعظ کہنے'' کے نہیں بلکہ حکم دینے کے ہیں ۔ یعنی کسی کو کسی ایسی بات سے حکماً روک دینا جسکا انجام خراب ہو* ۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ ایسی زجرو توبیخ کو کہتے ہیں جس میں ڈراوا بھی شامل ہو** ۔ قرآن کریم میں مَوْعِظَةٌ کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے ۔ حتی کہ خود قرآن کریم کو بھی مَوْعِظَةٌ مِنْ رَّبِّكُمْ (۱۰/۵۷) کہا ہے ۔ اس میں دونوں باتیں آجاتی ہیں ۔ یعنی دوسروں کو غلط روش زندگی کے انجام و عواقب سے متنبہ کرکے ، اُس سے روکنا ۔ اور (نظام کے اندر) افراد کو غلط کاموں سے حکماً (بذریعہ قانون) روکنا ۔ چنانچہ سورہ نحل میں ہے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ .... يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۱۶/۹۰) ۔ اس میں پہلے امر کا لفظ آیا ہے ۔ یعنی اللہ تمہیں عدل و احسان کا حکم دیتا ہے ۔ اور آخر میں يَعِظُكُمْ ہے ۔ لہذا مومنین کے لئے خدا کا امر اور وعظ ایک ہی بات ہے ۔ اس مقام پر یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ خدا کا حکم ، کسی ڈکٹیٹر کا مستبدانہ حکم نہیں ہوتا ۔ وہ حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اسکی حکمت ، علت غائی ، مقصد ، فائدہ بھی بتاتا ہے ۔ حکم اور حکمت کے اس مجموعہ کا نام وعظ ہے ۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ہے وَمَا اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ (۲/۲۳۱) ۔ خدا نے جو کتاب و حکمت (قرآن کریم) کو نازل کیا ہے جس کے ذریعے وہ تمہیں غلط کاموں کے انجام سے ڈراتا ہے ۔ یہ متقین

---

*تاج و محیط اور لین ۔ **راغب

کے لئے مَوْعِظَۃٌ ہے (۲/۶۶) - ویسے اس کے ذریعے متنبہ ہر ایک کو کیا جائیگا - چنانچہ منافقین کے متعلق ہے فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ (۴/۶۳) - ان سے اعراض کر اور انہیں ان کی غلط روش کے عواقب سے متنبہ کرتا رہ ، بڑے دلنشیں انداز سے (۴/۶۳)- لہذا غیر مسلموں کے لئے دین کی طرف دعوت کے سلسلے میں '' وعظ'' پندو نصائح کے مرادف ہوگا ، اور مسلمانوں کے لئے قرآنی احکام اور ان کے نظام کی طرف سے جاری کردہ ھدایات جن کے مقاصد و فوائد کو اس انداز سے سمجھایا گیا ہو کہ اس سے دل میں لینت و رقت پیدا ہو جائے اور وہ اسطرح ان پر عمل پیرا رہیں -

و ع ی

وَعَاہٗ یَعِیْہِ وَعْیاً - نیز اَوْعَی یُوْعِیْ - اِیْعَاءٌ - کسی چیز کو محفوظ کر لینا - یاد کر لینا - حفظ کر لینا - کسی چیز کو برتن میں جمع کر لینا*- بالعموم وعٰی باتوں وغیرہ کو یاد کرنے اور محفوظ کرنے کے لئے آتا ہے اور اَوْعٰی اشیاء اور سازوسامان کو محفوظ رکھنے کے لئے**- اَلْوِعَاءُ (جمع اَوْعِیَۃٌ) وہ چیز (برتن - تھیلا - بوری وغیرہ) جسمیں دوسری چیزیں اکٹھی کرکے رکھی جائیں (۱۲/۷۶) - سورہ معارج میں سرمایہ دارانہ ذھنیت والے کے متعلق ہے وَجَمَعَ فَاَوْعٰی (۷۰/۱۸) - وہ مال جمع کرتا ہے اور پھر اسے بند کرکے رکھ لیتا ہے - سورہ انشقاق میں ہے واللہُ اَعْلَمُ بِمَا یُوْعُوْنَ (۸۴/۲۳)- اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ یہ لوگ اسطرح جمع کرکے بند رکھتے ہیں - اُذُنٌ وَاعِیَۃٌ بات کو محفوظ رکھنے والا کان - یعنی جس کان میں جو کچھ پڑے پھر وہ اسے باہر نہ نکالے اور اس پر غور و فکر بھی کرے*- سورہ حاقہ میں ہے وَتَعِیَھَا اُذُنٌ وَّاعِیَۃٌ (۶۹/۱۲) - '' اور یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں'' -

و ف د

اَلْوَفْدُ - ریت کے اوپر سے جھکے ہوئے ٹیلے کی چوٹی - ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی جھانکنے اور نکلنے کے ہیں - اَلْوَافِدُ - سب سے آگے نکل جانے والا (اونٹ) - اَلْاِیْفَادُ - کسی چیز کا بلند ہونا اور اوپر سے جھکنا - تیز چلنا - جلدی کرنا - ھُمْ عَلٰی اَوْفَادٍ - وہ لوگ سفر پر ہیں - الاِیْفَادُ - کسی کو کسی کے پاس ایلچی بنا کر بھیجنا -

*تاج و محیط- **راغب و ابن فارس -

وَفَدَ فُلَانٌ ۔ وہ کسی بادشاہ یا امیر کے پاس (ایلچی بنکر) پہنچا ۔ اَوْفَدَہٗ عَلَیْہِ ۔ اس نے اسے اس کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا ۔ وُفُوْدٌ ۔ بڑے لوگوں کے پاس عطایا لینے کے لئے جانا* ۔ اَلْوَفْدُ ۔ وہ لوگ جو فتح کے جشن پر مبارکباد دینے کے لئے یا کسی اور موقعہ پر بادشاہ کے دربار میں پہنچیں** ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْوَفْدُ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے بادشاہوں کے پاس جائیں *** ۔

سورہ مریم میں ہے یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا (۱۹/۸۵) ۔ جس دن ہم متقیوں کو رحمٰن کے پاس بطور وَفْدٌ اکٹھا کرینگے ۔ اوپر دیئے ہوئے معانی کے لحاظ سے وَفْدًا کے اندر بلندی اور عظمت ، قرب اور مسابقت ، عزت اور برگزیدگی ، حصول عطایا و نوازشات اور وصول سامانِ نشو و نما سب کچھ آجاتا ہے ۔ یہ ہے متقین کے اعمال حیات کا نتیجہ اور اُن کا مقام ۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ متقین کو سب سے آگے رکھا جائیگا ۔ اس میں بھی عزت اور برگزیدگی کا پہلو موجود ہے ۔

و ف ر

اَلْوَفْرُ مِنَ الْمَالِ وَالْمَتَاعِ ۔ وسیع پیمانہ پر کثیر مال و اسباب جن میں کسی چیز کی کمی نہ ہو ۔ وَفَرَ الْمَالُ ۔ مال کثیر ، باقراط اور پورا ہو گیا ۔ اَرْضٌ وَفْرَاءُ ۔ وہ زمین جس میں بکثرت پودے اور گھاس وغیرہ ہوں ۔ وَفَرَہٗ تَوْفِیْرًا ۔ اسنے اسکو بھرپور ، کثیر اور مکمل کر دیا ۔ اَلْوَفْرَاءُ ۔ بھری ہوئی چیز ۔ وہ پکھال جو پوری کھال سے بنائی گئی ہو ۔ اَلْوَافِرَۃُ ۔ دنبہ کی بڑی چکتی (چکی) ۔ اَلْمَوْفُوْرُ ۔ ہر وہ چیز جو مکمل ہو چکی ہو**** ۔ قرآن کریم میں ہے جَزَاءً مَّوْفُوْرًا ۔ (۱۷/۶۳) ۔ پورا پورا بدلہ ۔ جسمیں سے کچھ کم نہ کیا گیا ہو ۔

و ف ض

وَفَضَ یَفِضُ وَفْضًا ۔ وہ تیزی سے دوڑا ۔ اِسْتَوْفَضَ ۔ اسنے جلدی کی ۔ نَاقَۃٌ مِیْفَاضٌ ۔ تیز رفتار اونٹنی ۔ اصل میں اَلْاِیْفَاضُ کے معنی ترکش اٹھا کر تیزی سے بھاگنے کے ہیں ۔ اسلئے کہ اَلْوَفْضَۃُ چمڑے کا ترکش ہوتا ہے جسمیں لکڑی لگی ہوئی نہیں ہوتی ۔ ویسے یہ اس تھیلے کو بھی کہتے ہیں جس میں چرواہا اپنا توشہ وغیرہ رکھتا ہے***** ۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****تاج و راغب و محیط ۔ *****تاج وراغب ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ کَاَنَّھُمْ اِلٰی نُصُبٍ یُّوْفِضُوْنَ (۷۰/۴۳)۔
گویا وہ کسی نشان (Goal) کیطرف بھاگے جارہے ہیں ۔

و ف ق

اَلْوَفْقُ ۔ دو چیزوں کے درمیان مطابقت اور ہم آہنگی ہونا ۔ ضرورت کے مطابق ہونا *۔ اَوْفَقَتِ الْاِبِلُ ۔ اونٹ سب برابر ہوئے اور ایک صف میں کھڑے ہوگئے *۔ اَلْاِتِّفَاقُ ۔ انسان کے عمل کا اندازے اور پیمانے (تقدیر) کے مطابق ہو جانا ***۔ اَلتَّوْفِیْقُ ۔ اسباب کا مقصد کے مطابق کر دینا ۔ حصول مقصد کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہے انہیں مہیا کر دینا**۔ موافقت پیدا کر دینا ۔ وَفَّقَ بَیْنَ الْقَوْمِ ۔ اس نے قوم کے درمیان صلح کرا دی**۔

سورہ نساء میں ہے کہ اگر میاں بیوی میں کشیدگی ہو جائے تو ان میں اصلاح کی کوشش کرو ۔ یُوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا (۴/۳۵) ۔ اللہ ان میں موافقت پیدا کر دیگا ۔ اعمال کے نتائج کو (سورہ النبأ میں) جَزَآءً وِّفَاقًا کہا گیا ہے (۷۸/۲۶) ۔ یعنی عمل اور اس کے نتیجہ میں پوری پوری موافقت ۔ (قرآن کریم کی رو سے جزا یا سزا خود عمل کے نتیجہ کا نام ہے)۔ سورہ ھود میں ہے ۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ (۱۱/۸۸) ۔ میرے پیش نظر مقصد کے مطابق اسباب کا مل جانا ، یا ان میں صحیح موافقت پیدا ہو جانا ، قانون خداوندی کے مطابق ہی ہو سکتا ہے ۔ اس کے سوا اسکی کوئی صورت نہیں ۔ (۴/۶۲) میں تَوْفِیْقًا کے معنی سنوارنے اور سدھارنے کے ہیں ۔ یعنی اصلاح ۔ موافقت ۔

و ف ی

وَفَی الشَّیْءُ وُفِیًّا ۔ وہ چیز مکمل ہوگئی ۔ پوری ہو گئی ۔ کثیر ہوگئی ۔ اسی سے وَفِیٌّ وَ وَافٍ کے معنی ہیں مکمل اور کثیر ۔ اَوْفَانِیْ حَقِّیْ ۔ اس نے میرا حق پورا پورا دیدیا ۔ اس میں کمی نہیں کی ۔ یہی معنی وَفّٰی کے بھی ہیں ۔ یعنی پورا پورا دیدینا ****۔ اِسْتَوْفٰی فُلَانٌ حَقَّہٗ ۔ اس نے اپنا حق پورا پورا لے لیا ۔ اَلْوَفِیُّ ۔ وہ شخص جو پورا پورا حق ادا کرے ۔ اور پورا پورا حق وصول کرے ۔ نیز بہت وفاشعار ۔ اَلْوَفَآءُ کے معنی ہیں وعدہ پورا کرنا ۔ عہد و پیمان کا لحاظ کرنا اور پاس رکھنا ۔ اَلْوَفَاۃُ کے معنی ہیں موت ، یعنی دنیا میں زندگی کے دن پورے کر لینا ۔ تَوَفَّاہُ اللّٰہُ ۔ خدا نے اسے وفات دیدی****۔ اَلْوَفْیُ ۔ بلند زمین کو کہتے ہیں اور اَلْمُوَافِیْ اس چیز کو جو آجائے یا اچانک نمودار ہو جائے****۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****تاج و محیط ۔

قرآن کریم میں ایفائے عہد، نقض عہد کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۶/۹۱)۔ اور (۳/۲۴) میں وُفِّيَتْ کے معنی لَا يُظْلَمُوْنَ نے کر دئے ہیں۔ یعنی کمی نہ ہونا۔ پورا پورا مل جانا۔ سورہ ہود میں ہے وَإِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ (۱۱/۱۰۹)۔ اس سے تَوْفِيَةٌ کے معنی واضح ہوجاتے ہیں۔ یعنی بلا کسی قسم کی کمی کئے پورا پورا دینا۔ سورہ نحل میں ہے وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمْ وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ اِلٰى اَرْذَلِ الْعُمُرِ (۱۶/۷۰)۔ اس کے معنی ہیں، اللہ تمہیں پیدا کرتا ہے۔ پھر تمہاری جسمانی ساخت کو تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔ یعنی بھرپور جوانی تک پہنچا دیتا ہے جس میں تمام قویٰ اپنی تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں۔ پھر تم میں سے بعض کو بڑھاپے کی عمر تک پہنچا دیتا ہے جس میں قویٰ میں ضعف اور اضمحلال آجاتا ہے۔ یہ معانی، انسان کی زندگی کے مختلف مراحل کی ترتیب کے اعتبار سے ہیں۔ یعنی پہلے پیدائش - پھر جوانی - پھر بڑھاپا - لیکن اگر يَتَوَفّٰكُمْ کے معنی "وفات دیتا ہے" کئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ بعض لوگ بڑھاپے سے پہلے ہی وفات پا جاتے ہیں اور بعض بڑھاپے کی عمر تک پہنچتے ہیں۔

وفات کے معنوں میں سورہ انعام میں ہے حَتّٰى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (۶/۶۱)۔ یہانتک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے فرستادے اُسے وفات دیدیتے ہیں۔ خدا کے قانون طبیعی کے مطابق اس کے زندگی کے دن پورے ہوجاتے ہیں۔ سورہ مائدہ میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (۵/۱۱۷)۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دیدی تو ان پر تو ہی نگہبان تھا۔

مُتَوَفٍّ۔ وفات دینے والا۔ اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ (۳/۵۴)۔ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے کہتے ہیں کہ یہ (مخالفین) اس قسم کی تدبیریں کر رہے ہیں کہ تجھے گرفتار کر کے سولی پر لٹکا دیں۔ لیکن ان کے خلاف ہم بھی ایک تدبیر کر رہے ہیں۔ اور ہماری تدبیر ان کی تدبیروں سے یقیناً بہتر ہے۔ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ - وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ (۳/۵۳)۔ میری (یعنی اللہ کی) تدبیر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ لوگ تمہیں نہ گرفتار کرسکینگے نہ صلیب دے سکینگے۔ بلکہ تم اپنی طبعی موت مروگے (اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ)۔ یہ لوگ تمہیں صلیب دیکر دنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ تم (معاذ اللہ) لعنتی موت مرے۔ ہم تیرے مدارج کو بلند کرینگے (وَرَافِعُكَ اِلَيَّ)۔ اور یہ اسطرح سے ہوگا کہ ہم تجھے ان مخالفین کی دستبرد سے دور لے جائیں گے۔ (وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ (۳/۵۴)۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ قبل اس کے

کہ یہودی حضرت مسیح ؑ پر ہاتھ ڈالتے ، آپ ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے مطابق ، وہاں سے ہجرت کر چکے تھے - یہ تھی خدا کی تدبیر جو کامیاب ہوئی - (مزید تفصیل میری کتاب ''شعلہ مستور'' میں ملیگی) -

و ق ب

اَلْوَقْبُ - پہاڑ یا چٹان میں گڑھا ، جس میں پانی جمع ہو جائے - اَلْوَقْبَۃُ - ہموار میدان میں کنوئیں کی طرح ایک قدِ آدم یا دو قدِ آدم کے برابر گڑھا جس میں پانی جمع ہوجائے - پھر ہر گڑھے کے لئے بولا جانے لگا - اَلْوَقْبُ - کسی چیز کے اندر داخل ہو کر غائب ہو جانا - وَقَبَتِ الشَّمْسُ - سورج غروب ہو گیا - وَقَبَ الظَّلَامُ - تاریکی چھا گئی - یعنی لوگ اس کے اندر ڈوب کر غائب ہوگئے* - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا غائب ہونے کی جگہ غائب ہو جانا بتائے ہیں -

قرآن کریم میں ہے وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (۱۱۳/۳) - جب چاروں طرف سے تاریکیاں چھا جائیں - جب رات کی تاریکی میں آنے والی مصیبتیں گھیر لیں - (دیکھئے عنوان غ - س - ق) - لیکن مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے معنے ہیں ''ڈوبنے والی چیز جس سے تاریکی پیدا ہو'' - اور اس سے مراد ہیں وہ تمام چیزیں جن کے نہ ہونے سے نشو و نما رک جائے ، جیسے چاند جب ڈوب جاتا ہے تو نباتات کو ضرر پہنچتا ہے - ہماری ضروریاتِ زندگی کے نہ ہونے سے جس قدر نقصانات ہمیں پہنچ سکتے ہیں ، ہم ان سے محفوظ رہنے کے لئے ، قانونِ خداوندی کی پناہ میں آتے ہیں کہ وہ ہمیں ان نقصانات سے بچائے اور ہمیں سامانِ نشو و نما مہیا کردے - (المقام المحمود) -

و ق ت

اَلْوَقْتُ - کسی کام کے لئے مقررہ زمانہ کی آخری حد - لہذا یہ لفظ بے اندازہ زمانہ کے لئے نہیں بولا جاتا** - یعنی غیر معین عرصہ کو وقت نہیں کہہ سکتے - ہر چیز جس کے لئے اس طرح زمانہ متعین کر دیا جائے مُوَقَّتٌ کہلاتی ہے - الوَقْتُ وَ التَّوْقِيْتُ - وقت مقرر کرنا - اَلْمِيْقَاتُ - مقررہ وقت کو بھی کہتے ہیں اور مقررہ مقام کو بھی - چنانچہ مِيْقَاتُ الْحَاجِّ - حاجیوں کے احرام باندھنے کے مقام کو کہتے ہیں*** -

*تاج و محیط و راغب - **راغب - ***تاج -

قرآن کریم میں ہے وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ (۷۷/۱۱) - جب رسولوں کا وقت مقرر کر دیا جائے گا - سورۃ نساء میں صلٰوۃ کے متعلق کِتَابًا مَّوْقُوْتًا (۴/۱۰۳) کہا گیا ہے - اس کے ایک معنی ہیں "خاص طور پر مقرر کردہ فریضہ" اور دوسرے معنی ہیں ایسا فریضہ جس کا وقت متعین کر دیا گیا ہو - ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْمَوْقُوْتُ - حد مقرر کردہ چیز کو کہتے ہیں - یعنی جس کی حد مقرر ہو - سورۃ بقرہ میں نئے چاند کے متعلق ہے - هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ (۲/۱۸۹) - یہ لوگوں کے لئے اوقات معین کرنے کا ذریعہ ہیں (مِیْقَاتٌ کی جمع مَوَاقِیْتُ) - سورۃ نبا میں یَوْمَ الْفَصْلِ کے متعلق ہے کَانَ مِیْقَاتًا (۷۸/۱۸) - یعنی قانون مکافات کی رو سے ظہور نتائج کا وقت متعین ہوتا ہے -

و ق د

وَقَدٌ - آگ کو کہتے ہیں ، اور آگ کے روشن ہونے کو بھی - وَقُوْدٌ - لکڑیوں کو کہتے ہیں جن سے آگ جلائی جائے - صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ اَلْحَطَبُ - ایندھن کی لکڑیوں کو کہتے ہیں - اور وَقُوْدٌ اس وقت کہتے ہیں جب ان لکڑیوں کو سلگا دیا جائے - اَوْقَدَ - اور اِسْتَوْقَدَ - آگ روشن کرنے کو کہتے ہیں* -

روح المعانی میں ہے کہ عربوں میں دستور تھا کہ جب جنگ کا اعلان کرنا ہوتا تو ایک بلند پہاڑی پر آگ جلا دیتے - اس کو نار الحرب کہتے تھے (۵/۶۴) - قرآن کریم میں اِسْتَوْقَدَ نَارًا (۲/۱۷) میں آیا ہے - سورۃ مائدہ میں اَوْقَدَ بمقابلہ اَطْفَاَ آیا ہے - (۵/۶۴) - اَطْفَاَ کے معنی آگ بجھا دینے کے ہیں - سورۃ قصص میں تذکرہ حضرت موسیٰؑ میں ہے کہ فرعون نے ھامان سے کہا کہ فَاَوْقِدْ لِیْ یٰھَامٰنُ عَلَی الطِّیْنِ (۲۸/۳۸) - جس سے مراد اینٹوں کا آگ میں پکانا ہے - وَقُوْدٌ - ایندھن (۲/۲۴ و ۶۶/۶ و ۸۵/۵) - مُوْقَدَۃٌ (۱۰۴/۶) جلائی ہوئی -

و ق ذ

اَلْوَقْذُ - شدت ضرب - بصائر میں ہے کہ مَوْقُوْذَۃٌ اس جانور کو کہتے ہیں جسے لاٹھی یا پتھر سے مار دیا جائے اور ذبح نہ کیا جائے اور جس پتھر سے اسے مارا جائے اس میں دھار نہ ہو** - جاھلیت میں اس طرح مرے

*تاج - **محیط -

ہوئے جانور کو کھا لیا کرتے تھے*۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی لکڑی سے مارنے کے لکھے ہیں ۔ اور مَوْقُوْذَۃٌ ۔ جسے لکڑی کی ضرب سے مار ڈالا گیا ہو ۔ قرآن کریم نے اسے حرام قرار دیا ہے (۵/۳) ۔ ابو سعید نے کہا ہے کہ اَلْوَقْذُ کا مطلب ہے گدی کے اوپر اس زور سے مارنا کہ اس سے دماغ ماؤف ہو جائے*۔

قرآن کریم نے اَلْمَیْتَۃُ (مردار) کو بھی حرام قرار دیا ہے ۔ اس کی تشریح یہ کہکر کر دی ہے کہ مردار میں صرف وہی جانور شامل نہیں جو طبیعی موت مرجائیں ۔ اس میں وہ جانور بھی شامل ہے جو گلا گھٹ کر مر جائے ۔ جو چوٹ کھا کر مر جائے (اَلْمَوْقُوْذَۃُ) ۔ جو اوپر سے گر کر مر جائے ۔ جو سینگ لگ کر مر جائے ۔ یا جسے درندوں نے کھایا ہو ۔ ہاں ، اگر ان میں سے کسی کو مرنے سے پہلے ذبح کرلیا جائے تو وہ حرام نہیں ہوگا ۔ (۵/۳) ۔

و ق ر

اَلْوَقْرُ ۔ کان میں بھاری پن ہونا ۔ یا سماعت کا بالکل جاتے رہنا** ۔ قرآن کریم میں ہے وَ فِیْ اٰذَانِہِمْ وَقْرًا (۶/۲۵) ۔ اَلْوِقْرُ ۔ بھاری بوجھ ۔ اَلْوَقَارُ ۔ سنجیدگی ، بھاری بھرکم پن ، عظمت ۔ جَنَانٌ وَاقِرٌ ۔ باھمت دل کو کہتے ہیں جو گھبرا نہ اٹھے** ۔ اس سے بھی وَقَارٌ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے مَالَکُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰہِ وَقَارًا (۷۱/۱۳) ۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم خدا سے وقار کے امیدوار (طلبگار) نہیں ہوتے۔ یعنی زندگی کی ایسی حالت جس میں انسان ذرا ذرا سی بات سے گھبرا نہ جائے اور انسانی ذات کی ایسی کیفیت کہ موت کے دھچکے سے بھی اس کا کچھ نہ بگڑے ۔ لیکن یہ مفہوم اس صورت میں درست ہوگا جب لِلّٰہِ کے معنے مِنَ اللہ (اللہ سے) لئے جائیں ۔ ورنہ اس کے معنی یہ ہونگے کہ تم اللہ کے لئے بزرگی اور عظمت کا یقین کیوں نہیں رکھتے ۔

وَقَّرَ ۔ کسی کی تعظیم کرنا ۔ تُعَزِّرُوْہُ وَتُوَقِّرُوْہُ (۴۸/۹) ۔ اسے تقویت پہنچاؤ اور اس کی تعظیم کرو ۔ سورۃ احزاب میں ازواج مطہرات سے کہا گیا ہے ۔ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ (۳۳/۳۳) ۔ اپنے گھروں میں نہایت سنجیدگی اور وقار سے رہو ۔ تم سے ذرا بھی چھچھورے پن کا مظاہرہ نہ ہو ۔ یعنی یہ وَقْرٌ سے ہے ۔ لیکن ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یہ وَقَارٌ سے ہے جس سے امر قِرْ آتا ہے ۔ جیسے وَعْدٌ سے عِدْ آتا ہے***۔

---

*تاج ۔ **تاج و محیط و راغب ۔ ***ابن فارس ۔

و ق ع

وَقَعَ يَقَعُ ۔ وُقُوْعاً ۔ چیز گر پڑی ۔ وَقَعَتِ الْاِبِلُ ۔ اونٹ بیٹھ گئے ۔ وَقَعَ رَبِيْعٌ بِالْاَرْضِ ۔ بہار کی پہلی بارش برسی ۔ مَوَاقِعُ الْغَيْثِ ۔ جن مقامات پر بارش برسی ہو ۔ وَقَعَتِ الطَّيْرُ ۔ پرندے اڑتے اڑتے کسی درخت یا زمین پر اتر پڑے ۔ اَلْوَقَعُ ۔ پتھر ۔ اَلْوَقِيْعَةُ ۔ اَلْوَاقِعَةُ ۔ جنگ ، معرکہ ۔ وَقَائِعُ الْعَرَبِ ۔ عربوں کے ایام جنگ ۔ اَلْوَقِيْعَةُ ۔ ہتوڑا * ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْوُقُوْعُ کسی چیز کے ثابت ہونے اور گرنے کو کہتے ہیں ۔ اَلْوَاقِعَةُ ایسا واقعہ جس میں سختی اور ناگواری پائی جائے ** ۔ زجاج نے کہا ہے کہ ہر آنے والی چیز جس کے متعلق یہ توقع ہو کہ وہ ضرور آئیگی ۔ اسے وَاقِعَةٌ کہدیتے ہیں * ۔

قرآن کریم میں ہے وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ (٢٢/٦٥) ۔ خدا نے (اپنے قانون کے مطابق) بارش کو روک رکھا ہے کہ وہ یونہی از خود زمین پر نہ گر پڑے ۔ سورہ نساء میں ہے ۔ وَقَعَ اَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ (٤/١٠٠) اس کا اجر اللہ پر واجب ہو گیا ۔ سورہ اعراف میں ہے فَوَقَعَ الْحَقُّ (٧/١١٨) ۔ حق محسوس شکل میں سامنے آ کر ثابت ہو گیا ۔ سورہ الطور میں ہے اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ (٥٢/٧) ۔ خدا کا عذاب یقیناً واقع ہو کر رہے گا ۔ دوسری جگہ ہے اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (٥٦/١) جب ہو جانے والی بات ہو جائیگی ۔ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (٥٦/٢) اسکے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ۔ مَوَاقِعُ ۔ واقع ہونے کی جگہیں (٥٦/٧٥) ۔ مُوَاقِعٌ (اسم فاعل) ۔ گر پڑنے والا (١٨/٥٣) ۔ اَوْقَعَ ۔ ڈال دینا ۔ (٥/٩١) ۔

و ق ف

وَقَفَ بِالْمَكَانِ يَقِفُ ۔ وُقُوْفاً ۔ وہ اس جگہ پر برابر کھڑا رہا ۔ وَقَفْتُهُ ۔ وَقْفاً ۔ میں نے اسے ٹھہرا دیا *** ۔ قرآن کریم میں ہے وَقِفُوْهُمْ (٣٧/٢٤) انہیں ٹھہراؤ ۔ اَلْمَوْقِفُ ۔ ٹھہرنے اور کھڑے ہونے کی جگہ ۔ اَلتَّوْقِيْفُ فِي الْحَدِيْثِ ۔ بات کو واضح کرنا *** ۔ اصطلاحاً اَلتَّوْقِيْفُ کسی بات کو معین کرنے کے لئے بولا جاتا ہے ۔

و ق ی

وَقَى الشَّيْءَ يَقِيْهِ وَقْياً وَ وِقَايَةً ۔ کسی چیز کی حفاظت کرنا ۔ نگہبانی و نگہداشت کرنا ۔ اسے مضر اور تکلیف دہ چیز سے بچانا ۔ چنانچہ جب

---

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و محیط ۔

گھوڑا چلتے وقت نعل نہ ہونے کی وجہ سے سنبھال سنبھال کر پاؤں زمین پر رکھے ، خواہ اپنے سم میں درد کی وجہ سے ہو، یا سم کے چھل کر زخمی ہونے اور زمین کے سخت ہونے کی وجہ سے، تو اسے وَقَی الْفَرَسُ مِنَ الْحَفَا کہتے ہیں *۔

وِقَایَۃٌ ۔ احتیاط ۔ یا محفوظ رکھنے کا ذریعہ (Preservative) **۔

سَرْجٌ وَاقٍ ۔ ایسی زین جو گھوڑے کی پیٹھ پر بالکل ٹھیک بیٹھ جائے اور اسے زخمی نہ کرے **۔

قرآن کریم میں وَاقٍ بمعنی محفوظ رکھنے والا ، بچانے والا آیا ہے۔ مَالَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا وَاقٍ (۱۳/۳۷) " تیرے لئے اللہ کے مقابلہ پر نہ کوئی سرپرست ہوگا۔ نہ بچانے والا" ۔دوسرے مقام پر یہ مادہ محتاط رہنے اور اپنی حفاظت کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے ۔ جیسے فَاتَّقُوا النَّارَ (۲/۲۴) اپنے آپ کو عذاب آتش سے محفوظ رکھو۔ یا اس سے محتاط رہو۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ (جو قرآن کریم میں بار بار آتا ہے) کے معنی ہیں قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنا ۔ احکام خداوندی کا اتباع کرنا ۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرنا ۔ ان سے ہم آہنگ رہنا ۔ چنانچہ قرآن کریم نے یہ مفہوم دیگر مقامات میں واضح کر دیا ہے ۔ سورہ مائدہ میں تَقْوٰی کے مقابلہ میں عُدْوَانٌ کا لفظ آیا ہے (۵/۲) ۔ اور عُدْوَانٌ کے معنی سرکشی کے ہیں ۔ لہذا تَقْوٰی کے معنی قوانین خداوندی کی اطاعت ہوا ۔ سورہ آل عمران میں اسکی مزید تشریح کر دی گئی ہے جہاں فرمایا یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (۳/۱۰۱) ۔ اے ایمان والو۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو ۔ جیسا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہوتا ہے۔ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۳/۱۰۱) یعنی تمام عمر قوانین خداوندی کے سامنے جھکے رہو۔ بالفاظ دیگر اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا (۳/۱۰۲) ۔ سب کے سب مل کر اللہ کے ضابطہ ہدایت کے ساتھ متمسک رہو۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ وَاتَّقُوا اللّٰہَ کے معنی ہیں قوانین خداوندی (قرآن کریم) سے ہم آہنگ رہنا ۔ اس کے مطابق زندگی بسر کرنا ۔ ان کی پوری پوری نگہداشت کرنا ۔ اسی لئے سورہ شعراء میں مُتَّقِیْنَ کے مقابلہ میں غَاوِیْنَ آیا ہے (۲۶/۹۰-۹۱) ۔ غَاوِیْنَ وہ جو قوانین الٰہیہ کی راہ نمائی چھوڑ کر دوسری راہیں اختیار کر لیں اور مُتَّقِیْنَ وہ جو اسکی راہ نمائی کے پیچھے پیچھے چلیں ۔ قوانین خداوندی کی اس کامل ہم آہنگی کے اعتبار سے سورہ ص میں مُتَّقِیْنَ کے مقابلہ میں فُجَّارٌ کا لفظ آیا ہے (۳۸/۲۸) ۔ فَاجِرٌ وہ

*تاج ۔ **لین ۔

ہے جو پھٹ کر الگ ہو جائے (دیکھئے ف - ج - ر) لہذا متقی وہ ہے جو اس ضابطہ کے ساتھ متمسک رہے - اسکے ساتھ چمٹا رہے - اس سے ہم آہنگ رہے - پھٹ کر الگ الگ ہو جانے (Disintegration) اور ہم آہنگ رہنے (Integration) کے مفہوم کے اعتبار سے سورہ الشمس میں ہے کہ خدا نے نفس انسانی (انسانی ذات Human Personality) میں یہ دونوں صلاحیتیں رکھدی ہیں - فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۹۱/۸) چاہے تو انسان ضابطہ خداوندی سے ہم آہنگ رہ کر اپنی ذات میں ارتکاز (Crystallisation) پیدا کرتا جائے اور چاہے اس سے الگ ہٹ کر اپنی ذات میں تشتت و انتشار پیدا کر لے - انہی دونوں گروہوں کے متعلق سورہ محمد میں ہے کہ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو اپنے ہی خیالات اور جذبات کے پیچھے چلتے ہیں (۴۷/۱۴) - لیکن دوسرا گروہ ان کا ہے جو قوانین خداوندی کی راہ نمائی میں چلتے ہیں - اس دوسرے گروہ کو ان کا تقوی مل جاتا ہے (آتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ - ۴۷/۱۷) - لیکن یہ اسی کو ملتا ہے اَلَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى * - (۹۲/۱۷-۱۸) - جو اپنا مال (یا جو کچھ اس کی ضروریات سے زائد (۲/۲۱۹) اسکے پاس ہے وہ نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے) دیدیتا ہے اور اسطرح خود اپنی ذات کی نشوو نما (Development) کا سامان بہم پہنچا لیتا ہے * -

لہذا مُتَّقِيْنَ وہ ہیں جو غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہیں اور قوانین خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کرکے اپنی ذات کی نشوو نما کریں - تخریبی قوتوں کے تباہ کن اثرات سے حفاظت (تُقَاةً) کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ انسان قوانین خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کرے (تَقْوٰى) - ان کا ہر وقت خیال رکھے - (تَقْوَى الْقُلُوْبِ) اور اپنا ہر قدم ان کے مطابق اٹھائے - اسی کا نام ان سے متمسک یا ہم آہنگ رہنا ہے - ایسا تمسک جیسے زین گھوڑے کی پیٹھ پر فٹ آجاتی ہے اور اسے زخمی نہیں ہونے دیتی -

قرآن کریم نے اپنے متعلق شروع ہی میں یہ کہدیا ہے کہ یہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲/۲) - ہے - یعنی یہ صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے لیکن صرف ان کی جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں اور خاردار وادیوں سے محفوظ رہ کر چلنا چاہیں - جو شخص تباہ ہونا چاہے اسے صحیح اور غلط راستے کے امتیاز سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے - خودکشی کرنے والے سے یہ کہنا کہ سنکھیا

* يتزكى (نشو و نما) - دیکھئے (ز - ك - و)

مہلک ہوتا ہے ، اس سے بچنا ، بے سود ہوتا ہے ۔ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲/۶)۔ ”ان کے لئے برابر ہے چاہے تو انہیں راستے کے خطرات سے آگاہ کرے یا نہ کرے۔ وہ صحیح بات کو ماننگے ہی نہیں“۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں دیکھنا چاہئے کہ کہاں اس کے معنی قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنا ہیں اور کہاں تباہیوں اور ہلاکتوں سے بچنا ۔ مثلاً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲/۲۰۱) ۔ قُوْا أَنْفُسَكُمْ (۶۶/۶) مَنْ يُوْقَ شُحَّ نَفْسِهِ (۵۹/۹)۔ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ اور مَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ (۴۰/۹) ۔ میں معنی بچانے کے ہیں ۔ لیکن وَاتَّقُوا اللّٰهَ (۵۹/۱۸) کے معنی یہ نہیں کہ اللہ سے بچو۔ اس کے معنی ہیں قوانین خداوندی کو توڑنے یا ان سے سرکشی برتنے سے بچو ۔ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو ۔ اسی کو تَقْوٰی کہتے ہیں ۔ اور جو أَتْقٰی (سب سے زیادہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنے والا) ہو وہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم ہوتا ہے (۴۹/۱۳) ۔

حقیقت یہ ہے کہ تَقْوٰی قرآن کریم کی خاص اصطلاح ہے اور اس لفظ کو اس نے اسقدر اہمیت دی ہے کہ یہ بجائے خویش گویا ایک مادہ بن گیا ہے جس سے قرآن کریم مختلف الفاظ لایا ہے ۔ اس کے معنی ”پرہیزگاری“ نہیں ۔ ”پرہیزگاری“ محض سلبی صفت (Negative virtue) ہے لیکن تقوی میں زندگی کی تباہیوں سے بچکر چلنے کے ساتھ ساتھ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا بھی ہے ۔ یعنی اس میں سلبی صفت کے ساتھ ایجابی پہلو (Positive side) بھی ہے اور ایجابی پہلو غالب ہے ۔ لفظ ”تقوی“ اسقدر جامع ہے کہ اس کا ترجمہ کسی ایک لفظ میں ہو نہیں سکتا ۔ جس چیز کو عام طور پر کیریکٹر (سیرت اور کردار کی بلندی) کہا جاتا ہے ، وہ اس کے اندر آجاتی ہے ۔ ”کیریکٹر“ کی تعریف (Definition) بڑی مشکل ہے اور خود مغرب کے علمائے اخلاقیات بھی اس باب میں باہمدگر متفق نہیں ۔ لیکن قرآن کریم اس مشکل عقدہ کو بڑی آسانی سے حل کر دیتا ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے ، انسان کی زندگی کی دو سطحیں ہیں ۔ ایک حیوانی سطح زندگی جس کے تقاضے وہی ہیں جو دوسرے حیوانات کے ہیں ۔ تحفظ خویش (Self-Preservation)؛ تغلب (Self-Assertion) اور افزائش نسل (Procreation) ۔ تحفظ خویش کا جذبہ اسقدر قوی اور شدید ہے کہ کوئی فرد اپنے مفاد کے مقابلے میں دوسرے کے مفاد کی پرواہ نہیں کرتا ۔ اسی سے تمام کشمکش پیدا ہوتی ہے ۔

دوسری سطح زندگی وہ ہے جسے ”انسانی زندگی“ کہہ لیجئے ۔ اس زندگی میں مقصد، انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے ۔ یہ نشو و نما ان بلند اور

مستقل اقدار (Permanent Values) کے تحفظ سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ حیوانی سطح زندگی کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی ضروری ہے لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ حیوانی سطح زندگی کے کسی تقاضے اور انسانی زندگی کے تقاضے (یعنی کسی بلند قدر) میں تصادم ہو جائے، (ان میں Tie پڑ جائے، تو، حیوانی زندگی کے تقاضے کو، بلند قدر کی خاطر قربان کر دینا چاہئے ۔ یہ ''تقویٰ'' ہے ۔ اس کو کریکٹر کہتے ہیں ۔ (نیشنل کیریکٹر نہیں بلکہ انسانی کریکٹر) ۔ حتیٰ کہ اگر کوئی وقت ایسا آ جائے کہ بلند قدر کی حفاظت کے لئے جان تک بھی دینی پڑ جائے تو جان دیدے اور انسانی قدر کو بچا لے ۔ اس لئے کہ جان کا تحفظ بہر حال حیوانی سطح زندگی کا تقاضہ ہے ۔ اور بلند قدر کی قیمت اس سے زیادہ ہے ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ جو لوگ زندگی کو محض حیوانی زندگی (Physical Life) سمجھتے ہیں اور انسانی سطح زندگی (انسانی ذات) پر ایمان نہیں رکھتے ، وہ کافر ہیں ۔ (۲۴/۴۵ ; ۲۳/۱۴)۔ انسانی ذات پر ایمان رکھنا مومن کی خصوصیت ہے ۔

قرآن کریم اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ اپنے نفع کا خیال رکھنا اور نقصان سے بچنا عقل کا تقاضا ہے ۔ جو اپنا نفع نقصان نہ پہچانے اسے پاگل کہتے ہیں ۔ چونکہ مومن کے نزدیک ، انسانی ذات کا تحفظ ، حیوانی زندگی کے تحفظ سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے اس لئے جب ان دونوں تقاضوں میں تصادم ہو جائے ، تو اس کی عقل کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی قیمت کی شے (انسانی ذات) کی حفاظت کے لئے چھوٹی قیمت کی شے (حیوانی تقاضے) کو قربان کر دے ۔ لہذا ، صحیح عقل و فکر کے مالک مومن ہی ہوتے ہیں (۳/۱۸۹)۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ فَاتَّقُوااللهَ یٰاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۶۵/۱۰) ۔ ''اے عقل والو ، جو ایمان لائے ہو ، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو'' ۔ یعنی بلند اقدار کی خاطر پست اقدار کو قربان کر دینا تقاضائے عقل و ایمان ہے ۔ قرآن کریم انسان میں کیریکٹر پیدا کرنے کے لئے خالی جذبات سے اپیل نہیں کرتا ۔ وہ علم و بصیرت (Reason) سے اپیل کرتا ہے اور عقل کو سمجھاتا ہے کہ ایسا کرنا خود اس کے لئے کسقدر مفید ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کیطرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہے (۱۲/۱۰۸) ۔ اور مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ ، اور تو اور ، قوانین خداوندی کے سامنے بھی اندھے اور بہرے بن کر نہیں گر پڑتے ۔ (۲۵/۷۳) ۔ یہ ہے قرآن کریم کی رو سے تقویٰ ۔ اور انہیں کہتے ہیں متقین ۔

و ک أ

تَوَکَّأَ عَلَی الشَّیْءِ ۔ اس نے اس چیز پر سہارا لیا اور ٹیک لگائی ۔ اَلتُّکَاَۃُ ۔ لاٹھی ، جس پر چلنے میں ٹیک لگائی جاتی ہے ۔ بہت سہارا لینے والا آدمی* ۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کہا ھِیَ عَصَایَ اَتَوَکَّؤُا عَلَیْھَا (۲۰/۱۸) ۔ یہ میرا عصا ہے جس پر میں سہارا لیتا ہوں ۔ (اس کے مجازی معنی لئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ احکام و ضوابط مجھے ملے ہیں وہ میرے لئے عصائے زندگی ہیں جن کے سہارے میں سفر حیات طے کروں گا) ۔ سورۃ طور میں ہے ۔ مُتَّکِـئِیْنَ عَلٰی سُرُرٍ مَّصْفُوْفَۃٍ (۵۲/۲۰) ۔

سورۃ یوسف میں (عزیز مصر کی بیوی کی ضیافت کے سلسلہ میں ہے) وَ اَعْتَدَتْ لَھُنَّ مُتَّکَاً (۱۲/۳۱)۔ زجاج نے کہا ہے کہ اس میں مُتَّکَاً کے معنے اس چیز کے ہیں جس پر کھانے پینے یا بات کرتے وقت ٹیک لگائی جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی خود کھانے (طعام) کے ہیں ۔ چنانچہ کہتے ہیں اِتَّکَاْنَا عِنْدَ زَیْدٍ ۔ ہم نے زید کے پاس کھانا کھایا* ۔

و ک د

اَلْوِکَادُ ۔ وہ رسّی جس سے دودھ دوھتے وقت گائے کے پیروں کو باندھ دیتے ہیں ۔ نیز تسمہ جس سے زین کستے ہیں ۔ اَلتَّوَاکِیْدُ ۔ اَلتَّاٰکِیْدُ ۔ اَلْمَیَاکِیْدُ ۔ وہ چمڑے کے تسمے جن سے زین کے اگلے یا پچھلے (حصے کو) کس کر باندھ دیا جاتا ہے ۔ وَکَّدَ الرَّحْلَ ۔ اس نے کجاوہ کو کس کر باندھ دیا ۔ وَکَّدَ الْعَھْدَ وَ الْعَقْدَ وَ اَکَّدَھُمَا ۔ اس نے عقد اور معاملہ کو بہت محکم اور موثق (پختہ) کر دیا ۔ گرہ کو بہت سختی سے باندھ دیا** ۔

خلیل نے کہا ہے کہ اَکَّدْتُ قسموں کی پختگی کے لئے زیادہ مناسب ہے اور وَکَّدْتُ باتوں کی پختگی کے لئے*** ۔ بعض نے کہا ہے کہ تَاْکِیْدٌ کی نسبت تَوْکِیْدٌ زیادہ فصیح ہے* ۔ قرآن کریم میں ہے لَا تَنْقُضُوْا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا (۱۶/۹۱)۔ اپنی قسموں کو ان کی پختگی کے بعد مت توڑو ۔

---

*تاج و محیط ۔ **تاج و محیط و راغب و ابن فارس ۔ ***راغب ۔

و ک ز

اَلْوَکْزُ - دھکا دینا - گھونسہ مارنا - ضرب لگانا - ٹھوڑی پر مکا مارنا- وَکَزَہٗ بِالرُّمْحِ - اس نے اس کے نیزہ گھونپا - وَکَزْتُ اَنْفَہٗ میں نے اس کی ناک توڑ دی* - سورۃ قصص میں ہے فَوَکَزَہٗ مُوْسٰی (۲۸/۱۵) - موسیٰ نے اسے گھونسا مارا - (مفہوم مارنے کا ہے) -

و ک ل

رَجُلٌ وَکَلٌ یا مُوَاکِلٌ - اس آدمی کو کہتے ہیں جو خود کمزور ہو اور ہر کام میں دوسروں کا سہارا تلاش کرے - تَوَاکَلُوْا تَوَاکُلًا - لوگوں نے اپنے کام ایک دوسرے پر ڈالنے شروع کر دیئے - اِتَّکَلَ عَلَیْہِ فِیْ اَمْرِہٖ - اس نے اپنے معاملہ میں اس پر اعتماد کیا - اَوْ کَلْتُ عَلٰی اَخِیْکَ الْعَمَلَ - میں نے تمام کام تمہارے بھائی پر چھوڑ دیا - اس کے سپرد کر دیا - اَلْوَکِیْلُ - اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے آدمی کے کام کی نگرانی اور دیکھ بھال کرے** - نیز یہ کَفِیْلٌ کے معنی میں بھی آتا ہے - یعنی کسی بات کا ذمہ دار*** -

ہمارے ہاں تَوَکُّل عَلَی اللّٰہِ کے معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ انسان خود کچھ نہ کرے اور اس انتظار میں رہے کہ خدا اس کے لئے از خود سب کچھ کر دے گا - توکل کا یہ مفہوم قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے جو ہر قدم پر سعی و عمل اور جد و جہد کی تاکید کرتا ہے -

آپ ایک آدمی کو سمندر میں پھینک دیجئے - وہ تیرنا نہ جانتا ہو تو ڈوب کر مر جائے گا - آپ لوہے کے ایک ٹکڑے کو پانی میں ڈال دیجئے، وہ جھٹ پانی کے نیچے چلا جائے گا - لیکن اگر آپ اسی لوہے کی چادروں سے ایک خاص قاعدے کے مطابق ایک عظیم القدر جہاز بنا لیں تو وہ سینہ بحر پر بط کی طرح تیرتا چلا جائے گا - اور اس میں اگر ہزار آدمی بھی سوار کر لیں تو بھی وہ نہیں ڈوبے گا - (بشرطیکہ یہ وزن اس حد کے اندر ہو جسے وہ قاعدے کے مطابق اٹھا سکتا ہے) -

آپ جہاز کو سمندر میں کس اطمینان سے چلاتے رہتے ہیں - اور کس اطمینان سے اس میں سوار ہو جاتے ہیں - یہ اطمینان کس چیز سے پیدا ہوتا ہے؟

*تاج و محیط و راغب - **تاج - ***راغب -

اس "ایمان" سے کہ یہ جو قانون خداوندی ہے کہ اتنی جسامت کا جہاز اگر پانی میں چھوڑ دیا جائے تو وہ اس قدر وزن لیے کر تیرتا رہیگا ، یہ قانون کبھی دھوکا نہیں دے گا۔ اس قانون پر پورا پورا اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ راستے میں دھوکا نہیں دے گا۔ یہ آسرا ٹوٹے گا نہیں۔ یہ سہارا دغا نہیں دے گا۔ اسی کو توکل کہتے ہیں۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں قوانین خداوندی جاری و ساری ہیں جن پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے اسی طرح انسانوں کی تمدنی زندگی کے لئے جو قانون خدا نے عطا کیا ہے (جو قرآن کریم کے اندر ہے) اس کی نتیجہ خیزی پر بھی اسی طرح سے بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر تم اس کے مطابق چلو گے تو جس نتیجہ کا اس نے وعدہ کر رکھا ہے وہ یقیناً برآمد ہو کر رہے گا۔ اس کا نام تَوَكُّلٌ عَلَى اللهِ ہے۔ اور انہی معنوں میں خدا اَلْوَكِيْلُ ہے۔ یعنی جس کے قانون پر پورا پورا بھروسہ کیا جائے۔ عزم (کسی کام کے کرنے کا محکم ارادہ) اس توکل کی لازمی شرط ہے ($\frac{3}{158}$)۔ جماعت مومنین وہ ہے جو اپنے عزم و ارادہ کے ساتھ قانون خداوندی کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ کرے۔ انہی کو مُتَوَكِّلِيْنَ کہا گیا ہے ($\frac{3}{158}$)۔ جو اس کے قانون کے علاوہ کسی اور قانون پر بھروسہ کرے وہ مشرک ہے۔ ($\frac{16}{99\cdot100}$)۔

وَكَّلَ کے معنی ہیں معاملہ کسی کے سپرد کر دینا ($\frac{6}{90}$)۔ سورۃ سجدہ میں ہے وُكِّلَ بِكُمْ ($\frac{32}{11}$)۔ جس کے تم سپرد کئے گئے ہو۔

و ل ت

اَلْوَلْتُ ۔ کے معنی ہیں نقصان اور کم کرنا۔ وَلَتَهٗ حَقَّهٗ يَلِتُهٗ ۔ اَوْلَتَهٗ اس نے اس کا حق کم کر دیا*۔ قرآن کریم میں ہے لَا يَلِتْكُمْ مِنْ اَعْمَالِكُمْ ($\frac{49}{14}$)۔ وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ کم کرکے نہیں دے گا۔ سورۃ طور میں ہے مَا اَلَتْنٰهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ ($\frac{52}{21}$)۔ ان کے اعمال سے ہم کچھ کم نہیں کریں گے۔

(اسے ل ۔ ی ۔ ت کے عنوان کے تحت بھی لکھا گیا ہے)۔

و ل ج

وَلَجَ ۔ يَلِجُ ۔ داخل ہونا**۔ لیکن راغب نے کہا ہے کہ اَلْوُلُوْجُ کسی تنگ جگہ میں داخل ہونے کو کہتے ہیں***۔ اور بعض کے نزدیک اس

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔

کے معنی آہستہ آہستہ داخل ہونے کے ہیں* ۔ اَلْوَلِيْجَةُ ۔ (واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے) ۔ دلی دوست ۔ مخلص دوست ۔ وہ شخص جو تمہارے خاندان سے تو نہ ہو لیکن تم اسے بہت ہی قابل اعتماد سمجھو (تمہارے اندر گھسا ہوا) رازدار (۹/۱۶)۔ سورۃ سبا میں وَلَجَ کے بمقابلہ خَرَجَ آیا ہے (۳۴/۲) ۔ دیگر مقامات پر ہے يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ (۳/۲۹ و ۳/۲۶) ۔ اس میں يُوْلِجُ کے بجائے تُوْلِجُ ہے)۔ وہ رات کو دن کے اندر داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات کے اندر ۔

و ل د

اَلْوَلَدُ ۔ جسے کسی نے جنا ہو ۔ (مذکر ۔ مونث ۔ واحد ، تثنیہ ، جمع ۔ سب کے لئے یہ لفظ آتا ہے ۔ نیز جمع کے لئے اَوْلَادٌ ۔ وِلْدَةٌ ۔ اور وُلْدٌ بھی مستعمل ہیں)**۔ لیکن یہ لفظ بچہ کے لئے اس وقت بھی بولا جاتا ہے جب وہ ابھی رحم مادر میں ہو***۔ اَلْوَلِيْدُ ۔ جب تک بچہ چھوٹا رہے ، نیز غلام یا ملازم (جمع وِلْدَانٌ) ۔ اَلْوَالِدُ ۔ باپ ۔ اَلْوَالِدَةُ ۔ ماں ۔ اَلْوَالِدَانِ ۔ ماں باپ ۔ مَوْلِدٌ ۔ ولادت کا مقام اور وقت ۔ مِيْلَادٌ ۔ ولادت کا وقت** ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَلتَّوَالُدُ کے معنی ہیں بغیر ماں باپ کے کسی جاندار کا وجود پذیر ہو جانا جیسے گرمی کے موسم میں بند پانی میں جراثیم (یا اورذی حیات) پیدا ہو جاتے ہیں***۔ (یہ غالباً اس زمانے کی اصطلاح ہے جب جراثیم کے متعلق صحیح معلومات بہم نہیں پہنچی تھیں ورنہ یہ جراثیم بھی بغیر ''ماں باپ'' کے پیدا نہیں ہوتے ۔ اگرچہ ان کی پیدائش کا طریقِ عمل تَوْلِيْد سے مختلف ہوتا ہے) ۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق متعدد مقامات پر ہے کہ اس کا وَلَدٌ نہیں (۴/۱۷۱) ۔ اس سے صرف عیسائیوں کے اس عقیدہ ہی کی تردید مقصود نہیں جس کی رو سے وہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں ۔ اس سے مقصود یہ کہنا بھی ہے کہ خدا نے کائنات کو تَوْلِيْدٌ کے سلسلہ سے پیدا نہیں کیا (جس طرح ماں باپ کے ہاں اولاد پیدا ہوتی ہے) بلکہ اس نے اسے تخلیقاً پیدا کیا ۔ تولید (Pro - creation) میں ، پیدا کرنے والے (وَالِدٌ) کا ایک جزو ، مَوْلُوْدٌ (جو جنا گیا ہو اس) میں شامل ہوتا ہے ۔ اور والد میں اتنے حصے کی کمی آ جاتی ہے ۔ لیکن تخلیق (Creation) میں پیدا کرنے والے (خالق) کی ذات کا کوئی جزو اس کی مخلوق میں نہیں آتا ۔ اس لئے عمل

*غریب القرآن مرزا ابو الفضل ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

تخلیق سے اس کی ذات میں کسوئی کمی (Deficiency) واقع نہیں ہوتی ۔ خدا خالق ہے اور وہ انسانوں سے بھی تخلیق چاہتا ہے ۔ باقی رہا عملِ تولید ، سو یہ ایک حیاتیاتی عمل (Biological Action) ہے جس میں حیوان اور انسان دونوں شامل ہیں ۔ آدمی ، انسانیت کی سطح پر عملِ تخلیق سے آتا ہے اور صرف تولید (اولاد پیدا کرنے) سے وہ حیوانی سطح پر رہتا ہے (اگرچہ افزائشِ نسل کے لئے یہ بھی ضروری ہے ۔ جس طرح تحفظ خویش کے لئے کھانا ، پینا ضروری ہے) ۔ لہذا ، انسان کو دیکھنا یہ چاہئے کہ اس نے ''تخلیق'' کس قدر کی ہے ۔ نہ یہ کہ اس نے ''تولید'' کتنی کی ہے ۔ کتنے بچے پیدا کئے ہیں ۔ تخلیق ، فریضۂ انسانیت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اللہ کے علاوہ اور خالقین کے وجود کو بھی تسلیم کرتا ہے ۔ وہ خدا کو اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ (۲۳/۱۴) کہہ کر پکارتا ہے ۔ یعنی تمام خالقین میں سب سے بہتر خالق ۔ وہ جس کی تخلیق حسن کی انتہائی شکل لئے ہو ۔

صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ اَلْوَلَدُ کا استعمال بیٹے اور بیٹے کے بیٹے (وَلَدُ الْوَلَد ۔ یعنی پوتے) سب کے لئے ہوتا ہے (لیکن اَلْمَوْلُوْدُ صرف اسے کہینگے جو براہ راست کسی کا بیٹا ہو) ۔ قرآن کریم نے احکامِ وراثت کے ضمن میں کہا ہے يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ (۴/۱۱) ۔ اَوْلَادٌ ۔ وَلَدٌ کی جمع ہے ۔ لہذا اس سے مراد صرف اپنے بیٹے اور بیٹیاں ہی نہیں بلکہ بیٹوں اور بیٹیوں کے بیٹے بیٹیاں بھی ہیں ۔ اگر کسی متوفی کا بیٹا زندہ ہے تو وہ اس کا وَلَدٌ ہوگا ۔ اور اگر بیٹا پہلے مر چکا ہے لیکن اس کا پوتا (بیٹے کا بیٹا) زندہ ہے تو وہ بھی اس کا وَلَدٌ ہوگا اور وہ دادا کی وراثت سے حصہ پائے گا ۔ اسی طرح بیٹی کی اولاد بھی اَوْلَادٌ میں شامل ہوگی ۔ اسی طرح والدین سے مراد صرف ماں باپ نہیں ہونگے بلکہ یہ سلسلہ اوپر تک چلا جائیگا ۔ یعنی دادا ۔ نانی وغیرہ ۔

سورۃ بقرہ میں یہ کہا گیا ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دو سال تک دودھ پلائیں ۔ اس کے ساتھ طلاق کا بھی ذکر آرہا ہے ۔ اس ضمن میں کہا کہ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ (۲/۲۳۳) ۔ مطلب یہ ہے کہ بچے کی ماں کے کھانے پینے کی ذمہ داری بچے کے باپ پر ہے ۔ اس کے لئے قرآن کریم نے مَوْلُوْدٌ لَهٗ کے الفاظ استعمال کئے ہیں ۔ یعنی وہ جس کے لئے اس عورت نے بچہ جنا تھا ۔ اگر بچے کا باپ موجود ہے تو یہ الفاظ اس کے لئے ہونگے ۔ اگر وہ نہیں تو اس کی جگہ جو اس کا (مذکر) وارث ہوگا یہ الفاظ اس کی طرف رجوع کر جائیں گے ۔

و ل ی

الوَلْیُ ۔ کے بنیادی معنی ہیں کسی کے قریب اور نزدیک ہونا ۔ ابن فارس نے بھی یہی اس مادہ کے بنیادی معنی بتائے ہیں ۔ دَارٌ وَلِیۡةٌ ۔ قریب گھر*۔ قریب ہونے کے اعتبار سے اَلْوَلْیُ کے معنی ہوتے ہیں دوسری چیز کا پہلی چیز کے بعد بغیر فصل (ساتھ ہی) ہونا**۔ راغب نے کہا ہے کہ الوَلَاءُ والتَّوَالِیُ کے معنے ہیں دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اسطرح یکے بعد دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہ ہو، اور اس جہت سے استعارۃ یہ قرب کے لئے استعمال ہوتا ہے***۔ وُلِیَتِ الاَرْضُ ۔ زمین پر موسم بہار کی پہلی بارش کے بعد بارش برسی ۔ اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی کے معنے ہیں خرابی اور تباہی تمہارے قریب پہنچ چکی ہے یا ساتھ ہی لگی ہوئی ہے ۔ یہ زجرو وعید اور توبیخ کے موقع پر استعمال ہوتا ہے ۔ ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے ۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کلمہ ہاتھ سے نکل جانے والے فائدے پر افسوس دلانے کے لئے بولا جاتا ہے ۔ هُوَ اَوْلٰی بِکَذَا ۔ وہ اس کا زیادہ حق دار ہے ، زیادہ لائق و مستحق ہے* (۳۳/۶) ۔

قرب کے اعتبار سے اَلْوَلِیُّ دوست اور مدد گار کو کہتے ہیں ۔ اَلْمُوَالَاۃُ ۔ ایک دوسرے سے محبت اور دوستی کرنا ۔ معاہدہ کرنا ۔ ایک دوسرے کے قریب ہونا ۔ لگاتار و مسلسل آنا ۔ نیز اس کے معنے دو لڑنے جھگڑنے والوں کے درمیان صلح و صفائی کے لئے دخل اندازی کرنا بھی ہیں ۔ لیکن اِسْتَوْلٰی عَلَی الشَّیْءِ کے معنے ہیں کسی چیز کو اپنے قبضہ قدرت میں لے لینا ۔ اور اِسْتَوْلٰی عَلَی الاَمْرِ ۔ کسی معاملہ پر غالب آجانا*۔ اسی لئے الوِلَایَۃُ ۔ سلطنت اور حکومت کو کہتے ہیں** ۔ اور وَالٍ ۔ نگران و ناظم اور حاکم کو ۔ اَوْلَیْتُهُ الاَمْرَ ۔ میں نے اسے معاملہ کا ناظم و نگران بنا دیا ۔ الوَلِیُّ بھی نگران و ناظم اور حاکم کو کہتے ہیں * ۔ تَوَلَّاہُ (۲۲/۴) ۔ اسکو ولی بنا لیا ۔ تَوَلّٰی الاَمْرَ ۔ اس نے معاملہ کی ذمہ داری اٹھا لی ۔

وَلّٰی کے متضاد معنی آتے ہیں ۔ کسی کی طرف رجوع کرنا بھی اور کسی سے اعراض کرنا بھی ۔ وَلّٰی هَارِبًا ۔ پیٹھ موڑ کر بھاگا ۔ اور فَوَلِّ وَجْهَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے معنی ہیں تو مسجد حرام کی طرف اپنا رخ کر ۔ تَوَلّٰی عَنْهُ ۔ اس سے اعراض کیا * ۔ تَوَلَّاہُ کے معنی اسکی پیروی کرنا اور اسے اختیار کرنا بھی ہیں * ۔ (۲/۱۰۰)

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔

قرآن مجید میں یہ مادہ ان تمام مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ کسی کی طرف رخ کرنا (۲/۱۱۵) اور رو گردانی کرنا (۲/۱۴۲)۔ حاکم بن جانا (۲/۲۰۵)۔ وَلَایَۃٌ بمعنی غلبہ و اقتدار (۱۸/۴۴)۔ وَلِیٌّ۔ مدد گار۔ حمایتی (۲/۱۱۲) وَلِیٌّ بمعنی وارث (۱۷/۳۳ ; ۱۹/۵)۔ اَلمَوَالِیْ (دور کے) رشتہ دار (۱۹/۵ ; ۳/۳۳)۔

ایک راہ تو یہ ہے کہ انسان جس نظریہ یا تصور کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالے (اسے ایمان کہتے ہیں) اس کے سامنے بطیب خاطر جھک جائے اور اس کی پوری پوری اطاعت کرے۔ (اسے اسلام کہتے ہیں)۔ لیکن دوسری راہ یہ ہے کہ انسان اس سے گریز کی راہیں تلاش کرے۔ یہ اعراض ہے۔ اس کو تَوَلّیٖ کہتے ہیں۔ چنانچہ (۲/۱۳۷) میں یہ لفظ ایمان کے مقابلہ میں آیا ہے۔ اور (۳/۱۹) میں اَسْلَمَ کے مقابلہ میں (نیز ۱۶/۸۲–۸۱ میں)۔ اور (۴/۸۰) میں یہ لفظ اِطَاعَتٌ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ لہذا تَوَلّیٖ کے معنی یہی نہیں کہ انسان ایک مذہب (یا نظام) کو چھوڑ کر دوسرا مذہب یا (نظام) اختیار کر لے۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے اسکی پوری پوری اطاعت نہ کرے بلکہ گریز کی راہیں نکالتا رہے۔ اسی لئے تَوَلّیٰ بمقابلہ صَلّٰی آیا ہے (۷۵/۳۱–۳۲)۔ صلّٰی کے معنی پوری اطاعت کرنا۔ کسی کے پیچھے پیچھے چلے جانا ہیں۔ صلّٰی کے مقابل میں تَوَلّٰی کی عام صورت یہ ہے کہ خدا کے دئے ہوئے دین (یا نظام اطاعت) کی جگہ انسان کی خود ساختہ شریعت کو دین قرار دیدیا جائے اور اسکی اتباع کو دین کی اطاعت بنا دیا جائے۔

قرآن کریم نے خدا اور انسان کا تعلق اس قسم کا قرار دیا ہے جسے ہم عام الفاظ میں رفاقت کا تعلق کہتے ہیں۔ اگر انسان قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے تو خدا خود اسکا رفیق (ولی) بن جاتا ہے۔ اور اس کے قانون کے حیات بخش نتائج اس کے شامل حال ہوتے ہیں۔ دوسری طرف، ان قوانین کی اطاعت سے انسان کے ہاتھوں خدا کے کائناتی پروگرام کی تکمیل ہوتی جاتی ہے (یعنی کائنات میں حسن اور نکھار پیدا ہوتا جاتا ہے)۔ اسطرح انسان خدا کا وَلِیٌّ بن جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے ایک طرف خدا کو مومنین کا ولی کہا ہے (۲/۲۵۷)۔ اور دوسری طرف مومنین کو اَوْلِیَاءُ اللّٰہِ کہا ہے (۱۰/۶۲)۔ اَوْلِیَاء وَلِیٌّ کی جمع ہے۔ یاد رہے کہ اَوْلِیَاءُ اللّٰہِ کا کوئی خاص گروہ نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے ہر مومن وَلِیُّ اللّٰہِ ہے اور تمام مومنین اَوْلِیَاءُ اللّٰہِ ہیں۔ اس نے صاف الفاظ میں کہدیا ہے کہ اَوْلِیَاءُ اللّٰہِ وہ ہیں اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ (۱۰/۶۳)۔ جو لوگ قرآن کریم

پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں ۔ ان کی '' پہچان '' یہ بتا دی کہ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ (۱۰/۶۴)۔ انہیں اس دنیا میں بھی زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی ۔ آخرت کی زندگی کو تو یہاں دیکھا نہیں جا سکتا لیکن یہاں کی زندگی تو ہر ایک کے سامنے ہوتی ہے ۔ لہذا اَوْلِيَاءُ اللهِ (جماعت مومنین) وہ ہیں جنہیں زندگی کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوں اور وہ دنیا میں نظام خداوندی کو قائم کریں (کیونکہ دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں صرف اسی نظام کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہیں) ۔ انہی کو قرآن کریم نے حِزْبُ اللهِ (۵۸/۲۲) کہا ہے ۔ اور ان کے مقابلہ میں غیر خدائی نظام کے تابع زندگی بسر کرنے والوں کو حِزْبُ الشَّيْطَانِ (۵۸/۱۹) ۔ اس تصور کے علاوہ اَوْلِيَاءُ اللهِ کا جو تصور بھی ہے وہ غیر قرآنی ہے اور دوسروں سے مستعار لیا ہوا ۔

سورہ محمد میں سلسلہ کلام یوں چلا آرہا ہے کہ تم اقوام سابقہ کے احوال و کوائف پر غور کرو اور دیکھو کہ جن لوگوں نے وحی کے بتائے ہوئے راستے سے سرکشی برتی ان کا انجام کیا ہوا ۔ جو انجام ان کا ہوا وہی انجام دور حاضر کے مخالفین کا بھی ہوگا ۔ اس کے بعد ہے ذَالِكَ بِاَنَّ اللهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَاَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَىٰ لَهُمْ (۴۷/۱۱) ۔ '' یہ اس لئے کہ جو لوگ وحی کے بتائے ہوئے راستے پر ایمان رکھتے ہیں ان کا مولیٰ (دوست ۔ رفیق ۔ کارساز) اللہ ہے ۔ اور جو اس راستے کی مخالفت کرتے ہیں ان کا کوئی مولیٰ نہیں ہو سکتا '' ۔ یعنی جو شخص یا قوم قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرے اسے اسکی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے کوئی نہیں بچا سکتا ۔ ظاہر ہے کہ ان معنوں میں اللہ کے سوا کوئی کسی کا مولیٰ نہیں ہو سکتا ۔ یہی وہ مفہوم ہے جس کی رو سے جماعت مومنین کا اعلان ہوتا ہے کہ اَنْتَ مَوْلٰنَا (۲/۲۸۶) ۔ '' تو ہمارا مولیٰ ہے '' ۔ لیکن اس کے ساتھ سورہ تحریم میں (نبی اکرمؐ کے سلسلہ میں) فرمایا کہ فَاِنَّ اللهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ (۶۶/۴) ۔ '' اس کا مولیٰ اللہ ہے ۔ اور جبریل ۔ اور صالح مومنین ہیں ۔ ظاہر ہے کہ جس مفہوم میں اللہ مولیٰ ہو سکتا ہے اس میں اللہ کے سوا کوئی اور مولیٰ نہیں ہو سکتا ۔ لہذا اللہ ۔ جبریل ۔ اور مومنین کی '' مولائیت '' کی نوعیت الگ الگ ہے ۔ انہیں ایک سطح کا مولیٰ سمجھنا غلط ہے ۔ قوانین خداوندی کے خلاف کسی کی مولائیت کام نہیں آسکتی ۔ يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَوْلًى شَيْئًا (۴۴/۴۱) ۔ '' جسدن کوئی دوست کسی دوست کے کام نہیں آسکیگا '' اس پر شاھد ہے ۔

قرآن کریم نے اس حقیت کو بتاکید دھرایا ، اور بار بار دھرایا ہے کہ مومنین ایک دوسرے کے اولیاء ہو سکتے ہیں اور مومن کسی غیر مومن (کافر) کا ولی نہیں ہو سکتا ۔ بات بالکل واضح ہے ۔ دنیا میں ایک دوسرے کے دوست رفیق ، ھمراز ، ہم نوا وھی ہو سکتے ہیں جن کی منزل مقصود اور اس تک پہنچنے کا راستہ ایک ہو ۔ جن کی منزلیں مختلف اور راستے الگ الگ ہوں ، وہ ایک دوسرے کے دمساز اور ھمراز کیسے ہو سکتے ہیں ؟ غیر مومنین سے اچھے کاموں میں تعاون کیا جا سکتا ہے ۔ انہیں اپنا ھمراز اور دمساز نہیں بنایا جا سکتا (اس ضمن میں حسب ذیل آیات دیکھئے۔ (۳/۲۸ ۔ ۳/۱۱۷ ۔ ۳/۸۹ ۔ ۳/۱۳۹ ۔ ۳/۱۴۴ ۔ ۵/۵۱-۵۵ ۔ ۸/۷۳ ۔ ۹/۱۰-۱۶-۲۳-۲۷ ۔ ۴۷/۱۲-۱۳ ۔ ۵۸/۲۲ ۔ ۶۰/۱-۴) ۔

و ن ی

اَلْـوَنیٰ ۔ تکان۔ درماندگی ۔ وَنیٰ۔ یَنِیْ ۔ وَنْیًا ۔ سستی کرنا ۔ تھک جانا ، کمزور اور ضعیف ہو جانا ۔ نَاقَـةٌ وانِیَـةٌ ۔ تھکی ہوئی اونٹنی ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے کمزوری اور ضعف بتائے ہیں ۔

اَلْمِیْنَا وَ الْمِیْنَاءُ ۔ بندرگاہ ، جہاں پہنچ کر جہاز دم لیتے ہیں ۔ نیز اَلْمِیْنَا (بغیر ھمزہ کے) ان پتھر کے ٹکڑوں کو بھی کہتے ہیں جس سے کانچ بنایا جاتا ہے* ۔

سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ھارونؑ سے کہا گیا ہے کہ فرعون کی طرف جاؤ ۔ وَلَا تَنِیَا فِیْ ذِکْرِیْ (۲۰/۴۲) ۔ اور دیکھو اس کشمکش میں ضابطۂ خداوندی کو آگے بڑھانے میں ذرا بھی سستی نہ کرنا ۔ اس مقصد کے لئے تمہاری تگ و تاز میں ذرا بھی کمی نہ آنے پائے ۔

و ھ ب

وَھَبَ یَھَبُ وَھْبًا ۔ ھِبَـةٌ ۔ عطا کرنا ۔ دینا ۔ اَلْھِبَـةُ ۔ وہ عطیہ جو نہ کسی چیز کے عوض دیا گیا ہو نہ ھی اس میں دینے والے کی اپنی غرض وابستہ ہو ۔ اَلْمَوْھِبَـةُ ۔ وہ بادل جو جہاں واقع ہو وھاں ھی برس جائے ۔ اَوْھَبْتُ لِاَمْرِ کَذَا ۔ میں فلاں امر پر قادر ہو گیا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے الفاظ بغیر قیاس کے آئے ہیں ۔

سورۃ احزاب میں ہے اِنْ وَھَبَتْ نَفْسَھَا (۳۳/۵۰) ۔ اگر وہ اپنے آپ کو نبی کے حوالے کر دے ۔ سورۃ مریم میں ہے قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَھَبَ لَکِ غُلَامًا زَکِیًّا (۱۹/۱۹)۔ اس نے کہا کہ میں تیرے

---

*تاج ۔ **تاج و محیط ۔

رب کا یہ پیغام لے کر آیا ہوں کہ "میں (خدا) تجھے ایک پاکیزہ اورنشوونما یافتہ بچہ عطا کروں گا"۔ سورۃ شعراء میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے کہا فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا... (۲۶/۲۱) ۔ اللہ نے مجھے قوت فیصلہ اور نبوت عطا فرمائی ۔ نبوت ایک ایسا علم ہے جو خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتا ہے ۔ کسب و ہنر سے حاصل نہیں کیا جاسکتا ۔ خدا کی صفت اَلْوَهَّابُ ہے (۳/۸) ۔ یعنی بلا مزد و معاوضہ بہت زیادہ عطا کرنے والا ۔ سورۃ صٓ میں یہ لفظ واپس دینے کے معنوں میں بھی آیا ہے وَ وَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ... (۳۸/۴۳)۔ مطلب عطا کرنے سے ہی ہے ۔ کھوئے ہوؤں کا واپس مل جانا بھی تو عطا ہے ۔

و ہ ج

وَهَجَتِ النَّارُ ۔ وَهْجًا ۔ آگ کا روشن ہونا ، جلنا اور بھڑکنا ۔ اَلْوَهَجُ ۔ آفتاب اور آگ کی حرارت ۔ تَوَهَّجَ الْجَوْهَرُ ۔ جوہر چمک اٹھا*۔

قرآن کریم میں ہے وَ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا (۷۸/۱۳) ۔ ہم نے (سورج کو) چراغ بنایا جو بافراط روشنی اور حرارت دینے والا ہے ۔

و ہ ن

اَلْوَهْنُ ۔ کسی کام یا معاملہ میں یا جسمانی طور پر کمزور ہونا ۔ لیث نے کہا ہے کہ وَاهِنٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جو کام اور معاملہ میں کمزور ہو ۔ اور مَوْهُوْنٌ ۔ اُسے جو بدنی لحاظ سے کمزور ہو**۔ سورۃ آل عمران میں وَهْنٌ کے ساتھ ضعف اور استکانت کے الفاظ آئے ہیں (۳/۱۴۵) ۔ اس سے اس کے مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے ۔ وَهَنَ ۔ کمزور و ضعیف ہوا ۔ اَوْهَنَ کمزور اور ضعیف بنایا ۔ سورۃ انفال میں ہے اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِيْنَ (۸/۱۸) ۔ اللہ مخالفین ، کفار کے منصوبوں کو کمزور (ناکام) بنا دیگا ۔ مسلمانوں سے کہا گیا ہے وَلَا تَهِنُوْا (۳/۱۳۸) ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم میں کسی قسم کی بھی کمزوری نہیں ہونی چاہئے ۔ نہ جسمانی کمزوری (جس میں مادی اسباب بھی شامل ہیں) اور نہ ہی عقل و فکر اور علم و بصیرت کی کمزوری ، کیونکہ قرآن کریم نے قیادت کے لئے جسمانی اور علمی دونوں صلاحیتوں کو ضروری قرار دیا ہے (۲/۲۴۷) ۔ نہ ہی سیرت و کردار میں کسی قسم کی کمزوری۔ اس طرح ایمان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (۳/۱۳۸) ۔ تم سب سے بلند ہو جاؤ گے ۔

---

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔

و ھ ی

اَلْوَھْیُ ۔ کسی چیز میں شگاف ھونا ۔ کسی چیز کی بندشوں کا ڈھیلا پڑ جانا ۔ اَوْھَاہُ ۔ اس نے اسے کمزور کر دیا ۔ اَلْحَائِطُ یَھِیْ * ۔ دیوار گرا چاھتی ھے ۔ رَجُلٌ وَاہٍ ۔ بودا ۔ کمزور ۔ احمق آدمی ۔ ناقابل اعتماد ۔ حَدِیْثٌ وَاہٍ ۔ نہایت بودی بات* ۔

قرآن کریم میں ھے وَ انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَھِیَ یَوْمَئِذٍ وَّاھِیَۃٌ (۶۹/۱۶) ۔ آسمان پھٹ جائیگا اور اس دن اس کی بندشیں ڈھیلی پڑجائینگی ۔

وَیْ (حرف)

وَیْ ۔ تعجب و افسوس یا زجر و توبیخ یا پشیمانی اور تعجب کے لئے آتا ھے**۔ قرآن کریم میں وَیْکَاَنَّ آیا ھے (۲۸/۸۲) ۔ (وَیْ + کَ + اَنَّ یا وَیْ + کَاَنَّ) ۔ ھائے افسوس ۔ یا جیسے ھم کہتے ھیں کہ ''ارے! ھم تو کچھ اور سمجھ رھے تھے اور معاملہ یوں نکلا!''

و ی ل

وَیْلٌ ۔ شر کا نازل ھونا ۔ یہ مصدر جامد ھے جس کا کوئی فعل نہیں***۔ اظہار درد و کرب کے موقع پر، نیز عذاب و تکلیف اور بد انجامی کے لئے یہ کلمہ استعمال ھوتا ھے ۔ اَلْوَیْلَۃُ ۔ رسوائی ۔ تباھی ۔ بربادی ۔ ھلاکت*** ۔

تباھی اور بربادی کے معنوں میں وَیْلٌ (۲/۱۰۳) میں آیا ھے ۔ حسرت اور افسوس کے لئے وَیْلَکَ (۴۶/۱۷) میں ۔ اور شرم اور تعجب کے ملے جلے جذبات کے لئے یٰوَیْلَتٰی (۱۱/۷۲) میں ۔

---

*تاج و راغب ۔ **تاج و راغب و محیط ۔ ***تاج ۔

ھ

ہٗ (ضمیر)

ہٗ - یہ ضمیر منصوب متصل اور مجرور متصل ہے - واحد مذکر غائب کے لئے آتی ہے -

منصوب متصل کی مثال - یَنْصُرُوْنَہٗ (۲۸/۸۱) - ''(جو) اس کی مدد کرے'' - مجرور متصل کی مثال - مَکَانَہٗ (۲۸/۸۲) - ''اسکی جگہ'' -

[یہ ضمیر کبھی ہِ اورہ بھی پڑھی جاتی ہے مثلاً فِیْہِ - بِہٖ - اورکبھی یہ ساکن ہوکر محض وقف کے لئے بڑھا دی جاتی ہے مثلاً مَاھِیَہْ - اور کِتَابِیَہْ] -

ھَا (ضمیر)

ھا - ضمیر منصوب متصل اور مجرور متصل ہے - واحد مؤنث غائب کے لئے آتی ہے - منصوب متصل کی مثال - اَنْتَھَا (۳/۶۹) -

مجرور متصل کی مثال - لَوْنُھَا (۲/۶۹) -

ھَا

ھَا - خُذْ (پکڑو - لو) کے معنے میں آتا ہے - ھَاؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَہْ (۶۹/۱۹) لو - میری کتاب پڑھو - (اس میں جمع کے لئے اُمْ بڑھایا گیا ہے) ھَا - تنبیہ کے لئے بھی آتا ہے - ھَا اَنْتُمْ اُوْلَاءِ - ہاں تم وہی تو ہو -

جب ھَا، اَیّٗ کے بعد آئے تو ندا (پکارنے) کے لئے آتا ہے - جیسے اَیُّھَا الرَّجُلُ - اے مرد! اکثر اَیُّھَا سے پہلے یَا بڑھا کر یَا اَیُّھَا بولا جاتا ہے - قرآن کریم میں ہے یَا اَیُّھَا النَّاسُ (۲/۲۱) اے لوگو!

[ھٰکَذَا کے لئے دیکھئے عنوان ھٰذَا] -

ھٰؤُلَاءِ

ھٰٓؤُلَاءِ - (ھَا + اُولَاءِ) ھٰذَا اور ھٰذِہٖ دونوں کی جمع ہے - "یہ سب" (مذکر و مؤنث) - مذکر کے لئے ھٰٓاَنْتُمْ ھٰٓؤُلَاءِ (۲/۶۵) - خبردار تم ہی وہ لوگ ہو - مؤنث کے لئے ھٰٓؤُلَاءِ بَنَاتِیْ (۱۱/۷۸) یہ سب میری بیٹیاں ہیں -

ھَاؤُمُ

دیکھئے عنوان ھَا -

ھٰذَا

ھٰذَا - (اسم اشارہ - واحد مذکر) "یہ" - ھٰذَانِ ھٰذَیْنِ (مذکر - تثنیہ) "یہ دونوں" - ھٰذِہٖ (واحد مؤنث) - "یہ" - ھَاتَانِ ھَاتَیْنِ - (تثنیہ مؤنث) "یہ دونوں" - (ھٰٓؤُلَاءِ - جمع کے لئے آتا ہے) - "یہ سب" - ھٰکَذَا - (ھَا + کَ + ذَا) - "اسی طرح ایسا ہی" - اَھٰکَذَا عَرْشُکِ (۲۷/۴۲) - کیا تیرا تخت ایسا ہی تھا؟

ھَارُوْتُ

اَلْھَرْتُ - نیزہ گھونپنا - کپڑے کو پھاڑنا اور چندی چندی کرنا - اَلْھَرَتُ - منہ کی باچھوں کا کشادہ ہونا - اَلْھَرِبْتُ - وہ شخص جس کی باچھیں وسیع ہوں - رَجُلٌ ھَرِبْتٌ - وہ آدمی جو فحش گوئی کے ساتھ کسی راز کو پوشیدہ نہ رکھے* -

ھَارُوْتُ - افسانہ طرازوں نے حضرت سلیمانؑ کے متعلق جو طرح طرح کی چیستانیں مشہور کر رکھی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ بابل میں دو فرشتے تھے - ھاروت اور ماروت - وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے - قرآن کریم نے ان مزخرفات کی تردید کردی (۲/۱۰۲) - یہ عجمی لفظ ہے -

(ماروت اور بابل کے عنوانات بھی دیکھئے) -

*تاج -

ھَارُوْنُ

ھَارُوْنُ ۔ یہ عجمی نام ہے ۔ حضرت موسیٰؑ کے بھائی اور بنی اسرائیل کے پیغمبر کا نام تھا ۔ عربی میں اَلْھَیْرُوْنُ ۔ عمدہ قسم کی کھجور کو کہتے ہیں* ۔

بعض لوگ اپنے اس (غلط) عقیدہ کی دلیل میں کہ نبی بغیر کتاب کے بھی آتے ہیں ، حضرت ھارونؑ کی مثال پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کو کتاب ملی تھی اور حضرت ھارونؑ ان کے ساتھ بغیر کتاب کے تھے ۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ کتاب ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ھارونؑ دونوں کو ملی تھی ۔ وَ آتَیْنٰھُمَا الْکِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ (۳۷/۱۱۷) ۔ ''اور ہم نے دونوں کو واضح کتاب دی'' ۔

[مزید تفصیل کے لئے (ن ۔ ب ۔ أ) کا عنوان دیکھئے] ۔

ھَامَان

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو فرعون ، ھامان اور قارون کیطرف بھیجا تھا (۴۰/۲۴) ۔ اور یہ تینوں ھلاک ھونیوالوں میں سے تھے(۲۹/۳۹) ۔

تاریخ انسانیت کے مختلف ادوار پر نگاہ ڈالئے ۔ ھر جگہ بادشاھت کے غلبہ و استیلاء سے کہیں زیادہ عمیق و شدید ، '' پیشوائیت '' (Priesthood) کا تسلط نظر آئیگا ۔ بادشاہ تو خیر بادشاھی کرتا تھا ، برھمن (مذھبی پیشوا) خدائی کرتا تھا ۔ ایسی خدائی جس میں ، سچ پوچھئے تو بادشاہ بھی اسکی رعایا میں سے ھوتا تھا ۔ مصر میں آمن رع (سورج کا دیوتا) سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا ۔ اس مندر کا بڑا پجاری ، شوکت و ثروت کے بلند ترین مقام پر فائز ھوتا تھا ۔ ڈاکٹر سٹینڈروف ، اپنی کتاب '' قدیم مصریوں کا مذھب '' میں لکھتا ہے ۔

''آمن دیوتا کے سردار کاھن کو نبی اول کہتے تھے ۔ وہ محکمہ تعمیرات** کا بھی افسر تھا ۔ مندر کی عالی شان عمارات اور ان کی زیبائش و آرائش کا انتظام اس کی تفویض میں تھا ۔ یہی دیوتاؤں کی فوج یعنی مندر کی سپاہ کا جرنیل بھی تھا ۔ خزانہ کی نگرانی اور نظم و نسق کا بھی یہی ذمہ دار تھا ۔ نہ صرف آمن کا مندر اور اس کے پجاری اس کے دائرہ حکومت میں تھے بلکہ تھیبس اور شمالی اور

*تاج ۔ ** غالباً مذھبی عمارات مراد ھیں۔

مغربی مصر کے تمام مندروں کے پجاریوں کا افسر اعلیٰ بھی یہی تھا - اگر حساب لگایا جائے تو صرف شہر تھیبس کے مندر کے قبضہ میں تمام مصر کی زمین کا دسواں حصہ تھا،، - یہ تھی آمن دیوتا کے مندر کے سردار کاھن (Head Priest) کی وجاھت - یہی آمن، قرآن کا ھامان ھے [جیسے تغیر لفظی سے آرون (Aoron) ھارون ھو گیا] انسائکلوپیڈیا برٹانیکا میں (مصر کے عنوان کے تحت) مذکور ھے کہ

> فراعنہ مصر کے اٹھارھویں خاندان کے وقت سے مندر کے پجاریوں نے خاص اثر اور اھمیت اختیار کر لی تھی - اس خاندان کے زمانہ میں آمن رع (واقع تھیبس) کے کاھن کے نام پر ایشیا کے مفتوح علاقے وقف ھو چکے تھے جنکی وجہ سے وہ بے حساب دولت اور قوت کا مالک سمجھا جاتا تھا -

ڈاکٹر (Breasted) نے بھی اپنی کتاب '' تاریخ مصر'' میں لکھا ھے کہ آمن کے سب سے بڑے پجاری کے ماتحت بہت بڑا مقامی لشکر ھوتا تھا -

ان تصریحات سے یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ھے کہ قرآن کریم نے فرعون کے ساتھ ھامان کے لشکروں کا ذکر کیوں ضروری سمجھا ($\frac{۲۸}{۶}$) - اور فرعون نے ھامان (محکمہ تعمیرات کے افسر اور نظام '' روحانیت ،، کے سب سے بڑے رکن) سے کیوں کہا تھا کہ اس کے لئے ایک بلند عمارت یا برجی تعمیر کر دی جائے جس پر چڑھکر وہ (معاذ اللہ) حضرت موسیٰؑ کے خدا کو جھانک لے ($\frac{۴۰}{۳۶}$) -

حقیقت یہ ھے کہ آسمانی انقلاب کی آواز جب بھی اٹھی ھے اس کے مقابلہ کے لئے ملوکیت کبھی براہ راست سامنے نہیں آئی وہ ھمیشہ '' پیشوائیت،، کو آگے بڑھاتی ھے اور خود اسکی سپر میں محفوظ رھتی ھے - یہی فرعون نے کیا - خود پیچھے رھا اور حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے ھامان اور اس کے ساحرین کو آگے بڑھایا - لیکن عصائے موسیٰؑ نے ان سب کی دسیسہ کاریوں کو نیست و نابود کر دیا - فَاِذَا ھِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِکُوْنَ ($\frac{۷}{۱۱۷}$) -

ملوکیت - پیشوائیت - اور سرمایہ داری ، تینوں بلائیں انسانیت کے لئے ھلاکت آفریں ھیں - قرآن کریم نے ، داستان بنی اسرائیل کے ضمن میں ان تینوں بلاؤں کا ذکر شرح و بسط سے کیا ھے - فرعون ، استبداد ملوکیت کا مجسمہ - ھارون، پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا نمائندہ - اور قارون، سرمایہ داری

کی خون آشامیوں کا پیکر ۔ آسمانی انقلاب ، انسانیت کو ان تینوں بلاؤں سے نجات دلانے کے لئے آتا ھے ۔ اس کا علاج قرآنی نظام حکومت و معیشت میں ھے جس میں نہ کوئی کسی انسان کا بندہ اور غلام ھوتا ھے نہ محکوم اور محتاج ۔

ھ ب ط

ھَبُوْطٌ ۔ اترنا ۔ راغب نے اس کے معنے دب کر مجبوراً اترنا لکھے ھیں***۔ ھَبَطَ اَرْضَ کَذَا ۔ وہ فلاں زمین میں اترا*۔ صاحب محیط نے لکھا ھے کہ ھَبَطَ مِنْ مَوْضِعٍ اِلٰی مَوْضِعٍ کے معنی ھیں وہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ھو گیا**۔ قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ھے اِھْبِطُوْا مِصْرًا ۔ (۲/۶۱) ۔ جس کے معانی ھیں تم اس بیابانی زندگی سے کسی شہر کی طرف منتقل ھو جاؤ ۔ راغب نے لکھا ھے کہ جب لفظ ھَبُوْطٌ انسان کے لئے بولا جائے تو اس میں استخفاف اور حقارت کا پہلو پایا جاتا ھے ۔ بخلاف اِنْزَالٌ کے کہ اسے اللہ تعالٰی نے بہت سے موقعوں پر باشرف چیزوں کے لئے بھی استعمال کیا ھے***۔ ھَبَطَ الْمَرَضُ لَحْمَهٗ کے معنی ھیں بیماری نے اس کے گوشت کو کم کر دیا ۔ اسے لاغر کر دیا ۔ اَلْھَبْطَةُ ۔ نشیبی زمین کو کہتے ھیں ۔ اور اَلْھَبْطُ کے معنی نقصان کے ھیں ، نیز یہ لفظ ذلت ، عاجزی اور شر میں پڑ جانے کے لئے بھی آتا ھے ۔ اَلْھَبِیْطُ ۔ لاغر اونٹ کو کہتے ھیں*۔ (ابن فارس) ۔

لہذا ھَبُوْطٌ کے معنی ھیں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تبدیلی جب کہ دوسری حالت میں پہلی حالت کے مقابلہ میں کچھ کمی ھو ۔ قرآن کریم میں قصہ آدم میں ھے کہ اگر انسان وحی کی راہ نمائی میں امۃ واحدہ بنکر رھیں تو یہ زندگی شرف انسانیت کی زندگی ھے لیکن اگر وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں تو یہ اُس مقام سے پستی کی طرف تبدیلی (ھبوط) ھے ۔ فَقُلْنَا اھْبِطُوْا بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) ۔ "ھم نے کہا کہ تم (اس) مقام بلند سے پستی کی طرف جاؤ ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ھوگے" ۔ اس ھَبُوْطٌ سے ، بلند مقام آدمیت کیطرف تبدیلی اسی صورت میں ھوسکتی ھے جب انسان وحی کے مطابق زندگی بسر کریں (۲/۳۸) ۔ تفصیل ان امور کی (ا ۔ د ۔ م) اور (ش ۔ ج ۔ ر) کے عنوانات میں ملیگی ۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

ھ ب و

اَلْھَبَاءُ ۔ غبار ۔ بہت باریک غبار جو فضا میں بالکل دھویں جیسا نظر آئے ۔ یا وہ باریک غبار کہ جب کسی تاریک کوٹھڑی میں ، روشندان سے دھوپ کی کوئی کرن آرہی ہو تو اس میں جو چھوٹے چھوٹے ذرے نظر آتے ہیں ۔ گھوڑے کے سموں سے اڑنے والے غبار کو بھی کہتے ہیں ۔*
اَلْھَبْوَۃُ ۔ غبار ۔ ھَبَا الْغُبَارُ ۔ گرد اڑی*۔

جَاءَ یَتَھَبّٰی کے معنی ہوتے ہیں وہ خالی ہاتھ ، خاک اڑاتا ہوا آیا ۔
اَلْھَابِیُ ۔ قبر میں گرنے والی مٹی کو کہتے ہیں * ۔

قرآن کریم میں ہے کہ مکافات عمل کی میزان میں مجرمین کے اعمال بالکل بے وزن ہونگے ۔ ان کا کوئی منفعت بخش نتیجہ مرتب نہیں ہوگا ۔ فَجَعَلْنٰہُ ھَبَاءً مَّنْثُوْرًا (۲۵/۲۳) ۔ پھر ہم اسے خاک پراگندہ کی طرح کر دینگے ۔

ھ ج د

اَلْھُجُوْدُ ۔ اَلتَّھَجُّدُ ۔ سونے اور جاگنے دونوں کے لئے آتا ہے ** ۔ (اضداد میں سے ہے ۔ لطائف اللغۃ) ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْھَاجِدُ سونے والے کو کہتے ہیں ۔ لیکن ھَجَّدْتُہٗ فَتَھَجَّدَ کے معنی ہیں ”میں نے اسکی نیند کو دور کر دیا ۔ پس وہ جاگ گیا“ ۔ (جیسے مَرَّضْتُہٗ کے معنی ہوتے ہیں میں نے اس کے مرض کو دور کیا ۔ یا تیمارداری کی) ***۔

قرآن کریم میں ہے وَمِنَ اللَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ (۱۷/۷۹) ۔ رات کے کچھ حصے میں (قرآن کریم کے ساتھ) جاگو ۔ یہ وہی چیز ہے جسے دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے کہ قُمِ اللَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا (۷۳/۲) ۔ ”رات کو قیام کر مگر تھوڑے حصے کو چھوڑ کر“ ۔ قرآنی انقلاب کے اولین مراحل میں پروگرام اسقدر طویل اور سخت ہوتا ہے کہ اس کے لئے دن کے علاوہ ، راتوں کو بھی کام کرنا پڑتا ہے ۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ ھُجُوْدٌ دن میں سونے کو کہتے ہیں اور ھُجُوْعٌ رات میں سونے کو****۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی مقام پر ٹھہرنے کے ہیں ۔

*تاج و راغب و محیط ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔ ****محیط ۔

ھ ج ر

اَلْھَجْرُ ۔ اَلْھِجْرَانُ ۔ کسی چیز کو چھوڑ دینا ۔ ترک کر دینا ۔ الگ ہو جانا ۔ کاٹ دینا ۔ جدا کردینا ۔ قطع تعلق کر لینا ۔ نیز اعراض برتنا ۔ راغب نے اس کے معنے دوسرے سے جدا ہونے کے بتائے ہیں خواہ یہ جدائی زبانی ہو یا قلبی یا بدنی ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) قطع و جدائی اور (۲) کسی کرباندھنا بتائے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے ۔ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلًا (۷۳/۱۰) ۔ نہایت خوبصورتی سے ان سے الگ ہٹ کر (اپنی جماعت کی تنظیم میں مشغول ہوجا) ۔ یعنی فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ (۱۵/۸۵)۔

ھَاجِرَاتٌ ۔ بری باتیں ۔ فحش باتیں ۔ رسوا کن باتیں ۔ ایسی باتیں جنہیں ترک کر دینا چاہئے*۔ بِہٖ سٰمِرًا تَھْجُرُوْنَ (۲۳/۶۷) میں بعض کے نزدیک تَھْجُرُوْنَ کے معنے بکواس کرنا ہیں ۔

اَلْھِجْرَۃُ ۔ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں کوچ کر جانا ۔ اس سے فعل ھَاجَرَ ہے ۔ ازہری نے کہا ہے کہ دراصل اہل عرب کے نزدیک بادیہ نشینوں کا شہر کی طرف منتقل ہو کر آ جانا ، اَلْمُھَاجَرَۃُ کہلاتا تھا، پھر اس شخص کو جو اپنے مقام رہائش کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلا جائے مُھَاجِرٌ کہہ دیتے ہیں* ۔ لیکن قرآن کریم نے اسے اپنے خاص معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے ایک رسول یا مرد مومن کا فریضہ زندگی یہ ہے کہ وہ دنیا میں نظام خداوندی کے قیام کے لئے کوشش کرے ۔ وہ جس مقام میں رہتا ہے سب سے پہلے اپنی اس کوشش کو وہیں سے شروع کرتا ہے ۔ لیکن اگر وہ دیکھے کہ وہاں کی فضا اس نظامِ نو کے لئے سازگار نہیں ، تو اسے اپنے پاؤں توڑ کر وہیں نہیں بیٹھے رہنا چاہئے ۔ اسے اس زمین کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف چلا جانا چاہئے جہاں کی فضا اس کے مقصد کے حصول کے لئے زیادہ سازگار ہو ۔ مومن کسی خاص خطہٗ زمین سے وابستہ نہیں رہ سکتا ۔ مومن کا جہان ہر کہیں ہے ۔ وہ کسی خاص زمین میں زندگی بسر کرکے وہیں مر جانے کے لئے پیدا نہیں ہوتا ۔ وہ خدا کی زمین میں خدا کا قانون نافذ کرنے کے لئے پیدا ہوتا ہے ۔ اس مقصد کے لئے اسے جو کچھ چھوڑنا پڑے بلا توقف چھوڑ دینا چاہئے ۔ مال و دولت ۔ جھوٹی عزت اور قوت ۔ رشتہ دار ۔ وطن ۔ سب کچھ ۔ اس ''چھوڑ دینے'' کا نام ھِجْرَۃٌ ہے اور ایسا کرنے والے کو ''مہاجر'' کہتے ہیں ۔ لیکن صرف ''چھوڑ دینا''

---

*تاج ۔

ہی نہیں بلکہ اس کے بعد اپنے مقصد کے حصول کے لئے مسلسل جد و جہد کرنا بھی۔ اسی لئے قرآن کریم میں اکثر هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا (۲/۲۱۸) - اکٹھا آیا ہے - هَاجَرُوْا حصہ لا ہے اور اس کے بعد جَاهَدُوْا حصہ إلا اگرچہ وہ چھوڑ دینا بھی درحقیقت اسی جد و جہد ہی کا ایک پہلو ہے - ہجرت مشکلات سے فرار کا نام نہیں - یہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے زیادہ مساعد ماحول کی طرف منتقل ہونے کا نام ہے -

مَهْجُوْرٌ - قرآن کریم میں ہے وَقَالَ الرَّسُوْلُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (۲۵/۳۰) - اور رسول ، خدا کے حضور میں کہے گا کہ اے میرے نشو و نما دینے والے! میری قوم نے اس قرآن کریم کو مَهْجُوْر بنا دیا تھا - اس کا عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تھا - لیکن مَهْجُوْرٌ کے معنی اس سے کہیں گہرے ہیں - آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو گائے یا بھینس دوڑ جاتی ہو اس کے پاؤں کے ساتھ ایک رسی باندھ دیتے ہیں اور رسی کا دوسرا سرا اس کے سینگ کے ساتھ (یا گلے میں) باندھ دیتے ہیں لیکن رسی اتنی چھوٹی رکھتے ہیں کہ جانور کا سر بہت جھکا رہتا ہے - وہ اس طرح یوں جکڑا جاتا ہے کہ آزادی سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا - عرب گھوڑوں اور اونٹوں کو اسی طرح جکڑ کر باندھ دیتے تھے - اس طرح بندھے ہوئے جانور کو مَهْجُوْرٌ کہا جاتا تھا - اَلْهِجَارُ اس رسی کو کہتے تھے جس سے انہیں اس طرح جکڑا جاتا تھا* - رسول اللہؐ خدا سے فریاد کریں گے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو اپنے خود ساختہ اعتقادات ، خیالات ، رسومات ، روایات ، قوانین ، تفاسیر ، وغیرہ کی رسیوں سے جکڑ کر مَهْجُوْرٌ بنا رکھا تھا جس سے وہ ایک قدم بھی آزادی سے نہیں اٹھا سکتا تھا - انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑا نہیں تھا - سینوں سے لگا رکھا تھا- لیکن اس کی ساری آزادیاں سلب کر رکھی تھیں اور اسے اتنا ہی چلنے کی اجازت دے دی جاتی تھی جتنی ان کے خود ساختہ ''مذہب وشریعت،، کی رسی مناسب سمجھتی تھی - یعنی یہ قرآن کے تابع نہیں تھے ، قرآن کریم ان کے تابع تھا - یہ ہے مطلب قرآن کریم کو مَهْجُوْرٌ بنا دینے کا -

ابن قتیبہ نے هُجْرٌ کے معنی هذیان بکنے کے بھی لکھے ہیں** - اس اعتبار سے مندرجہ بالا آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے قرآن کریم کو محض منتر بنا رکھا تھا -

---

*تاج - **القرطبی ج/۲ صفحہ ۳۹ -

ھ ج ع

اَلْھُجُوْعُ ۔ سونا خواہ کسی وقت بھی ہو۔ یا رات کو سونا ۔ کبھی یہ سوئے بغیر صرف لیٹنے اور آرام کرنے کو بھی کہتے ہیں ۔ اَلتَّھْجَاعُ ۔ ھلکی سی نیند ۔ رَجُلٌ ھُجَعَۃٌ ۔ بیوقوف ، لا ابالی اور غافل آدمی* ۔

قرآن کریم میں ہے کَانُوْا قَلِیْلاً مِّنَ اللَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ ($\frac{۵۱}{۱۷}$) ۔ وہ رات کو بہت کم سوتے تھے (جس انقلاب عظیم کی وہ تیاریاں کر رہے تھے اور جو کام انہوں نے اپنے ذمے لیے رکھے تھے ، ان کی تکمیل میں وہ دن رات مصروف رہتے تھے اور رات کا بہت کم حصہ سونے میں گذارتے تھے ($\frac{۷۳}{۲۰۔۲}$) ۔

ھ د د

اَلْھَدُّ ۔ کسی چیز کو سختی سے زور کی آواز کے ساتھ گرا دینا ۔ منہدم کر دینا ۔ عمارت کو توڑ کر گرا دینا ۔ اَلْھَدَادُّ ۔ سمندر کی آواز جسے اہل ساحل سنتے ہیں اور جس میں ایک گونج سی معلوم ہوتی ہے ۔ اور کبھی یہ آواز زلزلہ کا پیش خیمہ بھی ہوتی ہے ۔ اَلْھَدَادَّۃُ ۔ گرج (بادلوں کی)** ۔ اَلْھَدَّۃُ کسی چیز کے گرنے کی آواز۔ ھَدَدْتُّ الْبَقَرَۃَ ۔ میں نے گائے کو ذبح کرنے کے لئے گرا دیا ۔ اَلْھَدُّ ۔ گری ہوئی چیز*** ۔ ھَدَّدَہٗ تَھْدِیْدًا ۔ اس نے اسے دھمکایا اور خوف دلایا ** ۔

سورۃ مریم میں ہے وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ ھَدًّا ($\frac{۱۹}{۹۰}$) ۔ پہاڑ سخت آواز کے ساتھ گر کر ریزہ ریزہ ہو جائیں ۔

اَلْھُدْھُدُ ۔ وہ کبوتر جو زیادہ غٹرغوں کرے ۔ نیز ہر وہ پرندہ جو کبوتر کی طرح زیادہ بولے ۔ ایک معین پرندہ کو بھی کہتے ہیں* ۔ لیکن قصہ حضرت سلیمان[ؑ] میں جس ھُدْھُد ($\frac{۲۷}{۲۰}$) کا ذکر ہے وہ ان کی فوج کے ایک افسر کا نام تھا ۔ اُس زمانے میں پرندوں اور جانوروں کے ناموں پر قبائل اور افراد کے نام عام طور پر رکھتے تھے ۔ (انگریزوں کے ہاں یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے ۔ وہاں لوگوں کے نام (Fox) اور (Lamb) عام طور پر ملتے ہیں ۔ ہندؤوں میں بھی طوطا رام اور چوھامل جیسے نام پائے جاتے ہیں) ۔ توریت (کتاب اول سلاطین) میں یہ نام (ھد ھد) کئی بار آیا ہے ۔ لسان العرب میں ہے کہ ھَدَا ھِدُ یمن کے ایک قبیلہ کا نام تھا ۔ اور تاج العروس میں ہے کہ ھَدَدٌ ۔ حمیر کے ایک بادشاہ کا نام تھا جو حضرت سلیمان[ؑ] کا ہم عصر تھا ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج و محیط ۔ ***راغب ۔

قرآن کریم میں اَلْھُدْھُدَ (ال کے ساتھ) آیا ہے - اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ اس شخص کا نام نہیں تھا ، بلکہ اپنے قبیلہ یا فوج کی نمائندگی کی جہت سے اسے اس طرح پکارا گیا ہے -

ھ د م

اَلْھَدْمُ - عمارت کو توڑ دینا اور گرا دینا - اَلتَّھْدِیْمُ کے بھی یہی معنے ہیں لیکن اس میں زیادہ شدت پائی جاتی ہے - اَلْھَدْمُ - کمر توڑ دینا - اَلْھُدَامُ - چکر جو کسی کو سمندری سفر میں آتے ہیں - اِنْھَدَمَ الْبِنَاءُ - عمارت گر پڑی* - تَھَدَّمَ الْبِنَاءُ - عمارت تھوڑی تھوڑی کرکے گر پڑی** - دِمَاؤُھُمْ ھَدَمٌ - ان کے خون رائیگاں گئے* -

سورۃ حج میں ہے لَھُدِّمَتْ صَوَامِعُ - (۲۲/۴۰) - عبادت گاہیں گرا دی جاتیں - یہاں یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ ان عبادت گاہوں کی عزت وحرمت کا لحاظ نہ کیا جاتا -

ھ د ھ د

الھُدْھُدُ - دیکھئے عنوان (ھ - د - د) -

ھ د ی

ھُدًی - کے بنیادی معنی نمایاں اور روشن ہونا - آگے آگے ہونا - اور دوسروں کے آگے آگے چلنا ہیں - چنانچہ روشن ہونے کی وجہ سے دن کو ھُدًی کہا جاتا ہے - اور ھَادِیَۃٌ اس ابھری ہوئی چٹان کو کہتے ہیں جو پانی میں دور سے نظر آجائے*** - قرآن کریم میں ہے اَفَلَمْ یَھْدِ لَھُمْ (۲۰/۱۲۸) - جس کے معنی ہیں ، کیا یہ امر ان پر واضح ، نمایاں اور روشن نہیں کیا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) راستہ بتانے کے لئے آگے بڑھ جانا اور (۲) ھدیہ اور تحفہ بھیجنا -

ھَادِ (جو اصل میں ھَادِیٌ تھا) - ہر چیز کے اگلے حصے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دور سے پہلے نظر آجاتا ہے - اس لئے جانور کی گردن پر اَلْھَادِیْ کا اطلاق کیا جاتا ہے کیونکہ وہ باقی بدن سے آگے ہوتی ہے - اس اعتبار سے ھَدْیٌ اور ھَدِیٌّ - اُس جانور کو کہتے تھے جو حج کے موقع پر بیت اللہ میں ذبح کرنے کے لئے لے جاتے تھے کیونکہ اُس جانور کو آگے آگے رکھا

*تاج و راغب - **محیط - ***تاج و محیط -

جاتا تھا ۔ ھَدِیَّۃٌ ۔ اُس تحفہ کو کہتے ھیں جو بغیر معاوضہ دیا جائے ، اس لحاظ سے کہ وہ ضرورت پڑنے سے پہلے ھی دیدیا جاتا ہے۔

ھُدًی کے معنی ھیں راستہ کو پہچنوا دینا ۔ واضح کرنا ۔ راہ نمائی کرنا * ۔ بعض اوقات ھُدًی کے معنی راہ نمائی کی بجائے راہ نما ھوتا ہے ۔ مثلاً اَوْ اَجِدُ عَلَی النَّارِ ھُدًی (۲۰/۱۰) میں ھُدًی (راہ نمائی) کا مطلب الھَادِیُ یعنی راہ نما ہے ** ۔ سورۂ بقرہ میں ہے حَتّٰی یَبْلُغَ الْھَدْیُ مَحِلَّہٗ (۲/۱۹۶) ۔ اس سے مراد وہ جانور ہے جسے مکہ میں (حج کی تقریب) پر ذبح کیا جائے۔ نیز ھر قسم کا سامان اور مال (جو وھاں بھیجا جائے)۔ ھَدِیَّۃٌ (۲۷/۳۵) تحفہ ۔ ھَادٍ (۱۳/۷) راستہ دکھانے والا۔ مُھْتَدٍ (۵۷/۲۶)۔ ھدایت پایا ھوا ۔

دین کا مدار اس بنیادی حقیقت پر ہے کہ عقلِ انسانی، اُن مستقل اقدار کو نہ وضع کر سکتی ہے اور نہ ھی از خود ان کا انکشاف کر سکتی ہے جنکے مطابق انسانی زندگی اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتی ہے ۔ یہ اقدار خدا کی طرف سے ملتی ھیں ۔ اسے وحی کہا جاتا ہے جو آخری بار نبی اکرمؐ کو ملی اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے ۔ عقلِ انسانی کو اس وحی کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح انسانی آنکھ کو (سورج کی) روشنی کی ۔ جب انسانی عقل ، وحی کی راھنمائی میں چلیگی تو یہ دنیا جنت بن جائے گی ورنہ فساد اور خون ریزیوں کا جہنم بنی رہے گی ۔ وحی کی اسی راہ نمائی کو ھدایت خداوندی کہتے ھیں جو انسان کو زندگی کی توازن بدوش راہ کی طرف لے جاتی ہے ۔ قرآن کریم کی رُو سے ھدایت (راہنمائی) صرف وحی ہے جو خدا کی طرف سے ملی ہے۔ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی (۲/۱۲۰) ۔ اس کے مقابلہ میں انسانوں کی تجویز کردہ راھنمائی ، ھدایت نہیں ، ضلالت ہے (۲/۱۶) ۔ یہی راہ سیدھی ہے ۔ اس کے علاوہ ھر راستہ ٹیڑھا ہے (۳/۷) ۔ رسول ، اسی ھدایت خداوندی کو لیکر آتے تھے ۔ لیکن ان کے ذمے اس ھدایت کو لوگوں تک پہنچا دینا تھا ۔ اُنہیں اس راستہ پر چلا دینا نہیں تھا (۲/۲۷۲ و ۲۸/۵۶) ۔ سیدھے راستہ پر انسان خود اپنی رضا و رغبت سے چل سکتا ہے ۔ زبردستی کسی کے چلانے نہیں چل سکتا ۔ اس لئے کہ دین میں اکراہ نہیں (۲/۲۵۶) ۔ خود خدا نے بھی انسانوں کے لئے زندگی کی راھوں کو روشن اور واضح کیا ہے ۔ انہیں ان راھوں پر چلنے کے لئے مجبور پیدا نہیں کیا ۔ اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا (۷۶/۳) ۔ ھم نے اس کے لئے راستہ واضح کر دیا ہے ۔ اب وہ چاھے تو اسے اختیار کرلے

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔

اور چاہے اس سے انکار کر دے'' ۔ حقیقت یہ ہے کہ خود لفظ ''ھدایت'' اس اس کی شہادت دے رہا ہے کہ اس میں جبر کا کوئی پہلو نہیں ۔ راستہ اسی کو بتایا جاتا ہے جو منزل تک پہنچنے کے لئے سفر اختیار کرنا چاہے اور بھٹک جانے کی مصیبتوں سے بچنا چاہے ۔ انہی کو مُتَّقِیْن کہا جاتا ہے ۔ قرآن کریم نے انہی معنوں میں اپنے آپ کو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (۲/۲) کہا ہے ۔ یعنی جو لوگ غلط راستے کے خطرات سے محفوظ رہنا چاہیں ان کے لئے صحیح راستے کیطرف راہ نمائی ۔

ھ ر ب

ھَرَبَ ۔ یَھْرُبُ ۔ ھَرَبًا ۔ وہ بھاگ گیا ۔ ھَرَبَ فِی الْاَرْضِ وہ زمین میں دور چلا گیا ۔ ھَرَّبَہٗ ۔ اس نے کسی دوسرے آدمی کو بھگا دیا ۔ ھَرَبَ مِنَ الْوَتَدِ نِصْفُہٗ ۔ میخ آدھی گھس گئی ۔ اَھْرَبَ فُلَانٌ ۔ فلاں آدمی معاملہ میں منہمک ہو گیا ۔ مستغرق ہو گیا ۔ اَھْرَبَتِ الرِّیْحُ ۔ ہوا نے خاک اڑائی *۔

ھَرَبَ ۔ یَھْرُبُ ۔ وہ زمین میں دور تک چلا گیا** ۔

قرآن کریم میں ہے وَ اَنَّا ظَنَنَّا اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰہَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَہٗ ھَرَبًا (۷۲/۱۲) ۔ ''اور ہمارا گمان ہے کہ نہ تو ہم زمین میں (مقابلہ کرکے) اللہ کو عاجز کرسکتے (شکست دے سکتے) ہیں اور نہ ہی بھاگ کر ایسا کرسکتے ہیں'' ۔ یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم بھاگ کر اس کے قانون مکافات کی زد سے نکل جائیں اور اسطرح اسے ہرا دیں ۔

ھ ر ع

اَلْھَرَعُ ۔ وَ الْاِھْرَاعُ ۔ سختی سے ہانکنا ۔ تیز دوڑانا* ۔ ھَرَعَ اِلَیْہِ ۔ اضطراب اور تیزی سے اس کی طرف پہنچا ۔ اَلْاِھْرَاعُ ۔ شدت شوق ۔ اَلْمُھْرِعُ ۔ شیر کو کہتے ہیں** ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے حرکت و اضطراب بتائے ہیں اور اُھْرِعَ الرَّجُلُ کے معنے بتائے ہیں وہ خوف سے کانپا ۔ اور ھُمْ یُھْرَعُوْنَ اِلَیْہِ کے معنے، وہ اس کی طرف کشاں کشاں آئے ۔ قرآن کریم میں قوم لوط کے متعلق ہے وَجَآءَہٗ قَوْمُہٗ یُھْرَعُوْنَ اِلَیْہِ (۱۱/۷۸) ۔ اس کی قوم اس کی طرف شدت شوق سے تیزی کے

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔

ساتھ دوڑتی ہوئی آئی ۔ یُھْرَعُوْنَ میں شوق کی شدت اور مضطربانہ تیزی پائی جاتی ہے ۔ اس لئے اس ایک لفظ نے ان کی اس حرکت کی پوری پوری تصویر کھینچ دی ہے ۔ یُھْرَعُوْنَ مجہول کا صیغہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جذبات انہیں ایسا کرنے پر ابھار رہے تھے ۔

ھ ز ء

ھَزِیءَ ۔ ھَزْواً ۔ (اور ھُزُوْءً ۔ اور ھُزُواً) کے معنی ہیں مذاق اڑانا ۔ رَجُلٌ ھُزْأَۃٌ ۔ اُس شخص کو کہتے ہیں جسکا لوگ بہت مذاق اڑائیں ۔ اور مَفَازَۃٌ ھَازِئَۃٌ بِالرَّکْبِ ۔ ایسا لق و دق جنگل جو سواروں کا مذاق اڑائے ۔ (یعنی اسکی وسعت اور ہیبت سے سوار اپنے آپ کو خفیف محسوس کرنے لگ جائیں)* ۔ منافقین اپنی پارٹی کے سرغنوں سے خلوت میں جا کر کہتے تھے کہ ہم جو جماعت مومنین سے جا کر ملتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو ہم صرف مذاق کرتے ہیں ۔ نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ (۲/۱۴) ۔ قرآن کریم نے اس کے جواب میں کہا کہ وہ کیا مذاق کرینگے ۔ خدا کے قانون مکافات کی رو سے خود ان کے ساتھ مذاق ہو رہا ہے ۔ یہ سراب کو حقیقت سمجھ کر اسکے حصول میں پوری جدوجہد کرتے ہیں اور بالآخر دیکھتے ہیں کہ ان کی ساری کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں ۔ ان کا خود اپنی نفسیاتی فریب انگیزیوں میں اسطرح مارے مارے پھرنا ان کے ساتھ عملی مذاق ہے ۔ خدا کا مہلت کا قانون ان کی جلدی گرفت نہیں کرتا بلکہ ان کی رسی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے جس سے یہ اپنی بے راہ روی میں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں اور حقیقت کی دنیا میں اپنا مذاق آپ اڑواتے ہیں ۔ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِیءُ بِھِمْ وَیَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ (۲/۱۵) ۔

سورہ حجر میں ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کائنات میں خدا کے علاوہ کسی اور کا اقتدار و اختیار بھی ہے ۔ یہاں قانون خداوندی کے علاوہ کسی اور کا قانون بھی کارفرما ہے ۔ تو یہ لوگ درحقیقت خدا کے ساتھ مذاق کرتے ہیں ۔ اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَھْزِئِیْنَ الَّذِیْنَ یَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا آخَرَ (۱۵/۹۵-۹۶) ۔ " ہم ان مذاق کرنے والوں کے لئے تیری طرف سے کافی ہیں ۔ یہ جو اللہ کے ساتھ اور معبود اختیار کرتے ہیں " ۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے ساتھ مذاق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو مقام خدا کا ہے اس میں کسی اور کو بھی شریک سمجھ لیا جائے ۔ یا خدا کے متعلق عقیدہ و تصور

*تاج ۔

کو یونہی (Lightly) لیا جائے - اور زندگی کے حقائق پر (Seriously) غور نہ کیا جائے -

سورہ بقرہ میں ہے قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا (۲/۶۷) - انہوں نے کہا کیا تو ہم سے مذاق کر رہا ہے ؟

ھ ز ز

هَزَّهٗ - يَهُزُّهٗ - هَزًّا - کسی چیز کو حرکت دینا (کھینچ کر، دھکا دیکر، یا دائیں بائیں ہلا کر) - راغب نے کہا ہے کہ هَزٌّ - شدت کے ساتھ حرکت دینے کو کہتے ہیں - یعنی زور سے ہلانا *- سورہ مریم میں ہے وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ (۱۹/۲۵) - اسے زور سے اپنی طرف حرکت دے -

هَزَّ الْحَادِيْ الْاِبِلَ هَزًّا - حدی خواں نے اپنی حدی سے اونٹوں کو پرنشاط اور مست کر دیا چنانچہ وہ ہلکے پھلکے ہو کر چلنے لگے - اسی سے اَلْهِزَّةُ - نشاط اورمستی کو کہتے ہیں (جس میں انسان جھومنے لگ جاتا ہے) - اِهْتَزَّ النَّبَاتُ - پودے لہلہانے لگے (ہوا سے ہلنے اور جھومنے لگے)* - قرآن کریم میں ہے فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ (۲۲/۵) - جب ہم مینہ برساتے ہیں تو پودے لہلہانے لگتے ہیں - دوسری جگہ یہ لفظ خَاشِعَةً کے مقابلہ میں آیا ہے (۴۱/۳۹) جس کے معنی پژمردگی ہیں -

ھ ز ل

اَلْهَزْلُ - کسی معاملہ کو سنجیدگی کے ساتھ (Seriously) نہ لینا - یونہی مذاق کے طور پر لینا - هِزِّيْلٌ - بہت مذاق کرنے والا - اَلْهُزَالَةُ - مذاق - اَلْهُزَالُ - لاغری کو کہتے ہیں ** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کمزوری ہیں - راغب نے کہا ہے کہ اَلْهَزْلُ ہر اس بات کو کہتے ہیں جس کا کوئی فائدہ اور نتیجہ نہ ہو*** - قرآن کریم میں خود قرآن کریم کے متعلق ہے اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۸۶/۱۳-۱۴) - یہ ایک فیصلہ کن حقیقت ہے - یونہی مذاق کی بات نہیں - یہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے بحث کرتا ہے، سطحی جذبات کی تسکین کے لئے سرسری گفتگو نہیں کرتا - یہ ''شاعری'' نہیں - اسکے ایک ایک لفظ پر بڑی سنجیدگی سے (Most Seriously) غور کرنا چاہئے - یونہی (Lightly) نہیں لینا چاہئے - نہ ہی اس کے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ اس میں خالی پند و نصائح کے

*تاج و راغب - **تاج - ***راغب -

طور پر باتیں کہ دی گئی ہیں - قرآن کریم ایک حقیقت ثابتہ ہے اور اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بطور حقیقت کہا گیا ہے نہ محض جھوٹ موٹ ڈرانے دھمکانے کی خاطر۔

ہ ز م

هَزْمٌ - کسی سوکھی چیز کو اتنا دبانا کہ وہ ٹوٹ جائے*۔ پھر اس کے معنی محض توڑ دینے کے ہو گئے**۔ تَهَزَّمَتِ الْقَوْسُ - کمان آواز کے ساتھ پھٹ گئی - اَلْهَزِيْمُ گرج جسکی آواز میں کٹاؤ ہو۔ هَزَمَ الْعَدُوَّ - دشمن کو شکست دیدی** (۲/۲۵۱)۔

جُنْدٌ . . . مَهْزُوْمٌ - (۳۸/۱۱) شکست خوردہ لشکر۔ سورہ قمر میں ہے سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ (۵۴/۴۵)۔ یہ جمعیت شکست کھا جائیگی۔

ہ ش ش

هَشٌّ حرکت دینا - (یہ هَزٌّ کے قریب المعنی ہے)۔ اور عام طور پر نرم چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے - جیسے پتوں وغیرہ کو حرکت دینا*۔ یہیں سے هَشُّ الْوَرَقِ کے معنی ہیں درخت سے پتے جھاڑنا (ابن فارس)۔

حرکت اور نرمی کے مفہوم کے اعتبار سے اس کے معنی خوش ہونے کے بھی آتے ہیں - اَنَا بِهٖ هَشٌّ بَشٌّ - میں اس کے ساتھ بہت خوش ہوں - اسی سے هشاش بشاش ہے - اَلْهَشِيْشُ - وہ سخی شخص کہ جب اس سے مانگا جائے تو وہ بہت خوش ہو**۔

سورہ طٰہٰ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کو وحی کی راہ نمائی عطا ہوئی اور اللہ نے ان سے پوچھا کہ اس ضابطہ هدایت کے متعلق ان کا کیا خیال ہے کہ اس سے کیا کام لیا جائیگا ، تو آپ نے کہا کہ یہ میرے لئے عمر بھر کا سہارا ہوگا - اور اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ (۲۰/۱۸)۔ میں اس سے اپنی بھیڑوں (بنی اسرائیل) کے لئے غذائے نفس پیدا کرونگا۔ آیت کے لفظی معنی ہیں "میں اس (عصا) سے اپنی بھیڑوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں"۔

ہ ش م

اَلْهَشْمُ - خشک چیز کو توڑ دینا (یا ہر ایسی چیز کو جس کا توڑنا دشوار نہ ہو) - اَلْهَشِيْمُ ٹوٹا ہوا - وہ گھاس جو خشک ہو کر چورہ چورہ ہو گئی ہو - خشک گھاس یا درخت***۔ سورہ کہف میں ہے فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا (۱۸/۴۵) وہ خشک ہو کر چورا چورا ہو جاتی ہے - سورہ القمر میں ہے

*راغب - **تاج - ***تاج و راغب و محیط -

فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ (۵۴/۳۱)۔ وہ ایسے ردی چورے کیطرح ہوگیا جو باڑ بنانے والے کی باڑ سے خستہ ہو کر گرتا ہے۔ یعنی بالکل ناکارہ، خستہ و تباہ۔

تَهَشَّمَ النَّاقَةَ ۔ اس نے پورے ہاتھ سے اونٹنی کا دودھ دوہ لیا (اور اس کے تھنوں کو خشک کرکے یا نچوڑ کر رکھ دیا)۔ اسی سے هَاشِمٌ ۔ روٹی توڑنے یا اس کا چورا کرنے والے کو کہتے ہیں ۔ نیز یہ عمرو العلاء کا لقب تھا جو عبدالمطلب کا باپ تھا کیونکہ وہ حاجیوں کو ثرید بنا کر کھلایا کرتا تھا ۔ روٹی کو توڑ توڑ کر سالن میں ڈالتے ہیں ۔ اسے ثرید کہتے ہیں ۔ اَلْهَشِيْمُ ۔ سخی آدمی کو کہتے ہیں ۔ اور الهَشْمُ خشک اور نشیبی زمین کو*۔

ھ ض م

هَضْمٌ ۔ کے اصلی معنی ہیں کسی نرم چیز کو کچلنا یا توڑنا ۔ کسی چیز کو کم کرنا ۔ هَضَمَ فُلَانًا ۔ اس نے فلاں آدمی پر ظلم کیا ۔ اسے دبایا اور اسکا حق غصب کر لیا ۔ ہماری زبان میں بھی اس مفہوم کے لئے یہی کہتے ہیں کہ فلاں نے اس کی چیز ہضم کر لی ۔ اَلْهَضَّامُ ۔ شیر کو کہتے ہیں ۔ هَضَمَهٗ حَقَّهٗ اس نے اس کا حق کم کر دیا ۔ اَلْهَضِيْمُ ۔ نرم ۔ لطیف ۔ پختہ ۔ خوشگوار ۔ وہ چیز جسکا ایک حصہ دوسرے میں گھسا ہوا ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں ۔

سورہ طٰہٰ میں ہے فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (۲۰/۱۱۲)۔ اس (جنتی معاشرہ) میں نہ حق تلفی کا خوف ہوگا نہ غصب و نہب کا ۔ اس میں نہ استبداد ہوگا نہ ناجائز انتفاع یا استحصال (Exploitation) ۔ سورہ شعراء میں ہے ۔ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۔ (۲۶/۱۴۸) جن کے شگوفے تہ بہ تہ جمے ہوئے اور ایک دوسرے میں گھسے ہوئے ہوں ۔

ھ ط ع

هَطَعَ هَطْعًا وهُطُوْعًا ۔ تیزی سے کسی چیز کی طرف ڈرتے ہوئے بڑھنا ۔ یا کسی چیز پر نگاہیں جمائے ہوئے آگے بڑھنا اور نگاہوں کو اس پر سے ادھر ادھر نہ ہٹانا ۔ اَهْطَعَ کے بھی یہی معنی ہیں ۔ چنانچہ کہتے ہیں

*تاج و محیط و راغب ۔

أَهْطَعَ الْبَعِيْرُ فِیْ سَيْرِہٖ ۔ اونٹ نے چلنے میں اپنے سر کو سیدھا اور گردن کو لمبا کیا *۔ قرآن کریم نے جنگ کی بدحواسی کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں کہا ہے کہ مُهْطِعِيْنَ (۱۴/۴۳) ۔ لوگ اسطرح بدحواس ہو کر بھاگ رہے ہونگے کہ انہیں این و آں کی کچھ خبر نہ ہوگی ۔ ڈر اور دہشت کے مارے سیدھا رخ کئے بھاگ رہے ہونگے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں کسی چیز کی طرف رخ کرنے، اسکی طرف بڑھنے، نیز اطاعت و انقیاد کا مفہوم ہوتا ہے ۔

هَلْ (حرف)

هَلْ (۱) استفہام کے لئے آتا ہے ۔ مثلاً هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا (۱۸/۱۰۳)۔ ''کیا ہم تمہیں بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے اعمال انہیں سخت خسارے میں رکھینگے ؟ ''

(۲) قَدْ ۔ (یقیناً) کے معنوں میں آتا ہے ۔ هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (۷۶/۱) '' یقیناً انسان پر ایسا وقت بھی گذر چکا ہے '' . . . .

(۳) کبھی ، بطور استفہام ، مَا نافیہ کے معنوں میں آتا ہے ۔ هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (۵۵/۶۰) ۔ کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا بھی کچھ ہے ؟ (یعنی احسان کا بدلہ احسان کے سوا اور کچھ نہیں)۔

ھ ل ع

اَلْهَلَعُ ۔ گھبراہٹ ۔ بے صبری ۔ بہت زیادہ ، حد سے متجاوز اور بد ترین قسم کی گھبراہٹ ۔ رنج و حزن ۔ اَلْهَلُوْعُ ۔ حریص اور انتہائی بخیل ۔ تنگ دل ۔ بےصبری کا مظاہرہ کرنے والا ۔ هَلِعَ يَهْلَعُ ۔ وہ بھوکا ہوگیا **۔ جب بھوک اور حرص اکٹھی ہو جائیں تو ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان جتنا بھی چاہے کہا جائے اسکی بھوک مٹتی ہی نہیں ، اور ہر وقت واویلا ('' ہے نہیں ۔ ہے نہیں '') کرتا رہتا ہے ۔ ابن السکیت نے کہا ہے کہ رَجُلٌ هُلَعَةٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت جلد گھبرا کر واویلا کرنے لگ جائے اور ہمت ہار دے ***۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۷۰/۱۹)۔ انسان کو اگر علی حالہ چھوڑ دیا جائے تو اسکی حرص کبھی ختم ہی نہیں ہوتی ۔ یہ تو صرف نظام صلوۃ ہے جو اس میں سیر چشمی پیدا کر دیتا ہے (۷۰/۲۲) اور اس کے واویلے کو ختم کر دیتا ہے ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج و محیط ۔ ***ابن فارس ۔

ہ ل ک

هَلَكَتْ - يَهْلِكُ - کے معنی مر جانے کے ہیں ، اگرچہ عوام اس لفظ کو بری موت کے لئے بولتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ٹوٹنے اور گر پڑنے کے ہیں - راغب نے کہا ہے کہ هَلَاكٌ کے معنی عذاب ، خوف اور فقر کے بھی ہوتے ہیں**۔ اِسْتَهْلَكَ الْمَالَ - مال کو خرچ کرکے ختم کردیا - اَهْلَكَ الْمَالَ - اس نے مال کو فروخت کر دیا - اَلْهَلَكُ - قحط کے سال* - اَلْهُلَّاكُ - فقیر اور نادار لوگ - وہ مسافر جو امداد اور صلہ حاصل کرنے کے لئے جائیں اور راستہ بھول جائیں - اَلْهَالِكَةُ - حریص اور لالچی نفس - اَلتَّهْلُكَةُ - ہر وہ چیز جو بالآخر تباہی کی طرف لے جائے* - راغب نے کہا ہے کہ کسی چیز کا اپنے پاس نہ رہنا - کسی چیز کا خراب اور بدحال ہوجانا، مر جانا یا بالکل ضائع ہوجانا، سب کے لئے هَلَاكٌ کا لفظ بولا جاتا ہے** -

قرآن کریم میں قوموں کی ہلاکت کا ذکر متعدد بار آیا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ زمانۂ قدیم میں ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ کوئی بستی کسی طبعی حادثہ (مثلاً زلزلہ یا کوہِ آتش فشاں کے پھٹنے) کی وجہ سے بالکل تباہ ہو جائے - لیکن عام طور پر قوموں کی ہلاکت سے مراد ان کی ذلت و رسوائی اور کمزوری و محکومی ہوتی ہے - یعنی اگر کسی قوم سے سروری و سرفرازی چھن جائے تو وہ اس کی ہلاکت ہے - یہی وہ ہلاکت ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ - وَ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (۲/۱۹۵) - نظام خداوندی کے قیام کے لئے اپنے اموال کو کھلا رکھو - ایسا نہ کروگے تو تم اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لوگے - بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی ہنگامی حادثہ یا عارضی سبب سے کوئی قوم وقتی طور پر گر جاتی ہے لیکن حالات کے سدھرنے پر وہ پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہے (یہ اس کی حیاتِ نو یا نَشْاَةِ ثانیہ کہلاتی ہے)۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے قصہ میں کہا گیا ہے کہ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ (۲/۵۶)۔ ''ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں پھر اٹھا کھڑا کیا'' - لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ تباہی عارضی نہیں ہوتی بلکہ وہ قوم ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جاتی ہے - سورۃ بنی اسرائیل میں پہلی صورت کو عذاب سے اور دوسری کو ہلاکت سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۷/۵۸) نیز (۲۱/۹۵) - لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں - اس میں بھی استثناء کی گنجائش ہوتی ہے -

سورۃ قصص میں ہے "كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" (۲۸/۸۸)۔ اس کے معنی یہ کئے جاتے ہیں کہ تمام کائنات فنا ہو جائے گی اور صرف خدا کی

---

*تاج و محیط - **راغب -

ذات باقی رہ جائے گی ۔ اس کی تائید میں سورۃ رحمان کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے ۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ۔ وَّ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ (۵۵/۲۶-۲۷) ۔ لیکن ان آیات کا صحیح مفہوم یہ نہیں ۔ پہلی آیت میں هَالِکٌ اور دوسری میں فَانٍ دونوں اسم فاعل ہیں اور اسم فاعل کو جب تک خصوصیت سے مستقبل کے ساتھ مشروط نہ کردیا جائے اسکے معنی زمانہ حال کے ہوتے ہیں۔ مثلاً اِنِّیْ جَاعِلٌ کے معنی یہ نہیں کہ میں بناؤنگا۔ اس کے معنی ہیں میں بنا رہا ہوں ۔ لہذا هَالِکٌ اور فَانٍ کے معنی یہ نہیں کہ یہ کائنات ایک دن فنا ہو جائیگی* ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز (فنا اور ہلاکت) اب ہو رہی ہے ۔ کائنات کی ہر شے حالت فنا و ہلاکت سے گزر رہی ہے ۔ فنا کے معنی معدوم ہو جانا نہیں ۔ اس کے معنی ہیں تغیر پذیر ہو جانا ۔ ایک حال پر نہ رہنا ۔ اور ہلاکت کے معنے بھی قوت کے کم ہو جانے کے ہیں۔ لہذا ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی کوئی شے مستقل طور پر ایک حالت میں نہیں رہتی ۔ ہر شے میں ہر آن تغیرات نمودار ہوتے رہتے ہیں ۔ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ۔ اس کی قوت میں کمزوری آتی رہتی ہے لیکن خدا کا وہ قانون (یا وہ راستہ) جو عالمگیر نشو و نما کی طرف لے جاتا ہے تغیر نا آشنا ہے ۔ وہ تغیرات کے اثر سے مامون رہتا ہے ۔ اسی کو مستقل قدر کہتے ہیں ۔ لہذا ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر یا روبہ انحطاط ہے ، بجز مستقل اقدار کے جو قوانین خداوندی کی رو سے متعین ہوتی ہیں اور جن کا نتیجہ خدا کی ربوبیت کبریٰ (عالمگیر نشو و نما) ہے ۔ لہذا وہی نظریہ زندگی ، وہی نظام حیات ، وہی قوم ، تغیرات اور انحطاط سے محفوظ رہ سکتی ہے جو اپنا دامن ان مستقل اقدار کے ساتھ باندھ لے ۔ جو قوم ایسا نہیں کرتی اس کا غلبہ و تسلط اور قوت و اثر آہستہ آہستہ ضائع ہوتا رہتا ہے اور ایک دن ختم ہو جاتا ہے ۔ اسی کے متعلق سورۃ اَلْحَآقَّۃ میں ہے کہ هَلَکَ عَنِّیْ سُلْطَانِیَهْ (۶۹/۲۹) ۔ ''میرا غلبہ مجھ سے جاتا رہا'' ۔ قوتیں ضعف سے بدل گئیں ۔

آیات مندرجہ صدر میں ''وجہ رب'' کے معنی خود ذات خداوندی بھی ہوسکتے ہیں

---

*کائنات کا انجام کیا ہوگا ۔ یہ بھی اس قسم کا راز ہے جس قسم کا راز کائنات کا آغاز ہے ۔ یہ امور انسانی شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ میں نہیں آسکتے ۔ بہر حال ، کائنات خدا کی پیدا کردہ ہے ۔ اسی کے قانون کے مطابق قائم ہے ۔ اور اسی کے مطابق اس کا انجام ہوگا ۔ ابدی تو یہ بہرحال نہیں ۔ یعنی اُن معنوں میں ابدی جن معنوں میں خدا ابدی ہے ۔ ہمارے لئے یہ سوال بھی بیکار ہے کہ کائنات کا انجام کیا ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ ہم نے تو بہر حال ایک دن موجودہ ارضی زندگی کو چھوڑنا ہے ۔ ہمارا کام یہ ہے کہ جب تک اس میں رہیں اس کے حسن میں اضافہ کرتے چلے جائیں ۔

ھ ل ل

اَھْلَال – کے اصلی معنی ہوتے ہیں آواز بلند کرنا* – راغب نے لکھا ہے کہ رویت ہلال کے موقع پر اونچی آواز نکالنے کے لئے بولا جاتا ہے، بعد ازاں ہر آواز کے لئے بولا جانے لگا*** – ھَلَّ الرَّجُلُ – آدمی چیخا۔ اِسْتَھَلَّ الصَّبِیُّ – بچہ نے پیدا ہوتے ہی رونے کی آواز بلند کی۔ اَلْھِلَالُ – مہینے کی پہلی اور دوسری تاریخ کا چاند – بعض نے کہا ہے کہ تیسری تاریخ بلکہ ساتویں تاریخ تک کے چاند کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے – (اسی طرح قمری مہینے کی چھبیس – ستائیس تاریخ کے چاند کو بھی کہتے ہیں)۔ ھِلَال کو ھِلَال اس لئے کہتے ہیں کہ لوگ جب اسے دیکھتے ہیں تو ایک دوسرے کو آواز دے کر بتاتے ہیں* – ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے آواز بلند کرنا لکھے ہیں – اَھَلَّ الشَّھْرَ – مہینہ کا چاند دیکھ لیا* – اَلْھَلَالُ اور اَلْھِلَالُ – پہلی بارش کو بھی کہتے ہیں*۔ (لیکن اسی بارش کو جسکے برسنے کی آواز آئے)۔

اَلْھَلَّلُ – ہاتھی کے مغز کو کہتے ہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زہر قاتل ہوتا ہے – یعنی زہر ہلاہل*۔ ھَلَّلَ – یہودی اور نصرانی اس لفظ کو تسبیح پڑھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں جو عبرانی اور سریانی زبان کا لفظ ہے** – ہمارے ہاں بھی تسبیح و تہلیل کہتے ہیں – ھَلَّلَ کے معنی ہیں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا** –

قرآن کریم میں (کھانے پینے کی حرام اشیاء کی فہرست میں) ہے وَمَا اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ ($\frac{2}{173}$)۔ یعنی وہ چیز جسے خدا کے سوا کسی دوسرے کے نام سے پکارا جائے – جو چیز بھی خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دی جائے وہ قرآن کریم کی رو سے حرام ہو جاتی ہے – مؤمن کے لئے خدا کے سوا کسی اور قوت کا تصور شرک ہے – "منسوب ہونے" – یا خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے نام سے پکارے جانے کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے – مثلاً شاہ مدار کے نام پر بکرا چھوڑ دیا جاتا ہے – بکرا ویسے تو حلال جانور ہے لیکن چونکہ اسے اللہ کے سوا کسی اور کے نام سے پکارا گیا ہے، یا اسے اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس لئے اس کا کھانا حرام ہو جائے گا – اسی طرح کھانا پکا کر کہدیا جائے کہ یہ فلاں پیر صاحب کی نیاز ہے تو اگرچہ وہ کھانا پاک اور صاف، حلال اور طیب تھا لیکن غیر اللہ کی طرف نسبت سے وہ حرام

*تاج – **محیط – ***راغب –

ہوجائے گا ۔ اس لئے کہ اس نسبت میں شرک کا پہلو آجاتا ہے اور یہ توحید کے منافی ہے ۔ قرآن کریم انسان کے عقائد اور تصورات کو شرک کے شائبہ تک سے پاک رکھنا چاہتا ہے ۔ کیونکہ شرک وجہِ تذلیل انسانیت ہے ۔

هَلُمَّ

هَلُمَّ (۱) آؤ ۔ هَلُمَّ اِلَیْنَا (۳۳/۱۸) ۔ ہماری طرف آؤ ۔
(۲) لاؤ ۔ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمْ (۶/۱۵۱) ۔ اپنے گواہ لاؤ ۔

هُمْ

هُمْ ۔ جمع مذکر غائب کی ضمیر مرفوع منفصل ہے ۔ هُمْ رِجَالٌ وہ سب آدمی ہیں ۔ سورۃ منافقون میں ہے هُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ . . . (۶۳/۷) یہ وہ ہیں جو کہتے ہیں ۔

(۲) هُمْ ضمیر منصوب متصل بھی ہے ۔ جمع مذکر غائب کے لئے آتی ہے ۔ ضَرَبَهُمْ ۔ اس نے ان سب کو مارا ۔ سورۃ بقرہ میں ہے ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ (۲/۳۱) ۔ پھر انہیں ملائکہ کے سامنے کیا ۔

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے ۔ غُلَامُهُمْ ۔ ان سب کا غلام ۔

سورۃ طٰہٰ میں ہے حِبَالُهُمْ وَعِصِیُّهُمْ . . . (۲۰/۶۶) ۔ ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں . . .

هُمَا (ضمیر)

هُمَا ۔ تثنیہ غائب کی ضمیر مرفوع منفصل ہے ۔ اور مذکر و مؤنث دونوں کے لئے آتی ہے ۔ هُمَا رَجُلَانِ ۔ وہ دونوں مرد ہیں ۔ هُمَا امْرَاَتَانِ ۔ وہ دونوں عورتیں ہیں ۔ سورۃ توبہ میں ہے اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ (۹/۴۰) ۔ ”جب وہ دونوں غار میں تھے“ ۔

(۲) یہ ضمیر منصوب متصل کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہے اور تثنیہ غائب کے لئے آتی ہے ۔ اور مذکر و مؤنث دونوں کے لئے یکساں طور پر آتی ہے ۔ ضَرَبَهُمَا ۔ اس نے ان دونوں کو مارا ۔ سورۃ بقرہ میں ہے ۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ . . . (۲/۳۶) ۔ پس شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا ۔

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل کے طور پر بھی آتی ہے ۔ غُلَامُهُمَا ۔ ان دونوں کے غلام ۔ (مذکر و مؤنث دونوں کیلئے) ۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے بِسِحْرِهِمَا (۲۰/۶۳) ۔ (یہ دونوں) اپنے سحر کے زور سے . . .

ھ م د

اَلْهُمُوْدُ ۔ آگ کا بجھ جانا ۔ خَمَدَتِ النَّارُ اُسوقت کہتے ہیں جب اس کا شعلہ بیٹھ جائے ، اور هَمَدَتْ هُمُوْداً اسوقت جب وہ بالکل ہی بجھ جائے ۔ اور جب وہ راکھ ہو جائے تو اس کے لئے هَبَا يَهْبُوْ کہتے ہیں ۔ اَلْهُمُوْدُ فِي الْاَرْضِ ۔ زمین میں زندگی کا باقی نہ رہنا ۔ یعنی نہ اس میں درخت و سبزہ ہو نہ اس پر بارش برسی ہو* ۔ قرآن کریم میں ہے وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً (۲۲/۵) ۔ تم زمین کو مردہ دیکھتے ہو جہاں سبزی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا ۔

ھ م ر

هَمَرَ الْمَاءَ يَهْمِرُهُ ۔ اس نے پانی کو گرا دیا ۔ یا بہا دیا ۔ هَمَرَ الدَّمْعَ ۔ اس نے آنسو بہائے ۔ اِنْهَمَرَ الدَّمْعُ وَالْمَطَرُ ۔ آنسو اور بارش بہے ۔ اَلْهَمَّارُ ۔ خوب برسنے والا بادل ** ۔

قرآن کریم میں حضرت نوحؑ کے قصہ میں ہے فَفَتَحْنَا اَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ (۵۴/۱۱) ۔ پھر ہم نے آسمان کے دروازے زور سے برسنے والے پانی سے کھول دئے ۔

ھ م ز

اَلْهَمْزُ ۔ کچوکا دینا ۔ دھکا دینا ۔ اور مارنا ۔ کاٹ کھانا ۔ اَلْهَامِزُ کچوکے مارنے والا ۔ جماعت میں تفریق ڈالنے والا ۔ دوستوں میں جھگڑا ڈلوانے والا ۔ غیبت کرنے والا ۔ یہی معنی مبالغہ کے ساتھ اَلْهُمَزَةُ میں پائے جاتے ہیں ۔ اَلْمِهْمَزُ ۔ اَلْمِهْمَازُ ۔ لوہے کی نکیلی چیز (میخ سی) جو سوار کے جوتے میں لگی ہوتی ہے اور اس سے وہ جانور کو کچوکے مارتا جاتا ہے تاکہ وہ تیز بھاگے*** ۔ اسی کو ہماری زبان میں مہمیز (یا ایڑھ) لگانا کہتے ہیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْهَمْزُ نچوڑنے نیز غیبت کرنے کو کہتے ہیں **** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی دبانے اور نچوڑنے کے لکھے ہیں ، اور هُمَزَةٌ وهَمَّازٌ کے معنی عیب چینی کرنے والا ۔

*تاج ۔ **تاج و محیط و راغب ۔ ***تاج و محیط ۔ ****راغب ۔

سورہ مومنون میں ھَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ (۲۳/۹۷) آیا ہے ۔ سرکش مخالفین کی تمام وہ تدبیریں جن سے وہ جماعت مومنین میں تفرقہ انگیزی چاہتے ہوں ۔ سورہ قلم میں ھَمَّازٍ (۶۸/۱۱) آیا ہے ۔ سورہ ھُمَزَة میں ھُمَزَةٍ (۱۰۴/۱) آیا ہے ۔ معنی ہر جگہ ایک ہی ہیں ۔ یعنی اپنی دسیسہ کاریوں سے جماعت میں تفریق پیدا کرنے والے ۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں ایسا شخص جسے ہر جگہ خرابی ہی خرابی نظر آئے اور وہ ہر ایک کے کام میں نقص نکالتا رہے ۔ وہ نہ کائنات کے حسن کی تحسین (Appreciation) کا جذبہ رکھتا ہو اور نہ ہی کسی کے اچھے کام کی تعریف کرے ۔ یہ ذہنیت سرمایہ دار کی ہوتی ہے جو سمجھتا ہے کہ اس کے پاس جو اسقدر مال و دولت ہے تو اس سے دنیا بھر کی خوبیاں اس میں جمع ہو گئی ہیں ۔ جس کے پاس دولت نہیں اس میں کوئی خوبی نہیں ہو سکتی ۔ (المقام المحمود) ۔

ھ م س

اَلْهَمْسُ ۔ خفی آواز ۔ قدموں کی مخفی ترین آہٹ ۔ اَلْهَمِيْسُ ۔ اونٹوں کے پاؤں کی آہٹ*۔ قرآن کریم میں ہے ۔ لَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ۔ تو نہایت ہلکی سی آواز کے سوا کچھ نہیں سنے گا ۔

اَلْهَمْسُ ۔ منہ کو بند کرکے کھانے کو چبانا تاکہ آواز نہ نکلے ۔ اَلْهَمْسُ ۔ نچوڑنا ۔ کوٹنا ۔ اَلْمُهَامَسَةُ ۔ آپس میں راز داری کی باتیں کرنا*۔ سورہ طٰہٰ میں ہے فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا (۲۰/۱۰۸) ۔ تو سوائے ہلکی سی آواز کے کچھ نہیں سنے گا ۔

ھ م م

هَمٌّ ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پگھلنے ، بہنے اور آہستہ آہستہ رینگنے کے ہوتے ہیں ۔ اَلْهَمُّ ۔ غم اور حزن ۔ کیونکہ وہ آدمی کو پگھلا دیتا ہے ۔ هَمٌّ اور غَمٌّ میں فرق یہ ہے کہ غَمٌّ اس کرب کو کہتے ہیں جو کسی بات کے واقع ہو جانے کے بعد دل میں پیدا ہو ۔ اور هَمٌّ اس کرب کو کہتے ہیں جو کسی پیش آنے والی مصیبت کے خیال سے پیدا ہو رہا ہو**۔ هَمَّهُ وَ اَهَمَّهُ ۔ اسے غمگین اور بے چین کیا ۔ سورہ آل عمران میں ہے وَطَائِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ (۳/۱۵۳) ۔ ایک گروہ کو خود اسکی اپنی جانوں نے (اپنے خیالات کے وجہ سے) فکر مند کر رکھا تھا ۔ یعنی وہ سچ مچ کسی مصیبت میں مبتلا نہیں تھے بلکہ موہوم خطرات کے تصور سے خواہ مخواہ مضطرب و بیقرار ہو رہے تھے ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔

اَلْھَمُّ۔ کسی بات کی دل میں نیت کرنا۔ ارادہ کرنا*۔ ھَمَّ بِالشَّیْءِ۔ کسی چیز کا ارادہ و قصد کیا لیکن اسے کیا نہیں**۔ وَلَقَدْ ھَمَّتْ بِہٖ، وَھَمَّ بِھَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰبُرْھَانَ رَبِّہٖ (۱۲/۲۴) ۔ عزیز کی بیوی نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا (کہ یوسف کو اپنے دام ہوس میں پھانس کر چھوڑیگی) اور ہو سکتا تھا کہ یوسف بھی ایسی نیت کر لیتا اگر اس کے سامنے خدا کا واضح قانون نہ آچکا ہوتا*۔ یعنی عزیز کی بیوی چونکہ محض اپنے جذبات کے تابع چل رہی تھی اسلئے اسے اس ارادۂ بد سے روکنے والی کوئی چیز نہ تھی لیکن حضرت یوسفؑ کے سامنے خدا کا قانون تھا اسلئے وہ ایسا ارادہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ غور کیجئے قرآن کریم نے اس داستان کے اتنے سے ٹکڑے میں کیسی عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب انسانی جذبات اور کسی مستقل اور بلند قدر میں(Tie) پڑ جائے تو مومن اس بلند قدر کے تحفظ کے لئے جذبات کے تقاضے کو قربان کر دیتا ہے۔ اسی کا نام بلند اقدار پر ایمان ہے۔

سورہ مومن میں ہے وَھَمَّتْ کُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِھِمْ لِیَاْخُذُوْہُ (۴۰/۵) ۔ ہر قوم نے اپنے اپنے رسول کے خلاف (نقصان پہنچانے کی) تدبیریں کیں یا اسکا ارادہ کیا۔ اَلْھِمَّةُ۔ جس کام کے کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا جائے۔ پختہ ارادہ۔ آغاز ارادہ*۔ اَلْمُھِمَّاتُ مِنَ الْاُمُوْرِ۔ نہایت اہم امور*۔

ھُنَا

ھُنَا۔ ھٰھُنَا۔ یہاں۔ یہیں۔ اِنَّا ھٰھُنَا قٰعِدُوْنَ (۵/۲۴) ۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں (نیز ۳/۱۵۴)۔ ھُنَالِکَ۔ وہاں۔ ھُنَالِکَ دَعَا زَکَرِیَّا (۳/۳۸) ۔ وہاں زکریا نے پکارا۔ ھُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ (۳۳/۱۱) ۔ وہاں مومنوں کے ابتلاء کا وقت آیا۔

ھ ن أ

اَلْھَنِیْءُ۔ ہر وہ چیز جسکے حاصل کرنے میں کوئی مشقت نہ ہو اور جسکے نتیجہ میں کوئی برائی نہ ہو۔ یہ لفظ دراصل خوراک کے لئے بولا جاتا ہے، اگرچہ دوسری چیزوں کے لئے بھی استعمال کر لیا جاتا ہے***۔ طَعَامٌ ھَنِیْءٌ۔ خوشگوار کھانا۔ اَلتَّھْنِئَةُ۔ تعزیت کے خلاف ہے۔ مبارک باد دینا*۔ سورہ نساء میں ہے۔ فَکُلُوْہُ ھَنِیْٓئًا مَّرِیْٓئًا۔ (۴/۴) ۔ اسے خوشگواری سے کھاؤ (اپنے تصرف میں لاؤ)۔

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

هُنَّ (ضمیر)

هُنَّ - جمع مؤنث غائب کی مرفوع منفصل ضمیر ہے - هُنَّ نِسْوَۃٌ وہ سب عورتیں ہیں -

(۲) هُنَّ - ضمیر منصوب متصل بھی ہے - ضَرَبَهُنَّ - اس نے ان سب عورتوں کو مارا -

(۳) نیز یہ ضمیر مجرور متصل بھی ہے - غُلَامُهُنَّ - ان سب عورتوں کا غلام -

سورۃ بقرہ میں ہے هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ ($\frac{۲}{۱۸۷}$) "وہ تمہارے لئے (بمنزلہ) لباس ہیں -

سورۃ نساء میں ہے فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ.... ($\frac{۴}{۲۵}$) ان کے مالکوں کی اجازت سے انہیں نکاح میں لاؤ اور ان کے مہر انہیں دے دو -

هُوَ (ضمیر)

هُوَ - واحد مذکر غائب کے لئے ضمیر مرفوع منفصل ہے - هُوَ رَجُلٌ وہ ایک مرد ہے - هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ... ($\frac{۵۹}{۲۲}$) وہی اللہ ہے -

ھ و د

اَلْهَوْدُ - نرمی اور سہولت کے ساتھ حق کی طرف رجوع کرنا* - قرآن کریم میں ہے - اِنَّا هُدْنَا اِلَیْكَ ($\frac{۷}{۱۵۶}$) - ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں - اَلْهَوْدُ - یہود* - هَادَ - وہ یہودی ہوا - یَتَهَوَّدُ - حضرت یعقوب[۴] کے ایک بیٹے کا نام تھا* -

سورۃ بقرہ میں ہے اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا.... ($\frac{۲}{۱۱۱}$) - سوائے ان کے جو یہودی ہوں - اور سورۃ مائدہ میں ہے وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا.... ($\frac{۵}{۶۹}$) - اور جو لوگ یہودی ہوئے - (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "موسیٰ[۴]") -

هود علیه السلام

قوم نوح کی جانشین ، قوم عاد ہوئی ($\frac{۷}{۶۹}$) - تفصیل عنوان "نوح[۴]" میں دیکھئے - ان کی طرف ان کے بھائی ، حضرت ہود[۴] مبعوث ہوئے - ($\frac{۷}{۶۵}$) - یہ لوگ جسمانی طور پر ، مضبوط اور طاقتور تھے - بڑے ڈیل ڈول والے تھے -

*تاج و محیط و راغب -

(۶۹/۷)۔ اور ان کی زمینیں بڑی زرخیز تھیں (۲۶/۱۳۴)۔ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے بھی وہ قوم نوحؑ سے آگے تھے ۔ یہ بڑے بڑے مضبوط قلعے بناتے تھے (۲۶/۱۲۹)۔ اور پہاڑوں کی بلندیوں پر یادگاریں تعمیر کرتے تھے (۲۶/۱۲۸) ۔ اور علم و بصیرت بھی رکھتے تھے (۲۹/۳۸) ۔ لیکن بڑے مستبد اور جبار تھے ۔ غریبوں اور مظلوموں کو اپنے فولادی شکنجوں میں کس کر رکھتے تھے (۲۶/۱۳۰) ۔

حضرت ھودؑ نے انہیں خدا کا وہی پیغام دیا جو اس سے قبل حضرت نوحؑ اپنی قوم کو دے چکے تھے ۔ یعنی یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ۔ ۔ ۔ ۔ (۷/۶۵) ۔ اے میری قوم! اللہ کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا الٰہ اور کوئی نہیں ۔ حسب معمول ، سردارانِ قوم (مترفین کے طبقہ) کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت ہوئی (۷/۶۶) ۔ اور وہ اس شدت مخالفت میں اس قدر اندھے ہوگئے کہ ان کا علم و بصیرت بھی ان کے کسی کام نہ آیا (۴۶/۲۶) ۔ اور تباہ کن آندھی نے انہیں برباد کرکے رکھدیا (۵۱/۴۱-۴۲) ۔ اور ان کی جڑ کٹ گئی (۷/۷۲) ۔ قرآن کریم نے اس قوم کو ”عادِ اولیٰ“ بھی کہا ہے (۵۳/۵۰) ۔

(جو قومیں اس طرح ہلاک ہوئی تھیں، ان کے اعمال اور ان طبعی حوادث میں کیا تعلق تھا ، اس کے لئے میری کتاب ”جوئے نور“ میں عنوان ”حضرت نوحؑ“ دیکھئے) ۔

ھ و ر

ھَارَ الْبِنَاءَ ھَوْرًا ۔ اس نے عمارت کو منہدم کر دیا ۔ فَتَھَارَ ۔ پس وہ منہدم ہوگئی ۔ (لازم و متعدی) ۔ منہدم ہونے اور پھٹ کر گر پڑنے کے لئے اِنْھَارَ بھی آتا ہے ۔ وَ ھَوَ ھَائِرٌ وَ ھَارٍ (اسم فاعل) ۔ تَھَوَّرَ وہ منہدم ہوگیا ۔ تَھَوُّرٌ ۔ کسی چیز کا حوض کے کنارے یا کنویں کے دہانے سے حوض یا کنویں کے اندر گر پڑنا ۔ تَھَوَّرَ الرَّجُلُ ۔ آدمی معاملہ میں بلا سوچے سمجھے گھس گیا* ۔ یعنی اس میں اس طرح گر گیا جس طرح دریا کا کنارہ دھڑام سے نیچے گر جاتا ہے ۔ ایسے تَھَوُّرٌ کہتے ہیں* ۔ قرآن کریم میں ہے عَلٰی شَفَا جُرُفٍ ھَارٍ فَانْھَارَ بِہٖ (۹/۱۰۹) ۔ ایک گرنے والے کنارے کی بالکل آخری حد پر جو اسے لے کر نیچے گر جائے ۔

ھ و ن

ھَانَ ۔ یَھُوْنُ ۔ ھَوْنًا ۔ ذلیل ہونا اور ھَانَ ھَوْنًا سہل اور آسان ہونا ۔ یعنی نرمی اور سہولت اور ذلت و رسوائی دونوں کے لئے یہ مادہ آتا ہے** ۔

---

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سکون ۔ سکینت و اطمینان یا ذلت کے ہوتے ہیں ۔ راغب نے لکھا ہے کہ جب انسان اپنے مزاج میں خود ہی ایسی نرمی اور جھکاؤ پیدا کرلے جس میں اسکی سبکی نہ ہوتی ہو تو یہ نرمی اور جھکاؤ محمود ہوتا ہے لیکن اگر کوئی مستبد قوت کسی میں نرمی اور جھکاؤ پیدا کرے جس میں اسکی ذلت و رسوائی کا پہلو ہو تو یہ مذموم ہوتا ہے **۔ هَوَّنَ الشَّيْءَ وَأَهَانَهُ ۔ کسی چیز کو حقیر سمجھنا ۔ اسکی اہانت کرنا ۔ اَلْهَيِّنُ ۔ ذلیل نیز آسان و سہل ۔ اَلْهَوَانُ وَالْمَهَانَةُ ۔ ضعف اور کمزوری *۔ ذلت و حقارت ***۔

هَيِّنٌ ۔ ساکن اور مطمئن ۔ اِمْرَأَةٌ هَوْنَةٌ ۔ مطمئن اور سہولت کے ساتھ کام کرنے والی باوقار عورت ۔ سَارَ عَلٰى هِيْنَتِهٖ ۔ وہ اپنی عادت کے مطابق نرمی اور سہولت کے ساتھ چلا ۔

سورۃ نحل میں ہے کہ جب ان (بدوؤں) میں سے کسی کو لڑکی کی پیدائش کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر رنج و غم کی گھٹا چھا جاتی ہے اور وہ قوم سے چھپتا پھرتا ہے اور پھر سوچتا ہے کہ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ (۱۶/۵۹) ۔ وہ (اس لڑکی کو جس کی پیدائش کی خبر ملی ہے) ذلت و رسوائی کی خاطر باقی رہنے دے یا اسے مٹی میں دبا دے ۔

سورۃ الفرقان میں جہنم کے متعلق ہے يَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا (۲۵/۶۹) ۔ اس میں ذلت و رسوائی کا مفہوم ہے ۔ سورۃ مریم میں ہے هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ (۱۹/۹)۔ یہ مجھ پر سہل اور آسان ہے ۔ سورۃ نور میں ہے تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (۲۴/۱۵) ۔ تم اسے معمولی بات سمجھتے ہو حالانکہ قانون خداوندی کی رو سے وہ بہت بڑی بات ہے ۔

سورۃ الفجر میں تنگی رزق کی وجہ سے ذلیل اور کمزور کرنے کے لئے رَبِّيْٓ اَهَانَنِ (۸۹/۱۶) آیا ہے ۔

لہذا قرآن کریم میں جہاں عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۲/۹۰) آیا ہے تو اس کے معنی ہیں ایسی سزا جو ذلیل و رسوا بھی کر دے اور جس سے قوم کی قوت ٹوٹ کر اسمیں ضعف اور کمزوری آ جائے ۔ محکومیت میں یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں ۔ نیز دوسروں کے آسروں پر جینے والی قوموں میں ۔

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔

سورۃ الفرقان میں عبادالرحمٰن کے متعلق ہے یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْناً (۲۵/۶۳) ۔ وہ دنیا میں نہایت اطمینان و سکون سے چلتے پھرتے ہیں ۔ نہ ان میں کسی قسم کی افراتفری ہوتی ہے نہ خوف اور گھبراہٹ ۔ اس لئے کہ وہ کمزور اور ذلیل نہیں ہوتے۔ وہ اَعْلَوْنَ ہوتے ہیں (۳/۱۳۸) ۔ سب پر غالب ۔ اگر اس میں صرف رفتار کے انداز کا ذکر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ میانہ روی سے چلتے ہیں اور یونہی اکڑتے نہیں پھرتے (۳۱/۱۷۔۱۸) اور اگر یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ کے معنی زمین میں غلبہ و حکومت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی حکومت قہر اور استبداد کی حکومت نہیں ہوتی ۔

(جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) سورۃ الفجر میں ہے کہ جب انسان پر رزق کی تنگی کی وجہ سے ذلت و خواری کا عذاب آ جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ رَبِّیْ اَهَانَنِ (۸۹/۱۶) "میرے رب نے مجھے یونہی ذلیل کر دیا" ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ خدا کسی کو یونہی ذلیل نہیں کیا کرتا ۔ ہر شخص اپنے اعمال کی وجہ سے سرفراز ہوتا ہے اور اعمال ہی کی وجہ سے ذلیل ہوتا ہے۔ تم جو ذلیل ہوئے ہو تو اسکی وجہ یہ ہے کہ جب تمہارے پاس رزق کی فروانی تھی تو لَا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۔ وَ لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۸۹/۱۷۔۱۸) ۔ تم ان لوگوں کی جو معاشرہ میں تنہا رہ جاتے تھے عزت نہیں کرتے تھے اور جن کی چلتی گاڑی رک جاتی تھی ان کی روٹی کے انتظام کے لئے ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے تھے۔ تم وراثت کا مال سمیٹ کر کھا جاتے تھے اور چاروںطرف سے مال اکھٹا کرتے چلے جاتے تھے۔ (۸۹/۱۹۔۲۰) ۔ یہ تھا تمہارا وہ غلط معاشرہ جس کی وجہ سے تم پر رزق کی تنگی آئی اور تم ذلیل و خوار ہوگئے ۔

ھ و ی

هَوَىٰ - يَهْوِىْ - هَوِيًّا - اوپر سے نیچے گرنا - هَوَى الشَّيْئُ - چیز اوپر سے نیچے کی طرف گری - هَوَتِ الْعُقَابُ تَهْوِىْ هُوِيًّا - عقاب شکار پکڑنے کے لئے نیچے کی طرف جھپٹا - اَلْمَهْوَاةُ - جَوّ (فضا یا خلا) نیز دو پہاڑوں کے درمیانی نشیبی علاقے کو کہتے ہیں* - اَلْهَوِىُّ - کان میں بھن بھن کی آوازیں آنا** - هَوَاءٌ - ہر خالی چیز کو کہتے ہیں بالخصوص زمین و آسمان کے درمیان خالی فضا کو۔ نیز بزدل کو بھی کہتے ہیں* ۔ الھَوَىٰ ۔ انسانی جذبہ اورخواہش کو کہتے ہیں ۔ یہیں سے هَوِيَهٗ ۔

*تاج ۔ **محیط ۔

یَہْوَاہُ ۔ ھَوِیَ کے معنے چاھنے، محبت کرنے یا پسند کرنے کے آتے ھیں ۔ اِسْتَھْوٰی ۔ اِسْتِھْوَاءً ۔ (۶/۷۱) ۔ اس نے اسے گرانا چاھا ۔ اس کی عقل کو لے اڑا ۔ یا اس کی خواھش کو اس کے لئے مزین کیا ۔ ھَوٰی صَدْرُہٗ یَھْوِیْ ۔ اس کا سینہ خالی ھو گیا* ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے (۱) خالی ھونا اور (۲) گرنا بتائے ھیں ۔

قرآن کریم میں ھے وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی (۵۳/۱) ۔ (طلوع ھونے والا) ستارہ اس پر شاھد ھے جبکہ وہ نیچے کی طرف جا رھا ھو ۔ سورۃ حج میں مشرک کے متعلق ھے ۔ اَوْ تَھْوِیْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ مَکَانٍ سَحِیْقٍ (۲۲/۳۱) ۔ اسے ھوا اڑا کر کسی دور دراز جگہ میں پھینک دے ۔ اس میں نیچے گرانا اور دور پھینک دینا، دونوں آجاتے ھیں ۔ سورۃ النجم میں ھے ۔ وَالْمُؤْتَفِکَۃَ اَھْوٰی ۔ (۵۳/۵۳) ۔ اس نے تباہ شدہ بستیوں کو خالی کر دیا ۔ یا نیچے گرا دیا ۔ سورۃ ابراھیم میں ھے ۔ وَاَفْئِدَتُھُمْ ھَوَاءٌ (۱۴/۴۳) ۔ ان کے دل جرأت و بسالت سے خالی ھو رھے تھے ۔

سورۃ ابراھیم میں حضرت ابراھیمؑ کی دعا ھے ۔ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِنَ النَّاسِ تَھْوِیْ اِلَیْھِمْ (۱۴/۳۷) ۔ اور ایسا کردے کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ھو جائیں ۔ سورۃ بقرہ میں لَا تَھْوٰی اَنْفُسُکُمْ کے بعد ھے اِسْتَکْبَرْتُمْ (۲/۸۷) ۔ یعنی جن رسولوں کو تمہارا دل پسند نہیں کرتا تھا تم ان سے انکار و سرکشی اختیار کرلیتے تھے ۔

سورۃ النجم میں وحی کے مقابلہ میں انسان کے ذاتی خیالات کو ھَوٰی کہا ھے ۔ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (۵۳/۳-۴) ۔ یہ قرآن کریم اس رسول کے ذاتی خیالات نہیں بلکہ وحی ھے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ھے ۔ سورہ بقرہ میں ھے وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَاءَھُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَاءَکَ مِنَ الْعِلْمِ ۔ ۔ ۔ (۲/۱۲۰) ۔ اس وحی کے بعد اگر تم ان لوگوں کے ذاتی خیالات کا اتباع کرو گے تو ۔ ۔ ۔ ۔

اس سے ظاھر ھے کہ قرآن کریم انسانی جذبات و خواھشات کے خلاف نہیں (۳/۱۳) ۔ وہ ان جذبات و خواھشات کے خلاف ھے جو وحی کے تابع نہ رکھے جائیں ۔ وَاِنَّ کَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَھْوَاءِھِمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ (۶/۱۲۰) ۔ ان میں سے بیشتر وہ ھیں جو اپنے ذاتی خیالات کی بناء پر جنہیں وحی (علم) کی سند حاصل نہیں ھوتی، لوگوں کو صحیح راستے سے بھٹکا دیتے ھیں ۔

*تاج ۔

یہی وہ جذبات و خیالات ہیں جو انسان کو شرف انسانیت کی بلندیوں سے حیوانی سطح کی پستیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ وَ مَنۡ یَّحۡلِلۡ عَلَیۡہِ غَضَبِیۡ فَقَدۡ ھَوٰی (۲۰/۸۱)۔ اور جو غلط راستے پر چلکر ہمارے انعامات سے محروم رہ گیا وہ پستیوں میں جا گرا۔ وحی کا مقصود یہ ہے کہ انسان کو بلندیوں کی طرف لے جائے۔ لیکن انسان اس راستے کو چھوڑ کر اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگ جاتا ہے اوراس طرح ذلتوں کی پستیوں میں جا گرتا ہے۔ وَ لَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰہُ بِھَا وَ لٰکِنَّہٗۤ اَخۡلَدَ اِلَی الۡاَرۡضِ وَ اتَّبَعَ ھَوٰٮہُ (۷/۱۷٦)۔ اگر وہ ہمارے قانون مشیت کے مطابق چلتا تو ہم اسے بلندیوں کی طرف لے جاتے۔ لیکن وہ اپنی معاشی مفاد پرستیوں کے ساتھ چمٹ گیا۔ یعنی (وحی کو چھوڑ کر) اپنے ذاتی خیالات و مفادات کے پیچھے لگ گیا۔

یہی وہ پستیوں کی زندگی ہے جسے ھَاوِیَۃٌ کہا گیا ہے (۱۰۱/۹-۱۱)۔ یعنی زندگی کی ایسی حالت جس میں انسان کا دل و دماغ کچھ کام نہ دے اور وہ پریشانیوں اور ذلتوں میں مارا مارا پھرے۔ گری ہوئی حالت۔ اور قرآن کریم کے الفاظ میں نَارٌ حَامِیَۃٌ یعنی بھڑکتی آگ۔

لہذا اگر انسانی جذبات وحی کے تابع چلیں تو اس کا نتیجہ جنت کی زندگی ہے۔ اور اگر وہ سرکش و بے باک ہو جائیں (جسے شیطان کہتے ہیں) تو اس کا نتیجہ جہنم کی پستیاں ہیں۔

اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن کریم کی رو سے انسانی جذبات کوئی قابل نفرت چیز نہیں کہ جنہیں دبانے یا فنا کر دینے میں ''روحانی ترقی'' کا راز مضمر ہے۔ بالکل نہیں۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ جب انسان کی طبیعی زندگی کے کسی تقاضے (جذبہ) اور انسانی سطح زندگی کے تقاضے میں (Tie) آپڑے تو اس وقت اسے اس بلند تقاضے کی خاطر پست تقاضے کو قربان کر دینا چاہئے۔ ''انسانی سطح زندگی کے تقاضے'' ان مستقل اقدار سے وابستہ ہیں جو وحی کی رو سے ملتی ہیں۔ انسانی جذبات کو وحی کی روشنی کے تابع رکھنا، یہ ہے وجہ بالیدگی شرف انسانیت۔ یا انسانی ذات کی نشو و نما (Development) کا طریق۔ جب دونوں میں تصادم (Clash) نہ ہو تو انسانی جذبات کی تسکین کوئی مذموم چیز نہیں۔

ھی (ضمیر)

ھِیَ۔ واحد مؤنث غائب ضمیر مرفوع منفصل ہے۔ ھِیَ اِمۡرَاَۃٌ وہ ایک عورت ہے۔ قرآن کریم میں ہے ھِیَ حَیَّۃٌ (۲۰/۲۰)۔ وہ سانپ ہے۔

ھ ی أ

ھَیَّاَ اْلاَمْرَ تَھْیِئَۃً - اس نے معاملہ کو درست کر دیا - تیار کیا ، ھموار کیا *- سورہ کہف میں ہے وَھَیِّیءْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا (۱۸/۱۰) - ھمارے لئے ھمارے معاملہ کی صحیح صورت مہیا کر دے - اَلْھَیْئَۃُ - کسی چیز کی حالت اور کیفیت - شکل و صورت ***- راغب نے کہا ہے کہ ھیئت محسوس بھی ھو سکتی ہے (یعنی شکل و صورت) اور معقول بھی **- (یعنی کسی کی ذھنی ، قلبی یا دوسری کیفیت جو محسوس شکل میں سامنے نہ آئے لیکن ھم بہ چشم بصیرت اسے دیکھ سکیں) - سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اِنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ مِنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ (۳/۴۸) - اس کے لفظی معنی ھیں '' میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی مانند شکل بنا دوں گا '' - اس کا مجازی مفہوم یہ ہے کہ میں تمہیں ایسی ترتیب نو عطا کرونگا جس سے تم اپنی موجودہ خاک نشینی سے ابھر کر فضا کی بلندیوں میں بال فشاں ھو جاؤ گے - تمہیں فکر و عمل کی رفعتیں نصیب ھو جائیں گی - یہاں ھیئت محسوس نہیں بلکہ معقول مراد ہے (یعنی جسے عقل کی آنکھ سے دیکھا جا سکے) -

ھ ی ت

ھَیْتَ لَکَ - فراء نے کہا کہ یہ حوران کا لغت ہے جو کسی طرح مکہ میں پہنچ گیا اور وھاں کے لوگ اسے بولنے لگ گئے - بعض کے نزدیک یہ عبرانی ھَیْتَالَخْ سے معرب ہے ****- اس کے معنی ھیں ادھر آؤ - جلدی آؤ - ھَیْتَ کلمہ تعجب بھی ہے - مجاھد نے کہا ہے کہ یہ اکسانے کے لئے بولا جاتا ہے *-

اَلْھَیْتُ - گہری نشیبی زمین*- ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی چیخنا اور ھَیَّتَ بِہٖ کے معنی اسے '' چلا کر پکارا '' لکھے ھیں -

سورہ بقرہ میں ہے ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ (۲/۱۱۱) - اپنی دلیل پیش کرو - جلدی سے سامنے لاؤ - بعض اھل لغت نے ھَاتُوْا کو (ھ - ت - و) یا (ھ - ت - ی) کے تابع بھی لکھا ہے - خلیل نے کہا ہے کہ ھَاتِ دراصل آتٰی یُؤْتِیْ سے ہے - اس کے الف کو ھاء سے بدل لیا گیا ہے - سورہ یوسف میں ہے ھَیْتَ لَکَ (۱۲/۲۳) - ادھر آؤ -

---

*تاج - **راغب - ***محیط - ****لین - بحوالہ غریب القرآن میرزا ابوالفضل -

ھ ی ج

اَلْھَیْجُ ۔ حرکت میں آنا ۔ حرکت میں لانا ۔ (لازم اور متعدی) ھَاجَ الْاِبِلَ ۔ اس نے اونٹوں کو رات کے وقت (جب وہ سکون میں تھے) حرکت دی اور چلایا*۔ ھَاجَ الْبَحْرُ ۔ سمندر میں اضطراب اور ھیجان پیدا ھو گیا**۔ ھَاجَتِ الْاِبِلُ ۔ اونٹ پیاسے ھو گئے ۔ یہیں سے ھَاجَ النَّبْتُ کے معنی ھیں سبزیاں خشک ھو گئیں **۔ ھَاجَ الْبَقْلُ ۔ سبزی کا لمبا ھونا اور زرد پڑنا اور سوکھنا *۔ اَلْھَائِجَۃُ ۔ وہ زمین جس کی سبزیاں زرد ھو گئی ھوں یاخشک ھو چکی ھوں*۔ قرآن کریم میں کھیتی کے متعلق ھے ۔ ثُمَّ یَھِیْجُ ($\frac{۳۹}{۲۱}$) ۔ پھر وہ خشک ھو جاتی ھیں ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) برانگیختہ ھونا اور (۲) پودوں کا خشک ھو جانا ھیں ۔

ھ ی ل

ھَالَ عَلَیْہِ التُّرَابَ ھَیْلاً وَ ھَیْلَۃً وَاَھَالَہٗ ۔ اس نے اس پر مٹی ڈالی ۔ فَانْھَالَ وَ تَھَیَّلَ پس مٹی پڑ گئی ، اوپر سے نیچے گر گئی ۔ رَمْلٌ ھَالٍ وَ اَھْیَلُ ۔ ریگ رواں ۔ اَلْھَیْلُ وَالْھَالُ وہ ریت جو گر جائے ۔ کَثِیْبٌ اَھْیَلُ ۔ ریت کا وہ ٹیلہ جس کی ریت گر جائے ۔ اَلْھَیُوْلُ وہ منتشر ذرات جو دوپہر کو روشندانوں میں اڑتے نظر آتے ھیں ۔ اَلْھَالَۃُ چاند کے گرد حلقہ *۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس لفظ کے معنے کسی چیز کو جسے ناپا جاسکے بغیر ناپے دے دینے کے ھیں ۔ یعنی اسے یونہی دھکیل دینا (جس طرح بہنے والی ریت یونہی آگے بڑھ جاتی ھے)۔

قرآن کریم میں ھے یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَکَانَتِ الْجِبَالُ کَثِیْبًا مَّھِیْلاً ($\frac{۳}{۱۴}$) ۔ جس دور (یا زمانے) میں زمین اور پہاڑ کانپ اُٹھینگے ۔ اور پہاڑ ایسے ھو جائینگے جیسے ریت کا وہ تودہ جو خود بخود ڈھیلا پڑ کر بہ گیا ھو ۔ قرآنی انقلاب کے وقت بڑے بڑے سرداران قوم کی عظمت و اقتدار کے ختم ھو جانے کی کیسی عمدہ تشبیہ ھے ۔ یعنی دکھائی تو وہ ایسے دینگے گویا محکم اور مضبوط پہاڑ ھیں ، لیکن درحقیقت ان کی قوت اور استحکام ختم ھو چکے ھوں گے ۔ بس یوں سمجھئے جیسے دریا کے کنارے ریت کا تودہ جو خود بخود پھسل کر نیچے گرتا جا رھا ھو ۔ غلط بنیادوں پر اٹھے ھوئے تمدن

*تاج ۔ **محیط ۔

کی یہی کیفیت ہوتی ہے ۔ وہ زمانے کے تقاضے کے دھچکوں کو سہار نہیں سکتا اور جونہی صحیح انقلاب سے اس کا سامنا ہوتا ہے ریگ رواں کی طرح نیچے آگرتا ہے ۔

ھ ی م

الهُيَامُ ۔ سخت ترین پیاس ۔ ایک بیماری جسکی وجہ سے اونٹ اس طرح پیاسا ہوتا ہے کہ اسے سیرابی نہیں ہوتی**۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی سخت پیاس کے لکھے ہیں ۔

اَلْاَهْيَمُ ۔ وہ اونٹ جسے پیاس کی بیماری لگ جائے اور کسی طرح اس کی تشنگی دور نہ ہو سکے ۔ مؤنث هَيْمَاءُ ہے ۔ اور جمع هِيْمٌ*۔ قرآن کریم میں ہے فَشَارِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ۔ (۵۶/۵۵) ”تم پیوگے جسطرح چھوٹی پیاس کے مارے ہوئے اونٹ پیتے ہیں“ ۔ رَجُلٌ هَيْمَانُ ۔ پیاسا آدمی ۔ رَجُلٌ هَائِمٌ ۔ وَهَيُوْمٌ ۔ متحیر اور حیران آدمی ۔ هَامَ فِي الْاَمْرِ يَهِيْمُ ۔ وہ اس معاملہ میں حیران اور پریشان رہا ۔ اَلْهَيَامُ ۔ وہ ریت جسے ہاتھ میں لیا جائے تو وہ ٹھہرے نہیں بلکہ برابر نیچے کی طرف پھسلتی جائے*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی خشک ریت کے ہیں ۔ اَلْهَيْمَاءُ ۔ لق و دق صحرا جس میں پانی نہ ہو*۔

هَامَتِ النَّاقَةُ تَهِيْمُ ۔ اونٹنی چرنے کے لئے جدھر کو جی چاہا منہ اٹھا کر چلدی ۔ لَيْلٌ اَهْيَمُ ۔ وہ رات جسمیں ستارے نہ ہوں (اور اس لئے مسافروں کو راستہ نہ مل سکے) ۔ اَلْهُيَامُ ۔ ان ریتلے میدانوں کو بھی کہتے ہیں جو پانی کو پی جائیں**۔

ان معانی کو سامنے رکھئے اور پھر یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے شاعرانہ ذہنیت کے متعلق جو کچھ کہا ہے اسکا مفہوم کیا ہے ۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ شاعری ایک پیام بر کے شایان شان نہیں ہوتی (۳۶/۶۹) ۔ (دیکھئے عنوان ش ۔ ع ۔ ر) ۔ ایک رسول ، خدا کا انقلاب آفریں پیغام لیکر آتا ہے ۔ اس کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے اور اسکا ہر قدم اُسی منزل کی طرف اٹھتا ہے ۔ وہ کبھی یہ نہیں کرتا کہ کبھی ادھر نکل گیا ، کبھی اُدھر ۔ وہ اپنے جذبات کے تابع نہیں چلتا بلکہ قانون خداوندی کے بتائے ہوئے راستے پر سیدھا چلا جاتا ہے ۔ اس کے برعکس شاعرانہ ذہنیت کے متعلق کہا کہ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَهِيْمُوْنَ (۲۶/۲۲۵) ۔ وہ ایک ایسے اونٹ کیطرح جسے شدید پیاس کی

---

*تاج ۔ **تاج و محیط و ابن فارس ۔

بیماری مارے مارے پھرا رہی ہو ، کبھی جذبات کی ان وادیوں میں پھرتا ہے اور کبھی تخیلات کی ان جولا نگاہوں میں جانکلتا ہے ۔ اس کا یہ مارے مارے پھرنا جذبات کی پیاس کی وجہ سے ہوتا ہے جسے کبھی اور کہیں بھی سیرابی نصیب نہیں ہو سکتی ۔ وہ ساری عمر یونہی بھٹکتا پھرتا ہے ۔ یہ ہے فرق ایک پیامبر اور ایک شاعر میں ۔ شاعر ، جذبات کی وادیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے ، ایک پیاسے اونٹ کیطرح جسے پیاس کی بیماری کسی پہلو بھی چین نہیں لینے دیتی اور اسکی پیاس بجھتی ہی نہیں ۔ اس کے سفر کی راہیں تاریک ہوتی ہیں جن میں راستہ دکھانے والے ستارے کہیں نہیں ہوتے ۔ برعکس اس کے ایک پیغامبر ایک متعین منزل کی طرف واضح ، سیدھے اور توازن بدوش راستے پر نہایت جزم و یقین اورسکون و اطمینان کے ساتھ چلا جاتا ہے ۔ شاعری جذبات پرستی ہے اور رسالت حقائق کا اتباع ۔ مسلمان کے سپرد " رسالت" کا فریضہ ہوا تھا ۔ یعنی خدا کے دئے ہوئے پیغام پر خود بھی چلنا اور اسے دوسروں تک بھی پہنچانا ۔ لیکن یہ اس راستے کو چھوڑ کر اسطرح " شاعری" میں گم ہوا کہ اب اسے نہ راستے کا پتہ نشان ملتا ہے ، نہ منزل کا ۔ ایک پیاسے اونٹ کیطرح زندگی کے لق و دق صحرا میں مارا مارا پھر رہا ہے اور کہیں اپنی تشنگی کی سیرابی کا سامان نہیں پاتا ۔ اس لئے کہ اسکی پیاس بیماری ہوتی ہے ، سچی پیاس نہیں ہوتی ۔ کسقدر عبرت انگیز ہے یہ نقشہ اور کیسی افسوسناک ہے یہ روش ؟ اور طرفہ تماشا یہ کہ یہ اُمت (جو شاعروں کی قوم بنکر رہ گئی ہے) راستہ دکھانے والا ضابطہ حیات ہر وقت بغل میں دابے ہوئے ہے ۔ چشمۂ شیریں پاؤں کے نیچے اور تلاشِ آب ، صحراؤں کے سراب میں ۔ اب ان کی پیاس کیسے بجھے ؟

ھ ی م ن

هَيْمَنَ الطَّائِرُ عَلٰى فِرَاخِهٖ ۔ کے معنی ہوتے ہیں پرند نے اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے ان کے اوپر پروں کو پھیلایا ، اور لٹکایا ۔ هَيْمَنَ عَلٰى كَذَا ۔ وہ اس کا محافظ و نگران ہوا *۔ اللہ تعالی نے قرآن کریم کو تمام کتب سابقہ کا مُهَيْمِن کہا ہے (۵/۴۸) ۔ یعنی ان تمام صداقتوں کا محافظ جو کتب سابقہ میں بیان ہوئی تھیں ۔ خود اللہ تعالی بھی اَلْمُهَيْمِنُ ہے (۵۹/۲۳) ۔ یعنی جو کائنات کی اسطرح حفاظت کرتا ہے جسطرح بچوں کی ماں اپنے بچوں کی حفاظت کرتی ہے ۔

---

*تاج۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ ھاء - میم - نون کوئی سادہ نہیں ہے - اَلْمُهَيْمِنُ دراصل آمَنَ سے ہے ، جس کا ہمزہ ھ سے بدل گیا ہے -

هَيْهَاتَ

اَلْهَيْهَةُ - وہ جسے اس کے میلے کچیلے کپڑوں کی وجہ سے ایک طرف ہٹا دیا جائے - هَيْهَاتَ - ایک کلمہ ہے جسکے معنی ''دور ہؤا'' کے ہوتے ہیں*- یہ اسم فعل ہے - یعنی ایسا اسم جسکے معنی ماضی کے (یا کبھی امر کے) ہوتے ہیں - اور ایسا فعل جس کی گردان نہیں ہوتی - قرآن کریم میں منکرین حیاتِ آخرت کی زبان سے کہا گیا ہے هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ (۲۳/۳۶) - کس قدر بعید (از قیاس) ہے وہ بات جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے- (جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ وہ ضرور واقع ہو کر رہیگی) - یعنی وہ اپنے ہم مشربوں سے کہتے ہیں کہ یہ جو رسول تم سے کہتا ہے کہ تم مرنے کے بعد پھر زندہ کئے جاؤ گے تو یہ کسقدر بعید از قیاس ہے !

---

*تاج - محیط و راغب -

ی

ی (ضمیر)

ی ۔ ضمیر مجرور متصل ہے۔ واحد متکلم (مذکر اور مؤنث دونوں) کیلئے آتی ہے۔ غُلَامِیْ ۔ میرا غلام۔ نیز ضمیر منصوب متصل ۔ جیسے یَعْبُدُوْنَنِیْ ۔ کبھی یہ ی مفتوح بھی ہو جاتی ہے ۔ جیسے نِعْمَتِیَ الَّتِیْ (۲/۴۰) ۔ اور کبھی حذف بھی ہوجاتی ہے ۔ مثلاً وَلِیَ دِیْنِ (۱۰۹/۶) ۔ میرے لئے میرا دین (یہاں دِیْنِ کے بعد ''ی'' حذف ہو گئی اور ''ن'' پر صرف زیر رہ گیا ۔)

یَا (حرف)

یَا ۔ حرف نداء ۔ پکارنے کے لئے آتا ہے۔ ''اے'' کے معنوں میں۔ یَا اَرْضُ ابْلَعِیْ (۱۱/۴۴) اے زمین تو نگل لے۔ یہ حرف نداء عموماً حذف بھی ہوجاتا ہے۔ جیسے رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا (۲۱/۸۹) ۔ (اے) میرے رب مجھے تنہا نہ چھوڑیو ۔ (یہاں رَبِّ سے پہلے یَا محذوف ہے) یَا کے بعد اَیُّهَا کا اضافہ بھی کر دیا جاتا ہے ۔ جیسے یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا (۹/۲۸) ۔ اے ایمان والو! ۔

ی أ س

اَلْیَاْسُ ۔ ناامید اور مایوس ہونا ۔ یَؤُسٌ ۔ یَئُوْسٌ ۔ ناامید ہوجانے والا ۔ اِسْتَیْاَسَ ۔ ناامید ہو گیا * ۔ سورہ یوسف میں ہے فَلَمَّا اسْتَایْئَسُوْا مِنْهُ (۱۲/۸۰) '' جب وہ اس سے مایوس ہو گئے '' ۔ اور وَلَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یَایْئَسُ ..... (۱۲/۸۷) ۔ اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو ۔ اس سے کافروں کے سوا کوئی مایوس نہیں ہوتا ۔

سورہ رعد میں ہے اَفَلَمْ یَایْئَسِ الَّذِیْنَ آمَنُوْا .... (۱۳/۳۱) اہل لغت نے کہا ہے کہ یہاں اسکے معنی اَفَلَمْ یَعْلَمْ کے ہیں ۔ یعنی کیا

*تاج ۔

انھوں نے اسباب کو جان نہیں لیا*۔ ابن فارس نے یہ معنی بھی بنیادی لکھے ھیں (یعنی جاننا) ۔ لیکن راغب کا کہنا ھے کہ یہ معنی مجازی ھیں**۔ سورہ ممتحنہ میں ھے قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَۃِ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۱۳/۶۰) ۔ یہاں اس کے معنی انکار کرنے کے ھیں ۔ یعنی وہ انکار جو ناامیدی کا نتیجہ ھوتا ھے ۔

آپ سورہ یوسف کی اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جو اوپر درج کی گئی ھے ۔ اس میں آپ کو قوموں کے عروج و زوال کے متعلق ایک عظیم اصول ملیگا ۔ آیت ھے وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۔ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (۸۷/۱۲)۔ ’’ اللہ کی رحمت سے نا امید مت ھو ۔ کیونکہ اللہ کی رحمت سے سوائے کافروں کے کوئی ناامید نہیں ھوتا‘‘ ۔ اسی کو دوسری جگہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (۵۳/۳۹) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ھے۔ (نیز ۴۹/۴۱)۔ اسلام کسی کو قنوطی (Pessimistic) نہیں بنانا چاھتا ۔ مومن وہ ھے جو علٰی وجہ البصیرت خدا کے قوانین کی محکمیت ، نتیجہ خیزی اور صداقت پر یقین رکھتا ھے ۔ وہ اس یقین کے ساتھ اس راستے پر گامزن ھوتا ھے ۔ اگر اسے کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ھے ، یا اپنی کسی غلطی سے نقصان اٹھانا پڑتا ھے تو اپنی روش کی صداقت اور محکمیت پر یقین اسے بددل نہیں ھونے دیتا ۔ وہ سنبھلتا ھے ۔ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ھے اور اپنی غلطی کا ازالہ کرکے ، پھر اسی راستے پر چل پڑتا ھے ۔ یہ ھے خدا کی رحمت سے ناامید نہ ھونے کا مفہوم ۔ ناامید وہ ھوتا ھے جو کسی راستے کو قیاس اور گمان پر تجربۃً اختیار کرتا ھے ۔ جب اُسے ناکامی ھوتی ھے تو وہ وھیں رک جاتا ھے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے سے نا امید ھو جاتا ھے ۔ لیکن جسے راستے کی صحت پر یقین ھو وہ کبھی نا امید نہیں ھوتا ۔ یہ وجہ ھے کہ قرآن کریم نے نا امیدی اور ابلیسیت کو لازم و ملزوم قرار دیا ھے ۔ (دیکھئے عنوان ب ۔ ل ۔ س) ۔ لیکن خدا کی رحمت یونہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتی ۔ اس کے لئے کہا ھے کہ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۔ تم دفع مضرت اور جلب منفعت ، دونوں صورتوں میں قوانین خداوندی کو آواز دو ۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۵۶/۷) ۔ یقین جانو کہ خدا کی رحمت ان کے قریب ھوتی ھے جو حسن کارانہ انداز سے توازن بدوش زندگی بسر کرتے ھیں ۔

اسی میں ایک اور بات بھی قابل غور ھے ۔ ایک شخص مصائب کے ہجوم میں گھر جاتا ھے جہاں سے نکلنے کی کوئی راہ اسے نہیں ملتی ۔ لیکن

*تاج ۔ **راغب ۔

وہ ہمت نہیں ہارتا ۔ دل نہیں چھوڑتا ۔ وہ اسے محض طبعی حالات کی مجبوری سمجھتا ہے ۔ اپنے اندر شکست خوردگی کا احساس نہیں پیدا ہونے دیتا ۔ یہ شخص '' خدا کی رحمت '' سے مایوس نہیں ۔ لیکن اگر وہ ایسی مجبوری کے عالم میں (یا جونہی کوئی مشکل سامنے آئے اسوقت) فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں اس قابل ہی نہیں کہ اس کا مقابلہ کر سکوں یا اسے برداشت کر سکوں ، تو اس پر مایوسی چھا جائیگی ۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی ذات پر ایمان رکھتا ہے ، جسے خود اعتمادی حاصل ہے ، وہ کبھی مایوسی کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتا ۔ اسے اپنے آپ پر بھروسہ ہوتا ہے اور وہ اسی وجہ سے پرامید رہتا ہے ۔ لیکن جس شخص کا اپنی ذات پر ایمان نہیں رہتا ۔ جو اس سے انکار کر دیتا ہے ، وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے ۔ اس پر (Frustration) چھا جاتی ہے یہی چیز ہے جو بسا اوقات انسان کو خودکشی تک لے جاتی ہے ۔ خودکشی وہ کرتا ہے جس کی اپنی نظروں میں کوئی قیمت نہیں رہتی ۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرے زندہ رہنے میں میرا کچھ فائدہ نہیں ۔ وہ اپنی نظروں میں آپ گر جاتا ہے ۔ مادی نظریہ حیات (Materialistic concept of life) میں چونکہ سارا انحصار خارجی (مادی) اسباب و ذرائع پر ہوتا ہے اس لئے جب وہ اسباب ختم ہو جاتے ہیں تو انسان مایوس ہو جاتا ہے ۔ لیکن انسانی ذات کی ممکنات کی کوئی ۔

مقام پر بھی یہ نہیں کہتا کہ اس سے آگے میں کچھ کر سکنے کے قابل نہیں ۔ وہ یہ کہیگا کہ اس کے بعد سردست میرے پاس مادی وسائل نہیں رہے لیکن وہ اپنی ذات سے کبھی مایوس نہیں ہوگا ۔ کفر درحقیقت انسان کا اپنی ذات سے انکار — اور اس کے بعد مکمل ترین ذات خداوندی سے انکار ہے ۔ علاوہ بریں ، انسانی ذات پر ایمان سے انسان ، بلند اقدار کی ضرورت محسوس کرتا ہے جو اسے وحی سے ملتی ہیں ۔ اسی کی قوت سے وہ طبیعی مجبوریوں سے نہیں گھبراتا اور مایوسی کو کبھی اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتا ۔ حتکہ موت کا سامنا کرتے وقت بھی نہیں گھبراتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت سے اس کا جسم فنا ہوجائیگا لیکن اس کی ذات پر کوئی آنچ نہیں آئیگی ۔

آپ نے غور فرمایا کہ مایوسی کیوں کفر ہے ۔

يَأجُوجُ وَمَأجُوجُ

وہ اقوام جن کی یورشوں سے حفاظت کے لئے ذوالقرنین نے دیوار بنا کر دی تھی (۹۴/۱۸) تفصیل عنوان (ا - ج - ج) کے تحت دیکھئے۔

یَاقُوْتٌ

اَلْیَاقُوْتُ ۔ یہ فارسی لفظ ہے جو عربی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ سخت اور صاف شفاف جواہرات جن کے مختلف رنگ ہوتے ہیں ۔ عموماً سرخ رنگ مراد ہوتا ہے ۔

قرآن کریم میں ہے کَاَنَّھُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ (۵۵/۵۸) ۔ گویا کہ وہ (مؤنث) یاقوت اور مرجان ہیں ۔

یٰلَیْتَ

یہ حرفِ ندا (یا) اور لَیْتَ کا مجموعہ ہے ۔ اس کے معنی ہیں "اے کاش" (دیکھئے یَا اور لَیْتَ) ۔

ی ب س

یَبِسَ ۔ کسی مرطوب چیز کا خشک ہو جانا ۔ اَلْیَبْسُ ۔ وہ چیز جو پہلے تر ہو اور پھر خشک ہو جائے ۔ شَاۃٌ یَبْسٌ ۔ اس بکری کو کہتے ہیں جس کے تھن خشک ہو جائیں اور وہ دودھ دینا بند کر دے * ۔ اَلْیَبَسُ ۔ وہ جگہ جہاں پانی ہو اور پھر جاتا رہے ۔ تورات میں اَلْیَابِسَۃُ خشکی کے لئے آیا ہے بمقابلہ بَحْرٌ کے ** ۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا فَاضْرِبْ لَھُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا (۲۰/۷۷) ۔ بنی اسرائیل کو سمندر میں ایسے راستے سے لے جا جس پر پہلے پانی تھا لیکن جو اسوقت خشک ہے ۔

سورۃ انعام میں ہے وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (۶/۵۹) ۔ کائنات کی کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں (یا خشک و تر پھل ایسا نہیں) جس کے لئے ضروری قانون اور قاعدہ صحیفہ فطرت (کائناتی قوانین کے ضابطہ) میں موجود نہ ہو ۔

ی ت م

اَلْیُتْمُ ۔ اکیلا اور تنہا رہ جانا ۔ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ اصمعی نے کہا ہے کہ اَلْیَتِیْمُ اس ریتیلی زمین کو کہتے ہیں جو اپنے اردگرد کی زمینوں سے الگ تھلگ ہو ۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ اَلْمُیْتَمُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تنہا اور اکیلی ہو ۔ راغب کے نزدیک ہر منفرد

---

* تاج ۔ ** محیط ۔

اور تنہا چیز یتیم کہلاتی ہے*۔ دُرَّۃٌ یَتِیْمَۃٌ۔ اس موتی کو کہتے ہیں جو اپنی نوعیت کا ایک ہی ہو۔

بن باپ کے بچے کو بھی یَتِیْمٌ اسلئے کہتے ہیں کہ وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ حرالی نے کہا ہے کہ ضرورت کے وقت باپ کا نہ رہنا یُتْمٌ کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک بچہ جوان نہ ہو وہ یَتِیْمٌ کہلاتا ہے، لیکن جب وہ جوان ہو جائے تو اسے یَتِیْمٌ نہیں کہتے۔ اس کے برعکس لڑکی اُسوقت تک یَتِیْمَۃٌ کہلاتی ہے جب تک اسکی شادی نہ ہو جائے، خواہ وہ بالغ بھی کیوں نہ ہو چکی ہو۔ بہائم (حیوانات) میں یَتِیْمٌ ان بچوں کو کہتے ہیں جنکی ماں نہ رہے اسلئے کہ ان میں بچہ کی پرورش ماں کرتی ہے۔ باپ کی انہیں احتیاج نہیں ہوتی۔ برعکس اس کے اگر انسانی بچہ کی ماں مر جائے تو اسے یَتِیْمٌ نہیں کہتے۔ مُنْقَطِعٌ یا عَجِیٌّ کہتے ہیں۔ اگر ماں باپ دونوں مرجائیں تو اسے لَطِیْمٌ کہتے ہیں۔ (یَتِیْمٌ کی جمع اَیْتَامٌ اور یَتَامٰی دونوں آتی ہیں)۔ اِمْرَاَۃٌ مُؤْتِمٌ۔ اس عورت کو کہتے ہیں جس کے بچے یتیم ہو جائیں۔ یعنی جس کا شوہر مر جائے*۔ لسان العرب میں ہے کہ یَتِیْمٌ اس عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند نہ ہو۔ یعنی خواہ مر چکا ہو یا ویسے ہی اس کا خاوند نہ ہو۔ قرآن کریم میں یَتٰمَی النِّسَآءِ ($\frac{۴}{۱۲۷}$) ایسی ہی عورتوں کے لئے آیا ہے۔

یَتَامٰی کے ان معانی کو سامنے رکھئے اور پھر سورہ نساء کی اس آیت کو دیکھئے جس میں کہا گیا ہے کہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتَامٰی فَانْکِحُوْا مَاطَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ . . . ($\frac{۴}{۳}$) - اگر تم دیکھو (تمہیں اس کا خدشہ ہو) کہ تم "یتامٰی" کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں کر سکتے - ان کے حقوق پورے نہیں ہو سکتے - تو تم ان میں سے جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے دو دو - تین تین - چار چار تک سے شادی کر لو۔

ظہور اسلام کے بعد مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کو بے شمار لڑائیاں لڑنی پڑیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئیں - بہت سے بچے لاوارث رہ گئے - بہت سی بالغ لڑکیاں ایسی رہ گئیں جنہیں خاوند ہی نہیں مل سکتا تھا - یہ ایک ایسی ہنگامی اور اجتماعی مشکل پیدا ہو گئی جس کا حل نہایت ضروری تھا - یہ مشکل اس لئے تھی کہ

*تاج و محیط و راغب -

(۱) قرآن کریم کا عام قانون ایک عورت سے شادی کرنے کا تھا (فَوَاحِدَةً ۔ ۳/۴)

(۲) مسلمان عورتیں نہ کفار سے شادی کر سکتی تھیں ، نہ مشرکین سے ۔ نہ اہل کتاب سے ۔ انہیں بہرحال مسلمان ہی سے شادی کرنی تھی ۔ اور مسلمان مردوں کی تعداد اسقدر کم ہو گئی تھی ۔

اس ہنگامی مسئلہ کے حل کے لئے قرآن کریم نے وحدت زوج (Monogamy) کے قاعدے میں وقتی طور پر استثناء (Relaxation) کی اجازت دی اور کہا کہ ان عورتوں میں سے (اَلنِّسَآءَ ۔ ۳/۴) جو اسطرح بے شوہر رہ گئی ہیں (خواہ بیوہ ہو کر ۔ اور خواہ نا کتخدائی کی حالت میں جنہیں شوہر نہیں ملتا) ۔ حسب پسند ، ایک سے زیادہ سے نکاح کرکے ان کی حفاظت کا سامان پیدا کر دو ۔ یہی ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل ہے ۔ قرآن کریم میں بس یہی ایک آیت ہے جس میں تعدد ازدواج (Polygamy) کی اجازت ہے ۔ اگر ایسے حالات پیدا نہ ہوں تو پھر قانون وہی ایک بیوی کا ہے ۔

یَتِیمٌ ۔ یَتَمًا کے معنی کمزور اور ضعیف ہو جانا ۔ قاصر ہو جانا اور تھک جانا ۔ درماندہ ہو جانا ۔ بھی ہوتے ہیں ۔ نیز یَتْمٌ کے معنی فکر و غم کے بھی آتے ہیں اور دیر کرنے اور غفلت کرنے کے بھی ۔ اسلئے کہ یتیموں کی خبر گیری میں غفلت کی جاتی ہے اور انہیں مدد پہنچانے میں دیر لگائی جاتی ہے ۔ اَلْیَتَمُ کے معنی حاجت اور ضرورت کے بھی ہوتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں یتیموں کی نگہداشت کے متعلق بڑی تاکید آئی ہے ، اور سرمایہ داری کے نظام کی تباہی کا سبب یہ بتایا ہے کہ لَا تُکْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ (۸۹/۱۷) ۔ ان آیات میں یَتِیْمٌ سے مراد وہی نہیں جنکے باپ مر چکے ہوں ۔ اس سے مراد تمام وہ لوگ ہیں جو معاشرہ میں تنہا رہ گئے ہوں ۔ جو بے یار و مدد گار ہوں ۔ لہذا جس معاشرہ میں کسی فرد کو بھی یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ اکیلا ہے ۔ اس کا کوئی مدد گار نہیں ۔ اسکی مصیبت تنہا اس کی مصیبت ہے ۔ اسکا کوئی مونس و غمخوار اور کوئی یار و مدد گار نہیں ۔ وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے ، کیونکہ اس میں تنہا رہ جانے والے کو واجب التکریم نہیں سمجھا جاتا ۔ قرآن کریم ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں کسی فرد کو اس کا احساس تک نہ ہونے پائے کہ وہ تنہا ہے ۔ اس کا کوئی پناہ دینے والا نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود نبی اکرمؐ

*تاج و محیط و راغب ۔

سے کہا کہ اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی (۹۳/۶) ۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس نے تجھے یتیم پایا اور پناہ کا سامان بہم پہنچا دیا ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یتیم وہ ہے جو پناہ سے محروم رہ جائے ۔ اور ایسے شخص کے لئے پناہ کا سامان بہم پہنچانا اس معاشرہ کا کام ہے جو خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوا ہو ۔

یحیی علیہ السلام

قرآن کریم نے حضرت یحییٰ کو منجملہ انبیاء بنی اسرائیل بتایا ہے (۶/۸۵) ۔ آپ حضرت زکریا کے بیٹے تھے (۱۹/۷) ۔ صاحب کتاب اور بچپن ہی سے عمدہ قوتِ فیصلہ کے مالک (۱۹/۱۲) اور صفاتِ حسنہ سے آراستہ (۱۹/۱۳-۱۵)۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انجیل میں جنہیں یوحنا کہکر پکارا گیا ہے وہ حضرت یحییٰ ہی ہیں۔ انجیل (لوقا) میں "یوحنا" کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے کہ

> وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا اور اسرائیل پر ظاہر ہونے تک جنگلوں میں رہا (۱/۸۰) ۔

انجیل متی میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے آپ کے متعلق فرمایا کہ

> میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا ۔

رینان نے اپنی کتاب (Life of Jesus) میں لکھا ہے کہ "یوحنا" کی تعلیم کا مرکز (Judea) تھا لیکن اس کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا اور حضرت عیسیٰ ان سے آ کر ملے تھے ۔ اس کے بعد اس نے لکھا ہے کہ " یوحنا " اور حضرت عیسیٰ نے فلسطین کے صحرا میں ایک عجیب انقلاب انگیز نظام قائم کیا تا آنکہ ۲۹ء میں " یوحنا " کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ نے وطن کی طرف مراجعت فرمائی ۔

ی د ی

اَلْیَدُ ۔ ہاتھ کو کہتے ہیں ۔ مؤنث استعمال ہوتا ہے ۔ اسکی جمع اَیْدٍ ہے ۔ لیکن اس لفظ کا استعمال اسقدر متعدد معانی میں ہوتا ہے جنکی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں ۔ جیسے ہمارے ہاں " ہاتھ" کا استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً جاہ اور وقار ۔ قوت و اقتدار ۔ غلبہ و تسلط ۔ ملکیت ۔ مددگار ۔ امداد اور فریاد رسی۔ احسان و انعام ۔ حفاظت و صیانت ۔ حذاقت و مہارت ۔ دوسری طرف یہ لفظ

ندامت وشرمندگی۔ ذلت و انقیاد کے لئے بھی آتا ہے۔ قرآن کریم میں حضرات انبیاء کرام کے متعلق ہے کہ وہ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ تھے (۳۸/۴۵)۔ یعنی قوت اور بصیرت دونوں کے مالک۔ دوسری طرف ان کے مخالفین کے متعلق کہا ہے کہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ (۱۴/۹) انہیں بات کرنے سے روک دیا جائے۔ ابن قتیبہ نے ان معانی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ وہ غیظ و غضب میں اپنے ہاتھ کاٹنے لگتے ہیں***۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آئیگا سیاق و سباق کے اعتبار سے اس کے معنی کئے جائینگے۔ قرآن کریم میں بَيْنَ يَدَيْهِ کا محاورہ متعدد بار آیا ہے۔ اسکے لفظی معنی ہیں اس کے دونوں ہاتھوں کے درمیان۔ یعنی سامنے*۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (۲/۹۷) کہا ہے۔ لہذا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ کے معنی ہیں " جو اس کے سامنے ہے"۔ قرآن کریم نے اپنے آپ کو ان اخلاقی اقدار کا مصدق کہا ہے جو دنیا کے پاس اس سے پہلے آئی تھیں۔ اور ان میں سے بعض، نزول قرآن کے وقت بھی ان لوگوں کے پاس موجود تھیں۔ مثلاً جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ وغیرہ۔ قرآن کریم ان کی اس قسم کے اقدار کا مصدق تھا۔ وہ اہل کتاب کی کتابوں کی تصدیق نہیں کرتا تھا، وہ انہیں خود محرف قرار دیتا تھا۔"مصدق" کے صحیح مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان (ص د ق)۔

سورہ ذاریات میں ہے وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ (۵۱/۴۷)۔ ہم نے آسمان (فضائی کروں یا خارجی کائنات) کو قوت و اقتدار کے ساتھ بنایا ہے۔ [نیز دیکھئے عنوان ا۔ ی۔ د]

سورہ توبہ میں ہے کہ اہل کتاب اسلامی نظام میں جزیہ دیں عَنْ يَدٍ (۹/۲۹) اس نعمت و آسائش کے بدلے میں جو انہیں اطمینان و سکون کے ساتھ رہنے میں حاصل ہے**۔

سورہ فرقان میں ہے يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ (۲۵/۲۷) اس کے معنی، غم و غصہ میں دانتوں سے ہاتھ چبانے کے ہیں۔ اعمالِ انسانی کےمتعلق بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ (۲/۹۵)، کئی مقامات پر آیا ہے۔ یعنی جو کچھ ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی ہاتھ نہیں بلکہ خود

*تاج و محیط۔ **راغب۔ (بحوالہ۔ غریب القرآن میرزا ابوالفضل)
***القرطین ج/۱ صفحہ ۲۳۵

انسان کے ہیں - سورہ بقرہ میں ہے وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ (۲/۱۹۵) اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو - سورہ حجرات میں ہے لَا تُقَدِّمُوا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۴۹/۱) اس سے مراد احکام اور فیصلے ہیں -

(سَارِقٌ کے قطع یَد کے لئے دیکھئے عنوان ق - ط - ع - اور یَد بَیْضَاء کے لئے دیکھئے عنوان ب - ی - ض اور ض - م - م) -

ی س ر

اَلْیَسَرُ - اَلْیَسْرُ - نرمی - اَلْیُسْرُ - سہولت - آسانی - فراخی - کشائش آسودگی، تونگری - معیشت کی طرف سے فارغ البالی - بہتات - (عُسْرٌ بمعنی تنگی کی ضد ہے) * - یَسِرَ و یَسُرَ الاَمْرُ - معاملہ آسان اورسہل ہوا - یَسَّرَ - اس کام کو آسان یا سہل کر دیا - تَیَسَّرَ واسْتَیْسَرَ - آسان ہوا - بآسانی مہیا ہؤا * - (۲/۱۹۶ : ۷۳/۲۰) - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی کھل جانا اور ہلکا پھلکا ہونا لکھے ہیں - اَلْیَسَارُ - بایاں ہاتھ - بائیں جانب (یَمِیْنٌ کی ضد ہے) * - الیَسِیْرُ والمَیْسُوْرُ - آسان - سہل - اَلْیَسِیْرُ - تھوڑی چیز ** - اَلْمَیْسَرَةُ وَالْیَسَارُ - تونگری - آسودگی - غنی ** - (۲/۲۸۰) - اَلْمَیْسِرُ - قمار - جوا - وہ اونٹ جو جوئے میں ہارا یا جیتا جاتا تھا * -

قرآن کریم میں یُسْرٌ بمقابلہ عُسْرٌ آیا ہے (۲/۱۸۵) - سورہ بنی اسرائیل میں ہے - فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَیْسُوْرًا (۱۷/۲۸) - ان سے نرمی سے بات کرو - ایسی بات جو انہیں گراں نہ گذرے - سورہ احزاب میں یَسِیْرًا (۳۳/۱۴) کے معنی ہیں کم از کم - بہت تھوڑے - قلیل تعداد میں - ''کم وقت کے لئے یا کم تعداد میں'' دونوں معنی ہو سکتے ہیں -

سورہ بقرہ میں خَمْرٌ اور مَیْسِرٌ کے متعلق ہے فِیْهِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲/۲۱۹) - مَیْسِرٌ یُسْرٌ سے ہے جسکے بنیادی معنی آسانی ہیں - اگرچہ عربوں میں مَیْسِرٌ ہر قسم کے جوئے کو کہتے ہیں - اس جوئے کو بھی جو تیروں سے ایک خاص طریق سے کھیلا جاتا تھا اور جس میں اونٹ کے گوشت کے حصے بخرے کئے جاتے تھے - لیکن اس کے مفہوم کو اسکے بنیادی معانی کے پیش نظر مقید نہ رکھا جائے تو ہر وہ مال جو انسان کو آسانی سے ہاتھ آجائے مَیْسِرٌ ہوگا -

*تاج - **راغب -

اسکی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اگرچہ اس قسم کی دولت سے فائدے بھی حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اس سے انسانی طبیعت میں جو سستی اور کسل مندی، جو ضعف اور اضمحلال پیدا ہوتا ہے (دیکھئے عنوان ا۔ ث۔ م) اس کے نقصانات ان فوائد کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں جو اس روپے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس قسم کی دولت کو رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ کہکر اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ($\frac{۵}{۹۰}$)۔ اور اسے قرآن کریم کے نظام صلوٰۃ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کا موجب بتایا گیا ہے ($\frac{۵}{۹۱}$)۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان محنت اور کوشش سے کمائے اور جو کچھ اپنی ضروریات سے زائد ہو اسے نوع انسانی کی پرورش کے لئے عام کر دے ($\frac{۲}{۲۱۹}$)۔ ظاہر ہے کہ جو دولت انسان کو آسانی سے بیٹھے بٹھائے ہاتھ آجائے وہ اسے محنت اور مشقت کا عادی نہیں رہنے دیگی اور اسطرح اس کی صلاحیتوں میں اضمحلال پیدا کرنے کا موجب بن جائیگی، جیسے ہر رئیس زادے کی حالت ہوتی ہے کہ وہ خود کمانے کا اہل ہی نہیں رہتا۔ اس طرح حاصل شدہ دولت سے انسان میں دولت کی ہوس اور زر پرستی کا جذبہ بڑھ جاتا ہے اور وہ دوسروں کو دینے کی بجائے زیادہ سے زیادہ اپنے لئے حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ جیسے ہر قمار باز کی کیفیت ہوتی ہے۔ لہذا ہر وہ دولت جو آسانی سے (بغیر محنت و مشقت) ہاتھ آجائے قرآنی تعلیم کی روح کے مطابق مَیْسِرٌ میں داخل ہے۔ بالخصوص عصر حاضر کی "تجارت" جو کہنے میں تجارت ہے لیکن درحقیقت میسر ہے۔ اور زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھئے تو سارا نظام سرمایہ داری ہی میسر ہے۔ اس میں ہر سرمایہ دار کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اس کا پھل یہ لے جائے۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ زندگی کی سہولتیں اور آسانیاں حاصل کرنا چاہتے ہو تو مشکلات کا سامنا کرو۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ($\frac{۹۴}{۵}$)۔ جو قوم (یا فرد) مشکلات کا سامنا کرنے سے گھبراتی ہے اسے وہ آسانیاں حاصل نہیں ہو سکتیں جو صحیح خوشگواریوں کا موجب بنتی ہیں۔ البتہ اسے وہ یُسْرٌ حاصل ہوجاتا ہے جو اثم (اضمحلال اور ضعف) کا موجب بنتا ہے اور تباہی و بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔

یعقوب علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسحٰقؑ۔ اور حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کا ذکر زمرۂ انبیائے کرامؑ میں

کیا ہے . . . . وَمَا اُنْزِلَ اِلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ . . . . (۱۳۶/۲) ۔ آپ کا لقب اِسْرَائِیْلُ (یعنی مردِ خدا) تھا ۔ اسی نسبت سے آپ کی اولاد (در اولاد) بنی اسرائیل کہلائی ۔ قرآن کریم نے بھی آپ کو اس لقب سے یاد کیا ہے ۔ مثلاً سورہ آل عمران میں ہے . . . . اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَائِیْلُ عَلٰی نَفْسِہٖ . . . . (۹۳/۳) ۔ ''سوائے اس کے جسے اسرائیل نے اپنے آپ پر حرام قرار دے لیا تھا'' ۔ اور سورہ مریم میں ہے مِنْ ذُرِّیَّۃِ اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْرَائِیْلَ . . . . (۵۸/۱۹) ۔ ذریتِ ابراھیم اور اسرائیل سے'' ۔

حضرت یوسف آپ کے بیٹے تھے ۔

یَعُوْق

قوم نوح کا بت تھا (۲۳/۷۱) ۔ عرب کے لوگ اس بت کے نام سے بخوبی متعارف تھے ۔ چنانچہ قبیلہ بنو ھمدان اس نام کے ایک بت کی پرستش کیا کرتا تھا ۔

یَغُوْث

قوم نوح کا بت تھا (۲۳/۷۱) ۔ عرب کے لوگ اس بت کے نام سے بخوبی متعارف تھے ۔ چنانچہ خود عرب میں قبیلہ بنو مراد کے لوگ اس نام کے ایک بت کی پرستش کیا کرتے تھے ۔

یَقْطِیْن

اَلْیَقْطِیْنُ ۔ وہ بیل جو زمین پر پھیل جائے ۔ جیسے خربوزہ، تربوز، کدو کی بیلیں ۔ بعض نے کہا ہے کہ یَقْطِیْنٌ کدو کی بیل کو کہتے ھیں ۔ نیز اَلْیَقْطِیْنَۃُ کدو کو کہتے ھیں* ۔ صاحب تاج العروس نے یہ بھی کہا ہے کہ ھر وہ پودا جو ایک سال کے اندر ھی پیدا ھوکر ختم ھو جائے یَقْطِیْنٌ کہلائیگا ۔ نیز ھر بڑا پتہ یَقْطِیْنٌ کہلائیگا ۔ قرآن کریم میں شَجَرَۃً مِنْ یَقْطِیْنٍ (۱۴۶/۳۷) آیا ہے ۔ اس سے مراد ہے چوڑے پتوں والا پودا جو سایہ دیتا ھو ۔

*تاج و راغب و محیط ۔

ی ق ظ

اَلْیَقَظَۃُ - بیداری - یہ نَوْمٌ (نیند) کی ضد ہے - اس میں ہوشیاری کا مفہوم بھی ہوتا ہے - رَجُلٌ یَقْظٌ وَ یَقِظٌ - بیدار آدمی - اسکی جمع اَیْقَاظٌ آتی ہے، بمقابلہ رُقُوْدٌ (۱۸/۱۸) - اَبُوالْیَقْظَانِ - مرغ کو کہتے ہیں *-

ی ق ن

یَقِنَ الاَمْرَ وَاَیْقَنَہٗ وَاسْتَیْقَنَہٗ وَتَیَقَّنَہٗ - اس نے معاملہ کو جانا اور اسکی حقیقت معلوم کر لی - یَقْنٌ وَیَقَنٌ - کسی بات کا واضح اور ثابت ہو جانا - یَقِیْنٌ - شَکٌّ کی ضد ہے - یعنی شک کا زائل ہو کر علم و تحقیق کے ساتھ کسی امر کا پایۂ ثبوت تک پہنچ جانا *- مَوْتٌ کو بھی یَقِیْنٌ کہتے ہیں کیونکہ ہر مخلوق پر اس کا آنا یقینی ہے اور ٹھوس واقعات ہر روز اسکی شہادت دیتے ہیں *-

سورہ انعام میں حضرت ابراهیمؑ کے متعلق مذکور ہے کہ وہ کائناتی قوانین (مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) کے مشاہدہ کے بعد یَقِیْنٌ کے درجہ تک پہنچ گئے (۶/۷۵) - سورہ حجر میں جہاں فرمایا کہ وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ (۱۵/۹۹) - تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تو اپنے نشو و نما دینے والے کے قانون ربوبیت کا کامل اتباع کئے جا، حتکہ کہ تیرا دعوی (کہ اس نظام کے نتائج حیات بخش اور خوشگوار ہونگے) ایک ٹھوس واقعہ کی شکل میں سامنے آجائے (نیز ۷۴/۴۷) -

لہذا اِیْمَانٌ کے معنی ہونگے کسی پر اعتماد کرکے اسکی بات کو صحیح مان لینا اور یَقِیْنٌ کے معنی ہونگے علم و تحقیق کے بعد اس بات کا ثابت ہو جانا اور اس کا ٹھوس واقعہ کی شکل میں سامنے آجانا - لَتَرَوُنَّهَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ (۱۰۲/۷) - تم اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے - قرآن کریم نے جب مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ آخرت (مستقبل) پر یقین رکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی سعی و عمل کے ٹھوس نتائج ان کے سامنے آجاتے ہیں - یعنی پہلے وہ اپنے نظام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان لاتے ہیں (۲/۳) - اس کے بعد جب وہ اس نظام کو قائم کر لیتے ہیں تو اس کے بدیہی نتائج مرئی اور محسوس شکل میں ان کے سامنے آجاتے ہیں - اس طرح ان کا ایمان، یقین میں بدل جاتا ہے (۲/۴) - یہ ہیں مستقبل پر یقین کے معنی - اسی

*تاج -

یقین سے انسان اس امر پر ایمان لے آتا ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی (آخرت) بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے۔

ہم نے ''ایمان'' اور ''یقین'' میں جو امتیازی خط کھینچا ہے وہ دونوں الفاظ کا الگ الگ مفہوم سمجھانے کے لئے ہے۔ ورنہ ایمان، خود یقین ہی کا نام ہے۔ اور یقین، ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں مرادف المعنی بھی ہو جاتے ہیں۔ یا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ''یقین'' ''ایمان'' کے نتائج کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

ی م م

اَلْیَمَامُ۔ قصد کرنا*۔ اَلْیَمُّ۔ دریا۔ سمندر کو بھی کہتے ہیں*۔ (۲۰/۳۹؛ ۲۸/۷؛ ۲۸/۴۰)۔

اَلتَّیَمُّمُ۔ کسی کام کا ارادہ کرنا، قصد کرنا*۔ (۲/۲۶۷؛ ۴/۴۳؛ ۵/۶) (دیکھئے عنوان م۔ س۔ ح)

ی م ن

اَلْیُمْنُ۔ برکت۔ اَلْمَیْمَنَةُ۔ برکت۔ دائیں جانب۔ اَلْیَمَنُ۔ دائیں جانب۔ اَلْیَمِیْنُ۔ دایاں ہاتھ۔ دائیں جانب۔ (یَسَارٌ کی ضد ہے)۔ نیز اس کے معنی قوت کے ہیں**۔ یَمِیْنٌ۔ جمع اَیْمَانٌ۔ قسم۔ اس لئے کہ عرب قسم کھاتے وقت اپنا دایاں ہاتھ دوسرے کے دائیں ہاتھ پر مارتے تھے*۔

سورہ کہف میں ہے ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ (۱۸/۱۸)۔ یعنی دائیں بائیں۔ سورہ قصص میں ہے مِنْ شَاطِیءِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ (۲۸/۳۰)۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ''وادی کے دائیں کنارے سے'' اور یہ بھی کہ ''مبارک وادی کے کنارے سے''۔

قسم کے معنوں میں یہ لفظ (اَیْمَانُکُمْ) متعدد مقامات پر آیا ہے۔ (مثلاً ۲/۲۲۴)۔ نکاح کے لئے عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ کے الفاظ آئے ہیں (۴/۳۳)۔ یعنی تمہارے عہد و پیمان بندھے اور مستحکم ہوئے۔

برکت کے لئے اَصْحَابَ الْیَمِیْنِ (۵۶/۲۷)۔ اور اَصْحَابُ الْمَیْمَنَةِ (۵۶/۸) آیا ہے۔ لیکن اس کے معنی ''دائیں جانب والے'' بھی ہو سکتے ہیں۔

---

*تاج و محیط۔ **ابن قتیبہ۔ (القرطین ج/۲۔ صفحہ ۱۸۰)

نیز اَلطّوْرِ الاَیْمَنِ (۵۲/۱۹) - زور اور قوت کے معنوں میں سورہ صفٰت میں ہے فَرَاغَ عَلَیْھِمْ ضَرْبًا بِالْیَمِیْنِ (۹۳/۳۷) - (ابراھیم ؑ) نے ان بتوں پر پوری قوت سے بھرپور وار کیا۔ اسی سورۃ میں ذرا پہلے ہے قَالُوْا اِنَّکُمْ کُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ (۲۸/۳۷) - وہ کہینگے تم ہمارے پاس بڑی قوت اور زبردست ذرائع کے ساتھ آیا کرتے تھے - (اور اسطرح ہمیں حق کے راستے سے روک دیا کرتے تھے)۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے - مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ - اس کے لفظی معنی ہیں '' جن کے مالک تمہارے دائیں ہاتھ ہو چکے '' - بعض مقامات پر اس کے معنی ہیں وہ لوگ جو کسی کے ماتحت کام کریں - کسی کے تابع فرمان ہوں - (مثلاً ۳۶/۴ میں) - لیکن بعض مقامات پر اس کے معنی غلام اور لونڈیاں ہیں - سورہ نور میں ہے وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتَابَ مِمَّامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (۳۳/۲۴) - تمہارے غلام اور لونڈیوں میں سے جو تم سے مکاتبت کریں - یعنی ایک معاھدہ کے تحت آزادی کی تحریر مانگیں -

اسلام سے پہلے عرب میں غلاموں اور لونڈیوں کا عام رواج تھا - غلام باھر کا کام کاج کیا کرتے تھے اور لونڈیوں کو وہ لوگ گھروں میں ڈال لیتے تھے - یہ وہ معاشرہ تھا جس میں اسلام نمودار ھوا - جب یہ لوگ مسلمان ھوئے تو ان کے ھاں غلام اور لونڈیاں موجود تھے - اسلام غلامی کو مٹانے کے لئے آیا تھا لیکن اگر وہ ان غلاموں اور لونڈیوں کو (جو اُسوقت موجود تھے) یک لخت آزاد کر دینے کا حکم دیتا تو اس سے معاشرہ کا توازن بگڑ جاتا - یہ جوان لونڈیاں (اتنی بڑی تعداد میں) جب خاوندوں کے بغیر آزاد کر دی جاتیں تو وہ معاشرہ کے لئے سخت خرابیوں کا موجب بن جاتیں - اسلام نے اس صورت حالات کو برقرار رھنے دیا اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا - لیکن جو غلام اور لونڈیاں اس وقت موجود تھیں ان کے متعلق ایسے احکام دئے کہ وہ رفتہ رفتہ آزاد ھوکر معاشرہ کا جزو بننے جائیں اور جب تک غلام رھیں ان سے انسانوں جیسا سلوک کیا جائے - مَامَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ کے ماتحت لونڈی غلاموں کے متعلق قرآن کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ انھی لونڈی غلاموں کے متعلق ہے - ان کے بعد لونڈی غلاموں کا سلسلہ بھی بند ھوجانا تھا اسلئے یہ احکام بھی نافذ العمل نہیں رھنے تھے - البتہ اگر اس دور کے بعد کوئی ایسی صورت پیدا ھو جائے جس میں کوئی ایسی قوم مسلمان ھو جائے جن میں پہلے سے لونڈی غلام موجود ھوں تو ان غلاموں پر یہی احکام نافذ ھو جائینگے -

مَامَلَکَتْ" اَیْمَانُکُمْ" کی مندرجہ بالا تشریح کی روشنی میں قرآن کریم کے مختلف مقامات کو دیکھئے۔ بات صاف ہو جائے گی کہ یہ احکام اُسوقت کے لونڈی غلاموں کے متعلق ہیں، اور بس۔ مثلاً وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَامَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ (۲۹-۳۰/۷۰)۔ وہ لوگ جو اپنی پاکدامنی کی حفاظت کرتے ہیں اور صرف اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہیں یا ان لونڈیوں کے پاس جن کے وہ مالک بن چکے ہیں (قرآن کریم میں ہر جگہ یہ لفظ ماضی کے صیغے میں آیا ہے)۔ مزید تفصیل کے لئے عنوان (م - ل - ک) دیکھئے۔

ہماری بدبختی کہ مسلمان سلاطین نے غلاموں اور لونڈیوں کا دروازہ کھول لیا اور قرآن کریم کی انہی آیات (اور موضوع روایات) کو اپنے عمل کے جواز کے لئے بطور سند پیش کر دیا۔ قرآن کریم پر اس سے بڑا اتہام اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس سے غلامی کا جواز ثابت کیا جائے۔

ی ن ع

یَنَعَ الثَّمَرُ۔ یَیْنَعُ۔ یَنْعاً۔ پھل کا پک کر بالکل تیار اور توڑنے کے قابل ہو جانا۔ اَلْیَنِیْعُ۔ پوری طرح پکا ہوا پھل۔ اَلْیَانِعُ۔ پختہ پھل - سرخ*۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَیَنْعِهٖ (۱۰۰/۶) پھل کا پکنا۔ اس کا سرخ ہونا۔

یہود

قوم بنی اسرائیل۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "موسیٰ[ؑ]" اور عنوان (ھ - و - د)

یوسف علیہ السلام

حضرت ابراہیم[ؑ] کے بیٹے حضرت اسحٰق[ؑ]۔ آپ کے بیٹے حضرت یعقوب[ؑ] اور ان کے بیٹے حضرت یوسف[ؑ]۔ قرآن کریم نے آپ کا تذکرہ جلیلہ ایک ہی سورۃ میں مسلسل بیان کیا ہے (اور کسی نبی کا تذکرہ اس طرح مسلسل بیان نہیں ہوا)۔ بچپن میں بھائیوں نے انہیں ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا (۱۵/۱۲)۔ جہاں سے اُنہیں ایک قافلے والے مصر لے گئے۔ وہاں آپ (مختلف مراحل طے کرنے کے بعد)، مملکت کے اقتدار و اختیار کے مالک ہو گئے (۵۶/۱۲؛ ۱۰۱/۱۲)

*تاج و محیط و راغب

اور اپنے والدین اور دیگر اہل خاندان کو بھی وہیں بلا لیا ۔ اس طرح بنی اسرائیل (یعنی حضرت یعقوبؑ کی اولاد) کنعان سے مصر کی طرف منتقل ہو گئی ۔

سورہ انعام میں حضرت یوسفؑ کا نام انبیاء کرام کے زمرہ میں آیا ہے ۔ .... دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْسُفَ وَ مُوْسٰی وَ ھٰرُوْنَ .... (۶/۸۵) ۔ اور سورہ مؤمن میں ، دربار فرعون کا مرد مؤمن اپنی تقریر میں حضرت یوسفؑ کا ذکر ایک رسول کی حیثیت سے کرتا ہے ۔ (۴۰/۳۴) ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنا پیغام جو بینات پر مشتمل تھا قوم مصر تک پہنچایا تھا ۔

(حضرت یوسفؑ کے کوائف حیات اور ان کے حسن سیرت کی داستان نور پاش ، میری کتاب ''جوئے نور'' میں ملیگی) ۔

ی و م

یَوْمٌ ۔ دن ۔ طلوع آفتاب یا طلوع فجر صادق سے غروب آفتاب تک کا وقت ۔ یہ لفظ عربوں کے ہاں مطلقاً وقت اور زمانہ کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ دن اور رات کی اس میں کوئی قید نہیں ہوتی ۔ صبح اور شام کی گردش بھی یَوْمٌ ہے (یعنی ایک دن) ۔ سال بھی ۔ ایک صدی بھی ۔ ہزار سال اور پچاس ہزار سال بھی ۔ وَقْتٌ اور سَاعَۃٌ کی طرح یَوْمٌ کے بعد بھی اِذٍ بڑھا دیا جاتا ہے ۔ اور یَوْمَئِذٍ کے معنی تقریباً وہی ہوتے ہیں جو وَقْتَئِذٍ اور سَاعَتَئِذٍ کے ہوتے ہیں* ۔ گویا وَقْتٌ ۔ سَاعَۃٌ اور یَوْمٌ ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں ۔ یَوْمٌ کی جمع اَیَّامٌ ہے* ۔ ابن فارس نے یَوْمٌ کے معنے دن بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ استعارۃً یہ لفظ امر عظیم کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔

نیز اس کے معنی ہیں حکومت اور دولت اور زمانہ' ولایت** ۔ تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹) میں اَیَّامٌ کے معنی حکومت و سلطنت کے لئے گئے ہیں** ۔

اَیَّامٌ ۔ وقائع (یعنی تاریخ کے ناقابل فراموش واقعات یا معرکے) کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً اَیَّامُ الْعَرَبِ کے معنی وَقَائِعُ الْعَرَبِ ہیں** ۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اَیَّامُ اللّٰہِ انہی معانی میں آیا ہے ۔ مثلاً وَذَکِّرْھُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰہِ (۱۴/۵) ۔ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے

*محیط ۔ **تاج ۔

معرکہ کے لئے آیا ہے ۔ یہ اَیَّامُ اللّٰہِ اس لئے وقوع پذیر ہوتے ہیں لِیَجْزِیَ قَوْمًا بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۴۵/۱۴) ۔ تاکہ کسی قوم کو اس کے کئے کی سزا مل جائے ۔ اسی لئے بعض اہل لغت نے اَیَّام کے معنے عقوبتیں اور سزائیں بھی کئے ہیں* ۔

کائنات میں خدا کا قانون ارتقاء جاری و ساری ہے ۔ اس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ خدا اپنے اس (ابتدائی قانون مشیت ۔ دیکھئے عنوان ش ۔ ی ۔ أ) کے مطابق جب کسی اسکیم کو بروئے کار لانے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے اس کا مکمل پلان اپنے عالم امر (السماء) میں مرتب کرتا ہے ۔ پھر اس پلان کو عملاً متشکل کرنے کے لئے اس کی ابتداء پست ترین نقطہ سے کرتا ہے ۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ۔ پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اوپر کو اٹھتی ہے ۔ یہ منازل ایک یَوْم میں طے ہوتے ہیں جو انسانی حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے ۔ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲/۵) ظاہر ہے کہ یہاں ''یوم'' سے مراد دور یا مدت یا زمانہ یا تدریجی مرحلہ ہے ۔ یہی دور بعض اوقات پچاس پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے (۷۰/۴) ۔ علمائے طبقات الارض یا محققین نظریہ ارتقاء اس کی شہادت دینگے کہ یہ تدریجی مراحل کتنے کتنے طویل المیعاد ہوتے ہیں ۔

لہذا قرآن کریم میں جہاں یَوْم کا لفظ آئے گا تو ہر جگہ اس کے معنے اس ''دن'' کے نہیں ہوں گے جو چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے ۔ اس کے معنی وقت (Time) یا دور (Period) یا زمانہ (Age) یا کسی خاص مدت یا حالت (Stage) کے ہوں گے ۔ مثلاً مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ (۱/۳) کے معنے ہونگے وہ دور جس میں تمام مخالف قوتیں شکست کھا جائیں اور غلبہ و اقتدار صرف قانون خداوندی کا رہ جائے ۔ یا وہ دور جس میں انسانی اعمال کے نتائج عدل و انصاف کی رو سے مرتب ہوں ۔ یا ظہور نتائج کا وقت ۔ وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (۸۲/۱۹) ۔ جس دور میں حکومت صرف خدا کے قانون کی ہوگی ۔ (مزید تصریح د ۔ ی ۔ ن کے عنوان میں دیکھئے) ۔

یونس علیہ السلام

حضرت یونسؑ انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں ۔ ان کا عبرانی نام یوناہ تھا جو عربی میں آ کر یونس ہو گیا ۔ تورات میں ان کا نوشتہ ''کتاب یوناہ''

*تاج ۔

کے نام سے موجود ہے ۔ ان کا زمانہ اندازاً ۸۰۰ ق ۔ م کا قیاس کیا جاتا ہے ۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۔ ۔ ۔ (۳۷/۱۳۹) ۔

تورات (صحیفہ یوناہ) میں آپ کے متعلق تفصیلی تذکرہ آیا ہے ۔ لیکن (تورات کے عام انداز کے مطابق) اس میں بہت کچھ ایسا بھی ہے جو خدا کے کسی رسول کے شایانِ شان نہیں ہو سکتا ۔ قرآن کریم نے اتنا ہی بتایا ہے کہ آپ اپنی قوم سے خشمناک ہو کر کسی دوسری طرف جانے کے ارادہ سے نکلے ۔ راستہ میں کشتی میں سوار ہو گئے ۔ کشتی طوفان میں پھنس گئی ۔ ملاحوں نے (غالباً) فیصلہ کیا کہ کچھ سواریوں کو دریا میں پھینک دیا جائے تاکہ کشتی کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور باقی مسافر محفوظ رہجائیں ۔ آپ کو بھی حوالہٴ دریا کر دیا گیا جہاں آپ کو ایک بڑی مچھلی نے دبوچ لیا ۔ لیکن آپ صحیح و سلامت کنارے تک آپہنچے ۔ دیکھئے (۲۱/۸۷-۸۸؛ ۳۷/۱۳۹-۱۴۶) ۔

حضرات انبیاء کرام[1] کا یہ عام طریق رہا ہے کہ جب وہ دیکھیں کہ ان کا اپنا وطن ان کے نظام کے لئے سازگار نہیں تو وہ وہاں سے ہجرت کر کے اس علاقے کیطرف چلے جاتے تھے جہاں کی فضا ان کے مشن کے لئے مساعد ہوتی تھی ۔ لیکن یہ ہجرت خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق ہوتی تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یونس[1] نے اپنی قوم سے ، اپنے اجتہاد کے مطابق ، ہجرت کر لی اور ان کا یہ فیصلہ خدا کے پروگرام کے مطابق نہیں تھا ۔ قبل از وقت تھا ۔ اس لئے وہ بعد میں اس پر نادم ہوئے (۳۷/۱۴۲) ۔ نبی اکرم[2] سے کہا گیا کہ آپ نے صاحب حوت کی طرح نہ ہو جانا (۶۸/۴۸) [نیز دیکھئے عنوان ا ۔ ب ۔ ق]

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس بستی (نینوا) کیطرف آپ کو رسول بنا کر بھیجا گیا تھا اسکی آبادی ایک لاکھ سے بھی اوپر تھی ۔ (یعنی اس زمانہ کے اعتبار سے وہ بہت بڑا شہر تھا) (۳۷/۱۴۷) ۔ انہوں نے آپ کی دعوت سے انکار کیا لیکن قبل اس کے کہ ان پر عذاب آ جاتا ، وہ ایمان لے آئے اور اس طرح انہیں مہلت مل گئی (۳۷/۱۴۸) ۔ اہل نینوا اس وقت تو تباہی سے بچ گئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد (قریب ۶۹۰ ق ۔ م میں) انہوں نے پھر وہی شیوہ اختیار کر لیا ۔ بنی اسرائیل کے ایک اور نبی نے (جن کا ذکر قرآن کریم نے نہیں کیا لیکن یہود کی روایات میں ان کا پتہ ملتا ہے) اُنہیں خدا کے عذاب سے متنبہ کیا ۔ وہ باز نہ آئے تو ایک طرف سے اہل بابل نے ان پر حملہ کیا اور دوسری طرف سے دریا میں سخت سیلاب آیا ۔ اور اس طرح نینوا کا نام و نشان صفحہٴ ہستی سے مٹ گیا ۔

قرآن کریم نے آپ کو ذَا النُّوْنِ (۲۱/۸۷) اور صَاحِبِ الْحُوْتِ (۶۸/۴۸) کہکر بھی پکارا ہے ۔

الحمد للہ

کہ

لغات القرآن کی چوتھی (اور آخری) جلد بھی مکمل ہوگئی۔ اس کے بعد اس کا تتمہ آپ کے سامنے آئیگا جس میں، پوری لغات پر نظر ثانی کے بعد، ضروری اضافے اور ترمیمات کی گئی ہیں۔

اللہ کا شکر ہے

کہ

اس لغات کی تکمیل سے میری عمر بھر کی محنت محفوظ ہوگئی۔ اب "مفہوم القرآن" کی طباعت کا سلسلہ شروع ہوگا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ لغات القرآن اور مفہوم القرآن کی موجودگی میں، قرآن کریم کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہیگی۔

یہ بہرحال

ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو اور خطا کا ہر وقت امکان ہوتا ہے۔ مینے قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ دیگر ارباب ذوق اور علم دوست حضرات، مزید غور و تدبر سے، اسے بہتر بنا سکتے ہیں۔ قرآن کریم میں غور و فکر کا سلسلہ تو کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس باب میں کسی انسان کا قول بھی حرف آخر نہیں کہلا سکتا۔ والسلام۔

پرویز